قرآن کریم کی دو مستند اور مقبول تفسیریں

آسان بیان القرآن

مع

تفسیر عثمانی

سورۃ العنکبوت تا سورۃ الناس

3

ترجمہ قرآن شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

خلاصہ تفسیر حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

فوائد تفسیر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

تسہیل و ترتیب

عُمَر أنوَر بَدَخشَانِی

استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

Banuri

بنوری

بسم الله الرحمن الرحيم

وقل رب زدني علما

اللهم صل على سيدنا محمد وسلم

2019 — ١٤٤٠

Banuri
بنوری

Banuripublishers@gmail.com

قرآن کریم کی دو مستند اور مقبول تفسیریں

آسان بیان القرآن
مع
تفسیر عثمانی

سورۃ العنکبوت تا سورۃ الناس

3

ترجمہ قرآن شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

خلاصہ تفسیر حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

فوائد تفسیر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

تسہیل و ترتیب
عمر انور بدخشانی
استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

Banuri
بنوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

ایاتھا ٦٩ | ٢٩ سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ ٨٥ | رکوعاتھا ٧

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں زیادہ تر ان امور کے متعلق احکام ہیں جو دین پر قائم رہنے سے مانع ہیں: ① ایک مانع کفار کا مسلمانوں کو عملی وقولی ایذا پہنچانا تھا ② دوسرا مانع بعض کفار کا مسلمانوں پر زبانی جبر کرنا تھا ③ تیسرا مانع کفار کا مسلمانوں کو بہکانا تھا اور ان میں سے اکثر کفار کا مقصود مسلمانوں کو دین سے ہٹا دینا تھا اور یہی مضمون خاص عنوان سے گزشتہ سورت کی اخیر آیت: **ولا یصدنك عن آیات الله** میں بیان ہوا ہے، اس سے اس سورت کے شروع کا گزشتہ سورت کے خاتمہ سے تعلق بھی ظاہر ہوگیا ④ چوتھا مانع ہجرت سے تھا، یعنی فکر رزق جس کو **یعبادی الذین امنوا** میں دور کیا، اور اس سارے مجموعہ کے درمیان میں مسائل توحید ونبوت بیان ہوئے جو کفار کی اس تمام مخالفت کا بڑا سبب تھا، پھر تسلی کے لیے بعض قصے پہلی امتوں کے بیان ہوئے، اور سب کے بعد آخر میں **والذین جاھدوا فینا** میں کفار کی ان ایذاؤں پر صبر کرنے والوں اور دین پر جمے رہنے والوں کو بڑی بشارت دے کر سورت ختم کی گئی، اور چونکہ یہ مجاہدہ سورت کی ابتدائی آیتوں میں: **ومن جاھد فانما** میں بھی مذکور تھا اس سے سورت کی دونوں طرفیں بھی باہم متناسب ہوگئیں، اور اگر اس پر نظر کی جائے کہ پہلی آیت مجاہدہ میں ہیبت کا اثر ہے اور اخیر کی آیت میں انس کا اثر ہے تو اس ترتیب سے تربیت کا جو لطف سمجھا جاتا ہے وہ وجد میں لانے والا ہے، واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓمّٓ ۚ① اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ②

المّٓ، کیا یہ سمجھتے ہیں لوگ کہ چھوٹ جائیں گے اتنا کہہ کر کہ ہم یقین لائے اور ان کو جانچ نہ لیں گے (نہ ہوگی)

خلاصہ تفسیر: الٓمّٓ (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں، بعض مسلمان جو کفار کی ایذاؤں سے گھبرا جاتے ہیں تو) کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے میں چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو (قسم قسم کے مصائب سے) آزمایا نہ جائے گا (یعنی ایسا نہ ہوگا، بلکہ اس قسم کے امتحانات بھی پیش آئیں گے)۔

وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ: شبہ ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں کو تو کچھ بھی تکلیف پیش نہیں آئی؟ جواب یہ ہے کہ ان لوگوں سے مراد خاص خاص مؤمن ہیں جو اس وقت مصائب میں مبتلا تھے، یا مطلق مسلمان مراد ہیں، جس کے صحیح ہونے کے لیے بعض کا مبتلا ہونا کافی ہے سب مسلمان مراد نہیں، سو دونوں تقدیر پر شبہ نہ رہا کہ بعض مسلمانوں کو تو کچھ بھی تکلیف نہیں پیش آئی۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا: اس میں دلالت ہے کہ منزل مقصود پانے کے لیے محنت، مجاہدہ اور آزمائش شرط ہے، محنت، مجاہدہ اور آزمائش کے بغیر منزل نہیں ملتی، خواہ مجاہدہ اختیاری ہو یا اضطراری، بہر حال ضروری ہوا کرتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرنا کچھ سہل نہیں جو دعویٰ کرے امتحان وابتلاء کے لیے تیار ہو جائے یہ ہی کسوٹی ہے جس پر کھرا کھوٹا کسا جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ سب سے سخت امتحان انبیاء کا ہے، ان کے بعد صالحین کا، پھر درجہ بدرجہ ان لوگوں کا جو ان کے ساتھ مشابہت رکھے ہوں، نیز امتحان آدمی کا اس کی دینی حیثیت کے موافق ہوتا ہے جس قدر کوئی شخص دین میں مضبوط اور سخت ہوگا اسی قدر امتحان میں سختی کی جائے گی۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ③

اور ہم نے جانچا ہے ان کو جو ان سے پہلے تھے ۱؎ سو البتہ معلوم کرے گا اللہ جو لوگ سچے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جھوٹوں کو ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور ہم تو (ایسے ہی واقعات سے) ان لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے (مسلمان) ہو گذرے ہیں (یعنی اور امتوں کے مسلمانوں پر بھی یہ معاملے گذرے ہیں، اس بات کے معلوم ہونے سے تسلی ہو سکتی ہے کہ اہل باطل ہمیشہ اہل حق کے ساتھ مخالفت کرتے رہے ہیں) سو (اسی طرح ان کی آزمائش بھی کی جائے گی اور اس آزمائش میں) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (ظاہری علم سے) جان کر رہے گا جو (ایمان کے دعویٰ میں) سچے تھے، اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا (چنانچہ جو سچے اعتقاد سے مسلمان ہوتے ہیں وہ ان امتحانات میں ثابت قدم رہتے ہیں بلکہ اور زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں اور جو دفع الوقتی کے لئے مسلمان ہو جاتے ہیں وہ ایسے وقت میں اسلام کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، یعنی یہ ایک حکمت ہے امتحان کی کیونکہ مخلص اور غیر مخلص کے خلط ملط میں بہت سی مضرتیں ہوتی ہیں، خاص کر ابتدائی حالات میں)۔

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا: مقصد اس آیت کا نیک و بد اور مخلص و غیر مخلص کا امتیاز واضح کر دینا ہے، جس کو اس طرح تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے گا صادقین کو اور کاذبین کو، اللہ تعالیٰ کو تو ہر انسان کا صادق یا کاذب ہونا اس کے پیدا ہونے سے پہلے بھی معلوم ہے، امتحانات اور آزمائشوں کے جان لینے کے معنی یہ ہیں کہ اس امتیاز کو دوسروں پر بھی ظاہر فرما دیں گے، ظاہری علم کے متعلق دوسرے پارے سیقول کے شروع میں بھی گزر چکا ہے، شیخ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے اس کی توجیہ یہ بھی منقول ہے کہ بعض اوقات عوام کے درجہ علم پر تنزل کر کے بھی کلام کیا جاتا ہے، عام انسان مخلص اور منافق میں فرق آزمائش ہی کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں، ان کے مذاق کے مطابق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ان مختلف قسم کے امتحانات کے ذریعہ ہم یہ جان کر رہیں گے کہ کون مخلص ہے کون نہیں، حالانکہ اس کے علم میں یہ سب کچھ ازل سے ہے، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پہلے نبیوں کے متبعین بڑے بڑے سخت امتحانوں میں ڈالے جا چکے ہیں، بخاری میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مرتبہ آپ ﷺ کی خدمت میں فریاد کی کہ حضرت! ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کیجیے اور دعاء فرمائیے، یہ وہ زمانہ تھا کہ مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر سختی اور ظلم و ستم کی انتہاء کر رکھی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے ایک (زندہ) آدمی کو زمین کھود کر (کھڑا) گاڑ دیا جاتا تھا، پھر اس کے سر پر آرہ چلا کر بیچ سے دو ٹکڑے کر دیتے تھے، بعضوں کے بدن میں لوہے کہ کنگھیاں پھرا کر چمڑا اور گوشت ادھیڑ دیا جاتا تھا، تاہم یہ سختیاں ان کو دین سے نہ ہٹا سکیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ اعلانیہ ظاہر کر دے گا اور دیکھ لے گا کہ دعوائے ایمان میں کون سچا نکلتا ہے اور کون جھوٹا، اسی کے موافق ہر ایک کو جزا دی جائے گی۔

تنبیہ: فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الخ سے جو حدوث علم باری کا وہم ہوتا ہے اس کا نہایت محققانہ جواب مترجم علام قدس سرہ نے دیا ہے، ملاحظہ کیا جائے پارہ دوم رکوع اول: اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ (البقرۃ: ۱۴۳) کے تحت میں، ہم نے یہاں ان توجیہات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو مفسرین نے لکھی ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ④

کیا یہ سمجھتے ہیں جو لوگ کہ کرتے ہیں برائیاں کہ ہم سے بچ جائیں بری بات (برا فیصلہ) طے کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: گذشتہ مضمون تو مسلمانوں کے متعلق ہوا، آگے ان تکلیف دینے والے کفار کی نسبت فرماتے ہیں:

ہاں! کیا جو لوگ برے برے کام کر رہے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم سے کہیں نکل بھاگیں گے، ان کی یہ تجویز نہایت ہی بیہودہ ہے (یہ

جملہ معترضہ کے طور پر تھا جس میں کفار کی بدانجامی سنا کر مسلمانوں کی ایک گونہ تسلی کردی کہ انجام کار اہل باطل ہی ناکام ہوتے ہیں اور ان سب ایذاؤں کا ان سے بدلہ لیا جائے گا)۔

***

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''پہلی دو آیتیں مسلمانوں کے متعلق تھیں جو کافروں کی ایذاؤں میں گرفتار تھے اور یہ آیت ان کافروں سے متعلق ہے جو مسلمانوں کو ستا رہے تھے''، (موضح) یعنی مومنین کے امتحانات کو دیکھ کر یہ نہ سمجھیں کہ ہم مزے سے ظلم کرتے رہیں گے اور سختیوں سے بچے رہیں گے، وہ ہم سے بچ کر کہاں جاسکتے ہیں، جو سخت ترین سزا ان کو ملنے والی ہے اس کے سامنے مسلمانوں کے امتحان کی سختی کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی، اگر اس وقت کی عارضی مہلت سے انہوں نے یہ رائے قائم کرلی ہے کہ ہم ہمیشہ مامون رہیں گے اور سزادہی کے وقت خدا کے ہاتھ نہ آئیں گے تو حقیقت میں بہت ہی بری بات طے کی ایسا احمقانہ فیصلہ آنے والی مصیبت کو روک نہیں سکتا۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ⑤

جو کوئی توقع رکھتا ہے اللہ کی ملاقات کی سو اللہ کا وعدہ آرہا ہے اور وہ ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: (اب پھر مسلمانوں کی طرف روئے سخن ہے کہ) جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو سو (اس کو تو ایسے ایسے حوادث سے پریشان ہونا ہی نہ چاہئے کیونکہ) اللہ (کے ملنے) کا وہ معین وقت ضرور ہی آنے والا ہے (جس سے سارے غم غلط ہوجائیں گے۔ کقولہ تعالیٰ: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ) اور وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (نہ کوئی بات اس سے مخفی نہ کوئی فعل، پس ملاقات کے وقت تمہاری تمام قولی و فعلی طاعات کا صلہ دے کر سب غم دور کردے گا)۔

***

فائدہ: یعنی جو شخص اس توقع پر سختیاں اٹھا رہا ہے کہ ایک دن مجھے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے جہاں بات بات پر پکڑ ہوگی۔ ناکامیاب ہوا تو یہاں کی سختیوں سے کہیں بڑھ کر سختیاں جھیلنی پڑیں گی اور کامیاب رہا تو ساری کلفتیں ڈھل جائیں گی اللہ کی خوشنودی اور اس کا دیدار نصیب ہوگا، ایسا شخص یاد رکھے کہ اللہ کا وعدہ آرہا ہے، کوئی طاقت اسے پھیر نہیں سکتی، اس کی اعلیٰ توقعات پوری ہوکر رہیں گی اور اس کی آنکھیں ضرور ٹھنڈی کی جائیں گی، اللہ سب کی باتیں سنتا اور جانتا ہے کسی کی محنت رائگاں نہ کرے گا۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ⑥

اور جو کوئی محنت اٹھائے سو اٹھاتا ہے اپنے ہی واسطے اللہ کو پروا نہیں جہان والوں کی

خلاصہ تفسیر: اور (یاد رکھو کہ ہم جو تم کو مشقتیں برداشت کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں سو اس میں ظاہر اور مسلّم ہے کہ ہماری کوئی منفعت نہیں، بلکہ) جو شخص محنت کرتا ہے وہ اپنے ہی (نفع کے) لئے محنت کرتا ہے (ورنہ) اللہ تعالیٰ کو (تو) تمام جہان والوں میں کسی کی حاجت نہیں (اس میں بھی مشقتیں برداشت کرنے کی ترغیب ہے، کیونکہ اپنے نفع پر متنبہ ہوجانے سے وہ کام زیادہ آسان ہوجاتا ہے)۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ: اللہ تعالیٰ کی صفت بے نیازی سے انسانوں کے عجب و دعوی استحقاق کی بنیاد گرجاتی ہے، عجب و تکبر تو وہ کرے جو کسی کا محتاج نہ ہو۔

***

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ کو کسی کی اطاعت سے کیا نفع اور معصیت سے کیا نقصان، وہ تو کلی طور پر بے نیاز ہے، ہاں بندہ اپنے پروردگار کی طاعت میں جس قدر محنت اٹھائے گا اس کا پھل دنیا و آخرت میں اسی کو ملے گا، پس مجاہدے کرنے والے یہ خیال کبھی نہ آنے دیں کہ ہم خدا کے راستہ میں

اتنی محنت کر کے کچھ اس پر احسان کر رہے ہیں؟ (العیاذ باللہ) اس کا احسان ہے کہ خود تمہارے فائدہ کے لیے طاعت و ریاضت کی توفیق بخشے:

من نہ کردم خلق تا سودے کنم بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ

اور جو لوگ یقین لائے اور کئے بھلے کام ہم اتار دیں گے ان پر سے برائیاں ان کی اور بدلہ دیں گے ان کو بہتر

الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۷

سے بہتر کاموں کا

خلاصہ تفسیر: اور (وہ نفع جو اطاعت سے پہنچتا ہے اس کا بیان یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ہم ان کے گناہ ان سے دور کر دیں گے (جن میں سے بعض گناہ جیسے کفر و شرک تو ایمان سے زائل ہو جاتے ہیں اور بعض گناہ توبہ سے کہ اعمال صالحہ میں داخل ہے اور بعض گناہ صرف اعمال حسنہ سے، اور بعض گناہ محض فضل سے معاف ہو جائیں گے اور کوئی گناہ قدرے سزا کے بعد، پس گناہ دور کرنا سب کو شامل ہے) اور ان کو ان کے (ان) اعمال (ایمان و اعمال صالحہ) کا (استحقاق سے) زیادہ اچھا بدلہ دیں گے (پس اتنی ترغیبوں کے بعد طاعات اور مجاہدہ پر قائم رہنے کا اہتمام بہت ضروری ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جہاں سے بے پروا اور بے نیاز ہونے کے باوجود اپنی رحمت و شفقت سے تمہاری محنت کو ٹھکانے لگاتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی ایمان کی برکت سے نیکیاں ملیں گی اور برائیاں معاف ہوں گی''، (موضح القرآن)

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۭ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ

اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی سے رہنے کی اور اگر وہ تجھ سے زور کریں کہ تو شریک کرے میرا جسکی تجھ کو خبر نہیں ۱

فَلَا تُطِعْهُمَا ۭ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸

تو ان کا کہنا مت مان ۲ مجھی تک پھر آنا ہے تم کو سو میں بتلا دوں گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے ۳

خلاصہ تفسیر: کفار طرح طرح سے مسلمانوں کو اسلام سے ہٹانے کی فکریں کرتے تھے، بعض تکالیف پہنچاتے جس کا اوپر بیان تھا، اور بعض دوسرے طریقوں سے مجبور کرتے، چنانچہ سعد بن ابی وقاصؓ کی والدہ نے ان سے کہا کہ اللہ کا حکم ہے والدین کی اطاعت کا، سو میں قسم کھاتی ہوں کہ جب تک تو اسلام کو نہ چھوڑے گا کھانا پانی نہ چکھوں گی اگرچہ میری جان نکل جائے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ارشاد ہے کہ ایسی بات میں والدین کی اطاعت نہیں۔

اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اور (اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ) اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا زور ڈالیں کہ تو ایسی چیز کو میرا شریک ٹھہرائے جس (کے معبود ہونے) کی کوئی (صحیح) دلیل تیرے پاس نہیں ہے (اور ہر چیز ایسی ہی ہے، بلکہ تمام اشیاء کے معبود نہ ہونے پر دلائل قائم ہیں) تو (اس باب میں) ان کا کہنا نہ ماننا، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے سو میں تم کو تمہارے سب کام (نیک ہوں یا برے) جتلا دوں گا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تمام کائنات میں ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں جو خدا کی شریک ہو سکے، پھر اس کی خبر کسی کو کہاں سے ہوئی، جو لوگ شرکاء ٹھہراتے ہیں محض جاہلانہ اوہام اور بے سند خیالات کی پیروی کر رہے ہیں، واقعہ کی خبر انھیں کچھ بھی نہیں۔

فائدہ: ۲؎ دنیا میں ماں باپ سے زیادہ حق کسی کا نہیں، پر اللہ کا حق ان سے زیادہ ہے، ان کی خاطر دین نہ چھوڑے۔ (موضح) حدیث میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی والدہ نے جو مشرکہ تھی بیٹے کے اسلام کی خبر سن کر عہد کیا کہ دانہ پانی کچھ نہ چکھوں گی نہ چھت کے نیچے آرام کروں گی، تاوقتیکہ سعد (معاذ اللہ) اسلام سے نہ پھر جائے چنانچہ کھانا پینا ترک کر دیا اور بالکل نڈھال ہوگئی، لوگ زبردستی منہ چیر کر کھانا پانی دیتے تھے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، گویا بتلا دیا کہ والدین کا اس طرح خلاف حق پر مجبور کرنا یہ بھی ایک ابتلاء وامتحان ہے، چاہیے کہ مومن کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہو۔

فائدہ: ۳؎ یعنی سب کو عدالت میں حاضر ہونا ہے اسوقت بتلا دیا جائے گا کہ اولاد اور والدین میں سے کس کی زیادتی اور کون حق پر تھا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ⑨

اور جو لوگ یقین لائے اور بھلے کام کیے ہم ان کو داخل کریں گے نیک لوگوں میں

خلاصہ تفسیر: اور (تم میں) جو لوگ ایمان لائے ہوں گے ہم ان کو نیک بندوں (کے درجہ) میں (جو کہ بہشت ہے) داخل کر دیں گے (وراسی طرح برے اعمال پر ان کے مناسب سزا دیں گے، پس جس نے والدین کی اطاعت کو ہماری اطاعت پر مقدم رکھا ہوگا وہ سزا پائے گا اور جس نے اس کا الٹا کیا ہوگا نیک جزا پائے گا، حاصل یہ ہوا کہ مذکورہ واقعہ میں ماں باپ کی نافرمانی سے گناہ کا وسوسہ نہ کیا جائے، بلکہ اس صورت میں اس کی اطاعت سے گناہ ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جو اس قسم کی زبردست رکاوٹوں کے باوجود بھی ایمان اور نیکی کی راہ پر قائم رہے حق تعالیٰ ان کا حشر اپنے خاص نیک بندوں میں کرے گا، ابن کثیرؒ لکھتے ہیں یعنی اولاد نے اگر ناحق بات میں والدین کا کہنا نہ مانا اور والدین ناحق پر قائم رہے تو اولاد کا حشر صالحین کے زمرہ میں ہوگا، ان والدین کے زمرہ میں نہ ہوگا گو طبعی ونسبی تعلقات کی بناء پر وہ اس سے سب سے زیادہ قریب تھے، معلوم ہوا: "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" میں حب دینی مراد ہے، حب طبعی مراد نہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ

اور ایک وہ لوگ ہیں کہ کہتے ہیں یقین لائے ہم اللہ پر پھر جب اسکو ایذاء پہنچے اللہ کی راہ میں کرنے لگے لوگوں کے ستانے کو

كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ

برابر اللہ کے عذاب کی ۱؎ اور اگر آ پہنچے مدد تیرے رب کی طرف سے تو کہنے لگیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں (تھے) ۲؎

اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ⑩

کیا یہ نہیں کہ اللہ خوب خبردار ہے جو کچھ سینوں میں ہے جہان والوں کے ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے فرمایا تھا کہ ہم سچوں اور جھوٹوں کو جان کر رہیں گے، پھر اس کی تفصیل میں سچوں کا ذکر فرمایا تھا، اب جھوٹوں کا ذکر ہے جو ذرا سی تکلیف سے گھبرا کر دین پر قائم نہیں رہتے، اس کا نزول بعض خاص لوگوں کے بارے میں ہوا ہے جو ایمان لا کر مکہ سے ہجرت کر کے چلے تھے، بعض رؤساء مکہ ان کو اٹھا کر لے گئے اور تکلیف پہنچائی تو وہ دین پر ثابت قدم نہ رہے۔

اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں جو کہہ دیتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب ان کو راہ خدا میں کچھ تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو لوگوں کی ایذا رسانی کو ایسا (عظیم) سمجھ بیٹھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب (جس سے آدمی بالکل ہی مجبور ہو جاتا ہے، حالانکہ کسی مخلوق کو ایسے عذاب پر قدرت ہی نہیں، اب تو ان کا یہ حال ہے) اور اگر (کبھی) کوئی مدد (مسلمانوں کی) آپ کے رب کی طرف سے آ پہنچتی ہے (مثلاً جہاد ہو اور اس میں ایسے لوگ بھی ہاتھ آ جائیں) تو (وہ اس وقت) کہتے ہیں کہ ہم تو (دین اور عقیدہ میں) تمہارے ساتھ تھے (یعنی مسلمان ہی تھے، اگرچہ کفار کے اکراہ اور زبردستی کی وجہ سے بظاہر کفار کے ساتھ ہو گئے تھے، اس پر حق تعالیٰ رد فرماتے ہیں کہ:) کیا اللہ تعالیٰ کو دنیا جہان والوں کے دلوں کی باتیں معلوم نہیں ہیں (یعنی ان کے دل ہی میں ایمان نہ تھا)۔

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللهِ: احقر کے نزدیک کعذاب اللہ کی تشبیہ کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ عذاب دینے کے وقت جو کچھ زبان سے کہے گا وہ دل میں بھی ہوگا، پس مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کے تکلیف دینے سے جو یہ کلمہ کفر کہتے ہیں اس میں بلاضرورت دل کو بھی موافق کر لیتے ہیں اور بلاضرورت اس لیے ہے کہ جبر کرنے والے کو دل کی تو خبر نہیں ہوتی، وہ کوئی خدا تو نہیں جو دل کے بھید سے واقف ہو، پھر دل سے کفر کرنے کی کیا وجہ، اس لیے زبردستی کے وقت زبان سے کلمہ کفر کہنے کی تو شرعاً اجازت ہے، دل سے اجازت نہیں اور ملامت اسی پر ہے کہ دل سے کیوں کفر کیا تھا اور کچی طبیعت کے لوگ دل ہی سے پھر جاتے ہیں، اس خیال سے کہ روز روز جھگڑے کون جھیلے، لاؤ ان ہی میں شامل رہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو زبان سے اپنے کو مومن کہتے تھے، مگر دلوں میں ایمان راسخ نہیں تھا، ان کو جہاں اللہ کے راستہ میں کوئی تکلیف پہنچی یا دین کی وجہ سے لوگوں نے ستایا تو آزمائش کو خدائی عذاب سمجھنے لگے، جس طرح آدمی عذاب الٰہی سے گھبرا کر جان بچانا چاہتا اور اپنے پہلے دعووں سے دستبردار ہونے لگتا ہے اور ناچار اعتراف کرتا ہے کہ میں غلطی پر تھا، یہ ہی حال ان ضعفاء القلوب کا ہے، جہاں دین کے معاملہ میں کوئی سختی پہنچی بس گھبرا کر دعویٰ ایمان سے دستبردار ہونا شروع کر دیا اور زبان سے یا عمل سے گویا اقرار کرنے لگے کہ ہم اس دعوے میں غلطی پر تھے یا ایسا دعویٰ کیا ہی نہ تھا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اگر مسلمان کی کوئی کامیابی اور عروج دیکھیں تو باتیں بنانے لگیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے اور اب بھی تمہارے اسلامی بھائی ہیں، خصوصاً اگر مسلمانوں کو فتح ہو اور فرض کیجیے یہ لوگ کفار کا ساتھ دیتے ہوئے ان کے ہاتھ میں قید ہو جائیں، پھر تو نفاق و تملق کی کوئی حد نہ رہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جیسے کچھ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ ہیں اللہ کو سب معلوم ہے کیا زبانی دعوے کر کے اللہ سے اپنے دلوں کا حال چھپا سکتے ہیں؟

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱

اور البتہ معلوم کرے گا اللہ ان لوگوں کو جو یقین لائے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جو لوگ دغا باز ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (یہ واقعات اس لئے ہوتے رہتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو معلوم کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی معلوم کر کے رہے گا۔

مقصود اس رد کرنے سے یہ نہیں کہ ان کا اسلام اب بھی مقبول نہ ہو، بلکہ وہ جو دعوی کرتے تھے کہ ہم ہمیشہ سے اسلام پر قائم ہیں اس کی تکذیب فرماتے ہیں کہ زمانہ گذشتہ میں تو یہ مؤمن نہ رہے تھے اور دعوی کرتے ہیں کہ ہم مؤمن تھے اس اعتبار سے ان کو آیت میں منافق فرمایا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی معلوم تو اسے پہلے ہی سے سب کچھ ہے لیکن اب تمہارے اعمال و افعال کو دیکھ لے گا کہ کون اپنے کو سچا مومن ثابت کرتا ہے اور کون جھوٹا دغا باز منافق ہے۔

تنبیہ: اس قسم کے مواضع میں لَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ کے معنی "لَيُرِيَنَّ اللّٰهُ" کے لینا ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ کما فی تفسیر ابن کثیر۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۗ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ

اور کہنے لگے منکر ایمان والوں کو تم چلو ہماری راہ اور ہم اٹھا لیں تمہارے گناہ [1] اور وہ کچھ نہ اٹھائیں گے

مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ⑫ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ

ان کے گناہ، بیشک وہ جھوٹے ہیں، اور البتہ اٹھائیں گے اپنے بوجھ اور کتنے بوجھ ساتھ اپنے بوجھ کے [2]

ع ۱۲ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ⑬

اور البتہ ان سے پوچھ ہوگی قیامت کے دن جو باتیں کہ جھوٹ بناتے تھے [3]

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی ایذاء اور بعض دوسرے طریقوں کا ذکر تھا جس سے مسلمانوں کو دین سے ہٹانے کی وہ کوشش کرتے تھے، ایک طریقہ کا آگے بیان ہے، وہ یہ کہ کفار قریش نومسلموں کو کہتے کہ اس دین میں تمام چیزیں جن کے تم عادی تھے حرام ہیں تم اس سے ہٹ جاؤ، اگر قیامت ہوئی تو تمہارا گناہ ہمارے ذمہ، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور کفار مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم (دین میں) ہماری راہ چلو اور (قیامت میں) تمہارے گناہ (جو کفر و معاصی سے ہوں گے) ہمارے ذمہ (اور تم سبکدوش) حالانکہ یہ لوگ ان کے گناہوں میں سے ذرا بھی (اس طور پر کہ وہ سبکدوش ہوجائیں) نہیں لے سکتے، یہ بالکل جھوٹ بک رہے ہیں، اور (البتہ یہ تو ہوگا کہ) یہ لوگ اپنے گناہ (پورے پورے) اپنے اوپر لادے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ گناہ اور بھی (لادے ہوں گے اور یہ دوسرے گناہ وہ ہیں جن کے یہ لوگ دوسروں کو بہکانے کی وجہ سے سبب بنتے تھے، اور یہ گناہ ان پر لادنے سے اصل گناہگار سبکدوش نہیں ہوں گے، غرض دوسرے تو ہلکے نہ ہوئے، مگر یہ لوگ ان کو گمراہ کرنے کے سبب اور زیادہ بھاری ہوگئے اگرچہ بہکانے کا اثر بھی نہ ہوا ہو، کیونکہ ان کی طرف سے تو ارادہ پایا گیا تو ان کو بہکانے کا بھی گناہ ہوگا) اور یہ لوگ جیسی جیسی جھوٹی باتیں بناتے تھے قیامت میں ان سے باز پرس (اور پھر اس پر سزا) ضرور ہوگی۔

یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک گناہ گار کے گناہ دوسرے کے ذمہ اس طرح ہوجائیں کہ وہ بالکل ہلکا ہوجائے، بلکہ اس کو اپنے گناہ کا عذاب ہوگا اور بہکانے والے کو اس کے اور اپنے دونوں کے گناہوں کا عذاب ہوگا۔

اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ: اس میں ان جاہل اور گمراہ پیروں اور مدعیان طریقت کی تردید ہے جو اپنے مریدوں اور متبعین سے اپنا گروہ بڑھانے کے لیے کہا کرتے ہیں کہ میاں! تم ہمارے سلسلہ میں آجاؤ، اگر کوئی گناہ ہو تو ہمارے ذمہ۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی مسلمان کو چاہیے ایمان پر مضبوط رہے، نہ کوئی تکلیف وایذاء دہی اس کو طریق استقامت سے ہٹا سکے اور نہ کفار کی احمقانہ استمالت سے متاثر ہو، مثلاً کفار مسلمانوں سے کہیں کہ تم اسلام چھوڑ کر اپنی برادری میں آملو اور ہماری راہ پر چلو، تمام تکلیفوں اور ایذاؤں سے بچ جاؤ گے مفت میں کیوں مصیبتیں جھیل رہے ہو، اور اگر ایسا کرنے میں گناہ سمجھتے اور مؤاخذہ کا اندیشہ رکھتے ہو تو خدا کے ہاں بھی ہمارا نام لے دینا کہ انہوں نے ہم کو یہ مشورہ دیا تھا، اگر ایسی صورت پیش آئی تو ساری ذمہ داری ہم اٹھالیں گے، اور تمہارے گناہ کا بوجھ اپنے سر رکھ لیں گے کما قال الشاعر: تو مشقِ ناز کر خونِ دوعالم میری گردن پر۔

فائدہ: [2] یعنی جھوٹے ہیں، تمہارا بوجھ رتی برابر بھی ہلکا نہیں کرسکتے، ہاں اپنا بوجھ بھاری کر رہے ہیں، ایک تو ان کے ذاتی گناہوں کا بار تھا، اب دوسروں کے اغواء واضلال کے بارے اس میں مزید اضافہ کر دیا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "کوئی چاہے کہ رفاقت کرکے کسی کے گناہ اپنے اوپر لے لے، یہ نہیں ہوگا، مگر جس کو گمراہ کیا اور اس کے بہکائے سے اس نے گناہ کیا، وہ گناہ اس پر بھی اور اس پر بھی" (موضح) جیسا کہ حدیث میں

آیا ہے کہ دنیا میں تو جو کوئی کسی کو (ناحق) قتل کرے، اس کے گناہ کا حصہ آدم کے پہلے بیٹے (قابیل) کو پہنچتا ہے جس نے اول یہ بری راہ نکالی۔

فائدہ: ۳ یعنی جو جھوٹی باتیں بناتے ہیں کہ ہم تمہارا بوجھ اٹھالیں گے، یہ خود مستقل گناہ ہے جس پر ماخوذ ہوں گے، آگے چند قصص کے ضمن میں متنبہ کیا گیا ہے کہ سچوں کے مقابلہ میں ہمیشہ سے جھوٹے اغواء اور شرارت کرتے رہیں اور سچوں کو مدتوں تک امتحان وابتلاء کے دور میں سے گزرنا پڑا ہے، مگر آخری نتیجہ انہی کے حق میں بہتر ہوا، منکر اور شریر لوگ خائب وخاسر رہے سچے کامیاب وسربلند ہوئے، اشقیاء کے تمام مکائد تار عنکبوت سے زیادہ ثابت نہ ہوئے۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖ فَلَبِثَ فِیۡهِمۡ اَلۡفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کے پاس پھر رہا ان میں ہزار برس پچاس برس کم ۱

فَاَخَذَهُمُ الطُّوۡفَانُ وَهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

پھر پکڑا ان کو طوفان نے اور وہ گناہ گار تھے ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی ایذاؤں اور مخالفتوں کا بیان تھا جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچتا تھا، اب تسلی کے لیے بعض پہلی امتوں کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

(پہلا قصہ) اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا سو وہ ان میں پچاس سال کم ایک ہزار برس رہے (اور قوم کو سمجھاتے رہے) پھر (جب اس پر بھی وہ لوگ ایمان نہ لائے تو) ان کو طوفان نے آدبایا اور وہ بڑے ظالم لوگ تھے (کہ اتنی مدت دراز کے سمجھانے سے بھی ان پر اثر نہ ہوا)۔

اَلۡفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا: روح المعانی میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کو چالیس برس میں نبوت ملی اور ساڑھے نو سو برس وعظ فرمایا، پھر طوفان کے بعد ساٹھ برس زندہ رہے، سو اس حساب سے ان کی عمر ایک ہزار پچاس سال کی ہوئی، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت نوح چالیس سال کی عمر میں مبعوث ہوئے، ساڑھے نو سو برس دعوت وتبلیغ اور سعی واصلاح میں مصروف رہے، پھر طوفان آیا، طوفان کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے اس طرح کل عمر ایک ہزار پچاس سال ہوئی۔

فائدہ: ۲ یعنی جب گناہوں اور شرارتوں سے باز نہ آئے تو طوفان نے سب کو گھیر لیا، بجز چند نفوس کے سب ہلاک ہو گئے۔

فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَاَصۡحٰبَ السَّفِیۡنَةِ وَجَعَلۡنٰهَاۤ اٰیَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۵﴾

پھر بچا دیا ہم نے اس کو اور جہاز والوں کو ۱ اور رکھا ہم نے جہاز کو نشانی جہان والوں کے واسطے ۲

خلاصہ تفسیر: پھر (اس طوفان آنے کے بعد) ہم نے ان کو اور کشتی والوں کو (جو ان کے ساتھ سوار تھے اس طوفان سے) بچا لیا اور ہم نے اس واقعہ کو تمام جہان والوں کے لئے (جن کو تواتر کے ساتھ خبر پہنچی) موجب عبرت بنایا (کیونکہ دوسروں کو تواتر کے ساتھ یہ خبر پہنچی تو غور کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ حق کی مخالفت کا کیا انجام ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو آدمی یا جانور جہاز پر سوار تھے ان کو نوح علیہ السلام کی معیت میں ہم نے محفوظ رکھا، سورہ ہود میں یہ قصہ مفصل گزر چکا۔

فائدہ: ۲ کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کا جہاز مدت دراز تک ''جودی'' پر لگا رہا تا کہ دیکھنے والوں کے لیے عبرت ہو اور اب جو

جہاز اور کشتیاں موجود ہیں یہ بھی ایک نشانی ہے جسے دیکھ کر سفینہ نوح کی یاد تازہ ہوتی اور قدرت الٰہی کا نمونہ نظر آتا ہے، یا شاید یہ مراد ہو کہ کشتی کے اس قصہ کو ہم نے ہمیشہ کے لیے عبرت بنا دیا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جس وقت یہ سورت اتری ہے حضرت کے بہت سے اصحاب کافروں کی ایذاؤں سے تنگ آ کر جہاز پر سوار ہو کر ملک حبشہ کی طرف گئے تھے جب حضرت ﷺ مدینہ ہجرت کر آئے تب وہ جہاز والے صحابہ بھی سلامتی سے آ ملے''، (موضح بتغییر یسیر) گویا نوح وسفینہ نوح کی تاریخ اس رنگ میں دہرائی گئی۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور ابراہیم کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو بندگی کرو اللہ کی اور ڈرتے رہو اس، سے یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

تم تو پوجتے ہو اللہ کے سوائے یہی بتوں کے تھان اور بناتے ہو جھوٹی باتیں ۱؎ بیشک جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے

لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

وہ مالک نہیں تمہاری روزی کے سو تم ڈھونڈو اللہ کے یہاں روزی اور اس کی بندگی کرو اور اس کا حق مانو اسی کی طرف پھر جاؤ گے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (دوسرا قصہ) اور ہم نے ابراہیم کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے (جو کہ بت پرست تھے) فرمایا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو (اور ڈر کر شرک چھوڑ دو) یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو (طریقہ شرک کے خلاف جو کہ محض بے وقوفی ہے، کیونکہ) تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر محض بتوں کو (جو بالکل عاجز اور ناکارہ ہیں) پوج رہے ہو اور (اس کے متعلق) جھوٹی باتیں تراشتے ہو (کہ ان سے ہماری روزی اور روزگار کے احکام چلتے ہیں اور یہ محض جھوٹ ہے کیونکہ) تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے، سو تم لوگ رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو (یعنی اس سے مانگو، مالک رزق وہی ہے) اور (جب مالک رزق وہی ہے تو) اسی کی عبادت کرو اور (چونکہ پچھلا رزق بھی اسی کا دیا ہوا ہے تو) اسی کا شکر کرو (پس ایک سبب تو خدا کی عبادت واجب ہونے کا یہ ہے کہ وہ نفع کا مالک ہے اور دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ نقصان کا بھی مالک ہے، چنانچہ) تم سب کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے (اس وقت تم کو کفر پر سزا دے گا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جھوٹے عقیدے تراشتے ہو اور جھوٹے خیالات واوہام کی پیروی کرتے ہو، چنانچہ اپنے ہاتھوں سے یہ بت بنا کر کھڑے کر لیے ہیں، جنہیں جھوٹ موٹ خدا کہنے لگے۔

فائدہ: ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اکثر خلق روزی کے پیچھے ایمان دیتی ہے، سو جان رکھو کہ اللہ کے سوا روزی کوئی نہیں دیتا وہی دیتا ہے، اپنی خوشی کے موافق''، لہٰذا اس کے شکر گزار بنو اور اسی کی بندگی کرو، وہیں تم کو لوٹ کر جانا ہے، آخر اس وقت کیا منہ دکھاؤ گے۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾

اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو جھٹلا چکے ہیں بہت فرقے تم سے پہلے اور رسول کا ذمہ تو بس یہی ہے پیغام پہنچا دینا کھول کر

خلاصہ تفسیر: اور اگر تم (ان باتوں میں) مجھ کو جھوٹا سمجھو تو (یاد رکھو کہ میرا کوئی نقصان نہیں) تم سے پہلے بھی بہت سی امتیں (اپنے پیغمبروں کو) جھوٹا سمجھ چکی ہیں (مگر ان پیغمبروں کا کوئی نقصان نہیں ہوا) اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) پیغمبر کے ذمہ تو صرف (بات کا) صاف طور

پر پہنچا دینا ہے (منوانا پیغمبر کا کام نہیں، پس تمام انبیاء تبلیغ کے بعد سبکدوش ہو گئے، اسی طرح میں بھی، پس ہم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، البتہ ماننا تمہارے ذمہ واجب تھا اس کے چھوڑنے سے تمہارا نقصان ضرور ہوا، یہاں تک تو ابراہیم علیہ السلام کا ارشاد ہوا، کچھ آیتوں کے بعد ان کی قوم کا جواب مذکور ہے)۔

***

فائدہ: یعنی جھٹلانے سے میرا کچھ نہیں بگڑتا، میں صاف صاف تبلیغ و نصیحت کر کے اپنا فرض ادا کر چکا، بھلا برا سمجھا چکا، نہ مانو گے نقصان اٹھاؤ گے جیسے عاد و ثمود وغیرہ تم سے پہلے اٹھا چکے ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑲

کیا دیکھتے نہیں کیونکر شروع کرتا ہے اللہ پیدائش کو پھر اس کو دہرائے گا۱ یہ اللہ پر آسان ہے ۲

خلاصہ تفسیر: ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا جواب آگے آرہا ہے، اب یہاں سے آیت ۲۳ تک کفار عرب کی طرف قیامت اور جزا وسزا کے مضمون کے متعلق اس مناسبت سے روئے سخن ہے کہ وہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخالفت کرنے میں قوم ابراہیم کے مشابہ تھے اس لیے ان کو متنبہ کر دیا گیا کہ دیکھو ابراہیم علیہ السلام کی یہ تعلیم تھی جس میں قیامت کا بھی ذکر ہے، پھر تم ان کی اولاد ہو کر قیامت کے کیوں منکر ہو، اور اگر اب بھی اس میں شک و شبہ ہو تو اگلا مضمون سنو، اس تقریر سے اگلی آیتوں کا ربط ظاہر ہو گیا۔

کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مخلوق کو اول بار پیدا کرتا ہے (عدم محض سے وجود میں لاتا ہے) پھر وہی اس کو دوبارہ پیدا کرے گا، یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی آسان بات ہے (بلکہ ظاہر نظر میں دوبارہ پیدا کرنا پہلی پیدائش سے زیادہ آسان ہے، اگرچہ حق تعالیٰ کی قدرت کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں، البتہ یہ لوگ پہلی بار کا تو اقرار و اعتراف کرتے تھے لقولہ تعالیٰ: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ الخ اور دوسری بار پیدا کرنا اسی کی مثل ہے، اس دلیل سے اس کا بھی قدرت کے تحت ہونا اور زیادہ واضح ہو گیا، اس لئے اَوَلَمْ يَرَوْا اس سے بھی متعلق ہو سکتا ہے)۔

***

فائدہ: ۱ یعنی خود اپنی ذات میں غور کرو، پہلے تم کچھ نہ تھے، اللہ نے تم کو پیدا کیا اسی طرح مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر دے گا۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''شروع تو دیکھتے ہو، دوہرانا اسی سے سمجھ لو''۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کے نزدیک تو کوئی چیز بھی مشکل نہیں۔ البتہ تمہارے سمجھنے کی بات ہے کہ جس نے بدون نمونہ کے اول ایک چیز کو بنایا، نمونہ قائم ہونے کے بعد بنانا تو اور زیادہ آسان ہونا چاہیے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۭ

تو کہہ ملک میں پھرو پھر دیکھو کیونکر شروع کیا ہے پیدائش کو پھر اللہ اٹھائے گا پچھلا اٹھان ۱

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑳ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ㉑

بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے، دکھ (عذاب) دے گا جس کو چاہے اور رحم کرے گا جس پر چاہے ۲ اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے

خلاصہ تفسیر: زیادہ اہتمام کے لئے پھر یہی مضمون کسی قدر عنوان بدل کر سنانے کے لیے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ:

آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ تم لوگ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو کس طور پر اول بار پیدا کیا ہے، پھر اللہ پچھلی بار بھی پیدا کرے گا، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (گذشتہ آیت میں پہلی پیدائش کے عقلی علم سے دوبارہ پیدا کرنے پر استدلال کیا تھا جیسا کہ **اولم یروا** اس پر دلالت کرتا ہے، اور اس آیت میں اس کے حسی علم سے دوبارہ پیدا کرنے پر دلیل بیان کی جس میں اول سے ترقی ہے کہ اس دعوی پر صرف عقلی ہی دلیل

نہیں حسی دلیل بھی ہے جس کا تعلق کائنات کے مشاہدہ سے ہے، اور چونکہ فکر کرنے کے لیے ایک چیز کا مشاہدہ کافی ہے اور نظر دوڑانے کے لیے اشیاء کثیر کا مشاہدہ ضروری ہے اس لیے یہاں فانظروا کے ساتھ سیروا فی الارض بھی آیا کہ زمین میں چل پھر کر دیکھ لو، یہ تو قیامت کا اثبات تھا آگے جزاء و سزا کا بیان ہے کہ دوبارہ زندہ کرنے کے بعد) جس کو چاہے گا عذاب دے گا (یعنی جو اس کا مستحق ہوگا) اور جس پر چاہے رحمت فرمادے گا (یعنی جو اس کا اہل ہوگا) اور (اس عذاب و رحمت دینے میں کسی دوسرے کا دخل نہ ہوگا، کیونکہ) تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے (نہ کہ اور کسی کے پاس)۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا: اس میں اس بات کی اصل ہے کہ بعض اہل طریقت زمین میں سیاحت کرتے ہیں، تاکہ عالم میں گھوم پھر کر اللہ کی صفت خلق کا مشاہدہ کریں اور مخلوقات کے احوال سے عبرت حاصل کریں اور اس سیاحت میں ان کی اور بھی مصلحتیں ہوتی ہیں جیسے مخلوق سے تعلقات کم ہونا، گمنامی اور مسافرت اور گناہوں کے اسباب کا فقدان وغیرہ تاکہ اپنی آخرت کو کامیاب بنائیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اپنی ذات کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کی پیدائش میں بھی غور کرو اور چل پھر کر دیکھو کہ کیسی کیسی مخلوق خدا نے پیدا کی ہے، اسی پر دوسری زندگی کو قیاس کرلو، اس کی قدرت اب کچھ محدود نہیں ہوگئی۔

فائدہ: ۲ یعنی دوبارہ پیدا کر کے جسے اپنی حکمت کے موافق چاہے گا سزا دے گا اور جس پر چاہے گا اپنے فضل و کرم سے مہربانی فرمائے گا۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۡ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ ع

اور تم عاجز کرنے والے نہیں زمین میں اور نہ آسمان میں اور کوئی نہیں تمہارا اللہ سے ورے حمایتی اور نہ مددگار

خلاصہ تفسیر: اور (اس عذاب سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے) تم نہ زمین میں (چھپ کر خدا کو) ہرا سکتے ہو (کہ اسکے ہاتھ نہ آؤ) اور نہ آسمان میں (اڑ کر) اور نہ خدا کے سوا تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار (پس نہ اپنی تدبیر سے بچ سکو گے نہ دوسرے کی حمایت سے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس کو اللہ تعالیٰ سزا دینا چاہے وہ نہ زمین کے سوراخوں میں گھس کر سزا سے بچ سکتا ہے نہ آسمان میں اڑ کر، کوئی بلندی یا پستی خدا کے مجرم کو پناہ نہیں دے سکتی نہ کوئی طاقت اس کی حمایت اور مدد کو پہنچ سکتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

اور جو لوگ منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے اور اس کے ملنے سے وہ ناامید ہوئے میری رحمت سے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: اور (پیچھے جو ہم نے قاعدہ کلیہ بتایا تھا: يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ کہ جس کو ہم چاہیں گے عذاب دیں گے اب اس کا مصداق بتلاتے ہیں کہ وہ عذاب کے مستحق کون لوگ ہیں) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے اور (بالخصوص) اس کے سامنے جانے کے منکر ہیں وہ لوگ (قیامت میں) میری رحمت سے ناامید ہوں گے (یعنی اس وقت مشاہدہ ہوجائے گا کہ ہم محل رحمت نہیں ہیں) اور یہی ہیں جن کو عذاب دردناک ہوگا۔

* * *

فائدہ: یعنی جنہوں نے اللہ کی باتوں کا انکار کردیا اور اس سے ملنے کی امید نہیں رکھی (کیونکہ وہ بعث بعد الموت کے قائل ہی نہ ہوئے) انہیں رحمت الٰہی کی امید کیونکر ہوسکتی ہے، لہٰذا وہ آخرت میں بھی محروم و مایوس ہی رہیں گے، یہ گویا: مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ (العنکبوت: ۵) کا عکس ہوا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ

پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ بولے اس کو مار ڈالو یا جلا دو ۱۔ پھر اس کو بچا دیا اللہ نے آگ سے ۲۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لاتے ہیں ۳۔

خلاصہ تفسیر: اب پھر ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کی طرف رجوع ہے اور ان کی قوم کا جواب بیان کیا جاتا ہے۔

سو (ابراہیم علیہ السلام کی اُس تقریر دلپذیر کے بعد) ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ (آپس میں) کہنے لگے کہ ان کو یا تو قتل کر ڈالو یا ان کو جلا دو (چنانچہ جلانے کا سامان کیا) سو اللہ نے ان کو اس آگ سے بچا لیا (جس کا قصہ سورۃ انبیاء میں گذر چکا ہے) بیشک اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو کہ ایمان رکھتے ہیں کئی نشانیاں ہیں (یعنی یہ واقعہ چند باتوں کی دلیل ہے اللہ کا قادر ہونا، ابراہیم علیہ السلام کا نبی ہونا، کفر وشرک کا باطل ہونا، پس ایک ہی دلیل سے چونکہ چند باتیں سمجھ میں آ گئیں اس لئے یہ ایک ہی دلیل متعدد دلائل کے قائم مقام ہو گئی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ابراہیم کی تمام معقول باتیں اور دلائل و براہین سن کر جب ان کے ہم قوم جواب سے عاجز ہوئے تو قوت کے استعمال پر اتر آئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ یا تو قتل کر کے ایک دم ان کا قصہ ہی تمام کر دو اور یا آگ میں جلاؤ شاید تکلیف محسوس کر کے اپنی باتوں سے باز آ جائے تو نکال لیں گے ورنہ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جائے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی انہوں نے مشورہ کر کے آگ میں ڈال دیا، مگر حق تعالیٰ نے آگ کو گلزار بنا دیا، جیسا کہ سورہ انبیاء میں مفصلاً گزر چکا ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی اس واقعہ سے سمجھا دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے سچے بندوں کو کس طرح بچا لیتا ہے، اور مخالفین حق کو کس طرح خائب و خاسر کرتا ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی تاثیر اس کے حکم سے ہے، جب حکم نہ ہو تو آگ جیسی چیز جلا نہیں سکتی۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

اور ابراہیم بولا ۱ جو ٹھہرائے ہیں تم نے اللہ کے سوا بتوں کے تھان سو دوستی (آپس کی دوستی سے) کر کر آپس میں دنیا کی زندگانی میں ۲ پھر دن قیامت کے

يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

منکر ہو جاؤ گے ایک سے ایک اور لعنت کرو گے ایک کو ایک ۳ اور ٹھکانا تمہارا آگ ہے اور کوئی نہیں تمہارا مددگار ۴

خلاصہ تفسیر: اور ابراہیم (علیہ السلام) نے (وعظ میں یہ بھی) فرمایا کہ تم نے جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کو (معبود) تجویز کر رکھا ہے، بس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے (چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اکثر آدمی اپنے تعلقات اور دوستی اور رشتہ داروں کے طریقہ پر رہتا ہے اور اس وجہ سے حق بات میں غور نہیں کرتا، یا حق کو سمجھ کر بھی ڈرتا ہے کہ سب دوست اور رشتہ دار چھوٹ جائیں گے) پھر قیامت میں (تمہارا یہ حال ہوگا کہ) تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہو جائے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا (جیسا کہ سورۃ اعراف میں ہے: لَّعَنَتْ اُخْتَهَا کہ ہر جماعت دوسری کو لعنت کرے گی، اور سورۃ سباء میں ہے: يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ کہ ایک دوسرے کے ذمہ بات رکھیں گے، اور سورۃ بقرہ میں ہے: اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا الخ کہ سردار کمزور لوگوں سے بے تعلقی ظاہر کریں گے، خلاصہ یہ ہے کہ آج جن احباب واقارب کی وجہ سے تم گمراہی کو

اختیار کئے ہوئے ہو قیامت کے روز یہی احباب تمہارے دشمن بن جائیں گے) اور (اگر تم اس بت پرستی سے باز نہ آئے تو) تمہارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ: اس آیت میں دلالت ہے کہ جس اتحاد و اتفاق میں دین اسلام کا فساد و بگاڑ ہو تو ایسے اتحاد کا ترک واجب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی آگ سے نکل کر پھر نصیحت شروع کر دی۔

فائدہ: ۲ یعنی بت پرستی کو کون عقلمند جائز رکھ سکتا ہے؟ بت پرست بھی دل میں جانتے ہیں کہ یہ نہایت مہمل حرکت ہے، مگر شیرازہ قومی کو جمع رکھنے کے لیے ایک مذہب ٹھہرا لیا ہے کہ اس کے نام پر تمام قوم متحد و متفق رہے اور ایک دوسرے کے دوست بنے رہیں کہ جیسا کہ آج کل ہم یورپ کی عیسائی قوموں کا حال دیکھتے ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ بت پرستی کا شیوع و رواج اس بناء پر نہیں ہوا کہ وہ کوئی معقول چیز ہے بلکہ اندھی تقلید، قومی مروت و لحاظ اور تعلقات باہمی کا دباؤ اس کا بڑا سبب ہے، یا یہ غرض ہو کہ بت پرستی کی اصل جڑ آپس کی محبت اور دوستی تھی، ایک قوم میں کچھ نیک آدمی جنہیں لوگ محبوب رکھتے تھے انتقال کر گئے، لوگوں نے جوش محبت میں ان کی تصویریں بنا کر بطور یادگار رکھ لیں پھر تصویروں کی تعظیم کرنے لگے، وہی تعظیم بڑھتے بڑھتے عبادت بن گئی، یہ سب احتمالات آیت میں مفسرین نے بیان کئے ہیں، اور ممکن ہے: مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ سے بت پرستوں کی اپنے بتوں سے جو محبت ہے وہ مراد ہو جیسا کہ دوسری جگہ: اندادا یحبونهم کحب الله فرمایا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳ یعنی یہ سب دوستیاں اور محبتیں چند روزہ ہیں۔ قیامت کے دن ایک دوسرے کے دشمن بنو گے اور بعض بعض کو لعنت کرو گے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی وہ شیطان جس کے نام کے تھان ہیں اللہ کے روبرو منکر ہوں گے کہ ہم نے نہیں کہا کہ ہم کو پوجو۔ تب یہ پوجنے والے ان کو لعنت کریں گے کہ ہماری نذر و نیاز لے کر وقت پر پھر گئے''۔ (موضح)

فائدہ: ۴ جو دوزخ کی آگ سے تم کو بچالے جیسے میرے پروردگار نے تمہاری آگ سے مجھ کو بچالیا۔

وقف لازم

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾

پھر مان لیا اس کو لوط نے اور وہ (ابراہیم) بولا میں تو وطن چھوڑتا ہوں اپنے رب کی طرف بیشک وہ ہی ہے زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر: سو (اتنے وعظ و نصیحت پر بھی ان کی قوم نے نہ مانا) صرف لوط (علیہ السلام) نے ان کی تصدیق فرمائی اور ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ میں (تم لوگوں میں نہیں رہتا، بلکہ) اپنے پروردگار کی (بتلائی ہوئی جگہ کی) طرف ترک وطن کر کے چلا جاؤں گا بیشک وہ زبردست حکمت والا ہے (وہ میری حفاظت کرے گا اور مجھ کو ہجرت کا ثمرہ دے گا)۔

* * *

فائدہ: حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے، ابراہیم کو ان کی قوم کے کسی مرد نے نہ مانا، البتہ لوط نے فوراً بلا توقف تصدیق کی، دونوں کا وطن عراق میں شہر بابل تھا، خدا کے توکل پر وطن سے نکل کھڑے ہوئے اللہ نے ملک شام میں پہنچا کر بسایا۔

تنبیہ: وقال اِنِّيْ مُهَاجِرٌ الخ میں دونوں احتمال ہیں: قائل ابراہیم ہوں یا لوط علیہما السلام۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ

اور دیا ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب ۱ اور رکھ دی اس کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب ۲ اور دیا ہم نے اس کو اس کا ثواب دنیا میں

وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٢٧﴾

اور وہ آخرت میں البتہ نیکوں سے ہے ۳

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے (ہجرت کے بعد) ان کو اسحاق (بیٹا) اور یعقوب (پوتا) عنایت فرمایا اور ہم نے ان کی نسل میں نبوت اور کتاب (کے سلسلہ) کو قائم رکھا اور ہم نے ان کا صلہ ان کو دنیا میں بھی دیا اور آخرت میں بھی (بڑے درجہ کے) نیک بندوں میں ہوں گے (اس صلہ سے مراد قبولیت اور قرب ہے کہ وہ دنیا و آخرت دونوں جگہ مقبول و مقرب ہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ میں فرمایا: وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا)۔

وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا: اس میں دلالت ہے کہ دنیوی نعمتوں کی کثرت جیسا کہ بعض اللہ والوں کو نصیب ہوتی ہے آخرت میں ان کے مراتب کو گھٹا نہیں دیتی، معلوم ہوا کہ اعمال کی اصل جزا تو آخرت میں ملے گی مگر اس کا کچھ حصہ دنیا میں بھی نقد دیا جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اسحاق بیٹا اور یعقوب پوتا دیا، جن کی نسل ''بنی اسرائیل'' کہلاتی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی حضرت ابراہیم کے بعد بجز ان کی اولاد کے کسی کو کتاب آسمانی اور پیغمبری نہ دی جائے گی، چنانچہ جس قدر انبیاء ان کے بعد تشریف لائے ان ہی کی ذریت سے تھے، اسی لیے ان کو ''ابوالانبیاء'' کہا جاتا ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی دنیا میں حق تعالیٰ نے مال، اولاد، عزت اور ہمیشہ کا نام نیک دیا، اور ملک شام ہمیشہ کے لیے ان کی اولاد کو بخشا، (کذا فی الموضح) اور آخرت میں اعلیٰ درجہ کے صالحین کی جماعت میں (جو انبیائے اولوالعزم کی جماعت ہے) شامل رکھا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٨﴾

اور بھیجا لوط کو جب کہا اپنی قوم کو تم آتے ہو بے حیائی کے کام پر تم سے پہلے نہیں کیا وہ کسی نے جہان میں

خلاصہ تفسیر: (تیسرا قصہ) اور ہم نے لوط (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں نہیں کیا۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ فعل شنیع تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا، یہ ہی اس کی دلیل ہے کہ فطرت انسانی اس سے نفور ہے، ایسے خلاف فطرت و شریعت کام کی بنیاد تم نے ڈالی۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ

کیا تم دوڑتے ہو مردوں پر اور رَاہ مارتے ہو ۱ اور کرتے ہو اپنی مجلس میں برا کام ۲

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٩﴾

پھر کچھ جواب نہ تھا اس کی قوم کا مگر یہی کہ بولے لے آ ہم پر عذاب اللہ کا اگر تو ہے سچا ۳

خلاصہ تفسیر: کیا تم مردوں سے برا فعل کرتے ہو (وہ بے حیائی کا کام یہی ہے) اور (اس کے علاوہ دوسری نامعقول حرکتیں بھی کرتے ہو، مثلاً یہ کہ) تم ڈاکہ ڈالتے ہو اور (غضب یہ ہے کہ) اپنی بھری مجلس میں نامعقول حرکت کرتے ہو (اور گناہ کھلم کھلا کرنا یہ خود ایک گناہ اور عقلا بہت قبیح ہے) سو ان کی قوم کا (آخری) جواب بس یہ تھا کہ ہم پر اللہ کا عذاب لے آ و اگر تم (اس بات میں) سچے ہو (کہ یہ افعال موجب عذاب ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ راہ مارنے سے مراد ممکن ہے کہ ڈاکہ زنی ہو، یہ بھی ان میں رائج ہوگئی، یا اسی بدکاری سے مسافروں کی راہ مارتے تھے کہ ڈر کے مارے اس طرف ہو کر نہ نکلیں یا: تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ کا مطلب یہ ہو کہ فطری اور معتاد راستہ کو چھوڑ کر توالد وتناسل کا سلسلہ منقطع کر رہے تھے۔

فائدہ: ۲؎ شاید یہی بدکاری اعلانیہ لوگوں کے سامنے کرتے ہوں گے، اس بات کی شرم بھی نہ رہی تھی یا کچھ اور ٹھٹھے اور چھیڑ اور بے شرمی کی باتیں کرتے ہوں گے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اگر تم سچے نبی ہو اور واقعی سچ کہتے ہو کہ ہمارے یہ کام خراب اور مستوجب عذاب ہیں تو دیر کیا ہے وہ عذاب لے آیئے، دوسری جگہ فرمایا: وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (الاعراف: ۸۲) یعنی ان کی قوم کا جواب یہی تھا کہ لوط کے گھرانے کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو، یہ بڑے پاک بننا چاہتے ہیں، شاید قوم میں سے بعض نے یہ بعض نے وہ جواب دیا ہوگا، یا ایک وقت میں ایک بات اور دوسرے میں دوسری کہی ہوگی، مثلاً اول عذاب کی دھمکیوں کا مذاق اڑایا، پھر آخری فیصلہ یہ کیا ہوگا، کہ انھیں بستی سے نکال دیا جائے بہر حال ثابت ہوگیا کہ وہ قوم نہ صرف اس فعل شنیع کی مرتکب اور بانی تھی، بلکہ اس کے جاری رکھنے پر اس قدر اصرار تھا کہ نصیحت کرنے والے پیغمبر کو اپنی بستی سے نکالنے پر تیار ہوگئے، ان کی فطرت اور طبائع اس قدر مسخ ہو چکی تھی کہ خوف خدا کا کوئی شائبہ دلوں میں باقی نہ رہا تھا، عذاب کی دھمکیوں کا مذاق اڑاتے تھے اور پیغمبر کے مقابلہ پر آمادہ تھے، جرم کی یہ ہی نوعیت ان کے ہلاک کرنے کے لیے کافی تھی، اور اگر اس کے ساتھ توحید کے بھی قائل نہ تھے تو "کڑوا کریلا نیم چڑھا" سمجھئے، معلوم ہوتا ہے کہ توحید کی دعوت حضرت ابراہیم کی طرف سے مشتہر ہو کر پہنچ چکی ہوگی، اس لیے لوط علیہ السلام خاص اسی فعل شنیع سے روکنے پر مامور ہوئے، اور ممکن ہے انہوں نے توحید وغیرہ کی دعوت بھی دی ہو، مگر اس کو یہاں نقل نہیں فرمایا، واللہ اعلم۔

ع ۳ ۸ ۱۵ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۳۰﴾

بولا اے رب میری مدد کر ان شریر لوگوں پر

خلاصہ تفسیر: لوط نے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھ کو ان مفسد لوگوں پر غالب (اور ان کو عذاب سے ہلاک) کر دے۔

رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ: اس سے دین کے دشمنوں پر بددعا کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اس قسم کی دعا کمال اخلاق اور حلم وکرم کے خلاف نہیں۔

* * *

فائدہ: یہ ان کی طرف سے مایوس ہو کر فرمایا، شاید سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کی آئندہ نسلیں بھی درست ہونے والی نہیں، وہ بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں گی جیسے نوح علیہ السلام نے فرمایا تھا: اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح: ۲۷) کذا قال النیشا بوری فی تفسیرہ۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ

اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر بولے ہم کو غارت کرنا ہے اس بستی والوں کو

اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

بیشک اس کے لوگ ہو رہے ہیں گناہ گار

خلاصہ تفسیر: اور (ان کی دعا قبول ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے عذاب کی خبر دینے کے لئے فرشتے مقرر فرمائے اور دوسرا کام ان فرشتوں کو یہ بتلایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دیں چنانچہ) ہمارے (وہ) بھیجے ہوئے فرشتے جب ابراہیم

(علیہ السلام) کے پاس (ان کے بیٹے اسحاق کے پیدا ہونے کی) بشارت لے کر آئے تو (اثنائے گفتگو میں جس کا مفصل بیان دوسرے موقع پر ہے:
قال فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ الخ) ان فرشتوں نے (ابراہیم علیہ السلام سے) کہا کہ ہم اس بستی والوں کو (جس میں قوم لوط آباد ہے)
ہلاک کرنے والے ہیں (کیونکہ) وہاں کے باشندے بڑے شریر ہیں۔

* * *

فائدہ: لوط علیہ السلام کی دعا پر فرشتوں کو اس بستی کے تباہ کرنے کا حکم ہوا، فرشتے اول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچے، ان کو بڑھاپے میں بیٹے کی بشارت سنائی اور اطلاع دی کہ ہم اس بستی ''سُدُوم'' کو تباہ و برباد کرنے کے لیے جا رہے ہیں، کیونکہ وہاں کے لوگ کسی طرح اپنی حرکات شنیعہ سے باز نہیں آتے، ان واقعات کی تفصیل سورہ اعراف، ہود اور حجر وغیرہ میں گزر چکی ہے۔

تنبیہ: شاید ہلاکت کی خبر کے ساتھ بیٹے کی بشارت دینے کا مطلب یہ ہو کہ ایک قوم سے اگر خدا کی زمین خالی کی جانے والی ہے تو دوسری طرف حق تعالیٰ ایک عظیم الشان قوم بنی اسرائیل کی بنیاد ڈالنے والا ہے، نبه عليه العلامة النيشابوري في تفسيره۔

قَالَ اِنَّ فِيۡهَا لُوۡطًا‌ ؕ قَالُوۡا نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَنۡ فِيۡهَا‌ ۖ لَـنُـنَجِّيَنَّهٗ وَاَهۡلَهٗۤ اِلَّا امۡرَاَتَهٗ ‌ كَانَتۡ مِنَ الۡغٰبِرِيۡنَ‏ ﴿۳۲﴾

بولا اس میں تو لوط بھی ہے [1] وہ بولے ہم کو خوب معلوم ہے جو کوئی اس میں ہے ہم بچا لیں گے اس کو اور اس کے گھر والوں کو مگر اس کی عورت کہ رہے گی رہ جانے والوں میں [2]

خلاصہ تفسیر: ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کہ وہاں تو لوط (علیہ السلام بھی موجود) ہیں (وہاں عذاب نہ بھیجا جائے کہ ان کو نقصان پہنچے گا) فرشتوں نے کہا کہ جو جو وہاں (رہتے) ہیں ہم کو سب معلوم ہیں ہم ان کو اور ان کے خاص متعلقین کو (یعنی ان کے خاندان والوں کو اور جو مومن ہوں ان کو اس عذاب سے) بچا لیں گے (اس طرح سے کہ عذاب آنے سے پہلے ان کو بستی سے باہر نکل جانے کی ہدایت کر دیں گے) بجز ان کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں سے ہوگی (جس کا ذکر سورۃ ہود اور سورۃ حجر میں گذر چکا ہے، یہ گفتگو تو ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی)۔

قَالَ اِنَّ فِيۡهَا لُوۡطًا: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی مجمع میں اہل اللہ کا ہونا عذاب سے حفاظت کا سبب بن جاتا ہے اور اہل اللہ کا ان سے جدا ہونا اس حفاظت اور مانع کو دور کر دیتا ہے اگرچہ کسی عارض کی وجہ سے اس کے خلاف بھی ہو سکتا ہے (یعنی یہ قاعدہ کلیہ نہیں، اکثریہ ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی کیا لوط کی موجودگی میں بستی کو تباہ کیا جائے گا؟ یا انھیں وہاں سے علیحدہ کر کے تعذیب کی کارروائی عمل میں لائی جائے گی؟ غالباً حضرت ابراہیم کو ازراہ شفقت خیال آیا کہ لوط کی آنکھوں کے سامنے یہ آفت نازل ہوئی تو عجب نہیں کہ عذاب کا ہولناک منظر دیکھنے سے وحشت اور گھبراہٹ ہو، فرشتوں نے اپنے کلام میں کوئی استثناء کیا نہ تھا، اس سے ان کے ذہن میں یہی شق آئی ہوگی کہ لوط کی موجودگی میں کارروائی کریں گے، واللہ اعلم۔

فائدہ: [2] یعنی فرشتوں نے اطمینان دلایا کہ ہم سب کو جانتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں اور جو ان میں خدا کے مجرم ہیں، تنہا لوط نہیں، بلکہ اسکے گھر والوں کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے گا، سب کو عذاب کے مواقع سے علیحدہ کر لیں گے صرف اسکی ایک عورت وہاں رہ جائے گی، کیونکہ اس پر بھی عذاب آنا ہے۔

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ

اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس ناخوش ہوا اُن کو دیکھ کر، اور تنگ ہوا دل میں ۱؎ اور وہ بولے مت ڈر اور غم نہ کھا

اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

ہم بچائیں گے تجھ کو اور تیرے گھر کو مگر عورت تیری رہ گئی رہ جانے والوں

خلاصہ تفسیر: اور (پھر وہاں سے فارغ ہوکر) جب ہمارے وہ فرستادے لوط (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو لوط (علیہ السلام) ان (کے آنے) کی وجہ سے (اس لئے) مغموم ہوئے (کہ وہ بہت حسین جوانوں کی شکل میں آئے تھے اور لوط علیہ السلام نے ان کو آدمی سمجھا اور اپنی قوم کی نامعقول حرکت کا خیال آیا) اور (اس وجہ سے) ان (کے آنے) کے سبب تنگ دل ہوئے اور (فرشتوں نے جو یہ حال دیکھا تو) وہ فرشتے کہنے لگے (آپ کسی بات کا) اندیشہ نہ کریں اور نہ مغموم ہوں (ہم آدمی نہیں ہیں، بلکہ عذاب کے فرشتے ہیں، کقولہ تعالیٰ: اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ اور اس عذاب سے) ہم آپ کو اور آپ کے خاص متعلقین کو بچالیں گے بجز آپ کی بی بی کے کہ وہ عذاب میں رہ جانے والوں میں ہوگی۔

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ :اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طبعی غم اور دل کا بوجھ کمال کے خلاف نہیں جبکہ اس غم اور بوجھ کی وجہ سے غیر شرعی عمل نہ کیا جائے۔

اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ:اس میں دلالت ہے کہ اللہ کے مقبول بندوں کے ساتھ بغیر ایمان کے محض قرابت کا تعلق نافع نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ فرشتے نہایت حسین وجمیل مردوں کی شکل میں وہاں پہنچے، حضرت لوط نے اول پہچانا نہیں، بہت تنگدل اور ناخوش ہوئے کہ اب ان مہمانوں کی عزت قوم کے ہاتھ سے کس طرح بچاؤں گا، اگر اپنے یہاں نہ ٹھہراؤں تو اخلاق ومروت اور مہمان نوازی کے خلاف ہے، ٹھہراتا ہوں تو اس بدکار قوم سے آبرو کس طرح محفوظ رہے گی۔

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾

ہم کو اتارنی ہے اس بستی والوں پر ایک آفت آسمان سے اس بات پر کہ وہ نافرمان ہو رہے تھے ۱؎

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور چھوڑ (باقی) رکھا ہم نے اس کا نشان نظر آتا ہوا سمجھدار لوگوں کے واسطے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور آپ کو مع متعلقین کے عذاب سے بچا کر) ہم اس بستی کے (بقیہ) باشندوں پر ایک آسمانی عذاب (یعنی اسباب طبعیہ غیر ارضیہ سے) ان کی بدکاریوں کی سزا میں نازل کرنے والے ہیں (چنانچہ وہ بستی الٹ دی گئی اور غیبی پتھروں سے سنگباری کی گئی) اور ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہر نشان (اب تک) رہنے دیئے ہیں ان لوگوں (کی عبرت) کے لئے جو عقل رکھتے ہیں (چنانچہ اہل مکہ سفر شام میں ان ویران مقامات کو دیکھتے تھے اور جو اہل عقل تھے وہ منتفع بھی ہوتے تھے کہ ڈر کر ایمان لے آتے تھے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اپنی قوم کی شرارت سے ڈریے مت، یہ کچھ نہیں کرسکتی اور ہمارے بچاؤ کے لیے غمگین نہ ہو ہم آدمی نہیں، فرشتے ہیں، جو تجھ کو اور تیرے ہم مشرب گھر والوں کو بچا کر اس قوم کو غارت کرنے کے لیے آئے ہیں، یہ قصہ پہلے کئی جگہ گزر چکا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان کی الٹی ہوئی بستیوں کے نشان مکہ والوں کو ملک شام کے سفر میں دکھائی دیتے ہیں۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا فَقَالَ يَٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْآخِرَ وَلَا تَعْثَوْا

اور بھیجا مدین (مدین والوں) کے پاس ان کے بھائی شعیب کو پھر بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی اور توقع رکھو پچھلے دن کی ۱؎ اور مت پھرو

فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٣٦﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ﴿٣٧﴾

زمین میں خرابی مچاتے ۲؎ پھر اس کو جھٹلایا تو پکڑ لیا ان کو زلزلے نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے

خلاصہ تفسیر: (چوتھا قصہ:) اور مدین والوں کے پاس ہم نے ان (کی برادری) کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا، سو انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو (اور شرک چھوڑ دو) اور روز قیامت سے ڈرو (اور اس کے انکار سے باز آؤ) اور سرزمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی حقوق اللہ وحقوق العباد کو ضائع مت کرو، کیونکہ یہ لوگ کفر وشرک کے ساتھ کم ناپنے کم تولنے کے بھی عادی تھے، جس سے فساد پھیلنا ظاہر ہے) سو ان لوگوں نے شعیب (علیہ السلام) کو جھٹلایا پس زلزلہ نے ان کو آ پکڑا، پھر وہ اپنے گھروں میں گر کر رہ گئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آخرت کی طرف سے غافل نہ ہو، اکیلے خدائے واحد کی پرستش کرو۔

فائدہ: ۲؎ خرابی مچانے سے شاید مراد ہے لین دین میں دغا بازی کرنا، سودبٹہ لگانا، جیسا کہ ان کی عادت تھی، اور ممکن ہے رہزنی بھی کرتے ہوں، وقيل غير ذلك۔

وَعَادًا وَثَمُودَا۟ وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَٰكِنِهِمْ ۖ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ فَصَدَّهُمْ

اور ہلاک کیا عاد کو اور ثمود کو اور تم پر حال کھل چکا ہے ان کے گھروں سے ۱؎ اور فریفتہ کیا ان کو شیطان نے ان کے کاموں پر پھر روک دیا ان کو

عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ﴿٣٨﴾

راہ سے اور تھے ہوشیار ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پانچواں اور چھٹا قصہ:) اور ہم نے عاد وثمود کو بھی (ان کے عناد ومخالفت کی وجہ سے) ہلاک کیا اور یہ ہلاک ہونا تم کو ان کے رہنے کے مقامات سے نظر آ رہا ہے (کہ ان کی ویران برباد بستیوں کے کھنڈرات ملک شام کو جاتے ہوئے تمہارے راستہ پر ملتے ہیں) اور (حالت ان کی یہ تھی کہ) شیطان نے ان کے (برے) اعمال کو ان کی نظر میں مستحسن کر رکھا تھا اور (اس ذریعہ سے) ان کو راہ (حق) سے روک رکھا تھا اور وہ لوگ (ویسے) ہوشیار تھے (مجنون وبیوقوف نہ تھے، مگر اس جگہ انہوں نے اپنی عقل سے کام نہ لیا)۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ (الی قولہ) وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ: اس میں دلالت ہے کہ عقل ونظر کے ہوتے ہوئے نفسانی وشیطانی فریب عذر نہیں اگرچہ عقل ونظر کے استعمال سے غافل رہے (یعنی جس انسان کو بھی اللہ تعالی نے ذرا سا بھی عقل وفہم عطا کیا ہے تو وہ شیطان کے مکر وفریب کو سمجھ کر اس سے بچ سکتا ہے، روز محشر وہ یہ نہ کہہ سکے گا کہ میں کیا کرتا مجھے تو شیطان ونفس نے بہکا دیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان کی بستیوں کے کھنڈر تم دیکھ چکے ہو ان سے عبرت حاصل کرو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دنیا کے کام میں ہشیار تھے اور اپنے نزدیک عقلمند تھے پر شیطان کے بہکائے سے نہ بچ سکے۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۙ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ

اور ہلاک کیا قارون اور فرعون اور ہامان کو اور ان کے پاس پہنچا موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر، پھر بڑائی کرنے لگے ملک میں

وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿٣٩﴾

اور نہیں تھے ہم سے جیت جانے والے

خلاصہ تفسیر: (ساتواں، آٹھواں اور نواں قصہ:) اور ہم نے قارون اور فرعون اور ہامان کو بھی (ان کے کفر کے سبب) ہلاک کیا اور ان (تینوں) کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) کھلی دلیلیں (حق کی) لے کر آئے تھے، پھر ان لوگوں نے زمین میں سرکشی کی اور (ہمارے عذاب سے) بھاگ نہ سکے۔

* * *

فائدہ: یعنی کھلی نشانیاں دیکھ کر بھی حق کے سامنے نہ جھکے اور کبر وغرور نے ان کی گردن نیچے نہ ہونے دی۔ پھر نتیجہ کیا ہوا؟ کیا بڑے بن کر سزا سے بچ گئے؟ یا العیاذ باللہ خدا کو تھکا دیا۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ

پھر سب کو پکڑا ہم نے اپنے اپنے گناہ پر ۱ پھر کوئی تھا کہ اس پر ہم نے بھیجا پتھراؤ ہوا سے ۲ اور کوئی تھا کہ اس کو پکڑا چنگھاڑ نے ۳

وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ

اور کوئی تھا کہ اس کو دھنسا دیا ہم نے زمین پر ۴ اور کوئی تھا کہ اس کو ڈبا دیا ہم نے ۵ اور اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے

وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٤٠﴾

پر تھے وہ اپنا آپ ہی برا کرتے ۶

خلاصہ تفسیر: تو ہم نے (ان پانچوں میں سے) ہر ایک کو اس کے گناہ کی سزا میں پکڑ لیا، سو ان میں بعضوں پر تو ہم نے سخت ہوا بھیجی (مراد اس سے قوم عاد ہے) اور ان میں بعضوں کو ہولناک آواز نے آ دبایا (مراد اس سے قوم ثمود ہے، لقولہ تعالیٰ فی سورۃ ہود: وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ) اور ان میں بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا (مراد اس سے قارون ہے) اور ان میں بعض کو ہم نے (پانی میں) ڈبو دیا (مراد اس سے فرعون وہامان ہے) اور (ان لوگوں پر جو عذاب نازل ہوئے تو) اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا (یعنی بلاوجہ سزا دینا جو ظاہراً ظلم کے مشابہ ہے اگرچہ واقع میں اپنی ملک میں تصرف کرنے کی وجہ سے یہ بھی ظلم نہ تھا) لیکن یہی لوگ (شرارتیں کرکے) اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے (کہ اپنے کو مستحق عذاب بنایا اور غارت ہوئے تو اپنا نقصان خود کیا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ان میں سے ہر ایک کو اس کے جرم کے موافق سزا دی گئی۔

فائدہ: ۲ یہ قوم لوط ہے اور بعض نے عاد کو بھی اس میں داخل کیا ہے۔

فائدہ: ۳ یہ ثمود تھے اور اہل مدین بھی۔

فائدہ: ۴ یعنی قارون کو جیسا کہ سورہ قصص میں گزرا۔

فائدہ: ۵ یہ فرعون وہامان ہوئے اور بعض نے قوم نوح کو بھی اس میں داخل کیا ہے۔

فائدہ: ۶ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یہ نہیں کہ کوئی ناانصافی یا بے موقع کام کرے، اس کی بارگاہ عیوب ونقائص سے بکلی مبرا ومنزہ ہے، ظلم تو وہاں متصور ہی نہیں، ہاں! بندے خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، یعنی ایسے کام کرتے ہیں جن کا نتیجہ لامحالہ ان کے حق میں برا ہو۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ

مثال ان لوگوں کی جنہوں نے پکڑے اللہ کو چھوڑ کر اور حمایتی جیسے مکڑی کی مثال بنالیا اس نے ایک گھر

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور سب گھروں میں بودا سو مکڑی کا گھر اگر ان کو سمجھ ہوتی

خلاصہ تفسیر: شروع سورت سے کفار کے مسلمانوں کو تکلیف دینے کا مضمون یہاں تک چلا آیا ہے، اب آگے توحید ونبوت کی تحقیق ہے جو اس تکلیف دینے کی وجہ تھی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ یہ ایذا رسانی ناحق تھی۔

جن لوگوں نے خدا کے سوا اور کارساز تجویز کر رکھے ہیں ان لوگوں کی (مثال) مکڑی کی سی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شک نہیں کہ سب گھروں میں زیادہ بودا مکڑی کا گھر ہوتا ہے (پس جیسا اس مکڑی نے اپنے خیال میں ایک پناہ اپنے واسطے بنائی ہے مگر واقع میں وہ پناہ انتہائی کمزور ہونے کی وجہ سے بالکل کالعدم ہے، اسی طرح یہ مشرک لوگ اپنے باطل معبودوں کو اپنے گمان میں اپنی پناہ سمجھتے ہیں مگر واقع میں وہ پناہ کچھ نہیں ہے) اگر وہ (حقیقت حال کو) جانتے تو ایسا نہ کرتے (یعنی شرک نہ کرتے، لیکن وہ نہ جانیں تو کیا ہوا)۔

***

فائدہ: یعنی گھر اس واسطے ہے کہ جان مال کا بچاؤ ہو، نہ مکڑی کا جالا کہ دامن کے جھٹکے سے ٹوٹ پڑے، یہ ہی مثال اس کی ہے جو اللہ کے سوا کسی کو اپنا بچانے والا اور محافظ سمجھے بدون مشیت الٰہی کچھ بچاؤ نہیں کرسکتے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾

اللہ جانتا ہے جس جس کو وہ پکارتے ہیں اس کے سوائے کوئی چیز ہو۱ اور وہ زبردست ہے حکمتوں والا۲

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ (تو) ان سب چیزوں (کی حقیقت اور ضعف) کو جانتا ہے جس جس کو وہ لوگ خدا کے سوا پوج رہے ہیں (پس وہ چیزیں تو نہایت ضعیف ہیں) اور وہ (خود یعنی اللہ تعالیٰ) زبردست حکمت والا ہے (جس کا حاصل یہ ہے کہ اس کی علمی اور عملی دونوں قوتیں کامل ہیں)۔

***

فائدہ: ۱ یعنی ممکن تھا سننے والا تعجب کرے کہ سب کو ایک ہی ذیل میں کھینچ دیا کسی کو مستثنیٰ نہ کیا، بعض لوگ بت کو پوجتے ہیں، بعض آگ پانی کو، بعض اولیاء انبیاء یا فرشتوں کو، سو اللہ نے فرمادیا کہ اللہ کو سب معلوم ہیں، اگر کوئی ایک بھی ان میں سے مستقل قدرت واختیار رکھتا تو اللہ سب کی یک قلم نفی نہ کرتا۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کو کسی کی رفاقت نہیں چاہیے، وہ زبردست ہے، اور مشورہ نہیں چاہیے کیونکہ حکیم مطلق ہے۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَاۤ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿٤٣﴾

اور یہ مثالیں بتلاتے (چسپاں کرتے) ہیں ہم لوگوں کے واسطے اور ان کو سمجھتے وہی ہیں جن کو سمجھ ہے

خلاصہ تفسیر: اور (چونکہ ہم ان چیزوں کی حقیقت کو جانتے ہیں اسی لئے) ہم ان (قرآنی) مثالوں کو (جس میں سے ایک مثال اس مقام پر مذکور ہے) لوگوں کے (سمجھانے کے) لئے بیان کرتے ہیں اور (ان مثالوں سے چاہئے تھا کہ ان لوگوں کا جہل علم سے بدل جاتا مگر) ان مثالوں کو بس علم والے ہی سمجھتے ہیں (خواہ اسی وقت علم والے ہوں یا آئندہ ہو جائیں، حاصل یہ کہ علم اور حق کے طالب ہوں اور یہ لوگ عالم بھی نہیں طالب بھی نہیں، اس لئے جہل میں مبتلا رہتے ہیں، لیکن ان کے جہل سے حق حق ہی رہے گا، جس کو خدا جانتا ہے اور اپنے بیان سے ظاہر فرماتا ہے، پس خدا کے سوا کسی کا مستحق عبادت نہ ہونا تو ثابت ہوا)۔

* * *

فائدہ: مشرکین مکہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ "مکڑی" اور "مکھی" وغیرہ حقیر چیزوں کی مثالیں بیان کرتا ہے جو اس کی عظمت کے منافی ہیں اس کا جواب دیا، کہ مثالیں اپنے مواقع کے لحاظ سے نہایت موزوں اور ممثل لہ پر پوری منطبق ہیں، مگر سمجھدار ہی اس کا مطلب ٹھیک سمجھتے ہیں، جاہل بیوقوف کیا جانیں، مثال کا انطباق مثال دینے والے کی حیثیت پر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جس کی مثال ہے اس کی حیثیت کو دیکھو، اگر وہ حقیر و کمزور ہے تو تمثیل بھی ایسی ہی حقیر و کمزور چیزوں سے ہوگی، مثال دینے والے کی عظمت کا اس سے کیا تعلق۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٤٤﴾ ع

اللہ نے بنائے آسمان اور زمین جیسے چاہئیں [1] اس میں نشانی ہے یقین لانے والوں کے لیے [2]

خلاصہ تفسیر: (آگے اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو مناسب طور پر بنایا ہے (چنانچہ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں) ایمان والوں کے لئے اس میں (اس کے استحقاق عبادت کی) بڑی دلیل ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی نہایت حکمت سے بنایا، بیکار پیدا نہیں کیا۔

فائدہ: [2] یعنی جب آسمان و زمین اس اکیلے نے بنا دیے تو چھوٹے چھوٹے کاموں میں اسے کسی شریک یا مددگار کی کیا احتیاج ہوگی، ہوتی تو ان بڑے کاموں میں ہوتی۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ

تو پڑھ جو اتری تیری طرف کتاب[1] اور قائم رکھ نماز، بیشک نماز روکتی ہے بےحیائی اور بری بات سے[2]

وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

اور اللہ کی یاد ہے سب سے بڑی[3] اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو[4]

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا ذکر تھا جس کے ربط کی وجہ اوپر بیان ہوچکی، اب نبوت کا ذکر ہے کہ پہلے آپ کو زبانی تبلیغ کا حکم ہے، پھر عملی تبلیغ کا حکم ہے اس کے بعد اعمال کی فضیلت کا بیان ہے۔

(اے محمد ﷺ! چونکہ آپ رسول ہیں، اس لئے) جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے آپ (تبلیغ کے واسطے) اس کو (لوگوں کے سامنے) پڑھا کیجئے (اور زبانی تبلیغ کے ساتھ تبلیغ عملی بھی کیجئے کہ دین کے کام ان کو عمل کر کے بھی بتلایئے، خصوصاً) نماز کی پابندی رکھئے (تاکہ اور لوگ بھی عمل میں اتباع کریں، اس اتباع کی رغبت دلانے کے لیے نماز کی فضیلت سنائی جاتی ہے کہ) بیشک نماز (اپنی وضع کے اعتبار سے) بےحیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی رہتی ہے (یعنی نماز کی صورت یہ کہتی ہے کہ جس معبود کی تو اتنی تعظیم کر رہا ہے اور اس کی اطاعت کا اقرار کر رہا ہے بےحیائی اور منکر میں مبتلا ہونا اس کی شان میں بےادبی ہے) اور (اسی طرح نماز کے علاوہ بھی جتنے نیک کام ہیں سب پابندی کے قابل ہیں، کیونکہ وہ سب زبان سے یا عمل سے اللہ کی یاد ہی ہیں اور) اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور (اگر تم اللہ کی یاد میں غفلت کرو تو یہ بھی سن لو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے (جیسا کرو گے ویسا بدلہ ملے گا، ترغیب کے بعد اس میں دھمکی کا مضمون بھی عام عنوان سے سنا دیا)۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ: یہاں بعض لوگ یہ شبہ کیا کرتے ہیں کہ ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ نماز کے پابند ہونے کے باوجود بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں جو بظاہر اس آیت کے ارشاد کے خلاف ہے، اس کے جواب میں بعض حضرات نے تو یہ فرمایا کہ آیت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ نماز نمازی کو گناہوں سے منع کرتی ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ جس کو کسی کام سے منع کیا جائے وہ اس سے باز بھی آجائے، آخر قرآن و حدیث سب لوگوں کو گناہ سے منع کرتے ہیں، مگر بہت سے لوگ اس منع کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے اور گناہ سے باز نہیں آتے، خلاصہ تفسیر مذکور میں یہی توجیہ لی گئی ہے، مگر اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا کہ نماز کے منع کرنے کا مفہوم صرف حکم دینا نہیں، بلکہ نماز میں بالخاصہ یہ اثر بھی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کو گناہوں سے بچنے کی توفیق ہوجاتی ہے، اور جس کو توفیق نہ ہو تو غور کرنے سے ثابت ہوجائے گا کہ اس کی نماز میں کوئی خلل تھا اور اقامت صلوۃ کا حق اس نے ادا نہیں کیا، احادیث مبارکہ سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ: اس آیت میں اللہ تعالی کی قربت حاصل کرنے والے اعمال کے اصول یعنی تلاوت، نماز، ذکر اور مراقبہ تینوں جمع ہیں، اور دوسرے تمام اعمال انہی کے تابع ہیں۔

* * *

فائدہ: [1] اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ: یعنی قرآن کی تلاوت کرتے رہیے تاکہ دل مضبوط اور قوی رہے، تلاوت کا اجر و ثواب الگ حاصل ہو، اس کے معارف و حقائق کا انکشاف بیش از بیش ترقی کرے، دوسرے لوگ بھی سن کر اس کے مواعظ اور علوم و برکات سے منتفع ہوں، جو نہ مانیں ان پر خدا کی حجت تمام ہو، اور دعوت و اصلاح کا فرض بحسن و خوبی انجام پاتا رہے۔

فائدہ: [2] اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ: نماز کا برائیوں سے روکنا دو معنی میں ہوسکتا ہے:

① ایک بطریق تسبب، یعنی نماز میں اللہ تعالیٰ نے خاصیت و تاثیر رکھی ہو کہ نمازی کو گناہوں اور برائیوں سے روک دے جیسے کسی دوا کا استعمال کرنا بخار وغیرہ امراض کو روک دیتا ہے، اس صورت میں یاد رکھنا چاہیے کہ دوا کے لئے ضروری نہیں کہ اس کی ایک ہی خوراک بیماری کو روکنے کے

لئے کافی ہو جائے، بعض دوائیں خاص مقدار میں مدت تک التزام کے ساتھ کھائی جاتی ہیں، اس وقت ان کا نمایاں اثر ظاہر ہوتا ہے بشرطیکہ مریض کسی ایسی چیز کا استعمال نہ کرے جو اس دوا کی خاصیت کے منافی ہو، پس نماز بھی بلاشبہ بڑی قوی التاثیر دوا ہے، جو روحانی بیماریوں کو روکنے میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے، ہاں ضرورت اس کی ہے کہ ٹھیک مقدار میں اس احتیاط اور بدرقہ کے ساتھ جو اطبائے روحانی نے تجویز کیا ہو خاصی مدت تک اس پر مواظبت کی جائے، اس کے بعد مریض خود محسوس کرے گا کہ نماز کس طرح اس کی پرانی بیماریوں اور برسوں کے روگ کو دور کرتی ہے۔

② دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ نماز کا برائیوں سے روکنا بطور اقتضاء ہو یعنی نماز کی ہر ایک ہیئت اور اس کا ہر ایک ذکر مقتضی ہے کہ جو انسان ابھی ابھی بارگاہ الٰہی میں اپنی بندگی، فرمانبرداری، خضوع وتذلل، اور حق تعالیٰ کی ربوبیت، الوہیت اور حکومت وشہنشاہی کا اظہار واقرار کر کے آیا ہے، مسجد سے باہر آ کر بھی بدعہدی اور شرارت نہ کرے اور اس شہنشاہ مطلق کے احکام سے منحرف نہ ہو، گویا نماز کی ہر ایک ادا نمازی کو پانچ وقت حکم دیتی ہے کہ او ر بندگی اور غلامی کا دعویٰ کرنے والے واقعی بندوں اور غلاموں کی طرح رہ، اور بزبان حال مطالبہ کرتی ہے کہ بے حیائی اور شرارت وسرکشی سے باز آ، اب کوئی باز آئے یا نہ آئے مگر نماز بلاشبہ اسے روکتی اور منع کرتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ خود روکتا اور منع فرماتا ہے، کما قال تعالیٰ: إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (النحل: ۹۰) پس جو بدبخت اللہ تعالیٰ کے روکنے اور منع کرنے پر برائی سے نہیں رکتے نماز کے روکنے پر بھی ان کا نہ رکنا محل تعجب نہیں۔

ہاں! یہ واضح رہے کہ ہر نماز کا روکنا اور منع کرنا اسی درجہ تک ہوگا جہاں تک اس کے ادا کرنے میں خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو، کیونکہ نماز محض چند مرتبہ اٹھنے بیٹھنے کا نام نہیں، سب سے بڑی چیز اس میں خدا کی یاد ہے، نمازی ارکان صلوٰۃ ادا کرتے وقت اور قرات قرآن یا دعاء وتسبیح کی حالت میں جتنا حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کو مستحضر اور زبان ودل کو موافق رکھے گا اتنا ہی اس کا دل نماز کے منع کرنے کی آواز کو سنے گا، اور اسی قدر اس کی نماز برائیوں کو چھڑانے میں موثر ثابت ہوگی، ورنہ جو نماز قلب لاہی وغافل سے ادا ہو وہ صلوٰۃ منافق کے مشابہ ٹھہرے گی، جس کی نسبت حدیث میں فرمایا: "لا یذکر اللہ فیھا الا قلیلا" اسی کی نسبت "لم یزدد بھا من اللہ الا بعدا" کی وعید آئی ہے۔

فائدہ: ۳ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ: یعنی نماز برائی سے کیوں نہ روکے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے یاد کرنے کی بہترین صورت ہے، کما قال تعالیٰ: وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ: ۱۴) اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے، یہ وہ چیز ہے جسے نماز اور جہاد وغیرہ تمام عبادات کی روح کہہ سکتے ہیں، یہ نہ ہو تو عبادت کیا، ایک جسد بے روح اور لفظ بے معنی ہے، حضرت ابوالدرداء وغیرہ کی احادیث کو دیکھ کر علماء نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ذکر اللہ (خدا کی یاد) سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں، اصلی فضیلت اسی کو ہے، یوں عارضی اور وقتی طور پر کوئی عمل ذکر اللہ پر سبقت لے جائے وہ دوسری بات ہے، لیکن غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس عمل میں بھی فضیلت اسی ذکر اللہ کی بدولت آئی ہے، بہر حال ذکر اللہ تمام اعمال سے افضل ہے اور جب وہ نماز کے ضمن میں ہو تو افضل تر ہوگا، پس بندے کو چاہیے کہ کسی وقت خدا کے ذکر سے غافل نہ ہو خصوصاً جس وقت کسی برائی کی طرف میلان ہو فوراً خدا تعالیٰ کی عظمت وجلال کو یاد کر کے اس سے باز آ جائے، قرآن وحدیث میں ہے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو یاد فرماتا ہے۔

بعض سلف نے آیت کا یہی مطلب لیا ہے کہ نماز میں ادھر سے بندہ خدا کو یاد کرتا ہے اس لئے نماز بڑی چیز ہوئی لیکن اس کے جواب میں جو ادھر سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو یاد فرماتا ہے، یہ سب سے بڑی چیز ہے، جس کی انتہائی قدر کرنی چاہیے اور یہ شرف وکرامت محسوس کر کے اور زیادہ ذکر اللہ کی طرف راغب ہونا چاہئے، کسی شخص نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ اسلام کے احکام بہت ہیں مجھے کوئی ایک جامع ومانع چیز بتلا دیجئے، فرمایا: "لا یزال لسانك رطبا من ذکر اللہ" (تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہئے)۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "جتنی دیر نماز میں لگے اتنا تو ہر گناہ سے بچے، امید ہے آگے بھی بچتا رہے، اور اللہ کی یاد کو اس سے زیادہ اثر ہے یعنی گناہ سے بچے اور اعلیٰ درجوں پر چڑھے"، (موضح) یہ ولذکر اللہ اکبر کی ایک اور لطیف تفسیر ہوئی۔

فائدہ: ۴ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: یعنی جو آدمی جس قدر خدا کو یاد رکھتا ہے یا نہیں رکھتا خدا تعالیٰ سب کو جانتا ہے، لہٰذا ذاکر اور غافل میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کا معاملہ بھی جداگانہ ہوگا۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا

اور جھگڑا نہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو، مگر جو ان میں بے انصاف ہیں ۱ے اور یوں کہو کہ ہم مانتے ہیں

بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

جو اترا ہم کو اور اترا تم کو ۲ے اور بندگی ہماری اور تمہاری ایک ہی کو ہے اور ہم اسی کے حکم پر چلتے ہیں ۳ے

خلاصہ تفسیر: اب رسالت کا انکار کرنے والوں سے کلام ہے، پہلے اہل کتاب سے، پھر دوسروں سے۔

اور (جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت ہے تو اے مسلمانو! منکرین رسالت میں سے جو اہل کتاب ہیں ہم ان سے گفتگو کا طریقہ تم کو بتلاتے ہیں اور اہل کتاب کی خصوصیت اس وجہ سے ہے کہ اول تو وہ اہل علم ہونے کی وجہ سے بات کو سنتے ہیں اور مشرکین تو بات سننے سے پہلے ہی تکلیف پہنچانے کے درپے ہوجاتے تھے، دوسرے اہل علم کے ایمان لے آنے سے عام لوگوں کے ایمان لانے کی زیادہ توقع ہوسکتی ہے اور وہ طریقہ یہی ہے کہ:) تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب طریقے کے مباحثہ مت کرو ہاں! جو ان میں زیادتی کریں (تو ان کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کا مضائقہ نہیں، اگرچہ جب بھی احسن طریقہ ہی افضل ہے) اور (وہ مہذب طریقہ یہ ہے کہ مثلاً ان سے) یوں کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو تم پر نازل ہوئیں (کیونکہ ایمان کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے، پس جب ہماری کتاب کا اللہ کی طرف سے نازل ہونا تمہاری کتابوں سے بھی ثابت ہے پھر تم کو قرآن پر بھی ایمان لانا چاہئے) اور (یہ تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ) ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے (جیسا کہ: تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا الخ میں اس کا بیان ہوا ہے، تو جب توحید پر سب کا اتفاق ہے اور اپنے احبار و رہبان کی اطاعت کی وجہ سے نبی آخر الزماں پر ایمان نہ لانا توحید کے خلاف ہے، تو تم کو ہمارے نبی پر ایمان لانا چاہئے کقولہ تعالیٰ: وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا الخ) اور (اس گفتگو کے ساتھ اپنا مسلمان ہونا بھی تنبیہ کے لئے سنا دو کہ) ہم تو اس کی اطاعت کرتے ہیں (اس میں عقائد و اعمال سب آ گئے، یعنی اسی طرح تم کو بھی کرنا چاہئے جیسا کہ پہلے ارشاد فرمایا: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ)۔

بحث و گفتگو میں تہذیب کا حکم مشرکین کے ساتھ بھی سورہ نحل کے آخر میں آیا ہے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ: اس میں دلالت ہے کہ مخالف کے ساتھ پہلے تو نرمی برتی جائے اور جب اس کا عناد ظاہر ہونے لگے تو سختی کرنے کی بھی اجازت ہے، اور اہل اللہ کا مخالفین کے ساتھ یہی طریقہ ہوتا ہے، باقی طالب حق کے ساتھ دوسرا انداز ہوتا ہے کہ عذر کی حالت میں نرمی اور عذر نہ ہونے کے وقت سختی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کے ساتھ یہی طرز تھا۔

وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ: بعض لوگوں کو شبہ ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں موجودہ تورات و انجیل کے مضامین کی تصدیق کا حکم ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اہل کتاب کی طرف آنے والی کتابوں تورات و انجیل پر مسلمانوں کے ایمان کا تذکرہ جن عنوان سے کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کتابوں پر اجمالی ایمان رکھتے ہیں بایں معنی کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کتابوں میں نازل فرمایا تھا اس پر ہمارا ایمان ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ موجودہ تورات و انجیل کے سب مضامین پر ہمارا ایمان ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی بہت تحریفات ہوچکی تھیں اور اس وقت سے اب تک ان میں تحریف کا سلسلہ چل ہی رہا ہے، ایمان صرف ان مضامین تورات و انجیل پر ہے جو اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) پر نازل ہوئے تھے، تحریف شدہ مضامین اس سے خارج ہیں، اصولی بات یہ ہے کہ موجودہ تورات و انجیل کی نہ مطلقاً تصدیق کی جائے، نہ مطلقاً تکذیب کی جائے، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ اہل کتاب تورات و انجیل کو ان کی اصلی زبان عبرانی میں پڑھتے تھے، اور مسلمانوں کو ان کا ترجمہ عربی زبان میں سناتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق مسلمانوں کو یہ ہدایت دی کہ تم اہل کتاب کی نہ

تصدیق کرو نہ تکذیب کرو، بلکہ یوں کہو: اٰمَنَّا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ ،یعنی ہم اجمالاً اس وحی پر ایمان لاتے ہیں جو تمہارے انبیاء پر نازل ہوئی ہے اور جو تفصیلات تم بتلاتے ہو وہ ہمارے نزدیک قابل اعتماد نہیں، اس لئے ہم اس کی تصدیق و تکذیب سے اجتناب کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡہُمۡ : یعنی مشرکوں کا دین جڑ سے غلط ہے اور اہل کتاب کا دین اصل میں سچا تھا، تو ان سے ان کی طرح مت جھگڑو کہ جڑ سے ان کی بات کاٹنے لگو، بلکہ نرمی، متانت، خیر خواہی اور صبر و تحمل سے واجبی بات سمجھاؤ، البتہ جو ان میں صریح بے انصافی، عناد اور ہٹ دھرمی پر تل جائے اس کے ساتھ مناسب سختی کا برتاؤ کر سکتے ہو اور آگے چل کر ایسوں کو سزا دینی ہے۔

تنبیہ: پہلے قرآن کی تلاوت کا حکم تھا، اغلب ہے کہ منکرین اسے سن کر الجھنے لگیں، تو بتلا دیا کہ بحث کے وقت فریق مقابل کی علمی و دینی حیثیت کا خیال رکھو، جوش مناظرہ میں صداقت و اخلاق کی حد سے نہ نکلو، جہاں کہیں جتنی سچائی ہو اس کا اعتراف کرو۔

فائدہ: ۲۔ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ : یعنی ہمارا جیسا کہ قرآن پر ایمان ہے اس پر بھی ایمان ہے کہ اللہ نے تمہاری ہدایت کے لئے حضرت موسیٰ و مسیح علیہما الصلوٰۃ والسلام اور دوسرے انبیاء پر جو کتابیں اتاریں بیشک وہ سچی تھیں، ایک حرف ان کا غلط نہ تھا، (گو تمہارے ہاتھ میں وہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی صورت و حقیقت میں باقی نہ رہیں)۔

فائدہ: ۳۔ وَّ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ : یعنی اصلی معبود ہمارا تمہارا ایک ہے، فرق اتنا ہے کہ ہم تنہا اسی کے حکم پر چلتے ہیں، تم نے اس سے ہٹ کر اوروں کو بھی خدائی کے حقوق و اختیارات دے دیے، مثلاً حضرت مسیح یا حضرت عزیر علیہما السلام کو یا احبار و رہبان کو، نیز ہم نے اس کے تمام احکام کو مانا سب پیغمبروں کی تصدیق کی، سب کتابوں کو برحق سمجھا اس کے آخری حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، تم نے کچھ مانا کچھ نہ مانا اور آخری صداقت سے منکر ہو گئے۔

وَ کَذٰلِکَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ۚ وَ مِنۡ ہٰۤؤُلَآءِ

اور ویسی ہی ہم نے اتاری تجھ پر کتاب ۱۔ سو جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو مانتے ہیں، اور ان مکہ والوں میں بھی بعضے

مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِہٖ ؕ وَ مَا یَجۡحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۷﴾

ہیں کہ اس کو مانتے ہیں، اور منکر وہی ہیں ہماری باتوں سے جو نافرمان ہیں ۲۔

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح ہم نے پہلے انبیاء پر کتابیں نازل کیں) اسی طرح ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی (اور اسی وجہ سے مہذب گفتگو کی تعلیم کی گئی) سو جن لوگوں کو ہم نے کتاب (کی نافع سمجھ) دی ہے وہ اس (آپ والی) کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (اور ان سے مباحثہ کی بھی نوبت بہت کم آتی ہے) اور ان (اہل عرب مشرک) لوگوں میں بھی بعض ایسے (منصف) ہیں کہ اس کتاب پر ایمان لے آتے ہیں (خواہ خود سمجھ کر یا اہل علم کے ایمان کو دیکھ کر) اور (دلائل کے واضح ہونے کے بعد) ہماری (اس کتاب کی) آیتوں سے بجز (ضدی) کافروں کے اور کوئی منکر نہیں ہوتا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی اس کتاب میں آخر تمہاری کتابوں سے کونسی بات کم ہے جو قبول کرنے میں تردد ہے، جس طرح انبیائے سابقین پر کتابیں اور صحیفے ایک دوسرے کے بعد اترتے رہے، پیغمبر آخر الزماں پر یہ کتاب لاجواب اتری اس کے ماننے سے اتنا انکار کیوں ہے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی جن اہل کتاب نے اپنی کتاب ٹھیک سمجھی وہ اس کتاب کو بھی مانیں گے اور انصافاً ماننا چاہیے، چنانچہ ان میں سے جو منصف ہیں، وہ اس کی صداقت دل سے تسلیم کرتے ہیں، اور نہ صرف اہل کتاب بلکہ عرب کے بعض لوگ بھی جو کتب سابقہ کا کچھ علم نہیں رکھتے اس قرآن کو مانتے جا رہے ہیں، حقیقت میں قرآن کریم کی صداقت کے دلائل اس قدر روشن ہیں کہ بجز سخت حق پوش نافرمان کے کوئی ان کی تسلیم سے انکار نہیں کر سکتا۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے تب تو البتہ شبہ میں پڑتے یہ جھوٹے ۱

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

بلکہ یہ قرآن تو آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو ملی ہے سمجھ ۲ اور منکر نہیں ہماری باتوں سے مگر وہی جو بے انصاف ہیں ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے مباحثہ ومجادلہ کی تقریر نقلی دلیل سے کی تھی جس سے خاص اہل علم کو خطاب تھا، اب عقلی دلیل بیان کرتے ہیں جس میں سب کو عام طور پر خطاب ہے۔

اور (جو لوگ آپ کی نبوت کے منکر ہیں، ان کے پاس کوئی منشاء بھی تو شبہ کرنے کا نہیں، کیونکہ) آپ اس کتاب (یعنی قرآن) سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ ناحق شناس لوگ کچھ شبہ نکالتے (یعنی اگر آپ لکھے پڑھے ہوتے اس وقت تو شبہ کرنے کا کچھ منشا بھی ہوتا کہ یہ لکھے پڑھے آدمی ہیں، آسمانی کتابیں دیکھ کر ان کی مدد سے مضامین سوچ کر فرصت میں بیٹھ کر لکھ لیے اور ہم کو یاد کر کے سنا دیے ہوں گے، اگرچہ تب بھی یہ شبہ کرنے والے غلطی پر ہوتے، کیونکہ قرآن کا اعجاز پھر بھی نبوت کے لیے کافی دلیل تھا، لیکن اب تو اتنا منشا بھی شبہ کرنے کے واسطے نہیں، اس لیے کہ اس کتاب میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں) بلکہ یہ کتاب (یعنی اگرچہ یہ ایک کتاب ہے، لیکن چونکہ اس کا ہر حصہ معجزہ ہے اور حصے بہت ہیں، اس لئے وہ تنہا گویا) خود بہت سی واضح دلیلیں ہیں ان لوگوں کے ذہن میں جن کو علم عطا ہوا ہے اور (اس کا اعجاز ظاہر ہونے کے باوجود) ہماری آیتوں سے بس ضدی لوگ انکار کئے جاتے ہیں (ورنہ منصف کو تو ذرا شبہ نہیں رہنا چاہئے)۔

فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ: خلاصہ تفسیر میں اس کا ترجمہ مجمل کیا گیا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اوتوا العلم میں اہل علم سے مراد مؤمنین ہیں، اور یہ صفت قرآن کی مدح کے لیے بڑھائی کہ وہ مسلمانوں کے ذہن میں قوت حافظہ سے محفوظ ہے، اس کی حفاظت لکھنے پر موقوف نہیں اور یہ بات فی نفسہ بہت عجیب ہے، دوسرے اس سے پہلی کتابوں کی پیشین گوئی سچی ہوگئی کہ: "أناجیلهم فی صدورهم" پہلی کتابوں میں امت محمدیہ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ ان کی کتاب ان کے سینوں میں ہوگی، یعنی وہ اپنی کتاب کے حافظ ہوا کریں گے، چنانچہ اس کا ظہور اچھی طرح ہوگیا کہ ہر زمانہ میں ہزاروں مسلمان قرآن کے حافظ موجود رہتے ہیں، تیسرے اس کتاب کا قوت حافظہ میں محفوظ رہنا خود اس کے لیے تبدل وتغیر اور تحریف سے بھی حفاظت کا سبب ہے اور اس صفت کا قابل مدح ہونا ظاہر ہے۔

اور درمنثور میں قتادہ سے مروی ہے کہ اوتوا العلم میں اہل علم سے مراد اہل کتاب ہیں اور ھو کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے، اور معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ گذشتہ آیت میں بیان کردہ اوصاف: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ الخ کے اعتبار سے جس کا حاصل اُمّی ہونا ہے اہل کتاب کے سینوں میں جو کہ محل علم ہیں گویا خود دلیل ہیں اپنے صدق ونبوت کی، اور اس تقدیر پر ھو کی ضمیر قرآن کی طرف بھی راجع ہوسکتی ہے اور دونوں احتمال پر حاصل اس کا یہ ہوگا: یعرفونه کما یعرفون ابناءهم۔

* * *

فائدہ: ۱ نزول قرآن سے پہلے آپ کی عمر کے چالیس سال ان ہی مکہ والوں میں گزرے، سب جانتے ہیں کہ اس مدت میں نہ آپ کسی استاد کے پاس بیٹھے نہ کوئی کتاب پڑھی نہ کبھی ہاتھ میں قلم پکڑا، ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں کو شبہ نکالنے کی جگہ رہتی کہ شاید اگلی کتابیں پڑھ کر یہ باتیں نوٹ کر لی ہوں گی، ان ہی کو اب آہستہ آہستہ اپنی عبارت میں ڈھال کر سنا دیتے ہیں، گو اس وقت بھی یہ کہنا غلط ہوتا، کیونکہ کوئی پڑھا لکھا انسان بلکہ دنیا کے تمام پڑھے لکھے آدمی مل کر اور کل مخلوق کی طاقت کو اپنے ساتھ ملا کر بھی ایسی بے نظیر کتاب تیار نہیں کر سکتے، تاہم جھوٹوں کو بات بنانے کا ایک موقع ہاتھ لگ

جاتا لیکن جب کہ آپ کا امی ہونا مسلمات میں سے ہے تو اس سرسری شبہ کی بھی جڑ کٹ گئی اور یوں ضدی لوگ کہنے کو تو اس کو بھی کہتے تھے: اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (الفرقان:۵)

فائدہ: ۲ یعنی پیغمبر نے کسی سے لکھا پڑھا نہیں، بلکہ یہ وحی جوان پر آئی ہمیشہ کو بن لکھے سینہ بسینہ جاری رہے گی، اللہ کے فضل سے علماء اور حفاظ وقراء کے سینے اس کے الفاظ و معانی کی حفاظت کریں گے اور آسمانی کتابیں حفظ نہ ہوتی تھیں، یہ کتاب حفظ ہی سے باقی ہے، لکھنا اس پر افزود ہے (موضح باضافہ یسیر)۔

فائدہ: ۳ یعنی ناانصافی کا کیا علاج، ایک شخص یہ ہی ٹھان لے کہ میں کبھی سچی بات نہ مانوں گا، وہ روشن سے روشن چیز کا بھی انکار کردے گا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۵۰

اور کہتے ہیں کیوں نہ اتریں اس پر کچھ نشانیاں اس کے رب سے، تو کہہ نشانیاں تو ہیں اختیار میں اللہ کے، اور میں تو بس سنا دینے والا ہوں کھول کر

خلاصہ تفسیر: اور یہ لوگ (معجزہ قرآن عطا ہونے کے باوجود محض سرکشی اور عناد سے) یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر ان کے رب کے پاس سے (ہماری فرمائشی) نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوئیں، آپ یوں کہہ دیجئے کہ وہ نشانیاں تو خدا کے قبضہ (قدرت) میں ہیں اور (فرمائشی معجزے میرے اختیار کی چیزیں نہیں) میں تو صرف ایک صاف صاف (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا (یعنی رسول) ہوں (اور اپنے رسول ہونے پر قطعی اور صحیح دلیلیں رکھتا ہوں جن میں سب سے بڑی دلیل قرآن ہے، پھر خاص دلیل کی کیا ضرورت ہے؟ خصوصاً جبکہ فرمائشی معجزات کے واقع نہ ہونے میں حکمت بھی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی میرے قبضہ میں نہیں کہ جونشان تم طلب کیا کرو وہی دکھلا دیا کروں نہ کسی نبی کی تصدیق اس بات پر موقوف ہوسکتی ہے، میرا کام تو یہ ہے کہ بدی کے نتائج سے تم کو صاف لفظوں میں آگاہ کرتا رہوں باقی حق تعالیٰ میری تصدیق کے لئے جونشان چاہے دکھلا دے، یہ اسکے اختیار میں ہے۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۵۱ ع

کیا ان کو یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر اتاری کتاب کہ ان پر پڑھی جاتی ہے، بیشک اس میں رحمت ہے اور سمجھانا ان لوگوں کو جو مانتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (اب قرآن کا بڑی دلیل ہونا بیان کرتے ہیں) کیا (نبوت پر دلالت کے لیے) ان لوگوں کو یہ بات کافی نہیں ہوئی کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب (معجز) نازل فرمائی ہے جو ان کو (ہمیشہ) سنائی جاتی رہتی ہے (کہ اگر ایک بار سننے سے اس کا معجزہ ظاہر نہ ہو تو دوسری بار میں ہوجائے، یا اس کے بعد ہوجائے اور دوسرے معجزات میں تو یہ بات بھی نہ ہوتی، کیونکہ وہ ہمیشہ باقی نہ رہتے جیسا کہ ظاہر ہے، اور ایک ترجیح اس معجزہ میں یہ ہے کہ) بلاشبہ اس کتاب میں (معجزہ ہونے کے ساتھ) ایمان لانے والے لوگوں کے لئے بڑی رحمت اور نصیحت ہے (''رحمت'' یہ کہ احکام کی تعلیم ہے جو خالص نفع ہے اور ''نصیحت'' ترغیب وترہیب سے ہے، اور یہ بات دوسرے معجزات میں کب ہوتی، پس ان ترجیحات سے تو اس کو غنیمت سمجھتے اور ایمان لے آتے)۔

* * *

فائدہ: یعنی کیا یہ نشان کافی نہیں جو کتاب انھیں دن رات پڑھ کر سنائی جاتی ہے اس سے بڑا نشان کون سا ہوگا، دیکھتے نہیں کہ اس کتاب کے ماننے والے کس طرح سمجھ حاصل کرتے جاتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے بہرہ ور ہورہے ہیں۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

تو کہہ کافی ہے اللہ میرے اور تمہارے بیچ گواہ ،جانتا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں ۱؎ اور جو لوگ یقین لاتے ہیں

بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

جھوٹ پر اور منکر ہوئے ہیں اللہ سے، وہی ہیں نقصان پانے والے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور اگر ان واضح دلائل کے بعد بھی ایمان نہ لائیں تو آخری جواب کے طور پر) آپ کہہ دیجئے کہ (خیر! بھائی مت مانو) اللہ میرے اور تمہارے درمیان (میری رسالت کا) گواہ بس ہے، اس کو سب چیز کی خبر ہے جو آسمان میں ہے اور زمین میں ہے، اور (جب میری رسالت اور اللہ کا علم محیط ثابت ہوا تو) جو لوگ جھوٹی باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور اللہ (کی باتوں) کے منکر ہیں (جن میں رسالت بھی داخل ہے) تو وہ لوگ بڑے زیاں کار ہیں (یعنی جب اللہ کے ارشاد سے میری رسالت ثابت ہے تو اس کا انکار کفر باللہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے تو اس کو اس انکار و کفر کی بھی خبر ہے، اور اللہ تعالیٰ کفر پر خسارے کی سزا دیتے ہیں، پس لامحالہ ایسے لوگ خسارہ میں ہوں گے)۔

یہ دلیل نہ ماننے والوں کے مقابلہ میں جواب ہے مگر پھر بھی اس میں دلیل کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ اللہ کی شہادت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے صدق و نبوت پر دلائل قائم کیے، اور باطل کے عموم میں تمام اہواء اور باطل خدا سب داخل ہو گئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی خدا کی زمین پر اس کے آسمان کے نیچے میں اعلانیہ دعویٰ رسالت کر رہا ہوں جسے وہ سنتا اور دیکھتا ہے پھر روز بروز مجھے اور میرے ساتھیوں کو غیر معمولی طریقہ سے بڑھا رہا ہے، برابر میرے دعوے کی فعلی تصدیق کرتا ہے، میری زبان پر اور ہاتھوں پر قدرت کے وہ خارق عادت نشان ظاہر کئے جاتے ہیں جن کی نظیر پیش کرنے سے تمام جن وانس عاجز ہیں، کیا میری صداقت پر اللہ کی گواہی کافی نہیں۔

فائدہ: ۲؎ آدمی کی بڑی شقاوت اور خسران یہ ہے کہ جھوٹی بات کو خواہ کتنی ہی بدیہی البطلان ہو فوراً قبول کر لے اور سچی بات سے گو کتنی ہی صاف روشن ہو انکار کرتا رہے۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً

اور جلدی مانگتے ہیں تجھ سے آفت ۱؎ اور اگر نہ ہوتا ایک وعدہ مقرر (ٹھہرا ہوا) تو آ پہنچتی ان پر آفت، اور البتہ آئے گی ان پر اچانک

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور ان کو خبر نہ ہوگی ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب یہاں سے منکروں کے بعض شبہ کا جواب ہے۔

اور یہ لوگ آپ سے عذاب (واقع ہونے) کا تقاضا کرتے ہیں (اور فوراً عذاب نہ آنے سے آپ کی نبوت و رسالت پر شبہ اور انکار کرتے ہیں) اور اگر (علم الٰہی میں عذاب آنے کے لئے) میعاد معین نہ ہوتی تو (ان کے تقاضہ کے ساتھ ہی) ان پر عذاب آ چکا ہوتا اور (جب وہ میعاد آ جائے گی تو) وہ عذاب ان پر دفعۃً (اچانک) آ پہونچے گا اور ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔

وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً: قیامت کے عذاب کا اچانک آنا اس طرح ہو سکتا ہے کہ قبر میں اگرچہ عذاب کا مشاہدہ ہوگا، لیکن قیامت کا عذاب اس

سے بھی سخت ہوگا، اس کا مشاہدہ نہیں ہوا تھا اس لیے اس کا آنا اچانک ہی ہوگا۔

فائدہ: ۱ یعنی اگر باطل پر ہیں تو ہم پر دنیا میں کوئی آفت کیوں نہیں آتی۔

فائدہ: ۲ یعنی ہر چیز اپنے وقت معین پر آتی ہے، گھبراؤ نہیں، وہ آفت بھی آکر رہے گی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس امت کا عذاب یہ ہی تھا مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہونا اور پکڑے جانا، سو فتح مکہ کے لوگ بے خبر رہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر سر پر آ کھڑا ہوا۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٤﴾ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ

جلدی مانگتے ہیں تجھ سے عذاب ۱ اور گھیر رہی ہے منکروں کو ۲ جس دن گھیر لے گا ان کو عذاب

مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٥﴾

ان کے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے اور کہے گا چکھو جیسا کچھ تم کرتے تھے ۳

خلاصہ تفسیر: اب ان لوگوں کی جہالت اور بے وقوفی کے اظہار کے لئے ان کی جلد بازی کو دوبارہ ذکر کر کے عذاب کی میعاد معین اور اس میں پیش آنے والے عذاب کا ذکر کرتے ہیں کہ:

یہ لوگ آپ سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں اور (عذاب کی صورت یہ ہے کہ) اس میں کچھ شک نہیں کہ جہنم ان کافروں کو (چاروں طرف سے) گھیر لے گا، جس دن ان پر عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے نیچے سے گھیر لے گا اور (اس وقت ان سے) حق تعالیٰ فرمائے گا کہ جو کچھ (دنیا میں) کرتے رہے ہو (اب اس کا مزہ) چکھو (پس وہ عذاب جہنم کا عذاب اور وہ میعاد قیامت کا دن ہے)۔

فائدہ: ۱ یہاں عذاب سے شاید آخرت کا عذاب مراد ہو جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی آخرت کا عذاب تو فضول مانگتے ہیں، اس عذاب میں تو پڑے ہی ہیں، یہ کفر اور برے کام دوزخ نہیں تو اور کیا ہے، جس نے ہر طرف سے انھیں گھیر رکھا ہے، موت کے بعد حقیقت کھل جائے گی کہ دوزخ کس طرح جلاتی ہے جب یہ ہی اعمال جہنم کی آگ اور سانپ بچھو بن کر لپٹیں گے۔

فائدہ: ۳ یہ اللہ تعالیٰ کہے گا، یا وہ عذاب ہی بولے گا جیسے زکوٰۃ نہ دینے والے کا مال، حدیث میں آیا ہے کہ سانپ ہو کر گلے میں پڑے گا، گلے چیرے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں تیرا خزانہ ہوں۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾

اے بندوں میرے جو یقین لائے ہو میری زمین کشادہ ہے سو میری ہی بندگی کرو

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں مسلمانوں کے ساتھ کفار کی دشمنی کا ذکر تھا، اور گزشتہ آیتوں میں بھی توحید و رسالت کے انکار کے علاوہ ان کی دشمنی کا حال معلوم ہو چکا ہے اور چونکہ یہ دشمنی احکام الٰہی کے ادا کرنے سے مانع ہوتی ہے اس لیے ایسی صورت میں اکثر وطن چھوڑنے یعنی ہجرت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے آگے ہجرت کا حکم فرماتے ہیں، اور چونکہ ہجرت میں کبھی عزیزوں اور وطن کے چھوٹنے کا خیال اور فقر و فاقہ کا اندیشہ مانع ہوتا ہے اس لیے ان موانع کو بھی باطل فرماتے ہیں اور ساتھ ساتھ صبر و توکل وغیرہ کی ترغیب فرماتے ہیں:

اے میرے ایمان دار بندو! (جب یہ لوگ انتہائی دشمنی اور عناد سے تم کو ایمان لانے اور احکام خداوندی بجالانے پر تکلیفیں پہنچاتے ہیں تو یہاں رہنا کیا ضرور) میری زمین فراخ ہے، سو (اگر یہاں رہ کر عبادت نہیں کر سکتے تو اور کہیں چلے جاؤ اور وہاں جا کر) خالص میری ہی عبادت کرو

(کیونکہ یہاں اہل شرک کا زور ہے، تو ایسی عبادت جو خالص توحید پر مبنی ہو اور شرک سے پاک ہو، یہاں رہ کر مشکل ہے، البتہ خدا کے ساتھ غیر خدا کی بھی عبادت ہو یہ ممکن ہے، مگر وہ عبادت ہی نہیں، اس لیے ہجرت کرنا ضروری ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ مکہ کے کافر اگر تم کو تنگ کرتے ہیں تو خدا کی زمین تنگ نہیں دوسری جگہ جا کر خدا کی عبادت کرو۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٧﴾

جو جی ہے سو چکھے گا موت، پھر ہماری طرف پھر آ ؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور اگر تم کو ہجرت میں احباب اور وطن کا چھوڑنا دشوار معلوم ہو تو یہ سمجھ لو کہ ایک نہ ایک روز تو ایسا ہونا ہی ہے، کیونکہ) ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا (ضرور) ہے (آخر اس وقت سب چھوٹیں گے اور) پھر تم سب کو ہمارے پاس آنا ہے (اور نافرمان ہو کر آنے میں خوف سزا کا ہے)۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: جب کافروں نے مکہ میں بہت زور باندھا تو مسلمانوں کو ہجرت کا حکم ہوا، چنانچہ اسی ترا سی گھر حبشہ چلے گئے، اس کو فرمایا کوئی دن کی زندگی ہے جہاں بن پڑے وہاں کاٹ دو، پھر ہمارے پاس اکٹھے آ ؤ گے، اس میں مہاجرین کی تسلی کر دی تا کہ وطن چھوڑنا اور حضرت سے جدا ہونا دل پر بھاری نہ گزرے، گویا جتلا دیا کہ وطن، خویش و اقارب، رفقاء اور چھوٹے بڑے آج نہیں کل چھوٹیں گے، فرض کرو اس وقت مکہ سے ہجرت نہ کی تو ایک روز دنیا سے ہجرت کرنا ضروری ہے مگر وہ بے اختیار ہوگا، بندگی اس کا نام ہے کہ اپنی خوشی اور اختیار سے ان چیزوں کو چھوڑ دے جو پروردگار حقیقی کی بندگی میں مزاحم اور خلل انداز ہوتی ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اور جو لوگ یقین لائے اور کیے بھلے کام ان کو ہم جگہ دیں گے بہشت میں جھروکے نیچے بہتی ہیں ان کے نہریں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿٥٨﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٥٩﴾

سدا رہیں ان میں، خوب ثواب ملا کام والوں کو، جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر بھروسہ رکھا۔

خلاصہ تفسیر: اور (یہ مفارقت اگر ہماری رضا کے واسطے ہو تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہمارے پاس پہنچنے کے بعد تم اس وعدہ کے مستحق ہو جاؤ گے اور وہ وعدہ یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے (جن پر عمل کرنا بعض اوقات ہجرت پر موقوف ہوتا ہے تو ایسے وقت میں ہجرت بھی کی) ہم ان کو جنت کے بالا خانوں میں جگہ دیں گے، جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور ان نیک کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے، جنہوں نے (واقع شدہ سختیوں پر جن میں ہجرت کی سختی بھی داخل ہوگئی) صبر کیا اور (دوسرے ملک یا شہر میں جا کر جو تکالیف کا اور رزق وغیرہ کی مشکلات کا اندیشہ تھا اس میں) وہ اپنے رب پر توکل کیا کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: یعنی جو صبر و استقلال سے اسلام و ایمان کی راہ پر جمے رہے اور خدا پر بھروسہ کر کے گھر بار چھوڑ کر وطن سے نکل کھڑے ہوئے ان کو اس وطن کے بدلے وہ وطن ملے گا اور یہاں کے گھروں سے بہتر گھر دیے جائیں گے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٠﴾

اور کتنے جانور ہیں جو اٹھا نہیں رکھتے اپنی روزی، دیتا ہے ان کو اور تم کو بھی، اور وہی ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: اور (اگر ہجرت میں تم کو یہ وسوسہ ہو کہ پردیس میں کھانے کو کہاں سے ملے گا تو یہ سمجھ لو کہ) بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنی غذا اُٹھا کر نہیں رکھتے (یعنی جمع نہیں کرتے، اگرچہ بعضے جمع بھی کرتے ہیں، مگر بہت سے نہیں بھی کرتے) اللہ ہی ان کو (مقدر) روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی (مقدر روزی پہنچائے گا، خواہ تم کہیں ہو، پھر ایسا وسوسہ مت لاؤ، بلکہ دل قوی کر کے اللہ پر بھروسہ رکھو) اور (وہ بھرسہ کے لائق ہے، کیونکہ) وہ سب کچھ سنتا سب کچھ جانتا ہے (اسی طرح وہ سب صفات میں کامل ہے اور جو ایسا کامل ہو وہ ضرور بھروسہ کے قابل ہے)۔

فائدہ: یہ روزی کی طرف سے خاطر جمع کر دی کہ: ''اکثر جانوروں کے گھر میں اگلے دن کا قوت نہیں ہوتا، نیا دن اور نئی روزی'' (موضح) پھر جو خدا جانوروں کو روزی پہنچاتا ہے کیا اپنے وفادار عاشقوں کو نہ پہنچائے گا، خوب سمجھ لو رزاق حقیقی وہ ہے جو سب کی باتیں سنتا اور دلوں کے اخلاص کو جانتا ہے، ہر ایک کا ظاہر و باطن اس کے سامنے ہے، کسی کی محنت وہاں رائیگاں نہیں ہوسکتی، جو لوگ اس کے راستہ میں وطن چھوڑ کر نکلے ہیں انھیں ضائع نہیں کرے گا، سامان معیشت ساتھ لے جانے کی فکر نہ کریں، کتنے جانور ہیں جو اپنی روزی اپنی کمر پر لادے نہیں پھرتے، پھر بھی رازق حقیقی ان کو ہر روز رزق پہنچاتا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾

اور اگر تو لوگوں سے پوچھے کہ کس نے بنایا ہے آسمان اور زمین کو اور کام میں لگایا سورج اور چاند کو تو کہیں اللہ نے، پھر کہاں سے الٹ جاتے ہیں

خلاصہ تفسیر: کافی پیچھے شرک کی برائی اور توحید کے اثبات کا مضمون تھا، پھر رسالت وہجرت کا بیان آ گیا تھا، چونکہ توحید نہایت مہتم بالشان ہے اس لیے اب پھر مضمون توحید کی طرف رجوع ہے جو سورت کے اختتام تک چلا گیا ہے۔

اور (تخلیق کائنات میں اللہ کی توحید تو ان لوگوں کے نزدیک بھی مسلم ہے، چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ (بھلا) وہ کون ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے، تو وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ اللہ ہے پھر (جب تخلیق کائنات میں اللہ کی توحید کو مانتے ہیں تو الوہیت میں توحید کے بارے میں) کدھر الٹے چلے جا رہے ہیں۔

فائدہ: یعنی رزق کے تمام اسباب (سماویہ وارضیہ) اسی نے پیدا کئے سب جانتے ہیں، پھر اس پر بھروسہ نہیں کرتے کہ وہ ہی پہنچا بھی دے گا، مگر جتنا وہ چاہے نہ جتنا تم چاہو، یہ اگلی آیت میں سمجھا دیا ہے (موضح)۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾

اللہ پھیلاتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اپنے بندوں میں اور ناپ کر دیتا ہے جس کو چاہے [1] بیشک اللہ ہر چیز سے خبردار ہے [2]

خلاصہ تفسیر: (اور جیسے خالق اللہ ہی ہے، اسی طرح) اللہ ہی (رازق بھی ہے، چنانچہ وہ) اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے، بیشک اللہ ہی سب چیز کے حال سے واقف ہے (جیسی مصلحت دیکھتا ہے ویسی ہی روزی دیتا ہے، غرض رازق وہی ٹھہرا، اس لئے رزق کا اندیشہ ہجرت سے مانع نہ ہونا چاہئے، نیز رزق کے لیے بھی شرک کرنا بے ہودہ ٹھہرا)۔

فائدہ: ۱؎ ناپ کر دیتا ہے یہ نہیں کہ بالکل نہ دے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یہ خبر اسی کو ہے کہ کس کو کتنا دینا چاہیئے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ

اور جو تو پوچھے ان سے کس نے اتارا آسمان سے پانی پھر زندہ کر دیا اس سے زمین کو اس کے مر جانے کے بعد تو کہیں اللہ نے

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ ع

تو کہہ سب خوبی اللہ کو ہے، پر بہت لوگ نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر: اور (جیسا کہ تخلیق کائنات میں اللہ کی توحید ان کے نزدیک بھی مسلم ہے، اسی طرح کائنات کے باقی رکھنے اور ان کا نظام چلانے میں بھی توحید کو تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ) اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ وہ کون ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس سے زمین کو بعد اس کے کہ خشک (نا قابل نبات) پڑی تھی تر و تازہ (قابل نبات) کر دیا تو (جواب میں) وہ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ بھی اللہ ہی ہے، آپ کہئے کہ الحمد اللہ! (اتنا تو اقرار کیا جس سے توحید پر استدلال کرنا بھی ظاہر ہے، کیونکہ انہوں نے تسلیم کر لیا، مگر یہ لوگ مانتے نہیں) بلکہ (اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ) ان میں اکثر سمجھتے بھی نہیں (اس وجہ سے نہیں کہ ان کو عقل نہیں، بلکہ عقل سے کام نہیں لیتے اور غور نہیں کرتے، اس لئے کھلی واضح بات بھی چھپی رہتی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی مینہ بھی ہر کسی پر برابر نہیں برستا اور اسی طرح حال بدلتے دیر نہیں لگتی، ذرا دیر میں مفلس سے دولت مند کر دے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾

اور یہ دنیا کا جینا تو بس جی بہلانا اور کھیلنا ہے، اور پچھلا گھر جو ہے سو وہی ہے زندہ رہنا، اگر ان کو سمجھ ہوتی

خلاصہ تفسیر: اور (ان کے غور نہ کرنے کی وجہ دنیا کے کاموں میں بہت انہماک ہے، حالانکہ) یہ دنیوی زندگی (جس کی یہ تمام تر مشغولیات ہیں فی نفسہ) بجز لہو و لعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت (کی) ہے (چنانچہ دنیا کے فانی ہونے اور آخرت کے باقی اور پائیدار ہونے سے یہ دونوں باتیں ظاہر ہیں، پس فنا ہونے والی چیز میں اس قدر انہماک کہ باقی رہنے والی چیز سے غفلت اور محرومی، یہ خود بے عقلی کی بات ہے) اگر ان کو اس کا (کافی) علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے (کہ فانی میں منہمک ہو کر باقی کو بھلا دیتے اور اس کے لئے سامان نہ کرتے، بلکہ یہ لوگ دلائل میں غور کرتے اور ایمان لے آتے جیسا کہ خود ان کو یہ تسلیم ہے کہ تخلیق کائنات اور اس کے باقی رکھنے میں خدا کا کوئی شریک نہیں)۔

اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ: خلاصہ تفسیر میں "لہو ولعب" کے ساتھ "فی نفسہ" کی قید اس لیے لگائی کہ اگر دنیا کی زندگی دین کے حصول کا ذریعہ بن جائے تو پھر وہ لہو ولعب نہیں، بلکہ ثمرہ اور نتیجہ یعنی ثواب کے اعتبار سے وہ بھی باقی رہنے والی ہے، یعنی اسے بقا حاصل ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ: یہ آیت زہد فی الدنیا یعنی دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی ترغیب پر صراحتاً دلالت کرتی ہے اور اس میں دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والے پر جہالت کا حکم ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی آدمی کو چاہیے یہاں کی چند روزہ زندگی سے زیادہ آخرت کی فکر کرے کہ اصلی و دائمی زندگی وہ ہے، دنیا کے کھیل تماشے میں غرق ہو کر عاقبت کو بھول نہ بیٹھے، بلکہ یہاں رہ کر وہاں کی تیاری اور سفر آخرت کے لئے توشہ درست کرے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾

پھر جب سوار ہوئے کشتی میں پکارنے لگے اللہ کو خالص اسی پر رکھ کر اعتقاد، پھر جب بچا لایا ان کو زمین کی طرف اسی وقت لگے شریک بنانے

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

تا کہ مکرتے رہیں ہمارے دیئے ہوئے سے اور مزے اڑاتے رہیں، سو عنقریب جان لیں گے [1]

خلاصہ تفسیر: آگے بتلاتے ہیں کہ جس طرح خالق کے ایک ماننے سے معبود کا ایک ہونا عقلا لازم آتا ہے، اسی طرح کبھی کبھی یہ لوگ زبان سے بھی اس کا اظہار و اقرار کر لیتے ہیں، اور سچی بات ان کے منہ سے خود بخود نکل جاتی ہے، چنانچہ:

پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں (اور وہ کشتی زیر و زبر ہونے لگتی ہے) تو (اس وقت) خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں (کہ: لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ، أي الموحّدين، کہ اگر خدا ہم کو اس مصیبت سے نجات دے تو ہم موحد ہو جائیں گے، جس سے معبود کے ایک ہونے پر اور بھی حجت پوری ہو جاتی ہے، مگر یہ حالت دنیا میں منہمک ہونے کی وجہ سے دیر تک نہیں رہتی، چنانچہ اس وقت تو توحید کے سب قول و اقرار ہو چکے ہیں مگر) پھر جب ان کو (اس آفت سے) نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو نعمت (نجات وغیرہ) ان کو دی ہے اس کی ناقدری کرتے ہیں اور یہ لوگ (شرکیہ عقائد، اور کفریہ اعمال میں خواہش نفس کی پیروی کر کے) چندے اور حظ حاصل کر لیں پھر قریب ہی ان کو سب خبر ہوئی جاتی ہے (اس وقت ان کو دنیا میں منہمک ہونے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا)۔

دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: ان کا یہ اخلاص اگر دل سے نہ تھا یعنی محض دکھلاوا تھا تب تو اس میں دلالت ہے کہ محض صورتاً عمل کافی نہیں، اور اگر ان کا اخلاص دل سے تھا تو اس پر دلالت ہے کہ عمل استقامت کے بغیر کافی نہیں۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ آدمی دنیا کے مزوں میں پڑ کر خدا کو اور آخرت کو فراموش نہ کرے، لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کشتی طوفان میں گھر جائے تو بڑی عقیدت مندی سے اللہ کو پکارتے ہیں، پھر جہاں آفت سر سے ٹلی اور خشکی پر قدم رکھا، اللہ کے احسانوں سے مکر کر جھوٹے دیوتاؤں کو پکارنا شروع کر دیا، گویا غرض یہ ہوئی کہ اللہ کی نعمتوں کا کفران کرتے رہیں اور دنیا کے مزے اڑاتے رہیں، خیر بہتر ہے چند روز دل کے ارمان نکال لیں، عنقریب پتہ لگ جائے گا کہ اس بغاوت و شرارت، احسان فراموشی اور ناسپاسی کا نتیجہ کیا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ

کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے رکھ دی ہے پناہ کی جگہ امن کی اور لوگ اچکے جاتے ہیں ان کے آس پاس سے، کیا جھوٹ پر یقین رکھتے ہیں

وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

اور اللہ کا احسان نہیں مانتے

خلاصہ تفسیر: پس توحید قبول کرنے سے ایک مانع تو ان کو دنیا کا انہماک ہے، جیسا کہ پیچھے گذرا، اور دوسرا ایک اور نامعقول حیلہ بہانہ یہ نکال رکھا ہے کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ: اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا یعنی اگر ہم رسول کا اتباع کریں گے تو اپنے وطن سے نکال دیے جائیں گے، حالانکہ مشاہدہ سے اس حیلہ بہانہ کا بے ہودہ ہونا ان کو خود معلوم ہو سکتا ہے:

کیا ان لوگوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم نے (ان کے شہر مکہ کو) امن والا حرم بنایا ہے اور ان کے گرد و پیش (کے مقامات) میں (جو

خارج حرم ہیں) لوگوں کو (مار دھاڑ کر ان کے گھروں سے) نکالا جا رہا ہے (بخلاف ان لوگوں کے کہ یہ امن سے بیٹھے ہیں اور یہ بات مشاہدہ میں بھی آ رہی ہے تو یہ لوگ مشاہدہ کے خلاف بھی بہانے نکالتے ہیں، اور ہلاکت کے خوف کو ایمان لانے میں مانع اور عذر بتاتے ہیں اور) پھر (حق واضح ہونے کے بعد اس حماقت اور ضد کا) کیا (ٹھکانا ہے کہ) یہ لوگ جھوٹے معبود (وں) پر تو ایمان لاتے ہیں (جن پر ایمان لانے کی کوئی بھی وجہ نہیں اور مانع بہت سے ہیں) اور اللہ (جس پر ایمان لانے کے بہت سے دلائل موجود ہیں اور واقعی مانع کوئی بھی نہیں اس کی) نعمتوں کی ناشکری (یعنی اللہ کے ساتھ شرک) کرتے ہیں (کیونکہ شرک سے بڑھ کر کوئی ناشکری نہیں کہ زندگی اور روزی اور دیگر نعمتیں تو حق تعالی عطا فرمائیں اور عبادت جو کہ ان نعمتوں کا شکریہ تھا وہ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے لیے تجویز کی جائے)۔

وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ: اس کے متعلق کچھ تفصیل سورہ قصص آیت ۵۷ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

* * *

فائدہ: مکہ کے لوگ اللہ کے گھر کے طفیل دشمنوں سے پناہ میں تھے، حالانکہ سارے ملک عرب میں فساد اور کشت وخون کا بازار گرم تھا، بتوں کے جھوٹے احسان مانتے ہیں اللہ کا یہ سچا احسان نہیں مانتے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ

اور اس سے زیادہ بے انصاف کون ہے جو باندھے اللہ پر جھوٹ یا جھٹلائے سچی بات کو جب اس تک پہنچے

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

کیا دوزخ میں بسنے کی جگہ نہیں منکروں کے لئے

خلاصہ تفسیر: اور (واقعی بات یہ ہے کہ) اس شخص سے زیادہ کون ناانصاف ہوگا جو (بلا دلیل) اللہ پر جھوٹ افتراء کرے (کہ وہ شریک رکھتا ہے) اور جب سچی بات اس کے پاس (دلیل کے ساتھ) پہنچے وہ اس کو جھٹلا دے (بے انصافی ظاہر ہے کہ بلا دلیل بات کو تو مانا جائے اور دلیل والی بات کو جھٹلایا جائے) کیا ایسے کافروں کا (جو اس قدر ناانصافی کریں) جہنم میں ٹھکانا نہ ہوگا (یعنی ضرور ہوگا، کیونکہ سزا جرم کے مناسب ہوتی ہے، سو جتنا بڑا جرم ہو ویسی ہی بڑی سزا ہونی چاہیے)۔

* * *

فائدہ: یعنی سب سے بڑی ناانصافی یہ ہے کہ اللہ کا شریک کسی کو ٹھہرائے، یا اس کی طرف وہ باتیں منسوب کرے جو اس کی شان کے لائق نہیں، یا پیغمبر جو سچائی لے کر آئے ہیں اسے سنتے ہی جھٹلانا شروع کر دے، کیا ان ظالموں کو معلوم نہیں کہ منکروں کا ٹھکانا دوزخ ہے جو ایسی بیباکی اور بے حیائی سے عقل وانصاف کے گلے پر چھری پھیرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾ ع

اور جنہوں نے محنت کی ہمارے واسطے ہم سجھا دیں گے ان کو اپنی راہیں ۱ اور بیشک اللہ ساتھ ہے نیکی والوں کے ۲

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں تمام تر وہ مضامین ہیں جن سے مسلمانوں پر مشقت وآزمائش کا واقع ہونا سمجھ میں آتا ہے، چنانچہ سورت کی ابتدا میں قصوں کے ضمن انہی آزمائشوں کا بیان تھا، اور سورت کے آخر کے قریب ہجرت کا مضمون ہے اس میں بھی مشقت وآزمائش ظاہر ہے، اور درمیان میں توحید ورسالت کے جو مضامین ہیں ان میں گفتگو کرنے سے اکثر اہل دین کو مخالفین کی طرف سے مشقت وآزمائش پیش آتی ہے، غرض یہ کہ اس سورت کے تمام تر مضامین مشقت وآزمائش کے متعلق ہیں، اس لیے اب خاتمہ میں دین کے لیے مشقت برداشت کرنے والوں کو بشارت عظمی

دے کر سورت کو ختم فرماتے ہیں، جیسا کہ سورت کے شروع میں بھی آیت: ومن جاھد فانما یجاھد لنفسه میں دوسرے عنوان سے یہ مضمون تھا۔ (پیچھے تو ان لوگوں کا حال تھا جو کفر کرنے والے اور نفس کی خواہش پر چلنے والے ہیں) اور (اب ان کے مقابلوں کا بیان ہے کہ) جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (قرب وثواب یعنی جنت) کے راستے ضرور دکھا دیں گے (جن سے وہ جنت میں جا پہنچیں گے کقولہ تعالیٰ: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا) اور بیشک اللہ تعالیٰ (کی رضا ورحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا: اس میں دلالت ہے کہ مجاہدہ مفتاح مشاہدہ ہے، یعنی ہر عمل میں نور الٰہی کا نظارہ کرنا ہو تو مجاہدہ شرط ہے، یعنی مشقت برداشت کرنی پڑے گی، اور سبل یعنی ''راستے'' یہاں جمع کا صیغہ اس لیے کہا کہ جنت میں جانے والے بہت سے ہوں گے تو ایک راستہ کے بہت سے حصے ہو جائیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو لوگ اللہ کے واسطے محنت اٹھاتے اور سختیاں جھیلتے ہیں اور طرح طرح کے مجاہدات میں سرگرم رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ایک خاص نور بصیرت عطا فرماتا اور اپنے قرب ورضا یا جنت کی راہیں سجھاتا ہے، جوں جوں وہ ریاضات ومجاہدات میں ترقی کرتے ہیں، اسی قدر ان کی معرفت وانکشاف کا درجہ بلند ہوتا جاتا ہے اور وہ باتیں سوجھنے لگتی ہیں کہ دوسروں کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کی حمایت ونصرت نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایاتها ٦٠ ۞ ٣٠ سُوْرَةُ الرُّوْمِ مَكِّيَّةٌ ٨٤ ۞ ركوعاتها ٦

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں یہ مضامین ہیں: ① اول بعض ایسے واقعات کی پیشین گوئی ہے جو اہل اسلام کے لیے خوشی کا باعث تھے جن میں نبوت پر بھی دلالت ہے اور گذشتہ سورت میں کفار کے تکلیف پہنچانے سے جو مسلمانوں کے رنج کا بیان تھا جس پر انہیں صبر تحمل اور مجاہدہ کی تعلیم دی گئی تھی اس خوش خبری سے وہ رنج بھی دور کر دیا اور اس سے دونوں سورتوں میں مناسبت بھی ظاہر ہو گئی ② کفار کی سرکشی اور عناد کا بیان اور ان کے کفر وتکذیب پر ملامت وتوبیخ اور اس کی تائید کے لیے بعض سابقہ جھٹلانے والوں کے برے انجام کا اجمالی بیان ③ آخرت کا اثبات اور اس کے سخت ہولناک احوال کا بیان ④ توحید کا اثبات اور اس کے دلائل ⑤ عقیدہ توحید سے متعلق بعض اہم فروعی امور کا بیان اور پھر ان مضامین سے کفار کے متاثر نہ ہونے پر خاتمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔

سورت کے شروع میں جس قصہ کے متعلق پیشین گوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار روم اور فارس میں لڑائی ہوئی اور رومی مغلوب ہو گئے، مشرکین مکہ مسلمانوں سے کہنے لگے کہ تم اور رومی کتاب والے ہو، ہم اور فارس کتاب والے نہیں، پس فارس کا روم پر غالب آنا اس بات کی فال ہے کہ ہم بھی تم پر غالب رہیں گے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں جس میں پیشین گوئی ہے کہ نو سال کے اندر رومی فارس پر غالب آ جائیں گے، چنانچہ اس سے ساتویں برس پھر دونوں کا مقابلہ ہوا، رومی غالب آ گئے، اتفاق سے اسی زمانہ میں یہاں مسلمان بدر میں مشرکین پر غالب آئے تھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓمّٓ ۞۱ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۞۲ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۞۳

الف لام میم، مغلوب ہو گئے ہیں رومی، ملتے ہوئے ملک میں ۱ اور وہ اس مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے

فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۴

چند برسوں میں ۲؎ اللہ کے ہاتھ ہیں سب کام پہلے اور پچھلے ۳؎ اور اس دن خوش ہوں گے مسلمان ۴؎

بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۵

اللہ کی مدد سے، مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے، اور وہی ہے زبردست رحم والا ۵؎

خلاصہ تفسیر: الٓمّٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) اہل روم ایک قریب کے موقع میں (یعنی زمین روم کے ایسے مقام میں جو بہ نسبت فارس کے عرب سے زیادہ قریب ہے، مراد اس سے اذرعات و بصری ہے، جو ملک شام میں دو شہر ہیں، اور حکومت روم کے تحت ہونے سے زمین روم میں داخل ہیں، اس موقع پر اہل روم اہل فارس کے مقابلہ میں) مغلوب ہوگئے (جس سے مشرکین خوش ہوئے) اور وہ (رومی) اپنے (اس) مغلوب ہونے کے بعد عنقریب (اہل فارس پر دوسرے مقابلہ میں) تین سال سے لے کر نو سال کے اندر اندر غالب آجائیں گے (اور یہ مغلوب اور غالب ہونا سب خدا کی طرف سے ہے، کیونکہ مغلوب ہونے سے) پہلے بھی اختیار اللہ ہی کو تھا (جس سے مغلوب کردیا تھا) اور (مغلوب ہونے سے) پیچھے بھی (اللہ ہی کو اختیار ہے جس سے غالب کردے گا) اور اس روز (یعنی جب اہل روم غالب آئیں گے) مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس امداد پر خوش ہوں گے (اور مسلمانوں کی ظاہری کمزوری کو دیکھ کر یہ بات بعید نہ سمجھی جائے کہ یہ کمزور مسلمان مقابلہ کے وقت کفار پر کیسے غالب آجائیں گے، کیونکہ نصرت اللہ کے قبضے میں ہے) وہ جس کو چاہے غالب کردیتا ہے، اور وہ زبردست ہے (وہ جب چاہے کفار کو لڑائی میں یا اس پیشین گوئی کے جھٹلانے میں مغلوب کرسکتا ہے، اور) رحیم (بھی) ہے (جب چاہے مسلمانوں کو غالب کردے)۔

بِنَصْرِ اللّٰهِ: ''امداد'' سے یا تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے قول میں سچا اور غالب فرمادے گا، کیونکہ مسلمانوں نے اس پیشین گوئی کو بطور دعویٰ کفار پر ظاہر کیا تھا تو انہوں نے جھٹلایا چنانچہ ترمذی میں مذکور ہے، تو اس کے واقع ہونے سے مسلمانوں کی جیت ہوجائے گی، یا یہ مراد ہے کہ مسلمانوں کو قتال ولڑائی میں بھی غالب کردے گا، چناچہ وہی وقت جنگ بدر میں مسلمانوں کے غالب اور فتحیاب ہونے کا تھا، غرض ہر حالت میں مسلمانوں ہی کی مدد اور ان کو خوشی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ: (ملتے ہوئے ملک یا پاس والے ملک) سے مراد: ① ''اذرعات'' و ''بصری'' کے درمیان کا خطہ ہے جو شام کی سرحد پر حجاز سے ملتا ہوا مکہ کے قریب واقع ہوا ہے ② یا فلسطین مراد ہو جو رومیوں کے ملک سے نزدیک تھا ③ یا جزیرہ ابن عمر جو فارس سے اقرب ہے، ابن حجر نے پہلے قول کی تصحیح کی ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ: یعنی نو ۹ سال کے اندر اندر رومی غالب ہوجائیں گے، کیونکہ لغت میں اور حدیث میں بضع کا اطلاق تین سے نو تک ہوا ہے، ان آیات میں قرآن نے ایک عجیب وغریب پیشنگوئی کی جو اس کی صداقت کی عظیم الشان دلیل ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی بڑی بھاری دو سلطنتیں ''فارس'' (جسے ایران کہتے ہیں) اور روم مدت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آتی تھیں، ۶۰۲ء سے لے کر ۶۱۴ء کے بعد تک ان کی حریفانہ نبرد آزمائیوں کا سلسلہ جاری رہا کیا، جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی تصریحات سے ظاہر ہے، ۵۷۰ء میں نبی کریم ﷺ کی ولادت شریفہ اور چالیس سال بعد ۶۱۰ء میں آپ کی بعثت ہوئی، مکہ والوں میں جنگ روم وفارس کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں، اسی دوران میں نبی کریم ﷺ کے دعویٰ نبوت اور اسلامی تحریک نے ان لوگوں کے لئے ان جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کردی، فارس کے آتش پرست مجوس کو مشرکین مکہ مذہبا اپنے سے نزدیک سمجھتے تھے، اور روم کے نصاریٰ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے بھائی یا کم از کم ان کے قریبی دوست قرار دیے جاتے تھے، جب فارس کے غلبہ

کی خبر آتی مشرکین مکہ مسرور ہوتے اور اس سے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے غلبہ کی فال لیتے اور خوش آئندہ توقعات باندھتے تھے، مسلمانوں کو بھی طبعاً صدمہ ہوتا کہ عیسائی اہل کتاب آتش پرست مجوسیوں سے مغلوب ہوں، ادھران کو مشرکین مکہ کی شماتت کا ہدف بننا پڑے، آخر ۶۱۴ء کے بعد (جبکہ ولادت نبوی کو قمری حساب سے تقریباً پینتالیس سال اور بعثت کے پانچ سال گزر چکے) خسرو پرویز (کیخسر وثانی) کے عہد میں فارس نے روم کو ایک مہلک اور فیصلہ کن شکست دی، شام، مصر، ایشیائے کوچک وغیرہ سب ممالک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گئے، ہرقل قیصر روم کو ایرانی لشکر نے قسطنطنیہ میں پناہ گزین ہونے پر مجبور کردیا اور رومیوں کا دارالسلطنت بھی خطرہ میں پڑ گیا، بڑے بڑے پادری قتل یا قید ہوگئے، بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایرانی فاتحین لے اڑے، قیصر روم کا اقتدار بالکل فنا ہوگیا، بظاہر اسباب کوئی صورت روم کے ابھرنے اور فارس کے تسلط سے نکلنے کی باقی نہ رہی، یہ حالات دیکھ کر مشرکین مکہ نے خوب بغلیں بجائیں، مسلمانوں کو چھیڑنا شروع کیا، بڑے بڑے حوصلے اور توقعات قائم کرنے لگے، حتیٰ کہ بعض مشرکین نے ابوبکر صدیقؓ سے کہا کہ آج ہمارے بھائی ایرانیوں نے تمہارے بھائی رومیوں کو مٹادیا ہے، کل ہم بھی تمہیں اسی طرح مٹاڈالیں گے۔

اس وقت قرآن نے سلسلہ اسباب ظاہری کے بالکل خلاف عام اعلان کردیا کہ بیشک اس وقت رومی فارس سے مغلوب ہوگئے ہیں، لیکن نو سال کے اندر اندر وہ پھر غالب ومنصور ہوں گے، اس پیشین گوئی کی بناء پر حضرت ابوبکر صدیق نے بعض مشرکین سے شرط باندھ لی (اس وقت تک ایسی شرط لگانا حرام نہ ہوا تھا) کہ اگر اتنے سال تک رومی غالب نہ ہوئے تو میں سو اونٹ تم کو دوں گا، ورنہ اسی قدر اونٹ تم مجھ کو دوگے، شروع میں حضرت ابوبکر صدیق نے اپنی رائے سے بضع سنین کی میعاد کچھ کم رکھی تھی، بعدہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے بضع کے لغوی مدلول یعنی نوسال پر معاہدہ ٹھہرا، ادھر ہرقل قیصر روم نے اپنے زائل شدہ اقتدار کو واپس لینے کا تہیہ کرلیا اور منت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو فارس پر فتح دی تو ''حمص'' سے پیدل چل کر ''ایلیا'' (بیت المقدس) تک پہنچوں گا، قدرت دیکھو کہ قرآنی پیشنگوئی کے مطابق نوسال کے اندر یعنی ہجرت کا ایک سال گزرنے پر عین بدر کے دن جبکہ مسلمان اللہ کے فضل سے مشرکین پر نمایاں فتح ونصرت حاصل ہونے کی خوشیاں منارہے تھے، یہ خبر سن کر اور زیادہ مسرور ہوگئے کہ رومی اہل کتاب کو خدا تعالیٰ نے ایرانی مجوسیوں پر غالب فرمایا، اس ضمن میں مشرکین مکہ کو مزید خذلان وخسران نصیب ہوا، قرآن کی اس عظیم الشان اور محیر العقول پیشینگوئی کی صداقت کا مشاہدہ کر کے بہت لوگوں نے اسلام قبول کیا اور حضرت ابوبکر نے سو اونٹ مشرکین مکہ سے وصول کئے جن کے متعلق حضور ﷺ نے حکم دیا کہ صدقہ کردیے جائیں، فللہ الحمد علیٰ نعمآئہ الظاہرۃ وألائہ الباہرۃ۔

فائدہ: ۳۔ **لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ**: پہلے فارس کو غالب کرنا، روم کو مغلوب کرنا، اور پیچھے حالات کو الٹ دینا، سب اللہ کے قبضہ میں ہے، صرف اتنی بات سے کسی قوم کے مقبول ومردود ہونے کا فیصلہ نہیں ہوسکتا: **وتلك الايام نداولها بين الناس**

فائدہ: ۴۔ **وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ**: یعنی ایک تو اس دن اپنی فتح کی خوشی اس پر مزید خوشی یہ ہوئی کہ رومی اہل کتاب (جو نسبۃً مسلمانوں سے اقرب تھے) فارس کے مجوسیوں پر غالب آئے، قرآن کی پیشین گوئی کے صدق کا لوگوں نے مشاہدہ کرلیا، کفار مکہ کو ہر طرح ذلت نصیب ہوئی۔

فائدہ: ۵۔ **وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ**: یعنی جسے مغلوب کرنا چاہے تو کوئی زبردستی کرکے روک نہ سکے اور جس پر مہربانی فرمانا چاہے اسے بے روک ٹوک غالب کرکے رہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶

اللہ کا وعدہ ہو چکا، خلاف نہ کرے گا اللہ اپنا وعدہ لیکن بہت لوگ نہیں جانتے

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے (اور) اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں فرماتا (اس واسطے یہ پیشین گوئی ضرور واقع ہوگی) ولیکن اکثر لوگ (اللہ تعالیٰ کے تصرفات کو) نہیں جانتے (بلکہ صرف ظاہری اسباب کو دیکھ کر ان اسباب پر حکم لگادیتے ہیں، اس لئے اس

پیشین گوئی کے پورا ہونے کو دشوار سمجھتے ہیں)۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: حالانکہ حق تعالی اسباب کا مالک ہے، اس کو ان اسباب کا بدلنا بھی آسان ہے، اور اسباب کے خلاف واقع کرنا بھی آسان ہے، اور جس طرح پیشین گوئی کے واقع ہونے سے پہلے ظاہری اسباب نہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرتے ہیں اسی طرح پیشین گوئی کو پورا ہوتا ہوا دیکھ کر بھی اس کو ایک اتفاقی واقعہ قرار دیتے ہیں، وعدہ الٰہیہ کا ظہور نہیں سمجھتے، یعنی پیشین گوئی سچی ہونے کے بعد پیشگی خبر دینے والے کی نبوت پر استدلال نہیں کرتے اور یہ نہیں مانتے کہ خدا وعدہ سچا ہو گیا، اس لئے لفظ لَا يَعْلَمُوْنَ میں یہ دونوں چیزیں آ گئیں۔

* * *

فائدہ: یعنی اکثر لوگ نہیں سمجھتے کہ غالب یا مغلوب کرنے میں اللہ تعالیٰ کی کیا کیا حکمتیں ہیں اور یہ قدرت جب کوئی کام کرنا چاہے تو سب ظاہری رکاوٹیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں، اسی لئے اکثر ظاہر بیں بغیر اسباب ظاہری خدا پر بھروسہ نہیں رکھتے اور کسی کا عارضی غلبہ دیکھ کر سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ہی اللہ کے ہاں مقبول ہو گا۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝٧

جانتے ہیں اوپر اوپر دنیا کے جینے کو، اور وہ لوگ آخرت کی خبر نہیں رکھتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے پیشین گوئی کے ساتھ کفار کی جہالت کا بیان تھا کہ وہ اس سے نبوت پر استدلال نہیں کرتے، اب آخرت کے بارے میں ان کی جہالت بیان فرماتے ہیں اور اس کا سبب بھی بتلاتے ہیں جو کہ دنیا میں منہمک ہونا ہے۔

(ان لوگوں کا اللہ تعالیٰ اور نبوت سے غافل و جاہل رہنا اس سبب سے ہے کہ) یہ لوگ صرف دنیوی زندگانی کی ظاہر (حالت) کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے (بالکل ہی) بے خبر ہیں (کہ وہاں کیا ہوگا، اس لئے نہ ان کو دنیا میں کفر وغیرہ سے اندیشہ ہے جو عذاب کا سبب ہے، اور نہ ایمان و عمل صالح کی فکر ہے جو کہ نجات کا ذریعہ ہے)۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: اس میں اس شخص کی جہالت کا اظہار ہے جو اپنی نگاہ صرف دنیا کے مال و متاع اور دنیا کی لذت اور رنگینی تک محدود رکھتا ہے اور آخرت سے جو کہ مقصود ہے غافل رہتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ لوگ دنیاوی زندگی کی ظاہری سطح کو جانتے ہیں، یہاں کی آسائش و آرائش، کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا، بونا جوتنا، پیسہ کمانا، مزے اڑانا بس یہ ہی ان کے علم و تحقیق کی انتہائی جولان گاہ ہے، اس کی خبر ہی نہیں کہ اس زندگی کی تہ میں ایک دوسری زندگی کا راز چھپا ہوا ہے جہاں پہنچ کر اس دنیاوی زندگی کے بھلے برے نتائج سامنے آئیں گے، ضروری نہیں کہ جو شخص یہاں خوشحال نظر آتا ہے وہاں بھی خوشحال رہے، بھلا آخرت کا معاملہ تو دور ہے، یہیں دیکھ لو کہ ایک شخص یا ایک قوم کبھی دنیا میں عروج حاصل کر لیتی ہے لیکن اس کا آخری انجام ذلت و ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ

کیا دھیان نہیں کرتے اپنے جی میں کہ اللہ نے جو بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے سو ٹھیک سادھ کر

وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝٨

اور وعدہ مقرر پر، اور بہت لوگ اپنے رب کا ملنا نہیں مانتے۔

خلاصہ تفسیر: کیا (قیامت آنے کے دلائل سن کر بھی ان کی نظر دنیا ہی پر رہی اور) انہوں نے اپنے دلوں میں یہ غور نہیں کیا کہ

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کسی حکمت ہی سے اور ایک میعاد معین (تک) کے لئے پیدا کیا ہے (جیسا کہ اس نے قرآن میں خبر دی ہے کہ ان حکمتوں میں سے ایک حکمت جزاء وسزا کا ہونا بھی ہے، اور یہ میعاد معین قیامت ہے، اگر اپنے دلوں میں غور کرتے تو ان واقعات کا ممکن ہونا عقل سے، اور ان کا واقع ہونا نقل یعنی قرآن سے، اور اس نقل یعنی قرآن کا سچا ہونا اس کے اعجاز سے منکشف ہو جاتا، لہٰذا آخرت کے منکر نہ ہوتے، مگر غور کرنے سے ہی انکار کر رہے ہیں) اور (یہی کیا اور) بہت سے آدمی اپنے رب کے ملنے کے منکر ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی عالم کا اتنا زبردست نظام اللہ تعالیٰ نے بیکار پیدا نہیں کیا، کچھ اس سے مقصود ضرور ہے وہ آخرت میں نظر آئے گا، ہاں یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہتا تو ایک بات تھی، لیکن اس کے تغیرات واحوال میں غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ اس کی کوئی حد اور انتہا ضرور ہے، لہٰذا ایک وعدہ مقررہ پر یہ عالم فنا ہوگا اور دوسرا عالم اس کے نتیجہ کے طور پر قائم کیا جائے گا۔

فائدہ: ۲؎ وہ سمجھتے ہیں کہ کبھی خدا کے سامنے جانا ہی نہیں جو حساب وکتاب دینا پڑے۔

اَوَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ‌ؕ

کیا انہوں نے سیر نہیں کی ملک کی جو دیکھیں انجام کیسا ہوا ان سے پہلوں کا

كَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَعَمَرُوۡهَاۤ اَكۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡهَا وَجَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ

ان سے زیادہ تھے زور میں اور جوتا انہوں نے زمین کو اور بسایا اس کو ان کے بسانے سے زیادہ اور پہنچے ان کے پاس رسول ان کے

بِالۡبَيِّنٰتِ‌ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظۡلِمَهُمۡ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَؕ ۝۹

لے کر کھلے حکم ۱؎ سو اللہ نہ تھا ان پر ظلم کرنے والا لیکن وہ اپنا آپ برا کرتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: کیا یہ لوگ (کبھی گھر سے نہیں نکلے اور) زمین میں چلے پھرے نہیں، جس میں دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کا (آخری) انجام کیا ہوا (کیفیت ان کی یہ تھی کہ) وہ ان سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے اور انہوں نے زمین کو بھی (ان سے زیادہ) بویا تھا اور جتنا انہوں نے (سامان اور مکان سے) اس کو آباد کر رکھا ہے اس سے زیادہ انہوں نے اس کو آباد کیا تھا اور ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے لے کر آئے تھے (جن کو انہوں نے نہیں مانا اور عذاب سے ہلاک ہوئے جن کی ہلاکت کے نشان ان کے ویران مکانات سے جو شام کے رستہ میں ملتے ہیں ظاہر ہو رہے ہیں) سو (اس ہلاکت میں) اللہ تعالیٰ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا وہ تو خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے (کہ پیغمبروں کا انکار کر کے ہلاکت کے مستحق ہوئے، یہ تو ان کی حالت دنیا میں ہوئی)۔

اَوَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا: اس میں اہل اللہ کی اس عادت کی اصل ہے کہ وہ دینی مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بڑی بڑی طاقتور قومیں (عاد وثمود) جنہوں نے زمین کو بو، جوت کر لالہ وگلزار بنایا، اسے کھود کر چشمے اور کانیں نکالیں، ان منکرین سے بڑھ کر تمدن کو ترقی دی، لمبی عمریں پائیں اور زمین کو ان سے زیادہ آباد کیا، وہ آج کہاں ہیں؟ جب اللہ کے پیغمبر کھلے نشان اور احکام لے کر آئے اور انہوں نے تکذیب کی تو کیا نہیں سنا کہ انجام کیا ہوا، کس طرح تباہ و برباد کئے گئے، ان کے ویران کھنڈر آج بھی ملک میں چل پھر کر دیکھ سکتے ہیں، کیا ان میں ان بے فکروں کے لئے کوئی عبرت نہیں۔

فائدہ: ؎ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توظلم کا امکان نہیں، ہاں یہ لوگ خود اپنے ہاتھوں اپنی جڑ پر کلہاڑی مارتے ہیں اور وہ کام کرتے ہیں، جن کا نتیجہ بربادی ہو تو یہ اپنی جان پر ظلم کرنا ہوا، ورنہ اللہ تعالیٰ کے عدل و رحم کی کیفیت تو یہ ہے کہ بے رسول بھیجے اور بدون پوری طرح ہوشیار کئے کسی کو پکڑتا بھی نہیں۔

ع ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑩

پھر ہوا انجام برا کرنے والوں کا برا اس واسطے کہ جھٹلاتے تھے اللہ کی باتیں اور ان پر ٹھٹھے کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: (اور) پھر (آخرت میں) ایسے لوگوں کا انجام جنہوں نے (ایسا) برا کام (یعنی پیغمبروں کا انکار) کیا تھا برا ہی ہوا (محض) اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو (یعنی احکام و واقعات کو) جھٹلایا تھا اور (تکذیب سے بڑھ کر یہ کہ) ان کی ہنسی اڑاتے تھے (اور وہ برا انجام دوزخ کی سزا ہے)۔

* * *

فائدہ: وہ نتیجہ تو دنیا میں دیکھا تھا پھر آخرت میں تکذیب و استہزاء کی جو سزا ہے وہ الگ رہی، موجودہ اقوام کو چاہیے کہ گذشتہ قوموں کے احوال سے عبرت پکڑیں کیونکہ ایک قوم کو جن باتوں پر سزا ملی سب کو وہی سزا مل سکتی ہے، سب کی فنا بھی ایک کی فنا سے سمجھو اور سب کی سزا بھی ایک کی سزا سے۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ⑪ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ

اللہ بناتا ہے پہلی بار پھر اس کو دہرائے گا پھر اسی کی طرف پھر جاؤ گے، اور جس دن برپا ہوگی قیامت آس توڑ کر رہ جائیں گے

الْمُجْرِمُوْنَ ⑫ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ⑬

گنہگار، اور نہ ہوں گے ان کے شریکوں میں کوئی ان کے سفارش کرنے والے اور وہ ہوجائے گا اپنے شریکوں سے منکر ؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے آخرت سے انکار پر دھمکی تھی، اب آخرت کا واقع ہونا بتاتے ہیں اور ساتھ ہی کفر و انکار اور تصدیق و ایمان کا انجام بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ خلق کو اول بار بھی پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ بھی اس کو پیدا کرے گا، پھر (پیدا ہونے کے بعد) اس کے پاس (حساب کتاب کے لئے) لائے جاؤ گے، اور جس روز قیامت قائم ہوگی (جس میں مذکورہ اعادہ ہونے والا ہے) اس روز مجرم (یعنی کافر) لوگ (باز پرس کے وقت) حیرت زدہ رہ جائیں گے (یعنی ان سے کوئی معقول بات نہ بن پڑے گی) اور ان کے (تراشے ہوئے) شریکوں میں سے (جن کو عبادت میں شریک کرتے تھے) ان کا کوئی سفارشی نہ ہوگا اور (اس وقت خود) یہ لوگ (بھی) اپنے شریکوں میں سے منکر ہوجائیں گے (یوں کہیں گے کہ: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ)۔

* * *

فائدہ: ؎ یعنی جن کو اللہ کا شریک بناتے تھے جب وقت پر کام نہ آئیں گے تو منکر ہو کر کہنے لگیں گے کہ: واللہ ربنا ما کنا مشرکین (خدا کی قسم ہم مشرک نہ تھے)۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ⑭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ

اور جس دن قائم ہوگی قیامت اس دن لوگ ہوں گے قسم قسم ؎ سو جو لوگ یقین لائے اور کئے بھلے کام سو

فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ⑮ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ

باغ میں ہوں گے ان کی آؤ بھگت ہوگی ۲ اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری باتیں اور ملنا پچھلے گھر کا سو وہ

فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ⑯

عذاب میں پکڑے آئیں گے

خلاصہ تفسیر: اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز (مذکورہ واقعہ کے علاوہ ایک واقعہ یہ بھی ہوگا کہ مختلف طریقوں کے) سب آدمی جدا جدا ہو جائیں گے، یعنی جو لوگ ایمان لائے تھے اور انہوں نے اچھے کام کئے تھے وہ تو (جنت کے) باغ میں مسرور ہوں گے، اور جن لوگوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں کو اور آخرت کے پیش آنے کو جھٹلایا تھا وہ لوگ عذاب میں گرفتار ہوں گے (یہ معنی ہیں جدا جدا ہونے کے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نیک و بد ہر قسم کے لوگ الگ کر دیئے جائیں گے، اور علیحدہ علیحدہ اپنے ٹھکانہ پر پہنچا دیے جائیں گے، جس کی تفصیل اگلی آیت میں ہے:

فائدہ: ۲ یعنی انعام و اکرام سے نوازے جائیں گے اور ہر قسم کی لذت و سرور سے بہرہ اندوز ہوں گے، یہ نیکوں کا ٹھکانہ ہوا، آگے بدوں کی جگہ بتلائی ہے، مطلب یہ ہے، کہ دونوں میں ایسی تفریق اور جدائی کر دی جائے گی جس سے بڑھ کر کوئی جدائی نہیں ہوسکتی۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ⑰ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا

سو پاک اللہ کی یاد کرو جب شام کرو اور جب صبح کرو، اور اسی کی خوبی ہے آسمان میں اور زمین میں اور پچھلے وقت

وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ⑱

اور جب دوپہر ہو ۱

خلاصہ تفسیر: پیچھے ایمان اور نیک اعمال کی فضیلت یعنی اس پر جنت ملنے کا ذکر تھا، اب ایک خاص عنوان سے ایمان اور نیک اعمال کی ترغیب ہے، کیونکہ تسبیح اور تحمید جن کا آگے ذکر ہے عبادت کی تمام اقسام کو جامع اور شامل ہے جن میں ایک بڑی چیز نماز ہے جس سے ان اوقات کو خاص تعلق اور مناسبت ہے جن کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

(جب ایمان و عمل صالح کی فضیلت تم کو معلوم ہوگئی) سو تم اللہ کی تسبیح (دل سے اور اعتقاد سے بھی تسبیح کرو جس میں ایمان داخل ہوگیا، اور زبان سے اور قول سے بھی جس میں ایمان کا اقرار اور تمام اذکار آگئے، اور ظاہری اعضاء اور عمل سے بھی جس میں عام طور پر سب عبادتیں اور خصوصاً نماز داخل ہوگئی، غرض تم اللہ کی تسبیح ہر وقت کیا کرو، اور خصوصاً) شام کے وقت اور صبح کے وقت، اور (اللہ کی تسبیح کرنے کا جو حکم ہوا ہے تو وہ واقع میں اس کا مستحق بھی ہے، کیونکہ) تمام آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہے (یعنی آسمان میں تو سب فرشتے اس کی حمد کرتے ہیں، اور زمین میں بعض انسان تو اپنے اختیار سے کرتے ہیں اور جو نہیں کرتے تو ان کی عاجزی اور احتیاج کی حالت سے خدا کی حمد ظاہر ہوتی ہے، کقولہ تعالیٰ: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ پس جب وہ ذات و صفات میں ایسا کامل ہے تو تم کو بھی ضرور اس کی تسبیح کرنی چاہیے) اور بعد زوال (بھی تسبیح کیا کرو) اور ظہر کے وقت (بھی تسبیح کیا کرو)۔

کیونکہ ان اوقات میں نئی نعمت حاصل ہوتی ہے اور قدرت کے آثار زیادہ ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے ان میں مستقل طور پر تسبیح و تحمید کرنا

مناسب ہے، اس لیے بالخصوص نماز کے لیے بھی یہ اوقات مقرر ہیں، چنانچہ مسا یعنی شام کے وقت میں مغرب وعشاء داخل ہے، اور عشی یعنی بعد زوال میں ظہر وعصر دونوں داخل تھیں مگر ظہر کا ذکر صراحۃ ہو گیا اس لیے بعد زوال سے صرف عصر مراد رہ گئی اور صبح کا ذکر بھی صراحۃ ہوا ہے۔

حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ: پیچھے مؤمنین اور کافرین کا حال بیان فرمایا ہے، پھر اس پر نتیجے کے طور پر تسبیحات کا حکم دیا، یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی صفات جمال یعنی بندوں کو انعام واکرام سے نوازنے کے اعتبار سے تعریف کا اہل ہے اسی طرح اپنی صفات جلال یعنی قہاریت والی صفات کے اعتبار سے بھی تعریف کا اہل ہے۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی جنت چاہتے ہو تو اللہ پاک کی یاد کرو جو دل، زبان اور اعضاء وجوارح سب سے ہوتی ہے، نماز میں تینوں قسم کی یاد جمع کردی گئی، اور اوقات فرض نماز کے یہ ہی ہیں جو آیت میں بیان ہو گے، یعنی صبح، شام، (جس میں مغرب وعشاء شامل ہیں) دن کے پچھلے وقت (عصر) اور دوپہر ڈھلنے کے بعد (ظہر) کی نمازیں ہیں ان اوقات میں حق تعالیٰ کی رحمت یا قدرت وعظمت کے آثار بہت زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔

''آفتاب'' عالم اجسام میں سب سے بڑا روشن کرہ ہے جس کے بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض وتاثیر سے عالم اسباب میں شاید ہی کوئی مادی مخلوق مستثنیٰ ہو (جیسا کہ ''ارض النجوم'' کے مصنف نے بہت شرح وبسط سے اس کو ثابت کیا ہے) اسی بناء پر سیارہ پرستوں نے اسے اپنا معبود اکبر قرار دیا تھا جس کی طرف حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قول: هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ میں اشارہ ہے، اس کے عجز وبیچارگی اور آفتاب پرستوں کی اس کے فیض سے محرومی کا کھلا ہوا مظاہرہ بھی ان ہی پانچ اوقات میں ہوتا ہے، صبح کو جب تک طلوع نہیں ہوا اور دوپہر ڈھلنے پر جبکہ اس کے عرض میں کمی آنی شروع ہوئی اور عصر کے وقت جبکہ اس کی حرارت اور روشنی میں نمایاں طور پر ضعف آ گیا اور غروب کے بعد جب اس کی نورانی شعاعوں کے اتصال سے اس کے پجاری محروم ہو گئے، پھر عشاء کے وقت جب شفق بھی غائب ہو گئی اور روشنی کے ادنیٰ ترین آثار بھی افق پر باقی نہ رہے، ان اوقات میں موحدین کو حکم ہوا کہ خدائے اکبر کی عبادت کریں، اور شروع صلوٰۃ ہی میں اللہ اکبر کہہ کر اس موحد اعظم (ابراہیم خلیل اللہ) کی اقتداء کرتے رہیں، جس نے: هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ کے بعد فرمایا تھا: اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام: رکوع ۹)

شاید آیت ہذا میں: وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فرما کر یہ ہی یاد دلایا ہے کہ تسبیح وتنزیہ اور یاد کرنے کے لائق وہی ذات ہو سکتی ہے جس کی خوبی آسمان وزمین کی کل کائنات زبان حال وقال سے بیان کر رہی ہے کوئی مجبور وعاجز مخلوق اس کا استحقاق نہیں رکھتی خواہ وہ دیکھنے میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، آگے اسی خدائے اکبر کی بعض شؤون عظیمہ اور صفات کاملہ کا بیان ہے تاکہ معبودیت کا استحقاق اور زیادہ واضح ہو جائے اسی ضمن میں بعث بعد الموت کے مسئلہ پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط

نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے

وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ ع ۲ ۵

اور اسی طرح تم نکالے جاؤ گے

خلاصہ تفسیر: اوپر تسبیح وتحمید کے ذکر سے پہلے آخرت کا ذکر تھا، چونکہ کفار مشرکین قیامت کے امکان ہی کا انکار کرتے تھے اس لیے آگے دلائل قدرت کا بیان کر کے قیامت کا ممکن ہونا اور بالیقین واقع ہونا ثابت کرتے ہیں، دلیل کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کا واقع ہونا فی نفسہ ممکن بات ہے، کیونکہ اس کے محال ہونے کی کوئی دلیل نہیں، اور اگر یہ شبہ ہو کہ قیامت ممکن تو ہے مگر دشوار ہے، جواب یہ ہے کہ جو کام خدا کی قدرت سے رات دن ہوتے ہیں قیامت ان سے زیادہ دشوار تو نہیں، پھر خدا کی قدرت کے سامنے تمام ممکنات برابر ہیں خواہ وہ آسان ہوں یا دشوار، جب قیامت کا ممکن

ہونا ثابت ہوگیا اور دشواری کا شبہ بھی دور ہوگیا تو اب مخبر صادق یعنی قرآن اور رسول اس کے واقع ہونے کی خبر دیتے ہیں، پس قیامت یقیناً آئے گی۔

(اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے، کیونکہ اس کی ایسی قدرت ہے کہ) وہ جاندار کو بے جان سے باہر لاتا ہے اور بے جان کو جان دار سے باہر لاتا ہے (مثلاً نطفہ اور انڈہ سے انسان اور بچہ، اور انسان اور پرندہ سے نطفہ اور انڈہ) اور زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہونے کے بعد زندہ (یعنی تازہ وشاداب) کرتا ہے اور اسی طرح تم لوگ (قیامت کے روز) قبروں سے نکالے جاؤ گے۔

فائدہ: یعنی انسان کو نطفہ سے، نطفہ کو انسان سے، جانور کو بیضہ [انڈہ] سے اور بیضہ کو جانور سے، مومن کو کافر سے، کافر کو مومن سے پیدا کرتا ہے اور زمین جب خشک ہو کر مرجاتی ہے تو رحمت کے پانی سے پھر زندہ کر کے سرسبز وشاداب کر دیتا ہے، غرض موت وحیات حقیقی ہو یا مجازی، حسی ہو یا معنوی، سب کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہے، پھر تم کو زندہ کر کے قبروں سے نکال کھڑا کرنا اس کے نزدیک کیا مشکل ہوگا۔

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ ﴿۲۰﴾

اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ تم کو بنایا مٹی سے پھر اب تم انسان ہو زمین میں پھیلے پڑے

خلاصہ تفسیر: اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (بات) ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا (یا تو اس طرح کہ آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے جو اپنی تمام اولاد کے لیے اصل ہیں تو ان کے واسطہ سے گویا سب مٹی سے پیدا ہوئے، یا اس طرح کہ نطفہ غذا سے بنتا ہے اور غذا عناصر سے بنتی ہے جس میں غالب حصہ مٹی ہے) پھر تھوڑے ہی روز بعد (کیا ہوا کہ) تم آدمی بن کر (زمین پر) پھیلے ہوئے پھرتے (نظر آتے) ہو۔

فائدہ: یعنی آدم کو مٹی سے بنایا، پھر دیکھو قدرت نے اسے پھیلایا کہ ساری زمین پر اس کی ذریت چھا گئی اور زمین میں پھیل کر کیسی کیسی عجیب وغریب ہشیاریاں اس مٹی کے پتلے نے دکھلائیں۔

وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً

اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ بنا دیئے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار

وَّرَحۡمَۃً ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾

اور مہربانی، البتہ اس میں بہت پتے کی باتیں ہیں ان کے لئے جو دھیان کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (بات) ہے کہ اس نے تمہارے (فائدے کے) واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں (اور وہ فائدہ یہ ہے کہ) تا کہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس (مذکورہ بات) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں (کیونکہ استدلال کے لئے غور وفکر کی ضرورت ہے اور "نشانیاں" صیغہ جمع کے ساتھ اس لئے فرمایا کہ ان میں سے ہر چیز متعدد نشانیوں پر مشتمل ہے)۔

اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ بیوی کی طرف میلان والتفات ہونا حق تعالی کے احسانات میں سے ہے، کیونکہ یہ احسان کے موقع پر بیان کیا جارہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بیوی کی طرف میلان ہونا تقوی وکمال کے خلاف نہیں جیسا کہ بعض خشک حضرات سمجھتے ہیں۔

فائدہ: یعنی اول مٹی سے ایک آدم کو پیدا کیا پھر اسی کے اندر سے اس کا جوڑا نکالا تاکہ اس سے انس اور چین پکڑے اور پیدائشی طور پر دونوں صنفوں (مرد وعورت) کے درمیان خاص قسم کی محبت اور پیار رکھ دیا، تاکہ مقصود ازدواج حاصل ہو، چنانچہ دونوں کے میل جول سے نسل انسانی دنیا میں پھیل گئی، کما قال تعالیٰ: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً (النساء:۱)

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ط

اور اس کی نشانیوں سے ہے آسمان اور زمین کا بنانا اور طرح طرح کی بولیاں تمہاری اور رنگ

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾

اس میں بہت نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا بنانا ہے اور تمہارے لب ولہجہ اور رنگتوں کا الگ الگ ہونا ہے (لب ولہجہ کے اختلاف سے مراد یا تو زبانوں کا مختلف ہونا ہے، یا آواز وطرز گفتگو کا مختلف ہونا) اس (مذکورہ بات) میں (بھی) دانشمندوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں (یہاں بھی ''نشانیاں'' صیغہ جمع لانے کی وہی توجیہ ہوسکتی ہے جو گذشتہ آیت میں بیان ہوچکی)۔

* * *

فائدہ: سب انسان ایک ماں باپ سے بنائے، ملا کر بسائے، پھر تمام روئے زمین پر ان کو پھیلا دیا، سب کی جدا جدا بولیاں کردیں، ایک ملک کا آدمی دوسرے ملک میں جاکر زبان کے اعتبار سے محض اجنبی ہوگیا، پھر دیکھو شروع دنیا سے آج تک کتنے بیشمار آدمی پیدا ہوئے مگر کوئی دو آدمی ایسے نہ ملیں گے جن کا لب ولہجہ، تلفظ، طرز تکلم بالکل یکساں ہو، جس طرح ہر آدمی کی شکل وصورت اور رنگت وغیرہ دوسرے سے ممتاز ہے، آواز اور لب ولہجہ بھی بالکل الگ ہے کوئی دو شخص ایسے نہ ملیں گے جن کی آواز اور رنگ، روپ میں کوئی مابہ الامتیاز نہ ہو، ابتدائے عالم سے آج تک برابر نئی نئی صورتیں اور بولنے کے نئے نئے طور نکلتے چلے آتے ہیں، اس خزانہ میں کبھی ٹوٹا نہیں آیا، حقیقت میں یہ کتنا بڑا نشان حق تعالیٰ کی قدرت عظیمہ کا ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ط

اور اس کی نشانیوں سے ہے تمہارا سونا رات میں اور دن میں تلاش کرنا اس کے فضل سے لہ

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

اس میں بہت پتے ہیں ان کو جو سنتے ہیں ۲ۂ

خلاصہ تفسیر: اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں (اگرچہ رات کو زیادہ اور دن کو کم ہو) اور اسکی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے (روزی کی تلاش دن کو زیادہ ہوتی ہے اور رات کو کم، اسی لئے دوسری آیتوں میں روزی کی تلاش کو دن کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور سونے کو رات کے ساتھ) اس (مذکورہ بات) میں (بھی) ان لوگوں کیلئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو (دلیل کو توجہ سے) سنتے ہیں۔

مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ: اس سے معلوم ہوا کہ استراحت یعنی آرام کے لیے سونا اور اسباب معاش کے لیے روزی تلاش کرنا تقویٰ وکمال کے خلاف نہیں، البتہ اس میں انہماک (ڈوب جانا) اور اسے مقصد زندگی بنالینا ممنوع ہے۔

* * *

فائدہ: ؎۱ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ انسان کی دو حالتیں بدلی جاتی ہیں: ① سو یا تو بے خبر پتھر کی طرح اور ② روزی کی تلاش میں لگا تو ایسا ہوشیار کوئی نہیں، اصل تو رات ہے سونے کو اور دن تلاش کو، پھر دونوں وقت دونوں کام ہوتے ہیں۔

فائدہ: ؎۲ یعنی جو سن کر محفوظ رکھتے ہیں، کما فی تفسیر ابن کثیر، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "اپنے سونے کا احوال نظر نہیں آتا، سو لوگوں کی زبانی سنتے ہیں"، (موضح) یہ لفظ یسمعون اختیار کرنے کا نکتہ ہوا۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ

اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ دکھلاتا ہے تم کو بجلی ڈر اور امید کے لیے ؎۱ اور اتارتا ہے آسمان سے پانی پھر زندہ کرتا ہے اس سے زمین کو

بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾

مر گئے پیچھے، اس میں بہت پتے ہیں ان کے لیے جو سوچتے ہیں ؎۲

خلاصہ تفسیر: اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (بات) ہے کہ وہ تم کو (بارش کے وقت) بجلی (چمکتی ہوئی) دکھلاتا ہے جس سے (اس کے گرنے کا) ڈر بھی ہوتا ہے اور (اس سے بارش کی) امید بھی ہوتی ہے، اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہو جانے کے بعد زندہ (یعنی تروتازہ) کر دیتا ہے، اس (مذکورہ بات) میں (بھی) ان لوگوں کے لئے (قدرت کی) نشانیاں ہیں جو عقل (نافع) رکھتے ہیں۔

يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا: چونکہ خطاب اپنے عام ہونے کی وجہ سے کاملین کو بھی شامل ہے، چنانچہ اس عموم کی وجہ سے یہ اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ طبعی خوف اور طمع کمال کے خلاف نہیں۔

فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا: زمین کے زندہ کرنے کا ذکر اس جگہ مکرر شاید اس لیے ہو کہ یہاں قیامت میں مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر ہے اور یہ اس کا خاص نمونہ ہے۔

* * *

فائدہ: ؎۱ بجلی کی چمک دیکھ کر لوگ ڈرتے ہیں کہیں کسی پر گر نہ پڑے، یا بارش زیادہ نہ ہو جائے جس سے جان و مال تلف ہوں، اور امید بھی رکھتے ہیں کہ بارش ہو تو دنیا کا کام چلے، مسافر کبھی اندھیرے میں اس کی چمک کو غنیمت سمجھتا ہے کہ دور تک راستہ نظر آ جائے، اور کبھی خوف کھا کر گھبراتا ہے۔

فائدہ: ؎۲ یعنی اسی سے سمجھ لو کہ مرے پیچھے تمہارا پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ

اور اس کی نشانیوں سے یہ ہے کہ کھڑا ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے ؎۱ پھر جب پکارے گا تم کو ایک بار زمین میں سے

اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾

اسی وقت تم نکل پڑو گے ؎۲ اور اسی کا ہے جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں، سب اس کے حکم کے تابع ہیں ؎۳

خلاصہ تفسیر: اور اسی کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ (بات) ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم (یعنی ارادہ) سے قائم ہیں (آگے یہ بتلاتے ہیں کہ یہ تمام نظام عالم جو اوپر بیان ہوا یعنی انسانوں میں سلسلہ توالد وتناسل کا جاری ہونا، اور ان میں باہم میاں بیوی کا تعلق ہونا

اور آسمان وزمین کا اس خاص ہیئت پر موجود اور قائم ہونا، اور زبانوں اور رنگت میں اختلاف ہونا، اور دن رات کی تبدیلی میں خاص مصلحتوں کا ہونا، اور بارش کا نازل ہونا، اور اس کے ابتدائی آثار کا ظاہر ہونا یہ سب سلسلہ زمانہ کے باقی رہنے تک ہے اور ایک روز یہ سب کارخانہ ختم ہوجائے گا) پھر (اس وقت یہ ہوگا کہ) جب تم کو پکار کر زمین میں سے بلائے گا تو تم یکبارگی نکل پڑو گے (اور دوسرا انظام شروع ہوجائے گا جس کا بیان کرنا اس جگہ مقصود ہے) اور (پیچھے دلائل قدرت سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ) جتنے (فرشتے اور انسان وغیرہ) آسمان اور زمین میں موجود ہیں سب اسی کے (مملوک) ہیں (اور) سب اسی کے تابع (یعنی مسخر قدرت) ہیں۔

اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِہٖ: پیچھے خلق السموات والارض میں آسمان وزمین کی پیدائش کا ذکر تھا، یہاں ان کے باقی رہنے کا ذکر ہے، پس تکرار نہ رہا، مقصود یہ ہے کہ ان چیزوں کی پیدائش اور بقا سب خدا تعالیٰ کی قدرت اور ارادہ سے متعلق ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ پہلے آسمان وزمین کا پیدا کرنا مذکور ہوا تھا یہاں ان کے بقاء وقیام کو بتلایا کہ وہ بھی اسی کے حکم سے ہے مجال نہیں کہ کوئی اپنے مرکز ثقل سے ہٹ جائے، یا ایک دوسرے پر گر کر نظام کائنات کو درہم برہم کردے۔

فائدہ: ۲ یعنی زمین وآسمان جب تک اس کا حکم ہے قائم رہیں گے، پھر جس وقت دنیا کی میعاد پوری ہوجائیگی اللہ تعالیٰ کی ایک پکار پر تم سب قبروں سے نکلے چلے آؤ گے میدان حشر کی طرف۔

فائدہ: ۳ یعنی آسمان وزمین کے رہنے والے سب اسی کے مملوک بندے اور اسی کی رعیت ہیں، کس کی طاقت ہے کہ اس کے حکم تکوینی سے سرتابی کرسکے۔

وَهُوَ الَّذِىْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِى السَّمٰوٰتِ

اور وہ ہی ہے جو پہلی بار بناتا ہے پھر اس کو دہرائے گا اور وہ آسان ہے اس پر ۱ اور اس کی شان سب سے اوپر ہے آسمان

وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ ع ۸

اور زمین میں، اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اس خاص قدرت کاملہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ) وہی ہے جو اول بار پیدا کرتا ہے (چنانچہ یہ بات کفار کے نزدیک بھی مسلم ہے) پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا (جیسا کہ دلائل مذکورہ سے اس کا ممکن ہونا اور دشوار نہ ہونا معلوم ہوچکا ہے اور اس کے ساتھ جب یہ بات ملالی جائے کہ مخبر صادق کی خبر سے دوبارہ زندہ ہونا ثابت ہے) اور یہ (دوبارہ پیدا کرنا) اس کے نزدیک (یعنی ظاہری نظر میں انسان کے اعتبار سے دوبارہ پیدا کرنا پہلی بار پیدا کرنے سے) زیادہ آسان ہے (چنانچہ انسانی قدرت کے اعتبار سے غالب عادت یہی ہے کہ کسی چیز کا پہلی بار بنانے سے دوسری بار بنانا بہت آسان ہوتا ہے اور قدرت خداوندی کے سامنے دونوں یکساں ہیں) اور آسمان اور زمین میں اسی کی شان (سب سے) اعلیٰ ہے (یعنی نہ آسمانوں میں کوئی ایسا بڑا ہے اور نہ زمین میں، کقولہ: وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) اور وہ (بڑا) زبردست (یعنی قادر مطلق اور) حکمت والا ہے (چنانچہ مذکورہ بالا تصرفات سے اس کی قدرت اور حکمت دونوں ظاہر ہیں، پس وہ اپنی قدرت سے دوبارہ پیدا کردے گا اور اس میں جتنا توقف ہورہا ہے اس میں حکمت اور مصلحت ہے، پس قدرت اور حکمت کے ثابت ہوجانے کے بعد جلدی قیامت نہ آنے سے اس کا انکار کردینا جہالت ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قدرت الٰہی کے سامنے تو سب برابر ہیں لیکن تمہارے محسوسات کے اعتبار سے اول بار پیدا کرنے سے دوسری بار دوہرا

دینا آسان ہونا چاہیے پھر یہ عجیب بات ہے کہ اول پیدائش پر اسے قادر مانو اور دوسری مرتبہ پیدا کرنے کو مستبعد سمجھو۔

فائدہ: ۲ یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ صفات اور اونچی شان اس کی ہے، آسمان وزمین کی کوئی چیز اپنے حسن وخوبی میں اس کی شان وصفت سے لگاؤ نہیں کھاسکتی، مساوی ہونا تو کجا، وہ تو اس سے بھی بالا وبرتر ہے جہاں تک مخلوق اس کے جلال وجمال کا تصور کرسکتی ہے، بلکہ جو خوبی کسی جگہ موجود ہے وہ اسی کے کمالات کا ادنیٰ پرتو ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''آسمان کے فرشتے نہ کھائیں نہ پیئیں نہ حاجت بشری رکھیں، سوائے بندگی کے کچھ کام نہیں، اور زمین کے لوگ سب چیز میں آلودہ، پر اللہ کی صفت نہ ان سے ملے نہ ان سے، وہ پاک ذات ہے'' (موضح)۔

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۭ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۗءَ

بتلائی تم کو ایک مثل تمہارے اندر سے، دیکھو جو تمہارے ہاتھ کے مال ہیں ان میں ہیں کوئی ساجھی تمہارے

فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

ہماری دی ہوئی روزی میں کہ تم سب اس میں برابر رہو خطرہ رکھو ان کا جیسے خطرہ رکھو اپنوں کا، یوں کھول کر بیان کرتے ہیں ہم

الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۲۸

نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کا مضمون تھا جس کو ثابت کرنے کے لیے حق تعالیٰ کے افعال اور صفات کمال کا بیان تھا، اب اصل مقصود توحید کا بیان ہے، اور یہ مضمون پورے رکوع تک چلا گیا ہے، اور چونکہ توحید کے دلائل میں سے رزاقی بھی ہے اسی کی مناسبت سے بعض احکام مال خرچ کرنے کے اور اس کے اغراض ومقاصد کے متعلق ضمنا بیان کیے گئے، باقی اصل مقصود توحید ہی کا مضمون ہے۔

اللہ تعالیٰ (شرک کی مذمت اور اس کا باطل ہونا ثابت کرنے کے لئے) تم سے ایک مضمون عجیب تمہارے ہی حالات میں سے بیان فرماتے ہیں (وہ یہ کہ غور کرو) کیا تمہارے غلاموں میں کوئی شخص تمہارا اُس مال میں جو ہم نے تم کو دیا ہے شریک ہے کہ تم اور وہ (اختیارات کے اعتبار سے) اس میں برابر ہوں جن کا تم (تصرفات کے وقت) ایسا خیال کرتے ہو جیسا اپنے آپس (کے شریک وسہیم آزاد خود مختار) کا خیال کیا کرتے ہو۔

(کہ ان شرکاء کی اجازت کے بغیر تم مال میں کوئی تصرف نہیں کرتے، یا کم ازکم یہ اندیشہ تو ضرور رہتا ہے کہ کبھی وہ مخالفت نہ کر بیٹھے، اور ظاہر ہے کہ غلام اس طرح اپنے آقا کے مال میں شریک نہیں ہوتا، پس جب تمہارا غلام جو کہ انسان ہونے میں تمہارا شریک اور تمہیں جیسا ہے، فرق صرف ایک چیز میں ہے کہ تم مال ودولت کے مالک ہو اور وہ نہیں، صرف ایک صفت سے اس میں اور تم میں امتیاز ہے کہ وہ تمہارے خاص اختیارات میں شریک نہیں ہوسکتا تو یہ من گھڑت معبود جو کہ حق تعالیٰ کے غلام ہیں، اور کسی کمال میں اس کے برابر نہیں، بلکہ بعض تو ان میں سے خود مخلوق کے بنائے ہوئے ہیں وہ حق تعالیٰ کے خاص حق عبادت میں کس طرح اس کے شریک ہوسکتے ہیں، اور ہم نے جس طرح یہ کافی وشافی دلیل شرک کے باطل ہونے کی بیان فرمائی) ہم اس طرح سمجھداروں کے لئے دلائل صاف صاف بیان کرتے رہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی شرک کا قبح وبطلان سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ خود تمہارے ہی احوال میں سے ایک مثال نکال کر بیان فرماتا ہے، وہ یہ کہ تمہارے ہاتھ کا مال (یعنی لونڈی غلام) جن کے تم محض ظاہری اور مجازی مالک ہو کیا اپنی روزی اور مال ومتاع میں جو حق تعالیٰ نے دے رکھی ہے، تم ان کو برابر کا شریک تسلیم کرسکتے ہو جس طرح مشترک اموال وجائیداد میں اپنے بھائی بند حصہ دار ہوتے ہیں اور ہروقت کھٹکا رہتا ہے کہ مشترک چیز میں تصرف کرنے پر برہم ہو جائیں یا تقسیم کرنے لگیں یا کم ازکم سوال کر بیٹھیں کہ ہماری اجازت اور مرضی کے بدون فلاں کام کیوں کیا، کیا ایسا ہی کھٹکا ایک آقا کو اپنے

غلام یا نوکر کی طرف سے ہوتا ہے، اگر نہیں تو سمجھنا چاہیے کہ جب ایک چھوٹے مالک کا یہ حال ہے تو اس سچے مالک کو اپنے غلام کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے، جس کو تم حماقت سے اس کا ساجھی گنتے ہو، ایک غلام تو آقا کی ملک میں شریک نہ ہو سکے، حالانکہ دونوں خدا کی مخلوق ہیں اور اسی کی دی ہوئی روزی کھاتے ہیں، مگر ایک مخلوق بلکہ مخلوق در مخلوق، خالق کی خدائی میں شریک ہو جائے! ایسی مہمل بات کوئی عقلمند قبول نہیں کر سکتا۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۹

بلکہ چلتے ہیں یہ بے انصاف اپنی خواہشوں پر بن سمجھے ۱؎ سو کون سمجھائے جس کو اللہ نے بھٹکایا اور کوئی نہیں ان کا مددگار ۲؎

خلاصہ تفسیر: (ان صاف دلائل کے بیان کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ لوگ حق کا اتباع اختیار کر لیتے اور شرک وکفر کو چھوڑ دیتے مگر وہ حق کا اتباع نہیں کرتے) بلکہ ان ظالموں نے بلا (کسی صحیح) دلیل (کے محض) اپنے خیالات (فاسدہ) کا اتباع کر رکھا ہے سو جس کو (اس کی سرکشی، عناد اور باطل پر بے جا ہٹ دھرمی کی وجہ سے) خدا (ہی) گمراہ کرے اس کو کون راہ پر لائے (اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ معذور ہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ غم نہ کریں، آپ کا جو کام تھا وہ آپ کر چکے) اور (جب ان گمراہوں کو عذاب ہونے لگے گا تو) ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ: اس میں صراحت ہے کہ خواہش نفس کی پیروی کرنا برا ہے اور یہ جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ بے انصاف لوگ ایسی صاف وواضح باتوں کو کیونکر سمجھیں، وہ سمجھنا چاہتے ہی نہیں بلکہ جہالت اور ہوا پرستی سے محض اوہام وخواہشات کی پیروی پر تلے ہوئے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی بے انصافی جہل اور ہوا پرستی کی بدولت راہ حق پر چلنے اور سمجھنے کی توفیق نہ دی، اب کون طاقت ہے جو اسے سمجھا کر راہ حق پر لے آئے یا مدد کر کے گمراہی اور تباہی سے بچا لے لہٰذا ایسوں کی طرف سے زیادہ متحسر اور غمگین ہونے کی ضرورت نہیں، ان سے قطع نظر کر کے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمہ تن اپنے پروردگار کی طرف توجہ کیجئے، اور دین فطرت پر جمے رہیے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ

سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ دین پر ایک طرف کا ہو کر ۱؎ وہی تراش اللہ کی جس پر تراشا لوگوں کو ۲؎ بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو ۳؎

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

یہی ہے دین سیدھا ولیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے ۴؎

خلاصہ تفسیر: (جب اوپر کے مضمون سے توحید کی حقیقت واضح ہوگئی) تو (مخاطبین میں سے ہر ہر شخص سے کہا جاتا ہے کہ) تم (ادیان باطلہ سے) یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین (حق) کی طرف رکھو (اور سب) اللہ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس (قابلیت) پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (فطرۃ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں پیدائشی طور پر یہ استعداد رکھی ہے کہ اگر وہ حق کو سننا اور سمجھنا چاہے تو سمجھ میں آجاتا ہے، اور اس فطرت کی اتباع کا مطلب یہ ہے کہ اس استعداد اور قابلیت سے کام لے اور اس کے مقتضا پر عمل کرے، غرض اس فطرت کی اتباع کرنی چاہئے اور) اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے بدلنا نہ چاہئے پس سیدھا (رستہ) دین (کا) یہی ہے لیکن اکثر لوگ (اس کو غور وفکر اور تدبر نہ کرنے کی وجہ سے) نہیں جانتے (اس لئے اس کا اتباع نہیں کرتے)۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا: فطرت سے کیا مراد ہے؟ اس معاملہ میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں ان میں دو زیادہ

مشہور ہیں: ①اول: یہ کہ فطرت سے مراد "اسلام" ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان اپنی فطرت اور جبلت کے اعتبار سے مسلمان پیدا کیا ہے، اگر اس کو گرد و پیش اور ماحول میں کوئی خراب کرنے والا خراب نہ کردے تو ہر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان ہی ہوگا، مگر عادۃً ہوتا یہ ہے کہ ماں باپ اس کو بعض اوقات اسلام کے خلاف چیزیں سکھا دیتے ہیں، جس کے سبب وہ اسلام پر قائم نہیں رہتا جیسا کہ صحیحین کی ایک حدیث میں مذکور ہے۔

②دوسرا قول یہ ہے کہ فطرت سے مراد "استعداد" ہے، یعنی تخلیق انسانی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ ہر انسان میں اپنے خالق کو پہچاننے اور اس کو ماننے کی صلاحیت و استعداد موجود ہے جس کا اثر اسلام کا قبول کرنا ہوتا ہے، بشرطیکہ اس استعداد سے کام لے۔

مگر پہلے قول پر متعدد اشکالات ہیں، اول یہ کہ خود اسی آیت میں یہ بھی آگے مذکور ہے: لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ اور یہاں "خلق اللہ" سے مراد وہی فطرۃ اللہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس لئے معنی اس جملے کے یہ ہیں کہ اللہ کی اس فطرت کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا، حالانکہ حدیث صحیحین میں خود یہ آیا ہے کہ پھر ماں باپ بعض اوقات بچے کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں، اگر فطرت کے معنی خود اسلام کے لئے جائیں جس میں تبدیلی نہ ہونا خود اسی آیت میں مذکور ہے تو حدیث مذکور میں یہودی، نصرانی بنانے کی تبدیلی کیسے صحیح ہوگی؟ اور یہ تبدیلی تو عام مشاہدہ ہے کہ ہر جگہ مسلمانوں سے زیادہ کافر ملتے ہیں، اگر اسلام ایسی فطرت ہے جس میں تبدیلی نہ ہوسکے تو پھر یہ تبدیلی کیسے اور کیوں؟ دوسرے حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا اس کے متعلق صحیح حدیث میں ہے کہ اس لڑکے کی فطرت میں کفر تھا، اس لئے خضر علیہ السلام نے اس کو قتل کیا، یہ حدیث بھی اس کے منافی ہے کہ ہر انسان اسلام پر پیدا ہوتا ہو، تیسرا شبہ یہ ہے کہ اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کی فطرت میں اس طرح رکھ دیا گیا ہے جس کی تبدیلی پر بھی اس کو قدرت نہیں تو وہ کوئی اختیاری فعل نہ ہوا، پھر اس پر آخرت کا ثواب کیسا؟ کیونکہ ثواب تو اختیاری عمل پر ملتا ہے، چوتھا شبہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ کے مطابق فقہاء امت کے نزدیک بچہ بالغ ہونے سے پہلے ماں باپ کے تابع سمجھا جاتا ہے، اگر ماں باپ کافر ہوں تو بچے کو بھی کافر قرار دیا جائے گا، اس کی تجہیز و تکفین اسلامی طرز پر نہیں کی جائے گی۔

یہ سب شبہات امام تورپشتی نے شرح مصابیح میں بیان کئے ہیں اور اسی بناء پر انہوں نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے، یہاں خلاصہ تفسیر میں بھی اسی کے مطابق تفسیر کی گئی، کیونکہ اس خلقی استعداد کے متعلق یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، جو شخص ماں باپ یا کسی دوسرے کے گمراہ کرنے سے کافر ہوگیا اس میں استعداد اور قابلیت حق یعنی اسلام کی حقانیت کے پہچاننے کی ختم نہیں ہوتی، غلام خضر کے واقعہ میں اس کے کفر پر پیدا ہونے سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں حق کو سمجھنے کی استعداد ہی نہ رہی تھی، کیونکہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قسمت میں یہ تھا کہ وہ بڑا ہوگا تو کافر ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ اس میں حق کے سمجھنے اور قبول کرنے کی قابلیت ہی نہ تھی، اور چونکہ اس خداداد استعداد و قابلیت کا صحیح استعمال انسان اپنے اختیار سے کرتا ہے اس لئے اس پر ثواب عظیم کا مرتب ہونا بھی واضح ہوگیا اور حدیث صحیحین میں جو یہ مذکور ہے کہ بچے کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں اس کا مفہوم بھی اس دوسرے معنی کے اعتبار سے واضح اور صاف ہوگیا کہ اگرچہ اس میں استعداد اور قابلیت فطری ہے جو اللہ نے اس کی تخلیق میں رکھی تھی وہ اسلام ہی کی طرف لے جانے والی تھی، مگر عوارض اور موانع حائل ہوگئے اور اس طرف نہ جانے دیا اور حضرات سلف سے جو پہلا قول منقول ہے بظاہر اس کی مراد بھی اصل اسلام نہیں، بلکہ یہی استعداد اسلام اور اس کی قابلیت و صلاحیت ہے، محدث دہلوی نے لمعات شرح مشکوٰۃ میں جمہور کے قول کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے، اور اسی کی تائید اس مضمون سے ہوتی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بیشمار قسم کی مخلوقات مختلف طبائع اور مزاج کی بنائی ہیں، ہر مخلوق کی فطرت اور جبلت میں ایک خاص مادہ رکھ دیا ہے، جس سے وہ مخلوق اپنی تخلیق کے منشاء کو پورا کرسکے قرآن کریم میں: اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ جس مخلوق کو خالق کائنات نے کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اس کو اس مقصد کے لئے ہدایت بھی دے دی ہے، وہ ہدایت یہی مادہ اور استعداد ہے، شہد کی مکھی میں یہ مادہ رکھ دیا کہ وہ درختوں اور پھولوں کو پہچانے اور انتخاب کرے، پھر اس کے رس کو اپنے پیٹ میں محفوظ کرکے اپنے چھتے میں لاکر جمع کرے، اسی طرح انسان کی فطرت و جبلت میں ایسا مادہ اور استعداد رکھ دی ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچانے، اس کی شکرگزاری اور اطاعت شعاری کرے، اسی کا نام اسلام ہے۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ: فطرت میں تبدیلی نہیں ہوتی، البتہ ریاضت اور مجاہدہ سے تعدیل ہوجاتی ہے، یعنی فطرت کا رخ موڑا جاسکتا ہے، زائل وفنا نہیں کیا جاسکتا، مثال کے طور پر غصہ کی کیفیت کو لے لیجیے، ہر انسان کی فطرت میں یہ کیفیت رکھی گئی ہے، یہ صفت حلال وحرام دونوں موقعوں پر استعمال ہوتی ہے، غصہ کا بے جا استعمال حرام ہے اور حق کے لیے غصہ کرنا حلال ہے، اب اگر کوئی چاہے کہ غصہ کی یہ کیفیت ہی دل سے زائل ہوجائے کہ غصہ پیدا ہی نہ ہو تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ فطرت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، جو فطرت ہے وہ موجود رہے گی، البتہ ریاضت ومجاہدہ سے اس کیفیت کا رخ تبدیل کیا جاسکتا ہے کہ صرف جائز اور حق کے لیے غصہ کیا جائے، اہل طریق نے اس حقیقت کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ: ''فطرت کا ازالہ ممکن نہیں، اِمالہ ممکن ہے''، اِمالہ یعنی رخ پھیر دینا۔

* * *

فائدہ: ۱ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا: یعنی جو گمراہی سے کسی طرح نکلنا نہیں چاہتا اسے شرک کی دلدل میں پڑا رہنے دو اور تم ہر طرف سے منہ موڑ کر ایک خدا کے ہو رہو، اور اس کے سچے دین کو بڑی توجہ اور یک جہتی سے تھامے رکھو۔

فائدہ: ۲ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا: اللہ تعالیٰ نے آدمی کی ساخت اور تراش شروع سے ایسی رکھی ہے کہ اگر وہ حق کو سمجھنا اور قبول کرنا چاہے تو کر سکے اور بدءِ فطرت سے اپنی اجمالی معرفت کی ایک چمک اس کے دل میں بطور تخم ہدایت کے ڈال دی ہے کہ اگر گرد و پیش کے احوال اور ماحول کے خراب اثرات سے متاثر نہ ہو اور اصلی بیعت پر چھوڑ دیا جائے تو یقیناً دین حق کو اختیار کرے کسی دوسری طرف متوجہ نہ ہو، ''عہد الست'' کے قصہ میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور احادیث صحیحہ میں تصریح ہے کہ ہر بچہ فطرۃ (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے بعدہ ماں باپ اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنادیتے ہیں، ایک حدیث قدسی میں ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو ''حنفاء'' پیدا کیا، شیاطین نے اغوا کر کے انھیں سیدھے راستہ سے بھٹکا دیا، بہرحال دین حق، دین حنیف اور دین قیم وہ ہے کہ اگر انسان کو اس کی فطرت پر مخلی بالطبع چھوڑ دیا جائے تو اپنی طبیعت سے اسی کی طرف جھکے، تمام انسانوں کی فطرت اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے جس میں کوئی تفاوت اور تبدیلی نہیں، فرض کرو اگر فرعون یا ابوجہل کی اصلی فطرت میں یہ استعداد اور صلاحیت نہ ہوتی تو ان کو قبول حق کا مکلف بنانا صحیح نہ ہوتا، جیسے اینٹ پتھر، یا جانوروں کو شرائع کا مکلف نہیں بنایا، فطرت انسانی کی اسی یکسانیت کا یہ اثر ہے کہ دین کے بہت سے اصول مہمہ کو کسی نہ کسی رنگ میں تقریباً سب انسان تسلیم کرتے ہیں گو ان پر ٹھیک ٹھیک قائم نہیں رہتے، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی اللہ سب کا مالک حاکم، سب سے نرالا، کوئی اس کے برابر نہیں، کسی کا زور اس پر نہیں، یہ باتیں سب جانتے ہیں، اس پر چلنا چاہئے، ایسے ہی کسی کے جان ومال کو ستانا، ناموس میں عیب لگانا، ہر کوئی برا جانتا ہے، ایسے ہی اللہ کو یاد کرنا، غریب پر ترس کھانا، حق پورا دینا، دغا نہ کرنا ہر کوئی اچھا جانتا ہے، اس (راستہ) پر چلنا ہی دین سچا ہے (یہ امور فطری تھے مگر) ان کا بندوبست پیغمبروں کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے سکھلا دیا''۔

فائدہ: ۳ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ: یعنی اصل پیدائش کے اعتبار سے کوئی فرق اور تغیر وتبدل نہیں، ہر فرد انسان کی فطرت قبول حق کے لئے مستعد بنائی ہے، یا یہ مطلب کہ اللہ نے جس فطرت پر پیدا کیا اس کو تم اپنے اختیار سے بدل کر خراب نہ کرو، بیج تم میں ڈال دیا ہے اسے بے توجہی یا بے تمیزی سے ضائع مت ہونے دو۔

فائدہ: ۴ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: یعنی سیدھا دین یہ ہی فطرت کی آواز ہے، پر بہت لوگ اس نکتہ کو سمجھتے نہیں۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۳۱﴾

سب رجوع ہو کر اس کی طرف ۱ اور اس سے ڈرتے رہو اور قائم رکھو نماز اور مت ہو شرک کرنے والوں میں

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

جنہوں نے کہ پھوٹ ڈالی اپنے دین میں اور ہوگئے ان میں بہت فرقے، ہر فرقہ جو اس کے پاس ہے اس پر خوش ہے ۲

خلاصہ تفسیر: (غرض) تم خدا کی طرف رجوع ہو کر فطرت الہیہ کا اتباع کرو اور اس (کی مخالفت اور مخالفت کے عذاب) سے ڈرو اور (اسلام قبول کر کے) نماز کی پابندی کرو (جو توحید کا عملی اظہار ہے) اور شرک کرنے والوں میں سے مت رہو، جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا (یعنی حق تو یہ ایک تھا اور باطل بہت ہیں، انہوں نے حق کو چھوڑ کر باطل کی مختلف راہیں اختیار کر لیں، ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا یہی مطلب ہے کہ ایک نے ایک راستہ لیا، اور دوسرے نے دوسرا) اور بہت سے (مختلف) گروہ ہو گئے (اور اگر حق پر رہتے تو سب کی ایک ہی جماعت ہوتی، آگے فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ ان حق کے چھوڑنے والوں میں سب کے طریقے باطل اور غلط ہیں، مگر پھر بھی انتہائی جہالت کی وجہ سے ان میں) ہر گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہیں جو ان کے پاس ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اصل دین پکڑے رہو، اس کی طرف رجوع ہو کر، اگر محض دنیاوی مصلحت کے واسطے یہ کام کئے تو دین درست نہ ہوگا، آگے دین فطرت کے چند اہم اصول کی طرف توجہ دلائی ہے، مثلاً اتقاء (خدا سے ڈرتے رہنا) نماز قائم رکھنا، شرک جلی و خفی سے بیزار اور مشرکین سے علیحدہ رہنا، اپنے دین میں پھوٹ نہ ڈالنا۔

فائدہ: ۲ یعنی دین فطرت کے اصول سے علیحدہ ہو کر ان لوگوں نے اپنے مذہب میں پھوٹ ڈالی، بہت سے فرقے بن گئے، ہر ایک کا عقیدہ الگ مذہب و مشرب جدا، جس کسی نے غلط کاری یا ہوا پرستی سے کوئی عقیدہ قائم کر دیا یا کوئی طریقہ ایجاد کر لیا، ایک جماعت اسی کے پیچھے ہو گئی، تھوڑے دن بعد وہ ایک فرقہ بن گیا، پھر ہر فرقہ اپنے ٹھہرائے ہوئے اصول و عقائد پر خواہ وہ کتنے ہی مہمل کیوں نہ ہوں ایسا فریفتہ اور مفتون ہے کہ اپنی غلطی کا امکان بھی اس کے تصور میں نہیں آتا۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَآ أَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ

اور جب پہنچے لوگوں کو کچھ سختی تو پکاریں اپنے رب کو اسکی طرف رجوع ہو کر پھر جہاں چکھائی انکو اپنی طرف سے کچھ مہربانی اسی وقت ایک جماعت

مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَآ آتَيْنٰهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣٤﴾

ان میں اپنے رب کا شریک لگی بتانے، کہ منکر ہوجائیں ہمارے دیئے ہوئے سے سو مزے اڑالو اب آگے جان لو گے ۱

خلاصہ تفسیر: اور (جس توحید کی طرف ہم بلا رہے ہیں مصیبت کے وقت عام طور پر مخالف اور منکر لوگوں کی حالت اور زبان سے بھی اس کا اظہار و اقرار ہونے لگتا ہے جس سے اس کی بھی تائید ہوتی ہے کہ توحید ایک فطری چیز ہے، چنانچہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ:) جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے (اس وقت بے قرار ہو کر) اپنے رب (حقیقی) کو اسی کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگتے ہیں (اور سب معبودوں کو چھوڑ دیتے ہیں مگر) پھر (قریب ہی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) جب اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو بس ان میں سے بعض لوگ (پھر) اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے جو (آرام و عیش) ان کو دیا ہے اس کی ناشکری کرتے ہیں (جو عقلاً بھی بری چیز ہے) سو (خیر) چند روز اور حظ (مزے) حاصل کر لو پھر جلدی تم (حقیقت) معلوم کر لو گے۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ: روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ انسان کی طبیعت ہدایت اور گمراہی سے مرکب ہے، مصیبت کے وقت ہدایت کا ظہور ہوتا ہے، اور مصیبت کے زائل ہونے کے بعد گمراہی کا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جیسے بھلے کام ہر انسان کی فطرت پہچانتی ہے، اللہ کی طرف رجوع ہونا بھی ہر ایک کی فطرت جانتی ہے، چنانچہ خوف اور سختی کے وقت اس کا اظہار ہو جاتا ہے، بڑے سے بڑا سرکش مصیبت میں گھر کر خدائے واحد کو پکارنے لگتا ہے، اس وقت جھوٹے سہارے سب ذہن سے نکل

جاتے ہیں، وہ ہی سچا مالک یاد رہ جاتا ہے جس کی طرف فطرت انسانی راہنمائی کرتی تھی، مگر افسوس کہ انسان اس حالت پر دیر تک قائم نہیں رہتا، جہاں خدا کی مہربانی سے مصیبت دور ہوئی، پھر اس کو چھوڑ کر جھوٹے دیوتاؤں کے بھجن گانے لگا، گویا اس کے پاس سب کچھ ان ہی کا دیا ہوا ہے! خدا نے کچھ نہیں دیا! (العیاذ باللہ) اچھا چند روز مزے اڑا لے، آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ اس کفر اور ناشکری کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اگر آدمیت ہوتی تو سمجھتا کہ اس کا ضمیر جس خدا کو سختی اور مصیبت کے وقت پکار رہا تھا وہ ہی اس لائق ہے کہ ہمہ وقت یاد رکھا جائے۔

اَمۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنًا فَہُوَ یَتَکَلَّمُ بِمَا کَانُوۡا بِہٖ یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۵﴾

کیا ہم نے ان پر اتاری ہے کوئی سند سو وہ بول رہی ہے جو یہ شریک بتاتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں خصوصاً اقرار توحید کے بعد بھی تو ان سے کوئی پوچھے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟

کیا ہم نے ان پر کوئی سند (یعنی کوئی کتاب) نازل کی ہے کہ وہ ان کو خدا کے ساتھ شرک کرنے کو کہہ رہی ہے (یعنی ان کے پاس اس کی کوئی دلیل نقلی بھی نہیں اور شرک کا عقل کے خلاف ہونا ظاہر ہے جو مصیبت کے وقت خود ان کے اقرار سے ظاہر ہو جاتا ہے، پس شرک سراسر باطل ٹھہرا)۔

* * *

فائدہ: یعنی عقل سلیم اور فطرت انسانی کی شہادت شرک کو صاف طور پر رد کرتی ہے تو کیا اس کے خلاف وہ کوئی حجت اور سند رکھتے ہیں، جو بتلاتی ہو کہ خدا کی خدائی میں دوسرے بھی اس کے شریک ہیں (معاذ اللہ) اگر نہیں تو انھیں معبود بننے کا استحقاق کہاں سے ہوا۔

وَاِذَاۤ اَذَقۡنَا النَّاسَ رَحۡمَۃً فَرِحُوۡا بِہَا ؕ وَاِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ

اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو کچھ مہربانی اس پر پھولے نہیں سماتے، اور اگر آپڑے ان پر کچھ برائی اپنے ہاتھوں کے بھیجے ہوئے پر

اِذَا ہُمۡ یَقۡنَطُوۡنَ ﴿۳۶﴾

تو آس توڑ بیٹھیں

خلاصہ تفسیر: اور (آگے مضمون بالا کا تتمہ ہے اور وہ یہ ہے کہ:) ہم جب (ان) لوگوں کو کچھ عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اس سے (اس طرح) خوش ہوتے ہیں (کہ خوشی میں مست ہو کر شرک کرنے لگتے ہیں جیسا اوپر ذکر آیا) اور اگر ان کے (برے) اعمال کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو بس وہ لوگ ناامید ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کا مضمون پیچھے گذری ہوئی آیت: وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ کے مضمون کا تتمہ ہے، درمیان میں آیت: اَمۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنًا اس مناسبت سے لائی گئی کہ اوپر معلوم ہوا تھا کہ شرک پر عقلی دلیل کوئی نہیں تو اس کے ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ نقلی دلیل بھی کوئی نہیں، پھر مذکورہ آیت کے پہلا جملہ: اِذَاۤ اَذَقۡنَا النَّاسَ میں شرک کا سبب بتلا دیا جو کہ بدمست اور غافل ہونا ہے اور یہی بتانا اصل مقصود ہے، یہاں دوسرا جملہ تقابل کی مناسبت سے ذکر کر دیا، یعنی مصیبت کے وقت کفار کی مایوسی بیان کر کے یہ بتلا دیا کہ دونوں حالتوں میں ان کا تعلق خدا کے ساتھ بہت کمزور ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر اس تعلق کو بھلا دیتے ہیں، پس اصل مضمون توحید کو ثابت اور شرک کو باطل کرنا ہے، اس آیت کے متعلق ایک ضروری مضمون سورہ یونس آیت ۱۲ کی تفسیر میں لکھا گیا ہے، جو قابل ملاحظہ ہے۔

وَاِذَاۤ اَذَقۡنَا النَّاسَ رَحۡمَۃً فَرِحُوۡا بِہَا: نعمت پر اس طرح کی خوشی ناجائز ہے جس میں اتراہٹ اور فخر و غرور شامل ہو، اور سورہ یونس میں: فلیفرحوا میں نعمت پر خوشی کا جو حکم ہے اس سے مراد بطور شکر کے خوش ہونا ہے، پس دونوں میں کچھ تعارض نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی ان لوگوں کی حالت عجیب ہے، جب اللہ کی مہربانی اور احسان سے عیش میں ہوں تو پھولے نہ سمائیں ایسے اترانے لگیں اور آپے سے باہر ہو جائیں کہ محسن حقیقی کو بھی یاد نہ رکھیں، اور کسی وقت شامت اعمال کی بدولت مصیبت کا کوڑا پڑا تو بالکل آس توڑ کر اور ناامید ہو کر بیٹھ رہیں، گویا اب کوئی نہیں جو مصیبت کے دور کرنے پر قادر ہو، مومن کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے، وہ عیش و راحت میں منعم حقیقی کو یاد رکھتا ہے، اس کے فضل و رحمت پر خوش ہو کر زبان و دل سے شکر ادا کرتا ہے اور مصیبت میں پھنس جائے تو صبر و تحمل کے ساتھ اللہ سے مدد مانگتا ہے، اور امید رکھتا ہے کہ کتنی ہی سخت مصیبت ہو اور ظاہری اسباب کتنے ہی مخالف ہوں اس کے فضل سے سب فضا بدل جائے گی۔

تنبیہ: ایک آیت پہلے فرمایا تھا کہ: ''لوگ سختی کے وقت خالص خدا کو پکارنے لگتے ہیں''، یہاں فرمایا کہ: ''برائی پہنچتی ہے تو آس توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں''، دونوں میں کچھ اختلاف نہیں، پہلی حالت یعنی خدا کو پکارنا، ابتدائی منزل ہے، پھر جب مصیبت اور سختی میں امتداد ہوتا ہے تو آخر گھبرا کر ناامید ہو جاتا ہے یا بعض لوگوں کا وہ حال ہو بعض کا یہ ہو، واللہ تعالیٰ اعلم۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٣٧﴾

کیا نہیں دیکھ چکے کہ اللہ پھیلا دیتا ہے روزی کو جس پر چاہے اور ناپ کر دیتا جس کو چاہے، اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (اب اسی کی دوسری دلیل ہے کہ یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں تو) کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے کم دیتا ہے (اور مشرکین کے نزدیک یہ مسلم بھی تھا کہ روزی کا گھٹانا بڑھانا اصل میں خدا ہی کا کام ہے، لقولہ تعالیٰ: وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُولُنَّ اللَّهُ) اس (بات) میں (بھی توحید کی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (یعنی وہ سمجھتے ہیں اور دوسرے بھی سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ جو شخص ایسا قادر ہوگا عبادت کا مستحق وہی ہوگا)۔

* * *

فائدہ: یعنی ایمان و یقین والے سمجھتے ہیں کہ دنیا کی سختی نرمی اور روزی کا بڑھانا گھٹانا سب اسی رب قدیر کے ہاتھ میں ہے، لہٰذا جو حال آئے بندہ کو صبر و شکر سے رضا بالقضا رہنا چاہئے، نعمت کے وقت شکر گزار رہے، اور ڈرتا رہے کہیں چھن نہ جائے اور سختی کے وقت صبر کرے اور امید رکھے کہ حق تعالیٰ اپنے فضل و عنایت سے سختیوں کو دور فرما دے گا۔

فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ ۖ

سو تو دے قرابت والے کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو، یہ بہتر ہے ان کے لیے جو چاہتے ہیں اللہ کا منہ

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٣٨﴾

اور وہی ہیں جن کا بھلا ہے

خلاصہ تفسیر: پھر (جب دلائل توحید سے معلوم ہو گیا کہ رزق کی فراخی اور تنگی اللہ ہی کی طرف سے ہے تو اس سے ایک بات اور بھی ثابت ہوئی کہ بخل کرنا برا ہے، کیونکہ بخل کرنے سے جتنا رزق مقدر ہے اس سے زیادہ نہیں مل سکتا، اس لئے نیک کاموں میں خرچ کرنے سے بخل نہیں کیا کرو بلکہ) قرابت دار کو اس کا حق دیا کرو اور (اسی طرح) مسکین اور مسافر کو بھی (ان کے حقوق دیا کرو جن کی تفصیل دلائل شرعیہ سے معلوم ہے) یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جب فطرت کی شہادت سے ثابت ہو گیا کہ حقیقی مالک و رب وہ ہی اللہ ہے، دنیا کی نعمتیں سب اسی کی عطا کی ہوئی ہیں، تو جو

لوگ اس کے دیئے ہوئے میں سے خرچ کریں، مسافر، محتاج اور غریب رشتہ داروں کی خبر لیں، اہل قرابت کے حقوق درجہ بدرجہ ادا کرتے رہیں، ایسے ہی بندوں کو دنیا و آخرت کی بھلائی نصیب ہوگی۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ

اور جو دیتے ہو بیاج پر کہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں سو وہ نہیں بڑھتا اللہ کے یہاں، اور جو دیتے ہو پاک دل سے

تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

چاہ کر رضامندی اللہ کی سو یہ وہی ہیں جن کے دونے ہوئے

خلاصہ تفسیر: ہم نے جو یہ قید لگائی کہ ''یہ مضمون بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی رضا کے طلبگار ہوں''، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مطلق مال خرچ کر دینا بہتری اور فلاح کا سبب نہیں ہے بلکہ اس کا قانون یہ ہے کہ:

اور جو چیز تم (دنیا کی غرض سے خرچ کرو گے مثلاً کوئی چیز) اس غرض سے کسی کو دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں (شامل ہو کر یعنی ان کے ملک وقبضہ میں) پہنچ کر (تمہارے لئے) زیادہ ہو (کر آ) جائے (جیسا نوتہ وغیرہ دنیوی رسوم میں اکثر اسی غرض سے روپیہ تحفہ دیا جاتا ہے کہ یہ شخص ہمارے موقع پر کچھ اور زائد شامل کر کے دے گا) تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا (کیونکہ خدا کے پاس پہنچنا اور بڑھنا اس مال کے ساتھ خاص ہے جو اللہ کی رضا کے لئے خرچ کیا جائے جیسا آگے آتا ہے اور حدیث میں بھی ہے کہ مقبول صدقہ کی ایک کھجور احد پہاڑ سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اس میں یہ نیت تھی نہیں اس لیے نہ مقبول ہوا نہ زیادہ ہوا) اور جو زکوٰۃ (وغیرہ) دو گے جس سے اللہ کی رضا طلب کرتے ہو گے تو ایسے لوگ (اپنے دیئے ہوئے کو) اللہ تعالیٰ کے پاس بڑھاتے رہیں گے (جیسا ابھی حدیث کا مضمون گذرا)۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ: اس آیت میں ایک بری رسم کی اصلاح کی گئی ہے، جو عام خاندانوں اور اہل قرابت میں چلتی ہے، وہ یہ کہ عام طور پر کنبہ رشتہ کے لوگ جو کچھ دوسرے کو دیتے ہیں اس پر نظر رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے وقت میں کچھ دے گا بلکہ رسمی طور پر کچھ زیادہ دے گا، خصوصاً نکاح، شادی وغیرہ کی تقریبات میں جو کچھ دیا لیا جاتا ہے اس کی یہی حیثیت ہوتی ہے جس کو عرف میں ''نوتہ'' کہتے ہیں، اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ اہل قرابت کا جو حق ادا کرنے کا حکم پہلی آیت میں دیا گیا ہے ان کو یہ حق اس طرح دیا جائے کہ نہ ان پر احسان جتائے اور نہ کسی بدلے پر نظر رکھے اور جس نے بدلے کی نیت سے دیا کہ ان کا مال دوسرے عزیز رشتہ دار کے مال میں شامل ہونے کے بعد کچھ زیادتی لے کر واپس آئے گا تو اللہ کے نزدیک اس کا کوئی درجہ اور ثواب نہیں اور قرآن کریم نے اس زیادتی کو لفظ ربوا سے تعبیر کر کے اس کی قباحت کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ ایک صورت سود کی سی ہوگئی۔

ہدیہ اور ہبہ دینے والے کو اس پر نظر رکھنا کہ اس کا بدلہ ملے گا یہ تو ایک بہت مذموم حرکت ہے، جس کو اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے، لیکن بطور خود جس شخص کو کوئی ہبہ عطیہ کسی دوست عزیز کی طرف سے ملے اس کے لئے اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ وہ بھی جب اس کو موقع ملے اس کی مکافات کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہی تھی کہ جو شخص آپ کو کوئی ہدیہ پیش کرتا تو اپنے موقع پر آپ بھی اس کو ہدیہ دیتے تھے، ہاں! اس مکافات کی صورت ایسی نہ بنائے کہ دوسرا آدمی یہ محسوس کرے کہ یہ میرے ہدیہ کا بدلہ دے رہا ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ: یہ آیت اگر مکی ہو تو یہاں زکوٰۃ کے معنی مطلق صدقہ ہوں گے، کیونکہ زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی سود بیاج سے گو بظاہر مال بڑھتا دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت میں گھٹ رہا ہے جیسے کسی آدمی کا بدن ورم سے پھول جائے وہ

بیماری یا پیام موت ہے اور زکوۃ نکالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مال کم ہوگا فی الحقیقت وہ بڑھتا ہے جیسے کسی مریض کا بدن مسہل وتنقیہ سے گھٹتا دکھائی دے مگر انجام اس کا صحت ہو، سود اور زکوۃ کا حال بھی انجام کے اعتبار سے ایسا ہی سمجھ لو: یَمۡحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرۡبِى الصَّدَقٰتِ (البقرۃ:۲۷۶) حدیث میں ہے کہ ایک کھجور جو مومن صدقہ کرے قیامت کے دن بڑھ کر پہاڑ کے برابر نظر آئے گی۔

تنبیه: بعض مفسرین نے ''ربا'' سے یہاں سود بیاج مراد نہیں لیا، بلکہ آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جو آدمی کسی کو کچھ دے اس غرض سے کہ دوسرا اس سے بڑھ کر احسان کا بدلہ کرے گا تو یہ دینا اللہ کے ہاں موجب برکت ثواب نہیں، گو مباح ہو، اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حق میں تو مباح بھی نہیں، کقوله تعالىٰ: وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ (المدثر:۶) واللہ اعلم۔

اَللّٰهُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ ثُمَّ رَزَقَكُمۡ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡكُمۡ ؕ هَلۡ مِنۡ شُرَكَآئِكُمۡ مَّنۡ يَّفۡعَلُ

اللہ وہی ہے جس نے تم کو بنایا پھر تم کو روزی دی پھر تم کو مارتا ہے پھر تم کو جلائے گا، کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو کر سکے

ع ۴ ۱۲ مِنۡ ذٰلِكُمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۝۴۰

ان کاموں میں سے ایک کام، وہ نرالا ہے اور بہت اوپر ہے اس سے کہ شریک بتلاتے ہیں

خلاصه تفسير: گذشتہ آیت میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مضمون تبعا اور ضمنا بیان ہوگیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقی پر دلالت کرنے کی وجہ سے جو کہ توحید کی دلیل ہے اس کو مناسبت تھی اور اصل مقصود توحید کا بیان ہے، اسی لئے آگے پھر اسی توحید کا ذکر ہے:

اللہ ہی وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم کو رزق دیا، پھر تم کو موت دیتا ہے، پھر (قیامت میں) تم کو جلائے گا (ان میں بعض امور تو مخاطبین کے اقرار سے ثابت ہیں اور بعض دلائل سے، غرض کہ وہ ایسا قادر ہے، اب یہ بتلاؤ کہ) کیا تمہارے شرکاء میں بھی کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے (اور ظاہر ہے کہ کوئی بھی ایسا نہیں، اس لئے ثابت ہوا کہ) وہ ان کے شرک سے پاک اور برتر ہے (یعنی خدا کا کوئی شریک نہیں، پس توحید کا ثبوت اور شرک کا باطل ہونا معلوم ہوگیا)۔

* * *

فائده: یعنی مارنا جلانا، روزی دینا، سب کام تو تنہا اس کے قبضہ میں ہوئے، پھر دوسرے شریک کدھر سے آ کر الوہیت کے مستحق بن گئے۔

ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ بِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِى النَّاسِ لِيُذِيۡقَهُمۡ بَعۡضَ الَّذِىۡ عَمِلُوۡا

پھیل پڑی ہے خرابی جنگل میں اور دریا میں لوگوں کے ہاتھ کی کمائی سے چکھانا چاہیے ان کو کچھ مزہ ان کے کام کا

لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۝۴۱

تاکہ وہ پھر آئیں

خلاصه تفسير: پیچھے توحید کو ثابت اور شرک کو باطل کیا تھا، اب گناہوں کا دنیا اور آخرت میں شامت اور وبال کا سبب ہونا بتاتے ہیں، جن میں کفر وشرک سب سے بڑا گناہ ہے اور مقابلہ کے طور پر توجہ اور طاعات کا نیک انجام ہونا بتاتے ہیں۔

(شرک ومعصیت ایسی بری چیز ہے کہ) خشکی اور تری (یعنی تمام دنیا) میں لوگوں کے (برے) اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں (مثلاً قحط، وباء، طوفان) تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال (کی سزا) کا مزہ ان کو چکھا دے تاکہ وہ (اپنے ان اعمال سے) باز آجائیں (جیسا دوسری آیت میں ہے: وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ)۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ عام دنیا کے مشاہدات یہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں عام طور پر مومن مسلمان تنگی اور تکلیف میں اور کفار فجار عیش وعشرت میں رہتے ہیں، اگر آیت مذکورہ کے مطابق دنیا کے مصائب اور تکلیفیں گناہوں کے سبب سے ہوتیں تو معاملہ برعکس ہوتا، یعنی مسلمان عیش وعشرت میں ہوتے اور کفار تنگی اور تکلیف میں ہوتے، اسی طرح گناہوں کے سبب حوادث اور مصیبت آنے پر ایک شبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ نیک بندوں پر بھی تو بلائیں اور مصیبتیں آتی ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں گناہوں کو مصائب کا سبب ضرور بتلایا ہے مگر علت تامہ نہیں فرمایا کہ جب کسی پر کوئی مصیبت آئے تو گناہ ہی کے سبب سے ہوگی، یا جس پر کوئی مصیبت آئے تو اس کا گناہ گار ہونا ضروری ہو، بلکہ عام اسباب کا جو دنیا میں دستور ہے کہ سبب واقع ہونے کے بعد اس کا مسبب اکثر واقع ہو جاتا ہے اور کبھی کوئی دوسرا سبب اس کے اثر کے ظاہر ہونے سے مانع ہو جاتا ہے تو اس سبب کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، جیسے کوئی مسہل یا ملین دواء کے متعلق یہ کہے کہ اس سے اسہال ہوں گے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے، مگر بعض اوقات کسی دوسری دواء غذاء یا ہوا وغیرہ کے اثر سے اسہال نہیں ہوتے، اور جو دوائیں بخار اتارنے کی ہیں بعض اوقات ایسے عوارض پیش آجاتے ہیں کہ ان دواؤں کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، خواب آور گولیاں کھا کر بھی نیند نہیں آتی، جس کی ہزاروں مثالیں دنیا میں ہر وقت مشاہدہ کی جاتی ہیں، اس لئے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ اصل خاصہ گناہوں کا یہ ہے کہ ان سے مصائب وآفات آئیں، لیکن بعض اوقات دوسرے کچھ اسباب اس کے منافی جمع ہوجاتے ہیں جن کی وجہ سے مصائب کا ظہور نہیں ہوتا، اور بعض صورتوں میں بغیر کسی گناہ کے کوئی آفت ومصیبت آجانا بھی اس کے منافی نہیں، کیونکہ آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ بغیر گناہ کے کوئی تکلیف ومصیبت کسی کو پیش نہیں آتی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ کسی کو کوئی مصیبت وآفت کسی دوسرے سبب سے پیش آجائے، جیسے انبیاء واولیاء کو جو مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آتی ہیں ان کا سبب کوئی گناہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی آزمائش اور آزمائش کے ذریعہ ان کے درجات کی ترقی اس کا سبب ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ قرآن کریم نے جن آفات ومصائب کو گناہوں کے سبب سے قرار دیا ہے اس سے مراد وہ آفات ومصائب ہیں جو پوری دنیا پر یا پورے شہر یا بستی پر عام ہوجائیں، عام انسان اور جانوران کے اثر سے نہ بچ سکیں، ایسی مصائب وآفات کا سبب عموماً لوگوں میں گناہوں کی کثرت خصوصاً علانیہ گناہ کرنا ہی ہوتا ہے، شخصی اور انفرادی تکلیف ومصیبت میں یہ ضابطہ نہیں، بلکہ وہ کبھی کسی انسان کی آزمائش کرنے کے لئے بھی بھیجی جاتی ہے اور جب وہ اس آزمائش میں پورا اترتا ہے تو اس کے درجات آخرت بڑھ جاتے ہیں، یہ مصیبت درحقیقت اس کے لئے رحمت ونعمت ہوتی ہے، اس لئے انفرادی طور پر کسی شخص کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بہت گناہ گار ہے، اسی طرح کسی کو خوش عیش بعافیت دیکھ کر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ بڑا نیک صالح بزرگ ہے، البتہ عام مصائب وآفات جیسے قحط، طوفان، وبائی امراض، گرانی اشیاء ضرورت، چیزوں کی برکت مٹ جانا وغیرہ اس کا اکثر اور بڑا سبب لوگوں کے علانیہ گناہ اور سرکشی ہوتی ہے۔

مصائب وآفات کے ذریعہ جن لوگوں کو ان کے گناہوں کی کچھ سزا دی جاتی ہے اور جن نیک لوگوں کو رفع درجات یا کفارہ سیئات کے لئے بطور امتحان مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے، ظاہری صورت ابتلاء کی ایک ہی سی ہوتی ہے، تو ان دونوں میں فرق کیسے پہچانا جائے؟ ان دونوں صورتوں میں فرق کی علامت یہ ہے کہ جس مصیبت سے پہلے گناہ اور معصیت ہوئی ہو تو اس مصیبت کی علت گناہ ہے، اور جس مصیبت سے پہلے گناہ نہ ہوا ہو (جیسے انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں) تو اس کا سبب گناہ نہ ہوگا، ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جس مصیبت کے ساتھ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اپنے گناہوں پر تنبہ اور توبہ واستغفار کی رغبت زیادہ ہوجائے وہ علامت اس کی ہے کہ یہ قہر نہیں بلکہ مہر اور عنایت ہے اور جس کو یہ صورت نہ بنے بلکہ جزع وفزع اور معاصی میں اور زیادہ انہماک بڑھ جائے وہ علامت قہر الٰہی اور عذاب کی ہے، واللہ اعلم۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ: اس میں اشارہ ہے کہ شر یعنی برائی اور مصیبت مقصود بالذات نہیں، بلکہ اس کی مثال کڑوی دوا یا آپریشن کی سی ہے کہ ان دونوں سے صحت ہی مقصود ہوتی ہے تاہم وہ کڑوی دوا یا آپریشن محض صحت یابی کا ذریعہ ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو ان کے برے اعمال کی وجہ سے سزا دینا مقصود اس سے سزا نہیں، بلکہ اصلاح کرنا ہے۔

لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا: ''بعض اعمال'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر سب گناہوں پر یہ سزائیں دی جائیں تو ایک دم کوئی بھی زندہ نہ

رہے، جیسا ایک جگہ فرمایا: وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلَى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ ،اوراسی معنی سے آیت بالا میں: وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ فرمایا ہے، یعنی جو کچھ تم پر مصیبت آتی ہے تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کے سبب آتی ہے اور بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ معاف ہی کر دیتے ہیں، بعض ہی اعمال کی سزا دیتے ہیں، غرض جب اعمال بد مطلقاً سبب وبال ہیں تو شریک وکفر تو سب سے بڑھ کر موجب عذاب ہوگا۔

فائدہ: یعنی لوگ دین فطرت پر قائم نہ رہے کفر وظلم دنیا میں پھیل پڑا اور اس کی شامت سے ملکوں اور جزیروں میں خرابی پھیل گئی، نہ خشکی میں امن وسکون رہا نہ تری میں، روئے زمین کو فتنہ وفساد نے گھیر لیا بحری لڑائیوں اور جہازوں کی لوٹ مار سے سمندروں میں بھی طوفان بپا ہوگیا، یہ سب اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ بندوں کی بداعمالیوں کا تھوڑا سا مزہ دنیا میں بھی چکھا دیا جائے پوری سزا تو آخرت میں ملے گی، مگر کچھ نمونہ یہاں بھی دکھلا دیں، ممکن ہے بعض لوگ ڈر کر راہ راست پر آجائیں۔

تنبیہ: بندوں کی بدکاریوں کی وجہ سے خشکی اور تری میں خرابی پھیلنا گو ہمیشہ ہوتا رہا اور ہوتا رہیگا، لیکن جس خوفناک عموم وشمول کے ساتھ بعثت محمدی ﷺ سے پہلے یہ تاریک گھٹا مشرق ومغرب اور بر وبحر پر چھا گئی تھی، دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، یورپ کے محققین نے اس زمانہ کی تاریک حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر مسلم مورخ بھی اس مشہور ومعروف صداقت پر کوئی حرف گیری نہیں کر سکے (دیکھو دائرۃ المعارف فرید وجدی مادہ حمد) شاید اسی عموم فتنہ وفساد کو پیش نظر رکھ کر قتادہ رحمہ اللہ نے آیت کا محمل زمانہ جاہلیت کو قرار دیا ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ﴿٤٢﴾

تو کہہ پھرو ملک میں تو دیکھو کیسا ہوا انجام پہلوں کا بہت ان میں تھے شرک کرنے والے

خلاصہ تفسیر: (اور اگر مشرکین کو اس کے ماننے میں تردد ہو تو) آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ ملک میں چلو پھرو پھر دیکھو کہ جو (کافر ومشرک) لوگ پہلے ہو گزرے ہیں ان کا اخیر کیسا ہوا، ان میں اکثر مشرک ہی تھے (سو دیکھ لو وہ عذاب آسمانی سے کس طرح ہلاک ہوئے جس سے صاف واضح ہوا کہ شرک بڑی وبال کی چیز ہے)۔

كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ: یہ جو فرمایا کہ ''ان میں اکثر مشرک ہی تھے'' اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ شرک کے علاوہ کفر کی دوسری اقسام میں مبتلا تھے، جیسے قوم لوط اور قارون، اور وہ لوگ جو مسخ ہوکر بندر اور سور ہوگئے تھے کہ انہوں نے آیات کی تکذیب کی اور جن باتوں سے ان کو منع کیا گیا تھا ان کی مخالفت کی اس لیے کفر اور لعنت میں مبتلا ہوئے، اور شاید شرک کا خاص طور پر ذکر اس لئے ہو کہ کفار مکہ کی خاص اور مشہور حالت یہی تھی۔

فائدہ: یعنی اکثروں کی شامت شرک کی وجہ سے آئی، بعضوں پر دوسرے گناہوں کی وجہ سے آئی ہوگی۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۖ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ﴿٤٣﴾

سو تو سیدھا رکھ اپنا منہ سیدھی راہ پر ۱ اس سے پہلے کہ آپہنچے وہ دن جس کو پھرنا نہیں اللہ کی طرف سے ۲ اس دن لوگ جدا جدا ہوں گے ۳

خلاصہ تفسیر: (جب شرک کا موجب وبال ہونا ثابت ہوگیا) سو (اے مخاطب!) تم اپنا رخ اس دین راست (یعنی توحید اسلامی) کی طرف رکھو قبل اس کے کہ ایسا دن آئے جس کے واسطے پھر خدا کی طرف سے ہٹنا نہ ہوگا (یعنی جیسے دنیا میں کسی خاص عذاب کے وقت کو قیامت کے وعدہ پر ہٹا دیا جاتا ہے، جب وہ قیامت کا دن آجائے گا تو پھر اس کو ہٹایا نہ جاسکے گا، اس دن کے آنے کے لیے توقف اور مہلت نہ ہوگی، اس جملہ میں شرک کے اخروی وبال کا ذکر ہوگیا، جیسا اوپر ظَهَرَ الْفَسَادُ الخ اور: كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الخ میں دنیوی وبال مذکور تھا اور) اس دن (یہ

ہوگا کہ) سب (عمل کرنے والے) لوگ (جزاء وسزا کے اعتبار سے) جدا جدا ہوجائیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دنیا میں فساد پھیل گیا تو تم دین قیم پر جو دین فطرت ہے ٹھیک ٹھیک قائم رہو، سب خرابیوں کا ایک یہ ہی علاج ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کی طرف سے اس دن کا آنا اٹل ہے نہ کوئی طاقت اسے پھیر سکتی ہے نہ خود اللہ ملتوی کرے گا۔

فائدہ: ۳ یعنی نیک جنت میں اور بد دوزخ میں بھیج دیے جائینگے: فریق فی الجنة و فریق فی السعیر (شوریٰ) حضرت شاہ صاحبؒ اس کو دنیا کے احوال پر حمل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یعنی دین کا غلبہ ہو، سزا پانیوالے الگ ہوں اور اللہ کے مقبول بندے الگ''۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

جو منکر ہوا سو اس پر پڑے اس کا منکر ہونا ۱ اور جو کوئی کرے بھلے کام سو وہ اپنی راہ سنوارتے ہیں ۲

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

تاکہ وہ بدلہ دے ان کو جو یقین لائے اور کام کئے بھلے اپنے فضل سے ۳ بیشک اس کو نہیں بھاتے انکار والے ۴

خلاصہ تفسیر: (عمل کرنے والے جزا وسزا کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس طور پر ممتاز ہوجائیں گے کہ) جو شخص کفر کررہا ہے اس پر تو اس کا (وبال) کفر پڑے گا، اور جو نیک عمل کررہا ہے سو یہ لوگ اپنے (نفع کے) لئے سامان کررہے ہیں، جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے فضل سے (نیک) جزا دے گا جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے (اور اس سے کفار محروم رہیں گے جیسا کہ پیچھے فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ سے معلوم ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ) واقعی اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا (بلکہ ان کے کفر پر ان سے ناخوش ہے، اور کفر حقیقت میں ہے بھی ناخوشی کی بات اس لیے وہ اس دولت سے محروم ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی انکار کا وبال اسی پر پڑیگا۔

فائدہ: ۲ یعنی جنت میں آرام کرنے کی تیاری کررہے ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی کتنا ہی بڑا نیک ہو اسے بھی اللہ کے فضل سے جنت ملے گی۔

فائدہ: ۴ جو اس سچے مالک کو نہ بھائے اسکا کہاں ٹھکانا۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ

اور اسکی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والیاں اور تاکہ چکھائے تم کو کچھ مزہ اپنی مہربانی کا ۱ اور تاکہ چلیں جہاز

بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾

اس کے حکم سے ۲ اور تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم حق مانو ۳

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات سے کچھ قبل توحید کا مضمون تھا، اب پھر دوسرے عنوان سے توحید کے مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں، دوسرا عنوان یہ ہے کہ پہلے توحید کو دلائل کے پیرایہ میں ثابت کیا تھا اور یہاں خاص انعامات کے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں جو کہ بارش کے نازل ہونے اور اس کے آثار وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی (قدرت ونعمت اور توحید کی) نشانیوں میں سے ایک یہ (بھی) ہے کہ وہ (بارش سے پہلے) ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی) خوش خبری دیتی ہیں (پس ان کے بھیجنے میں ایک نفع تو مخلوق کا جی خوش کرنا ہے) اور (نیز اس واسطے) تا کہ (اس کے بعد بارش ہو اور) تم کو اپنی (اس) رحمت (بارش) کا مزہ چکھائے (یعنی بارش کے فوائد عنایت فرمائے) اور (نیز اس واسطے ہوا بھیجتا ہے) تا کہ (اس کے ذریعے سے بادبانی) کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تا کہ (اس ہوا کے ذریعہ سے جب کشتیاں چلیں تو تم ان کے ذریعہ سے دریا کے سفر سے) تم اس کی روزی تلاش کرو (یعنی کشتیوں کا چلنا اور ان میں سوار ہو کر بغرض تجارت سفر کرنا یہ دونوں کام ہوا کے ذریعے سے ہی حاصل ہوتے ہیں، پہلا بلا واسطہ اور دوسرا کشتی کے واسطے سے) اور تا کہ تم شکر کرو (یعنی روزی حاصل کر کے خدا کی ان تمام نعمتوں کا شکر کرو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی باران رحمت کی خوشخبری لاتی ہیں پھر خدا کی مہربانی سے مینہ برستا ہے

فائدہ: ۲؎ یعنی بادبانی جہاز اور کشتیاں ہوا سے چلتی ہیں اور دخانی اسٹیمروں کی رفتار میں بھی باد موافق مدد دیتی ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جہازوں کے ذریعہ سے تجارتی مال سمندر پار منتقل کر سکو، اور اللہ کے فضل سے خوب نفع کماؤ، پھر ان نعمتوں پر خدا کا شکر ادا کرتے رہو۔

تنبیہ: پہلے خشکی تری میں فساد پھیلنے کا ذکر تھا اس کے مقابل یہاں بشارت ونعمت الٰہی کا تذکرہ ہوا، شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ آندھی اور غبار پھیل جانے کے بعد امید رکھو کہ باران رحمت آیا چاہتی ہے، ٹھنڈی ہوائیں چل پڑی ہیں جو رحمت وفضل کی خوشخبری سنا رہی ہیں کافروں کو چاہیے کہ شرارت اور کفران نعمت سے باز آجائیں اور خدا کی مہربانیوں کو دیکھ کر شکر گزار بندے بنیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ

اور ہم بھیج چکے ہیں تجھ سے پہلے کتنے رسول اپنی اپنی قوم کے پاس سو پہنچے ان کے پاس نشانیاں لے کر پھر بدلہ لیا ہم نے ان سے جو

اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

گناہ گار تھے، اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی

خلاصہ تفسیر: اب رسول اللہ ﷺ کو تسلی ہے کہ ان نعمتوں کے بعد بھی جو یہ مشرکین شرک اور رسول کی مخالفت اور مسلمانوں کو ایذا دے کر حق تعالیٰ کی ناشکریاں کرتے ہیں اس سے آپ مغموم نہ ہوں، کیونکہ ہم عنقریب ان سے بدلہ لینے والے ہیں جس میں کفار مغلوب اور اہل حق غالب ہو جائیں گے جیسا کہ پہلے بھی ہوا ہے۔

اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر ان کی قوموں کے پاس بھیجے اور وہ ان کے پاس دلائل (ثبوت حق کے) لے کر آئے (جس پر بعض ایمان لائے اور بعض نہ لائے) سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو جرائم کے مرتکب ہوئے تھے (اور وہ جرائم یہ تھے کہ وہ حق کی تکذیب اور اہل حق کی مخالفت کرتے تھے، پس انتقام لے کر ہم نے انکو مغلوب اور اہل ایمان کو غالب کیا) اور اہل ایمان کو غالب کرنا (حسب وعدہ وعادت) ہمارے ذمہ تھا۔

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا: انتقام سے مراد عذاب الٰہی ہے، اور اس میں کفار کا ہلاک ہونا ان کا مغلوب ہونا ہے، اور مسلمانوں کا بچ جانا ان کا غالب آنا ہے، غرض اسی طرح ان کفار سے بھی انتقام لیا جائے گا، خواہ دنیا میں یا موت کے بعد۔

* * *

فائدہ: پہلے فرمایا تھا کہ مقبول اور مردود جدا کر دیے جائیں گے منکروں پر ان کے انکار کا وبال پڑے گا، وہ اللہ کو اچھے نہیں لگتے، اب بتلاتے ہیں کہ اسکا اظہار دنیا ہی میں ہو کر رہیگا، کیونکہ اللہ کی عادت اور وعدہ ہے کہ مجرمین ومکذبین سے انتقام لے اور مومنین کاملین کو اپنی امداد واعانت

سے دشمنوں پر غالب کرے، بیچ میں ہوا کا ذکر اس واسطے آیا کہ جیسے باران رحمت کے نزول سے پہلے ہوائیں چلتی ہیں اسی طرح دین کے غلبہ کی نشانیاں روشن ہوتی جاتی ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى

اللہ ہے جو چلاتا ہے ہوائیں پھر وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر پھیلا دیتا ہے اسکو آسمان میں جس طرح چاہے ۱ اور رکھتا ہے اس کو تہ بہ تہ پھر تو دیکھے

الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۝۴۸

مینہ کو کہ نکلتا ہے اسکے بیچ میں سے، پھر جب اس کو پہنچاتا ہے جس کو کہ چاہتا ہے اپنے بندوں میں تبھی وہ لگتے ہیں خوشیاں کرنے ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں تسلی کا مضمون بطور جملہ معترضہ کے آگیا تھا، اب دوبارہ ہواؤں کے بھیجنے کے بعض آثار بیان کیے جاتے ہیں، ایک آیت قبل اجمالا بیان تھا، یہاں اس کی تفصیل ہے:

اللہ ایسا (قادر وحکیم ومنعم) ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے پھر وہ (ہوائیں) بادلوں کو (جو کہ کبھی ان ہواؤں سے پہلے بخارات اٹھ کر بادل بن چکتے ہیں جن کو ہوائیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں، اور کبھی وہ بخارات انہی ہواؤں سے بلند ہوکر بادل بن جاتے ہیں، پھر وہ ہوائیں بادلوں کو ان کی جگہ سے یعنی فضائے آسمانی سے یا زمین سے) اٹھاتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اس (بادل) کو (کبھی تو) جس طرح چاہتا ہے آسمان (یعنی فضائے آسمانی) میں پھیلا دیتا ہے اور (کبھی) اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر (دونوں حالت میں) تم مینہ کو دیکھتے ہو کہ اس (بادل) کے اندر سے نکلتا ہے (گھرے ہوئے بادل سے بارش برستا تو بکثرت ہوتا ہے اور بعض موسموں میں متفرق بدلیوں سے بھی اکثر بارش ہو جاتی ہے) پھر (بادل سے نکلنے کے بعد) جب وہ (مینہ) اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے پہنچا دیتا ہے تو بس وہ خوشیاں کرنے لگتے ہیں۔

فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ: **فیبسطہ** یعنی پھیلانے کا مطلب یہ ہے کہ بادلوں کو اکٹھا کر کے دور تک پھیلا دیتا ہے، اور كَیْفَ یَشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ کبھی تھوڑی دور تک، کبھی بہت دور تک اور **کسفا** یعنی ٹکڑے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بادل ایک ساتھ گھرے ہوئے نہیں ہوتے، علیحدہ متفرق رہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی پہلے کسی طرف، پیچھے کسی طرف، اسی طرح دین بھی پھیلائے گا، چنانچہ پھیلا دیا۔

فائدہ: ۲ اسی طرح جو ایمانی اور روحانی بارش سے منتفع ہوں گے وہ خوشیاں منائیں گے۔

وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ ۝۴۹

اور پہلے سے ہو رہے تھے اس کے اترنے سے پہلے ہی ناامید

خلاصہ تفسیر: اور وہ لوگ قبل اس کے کہ ان کے خوش ہونے سے پہلے ان پر برسے (بالکل ہی) ناامید (ہو رہے) تھے (یعنی ابھی ابھی تو ناامید تھے اور ابھی خوش ہو گئے، اور ایسا ہی دیکھا بھی جاتا ہے کہ انسان کی کیفیت ایسی حالت میں بہت ہی جلدی بدل جاتی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی پہلے سے لوگ ناامید ہو رہے تھے، حتیٰ کہ بارش آنے سے ذرا پہلے تک بھی امید نہ تھی کہ مینہ برس کر ایسی جگ پر لو ہو جائیگی، انسان کا حال بھی عجیب ہے، ذرا دیر میں ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے پھر ذرا سی دیر میں خوشی سے کھل پڑتا ہے۔

فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ

سو دیکھ لے اللہ کی مہربانی کی نشانیاں کیونکر زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرگئے پیچھے ۱؎ بیشک وہی ہے مردوں کو زندہ کرنے والا

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو (ذرا) رحمت الٰہی (یعنی بارش) کے آثار (تو) دیکھو کہ اللہ تعالیٰ (اس کے ذریعہ سے) زمین کو اس کے مردہ (یعنی خشک) ہونے کے بعد کس طرح زندہ (یعنی تروتازہ) کرتا ہے (اور یہ بات نعمت اور دلیل توحید ہونے کے علاوہ اس کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر پوری قدرت ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا نے مردہ زمین کو زندہ کردیا) کچھ شک نہیں کہ وہی (خدا) مردوں کو زندہ کرنے والا ہے (پس عقلاً ممکن ہونے میں دونوں برابر ہیں، خشک زمین کا زندہ کرنا بھی اور مردوں کو زندہ کرنا بھی، اور قدرت خداوندی کے سامنے کوئی دشوار اور بعید نہیں تو جب ایک پر قدرت ثابت ہے دوسرے پر بھی ثابت ہے) اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ: اس میں تجلی افعال کے مشاہدہ کا حکم ملتا ہے، تجلی افعال کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کارخانہ عالم کا نظام جن اسباب کے تحت چلایا جارہا ہے اس نظام پر غور وفکر کیا جائے تاکہ خالق کائنات کی تدبیر وتخلیق کا مشاہدہ حاصل ہو، اللہ کی معرفت صفات ہی کے مشاہدہ سے ممکن ہے، ذات الٰہی کا مشاہدہ اس جہاں میں ممکن نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی چند گھنٹے پہلے ہر طرف خاک اڑ رہی تھی اور زمین خشک، بے رونق اور مردہ پڑی تھی ناگہاں اللہ کی مہربانی سے زندہ ہو کر لہلہانے لگی، بارش نے اس کی پوشیدہ قوتوں کو کتنی جلد ابھار دیا، یہ ہی حال روحانی بارش کا سمجھو، اس سے مردہ دلوں میں جان پڑ یگی اور خدا کی زمین **ظهر الفساد فی البر و البحر** والی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہو جائیگی، ہر طرف رحمت الٰہی کے نشان اور دین کے آثار نظر آئینگے جو قابلیتیں مدت سے مٹی میں مل رہی تھیں، باران رحمت کا ایک چھینٹا ان کو ابھار کر نمایاں کردیگا، چنانچہ حق تعالیٰ نے بعثت محمدی کے ذریعہ سے یہ جلوہ دنیا کو دکھلا دیا، ہمارے صوبہ کے شاعر حکیم نے کیا خوب کہا ہے:

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر — ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض کو کردے سما ابھار کر — اکبر اسی کو ورد تو صدق سے بے شمار کر
صل علی محمد، صل علی محمد

فائدہ: ۲؎ یعنی یہاں مردہ دلوں کو روحانی زندگی عطا فرمائے گا اور قیامت کے دن مردہ لاشوں میں دوبارہ جان ڈالے گا، اس کی قدرت کاملہ کے آگے کوئی چیز مشکل نہیں۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور اگر ہم بھیجیں ایک ہوا پھر دیکھیں وہ کھیتی کو کہ زرد پڑ گئی تو لگیں اس کے پیچھے ناشکری کرنے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں مردوں کو زندہ کرنے کا مضمون زمین کو زندہ کرنے کی مناسبت سے درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر تھا، اب پھر بارش اور ہواؤں کے متعلق مضمون ہے جس میں غافلوں کی ناشکری کا بیان ہے۔

اور (اہل غفلت ایسے حق ناشناس اور احسان فراموش ہیں کہ اتنی بڑی بڑی نعمتوں کے بعد) اگر ہم ان پر اور (قسم کی) ہوا چلادیں پھر (اس

ہوا سے) یہ لوگ کھیتی کو (خشک اور) زرد دیکھیں (کہ اس کی سبزی اور شادابی جاتی رہی) تو یہ اس کے بعد ناشکری کرنے لگیں (اور پچھلی نعمتیں سب طاق نسیاں میں رکھ دیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی پہلے ناامید تھے، بارش آئی، زمین جی اٹھی، خوشیاں منانے لگے، اب اگر اس کے بعد ہم ایک ہوا چلا دیں جس سے کھیتیاں خشک ہو کر زرد پڑ جائیں تو یہ لوگ فوراً پھر بدل جائیں گے اور اللہ کے سب احسان فراموش کر کے ناشکری شروع کر دیں، غرض ان کا شکر اور ناشکری سب دنیاوی اغراض کے تابع ہیں اور یہاں اس پر فرمایا کہ اللہ کی مہربانی سے مراد پا کر بندہ نڈر نہ ہو جائے، اس کی قدرت رنگارنگ ہے، معلوم نہیں دی ہوئی نعمت کب سلب کر لے، اور شاید ادھر بھی اشارہ ہو کر دین کی کھیتی دنیا میں سرسبز و شاداب ہونے کے بعد پھر باد مخالف کے جھونکوں سے مرجھا کر زرد پڑ جائیگی، اس وقت مایوس ہو کر ہمت ہارنی نہیں چاہئے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ

سو تو سنا نہیں سکتا مردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو پکارنا جبکہ پھریں پیٹھ دے کر، اور نہ تو راہ سجھائے

الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾ ع ۸

اندھوں کو ان کے بھٹکنے سے، تو تو سنائے اسی کو جو یقین لائے ہماری باتوں پر سو وہ مسلمان ہوتے ہیں [1]

خلاصہ تفسیر: سو (جب ان کی غفلت اور ناشکری کی یہ حالت ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ بالکل ہی بے حس ہیں، پس ان کے ایمان نہ لانے اور آیات میں غور و فکر نہ کرنے پر غم کرنا بھی بے کار ہے، کیونکہ) آپ مردوں کو (تو) نہیں سنا سکتے اور بہروں کو (بھی) آواز نہیں سنا سکتے (خصوصاً) جب کہ پیٹھ پھیر کر چل دیں (کہ اشارہ کو بھی نہ دیکھیں) اور (اسی طرح) آپ (ایسے) اندھوں کو (جو کہ آنکھوں والے کا اتباع نہ کریں) ان کی بے راہی سے راہ پر نہیں لا سکتے (غرض ان کفار کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے تمام حواس بالکل ماؤف اور معطل ہو جائیں) آپ تو بس ان کو سنا سکتے ہیں، جو ہماری آیتوں کا یقین رکھتے ہیں (اور) پھر وہ مانتے (بھی) ہیں (تو جب یہ کفار مردوں، بہروں، اندھوں کے مشابہ ہیں پھر ان سے ایمان کی توقع نہ رکھئے اور غم نہ کیجئے)۔

سورہ نمل کے آخر میں ۸۰-۸۱ میں ایسی ہی آیت آئی ہے وہاں سماع موتی کی تحقیق گزر چکی ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى: مردوں، بہروں اور اندھوں کے یہ تینوں جملوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت نہ نبی کے اختیار میں ہے، نہ کسی اور کے اختیار میں، تو بعض نادان لوگ کیسے یہ گمان کر لیتے ہیں کہ کامل بنا دینا شیخ و مرشد کے اختیار میں ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی اللہ کو سب قدرت ہے، مردہ کو زندہ کر دے، تم کو یہ قدرت نہیں کہ مردوں سے اپنی بات منواسکو یا بہروں کو سنا دو، یا اندھوں کو دکھلا دو، خصوصاً جب وہ سننے اور دیکھنے کا ارادہ بھی نہ کریں، پس آپ ان کے کفر و ناسپاسی سے ملول و غمگین نہ ہوں، آپ صرف دعوت و تبلیغ کے ذمہ دار ہیں کوئی بدبخت نہ مانے تو آپ کا کیا نقصان ہے آپ کی بات وہ ہی سنیں گے جو ہماری باتوں پر یقین کر کے تسلیم و انقیاد کی خو اختیار کرتے ہیں۔

تنبیہ: اسی قسم کی آیت سورہ نمل کے آخر میں گزر چکی، اس پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مفسرین نے اس موقع پر ''سماع موتی'' کی بحث چھیڑ دی ہے، اس مسئلہ میں صحابہؓ کے عہد سے اختلاف چلا آتا ہے اور دونوں جانب سے نصوص قرآن و حدیث پیش کی گئی ہیں، یہاں ایک بات سمجھ لو کہ یوں تو دنیا میں کوئی کام اللہ کی مشیت و ارادہ کے بدون نہیں ہو سکتا مگر آدمی جو کام اسباب عادیہ کے دائرہ میں رہ کر باختیار خود کرے وہ اسکی طرف منسوب ہوتا ہے اور جو عام عادت کے خلاف غیر معمولی طریقہ سے ہو جائے اسے براہ راست حق

تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہیں، مثلاً کسی نے گولی مار کر کسی کو ہلاک کر دیا یہ اس قاتل کا فعل کہلائے گا اور فرض کیجئے ایک مٹھی کنکریاں پھینکیں جس سے لشکر تباہ ہوگیا، اسے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے تباہ کر دیا باوجودیکہ گولی سے ہلاک کرنا بھی اسی کی قدرت کا کام ہے، ورنہ اس کی مشیت کے بدون گولی یا گولا کچھ بھی اثر نہیں کرسکتا، قرآن کریم میں دوسری جگہ فرمایا: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: ١٧) یہاں خارق عادت ہونے کی وجہ سے پیغمبر اور مسلمانوں سے ''قتل'' و''رمی'' کی نفی کرکے براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی، ٹھیک اسی طرح: انك لا تسمع الموتیٰ کا مطلب سمجھو، یعنی تم یہ نہیں کرسکتے کہ بولو اور اپنی آواز مردے کو سنا دو، کیونکہ یہ چیز ظاہری اور عادی اسباب کے خلاف ہے، البتہ حق تعالیٰ کی قدرت سے ظاہری اسباب کے خلاف تمہاری کوئی بات مردہ سن لے اس کا انکار کوئی مومن نہیں کرسکتا۔

اب نصوص سے جن باتوں کا اس غیر معمولی طریقہ سے سننا ثابت ہو جائے گا اسی حد تک ہم کو ''سماع موتی'' کا قائل ہونا چاہئے، محض قیاس کر کے دوسری باتوں کو سماع کے تحت میں نہیں لا سکتے، بہرحال آیت میں ''اسماع'' کی نفی سے مطلقاً ''سماع'' کی نفی نہیں ہوتی، واللہ اعلم۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا

اللہ ہے جس نے بنایا تم کو کمزوری سے پھر دیا کمزوری کے پیچھے زور پھر دے گا زور کے پیچھے کمزوری

وَّشَيْبَةً ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿٥٤﴾

اور سفید بال، بناتا ہے جو کچھ چاہے، اور وہ ہے سب کچھ جانتا کرسکتا

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا مضمون تھا، اب قیامت میں دوبارہ زندہ کرنے کا بیان ہے جو اور پر توحید کے مضمون میں بھی اجمالاً آچکا ہے:

اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا (مراد اس سے بچپن کی ابتدائی حالت ہے) پھر (اس) ناتوانی کے بعد توانائی (یعنی جوانی) عطا کی، پھر (اس) توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا کیا (اور) وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ (ہر تصرف کو) جاننے والا (اور اس تصرف کے نافذ کرنے پر) قدرت رکھنے والا ہے (پس جو ایسا قادر ہو اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی بچہ شروع میں پیدائش کے وقت بیحد کمزور ناتواں ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ قوت آنے لگتی ہے حتیٰ کہ جوانی کے وقت اسکا زور انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور تمام قوتیں شباب پر ہوتی ہیں، پھر عمر ڈھلنے لگتی ہے اور زور قوت کے پیچھے کمزوری کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں، جس کی آخری حد بڑھاپا ہے، اس وقت تمام اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے اور قویٰ معطل ہونے لگتے ہیں، قوت وضعف کا یہ سب اتار چڑھاؤ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس طرح چاہے جس چیز کو بنائے، اور قوت وضعف کے مختلف ادوار میں سے گزارے، اسی کو قدرت حاصل ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس چیز کو کس وقت تک کن حالات میں رکھنا مناسب ہے، لہذا اسی خدا کی اور اس کے پیغمبروں کی باتیں ہمیں سننی چاہئیں۔

شاید اس میں یہ بھی اشارہ کر دیا کہ جس طرح تم کو کمزوری کے بعد زور دیا، مسلمانوں کو بھی ضعف کے بعد زور پکڑیگا اور اپنے شباب وعروج کو پہنچے گا، اسکے بعد پھر ہوسکتا ہے کہ ایک زمانہ مسلمانوں کے ضعف کا آئے، سو یاد رکھنا چاہیے کہ خدائے قادر وتوانا ہر وقت ضعف کو قوت سے تبدیل کرسکتا ہے، ہاں ایسا کرنے کی خاص صورتیں اور اسباب ہوتے ہیں، واللہ اعلم۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ڏ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿٥٥﴾

اور جس دن قائم ہوگی قیامت قسمیں کھائیں گے گناہ گار کہ ہم نہیں رہے تھے ایک گھڑی سے زیادہ [1] اسی طرح تھے الٹے جاتے [2]

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں قیامت اور بعث کے ممکن ہونے کا بیان تھا، اب اس کے واقع ہونے کا بیان ہے۔

اور جس روز قیامت ہوگی مجرم (یعنی کافر) لوگ (وہاں کی ہول، ہیبت اور پریشانی کو دیکھ کر قیامت کی آمد کو انتہائی درجہ ناگوار سمجھ کر) قسم کھا بیٹھیں گے کہ (قیامت بہت جلدی آ گئی اور) وہ لوگ (یعنی ہم لوگ عالم برزخ میں) ایک ساعت سے زیادہ نہیں رہے (یعنی جو میعاد قیامت کے آنے کی مقرر تھی وہ بھی پوری نہ ہونے پائی کہ قیامت آ پہنچی جیسا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اگر پھانسی والے کی میعاد ایک ماہ مقرر کی جائے تو مہینہ گذرنے کے بعد اس کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا مہینہ نہیں گذرا، اور مصیبت جلدی آ گئی، حق تعالی کا ارشاد ہے کہ:) اسی طرح یہ لوگ (دنیا میں) الٹے چلا کرتے تھے (یعنی جس طرح یہاں آخرت میں قیامت کے قبل از وقت آجانے پر قسمیں کھانے لگے، اسی طرح دنیا میں قیامت کے وجود ہی کے سرے سے منکر تھے اور نہ آنے پر قسمیں کھایا کرتے تھے)۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ محشر میں کفار قسم کھا کر یہ جھوٹ بولیں گے کہ ہم تو دنیا میں یا قبر میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے، اسی طرح ایک دوسری آیت میں مشرکین کا یہ قول مذکور ہے کہ وہ قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم مشرک نہیں تھے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، وجہ یہ ہے کہ محشر میں رب العالمین کی عدالت قائم ہوگی وہ سب کو آزادی دیں گے کہ جو چاہے بیان دے، جھوٹ بولے یا سچ بولے، کیونکہ رب العزت کو ذاتی علم بھی پورا پورا ہے اور عدالتی تحقیقات کے لئے وہ ان کے اقرار کرنے نہ کرنے کا محتاج نہیں، جب انسان جھوٹ بولے گا تو اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے ہاتھ پاؤں اور کھال و بال سے شہادت لی جائے گی، وہ سچ سچ سارا واقعہ بیان کردیں گے، جس کے بعد اس کو کوئی حجت باقی نہ رہے گی: اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ کا یہی مطلب ہے، اور قرآن کریم کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں مختلف مواقف ہوں گے، ہر موقف کے حالات الگ ہیں، ایک موقف وہ بھی ہوگا جس میں بغیر اذن الٰہی کسی کو بولنے کا اختیار نہ ہوگا اور وہ صرف سچ اور صحیح بات ہی بول سکے گا، جھوٹ پر قدرت نہ ہوگی، جیسا ارشاد ہے: لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی قبر میں یا دنیا میں رہنا تھوڑا معلوم ہوگا جب مصیبت سر پر کھڑی نظر آئے گی کہیں گے کہ افسوس بڑی جلدی دنیا کی اور برزخ کی زندگی ختم ہوگئی، کچھ بھی مہلت نہ ملی جو ذرا سی دیر اور اس عذاب الیم سے بچے رہتے، یا دنیا میں کچھ زیادہ مدت ٹھہرنے کا موقع ملتا تو اس دن کے لئے تیاری کرتے یہ تو ایک دم مصیبت کی گھڑی سامنے آ گئی۔

فائدہ: ۲۔ یعنی جیسے اسوقت یہ کہنا جھوٹ اور غلط ہوگا اسی طرح سمجھو کہ دنیا میں بھی یہ لوگ غلط خیالات جماتے اور الٹی باتیں کیا کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ز

اور کہیں گے جن کو ملی ہے سمجھ اور یقین تمہارا ٹھہرنا تھا اللہ کی کتاب میں جی اٹھنے کے دن تک

فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٥٦﴾

سو یہ ہے جی اٹھنے کا دن پر تم نہیں تھے جانتے

خلاصہ تفسیر: اور جن لوگوں کو ایمان اور علم عطا ہوا ہے (مراد اہل ایمان ہیں جن کو شریعت کی خبروں کا علم حاصل ہے) وہ (ان مجرمین کے جواب میں) کہیں گے کہ (تم عالم برزخ میں میعاد سے کم ہرگز نہیں رہے، تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے بلکہ) تم تو (میعاد) نوشتہ خداوندی کے موافق قیامت کے دن تک رہے، سو قیامت کا دن یہی ہے (جو میعاد مقرر تھی برزخ میں رہنے کی) ولیکن (وجہ اس بات کی کہ قیامت کو میعاد سے پہلے آیا ہوا سمجھتے ہو یہ ہے کہ) تم (دنیا میں قیامت کے وقوع کا) یقین (اور اعتقاد) نہ کرتے تھے (بلکہ تکذیب و انکار کیا کرتے تھے)۔

اس انکار کے وبال میں آج تم کو پریشانی کا سامنا ہوا، اس وجہ سے گھبرا کر یہ خیال ہوا کہ ابھی تو میعاد پوری بھی نہیں ہوئی، حالانکہ وہ ٹھیک وقت پر آئی ہے، اور اگر تم تصدیق کرتے اور ایمان لے آتے تو اس کے واقع ہونے کو جلدی نہ سمجھتے، بلکہ یوں چاہتے کہ اس سے بھی جلدی آ جاتی، کیونکہ

انسان جب اس سے کسی راحت و آرام کا وعدہ ہو تو طبعی طور پر اس کا جلدی آنا چاہتا ہے اور انتظار کی مدت اس پر طویل اور گراں گذرتی ہے، جیسا کہ حدیث میں بھی ہے کہ کافر قبر میں کہتا ہے: "رب لا تقم الساعة" الٰہی! قیامت نہ لائیو، اور مومن کہتا ہے: "رب أقم الساعة"، الٰہی! قیامت جلدی قائم کردے، اور مومنین کے اس جواب سے بھی جو یہاں مذکور ہے کہ مقام برزخ کو انہوں نے بہت سمجھا ہے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے مشتاق تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ جلد آجائے۔

* * *

فائدہ: یعنی مومنین اور ملائکہ اس وقت ان کی تردید کرینگے کہ تم جھوٹ بکتے ہو یا دھوکہ میں پڑے ہو جو کہتے ہو کہ قبر میں یا دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ ٹھہرنا نہیں ہوا، تم ٹھیک اللہ کے علم اور اس کی خبر اور لوح محفوظ کے نوشتہ کے موافق قیامت کے دن تک ٹھہرے، ایک منٹ کی بھی کمی نہیں ہوئی، آج عین وعدہ کے موافق وہ دن آپہنچا، اب وہ دیکھ لو جسے تم جانتے اور مانتے نہ تھے، اگر پہلے سے اس دن کا یقین کرتے تو تیار ہو کر آتے اور یہاں کی مسرتیں دیکھ کر کہتے کہ اس دن کے آنے میں بہت دیر لگی، بڑے انتظار و اشتیاق کے بعد آیا، جیسا کہ مومنین سمجھتے ہیں۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنفَعُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿٥٧﴾

سو اس دن کام نہ آئے گا ان گناہ گاروں کو قصور بخشوانا اور نہ ان سے کوئی منانا چاہے

خلاصہ تفسیر: غرض اس روز ظالموں (یعنی کافروں کی پریشانی اور مصیبت کی یہ کیفیت ہوگی کہ ان) کو ان کا (کسی قسم کا جھوٹا سچا) عذر کرنا نفع نہ دے گا اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا تدارک چاہا جائے گا (یعنی اس کا موقع نہ دیا جائے گا کہ توبہ کرکے خدا کو راضی کرلیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی نہ کوئی معقول عذر پیش کرسکیں گے جو کام آئے اور نہ ان سے کہا جائیگا کہ اچھا اب توبہ اور اطاعت سے اپنے پروردگار کو راضی کرلو، کیونکہ اس کا وقت گزر چکا اب تو ہمیشہ کی سزا بھگتنے کے سوا چارہ نہیں۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَلَئِن جِئْتَهُم بِآيَةٍ لَّيَقُولَنَّ

اور ہم نے بتلائی ہے آدمیوں کے واسطے اس قرآن میں ہر ایک طرح کی مثل، اور جو تو لائے ان کے پاس کوئی آیت تو ضرور کہیں

الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُبْطِلُونَ ﴿٥٨﴾

وہ منکر تم سب جھوٹ بناتے ہو

خلاصہ تفسیر: اب خاتمہ میں دو مضمون ہیں جو اس سورت کے تمام مضامین کا گویا نتیجہ ہے، یعنی سورت کے تمام مضامین کی مدح اور ان کے بلیغ ہونے کا اجمالی بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مضامین تاثیر میں بہت کامل ہیں، اور باوجود اس تاثیر کے کفار کے نہ ماننے پر حضور ﷺ کی تسلی کے لیے کفار کی سرکشی اور جہالت کا ذکر ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے واسطے اس قرآن (کے مجموعہ یا اس کے خاص جز یعنی اس سورۃ) میں، ہر طرح کے عمدہ (اور عجیب، ضروری) مضامین بیان کئے ہیں (جو اپنی بلاغت اور کمال تاثیر کی وجہ سے اس کو مقتضی ہیں کہ ان کافروں کو ہدایت ہوجاتی، مگر ان لوگوں نے غایت عناد کی وجہ سے اس کو قبول نہ کیا اور اس سے منتفع نہ ہوئے) اور (قرآن کی کیا تخصیص ہے ان لوگوں کا عناد اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ) اگر (قرآن کے علاوہ ان معجزات سے جن کی یہ خود فرمائش کیا کرتے ہیں) آپ ان کے پاس کوئی نشان لے آئیں تب بھی یہ لوگ جو کہ کافر ہیں یہی کہیں گے کہ تم سب (یعنی پیغمبر ﷺ اور مومنین جو تشریعی و تکوینی آیات کی تصدیق کرتے ہیں) نرے اہل باطل ہو (پیغمبر پر جادو کی تہمت لگا کر صاحب باطل کہیں اور مسلمانوں

کو جادو کی تصدیق کرنے سے اہل باطل کہیں)۔

***

فائدہ: یعنی اس وقت پچھتائیں گے اور آج خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقع ہے قرآن کریم کیسی عجیب مثالیں اور دلیلیں بیان کر کے طرح طرح سے ان کو سمجھاتا ہے، پر ان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی، کیسی ہی آیتیں پڑھ کر سنایئے یا صاف سے صاف معجزے دکھلایئے وہ سن کر اور دیکھ کر یہ ہی کہہ دیتے ہیں کہ تم (پیغمبر اور مسلمان) سب مل کر جھوٹ بنالائے ہو، ایک نے چند آیتیں بنالیں دوسروں نے تصدیق کردی، ایک نے جادو دکھلایا دوسرے اس پر ایمان لانے کو تیار ہو گئے، اس طرح ملی بھگت کر کے اپنا مذہب پھیلانا چاہتے ہو۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٩﴾

یوں مہر لگا دیتا ہے اللہ ان کے دلوں پر جو سمجھ نہیں رکھتے

خلاصہ تفسیر: (اور ان لوگوں کے اس عناد کے بارے میں اصل بات یہ ہے کہ) جو لوگ (مکرر نشانیاں اور دلائل حق ظاہر ہونے کے باوجود) یقین نہیں کرتے (اور نہ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر یوں ہی مہر کر دیا کرتا ہے (جیسا کہ ان کے دلوں پر ہو رہی ہے کہ بار بار دلائل اور معجزات ظاہر ہوجانے کے باوجود پھر بھی طریق حق حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے جس سے حق بات قبول کرنے کی استعداد روزانہ مضمحل اور کمزور ہوتی جاتی ہے اس لیے اطاعت سے انحراف اور سرکشی میں زیادتی ہوتی جارہی ہے)۔

***

فائدہ: یعنی جو آدمی نہ سمجھے، نہ سمجھنے کی کوشش کرے اور ضد و عناد سے ہر بات کا انکار کرتا رہے اور اسی طرح شدہ شدہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور آخر کار ضد و عناد سے دل اتنا سخت ہوجاتا ہے کہ قبول حق کی استعداد بھی ضائع کر بیٹھتا ہے، العیاذ باللہ!

ع فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿٦٠﴾

سو تو قائم رہ بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے اور اکھاڑ نہ دیں تجھ کو وہ لوگ جو یقین نہیں لاتے

خلاصہ تفسیر: (اب حضور ﷺ کو خطاب ہے) سو (جب یہ ایسے سرکش ہیں تو ان کی مخالفت، ایذا رسانی اور بدکلامی وغیرہ پر) آپ صبر کیجئے بیشک اللہ تعالیٰ کا وعدہ (کہ آخر میں اہل کفر ناکام اور اہل حق کامیاب ہوں گے) سچا ہے (وہ وعدہ ضرور واقع ہوگا، پس صبر و تحمل تھوڑے ہی دن کرنا پڑتا ہے) اور یہ بدیقین لوگ آپ کو بے برداشت نہ کرنے پائیں (یعنی ان کی طرف سے خواہ کیسی ہی بات پیش آئے مگر آپ تحمل و برداشت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں)۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ: مطلب یہ کہ نفسانی انتقام اگرچہ فی نفسہ جائز ہے، مگر پیغمبر کو اپنے نفس کی وجہ سے انتقام لینا مناسب نہیں، بلکہ خلاف مصلحت ہے، خصوصاً ایسے وقت میں کہ اسلام کی ابتدائی حالت تھی، باقی رہا جہاد سو وہ فی نفسہ انتقام نہیں ہے، اس لیے اس کی ممانعت بھی نہیں ہے، پس اس آیت کا جہاد سے کوئی تعارض نہیں کہ ناسخ و منسوخ کا قائل ہونا پڑے۔

اس آیت میں وارثان محمدی کو جو کہ درحقیقت اہل ارشاد ہیں منکرین کے شدائد و مکارہ پر صبر و تحمل کرنے کی ہدایت ہے۔

***

فائدہ: یعنی جب ان بدبختوں کا حال ضد و عناد کے اس درجہ پر پہنچ گیا تو آپ ﷺ ان کی شرارتوں سے رنجیدہ نہ ہوں، بلکہ پیغمبرانہ صبر و تحمل کے ساتھ اپنے دعوت و اصلاح کے کام میں لگے رہیں، اللہ نے جو آپ سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے یقیناً پورا کر کے رہے گا، اس میں رتی برابر تفاوت و تخلف نہیں ہوسکتا، آپ اپنے کام پر جمے رہیے، یہ بدعقیدہ اور بےیقین لوگ آپ کو ذرا بھی آپ کے مقام سے جنبش نہ دے سکیں گے۔

ركوعاتها ٤ ۳۱ سُوْرَةُ لُقْمٰنَ مَكِّيَّةٌ ۵۷ اٰياتها ۳٤

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝١ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝٢ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝٣ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

الف لام میم، یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی ہدایت ہے، اور مہربانی نیکی کرنے والوں کے لئے ا جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز

وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝٤ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ

اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور وہ ہیں جو آخرت پر ان کو یقین ہے، انہوں نے پائی ہے راہ اپنے رب کی طرف سے اور وہی

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝٥

مراد کو پہنچے ۲

خلاصہ تفسیر: اس سورت کے شروع میں قرآن کریم کی مدح وتعریف ہے جو گذشتہ سورت کے اختتام پر بھی مذکور ہے، اور بقیہ مضامین بھی دونوں سورتوں کے باہم مناسب ہیں جیسا کہ آئندہ معلوم ہوجائے گا۔

الم (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ (جو اس سورۃ یا قرآن میں مذکور ہیں) آیتیں ہیں ایک پرحکمت کتاب (یعنی قرآن) کی جو کہ ہدایت اور رحمت (کا سبب) ہے نیک کاروں کے لئے، جو نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ لوگ آخرت کا پورا یقین رکھتے ہیں (سو) یہ لوگ (اس قرآن کے اعتقاد اور عمل کی بدولت) اپنے رب کے سیدھے راستہ پر ہیں اور یہی لوگ (اس ہدایت کی بدولت) فلاح پانے والے ہیں (پس قرآن اس طرح ان کے لئے ہدایت اور رحمت کا سبب ہوگیا جس کا انجام فلاح وکامیابی ہے)۔

وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ: محسنین جو کہ ہدایت کے اعلیٰ درجات پر فائز ہیں اس کے باوجود قرآن کا ان کے لیے موجب ہدایت ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہدایت کے بے شمار مراتب ہیں، درجہ احسان کی کوئی حد نہیں، انسان قرآن کی ہدایت اختیار کرکے اللہ تعالیٰ کے یہاں درجہ بدرجہ قریب تر ہوتا رہتا ہے۔

وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: زکوۃ کی فرضیت اگر چہ مدینہ میں ہوئی، مکہ میں جائز اور مستحب ہوگی، اس لیے جو سورتیں مکی ہیں جیسے یہ سورت، سورہ مؤمنین یا سورہ روم ان میں زکوۃ کا ذکر آنے سے کوئی اشکال نہیں، احقر نے ان مذکورہ سورتوں کی تفسیر میں "صدقہ" سے تعبیر کیا ہے۔

* * *

فائدہ: ا یہ کتاب خاص نیکی اختیار کرنے والوں کے لئے سرمایہ رحمت وہدایت ہے، کیونکہ وہ ہی لوگ اس سے منتفع ہوتے ہیں، ورنہ نفس نصیحت وفہمائش کے لحاظ سے تو تمام جن وانس کے حق میں ہدایت ورحمت بن کر آئی ہے۔

فائدہ: ۲ "سورہ بقرہ" کے شروع میں اسی طرح کی آیات گزر چکی ہیں وہاں کے فوائد دیکھ لئے جائیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ

اور ایک وہ لوگ ہیں کہ خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے تا کہ بچلائیں اللہ کی راہ سے بن سمجھے

وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

اور ٹھہرائیں اسی کو ہنسی، وہ جو ہیں ان کو ذلت کا عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: (پس بعض لوگ تو ایسے ہیں جیسا گذشتہ آیت میں بیان کیا) اور (ان کے برخلاف) بعض آدمی ایسا (بھی) ہے جو (قرآن سے اعراض کر کے) ان باتوں کا خریدار بنتا ہے (یعنی ایسی باتیں اختیار کرتا ہے) جو (اللہ سے) غافل کرنے والی ہیں (سو اول تو لہو ولعب کا اختیار کرنا جب کہ اس کے ساتھ خدا کی آیتوں سے اعراض بھی ہو خود ہی کفر اور گمراہی ہے، پھر خاص کر جب کہ اس کو اس غرض سے اختیار کیا جائے) تا کہ (اس کے ذریعہ سے دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ (یعنی دین حق سے) بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے اور (اسی گمراہ کرنے کے ساتھ) اس (راہ حق) کی ہنسی اڑادے (تا کہ دوسروں کے دل سے بالکل اس کی وقعت اور تاثیر نکل جائے، تب تو کفر بر کفر اور اپنی گمراہی کے ساتھ دوسروں کو بھی گمراہ کرنا ہے اور) ایسے لوگوں کے لیے (آخرت میں) ذلت کا عذاب (ہونے والا) ہے (جیسا کہ پہلی قسم کے لوگوں کے لئے فلاح و کامیابی کا ہونا معلوم ہوا)۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ: اس آیت کا شان نزول ایک خاص واقعہ ہے کہ نضر بن حارث مشرکین مکہ میں سے ایک بڑا تاجر تھا اور تجارت کے لئے مختلف ملکوں کا سفر کرتا تھا۔ وہ ملک فارس سے شاہان عجم کسریٰ وغیرہ کے تاریخی قصے خرید کر لایا اور مکہ کے مشرکین سے کہا کہ محمد ﷺ تم کو قوم عاد و ثمود وغیرہ کے واقعات سناتے ہیں، میں تمہیں ان سے بہتر رستم اور اسفند یار اور دوسرے شاہان کے قصے سناتا ہوں، یہ لوگ اس کے قصہ کو شوق ورغبت سے سننے لگے، کیونکہ ان میں کوئی تعلیم تو تھی نہیں جس پر عمل کرنے کی محنت اٹھانی پڑے، صرف لذیذ قسم کی کہانیاں تھیں، ان کی وجہ سے بہت سے مشرکین جو اس سے پہلے کلام الٰہی کے اعجاز اور یکتائی کی وجہ سے اس کو سننے کی رغبت رکھتے اور چوری چوری سنا بھی کرتے تھے، ان لوگوں کو قرآن سے اعراض کا بہانہ ہاتھ آ گیا، تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مذکور الصدر تاجر باہر سے ایک گانے والی کنیز (لونڈی) خرید کر لایا تھا اور اس کے ذریعہ اس نے لوگوں کو قرآن سننے سے روکنے کی یہ صورت نکالی کہ جو لوگ قرآن سننے کا ارادہ کریں اپنی اس کنیز سے ان کو گانا سنواتا تھا اور کہتا تھا کہ: ”محمد ﷺ تم کو قرآن سنا کر کہتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو اور اپنی جان دو جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، آؤ تم یہ گانا سنو اور جشن طرب مناؤ“۔

مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ: قرآن کریم کی مذکورہ آیت اسی واقعہ پر نازل ہوئی، اور اس میں ”اشتراء لھو الحدیث“ سے شاہان عجم کے وہ قصے کہانیاں، یا یہ گانے والی لونڈی مراد ہے، واقعہ نزول کے اعتبار سے لفظ ”اشتراء“ بھی اس جگہ عام ہے، یعنی ایک کام کے بدلے میں دوسرے کو اختیار کرنا، اس میں سامان لہو کی خریداری بھی داخل ہے، اور لہو الحدیث میں لفظ ”حدیث“ تو باتوں اور قصے کہانیوں کے معنی میں ہے اور ”لہو“ کے لفظی معنی غفلت میں پڑنے کے ہیں، جو چیزیں انسان کو ضروری کاموں سے غفلت میں ڈالیں وہ ”لہو“ کہلاتی ہیں اور بعض اوقات ایسے کاموں کو بھی ”لہو“ کہا جاتا ہے جن کا کوئی معتد بہ فائدہ نہ ہو، محض وقت گزاری کا مشغلہ یا دل بہلانے کا سامان ہو، آیت مذکورہ میں ”لہو الحدیث“ کے معنی اور تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، حضرت ابن مسعود، ابن عباس و جابر رضی اللہ عنہم کی ایک روایت میں اس کی تفسیر گانے بجانے سے کی گئی ہے۔

اور جمہور صحابہ و تابعین اور عامہ مفسرین کے نزدیک ”لہو الحدیث“ عام ہے تمام ان چیزوں کے لئے جو انسان کو اللہ کی عبادت اور یاد سے غفلت میں ڈالے، اس میں غناء مزامیر بھی داخل ہے اور بے ہودہ قصے کہانیاں بھی، امام بخاری نے اپنی کتاب الادب المفرد میں اور بیہقی نے اپنی سنن میں ”لہو الحدیث“ کی یہی تفسیر اختیار کی ہے، اس میں فرمایا ہے کہ: ”لھو الحدیث : ھو الغناء و أشباھه“، یعنی لہو الحدیث سے مراد گانا اور اس کے مشابہ دوسری چیزیں ہیں (یعنی جو اللہ کی عبادت سے غافل کر دیں) اور سنن بیہقی میں ہے کہ ”اشتراء لہو الحدیث“ سے مراد گانے بجانے والے مرد یا عورت کو خریدنا یا اس کے امثال ایسی بے ہودہ چیزوں کو خریدنا ہے جو اللہ کی یاد سے غافل کریں، ابن جریر نے بھی اسی عام معنی کو اختیار فرمایا ہے، اور ترمذی کی ایک روایت سے بھی یہی عموم ثابت ہوتا ہے جس میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ گانے والی لونڈیوں کی تجارت نہ کرو، اور پھر فرمایا: ”فی مثل ھذا أنزلت ھذہ الآیة: ﴿ومن الناس من یشتری﴾“ الخ۔

آیت مذکورہ میں چند صحابہ کرام نے تو ''لہوالحدیث'' کی تفسیر گانے بجانے سے کی ہے، اور دوسرے حضرات نے اگرچہ تفسیر عام قرار دی ہے، یعنی ہر ایسے کھیل کو جو اللہ سے غافل کرے ''لہوالحدیث'' فرمایا ہے، مگر ان کے نزدیک بھی گانا بجانا اس میں داخل ہے، اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت: **لا یشھدون الزور** میں امام ابوحنیفہ اور مجاہد اور محمد بن الحنفیہ وغیرہ نے ''زور'' کی تفسیر غناء (گانے بجانے) سے کی ہے، اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے سنن میں اور ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں حضرت ابو مالک اشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے کچھ لوگ شراب کو اس کا نام بدل کر پئیں گے ان کے سامنے معازف ومزامیر کے ساتھ عورتوں کا گانا ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں خسف کردے گا اور بعض کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنادے گا''، اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے اور طبلہ وسارنگی کو حرام کیا ہے اور فرمایا کہ ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی مستند احادیث ہیں جن میں گانے بجانے کو حرام وناجائز فرمایا ہے اور اس پر وعید شدید ہے، اس کے مقابل بعض روایات سے غنا یعنی گانے کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے، یعنی خوش آوازی کے ساتھ بغیر آلات موسیقی کے مفید اشعار کا پڑھنا ممنوع نہیں، تطبیق ان دونوں میں اس طرح ہے کہ جو گانا اجنبی عورت کا ہو یا اس کے ساتھ طبلہ سارنگی وغیرہ آلات موسیقی ہوں وہ حرام ہے، جیسا کہ مذکورہ آیت قرآن اور احادیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا، اور اگر محض خوش آوازی کے ساتھ کچھ اشعار پڑھے جائیں اور پڑھنے والی عورت یا مرد نہ ہوں، اور اشعار کے مضامین بھی فحش یا کسی دوسرے گناہ پر مشتمل نہ ہوں تو جائز ہے، بعض صوفیائے کرام سے جو سماع غنا منقول ہے وہ اسی قسم کے جائز غنا پر محمول ہے، کیونکہ ان کا اتباع شریعت اور اطاعت رسول اللہ ﷺ آفتاب کی طرح یقینی ہے، ان سے ایسے گناہ کے ارتکاب کا گمان نہیں کیا جاسکتا، محققین صوفیائے کرام نے خود اس کی تصریح فرمائی ہے، اس معاملہ میں مذاہب اربعہ کے فقہاء اور صوفیائے کرام کے اقوال بھی موجود ہیں ہیں، یہاں اختصار پر اکتفا کیا گیا، واللہ المستعان۔

* * *

فائدہ: سعدائے مفلحین کے مقابلہ میں یہ ان اشقیاء کا ذکر ہے جو اپنی جہالت اور ناعاقبت اندیشی سے قرآن کریم کو چھوڑ کر ناچ رنگ کھیل تماشے، یا دوسری واہیات وخرافات میں مستغرق ہیں چاہتے ہیں، کہ دوسروں کو بھی ان ہی مشاغل وتفریحات میں لگا کر اللہ کے دین اور اس کی یاد سے برگشتہ کردیں اور دین کی باتوں پر خوب ہنسی مذاق اڑائیں، حضرت حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ **لھو الحدیث** کے متعلق فرماتے ہیں: ''کل ماشغلك عن عبادة الله و ذكره من السمر و الأضاحيك والخرافات والغناء و نحوها'' (روح المعانی) (یعنی **لھو الحدیث** ہر وہ چیز ہے جو اللہ کی عبادت اور یاد سے ہٹانے والی ہو، مثلاً فضول قصہ گوئی، ہنسی مذاق کی باتیں واہیات مشغلے اور گانا بجانا وغیرہ)۔

روایات میں ہے کہ نضر بن حارث جو رؤسائے کفار میں تھا بغرض تجارت فارس جاتا تو وہاں سے شاہان عجم کے قصص وتواریخ خرید کر لاتا اور قریش سے کہتا کہ محمد ﷺ تم کو عاد وثمود کے قصے سناتے ہیں، آؤ میں تم کو رستم واسفندیار اور شاہان ایران کے قصے سناؤں، بعض لوگ ان کو دلچسپ سمجھ کر ادھر متوجہ ہوجاتے، نیز اس نے ایک گانے والی لونڈی خرید کی تھی، جس کو دیکھتا کہ دل نرم ہوا اور اسلام کی طرف جھکا، اسکے پاس لے جاتا اور کہہ دیتا کہ اسے کھلا پلا اور گانا سنا، پھر اس شخص کو کہتا کہ دیکھ یہ اس سے بہتر ہے جدھر محمد ﷺ بلاتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، اور جان مارو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تنبیہ: شان نزول گو خاص ہو مگر عموم الفاظ کی وجہ سے حکم عام رہے گا، جو لہو (شغل) دین اسلام سے پھر جانے یا پھیر دینے کا موجب ہو حرام بلکہ کفر ہے، اور جو احکام شرعیہ ضروریہ سے باز رکھے یا سبب معصیت بنے وہ معصیت ہے، ہاں! جو لہو کسی امر واجب کا مفوت (فوت کرنے والا) نہ ہو اور کوئی شرعی غرض ومصلحت بھی اس میں نہ ہو وہ مباح ہے، لیکن لایعنی ہونے کی وجہ سے خلاف اولیٰ ہے، گھڑ دوڑ، یا تیر اندازی اور نشانہ بازی یا زوجین کی ملاعبت (جو حد شریعت میں ہو) چونکہ معتد بہ اغراض ومصالح شرعیہ پر مشتمل ہیں اس لئے لہو باطل سے مستثنیٰ قرار دی گئی ہیں۔

رہا غنا وسماع کا مسئلہ اس کی تفصیل کتب فقہ وغیرہ میں دیکھنی چاہئے، مزامیر وملاہی کی حرمت پر تو صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے، البتہ نفس غنا کو ایک درجہ تک مباح لکھتے ہیں اس کی قیود وشروط بھی کتابوں میں دیکھ لی جائیں، صاحب روح المعانی نے آیت ہذا کے تحت میں مسئلہ غنا وسماع کی تحقیق

نہایت شرح وبسط سے کی ہے، فلیراجع۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ

اور جب سنائے اس کو ہماری آیتیں پیٹھ دے جائے غرور سے گویا انکو سنا ہی نہیں گویا اس کے دونوں کان بہرے ہیں، سو خوشخبری دے اس کو

بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ⑦

دردناک عذاب کی

خلاصہ تفسیر: اور (اس مذکورہ شخص کے اعراض کی یہ حالت ہے کہ) جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ شخص تکبر کرتا ہوا (ایسی بے التفاتی سے) منہ موڑ لیتا ہے جیسے اس نے سنا ہی نہیں، جیسے اس کے کانوں میں ثقل ہے (یعنی جیسے بہرا ہے) سو اس (شخص) کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

* * *

فائدہ: یعنی غرور تکبر سے ہماری آیتیں سننا نہیں چاہتا بالکل بہرا بن جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۙ⑧

جو لوگ یقین لائے اور کئے بھلے کام ان کے واسطے ہیں نعمت کے باغ

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑨

ہمیشہ رہا کریں ان میں وعدہ ہو چکا اللہ کا سچا اور زبردست ہے حکمتوں والا ؎

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اعراض کرنے والوں کی سزا کا بیان ہوا، اب ہدایت والوں کی کامیابی کو بیان فرماتے ہیں۔

البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے عیش کی جنتیں ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ نے سچا وعدہ فرمایا ہے، اور وہ زبردست حکمت والا ہے (پس کمال قدرت کی وجہ سے وہ اپنے وعدہ اور وعید کو واقع کر سکتا ہے اور حکمت سے اس کو وعدہ کے مطابق وقت پر واقع کر دے گا)۔

* * *

فائدہ: ؎ یعنی کوئی قوت اس کو ایفائے وعدہ سے روک نہیں سکتی نہ کسی سے بے موقع وعدہ کرتا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا

بنائے آسمان بغیر ستونوں کے تم اس کو دیکھتے ہو ؎ اور رکھ دیئے زمین پر پہاڑ کہ تم کو لیکر جھک نہ پڑے ؎ اور بکھیر دیئے اس میں

مِنْ كُلِّ دَاۗبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑩

سب طرح کے جانور، اور اتارا ہم نے آسمان سے پانی پھر اگائے زمین میں ہر قسم کے جوڑے خاصے ؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے قرآن کریم اور اس کے ماننے والوں کی مدح و تعریف اور بے رخی اور اعراض کرنے والوں کی مذمت تھی، اب آگے دور تک توحید کا مضمون ہے جو قرآن کی بڑی اہم تعلیم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بلا ستون بنایا (چنانچہ) تم ان کو دیکھ رہے ہو، اور زمین میں (بھاری بھاری) پہاڑ ڈال رکھے ہیں کہ وہ تم کو لے کر ڈانوا ڈول نہ ہونے لگے، اور اس (زمین) میں ہر قسم کے جانور پھیلا رکھے ہیں، اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس زمین میں ہر طرح کے عمدہ اقسام (نباتات کے) اُگائے۔

بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا: اس کی تحقیق سورہ رعد کے پہلے رکوع آیت ۲ میں گذر چکی ہے۔

وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ: اس کی تحقیق سورہ نحل کے دوسرے رکوع آیت ۱۵ میں گذر چکی ہے۔

＊ ＊ ＊

فائدہ: ۱. اس لفظ کی تفسیر سورۂ رعد کے شروع میں گزر چکی۔

فائدہ: ۲. یعنی سمندر کی موجوں اور سخت ہوا کے جھٹکوں سے یا دوسرے اسباب طبیعہ سے مرتعش ہو کر جھک نہ پڑے، اس کا انتظام بڑے بڑے پہاڑ قائم کر کے کر دیا گیا، سورۂ نحل کے اوائل میں یہ مضمون گزر چکا ہے، باقی پہاڑوں کے پیدا کرنے کی حکمت کچھ اسی میں منحصر نہیں، دوسرے فوائد اور حکمتیں ہوں گی جو اللہ کو معلوم ہیں۔

فائدہ: ۳. یعنی ہر قسم کے پر رونق، خوش منظر اور نفیس و کارآمد درخت زمین سے اگائے، سورۂ شعراء کے شروع میں اسی مضمون کی آیت گزر چکی ہے۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَأَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ⑪ ع

یہ سب کچھ بنایا ہوا ہے اللہ کا اب دکھلاؤ مجھ کو کیا بنایا ہے اوروں نے جو اس کے سوا ہیں ۱. کچھ نہیں پر بے انصاف صریح بھٹک رہے ہیں ۲.

خلاصہ تفسیر: (اور جو لوگ شرک کرتے ہیں ان سے کہئے کہ) یہ تو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں (سو اگر تم دوسروں کو شریک الوہیت قرار دیتے ہو تو) اب تم لوگ مجھ کو دکھاؤ کہ اس کے سوا جو (معبود تم نے بنا رکھے) ہیں انہوں نے کیا کیا چیزیں پیدا کی ہیں (تا کہ ان کا خدائی میں شریک ہونا اور عبادت کا مستحق ہونا ثابت ہو، اور اس دلیل کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ لوگ ہدایت پر آ جاتے، مگر انہوں نے ہدایت کو قبول نہیں کیا) بلکہ یہ ظالم لوگ (بدستور) صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔

فَأَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ: اس دلیل سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ خدائی کا مستحق ہونے کے لیے ممکنات کا پیدا کرنا لازمی ہے، کیونکہ خدائی کا استحقاق قدیم ہے، یعنی ہمیشہ سے ہے، اگر ممکنات کا پیدا کرنا اس کے لیے لازم ہوگا تو ممکنات بھی سب قدیم ہو جائیں گے، حالانکہ عالم حادث ہے، پس مطلب یہ ہے کہ ممکنات کے موجود ہونے کی صورت میں یہ لازم ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا وہی ہو جو خدائی کا مستحق ہے۔

＊ ＊ ＊

فائدہ: ۱. جب نہیں دکھلا سکتے تو کس منہ سے ان کو خدائی کا شریک اور معبودیت کا مستحق ٹھہراتے ہو، معبود تو وہ ہی ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں پیدا کرنا اور رزق پہنچانا سب کچھ ہو، یہاں ایک ذرہ کے پیدا کرنے کا اختیار نہیں۔

فائدہ: ۲. یعنی ان ظالموں کو سوچنے سمجھنے سے کچھ سروکار نہیں، اندھیرے میں پڑے بھٹک رہے ہیں۔

ربط: آگے شرک و عصیان کی تقبیح کے لئے حضرت لقمان کی نصیحتیں نقل فرماتے ہیں جو انہوں نے اللہ سے دانائی پا کر اپنے بیٹے کو کی تھیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ

اور ہم نے دی لقمان کو عقلمندی ۱. کہ حق مان اللہ کا، اور جو کوئی حق مانے گا تو مانے گا اپنے بھلے کو، اور جو کوئی منکر ہوگا

فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿١٢﴾

تو اللہ بے پرواہے سب تعریفوں والا ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ کی طرح اب آگے بھی توحید کا مضمون ہے اور اس کی تقریر و تاکید کے لیے لقمان علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے ،جن کی وصیت میں توحید کی بھی تعلیم ہے جو کہ اعتقاد کی تکمیل میں سب سے بڑی چیز ہے، پھر عمل کامل کرنے کی تعلیم ہے جس کو اعتقاد کی مناسبت سے ذکر کر دیا گیا اور زیادہ مقصود توحید کا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

اور ہم نے لقمان کو دانشمندی (جس کی حقیقت علم مع عمل ہے) عطا فرمائی (اور ساتھ ہی یہ حکم دیا) کہ (سب نعمتوں پر عموماً اور اس نعمت حکمت پر جو کہ تمام نعمتوں سے افضل ہے خصوصاً) اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے رہو، اور جو شخص شکر کرے گا وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے شکر کرتا ہے (یعنی اسی کا نفع ہے کہ اس سے نعمت میں ترقی ہوتی ہے کما قال: لئن شکرتم لازیدنکم دینی نعمت میں تو ترقی دنیا میں بھی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی، دنیا میں تو نعمت کے شکر سے علم بڑھتا ہے اور عمل کی توفیق میں اضافہ ہوتا ہے اور آخرت میں ثواب عظیم ملتا ہے، اور دینی میں آخرت کی ترقی یعنی ثواب میں اضافہ تو یقینی ہے اور کبھی دنیا میں شکر کرنے سے نعمت بڑھ جاتی ہے) اور جو ناشکری کرے گا تو (اپنا ہی نقصان کرے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تو) بے نیاز (اور سب) خوبیوں والا ہے (کیونکہ حق تعالی اپنی ذات وصفات میں کامل ہے جو مدلول ہے حمید کا اس لئے وہ غنی بے نیاز ہے، اس کو کسی کے شکر وثناء کی احتیاج نہیں، کہ اس میں استکمال بالغیر لازم آتا ہے اور چونکہ لقمان حکمت یعنی علم وعمل کے ساتھ موصوف تھے اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے شکر کی تعلیم پر خود بھی عمل کیا ہوگا، پس وہ شاکر بھی تھے، اور شاکر ہونے سے ان کی حکمت میں ترقی بھی ہوئی ہوگی، پس وہ اعلیٰ درجہ کے حکیم ہوئے)۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ: حضرت لقمان علیہ السلام کو عکرمہ اور لیث نے نبی کہا ہے، لیکن حکیم ترمذی نے نوادر میں حدیث مرفوع نقل کی ہے کہ ان کو داود علیہ السلام سے پہلے خلافت (یعنی نبوت) دی جاتی تھی، انہوں نے عرض کیا کہ اگر حکم ہے تو سر آنکھوں پر، اور اگر میری مرضی پر ہے تو میں معافی چاہتا ہوں، پھر بعد میں داود علیہ السلام کو خلافت دی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ لقمان علیہ السلام نبی نہ تھے، لیکن بہت بڑے ولی تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا زمانہ داود علیہ السلام کے قریب تھا، پس ان کے نبی نہ ہونے کی صورت میں یہ حکم یا بطور الہام کے ہوا ہوگا جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے، یا اس زمانہ کے نبی کے ذریعہ سے۔

* * *

فائدہ: ۱ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ حضرت لقمان پیغمبر نہیں تھے، ہاں ایک پاکباز متقی انسان تھے جن کو حق تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کی عقل و فہم اور متانت ودانائی عطا فرمائی تھی، انہوں نے عقل کی راہ سے وہ باتیں کھولیں، جو پیغمبروں کے احکام وہدایات کے موافق تھیں، ان کی عاقلانہ نصیحتیں اور حکمت کی باتیں لوگوں میں مشہور چلی آتی ہیں، رب العزت نے ایک حصہ قرآن میں نقل فرما کر ان کا مرتبہ اور زیادہ بڑھا دیا، شاید مقصود یہ جتلانا ہو کہ شرک وغیرہ کا قبیح ہونا جس طرح فطرت انسانی کی شہادت اور انبیاء کی وحی سے ثابت ہے، دنیا کے منتخب عقلمند بھی اپنی عقل سے اسکی تائید وتصدیق کرتے رہے ہیں، پس توحید کو چھوڑ کر شرک اختیار کرنا ضلال مبین نہیں تو اور کیا ہے؟

تنبیہ: حضرت لقمان کہاں کے رہنے والے تھے؟ اور کس زمانہ میں پیدا ہوئے؟ اس کی پوری تعیین نہیں ہوسکتی، اکثر کا قول ہے کہ حبشی تھے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد میں ہوئے، ان کے بہت سے قصے اور اقوال تفاسیر میں نقل کئے ہیں، فالله اعلم بصحتها۔

فائدہ: ۲ یعنی اس احسان عظیم اور دوسرے احسانات پر منعم حقیقی کا شکر ادا کرنا اور حق ماننا ضروری ہے، لیکن واضح رہے کہ اس حق شناسی اور شکر گزاری سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جو کچھ فائدہ ہے خود شاکر کا ہے کہ دنیا میں مزید انعام اور آخرت میں اجر وثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے، اگر ناشکری کی تو اپنا نقصان کرے گا، اللہ تعالیٰ کو اس کے شکر یہ کی کیا پرواہو سکتی ہے، اس کی حمد وثنا تو ساری مخلوق زبان حال سے کر رہی ہے اور بفرض محال کوئی

تعریف کرنے والا نہ ہو تب بھی جامع الصفات اور منبع الکمالات ہونے کی بنا پر وہ بذات خود محمود ہے کسی کے حمد وشکر کرنے یا نہ کرنے سے اس کے کمالات میں ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۣ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

اور جب کہا لقمان نے اپنے بیٹے کو جب اس کو سمجھانے لگا اے بیٹے شریک نہ ٹھہرائیو اللہ کا ۱؎ بیشک شریک بنانا بھاری بے انصافی ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: چنانچہ لقمان جیسے حکیم کی تعلیم ضرور قابل عمل ہونی چاہیے اس لیے انکی تعلیمات لوگوں کے سامنے بیان فرتے ہیں:

اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا خدا کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہرانا، بیشک شرک کرنا بڑا بھاری ظلم ہے (ظلم کی حقیقت علماء نے یہ بیان کی ہے کہ کسی چیز کو بے موقع اور بے محل استعمال کیا جائے اور یہ بات شرک میں سب سے زیادہ ظاہر ہے کہ پیدا کرنے والے کی جگہ بتوں کی پرستش کی جائے)۔

يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ: جس بیٹے کو حضرت لقمان نے نصیحت کی کہیں صحیح اور صریح طور پر یہ نہیں دیکھا گیا کہ لقمان کے یہ بیٹے جن کو نصیحت کی گئی ہے اس کا طریقہ کیا تھا؟ آیا پہلے سے موحد تھا، یا اس نصیحت کے بعد موحد بن گیا یا کیا ہوا، واللہ اعلم۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ: یہ بھی حضرت لقمان کا قول معلوم ہوتا ہے، اور صحیحین کی روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے، آیت: الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانهم بظلم کے نزول کے وقت جناب رسول اللہ ﷺ نے یہاں تک تمام قول کو حضرت لقمان کی طرف منسوب فرمایا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ معلوم نہیں بیٹا مشرک تھا؟ سمجھا کر راہ راست پر لانا چاہتے تھے یا موحد تھا؟ اسے توحید پر خوب مضبوط کرنے اور جمائے رکھنے کی غرض سے یہ وصیت فرمائی؟

فائدہ: ۲؎ اس سے بڑھ کر بے انصافی کیا ہوگی کہ عاجز مخلوق کو خالق مختار کا درجہ دے دیا جائے اور اس سے زیادہ حماقت اور ظلم اپنی جان پر کیا ہوگا، کہ اشرف المخلوقات ہو کر خسیس ترین اشیاء کے آگے سر عبودیت خم کر دے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ

اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اسکے ماں باپ کے واسطے، پیٹ میں رکھا اسکو اسکی ماں نے تھک تھک کر اور دودھ چھڑانا ہے اسکا دو برس میں

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾

کہ حق مان میرا اور اپنے ماں باپ کا، آخر مجھی تک آنا ہے

خلاصہ تفسیر: اس قصہ کے درمیان میں توحید کی تاکید کے لئے آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے (کہ ان کی اطاعت اور خدمت کرے، کیونکہ انہوں نے اس کے لئے بڑی مشقتیں جھیلی ہیں بالخصوص ماں نے، چنانچہ) اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا (کیونکہ جوں جوں حمل بڑھتا جاتا ہے حاملہ کا ضعف بڑھتا جاتا ہے) اور (پھر) دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے (ان دنوں میں بھی وہ ہر طرح کی خدمت کرتی ہے، اسی طرح اپنی حالت کے موافق باپ بھی مشقت اٹھاتا ہے، اس لئے ہم نے اپنے حقوق کے ساتھ ماں باپ کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:) کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر (حق تعالیٰ کی شکر گزاری تو عبادت اور حقیقی اطاعت کے ساتھ اور ماں باپ کی شکر گذاری خدمت اور شرعی حقوق ادا کرنے کے ساتھ، کیونکہ) میری ہی طرف (سب کو) لوٹ کر آنا ہے (اس وقت میں اعمال کی جزاء وسزا دوں گا، اس لئے احکام کی بجا آوری ضروری ہے)۔

وَّفِصٰلُهٗ فِیۡ عَامَیۡنِ: اس آیت میں جو دودھ چھڑانے کی مدت دو سال بتلائی گئی ہے یہ عام عادت کے مطابق ہے، کیونکہ اکثر دو سال میں دودھ چھڑادیا جاتا ہے، یہ مطلب نہیں کہ اس سے زیادہ دودھ پلانا حرام ہے، کیونکہ بعض فقہاء کے نزدیک انتہائی مدت رضاعت ڈھائی سال ہے۔

اَنِ اشۡكُرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیۡكَ: اس میں صراحت ہے کہ جو لوگ بھی نعمت حاصل کرنے میں واسطہ اور ذریعہ بنے ہوں منعم حقیقی (اللہ) کی طرح ان کا بھی شکرادا کرنا مطلوب ہے، لہٰذا والدین کی شکرگزاری کے ساتھ ساتھ استاذ، خیرخواہ، شیخ ومرشد بھی اس فہرست میں شامل ہوں گے ان کا حق بھی ادا کیا جائے، ان کا شکریہ ادا کرنا گویا نعمت دینے والے کا شکریہ ادا کرنا ہے، البتہ شریعت سے تعارض کے وقت ان لوگوں کی اتباع جائز نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی ماں کا حق باپ سے بھی زیادہ ہے، وہ مہینوں تک اس کا بوجھ پیٹ میں اٹھائے پھری، پھر وضع حمل کے بعد دو برس تک دودھ پلایا، اس دوران میں نہ معلوم کیسی کیسی تکلیفیں اور سختیاں جھیل کر بچہ کی تربیت کی، اپنے آرام کو اس کے آرام پر قربان کیا، لہٰذا ضروری ہے کہ آدمی اولاً خدا تعالیٰ کا اور ثانیاً اپنے ماں باپ کا، خصوصاً ماں کا حق پہچانے، یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور ماں باپ کی خدمت واطاعت میں بقدر استطاعت مشغول رہے جہاں تک اللہ کی نافرمانی نہ ہو کیونکہ اس کا حق سب سے مقدم ہے اور اسی کے سامنے سب کو حاضر ہونا ہے، انسان دل میں سوچ لے کہ کیا منہ لے کر وہاں جائے گا۔

تنبیہ: دودھ چھڑانے کی مدت جو یہاں دوسال بیان ہوئی باعتبار غالب اور اکثر عادت کے ہے، امام ابوحنیفہ جو اکثر مدت ڈھائی سال بتاتے ہیں ان کے پاس کوئی اور دلیل ہوگی، جمہور کے نزدیک دو ہی سال ہیں، واللہ اعلم۔

وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا

اور اگر وہ دونوں تجھ سے اڑیں اس بات پر کہ شریک مان میرا اس چیز کو جو تجھ کو معلوم نہیں تو انکا کہنا مت مان ۱؎ اور ساتھ دے ان کا دنیا میں

مَعۡرُوۡفًا ۫ وَّاتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾

دستور کے موافق ۲؎ اور راہ چل اس کی جو رجوع ہوا میری طرف ۳؎ پھر میری طرف ہے تم کو پھر آنا میں جتلادوں گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے ۴؎

خلاصہ تفسیر: اب فرماتے ہیں کہ باوجودیکہ ماں باپ کا اتنا بڑا حق ہے جیسا کہ معلوم ہوا، لیکن توحید ایسی عظیم الشان چیز ہے کہ:

اور اگر تجھ پر وہ دونوں (بھی) اس بات کا زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک ٹھہرائے جس (کے شریک الوہیت ہونے) کی تیرے پاس کوئی دلیل (اور سند) نہ ہو (اور ظاہر ہے کہ ایسی کوئی بھی چیز نہیں جس کے شریک خدائی ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو، بلکہ اس کے خلاف پر دلیلیں قائم ہیں کہ کوئی چیز خدا کے سوا خدائی کی مستحق نہیں، پس مطلب یہ ہوا کہ اگر وہ کسی چیز کو بھی خدا کا شریک ٹھہرانے کے لیے تجھ پر زور دیں) تو تو ان کا کہنا نہ ماننا اور (ہاں! یہ ضرور ہے کہ) دنیا (کے حوائج ومعاملات) میں (جیسے ان کے ضروری اخراجات اور خدمت وغیرہ) ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ بسر کرنا اور (دین کے بارے میں صرف) اس (ہی) شخص کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو (یعنی میرے احکام کا معتقد اور ان پر عمل کرنے والا ہو) پھر تم سب کو میرے پاس آنا ہے پھر (آنے کے وقت) میں تم کو جتلادوں گا جو کچھ تم کرتے تھے (اس لئے کسی معاملہ میں میرے حکم کے خلاف مت کرو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ’’شریک نہ مان جو تجھے معلوم نہیں، یعنی شبہ میں بھی نہ مان اور یقین سمجھ کر تو کیوں مانے‘‘۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دین کے خلاف ماں باپ کا کہنا نہ مان، ہاں دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ نیکی اور سلوک کرتا رہ اسی مضمون کی آیت سورۂ عنکبوت میں گزر چکی وہاں کا فائدہ دیکھ لیا جائے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی پیغمبروں اور مخلص بندوں کی راہ پر چل! دین کے خلاف ماں باپ کی تقلید یا اطاعت مت کر۔

فائدہ: ۳؎ یعنی خدا کے ہاں پہنچ کر اولاد اور والدین سب کو پتہ لگ جائے گا کہ کس کی زیادتی یا تقصیر تھی۔

تنبیہ: ووصّینا الانسان سے یہاں تک حق تعالیٰ کا کلام ہے، پہلے لقمان کی وصیت بیٹے کو تھی، اور آگے بھی: یابنی انہا ان تک الخ سے اسی وصیت کا سلسلہ ہے، درمیان میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک ضروری تنبیہ فرمادی، یعنی شرک اتنی سخت قبیح چیز ہے کہ ماں باپ کے مجبور کرنے پر بھی اختیار نہیں کیا جاسکتا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''لقمان نے بیٹے کو باپ کا حق نہ بتلایا تھا کہ اپنی غرض معلوم ہوتی، اللہ تعالیٰ نے توحید کی نصیحت سے پیچھے اور دوسری نصیحتوں سے پہلے ماں باپ کا حق فرمادیا کہ بعد اللہ کے حق کے ماں باپ کا، باقی پیغمبر یا مرشد وہادی کا حق بھی حق اللہ کے ذیل میں سمجھو کہ وہ اسی کے نائب ہوتے ہیں'' طط، (موضح بتغیر یسیر)

یٰبُنَیَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ

اے بیٹے اگر کوئی چیز ہو برابر رائی کے دانہ کی پھر وہ ہو کسی پتھر میں یا آسمانوں میں یا زمین میں

یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۶﴾

لا حاضر کرے اس کو اللہ، بیشک اللہ جانتا ہے چھپی ہوئی چیزوں کو خبردار ہے

خلاصہ تفسیر: آگے پھر لقمان علیہ السلام کی وصیتوں کا بیان اور تکمیل ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو اور بھی نصیحتیں کیں، چنانچہ توحید وعقائد کے بارے میں ایک نصیحت یہ بھی کی کہ:

بیٹا! (حق تعالیٰ کا علم اور قدرت اس درجہ ہے کہ) اگر (کسی کا) کوئی عمل (کیسا ہی مخفی ہو، مثلاً فرض کرو کہ وہ) رائی کے دانہ کے برابر (مقدار میں) ہو (اور) پھر (فرض کرو کہ) وہ کسی پتھر کے اندر (چھپا رکھا) ہو (جو کہ ایسی آڑ یا حجاب میں ہو جس کا اٹھانا دشوار ہو اور بغیر وہ حجاب یا آڑ اٹھائے کسی کو اس کے اندر کی چیز معلوم نہیں ہوسکتی) یا وہ آسمانوں کے اندر ہو (جو کہ تمام مخلوقات سے بہت دور ہے) یا وہ زمین کے اندر ہو (جہاں خوب ظلمت اور تاریکی رہتی ہے، اور کسی چیز کے مخلوق سے پوشیدہ ہونے کی یہی صورتیں ہوتی ہیں، کیونکہ کبھی کوئی چیز چھوٹی اور باریک ہوتی ہے کہ نظر میں نہیں آتی اور کبھی کوئی شدید حجاب یا آڑ حائل ہونے کی وجہ سے، کبھی دور ہونے کی وجہ سے اور کبھی ظلمت اور تاریکی کی وجہ سے، لیکن حق تعالیٰ کے علم وقدرت کی ایسی شان ہے کہ اگر چھپنے کی یہ سب صورتیں بھی جمع ہوجائیں) تب بھی (قیامت کے روز حساب کے وقت) اس کو اللہ تعالیٰ حاضر کردے گا (جس سے علم اور قدرت دونوں ثابت ہوئے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا باریک بین (اور) باخبر ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی کوئی چیز یا کوئی خصلت اچھی یا بری اگر رائی کے دانہ کے برابر چھوٹی ہو اور فرض کرو پتھر کی کسی سخت چٹان کے اندر یا آسمانوں کی بلندی پر یا زمین کی تاریک گہرائیوں میں رکھی ہو، وہ بھی اللہ سے مخفی نہیں ہوسکتی، جب وقت آئے گا وہیں سے لا حاضر کرے گا، اس لئے آدمی کو چاہیے کہ عمل کرتے وقت یہ بات پیش نظر رکھے کہ ہزار پردوں میں بھی جو کام کیا جائے اس کا اثر ضرور ظاہر ہوکر رہتا ہے جسے اہل نظر بے تکلف محسوس کرلیتے ہیں۔

یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَاۤ اَصَابَكَ ؕ

اے بیٹے! قائم رکھ نماز اور سکھلا بھلی بات اور منع کر برائی سے ۱؎ اور تحمل کر جو تجھ پر پڑے

اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾

بیشک یہ ہیں ہمت کے کام ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور اعمال کے بارے میں یہ نصیحت کی کہ:) بیٹا! نماز پڑھا کرو (جو عقائد درست کرنے کے بعد اعلیٰ درجہ کا عمل

ہے) اور (جس طرح اعمال وعقائد کی درستی سے اپنی اصلاح اور تکمیل کرتے ہو اسی طرح دوسروں کی اصلاح وتکمیل میں بھی کوشش کرنی چاہیے، پس لوگوں کو) اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور برے کاموں سے منع کیا کر اور (خاص طور پر اس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں، اور عام طور پر ہر حالت میں) تجھ پر جو مصیبت واقع ہو اس پر صبر کیا کر، یہ (صبر کرنا) ہمت کے کاموں سے ہے۔

اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ: عزم کے معنی ''واجب'' اس لیے نہیں کیے کہ اس مقام پر جو امور مذکور ہیں بعض ان میں سے مستحبات اور آداب ہیں، اور ''عزم'' کے معنی قاموس میں ہمت اور کوشش کے بھی لکھے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی خود اللہ کی توحید اور بندگی پر قائم ہو کر دوسروں کو بھی نصیحت کر کہ بھلی بات سیکھیں اور برائی سے رکیں۔

فائدہ: ۲ یعنی دنیا میں جو سختیاں پیش آئیں جن کا پیش آنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں اغلب ہے ان کو تحمل اور اولوالعزمی سے برداشت کر، شدائد سے گھبرا کر ہمت ہار دینا حوصلہ مند بہادروں کا کام نہیں۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۞ ۱۸

اور اپنے گال مت پھلا لوگوں کی طرف ۱ مت چل زمین پر اتراتا بیشک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اتراتا بڑائیاں کرنے والا ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اخلاق وعادات کے بارے میں یہ نصیحت کی کہ بیٹا!) لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور زمین پر اترا کر مت چل، بیشک اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی غرور سے مت دیکھ اور لوگوں کو حقیر سمجھ کر متکبروں کی طرح بات نہ کر بلکہ خندہ پیشانی سے مل۔

فائدہ: ۲ یعنی اترانے اور شیخیاں مارنے سے آدمی کی عزت نہیں بڑھتی بلکہ ذلیل وحقیر ہوتا ہے، سامنے نہیں تو پیچھے لوگ برا کہتے ہیں۔

ع وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۞ ۱۹

اور چل بیچ کی چال اور نیچی کر آواز، اپنی بیشک بری سے بری آواز گدھے کی آواز ہے

خلاصہ تفسیر: اور اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر (نہ بہت دوڑ کر چل کہ وقار کے خلاف ہے، نیز گر جانے کا بھی احتمال ہے، اور نہ بہت گن گن کر قدم رکھ کہ یہ متکبرین کا انداز ہے، بلکہ بے تکلف اور درمیانی رفتار، تواضع اور سادگی کی چال اختیار کر، جس کو دوسری آیت میں اس عنوان سے ذکر کیا ہے: **یمشون علی الارض هونا**) اور (بولنے میں) اپنی آواز کو پست کر (یعنی بہت غل مت مچا، یہ مطلب نہیں کہ اتنی پست آواز کر کہ دوسرا سنے بھی نہیں، آگے غل مچانے سے نفرت دلاتے ہیں کہ:) بیشک آوازوں میں سے سب سے بری آواز گدھوں کی آواز (ہوتی) ہے (تو آدمی ہو کر گدھوں کی طرح چیخنا اور چلانا کب مناسب ہے، نیز چیخ چلاؤ سے بعض اوقات دوسروں کو وحشت اور اذیت بھی ہوتی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی تواضع، متانت اور میانہ روی کی چال اختیار کر، بے ضرورت مت بول، کلام کرتے وقت حد سے زیادہ نہ چلا، اگر اونچی آواز سے بولنا ہی کوئی کمال ہوتا تو گدھے کی آواز پر خیال کرو، وہ بہت زور سے آواز نکالتا ہے مگر کس قدر کریہہ وکرخت ہوتی ہے، بہت زور سے بولنے میں بسا اوقات آدمی کی آواز بھی ایسی ہی بے ڈھنگی اور بے سری ہو جاتی ہے۔

ربط: لقمان کا کلام یہاں تک تمام ہوا، آگے پھر اصل مضمون کی طرف عود کیا گیا ہے، یعنی حق تعالیٰ کی عظمت وجلال اور احسان وانعام یاد دلا کر توحید وغیرہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کام میں لگائے تمہارے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں ۱؎ اور پوری کردیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی

وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝۲۰

اور چھپی ۲؎ اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں نہ سمجھ رکھیں نہ سوجھ اور نہ روشن کتاب ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے سے توحید کا مضمون چلا آرہا تھا اور اسی کی مناسبت سے حضرت لقمان کی وصیتیں اور نصیحتیں بیان ہوئیں، اب پھر توحید کا مضمون ہے۔

کیا تم لوگوں کو (مشاہدہ دلائل سے) یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو (بواسطہ یا بلا واسطہ) تمہارے کام میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں (موجود) ہیں اور جو کچھ زمین میں (موجود) ہیں اور اس نے تم پر اپنی نعمتیں ظاہری اور باطنی پوری کر رکھی ہیں (ظاہری نعمت وہ جو کان، آنکھ وغیرہ یعنی حواس سے معلوم ہو سکے، اور باطنی نعمت وہ جو عقل سے معلوم ہوتی ہے، اور ان نعمتوں سے وہ نعمتیں مراد ہیں جو آسمان اور زمین کے مسخر کرنے سے حاصل ہوئیں، پس یہ لازم نہیں آتا کہ اس آیت کے مخاطب مسلمان ہی ہوں، کیونکہ یہ نعمتیں تو سب پر ہیں) اور باوجودیکہ (اس دلیل سے توحید ثابت ہوتی ہے مگر) بعضے آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں (یعنی اس کی توحید میں) بدون واقفیت (یعنی ضروری علم کے بغیر) اور بدون دلیل (عقلی دلیل کے بغیر) اور بدون کسی روشن کتاب (بغیر نقلی دلیل) کے جھگڑا کرتے ہیں۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: یعنی مسخر کردیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، مسخر کرنے کے مشہور معنی کسی چیز کو کسی کے تابع فرمان بنا دینے کے ہیں، یہاں اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اول تو زمین کی سب چیزیں بھی انسان کے تابع فرمان نہیں، بلکہ بہت سی چیزیں اس کے مزاج کے خلاف کام کرتی ہیں، خصوصاً جو چیزیں آسمانوں میں ہیں ان میں تو انسان کے تابع فرمان ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں، جواب یہ ہے کہ دراصل تسخیر کے معنی کسی چیز کو زبردستی کسی کام میں لگا دینا اور اس پر مجبور کر دینا ہے، آسمان وزمین کی سب مخلوقات کو انسان کے لئے مسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام مخلوقات کو انسان کی خدمت اور نفع رسانی میں لگا دیا، ان میں بہت سی چیزوں کو تو اس طرح خدمت میں لگایا کہ ان کو انسان کا تابع فرمان بھی بنا دیا وہ جس وقت جس طرح چاہے ان کو استعمال کرتا ہے، بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو انسان کے کام میں تو لگا دیا گیا ہے کہ وہ انسان کی خدمت میں لگی ہوتی ہیں، مگر بتقاضائے حکمت ربانی ان کو انسان کے تابع نہیں بنایا گیا، جیسا کہ آسمانی مخلوق اور سیارات اور برق و باراں وغیرہ، کہ ان کو انسان کے حکم کا تابع بنا دیا جاتا تو انسانوں کی طبائع اور مزاجوں اور حالات کے اختلافات کا ان پر اثر پڑتا، ایک انسان چاہتا کہ آفتاب جلدی طلوع ہو جائے دوسرے کی ضرورت اس پر موقوف ہوتی کہ اس میں دیر لگے، ایک شخص بارش مانگتا دوسرا سفر میں ہے کھلے میدان میں ہے وہ چاہتا کہ بارش نہ ہو، تو یہ متضاد تقاضے آسمانی کائنات کے عمل میں تضاد اور خلل پیدا کرتے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو انسان کی خدمت میں لگا دیا مگر اس کا تابع حکم نہیں بنایا، یہ بھی ایک قسم کی تسخیر ہی ہے، واللہ اعلم۔

***

فائدہ: ۱؎ یعنی آسمان وزمین کی کل مخلوق تمہارے کام میں لگا دی ہے، پھر تم اس کے کام میں کیوں نہیں لگتے۔

فائدہ: ۲؎ کھلی نعمتیں وہ جو حواس سے مدرک ہوں یا بے تکلف سمجھ میں آجائیں چھپی وہ عقلی غور و فکر سے دریافت کی جائیں، یا ظاہری مادی ومعاشی اور باطنی سے روحانی ومعادی نعمتیں مراد ہوں، گویا پیغمبر بھیجنا کتاب اتارنا، نیکی کی توفیق دینا، سب باطنی نعمتیں ہوں گی، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ایسے کھلے ہوئے انعام واحسان کے باوجود بعض لوگ آنکھیں بند کر کے اللہ کی وحدانیت میں یا اس کی شؤون وصفات میں یا اس کے احکام وشرائع میں جھگڑتے ہیں اور محض بے سند جھگڑتے ہیں، نہ کوئی علمی اور عقلی اصول ان کے پاس ہے نہ کسی ہادی برحق کی ہدایت، نہ کسی مستند

اور روشن کتاب کا حوالہ محض باپ دادوں کی اندھی تقلید ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے۔

تنبیہ: ترجمہ سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ غالباً مترجم محقق قدس اللہ روحہ، نے ''علم'' سے عقلی طور پر سمجھنا مراد لیا ہے، اور ''ہدیٰ'' سے ایک طرف بصیرت مراد لی ہے جو سلامتی ذوق و وجدان اور ممارست عقل و فکر سے ناشی ہوتی ہے، مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں کو نہ معمولی سمجھ ہے نہ وجدانی بصیرت حاصل ہے نہ روشن کتاب یعنی نقلی دلیل رکھتے ہیں، یہ معنی بہت لطیف ہیں، ہم نے آیت کی جو تقریر اختیار کی محض تسہیل کی غرض سے کی ہے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ

اور جب ان کو کہیے چلو اس حکم پر جو اتارا اللہ نے کہیں نہیں ہم تو چلیں گے اس پر جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادوں کو

اَوَلَوۡ كَانَ الشَّيۡطٰنُ يَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيۡرِ ﴿۲۱﴾

بھلا اور جو شیطان بلاتا ہو ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف تو بھی

خلاصہ تفسیر: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کا اتباع کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے (یعنی حق کو ثابت کرنے والے دلائل میں غور کر کے ان کا اتباع کرو) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ (ہم اس کا اتباع) نہیں (کرتے) ہم (تو) اسی کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے (آگے ان پر رد ہے کہ) کیا اگر شیطان ان کے بڑوں کو عذاب دوزخ کی طرف (یعنی گمراہی کی طرف جو کہ عذاب دوزخ کا سبب ہے) بلاتا رہا ہو تب بھی (انہی کا اتباع کریں گے، مطلب یہ کہ ایسے سرکش ہیں کہ باوجودیکہ ان کو دلیل کی طرف بلایا جاتا ہے مگر پھر بھی بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل محض اپنے گمراہ باپ دادوں کی راہ پر چلتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر شیطان تمہارے باپ دادوں کو دوزخ کی طرف لئے جا رہا ہو، تب بھی تم ان کے پیچھے چلو گے؟ اور جہاں وہ گریں گے وہیں گرو گے؟

وَمَنۡ يُّسۡلِمۡ وَجۡهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ ﴿۲۲﴾

اور جو کوئی تابع کرے اپنا منہ اللہ کی طرف اور وہ ہو نیکی پر سو اس نے پکڑ لیا مضبوط کڑا [1] اور اللہ کی طرف ہے آخر ہر کام کا [2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے گمراہوں کی حالت بیان ہوئی، اب اہل حق کا حال بیان کیا جاتا ہے:

اور جو شخص (حق کا اتباع کر کے) اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے (یعنی فرمانبرداری اختیار کرے عقائد میں بھی، اعمال میں بھی، مراد اسلام اور توحید ہے) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (یعنی محض ظاہری اسلام نہ ہو) تو اس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا (یعنی وہ اس شخص کے مشابہ ہو گیا جو کسی مضبوط رسی کا حلقہ ہاتھ میں تھام کر گرنے سے محفوظ رہتا ہے، اسی طرح یہ شخص ہلاکت اور خسارہ سے بچا رہے گا) اور آخر سب کاموں کا انجام اللہ ہی کی طرف پہنچے گا (پس چاہے حق کا اتباع کرو یا باطل کا سب اعمال اسی کے حضور میں پیش ہوں گے، وہ ہر ایک کو مناسب جزاء و سزا دے گا)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جس نے اخلاص کے ساتھ نیکی کا راستہ اختیار کیا اور اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا، سمجھ لو کہ اس نے بڑا مضبوط حلقہ ہاتھ میں تھام لیا ہے جب تک یہ کڑا پکڑے رہے گا، گرنے یا چوٹ کھانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔

فائدہ: [2] یعنی جس نے یہ کڑا مضبوط تھامے رکھا وہ آخر اسکے سہارے سے اللہ تک پہنچ جائے گا اور خدا اسکا انجام درست کر دے گا۔

وَمَنۡ كَفَرَ فَلَا يَحۡزُنۡكَ كُفۡرُهٗ ؕ اِلَيۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ فَنُنَبِّئُهُمۡ بِمَا عَمِلُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ

اور جو کوئی منکر ہوا تو تو غم نہ کھا اس کے انکار سے، ہماری طرف پھر آنا ہے ان کو پھر ہم جتلا دیں گے ان کو جو انہوں نے کیا ہے، البتہ اللہ جانتا ہے

بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۞۲۳ نُمَتِّعُهُمۡ قَلِيۡلًا ثُمَّ نَضۡطَرُّهُمۡ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ۞۲۴

جو بات ہے دلوں میں ۱؎ کام چلا دیں گے ہم ان کا تھوڑے دنوں پھر پکڑ بلائیں گے ان کو گاڑھے عذاب میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور جو شخص (حق کو ثابت کرنے والے دلائل کے باوجود) کفر کرے سو آپ کے لئے اس کا کفر باعث غم نہ ہونا چاہئے (یعنی آپ غم نہ کریں) ان سب کو ہمارے ہی پاس لوٹنا ہے سو ہم ان سب کو جتلا دیں گے جو جو کچھ وہ (دنیا میں) کیا کرتے تھے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو (تو) دلوں کی باتیں (تک) خوب معلوم ہیں (تو ظاہری اعمال کس شمار میں ہیں، پس ہم سے کوئی امر مخفی نہیں، سب جتلا دیں گے اور مناسب سزا دیں گے، اس لئے آپ کچھ غم نہ کریں، اور یہ لوگ اگر محض چندروزہ عیش پر پھول رہے ہیں تو یہ ان کی بڑی غلطی ہے، کیونکہ یہ ہمیشہ نہ رہے گا، بلکہ) ہم ان کو چندروزہ عیش دیئے ہوئے ہیں پھر ان کو کشاں کشاں ایک سخت عذاب کی طرف لے آئیں گے (پس اس پر ناز کرنا جہالت ہے)۔

وَمَنۡ كَفَرَ فَلَا يَحۡزُنۡكَ كُفۡرُهٗ: اس میں دلالت ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لیے بہت ہی زیادہ اہتمام ومبالغہ نہیں کرنا چاہیے (نصیحت کر دینی چاہیے اور نتیجہ اللہ کے حوالہ کرنا چاہیے، نتیجہ سامنے آئے گا، خواہ دنیا میں یا آخرت میں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تم اپنا علاقہ خدا تعالیٰ سے جوڑے رکھو، کسی کے انکار و تکذیب کی پروا نہ کرو، منکرین کو بھی بالآخر ہمارے ہاں آنا ہے، اس وقت سب کیا دھرا سامنے آ جائے گا، کسی جرم کو اللہ سے چھپا نہ سکیں گے وہ تو دلوں تک کے راز جانتا ہے، سب کھول کر رکھ دے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تھوڑے دن کا عیش اور بےفکری ہے مہلت ختم ہوتے پر سخت سزا کے نیچے کھنچے چلے آئیں گے مجال ہے کہ چھوڑ کر بھاگ جائیں؟

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ ؕ

اور اگر تو پوچھے ان سے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں اللہ نے، تو کہہ سب خوبی اللہ کو ہے

بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۞۲۵

پر وہ بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے

خلاصہ تفسیر: اب فرماتے ہیں کہ جس توحید کی طرف ہم ان کو بلا رہے ہیں اس کے مقدمات کو خود یہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر اس سے صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا کام نہیں لیتے چنانچہ:

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے (اس پر) آپ کہئے کہ الحمد للہ! (جو مقدمہ مہتم بالشان تھا وہ تو تمہارے اعتراف سے ثابت ہوا اور دوسرا مقدمہ نہایت ہی ظاہر ہے کہ جو خود مخلوق ہو اور دوسروں کا بنایا ہوا ہو وہ مستحق عبادت نہیں، پس مقصود ثابت ہو گیا کہ خدا کے سوا کوئی معبود بننے کے قابل نہیں، مگر یہ لوگ اس کو نہیں مانتے) بلکہ ان میں اکثر (تو مجموعہ مقدمات کو بھی) نہیں جانتے (چنانچہ دوسرے واضح بدیہی مقدمہ کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے کہ معبود ہونا صرف خالق کا حق ہے جو خالق نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا)۔

* * *

فائدہ: یعنی الحمد للہ اتنا تو زبان سے اعتراف کرتے ہو کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنا بجز اللہ کے کسی کا کام نہیں، پھر اب کونسی خوبی رہ گئی جو

اس کی ذات میں نہ ہو، کیا ان چیزوں کا پیدا کرنا اور ایک خاص محکم نظام پر چلانا بدون اعلیٰ درجہ کے علم وحکمت اور زور قدرت کے ممکن ہے؟ لامحالہ ''خالق السموات والارض'' میں تمام کمالات تسلیم کرنے پڑیں گے، اور یہ بھی اسی کی قدرت کا ایک نمونہ ہے کہ تم جیسے منکرین سے اپنی عظمت کا اقرار کرا دیتا ہے، جس کے بعد تم ملزم ٹھہرتے ہو کہ جب تمہارے نزدیک خالق تنہا وہ ہے تو معبود دوسرے کیونکر بن گئے، بات تو صاف ہے پر بہت لوگ نہیں سمجھتے اور یہاں پہنچ کر اٹک جاتے ہیں۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۶﴾

اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں، بیشک اللہ وہی ہے بے پروا سب خوبیوں والا

خلاصہ تفسیر: (اور اللہ کی وہ شان ہے کہ) جو کچھ آسمان وزمین میں موجود ہے سب اللہ ہی کا (مملوک) ہے (پس سلطنت تو ان کی ایسی) اور بیشک اللہ تعالیٰ (خود اپنی ذات میں بھی) بے نیاز (اور) سب خوبیوں والا ہے (پس الوہیت کے لائق صرف وہی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس طرح آسمان وزمین کا پیدا کرنے والا اللہ ہے ایسے ہی آسمان وزمین میں جو چیزیں موجود ہیں سب بلا شرکت غیرے اسی کی مخلوق ومملوک اور اسی کی طرف محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں، کیونکہ وجود اور توابع وجود یعنی جملہ صفات کمالیہ کا مخزن ومنبع اسی کی ذات ہے، اس کا کوئی کمال دوسرے سے مستفاد نہیں، وہ بالذات سب عزتوں اور خوبیوں کا مالک ہے، پھر اسے کسی کی کیا پروا ہوتی؟

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ

اور اگر جتنے درخت ہیں زمین میں قلم ہوں اور سمندر ہو اس کی سیاہی اس کے پیچھے ہوں سات سمندر نہ تمام ہوں

كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾

باتیں اللہ کی، بیشک اللہ زبردست ہے حکمتوں والا

خلاصہ تفسیر: اور (اس کی خوبیاں اس کثرت سے ہیں کہ) جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں (یعنی جیسے قلم سے عادتاً لکھا جاتا ہے اس کے برابر درختوں کے قلم بنالیے جائیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح ایک ایک درخت سے ہزاروں قلم تیار ہوں) اور یہ جو سمندر ہیں اس کے علاوہ سات سمندر (روشنائی کی جگہ) اس میں اور شامل ہو جائیں (اور پھر ان قلموں اور اس روشنائی سے حق تعالیٰ کے کمالات لکھنا شروع کریں) تو (سب قلم روشنائی ختم ہو جائیں اور) اللہ کی باتیں (یعنی وہ کلمات جن سے اللہ تعالیٰ کے کمالات کی حکایت ہوتی ہو) ختم نہ ہوں، بیشک اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے (کہ وہ قدرت میں بھی کامل ہے اور علم میں بھی، اور یہ دونوں صفتیں چونکہ تمام صفات اور افعال سے تعلق رکھتی ہیں، شاید اس لئے ان دونوں کو خاص طور پر بیان کیا گیا)۔

سَبْعَةُ اَبْحُرٍ: یہاں سات سمندر بطور مثال کے فرض کیے گئے ہیں، سو یہ شبہ نہ کیا جائے کہ سمندر تو ایک ہی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر تمام دنیا کے درختوں کو تراش کر قلم بنالیں اور موجودہ سمندر کی سیاہی تیار کی جائے، پھر پیچھے سے سات سمندر اور اس کی کمک پر آجائیں اور فرض کرو تمام مخلوق اپنی اپنی بساط کے موافق لکھنا شروع کرے، تب بھی ان باتوں کو لکھ کر تمام نہ کر سکیں گے جو حق تعالیٰ کے کمالات اور عظمت وجلال کو ظاہر کرنیوالی ہیں، لکھنے والوں کی عمریں تمام ہو جائیں گی، قلم گھس گھس کر ٹوٹ جائیں گے، سیاہی ختم ہو جائے گی پر اللہ کی تعریفیں اور

اس کی خوبیاں ختم نہ ہوں گی، بھلا محدود ومتناہی قوتوں سے لامحدود اور غیر متناہی کام سرانجام کیونکر ہو، "اللهم لا احصى ثناءا عليك انت كما اثنيت على نفسك"۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

تم سب کا بنانا اور مرے پیچھے جلانا ایسا ہی ہے جیسا ایک جی کا ۱؎ بیشک اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور کمال قدرت کی ایک فرع عالم آخرت بھی ہے، جس کو جاہل بدفہم دشوار سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ ایسا قادر ہے کہ: تم سب کا (پہلی بار) پیدا کرنا اور (دوسری بار) زندہ کرنا (اس کے نزدیک) بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا (پیدا کرنا اور زندہ کرنا، اگرچہ یہاں مقصود قرینہ مقام سے قیامت کا ذکر فرمانا ہے، لیکن تخلیق کے ذکر سے استدلال اور قوی ہوگیا ہے) بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے (پس جو لوگ باوجود ان دلائل کے قیامت کا انکار کر رہے ہیں اور اس جرأت پر فسق وفجور کرتے ہیں ان سب کو سن رہا ہے دیکھ رہا ہے ان کو سزا دے گا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سارے جہاں کا پیدا کرنا اور ایک آدمی کا پیدا کرنا خدا تعالیٰ کے لئے دونوں برابر ہیں، نہ اس میں کچھ دقت نہ اس میں کچھ تعب، ایک "کن" سے جو چاہے کر ڈالے اور لفظ "کن" کہنے پر بھی موقوف نہیں، یہ ہم کو سمجھانے کا ایک عنوان ہے بس ادھر ارادہ ہوا ادھر وہ چیز موجود۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس طرح ایک آواز کا سننا اور بیک وقت تمام جہان کی آوازوں کو سننا، یا ایک چیز کا دیکھنا اور بیک وقت تمام جہان کی چیزوں کو دیکھنا، اس کے لئے برابر ہیں، ایسے ہی ایک آدمی کا مارنا، جلانا، اور سارے جہان کا مارنا اور جلانا اس کی قدرت کے سامنے یکساں ہے پھر دوبارہ جلانے کے بعد بیک وقت تمام اولین وآخرین کے اگلے پچھلے اعمال کا رتی رتی حساب چکا دینے میں بھی اسے کوئی دقت نہیں ہوسکتی کیونکہ ہمارے تمام اقوال کو سنتا اور تمام افعال کو دیکھتا ہے، کوئی چھپی کھلی بات وہاں پوشیدہ نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ز

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور کام میں لگا دیا ہے سورج اور چاند کو

كُلٌّ يَّجْرِىْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾

ہر ایک چلتا ہے ایک مقرر وقت تک ۱؎ اور یہ کہ اللہ خبر رکھتا ہے اس کی جو تم کرتے ہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب پھر توحید کا بیان ہے) اے مخاطب! کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ رات (کے اجزاء) کو دن میں اور دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتا ہے، اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے کہ ہر ایک مقررہ وقت تک (یعنی قیامت تک) چلتا رہے گا اور (کیا تجھ کو) یہ (معلوم نہیں) کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب عملوں کی پوری خبر رکھتا ہے (پس جب خدا کی قدرت اور اس کا علم ایسا کامل ہے تو اس کا مقتضی یہ ہے کہ شرک چھوڑ دیا جائے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ "مقررہ وقت" سے قیامت مراد ہے، یا چاند سورج میں سے ہر ایک کا دورہ، کیونکہ ایک دورہ پورا ہونے کے بعد گویا از سر نو چلنا شروع کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جو قوت رات کو دن اور دن کو رات کرتی اور چاند سورج جیسے کرات عظیمہ کو ادنیٰ مزدور کی طرح کام میں لگائے رکھتی ہے، اسے تمہارا مرے پیچھے زندہ کر دینا کیا مشکل ہوگا، اور جب ہر ایک چھوٹے بڑے عمل سے پوری طرح باخبر ہے تو حساب کتاب میں کیا دشواری ہوگی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٣٠﴾

یہ اس لیے کہا کہ اللہ وہی ہے ٹھیک اور جس کسی کو پکارتے ہیں اس کے سوا سو وہی جھوٹ ہے ۱ اور اللہ وہی ہے سب سے اوپر بڑا ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے جو صفات وافعال کو حق تعالیٰ کے ساتھ خاص بیان کیا گیا اب اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ یہ کمال قدرت وغیرہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص کیوں ہے؟

یہ (اختصاص) اس سبب سے ہے کہ اللہ ہی ہستی میں کامل (اور واجب الوجود) ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں بالکل ہی لچر ہیں اور اللہ ہی عالی شان اور (سب سے) بڑا ہے (اس لئے یہ سب تصرفات اسی کے ساتھ خاص ہیں، ہاں! اگر دوسرے موجودات باطل اور فانی اور نہ ہوتے، بلکہ نعوذ باللہ کوئی اور بھی ایسا ہوتا جس کا فنا ہونا محال اور ہمیشہ موجود رہنا ضروری ہوتا تو پھر یہ تصرفات خدا کے ساتھ خاص نہ ہوتے، مگر موجودات میں کوئی بھی اس شان کا نہیں، پس توحید ثابت ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حق تعالیٰ کی یہ شؤون عظیمہ اور صفات قاہرہ اس لئے ذکر کی گئیں کہ سننے والے سمجھ لیں کہ ایک خدا کو ماننا اور صرف اس کی عبادت کرنا ہی ٹھیک راستہ ہے، اس کے خلاف جو کچھ کہا جائے یا کیا جائے باطل اور جھوٹ ہے، یا یہ مطلب ہو کہ اللہ تعالیٰ کا موجود بالذات اور واجب الوجود ہونا جو بان اللہ هو الحق سے سمجھ میں آتا ہے اور دوسروں کا باطل وہالک الذات ہونا اس کو مستلزم ہے کہ اکیلے اسی خدا کے واسطے یہ شؤون وصفات ثابت ہوں پھر جس کے لئے یہ شؤن وصفات ثابت ہوں گی وہ ہی معبود بننے کا مستحق ہوگا۔

فائدہ: ۲ لہٰذا بندہ کی انتہائی پستی اور تذلل (جس کا نام عبادت ہے) اسی کے لئے ہونا چاہئے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

تو نے نہ دیکھا کہ جہاز چلتے ہیں سمندر میں اللہ کی نعمت لے کر تا کہ دکھلائے تم کو کچھ اپنی قدرتیں ۱ البتہ اس میں نشانیاں ہیں

لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿٣١﴾

ہر ایک تحمل کرنے والے احسان ماننے والے کے واسطے ۲

خلاصہ تفسیر: اے مخاطب! کیا تجھ کو (توحید کی) یہ (دلیل) معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے، تا کہ تم کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھلا دے (چنانچہ ہر ممکن کا وجود اپنے پیدا کرنے والے کے وجود کی دلیل ہے، یعنی مخلوقات میں ہر موجود چیز اپنے پیدا کرنے والے کو بتلاتی ہے، اسی طور پر) اس میں (بھی قدرت کی) نشانیاں ہیں ہر ایسے شخص کے لئے جو صابر وشاکر ہو (مراد اس سے مومن ہے کہ صبر و شکر میں کامل ہونا اسی کی صفت ہے، نیز صبر وشکر تذکر وتدبر عالم کے لیے محرک ہیں، اور استدلال کے لئے تذکر وتفکر ضروری ہے)۔

لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ: اس جگہ صابر وشاکر ان صفتوں کا بیان کرنا خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے مناسب ہوا کہ کشتی کی حالت کے اعتبار سے موجوں کا اٹھنا ''صبر'' کا موقع ہے، اور سلامتی سے کنارہ پر جا لگنا ''شکر'' کا موقع ہے، پس جو لوگ ان سب واقعات میں فکر کرتے رہتے ہیں توحید پر استدلال کی توفیق انہی کو ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جہاز بھاری بھاری سامان اٹھا کر خدا کی قدرت اور فضل ورحمت سے کس طرح سمندر کی موجوں کو چیرتا پھاڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اس بحری سفر کے احوال وحوادث میں غور کرنا انسان کے لئے صبر وشکر کے مواقع بہم پہنچاتا ہے، جب طوفان اٹھ رہے ہوں

اور جہاز پانی کے تھپیڑوں میں گھرا ہو، اس وقت بڑے صبر وتحمل کا کام ہے اور جب اللہ نے اس کشمکش موت وحیات سے صحیح وسالم نکال دیا تو ضروری ہے کہ اس کا احسان مانے۔

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ

اور جب سر پر آئے ان کے موج جیسے بادل پکارنے لگیں اللہ کو خالص کر کے اسی کے لیے بندگی ۱ے پھر جب بچا دیا ان کو جنگل کی طرف

فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

تو کوئی ہوتا ہے ان میں بیچ کی چال پر ۲ے اور منکر وہی ہوتے ہیں ہماری قدرتوں سے جو قول کے جھوٹے ہیں حق نہ ماننے والے ۳ے

خلاصہ تفسیر: اب بتلاتے ہیں کہ جس طرح کفار کو دلیل توحید کے مقدمات کا اقرار ہے جس کا بیان پیچھے آیت: ولئن سالتھم میں آچکا ہے اسی طرح بعض اوقات خود نتیجہ دلیل یعنی توحید کا اقرار بھی کر لیتے ہیں جس سے توحید خوب ہی واضح ہوگئی، چنانچہ:

اور جب ان لوگوں کو موجیں سائبانوں (یعنی بادلوں) کی طرح (محیط ہوکر) گھیر لیتی ہیں تو وہ خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں، پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے، سو بعضے تو ان میں اعتدال پر رہتے ہیں (یعنی شرک کے ٹیڑھے راستہ کو چھوڑ کر توحید کو اختیار کر لیتے ہیں جو کہ نہایت معتدل راستہ ہے) اور (بعض پھر ہماری آیتوں کے منکر ہوجاتے ہیں اور) ہماری آیتوں کے بس وہی لوگ منکر ہوتے ہیں جو بدعہد اور ناشکرے ہیں (کہ کشتی میں جو توحید کا عہد کیا تھا اس کو توڑ دیا، اور سلامتی سے خشکی میں آنے کا مقتضی شکر کرنا تھا اس کو چھوڑ دیا)۔

* * *

فائدہ: ۱ے اوپر دلائل وشواہد سے سمجھایا تھا کہ ایک اللہ ہی کا ماننا ٹھیک ہے، اس کے خلاف سب باتیں جھوٹی ہیں، یہاں بتلایا کہ طوفانی موجوں میں گھر کر کٹر سے کٹر مشرک بھی بڑی عقیدت مندی اور اخلاص کے ساتھ اللہ کو پکارنے لگتا ہے، معلوم ہوا کہ انسانی ضمیر وفطرت کی اصلی آواز یہ ہی ہے، باقی سب بناوٹ اور جھوٹے ڈھکوسلے ہیں۔

فائدہ: ۲ے یعنی جب خدا تعالیٰ طوفان سے نکال کر خشکی پر لے آیا تو تھوڑے نفوس ہیں جو اعتدال وتوسط کی راہ پر قائم رہیں ورنہ اکثر تو دریا سے نکلتے ہی شرارتیں شروع کر دیتے ہیں، مترجم رحمہ اللہ نے فمنھم مقتصد کا ترجمہ کیا ''تو کوئی ہوتا ہے ان میں بیچ کی چال پر''، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی جو حال خوف کے وقت تھا وہ تو کسی کا نہیں، مگر بالکل بھول بھی نہ جائے، ایسے بھی کم ہیں، نہیں تو اکثر قدرت سے منکر ہوتے ہیں، اپنے بچ نکلنے کو تدبیر پر رکھتے ہیں یا کسی ارواح وغیرہ کی مدد پر''۔

فائدہ: ۳ے یعنی ابھی تھوڑی دیر پہلے طوفان میں گھر کر جو قول وقرار اللہ سے کر رہے تھے، سب جھوٹے نکلے، چند روز بھی اس کے انعام واحسان کا حق نہ مانا اس قدر جلد قدرت کی نشانیوں سے منکر ہو گئے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ

اے لوگو بچتے رہو اپنے رب سے اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی باپ اپنے بیٹے کے بدلے، اور نہ کوئی بیٹا ہو جو کام آئے

وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ٙ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾

اپنے باپ کی جگہ کچھ بھی ۱ے بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے سو تم کو نہ بہکائے دنیا کی زندگانی اور نہ دھوکا دے تم کو اللہ کے نام سے وہ دغاباز ۲ے

خلاصہ تفسیر: پیچھے شرک کو باطل کیا تھا، اور آیت: نمتعھم قلیلا میں اس پر اجمالی وعید تھی، اب عام نصیحت کے رنگ میں

قیامت کو یاد دلا کر تفصیلی وعید بیان فرماتے ہیں۔

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو (اور کفر و شرک چھوڑ دو) اور اس دن سے ڈرو جس میں نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کر سکے گا اور نہ کوئی بیٹا ہی ہے کہ وہ اپنے باپ کی طرف سے ذرا بھی مطالبہ ادا کر دے (اور یہ دن آنے والا ضرور ہے، کیونکہ اس کی نسبت اللہ کا وعدہ ہے اور) یقینا اللہ کا وعدہ سچا (ہوتا) ہے سو تم کو دنیاوی زندگانی دھوکہ میں نہ ڈالے (کہ اس میں منہمک ہو کر اس دن سے غافل رہو) اور نہ تم کو وہ دھوکہ باز (یعنی شیطان) اللہ سے دھوکہ میں ڈالے (کہ تم اس کے بہکانے میں آجاؤ کہ اللہ تم کو عذاب نہ دے گا جیسا کہ بعض کہا کرتے تے: **ولئن رجعت الیٰ ربی ان لی عندہ للحسنیٰ**، کہ اگر میں خدا کے پاس گیا تب بھی میرے لیے خدا کے پاس اچھا ٹھکانہ ہوگا)۔

يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ: مراد اس سے وہ باپ اور بیٹے ہیں جن میں ایک مومن ہو دوسرا کافر، کیونکہ مومن باپ نہ اپنے کافر بیٹے کے عذاب میں کوئی کمی کر سکے گا، نہ اس کو کوئی نفع پہنچا سکے گا، اسی طرح مومن بیٹا اپنے کافر باپ کے کچھ کام نہ آسکے گا، وجہ اس تخصیص کی قرآن کریم کی دوسری آیات اور روایات حدیث ہیں جن میں اس کی تصریح ہے کہ قیامت کے روز ماں باپ اولاد کی اور اولاد ماں باپ کی شفاعت کریں گے، اور اس شفاعت کی وجہ سے ان کو کامیابی بھی ہوگی، قرآن کریم میں ہے: **والذین امنوا اتبعتھم ذریتھم بایمان الحقنا بھم ذریتھم** "یعنی جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان میں ان کے تابع ہوئی، یعنی وہ بھی مومن ہو گئے تو ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ماں باپ صالحین کے درجہ میں پہنچا دیں گے" اگر چہ ان کے اپنے اعمال اس درجہ کے قابل نہ ہوں مگر صالح والدین کی برکت سے قیامت میں بھی ان کو یہ نفع پہنچے گا کہ والدین کے مقام پر پہنچا دیا جائے گا مگر اس میں شرط یہی ہے کہ اولاد مومن ہو، اگر چہ عمل میں کچھ کوتاہی ہوئی ہو، اسی طرح ایک دوسری آیت میں ہے: **جنت عدن یدخلونھا ومن صلح من اباءھم وازواجھم وذریتھم**، یعنی ہمیشہ رہنے کی جنتوں میں داخل ہوں گے اور ان کے ساتھ وہ لوگ بھی داخل ہوں گے جو ان کے ماں باپ بیویوں اور اولادوں میں سے اس قابل ہوں گے، مراد قابل ہونے سے مومن ہونا ہے، ان دونوں آیتوں سے ثابت ہوا کہ ماں باپ اور اولاد، اسی طرح شوہر اور بیوی اگر مومن ہونے میں مشترک ہوں تو پھر ایک سے دوسرے کو محشر میں بھی فائدہ پہنچے گا، اسی طرح متعدد روایات حدیث میں اولاد کا ماں باپ کی شفاعت کرنا منقول ہے، اس لئے آیت مذکورہ کا یہ ضابطہ کہ کوئی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو محشر میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا، یہ اسی صورت میں ہے کہ ان میں سے ایک مومن ہو دوسرا کافر۔

* * *

فائدہ: ۱ طوفان کے وقت جہاز کے مسافروں میں سخت افراتفری ہوتی ہے، ہر ایک اپنی جان بچانے کی فکر میں رہتا ہے، تاہم ماں باپ اولاد سے اور اولاد ماں باپ سے بالکل غافل نہیں ہو جاتی، ایک دوسرے کے بچانے کی تدبیر کرتا ہے، بلکہ بسا اوقات والدین کی شفقت چاہتی ہے کہ ہو سکے تو بچہ کی مصیبت اپنے سر لے کر اس کو بچالیں لیکن ایک ہولناک اور ہوش ربا دن آنے والا ہے جب ہر طرف نفسی نفسی ہوگی، اولاد اور والدین میں سے کوئی ایثار کر کے دوسرے کی مصیبت اپنے سر لینے کو تیار نہ ہوگا، اور تیار بھی ہو تو یہ تجویز چل نہ سکے گی، چاہیے کہ آدمی اس دن سے ڈر کر غضب الٰہی سے بچنے کا سامان کرے، آج اگر سمندر کے طوفان سے بچ گئے تو کل اس سے کیونکر بچو گے۔

فائدہ: ۲ یعنی وہ دن یقینا آکر رہے گا یہ اللہ کا وعدہ ہے جو ٹل نہیں سکتا، لہذا دنیا کی چند روزہ بہار اور چہل پہل سے دھوکا نہ کھاؤ کہ ہمیشہ اسی طرح رہے گی، اور یہاں آرام سے ہو تو وہاں بھی آرام کرو گے؟ نیز اس دغا باز شیطان کے اغواء سے ہوشیار رہو جو اللہ کا نام لے کر دھوکا دیتا ہے، کہتا ہے میاں اللہ غفور رحیم ہے خوب گناہ سمیٹو، مزے اڑاؤ، بوڑھے ہو کر اکٹھی توبہ کر لینا، اللہ سب بخش دے گا، تقدیر میں اگر اس نے جنت لکھ دی ہے تو گناہ کتنے ہی ہوں ضرور پہنچ کر رہو گے اور دوزخ لکھی ہے تو کسی طرح بچ نہیں سکتے پھر کاہے کے لئے دنیا کا مزہ چھوڑیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ

بے شک اللہ کے پاس ہے قیامت کی خبر، اور اتارتا ہے مینہ، اور جانتا ہے جو کچھ ہے ماں کے پیٹ میں، اور کسی جی کو معلوم نہیں

مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌۢ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۖ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾ ع

کہ کل کو کیا کرے گا اور کسی جی کو خبر نہیں کہ کس زمین میں مرے گا تحقیق اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کی وعید تھی اور کفار بغرض انکار سے اس کا وقت پوچھا کرتے تھے اس لیے اب بطور جواب کے فرماتے ہیں کہ علم غیب خدا ہی کے ساتھ خاص ہے، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قیامت کے وقت کو نہ جاننا اس کے نہ آنے کی دلیل نہیں ہوسکتی، نیز اس آیت میں مخلوقات سے علم غیب کی نفی ہوگئی جن میں باطل معبود بھی داخل ہیں تو اس سے توحید کا اثبات بھی ہوگیا کہ جس کا علم ناقص ہو وہ معبود نہیں ہوسکتا، خلاصہ تمام سورت کا یہی دو باتیں ہیں: قیامت کو ثابت کرنا اور توحید کو بیان کرنا، پس یہ آیت سورت کے تمام مضامین کو جامع ہوگئی اس لیے اس پر ختم کرنا عین بلاغت ہوا۔

بیشک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی (اپنے علم کے موافق) مینہ برساتا ہے (پس اس کا علم اور قدرت بھی اسی کے ساتھ خاص ہے) اور وہی جانتا ہے جو کچھ (لڑکا لڑکی حاملہ کے) رحم میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کرے گا (اس کی بھی اسی کو خبر ہے) اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا (اس کی بھی اسی کو خبر ہے اور انہی چیزوں کی کیا تخصیص ہے جتنے غیوب ہیں) بیشک اللہ (ہی ان) سب باتوں کا جاننے والا (اور ان سے) باخبر ہے (کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں)۔

علم غیب کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کو بلا واسطہ جاننا اور تمام چیزوں کے حالات وغیرہ کو احاطہ کرلینا ایسا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا، رہا یہ سوال کہ جب علم غیب مطلقاً خدا کے لیے مخصوص ہے تو ان پانچ چیزوں کی کیا خصوصیت ہے جو ان ہی کو بیان کیا گیا؟ ① ایک جواب یہ ہے کہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان ہی پانچ چیزوں کا سوال کیا تھا، اس لیے آیت میں ان کو خصوصیت کے ساتھ بیان کردیا گیا ② دوسرا جواب یہ ہے کہ عام طور پر جن غیب کی چیزوں کو انسان معلوم کرنے کا شائق ہوتا ہے وہ یہی پانچ چیزیں ہیں، نیز علم غیب کا دعویٰ کرنے والے نجومی وغیرہ جن چیزوں کی خبریں لوگوں کو بتا کر اپنا عالم الغیب ہونا ثابت کرتے ہیں وہ یہی پانچ چیزیں ہیں، ان چیزوں کے جاننے کا لوگوں کو بہت اشتیاق ہوتا ہے اور حدیث میں وارد ہے: "مفاتح الغیب خمس" کہ غیب کی کنجیاں پانچ چیزیں ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی چیزوں کو بیان فرمایا تو اس سے مقصود مثال کے طور پر بیان کرنا ہے، یہ مطلب نہیں کہ ان پانچ کے سوا دوسری چیزوں کا علم غیب مخلوق کو ہوسکتا ہے۔

اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بعض اوقات علامات سے پیٹ کے بچہ کا حال اور بارش نازل ہونے کا وقت دوسرے لوگ بھی جان لیتے ہیں پھر ان کا جاننا خدا کے ساتھ کیونکر مخصوص ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا علم غیب کے طریقہ پر جاننا خدا کے ساتھ خاص ہے، اور علم غیب کے معنی معلوم ہوچکے ہیں کہ بلا واسطہ جاننے کو کہتے ہیں اور دوسرے لوگ علامات کے واسطہ سے جانتے ہیں، بلا واسطہ نہیں جان سکتے، پس اب کوئی اشکال نہیں رہا۔

اس آیت میں پانچ چیزوں کے علم کا حق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا ایک خاص اہتمام کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے، جس کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ ایک ہی عنوان سے پانچ چیزوں کو شمار کر کے کہہ دیا جاتا کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے کسی مخلوق کو ان کا علم نہیں دیا گیا، مگر آیت مذکورہ میں ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ ابتدائی تین چیزوں کے علم کو تو مثبت طور پر اللہ کے لئے خاص ہونے کا ذکر فرمایا اور آخری دو چیزوں میں غیر اللہ سے علم کی نفی فرمائی اور پہلی تین چیزوں میں بھی علم ساعت یعنی قیامت کا ذکر تو اس طرح فرمایا کہ: **ان اللہ عندہ علم الساعۃ**، یعنی اللہ ہی کے پاس ہے علم قیامت کا، اور دوسری چیز کا ذکر عنوان بدل کر جملہ فعلیہ میں اس طرح ذکر فرمایا: **ینزل الغیث**، یعنی اللہ تعالیٰ اتارتا ہے بارش، اس میں بارش کے علم کا ذکر ہی نہیں، بلکہ اس میں اتارنے کا ذکر ہے، تیسری چیز کا ذکر پھر عنوان بدل کر اس طرح فرمایا کہ: **ویعلم ما فی الارحام**، اس تغیر عنوان کو بلاغت کلام کا ایک تفنن بھی کہا جاسکتا ہے اور غور کرنے سے اس میں کچھ اور حکمتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آخری دو چیزیں یعنی آئندہ کل میں انسان کیا کمائے گا، اور یہ کہ وہ کس زمین میں مرے گا خود انسان کی ذات کے متعلق

حالات ہیں ان میں احتمال ہوسکتا تھا کہ انسان ان کا علم حاصل کرلے، اس لئے ان دونوں میں خصوصیت سے غیر اللہ کے علم کو منفی کر کے بیان فرمایا گیا، جس سے پہلی تین چیزوں کا علم غیر اللہ کے لئے نہ ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگیا کہ جب انسان خود اپنے اعمال و مکاسب کو اور ان کی انتہا یعنی موت اور اس کی جگہ نہیں جانتا تو آسمان اور نزول مطر اور شکم مادر کی اندھیریوں میں مخفی چیز کو کیا جانے گا؟ اور آخری چیز میں صرف مکان موت کا علم انسان کو نہ ہونا بیان فرمایا ہے، حالانکہ مکان موت کی طرح زمان موت بھی انسان کے علم میں نہیں ہوتا، وجہ یہ ہے کہ مکان موت اگرچہ متعین طور پر معلوم نہ ہو مگر ظاہری حالات کے اعتبار سے انسان کچھ سمجھ سکتا ہے، کہ جہاں رہتا سہتا ہے وہیں مرے گا اور کم از کم وہ مکان جس میں اس کو مرنا ہے دنیا میں موجود تو ہے، بخلاف زمان موت کے جو زمانہ مستقبل ہے ابھی وجود میں بھی نہیں آیا، تو جو شخص مکان موت کو موجود بالفعل ہونے کے باوجود نہیں جان سکتا، اس کے متعلق یہ تصور کیسے کیا جائے کہ زمان موت جس کا اس وقت وجود ہی نہیں اس کو جان لے، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں ایک چیز کی نفی سے خود بخود دوسری چیزوں کی نفی بدرجہ اولیٰ معلوم ہوجاتی ہے، اس لئے ان دونوں کو منفی عنوان سے بیان فرمایا، اور پہلی تین چیزیں تو انسانی دسترس سے ظاہر حالات میں خود ہی خارج ہیں، ان میں انسان کے علم کا دخل نہ ہونا واضح ہے، اس لئے ان میں مثبت عنوان اختیار کر کے ان کا اختصاص حق تعالیٰ کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔

اور ان میں سے پہلے جملے کو جملہ اسمیہ سے اور بعد کے دونوں جملوں کو فعلیہ کے عنوان سے ذکر کرنے میں شاید یہ حکمت ہے کہ قیامت تو ایک امر متعین ہے اس میں تجدد نہیں بخلاف نزول مطر اور حمل کے کہ ان کے حالات میں تجدد ہوتا رہتا ہے، اور جملہ فعلیہ تجدد پر دلالت کرتا ہے، اس لئے ان دونوں میں وہ استعمال کیا گیا، اور ان دونوں میں بھی حمل کے حالات میں تو علم الٰہی کا ذکر فرمایا: **ویعلم ما فی الارحام**، اور نزول بارش میں علم کا ذکر ہی نہیں، وجہ یہ ہے کہ یہاں بارش نازل کرنے کا ذکر کر کے ضمناً یہ بھی بتلا دیا کہ بارش جس سے انسان کے ہزاروں منافع وابستہ ہیں وہ اللہ ہی کے کرنے سے آتی ہے، اور کسی کے تصرف میں نہیں، اور اس کا علمی اختصاص تو سیاق کلام ہی سے ثابت ہوجاتا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

* * *

فائدہ: یعنی قیامت آکر رہے گی، کب آئے گی؟ اس کا علم خدا کے پاس ہے، نہ معلوم کب یہ کارخانہ توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا جائے آدمی دنیا کے باغ و بہار اور وقتی تروتازگی پر ریجھتا ہے، کیا نہیں جانتا کہ علاوہ فانی ہونے کے فی الحال بھی یہ چیز اور اس کے اسباب سب خدا کے قبضہ میں ہیں، زمین کی ساری رونق اور مادی برکت (جس پر تمہاری خوشحالی کا مدار ہے) آسمانی بارش پر موقوف ہے، سال دو سال مینہ نہ برسے تو ہر طرف خاک اڑنے لگے، نہ سامان معیشت رہیں نہ اسباب راحت، پھر تعجب ہے کہ انسان دنیا کی زینت اور تروتازگی پر فریفتہ ہو کر اس ہستی کو بھول جائے جس نے اپنی باران رحمت سے اس کو تروتازہ اور پر رونق بنا رکھا ہے۔

علاوہ بریں کسی شخص کو کیا معلوم ہے کہ دنیا کے عیش و آرام میں اس کا کتنا حصہ ہے، بہت سے لوگ کوشش کر کے اور ایڑیاں رگڑ کر مر جاتے ہیں، لیکن زندگی بھر چین نصیب نہیں ہوتا، بہت ہیں جنہیں بے محنت دولت مل جاتی ہے، یہ دیکھ کر بھی کوئی آدمی جو دین کے معاملہ میں تقدیر الٰہی پر بھروسہ کیے بیٹھا ہو، دنیاوی جدوجہد میں تقدیر پر قانع ہو کر ذرہ برابر کمی نہیں کرتا، وہ سمجھتا ہے کہ تدبیر کرنی چاہئے، کیونکہ اچھی تقدیر عموماً کامیاب تدبیر ہی کے ضمن میں ظاہر ہوتی ہے، یہ علم خدا کو ہے کہ فی الواقع ہماری تقدیر کیسی ہوگی اور صحیح تدبیر بن پڑے گی یا نہیں، یہ ہی بات اگر ہم دین کے معاملہ میں سمجھ لیں تو شیطان کے دھوکہ میں ہرگز نہ آئیں، بیشک جنت دوزخ جو کچھ ملے گی تقدیر سے ملے گی جس کا علم خدا کو ہے، مگر عموماً اچھی یا بری تقدیر کا حوالہ دے کر ہم تدبیر کو نہیں چھوڑ سکتے، کیونکہ یہ پتہ کسی کو نہیں کہ اللہ کے علم میں وہ سعید ہے یا شقی؟ جنتی ہے یا دوزخی؟ مفلس ہے یا غنی؟ لہذا ظاہری عمل اور تدبیر ہی وہ چیز ہوئی جس سے عادۃً ہم کو نوعیت تقدیر کا قدرے پتہ چل جاتا ہے، ورنہ یہ علم تو حق تعالیٰ ہی کو ہے کہ عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی اور پیدا ہونے کے بعد اس کی عمر کیا ہو، روزی کتنی ملے، سعید ہو یا شقی، اسی کی طرف: **وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ** میں اشارہ کیا ہے۔

رہا شیطان کا یہ دھوکا کہ فی الحال تو دنیا کے مزے اڑالو، پھر توبہ کر کے نیک بن جانا، اس کا جواب: **وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا** میں دیا ہے، یعنی کسی کو خبر نہیں کہ کل وہ کیا کرے گا؟ اور کچھ کرنے کے لئے زندہ بھی رہے گا؟ کب موت آجائے گی اور کہاں آئے گی؟ پھر یہ وثوق

کیسے ہوکہ آج کی بدی کا تدارک کل نیکی سے ضرور کرلے گا اور توبہ کی توفیق ضرور پائے گا؟ ان چیزوں کی خبر تو اسی علیم وخبیر کو ہے۔

تنبیہ: یادرکھنا چاہیے کہ مغیبات ① جنس احکام سے ہوں گی یا ② جنس اکوان سے۔

پھر اکوان غیبیہ ① زمانی ہیں یا ② مکانی، اور (اکوان غیبیہ) زمانی کی باعتبار ماضی، مستقبل، حال کے تین قسمیں کی گئی ہیں۔

ان میں سے احکام غیبیہ کا کلی علم پیغمبر (علیہ السلام) کو عطا فرمایا گیا: فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا (الجن :۲۶۔۲۸) جس کی جزئیات کی تفصیل وتبویب اذکیائے امت نے کی۔

اور اکوان غیبیہ کی کلیات واصول کا علم حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ مختص رکھا، ہاں جزئیات منتشرہ پر بہت سے لوگوں کو حسب استعداد اطلاع دی، اور نبی کریم ﷺ کو اس سے بھی اتنا وافر اور عظیم الشان حصہ ملا جس کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا، تاہم اکوان غیبیہ کا علم کلی رب العزت ہی کے ساتھ مختص رہا، آیت ہذا میں جو پانچ چیزیں مذکور ہیں احادیث میں ان کو ''مفاتیح الغیب'' فرمایا ہے جن کا علم (یعنی علم کلی) بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں، فی الحقیقت ان پانچ چیزوں میں کل اکوان غیبیہ کی انواع کی طرف اشارہ ہوگیا: ① بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ میں غیوب مکانیہ ② ماذا تکسب غدا میں زمانیہ مستقبلہ ③ مَا فِي الْاَرْحَامِ میں زمانیہ حالیہ اور ④ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ میں غالباً زمانیہ ماضیہ پر تنبیہ ہے۔

یعنی بارش آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ کسی کو معلوم نہیں کہ پہلے سے کیا ایسے اسباب فراہم ہو رہے تھے کہ ٹھیک اسی وقت اسی جگہ اسی مقدار میں بارش ہوئی، ماں بچہ کو پیٹ میں لئے پھرتی ہے پر اسے پتہ نہیں کہ پیٹ میں کیا ہے، لڑکا یا لڑکی؟ انسان واقعات آئندہ پر حاوی ہونا چاہتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ کل میں خود کیا کام کروں گا؟ میری موت کہاں واقعہ ہوگی؟ اس جہل وبیچارگی کے باوجود تعجب ہے کہ دنیاوی زندگی پر مفتون ہو کر خالق حقیقی کو اور اس دن کو بھول جائے جب پروردگار کی عدالت میں کشاں کشاں حاضر ہونا پڑے گا۔

بہر حال ان پانچ چیزوں کے ذکر سے تمام اکوان غیبیہ کے علم کلی کی طرف اشارہ کرنا ہے، حصر مقصود نہیں اور غالباً ذکر میں ان پانچ کی تخصیص اس لئے ہوئی کہ ایک سائل نے سوال انہی پانچ باتوں کی نسبت کیا تھا جس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی، کما فی الحدیث، پہلے سورۃ انعام اور سورۃ نمل میں بھی ہم علم غیب کے متعلق کچھ لکھ چکے ہیں، ایک نظر ڈال لی جائے۔

ایاتها ۳۰ | ۳۲ سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ ۷۵ | رکوعاتها ۳

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں توحید وقیامت کے مضامین تھے، اس سورت کے شروع میں قرآن کی حقانیت سے رسالت کو ثابت کیا گیا ہے جس کا توحید ومعاد کے ساتھ تناسب ظاہر ہے، پھر اس کے بعد توحید وآخرت کا ذکر ہے، پھر **ولقد اتینا موسی** سے مسئلہ رسالت کی تائید اور جھٹلانے والوں کے معاملہ میں صاحب رسالت یعنی پیغمبر کو تسلی دی جاتی ہے اور **اولم یھد** سے آخر تک جھٹلانے والوں کی توبیخ اور ان کے بعض اقوال کا جواب ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ① تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ②

الف لام میم، اتارنا کتاب کا اس میں کچھ دھوکا نہیں پروردگار عالم کی طرف سے ہے۔

خلاصہ تفسیر: الم (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے (اور) اس میں کچھ شبہ نہیں (اور) یہ رب

العالمین کی طرف سے ہے (جیسا کہ اس کتاب کا اعجاز بلاغت وغیرہ خود اس کی دلیل ہے)۔

* * *

فائدہ: لہ بلاشبہ یہ کتاب مقدس رب العالمین نے اتاری ہے نہ اس میں کچھ دھوکا ہے نہ شک وشبہ کی گنجائش۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ

کیا کہتے ہیں کہ جھوٹ باندھ لایا ہے، کوئی نہیں وہ ٹھیک ہے تیرے رب کی طرف سے تا کہ تو ڈر سناوے ان لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا

مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ③

تجھ سے پہلے تا کہ وہ راہ پر آئیں

خلاصہ تفسیر: کیا یہ (منکر) لوگ یوں کہتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ اپنے دل سے بنا لیا ہے (یعنی یہ کہنا محض لغو اور جھوٹ ہے، یہ بنایا ہوا ہرگز نہیں) بلکہ یہ سچی کتاب ہے آپ کے رب کی طرف سے (آئی ہے) تا کہ آپ (اس کے ذریعہ سے) ایسے لوگوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا تا کہ وہ لوگ راہ پر آ جائیں۔

لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ: مطلب یہ ہے کہ قریش مکہ میں آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انبیاء کی دعوت بھی ان کو اب تک نہ پہنچی تھی، کیونکہ دوسری آیت قرآن میں واضح طور پر ارشاد ہے: وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر یعنی کوئی امت اور جماعت دنیا میں ایسی نہیں جس میں کوئی اللہ سے ڈرانے والا اور اس کی طرف دعوت دینے والا نہ آیا ہو، اس آیت میں لفظ ''نذیر'' اپنے عام لغوی معنی میں ہے، یعنی اللہ کی طرف دعوت دینے والا وہ خواہ رسول اور پیغمبر ہو یا ان کا کوئی نائب، خلیفہ یا عالم دین، تو اس آیت سے تمام امتوں اور جماعتوں تک توحید کی دعوت پہنچ جانا معلوم ہوتا ہے، وہ اپنی جگہ صحیح درست اور حق تعالیٰ کی رحمت عامہ کا مقتضا ہے، مگر اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ دعوت خود کوئی نبی و رسول لے کر آیا ہو، ہوسکتا ہے کہ ان کے نائبین علماء کے ذریعہ پہنچ گئی ہو، اس لئے اس سورۃ اور سورۃ یٰسین وغیرہ کی وہ آیتیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قریش عرب میں آپ سے پہلے کوئی ''نذیر'' نہیں آیا تھا، ضروری ہے کہ اس میں نذیر سے مراد اصطلاحی معنی کے اعتبار سے رسول و نبی ہو، اور مراد یہ ہو کہ اس قوم کے اندر آپ سے پہلے کوئی نبی و رسول نہیں آیا تھا، اگرچہ دعوت ایمان و توحید دوسرے ذرائع سے یہاں بھی پہنچ چکی ہو۔

* * *

فائدہ: یعنی جس کی کتاب کا معجزہ اور من اللہ ہونا اس قدر واضح ہے کہ شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں، کیا اس کی نسبت کفار کہتے ہیں کہ اپنی طرف سے گھڑ لایا ہے۔ اور معاذ اللہ جھوٹ طوفان خدا کی طرف نسبت کرتا ہے؟ حد ہوگئی! جب ایسی روشن چیز میں بھی شبہات پیدا کیے جانے لگے، ذرا غور و انصاف کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ یہ کتاب ٹھیک پروردگار عالم کی طرف سے آئی ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے آپ اس قوم کو بیدار کرنے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کریں جن کے پاس قرنوں سے کوئی بیدار کرنے والا پیغمبر نہیں آیا۔

سوچنے کی بات ہے کہ آدمی اپنی طرف سے وہ ہی چیز بنا کر لاتا ہے یا بنا سکتا ہے جس کی کوئی نظیر یا زبردست خواہش اس کے ماحول میں پائی جاتی ہو۔ کسی ملک میں ایسی بات دفعۃً منہ سے نکال دینا جوان کی سینکڑوں برس کی مسخ شدہ ذہنیت اور مذاق کے یکسر مخالف ہو اور جس کے قبول کی ادنیٰ ترین استعداد بھی بظاہر نہ پائی جائے، کسی عاقل کا کام نہیں ہوسکتا۔ ہاں! اللہ کی قدرت قاہرہ کسی کو مامور کرے وہ الگ بات ہے پس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم جن کا اعقل الناس ہونا ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے جو آپ کو (معاذ اللہ) مفتری کہتے ہیں، اگر کوئی بات بنا کر لاتے تو یقیناً ایسی لاتے جو عرب کی اس فضا کے مناسب اور عام جذبات کے موافق ہوتی اور جس کا کوئی نمونہ ان کے گرد و پیش پایا جاتا۔ یہ ہی بات ایک انصاف پسند کو یقین دلا سکتی ہے کہ وہ خود اپنی ذاتی خواہش سے کھڑے نہیں ہوئے اور نہ جو پیغام لائے وہ ان کا تصنیف کیا ہوا تھا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ط

اللہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن کے اندر پھر قائم ہوا عرش پر ١ے

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ط اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴﴾

کوئی نہیں تمہارا اُس کے سوائے حمایتی اور نہ سفارشی، پھر تم کیا دھیان نہیں کرتے ٢ے

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسالت کو ثابت کیا گیا تھا، اب توحید کا اثبات ہے اور ضمنا قیامت کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اللہ ہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو اور اس مخلوق کو جو ان دونوں کے درمیان میں (موجود) ہے چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا، پھر عرش پر (جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے، وہ ایسا عظیم ہے کہ) بدون اس (کی مرضی و اجازت) کے نہ تمہارا کوئی مددگار ہے اور نہ سفارش کرنے والا (البتہ اجازت کے بعد شفاعت ہو جائے گی اور نصرت کے ساتھ اجازت ہی متعلق نہ ہوگا) سو کیا تم سمجھتے نہیں ہو (کہ ایسی ذات کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا)۔

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ: اس میں اشارہ ہے کہ محض اسباب کی طرف توجہ اور ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ١ے اس کا بیان سورۃ اعراف میں آٹھویں پارہ کے اختتام کے قریب گزر چکا، ملاحظہ کر لیا جائے۔

فائدہ: ٢ے یعنی دھیان نہیں کرتے کہ اس کے پیغام اور پیغامبر کو جھٹلا کر کہاں جاؤ گے، تمام زمین و آسمان میں عرش سے فرش تک اللہ کی حکومت ہے، اگر پکڑے گئے تو اس کی اجازت و رضاء کے بدون کوئی حمایت اور سفارش کرنے والا بھی نہ ملے گا۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۵﴾

تدبیر سے اتارتا ہے کام آسمان سے زمین تک پھر چڑھتا ہے وہ کام اس کی طرف ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے تمہاری گنتی میں

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ (ایسا ہے کہ) آسمان سے لے کر زمین تک (جتنے امور ہیں) ہر امر کی (وہی) تدبیر (اور انتظام) کرتا ہے، پھر ہر امر اسی کے حضور میں پہنچ جائے گا ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار کے موافق ایک ہزار برس کی ہوگی (یعنی قیامت میں تمام امور اور ان کے متعلقات یعنی طاعات و گناہ سب اس کے حضور میں پیش ہوں گے، کقولہ تعالیٰ: **والیہ یرجع الامر کلہ**)۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ: اس میں اشارہ ہے کہ بندہ اللہ تعالی کی تدبیر پر نظر کر کے اپنی تدبیر سے مستغنی ہو جائے۔

كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ: یہاں قیامت کے دن کی مقدار ایک ہزار برس بیان ہوئی ہے اور دوسری آیت میں: **خمسین الف سنۃ** یعنی پچاس ہزار سال کی مقدار آئی ہے، سو دونوں میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ بعضوں کو سختی اور پریشانی کی وجہ سے وہ دن بہت زیادہ بڑا معلوم ہوگا، ان کے اعتبار سے پچاس ہزار سال کہا گیا ہے کہ وہ ایسا ہی سمجھیں گے۔

* * *

فائدہ: بڑے کام اور اہم انتظامات کے متعلق عرش عظیم سے مقرر ہو کر نیچے حکم اترتا ہے، سب اسباب حسی و معنوی، ظاہری و باطنی، آسمان و زمین سے جمع ہو کر اس کے انصرام میں لگ جاتے ہیں، آخر وہ کام اور انتظام اللہ کی مشیت و حکمت سے مدتوں جاری رہتا ہے، پھر زمانہ دراز کے بعد اٹھ جاتا ہے۔ اس وقت اللہ کی طرف سے دوسرا رنگ اترتا ہے۔ جیسے بڑے بڑے پیغمبر جن کا اثر قرنوں رہا، یا کسی بڑی قوم میں سرداری جو نسلوں تک چلی۔ وہ ہزار برس اللہ کے ہاں ایک دن ہے (موضح بتغیر یسیر)۔

مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہزار سال کے انتظامات وتدابیر فرشتوں کو القاء کرتا ہے اور یہ اس کے ہاں ایک دن ہے، پھر فرشتے جب (انہیں انجام دے کر) فارغ ہوجاتے ہیں، آئندہ ہزار سال کے انتظامات القاء فرمادیتا ہے، یہ ہی سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

بعض مفسرینؒ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اللہ کا حکم آسمانوں کے اوپر سے زمین تک آتا ہے، پھر جو کاروائیاں اس کے متعلق یہاں ہوتی ہیں وہ دفتر اعمال میں درج ہونے کے لئے اوپر چڑھتی ہیں جو سمائے دنیا کے محدب پر واقع ہے۔ اور زمین سے وہاں تک کا فاصلہ آدمی کی متوسط رفتار سے ایک ہزار سال کا ہے جو خدا کے ہاں ایک دن قرار دیا گیا۔ مسافت تو اتنی ہے یہ جداگانہ بات ہے کہ فرشتہ ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کم میں قطع کرلے۔

بعض مفسرین یوں معنی کرتے ہیں کہ ایک کام اللہ تعالیٰ کو کرنا ہے تو اس کے مبادی واسباب کا سلسلہ ہزار سال پہلے سے شروع کردیتے ہیں۔ پھر وہ حکمت بالغہ کے مطابق مختلف ادوار میں گزرتا اور مختلف صورتیں اختیار کرتا ہوا بتدریج اپنے منتہائے کمال کو پہنچتا ہے۔ اس وقت جو نتائج وآثار اس کے ظہور پذیر ہوتے ہیں بارگاہ ربوبیت میں پیش ہونے کے لئے چڑھتے ہیں۔

بعض کے نزدیک **یوم** سے "یوم قیامت مراد" ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ آسمان سے زمین تک تمام دنیا کا بندوبست کرتا ہے۔ پھر ایک وقت آئے گا جب یہ سارا قصہ ختم ہوکر اللہ کی طرف لوٹ جائے گا اور آخری فیصلہ کے لئے پیش ہوگا۔ اس کو قیامت کہتے ہیں۔ قیامت کا دن ہزار سال کے برابر ہے۔ بہرحال **فی یوم** کو بعض نے **یعرج** کے متعلق کیا ہے اور بعض نے تنازع فعلین مانا ہے۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ

یہ ہے جاننے والا چھپے اور کھلے کا زبردست رحم والا۔ جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور شروع کی انسان کی

الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ

پیدائش ایک گارے سے، پھر بنائی اس کی اولاد نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے[2] پھر اس کو برابر کیا[3] اور پھونکی اس میں

مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝

اپنی ایک جان[4] اور بنا دیئے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل، تم بہت تھوڑا شکر کرتے ہو[5]

خلاصہ تفسیر: وہی ہے جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا زبردست رحمت والا، جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی (یعنی جس مصلحت کے لئے اس کو بنایا اس کے مناسب بنایا) اور انسان (یعنی آدم (علیہ السلام) کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس (انسان یعنی آدم) کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی ایک بے قدر پانی سے (یعنی نطفہ سے جو کہ غذا کے چوتھے ہضم کا فضلہ ہے جبکہ غذا سے اخلاط اربعہ یعنی خون، بلغم، سوداء اور صفراء بن جاتے ہیں) بنایا، پھر (ماں کے رحم میں) اس کے اعضاء درست کئے اور اس میں اپنی (طرف سے) روح پھونکی اور (پیدائش کے بعد) تم کو کان اور آنکھیں اور دل (یعنی ظاہری اور باطنی حواس، قوتیں اور ادراک) دیئے (اور یہ سب خدا کی قدرت اور انعام پر دلالت کرتے ہیں جس کا مقتضا یہ تھا کہ خدا کا شکر کرتے اور بڑا شکر یہ ہے کہ توحید اختیار کرتے مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو (یعنی نہیں کرتے)۔

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ: یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے ہر چیز کی خلقت کو حسین اور بہتر بنایا ہے، وجہ یہ ہے کہ اس عالم میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا وہ حکمت اور مصالح عالم کے اقتضا سے بنایا ہے، اس لئے ہر چیز اپنی ذات کے اعتبار سے ایک حسن رکھتی ہے، اور ان سب سے زیادہ حسین اور بہتر انسان کو بنایا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم "یعنی ہم نے انسان کو سب سے زیادہ حسین تقویم اور بہتر شکل وصورت میں پیدا کیا ہے" اور دوسری مخلوقات خواہ وہ ظاہر میں کتنی ہی قبیح اور بری سمجھی جاتی ہوں، کتا، خنزیر، سانپ، بچھو، شیر اور بھیڑیا یہ سب

زہریلے اور درندے جانور عام نظروں میں برے سمجھے جاتے ہیں، مگر مجموعہ عالم کے مصالح کے اعتبار سے ان میں سے کوئی برا نہیں، کسی نے خوب کہا ہے:

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

کل شیئ میں تمام جواہر اور اعراض داخل ہیں، یعنی وہ چیزیں بھی جو وجود جوہری رکھتی ہیں جیسے حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ اور اعراض بھی جن میں اخلاق واعمال بھی داخل ہیں، یہاں تک کہ جو اخلاق برے بتلائے جاتے ہیں جیسے غصہ، حرص، شہوت وغیرہ یہ بھی اپنی ذات میں برے نہیں، ان کی برائی غیر مصرف میں صرف کرنے اور بے محل استعمال کرنے سے ہوتی ہے، اپنے محل میں رہیں تو ان میں کوئی چیز بری نہیں، لیکن مراد اس سے ان اشیاء کی جہت تخلیق وتکوین ہے کہ وہ خیر ہی خیر اور حسن ہی حسن ہے، اور اعمال کی دوسری جہت انسان کا کسب واکتساب ہے، یعنی اپنے اختیار کو کسی کے کام کے کرنے میں صرف کرنا، تو اس حیثیت سے سب حسن نہیں، بلکہ ان میں تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کی اجازت نہیں دی وہ حسن نہیں، قبیح ہیں:

اے بسا امساک کز انفاق بہ مال حق را جز بامر حق مدہ

وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ: روح اگر مادی وجود رکھتی ہو تب تو فیہ کے معنی ظاہر ہیں اور اگر روح مجرد ہو تو یہاں تعلق بالبدن سے مجاز ہے، جسمانی وبدنی اجزاء کے بعد نفخ روح کا ذکر فرمانے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ روح جسم نہیں اور امام غزالی کا بھی یہی مذہب ہے، جبکہ جمہور نے روح کے متعلق جسم لطیف کہا ہے، اور میرے نزدیک ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، ممکن ہے کہ اس مجرد (بلا جسم) کا بدن کے ساتھ تعلق اسی جسم لطیف کے واسطہ سے ہو، یہاں جو روح کی خدا کی طرف نسبت کی گئی ہے یہ اضافت تشریفی ہے، جیسے کعبہ کو بزرگی کی وجہ سے خدا کی طرف منسوب کر کے بیت اللہ (خدا کا گھر) کہا جاتا ہے، ایسا ہی یہاں روح کو شرافت کی وجہ سے خدا کی طرف منسوب کر دیا گیا، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ میں کوئی روح ہے اور اس کا کوئی جز انسان میں پیدا کر دیا، نعوذ باللہ منہ۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ایسے اعلیٰ اور عظیم الشان انتظام وتدبیر کا قائم کرنا اسی پاک ہستی کا کام ہے جو ہر ایک ظاہرہ وپوشیدہ کی خبر رکھے، زبردست اور مہربان ہو۔

فائدہ: ۲ یعنی نطفہ جو بہت سی غذاؤں کا نچوڑ ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی شکل وصورت، اعضاء موزوں ومتناسب رکھے۔

فائدہ: ۴ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں جو مخلوق ہے، اسی کا مال ہے، مگر جس کی عزت بڑھائی، اس کو اپنا کہا جیسے فرمایا: اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا (مریم: ۹۳) حالانکہ سب خدا کے بندے ہیں کما قال: اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا سو انسان کی جان عالم غیب سے آئی ہے مٹی پانی سے نہیں بنی اس کو اپنا کہا۔ ورنہ اللہ کی جان کا اگر وہ مطلب لیا جائے جو مثلاً آدمی کی جان کا لیتے ہیں تو چاہیے جان کسی بدن میں ہو، بدن ہوا تو ترکیب آئی، ترکیب آئی تو حدوث آیا، ذات پاک کہاں رہی (موضح بتغییر)

فائدہ: ۵ ان نعمتوں کا شکر یہ تھا کہ آنکھوں سے اس کی آیات تکوینیہ کو بنظر امعان دیکھتے۔ کانوں سے آیات تنزیلیہ کو توجہ وشوق کے ساتھ سنتے۔ دل سے دونوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کرتے، پھر سمجھ کر اس پر عامل ہوتے۔ مگر تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِى الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِىۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ؕ بَلۡ هُمۡ بِلِقَآئِ رَبِّهِمۡ كٰفِرُوۡنَ ۝۱۰

اور کہتے ہیں کیا جب ہم رل گئے زمین میں کیا ہم کو نیا بننا ہے، کچھ نہیں وہ اپنے رب کی ملاقات سے منکر ہیں ۱

قُلۡ يَتَوَفّٰٮكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ الَّذِىۡ وُكِّلَ بِكُمۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ۝۱۱ ع

تو کہہ قبض کر لیتا ہے تم کو فرشتہ موت کا جو تم پر مقرر ہے پھر اپنے رب کی طرف پھر جاؤ گے ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا مضمون تھا، اب قیامت اور جزا کا بیان ہے اور کافروں کو زیادہ دھمکانے کے لیے قیامت کی سزا سے پہلے ایک اور سزا کا بیان فرمایا ہے جس کو ''عذاب ادنی'' کہا ہے اور اس کے ساتھ اس کی وجہ بھی بتلادی کہ یہ لوگ عذاب کے مستحق کیوں ہیں؟ محض اپنے شرک اور معصیت کی وجہ سے۔

اور یہ (کافر) لوگ کہتے ہیں کہ ہم جب زمین میں (مل جل کر) نیست و نابود ہو گئے تو کیا ہم پھر (قیامت میں) نئے جنم میں آئیں گے (اور یہ لوگ اس دوبارہ زندہ کیے جانے پر صرف متعجب ہی نہیں ہیں جیسا کہ بظاہر ان کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے) بلکہ (درحقیقت) وہ لوگ اپنے رب سے ملنے کے منکر ہی ہیں (اور یہ سوال محض انکار کی غرض سے کر رہے ہیں، یعنی ان کا استفہام انکاری ہے) آپ (جواب میں) فرمادیں کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے جو تم پر (اللہ کی طرف سے) متعین ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے۔

جواب میں اصل مقصود تو یہی جملہ **ترجعون** ہے کہ تم خدا کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے، اور درمیان میں **یتوفّٰکم** یعنی موت کا ذکر زیادہ ڈرانے کے لیے بڑھادیا کہ موت بھی فرشتے کے ذریعہ سے آئے گی جو جان نکلنے کے وقت تم کو مارے دھاڑے گا بھی جیسا دوسری آیت میں ہے: **ولو تریٰ اذ یتوفی الذین کفرو الملٰئکة یضربون وجوھھم و ادبارھم** الخ کہ فرشتے جان نکالنے کے وقت کافروں کے چہروں اور پشت پر ماریں گے، پس مرنے کا انجام صرف خاک ہی میں مل جانا نہ ہوگا، جیسا کہ تم سمجھتے ہو اور تمہارے قول: **اذا اضللنا فی الارض** الخ سے معلوم ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس پر غور نہ کیا کہ اللہ نے ان کو اول مٹی سے پیدا کیا ہے۔ الٹے شبہات نکالنے لگے کہ مٹی میں مل جانے کے بعد ہم دوبارہ کس طرح بنائے جائیں گے۔ اور شبہ یا استبعاد ہی نہیں بلکہ صاف طور پر یہ لوگ بعث بعد الموت سے منکر ہو گئے۔

فائدہ: ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں یعنی: ''تم آپ کو محض بدن اور دھڑ سمجھتے ہو کہ خاک میں رل مل کر برابر ہو گئے۔ ایسا نہیں تم حقیقت میں جان ہو جسے فرشتہ لے جاتا ہے بالکل فنا نہیں ہو جاتے''۔ (موضح)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا

اور کبھی تو دیکھے جس وقت کہ منکر سر ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے ۱؎ اے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا

فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ⑫

اب ہم کو پھر بھیج دے کہ ہم کریں بھلے کام ہم کو یقین آ گیا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (اس رجوع کے وقت جس پر گذشتہ آیت میں **ترجعون** دال ہے) اگر آپ (ان لوگوں کا حال) دیکھیں تو عجب حال دیکھیں جب کہ یہ مجرم لوگ (انتہائی شرمندگی سے) اپنے رب کے سامنے سر جھکائے (کھڑے) ہوں گے (اور کہتے ہوں گے) کہ اے ہمارے پروردگار! بس (اب) ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے (اور معلوم ہو گیا کہ پیغمبروں نے جو کچھ کہا سب حق تھا) سو ہم کو (دنیا میں) پھر بھیج دیجئے ہم (اب کے جا کے خوب) نیک کام کیا کریں گے (اب) ہم کو پورا یقین آ گیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ذلت و ندامت سے محشر میں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہمارے کان اور آنکھیں کھل گئیں، پیغمبر جو باتیں فرمایا کرتے تھے ان کا یقین آ گیا، بلکہ آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا کہ ایمان اور عمل صالح ہی خدا کے ہاں کام دیتا ہے، اب ایک مرتبہ پھر دنیا میں بھیج دیجیے دیکھیے کیسے کام کرتے ہیں۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ

اور اگر ہم چاہتے تو سجھا دیتے ہر جی کو اس کی راہ لیکن ٹھیک پڑ چکی میری کہی بات کہ مجھ کو بھرنی ہے دوزخ

وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾

جنوں سے اور آدمیوں سے اکٹھے

خلاصہ تفسیر: ان کا یہ دنیا میں واپسی کا کہنا محض بے کار ہوگا، کیونکہ دنیا میں تو ان کو جب بھیجتے کہ خواہ مخواہ ان کا راہ پر آنا ہی ہم کو مطلوب ہوتا، نیز دوبارہ بھیجنے میں ان کا راہ پر آنا متوقع بھی ہوتا، حالانکہ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، نہ ان کا راہ پر آنا مطلوب ہے، نہ یہ دوبارہ دنیا میں جا کر راہ پر آئیں گے، پہلی بات کہ نہ ان کا راہ پر آنا مطلوب ہے اس کی نفی اس لیے کہ:

اور اگر ہم کو (یہ) منظور ہوتا (کہ ضرور ہی یہ راہ پر آئیں) تو ہم ہر شخص کو اس (کی نجات) کا راستہ (مقصود تک پہنچا دینے کے درجہ میں ضرور) عطا فرماتے (جیسا کہ ان کو راستہ بتلایا گیا تھا اسی طرح ان کو مقصود تک پہنچا بھی دیا جاتا) ولیکن میری (تو) یہ (ازلی تقدیری) بات (بہت سی حکمتوں سے) محقق ہو چکی ہے کہ میں جہنم کو جنات وانسان دونوں (میں جو کافر ہوں گے ان) سے ضرور بھروں گا (اور بعض حکمتوں کا بیان سورۃ ہود کے اخیر میں ایسی ہی آیت کی تفسیر میں گزرا ہے)۔

پس ان کا راہ پر آنا تو اس لیے مطلوب نہیں اور دوسری بات کہ یہ دوبارہ جا کر بھی راہ پر نہ آئیں گے اس کی نفی کا بیان سورہ انعام کے تیسرے رکوع کی اس آیت میں گذر چکا ہے: **ولو ردوا لعادو لما نھوا عنه** کہ اگر بالفرض وہ واپس بھی کر دیے جائیں تب بھی وہ ان ہی باتوں کی طرف لوٹیں گے جن سے ان کو منع کیا گیا ہے، اور جن باتوں پر ان کا دنیا میں دوبارہ لوٹنا موقوف تھا جب دونوں نہیں ہو سکتیں تو ان کا لوٹنا بھی نہیں ہو سکتا۔

* * *

فائدہ: دوسری جگہ فرمایا: وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (الانعام: ۲۸) یعنی جھوٹے ہیں اگر دنیا کی طرف لوٹائے جائیں پھر وہ ہی شرارتیں کریں۔ ان کی طبیعت کی افتاد ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ شیطان کے اغواء کو قبول کرلیں اور اللہ کی رحمت سے دور بھاگیں۔ بیشک ہم کو قدرت تھی چاہتے تو ایک طرف سے تمام آدمیوں کو زبردست اسی راہ ہدایت پر قائم رکھتے جس کی طرف انسان کا دل فطرۃً راہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس طرح سب کو ایک ہی طور وطریق اختیار کرنے کے لئے مضطر کر دینا حکمت کے خلاف تھا، جس کا بیان کئی جگہ پہلے ہو چکا ہے۔ لہذا وہ بات پوری ہوئی تھی جو ابلیس کے دعوے: لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (ص: ۸۲-۸۳) کے جواب میں فرمائی تھی: قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (ص: ۸۵-۸۶) معلوم ہوا کہ یہاں جن وانس سے مراد وہ ہی شیاطین اور ان کے اتباع ہیں۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا

سو اب چکھو مزہ جیسے تم نے بھلا دیا تھا اس دن کے ملنے کو، ہم نے بھی بھلا دیا تم کو اور چکھو عذاب سدا کا عوض

كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

اپنے کیے کا

خلاصہ تفسیر: تو (ان سے کہا جائے گا کہ) اب اس کا مزہ چکھو کہ تم اپنے اس دن کے آنے کو بھولے رہے، ہم نے تم کو بھلا دیا

(یعنی رحمت سے محروم کردیا اور رحمت سے محروم کرنے کو مجازاً بھلادینا کہہ دیا) اور (ہم جو کہتے ہیں کہ مزہ چکھو، تو یہ مزہ چکھنا ایک دوروز کا نہیں، بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اپنے (برے) اعمال کی بدولت ابدی عذاب کا مزہ چکھو۔

* * *

فائدہ: ہم نے بھی تم کو بھلادیا، یعنی کبھی رحمت سے یاد نہیں کئے جاؤ گے۔

ربط: آگے مجرمین کے مقابلہ میں مومنین کا حال ومآل بیان فرماتے ہیں:

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ

ہماری باتوں کو وہی مانتے ہیں جب ان کو سمجھائے ان سے گر پڑیں سجدہ کر کے اور پاک ذات کو یاد کریں اپنے رب کی خوبیوں کے ساتھ

وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩ ﴿١٥﴾ السجدۃ ۹

اور وہ بڑائی نہیں کرتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کا حال اور ان کا انجام بیان ہوا، اب مومنین کا حال اور انجام بیان فرماتے ہیں، یعنی:

بس ہماری آیتوں پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو وہ آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں (جس کی تحقیق سورۃ مریم کے چوتھے رکوع میں بیان ہوئی ہے) اور اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرنے لگتے ہیں اور وہ لوگ (ایمان سے) تکبر نہیں کرتے (جیسا کہ کافر لوگ تکبر کرتے ہیں: ولّٰی مستکبراً)۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ: اس میں کامل الایمان لوگوں کا حال اور ساتھ ہی سجود، حمد وتسبیح باری تعالی اور تواضع کی بلند شان مذکور ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی خوف وخشیت اور خشوع وخضوع سے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، زبان سے اللہ کی تسبیح وتحمید کرتے ہیں، دل میں کبر وغرور اور بڑائی کی بات نہیں رکھتے جو آیات اللہ کے سامنے جھکنے سے مانع ہو۔

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ﴿١٦﴾

جدا رہتی ہیں ان کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہ سے ۱ پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈر سے اور لالچ سے ۲ اور ہمارا دیا ہوا کچھ خرچ کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں مومنین کی تصدیق اور اخلاق کا حال تھا، اب مومنین کے اعمال کا حال بیان کرتے ہیں کہ:

(مومنین اعمال کا حال یہ ہے کہ رات کو) ان کے پہلو خوابگاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں (خواہ فرض عشاء کے لئے یا تہجد کے لئے بھی اور اس عام تفسیر سے سب روایتیں جمع ہوگئیں، اور ان کے پہلو خوابگاہوں سے صرف علیحدہ ہی نہیں ہوتے بلکہ) اس طور پر (علیحدہ ہوتے ہیں) کہ وہ لوگ اپنے رب کو (ثواب کی) امید سے اور (عذاب کے) خوف سے پکارتے ہیں (اس میں نماز اور دعا وذکر سب آگیا) اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں (مطلب یہ کہ ایمان لانے والوں کی یہ صفات ہیں جن میں بعض تو ایسی ہیں جن پر خود ایمان ہی موقوف ہے اور بعض ایسی ہیں جن پر ایمان کا کامل ہونا موقوف ہے)۔

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ: بعض روایات میں رات کی اس عبادت سے مراد تہجد کی نماز ہے، اس لحاظ سے اس میں نماز تہجد کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، یہاں شروع میں صفات کمال کی طرف اور آخر میں تکمیل کی طرف اشارہ ہے، یعنی معارف وفیوض کو پھیلاتے ہیں روکتے نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی میٹھی نیند اور نرم بستروں کو چھوڑ کر اللہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔
① مراد تہجد کی نماز ہوئی، جیسا کہ حدیث صحیح میں مذکور ہے۔ ② اور بعض نے صبح کی ③ یا عشاء کی نماز
④ یا مغرب وعشاء کے درمیان کی نوافل مراد لیے ہیں، گو الفاظ میں اس کی گنجائش ہے، لیکن راجح وہ ہی پہلی تفسیر ہے۔ واللہ اعلم۔
فائدہ: ۲۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''اللہ سے لالچ اور ڈر برا نہیں، دنیا کا ہو یا آخرت کا، اور اس واسطے بندگی کرے تو قبول ہے، ہاں! اگر کسی اور کے خوف ورجاء سے بندگی کرے تو ریاء ہے، کچھ قبول نہیں''۔

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۷﴾

سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھری ہے ان کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک، بدلہ اس کا جو کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے، یہ ان کو ان کے اعمال (نیک) کا صلہ ملا ہے۔

* * *

فائدہ: جس طرح راتوں کی تاریکی میں لوگوں سے چھپ کر انہوں نے بے ریا عبادت کی۔ اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں چھپا رکھی ہیں ان کی پوری کیفیت کسی کو معلوم نہیں۔ جس وقت دیکھیں گے آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ حدیث میں ہے کہ: میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے جنت میں وہ چیز چھپا رکھی ہے جو نہ آنکھوں نے دیکھی، نہ کانوں نے سنی، نہ کسی بشر کے دل میں گزری۔

وقف غفران

اَفَمَنۡ كَانَ مُؤۡمِنًا كَمَنۡ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ ﴿۱۸﴾

بھلا ایک جو ہے ایمان پر برابر ہے اس کے جو نافرمان ہے، نہیں برابر ہوتے ۱۔

اَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ جَنّٰتُ الۡمَاۡوٰی ۫ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾

سو وہ لوگ جو یقین لائے اور کیے کام بھلے تو ان کے لئے باغ ہیں رہنے کے، مہمانی ان کاموں کی وجہ سے جو کرتے تھے ۲۔

خلاصہ تفسیر: (جب فریقین کا حال اور انجام معلوم ہو گیا) تو (اب بتلاؤ) جو شخص مومن ہو کیا وہ اس شخص جیسا ہو جائے گا جو بے حکم (یعنی کافر) ہو (نہیں) وہ آپس میں (حال اور انجام کے اعتبار سے) برابر نہیں ہو سکتے (چنانچہ معلوم بھی ہو چکا ہے، اور خاص انجام میں برابر نہ ہونے کی تفصیل تاکید کے لئے پھر بھی سن لو کہ) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے، سو ان کے لئے ہمیشہ کا ٹھکانہ جنتیں ہیں، جو ان کے (نیک) اعمال کے بدلہ میں بطور ان کی مہمانی کے ہیں (یعنی جس طرح مہمان کی خاطر تعظیم کے ساتھ کی جاتی ہے اسی طرح اکرام کے ساتھ ان کو یہ چیزیں دی جائیں گی، سائل محتاجوں کی طرح بے قدری اور بے وقعتی کے ساتھ نہ دی جائیں گی)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اگر ایک ایماندار اور بے ایمان کا انجام برابر ہو جائے تو سمجھو خدا کے ہاں بالکل اندھیر ہے۔ (العیاذ باللہ)
فائدہ: ۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کے عمل جنت کی مہمانی کا سبب بن جائیں گے۔

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡا فَمَاۡوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَاۤ اُعِیۡدُوۡا فِیۡهَا

اور وہ لوگ جو نافرمان ہوئے سو ان کا گھر ہے آگ، جب چاہیں کہ نکل پڑیں اس میں سے الٹا دیئے جائیں پھر اسی میں

وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۰﴾

اور کہیں ان کو چکھو آگ کا عذاب جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: اور جو لوگ بے حکم تھے سو ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے وہ لوگ جب اس سے باہر نکلنا چاہیں گے (تکلیف اور مصیبت سے بھاگنا اور نکلنے کا قصد کرنا طبعی حرکت ہے اگرچہ نکلنے کا راستہ کوئی بھی نہ ہو، پس کفار بھی اسی طرح نکلنا چاہیں گے اگرچہ جہنم کی گہرائی اور اور دروازوں کے بند ہونے کی وجہ سے وہ نکل نہ سکیں گے) تو پھر اسی میں دھکیل دیئے جائیں گے، اور ان کو کہا جائے گا کہ دوزخ کا وہ عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: کبھی کبھی آگ کے شعلے جہنمیوں کو دروازہ کی طرف پھینکیں گے، اس وقت شاید نکلنے کا خیال کریں، فرشتے پھر ادھر ہی دھکیل دیں گے کہ جاتے کہاں ہو؟ جس چیز کو جھٹلاتے تھے ذرا اس کا مزہ چکھو، اللھم اعذنی من النار واجرنی من غضبك.

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور البتہ چکھائیں گے ہم ان کو تھوڑا عذاب ورے اس بڑے عذاب سے تاکہ وہ پھر آئیں

خلاصہ تفسیر: (اور یہ عذاب جس کا پیچھے وعدہ کیا گیا ہے یہ تو آخرت میں ہوگا) اور ہم ان کو قریب کا (یعنی دنیا میں آنے والا) عذاب بھی اس بڑے عذاب (آخرت کے وعدہ شدہ عذاب) سے پہلے چکھا دیں گے (جیسے امراض، بیماریاں، وبائیں، اور قحط وغیرہ کے مصائب، کیونکہ امراض و آفات قرآن کے مطابق اکثر برے اعمال کے سبب آتے ہیں) تاکہ یہ لوگ (متاثر ہو کر کفر سے) باز آئیں (کقولہ تعالیٰ :ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس، پھر جو باز نہ آئے اس کے لئے آخرت کا عذاب اکبر ہے ہی)۔

بعض نے کہا ہے کہ دنیا کی تمنا اور خواہش کرنا یہ ادنیٰ یعنی چھوٹا عذاب ہے، جو اس سے باز نہ آئے گا وہ اکبر یعنی بڑے عذاب کا مستحق ہوگا۔

* * *

فائدہ: یعنی آخرت کے بڑے عذاب سے قبل دنیا میں ذرا کم درجہ کا عذاب بھیجیں گے تاکہ جسے رجوع کی توفیق ہو ڈر کر خدا کی طرف رجوع ہو جائے۔ کم درجہ کا عذاب یہی دنیا کے مصائب، بیماری، قحط، قتل، قید، مال اولاد وغیرہ کی تباہی وغیرہ۔

ع ۱۵ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور کون بے انصاف زیادہ اس سے جسکو سمجھایا گیا اسکے رب کی باتوں سے، پھر ان سے منہ موڑ گیا۱ مقرر ہم کو ان گناہ گاروں سے بدلہ لینا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: اور (ایسے لوگوں پر عذاب ہونے سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہئے کیونکہ) اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتیں یاد دلائی جائیں پھر وہ ان سے اعراض کرے (تو اس کے مستحق عذاب ہونے میں کیا شبہ ہے، اس لئے) ہم ایسے مجرموں سے بدلہ لیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سمجھنے کے بعد پھر گیا۔

فائدہ: ۲ جب تمام گنہگاروں اور ظالم مجرموں سے بدلہ لینا ہے تو یہ اظلم کیونکر بچ سکتے ہیں۔

ربط: آگے رسول اللہ ﷺ کو تسلی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ ان کے ظلم و اعراض سے دلگیر نہ ہوں، پہلے موسیٰ کو ہم نے کتاب دی تھی جس

سے بنی اسرائیل کو ہدایت ہوئی اور اس کی پیروی کرنے والوں میں بڑے بڑے دینی پیشوا اور امام ہو گزرے، آپ کو بھی بلا شبہ اللہ کی طرف سے عظیم الشان کتاب ملی ہے جس سے بڑی مخلوق ہدایت پائے گی اور بنی اسرائیل سے بڑھ کر آپ کی امت میں امام اور سردار اٹھیں گے، رہے منکر! ان کا فیصلہ حق تعالیٰ خود کر دے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۳﴾

اور ہم نے دی ہے موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ دھوکے میں اس کے ملنے سے [1] اور کیا ہم نے اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی تکذیب اور مخالفت کا ذکر آیا ہے، چونکہ ان امور سے جناب رسول اللہ ﷺ کو حزن اور غم ہوتا تھا اور مخالفت کی بعض باتوں سے مسلمانوں کو بھی تکلیف ہوتی تھی اس لیے اب آگے آپ ﷺ اور مومنین کی تسلی کا مضمون ہے، اور اس مضمون پر کفار کے بعض شبہات تھے ان کا بھی جواب دیا گیا ہے اور اسی پر سورت کا اختتام ہے۔

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو (آپ ہی کی طرح) کتاب دی تھی (جس کی تبلیغ اور اشاعت میں ان کو تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں، اسی طرح آپ کو بھی برداشت کرنا چاہئے، ایک تسلی تو یہ ہوئی، پھر اسی طرح آپ کو بھی کتاب دی) سو آپ (اپنی) اس (کتاب) کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے (جیسا کہ ارشاد ہے: وانك لتلقى القرآن، اور ظاہر ہے کہ آپ کو اس میں شبہ کبھی نہیں ہو سکتا، مطلب یہ ہے کہ آپ یقیناً صاحب کتاب صاحب خطاب ہیں، پس جب آپ اللہ کے نزدیک ایسے مقبول ہیں تو اگر چند مٹھی بھر احمق آپ کو قبول نہ کریں تو کوئی غم کی بات نہیں، دوسری تسلی کی بات یہ ہوئی) اور ہم نے اس (کتاب موسیٰ) کو بنی اسرائیل کے لئے موجب ہدایت بنایا تھا (اسی طرح آپ کی کتاب سے بہتوں کو ہدایت ہوگی، آپ خوش رہئے، تیسری تسلی یہ ہوئی)۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ: یہاں خصوصیت کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شاید اس لیے کیا گیا کہ آپ ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام میں بہت سی وجوہ سے مشابہت تھی۔

* * *

فائدہ: [1] یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے: ① یعنی بیشک و شبہ موسیٰ کو کتاب دی گئی اور آپ کو بھی اسی طرح کی کتاب ملی، اس میں کوئی دھوکا اور فریب نہیں ② یا موسیٰ کے ذکر پر فرما دیا کہ تم جو موسیٰ سے شب معراج میں ملے تھے وہ سچی حقیقت ہے کوئی دھوکا یا نظر بندی نہیں۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۗ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور کیے ہم نے ان میں پیشوا جو راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے [1] اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے [2]

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں بہت سے (دین کے) پیشوا بنا دیئے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، جبکہ وہ لوگ (تکلیف پر) صبر کئے رہے، اور ہماری آیتوں کا یقین رکھتے تھے (اس لئے ان کی اشاعت اور مخلوق کی ہدایت میں مشقت گوارا کرتے تھے، اس میں مسلمانوں کو تسلی ہے کہ تم لوگ صبر کرو، اور جب تم لوگ بھی صاحب یقین ہو اور یقین کا مقتضا صبر کرنا ہے تو تم کو بھی صبر کرنا ضروری ہے، اس وقت ہم تم کو بھی دین کا پیشوا بنا دیں گے، یہ تسلی تو دنیا کے اعتبار سے ہے)۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ: اس میں شیخ کامل کی علامات کا بیان ہے اور جو ان علامات کے بغیر مرشد و شیخ ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ گمراہ ہے، نیز اس میں مشائخ کے اس عمل کی دلالت ہے کہ جب مرید میں ریاضت و یقین کا مشاہدہ کیا جائے تو اس کو خلافت دے دینا مناسب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ دنیا کے شدائد اور منکرین کے جور و ستم پر۔

فائدہ: ۲ یعنی مسلمان اللہ کے وعدوں پر یقین رکھیں اور سختیوں پر صبر کر کے اپنے کام پر جمے رہیں تو ان کے ساتھ بھی خدا کا یہی معاملہ ہوگا۔ چنانچہ ہوا اور خوب ہوا۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٢٥﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ

تیرا رب جو ہے وہی فیصلہ کرے گا ان میں دن قیامت کے جس بات میں کہ وہ اختلاف کرتے تھے ۱ کیا ان کو راہ نہ سوجھی اس بات سے کہ کتنی

أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسٰكِنِهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۖ أَفَلَا يَسْمَعُونَ ﴿٢٦﴾

غارت کر ڈالیں ہم نے ان سے پہلے جماعتیں کہ پھرتے ہیں یہ ان کے گھروں میں، اس میں بہت نشانیاں ہیں، کیا وہ سنتے نہیں

خلاصہ تفسیر: اور آخرت کے اعتبار سے دوسری تسلی بھی تم کو رکھنی چاہئے اور وہ تسلی کا سبب یہ ہے کہ:

آپ کا رب قیام کے روز ان سب کے آپس میں (عملی) فیصلہ ان امور میں کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کرتے تھے (یعنی مومن کو جنت میں اور کفار کو دوزخ میں ڈال دے گا اور قیامت بھی کچھ دور نہیں، اس سے بھی تسلی حاصل کرنا چاہئے)۔

(اس مضمون کو سن کر کفار دو شبہ کر سکتے تھے: ① ایک شبہ یہ کہ ہم اسی کو نہیں مانتے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا کفر ناپسند ہے ② دوسرا شبہ یہ کہ ہم قیامت ہی کو ناممکن سمجھتے ہیں، اب آگے دونوں کا جواب ہے، پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ اگر ان کو کفر کے برا ہونے میں شبہ ہے تو:)

کیا ان کو یہ امر موجب رہنمائی نہیں ہوا کہ ہم ان سے پہلے (ان کے کفر و شرک ہی کے سبب) کتنی امتیں ہلاک کر چکے ہیں (کہ ان کی ہلاکت خلاف عادت طریقہ سے ہوئی اور نیز انبیاء کی پیشین گوئی کے بعد ہوئی جس سے خدا کا غضب ٹپکتا تھا، اس سے کفر کا مبغوض اور برا ہونا صاف واضح ہوتا ہے) جن کے رہنے کے مقامات میں یہ لوگ (شام کے سفر کے دوران) آتے جاتے (گزرتے) ہیں اس (امر) میں (تو) صاف نشانیاں (کفر کے مبغوض اور برا ہونے کی موجود) ہیں، کیا یہ لوگ (ان گزشتہ امتوں کے قصے) سنتے نہیں ہیں (حالانکہ وہ مشہور ہیں اور مخلوق کی زبانوں پر مذکور ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اہل حق اور منکرین کے درمیان دوٹوک اور عملی فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ ہاں! دنیا میں بھی کئی مثالیں ایسی دکھلائی جا چکی ہیں کہ آدمی انھیں دیکھ کر سمجھ اور عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ کیا عاد و ثمود کی بستیوں کے تباہ شدہ کھنڈر اور نشان ان منکروں نے نہیں دیکھے؟ جن پر شام وغیرہ کے سفر میں ان کا گزر ہوتا رہتا ہے۔ اور کیا ان کی ہلاکت کی داستانیں نہیں سنیں۔ مقام تعجب ہے کہ وہ چیزیں دیکھنے اور سننے کے بعد بھی ان کو تنبہ نہ ہوا اور نجات و فلاح کا راستہ نظر نہ آیا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ

کیا دیکھا نہیں انہوں نے کہ ہم ہانک دیتے ہیں پانی کو ۱ ایک زمین چٹیل کی طرف ۲ پھر ہم نکالتے ہیں اس سے کھیتی کہ کھاتے ہیں اس میں

أَنْعَامُهُمْ وَأَنفُسُهُمْ ۖ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿٢٧﴾ الثلثة

سے ان کے چوپائے اور خود وہ بھی، پھر کیا دیکھتے نہیں ۳

خلاصہ تفسیر: اب دوسرے شبہ کا جواب ہے کہ وہ لوگ جو قیامت کو ناممکن سمجھتے ہیں تو:

کیا انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ ہم (بادلوں یا نہروں وغیرہ کے ذریعہ سے) خشک زمین کی طرف پانی پہنچاتے ہیں پھر اس کے

ذریعہ سے کھیتی پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے مواشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں تو کیا (اس بات کو دن رات) دیکھتے نہیں ہیں (یہ صاف نمونہ ہے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا، جیسا کہ اس کی تقریر کئی جگہ گزر چکی ہے، پس دونوں شبہ دور ہو گئے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نہروں اور دریاؤں کا پانی یا بارش کا۔

فائدہ: ۲؎ ارض جرز سے ہر ایک خشک زمین جو نباتات سے خالی ہو مراد ہے، بعض نے خاص سرزمین مصر کو اس کا مصداق قرار دیا ہے، اور نسوق المآء سے دریائے نیل کا پانی مراد لیا ہے۔ اس تخصیص کی کوئی ضرورت نہیں، کما نبّه علیه ابن کثیر (رح)۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ان نشانات کو دیکھ کر چاہیے تھا کہ حق تعالیٰ کی قدرت اور رحمت و حکمت کے قائل ہوتے اور سمجھتے کہ اسی طرح مردہ لاشوں میں دوبارہ جان ڈال دینا بھی اس کے لئے کچھ دشوار نہیں۔ نیز اللہ کی نعمتوں کے جان و دل سے شکر گزار بنتے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ فیصلہ اگر تم سچے ہو ۱؎ تو کہہ کر فیصلہ کے دن کام نہ آئے گا منکروں کو

ع ۳ ۸ ۱۶ اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

ان کا ایمان لانا اور نہ ان کو ڈھیل ملے گی ۲؎ سو تو خیال چھوڑ ان کا اور منتظر رہ وہ بھی منتظر ہیں ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور یہ لوگ (قیامت اور فیصلہ کا ذکر سن کر محض جلدی کے تقاضا اور استہزا کے طور پر یوں) کہتے ہیں کہ اگر تم (اس بات میں) سچے ہو تو (بتلاؤ) یہ فیصلہ کب ہوگا، آپ فرما دیجئے کہ (تم فضول اس دن کا تقاضا کرتے ہو تمہارے لئے تو وہ پوری مصیبت کا دن ہے، کیونکہ) اس فیصلہ کے دن کافروں کو ان کا ایمان لانا (بالکل) نفع نہ دے گا (اور ان کے بچاؤ کی یہی ایک صورت تھی جو وہاں نہ ہو سکے گی) اور (نفع نجات تو کیا ہوتا) ان کو مہلت بھی (تو) نہ ملے گی، سو (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے (جن کے خیال سے غم ہوتا ہے) اور آپ (وعدہ شدہ فیصلہ کے) منتظر رہئے یہ بھی (اپنے خیال میں آپ کے نقصان کے) منتظر ہیں (جیسا کہ ارشاد ہے: نتربص به ریب المنون، مگر معلوم ہو جائے گا کس کا انتظار صحیح ہے اور کس کا غلط، اور کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام، ارشاد ہے: قل تربصوا فانی معکم من المتربصین)۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ (الی قوله) فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ: گذشتہ سوال کے جواب میں یہاں قانون مناظرہ کے مطابق جواب نہ دینا، بلکہ اس سے اعراض کا حکم فرمانا یہ بحث و مباحثہ کے ترک پر دلالت کرتا ہے جو کہ اللہ والوں کا طریقہ ہے۔

نیز اس میں اشارہ ہے کہ جو لوگ عارفین یعنی اللہ والوں کے کمالات کے منکر ہوں اور ان کے ساتھ تمسخر و استہزا کرتے ہوں تو ایسے لوگوں کو جب سمجھانا مفید اور نافع نہ ہو تو ان سے اعراض مناسب ہے اور ان کی ہلاکت کا انتظار کرے کہ ان پر وبال آنے والا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ پہلے فرمایا تھا کہ ان کا فیصلہ قیامت کے دن کیا جائے گا، اس پر منکرین کہتے ہیں کہ قیامت قیامت کہے جاتے ہو، اگر سچے ہو تو بتاؤ وہ دن کب آ چکے گا؟ مطلب یہ ہے کہ خالی دھمکیاں ہیں قیامت وغیرہ کچھ بھی نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ابھی موقع ہے کہ اللہ و رسول کے کہنے پر یقین کر لو اور اس دن سے بچنے کی تیاری کر لو، ورنہ اس کے پہنچ جانے پر نہ ایمان لانا کام دے گا نہ سزا میں ڈھیل ہوگی اور نہ مہلت ملے گی کہ آئندہ چال چلن درست کر کے حاضر ہو جاؤ، اس وقت کی مہلت کو غنیمت سمجھو۔ استہزاء و تکذیب میں رائیگاں مت کرو جو گھڑی آنے والی ہے یقیناً آ کر رہے گی، کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی۔ پھر یہ کہنا فضول ہے کہ کب آئے گی اور کب فیصلہ ہوگا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جو ایسے بے فکرے اور بے حس ہیں کہ باوجود انتہائی مجرم اور مستوجب سزا ہونے کے فیصلہ اور سزا کے دن کا مذاق اڑاتے

ہیں، ان کے راہ راست پر آنے کی کیا توقع ہے۔ لہذا آپ فرض دعوت وتبلیغ ادا کرنے کے بعد ان کا خیال چھوڑیے اور ان کی تباہی کے منتظر رہیے جیسے وہ اپنے زعم میں معاذ اللہ آپ کی تباہی کے منظر ہیں۔

ایاتھا ۷۳ — ۳۳ سُوْرَۃُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ ۹۰ — رکوعاتھا ۹

خلاصہ تفسیر: اس سورت کے تمام مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کا من جانب اللہ منصور ہونا اور خدا کے نزدیک محبوب اور خاص مقرب ہونا بتلایا گیا ہے، اور آپ ﷺ کی تعظیم کو مختلف وجوہ سے واجب اور ایذا رسانی کو حرام بتلایا گیا ہے، گذشتہ سورت کے اختتام پر حضور ﷺ کی تسلی کا مضمون تھا کہ وہ بھی محبوب ہونے کی دلیل ہے، اس لیے دونوں سورتوں میں پوری مناسبت ہے، اور چونکہ رسول کو ایذا پہنچانے کی مختلف صورتیں ہیں جن میں سے ایک ایذا کفار کی طرف سے زبان اور بات کی تھی کہ وہ آپ سے درخواست کرتے تھے کہ نعوذ باللہ آپ دعوت اسلام سے باز آ جائیں اور ہم آپ کو اتنا مال دیں گے اور بعض نے قتل کی بھی دھمکی تھی، اس پر آپ کو رنج ہوا، اس لیے سورت اسی کے متعلق مضمون سے شروع کی گئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾

اے نبی! ڈر اللہ سے اور کہنا مان منکروں کا اور دغابازوں کا۔ مقرر اللہ ہے سب کچھ جاننے والا حکمتوں والا

وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾

اور چل اسی پر جو حکم آئے تجھ کو تیرے رب کی طرف سے بیشک اللہ تمہارے کام کی خبر رکھتا ہے

وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾

اور بھروسہ رکھ اللہ پر، اور اللہ کافی ہے کام بنانے والا۔

خلاصہ تفسیر: اے نبی! اللہ سے ڈرتے رہیے (اور کسی سے نہ ڈریئے اور ان کی دھمکیوں کی ذرا پروانہ کیجئے) اور کافروں کا (جو کھلم کھلا دین کے خلاف مشورے دیتے ہیں) اور منافقوں کا (جو در پردہ ان کے ساتھ متفق ہیں) کہنا نہ مانئے (بلکہ اللہ ہی کا کہنا کیجئے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے (اس کا ہر حکم فوائد اور مصالح پر مشتمل ہوتا ہے)۔

اور (اللہ کا کہنا ماننا یہ ہے کہ) آپ کے پروردگار کی طرف سے جو حکم آپ پر وحی کیا جاتا ہے اس پر چلئے (اور اے لوگو!) بیشک تم لوگوں کے سب اعمال کی اللہ تعالیٰ پوری خبر رکھتا ہے (تم میں سے جو لوگ ہمارے پیغمبر کی مخالفت اور مزاحمت کر رہے ہیں، ہم سب کو سمجھیں گے)۔

اور (اے نبی!) آپ (ان لوگوں کی دھمکیوں کے معاملہ میں) اللہ پر بھروسہ رکھئے اور اللہ کافی کارساز ہے (اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کی کوئی تدبیر نہیں چل سکتی، اس لئے کچھ فکر نہ کیجئے، البتہ اگر اللہ تعالیٰ ہی اپنی حکمت کی وجہ سے کوئی ابتلاء وکلفت آپ کے لیے بھیجے تو وہ نقصان نہیں بلکہ سراسر منفعت ہے، غرض یہ لوگ خود نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں)۔

اتَّقِ اللّٰهَ، وَلَا تُطِعِ، وَاتَّبِعْ اور وَّتَوَكَّلْ: رسول اللہ ﷺ تو ان تمام مذکورہ احکامات پر پہلے ہی سے عمل کرنے والے تھے، یہاں زیادہ مقصود مخالفین کو سنانا ہے کہ ہمارے نبی تو اس حالت پر رہیں گے تم تا کام ہو کر بیٹھ رہو۔

رہا یہ سوال کہ آیت مذکورہ میں کافروں کی طرف سے خلاف شرع اور خلاف حق باتوں کا اظہار تو کوئی بعید نہیں، ان کی اطاعت سے منع کرنا بھی ظاہر ہے، مگر منافقین نے اگر اسلام کے خلاف کوئی بات آپ سے کہی تو پھر وہ منافقین نہ رہے، کھلے کافر ہوگئے، ان کو الگ ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ منافقین نے بالکل کھول کر تو کوئی بات خلاف اسلام نہ کہی ہو مگر دوسرے کفار کی تائید اور حمایت میں کوئی کلمہ کہا ہو، نیز خلاصہ تفسیر میں منافقین کے ترجمہ کے ساتھ جس عبارت کی تصریح کردی گئی اس سے بھی یہ شبہ دور ہوجاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے چالاکی کے انداز سے کسی مباح اور جائز عمل کے پردہ میں ایسا مشورہ اعلانیہ دیا ہو، مثلاً یہی کہا ہو کہ چند اختلافی مضامین کے بارے میں سکوت اختیار کرنا تالیف قلب اور اسلام کی طرف میلان کا سبب ہوجائے گا، اور ظاہر ہے کہ بعض مواقع پر ایک خاص وقت تک سکوت جائز بھی ہے، اس صورت میں لا تطع کی توجیہ اور بھی آسان ہوجائے گی، کیونکہ ایسا ارادہ عصمت وشان نبوت کے خلاف نہیں۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ: اس میں تقوی کی عظمت شان کی طرف اشارہ ہے، نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالی کے دشمنوں سے محبت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ ان کی اطاعت کرنا (جس سے منع کیا گیا) اور ان سے محبت کرنا یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ: اس میں دلالت ہے کہ کامل الایمان کسی بھی وقت ایسے مقام پر نہیں پہنچتا کہ اس سے شرعی احکامات ساقط یا معاف ہوجائیں جیسا کہ بعض نادانوں کا خیال ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جیسے اب تک معمول رہا ہے، آئندہ بھی ہمیشہ ایک اللہ سے ڈرتے رہیے اور کافروں اور منافقوں کا کبھی کہنا نہ مانیے۔ یہ سب مل کر خواہ کتنا ہی بڑا جتھا بنالیں، سازشیں کریں، جھوٹے مطالبات منوانا چاہیں عیارانہ مشورے دیں، اپنی طرف جھکانا چاہیں، آپ اصلاً پروا نہ کیجئے اور خدا کے سوا کسی کا ڈر پاس نہ آنے دیجئے۔ اسی اکیلے پروردگار کی بات مانیے اسی کے آگے جھکیے، خواہ ساری مخلوق اکٹھی ہوکر آجائے اس کے خلاف ہرگز کسی کی بات نہ سنیں۔ اللہ تعالیٰ سب احوال کا جاننے والا ہے۔ وہ جس وقت جو حکم دے گا نہایت حکمت اور خبرداری سے دے گا۔ اسی میں تمہاری اصلی بہتری ہوگی۔ جب اس کے حکم پر چلتے رہو گے اور اسی پر بھروسہ رکھو گے تمہارے سب کام اپنی قدرت سے بنادے گا۔ تنہا اسی کی ذات بھروسہ کرنے کے لائق ہے۔ جو سارے دل سے اس کا ہو رہا دوسری طرف دل نہیں لگا سکتا۔ دوسرا دل ہو تو دوسری طرف جائے لیکن سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''کافر چاہتے تھے اپنی طرف نرم کرنا اور منافق چاہتے تھے اپنی چال سکھانا اور پیغمبر کو صرف اللہ پر بھروسہ ہے۔ اس سے زیادہ دانا کون''۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ

اللہ نے رکھے نہیں کسی مرد کے دو دل اس کے اندر، اور نہیں کیا تمہاری جوروؤں کو جن کو

اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ

ماں کہہ بیٹھے ہو سچی مائیں تمہاری اور نہیں کیا تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے یہ تمہاری بات ہے اپنے منہ کی اور اللہ کہتا ہے

الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝۴

ٹھیک بات اور وہی سجھاتا ہے راہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسول اللہ ﷺ کو کفار کی زبانی ایذا کے متعلق تسلی دی گئی تھی، اب آگے ایک دوسری زبانی ایذا کے متعلق مضمون ہے جس کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضور ﷺ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا تھا جن کو حضرت زید بن حارثہؓ نے طلاق دی تھی اور ان زید بن حارثہؓ

کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وقت اپنا متبنی (منہ بولا بیٹا) بنالیا تھا، اس لیے زمانہ نبوت سے پہلے اور اس کے بعد بھی اگلی آیت: ادعوھم لاٰبائھم کے نازل ہونے تک یہ زید بن محمد کہلاتے تھے، پھر جب اگلی آیت میں متبنی (منہ بولا بیٹا) کو حقیقی بیٹا سمجھنے کی ممانعت نازل ہوئی تو زید بن حارثہ پکارے جانے لگے، غرض جب آپ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا تو مخالفین نے طعنہ دیا کہ اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرلیا، اب آگے اسی طعن کا اجمالی جواب دینا مقصود ہے اور تفصیلاً یہ مضمون سورت کے نصف پر آئے گا، اور جواب کی تاکید کے لیے دو مضمون اور بیان فرمادیے کہ ان دونوں مضمونوں میں منہ بولے بیٹے کے مسئلہ کی طرح جاہلیت کے غلط خیالات کی اصلاح کرنا منظور ہے، حاصل یہ کہ منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا سمجھنا اور اس وجہ سے اس کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنے پر کسی کو طعنہ دینا ایسا ہی غلط خیال ہے جیسا کہ بیوی کو زبان سے ماں کہہ دینے پر اس کو حقیقی ماں کی طرح سمجھ لینا اور اس وجہ سے اس کو نکاح سے باہر سمجھنا یا کسی شخص کو زیادہ ہوشیار ہونے کی وجہ سے یہ سمجھنا کہ اس کے دو دِل ہیں تو جس طرح یہ دونوں خیال غلط ہیں ایسے ہی یہ بھی غلط ہے کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا طعنہ کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے، اور (اسی طرح) تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کرلیتے ہو تمہاری ماں نہیں بنایا، اور (اسی طرح سمجھ لو) کہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (سچ مچ کا) بیٹا (بھی) نہیں بنادیا، یہ صرف تمہارے منہ سے کہنے کی بات ہے (جو واقعہ کے مطابق نہیں، بلکہ غلط ہے اور غلط بات پر کوئی حکم واقعی حکم نہیں لگایا جاتا، پس منہ بولے بیٹے کی بیوی سے طلاق کے بعد نکاح کرنے پر طعنہ دینا محض حماقت ہے) اور اللہ تعالیٰ حق بات فرماتا ہے اور وہی سیدھا راستہ بتلاتا ہے۔

چنانچہ ان تینوں غلطیوں کی اصلاح فرمادی، جاہلیت میں یہ تینوں غلط باتیں مشہور تھیں: ① ایک یہ کہ ذہین اور عقل مند آدمی کے دو دل سمجھا کرتے تھے، چنانچہ روح المعانی میں ایک شخص کی حکایت ہے جو دو دل والا ہونے کا دعوی کرتا تھا، وہ جنگ بدر سے اس حال میں بھاگا کہ ایک جوتا پاؤں میں اور ایک ہاتھ میں تھا، ابوسفیان نے اس کو ٹوکا تو اس نے کہا کہ میں دونوں جوتے پاؤں ہی میں سمجھا تھا جس سے اس کے دعوی کا جھوٹ ہونا واضح ہوگیا ② دوسرے بیوی کو ماں کہہ دینے سے ہمیشہ کے لیے اسے حرام سمجھتے ③ تیسرے متبنی یعنی منہ بولے بیٹا کو تمام احکام میں حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتے، پس یہاں بظاہر تیسری غلطی کا دور کرنا زیادہ مقصود ہے مگر تاکید کے لیے دو غلطیاں اور دور کردیں، اور ان کو پہلے بیان کیا گیا، کیونکہ ان کا غلط ہونا زیادہ ظاہر تھا تو ان کی غلطی معلوم ہوجانے کے بعد تیسری بات کا غلط ہونا بھی اسی طرح معلوم ہوجائے کہ متبنی کا حقیقی بیٹا ہونا محض مشہور ہی مشہور ہے اور کسی بات کا مشہور ہونا کوئی تعجب نہیں، چنانچہ دیکھو فلاں فلاں باتیں بھی مشہور ہیں، حالانکہ محض غلط ہیں، اور جب وہ واقع میں تمہارے بیٹے نہیں تو ان کو متبنی کرنے والوں کا حقیقی بیٹا نہ کہو۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ: اس میں صوفیاء کے اس قول کی اصل ہے کہ نفس ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہوتا، اور کئی جزوی مسائل کا اسی پر مدار ہے، مثلاً وسوسہ کا علاج یہ کیا گیا ہے کہ ذکر کی طرف متوجہ ہوجائے، پھر اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں تسبیح پڑھتا ہوں اور باتیں بھی کرتا ہوں اور عین گفتگو کے وقت ذکر اللہ میں بھی مشغول رہتا ہوں، ایسا شخص جھوٹا اور فریب خوردہ ہے، چنانچہ ایک وقت میں دل کی توجہ دو جانب نہیں ہوسکتی، کیونکہ دل ایک ہی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جس طرح ایک آدمی کے سینہ میں دو دل نہیں، ایسے ہی ایک شخص کی حقیقۃً دو مائیں یا ایک بیٹے کے دو باپ نہیں ہوتے، جاہلیت کے زمانہ میں کوئی بیوی کو ماں کہہ دیتا تو ساری عمر کے لئے اس سے جدا ہوجاتی، گویا اس لفظ سے وہ حقیقی ماں بن گئی، اور کسی کو منہ بولا بیٹا بنالیا تو سچ مچ بیٹا سمجھا جاتا تھا اور سب احکام اس پر بیٹے کے جاری ہوتے تھے، قرآن کریم نے اس لفظی و مصنوعی تعلق کو حقیقی اور قدرتی تعلق سے جدا کرنے کے لئے ان رسوم و مفروضات کی بڑی شد و مد سے تردید فرمائی، اس نے بتلایا کہ بیوی کو ماں کہہ دینے سے اگر واقعی وہ ماں بن جاتی ہے تو کیا یہ دو ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے؟ ایک وہ جس نے اول جنا تھا، اور دوسری یہ جس کو ماں کہہ کر پکارتا ہے، اسی طرح کسی نے زید کو بیٹا بنالیا تو ایک باپ تو اس کا پہلے سے

موجود تھا جس کے نطفہ سے پیدا ہوا ہے، کیا واقعی اب یہ ماننا چاہیے کہ یہ دو باپوں سے الگ الگ پیدا ہوا ہے، جب ایسا نہیں تو حقیقی ماں باپ اور اولاد کے احکام ان پر جاری نہیں کئے جاسکتے، چنانچہ بیوی کو ماں کہنے کا حکم سورۃ تحریم میں آئے گا، اور لے پالک (منہ بولے بیٹے) کا حکم آگے بیان ہوتا ہے۔

ان دو باتوں کے ساتھ تیسری بات (بطور تمہید وتشریح کے) یہ بھی سنا دی کہ ایسی باتیں زبان سے کہنے کی بہتیری ہیں جن کی حقیقت واقع میں وہ نہیں ہوتی جو الفاظ میں ادا کی جاتی ہے جیسے کسی غیر مستقل مزاج یا دو غلے آدمی کو یا کسی قوی الحفظ اور قوی القلب یا ایسے شخص کو جو ایک وقت میں دو مختلف چیزوں کی طرف متوجہ ہو کہہ دیتے ہیں کہ اس کے دو دل ہیں، حالانکہ سینہ چیر کر دیکھا جائے تو ایک ہی دل نکلے گا، اسی طرح ماں کے علاوہ کسی کو ماں یا باپ کے سوا کسی کو باپ یا بیٹے کے سوا کسی کو بیٹا کہہ دینے سے واقع میں وہ نسبت ثابت نہیں ہوجاتی جو بدون ہمارے زبان سے کہے قدرت نے قائم کردی ہے، لہٰذا مصنوعی اور حقیقی تعلقات میں خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ

پکارو لے پالکوں کو انکے باپ کی طرف نسبت کر کے یہی پورا انصاف ہے اللہ کے یہاں ۱؎ پھر اگر نہ جانتے ہو انکے باپ کو تو تمہارے بھائی ہیں دین

وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ

میں اور رفیق ہیں ۲؎ اور گناہ نہیں تم پر جس چیز میں چوک جاؤ، پر وہ جو دل سے ارادہ کرو

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان ۳؎

خلاصہ تفسیر: (جب منہ بولے بیٹے واقعہ میں تمہارے بیٹے نہیں تو) تم ان کو (متبنی بنانے والوں کا بیٹا مت کہو، بلکہ) ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف منسوب کیا کرو، یہ اللہ کے نزدیک راستی کی بات ہے اور گر تم ان کے باپوں کو نہ جانتے ہو تو (ان کو اپنا بھائی یا اپنا دوست کہہ کر پکارو، کیونکہ آخر) وہ تمہارے دین کے بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں اور تم کو اس میں جو بھول چوک ہوجائے تو اس سے تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا (یعنی اگر قدیم عادت کے موافق سبقت لسانی یا سہو سے نکل جائے تو معاف ہے) لیکن ہاں جو دل سے ارادہ کر کے کہو (تو اس سے گناہ ہوگا) اور (اس سے بھی معافی مانگ لو تو معاف ہوجائے گا کیونکہ) اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ: اس ممانعت میں وہ صورت داخل نہیں جب کہ بطور مجاز اور شفقت کے کسی کو بیٹا کہہ دیا جائے، بلکہ خاص جاہلیت کے اعتقاد کے طور پر اپنی حقیقی اولاد کی طرح سمجھ کر بیٹا کہنے کی ممانعت ہے، اور اگر کہنے والا کا یہ اعتقاد نہ ہو مگر وہ یقینا جانتا ہے کہ اس سے جاہلیت کے اعتقاد کی تائید اور اشاعت ہوگی تب بھی قصداً ممنوع ہے۔

فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیر بھائیوں کے حقوق بھائیوں جیسے، اسی طرح پیر کے حقوق باپ کی طرح ہونے چاہئیں، کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں دینی میں شریک بھائیوں کو اخوان فرمایا اور رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کو مؤمنین کی ماں قرار دیا ہے۔

***

فائدہ: ۱؎ یعنی ٹھیک انصاف کی بات یہ ہے کہ ہر شخص کی نسبت اس کے حقیقی باپ کی طرف کی جائے کسی نے ''لے پالک'' بنالیا تو وہ واقعی باپ نہیں بن گیا، یوں شفقت ومحبت سے کوئی کسی کو مجازاً بیٹا یا باپ کہہ کر پکارلے وہ دوسری بات ہے، غرض یہ ہے کہ نسبی تعلقات اور ان کے احکام میں اشتباہ والتباس واقع نہ ہونے پائے، ابتدائے اسلام میں نبی کریم ﷺ نے زید بن حارثہ کو آزاد کر کے متبنی کرلیا تھا، چنانچہ دستور کے موافق لوگ انھیں زید بن محمد ﷺ کہہ کر پکارنے لگے، جب یہ آیت نازل ہوئی سب زید بن حارثہ کہنے لگے۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر باپ معلوم نہ ہو تو بہرحال تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں ان ہی القاب سے یاد کرو، چنانچہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زید بن حارثہ کو فرمایا: "انت اخونا و مولانا".

فائدہ: ۳ یعنی بھول کر یا دانستہ اگر غلط کہہ دیا کہ فلاں کا بیٹا فلاں، وہ معاف ہے، بھول چوک کا گناہ کسی چیز میں نہیں، ہاں ارادہ کا ہے، اس میں بھی اللہ چاہے تو بخش دے۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى

نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے ۱ اور اسکی عورتیں انکی مائیں ہیں ۲ اور قرابت والے ایک دوسرے سے لگاؤ

بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ

رکھتے ہیں اللہ کے حکم میں زیادہ سب ایمان والوں اور ہجرت کرنے والوں سے مگر یہ کہ کرنا چاہو اپنے رفیقوں سے احسان ۳

كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝۶

یہ ہے کتاب میں لکھا ہوا ۴

خلاصہ تفسیر: پیچھے معلوم ہو چکا ہے کہ اس سورت کا خلاصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت شان اور آپ کے حقوق کا بیان کرنا ہے جن میں سے ایک حق آپ کا اتباع اور تعظیم بھی ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں، اب ایک خاص قسم کا بیان ہے جو سب کو شامل ہے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسلمانوں کے ساتھ ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق ہونا اور اسی معنوی تعلق کی مناسبت سے میراث کے ایک مسئلہ کی تحقیق کا بیان بھی بیان فرمادیا، کیونکہ وہ ظاہری تعلق ہی کی ایک فرع ہے۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مومنین کے ساتھ تو ان کے نفس (اور ذات) سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں (کیونکہ انسان کا نفس تو کبھی اس کو نفع پہنچاتا ہے کبھی نقصان، کیونکہ اگر نفس اچھا ہے اچھے کاموں کی طرف چلتا ہے تو نفع ہے اور برے کاموں کی طرف چلنے لگے تو خود اپنا نفس ہی اپنے لئے مصیبت بن جاتا ہے، بخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہ آپ کی تعلیم نفع ہی نفع اور خیر ہی خیر ہے، اور اپنا نفس اگر اچھا بھی ہو اور نیکی ہی کی طرف چلتا ہو پھر بھی اس کا نفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نفع کے برابر نہیں ہوسکتا، کیونکہ اپنے نفس کو تو خیر و شر اور نفع و نقصان میں مغالطہ بھی ہوسکتا ہے اور اس کو نفع و نقصان کا پورا علم بھی نہیں، بخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہ آپ کی تعلیمات میں کسی مغالطہ کا خطرہ نہیں، اور جب نفع رسانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری جان اور ہمارے نفس سے بھی زیادہ ہیں تو ان کا حق ہم پر ہماری جان سے زیادہ ہے اور وہ حق یہی ہے کہ آپ کے ہر کام میں اطاعت کریں اور آپ کی تعظیم و تکریم تمام مخلوق سے زیادہ کریں) اور آپ کی بیویاں ان (مومنین) کی مائیں ہیں (یعنی مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مومنین کے لئے روحانی باپ ہیں جو ان کی اپنی ذات سے بھی زیادہ ان پر شفیق و مہربان ہیں، اسی مناسبت سے آپ کی ازواج مطہرات امت کی مائیں ہوگئیں یعنی تعظیم و تکریم میں ان کا حق ماؤں کی طرح ہے، اس آیت نے ازواج مطہرات کو صراحۃً امت کی مائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اشارۃً امت کے روحانی باپ قرار دے دیا، تو اس سے بھی اسی طرح کا ایک التباس اور اشتباہ ہوسکتا تھا جس طرح کا اشتباہ متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کو اس کے غیر حقیقی باپ کی طرف منسوب کرنے میں ہوتا تھا، جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ امت کے مسلمان سب آپس میں حقیقی بہن بھائی ہوجائیں تو ان کے آپس میں نکاح کا تعلق حرام ہوجائے، اور میراث کے احکام میں بھی ہر مسلمان دوسرے کا وارث قرار دیا جائے چنانچہ اسی اشتباہ کو دور کرنے کے لئے آخر آیت میں فرمادیا:) رشتہ دار کتاب اللہ (یعنی حکم شرعی) میں ایک دوسرے سے (میراث کا) زیادہ تعلق رکھتے ہیں، بہ نسبت دوسرے مومنین اور مہاجرین کے (پس ایمان اور ہجرت کے تعلق

سے اب کوئی کسی کا وارث نہ ہوگا، شروع اسلام میں جو اس قسم کا حکم تھا کہ ایمان اور ہجرت کے تعلق سے بھی ایک مسلمان دوسرے کا وارث ہوتا تھا وہ بعض مصالح کی وجہ سے تھا، اب وہ حکم منسوخ ہے) مگر یہ کہ تم اپنے (ان) دوستوں سے (بطور وصیت کے) کچھ سلوک کرنا چاہو تو وہ جائز ہے، یہ بات لوح محفوظ میں لکھی جا چکی ہے (کہ ابتداء ہجرت میں ایمانی اخوت کی بنا پر مہاجرین کو انصار کی میراث کا حق دار بنا دیا گیا تھا مگر بالآخر تقسیم میراث رشتہ داری اور ارحام کی بنیاد پر رہے گی، ایمان اور ہجرت کے تعلق سے کوئی کسی کا وارث نہ ہوگا)۔

وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ: حضور ﷺ کا اگرچہ مسلمانوں کے ساتھ تعلق ان کی جان سے بھی زیادہ ہے تو آپ معناً سب مسلمانوں کے باپ ہیں، اس تعلق کی فرع یہ ہے کہ آپ کی ازواج مطہرات باعتبار تعظیم کے ان کی ماں ہیں اور اسی طرح ہر نبی اپنی امت کا باپ ہے اور ان کی بیویاں ماں ہیں، اور چونکہ ازواج مطہرات کا ماں ہونا تعظیم کے اعتبار سے ہے تو جن احکام کا تعلق تعظیم سے نہ ہوگا ان میں ماں ہونے کا اثر ظاہر نہ ہوگا، مثلاً پردہ نہ کرنا اور ان کو دیکھنا یا تنہائی میں ان کے پاس بیٹھنا وغیرہ کہ ان امور کو تعظیم سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے ازواج مطہرات سے مسلمانوں کو پردہ کرنا واجب اور ان کو دیکھنا اور تنہائی میں ان کے پاس بیٹھنا بدستور حرام ہے، البتہ حضور ﷺ کے بعد ان سے نکاح کرنا حرام کیا گیا، کیونکہ تعظیم کی یہ بھی ایک فرع ہے، اور یہ حکم رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ: اس کے متعلق مزید تفصیل پانچواں پارہ سورہ نساء آیت ۳۳؍اور دسواں پارہ میں سورہ انفال کی آخری آیت میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

* * *

فائدہ: ۱ مومن کا ایمان اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک شعاع ہے اس نور اعظم کی جو آفتاب نبوت سے پھیلتا ہے، آفتاب نبوت پیغمبر ﷺ ہوئے، بنابریں مومن (من حیث هو مومن) اگر اپنی حقیقت سمجھنے کے لئے حرکت فکری شروع کرے تو اپنی ایمانی ہستی سے پیشتر اس کو پیغمبر ﷺ کی معرفت حاصل کرنی پڑے گی، اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ نبی کا وجود مسعود خود ہماری ہستی سے بھی زیادہ ہم سے نزدیک ہے اور اگر اس روحانی تعلق کی بناء پر کہہ دیا جائے کہ مومنین کے حق میں نبی بمنزلہ باپ کے بلکہ اس سے بھی بمراتب بڑھ کر ہے تو بالکل بجا ہوگا۔

چنانچہ سنن ابی داؤد میں: "انما انا لکم بمنزلة الوالد" الخ. اور ابی بن کعب وغیرہ کی قرآت میں آیت: **اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ** الخ کے ساتھ "وهو اب لهم" کا جملہ اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے، باپ بیٹے کے تعلق میں غور کرو تو اس کا حاصل یہ ہی نکلے گا کہ بیٹے کا جسمانی وجود باپ کے جسم سے نکلا ہے اور باپ کی تربیت و شفقت طبعی اوروں سے بڑھ کر ہے لیکن نبی اور امتی کا تعلق کیا اس سے کم ہے؟ یقیناً امتی کا ایمان و روحانی وجود نبی کی روحانیت کبریٰ کا ایک پرتو اور ظل ہوتا ہے اور شفقت و تربیت نبی کی طرف سے ظہور پذیر ہوتی ہے، ماں باپ تو کیا تمام مخلوق میں اسکا نمونہ نہیں مل سکتا، باپ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہم کو دنیا کی عارضی حیات عطا فرمائی تھی، لیکن نبی کے طفیل ابدی اور دائمی حیات ملتی ہے، نبی کریم ﷺ ہماری وہ ہمدردی اور خیر خواہانہ شفقت و تربیت فرماتے ہیں جو خود ہمارا نفس بھی اپنی نہیں کر سکتا، اسی لئے پیغمبر ﷺ کو ہماری جان و مال میں تصرف کرنے کا وہ حق پہنچتا ہے جو دنیا میں کسی کو حاصل نہیں۔

حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں کہ: "نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان و مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا جتنا نبی کا چلتا ہے، اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنا رَوا نہیں اور اگر نبی حکم دے دے تو فرض ہو جائے"، ان ہی حقائق پر نظر کرتے ہوئے احادیث میں فرمایا کہ: "تم میں کوئی آدمی مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک باپ، بیٹے اور سب آدمیوں بلکہ اس کی جان سے بھی بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں"۔

فائدہ: ۲ یعنی دینی مائیں ہیں، تعظیم و احترام میں اور بعض احکام میں جو ان کے لئے شریعت سے ثابت ہوں، کل احکام میں نہیں۔

فائدہ: ۳ حضرت کے ساتھ جنہوں نے وطن چھوڑا، بھائی بندوں سے ٹوٹے، آپ نے ان مہاجرین اور انصار مدینہ میں سے دو دو آدمیوں کو آپس میں بھائی بنا دیا تھا، بعدہ مہاجرین کے دوسرے قرابت دار مسلمان ہو گئے تب فرمایا کہ قدرتی رشتہ ناطہ اس بھائی چارہ سے مقدم ہے

میراث وغیرہ رشتہ ناطے کے موافق تقسیم ہوگی، ہاں سلوک احسان ان رفیقوں سے بھی کئے جاؤ۔

فائدہ: ۴ یعنی قرآن میں یہ حکم ہمیشہ کو جاری رہا۔ یا تورات میں بھی ہوگا یا ''کتاب'' سے ''لوح محفوظ'' مراد ہو۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ

اور جب لیا ہم نے نبیوں سے ان کا قرار اور تجھ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ سے جو بیٹا

مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۷ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ

مریم کا، اور لیا ہم نے ان سے گاڑھا قرار ۱ تاکہ پوچھے اللہ سچوں سے ان کا سچ

وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۸ ع ۲

اور تیار رکھا ہے منکروں کے لیے دردناک عذاب ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے شروع سورت میں حضور ﷺ کو وحی کی اتباع کا حکم ہوا ہے اور مسلمانوں کو صاحب وحی کی اتباع کا، اب ان کی تاکید کے لیے انبیاء سے عہد لیے جانے کا بیان ہے اور یہ کہ جو لوگ انبیاء کے منکر ہیں وہ عذاب کے مستحق ہیں۔

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب کہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا (کہ احکام الٰہیہ کا اتباع کریں، جن میں مخلوق کو تبلیغ و دعوت اور باہمی تعاون و تناصر بھی داخل ہے) اور (ان پیغمبروں میں) آپ سے بھی (اقرار لیا) اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم (علیہم السلام) سے بھی، اور (یہ کوئی معمولی عہد و اقرار نہیں تھا، بلکہ) ہم نے ان سب سے خوب پختہ عہد لیا، تاکہ (قیامت کے روز) ان سچے لوگوں (یعنی انبیاء علیہم السلام) سے ان کے سچ کی تحقیقات کرے (تاکہ انبیاء کا شرف و اعزاز ظاہر ہو جائے، اور نہ ماننے والوں پر حجت مکمل ہو جائے، اس عہد اور اس کی تحقیقات سے دو باتوں کا وجوب ثابت ہوگیا: ① یہ کہ صاحب وحی یعنی انبیاء پر اپنی وحی کا اتباع واجب ہے ② جو عام لوگ صاحب وحی نہیں ان پر اپنے صاحب وحی پیغمبر کی اتباع واجب ہے) اور کافروں کے لئے (جو صاحب وحی کی اتباع سے منحرف ہیں) اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

لفظ ''صادقین'' سے انبیاء علیہم السلام کا اپنے عہد کو پورا کرنا ظاہر فرما دیا، چنانچہ ان کا اپنی وحی پر اتباع تو ثابت ہوگیا، اب رہ گئے دوسرے لوگ سو ان کو انبیاء کا اتباع نہ کرنے پر آخر میں وعید سنا دی اور چونکہ تاکید کے لیے تہدید زیادہ مناسب ہے اس لیے ترک اتباع کی وعید پر اکتفا فرمایا گیا۔

تیسرا پارہ سورہ آل عمران آیت ۸۱ میں میثاق انبیاء کی تحقیق گذر چکی ہے وہاں دیکھ لیا جائے، اور سورہ مائدہ کی آخری آیت میں ''صدق رسل'' کی تفسیر ملاحظہ کر لی جائے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی یہ قول و قرار کہ ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرے گا اور دین کے قائم کرنے اور حق تعالیٰ کا پیغام پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا، ''آل عمران'' میں اس میثاق کا ذکر ہو چکا ہے، حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''اوپر پیغمبر ﷺ کے حق میں فرمایا تھا کہ مومنین پر ان کی جان سے زیادہ تصرف رکھتا ہے، یہاں اشارہ کر دیا کہ یہ درجہ نبیوں کو اس لئے ملا کہ ان پر محنت (اور ذمہ داری بھی) سب سے زیادہ ہے، اکیلے ساری خلق سے مقابل ہونا اور کسی سے خوف و رجا نہ رکھنا''، پیغمبروں کے سوا کس کا کام ہو سکتا ہے۔

یہ پانچ پیغمبر جن کے نام یہاں خصوصیت سے لئے اولوالعزم پیغمبر کہلاتے ہیں، ان کی ہدایت کا اثر ہزاروں برس رہا اور جب تک دنیا ہے رہے گا، ان میں پہلے نام لیا ہمارے نبی کا حالانکہ عالم شہادت میں آپ کا ظہور سب کے بعد ہوا ہے۔ مگر درجہ میں آپ ﷺ سب سے پہلے ہیں، اور وجود بھی آپ کا عالم غیب میں سب سے مقدم ہے۔ کما ثبت فی الحدیث۔

فائدہ:۲ یعنی قول وقرار کے مطابق ان پیغمبروں کی زبانی اپنے احکام خلق کو پہنچائے اور حجت تمام کردے، تب ہر ایک سے پوچھ پاچھ کرے گا، تاکہ سچوں کا سچائی پر قائم رہنا ظاہر ہو اور منکروں کو سچائی سے انکار کرنے پر سزا دی جائے۔

ربط: آگے جنگ احزاب کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے سچے پیغمبر اور مومنین اوران کے ظاہری ثمرات ونتائج ذکر کیے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

اے ایمان والو! یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں پھر ہم نے بھیج دی ان پر

رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۚ﴿۹﴾

ہوا اور وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں ۱ اور ہے اللہ جو کچھ کرتے ہو دیکھنے والا ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے وعید سنا کر اطاعت کی رغبت دلائی تھی، اب اپنی ایک بڑی نعمت یاد دلا کر اطاعت کی ترغیب دیتے ہیں، وہ یہ کہ مسلمانوں کو دو غزووں میں کامیابی دی اور پریشانی دور کی، اور اس کے ضمن میں کفار ومنافقین کے افعال واقوال اور زبان درازی وغیرہ پر ملامت اور تشنیع بھی ہے جن سے رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچی تھی اور اس سورت میں بڑا مقصود رسول ﷺ کی ایذا رسانی پر ملامت بھی ہے، نیز اس قصہ سے رسول اللہ ﷺ کا منظور من اللہ اور محبوب ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ بھی اس سورت کا بڑا مقصود ہے۔

خلاصہ اس واقعہ کا یہ ہے کہ حضور ﷺ نے یہود بنی نضیر کو مدینہ سے نکال دیا تھا، جس کا قصہ سورہ حشر میں آئے گا، انہوں نے سنہ چار یا پانچ ہجری میں قبائل عرب کو بہکایا اور سب مل کر دس بارہ ہزار آدمی مدینہ پر چڑھ آئے، آپ ﷺ نے مدینہ کے گرد جہاں جہاں سے آنے کا موقع تھا خندق کھدوائی اور تین ہزار آدمیوں سے ان کا مقابلہ کیا، اور دور دور سے کچھ لڑائی بھی ہوتی رہی، قریب ایک ماہ تک یہ محاصرہ رہا، آخر اللہ تعالیٰ نے ظاہر میں ایک آندھی سے اور باطن میں فرشتوں کے لشکر سے سب کفار کو بھگا دیا، چونکہ یہود بنی قریظہ نے اپنے معاہدہ کے خلاف ان محاصرہ کرنے والوں کی مدد کی تھی اس لیے آپ غزوہ خندق سے فارغ ہوتے ہی بنو قریظہ کے مقابلہ کے لیے چلے، وہ اول قلعہ میں بند ہو گئے اور بیس پچیس روز تک محصور رہے، پھر آخر تنگ ہو کر نکلے، بعض قتل اور بعض قید ہوئے، اور اس واقعہ میں منافقین کی طرف سے بھی بہت بے مروتی کی باتیں ظاہر ہوئیں۔

اے ایمان والو! اللہ کا انعام اپنے اوپر یاد کرو، جب تم پر بہت سے لشکر چڑھ آئے (یعنی عیینہ کا لشکر، ابو سفیان کا لشکر اور یہود بنی قریظہ) پھر ہم نے ان پر ایک آندھی بھیجی (جس نے ان کو پریشان کر دیا اور ان کے خیمے اکھاڑ پھینکے) اور (فرشتوں کی) ایسی فوج بھیجی جو تم کو (عام طور پر) دکھائی نہ دیتی تھی (اگرچہ بعض صحابہ مثلاً حضرت حذیفہؓ نے بعض فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھا بھی تھا اور کفار کے لشکر میں یہ جاسوسی کے لئے گئے تھے وہاں یہ آواز بھی سنی کہ بھاگو بھاگو، اور اس واقعہ میں ملائکہ نے قتال نہیں کیا، صرف کفار کے دلوں میں رعب ڈالنے کے لئے بھیجے گئے تھے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے (اس وقت کے) اعمال کو دیکھتے تھے (کہ تم نے ایک طویل وعریض اور گہری خندق کھودنے میں بڑی محنت اٹھائی، پھر کفار کے مقابلہ کے لئے بڑے استقلال کے ساتھ ثابت قدم رہے اور ان کاموں سے خوش ہو کر تمہاری امداد فرما رہے تھے)۔

* * *

فائدہ:۱ یعنی فرشتوں کی فوجیں جو کفار کے دلوں میں رعب ڈال رہی تھیں۔

فائدہ:۲ ہجرت کے چوتھے پانچویں سال یہود بنی نضیر جو مدینہ سے نکالے گئے تھے (اس کا ذکر سورۃ حشر میں آئے گا) ہر قوم میں پھرے اور اُبھار اُکسا کر قریش مکہ، بنی فزارہ اور غطفان وغیرہ قبائل عرب کی متحدہ طاقت کو مدینہ پر چڑھا لانے میں کامیاب ہو گئے۔ تقریباً بارہ ہزار کا لشکر جرار پورے ساز وسامان سے آراستہ اور طاقت کے نشہ میں چور تھا، یہود "بنی قریظہ" جن کا ایک مضبوط قلعہ مدینہ کی شرقی جانب تھا، پہلے سے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کئے ہوئے تھے، "نضیری" یہود کی ترغیب وترہیب سے آخر کار وہ بھی معاہدات کو بالائے طاق رکھ کر حملہ آوروں کی مدد کے

لئے کھڑے ہو گئے۔ مسلمانوں کی جمعیت کل تین ہزار تھی۔ جن میں ایک بڑی تعداد ان دغاباز منافقوں کی تھی جو سختی کا وقت آنے پر جھوٹے حیلے بہانے کر کے میدان جنگ سے کھسکنے لگے، نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، آخر حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے شہر کے گرد جدھر سے حملہ کا اندیشہ تھا خندق کھودی گئی، سخت جاڑے کا موسم تھا، غلہ کی گرانی تھی، بھوک کی وجہ سے صحابہ اور خود سرور عالم ﷺ کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے تھے، مگر عشق الٰہی کے نشہ میں سرشار سپاہی اور ان کے سالار اعظم اس سنگلاخ زمین کی کھدائی میں حیرت انگیز قوت اور ہمت مردانہ کے ساتھ مشغول تھے، مجاہدین پتھریلی زمین پر کدال مارتے اور کہتے: "نحن الذين با يعوا محمدا على الجهاد ما بقينا ابدا"، ادھر سرکار محمدی سے جواب ملتا: "اللهم لا عيش الا عيش الاخيرة فاغفر للانصار والمهاجرة" ،خندق تیار ہو گئی تو اسلامی لشکر نے دشمن کے مقابل مورچے جما دیے، تقریباً بیس پچیس روز تک دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی رہیں، درمیان میں خندق حائل تھی، باوجود کثرت تعداد کے کفار سے بن نہ پڑا کہ شہر پر عام حملہ کر دیتے، البتہ دور سے تیر اندازی ہوتی رہی اور گاہ بگاہ فریقین کے خاص خاص افراد میدان مبارزت میں بھی دو دو ہاتھ دکھانے لگتے تھے، مشرکین اور یہود بنی قریظہ کے درمیان مسلمانوں کی جمعیت محصورین کی حیثیت رکھتی تھی، تاہم انہوں نے سب عورتوں بچوں کو شہر کی مضبوط و محفوظ حویلیوں میں پہنچا کر خود بڑی پامردی اور استقامت کے ساتھ شہر کی حفاظت و مدافعت کا فرض انجام دیا۔

آخر کار نعیم ابن مسعود الاشجعیؓ کی ایک عاقلانہ اور لطیف تدبیر سے مشرکین اور یہود بنی قریظہ میں پھوٹ پڑ گئی، ادھر کفار کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کا غیر مرئی لشکر مرعوب کر رہا تھا، اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے ایک رات سخت خوفناک جھکڑ ہوا کا چلا دیا، پر وا ہوا سے ریت اور سنگریزے اڑ کر کفار کے منہ پر لگتے تھے، ان کے چولھے بجھ گئے، دیگچے زمین پر جا پڑے، کھانے پکانے کی کوئی صورت نہ تھی، ہوا کے زور سے خیمے اکھڑ گئے، گھوڑے چھوٹ کر بھاگ گئے، لشکر پریشان ہو گیا، سردی اور اندھیری ناقابل برداشت بن گئی، آخر ابوسفیان نے جن کے ہاتھ میں تمام لشکروں کی اعلیٰ کمان تھی طبل رحیل بجا دیا، ناچار سب اٹھ کر بے نیل و مرام واپس چل دیے: وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا (الاحزاب: ۲۵)

یہ جنگ "احزاب" کہلاتی ہے اور اسے "جنگ خندق" بھی کہتے ہیں، سخت جاڑے کے موسم اور فاقہ کشی کی حالت میں خندق کھودنا اور اتنے دشمنوں کے بیچ میں گھر کر لڑائی لڑنا، یہ وہ حالات تھے جن میں منافق دل کی باتیں بولنے لگے اور مومن ثابت قدم رہے، اسی جنگ میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب آئندہ ہم کفار پر چڑھائی کریں گے وہ ہم پر چڑھ کر نہ آسکیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ

جب چڑھ آئے تم پر اوپر کی طرف سے اور نیچے سے ۱ے اور جب بدلنے لگیں آنکھیں ۲ے اور پہنچے دل

الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ⑩

گلوں تک ۳ے اور اٹکلنے لگے تم اللہ پر طرح طرح کی اٹکلیں ۴ے

خلاصہ تفسیر: (یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ وہ (دشمن) لوگ تم پر (ہر طرف سے نرغہ کر کے) آ چڑھے تھے اوپر کی طرف سے اور نیچے کی طرف سے بھی (یعنی کوئی قبیلہ مدینہ کے نشیب کی طرف سے اور کوئی قبیلہ اس کی بلندی کی طرف سے) اور جب کہ آنکھیں (مارے دہشت کے) کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے تھے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کر رہے تھے (جیسا کہ پریشانی کے وقت میں مختلف وسوسے اور اپنے غالب یا مغلوب ہونے کے احتمالات طبعی طور پر آیا کرتے ہیں اور یہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں)۔

وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ: آیت میں "زیغ ابصار" سے مراد حیرت ودہشت، "بلوغ القلوب الحناجر" سے مراد شدید خوف اور "ظنون" سے مراد خواطر نفس ہے، خواطر یعنی وساوس جو طبعی خوف سے انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتے ہیں، اس

سے معلوم ہوا کہ غیر اختیاری طبعی احوال کامل ایمان کے منافی نہیں، یعنی طبعی خوف بڑے لوگوں کو بھی پیش آتا ہے، ایسا خوف ایمان ویقین کے خلاف نہیں ہوتا، یہ ایک طبعی حالت ہے جو ناگہانی اور خلاف توقع حالات پر پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ تقاضہ طبیعت سے کوئی محفوظ نہیں، چنانچہ ایسی حالت پیش آنے پر صبر اور طاعات پر قائم رہنا چاہیے۔

آگے جو اہل ایمان کا قول آئے گا کہ: ھذا ما وعدنا اللہ و رسولہ وصدق اللہ و رسولہ (یہ وہی موقع ہے جس کی خدا اور اس کے رسول نے ہمیں خبر دی اور خدا اور اس کے رسول کی خبر سچی تھی) تو یہاں مذکورہ بالا آیت میں بیان کردہ کیفیت اس کے منافی نہیں، کیونکہ اس میں لفظ ھذا کا اشارہ لشکروں کے چڑھ آنے کی طرف ہے، جیسا کہ آگے اس کی تفسیر میں معلوم ہوگا، چونکہ کفار کے لشکروں کے آنے کی خبر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دے دی گئی تھی، اس لئے اس کا تو پہلے سے یقین تھا، لیکن اس واقعہ کا انجام نہیں بتلایا گیا تھا اس لئے انجام کی بابت مختلف خیالات پیدا ہوتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی مدینہ کی شرقی جانب سے جو اونچی ہے اور غربی جانب سے جو نیچی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی دہشت وحیرت سے آنکھیں پھرنے لگیں اور لوگوں کے تیور بدلنے لگے، دوستی جتانے والے لگے آنکھیں چرانے۔

فائدہ: ۳ یعنی خوف وہراس سے دل دھڑک رہے تھے، گویا اپنی جگہ سے اٹھ کر گلے میں آ لگے۔

فائدہ: ۴ یعنی کوئی کچھ سمجھتا تھا، کوئی کچھ اٹکلیں لڑا رہا تھا، مسلمانوں نے سمجھا کہ اس مرتبہ اور سخت آزمائش آئی، دیکھیے کیا صورت پیش آئے، کچے ایمان والوں نے خیال کیا کہ بس جی اب کی بار نہیں بچیں گے، منافقین کا تو پوچھنا ہی کیا، آگے ان کے مقولے آ رہے ہیں۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ⑪

وہاں جانچے گئے ایمان والے اور جھڑجھڑائے گئے زور کا جھڑجھڑانا

خلاصہ تفسیر: اس موقع پر مسلمانوں کا (پورا) پورا امتحان کیا گیا (جس میں وہ پورے اترے) اور (سخت) زلزلہ میں ڈالے گئے۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ: اس سے معلوم ہوا کہ اسی ظاہری آزمائش ومشقت کی طرح باطنی طور پر بھی آزمائش ومشقت اور ناگوار امور پیش آیا کرتے ہیں، جس میں قبض وغیرہ کی کیفیت بھی داخل ہے اور یہ بھی صدق وخلوص کے امتحان کے لیے ہوتا ہے، پس ایسی حالت میں واجب ہے کہ صبر کرے اور طاعات پر ثابت قدم رہے۔

* * *

فائدہ: حضرت حذیفہ کو آپ نے دشمن کی خبر لانے کے لئے بھیجا تھا، اس کا مفصل قصہ حدیث میں پڑھو تو اس جھڑجھڑانے کی کیفیت کا کچھ اندازہ ہو، یہاں ترجمہ کی گنجائش نہیں۔

وَإِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ إِلَّا غُرُوْرًا ⑫

اور جب کہنے لگے منافق اور جن کے دلوں میں روگ ہے جو وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ نے اور اس کے رسول نے سب فریب تھا

خلاصہ تفسیر: اور (یہ واقعہ اس وقت ہوا تھا) جب کہ منافقین اور وہ (وہ) لوگ جن کے دلوں میں (نفاق اور شک کا) مرض ہے یوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ نے اور اس کے رسول نے محض دھوکہ ہی کا وعدہ کر رکھا ہے۔

مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ إِلَّا غُرُوْرًا: خندق کھودتے ہوئے ایک پتھر پر کدال لگنے سے کئی بار آگ کی چنگاریاں نکلی تھیں اور حضور ﷺ نے ہر بار میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ مجھ کو روم، شام اور فارس کے محل اس کی روشنی میں نظر آئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی فتح کا وعدہ فرمایا ہے، جب کفار کے ان لشکروں کے جمع ہونے سے پریشانی ہوئی تو معتب بن قشیر اور اس کے ساتھی منافقین کہنے لگے کہ یہ تو حالت ہے اور اس پر روم اور شام

کے فتح ہونے کی بشارتیں دی جاتی ہیں، یہ محض دھوکہ ہے، اور اگر چہ وہ منافقین اس کو اللہ کا وعدہ نہ سمجھتے تھے، نہ آپ کو رسول مانتے تھے، پھر یہ کہنا کہ: ماوعدنا اللہ ورسولہ الا غرورا، یا صرف حکایت کے درجہ میں ہے، یا اس کو اللہ کا اور رسول کا وعدہ استہزا اور دل لگی کے طور پر کہا ہوگا۔

* * *

فائدہ: بعض منافق کہنے لگے کہ پیغمبر ﷺ کہتے تھے کہ میرا دین مشرق و مغرب میں پھیلے گا اور فارس، روم، صنعاء کے محلات مجھ کو دیے گئے، یہاں تو مسلمان قضائے حاجت کو بھی نہیں نکل سکتے، وہ وعدے کہاں ہیں؟ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''مسلمان کو چاہیے اب بھی ناامیدی کے وقت بے ایمانی کی باتیں نہ بولیں''۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ

اور جب کہنے لگی ایک جماعت ان میں اے یثرب والو ۱؎ تمہارے لیے ٹھکانہ نہیں سو پھر چلو اور رخصت مانگنے لگا ایک فرقہ ان میں

النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾

نبی سے کہنے لگے ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں، اور وہ کھلے نہیں پڑے، ان کی کوئی غرض نہیں مگر بھاگ جانا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (یہ واقعہ اس وقت کا تھا) جبکہ ان (منافقین) میں سے بعض لوگوں نے (دوسرے حاضرین معرکہ) سے کہا کہ یثرب (یعنی مدینہ) کے لوگو! (یہاں) ٹھہرنے کا موقع نہیں (کیونکہ یہاں میدان میں رہنا موت کے منہ میں جانا ہے) سو (اپنے گھروں کو) لوٹ چلو (یہ بات اوس بن قیظی نے کہی تھا دیگر کچھ لوگ بھی اس میں شریک تھے) اور بعض لوگ ان (منافقوں میں) نبی (ﷺ) سے (اپنے گھر واپس جانے کی) اجازت مانگتے تھے کہتے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں (یعنی صرف عورتیں بچے رہ گئے ہیں، اور گھر کی دیواریں قابل اطمینان نہیں، اندیشہ ہے کبھی چور نہ آگھسیں، یہ بات ابوعرابہ اور بنی حارثہ کے بعض لوگوں نے کہی تھی) حالانکہ وہ (ان کے خیال میں) غیر محفوظ نہیں ہیں (یعنی ان کو چوری وغیرہ کا اندیشہ ہرگز نہیں اور نہ واپس جانے سے ان کی یہ نیت ہے کہ ان کا قابل اطمینان انتظام کر کے چلے آئیں گے) یہ محض بھاگنا ہی چاہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ''یثرب'' مدینہ طیبہ کا پرانا نام تھا۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری سے ''مدینۃ النبی'' ہوگیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی سارے عرب ہمارے دشمن ہوئے تو ہم کو رہنے کا ٹھکانا کہاں، سب لشکر سے جدا ہو کر گھر لوٹ چلو اور حضرت لشکر کے ساتھ باہر کھڑے تھے، شہر میں مضبوط حویلیوں کے ناکے بند کر کے زنانے ان میں رکھ دیے تھے، یہ بہانہ کرنے لگے کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں کہیں چور گھس کر لوٹ نہ لیں اور یہ محض جھوٹ بات بنائی تھی، غرض یہ تھی کہ بہانہ کر کے میدان سے بھاگ جائیں، چنانچہ جو اجازت لینے آیا آپ اجازت دیتے رہے کچھ پروا تکثیر سواد کی نہ کی، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف تین سو نفوس قدسیہ آپ کے ساتھ باقی رہ گئے۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُىِٕلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾

اور اگر شہر میں کوئی گھس آئے ان پر اس کے کناروں سے پھر ان سے چاہے دین سے بچلنا تو مان لیں اور دیر نہ کریں اس میں مگر تھوڑی

خلاصہ تفسیر: اور (ان کی یہ حالت ہے کہ) اگر مدینہ میں اس کے (سب) اطراف سے ان پر (جب یہ اپنے گھروں میں ہوں) کوئی (لشکر کفار کا) آگھسے پھر ان سے فساد (یعنی مسلمانوں سے لڑنے) کی درخواست کی جائے تو یہ (فوراً) اس (فساد) کو منظور کرلیں اور ان گھروں میں بہت ہی کم ٹھہریں۔

یعنی اتنا توقف تو کریں کہ کوئی ان سے اس قسم کی درخواست کرے اور یہ منظور کریں اور اس کے بعد وہ فوراً ہی تیار ہو جائیں اور مسلمانوں کے مقابلہ میں جا پہنچیں اور اپنے گھروں کا کچھ بھی خیال نہ کریں کہ ہم لڑائی میں جا رہے ہیں ایسا نہ ہو کبھی کوئی ہمارے گھر کو لوٹ لے تو اگر ان کا قصد واقعی حفاظت کا ہے تو اب گھروں میں کیوں نہیں رہے، اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصل میں ان کو مسلمانوں سے عداوت اور کفار سے محبت ہے، اس لئے مسلمانوں کی اتنی مدد بھی گوارا نہیں کرتے کہ ان کے ساتھ رہ کر شمار اور گنتی ہی بڑھا دیں، باقی گھروں کا تو بہانہ ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جھوٹے حیلے بنا رہے ہیں، اگر فرض کرو یہ لوگ شہر میں ہوں اور کوئی غنیم ادھر ادھر سے گھس آئے پھر ان سے مطالبہ کرے کہ دین اسلام چھوڑ دو، جسے بظاہر یہ لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں، یا کہے کہ مسلمانوں سے لڑو اور فتنے فساد برپا کرو، اس وقت ان کا جھوٹ صاف کھل جائے، فوراً ان مطالبات کی تائید میں نکل پڑیں، نہ گھروں کے کھلے ہونے کا عذر کریں نہ لٹنے کا، بس بات چیت کرنے اور ہتھیار اٹھا کر لانے میں جو تھوڑی دیر لگے گی اسے مستثنٰی کر کے ایک منٹ کا توقف نہ کریں، اسلام کے ظاہری دعوے سے دستبردار ہو کر فوراً فتنہ و فساد کی آگ میں کود پڑیں۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ⑮

اور اقرار کر چکے تھے اللہ سے پہلے کہ نہ پھیریں گے پیٹھ، اور اللہ کے قرار کی پوچھ ہوتی ہے

خلاصہ تفسیر: حالانکہ یہ لوگ (اس سے) پہلے خدا سے عہد کر چکے تھے کہ (دشمن کے مقابلہ میں) پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے جو (اس قسم کا) عہد کیا جاتا ہے اس کی باز پرس ہوگی۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ: یہ عہد اس وقت کیا تھا جب جنگ بدر میں بعض لوگ شرکت سے رہ گئے تھے تو بعض منافقین نے مفت کا احسان دھرنے کے لیے کہا تھا کہ افسوس! ہم شریک نہ ہوئے، ورنہ ایسا کرتے ویسا کرتے، جب وقت آیا تو ساری قلعی کھل گئی۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ: ''جنگ احد کے بعد انہوں نے اقرار کیا تھا کہ پھر ہم ایسی حرکت نہ کریں گے''۔ اس کی پوچھ اللہ کی طرف سے ہوگی کہ وہ قول و قرار کہاں گیا۔

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ⑯

تو کہہ کچھ کام نہ آئے گا تمہارے یہ بھاگنا اگر بھاگو گے مرنے سے یا مارے جانے سے اور پھر بھی پھل نہ پاؤ گے مگر تھوڑے دنوں

خلاصہ تفسیر: آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ (تم جو بھاگے بھاگے پھرتے ہو کما قال تعالیٰ: ان یریدون الا فرارا تو) تم کو بھاگنا کچھ نافع نہیں ہو سکتا اگر تم موت سے یا قتل سے بھاگتے ہو اور اس (بھاگنے کی) حالت میں بجز تھوڑے دنوں کے (کہ وہ بقیہ عمر مقدر ہے) اور زیادہ (زندگی سے) متمتع نہیں ہو سکتے (یعنی بھاگ کر عمر نہیں بڑھ سکتی، کیونکہ اس کا وقت مقدر ہے، اور جب مقدر ہے تو اگر نہ بھاگتے تو بھی وقت سے پہلے نہیں مر سکتے، پس نہ قرار یعنی میدان جہاد میں ٹھہرنے سے کوئی نقصان، اور نہ فرار یعنی بھاگنے سے کوئی نفع، پھر بھاگنا محض بے عقلی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس کی قسمت میں موت ہے وہ کہیں بھاگ کر جان نہیں بچا سکتا، قضائے الٰہی ہر جگہ پہنچ کر رہے گی اور اگر ابھی موت مقدر نہیں تو میدان سے بھاگنا بے سود ہے، کیا میدان جنگ میں سب مارے جاتے ہیں اور فرض کرو بھاگنے سے بچاؤ ہی ہو گیا تو کتنے دن؟ آخر موت آنی ہے، اب نہیں چند روز کے بعد آئے گی اور نہ معلوم کس سختی اور ذلت سے آئے۔

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَلَا یَجِدُوْنَ

تو کہہ کون ہے کہ تم کو بچائے اللہ سے اگر چاہے تم پر برائی یا چاہے تم پر مہربانی ۱ اور نہ پائیں گے

لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۱۷﴾

اپنے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار ۲

خلاصہ تفسیر: (اور اس مسئلہ تقدیر کی تحقیق کے لئے ان سے) یہ بھی فرما دیجئے کہ وہ کون ہے جو تم کو خدا سے بچا سکے اگر وہ تمہارے ساتھ برائی کرنا چاہے (مثلاً تم کو ہلاک کرنا چاہے تو کیا تم کو کوئی بچا سکتا ہے جیسا کہ تم بھاگنے کو نافع سمجھتے ہو) یا وہ کون ہے جو خدا کے فضل کو تم سے روک سکے اگر وہ تم پر فضل کرنا چاہے (مثلاً وہ زندہ رکھنا چاہے جو کہ دنیوی فضل و رحمت ہے تو کیا کوئی خدا کو روک سکتا ہے؟ جیسا کہ تم سمجھتے ہو کہ میدان میں رہنا یقیناً موت کے منہ میں جانا ہے) اور (وہ لوگ سن رکھیں کہ) خدا کے سوا نہ کوئی اپنا حمایتی پائیں گے (جو نفع پہنچائے) اور نہ کوئی مددگار (جو نقصان سے بچائے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ کے ارادے کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی، نہ کوئی تدبیر اور حیلہ اس کے مقابلہ میں کام دے سکتا ہے، آدمی کو چاہیے کہ اسی پر توکل کرے اور ہر حالت میں اسی کی مرضی کا طلبگار رہے، ورنہ دنیا کی برائی بھلائی یا سختی نرمی تو یقیناً پہنچ کر رہے گی، پھر اس کے راستہ میں بزدلی کیوں دکھائے اور وقت پر جان کیوں چرائے جو عاقبت خراب ہو اور دنیا کی تکلیف ہٹ نہ سکے۔

فائدہ: ۲ یعنی عرب کی مخالفت سے ڈرتے ہو، اگر اللہ حکم دے تو مسلمان اب تم کو قتل کر ڈالیں۔

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِیْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآىِٕلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا ۚ

اللہ کو معلوم ہیں جو اٹکانے والے ہیں تم میں اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو چلے آؤ ہمارے پاس

وَلَا یَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ﴿۱۸﴾

اور لڑائی میں نہیں آتے مگر کبھی

خلاصہ تفسیر: (مسئلہ تقدیر کو بیان کر کے اب آگے پھر منافقین کی مذمت کا سلسلہ ہے، یعنی) اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو (خوب) جانتا ہے جو (دوسروں کو لڑائی میں جانے سے) مانع ہوتے ہیں اور جو اپنی (نسبی یا وطنی) بھائیوں سے کہتے ہیں کہ ہمارے پاس آ جاؤ (وہاں جا کر اپنی جان کیوں دیتے ہو) اور (ان کی بزدلی اور حرص و بخل کی یہ کیفیت ہے کہ) لڑائی میں بہت ہی کم آتے ہیں (یعنی اتنی دیر کو آتے ہیں کہ جس میں ذرا نام ہو جائے، یہ تو ان کی بزدلی ہے)۔

وَالْقَآىِٕلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا: یہ بات ایک منافق شخص نے اپنے حقیقی بھائی سے کہی تھی اور اس وقت یہ کہنے والا بھنا ہوا گوشت اور روٹی کھا رہا تھا، مسلمان بھائی نے کہا افسوس! تو اس چین میں ہے اور حضور ﷺ ایسی تکلیف میں، وہ بولا میاں! تم بھی یہیں چلے آؤ۔

* * *

فائدہ: یعنی ظاہری وضع داری اور دکھاوے کو شرما شرمی کبھی میدان میں آ کھڑے ہوتے ہیں، ورنہ عموماً گھروں میں بیٹھے عیش اڑاتے اور اپنی برادری کے لوگوں کو بھی جو سچے مسلمان ہیں جہاد میں آنے سے روکتے رہتے ہیں۔

اَشِحَّةً عَلَيۡكُمۡ ۚ فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ رَاَيۡتَهُمۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَيۡكَ تَدُوۡرُ اَعۡيُنُهُمۡ كَالَّذِىۡ يُغۡشٰى

دریغ رکھتے ہیں تم سے ۱؎ پھر جب آئے ڈر کا وقت تو تو دیکھے ان کو کہ تکتے ہیں تیری طرف پھرتی ہیں آنکھیں ان کی جیسے کسی پر آئے بیہوشی

عَلَيۡهِ مِنَ الۡمَوۡتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الۡخَوۡفُ سَلَقُوۡكُمۡ بِاَلۡسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الۡخَيۡرِ ؕ

موت کی، پھر جب جاتا رہے ڈر کا وقت چڑھ چڑھ بولیں تم پر تیز تیز زبانوں سے ڈھکے پڑتے ہیں مال پر ۲؎

اُولٰٓئِكَ لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا فَاَحۡبَطَ اللّٰهُ اَعۡمَالَهُمۡ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۱۹﴾

وہ لوگ یقین نہیں لائے پھر اکارت کر ڈالے اللہ نے ان کے کیے کام، اور یہ ہے اللہ پر آسان ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اور آتے بھی ہیں تو) تمہارے حق میں بخیلی لئے ہوئے (یعنی آنے میں بڑی نیت یہ ہوتی ہے کہ سب غنیمت مسلمانوں ہی کو نہ مل جائے اس لیے برائے نام شریک ہوجاتے ہیں تاکہ غنیمت کے استحقاق کا دعوی تو کرسکیں) سو (جب ان کی بزدلی اور بخل دونوں ثابت ہوگئیں ہیں تو اس مجموعہ کا اثر یہ ہے کہ) جب (کوئی) خوف (کا موقع) پیش آتا ہے تو ان کو دیکھتے ہو کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرائی جاتی ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو (یہ تو بزدلی کی حالت ہے) پھر جب وہ خوف دور ہوجاتا ہے تو تم کو تیز تیز زبانوں سے طعنے دیتے ہیں مال (غنیمت) پر حرص لئے ہوئے (یعنی مال غنیمت لینے کے لئے دل خراش باتیں کرتے ہیں کہ کیوں ہم شریک نہ تھے، ہماری ہی مدد سے تم کو یہ فتح میسر نہیں ہوئی، یہ ان کے بخل وحرص کی حالت ہے، ان کا یہ معاملہ تو تمہارے ساتھ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہے کہ) یہ لوگ (پہلے ہی سے) ایمان نہیں لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال (نیک پہلے ہی سے) بے کار کر رکھے ہیں (آخرت میں کچھ ثواب نہ ملے گا) اور یہ بات اللہ کے نزدیک بالکل آسان ہے (کوئی اس سے مزاحمت نہیں کرسکتا کہ ہم تو اپنے ان اعمال کا بدلہ ضرور لیں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مسلمانوں کا ساتھ دینے سے دریغ رکھتے ہیں اور ہر قسم کی ہمدردی وبہی خواہی سے بخل ہے، ہاں غنیمت کا موقع آئے تو حرص کے مارے چاہیں کہ کسی کو کچھ نہ ملے سارا مال ہم ہی سمیٹ کر لے جائیں، اسی احتمال پر لڑائی میں قدرے شرکت بھی کر لیتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ ① یعنی آڑے وقت رفاقت سے جی چراتے ہیں، ڈر کے مارے جان نکلتی ہے اور فتح کے بعد آکر باتیں بناتے اور سب سے زیادہ مردانگی جتاتے ہیں اور مال غنیمت پر مارے حرص کے گرے پڑتے ہیں ② یا یہ مطلب ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق طعن وتشنیع سے زبان درازی کرتے ہیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جب اللہ ورسول پر ایمان نہیں تو کوئی عمل مقبول نہیں ہوسکتا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جہاں ''حبط اعمال'' کا ذکر ہے تو فرمایا کہ یہ اللہ پر آسان ہے''۔ یعنی بظاہر اللہ تعالیٰ کے عدل وحکمت کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے اور یہ بات بھاری معلوم ہوتی ہے کہ وہ کسی کی محنت کو ضائع کردے، لیکن اس لئے بھاری نہیں رہتی کہ خود عمل ہی کے اندر ایسی خرابی چھپی ہوتی ہے جو کسی طرح اس کو درست نہیں ہونے دیتی، جیسے بے ایمان کا عمل کہ ایمان شرط اور روح ہے ہر عمل کی، بدون اس کے عمل مردہ ہے پھر قبول کس طرح ہو، کافر کتنی ہی محنت کرے سب اکارت ہے۔

يَحۡسَبُوۡنَ الۡاَحۡزَابَ لَمۡ يَذۡهَبُوۡا ۚ وَاِنۡ يَّاۡتِ الۡاَحۡزَابُ يَوَدُّوۡا لَوۡ اَنَّهُمۡ بَادُوۡنَ فِى الۡاَعۡرَابِ

سمجھتے ہیں کہ فوجیں کفار کی نہیں پھر گئیں، اور اگر آجائیں وہ فوجیں تو آرزو کریں کسی طرح ہم باہر نکلے ہوئے ہوں گاؤں میں

ع ۱۸ يَسۡـَٔلُوۡنَ عَنۡ اَنۡۢبَآٮِٕكُمۡ‌ؕ وَلَوۡ كَانُوۡا فِيۡكُمۡ مَّا قٰتَلُوۡۤا اِلَّا قَلِيۡلًا ۲۰

پوچھ لیا کریں تمہاری خبریں ۱ اور اگر ہوں تم میں لڑائی نہ کریں مگر بہت تھوڑی ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ حالت تو منافقین کی اس وقت تھی جبکہ کفار کے لشکر جمع ہو گئے تھے، اب فرماتے ہیں کہ یہ منافقین ایسے بزدل ہیں کہ ان لشکروں کے چلے جانے کے بعد بھی ان کے دل سے دہشت دور نہیں ہوئی۔

ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ (ابھی تک) یہ لشکر گئے نہیں اور (انتہائی بزدلی سے ان کی یہ حالت ہے کہ) اگر (بالفرض) یہ (گئے ہوئے) لشکر (پھر لوٹ کر) آجائیں تو (پھر تو) یہ لوگ (اپنے لئے) بھی پسند کریں کہ کاش ہم (کہیں) دیہاتوں میں باہر جارہیں کہ (وہاں ہی بیٹھے بیٹھے آنے جانے والوں سے) تمہاری خبریں پوچھتے رہیں (اور اپنی آنکھوں سے میدان کا خوف ناک منظر نہ دیکھیں) اور اگر (اتفاق سے سب یا کچھ دیہات میں نہ جاسکیں) بلکہ تم ہی میں رہیں تب بھی (اس وقت کی لے دے سن کر بھی کبھی غیرت نہ آئے کہ لڑائی میں پوری طرح شریک ہوں بلکہ محض نام کرنے اور غنیمت میں حق لینے کے خیال سے برائے نام) کچھ یوں ہی سا لڑیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی کفار کی فوجیں ناکامیاب واپس جاچکیں لیکن ان ڈرپوک منافقوں کو ان کے چلے جانے کا یقین نہیں آتا اور فرض کیجئے کفار کی فوجیں پھر لوٹ کر حملہ کردیں تو ان کی تمنا یہ ہوگی کہ اب وہ شہر میں بھی نہ ٹھہریں، جب تک لڑائی رہے کسی گاؤں میں رہنے لگیں اور وہیں دور بیٹھے آنے جانے والوں سے پوچھ لیا کریں کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ لڑائی کا نقشہ کیسا ہے؟!۔

فائدہ: ۲ یعنی باتوں میں تمہاری خیرخواہی جتائیں اور لڑائی میں زیادہ کام نہ دیں، محض مجبوری کو برائے نام شرکت کریں۔

لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا ۲۱

تمہارے لیے بھلی تھی سیکھنی رسول اللہ کی چال اس کے لیے جو کوئی امید رکھتا ہے اللہ کی اور پچھلے دن کی اور یاد کرتا ہے اللہ کو بہت سا

خلاصہ تفسیر: اب فرماتے ہیں کہ استقلال اور ثابت قدمی میں رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنا ایمان کی علامت اور اسلام کا تقاضا ہے جس سے منافقین کو عار دلانا مقصود ہے کہ وہ دعوی ایمان کے باوجود حضور ﷺ کی اتباع سے پیچھے ہٹ گئے اور سچے مؤمنوں کو بشارت ہے کہ وہ اس آیت کے مصداق ہیں، پس ارشاد فرماتے ہیں کہ:

تم لوگوں کے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے جو اللہ سے اور روز آخرت سے ڈرتا ہو اور کثرت سے ذکر الٰہی کرتا ہو (یعنی مومن کامل ہو، پس اللہ اور روز آخرت سے ڈرنے میں آخرت کا اعتقاد داخل ہے اور ذکر اللہ میں سب طاعتیں آگئیں، غرض ایسے شخص کے لئے) رسول اللہ (ﷺ) کا ایک عمدہ نمونہ موجود تھا (کہ جب آپ ہی لڑائی شریک رہے تو آپ سے زیادہ کون پیارا ہے کہ وہ اقتداء نہ کرے اور اپنی جان بچائے پھرے)۔

* * *

فائدہ: یعنی پیغمبر کو دیکھو، ان سختیوں میں کیا استقلال رکھتے ہیں، حالانکہ سب سے زیادہ اندیشہ اور فکر ان ہی پر ہے، مگر مجال ہے پائے استقامت ذرا جنبش کھاجائے، جو لوگ اللہ سے ملنے اور آخرت کا ثواب حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں اور کثرت سے خدا کو یاد کرتے ہیں ان کے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات منبع البرکات بہترین نمونہ ہے، چاہیے کہ ہر معاملہ، ہر ایک حرکت وسکون اور نشست و برخاست میں ان کے نقش قدم پر چلیں اور ہمت واستقلال وغیرہ میں ان کی چال سیکھیں۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫

اور جب دیکھیں مسلمانوں نے فوجیں، بولے یہ وہی ہے جو وعدہ دیا تھا ہم کو اللہ نے اور اس کے رسول نے اور سچ کہا اللہ نے اور رسول نے

وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ؀۲۲ۭ

اور ان کو اور بڑھ گیا یقین اور اطاعت کرنا

خلاصہ تفسیر: اور (اب منافقین کے مقابلہ میں مومنین مخلصین کا ذکر ہے) جب ایمان داروں نے ان لشکروں کو دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ وہی (موقع) ہے جس کی ہم کو اللہ اور اس کے رسول نے خبر دی تھی (چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت: **ام حسبتم ان تدخلوا الجنة (الی قوله) وزلزلوا حتی یقول الرسول** الخ میں اس کی طرف اشارہ قریب صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ پہلے مسلمانوں کو جس طرح مصیبتیں اور سخت پریشانیاں پہنچیں اور زلزلہ میں ڈالے گئے اسی طرح تم کو بھی ان کے لیے آمادہ رہنا چاہیے، کیونکہ سورہ بقرہ سورہ احزاب سے پہلے نازل ہوئی ہے) اور اللہ، رسول نے سچ فرمایا تھا اور اس (احزاب یعنی لشکروں کو دیکھنے) سے (جو کہ اس پیشین گوئی کی تصدیق کرنے والا ہے) ان کے ایمان اور اطاعت میں ترقی ہوگئی۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ (الی قوله) وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا: پیچھے کئی آیات سے یہاں تک میں اس پر دلالت ہوتی ہے کہ کامل ایمان والوں کے لیے طبیعت کے خلاف ناگوار امور بسا اوقات معارف میں اضافہ کا سبب ہو جاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی پکے مسلمانوں نے جب دیکھا کہ کفر کی فوجیں اکٹھی ہو کر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑی ہیں تو بجائے مذبذب یا پریشان ہونے کے ان کی اطاعت شعاری کا جذبہ اور ان کا یقین اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں پر اور زیادہ بڑھ گیا، وہ کہنے لگے کہ یہ تو وہ ہی منظر ہے جس کی خبر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے دے رکھی تھی اور جس کے متعلق ان کا وعدہ ہو چکا تھا جیسا کہ سورۃ بقرہ میں فرمایا: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (البقرۃ: ۲۱۴) اور سورۃ ص میں جو مکیہ ہے فرمایا تھا: جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ (ص: ۱۱)۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ

ایمان والوں میں کتنے مرد ہیں کہ سچ کر دکھلایا جس بات کا عہد کیا تھا اللہ سے، پھر کوئی تو ان میں پورا چکا اپنا ذمہ اور کوئی ہے

مَّنْ يَّنْتَظِرُ ڮ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ؀۲۳ۙ

ان میں راہ دیکھ رہا، اور بدلا نہیں ایک ذرہ

خلاصہ تفسیر: گزشتہ بیان کردہ وصف تو سب مومنین میں مشترک ہے اور بعض مومنین کے کچھ خاص اوصاف بھی ہیں جس کا بیان یہ ہے کہ:

ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے، پھر ان (عہد کرنے والوں) میں (دو قسمیں ہوگئیں) بعض تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے (نذر سے مراد وہ عہد ہے جس کا پورا کرنا مثل نذر کے واجب ہے، مطلب یہ کہ وہ عہد پورا کر چکے اور شہید ہو گئے، اخیر دم تک منہ نہیں موڑا، چنانچہ حضرت انس بن نضر احد میں شہید ہو گئے تھے، اسی طرح حضرت مصعب) اور بعض ان میں

(اس عہد کے پورا کرنے کے آخری اثر یعنی شہادت کے) مشتاق ہیں (ابھی شہید نہیں ہوئے) اور (اب تک) انہوں نے (اس میں) ذرا تغیر تبدل نہیں کیا (یعنی اپنے عزم پر بدستور قائم ہیں)۔

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ: یعنی انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعض مسلمانوں نے عہد کیا اور سچے نہیں اترے، بلکہ یہ تقسیم اس بنا پر ہے کہ بعض نے عہد ہی نہیں کیا تھا اور بلا عہد ہی ثابت قدم رہے، یہاں ان عہد کرنے والوں کے کے ذکر کی صراحت آیت بالا کے مقابلہ میں ہے جو منافقین کے حق میں ہے: ولقد کانوا عاهدوا الله من قبل الخ، اور ان عہد کرنے والوں سے مراد حضرت انس بن نضر اور ان کے ساتھی ہیں، یہ حضرات اتفاق سے غزوہ بدر میں شریک نہیں ہونے پائے تھے تو ان کو افسوس ہوا اور عہد کیا کہ اگر اب کے کوئی جہاد ہو تو اس میں ہماری جان توڑ کوشش دیکھ لی جائے گی، مطلب یہ تھا کہ منہ نہ موڑیں گے اگر چہ مارے جائیں۔

پس تمام لوگوں کی اول دو قسمیں ہوئیں: ① ایک منافق جن کا اوپر بیان ہوا ② دوسرے مومنین، پھر مومنین کی دو قسم ہیں: ① عہد کرنے والے ② دوسرے عہد نہ کرنے والے، اور ثابت قدم رہنے میں دونوں مشترک ہیں، لقولہ تعالیٰ: لما را المومنون الخ، پھر عہد کرنے والوں کی دو قسمیں ہیں: ① ایک شہید ② دوسرے شہادت کے منتظر، پس ان آیتوں میں کل چار قسمیں مذکور ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی منافقین نے جو عہد کیا تھا پچھلے رکوع میں گزر چکا: وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ (الاحزاب :۱۵) اسے توڑ کر بے حیائی کے ساتھ میدان جنگ سے ہٹ گئے، ان کے برعکس کتنے پکے مسلمان ہیں جنہوں نے اپنا عہد و پیمان سچا کر دکھلایا، بڑی بڑی سختیوں کے وقت دین کی حمایت اور پیغمبر کی رفاقت سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹایا، اللہ و رسول ﷺ کو جو زبان دے چکے تھے، پہاڑ کی طرح اس پر جمے رہے، ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو اپنا ذمہ پورا کر چکے، یعنی جہاد ہی میں جان دے دی، جیسے شہدائے بدر و احد جن میں سے حضرت انس بن النضر رضی اللہ عنہ کا قصہ بہت مشہور ہے اور بہت سے مسلمان وہ ہیں جو نہایت اشتیاق کے ساتھ موت فی سبیل اللہ کا انتظار کر رہے ہیں کہ کب کوئی معرکہ پیش آئے، جس میں ہمیں بھی شہادت کا مرتبہ نصیب ہو، بہر حال دونوں قسم کے مسلمانوں نے (جو اللہ کی راہ میں جان دے چکے، اور جو مشتاق شہادت ہیں) اپنے عہد و پیمان کی پوری حفاظت کی اور اپنی بات سے ذرہ بھر نہیں بدلے۔

فائدہ: حدیث میں نبی کریم ﷺ نے حضرت طلحہ کو فرمایا: "هٰذا ممن قضى نحبه" (یہ ان میں سے ہے جو اپنا ذمہ پورا کر چکے) گویا ان کو اسی زندگی میں شہید قرار دے دیا، یہ وہ بزرگ ہیں جو جنگ احد میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے اپنے ہاتھ پر تیر روکتے رہے حتیٰ کہ ہاتھ شل ہو کر رہ گیا۔ رضی الله عنه وارضاه۔

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ

تاکہ بدلے دے اللہ سچوں کو ان کے سچ کا اور عذاب کرے منافقوں پر اگر چاہے یا توبہ ڈالے ان کے دل پر

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴿۲۴﴾

بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: (اب اس غزوہ احزاب کی ایک حکمت بیان فرماتے ہیں کہ:) یہ واقعہ اس لئے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ سچے مسلمانوں کو ان کے سچ کا صلہ دے اور منافقوں کو چاہے سزا دے یا چاہے ان کو (نفاق سے) توبہ کی توفیق دے (کیونکہ ایسے مصائب اور حوادث میں مخلص اور بناوٹ کرنے والے میں امتیاز ہو جاتا ہے اور کبھی ملامت سے متاثر ہو کر بعض بناوٹ کرنے والے بھی مخلص ہو جاتے ہیں اور بعض اپنی حالت پر ہی

رہتے ہیں) بیشک اللہ غفور رحیم ہے (اس لئے توبہ کا قبول ہوجانا کچھ مستبعد نہیں، اس میں توبہ کی ترغیب ہے)۔

***

فائدہ: یعنی جو عہد کے پکے اور قول و قرار کے سچے رہے، ان کو سچ پر جمے رہنے کا بدلہ ملے اور بدعہد دغاباز منافقوں کو چاہے سزا دے اور چاہے توبہ کی توفیق دے کر معاف فرمادے، اس کی مہربانی سے کچھ بعید نہیں۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ

اور پھیر دیا اللہ نے منکروں کو اپنے غصہ میں بھرے ہوئے ہاتھ نہ لگی کچھ بھلائی ۱؎ اور اپنے اوپر لے لی اللہ نے مسلمانوں کی لڑائی

وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ؀

اور ہے اللہ زورآور زبردست ۲؎

خلاصہ تفسیر: یہاں تک مجمع اسلام کے مختلف لوگوں کے حالات بیان ہوئے، اب آگے مخالفین یعنی کفار کی حالت کا ذکر ہے کہ:
اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو (یعنی مشرکین کو) ان کے غصہ میں بھرا ہوا (مدینہ سے) ہٹا دیا کہ ان کی کچھ بھی مراد پوری نہ ہوئی (اور اسی کا غصہ ان میں بھرا ہوا تھا) اور جنگ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے آپ ہی کافی ہوگیا (یعنی کفار کو باقاعدہ لڑائی کی نوبت ہی نہ آئی کہ پہلے ہی دفع ہوگئے اگرچہ متفرق طور پر خفیف سی لڑائی ہوئی سو اس کی نفی مراد نہیں) اور (اس طرح کافروں کو دفع کردینا کچھ عجیب نہ سمجھو، کیونکہ) اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا زبردست ہے (اس کو کچھ دشوار نہیں، یہ تو مشرکین کا حال ہوا)۔

***

فائدہ: ۱؎ یعنی کفار کا لشکر ذلت و ناکامی سے پیچ و تاب کھاتا اور غصہ سے دانت پیستا ہوا میدان چھوڑ کر واپس ہوا، نہ فتح ملی نہ کچھ سامان ہاتھ آیا، ہاں! عمرو بن عبدود جیسا ان کا نامور سوار جسے لوگ ایک ہزار سواروں کے برابر گنتے تھے اس لڑائی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ سے کھیت رہا، مشرکین نے درخواست کی کہ دس ہزار لے کر اس کی لاش ہمیں دے دی جائے، آپ نے فرمایا وہ تم لے جاؤ، ہم مردوں کا ثمن کھانے والے نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی مسلمانوں کو عام لڑائی لڑنے کی نوبت نہ آنے دی، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ہوا کا طوفان اور فرشتوں کا لشکر بھیج کر وہ اثر پیدا کردیا کہ کفار از خود سراسیمہ اور پریشان حال ہو کر بھاگ گئے، اللہ کی زبردست قوت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ

اور اتار دیا ان کو جو ان کے پشت پناہ ہوئے تھے اہل کتاب سے ان کے قلعوں سے اور ڈال دی ان کے دلوں میں دھاک

فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ؀

کتنوں کو تم جان سے مارنے لگے اور کتنوں کو قید کرلیا

خلاصہ تفسیر: اور (مخالفین میں دوسرا گروہ یہود بنی قریظہ کا تھا آگے ان کا ذکر ہے) جن اہل کتاب نے ان (مشرکین) کی مدد کی تھی ان کو (اللہ تعالیٰ نے) ان کے قلعوں سے (جن میں وہ محصور تھے) نیچے اتار دیا اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھلا دیا (جس سے وہ اتر آئے اور پھر) بعض کو تم قتل کرنے لگے اور بعض کو قید کرلیا۔

***

فائدہ: یہ یہود ''بنی قریظہ'' ہیں، مدینہ کے شرقی جانب ان کا مضبوط قلعہ تھا اور پہلے سے مسلمانوں کے ساتھ صلح کا معاہدہ کئے ہوئے تھے، جنگ احزاب کے موقع پر حیی ابن اخطب کے اغواء سے تمام معاہدات بالائے طاق رکھ کر مشرکین کی مدد پر کھڑے ہو گئے، ان میں سے بعض نے مسلمان عورتوں پر بزدلانہ حملہ کرنا چاہا جس کا جواب حضرت صفیہؓ نے بڑی بہادری سے دیا، جب کفار قریش وغیرہ عاجز ہو کر چلے گئے تو ''بنو قریظہ'' اپنے مضبوط قلعوں میں جا گھسے، نبی کریم ﷺ جنگ احزاب سے فارغ ہو کر غسل وغیرہ میں مشغول تھے کہ حضرت جبرائیل تشریف لائے، چہرہ پر غبار کا اثر تھا فرمایا: ''یا رسول اللہ! آپ نے ہتھیار اتار دیے حالانکہ فرشتے ہنوز ہتھیار بند ہیں، اللہ کا حکم ہے کہ بنو قریظہ پر حملہ کیا جائے۔'' فوراً منادی ہو گئی کہ بنو قریظہ کے بدعہد یہودیوں پر چڑھائی ہے، نہایت سرعت کے ساتھ اسلامی فوج نے ان کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا، چوبیس پچیس دن محاصرہ جاری رہا، آخر محصورین تاب نہ لا سکے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیام بھیجنے شروع کیے، اخیر میں ان کی طرف سے بات اس پر ٹھہری کہ ہم قلعوں سے باہر آتے ہیں اور ''اوس'' کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ کو حکم ٹھہراتے ہیں (کیونکہ وہ ان کے حلیف تھے) جو فیصلہ ہمارے حق میں حضرت سعدؓ کر دیں گے ہم کو منظور ہوگا، آنحضرت ﷺ نے بھی قبول فرمالیا، قصہ مختصر سعد تشریف لائے اور بحیثیت ایک مسلم حکم کے فیصلہ کیا کہ بنی قریظہ کے سب جوان قتل کر دیے جائیں اور عورتیں لڑکے سب قید غلامی میں لائے جائیں اور ان کے اموال و جائیداد کے مالک مہاجرین ہوں، خدا اور رسول ﷺ کی مرضی اور ان کی بدعہدی کی سزا یہی تھی اور یہ فیصلہ ٹھیک ان کی مسلمہ آسمانی کتاب ''تورات'' کے موافق تھا، چنانچہ تورات کتاب استثناء اصحاح ۲۰ آیت ۱۰ میں ہے:

> ''جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کر لیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے، لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے، باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مال غنیمت ہوں گے''۔

اس فیصلہ کے مطابق کئی سو یہودی جوان قتل کئے گئے اور کئی سو عورتیں لڑکے قید ہوئے اور انکے املاک و اموال پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔

ع وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾

اور تم کو دلائی ان کی زمین اور ان کے گھر اور ان کے مال اور ایک زمین کہ جس پر نہیں پھیرے تم نے اپنے قدم، اور ہے اللہ سب کچھ کر سکتا

خلاصہ تفسیر: اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا تم کو مالک بنا دیا، اور ایسی زمین کا بھی (تم کو اپنے علم ازلی میں مالک بنا رکھا ہے) جس پر تم نے (ابھی) قدم (تک) نہیں رکھا (یعنی جہاں اب تک تم نہیں پہنچے، اس میں بشارت ہے آئندہ ہونے والی فتوحات کی عموماً، یا فتح خیبر کی خصوصاً جو اس واقعہ سے کچھ ہی بعد ہوا) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے (اس لئے یہ امور کچھ بعید نہیں ہیں)۔

* * *

فائدہ: یہ زمین جو مدینہ کے قریب ہاتھ لگی حضرت نے مہاجرین پر تقسیم کر دی، ان کے گزران کا ٹھکانا ہو گیا اور انصار پر سے ان کا خرچ ہلکا ہوا، اور دوسری زمین سے مراد خیبر کی زمین ہے جو اس کے دو برس بعد ہاتھ لگی، اس سے حضرت کے سب اصحاب آسودہ ہو گئے، بعض کہتے ہیں کہ قیامت تک جو زمینیں فتح کی جائیں سب اس میں شامل ہیں، واللہ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ

اے نبی! کہہ دے اپنی عورتوں کو اگر تم چاہتی ہو دنیا کی زندگانی اور یہاں کی رونق تو آؤ کچھ فائدہ پہنچا دوں تم کو

وَاُسَرِّحۡكُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَالدَّارَ الۡاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ

اور رخصت کردوں بھلی طرح سے رخصت کرنا ، اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور پچھلے گھر کو تو اللہ نے

اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡكُنَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۲۹﴾

رکھ چھوڑا ہے ان کے لیے جو تم میں نیکی پر ہیں بڑا ثواب لہ

خلاصہ تفسیر: اس سورت کا مقصود پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایذا سے منع کرنا ہے، اب آگے اس ایذا کا بیان ہے جو ازواج مطہرات کے کچھ زیادہ دنیوی سامان تقاضے کے ساتھ مانگنے سے آپ کے قلب کو پہنچی تھی جس کو ازواج مطہرات غلطی سے زیادہ نہ سمجھی تھیں، حتیٰ کہ آپ ناخوش ہو کر ایک مہینہ کے لیے سب سے الگ ہو گئے تھے، ایذا کی یہ قسم دوسری اقسام سے بہت زیادہ خفیف ہے، کیونکہ اس میں ان کا مقصد ایذا کا نہ تھا، بلکہ دلی محبت اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی محض غلطی کی بنا پر ان سے یہ فعل صادر ہوا، اور بلا قصد و اختیار رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچی، اور غالباً اس مانگنے کی وجہ یہ ہوئی کہ فتح خیبر وغیرہ سے حضور ﷺ کو کسی قدر مالی وسعت ہو گئی تھی تو اپنے خیال میں وہ اس کو تکلیف اور ایذا کا سبب نہیں سمجھیں اور یہ قصہ فتح خیبر کے بعد ہوا ہے، اگلی آیتیں حضرات امہات المؤمنین کی فہمائش کے لیے نازل ہوئیں اور یہ قصہ احادیث میں خوب مفصل آیا ہے۔

اے نبی! (ﷺ) آپ اپنی بیویوں سے فرما دیجئے (تم سے دوٹوک بات کہی جاتی ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے قصہ ایک طرف ہو وہ بات یہ ہے کہ) تم اگر دنیوی زندگی (کی عیش) اور اس کی بہار چاہتی ہو تو آؤ (یعنی لینے کے لئے تیار ہو جاؤ) میں تم کو کچھ (مال و) متاع (دنیوی) دے دوں (یا تو مراد اس سے وہ جوڑا ہے جو طلاق کے بعد مطلقہ مدخولہ کو دینا مستحب ہے، یا مراد عدت کا نان ونفقہ ہے، یا دونوں مراد ہے) اور (متاع دے کر) تم کو خوبی کے ساتھ رخصت کروں (یعنی سنت کے موافق طلاق دے دوں تاکہ جہاں چاہو جا کر دنیا حاصل کرو)۔

اور اگر تم اللہ کو چاہتی ہو اور (مطلب اللہ کو چاہنے کا اس جگہ یہ ہے کہ) اس کے رسول کو (چاہتی ہو، یعنی فقر و افلاس کی موجودہ حالت میں تھوڑی سی روزی پر قناعت کر کے رسول کے نکاح میں رہنا چاہتی ہو) اور عالم آخرت (کے بلند درجات) کو (چاہتی ہو جو کہ رسول کی زوجیت کی وجہ سے تم کو ملیں گے) تو (یہ تمہاری نیک کرداری ہے اور) تم میں نیک کرداروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے (آخرت میں) اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے (یہاں تک تو تخییر کا مضمون ہے جس میں حضور ﷺ کی طرف سے ازواج کو اختیار دیا گیا کہ موجودہ حالت پر قناعت کر کے آپ کی زوجیت میں رہنا پسند کریں، یا پھر آپ سے طلاق حاصل کرلیں)۔

اِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَزِيۡنَتَهَا: اس میں اس بات کی دلالت ہے کہ دنیا اور اس کی زیب وزینت سے محبت اللہ و رسول سے بعد اور دوری پیدا کرتی ہے۔

فَتَعَالَيۡنَ اُمَتِّعۡكُنَّ: اس کے خلاصہ تفسیر میں جو جوڑا لکھا ہے اس کے ضروری مسائل سورہ بقرہ کی آیت **وللمطلقت متاع بالمعروف** کے ذیل میں گذر چکے ہیں۔

فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡكُنَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا: یعنی جو تم میں سے حضور کو اختیار کرے گی اس کے لیے خاص ثواب کا وعدہ ہے جو دوسری نیک بیویوں کے ثواب سے بڑھا ہوا ہے اور جس سے وہ عورت محروم رہے گی جو حضور کی زوجیت کو اختیار نہ کرے، بلکہ دنیوی سامان کو اختیار کرے، اگرچہ ایمان اور اعمال صالحہ کا ثواب اس صورت میں بھی حاصل ہوگا جیسا کہ دوسری آیات کے عام الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡكُنَّ: اس میں جو کلمہ مِنۡ ہے اگر یہ تبیین و وضاحت کے لیے ہو تب تو کوئی اشکال ہی نہیں، اور اگر مِنۡ تبعیض کے لیے ہو تو بعض ازواج کے غیر محسنہ ہونے کا شبہ واقع ہوتا ہے تو اس کی دو توجیہ ممکن ہیں: ① ایک یہ کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک عورت عامریہ حمیریہ نے اس

آیت کے بعد آپ ﷺ کی زوجیت میں رہنا نہیں چاہا، چنانچہ اس مِنۡ تبعیض سے اسی کا مستثنیٰ کرنا مقصود ہے، اور اگر یہ روایت ثابت نہ ہوتو ② دوسری توجیہ یہ ہے کہ اگرچہ سب ازواج مطہرات محسنات مخلصات تھیں مگر اس آیت سے قبل اس کا ظہور نہ تھا، ظاہر حال سے ہر ایک میں احتمال تھا، اس صورت میں یہ مِنۡ تبعیض بطور معنی تعلیق کے ہے، یعنی "من أحسن منكن "یعنی یہ کلام تعلیقی ہے، اور تعلیقی کلام وقوع اور عدم وقوع پر دلالت نہیں کرتا۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اپنی ازواج کو پڑھ کر سنادی، آپ کی جو نو ازواج مشہور ہیں: ① حضرت عائشہ ② حفصہ ③ ام حبیبہ ④ ام سلمہ ⑤ سودہ (یہ پانچوں تو قریش میں سے ہیں) ⑥ صفیہ خیبریہ ⑦ میمونہ ہلالیہ ⑧ زینب اسدیہ ⑨ جویریہ مصطلقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن، ان سب نے آپ کی زوجیت میں رہنا قبول کیا اور دنیا کی طرف التفات نہ کیا۔

* * *

فائدہ: لہ حضرت کی ازواج نے دیکھا کہ لوگ آسودہ ہوگئے، چاہا کہ ہم بھی آسودہ ہوں، ان میں سے بعض نے آنحضرت ﷺ سے گفتگو کی کہ ہم کو مزید نفقہ اور سامان دیا جائے، جس سے عیش و ترفہ کی زندگی بسر کرسکیں، حضرت کو یہ باتیں شاق گزریں، قسم کھالی کہ ایک مہینہ گھر میں نہ جائیں گے، مسجد کے قریب ایک بالا خانہ میں علیحدہ فروکش ہوگئے، صحابہ مضطرب تھے، ابوبکرؓ وعمرؓ اس فکر میں ہوئے کہ کسی طرح یہ گتھی سلجھ جائے، انھیں زیادہ فکر اپنی اپنی صاحبزادیوں (عائشہ اور حفصہ) کی تھی کہ پیغمبر کو ملول کر کے اپنی عاقبت نہ خراب کر بیٹھیں، دونوں نے دونوں کو دھمکایا اور سمجھایا، پھر حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر کچھ انس اور بے تکلفی کی باتیں کیں، آپ منشرح ہوئے ایک ماہ بعد یہ آیت "تخییر" اتری۔

یعنی اپنی ازواج سے صاف صاف کہہ دو کہ دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرلیں، اگر دنیا کی عیش و بہار اور امیرانہ ٹھاٹھ چاہتی ہیں تو کہہ دو کہ میرے ساتھ تمہارا نباہ نہیں ہوسکتا، آؤ کہ میں کچھ دے دلا کر (یعنی کپڑوں کا جوڑا جو مطلقہ کو دیا جاتا تھا) تم کو خوبصورتی کے ساتھ رخصت کردوں (یعنی شرعی طریقہ سے طلاق دے دوں) اور اگر اللہ رسول ﷺ کی خوشنودی اور آخرت کے اعلیٰ مراتب کی طلب ہے تو پیغمبر کے پاس رہنے میں اس کی کمی نہیں، جو آپ کی خدمت میں صلاحیت سے رہے گی، اللہ کے یہاں اس کے لئے بہت بڑا اجر تیار ہے، اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ جنت کے سب سے اعلیٰ مقام میں پیغمبر (علیہ السلام) کے ساتھ رہیں۔

نزول آیت کے بعد آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لائے اول عائشہؓ کو حکم سنایا، انہوں نے اللہ و رسول ﷺ کی مرضی اختیار کی، پھر سب ازواج نے ایسا ہی کیا، دنیا کے عیش و عشرت کا تصور دلوں سے نکال ڈالا، حضرت ﷺ کی ازواج سب نیک ہی رہیں: الطیبات للطیبین، مگر حق تعالیٰ قرآن میں صاف خوشخبری کسی کو نہیں دیتا تاکہ نڈر نہ ہوجائے، خاتمہ کا ڈر لگا رہے، یہی بہتر ہے۔

ربط: آگے ان عورتوں کو خطاب ہے جو نبی کی معیت اختیار کرلیں کہ انکا درجہ اس نسبت کی وجہ سے بہت بلند ہے چاہیے کہ ان کی اخلاقی اور روحانی زندگی اس معیار پر ہو جو اس مقام رفیع کے مناسب ہے، کیونکہ علاوہ ان کی ذاتی بزرگی کے وہ امہات المومنین ہیں، مائیں اپنی اولاد کی بڑی حد تک ذمہ دار ہوتی ہیں، لازم ہے کہ ان کے اعمال واخلاق امت کے لئے اسوہ حسنہ بنیں۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنۡ يَّاۡتِ مِنۡكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفۡ لَهَا الۡعَذَابُ ضِعۡفَيۡنِ ؕ

اے نبی کی عورتوں! جو کوئی کر لائے تم میں کام بےحیائی کا صریح دونا ہو اس کو عذاب دوہرا

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ۝٣٠

اور ہے یہ اللہ پر آسان

خلاصہ تفسیر: پیچھے وہ مضمون تھا جس کا خطاب حضور ﷺ کی طرف سے ازواج مطہرات کو ہوا، آگے خود حق تعالیٰ ان کو خطاب کر کے وہ احکام بیان فرماتے ہیں جن کا اہتمام کرنا حضور کے نکاح میں رہنے کے بعد ان پر ضروری ہوگا، ارشاد ہے کہ:

اے نبی کی بیویوں! جو تم میں کھلی ہوئی بے ہودگی کرے گی (مراد اس سے وہ معاملہ ہے جس سے رسول اللہ ﷺ تنگ و پریشان ہوں تو) اس کو (اس پر آخرت میں) دوہری سزا دی جائے گی (یعنی دوسرے شخص کو اس عمل پر جتنی سزا ملتی اس سے دوہری سزا ہوگی) اور یہ بات اللہ کو (بالکل) آسان ہے (یہ نہیں کہ جس طرح دنیوی حکام کبھی کسی کی عظمت کی وجہ سے سزا بڑھانے سے رک جاتے ہیں، سو خدا پر کسی کی عظمت کا اثر نہیں ہوسکتا)۔

مَنۡ يَّاۡتِ مِنۡكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ: ''بے ہودگی'' سے مراد وہ معاملہ ہے جس سے رسول اللہ ﷺ تنگ اور پریشان ہوں، کیونکہ بے ہودگی کے جو معنی عام طور پر سمجھے جاتے ہیں اس کا احتمال حضور ﷺ کی ازواج مطہرات میں نہیں ہوسکتا، جیسا کہ سورہ نور کی آیت: **الطیبت للطیبین** میں بھی تفصیل سے گذر چکا ہے، لفظ فاحشة عربی زبان میں بدکاری اور زنا وغیرہ کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور مطلق معصیت اور گناہ کے لئے بھی، یہ لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے اس آیت میں فاحشة کے لفظ سے بدکاری اور زنا مراد نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب پیغمبروں کی ازواج کو اس سخت عیب سے بری فرمایا ہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی ازواج میں کسی سے بھی ایسا فعل صادر نہیں ہوا، حضرت لوط اور حضرت نوح علیہما السلام کی بیویاں ان کے دین سے منحرف ہوئیں اور سرکشی اختیار کی جس کی سزا اُن کو ملی، لیکن بدکاری کا الزام ان میں بھی کسی پر نہیں تھا، ازواج مطہرات میں سے کسی بے حیائی و بدکاری کے صدور کا تو احتمال ہی نہ تھا اس لئے اس آیت میں فاحشة سے مراد عام گناہ، یا رسول اللہ ﷺ کی ایذاء و تکلیف ہے، اور اس جگہ فاحشة کے ساتھ جو لفظ مبینة آیا ہے یہ اس پر شاہد ہے، کیونکہ بے حیائی اور بدکاری کہیں بھی مبینہ نہیں ہوتی، وہ تو پردوں میں اخفاء سے کی جاتی ہے، ''فاحشہ مبینہ'' سے مراد عام گناہ ہیں، یا رسول اللہ ﷺ کی ایذاء تو آئمہ تفسیر میں سے مقاتل بن سلیمان نے اس آیت میں فاحشہ کا مفہوم رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی یا آپ سے کوئی ایسا مطالبہ قرار دیا ہے جس کا پورا کرنا آپ کے لئے شاق ہو، دوسرا یہ کہ اس کے مقابلہ میں اگلی آیت میں: **ومن يقنت منكن** فرمایا، اور قنوت کا مطلب اطاعت ہے، اس معلوم ہوا کہ یہاں فاحشہ مبینہ سے مراد عدم قنوت یعنی عدم اطاعت ہے۔

ازواج مطہرات کو یہ خطاب بطور شرط ہے جس کے لئے وقوع ضروری نہیں اور شرط کا مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض والتقدیر تم سے کوئی معصیت سرزد ہو جائے تو جو سزا اوروں کو ملتی تم کو اس سے دوگنی سزا ملے گی جس سے مقصود محض تخویف اور تنبیہ ہے، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کے متعلق آیا ہے: **لئن اشركت ليحبطن عملك** یعنی اگر بالفرض والتقدیر آپ ﷺ سے شرک سرزد ہو جائے تو آپ ﷺ کے اعمال حبط کر لئے جائیں گے اگر چہ پیغمبر خدا سے شرک کا سرزد ہونا محال ہے، مقصود دوسروں کو سنانا ہے تا کہ شرک کی قباحت اور شناعت ان پر ظاہر ہو جائے۔

يُّضٰعَفۡ لَهَا الۡعَذَابُ ضِعۡفَيۡنِ: اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قرآن کی ایک اور آیت: **من جاء بالسيئة فلا يجزى الا مثلها** سے اس مضمون کو تعارض ہے، کیونکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کی سزا اُس کے برابر ہی ہوگی اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کو حضور ﷺ کی نافرمانی پر دوگنی سزا ہوگی، جواب یہ ہے کہ اس خاص صورت میں دوگنی سزا گناہ سے زیادہ ہرگز نہیں، بلکہ بالکل اس کے برابر ہے، کیونکہ وہ گناہ ہی ایسا ہے کہ دوسروں کے گناہ سے بڑھا ہوا ہے تو سزا بھی دوسروں کی سزا سے زیادہ ہونی چاہیے۔

اس میں دلالت ہے کہ جس کی فضیلت زیادہ اس کا عصیان اور طاعت بھی زیادہ ہے، یعنی علماء اور بڑے بڑے درجہ کے لوگوں پر گرفت عام لوگوں کی گرفت سے زیادہ سخت ہوتی ہے، اسی طرح ان کا اجر وثواب بھی عام لوگوں کے اجر وثواب سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، اہل اللہ میں جو اصل مشہور ہے کہ: ''نزدیکاں رابیش بود حیرانی'' تو آیت سے اس اصل کی بھی تائید ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: بڑے کی غلطی بھی بڑی ہوتی ہے، اگر بالفرض تم میں کسی سے کوئی بداخلاقی کا کام ہو جائے تو جو سزا اوروں کو اس پر ملتی ہے اس سے دگنی سزا ملے گی۔

''اور اللہ پر آسان ہے'': یعنی تمہاری وجاہت اور نسبت زوجیت سزا دینے سے اللہ کو روک نہیں سکتی۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ

اور جو کوئی تم میں اطاعت کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور عمل کرے اچھے دیویں ہم اس کو اس کا ثواب دوبار

وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

اور رکھی ہے ہم نے اس کے واسطے روزی عزت کی

خلاصہ تفسیر: اور جو کوئی تم میں اللہ کی اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گی (یعنی جن امور کو اللہ تعالیٰ نے واجب فرمایا ہے ان کو ادا کرے گی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہونے کے جو حقوق وغیرہ واجب ہیں وہ سب ادا کرے گی، کیونکہ رسول ہونے کی حیثیت سے جو حقوق آپ کے ہیں ان کا ادا کرنا خدا ہی کی اطاعت میں داخل ہے) اور (واجبات کے علاوہ میں سے جو) نیک کام (ہیں ان کو) کرے گی تو ہم اس کو اس کا ثواب (بھی) دوہرا دیں گے اور ہم نے اس کے لئے (وعدہ شدہ دوہرے اجر کے علاوہ) ایک (خاص) عمدہ روزی (جو جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے لئے مخصوص ہے اور اس وجہ سے ثواب کے علاوہ ہے) تیار کر رکھی ہے۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: یہ کلام بھی بطور شرط اور تعلیق کے ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ معاذ اللہ ازواج مطہرات متقی نہ تھیں، معلق کلام وقوع اور عدم وقوع پر دلالت نہیں کرتا، اس شرط سے فقط یہ بتلانا مقصود ہے کہ رسول خدا سے فقط زوجیت کا تعلق اور محض ظاہری نسبت واتصال فضیلت اور شرف کے لئے کافی نہیں جب تک کہ ورع اور تقویٰ اس کے ساتھ نہ ہو اور واقعات اور حالات سے اور کتاب وسنت کی شہادات سے یہ امر قطعی طور پر ثابت ہے کہ الحمد للہ ازواج مطہرات از اول تا آخر تمام زندگی تقویٰ اور پرہیزگاری پر قائم رہیں، حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں بھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اور اسی وجہ سے یہ حکم نازل ہوا: **ولا ان تنکحوا ازواجه من بعده ابدا**، ازواج مطہرات دنیا اور آخرت دونوں ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہیں۔

نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ: ازواج مطہرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر دوہرا ثواب اور نافرمانی پر دوگنی سزا ہونے کی وجہ نبی کی زوجیت کا شرف ہے جیسا کہ یٰنساء النبی میں اس طرف اشارہ ہے، کیونکہ خاص لوگوں کی نافرمانی بھی اوروں کی نافرمانی سے سخت ہوتی ہے، اسی طرح ان کی اطاعت بھی دوسروں کی اطاعت سے زیادہ مقبول ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ ازواج مطہرات کی خدمت واطاعت بہ نسبت دوسروں کی اطاعت کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زیادہ راحت پہنچانے والی تھی، اسی طرح ان کی نافرمانی بھی زیادہ ایذا دینے والی ہوگی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت رسانی مطلقا موجب ثواب ہے تو زیادہ راحت رسانی اور زیادہ ثواب کا سبب ہے، اور آپ کو ایذا رسانی مطلقا گناہ کا سبب ہے تو زیادہ ایذا رسانی زیادہ گناہ کا سبب ہے۔

ازواج مطہرات کی یہ خصوصیت کہ ان کے عمل کو دوہرا ثواب ملے عام امت کے اعتبار سے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امت میں کسی فرد یا جماعت کو کسی خصوصیت سے ایسا انعام نہ بخشا جائے کہ اس کو دوہرا ثواب ملے، چنانچہ اہل کتاب میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے ان کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہے: **اولئك یوتون اجرهم مرتین**، اور قیصر روم کے نام جو نامہ مبارک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر فرمایا اس میں اس ارشاد قرآنی کی وجہ سے آپ نے قیصر روم کو یہ لکھا کہ: "یوتك الله اجرك مرتین" اہل کتاب جو اسلام لے آئیں ان کے متعلق تو خود قرآن میں "اجر مرتین" کی تصریح ہے، اور ایک حدیث اور بھی ہے جس میں تین آدمیوں کے لئے اس طرح دوہرا اجر مذکور ہے، اس کی تفصیل سورۃ قصص میں آیت: **یوتون اجرهم مرتین** کے تحت میں لکھی گئی ہے۔

قرآن کریم نے دوہرے عذاب کے سلسلہ میں تو صرف فاحشہ مبینہ پر یہ عذاب مرتب کیا ہے، مگر دوہرے اجر وثواب کے لئے کئی شرطیں رکھی ہیں: **ومن یقنت منکن لله و رسوله وتعمل صالحاً**، اس میں قنوت یعنی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت شرط ہے، پھر عمل صالح شرط

ہے، سبب یہ ہے کہ اجر وثواب تو اسی وقت ملتا ہے جب اطاعت مکمل ہو اور سزا کے لئے ایک گناہ بھی کافی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی نیکی اور اطاعت پر جتنا اجر دوسروں کو ملے اس سے دوگنا ملے گا اور مزید برآں ایک خاص روزی عزت کی عطا ہوگی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی بڑے درجہ کا لازم ہے کہ نیکی کا ثواب دونا اور برائی کا عذاب دونا''، خود پیغمبر ﷺ کو فرمایا: اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ (الاسراء:۷۵)۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ

اے نبی کی عورتوں تم نہیں ہو جیسے ہر کوئی عورتیں ۱ اگر تم ڈر رکھو سو تم دب کر بات نہ کرو پھر لالچ کرے کوئی جس کے

فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۳۲

دل میں روگ ہے اور کہو بات معقول ۲

خلاصہ تفسیر: یہاں تک ازواج مطہرات سے آپ ﷺ کے حقوق کے متعلق خطاب تھا، اب آگے عام احکام کے متعلق زیادہ اہتمام کے لئے خطاب ہے کہ:

اے نبی کی بیویو! (محض اس بات پر مت پھول جانا کہ ہم نبی کی بیویاں ہیں اس لئے عام عورتوں سے ممتاز ہیں، اور ہمارے لیے یہی نسبت وشرف کافی ہے، سو یہ وسوسہ مت کرنا، یہ بات صحیح ہے کہ) تم معمولی عورتوں کی طرح نہیں ہو (بیشک ان سے ممتاز ہو مگر مطلقاً نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ایک شرط بھی ہے وہ یہ کہ) اگر تم تقویٰ اختیار کرو (تب تو واقعی اس نسبت کی وجہ سے تم کو دوسروں پر شرف وفضیلت حاصل ہے، حتیٰ کہ ثواب دوگنا ملے گا، اور اگر یہ شرط نہ پائی گئی تو اس نسبت کی وجہ سے تم کو گناہ بھی اوروں سے زیادہ ہوگا، جب یہ بات ہے کہ تقوی کے بغیر نری نسبت کچھ نہیں) تو (تم کو احکام شرعیہ کی پوری پابندی عموماً دوسروں سے زیادہ کرنی چاہیے، خصوصاً ان احکام کی جو آگے مذکور ہیں، اور وہ احکام یہ ہیں کہ:) تم (نامحرم مرد سے) بولنے میں (جب کہ ضرورت کے وقت بولنا پڑے) نزاکت مت کرو (اس کا مطلب یہ نہیں کہ قصداً نزاکت مت کرو، کیونکہ اس کا برا ہونا تو واضح اور بدیہی ہے، دوسرے مخاطب یعنی ازواج مطہرات میں اس کا احتمال بھی نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے عورتوں کے کلام کا فطری انداز ہوتا ہے کہ کلام میں نرمی اور طبعی نزاکت ہوتی ہے، اس انداز کو مت برتو) کہ (اس سے) ایسے شخص کو (طبعاً) خیال (فاسد پیدا) ہونے لگتا ہے، جس کے قلب میں خرابی (اور برائی) ہے (بلکہ ایسے موقع پر تکلف اور اہتمام سے اس فطری انداز کو بدل کر گفتگو کرو) اور قاعدہ (عفت) کے موافق بات کہو (یعنی ایسے انداز سے جس میں خشکی اور روکھا پن ہو کہ یہ انداز عصمت کا محافظ ہے، اور یہ بداخلاقی نہیں ہے، بداخلاقی وہ ہے جس سے کسی کے قلب کو ایذاء پہنچے اور فاسد طمع کے روکنے سے ایذاء لازم نہیں آتی)۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ: یہ اور اگلی آیات میں آنے والی سب ہدایات اگرچہ ازواج مطہرات کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ تمام ہی مسلمان عورتیں ان کی مامور ہیں، مگر یہاں ازواج مطہرات کو خصوصی خطاب کر کے اس پر متوجہ کیا ہے کہ یہ اعمال واحکام جو سب مسلمان عورتوں کے لئے لازم وواجب ہیں آپ کو ان کا اہتمام دوسروں سے زیادہ کرنا چاہئے اور آیت: لستن کاحد من النساء سے یہی خصوصیت مراد ہے، مزید تفصیل اگلی آیت کے ذیل میں آرہی ہے۔

اِنِ اتَّقَيْتُنَّ: اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ازواج مطہرات متقی نہ تھیں، بلکہ مقصود یہ بتلانا ہے کہ فضیلت کا مدار تقوی پر ہے، دوسرا مطلب محاورہ کے مطابق یہ بھی ہوسکتا ہے اتّقیتنّ کے معنی ''دمتن علی التقوی'' ہوں، یعنی جس طرح اب متقی ہو اسی طرح اگر متقی رہو تب دوسروں سے افضل رہوگی۔

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ: اس میں فتنہ کے اسباب سے بھی بچنے کا حکم ہے، یعنی جیسے فتنہ سے بچنا ضروری ہے، ایسے ہی فتنہ کے اسباب سے بھی بچنا ضروری ہے، اگر چہ سبب بعید ہی کیوں نہ ہو، خاص طور پر عورتوں سے کہ ان کا فتنہ بہت ہی سنگین اور سخت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تمہاری حیثیت اور مرتبہ عام عورتوں کی طرح نہیں، آخر اللہ تعالیٰ نے تم کو سید المرسلین کی زوجیت کے لیے انتخاب فرمایا اور امہات المومنین بنایا، لہذا اگر تقویٰ وطہارت کا بہترین نمونہ پیش کرو گی جیسا کہ تم سے متوقع ہے، اس کا وزن اللہ کے ہاں بہت زیادہ ہوگا۔ اور بالفرض کوئی بری حرکت سرزد ہو تو اسی نسبت سے وہ بھی بہت زیاد بھاری اور قبیح سمجھی جائے گی۔ غرض بھلائی کی جانب ہو یا برائی کی عام مومنات سے تمہاری پوزیشن ممتاز رہے گی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اگر تقویٰ اور خدا کا ڈر دل میں رکھتی ہو تو غیر مردوں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے (جس کی ضرورت خصوصا امہات المومنین کو پیش آتی رہتی ہے) نرم اور دلکش لہجہ میں کلام نہ کرو، بلاشبہ عورت کی آواز میں قدرت نے طبعی طور پر ایک نرمی اور نزاکت رکھی ہے، لیکن پاکباز عورتوں کی شان یہ ہونی چاہیے کہ حتی المقدور غیر مردوں سے بات کرتے میں بہ تکلف ایسا لب ولہجہ اختیار کریں جس میں قدرے خشونت اور روکھا پن ہو اور کسی بدباطن کے قلبی میلان کو اپنی طرف جذب نہ کرے، امہات المومنین کو اس بارے میں اپنے مقام بلند کے لحاظ سے اور بھی زیادہ احتیاط لازم ہے تا کہ کوئی بیمار اور روگی دل کا آدمی بالکل اپنی عاقبت تباہ نہ کر بیٹھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ”یہ ایک ادب سکھایا کہ کسی مرد سے بات کہو تو اس طرح کہو جیسے ماں کہے بیٹے کو اور بات بھی بھلی اور معقول ہو“۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ

اور قرار پکڑو اپنے گھروں میں اور دکھلاتی نہ پھرو جیسا کہ دکھانا دستور تھا پہلے جہالت کے وقت میں ۱؎ اور قائم رکھو نماز اور دیتی رہو زکوٰۃ

وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ

اور اطاعت میں رہو اللہ کی اور اس کے رسول کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے گفتگو کے متعلق حکم فرمایا، آگے پردہ کے متعلق ارشاد ہے، ان دونوں میں امر مشترک فقط عفت ہے۔

اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو (مراد اس سے یہ ہے کہ محض کپڑا اُوڑھ لپیٹ کر پردہ کر لینے پر کفایت مت کرو، بلکہ پردہ اس طریقہ سے کرو کہ بدن مع لباس نظر نہ آئے، جیسا کہ آج کل شرفاء میں پردہ کا طریقہ متعارف ہے کہ عورتیں گھروں ہی سے نہیں نکلتیں، البتہ ضرورت کے مواقع دوسری دلیل سے مستثنیٰ ہیں) اور (آگے اسی حکم کی تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) قدیم زمانہ جہالت کے دستور کے موافق مت پھرو (جس میں بے پردگی رائج تھی اگر چہ بلافحش ہی کیوں نہ ہو، یہاں تک عفت کے متعلق احکام تھے) اور (آگے دوسرے شرعی احکام کا ارشاد ہے کہ) تم نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ (اگر نصاب کی مالک ہو) دیا کرو (کہ یہ دونوں اسلام کے عظیم شعائر وارکان میں سے ہیں، اس لئے ان کو بطور خاص ذکر کیا) اور (بھی جتنے احکام ہیں اور تم کو معلوم ہیں سب میں) اللہ کا اور اس کے رسول ﷺ) کا کہنا مانو۔

گذشتہ اور اس آیت میں پانچ ہدایات یا احکام دیے: ① محارم یعنی غیر مردوں سے کلام میں نرمی ونزاکت سے اجتناب ② گھروں سے بلاضرورت نہ نکلنا ③ نماز کی پابندی ④ زکوٰۃ کی ادائیگی ⑤ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت، یہ کل پانچ ہدایات ہیں جو عورتوں کے لئے مہمات دین میں سے ہیں، اور یہ پانچوں ہدایات سب مسلمانوں کے لئے عام ہیں، الفاظ کے اعتبار سے مذکورہ پانچوں احکام کی مخاطب بظاہر ازواج مطہرات ہیں، یعنی ظاہری طور پر حکم خاص نظر آتا ہے مگر دلالت کے اعتبار سے تمام عورتوں سے مطلوب ہے، کیونکہ ان احکام سے عفت وپاکیزگی کی حفاظت مقصود ہے، اور یہ عفت وپاکیزگی کی حفاظت کا حکم سب عورتوں کے لیے عام ہے، جیسا کہ مقاتل نے لا تبرجن کی تفسیر میں کہا ہے: ”ثم عمت نساء المؤمنین فی

التبرج"، بلکہ غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر عورتوں کے لیے تو یہ احکام بدرجہ اولی ہیں، کیونکہ ان احکام کی علت فتنہ وفساد کے ذرائع کو روکنا ہے جیسا کہ: فیطمع الذی فی قلبہ مرض اس پر دلالت کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ دوسری عورتیں فتنہ وفساد سے روکے جانے کی زیادہ محتاج ہیں، نیز وقرن فی بیوتکن کی ضد عدم قرار یعنی گھر میں نہ رہنے اور بلا ضرورت گھر سے باہر نکلنے اور اپنی زینت اور حسن وجمال کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنے کو جاہلیت سے تشبیہ دی گئی ہے، یہ خود عدم قرار کی مذمت اور برائی کے لیے کافی ہے اور ظاہر ہے کہ عدم قرار جب ایسا مذموم اور برا ہے تو دوسری عورتوں کے لیے بھی ہرگز جائز نہیں ہوسکتا، نیز احادیث میں بھی اس قسم کے مضامین کثرت کے ساتھ وارد ہیں کہ:"المرأة عورة فإذا خرجت استشرفها الشيطان" یعنی عورت سراپا ستر ہے جس کا مستور رکھنا واجب ہے، جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے سر اٹھا کر دیکھتا ہے اور اس کی تاک میں لگ جاتا ہے، ان جیسی احادیث بھی ان احکام کے عام ہونے پر دلالت کرنے میں کافی وشافی ہیں، چنانچہ مذکورہ دلائل سے ان احکام کا عام ہونا ثابت ہوگیا۔

شبہ ہوتا ہے کہ جب یہ احکام عام ہیں تو پھر یہاں امہات المؤمنین کو ہی خاص خطاب کر کے کیوں ذکر فرمایا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں وعظ امہات مؤمنین کو ہے اس لیے وہی مخاطب ہیں مگر اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ حکم بھی صرف انہی کے ساتھ خاص ہو، بلکہ عام سب کے لیے عام ہے، اور اگر آیت میں: لستن کاحد من النساء سے ان احکام کے ازواج مطہرات کے ساتھ خاص ہونے کا شبہ ہو تو اس کے جو معنی خلاصہ تفسیر میں بیان کیے گئے ہیں اس سے اس شبہ کی اصلا گنجائش نہیں رہتی۔

وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ: اس میں عورتوں پر گھروں میں رہنے کو واجب کیا گیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کے لئے گھر سے باہر نکلنا مطلقاً ممنوع اور حرام ہو، مگر اول تو خود اسی آیت ولا تبرّجن سے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ مطلقاً خروج بضرورت ممنوع نہیں، بلکہ وہ خروج ممنوع ہے جس میں زینت کا اظہار ہو، دوسرے سورۃ احزاب کی آیت جو آگے آ رہی ہے اس میں خود: یدنین علیھن من جلابیبھن کا حکم یہ بتلا رہا ہے کہ کسی درجہ میں عورتوں کے لئے گھر سے نکلنے کی اجازت بھی ہے بشرطیکہ برقع وغیرہ کے پردہ کے ساتھ نکلیں۔

اس کے علاوہ خود رسول اللہ ﷺ نے مواضع ضرورت کا اس حکم سے مستثنیٰ ہونا ایک حدیث میں واضح فرما دیا، جس میں ازواج مطہرات کو خطاب کر کے فرمایا:"قد أذن لكن أن تخرجن لحاجتكن"، یعنی تمہارے لئے اس کی اجازت ہے کہ اپنی ضرورت کے لئے گھر سے نکلو، پھر رسول اللہ ﷺ کا عمل آیت حجاب نازل ہونے کے بعد اس پر شاہد ہے کہ ضرورت کے مواقع میں عورتوں کو گھروں سے نکلنے کی اجازت ہے جیسا کہ حج وعمرہ کے لئے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ازواج مطہرات کا جانا احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اسی طرح بہت سے غزوات میں ساتھ جانا ثابت ہے، اور بہت سی روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ ازواج مطہرات اپنے والدین وغیرہ سے ملاقات کے لئے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں اور عزیزوں کی بیمار پرسی اور تعزیت وغیرہ میں شرکت کرتی تھیں، خلاصہ یہ ہے کہ آیت: وقرن فی بیوتکن کے مفہوم سے باشارات قرآن اور بعمل نبی کریم ﷺ اور باجماع صحابہ مواقع ضرورت مستثنیٰ ہیں، جن میں عبادات حج وعمرہ بھی داخل ہیں اور ضروریات طبعیہ والدین اور اپنے محارم کی زیارت، عیادت وغیرہ بھی، اسی طرح اگر کسی کے نفقہ اور ضروریات زندگی کا کوئی اور سامان نہ ہو تو پردہ کے ساتھ محنت مزدوری کے لئے نکلنا بھی، البتہ مواقع ضرورت میں خروج کے لئے شرط یہ ہے کہ اظہار زینت کے ساتھ نہ نکلیں، بلکہ برقع یا جلباب (بڑی چادر) کے ساتھ نکلیں۔

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى: لفظ"تبرج" کے اصلی معنی ظہور کے ہیں اور اس جگہ اس سے مراد غیر مردوں پر اپنی زینت کا اظہار ہے، جیسا کہ دوسری آیت میں: غیر متبرّجت بزینة آیا ہے، اور"قدیم جاہلیت" سے مراد وہ جاہلیت ہے جو اسلام سے پہلے تھی، اور اس کے مقابلہ میں ایک مابعد کی جاہلیت ہے کہ احکام اسلام کی تبلیغ اور تعلیم کے بعد بھی ان پر عمل نہ کیا جائے، پس جو تبرج اسلام کے بعد ہوگا وہ جاہلیت اخری ہے، اس لئے تشبیہ میں بطور خاص جاہلیت اولی ہی کو ذکر کیا، کیونکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں تغائر ضروری ہے، مطلب یہ کہ جاہلیت اخریٰ جاری کر کے جاہلیت اولیٰ کا اقتداء نہ کرو جس کے مٹانے کو اسلام آیا ہے۔

وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ: ان آخری تین ہدایات میں تو کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا کہ یہ صرف ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہوں،

کیونکہ نماز، زکوٰۃ اور اللہ ورسول کی اطاعت سے کون سا مسلمان مرد وعورت مستثنیٰ ہوسکتا ہے؟!!، باقی پہلی دو ہدایتیں جو عورتوں کے پردہ سے متعلق ہیں ذرا غور کرنے سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ وہ بھی ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ سب مسلمان عورتوں کے لئے یہی حکم ہے، رہا یہ معاملہ کہ ان ہدایات کے ذکر سے پہلے قرآن نے یہ فرمایا ہے: لستن کاحد من النساء ان اتقیتن، یعنی ازواج مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں اگر وہ تقویٰ اختیار کریں، اس سے بظاہر تخصیص معلوم ہوتی ہے، تو اس کا واضح جواب یہ ہے کہ تخصیص احکام کی نہیں، بلکہ ان پر عمل کے اہتمام کی ہے، یعنی ازواج مطہرات عام عورتوں کی طرح نہیں، بلکہ ان کی شان سب سے اعلیٰ وارفع ہے، اس لئے جو احکام تمام مسلمان عورتوں پر فرض ہیں ان کا اہتمام ان کو سب سے زیادہ کرنا چاہئے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

جاننا چاہئے کہ ان آیات کا نزول اگرچہ ازواج مطہرات کے بارے میں ہوا مگر حکم عام ہے، ان آیات کا تمام سیاق وسباق ازواج مطہرات کی فضیلت کے بیان میں ہے اور یہ بتلانا مقصود ہے کہ ازواج مطہرات کی شان اور عورتوں جیسی نہیں وہ نبی کی ازواج ہیں اور امہات المومنین ہیں، وہ اگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں تو ان کو دوہرا اجر ہے، اور اگر معصیت کریں تو دوہرا عذاب ہے اور یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اطاعت خدا ورسول اور تقویٰ اور اعمال صالحہ کی بجا آوری صرف ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہے، اسی طرح سمجھو کہ: وقرن فی بیوتکن اور ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولى میں اگرچہ خطاب ازواج مطہرات کو ہے، لیکن قرار فی البیوت کا حکم اور تبرج جاہلیت کی ممانعت ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ عام مومنات کے لئے ہے اور بلاضرورت گھروں سے باہر نکلنا اور اپنی زینت اور حسن وجمال کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا اور کھلے منہ باہر پھرنا اور غیروں سے کلام کرنا، بلاشبہ ہر مسلمان عورت پر حرام ہے اس میں ازواج مطہرات کی کوئی خصوصیت نہیں کیونکہ ہر ادنیٰ عقل والا جانتا ہے کہ ایسا خروج جس میں زینت کا اظہار ہو اور غیر مردوں سے فقط کلام ہی نہ ہو بلکہ ہنسی اور دل لگی بھی ہو بلاشبہ موجب فتنہ ہے اور زنا کا مقدمہ ہے جس میں کسی عقل کے اندھے کو بھی شبہ نہیں، اس فتنہ کا انسداد بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ عورتیں اپنے گھروں ہی میں رہیں اور بلاضرورت گھر سے باہر نہ نکلیں اور اگر شدید ضرورت کی بناء پر باہر نکلیں تو بغیر زینت کے اپنے تمام بدن کو ڈھک کر نکلیں، عورت کے گھر سے باہر نکلنے کی یہ تمام قیود احادیث سے ثابت ہیں۔

جس طرح ان آیات میں اگرچہ خطاب ازواج مطہرات کو ہے مگر نماز کی پابندی، زکوۃ کی ادائیگی اور اطاعت رسول کا حکم ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عامہ مومنات ومسلمات پر یہ تینوں حکم فرض اور لازم ہیں، اسی طرح قرار فی البیوت اور ترک تبرج کا حکم بھی ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام مومنات ومسلمات اس حکم کی مکلف اور پابند ہیں چونکہ حق جل شانہ کا ارادہ یہ ہے نبی کے گھرانہ کو فواحش اور منکرات سے بالکلیہ پاک کردے، اس لئے ان آیات میں خاص طور پر ازواج مطہرات کو خطاب فرمایا کہ تمہاری شان عام مومنات جیسی نہیں اس لئے تم کو اطاعت خدا ورسول اور تقویٰ وطہارت میں سب سے آگے ہونا چاہئے تاکہ تمہارے لباس تقویٰ وطہارت پر اور تمہاری چادر عصمت ونزاہت پر کسی فاحشہ کا میل کچیل اور گرد وغبار بھی نہ لگنے پائے تم دنیا کی عورتوں کے لئے مثال اور نمونہ ہو لہٰذا تم سب کا کامل اور اکمل ہونا چاہئے، پھر دیکھو کہ اسی سورت کے اخیر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یایها النبی قل لازواجك وبناتك ونساء المؤمنین یدنین علیهن من جلابیبهن اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی بیویوں کو اور نبی ﷺ کی بیٹیوں کو اور تمام مسلمان عورتوں کو منہ ڈھکنے کا حکم دیا ہے، پس اسی طرح سمجھو کہ قرار فی البیوت فقط ازواج مطہرات ہی پر فرض نہیں، بلکہ تمام مومنات اور مسلمان پر فرض ہے اور تبرج جاہلیت تمام مسلمان عورتوں کے حق میں حرام ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان آیات میں جس قدر بھی احکام مذکور ہیں وہ ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ تمام عورتوں کے لئے عام ہیں، البتہ ازواج مطہرات کے حق میں ان کی خصوصیت کی وجہ سے سب سے زیادہ موکد اور مہتم بالشان ہیں جیسے عالم دین پر بہ نسبت جاہل کے احکام شریعت کی پابندی زیادہ لازم ہے، اسی طرح ان احکام کی پابندی ازواج مطہرات کے لئے تمام عورتوں سے زیادہ لازم اور موکد ہے، اس لئے کہ وہ اہل بیت نبی ہیں اور امہات المومنین ہیں، اس لئے ان کا فریضہ اور ذمہ داری تمام عورتوں سے بڑھ کر ہے، یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں کہ یہ احکام ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہیں، جب علت عام ہے تو لامحالہ حکم بھی عام ہوگا، کیا کوئی ادنیٰ عقل والا اس کے کہنے کی جرات کرسکتا ہے کہ آیت مذکور میں تبرج جاہلیت تک بے حیائی کی

روک تھام کے لئے جو تین حکم دیئے گئے ہیں وہ صرف ازواج مطہرات کے ساتھ مخصوص ہیں اور دیگر خواتین کے لیے ہر بے حیائی جائز ہے، نماز، زکوٰۃ، اطاعت خدا ورسول، تقویٰ اور اعمال صالحہ میں سے کوئی چیز ان پر فرض نہیں، اس لئے کہ ان آیات میں تمام خطابات صرف ازواج مطہرات کو ہیں۔

غرض یہ کہ جو احکامات ان آیات میں مذکور ہیں وہ کسی کے ساتھ مخصوص نہیں سب مسلمان عورتوں کے لئے ہیں، البتہ ازواج مطہرات کے لئے ان کے تقدس اور طہارت اور علو مرتبت کی وجہ سے ان احکام کی پابندی سب سے زیادہ ان پر ضروری ہے اور لازم ہے، پس ثابت ہوگیا کہ قرار فی البیوت تمام مسلمان عورتوں پر فرض اور لازم ہے، اور بلاضرورت منہ کھولے گھر سے باہر نکلنا، بلاشبہ موجب معصیت اور محل فتنہ وفساد ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "المراة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان" یعنی عورت سراپا ستر ہے جس کا مستور رکھنا واجب ہے، جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے سر اٹھا کر دیکھتا ہے اور اس کی تاک میں لگ جاتا ہے، پس اس تقریر سے یہ امر بخوبی ثابت ہوگیا کہ ہمارے ہاں جو پردہ رائج ہے وہ بلاشبہ پردہ شرعی ہے جو قرآن اور حدیث سے قطعی طور پر ثابت ہے، معاذ اللہ پردہ مروجہ کوئی قومی رسم نہیں جیسا کہ آزاد منشوں کا خیال ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں عورتیں بے پردہ پھرتی اور اپنے بدن اور لباس کی زیبائش کا اعلانیہ مظاہرہ کرتی تھیں، اس بداخلاقی اور بے حیائی کی روش کو مقدس اسلام کب برداشت کرسکتا ہے، اس نے عورتوں کو حکم دیا کہ گھروں میں ٹھہریں اور زمانہ جاہلیت کی طرح باہر نکل کر حسن وجمال کی نمائش کرتی نہ پھریں، امہات المومنین کا فرض اس معاملہ میں بھی اوروں سے زیادہ مؤکدہ ہوگا جیسا کہ **لستن کاحد من النسآء** کے تحت میں گزر چکا، باقی کسی شرعی یا طبعی ضرورت کی بناء پر بدون زیب وزینت کے مبتذل اور ناقابل اعتناء لباس میں مستتر ہوکر احیانا باہر نکلنا بشرطیکہ ماحول کے اعتبار سے فتنہ کا مظنہ نہ ہو، بلاشبہ اس کی اجازت نصوص سے نکلتی ہے اور خاص ازواج مطہرات کے حق میں بھی اس کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ متعدد واقعات سے اس طرح نکلنے کا ثبوت ملتا ہے، لیکن شارع کے ارشادات سے یہ بداہتہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پسند اسی کو کرتے ہیں کہ ایک مسلمان عورت بہرحال اپنے گھر کی زینت بنے اور باہر نکل کر شیطان کو تاک جھانک کا موقع نہ دے، اس کی تفصیل ہمارے رسالہ "حجاب شرعی" میں ہے۔

رہا "ستر" کا مضمون یعنی عورت کے لیے کن اعضاء کو کن مردوں کے سامنے کھلا رہنا جائز ہے، اس کا بیان سورہ نور میں گزر چکا۔

تنبیہ: جو احکام ان آیات میں بیان کیے گئے تمام عورتوں کے لیے ہیں، ازواج مطہرات کے حق میں چونکہ ان کا تاکد واہتمام زائد تھا، اس لیے لفظوں میں خصوصیت کے ساتھ مخاطب ان کو بنایا گیا۔

میرے نزدیک يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ تک ان احکام کی تمہید تھی، تمہید میں دو شقیں ذکر تھیں:

① ایک بے حیائی کی بات کا ارتکاب، اس کی روک تھام **فلا تخضعن بالقول** سے **تبرج الجاهلية الاولى** تک کی گئی۔

② دوسری اللہ ورسول کی اطاعت اور عمل صالح، آگے **واقمن الصلوٰة** سے **اجرا عظيما** تک اس کا سلسلہ چلا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ برائی کے مواقع سے بچنا اور نیکی کی طرف سبقت کرنا سب کے لیے ضروری ہے مگر ازواج مطہرات کے لیے سب عورتوں سے زیادہ ضروری ہے، ان کی ہر ایک بھلائی برائی وزن میں دوگنی قرار دی گئی۔ اس تقریر کے موافق **فاحشة مبينة** کی تفسیر بھی بے تکلف سمجھ میں آ گئی ہوگی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اوروں سے بڑھ کر ان چیزوں کا اہتمام رکھو، کیونکہ تم نبی سے اقرب اور امت کے لیے نمونہ ہو۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾

اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو! اور ستھرا کر دے تم کو ایک ستھرائی سے ۱؎

خلاصہ تفسیر: (اور ہم نے جو تم کو ان احکام کے اس التزام اور اہتمام کا مکلف کیا ہے تو تمہارا ہی نفع ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ کو (ان احکام کے بتانے سے تشریعا) یہ منظور ہے کہ اے (پیغمبر کے) گھر والو! تم سے (معصیت ونافرمانی کی) آلودگی کو دور رکھے، اور تم کو (ظاہری، باطنی،

عملی اور اخلاقی طور پر بالکل) پاک صاف رکھے (کیونکہ احکام کے جاننے سے اس آلودگی سے بچنا ممکن ہے جو مخالفت کے سبب ہو جاتی ہے اور وہ آلودگی صفائی میں بھی مانع اور رکاوٹ بن جاتی ہے)۔

اَهْلَ الْبَيْتِ: اس کو آیت تطہیر بھی کہا جاتا ہے، یہاں دو باتیں اہم ہیں: ① اہل بیت سے کون کون مراد ہے؟ ② کیا اہل بیت معصوم ہیں؟

اس میں جو لفظ اہل بیت آیا ہے اس میں ازواج مطہرات کے ساتھ ان کی اولاد و آباء بھی داخل ہیں، اس لئے بصیغہ مذکر فرمایا: عنکم، ویطھرکم، بعض آئمہ تفسیر نے "اہل بیت" سے مراد صرف ازواج مطہرات کو قرار دیا ہے، حضرت عکرمہ و مقاتل نے یہی فرمایا ہے اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے بھی یہی روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے آیت میں "اہل بیت" سے مراد ازواج مطہرات کو قرار دیا اور استدلال میں اگلی آیت پیش فرمائی: واذکرن مایتلی فی بیوتکن، اور سابقہ آیات میں ینساء النبی کے الفاظ سے خطاب بھی اس کا قرینہ ہے، حضرت عکرمہ تو بازار میں منادی کرتے تھے، کہ آیت میں اہل بیت سے مراد ازواج مطہرات ہیں، کیونکہ یہ آیت انہی کی شان میں نازل ہوئی ہے اور فرماتے تھے کہ میں اس پر مباہلہ کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن حدیث کی متعدد روایات جن کو ابن کثیر نے اس جگہ نقل کیا ہے اس پر شاید ہیں کہ اہل بیت میں حضرت فاطمہ اور علی اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں، جیسے صحیح مسلم کی حدیث حضرت عائشہ کی روایت سے ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر تشریف لے گئے اور اس وقت آپ ایک سیاہ رومی چادر اوڑھے ہوئے تھے، حسن بن علی آ گئے تو ان کو اس چادر میں لے لیا، پھر حسین آ گئے، ان کو بھی اسی چادر کے اندر داخل فرما لیا، اس کے بعد حضرت فاطمہ پھر حضرت علی مرتضیٰ آ گئے، ان کو بھی چادر میں داخل فرما لیا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیراً، اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آیت پڑھنے کے بعد فرمایا: "اللھم ھولاء اھل بیتی"، ابن کثیرؒ نے اس مضمون کی متعدد احادیث معتبرہ نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ درحقیقت ان دونوں اقوال میں جو آئمہ تفسیر سے منقول ہیں کوئی تضاد نہیں، جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت ازواج مطہرات کی شان میں نازل ہوئی اور اہل بیت سے وہی مراد ہیں یہ اس کے منافی نہیں کہ دوسرے حضرات بھی اہل بیت میں شامل ہوں، اس لئے صحیح یہی ہے کہ لفظ اہل بیت میں ازواج مطہرات بھی داخل ہیں، کیونکہ شان نزول اس آیت کا وہی ہیں، اور شان نزول کا مصداق آیت میں داخل ہونا کسی شبہ کا متحمل نہیں، اور حضرت فاطمہ و علی و حسن و حسین بھی ارشاد نبوی کے مطابق اہل بیت میں شامل ہیں، اور اس آیت سے پہلے اور بعد میں دونوں جگہ نساء النبی کے عنوان سے خطاب اور ان کے لئے صیغے مونث کے استعمال فرمائے گئے ہیں، سابقہ آیات میں: فلا تخصضعن بالقول سے آخر تک سب صیغے مونث کے استعمال ہوئے ہیں اور آگے پھر واذکرن مایتلیٰ میں بصیغہ تانیث خطاب ہوا ہے، اس درمیانی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر بصیغہ مذکر عنکم اور یطھرکم فرمانا بھی اس پر شاہد قوی ہے کہ اس میں صرف ازواج ہی داخل نہیں کچھ رجال بھی ہیں۔

یہاں بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ نے ایک دفعہ حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حسنین رضی اللہ عنہم کو اپنی عباء میں داخل کر کے فرمایا: "اللھم ھؤلاء اھل بیتی" اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں، اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں، حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ بھی میرے اہل بیت ہیں، ان کو بھی انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا کی فضیلت میں داخل اور شامل فرما اور ان کو بھی اس کرامت میں شریک فرما، آپ ﷺ کا مقصود حصر نہ تھا کہ بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں اور اس حدیث کے بعض طرق میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے جب ان مذکورہ حضرات کو عباء میں داخل کر کے دعا فرمائی تو ام المومنین ام سلمہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرما لیجئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو، اس کا مطلب یہ تھا کہ تم کو عبا میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں تم تو پہلے ہی سے بہل بیت میں داخل ہو، کیونکہ ان تمام آیات کا نزول تمہاری ہی بارے میں ہے اور ان آیات میں از اول تا آخر تمام خطابات ازواج مطہرات ہی کو ہیں اور ازواج مطہرات ہی ان خطابات کی اولین مخاطب ہیں، للہذا ان کے لئے اس قسم کے عمل کی اور کسی قسم کی تصریح کی ضرورت ہی نہیں، ان کا اہل بیت ہونا تو قطعی اور یقینی ہے، البتہ داماد اور داماد کی اولاد کے بارے میں شبہ ہو سکتا ہے

کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھرانہ قرار دیا جائے یا ان کو مستقل اور علیحدہ گھرانہ سمجھا جائے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو ایک چادر میں لے کر یہ دعا کی: " اللهم هو لاء اهل بيتى " الخ تا کہ اس دعا کے ذریعہ یہ حضرات بھی ازواج مطہرات کے ساتھ اس وعدہ نعمت و کرامت میں شریک ہو جائیں جو اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانہ کے لئے ارادہ فرمایا ہے، اگر اس آیت کا اصل نزول حضرت علی اور حضرت فاطمہ کے بارے میں ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کی ضرورت نہ ہوتی۔

غرض یہ کہ عباء میں داخل کر کے دعا کرنا ان لوگوں کے لئے تھا کہ جن کے اہل بیت ہونے میں کسی قسم کا شبہ ہو سکتا تھا اور ازواج مطہرات کا تو اہل بیت ہونا ایسا قطعی اور یقینی تھا کہ جس میں کسی قسم کے شبہ کا امکان ہی نہ تھا اس لئے ان کو عباء میں داخل کرنے اور اللهم هو لاء اهل بيتى کہنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی، حضرت علی اور حضرت ام سلمہ سے اجنبی تھے اس لئے ان کے ساتھ ام سلمہ کو عبا میں کیونکر داخل کیا جا سکتا تھا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ ام سلمہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میں آپ کے اہل بیت میں سے نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں، اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ اور حسنین کی دعا سے فارغ ہونے کے بعد حضرت ام سلمہ کو بلایا اور اپنی کساء میں داخل کر کے ان کے لئے دعا فرمائی، اور جس طرح احادیث میں حضرت علی اور ان کی اولاد کو عبا میں داخل کر کے دعا کرنے کا ذکر آیا ہے اسی طرح بعض روایات میں حضرت عباس اور ان کی اولاد کے متعلق بھی آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عباس کو اور ان کی اولاد کو اپنی کساء میں داخل کر کے دعا فرمائی۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کی فضیلت اور کرامت کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہوا کہ یہ آیتیں اگرچہ خاص ازواج ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور آیت ہذا سے پہلے اور اس تمام رکوع میں تمام خطابات ازواج مطہرات ہی کو ہیں، اور وقرن فی بیوتکن میں اور واذکرن ما یتلی فی بیوتکن میں بیوت کی نسبت بھی انہی کی طرف کی گئی ہے جو اللہ کے خاص الخاص عنایات پر دلالت کرتی ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل چاہا کہ اہل بیت کے عموم میں اپنی اولاد کو داخل کر کے اللہ تعالیٰ سے درخواست کروں کہ اے اللہ! علی اور فاطمہ اور حسنین یہ بھی میرے اہل بیت ہیں ان کو بھی اس خاص رحمت اور کرامت اور عنایت میں شریک فرما، خلاصہ کلام یہ کہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک اہل بیت کے مفہوم عام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور ذریت اور اولاد اور بنی الاعمام سب داخل ہیں اور سب اس بشارت اور کرامت میں شریک اور داخل ہیں، کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے: "العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب" یعنی اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصی سبب کا، آیت کا نزول اصلا اگرچہ ازواج مطہرات کے بارے میں ہوا ہے مگر عموم لفظ کی وجہ سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی وجہ سے تمام اہل بیت کو شامل کیا گیا ہے۔

نیز قرآن کریم کا محاورہ بھی یہی ہے کہ ''اہل بیت'' کے مفہوم میں زوجہ اصلا داخل ہے، حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جب ملائکہ نے ان کو بیٹے کے پیدائش کی بشارت دی اور پیرانہ سالی میں ان کی اہلیہ کو اس بشارت پر تعجب ہوا تو فرشتوں نے ان کی اہلیہ کو مخاطب کر کے کہا: **قالوا تعجبين من امر الله رحمة الله وبركاته عليكم اهل البيت**، اور ظاہر ہے کہ اس آیت میں اہل بیت کے خطاب میں حضرت سارہ علیہ السلام داخل ہوئیں، کیونکہ اصل خطاب انہی سے ہے اور فرشتوں نے حضرت سارہ علیہ السلام ہی کو ''اہل البیت'' سے خطاب کر کے ان کو خدا کی رحمتوں اور برکتوں کی دعائیں دی ہیں، فرشتوں نے نبی کی زوجہ پر لفظ ''اہل البیت'' کا اطلاق کیا، معلوم ہوا کہ اہل بیت میں ازواج بھی داخل ہیں اور **تعجبين** کا اصل خطاب حضرت سارہ علیہ السلام کو ہے جو صیغہ مؤنث کا ہے اور اس کے بعد **رحمة الله وبركاته عليكم اهل البيت** میں اہل بیت کو بلفظ مذکر **عليكم** خطاب کیا اور علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ اظہار محبت و کرامت کے لئے عورتوں کے لئے مذکر کی ضمیریں لانا کلام عرب میں شائع اور ذائع ہے، اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے: **قال لاهله امكثوا**، ورنہ ظاہر کے مطابق امکثی یا امکثن ہونا چاہئے تھا، اس قسم کے مواقع میں صیغہ مذکر اور خطاب مذکر لفظ اہل کی رعایت سے لایا گیا ہے کہ وہ اصل میں مذکر ہے۔

وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا: دوسری بات آیت مذکورہ میں جو یہ فرمایا ہے کہ: **ويطهركم تطهيرا**، ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان ہدایات کے ذریعہ اغواء شیطانی اور معاصی اور قبائح سے حق تعالیٰ اہل بیت کو محفوظ رکھے گا، اور پاک کر دے گا، خلاصہ یہ ہے کہ تطہیر تشریعی مراد ہے، تکوینی

تطہیر جو خاصہ انبیاء ہے وہ مراد نہیں، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اہل بیت سب معصوم ہوں اور ان سے انبیاء علیہم السلام کی طرح کوئی گناہ سرزد ہونا ممکن نہ ہو، جو تکوینی تطہیر کا خاصہ ہے، اہل تشیع نے اس آیت میں جمہور امت سے اختلاف کر کے اول تو لفظ ''اہل بیت'' کا صرف اولاد وعصبات رسول کے ساتھ مخصوص ہونے اور ازواج مطہرات کے ان سے خارج ہونے کا دعویٰ کیا جس کی تفصیل ابھی گذر چکی ہے، دوسری آیت مذکورہ میں تطہیر سے مراد ان کی عصمت قرار دے کر اہل بیت کو انبیاء کی طرح معصوم ثابت کیا، اہل سنت و جماعت کے نزدیک گندگی دور کرنے اور پاک صاف کرنے سے معصوم بنانا اور عصمت عطا کرنا مراد نہیں، بلکہ معاصی ونقائص کا ازالہ مراد ہے جس کو تزکیہ نفس، تخلیہ اور تجلیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہاں تطہیر سے تجلیہ ء باطن اور تنویر قلب مراد ہے، علامہ آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں: ''والمعنی انما یرید الله لیذهب عنکم الذنوب والمعاصی ویحلیکم بالطاعة والتقوی تحلیة بلیغة فیما امرکم''، یعنی اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے خطاؤں اور گناہوں کی گندگی دور کردے اور طاعت اور تقویٰ سے تم کو خوب مزین اور آراستہ کردے کہ اللہ نے تم کو جو حکم دیا ہے اس میں کمی نہ ہو، مطلب یہ ہے کہ ان ہدایتوں اور نصیحتوں سے اللہ کا منشا یہ ہے کہ نبی کے گھر والے ان احکام پر عمل کر کے بالکل پاک اور صاف ستھرے ہوجائیں اور ان کا ظاہر اور باطن ایسا معطر اور مطہر اور منور ہوجائے کہ جو نبی کے گھرانہ کے مناسب اور شایان شان ہو اور ان کی صفائی اور ستھرائی اوروں سے ممتاز اور فائق ہو پس اگر تم نے ہماری ان ہدایتوں اور نصیحتوں پر عمل کیا تو تم برائیوں سے بالکل پاک اور صاف ہوجاؤ گے۔

اور اگر بالفرض گندگی دور کرنے اور پاک صاف کرنے سے عطاء عصمت یعنی کسی کو معصوم بنانے کے معنی مراد لئے جائیں تو پھر اس سے تو صحابہ بدریین کا بھی معصوم ہونا ثابت ہوجائے گا، کیونکہ یہ لفظ صحابہ کرام کے لئے بھی آیا ہے: ولکن یرید لیطهرکم ولیتم نعمته علیکم، اور حاضرین جنگ بدر کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے: ویذهب عنکم رجز الشیطان، پس اگر آیت تطہیر اہل بیت کی عصمت کی دلیل ہے تو مذکورہ بالا دو آیتیں تمام صحابہ کی اور خصوصاً صحابہ بدریین کی عصمت کی دلیل بنیں گی، بلکہ مزید برآں ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے لئے اتمام نعمت یعنی نعمت پورا کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ اتمام نعمت کا مضمون اذہاب رجس اور تطہیر سے بڑھ کر ہے، نیز گزشتہ آیت میں: یعنی ویذهب عنکم رجز الشیطان میں اہل بدر کے لئے شیطان کے شر سے محفوظ ہونے کا ذکر فرمایا ہے اور شیطان کے شر سے محفوظ رکھنا بدون عطا عصمت کے ممکن نہیں اور اتمام نعمت اس پر مزید اضافہ ہے اس لئے کہ اتمام نعمت کا لفظ تمام فضائل اور کمالات کو حاوی ہے، پس اس صورت میں ہونا تو یہ چاہیے کہ تمام صحابہ کرام کی عصمت کے عموماً اور اہل بدر کی عصمت کے خصوصاً قائل ہوا جائے، نیز اگر غور سے دیکھا جائے تو عجب نہیں کہ آیت تطہیر سے عدم عصمت ثابت ہوجائے اس لئے کہ جو پہلے سے معصوم اور طاہر ہو اس کی تطہیر کے ارادہ کے کیا معنی، تحصیل حاصل کا ارادہ بھی عقلاً قبیح ہے۔

— لِيُذۡهِبَ عَنۡكُمُ الرِّجۡسَ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ وَيُطَهِّرَكُمۡ تَطۡهِيۡرًا: اس سے اہل بیت کے معصوم ہونے پر استدلال نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ مضمون ایسا ہی ہے جیسے کہ دوسری آیت میں عام مؤمنین کو ارشاد ہے: ولکن یرید لیطهرکم۔

***

فائدہ: ا یعنی اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ نبی کے گھر والوں کو ان احکام پر عمل کرا کر خوب پاک وصاف کردے اور ان کے رتبہ کے موافق ایسی قلبی صفائی اور اخلاقی ستھرائی عطا فرمائے جو دوسروں سے ممتاز وفائق ہو (جس کی طرف یطهرکم کے بعد تطهیرا بڑھا کر اشارہ فرمایا ہے)

یہ تطہیر واذہاب رجس اس قسم کی نہیں جو آیت وضو میں: وَلٰكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ (المائدہ:٦) سے یا ''بدر'' کے قصہ میں: لیطهرکم به ویذهب عنکم رجز الشیطان (انفال) سے مراد ہے، بلکہ یہاں تطہیر سے مراد تہذیب نفس، تصفیہ قلب اور تزکیہ باطن کا وہ اعلیٰ مرتبہ ہے جو کامل اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے اور جس کے حصول کے بعد وہ انبیاء کی طرح معصوم تو نہیں بن جاتے ہاں محفوظ کہلاتے ہیں، چنانچہ لفظ یرید الله لیذهب الخ فرمانا اور اراد الله نہ فرمانا خود اسکی دلیل ہے کہ اہل بیت کیلئے عصمت ثابت نہیں۔

تنبیہ: نظم قرآن میں تدبر کرنے والے کو ایک لحہ کیلئے اس میں شک وشبہ نہیں ہوسکتا کہ یہاں اہل بیت کے مدلول میں ازواج مطہرات یقیناً داخل ہیں، کیونکہ آیت ہذا سے پہلے اور پیچھے پورے رکوع میں تمام تر خطابات ان ہی سے ہوئے ہیں اور بیوت کی نسبت بھی پہلے: وقرن فی

بیوتکن میں اور آگے: واذ کرن مایتلی فی بیوتکن میں ان کی طرف کی گئی ہے، اسکے علاوہ قرآن میں یہ لفظ عموما اسی سیاق میں مستعمل ہوا ہے:
① حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ کو خطاب کرتے ہوئے ملائکہ نے فرمایا: اتعجبین من امر الله رحمة الله وبركاته عليكم اهل البيت (ہود) ② مطلقہ عورت باوجودیکہ نکاح سے نکل چکی، مگر عدت منقضی ہونے سے پہلے "بیوت" کی نسبت اسی کی طرف کی گئی، چنانچہ فرمایا: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ (الطلاق: ۱) ③ حضرت یوسف کے قصہ میں "بیت" کو زلیخا کی طرف منسوب کیا: وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ (یوسف: ۲۳)۔

بہرحال اہل بیت میں اس جگہ ازواج مطہرات کا داخل ہونا یقینی ہے، بلکہ آیت کا خطاب اولا ان ہی سے ہے، لیکن چونکہ اولاد و داماد بھی بجائے خود اہل بیت (گھر والوں) میں شامل ہیں، بلکہ بعض حیثیات سے وہ اس لفظ کے زیادہ مستحق ہیں، جیسا کہ مسند احمد کی ایک روایت میں "احق" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے آپ کا حضرت فاطمہ، علی، حسن، حسین (رضوان علیہم اجمعین) کو ایک چادر میں لے کر "اللهم هؤلاء اهل بیتی" الخ وغیرہ فرمانا، یا حضرت فاطمہ کے مکان کے قریب گزرتے ہوئے: "الصلوٰة اهل البيت يريد الله ليذهب عنكم الرجس" الخ سے خطاب کرنا، اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے تھا کہ گو آیت کا نزول بظاہر ازواج کے حق میں ہوا اور ان ہی سے تخاطب ہو رہا ہے، مگر یہ حضرات بھی بطریق اولی اس لقب کے مستحق اور فضیلت تطہیر کے اہل ہیں، باقی ازواج مطہرات چونکہ خطاب قرآنی کی اولین مخاطب تھیں، اس لیے ان کی نسبت اس قسم کے اظہار اور تصریح کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِیْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ ع

اور یاد کرو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں اللہ کی باتیں اور عقل مندی کی ۱؎ مقرر اللہ ہے بھید جاننے والا خبردار ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (چونکہ ان احکام پر عمل واجب ہے اور عمل موقوف ہے احکام کے جاننے اور ان کے یاد رکھنے پر، اس لئے) تم ان آیات الٰہیہ (یعنی قرآن) کو اور اس علم (احکام) کو یاد رکھو جس کا تمہارے گھروں میں چرچا رہتا ہے (اور یہ بھی پیش نظر رکھو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ رازداں ہے (کہ دلوں کی حالت کو بھی جانتا ہے اور) پورا خبردار ہے (کہ پوشیدہ اعمال کو بھی جانتا ہے، اس لئے ظاہری، باطنی، خفیہ اور اعلانیہ ہر طرح سے احکامات کی تعمیل اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام واجب ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی قرآن وسنت میں جو اللہ کے احکام اور دانائی کی باتیں ہیں، انھیں سیکھو، یاد کرو، دوسروں کو سکھاؤ اور اللہ کے احسان عظیم کا شکر ادا کرو کہ تم کو ایسے گھر میں رکھا جو حکمت کا خزانہ اور ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

فائدہ: ۲؎ اس کی آیتوں میں بڑے باریک بھید اور پتے کی باتیں ہیں اور وہ ہی جانتا ہے کہ کون اس امانت کے اٹھانے کا اہل ہے اس نے اپنے لطف ومہربانی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے لیے اور تم کو ان کی زوجیت کے لیے چن لیا، کیونکہ وہ ہر ایک کے احوال واستعداد کی خبر رکھتا ہے، کوئی کام یوں ہی بے جواز نہیں کرسکتا۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ

تحقیق مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان دار مرد اور ایمان دار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد

وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ

اور سچی عورتیں اور محنت جھیلنے والے مرد اور محنت جھیلنے والی عورتیں ۱؎ اور دبے رہنے والے مرد اور دبی رہنے والی عورتیں ۲؎ اور خیرات کرنے والے مرد

وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآىِٕمِیْنَ وَالصّٰٓىِٕمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ

اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور حفاظت کرنے والے مرد اپنی شہوت کی جگہ کو اور حفاظت کرنے والی عورتیں

وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۳۵﴾

اور یاد کرنے والے مرد اللہ کو بہت سا اور یاد کرنے والی عورتیں، رکھی ہے اللہ نے ان کے واسطے معافی اور ثواب بڑا ۳

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں خاص ازواج مطہرات کی بشارت کا ذکر تھا اب عام بشارت کا ذکر ہے کہ جو مسلمان عورت احکام اسلام بجالائے اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے، قتادہ سے روایت ہے کہ جب گزشتہ آیتیں ازواج مطہرات کے بارے میں نازل ہوئیں تو عورتوں کی ایک جماعت نے یہ کہا کہ ہمارے لئے تو کچھ نازل نہیں ہوا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں تا کہ تسلی ہو جائے کہ عورت ہو یا مرد ہو اللہ کے یہاں کسی کا عمل ضائع نہیں، قرآن کریم میں اکثر و بیشتر خطاب صرف مردوں کو ہوتا ہے اور عورتیں احکام میں مردوں کی تابع ہوتی ہیں مگر ان آیات میں عورتوں کی دلجوئی کے لئے مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی خطاب میں شامل کر لیا گیا، اس میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عورتوں کا علیحدہ مستقل ذکر کرنے کی اس لیے ضرورت نہیں کہ احکام وقوانین مردوں اور عورتوں میں مشترک ہوتے ہیں۔

بیشک اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں (مسلمین و مسلمات کی اس تفسیر پر اسلام سے مراد اعمال نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ ہوئے اور مومنین و مومنات میں ایمان سے مراد عقائد ہوئے جیسا صحیح بخاری و مسلم میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے پوچھنے پر آنحضرت ﷺ سے اسلام و ایمان کے متعلق بھی یہی جواب دینا منقول ہے) اور فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں (اس راست بازی یعنی سچائی میں بات، عمل اور نیت سب کی سچائی آگئی، یعنی نہ وہ بات میں جھوٹے ہیں، نہ عمل میں کم ہمت اور سست ہیں، نہ نیت میں ریاکار ہیں اور نہ منافق ہیں) اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں (اس میں صبر کی سب قسمیں آگئیں، یعنی طاعات و عبادات پر ثابت قدم رہنا اور گناہوں سے اپنے نفس کو روکنا اور مصائب پر صبر و تحمل کرنا) اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں (لفظ خشوع میں نماز و عبادت کا خشوع بھی داخل ہے کہ قلب سے بھی عبادت کی طرف متوجہ ہو اور اپنے اعضاء و جوارح کو بھی اس کے مناسب رکھے اور اس میں عام تواضع بھی داخل ہے جو تکبر کے بالمقابل ہے، یعنی یہ لوگ تکبر اور اپنی بڑائی سے بھی پاک ہیں اور نماز وغیرہ عبادات میں بھی خشوع و خضوع ان کا وظیفہ ہے) اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں (اس میں زکوٰۃ اور نفلی صدقات سب داخل ہیں) اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنیوالے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور بکثرت خدا کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں (یعنی جو اذکار فرض کے علاوہ نفلی اذکار بھی ادا کرتے ہیں) ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی تکلیفیں اٹھا کر اور سختیاں جھیل کر احکام شریعت پر قائم رہنے والے۔

فائدہ: ۲ یعنی ① تواضع و خاکساری اختیار کرنے والے۔ ② یا نماز خشوع و خضوع سے ادا کرنے والے۔

فائدہ: ۳ بعض ازواج مطہرات نے کہا تھا کہ قرآن میں اکثر جگہ مردوں کا ذکر ہے عورتوں کا کہیں نہیں اور بعض نیک بخت عورتوں کو خیال ہوا کہ آیات سابقہ میں ازواج نبی کا ذکر تو ہوا عام عورتوں کا کچھ حال بیان نہ ہوا اس پر یہ آیت اتری، تا کہ تسلی ہو جائے کہ عورت ہو یا مرد کسی کی محنت اور کمائی اللہ کے یہاں ضائع نہیں جاتی اور جس طرح مردوں کو روحانی اور اخلاقی ترقی کرنے کے ذرائع حاصل ہیں، عورتوں کے لیے بھی یہ میدان کشادہ

ہے، یہ طبقہ اناث کی دلجمعی کے لیے تصریح فرمادی، ورنہ جو احکام مردوں کے لیے قرآن میں آئے وہ ہی عموماً عورتوں پر عائد ہوتے ہیں، جداگانہ نام لینے کی ضرورت نہیں، ہاں خصوصی احکام الگ بتلا دیے گئے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ

اور کام نہیں کسی ایماندار مرد کا اور نہ ایمان دار عورت کا جب کہ مقرر کر دے اللہ اور اس کا رسول کوئی کام کہ ان کو رہے اختیار

مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ﴿۳۶﴾

اپنے کام کا، اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور اس کے رسول کی سو وہ راہ بھولا صریح چوک کر

خلاصہ تفسیر: پیچھے زید بن حارثہ کا قصہ اجمالاً آچکا ہے، اب آگے اسی قصہ کے متعلق دو مضمون مذکور ہیں، پہلے مضمون میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان حق کا بیان ہے، اس مضمون کا سبب نزول یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے کرنا چاہا، کیونکہ حضرت زید عام لوگوں میں غلام مشہور ہو چکے تھے اس لیے حضرت زینب اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحش نے اس نکاح کی منظوری سے عذر کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا (اگرچہ وہ دنیا ہی کی بات کیوں نہ ہو بطور وجوب کے) حکم دے دیں کہ (پھر) ان (مومنین) کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار (باقی) رہے (یعنی اس اختیار کی گنجائش نہیں رہتی کہ خواہ کریں یا نہ کریں، بلکہ عمل ہی کرنا واجب ہو جاتا ہے) اور جو شخص (حکم کے واجب ہونے کے بعد) اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ: یہاں "مؤمن" کے عموم حضرت عبداللہ بن جحش اور "مؤمنہ" کے عموم میں حضرت زینب بن جحش اور امرھم کے عموم میں حضرت زیدؓ سے نکاح کرنا داخل ہے، چنانچہ اس آیت کے سننے کے بعد وہ نکاح منظور کر لیا۔

اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ: نیز اس آیت میں: مِنْ اَمْرِهِمْ عام ہے جو تمام دینی اور دنیاوی امور کو شامل، چنانچہ دنیاوی امور میں بھی اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تاکید کوئی حکم فرما دیں تو وہ واجب العمل ہوگا، اور حدیث تابیر میں جو ارشاد ہے: "انتم اعلم بامور دنیاکم" کہ تم اپنے دنیاوی امور کو زیادہ جاننے والے ہو، تو یہ ارشاد اس صورت میں ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم محض رائے اور مشورہ کے طور پر فرمائیں، اور رہی یہ بات کہ پھر بلا تاکید فرمانے میں تو دینی امور میں بھی اتباع واجب نہیں جیسے نوافل میں، پھر حدیث تابیر میں مذکورہ ارشاد کا مقابلہ: "اذا امرتکم بشیئ من الدین" سے کیا، معنی جواب یہ ہے کہ دینی امر میں ایک اتباع مطلقاً واجب ہے، یعنی اس دینی حکم کا اعتقاد رکھنا، بخلاف دنیاوی امر کے کہ اس کی مصلحت اور نافع ہونے کا اعتقاد بھی واجب نہیں، اور چونکہ حضرت زیدؓ کو قرائن سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور رائے اور مشورہ کے طلاق نہ دینے کا فرما رہے ہیں تو اس کو نہ ماننا معصیت میں داخل نہ ہوگا، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ کو مغیث کے پاس رہنے کو فرمایا اور طلاق نہ لینے کا کہا، حضرت بریرہؓ نے یہ تحقیق کر کے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محض سفارش ہے حکم نہیں ہے، تو انہوں نے اسے منظور نہیں کیا اور طلاق لے لی اور اس پر انہیں ملامت بھی نہیں ہوئی، جبکہ یہاں حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور تاکید ارشاد فرمایا ہوگا۔

* * *

فائدہ: حضرت زینبؓ، امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن اور قریش کے اعلیٰ خاندان سے تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ان کا نکاح زید بن حارثہ سے کر دیں، یہ زید اصل سے شریف عرب تھے، لیکن لڑکپن میں کوئی ظالم ان کو پکڑ لایا اور غلام بنا کر مکہ کے بازار میں بیچ گیا، حضرت خدیجہؓ نے خرید لیا اور کچھ دنوں بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا، جب یہ ہشیار ہوئے تو ایک تجارتی سفر کی تقریب سے اپنے وطن کے قریب سے گزرے، وہاں ان کے اعزہ کو پتہ لگ گیا، آخر ان کے والد، چچا اور بھائی حضرت کی خدمت میں پہنچے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

معاوضہ لے کر ہمارے حوالہ کردیں، فرمایا کہ معاوضہ کی ضرورت نہیں، اگر تمہارے ساتھ جانا چاہے خوشی سے لے جاؤ، انہوں نے حضرت زیدؓ سے دریافت کیا، حضرت زیدؓ نے کہا کہ میں حضرت کے پاس سے جانانہیں چاہتا، آپ ﷺ مجھے اولاد سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہیں اور ماں باپ سے زیادہ چاہتے ہیں، حضرت نے ان کو آزاد کردیا اور متبنیٰ بنالیا۔

چنانچہ لوگ اس زمانہ کے رواج کے مطابق ''زید بن محمد'' کہہ کر پکارنے لگے تا آنکہ آیت :اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ (الاحزاب:۵) نازل ہوئی، اس وقت ''زید بن محمد'' کی جگہ پھر ''زید بن حارثہ'' رہ گئے، چونکہ قرآن کے حکم کے موافق ان کے نام سے اس نسبت عظیمہ کا شرف جدا کرلیا گیا تھا، شاید اس کی تلافی کے لیے تمام صحابہ کے مجمع میں سے صرف ان کو یہ خاص شرف بخشا گیا کہ ان کا نام قرآن میں تصریحا وارد ہوا جیسا کہ آگے آتا ہے: فلما قضی زید منہا وطرا ، بہرحال حضرت زینبؓ کی خاندانی حیثیت چونکہ بہت بلند تھی اور زید بن حارثہؓ بظاہر داغ غلامی اٹھا کر آزاد ہوئے تھے، اس لیے ان کی نیز ان کے بھائی کی مرضی زیدؓ سے نکاح کرنے کی نہ تھی، لیکن اللہ ورسول کو منظور تھا کہ اس طرح کی موہوم تفریقات و امتیازات نکاح کے راستہ میں حائل نہ ہوا کریں، اس لیے آپ ﷺ نے زینبؓ اور ان کے بھائی پر زور دیا کہ وہ اس نکاح کو قبول کرلیں، اسی وقت یہ آیت اتری اور ان لوگوں نے اپنی مرضی کو اللہ ورسول ﷺ کی مرضی پر قربان کردیا اور زینبؓ کا نکاح زید بن حارثہؓ سے ہوگیا۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ

اور جب تو کہنے لگا اس شخص کو جس پر اللہ نے احسان کیا اور تو نے احسان کیا رہنے دے اپنے پاس اپنی جورو کو اور ڈر اللہ سے

وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ

اور تو چھپاتا تھا اپنے دل میں ایک چیز جسکو اللہ کھولا چاہتا ہے اور ڈرتا تھا لوگوں سے، اور اللہ سے زیادہ چاہیے ڈرنا تجھ کو، پھر جب زید تمام کر چکا

مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ

اس عورت سے اپنی غرض ۱؎ ہم نے اس کو تیرے کو نکاح میں دے دیا تا کہ نہ رہے مسلمانوں پر گناہ نکاح کر لینا جوروئیں اپنے لے پالکوں کی

اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾

جب وہ تمام کرلیں ان سے اپنی غرض، اور ہے اللہ کا حکم بجالانا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب دوسرے مضمون میں اس ایذا کی تفصیل ہے جس کا پیچھے اجمالا بیان آچکا ہے کہ منافقین وکفار نے آپ پر طعن کیا تھا کہ اپنے بیٹے کی بیوی یعنی بہو سے نکاح کرلیا ہے، اس کا سبب نزول یہ ہے کہ جب گذشتہ آیت کے نازل ہونے پر نکاح منظور کرلیا گیا تو اتفاق سے باہم مزاجوں میں موافقت نہ ہوئی، حضرت زیدؓ نے طلاق دینی چاہی اور حضور ﷺ سے مشورہ کیا، آپ نے سمجھایا کہ طلاق مت دو، مگر جب کسی طرح موافقت نہ ہوئی تو آخر کار طلاق کا ارادہ ظاہر کیا، اس وقت آپ ﷺ کو وحی سے معلوم ہوا کہ زید ضرور طلاق دیں گے اور زینب کا نکاح آپ سے ہوگا، اور اس وقت مصلحت بھی یہی تھی کہ زینب سے حضور ﷺ نکاح کرلیں، کیونکہ اول تو یہ نکاح خلاف مرضی ہونے سے طبعی رنج کا سبب ہوا تھا، پھر اس پر طلاق دینا اور زیادہ دل شکنی کا سبب تھا، اس کا تدارک اس سے بہتر اور کوئی نہ تھا کہ حضور ان سے نکاح کر کے ان کی دل جوئی اور عزت افزائی فرمائیں، مگر ساتھ ہی آپ کو عوام کے طعن کا خیال تھا، مگر حکم الٰہی سے نکاح ہوا، جس میں مذکورہ مصلحت کے علاوہ خاص شرعی مصلحت یہی تھی کہ متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کی زوجہ سے نکاح کا حلال ہونا حضور ﷺ کے فعل سے بھی ثابت ہوجائے۔

اور (اس وقت کو یاد کیجئے) جب آپ (فہمائش ومشورہ کے طور سے) اس شخص سے فرمارہے تھے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا (کہ اسلام کی

توفیق دی جو دینی انعام ہے اور غلامی سے چھڑایا جو دنیوی نعمت ہے) اور آپ نے بھی انعام کیا (کہ دین کی تعلیم دی اور آزاد کیا، اور پھوپھی زاد بہن سے نکاح کرایا، مراد حضرت زیدؓ ہیں کہ آپ ان کو سمجھا رہے تھے) کہ اپنی بیوی (زینبؓ) کو اپنی زوجیت میں رہنے دے (اور اس کی معمولی خطاؤں پر نظر نہ کر کہ گاہے اس سے ناموافقت ہو جاتی ہے) اور خدا سے ڈر (اور اس کے حقوق میں بھی کوتاہی نہ کر کہ کبھی اس سے ناموافقت پیدا ہو جاتی ہے) اور (جب شکایتیں حد سے متجاوز ہو گئیں اور قرائن سے اصلاح و موافقت کی امید نہ رہی تو اس وقت فہمائش کے ساتھ) آپ اپنے دل میں وہ بات (بھی) چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ (آخر) میں ظاہر کرنیوالا تھا (اس سے مراد آپ کا حضرت زینب سے نکاح ہے جبکہ زید ان کو طلاق دے دیں جس کو حق تعالیٰ نے **زوجنکھا** میں قولاً اور خود نکاح کر دینے سے فعلاً ظاہر فرمایا) اور (اس مشروط اور معلق ارادہ کے ساتھ ہی) آپ لوگوں (کے طعن) سے (بھی) اندیشہ کرتے تھے (کیونکہ اس وقت تک اس نکاح میں کسی اہم دینی مصلحت کا ہونا ذہن مبارک میں نہ آیا ہوگا، محض دنیوی مصلحت خاص حضرت زینب کی خیال میں ہوگی اور دنیوی امور میں ایسا اندیشہ ہونا مضائقہ نہیں، بلکہ بعض حیثیتوں سے مطلوب ہے جبکہ اعتراض سے دوسروں کے دین کی خرابی کا احتمال ہو اور ان کو اس سے بچانا مقصود ہو) اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے زیادہ سزاوار ہے (یعنی چونکہ واقع میں اس نکاح میں دینی مصلحت ہے، جیسا کہ آگے: **لکی لایکون** الخ میں اس کا بیان آرہا ہے، اس لئے مخلوق کا اندیشہ نہ کیجئے، چنانچہ دینی مصلحت معلوم ہونے کے بعد پھر آپ نے اندیشہ نہیں کیا اور نکاح کے ارادہ میں تو کیا اندیشہ ہوتا خود نکاح کے بعد بھی اندیشہ نہیں کیا جس کا قصہ آگے ہے کہ) پھر جب زید کا اس (زینب) سے جی بھر گیا (یعنی طلاق دے دی اور عدت بھی گزر گئی تو) ہم نے آپ سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ مسلمانوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے (نکاح کے) بارے میں کچھ تنگی نہ رہے جب وہ (منہ بولے بیٹے) ان سے اپنا جی بھر چکیں (یعنی طلاق دے دیں، مطلب یہ کہ اس نکاح سے ہمیں اس حکم شرعی کا ظاہر کرنا مقصود تھا) اور خدا کا یہ حکم تو ہونے والا تھا ہی (کیونکہ حکمت اس کو مقتضی تھی)۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ: اس میں یاد دلانے سے ایک عتاب محبت مترشح ہوتا ہے، اس میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ جب آپ ﷺ کو وحی سے آئندہ اپنے ساتھ زینبؓ کا نکاح ہونا معلوم تھا تو زیدؓ کو سمجھنا اور فہمائش کرنا مناسب نہ تھا، مگر آپ کی فہمائش اس وحی کے خلاف اس لیے نہ تھی کہ آپ ﷺ کو اپنے نکاح کا وقت معلوم ہوگا، اس لیے آپ چاہتے ہوں گے کہ جب تک وہ وقت نہ آئے اس وقت تک زیدؓ کے نکاح کا باقی رہنا ہی بہتر ہے۔

وَتَخْشَى النَّاسَ: یعنی لوگوں کے اعتراض سے ڈرتے تھے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اس معاملہ کا اخفاء کیوں فرمایا جو سبب عتاب بنا؟ جواب یہ ہے کہ اس معاملہ میں اصل مغالطہ جو قرآن و سنت سے ثابت ہے یہ ہے کہ جس کام کے کرنے سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہونے اور ان کے طعن و تشنیع میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو تو لوگوں کے دین کی حفاظت اور ان کو طعن و تشنیع کے گناہ سے بچنے کے نیت سے چھوڑ دینا اس صورت میں تو جائز ہے جب کہ یہ فعل خود مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اور کوئی دینی حکم حلال و حرام کا اس سے متعلق نہ ہو، اگرچہ فعل فی نفسہ محمود ہو، اس کی نظیر حدیث و سنت رسول اللہ ﷺ میں موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں جب بیت اللہ کی تعمیر کی گئی تو اس میں کئی چیزیں بناء ابراہیمی کے خلاف کر دی گئی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر نو مسلم لوگوں کے غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کو پھر بناء ابراہیمی کے مطابق بنا دیتا، یہ حدیث سب کتب معتبرہ میں موجود ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے اپنا یہ ارادہ جو شرعاً محمود تھا اس کو ترک کر دیا، اور من جانب اللہ اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا، جس سے اس عمل کا عند اللہ مقبول ہونا بھی معلوم ہو گیا، مگر بیت اللہ کو بناء ابراہیمی کے مطابق دوبارہ تعمیر کرنے کا معاملہ ایسا نہیں جس پر کوئی مقصد شرعی موقوف ہو، یا جس سے احکام حلال و حرام متعلق ہوں، بخلاف واقعہ نکاح زینب کے کہ اس سے ایک مقصد شرعی متعلق تھا کہ جاہلیت کی رسم بد اور اس خیال باطل کی عملی تردید ہو جائے کہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح حرام ہے، کیونکہ قوموں میں چلی ہوئی غلط رسموں کو توڑنا عملاً جب ہی ممکن ہوتا ہے جب اس کا عملی مظاہرہ ہو، حکم ربانی اسی کی تکمیل کے لئے حضرت زینب کے نکاح سے متعلق ہوا تھا، اس تقریر سے بناء بیت اللہ کے ترک اور نکاح زینب پر بارشاد خداوندی عمل کے ظاہری تعارض کا جواب ہو گیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حکم کی قولی تبلیغ جو سورۂ احزاب کی پہلی آیات میں آچکی

ہے اس کو کافی سمجھا اور اس کے عملی مظاہرہ کی حکمت کی طرف نظر نہیں گئی، اس لئے باوجود علم وارادہ کے اس کو چھپایا، اللہ تعالیٰ نے آیات مذکورہ میں اس کی اصلاح فرمائی، اور اس کا اظہار فرمایا، خلاصہ یہ کہ جس کام میں کوئی دینی مصلحت ہو جیسا کہ مذکورہ نکاح کے واقعہ میں مصلحت تھی ایسے امور میں عوام کی ملامت اور طعن کی پراوہ نہیں کرنی چاہیے اور اس کو ظاہر کر دینا چاہیے، البتہ جس کام میں عام مسلمانوں کے لیے فتنہ وفساد اور نقصان کا اندیشہ ہو تو اس میں احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے جیسا کہ کعبہ کی دوبارہ تعمیر میں نبی کریم ﷺ نے ملحوظ رکھا تھا۔

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا: زوجنکھا کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کا نکاح آپ سے کر دیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نکاح کو یہ امتیاز بخشا کہ خود ہی نکاح کر دیا جو عام شرائط نکاح سے مستثنیٰ رہا، اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں ہم نے اس نکاح کا حکم دے دیا، اب آپ شرعی قواعد وشرائط کے مطابق ان سے نکاح کر لیں، حضرات مفسرین میں بعض نے پہلے احتمال کو ترجیح دی، بعض نے دوسرے احتمال کو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی زید نے طلاق دے دی اور عدت بھی گزر گئی، زینب سے کچھ غرض مطلب نہ رہا۔

فائدہ: ۲؎ حضرت زینبؓ زیدؓ کے نکاح میں آئیں تو وہ ان کی آنکھوں میں حقیر لگتا، مزاج کی موافقت نہ ہوئی، جب آپس میں لڑائی ہوتی تو زیدؓ آ کر حضرت ﷺ سے ان کی شکایت کرتے اور کہتے میں اسے چھوڑتا ہوں، حضرت منع فرماتے کہ میری خاطر اور اللہ ورسول ﷺ کے حکم سے اس نے تجھ کو اپنی منشاء کے خلاف قبول کیا، اب چھوڑ دینے کو وہ اور اس کے عزیز دوسری ذلت سمجھیں گے، اس لیے خدا سے ڈرو اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگاڑ مت کر، اور جہاں تک ہو سکے نباہ کی کوشش کرتا رہ، جب معاملہ کسی طرح نہ سلجھا، اور بار بار جھگڑے قضیے پیش آتے رہے تو ممکن ہے آپ ﷺ کے دل میں آیا ہو کہ اگر ناچار زیدؓ چھوڑ دے گا تو زینبؓ کی دلجوئی بغیر اس کے ممکن نہیں کہ میں خود اس سے نکاح کروں، لیکن جاہلوں اور منافق کی بدگوئی سے اندیشہ کیا کہ کہیں گے اپنے بیٹے کی جورو گھر میں رکھ لی، حالانکہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ کے نزدیک ''لے پالک'' کو کسی بات میں حکم بیٹے کا نہیں۔

ادھر اللہ کو یہ منظور تھا کہ اس جاہلانہ خیال کو اپنے پیغمبر ﷺ کے ذریعہ سے عملی طور پر ہدم کر دے تا کہ مسلمانوں کو آئندہ اس مسئلہ میں کسی قسم کا توحش اور استنکاف باقی نہ رہے، اس نے پیغمبر ﷺ کو مطلع فرمایا کہ میں زینب کو تیرے نکاح میں دینے والا ہوں، کیوں دینے والا ہوں؟ اس کو خود قرآن کے الفاظ: **لکی لا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیاءھم** صاف صاف ظاہر کر رہے ہیں، یعنی آپ ﷺ کے نکاح میں دینے کی غرض یہ ہی تھی کہ دلوں سے جاہلیت کے اس خیال باطل کا بالکل قلع قمع کر دیا جائے اور کوئی تنگی اور رکاوٹ آئندہ اس معاملہ میں باقی نہ رہنے پائے۔ اور شاید یہ ہی حکمت ہوگی جو اول زینبؓ کا نکاح زیدؓ سے زور ڈال کر کرایا گیا، کیونکہ اللہ کو معلوم تھا کہ یہ نکاح زیادہ مدت تک باقی نہ رہے گا، چند مصالح مہمہ تھیں جن کا حصول اس عقد پر معلق تھا، الحاصل آنحضرت ﷺ خود اپنے ذاتی خیال اور اس آسمانی پیشین گوئی کے اظہار سے عوام کے طعن وتشنیع کا خیال فرما کر شرماتے تھے اور زیدؓ کو طلاق کا مشورہ دینے میں بھی حیا کرتے تھے، لیکن خدا کی خبر سچی ہونی تھی اور اس کا حکم تکوینی وتشریعی ضرور تھا کہ نافذ ہو کر رہے، آخر کار زیدؓ نے طلاق دے دی اور عدت گزر جانے پر اللہ نے زینبؓ کا نکاح آنحضرت ﷺ سے باندھ دیا۔

اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ دل میں جو چیز چھپائے ہوئے تھے، وہ یہ ہی نکاح کی پیشین گوئی اور اس کا خیال تھا، اسی کو بعد میں اللہ نے ظاہر فرما دیا، جیسا کہ لفظ **زوجنا کھا** سے ظاہر ہے اور ڈر اس بات کا تھا کہ بعض لوگ اس بات پر بدگمانی یا بدگوئی کر کے اپنی عاقبت خراب نہ کر بیٹھیں، یا گمراہی میں ترقی نہ کریں، چونکہ مصالح مہمہ شرعیہ کے مقابلہ میں اس قسم کی جھجک بھی پیغمبر کی شان رفیع کے لئے مناسب نہ تھی، اس لیے بقاعدہ ''حسنات الابرار سیأت المقربین'' اس کو عتاب آمیز رنگ میں بھاری کر کے ظاہر فرمایا گیا، جیسا کہ عموماً انبیاء (علیہم السلام) کی حالات کے ذکر میں واقع ہوا ہے۔

تنبیہ: ہم نے جو لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو نکاح کی خبر پہلے سے دے دی تھی، اس کی روایات فتح الباری سورۃ احزاب کی تفسیر میں موجود ہیں، باقی جو لغو اور دوراز کار قصے اس مقام پر حاطب اللیل مفسرین ومورخین نے درج کر دیئے ہیں، ان کی نسبت حافظ ابن حجرؒ لکھتے

ہیں: "لا ینبغی التشاغل بها" اور ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: "احببنا ان تضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها"۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ اللهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۭ

نبی پر کچھ مضائقہ نہیں اس بات میں جو مقرر کردی اللہ نے اس کے واسطے، جیسے دستور رہا ہے اللہ کا ان لوگوں میں جو گزرے پہلے

وَكَانَ اَمْرُ اللهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَاۨ ۝۳۸ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا

اور ہے حکم اللہ کا مقرر ٹھہر چکا، وہ لوگ جو پہنچاتے ہیں پیغام اللہ کے اور ڈرتے ہیں اس سے اور نہیں ڈرتے کسی سے

اِلَّا اللهَ ۭ وَكَفٰى بِاللهِ حَسِيْبًا ۝۳۹

سوا اللہ کے، اور بس ہے اللہ کفایت کرنے والا۔

خلاصہ تفسیر: (اب ان کے طعن کا جواب ہے کہ:) ان پیغمبر کے لئے خدا تعالیٰ نے جو بات (تکوینا یا تشریعا) مقرر کردی تھی اس میں نبی پر کوئی الزام (اور طعن کی بات) نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان (پیغمبروں) کے حق میں (بھی) یہی معمول کر رکھا ہے جو پہلے ہو گزرے ہیں (کہ ان کو جس کی اجازت ہوتی ہے بے تکلف وہ اس کو کرتے رہے ہیں اور محل طعن نہیں بنے، ایسے ہی ان پیغمبر پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا) اور (ان پیغمبروں کے بھی اس قسم کے جتنے کام ہوتے ہیں ان سب کے بارے میں بھی) اللہ کا حکم تجویز کیا ہوا (پہلے سے) ہوتا ہے (اور اسی تجویز کے موافق پھر ان کو حکم ہوتا ہے جس پر وہ عمل کرتے رہے ہیں، اسی طرح آپ کے لیے یہ حکم تجویز ہو چکا تھا جس پر آپ نے عمل کیا، پہلے آپ کے قصہ میں اس مضمون کو لانا اور پھر انبیاء کے تذکرہ میں اس مضمون کو مکرر لانے سے شاید اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ ایسے کاموں میں پیغمبر پر اعتراض کرنا جو کہ پہلے ہی سے علم الٰہی میں ان کے لیے بطور حکم کے تجویز ہو چکے ہیں اللہ پر طعن کرنا ہے کہ خدا نے ایسا حکم کیوں تجویز کیا)

(آگے ان پیغمبروں کی خاص مدح ہے تاکہ آپ کو تسلی ہو یعنی) یہ سب (پیغمبران گزشتہ) ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچایا کرتے تھے (اگر تبلیغ قولی کے مامور ہوئے تو قولاً اور اگر تبلیغ فعلی کے مامور ہوئے تو فعلاً) اور (اس باب میں) اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے (پس آپ کو بھی جب تک معلوم نہ تھا کہ اس نکاح میں ایک شرعی حکم مسلمانوں کو عملی طور پر بتلانا مقصود ہے اس وقت تک اندیشہ ہونے کا مضائقہ نہیں تھا، لیکن اب جب یہ بات معلوم ہوگئی تو آپ بھی اندیشہ نہ کیجیے جیسا کہ شان رسالت کا مقتضا ہے، چنانچہ یہ مصلحت منکشف ہونے کے بعد پھر آپ نے اندیشہ نہیں کیا اور باوجودیکہ حضور کو رسالت کے ادا کرنے میں کبھی خوف نہیں ہوا، نہ اس کا احتمال تھا، پھر بھی انبیاء علیہم السلام کا قصہ سنانا آپ کے دل کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے ہے) اور (آپ کی زیادہ تسلی کے لئے فرماتے ہیں کہ) اللہ (اعمال کا) حساب لینے کے لئے کافی ہے (پھر کسی سے کاہے کا ڈر ہے، نیز آپ پر طعن کرنے والوں کو بھی حق تعالیٰ سزا دے گا تو آپ اس طعن سے مغموم نہ ہوجایے)۔

وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللهَ: یعنی یہ حضرات اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ بمصالح دینیہ اگر ان کو کسی کام کی عملی تبلیغ کا مامور کیا جاتا ہے وہ اس میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے، اگر کچھ لوگ اس پر طعنہ کریں تو اس سے نہیں ڈرتے، یہاں جبکہ تمام زمرہ انبیاء کا یہ حال بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو اس سے پہلی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ: تخشی الناس (یعنی آپ لوگوں سے ڈرتے ہیں) یہ کس طرح درست ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں انبیاء کا غیر اللہ سے نہ ڈرنا تبلیغ رسالات کے معاملے میں بیان ہوا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوف طعنہ زنی کا ایک ایسے کام میں پیش آیا جو بظاہر ایک دنیوی کام تھا، تبلیغ و رسالت سے اس کا تعلق نہ تھا، پھر جب آیات مذکورہ سے آپ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ نکاح بھی عملی تبلیغ و رسالت کا ایک جز ہے تو اس کے بعد آپ کو بھی

کسی کا خوف طعن وتشنیع مانع عمل نہیں ہوا، اور یہ نکاح عمل میں لایا گیا، اگر چہ بہت سے کفار نے اعتراضات کئے اور آج تک کرتے رہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ کا حکم اٹل ہے، جو بات اس کے یہاں طے ہو چکی ضرور ہو کر رہے گی، پھر پیغمبر ﷺ کو ایسا کرنے میں کیا مضائقہ ہے جو شریعت میں روا ہو گیا، انبیاء و رسل کو اللہ کے پیغامات پہنچانے میں اس کے سوا کبھی کسی کا ڈر نہیں رہا (چنانچہ آپ ﷺ نے بھی پیغام رسانی میں آج تک کسی چیز کی پروا نہیں کی، نہ کسی کے کہنے سننے کے خیال سے کبھی متاثر ہوئے) پھر اس نکاح کے معاملہ میں رکاوٹ کیوں ہو؟!

حضرت داؤد علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں، اسی طرح سلیمان علیہ السلام کی کثرت ازواج مشہور ہے، جو الزام سفہاء آپ ﷺ کو دے سکتے ہیں، انبیائے سابقین کی لائف میں اس سے بڑھ کر نظیریں موجود ہیں، لہٰذا اس طرح کی سفیہانہ اور جاہلانہ نکتہ چینیوں پر نظر نہیں کرنا چاہیے۔

ربط: آگے بتلایا ہے کہ زید بن حارثہ جن کو آپ ﷺ نے متبنیٰ کر لیا تھا، آپ ﷺ کے واقعی بیٹے نہیں بن گئے تھے کہ ان کی مطلقہ سے آپ ﷺ نکاح نہ کر سکیں۔ اور ایک زید کیا! آپ ﷺ تو مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں، کیونکہ آپ کی اولاد میں یا لڑکے ہوئے جو بچپن میں گزر گئے، اور بعض اس آیت کے نزول کے وقت پیدا ہی نہیں ہوئے، یا بیٹیاں تھیں جن میں سے حضرت فاطمہ زہرا کی ذریت دنیا میں پھیلی۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ

محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے لیکن رسول ہے اللہ کا ۱؎ اور مہر سب نبیوں پر ۲؎

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾ ع

اور ہے اللہ سب چیزوں کو جاننے والا ۳؎

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیات میں نکاح زینب کا عملی تبلیغ ہونے اور سنت انبیاء ہونے کی حیثیت سے محمود ہونا بتلایا گیا تھا، آگے ان معترضین کو جواب ہے جو اس نکاح کو برا سمجھ کر طعنہ زنی اور اعتراض کرتے تھے، یعنی:

محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں (یعنی جو لوگ رسول اللہ ﷺ سے اولاد ہونے کا علاقہ نہیں رکھتے تھے آپ ان کے ایسے باپ نہیں ہیں کہ ان کی بیویاں آپ کے لیے قطعاً حرام ہو جائیں) لیکن (ہاں! آپ مسلمانوں کے روحانی باپ بیشک ہیں، چنانچہ) اللہ کے رسول ہیں (اور ہر رسول روحانی مربی ہونے کی وجہ سے امت کا روحانی باپ ہوتا ہے) اور (اس روحانی باپ ہونے میں آپ اس درجہ کامل ہیں کہ سب رسولوں سے افضل و اکمل ہیں، چنانچہ آپ) سب نبیوں کے ختم پر ہیں (اور جو نبی ایسا ہوگا وہ روحانی باپ ہونے میں سب سے بڑھ کر ہوگا، کیونکہ آپ کے روحانی باپ ہونے کا سلسلہ قیامت تک چلے گا، نیز خاتم الانبیاء کی نبوت تمام عالم کے لیے عام ہوگی تو وہ سب کے لیے روحانی باپ ہوگا، اور دوسرے انبیاء خاص خاص قوموں کے لیے نبی ہوتے ہیں تمام عالم کے مربی نہیں ہوتے، جس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کی روحانی اولاد سب سے زیادہ ہوگی، مطلب یہ ہے کہ امت کے لئے آپ کا باپ ہونا جسمانی اور نسبی نہیں ہے جس سے حرمت نکاح متعلق ہوتی ہے بلکہ آپ امت کے روحانی باپ ہیں، اس لئے متبنیٰ بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کوئی قابل اعتراض نہیں، بلکہ اس روحانی باپ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ سب لوگ آپ پر مکمل اعتماد و اعتقاد رکھیں، آپ کے کسی قول و فعل پر شک و شبہ نہ کریں) اور (اگر یہ وسوسہ ہو کہ یہ نکاح ناجائز تو اگر چہ نہیں تھا، لیکن اگر نہ ہوتا تو بہتر ہوتا، تاکہ لوگوں کو اعتراض اور طعن کا موقع ہی نہ ملتا تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ) اللہ تعالیٰ ہر چیز (کے ہونے یا نہ ہونے کی مصلحت) کو خوب جانتا ہے (پس اس نکاح کے ہونے ہی میں مصلحت تھی، اس لیے نبی کے لیے تجویز کیا گیا)۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ: شبہ ہوتا ہے کہ یہاں صرف رجال یعنی مردوں کا ذکر کیوں کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ

یہاں گفتگو حضرت زیدؓ کے بارے میں ہو رہی ہے اس لیے بطور خاص رجال یعنی مردوں کا ذکر کیا گیا، ورنہ جو تفسیر رجالکم کی کی گئی ہے اس میں نساء یعنی عورتیں بھی شریک ہیں۔

وَخَاتَمَ النَّبِيِّنَ: حضور کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے آپ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام اگر چہ اُس وقت بھی نبی ہوں گے مگر ان کی نبوت پہلے سے ہے، حضور کے بعد نہیں ملی، دوسرے وہ مستقل ہو کر نہیں آئیں گے، بلکہ آپ ﷺ ہی کا اتباع کریں گے۔

فائدہ: ۱ یعنی کسی کو اس کا بیٹا نہ جانو، ہاں اللہ کا رسول ہے، اس حساب سے سب ان کے روحانی بیٹے ہیں جیسا کہ ہم: **اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ** (الاحزاب: ٦) کے حاشیہ میں لکھ چکے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی آپ ﷺ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلہ پر مہر لگ گئی، اب کسی کو نبوت نہیں دی جائے گی، بس جن کو ملنی تھی مل چکی، اسی لیے آپ ﷺ کی نبوت کا دورہ سب نبیوں کے بعد رکھا جو قیامت تک چلتا رہے گا۔

حضرت مسیح علیہ السلام بھی اخیر زمانہ میں بحیثیت آپ کے ایک امتی کے آئیں گے، خود ان کی نبوت و رسالت کا عمل اس وقت جاری نہ ہوگا، جیسے آج تمام انبیاء اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں، مگر شش جہت میں عمل صرف نبوت محمدیہ کا جاری و ساری ہے، حدیث میں ہے کہ: ''اگر آج موسیٰ علیہ السلام (زمین پر) زندہ ہوتے تو ان کو بھی بجز میرے اتباع کا چارہ نہ تھا''۔

بلکہ بعض محققین کے نزدیک تو انبیائے سابقین اپنے اپنے عہد میں بھی خاتم الانبیاء ﷺ کی روحانیت عظمیٰ ہی سے مستفید ہوتے تھے، جیسے رات کو چاند اور ستارے سورج کے نور سے مستفید ہوتے ہیں، حالانکہ سورج اس وقت دکھائی نہیں دیتا، اور جس طرح روشنی کے تمام مراتب عالم اسباب میں آفتاب پر ختم ہو جاتے ہیں، اسی طرح نبوت و رسالت کے تمام مراتب و کمالات کا سلسلہ بھی روح محمدی ﷺ پر ختم ہوتا ہے، بدین لحاظ کہہ سکتے ہیں کہ آپ رتبی اور زمانی ہر حیثیت سے خاتم النبیین ہیں اور جن کو نبوت ملی ہے، آپ ہی کی مہر لگ کر ملی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

تنبیہ: ''ختم نبوت'' کے متعلق قرآن، حدیث، اجماع وغیرہ سے سینکڑوں دلائل جمع کر کے بعض علمائے عصر نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، مطالعہ کے بعد ذرا تردد نہیں رہتا کہ اس عقیدہ کا منکر قطعاً کافر اور ملت اسلام سے خارج ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی وہ ہی جانتا ہے کہ رسالت یا ختم نبوت کو کس محل میں رکھا جائے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴿٤١﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٤٢﴾

اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کی بہت سی یاد، اور پاکی بولتے رہو اس کی صبح اور شام ۱

خلاصہ تفسیر: پیچھے نکاح زینبؓ کے متعلق طعن کو دور کیا تھا اور اس کے ضمن میں آپ ﷺ کی رسالت اور فضیلت ختم نبوت وغیرہ کا ذکر تھا جس سے عام مسلمانوں کو پورا نفع پہنچا ہے، اب مسلمانوں کو اس احسان عظیم کے شکریہ میں خصوصیت کے ساتھ ذکر و طاعت کا حکم، نیز مزید ترغیب کے لیے اپنے دوسرے احسانات اور بشارات کا بیان ہے۔

اے ایمان والو! تم (احسانات الٰہیہ کو عموماً اور ایسے کامل رسل کی بعثت کے احسان کو خصوصاً یاد کر کے اس کا یہ شکر ادا کرو کہ) اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو (اس میں سب طاعات آگئیں) اور (اس ذکر و طاعت پر دوام رکھو پس) صبح و شام (یعنی ہمیشہ اور مستقل) اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتے رہو (یعنی دل سے بھی اور اعضاء سے بھی اور زبان سے بھی)۔

اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا: پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تمام طاعات کو عام طور پر بجالاؤ اور دوسرے جملہ کا حاصل یہ ہے کہ تمام اوقات میں بجالاؤ، یعنی نہ تو ایسا کرو کہ کوئی حکم بجالائے اور کوئی نہ بجالائے، اور نہ ایسا کرو کہ کسی دن کوئی کام کر لیا کسی دن نہ کیا، اور

جیسا اس نے تم پر بہت احسان کئے ہیں اور آئندہ بھی کرتا رہتا ہے تو وہ بالضرور ذکر و شکر کا مستحق ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حق تعالیٰ نے اتنا بڑا احسان فرمایا کہ ایسے عظیم الشان پیغمبر اور پیغمبروں کے سردار محمد ﷺ کو تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا، اس پر اس کا شکر ادا کرو اور منعم حقیقی کو کبھی نہ بھولو، اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے، رات، دن صبح و شام، ہمہ اوقات اس کو یاد رکھو۔

هُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ

وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے تا کہ نکالے تم کو اندھیروں سے اجالے میں

وَ کَانَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَحِیۡمًا ﴿۴۳﴾

اور ہے ایمان والوں پر مہربان

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ) وہ ایسا (رحیم) ہے کہ وہ (خود بھی) اور (اس کے حکم سے) اس کے فرشتے (بھی) تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں (اس کا رحمت بھیجنا تو یہ ہے کہ وہ رحمت کرتا ہے، اور فرشتوں کا رحمت بھیجنا رحمت کی دعاء کرنا ہے جیسا کہ آیت: الذین یحملون العرش ومن حوله میں ملائکہ کی دعا مذکور ہے، اور یہ رحمت بھیجنا اس لئے ہے) تا کہ حق تعالیٰ (اس رحمت کی برکت سے) تم کو (جہالت و ضلالت کی) تاریکیوں سے (علم اور ہدایت کے) نور کی طرف لے آئے (یعنی تم کو جو علم اور ہدایت کی توفیق اور اس پر استقامت حاصل ہے، یہ خدا کی رحمت اور فرشتوں کی دعا کی برکت ہے، اور یہ نعمت تم پر ہر وقت ہوتی رہتی ہے) اور (اس سے ثابت ہوا کہ) اللہ تعالیٰ مومنین پر بہت مہربان ہے (اور یہ رحمت تو مومنین کے حال پر دنیا میں ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کو بکثرت یاد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ اپنی رحمت تم پر نازل کرتا ہے، جو فرشتوں کے توسط سے آتی ہے، یہ ہی رحمت و برکت ہے جو تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہالت و ضلالت کی اندھیریوں سے علم و تقویٰ کے اجالے میں لاتی ہے، اگر اللہ کی خاص مہربانی ایمان والوں پر نہ ہو تو دولت ایمان کہاں سے ملے اور کیونکر محفوظ رہے، اسی کی مہربانی سے مومنین رشد و ہدایت اور ایمان و احسان کی راہوں میں ترقی کرتے ہیں، یہ تو دنیا میں ان کا حال ہوا، آخرت کا اعزاز و اکرام آگے مذکور ہے:

تَحِیَّتُہُمۡ یَوۡمَ یَلۡقَوۡنَہٗ سَلٰمٌ ۖۚ وَ اَعَدَّ لَہُمۡ اَجۡرًا کَرِیۡمًا ﴿۴۴﴾

دعا ان کی جس دن اس سے ملیں گے سلام ہے، اور تیار رکھا ہے ان کے واسطے ثواب عزت کا

خلاصہ تفسیر: (اور مومنین آخرت میں بھی مورد رحمت ہوں گے، چنانچہ) وہ جس روز اللہ سے ملیں گے تو ان کو جو سلام ہوگا وہ یہ ہوگا کہ (اللہ تعالیٰ خود ان سے ارشاد فرمادے گا) السلام علیکم (کہ اولاً خود سلام ہی اعزاز کی علامت ہے، پھر جب کہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ہو کما قال: سلام قولاً من رب رحیم اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اہل جنت سے فرمائے گا السلام علیکم، اور یہ سلام تو روحانی انعام ہے جس کا حاصل اکرام ہے) اور (آگے جسمانی انعام کی عام عنوان سے خبر ہے کہ:) اللہ تعالیٰ نے ان (مومنین کے لئے) عمدہ صلہ (جنت میں) تیار کر رکھا ہے (بس ان کے جانے کی دیر ہے، یہ گئے اور وہ ملا)۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ ان پر سلام بھیجے گا اور فرشتے سلام کرتے ہوئے ان کے پاس آئیں گے۔ اور مومنین کی آپس میں بھی یہ ہی دعا ہوگی جیسا

کہ دنیا میں ہے۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ﴿۴۵﴾

اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا بتانے والا ۱ اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا ۲

خلاصہ تفسیر: (اب حضور ﷺ کو خطاب ہے کہ) اے نبی! (آپ مٹھی بھر معترضین کے طعنوں سے مغموم نہ ہوں، اگر یہ بے وقوف آپ کو نہ جانیں تو کیا ہوا، ہم نے تو ان بڑی بڑی نعمتوں اور رحمتوں کا جو کہ پیچھے خطاب مومنین میں بیان ہوئی آپ ہی کو واسطہ بنایا ہے اور آپ کے مخالفین کی سزا کے لئے خود آپ کا بیان کافی قرار دیا گیا ہے کہ ان کے مقابلہ میں آپ سے ثبوت نہ لیا جائے گا، پس اس سے ظاہر ہے کہ آپ ہمارے نزدیک کس درجہ محبوب و مقبول ہیں، چنانچہ) ہم نے بیشک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ (قیامت کے روز امت کے اعتبار سے خود سرکاری) گواہ ہوں گے (کہ آپ کے بیان کے موافق ان کا فیصلہ ہوگا، کما قال: انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھدا علیکم اور ظاہر ہے کہ خود صاحب معاملہ کو دوسرے فریق اہل معاملہ کے مقابلہ میں گواہ قرار دینا اعلیٰ درجہ کا اکرام اور علوشان ہے جس کا قیامت کے روز ظہور ہوگا) اور (دنیا میں جو آپ کی صفات کمال ظاہر ہیں وہ یہ ہیں کہ:) آپ (مومنین کو) بشارت دینے والے ہیں اور (کفار کو) ڈرانے والے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ کی توحید سکھاتے اور اس کا راستہ بتاتے ہیں، جو کچھ کہتے ہیں دل سے اور عمل سے اس پر گواہ ہیں اور محشر میں بھی امت کی نسبت گواہی دیں گے کہ خدا کے پیغام کو کس نے کس قدر قبول کیا۔

فائدہ: ۲ یعنی نافرمانوں کو ڈراتے اور فرمانبرداروں کو خوشخبری سناتے ہیں۔

وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ﴿۴۶﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيرًا ﴿۴۷﴾

اور بلانے والا اللہ کیطرف اسکے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ ۱ اور خوشخبری سنا دے ایمان والوں کو کہ ان کیلئے ہے خدا کی طرف سے بڑی بزرگی ۲

خلاصہ تفسیر: اور (عام طور پر سب کو) اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں (اور یہ تبشیر و انذار دعوت و تبلیغ کے اعتبار سے ہے) اور (یوں خود اپنی ذات وصفات و کمالات و عبادات و عادات وغیرہ مجموعی حالات کے اعتبار سے) آپ (سرتا پا نمونہ ہدایت ہونے میں بمنزلہ) ایک روشن چراغ (کے) ہیں (کہ آپ کی ہر حالت طالبان انوار کے لئے سرمایہ ہدایت ہے، پس قیامت میں ان مومنین پر جو کچھ رحمت ہوگی وہ آپ ہی کی ان مذکورہ صفات بشیر و نذیر و داعی و سراج منیر کے واسطہ سے ہے، پس آپ اس غم و پریشانی کو الگ کیجئے) اور (اپنے منصبی کام میں لگئے، یعنی) مومنین کو بشارت دیجئے کہ ان پر اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہونے والا ہے۔

وَسِرَاجًا مُّنِيرًا: احقر کے نزدیک چراغ سے تشبیہ دینے میں یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو چراغ تک رسائی آسان ہے، پھر چراغ سے ہر وقت نور حاصل کرنا ممکن ہے، اور اس نور کا حصول آسان بھی ہے، پھر اس سے نور حاصل کرنے میں کوشش و ارادہ کو بھی دخل ہے، پھر صحیح مزاج اور صحیح بدن کے آدمی کو اس سے ناگواری کسی وقت نہیں ہوتی، پھر اس چراغ میں ہر ایک کے لیے مانوسیت کی شان بھی ہے، اور ان سب صفات کو انبیاء علیہم السلام کی شان سے زیادہ مناسبت ہے، اور بعض مفسرین نے "سراج منیر" سے آفتاب مراد لیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ پہلے جو فرمایا تھا کہ اللہ کی رحمت مومنین کو اندھیرے سے نکال کر اجالے میں لاتی ہے، یہاں بتلا دیا کہ وہ اجالا اس روشن چراغ سے پھیلا ہے، شاید چراغ کا لفظ اس جگہ اس معنی میں ہو جو سورہ نوح میں فرمایا: وجعل القمر فیھن نورا وجعل الشمس سراجا (اللہ نے

چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا) یعنی آپ آفتاب نبوت وہدایت ہیں، جس کے طلوع ہونے کے بعد کسی دوسری روشنی کی ضرورت نہیں رہی، سب روشنیاں اسی نورِ اعظم میں محو و مدغم ہوگئیں۔

فائدہ: ۲ یعنی دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کو حضرت کے طفیل سب امتوں پر بزرگی اور برتری دی۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۴۸

اور کہا مت مان منکروں کا اور دغا بازوں کا ۱ اور چھوڑ دے ان کا ستانا اور بھروسہ کر اللہ پر، اور اللہ بس ہے کام بنانے والا ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اسی طرح کافروں اور منافقوں کو ڈراتے رہئے جس کو ایک خاص عنوان سے تعبیر کیا ہے وہ یہ کہ) کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ کیجئے، اور ان (کافروں اور منافقوں) کی طرف سے جو (کوئی) ایذاء پہنچے (جیسا اس نکاح میں جو کہ عملاً تبلیغ ہے ایذاء قولی پہنچی) اس کا خیال نہ کیجئے اور (فعلی ایذاء کا بھی اندیشہ نہ کیجئے، اور اگر اس کا وسوسہ آئے تو) اللہ پر بھروسہ کیجئے اور اللہ کافی کارساز ہے (وہ آپ کو ہر نقصان سے بچائے گا، اور اگر تبلیغ میں کوئی ظاہری نقصان پہنچتا ہے تو وہ باطنی طور پر نفع ہوتا ہے، وہ وعدہ کفایت و وکالت کے خلاف نہیں)۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ: یعنی کافروں اور منافقوں کا کہنا مت مانیے، رسول اللہ ﷺ سے اس کا تو امکان ہی نہ تھا کہ آپ کفار و منافقین کے کہنے میں آ کر تبلیغ و دعوت چھوڑ دیں، لیکن لوگوں کی طعن و تشنیع سے بچنے کے لئے ممکن تھا کہ آپ اس عملی تبلیغ میں جو نکاح زینب کے ذریعہ مقصود تھی کوئی سستی کریں اس کو کفار کا کہنا ماننے سے تعبیر کر دیا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جب اللہ نے آپ کو ایسے کمالات اور ایسی برگزیدہ جماعت عنایت فرمائی تو آپ حسب معمول فریضہ دعوت و اصلاح کو پوری مستعدی سے ادا کرتے رہے اور اللہ جو حکم دے اس کے کہنے یا کرنے میں کسی کافر و منافق کی یاوہ گوئی کی پروانہ کیجئے۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر یہ بدبخت زبان اور عمل سے آپ ﷺ کو ستائیں تو ان کا خیال چھوڑ کر اللہ پر بھروسہ رکھیے، وہ اپنی قدرت و رحمت سے سب کام بنادے گا، منکروں کو راہ پر لے آنا، یا سزا دینا سب اسی کے ہاتھ میں ہے، آپ کو اس فکر اور الجھن میں پڑنے کی ضرورت نہیں، ان کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ آپ طعن و تشنیع وغیرہ سے گھبرا کر اپنا کام چھوڑ بیٹھیں، اگر بفرض محال آپ ایسا کریں تو گویا ان کا مطلب پورا کر دیں گے اور ان کا کہا مان لیں گے۔ العیاذ باللہ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

اے ایمان والو جب تم نکاح میں لاؤ مسلمان عورتوں کو، پھر ان کو چھوڑ دو پہلے اس سے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۴۹

سو ان پر تم کو حق نہیں عدت میں بٹھلانا کہ گنتی پوری کراؤ، سو ان کو دو کچھ فائدہ اور رخصت کرو بھلی طرح سے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں رسول اللہ ﷺ کی چند صفات کمال اور آپ کی مخصوص شان کا ذکر تھا، اب آگے بھی آپ کی ان خصوصیات کا ذکر آنے والا ہے، جو نکاح و طلاق کے معاملات میں آپ کے ساتھ ایک گونہ خصوصیت رکھتی ہیں اور عام امت کی نسبت سے آپ کو ان میں ایک امتیاز حاصل ہے، لیکن اس سے پہلے بطور تمہید کے ایک عام حکم طلاق کے متعلق ذکر کیا جارہا ہے جو سب مسلمانوں کے لئے عام ہے۔

اے ایمان والو! (تمہارے نکاح کے احکام میں سے تو ایک حکم یہ ہے کہ) جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو (اور) پھر ان کو قبل ہاتھ لگانے کے (کسی وجہ سے) طلاق دے دو تو تمہاری ان پر کوئی عدت (واجب) نہیں جس کو تم شمار کرنے لگو (تاکہ ان کو اس عدت میں نکاح ثانی سے

روک سکو جیسا کہ عدت واجب ہونے کی صورت میں شرعاً یہ روکنا جائز بلکہ واجب ہے اور جب اس صورت میں عدت نہیں) تو ان کو کچھ (مال) متاع دے دو اور خوبی کے ساتھ ان کو رخصت کر دو (اور مسلمان عورتوں کی طرح کتابی عورتوں کا بھی یہی حکم ہے)۔

اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ: مسلمان عورتوں کی طرح کتابی عورتوں کا بھی یہی حکم ہے، آیت میں ''مومنات'' کی قید بطور شرط کے نہیں، بلکہ ایک ترغیبی ہدایت ہے کہ مومن کو اپنے نکاح میں مسلمان عورت ہی کا انتخاب کرنا بہتر ہے۔

ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ: اور ہاتھ لگانا کنایہ ہے صحبت کرنے سے خواہ حقیقۃً یا حکماً، جیسے باہم خلوت صحیحہ ہو جائے تو یہ بھی صحبت کے حکم میں ہے، اور صحبت حقیقۃً ہو یا حکماً دونوں صورتوں میں عدت واجب ہے، اور مال و متاع دینے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس عورت کا مہر مقرر نہیں ہوا تو ایک جوڑا، اور اگر مہر مقرر ہوا ہے تو آدھا مہر دیا جائے۔

وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا: خوبی سے رخصت کرنا یہ ہے کہ ناحق نہ روکے، اور جو متاع دینا واجب ہے وہ ادا کر دے، اور دیا ہوا واپس نہ لے، اور زبان سے بھی کوئی سخت بات نہ کہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جو مرد اپنی عورت کو بغیر صحبت کیے طلاق دے، اگر اس کا مہر بندھا تھا تو نصف مہر دینا ہوگا، ورنہ کچھ فائدہ پہنچا کر (یعنی عرف اور حیثیت کے موافق ایک جوڑا پوشاک دے کر) خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دے۔ اور عورت اسی وقت چاہے تو نکاح کر لے، اس صورت میں عدت نہیں (حنفیہ کے نزدیک خلوت صحیحہ بھی صحبت کے حکم میں ہے، تفصیل فقہ میں دیکھ لی جائے) یہ مسئلہ یہاں بیان فرمایا۔

حضرت ﷺ کی ازواج کے ذکر میں جس کا سلسلہ دور سے چلا آتا تھا، درمیان میں چند آیات ضمنی مناسبت سے آ گئی تھیں، یہاں سے پھر مضمون سابق کی طرف عود کیا گیا ہے، روایات میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک عورت سے نکاح کیا، جب اس کے نزدیک گئے کہنے لگی اللہ تجھ سے پناہ دے، حضرت نے اس کو جواب دیا کہ تو نے بڑے کی پناہ پکڑی، اس پر یہ حکم فرمایا اور خطاب فرمایا ایمان والوں کو معلوم ہو کہ یہ پیغمبر کے لیے خاص حکم نہیں، سب مسلمانوں پر یہی حکم ہے، اسی کے موافق حضرت ﷺ نے اس کو جوڑا دے کر رخصت کر دیا، پھر وہ ساری عمر اپنی محرومی پر پچھتاتی رہی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ

اے نبی ہم نے حلال رکھیں تجھ کو تیری عورتیں جن کے مہر تو دے چکا ہے [1] اور جو مال ہو تیرے ہاتھ کا جو ہاتھ لگا دے تیرے اللہ [2]

عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ

اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالہ کی بیٹیاں جنہوں نے وطن چھوڑا تیرے ساتھ [3]

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں جو احکام بیان ہوئے وہ عام مسلمانوں کے متعلق تھے، اب آگے حضور ﷺ کو خطاب ہے کہ:

اے نبی! (بعض احکام آپ کے ساتھ مخصوص ہیں جن سے آپ کی خصوصیت، بزرگی اور شرف بھی ثابت ہوتا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

① پہلا حکم) ہم نے آپ کے لئے آپ کی یہ بیویاں (جو کہ اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہیں اور) جن کو آپ ان کے مہر دے چکے ہیں (باوجود چار سے زیادہ ہونے کے) حلال کی ہیں (② دوسرا حکم) اور وہ عورتیں بھی (خاص طور پر حلال کی ہیں) جو تمہاری مملوکہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو غنیمت میں دلوادی ہیں (اس خاص طور کی وضاحت آگے آ رہی ہے، ③ تیسرا حکم) اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں (مراد اس سے باپ کے خاندان کی بیٹیاں ہیں، کسی خاص چچا یا پھوپھی کی بیٹیاں مراد نہیں) اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں (مراد اس سے ماں کے خاندان کی بیٹیاں ہیں، یعنی ان سب کو) بھی (اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے مگر یہ خاندان کی عورتیں مطلقاً نہیں بلکہ ان میں سے صرف وہی)

جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو (ساتھ ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ جنہوں نے آپ کی طرح ہجرت کی ہو، یہ مطلب نہیں کہ ایک زمانہ میں آپ کی اوران کی ہجرت واقع ہوئی ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کی طرح انہوں نے بھی یہ فعل کیا ہو، اوراس قید سے وہ نکل گئیں جو مہاجر نہ ہوں)۔

اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ: ① پہلا حکم: یعنی ہم نے حلال کردیا آپ کے لئے آپ کی سب موجودہ ازواج کو جن کے مہر آپ نے ادا کردیئے ہیں، یہ حکم بظاہر سبھی مسلمانوں کے لئے عام ہے، مگراس میں وجہ خصوصیت یہ ہے کہ نزول آیت کے وقت آپ کے نکاح میں چار سے زیادہ عورتیں موجود تھیں اور عام مسلمانوں کے لئے چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حلال نہیں، تو یہ آپ کی خصوصیت تھی کہ چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں رکھنا آپ کے لئے حلال کردیا گیا۔

یہاں جو: التی اٰتیت اجورھن فرمایا ہے یہ کوئی قید احترازی یا شرط حلت نہیں، بلکہ واقعہ کا اظہار ہے کہ جتنی عورتیں رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں آپ نے سب کا مہر نقد ادا کردیا ادھار نہیں رکھا، آپ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جس چیز کا دینا آپ کے ذمہ عائد ہو اس کو فوراً دے کر سبکدوش ہوجاتے تھے، بلاضرورت تاخیر نہ فرماتے تھے، اس کے اظہار میں عام مسلمانوں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب ہے۔

وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ: ② دوسرا حکم: یعنی آپ کے لئے حلال کردیا ان عورتوں کو جو آپ کی ملک میں ہوں، اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کا مالک بنادیا ہے، اس آیت میں لفظ افاء فئی سے مشتق ہے، اصطلاحی معنی کے لحاظ سے وہ مال جو کفار سے بغیر جنگ کے یا بطور مصالحت کے حاصل ہوجائے اور کبھی مطلق مال غنیمت کو بھی لفظ فئی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس آیت میں اس کا ذکر کسی شرط کے طور پر نہیں کہ آپ کے لئے صرف وہ کنیز حلال ہوگی جو مال فئی یا غنیمت میں سے آپ کے حصہ میں آئی ہو، بلکہ جس کو آپ نے قیمت دے کر خریدا ہو وہ بھی اس حکم میں شامل ہے، لیکن اس حکم میں بظاہر رسول اللہ ﷺ کا کوئی اختصاص و امتیاز نہیں، پوری امت کے لئے یہ حکم ہے کہ جو کنیز مال غنیمت سے حصہ میں آئے یا جس کی قیمت دے کر خریدیں وہ ان کے لئے حلال ہے، یہاں اس کے خلاصہ تفسیر میں لفظ "خاص طور پر" جو بڑھایا گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس جگہ حضور ﷺ کی خصوصیات کا ذکر ہے، اور بظاہر سیاق ان تمام آیات کا یہ چاہتا ہے کہ ان میں جو احکام آئے ہیں وہ کچھ نہ کچھ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہوں، اسی لئے روح المعانی میں کنیزوں کی حلت سے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ کی ایک خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ جس طرح آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات میں سے کسی کا نکاح کسی امتی سے حلال نہیں، اسی طرح جو کنیز آپ کے لئے حلال کی گئی ہے آپ کے بعد وہ کسی کے لئے حلال نہ ہوگی، جیسا کہ حضرت ماریہ قبطیہ ہیں جن کو مقوقس بادشاہ روم نے آپ کے لئے بطور ہدیہ بھیجا تھا، تو جس طرح آپ کی وفات کے بعد ازواج مطہرات کا نکاح کسی سے جائز نہیں تھا ان کا بھی نکاح کسی سے جائز نہیں رکھا گیا، اور ممکن ہے کہ کوئی اور خصوصیت ہو جو اس زمانہ کے لوگوں کو معلوم ہو کہ انہی کے جاننے کی ضرورت بھی تھی، یہاں تک لکھنے کے بعد ظہر کی نماز میں جو کھڑا ہوا تو من جانب اللہ باندیوں کے متعلق دو حکم قلب پر وارد ہوئے جو مذکورہ خصوصیت سے زیادہ واضح ہیں:

① اول یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو حق تعالیٰ کی طرف سے یہ اختیار خصوصی دیا گیا تھا کہ مال غنیمت کو تقسیم کرنے سے پہلے آپ اس میں سے کسی چیز کا اپنے لئے انتخاب فرمالیں تو وہ آپ کی ملک خاص ہوجاتی تھی، اس خاص چیز کو اصطلاح میں صفی النبی کہا جاتا تھا، جیسا کہ غزوہ خیبر کی غنیمت میں سے آنحضرت ﷺ نے حضرت صفیہ کو اپنے لئے مخصوص کرلیا تھا تو ملک یمین کے مسئلہ میں یہ صرف آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے۔

② دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دار الحرب سے کسی غیر مسلم کی طرف سے اگر کوئی ہدیہ مسلمانوں کے امیر المومنین کے نام پر آئے تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کا مالک امیر المومنین نہیں ہوتا بلکہ وہ بیت المال شرعی کی ملک قرار دیا جاتا ہے، بخلاف نبی کریم ﷺ کے کہ ایسا ہدیہ آپ کے لئے خصوصیت سے حلال کردیا گیا، جیسا ماریہ قبطیہ کا معاملہ ہے کہ مقوقس نے ان کو بطور ہدیہ وتحفہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، تو یہ آپ ہی کی ملک قرار پائیں، چنانچہ مذکورہ خصوصیات کے اعتبار سے باندیوں کے حلال ہونے میں بھی آپ کی ایک خصوصیت ثابت ہوگئی، واللہ اعلم۔

وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ: ③ تیسرا حکم: مطلب یہ ہے کہ آپ کے لئے چچا اور پھوپھی کی لڑکیاں

اور ماموں خالہ کی لڑکیاں حلال کردی گئیں، چچا پھوپھی میں باپ کے خاندان کی سب لڑکیاں اور ماموں خالہ میں ماں کے خاندان کی سب لڑکیاں شامل ہیں، اور ان سے نکاح کا حلال ہونا تو آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص نہیں، سب مسلمانوں کا یہی حکم ہے، لیکن ان میں یہ قید کہ انہوں نے آپ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے ہجرت کی ہو یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیت ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ عام امت کے لئے تو باپ اور ماں کے خاندان کی یہ لڑکیاں بغیر کسی شرط کے حلال ہیں، خواہ انہوں نے ہجرت کی ہو یا نہ کی ہو، مگر رسول اللہ ﷺ کے لئے ان میں سے صرف وہ حلال ہیں جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو، ساتھ ہجرت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ سفر میں آپ کی معیت رہی ہو یا ایک ہی وقت میں ہجرت کی ہو، بلکہ مراد نفس ہجرت میں معیت وموافقت ہے، ان میں سے جس نے کسی وجہ سے ہجرت نہیں کی اس سے آپ کا نکاح حلال نہیں رکھا گیا، جیسا کہ آپ کے چچا ابو طالب کی بیٹی ام ہانی نے فرمایا کہ مجھ سے آپ کا نکاح اس لئے حلال نہیں تھا کہ میں نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی، بلکہ میرا شمار طلقاء میں تھا، طلقاء ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کو فتح مکہ کے وقت رسول اللہ ﷺ نے آزاد کر دیا تھا نہ قتل کیا نہ غلام بنایا۔

الّٰتِیْ هَاجَرْنَ مَعَكَ: رسول اللہ ﷺ سے نکاح کے لئے مہاجرات کی شرط صرف اپنی ماں باپ کے خاندان کی لڑکیوں میں تھی، عام امت کی عورتوں میں ہجرت کی شرط نہ تھی، بلکہ ان کا صرف مسلمان ہونا کافی تھا، اور خاندان کی لڑکیوں میں ہجرت کی شرط لگانے میں شاید یہ حکمت ہو کہ عموماً خاندان کی لڑکیوں کو اپنے خاندان کا ایک ناز اور فخر ہوتا ہے، اور رسول کی زوجیت کے لئے یہ شایان شان نہیں، اس کا علاج ہجرت کی شرط سے کیا گیا، کیونکہ ہجرت صرف وہی عورت کرے گی جو اللہ ورسول کی محبت کو اپنے سارے خاندان اور وطن وجائیداد کی محبت سے غالب رکھے، نیز ہجرت کے وقت انسان کو طرح طرح کی تکلیفیں پیش آتی ہیں، اور اللہ کی راہ میں جو تکلیف ومشقت اٹھائی جائے اس کو اصلاح اعمال میں خاص دخل ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ماں اور باپ کے خاندان کی لڑکیوں سے نکاح میں آنحضرت ﷺ کے لئے ایک خصوصی شرط یہ ہے کہ انہوں نے مکہ سے ہجرت کرنے میں آپ کا ساتھ دیا ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ: یہ حکم اس پر دلالت کرتا ہے کہ بیویوں کا زیادہ ہونا کمال زہد کے خلاف نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ ''تیری عورتیں جن کا مہر تو دے چکا'': یعنی جو اب تیرے نکاح میں ہیں، خواہ قریش سے ہوں اور مہاجر ہوں یا نہ ہوں، سب حلال رہیں ان میں سے کسی کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی لونڈیاں، باندیاں جو غنیمت وغیرہ سے ہاتھ لگی ہوں۔

فائدہ: ۳ اور چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ کی بیٹیاں یعنی قریش میں سے جو باپ یا ماں کی طرف سے قرابت دار ہوں بشرط ہجرت کے حلال ہیں ان سے نکاح کر سکتے ہو۔

وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ

اور جو عورت ہو مسلمان اگر بخش دے اپنی جان نبی کو ۱ اگر نبی چاہے کہ اس کو نکاح میں لائے، یہ خالص ہے تیرے لیے

مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ

سوائے سب مسلمانوں کے، ہم کو معلوم ہے جو مقرر کر دیا ہے ہم نے ان پر ان کی عورتوں کے حق میں اور ان کے ہاتھ کے مال میں

لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۰

تا کہ نہ رہے تجھ پر تنگی، اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: (۴ چوتھا حکم) اور اس مسلمان عورت کو بھی (آپ کے لئے حلال کیا) جو بلا عوض (یعنی بلا مہر) اپنے کو پیغمبر کو دے

دے (یعنی نکاح میں آنا چاہے) بشرطیکہ پیغمبر اس کو نکاح میں لانا چاہے (مسلمان کی قید سے کافرہ نکل گئی کہ حضور ﷺ کو اس سے نکاح درست نہ تھا اور یہ مسلمان کی قید پانچواں حکم ہے، اور) یہ سب (احکام) آپ کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں، نہ اور مومنین کے لئے (کہ ان کے لئے دیگر احکام ہیں، چنانچہ) ہم کو وہ احکام معلوم ہیں (اور آیات و احادیث کے ذریعہ دوسروں کو بھی بتلا دیے دیئے ہیں) جو ہم نے ان (عام مومنین) پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں مقرر کئے ہیں (جو ان احکام سے الگ اور علیحدہ ہیں، جن میں سے نمونہ کے طور پر ایک گذشتہ آیت: اذا نکحتم میں مذکور ہے، جس میں فمتعوھن سے مہر کا لازم ہونا ہر نکاح کے لئے ثابت ہوتا ہے، خواہ باہمی طے کرنے کی وجہ سے ہو یا شرعی حکم کی وجہ سے، اور چوتھے حکم میں نکاح نبوی مہر سے خالی ہے اور یہ خصوصیت اس لئے ہے) تاکہ آپ پر کسی قسم کی تنگی (واقع) نہ ہو (پس جن مخصوص احکام میں آپ کے لیے دوسروں سے زیادہ گنجائش ہے جیسے پہلا اور چوتھا حکم، ان میں تو تنگی نہ ہونا ظاہر ہے، اور جن میں ظاہراً تنگی وقید ہے جیسے تیسرا اور پانچواں حکم، وہاں تنگی نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے یہ قید آپ کے بعض مصالح کے لئے لگائی ہے اگر یہ قید نہ ہوتی تو آپ کی وہ مصلحت فوت ہوجاتی اور اس وقت آپ کو تنگی ہوتی جو ہم کو معلوم ہے، اس لئے اس مصلحت کی رعایت کی گئی تاکہ وہ محتمل تنگی واقع نہ ہو) اور (حرج دور کرنے کی رعایت کچھ انہی خاص احکام میں ہی نہیں ہے، بلکہ عام مومنین کے متعلق جو احکام ہیں ان میں بھی یہ امر ملحوظ ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (پس رحمت سے احکام میں سہولت کی رعایت فرماتے ہیں، اور آسان احکام میں بھی کوتاہی ہوجانے پر احیاناً مغفرت فرماتے ہیں جو کہ انتہائی رحمت کی دلیل ہے اور احکام میں آسانی اور حرج کو دور کرنے کا یہی سبب ہے)۔

وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ: ④ چوتھا حکم: یعنی اگر کوئی مسلمان عورت اپنے نفس کو آپ کے لئے ہبہ کردے، یعنی بغیر مہر کے آپ سے نکاح کرنا چاہے، اگر آپ اس سے نکاح کا ارادہ کریں تو آپ کے لئے بلا مہر کے بھی نکاح حلال ہے، اور یہ خاص حکم بھی آپ کے لئے ہے ،دوسرے مومنین کے لئے نہیں"، اس معاملہ کی خصوصیت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بالکل واضح ہے، کیونکہ عام لوگوں کے لئے نکاح میں مہر شرط لازم ہے، یہاں تک کہ اگر بوقت نکاح کسی مہر کا ذکر نہیں یا نفی کے ساتھ آیا کہ عورت نے کہا کہ مہر نہیں لوں گی، یا مرد نے کہا کہ نکاح اس شرط پر کرتے ہیں کہ مہر نہیں دیں گے، دونوں صورتوں میں ان کا کہنا اور شرط شرعی حیثیت سے لغو ہوگی، اور شرعاً مہر مثل واجب ہوگا، صرف رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت سے نکاح بلا مہر حلال کیا گیا ہے جبکہ عورت بلا مہر نکاح کرنے کی خواہش مند ہو، واضح رہے کہ یہاں ان وھبت کی شرط حلال یا جائز ہونے کے لیے نہیں ہے، بلکہ اصل شرط تو صرف ایمان ہے، یہ قید شبہ دور کرنے کے لیے ہے اور درحقیقت اس سے نکاح کا حکم بطریق اولی ثابت ہوتا ہے، کیونکہ آزاد عورت ہبہ کا محل نہیں، جب اس بلا عوض عقد سے وہ حلال ہوجاتی ہے تو عوض کے ساتھ نکاح سے تو بدرجہ اولی حلال ہوجائے گی، سو حاصل یہ ہوا کہ اقارب کے لیے تو ہجرت شرط ہے، اور اجنبی خواتین کے لیے ایمان کافی ہے اگرچہ بلا عوض نکاح ہوجائے۔

یہ حکم کہ جو عورت آپ کے لئے اپنے آپ کو ہبہ کرے، یعنی بلا مہر کے نکاح کرنا چاہے وہ آپ کے لئے حلال ہے، اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کوئی ایسا واقعہ پیش بھی آیا یا نہیں؟ بعض نے فرمایا کہ کسی ایسی عورت سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح کرنا ثابت نہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے کسی ہبہ کرنے والی عورت سے نکاح نہیں کیا، اور بعض حضرات نے بعض ایسی عورتوں سے نکاح ہونا ثابت کیا ہے۔

⑤ پانچواں حکم: جو آیت مذکورہ میں "مومنہ" کی قید سے مستفاد ہوتا ہے یہ کہ اگرچہ عام مسلمانوں کے لئے یہود و نصاریٰ کی عورتوں یعنی کتابیات سے نکاح بنص قرآن حلال ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کے لئے عورت کا مومن ہونا شرط ہے، کتابیات سے آپ کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ: چوتھے اور پانچویں حکم کے ساتھ جو جملہ خالصة لك کا آیا ہے، اس کو بعض حضرات نے صرف اسی حکم کے ساتھ مخصوص کہا ہے اور زمخشری وغیرہ مفسرین نے اس جملے کو ان تمام احکام کے ساتھ لگایا ہے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں، کہ یہ سب خصوصیات نبی کریم ﷺ کی ہیں۔

* * *

فائدہ: لے ''اور جو عورت بخشے نبی کو اپنی جان'': یعنی بلا مہر کے نکاح میں آنا چاہے وہ بھی حلال ہے، اگر آپ ﷺ اس طرح نکاح میں لانا پسند کریں، یہ اجازت خاص پیغمبر کے لیے ہے، گو آپ نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا (کمافی الفتح) شاید ان اراد النبی کی شرط سے اباحت مرجوحہ سمجھی ہو۔

بہر حال! دوسرے مسلمانوں کے لیے وہ ہی حکم ہے، جو معلوم ہو چکا: اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ (النساء: ۲۴) یعنی بلا مہر نکاح نہیں، خواہ عقد کے وقت ذکر آیا، خواہ پیچھے ٹھہرا لیا، یا نہ ٹھہرایا تو مہر مثل (جو اس کی قوم کا مہر ہو) واجب ہوگا، پیغمبر ﷺ پر سے اللہ تعالیٰ نے یہ مہر کی قید اٹھا دی تھی، برخلاف مومنین کے کہ ان کو نہ چار سے زائد سے اجازت، نہ بدون مہر کے نکاح درست۔

تنبیہ: آنحضرت ﷺ نے پچیس سال کی عمر تک جو شباب کی امنگوں کے اصلی دن ہوتے ہیں محض تجرد میں گزارے، پھر اقرباء کے اصرار اور دوسری جانب کی درخواست پر حضرت خدیجہؓ سے (جن کی عمر ڈھل چکی تھی اور دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھیں) آپ نے عقد کیا، ترپن (۵۳) سال کی عمر تک پورے سکون وطمانیت سے اسی پاکباز بیوی کے ساتھ زندگی بسر کی، یہ ہی زمانہ تھا کہ آپ ساری دنیا سے الگ غاروں اور پہاڑوں میں جا کر خدائے واحد کی عبادت کیا کرتے تھے اور یہ اللہ کی نیک بندی آپ ﷺ کے لیے توشہ تیار کرتی اور عبادت الٰہی اور سکون قلبی کے حصول میں آپ ﷺ کی اعانت وامداد کیا کرتی تھی۔

زندگی کے اس طویل عرصہ میں جو دوسرے لوگوں کے لیے عموماً نفسانی جذبات کی انتہائی ہنگامہ خیزیوں کے اٹھ اٹھ کر ختم ہو جانے کا زمانہ ہوتا ہے، کوئی معاند سے معاند اور کٹر سے کٹر متعصب دشمن بھی ایک حرف، ایک نقطہ، ایک شوشہ آپ کی پیغمبرانہ عصمت اور خارق عادت عفاف وپاکبازی کے خلاف نقل نہیں کر سکتا۔ اور واضح رہے کہ یہ اس اکمل البشر کی سیرت کا ذکر ہے جس نے خود اپنی نسبت فرمایا کہ مجھ کو جو جسمانی قوت عطا ہوئی ہے، وہ اہل جنت میں سے چالیس مردوں کی برابر ہے، جن میں سے ایک مرد کی قوت سو کے برابر ہوگی، گویا اس حساب سے دنیا کے چار ہزار مردوں کی برابر قوت حضور کو عطا فرمائی گئی تھی۔ اور بیشک دنیا کے اکمل ترین بشر کی تمام روحانی وجسمانی قوتیں ایسے ہی اعلیٰ اور اکمل پیمانہ پر ہونی چاہیں، اس حساب سے اگر فرض کیجیے چار ہزار بیویاں آپ کے نکاح میں ہوتیں تو آپ ﷺ کی قوت کے اعتبار سے اس درجہ میں شمار کیا جا سکتا تھا جیسے ایک مرد ایک عورت سے نکاح کر لے۔ لیکن اللہ اکبر! اس شدید ریاضت اور ضبط نفس کا کیا ٹھکانہ ہے کہ ترپن سال کی عمر اس تجرد یا زہد کی حالت میں گزار دی۔

پھر حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد اپنے سب سے بڑے جان نثار وفادار رفیق کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہؓ سے عقد کیا، ان کے سوا آٹھ بیوائیں آپ کے نکاح میں آئیں، وفات کے بعد نو موجود تھیں، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

① حضرت عائشہؓ ② حضرت حفصہؓ ③ حضرت سودہؓ ④ حضرت ام سلمہؓ ⑤ حضرت زینبؓ
⑥ حضرت ام حبیبہؓ ⑦ حضرت جویرہؓ ⑧ حضرت صفیہؓ ⑨ حضرت میمونہؓ (ان میں پچھلی تین قریشی نہیں)

دنیا کا سب سے بڑا بے مثال انسان جو اپنے فطری قویٰ کے لحاظ سے کم از کم چار ہزار بیویوں کا مستحق ہو، کیا نو (۹) کا عدد دیکھ کر کوئی انصاف پسند اس پر کثرت ازواج کا الزام لگا سکتا ہے، پھر جب ہم ایک طرف دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی عمر ترپن سال سے متجاوز ہو چکی تھی، باوجود عظیم الشان فتوحات کے ایک دن پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتے تھے، جو آتا اللہ کے راستہ میں دے ڈالتے، اختیاری فقر وفاقہ سے پیٹ کو پتھر باندھتے، مہینوں ازواج مطہرات کے مکانوں سے دھواں نہ نکلتا، پانی اور کھجور پر گذارہ چلتا، روزہ پر روزہ رکھتے، کئی کئی دن افطار نہ کرتے، راتوں کو اللہ کی عبادت میں کھڑے رہنے سے پاؤں پر ورم ہو جاتا، لوگ دیکھ کر رحم کھانے لگتے، عیش وطرب کا سامان تو کجا، تمام بیویوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ جسے آخرت کی زندگی پسند ہو، ہمارے ساتھ رہے، جو دنیا کا عیش چاہے رخصت ہو جائے، ان حالات کے باوجود دوسری طرف دیکھا جاتا ہے کہ سب ازواج کے حقوق ایسے اکمل واحسن طریقہ سے ادا فرماتے جس کا تحمل بڑے سے بڑا طاقتور مرد نہیں کر سکتا اور میدان جنگ میں لشکروں کے مقابلہ پر جب بڑے بڑے جوان مرد بہادر دل چھوڑ بیٹھتے تھے آپ ﷺ پہاڑ کی طرح ڈٹے رہتے اور زبان سے فرماتے: ''الیّ عباد الله ! انا رسول الله'' اور ''انا النبی لا کذب انا بن عبدالمطلب''۔

بیویوں کا تعلق فرائض عبودیت ورسالت کی بجا آوری میں ذرہ برابر فرق نہ ڈالتا، نہ کسی سخت سے سخت کٹھن کام میں ایک منٹ کے لیے ضعف وتعب لاحق ہوتا، کیا یہ خارق عادت احوال اہل بصیرت کے نزدیک معجزہ سے کچھ کم ہیں؟ حقیقت میں جس طرح آپ ﷺ کا بچپن اور آپ ﷺ کی جوانی ایک معجزہ تھی، بڑھاپا بھی ایک معجزہ ہے، سچ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کی پاک زندگی کے ہر ایک دور میں پاک بزرگ متقیوں کے لیے کچھ نمونے رکھ دیے ہیں، جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی عملی رہبری کر سکیں۔

ازواج مطہرات کی جس نام نہاد کثرت پر مخالفین کو اعتراض ہے وہ ہی امت مرحومہ کے لیے اس کا ذریعہ بنی کہ پیغمبر کا اتباع کرنے والے مرد اور عورتیں ان حکموں اور نمونوں سے بے تکلف واقف ہوں، یا بالخصوص باطنی احوال اور خانگی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، گویا کثرت ازواج میں ایک بڑی مصلحت یہ ہوئی کہ خانگی معاشرت اور نسوائی مسائل کے متعلق نبی کے احکام اور اسوہ حسنہ کی اشاعت کافی حد تک بے تکلف ہو سکے، نیز مختلف قبائل اور جماعتوں کو آپ کی دامادی کا شرف حاصل ہوا اور اس طرح ان کی وحشت ونفرت بھی کم ہوئی اور اپنے کنبہ کی عورتوں سے آپ ﷺ کی پاکدامنی، خوبی اخلاق، حسن معاملہ اور بے لوث کریکٹر کو سن کر اسلام کی طرف رغبت بڑھی، شیطانی شکوک واوہام کا ازالہ ہوا، اور اس طرح خدا کے عاشقوں، آپ ﷺ کے فدا کاروں اور دنیا کے ہادیوں کی وہ عظیم الشان جماعت تیار ہوئی جس سے زیادہ پرہیزگار وپاکباز کوئی جماعت (بجز انبیاء کے) آسمان کے نیچے کبھی نہیں پائی گئی اور جو کسی برے کریکٹر رکھنے والے کی تربیت میں محال تھا کہ تیار ہو سکے۔

تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآءُ مِنۡهُنَّ وَتُـْٔوِیۡۤ اِلَیۡكَ مَنۡ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابۡتَغَیۡتَ مِمَّنۡ عَزَلۡتَ فَلَا جُنَاحَ

پیچھے رکھ دے تو جسکو چاہے ان میں اور جگہ دے اپنے پاس جسکو چاہے، اور جسکو جی چاہے تیرا ان میں سے جن کو کنارے کر دیا تھا تو کچھ گناہ نہیں

عَلَیۡكَ ؕ ذٰلِكَ اَدۡنٰۤی اَنۡ تَقَرَّ اَعۡیُنُهُنَّ وَلَا یَحۡزَنَّ وَیَرۡضَیۡنَ بِمَاۤ اٰتَیۡتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ

تجھ پر، اس میں قریب ہے کہ ٹھنڈی رہیں آنکھیں ان کی اور غم نہ کھائیں اور راضی رہیں اس پر جو تو نے دیا ان سب کی سب کو، اور اللہ جانتا ہے

مَا فِیۡ قُلُوۡبِكُمۡ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا ﴿۵۱﴾

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا تحمل والا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں تو ان عورتوں کی اقسام کا بیان تھا جو آپ کے لئے حلال کی گئیں، اب اس کا بیان ہے کہ جو اقسام حلال کی گئیں ہیں ان میں سے جتنی جس وقت آپ کے پاس ہوں ان کے کیا احکام ہیں، پس (۶) چھٹا حکم یہ ارشاد ہے کہ:

ان میں سے آپ جس کو چاہیں (اور جب تک چاہیں) اپنے سے دور رکھیں (یعنی اس کو باری نہ دیں) اور جس کو چاہیں (اور جب تک چاہیں) اپنے نزدیک رکھیں (یعنی اس کو باری دیں) اور جن کو دور کر رکھا تھا ان سے پھر کسی کو طلب کریں تب بھی آپ پر کوئی گناہ نہیں (مطلب یہ ہوا کہ ازواج میں رات گذارنے کی باری وغیرہ کی رعایت آپ پر واجب نہیں اور اس میں ایک ضروری مصلحت کی رعایت ہے وہ یہ کہ) اس میں زیادہ توقع ہے کہ ان (بیبیوں) کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی (یعنی خوش رہیں گی) اور آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ بھی آپ ان کو دے دیں گے اس پر سب کی سب راضی رہیں گی (کیونکہ رنج اکثر استحقاق کے دعوی کی وجہ سے ہوتا ہے کہ ہمارا یہ حق تھا جو ہم کو نہیں دیا گیا، اور جب یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا کوئی حق نہیں اور جو کچھ توجہ وغیرہ مبذول ہوگی وہ محض احسان ہے تو پھر کسی کو کوئی شکایت نہ رہے گی، اور باندیوں کا باری میں حق نہ ہونا سب ہی کو معلوم ہے) اور (اب مسلمانوں کو خطاب ہے کہ اے مسلمانو! یہ خاص خاص احکام سن کر دل میں یہ خیالات مت پکا لینا کہ یہ احکام سب کے لیے عام کیوں نہ ہوئے، اگر ایسا کرو گے تو) خدا تعالیٰ کو تم لوگوں کے دلوں کی سب باتیں معلوم ہیں (ایسا خیال پکا لینے پر تم کو سزا دے گا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض اور رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم پر حسد ہے جو کہ عذاب کا سبب ہے) اور اللہ تعالیٰ (یہی کیا) سب کچھ جاننے والا ہے (اور اعتراض کرنے والوں کو جلدی سزا نہ دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو علم نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) بردبار (بھی) ہے (اس لئے کبھی سزا میں ڈھیل بھی دیتا ہے)۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ: ⑥ چھٹا حکم: مطلب یہ ہے کہ آپ کو اختیار ہے کہ ازواج مطہرات میں سے جس کو چاہیں موخر کردیں جس کو چاہیں اپنے قریب کریں، یہ رسول اللہ، کا مخصوص حکم ہے، عام امت کے لوگوں کے لئے جب متعدد بیویاں ہوں تو سب میں برابری کرنا ضروری ہے، اس کے خلاف کرنا حرام ہے، برابری سے مراد نفقہ کی برابری اور شب باشی میں برابری ہے کہ جتنی راتیں ایک بیوی کے ساتھ گزاریں اتنی دوسری اور تیسری کے ساتھ گزارنا چاہئے، کمی بیشی ناجائز ہے۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاملے میں مکمل اختیار دے دیا کہ جس بی بی سے ایک مرتبہ اجتناب کا ارادہ کرلیا پھر اگر چاہیں تو اس کو پھر قریب کرسکتے ہیں۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ: یہ چھٹے حکم کی علت و حکمت کا بیان ہے کہ آپ کو یہ عام اختیار دینے کی مصلحت یہ ہے کہ سب ازواج مطہرات کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ اپنے حصہ پر راضی رہیں، یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یہ حکم تو بظاہر ازواج مطہرات کی مرضی اور منشاء کے خلاف اور ان کے رنج کا سبب ہوسکتا ہے، اس کو ازواج کی خوشی کا سبب کیسے قرار دیا گیا؟ اس کا جواب خلاصہ تفسیر میں اوپر آچکا ہے کہ دراصل ناراضی کا اصل سبب اپنا استحقاق ہوتا ہے، جس شخص کے متعلق انسان کو یہ معلوم ہو کہ میرا فلاں حق اس کے ذمہ واجب ہے، اگر وہ اس کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو رنج و غم پیش آتا ہے اور جس شخص پر ہمارا کوئی حق واجب نہ ہو پھر وہ جو کچھ بھی مہربانی کرے وہ خوشی ہی خوشی ہوتی ہے، یہاں بھی جب یہ بتلادیا گیا کہ ازواج میں برابری کرنا آپ پر واجب نہیں، بلکہ آپ مختار ہیں تو اب جس بیوی کو جتنا حصہ بھی آپ کی توجہ اور صحبت کا ملے گا، وہ اس کو ایک احسان و تبرع سمجھ کر خوش ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی واھبتہ النفس کے متعلق اختیار ہے قبول کرو یا نہ کرو، اور موجودہ بیویوں میں سے جس کو چاہو رکھو یا طلاق دے دو، نیز جو بیویاں رہیں آپ پر قسم (باری باری سے رہنا) واجب نہیں، جسے چاہیں باری میں آگے پیچھے کرسکتے ہیں، اور جسے کنارے کردیا ہو اسے دوبارہ واپس لینے کا بھی اختیار ہے، یہ حقوق و اختیارات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیے گئے تھے، مگر آپ نے مدت العمر ان سے کام نہیں لیا، معاملات میں اس قدر عدل و مساوات کی رعایت فرماتے تھے جو بڑے سے بڑا محتاط آدمی نہیں کرسکتا، اس پر بھی اگر قلبی میلان کس کی طرف بے اختیار ہوتا تو فرماتے: "اللهم هذا قسمي فيما املك فلا تلمني فيما تملك و لا املك" (اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے ان چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں، جو چیز صاف تیرے قبضہ میں ہے، میرے اختیار میں نہیں اس پر ملامت نہ کیجئے) شاید: وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا میں اسی طرف اشارہ ہو۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "کسی مرد کی کئی عورتیں ہوں تو اس پر باری سے سب کے پاس برابر رہنا واجب ہے، حضرت پر یہ واجب نہ تھا، اس واسطے کہ عورتیں اپنا حق نہ سمجھیں، تو جو دیں راضی ہوکر قبول کریں (ورنہ روز یہ ہی کشمکش اور جھنجھٹ رہا کرتی، مہمات دین میں خلل پڑتا، اور ازواج کی نظر بھی دنیا سے بالکل یکسو ہوکر مقصد اصلی کی طرف نہ رہتی، اسی غم و فکر میں مبتلا رہا کرتیں) پر حضرت نے اپنی طرف سے فرق نہیں کیا سب کی باری برابر رکھی، ایک حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے (جب عمر زیادہ ہوگئی) اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بخش دی تھی"۔

لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ

حلال نہیں تجھ کو عورتیں اس کے بعد اور نہ یہ کہ ان کے بدلے کرلے اور عورتیں اگرچہ خوش لگے تجھ کو ان کی صورت ۱؎

اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ﴿۵۲﴾ ع

مگر جو مال ہو تیرے ہاتھ کا ۲؎ اور ہے اللہ ہر چیز پر نگہبان ۳؎

خلاصہ تفسیر: آگے بقیہ احکام مذکور ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں جن میں بعض نئے احکام ہیں اور بعض گذشتہ احکام

کا تتمہ ہیں، پس ارشاد ہے کہ پیچھے جو تیسرے اور پانچویں حکم میں منکوحہ عورتوں میں ہجرت اور ایمان کی قید لگائی ہے سو:

ان کے علاوہ اور عورتیں (جن میں یہ پیچھے بیان کردہ قید نہ ہو) آپ کے لئے حلال نہیں ہیں (یعنی اہل قرابت میں سے ہجرت نہ کرنے والی حلال نہیں اور دوسری عورتوں میں سے جو مؤمنہ نہ ہو وہ حلال نہیں، یہ تو پہلے حکم کا تتمہ ہوا) اور (اب ⑥ ساتواں حکم نیا یہ ہے کہ) نہ یہ درست ہے کہ آپ ان (موجودہ) بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں کرلیں (اس طرح سے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دے دیں اور اس کی جگہ دوسری کرلیں، کیونکہ اس میں کم فہموں کو غرض پرستی کا شبہ ہوسکتا ہے کہ اپنے ایک نفسانی نفع کے لیے نئی بیوی کرلی، اور پہلی کو نقصان پہنچایا گیا، اور یوں بغیر ان کے طلاق دیئے ہوئے اگر کسی سے نکاح کرلیں تو اس کی ممانعت نہیں، اسی طرح اگر ایک کی جگہ دوسری سے نکاح یعنی بیوی بدلنے کا قصد نہ ہو اور کسی کو طلاق دے دیں تو اس کی ممانعت بھی ثابت نہیں، کیونکہ اس صورت میں اس شبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی، لفظ تبدل اس مجموعہ کی ممانعت پر دلالت کرتا ہے، پس یہ بدلنا ممنوع ہے) اگرچہ آپ کو ان (دوسریوں) کا حسن اچھا معلوم ہو مگر جو آپ کی مملوکہ ہو (کہ باندیاں ان احکام سے مستثنیٰ ہیں، یعنی وہ کتابیہ ہونے پر بھی حلال ہیں، اور اس میں ایک کی جگہ دوسری کا بدلنا بھی جائز ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز (کی حقیقت اور آثار و مصالح) کا پورا نگراں ہے (اس لئے ان سب احکام میں مصلحتیں و حکمتیں ہیں اگرچہ عام لوگوں کو معلوم نہ ہوں، اس واسطے کسی کو سوال یا اعتراض کا منصب و استحقاق نہیں)۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ: ⑥ ساتواں حکم: یعنی اس کے بعد آپ کے لئے دوسری عورتوں سے نکاح حلال نہیں، اور یہ بھی حلال نہیں کہ موجودہ ازواج میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بدلیں"۔

اس آیت میں لفظ من بعد کی دو تفسیریں ہوسکتی ہیں: ① ایک یہ کہ من بعد سے مراد یہ ہو کہ ان نو عورتوں کے بعد جو اس وقت آپ کے نکاح میں ہیں، اور کسی سے آپ کا نکاح حلال نہیں، بعض صحابہ اور آئمہ تفسیر سے بھی یہی تفسیر منقول ہے، جیسا کہ حضرت انس نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو اختیار دیا کہ دنیا طلبی کے لئے آپ سے جدائی اختیار کریں یا پھر تنگی و فراخی جو کچھ پیش آئے اس پر قناعت کرکے آپ کی زوجیت میں رہیں، تو سب ازواج مطہرات نے اپنے نفقہ کی زیادتی کے مطالبہ کو چھوڑ کر اسی حال میں زوجیت کے اندر رہنا اختیار کیا تو اس پر بطور انعام کے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات گرامی کو بھی انہی نو ازواج کے لئے مخصوص کردیا، ان کے سوا کسی سے نکاح جائز نہ رہا، اور حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو آپ کے لئے مخصوص فرمادیا کہ آپ کے بعد بھی وہ کسی سے نکاح نہیں کرسکتیں، اسی طرح آپ کو بھی ان کے لئے مخصوص فرمادیا کہ آپ ان کے علاوہ اور کوئی نکاح نہیں کرسکتے۔

② حضرت عکرمہ، ابن عباس اور مجاہد آئمہ تفسیر سے ایک روایت میں لفظ من بعد کی یہ تفسیر نقل کی گئی ہے کہ: "من بعد الاصناف المذکورۃ"، یعنی شروع آیت میں آپ کے لئے جتنی اقسام عورتوں کی حلال کی گئی ہیں، اس کے بعد یعنی ان کے سوا کسی اور قسم کی عورتوں سے آپ کا نکاح حلال نہیں، مثلاً شروع آیت میں اپنے خاندان کی عورتوں میں سے صرف وہ حلال کی گئیں جنہوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے میں آپ کی موافقت کی تھی، خاندان کی عورتوں میں غیر مہاجرات سے آپ کا نکاح حلال نہیں رکھا گیا، اسی طرح مومنہ کی قید لگا کر آپ کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح ناجائز قرار دے دیا گیا، تو آیت کے جملہ من بعد کا مطلب یہ ہے کہ جتنی قسمیں آپ کے لئے حلال کردی گئی ہیں صرف انہی میں سے آپ کا نکاح ہوسکتا ہے، عام عورتوں میں تو مسلمان ہونا ہی شرط ہے اور خاندان کی عورتوں میں مسلمان ہونے کے ساتھ مہاجرہ ہونا بھی شرط ہے، جن میں یہ دو شرطیں موجود نہ ہوں، ان سے آپ کا نکاح حلال نہیں، اس تفسیر کے مطابق یہ جملہ کوئی نیا حکم نہیں، بلکہ پہلے ہی حکم کی تاکید و توضیح ہے، جو شروع آیت میں بیان ہوا ہے اور اس آیت کی وجہ سے نو کے بعد کسی اور عورت سے نکاح حرام نہیں کیا گیا، بلکہ غیر مومنہ اور خاندان کی غیر مہاجرہ سے نکاح ممنوع ہوا ہے جو پہلے ہی معلوم ہوچکا ہے، باقی عورتوں سے مزید نکاح آپ کے اختیار میں رہا، حضرت عائشہ صدیقہ کی ایک روایت سے بھی اس دوسری تفسیر کی تائید ہوتی ہے، کہ آپ کیلئے مزید نکاح کرنے کی اجازت رہی ہے، واللہ اعلم۔

آیت مذکورہ کی اگر دوسری تفسیر اختیار کی جائے تو اس جملے کا مطلب واضح ہے کہ اگرچہ آپ کو موجودہ ازواج کے علاوہ دوسری عورتوں سے

نکاح بشرائط مذکورہ جائز ہے، مگر یہ جائز نہیں کہ ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری کو بدلیں یعنی خالص تبدیلی کی نیت سے کوئی نکاح جائز نہیں، بغیر لحاظ ونیت تبدیلی کے جتنے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں، اور اگر آیت مذکورہ کی پہلی تفسیر مراد لی جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ آئندہ نہ کسی عورت کا اضافہ موجودہ ازواج میں آپ کر سکتے ہیں، اور نہ کسی کی تبدیلی کر سکتے ہیں، کہ اسے طلاق دے کر اس کے قائم مقام کسی اور عورت سے نکاح کر لیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَّلَوۡ اَعۡجَبَكَ حُسۡنُهُنَّ: اس پر کوئی شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ کسی کے حسن کا اچھا ہونا غیر اختیاری بات ہے، دوسرے اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہے اس کو ویسا ہی سمجھنا سو یہ تو واقع میں کمال ہے، کیونکہ حسین کو بدصورت سمجھنا یہ کوئی کمال نہیں، اور جو بات شرعاً بری اور مذموم ہے وہ یہ ہے کہ بلاضرورت اور بغیر شرعی اجازت کے قصداً نظر کرنا یا اس کے تصور سے لذت لینا، سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منزہ تھے اور قرآن کا لفظ اس پر کسی طرح دلالت نہیں کرتا، بلکہ دوسرے دلائل اس کے خلاف پر موجود ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جتنی قسمیں: اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ الّٰتِیۡۤ اٰتَیۡتَ اُجُوۡرَهُنَّ (الاحزاب: ۵۰) میں فرمادیں، اس سے زیادہ حلال نہیں، اور جو اب موجود ہیں ان کو بدلنا حلال نہیں، یعنی یہ کہ ان میں سے کسی کو اس لیے چھوڑ دو کہ دوسری اس کی جگہ کر لاؤ، حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ یہ ممانعت آخر کو موقوف ہوگئی، مگر واقعہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اس کے بعد کوئی نکاح کیا، نہ ان میں سے کسی کو بدلا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت سب ازواج برابر موجود رہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی لونڈی یا باندی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حرم (باندیاں) مشہور ہیں:

① ایک ماریہ قبطیہؓ جن کے شکم سے صاحبزادہ حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے، بچپن میں انتقال کر گئے۔ ② دوسری ریحانہؓ۔

فائدہ: ۳ یعنی اللہ کی نگاہ میں ہے جو اس کے احکام وحدود کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں کرتے، اس کا خیال رکھ کر کام کرنا چاہیے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡذَنَ لَكُمۡ اِلٰی طَعَامٍ غَیۡرَ نٰظِرِیۡنَ اِنٰىهُ

اے ایمان والو مت جاؤ نبی کے گھروں میں مگر جو تم کو حکم ہو کھانے کے واسطے نہ راہ دیکھنے والے اس کے پکنے کی

وَلٰكِنۡ اِذَا دُعِیۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا وَلَا مُسۡتَاۡنِسِیۡنَ لِحَدِیۡثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمۡ

لیکن جب تم کو بلائے تب جاؤ ۱ پھر جب کھا چکو تو آپ آپ کو چلے جاؤ اور نہ آپس میں جی لگا کر بیٹھو باتوں میں ۲ اس بات سے تمہاری

كَانَ یُؤۡذِی النَّبِیَّ فَیَسۡتَحۡیٖ مِنۡكُمۡ ۫ وَاللّٰهُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا

تکلیف تھی نبی کو پھر تم سے شرم کرتا ہے، اور اللہ شرم نہیں کرتا ٹھیک بات بتلانے میں ۳ اور جب مانگنے جاؤ بیبیوں سے کچھ چیز کام کی

فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمۡ اَطۡهَرُ لِقُلُوۡبِكُمۡ وَقُلُوۡبِهِنَّ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمۡ اَنۡ تُؤۡذُوۡا

تو مانگ لو پردہ کے باہر سے، اس میں خوب ستھرائی ہے تمہارے دل کو اور ان کے دل کو ۴ اور تم کو نہیں پہنچتا کہ تکلیف دو

رَسُوۡلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنۡ تَنۡكِحُوۡۤا اَزۡوَاجَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمۡ كَانَ عِنۡدَ اللّٰهِ عَظِیۡمًا ﴿۵۳﴾

اللہ کے رسول کو اور نہ یہ کہ نکاح کرو اس کی عورتوں سے اس کے پیچھے کبھی، البتہ یہ تمہاری بات اللہ کے یہاں بڑا گناہ ہے ۵

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں نکاح کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص کو بیان فرمایا اور ان امور کی ممانعت فرمائی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے باعث ایذا اور موجب تکلیف ہوں، اس سے پہلے بھی ایذا نبوی کے انواع واقسام اور ان کے احکام کا بیان ہو چکا تھا اس لئے

اب آئندہ آیات میں ایک خفیف اور معمولی ایذا نبوی کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو بعض لوگوں کی جانب سے بلا قصد اور بلا ارادہ ایسی چیز ظہور میں آئی کہ جو حضور ﷺ کی ایذاء کا سبب بنی، جس کا قصہ یہ ہے کہ جب آپ ﷺ کی شادی حضرت زینب سے ہوئی تو آپ نے لوگوں کی دعوت ولیمہ فرمائی، اکثر لوگ تو کھانا کھا کر چلے گئے، بعض لوگ کھانے کے بعد گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہے، آپ ﷺ نے کئی بار اٹھنے کا ارادہ کیا تا کہ لوگ بھی اٹھ جائیں، مگر اس اشارہ کو وہ لوگ نہ سمجھے، آخر آپ اٹھ کھڑے ہوئے، اس وقت سب اٹھ گئے مگر تین شخص پھر بھی بیٹھے رہے، آپ پھر تشریف لائے تب بھی وہ بیٹھے تھے، آپ لوٹ گئے، تب وہ اٹھ کر چلے گئے، حضرت انس ؓ نے آپ کو خبر کی پھر آپ حجرہ مبارکہ میں تشریف لائے، اس وقت یہ آیتیں یعنی: یایھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوت النبی سے لے کر: ان اللہ کان علی کل شیء شھیدا تک نازل ہوئیں۔

اے ایمان والو نبی کے گھروں میں (بغیر بلائے) مت جایا کرو مگر جس وقت تم کو کھانے کے لئے (آنے کی) اجازت دی جائے (تو جانا مضائقہ نہیں، مگر تب بھی جانا) ایسے طور پر (ہو) کہ اس (کھانے) کی تیاری کے منتظر نہ رہو (یعنی بغیر دعوت تو جاؤ مت، اور دعوت ہو تب بھی بہت پہلے سے مت جا بیٹھو) لیکن جب تم کو بلایا جائے (کہ اب چلو کھانا تیار ہے) تب جایا کرو، پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھا کرو (کیونکہ) اس بات سے نبی کو ناگواری ہوتی ہے سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں (اور زبان سے نہیں فرماتے کہ اٹھ کر چلے جاؤ) اور اللہ تعالیٰ صاف بات کہنے سے (کسی کا) لحاظ نہیں کرتا (اس لئے صاف صاف تم کو کہہ دیا) اور (اب سے یہ حکم کیا جاتا ہے کہ حضرت کی ازواج تم سے پردہ کیا کریں گی تو اب سے) جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر (کھڑے ہو کر وہاں) سے مانگا کرو (یعنی بغیر ضرورت تو پردہ کے پاس جانا اور بات کرنا بھی نہیں چاہئے، لیکن ضرورت میں کلام کا مضائقہ نہیں، مگر دیکھنے اور جھانکنے کی اجازت نہیں) یہ بات (ہمیشہ کے لئے) تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کے پاک رہنے کا عمدہ ذریعہ ہے (یعنی اب تک جانبین کے دل پاک ہیں، اور اس سے آئندہ کے لیے بھی ان کی پاکیزگی اور طہارت ثابت ہو گئی جس کا ان حضرات میں غیر معصوم کے اعتبار سے فی نفسہ احتمال ہو سکتا تھا) اور (ایذاء نبوی کا حرام ہونا صرف فضول جم کر بیٹھ جانے ہی کی صورت میں منحصر نہیں، بلکہ مطلق طور پر حکم یہ ہے کہ) تم کو (کسی معاملہ میں) جائز نہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) کو کلفت پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے کبھی بھی نکاح کرو، یہ خدا کے نزدیک بڑی بھاری (معصیت) کی بات ہے (اور جس طرح یہ نکاح ناجائز ہے ایسے ہی اس کا زبان سے ذکر کرنا یا دل میں ارادہ کرنا سب گناہ ہے)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ: مذکورہ آیت میں اسلامی معاشرت کے چند آداب و احکام کا بیان ہے جس کا تعلق سابقہ آیات سے یہ ہے کہ جو آداب ان آیات میں تلقین کئے گئے وہ ابتداً آنحضرت ﷺ کے مکان اور آپ کی ازواج کے بارے میں نازل ہوئے ہیں، اگر چہ حکم ان کا آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں، اس میں دعوت طعام اور مہمانی کے متعلق تین احکام کا بیان ہے اور حکم اگر چہ سب مسلمانوں کے لئے عام ہے، مگر سبب نزول چونکہ خاص واقعہ رسول اللہ ﷺ کے مکان میں ہوا، اس لئے عنوان میں ”بیوت النبی“ کا ذکر فرمایا گیا۔

اس قصہ میں اصل مقصود نظم وضبط کا حکم ہے جس کے لیے آگے ارشاد فرمایا کہ: فاذا طعمتم فانتشروا، کہ جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو، لیکن اس سے قبل آیت کے شروع میں بطور تمہید و مقدمہ کے یہ ارشاد فرمایا: لا تدخلوا بیوت النبی کہ نبی کے گھروں میں مت جایا کرو، جو کہ نظم وضبط کی تکمیل کا سبب ہے اور اس سے مزید اہتمام کا فائدہ بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ تمہید و مقدمات کا اہتمام آگے مقصود کے مہتم بالشان ہونے پر دلالت کرتا ہے، نیز یہ حکم ایک دوسری بری عادت کے انسداد اور اصلاح کے لیے بھی مفید ہے جس کو صاحب درمنثور اور صاحب روح المعانی نے بروایت حضرت انس ؓ نقل کیا ہے کہ بعض لوگ عین کھانے کے وقت حضور ﷺ کے دولت کدے میں جا پہنچتے، کیونکہ اس وقت آیت حجاب نازل نہ ہوئی تھی، اور وہاں کھانا پکنے کے انتظار میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے، کھانا کھلانے والا تو حضور سے بڑھ کر کون تھا، مگر اس طرح پہلے سے جا کر بیٹھے رہنا بلاشبہ گراں گذرتا ہے، سو اس حکم: لا تدخلوا بیوت النبی سے اس کا بھی انتظام ہو گیا، چنانچہ حجاب کے واجب کر دینے سے ایسے واقعات کا ہمیشہ کے

لیے انسداد کردیا گیا، نیز سد ذرائع کے ساتھ ساتھ حجاب کے حکم میں حضور ﷺ کا احترام اور جلالت شان بھی ظاہر ہوتی ہے۔

اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى النَّبِىَّ: اس میں ذٰلِكُمْ سے کھانے کے بعد حضور ﷺ کے گھر میں ٹھہرے رہنے کی طرف اشارہ ہے، اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ① ایک یہ کہ ایسے موقع پر صاف طور سے نہ کہنا طبع کریم کا تقاضا ہے، اور صاف طور سے کہہ دینا عقل حکیم کا تقاضا ہے، سو مصلح اور دانا عقل کے تقاضے کو طبیعت کے تقاضے پر ترجیح دیتا ہے ② دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ معاشرت کی اصلاح واجب ہے، اسی طرح جس حرکت سے دوسرے کو تکلیف پہنچے اور وہ ضروری بھی نہ ہو تو وہ حرام ہے، آج کل ایسے امور کی اہل علم و مشائخ تک میں احتیاط نہیں۔

فَيَسْتَحْىٖ مِنْكُمْ: یعنی وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں اور زبان سے نہیں فرماتے، اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حضور ﷺ کبھی کبھار اظہار حق نہ کرتے تھے، اصل بات یہ ہے کہ جس حق کا اظہار واجب ہے وہ حق اللہ ہے جس کو آپ ﷺ نے ہمیشہ بحسن وخوبی انجام دیا اور اس پر مخالفین بھی گواہ ہیں، اور یہاں جس حق کے اظہار سے آپ لحاظ، مروت اور حیا کی وجہ سے خاموش رہے وہ اپنی ذات سے متعلق تھا، چنانچہ اس کی وجہ سے آپ ﷺ نے کلفت اور بوجھ برداشت کیا، لیکن زبان سے اظہار نہ فرمایا، اور اس سے کسی حکم شرعی کا چھپانا لازم نہیں آتا۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ: یہاں حجاب کے حکم میں: وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا کے بڑھانے کا فائدہ خلاصہ تفسیر کی تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ یہ اہتمام مبالغہ کے لیے ہے، یعنی ویسے تو حجاب کیوں نہ ضروری ہوگا، لیکن ایسی شدید حاجت کے وقت بھی حجاب ضروری ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت کو ''آیت حجاب'' کہتے ہیں، اس آیت کا نزول **وقرن في بيوتكن** کے نزول سے مقدم ہے، اور آیت: **وقرن في بيوتكن** کا نزول بعد میں ہے، کیونکہ اس آیت حجاب کا نزول حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ولیمہ میں ہوا، اور آیت: **وقرن في بيوتكن** کا نزول آیت تخییر کے نزول کے وقت ہوا، اور آیت تخییر کا نزول حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے بہت بعد ہوا ہے، اس لئے کہ مخیرات میں تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں، اور ظاہر ہے کہ نفقہ کا مطالبہ نکاح کے بعد ہی ہوتا ہے، پس یہاں آیت حجاب کے نزول سے پردہ فرض ہوا اور بعد میں: **وقرن في بيوتكن** کے نزول سے پردہ کے حکم کی مزید تاکید ہوگئی۔

ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ: یہ آیت واضح طور پر بتلا رہی ہے کہ پردہ متعارفہ جو اہل اسلام میں رائج ہے وہ انتہائی درجہ ضروری ہے اور نہایت قابل اہتمام ہے، نفسانی وسوسوں اور خطروں سے حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے، اور یہ آیت بھی اگرچہ ازواج مطہرات کے حق میں ہے، لیکن اس حکم کی جو علت بیان کی گئی ہے وہ عام ہے: **ذلكم اطهر لقلوبكم وقلوبهن** یعنی یہ حجاب طہارت قلوب کا بہترین ذریعہ ہے اور بلا شبہ حق اور درست ہے، اور یہ علت صراحۃ دلالت النص سے ثابت ہے جس میں شک اور شبہ کی گنجائش نہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بے حجابی اور بے پردگی قلب کی نجاست اور گندگی کا سبب ہے اور حجاب اور پردہ قلب کی طہارت اور پاکیزگی کا سبب ہے، اور ازواج مطہرات تو بوجہ امہات المومنین ہونے کے ان کی عظمت اور حرمت دلوں میں ایسی راسخ ہے کہ جہاں فتنہ کا احتمال ہی نہیں ہوتا، لہٰذا جہاں فتنہ کا احتمال غالب بلکہ فتنہ یقینی ہو وہاں حجاب قطعی طور پر فرض اور لازم ہے۔

وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا: اسی مقام پر ایک حکم یہ دیا گیا کہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات سے آپ کی وفات کے بعد کسی کا نکاح حلال نہیں، جس کا سبب نزول یہ ہے کہ کسی شخص نے یہ کہا کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی کسی زوجہ سے نکاح کروں گا، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کو بھی یہ خبر پہنچ گئی تو کلفت ہوئی، اور ایک روایت میں ہے کہ کسی نے مسئلہ حجاب پر یہ کہا کہ ہم سے ہماری چچازاد بہنوں کو چھپایا جاتا ہے، اگر آپ کی وفات ہو جائے گی تو ہم آپ کی ازواج سے نکاح کریں گے، اس پر یہ حکم نازل ہوا۔

خلاصہ یہ کہ اس مضمون کو کئی طرح سے اس مقام سے مناسبت ہے: ① اس میں آپ ﷺ کا احترام اور جلالت شان ہے جیسا کہ پیچھے بھی چند آیات میں بعض احکام آپ کی جلالت شان کے بارے میں آئے ہیں ② دوسرا اس میں ایذاء و تکلیف کو دور کرنا بھی ہے ③ حجاب کے مضمون کا تتمہ بھی ہو گیا، وہ یہ کہ امہات المؤمنین کا ایسا حجاب ہے کہ ان سے جب ایک دفعہ حجاب واجب ہو گیا تو پھر ہمیشہ ہمیشہ اس کے ختم ہونے کا احتمال ہی نہیں، حتی کہ

حجاب کے ختم ہونے کی ایک صورت نکاح کی تھی، لیکن وہ بھی حرام کر دیا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا: یعنی بدون حکم و اجازت کے دعوت میں مت جاؤ اور جب تک بلائیں نہیں، پہلے سے جا کر نہ بیٹھو کہ وہاں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑے اور گھر والوں کے کام کاج میں حرج واقع ہو۔

فائدہ: ۲؎ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ: یعنی کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھر کا راستہ لینا چاہیے، وہاں مجلس جمانے سے میزبان اور دوسرے مکان والوں کو تکلیف ہوتی ہے، یہ باتیں گو نبی کے مکانوں کے متعلق فرمائی ہیں، کیونکہ شان نزول کا تعلق ان ہی سے تھا، مگر مقصود ایک عام ادب سکھلانا ہے، بے دعوت کسی کے یہاں کھانا کھانے کی غرض سے جا بیٹھنا یا طفیلی بن کر جانا، یا کھانے سے قبل یوں ہی مجلس جمانا، یا فارغ ہونے کے بعد گپ شپ لڑانا درست نہیں۔

فائدہ: ۳؎ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ: یعنی آپ حیا کی وجہ سے اپنے نفس پر تکلیف برداشت کرتے ہیں، لحاظ کی وجہ سے صاف نہیں فرماتے کہ اٹھ جاؤ، مجھے کلفت ہوتی ہے، یہ تو آپ کے اخلاق اور مروت کی باتیں ہوئی، مگر اللہ تعالیٰ کو تمہاری تادیب و اصلاح میں کیا چیزیں مانع ہو سکتی ہیں، اس نے بہر حال پیغمبر ہی کی زبان سے اپنے احکام سنا دیئے۔

فائدہ: ۴؎ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آداب سکھلائے، کبھی کھانے کو حضرت کے گھر میں جمع ہوتے تو پیچھے باتیں کرنے لگ جاتے، حضرت ﷺ کا مکان آرام کا وہ ہی تھا، شرم سے نہ فرماتے کہ اٹھ جاؤ، ان کے واسطے اللہ نے فرما دیا''، اور اس آیت میں حکم ہوا پردہ کا کہ مرد حضرت کی ازواج کے سامنے نہ جائیں کوئی چیز مانگنی ہو تو وہ بھی پردہ کے پیچھے سے مانگیں، اس میں جانبین کے دل ستھرے اور صاف رہتے ہیں اور شیطانی وساوس کا استیصال ہو جاتا ہے۔

فائدہ: ۵؎ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا: یعنی کافر منافق جو چاہیں بکتے پھریں اور ایذاء رسانی کریں، مومنین جو دلائل و براہین کی روشنی میں پیغمبر (علیہ السلام) کی انتہائی راست بازی اور پاکبازی کو معلوم کر چکے ہیں، انھیں لائق نہیں کہ حضور ﷺ کی حیات میں یا وفات کے بعد کوئی بات ایسی کہیں یا کریں جو خفیف سے خفیف درجہ میں آپ ﷺ کی ایذا کا سبب بن جائے، لازم ہے کہ مومنین اپنے محبوب و مقدس پیغمبر کی عظمت شان کو ہمیشہ مرعی رکھیں، مبادا غفلت یا تساہل سے کوئی تکلیف دہ حرکت صادر ہو جائے اور دنیا و آخرت کا خسارہ اٹھانا پڑے۔

ان تکلیف دہ حرکات میں سے ایک بہت سخت اور بھاری گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص ازواج مطہرات سے آپ کے بعد نکاح کرنا چاہے، یا ایسے نالائق ارادہ کا حضور ﷺ کی موجودگی میں اظہار کرے، ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات کی مخصوص عظمت پیغمبر (علیہ السلام) کے تعلق کی وجہ سے قائم ہوئی ہے کہ روحانی حیثیت سے وہ تمام مومنین کی محترم مائیں قرار دی گئیں، کیا کسی امتی کے عقد نکاح میں آنے کے بعد ان کا یہ احترام کما حقہ محفوظ رہ سکتا ہے!، یا آپ کے بعد وہ خانگی بکھیڑوں میں پڑ کر تعلیم و تلقین دین کی اس اعلیٰ غرض کو آزادی کے ساتھ پورا کر سکتی ہیں جس کے لیے ہی فی الحقیقت قدرت نے نبی کی زوجیت کے لیے ان کو چنا تھا!۔ اور کیا کوئی پرلے درجہ کا بے حس و بے شعور انسان بھی باور کر سکتا ہے کہ سید البشر امام المتقین اور پیکر خلق عظیم کی خدمت میں عمر گزارنے والی خاتون ایک لحہ کے لیے بھی کسی دوسری جگہ رہ کر قلبی مسرت و سکون حاصل کرنے کی امید رکھ سکے گی، خصوصاً جبکہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ وہ منتخب خواتین تھیں جن کے سامنے دنیا و آخرت کے دو راستوں میں سے ایک راستہ انتخاب کے لیے پیش کیا گیا تو انہوں نے بڑی خوشی اور آزادی سے دنیا کے عیش و بہار پر لات مار کر اللہ رسول کی خوشنودی اور آخرت کا راستہ اختیار کر لینے کا اعلان کر دیا۔

چنانچہ تاریخ بتلاتی ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد کیسے عدیم النظیر زہد و ورع اور صبر و توکل کے ساتھ ان مقدس خواتین جنت نے عبادت الٰہی میں اپنی زندگیاں گزاریں اور احکام دین کی اشاعت اور اسلام کی خدمات مہمہ کے لیے اپنے کو وقف کیے رکھا، ان میں سے کسی ایک کو بھی بھول کر بھی دنیا کی لذتوں کا خیال نہیں آیا اور کیسے آ سکتا تھا جبکہ پہلے ہی حق تعالیٰ نے: اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ

وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (الاحزاب: ۳۳) فرما کر ان کے تزکیہ وتطہیر کی کفالت فرمائی تھی، رضی اللہ عنھن وارضاھن وجعلنا ممن یعظمھن حق تعظیمھن فوق مانعظم امھاتنا التی ولدتنا، آمین۔

اس مسئلہ کی نہایت محققانہ بحث حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی کتاب ''آب حیات'' میں ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۵۴﴾

اگر کھول کر کہو تم کسی چیز کو یا اس کو چھپاؤ سو اللہ ہے ہر چیز کو جاننے والا

خلاصہ تفسیر: اب فرماتے ہیں کہ جس طرح ازواج مطہرات سے نکاح حرام ہے ویسے ہی اس کا زبان سے ذکر کرنا یا دل میں ارادہ کرنا سب گناہ ہے۔

(سو) اگر تم (اس کے متعلق) کسی چیز کو (زبان سے) ظاہر کرو گے یا اس (کے ارادہ) کو (دل میں) پوشیدہ رکھو گے تو اللہ تعالیٰ (کو دونوں کی خبر ہوگی، کیونکہ وہ) ہر چیز کو خوب جانتا ہے (پس تم کو اس پر سزا دیں گے)۔

* * *

فائدہ: یعنی زبان سے کہنا تو کجا دل میں بھی ایسا وسوسہ کبھی نہ لانا اللہ کے سامنے ظاہر و باطن سب یکساں ہے دل کا کوئی بھید اس سے پوشیدہ نہیں۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ

گناہ نہیں ان عورتوں کو سامنے ہونے کا اپنے باپوں سے اور نہ اپنے بیٹوں سے اور نہ اپنے بھائیوں سے اور نہ اپنے بھائی کے بیٹوں سے

وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ

اور نہ اپنی بہن کے بیٹوں سے اور نہ اپنی عورتوں سے اور نہ اپنے ہاتھ کے مال سے [1] اور ڈرتی رہو اے عورتوں اللہ سے بیشک اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۵۵﴾

کے سامنے ہے ہر چیز [2]

خلاصہ تفسیر: اب مسئلہ حجاب کے متعلق ان کا ذکر ہے جن سے پردہ نہیں ہے، اگرچہ سورہ نور میں بھی ان کا ذکر آ چکا ہے، لیکن وہاں عام عورتوں کا حکم تھا جس میں یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ چونکہ ازواج مطہرات کے لیے بعض مخصوص احکام بھی ہیں تو شاید ان کو محارم کے سامنے آنا بھی جائز نہ ہو اس لیے یہاں بھی ان کو دوبارہ ذکر فرما دیا، چنانچہ ہم نے جو اوپر حجاب کا حکم دیا ہے اس سے بعض مستثنیٰ بھی ہیں جن کا بیان یہ ہے کہ:

پیغمبر کی بیویوں پر اپنے باپوں کے (سامنے ہونے کے) بارے میں کوئی گناہ نہیں اور نہ اپنے بیٹوں کے (یعنی جس کے بیٹا ہو) اور نہ اپنے بھائیوں کے اور نہ اپنے بھتیجوں کے اور نہ اپنے بھانجوں کے اور نہ اپنی (دین شریک) عورتوں کے اور نہ اپنی لونڈیوں کے (یعنی ان کے سامنے آنا جائز ہے) اور (اے پیغمبر کی بیبیوں! ان مذکورہ احکام کی تعمیل میں) خدا سے ڈرتی رہو (کسی حکم کے خلاف نہ ہونے پائے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر حاضر (ناظر) ہے (یعنی اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں، جو اس کے خلاف کرے گا اس کو سزا سے ڈرنا چاہئے)۔

یہاں آیت میں انحصار مقصود نہیں، بلکہ تمام نسبی یا رضاعی محارم مراد ہیں جن کا ذکر سورہ نور میں گذر چکا ہے۔

* * *

فائدہ: [1] اوپر ازواج مطہرات کے سامنے مردوں کے جانے کی ممانعت ہوئی تھی، اب بتلا دیا کہ محارم کا سامنے جانا منع نہیں، اس بارے

میں جوحکم عام مستورات کا ''سورہ نور'' میں گزر چکا، وہی ازواج مطہرات کا ہے۔

وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ کی تشریح ہم سورہ نور میں کر چکے ہیں وہاں مطالعہ کرلیا جائے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی پردہ کے جو احکام بیان ہوئے اور جو استثناء کیا گیا، پوری طرح ملحوظ رکھو، ذرا بھی گڑبڑ نہ ہونے پائے، ظاہر و باطن میں حدود الٰہیہ محفوظ رہنی چاہئیں، اللہ سے تمہارا کوئی حال چھپا ہوا نہیں: یعلم خائنة الاعین وما تخفی الصدور

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾

اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر، اے ایمان والو! رحمت بھیجو اس پر اور سلام بھیجو سلام کہہ کر

خلاصہ تفسیر: اس سے پہلی آیات میں رسول اللہ ﷺ کی کچھ خصوصیات و امتیازات کا ذکر تھا، جن کے ضمن میں ازواج مطہرات کے پردہ کا حکم آیا تھا، اور آگے بھی کچھ احکام پردے کے آئیں گے، درمیان میں اس چیز کا حکم دیا گیا ہے جس کے لئے یہ سب خصوصیات و امتیازات رکھے گئے ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت شان کا اظہار اور آپ کی عظمت و محبت اور اطاعت کی ترغیب ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں ان پیغمبر (ﷺ) پر اے ایمان والو! تم بھی آپ پر رحمت بھیجا کرو اور خوب سلام بھیجا کرو (تاکہ آپ ﷺ کی عظمت کا حق جو تمہارے ذمہ ہے ادا ہو)۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ: اللہ تعالیٰ کا رحمت بھیجنا تو یہ ہے کہ وہ رحمت کرتے ہیں، مگر اس سے عام رحمت مراد نہیں، کیونکہ اس سے کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوگی، حالانکہ یہاں خصوصیت بیان کرنا مقصود ہے، بلکہ خاص رحمت مراد ہے جو آپ کی شان عالی کے مناسب ہے، اور فرشتوں کا رحمت بھیجنا اور اسی طرح جس رحمت بھیجنے کا ہمیں حکم ہے اس سے مراد اس خاص رحمت کی دعا کرنا ہے، اور اسی کو ہمارے محاورہ میں ''درود'' کہتے ہیں، اور اس دعا سے حضور ﷺ کے مراتب عالیہ میں بھی ترقی ہو سکتی ہے، کیونکہ ترقی کی کوئی حد نہیں، چنانچہ خود حضور ﷺ نے اذان کے بعد دعا میں دعائے وسیلہ کی عام امتیوں کو تعلیم فرمائی ہے، اور خود دعا کرنے والے کو بھی اس سے نفع ہوتا ہے کہ حکم الٰہی کو بجالایا، اور آپ کی تعظیم کا حق ادا کیا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ہر بار درود بھیجنے سے اس شخص پر حق تعالیٰ کی دس رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

اور آپ پر سلام بھیجنے کا معنی دو باتوں کا مجموعہ ہے، ایک یہ دعا ہے سلامتی کی، یعنی نقائص، عیوب اور آفتوں سے سالم رہنا، اور معنی یہ ہیں کہ نقائص اور آفات سے سلامتی آپ کے ساتھ رہے، دوسرا یہ ثناء ہے جو اس دعا کے لیے لازم ہے، کیونکہ عرفاً یہ لفظ اسی کے لیے مخصوص ہے جو ثناء کا مستحق ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس تسلیم سے مقصود اللہ کی طرف سے سلامتی کی دعا ہو اور اس سلام سے مقصود سلامتی کی بشارت ہو، پس حاصل یہ ہوگا کہ: ''اللھم بشر النبی ﷺ بالسلامة الابدية الموعودة''، اور بعض حضرات نے یہاں لفظ ''سلام'' سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات لی ہے، کیونکہ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے تو مراد یہ ہوگی کہ اللہ آپ کی حفاظت و رعایت پر متولی اور کفیل ہے۔

صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا: اس آیت میں محققین نے فرمایا ہے کہ: صلّوا صیغہ امر فرضیت کے لیے ہے، اس لیے عمر بھر میں ایک بار درود بھیجنا تو فرض ہے جیسا کہ کلمہ توحید کا ایک بار کہنا فرض ہے اور جس مجلس میں آپ ﷺ کا ذکر مبارک ہو وہاں ایک بار درود پڑھنا واجب ہے لیکن مستحب یہ ہے کہ جتنی بار ذکر مبارک خود کرے یا کسی سے سنے ہر مرتبہ درود شریف پڑھے، یہ تو نماز سے باہر کا حکم ہے، اور نماز کے اندر اختلاف ہے، امام صاحبؒ کے نزدیک سنت ہے، یہ سب تفصیل لفظ ''صلوۃ'' میں ہے، اور لفظ ''سلام'' میں بھی صیغہ امر یعنی سلّموا دیکھتے ہوئے بعض علماء نے عمر بھر میں ایک بار اس کو بھی فرض کہا ہے، لیکن صلوۃ اور سلام ان دونوں لفظوں کے معنی کی طرف نظر کرتے ہوئے چونکہ ان دونوں سے مقصود ایک ہی ہے اس لیے لفظ ''سلام'' کی مستقل فرضیت کا ثبوت محل کلام ہے، اور مقصود میں متحد ہونے کے اعتبار سے شروع میں یصلّون کے ساتھ یسلّمون نہیں فرمایا کہ وہ خود ہی واضح ہے، پس مقصود گویا یہ ہے: ''ان اللہ و ملائکته یصلون و یسلمون علی النبی'' تاکہ آیت کا آخر اس پر منطبق ہو جائے، اور شاید آخر میں اس لیے صراحت کردی کہ مخاطبین یعنی امت پر حضور ﷺ کے حقوق و احسانات بے شمار ہیں اس لیے اہتمام کے طور پر دو

باتوں یعنی صلّوا علیه وسلّموا کا حکم دیا، اور پھر دوسرے حکم یعنی وسلّموا کی تاکید مفعول مطلق تسلیما سے فرمائی گئی جس میں طلب حکم کے ساتھ ساتھ کثرت پر بھی دلالت ہے۔

ذکر مبارک کے وقت افضل واعلیٰ اور مستحب تو یہی ہے کہ صلوٰۃ اور سلام دونوں پڑھے اور لکھے جائیں، لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے ایک یعنی صرف صلوٰۃ یا صرف سلام پر اکتفا کرے تو جمہور فقہاء کے نزدیک کوئی گناہ نہیں، اور علماء امت کا مسلسل عمل اس پر شاہد ہے کہ وہ دونوں ہی کو جمع کرتے ہیں اور بعض اوقات ایک پر بھی اکتفا کر لیتے ہیں، جیسے نماز کے آخری قعدہ میں دونوں کو جمع کیا گیا کہ تشہد میں سلام ہے اور آگے پھر درود ہے، جبکہ نماز کے پہلے قعدہ میں صرف سلام ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف صلوٰۃ یا صرف سلام پر اکتفا کرنا مکروہ نہیں۔

* * *

فائدہ: ''صلوٰۃ النبیؐ'' کا مطلب ہے: ''نبی کی ثناء وتعظیم رحمت وعطوفت کے ساتھ''، پھر جس کی طرف ''صلوٰۃ'' منسوب ہوگی، اسی کی شان ومرتبہ کے لائق ثناء وتعظیم اور رحمت وعطوفت مراد لیں گے، جیسے کہتے ہیں کہ باپ بیٹے پر، بیٹا باپ پر اور بھائی بھائی پر مہربان ہے، یا ہر ایک دوسرے سے محبت کرتا ہے تو ظاہر ہے جس طرح کی محبت اور مہربانی باپ کی بیٹے پر ہے، اس نوعیت کی بیٹے کی باپ پر نہیں اور بھائی کی بھائی پر ان دونوں سے جداگانہ ہوتی ہے، ایسے ہی یہاں سمجھ لو، اللہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے، یعنی رحمت وشفقت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناء اور عزاز واکرام کرتا ہے اور فرشتے بھی بھیجتے ہیں، مگر ہر ایک کی صلوٰۃ اور رحمت وتکریم اپنی شان ومرتبہ کے موافق ہوگی۔

آگے مومنین کو حکم ہے کہ تم بھی صلوٰۃ ورحمت بھیجو، اس کی حیثیت ان دونوں سے علیحدہ ہونی چاہیے، علماء نے کہا کہ اللہ کی صلوٰۃ ''رحمت بھیجنا'' اور فرشتوں کی صلوٰۃ ''استغفار کرنا'' اور مومنین کی صلوٰۃ ''دعا کرنا'' ہے، حدیث میں ہے کہ جب آیت نازل ہوئی صحابہؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ''سلام'' کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا (یعنی نماز کے تشہد میں جو پڑھا جاتا ہے) السلام علیك ایها النبی ورحمة الله وبركاته ''صلوٰۃ'' کا طریقہ بھی ارشاد فرما دیجئے جو نماز میں پڑھا کریں''، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درود شریف تلقین کیا:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ

غرض یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مومنین کو حکم دیا کہ تم بھی نبی پر صلوٰۃ (رحمت) بھیجو، نبی نے بتلا دیا کہ تمہارا بھیجنا یہی ہے کہ اللہ سے درخواست کرو کہ وہ اپنی بیش از بیش رحمتیں ابدالآباد تک نبی پر نازل فرماتا رہے، کیونکہ اس کی رحمتوں کی کوئی حد ونہایت نہیں، یہ بھی اللہ کی رحمت ہے کہ اس درخواست پر جو مزید رحمتیں نازل فرمائے وہ ہم عاجز وناچیز بندوں کی طرف منسوب کر دی جائیں، گویا ہم نے بھیجی ہیں، حالانکہ ہر حال میں رحمت بھیجنے والا وہی اکیلا ہے، کسی بندہ کی کیا طاقت تھی کہ سید الانبیاء کی بارگاہ میں ان کے رتبہ کے لائق تحفہ پیش کر سکتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اللہ سے رحمت مانگنی اپنے پیغمبر پر اور ان کے ساتھ ان کے گھرانے پر بڑی قبولیت رکھتی ہے، ان پر ان کے لائق رحمت اترتی ہے، اور ایک دفعہ مانگنے سے دس رحمتیں اترتی ہیں مانگنے والے پر، اب جس کا جتنا جی چاہے اتنا حاصل کر لے''۔

تنبیہ: ''صلوٰۃ علی النبیؐ'' کے متعلق مزید تفصیلات ان مختصر فوائد میں نہیں سما سکتیں، شروح حدیث میں مطالعہ کی جائیں اور اس باب میں شیخ شمس الدین سخاوی کا رسالہ ''القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع'' قابل دید ہے، ہم نے شرح صحیح مسلم میں بقدر کفالت لکھ دیا ہے، فالحمد لله علی ذلك۔

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٥٧﴾

جو لوگ ستاتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو ان کو پھٹکار اللہ نے دنیا میں اور آخرت میں اور تیار رکھا ہے ان کے واسطے ذلت کا عذاب

خلاصہ تفسیر: پیچھے متفرق آیتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے کی مختلف صورتوں سے منع کیا گیا ہے جن میں بعض جو بلا قصد

تھیں ان میں صرف فہمائش اور نصیحت کر دی گئی اور بعض ایذائیں جو قصداً تھیں جو مخالفین کی طرف سے پیش آتی تھیں اب ان پر آگے سخت وعید فرماتے ہیں اور تاکید کے لیے یہاں آیت میں رسول کی ایذا کو مثل خدا کی ایذا کے قرار دیا گیا۔

بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (قصداً) ایذاء دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ: خلاصہ تفسیر میں "قصداً" کی قید اس لیے بڑھائی گئی کہ ایذا پہنچانا اختیاری فعل ہے اور اختیاری فعل کے لیے ارادہ وقصد شرط ہے، دوسری بات یہ کہ جس فعل سے بلا قصد وارادہ ایذا ہو جائے وہ حقیقت میں ایذا نہیں، بلکہ اس کا مقدمہ ہے، اس کو ایذا کہنا مجاز اہے، اور کلام میں اصل معنی حقیقی ہوتے ہیں، اور حقیقی ایذا وہی ہے جو قصد وارادہ سے ہو، تیسری بات یہ کہ شریعت میں ان کاموں پر وعید نہیں جو بلا قصد وارادہ ہوں، جیسا کہ حدیث میں ہے: "رفع عن امتی الخطأ والنسیان" میری امت سے خطا اور بھول پر مواخذہ نہیں اور یہاں آیت میں وعید مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایذا مراد ہے جو قصد وارادہ سے ہو، اور ازواج مطہرات کے بارے میں جو پیچھے آیت میں یضاعف لها العذاب ضعفين آیا ہے کہ ان میں سے جو کوئی حضور کو ایذا پہنچائے تو اس کو دوگنا عذاب ہوگا، حالانکہ ان کی ایذا قصد وارادہ سے نہ تھی، اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ حضور کو اس کام سے ایذا ہوتی ہے پھر جو کوئی اس کام کو کرے گی اس کو دوگنا عذاب ہوگا، اور جان لینے کے بعد ان میں سے پھر کسی نے ایذا کا کام نہیں کیا، اور جو پہلے ہو چکا تھا اس کی بابت ان کو یہ علم نہ تھا کہ آپ کو اس سے ایذا ہوگی۔

یہاں یہ واضح رہے کہ اگرچہ حق تعالیٰ کی ذات ہر تاثر وانفعال سے بالاتر ہے، کسی کی مجال ہی نہیں کہ اس تک کوئی تکلیف پہنچا سکے، لیکن ایسے افعال جن سے عادۃً ایذا پہنچا کرتی ہے ان کو "ایذاء اللہ" سے تعبیر کر دیا گیا ہے، گویا آیت میں اللہ تعالیٰ کے ناراض کرنے کو بطور مجاز ایذا کہہ دیا گیا۔

* * *

فائدہ: اوپر مسلمانوں کو حکم تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کا سبب نہ بنیں، بلکہ ان کی انتہائی تعظیم وتکریم کریں، جس کی ایک صورت "صلوٰۃ وسلام" بھیجنا ہے، اب بتلایا کہ اللہ ورسول کو ایذا دینے والے دنیا و آخرت میں ملعون ومطرود اور سخت رسوا کن عذاب میں مبتلا ہوں گے، اللہ کو ستانا یہی ہے کہ اس کے پیغمبروں کو ستائیں، یا اس کی جناب میں نالائق باتیں کہیں۔

وَالَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ بِغَیۡرِ مَا اکۡتَسَبُوۡا فَقَدِ احۡتَمَلُوۡا بُہۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۵۸﴾

اور جو لوگ تہمت لگاتے ہیں مسلمان مردوں کو اور مسلمان عورتوں کو بدون گناہ کئے تو اٹھایا انہوں نے بوجھ جھوٹ کا اور صریح گناہ کا

خلاصہ تفسیر: اب اس آیت میں مسلمانوں کی ایذا کو بھی بڑا گناہ فرمایا جس سے رسول کی ایذا کا موجب وعید ہونا زیادہ مؤکد ہو گیا کہ جب مسلمانوں کی ایذا ایسی بری ہے تو سید المومنین صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا کیسی ہوگی!!۔

اور (اسی طرح) جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو بدون اس کے کہ انہوں نے کچھ (ایسا کام) کیا ہو (جس سے وہ مستحق سزا ہو جائیں) ایذاء پہنچاتے ہیں تو وہ لوگ بہتان اور صریح گناہ کا (اپنے اوپر) بار لیتے ہیں (یعنی اگر وہ ایذاء زبانی ہے تو بہتان ہے اور اگر فعلی ہے تو مطلق بڑا گناہ ہے)۔

بِغَیۡرِ مَا اکۡتَسَبُوۡا: یہ جو فرمایا کہ "بدون اس کے کہ انہوں نے کچھ کیا ہو" اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر مسلمان کوئی کام سزا کے لائق کرے تو اس وقت سیاست اور تادیب جائز ہے بشرطیکہ شرعی قاعدہ سے ہو۔

* * *

فائدہ: یہ منافق تھے جو پیٹھ پیچھے بدگوئی کرتے رسول کی، آپ کی ازواج مطہرات پر جھوٹے طوفان اٹھاتے جیسا کہ سورہ نور میں گزر چکا۔

ربط: آگے بعض ایذاؤں کے انسداد کا بندوبست کیا گیا ہے جو مسلمان عورتوں کو ان کی طرف سے پہنچتی تھیں، روایات میں ہے کہ مسلمان

مستورات جب ضروریات کے لیے باہر نکلتیں، بدمعاش منافق تاک میں رہتے اور چھیڑ چھاڑ کرتے، پھر پکڑے جاتے تو کہتے ہم نے سمجھا نہیں تھا کہ کوئی شریف عورت ہے، لونڈی باندی سمجھ کر چھیڑ دیا تھا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ

اے نبی کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں ؎۱

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾

اس میں بہت قریب ہے کہ پہچانی پڑیں تو کوئی ان کو نہ ستائے، اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان ؎۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین کی ایذا پر وعید فرمائی تھی، اب بعض خاص ایذاؤں کے متعلق بیان ہے اور یہ ایذا منافقین کی طرف سے دو طرح ظاہر ہوئی تھی، ایک یہ کہ ان میں سے بعض شریر بدطینت مسلمانوں کی کنیزوں کو رستہ میں چھیڑتے تھے اور بعض اوقات باندیوں کے شبہ میں آزاد عورتوں کو بھی چھیڑتے تھے، دوسرے یہ کہ ہمیشہ ایسی جھوٹی خبریں اڑاتے کہ فلاں غنیم چڑھائی کرنا چاہتا ہے، ان دونوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور عام مسلمانوں کو کلفت ہوتی، اب آگے انہی ایذاؤں کے انسداد کا انتظام ہے۔

اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی عورتوں سے بھی کہہ دیجئے کہ (سر سے) نیچی کر لیا کریں اپنے (چہرے کے) اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اس سے جلدی پہچان ہو جایا کرے گی تو آزار نہ دی جایا کریں گی، اور (اس چہرہ کے اور سر کے ڈھانکنے میں اگر کوئی کمی یا بے احتیاطی بلا قصد ہو جائے تو) اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (اس کو معاف کر دے گا)۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ: یعنی کسی ضرورت سے باہر نکلنا پڑے تو چادر سے سر اور چہرہ بھی چھپا لیا جائے جیسا کہ سورۂ نور کے ختم کے قریب غیر متبرجت بزینۃ میں اس کی تفسیر روایت سے گزر چکی ہے، چونکہ کنیزوں کے لئے سر فی نفسہ داخل ستر نہیں، اور چہرہ کھولنے میں ان کو آزاد عورتوں سے زیادہ رخصت ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی خدمت میں لگی رہتی ہیں، اس لئے کام کاج کے لئے ان کو باہر نکلنے اور چہرہ وغیرہ کھولنے کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے، بخلاف آزاد عورتوں کے کہ وہ اتنی مجبور نہیں، اور چونکہ اوباش لوگ آزاد عورتوں کو چھیڑنے کی ہمت ان کی خاندانی وجاہت وحمایت کی وجہ سے نہ کرتے تھے، کنیزوں کو چھیڑتے تھے، بعض اوقات کنیزوں کے دھوکے میں آزاد عورتوں کو بھی چھیڑنے لگتے تھے، اسی لئے اس آیت نے آزاد عورتوں کو کنیزوں سے ممتاز کرنے کے لئے بھی اور اس لئے بھی کہ سر اور گردن وغیرہ ان کا ستر میں داخل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج وبنات اور عام مسلمانوں کی بیویوں کو یہ حکم دیا کہ لمبی چادر میں مستور ہو کر نکلیں جس کو سر سے کچھ نیچے چہرے پر لٹکا لیا کریں جس کو اردو میں ''گھونگھٹ'' کرنا کہتے ہیں، اس حکم سے پردہ شرعی کے حکم کی تعمیل بھی ہو جائے گی اور بہت سہولت کے ساتھ اوباش اور شریر لوگوں سے حفاظت بھی، رہ گئی غیر آزاد یعنی کنیزیں سو ان کی حفاظت کا انتظام آگے اگلی آیت میں آئے گا۔

پہلی ایذاء سے حرائر (آزاد عورتوں) کو بچانے کا فوری اور سہل انتظام یہ ہو سکتا تھا کہ ان کو یہ لوگ ان کے خاندان کی وجاہت اور حمایت کی وجہ سے بالقصد چھیڑنے کی جرأت نہ کرتے تھے، کبھی کنیزوں کے شبہ میں یہ بھی ان کی چھیڑ چھاڑ کی زد میں آجاتی تھیں، اگر ان کی پہچان ہو جاتی تو یہ نوبت نہ آتی، اس لئے ضرورت پیش آئی کہ حرائر کا کوئی خاص امتیاز ہو جائے، تاکہ آسانی کے ساتھ خود بخود ہی کم از کم حرائر تو ان شریروں کے فساد سے فوری طور پر محفوظ ہو جائیں اور کنیزوں کا دوسرا انتظام کیا جائے، دوسری طرف شریعت اسلام نے حرائر اور کنیزوں کے پردہ شرعی میں بضرورت ایک فرق بھی رکھا ہے کہ کنیزوں کا شرعی پردہ وہ ہے جو حرائر کا اپنے محرموں کے سامنے ہوتا ہے کہ مثلاً چہرہ وغیرہ کھولنا جو حرائر کے لئے اپنے محرموں کے سامنے جائز ہے، کنیزوں کے لئے باہر بھی اس کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ ان کا کام ہی اپنے آقا اور اس کے گھر کی خدمت ہے جس میں ان کو باہر بھی بار بار نکلنا پڑتا

ہے، اور چہرہ اور ہاتھ مستور رکھنا مشکل ہوتا ہے، بخلاف حرائر کے کہ ان کو کسی ضرورت سے باہر نکلنا بھی پڑے تو کبھی کبھی ہوگا جس میں پورے پردے کی رعایت مشکل نہیں، اس لئے حرائر کو یہ حکم دے دیا گیا کہ وہ لمبی چادر جس میں مستور ہو کر نکلتی ہیں اس کو اپنے سر پر سے چہرے کے سامنے لٹکالیا کریں تا کہ چہرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہ آئے اس سے ان کا پردہ بھی مکمل ہو گیا، اور باندیوں کنیزوں سے امتیاز خاص بھی ہو گیا، جس کے سبب وہ شریر لوگوں کی چھیڑ چھاڑ سے خود بخود مامون ہو گئیں، اور کنیزوں کی حفاظت کا انتظام ان منافقین کو سزا کی وعید سنا کر کیا گیا کہ اس سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں بھی اپنے نبی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دلوائیں گے۔

يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ: آیت مذکورہ میں حرہ (آزاد) عورتوں کے پردہ کے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ: **یدنین علیهن من جلابیبهن**، اس میں **یدنین**، ادناء سے مشتق ہے، جس کے لفظی معنی قریب کرنے کے ہیں اور لفظ **علیهن** کے معنی اپنے اوپر، اور **جلابیب** جمع جلباب کی ہے جو ایک خاص لمبی چادر کو کہا جاتا ہے، اس چادر کی ہیئت کے متعلق حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ وہ چادر ہے جو دوپٹہ کے اوپر اوڑھی جاتی ہے، اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کی ہیئت یہ بیان فرمائی ہے: "أمر الله نساء المؤمنين إذا خرجن من بيوتهن في حاجة ان يغطين وجوههن من فوق رؤوسهن بالجلابيب و يبدين عينا واحدة"، یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی عورتوں کو حکم دیا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے نکلیں تو اپنے سروں کے اوپر سے یہ چادر لٹکا کر چہروں کو چھپالیں اور صرف ایک آنکھ (راستہ دیکھنے کے لئے) کھلی رکھیں"، اور امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبیدہ سلمانی سے اس آیت کا مطلب اور جلباب کی کیفیت دریافت کی تو انہوں نے سر کے اوپر سے چادر چہرہ پر لٹکا کر چہرہ چھپالیا، اور صرف بائیں آنکھ کھلی رکھ کر ادناء وجلباب کی تفسیر عملاً بیان فرمائی، سر کے اوپر سے چہرہ پر چادر لٹکانا جو حضرت ابن عباس اور عبیدہ سلمانی کے بیان میں آیا ہے یہ لفظ **علیهن** کی تفسیر ہے کہ اپنے اوپر چادر کو قریب کرنے کا مطلب چادر کو سر کے اوپر سے چہرہ پر لٹکانا ہے، اس آیت نے بصراحت چہرہ کے چھپانے کا حکم دیا ہے جس سے اس مضمون کی مکمل تائید ہوگئی جو اوپر حجاب کی پہلی آیت کے ذیل میں مفصل بیان ہو چکا ہے، کہ چہرہ اور ہتھیلیاں اگرچہ فی نفسہ ستر میں داخل نہیں مگر بوجہ خوف فتنہ کے ان کا چھپانا بھی ضروری ہے، صرف مجبوری کی صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

ضروری تنبیہ: اس آیت میں آزاد عورتوں کو ایک خاص طرح کے پردہ کی ہدایت فرمائی کہ چادر کو سر کے اوپر سے لٹکا کر چہرے کو چھپالیں، تا کہ عام کنیزوں سے ان کا امتیاز ہو جائے اور یہ شریر لوگوں کے فتنہ سے محفوظ ہو جائیں، مذکورہ بیان میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلام نے عصمت وعفت کی حفاظت میں آزاد اور کنیزوں کے درمیان کوئی فرق کر دیا کہ آزاد کی حفاظت کرائی، کنیزوں کو چھوڑ دیا، بلکہ درحقیقت یہ فرق اوباش شریر لوگوں نے خود کر رکھا تھا کہ آزاد عورتوں پر دست اندازی کی تو جرأت وہمت نہیں کرتے تھے، مگر اماء یعنی کنیزوں کو چھیڑتے تھے، شریعت اسلام نے ان کے اختیار کردہ اس فرق سے یہ فائدہ اٹھایا کہ عورتوں کی اکثریت تو خود انہی کے مسلمہ عمل کے ذریعہ خود بخود محفوظ ہو جائے گی، باقی رہا کنیزوں کا معاملہ سوان کی عصمت کی حفاظت بھی اسلام میں ایسی ہی فرض وضروری ہے جیسی حرائر کی، اس کے لئے قانونی تشدد اعتبار کئے بغیر چارہ نہیں، تو اگلی آیت میں اس کا قانون بتلا دیا کہ جو لوگ اپنی اس حرکت سے باز نہ آئیں گے ان کو کسی طرح معاف نہ کیا جائے گا، بلکہ جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے، اور قتل کر دیئے جائیں گے، اس نے کنیزوں کی عصمت کو بھی حرائر کی طرح محفوظ کر دیا، اس سے واضح ہو گیا کہ مذکورہ شبہ سے بچنے کیلئے آیت کی تفسیر جمہور علماء سے مختلف کرنے کی تاویل کی ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں، شبہ تو جب ہوتا جبکہ کنیزوں کی حفاظت کا انتظام نہ کیا گیا ہوتا۔

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس وغیرہ میں امتیاز رکھنا جبکہ اس میں کسی فتنہ وفساد اور نقصان سے بچاؤ ہو اور تکبر نہ ہو تو مذموم نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی بدن ڈھانپنے کے ساتھ چادر کا کچھ حصہ سر سے نیچے چہرہ پر بھی لٹکالیویں، روایات میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر مسلمان عورتیں بدن اور چہرہ چھپا کر اس طرح نکلتی تھیں کہ صرف ایک آنکھ دیکھنے کے لیے کھلی رہتی تھی، اس سے ثابت ہوا کہ فتنہ کے وقت آزاد عورت کو

چہرہ بھی چھپالینا چاہیے، لونڈی باندیوں کو ضرورت شدیدہ کی وجہ سے اس کا مکلف نہیں کیا، کیونکہ کاروبار میں حرج عظیم واقع ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی پہچانی پڑیں کہ لونڈی نہیں، بی بی ہے صاحب ناموس، بدذات نہیں، نیک بخت ہے، تو بدنیت لوگ اس سے نہ الجھیں، گھونگھٹ اس کا نشان رکھ دیا، یہ حکم بہتری کا ہے''۔

آگے فرمادیا: ''اللہ ہے بخشنے والا مہربان''؛ یعنی باوجود اہتمام کے کچھ تقصیر رہ جائے تو اللہ کی مہربانی سے بخشش کی توقع ہے۔

تکمیل: یہ تو آزاد عورتوں کے متعلق انتظام تھا کہ انھیں پہچان کر ہر ایک کا حوصلہ چھیڑنے کا نہ ہو، اور جھوٹے عذر کرنے کا موقع نہ رہے، آگے عام چھیڑ چھاڑ کی نسبت دھمکی دی ہے، خواہ بی بی سے ہو یا لونڈی سے۔

لَىِٕنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ لَنُغْرِیَنَّكَ

البتہ اگر باز نہ آئیں منافق اور جن کے دل میں روگ ہے ۱ اور جھوٹی خبریں اڑانے والے مدینہ میں ۲ تو ہم لگا دیں گے تجھ کو ان کے

بِهِمْ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَاۤ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِیْنَ ۚۛ اَیْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ﴿۶۱﴾

پیچھے پھر نہ رہنے پائیں گے تیرے ساتھ اس شہر میں مگر تھوڑے دنوں، پھٹکارے ہوئے جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے گئے جان سے ۳

خلاصہ تفسیر: اب ان لوگوں کو تنبیہ کی جارہی ہے جو کنیزوں کو چھیڑا کرتے تھے اور ان لوگوں کو بھی جو ایک دوسری شرارت کے مرتکب تھے کہ مسلمانوں کے خلاف غلط افواہیں پھیلا کر ان کو پریشان کرنا چاہتے تھے فرمایا:

یہ (خاص اصل) منافقین اور (عام منافقین میں سے) وہ لوگ جن کے دلوں میں (شہوت پرستی کی) خرابی ہے (جس کی وجہ سے کنیزوں کو چھیڑتے اور پریشان کرتے ہیں) اور (انہی منافقین میں) وہ لوگ جو مدینہ میں (جھوٹی اور پریشان کرنے والی) افواہیں اڑایا کرتے ہیں (یہ لوگ) اگر (اپنی ان حرکتوں سے) باز نہ آئے تو ضرور (ایک نہ ایک دن) ہم آپ کو ان پر مسلط کردیں گے (یعنی ان کو مدینہ سے نکال دینے کا حکم دیں گے) پھر (اس حکم کے بعد) یہ لوگ آپ کے پاس مدینہ میں بہت ہی کم رہنے پائیں گے، وہ بھی (ہر طرف سے) پھٹکارے ہوئے (یعنی مدینہ سے نکل جانے کا سامان کرنے کے لئے جو کچھ تھوڑی مدت معین کی جائے گی اس مدت میں تو یہ یہاں رہ لیں گے اور اس مدت میں بھی ہر طرف سے ذلیل وخوار ہوں گے، پھر نکال دیئے جائیں گے اور نکالنے کے بعد بھی کہیں امن نہ ہوگا بلکہ) جہاں ملیں گے پکڑ دھکڑ اور مار دھاڑ کی جائے گی۔

اَیْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا: وجہ یہ ہے کہ ان منافقین کے کفر کا تقاضہ تو یہی تھا، لیکن نفاق کی آڑ میں ان کو پناہ ملی ہے جب علی الاعلان ایسی مخالفتیں کرنے لگیں گے تو وہ مانع اٹھ گیا اس لئے ان کے ساتھ بھی کفر کے اصلی اقتضاء کے موافق معاملہ ہوگا کہ ان کا اخراج، قید اور قتل سب جائز ہے، اور اگر خروج کے لئے کچھ مدت معین ہوجائے تو اس مدت کے اندر معاہدہ کی وجہ سے مامون ہوں گے، اس کے بعد جہاں ملیں گے عہد ختم ہوجانے کی بنا پر ان کے قتل وقید کی اجازت ہوگی، منافقین کو جو یہ دھمکی دی گئی اس میں کنیزوں کو چھیڑنے کا بھی انتظام کیا اور دوسری شرارت افواہیں پھیلانے کا بھی انسداد ہوگیا، مطلب آیت کا یہ ہوا کہ اگر یہ لوگ علی الاعلان مخالفت احکام اور مسلمانوں کے خلاف حرکتوں سے باز آگئے اگرچہ درپردہ اپنی منافقانہ چالوں میں لگے رہیں تو یہ سزا جاری نہ ہوگی، ورنہ پھر عام کفار کے حکم میں داخل ہوکر سزاوار ہوجائیں گے۔

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ ثابت ہوا کہ: ① عورتوں کو جب کسی ضرورت کی بنا پر گھر سے نکلنا پڑے تو لمبی چادر سے تمام بدن چھپا کر نکلیں، اور اس چادر کو سر کے اوپر سے لٹکا کر چہرہ بھی چھپا کر چلیں، مروجہ برقع بھی اس کے قائم مقام ہے۔

② مسلمانوں میں ایسی افواہیں پھیلانا حرام ہے جن سے ان کو تشویش اور پریشانی ہو اور نقصان پہنچے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جن کو بدنظری اور شہوت پرستی کا روگ لگا ہوا ہے۔

فائدہ: ۲ یہ غالباً یہود ہیں جو اکثر جھوٹی خبریں اڑا کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کیا کرتے تھے اور ممکن ہے منافق ہی مراد ہوں۔

فائدہ: ۳ یعنی اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے تا چندروز میں ان کو مدینہ سے نکال باہر کریں، اور جتنے دن رہیں ذلیل و مرعوب ہو کر رہیں، چنانچہ یہود نکالے گئے اور منافقوں نے دھمکی سن کر شاید اپنا رویہ بدل دیا ہوگا، اس لیے سزا سے بچے رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جو لوگ بدنیت تھے مدینہ میں عورتوں کو چھیڑتے، ٹوکتے، اور جھوٹی خبریں اڑاتے، مخالفوں کے زور اور مسلمانوں کے ضعف و شکست کی وجہ سے تھا ان کو یہ فرمایا''۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾ ع

دستور پڑا ہوا ہے اللہ کا ان لوگوں میں جو پہلے ہو چکے ہیں، اور تو نہ دیکھے گا اللہ کی چال بدلی

خلاصہ تفسیر: (اور فساد و شورش پر سزا جاری کرنا کچھ انہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ) اللہ تعالیٰ نے ان (مفسد) لوگوں میں بھی اپنا یہی دستور (جاری) رکھا ہے جو (ان سے) پہلے ہو گزرے ہیں (کہ ان کو آسمانی سزائیں دیں، یا انبیاء کے ہاتھ سے جہاد کے ذریعہ سزائیں دلوائی ہیں، پس اگر پہلے ایسا نہ ہو چکتا تو ایسی سزا میں کچھ استبعاد ہو سکتا تھا، اور اب تو اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں) اور آپ اللہ تعالیٰ کے دستور میں (کسی شخص کی طرف سے) رد و بدل نہ پائیں گے (کہ خدا تو کوئی حکم جاری کرنا چاہے اور کوئی اس کو روک سکے)۔

لفظ سنّۃ اللہ میں تو اس کا اظہار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ سے پہلے کوئی کام نہیں کر سکتا، اور ولن تجد لسنّۃ اللہ تبدیلاً میں یہ بتلا دیا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرمالیں تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔

* * *

فائدہ: یعنی عادت اللہ یہ ہی رہی ہے کہ پیغمبروں کے مقابلہ میں جنہوں نے شرارتیں کیں اور فتنے فساد پھیلائے، اسی طرح ذلیل و خوار یا ہلاک کیے گئے، یا یہ مطلب ہے کہ پہلی کتابوں میں یہ بھی حکم ہوا ہے کہ مفسدوں کو اپنے درمیان سے نکال باہر کرو۔ جیسا کہ حضرت شاہ صاحبؒ ''تورات'' سے نقل فرماتے ہیں۔

يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو، تو کہہ اس کی خبر ہے اللہ ہی کے پاس، اور تو کیا جانے شاید وہ گھڑی پاس ہی ہو

خلاصہ تفسیر: سابقہ آیات میں اللہ و رسول کی مخالفت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں لعنت و عذاب کی وعید سنائی گئی تھی اور چونکہ اس سے قیامت اور آخرت ثابت ہوتی ہے، اور کفار کے بہت سے فرقے خود قیامت اور آخرت ہی کے منکر تھے اور انکار کی وجہ سے بطور استہزاء کے پوچھا کرتے تھے کہ وہ قیامت کب آئے گی؟ اس لیے اب آگے اس کا جواب اور مذکورہ لعنت و عذاب کی تفصیل و کیفیت بیان کرتے ہیں۔

یہ (منکر) لوگ آپ سے قیامت کے متعلق (منکرانہ) سوال کرتے ہیں (کہ کب ہوگی؟) آپ (ان کے جواب میں) فرما دیجئے کہ اس (کے وقت) کی خبر بس اللہ ہی کے پاس ہے اور آپ کو کیا خبر (کہ کب ہے؟ البتہ اجمالاً ان لوگوں کو جان رکھنا چاہئے کہ) عجب نہیں کہ قیامت ابھی واقع ہو جائے (کیونکہ جب کوئی معین وقت مقرر نہیں تو قریب زمانے میں اس کے واقع ہو جانے کا احتمال بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جس کا تقاضا یہ تھا کہ یہ لوگ انجام سے ڈرتے اور اس کی تیاری میں لگتے، منکرانہ سوالات اور استہزاء سے بچتے)۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبًا: قیامت کو ’’قریب‘‘ فرمانے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قیامت ہر روز قریب ہی ہوتی جارہی ہے، جتنا بعد اور دوری گذشتہ کل تھی آج اس قدر نہیں رہی، اور جو چیز سامنے سے آرہی ہو اس کو قریب ہی سمجھنا دانش مندی ہے، اور دوسرے اس لحاظ سے بھی قیامت کو قریب کہا جاسکتا ہے کہ قیامت کے ہولناک واقعات اور سخت پریشانیوں کے سامنے یہ ساری دنیا کی عمر بھی قلیل نظر آئے گی، اور ہزاروں سال کی یہ مدت چند روز کے برابر محسوس ہوگی۔

* * *

فائدہ: گویا قیامت کے وقت کی ٹھیک تعیین کر کے اللہ نے کسی کو نہیں بتلایا، مگر یہاں اس کے قرب کی طرف اشارہ کردیا، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے شہادت کی اور بیچ کی انگلی اٹھا کر فرمایا: ’’انا والساعۃ کھاتین‘‘ (میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں) یعنی بیچ کی انگلی جس قدر آگے نکلی ہوئی ہے، میں قیامت سے بس اتنا پہلے آگیا ہوں، قیامت بہت قریب لگی چلی آرہی ہے۔

حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ’’شاید یہ بھی منافقوں نے ہتھکنڈا پکڑا ہوگا کہ جس چیز کا (دنیا میں کسی کے پاس) جواب نہیں وہ ہی بار بار سوال کریں۔ اس پر یہاں ذکر کردیا‘‘۔ اور ممکن ہے پہلے جو فرمایا تھا: لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا (الاحزاب: ۵۷) اس پر بطور تکذیب و استہزاء کے کہتے ہوں گے کہ وہ قیامت اور آخرت کب آئے گی جس کی دھمکیاں دی جاتی ہیں؟ آخر اس کا کچھ وقت تو بتاؤ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝۶۴ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝۶۵

بیشک اللہ نے پھٹکار دیا ہے منکروں کو اور رکھی ہے ان کے واسطے دہکتی ہوئی آگ ۱؎ رہا کریں اسی میں ہمیشہ، نہ پائیں کوئی حمایتی اور نہ مددگار

خلاصہ تفسیر: (اب اس لعنت اور عذاب کی کیفیت ارشاد ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ نے کافروں کو رحمت سے دور کر رکھا ہے، اور (اس لعنت ہی کا اثر یہ ہے کہ) ان کے لئے آتش سوزاں تیار کر رکھی ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) نہ کوئی یار پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔

* * *

فائدہ: اسی پھٹکار کا اثر ہے کہ لاطائل سوالات کرتے ہیں، انجام کی فکر نہیں کرتے۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝۶۶

جس دن اوندھے ڈالے جائیں گے ان کے منہ آگ میں ۱؎ کہیں گے کیا اچھا ہوتا جو ہم نے کہا مانا ہوتا اللہ کا اور کہا مانا ہوتا رسول کا ۲؎

خلاصہ تفسیر: جس روز ان کے چہرے دوزخ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے (یعنی چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے کبھی چہرے کی اس کروٹ پر، کبھی دوسری کروٹ پر، جیسا کہ اس طرح گھسیٹنے میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا منہ کبھی ایک طرف ہو جاتا ہے کبھی دوسری طرف، اور اس وقت غایت حسرت سے) یوں کہیں گے اے کاش! ہم نے (دنیا میں) اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی (تو آج اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اوندھے منہ ڈال کر ان کے چہروں کو آگ میں الٹ پلٹ کیا جائے گا۔

فائدہ: ۲؎ اس وقت حسرت کریں گے کہ کاش ہم دنیا میں اللہ و رسول کے کہنے پر چلتے تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝۶۷

اور کہیں گے اے رب! ہم نے کہا مانا اپنے سرداروں کا اور اپنے بڑوں کا پھر انہوں نے چکا دیا ہم کو راہ سے

ع رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿٦٨﴾

اے رب ان کو دے دونا عذاب اور پھٹکار ان کو بڑی پھٹکار۔ل

خلاصہ تفسیر: اور (حسرت کے ساتھ اپنے گمراہ کرنے والوں پر غصہ آئے گا تو) یوں کہیں گے کہ ہمارے رب! ہم اپنے سرداروں کا (یعنی اہل حکومت کا) اور اپنے بڑوں کا (جن میں کسی دوسری وجہ سے یہ صفت پائی جاتی تھی کہ ان کی بات ماننا اور اتباع کرنا ہمارے ذمے داری تھی) کہنا مانا تھا سوانہوں نے ہم کو (سیدھے) رستہ سے گمراہ کیا تھا اے ہمارے رب! (اس لیے) ان کو دوہری سزا دیجئے اور ان پر بڑی لعنت کیجئے۔

یہ ایسا ہی مضمون ہے جیسا سورۃ اعراف کے چوتھے رکوع میں پہلے آ چکا ہے: ربنا ھولاء اضلونا فاتھم عذاباً ضعفاً فی النار، جس کا جواب اسی آیت میں یہ بیان فرمایا ہے: قال لکل ضعف، جس سے معلوم ہو گیا کہ کفار کی اس درخواست سے جو غرض تھی وہ اس میں ناکام رہے، سورہ اعراف کی ان آیات کی تفسیر کو دیکھ لیا جائے۔

اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا: آج کل بدعات ورسوم کے اختیار کرنے میں مشائخ کی طرف منسوب کر کے بہت استدلال کرتے ہیں، تو اس آیت میں دلالت ہے کہ ایسی تقلید عذر نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ل یہ شدت غیظ سے کہیں گے کہ ہمارے ان دنیاوی سرداروں اور مذہبی پیشواؤں نے دھوکے دے کر اور جھوٹ فریب کہہ کر اس مصیبت میں پھنسوایا، ان ہی کے اغواء پر ہم راہ حق سے بھٹکے رہے، اگر ہمیں سزا دی جاتی ہے تو ان کو دوگنی سزا دیجئے اور جو پھٹکار ہم پر ہے، اس سے بڑی پھٹکار ان بڑوں پر پڑنی چاہیے، گویا ان کو دوگنی سزا دلوا کر اپنا دل ٹھنڈا کرنا چاہیں گے، اسی مضمون کی ایک آیت سورہ اعراف کے چوتھے رکوع میں گزر چکی ہے، وہیں ان کی اس فریاد کا جواب بھی دیا گیا ہے ملاحظہ کر لیا جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿٦٩﴾

اے ایمان والو تم مت ہو ان جیسے جنہوں نے ستایا موسیٰ کو پھر بے عیب دکھلا دیا اس کو اللہ نے ان کے کہنے سے، اور تھا اللہ کے یہاں آبرو والا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیتوں میں اللہ اور رسول کی مخالفت کا مہلک ہونا اور اطاعت کا باعث نجات ہونا معلوم ہوا، اب آگے خاص طور سے مسلمانوں کو اللہ ورسول کی مخالفت سے بچنے کی ہدایت ہے، کیونکہ یہ مخالفت ان کی ایذا کا سبب ہے، اور اطاعت وموافقت کا حکم ہے، کیونکہ احکام الٰہی سے یہی لوگ منتفع ہوتے ہیں۔

اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہونا جنہوں نے (کچھ تہمت تراش کر) موسیٰ (علیہ السلام) کو ایذاء دی تھی سو ان کو خدا تعالیٰ نے بری ثابت کر دیا اس چیز سے جو وہ کہتے تھے (یعنی ان کو تو کچھ نقصان نہ پہنچا، تہمت لگانے والے ہی کذاب اور مستحق سزا ٹھہرے) اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اللہ کے نزدیک بڑے معزز (پیغمبر) تھے (اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی براءت ظاہر فرما دی جیسا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کے لئے اس طرح کی وجاہت کی تہمتوں سے برات عام ہے، مطلب یہ ہے کہ تم رسول کی مخالفت کر کے ان کو ایذاء نہ دینا، کیونکہ ان کی مخالفت اللہ کی مخالفت ہے، ورنہ اس کے نتیجہ میں تم خود اپنا ہی نقصان کر لو گے)۔

لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى: اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ جس میں ان کی قوم نے ان کو ایذا پہنچائی تھی ذکر کر کے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مسلمانوں نے کبھی قصد وارادہ سے ایسا کیا ہو، بلکہ حفظ ما تقدم کے طور پر ہمیشہ احتیاط رکھنے کا حکم ہے، جیسا کہ خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہے، اور احادیث میں جو بعض لوگوں کے قصے آئے ہیں یا تو وہ منافقین کے قصے ہیں،

یا بعض ناواقف بھولے مسلمانوں کو ان باتوں کے موذی ہونے کی طرف توجہ والتفات نہ ہوا ہوگا۔

اس کا قصہ خود جناب رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر کے طور پر بیان فرمایا ہے، بخاری وغیرہ میں اس طرح مذکور ہے کہ بنی اسرائیل غلبہ جہالت سے کھلم کھلا ننگے نہایا کرتے تھے اور موسی علیہ السلام حکم شرعی کے موافق بدن چھپا کر کسی آڑ میں غسل فرماتے، بنی اسرائیل نے چرچا کیا کہ ان کے بدن میں کوئی عیب اور مرض ضرور ہے، اس لیے یہ سب کے سامنے بدن نہیں کھولتے، یہ بات ایذا رسانی کی تھی، اللہ تعالی کو اس عیب سے آپ کی براءت ظاہر کرنا تھی، آپ نے ایک بار تنہائی میں کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیے اور غسل کرنے لگے، خدا کے حکم سے وہ پتھر کپڑوں سمیت وہاں سے چلا، آپ کپڑے اٹھانے کے لیے اس کے پیچھے ہولیے، آپ کا گمان تھا کہ یہاں خالی میدان میں کوئی آدمی نہ ہوگا، اتفاق سے بنی اسرائیل کا ایک مجمع موجود تھا، وہ پتھر وہاں جا کر ٹھہرا، اور سب نے سر سے پاؤں تک دیکھ لیا کہ کسی قسم کا کوئی عیب آپ کے بدن میں نہیں، پھر آپ نے کپڑے پہن لیے، اور اس وقت سرمد کا یہ قول صادق آگیا:

پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید — بے عیباں را لباس عریانی داد

اس قصہ میں موسی علیہ السلام پر تو اس لیے اعتراض نہیں ہوسکتا ہے کہ آپ کے اختیار کو اس میں کوئی دخل نہ تھا، اور اللہ تعالی پر اس لیے اعتراض نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی قانون کے محکوم نہیں، اور یہاں تو موسی علیہ السلام کو بری کرنے کی حکمت بھی ظاہر ہے، اور خود اس براءت میں یہ حکمت ہے کہ نبی سے کسی کو نفرت نہ ہو جو کہ طبعا اتباع سے مانع ہوجاتی ہے، مذکورہ بالا قصہ حضور ﷺ نے بیان فرما کر ارشاد فرمایا: فذلك قوله تعالی: **یاایھا الذین امنوا لا تکونوا کالذین اذوا موسی**، یعنی قرآن کی اس آیت کا یہی مطلب ہے، پس یہ مذکورہ قصہ تو بالیقین اس آیت کی تفسیر ہے، باقی دیگر قصے بھی اگر ایذا کے عموم میں داخل کر لیے جائیں اور اس کی تخصیص کو تمثیل پر محمول کیا جائے تو گنجائش ہے، لیکن اس قصہ کے تفسیر ہونے کا انکار کرنا صحیح نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی تم ایسا کوئی کام یا کوئی بات نہ کرنا، جس سے تمہارے نبی کو ایذاء پہنچے، نبی کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، کیونکہ اللہ کے ہاں ان کی بڑے آبرو ہے، وہ سب اذیت دہ باتوں کو رد کر دے گا، ہاں تمہاری عاقبت خراب ہوگی، دیکھو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی نسبت لوگوں نے کیسی اذیت دہ باتیں کیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی وجاہت ومقبولیت کی وجہ سے سب کا ابطال فرما دیا اور موسیٰ کا بے خطا اور بے داغ ہونا ثابت کر دیا۔

① روایات میں ہے کہ بعض مفسد حضرت موسیٰ کو تہمت لگانے لگے کہ حضرت ہارون کو جنگل میں لے جا کر قتل کر آئے ہیں، اللہ تعالی نے ایک خارق عادت طریقہ سے اس کی تردید کردی ② اور صحیحین میں ہے کہ حضرت موسیٰ حیا کی وجہ سے (ابنائے زمانہ کے دستور کے خلاف) چھپ کر غسل کرتے تھے، لوگوں نے کہا کہ ان کے بدن میں کچھ عیب ہے، برص کا داغ یا خصیہ پھولا ہوا، ایک روز حضرت موسیٰ اکیلے نہانے لگے، کپڑے اتار کر ایک پتھر پر رکھ دیے، وہ پتھر کپڑے لے کر بھاگا، حضرت موسیٰ عصا لے کر اس کے پیچھے دوڑے، جہاں سب لوگ دیکھتے تھے پتھر کھڑا ہوگیا، سب نے برہنہ دیکھ کر معلوم کرلیا کہ بے عیب ہیں، کسی نے خوب کہا ہے:

پوشاند لباس ہر کرا عیبے دید — بے عیباں را لباس عریانی داد

③ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ قارون نے ایک عورت کو کچھ دے دلا کر مجمع میں کہلا دیا کہ موسیٰ علیہ السلام (العیاذ باللہ) اس کے ساتھ مبتلا ہیں، حق تعالیٰ نے آخر کار قارون کو زمین میں دھنسا دیا اور اسی عورت کی زبان سے اس تہمت کی تردید کرائی جیسا کہ سورہ قصص میں گزرا۔

تنبیہ: موسیٰ علیہ السلام کا پتھر کے تعاقب میں برہنہ چلے جانا مجبوری کی وجہ سے تھا اور شاید یہ خیال بھی نہ ہو کہ پتھر مجمع میں لے جا کر کھڑا کر دے گا، رہی پتھر کی حرکت وہ بطور "خرق عادت" تھی، خوارق عادات پر ہم نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے، اسے پڑھ لینے کے بعد اس قسم کی جزئیات میں الجھنے کی ضرورت نہیں رہتی، بہر حال اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں انبیاء (علیہم السلام) کو جسمانی وروحانی عیوب سے پاک ثابت کرنے کا کس قدر اہتمام ہے تا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کی طرف سے تنفر اور استخفاف کے جذبات پیدا ہو کر قبول حق میں رکاوٹ نہ ہو۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱتَّقُوا ٱللَّهَ وَقُولُوا قَوۡلٗا سَدِيدٗا ﴿٧٠﴾ يُصۡلِحۡ لَكُمۡ أَعۡمَٰلَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور کہو بات سیدھی، کہ سنوار دے تمہارے واسطے تمہارے کام اور بخش دے تم کو

ذُنُوبَكُمۡۗ وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِيمًا ﴿٧١﴾

تمہارے گناہ، اور جو کوئی کہنے پر چلا اللہ کے اور اس کے رسول کے اس نے پائی بڑی مراد۔[1]

خلاصہ تفسیر: (بلکہ ہر کام میں اللہ و رسول کی اطاعت کرنا جس کا حکم آگے آتا ہے کہ) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو (یعنی ہر امر میں اس کی اطاعت کرو) اور (بالخصوص کلام کرنے میں اس کی بہت رعایت رکھو کہ جب بات کرو) راستی کی بات کرو (جس میں عدل و اعتدال سے تجاوز نہ ہو) اللہ تعالیٰ (اس کے صلہ میں) تمہارے اعمال کو قبول کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا (کچھ ان اعمال کی برکت سے، کچھ توبہ کی برکت سے کہ وہ بھی تقویٰ اور قول سدید میں داخل ہے) اور (یہ تمام ثمرات اطاعت کے ہیں اور اطاعت ایسی بڑی چیز ہے کہ) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ بڑی کامیابی کو پہنچے گا۔

وَقُولُوا قَوۡلٗا سَدِيدٗا: تقویٰ اور اطاعت کی باتوں میں اس جگہ راستی کلام یعنی بات میں سچائی کو خاص طور پر شاید اس لیے ذکر کیا ہو کہ اس کو اکثر لوگ آسان سمجھتے ہیں، یا اس لیے کہ اس میں ایذا سخت اور صریح ہوتی ہے، نیز اس کا وقوع بھی زیادہ ہوتا ہے۔

يُصۡلِحۡ لَكُمۡ أَعۡمَٰلَكُمۡ: تقویٰ اور سچی بات سے عمل کا مقبول ہونا ظاہر ہے، کیونکہ عمل کا مقبول ہونا جن شرائط پر موقوف ہے وہ تقویٰ کے اجزاء ہیں، جب کسی عمل کے مقبول ہونے میں کمی ہوگی ضرور تقویٰ کا کوئی جز کم ہوگا۔

صدق بیانی اور تقویٰ دیگر اعمال کی درستگی کا ذریعہ ہیں، اس میں دلالت ہے کہ اعمال صالحہ کو جیسا ثواب میں دخل ہے، اسی طرح دوسرے اعمال کی اصلاح میں بھی ان کو دخل ہے، اسی بنا پر مشائخ بعض اوقات ایک کام کا حکم دیتے ہیں مگر مقصود اس سے کسی دوسرے عمل کی اصلاح ہوتی ہے اور اس ربط و تعلق کو وہ حضرات بخوبی جانتے ہیں۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی اللہ سے ڈر کر درست اور سیدھی بات کہنے والے کو بہترین اور مقبول اعمال کی توفیق ملتی ہے اور تقصیرات معاف کی جاتی ہیں، حقیقت میں اللہ و رسول کی اطاعت ہی میں حقیقی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے، جس نے یہ راستہ اختیار کیا مراد کو پہنچ گیا۔

إِنَّا عَرَضۡنَا ٱلۡأَمَانَةَ عَلَى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَٱلۡجِبَالِ فَأَبَيۡنَ أَن يَحۡمِلۡنَهَا وَأَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا

ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو پھر کسی نے قبول نہ کیا اس کو اٹھائیں اور اس سے ڈر گئے

وَحَمَلَهَا ٱلۡإِنسَٰنُۖ إِنَّهُۥ كَانَ ظَلُومٗا جَهُولٗا ﴿٧٢﴾

اور اٹھا لیا اس کو انسان نے، یہ ہے بڑا بے ترس نادان

خلاصہ تفسیر: پچھلے آیتوں میں اللہ و رسول کی اطاعت کا واجب ہونا اور مخالفت کا حرام ہونا مذکور ہے، بلکہ تمام تر سورت اسی مضمون کی شرح ہے، اب آگے اسی کی تاکید کے لیے خاتمہ سورت میں احکام کے ساتھ انسان کا مکلف ہونا بیان کرتے ہیں، اور احکام کو امانت کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کا حق ادا کرنے والوں کا مورد عنایت اور حق ضائع کرنے والوں کا مستحق عذاب ہونا بیان فرماتے ہیں۔

ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی (یعنی ان میں کچھ سمجھ اور شعور

پیدا کر کے جو کہ اب بھی ہے ان کے سامنے اپنے احکام پیش کیے، اور یہ کہہ دیا گیا کہ اگر تم ان احکام کو اپنے ذمہ رکھتے ہو تو ان کے موافق عمل کرنے میں ثواب، اور خلاف کرنے کی صورت میں عذاب ہوگا، اور اگر ذمہ نہیں لیتے تو مکلف نہ بنائے جاؤ گے، اور ثواب وعذاب کے مستحق نہ ہوگے، سو تم کو دونوں اختیار ہیں کہ اس کو نہ لینے سے نافرمان نہ ہوگے، جس قدر ان کو شعور تھا وہ اجمالاً اس قدر مضمون سمجھ لینے کے لئے کافی تھا، چونکہ ان کو اختیار بھی دیا گیا تھا) سو انہوں نے (عذاب کے خوف سے انہوں نے ثواب سے بھی دست برداری کی اور) اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس (کی ذمہ داری) سے ڈر گئے (کہ خدا جانے کیا انجام ہو، اور اگر وہ اپنے ذمہ رکھ لیتے تو انسان کی طرح ان کو بھی عقل عطا کی جاتی، جس پر احکام اور ثواب وعذاب کی تفصیل کا سمجھنا موقوف ہے، چونکہ انہوں نے منظور نہیں کیا، اس لیے عقل کی بھی ضرورت نہ ہوئی، غرض انہوں نے تو عذر کر دیا) اور (جب ان آسمان وزمین اور پہاڑوں کے بعد انسان کو پیدا کر کے اس سے یہی بات پوچھی گئی تو) انسان نے (بوجہ اس کے کہ علم الٰہی میں اس کا خلیفہ ہونا مقرر تھا) اس (امانت) کو اپنے ذمہ لے لیا (غالباً اس وقت تک انسان میں بھی اتنا ہی ضرورت کے قدر شعور ہوگا، پھر اس التزام کے بعد انسان کی حالت اکثر افراد کے اعتبار سے یہ ہوئی کہ) وہ (انسان عمل میں) ظالم ہے (اور علم میں) جاہل ہے (یعنی اعمال وعقائد دونوں میں خلاف ورزی کرتا ہے)۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ: غالباً یہ پیش کرنا اخذ میثاق سے پہلے ہے، اور وہ میثاق اسی حمل امانت کی فرع ہے، اور اس میثاق کے وقت اس میں عقل عطا کی گئی ہوگی، اور یہ کسی خاص انسان مثلاً آدم علیہ السلام سے نہیں پوچھا گیا، بلکہ اخذ میثاق کی طرح سب انسانوں سے ہوئی، اور التزام بھی عام تھا، پس آسمان، زمین اور پہاڑ مکلف نہ ہوئے اور انسان مکلف بنا دیا گیا، آیت میں اس کا یاد دلانا غالباً اسی حکمت سے ہے جیسا کہ میثاق یاد دلایا، یعنی ان احکام کا تم نے از خود التزام کیا ہے تو پھر نبھانا چاہئے، اور چونکہ مکلف جن بھی ہے اس لئے غالباً وہ اس عرض اور حمل میں شریک ہیں مگر یہاں صرف خاص انسان کو اس لیے ذکر کیا گیا کہ اس مقام میں کلام اسی سے ہو رہا ہے۔

شریعت کی تمام تکلیفات امر ونہی کا مجموعہ ''امانت'' ہے، خلاصہ یہ ہے کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ کا مکلف و مامور ہونا ہے، جن میں پورا اترنے پر جنت کی دائمی نعمتیں اور خلاف ورزی یا کوتاہی پر جہنم کا عذاب موعود ہے، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ امانت سے مراد احکام الٰہیہ کا بار اٹھانے کی صلاحیت واستعداد ہے جو عقل وشعور کے خاص درجہ پر موقوف ہے، اور ترقی اور استحقاق خلافت الٰہیہ اسی خاص استعداد پر موقوف ہے جن اجناس مخلوقات میں یہ استعداد نہیں ہے وہ اپنی جگہ کتنا ہی اونچا اور اعلیٰ مقام رکھتے ہوں مگر وہ اس مقام سے ترقی نہیں کر سکتے، اسی وجہ سے آسمان زمین وغیرہ میں یہاں تک کہ فرشتوں میں بھی ترقی نہیں جس کا جو مقام قرب ہے بس وہی ہے، ان کا حال یہ ہے: وما منا الا له مقام معلوم، ''یعنی ہم میں سے کوئی نہیں مگر اس کا ایک معین مقام ہے''، امانت کے اس مفہوم میں تمام روایات حدیث جو امانت کے متعلق آئی ہیں مربوط ومطابق ہو جاتی ہیں، جمہور مفسرین کے اقوال بھی اس میں تقریباً متفق ہو جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ آسمان، زمین، پہاڑ جو غیر ذی روح اور بظاہر بے علم وشعور ہیں ان کے سامنے پیش کرنے اور ان کے جواب دینے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ بعض حضرات نے تو اس کو مجاز اور تمثیل قرار دے دیا جیسے قرآن کریم نے ایک موقع پر بطور تمثیل کے فرمایا: لو انزلنا هذا القرآن علیٰ جبل لرایة خاشعاً متصدعاً ''یعنی ہم اگر یہ قرآن پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ بھی اس کے بوجھ سے جھک جاتا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا'' کہ اس میں بطور فرض کے یہ مثال دی گئی ہے، یہ نہیں کہ حقیقتاً پہاڑ پر اتارا ہو، ان حضرات نے یہاں آیت انا عرضنا کو بھی اسی طرح کی تمثیل ومجاز قرار دے دیا، مگر جمہور علماء کے نزدیک یہ صحیح نہیں، کیونکہ جس آیت سے تمثیل پر استدلال کیا گیا ہے وہاں تو قرآن کریم نے حرف لو کے ساتھ بیان کر کے اس کا قضیہ فرضیہ ہونا خود واضح کر دیا ہے، اور یہاں آیت انا عرضنا میں ایک واقعہ کا اثبات ہے، جس کو مجاز وتمثیل پر حمل کرنا بغیر کسی دلیل کے جائز نہیں۔

اور اگر دلیل میں یہ کہا جائے کہ یہ چیزیں بے حس وبے شعور ہیں ان سے جواب سوال نہیں ہو سکتا، تو یہ قرآن کی دوسری تصریحات سے مردود ہے، کیونکہ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے: وان من شئی الا یسبح بحمده ''یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی حمد وتسبیح نہ پڑھتی ہو''، اور ظاہر ہے کہ اللہ

تعالیٰ کو پہچاننا اور اس کو خالق و مالک اور سب سے اعلیٰ و برتر جان کر اس کی تسبیح کرنا بغیر ادراک و شعور کے ممکن نہیں، اس لئے اس آیت سے ثابت ہوا کہ ادراک و شعور تمام مخلوقات میں یہاں تک کہ جمادات میں بھی موجود ہے، اسی ادراک و شعور کی بنا پر ان کو مخاطب بھی بنایا جاسکتا ہے اور وہ جواب بھی دے سکتے ہیں، جواب کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، الفاظ و حروف کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے اور اس میں عقلی امتناع نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان جمادات، آسمان، زمین اور پہاڑوں کو نطق و گویائی عطا فرمادیں، اس لئے جمہور امت کے نزدیک آسمان، زمین اور پہاڑوں پر عرض امانت حقیقی طور پر کیا گیا اور انہوں نے حقیقی طور پر ہی اپنا اس بار سے عاجز ہونا ظاہر کیا، اس میں کوئی تمثیل یا مجاز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ جب حق تعالیٰ شانہ نے آسمان زمین وغیرہ پر اس امانت کو خود پیش فرمایا تو ان کو مجال انکار کیسے ہوئی؟ حکم الٰہی سے روگردانی کی تھی تو ان کو نیست و نابود ہوجانا چاہئے تھا، اسکے علاوہ آسمان و زمین کا مطیع ہونا اور تابع فرمان ہونا قرآن کریم کی آیت اتینا طائعین سے بھی ثابت ہے، یعنی جب حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکم دیا کہ (ہمارے حکم کی تعمیل کیلئے) آجاؤ خواہ اپنی خوشی سے یا زبردستی سے، تو دونوں نے یہ جواب دیا کہ ہم تعمیل حکم کیلئے خوشی سے حاضر ہیں، جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ میں انکو ایک حاکمانہ پابندی کا حکم دے دیا گیا تھا، جس میں یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ تم اس حکم پر دل سے راضی ہو یا نہ ہو بہرحال یہ حکم ماننا پڑے گا، بخلاف یہاں آیت عرض امانت کے کہ اس میں امانت کو پیش کرکے انکو اختیار دیا گیا تھا کہ قبول کریں یا نہ کریں۔

عرض امانت کا واقعہ کس زمانے میں ہوا؟ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عرض امانت آسمان، زمین وغیرہ پر تخلیق آدم سے پہلے ہوا تھا، پھر جب آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا تو ان کے سامنے یہ بھی بیان فرمایا گیا کہ آپ سے پہلے آسمان زمین پر بھی یہ امانت پیش کی جاچکی ہے، جس کی ان کو طاقت نہ تھی، اس لئے عذر کردیا، اور ظاہر یہ ہے کہ یہ عرض امانت کا واقعہ میثاق اول یعنی عہد الست سے پہلے کا ہے، کیونکہ عہد الست بربکم اسی بار امانت کی پہلی کڑی اور اپنے منصب کا حلف اٹھانے کے قائم مقام ہے۔

حق تعالیٰ نے تقدیر ازلی میں آدم علیہ السلام کو زمین میں اپنا خلیفہ بنانا طے فرمایا تھا اور یہ خلافت اسی کو سپرد کی جاسکتی تھی جو احکام الٰہیہ کی اطاعت کا بار اٹھائے، کیونکہ اس خلافت کا حاصل ہی یہ ہے کہ زمین پر اللہ کے قانون کو نافذ کرے، خلق خدا کو احکام الٰہیہ کی اطاعت پر آمادہ کرے، اس لئے تکوینی طور پر حضرت آدم علیہ السلام اس امانت کے اٹھانے کے لئے آمادہ ہوگئے، حالانکہ دوسری بڑی بڑی مخلوقات کا اس سے عاجز ہونا بھی معلوم ہوچکا تھا۔

* * *

فائدہ: یعنی ستم کرڈیئے، جو بوجھ آسمان، زمین اور پہاڑوں سے نہ اٹھ سکتا تھا، اس نادان نے اپنے نازک کندھوں پر اٹھالیا:

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یعنی اپنی جان پر ترس نہ کھایا، امانت کیا ہے؟ پرائی چیز رکھنی اپنی خواہش کو روک کر، آسمان و زمین وغیرہ میں اپنی خواہش کچھ نہیں، یا ہے تو وہ ہی ہے جس پر قائم ہیں، آسمان کی خواہش پھرنا، زمین کی خواہش ٹھہرنا، انسان میں خواہش اور ہے اور حکم خلاف اسکے، اس پرائی چیز (یعنی حکم) کو برخلاف اپنے جی کے تھامنا بڑا زور چاہتا ہے، اسکا انجام یہ ہے کہ منکروں کو قصور پر پکڑا جائے اور ماننے والوں کا قصور معاف کیا جائے، اب بھی یہ ہی حکم ہے کسی کی امانت کوئی جان کر ضائع کردے تو بدلہ (ضمان) دینا پڑے گا اور بے اختیار ضائع ہوجائے تو بدلہ نہیں"۔ (موضح القرآن)

اصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ایک خاص امانت مخلوق کی کسی نوع میں رکھنے کا ارادہ کیا، جو اس امانت کو اگر چاہے تو اپنی سعی و کسب اور قوت بازو سے محفوظ رکھ سکے اور ترقی دے سکے، تاکہ اس سلسلہ میں اللہ کی ہر قسم کی شؤن وصفات کا ظہور ہو، مثلاً اس نوع کے جو افراد امانت کو پوری طرح محفوظ رکھیں اور ترقی دیں ان پر انعام و اکرام کیا جائے، جو غفلت یا شرارت سے ضائع کردیں، ان کو سزا دی جائے اور جو لوگ اس بارے میں قدرے کوتاہی کریں ان سے عفو و درگزر کا معاملہ ہو۔

میرے خیال میں یہ "امانت" ایمان و ہدایت کا ایک تخم ہے جو قلوب بنی آدم میں بکھیرا گیا، جس کو "مابہ التکلیف" بھی کہہ سکتے ہیں، "لا ایمان لمن لا امانۃ لہ" اسی کی نگہداشت اور تردد کرنے سے ایمان کا درخت اگتا ہے، گویا بنی آدم کے قلوب اللہ کی زمینیں ہیں، بیج بھی اسی نے ڈال دیا

ہے، بارش برسانے کے لیے رحمت کے بادل بھی اس نے بھیجے، جن کے سینوں سے وحی الٰہی کی بارش ہوئی، آدمی کا فرض یہ ہے کہ ایمان کے اس بیج کو جو امانت الٰہیہ ہے ضائع نہ ہونے دے، بلکہ پوری سعی و جہد اور تردد وتفقد سے اس کی پرورش کرے، مبادا غلطی یا غفلت سے بجائے درخت اگنے کے بیج بھی سوخت ہوجائے، اسی کی طرف اشارہ ہے حذیفہؓ کی اس حدیث میں:

"ان الامانة نزلت من السماء فی جذر قلوب الرجال ثم علموا من القرآن" (الحدیث)

یہ "امانت" وہی تخم ہدایت ہے جو اللہ کی طرف سے قلوب رجال میں تہ نشین کیا گیا، پھر علوم قرآن وسنت کی بارش ہوئی، جس سے اگر ٹھیک طور پر انتفاع کیا جائے تو ایمان کا پودا اُگے، بڑھے، پھولے، پھلے اور آدمی کو اس کے ثمرہ شیریں سے لذت اندوز ہونے کا موقع ملے، اگر انتفاع میں کوتاہی کی جائے تو اسی قدر درخت کے ابھرنے اور پھولنے پھلنے میں نقصان رہے، یا بالکل غفلت برتی جائے تو سرے سے تخم بھی برباد ہوجائے۔

یہ "امانت" تھی جو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور پہاڑوں کو دکھلائی، مگر کس میں استعداد تھی جو اس امانت عظیمہ کو اٹھانے کا حوصلہ کرتا، ہر ایک نے بلسان حال یا بزبان قال ناقابل برداشت ذمہ داریوں سے ڈر کر انکار کردیا کہ ہم سے یہ بار نہ اٹھ سکے گا، خود سوچ لو کہ بجز انسان کے کون سی مخلوق ہے جو اپنے کسب و محنت سے اس تخم ایمان کی حفاظت و پرورش کرکے ایمان کا شجر بارآور حاصل کرسکے، فی الحقیقت عظیم الشان "امانت" کا حق ادا کرسکنا اور ایک افتادہ زمین کو جس میں مالک نے تخم تیزی کردی تھی، خون پسینہ ایک کرکے باغ و بہار بنالینا اسی "ظلوم"، "جہول" انسان کا حصہ ہوسکتا ہے جس کے پاس زمین قابل موجود ہے اور محنت وتردد کرکے کسی چیز کو بڑھانے کی قدرت اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے۔

ظلوم وجھول: "ظالم"، "جاہل" کا مبالغہ ہے، ظالم و جاہل وہ کہلاتا ہے جو بالفعل عدل اور علم سے خالی ہو، مگر استعداد و صلاحیت ان صفات کے حصول کی رکھتا ہو، پس جو مخلوق بدءِ فطرت سے علم وعدل کے ساتھ متصف ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی یہ اوصاف سے جدا نہیں ہوئے، مثلاً ملائکۃ اللہ یا جو مخلوق ان چیزوں کے حاصل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی (مثلاً زمین آسمان پہاڑ وغیرہ) ظاہر ہے کہ دونوں اس امانت الٰہیہ کے حامل نہیں بن سکتے، بیشک انسان کے سوا "جن" ایک نوع ہے جس میں فی الجملہ استعداد اس کے تحمل کی پائی جاتی ہے اور اسی لیے: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** (الذاریات: ۵۶) میں دونوں کو جمع کیا گیا، لیکن انصاف یہ ہے کہ ادائے حق امانت کی استعداد ان میں اتنی ضعیف تھی کہ حمل امانت کے مقام میں چنداں قابل ذکر اور درخور اعتناء نہیں سمجھے گئے، گویا وہ اس معاملہ میں انسان کے تابع قرار دیئے گئے جن کا نام مستقل طور پر لینے کی ضرورت نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

تاکہ عذاب کرے اللہ منافق مردوں کو اور عورتوں کو اور شرک والے مردوں کو اور عورتوں کو اور معاف کرے اللہ ایمان دار مردوں کو

ع۹ **وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾**

اور عورتوں کو، اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیت میں بیان کردہ حالت تو اکثر افراد کے اعتبار سے ہے، باقی مجموعہ کے اعتبار سے اس ذمہ داری کا) انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ منافقین ومنافقات اور مشرکین ومشرکات کو (کہ یہ لوگ احکام کو ضائع کرنے والے ہیں) سزا دے گا اور مومنین ومومنات پر توجہ (اور رحمت) فرمادے گا (کیونکہ یہ امانت کا حق ادا کرنے والے ہیں) اور (مخالفت کے بعد بھی اگر کوئی باز آجائے تو پھر اس کو بھی مومنین ومومنات کے زمرہ میں شامل کرلیا جائے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

* * *

فائدہ: میرے نزدیک اس جگہ: ویتوب اللہ علی المومنین الخ کے معنی معاف کرنے کے نہ لیے جائیں، بلکہ ان کے حال پر

متوجہ ہونے اور مہربانی فرمانے کے لیں تو بہتر ہے، جیسے: لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ (التوبہ:۱۱۷) میں لیے گئے ہیں، یہ تو مومنین کاملین کا بیان ہوا، اور: وکان اللہ غفورا رحیما میں قاصرین ومقصرین کے حال کی طرف اشارہ فرمادیا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

نسأل الله تعالىٰ أن يتوب علينا و يغفرلنا و يثيبنا بالفوز العظيم إنه جل جلاله وعم نواله غفور رحيم

ایاتہا ۵۴ ۳۴ سُوْرَةُ سَبَاٍ مَكِّيَّةٌ ۵۸ رکوعاتہا ٦

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں شروع سے لے کر اخیر تک تین مضمون بیان فرمائے۔ توحید اور رسالت اور قیامت اور یہی تینوں مضمون امانت الٰہیہ کے جزء اعظم ہیں اور جو لوگ عیش پرستی میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں وہی لوگ قیامت اور حشر اور نشر کے زیادہ منکر ہوتے ہیں، ان کی نظر صرف دنیاوی لذتوں پر ہوتی ہے، اس لئے اس سورت میں دلائل توحید کے علاوہ ان لوگوں کی خاص طور پر تہدید و توبیخ کی گئی جو قیامت کے منکر تھے جو یہ کہتے تھے: لا تاتینا الساعة ان کے جواب میں کہا گیا: قل بلی وربی لتاتینکم اس لئے اس سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد اور شکر سے کیا گیا اور بتلادیا گیا کہ حمد وشکر کی مستحق صرف وہی ذات ہے، جو آسمان وزمین کی مالک ہے اس لئے کہ تمام نعمتوں کا سرچشمہ آسمان کی بارش اور زمین کی پیداوار ہے، اس لئے اس سورت میں دلائل توحید کے ساتھ دلائل قیامت کو بھی بیان کیا تا کہ مشرکین اور منکرین قیامت کا رد ہوجائے اور ان لوگوں کا بھی رد فرمایا کہ جو نبی کریم ﷺ کو مفتری اور ساحر اور مجنون کہتے تھے کہ جو شخص علم وحکمت کی باتیں پیش کرتا ہو اس کو مجنون کہنا خود اس کہنے والے کے دیوانہ اور مجنون ہونے کی دلیل ہے، نیز گذشتہ سورت کے اخیر میں ذکر تھا کہ کفار بطور تمسخر آپ ﷺ سے یہ سوال کرتے تھے کہ قیامت کب ہوگی: یسالك الناس عن الساعة اور اس سورت میں یہ ذکر فرمایا کہ کفار صراحۃً قیامت کے منکر ہیں: وقال الذین کفروا لا تاتینا الساعة اس سورت میں ان کے اس صریحی انکار کو نقل کر کے اس کا جواب دیا، گذشتہ سورت میں کفار کے سوال کا ذکر تھا اور اس سورت میں ان کے صریح انکار کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ①

سب خوبی اللہ کی ہے جسکا ہے جو کچھ کہ ہے آسمان اور زمین میں اور اسی کی تعریف ہے آخرت میں، اور وہی ہے حکمتوں والا سب کچھ جاننے والا

خلاصہ تفسیر: تمام ترحمد (وثنا) اسی اللہ کو سزاوار ہے، جس کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور کچھ زمین میں ہے (جس طرح وہ فی الحال مستحق حمد ہے اسی طرح) اسی کو حمد (وثناء) آخرت میں (بھی) سزاوار ہے (اس کا ظہور اس طرح ہوگا کہ اہل جنت، جنت میں داخل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد ان الفاظ میں کریں گے: الحمد لله الذی هدانا لهذا، الحمد لله الذی اذهب عنا الحزن، الحمد لله الذی صدقنا وعده، وغیرہ) اور وہ حکمت والا ہے (کہ آسمان وزمین کی تمام مخلوقات کو بیشمار مصالح اور منافع پر مشتمل بنایا ہے، اور وہ) خبردار (بھی) ہے (کہ ان مصالح اور منافع کو پیدا کرنے سے پہلے سے جانتا ہے، ہر چیز میں مصالح اور منافع بڑی حکمت کے ساتھ رکھ دیئے)۔

* * *

فائدہ: یعنی سب خوبیاں اور تعریفیں اس خدا کیلئے ہیں جو اکیلا بلا شریک غیرے تمام آسمانی وزمینی چیزوں کا مالک وخالق اور نہایت حکمت و خبرداری سے ان کی تدبیر کرتا ہے، اس نے یہ سلسلہ بیکار پیدا نہیں کیا، ایسے حکیم ودانا کی نسبت یہ گمان نہیں ہوسکتا، ضرور ہے کہ یہ نظام آخر میں کسی اعلیٰ نتیجہ پر منتہی ہو، اسی کو آخرت کہتے ہیں، اور جس طرح دنیا میں وہ اکیلا تمام تعریفوں کا مستحق ہے، آخرت میں بھی صرف اسی کی تعریف ہوگی، بلکہ یہاں تو بظاہر اور کسی کی بھی تعریف ہوجاتی تھی، کیونکہ مخلوق کا فعل خالق کے فعل کا پردہ اور اسکا کمال اس کے کمال حقیقی کا پردہ تو ہے، لیکن وہاں سب وسائط اور پردے اٹھ

جائیں گے، جو کچھ ہوگا، سب دیکھیں گے کہ اسکی طرف سے ہورہا ہے، اس لیے صورۃً وحقیقۃً ہر حیثیت سے تنہا اسی محمود مطلق کی تعریف رہ جائے گی۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ

جانتا ہے جو کچھ کہ اندر گھستا ہے زمین کے اور جو کچھ کہ نکلتا ہے اس سے اور جو اترتا ہے آسمان سے اور جو چڑھتا ہے اس میں ۱

وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ﴿۲﴾

اور وہی ہے رحم والا بخشنے والا ۲

خلاصہ تفسیر: (اور وہ ایسا خبیر ہے کہ) وہ سب کچھ جانتا ہے جو چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے (مثلاً بارش کا پانی) اور جو چیز اس میں سے نکلتی ہے (مثلاً درخت اور عام نباتات) اور جو چیز آسمان سے اترتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے (مثلاً فرشتے جو آسمان سے اترتے ہیں اور چڑھتے رہتے ہیں، اور مثلاً احکام شرعیہ جو آسمان سے اتارے جاتے ہیں اور اعمال صالحہ جو آسمان میں لے جائے جاتے ہیں) اور (چونکہ ان سب چیزوں میں جسمانی یا روحانی منافع ہیں جن کا مقتضا یہ ہے کہ سب لوگ پورا شکر ادا کریں اور جو کوتاہی کرے وہ مستحق سزا ہو، لیکن) وہ (اللہ) رحیم (اور) غفور (بھی) ہے (اور اپنی رحمت سے صغیرہ گناہ کو نیک اعمال سے اور کبیرہ کو توبہ سے، اور کبھی دونوں قسم کے گناہوں کو محض اپنے فضل سے معاف فرمادیتا ہے، اور جو گناہ کفر و شرک کی حد تک پہنچ جائے اس کو ایمان لانے سے معاف کردیتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی آسمان و زمین کی کوئی چھوٹی بڑی چیز اس کے علم سے باہر نہیں، جو چیز زمین کے اندر چلی جاتی ہے، مثلاً جانور کیڑے مکوڑے نباتات کا بیج، بارش کا پانی، مردہ کی لاش، اور جو اس کے اندر سے نکلتی ہے مثلاً کھیتی، سبزہ، معدنیات وغیرہ اور جو اوپر چڑھتی ہے مثلاً روح، دعاء، عمل اور ملائکہ وغیرہ ان سب انواع و جزئیات پر اللہ کا علم محیط ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی یہ سب بستی اور چہل پہل اس کی رحمت اور بخشش سے ہے، ورنہ بندوں کی ناشکری اور حق ناشناسی پر اگر ہاتھوں ہاتھ گرفت ہونے لگے تو ساری رونق ایک لحظہ میں ختم کردی جائے: وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (فاطر: ۴۵)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَأْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ

اور کہنے لگے منکر نہ آئے گی ہم پر قیامت ۱ تو کہہ کیوں نہیں قسم ہے میرے رب کی البتہ آئے گی تم پر ۲ اس عالم الغیب کی

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَآ أَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ أَكْبَرُ

غائب نہیں ہوسکتا اس سے کچھ ذرہ بھر آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور کوئی چیز نہیں اس سے چھوٹی اور نہ اس سے بڑی

إِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳﴾

جو نہیں ہے کھلی کتاب میں ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا ذکر تھا، اب قیامت کا ذکر ہے کہ منکرین توحید قیامت کے بھی منکر تھے، اور نیز منکرین توحید کے عذاب کا وہ اصلی وقت بھی ہے۔

اور یہ کافر کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہ آئے گی، آپ فرمادیجئے کہ کیوں نہیں (آئے گی) قسم اپنے پروردگار عالم الغیب کی کہ وہ ضرور تم پر

آئے گی (اس کا علم ایسا وسیع اور محیط ہے کہ) اس (کے علم) سے کوئی ذرہ برابر بھی غائب نہیں نہ آسمانوں میں نہ زمین میں (بلکہ سب اس کے علم میں حاضر ہیں) اور نہ کوئی چیز اس (مذکورہ مقدار) سے چھوٹی ہے اور نہ کوئی چیز (اس سے) بڑی ہے مگر یہ سب (بوجہ احاطہ علم الٰہی کے) کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (مرقوم) ہے۔

قیامت کے متعلق کفار کے کئی شبہات تھے: ① ایک یہ کہ اگر وہ آنے والی ہے تو اس کا وقت بتلایئے، کما قال تعالیٰ: ایان مرسھا ② دوسرا یہ کہ ہمارے بدن کے اجزاء اور دیگر اجسام کا تو کہیں نشان بھی نہ رہے گا پھر وہ جمع کیسے ہوں گے؟ پس ان آیتوں میں خدا کے لیے علم غیب ثابت کرنے سے پہلے شبہ کا جواب ہو گیا کہ قیامت کے وقت کا علم بعض حکمتوں کی وجہ سے خدا تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے، پس نبی کے نہ جاننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قیامت واقع ہی نہ ہو، کما قال تعالیٰ: قل انما علمها عند الله، اور خدا کے علم کا محیط ہونا ثابت کر کے دوسرے شبہ کا جواب دے دیا کہ وہ اجزاء چاہے زمین میں مل جائیں یا ہوا میں منتشر ہو جائیں کسی بھی طرح ہمارے علم سے باہر نہ ہوں گے، ہم جب چاہیں جمع کر لیں گے، کما قال تعالیٰ: قد علمنا ما تنقص الارض منهم ③ تیسرا شبہ یہ تھا کہ وہ قیامت کو محال سمجھتے تھے اس کا جواب آگے آئے گا کہ: افلم یروا الی ما بین، الخ۔

* * *

فائدہ: ۱ کیوں نہیں آئے گی، اس کا منشاء آگے آتا ہے: اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ

فائدہ: ۲ یعنی وہ معصوم و مقدس انسان جس کے صدق و امانت کا اقرار سب کو پہلے سے تھا اور اب براہین ساطعہ سے اس کی صداقت پوری طرح روشن ہو چکی، مؤکد قسم کھا کر اللہ کی طرف سے خبر دیتا ہے کہ قیامت ضرور آئے گی، پھر تسلیم نہ کرنے کی کیا وجہ، ہاں! اگر کوئی محال یا خلاف حکمت بات کہتا تو انکار کی گنجائش ہو سکتی تھی، لیکن نہ یہ محال ہے نہ خلاف حکمت، پھر انکار کرنا ہٹ دھرمی نہیں تو کیا ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی اس عالم الغیب کی قسم جس کے علم محیط سے آسمان و زمین کا کوئی ذرہ یا ذرہ سے چھوٹی بڑی کوئی چیز بھی غائب نہیں۔
شاید یہ اس لیے فرمایا کہ قیامت کے وقت کی تعیین ہم نہیں کر سکتے، اس کا علم اسی کو ہے، جس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں، ہم کو جتنی خبر دی گئی بلاکم و کاست پہنچا دی اور اس کا جواب بھی ہو گیا جو کہتے تھے: وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ (السجدہ:۱۰) یعنی جب ہمارے ذرات منتشر ہو کر مٹی میں مل گئے، پھر کیسے دوبارہ اکٹھے کیے جائیں گے؟ تو بتلا دیا کہ کوئی ذرہ اس کے علم سے غائب نہیں، اور پہلے بتلایا جا چکا کہ آسمان و زمین کی ہر چیز پر قبضہ اسی کا ہے، لہٰذا اس کو کیا مشکل ہے کہ تمام منتشر ذرات کو ایک دم میں اکٹھا کر دے۔

تنبیہ: "کھلی کتاب" سے "لوح محفوظ" مراد ہے، جس میں ہر چیز اللہ کے علم کے مطابق ثبت ہے۔

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ④

تا کہ بدلہ دے ان کو جو یقین لائے اور کیے بھلے کام، وہ لوگ جو ہیں ان کے لیے ہے معافی اور عزت کی روزی

وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ⑤

اور جو لوگ دوڑے ہماری آیتوں کے ہرانے کو ان کو بلا کا عذاب ہے دردناک ۱

خلاصہ تفسیر: اب قیامت کی غرض و غایت بتلاتے ہیں کہ وہ قیامت اس لئے آئے گی:

تا کہ ان لوگوں کو صلہ (نیک) دے جو ایمان لائے تھے اور انہوں نے نیک کام کیا تھا (سو) ایسے لوگوں کے لئے مغفرت اور (بہشت میں) عزت کی روزی ہے، اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کے متعلق (ان کو باطل کرنے کی) کوشش کی تھی (نبی کو) ہرانے کے لئے (اگرچہ وہ اس کوشش میں ناکام ہی رہے) ایسے لوگوں کے واسطے سختی کا دردناک عذاب ہوگا۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ: قرآن کی تکذیب پر یہ سزا ہونی ہی چاہیے، کیونکہ اول تو قرآن فی نفسہ خدا کی طرف سے اترا ہوا

ہے، اور ایسے امرِ حق کو جھٹلانا خود حق تعالیٰ کو جھٹلانا ہے اس پر جتنی سزا ہو تھوڑی ہے، دوسرے قرآن راہ راست کی تعلیم دیتا ہے جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہے تو جو شخص اس کو نہ مانے گا وہ راہ راست سے قصداً دور رہے گا کہ نہ اس کو صحیح عقائد کا پتہ لگے گا نہ اعمال صالحہ کا اور یہی طریقہ تھا نجات کا، پس نجات کے طریقہ سے قصداً دور رہنے پر سزا ہونا بے جا نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی قیامت کا آنا اسلئے ضروری ہے کہ لوگوں کو ان کی نیکی اور بدی کا پھل دیا جائے اور حق تعالیٰ کی جملہ صفات کا کامل ظہور ہو۔

تنبیہ: ''جو لوگ دوڑے ہماری آیتوں کے ہرانے کو'': یعنی ہماری آیتوں کے ابطال اور لوگوں کو قولاً وفعلاً ان سے روکنے کے لیے کھڑے ہوئے، گویا وہ (العیاذ باللہ) اللہ کو عاجز کرنا اور ہرانا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَالْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ

اور دیکھ لیں جن کو ملی ہے سمجھ کہ جو تجھ پر اترا تیرے رب سے وہی ٹھیک ہے اور سجھاتا ہے راہ

الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۶

اس زبردست خوبیوں والے کی

خلاصہ تفسیر: اور (قرآن کا حق اور ہادی ہونا ایسا واضح ہے کہ اس کے علاوہ اور دلائل سے بھی ثابت ہے، ایک آسان طریقہ اس کے ثبوت کا یہ ہے کہ) جن لوگوں کو (آسمانی کتابوں کا) علم دیا گیا ہے وہ اس قرآن کو جو کہ آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے ایسا سمجھتے ہیں کہ وہ حق ہے اور وہ خدائے غالب محمود (کی رضا) کا راستہ بتلاتا ہے۔

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ: پس قرآن کی حفاظت کی یہ کھلی دلیل ہے کہ علماء اہل کتاب اس کو حق سمجھتے ہیں، اس استدلال کی تقریر سورہ شعراء آیت ۱۹۶، ۱۹۷ میں گذر چکی ہے، اور شاید قرآن کی حقانیت ثابت کرنے کا اہتمام اس جگہ اس لیے کیا گیا کہ وہ قیامت کی خبر دیتا ہے جس میں یہاں کلام ہو رہا ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ قیامت کے دن قرآن کے جھٹلانے پر بھی عذاب ہوگا۔

* * *

فائدہ: یعنی اس واسطے قیامت آنی ہے کہ جن لوگوں کو یقین تھا کہ انھیں عین الیقین حاصل ہو جائے اور آنکھوں سے دیکھ لیں کہ قرآن کی خبریں مو بہ مو صحیح و درست ہیں اور بیشک قرآن ہی وہ کتاب ہے جو اس زبردست خوبیوں والے خدا تک پہنچنے کا ٹھیک راستہ بتاتی ہے۔

بعض مفسرین نے ویری الذین الخ کا مطلب یہ لیا ہے کہ: وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ کے برخلاف جو اہل علم ہیں (خواہ مسلمان یا اہل کتاب) وہ جانتے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ قیامت وغیرہ کے متعلق قرآن کریم کا بیان بالکل صحیح ہے اور وہ آدمی کو وصول الی اللہ کے ٹھیک راستہ پر لے جاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ

اور کہنے لگے منکر ہم بتلائیں تم کو ایک مرد کہ تم کو خبر دیتا ہے جب تم پھٹ کر ہو جاؤ ٹکڑے ٹکڑے

اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۷ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

تم کو پھر نئے سرے سے بننا ہے، کیا بنا لایا ہے اللہ پر جھوٹ یا اس کو سودا ہے ۱۔ کچھ بھی نہیں پر جو یقین نہیں رکھتے آخرت کا

فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ﴿۸﴾

آفت میں ہیں اور دور جا پڑے غلطی میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (آگے پھر قیامت کا ثبوت بیان فرماتے ہیں، یعنی) یہ کافر (آپس میں) کہتے کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی بتائیں جو تم کو یہ (عجیب) خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو (اس کے بعد قیامت کو) تم ضرور ایک نئے جنم میں آؤ گے، معلوم نہیں اس شخص نے خدا پر (قصداً) جھوٹ بہتان باندھا ہے یا اس کو کسی طرح کا جنون ہے (کہ قصداً تو جھوٹ نہیں بولتا، مگر جنون کی وجہ سے واہی تباہی باتیں کرتا ہے، کیونکہ قیامت کا آنا تو محال ہے، تو اس کے آنے کی خبر دینا بھی ضرور غلط ہے، خواہ قصداً جھوٹ بولا گیا ہو، یا حواس میں خلل ہو، اب حق تعالیٰ ان دونوں شقوں کی تردید فرماتے ہیں کہ ہمارے نبی تو مفتری اور مجنون کچھ بھی نہیں) بلکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے (وہی) عذاب اور دور دراز گمراہی میں (مبتلا) ہیں (اس گمراہی کا اس وقت تو اثر یہ ہے کہ سچے آدمی بھی مفتری اور مجنون نظر آتے ہیں، اور انجام میں اثر یہ ہے کہ عذاب بھگتنا پڑے گا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ کفار قریش نبی کریم ﷺ کی شان میں یہ گستاخی کرتے تھے، یعنی آؤ تمہیں ایک شخص دکھلائیں جو کہتا ہے کہ تم گل سڑ کر اور ریزہ ریزہ ہو کر جب خاک میں مل جاؤ گے پھر تم کو از سر نو بھلا چنگا بنا کر کھڑا کر دیا جائے گا، بھلا ایسی مہمل بات کون قبول کر سکتا ہے، دو حال سے خالی نہیں، یا تو یہ شخص جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ لگاتا ہے کہ اس نے ایسی خبر دی، نہیں تو سودائی ہے، دماغ ٹھکانے نہیں، دیوانوں کی سی بے تکی باتیں کرتا ہے۔ (العیاذ باللہ)

فائدہ: ۲؎ یعنی نہ جھوٹ ہے نہ جنون، البتہ یہ لوگ عقل و دانش اور صدق و صواب کے راستہ سے بھٹک کر بہت دور جا پڑے ہیں، اور بیہودہ بکواس کر کے اپنے کو آفت میں پھنسا رہے ہیں، فی الحقیقت یہ بڑا عذاب ہے کہ آدمی کا دماغ اس قدر مختل ہو جائے کہ وہ خدا کے پیغمبروں کو مفتری یا مجنون کہنے لگے۔ (العیاذ باللہ)

اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ

کیا دیکھتے نہیں جو کچھ ان کے آگے ہے اور پیچھے ہے آسمان اور زمین سے، اگر ہم چاہیں دھنسا دیں ان کو

الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ﴿۹﴾ ع

زمین میں، یا گرا دیں ان پر ٹکڑا آسمان سے ۱؎ تحقیق اس میں نشانی ہے ہر بندے رجوع کرنے والے کے واسطے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور یہ جاہل جو قیامت کو محال اور مردہ جسم کے اجزاء جمع کرنے اور اس میں جان ڈالنے کو دشوار سمجھتے ہیں:

تو کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی طرف نظر نہیں کی (جو کہ قدرت الٰہی کی بڑی دلیلیں ہیں) جو ان کے آگے (بھی) اور ان کے پیچھے (بھی) موجود ہیں (کہ جدھر دیکھیں وہ نظر آ رہے ہیں، پس ان بڑے بڑے اجسام کا ابتداً پیدا کرنے والا کیا اس پر قادر نہیں کہ چھوٹے چھوٹے اجسام کو دوبارہ پیدا کر دے، کما قال تعالیٰ: لخلق السموٰت والارض اکبر من خلق الناس الخ، اور ان واضح دلائل کے بعد بھی قیامت کا انکار کرنا محض عناد اور سرکشی ہے، پس یہ لوگ ہیں تو اس قابل کہ انہی آسمان و زمین کو جو کہ بندوں کے لیے بڑی نعمتیں ہیں ان کے عذاب کا آلہ بنا دیا جائے کہ جس نعمت کی ناشکری ہو اسی نعمت کو عذاب کا آلہ بنانے سے سخت حسرت ہوتی ہے، اور ہم اس سزا پر بھی قادر ہیں چنانچہ) اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا (اگر چاہیں تو) ان پر آسمان کے ٹکڑے گرا دیں (لیکن حکمت کی وجہ سے مہلت دے رکھی ہے، غرض ان لوگوں کو قیامت کو محال نہیں سمجھنا چاہیے اور آسمان و زمین میں قدرت الٰہی پر نظر کرنی چاہیے، کیونکہ) اس (دلیل مذکور) میں (قدرت الٰہیہ) کی پوری دلیل ہے (مگر) اس بندہ کے لئے جو

(خدا کی طرف) متوجہ (بھی) ہو (اور حق کی طلب ہو یعنی دلیل تو کافی ہے مگر ان کی طرف سے طلب نہیں اس لئے محروم ہیں)۔

اس آیت میں قیام قیامت کے دلائل بھی ہیں کہ آسمان وزمین کی مخلوقات میں غور کرنے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کرنے سے وہ استبعاد ختم ہوسکتا ہے جو منکرین قیامت کو اس کی تسلیم سے مانع تھا، اور ساتھ ہی منکرین کے لئے سزا کی دھمکی بھی ہے کہ یہ آسمان وزمین کی تمام مخلوقات عظیمہ جو تمہارے لئے بڑی نعمتیں ہیں، اگر ان کے مشاہدہ کے بعد بھی تم تکذیب وانکار پر جمے رہے تو اللہ کی قدرت میں یہ بھی ہے کہ انہی نعمتوں کو تمہارے لئے عذاب بنادے کہ زمین تمہیں نگل جائے، یا آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تم پر گر پڑے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی کیا یہ لوگ اندھے ہوگئے ہیں کہ آسمان وزمین بھی نظر نہیں آتے جو آگے پیچھے ہر طرف نظر ڈالنے سے نظر آسکتے ہیں، ان کو تو وہ بھی مانتے ہیں کہ اللہ نے بنایا ہے، پھر جس نے بنایا، اسے توڑنا کیا مشکل ہے اور جو ایسے عظیم الشان اجسام کو بنا سکتا اور توڑ پھوڑ سکتا ہے، اسے انسانی جسم کا بگاڑ دینا اور بنانا کیا مشکل ہوگا، یہ لوگ ڈرتے نہیں کہ اسی کے آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر رہ کر ایسے گستاخانہ کلمات زبان سے نکالیں، حالانکہ خدا چاہے تو ابھی ان کو زمین میں دھنسا کر یا آسمان سے ایک ٹکڑا گرا کر نیست ونابود کردے اور قیامت کا چھوٹا سا نمونہ دکھلا دے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جو بندے عقل وانصاف سے کام لے کر اللہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں، اسی آسمان وزمین میں ان کے لیے بڑی بھاری نشانی موجود ہے وہ اس منظم اور پُرحکمت نظام کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ ضرور یہ ایک دن کسی اعلیٰ واکمل نتیجہ پر پہنچنے والا ہے جس کا نام ''دارالآخرت'' ہے، یہ تصور کر کے وہ بیش از بیش اپنے مالک وخالق کی طرف جھکتے ہیں اور جو آسمانی وزمینی نعمتیں ان کو پہنچتی ہیں، تہ دل سے اس کے شکر گزار ہوتے ہیں، ان میں سے بعض بندوں کا ذکر آگے آتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝۱۰

اور ہم نے دی ہے داؤد کو اپنی طرف سے بڑائی ۱؎ اے پہاڑو خوش آوازی سے پڑھو اسکے ساتھ اور اڑتے جانوروں کو ۲؎ اور نرم کردیا ہم نے اسکے آگے لوہا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے والے بندوں کی فضیلت اجمالاً بیان فرمائی ہے، اب آگے اس کی تفصیل کے لیے بعض اعلیٰ درجہ کے حضرات یعنی حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کا قصہ بیان کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی طرف متوجہ ہونا سرمایہ سعادت ہے اور اپنی استعداد کے موافق اس سے حصہ لیں، نیز حضرت داؤد وسلیمان علیہما السلام کو چونکہ دنیاوی سامان ایسا دیا گیا تھا جو دنیا پرستوں کے نزدیک بھی بہت عجیب وغریب چیز تھی، اس لیے ان کی نبوت میں کسی کو انکار کی گنجائش نہیں رہتی تو ان کی نبوت بیان کرنے سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ انسان کا نبی ہونا کچھ دشوار نہیں، پس کفار جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار اس وجہ سے کرتے تھے کہ رسول آدمی نہیں ہوتا، اس شبہ کا جواب بھی اس قصہ سے ہوجائے گا۔

اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو اپنی طرف سے بڑی نعمت دی تھی (چنانچہ ہم نے پہاڑوں کو حکم دیا تھا کہ) اے پہاڑو! داؤد کے ساتھ بار بار تسبیح کرو (یعنی جب یہ ذکر میں مشغول ہوں تم بھی ان کا ساتھ دو) اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی حکم دیا (کہ ان کے ساتھ تسبیح کرو جیسا کہ ارشاد ہے: انا سخرنا الجبال معہ یسبحن بالعشی والاشراق والطیر محشورۃ الخ) اور (ایک نعمت یہ دے دی کہ) ہم نے ان کے واسطے لوہے کو (موم کی طرح) نرم کردیا۔

يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ: ساتھ تسبیح کرنے میں شاید ایک حکمت یہ ہو کہ داؤد علیہ السلام کو ذکر میں نشاط ہو، اور یہ بھی حکمت ہو کہ آپ کا ایک معجزہ ظاہر ہوگا اور غالباً یہ تسبیح ایسی ہوگی جس کو سب لوگ سمجھتے ہوں گے، ورنہ اس میں اس میں داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کرنے کی کیا تخصیص ہوگی، اسی لیے ظاہر ہے کہ اس تسبیح کو عام سننے والے بھی سنتے سمجھتے ہوں گے ورنہ پھر یہ معجزہ ہی نہ ہوتا، کیونکہ پہاڑ اور دیگر مخلوقات وغیرہ ایسی تسبیح تو اب بھی کرتے ہیں جس کو لوگ نہیں سمجھتے، کما قال تعالیٰ: وان من شئی الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی آواز کے ساتھ پہاڑوں کا آواز ملانا اور تسبیح کو دہرانا یہ آواز باز گشت کے طور پر نہ تھا جو عام طور پر گنبد یا کنویں وغیرہ میں آواز دینے کے وقت آواز کے لوٹنے سے سنی جاتی ہے، کیونکہ قرآن کریم نے اس کو حضرت داؤد علیہ السلام پر خصوصی فضل و انعام کی حیثیت میں ذکر فرمایا ہے، آواز باز گشت میں کسی کی فضیلت وخصوصیت سے کیا تعلق ہے، وہ تو ہر انسان چاہے کافر ہی ہو باز گشت کی جگہ میں اس کی آواز بھی لوٹتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نبوت کے ساتھ غیر معمولی سلطنت عنایت فرمائی۔

فائدہ: ۲ حضرت داؤد علیہ السلام کبھی کبھی جنگل میں نکلتے، خدا کو یاد کرتے، خوف الٰہی سے روتے، تسبیح وتہلیل میں مشغول رہتے اور اپنی ضرب المثل خوش آوازی سے زبور پڑھتے، اس کی عجیب وغریب تاثیر سے پہاڑ بھی ان کے ساتھ تسبیح پڑھنے لگتے تھے اور پرندے ان کے گرد جمع ہو کر اسی طرح آواز کرتے، حق تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو یہ خاص بزرگی عطا فرمائی تھی، ورنہ پہاڑوں کی تسبیح سے مراد محض ان کی آواز باز گشت ہو، یا وہ عام تسبیح جو ہر چیز زبان حال یا قال سے کرتی رہتی ہے تو حضرت داؤد کے مخصوص فضل وشرف کے ذیل میں اس چیز کا ذکر کرنا محض بے معنی ہوگا (العیاذ باللہ)۔

یاجبال اوّبی معه: کا حکم تکوینی ہے۔

اَنِ اعۡمَلۡ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرۡ فِی السَّرۡدِ وَاعۡمَلُوۡا صَالِحًا ؕ اِنِّیۡ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ⑪

کہ بنا زرہیں کشادہ اور اندازے سے جوڑ کڑیاں ۱ اور کرو تم سب کام بھلا میں جو کچھ تم کرتے ہو دیکھتا ہوں ۲

خلاصہ تفسیر: (اور یہ حکم دیا) کہ تم (اس لوہے کی اچھی) پوری زرہیں بناؤ اور (کڑیوں کے) جوڑنے میں (مناسب) اندازہ (کا خیال) رکھو اور (جیسے ہم نے تم کو نعمتیں دی ہیں ان کے شکر میں) تم سب (یعنی داؤد علیہ السلام اور ان کے متعلقین) نیک کام کیا کرو، میں تمہارے سب کے اعمال کو دیکھ رہا ہوں (اس لئے احکام وحدود کی رعایت کا پورا اہتمام رکھو)۔

وَاَلَنَّا لَهُ الۡحَدِیۡدَ اَنِ اعۡمَلۡ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرۡ فِی السَّرۡدِ: اس سے تین مسئلے ثابت ہوتے ہیں: ① خرق عادت یعنی معجزہ کا ثبوت ② دستکاری یعنی اپنی محنت سے کمانے کی فضیلت ③ ہر ہر کام میں اعتدال اور توازن کی رعایت رکھنا حتی کہ دنیاوی امور میں بھی، چونکہ حکم دیا کہ زرہ بنانے میں اس کی کڑیوں کو متوازن اور متناسب بنائیں، کوئی چھوٹی کوئی بڑی نہ ہو، تاکہ وہ مضبوط بھی بنے اور دیکھنے میں بھی بھلی معلوم ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صنعت میں ظاہری خوش نمائی کی رعایت بھی پسندیدہ چیز ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص ہدایت فرمائی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حضرت داؤد (علیہ السلام) کے حق میں ہم نے لوہے کو موم کی طرح نرم کر دیا، بدون آگ اور آلات صناعیہ کے لوہے کو جس طرح چاہتے ہاتھ سے توڑ موڑ لیتے تھے اور اس کی زرہیں تیار کر کے فروخت کرتے تاکہ قوت بازو سے کما کر کھائیں، بیت المال پر اپنا بار نہ ڈالیں، کہتے ہیں کہ کڑیوں کی زرہ پہلے ان ہی سے نکلی کہ کشادہ رہے، حق تعالیٰ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ فراخ وکشادہ زرہیں تیار کرو اور اس کے حلقے اور کڑیاں ٹھیک اندازہ سے جوڑو جو بڑی چھوٹی اور پتلی موٹی ہونے کے اعتبار سے متناسب ہوں۔

فائدہ: ۲ یعنی ان صنائع میں پڑ کر منعم حقیقی کی طرف سے غفلت نہ ہونے پائے، ہمیشہ عمل صالح کرتے رہو اور یاد رکھو کہ اللہ سب کام دیکھتا ہے۔

وَلِسُلَیۡمٰنَ الرِّیۡحَ غُدُوُّهَا شَهۡرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهۡرٌ ۚ وَاَسَلۡنَا لَهٗ عَیۡنَ الۡقِطۡرِ ؕ

اور سلیمان کے آگے ہوا کو صبح کی منزل اسکی ایک مہینہ کی اور شام کی منزل ایک مہینہ کی اور بہا دیا ہم نے اسکے واسطے چشمہ پگھلے ہوئے تانبے کا ۱

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ

اور جنوں میں کتنے لوگ تھے جو محنت کرتے اسکے سامنے اسکے رب کے حکم سے اور جو کوئی پھرے ان میں سے ہمارے حکم سے چکھائیں ہم اسکو

مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ⑫

آگ کا عذاب ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اس (ہوا) کا صبح کا چلنا مہینے بھر کی مسافت تھی اور (اسی طرح) اس کا شام کو چلنا مہینے بھر کی مسافت تھی (یعنی وہ ہوا سلیمان علیہ السلام کو اتنی اتنی دور پہنچاتی تھی، کما قال تعالیٰ: **وسخرنا له الريح تجری بامره**) اور (ایک نعمت ان کو یہ دی کہ) ہم نے ان کے لئے تانبے کا چشمہ بہادیا (یعنی تانبے کو اس کی کان میں پانی کی طرح بہنے والا کر دیا تاکہ اس سے مصنوعات اور چیزیں بنانے میں بغیر آلات کے سہولت ہو، پھر وہ منجمد ہو جاتا، یہ بھی ایک معجزہ ہے) اور (ایک نعمت یہ تھی کہ ہم نے جنات کو ان کے تابع کر دیا تھا، چنانچہ) جنات میں بعضے وہ تھے جو ان کے آگے (طرح طرح کے) کام کرتے تھے ان کے رب کے حکم (تسخیری) سے (یعنی چونکہ پروردگار نے مسخر کر دیا تھا) اور (تسخیر کے ساتھ ان کو شرعی حکم بھی مع وعید یہ دیا تھا کہ) ان میں جو شخص ہمارے (اس) حکم سے (کہ سلیمان علیہ السلام کی اطاعت کرو) سرتابی کرے گا (یعنی تسلیم اور اپنی خوشی سے کام نہ کرے گا اگرچہ تسخیر کی وجہ سے سلیمان علیہ السلام ان سے جبراً کام لینے پر بھی قادر ہوں گے جیسے بیگاریوں سے کام لیا جاتا ہے تو) ہم اس کو (آخرت میں) دوزخ کا عذاب چکھادیں گے۔

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ: یا تو تمام عالم کے جنات مسخر نہ ہوں گے بلکہ صرف ضرورت کے بقدر جنات مسخر کیے گئے ہوں، یا تمام عالم کے جنات مسخر تو ہوں مگر احکام پر ماموران میں سے بعض ہوں سب نہ ہوں، اس میں یہ بھی دلالت ہے کہ اگر جنات کا تابع ہونا کسی عمل وغیرہ کے ذریعے سے نہ ہو، محض من جانب اللہ ہو تو عبدیت کے خلاف نہیں۔

وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو تسلیم اور خوشی سے کام کرے گا وہ عذاب سے محفوظ رہے گا، اور ظاہر ہے کہ ہر نبی اپنے محکومین کو ایمان کا بھی حکم کرتا ہے تو پوری اطاعت یہ ہے کہ ایمان بھی اختیار کریں، پس حاصل یہ ہوا کہ جو جن ایمان اور اطاعت اختیار کرے گا وہ عذاب دوزخ سے بچا رہے گا، جیسا کہ ایمان کا تقاضا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت سلیمان کا تخت تھا جو فضا میں اڑتا، ہوا اس کو شام سے یمن اور یمن سے شام لے چلتی، اللہ تعالیٰ نے ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا تھا، ایک مہینہ کی مسافت ہوا کے ذریعہ سے آدھے دن میں طے ہوتی تھی، سورہ انبیاء اور سورہ نمل میں اس کا کچھ بیان گزر چکا ہے اور آگے سورہ ص میں آئے گا، اور ''پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ'' کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یمن کی طرف نکال دیا تھا، اس کو سانچوں میں ڈال کر جنات بڑے بڑے برتن (دیگیں اور لگن وغیرہ) تیار کرتے تھے جن میں ایک لشکر کا کھانا پکتا اور کھلایا جاتا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بہت سے جن جنہیں دوسری جگہ شیاطین سے تعبیر فرمایا ہے معمولی قلیوں اور خدمت گاروں کی طرح ان کے کام میں لگے رہتے تھے، اللہ کا حکم تھا کہ سلیمان کی اطاعت کریں، ذرا سرکشی کی تو آگ میں پھونک دیا جائے گا۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ

بناتے اس کے واسطے جو کچھ چاہتا قلعے اور تصویریں اور لگن جیسے تالاب اور دیگیں چولہوں پر جمی ہوئی ۱؎

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا ؕ وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِىَ الشَّكُوۡرُ ﴿۱۳﴾

کام کرواے داؤد کے گھر والو احسان مان کر، اور تھوڑے ہیں میرے بندوں میں احسان ماننے والے ۲

خلاصہ تفسیر: (اب ان کاموں کو بتلاتے ہیں جن پر جنات مامور تھے) یعنی وہ جنات ان کے لئے وہ چیزیں بناتے جو ان کو (بنوانا) منظور ہوتا بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن (پانی کے ایسے بڑے برتن) جیسے حوض اور (بڑی بڑی) دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں (ہلائے ہل نہ سکیں اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا کہ جیسے ہم نے تم کو نعمتیں بھی دی ہیں) اے داؤد کے خاندان والو! (یعنی سلیمان علیہ السلام اور ان کے متعلقین) تم سب (ان نعمتوں کے) شکریہ میں نیک کام کیا کرو اور میرے بندوں میں شکرگزار کم ہی ہوتے ہیں (اس لیے ان نعمتوں کا شکریہ ادا کرتے رہو جس کا طریقہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کرتے رہو، تم مخلوق میں ممتاز ہو جاؤ گے)۔

وَتَمَاثِيۡلَ: تمثال تصویر کو کہا جاتا ہے، آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں جان داروں کی تصاویر بنانا اور استعمال کرنا جائز تھا، مگر شریعت محمدیہ میں اسے حرام کر دیا گیا، رسول اللہ ﷺ کی احادیث صحیحہ ومتواترہ سے اس کی حرمت ثابت ہے۔

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا: خاندان والوں کو ان نعمتوں کے شکر کا حکم فرمانا اس لیے ہے کہ ان کا نفع ان کو بھی پہنچتا تھا، خواہ ظاہری خواہ باطنی، اور کم از کم یہ نفع تو تھا ہی کہ ایسے جلیل القدر انبیاء کے ساتھ ان کو نسبت تھی، کیونکہ خاندان میں ایک شخص کو بادشاہت یا نبوت مل جانے سے سارا خاندان دوسروں کی نگاہوں میں معزز ہو جاتا ہے، نیز اس جملہ میں شکر وعمل صالح پر ترغیب وتحریض ہوگئی، جیسے پیچھے داؤد علیہ السلام کو بھی اعملوا صالحا حکم ہوا تھا، اسی طرح یہاں بھی یہ حکم دیا، اور اسی طرح پیچھے پہاڑ اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا، یہاں جن اور ہوا کو مسخر کر دیا، اور وہاں لوہے کو نرم کر دینے کا ذکر تھا اور یہاں تانبے کو۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بڑے بڑے محل، مسجدیں اور قلعے جنات تعمیر کرتے اور مجسم تصویریں بناتے (جو ان کی شریعت میں ممنوع نہیں ہوں گی، شریعت محمدیہ نے منع کر دیا) اور تانبے کے بڑے بڑے لگن بناتے، جیسے حوض یا تالاب اور دیگیں تیار کرتے، جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتی تھیں، ایک ہی جگہ رکھی رہتیں۔

فائدہ: ۲ یعنی ان عظیم الشان انعامات واحسانات کا شکر ادا کرتے رہو، محض زبان سے نہیں، بلکہ عمل سے وہ کام کرو جن سے حق تعالیٰ کی شکرگزاری ٹپکتی ہو، بات یہ ہے کہ احسان تو خدا کم وبیش سب پر کرتا ہے، لیکن پورے شکرگزار بندے بہت تھوڑے ہیں، جب تھوڑے ہیں تو قدر زیادہ ہوگی، لہٰذا کامل شکرگزار بن کر اپنی قدر ومنزلت بڑھاؤ، یہ خطاب داؤد کے کنبے اور گھرانے کو ہے، کیونکہ علاوہ مستقل احسانات کے داؤد پر احسان من وجہ سب پر احسان، کہتے ہیں کہ داؤد (علیہ السلام) نے تمام گھر والوں پر اوقات تقسیم کر دیئے تھے، دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی وقت ایسا نہ تھا جب ان کے گھر میں کوئی نہ کوئی شخص عبادت الٰہی میں مشغول نہ رہتا ہو۔

فَلَمَّا قَضَيۡنَا عَلَيۡهِ الۡمَوۡتَ مَا دَلَّهُمۡ عَلٰى مَوۡتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الۡاَرۡضِ تَاۡكُلُ مِنۡسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ

پھر جب مقرر کیا ہم نے اس پر موت کو نہ جتلایا ان کو اس کا مرنا مگر کیڑے نے گھن کے کھاتا رہا اس کا عصا پھر جب وہ گر پڑا

تَبَيَّنَتِ الۡجِنُّ اَنۡ لَّوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ الۡغَيۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِى الۡعَذَابِ الۡمُهِيۡنِ ﴿۱۴﴾ؕ

معلوم کیا جنوں نے کہ اگر خبر رکھتے ہوتے غیب کی نہ رہتے ذلت کی تکلیف میں

خلاصہ تفسیر: (غرض زندگی بھر سلیمان علیہ السلام کے ساتھ جنات کا یہ معاملہ رہا) پھر جب ہم نے ان پر (یعنی سلیمان علیہ

السلام پر) موت کا حکم جاری کر دیا (یعنی انتقال فرما گئے) تو (ایسے طور پر موت واقع ہوئی کہ جنات کو خبر نہیں ہوئی وہ یہ کہ سلیمان علیہ السلام موت کے قریب اپنے عصا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ٹھوڑی کے نیچے لگا کر تخت پر بیٹھ گئے اور اسی حالت میں روح قبض ہوگئی، اسی طرح سال بھر تک بیٹھے رہے، جنات آپ کو بیٹھا دیکھ کر زندہ سمجھتے رہے، رعب کی وجہ سے کسی کو یہ مجال نہ تھی کہ پاس جا کر یا خوب گھور کر دیکھ سکے، خصوصاً جبکہ کوئی وجہ شبہ کی بھی نہ ہو، غرض وہ زندہ سمجھ کر بدستور کام کرتے رہے اور) کسی چیز نے ان کے مرنے کا پتہ نہ بتلایا مگر گھن کے کیڑے نے کہ وہ سلیمان (علیہ السلام) کے عصا کو کھاتا تھا (یہاں تک کہ اس کا ایک حصہ کھا لیا، تو وہ عصا گر پڑا، اس کے گرنے سے سلیمان علیہ السلام بھی گر پڑے) سو جب وہ گر پڑے (اور گھن کے کھانے کا تخمینہ لگانے سے معلوم ہوا کہ ان کو تو وفات پائے ہوئے ایک سال ہوا) تب جنات کو (اپنے دعویٰ غیب دانی کی) حقیقت معلوم ہوئی (وہ یہ کہ) اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو (سال بھر تک) اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے (مراد وہ سخت کام ہیں جن میں محکوم ہونے کی وجہ سے ذلت بھی تھی اور مشقت کی وجہ سے مصیبت بھی ہے)۔

فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ: حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کے انداز میں اخفاء اور پوشیدگی میں دنیاوی مصلحت یہ تھی تا کہ ضروری اور باقی ماندہ کام پورے ہو جائیں، اور دینی مصلحت یہ تھی کہ ان لوگوں پر جنات کی بے خبری اور بے بسی واضح ہو جائے کہ جنات علم غیب نہیں جانتے، اگر چہ خود جنات کو اپنے بارے میں یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ وہ غیب کی باتوں سے واقف نہیں مگر یہاں مقصود یہ ہے کہ پہلے جنات خود اپنے دل میں تو جانتے تھے مگر دوسروں سے چھپاتے تھے اور ان کو بہکاتے تھے، اس واقعہ کے بعد حقیقت کھل گئی اور جنات کی غیب دانی کا دعویٰ باطل ہو گیا۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ: اس میں اشارہ ہے کہ کبھی کبھار قوی اور طاقتور کو ضعیف اور کمزور سے بھی بعض علم حاصل ہو جاتا ہے۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں کے ہاتھوں مسجد بیت المقدس کی تجدید کرا رہے تھے، جب معلوم کیا کہ میری موت آ پہنچی، جنوں کو نقشہ بتا کر آپ ایک شیشہ کے مکان میں در بند کر کے عبادت الٰہی میں مشغول ہو گئے جیسا کہ آپ کی عادت تھی کہ مہینوں خلوت میں رہ کر عبادت کیا کرتے تھے، اسی حالت میں فرشتہ نے روح قبض کر لی اور آپ کی نعش مبارک لکڑی کے سہارے کھڑی رہی، کسی کو آپ کی وفات کا احساس نہ ہو سکا، وفات کے بعد مدت تک جن بدستور تعمیر کرتے رہے، جب تعمیر پوری ہوگئی، جس عصا پر ٹیک لگا رہے تھے گھن کے کھانے سے گرا، تب سب کو وفات کا حال معلوم ہوا۔

اس سے جنات کو خود اپنی غیب دانی کی حقیت کھل گئی اور ان کے معتقد انسانوں کو بھی پتہ لگ گیا کہ اگر انھیں غیب کی خبر رہتی تو کیا اس ذلت آمیز تکلیف میں پڑے رہتے، حضرت سلیمان کی وفات کو محسوس کرتے ہی کام چھوڑ دیتے، اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ شیاطین وغیرہ کی تسخیر کچھ حضرت سلیمان کا کسبی کمال نہ تھا، محض فضل ایزدی تھا، جو اللہ چاہے تو موت کے بعد ایک لاش کے حق میں بھی قائم رکھ سکتا ہے، نیز سلیمان (علیہ السلام) پر زندگی میں جو انعامات ہوئے تھے یہ اس کی تکمیل ہوئی کہ موت کے بعد بھی ایک ضروری حد تک انھیں جاری رکھا گیا، اور بتلا دیا کہ پیغمبروں کے اٹھائے ہوئے کاموں کو اللہ تعالیٰ کس کس تدبیر سے پورا کراتا ہے۔

ربط: یہاں تک بعض منیب اور شکر گزار بندوں کا ذکر تھا، آگے ایک معرض و ناسپاس قوم (سبا) کا ذکر کیا جاتا ہے، جو بڑے عیش و رفاہیت اور خوشحالی و فارغ البالی کے بعد کفر و ناسپاسی کی سزا میں تباہ کی گئی، یہ قوم یمن کی بڑی دولت مند اور ذی اقتدار قوم تھی جو صدیوں تک بڑے جاہ و جلال سے ملک پر حکومت کرتی رہی، ان ہی میں ایک وہ ملکہ تھی (بلقیس) جس کا حضرت سلیمان کی بارگاہ میں حاضر ہونا سورہ نمل میں گزر چکا ہے، شاید یہاں سلیمان کے بعد "سبا" کا ذکر اس مناسبت سے بھی ہوا ہو۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ

تحقیق قوم سبا کو تھی ان کی بستی میں نشانی ، دو باغ داہنے اور بائیں لے کھاؤ روزی اپنے رب کی

وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ ؕ بَلۡدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوۡرٌ ﴿۱۵﴾

اور اس کا شکر کرو۔ شہر ہے پاکیزہ اور رب ہے گناہ بخشنے والا۔

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیات میں ان حضرات کا قصہ ذکر فرمایا جو بندے اللہ کی نعمتوں کا شکر اور اس کی طرف کرتے ہیں، اب اس کے مقابلہ میں ناشکروں کا ایک قصہ ذکر کرتے ہیں جو خدا کے ناسپاس اور ناشکرے تھے تاکہ لوگ اس سے نصیحت اور عبرت پکڑیں، یعنی اہل سبا کا قصہ عبرت بیان کرتے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ ناسپاسی اور ناشکری اور اللہ کی طرف رجوع نہ کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے، بعض دفعہ اس کا وبال دنیا ہی میں ظاہر ہوجاتا ہے، اہل سبا کا قصہ بھی آیات قیامت میں سے ہے کہ حق جل شانہ نے ان کو جو سرسبز وشاداب باغات عطا کئے تھے وہ نمونہ جنت وبہشت تھے، کفران نعمت کی وجہ سے نمونہ دوزخ بنا دیئے گئے، ناشکری اور ناسپاسی کی سزا میں اہل سبا کی جنت (باغ) کو جہنم سے بدل دیا گیا، غرض یہ کہ گذشتہ آیات میں داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا حال بیان کر کے کفار کو آگاہ کر دیا کہ خدا کے نیک بندے دنیا کے طالب نہیں ہوتے، بلکہ مولیٰ کے طالب ہوتے ہیں اور اس کے فرمانبردار اور شکر گزار بندے ہوتے ہیں، اب آئندہ آیات میں ناشکروں کا حال بیان کرتے ہیں۔

سبا (کے لوگوں) کے لئے (خود) ان کے وطن (کی مجموعی حالت) میں (احکام خداوندی کی اطاعت واجب ہونے کے لیے) نشانیاں موجود تھیں (ان میں سے ایک نشانی) دو قطاریں تھیں باغ کی (ان کی سڑک کے) داہنے اور بائیں (یعنی ان کے تمام علاقہ میں دوطرفہ متصل باغات چلے گئے تھے کہ جس میں آمدنی بھی وافر اور پھل بھی اس قدر کہ ختم کئے ختم نہ ہوں، جس سے سایہ اور رونق خوب تھی، ہم نے انبیاء علیہم السلام وناصحین کی معرفت ان کو حکم دیا کہ) اپنے رب کا (دیا ہوا) رزق کھاؤ اور (کھا کر) اس کا شکر کرو (یعنی اطاعت کرو کہ دو قسم کی نعمتیں اطاعت کا تقاضا کرتی ہیں، ایک دنیاوی کہ رہنے کو) عمدہ شہر اور (ایک اخروی کہ ایمان واطاعت کی صورت میں اگر کچھ کوتاہی ہوجائے تو گناہ بخشنے کو) بخشنے والا پروردگار ہے (پس ایسے مقتضی پر مقتضا کا ترتب ضرور ہونا چاہئے)۔

لَقَدۡ كَانَ لِسَبَاٍ فِىۡ مَسۡكَنِهِمۡ اٰيَةٌ: قوم سبا کے قصہ سے رسول اللہ ﷺ کے مخالفین اور دیگر کفار کو ڈرانا مقصود ہے، خاص قوم سبا کا قصہ شاید اس لیے بیان کیا کہ یہ لوگ بھی عرب ہیں، ان کے حالات وواقعات سے کفار مکہ کو جو انہی کے قریب رہتے ہیں زیادہ اثر ہوسکتا ہے اور بقول صاحب روح المعانی اہل مکہ میں قوم سبا اور ان کے قصہ کی شہرت بھی تھی، قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سبا ایک شخص کا نام ہے، پھر اس کے تمام خاندان کو سبا کہنے لگے، اس خاندان کے بہت سے قبائل یمن کے شہر مارب (منزل کے وزن پر) میں رہتے تھے اور ان میں سلطنت بھی تھی جس میں بعض بادشاہ اچھے بھی ہوئے اور بعض بت پرست تھے، کسی بادشاہ نے برساتی پانی کو روکنے کے لیے ایک مضبوط بند تیار کیا جو کئی میل طویل تھا، دور دور کا پانی وہاں جمع ہوتا اور اس سے جو چھوٹی چھوٹی شاخیں اور نہریں نکالی گئی تھیں، ان کے ذریعہ سے سال بھر تک کھیتیاں اور باغات سیراب کیے جاتے اور یہ باغات سڑک کے دونوں طرف ایک قوم کے مطابق شام اور ایک قول کے مطابق صنعاء تک غرض دور کئی منزلوں تک چلے گئے تھے، راستے ناہموار تھے، اللہ تعالیٰ نے قوم سبا پر یہ انعام فرمایا کہ ان کے شہر مارب سے لے کر ملک شام تک تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بستیاں بنادی تھیں، یہ بستیاں لب سڑک تھیں، ان مسلسل بستیوں کا فائدہ یہ تھا کہ مسافر جہاں چاہتا جس وقت چاہتا ٹھہر جاتا اور ہر جگہ کھانے پینے کا سامان مہیا تھا، مسلسل بستیاں ہونے کے سبب راستے سب محفوظ ومامون تھے، کسی چور ڈاکو کا وہاں گذر نہ تھا، آب وہوا بھی اس ملک کی نہایت پاکیزہ تھی، مگر جب لوگوں نے ان تمام نعمتوں پر شکر واطاعت کے بجائے ناشکری اور نافرمانی شروع کی تو ان کے انتقام کا وقت آیا، اور ایک بار وہ بند ٹوٹ گیا، بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھچھوندر کو اس پر مسلط کر دیا، اس نے اس بند میں سوراخ کر دیا، پھر سیلاب وہ سوراخ کشادہ ہوگیا اور تمام آبادی اور باغات کو غرق کر دیا، جب پانی خشک ہوا تو ان باغات کی جگہ کچھ جھاڑ جھنکاڑ رہ گئے اور اہل ملک بھی کچھ ہلاک، کچھ پریشان ہو کر منتشر ہوگئے، یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا ہے، بعض روایات میں قوم سبا کی طرف تیرہ انبیاء کرام کا تشریف لانا بیان ہوا ہے، سو یہ عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے آئے تھے جن کی تعلیمات ناقلین کے واسطہ سے انتقام کے وقت تک چلی آرہی

ہوگی، جب مہلت کی حد ہوگئی تو عذاب نازل ہوا۔

* * *

فائدہ:۱ یعنی باغوں کے دوطویل سلسلے داہنے اور بائیں میلوں تک چلے گئے تھے، اگر سمجھتے تو خدا کی رحمت وقدرت کی یہ ہی نشانی ایمان لانے اور شکر گزار بننے کے لئے کافی تھی۔

فائدہ:۲ گویا وہ نشانی زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ اپنے رب کی دی ہوئی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو اور اس منعم حقیقی کا شکر ادا کرو، کفر و عصیان اختیار کر کے ناشکرے مت بنو، یا جیسا کہ بعض سلف کا قول ہے انبیاء کی زبانی اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی ہوگی، کہتے ہیں تیرہ نبی اس قوم کی طرف بھیجے گئے، اگر یہ صحیح ہے تو حضرت مسیح سے پہلے آئے ہوں گے اور ان کے وارث بعد کو بھی اس قوم کی بربادی کے وقت تک سمجھاتے رہے ہوں گے، واللہ علم۔

فائدہ:۳ مصنف ''ارض القرآن'' سبا کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''اسی سلسلہ عمارات میں ایک چیز بند آب ہے، جس کو عرب حجاز ''سد'' اور عرب یمن ''عرم'' کہتے ہیں، عرب کے ملک میں کوئی دائمی دریا نہیں، پانی پہاڑوں سے بہہ کر ریگستانوں میں خشک اور ضائع ہو جاتا ہے، زراعت کے مصرف میں نہیں آتا، سبا مختلف مناسب موقعوں پر پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند باندھ دیتے تھے کہ پانی رک جائے اور بقدر ضرورت زراعت کے کام میں آئے، مملکت سبا میں اس طرح کے سینکڑوں بند تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور ''سد مأرب'' ہے، جو ان کے دارالحکومت ''مارب'' میں واقع تھا، شہر مارب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں جن کا نام کوہ ابلق ہے، سبا نے ان دو پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ ق م میں ''سد مارب'' کی تعمیر کی تھی، یہ بند تقریباً ایک سو پچاس فٹ لمبی اور پچاس فٹ چوڑی ایک دیوار ہے، اس کا اکثر حصہ تو اب افتادہ ہے، تاہم ایک ثلث دیوار اب بھی باقی ہے، ''ارناڈ'' ایک یورپین سیاح نے اس کے موجودہ حالات پر ایک مضمون فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں لکھا ہے، اس کا موجودہ نقشہ نہایت عمدگی سے تیار کیا ہے، اس دیوار پر جابجا کتبات ہیں، وہ بھی پڑھے گئے، اس سد میں اوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھیں جو حسب ضرورت کھولی اور بند کی جاسکتی تھیں، ''سد'' کے دائیں بائیں مشرق و مغرب میں دو بڑے بڑے دروازے تھے جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ و راست کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا، اس نظام آب رسانی سے چپ و راست دونوں جانب اس ریگستانی اور شور ملک کے اندر تین سو میل مربع میں سینکڑوں کوس تک بہشت زار تیار ہو گئی تھی، جس میں انواع و اقسام کے میوے اور خوشبودار درخت تھے، قرآن کریم جنتٰن عن یمین و شمال کہہ کر ان ہی باغوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

یونانی مورخ ''اگاتھرشیڈس'' جو ۱۴۵ ق م میں ''سبا'' کا معاصر تھا بیان کرتا ہے: ''سبا عرب کے سرسبز و آباد حصہ میں رہتے ہیں جہاں بہت اچھے اچھے بیشمار میوے ہوتے ہیں، دریا کے کنارے جو زمین ہے، اس میں نہایت خوبصورت درخت ہوتے ہیں، اندرون ملک میں بخورات، دارچینی اور چھوارے کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں اور ان درختوں سے نہایت شیریں خوشبو پھیلا کرتی ہے، درختوں کے اقسام کی کثرت و تنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے، جو خوشبو اس میں سے اڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی، جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے گزرتے ہیں، وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں، وہ گویا آب حیات کا لطف اٹھاتے ہیں، اور یہ تشبیہ بھی اس کی قوت و لطافت کے مقابل میں ناقص ہے''۔

''آرٹی میڈروس'' جو ''سبا'' کے عہد آخر میں تھا لکھتا ہے: ''سبا'' کا بادشاہ اور اس کا ایوان ''مارب'' میں ہے جو ایک پر اشجار پہاڑ پر عیش و مسرت (زمانہ خوشحالی) میں واقع ہے''، غرض باعتبار سرسبزی، خوشحالی، سامان عیش اور اعتدال آب و ہوا کے ''مارب'' اسی کا مصداق تھا۔

بلدۃ طیبۃ ورب غفور: ''رب غفور'' سے ادھر اشارہ کر دیا کہ اپنی طرف سے شکر گزار بنو، اگر بمقتضائے بشریت کچھ تقصیر رہ جائے گی تو اللہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایسا سخت نہیں پکڑتا، اپنی مہربانی سے معاف فرما دے گا، اس کی نعمتوں کا شکر کما حقہ کس سے ادا ہو سکتا ہے۔

فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ

سو دھیان میں نہ لائے پھر چھوڑ دیا ہم نے ان پر ایک نالہ زور کا اور دیئے ہم نے ان کو بدلے میں ان دو باغوں کے دو اور باغ جن میں کچھ میوہ

خَمۡطٍ وَّاَثۡلٍ وَّشَیۡءٍ مِّنۡ سِدۡرٍ قَلِیۡلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِکَ جَزَیۡنٰہُمۡ بِمَا کَفَرُوۡا ؕ وَ ہَلۡ نُجٰزِیۡۤ اِلَّا الۡکَفُوۡرَ ﴿۱۷﴾

کسیلا تھا اور جھاؤ اور کچھ بیر تھوڑے سے ۱؎ یہ بدلہ دیا ہم نے ان کو اس پر کہ ناشکری کی، اور ہم یہ بدلہ اسی کو دیتے ہیں جو ناشکر ہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو (اس پر بھی) انہوں نے (اس حکم سے) سرتابی کی (شاید یہ لوگ آفتاب پرست بھی ہوں جیسے بعض کی نسبت سورۂ نمل میں ہے: وجدتھا وقومھا یسجدون للشمس) تو ہم نے (ان پر اپنا قہر اس طرح نازل کیا کہ) ان پر بند کا سیلاب چھوڑ دیا (یعنی جو سیلاب بند سے رکا رہتا تھا بند ٹوٹ کر اس سیلاب کا پانی چڑھ آیا جس سے وہ اور ان کے باغات سب غارت ہوگئے) اور ہم نے ان کے ان دو رویہ باغوں کے بدلے اور دو باغ دے دیئے جن میں یہ چیزیں رہ گئیں، بدمزہ پھل اور جھاؤ اور قدرے قلیل بیری (اور وہ بھی شہری نہیں جنگلی خودرو جس میں کانٹے بہت اور پھل میں لطافت ندارد) ان کو یہ سزا ہم نے ان کی ناسپاسی کے سبب دی اور ہم ایسی سزا بڑے ناسپاس ہی کو دیا کرتے ہیں (ورنہ معمولی خطاؤں پر تو ہم درگزر ہی کرتے رہتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کفر سے بڑھ کر کیا ناسپاسی ہوگی جس میں وہ مبتلا تھے)۔

فَاَعۡرَضُوۡا فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡہِمۡ: اس سے پتہ چلتا ہے کہ اطاعت اور نافرمانی کا دنیاوی نعمتوں کے حصول اور زوال میں بھی دخل ہوا کرتا ہے، یعنی اطاعت و بندگی سے جیسے دنیاوی نعمتیں ملتی ہیں، گناہوں اور نافرمانیوں سے نعمتوں کا زوال بھی ہوجاتا ہے، چنانچہ اگلی آیت میں اس کی صراحت بھی ہے: ذٰلک جزینٰھم بما کفروا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نصیحتوں کو خاطر میں نہ لائے اور منعم حقیقی کی شکر گزاری سے منہ موڑے رہے، تب ہم نے پانی کا عذاب بھیج دیا، وہ بند ٹوٹا تمام باغات اور زمینیں غرقاب ہوگئیں اور ان اعلیٰ درجہ کے نفیس میووں اور پھلوں کی جگہ نکمے درخت اور جھاڑ جھنکاڑ رہ گئے، جہاں انگور چھوارے اور قسم قسم کی نعمتیں پیدا ہوتی تھیں، اب وہاں پیلو، جھاؤ، کسیلے اور بدمزہ پھل والے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا، جن میں بہترین چیز تھوڑی سی جھڑ بیریوں کو سمجھ لو۔

یہ واقعہ حضرت مسیح اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیانی عہد کا ہے، محققین آثار قدیمہ کو ابرہۃ الاشرم کے زمانہ کا ایک بہت بڑا کتبہ سد عرم کی بقیہ دیوار پر ملا ہے، اس میں بھی اس بند کے ٹوٹنے کا ذکر ہے، مگر یہ غالباً اس واقعہ کے بعد ہوا جس کا ذکر قرآن میں ہے واللہ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جب اللہ نے چاہا کہ عذاب بھیجے، گھونس پیدا ہوئی اس پانی کے بند میں اس کی جڑ کرید ڈالی، ایک بار پانی نے زور کیا، بند کو توڑ ڈالا، وہ پانی عذاب کا تھا، جس زمین پر پھر گیا کام سے جاتی رہی''۔

کہتے ہیں کہ بند ٹوٹنے کی پیشگوئی ایک کاہن نے کی تھی اس پر بہت لوگ وطن چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے، جو باقی رہے، انھیں ان باغوں کے بدلے یہ نکمی اور کڑوی کسیلی چیزیں ملیں، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ ایسی سخت سزا بڑے ناشکروں کو دی جاتی ہے، کفر سے بڑھ کر کیا ناشکری ہوگی، سورۂ نمل میں گزر چکا: وَجَدۡتُّہَا وَقَوۡمَہَا یَسۡجُدُوۡنَ لِلشَّمۡسِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَزَیَّنَ لَہُمُ الشَّیۡطٰنُ اَعۡمَالَہُمۡ فَصَدَّہُمۡ عَنِ السَّبِیۡلِ فَہُمۡ لَا یَہۡتَدُوۡنَ (النمل: ۲۴) بظاہر اس قسم کا شرک اس قوم میں بلقیس کے بعد بھی باقی رہا ہوگا۔

وَجَعَلۡنَا بَیۡنَہُمۡ وَبَیۡنَ الۡقُرَی الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡہَا قُرًی ظَاہِرَۃً وَّقَدَّرۡنَا فِیۡہَا السَّیۡرَ ؕ

اور رکھی تھیں ہم نے انمیں اور ان بستیوں میں جہاں ہم نے برکت رکھی ہے ایسی بستیاں جو راہ پر نظر آتی تھیں اور منزلیں مقرر کردیں ہم نے انمیں آنے جانے کی

سِیۡرُوۡا فِیۡہَا لَیَالِیَ وَاَیَّامًا اٰمِنِیۡنَ ﴿۱۸﴾

پھرو ان میں راتوں کو اور دنوں کو امن سے

خلاصہ تفسیر: اور (اس مذکورہ نعمت کے علاوہ ایک اور نعمت خاص سفر کے متعلق تھی وہ یہ کہ) ہم نے ان کے اور ان بستیوں کے درمیان میں جہاں ہم نے (پیداوار وغیرہ کے اعتبار سے) برکت کر رکھی ہے بہت سے گاؤں آباد کر رکھے تھے (جو سڑک پر سے) نظر آتے تھے (کہ مسافر کو سفر میں بھی وحشت نہ ہو اور کہیں ٹھہرنا چاہے تو وہاں جانے میں خوف وتردد بھی نہ ہو) اور ہم نے ان دیہات کے درمیان ان کے چلنے کا ایک خاص اندازہ رکھا تھا (یعنی ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک چال کے حساب سے ایسا مناسب فاصلہ رکھا تھا کہ سفر کے دوران عادت کے مطابق آرام کرلے، وقت پر کوئی نہ کوئی گاؤں مل جاتا جہاں کھا پی سکے آرام کرسکے) کہ بےخوف وخطر ان میں (چاہو) راتوں کو اور (چاہو) دنوں کو چلو (یعنی پاس پاس گاؤں ہونے سے نہ رہزن کا خطرہ تھا، نہ دانہ پانی اور زادِ راہ میسر نہ آنے کا اندیشہ، کیونکہ ہر جگہ ہر سامان ملتا تھا)

الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا: اگر اس سے شام کی بستیاں مراد ہوں تو برکت سے دینی برکات مراد ہیں، کیونکہ شام انبیاء علیہم السلام کا مسکن رہا ہے، اور اگر صنعاء کی بستیاں مراد ہوں تو اس سے پیداوار، نہروں اور پھلوں کی برکت مراد ہے۔

* * *

فائدہ: برکت والی بستیاں ملک شام کی ہیں، یعنی ان کے ملک سے شام تک راستے مامون تھے، سڑک کے کنارے کنارے دیہات کا سلسلہ ایسے اندازے اور تناسب سے چلا گیا تھا کہ مسافر کو ہر منزل پر کھانا، پانی اور آرام کرنے کا موقع ملتا تھا، آبادیوں کے قریب ہونے اور جلد جلد نظر آنے سے مسافر کا جی نہیں گھبراتا تھا، نہ چوروں ڈاکوؤں کا خوف تھا، سفر کیا تھا ایک طرح کی سیر تھی۔

مصنف ''ارض القرآن'' لکھتا ہے: ''سبا کی دولت وثروت کی اساس صرف تجارت تھی، یمن ایک طرف سواحل ہندوستان کے مقابل واقع ہے، اور دوسری طرف سواحل افریقہ کے۔ سونا، بیش قیمت پتھر، مسالہ، خوشبوئیں، ہاتھی دانت، یہ چیزیں حبش اور ہندوستان سے ٹھیک یمن آکر اترتی تھیں، وہاں سے سبا اونٹوں پر لاد کر بحر احمر کے کنارے خشکی حجاز سے گزر کر شام ومصر لاتے تھے، قرآن مجید نے اس راستہ کو امام مبین (کھلا راستہ) اور اسی سفر کا نام رحلة الشتاء والصيف رکھا ہے، جس کو قریش نے جاری کیا تھا، ان تجارتی کاروانوں کی آمد ورفت کے سبب یمن سے شام تک آبادیوں کی ایک قطار قائم تھی، جہاں بےخوف وخطر سفر ہوسکتا تھا، یونانی مورخ اراٹوستھنس ۱۹۴ ق م بیان کرتا ہے کہ ''حضرموت'' سے ''سبا'' کے ملک تک چالیس روز کا راستہ ہے اور ''معین'' سے سوداگر ستر دن میں ''ایلہ'' (عقبہ) پہنچتے ہیں''۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ

پھر کہنے لگے اے رب دراز کردے ہمارے سفروں کو ۱ اور آپ اپنا برا کیا پھر کر ڈالا ہم نے ان کو کہانیاں اور کر ڈالا چیر کر

كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

ٹکڑے ٹکڑے ۲ اس میں پتے کی باتیں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کو ۳

خلاصہ تفسیر: مگر جیسا کہ انہوں نے ان نعمتوں کی اصل شکرگزاری نہیں کی جو کہ اطاعت الٰہی تھی ایسے ہی ظاہری شکرگزاری بھی نہ کی کہ اس نعمت کو غنیمت سمجھتے اور اس کی قدر کرتے:

سو وہ کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! (ایسے پاس پاس دیہات ہونے سے سفر کا لطف نہیں آتا، لطف تو اسی میں ہے کہ کہیں زادِ راہ ختم ہوگیا کہیں پیاس ہے اور پانی نہیں ملتا، اشتیاق ہو، انتظار ہو، کہیں چوروں کا خطرہ ہو، نوکر پہرہ دے رہے ہوں، ہتھیار بندھے ہوئے ہوں، نیز اس موجودہ حالت میں ہمیں اپنی امارت ظاہر کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا، امیر غریب سب یکساں سفر کرسکتے ہیں، پس جس طرح بنی اسرائیل من وسلویٰ سے اکتا گئے تھے اور کھیرے ککڑی کی درخواست کرنے لگے یونہی اہل سبا اس راحت کے سامان سے اکتا گئے، اسی لئے یوں جی چاہتا ہے کہ) ہمارے سفروں میں

درازی (اور فاصلہ) کردے (یعنی بیچ کے دیہات اجاڑ دے کہ منزلوں میں خوب فاصلہ ہوجائے) اور (اس ناشکری کے علاوہ) انہوں نے (اور بھی نافرمانیاں کرکے) اپنی جانوں پر ظلم کیا تو ہم نے ان کو افسانہ بنادیا اور ان کو بالکل تتر بتر کردیا، بیشک اس (قصہ) میں ہر صابر شاکر یعنی مومن کے لئے بڑی بڑی عبرتیں ہیں۔

وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ: یعنی ہم نے ان کو بالکل تتر بتر کردیا، یا تو اس طرح کہ بعض کو ہلاک کردیا کہ ان کے قصے ہی رہ گئے اور بعض کو پریشان ومنتشر کردیا، یا یہ کہ تنعم اور عیش کے اعتبار سے سب ہی افسانہ ہوگئے، یا یہ مطلب ہے کہ ان کی حالت کو عبرت بنادیا کہ اب عبرت کے طور پر ان کے واقعات بیان ہوتے ہیں: ای جعلناھم ذات حکایات یعتبر بھا، غرض وہ پاس پاس کے دیہات اور خود ان کے باغات اور رہنے کے گھر بھی سب ویران ہوگئے۔

* * *

فائدہ: ۱ زبان حال سے کہا ہوگا اور ممکن ہے زبان قال سے کہنے لگے ہوں کہ اے اللہ! اس طرح سفر کا لطف نہیں آتا، منزلیں دور ہوں، آس پاس آبادیاں نہ ملیں، بھوک پیاس ستائے، تب سفر کا مزہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''آرام میں مستی آئی، لگے تکلیف مانگنے کہ جیسے اور ملکوں کی خبر سنتے ہیں سفروں میں پانی نہیں ملتا، آبادی نہیں ملتی، ویسا ہم کو بھی ہو، یہ بڑی ناشکری ہوئی''۔ جیسے بنی اسرائیل نے من وسلویٰ سے اکتا کر لہسن وپیاز کی طلب کی تھی۔

فائدہ: ۲ یعنی ہم نے شیرازہ بکھیر دیا اور ان کو پارہ پارہ کرڈالا، اکثر خاندان ادھر ادھر منتشر ہوگئے، کوئی ایک طرف، کوئی دوسری طرف نکل گیا، آبادیوں کے نام ونشان حرف غلط کی طرح مٹ گئے، اب ان کی صرف کہانیاں باقی رہ گئیں کہ لوگ سنیں اور عبرت پکڑیں، ان کا وہ عظیم الشان تمدن اور شان وشکوہ سب خاک میں مل گیا۔

صاحب ''ارض القرآن'' ان کے زوال وسقوط کی توجیہ اس طرح کرتا ہے کہ: ''یونانیوں اور رومیوں نے مصر وشام پر قبضہ پاکر ہندوستان و افریقہ کی تجارت کو بری راستہ سے بحری راستہ کی طرف منتقل کردیا اور تمام مال کشتیوں کے ذریعہ سے بحر احمر کی راہ مصر وشام کے سواحل پر اترنے لگا، اس طریق سفر نے یمن سے شام تک خاک اڑادی اور سبا کی نو آبادیاں تباہ ہوکر رہ گئیں''، مصنف موصوف نے یہ توجیہ ''مولر'' کی تحریر سے اخذ کی ہے، ممکن ہے تباہی اور انتشار کا ایک ظاہری سبب یہ بھی ہو، مگر اس پر حصر کردینا صحیح نہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی ان حالات کو سن کر چاہیے عقلمند عبرت حاصل کریں جب اللہ فراخی اور عیش دے خوب شکر ادا کرتے رہیں اور تکلیف و مصیبت آئے تو صبر وتحمل اختیار کرکے اللہ سے مدد مانگیں۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝٢٠

اور سچ کر دکھلائی ان پر ابلیس نے اپنی اٹکل، پھر اسی کی راہ چلے، مگر تھوڑے سے ایمان دار

خلاصہ تفسیر: پیچھے خدا کی طرف متوجہ ہونے والوں اور متوجہ نہ ہونے والوں میں سے خاص لوگوں کا ذکر تھا، اب دونوں جماعتوں کا عام طور پر ذکر ہے، اور ابلیس کے اتباع کرنے اور نہ کرنے سے ان دونوں کی حالت اور انجام میں فرق بتلاتے ہیں جس سے خدا کی طرف متوجہ ہونے والوں کی خاص فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ ایسے بڑے بہکانے والے شیطان سے بچتے ہیں اور متوجہ نہ ہونے والوں کی مذمت ثابت ہوتی ہے کہ شیطان جیسے بدخواہ اور دشمن کے ہاتھ میں پھنستے ہیں۔

اور واقعی ابلیس نے اپنا گمان ان لوگوں کے بارے میں (یعنی بنی آدم کے بارے میں) صحیح پایا (یعنی اس کو جو یہ گمان تھا کہ: لاحتنکن ذریتہ الا قلیلا یعنی میں آدم کی اولاد کو تباہ کردوں گا مگر تھوڑے سے آدمیوں کو، اور شاید اس نے مٹی کے ضعف اور آگ کی قوت سے یہ استدلال کیا ہو

تو اس کا یہ گمان صحیح نکلا) کہ یہ سب اسی راہ پر ہو لئے مگر ایمان والوں کا گروہ (کہ وہ محفوظ رہا، اگر ایمان کامل تھا تو بالکل محفوظ رہا، اور اگر ایمان ضعیف تھا تو اگرچہ گناہوں میں مبتلا ہو گئے مگر شرک وکفر میں اتباع نہیں کیا)۔

* * *

فائدہ: پہلے دن ابلیس نے تخمینہ کر کے کہا تھا: لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا (الاسراء: ۶۲) اور ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭوَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (الاعراف: ۱۷)

وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ۭ

اور اسکا ان پر کچھ زور نہ تھا مگر اتنے واسطے کہ معلوم کرلیں ہم اسکو جو یقین لاتا ہے آخرت پر جدا کر کے اس سے جو رہتا ہے آخرت کی طرف سے دھوکے میں

وَرَبُّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝ۧ۲۱

اور تیرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے

خلاصہ تفسیر: اور ابلیس کا ان لوگوں پر (جو) تسلط (بطور اغوا کے ہے وہ) بجز اس کے اور کسی وجہ سے نہیں کہ ہم کو (ظاہری طور پر) ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے (الگ کر کے) معلوم کرنا ہے جو اس کی طرف سے شک میں ہیں (یعنی ہم کو امتحان اور آزمائش مقصود ہے کہ مومن وکافر میں امتیاز ہو جائے، کیونکہ بعض کو ثواب اور بعض کو عذاب دینا مقتضائے حکمت ہے اور وہ حکمت صفات الٰہی کا ظاہر ہونا ہے یا اور کچھ ہو جو انسان کو معلوم نہ ہو) اور (چونکہ) آپ کا رب ہر چیز کا نگراں ہے (جس میں لوگوں کا ایمان وکفر بھی داخل ہے اس لئے اس کی بھی خبر ہے، پس ہر ایک کو مناسب جزاء وسزا ملے گی)۔

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ: ظاہری طور پر جاننے کا مطلب سیقول دوسرے پارہ کے شروع میں گزر چکا ہے، اور ایمان میں آخرت کی تخصیص کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ آخرت کے اعتقاد کو طلب حق اور دین کی درستی میں زیادہ دخل ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی شیطان کو یہ قدرت نہ تھی کہ لاٹھی لے کر ان کو زبردستی راہ حق سے روک دیتا، ہاں! بہکاتا پھسلاتا ہے اور اتنی قدرت بھی اس لیے دی گئی کہ بندوں کا امتحان وابتلاء منظور تھا، دیکھیں کون آخرت پر یقین کر کے خدا کو یاد رکھتا ہے اور کون دنیا میں پھنس کر انجام سے غافل ہو جاتا ہے اور بیوقوف بن کر شک یا دھوکہ میں پڑ جاتا ہے، اللہ کی حکمت کا مقتضاء یہی یہ تھا کہ دنیا میں انسان کے لیے دونوں طرف جانے کے راستے کشادہ رکھیں، جیسا کہ پہلے کئی جگہ اس کی تقریر ہو چکی ہے، ایسا نہیں کہ (معاذ اللہ) خدا کو خبر نہ ہو، بے خبری میں شیطان کسی بندے کو اچک لے جائے، خوب سمجھ لو کہ ہر چیز اللہ کی نگاہ میں ہے اور تمام احوال وشؤن کی دیکھ بھال وہ ہی ہمہ وقت کرتا ہے، جس کو جتنی آزادی دے رکھی ہے وہ عجز وسفہ سے نہیں، حکمت ومصلحت کی بناء پر ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ

تو کہہ پکارو ان کو جن کو گمان کرتے ہو سوائے اللہ کے، وہ مالک نہیں ایک ذرہ بھر کے آسمانوں میں

وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝۲۲

اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کچھ ساجھا اور نہ ان میں کوئی اس کا مددگار

خلاصہ تفسیر: پیچھے شروع سورت میں توحید کا ذکر تھا، اب پھر توحید کی طرف رجوع ہے، نیز قوم سبا کے قصہ میں ناشکری کی مذمت

تھی اور شرک سے بڑھ کر کیا ناشکری ہوگی، اس لیے شرک کو باطل کرتے ہیں۔

آپ (ان لوگوں سے) فرمائیے کہ جن (معبودوں) کو تم خدا کے سوا (خدائی میں دخیل) سمجھ رہے ہو، ان کو (اپنی حاجتوں کے لئے) پکارو (تو سہی معلوم ہوجائے گا کہ وہ کتنی قدرت اور اختیار رکھتے ہیں ان کی واقعی حالت تو یہ ہے کہ) وہ ذرہ برابر (کسی چیز کا) اختیار نہیں رکھتے نہ آسمانوں (کی کائنات) میں اور نہ زمین (کی کائنات) میں، اور نہ ان کی ان دونوں (کے پیدا کرنے) میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا (کسی کام میں) مددگار ہے۔

خلاصہ یہ کہ نہ عالم کی ایجاد میں ان کا کوئی دخل ہے اور نہ عالم کے موجود ہونے کے بعد اس میں کوئی مستقل اختیار رکھتے ہیں، اور نہ خدا کے نائب ہوکر کچھ اختیار رکھتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ١ یہاں سے مشرکین مکہ کو خطاب ہے جن کی تنبیہ کے لیے ''سبا'' کا قصہ سنایا تھا، یعنی اللہ کے سوا جن چیزوں پر تم کو خدائی کا گمان ہے، ذرا کسی آڑے وقت میں ان کو پکارو تو سہی دیکھیں وہ کیا کام کرتے ہیں۔

وَلَا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا لِمَنۡ اَذِنَ لَهٗ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِهِمۡ قَالُوۡا مَاذَا ۙ

اور کام نہیں آتی سفارش اسکے پاس مگر اسکو کہ جس کے واسطے حکم کردے ١ یہاں تک کہ جب گھبراہٹ دور ہوجائے ان کے دل سے کہیں کیا

قَالَ رَبُّكُمۡ ؕ قَالُوا الۡحَقَّ ۚ وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡكَبِيۡرُ ﴿۲۳﴾

فرمایا تمہارے رب نے، وہ کہیں فرمایا جو واجبی ہے اور وہی ہے سب سے اوپر بڑا ٢

خلاصہ تفسیر: جس طرح وہ خود کوئی کام نہیں کر سکتے اسی طرح اللہ تعالیٰ سے کہہ کر بھی کوئی کام نہیں کرا سکتے جس کو شفاعت کہتے ہیں جیسا کہ کفار کا قول تھا: ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ، کہ یہ معبود خدا کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں اور بھلا ان معبودین میں جو بے جان جمادات ہیں وہ تو بے چارے کیا شفاعت کرتے اس کی قابلیت ہی نہیں رکھتے، اسی طرح جو ذی روح جاندار ہیں مگر خود عند اللہ مقبول نہیں جیسے شیاطین تو وہ بھی کیا شفاعت کرتے، اور جو ذی روح جاندار مقبول بھی ہیں جیسے فرشتے تو مشرکین انہیں معبود اور اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے، خود ان کی شفاعت اس عام قانون میں داخل ہے کہ:

اور خدا کے سامنے (کسی کی) سفارش کسی کے لئے کام نہیں آتی (بلکہ سفارش ہی نہیں ہوسکتی) مگر اس کے لئے جس کی نسبت وہ (کسی سفارش کرنے والے کو) اجازت دے دے (اور دلائل سے ثابت ہے کہ یہ اجازت صرف مؤمنین کے حق میں ہوگی، پس اس عام قانون کے مطابق کفار کی کوئی سفارش نہ کرے گا، آگے یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ بت اور شیاطین تو کیا شفاعت کرتے کہ بتوں میں تو قابلیت ہی نہیں اور شیاطین میں مقبولیت کی شان نہیں، وہاں تو فرشتے بھی باوجودیکہ مقبولان الٰہی ہیں اجازت کے بغیر سفارش کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے، فرشتوں کا تو خدا کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے یہ حال ہے کہ جب ان کو حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم ہوتا ہے تو اسی میں ہیبت کے مارے گھبرا اٹھتے ہیں) یہاں تک کہ جب (اس حکم کے ختم ہوچکنے پر) ان کے دلوں سے گھبراہٹ (جو حکم سننے کے وقت طاری ہوئی تھی) دور ہوجاتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حکم فرمایا؟ وہ کہتے ہیں کہ (فلاں) حق بات کا حکم فرمایا (یعنی حکم دینے کے وقت شدت ہیبت کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ان کو اس وقت اپنے سمجھنے اور یاد رکھنے پر پورا بھروسہ نہیں ہوتا، تو جب حق تعالیٰ کی جانب سے معمولی احکام کے خطاب پر ان کی یہ حالت ہے تو خود ان کا اپنی طرف سے ایک نئی بات کے متعلق خطاب کرنا کیا کچھ دشوار نہ ہوگا، پس جب مقرب فرشتوں کی یہ حالت ہو تو اصنام و شیاطین کس شمار میں ہیں، بتوں میں

قدرت نہیں اور شیاطین کو مقبولیت حاصل نہیں) اور (خدا تعالیٰ کے سامنے فرشتوں کا ایسا حال ہو جانا کچھ تعجب کی بات نہیں، کیونکہ) وہ عالی شان سب سے بڑا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِہِمۡ قَالُوۡا مَاذَا: جیسے طالب علم سبق پڑھنے کے بعد استاذ کی تقریر کو صحیح کرنے اور یاد کرنے کے لئے باہم اس کا تکرار کیا کرتے ہیں، اور باہم پوچھ پاچھ اور تحقیق کرتے ہیں، اسی طرح یہ فرشتے بھی اپنے سنے ہوئے حکم کی باہم ایک دوسرے سے تحقیق وتصدیق کرتے ہیں، اس کے بعد حکم کی تعمیل کرتے ہیں، روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ بسا اوقات ہیبت بھی سمجھ اور فہم میں رکاوٹ بن جاتی ہے، احقر کہتا ہے کہ ہیبت کا سمجھ اور فہم میں رکاوٹ ہو جانا کبھی اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ انسان کو معذور کر دیتا ہے، جیسے بعض اہل حال کو پیش آ جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ مسکین کیا کام آتے جنہیں آسمان وزمین میں نہ ایک ذرہ کا مستقل اختیار ہے (بلکہ بتوں کو تو غیر مستقل بھی نہیں) نہ آسمان وزمین میں ان کی کچھ شرکت، نہ خدا کو کسی کام میں مدد کی ضرورت، جو یہ اس کے معین ومددگار بن کر ہی کچھ حقوق جتلاتے، اس کی بارگاہ تو وہ ہے جہاں بڑے بڑے مقربین کی یہ بھی طاقت نہیں کہ بدون اذن ورضا کے کسی کی نسبت ایک حرف سفارش ہی زبان سے نکال سکیں، انبیاء واولیاء اور ملائکۃ اللہ کی شفاعت بھی صرف انہی کے حق میں نافع ہوگی جن کے لیے ادھر سے سفارش کا حکم مل جائے۔

فائدہ: ۲؎ یہ فرشتوں کا حال فرمایا جو ہمہ وقت اس بارگاہ کے حاضر باش ہیں، جب اوپر سے اللہ کا حکم اترتا ہے، ایسی آواز آتی ہے جیسے صاف چکنے پتھر پر زنجیر کھینچی جائے (شاید اتصال وبساطت کو قریب الی الفہم کرنے کے لیے یہ تشبیہ دی گئی) فرشتے دہشت اور خوف ورعب سے تھرا جاتے ہیں اور تسبیح کرتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، جب یہ حالت رفع ہو کر دل کو تسکین ہوئی اور کلام اتر چکا، ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کیا حکم ہوا؟ اوپر والے فرشتے نیچے والوں کو درجہ بدرجہ بتاتے ہیں جو اللہ کی حکمت کے موافق ہے اور آگے سے قاعدہ معلوم ہے وہ ہی حکم ہوا، ظاہر ہے وہاں معقول اور واجبی بات کے سوا کیا چیز ہو سکتی ہے، پس جس کے علو وعظمت کی یہ کیفیت ہو کہ حکم دے تو مقربین کا مارے ہیبت وجلال کے یہ حال ہو جائے وہاں کس کی ہمت ہے کہ از خود سعی وسفارش کے لیے کھڑا ہو جائے۔

تنبیہ: آیت کی اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں جن کی نسبت حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: "وجمیع ذلك مخالف لھذا الحدیث الصحیح (الذی فی البخاری) ولا حادیث کثیرة تو یده (فتح الباری ۱۳-۳۸۱)

قُلۡ مَنۡ یَّرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰہُ ۙ وَاِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ لَعَلٰی ہُدًی

تو کہہ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے بتلا دے کہ اللہ ۱؎ اور یا ہم یا تم بیشک ہدایت پر ہیں یا پڑے ہیں

اَوۡ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۴﴾

گمراہی میں صریح ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور) آپ (ان سے توحید کی تحقیق کے لئے یہ بھی) پوچھئے کہ تم کو آسمان وزمین سے (پانی برسا کر اور نباتات نکال کر) کون روزی دیتا ہے (چونکہ اس کا جواب ان کے نزدیک بھی متعین ہے کہ خدا ایسا کرتا ہے، اس لئے) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ (روزی دیتا ہے) اور (یہ بھی کہئے کہ اس مسئلہ توحید میں) بیشک ہم یا تم ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں۔

وَاِنَّاۤ اَوۡ اِیَّاکُمۡ: یعنی یہ تو ہو نہیں سکتا کہ توحید کے ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں حق پر یا دونوں غلطی پر ہوں، ضرور ایک راہ پر ہے اور دوسرا گمراہ ہے، اب غور کرنے کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ توحید کے دلائل میں غور کرنے سے نتیجہ اہل اسلام ہی کے موافق نکلتا ہے، پس ان ہی کا حق

پر ہونا ثابت ہوگا، اور باوجود یکہ واقع میں ہدایت والے اور گمراہ ہونے والے متعین ہیں مگر اس جگہ نرمی اور لطف کی غرض سے یہ عنوان اختیار کیا گیا کہ ہم یا تم ضرور راہ راست پر ہیں یا صریح گمراہی میں، تاکہ مقابل کو اشتعال نہ ہو جائے جو کہ غور وفکر اور طلب کے رستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: یہ مشرکین وکفار کے ساتھ خطاب ہے، دلائل واضحہ سے اللہ تعالیٰ کا خالق و مالک ہونا اور قادر و مطلق ہونا واضح کردیا گیا، بتوں اور غیر اللہ کی بے بسی اور کمزوری کا مشاہدہ کرا دیا گیا، ان سب باتوں کے بعد موقع اس کا تھا کہ مشرکین کو خطاب کر کے کہا جاتا کہ تم جاہل اور گمراہ ہو کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں اور شیاطین کی پرستش کرتے ہو، مگر قرآن حکیم نے اس جگہ جو حکیمانہ عنوان اختیار فرمایا وہ دعوت وتبلیغ اور مخالفین اسلام اور اہل باطل سے بحث و مناظرہ کرنے والوں کے لئے ایک اہم ہدایت نامہ ہے کہ اس آیت میں ان کو کافر گمراہ کہنے کی بجائے عنوان یہ رکھا کہ ان دلائل واضحہ کی روشنی میں یہ تو کوئی سمجھدار آدمی کہہ نہیں سکتا کہ توحید وشرک دونوں باتیں حق ہیں اور اہل توحید اور مشرک دونوں حق پرست ہیں، بلکہ یقینی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک حق پر دوسرا گمراہی پر ہے، اب تم خود سوچ لو اور فیصلہ کرلو کہ ہم حق پر ہیں یا تم، مخاطب کو خود کافر گمراہ کہنے سے اس کو اشتعال ہوتا، اس سے گریز کیا گیا، اور ایسا مشفقانہ عنوان اختیار کیا کہ سنگدل مخالف بھی غور کرنے پر مجبور ہو جائے، یہ پیغمبرانہ دعوت وموعظمت اور مجادلہ بالتی ھی احسن کا طریقہ جو علماء کو وقت پیش نظر رکھنا چاہئے، اس کے نظر انداز ہونے ہی سے دعوت وتبلیغ اور بحث ومناظرہ بے اثر بلکہ مضر ہو کر رہ جاتا ہے، مخالفین ضد پر آجاتے ہیں ان کی گمراہی اور پختہ ہو جاتی ہے۔

فائدہ: ۱ یعنی آسمان وزمین سے روزی کے سامان بہم پہنچانا صرف اللہ کے قبضہ میں ہے، اس کا اقرار مشرکین بھی کرتے تھے، لہذا آپ بتلا دیں کہ یہ تم کو بھی مسلم ہے، پھر الوہیت میں دوسرے شریک کہاں سے ہو گئے۔

فائدہ: ۲ یعنی دونوں فرقے تو سچ نہیں کہتے (ورنہ اجتماع نقیضین لازم آجائے) یقیناً دونوں میں ایک سچا اور ایک جھوٹا ہے تو لازم ہے کہ سوچو اور غور کر کے سچی بات قبول کرو۔

اس میں ان کا جواب ہے جو بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ میاں! دونوں فرقے ہمیشہ سے چلے آئے ہیں، کیا ضروری ہے جھگڑنا؟ تو بتلا دیا کہ ایک یقیناً خطا کار اور گمراہ ہے، باقی تعیین نہ کرنے میں حکیمانہ حسن خطاب ہے، یعنی لو ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے، بہرحال ایک تو یقیناً غلطی پر ہوگا، اب اوپر کے دلائل سن کر تم ہی خود فیصلہ کرلو کہ کون غلطی پر ہے، گویا مخالف کو نرمی سے بات کر کے اپنے نفس میں غور کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

تو کہہ تم سے پوچھ نہ ہوگی اس کی جو ہم نے گناہ کیا اور ہم سے پوچھ نہ ہوگی اس کی جو تم کرتے ہو

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾

کہہ جمع کرے گا ہم سب کو رب ہمارا پھر فیصلہ کرے گا ہم میں انصاف کا اور وہی ہے قصہ چکانے والا سب کچھ جاننے والا ۱

خلاصہ تفسیر: آپ (ان سے اس بحث ومناظرہ میں یہ بھی) فرما دیجئے (کہ ہم نے کھول کر حق وباطل کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے، اب تم اور ہم ہر ایک اپنے عمل کا ذمہ دار ہے، چنانچہ اخیر درجہ کی بات یہی ہے) کہ (اگر ہم خطا پر اور مجرم ہیں تو) تم سے ہمارے جرائم کی باز پرس نہ ہوگی اور ہم سے تمہارے اعمال کی باز پرس نہ ہوگی (اور آپ ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (یہ احتمال نہ کیا جائے کہ بالکل باز پرس نہ ہوگی، جیسا کہ قیامت کے منکر کہتے تھے، بلکہ ایک وقت ضرور آنے والا ہے جس میں) ہمارا رب سب کو (ایک جگہ) جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان ٹھیک فیصلہ (عملی) کر دے گا اور وہ بڑا فیصلہ کرنے والا اور (سب کا حال) جاننے والا ہے (اس سے کسی کا حال پوشیدہ نہیں جس سے غلط فیصلہ کا شبہ ہو سکے)۔

وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ: اس جواب میں بھی انتہائی درجہ نرمی کی رعایت ہے کہ مقابل کے اعمال کو جرائم سے تعبیر نہیں کیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہر ایک کو اپنی عاقبت کی فکر کرنی چاہیے، کوئی شخص دوسرے کے قصور اور غلطی کا جواب دہ نہ ہوگا، اگر اتنی صاف باتیں سننے کے بعد بھی تم اپنی حالت میں غور کرنے کے لیے تیار نہیں تو یاد رکھو ہم حجت تمام کر چکے اور کلمہ حق پہنچا چکے، اب تم اپنے اعمال کے خود جواب دہ ہو گے، ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، نہ ایسی حالت میں ہمارا تمہارا کوئی واسطہ، خدا کے یہاں حاضر ہونے کے لیے ہر ایک اپنی اپنی فکر کر رکھے، وہ سب کو اکٹھا کر کے ٹھیک ٹھیک انصاف کا فیصلہ کر دے گا۔

قُلْ اَرُوْنِیَ الَّذِیْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۷﴾

تو کہہ مجھ کو دکھلاؤ تو سہی جن کو اس سے ملاتے ہو ساجھی قرار دیکر ۱؎ کوئی نہیں وہی اللہ ہے زبردست حکمتوں والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: جب حق تعالیٰ کی شان اور دوسرے باطل معبودوں کی عاجزی ظاہر ہو چکی تو اب نتیجہ کے طور پر شرک کا باطل ہونا اور توحید کا حق ہونا بتلاتے ہیں۔

آپ (یہ بھی) کہئے کہ (تم نے اللہ تعالیٰ کی شان عالی اور قدرت کاملہ کے دلائل سن لئے اور اپنے بتوں کی بے بسی بھی دیکھ لی) مجھ کو ذرا وہ تو دکھلاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر (عبادت کا مستحق ہونے میں) خدا کے ساتھ ملا رکھا ہے، ہرگز (اس کا کوئی شریک) نہیں بلکہ (واقع میں) وہی ہے اللہ (یعنی معبود برحق) زبردست حکمت والا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ذرا سامنے تو کرو کون سی ہستی ہے جو اس کی خدائی میں ساجھا رکھتی ہے؟ ہم بھی تو دیکھیں کہ اس کے کیا کچھ اختیارات ہیں، کیا ان پتھر کی بے جان اور خود تراشیدہ مورتوں کو پیش کرو گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہرگز تم ایسی کوئی ہستی پیش نہیں کر سکتے، وہ تو اکیلا ایک ہی خدا ہے جو زبردست، غالب و قاہر اور اعلیٰ درجہ کی حکمت و دانائی رکھنے والا ہے، سب اس کے سامنے مغلوب و مقہور ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو لیکن بہت لوگ نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا ذکر تھا، اب رسالت محمدیہ کا حق ہونا اور اس کا تمام مخلوق کے لیے عام ہونا بتلاتے ہیں، کیونکہ کفار اس کے بھی منکر تھے، نیز توحید کا حق رسول کی اتباع کے بغیر ادا بھی نہیں ہو سکتا۔

اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے (خواہ جن ہوں یا انسان، عرب ہوں یا عجم، اس وقت موجود ہوں یا آئندہ ہونے والے ہوں سب کے لئے) پیغمبر بنا کر بھیجا ہے (ایمان لانے پر ان کو ہماری رضا و ثواب کی) خوش خبری سنانے والا اور (ایمان نہ لانے پر ان کو ہمارے غضب و عذاب سے) ڈرانے والا لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (محض جہالت یا عناد کی وجہ سے انکار و تکذیب میں لگ جاتے ہیں اگرچہ یقین ہی آ جائے)۔

* * *

فائدہ: یہ توحید کے ساتھ رسالت کا ذکر کر دیا، یعنی آپ ﷺ کا فرض اور آپ ﷺ کی بعثت کی غرض یہ ہی ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کو ان کے نیک و بد سے آگاہ کر دیں سو کر دیا، جو نہیں سمجھتے وہ جانیں، سمجھدار آدمی تو اپنے نفع نقصان کو سوچ کر آپ ﷺ کی بات کو ضرور مانیں گے، ہاں! دنیا میں کثرت جاہلوں اور ناسمجھوں کی ہے، ان کے دماغوں میں کہاں گنجائش ہے کہ کارآمد باتوں کی قدر کریں۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٩﴾

اور کہتے ہیں کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو ۱

قُلْ لَكُمْ مِيعَادُ يَوْمٍ لَا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٠﴾ قف ع ۳

تو کہہ تمہارے لیے وعدہ ہے ایک دن کا نہ دیر کرو گے اس سے ایک گھڑی نہ جلدی ۲

خلاصہ تفسیر: توحید و رسالت کے بعد قیامت کا اور اس کے بعض واقعات کا ذکر کرتے ہیں، کیونکہ کفار اس کے بھی منکر تھے، دوسرے قیامت کا اعتقاد نہ ہونے سے بعض دفعہ حق کی طلب اور فکر ہی نہیں ہوتی۔

اور یہ لوگ (قیامت کے متعلق گذشتہ مضامین یعنی: یجمع بیننا ربنا ثم یفتح الخ سن کر) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب (واقع) ہوگا اگر تم (یعنی نبی اور آپ کے متبعین) سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ کہہ دیجئے کہ تمہارے واسطے ایک خاص دن کا وعدہ (مقرر) ہے اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکتے ہو اور نہ آگے بڑھ سکتے ہو (یعنی تم جو پوچھ رہے ہو اور اس پوچھنے سے تمہارا مقصود انکار کرنا ہے تو سن لو کہ قیامت ضرور آئے گی اگرچہ بعض حکمتوں کی وجہ سے ہم اس کا وقت تم کو نہ بتلائیں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جس گھڑی سے ڈراتے ہو وہ کب آئے گی؟ اگر سچے ہو تو جلدی لا کر دکھلا دو۔

فائدہ: ۲ یعنی گھبراؤ نہیں، جس دن کا وعدہ ہے ضرور آ کر رہے گا، جب آئے گا تو ایک منٹ کی مہلت نہ ملے گی، جلدی مچانے کے بجائے اس کی ضرورت ہے کہ اس وقت کے آنے سے پہلے کچھ تیاری کر رکھو۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ

اور کہنے لگے منکر ہم ہرگز نہ مانیں گے اس قرآن کو اور نہ اس سے اگلے کو ۱ اور کبھی تو دیکھے جب کہ گناہ گار

مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ يَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا

کھڑے کئے جائیں اپنے رب کے پاس، ایک دوسرے پر ڈالتا ہے بات کو ۲ کہتے ہیں وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے

لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ﴿٣١﴾

بڑائی کرنے والوں کو اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایمان دار ہوتے ۳

خلاصہ تفسیر: اور یہ کفار (دنیا میں تو خوب خوب باتیں بناتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس سے پہلی کتابوں پر اور (قیامت میں یہ ساری لمبی چوڑی باتیں ختم ہو جائیں گی، چنانچہ) اگر آپ (ان کی) اس وقت کی حالت دیکھیں (تو ایک ہولناک منظر نظر آئے) جبکہ یہ ظالم اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے ایک دوسرے پر بات ڈالتا ہوگا (جیسا کوئی کام بگڑ جانے کے وقت عادت ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو الزام دیتے ہیں، چنانچہ) ادنیٰ درجہ کے لوگ (یعنی متبعین) بڑے لوگوں سے (یعنی اپنے مقتداؤں سے) کہیں گے کہ (ہم تو تمہارے سبب برباد ہوئے) اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آئے ہوتے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہم نہ قرآن کو مانیں، نہ اگلی کتابوں کو، جنہیں تم آسمانی کتابیں بتلاتے ہو، مثلاً تورات وانجیل وغیرہ، یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں، جہاں دیکھو وہی حساب کتاب اور قیامت کا مضمون ہے، سو ان چیزوں کو ہم ہرگز تسلیم کرنے والے نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی جیسے ناکامیابی کے وقت ہوتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کو ناکامیابی کا سبب گردانتا ہے، محشر میں بھی کفار ایک دوسرے کو مورد الزام بنائیں گے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

فائدہ: ۳ دنیا میں جو لوگ نیچے کے طبقہ میں شمار ہوتے تھے اور دوسروں کے پیچھے چلتے تھے، وہ اپنے بڑے سرداروں کو الزام دیں گے کہ تم نے ہمیں اس مصیبت میں پھنسوایا، تمہاری روک نہ ہوتی تو ہم ضرور پیغمبروں کی بات مان لیتے اور یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ

کہنے لگے بڑائی کرنے والے ان سے جو کہ کمزور گنے گئے تھے کیا ہم نے روکا تم کو حق بات سے تمہارے پاس پہنچ چکنے کے بعد

بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾

کوئی نہیں تم ہی تھے گناہ گار

خلاصہ تفسیر: (اس پر) یہ بڑے لوگ ان ادنیٰ درجہ کے لوگوں سے کہیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت (پر عمل کرنے) سے (زبردستی) روکا تھا بعد اس کے کہ وہ (ہدایت) تم کو پہنچ چکی تھی، نہیں بلکہ تم ہی قصوروار ہو (کہ حق کے ظاہر ہونے کے بعد بھی اس کو قبول نہ کیا، اب ہمارے سر دھرتے ہو)۔

اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى: اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بعض کفار نے تو اپنے ماتحتوں پر زبردستی بھی کی ہے پھر وہ یہ کیسے کہیں گے کہ ہم نے تم کو زبردستی نہیں روکا، جواب یہ ہے کہ اصل ایمان اعتقاد ہے، اور وہ دل میں ہوتا ہے، اور دل پر کسی کی زبردستی نہیں چل سکتی، پس ان کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے دلوں پر تو جبر نہ کیا تھا۔

* * *

فائدہ: یعنی جب تمہارے پاس حق بات پہنچ گئی اور سمجھ میں آ گئی تھی، کیوں قبول نہ کی؟ کیا ہم نے زبردستی تمہارے دلوں کو ایمان ویقین سے روک دیا تھا؟ چاہیے تھا کہ کسی کی پروا نہ کر کے حق کو قبول کر لیتے، اب اپنا جرم دوسروں کے سر کیوں رکھتے ہو؟

وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ

اور کہنے لگے وہ لوگ جو کمزور گنے گئے تھے بڑائی کرنے والوں کو کوئی نہیں پر فریب سے رات دن کے جب تم ہم کو حکم کیا کرتے کہ ہم نہ مانیں

بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ

اللہ کو اور ٹھہرائیں اس کے ساتھ برابر کے ساجھی ۱ اور چھپے چھپے پچتانے لگے جب دیکھ لیا عذاب ۲ اور ہم نے ڈالے ہیں طوق گردنوں میں

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾

منکروں کے ۳ وہی بدلہ پاتے ہیں جو عمل کرتے تھے ۴

خلاصہ تفسیر: اور (اس کے جواب میں) یہ کم درجہ کے لوگ ان بڑے لوگوں سے کہیں گے کہ (ہم یہ نہیں کہتے کہ تم نے زبردستی کی

تھی) نہیں، بلکہ تمہاری رات دن کی تدبیروں نے روکا تھا جب تم ہم سے فرمائش کرتے رہتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لئے شریک قرار دیں (تدبیروں سے مراد للچانا ہے اور دھمکانا ہے، یعنی رات دن کی ان تعلیمات اور ان تدبیرات کا اثر ہو گیا، اور تباہ و برباد ہوئے، بس ہم کو تم ہی نے خراب کیا) اور (اس گفتگو میں تو ہر شخص دوسرے پر الزام دے گا، مگر دل میں اپنا اپنا قصور بھی سمجھیں گے، گمراہ کرنے والے سمجھیں گے کہ واقعی ہم نے ایسا کیا تو تھا اور گمراہ ہونے والے سمجھیں گے کہ اگر چہ انہوں نے ہم کو غلط راستہ بتلایا تھا، لیکن آخر ہم بھی تو اپنا نفع نقصان سمجھ سکتے تھے، ضرور ہمارا بھی بلکہ زیادہ ہمارا ہی قصور ہے لیکن) وہ لوگ (اپنی اس) پشیمانی کو (ایک دوسرے سے) مخفی رکھیں گے جبکہ (اپنے اپنے عمل پر) عذاب (ہوتا ہوا) دیکھیں گے (تا کہ نقصان مایہ کے ساتھ شماتت ہمسایہ نہ ہو، لیکن آخر میں عذاب کی شدت سے وہ تحمل جاتا رہے گا) اور (ان سب کو مشترک یہ عذاب دیا جائے گا کہ) ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈالیں گے (اور ہاتھ پاؤں میں زنجیر پھر مشکیں باندھ کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا) جیسا کرتے تھے ویسا ہی تو بھرا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بیشک تم نے زبردستی مجبور تو نہ کیا تھا، مگر رات دن مکر و فریب اور مغویانہ تدبیر سے ہم کو بہکاتے پھسلاتے رہتے تھے، جب ملے یہ تلقین کی کہ ہم پیغمبروں کے ارشاد کے موافق خدا کو ایک نہ مانیں، بلکہ بعض مخلوقات کو بھی اس کا مماثل اور برابر کا شریک سمجھیں، آخر تمہاری شب و روز کی ترغیب و ترہیب کا کہاں تک اثر نہ ہوتا۔

فائدہ: ۲ یعنی جس وقت ہولناک عذاب سامنے آئے گا، تابعین اور متبوعین دونوں اپنے اپنے دل میں پچھتائیں گے، ہر ایک محسوس کرے گا کہ واقعی میں مجرم اور قصوروار ہوں، لیکن شرم کے مارے ایک دوسرے پر ظاہر نہ کریں گے اور شدید اضطراب و خوف سے شاید بولنے کی قدرت بھی نہ ہو۔

فائدہ: ۳ گردنوں میں طوق اور ہاتھ پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوں گی۔

فائدہ: ۴ یعنی جو عمل کیے تھے آج وہ اس سزا کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں، جیسا کرنا ویسا بھرنا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا مگر کہنے لگے ہیں وہاں کے آسودہ لوگ، جو تمہارے ہاتھ بھیجا گیا ہم اس کو نہیں مانتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے آخرت کے عذاب کا بیان تھا، چونکہ وہ لوگ دنیا میں اپنی خوش حالی دیکھ کر آخرت کے عذاب کو غلط بتاتے تھے اور اس سے طبعاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غم ہونے کا احتمال تھا، اس لیے آگے کفار کے اس خیال کا رد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرماتے ہیں۔

اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! ان لوگوں کی گمراہانہ اور جاہلانہ باتوں سے آپ مغموم نہ ہوں، کیونکہ یہ معاملہ انوکھا آپ ہی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ) ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈر سنانے والا (پیغمبر) نہیں بھیجا، مگر وہاں کے خوش حال لوگوں نے (ان موجودہ کفار کی طرح ان سے) یہی کہا کہ ہم تو ان احکام کے منکر ہیں جو تم کو دے کر بھیجا گیا ہے۔

اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ: خاص خوش حال لوگوں کو اس لیے ذکر فرمایا کہ تکذیب اکثر وہی لوگ پہلے شروع کرتے تھے۔

اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ: ان کا یہ کہنا کہ "جو حکم تم کو دے کر بھیجا گیا ہے" یہ بطور استہزاء اور دل لگی کے ہے ورنہ وہ تو رسالت ہی کے منکر تھے۔

* * *

فائدہ: یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ آپ رؤسائے مکہ کے انحراف و سرکشی سے مغموم نہ ہوں، ہر زمانہ میں پیغمبروں کا مقابلہ ایسے ہی بدبخت رئیسوں نے کیا ہے، دولت و ثروت کا نشہ اور اقتدار طلبی کا جذبہ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے، وہ کسی کے سامنے گردن جھکانا اور چھوٹے آدمیوں کے برابر بیٹھنا گوارا نہیں کرتا، اسی لیے انبیاء کے اول متبعین عموماً ضعیف و مسکین لوگ ہوتے ہیں، کما ورد فی حدیث ھرقل۔

وَقَالُوا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور کہنے لگے ہم زیادہ ہیں مال اور اولاد میں اور ہم پر آفت نہیں آنے والی

خلاصہ تفسیر: اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہم مال اور اولاد میں تم سے زیادہ ہیں (جیسا کہ سورہ کہف میں ہے: انا اکثر منك مالاً واعز نفراً) اور (یہ اس کی دلیل ہے کہ ہم اللہ کے نزدیک بھی مقبول اور معزز ہیں، پس) ہم کو کبھی عذاب نہ ہوگا (اور یہی بات کفار مکہ کہتے ہیں، کما قال تعالیٰ: قال الذین کفروا للذین امنوا ای الفریقین خیر مقاماً، پس آپ ان لوگوں کی جہالت اور گمراہی کی باتوں سے غم نہ کیجئے، کیونکہ یہ معاملہ انوکھا آپ ہی کے ساتھ نہیں ہوا، بلکہ سب رسولوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی معلوم ہوا خدا ہم سے خوش اور راضی ہے، ورنہ اتنا مال و اولاد کیوں دیتا؟ جب وہ خوش ہے تو ہم کو کسی آفت کا اندیشہ نہیں، تم فضول عذاب کی دھمکیاں دیتے ہو۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع ۳

تو کہہ میرا رب ہے جو کشادہ کر دیتا ہے روزی جس کو چاہے اور ناپ کر دیتا ہے لیکن بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے

خلاصہ تفسیر: (البتہ آپ ان کے اس قول کو رد کیجئے اور ان سے یوں) کہہ دیجئے کہ (وسعت رزق کا مدار عند اللہ مقبول ہونے پر نہیں ہے، بلکہ محض مشیت پر ہے، چنانچہ) میرا پروردگار جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے (اور اس میں دوسری حکمتیں ہوتی ہیں) لیکن اکثر لوگ (اس سے) واقف نہیں (کہ اس کا مدار دوسری مصلحتوں پر ہے، عند اللہ مقبول ہونے پر نہیں ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی روزی کی فراخی یا تنگی اللہ کے خوش یا ناخوش ہونے کی دلیل نہیں، دیکھتے نہیں دنیا میں کتنے بدمعاش، شریر، دہریے ملحد (ناستک) مزے اڑاتے ہیں؟ حالانکہ ان کو کوئی مذہب بھی اچھا نہیں کہتا، اور بہت سے خدا پرست پرہیزگار اور نیک بندے بظاہر فاقے کھینچتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ دولت و افلاس یا تنگی و فراخی کسی کے محبوب و مقبول عند اللہ ہونے کی دلیل نہیں، یہ معاملات تو دوسری مصالح اور حکمتوں پر مبنی ہیں جن کو اللہ ہی جانتا ہے، مگر بہت لوگ اس نکتہ کو نہیں سمجھتے:

ومن الدليل على القضاء وحكمه　　　بؤس اللبيب وطيب عيش الاحمق

وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ

اور تمہارے مال اور تمہاری اولاد وہ نہیں کہ نزدیک کر دیں ہمارے پاس تمہارا درجہ پر جو کوئی یقین لایا اور بھلا کام کیا ۱ے

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

سو ان کے لیے ہے بدلہ دونا کیے کام کا ۲ے اور وہ جھروکوں میں بیٹھے ہیں دل جمعی سے

خلاصہ تفسیر: اور (اے کفار! یہ بھی سن رکھو کہ جس طرح تمہارے مال و اولاد عند اللہ قرب کی علامات نہیں ہیں، اسی طرح) تمہارے اموال و اولاد ایسی چیزیں نہیں جو تم کو درجہ میں ہمارا مقرب بنا دے (یعنی یہ بھی قرب کی علت اور سبب نہیں ہیں، غرض نہ یہ بات ہے کہ مال

واولاد مقرب اور مقبول ہی کو ملے اور نہ یہ بات ہے کہ جس کے پاس مال واولاد ہو وہ مقرب اور مقبول ہی ہوا کرے، ان چیزوں کو قرب میں کسی درجہ میں بھی دخل نہیں) ہاں مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کرے (یہ دونوں چیزیں البتہ قرب کا سبب ہوتی ہیں) سو ایسے لوگوں کے لئے ان کے (نیک) عمل کا دونا صلہ ہے (یعنی عمل سے زیادہ ثواب ملے گا اگر چہ دوگنے سے بھی زیادہ ہو، لقولہ تعالیٰ: من جاء بالحسنہ فلہ عشر امثالھا) اور وہ (بہشت کے) بالا خانوں میں چین سے (بیٹھے) ہوں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مال واولاد کی کثرت نہ قرب الٰہی کی علامت ہے، جیسا کہ اوپر کی آیت میں گزرا ہے اور نہ قرب حاصل کرنے کا سبب ہے، بلکہ اس کے برعکس کافر کے حق میں زیادت بعد کا سبب بن جاتا ہے، ہاں! مومن اگر مال ودولت اور شائستہ بنائے، ایسا مال واولاد ایک درجہ میں قرب الٰہی کا سبب بنتا ہے، بہر حال وہاں مال واولاد کی پوچھ نہیں، محض ایمان وعمل صالح کی پرسش ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کام پر جتنے اجر کا استحقاق ہے اس سے زائد بدلہ ملے گا، کم از کم دس گنا اور زیادہ سے ہو تو سات سو گنا، بلکہ اللہ چاہے تو اس سے بھی زیادہ جس کی کوئی حد نہیں: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ: ۲۶۱) یہاں ضعف سے مطلقاً زیادت مراد ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور جو لوگ دوڑتے ہیں ہماری آیتوں کے ہرانے کو وہ عذاب میں پکڑے ہوئے آتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور جو لوگ (ان کے خلاف محض اپنے مال واولاد پر مغرور ہیں اور ایمان وعمل صالح کو اختیار نہیں کرتے، بلکہ وہ) ہماری آیتوں کے متعلق (ان کو باطل ثابت کرنے کی) کوشش کر رہے ہیں (نبی کو) ہرانے کے لئے ایسے لوگ عذاب میں لائے جائیں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی جو بدبخت اللہ کی آیات کو رد کرتے اور ان پر طعن کر کے لوگوں کو ادھر سے روکتے ہیں، گویا سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ ورسول کو ہرا دیں گے، وہ سب عذاب میں گرفتار ہو کر حاضر کیے جائیں گے، ایک بھی چھوٹ کر نہ بھاگ سکے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ

تو کہہ میرا رب ہے جو کشادہ کر دیتا ہے روزی جس کو چاہے اپنے بندوں میں اور ناپ کر دیتا ہے، اور جو خرچ کرتے ہو کچھ چیز

فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

وہ اس کا عوض دیتا ہے، اور وہ بہتر ہے روزی دینے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے رزق کے کم یا زیادہ ہونے کو خدا کی مشیت پر موقوف بتا کر کفار کے غلط گمان کو دور کیا تھا، اب آگے اسی مضمون پر متفرع کر کے مسلمانوں کی ایک اصلاح فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب مال کے کم یا زیادہ ہونے کا مدار محض مشیت پر ہے تو مومن کو چاہیے کہ اس کے ساتھ زیادہ دل نہ لگائے اور کفار کی طرح اس کو مقصود نہ سمجھے، بلکہ اس کو رضا وقرب الٰہی حاصل ہونے کا ذریعہ بنائے۔

آپ (مومنین سے) یہ فرما دیجئے کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے فراخ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے تنگی دیتا ہے اور (خرچ میں روکنے اور بخل کرنے سے رزق بڑھ نہیں سکتا، اور شریعت کے مطابق خرچ کرنے سے گھٹ نہیں سکتا، اس لئے تم مال سے دل نہ لگاؤ، بلکہ جہاں جہاں خدا کے حقوق اور اہل وعیال کے حقوق اور فقراء ومساکین وغیرہ میں خرچ کرنے کا حکم ہے بے دھڑک خرچ کرتے رہو، کہ اس سے رزق مقسوم ومقدر میں تو کسی کمی کا نقصان نہ ہوگا اور آخرت میں اس سے نفع حاصل ہوگا، کیونکہ) جو چیز تم (حکم خداوندی کے مواقع میں) خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کا

(آخرت میں توضرور اور کبھی دنیا میں بھی) بدلہ دے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے (پس اس خرچ سے تمہاری دنیاوی روزی کم نہ کرے گا اور آخرت کی روزی اس کے علاوہ عطا فرمائے گا)۔

وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ: یہاں رازقین صیغہ جمع لانا اس اعتبار سے فرمایا کہ جو لوگ ظاہر میں اپنے ہاتھ سے دیتے دلاتے ہیں ان کو مجازاً رازق قرار دے دیا گیا، اور چونکہ اللہ تعالیٰ حقیقی رازق ہیں اس لیے اس کا خیر الرازقین ہونا ظاہر ہے۔

* * *

فائدہ: یہ مسلمانوں کو سنایا کہ تم وجوہ خیر میں خرچ کرتے وقت تنگی اور افلاس سے نہ ڈرنا، خرچ کرنے سے رزق کم نہیں ہوجاتا، جو مقدر ہے پہنچ کر رہے گا، اللہ اپنی حکمت سے جس کو جتنا دینا چاہے اس میں تمہارے خرچ کرنے نہ کرنے سے فرق نہیں پڑتا، بلکہ وجوہ خیر میں خرچ کرنے سے برکت ہوتی ہے اور حق تعالیٰ اس کا عوض دیتا ہے، خواہ مال کی صورت میں یا قناعت وغنائے قلبی کی شکل میں اور آخرت میں بدلہ ملنا تو یقینی ہے، غرض اس کے ہاں کچھ کمی نہیں، مسلمان کو چاہیے کہ اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھے اور اس کی مرضی کے سامنے فقر وفاقہ کا اندیشہ دل میں نہ لائے: "وَلا تخش من ذی العرش اقلالاً".

تنبیہ: آیت میں گویا اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ جس طرح دنیا میں تنگی اور فراخی کے اعتبار سے لوگوں کا حال متفاوت ہے، آخرت میں بھی باعتبار مراتب ثواب وعذاب کے ایسا ہی تفاوت ہوگا۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ﴿٤٠﴾

اور جس دن جمع کرے گا ان سب کو پھر کہے گا فرشتوں کو کیا یہ لوگ تم کو پوجا کرتے تھے ۱۔

قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۚ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُونَ ﴿٤١﴾

وہ کہیں گے پاک ذات ہے تیری ہم تیری طرف میں ہیں نہ ان کی طرف میں، نہیں پر پوجتے تھے جنوں کو، یہ اکثر انہی پر اعتقاد رکھتے تھے ۲۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: ویقولون متی هذا الوعد میں قیامت کا بیان تھا، اب پھر اسی کی طرف رجوع ہے۔

اور (وہ دن قابل ذکر ہے) جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو (میدان قیامت میں) جمع فرمائے گا، پھر فرشتوں سے ارشاد فرمائے گا کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کیا کرتے تھے، وہ (فرشتے پہلے حق تعالیٰ کا شریک سے بالاتر اور پاک ہونا ظاہر کرنے کے لئے) عرض کریں گے کہ آپ (شریک سے) پاک ہیں (یہ جواب سے پہلے اس لئے کہا گیا کہ گذشتہ آیت میں فرشتوں کی طرف جو شریک کرنے کی نسبت حکایت کی گئی ہے اس سے گھبرا کر پہلے یہ جملے عرض کئے، پھر آگے اس سوال کا جواب یہ دیں گے کہ) ہمارا تو (محض) آپ سے تعلق ہے نہ کہ ان سے (اس سے رضا اور امر دونوں کی نفی ہوگئی، یعنی نہ ہم نے ان کو شرک کا حکم دیا، نہ ہم ان کے فعل سے راضی تھے، ہم تو آپ کے مطیع ہیں، جو چیز آپ کو ناپسند ہے مثلاً شرک وغیرہ اس سے ہم بھی ناخوش ہیں، جب اس شرک میں نہ ہمارا امر ہے نہ رضا تو واقع میں یہ ہماری عبادت نہ کرتے تھے) بلکہ یہ لوگ شیاطین کو پوجا کرتے تھے (کیونکہ شیاطین ہی شرک کی ترغیب دیتے تھے اور اس سے راضی بھی تھے، اس لئے واقع میں ان کے معبود شیاطین ہوئے، کیونکہ عبادت کے واسطے کامل اطاعت لازم ہے، اور یہ لوگ شیاطین ہی کی اطاعت کرتے تھے اور ان ہی کے کہنے پر چلتے تھے تو عبادت بھی انہی کی ہوئی، اگرچہ یہ لوگ اس کا نام کچھ بھی رکھیں، خواہ اسے فرشتوں کی عبادت کہیں یا بتوں کی، مگر واقع میں وہ شیاطین ہی کی عبادت ہے، اور جیسے مذکورہ تقریر سے ان لوگوں کا عابد شیاطین ہونا لازم آیا اسی طرح) ان میں اکثر لوگ (التزاماً بھی) انہی (شیاطین) کے معتقد تھے (یعنی قصداً بھی بہت سے ان کو پوجتے تھے، جیسے سورۃ جن کی آیت میں ہے: وانہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن وغیرہ ذلک من الآیات)۔

أَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ: فرشتوں سے یہ سوال مشرکین کولا جواب کرنے کے لئے ہوگا، جوفرشتوں وغیرہ کواس خیال سے پوجتے تھے کہ یہ راضی ہوکر ہماری شفاعت کریں گے، جیسے ایک آیت میں اس طرح کا سوال حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا ہے: أأنت قلت للناس، مطلب سوال کا یہ ہے کہ کیا تمہاری رضا سے تمہاری عبادت کیا کرتے تھے، نیز جواب میں بھی اسی قید کا قرینہ ہے جیسا کہ جواب کے خلاصہ تفسیر سے معلوم ہوگا۔

* * *

فائدہ: لے بہت مشرکین فرشتوں کوخدا کی بیٹیاں کہتے تھے، بہت ان کے ہیاکل بنا کر پرستش کرتے تھے، بلکہ بعض نے لکھا ہے کہ اصنام پرستی کی ابتداء ملائکہ پرستی ہی سے ہوئی اور عمرو بن لحی یہ رسم قبیح شام سے حجاز میں لایا، بہرحال قیامت کے دن کفار کو سنا کر فرشتوں سے سوال کریں گے کہ کیا یہ لوگ تم کو پوجتے تھے؟ شاید یہ مطلب ہو کہ تم نے تو ان سے ایسا نہیں کہا؟ یا تم ان کے فعل سے خوش تو نہیں ہوئے؟ جیسے حضرت مسیح (علیہ السلام) سے سوال ہوگا: ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (المائدہ:۱۱٦) اور سورۃ فرقان میں ہے: ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ (الفرقان:۱۷)

فائدہ: ۲ یعنی آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ کوئی کسی درجہ میں اس کا شریک ہو (العیاذ باللہ)، ہم کیوں ان کو ایسی بات کہنے لگے تھے، یا ایسی واہیات حرکت سے خوش ہوتے، ہماری رضا تو آپ کی رضا کے تابع ہے، ہم کو ان مجرموں سے کیا واسطہ؟ ہم تو آپ کے فرمانبردار غلام ہیں، پھر یہ بدبخت توحقیقت میں ہماری پرستش بھی نہیں کرتے تھے، نام ہمارا لے کر شیطانوں کی پرستش تھی، فی الحقیقت ان کی عقیدت مندی ان ہی کے ساتھ ہے، شیاطین ان کو جس طرف ہانکتے ہیں ادھر ہی مڑ جاتے ہیں، خواہ فرشتوں کا نام لے کر یا کسی نبی اور ولی کا، بلکہ بعض تو اعلانیہ شیطان ہی کو پوجتے ہیں، جیسا کہ پہلے کسی جگہ غالبا سورہ انعام میں ہم مفصل لکھ چکے ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ

سو آج تم مالک نہیں ایک دوسرے کے بھلے کے نہ برے کے لے اور کہیں گے ہم ان گناہ گاروں کو چکھو تکلیف

النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾

اس آگ کی جس کو تم جھوٹ بتلاتے تھے

خلاصہ تفسیر: سو (کافروں سے کہا جائے گا کہ جن سے تم امیدیں رکھتے تھے) آج (خود ان کی اس براءت سے بھی اور ان کی بےبسی و بےزاری سے بھی تمہارے گمان کے خلاف یہ حالت ظاہر ہوئی کہ) تم (شرک کرنے والوں اور باطل معبودوں) میں سے نہ کوئی کسی کو نفع پہنچانے کا اختیار رکھتا ہے اور نہ نقصان پہنچانے کا اور (اس وقت) ہم ظالموں (یعنی کافروں) سے کہیں گے کہ جس دوزخ کے عذاب کو تم جھٹلایا کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو۔

لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا: اصل مطلب تو یہ ہے کہ تمہارے معبود تم کو نفع نہیں پہنچا سکتے، مگر مبالغہ کے لئے بعضکم لبعض سے تعبیر فرمایا کہ تم میں سے کوئی کسی کے نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتا، تاکہ اس سے دونوں کا برابر ہونا ثابت ہوجائے کہ جیسے تم عاجز ہو ایسے ہی وہ بھی عاجز ہیں اور وہ تم کو نفع تو کیا پہنچا سکتے نقصان پہنچانے پر بھی قادر نہیں، اس سے کلام اور پختہ ہوگیا۔

اگرچہ یہ بےزاری اور عجز تمام معبود ظاہر کریں گے، مگر فرشتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے ہوا کہ جب سب سے افضل معبودوں کا یہ حال ہوگا تو دوسروں کا نفع نہ دینا بدرجہ اولیٰ سمجھ لیا جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی آج عابد اور معبود دونوں کا عجز واضح ہوگیا کہ کوئی کسی کو ذرہ بھر نفع نقصان نہیں پہنچا سکتا، جن معبودین کا بڑا سہارا سمجھتے تھے، انہوں نے اس طرح وقت پر بیزاری ظاہر کردی۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ

اور جب پڑھی جائیں انکے پاس ہماری آیتیں کھلی کھلی کہیں اور کچھ نہیں مگر یہ ایک مرد ہے چاہتا ہے کہ روک دے تم کو ان سے جن کو پوجتے

اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ

رہے تمہارے باپ دادے ۱ اور کہیں اور کچھ نہیں یہ جھوٹ ہے باندھا ہوا ۲ اور کہتے ہیں منکر حق بات کو جب پہنچے ان تک

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾

اور کچھ نہیں یہ ایک جادو ہے صریح ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: وما ارسلناك الا كافة میں رسالت کا مسئلہ مذکور تھا، اب پھر اسی کی طرف رجوع ہے۔

اور جب ان لوگوں کے سامنے ہماری آیتیں جو (حق اور ہادی ہونے کی صفت میں) صاف صاف ہیں پڑھی جاتی ہیں تو یہ لوگ (پڑھنے والے یعنی نبی ﷺ کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ محض ایک ایسا شخص ہے جو یوں چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں (کی عبادت) سے باز رکھے جن کو (قدیم سے) تمہارے بڑے پوجتے (آرہے) تھے (اور ان سے باز رکھ کر اپنا تابع بنانا چاہتا ہے، مطلب ان کم بختوں کا یہ تھا کہ یہ نبی نہیں اور ان کی دعوت خدا کی طرف سے نہیں، بلکہ اس میں خود ان کی ذاتی غرض اپنی ریاست اور بڑا بننے کی ہے) اور (قرآن کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ محض ایک تراشا ہوا جھوٹ ہے (یعنی خدا کی طرف اس کی نسبت کرنا محض تراشی ہوئی بات ہے) اور یہ کافر اس امر حق (یعنی قرآن) کی نسبت جبکہ وہ ان کے پاس پہنچا (یعنی جب ان کافروں پر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ اگر قرآن تراشا ہوا جھوٹ ہے تو پھر بہت سے عاقل اس کا اتباع کیوں کرتے ہیں اور یہ ایسا موثر کیوں ہے تو وہ) یوں کہتے ہیں کہ یہ محض ایک صریح جادو ہے (اس لیے اس کو سن کر لوگ فریفتہ اور مغلوب العقل ہوجاتے ہیں)۔

قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ: روح المعانی میں ہے کہ یہی حال اولیاء کے منکرین کا ہے جو لوگوں کو اولیاء اللہ کے ساتھ اعتقاد رکھنے اور ان کی اتباع کرنے سے روکتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ رسول کریم ﷺ کی نسبت آپس میں کہتے تھے کہ یہ شخص نبی رسول کچھ نہیں، بس اتنی غرض ہے کہ ہمارے باپ داداوں کا طریقہ چھڑا کر (جس کو ہم قدیم سے حق جانتے چلے آئے ہیں) اپنے ڈھب پے لے آئے اور خود حاکم و متبوع بن کر بیٹھ جائے، گویا صرف حکومت و ریاست مطلوب ہے، (العیاذ باللہ)۔

فائدہ: ۲ یعنی قرآن کیا ہے (العیاذ باللہ) چند جھوٹی باتیں جو خدا کی طرف منسوب کردی گئی ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی یہ نبوت کا دعویٰ جس کے ساتھ چند معجزات و خوارق کی نمائش کی گئی ہے یا مذہب اسلام جس نے آخر میاں کو بیوی سے اور باپ کو بیٹے سے جدا کردیا ہے، یا قرآن جس کی تاثیر لوگوں کے دلوں پر غیر معمولی ہوتی ہے، صریح جادو کے سوا اور کچھ نہیں۔ (العیاذ باللہ)

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ﴿۴۴﴾ؕ

اور ہم نے دی نہیں ان کو کچھ کتابیں کہ جن کو وہ پڑھتے ہوں اور بھیجا نہیں ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا

خلاصہ تفسیر: اور (ان لوگوں کو تو قرآن کی اور نبی کی بڑی قدر کرنا چاہئے تھی، کیونکہ ان کے لئے تو یہ دونوں نعمت غیر مترقبہ ہیں اس سبب سے کہ) ہم نے (اس قرآن سے پہلے) ان کو (کبھی آسمانی) کتابیں نہیں دی تھیں کہ ان کو پڑھتے پڑھاتے ہوں (جیسے بنی اسرائیل کے پاس کتابیں تھیں تو ان کے حق میں تو قرآن بالکل ایک نئی چیز تھی، اس لئے اس کی قدر کرنا چاہئے تھی) اور (اسی طرح) ہم نے آپ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) نہیں بھیجا تھا (تو ان کے حق میں نبی کا آنا بھی ایک نئی دولت تھی، اس لئے ان کی بھی قدر کرنا چاہئے تھی، خصوصاً جبکہ نئی نعمت ہونے کے علاوہ پہلے سے خود ان کی تمنا بھی تھی کہ ان کے پاس کوئی نبی آئے تو یہ اس کا اتباع کریں جیسا اس آیت میں ہے: **واقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن جاءھم نذیر لیکونن اھدیٰ من احدی الامم**، مگر ان لوگوں نے پھر بھی قدر نہ کی، کما قال تعالیٰ: **فلما جاءھم نذیر ما زادھم الا نفوراً** الخ بلکہ جھٹلایا)۔

* * *

فائدہ: یعنی محض امی تھے نہ کوئی کتاب سماوی ان کے ہاتھ میں تھی، نہ اتنی مدت دراز سے کوئی نبی ان میں آیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ایسا عظیم الشان پیغمبر اور ایسی جلیل القدر کتاب مرحمت فرمائی، چاہیے کہ اسے غنیمت جانیں اور انعام الٰہی کی قدر کریں، خصوصاً جبکہ پہلے سے خود کہا بھی کرتے تھے کہ اگر ہم میں کوئی پیغمبر آیا، یا کوئی کتاب ہم پر اتاری جاتی تو اوروں سے بڑھ کر ہم فرمانبردار ہوتے، اب وہ چیز آئی تو لگے انکار و استکبار کرنے۔

یا یہ مطلب ہے کہ ہم نے ان کے پاس کوئی کتاب یا ہادی ایسا نہیں بھیجا جو آپ کی تعلیم کے خلاف تعلیم دیتا ہو، پھر کس دلیل نقلی یا عقلی کی بناء پر یہ لوگ آپ کی مخالفت کرتے ہیں؟

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي ۖ

اور جھٹلایا ہے ان سے اگلوں نے، اور یہ نہیں پہنچے دسویں حصہ کو اس کے جو ہم نے ان کو دیا تھا پھر جھٹلایا انہوں نے میرے بھیجے ہوؤں کو

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٥﴾ ع

تو کیسا ہوا انکار میرا

خلاصہ تفسیر: اور (یہ لوگ جھٹلا کر بے فکر نہ بیٹھیں، کیونکہ اس کا وبال بڑا سخت ہے، چنانچہ) ان سے پہلے جو (کافر) لوگ تھے انہوں نے (بھی انبیاء اور وحی کی) تکذیب کی تھی اور یہ (مشرکین عرب) تو اس سامان کے جو ہم نے ان کو دے رکھا تھا دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے (یعنی ان کی سی قوت، ان کی سی عمریں اور ان کی سی ثروت ان کو نہیں ملی جو کہ ناز و افتخار کا سامان ہوتے ہیں، کما قال تعالیٰ: **کانوا اشد منکم قوۃ و اکثر اموالاً و اولاداً**) غرض انہوں نے میرے رسول کی تکذیب کی، سو (دیکھو) میرا (ان پر) کیسا عذاب ہوا (سو یہ بیچارے تو کیا چیز ہیں کہ ان کے پاس تو اتنا سامان بھی نہیں جب اس قدر ثروت و دولت کام نہ آئی تو یہ کس دھوکہ میں ہیں، نیز جب ان کے پاس سامان کم ہے جو کہ غرور کا سبب ہوتا ہے، تو ان کا جرم بھی بہت شدید ہے، پھر یہ کیسے بچ جائیں گے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جیسی لمبی عمریں، جسمانی قوتیں، مال و دولت اور عیش و ترفہ ان کو دیا گیا، تمہیں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملا، جب انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب و مخالفت کی، دیکھ لو! کیا انجام ہوا، سب ساز و سامان دھرا رہ گیا، ایک منٹ بھی عذاب الٰہی کو روک نہ سکے، پھر تم اتنا کاہے پر اتراتے ہو؟ ''اس برتے پر یہ تتا پانی''۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۣ مَا بِصَاحِبِكُمْ

تو کہہ میں تو ایک ہی نصیحت کرتا ہوں تم کو، کہ اٹھ کھڑے ہو اللہ کے نام پر دو دو اور ایک ایک پھر دھیان کرو، کہ اس تمہارے رفیق کو

مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۝۴۶

کچھ سودا نہیں، یہ تو ایک ڈرانے والا ہے تم کو ایک بڑی آفت کے آنے سے

خلاصہ تفسیر: یہاں تک کفار کو انکار نبوت پر دھمکی تھی، اب آگے نبوت کی تصدیق کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ اے محمد ﷺ! آپ (ان سے) یہ کہئے کہ میں تم کو صرف ایک بات (مختصری) سمجھاتا ہوں (اس سے واضح ہوجائے گا بس اس کو کرلو) وہ یہ کہ تم (محض) خدا کے واسطے (کہ اس میں نفسانیت و تعصب نہ ہو) کھڑے (یعنی مستعد) ہوجاؤ (کسی موقع پر) دو دو اور (کسی موقع پر) ایک ایک (یعنی چونکہ مقصود غور و فکر ہے جیسا آگے آتا ہے، اور غور و فکر کا قاعدہ ہے کہ بعض اوقات اور بعض طبائع کے اعتبار سے دو کے ملنے سے ہر شخص کی فکر کو دوسرے سے تقویت ملتی ہے، اور بعض اوقات اور بعض طبائع کے اعتبار سے اکیلے خوب فکر میں جولانی ہوتی ہے، اور بہت زیادہ مجمع میں اکثر قوت فکر یہ مشوش ہوجاتی ہے، اسی لئے اسی پر اکتفا فرمایا، غرض اس طرح مستعد ہوجاؤ) پھر (خوب) سوچو (کہ جیسے دعوے میں کرتا ہوں مثلاً یہ کہ قرآن کا مماثل ممکن نہیں، جیسے کئی مکی سورتوں میں یہ مضمون ہے، تو ایسے دعوے دو ہی شخص کرسکتے ہیں یا تو وہ جس کے دماغ میں خلل ہو کہ انجام کی خبر نہ ہو، اور یا وہ جو کہ نبی ہو جس کو اس دعوی کی صداقت اور اللہ کی طرف سے ہونے پر پورا اعتماد ہو، ورنہ اگر نبی نہ ہو اور عاقل بھی ہو تو وہ ایسے دعوے کے وقت رسوائی کا اندیشہ کرے گا، اگر اس کا مماثل بنالائے گا تو میری کیا رہ جائے گی، اس تردید حاصر کے بعد میرے مجموعی احوال میں غور کرکے یہ سوچو کہ آیا مجھ کو جنون ہے یا نہیں، سو یہ امر مشاہدہ سے معلوم ہوجائے گا) کہ تمہارے اس ساتھی کو (جو ہر وقت تمہارے سامنے رہتا ہے اور جس کے تمام حالات تم مشاہدہ کیا کرتے ہو یعنی مجھ کو) جنون (تو) نہیں ہے (جب دو صورتوں میں سے ایک صورت باطل ہوگئی تو دوسری صورت متعین ہوگئی کہ) وہ (تمہارا ساتھی پیغمبر ہے اور بحیثیت پیغمبر ہی) تم کو ایک سخت عذاب آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے (پس اس طریق سے نبوت کا ثبوت اور اس کی تصدیق بہت آسان ہے، اور دوسری جگہ بھی اس کے قریب قریب مضمون ہے کما قال: ام لم یعرفوا رسولھم، الخ)۔

* * *

فائدہ: یعنی تعصب و عناد چھوڑ کر انصاف و اخلاص کے ساتھ اللہ کے نام پر اٹھ کھڑے ہو، اور کئی مل کر بحث و مشورہ کرلو اور الگ الگ تنہائی میں غور کرکے سوچو کہ یہ تمہارا رفیق محمد رسول اللہ (ﷺ) جو چالیس برس سے زیادہ تمہاری آنکھوں کے سامنے رہا، جس کے بچپن سے لے کر کہولت تک کے ذرہ ذرہ حالات تم نے دیکھے، جس کی امانت و دیانت، صدق و عفاف اور فہم و دانش کے تم برابر قائم رہے، کبھی کسی معاملہ میں نفسانیت یا غرض پرستی کا الزام تم نے اس پر نہیں رکھا، کیا تم واقعی گمان کرسکتے ہو کہ العیاذ باللہ اسے بیٹھے بٹھائے جنون ہوگیا ہے، جو خواہ مخواہ اس نے ایک طرف سے سب کو دشمن بنالیا، کیا کہیں دیوانے ایسی حکمت کی باتیں کیا کرتے ہیں؟ یا کوئی مجنون اپنی قوم کی اس قدر خیر خواہی اور ان کی اخروی فلاح اور دنیاوی ترقی کا اتنا زبردست لائحہ عمل پیش کرسکتا ہے؟ وہ تم کو سخت مہلک خطرناک اور تباہی انگیز مستقبل سے آگاہ کررہا ہے، قوموں کی تاریخیں سناتا ہے، دلائل و شواہد سے تمہارا بھلا برا سمجھتا ہے، یہ کام دیوانوں کے نہیں، ان اولوالعزم پیغمبروں کے ہوتے ہیں جنہیں احمقوں اور شریروں نے ہمیشہ دیوانہ کہا ہے۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۴۷

تو کہہ جو میں نے تم سے مانگا ہو کچھ بدلہ سو وہ تمہی رکھو، میرا بدلہ ہے اسی اللہ پر اور اس کے سامنے ہے ہر چیز

خلاصہ تفسیر: اثبات نبوت کے بعد اب آگے کفار کے اس شبہ کا جواب ہے کہ یہ رسول نہیں، بلکہ اپنی ریاست و اقتدار کے طالب

ہیں،فرماتے ہیں اے محمد ﷺ! :

آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں نے تم سے (اس تبلیغ پر) کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمہارا ہی رہا (یعنی تم اپنے ہی پاس رکھو، یہ محاورہ ہے اور مبالغہ کے طرز پر طلب اجرت کا انکار ہے) میرا معاوضہ تو بس (حسب وعدہ فضل) اللہ ہی کے ذمہ ہے اور وہی ہر چیز پر اطلاع رکھنے والا ہے (پس اللہ ہی میرے حال کے لائق مجھے اجر دے دیں گے)۔

معاوضہ میں مال اور جاہ یعنی ریاست سب آ گیا کیونکہ ان دونوں میں اجرت بننے کی صلاحیت ہے، مطلب یہ کہ میں تم سے کسی غرض کا طالب نہیں ہوں جو ریاست کا شبہ کیا جائے، رہا یہ معاملہ کہ میں لوگوں کے معاملات اور حالات کی اصلاح کرتا ہوں، مجرم کو سزا دیتا ہوں، باہمی جھگڑوں میں فیصلہ کرتا ہوں تو یہ موجب شبہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ اس میں میری کوئی غرض نہیں، چنانچہ آپ ﷺ کے طرز معاشرت اور معیشت سے صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں سے آپ نے کوئی ذاتی منفعت حاصل نہیں کی بلکہ خود قوم ہی کا نفع تھا کہ ان کے جان، مال، آبرو محفوظ رہتے تھے، باپ جو اپنے چھوٹے بچوں کی حفاظت اور ان کی تادیب محض خیر خواہی سے کرتا ہے اس کو خود غرضی اور طلب ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

❀ ❀ ❀

فائدہ: ۱ یعنی میں تم سے اپنی محنت کا کچھ صلہ نہیں چاہتا، اگر تمہارے خیال میں کچھ معاوضہ طلب کیا ہو وہ سب تم اپنے پاس رکھو، مجھے ضرورت نہیں، میرا صلہ تو خدا کے یہاں ہے، تم سے جو چیز طلب کرتا ہوں یعنی ایمان و اسلام، وہ صرف تمہارے نفع کی خاطر اس سے زائد میری کوئی غرض نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی میری سچائی اور نیت اللہ کے سامنے ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ ﴿۴۹﴾

تو کہہ میرا رب پھینک رہا ہے سچا دین اور وہ جانتا ہے چھپی چیزیں ۱ تو کہہ آیا دین سچا اور جھوٹ تو کسی چیز کو نہ پیدا کرے اور نہ پھیر کر لائے ۲

خلاصہ تفسیر: جب نبوت بھی ثابت ہو چکی اور اجرت کا شبہ بھی ختم ہو گیا تو اب فرماتے ہیں کہ اے محمد ﷺ! :

آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب حق بات کو (یعنی ایمان کو باطل یعنی کفر پر) غالب کر رہا ہے (گفتگو اور دلیل سے بھی، چنانچہ ابھی گذشتہ آیت میں دیکھا اور قتال کا بھی سامان کرنے والا ہے، غرض ہر طرح حق غالب ہے اور) وہ علام الغیوب ہے (اس کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ حق غالب ہو گا، دوسروں کو تو اب واقع ہونے کے بعد معلوم ہوا، اور اسی طرح اس کو معلوم ہے کہ آئندہ غلبہ بڑھے گا، چنانچہ فتح مکہ میں حضور ﷺ کا اگلی آیت کو پڑھنا قرینہ ہے کہ اس مضمون میں جو غلبہ کی خبر دی گئی ہے اس میں تلوار کے ذریعہ غلبہ بھی داخل ہے، چنانچہ گذشتہ مضمون کی زیادہ وضاحت کے لئے ارشاد ہے کہ اے محمد ﷺ!) آپ کہہ دیجئے کہ (دین) حق آ گیا اور (دین) باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا (یعنی محض گیا گزرا ہو گیا)۔

وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ: یعنی باطل نہ کرنے کا رہا، نہ دھرنے کا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہل باطل کو کبھی شان و شوکت اور قوت حاصل نہ ہوگی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے اس دین حق کے آنے سے پہلے کبھی باطل کے بارے میں حق ہونے کا شبہ ہو جایا کرتا تھا، اب باطل اس صفت کی حیثیت سے بالکل نیست و نابود ہو گیا، یعنی اس کا باطل ہونا خوب اچھی طرح ظاہر ہو گیا، اور ہمیشہ قرب قیامت تک یوں ہی ظاہر رہے گا۔

❀ ❀ ❀

فائدہ: ۱ یعنی اوپر سے وحی اتر رہی اور دین کی بارش ہو رہی ہے، موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو، اس سے فائدہ اٹھاؤ، جس زور سے اللہ تعالیٰ حق کو باطل کے سر پر پھینک کر مار رہا ہے، اس سے اندازہ کرو کہ باطل کہاں ٹھہر سکے گا، ضرور علام الغیوب نے خوب دیکھ بھال کر عین موقع پر حق کو باطل کا سر کچلنے کے لیے بھیجا ہے: **بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ** (الانبیاء:۱۸)

فائدہ: ۲ یعنی دین حق آ پہنچا، اب اس کا زور رکنے والا نہیں، سب پر غالب ہو کر اور باطل کو زیر کر کے رہے گا، جھوٹ کے پاؤں کہاں جو

حق کے سامنے چل سکے، وہ تو اب کرنے کا نہ دھرنے کا سمجھ لو آیا گیا ہوا، فتح مکہ کے دن یہ آیت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان پر تھی۔

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ ط

تو کہہ اگر میں بہکا ہوا ہوں تو بہکوں گا اپنے ہی نقصان کو اور اگر ہوں سیدھے راستہ پر تو اس سبب سے کہ وحی بھیجتا ہے مجھ کو میرا رب

اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ﴿۵۰﴾

بیشک وہ سب کچھ سنتا ہے نزدیک

خلاصہ تفسیر: حق بات کے ثابت اور واضح ہو جانے کے بعد اب نجات کا اس کی اتباع میں منحصر ہونا بیان فرماتے ہیں کہ:

(اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جب اس دین کا حق ہونا ثابت ہو گیا تو اس سے یہ بھی لازم آ گیا کہ) اگر (بالفرض) میں (اس حق کو چھوڑ کر) گمراہ ہو جاؤں تو میری گمراہی مجھ ہی پر وبال ہوگی (دوسروں کا کیا نقصان ہے) اور اگر میں (اس حق کا اتباع کر کے) راہ (راست) پر رہوں تو یہ بدولت اس قرآن (اور دین) کے ہے جس کو میرا رب میرے پاس بھیج رہا ہے (اصل مقصود مخاطبین یعنی دوسروں کو سنانا ہے کہ حق واضح ہو جانے کے باوجود اگر تم نے اس کا اتباع نہ کیا تو تم بھگتو گے، میرا کیا بگڑے گا، اور اگر راہ پر آ گئے تو یہ راہ پر آنا اسی دین کی بدولت ہوگا جو کہ وحی سے ثابت ہے، پس تم کو چاہئے کہ راہ راست پر آنے کے لئے اس دین کو اختیار کرو اور کسی کا گمراہ ہونا یا راہ پر آنا خالی نہ جائے گا کہ بے فکری کی گنجائش ہو، بلکہ ہر ایک کا حال اللہ کو معلوم ہے کیونکہ) وہ سب کچھ سنتا (اور) بہت نزدیک ہے (وہ ہر ایک کو اس کے مناسب جزا دے گا)۔

اگرچہ رسول سے ایسا ہونا محال ہے، لیکن مبالغہ کے لیے اس مضمون کو رسول پر رکھ کر بیان کیا گیا، پھر دوسرے تو کس شمار میں ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر میں نے یہ ڈھونگ خود کھڑا کیا ہے تو کون سے دن چلے گا؟ اس میں آخر میرا ہی نقصان ہے، دنیا کی عداوت مول لینا، ذلت اٹھانا اور آخرت کی رسوائی قبول کرنا (العیاذ باللہ) لیکن اگر میں سیدھے راستہ پر ہوں، جیسا کہ واقعی ہوں تو سمجھ لو کہ یہ سب اللہ کی تائید و امداد اور وحی الٰہی کی برکت و ہدایت سے ہے، جو کسی وقت میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی، میرا خدا سب کچھ سنتا ہے اور بالکل نزدیک ہے، وہ ہمیشہ میری مدد فرمائے گا اور اپنے پیغام کو دنیا میں روشن کرے گا، تم مانو یا نہ مانو۔

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ ﴿۵۱﴾ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰی لَهُمُ

اور کبھی تو دیکھے جب یہ گھبرائیں پھر نہ بچیں بھاگ کر اور پکڑے ہوئے آئیں نزدیک جگہ سے ۱ اور کہنے لگیں ہم نے اسکو یقین مان لیا اور اب کہاں

التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۵۲﴾ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَیَقْذِفُوْنَ بِالْغَیْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۵۳﴾

انکا ہاتھ پہنچ سکتا ہے بعید جگہ سے ۲ اور اس سے منکر رہے پہلے سے، اور پھینکتے رہے بن دیکھے نشانہ پر دور کی جگہ سے ۳

خلاصہ تفسیر: سورت میں مجموعی طور پر توحید، رسالت اور قیامت کا بیان تھا جن کو دیگر اجزاء کے ساتھ پیچھے "دین حق" سے تعبیر کیا تھا، اب آگے خاتمہ میں کفار کی سزا اور دائمی حسرت کا ذکر ہے جو کہ ان اصول کا انکار کرتے ہیں۔

اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) اگر آپ وہ وقت ملاحظہ کریں (تو آپ کو حیرت ہو) جب یہ کفار (قیامت کے ہول و ہیبت کی وجہ سے) گھبرائے پھریں گے پھر نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور پاس کے پاس ہی سے (یعنی فوراً) پکڑ لئے جائیں گے، اور (اس وقت) کہیں گے کہ ہم اس حق پر ایمان لے آئے (اور جتنی باتیں اس میں بتلائی گئی ہیں سب کو مان لیا، اس لئے ہماری توبہ قبول کر لیجئے، خواہ دوبارہ دنیا میں بھیج کر یا بغیر بھیجے ویسے ہی

معاف کر دیجیے، کما قال تعالیٰ: ربنا ابصرنا وسمعنا فارجعنا حق تعالیٰ فرماتے ہیں) اور اتنی دور جگہ سے (ایمان کا) ان کے ہاتھ آنا کہاں ممکن ہے (یعنی ایمان لانے کی جگہ دار العمل ہونے کی وجہ سے دنیا تھی جو بڑی دور ہوگئی، اب آخرت کا عالم ہے جو دار العمل نہیں دار الجزاء ہے، اس میں ایمان مقبول نہیں) حالانکہ پہلے سے (دنیا میں) یہ لوگ اس حق کا انکار کرتے رہے اور (ان کا انکار بھی ایسا تھا جس کا کوئی صحیح منشاء نہ تھا بلکہ) بے تحقیق باتیں دور ہی دور سے ہانکا کرتے تھے (دور سے ہانکنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تحقیق سے دور تھے، یعنی دنیا میں تو کفر کرتے رہے، اب ایمان سوجھا ہے، اور اس کے قبول ہونے کی آرزو ہے)۔

وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ: دنیا کی طرف دوبارہ لوٹنا شرعاً محال ہے، اور اب آخرت میں جو ایمان ہوگا وہ معائنہ ومشاہدہ کے بعد ہے، وہ ایمان بالغیب نہیں، اور مشاہدہ کے بعد کسی چیز کا اقرار کرنا تو طبعی بات ہے، اس میں تسلیم اور اطاعت حکم کا کوئی پہلو نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی یہ کفار یہاں ڈینگیں مارتے ہیں مگر وہ وقت عجیب قابل دید ہوگا جب یہ لوگ محشر کا ہولناک منظر دیکھ کر گھبرائیں گے اور کہیں بھاگ نہ سکیں گے، اس وقت گرفتاری کیلئے کہیں دور سے ان کو تلاش کرنا نہ پڑے گا، بلکہ نہایت آسانی سے فوراً جہاں کے تہاں گرفتار کر لیے جائیں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی اس وقت کہیں گے کہ ہمیں پیغمبر کی باتوں پر یقین آ گیا، اب ہم ایمان لاتے ہیں، حالانکہ اب ایمان کیسا؟ وہ موقع دور گیا جب ایمان لا کر اپنے کو بچا سکتے تھے، اب ان کا ہاتھ اتنی دور کہاں پہنچ سکتا ہے جو وہاں سے ایمان کو اٹھا لائیں، مطلب یہ کہ ایمان مقبول ومنجی وہ ہے جو موت سے پہلے اس دنیا میں حاصل ہو، آخرت میں تو آنکھوں سے دیکھ کر سب ہی کو یقین آ جائے گا، اس میں کیا کمال ہوا!۔

فائدہ: ۳ یعنی پہلے جب ایمان لانے کا وقت تھا انکار پر تلے رہے اور یوں ہی اٹکل کے تیر چلاتے رہے، دنیا میں رہ کر ہمیشہ بے تحقیق باتیں کیں، سچی اور تحقیقی باتوں کو قبول نہ کیا، اب پچھتانے سے کیا حاصل؟

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ط

اور رکاوٹ پڑ گئی ان میں اور ان کی آرزو میں ۱ جیسا کہ کیا گیا ہے ان کے طریقہ والوں کے ساتھ اس سے پہلے

اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۝۵۴ ع

وہ لوگ تھے ایسے تردد میں جو چین نہ لینے دے ۲

خلاصہ تفسیر: اور (چونکہ آخرت دار العمل نہیں ہے اس لئے) ان میں اور ان کے (قبول ایمان کی) آرزو میں ایک آڑ کر دی جائے گی (یعنی ان کی آرزو پوری نہ ہوگی، کیونکہ آخرت ایمان لانے اور عمل کرنے کی جگہ نہیں) جیسا کہ ان کے ہم مشربوں کے ساتھ (بھی) یہی (برتاؤ) کیا جائے گا جو ان سے پہلے (کفر کر چکے) تھے (یعنی ان کا ایمان بھی آخرت میں مقبول نہ ہوگا، اور دونوں کے ساتھ ایک معاملہ کرنے کی یہ وجہ ہے کہ عمل بھی دونوں کا یکساں ہے، کیونکہ) یہ سب بڑے شک میں تھے جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا تھا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ: یہاں شک اور تردد یقین کے مقابل ہے جو کہ پختہ انکار کو بھی شامل ہے، کیونکہ کفار کو تو شک نہ تھا، وہ تو بڑی پختگی سے انکار کرتے تھے اور لفظ "شک" سے تعبیر کرنے میں یہ نکتہ ہو سکتا ہے کہ اگر حق میں شک بھی ہو تب بھی مہلک ہے، چہ جائیکہ پختہ انکار ہو، یا یوں کہا جائے کہ حق جب بار بار کان میں پہنچتا ہے تو طبعی طور پر کچھ نہ کچھ احتمال جانب مخالف کا اکثر ہو ہی جاتا ہے، پس شک اور تردد دونوں اپنے معنی پر رہیں گے، مگر چونکہ حق کا یقین حاصل نہ ہوا تھا اس لیے باطل کا احتمال سے اکھڑ جانا مقبول نہ ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس چیز کی آرزو رکھتے ہیں، مثلاً ایمان مقبول یا نجات، یا دنیا کی طرف واپس جانا، یا دنیاوی لذتیں اور عیش و آرام، ان چیزوں کے اور ان کفار کے درمیان سخت روک قائم کردی گئی، کبھی ان تک نہیں پہنچ سکتے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی پہلے جو اسی قماش کے لوگ گزرے ہیں، جیسا معاملہ ان سے کیا گیا تھا ان سے بھی ہوا، کیونکہ وہ لوگ بھی ایسے ہی مہمل شبہات اور بیجا شک و تردد میں گھرے ہوئے تھے جو کسی طرح ان کو چین نہ لینے دیتا تھا۔

ایاتہا ۴۵ ۳۵ سُورَۃُ فَاطِرٍ مَّکِّیَّۃٌ ۴۳ رکوعاتہا ۵

خلاصہ تفسیر: اس سورت کا زیادہ حصہ توحید کا اثبات، شرک کا ابطال اور منکرین توحید اور منکرین قیامت کی تہدید اور توبیخ میں ہے، بعض آیات میں آنحضرت ﷺ کی تسلی کا ذکر ہے جو آپ ﷺ کو کفار کی تکذیب سے رنج و غم ہوتا تھا، بعض آیات میں جزاء اور سزا اور ایمان اور عمل صالح کی عزت اور کفر اور اعمال سیئہ کی ذلت اور خواری کا بیان ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَثُلٰثَ

سب خوبی اللہ کو ہے جس نے بنا نکالے آسمان اور زمین ۱؎ جس نے ٹھہرایا فرشتوں کو پیغام لانے والے ۲؎ جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین

وَرُبٰعَ ؕ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ①

اور چار چار ۳؎ بڑھا دیتا ہے پیدائش میں جو چاہے بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے ۴؎

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے اختتام پر توحید کے انکار کا وبال مذکور تھا، یہ سورت توحید کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔

تمام ترحمد (وثناء اسی) اللہ کو لائق ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، جو فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے، جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار پر دار بازو ہیں (پیغام سے مراد انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی لانا ہے خواہ وہ احکام شرعیہ ہوں یا محض بشارات وغیرہ، اور بازوؤں کی تعداد کچھ چار چار ہی میں منحصر نہیں بلکہ) وہ پیدائش میں جو چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے (یہاں تک کہ بعض فرشتوں کے چھ سو بازو پیدا کیے ہیں جیسا کہ حدیث میں حضرت جبرئیل کے متعلق آیا ہے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا: شاید فرشتوں کی رسالت کے ذکر میں یہ حکمت ہو کہ بعض ان کو بھی معبود قرار دیتے تھے، پس اس میں ان کا محکوم اور مامور ہونا بتلا دیا تا کہ ان کی الوہیت اور خدائی کا ابطال ہو جائے، فرشتوں کے معنی رسالت کی تفصیل سورہ حج آیت ۷۵ کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَثُلٰثَ: یعنی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پروالے بازو عطا فرمائے ہیں جن سے وہ اڑ سکتے ہیں، اور لفظ مثنی و ثلاث ورباع ظاہر یہ ہے کہ اجنحۃ کی صفت ہے کہ فرشتوں کے پر مختلف تعداد پر مشتمل ہیں، بعض کے صرف دو دو پر ہیں، بعض کے تین تین، بعض کے چار چار اور اس میں کوئی حصر نہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ مثنی و ثلث رسلا کی صفت ہو یعنی یہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالات دنیا میں پہنچاتے ہیں، کبھی دو دو آتے ہیں، کبھی تین تین، یا چار چار اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی چار کا عدد حصر کے لئے نہیں، محض تمثیل کے طور پر ہے، کیونکہ اس سے بہت زیادہ مقدار میں فرشتوں کا نزول خود قرآن کریم سے ثابت ہے۔

***

فائدہ: ۱ یعنی آسمان وزمین کو ابتداء عدم سے نکال کر وجود میں لایا، پہلے سے کوئی نمونہ اور تخلیق کا قانون موجود نہ تھا۔

فائدہ: ۲ یعنی بعض فرشتے انبیاء کے پاس اللہ کا پیغام لاتے ہیں اور بعض دوسرے جسمانی وروحانی نظام کی تدبیر وتشکیل پر مامور ہیں: فالمدبرات امرا۔

فائدہ: ۳ یعنی بعض فرشتوں کے دوبازو (یادوپر) بعض کے تین بعض کے چار ہیں، ان بازوؤں اور پروں کی کیفیت کو اللہ ہی جانتا ہے، یا جس نے دیکھے ہوں وہ کچھ بتلا سکیں۔

فائدہ: ۴ یعنی اللہ تعالیٰ جس مخلوق میں جو عضو اور جو صفت چاہے اپنی حکمت کے موافق بڑھادے، فرشتوں کے دو، تین، چار بازو (یا پر) اسی نے بنائے، چاہے تو بعض فرشتوں کے چار سے زیادہ بنادے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت جبرائیل کے چھ سو بازو (یا پر) ہیں۔

اور جاعل الملائکۃ رسلا سے یہ مت سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کچھ ان وسائط کا محتاج ہے، ہرگز نہیں! وہ بذات خود ہر چیز پر قادر ہے، محض حکمت کی بناء پر یہ اسباب ووسائط کا سلسلہ قائم کیا ہے۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ ؕ

جو کچھ کہ کھول دے اللہ لوگوں پر رحمت میں سے تو کوئی نہیں اس کو روکنے والا ۱ اور جو کچھ روک رکھے تو کوئی نہیں اس کو بھیجنے والا اس کے سوا

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ②

اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا ۲

خلاصہ تفسیر: (اور اللہ قادر بھی ایسا کہ کوئی اس کی مزاحمت اور مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا کہ وہ) اللہ جو رحمت لوگوں کے لئے کھول دے (مثلاً بارش، نباتات اور عام رزق کے دروازے) تو اس کا کوئی بند کرنے والا نہیں اور جس کو بند کردے تو اس کے (بند کرنے کے) بعد اس کا کوئی جاری کرنے والا نہیں (البتہ وہی پھر بند کرسکتا ہے اور وہی کھول سکتا ہے) اور وہی غالب (یعنی قادر اور) حکمت والا ہے (یعنی کھولنے اور بند کرنے پر قادر بھی ہے اور ان میں سے جس صورت کو وہ اختیار کرتا ہے اس میں حکمت ہوتی ہے)۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱ رحمت جسمانی ہو، مثلاً بارش، روزی وغیرہ، یا روحانی جیسے انزال کتب وارسال رسل۔ غرض اللہ جب لوگوں پر اپنی رحمت کا دروازہ کھولے، کون ہے جو بند کرسکے۔

فائدہ: ۲ یعنی اپنی حکمت بالغہ کے موافق جو کچھ کرنا چاہے فوراً کر گزرے، ایسا زبردست ہے جسے کوئی نہیں روک سکتا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ

اے لوگوں یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر، کیا کوئی ہے بنانے والا اللہ کے سوا روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے

وَالْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ③

اور زمین سے، کوئی حاکم نہیں مگر وہ، پھر کہاں الٹے جاتے ہو

خلاصہ تفسیر: اے لوگو! (جیسے اس کی قدرت کامل ہے اسی طرح اس کی نعمت بھی کامل ہے، اس کی نعمتوں کی کوئی شمار نہیں، اس لئے) تم پر جو اللہ کے احسانات ہیں ان کو یاد کرو (اور ان کا شکر یہ ادا کرو اور وہ شکر یہ ہے کہ توحید اختیار کرو شرک چھوڑو، کم ازکم اس کی دو بڑی نعمتوں میں

غور کرو، ایک نعمت ایجاد یعنی پیدا کرنے کی نعمت، دوسرے باقی اور قائم رکھنے کی نعمت) کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق ہے جو تم کو آسمان وزمین سے رزق پہنچاتا ہو (یعنی اس کے سوا نہ کوئی تخلیق وایجاد کرسکتا ہے، اور نہ کوئی ایجاد کردہ کو باقی اور قائم رکھنے کے لئے رزق پہنچانے کا کام کرسکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ ہر طرح کامل ہے تو یقیناً) اس کے سوا کوئی لائق عبادت (بھی) نہیں تو (جب معبود ہونا اسی کا حق ہے تو) تم (شرک کرکے) کہاں الٹے جا رہے ہو۔

* * *

فائدہ: یعنی مانتے ہو کہ پیدا کرنا اور روزی کے سامان بہم پہنچا کر زندہ رکھنا، سب اللہ کے قبضہ اور اختیار میں ہے، پھر معبودیت کا استحقاق کسی دوسرے کو کدھر سے ہوگیا، جو خالق ورزاق حقیقی ہے، وہ ہی معبود ہونا چاہیے۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ④

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو جھٹلائے گئے رسول تجھ سے پہلے، اور اللہ تک پہنچتے ہیں سب کام

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا ذکر تھا، چونکہ کفار اس کا انکار کرتے تھے جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غم بھی ہوتا تھا تو اب انکار پر دھمکی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حزن وملال پر تسلی کا مضمون ہے، اور درمیان میں مقابلہ کے طور پر مؤمنین کے لیے بشارت ہے۔

اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) اگر یہ لوگ (توحید ورسالت وغیرہ کے بارہ میں) آپ کو جھٹلائیں تو (آپ غم نہ کریں، کیونکہ) آپ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر جھٹلائے جاچکے ہیں (ایک تو اس سے تسلی حاصل کیجئے کہ یہ معاملہ میرے ساتھ انوکھا نہیں) اور (دوسری تسلی کی بات یہ کہ) سب امور اللہ ہی کے روبرو پیش کئے جائیں گے (وہ خود سب سے سمجھ لے گا، آپ کیوں فکر میں پڑے)۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ: روح المعانی میں ہے کہ اس آیت میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی وہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارثین اور نائبوں کے لیے بھی اس میں تسلی ہے کہ وہ بھی مخالف دشمن کی ایذا، تکذیب اور انکار پر صبر کریں۔

* * *

فائدہ: یعنی اس قدر سمجھانے اور حجت تمام کرنے کے بعد یہ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جھٹلائیں تو غم نہ کیجئے، انبیاء سابقین کے ساتھ بھی یہ ہی برتاؤ ہوا ہے، کوئی انوکھی بات نہیں، متعصب اور ضدی لوگ کبھی اپنی ہٹ سے باز نہیں آئے، ایسوں کا معاملہ خدا کے حوالہ کیجئے، وہیں پہنچ کر سب باتوں کا فیصلہ ہوجائے گا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۥ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ⑤

اے لوگوں بیشک اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے سو نہ بہکائے تم کو دنیا کی زندگانی اور نہ دغا دے تم کو اللہ کے نام سے وہ دغا باز

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑥ۭ

تحقیق شیطان تمہارا دشمن ہے سو تم بھی سمجھ رکھو اس کو دشمن، وہ تو بلاتا ہے اپنے گروہ کو اسی واسطے کہ ہوں دوزخ والوں میں ۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ڛ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑦ ع

جو منکر ہوئے ان کو سخت عذاب ہے، اور جو یقین لائے اور کئے بھلے کام ان کے لیے ہے معافی اور بڑا ثواب

خلاصہ تفسیر: چونکہ گذشتہ آیت کے اخیر میں قیامت کی خبر تھی اس لیے اب آگے عام لوگوں کو خطاب ہے کہ:

اے لوگو! (قیامت کی خبر کو سن کر تعجب مت کرنا) اللہ تعالیٰ کا (یہ) وعدہ ضرور سچا ہے، سو ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکہ میں ڈالے رکھے (کہ اس میں منہمک ہو کر اس خاص دن سے غافل رہو) اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں ڈال دے (کہ تم اس کے اس بہکانے میں آجاؤ کہ اللہ تعالیٰ تم کو عذاب نہ دے گا جیسا کہ کفار کہا کرتے تھے: ولئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنی، کہ اگر بالفرض قیامت آئی بھی تب بھی ہم آرام میں ہی رہیں گے، اور) یہ شیطان (جس کے دھوکہ کا اوپر ذکر ہے) بیشک تمہارا دشمن ہے سو تم اس کو (اپنا) دشمن (ہی) سمجھتے رہو وہ تو اپنے گروہ کو (یعنی اپنے تبعین کو) محض اس لئے (باطل کی طرف) بلاتا ہے تا کہ وہ لوگ دوزخیوں میں سے ہو جائیں (پس) جو لوگ کافر ہو گئے (اور شیطان کے بہکاوے میں آکر دھوکہ میں پھنس گئے) ان کے لئے سخت عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے (اور شیطان کے کہنے میں نہیں آئے، نہ اس کے دھوکے میں پھنسے) ان کے لئے (معاصی کی) بخشش اور (ایمان وعمل صالح پر) بڑا اجر ہے۔

***

فائدہ: ۱ یعنی قیامت آنی ہے اور یقیناً سب کو اللہ تعالیٰ کی بڑی عدالت میں حاضر ہونا ہے، اس دنیا کی ٹیپ ٹاپ اور فانی عیش و بہار پر نہ پھولو اور اس مشہور دغا باز شیطان کے دھوکہ میں مت آؤ، وہ تمہارا ازلی دشمن ہے، کبھی اچھا مشورہ نہ دے گا، یہ ہی کوشش کرے گا کہ اپنے ساتھ تم کو بھی دوزخ میں پہنچا کر چھوڑے، طرح طرح کی باتیں بنا کر خدا اور آخرت کی طرف سے غافل کرتا رہے گا، چاہیے کہ تم دشمن کو دشمن سمجھو اس کی بات نہ مانو، اس پر ثابت کر دو کہ ہم تیری مکاری کے جال میں پھنسنے والے نہیں، خوب سمجھتے ہیں کہ تو دوستی کے لباس میں بھی دشمنی کرتا ہے۔

اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۖ

بھلا ایک شخص کہ بھلی سجھائی گئی اسکو اسکے کام کی برائی پھر دیکھا اس نے اسکو بھلا، کیونکہ اللہ بھٹکاتا ہے جس کو چاہے اور سجھاتا ہے جس کو چاہے

فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَیۡهِمۡ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ ﴿۸﴾

سو تیرا جی نہ جاتا رہے ان پر پچتا پچتا کر، اللہ کو معلوم ہے جو کچھ کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: آگے حضور ﷺ کو تسلی ہے کہ جب یہ کفار شیطان کے دھوکہ میں آگئے اور اس کے بہکانے سے بری باتوں کو اچھا سمجھتے ہیں کہ نیک و بد میں تمیز ہی نہیں کرتے تو ایسی حالت میں ہدایت کرنے والے کو ان سے مایوس ہو کر غم نہیں کرنا چاہیے۔

(جب کافر کا انجام شدید عذاب اور مؤمن کا انجام مغفرت و اجر کبیر ہے) تو کیا (دونوں مساوی ہو سکتے ہیں، یعنی) ایسا شخص جس کو اس کا عمل بد اچھا کر کے دکھلایا گیا، پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگا (اور ایسا شخص جو برے کو برا سمجھتا ہے کہیں برابر ہو سکتے ہیں؟ پہلے شخص سے مراد کافر ہے جو شیطان کے گمراہ کرنے سے باطل کو حق اور نقصان دہ چیز کو مفید سمجھتا ہے، اور دوسرے شخص سے مراد مومن ہے جو اتباع انبیاء و مخالفت شیطان سے باطل کو باطل، حق کو حق، نقصان کو نقصان، نافع کو نافع جانتا ہے، یعنی دونوں برابر کہاں ہوئے، بلکہ ایک جہنمی اور دوسرا جنتی ہے، پس شیطان کے دھوکہ میں آنے والے اور اس کو دشمن سمجھنے والوں میں یہ فرق ہے، اس لئے ہم کہتے ہیں: لا یغرنکم اور ان الشیطن لکم عدو اور اگر اس پر تعجب ہو کہ عقل مند آدمی برے کو اچھا اور نیک کیسے سمجھ لیتا ہے) سو (اس کی وجہ یہ ہی کہ) اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے (اس کی عقل الٹی ہو جاتی) اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے (اس کی سمجھ اور ادراک صحیح رہتا ہے، پھر جب ہدایت و گمراہی کا اصل مدار مشیت پر ہے) تو ان پر افسوس کر کے کہیں آپ کی جان نہ جاتی رہے (یعنی کچھ افسوس نہ کیجئے صبر سے بیٹھے رہیں) اللہ تعالیٰ کو ان کے کاموں کی خبر ہے (وقت پر ان سے سمجھ لے گا)۔

فَلَا تَذۡهَبۡ نَفۡسُكَ عَلَیۡهِمۡ حَسَرٰتٍ: اس میں اعراض کرنے والوں پر زیادہ غم کرنے سے ممانعت ہے۔

***

فائدہ: یعنی شیطان نے جس کی نگاہ میں برے کام کو بھلا کر دکھایا، کیا وہ شخص اس کے برابر ہوسکتا ہے جو خدا کے فضل سے بھلے برے کی تمیز رکھتا ہے، نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی سمجھتا ہے، جب دونوں برابر نہیں ہوسکتے تو انجام دونوں کا یکساں کیونکر ہوسکتا ہے اور یہ خیال نہ کرو کہ کوئی آدمی دیکھتی آنکھوں برائی کو بھلائی کیونکر سمجھ لے گا، اللہ جس کو سوء استعداد اور سوء اختیار کی بناء پر بھٹکانا چاہے، اس کی عقل اسی طرح اوندھی ہوجاتی ہے اور جس کو حسن استعداد اور حسن اختیار کی وجہ سے ہدایت پر لانا چاہے، تب کسی شیطان کی طاقت نہیں جو اسے غلط راستے پر ڈال سکے، یا الٹی بات سمجھادے، بہر حال جو شخص شیطانی اغواء سے برائی کو بھلائی، بدی کو نیکی اور زہر کو تریاق سمجھ لے، کیا اس کے سیدھے راستہ پر آنے کی کچھ توقع ہوسکتی ہے؟ جب نہیں ہوسکتی اور سلسلہ ہدایت وضلالت کا سب اللہ کی مشیت وحکمت کا تابع ہے تو آپ ان معاندین کے غم میں اپنے کو کیوں گھلاتے ہیں، اس حسرت میں کہ یہ بدبخت اپنے فائدہ کی بات کو کیوں قبول نہیں کرتے؟ کیا آپ اپنی جان دے بیٹھیں گے! آپ ان کا قصہ ایک طرف کیجئے، اللہ ان کی سب کرتوت جانتا ہے، وہ خود ان کا بھگتان کردے گا، آپ دلگیر وغمگین نہ ہوں۔

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ

اور اللہ ہے جس نے چلائی ہیں ہوائیں پھر وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پھر ہانک لے گئے ہم اسکو مردہ دیس کی طرف پھر زندہ کر دیا ہم نے اس سے زمین کو

بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ⑨

اس کے مرجانے کے بعد اسی طرح ہوگا جی اٹھنا

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں توحید کا مضمون تھا، اب رکوع کے اختتام تک پھر وہی مضمون ہے اور درمیان میں بعض دیگر مضامین اسی کی مناسبت سے آگئے ہیں۔

اور اللہ ایسا (قادر) ہے جو (بارش سے پہلے) ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ (ہوائیں) بادلوں کو اٹھاتی ہیں (جس کی کیفیت سورۃ روم کے رکوع کی پانچویں آیت: اللہ الذی یرسل الریاح کی تفسیر میں گذری ہے) پھر ہم اس بادل کو خشک قطعہ زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں (جن سے وہاں بارش ہوتی ہے) پھر ہم اس کے ذریعہ سے (یعنی اس بادل کے پانی کے ذریعہ سے) زمین کو (نباتات سے) زندہ کرتے ہیں اس کے خشک ہونے کے بعد (اور جس طرح خشک زمین کو پانی سے اس کے مناسب حیات یعنی تروتازگی عطا فرمائی) اسی طرح (قیامت میں مُردوں کا) جی اٹھنا ہے (کہ ان کے مناسب حیات ان کو عطا ہوگی کہ ان میں جان پڑجائے گی، وجہ تشبیہ ظاہر ہے کہ دونوں میں ایک زائل شدہ صفت کا احداث واعادہ ہے، اگرچہ زمین میں صرف ایک امر عرضی یعنی نشوونما کا تعلق ہوا ہے اور اعضاء میں ایک امر جوہری یعنی روح کا، یہ حشر ونشر کا مضمون دلائل توحید کے ضمن میں تبعاً آگیا ہے)۔

* * *

فائدہ: اللہ کے حکم سے ہوائیں بادلوں کو اٹھالاتی ہیں اور جس ملک کا رقبہ مردہ پڑا تھا، یعنی کھیتی وسبزہ کچھ نہ تھا، چاروں طرف خاک اڑ رہی تھی، بارش کے پانی سے اس میں جان پڑجاتی ہے، اسی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تم کو بھی مرے پیچھے جلا کر کھڑا کردے گا، روایات میں ہے کہ جب اللہ مردوں کو زندہ کرنا چاہے گا، عرش کے نیچے سے ایک (خاص قسم کی) بارش ہوگی جس کا پانی پڑتے ہی مردے اس طرح جی اٹھیں گے، جیسے ظاہری بارش ہونے پر دانہ زمین سے اگ آتا ہے، مزید تفصیل روایات میں دیکھنی چاہیے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ

جس کو چاہیے عزت تو اللہ کے لیے ہے ساری عزت ؎۱ اس کی طرف چڑھتا ہے کلام ستھرا ؎۲ اور کام نیک

يَرْفَعُهُ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ⑩

اس کو اٹھا لیتا ہے اور جو لوگ داؤ میں ہیں برائیوں کے ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا داؤ ہے ٹوٹنے کا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں زمین کے زندہ کرنے کی مناسبت سے قیامت میں زندہ ہونے کا بیان ہوا، اسی مناسبت سے اب آگے ایک دوسرا مضمون ارشاد فرماتے ہیں وہ یہ کہ جب قیامت میں زندہ ہونا ہے تو وہاں کی ذلت وخواری سے بچنے کی فکر کرنا ضروری ہے، اور مشرکین نے شیطان کے فریب میں آ کر اپنے خودساختہ معبودوں کو حصول عزت کا ذریعہ قرار دے رکھا تھا، وہ کہتے تھے: ھوءلآء شفعاؤنا عند اللہ یعنی یہ ہمارے ہر حال میں سفارش کرنے والے ہیں دنیاوی حوائج میں بھی اور اگر قیامت کوئی چیز ہے تو آخرت کی نجات کے لئے بھی، جیسا حق تعالیٰ نے سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا ہے: واتخذوا من دون اللہ آلھۃ لیکونوا لھم عزا آگے اس کے متعلق ارشاد ہے کہ:

جو شخص (آخرت میں) عزت حاصل کرنا چاہے (اور یہ چاہنا اس لئے ضروری بھی ہے کہ آخرت کا واقع ہونا یقینی بات ہے) تو (اس کو چاہئے کہ اللہ سے عزت حاصل کرے کیونکہ) تمام تر عزت (ذاتی طور پر صرف) خدا ہی کے لئے (حاصل) ہے (اور دوسرے کے لئے جب بھی ہوگی خدا ہی کے واسطہ سے ہوگی، پس اس میں سب خدا ہی کے محتاج ہیں، اور خدا سے اس کا حاصل کرنا اس طرح ہے کہ اقوال واعمال میں اسی کی اطاعت وفرمان برداری اختیار کرے کہ خدا کے نزدیک پہنچنے میں یہی باتیں پسندیدہ ہیں، چنانچہ) اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے (یعنی وہ اس کو قبول کرتا ہے، اچھے کلام میں کلمہ توحید اور ذکر الٰہی وغیرہ داخل ہیں) اور اچھا کام اس کو پہنچاتا ہے (اچھے کام میں ایمان اور تمام ظاہری وباطنی اچھے اعمال داخل ہیں، پس جب یہ چیزیں عند اللہ پسندیدہ ہیں تو جو شخص اس کو اختیار کرے گا وہ معزز ہوگا) اور جو لوگ (اس کے خلاف طریقہ اختیار کر کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں کہ وہ اللہ ہی کی مخالفت ہے اور آپ کے ساتھ) بری بری تدبیریں کر رہے ہیں ان کو سخت عذاب ہوگا (جو ان کی ذلت کا سبب ہوگا، اور ان کے خودساختہ خیالی معبود اس ذلت سے بچا کر ان کو خاک عزت نہ دے سکیں گے، بلکہ وہ الٹے ان کے خلاف ہو جائیں گے، کما قال تعالیٰ فی سورۃ مریم: سیکفرون بعبادتھم ویکونون علیھم ضدا، یہ خسارہ تو ان کا آخرت میں ہوگا) اور (دنیا میں بھی ان کو یہ نقصان ہوگا کہ) ان لوگوں کا یہ مکر نیست ونابود ہو جائے گا (یعنی ان تدبیروں میں ان کو کامیابی نہ ہوگی، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہ اسلام کو مٹانا چاہتے تھے خود ہی مٹ گئے، یہ درمیانی مضمون بطور جملہ معترضہ کے تمام ہوا)۔

فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا: اس کے خلاصہ تفسیر میں ''ذاتی طور پر'' کی قید ظاہر کر دینے سے یہ آیت اس آیت کے منافی نہ ہوگی: وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین جیسا کہ ظاہر ہے۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ: مطلب یہ کہ اچھے کاموں کے ذریعہ سے اچھی باتوں کا مقبول ہوتی ہیں، یعنی کلمہ توحید اور تمام اذکار کے مقبول بنانے کا ذریعہ عمل صالح ہے، اور مقبولیت عام ہے نفس قبولیت اور مکمل قبولیت دونوں کو، اور اس اجمال کو دوسرے دلائل شرعیہ نے اس طرح مفصل کر دیا کہ ایمان تو کلمہ طیب یعنی اچھی باتوں کے نفس قبول ہونے کے لیے ہر حال میں شرط ہے، ایمان کے بغیر کوئی بات کسی درجہ میں قبول نہیں ہو سکتی، اور دوسرے نیک کام یعنی اعمال صالحہ، اچھی باتوں یعنی کلمہ طیب کے لیے بدرجہ کمال مقبول کی شرط ہیں نہ کہ نفس قبول کی، کیونکہ فاسق اگر کوئی اچھی بات یعنی کلمہ طیب کہے تو وہ بھی قبول تو ہو جاتا ہے اگرچہ مکمل قبولیت نہیں ہوتی۔

وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ: اس کی ترکیب نحوی میں چند احتمال ہیں، ہر احتمال کے اعتبار سے جملے کے معنی الگ ہو جاتے ہیں، ائمہ تفسیر نے ان احتمالوں کے مطابق تفسیر اپنی اپنی صواب دید کے مطابق کی ہے: ① پہلا احتمال تو وہی ہے جس کے مطابق خلاصہ تفسیر میں ترجمہ کیا گیا ہے کہ یرفعہ کی ضمیر فاعل العمل الصالح کی طرف راجع ہو، اور ضمیر مفعول الکلم الطیب کی طرف، اور معنی یہ ہوں کہ کلم طیب اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتے ہیں مگر ان کے چڑھانے کا ذریعہ عمل صالح ہوتا ہے، جمہور ائمہ تفسیر وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور اللہ کی طرف چڑھنے اور چڑھانے سے مراد اللہ کے نزدیک

مقبول ہونا ہے، اس لئے خلاصہ اس جملے کا یہ ہوگا کہ کلم طیب خواہ کلمہ توحید ہو یا دوسرے اذکار تسبیح وتحمید وغیرہ ان میں سے کوئی چیز بغیر عمل صالح کے عنداللہ مقبول نہیں ہوتی، اس میں عمل صالح کا اہم جز، تصدیق قلبی ہے یعنی دل سے اللہ پر اور اس کی توحید پر ایمان لانا، یہ تو مطلقاً قبولیت اعمال کی شرط لازم ہے، اس کے بغیر نہ کلمہ لا الہ الا اللہ مقبول ہے نہ کوئی دوسرا ذکر، اور عمل صالح کے دوسرے اجزاء نماز، روزہ وغیرہ اعمال صالحہ اور محرمات ومکروہات سے پرہیز ہے، یہ اگر چہ مطلقاً قبولیت کی شرط نہیں، مگر قبولیت نامہ کی شرط یہ اعمال بھی ہیں، تو اگر ایک شخص دل میں ایمان وتصدیق ہی نہیں رکھتا تو وہ کتنا بھی زبان سے کلمہ توحید پڑھے اور تسبیح وتحمید کرے اللہ کے نزدیک اس کو کوئی حصہ قبولیت کا حاصل نہ ہوگا اور جو تصدیق وایمان تو رکھتا ہے مگر دوسرے اعمال صالحہ نہیں کرتا یا ان میں کوتاہی کرتا ہے اس کا ذکر اللہ اور کلمہ توحید بالکل ضائع تو نہیں ہوگا صرف اتنا کام دے گا کہ ہمیشہ کے عذاب سے اس کو نجات مل جائے گی، مگر مکمل قبولیت اس کو حاصل نہیں ہوگی جس کا یہ اثر ہوگا کہ بقدر اپنے ترک عمل کے اور کوتاہی کے عذاب بھگتے گا۔

④ اور بعض مفسرین نے اس جملہ کی ترکیب نحوی یہ قرار دی ہے کہ یرفعہٗ کی ضمیر فاعل الکلم الطیب کی طرف اور ضمیر مفعول العمل الصالح کی طرف راجع ہے، اس صورت میں معنی جملہ کے پہلے سے بالکل مختلف یہ ہو گئے کہ کلم طیب یعنی ذکر اللہ عمل صالح کو چڑھاتا اور اٹھاتا ہے، یعنی قابل قبول بناتا ہے، اس کا حاصل یہ ہوگا کہ جو شخص عمل صالح کے ساتھ ذکر اللہ بھی بکثرت کرتا ہے تو یہ ذکر اللہ اس کے عمل کو مزین اور قابل قبول بنا دیتا ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ جس طرح صرف کلمہ توحید اور تسبیحات بغیر عمل صالح کے کافی نہیں اسی طرح عمل صالح اور امر ونواہی کی پابندی بھی بغیر کثرت ذکر اللہ کے بے رونق رہتی ہے، ذکر اللہ کی کثرت ہی اعمال صالحہ کو مزین کر کے قابل قبول بناتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ کفار نے دوسرے معبود اس لیے ٹھہرائے تھے کہ اللہ کے ہاں ان کی عزت ہوگی: وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا (مریم) اور بہت لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے دوستانہ کرتے تھے کہ اس سے ان کی عزت بنی رہے گی: الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (نساء) اس قسم کے لوگوں کو بتلایا کہ جو شخص دنیا وآخرت کی عزت چاہے، چاہیے کہ اللہ سے طلب کرے کہ عزیز مطلق تو وہ ہے، اسی کی فرمانبرداری اور یادگاری سے اصلی عزت میسر آتی ہے، تمام عزتوں کا مالک وہی اکیلا ہے، جس کسی کو عزت ملی یا ملے گی، اسی کے خزانہ سے ملی ہے یا ملے گی۔

فائدہ: ۲۔ ''ستھرا کلام'' ہے ذکر اللہ، دعاء، تلاوت القرآن، علم ونصیحت کی باتیں، یہ سب چیزیں بارگاہ رب العزت کی طرف چڑھتی ہیں اور قبول واعتناء کی عزت حاصل کرتی ہیں۔

فائدہ: ۳۔ ''ستھرے کلام'' (ذکر اللہ وغیرہ) کا ذاتی اقتضاء ہے اوپر چڑھنا، اس کے ساتھ دوسرے اعمال صالحہ ہوں تو وہ اس کو سہارا دے کر اور زیادہ ابھارتے اور بلند کرتے رہتے ہیں، اچھے کلام کو بدون اچھے کاموں کے پوری رفعت شان حاصل نہیں ہوتی۔

بعض مفسرین نے وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ کی ضمیروں کا مرجع بدل کر یہ معنی لیے ہیں کہ ستھرا کلام اچھے کام کو اونچا اور بلند کرتا ہے، یہ بھی درست ہے اور بعض نے رفع کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹائی ہے، یعنی اللہ عمل صالح کو بلند کرتا اور معراج قبول پر پہنچاتا ہے، بہر حال غرض یہ ہے کہ بھلے کلام اور اچھے کام دونوں علو ورفعت کو چاہتے ہیں، لہذا جو شخص اللہ تعالیٰ سے عزت کا طالب ہو، وہ ان چیزوں کے ذریعہ سے حاصل کرے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: یعنی عزت اللہ کے ہاتھ میں ہے، تمہارے ذکر اور بھلے کام چڑھتے جاتے ہیں، جب اپنی حد کو پہنچیں گے تب بدی پر (پورا) غلبہ (حاصل) کریں گے، کفر دفع ہوگا، اسلام کو عزت ہوگی''۔ مکاروں کے سب داؤ گھات باطل اور بیکار ہو کر رہ جائیں گے۔

فائدہ: ۴۔ یعنی جو لوگ بری تدبیریں سوچتے اور حق کے خلاف داؤ گھات میں رہتے ہیں آخر نا کام ہو کر خسارہ اٹھائیں گے، دیکھو قریش نے ''دار الندوہ'' میں بیٹھ کر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قید کرنے یا وطن سے نکالنے کے مشورے کیے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ بدر کے موقع پر وہ ہی لوگ وطن سے نکلے، مسلمانوں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے اور قلیب بدر میں ہمیشہ کے لیے قید کر دیے گئے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ

اور اللہ نے تم کو بنایا مٹی سے پھر بوند پانی سے پھر بنایا تم کو جوڑے جوڑے ، اور نہ پیٹ رہتا ہے کسی مادہ کو اور نہ وہ جنتی ہے

اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ⑪

بن خبر اس کے ۱؎ اور نہ عمر پاتا ہے کوئی بڑی عمر والا اور نہ گھٹتی ہے کسی عمر مگر لکھا ہے کتاب میں، بیشک یہ اللہ پر آسان ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے پھر مضمون توحید کی طرف رجوع ہے، یعنی حق تعالیٰ کی قدرت کا مظہر ایک تو وہ تھا جو پیچھے آیت: واللہ الذی ارسل الریٰح الخ میں بیان کیا گیا) اور (دوسرا مظہر جو توحید پر دلالت کرتا ہے یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو (تخلیق آدم کے ضمن میں) مٹی سے پیدا کیا، پھر (مستقل طور پر) نطفہ سے پیدا کیا، پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا (یعنی کچھ مذکر کچھ مونث بنائے یہ تو اس کی قدرت ہے) اور (علم اس کا ایسا ہے کہ) کسی عورت کو نہ حمل رہتا ہے اور نہ وہ جنتی ہے مگر سب اس کی اطلاع سے ہوتا ہے (یعنی اس کو پہلے ہی سے سب کی خبر ہوتی ہے) اور (اسی طرح) نہ کسی کی عمر زیادہ (مقرر) کی جاتی ہے اور نہ کسی کی عمر کم (مقرر) کی جاتی ہے مگر یہ سب لوح محفوظ میں (لکھا ہوا) ہوتا ہے (جس کو حق تعالیٰ نے اپنے علم قدیم کے موافق اس میں ضبط فرما دیا ہے اور اگرچہ معلومات بے شمار اور لا متناہی ہیں، مگر یہ تعجب نہ کرو کہ واقع ہونے سے پہلے سب واقعات کو کیسے مقدور ومقرر فرمایا کیونکہ) یہ سب اللہ کو آسان ہے (کیونکہ اس کا علم کامل اور ذاتی ہے جس کا تعلق تمام معلومات کے ساتھ واقع ہونے سے پہلے اور واقع ہونے کے بعد یکساں ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آدم کو مٹی سے، پھر اس کی اولاد کو پانی کی بوند سے پیدا کیا، پھر مرد وعورت کے جوڑے بنا دیے، جس سے نسل پھیلی، اس درمیان میں استقرار حمل سے لے کر بچہ کی پیدائش تک جو ادوار واطوار گزرے سب کی خبر خدا ہی کو ہے، ماں باپ بھی نہیں جانتے کہ اندر کیا صورتیں پیش آئیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس کی جتنی عمر ہے لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے اور جو اسباب عمر کے گھٹنے بڑھنے کے ہیں، یا یہ کہ کون عمر طبعی کو پہنچے گا کون نہیں؟ سب اللہ کے علم میں ہے اور اللہ کو ان جزئیات پر احاطہ رکھنا بندوں کی طرح کچھ مشکل نہیں، اس کو تو تمام ما کان وما یکون، جزئی، کلی، اور غیب و شہادت کا علم ازل سے حاصل ہے، اس کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "ہر کام سہج سہج ہوتا ہے جیسے آدمی کا بننا"، اور اپنی عمر مقدر کو پہنچنا، اس طرح سمجھ لو، اسلام بتدریج بڑھے گا اور آخر کار کفر کو مغلوب ومقہور کر کے چھوڑے گا۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ

اور برابر نہیں دو دریا ، یہ میٹھا ہے پیاس بجھاتا ہے خوشگوار اور یہ کھارا کڑوا ، اور دونوں میں سے

تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا

کھاتے ہو گوشت تازہ اور نکالتے ہو گہنا جس کو پہنتے ہو ۱؎ اور تو دیکھے جہازوں کو اس میں کہ چلتے ہیں پانی کو پھاڑتے تا کہ تلاش کرو

مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ⑫

اس کے فضل سے اور تا کہ تم حق مانو ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (آگے قدرت کے مزید دلائل سنو کہ دیکھو پانی باوجود یکہ ایک مادہ ہے مگر اس میں حق تعالیٰ نے کس طرح دو مختلف قسمیں پیدا کردیں) دونوں دریا برابر نہیں (بلکہ) ایک تو شیریں پیاس بجھانے والا ہے جس کا پینا بھی آسان ہے (کیونکہ طبیعت اس کو قبول کرتی ہے) اور ایک شور تلخ ہے (تو یہ بات بھی عجائب قدرت میں سے ہے) اور (دوسرے دلائل قدرت بھی ہیں جو حق تعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہونے کے علاوہ نعمت پر بھی دلالت کرتے ہیں، بعض تو انہی دریاؤں کے متعلق ہیں مثلاً یہ کہ) تم ہر ایک (دریا) سے (مچھلیاں نکال کران کا) تازہ گوشت کھاتے ہو اور (نیز) زیور (یعنی موتی) نکالتے ہو جس کو تم پہنتے ہو اور (اے مخاطب!) تو کشتیوں کو اس میں دیکھتا ہے پانی کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم (ان کے ذریعہ سے سفر کر کے) اس کی روزی ڈھونڈو اور تاکہ (روزی حاصل کر کے) تم (اللہ کا) شکر کرو۔

وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً: یعنی مچھلی کا تازہ گوشت کھانا، یہ نعمت تو میٹھے اور کڑوے دونوں پانیوں میں مشترک ہے، اور بعض منافع کڑوے پانی کے ساتھ خاص ہیں جیسے موتی نکالنا، مشہور یہ ہے کہ موتی صرف کڑوے پانی کے دریا سے نکلتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو موتی نکالنے کا مضمون صرف کڑوے پانی کے دریا سے متعلق ہوگا: "أي وتستخرجون من الملح حلية"۔

* * *

فائدہ: ۱ اوپر سے دلائل توحید اور شواہد قدرت بیان ہوتے آرہے ہیں، اسی کے ضمن میں لطیف اشارے اسلام کے غلبہ کی طرف بھی ہوتے جاتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یعنی کفر اور اسلام برابر نہیں، خدا کفر کو مغلوب ہی کرے گا، اگرچہ تم کو دونوں سے فائدہ ملے گا، مسلمانوں سے قوت دین اور کافروں سے جزیہ خراج اور گوشت میٹھے کھاری دونوں دریاؤں سے نکلتا ہے یعنی مچھلی اور گہنا (زیور) یعنی موتی، مونگا اور جواہر اکثر کھارے سے نکلتے ہیں"۔

فائدہ: ۲ اکثر بڑی بڑی تجارتیں جہازوں کے ذریعے ہوتی ہیں، ان سے جو منافع حاصل ہو، یہ ہی اللہ کا فضل ہے، ان تمام انعامات پر انسان کو چاہیے مالک کا شکر ادا کرے۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ

رات گھساتا ہے دن میں اور دن گھساتا ہے رات میں، اور کام میں لگا دیا سورج اور چاند کو، ہر ایک چلتا ہے ایک مقرر وعدہ تک ۱

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ⑬

یہ اللہ ہے تمہارا رب اسی کے لیے بادشاہی ہے، اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا وہ مالک نہیں کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے ۲

خلاصہ تفسیر: (بعض اور نعمتیں بھی ہیں جو قدرت کے دلائل بھی ہیں مثلاً یہ کہ) وہ رات (کے اجزاء) کو دن (کے اجزاء) میں داخل کردیتا ہے، اور دن (کے اجزاء) کو رات (کے اجزاء) میں داخل کردیتا ہے (جس سے دن اور رات کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق فوائد ومنافع حاصل ہوتے ہیں) اور (مثلاً یہ کہ) اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے (ان میں سے) ہر ایک وقت مقرر (یعنی یوم قیامت) تک (اسی طرح) چلتے رہیں گے، یہی اللہ (جس کی یہ شان ہے) تمہارا پروردگار ہے، اسی کی سلطنت ہے اور اس کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے۔

چنانچہ جمادات یعنی بتوں وغیرہ میں اختیار نہ ہونا تو ظاہر ہے، اور ذی روح یعنی ان کے جو معبود جاندار ہیں جیسے ملائکہ وشیاطین وغیرہ تو وہ بھی خود کچھ اختیار نہیں رکھتے، بلکہ خدا تعالیٰ ہی کے واسطہ سے کچھ کرسکتے ہیں اور اسی کے محتاج ہیں۔

وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ: بعض جاہل لوگ غیر اللہ میں جس علم وقدرت کا اعتقاد رکھتے ہیں اس آیت میں

اس کی واضح نفی ہے، اور جو نادان لوگ غیر اللہ کو قبولیت واجابت کی امید سے پکارتے ہیں اس آیت سے ان کی حماقت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ مضمون پہلے کئی جگہ گزر چکا ہے، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی رات دن کی طرح کبھی کفر غالب ہے کبھی اسلام اور سورج چاند کی طرح ہر چیز کی مدت بندھی ہے، دیر سویر نہیں ہوتی، حق کا نمایاں غلبہ اپنے وقت پر ہوگا''۔

فائدہ: ۲ یعنی جس کی صفات وشؤن اوپر بیان ہوئی، حقیقت میں یہ ہے تمہارا سچا پروردگار اور کل زمین وآسمان کا بادشاہ، باقی جنہیں تم خدا قرار دے کر پکارتے ہو، وہ مسکین بادشاہ تو کیا ہوتے، کھجور کی گٹھلی پر جو باریک جھلی سی ہوتی ہے، اس کے بھی مالک نہیں۔

إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ

اگر تم ان کو پکارو سنیں نہیں تمہاری پکار، اور اگر سنیں پہنچیں نہیں تمہارے کام کو، اور قیامت کے دن

يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ﴿١٤﴾ ع

منکر ہوں گے تمہارے شریک ٹھہرانے سے ۱ اور کوئی نہ بتلائے گا تجھ کو جیسا بتلائے خبر رکھنے والا ۲

خلاصہ تفسیر: (اور ان کی یہ حالت ہے کہ) اگر تم پکارو تو بھی وہ تمہاری پکار (اول تو) سنیں گے نہیں (جمادات یعنی بتوں میں تو سننے کی طاقت ہی نہیں، اور ذی روح یعنی ملائکہ وشیاطین وغیرہ میں اگرچہ سننے کی قوت ہے مگر جیسا کہ کفار کا اعتقاد ہے کہ وہ ہمیشہ ہماری بات سنتے ہیں یہ غلط ہے، ان کا سننا لازمی اور دائمی نہیں، جب اللہ چاہے سنا دے، جب نہ چاہے نہ سنائے) اور اگر (بالفرض) سن بھی لیں تو تمہارا کہنا نہ کریں گے (کیونکہ بتوں میں تو اس کی قابلیت ہی نہیں، اور فرشتے جو کہ عند اللہ مقبول ہیں وہ ان سے راضی اور خوش نہیں، اور شیاطین جو کہ مردود ہیں ان کی قدرت سے بعض باتیں جن کی کفار دعا کرتے ہیں خارج ہیں اور جن کی قدرت بھی ہے ان میں بھی وہ خدا کے محتاج ہیں، خود کچھ نہیں کر سکتے، پس یہ حالت تو ان کے معبودوں کی دنیا میں ہے) اور قیامت کے روز وہ (خود) تمہارے شرک کرنے کی مخالفت کریں گے (چنانچہ وہ صاف صاف کہہ دیں گے: **ما کانوا ایانا یعبدون** کہ یہ لوگ ہماری عبادت نہ کرتے تھے) اور (ہم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے سچ ہونے میں ذرا شک وشبہ نہیں، کیونکہ ہم حقائق کی پوری خبر رکھنے والے ہیں اور اے مخاطب!) تجھ کو خبر رکھنے والے کی برابر کوئی نہیں بتلائے گا (پس ہمارا بتلانا سب سے زیادہ صحیح ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جن معبودوں کا سہارا ڈھونڈتے ہو، وہ تمہاری پکار نہیں سنتے اور توجہ کرتے بھی تو کچھ کام نہ آسکتے، بلکہ قیامت کے دن تمہاری مشرکانہ حرکات سے اعلانیہ بیزاری کا اظہار کریں گے اور بجائے مددگار بننے کے دشمن ثابت ہوں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ سے زیادہ احوال کو نجانے، وہ ہی فرماتا ہے کہ یہ شریک غلط ہیں، جو کچھ کام نہیں آسکتے، ایسے ٹھیک اور پکی باتیں اور کون بتلائے گا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿١٥﴾

اے لوگو تم ہو محتاج اللہ کی طرف، اور اللہ وہی ہے بے پروا سب تعریفوں والا ۱

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٦﴾ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿١٧﴾

اگر چاہے تم کو لے جائے اور لے آئے ایک نئی خلقت، اور یہ بات اللہ پر مشکل نہیں ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا ذکر تھا، چونکہ کفار اس کا انکار کرتے تھے اس لیے اب آگے فرماتے ہیں کہ ان کے انکار اور تسلیم سے خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان یا فائدہ نہیں، بلکہ تمہارا ہی فائدہ یا نقصان ہے، نیز چونکہ حضور ﷺ کو ان کے انکار سے رنج ہوتا تھا اس لیے بعد میں آپ کو بھی تسلی دی گئی۔

اے لوگو! تم (ہی) خدا کے محتاج ہو اور اللہ (تو) بے نیاز (اور خود تمام) خوبیوں والا ہے (پس تمہاری احتیاج دیکھ کر تمہارے ہی فائدہ کے لئے توحید وغیرہ کی تعلیم کی گئی ہے، اگر تم نہیں مانو گے تو تم اپنا نقصان کرو گے، باقی حق تعالیٰ کو تو بے نیازی اور ذاتی کمال کی وجہ سے تمہاری یا تمہارے عمل کی کوئی حاجت ہی نہیں کہ اس کے نقصان کا احتمال ہو، اور کفر سے جو نقصان ہونے والا ہے خدا تعالیٰ اس کو فی الحال اس وقت واقع کرنے پر بھی قادر ہے چنانچہ) اگر وہ چاہے تو (تمہارے کفر کی سزا میں) تم کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق پیدا کر دے (جو تمہاری طرح کفر و انکار نہ کریں) اور یہ بات خدا کو کچھ مشکل نہیں (لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے مہلت دے رکھی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سب لوگ اسی اللہ کے محتاج ہیں، جسے کسی کی احتیاج نہیں، کیونکہ تمام خوبیاں اور کمالات اس کی ذات میں جمع ہیں، پس وہ ہی مستحق عبادات و استعانت کا ہوا۔

فائدہ: ۲ یعنی تم نہ مانو تو وہ قادر ہے کہ تم کو ہٹا کر دوسری خلقت آباد کر دے، جو بہمہ وجوہ اس کی فرمانبرداری اور اطاعت گزار ہو، جیسے آسمانوں پر فرشتے اور ایسا کرنا اللہ کو کچھ مشکل نہیں، لیکن اس کی حکمت کا اقتضاء یہ ہے کہ زمین پر یہ سب سلسلے چلتے رہیں اور آخر میں ہر ایک اپنے نیک و بد عمل کا بدلہ پائے، تاکہ اس طرح اس کی تمام صفات کا ظہور ہو۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَیْءٌ وَّلَوْ كَانَ

اور نہ اٹھائے گا کوئی اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا، اور اگر پکارے کوئی بوجھل اپنا بوجھ بٹانے کو کوئی نہ اٹھائے اس میں سے ذرا بھی اگرچہ ہو

ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا

قرابتی ۱ تو تو ڈر سنا دیتا ہے ان کو جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے اور قائم رکھتے ہیں نماز ۲ اور جو کوئی سنورے گا تو یہی ہے کہ

يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۸

سنورے گا اپنے فائدہ کو، اور اللہ کی طرف سب کو پھر جانا ۳

خلاصہ تفسیر: (غرض کفر کی وجہ سے دنیا میں بھی نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اور قیامت میں تو یقیناً ضرور ہوگا) اور (اس وقت یہ حالت ہوگی کہ) کوئی دوسرے کا بوجھ (گناہ کا) نہ اٹھائے گا اور (خود تو کوئی کسی کی کیا رعایت کرتا وہاں یہ حالت ہوگی کہ) اگر کوئی بوجھ کا لدا ہوا (یعنی کوئی گنہگار) کسی کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے بلائے گا (بھی) تب بھی اس میں سے کچھ بھی بوجھ نہ ہٹایا جائے گا، اگرچہ وہ شخص (جس کو اس نے بلایا تھا اس کا) قرابت دار ہی (کیوں نہ) ہو (پس اس وقت کفر اور بدعملی کا پورا نقصان خود ہی بھگتنا پڑے گا، یہ تو کفار کو دھمکی تھی، آگے حضور ﷺ کو تسلی ہے کہ اے محمد ﷺ! آپ ان کے انکار پر جس کی سزا یہ ایک دن ضرور بھگتیں گے اس قدر غم و افسوس کیوں کرتے ہیں) آپ تو (ایسا ڈرانا جس پر نفع مرتب ہو) صرف ایسے لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں (اس سے مراد ایمان والے ہیں، یعنی آپ کے ڈرانے سے صرف مومنین منتفع ہوتے ہیں، خواہ وہ اس وقت مؤمن ہوں یا آئندہ ایمان لانے والے ہوں، کیونکہ ان کو حق کی طلب ہے، خلاصہ یہ ہے

کہ طالب حق کو نفع ہوا کرتا ہے، یہ لوگ طالب حق ہیں ہی نہیں، پس ان سے امید ہی نہ رکھئے) اور (آپ ان کے ایمان نہ لانے سے اس قدر فکر کیوں کرتے ہیں) جو شخص (ایمان لاکر شرک وکفر سے) پاک ہوتا ہے وہ اپنے (نفع) کے لئے پاک ہوتا ہے اور (جو نہیں ایمان لاتا وہ وہاں بھگتے گا، کیونکہ سب کو) اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے (پس نفع ہے تو ان کا، آپ کیوں غم کرتے ہیں)۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی: یعنی قیامت کے روز کوئی آدمی دوسرے آدمی کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا، ہر ایک کو اپنا بوجھ خود ہی اٹھانا پڑے گا اور سورۂ عنکبوت میں جو آیا ہے کہ: ولیحملن اثقالھم واثقالاً مع اثقالھم، یعنی گمراہ کرنے والے لوگ اپنے گمراہ ہونے کا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اتنا ہی دوسرا بوجھ اس کا اٹھائیں گے کہ انہوں نے دوسروں کو گمراہ کیا تھا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن کو گمراہ کیا تھا ان کا بوجھ یہ لوگ کچھ ہلکا کردیں گے، بلکہ ان کا بوجھ اپنی جگہ پر ان پر پورا ہوگا، اور گمراہ کرنے والوں کا جرم دوہرا ہونے کی وجہ سے ان کا بوجھ بھی دوہرا ہوجائے گا، ایک گمراہ ہونے کا، دوسرا دوسروں کو گمراہ کرنے کا، اس لئے ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نہ کوئی از خود دوسرے کا بوجھ اپنے سر رکھے گا کہ اس کے گناہ اپنے اوپر لے لے اور نہ دوسرے کے پکارنے پر اس کا کچھ ہاتھ بٹا سکے گا، خواہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، سب کو نفسی نفسی پڑی ہوگی، محض اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت ہی سے بیڑا پار ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی آپ کے ڈرانے سے وہ ہی اپنا رویہ درست کرکے نفع اٹھائے گا جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے اور ڈر کر اس کی بندگی میں لگا رہتا ہے، جس کے دل میں خدا کا خوف ہی نہ ہو، وہ ان دھمکیوں سے کیا متاثر ہوگا۔

فائدہ: ۳ یعنی آپ کی نصیحت سن کر جو شخص مان لے اور اپنا حال درست کرلے تو کچھ آپ پر یا خدا پر احسان نہیں، بلکہ اسی کا فائدہ ہے اور یہ فائدہ پوری طرح اس وقت ظاہر ہوگا جب سب اللہ کے ہاں لوٹ کر جائیں گے۔

وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾

اور برابر نہیں اندھا اور دیکھتا ، اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا ، اور نہ سایہ اور نہ لو

وَمَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ

اور برابر نہیں جیتے اور نہ مردے ۱ اللہ سناتا ہے جس کو چاہے ، اور تو نہیں سنانے والا

مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾

قبر میں پڑے ہوؤں کو، تو تو بس ڈر کی خبر پہنچانے والا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: ان لوگوں سے کیا توقع رکھی جائے کہ ان کی سمجھ فہم بھی مسلمانوں کی فہم جیسی ہو اور اس فہم وسمجھ سے کام لے کر مؤمنین کی طرح یہ بھی طریقۂ حق کو قبول کرلیں اور راہ حق کو قبول کرنے کے جو ثمرات ہیں ان میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوجائیں، کیونکہ مسلمانوں کی مثال حق بات سمجھنے میں بینا کی سی ہے، اور کافروں کی مثال حق بات کو نہ سمجھنے میں اندھوں کی سی ہے، اور اسی طرح مؤمن نے فہم وسمجھ کے ذریعہ جس ہدایت کے راستہ کو اختیار کیا اس کی مثال نور کی سی ہے اور کافر نے فہم اور سمجھ کے نہ ہونے سے جس راستہ کو اختیار کیا ہے اس کی مثال ظلمت اور اندھیرے کی سی ہے، کما قال تعالیٰ: وجعلنا له نورا یمشی به فی الناس کمن مثله فی الظلمت لیس بخارج منها، اور اس حق راستہ کو اختیار کرنے پر جو ثمرہ ایمان والوں کو ملے گا یعنی جنت وغیرہ اس کی مثال ٹھنڈے سایہ کی سی ہے، اور کافروں کی گمراہی پر جو ثمرہ ملے گا اس کی مثال جلتی دھوپ کی سی ہے، کما قال تعالیٰ: وظل ممدود الی قوله فی سموم وحمیم، ظاہر ہے کہ:

اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں اور نہ تاریکی اور روشنی اور چھاؤں اور دھوپ (پس نہ ان کافروں کی اور مسلمانوں کی فہم وسمجھ برابر ہے، نہ ہی طریقہ، اور نہ اس طریقہ کا ثمرہ) اور (مومن اور کافر میں جو بینا و نابینا کا سا فرق کہا گیا ہے تو اس سے مقصود کمی کی نفی ہے نہ کہ زیادتی کی، کیونکہ ان میں مردہ اور زندہ کا سا فرق ہے، پس ان کی برابری کے انکار کے لئے یوں بھی کہنا صحیح ہے کہ) زندے اور مردے برابر نہیں ہو سکتے (اور جب یہ مردے ہیں تو مردوں کو زندہ کرنا تو خدا کی قدرت میں ہے بندہ کی قدرت میں نہیں، پس اگر خدا ہی ان کو ہدایت کردے تب تو اور بات ہے، کیونکہ) اللہ جس کو چاہتا ہے سنوا دیتا ہے (باقی آپ کی کوشش سے یہ لوگ حق کو قبول نہیں کریں گے، کیونکہ ان کی مثال تو مردوں کی سی آپ نے سن لی) اور آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں (مدفون) ہیں (لیکن اگر یہ نہ مانیں تو آپ غم میں نہ پڑیئے، کیونکہ) آپ تو (کافروں کے حق میں) صرف ڈرانے والے ہیں (آپ کے ذمہ یہ نہیں کہ وہ کافر ڈر کر مان بھی جائیں)۔

وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ: اس آیت کے شروع میں کفار کی مثال مردوں سے اور مومنین کی زندوں سے دی گئی ہے، اسی کی مناسبت سے یہاں من فی القبور سے مراد کفار ہیں، مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے ان زندہ کافروں کو بھی نہیں سنا سکتے، اس آیت نے خود یہ بات واضح کردی کہ یہاں سنانے سے مراد وہ سنانا ہے جو مفید و موثر اور نافع ہو، ورنہ مطلق سنانا تو کفار کو ہمیشہ ہوتا ہی رہا، اور مشاہدہ میں آتا رہا ہے کہ ان کو تبلیغ کرتے اور وہ سنتے تھے، اس لئے مراد اس آیت کی یہ ہے کہ جس طرح آپ مردوں کو کلام حق سنا کر راہ حق پر نہیں لا سکتے، کیونکہ وہ دنیا کے دار العمل سے آخرت کے دار الجزاء میں منتقل ہو چکے ہیں، وہاں اگر وہ ایمان کا اقرار بھی کرلیں تو معتبر نہیں، اسی طرح کفار کا حال ہے، اس سے ثابت ہوا کہ مردوں کے سنانے کی جو نفی اس آیت میں کی گئی ہے اس سے مراد خاص اسماع نافع ہے جس کی وجہ سے سننے والا باطل کو چھوڑ کر حق پر آجائے، اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ مسئلہ سماع موتی سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں، یہ مسئلہ اپنی جگہ مستقل ہے کہ مردے زندوں کا کلام سنتے ہیں یا نہیں، اس کی مفصل تحقیق سورۃ نمل آیت ۸۰-۸۱ میں گزر چکی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مومن جس کو اللہ نے دل کی آنکھیں دی ہیں، حق کے اجالے اور وحی الٰہی کی روشنی میں بے کھٹکے راستہ قطع کرتا ہوا جنت کے باغوں اور رحمت الٰہی کے سایہ میں جا پہنچا ہے، کیا اس کی برابری وہ کافر کرسکے گا جو دل کا اندھا اوہام و ہواء کی اندھیریوں میں بھٹکتا ہوا جہنم کی آگ اور اس کی جھلس دینے والی لوؤں کی طرف بے تحاشا چلا جارہا ہے؟ ہرگز نہیں!! ایسا ہو تو یوں سمجھو کہ مردہ اور زندہ برابر ہوگیا، فی الحقیقت مومن و کافر میں اس سے بھی زیادہ تفاوت ہے، جو ایک زندہ تندرست آدمی اور مردہ لاش میں ہوتا ہے، اصل اور دائمی زندگی صرف روح ایمان سے ملتی ہے، بدون اس کے انسان کو ہزار مردوں سے بدتر مردہ سمجھنا چاہیے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اللہ چاہے تو مردوں کو بھی سنادے، یہ قدرت اوروں کو نہیں، اسی طرح سمجھ لو کہ پیغمبر کا کام خبر پہنچانا اور بھلے برے سے آگاہ کردینا ہے، کوئی مردہ دل کافر ان کی بات نہ سنے تو یہ ان کے بس کی بات نہیں۔

حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''یعنی سب خلق برابر نہیں، جنہیں ایمان دینا ہے ان ہی کو ملے گا، تو بہتیری آرزو کرے تو کیا ہوتا ہے، اور یہ جو فرمایا: ''نہ اندھیرا نہ اجالا'' یعنی نہ اندھیرا برابر اجالے کے اور نہ اجالا برابر اندھیرے کے (یہ ''لا'' کی تکریر کا فائدہ بتلا دیا) اور فرمایا: ''تو نہیں سنانے والا قبر میں پڑے ہوؤں کو''، حدیث میں آیا کہ مردوں سے سلام علیکم کرو، وہ سنتے ہیں اور بہت جگہ مُردے کو خطاب کیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ مردے کی روح سنتی ہے اور قبر میں پڑا دھڑ، وہ نہیں سن سکتا''، یہ بحث پہلے سورہ نمل کے آخر میں گزر چکی وہاں دیکھ لیا جائے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾

ہم نے بھیجا ہے تجھ کو سچا دین دے کر خوشی اور ڈر سنانے والا، کوئی فرقہ نہیں جس میں نہیں ہو چکا کوئی ڈر سنانے والا

خلاصہ تفسیر: اور آپ کا یہ ڈرانا اپنی طرف سے نہیں جیسا کہ کفار کہتے تھے بلکہ ہماری طرف سے ہے، کیونکہ:

ہم ہی نے آپ کو (دین) حق دے کر (مسلمانوں کو) خوشخبری سنانے والا اور (کافروں کو) ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے اور (یہ بھیجنا کوئی انوکھی بات نہیں جیسا کافر کہتے تھے بلکہ) کوئی ایسی امت نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا (یعنی پیغمبر) نہ گذرا ہو۔

* * *

فائدہ: ڈر سنانے والا خواہ نبی ہو، یا نبی کا قائم مقام جو اس کی راہ کی طرف بلائے، اس کے متعلق سورہ نمل کے چوتھے رکوع میں کچھ لکھا جا چکا ہے۔

وَاِنۡ یُّکَذِّبُوۡکَ فَقَدۡ کَذَّبَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۚ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ

اور اگر وہ تجھ کو جھٹلائیں تو آگے جھٹلا چکے ہیں جو لوگ کہ ان سے پہلے تھے، پہنچے ان کے پاس رسول ان کے لے کر کھلی باتیں اور صحیفے

وَبِالۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَکَیۡفَ کَانَ نَکِیۡرِ ﴿۲۶﴾ ع ۲۲/۱۵

اور روشن کتاب ۱۔ پھر پکڑا میں نے منکروں کو سو کیسا ہوا انکار میرا ۲۔

خلاصہ تفسیر: آگے فرماتے ہیں کہ آپ کو رسول بنا کر بھیجنا کوئی انوکھی بات نہیں، جیسا کہ کفار کہتے تھے:

اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلا دیں تو (آپ ان گزشتہ پیغمبروں کے ساتھ کافروں کا معاملہ یاد کر کے اپنے دل کو سمجھا لیجئے کیونکہ) جو لوگ ان سے پہلے ہوگذرے ہیں انہوں نے بھی (اپنے وقت کے پیغمبروں کو) جھٹلایا تھا (اور) ان کے پاس بھی ان کے پیغمبر معجزے اور صحیفے اور روشن کتابیں لے کر آئے تھے (یعنی بعض انبیاء سابقین صحائف، بعض بڑی کتابیں اور بعض صرف معجزات تصدیق نبوت کے لئے اور احکام لے کر آئے) پھر (جب انہوں نے جھٹلایا تو) میں نے ان کافروں کو پکڑ لیا سو (دیکھو) میرا کیسا عذاب ہوا (اسی طرح ان کے وقت پر ان کو بھی سزا دوں گا)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی روشن تعلیمات یا کھلے کھلے معجزات لیکر آئے، نیز ان میں سے بعض کو مختصر چھوٹے صحیفے دیے گئے، بعض کو بڑی مفصل کتابیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی جب تکذیب سے باز نہ آئے تو دیکھ لو انجام کیا ہوا؟! وہ ہی تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُہَا ؕ وَمِنَ الۡجِبَالِ

کیا تو نے نہ دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی، پھر ہم نے نکالے اس سے میوے طرح طرح کے ان کے رنگ ۱۔ اور پہاڑوں میں

جُدَدٌۢ بِیۡضٌ وَّحُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہَا وَغَرَابِیۡبُ سُوۡدٌ ﴿۲۷﴾

گھاٹیاں ہیں سفید اور سرخ طرح طرح کے ان کے رنگ اور بھجنگے کالے ۲۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے بیان فرمایا تھا کہ مؤمن اور کافر میں بینا اور اندھے کا فرق ہے، آگے فرماتے ہیں کہ یہ فرق کچھ انہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہم نے دیگر مخلوقات میں بھی مختلف حکمتوں کی وجہ سے بہت سی باتوں میں اختلاف رکھے ہیں، چنانچہ درخت، پھل، پہاڑ اور حیوانات ان میں ہر ایک میں طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں، پس جیسا کہ لوگوں کی رنگت میں اختلاف ہے اسی طرح ان کے اوصاف بھی مختلف ہیں کہ کوئی کافر ہے کوئی مؤمن ہے، پس آپ کافروں کے ایمان نہ لانے سے افسوس نہ کریں، کیونکہ سب لوگ یکساں برابر نہیں ہو سکتے۔

(اے مخاطب!) کیا تو نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعہ مختلف رنگتوں کے

پھل لگائے (خواہ اس طرح کہ ان کی انواع واقسام ہی الگ الگ ہوں یا ایک ہی نوع اور ایک ہی قسم کے پھل مختلف رنگتوں کے ہوں) اور (اسی طرح) پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں (بعض) سفید اور (بعض) سرخ کہ (پھر خود) ان (سفید و سرخ کی) بھی رنگتیں مختلف ہیں (بعض بہت سفید اور بہت سرخ، بعض ہلکے سفید اور ہلکے سرخ) اور (بعض نہ سفید نہ سرخ بلکہ) بہت گہرے سیاہ۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قسم قسم کے میوے، پھر ایک قسم میں رنگ برنگ کے پھل پیدا کیے، ایک زمین، ایک پانی اور ایک ہوا سے اتنی مختلف چیزیں پیدا کرنا عجیب وغریب قدرت کو ظاہر کرتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی سفید بھی کئی درجے (کوئی بہت زیادہ سفید، کوئی کم، کوئی اس سے کم) اور سرخ بھی کئی درجے، اور ''کالے بھجنگے''، یعنی بہت گہرے سیاہ کوے کے پر کی طرح۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ

اور آدمیوں میں اور کیڑوں میں اور چوپاؤں میں کتنے رنگ ہیں اسی طرح ۱ اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں

الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

جن کو سمجھ ہے، تحقیق اللہ زبردست ہے بخشنے والا ۲

خلاصہ تفسیر: اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں بھی بعض ایسے ہیں کہ ان کی رنگتیں مختلف ہیں (بعض اوقات اقسام واصناف میں اختلاف کے ساتھ رنگ میں بھی اختلاف ہوتا ہے، اور بعض اوقات ایک ہی قسم میں مختلف رنگ ہوتے ہیں، پس جیسا کہ آدمیوں کی رنگت میں اختلاف ہے اسی طرح ان کے اوصاف بھی مختلف ہیں کہ کوئی کافر ہے کوئی مؤمن ہے، پس آپ کافروں کے ایمان نہ لانے سے افسوس نہ کریں، کیونکہ سارے آدمی یکساں نہیں ہوتے، آپ کے ڈرانے سے صرف ان ہی لوگوں میں خدا کا خوف اور خوف سے اطاعت پیدا ہوسکتی ہے جو ان کے قدرت کے دلائل کے مضامین میں غور کر کے حق تعالیٰ کی عظمت کا علم حاصل کرتے ہیں، اور) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں (اگر عظمت کا علم محض اعتقادی اور عقلی ہے تو یہ خشیت بھی اعتقادی اور عقلی ہی رہے گی اور اگر عظمت کا علم حال کے درجہ میں ہے تو خوف وخشیت بھی حال کے درجہ میں ہوگا، اور) واقعی اللہ تعالیٰ (سے ڈرنا فی نفسہ بھی ضروری ہے کیونکہ وہ) زبردست ہے (کہ سب کچھ کرسکتا ہے اور اپنے مطلب کے لئے بھی ضروری ہے، کیونکہ وہ ڈرنے والوں کے گناہوں کا) بڑا بخشنے والا ہے (پس اس سے ڈرنے میں عزت بھی حاصل ہوتی ہے اور مغفرت بھی)۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا: اس کے خلاصہ تفسیر سے یہ شبہ بھی جاتا رہا کہ بہت اہل علم کو دیکھا جاتا ہے کہ ان میں خدا کا خوف و خشیت نہیں، جواب ظاہر ہے کہ ان کا علم محض اعتقاد کے درجہ میں ہے، حال کے درجہ میں نہیں، اس لیے خوف بھی اعتقاد ہی کے درجہ میں ہے، کیونکہ خلاصہ تفسیر سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک صرف عربی جاننے کا نام علم اور جاننے والے کا نام عالم نہیں، جس میں خشیت نہ ہو وہ قرآن کی اصطلاح میں عالم ہی نہیں، البتہ خشیت کبھی صرف اعتقادی اور عقلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی بہ تکلف احکام شرعیہ کا پابند ہوتا ہے، اور کبھی یہ خشیت حالی اور ملکہ راسخہ کے درجہ میں ہوجاتی ہے جس میں اتباع شریعت ایک تقاضائے طبیعت بن جاتا ہے، خشیت کا پہلا درجہ مامور بہ اور عالم کے لئے ضروری ہے دوسرا درجہ افضل واعلیٰ ہے ضروری نہیں۔

روح المعانی میں ہے کہ اس آیت میں لفظ علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ جل شانہ، کی ذات وصفات کا کماحقہ علم رکھتے ہیں، اور مخلوقات

عالم میں اس کے تصرفات پر اور اس کے احسانات وانعامات پر نظر رکھتے ہیں، صرف عربی زبان یا اس کے صرف ونحو اور فنون بلاغت جاننے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں عالم نہیں کہا جاتا جب تک اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت مذکورہ طریق پر حاصل نہ ہو، سو خوف وخشیت کا مدار پہلا علم ہے نہ کہ دوسرا۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ سب بیان ہے قدرت کی نیرنگیوں کا، پس جس طرح نباتات، جمادات، اور حیوانات میں رنگ برنگ کی مخلوق ہے، انسانوں میں بھی ہر ایک کی طرح جدا ہے، مومن اور کافر ایک دوسرا سا ہو جائے اور سب انسان ایک ہی رنگ اختیار کرلیں، یہ کب ہوسکتا ہے؟ اس میں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تسلی دے دی کہ لوگوں کے اختلاف سے غمگین نہ ہوں۔

فائدہ: ۲ یعنی بندوں میں نڈر بھی ہیں اور اللہ سے ڈرنے والے بھی، مگر ڈرتے وہ ہی ہیں جو اللہ کی عظمت وجلال، آخرت کے بقاء ودوام، اور دنیا کی بے ثباتی کو سمجھتے ہیں اور اپنے پروردگار کے احکام وہدایات کا علم حاصل کر کے مستقبل کی فکر رکھتے ہیں، جس میں یہ سمجھ اور علم جس درجہ کا ہوگا، اسی درجہ میں وہ خدا سے ڈرے گا، جس میں خوف خدا نہیں، وہ فی الحقیقت عالم کہلانے کا مستحق نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی سب آدمی ڈرنے والے نہیں، اللہ سے ڈرنا سمجھ والوں کی صفت ہے اور اللہ کا معاملہ بھی دو طرح ہے، وہ زبردست بھی ہے کہ ہر خطا پر پکڑے، اور غفور بھی کہ گنہگار کو بخشے''۔ پس دونوں حیثیت سے بندے کو ڈرنا چاہیے، کیونکہ نفع وضرر دونوں اسی کے قبضہ میں ہوئے تو جب چاہے نفع کو روک لے اور ضرر لاحق کر دے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَٰبَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ

جو لوگ پڑھتے ہیں کتاب اللہ اور سیدھی کرتے ہیں نماز اور خرچ کرتے ہیں کچھ ہمارا دیا ہوا چھپے اور کھلے امیدوار ہیں

تِجَٰرَةً لَّن تَبُورَ ﴿٢٩﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿٣٠﴾

ایک بیوپار کے جس میں ٹوٹا نہ ہو ۱ تاکہ پورا دے ان کو ثواب ان کا اور زیادہ دے اپنے فضل سے تحقیق وہ ہے بخشنے والا قدردان ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے کئی جگہ آخرت اور جزاوسزا کا ذکر ہوا ہے، اور گذشتہ مضمون کے اختتام پر عزیز غفور سے بھی اسی کی طرف اشارہ ہوا ہے، چنانچہ اب آگے اسی کی تفصیل ہے۔

اور جو لوگ کتاب اللہ (یعنی قرآن) کی تلاوت (عمل کے ساتھ) کرتے رہتے ہیں اور (خصوصیت واہتمام کے ساتھ) نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے پوشیدہ اور اعلانیہ (جس طرح بن پڑتا ہے) خرچ کرتے ہیں وہ (وعدہ الٰہی کی وجہ سے) ایسی (دائمی نفع کی) تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ ہوگی (کیونکہ اس سودے کا خریدار کوئی مخلوقات میں سے نہیں ہے جو کبھی تو سودے کی قدر کرتا ہے اور کبھی نہیں کرتا، بلکہ اس کا خریدار خود حق تعالیٰ ہوگا، جو ضرور حسب وعدہ اپنی غرض سے نہیں بلکہ محض ان کی نفع رسانی کے لئے اس کی قدر کرے گا) تاکہ ان کو ان (کے اعمال) کی اجرتیں (بھی) پوری (پوری) دیں (جس کا بیان آگے آیت جنت عدن یدخلونها الخ میں آئے گا) اور (اجرت کے علاوہ) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (بھی) دیں (مثلاً یہ کہ ایک نیکی کا ثواب دس کے برابر دیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: من جاء بالحسنة فله عشر امثالها) بیشک وہ بڑا بخشنے والا بڑا قدردان ہے (پس ان کے اعمال میں جو کچھ کوتاہی اور کمی رہ بھی گئی تھی اس کو معاف کر کے جس قدر تھوڑی بہت خوبی رہ گئی تھی اس کی ایسی قدر کی کہ اجرت کے علاوہ انعام بھی دیا)۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَٰبَ اللَّهِ: اس سے اتنا ثابت ہوا کہ تلاوت قرآن کو بھی دخول جنت میں دخل ہے، باقی اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ محض تلاوت پر دخول جنت موقوف ہو، اور خلاصہ تفسیر میں ''عمل'' کی قید اس لیے بڑھائی کہ بغیر عمل کے محض تلاوت کافی نہیں، اگرچہ کسی قدر ثواب مل

جاتا ہے، مگر کامل نجات تلاوت اور عمل دونوں کے ملنے سے ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو اللہ سے ڈر کر اس کی باتوں کو مانتے اور اس کی کتاب کو عقیدت کے ساتھ پڑھتے ہیں، نیز بدنی و مالی عبادات میں کوتاہی نہیں کرتے، وہ حقیقت میں ایسے زبردست بیوپار کے امیدوار ہیں، جس میں خسارے اور ٹوٹے کا کوئی احتمال نہیں، بلاشبہ جب خدا خود ان کے اعمال کا خریدار ہو تو اس امید میں یقیناً حق بجانب ہیں، نقصان کا اندیشہ کسی طرف سے نہیں ہو سکتا، ازسرتاپا نفع ہی نفع ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی بہت سے گناہ معاف فرماتا ہے اور تھوڑی سی طاعت کی قدر کرتا ہے اور ضابطہ سے جو ثواب ملنا چاہیے، بطور بخشش اس سے زیادہ دیتا ہے۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝۳۱

اور جو ہم نے تجھ پر اتاری کتاب وہی ٹھیک ہے تصدیق کرنے والی اپنے سے اگلی کتابوں کی بیشک اللہ اپنے بندوں سے خبردار ہے دیکھنے والا

خلاصہ تفسیر: اور (قرآن مجید پر عمل کرنے کی برکت سے جو ان کو اجر وفضل ملا سو واقعی قرآن مجید ایسی ہی چیز ہے، کیونکہ) یہ کتاب جو ہم نے آپ کے پاس وحی کے طور پر بھیجی ہے یہ بالکل ٹھیک ہے جو کہ اپنے سے پہلی کتابوں کی بھی (اس معنی میں) تصدیق کرتی ہے (کہ وہ کتابیں اصل میں حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں اگرچہ بعد میں جاہلوں نے ان میں تحریف کردی، غرض یہ کتاب ہر طرح کامل ہے، اور چونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی (حالت کی) پوری خبر رکھنے والا (اور ان کی مصلحتوں کو) خوب دیکھنے والا ہے (اس لئے اس وقت ایسی ہی کامل کتاب کا نازل کرنا قرین حکمت بھی تھا اور ظاہر ہے کہ کامل کتاب پر عمل کرنے والا بھی کامل اجر کا مستحق ہوگا جو کہ اصل اجر و انعام اور مزید فضل کا مجموعہ ہے، سو اس اجر وفضل کے افاضہ کے لئے یہ کتاب ہم نے آپ پر نازل کی)۔

* * *

فائدہ: یعنی بندوں کے احوال کو خوب جانتا ہے، ٹھیک موقع پر یہ کتاب اتاری۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ

پھر ہم نے وارث کیے کتاب کے وہ لوگ جن کو چن لیا ہم نے اپنے بندوں سے، پھر کوئی ان میں برا کرتا ہے اپنی جان کا

وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝۳۲

اور کوئی ان میں ہے بیچ کی چال پر، اور کوئی ان میں آگے بڑھ گیا ہے لیکر خوبیاں اللہ کے حکم سے، یہی ہے بڑی بزرگی

خلاصہ تفسیر: (اور) پھر یہ کتاب ہم نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچائی جن کو ہم نے اپنے (تمام دنیا جہان کے) بندوں میں سے (ایمان کے اعتبار سے) پسند فرمایا (مراد اس سے اہل اسلام ہیں جو ایمان کی وجہ سے تمام دنیا والوں میں مقبول عند اللہ ہیں اگرچہ ان میں کوئی دوسری وجہ مثلاً بدعملی موجب ملامت بھی ہو، مطلب یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں وہ کتاب پہنچائی) پھر (ان منتخب اور پسندیدہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں کہ) بعضے تو ان میں (کوئی گناہ کر کے) اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں، اور بعضے ان میں (جو نہ گناہ کرتے ہیں اور نہ طاعات میں فرائض و واجبات سے زیادہ کرتے ہیں) متوسط درجہ کے ہیں، اور بعضے ان میں وہ ہیں جو خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں (کہ گناہوں سے بھی بچتے ہیں اور فرائض و واجبات کے علاوہ بہت کچھ نیکیاں کرتے رہتے ہیں، غرض ہم نے تینوں قسم کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں وہ کتاب پہنچائی اور) یہ (یعنی

ایسی کامل کتاب کا پہنچا دینا خدا کا) بڑا فضل ہے (کیونکہ اس پر عمل کرنے کی بدولت وہ کیسے اجر وثواب کے مستحق ہو گئے)۔

مذکورہ تفسیر سے یہ ثابت ہوا کہ الذین اصطفینا سے مراد امت محمدیہ ہے اور اس کی یہ تین قسمیں ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ اس کی پہلی قسم یعنی ظالم بھی: الذین اصطفینا یعنی اللہ کے پسندیدہ اور منتخب بندوں میں شامل ہیں، اس کو بظاہر مستبعد سمجھ کر بعض لوگوں نے کہا کہ پہلی قسم امت محمدیہ اور اصطفینا سے خارج ہے، مگر بہت سی احادیث صحیحہ معتبرہ سے ثابت ہے کہ یہ تینوں قسمیں امت محمدیہ کی ہیں اور اصطفینا کے وصف سے خارج نہیں، یہ امت محمدیہ کے مومن بندوں کی انتہائی خصوصیت اور فضیلت ہے کہ ان میں جو عملی طور پر ناقص بھی ہیں وہ بھی اس شرف میں داخل ہیں، حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت مذکورہ الذین اصطفینا کی تینوں قسموں کے متعلق فرمایا کہ یہ سب ایک ہی مرتبے میں ہیں اور سب جنت میں ہیں، ایک مرتبہ میں ہونے سے مراد یہ ہے کہ سب کی مغفرت ہو جائے گی اور سب جنت میں جائیں گے، یہ مطلب نہیں کہ درجات کے اعتبار سے ان میں تفاضل نہ ہوگا، اور طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وکلھم من ھذہ الامۃ"، یعنی یہ تینوں قسمیں اسی امت محمدیہ میں سے ہوں گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلی قسم یعنی اعمال میں کوتاہی کرنے والوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کا ساری امت محمدیہ کو اصطفینا (ہم نے چن لیا) کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ مطلق اصطفاء ہر مؤمن کو حاصل ہے اور اسی کو "ولایت عامہ" کہتے ہیں (یعنی جو شخص بھی ایمان والا ہے وہ ولایت میں شامل ہے، لیکن ولایت میں مراتب ہیں جس درجہ کا تقویٰ اور ایمان ہوگا اسی درجہ کی ولایت حاصل ہوگی)۔

* * *

فائدہ: یعنی پیغمبر کے بعد اس کتاب کا وارث اس امت کو بنایا جو بحیثیت مجموعی تمام امتوں سے بہتر و برتر ہے، ہاں! امت کے سب افراد یکساں نہیں، ان میں وہ بھی ہیں جو باوجود ایمان صحیح کے گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں (یہ ظالم لنفسہ ہوئے)

- اور وہ بھی ہیں جو میانہ روی سے رہتے ہیں، نہ گناہوں میں منہمک، نہ بڑے بزرگ اور ولی (انکو مقتصد فرمایا)

اور ایک وہ کامل بندے جو اللہ کے فضل و توفیق سے آگے بڑھ بڑھ کر نیکیاں سمیٹتے اور تحصیل کمال میں مقتصدین سے آگے نکل جاتے ہیں، وہ مستحب چیزوں کو بھی نہیں چھوڑتے، اور گناہ کے خوف سے مکروہ تنزیہی بلکہ بعض مباحات تک سے پرہیز کرتے ہیں، اعلیٰ درجہ کی بزرگی اور فضیلت تو ان کو ہے، ویسے چنے ہوئے بندوں میں ایک حیثیت سے سب کو شمار کیا، کیونکہ درجہ بدرجہ بہشتی سب ہیں، گنہگار بھی اگر مومن ہے تو بہر حال کسی نہ کسی وقت ضرور جنت میں جائے گا، حدیث میں فرمایا کہ ہمارا گناہ گار معاف ہے، یعنی آخر کار معافی ملے گی اور میانہ سلامت ہے اور آگے بڑھے، سو سب سے آگے بڑھے، اللہ کریم ہے، اس کے یہاں بخل نہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾

باغ ہیں بسنے کے جن میں وہ جائیں گے وہاں ان کو گہنا پہنایا جائے گا کنگن سونے کے اور موتی کے اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہے۔1

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا

اور کہیں گے شکر اللہ کا جس نے دور کیا ہم سے غم، بیشک ہمارا رب بخشنے والا قدردان ہے۔2 جس نے اتارا ہم کو

دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾

آباد رہنے کے گھر میں اپنے فضل سے، نہ پہنچے ہم کو اس میں مشقت اور نہ پہنچے ہم کو اس میں تھکنا۔3

خلاصہ تفسیر: (اب آگے اس مذکورہ اجر و فضل کا بیان ہے کہ) وہ (اجر و فضل) باغات ہیں ہمیشہ رہنے کے جس میں یہ لوگ (جن

کا پیچھے آیت : ان الذین یتلون کتاب اللہ الخ میں ذکر ہوا) داخل ہوں گے (اور) ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے، اور پوشاک ان کی وہاں ریشم کی ہوگی، اور (وہاں داخل ہوکر) کہیں گے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم سے (ہمیشہ کے لئے رنج و) غم دور کیا بیشک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا بڑا قدردان ہے، جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ رہنے کے مقام میں لا اتارا جہاں نہ ہم کو کوئی کلفت پہنچے گی اور نہ ہم کو کوئی خستگی پہنچے گی (یہ تو کتاب اللہ اور اس کے احکام پر عمل کرنے والوں کا حال ہوا)۔

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ: دنیا میں مردوں کے لئے سونے کا زیور پہننا بھی حرام ہے اور ریشمی لباس بھی، اس کے عوض میں ان کو جنت میں یہ سب چیزیں دی جائیں گی، اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زیور پہننا تو عورتوں کا کام ہے، مردوں کے شایان شان نہیں، کیونکہ آخرت اور جنت کے حالات کو دنیا کے حالات پر قیاس کرنا بے عقلی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ے سونا اور ریشم مسلمان مردوں کے لیے وہاں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا جو کوئی (مرد) ریشمی (کپڑا) پہنے دنیا میں، نہ پہنے آخرت میں۔

فائدہ: ۲ے یعنی دنیا کا اور محشر کا غم دور کیا، گناہ بخشے اور از راہ قدردانی طاعت قبول فرمائی۔

فائدہ: ۳ے حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''رہنے کا گھر اس سے پہلے کوئی نہ تھا، ہر جگہ چل چلاؤ اور روزی کا غم، دشمنوں کا ڈر، اور رنج و مشقت، وہاں پہنچ کر سب کافور ہو گئے''۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ

اور جو لوگ منکر ہیں ان کے لیے ہے آگ دوزخ کی، نہ ان پر حکم پہنچے کہ مرجائیں اور نہ ان پر ہلکی ہو

مِّنْ عَذَابِهَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ ﴿٣٦﴾

وہاں کی کچھ کلفت، یہ سزا دیتے ہیں ہم ہر ناشکر کو

خلاصہ تفسیر: اور جو لوگ (ان کے برخلاف) کافر ہیں ان کے لئے دوزخ کی آگ ہے، نہ تو ان کو موت ہی آئے گی کہ مر ہی جائیں (اور مر کر چھوٹ جائیں) اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا، ہم ہر کافر کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

* * *

فائدہ: نہ کفار کو جہنم میں موت آئے گی کہ اسی سے تکالیف کا خاتمہ ہو جائے اور نہ عذاب کی تکلیف کسی وقت ہلکی ہوگی، ایسے ناشکروں کی ہمارے یہاں یہی سزا ہے۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا ۚ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ أَوَلَمْ

اور وہ چلائیں اس میں اے رب ہم کو نکال کہ ہم کچھ بھلا کام کرلیں وہ نہیں جو کرتے رہے ۱ے کیا ہم نے

نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ ۖ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ ﴿٣٧﴾ ع ۱۶

عمر نہ دی تھی تم کو اتنی کہ جس میں سوچ لے جس کو سوچنا ہو اور پہنچا تمہارے پاس ڈرانے والا، اب چکھو کہ کوئی نہیں گناہ گاروں کا مددگار ۲ے

خلاصہ تفسیر: اور وہ لوگ اس (دوزخ) میں (پڑے ہوئے) چلائیں گے، کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (یہاں سے) نکال لیجئے ہم (اب خوب) اچھے (اچھے) کام کریں گے برخلاف ان کاموں کے جو (پہلے) کیا کرتے تھے (ارشاد ہوگا کہ:) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ

دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہوتا وہ سمجھ سکتا اور (صرف عمر ہی دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ) تمہارے پاس (ہماری طرف سے) ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) بھی پہنچا تھا (کسی کے پاس بلا واسطہ اور کسی کے پاس واسطہ کے ذریعہ، مگر تم نے ایک نہ سنی) سو (اب اس نہ ماننے کا) مزہ چکھو کہ ایسے ظالموں کا (یہاں) کوئی مددگار نہیں (خدا تو ناراض ہونے کی وجہ سے مددگار نہیں، اور دوسرے لوگ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے مدد نہیں کر سکتے)۔

اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ: اس سے مراد بلوغت کی عمر ہے کہ بقدر ضرورت اس میں فہم کامل حاصل ہو جاتا ہے اس لیے اس عمر میں انسان مکلف ہو جاتا ہے، قتادہ سے درمنثور میں یہی تفسیر منقول ہے: "قال اعلموا ان طول العمر حجة نزلت وان فيهم لابن ثمان عشر سنة" قتادہ نے کہا ہے کہ عمر کا بڑھنا بھی انسان پر خدا کی حجت ہے، چنانچہ یہ آیت کفار کے حق میں نازل ہوئی ہے، حالانکہ ان میں اٹھارہ سال کی عمر کے بھی ہوں گے، اور اٹھارہ سال کی عمر سے مراد بلوغت ہے جیسا کہ امام صاحبؒ نے بلوغت کی اکثر مدت یہی ٹھہرائی ہے، اور بعض حدیثوں میں جو اس عمر کی تفسیر ساٹھ برس آئی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوگا کہ ساٹھ برس سے کم عمر حجت نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ساٹھ برس کی عمر سے تو اور بھی زیادہ حجت قائم ہوگی، خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کو صرف عمر بلوغ ملی اس کو بھی قدرت نے اتنا سامان دے دیا تھا کہ حق و باطل میں امتیاز کر سکے، جب نہ کیا تو وہ بھی مستحق ملامت و عذاب کا ہے، لیکن جس کو زیادہ عمر طویل ملی اس پر اللہ تعالیٰ کی حجت اور زیادہ پوری ہوگئی وہ اگر اپنے کفر و معصیت سے باز نہ آیا وہ زیادہ مستحق عذاب و ملامت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس وقت تو اسی کو بھلا سمجھتے تھے، پر اب وہ کام نہ کریں گے، ذرا دوزخ سے نکال دیجئے تو ہم خوب نیکیاں سمیٹ کر لائیں اور فرمانبردار بن کر حاضر ہوں۔

فائدہ: ۲ یہ جواب دوزخیوں کو دیا جائے گا، یعنی ہم نے تم کو عقل دی تھی، جس سے سمجھتے اور کافی عمر دی، جس میں سوچنا چاہتے تو سب نیک و بد سوچ کر سیدھا راستہ اختیار کر سکتے تھے، حتیٰ کہ تم میں بہت سے تو ساٹھ ستر برس دنیا میں زندہ رہ کر مرے، پھر اوپر سے ایسے اشخاص اور حالات بھیجے جو برے انجام سے ڈراتے اور خواب غفلت سے بیدار کرتے رہے، کیا اس کے بعد بھی کوئی عذر باقی رہا؟ اب بڑے عذاب کا مزہ چکھتے رہو اور کسی طرف سے مدد کی توقع نہ رکھو۔

إِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيۡبِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۳۸﴾

اللہ بھید جاننے والا ہے آسمانوں کا اور زمین کا، اس کو خوب معلوم ہے جو بات ہے دلوں میں

خلاصہ تفسیر: پیچھے اکثر آیات میں توحید کا بیان ہوا، اب پھر توحید کو ثابت اور شرک کو باطل کرتے ہیں اور درمیان میں کفر کی برائی بھی مذکور ہے۔

بیشک اللہ (ہی) جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کا بیشک وہی جاننے والا ہے دل کی باتوں کا (پس اس کا علم تو ایسا کامل ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اسے بندوں کے سب کھلے چھپے احوال و افعال اور دلوں کے بھید معلوم ہیں، کسی کی نیت اور استعداد اس سے پوشیدہ نہیں، اسی کے موافق معاملہ کرتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جو لوگ اب چلا رہے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دو، پھر ایسی خطا نہ کریں گے، وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں، اگر ستر دفعہ لوٹائے جائیں تب بھی شرارت سے باز نہیں آسکتے، ان کے مزاجوں کی افتاد ہی ایسی ہے: **وَلَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُهُوۡا عَنۡهُ وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ** (الانعام: ۲۸)

هُوَ الَّذِيۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ فِي الۡاَرۡضِ ؕ فَمَنۡ كَفَرَ فَعَلَيۡهِ كُفۡرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيۡدُ الۡكٰفِرِيۡنَ

وہی ہے جس نے کیا تم کو قائم مقام زمین میں ۱ پھر جو کوئی ناشکری کرے تو اس پر پڑے اس کی ناشکری، اور منکروں کو نہ بڑھے گی

كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

ان کے انکار سے ان کے رب کے سامنے مگر بیزاری، اور منکروں کو نہ بڑھے گا ان کے انکار سے مگر نقصان ۲؎

خلاصہ تفسیر: علمی کمال کے بعد اب عملی کمال بیان فرماتے ہیں جو کہ قدرت اور نعمت دونوں پر دلالت کرتا ہے وہ یہ کہ: اور وہی ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں آباد کیا (اور اس احسان کا تقاضا یہ تھا کہ ان دلیلوں اور نعمتوں میں غور کرتے اور شکر کرتے اور توحید واطاعت اختیار کر لیتے، مگر بعض اس کے خلاف کفر وعداوت پر جمے ہوئے ہیں) سو (کسی دوسرے کا کیا بگڑتا ہے، بلکہ) جو شخص کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر پڑے گا اور (اس وبال کی تفصیل یہ ہے کہ) کافروں کے لئے ان کا کفران کے پروردگار کے نزدیک ناراضگی ہی بڑھنے کا باعث ہوتا ہے (اور وہ ناراضگی دنیا ہی میں ہوجاتی ہے) اور (نیز) کافروں کے لئے ان کا کفر (آخرت میں) خسارہ ہی بڑھنے کا باعث ہوتا ہے (اور خسارہ یہ ہے کہ وہ جنت سے محروم رہیں گے اور جہنم کا ایندھن بنیں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگلی امتوں کی جگہ تم کو زمین پر آباد کیا اور ان کے بعد ریاست دی، چاہیے اب اس کا حق ادا کرو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کفر و ناشکری اور اللہ کی آیات کے انکار سے اس کا کچھ نقصان نہیں، وہ ہماری حمد وشکر سے مستغنی ہے، البتہ ناشکری کرنے والے پر اس کے فعل کا وبال پڑتا ہے، کفر کا انجام بجز اس کے کچھ نہیں کہ اللہ کی طرف سے برابر ناراضی اور بیزاری بڑھتی جائے اور کافر کے نقصان و خسران میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ

تو کہہ بھلا دیکھو تو اپنے شریکوں کو جن کو پکارتے ہو اللہ کے سوا، دکھلاؤ تو مجھ کو کیا بنایا انہوں نے زمین میں

اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ

یا کچھ انکا ساجھا ہے آسمانوں میں ۱؎ یا ہم نے دی ہے انکو کوئی کتاب سو وہ سند رکھتے ہیں اسکی ۲؎ کوئی نہیں پر جو وعدہ بتلاتے ہیں گناہ گار

بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾

ایک دوسرے کو سب فریب ہے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اور یہ جو کفر وشرک پر جمے ہوئے ہیں) آپ (ان سے ذرا یہ تو) کہئے کہ تم اپنے قرار دادہ شریکوں کا حال تو بتلاؤ جن کو تم خدا کے سوا پوجا کرتے ہو، یعنی مجھ کو یہ بتلاؤ کہ انہوں نے زمین کا کونسا حصہ بنایا ہے یا ان کا آسمان (بنانے) میں کچھ ساجھا ہے (تاکہ عقلی دلیل سے ان کا مستحق عبادت ہونا ثابت ہو، کیونکہ معبود وہی ہوسکتا ہے جو عالم کا پیدا کرنے والا ہو) یا ہم نے ان (کافروں) کو کوئی کتاب دی ہے (جس میں شرک وکفر کے اعتقاد کا صحیح ہونا لکھا ہو) کہ یہ اس کی دلیل پر قائم ہوں (اور اس نقلی دلیل سے اپنے دعوے کو ثابت کر دیں، اصل یہ ہے کہ ان کے پاس نہ عقلی دلیل ہے نہ نقلی دلیل) بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے نری دھوکہ کی باتوں کا وعدہ کرتے آئے ہیں (کہ ان کے بڑوں نے ان کو بے سند غلط بات بتلادی کہ: ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ یعنی یہ معبود خدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہوں گے، حالانکہ واقع میں وہ محض بے اختیار ہیں، پس وہ عبادت کے مستحق بھی نہیں ہوسکتے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اپنے معبودوں کے احوال میں غور کر کے مجھے بتلاؤ کہ زمین کا کون سا حصہ انہوں نے بنایا، یا آسمانوں کے بنانے اور تھامنے میں ان کی کس قدر شرکت ہے، اگر کچھ نہیں تو آخر خدا کس طرح بن بیٹھے؟! کچھ تو عقل سے کام لو۔

فائدہ: ۲ یعنی عقل نہیں تو کوئی معتبر نقلی دلیل پیش کرو، جس کی سند پر یہ مشرکانہ دعویٰ کرتے ہو۔

فائدہ: ۳ یعنی عقلی یا نقلی دلیل کوئی نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ ان میں سے بڑے چھوٹوں کو اور اگلے پچھلوں کو شیطان کے اغواء سے یہ وعدہ بتلاتے چلے آئے کہ **ھٰؤلاء شفعآؤنا عند اللہ** (یہ بت وغیرہ اللہ کے ہاں ہمارے شفیع بنیں گے) اور اس کا قرب عطا کرینگے، حالانکہ یہ خالص دھوکہ اور فریب ہے، یہ تو کیا شفیع بنتے، بڑے سے بڑا مقرب بھی وہاں کفار کی سفارش میں زبان نہیں ہلاسکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمۡسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا ۚ وَلَئِنۡ زَالَتَاۤ اِنۡ اَمۡسَكَهُمَا مِنۡ اَحَدٍ

تحقیق اللہ تھام رہا ہے آسمانوں کو اور زمین کو کہ ٹل نہ جائیں ، اور اگر ٹل جائیں تو کوئی نہ تھام سکے ان کو

مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيۡمًا غَفُوۡرًا ﴿۴۱﴾

اس کے سوا ۱ وہ ہے تحمل والا بخشنے والا ۲

خلاصہ تفسیر: البتہ حق تعالیٰ مختار و قادر مطلق ہے تو وہی عبادت کے قابل بھی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے مختار اور دوسروں کے بے اختیار ہونے کے دلائل میں سے نمونہ کے طور پر ایک مختصر سی بات بیان کرتے ہیں کہ دیکھو یہ تو:

یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو (اپنی قدرت سے) تھامے ہوئے ہے کہ وہ موجودہ حالت کو چھوڑ نہ دیں اور اگر (بالفرض) وہ موجودہ حالت کو چھوڑ بھی دیں تو پھر خدا کے سوا اور کوئی ان کو تھام بھی نہیں سکتا (جب دوسروں سے عالم کی حفاظت بھی نہیں ہوسکتی تو عالم کو وجود میں لانے اور ایجاد کرنے کی ان سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے، پھر وہ عبادت کے مستحق کیسے ہوسکتے ہیں، اور شرک وکفر کے باطل ہونے کے باوجود پھر بھی اس کو اختیار اس کا تقاضا کرتا ہے کہ ان کو ابھی سزا دی جائے مگر چونکہ) وہ حلیم (ہے اس لئے مہلت دے رکھی ہے اور اگر اس مہلت میں یہ لوگ حق کی طرف آجائیں تو چونکہ وہ) غفور (بھی) ہے (اس لئے ان کی گزشتہ تمام شرارتیں معاف کردی جائیں گی)۔

يُمۡسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا: آسمانوں وزمین کو روکنے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی حرکت بند کردی، بلکہ مراد اپنی جگہ اور موجودہ حالت سے ہٹ جانا اور ٹل جانا ہے، جیسا کہ لفظ **ان تزولا** اس پر شاہد ہے، اس لئے اس آیت میں آسمان کے متحرک یا ساکن ہونے میں سے کسی جانب پر کوئی دلیل نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اسی کی قدرت کا ہاتھ ہے جو اتنے بڑے بڑے کرات عظام کو اپنے مرکز سے ہٹنے اور اپنے مقام و نظام سے ادھر ادھر سرکنے نہیں دیتا اور اگر بالفرض یہ چیزیں اپنی جگہ سے ٹل جائیں تو پھر بجز خدا کے کسی کی طاقت ہے کہ ان کو قابو میں رکھ سکے، چنانچہ قیامت میں جب یہ سارا نظام اللہ تعالیٰ درہم برہم کرے گا، کوئی قوت اسے روک نہ سکے گی۔

فائدہ: ۲ یعنی لوگوں کے کفر وعصیان کا اقتضاء تو یہ ہے کہ یہ سارا نظام ایک دم میں تہ وبالا کردیا جائے گا، لیکن اس کے تحمل و بردباری سے تھما ہوا ہے، اس کی بخشش نہ ہو تو سب دنیا ویران ہوجائے۔

وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَهُمۡ نَذِيۡرٌ لَّيَكُوۡنُنَّ اَهۡدٰى مِنۡ اِحۡدَى الۡاُمَمِ ۚ

اور قسمیں کھاتے تھے اللہ کی تاکید کی قسمیں اپنی کہ اگر آئے گا ان کے پاس کوئی ڈر سنانے والا البتہ بہتر راہ چلیں گے ہر ایک امت سے

فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝٤٢ اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ؕ

پھر جب آیا ان کے پاس ڈر سنانے والا اور زیادہ ہوگیا ان کا بدکنا، غرور کرنا ملک میں اور داؤ کرنا برے کام کا

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ؕ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ

اور برائی کا داؤ الٹے گا انہی داؤں والوں پر، پھر اب وہی راہ دیکھتے ہیں پہلوں کے دستور کی، سو تو نہ پائے گا

لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝٤٣

اللہ کا دستور بدلتا، اور نہ پائے گا اللہ کا دستور ٹلتا ؏

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید و رسالت اور قیامت کے ذکر میں ضمناً کفار کی تکذیب اور انکار کا چند جگہ بیان ہوا ہے، اب آگے اس انکار و تکذیب پر ملامت اور تشنیع اور اس پر دھمکی دیتے ہوئے سورت مکمل کرتے ہیں۔

اور ان کفار (قریش) نے (رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل) بڑی زوردار قسم کھائی تھی کہ اگر ان کے (یعنی ہمارے) پاس کوئی ڈرانے والا (یعنی پیغمبر) آئے تو وہ (یعنی ہم) ہر ہر امت سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے ہوں (یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ کی طرح ہم رسول کی تکذیب نہ کریں گے سو پہلے سے تو یہ قسمیں کھایا کرتے تھے) پھر جب ان کے پاس ایک پیغمبر (یعنی رسول اللہ ﷺ) آپہنچے تو اب ان کی نفرت ہی کو ترقی ہوئی دنیا میں اپنے کو بڑا سمجھنے کی وجہ سے اور (صرف نفرت ہی پر اکتفا نہیں ہوا، بلکہ) ان کی بری تدبیروں کو (بھی ترقی ہوئی، یعنی تکبر کی وجہ سے آپ کے اتباع سے عار تو ہوئی ہی تھی، مگر یہ بھی نہ کیا کہ اگر اتباع کی توفیق نہ ہوئی تھی تو آپ کو ایذا ہی نہ پہنچاتے مگر وہ تو اور الٹے ایذا رسانی کی فکر میں لگ گئے، چنانچہ ان کا ہر وقت اسی میں لگا رہنا معلوم و مشہور ہے) اور (یہ جو کچھ ہمارے رسول کے لئے بری بری تدبیریں کر رہے ہیں خود اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، کیونکہ) بری تدبیروں کا وبال (حقیقی) ان تدبیر والوں پر ہی پڑتا ہے (اگرچہ ظاہر میں کبھی اس شخص کو بھی نقصان پہنچ جائے جس کو نقصان پہنچانا چاہا ہے، لیکن وہ دنیوی نقصان ہے، اور نقصان پہنچانے والے ظالم پر آخرت میں ضرور وبال پڑے گا، اور دنیوی نقصان اخروی نقصان کے سامنے کچھ بھی نہیں، پس اس حقیقی نقصان کے اعتبار سے حصر بالکل واقعی ہے) سو (یہ جو آپ کی دشمنی اور نقصان پہنچانے پر جمے ہوئے ہیں تو) کیا یہ (اپنے ساتھ بھی حق تعالیٰ کے) اسی دستور کے منتظر ہیں جو اگلے (کافر) لوگوں کے ساتھ ہوتا رہا ہے (یعنی عذاب و ہلاکت) سو (واقعی ان کے لئے بھی یہی ہونا ہے کیونکہ) آپ خدا کے (اس) دستور کو کبھی بدلتا ہوا نہ پائیں گے (کہ ان پر بجائے عذاب کے عنایت و رحمت ہونے لگے) اور (اسی طرح) آپ خدا کے (اس) دستور کو کبھی منتقل ہوتا ہوا نہ پائیں گے (کہ ان کی جگہ دوسروں کو عذاب ہونے لگے جو کافر نہ ہوں، مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ کافروں کو عذاب ہوگا، خواہ دنیا میں بھی خواہ یا صرف آخرت میں، اور حق تعالیٰ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے، پس نہ یہ احتمال ہے کہ ان کو عذاب نہ ہو، اور نہ یہ احتمال ہے کہ دوسرے بے گناہوں کو عذاب ہونے لگے، مقصود اس تکرار سے عذاب کے واقع ہونے کی تاکید ہے)۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ: درمنثور میں ابن ابی حاتم کے واسطہ سے ابوہلال سے یہ روایت منقول ہے کہ قریش کے لوگ آپ ﷺ کی نبوت سے پہلے کہتے تھے کہ اگر حق تعالیٰ ہمارے میں سے کوئی نبی بھیجیں تو ہم سے زیادہ کوئی امت خدا کی تابعدار اور نبی کی بات کو ماننے والی اور کتاب خداوندی کو مضبوطی کے ساتھ لینے والی نہ ہوگی، اس پر یہ آیت اور اس قسم کی چند دیگر آیات نازل ہوئیں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا: اس سے صوفیاء کی اس بات کی تائید ہوتی ہے جو وہ کہا کرتے ہیں کہ جس شخص کی استعداد فاسد اور خراب ہوتی ہے وظائف، اشغال، اذکار و اوراد سے اس کا مرض اور بڑھ جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے آپ کو بزرگوں میں شمار کرنے لگتا ہے،

یہاں آیت نے اس کا مرض تکبر قرار دیا ہے اور استکبارا فی الارض سے اسی طرف اشارہ ہے۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا: بعض تعلیم یافتہ لوگ اس آیت سے معجزات کے انکار پر استدلال کرتے ہیں کہ معجزات قانون قدرت کے خلاف ہیں اور قانون قدرت کا بدلنا ہے اور دلیل میں یہ آیت پیش کر دیتے ہیں، پس وہ لوگ آیت کی اس تفسیر میں غور کریں تو ان کے شبہ میں اس کی اصلا گنجائش نہ رہے گی، کیونکہ اس تفسیر سے معلوم ہو گیا کہ ''سنت اللہ'' سے نظام عالم کا قانون مراد نہیں ہے، بلکہ ''وعدہ خداوندی'' مراد ہے، اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ''سنت اللہ'' سے قانون قدرت اور نظام عالم ہی مراد ہے تب بھی ان کا استدلال غلط ہے، کیونکہ آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کے طریقہ کو کوئی دوسرا بدل نہیں سکتا، اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ خدا خود بھی نہیں بدل سکتا، اور ظاہر ہے کہ معجزات میں قانون قدرت کے خلاف خدا تعالیٰ خود کر دیتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں کرتا، اس کے متعلق مزید مضمون سورہ نحل آیت ۶۱ میں ملاحظہ کر لیا جائے۔

* * *

فائدہ: ۱ عرب کے لوگ جب سنتے کہ یہود وغیرہ دوسری قوموں نے اپنے نبیوں کی یوں نافرمانی کی، تو کہتے کہ کبھی ہم میں ایک نبی آئے تو ہم ان قوموں سے بہتر نبی کی اطاعت و رفاقت کر کے دکھلائیں، جب اللہ نے نبی بھیجا جو سب نبیوں سے عظمت شان میں بڑھ کر ہے تو حق سے اور زیادہ بدکنے لگے، ان کا غرور تکبر کہاں اجازت دیتا کہ نبی کے سامنے گردن جھکائیں، رفاقت اور اطاعت اختیار کرنے کے بجائے عداوت پر کمربستہ ہو گئے اور طرح طرح کی مکر و تدبیریں اور داؤ گھات شروع کر دیے، مگر یاد رہے کہ برا داؤ خود داؤ کرنے والوں پر الٹے گا، گو چند روز عارضی طور پر اپنے دل میں خوش ہو لیں کہ ہم نے تدبیریں کر کے یوں نقصان پہنچا دیا، لیکن انجام کار دیکھ لیں گے کہ واقع میں نقصان عظیم کس کو اٹھانا پڑا؟ فرض کرو دنیا میں ٹل بھی گیا تو آخرت میں تو یقیناً یہ مشاہدہ ہو کر رہے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی یہ اسی کے منتظر ہیں کہ جو گزشتہ مجرموں کے ساتھ معاملہ ہوا، ان کے ساتھ بھی ہو، سو باز نہ آئے تو وہ ہی ہو کر رہے گا، اللہ کا جو دستور مجرموں کی نسبت سزا دینے کا رہا، نہ وہ بدلنے والا ہے کہ بجائے سزا کے ایسے مجرموں پر انعام و اکرام ہونے لگے اور نہ ٹلنے والا کہ مجرم سے سزا ٹل کر غیر مجرم کو دے دی جائے۔

اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا

کیا پھرے نہیں ملک میں کہ دیکھ لیں کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے اور تھے

اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ ؕ

ان سے بہت سخت زور میں، اور اللہ وہ نہیں جس کو تھکائے کوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں

اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا ﴿۴۴﴾

وہی ہے سب کچھ جانتا کر سکتا

خلاصہ تفسیر: اور (کفار جو یوں سمجھتے ہیں کہ کفر کرنا عذاب کا سبب نہیں تو یہ ان کی بڑی غلطی ہے) کیا یہ لوگ زمین میں (مثلاً شام اور یمن کے سفروں میں عاد و ثمود و قوم لوط علیہم السلام کی بستیوں میں) چلے پھرے نہیں جس میں دیکھتے بھالتے کہ جو (منکر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا (آخری) انجام (اسی جھٹلانے کے سبب) کیا ہوا (کہ ان پر عذاب نازل ہوا) حالانکہ وہ قوت میں ان سے بڑھے ہوئے تھے اور (کسی میں خواہ کیسی ہی قوت ہو لیکن) خدا ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز (قوت والی) اس کو ہرا دے نہ آسمان میں اور نہ زمین میں (کیونکہ) وہ بڑے علم والا (اور) بڑی قدرت والا ہے (پس علم سے اپنے ہر ارادہ کو نافذ کرنے کا طریقہ جانتا ہے، اور اپنی قدرت سے اس کو نافذ کر سکتا ہے، اور دوسرا کوئی ایسا ہے

نہیں، پھر اس کو کون چیز ہرا سکتی ہے)۔

فائدہ: یعنی بڑے بڑے زور آور مدعی اللہ کی گرفت سے نہ بچ سکے مثلاً عاد وثمود وغیرہ، یہ بیچارے تو چیز کیا ہیں!! خوب سمجھ لو کہ آسمان و زمین کی کوئی طاقت اللہ کو عاجز نہیں کر سکتی، علم اس کا محیط اور قدرت اس کی کامل، پھر معاذ اللہ عاجز ہو تو کدھر سے ہو۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ

اور اگر پکڑ کرے اللہ لوگوں کی ان کی کمائی پر نہ چھوڑے زمین کی پیٹھ پر ایک ہلنے چلنے والا ۱ پر ان کو ڈھیل دیتا ہے

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

ایک مقرر وعدہ تک، پھر جب آئے ان کا وعدہ تو اللہ کی نگاہ میں ہیں اس کے سب بندے ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اگر یہ لوگ اس دھوکہ میں ہوں کہ اگر ہم کو عذاب ہونا ہوتا تو ہو چکا ہوتا، دیر کیوں ہو رہی ہے، اور اس سے وہ اپنے شرک وکفر کے اچھے ہونے پر استدلال کریں تو یہ بھی ان کی غلطی ہے، کیونکہ حکمت کی وجہ سے ان کے لئے فوری عذاب تجویز نہیں کیا گیا ورنہ) اگر اللہ تعالیٰ (ان) لوگوں پر ان کے (کفریہ) اعمال کے سبب (فوراً) دار وگیر فرمانے لگتا تو روئے زمین پر ایک متنفس کو نہ چھوڑتا (کیونکہ کفار تو کفر سے ہلاک ہو جاتے اور اہل ایمان کم ہونے کی وجہ سے دنیا میں نہ رکھے جاتے، کیونکہ نظام عالم بہت سی حکمتوں کی وجہ سے ان دونوں کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ ضروری نہیں کہ مسلمان بھی اسی عذاب سے ہلاک ہوتے، بلکہ وہ اور کسی طریقہ سے ہلاک کر دیے جاتے اور دوسری مخلوقات اس لئے ہلاک کر دی جاتیں کہ ان کے پیدا کرنے سے مقصود بنی آدم کا نفع اور فائدہ ہے، جب یہ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ رہتے) لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک میعاد معین (یعنی قیامت) تک مہلت دے رہا ہے، سو جب ان کی وہ میعاد آ پہنچے گی (اس وقت) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لے گا (یعنی ان میں جو کفار ہوں گے ان کو سزا دے لے گا)۔

سورہ نحل آیت ۶۱ میں ایسا ہی مضمون گذر چکا ہے، مزید وضاحت وہاں دیکھ لی جائے۔

فائدہ: ۱ یعنی لوگ جو گناہ کماتے ہیں، اگر ان میں سے ہر ہر جزئی پر گرفت شروع کر دے تو کوئی جاندار زمین میں باقی نہ رہے، نافرمان تو اپنی نافرمانی کی وجہ سے تباہ کر دیے جائیں اور کامل فرمانبردار جو عادۃً بہت تھوڑے ہوتے ہیں قلت کی وجہ سے اٹھا لیے جائیں، کیونکہ نظام عالم کچھ ایسے انداز پر قائم کیا گیا ہے کہ محض معدودے چند انسانوں کا یہاں بستے رہنا خلاف حکمت ہے، پھر جب انسان آباد نہ رہے تو حیوانات کاہے کے لیے رکھے جائیں گے، ان کا وجود بلکہ تمام عالم ہستی تو اس حضرت انسان کے لیے ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی ایک مقرر میعاد اور حد معین تک اللہ نے ڈھیل دے رکھی ہے کہ ہر ایک جرم پر فوراً گرفت نہیں کرتا، جب وقت موعود آ جائے گا تو یاد رکھو سب بندے اس کی نگاہ میں ہیں، کسی کا ایک ذرہ بھر برا یا بھلا عمل اس کے علم سے باہر نہیں، پس ہر ایک کا اپنے علم محیط کے موافق ٹھیک ٹھیک فیصلہ فرما دے گا، نہ مجرم کہیں چھپ سکے نہ مطیع کا حق مارا جائے۔

اللھم اجعلنا ممن یطیعک واغفر لنا ذنوبنا انک انت الغفور الرحیم

اٰیاتھا ۸۳ ｜ ۳۶ سُوْرَۃُ یٰسٓ مَکِّیَّۃٌ ۴۱ ｜ رکوعاتھا ۵

خلاصہ تفسیر: دین کے اصول تین ہیں: ① توحید ② رسالت ③ اور قیامت، سورت کا آغاز رسالت کے مضمون سے فرمایا، بعد ازاں دلائل توحید کو بیان کیا، پھر اخیر میں حشر ونشر اور معاد جسمانی پر مفصل اور مدلل کلام کیا اور اسی پر سورت کو ختم کیا، گذشتہ سورت میں زیادہ تر توحید اور رسالت کا مضمون تھا اور آخر میں رسالت کے انکار پر کفار کو دھمکی دی گئی تھی اور یہ سورت رسالت کے اثبات سے شروع ہوئی، جس سے ان دونوں کے آغاز وانجام میں مناسبت ظاہر ہے، پھر اخیر سورت تک اثبات توحید اور اثبات حشر ونشر کا مضمون چلا گیا جس پر دل اور روح کی زندگی کا دارومدار ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

یٰسٓ ۝۱ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ ۝۲ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝۳ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۴

یٰس، قسم ہے اس پکے قرآن کی، تو تحقیق ہے بھیجے ہوؤں میں سے، او پر سیدھی راہ کے ۱

تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ۝۵

اتارا زبردست رحم والے نے ۲

خلاصہ تفسیر: یٰسٓ (اس کی مراد اللہ ہی کو معلوم ہے) قسم ہے قرآن باحکمت کی کہ بیشک آپ من جملہ پیغمبروں کے ہیں (اور) سیدھے رستہ پر ہیں (کہ اس میں جو کوئی آپ کی پیروی کرے خدا تک پہنچ جائے گا، نہ کہ جیسا کفار کہتے ہیں: لست مرسلاً، یعنی آپ رسول نہیں، یا کہتے تھے: بل افتراہ یعنی آپ نے خود گھڑلیا ہے، جس کے لئے گمراہ ہونا لازم ہے تو یہ بالکل غلط بات ہے، اور قرآن عمومی ہدایت کے ساتھ آپ کی رسالت ونبوت کی دلیل بھی ہے کیونکہ) یہ قرآن خدائے زبردست مہربان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ: قرآن کی قسم اگر کلام نفسی کے اعتبار سے تب تو غیر مخلوق کی قسم ہے، کیونکہ کلام نفسی کے مرتبہ میں وہ خدا کی صفت ہے، اور اگر کلام لفظی کے اعتبار سے ہے تو مخلوق کی قسم ہے، اور مخلوقات کے ساتھ قسم کھانے کی توجیہ سورہ حجر آیت ۷۲ کی تفسیر میں گذر چکی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قرآن کریم اپنی اعجازی شان، پُرحکمت تعلیمات، اور پختہ مضامین کے لحاظ سے بڑا زبردست شاہد اس بات کا ہے کہ جو نبی امی اس کو لے کر آیا یقیناً وہ اللہ کا بھیجا ہوا اور بیشک وشبہ سیدھی راہ پر ہے۔ اس کی پیروی کرنے والوں کو کوئی اندیشہ منزل مقصود سے بھٹکنے کا نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی یہ دین کا سیدھا راستہ یا قرآن حکیم اس خدا کا اتارا ہوا ہے جو زبردست بھی ہے کہ منکر کو سزا دیے بغیر نہ چھوڑے، اور رحم فرمانے والا بھی کہ ماننے والوں کو نوازش وبخشش سے مالا مال کردے، اسی لیے آیات قرآنیہ میں بعض آیات شان لطف ومہر کا اور بعض شان غضب وقہر کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۶ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤی اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۷

تاکہ تو ڈرائے ایک قوم کو کہ ڈر نہیں سنا انکے باپ دادوں نے، سو انکو خبر نہیں، ثابت ہو چکی ہے بات ان میں بہتوں پر سو وہ نہ مانیں گے ۱

خلاصہ تفسیر: (اور آپ پیغمبر اس لئے بنائے گئے ہیں) تاکہ آپ (اولاً) ایسے لوگوں کو (عذاب خداوندی سے) ڈرائیں جن

کے باپ دادے (قریب کے کسی رسول کے ذریعہ سے) نہیں ڈرائے گئے تھے سو اسی سے یہ بے خبر ہیں (اور آپ کی رسالت کے صحیح اور قرآن کے سچا ہونے کے باوجود یہ لوگ جو نہیں مانتے تو آپ اس کا غم نہ کیجئے ، کیونکہ) ان میں اکثر لوگوں پر (تقدیری) بات ثابت ہوچکی ہے (وہ بات یہ ہے : لاملئن جھنم من الجنة والناس اجمعین کہ میں جہنم کو بعض جنوں اور بعض آدمیوں سے بھر دوں گا ، تو بعض آدمی جہنمی بھی ہوں گے جن میں سے یہ لوگ بھی ہیں جو آپ کی رسالت کا انکار کررہے ہیں) سو یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لائیں گے (یہ حال ان کے اکثر کا تھا اور بعض کی قسمت میں ایمان لانا بھی تھا وہ ایمان بھی لے آئے)۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ : کیونکہ اگرچہ عرب میں پہلے رسولوں کی بعض باتیں منقول ہوتی چلی آتی تھیں جیسا اس آیت میں ہے : ام جاءھم مالم یات اباءھم الاولین یعنی کیا قرآن ان کے پاس کوئی ایسی چیز لایا ہے جو ان کے آباء کے پاس نہیں آئی تھی ، یعنی دعوت توحید کوئی نئی چیز نہیں ، یہ ہمیشہ ان کے آباء واجداد میں بھی جاری رہی ہے ، مگر پھر بھی نبی کے آنے سے جس قدر تنبہ ہوتا ہے محض احکام کے منقول ہونے سے بالخصوص جبکہ وہ ناتمام اور بدلے ہوئے بھی ہوں ویسا تنبہ نہیں ہوتا ، اور آپ ﷺ کا ڈرانا اولا قریش کو تھا ، اس لیے اس جگہ انہی کا ذکر فرمایا ، پھر عام لوگوں کو بھی آپ نے دعوت فرمائی ، کیونکہ آپ ﷺ کی نبوت وبعثت عام ہے ، اور چونکہ آپ کی شریعت کے محفوظ رکھنے کا وعدہ خدا تعالی نے فرمایا ہے اس لیے آپ کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہیں رہی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بہت کٹھن کام آپ کے سپرد ہوا ہے کہ اس قوم (عرب) کو آپ قرآن کے ذریعہ سے ہوشیار و بیدار کریں ، جس کے پاس صدیوں سے کوئی جگانے والا نہیں بھیجا تھا ، وہ جاہل وغافل قوم جسے نہ خدا کی خبر نہ آخرت کی ، نہ ماضی سے عبرت نہ مستقبل کی فکر ، نہ مبداء پر نظر نہ منتہاء پر ، نہ نیک وبد کی تمیز نہ بھلے برے کا شعور ، اس کو اتنی ممتد جہالت وغفلت کی اندھیروں سے نکال کر رشد وہدایت کی صاف سڑک پر لا کھڑا کرنا کوئی معمولی اور سہل کام نہیں ہے۔ بلاشبہ آپ (ﷺ) پوری قوت اور زور شور کے ساتھ ان کو اس غفلت وجہالت کے خوفناک نتائج اور بھیانک مستقبل سے ڈرا کر فلاح وبہبود کے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے کی کوشش کریں گے ، تاکہ یہ قوم اپنی اعلیٰ کامیابی سے تمام عالم کے لیے کامیابی کا دروازہ کھول دے ، لیکن بہت افراد وہ ملیں گے جو کسی قسم کی نصیحت پر کان دھرنے والے نہیں ، اسی لیے ان پر سے شیطان پوری طرح مسلط ہوجاتا ہے ، جو ان کی حماقتوں اور شرارتوں کو ان کی نگاہ میں خوشنما کرکے دکھلاتا اور اگلے پچھلے سب احوال کو خواہ کتنے ہی گندے ہوں ، خوبصورت بنا کر ظاہر کرتا ہے ، آخر یہ لوگ دوسری زندگی سے بالکل منکر ہوکر اپنی فانی خوہشات ہی کو قبلہ مقصود ٹھہرا لیتے ہیں ، اس وقت ایک طرف سے شیطان کی بات : لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (ص : ۸۲ ۔ ۸۳) (مخلصین کے سوا میں سب کو بہکا کر رہوں گا) سچی ہوتی ہے اور دوسری طرف حق تعالیٰ کا قول : لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (تجھ سے اور تیرے پیروؤں سے دوزخ کو بھر دوں گا) ثابت اور چسپاں ہوجاتا ہے ، باقی علم الٰہی میں تو ازل سے ثابت ہے کہ فلاں قوم کے فلاں فلاں افراد اپنی بدتمیزی اور لاپروائی سے شیطان کے اغواء میں پھنس کر عذاب الٰہی کے مستحق ہوں گے ، ایسے لوگوں کے راہ پر آنے اور ماننے کی کیا توقع ہوسکتی ہے ، پس آپ کو سلسلہ انذار واصلاح میں اگر ایسے ہمت شکن واقعات کا مقابلہ کرنا پڑے تو ملول وغمگین نہ ہوں ، اپنا فرض ادا کیے جائیں اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کردیں ، تقریر بالا کو سمجھنے کے لیے یہ آیات پیش نظر رکھیے :

(الف) وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (الزخرف : ۳۶ ۔ ۳۷) معلوم ہوا کہ شیطان ابتداء کسی پر مسلط نہیں کیا جاتا ، بلکہ اندھا بن کر نصیحت سے اعراض کرتے رہنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آخر کار شیطان مسلط ہوجائے ، جیسے ہاتھ پاؤں سے مدت تک کام نہ لے تو وہ عضو بیکار کردیا جاتا ہے ، قال تعالیٰ : فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف : ۵) وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (الانعام : ۱۱۰)

(ب) وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ (فصلت : ۲۵)

تسلط کے بعد شیطان یہ کام کرتا ہے جس کا نتیجہ حق علیھم القول ہے۔

(ج) وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِیْۤ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ (الاحقاف:۱۷-۱۸)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ لفظ حق القول ان لوگوں پر صادق آتا ہے جو موت کے بعد کی دوسری زندگی کا یقین ہی نہیں رکھتے، نہ برائی کو برائی سمجھتے ہیں، بلکہ اغوائے شیطانی سے اپنی بدیوں کو نیکی اور گمراہی کو ہدایت تصور کر لیتے ہیں، کیسے ہی معقول دلائل سنایئے اور کھلے کھلے نشان دکھلایئے، سب کو جھٹلاتے رہیں اور فضول حجتیں نکالتے رہیں، بظاہر ہادیوں اور پیغمبروں کی بات کی طرف کان جھکائیں، مگر ایک حرف سمجھنے کی کوشش نہ کریں، محض ہوا وہوس کو اپنا معبود ٹھہرالیں، نہ عقل سے کام لیں نہ آنکھوں سے، یہ ہی لوگ ہیں جن کے اعراض وعناد کے نتیجہ میں آخر کار اللہ تعالیٰ دلوں پر مہر کر دیتا ہے کہ ان میں خیر کے گھسنے کی پھر ذرا گنجائش نہیں رہتی، جیسے کوئی شخص اپنے اوپر روشنی کے سب دروازے بند کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کو اندھیرے میں چھوڑ دیتا ہے، یا ایک بیمار دوا پینے کی قسم کھالے، طبیب سے روشنی کرے اور ہر قسم کی بد پرہیزی پر تیار ہو جائے تو اللہ اس کے مرض کو مہلک بنا دیتا اور مایوسی کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے، فرماتے ہیں: تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِیْنَ (الاعراف:۱۰۱) ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ (یونس:۷۴) وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ (الروم:۵۸ تا ۶۰) كَذٰلِكَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۚ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (غافر:۳۴-۳۵) وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْكَ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۫ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ (محمد:۱۶) بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا (النساء:۱۵۵) كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (المطففین:۱۴) اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (الجاثیہ:۲۳) وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (الاعراف:۱۷۹) یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ ۖۚ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (المائدہ:۴۱)

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ⑧ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ

ہم نے ڈالے ہیں ان کی گردنوں میں طوق سو وہ ہیں ٹھوڑیوں تک پھر ان کے سر الل رہے ہیں[1] اور بنائی ہم نے ان کے آگے

سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ⑨

دیوار اور پیچھے دیوار پھر اوپر سے ڈھانک دیا، سو ان کو کچھ نہیں سوجھتا[2]

خلاصہ تفسیر: (اور ان کافروں کی مثال ایمان سے دوری میں ایسی ہوگئی کہ گویا) ہم نے ان کی گردنوں میں (بھاری بھاری) طوق ڈال دیئے ہیں پھر وہ تھوڑیوں تک (اڑ گئے) ہیں جس سے ان کے سر اوپر کو الل گئے (یعنی اوپر کو اٹھے رہ گئے نیچے کو نہیں ہو سکتے، سو جیسا کہ اس حالت میں آدمی راستہ نہیں دیکھ سکتا اسی طرح یہ لوگ سیدھا راستہ دیکھنے سے محروم ہو گئے، اور ان لوگوں کی مثال ایمان سے دوری میں ایسی ہوگئی کہ گویا) ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کردی اور ایک آڑ ان کے پیچھے کردی جس سے ہم نے (ہر طرف سے) ان کو (پردوں میں) گھیر دیا سو وہ (اس وجہ سے کسی چیز کو) نہیں دیکھ سکتے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یہ ان ہی لوگوں کے حق میں ہے جن کا ذکر گزشتہ فائدہ میں ہوا، یہ طوق عادات ورسوم حب جاہ و مال اور تقلید آباء واجداد کے تھے، جنہوں نے ان کے گلے سختی سے دبا رکھے تھے اور نخوت وتکبر کی وجہ سے ان کے سر نیچے نہیں جھکتے تھے۔

فائدہ: ۲۔ نبی کی عداوت نے ان کے اور قبول ہدایت کے درمیان دیواریں کھڑی کردی تھیں، جاہلانہ رسوم واطوار اور اہواء وآرائے فاسدہ کی اندھیریوں میں اس طرح بند تھے کہ اگلا پیچھا اور نشیب وفراز کچھ نظر نہ آتا تھا، نہ ماضی پر نظر تھی نہ مستقبل پر۔

باقی ان افعال کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف سے اس لیے کہ گئی کہ خالق خیر وشر کا وہی ہے اور اسباب پر مسببات کا ترتب اسی کی مشیت سے ہوتا ہے، امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دلائل آفاقیہ میں غور کرنے کی نفی ہوئی جیسا کہ: **فھم مقمحون** میں دلائل انفسیہ کی طرف ملتفت نہ ہونے کا اشارہ تھا، کیونکہ سر اوپر کو اٹھ رہا ہو جھک نہ سکے تو اپنے بدن پر نظر نہیں پڑ سکتی۔

وَسَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰﴾

اور برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے یقین نہیں کریں گے

خلاصہ تفسیر: اور (مذکورہ دونوں مثالوں سے حاصل یہ ہے کہ) ان کے حق میں آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں یہ (کسی حالت میں بھی) ایمان نہیں لائیں گے (اس لئے آپ ان سے مایوس ہوکر راحت حاصل کر لیجئے اور فکر میں نہ پڑیے)۔

* * *

فائدہ: ان کو برابر ہے لیکن آپ کے حق میں برابر نہیں، بلکہ ایسی سخت معاند اور سرکش قوم کو نصیحت کرنا اور اصلاح کے درپے ہونا عظیم درجات کے حصول کا سبب ہے اور کبھی یہ اخلاق دوسروں کی ہدایت کا باعث بن جاتا ہے، اسی طرح کی آیات سورہ بقرہ کے اوائل میں گزر چکی ہیں۔

اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكۡرَ وَخَشِىَ الرَّحۡمٰنَ بِالۡغَيۡبِ‌ۚ فَبَشِّرۡهُ بِمَغۡفِرَةٍ وَّاَجۡرٍ كَرِيۡمٍ ﴿۱۱﴾

تو تو ڈر سنائے اس کو جو چلے سمجھائے پر اور ڈرے رحمان سے بن دیکھے، سو اس کو خوشخبری دے معافی کی اور عزت کے ثواب کی

خلاصہ تفسیر: بس آپ تو (ایسا ڈرانا جس پر نفع مرتب ہو) صرف ایسے شخص کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت پر چلے اور خدا سے بے دیکھے ڈرے (کہ ڈر ہی سے حق کی طلب ہوتی ہے اور طلب سے حق تک رسائی ہوتی ہے، اور یہ لوگ ڈرتے ہی نہیں، ہاں جن کو خدا کا خوف ہے ان کو بے شک آپ فائدہ پہنچا سکتے ہیں) سو (جو ایسا شخص ہو) آپ اس کو (گناہوں کی) مغفرت اور (اطاعت پر) عمدہ عوض کی خوش خبری سنا دیجئے (اور اسی سے اس پر بھی دلالت ہوگئی کہ جو شخص گمراہی اور بے رخی میں گرفتار ہے وہ مغفرت اور ثواب سے محروم ہے اور عذاب کا مستحق ہے)۔

اِنَّمَا تُنۡذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكۡرَ وَخَشِىَ الرَّحۡمٰنَ: اس میں دلالت ہے کہ تعلیم وتربیت پر جو نفع اور فائدہ مرتب ہوتا ہے وہ طالب کی استعداد کا ظہور ہوتا ہے، یعنی اس کی قلبی صلاحیت کی علامت ہے، اس نفع میں شیخ ومربی کی عطاء بخشش کا دخل نہیں ہوتا (یعنی مرید کی تربیت اس کی استعداد

کے بقدر ہوتی ہے جتنی اس کے اندر استعداد ہوگی اتنی زیادہ وہ تربیت حاصل کرے گا، اگر مرید کے اندر تربیت کی استعداد نہیں تو شیخ کا تربیت کرنا زیادہ فائدہ نہیں دیتا)۔

* * *

فائدہ: یعنی ڈرانے کا فائدہ اسی کے حق میں ظاہر ہوتا ہے جو نصیحت کو مان کر اس پر چلے اور اللہ کا ڈر دل میں رکھتا ہو، جس کو خدا کا ڈر ہی نہیں نہ نصیحت کی کچھ پروا، وہ نبی کی تنبیہ و تذکیر سے کیا فائدہ اٹھائے گا؟ ایسے لوگ بجائے مغفرت وعزت کے سزا اور ذلت کے مستحق ہوں گے۔

ربط: آگے اشارہ کرتے ہیں کہ فریقین کی اس عزت و ذلت کا پورا اظہار زندگی کے دوسرے دور میں ہوگا جس کے مبادی موت کے بعد سے شروع ہو جاتے ہیں۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ؕ وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۲﴾

ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں مردوں کو ۱ اور لکھتے ہیں جو آگے بھیج چکے اور جو نشان ان کے پیچھے رہے ۲ اور ہر چیز گن لی ہے ہم نے ایک کھلی اصل میں ۳

خلاصہ تفسیر: (اور اگرچہ دنیا میں اس جزاء و سزا کا ظاہر ہونا لازم نہیں، لیکن) بیشک ہم (ایک روز) مردوں کو زندہ کریں گے (اس وقت ان سب کا ظہور ہو جائے گا) اور (جن اعمال پر جزا و سزا ہوگی) ہم (ان کو برابر) لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جن کو لوگ آگے بھیجتے جاتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جن کو پیچھے چھوڑے جاتے ہیں اور (ہمارا علم تو ایسا وسیع ہے کہ ہم کو لوگوں کے عمل کرنے کے بعد لکھنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ) ہم نے (تو) ہر چیز کو (جو کچھ قیامت تک ہوگا واقع ہونے سے پہلے ہی) ایک واضح کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں ضبط کر دیا تھا (محض بعض حکمتوں کی وجہ سے عمل کرنے کے بعد بھی لکھا جاتا ہے، پس جب واقع ہونے سے قبل ہم کو سب چیزوں کا علم ہے تو واقع ہونے کے بعد تو کیوں نہ ہوتا، اس لئے کسی عمل سے مکرنے یا پوشیدہ رکھنے کی ذرا گنجائش نہیں، ضرور سزا ہوگی)۔

مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ: ماقدموا یعنی جو کام آگے بھیجے جاتے ہیں، اس سے مراد وہ کام ہیں جو خود اپنے ہاتھ سے کیا، اور آثارھم یعنی جو پیچھے چھوڑتے ہیں، اس سے مراد وہ اثر جو ان کاموں کے سبب پیدا ہوا اور موت کے بعد بھی باقی رہا، مثلاً کسی نے کوئی نیک کام کیا اور وہ دوسروں کی بھی ہدایت کا سبب ہو گیا، یا کسی نے کوئی برا کام کیا اور وہ دوسروں کی بھی گمراہی کا سبب ہو گیا، غرض یہ سب لکھے جا رہے ہیں اور وہاں ان سب پر جزا و سزا مرتب ہو جائے گی۔

اِمَامٍ مُّبِیْنٍ: لوح محفوظ میں چونکہ تمام اشیاء کی تفصیل ہے اس لیے اس کو "واضح کتاب" کہا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی موت کے بعد دوسری زندگی یقینی ہے، جہاں سب اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے اور شاید ادھر بھی اشارہ ہو کہ یہ قوم (عرب) جس کی روحانی قوتیں بالکل مردہ ہو چکی ہیں، حق تعالیٰ کو قدرت ہے کہ پھر ان میں زندگی کی روح پھونک دے کہ وہ دنیا میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں کرے اور آنے والی نسلوں کے لیے اپنے آثار عظیمہ چھوڑ جائے۔

فائدہ: ۲ یعنی نیک و بد اعمال جو آگے بھیج چکے اور بعض اعمال کے اچھے برے اثرات یا نشان جو پیچھے چھوڑے مثلاً کوئی کتاب تصنیف کی یا علم سکھلایا، یا عمارت بنائی یا کوئی رسم ڈالی نیک یا بد، سب اس میں داخل ہیں، بلکہ الفاظ کے عموم میں وہ نشان قدم بھی شامل ہو سکتے ہیں جو کسی عبادت کے لیے چلتے وقت زمین پر پڑ جاتے ہیں، چنانچہ بعض احادیث صحیحہ میں تصریح ہے: "دیارکم تکتب اثارکم"۔

فائدہ: ۳ یعنی جس طرح تمام اعمال و آثار وقوع کے بعد ضابطہ کے موافق لکھے جاتے ہیں، قبل از وقوع بھی ایک ایک چیز لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے اور وہ لکھنا بھی محض انتظامی ضوابط و مصالح کی بناء پر ہے، ورنہ اللہ کے علم قدیم میں ہر چھوٹی بڑی چیز پہلے سے موجود و حاضر ہے، اسی کے

موافق لوح محفوظ میں نقل کی جاتی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور بیان کر ان کے واسطے ایک مثل اس گاؤں کے لوگوں کی ۱؎ جب کہ آئے اس میں بھیجے ہوئے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسالت کے مسئلہ کا بیان ہوا، اب آگے رسالت کی تائید اور جھٹلانے والوں کی دھمکی کے لیے ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے، تاکہ مشرکین مکہ کو معلوم ہو جائے کہ اعراض کرنے اور جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے، اور اس قصہ میں بستی والوں کے بت پرست ہونے اور اس کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہونے سے توحید کا واجب ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے جو کہ سورت کے اہم مقاصد میں سے ہے۔

اور آپ ان (کفار) کے سامنے (اس غرض سے کہ رسالت کی تائید اور ان کو توحید و رسالت کے انکار پر دھمکی ہو) ایک قصہ یعنی ایک بستی والوں کا قصہ اس وقت کا بیان کیجئے جبکہ اس بستی میں کئی رسول آئے۔

مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ: اکثر مفسرین نے اس بستی کو انطاکیہ کہا ہے، اور ابن کثیرؒ نے اس پر چند اعتراض کیے ہیں اور بعضوں نے ان کے جواب بھی دیے ہیں، لیکن آیت کی تفسیر مقام کی تعیین پر موقوف نہیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس کو مبہم رکھا جائے۔

اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ: قصہ میں اختلاف کی بنا پر ان رسولوں میں دو احتمال ہیں: ① یا تو وہ بلا واسطہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے تھے جس کو ''پیغمبر'' کہتے ہیں ② یا کسی پیغمبر کے واسطہ سے خدا کے بھیجے ہوئے تھے جس کو ''نائب پیغمبر'' کہتے ہیں، اس لیے خلاصہ تفسیر میں لفظ ''رسول'' سے عام معنی مراد ہیں جو نائب رسول پر بھی صادق آتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ گاؤں اکثر کے نزدیک شہر ''انطاکیہ'' ہے اور بائبل کتاب اعمال کے آٹھویں اور گیارہویں باب میں ایک قصہ اسی قصہ کے مشابہ کچھ تفاوت کے ساتھ شہر انطاکیہ کا بیان ہوا ہے، لیکن ابن کثیرؒ نے تاریخی حیثیت سے اور سیاق قرآن کے لحاظ سے اس پر کچھ اعتراضات کیے ہیں، اگر وہ صحیح ہوں تو کوئی اور بستی ماننی پڑے گی، واللہ اعلم۔ اس قصہ کا ذکر مومنین کے لیے بشارت اور مکذبین کے لیے عبرت ہے۔

فائدہ: ۲؎ ان کے ناموں کی صحیح تعیین نہیں ہو سکتی اور نہ یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے، یا کسی پیغمبر کے واسطہ سے حکم ہوا تھا اس کے نائب ہو کر فلاں بستی کی طرف جاؤ، دونوں احتمال ہیں، گو متبادر یہی ہے کہ پیغمبر ہوں، شاید حضرت مسیح (علیہ السلام) سے پہلے مبعوث ہوئے ہوں گے۔

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

جب بھیجے ہم نے ان کی طرف دو تو ان کو جھٹلایا پھر ہم نے قوت دی تیسرے سے تب کہا انہوں نے ہم تمہاری طرف آئے ہیں بھیجے ہوئے

خلاصہ تفسیر: یعنی جبکہ ہم نے ان کے پاس (اول) دو کو بھیجا سو ان لوگوں نے اول دونوں کو جھوٹا بتلایا، پھر تیسرے (رسول) سے (ان دونوں کی) تائید کی (یعنی تائید کے لئے پھر تیسرے کو وہاں جانے کا حکم دیا) سو ان تینوں نے (ان بستی والوں سے) کہا کہ ہم تمہارے پاس (خدا کی طرف سے) بھیجے گئے ہیں (تاکہ تم کو ہدایت کریں کہ توحید اختیار کرو بت پرستی چھوڑو کیونکہ وہ لوگ بت پرست تھے، جیسا کہ آگے آیت: **ومالی لا اعبد الذی فطرنی** اور **ءاتخذ من دونه الهة** سے معلوم ہوتا ہے)۔

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ: روح المعانی میں ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھیجے ہوئے تھے، چنانچہ اس میں مشائخ کے اس عمل کی تائید ہے جو اپنے نائبین اور خلفاء کو دعوت و ارشاد کے لیے مختلف شہروں میں روانہ کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی اول دو گئے، پھر ان کی تائید کے لیے تیسرا بھیجا گیا، تینوں نے مل کر کہا ہم خود نہیں آئے، اللہ کے بھیجے ہوئے آئے ہیں، لہذا جو کچھ ہم کہیں اسی کا پیغام سمجھو۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾

وہ بولے تم تو یہی انسان ہو جیسے ہم ، اور رحمان نے کچھ نہیں اتارا ، تم سارے جھوٹ کہتے ہو

خلاصہ تفسیر: ان لوگوں نے (یعنی بستی والوں نے) کہا کہ تم تو ہماری طرح (محض) معمولی آدمی ہو (تم کو رسول ہونے کا امتیاز حاصل نہیں) اور (تمہاری کیا تخصیص ہے، رسالت کا مسئلہ ہی خود بے اصل ہے اور) خدائے رحمٰن نے (تو) کوئی چیز (کتاب واحکام کی قسم سے کبھی) نازل (ہی) نہیں کی، تم نرا جھوٹ بولتے ہو۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا: منتہی یعنی کامل شخص ظاہری احوال میں مبتدی یعنی غیر کامل کی طرح ہوتا ہے (سو اولیاء اللہ کو عوامی صورت میں شکل دیکھ کر ان کی بے قدری نہیں کرنی چاہیے، یہ بڑی محرومی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی تم میں کوئی سرخاب کا پر نہیں جو اللہ تمہیں بھیجتا، ہم سے کس بات میں تم بڑھ کر تھے، بس رہنے دو، خواہ مخواہ خدا کا نام نہ لو، اس نے کچھ نہیں اتارا، تینوں سازش کر کے ایک جھوٹ بنالائے اسے خدا کی طرف نسبت کر دیا۔

قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّاۤ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَیْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۷﴾

کہا ہمارا رب جانتا ہے ہم بیشک تمہاری طرف بھیجے ہوئے آئے ہیں ۱؎ اور ہمارا ذمہ یہی ہے پیغام دینا کھول کر ۲؎

خلاصہ تفسیر: ان رسولوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار علیم ہے کہ بیشک ہم تمہارے پاس (بطور رسول کے) بھیجے گئے ہیں اور (اس قسم کھانے سے یہ مقصود نہیں کہ اسی سے رسالت کو ثابت کرتے تھے بلکہ دلائل قائم کرنے کے بعد بھی جب انہوں نے نہ مانا تب آخری جواب کے طور پر مجبور ہو کر قسم کھائی جیسا آگے خود ان کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ) ہمارے ذمہ تو صرف واضح طور پر (حکم کا) پہنچا دینا تھا (چونکہ واضح طور پر حکم کا پہنچانا دلیل سے ثابت کرنے پر موقوف ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اول دلائل قائم کر چکے تھے، آخر میں قسم کھائی، غرض آخر میں یہ فرمایا کہ ہم اپنا کام کر چکے، تم نہ مانو تو ہم مجبور ہیں)۔

اگر وہ پیغمبر تھے تب تو معجزات ظاہر کیے ہوں گے، اور اگر نائب پیغمبر تھے تو اول عقلی دلائل سے اصل پیغمبر کی رسالت ثابت کی ہوگی، پھر اس کے معجزات کو ثابت کیا ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگر ہم خدا پر جھوٹ لگاتے ہیں تو وہ دیکھ رہا ہے، کیا وہ اپنے فعل سے برابر جھوٹوں کی تصدیق کرتا رہے گا؟ ایسا نہیں ہوسکتا، اب تم سمجھو یا نہ سمجھو، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ہم اپنے دعوے میں سچے ہیں اور کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے، اسی لیے فعلاً ہماری تصدیق کر رہا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہم اپنا فرض ادا کر چکے، خدا کا پیام خوب کھول کر واضح، معقول اور دلنشیں طریقہ سے تم کو پہنچا دیا، اب اتمام حجت کے بعد خود سوچ لو کہ تکذیب وعداوت کا انجام کیا ہونا چاہیے۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾

بولے ہم نے نامبارک دیکھا تم کو، اگر تم باز نہ رہو گے تو ہم تم کو سنگسار کریں گے اور تم کو پہنچے گا ہمارے ہاتھ سے عذاب دردناک

خلاصہ تفسیر: وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں، اور اگر تم (اس دعوت اور دعوے) سے باز نہ آئے تو (یاد رکھو) ہم پتھروں سے تمہارا کام تمام کردیں گے اور (سنگساری سے پہلے بھی) تم کو ہماری طرف سے سخت تکلیف پہنچے گی (یعنی اول طرح طرح سے ستائیں گے، نہیں مانو گے تو اخیر میں پتھروں سے کام تمام کردیں گے)۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ: یعنی ہم تم کو منحوس سمجھتے ہیں، یہ بات یا تو اس لئے کہی کہ ان پر قحط پڑا تھا، یا اس لئے کہی کہ جب کوئی نئی بات سنی جاتی ہے اگرچہ لوگ اس کو قبول نہ کریں مگر اس کا چرچا ضرور ہوتا ہے، اور اکثر عام لوگوں میں اس کی وجہ سے گفتگو اور اختلاف اور کبھی لڑائی جھگڑے اور نااتفاقی کی بھی نوبت پہنچ جاتی ہے، پس مطلب یہ ہوگا کہ تمام لوگوں میں ایک فتنہ جھگڑا ڈال دیا جس سے نقصان پہنچ رہا ہے، یہ نحوست ہے جس کا سبب تم ہو۔

علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ جب قوم نے رسولوں کی تکذیب کی اور انہیں دھمکایا تو ملک پر قحط اور مرض جذام مسلط ہوگیا، اور یہ مرض عام طور پر پھیل گیا، مقبولین یعنی اہل اللہ کے انکار کے وقت اللہ تعالیٰ کی یہی سنت رہی ہے کہ کوئی نہ کوئی مصیبت آ ہی جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: شاید تکذیب مرسلین اور کفر وعناد کی شامت سے قحط وغیرہ پڑا ہوگا، یا مرسلین کے سمجھانے پر آپس میں اختلاف ہوا، کسی نے مانا کسی نے نہ مانا، اس کو نامبارک کہا، یعنی تمہارے قدم کیا آئے، قحط اور نااتفاقی کی بلا ہم پر ٹوٹ پڑی، یہ سب تمہاری نحوست ہے (العیاذ باللہ) ورنہ پہلے ہم اچھے خاصے آرام چین کی زندگی بسر کر رہے تھے، بس تم اپنے وعظ ونصیحت سے ہم کو معاف رکھو، اگر یہ طریقہ نہ چھوڑو گے اور وعظ ونصیحت سے باز نہ آؤ گے تو ہم سخت تکلیف وعذاب پہنچا کر تم کو سنگسار کرڈالیں گے۔

قَالُوْا طَاۗىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

کہنے لگے تمہاری نامبارکی تمہارے ساتھ ہے، کیا اتنی بات پر کہ تم کو سمجھایا، کوئی نہیں پر تم لوگ ہو کہ حد پر نہیں رہتے

خلاصہ تفسیر: ان رسولوں نے کہا کہ تمہاری نحوست تو تمہارے ساتھ ہی لگی ہوئی ہے (یعنی جس کو تم نقصان اور مصیبت کہتے ہو اس کا سبب تو حق کا قبول نہ کرنا ہے، اگر حق کو سب مل کر قبول کر لیتے تو نہ آپس میں اختلاف ہوتا، نہ قحط کے عذاب میں مبتلا ہوتے) کیا تم اس کو نحوست سمجھتے ہو کہ تم کو نصیحت کی جائے (تو یہ واقع میں نحوست نہیں بلکہ سعادت کا سبب ہے) بلکہ تم (خود) حد (عقل وشرع) سے نکل جانے والے لوگ ہو (پس شریعت کی مخالفت سے تم پر یہ نحوست آئی جو خود تمہارا فعل ہے، اور عقل کی مخالفت کر کے تم نے اس نحوست کا سبب غلط سمجھا)۔

قَالُوْا طَاۗىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ: رہا پہلا اتفاق جو بت پرستی پر تھا تو ایسا اتفاق جو باطل پر ہو وہ خود فساد اور وبال ہے جس کو چھوڑنا لازم ہے، اور اس زمانے میں قحط نہ ہونا وہ بطور استدراج کے اللہ کی طرف سے ڈھیل دی ہوئی تھی، یا اس وجہ سے تھا کہ اس وقت تک ان لوگوں پر حق واضح نہیں ہوا تھا، اور اللہ کا قانون ہے کہ حق کو واضح کرنے سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیتے، جیسا کہ ارشاد ہے کہ: حتی یبین لهم ما یتقون، اور یہ ڈھیل یا حق کا نہ ہونا بھی تمہاری ہی غفلت، جہالت اور شامت اعمال تھی، اس سے معلوم ہوا کہ ہر حال میں اس نحوست کا سبب خود تمہارا فعل تھا۔

روح المعانی میں ہے کہ نبیوں کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم کی استعداد فاسد اور ناقص تھی تب ہی تو حق بات سمجھ نہ سکے (یعنی جو لوگ اللہ والوں کی باتوں کو برا سمجھتے ہیں یا جھٹلاتے ہیں یہ ان کی فطری صلاحیتوں کا بگاڑ ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی تمہارے کفر وتکذیب کی شامت سے عذاب آیا، اگر حق وصداقت کو سب مل کر قبول کر لیتے نہ یہ اختلاف مذموم پیدا ہوتا، نہ اس طرح مبتلائے آفات ہوتے، پس نامبارکی اور نحوست کے اسباب خود تمہارے اندر موجود ہیں، پھر کیا اتنی بات پر کہ تمہیں اچھی نصیحت وفہمائش کی اور بھلا برا سمجھایا، اپنی نحوست ہمارے سر ڈالنے لگے اور قتل کی دھمکیاں دینے لگے، حقیقت یہ ہے کہ تم عقل وآدمیت کی حدود سے خارج ہوجاتے ہو، نہ عقل سے سمجھتے ہو نہ آدمیت کی بات کرتے ہو۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٠﴾

اور آیا شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا بولا اے قوم چلو راہ پر بھیجے ہوؤں کی

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿٢١﴾

چلو راہ پر ایسے شخص کی جو تم سے بدلہ نہیں چاہتے اور وہ ٹھیک راستہ پر ہیں ۲۔

خلاصہ تفسیر: اور (اس گفتگو کی خبر جو شائع ہوئی تو) ایک شخص (جو مسلمان تھا) اس شہر کے کسی دور مقام سے (جو یہاں سے دور تھا یہ خبر سن کر اپنی قوم کی خیر خواہی کے لیے کہ ان رسولوں کا وجود قوم کی فلاح تھا، یا رسولوں کی طرف داری کے لیے کہ کہیں یہ لوگ رسولوں کو قتل نہ کر دیں جیسا کہ قوم والے سنگسار کرنے کی دھمکی دے رہے تھے) دوڑتا ہوا (یہاں) آیا (اور ان لوگوں سے) کہنے لگا کہ اے میری قوم! ان رسولوں کی راہ پر چلو، (ضرور) ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے، اور وہ خود راہ راست پر بھی ہیں (یعنی اتباع سے روکنے والی خودغرضی ہوتی ہے سو وہ یہاں موجود نہیں، اور اتباع کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کا اتباع کیا جائے وہ راہ راست پر ہو، سو یہ بات یہاں موجود ہے، پھر اتباع کیوں نہ کیا جائے)۔

* * *

فائدہ: ۱ کہتے ہیں کہ اس مرد صالح کا نام "حبیب" تھا، شہر کے پرلے کنارے عبادت میں مشغول رہتا اور کسب حلال سے کھاتا تھا، فطری صلاحیت نے چپ نہ بیٹھنے دیا، قصہ سنتے ہی مرسلین کی تائید وحمایت اور مکذبین کی نصیحت وفہمائش کے لیے دوڑتا ہوا آیا، مبادا اشقیاء اپنی دھمکیوں کو پورا کرنے لگیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرسلین کی آواز کا اثر شہر کے دور دراز حصوں تک پہنچ گیا تھا۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں، اس کا پیغام لے کر آئے ہیں، جو نصیحت کرتے ہیں اس پر خود کار بند ہیں، اخلاق، اعمال اور عادات واطوار سب ٹھیک ہیں، پھر ایسے بے لوث بزرگوں کا اتباع کیوں نہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے جو پیغام بھیجے کیوں قبول نہ کیا جائے!!۔

وَمَا لِيَ لَآ اَعۡبُدُ الَّذِيۡ فَطَرَنِيۡ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾

اور مجھ کو کیا ہوا کہ میں بندگی نہ کروں اس کی جس نے مجھ کو بنایا ١ اور اسی کی طرف سب پھر جاؤ گے ٢

خلاصہ تفسیر: اور میرے پاس کونسا عذر ہے کہ میں اس (معبود) کی عبادت نہ کروں جس نے مجھ کو پیدا کیا (جو کہ عبادت کا مستحق ہونے کی ایک دلیل ہے) اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے (اس لئے دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے رسولوں کا اتباع کرو)۔

وَمَا لِيَ لَآ اَعۡبُدُ الَّذِيۡ فَطَرَنِيۡ: اپنے اوپر رکھ کر اس لئے کہا تا کہ مخاطب کو اشتعال نہ ہو جو کہ غور و فکر اور تدبر سے مانع ہو جاتا ہے اور اصل مطلب یہی ہے کہ تم کو ایک اللہ کی عبادت کرنے میں کون سا عذر ہے، دعوت و تبلیغ میں اپنے اوپر بات رکھ کر کلام کرنا "تلطّف" کہلاتا ہے اور مخلص مصلحین کا یہی طرز ہوا کرتا ہے۔

* * *

فائدہ: ١ یہ اپنے اوپر رکھ کر دوسروں کو سنایا، یعنی تم کو آخر کیا ہوا کہ جس نے پیدا کیا اس کی بندگی نہ کرو؟!۔

فائدہ: ٢ یعنی یہ مت سمجھنا کہ پیدا کر کے آزاد چھوڑ دیا ہے، اب کچھ مطلب اس سے نہیں رہا، نہیں! سب کو مرے پیچھے اسی کے پاس واپس جانا ہے، اس وقت کی فکر کر رکھو۔

ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنۡ يُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّيۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يُنۡقِذُوۡنِ ﴿۲۳﴾

بھلا میں پکڑوں اس کے سوا اوروں کو پوجنا کہ اگر مجھ پر چاہے رحمان تکلیف تو کچھ کام نہ آئے مجھ کو ان کی سفارش اور نہ وہ مجھ کو چھڑائیں

اِنِّيۡۤ اِذًا لَّفِيۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّكُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ ﴿۲۵﴾

تو میں بھٹکتا رہوں صریح ١ میں یقین لایا تمہارے رب پر مجھ سے سن لو ٢

خلاصہ تفسیر: یہاں تک تو اس کا بیان تھا کہ حق تعالیٰ عبادت کے مستحق ہیں، اب اس کا بیان ہے کہ یہ من گھڑت باطل معبود عبادت کے مستحق نہیں، یعنی:

کیا میں خدا کو چھوڑ کر اور ایسے ایسے معبود قرار دے لوں (جن کی بے بسی کیکیفیت یہ ہے) کہ اگر خدائے رحمن مجھ کو تکلیف پہنچانا چاہے تو نہ ان معبودوں کی سفارش میرے کام آئے گی اور نہ وہ مجھ کو (خود اپنی قدرت و زور کے ذریعہ اس تکلیف سے) چھڑا سکیں (یعنی نہ وہ خود قادر ہیں نہ خدا تعالیٰ تک واسطہ سفارش بن سکتے ہیں، کیونکہ اول تو جمادات یعنی بتوں میں شفاعت کی قابلیت ہی نہیں، دوسرے شفاعت وہی کر سکتے ہیں جن کو اللہ کی طرف سے اجازت ہو، کفار کے واسطے شفاعت کی اجازت نہیں، اور) اگر میں ایسا کروں تو صریح گمراہی میں جا پڑا (یہ بھی اپنے اوپر رکھ کر دوسروں کو سنانا ہے) میں تو تمہارے پروردگار پر ایمان لا چکا سو تم (بھی) میری بات سن لو (اور ایمان لے آؤ)۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی کس قدر صریح گمراہی ہے کہ اس مہربان اور قادر مطلق پروردگار کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کی جائے جو خدا کی بھیجی ہوئی کسی تکلیف سے نہ بذات خود چھڑا سکیں، نہ سفارش کر کے نجات دلا سکیں۔

فائدہ: ٢ یعنی مجمع میں بے کھٹکے اعلان کرتا ہوں کہ میں خدائے واحد پر ایمان لا چکا، اسے سب سن رکھیں، شاید مرسلین کو اس لیے سنایا ہو کہ وہ اللہ کے ہاں گواہ رہیں اور قوم کو اس لیے کہ سن کر کچھ متاثر ہوں، یا کم از کم دنیا ایک مومن کی قوت ایمان کا مشاہدہ کرنے کی طرف متوجہ ہو۔

قِيلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِىۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۙ۝۲۶ بِمَا غَفَرَ لِىۡ رَبِّىۡ وَجَعَلَنِىۡ مِنَ الۡمُكۡرَمِيۡنَ ۝۲۷

حکم ہوا چلا جا بہشت میں ۱؎ بولا کسی طرح میری قوم معلوم کر لیں، کہ بخشا (بخش دیا) مجھ کو میرے رب نے اور کیا مجھ کو عزت والوں میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: مگر قوم والوں پر کچھ اثر نہ ہوا، بلکہ اس کو پتھروں سے، یا آگ میں ڈال کر، یا گلا گھونٹ کر شہید کر ڈالا، شہید ہوتے ہی اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری دی گئی:

ارشاد ہوا کہ جا جنت میں داخل ہو جا (اس وقت بھی اس کو اپنی قوم کی فکر ہوئی) کہنے لگا کہ کاش! میری قوم کو یہ بات معلوم ہو جاتی کہ میرے پروردگار نے (ایمان اور اتباع رسل کی برکت سے) مجھ کو بخش دیا اور مجھ کو عزت داروں میں شامل کر دیا (تو میری اس حالت کو معلوم کر کے وہ بھی ایمان لے آتے تو اسی طرح ان کی بھی مغفرت اور عزت ہوتی)۔

قِيلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ: اگر مراد یہ ہے کہ فی الفور اسی وقت داخل ہو تو جنت سے مراد کوئی خاص جگہ ہے جو جنت کے متصل ہوگی، کیونکہ جنت میں جانے کے بعد پھر اس سے نکلنا نہیں ہو سکتا، اور حشر ونشر یقیناً جنت سے باہر ہے جس میں تمام مخلوق حاضر ہوگی، اور اگر اس سے مقصود محض بشارت سنانا ہے کہ تو وقت معین پر جنت میں داخل ہونے کا مستحق ہے تو خود جنت بھی مراد لینا صحیح ہے۔

فائدہ: ۱؎ یعنی فوراً بہشت کا پروانہ مل گیا، آگے نقل کرتے ہیں کہ قوم نے اس کو نہایت بیدردی کے ساتھ شہید کر ڈالا، ادھر شہادت واقع ہوئی، ادھر سے حکم ملا کہ فوراً بہشت میں داخل ہو جا، جیسا کہ ارواح شہداء کی نسبت احادیث سے ثابت ہے کہ وہ قبل از محشر جنت میں داخل ہوتی ہیں۔

فائدہ: ۲؎ قوم نے اس کی دشمنی کی کہ مار ڈالا، اس کو بہشت میں پہنچ کر بھی قوم کی خیر خواہی کا خیال رہا کہ اگر میرا حال اور جو انعام واکرام حق تعالیٰ نے مجھ پر کیا ہے معلوم کر لیں تو سب ایمان لے آئیں۔

وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰى قَوۡمِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنۡزِلِيۡنَ ۝۲۸

اور اتاری نہیں ہم نے اس کی قوم پر اس کے پیچھے کوئی فوج آسمان سے اور ہم فوج نہیں اتارا کرتے

اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ خٰمِدُوۡنَ ۝۲۹

بس یہی تھی ایک چنگھاڑ پھر اسی دم سب بجھ (کررہ) گئے ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور (جب ان بستی والوں نے رسل اور متبع رسل کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور انتقام لینے کے لئے) ہم نے اس (شخص شہید) کی قوم پر اس (کی شہادت) کے بعد کوئی لشکر (فرشتوں کا) آسمان سے نہیں اتارا اور نہ ہم کو اتارنے کی ضرورت تھی (کیونکہ ان کا ہلاک کرنا اس پر موقوف نہ تھا کہ اس کے لئے کوئی بڑی جماعت لائی جاتی، بلکہ) وہ سزا ایک آواز سخت تھی (جو جبرئیل علیہ السلام نے یا اور کسی فرشتہ نے کر دی ہو) اور وہ سب اسی دم (اس سے) بجھ کر (یعنی مر کر) رہ گئے۔

وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰى قَوۡمِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ: اس سے جنگ بدر یا حنین میں کفار کے مقابلہ کے لیے ملائکہ کے نازل ہونے پر شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ یہاں اس آیت میں فرشتوں کے محتاج ہونے کی نفی کرنا مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ ہماری حکمت اور مصلحت اس بات کو مقتضی نہیں کہ کسی قوم کے ہلاک کرنے کے لئے آسمان سے فرشتوں کا کوئی لشکر اتاریں اور نہ ہمیں اس کی ضرورت تھی، گذشتہ قوموں نے جب خدا کی نافرمانی کی اور پیغمبروں کا مقابلہ کیا تو خدا تعالیٰ نے کسی قوم کو ہوا سے تباہ کیا، کسی پر پتھر برسائے، کسی کو سخت آواز نے پکڑا، کسی کو زمین میں دھنسایا اور کسی کو دریا میں غرق کیا، غرض یہ کہ گذشتہ قومیں اس طرح ہلاک کی گئیں، ان کے ہلاک کرنے کے لئے آسمان سے فرشتوں کا کوئی لشکر نازل نہیں کیا گیا، یہاں یہ مطلب ہرگز نہیں کہ

دوسری حکمتوں سے بھی فرشتوں کا نزول نہ ہوگا، سو ممکن ہے کہ اس مذکورہ قصہ میں نزول ملائکہ کے لیے کوئی حکمت مقتضی نہ ہو، اور جنگ بدر و حنین میں حکمت ہو، اور فرشتوں کی محتاجگی تو کسی وقت بھی نہ تھی۔

نیز جنگ بدر، جنگ احزاب اور جنگ حنین میں فرشتوں کے جو لشکر اتارے گئے اس سے آنحضرت ﷺ کا اعزاز اور اکرام مقصود تھا، یہ آپ ﷺ کی عظمت شان اور جلالت قدر کے اظہار کے لئے فرشتوں کے لشکر اتارے گئے نیز یہ معاملہ صحابہ کرام کی دلجوئی اور ان کی قدر افزائی کے لئے تھا، ورنہ ابو جہل کا لشکر ہلاک کرنے کے لئے فرشتوں کے لشکر کی ضرورت نہ تھی، غرض یہ کہ جنگ بدر اور جنگ احزاب میں فرشتوں کا لشکر اتارنا محض آنحضرت ﷺ کے شرف اور کرامت اور جلالت شان کو ظاہر کرنے کے لئے اور صحابہ کرام کی بشارت اور ان کی سکینت اور طمانینت کے لئے تھا کما قال تعالیٰ: وما جعله الله الّا بشرٰی لکم ولتطمئنّ قلوبکم به وما النّصر الّا من عند الله ورنہ ہزار کافروں کے ہلاک کرنے کے لئے ایک فرشتہ بھی کافی تھا، اسی طرح سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان اصحاب قریہ کی سرکشی اور شرارت کی سزا کے لئے فرشتوں کا کوئی لشکر نہیں اتارا، اور نہ اس کی ضرورت تھی، ایک تند آواز نے سب کا خاتمہ کر ڈالا فرشتہ کی ایک چیخ سب کی ہلاکت کے لئے کافی ہوئی۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً: یہ بھی ممکن ہے کہ صیحۃ سے آواز مراد نہ ہو، بلکہ مطلق عذاب مراد ہو جس کی کیفیت نہیں بتلائی گئی، جیسا کہ سورۃ مومنون کی آیت: فاخذتهم الصيحة کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس کے بعد اس کی قوم کفر و ظلم اور تکذیب مرسلین کی پاداش میں ہلاک کی گئی اور اس اہلاک کے لیے کوئی مزید اہتمام کرنا نہیں پڑا کہ آسمان سے فرشتوں کی فوج بھیجی جاتی، نہ حق تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ قوموں کی ہلاکت کے لیے بڑی بڑی فوجیں بھیجا کریں (یوں کسی خاص موقع پر کسی خاص مصلحت کی وجہ سے فرشتوں کا لشکر بھیج دیں وہ دوسری بات ہے) وہاں تو بڑے بڑے مدعیوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایک ڈانٹ کافی ہے، چنانچہ اس قوم کا حال بھی یہی ہوا کہ فرشتوں نے ایک چیخ ماری اور سب کے سب اسی دم بجھ کر رہ گئے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝٣٠ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا (وقف غفران)

کیا افسوس ہے بندوں پر، کوئی نہیں آیا ان کے پاس رسول جس سے ٹھٹھا نہیں کرتے، کیا نہیں دیکھتے کتنی غارت کر چکے ہم

قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝٣١ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ۝٣٢ ع

ان سے پہلے جماعتیں کہ وہ انکے پاس پھر کر نہیں آئیں گی ۱ اور ان سب میں کوئی نہیں جو اکٹھے ہو کر نہ آئیں ہمارے پاس پکڑے ہوئے ۲

خلاصہ تفسیر: اب قصہ کا انجام بتلانے کے لئے مکذبین یعنی جھٹلانے والوں کی مذمت فرماتے ہیں کہ:

افسوس (ایسے) بندوں کے حال پر کہ کبھی ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جس کی انہوں نے ہنسی نہ اڑائی ہو، کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم ان سے پہلے بہت سی امتیں (اسی تکذیب و استہزاء کے سبب) غارت کر چکے کہ وہ (پھر) ان کی طرف (دنیا میں) لوٹ کر نہیں آتے (اگر اس بات میں غور کرتے تو تکذیب و استہزا سے باز آجاتے اور یہ سزا تو جھٹلانے والوں کو دنیا میں دی گئی) اور (پھر آخرت میں) ان سب میں کوئی ایسا نہیں جو مجتمع طور پر ہمارے روبرو حاضر نہ کیا جائے (پس وہاں پھر سزا ہوگی، اور وہ سزا کبھی ختم نہ ہوگی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دیکھتے اور سنتے ہیں کہ دنیا میں کتنی قومیں پہلے پیغمبروں سے ٹھٹھا کر کے غارت ہو چکی ہیں، جن کا نام و نشان مٹ چکا، کوئی ان میں سے لوٹ کر ادھر واپس نہیں آئی، عذاب کی چکی میں سب پس کر برابر ہو گئیں، اس پر بھی عبرت نہیں ہوئی، جب کوئی نیا رسول آتا ہے وہ ہی تمسخر اور استہزاء شروع کر دیتے ہیں، جو پہلے کفار کی عادت تھی، چنانچہ آج خاتم الانبیاء (ﷺ) کے ساتھ کفار مکہ کا یہی معاملہ ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی وہ تو دنیا کا عذاب تھا، اور آخرت کی سزا الگ رہی، یہ نہ سمجھو کہ ہلاک ہو کر ادھر واپس نہیں آتے تو بس قصہ ختم ہوا، نہیں! سب کو پھر ایک دن خدا کے ہاں حاضر ہونا ہے، جہاں بلا استثناء مجرم پکڑے ہوئے آئیں گے۔

وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ ۚۖ اَحْیَیْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ یَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور ایک نشانی ہے ان کے واسطے زمین مردہ، اس کو ہم نے زندہ کر دیا اور نکالا اس میں سے اناج سو اسی میں سے کھاتے ہیں

وَجَعَلْنَا فِیْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِیْهَا مِنَ الْعُیُوْنِ ﴿۳۴﴾

اور بنائے ہم نے اس میں باغ کھجور کے اور انگور کے اور بہادیئے اس میں بعضے چشمے

لِیَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَیْدِیْهِمْ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

کہ کھائیں اس کے میووں سے ۱؎ اور اس کو بنایا نہیں ان کے ہاتھوں نے پھر کیوں شکر نہیں کرتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسالت کا مضمون تھا جس میں توحید کا مضمون بھی ضمناً آ گیا ہے، اب توحید کو قصداً بیان کیا جاتا ہے اور ایسے دلائل سے اس کو ثابت کیا جاتا ہے جو نعمتوں اور احسانات کی یاد دہانی پر مشتمل ہیں۔

اور (قدرت کی نشانیاں اور عظیم الشان نعمتیں جو توحید کے دلائل بھی ہیں ان میں سے) ایک نشانی ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے مردہ زمین ہے (اور اس میں نشانی کی بات یہ ہے کہ) ہم نے اس کو (بارش سے) زندہ کیا اور ہم نے اس (زمین) سے (مختلف) غلے نکالے سو ان میں سے لوگ کھاتے ہیں، اور (نیز) ہم نے اس (زمین میں) کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور اس میں (باغ کی آب پاشی کے لئے) چشمے (اور نالے) جاری کئے تاکہ (غلے کی طرح) لوگ باغ کے پھلوں میں سے (بھی) کھائیں اور اس (پھل اور غلہ) کو ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا (اگرچہ تخم ریزی اور آبپاشی بظاہر انہی کے ہاتھوں ہوئی ہو مگر بیج سے درخت اور درخت سے پھل پیدا کرنے میں ان کا کوئی دخل نہیں، خاص خدا ہی کا کام ہے) سو (ایسے دلائل دیکھ کر بھی) کیا شکر نہیں کرتے (جس کا پہلا زینہ اللہ کے وجود اور توحید کا اقرار ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی شاید شبہ گزرتا کہ میرے پیچھے پھر کس طرح زندہ ہو کر حاضر کیے جائیں گے؟ اس کو یوں سمجھا دیا کہ زمین خشک اور مردہ پڑی ہوتی ہے، پھر خدا اس کو زندہ کرتا ہے کہ ایک دم لہلہانے لگتی ہے، کیسے کیسے باغ و بہار، غلے اور میوے اس سے پیدا ہوتے ہیں، جن کو تم استعمال میں لاتے ہو، اسی طرح خیال کر لو کہ مردہ ابدان میں روح حیات پھونک دی جائے گی، بہر حال مردہ زمین میں ان کے لیے ایک نشانی ہے جس میں غور کرنے سے بعث بعد الموت اور حق تعالیٰ کی وحدانیت و عظمت اور اس کے انعام و احسان کے مسائل کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

تنبیہ: اوپر کی آیات میں ترہیب کا پہلو نمایاں تھا کہ عذاب الٰہی سے ڈر کر راہ ہدایت اختیار کریں، آیات حاضرہ میں ترغیب کی صورت اختیار فرمائی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچان کر شکر گزاری کی طرف متوجہ ہوں اور یہ بھی سمجھیں کہ جو خدا مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے، وہ ایمانی حیثیت سے ایک مردہ قوم کو زندہ کر دے، یہ کیا مشکل ہے!!۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یہ پھل اور میوے قدرت الٰہی سے پیدا ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں یہ طاقت نہیں کہ ایک انگور یا کھجور کا دانہ پیدا کر لیں، جو محنت اور تردد باغ لگانے اور اس کی پرورش کرنے میں کیا جاتا ہے، اس کو بار آور کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے اور غور سے دیکھا جائے تو جو کام بظاہر ان کے ہاتھوں سے ہوتا ہے وہ بھی فی الحقیقت حق تعالیٰ کی عطا کی ہوئی قدرت و طاقت اور اس کی مشیت و ارادہ سے ہوتا ہے لہٰذا ہر حیثیت سے اس کی شکر گزاری اور احسان شناسی واجب ہوئی۔

تنبیہ: مترجم محققؒ نے **وما عملته ايديهم** میں ''ما'' کو نافیہ لیا ہے، کما هو دأب أكثر المتاخرین۔ لیکن سلف سے عموماً ''ما'' کا موصلہ ہونا منقول ہے اور اسی کی تائید ابن مسعودؓ کی قرأت **ومما عملته ايديهم** سے ہوتی ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ﴿۳۶﴾

پاک ذات ہے جس نے بنائے جوڑے سب چیز کے اس قسم سے جو اگتا ہے زمین میں اور خود ان میں سے اور ان چیزوں میں کہ جن کی انکو خبر نہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے زمین کی خاص نشانیوں سے استدلال تھا، اب زمین کی عام نشانیوں سے اور انسان کی ذات میں جو نشانیاں ہیں ان سے استدلال کیا جاتا ہے یعنی:

وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا، نباتات زمین کی قسم سے بھی (خواہ مقابلہ مماثلت کا ہو مثلاً ایک جیسے غلے، ایک جیسے پھل، خواہ مقابلہ مخالفت واضداد کا ہو جیسے گیہوں اور جو اور میٹھے پھل اور کھٹے پھل) اور (خود) ان آدمیوں سے بھی (آدمیوں کی مقابل قسمیں جیسے مرد اور عورت) اور ان چیزوں میں بھی جن کو (عام) لوگ نہیں جانتے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا: اس میں لفظ ''ازواج'' زوج کی جمع ہے، جو جوڑے کے معنی میں آتا ہے، جوڑے میں دو متقابل چیزیں ہوتی ہیں، ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کا زوج کہا جاتا ہے، جیسے مرد و عورت ہیں مرد کو عورت کا اور عورت کو مرد کا زوج کہا جاتا ہے، اسی طرح حیوانات کے نر و مادہ باہم زوج ہیں، نباتات کے بہت سے درختوں میں بھی نر اور مادہ کا ادراک کیا گیا ہے، کھجور اور پپیتہ کے درختوں میں تو معروف و مشہور ہے ہی، اوروں میں بھی ہو تو کچھ بعید نہیں، جیسا کہ سائنس کی جدید تحقیقات میں تمام پھلدار اور پھولدار درختوں میں نر و مادہ ہوتے ہیں، ان میں توالد و تناسل ہونا بتلایا گیا ہے، اسی طرح اگر یہی مخفی سلسلہ جمادات اور دوسری مخلوقات میں بھی ہو تو کیا بعید ہے جس کی طرف: **ومما لا يعلمون** میں اشارہ پایا جاتا ہے، اور عام طور پر حضرات مفسرین نے ازواج کو بمعنے انواع و اقسام لکھا ہے، کیونکہ جس طرح نر و مادہ کو باہم زوجین کہا جاتا ہے اسی طرح دو متقابل چیزوں کو بھی زوجین کہتے ہیں جیسے سردی گرمی، خشکی تری، رنج خوشی، بیماری تندرستی، پھر ان میں سے ہر ایک کے اندر اعلیٰ، ادنیٰ، متوسط کے اعتبار سے بہت سے درجات اور انواع و اقسام بن جاتی ہیں، اسی طرح انسانوں اور جانوروں میں رنگ و ہیئت اور زبان اور طرز معیشت کے اعتبار سے بہت سی انواع و اقسام ہیں، لفظ ''ازواج'' ان تمام انواع و اقسام کو شامل ہے، آیت مذکورہ میں پہلے تو **مما تنبت الارض** یعنی نباتات کی انواع و اقسام کا بیان فرمایا ہے، اس کے بعد **من انفسهم** یعنی خود انسانی نفوس کے انواع و اقسام کا ذکر ہے، اور اس کے بعد **مما لا يعلمون** میں وہ ہزاروں مخلوقات شامل ہیں جن کا آج تک بھی لوگوں کو انکشاف نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ زمین کی تہہ میں اور دریاؤں اور پہاڑوں میں کتنی انواع اقسام حیوانات، نباتات اور جمادات ہیں، چنانچہ اسی سے حق تعالیٰ کا بے مقابل ہونا بھی معلوم ہو گیا، یعنی اس کا کوئی مقابل ہی نہیں، یہاں سے آیت: **ومن كل شئی خلقنا زوجين** کی بھی وضاحت ہو گئی۔

وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ: اس کی مزید وضاحت کے لیے سورہ نحل آیت ۸ ملاحظہ کی جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی نباتات میں، انسانوں میں اور دوسری مخلوقات میں جن کی انہیں پوری خبر بھی نہیں، اللہ تعالیٰ نے جوڑے بنائے ہیں: خواہ تقابل کی حیثیت سے: جیسے عورت مرد، نر مادہ، کھٹا میٹھا، سیاہ سفید، دن رات، اندھیرا اجالا، یا تماثل کی حیثیت سے: جیسے یکساں رنگ اور مزے کے پھل اور ایک شکل و صورت کے دو جانور، بہر حال مخلوقات میں کوئی مخلوق نہیں جس کا مماثل یا مقابل نہ ہو، یہ صرف خدا ہی کی ذات پاک ہے جس کا نہ کوئی مقابل ہے نہ مماثل، کیونکہ مقابلہ یا مماثلت ان چیزوں میں ہو سکتی ہے جو کسی درجہ میں فی الجملہ اشتراک رکھتی ہوں، خالق و مخلوق کا کسی حقیقت میں اشتراک ہی نہیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿٣٧﴾

اور ایک نشانی ہے ان کے واسطے رات، کھینچ (اتار) لیتے ہیں ہم اس پر سے دن کو پھر تبھی یہ رہ جاتے ہیں اندھیرے میں

خلاصہ تفسیر: اب یہاں سے آسمان کی بعض نشانیوں اور ان کے بعض آثار سے استدلال ہے:

اور ایک نشانی ان لوگوں کے لئے رات (کا وقت) ہے کہ (سورج کی روشنی عارضی تھی پس) ہم (اسی عارضی روشنی کو زائل کر کے گویا) اس (رات) پر سے دن کو اتار لیتے ہیں سو یکایک (پھر رات نمودار ہو جاتی ہے اور) وہ لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔

نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ: چونکہ روشنی کرنے والے اجسام بعد میں پیدا ہوئے اس لیے پہلے ظلمت ہی ظلمت تھی، اور گویا اصلی وقت رات ہی کا تھا، پھر سورج کی عارضی روشنی سے دن نے اس کو چھپالیا، جیسے بکری کے گوشت کو کھال چھپالیتی ہے تو اس کی عارضی روشنی کو زائل کرنا گویا رات پر سے دن کو اتار لینا ہے، جس سے رات پھر آجاتی ہے۔

* * *

فائدہ: سلخ کہتے ہیں جانور کی کھال اتارنے کو جس سے نیچے کا گوشت ظاہر ہو جائے، اسی طرح سمجھ لو رات کی تاریکی پر دن کی چادر پڑی ہوئی ہے، جس وقت یہ نور کی چادر اوپر سے اتار لی جاتی ہے، لوگ اندھیرے میں پڑے رہ جاتے ہیں، اس کے بعد پھر سورج اپنی مقررہ رفتار سے معین وقت پر آکر سب جگہ اجالا کرتا ہے، لیل ونہار کے ان تقلبات پر قیاس کر کے سمجھ لو کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ عالم کو فنا کر کے دوبارہ زندہ کرسکتا ہے اور بیشک وہ ہی ایک خدا لائق پرستش ہے جس کے ہاتھ میں ان عظیم الشان انقلابات کی باگ ہے، جن سے ہم کو مختلف قسم کے فوائد پہنچتے ہیں، نیز جو قادر مطلق رات کو دن سے تبدیل کرتا ہے، کیا کچھ بعید ہے کہ بذریعہ آفتاب رسالت کے دنیا سے جہالت کی تاریکیوں کو دور کر دے لیکن رات دن اور چاند، سورج کے طلوع وغروب کی طرح ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٣٨﴾

اور سورج چلا جاتا ہے اپنے ٹھہرے ہوئے راستہ (ٹھکانے) پر، یہ سادھا ہے اس زبردست باخبر نے

خلاصہ تفسیر: اور (ایک نشانی) آفتاب (ہے کہ وہ) اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے (ٹھکانے سے مراد عام ہے، یہ شامل ہے اس نقطہ کو بھی جہاں سے سورج چل کر سال بھر کا دورہ کر کے پھر اسی نقطہ پر پہنچ جاتا ہے اور اس افقی نقطہ کو بھی کہ جہاں روزانہ حرکت میں پہنچ کر غروب ہو جاتا ہے) اور یہ اندازہ باندھا ہوا ہے اس (خدا) کا جو زبردست (یعنی قادر ہے اور) علم والا ہے (کہ اپنے علم سے ان انتظامات کی مصلحت وحکمت جانتا ہے اور اپنی قدرت سے ان انتظامات کو نافذ کرتا ہے)۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا: اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث آئی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ "آفتاب کا مستقر یعنی ٹھکانا عرش کے نیچے ہے اور وہ غروب کے وقت سجدہ کر کے حکم دریافت کرتا ہے تو اس کو معمول کے مطابق طلوع ہونے کا حکم ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن اس کو واپس لوٹنے کا حکم ہوگا تو مغرب سے طلوع ہوگا"، اس حدیث سے چند باتیں معلوم ہوئیں جو قابل تحقیق ہیں:

① ایک یہ کہ ٹھکانے سے مراد وہ نقطہ ہے جہاں روزانہ حرکت ختم کر کے غروب ہو جاتا ہے، لیکن جو تفسیر اوپر بیان کی گئی ہے چونکہ وہ اس کو بھی شامل ہے اس لیے دونوں میں کوئی منافات نہیں۔

② دوسرے یہ کہ وہ ٹھکانا عرش کے نیچے ہے، سو ظاہر ہے کہ جس نقطہ پر پہنچ کر اس کا دورہ ختم ہوتا ہے، یا جس نقطہ پر پہنچ کر غروب ہوتا ہے وہ دونوں عرش ہی کے نیچے ہیں، اس لیے حدیث میں اور ہماری تفسیر میں کوئی منافات نہیں ہے۔

③ تیسرے یہ کہ سجدہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ بظاہر آیات و روایات سے ان مخلوقات میں بھی تھوڑا بہت شعور ہونا ثابت ہے، سو ممکن ہے کہ اسی شعور کی وجہ سے حق تعالی کے حضور میں آفتاب خشوع وخضوع اور عرض و معروض کرتا ہو۔

④ چوتھے یہ کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سجدہ کے وقت آفتاب کو سکون ہو جاتا ہو، حالانکہ دلائل رصد یہ اور نظام شمسی سے آفتاب کی حرکت کا منقطع نہ ہونا ثابت ہے، جواب یہ ہے کہ سجدہ کے جو معنی بیان کیے گئے ہیں اول تو اس کے لیے حرکت کا منقطع ہونا ضروری نہیں، دوسرے ممکن ہے کہ یہ سکون ایک آن میں ہوتا ہو اور حرکت زمانی ہو اس لیے نظام شمسی میں خلل نہ ہوتا ہو، اور اس سکون کا ادراک نہ ہوتا ہو۔

⑤ پانچویں یہ کہ حقیقی غروب تو کبھی نہیں ہوتا، کیونکہ جب ایک جگہ غروب ہوتا ہے دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے، پھر غروب کے وقت حکم دریافت کرنے کے کیا معنی؟ جواب ممکن ہے کہ اکثر حصہ آبادی کا غروب مراد ہو، یا خاص افق مدینہ کا غروب مراد ہو، یا خط استوا کا غروب مراد ہو، بہرحال یہ مخبر صادق کی خبر ہے اور عقلی اشکال کوئی ہے نہیں اس لیے تسلیم کرنا واجب ہے۔

***

فائدہ: لہ سورج کی چال اور راستہ مقرر ہے، اسی پر چلا جاتا ہے، ایک انچ یا ایک منٹ اس سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتا، جس کام پر لگا دیا ہے، ہر وقت اس میں مشغول ہے، کسی دم قرار نہیں، رات دن کی گردش اور سال بھر کے چکر میں جس جس ٹھکانہ پر اسے پہنچنا ہے پہنچتا ہے، پھر وہاں سے باذن خداوندی نیا دورہ شروع کرتا ہے، قرب قیامت تک اسی طرح کرتا رہے گا، تا آنکہ ایک وقت آئے گا جب اس کو حکم ہو گا کہ جدھر سے غروب ہوا ہے، ادھر سے واپس آئے، یہی وقت ہے جب باب توبہ بند کر دیا جائے گا کما ورد فی الحدیث الصحیح، بات یہ ہے کہ اس کے طلوع و غریب کا یہ سب نظام اس زبردست اور باخبر ہستی کا قائم کیا ہوا ہے، جس کے انتظام کو کوئی دوسرا شکست نہیں کر سکتا، اور نہ اس کی حکمت و دانائی پر کوئی حرف گیری کر سکتا ہے، وہ خود جب چاہے اور جس طرح چاہے الٹ پلٹ کرے کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتی۔

تنبیہ: اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث آئی ہے جس میں شمس کے تحت العرش سجدہ کرنے کا ذکر ہے، یہاں اس کی تشریح کا موقع نہیں، اس پر ہمارا مستقل مضمون ''سجود الشمس'' کے نام سے چھپا ہوا ہے، ملاحظہ کر لیا جائے۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿٣٩﴾

اور چاند کو ہم نے بانٹ دی ہیں منزلیں یہاں تک کہ پھر آ رہا (ہو جائے) جیسے ٹہنی پرانی

خلاصہ تفسیر: اور (ایک نشانی) چاند (ہے کہ اس کی چال) کے لئے منزلیں مقرر کیں (کہ ہر روز ایک منزل طے کرتا ہے) یہاں تک کہ (اپنے آخر دورے میں پتلا ہوتا ہوتا) ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی (جو کہ پتلی اور خمدار ہوتی ہے)۔

ممکن ہے کہ ضعف نور کی وجہ سے زردی میں بھی تشبیہ کا اعتبار کیا جائے، اس کے متعلق کچھ مضمون سورہ یونس آیت ۵ میں گذر چکا ہے۔

***

فائدہ: سورج کی طرح چاند ہمیشہ ایک طرح نہیں رہتا، بلکہ روزانہ گھٹتا بڑھتا، اس کی اٹھائیس منزلیں اللہ نے مقرر کر دی ہیں، ان کو ایک معین نظام کے ساتھ درجہ بدرجہ طے کرتا ہے، پہلی آیت میں رات دن کا بیان تھا، پھر سورج کا ذکر کیا جس سے سالوں اور فصلوں کی تشکیل ہوتی ہے، اب چاند کا تذکرہ کرتے ہیں، جس کی رفتار سے قمری مہینوں کا وجود وابستہ ہے، چاند سورج مہینہ کے آخر میں ملتے ہیں تو چاند چھپ جاتا ہے، جب آگے بڑھتا ہے تو نظر آتا ہے، پھر منزل بہ منزل بڑھتا چلا جاتا اور چودھویں شب کو پورا ہو کر بعد میں گھٹنا شروع ہوتا ہے، آخر رفتہ رفتہ اسی پہلی حالت پر آ پہنچتا اور کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح پتلا، خمدار اور بے رونق سا ہو کر رہ جاتا ہے۔

لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِؕ وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۝۴۰

نہ سورج سے ہو کہ پکڑلے چاند کو اور نہ رات آگے بڑھے دن سے ، اور ہر کوئی ایک چکر میں پھرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (سورج اور چاند کی چال اور دِن ورات کی آمد ورفت ایسے انداز اور انتظام سے رکھی گئی ہے کہ) نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو (اس کا نور ظاہر ہونے کے وقت میں یعنی رات میں جبکہ وہ منور ہو) جا پکڑے (یعنی سورج کی یہ مجال نہیں کہ رات کے وقت میں طلوع ہوکر اسے دن بنادے، نہ ہی چاند سورج کے وقت میں روشن ہوسکتا ہے کہ دن میں چاند کا نور ظاہر ہوجائے اور رات ہوجائے) اور (اسی طرح) نہ رات دن (کی مقررہ مقدار ختم ہونے) سے پہلے آسکتی ہے (جیسے رات کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے دن نہیں آسکتا) اور (چاند اور سورج) دونوں ایک ایک کے دائرہ میں (حساب سے اس طرح چل رہے ہیں جیسے گویا) تیر رہے ہیں (اور حساب سے باہر نہیں ہوسکتے کہ رات دن کے حساب میں خلل واقع ہوسکے)۔

وَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ: اس کے متعلق کچھ مضمون سورہ انبیاء آیت ۳۳ میں گذر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

* * *

فائدہ: سورج کی سلطنت دن میں ہے اور چاند کی رات میں، یہ نہیں ہوسکتا کہ چاند کی نور افشانی کے وقت سورج اس کو آدبائے، یعنی دن آگے بڑھ کر رات کا کچھ حصہ اڑالے، یا رات سبقت کرکے دن کے ختم ہونے سے پہلے آجائے ،جس زمانہ اور جس ملک میں جو اندازہ رات، دن کا رکھ دیا ہے، ان کی رات کی مجال نہیں کہ ایک منٹ آگے پیچھے ہوسکیں، ہرایک سیارہ اپنے اپنے مدار میں پڑا چکر کھا رہا ہے، اس سے ایک قدم ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتا اور باوجود اس قدر سریع حرکت اور کھلی ہوئی فضا کے نہ ایک دوسرے سے ٹکراتا ہے، نہ مقررہ انداز سے زیادہ تیز یا سست ہوتا ہے، کیا یہ اس کا واضح نشان نہیں کہ یہ سب عظیم الشان مشینیں اور ان کے تمام پرزے کسی ایک زبردست مدبر ودانا ہستی کے قبضہ اقتدار میں اپنا اپنا کام کررہے ہیں؟! پھر جو ہستی رات دن اور چاند سورج کا ادل بدل کرتی ہے، وہ تمہارے فنا کرنے اور فنا کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز ہوگی؟ (العیاذ باللہ)

تنبیہ: حضرت شاہ صاحبؒ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ کی تعبیر کا نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ: ”سورج چاند اخیر مہینہ میں ملتے ہیں تو چاند پکڑتا ہے سورج کو، سورج چاند کو نہیں پکڑتا“۔ اسی لیے ”لا القمر ینبغی له ان یدرك الشمس“ نہیں فرمایا، واللہ اعلم۔

وَ اٰیَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۝۴۱ وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا یَرْكَبُوْنَ۝۴۲

اور ایک نشانی ہے انکے واسطے کہ ہم نے اٹھالیا انکی نسل کو اس بھری ہوئی کشتی میں، اور بنادیا ہم نے انکے واسطے کشتی جیسی چیزوں کو جس پر سوار ہوتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اب آگے زمین کی نشانیوں میں سے ایک نشانی خاص سواری اور سفر وغیرہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا (اپنی اولاد کو اکثر لوگ تجارت کیلئے سفر میں بھیجتے تھے) اور (خشکی کے سفر کیلئے) ہم نے ان کے لئے کشتی ہی جیسی ایسی چیزیں پیدا کیں جن پر یہ لوگ سوار ہوتے ہیں (مراد اس سے اونٹ وغیرہ ہیں)۔

اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّیَّتَهُمْ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ: اس تعبیر میں تین نعمتوں کی طرف اشارہ ہوگیا: ① اول بھری ہوئی کشتی کو جو بوجھل ہونے کی وجہ سے پانی میں غرق ہونے والی چیز ہے اس کو پانی کی سطح پر رواں کرنا ② دوسرے ان لوگوں کو اولاد عطا فرمانا ③ تیسرے رزق وسامان دینا جس سے یہ خود گھر بیٹھے رہیں اور اولاد کو کارندہ بنا کر بھیجیں۔

وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ: اونٹ وغیرہ کو کشتی کے ساتھ تشبیہ اس خاص وصف کے اعتبار سے ہے کہ اونٹ پر بھی سواری اور بار برداری اور قطع مسافت کی جاتی ہے اور اس تشبیہ کا حسن اس سے بڑھ گیا کہ عرب میں اونٹ کو ”سفینۃ البر“ یعنی خشکی کی کشتی کہنے کا محاورہ شائع تھا۔

* * *

فائدہ: یعنی حضرت نوح کے زمانہ میں جب طوفان آیا تو آدم کی نسل کو اس بھری ہوئی کشتی پر سوار کرلیا جو حضرت نوح نے بنائی تھی، ورنہ

انسان کا تخم باقی نہ رہتا، پھر اسی کشتی کے نمونہ کی دوسری کشتیاں اور جہاز تمہارے لیے بنا دیے جن پر تم آج تک لدے پھرتے ہو، یا کشتیوں جیسی دوسری سواریاں پیدا کر دیں جس پر سوار ہوتے ہو، مثلاً اونٹ، جن کو عرب ''سفائن البر'' (خشکی کی کشتیاں) کہا کرتے تھے۔

وَاِنۡ نَّشَاۡ نُغۡرِقۡهُمۡ فَلَا صَرِيۡخَ لَهُمۡ وَلَا هُمۡ يُنۡقَذُوۡنَ۝۴۳ اِلَّا رَحۡمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيۡنٍ۝۴۴

اور اگر ہم چاہیں تو انکو ڈبا دیں، پھر کوئی نہ پہنچے انکی فریاد کو اور نہ چھڑائے جائیں، مگر ہم اپنی مہربانی سے اور انکا کام چلانے کو ایک وقت تک

خلاصہ تفسیر: اب کشتی کے ذکر کی مناسبت سے کفار کے لئے ایک وعید عذاب کی بیان فرماتے ہیں کہ:

اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ تو (جن چیزوں کو وہ پوجتے ہیں ان میں سے) ان کا کوئی فریاد رس ہو (جو غرق سے بچالے) اور نہ یہ (غرق ہونے کے بعد موت سے) خلاصی دیئے جائیں (یعنی نہ کوئی موت سے چھڑا سکے) مگر یہ ہماری ہی مہربانی ہے اور ان کو ایک وقت معین تک (دنیاوی زندگی سے) فائدہ دینا (منظور) ہے (اس لئے مہلت دے رکھی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ مشت استخواں انسان! دیکھو کیسے خوفناک سمندروں کو کشتی کے ذریعہ عبور کرتا ہے، جہاں بڑے بڑے جہازوں کی حقیقت ایک تنکے کے برابر نہیں، اگر اللہ اس وقت غرق کرنا چاہے تو کون بچا سکتا ہے اور کون ہے جو فریاد کو پہنچے؟ مگر یہ اس کی مہربانی اور مصلحت ہے کہ اس طرح سب بحری سواریوں کو غرق نہیں کر دیتا، کیونکہ اس کی رحمت وحکمت مقتضی ہے کہ ایک معین وقت تک دنیا کا کام چلتا رہے، افسوس ہے کہ بہت لوگ ان نشانیوں کو نہیں سمجھتے، نہ اس کی نعمتوں کو قدر کرتے ہیں۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّقُوۡا مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡكُمۡ وَمَا خَلۡفَكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ۝۴۵

اور جب کہیے ان کو بچو اس سے جو تمہارے سامنے آتا ہے اور جو پیچھے چھوڑتے ہو شاید تم پر رحم ہو

وَمَا تَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ اٰيَةٍ مِّنۡ اٰيٰتِ رَبِّهِمۡ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِيۡنَ۝۴۶

اور کوئی حکم نہیں پہنچتا ان کو اپنے رب کے حکموں سے جس کو وہ ٹلاتے نہ ہوں (ٹال نہیں جاتے)

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کے مظاہر قدرت وحکمت، زمین، آسمان وغیرہ میں بیان کر کے خدا شناسی اور توحید کی دعوت دی گئی تھی، اور اس کے قبول کرنے پر جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کا وعدہ تھا، اور نہ ماننے پر عذاب شدید کی وعید، آیات مذکورہ اور ان کے بعد آنے والی آیات میں کفار مکہ جو اس کے بلاواسطہ مخاطب تھے ان کی کج روی کا بیان ہے کہ نہ ان پر ترغیب ثواب کا اثر ہوتا ہے، نہ ترہیب عذاب کا، اور اس سلسلے میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کے دو مکالمے ذکر کئے گئے ہیں۔

اور جب ان لوگوں سے (دلائل توحید اور اس کے نہ ماننے پر عذاب کی وعید سنا کر) کہا جاتا ہے کہ تم لوگ اس عذاب سے ڈرو جو تمہارے سامنے (یعنی دنیا میں آسکتا) ہے (جیسے پیچھے آیت: **وان نشاء نغرقهم** میں بیان فرمایا غرض دنیا میں غرق کا عذاب بھی آسکتا ہے اور دوسرے عذاب بھی جیسے زمین میں دھنسا دینا) اور جو تمہارے پیچھے (یعنی مرنے کے بعد آخرت میں یقینی آنے والا) ہے (مطلب یہ ہے کہ انکار توحید کی وجہ سے جو عذاب تم پر آنے والا ہے، خواہ صرف آخرت میں یا دنیا میں بھی، تم اس عذاب سے ڈرو اور ایمان لے آؤ) تاکہ تم پر رحمت کی جائے (تو وہ اس ترہیب اور عذاب سے ڈرانے کی ذرہ پرواہ نہیں کرتے) اور (اسی بات کے نہ ماننے کی کیا تخصیص ہے وہ تو ایسے سنگدل ہو گئے ہیں کہ) ان کے رب کی آیتوں میں سے کوئی آیت بھی ان کے پاس ایسی نہیں آتی جس سے یہ سرتابی نہ کرتے ہوں۔

* * *

فائدہ: ل سامنے آتا ہے جزاء کا دن اور پیچھے چھوڑے اپنے اعمال، یعنی جب کہا جاتا ہے کہ قیامت کی سزا اور بداعمالیوں کی شامت سے بچنے کی فکر کرو، تا کہ خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہو تو نصیحت پر ذرا کان نہیں دھرتے، ہمیشہ خدائی احکام سے روگردانی کرتے رہتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ

اور جب کہیے ان کو خرچ کرو کچھ اللہ کا دیا، کہتے ہیں منکر ایمان والوں کو ہم کیوں کھلائیں

مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾

ایسے کو کہ اللہ چاہتا تو اس کو کھلا دیتا ل تم لوگ تو بالکل بہک رہے ہو صریح ۲

خلاصہ تفسیر جس طرح وہ عذاب کی وعیدوں سے متاثر نہیں ہوتے اسی طرح ثواب اور جنت کی ترغیب سے بھی ان کو نفع نہیں ہوتا چنانچہ:

اور جب (ان کو انعامات الٰہیہ یاد دلا کر) ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں فقیروں مسکینوں پر) خرچ کرو تو (شرارت اور استہزاء کے طور پر) یہ کفار ان مسلمانوں سے (جنہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کہا تھا) یوں کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو کھانے کو دیں جن کو اگر خدا چاہے تو (بہت کچھ) کھانے کو دے دے، تم صریح غلطی میں (پڑے) ہو۔

* * *

فائدہ: ل یعنی اور احکام الٰہی تو کیا مانتے، فقیروں مسکینوں پر خرچ کرنا تو ان کے نزدیک بھی کارِ ثواب ہے، لیکن یہ ہی مسلم بات جب پیغمبر اور مومنین کی طرف سے کہی جاتی ہے تو نہایت بھونڈے طریقہ سے تمسخر کے ساتھ یہ کہہ کر اس کا انکار کر دیتے ہیں کہ جنہیں خود اللہ میاں نے کھانے کو نہیں دیا ہم انہیں کیوں کھلائیں؟ ہم تو اللہ کی مشیت کے خلاف کرنا نہیں چاہتے، اگر اس کی مشیت ہوتی تو ان کو فقیر و محتاج اور ہمیں غنی و تونگر نہ بناتا، خیال کرو اس حماقت اور بے حیائی کا کیا ٹھکانہ ہے، کیا خدا کسی کو دینا چاہے تو اس کی یہ ہی ایک صورت ہے کہ خود بلا واسطہ رزق اس کے ہاتھ پر رکھ دے؟ اگر وسائط سے دلانا بھی اس کی مشیت سے ہے تو تم نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ اللہ ان کو روٹی دینا نہیں چاہتا؟ یہ تو اس کا امتحان ہے کہ اغنیا کو فقراء کی اعانت پر مامور فرمایا اور ان کے توسط سے رزق پہنچانے کا سامان کیا، جو اس امتحان میں ناکامیاب رہا اسے اپنی بدبختی اور شقاوت پر رونا چاہیے۔

تنبیہ: بعض سلف کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات بعض زنادقہ کے حق میں ہیں، اس صورت میں ان کے اس قول کو تمسخر پر حمل نہ کیا جائے گا بلکہ حقیقت پر رکھیں گے۔

فائدہ: ۲ اگر یہ جملہ کفار کے قول کا تتمہ ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ اے گروہ مومنین! تم صریح گمراہی میں پڑے ہو۔ ایسے لوگوں کا پیٹ بھرنا چاہتے ہو جن کا خدا پیٹ بھرنا نہیں چاہتا، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کفار کو خطاب ہے کہ کس قدر بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ گمراہی ہے نیک کام میں تقدیر کے حوالے کرنا اور اپنے مزے میں لالچ پر دوڑنا''۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو

خلاصہ تفسیر: اور یہ (کافر) لوگ (پیغمبر ﷺ اور آپ کے متبعین سے بطور انکار) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ (قیامت کا جو اوپر آیت میں مذکور ہے اور ویسے بھی اکثر اس کی خبر دیا کرتے ہو وہ) کب ہوگا اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (تو بتلاؤ)۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ قیامت اور عذاب کی دھمکیاں کب پوری ہوں گی؟ اگر سچے ہو تو جلد پوری کر کے دکھلا دو۔

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾

یہ تو راہ دیکھتے ہیں ایک چنگھاڑ کی جو ان کو آ پکڑے گی جب آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے

فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾

پھر نہ کر سکیں گے (ہو سکے گا) کہ کچھ کہہ ہی مریں اور نہ اپنے گھر کو پھر کر جا سکیں گے [1]

خلاصہ تفسیر: (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ جو بار بار پوچھ رہے ہیں تو گویا) یہ لوگ بس ایک آواز سخت (پہلی بار صور پھونکنے) کے منتظر ہیں جو ان کو (یعنی مطلق کفار کو) آ پکڑے گی اور وہ سب (اس وقت) باہم (عام معمول کے مطابق اپنے معاملات میں) لڑ جھگڑ رہے ہوں گے، سو (اس آواز کے ساتھ ایک دم اس طرح فنا ہو جائیں گے کہ) نہ تو وصیت کرنے کی فرصت ہوگی اور نہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جا سکیں گے (بلکہ جو جس حال میں ہوگا وہیں مر کر رہ جائے گا)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی قیامت ناگہاں آ پکڑے گی اور وہ اپنے معاملات میں غرق ہوں گے، جس وقت پہلا صور پھونکا جائے گا، سب ہوش و حواس جاتے رہیں گے اور آخر مر کر ڈھیر ہو جائیں گے، اتنی فرصت بھی نہ ملے گی کہ فرض کرو مرنے سے پہلے کسی کو کچھ کہنا چاہیں تو کہہ گزریں، یا جو گھر سے باہر تھے وہ گھر واپس جا سکیں۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا

اور پھونکی جائے صور پھر تبھی وہ قبروں سے اپنے رب کی طرف پھیل پڑیں گے [1] کہیں گے اے خرابی ہماری! کس نے اٹھا دیا ہم کو

مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾

ہماری نیند کی جگہ سے [2] یہ وہ ہے جو وعدہ کیا تھا رحمان نے اور سچ کہا تھا پیغمبروں نے [3]

خلاصہ تفسیر: اور (پھر دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو وہ سب یکا یک قبروں سے (نکل نکل کر) اپنے رب کی طرف (یعنی جہاں حساب ہوگا) جلدی جلدی چلنے لگیں گے (اور وہاں کی ہول و ہیبت دیکھ کر) کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی ہم کو ہماری قبروں سے کس نے اٹھا دیا (کہ یہاں کی بہ نسبت تو وہاں ہی راحت میں تھے، فرشتے جواب دیں گے کہ) یہ وہی (قیامت) ہے جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبر سچ کہتے تھے (مگر تم نے نہ مانا تھا)۔

فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ: اور ایک آیت میں جو ارشاد ہے: فاذا هم قيام ينظرون، یعنی دوسری بار صور پھونکنے کے وقت وہ اچانک حیرت زدہ کھڑے رہ جائیں گے، یہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ اول وہلہ میں حیرت زدہ کھڑے رہیں، پھر اس کے بعد فرشتوں کے ہانکنے سے دوڑنا شروع کریں، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔

يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا: کفار اگرچہ قبروں میں بھی عذاب قبر میں مبتلا تھے، وہاں کچھ آرام نہ تھا، مگر قیامت کے عذاب کے مقابلہ میں وہ پہلا عذاب کالعدم معلوم ہوگا اس لئے پکاریں گے کہ ہمیں کس نے قبروں سے نکال لیا، وہیں رہتے تو اچھا ہوتا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سب زندہ ہو کر اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور فرشتے ان کو جلد جلد دھکیل کر میدان حشر میں لے جائیں گے۔

فائدہ: ۲ شاید نفخہ اولی اور نفخہ ثانیہ کے درمیان ان پر نیند کی حالت طاری کر دی جائے، یا قیامت کا ہولناک منظر دیکھ کر عذاب قبر کو اہون سمجھیں گے اور نیند سے تشبیہ دیں گے، یا مرقد بمعنی "مضجع" کے ہو، نیند کی کیفیت سے تجرید کر لی جائے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳ یہ جواب اللہ کی طرف سے اس وقت ملے گا، یا مستقبل کو حاضر قرار دے کر اب جواب دے رہے ہیں، یعنی کیا پوچھتے ہو کس نے اٹھادیا؟ ذرا آنکھیں کھولو، یہ وہی اٹھانا ہے جس کا وعدہ خدائے رحمان کی طرف سے کیا گیا تھا اور پیغمبر جس کی خبر برابر دیتے رہے تھے۔

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٥٣﴾

بس ایک چنگھاڑ ہوگی پھر اسی دم وہ سارے ہمارے پاس پکڑے چلے آئیں ۱

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَّلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٤﴾

پھر آج کے دن ظلم نہ ہوگا کسی جی پر ذرا اور وہی بدلہ پاؤ گے جو کرتے تھے ۲

خلاصہ تفسیر: (آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) وہ (دوبارہ صور کا پھونکنا یعنی نفخہ ثانیہ) بس ایک زور کی آواز ہوگی (جیسے نفخہ اولیٰ بھی ایک آواز تھا جیسا کہ ارشاد ہے: ما ينظرون الا صيحة واحدة، اسی طرح یہ بھی ایک آواز ہوگی) جس سے یکا یک سب جمع ہو کر ہمارے پاس حاضر کر دیئے جائیں گے، پھر اس دن کسی شخص پر ذرا ظلم نہ ہوگا اور تم کو بس انہی کاموں کا بدلہ ملے گا جو تم (دنیا میں کفر وغیرہ) کیا کرتے تھے (یہاں تک تو اہل جہنم کا حال بیان ہوا)۔

فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ: پچھلی آیت میں میدان حساب کی طرف چلنا مذکور تھا اور یہاں اس آیت میں پہنچ جانا مذکور ہے، اور یہ چلنا اور پہنچنا جبراً وقہراً ہوگا، قرآن کریم کے الفاظ: محضرون اور: وجاءت کل نفس معها سائق سے یہی معلوم ہوتا ہے، یعنی آیات قرآن سے ثابت ہے کہ فرشتے ان سب کو پکار کر میدان حشر میں لائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی محشر میں حاضری اپنی خوشی سے نہیں بلکہ جبری طور پر ہوگی اور فرشتوں کے پکارنے کی وجہ سے دوڑتے ہوئے محشر میں آجائیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی کوئی متنفس نہ بھاگ سکے گا، نہ روپوش ہو سکے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی نہ کسی کی نیکی ضائع ہوگی، نہ جرم کی حیثیت سے زیادہ سزا ملے گی، ٹھیک ٹھیک انصاف ہوگا اور جو نیک و بد کرتے تھے فی الحقیقت عذاب وثواب کی صورت میں وہ ہی سامنے آجائے گا۔

إِنَّ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فٰكِهُونَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلٰلٍ عَلَى الْأَرَائِكِ

تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک مشغلہ (دھندے) میں ہیں باتیں کرتے، وہ اور ان کی عورتیں سایوں میں تختوں پر بیٹھے ہیں

مُتَّكِـُٔونَ ﴿٥٦﴾ لَهُمْ فِيهَا فٰكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُونَ ﴿٥٧﴾ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿٥٨﴾

تکیہ لگائے، ان کے لئے وہاں ہے میوہ اور ان کے لیے ہے جو کچھ مانگیں ۱ سلام بولنا ہے رب مہربان سے ۲

خلاصہ تفسیر: (اور) اہل جنت (کا حال یہ ہے کہ وہ) بیشک اس روز اپنے مشغلوں میں خوش دل ہوں گے، وہ اور ان کی بیویاں

سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے (اور) ان کے لئے وہاں (ہر طرح کے) میوے ہوں گے اور جو کچھ مانگیں گے ان کو ملے گا (اور) ان کو پروردگار مہربان کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا (یعنی حق تعالیٰ فرمائیں گے: "السلام علیکم یا أهل الجنة"، جنت میں سلام سے مقصود یا تو محض اکرام واعزاز ہے، یا ہمیشہ کی سلامتی کی بشارت اور خبر سنانا ہے)۔

هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ: اس سے حوریں اور دنیا کی مسلمان بیویاں دونوں مراد ہوسکتی ہیں، خواہ ان میں سے ایک قسم مراد ہو یا دونوں کا مجموعہ مراد ہو۔

وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ: اس پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ جب اہل جنت کو مانگنے سے ملے گا تو جنت میں بھی ایک گونہ کلفت باقی رہی، جواب یہ ہے کہ اپنے محبوب سے مانگنا یہ خود ایک قسم کی لذت ہے، بالخصوص جبکہ مانگتے ہی مل جائے ذرا بھی دیر نہ لگے، اور بعض علماء نے یدّعون کی تفسیر تمنا سے کی ہے کہ وہ جو کچھ تمنا کریں گے پوری کی جائے گی، اس تفسیر سے اور بھی سہولت ہوگئی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ بہشت میں ہر قسم کے عیش ونشاط کا سامان ہوگا، دنیا کی مکروہات سے چھوٹ کر آج یہ ہی ان کا مشغلہ ہوگا، وہ اور ان کی عورتیں آپس میں گھل مل کر اعلیٰ درجہ کے خوشگوار سایوں میں مسہریوں پر آرام کر رہے ہوں گے، ہمہ قسم کے میوے اور پھل وغیرہ ان کے لیے حاضر ہوں گے، بس خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کی جنتیوں کے دل میں طلب اور تمنا ہوگی وہ ہی دی جائے گی، اور منہ مانگی مرادیں ملیں گی، یہ تو جسمانی لذائذ کا حال ہوا، آگے روحانی نعمتوں کی طرف سلام قولا من رب رحیم سے اک ذرا سا اشارہ فرماتے ہیں:

فائدہ: ۲۔ یعنی اس مہربان پروردگار کی طرف سے جنتیوں کو سلام بولا جائے گا، خواہ فرشتوں کے ذریعہ سے، یا جیسا کہ ابن ماجہ کی ایک روایت میں ہے بلا واسطہ خود رب کریم سلام ارشاد فرمائیں گے، اس وقت کی عزت ولذت کا کیا کہنا، اللهم ارقنا هذه النعمة العظمى بحرمته نبيك محمد (صلى الله عليه وآله وسلم)۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ

اور تم الگ ہوجاؤ آج اے گناہ گارو ۱ میں نے نہ کہہ رکھا تھا تم کو اے آدم کی اولاد کہ نہ پوجیو شیطان کو

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾　وقف غفران

وہ کھلا دشمن ہے تمہارا، اور یہ کہ پوجو مجھ کو، یہ راہ ہے سیدھی ۲

خلاصہ تفسیر: آگے پھر دوزخ والوں کا بقیہ حال مذکور ہے کہ ان کو میدان حساب میں حکم ہوگا کہ:

اور اے (کفر کے ارتکاب کرنیوالے) مجرمو! آج (اہل ایمان سے) الگ ہوجاؤ (کیونکہ انکو جنت میں بھیجنا ہے اور تم کو دوزخ میں اور اس وقت ان سے مذمت اور ملامت کے طور پر یہ فرمایا جائے گا کہ) اے اولاد آدم! (اسی طرح جنات سے بھی خطاب ہوگا، چنانچہ دوسری آیت میں ہے **یمعشر الجن والانس** الخ) کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کر دی تھی کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا صریح دشمن ہے اور یہ کہ میری (ہی) عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے (عبادت سے مراد کامل اطاعت ہے: **لا تتبعوا خطوات الشیطن، ولا یفتننکم الشیطن**)۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ: یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ کفار عموماً شیطان کی تو عبادت نہ کرتے بتوں کو یا دوسری چیزوں کو پوجتے تھے، اس لئے ان پر عبادت شیطان کا الزام کیسے عائد ہوا؟ جواب یہ ہے کہ کسی کی اطاعت مطلقہ کرنا کہ ہر کام ہر حال میں اس کا کہنا ماننے اسی کا نام عبادت ہے، چونکہ ان لوگوں نے ہمیشہ شیطانی تعلیم ہی کی پیروی کی، اس لئے ان کو عابد شیطان کہا گیا، جیسا کہ حدیث میں اس شخص کو جو مال یا بیوی کی

محبت میں آکر ہر وہ کام کرنے لگے جس سے مال بڑھے یا بیوی راضی ہو اگر چہ خدا تعالیٰ اس سے ناراض ہو ایسے شخص کو حدیث میں "عبد الدرھم" اور "عبد الزوجہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس آیت کی تفسیر سے صوفیاء کے اس قول کی تاویل ہو جاتی ہے جس میں انہوں نے اپنے آپ کو یا کسی اور کو بت پرست کہا ہو، صوفیاء کے ہاں بت سے نفس اور خواہشات نفس مراد ہوتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص نفس پرست یا نفس کا بندہ ہے، یہ مطلب نہیں کہ وہ واقع میں بت پرست ہے، یہ تو صریح کفر و شرک والی بات ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جنتیوں کے عیش و آرام میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، تمہارا مقام دوسرا ہے جہاں رہنا ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی اسی دن کے لیے تم کو انبیاء (علیہم السلام) کی زبانی بار بار سمجھایا گیا کہ شیطان لعین کی پیروی مت کرنا، جو تمہارا صریح دشمن ہے، وہ جہنم میں پہنچائے بغیر نہ چھوڑے گا، اگر ابدی نجات چاہتے ہو تو یہ سیدھی راہ پڑی ہوئی ہے، اس پر چلے آؤ اور اکیلے ایک خدا کی پرستش کرو۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور وہ بہکا لے گیا تم میں سے بہت خلقت کو، پھر کیا تم کو سمجھ نہ تھی

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

یہ دوزخ ہے جس کا تم کو وعدہ تھا، جا پڑو اس میں آج کے دن بدلہ اپنے کفر کا ۱

خلاصہ تفسیر: اور (نیز تم کو شیطان کی نسبت یہ بات بھی معلوم کرائی تھی کہ) وہ تم میں (یعنی تمہاری بنی نوع میں) ایک کثیر مخلوق کو گمراہ کر چکا (ہے جن کی گمراہی کا وبال بھی تم کو بتلا دیا گیا تھا جیسا کہ پہلے کفار کے قصے اور ان کی سزائیں قرآن میں مذکور ہیں) سو کیا تم (اتنا) نہیں سمجھتے تھے (کہ اگر ہم اس کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہو جائیں گے تو ہم بھی اس طرح مستحق عذاب ہوں گے، لو اب) یہ جہنم ہے جس کا تم سے (کفر کی تقدیر پر) وعدہ کیا جایا کرتا تھا، آج اپنے کفر کے بدلے اس میں داخل ہو۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا: یہ خطاب سب کفار کو نہیں بلکہ اکثر کو ہے، کیونکہ جو لوگ سب سے پہلے کافر ہوئے ہیں انہوں نے دوسرے کفار کا گمراہ ہونا اور ان پر وبال نازل ہونا نہیں دیکھا اور نہ سنا، تو یہ خطاب ان کو شامل نہیں، مگر الزام ان پر بھی قائم ہے، کیونکہ ان کے حق میں اس ایک تنبیہ کے نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اور کسی طرح بھی ان کو تنبیہ نہ کی گئی ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی افسوس اتنی نصیحت و فہمائش پر بھی تم کو عقل نہ آئی اور اس ملعون نے ایک خلقت کو گمراہ کر چھوڑا، کیا تمہیں اتنی سمجھ نہ تھی کہ دوست دشمن میں تمیز کر سکتے؟ اور اپنے نفع و نقصان کو پہچانتے، دنیا کے کاموں میں تو اس قدر ہوشیاری اور ذہانت دکھلاتے تھے، مگر آخرت کے معاملہ میں اتنے غبی بن گئے کہ موٹی موٹی باتوں کے سمجھنے کی لیاقت نہ رہی، اب اپنی حماقتوں کا خمیازہ بھگتو، یہ دوزخ تیار ہے، جس کا بصورت کفر اختیار کرنے کے تم سے وعدہ کیا گیا تھا، کفر کا ٹھکانہ یہی ہے، چاہیے کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے منہ پر اور بولیں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور بتلائیں گے ان کے پاؤں جو کچھ وہ کماتے تھے

خلاصہ تفسیر: آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے (جس سے وہ جھوٹے اور بیہودہ عذر پیش نہ کر سکیں، جیسا کہ شروع شروع میں کہیں گے: واللہ ربنا ما کنا مشرکین کہ پروردگار کی قسم! ہم تو مشرک نہ تھے) اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے

پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ یہ لوگ کیا کرتے تھے (یہ عذاب تو آخرت میں ہوگا)۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ: آیت مذکورہ میں تو ہاتھ پاؤں کا بولنا ذکر کیا گیا ہے، دوسری آیت میں انسان کے کان، آنکھ اور کھال کا بولنا مذکور ہے: شهد عليهم سمعهم وابصارهم وجلودهم، اور ایک جگہ جو تشهد عليهم السنتهم آیا ہے، یعنی خود ان کی زبانیں گواہی دیں گی، یہ اس کے منافی نہیں کہ ان کے مونہوں پر مہر لگادی جائے گی، کیونکہ مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار سے کچھ نہ بول سکیں گے، ان کی زبان ان کی مرضی کے خلاف چلے گی اور شہادت دے گی، رہا یہ اشکال کہ ان اعضاء میں گویائی کیسے پیدا ہوگی؟ تو اس کا جواب خود قرآن نے دے دیا ہے: انطقنا الله الذی انطق کل شیٔ، یعنی یہ اعضاء کہیں گے جس اللہ نے ہر گویائی والے کو گویا کیا ہے، اس نے ہمیں بھی گویائی دے دی۔

* * *

فائدہ: یعنی آج اگر یہ لوگ اپنے جرموں کا زبان سے اعتراف نہ بھی کریں تو کیا ہوتا ہے، ہم منہ پر مہر لگادیں گے اور ہاتھ پاؤں کان آنکھ حتی کہ بدن کی کھال کو حکم دیا جائے گا کہ ان کے ذریعہ سے جن جرائم کا ارتکاب کیا تھا بیان کریں، چناچہ ہر ایک عضو اللہ کی قدرت سے گویا ہوگا اور ان جرموں کی شہادت دے گا، کما قال تعالیٰ: حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (فصلت: ۲۰) وقال تعالیٰ فی موضع آخر: قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (فصلت: ۲۱)۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾

اور اگر چاہیں مٹادیں ان کی آنکھیں پھر دوڑیں راستہ پانے کو پھر کہاں سے سوجھے

وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۷﴾ ع

اور اگر ہم چاہیں صورت مسخ کردیں ان کی جہاں کی تہاں پھر نہ آگے چل سکیں اور نہ وہ الٹے پھر سکیں ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور اگر ہم چاہتے تو (دنیا ہی میں ان کے کفر کی سزا میں) ان کی آنکھوں کو ملیا میٹ کردیتے (خواہ آنکھ کی بینائی کو یا خود آنکھ کے عضو ہی کو) پھر یہ راستے کی طرف (چلنے کے لئے) دوڑتے پھرتے سو ان کو کہاں نظر آتا (جیسا کہ قوم لوط پر ایسا ہی عذاب آیا تھا، چنانچہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فطمسنا اعينهم کہ ہم نے ان کی آنکھیں ملیا میٹ کردیں) اور (اس سے بڑھ کر) اگر ہم چاہتے تو (ان کی سزائے کفر میں) ان کی صورتیں بدل ڈالتے (جیسا کہ پہلے بعض لوگ بندر اور خنزیر ہوگئے) اس حالت سے کہ یہ جہاں ہیں وہیں رہ جاتے (یعنی مسخ کے ساتھ یہ بھی ہوتا کہ ان کو جانور بنادیتے اور جانور بھی اپاہج جو اپنی جگہ سے نہ ہل سکیں) جس سے یہ لوگ نہ آگے کو چل سکتے ہیں اور نہ پیچھے کو لوٹ سکتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جیسے انہوں نے ہماری آیتوں سے آنکھیں بند کرلی ہیں، اگر ہم چاہیں تو دنیا ہی میں بطور سزا کے ان کی ظاہری بینائی چھین کر نپٹ اندھا کردیں کہ ادھر ادھر جانے کا راستہ بھی نہ سوجھے اور جس طرح یہ لوگ شیطانی راستوں سے ہٹ کر اللہ کی راہ پر چلنا نہیں چاہتے، ہم کو قدرت ہے کہ اس کی صورتیں بگاڑ کر بالکل اپاہج بنادیں کہ پھر یہ کسی ضرورت کے لیے اپنی جگہ سے ہل نہ سکیں، پر ہم نے ایسا نہ چاہا اور ان جوارح وقویٰ سے ان کو محروم نہ کیا، یہ ہماری طرف سے مہلت اور ڈھیل تھی، آج وہ ہی آنکھیں اور ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے کہ ان بیہودوں نے ہم کو کن نالائق کاموں میں لگایا تھا۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ۭ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور جس کو ہم بوڑھا کریں اوندھا کریں اس کی پیدائش میں، پھر کیا ان کو سمجھ نہیں

خلاصہ تفسیر: اب فرماتے ہیں کہ اس پر کچھ تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ یہ صورتوں کا مسخ وغیرہ کیسے ہوجاتا، دیکھو اس کی ایک نظیر پر

ہمارا قادر ہونا شب و روز مشاہدہ میں آتا ہے:

اور ہم جس کی زیادہ عمر کر دیتے ہیں (یعنی بہت بوڑھا کر دیتے ہیں) تو اس کو طبعی حالت میں الٹا کر دیتے ہیں، سو کیا (اس حالت کو دیکھ کر بھی) وہ لوگ نہیں سمجھتے (کہ جب خدا کو ایک تغیر پر قدرت ہے تو وہ دوسری طرح بھی تغیر کر سکتا ہے، کیونکہ قدرت الٰہی کو تمام ممکنات کے ساتھ یکساں نسبت ہے، سو اس پر نظر کر کے ان لوگوں کو ڈرنا اور کفر کو چھوڑ دینا چاہیے)۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ: ''طبعی حالت'' سے مراد سمجھنے، سننے، دیکھنے اور نشو و نما پانے، غذا وغیرہ ہضم کرنے کی قوتیں اور رنگ و روغن اور حسن و جمال وغیرہ ہیں، اور ''الٹا کرنے'' سے مراد ان کو بدل دینا، اور قوت و طاقت کے بعد ضعف و کمزوری، اور حسن کے بعد بدصورت کر دینا ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ بڑھاپے میں انسان کی تمام قوتیں پستی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں، اسی پر مسخ وغیرہ کو قیاس کرنا چاہیے، کیونکہ وہ بھی ایک قسم کا تغیر ہے کامل سے ناقص کی طرف۔

* * *

فائدہ: یعنی آنکھیں چھین لینا اور صورت بگاڑ کر اپاہج بنا دینا کچھ مستبعد مت سمجھو، دیکھتے نہیں؟ ایک تندرست اور مضبوط آدمی زیادہ بوڑھا ہو کر کس طرح دیکھنے، سننے اور چلنے پھرنے سے معذور کر دیا جاتا ہے، گویا بچپن میں جیسا کمزور ناتواں اور دوسروں کے سہارے کا محتاج تھا، بڑھاپے میں پھر اسی حالت کی طرف پلٹا دیا جاتا ہے تو کیا جو خدا پیرانہ سالی کی حالت میں ان کی قوتیں سلب کر لیتا ہے، جوانی میں نہیں کر سکتا؟۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿٦٩﴾

اور ہم نے نہیں سکھایا اس کو شعر کہنا اور یہ اس کے لائق نہیں، یہ تو خالص نصیحت ہے اور قرآن ہے صاف ۔[1]

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٠﴾

تا کہ ڈر سنائے اس کو جس میں جان ہو اور ثابت ہو الزام منکروں پر ۔[2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت اور سزا و جزا کا ذکر تھا، اب رسالت اور اس کی بڑی دلیل یعنی قرآن کی حقانیت کا مضمون ہے۔

اور (یہ کفار جو آپ کی نبوت باطل کرنے کے لئے آپ کو شاعر یعنی خیالی مضامین باندھنے والا کہتے ہیں تو یہ بالکل باطل ہے، کیونکہ) ہم نے آپ کو شاعری (یعنی خیالی مضامین مرتب کرنے کا) علم نہیں دیا (اور نہ آپ نے کسی سے یہ فن سیکھا ہے) اور وہ (شاعری) آپ کے شایان شان بھی نہیں (کیونکہ آپ اعلیٰ درجہ کے محقق ہیں، صحیح اور حق مضامین بیان کرتے ہیں) وہ (یعنی آپ کو عطا کیا ہوا وحی کا علم جس کو یہ لوگ شاعری کہتے ہیں وہ) تو محض نصیحت (کا مضمون) اور ایک آسمانی کتاب ہے جو احکام کی ظاہر کرنے والی ہے، تا کہ (ان احکام کے بیان کے اثر سے) ایسے شخص کو (نافع) ڈرائے جو (دل کے اعتبار سے) زندہ ہو اور تا کہ کافروں پر (عذاب کی) حجت ثابت ہو جائے (کہ ان سے کہا جائے گا کہ تم نے احکام سننے کے باوجود انکار کیا تو اس کی سزا چکھو)۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ: بغیر تعلیم کے کوئی علم حاصل نہیں ہوتا، اور تعلیم کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو خدا سکھا دے، جس کو وہبی کہتے ہیں، یا بندے سکھا دیں، اور شاعری کا فن آپ کو کسی نے نہیں سکھایا، پس آپ اس سے بالکل پاک ہیں، اور شعر کا اطلاق نظم و نثر دونوں پر ہوتا ہے، کیونکہ شعر خیالی مضمون کو کہتے ہیں، خواہ موزون ہو یا نہ ہو۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ: شاعری کی بنا محض تخیل پر ہوتی ہے، اس لیے آپ کی باتیں شاعرانہ خیالات نہیں ہیں، پھر شاعری پر آپ کی قدرت نہ ہونا یہ اعلیٰ درجہ کی نزاہت اور پاکی ہے، حتیٰ کہ آپ کو نظم میں مہارت نہیں دی، کیونکہ نظم میں اکثر خیالی مضامین ہوتے ہیں اور یوں کبھی کسی شعر کا نقل کر دینا کسی

صحیح غرض سے، یا بلا قصد کوئی موزون کلام زبان سے نکل جانا یہ اس آیت کے خلاف نہیں، اس کے متعلق مزید تفصیل سورہ شعراء کے اخیر آیت ۲۲۴ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ حقائق واقعہ ہیں، کوئی شاعرانہ تخیلات نہیں، اس پیغمبر کو ہم نے قرآن دیا ہے جو نصیحتوں اور روشن تعلیمات سے معمور ہے، کوئی شعر وشاعری کا دیوان نہیں دیا، جس میں نری طبع آزمائی اور خیالی تک بندیاں ہوں، بلکہ آپ کی طبع مبارک کو فطری طور پر اس فن شاعری سے اتنا بعید رکھا گیا کہ باوجود قریش کے اس اعلیٰ خاندان میں سے ہونے کے جس کی معمولی لونڈیاں بھی اس وقت شعر کہنے کا طبعی سلیقہ رکھتی تھیں، آپ نے مدت العمر کوئی شعر نہیں بنایا، یوں رجز وغیرہ کے موقع پر کبھی ایک آدھ مرتبہ زبان مبارک سے مقفی عبارت نکل کر بے ساختہ شعر کے سانچہ میں ڈھل گئی ہو وہ الگ بات ہے، اسے شاعری یا شعر کہنا نہیں کہتے، آپ خود تو شعر کیا کہتے کسی دوسرے شاعر کا شعر یا مصرح بھی زندگی بھر میں دو چار مرتبہ سے زائد نہیں پڑھا اور پڑھتے وقت اکثر اس میں ایسا تغیر کر دیا کہ شعر شعر نہ رہے، محض مطلب شاعر ادا ہو جائے، غرض آپ کی طبع شریف کو شاعری سے مناسبت نہیں دی گئی تھی، کیونکہ یہ چیز آپ کے منصب جلیل کے لائق نہ تھی، آپ حقیقت کے ترجمان تھے اور آپ کی بعثت کا مقصد دنیا کو اعلیٰ حقائق سے بدون ادنیٰ ترین کذب وغلو کے روشناس کرنا تھا، ظاہر ہے کہ یہ کام ایک شاعر کا نہیں ہوسکتا، کیونکہ شاعریت کا حسن وکمال کذب ومبالغہ، خیالی بلند پروازی اور فرضی نکتہ آفرینی کے سوا کچھ نہیں، شعر میں اگر کوئی جز محمود ہے تو اس کی تاثیر اور دل نشینی ہو سکتی ہے، سو یہ چیز قرآن کی نثر میں اس درجہ پر پائی جاتی ہے کہ ساری دنیا کے شاعر مل کر یہ بھی اپنے کلاموں کے مجموعہ میں پیدا نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم کے اسلوب بدیع کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ گویا نظم کی اصل روح نکال کر نثر میں ڈال دی گئی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے فصیح وعاقل دنگ ہو کر قرآن کو شعر یا سحر کہنے لگے تھے، حالانکہ شعر وسحر کو قرآن سے کیا نسبت؟ کیا شاعری اور جادوگری کی بنیاد پر دنیا میں کبھی قومیت وروحانیت کی ایسی عظیم الشان اور لازوال عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں جو قرآنی تعلیم کی اساس پر آج تک قائم شدہ دیکھتے ہو؟ یہ کام شاعروں کا نہیں پیغمبروں کا ہے کہ خدا کے حکم سے مردہ قلوب کو ابدی زندگی عطا کرتے ہیں، حق تعالیٰ نے عرب کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ آپ پہلے سے شاعر تھے شاعری سے ترقی کر کے نبی بن بیٹھے۔

فائدہ: ۲ یعنی زندہ دل آدمی قرآن سن کر اللہ سے ڈرے اور منکروں پر حجت تمام ہو۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جس میں جان ہو، یعنی نیک اثر پکڑتا ہو، اس کے فائدہ کو اور منکروں پر الزام اتارنے کو''۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے بنا دیئے ان کے واسطے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں سے چوپائے پھر وہ ان کے مالک ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے ایسے دلائل سے توحید کو ثابت کیا تھا جو نعمتوں کو بھی شامل ہیں، اب پھر اسی مضمون کی طرف ایسے ہی دلائل سے رجوع کیا جاتا ہے، پیچھے شرکاء کی نفی اشارتاً تھی اور یہاں صراحتہً ہے۔

کیا ان (مشرک) لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے (نفع کے) لئے اپنے ہاتھ کی ساختہ (بنائی ہوئی) چیزوں میں سے مواشی (چوپائے) پیدا کئے (یعنی ان کی پیدائش میں کسی اور کو دخل نہیں) اور (ہمارے مالک بنانے سے) یہ لوگ ان کے مالک بن رہے ہیں۔

* * *

فائدہ: آیات تنزیلیہ کے بعد پھر آیات تکوینیہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں، یعنی ایک طرف قرآن کی پند ونصیحت کو سنو، اور دوسری طرف غور سے دیکھو کہ اللہ کے کیسے کیسے انعام واحسان تم پر ہوئے ہیں، اونٹ، گائے، بکری، گھوڑے، خچر وغیرہ جانوروں کو تم نے نہیں بنایا، اللہ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا ہے، پھر تم کو محض اپنے فضل سے ان کا مالک بنا دیا کہ جہاں چاہو بیچو اور جو چاہو کام لو۔

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿٤٢﴾

اور عاجز کر دیا ان (چوپایوں) کو ان کے آگے پھر ان میں کوئی ہے ان کی سواری اور کسی کو کھاتے ہیں

وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٤٣﴾

اور ان کے واسطے چار پایوں میں فائدے ہیں اور پینے کے گھاٹ پھر کیوں شکر نہیں کرتے ۔ل

خلاصہ تفسیر: اور (اب چوپایوں کے منافع کی کچھ تفصیل ہے کہ) ہم نے ان مواشی کو ان کا تابع بنا دیا، سو (وہ ان کے کام میں لانے سے کام دیتے ہیں چنانچہ) ان میں بعض تو ان کی سواریاں ہیں اور بعض کو وہ کھاتے ہیں، اور ان میں ان لوگوں کے لئے اور بھی نفع ہیں (جیسے بال، کھال، ہڈی وغیرہ مختلف طریقوں سے استعمال میں آتے ہیں) اور (ان میں ان لوگوں کے) پینے کی چیزیں بھی ہیں (یعنی دودھ) سو کیا (اس پر بھی) یہ لوگ شکر نہیں کرتے (اور شکر کا سب سے مقدم اور اہم درجہ توحید پر ایمان ہے)۔

وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ: اگر یہاں انعام سے خاص مواشی یعنی جانور مراد ہیں جو کہ حلال ہیں تو ''بعض کے کھانے'' کا یہ مطلب ہے کہ ان کے بعض اجزاء کھاتے ہیں، بعض پھینک بھی دیے جاتے ہیں، اور اگر لفظ انعام حلال وحرام سب جانوروں کو عام ہو تو ظاہر ہے کہ ان میں سے وہی کھائے جاتے ہیں جو حلال ہیں، اس صورت میں ''بعض'' کا لفظ بے تکلف درست ہے۔

***

فائدہ: ل دیکھو کتنے بڑے بڑے عظیم الجثہ قوی ہیکل جانور انسان ضعیف البنیان کے سامنے عاجز ومسخر کر دیے، ہزاروں اونٹوں کی قطار کو ایک خوردسال بچہ نکیل پکڑ کر جدھر چاہے لے جائے، ذرا کان نہیں ہلاتے، کیسے کیسے شہ زور جانوروں پر آدمی سواری کرتا ہے اور بعض کو کاٹ کر اپنی غذا بناتا ہے، علاوہ گوشت کھانے کے ان کی کھال، ہڈی اون وغیرہ سے کس قدر فوائد حاصل کیے جاتے ہیں، ان کے تھن کیا ہیں گویا دودھ کے چشمے ہیں، ان ہی چشموں کے گھاٹ سے کتنے آدمی سیراب ہوتے ہیں، لیکن شکر گزار بندے بہت تھوڑے ہیں۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٧٤﴾ۭ

اور پکڑتے ہیں اللہ کے سوا اور حاکم کہ شاید ان کی مدد کریں

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿٧٥﴾

نہ کر سکیں گے ان کی مدد اور یہ ان کی فوج ہو کر پکڑے آئیں گے ۔ل

خلاصہ تفسیر: اور انہوں نے (شکر اور توحید کے بجائے کفر اور شرک اختیار کر رکھا ہے چنانچہ) خدا کے سوا اور معبود قرار دے رکھے ہیں اس امید پر کہ ان کو (ان معبودین کی طرف سے) مدد ملے (لیکن) وہ ان کی کچھ مدد کر ہی نہیں سکتے اور (مدد تو کیا کرتے اور الٹے) وہ (معبودین) ان لوگوں کے حق میں ایک فریق (مخالف) ہو جائیں گے جو (موقف حساب میں جبری طور پر) حاضر کئے جائیں گے (اور وہاں حاضر ہو کر ان کی مخالفت کا اظہار کریں گے جیسا کہ سورہ مریم میں ارشاد ہے: ویکونون علیهم ضداً ، اسی طرح سورہ یونس میں ارشاد ہے: قال شرکاءھم ما کنتم ایانا تعبدون)۔

***

فائدہ: ل یعنی جس خدا نے یہ نعمتیں مرحمت فرمائیں اس کا یہ شکر ادا کیا کہ اس کے مقابل دوسرے احکام اور معبود ٹھہرا لیے، جنہیں سمجھتے

ہیں کہ آڑے وقت میں کام آئیں گے اور مدد کریں گے، سو یاد رکھو! وہ تمہاری تو کیا اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے، ہاں! جب تم کو مدد کی ضرورت ہوگی، اس وقت گرفتار ضرور کرا دیں گے، تب پتہ لگے گا کہ جن کی حمایت میں عمر بھر لڑتے رہے تھے، وہ آج کس طرح آنکھیں دکھانے لگے۔

وقف لازم

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝76

اب تو غمگین مت ہو ان کی بات سے، ہم جانتے ہیں جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے مشرکین کا حق واضح ہو جانے کے باوجود توحید قبول نہ کرنا، اور بتوں کی عاجزی ظاہر ہونے کے باوجود شرک اختیار کرنا مذکور تھا، جس سے ان کا انتہائی درجہ احمق یا نہایت درجہ سرکش ہونا لازم آتا ہے، اب آگے اس پر رسول اللہ ﷺ کی تسلی فرماتے ہیں کہ جب یہ لوگ ایسی صاف صاف باتوں میں مخالفت کرتے ہیں تو آپ ان کی حالت پر غم نہ کریں۔

(جب یہ لوگ ایسے واضح اور کھلے ہوئے امور میں بھی خلاف ہی کرتے ہیں) تو ان لوگوں کی باتیں (انکار توحید و رسالت سے متعلق) آپ کے لئے آزردگی کا باعث نہ ہونا چاہئے (کیونکہ آزردگی یعنی دل کا ٹوٹنا ہوتا ہے امید سے، اور امید ہوتی ہے مخاطب کے عقل و انصاف سے، اور ان لوگوں میں نہ عقل ہے نہ انصاف تو ان سے کسی چیز کی امید ہی نہیں ہو سکتی، پھر غم کیوں ہو! آگے دوسرے طریقہ سے آنحضرت محمد ﷺ کی تسلی ہے) بیشک ہم سب جانتے ہیں جو کچھ یہ دل میں رکھتے ہیں اور جو کچھ (زبان سے) ظاہر کرتے ہیں (اس لئے وقت مقرر پر ان کو ان کے عمل کی سزا ملے گی)۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ: اس میں اشارہ ہے کہ کام کرنے والوں کو مخالفین کی باتوں کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ واقف ہیں اور خود اس کا مناسب انتقام لے لیتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جب خود ہمارے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہے تو آپ ان کی بات سے غمگین و دلگیر نہ ہوں، اپنا فرض ادا کر کے ہمارے حوالہ کریں، ہم ان کے ظاہری و باطنی احوال سے خوب واقف ہیں، ٹھیک ٹھیک بھگتان کر دیں گے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝77

کیا دیکھتا نہیں انسان کہ ہم نے اس کو بنایا ایک قطرہ سے پھر تبھی وہ ہو گیا جھگڑنے بولنے والا

خلاصہ تفسیر: سورت کے اختتام پر پھر قیامت کے مضمون کی طرف رجوع ہے، البتہ اتنا فرق ہے کہ اوپر قیامت کے واقعات کا زیادہ ذکر تھا، اور آگے دلیل کا پہلو زیادہ ہے، کیونکہ وہاں قیامت کے وقت سے سوال ہوا تھا، اور یہاں اس کے ممکن ہونے پر اعتراض ہوا تھا، چنانچہ شان نزول یہ ہے کہ عاص بن وائل ایک بوسیدہ ہڈی لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کو چٹکی میں مل کر کہنے لگا کہ کیا ایسی حالت کے بعد پھر یہ زندہ ہوگی، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اور تو دوزخ میں جائے گا، اگلی آیتیں اسی قصہ میں نازل ہوئیں۔

کیا (اس) آدمی کو (جو قیامت کا انکار کرتا ہے) یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو (ایک حقیر) نطفہ سے پیدا کیا (جس کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی ابتدائی حالت کو یاد کر کے اول تو اپنی حقارت اور خالق کی عظمت کو دیکھ کر خود شرماتا کہ اعتراض اور گستاخی کی جرأت نہ کرتا، دوسرے خود اپنی حالت سے ہی سے دوبارہ زندہ ہونے پر استدلال کرتا کہ جس اللہ نے بے جان نطفہ سے جاندار آدمی بنا دیا ہے وہ بے جان ہڈی میں بھی جان ڈال سکتا ہے) سو (اس نے ایسا نہ کیا بلکہ مذکورہ تقاضہ کے خلاف) وہ علانیہ اعتراض کرنے لگا۔

* * *

فائدہ: یعنی انسان اپنی اصل کو یاد نہیں رکھتا کہ وہ ایک ناچیز قطرہ تھا، خدا نے کیا سے کیا بنا دیا، اس پانی کی بوند کو وہ زور اور قوت گویائی عطا

کی کہ بات بات پر جھگڑنے اور باتیں بنانے لگا، حتیٰ کہ آج اپنی حد سے بڑھ کر خالق کے مقابلہ میں خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾

اور بٹھلاتا ہے ہم پر ایک مثل اور بھول گیا اپنی پیدائش، کہنے لگا کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب کھوکھری ہو گئیں

خلاصہ تفسیر: اور (وہ اعتراض یہ کہ) اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا (عجیب اس لئے کہا کہ اس سے قدرت کا انکار لازم آتا ہے) اور اپنی اصل کو بھول گیا (کہ ہم نے اس کو حقیر نطفہ سے ایک کامل انسان بنایا، اگر اپنی اصل کو نہ بھولتا تو ایسی بات نہ کہتا) کہتا ہے کہ ہڈیوں کو (خصوصا) جبکہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کردے گا۔

* * *

فائدہ: یعنی دیکھتے ہو! خدا پر کیسے فقرے چسپاں کرتا ہے، گویا اس قادر مطلق کو عاجز مخلوق کی طرح فرض کرلیا ہے، جو کہتا ہے کہ آخر جب بدن گل سڑ کر صرف ہڈیاں رہ گئیں وہ بھی بوسیدہ پرانی اور کھوکھلی، تو انہیں دوبارہ کون زندہ کرے گا؟ ایسا سوال کرتے وقت اسے اپنی پیدائش یاد نہیں رہی ، ورنہ اس قطرہ ناچیز کو ایسے الفاظ کہنے کی جرأت نہ ہوتی، اپنی اصل پر نظر کر کے کچھ شرماتا اور کچھ عقل سے کام لے کر اپنے سوال کا جواب بھی حاصل کرلیتا جو اگلی آیت میں مذکور ہے:

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ ﴿۷۹﴾

تو کہہ ان کو زندہ کرے گا جس نے بنایا ان کو پہلی بار، اور وہ سب (طرح) بنانا جانتا ہے [۱]

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

جس نے بنادی تم کو سبز درخت سے آگ پھر اب تم اس سے سلگاتے ہو [۲]

خلاصہ تفسیر: آپ جواب دے دیجئے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی مرتبہ ان کو پیدا کیا ہے (کہ پہلی تخلیق کے وقت ان ہڈیوں کا زندگی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا، وہ زندگی سے بہت ہی دور تھیں، اور اب تو وہ ایک بار حیات یعنی زندگی کو قبول بھی کر چکی ہیں تو اب ان میں زندگی پیدا کرنا کیا مشکل ہے) اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے (یعنی ابتداً کسی چیز کو پیدا کرنا بھی، یا پیدا شدہ چیز کو ختم کر کے دوبارہ پیدا کردینا) وہ ایسا (قادر مطلق) ہے کہ (بعض) ہرے درخت سے تمہارے لئے آگ پیدا کر دیتا ہے، پھر تم اس سے اور آگ سلگا لیتے ہو۔

الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا: عرب میں ایک درخت تھا مرخ، اور دوسرا عفار، ان دونوں درختوں سے چقماق کا کام لیتے تھے، دونوں کے ملانے سے آگ پیدا ہو جاتی تھی، تو جس قادر نے ہرے درخت کے پانی میں آگ پیدا فرمادی حالانکہ پانی کا اثر ہی سرسبزی اور ہرا پن ہے تو دوسرے جمادات میں حیات پیدا کردینا اس کے لئے کیا مشکل ہے، کیونکہ وہاں تو آگ کے ساتھ پانی بھی رہتا ہے اور یہاں حیات کے بعد وہ جماد نہ رہے گا تو وہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔

* * *

فائدہ: [۱] یعنی جس نے پہلی مرتبہ ان ہڈیوں میں جان ڈالی، اسے دوسری بار جان ڈالنا کیا مشکل ہے، بلکہ پہلے سے زیادہ آسان ہونا چاہیے (وھو اھون علیہ) اور اس قادر مطلق کے لیے تو سب ہی چیز آسان ہے، پہلی مرتبہ ہو یا دوسری مرتبہ، وہ ہر طرح بنانا جانتا ہے اور بدن کے اجزاء اور ہڈیوں کے ریزے جہاں کہیں منتشر ہو گئے ہوں، ان کا ایک ایک ذرہ اس کے علم میں ہے۔

فائدہ: یعنی اول پانی سے سرسبز وشاداب درخت تیار کیا، پھر اسی تر وتازہ درخت کو سکھا کر ایندھن بنادیا، جس سے اب تم آگ نکال رہے

ہو، پس جوخدا ایسی متضاد صفات کو ادل بدل سکتا ہے کیا وہ ایک چیز کی موت وحیات کے الٹ پھیر پر قادر نہیں؟

تنبیہ: بعض سلف نے الشجر الاخضر (سبز درخت) سے خاص وہ درخت مراد لیے ہیں جن کی شاخوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ نکلتی ہو، جیسے بانس کا درخت ہے، یا عرب میں ''مرخ'' اور ''عفار'' تھے، واللہ اعلم۔

اَوَلَيۡسَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؕ بَلٰى وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۸۱﴾

کیا جس نے بنائے آسمان اور زمین نہیں بنا سکتا ان جیسے، کیوں نہیں! اور وہ ہی ہے اصل بنانیوالا سب کچھ جاننے والا

خلاصہ تفسیر: اور جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے ہیں کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے آدمیوں کو (دوبارہ) پیدا کر دے، ضرور قادر ہے (بلکہ زمین و آسمان تو اور بھی بڑے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: لخلق السموات والارض اکبر من خلق الناس) اور وہ بڑا پیدا کرنے والا خوب جاننے والا ہے۔

عَلٰٓى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ: یہ کلام ایسا ہے جیسا کہ ہمارے محاورے میں بولتے ہیں کہ ایں تم جیسوں کو کیا سمجھتا ہوں، یعنی تم کو بھی اور تم جیسوں کو بھی میں کچھ نہیں سمجھتا۔

* * *

فائدہ: یعنی جس نے آسمان وزمین جیسی بڑی بڑی چیزیں پیدا کیں اسے ان کافروں جیسی چھوٹی چیزوں کا پیدا کر دینا کیا مشکل ہے۔

اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡــًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۸۲﴾

اس کا حکم یہی ہے کہ جب کرنا چاہے کسی چیز کو تو کہے اس کو ہو وہ اسی وقت ہو جائے ؎۱

ع ۵

فَسُبۡحٰنَ الَّذِىۡ بِيَدِهٖ مَلَكُوۡتُ كُلِّ شَىۡءٍ وَّاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۳﴾

سو پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ ہے حکومت ہر چیز کی اور اسی کی طرف پھر کر چلے جاؤ گے ؎۲

خلاصہ تفسیر: (اور اس کی قدرت ایسی ہے کہ) جب وہ کسی چیز (کے پیدا کرنے) کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا معمول تو یہ ہے کہ اس چیز کو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے (پھر اس کو کیا بات مشکل ہو سکتی ہے) تو (ان سب مقدمات سے ثابت ہو گیا کہ) اس کی پاک ذات ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا پورا اختیار ہے (یعنی وہ عاجزی وغیرہ کے نقص سے پاک ہے) اور (اب یہ دعویٰ تمام شبہات سے سالم ہو گیا کہ) تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے (یعنی قیامت کے روز)۔

كُنۡ فَيَكُوۡنُ: اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر چیز کی تخلیق دفعی اور فوری ہی ہو، بلکہ حکمت خالق کے تابع جس چیز کا فوری طور پر پیدا ہو جانا مصلحت ہے وہ فوری طور پر بلا تدریج و مہلت پیدا ہو جاتی ہے اور جس چیز کا پیدا ہونا کسی حکمت و مصلحت کی بنا پر بتدریج مناسب سمجھا گیا وہ اسی تدریج کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے، خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ اس کو پہلے ہی حکم میں خاص تدریج کے ساتھ پیدا ہونا بتلایا گیا ہو، یا ہر مرحلہ پر اس کو جداگانہ حکم کن کا خطاب ہوتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

* * *

فائدہ: ؎۱ یعنی کسی چھوٹی بڑی چیز کے پہلی مرتبہ یا دوبارہ بنانے میں اسے دقت ہی کیا ہو سکتی ہے، اس کے ہاں تو بس ارادہ کی دیر ہے، جہاں کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور کہا ہو جا! فوراً ہوئی رکھی ہے، ایک سیکنڈ کی تاخیر نہیں ہو سکتی۔

تنبیہ: میرے خیال میں اس آیت کو پہلی آیت کے ساتھ ملا کر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے خلق بدن کا ذکر تھا، یہاں نفخ روح کا

مطلب سمجھا دیا، واللہ اعلم۔ راجع و فوائد سورۃ الإسراء تحت بحث الروح۔

فائدہ: ۲ یعنی وہ اعلیٰ ترین ہستی جس کے ہاتھ میں فی الحال بھی اوپر سے نیچے تک تمام مخلوقات کی زمام حکومت ہے اور آئندہ بھی اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے، پاک ہے عجز و سفہ اور ہر قسم کے عیب و نقص سے۔

آیاتها ۱۸۲ ۔ ۳۷ سُوْرَةُ الصّٰفّٰتِ مَكِّيَّةٌ ٥٦ ۔ ركوعاتها ٥

خلاصہ تفسیر: یہ سورت مکی ہے، اور دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا بنیادی موضوع بھی ایمانیات ہیں اور اس میں توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کو مختلف طریقوں سے مدلل کیا گیا ہے، اس ضمن میں مشرکین کے عقائد کی تردید بھی ہے، اور آخرت میں جنت دوزخ کے حالات کی منظر کشی بھی جو عقائد تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں شامل رہے ان کو مدلل کرنے اور کفار کے شبہات و اعتراض کو دور کرنے کے بعد یہ بیان کیا گیا ہے کہ ماضی میں جن لوگوں نے ان عقائد کو تسلیم کیا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ کیا رہا؟ اور جنہوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کی ان کا کیا انجام ہوا؟ چنانچہ اس ضمن میں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، اور ان کے صاحبزادگان، حضرت موسیٰ و ہارون حضرت الیاس، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے واقعات کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیل سے ذکر کئے گئے ہیں، مشرکین مکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے، آخر میں اس عقیدے کی مفصل تردید کی گئی ہے، اور سورت کے مجموعی طرز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت میں شرکت کی اس خاص قسم (یعنی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینے) کی تردید بطور خاص پیش نظر رہی ہے، اسی لئے سورت کو فرشتوں کی قسم کھا کر اور ان کے اوصاف بندگی کو ذکر کر کے شروع کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۳﴾ اِنَّ اِلٰـهَكُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾

قسم ہے صف باندھنے والوں کی قطار ہو کر ۱ پھر ڈانٹنے والوں کی جھڑک کر ۲ پھر پڑھنے والوں کی یاد کر کر ۳ بیشک حاکم تم سب کا ایک ہے ۴

خلاصہ تفسیر: قسم ہے ان فرشتوں کی جو (عبادت میں یا حق تعالیٰ کا حکم سننے کے وقت) صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں (جیسا اسی سورت میں آگے آئے گا: وانا لنحن الصافون) پھر (قسم ہے) ان فرشتوں کی جو (شہاب ثاقب کے ذریعہ آسمانی خبریں لانے سے شیاطین کی) بندش کرنے والے ہیں (جیسا کہ اسی سورت میں عنقریب آ رہا ہے) پھر (قسم ہے) ان فرشتوں کی جو ذکر (الٰہی تسبیح و تقدیس) کی تلاوت کرنے والے ہیں (جیسا کہ اسی سورت میں آئے گا: وانا لنحن المسبحون، غرض ان سب کی قسم کھا کر کہتے ہیں) کہ تمہارا معبود (برحق) ایک ہے۔

یہاں ان قسموں سے کلام میں تاکید مقصود ہے، استدلال مقصود نہیں، آگے کی چھ آیات میں توحید کی دلیل مستقلاً بیان کی گئی ہے، مخلوق کی قسم کھانے کے متعلق تفصیل سورہ حجر آیت ۷۲ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

* * *

فائدہ: ۱ وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا: یعنی جو صف باندھ کر قطار در قطار کھڑے ہوتے ہیں، خواہ فرشتے ہوں جو حکم الٰہی سننے کو اپنے اپنے مقام پر درجہ بدرجہ کھڑے ہوتے ہیں، یا عبادت گزار انسان جو نماز اور جہاد وغیرہ میں صف بندی کرتے ہیں۔

تنبیہ: قسم محاورات میں تاکید کے لیے ہے جو اکثر منکر کے مقابلہ میں استعمال کی جاتی ہے، لیکن بسا اوقات محض ایک مضمون کو مہتم بالشان ظاہر کرنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں اور قرآن کریم کی قسموں کا تتبع کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ عموماً مقسم بہ مقسم علیہ کے لیے بطور ایک شاہد

یا دلیل کے ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا: یعنی جو فرشتے شیطانوں کو ڈانٹ کر بھگاتے ہیں تا کہ استراق سمع کے ارادہ میں کامیاب نہ ہوں، یا بندوں کو نیکی کی بات سمجھا کر معاصی سے روکتے ہیں، یا وہ نیک آدمی جو خود اپنے نفس کو بدی سے روکتے اور دوسروں کو بھی شرارت پر ڈانٹتے جھڑکتے رہتے ہیں، خصوصاً میدان جہاد میں کفار کے مقابلہ پر ان کی ڈانٹ ڈپٹ بہت سخت ہوتی ہے۔

فائدہ: ۳ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا: یعنی وہ فرشتے یا آدمی جو اللہ کے احکام سننے کے بعد پڑھتے اور یاد کرتے ہیں ایک دوسرے کے بتانے کو۔

فائدہ: ۴ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ: بیشک آسمان پر فرشتے اور زمین پر خدا کے نیک بندے ہر زمانہ میں قولاً وفعلاً شہادت دیتے رہے ہیں کہ سب کا مالک ومعبود ایک ہے اور ہم اسی کی رعیت ہیں۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝۵

رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے اور رب مشرقوں کا

خلاصہ تفسیر: (اور اس توحید کی دلیل یہ ہے کہ وہ) پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے (یعنی ان کا مالک اور متصرف) اور پروردگار ہے (سب ستاروں کے) طلوع کرنے کے مواقع کا۔

وَرَبُّ الْمَشَارِقِ: چونکہ سورج سال کے ہر دن میں ایک نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے، اس لئے اس کی مشرقیں بہت ساری ہیں، اسی بنا پر یہاں جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، یہاں لفظ ''مشارق'' سے مغارب بھی خود مفہوم ہو گیا اس لیے لفظ مغارب کے اظہار کی حاجت نہیں، کیونکہ دو ضدوں میں سے ایک ضد کا ذکر دوسری ضد کی طرف اشارہ ہوتا ہے جیسے: سرابیل تقیکم الحر میں فقط گرمی کا ذکر کیا مراد گرمی اور سردی دونوں ہی ہیں۔

* * *

فائدہ: شمال سے جنوب تک ایک طرف مشرقین ہیں، سورج کی ہر روز کی جدا اور ہر ستارے کی جدا، یعنی وہ نقطے جن سے ان کا طلوع ہوتا ہے اور دوسری طرف اتنی ہی مغربیں ہیں، شاید ''مغارب'' کا ذکر یہاں سے اس لیے نہیں کیا کہ مشارق سے بطور مقابلہ کے خود ہی سمجھ میں آجائیں گی اور ایک حیثیت سے طلوع شمس وکواکب کو حق تعالیٰ کی شان حکومت وعظمت کے ثابت کرنے میں بہ نسبت غروب کے زیادہ دخل ہے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ ۝۶ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷

ہم نے رونق دی (سب سے) ورلے آسمان کو ایک رونق جو تارے ہیں ۱ اور بچاؤ بنایا ہر شیطان سرکش سے ۲

خلاصہ تفسیر: (اور) ہم ہی نے رونق دی ہے اس طرف والے آسمان کو ایک عجیب آرائش یعنی ستاروں کے ساتھ اور (انہی ستاروں کے ساتھ اس آسمان کی یعنی اس کی خبروں کی) حفاظت بھی کی ہے ہر شریر شیطان سے (جس کا طریقہ آگے بیان کیا گیا ہے)۔

زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ: اس آیت سے ستاروں کا بظاہر اسی قریب والے آسمان پر ہونا معلوم ہوتا ہے، بہرکیف ستاروں سے اس آسمان کی زینت ہونے میں تو کلام نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اندھیری رات میں یہ آسمان بیشمار ستاروں کی جگمگاہٹ سے دیکھنے والوں کو کیسا خوبصورت، مزین اور پر رونق معلوم ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی تاروں سے آسمان کی زینت وآرائش ہے اور بعض تاروں کے ذریعہ سے جو ٹوٹتے ہیں شیطانوں کو روکنے اور دفع کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے، یہ ٹوٹنے والے ستارے کیا ہیں؟ آیا کواکب نوریہ کے علاوہ کوئی مستقل نوع کواکب کی ہے؟ یا کواکب نوریہ کی شعاعوں ہی سے ہوا متکیف ہو کر ایک طرح کی آتش سوزاں پیدا ہو جاتی ہے؟ یا خود کواکب کے اجزاء ٹوٹ کر گرتے ہیں؟ اس میں علماء وحکماء کے مختلف اقوال ہیں، بہرحال

ان کی حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو رجم شیطان کا کام بھی ان سے لیا جاتا ہے، اس کی کچھ تفصیل سورہ حجر کے فوائد میں گزر چکی ملاحظہ کرلی جائے۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ﴿٨﴾ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ﴿٩﴾

سن نہیں سکتے (نہ سکیں) اوپر کی مجلس تک اور پھینکے جاتے ہیں (مار پڑتی ہے) ان پر ہر طرف سے بھگانے کو ا اور ان (کیلئے) پر مار (عذاب) ہے ہمیشہ کو ۲

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿١٠﴾

مگر جو کوئی اچک لایا (بھاگا) جھپ سے (جھٹ جھپٹ کر) پھر پیچھے لگا اس کے انگارا چمکتا ۳

خلاصہ تفسیر: (اور اسی حفاظت کے انتظام کی وجہ سے) وہ شیاطین عالم بالا (یعنی فرشتوں) کی (باتوں کی) طرف کان بھی نہیں لگا سکتے (یعنی اکثر تو مار کھانے کے ڈر سے دور ہی دور رہتے ہیں) اور (اگر کبھی اتفاقاً آنے کی کوشش کرتے بھی ہیں تو) وہ ہر طرف سے (یعنی جس طرف بھی جو شیطان جائے) مار کر دھکے دے دیئے جاتے ہیں (یہ عذاب اور ذلت تو انہیں فی الحال ملتی ہے) اور (پھر آخرت میں) ان کے لئے (جہنم کا) دائمی عذاب ہوگا (غرض کوئی آسمانی خبر سننے سے پہلے ہی انہیں مار بھگایا جاتا ہے، وہ سننے کا ارادہ لے کر آتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں) مگر جو شیطان کچھ خبر لے ہی بھاگے تو ایک دہکتا ہوا شعلہ اس کے پیچھے لگ لیتا ہے (کہ اس کو جلا پھونک کر ہلاک کر دیتا ہے، لہٰذا جو کچھ سنا ہے اسے دوسروں تک پہنچانے میں ناکام رہتا ہے)۔

وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شیطان کو ہر طرف سے رجم کرتے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس بھی طرف کوئی شیطان جائے ادھر ہی جلا کر مار دیا جاتا ہے۔

فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ: شہاب ثاقب سے شیاطین کے رجم کی تحقیق سورہ حجر آیت ۱۸ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کرلیا جائے، یہ تمام تر انتظامات وتصرفات توحید خداوندی پر دلالت کرتے ہیں، اور اگرچہ اس دلیل کے بعض مقدمات صرف قرآن ہی کے بیان سے معلوم ہوئے ہیں، لیکن خود قرآن کی صحت دلیل عقلی سے ثابت ہے اس لیے توحید پر یہ استدلال عقلی ہی رہا۔

شیاطین کی اس حالت کے بیان کرنے سے شرک کا ابطال ہوگیا کہ جن شیطانوں کو تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو وہ اس درجہ ذلیل وخوار ہیں کہ عالم بالا تک ان کو رسائی تو میسر ہے نہیں، اس سے زیادہ قدر ومنزلت ان کی کیا ہوگی، پھر وہ خدائی کے مستحق کب ہو سکتے ہیں، نیز اس سے رسالت محمدیہ کے صحیح ہونے پر بھی اشارہ ہوگیا کہ اس قرآن میں کہانت کا احتمال نہیں، کیونکہ اب شیاطین آسمان کی خبریں نہیں سن سکتے اور یہ بات کاہنوں کی زبانی بھی عام لوگوں کو معلوم ہوگئی تھی، کاہن خود اقرار کرتے کہ اب شیاطین پہلے کی طرح ہمارے پاس آسمانی خبریں نہیں لاتے۔

* * *

فائدہ: ۱ اوپر کی مجلس سے مراد فرشتوں کی مجلس ہے، یعنی شیاطین کو یہ قدرت نہیں دی گئی کہ فرشتوں کی مجلس میں پہنچ کر کوئی بات وحی الٰہی کی سن آئیں، جب ایسا ارادہ کر کے اوپر آسمانوں کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو جس طرف سے جاتے ہیں ادھر ہی سے فرشتے دھکے دے کر اور مار مار کر بھگا دیتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی دنیا میں ہمیشہ یوں ہی مار پڑتی رہے گی اور آخرت کا دائمی عذاب الگ رہا۔

فائدہ: ۳ یعنی اسی بھاگ دوڑ میں جلدی سے کوئی ایک آدھ بات اچک لایا، اس پر بھی فرشتے شہاب ثاقب سے اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ اس کی تفصیل سورہ حجر کے شروع میں گزر چکی۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ⑪

اب پوچھ ان سے کیا یہ بنانے مشکل ہیں (انکا بنانا مشکل ہے) یا جتنی خلقت کہ ہم نے بنائی ۱؎ ہم نے ہی انکو بنایا ہے ایک چپکتے (چمٹنے والے) گارے سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا بیان تھا، اب قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کو ثابت کرتے ہیں جس کے ممکن ہونے پر توحید کی دلیل کے بعض اجزا سے استدلال بھی ہو چکا ہے جیسا کہ یہاں فاستفتھم میں فاء داخل کر کے اس طرف اشارہ کیا گیا، یعنی جب دلائل توحید سے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ان عظیم الشان مخلوقات میں ایسے ایسے عظیم تصرفات پر قادر ہیں اور یہ ساری عظیم مخلوقات اس کے قبضہ قدرت میں ہیں:

تو آپ ان (آخرت کا انکار کرنے والوں) سے پوچھئے کہ یہ لوگ بناوٹ میں زیادہ سخت ہیں یا ہماری پیدا کی ہوئی یہ چیزیں (جن کا ابھی ذکر ہوا؟ حقیقت یہی ہے کہ یہی چیزیں زیادہ سخت ہیں، کیونکہ) ہم نے ان لوگوں کو (یعنی آدم علیہ السلام کو اسی معمولی) چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے (جس میں نہ کچھ قوت ہے نہ سختی اور انسان جو اس سے بنا ہے وہ بھی زیادہ قوی اور سخت نہیں ہے، اب سوچنے کی بات ہے کہ جب ہم ایسی قوی اور سخت مخلوقات کو عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہیں تو انسان جیسی ضعیف مخلوق کو ایک بار موت دے کر دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قدرت نہ ہو گی؟)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی منکرین بعث سے دریافت کیجئے کہ آسمان، زمین، ستارے، فرشتے، شیاطین وغیرہ مخلوقات کا پیدا کرنا ان کے خیال میں زیادہ مشکل کام ہے یا خود ان کا پیدا کرنا اور وہ بھی ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد، ظاہر ہے جو خدا ایسی عظیم الشان مخلوقات کا بنانے والا ہے، اسے ان کا دوبارہ بنا دینا کیا مشکل ہو گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان کی اصل حقیقت ہمیں سب معلوم ہے، ایک طرح کے چپکتے گارے سے جس کا پتلا ہم نے تیار کیا، آج اس کے یہ دعوے ہیں کہ آسمان و زمین کا بنانے والا اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں، جس طرح پہلے تجھ کو مٹی سے بنایا، دوبارہ بھی مٹی سے نکال کر کھڑا کر دیں گے۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۖ⑫ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۖ⑬ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۖ⑭

بلکہ تو کرتا ہے تعجب اور وہ کرتے ہیں ٹھٹھے ۱؎ اور جب ان کو سمجھایئے نہیں سوچتے، اور جب دیکھیں کچھ نشانی ہنسی میں ڈال دیتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (مگر ایسی واضح دلیل کے باوجود بھی یہ لوگ آخرت کے قائل نہیں ہوئے) بلکہ (اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ) آپ تو (ان کے انکار سے) تعجب کرتے ہیں (کہ یہ قیامت کو غیر ممکن سمجھ کر خدا کی قدرت کا انکار کیسے کرتے ہیں) اور یہ لوگ (انکار سے بڑھ کر آخرت کے عقیدے سے) تمسخر کرتے ہیں، اور (ان کی کیفیت یہ ہے کہ) جب ان کو (عقلی دلائل سے) سمجھایا جاتا ہے تو یہ سمجھتے نہیں، اور جب یہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں (جو آپ کی نبوت ثابت کرنے کے لئے ان کو دکھایا جاتا ہے جس سے عقیدہ آخرت ثابت کیا جائے) تو (خود) اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔

کیونکہ جب آپ کا نبی ہونا ثابت ہو جائے گا تو یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تجھ کو ان پر تعجب آتا ہے کہ ایسی صاف باتیں کیوں نہیں سمجھتے اور وہ ٹھٹھا کرتے ہیں کہ یہ (نبی) کس قسم کی بے سروپا باتیں کر رہا ہے۔ (العیاذ باللہ)

وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ⑮ۚ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۙ⑯

اور کہتے ہیں اور کچھ نہیں یہ تو کھلا جادو ہے ۱؎ کیا جب ہم مر گئے اور ہو گئے مٹی اور ہڈیاں تو کیا ہم کو پھر اٹھائیں گے کیا

اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾ قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

اور ہمارے اگلے باپ دادوں کو بھی ۲ تو کہہ کہ ہاں! اور تم ذلیل ہو گے

خلاصہ تفسیر: اور کہتے ہیں کہ یہ تو صریح جادو ہے (کیونکہ اگر یہ معجزہ ہو تو اس سے آپ کی نبوت ثابت ہو جائے گی اور آپ کو نبی ماننے کے بعد آپ کا بیان کردہ عقیدہ آخرت بھی ماننا پڑے گا، حالانکہ ہم آخرت کا عقیدہ نہیں مان سکتے، کیونکہ) بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا ہم (پھر) زندہ کئے جائیں گے، اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ ہوں گے) آپ کہہ دیجئے کہ ہاں (ضرور زندہ ہوں گے) اور تم ذلیل بھی ہو گے۔

قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ: دیکھنے میں تو یہ ایک حاکمانہ جواب ہے، جیسا ہٹ دھرمی کرنے والوں کو دیا جاتا ہے، لیکن جو شخص دلیل کے بعد بھی عناد اور ہٹ دھرمی سے انکار کرے اس کے لیے ایسا ہی جواب مناسب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نصیحت سن کر غور و فکر نہیں کرتے اور جو معجزات و نشانات دیکھتے ہیں انہیں جادو کہہ کر ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔

فائدہ: ۲ وہ ہی مرغے کی ایک ٹانگ گائے جاتے ہیں کہ صاحب جب ہمارا بدن خاک میں مل کر مٹی ہو گیا، صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں اور اس سے بھی بڑھ کر ہمارے باپ دادا جن کو مرے ہوئے قرن گزر گئے، شاید ہڈیاں بھی باقی نہ رہی ہوں، ہم کس طرح مان لیں کہ یہ سب پھر از سرِ نو زندہ کر کر کے کھڑے کر دیے جائیں گے۔

فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ یَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ قَالُوْا یٰوَیْلَنَا هٰذَا یَوْمُ الدِّیْنِ ﴿۲۰﴾

سو وہ اٹھانا تو یہی ہے ایک جھڑکی پھر اسی وقت یہ لگیں گے دیکھنے ۱ اور کہیں گے اے خرابی ہماری یہ آ گیا دن جزا کا ۲

هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۵

یہ ہے دن فیصلہ کا جس کو تم جھٹلاتے تھے ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کو دلیل سے ثابت کرنے کے بعد اب اس کے کچھ واقعات بیان فرماتے ہیں۔

پس قیامت تو بس ایک للکار ہو گی (یعنی دوسرا صور) سو (اس سے) سب یکا یک (زندہ ہو کر) دیکھنے بھالنے لگیں گے اور (حسرت سے) کہیں گے ہائے ہماری کم بختی یہ تو وہی روز جزا (معلوم ہوتا) ہے (ارشاد ہو گا کہ ہاں!) یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہاں ضرور اٹھائے جاؤ گے اور اس وقت ذلیل و رسوا ہو کر اس انکار کی سزا بھگتو گے۔

فائدہ: ۲ یعنی ایک ڈانٹ میں سب اٹھ کھڑے ہوں گے اور حیرت و دہشت سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں گے (یہ ڈانٹ یا جھڑکی نفخ صور کی ہو گی)۔

فائدہ: ۳ یعنی یہ تو سچ مچ جزاء کا دن آ پہنچا، جس کی انبیاء خبر دیتے اور ہم ہنسی اڑایا کرتے تھے۔

اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ وَ مَا كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾

جمع کرو گناہ گاروں کو اور ان کے جوڑوں (ساتھیوں) کو اور جو کچھ پوجتے تھے ۱

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿٢٣﴾

اللہ کے سوا پھر چلاؤ ان کو دوزخ کی راہ پر ۲ے

خلاصہ تفسیر: (اب آگے قیامت ہی کے بعض واقعات کی تفصیل ہے کہ فرشتوں کو حکم ہوگا) جمع کرلو ظالموں کو (یعنی جو شرک اور کفر کے بانی اور پیشوا تھے) اور ان کے ہم مشربوں کو (یعنی جو ان کے ساتھ تابع تھے) اور ان معبودوں کو جن کی وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (یعنی شیاطین اور بت) پھر ان سب کو دوزخ کا رستہ بتلاؤ (یعنی ادھر لے جاؤ)۔

* * *

فائدہ: ۱ے یہ حق تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوگا۔

فائدہ: ۲ے یہ حکم ہوگا فرشتوں کو کہ ان سب کو اکٹھا کر کے دوزخ کا راستہ بتاؤ۔

تنبیہ: ازواج (جوڑوں) سے مراد ہیں ایک قسم کے گنہگار، یا ان کی کافر بیویاں اور وما کانوا یعبدون من دون اللہ سے اصنام و شیاطین وغیرہ مراد ہیں۔

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿٢٤﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿٢٥﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿٢٦﴾

اور کھڑا رکھو ان کو ان سے پوچھنا ہے ۱ے کیا ہوا تم کو ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے، کوئی نہیں وہ آج اپنے کو پکڑواتے ہیں ۲ے

خلاصہ تفسیر: اور (پھر یہ حکم ہوگا کہ اچھا) ان کو (ذرا) ٹھہراؤ ان سے کچھ پوچھا جائے گا (چنانچہ ان سے یہ سوال ہوگا) کہ اب تم کو کیا ہوا کہ (عذاب کا حکم سن کر) ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے (یعنی کافروں کے بڑے بڑے رہنما انسانوں میں سے ہوں یا شیاطین جنات میں سے، وہ اب عذاب کی خبر سن کر اپنے تابعین کی کیوں مدد نہیں کرتے، جس طرح دنیا میں ان کو بہکایا کرتے تھے؟ کہ تم شرک اختیار کرو کچھ نقصان نہ ہوگا، مگر اس سوال کے بعد بھی وہ مدد نہ کرسکیں گے) بلکہ وہ سب کے سب اس روز سرافگندہ (سر جھکائے کھڑے) ہوں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ے حکم کے بعد کچھ دیر ٹھہرائیں گے تاکہ ان سے ایک سوال کیا جائے جو آگے مالکم لا تناصرون میں مذکور ہے۔

فائدہ: ۲ے یعنی دنیا میں تو نحن جمیع منتصر کہا کرتے تھے (کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں) آج کیا ہوا کہ کوئی اپنے ساتھی کی مدد نہیں کرتا، بلکہ ہر ایک بدون کان ہلائے ذلیل ہو کر پکڑا ہوا چلا آرہا ہے۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٧﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿٢٨﴾

اور منہ کیا بعضوں نے بعضوں کی طرف لگے پوچھنے، بولے تم ہی تھے کہ آتے تھے ہم پر داہنی طرف سے ۱ے

خلاصہ تفسیر: (بجائے اس کے کہ مشرکین ایک دوسرے کی مدد کرسکیں ان میں اس وقت الٹا جھگڑا ہوگا) اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر جواب سوال (یعنی اختلاف) کرنے لگیں گے (چنانچہ) تابعین (ماتحت اپنے سرداروں سے) کہیں گے کہ (ہمیں تم نے گمراہ کیا، کیونکہ) ہم پر تمہاری آمد بڑے زور کی ہوا کرتی تھی (یعنی تم ہم پر خوب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے)۔

* * *

فائدہ: ۱ے یمین (داہنے ہاتھ) میں عموماً زور وقوت زائد ہوتی ہے، یعنی تم ہی تھے جو ہم پر چڑھے آتے تھے بہکانے کو زور دکھلا کر اور مرعوب کر کے، یا یمین سے مراد خیر و برکت کی جانب لی جائے، یعنی تم ہی تھے کہ ہم پر چڑھائی کرتے تھے، بھلائی اور نیکی سے روکنے کے لیے، یہ گفتگو اتباع اور متبوعین (زبردستوں اور زیردستوں) کے درمیان ہوگی۔

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝٢٩ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ۝٣٠

وہ بولے کوئی نہیں پر تم ہی نہ تھے یقین لانے والے، اور ہمارا تم پر کچھ زور نہ تھا، تم ہی تھے لوگ حد سے نکل چلنے والے

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ۝٣١ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ۝٣٢ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ

سو ثابت ہوگئی ہم پر بات ہمارے رب کی بیشک ہم کو مزہ چکھنا ہے، ہم نے تم کو گمراہ کیا جیسے ہم خود تھے گمراہ ۱؎ سو وہ سب اس دن

فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝٣٣ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝٣٤

تکلیف میں شریک ہیں ۲؎ ہم ایسا ہی کرتے ہیں گناہ گاروں کے حق میں

خلاصہ تفسیر: متبوعین (پیشوا سردار) کہیں گے کہ نہیں بلکہ تم خود ہی ایمان نہیں لائے تھے، اور (ہم پر ناحق الزام لگاتے ہو، کیونکہ) ہمارا تم پر کوئی زور تو تھا ہی نہیں، بلکہ تم خود ہی سرکشی کیا کرتے تھے، سو (جب کفر کے مرتکب ہم بھی تھے اور تم بھی، تو اس سے معلوم ہوا کہ) ہم سب پر ہی ہمارے رب کی یہ (ازلی) بات محقق ہو چکی تھی کہ ہم سب کو (عذاب کا) مزہ چکھنا ہے، تو (اس تقدیر کے پورا ہونے کا سامان یہ ہوگیا کہ) ہم نے تم کو بہکایا (جس سے تم ہمارے جبر و اکراہ کے بغیر خود اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے اور ادھر) ہم خود بھی (اپنے اختیار سے) گمراہ تھے (پس دونوں کی گمراہی کے اسباب جمع ہو گئے، اور تمہاری گمراہی میں تمہارے اختیار کو بھی دخل تھا، پھر اپنے آپ کو بری کیسے کرنا چاہتے ہو؟ آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب دونوں فریق کا کفر میں شریک ہونا ثابت ہے) تو وہ سب کے سب اس روز عذاب میں (بھی) شریک رہیں گے (اور) ہم ایسے مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی خود تو ایمان نہ لائے ہم پر الزام رکھتے ہو، ہمارا تم پر کیا زور تھا جو دل میں ایمان نہ گھسنے دیتے، تم لوگ خود ہی عقل و انصاف کی حد سے نکل گئے کہ بے لوث ناصحین کا کہنا نہ مانا اور ہمارے بہکائے میں آ گئے، اگر عقل و فہم اور عاقبت اندیشی سے کام لیتے تو ہماری باتوں پر کبھی کان نہ دھرتے، رہے ہم سو ظاہر ہے خود گمراہ تھے، ایک گمراہ سے بجز گمراہی کی طرف بلانے کے اور کیا توقع ہو سکتی ہے، ہم نے وہ ہی کیا جو ہمارے حال کے مناسب تھا، لیکن تم کو کیا مصیبت نے گھیرا تھا کہ ہمارے چکموں میں آ گئے، بہر حال جو ہونا تھا ہو چکا، خدا کی حجت ہم پر قائم ہوئی اور اس کی وہ ہی بات: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (ص:٨٥) ثابت ہو کر رہی، آج ہم سب کو اپنی اپنی غلط کاریوں اور بدمعاشیوں کا مزہ چکھنا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی سب مجرم اور درجہ بدرجہ عذاب میں شریک ہوں گے، جیسے جرم میں شریک تھے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝٣٥ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا

وہ تھے کہ ان سے جب کوئی کہتا کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے تو غرور کرتے ۱؎ اور کہتے کیا ہم چھوڑ دیں گے اپنے معبودوں کو

لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝٣٦ ۭ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٣٧

کہنے سے ایک شاعر دیوانہ کے، کوئی نہیں وہ لے کر آیا ہے سچا دین اور سچا مانتا ہے سب رسولوں کو ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے ان کے کفر و جرم کا بیان ہے کہ) وہ لوگ ایسے تھے کہ (توحید کے بھی منکر تھے اور رسالت کے بھی چنانچہ) جب ان سے (بواسطہ رسول اللہ ﷺ) کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود برحق نہیں تو (اس کے ماننے سے) تکبر کیا کرتے تھے، اور کہا

کرتے تھے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر دیوانہ (کے کہنے) کی وجہ سے چھوڑ دیں گے؟ (پس اس میں توحید اور رسالت دونوں کا انکار ہو گیا، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ پیغمبر نہ شاعر ہیں نہ مجنون) بلکہ (پیغمبر ہیں کہ) ایک سچا دین لے کر آئے ہیں اور (اصول توحید وغیرہ میں) دوسرے پیغمبروں کی تصدیق (اور موافقت) کرتے ہیں (یعنی ایسے اصول بتلاتے ہیں جن میں سب رسول متفق ہیں)۔

پس ان کے بتائے ہوئے اصول بے شمار دلائل کی روشنی میں حق ہیں، خیال بندی نہیں، اور حق بات کا کہنا جنون نہیں، دوسری امتوں نے بھی اپنے انبیاء کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا، یہاں چونکہ براہ راست کفار عرب مخاطب ہیں اس لئے صرف اسی امت کے کافروں کا ذکر کیا گیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان کا کبر و غرور مانع ہے کہ نبی کے ارشاد سے یہ کلمہ (لا الہ الا اللہ) زبان پر لائیں جس سے اُن کے جھوٹے معبودوں کی نفی ہوتی ہے، خواہ دل میں اسے سچ ہی سمجھتے ہوں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی شاعروں کا جھوٹ تو مشہور ہے، پھر اس راست باز ہستی کو شاعر کیسے کہتے ہو جو دنیا میں خالص سچائی لے کر آیا ہے اور سارے جہان کے سچوں کی تصدیق کرتا ہے، کیا مجنون اور دیوانے ایسے صحیح اور پختہ اصول پیش کیا کرتے ہیں؟

إِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ﴿۳۸﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۹﴾

بیشک تم کو چکھنا ہے عذاب دردناک، اور وہ ہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کرتے تھے ۱؎

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿۴۰﴾

مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے اس بات کا بیان ہے کہ انہیں زبانی طور پر اس مشترک عذاب کی وعید سنائی جائے گی کہ:

تم سب (تابع اور متبوع) کو دردناک عذاب چکھنا پڑے گا اور (اس حکم میں تم پر کوئی ظلم نہیں ہوا، کیونکہ) تم کو اسی کا بدلہ ملے گا جو کچھ تم (کفر وغیرہ) کیا کرتے تھے، ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے بندے ہیں (اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جنہوں نے حق کا اتباع کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مقبول اور مخصوص فرما لیا تو ایسے لوگ عذاب سے محفوظ رہیں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی انکار توحید اور ان گستاخیوں کا مزہ چکھو گے جو بارگاہ رسالت میں کر رہے ہو، جو کچھ کرتے تھے ایک دن سب سامنے آ جائیگا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان کا کیا ذکر، وہ تو ایک قسم ہی دوسری ہے جس پر حق تعالیٰ نوازش و کرم فرمائے گا۔

أُولَٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ ﴿۴۱﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُم مُّكْرَمُونَ ﴿۴۲﴾ فِي جَنَّٰتِ النَّعِيمِ ﴿۴۳﴾

وہ لوگ جو ہیں ان کے واسطے روزی ہے مقرر، میوے ۱؎ اور ان کی عزت ہے ۲؎ نعمت کے باغوں میں

عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَٰبِلِينَ ﴿۴۴﴾ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿۴۵﴾ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشَّٰرِبِينَ ﴿۴۶﴾

تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے، لوگ لیے پھرتے ہیں ان کے پاس پیالہ شراب صاف کا، سفید رنگ مزہ دینے والی پینے والوں کو

لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ﴿۴۷﴾

نہ اس میں سر پھرتا ہے اور نہ وہ اس کو پی کر بہکیں ۳؎

خلاصہ تفسیر: ان (اللہ کے نیک اور مقبول بندوں) کے واسطے ایسی غذائیں ہیں جن کا حال (دوسری سورتوں میں) معلوم (ہوچکا) ہے، یعنی میوے (جن کا ملنا سورہ یٰسین میں اور جن کی صفات سورہ واقعہ میں اس سے پہلے معلوم ہوچکی ہیں، کیونکہ یہ دونوں سورتیں نزول میں سورہ صفت سے مقدم ہیں) اور وہ لوگ بڑی عزت سے آرام کے باغوں میں تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے (اور) ان کے پاس ایسا جام شراب لایا جائے گا (یعنی غلمان لائیں گے) جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا (اس سے شراب کی کثرت اور لطافت معلوم ہوئی، اور دیکھنے میں) سفید ہوگی (اور پینے میں) پینے والوں کو لذیذ معلوم ہوگی (اور) نہ اس میں دردسر ہوگا (جیسے دنیا کی شراب میں ہوتا ہے جس کو خمار کہتے ہیں) اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا۔

* * *

فائدہ: ا۔ یعنی عجیب وغریب میوے کھانے کو ملیں گے، جن کی پوری صفت تو اللہ ہی کو معلوم ہے، ہاں! کچھ مختصری بندوں کو بھی بتلادی ہے جیسے فرمایا: (لَا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ (واقعہ:۳۳)۔

فائدہ: ۲۔ خدا ہی جانے کیا کیا اعزاز واکرام ہوں گے۔

فائدہ: ۳۔ یعنی مزہ اور نشاط پورا ہوگا اور دنیا کی شراب میں جو خرابیاں ہوتی ہیں ان کا نام ونشان نہ ہوگا، نہ سرگرانی ہوگی، نہ نشہ چڑھے گا، نہ قے آئے گی، نہ پھیپھڑے وغیرہ خراب ہوں گے، نہ اس کی نہریں خشک ہوکر ختم ہوسکیں گی۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾

اور ان کے پاس ہیں عورتیں نیچی نگاہ رکھنے والیاں بڑی آنکھوں والیاں ا۔ گویا وہ انڈے ہیں چھپے دھرے ۲۔

خلاصہ تفسیر: اور ان کے پاس نیچی نگاہ والی بڑی بڑی آنکھوں والی (حوریں) ہوں گی (جن کی رنگت ایسی صاف ہوگی کہ) گویا بیضے ہیں جو (پروں کے نیچے) چھپے ہوئے ہیں (کہ گرد وغبار اور داغ سے بالکل محفوظ ہوتے ہیں)۔

كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ: یہ تشبیہ محض صفائی میں ہے، نہ کہ رنگ میں، کیونکہ اہل عرب عورتوں کے لیے اس تشبیہ کو استعمال کیا کرتے ہیں اور خاص رنگت میں انڈے سے تشبیہ دینا مقصود نہیں، چنانچہ سورہ رحمن میں ان کے رنگ کو یاقوت اور مونگے سے تشبیہ دی گئی ہے، تو یہ مختلف رنگتیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں، یا یوں کہا جائے کہ سب رنگ کچھ کچھ دمکتے ہوں گے۔

* * *

فائدہ: ا۔ یعنی شرم وناز سے نگاہ نیچی رکھنے والی حوریں جو اپنے ازواج کے سوا کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی صاف وشفاف رنگ ہوگا، جیسے انڈا جس کو پرندا اپنے پروں میں نیچے چھپائے رکھے کہ نہ داغ لگے، نہ گرد وغبار پہنچے، یا انڈے کے اندر کی سفیدی نہ جو سخت چھلکے کے نیچے پوشیدہ رہتی ہے، اور بعض نے کہا کہ شتر مرغ کے انڈے مراد ہیں جو بہت خوش رنگ ہوتے ہیں، بہر حال تشبیہ صفائی یا خوش رنگ ہونے میں ہے سفیدی میں نہیں، چناچہ دوسری جگہ فرمایا: كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ (الرحمن:۵۸)

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ ﴿۵۱﴾

پھر منہ کیا ایک نے دوسرے کی طرف لگے پوچھنے، بولا ایک بولنے والا ان میں میرا تھا ایک ساتھی

يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿۵۲﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾

کہا کرتا کیا تو یقین کرتا ہے، کیا جب ہم مرگئے اور ہوگئے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم کو جزا ملے گی ا۔

خلاصہ تفسیر: پھر (جب سب لوگ ایک جلسہ میں جمع ہوں گے تو) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے (اس بات چیت کے دوران میں) ان (اہل جنت) میں سے ایک کہنے والا (اہل مجلس سے) کہے گا کہ (دنیا میں) میرا ایک ملاقاتی تھا وہ (مجھ سے بطور تعجب) کہا کرتا تھا کہ کیا تو بعث (آخرت) کے معتقدین میں سے ہے؟ کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا ہم (دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور زندہ کر کے) جزا سزا دیئے جائیں گے؟ (یعنی وہ آخرت کا منکر تھا، اس لئے ضرور وہ دوزخ میں گیا ہوگا)۔

جس جنتی کا یہ قصہ یہاں مذکور ہے اسکا نام اور پتہ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ساری جنت میں ایسا شخص ایک ہی ہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یاران جلسہ جمع ہوں گے اور شراب طہور کا جام چل رہا ہوگا، اس عیش وتنعم کے وقت اپنے بعض گذشتہ حالات کا مذاکرہ کریں گے، ایک جنتی کہے گا کہ میاں! دنیا میں میرا ایک ملنے والا تھا، جو مجھے آخرت پر یقین رکھنے کی وجہ سے ملامت کیا کرتا اور احمق بنایا کرتا تھا، اس کے نزدیک یہ بالکل مہمل بات تھی کہ ایک شخص مٹی میں مل جائے اور گوشت پوست کچھ باقی نہ رہے، محض بوسیدہ ہڈیاں رہ جائیں، پھر اسے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے از سرنو زندہ کر دیں؟ بھلا ایسی بے تکی بات پر کون یقین کر سکتا ہے؟

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾

کہنے لگا بھلا تم جھانک کر دیکھو گے ۱؎ پھر جھانکا تو اس کو دیکھا بیچوں بیچ دوزخ کے

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾

بولا قسم اللہ کی تو تو مجھ کو ڈالنے لگا تھا گڑھے میں، اور اگر نہ ہوتا میرے رب کا فضل تو میں بھی ہوتا انہی میں جو پکڑے ہوئے آئے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (حق تعالیٰ کا) ارشاد ہوگا کہ (اے اہل جنت!) کیا تم جھانک کر (اس کو) دیکھنا چاہتے ہو؟ (اگر چاہو تو تم کو اجازت ہے) سو وہ شخص (جس نے قصہ بیان کیا تھا) جھانکے گا (خواہ اور لوگ بھی جھانکیں یا نہ جھانکیں) تو اس کو وسط جہنم میں (پڑا ہوا) دیکھے گا (اس کو وہاں دیکھ کر اس سے) کہے گا کہ خدا کی قسم! تو تو مجھ کو تباہ ہی کرنے کو تھا (یعنی مجھ کو بھی آخرت کا منکر بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا) اور اگر میرے رب کا (مجھ پر) فضل نہ ہوتا (کہ مجھ کو خدا نے صحیح عقیدے پر قائم رکھا) تو میں بھی (تیری طرح عذاب میں) ماخوذ لوگوں میں ہوتا۔

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ: یعنی ''اگر دیکھنا چاہو تو تم کو اجازت ہے'' احقر نے اس کو حق تعالیٰ کا قول قرار دیا ہے، اور بعض مفسرین کی طرح اس جنتی آدمی کا قول قرار نہیں دیا، کیونکہ حق تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اہل جنت کا ایسا کہنا اور کرنا بعید معلوم ہوتا ہے۔

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ: پہلی صورت میں اسی شخص کا ذکر خصوصیت سے اس لیے کیا گیا کہ اس کو اشتیاق زیادہ تھا، اور جھانکنے کی اجازت بھی اسی کے سبب ملی، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اوپر اور دوزخ نیچے ہے، اور اس وقت باہم ان میں ایسی نسبت ہوگی کہ جھانکنے سے دوزخ نظر آجائے گی۔

فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ: ''وسط'' کے لفظ سے حقیقی وسط یعنی بالکل بیچوں بیچ مراد ہونا ضروری نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی وہ ساتھی یقیناً دوزخ میں پڑا ہوگا، آؤ ذرا جھانک کر دیکھیں کس حال میں ہے (یہ اس جنتی کا مقولہ ہوا، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مقولہ اللہ کا ہے، یعنی حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم جھانک کر اس کو دیکھنا چاہتے ہو)۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس جنتی کو اپنے ساتھی کا حال دکھلا دیا جائے گا کہ ٹھیک دوزخ کی آگ میں پڑا ہوا ہے، یہ حال دیکھ کر اسے عبرت ہوگی اور اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان یاد آئے گا، کہے گا، کم بخت! تو نے تو مجھے بھی اپنے ساتھ برباد کرنا چاہا تھا، محض اللہ کے احسان نے دستگیری فرمائی جو اس مصیبت سے بچالیا اور میرا قدم راہ ایمان وعرفان سے ڈگمگانے نہ دیا، ورنہ آج میں بھی تیری طرح پکڑا ہوا آتا، اور اس دردناک عذاب میں گرفتار ہوتا۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿٥٨﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿٥٩﴾

کیا اب ہم کو مرنا نہیں، مگر جو پہلی بار مر چکے اور ہم کو تکلیف نہیں پہنچنے کی

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿٦١﴾

بیشک یہی ہے بڑی مراد ملنی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیے محنت کریں محنت کرنے والے [1]

خلاصہ تفسیر: (اوراس کے بعد جنتی اہل مجلس سے کہے گا کہ) کیا ہم بجز پہلی بار مرچکنے کے (کہ دنیا میں مر چکے ہیں) اب نہیں مریں گے اور نہ ہم کو عذاب ہوگا؟ (یہ ساری باتیں اس خوشی کے جوش میں کہی جائیں گی کہ اللہ تعالیٰ نے سب آفات اور کلفتوں سے ہمیں بچالیا اور ہمیشہ کے لئے بےفکر کردیا، آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جنت کی جتنی جسمانی اور روحانی نعمتیں اوپر بیان کی گئیں) یہ بیشک بڑی کامیابی ہے، ایسی ہی کامیابی (حاصل کرنے) کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے (یعنی ایمان لانا اور اطاعت کرنا چاہئے)۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ: اس آیت میں صراحت ہیں کہ جنت اور اس کی نعمتیں مطلوب ہیں جن کی یہاں ترغیب بھی دی گئی، ان لوگوں کی طرح نہیں جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ "ہم کو جنت کی کیا پروا، حور ومحلات سے کیا مطلب، ہم کو تو فقط لقاء رب چاہیے"، یہ دعوی درست نہیں، البتہ جن مغلوب الحال لوگوں سے اس قسم کی باتیں منقول ہیں وہ معذور ہیں۔

* * *

فائدہ: [1] اس وقت فرط مسرت سے کہے گا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس پہلی موت کے سوا جو دنیا میں آچکی، اب ہم کو کبھی مرنا نہیں اور نہ کبھی اس عیش و بہار سے نکل کر تکلیف وعذاب کی طرف جانا ہے، خدا تعالیٰ کے فضل و رحمت سے اسی تنعم و رفاہیت میں ہمیشہ رہیں گے، بیشک بڑی بھاری کامیابی اسی کو کہتے ہیں اور یہ ہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کی تحصیل کے لیے چاہیے کہ ہر طرح کی محنتیں اور قربانیاں گوارا کی جائیں۔

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٣﴾

بھلا یہ بہتر ہے مہمانی یا درخت سیہنڈ کا، ہم نے اس کو رکھا ہے ایک بلا ظالموں کے واسطے

اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٦٥﴾

وہ ایک درخت ہے کہ نکلتا ہے دوزخ کی جڑ میں [1] اس کا خوشہ جیسے سر شیطان کے [2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے عذاب اور ثواب دونوں کا موازنہ کرکے اب اہل ایمان کو ترغیب اور کفار کو ترہیب فرماتے ہیں کہ بتلاؤ: بھلا یہ دعوت (جنت کی نعمتوں کی) بہتر ہے (جو اہل ایمان کے لئے ہے) یا زقوم کا درخت (جو کفار کے لئے ہے) ہم نے اس درخت کو (آخرت کی سزا بنانے کے علاوہ دنیا میں بھی ان) ظالموں کے لئے موجب امتحان بنایا ہے (کہ اس کو سن کر تصدیق کرتے ہیں، یا تکذیب واستہزاء کرتے ہیں؟ چنانچہ کفار تکذیب واستہزاء سے پیش آئے، کہنے لگے کہ زقوم تو مکھن اور چھوارے کو کہتے ہیں، وہ تو خوب لذیذ چیز ہے اور کہنے لگے کہ زقوم اگر درخت ہے تو دوزخ میں جو آگ ہی آگ ہے تو درخت کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ) وہ ایک درخت ہے جو قعر دوزخ میں سے نکلتا ہے (یعنی مکھن اور چھوارا نہیں ہے، اور چونکہ زقوم خود آگ ہی میں پیدا ہوتا ہے اس لئے وہاں رہنا بعید نہیں، جیسے سمندر نامی جانور آگ میں پیدا ہوتا ہے، اور آگ ہی میں رہتا ہے، اس سے دونوں باتوں کا جواب ہوگیا، آگے زقوم کی ایک کیفیت مذکور ہے کہ) اس کے پھل ایسے (کریہہ منظر) ہیں

جیسے سانپ کے پھن (پس ایسے درخت سے ظالموں کی دعوت ہوگی)۔

شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ: بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ زقوم ایک درخت کا نام ہے جس کے چھوٹے چھوٹے پتے ہوتے ہیں، بدبودار اور کڑوا ہوتا ہے، تہامہ میں بکثرت پیدا ہوتا ہے، ہندوستان میں اس کے قریب تھوہر اور سینڈھ کا درخت ہوتا ہے، کفار کے استہزا کی وجہ یہ ہے عربی زبان میں زقوم کے معنی وہ بھی ہیں جو خلاصہ تفسیر میں لکھے گئے، مگر جب لفظ زقوم کے ساتھ درخت کا لفظ بڑھا دیا گیا اور بتلا دیا گیا کہ یہاں زقوم سے درخت مراد ہے تو اب دوسرے معنی کے احتمال کی بالکل گنجائش نہ رہی تھی، مگر کفار کو تو محض شرارت مقصود تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دے دیا۔

كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ: بدنمائی اور بدصورتی میں اس کو سانپ کے پھن سے تشبیہ دی گئی ہے، جیسے ہندوستان میں ایک خاردار درخت کو ناگ پھن کہتے ہیں اور سانپوں کو ایذا رسانی اور خباثت کی وجہ سے شیاطین کہتے ہیں، غرض ایسے درخت سے ظالموں کی دعوت ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱ اوپر بہشتیوں کی مہمانی کا ذکر تھا، یہاں سے دوزخیوں کی مہمانی کا حال سناتے ہیں، ''زقوم'' کسی درخت کا نام ہے جو سخت کڑوا، بدذائقہ ہوتا ہے، جیسے ہمارے یہاں تھوہر، یا سیہنڈ، دوزخ کے اندر حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ایک درخت اگایا ہے، اس کو یہاں **شجرۃ الزقوم** سے موسوم کیا، وہ ایک بلا ہے ظالموں کے واسطے آخرت میں، کیونکہ جب دوزخ والے بھوک سے بیقرار ہوں گے تو یہی کھانے کو دیا جائے گا اور اس کا حلق سے اتارنا یا اترنے کے بعد ایک خاص اثر پیدا کرنا سخت تکلیف دہ اور مستقل عذاب ہوگا اور دنیا میں بھی ایک طرح کی بلا اور آزمائش ہے کہ قرآن میں اس کا ذکر سن کر گمراہ ہوتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ سبز درخت دوزخ کی آگ میں کیونکر اُگا (حالانکہ ممکن ہے اس کا مزاج ہی ناری ہو، جیسے آگ کا کیڑا آگ کے سمندر میں زندہ رہتا ہے، اور سہارنپور کے کمپنی باغ میں بعض درختوں کی تربیت آگ کے ذریعہ ہوتی ہے)۔ کسی نے کہا **زقوم** فلاں لغت میں کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں انہیں سامنے دیکھ کر ایک دوسرے کو بلاتے ہیں کہ آؤ ''زقوم'' کھائیں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی سخت بدنما شیطان کی صورت، یا شیاطین کہا سانپوں کو، یعنی اس کا خوشہ سانپ کے سر کی طرح ہوگا، جیسے ہمارے ہاں ایک درخت کو اسی تشبیہ سے ''ناگ پھن'' کہتے ہیں۔

فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ

سو وہ کھائیں گے اس میں سے پھر بھریں گے اس سے پیٹ، پھر ان کے واسطے اس کے اوپر ملونی ہے جلتے پانی کی ۱

اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾

پھر ان کو لے جانا آگ کے ڈھیر میں ۲ انہوں نے پایا اپنے باپ دادوں کو بہکے ہوئے، سو وہ انہی کے قدموں پر دوڑتے ہیں ۳

خلاصہ تفسیر: تو وہ لوگ (بھوک کی شدت میں جب اور کچھ نہ ملے گا تو) اس سے کھائیں گے اور (چونکہ بھوک سے بے چین ہوں گے) اسی سے پیٹ بھریں گے، پھر (جب پیاس سے بے قرار ہو کر پانی مانگیں گے تو) ان کو کھولتا ہوا پانی (غساق یعنی پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا اور (یہ نہیں کہ اسی پر مصیبت کا خاتمہ ہو جائے بلکہ اس کے بعد) پھر اخیر ٹھکانا ان کا دوزخ ہی کی طرف ہوگا (یعنی اس کے بعد بھی ہمیشہ کے لئے دوزخ ہی میں رہنا ہوگا، اور انہیں یہ سزا اس لئے دی گئی کہ) انہوں نے (ہدایت خداوندی کا اتباع نہیں کیا تھا بلکہ) اپنے بڑوں کو گمراہی کی حالت میں پایا تھا، پھر یہ بھی انہی کے قدم بقدم تیزی کے ساتھ چلتے تھے (یعنی شوق اور رغبت سے اپنے بڑوں کی بے راہی پر چلتے تھے، یہ حکم اکثر کفار کے اعتبار سے ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ ''زقوم'' کھا کر پیاس لگے گی تو سخت جلتا پانی پلایا جائے گا جس سے آنتیں کٹ کر باہر آپڑیں گی: فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (محمد: ۱۵) اعاذنا اللہ منہا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بہت بھوکے ہوں گے تو آگ سے ہٹا کر یہ کھانا پانی کھلا پلا کر پھر آگ میں ڈال دیں گے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی پچھلے کا فر اگلوں کی اندھی تقلید میں گمراہ ہوئے، جس راہ پر انہیں چلتے دیکھا، اسی پر دوڑ پڑے، کنواں کھائی کچھ نہ دیکھا۔

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾

اور بہک چکے ہیں ان سے پہلے بہت لوگ اگلے، اور ہم نے بھیجے ہیں ان میں ڈر سنانے والے

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۷۴﴾ ع۴

اب دیکھ کیسا ہوا انجام ڈرائے ہوؤں کا، مگر جو بندے اللہ کے ہیں چنے ہوئے ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور ان (موجودہ کفار) سے پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر گمراہ ہو چکے ہیں اور ہم نے ان میں بھی ڈرانے والے (پیغمبر) بھیجے تھے سو دیکھ لیجئے ان لوگوں کو کیسا (برا) انجام ہوا جن کو ڈرایا گیا تھا (کہ انہوں نے رسولوں کا کہنا نہ مانا تھا تو ان پر دنیا ہی میں کیا کیا عذاب نازل ہوا) ہاں مگر جو اللہ کے خاص کئے ہوئے (یعنی ایمان والے) بندے تھے (وہ اس دنیاوی عذاب سے بھی محفوظ رہے، اور اخروی عذاب سے ان کے محفوظ رہنے کا پیچھے ذکر ہو چکا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہر زمانہ میں انجام سے آگاہ کرنے والے آخرت کا ڈر سنانے والے آتے رہے، آخر جنہوں نے نہ سنا اور نہ مانا دیکھ لو! ان کا انجام کیسا ہوا!! بس اللہ کے وہ ہی چنے ہوئے بندے محفوظ رہے، جن کو خدا کا ڈر اور عاقبت کی فکر تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ڈر سب ہی کو سناتے ہیں، ان میں نیک بچتے ہیں اور بد کھبتے ہیں۔

ربط: آگے بعض منذرین (بالکسر) اور منذرین (بالفتح) کے قصے سنائے جاتے ہیں، مکذبین کی عبرت اور مومنین کی تسلی کے لیے۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾

اور ہم کو پکارا تھا نوح نے سو کیا خوب پہنچنے والے ہیں ہم پکار پر، اور بچا دیا اس کو اور اس کے گھر کو اس بڑی گھبراہٹ سے

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾

اور رکھا اس کی اولاد کو وہی باقی رہنے والے، اور باقی رکھا اس پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہے نوح پر سارے جہان والوں میں

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾

ہم یوں بدلہ دیتے ہیں نیکی والوں کو، وہ ہے ہمارے ایمان دار بندوں میں، پھر ڈبا دیا ہم نے دوسروں کو ۱؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید اور آخرت کا مضمون تھا جس کے اختتام پر مسئلہ رسالت کو ثابت کیا تھا کہ ہم پہلے بھی پیغمبر بھیج چکے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں، اب آگے اس اجمال کی تفصیل کے لیے انبیاء علیہم السلام کے قصے بیان کیے جاتے ہیں اور چونکہ سب انبیاء توحید کی دعوت دیتے تھے اس سے توحید کی بھی تائید ہوگئی۔

اور ہم کو نوح نے (نصرت کے لئے) پکارا (یعنی دعا کی) سو (ہم نے ان کی فریاد رسی کی اور) ہم خوب فریاد سننے والے ہیں، اور ہم نے ان کو اور ان کے تابعین کو بڑے بھاری غم سے (جو کفار کی تکذیب اور ایذاء رسانی سے پیش آیا تھا) نجات دی (کہ طوفان سے کفار کو غرق کر دیا، انہیں اور ان کے

تابعین کو بچالیا) اور ہم نے باقی انہی کی اولاد کو رہنے دیا (اور کسی کی نسل نہیں چلی) اور ہم نے ان کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں یہ بات (مدت دراز کے لئے) رہنے دی کہ نوح پر سلام ہو عالم والوں میں (یعنی خدا کرے تمام جہاں والے جن، انسان اور فرشتے ان پر سلام بھیجا کریں) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں تھے، پھر ہم نے دوسرے (طریق کے) لوگوں کو (یعنی کافروں کو) غرق کردیا۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ: اس سے معلوم ہوا کہ طبعی غم وحزن کمال کے خلاف نہیں، کیونکہ طبعی تقاضے کاملین میں بھی رہتے ہیں، غم وحزن طبعی تقاضوں میں شامل ہے، البتہ اس کے خلاف ہونا جو ثابت ہے وہ ''غلبہ حال'' ہے جس میں انسان معذور سمجھا جاتا ہے۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ: اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ ان ہی کی اولاد کی نسل چلی، کیونکہ کفار تو غرق ہو گئے اور باقی کشتی والوں سے بھی کسی کی نسل نہیں چلی، بس اب جس قدر آدمی دنیا میں ہیں سب کا نسب نوح علیہ السلام پر پہنچتا ہے، جیسا کہ ترمذی نے اس آیت کی تفسیر میں دو حدیثیں نقل کی ہیں: ① اول یہ کہ نوح علیہ السلام کے تین بیٹے ہیں: سام، حام، یافث ② دوسری یہ کہ سام اہل عرب وفارس کے باپ ہیں، اور حام سے افریقہ اہل حبش کی آبادیاں دنیا میں پھیلیں، اور یافث سے اہل روم، ترک، منگول اور یاجوج و ماجوج کی نسلیں نکلیں، بظاہر قرآن کی آیات سے طوفان کا تمام روئے زمین کے لیے عام ہونا معلوم ہوتا ہے اور ترمذی کی مذکورہ روایتوں سے بھی بظاہر اسی کی تائید ہوتی ہے، جمہور نے اسی کو اختیار کیا ہے، اس صورت میں نوح علیہ السلام کی نبوت کے عام ہونے کا شبہ ہوتا ہے، اس کا جواب سورہ آل عمران کی آیت ۵۲ کے خلاصہ تفسیر میں گزر چکا ہے، اور ممکن ہے کہ اس وقت دنیا کی آبادی خاص اسی مقام تک محدود ہو جہاں نوح علیہ السلام تشریف رکھتے تھے اور اس سے نبوت کا عام ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ نبوت کا عام ہونا یہ ہے کہ جب زمین مختلف قوموں سے بکثرت آباد ہو، ان سب کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہو، ورنہ آدم علیہ السلام کی نبوت کا بھی عام ہونا لازم آئے گا۔

سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ: چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے ''علیہ السلام'' کہنا اسی آیت کے حکم میں ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ تمام جہاں کا سلام ان کو پہنچے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مخلصین برابر اور یکساں صلہ دیا کرتے ہیں، بلکہ معنی یہ ہے کہ مخلصین کو اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں، اب جس مرتبہ کا اخلاص ہوگا اسی مرتبہ کا بدلہ ہوگا، پس انبیاء اور غیر انبیاء کی برابری اس سے لازم نہیں آتی۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: لے تقریباً ہزار سال تک حضرت نوح (علیہ السلام) اپنی قوم کو سمجھاتے اور نصیحت کرتے رہے۔ مگر ان کی شرارت اور ایذاء رسانی برابر بڑھتی رہی، آخر حضرت نوح نے مجبور ہو کر اپنے بھیجنے والے کی طرف متوجہ ہو کر عرض کیا: فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (القمر: ۱۰) اے پروردگار! میں مغلوب ہوں آپ میری مدد کو پہنچئے، دیکھو کہ اللہ نے ان کی پکار کیسی سنی اور مدد کو کس طرح پہنچا، نوح (علیہ السلام) کو مع ان کے گھرانے کے رات دن کی ایذاء سے بچایا، پھر ہولناک طوفان کے وقت ان کی حفاظت کی، اور تنہا اس کی اولاد سے زمین کو آباد کر دیا اور رہتی دنیا تک اس کا ذکر خیر لوگوں میں باقی چھوڑا، چنانچہ آج تک خلقت ان پر سلام بھیجتی ہے اور سارے جہان میں ''نوح (علیہ السلام)'' کہہ کر یاد کیے جاتے ہیں، یہ تو نیک بندوں کا انجام ہوا، دوسری طرف ان کے دشمنوں کا حال دیکھو کہ سب کے سب زبردست طوفان کی نذر کر دیے گئے، آج ان کا نام ونشان تک باقی نہیں، اپنی حماقتوں اور شرارتوں کی بدولت دنیا کا بیڑا غرق کرا کر رہے۔

تنبیہ: اکثر علماء کا قول یہی ہے کہ آج تمام دنیا کے آدمی حضرت نوح (علیہ السلام) کے تین بیٹوں (سام، حام، یافث) کی اولاد سے ہیں، جامع ترمذی کی بعض احادیث میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، والتفصیل یطلب من مظانہ۔

وقف لازم وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿٨٣﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٤﴾

اور اسی کی راہ والوں میں ہے ابراہیم لے جب آیا اپنے رب کے پاس لے کر دل نروگا (بے روگ، ستھرا) ۲

خلاصہ تفسیر: (دوسرا واقعہ:) اور نوح (علیہ السلام) کے طریقہ والوں میں سے (یعنی ان لوگوں میں سے جو اصولی عقائد میں

نوح علیہ السلام کے ساتھ متفق تھے) ابراہیم بھی تھے (ان کا وہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے) جب کہ وہ اپنے رب کی طرف صاف دل سے متوجہ ہوئے (صاف دل کا مطلب یہ کہ ان کا دل غلط عقائد اور دکھلاوے کے جذبہ سے پاک تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کی توحید اور اخلاص کامل تھا)۔

اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ: رب کی طرف متوجہ ہونے میں "صاف دل" کی قید لگا کر اشارہ کر دیا گیا کہ حق تعالی کا قرب اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک بندہ کا دل غلط عقیدوں، برے جذبات سے پاک نہ ہو، یعنی ہر عمل میں حسن نیت ہو، اگر اصل مقصد اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے دکھلاوا یا کوئی مادی منفعت ہو تو وہ قابل تعریف نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رجوع الی اللہ ان تمام ملاوٹوں سے پاک تھا۔

* * *

فائدہ: ۱ انبیاء (علیہم السلام) اصول دین میں سب ایک راہ پر ہیں، اور ہر پچھلا پہلے کی تصدیق و تائید کرتا ہے، اسی لیے براہیم کو نوح (علیہم السلام) کے گروہ سے فرمایا: وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المؤمنون: ۵۲)

فائدہ: ۲ یعنی ہر قسم کے اعتقادی و اخلاقی روگ سے دل کو پاک کر کے اور دنیاوی خرخشوں سے آزاد ہو کر انکسار و تواضع کے ساتھ اپنے رب کی طرف جھک پڑا اور اپنی قوم کو بھی بت پرستی سے باز رہنے کی نصیحت کی۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾

جب کہا اپنے باپ کو اور اس کی قوم کو تم کیا پوجتے ہو، کیا جھوٹ بنائے ہوئے حاکموں کو اللہ کے سوائے چاہتے ہو ۱

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾

پھر کیا خیال کیا ہے تم نے پروردگار عالم کو ۲

خلاصہ تفسیر: جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے (جو بت پرست تھی) فرمایا کہ تم کس (واہیات) چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ کیا جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا (معبود بنانا) چاہتے ہو؟ تو تمہارا رب العالمین کے ساتھ کیا خیال ہے؟ (یعنی تم نے جو اس کی عبادت ترک کر رکھی ہے تو کیا اس کے معبود ہونے میں کوئی شبہ ہے؟ یعنی اول تو ایسا نہیں ہونا چاہئے اور اگر کوئی شبہ ہے تو اسے دور کر لو، غرض یوں ہی بحث و مباحثہ ہوتا رہتا تھا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی یہ آخر پتھر کی مورتیاں چیز کیا ہیں جنہیں تم اس قدر چاہتے ہو کہ اللہ کو چھوڑ کر ان کے پیچھے ہو لیے، کیا سچ مچ ان کے ہاتھ میں جہان کی حکومت ہے؟ یا کسی چھوٹے بڑے نقصان کے مالک ہیں؟ آخر سچے مالک کو چھوڑ کر ان جھوٹے حاکموں کی اتنی خوشامد اور حمایت کیوں ہے؟!

فائدہ: ۲ یعنی کیا اس کے وجود میں شبہ ہے؟ یا اس کی شان و رتبہ کو نہیں سمجھتے جو (معاذ اللہ) پتھروں کو اس کا شریک ٹھہرا رہے ہو؟ یا اس کے غضب و انتقام کی خبر نہیں؟ جو ایسی گستاخی پر جری ہو گئے ہو، آخر بتلاؤ تو سہی تم نے پروردگار عالم کو کیا خیال کر رکھا ہے؟!

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِى النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّىْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾

پھر نگاہ کی ایک بار تاروں میں، پھر کہا میں بیمار ہونے والا ہوں، پھر پھر گئے وہ اس سے پیٹھ دے کر

فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾

پھر جا گھسا ان کے بتوں میں پھر بولا تم کیوں نہیں کھاتے ۱ تم کو کیا ہے کہ نہیں بولتے ۲ پھر گھسا ان پر مارتا ہوا داہنے ہاتھ سے ۳

خلاصہ تفسیر: ایک بار کا واقعہ ہے کہ ان کا کوئی تہوار آیا، قوم نے ان سے بھی درخواست کی کہ ہمارے میلہ میں چلو: سوابراہیم (علیہ السلام) نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہونے کو ہوں (اس لئے میلہ میں نہیں جا سکتا) غرض وہ لوگ (ان کا یہ عذر سن کر) ان کو چھوڑ کر چلے گئے (کہ ناحق بیماری میں ان کو اور ان کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف ہوگی) تو یہ (یعنی ابراہیم علیہ السلام) ان کے بتوں میں جا گھسے اور (تحقیر اور استہزاء کے طور پر ان سے) کہنے لگے کیا تم (یہ چڑھاوے جو تمہارے سامنے رکھے ہیں) کھاتے نہیں ہو (اور) تم کو کیا ہوا تم بولتے بھی نہیں؟ پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (اور کلہاڑی وغیرہ سے ان کو توڑ پھوڑ دیا)۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ :ابراہیم علیہ السلام کو میلہ میں ساتھ لے کر جانے سے قوم والوں کی شاید یہ غرض ہو کہ ہماری شان وشوکت دیکھ کر ہمارے طریقہ کی کچھ وقعت ان کے دل میں پیدا ہو جائے، اور ابراہیم علیہ السلام کو یہ منظور تھا کہ میں اکیلا رہ جاؤں تو یہاں ان کے بتوں کی مرمت کروں، اس لیے آپ نے ایک بہانہ سے ان کو ٹال دیا، ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو دیکھنا قوم کو وہم میں ڈالنے کے لیے تھا کہ وہ چونکہ ستاروں کی تاثیر کے قائل تھے، اس لیے یہ سمجھے کہ ان کو نجوم کا کوئی قاعدہ آتا ہوگا جس سے ستارہ کی رفتار دیکھ کر ان کو معلوم ہو گیا کہ میں تھوڑی دیر میں بیمار ہو جاؤں گا، چونکہ وہ لوگ علم نجوم کے معتقد تھے اس لیے ابراہیم پر کچھ اصرار نہیں کیا، اور ابراہیم علیہ السلام کی غرض ستاروں کے دیکھنے سے وہی تھی جو شریعت میں محمود ہے، یعنی آسمان کو دیکھ کر حق تعالیٰ کے کمال اور عظمت پر نظر کرنا، جس سے اشارتاً ان کو یہ بتلانا مقصود تھا کہ میں تمہارے بتوں کا قائل نہیں، بلکہ اس خدا کو مانتا ہوں جس نے یہ آسمان اور ستارے پیدا کیے ہیں، اور بیمار ہونے کا یہ مطلب تھا کہ مجھے میلہ میں جا کر تمہاری حرکتوں سے سخت کلفت ہوگی، یا یہ کہ میں آئندہ کبھی تو بیمار ہوں گا، کیونکہ موت کا آنا یقینی ہے اور موت سے پہلے آدمی بیمار ہوا ہی کرتا ہے۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس طرح ستاروں کو دیکھ کر جواب دینا ان لوگوں کی گمراہی کا سبب تھا کہ وہ ابراہیم کو بھی علم نجوم کا معتقد سمجھنے لگے ہوں گے، جواب یہ ہے کہ وہ لوگ تو پہلے ہی سے گمراہ تھے، سو تھوڑی دیر ان کا اور گمراہ رہنا اس لیے نقصان دہ نہیں تھا کہ آپ اس طریقہ سے آئندہ موقع پا کر ان سے صاف صاف مناظرہ کرنے والے تھے، دوسرے آپ پہلے بھی ان سے بہت مناظرے کر چکے تھے جن سے وہ لوگ یہ جانتے تھے کہ آپ علم نجوم کے معتقد نہیں، تو ان صاف اور صریح باتوں کے ہوتے ہوئے اس وہم کا کیا اثر ہو سکتا تھا، تیسرے آپ کا اصل مقصود اپنی جان چھڑانا تھا تا کہ آئندہ ان سے مناظرہ کر کے ان کی حجت ختم کر دیں تو ایسی ضرورت میں ایسا وہمی نقصان قابل اعتبار نہیں ہوتا۔

ہم نے جو اوپر یہ کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کو دیکھنا قوم کو وہم میں ڈالنے کے لیے تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ علم نجوم شرعاً مذموم ہے، خواہ اس لیے کہ وہ اپنی اصل ہی سے باطل ہے اور ستاروں میں سعادت ونحوست کچھ نہیں، یا اس وجہ سے کہ ستاروں میں سعادت ونحوست نہ ہونے کا اگرچہ ثبوت نہ ہو، مگر ہونے کا بھی ثبوت نہیں، اور اس کے قواعد کسی صحیح دلیل سے ثابت نہیں، پھر اس پر بہت سے مفاسد مرتب ہوتے ہیں، اعتقاد کا خراب ہونا، صریح شرک میں مبتلا ہونا، خدا پر توکل کمزور ہو جانا اور نافع علوم سے محروم رہنا وغیرہ وغیرہ، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابراہیم نے علم نجوم سے یہ خبر دی تھی، رہی یہ بات کہ قرآن کریم میں جو بعض دنوں کی نسبت نحوست کا ذکر ہے جیسے: **ایام نحسات** اور **یوم نحس مستمر** تو اس سے یہ شبہ کرنا محض غلط ہے، کیونکہ وہاں عذاب کی نحوست مراد ہے جو انہی لوگوں کے ساتھ خاص تھی جن پر عذاب نازل ہوا تھا، مطلق طور پر دنوں کی نحوست مراد نہیں، ورنہ پہلی آیت کے مطابق تو پورا ہفتہ ہی منحوس ہونا چاہیے، کیونکہ **ایام نحسات** کی تفسیر خود قرآن میں: **سبع لیال وثمانیة ایام** یعنی سات راتیں اور آٹھ دن آئی ہے، حالانکہ نجومی پورے ہفتہ کو منحوس نہیں کہتے، اور دوسری آیت کی تفسیر میں بدھ کا دن مذکور ہوا ہے، حالانکہ نجومی بدھ کے دن کو منحوس نہیں کہتے، اور بعض واقعات کا اہل نجوم کے قول کے مطابق ہونا اگر اس کے سچے ہونے کی دلیل ہے تو ان سے زیادہ واقعات کا خلاف ہونا اس کے غلط ہونے کی بدرجہ اولیٰ دلیل ہوگی، اور یہ جو منقول ہے کہ فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کے ہاتھ سے اس کی سلطنت تباہ ہونے کی خبر نجوم سے دی گئی تھی، سو ممکن ہے کہ وہ خبر کہانت سے دی گئی ہو، کیونکہ پہلے کچھ آسمانی خبریں شیاطین کے ذریعہ سے معلوم ہو جاتی تھیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ان کی قوم میں نجوم کا زور تھا، حضرت ابراہیم نے ان کے دکھانے کو تاروں کی طرف نظر ڈال کر کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں (اور ایسا دنیا میں کون ہے جس کی طبیعت ہر طرح ٹھیک رہے؟ کچھ نہ کچھ عوارض اندرونی یا بیرونی لگے ہی رہتے ہیں، یہ ہی تکلیف اور بدمزگی کی کیا کم تھی کہ ہروقت قوم کی ردی حالت دیکھ کر کڑھتے تھے) یا یہ مطلب تھا کہ میں بیمار ہونے والا ہوں (بیماری نام ہے مزاج کے اعتدال سے ہٹ جانے کا، تو موت سے پہلے ہر شخص کو یہ صورت پیش آنے والی ہے) بہرحال حضرت ابراہیم کی مراد صحیح تھی، لیکن ستاروں کی طرف دیکھ کر انی سقیم کہنے سے لوگ یہ مطلب سمجھے کہ بذریعہ نجوم کے انہوں نے معلوم کرلیا ہے کہ عنقریب بیمار پڑنے والے ہیں، وہ لوگ اپنے ایک تہوار میں شرکت کرنے کے لیے شہر سے باہر جارہے تھے، یہ کلام سن کر حضرت ابراہیم کو ساتھ جانے سے معذور سمجھا اور تنہا چھوڑ کر چلے گئے، ابراہیم (علیہ السلام) کی غرض یہ ہی تھی کہ کوئی موقع فرصت اور تنہائی کا ملے تو ان جھوٹے خداؤں کی خبر لوں، چنانچہ بت خانہ میں جا گھسے اور بتوں کو خطاب کر کے کہا: ''یہ کھانے اور چڑھاوے جو تمہارے سامنے رکھے ہوئے ہیں کیوں نہیں کھاتے؟'' باوجودیکہ تمہاری صورت کھانے والوں کی سی ہے۔

تنبیہ: تقریر بالا سے ظاہر ہوگیا کہ حضرت ابراہیم کا انی سقیم کہنا مطلب واقعی کے اعتبار سے جھوٹ نہ تھا، ہاں! مخاطبین نے جو مطلب سمجھا اس کے اعتبار سے خلاف واقعہ تھا، اسی لیے بعض احادیث صحیحہ میں اس پر لفظ ''کذب'' کا اطلاق کیا گیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت یہ کذب نہیں، بلکہ ''توریہ'' ہے اور اس طرح کا ''توریہ'' مصلحت شرعی کے وقت مباح ہے، جیسے حدیث ہجرت میں ''ممن الرجل'' کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''من المآء'' اور ابوبکر صدیقؓ نے ایک سوال کے جواب میں کہا: ''رجل یھدینی السبیل'' ہاں! چونکہ یہ توریہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رتبہ بلند کے لحاظ سے خلاف اولیٰ تھا، اس لیے بقاعدہ ''حسنات الابرار سیئات المقربین'' حدیث میں اس کو ''ذنب'' قرار دیا گیا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ جب بتوں کی طرف سے کھانے کے متعلق کچھ جواب نہ ملا تو کہنے لگا کہ تم بولتے کیوں نہیں؟ یعنی اعضاء اور صورت تو تمہاری انسانوں کی سی بنادی، لیکن انسانوں کی روح تم میں نہ ڈال سکے، پھر تعجب ہے کہ کھانے پینے اور بولنے والے انسان، بے حس وحرکت انسان کے سامنے سربسجود ہوں اور اپنی مہمات میں ان سے مدد مطلب کریں؟!!

فائدہ: ۳؎ یعنی زور سے مار مار کر توڑ ڈالا، پہلے غالباً سورہ انبیاء میں یہ قصہ مفصل گزر چکا ہے۔

فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

پھر لوگ آئے اس پر دوڑ کر گھبراتے ہوئے ۱؎ بولا کیوں پوجتے ہو جو آپ تراشتے ہو، اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو تم بناتے ہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو (ان لوگوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو) وہ لوگ ان کے پاس دوڑتے ہوئے (گھبرائے ہوئے غصہ میں) آئے اور (گفتگو شروع ہوئی) ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود (اپنے ہاتھ سے) تراشتے ہو (تو جو تمہارا محتاج ہو وہ خدا کیا ہوگا؟) حالانکہ تم کو اور تمہاری بنائی ہوئی ان چیزوں کو (سب کو) اللہ ہی نے پیدا کیا ہے (سو عبادت اسی کی کرنا چاہئے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ لوگ جب اپنے میلے ٹھیلے سے واپس آئے، دیکھا بت ٹوٹے پڑے ہیں، قرائن سے سمجھا کہ ابراہیم کے سوا یہ کسی کا کام نہیں، چنانچہ سب ان کی طرف جھپٹ پڑے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس کسی نے بھی توڑا، مگر تم یہ احمقانہ حرکت کرتے کیوں ہو؟ کیا پتھر کی بیجان مورت جو خود تم نے اپنے ہاتھوں سے تراش کر تیار کی پرستش کے لائق ہوگی؟ اور جو اللہ تمہارا اور تمہارے ہر ایک عمل و معمول کا نیز ان پتھروں کا پیدا کرنے والا ہے، اس سے کوئی سروکار نہ تھا؟ پیدا تو ہر چیز کو وہ کرے اور بندگی دوسروں کی ہونے لگے، پھر دوسرے بھی کیسے جو مخلوق در مخلوق ہیں، آخر یہ کیا اندھیرا ہے؟!

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿٩٧﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿٩٨﴾

بولے بناؤ (چنو) اسکے واسطے ایک عمارت (چنائی) پھر ڈالو اسکو آگ کے ڈھیر میں، پھر چاہنے لگے اس پر براداؤ کرنا پھر ہم نے ڈالا انہی کو نیچے ۱؎

خلاصہ تفسیر: وہ لوگ (جب مناظرہ میں مغلوب ہوئے اور کچھ جواب نہ بن پڑا تو جھلا کر باہم) کہنے لگے کہ ابراہیم کے لئے ایک آتش خانہ تعمیر کرو (اور اس میں آگ دہکا کر) ان کو اس دہکتی آگ میں ڈال دو، غرض ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ برائی کرنی چاہی تھی (کہ یہ ہلاک ہو جائیں گے) سو ہم نے انہی کو نیچا دکھایا (جس کا قصہ سورۃ انبیاء میں گزر چکا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ جب ابراہیم (علیہ السلام) کی معقول باتوں کا کچھ جواب نہ بن پڑا تو یہ تجویز کی کہ ایک بڑا آتش خانہ بنا کر ابراہیم کو اس میں ڈال دو، اس تدبیر سے لوگوں کے دلوں میں بتوں کی عقیدت راسخ ہو جائے گی اور ہیبت بیٹھ جائے گی کہ ان کے مخالف کا انجام ایسا ہوتا ہے، آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کرے گا، مگر اللہ نے ان ہی کو نیچا دکھلایا، ابراہیم پر آگ گلزار کر دی گئی، جس سے علیٰ رؤس الاشہاد ثابت ہو گیا کہ تم اور تمہارے جھوٹے معبود سب مل کر خدائے واحد کے ایک مخلص بندے کا بال بیکا نہیں کر سکتے، آگ کی مجال نہیں کہ رب ابراہیم کی اجازت کے بدون ایک ناخن بھی جلا سکے۔

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿٩٩﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠٠﴾ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿١٠١﴾

اور بولا میں جاتا ہوں اپنے رب کی طرف وہ مجھ کو راہ دے گا ۱؎ اے رب! بخش مجھ کو کوئی نیک بیٹا ۲؎ پھر خوشخبری دی ہم نے اسکو ایک لڑکے کی جو ہوگا تحمل والا

خلاصہ تفسیر: اور ابراہیم (علیہ السلام جب ان لوگوں کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو) کہنے لگے کہ میں تو (تم سے ہجرت کر کے) اپنے رب کی (راہ میں کسی) طرف چلا جاتا ہوں، وہ مجھ کو (اچھی جگہ) پہنچا ہی دے گا (چنانچہ ملک شام میں جا پہنچے اور یہ دعا کی کہ) اے میرے رب! مجھ کو ایک نیک فرزند دے، سو ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند کی بشارت دی۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ: اس میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ فرزند جن کے ذبح کرنے کا حکم ہوا یہ اسماعیل ہیں یا اسحاق؟ بظاہر آیت کے سیاق سے اسماعیل معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ یہاں فرزند کی بشارت کے بعد ذبح کا قصہ بیان ہوا ہے، پھر قصہ ذبح کے بعد اسحاق کی بشارت مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذبح کا قصہ اسحاق علیہ السلام کی بشارت سے پہلے ہوا ہے، اور ان سے پہلے فرزند اسماعیل ہی تھے اور اس کی تائید دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے: **فبشّرنٰها باسحٰق ومن وراء اسحٰق یعقوب** کہ ہم نے سارہ کو اسحاق کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی، تو جب اسحاق کی بشارت کے ساتھ یہ بشارت بھی دی گئی کہ وہ صاحب اولاد ہوں گے تو ان کے ذبح کے حکم میں عظیم الشان امتحان نہ ہوگا، کیونکہ پہلی بشارت سے یہ معلوم ہی ہو چکا تھا کہ یہ زندہ رہیں گے اور ذبح نہ ہوں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ جب قوم کی طرف سے مایوسی ہوئی اور باپ نے بھی سختی شروع کی تو حضرت ابراہیم نے ہجرت کا ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو "شام" کا راستہ دکھلایا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کنبہ اور وطن چھوٹا تو اچھی اولاد عطا فرما، جو دینی کام میں میری مدد کرے اور اس سلسلہ کو باقی رکھے۔

فائدہ: ۳؎ یہاں سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اولاد کی دعا مانگی اور خدا نے قبول کی اور وہ ہی لڑکا قربانی کیلئے پیش کیا گیا۔

① موجودہ تورات سے ثابت ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیم کی دعا سے پیدا ہوا وہ حضرت اسماعیل ہیں اور اسی لیے ان کا نام "اسماعیل" رکھا گیا، کیونکہ "اسماعیل"، دو لفظوں سے مرکب ہے، "سمع" اور "ایل"، "سمع" کے معنی سننے کے اور "ایل" کے معنی خدا کے ہیں، یعنی خدا نے حضرت ابراہیم

کی دعا سن لی، ''تورات'' میں ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ اسماعیل کے بارے میں میں نے تیری سن لی، اس بناء پر آیت حاضرہ میں جس کا ذکر ہے وہ حضرت اسماعیل ہیں، حضرت اسحاق نہیں۔

② اور ویسے بھی ذبح وغیرہ کا قصہ ختم کرنے کے بعد حضرت اسحاق کی بشارت کا جداگانہ ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے: وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (الصافات:۱۱۲) معلوم ہوا کہ: فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (الصافات:۱۰۱) میں ان کے علاوہ کسی دوسرے لڑکے کی بشارت مذکور ہے۔

③ نیز اسحاق کی بشارت دیتے ہوئے ان کے نبی بنائے جانے کی بھی خوشخبری دی گئی اور سورۃ ہود میں ان کے ساتھ ساتھ یعقوب کا مژدہ بھی سنایا گیا، جو حضرت اسحاق کے بیٹے ہوں گے: وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ (ہود:۷۱) پھر کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ حضرت اسحاق ذبح ہوں، گویا نبی بنائے جانے اور اولاد عطا کیے جانے سے پیشتر ہی ذبح کر دیئے جائیں، لامحالہ ماننا پڑے گا کہ ذبیح اللہ حضرت اسماعیل ہیں، جن کے متعلق بشارت ولادت کے وقت نہ نبوت عطا فرمانے کا وعدہ ہوا، نہ اولاد دیے جانے کا۔

یہی وجہ ہے کہ قربانی کی یادگار اور اس کی متعلقہ رسوم بنی اسماعیل میں برابر بطور وراثت منتقل ہوتی چلی آئیں اور آج بھی اسماعیل کی روحانی اولاد ہی (جنہیں مسلمان کہتے ہیں) ان مقدس یادگاروں کی حامل ہے۔

④ موجودہ تورات میں تصریح ہے کہ قربانی کا مقام ''مورا'' یا ''مریا'' تھا، یہود ونصاریٰ نے اس مقام کا پتہ بتلانے میں بہت ہی دور از کار احتمالات سے کام لیا ہے، حالانکہ نہایت ہی اقرب اور بے تکلف بات یہ ہے کہ یہ مقام ''مروہ'' ہو، جو کعبہ کے سامنے بالکل نزدیک واقعہ ہے اور جہاں سعی بین الصفا والمروۃ ختم کر کے معتمرین حلال ہوتے ہیں۔

⑤ اور ممکن ہے بلغ معه السعي میں اسی سعی کی طرف ایماء ہو، موطا امام مالک کی ایک روایت میں نبی کریم ﷺ نے ''مروہ'' کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ قربان گاہ یہ ہے، غالباً وہ اسی ابراہیم واسماعیل کی قربان گاہ کی طرف اشارہ ہوگا، ورنہ آپ ﷺ کے زمانہ میں لوگ عموماً مکہ سے تین میل ''منیٰ'' میں قربانی کرتے تھے، جیسے آج تک کی جاتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم کی اصل قربان گاہ ''مروہ'' تھی، پھر حجاج اور ذبائح کی کثرت دیکھ کر منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

قرآن کریم میں بھی: هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (المائدہ:۹۵) اور ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (الحج:۳۳) فرمایا ہے جس سے کعبہ کا قرب ظاہر ہوتا ہے، واللہ اعلم، بہر حال قرائن وآثار یہی بتلاتے ہیں کہ ''ذبیح اللہ'' وہ ہی اسماعیل تھے، جو مکہ میں آخر رہے اور وہیں اس کی نسل پھیلی۔

⑥ تورات میں یہ بھی تصریح ہے کہ حضرت ابراہیم کو اپنے اکلوتے اور محبوب بیٹے کے ذبح کا حکم دیا گیا تھا اور یہ مسلم ہے کہ حضرت اسماعیل حضرت اسحاق سے عمر میں بڑے ہیں، پھر حضرت اسحاق (علیہ السلام) حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی موجودگی میں اکلوتے کیسے ہو سکتے ہیں؟!۔

⑦ عجیب بات یہ ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم کی دعاء کے جواب میں جس لڑکے کی بشارت ملی اسے: غلام حلیم کہا گیا ہے، لیکن حضرت اسحاق (علیہ السلام) کی بشارت جب فرشتوں نے ابتداء خدا کی طرف سے دی تو: غلام علیم سے تعبیر کیا، حق تعالیٰ کی طرف سے ''حلیم'' کا لفظ ان پر یا کسی اور نبی پر قرآن میں کہیں اطلاق نہیں کیا گیا، صرف اس لڑکے کو جس کی بشارت یہاں دی گئی اور اس کے باپ ابراہیم کو یہ لقب عطا ہوا ہے: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (ہود:۷۵) اور: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (التوبہ:۱۱۴) جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہی دونوں باپ بیٹے اس لقب خاص سے ملقب کرنے کے مستحق ہوئے۔ ''حلیم'' اور ''صابر'' کا مفہوم قریب قریب ہے، اسی غلام حلیم کی زبان سے یہاں نقل کیا: سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (الصافات:۱۰۲) دوسری جگہ صاف فرما دیا: وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (الانبیاء:۸۵) شاید اسی لیے سورہ مریم میں حضرت اسماعیل کو: صادق الوعد فرمایا کہ: ستجدنی انشاء اللہ من الصابرین کے وعدہ کو کس طرح سچا کر دکھایا، بہر حال ''حلیم''، ''صابر''، ''صادق الوعد'' کے القاب کا مصداق ایک ہی معلوم ہوتا ہے یعنی حضرت اسماعیل (علیہ السلام)

وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (مریم:۵۵)۔

⑧ سورہ بقرہ میں تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم واسماعیل کی زبان سے جو دعا نقل فرمائی ہے، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرۃ:۱۲۸) بعینہ اسی مسلم کے تثنیہ کو یہاں قربانی کے ذکر میں: فلما اسلما الخ کے لفظ سے ادا کر دیا اور ان ہی دونوں کی ذریت کو خصوصی طور پر مسلم کے لقب سے نامزد کیا، بیشک اس سے بڑھ کر اسلام وتفویض اور صبر وتحمل کیا ہوگا جو دونوں باپ بیٹے نے ذبح کرنے اور ذبح ہونے کے متعلق دکھلایا!! یہ اسی اسلما کا صلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی ذریت کو امت مسلمہ بنادیا، فللہ الحمد علی ذلک۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ

پھر جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں کہ تجھ کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے

قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ١٠٢

بولا اے باپ کر ڈال جو تجھ کو حکم ہوتا ہے، تو مجھ کو پائے گا اگر اللہ نے چاہا سہارنے والا

خلاصہ تفسیر: (غرض وہ فرزند پیدا ہوا اور ہشیار ہوا) سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم (علیہ السلام) نے (ایک خواب دیکھا کہ میں اس فرزند کو خدا کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں، اور یہ ثابت نہیں کہ گلا کٹا ہوا بھی دیکھا یا نہیں، غرض آنکھ کھلی تو اس وجہ سے کہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے اسے اللہ کا حکم سمجھے، اور اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہوگئے، پھر یہ سوچ کر کہ خدا جانے میرے بیٹے کی اس بارے میں کیا رائے ہو اس کو اطلاع کرنا ضروری سمجھا، اس لئے اس سے) فرمایا کہ برخوردار میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو (اللہ کے حکم سے) ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ بولے ابا جان (اس میں مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے، جب آپ کو خدا کی طرف سے حکم کیا گیا ہے تو) آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ (بلا تامل) کیجئے، ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو سہار کرنے والوں میں سے دیکھیں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی جب اسماعیل بڑا ہو کر اس قابل ہوگیا کہ اپنے باپ کے ساتھ دوڑ سکے اور اس کے کام آسکے، اس وقت ابراہیم نے اپنا خواب بیٹے کو سنایا، تاکہ اس کا خیال معلوم کریں کہ خوشی سے آمادہ ہوتا ہے یا زبردستی کرنی پڑے گی؟ کہتے ہیں کہ تین رات مسلسل یہی خواب دیکھتے رہے، تیسرے روز بیٹے کو اطلاع کی، بیٹے نے بلا توقف قبول کیا، کہنے لگا کہ ابا جان! (دیر کیا ہے) مالک کا جو حکم ہو کر ڈالیے (ایسے کام میں مشورہ کی ضرورت نہیں، امر الٰہی کے امتثال میں شفقت پدری مانع نہ ہونی چاہیے) رہا میں! سو آپ ان شاء اللہ دیکھ لیں گے کہ کس صبر وتحمل سے اللہ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں، ہزاروں ہزار رحمتیں ہوں ایسے بیٹے اور باپ پر۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ١٠٣ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ١٠٤ ۙ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ

پھر جب دونوں نے حکم مانا اور پچھاڑا اُس کو ماتھے کے بل اور ہم نے اس کو پکارا یوں کہ اے ابراہیم! تو نے سچ کر دکھایا خواب

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ١٠٥

ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: غرض جب دونوں نے (خدا کے حکم کو) تسلیم کرلیا، اور باپ نے بیٹے کو (ذبح کرنے کے لئے) کروٹ پر لٹایا

اور (چاہتے تھے کہ گلا کاٹ ڈالیں اور اس وقت) ہم نے ان کو آواز دی کہ ابراہیم! (شاباش ہے) تم نے خواب کو خوب سچ کر دکھایا (یعنی خواب میں جو حکم ہوا تھا اپنی طرف سے اس پر پورا عمل کیا، اب ہم اس حکم کو منسوخ کرتے ہیں بس ان کو چھوڑ دو، غرض ان کو چھوڑ دیا، جان کی جان بچ گئی اور بلند درجات مزید برآں عطا ہوئے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ دونوں جہاں کی راحت انہیں عطا کرتے ہیں)۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا: بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم بیداری میں بھی دیا جا سکتا تھا لیکن خواب میں حکم ہونے کی شاید یہ حکمت ہو کہ ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت اور فرمانبرداری زیادہ سے زیادہ ظاہر ہو کہ خواب کو خیال یا وسوسہ نہیں سمجھا اور اتنے بڑے کام پر آمادہ ہو گئے۔

* * *

فائدہ: ا۔ تا کہ بیٹے کا چہرہ سامنے نہ ہو، مبادا محبت پدری جوش مارنے لگے، کہتے ہیں یہ بات بیٹے نے سکھلائی، آگے اللہ نے نہیں فرمایا کہ کیا ماجرا گزرا؟ یعنی کہنے میں نہیں آتا جو حال گزرا، اس کے دل پر اور فرشتوں پر۔

فائدہ: ۲۔ یعنی بس بس! رہنے دے، تو نے خواب سچا کر دکھایا، مقصود بیٹے کا ذبح کرانا نہیں، محض تیرا امتحان منظور تھا، سو اس میں پوری طرح کامیاب ہوا۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَٰٓؤُا الْمُبِينُ ﴿۱۰۶﴾ وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿۱۰۷﴾

بیشک یہی ہے صریح جانچنا ا۔ اور اس کا بدلہ دیا ہم نے ایک جانور ذبح کرنے کے واسطے ۲۔ بڑا

خلاصہ تفسیر: حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان (جس کو کامل مخلص کے سوا کوئی دوسرا برداشت نہیں کر سکتا تو ایسے امتحان میں پورا اُترنے پر ہم نے ان کو بدلہ بھی بڑا بھاری دیا، اور اس میں جیسا ابراہیم علیہ السلام کا امتحان تھا، اسی طرح اسماعیل علیہ السلام کا بھی تھا، تو صلہ اور بدلہ میں وہ بھی شریک ہوں گے) اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا (کہ اسماعیل علیہ السلام کی جگہ وہ ذبح کرایا گیا)۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَٰٓؤُا الْمُبِينُ: اس میں دلالت ہے کہ اللہ کی طرف سے کبھی خواص یعنی اونچے درجہ والوں کا بھی امتحان لیا جاتا ہے، اس سے یہ شبہ نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ کے ہاں ان کی منزلت کم ہو گئی تھی یا یہ قرب الٰہی سے دور ہو گئے تھے، امتحان کی حکمت اللہ ہی کے علم میں ہوا کرتی ہے۔

وَفَدَيْنَٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ: بعض نے کہا ہے کہ معمولی دنبہ تھا، فربہ اور تیار ہونے کی وجہ سے اس کو بڑا ذبیحہ فرمایا، اور بعض نے کہا ہے کہ جنت سے بھیجا گیا تھا، اور بڑا ذبیحہ اس لیے فرمایا کہ جنت سے آنے کی وجہ سے وہ مرتبہ میں بڑا تھا، اور جب حجر اسود وغیرہ کا جنت سے آنا ثابت ہے تو ایک حیوان کا آنا کیا بعید ہے، اور یہاں آ کر اس میں یہاں کی خاصیت پیدا ہو گئی کہ ذبح کرنے سے اس کی جان نکل گئی، پس یہ اشکال نہیں ہو سکتا کہ جنت کی چیز فنا کیسے ہو گئی؟ جواب ظاہر ہے کہ جنت کی چیزیں جنت میں رہ کر فنا نہیں ہو سکتیں، باقی دنیا میں آ کر ان میں یہاں کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: ا۔ یعنی ایسے مشکل حکم کر کے آزماتے ہیں، پھر ان کو ثابت قدم رکھتے ہیں، تب درجے بلند دیتے ہیں، تورات میں ہے کہ جب ابراہیم نے بیٹے کو قربان کرنا چاہا اور فرشتہ نے ندا دی کہ ہاتھ روک لو، تو فرشتے نے یہ الفاظ کہے: "خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا، میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریت کی طرح پھیلا دونگا" (تورات تکوین اصحاح ۲۲، آیت ۱۵)

فائدہ: ۲۔ یعنی بڑے درجہ کا جو بہشت سے آیا، یا بڑا قیمتی، فربہ، تیار، پھر یہی رسم قربانی کی اسماعیل (علیہ السلام) کی عظیم الشان یادگار کے طور پر ہمیشہ کے لیے قائم کر دی۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿۱۰۸﴾ سَلَٰمٌ عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ ﴿۱۰۹﴾

اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہے ابراہیم پر ا۔

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو، وہ ہے ہمارے ایماندار بندوں میں ۲

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو (چنانچہ ان کے نام کے ساتھ اب تک "علیہ السلام" کہا جارہا ہے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ انہیں لوگوں کی دعاؤں اور سلامتی کی بشارتوں کا مرکز بنادیتے ہیں) بیشک وہ ہمارے ایمان دار بندوں میں سے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱ آج تک دنیا ابراہیم کو بھلائی اور بڑائی سے یاد کرتی ہے، علی نبینا وعلیہ الف الف سلام وتحیۃ۔

فائدہ: ۲ یعنی ہمارے اعلیٰ درجہ کے ایماندار بندوں میں۔

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور خوشخبری دی ہم نے اس کو اسحاق کی جو نبی ہوگا نیک بختوں میں ۱

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿۱۱۳﴾ ع

اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحاق پر اور دونوں کی اولاد میں نیکی والے ہیں اور بدکار بھی ہیں اپنے حق میں صریح ۲

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے (ایک انعام ان پر یہ کیا کہ) ان کو اسحاق (علیہ السلام) کی بشارت دی کہ نبی اور نیک بختوں میں ہوں گے، اور ہم نے ابراہیم پر اور اسحاق پر برکتیں نازل کیں (ان برکتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی نسل بہت پھیلی اور اس نسل میں کثرت سے انبیاء پیدا ہوئے) اور (پھر آگے) ان دونوں کی نسل میں بعضے اچھے بھی ہیں اور بعضے ایسے بھی جو (بدیاں کرکے) صریح اپنا نقصان کررہے ہیں۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ: اس میں یہ بات ظاہر کردی کہ باپ دادوں کا نیک ہونا اولاد کے کام نہیں آسکتا جب کہ اولاد خود ایمان سے محروم ہوں، اس میں علماء یہود کا فخر بھی توڑ دیا گیا کہ وہ نبی زادے ہونے پر ناز کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱ معلوم ہوا وہ پہلی خوشخبری اسماعیل کی تھی اور سارا قصہ ذبح کا ان ہی پر تھا۔

فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یہ دونوں کہا دونوں بیٹوں کو، دونوں سے بہت اولاد پھیلی، اسحاق کی اولاد میں انبیاء بنی اسرائیل ہوئے، اور اسماعیل کی اولاد میں عرب ہیں جن میں ہمارے پیغمبر مبعوث ہوئے"۔ یعنی اولاد میں سب یکساں نہیں، اچھے بھی جو بڑوں کا نام روشن رکھیں اور برے بھی جو اپنی بدکاریوں کی وجہ سے ننگ خاندان کہلانے کے مستحق ہیں۔

تنبیہ: عموماً مفسرین نے ومن ذریتھما کی ضمیر "ابراہیم واسحاق" کی طرف راجع کی ہے، مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے "اسماعیل و اسحاق" کی طرف راجع کرکے مضمون میں زیادہ وسعت پیدا کردی۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ۚ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ۚ

اور ہم نے احسان کیا موسیٰ اور ہارون پر، اور بچا دیا ہم نے ان کو اور ان کی قوم کو اس بڑی گھبراہٹ سے ۱

وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿١١٧﴾

اور ان کی ہم نے مدد کی تو رہے وہی غالب ۲ اور ہم نے دی ان کو کتاب واضح ۳

خلاصہ تفسیر: (تیسرا واقعہ:) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) پر بھی احسان کیا (کہ ان کو نبوت اور دیگر کمالات عطا فرمائے) اور ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) کو بڑے غم سے (یعنی فرعون کی جانب سے پہنچائی جانے والی تکالیف سے) نجات دی اور ہم نے ان سب کی (فرعون کے مقابلے میں) مدد کی، سو (آخر میں) یہی لوگ غالب آگئے (کہ فرعون کو غرق کر دیا گیا، اور یہ لوگ صاحب حکومت ہوگئے) اور ہم نے (فرعون کے غرق ہونے کے بعد) ان دونوں (صاحبوں) کو (یعنی موسیٰ علیہ السلام کو اصالتاً اور ہارون علیہ السلام کو تبعاً) واضح کتاب دی (مراد تورات ہے کہ اس میں احکام واضح طور پر مذکور تھے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی فرعون اور اس کی قوم کے ظلم وستم سے نجات دی اور ''بحر قلزم'' سے نہایت آسانی کے ساتھ پار کر دیا۔

فائدہ: ۲ یعنی فرعونیوں کا بیڑا غرق کر کے بنی اسرائیل کو غالب ومنصور کیا اور ہالکین کے اموال واملاک کا وارث بنایا۔

فائدہ: ۳ یعنی تورات شریف جس میں احکام الٰہی بہت تفصیل وایضاح سے بیان ہوئے ہیں۔

وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١١٨﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى

اور سجھائی ان کو سیدھی راہ ۱ اور باقی رکھا ان پر پچھلے لوگوں میں، کہ سلام ہے موسیٰ

وَهٰرُوْنَ ﴿١٢٠﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢١﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٢٢﴾

اور ہارون پر، ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو، تحقیق وہ دونوں ہیں ہمارے ایمان دار بندوں میں ۲

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے ان کو سیدھے رستہ پر قائم رکھا (جس کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انہیں نبی معصوم بنایا، کیونکہ نبوت کے لیے عصمت لازم ہے) اور ہم نے ان دونوں کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں (طویل مدت کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ موسیٰ اور ہارون پر سلام (چنانچہ دونوں حضرات کے ناموں کے ساتھ آج تک ''علیہ السلام'' کہا جاتا ہے) ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ ان کو ثناء اور دعا کا مستحق بنا دیتے ہیں) بیشک وہ دونوں ہمارے (کامل) ایمان دار بندوں میں سے تھے (اس لئے ان کو صلہ بھی کامل عطا ہوا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی افعال واقوال میں استقامت بخشی اور ہر معاملہ میں سیدھی راہ پر چلایا جو عصمت انبیاء کے لوازم میں سے ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی ہمارے کامل ایماندار بندوں میں سے ہیں۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٢٣﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٢٤﴾

اور تحقیق الیاس ہے رسولوں میں، جب اس نے کہا اپنی قوم کو کیا تم کو ڈر نہیں

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿١٢٥﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٢٦﴾

کیا تم پکارتے ہو بعل کو اور چھوڑتے ہو بہتر بنانے والے کو ۱ جو اللہ ہے رب تمہارا اور رب تمہارے اگلے باپ دادوں کا ۲

خلاصہ تفسیر: (چوتھا واقعہ:) اور الیاس (علیہ السلام) بھی (بنی اسرائیل کے) پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اس وقت کا واقعہ ذکر کیجئے) جبکہ انہوں نے اپنی قوم (بنی اسرائیل) سے (کہ وہ بت پرستی میں مبتلا تھی) فرمایا کہ کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ کیا تم بعل کو (جو ایک بت کا نام تھا) پوجتے ہو اور اس (اللہ کی عبادت) کو چھوڑ بیٹھے ہو جو سب سے بڑھ کر بنانے والا ہے (کیونکہ اور لوگ تو صرف بعض چیزوں کے جوڑ توڑ پر قدرت رکھتے ہیں اور وہ بھی عارضی، اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کے پیدا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں اور قدرت بھی ذاتی اور کامل، پھر دوسرا کوئی جان نہیں ڈال سکتا اور وہ جان ڈالتا ہے، اور وہ) معبود برحق ہے (اور) تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی رب ہے۔

روح المعانی میں طبری سے نقل کیا ہے کہ الیاس علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، اور بعل ایک بت کا نام ہے، اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بعلبک جو شام میں ایک مشہور شہر ہے وہ اسی بت کے نام پر ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت الیاس علیہ السلام بعض کے نزدیک حضرت ہارون کی نسل سے ہیں، اللہ نے ان کو ملک شام کے ایک شہر "بعلبک" کی طرف بھیجا، وہ لوگ "بعل" نامی ایک بت کو پوجتے تھے، حضرت الیاس نے ان کو خدا کے غضب اور بت پرستی کے انجام بد سے ڈرایا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یوں تو دنیا میں آدمی بھی تحلیل وترکیب کر کے بظاہر بہت سی چیزیں بنا لیتے ہیں، مگر بہتر بنانے والا وہ ہے جو تمام اصول و فروع، جواہر واعراض اور صفات وموصوفات کا حقیقی خالق ہے، جس نے تم کو اور تمہارے باپ دادوں کو پیدا کیا، پھر یہ کیسے جائز ہوگا کہ اس احسن الخالقین کو چھوڑ کر "بعل" بت کی پرستش کی جائے اور اس سے مدد مانگی جائے، جو ایک ظاہری طور پر بھی پیدا نہیں کر سکتا، بلکہ اس کا وجود خود اپنے پرستاروں کا رہین منت ہے، انہوں نے جیسا چاہا بنا کر کھڑا کر دیا۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾

پھر اسکو جھٹلایا سو وہ آنے والے ہیں (آئیں گے) پکڑے ہوئے ۱؎ مگر جو بندے ہیں اللہ کے چنے ہوئے ۲؎ اور باقی رکھا ہم نے اس پر پچھلے لوگوں میں

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

کہ سلام ہے الیاس پر ۳؎ ہم یوں دیتے ہیں بدلہ نیکی کرنے والوں کو، وہ ہے ہمارے ایمان دار بندوں میں

خلاصہ تفسیر: سو ان لوگوں نے (اس توحید کے دعوے میں) ان کو جھٹلایا سو (اس جھٹلانے کی شامت میں) وہ لوگ (عذاب آخرت میں) پکڑے جائیں گے مگر جو اللہ کے خاص بندے (یعنی ایمان والے) تھے (وہ ثواب واجر میں ہوں گے) اور ہم نے الیاس کے لئے پیچھے آنے والے لوگوں میں (مدتہائے دراز کے لئے) یہ بات رہنے دی کہ الیاسین پر (کہ یہ بھی الیاس علیہ السلام کا نام ہے) سلام ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ ان کو ثنا اور دعا کا مستحق بناتے ہیں) بیشک وہ ہمارے (کامل) ایمان دار بندوں میں سے تھے۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ: لفظ "الیاس" میں ایک لغت "الیاسین" بھی ہے، اور روح المعانی میں کشف سے نقل کیا ہے کہ شاید لغت سریانی میں اس یا دونوں کے کچھ معنی ہوں گے اور یہاں اس لغت کے اختیار کرنے میں آیت کے اخیر کلمات کے ہم وزن ہونے کی بھی رعایت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جھٹلانے کی سزا مل کر رہے گی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی سب نے جھٹلایا، مگر اللہ کے چنے ہوئے بندوں نے تکذیب نہیں کی، لہٰذا وہ ہی سزا سے بچے رہیں گے۔

فائدہ: ۳؎ ① "الیاس" کو "الیاسین" بھی کہتے ہیں کہ جیسے "طور سینا" کو طور سینین کہہ دیا جاتا ہے ② یا "الیاسین" سے حضرت

الیاس کے متبعین مراد ہوں ③ اور بعض نے ''آل یاسین'' بھی پڑھا ہے، تو ''یاسین'' ان کے باپ کا نام ہوگا ④ یا ان ہی کا نام ''یاسین'' اور لفظ ''آل'' مقحم ہو جیسے: ''کما صلیت علی ال ابراھیم'' میں، یا ''اللھم صل علی آل ابی اوفی'' میں ہے، واللہ اعلم۔

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

اور تحقیق لوط ہے رسولوں میں سے، جب بچا دیا ہم نے اس کو اور اس کے سارے گھر والوں کو

اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

مگر ایک بڑھیا کہ رہ گئی رہ جانے والوں میں ۱؎ پھر جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہم نے دوسروں کو ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پانچواں واقعہ:) اور بیشک لوط (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اس وقت کا قصہ قابل ذکر ہے) جب کہ ہم نے ان کو اور ان کے متعلقین کو سب کو نجات دی بجز اس بڑھیا (یعنی ان کی بیوی) کے کہ وہ (عذاب کے اندر) رہ جانے والوں میں رہ گئی، پھر ہم نے اور سب کو (جو لوط اور ان کے اہل وعیال کے سوا تھے) ہلاک کر دیا (جن کا قصہ کئی جگہ آ چکا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان کی زوجہ جو معذبین کے ساتھ ساز باز رکھتی تھی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی لوط اور اس کے گھر والوں کے سوا دوسرے سب باشندوں پر بستی الٹ دی گئی، یہ قصہ پہلے کئی جگہ مفصل گزر چکا ہے۔

وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ ع ۵

اور تم گزرتے ہو ان پر صبح کے وقت، اور رات کو بھی، پھر کیا نہیں سمجھتے (سوچتے) ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور (اے اہل مکہ!) تم تو ان (کے دیار و مساکن) پر (سفر شام میں کبھی) صبح ہوتے اور (کبھی) رات میں گزرا کرتے ہو (اور بربادی کے آثار دیکھتے ہو) تو کیا (اس کو دیکھ کر) پھر بھی نہیں سمجھتے ہو (کہ کفر کا کیا انجام ہوا، اور جو آئندہ کفر کرے گا اس کے لئے بھی یہی اندیشہ ہے)۔

مُّصْبِحِيْنَ وَبِالَّيْلِ: صبح اور رات کا ذکر اس لیے کیا کہ عرب میں اکثر عادت رات کو صبح تک چلنے کی ہے، پس اگر قوم لوط کے مساکن کے قریب سے منزل شروع ہوئی تو وہاں رات کو گزر ہوگا، اور اگر وہاں منزل ختم ہوئی تو صبح کو گزر ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ مکہ والوں کو فرمایا، کیونکہ مکہ سے ''شام'' کو جو قافلے آتے جاتے تھے، قوم لوط کی الٹی ہوئی بستیاں ان کے راستہ سے نظر آتی تھیں، یعنی دن رات ادھر گزرتے ہوئے یہ نشان دیکھتے ہیں، پھر بھی عبرت نہیں ہوتی، کیا نہیں سمجھتے کہ جو حال ایک نافرمان قوم کا ہوا، وہ دوسری نافرمان اقوام کا بھی ہو سکتا ہے۔

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

اور تحقیق یونس ہے رسولوں میں سے، جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر، پھر قرعہ ڈلوایا تو نکلا خطا وار ۱؎

خلاصہ تفسیر: (چھٹا واقعہ:) اور بیشک یونس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے تھے (ان کا اس وقت کا قصہ یاد کیجئے) جبکہ (اللہ تعالیٰ کی صریح اجازت کے بغیر اپنی رائے و اجتہاد سے کہیں دور چلے جانے کا ارادہ کر کے اپنی جگہ سے) بھاگ کر (چلے، راستہ میں دریا تھا، اس

میں مسافروں سے بھری ہوئی کشتی کھڑی تھی، اس) بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے (کشتی چلی تو طوفان آیا، کشتی والے کہنے لگے کہ ہم میں کوئی نیا قصوروار ہے، اس کو کشتی سے علیحدہ کرنا چاہئے، اس شخص کو متعین کرنے کے لئے سب کا اتفاق اس پر ہوا کہ قرعہ ڈالا جائے) سو یونس (علیہ السلام) بھی شریک قرعہ ہوئے تو (قرعہ میں) یہی ملزم ٹھہرے (یعنی انہی کا نام نکلا، پس انہوں نے اپنے کو دریا میں ڈال دیا، شاید کنارہ قریب ہوگا، تیر کر کنارہ پر جا پہنچنے کا ارادہ ہوگا، پس خودکشی کا شبہ لازم نہیں آتا)۔

اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ: حضرت یونس علیہ السلام نے اپنی قوم سے ایمان نہ لانے پر بحکم الٰہی عذاب آنے کا وعدہ کیا اور خود وہاں سے چلے گئے، جب وعدہ کے مطابق متعین وقت پر عذاب کے آثار نمودار ہونے لگے تو قوم کو یونس علیہ السلام کی تلاش ہوئی تاکہ ان پر ایمان لے آئیں، جب وہ نہ ملے تو سب نے متفق ہو کر حق تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری کی اور اجمالی طور پر ایمان لے آئے اور عذاب ٹل گیا، واضح رہے کہ عذاب کے ٹل جانے سے وعدہ کے خلاف ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ عذاب کا نافذ ہونا ایمان نہ لانے پر موقوف تھا، جب وہ ایمان لے آئے تو عذاب بھی نافذ نہ ہوا، غرض یونس علیہ السلام کو عذاب ٹل جانے کی خبر کسی ذریعہ سے معلوم ہوئی تو شرمندگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صریح اجازت کے بغیر اپنی رائے واجتہاد سے کہیں دور چلے جانے کا ارادہ کیا۔

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ: یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ نہ کسی کا حق ثابت کیا جاسکتا ہے نہ کسی کو مجرم قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قرعہ کے ذریعہ کسی کو چور ثابت نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح اگر دو آدمیوں میں یہ اختلاف ہو کہ فلاں جائیداد کس کی ملکیت ہے تو قرعہ کے ذریعہ اس کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، ہاں قرعہ اندازی اس موقع پر جائز بلکہ بہتر ہے جہاں ایک شخص کو شرعاً مکمل اختیار حاصل ہو کہ وہ چند جائز راستوں میں سے کسی بھی راستے کو اختیار کرلے، اب وہ اپنی مرضی سے کوئی راستہ متعین کرنے کے بجائے قرعہ ڈال کر فیصلہ کرے، مثلاً جس شخص کی ایک سے زائد بیویاں ہوں، اسے سفر میں جاتے وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس بیوی کو چاہے ساتھ لے جائے، اب وہ اپنی مرضی سے ایسا کرنے کے بجائے قرعہ اندازی کرلے تو بہتر ہے، تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو، آنحضرت محمد ﷺ کا یہی معمول تھا، حضرت یونس علیہ السلام کے اس واقعہ میں بھی قرعہ اندازی سے کسی کو مجرم ثابت کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ پوری کشتی کو بچانے کے لئے کسی کو بھی دریا میں ڈالا جاسکتا تھا، قرعہ کے ذریعہ اس کی تعیین کی گئی، کشتی کے مالکوں کو بغیر قرعہ اندازی کے بھی کسی سوار کو کشتی سے اتار دینے کا اختیار تھا، لیکن سب کی رضامندی اور خاطر دلی کے لیے قرعہ ڈالا گیا تھا اور خود یونس علیہ السلام بھی اپنی خوشی سے کشتی سے علیحدہ ہوگئے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ کشتی دریا میں چکر کھانے لگی، لوگوں نے کہا اس میں کوئی غلام ہے اپنے مالک سے بھاگا ہوا، سب کے ناموں پر کئی مرتبہ قرعہ ڈالا، ہر مرتبہ ان کا نام نکلا، یہ قصہ سورہ یونس اور سورہ انبیاء میں مفصل گزر چکا ہے، وہاں اس کی تحقیق ملاحظہ کی جائے۔

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ

لقمہ کیا اس کو مچھلی نے اور وہ الزام کھایا ہوا تھا ۱؎ پھر اگر نہ ہوتی یہ بات کہ وہ یاد کرتا تھا پاک ذات کو، تو رہتا اس کے پیٹ میں

اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

النصف

جس دن تک کہ مردے زندہ ہوں ۲؎

خلاصہ تفسیر: پھر (جب دریا میں گرے تو ہمارے حکم سے) ان کو مچھلی نے (ثابت) نگل لیا اور یہ (اس وقت) اپنے کو (اس اجتہادی غلطی پر) ملامت کر رہے تھے (کہ میں خدا کی صریح اجازت کے بغیر قوم سے کیوں نکلا، یہ تو دل سے توبہ ہوئی اور زبان سے بھی توحید و تسبیح کے

ساتھ استغفار کررہے تھے، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے کہ وہ: لا الہ الا انت سبحانك انی کنت من الظلمین کہہ رہے تھے) سو اگر وہ (اس وقت) تسبیح (واستغفار) کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی کے پیٹ میں رہتے (مطلب یہ کہ پیٹ سے نکلنا میسر نہ ہوتا، بلکہ اس کی غذا بنادیئے جاتے)۔

لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ: اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مچھلی اور اس کا پیٹ قیامت تک باقی رہتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ پیٹ سے باہر نکلنا میسر نہ ہوتا، بلکہ وہیں ہضم ہو کر اس کی غذا بنادیئے جاتے، خلاصہ یہ کہ اس اجتہادی غلطی پر جسمانی تکلیف مقربین کو دی جاتی کیونکہ "مقرباں را بیش بود حیرانی" ورنہ انبیاء علیہم السلام حقیقی گناہ اور حقیقی سزا سے تو پاک ہی ہوتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ الزام یہی تھا کہ خطائے اجتہادی سے حکم الٰہی کا انتظار کیے بغیر بستی سے نکل پڑے اور عذاب کے دن کی تعیین کردی۔

فائدہ: ۲ یعنی چونکہ مچھلی کے پیٹ میں بھی اور پیٹ میں جانے سے پہلے بھی اللہ پاک کو بہت یاد کرتا تھا، اس لیے ہم نے اس کو جلدی نجات دے دی، ورنہ قیامت تک اس کے پیٹ سے نکلنا نصیب نہ ہوتا، مچھلی کی غذا بن جاتے۔

تنبیہ: للبث فی بطنہ الیٰ آخرہ، کنایہ ہے کبھی نہ نکلنے سے، اور یہ واقعہ دریائے فرات کا ہے، علامہ محمود آلوسی بغدادیؒ نے لکھا ہے کہ ہم نے خود اس دریا میں بہت بڑی بڑی مچھلیاں مشاہدہ کی ہیں تعجب نہ کیا جائے، پہلے گزر چکا ہے کہ شکم ماہی میں ان کی تسبیح یہ تھی: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الانبیاء: ۸۷)

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾

پھر ڈال دیا ہم نے اس کو چٹیل میدان میں اور وہ بیمار تھا، اور اگایا ہم نے اس پر ایک درخت بیل (دار) والا۔۱

خلاصہ تفسیر: سو (چونکہ انہوں نے تسبیح اور توبہ کی اس لئے) ہم نے (ان کو اس کلفت سے محفوظ رکھا اور مچھلی کے پیٹ سے نکال کر) ان کو ایک میدان میں ڈال دیا (یعنی مچھلی کو حکم دیا کہ کنارے پر اگل دے) اور وہ اس وقت مضمحل تھے (کیونکہ مچھلی کے پیٹ میں کافی ہوا اور غذا نہ پہنچتی تھی) اور ہم نے (دھوپ سے بچانے کے لئے) ان پر ایک بیلدار درخت بھی اگا دیا تھا (اور کوئی پہاڑی بکری انہیں دودھ پلا جاتی تھی)۔

شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ: اس بیلدار درخت کی بابت بعض روایات میں آیا ہے کہ کدو کی بیل تھی، اور شاید اس میدان میں کوئی تنادار درخت ہوگا جس کے پتے سایہ دار نہ ہوں گے اس پر کدو کی بیل پھیل گئی ہوگی، اب یہ شبہ نہیں رہا کہ زمین پر پھیلنے والے درخت کا سایہ ان پر کیسے ہوا؟ اور بعض نے کہا ہے کہ خلاف عادت معجزہ کے طور پر وہ کدو ہی تنہ دار ہو گیا تھا، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱ مچھلی کو حکم ہوا، اس نے حضرت یونس کو اپنے پیٹ سے نکال کر ایک میدان میں ڈال دیا، غالباً کافی غذا و ہوا وغیرہ نہ پہنچنے کی وجہ سے بیمار اور نحیف ہو گئے، کہتے ہیں کہ دھوپ کی شعاع اور مکھی وغیرہ کا بدن پر بیٹھنا بھی ناگوار ہوتا تھا، اللہ کی قدرت سے وہاں کدو کی بیل اگ آئی، اس کے پتوں نے ان کے جسم پر سایہ کرلیا اور اسی طرح قدرت خداوندی سے غذا وغیرہ کا سامان بھی ہو گیا۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

اور بھیجا اس کو لاکھ آدمیوں پر یا اس سے زیادہ۔۱ پھر وہ یقین لائے پھر ہم نے فائدہ اٹھانے دیا ان کو ایک وقت تک۔۲

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے ان کو ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں کی طرف (شہر نینوا میں موصل کے قریب) پیغمبر بنا کر بھیجا

تھا، پھر وہ لوگ ایمان لے آئے تھے (عذاب کے آثار دیکھ کر اجمالاً ایمان لے آئے، اور مچھلی کے واقعہ کے بعد جب یونس علیہ السلام وہاں دوبارہ تشریف لے گئے تو اس وقت تفصیلاً ایمان لائے) تو (ایمان کی برکت سے) ہم نے ان کو ایک زمانہ تک (یعنی مدت عمر تک خیر وخوبی سے) عیش دیا۔

مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ: یہ جو کہا کہ ایک لاکھ یا اس سے زیادہ آدمیوں کی طرف، تو اس میں شک ظاہر کرنا مقصود نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر کسر کا اعتبار نہ کرو تو ایک لاکھ کہو، اور کسر کا اعتبار کرو تو زیادہ کہو، اور ترمذی میں مرفوعاً آیا ہے کہ تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار آدمی تھے۔

یہ قصہ سورہ یونس اور سورہ انبیاء میں بھی آیا ہے وہاں بھی اس کے متعلق کچھ ضروری مضامین لکھے گئے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگر صرف عاقل بالغ گنتے تو لاکھ تھے اور اگر سب چھوٹوں بڑوں کو شامل گنتے تو زیادہ تھے، یا یوں کہو کہ ایک لاکھ سے گزر کر دو لاکھ تک نہیں پہنچے تھے، ہزار کی کسر نہ لگاؤ تو ایک لاکھ کہہ لو اور کسر لگائی جائے تو لاکھ کے اوپر چند ہزار زائد ہوں گے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ایمان ویقین کی بدولت عذاب الٰہی سے بچ گئے اور اپنی عمر مقدر تک دنیا کا فائدہ اٹھاتے رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''وہی قوم جن سے بھاگے تھے ان پر ایمان لا رہی تھی، ڈھونڈتے تھی کہ یہ جا پہنچے، ان کو بڑی خوشی ہوئی''۔ یہ قصہ پہلے گزر چکا ہے، سورہ یونس اور سورہ انبیاء میں دیکھ لیا جائے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

اب ان سے پوچھ کیا تیرے رب کے یہاں بیٹیاں ہیں اور ان کے یہاں بیٹے، یا ہم نے بنایا فرشتوں کو عورت اور وہ دیکھتے تھے

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

سنتا ہے وہ اپنا جھوٹ بنایا (طوفان باندھ کر) کہتے ہیں، کہ اللہ کے اولاد ہوئی اور وہ بیشک جھوٹے ہیں ۱؎

خلاصہ تفسیر: گزشتہ بیان کردہ واقعات سے ان سب انبیاء علیہم السلام کا۔ جن کی نبوت عقلی دلائل سے ثابت ہے۔ مؤمن، موحد، مخلص اور توحید وایمان کی طرف داعی ہونا ثابت ہوتا ہے، اس سے پہلے شروع سورت میں توحید کے عقلی دلائل مذکور ہو چکے، اب آگے ان سب عقلی ونقلی دلائل پر تفریع کر کے شرک وکفر کا باطل ہونا بیان فرماتے ہیں۔

(توحید کے دلائل تو اوپر بیان ہو چکے) سو (اب اس کے بعد) ان لوگوں سے (جو ملائکہ اور جنات کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، اس طرح کہ ملائکہ کو نعوذ باللہ خدا کی بیٹیاں اور جنات کے سرداروں کی بیٹیوں کو ان فرشتوں کی مائیں قرار دیتے ہیں جس سے یہ لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کا فرشتوں سے نسبی رشتہ ہے، اور جنات سے زوجیت اور سسرالی کا تعلق ہے، سوان سب سے) پوچھئے کہ کیا خدا کے لئے تو بیٹیاں (ہوں) اور تمہارے لئے بیٹے (ہوں، یعنی جب اپنے لئے بیٹے پسند کرتے ہو تو خدا کے لئے بیٹیاں کیسے تجویز کرتے ہو، پس اس عقیدے میں ایک خرابی عرف کے اعتبار سے تو یہ ہے، اور) ہاں (دوسری بات سنو کہ) کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا ہے اور وہ (ان کے بننے کے وقت) دیکھ رہے تھے (یعنی دوسری برائی یہ ہے کہ فرشتوں پر عورت ہونے کی بلا دلیل تہمت رکھتے ہیں، کیونکہ دلیل یا عقلی ہے یا نقلی، اور اگر دونوں نہ ہوں تو مشاہدہ ہونا چاہیے تو کیا کسی نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ وہ عورتیں ہیں) خوب سن لو کہ وہ لوگ (دلیل کچھ نہیں رکھتے بلکہ محض) سخن تراشی سے کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ صاحب اولاد ہے اور وہ یقیناً (بالکل) جھوٹے ہیں (پس اس عقیدے میں تیسری برائی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت لازم آتی ہے)۔

ان تینوں قباحتوں میں سے پہلی قباحت کی برائی عرف سے بھی ثابت ہے، دوسری قباحت کی برائی نقل سے اور تیسری کی عقل سے ثابت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی انبیاء کا حال تو سن لیا کہ حضرت نوح، ابراہیم، اسماعیل، موسیٰ، ہارون، الیاس، لوط، یونس (علیہم السلام) سب کی مشکلات

اللہ کی امداد و اعانت سے حل ہوئیں، کوئی بڑے سے بڑا مقرب اس کی دستگیری سے بے نیاز نہیں، اب آگے تھوڑا سا فرشتوں اور جنوں کا حال سن لو، جن کی نسبت خدا جانے کیا کیا واہی تباہی عقیدے تراش کر رکھے ہیں، چنانچہ عرب کے بعض قبائل کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں، جب پوچھا جاتا کہ ان کی مائیں کون ہیں؟ تو بڑے بڑے جنوں کی لڑکیوں کو بتلاتے، اس طرح (العیاذ باللہ) خدا کا ناطہ جنوں اور فرشتوں دونوں سے جوڑ رکھا تھا، آگے دونوں کا حال ذکر کیا جاتا ہے، مگر اس سے پہلے بطور طوطیہ وتمہید کفار عرب کے اس لچر پوچ عقیدہ کا رد کیا گیا ہے، چنانچہ ابتدائے سورۃ سے اپنی عظمت و وحدانیت کے دلائل اور قصص کے ضمن میں اپنی قدرت قاہرہ کے آثار بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اب ذرا ان احمقوں سے پوچھئے، کیا اتنی بڑی عظمت وقدرت والا خدا (معاذ اللہ) اپنے لیے اولاد بھی تجویز کرتا تو بیٹیاں لیتا اور تم کو بیٹے دیتا، ایک تو یہ گستاخی کہ خداوند قدوس کے لیے اولاد تجویز کی، اور پھر اولاد بھی کمزور اور گھٹیا، اس پر مستزاد یہ کہ فرشتوں کو مونث (عورت) تجویز کیا، کیا جس وقت ہم نے فرشتوں کو پیدا کیا تھا، یہ کھڑے دیکھ رہے تھے کہ انہیں عورت بنایا گیا ہے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ! اس جہالت کا کیا ٹھکانا ہے۔

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿١٥٣﴾ مَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿١٥٤﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿١٥٥﴾

کیا اس نے پسند کیں بیٹیاں بیٹوں سے، کیا ہو گیا ہے تم کو کیسا انصاف کرتے ہو، کیا تم دھیان نہیں کرتے ہو۔ ا

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٥٦﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٥٧﴾

یا تمہارے پاس کوئی سند ہے کھلی، تو لاؤ اپنی کتاب اگر ہو تم سچے۔ ۲

خلاصہ تفسیر: چونکہ جاہلوں کے لئے عرفی برائی کا الزام زیادہ موثر ہوتا ہے، اس لئے پہلی برائی کو دوسرے عنوان سے پھر مکرر بیان فرماتے ہیں کہ:

(ہاں!) کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیاں زیادہ پسند کیں؟ تم کو کیا ہو گیا؟ تم کیسا (بیہودہ) حکم لگاتے ہو؟ (جس کو تم خود عرفاً بھی برا سمجھتے ہو) پھر (عرفی خرابی کے علاوہ) کیا تم (عقل اور) سوچ سے کام نہیں لیتے ہو (کہ یہ عقیدہ عقل کے بھی خلاف ہے، اب نقلی دلیل کی بھی نفی فرماتے ہیں کہ) ہاں! (اگر دلیل عقلی نہیں تو) کیا تمہارے پاس (اس پر) کوئی واضح دلیل موجود ہے (اس سے مراد نقلی دلیل ہے، کیونکہ مدعا کے ثابت کرنے میں نقلی دلیل زیادہ واضح ہوتی ہے اور آگے اس کو "کتاب" سے تعبیر کرنا بھی خود اس کا قرینہ ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ کیا تمہارے پاس کوئی نقلی موجود ہے) سو تم اگر (اس میں) سچے ہو تو اپنی وہ کتاب پیش کرو (خلاصہ یہ کہ جس عقیدہ کا تم دعویٰ کرتے اس میں تین قباحتیں ہیں، عرفی، نقلی اور عقلی، اور دلیل ایک بھی نہیں، نہ مشاہدہ، نہ نقل، نہ عقل، پس فرشتوں کو خدا کی اولاد بتلانا سراسر بہتان اور افترا پردازی ہے)۔

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ: خلاصہ یہ ہے کہ اول تو تمہارا یہ عقیدہ خود تمہارے عرف اور رسم ورواج کے لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ تم بیٹیوں کو باعث ننگ سمجھتے ہو، اب جو چیز تمہارے اپنے لئے ننگ وعار ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ پھر تم نے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا ہے، اس کی تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے ہیں ان کو الزامی جواب دینا زیادہ مناسب ہے، الزامی جواب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے دعوے کو خود انہی کے کسی دوسرے نظریہ کے ذریعہ باطل کیا جائے اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسرا نظریہ ہمیں بھی تسلیم ہے، بلکہ بسا اوقات وہ دوسرا نظریہ بھی غلط ہوتا ہے، لیکن مخالف کو سمجھانے کے لئے اس سے کام لے لیا جاتا ہے، یہاں باری تعالیٰ نے ان کے عقیدہ کی تردید کے لئے خود انہی کے اس نظریہ کو استعمال فرمایا ہے کہ بیٹیوں کا وجود باعث ننگ وعار ہے، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی بیٹیوں کا وجود باعث ننگ ہے، نہ یہ مطلب ہے کہ اگر وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کے بجائے خدا کے بیٹے کہتے تو یہ درست ہوتا، بلکہ یہ ایک الزامی جواب ہے، جس کا مقصد خود انہی کے مزعومات سے ان کے عقیدے کی تردید کرنا ہے، ورنہ اس قسم کے عقائد کا حقیقی جواب وہی

ہے جو قرآن کریم ہی میں کئی جگہ مذکور ہے، کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، اور اسے کسی اولاد کی ضرورت نہ ہے اور نہ اس کی رفعت شان کے یہ مناسب ہے کہ اس کی اولاد ہو۔

مَا لَكُمْ ۔ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ: کیونکہ یہ عقیدہ تو عرف کے علاوہ خود عقل کے بھی خلاف ہے چند وجہ سے :① ایک تو اس سے حق تعالیٰ کا صاحب اولاد ہونا لازم آتا ہے، ② دوسرے ذات وصفات کے مرتبہ میں ایک ناقص بات کی نسبت اس کی طرف لازم آتی ہے، کیونکہ اولاد ہونے کا اثر ذات وصفات تک پہنچے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی کچھ تو سوچو، عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیے، ایک غلط عقیدہ بنانا تھا تو ایسا بالکل ہی بے تکا تو نہ ہونا چاہیے تھا، یہ کون سا انصاف ہے کہ اپنے لیے تو بیٹے پسند کرو اور خدا سے بیٹیاں پسند کراؤ۔

فائدہ: ۲ یعنی آخر یہ مہمل اور بے تکی بات نکالی کہاں سے؟ عقل وفہم اور اصول سے تو اس کو لگاؤ نہیں، پھر کیا کوئی نقلی سند اس عقیدہ کی رکھتے ہو؟ ایسا ہے تو بسم اللہ وہ ہی دکھلاؤ۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

اور ٹھہرایا ہے انہوں نے خدا میں اور جنوں میں ناتا (قرابت)، اور جنوں کو تو معلوم ہے کہ تحقیق وہ پکڑے ہوئے آئیں گے

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بتاتے ہیں ۱ مگر جو بندے ہیں اللہ کے چنے ہوئے ۲

خلاصہ تفسیر: اور (مذکورہ عقیدہ میں فرشتوں کو خدا کی اولاد قرار دینے کے علاوہ) ان لوگوں نے اللہ میں اور جنات میں (بھی) رشتہ داری قرار دی ہے (جس کا باطل ہونا اور بھی زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ بیوی جس کام کے لئے ہوتی ہے اس سے حق تعالیٰ پاک ہے، اور جب بیوی ہونا محال ہے تو سسرالی رشتے جو اسی سے نکلتے ہیں وہ بھی محال ہوں گے) اور (جس جس کو یہ لوگ خدا کا شریک ٹھہرا رہے ہیں ان کی تو یہ کیفیت ہے کہ ان میں جو) جنات (ہیں خود ان) کا یہ عقیدہ ہے کہ (ان میں جو کافر ہیں) وہ (عذاب میں) گرفتار ہوں گے (اور عذاب میں کیوں گرفتار نہ ہوں کہ حق تعالیٰ کی نسبت بری بری باتیں بیان کرتے ہیں، حالانکہ) اللہ ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں (پس ان کفریہ بیانات کی وجہ سے وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے) مگر جو اللہ کے خاص (یعنی ایمان والے) بندے ہیں (وہ اس عذاب سے بچیں گے)۔

کفار عرب کے معبودوں میں سے بعض جن اسلام بھی لے آئے تھے، خلاصہ یہ کہ جنات بیچارے تو خود ہی اپنے آپ کو بندہ سمجھتے ہیں اور بندگی کا اقرار کرتے ہیں، پھر ان کو خدا کا شریک ٹھہرانا بڑی حماقت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی احمقوں نے جنوں کے ساتھ معاذ اللہ دامادی کا رشتہ قائم کر دیا، سبحان اللہ! کیا باتیں کرتے ہیں، موقع ملے تو ذرا ان جنوں سے پوچھ آؤ کہ وہ خود اپنی نسبت کیا سمجھتے ہیں؟ ان کو معلوم ہے کہ دوسرے مجرموں کی طرح وہ بھی اللہ کے روبرو پکڑے ہوئے آئیں گے، کیا داماد کا سسرال کے ساتھ یہ ہی معاملہ ہوتا ہے؟! بعض سلف نے ''نسب'' سے مراد یہ لی ہے کہ وہ لوگ شیاطین الجن کو اللہ تعالیٰ کا حریف مقابل سمجھتے تھے۔ جیسے مجوس ''یزدان'' اور ''اہرمن'' کے قائل ہیں، یعنی ایک نیکی کا خدا، اور دوسرا بدی کا۔

فائدہ: ۲ یعنی جنوں میں سے ہوں یا آدمیوں میں سے، اللہ کے چنے ہوئے بندے ہی اس پکڑ دھکڑ سے آزاد ہیں، معلوم ہوا وہاں کسی کا رشتہ ناتا نہیں، صرف بندگی اور اخلاص کی پوچھ ہے۔

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾

سو تم اور جن کو تم پوجتے ہو، کسی کو اس کے ہاتھ سے بہکا کر نہیں لے سکتے، مگر اسی کو جو پہنچنے والا ہے دوزخ میں ۱

خلاصہ تفسیر: فرشتوں کا ذکر آگے آئے گا، درمیان میں مخلصین کی مناسبت سے یہ بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح یہ اللہ کے خالص بندے عذاب سے بچے ہوئے ہیں اسی طرح گمراہ ہونے سے بھی بچے ہوئے ہیں اور کفار جو انکو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ ناکام رہیں گے۔

سو (اس سے لازم آگیا کہ) تم اور تمہارے سارے معبود (سب مل کر بھی) خدا سے کسی کو پھیر نہیں سکتے (جیسی تم کوششیں کیا کرتے ہو) مگر اسی کو جو کہ (علم الٰہی میں) جہنم رسید ہونے والا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ بہت لوگ سمجھتے ہیں کہ جنوں کے ہاتھ میں "بدی" کی اور فرشتوں کے ہاتھ میں "نیکی" کی باگ ہے، یہ جس کو چاہیں بھلائی پہنچائیں اور خدا کا مقرب بنا دیں اور وہ جسے چاہیں برائی اور تکلیف میں ڈال دیں، یا گمراہ کر دیں، شاید ان ہی مفروضہ اختیارات کی بناء پر انہیں اولاد یا سسرال بنایا ہوگا، اس کا جواب دیا کہ تمہارے اور ان کے ہاتھ میں کوئی مستقل اختیار نہیں، تم اور جن شیاطین کو تم پوجتے ہو سب مل کر ایک قدرت نہیں رکھتے کہ بدون مشیت ایزدی ایک متنفس کو بھی زبردستی گمراہ کر سکو، گمراہ وہ ہی ہوگا جسے اللہ نے اس کی سوئے استعداد کی بناء پر دوزخی لکھ دیا اور اپنی بدکاری کی وجہ سے از خود دوزخ میں پہنچ گیا۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

اور ہم میں جو ہے اس کا ایک ٹھکانا ہے مقرر ۱ اور ہم ہی ہیں صف باندھنے والے ۲ اور ہم ہی ہیں پاکی بیان کرنے والے ۳

خلاصہ تفسیر: اور (اب فرشتوں کا ذکر فرماتے ہیں کہ ان میں جو ملائکہ ہیں ان کا یہ مقولہ ہے کہ ہم تو بندہ محض ہیں، چنانچہ جو خدمت ہمارے سپرد ہے اس میں) ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے (کہ اسی کی بجا آوری میں لگے رہتے ہیں، اپنی رائے سے کچھ نہیں کر سکتے) اور ہم (خدا کے حضور میں حکم سننے کے وقت یا عبادت کے وقت ادب سے) صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور ہم (خدا کی) پاکی بیان کرنے میں بھی لگے رہتے ہیں (غرض ہر طرح محکوم اور بندے ہیں، سو جب فرشتے خود اپنی بندگی کا اعتراف کر رہے ہیں تو پھر ان پر معبود ہونے کا شبہ کرنا بڑی بے وقوفی ہے، پس جنات اور ملائکہ کے حق میں خدائی کا اعتقاد احسن وجوہ سے باطل ہو گیا)۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ: روح المعانی میں سدی سے منقول ہے کہ "مقام معلوم" سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کو اپنے مقام سے ترقی اور تنزل دونوں نہیں ہوتے اور انسان کو دونوں ہوتے ہیں (یعنی قرب اور مشاہدہ کی وجہ سے انسان کبھی تنزلی کی طرف اور کبھی ترقی کی طرف لوٹتا ہے، لیکن فرشتے قرب اور مشاہدہ کی وجہ سے ایک ہی حالت میں رہتے ہیں، کیونکہ ان کا ایمان نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے، اور انسان کبھی گناہوں کی وجہ سے ایمان میں کمزور ہو جاتا ہے اور کبھی نیکیوں کی وجہ سے اس کا ایمان بڑھ جاتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ کلام اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف سے گویا ان کی زبان سے فرمایا، جیسے بہت جگہ آدمیوں کی زبان سے دعائیں فرمائی ہیں، یعنی ہر فرشتہ کی ایک حد مقرر ہے، اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا، یہ اس پر فرمایا کہ کافر کہتے ہیں فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، جنوں کی عورتوں سے پیدا ہوئیں، سو جنوں کو اپنا حال خوب معلوم ہے اور فرشتے یوں کہتے ہیں ان کو بھی حکم الٰہی سے ذرا تجاوز کرنے کی گنجائش نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی اپنی اپنی حد پر ہر کوئی اللہ کی بندگی اور اس کا حکم سننے کے لیے کھڑا رہتا ہے، مجال نہیں آگے پیچھے سرک جائے۔

فائدہ: ۳ یہاں تک فرشتوں کا کلام ختم ہوا، آگے اہل مکہ کا حال بیان فرماتے ہیں:

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿١٦٧﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٦٨﴾

اور یہ تو کہا کرتے تھے، اگر ہمارے پاس کچھ احوال ہوتا پہلے لوگوں کا

لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿١٦٩﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٧٠﴾

تو ہم ہوتے بندے اللہ کے چنے ہوئے، سو اس سے منکر ہو گئے اب آگے جان لیں گے [1]

خلاصہ تفسیر: یہاں تک مشرکین کے باطل خیالات کا رد فرمایا، اب آگے مشرکین عرب کی ایک بدعہدی کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان لوگوں کی ایذا رسانیوں سے رنجیدہ نہ ہوں۔

اور یہ لوگ (یعنی کفار عرب آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے) کہا کرتے تھے کہ اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت (کی کتاب) پہلے لوگوں (کی کتابوں) کے طور پر آتی (یعنی جیسے یہود و نصاریٰ کے پاس رسول اور کتابیں آئیں، اگر ہمارے لئے ایسا ہوتا) تو ہم اللہ کے خاص بندے ہوتے (یعنی اس کتاب کی تصدیق اور اس پر عمل کرتے، ان کی طرح تکذیب اور مخالفت نہ کرتے) پھر (جب وہ نصیحت کی کتاب رسول کے ذریعہ سے ان کو پہنچی تو) یہ لوگ اس کا انکار کرنے لگے (اور اپنا وہ عہد توڑ دیا) سو (خیر) اب ان کو (اس کا انجام) معلوم ہوا جاتا ہے (چنانچہ مرتے ہی کفر کا انجام سامنے آ گیا، اور بعض سزائیں موت سے پہلے بھی مل گئیں)۔

* * *

فائدہ: [1] عرب لوگ انبیاء کے نام سنتے تھے ان کے علم سے خبردار نہ تھے تو یہ کہتے، یعنی اگر ہم کو پہلے لوگوں کے علوم حاصل ہوتے، یا ہمارے ہاں کوئی کتاب اور نصیحت کی بات اترتی تو ہم خوب عمل کر کے دکھلاتے اور معرفت و عبادت میں ترقی کر کے اللہ کے مخصوص و منتخب بندوں میں شامل ہو جاتے، اب جو ان کے اندر نبی آیا تو پھر گئے وہ قول و قرار کچھ یاد نہ رکھا، سو اس انکار و انحراف کا جو انجام ہونے والا ہے عنقریب دیکھ لیں گے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧١﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا

اور پہلے ہو چکا ہمارا حکم اپنے بندوں کے حق میں جو کہ رسول ہیں، بیشک انہی کو مدد دی جاتی ہے، اور ہمارا لشکر ہے جو ہے

لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿١٧٤﴾ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧٥﴾

بیشک وہی غالب ہے [1] سو تو ان سے پھر آ ایک وقت تک، اور ان کو دیکھتا رہ کہ وہ آگے دیکھ لیں گے [2]

خلاصہ تفسیر: اور (اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگرچہ اس وقت ان مخالفین کو کسی قدر شوکت حاصل ہے لیکن یہ چند روزہ ہے، کیونکہ) ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے ہمارا یہ قول پہلے ہی سے (یعنی لوح محفوظ ہی میں) مقرر ہو چکا ہے کہ بیشک وہی غالب کئے جائیں گے (چنانچہ اخیر میں غلبہ ہمیشہ انبیاء کو ہوتا ہے) اور (ہمارا تو عام قاعدہ ہے کہ) ہمارا لشکر غالب رہتا ہے (جو رسولوں کے متبعین کو بھی شامل ہے، سو جب یہ بات ہے کہ آپ غالب آنے والے ہیں ہی) تو آپ (تسلی رکھئے اور) تھوڑے زمانہ تک (صبر کیجئے اور) ان (کی مخالفت اور ایذا رسانی) کا خیال نہ کیجئے اور (ذرا) ان کو دیکھتے رہئے (یعنی ان کی حالت کا قدرے انتظار کیجئے) سو عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے (اس کا بھی وہی مطلب ہے جو پیچھے **فسوف یعلمون** کا تھا کہ ان کو مرنے کے بعد بھی اور مرنے سے پہلے بھی اللہ کی طرف سے سزا کا سامنا کرنا پڑے گا)۔

وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ: اہل حق کے غالب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اصل تقاضا تو یہی ہے کہ اہل حق ہی غالب ہوں، پس عارضی

مغلوبیت کسی آزمائش کی حکمت کی وجہ سے اس کے منافی یا معارض نہیں ہوگی،اس پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کوتو دنیا میں غلبہ حاصل نہیں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ معلوم پیغمبروں میں اکثریت تو ایسے ہی حضرات کی ہے جن کی قومیں انہیں جھٹلا کر عذاب میں مبتلا ہوئیں اور ان حضرات کو عذاب سے محفوظ رکھا گیا،صرف چند انبیاء علیہم السلام ایسے ہیں جنہیں دنیا میں آخر وقت تک بظاہر مادی طور پر غلبہ نہ مل سکا،لیکن دلیل وحجت کے میدان میں ہمیشہ وہی سربلند رہے،اور نظریاتی فتح ہمیشہ انہی کو حاصل ہوئی،ہاں اس سربلندی کے مادی آثار کسی خاص حکمت مثلاً آزمائش وغیرہ کی وجہ سے آخرت تک موخر کردیئے گئے،لہٰذا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ذلیل رہزن کسی بڑے حاکم افسر کے ساتھ سفر کی حالت میں لوٹ مار کرنے لگے،مگر وہ حاکم اپنی خداداد عالی دماغی کی وجہ سے ہرگز اس ذلیل رہزن کی خوشامد نہیں کرے گا،حتیٰ کہ جب وہ حاکم اپنے دارالحکومت میں پہنچے گا اس رہزن کو گرفتار کرکے سزا دے گا،لہٰذا اس عارضی غلبہ کی وجہ سے نہ اس رہزن کو حاکم کہہ سکتے ہیں،اور نہ اس افسر کو محکوم،بلکہ اصلی حالت کے اعتبار سے وہ رہزن اس غلبہ میں بھی محکوم ہے،اور وہ افسر اس مغلوبیت میں بھی حاکم ہے،اسی بات کو حضرت ابن عباس نے ایک مختصر اور سلیس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے:"ان لم ینصروا فی الدنیا ینصروا فی الاخرۃ"۔

لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ غلبہ خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں کسی قوم کو محض خصوصیات نسلی یا دین کے ساتھ محض نام کے تعلق سے حاصل نہیں ہوتا،بلکہ یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے آپ کو"اللہ کے لشکر" کا ایک فرد بنالے،جس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ ہر شعبہ زندگی میں اللہ کی اطاعت کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے ہو،یہاں جندنا(ہمارا لشکر) کا لفظ بتارہا ہے کہ جو شخص اسلام قبول کرے اسے اپنی ساری زندگی نفس اور شیطان کی طاقتوں سے جنگ کرنے میں خرچ کرنے کا معاہدہ کرنا ہوگا اور اس کا غلبہ خواہ مادی ہو یا اخلاقی،دنیا میں ہو یا آخرت میں،اسی شرط پر موقوف ہے۔

* * *

فائدہ:۱ یعنی یہ بات علم الٰہی میں ٹھہر چکی ہے کہ منکرین کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو مدد پہنچاتا ہے اور آخر کار خدائی لشکر ہی غالب ہو کر رہتا ہے،خواہ درمیان میں حالات کتنے ہی پلٹے کھائیں،مگر آخری فتح اور کامیابی مخلص بندوں ہی کے لیے ہے،باعتبار حجت وبرہان کے بھی اور باعتبار ظاہری تسلط وغلبہ کے بھی،ہاں شرط یہ ہے کہ"جند"فی الواقع"جند اللہ"ہو۔

فائدہ:۲ یعنی ابھی چند روز انہیں کچھ نہ کہیے۔صبر کے ساتھ آپ ان کا حال دیکھتے رہیے اور یہ اپنا انجام لیں گے چنانچہ دیکھ لیا۔

أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿١٧٦﴾ فَإِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنذَرِينَ ﴿١٧٧﴾

کیا ہماری آفت کو جلد مانگتے ہیں،پھر جب اترے گی ان کے میدان میں تو بری صبح ہوگی ڈرائے ہوؤں کی۔۱

وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿١٧٨﴾ وَأَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ ﴿١٧٩﴾

اور پھر ان سے ایک وقت تک،اور دیکھتا رہ اب آگے دیکھ لیں گے۔۲

خلاصہ تفسیر: گزشتہ بیان کردہ دھمکی پر وہ کہہ سکتے تھے اور اکثر وہ کہا بھی کرتے تھے کہ ایسا کب ہوگا؟ تو اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

کیا ہمارے عذاب کا تقاضا کررہے ہیں،سو وہ(عذاب) جب ان کے روبرو(سامنے) آنازل ہوگا،سو وہ دن ان لوگوں کا جن کو(پہلے سے) ڈرایا جاچکا تھا بہت ہی برا ہوگا(کہ وہ عذاب ٹل نہ سکے گا) اور(جب یہ بات ہے کہ ان لوگوں پر عذاب واقع ہونے والا ہے تو) آپ(تسلی رکھئے اور) تھوڑے زمانہ تک(صبر کیجئے اور) ان(کی مخالفت اور ایذارسانی) کا خیال نہ کیجئے اور(ذرا ان کی حالت کو) دیکھتے رہیے(یعنی منتظر رہیے) سو عنقریب یہ بھی دیکھ لیں گے(یعنی آپ کو تو ہمارے کہنے سے یقین ہے ہی،آنکھوں سے دیکھ کر انہیں بھی یقین آجائے گا)۔

وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ: بظاہر یہاں یہ آیت مکرر معلوم ہوتی ہے، مگر معنی کے اعتبار سے تکرار نہیں ہے، کیونکہ پیچھے یہ مضمون اہل حق کے غلبہ کے متعلق تھا، اور یہاں کفار کے مغلوب ہونے کے متعلق ہے۔

فائدہ: ۱؎ شاید فسوف یبصرون سن کر کہا ہوگا کہ پھر دیر کیا ہے؟ ہم کو ہمارا انجام جلدی دکھلا دو، اس کا جواب دیا کہ اپنے اوپر جو آفت لائے جانے کی جلدی مچا رہے ہو، جب وہ آئے گی تو بہت برا وقت ہوگا، عذاب الٰہی اس طرح آئے گا جیسے کوئی دشمن گھات میں لگا ہوا اور صبح کے وقت یکا یک میدان میں اتر کر چھاپہ مارا جائے، عذاب آنے کے وقت یہ ہی حشر ان لوگوں کا ہوگا جنہیں پہلے سے ڈرسنا کر ہشیار کر دیا گیا تھا، چناچہ فتح مکہ وغیرہ میں ایسا ہی ہوا۔

فائدہ: ۲؎ شاید پہلا وعدہ دنیا کے عذاب کا تھا اور یہ آخرت کے عذاب کا ہو، یعنی آپ دیکھتے جائیے اب آگے چل کر آخرت میں یہ کافر کیا کچھ دیکھتے ہیں۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾

پاک ذات ہے تیرے رب کی وہ پروردگار عزت والا پاک ہے ان باتوں سے جو بیان کرتے ہیں، اور سلام ہے رسولوں پر

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾ ع

اور سب خوبی اللہ کو جو رب ہے سارے جہان کا ۱؎

خلاصہ تفسیر: سورت میں اصل مقصود تین مضمون تھے: ① توحید ② رسالت ③ اثبات قیامت، پھر قیامت کا اعتقاد چونکہ نقل پر موقوف ہے اور اس کے ثبوت کے لیے صرف عقلی دلائل کافی نہیں ہیں، اس لیے واقع میں وہ عقیدہ رسالت کی فرع ہے، اس لحاظ سے اصل مقصود توحید ورسالت کے مضمون رہ گئے، سواب سورت کو انہی پر اجمالاً ختم کیا جاتا ہے۔

آپ کا رب جو بڑی عظمت والا ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ (کافر) بیان کرتے ہیں (پس خدا کو ان باتوں سے پاک ہی قرار دو) اور (پیغمبروں کو کا اتباع واجب سمجھو، کیونکہ ہم ان کی شان میں یہ کہتے ہیں کہ) سلام ہو پیغمبروں پر اور (خدا کو شرک وغیرہ سے پاک سمجھنے کے ساتھ ساتھ تمام کمالات کا جامع بھی سمجھو، کیونکہ) تمام تر خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام عالم کا پروردگار (اور مالک) ہے۔

سبحان اللہ! کیا اچھا خاتمہ ہے کہ اجمالاً شریعت کے تمام اصول وفروع کو جامع ہے، کیونکہ کوئی مسئلہ بھی عقیدہ رسالت پر مرتب ہونے سے خالی نہیں، اور اس خاتمہ کی عمدگی اور عظمت کی وجہ سے احادیث میں نماز کے بعد اور مجلس سے اٹھنے کے وقت اس کا پڑھنا منقول ہے۔

فائدہ: ۱؎ خاتمہ سورت پر تمام اصولی مضامین کا خلاصہ کر دیا، یعنی اللہ کی ذات تمام عیوب ونقائص سے پاک اور تمام محاسن وکمالات کی جامع ہے، سب خوبیاں اسی کی ذات میں مجتمع ہیں، اور انبیاء ورسل پر اس کی طرف سے سلام آتا ہے، جو ان کی عظمت وعصمت اور سالم ومنصور ہونے کی دلیل ہے۔

تنبیہ: احادیث سے بعد نماز اور ختم مجلس پر ان آیات کے پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اس لیے سورۃ ہذا کے فوائد کو ان ہی آیات متبرکہ پر ختم کرتا ہوں، اے اللہ میرا خاتمہ بھی اسی عقیدہ محکم پر کیجیو۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اٰیاتہا ۸۸ ۞ ۳۸ سورۃ ص مکیۃ ۳۸ ۞ رکوعاتہا ۵

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں زیادہ مضامین رسالت کے متعلق ہیں، اور بعض آیات میں خاص توحید، جزا وسزا کے انکار پر ملامت ہے، اور بعض آیات میں ان دونوں کی مجمل دلیل اور بعض میں ان دونوں کے واقعات کی قدرے تفصیل ہے، اور مسئلہ رسالت کی مناسبت سے بعض آیات میں قرآن کی مدح ہے، گزشتہ سورت کو انہی مضامین میں اس سورت سے مناسبت ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

صٓ وَالۡقُرۡاٰنِ ذِى الذِّكۡرِ ؕ‏ ①‏ بَلِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِىۡ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ‏ ②

ص، قسم ہے اس قرآن سمجھانے والے کی، بلکہ جو لوگ منکر ہیں غرور میں ہیں اور مقابلہ میں [1]

كَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيۡنَ مَنَاصٍ‏ ③

بہت غارت کر دیں ہم نے ان سے پہلے جماعتیں پھر لگے پکارنے اور وقت نہ رہا خلاصی کا [2]

خلاصہ تفسیر: شروع کی آیتوں کا سبب نزول یہ ہے کہ ابو طالب کے مرض میں قریش کے لوگ ان کے پاس آئے اور حضور ﷺ بھی تشریف لائے تو قریش نے آپ کی شکایت کی، ابو طالب نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ آپ اپنی قوم سے کیا بات چاہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ صرف ایک بات چاہتا ہوں جس سے تمام عرب ان کے مطیع ہو جائیں گے اور اہل عجم ان کو جزیہ دینے لگیں گے، انہوں نے پوچھا وہ ایک بات کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "لا الہ الا اللہ" قریش کہنے لگے کہ سب معبودوں کو باطل کر کے ایک ہی معبود قرار دے دیا، عجیب بات ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ ناراض ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، اس پر شروع سے بل لما یذوقوا عذاب تک آیتیں نازل ہوئیں۔

صٓ (اس کے معنی تو اللہ کو معلوم ہیں) قسم ہے قرآن کی جو نصیحت سے پر ہے (کہ کفار آپ کی رسالت کا انکار کرتے ہوئے جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ٹھیک نہیں) بلکہ (خود) یہ کفار (ہی) تعصب اور (حق کی) مخالفت میں (پڑے) ہیں (اور اس تعصب ومخالفت کا وبال ایک روز ان پر پڑنے والا ہے جیسا) ان سے پہلے بہت سی امتوں کو ہم (عذاب سے) ہلاک کر چکے ہیں سو انہوں نے (ہلاکت کے وقت) بڑی ہائے پکار کی (اور بہت شور وغل مچایا) اور (اس وقت شور وغل سے کیا ہوتا ہے، کیونکہ) وہ وقت خلاصی کا نہ تھا (اس لئے کہ عذاب جب آ چکے تو یہ بھی قبول نہیں ہوتی)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی یہ عظیم الشان، عالی مرتبہ قرآن (جو عمدہ نصیحتوں سے پر، اور نہایت موثر طرز میں لوگوں کو ہدایت ومعرفت کی باتیں سمجھانے والا ہے) با آواز بلند شہادت دے رہا ہے کہ جو لوگ قرآنی صداقت اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے منکر ہیں، اس کا سبب یہ نہیں کہ قرآن کی تعلیم وتفہیم میں کچھ قصور ہے، یا حضور پر نور اس کی تبلیغ وتبیین میں معاذ اللہ مقصر ہیں، بلکہ انکار وانحراف کا اصلی سبب یہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹی شیخی، جاہلانہ غرور ونخوت اور معاندانہ مخالفت کے جذبات میں پھنسے ہوئے ہیں، ذرا اس دلدل سے نکلیں تو حق وصداقت کی صاف سڑک نظر آئے۔

فائدہ: [2] یعنی ان کو معلوم رہنا چاہیے کہ اسی غرور وتکبر کی بدولت انبیاء اللہ سے مقابلہ ٹھان کر بہت سی جماعتیں پہلے تباہ وبرباد ہو چکی ہیں، وہ لوگ بھی مدتوں خدا کے پیغمبروں سے لڑتے رہے، پھر جب برا وقت آ کر پڑا اور عذاب الٰہی نے چاروں طرف سے گھیر لیا تو گھبرا کر شور مچانے اور خدا کو پکارنے لگے، مگر اس وقت فریاد کرنے سے کیا بنتا، رہائی اور خلاصی کا موقع گزر چکا تھا، اور وقت نہیں رہا تھا کہ ان کے شور وبکاء کی طرف توجہ کی جائے۔

وَعَجِبُوٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴

اور تعجب کرنے لگے اس بات پر کہ آیا ان کے پاس ایک ڈرسنانے والا انہی میں سے، اور کہنے لگے منکر یہ جادوگر ہے جھوٹا

خلاصہ تفسیر: اور ان کفار (قریش) نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس ان (ہی) میں سے (یعنی جو کہ ان ہی کی طرح انسان اور بشر ہے) ایک (پیغمبر) ڈرانے والا آ گیا (تعجب کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی جہالت سے بشریت کو نبوت کی ضد اور مخالف سمجھتے تھے) اور (اس انکار رسالت میں یہاں تک پہنچ گئے کہ آپ کے معجزات اور دعویٰ نبوت کے بارے میں) کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) یہ شخص (خوارق عادت کے معاملہ میں) ساحر اور (دعویٰ نبوت کے معاملہ میں) کذاب ہے۔

یعنی وہ یہ کہتے تھے کہ انسان ہونے کی وجہ سے آپ کا نبی ہونا محال ہے، اور قرآن کے معجزہ ہونے سے نبوت کا ثبوت لازم آتا ہے، مگر جب انسان کا نبی ہونا ہی ممکن نہیں تو قرآن کا معجزہ ہونا بھی صحیح نہیں، مگر ہے عجیب کلام، پس لامحالہ جادو ہوگا۔

* * *

فائدہ: یعنی آسمان سے کوئی فرشتہ آتا تو خیر ایک بات تھی، ہم ہی میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کر ہم کو ڈرانے دھمکانے لگے اور کہے میں آسمان والے خدا کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، یہ عجیب بات ہے، اب بجز اس کے کیا کہا جائے کہ ایک جادوگر نے جھوٹا ڈھونگ بنا کر کھڑا کر دیا ہے، جادو کے زور سے کچھ کرشمے دکھا کر انہیں معجزہ کہنے لگے اور چند قصے کہانیاں جمع کر کے جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ یہ اللہ کے اتارے ہوئے علوم ہیں اور میں اس کا پیغمبر ہوں۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝۵

کیا اس نے کر دی اتنوں کی بندگی کے بدلے ایک ہی بندگی، یہ بھی ہے بڑے تعجب کی بات

وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝۶

اور چل کھڑے ہوئے کئی پنچ ان میں سے کہ چلو اور جمے (قائم) رہو اپنے معبودوں پر، بیشک اس بات میں کوئی (کچھ) غرض ہے ۲

خلاصہ تفسیر: (اور) کیا (یہ شخص سچا ہو سکتا ہے جبکہ) اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا (اور سب کے معبود ہونے کی نفی کر دی) واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے (جس کی وجہ عنقریب آتی ہے) اور (توحید کا مضمون سن کر) ان کفار کے رئیس (مجلس سے اٹھ کر لوگوں سے) یہ کہتے ہوئے چلے کہ (یہاں سے) چلو اور اپنے معبودوں (کی عبادت) پر قائم رہو (کیونکہ اول تو) یہ (توحید کی دعوت) کوئی مطلب کی بات (معلوم ہوتی) ہے (یعنی اس بہانہ سے آپ معاذ اللہ ریاست اور سرداری کے خواہاں معلوم ہوتے ہیں)۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا: جو اہل غلو وحدۃ الوجود کے متعارف معنی کے قائل ہیں وہ اس آیت سے وحدۃ الوجود کو ثابت کرتے ہیں، ان کے مزعومہ استدلال کا حاصل یہ ہے کہ کفار نے **اجعل الالهة الها واحداً** پر ہمزہ استفہام داخل کر کے اس ''جعل'' کو حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا تو ضروری ہوا کہ آپ ﷺ سے اس اتحاد کا دعویٰ کبھی صادر ہوا ہوگا، ورنہ اس نسبت پر قرآن میں انکار ہوتا، تو متدلین کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جو لا الہ الا اللہ کی تبلیغ فرمائی ہے اس کلمہ کے معنی یہی اتحاد ہیں کہ کوئی معبود باطل غیر اللہ نہیں بلکہ (نعوذ باللہ) سب عین اللہ ہے، چنانچہ کفار اہل لسان کے اس انکار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صاحب وحی کا دعویٰ سب آلہہ کو الہ واحد کے ساتھ متحد قرار دینے کا تھا، اور چونکہ اس باب میں الہ باطل اور غیر باطل میں کچھ فرق نہیں لہٰذا ہر وہ چیز بھی جس کو ہم غیر اللہ کہتے ہیں سب گویا نعوذ باللہ عین اللہ ہوں گی۔

قائلین وحدۃ الوجود کا یہ استدلال اس لیے غلط ہے کہ اس ''جعل'' کے معنی یہ ہیں کہ غیر اللہ کی معبودیت کو نفی کر کے صرف ایک خدا کو معبود

ثابت کیا جائے، نہ یہ کہ سب کے اتحاد کا دعوی کیا ہو، چنانچہ کفار کے اس قول کا مطلب یہ نہیں کہ حضور ﷺ پہلے تمام آلہہ پر ایمان لائے، پھر ان کو ایک کر دیا، بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے تمام آلہہ کو چھوڑ کر ایک خدا کو اپنا لیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں جعل تصییر کے لئے نہیں کہ جس سے یہ دعوی ثابت ہو، بلکہ اس کا حاصل مفعول اول کا ابطال اور مفعول ثانی کا اثبات ہے، اس محاورے کی نظیر جیسے حدیث میں آیا ہے: "من جعل الهموم هما واحدا هم الاخرة كفاه الله هومه كلها" کہ جو شخص اپنی تمام فکروں کو ایک فکر یعنی آخرت کی فکر بنالے اللہ تعالیٰ دنیوی پریشانیوں اور فکروں سے اس کی کفایت فرماتے ہیں، اس حدیث میں ظاہر ہے کہ "جعل" کے یہی معنی ہیں کہ تمام دنیاوی فکروں کو چھوڑ کر صرف ایک آخرت کی فکر کو اختیار کرے، اس حدیث کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان پہلے تمام غموں کا روگ لگالے، پھر ان سب کو ایک غم میں تبدیل کر دے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسان غموں کے انبار کو چھوڑ کر ایک آخرت کی فکر کو اپنالے، اس حدیث میں دنیاوی فکروں کی نفی اور آخرت کی فکر کا اثبات مقصود ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اور لیجئے! اتنے بیشمار دیوتاؤں کا دربار ختم کر کے صرف ایک خدا رہنے دیا، اس سے بڑھ کر تعجب کی بات کیا ہوگی کہ اتنے بڑے جہان کا انتظام اکیلے ایک خدا کے سپرد کر دیا جائے اور مختلف شعبوں اور محکموں کے جن خداؤں کی بندگی قرنوں سے ہوتی چلی آتی تھی، وہ سب یک قلم موقوف کر دی جائے، گویا ہمارے باپ دادے نرے جاہل اور بیوقوف ہی تھے جو اتنے دیوتاؤں کے سامنے سر عبودیت خم کرتے رہے۔

روایات میں ہے کہ ابو طالب کی بیماری میں ابو جہل وغیرہ چند سرداران قریش نے ابو طالب سے آن کر حضرت ﷺ کی شکایت کی کہ یہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور ہمیں طرح طرح سے احمق بناتے ہیں، آپ ان کو سمجھایئے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے چچا! میں ان سے صرف ایک کلمہ چاہتا ہوں، جس کے بعد تمام عرب ان کا مطیع ہو جائے اور عجم ان کی خدمت میں جزیہ پیش کرنے لگے، وہ خوش ہو کر بولے کہ بتلایئے وہ کلمہ کیا ہے؟ آپ ایک کلمہ کہتے ہیں، ہم آپ کے دس کلمے ماننے کے لیے تیار ہیں، فرمایا زیادہ نہیں، بس ایک اور صرف ایک ہی کلمہ ہے "لا الہ الا اللہ"، یہ سنتے ہی طیش میں آ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کیا اتنے خداؤں کو ہٹا کر اکیلا ایک خدا؟! چلو جی! یہ اپنے منصوبے سے کبھی باز نہ آئیں گے، یہ تو انہی ہمارے معبودوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے ہیں، تم بھی مضبوطی سے اپنے معبودوں کی عبادت وحمایت پر جمے رہو، مبادا ان کا پروپیگنڈا کسی ضعیف الاعتقاد کا قدم پرانے آبائی طریقہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائے، ان کی ان تھک کوشش کے مقابلہ میں ہم کو بہت زیادہ صبر واستقلال دکھانے کی ضرورت ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی محمد ﷺ جو اس قدر زور وشور اور عزم واستقلال سے ہمارے معبودوں کے خلاف جہاد کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ضرور اس میں ان کی کوئی غرض ہے، وہ یہ ہی کہ ایک خدا کا نام لے کر ہم سب کو اپنا محکوم اور مطیع بنالیں اور دنیا کی حکومت وریاست حاصل کریں، سو لازم ہے کہ اس مقصد میں ہم ان کو کامیاب نہ ہونے دیں۔

① بعض مفسرین نے ان هذا لشيء يراد کا مطلب یہ لیا ہے کہ بیشک یہ وہ چیز ہے جس کا محمد ﷺ ارادہ ہی کر چکے ہیں، کسی طرح اس سے ہٹنے والے نہیں ② یا یوں کہا جائے کہ یہ بات (معلوم ہوتا ہے) ہونے والی ہے، اللہ کو یہ ہی منظور ہے کہ دنیا میں انقلاب ہو، لہذا جہاں تک ہو سکے صبر وتحمل سے اپنے قدیم دین وآئین کی حفاظت کرتے رہو ③ یا ممکن ہے از راہ تحقیر کہا ہو کہ بیشک محمد (ﷺ) کے ارادے سب کچھ ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ آدمی جو راہ اور تمنا کرے، وہ پوری ہو، چاہیے کہ ہم ان کے مقابلہ میں قدم پیچھے نہ ہٹائیں۔

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝

یہ نہیں سنا ہم نے اس پچھلے دین میں، اور کچھ نہیں یہ بنائی ہوئی بات ہے

خلاصہ تفسیر: (دوسرے توحید کا دعویٰ بھی باطل اور عجیب ہے کیونکہ) ہم نے تو یہ بات (اپنے) پچھلے مذہب میں نہیں سنی، ہو نہ ہو یہ (اس شخص کی) من گھڑت ہے (پچھلے مذہب کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے طریقہ کے لوگ ہوئے ہیں، سب سے پیچھے ہم موجود ہیں اور ہم

حق پر ہیں، سو ہم نے اس طریقہ کے بزرگوں سے کبھی یہ بات نہیں سنی)۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''پچھلا دین کہتے تھے اپنے باپ دادوں کو، یعنی آگے تو سنے ہیں کہ اگلے لوگ ایسی باتیں کہتے تھے، پر ہمارے بزرگ تو یوں نہیں کہہ گئے''۔

اور ممکن ہے پچھلے دین سے عیسائی مذہب مراد ہو، جیسا کہ اکثر سلف کا قول ہے، یعنی نصاریٰ جو اہل کتاب ہیں، ان کو بھی ہم نے نہیں سنا کہ سب خداؤں کو ہٹا کر ایک خدا رہنے دیا ہو، آخر وہ بھی تین خدا تو مانتے ہیں اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول نہیں مانتے، اگر پہلی کتابوں میں کچھ اصل ہوتی تو وہ ضرور قبول کرتے، معلوم ہوا کہ محض گھڑی ہوئی بات ہے، العیاذ باللہ۔

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۭ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝۸

کیا اسی پر اتری نصیحت ہم سب میں سے ۱؎ کوئی نہیں انکو دھوکا ہے میری (ہماری) نصیحت میں، کوئی نہیں ابھی انہوں نے چکھی نہیں میری مار ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور یہ شخص جو نبوت کا مدعی ہے اور توحید کو خدا کی تعلیم بتلاتا ہے، سو اول تو انسان نبی ہو ہی نہیں سکتا، دوسرے اگر اس بات سے بھی قطع نظر کی جائے تو:

کیا ہم سب میں اس شخص (کو کوئی فوقیت وفضیلت تھی کہ اسی کو نبوت ملی اور اسی) پر کلام الٰہی نازل کیا گیا (بلکہ کسی رئیس پر نازل ہوتا تو مضائقہ نہ تھا، آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ ان پر کیوں نزول ہوا؟ کسی رئیس پر کیوں نہ ہوا؟ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اگر کسی رئیس پر نازل ہوتا تو اس وقت یہ اس کا اتباع کرتے) بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ لوگ (خود) میری وحی کی طرف سے شک (یعنی انکار) میں ہیں (یعنی یہ تو سرے سے مسئلہ نبوت ہی کے منکر ہیں، خصوصاً بشر کو نبی ماننے کے لئے تیار نہیں اور یہ انکار بھی کچھ اس لئے نہیں کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے) بلکہ (اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ) انہوں نے ابھی تک میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا (ورنہ سب عقل ٹھکانے آجاتی، اس تقریر سے ان کے دونوں شبہوں کا جواب ہو گیا)۔

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا: چونکہ ان کی یہ بات کہنے کا سبب تکبر تھا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبر ایسی بری خصلت ہے کہ بعض اوقات کفر تک پہنچا دیتی ہے جیسے کہ مشرکین وکفار مکہ کا کبر تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اچھا قرآن کو اللہ کا کلام ہی مان لو اور یہ بھی نہ سہی کہ آسمان سے کوئی فرشتہ نبی بنا کر بھیجا جاتا، مگر یہ کیا غضب ہے کہ ہم سب میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا انتخاب ہوا، کیا سارے ملک میں ایک یہ ہی اس منصب کے لیے رہ گئے تھے؟ اور کوئی بڑا رئیس مالدار خدا کو نہ ملتا تھا جس پر اپنا کلام نازل کرتا۔

فائدہ: ۲؎ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی نامعقول یاوہ گوئی کا جواب ہوا، یعنی ان کی یہ خرافات کچھ نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ ابھی ہماری نصیحت کے متعلق ان کو دھوکا لگا ہوا ہے، وہ یقین نہیں رکھتے کہ جس خوفناک مستقبل سے آگاہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور پیش آکر رہے گا، کیونکہ ابھی تک انہوں نے خدائی مار کا مزہ نہیں چکھا، جس وقت خدائی مار پڑے گی، تمام شکوک وشبہات دور ہو جائیں گے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۝۹

کیا ان کے پاس ہیں خزانے تیرے رب کی مہربانی کے جو کہ زبردست ہے بخشنے والا

اَمۡ لَهُمۡ مُّلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا فَلۡيَرۡتَقُوۡا فِى الۡاَسۡبَابِ ⑩

یا ان کی حکومت ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے تو ان کو چاہیے کہ چڑھ جائیں رسیاں تان کر ا۔

خلاصہ تفسیر: (آگے دوسرے طرز پر جواب ہے کہ) کیا ان لوگوں کے پاس آپ کے پروردگار زبردست فیاض کی رحمت کے خزانے ہیں (جس میں نبوت بھی داخل ہے، کہ جس کو چاہیں دیں جس کو چاہیں نہ دیں، یعنی اگر رحمت کے سارے خزانے ان کے قبضہ میں ہوتے تب تو ان کو یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ ہم نے بشر کو نبوت نہیں دی، پھر وہ نبی کیسے ہوگیا؟) یا (اگر سارے خزانے قبضہ میں نہیں ہیں تو کم از کم آسمان وزمین ہی کی چیزیں ان کے قبضہ میں ہوتیں تب ان کو یہ بات کہنا زیبا تھی، کیونکہ نبوت سے خدا کے احکام معلوم ہوتے ہیں جن پر عمل کرنا بقاء عالم کا سبب ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مؤمن نہ رہے گا تو قیامت آجائے گی، پس نبوت کو عالم کے نظام اور بقاء میں بڑا دخل ہے تو نبوت دینے والا ایسا شخص ہونا چاہیے جو تمام عالم کے مصالح کو جانتا ہو ان کے نافذ کرنے پر قادر ہو تاکہ ایسے مناسب احکام مقرر کرے جن سے نظام عالم قائم رہے، اس لیے اب آگے فرماتے ہیں کہ کم از کم یہی قبضہ میں ہوتے تو) کیا ان کو آسمان اور زمین اور جو چیزیں ان کے درمیان میں ہیں ان (سب) کا اختیار حاصل ہے (کہ اگر اتنا ہی اختیار ہوتا تب بھی یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ یہ آسمان وزمین کے مصالح سے باخبر ہیں، اس لئے جسے چاہیں اسے نبوت ملنی چاہئے، اب آگے عاجز کرنے کے طور پر ارشاد ہے کہ اگر ان کو اس پر اختیار ہے) تو ان کو چاہئے کہ سیڑھیاں لگا کر (آسمان پر) چڑھ جائیں (اور ظاہر ہے کہ یہ اس پر قادر نہیں، پس جب انہیں اتنی بھی قدرت نہیں تو آسمان وزمین کی معلومات اور ان پر کیا اختیار ہوگا؟ پھر ان کو ایسی بے سروپا باتیں کہنے کا کیا حق ہے؟)۔

* * *

فائدہ: ا یعنی رحمت کے خزانے اور آسمان وزمین کی حکومت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ زبردست ہے اور بڑی بخشش والا ہے، جس پر جو انعام چاہے کرے، کون روک سکتا ہے یا نکتہ چینی کرسکتا ہے؟! اگر وہ اپنی حکمت ودانائی سے کسی بشر کو منصب نبوت ورسالت پر سرفراز فرماتا ہے تو تم دخل دینے والے کون ہو کہ صاحب! اس پر یہ مہربانی فرمائی ہم پر نہ فرمائی، کیا رحمت کے خزانوں اور زمین وآسمان کی حکومت کے تم مالک ومختار ہو؟! جو اس قسم کے لغو اعتراضات کرتے ہو، اگر ہو تو اپنے تمام اسباب ووسائل کو کام میں لے آؤ اور رسیاں تان کر آسمان پر چڑھ جاؤ، تاکہ وہاں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آنا بند کرسکو اور علویات پر قابض ہو کر اپنی مرضی ومنشاء کے موافق آسمان وزمین کے انتظام وتدبیر کا انجام دے سکو، اگر اتنا نہیں کرسکتے تو آسمان وزمین کی حکومت اور خزائن رحمت کی مالکیت کا دعویٰ عبث ہے، پھر خدائی انتظامات میں دخل دینا بجز بے حیائی یا جنون کے اور کیا ہوگا: ''ایاز! قدر خود شناس''۔

جُنۡدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهۡزُوۡمٌ مِّنَ الۡاَحۡزَابِ ⑪

ایک لشکر یہ بھی وہاں (یہاں) تباہ ہوا ان سب لشکروں میں

خلاصہ تفسیر: (مگر اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی مخالفت سے فکر نہ کریں، کیونکہ) اس مقام پر (یعنی مکہ میں) ان لوگوں کی یونہی ایک بھیڑ ہے، من جملہ (مخالفین انبیاء کے) گروہوں کے جو (عنقریب) شکست دیئے جائیں گے (چنانچہ غزوہ بدر میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی)۔

* * *

فائدہ: یعنی کچھ بھی نہیں، زمین وآسمان کی حکومت اور خزانوں کے مالک تو یہ بیچارے کیا ہوتے، چند ہزیمت خوردہ آدمیوں کی ایک بھیڑ ہے جو اگلی تباہ شدہ قوموں کی طرح تباہ وبرباد ہوتی نظر آتی ہے، چنانچہ یہ منظر ''بدر'' سے لے کر ''فتح مکہ'' تک لوگوں نے دیکھ لیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اگلی قومیں برباد ہوئیں، اگر چڑھ جائیں تو ان میں ایک یہ بھی برباد ہوں''، گویا اس آیت کا ربط ماقبل

سے بتلادیا، واللہ اعلم۔

كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوحٖ وَعَادٞ وَفِرۡعَوۡنُ ذُو ٱلۡأَوۡتَادِ ﴿١٢﴾ وَثَمُودُ وَقَوۡمُ لُوطٖ وَأَصۡحَٰبُ لۡـَٔيۡكَةِۚ

جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور فرعون میخوں والا ۱؎ اور ثمود اور لوط کی قوم اور ایکہ کے لوگ ۲؎

أُوْلَٰٓئِكَ ٱلۡأَحۡزَابُ ﴿١٣﴾ إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ ٱلرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿١٤﴾ ع

وہ بڑی بڑی فوجیں، یہ جتنے تھے سب نے یہی کیا کہ جھٹلایا رسولوں کو پھر ثابت ہوئی میری طرف سے سزا ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اور) ان سے پہلے بھی قوم نوح نے اور عاد نے اور فرعون نے جس (کی سلطنت) کے کھونٹے گڑ گئے تھے (یعنی اس کی سلطنت وسیع اور مضبوط تھی) اور ثمود نے اور قوم لوط نے اور اصحاب ایکہ نے (جن کے قصے کئی جگہ آ چکے ہیں، ان سب نے) تکذیب کی تھی (اور) وہ گروہ (جس کا پیچھے من الاحزاب میں ذکر آیا ہے) یہی لوگ ہیں، ان سب نے صرف رسولوں کو جھٹلایا تھا (جیسے یہ کفار قریش آپ کو جھٹلا رہے ہیں) سو میرا عذاب (ان پر) واقع ہو گیا (تو جب جرم میں سب شریک ہیں تو عذاب میں شریک ہونے سے یہ لوگ کیوں مطمئن ہیں؟)۔

إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ ٱلرُّسُلَ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے تکذیب کے علاوہ اور کچھ نہ کیا تھا، بلکہ اس میں اُس زمانہ کے کفار کا یہ وہم دور کرنا چاہتے ہیں کہ شاید ان کی ہلاکت کا سبب کفر نہ ہوا ہو، کوئی دوسری وجہ ہو، پس مطلب یہ ہے کہ ان کی ہلاکت کا اصل سبب کفر اور تکذیب کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، کیونکہ ان کی دوسری ناشائستہ حرکتیں بھی رسولوں کی تکذیب ہی کے سبب پیدا ہوئی تھیں، پس ہلاکت کا بڑا سبب یہی تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بہت زور و قوت اور لاؤلشکر والا جس نے دنیا میں اپنی سلطنت کے کھونٹے گاڑ دیئے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ وہ آدمی کو چومیخا کر کے مارتا تھا اس سے اس کا نام ذوالاوتاد (میخوں والا) پڑ گیا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی حضرت شعیب (علیہ السلام) جس کی طرف مبعوث ہوئے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی یہ بڑی بڑی طاقتور فوجیں اور رسولوں کو جھٹلا کر سزا سے نہ بچ سکیں، تمہاری تو حقیقت کیا ہے۔

وَمَا يَنظُرُ هَٰٓؤُلَآءِ إِلَّا صَيۡحَةٗ وَٰحِدَةٗ مَّا لَهَا مِن فَوَاقٖ ﴿١٥﴾

اور راہ نہیں دیکھتے یہ لوگ مگر ایک چنگھاڑ کی جو بیچ میں دم نہ لے گی

خلاصہ تفسیر: اور یہ لوگ (جو تکذیب پر مصر ہیں تو) بس ایک زور کی چیخ (یعنی نفخہ ثانیہ) کے منتظر ہیں جس میں دم لینے کی گنجائش نہ ہوگی (اس سے مراد قیامت ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو مخالفت اور تکذیب پر جمے ہوئے ہیں تو بس قیامت کے منتظر معلوم ہوتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی صور کی آواز کے منتظر ہیں، پوری سزا اس وقت ملے گی، اور ممکن ہے صیحة سے یہیں کی ایک ڈانٹ مراد ہو۔

وَقَالُواْ رَبَّنَا عَجِّل لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ يَوۡمِ ٱلۡحِسَابِ ﴿١٦﴾

اور کہتے ہیں اے رب جلد دے ہم کو چھٹی ہماری پہلے حساب کے دن سے

خلاصہ تفسیر: اور یہ لوگ (قیامت کی وعید سن کر رسول کو جھٹلانے اور ان سے استہزاء کے طور پر) کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! (آخرت میں جو کافروں کو عذاب ہوگا، اس میں سے) ہمارا حصہ ہم کو روز حساب سے پہلے ہی دے دے (کیونکہ اول تو قیامت کچھ نہیں ہے، اور

اگر ہے تو ہم کو ابھی عذاب مطلوب ہے، جب عذاب نہیں ہوتا تو معلوم ہوا قیامت نہ آئے گی، نعوذ باللہ)۔

* * *

فائدہ: یعنی جب وعدہ قیامت سنتے، مسخرا پن سے کہتے کہ ہم کو تو اس وقت کا حصہ ابھی دے دیجئے، ابھی ہم اپنا اعمالنامہ دیکھ لیں اور ہاتھ کے ہاتھ سزا جزاء سے فارغ ہو جائیں۔

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾

تو تحمل کرتا (سہتا) رہ اس پر جو وہ کہتے ہیں اور یاد کر ہمارے بندے داؤد قوت والے کو، وہ تھا رجوع رہنے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی مخالفت اور ان کے بعض کفریہ اقوال کا ذکر تھا، چونکہ ان باتوں سے حضور ﷺ کو غم ہوتا تھا اس لیے اب آگے آپ کو صبر کا حکم ہے اور تسلی کے لیے بعض انبیاء کے قصے مذکور ہیں کہ وہ بھی صابر تھے اور تسلی کے علاوہ ان قصوں میں نبوت کی بھی تائید ہے۔

آپ ان لوگوں کے اقوال پر صبر کیجئے اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کیجئے جو (عبادت میں جس میں صبر بھی داخل ہے) بڑی قوت (اور ہمت) والے تھے (اور) وہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہونے والے تھے۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اس جگہ ان کو (داؤد کا قصہ) یاد دلوایا کہ انہوں نے بھی طالوت کے (عہد) حکومت میں بہت صبر کیا، آخر حکومت ان کو ملی اور (جالوت وغیرہ) مخالفوں کو جہاد سے زیر کیا، یہ ہی نقشہ ہوا ہمارے پیغمبر کا''۔

تنبیہ: ① ذالاید کا ترجمہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ''ہاتھ کے بل والا'' کیا ہے، یعنی قوت سلطنت۔

② یا ادھر اشارہ ہو کہ ان کے ہاتھ میں لوہا نرم ہو جاتا تھا۔

③ یا ''ہاتھ کا بل'' یہ کہ سلطنت کا مال نہ کھاتے اپنے دست و بازو سے کسب کر کے کھاتے۔

اور اوّاب یعنی ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع رہتے تھے۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾

ہم نے تابع کئے پہاڑ اس کے ساتھ پاکی بولتے تھے شام کو اور صبح کو۔ اور اڑتے جانور جمع ہو کر سب تھی اس کے آگے رجوع رہتے۔

خلاصہ تفسیر: (اور ہم نے ان کو یہ نعمتیں عطا فرمائی تھیں: ایک یہ کہ) ہم نے پہاڑوں کو حکم کر رکھا تھا کہ ان کے ساتھ (شریک ہو کر) شام اور صبح (کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیح کے یہی اوقات تھے) تسبیح کیا کریں اور (اسی طرح) پرندوں کو بھی (یہی حکم دے رکھا تھا) جو کہ (تسبیح کے وقت ان کے پاس) جمع ہو جاتے تھے (اور یہ پہاڑ اور پرندے وغیرہ) سب ان کی (تسبیح کی) وجہ سے مشغول ذکر رہتے۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ: پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کے متعلق تحقیق سورہ سبا آیت ۱۰ میں گذر چکی وہاں ملاحظہ کریں، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کو باری تعالیٰ نے یہاں اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام پر ایک خاص انعام تھا، سوال یہ ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام، کے لئے نعمت کیسے ہوئی؟ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سے کیا خاص فائدہ پہنچا؟

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک معجزہ ظاہر ہوا، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا انعام ہے، اس کے علاوہ ایک لطیف توجیہ یہ بھی ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سے ذکر و شغل کا ایک خاص کیف پیدا ہو گیا تھا جس سے عبادت میں نشاط اور تازگی و ہمت پیدا ہوتی ہے، اجتماعی ذکر کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ذکر کی برکتوں کا ایک دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے، صوفیائے کرام کے یہاں ذکر و شغل کا ایک خاص طریقہ معروف ہے جس میں ذکر کرتے ہوئے یہ تصور کیا جاتا ہے کہ پوری کائنات ذکر کر رہی ہے، اصلاح باطن اور شوق عبادت میں اس طریقہ کی عجیب تاثیر

ہے، اس آیت سے اس طریقہ ذکر کی بنیاد بھی مستنبط ہوتی ہے۔

فائدہ: ۱؎ یعنی صبح وشام جب حضرت داؤد تسبیح پڑھتے، پہاڑ بھی ان کے ساتھ تسبیح کرتے تھے، اس کے متعلق کچھ مضمون سورہ سبا میں گزر چکا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔

فائدہ: ۲؎ یا سب اس کے ساتھ مل کر اللہ کی طرف رجوع رہتے، کما قال بعض المفسرین۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾

اور قوت دی ہم نے اس کی سلطنت کو۱؎ اور دی اس کو تدبیر اور فیصلہ کرنا بات کا۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (دوسری نعمت یہ کہ) ہم نے ان کی سلطنت کو نہایت قوت دی تھی، اور (تیسری نعمت یہ کہ) ہم نے ان کو حکمت (یعنی نبوت) اور فیصلہ کر دینے والی تقریر (جو نہایت واضح اور جامع ہو) عطا فرمائی تھی۔

باوجود اتنی بڑی سلطنت کے جو کہ اکثر احوال میں آدمی کو نازک مزاج اور بے فکر کر دیتی ہے وہ نبوت کی برکت سے نہایت ضابط اور صابر تھے، چنانچہ ان کے حالات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

فائدہ: ۱؎ یعنی دنیا میں اس کی سلطنت کی دھاک بٹھلا دی تھی اور اپنی اعانت ونصرت سے مختلف قسم کی کثیر التعداد فوجیں دے کر خوب اقتدار جما دیا تھا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بڑے مدبر و دانا تھے، ہر بات کا فیصلہ بڑی خوبی سے کرتے اور بولتے تو نہایت فیصلہ کن تقریر ہوتی تھی، بہر حال حق تعالیٰ نے ان کو نبوت، حسن تدبیر، قوت فیصلہ اور طرح طرح کے علمی و عملی کمالات عطا فرمائے تھے، لیکن امتحان وابتلاء سے وہ بھی نہیں بچے، جس کا قصہ آگے بیان کرتے ہیں:

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ (وقف لازم)

اور پہنچی ہے تجھ کو خبر دعوے والوں کی جب دیوار کود کر آئے عبادت خانہ میں، جب گھس آئے داؤد کے پاس تو ان سے گھبرایا۱؎

قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ

وہ بولے مت گھبرا، ہم دو جھگڑتے ہیں (جھگڑنے والے) زیادتی کی ہے ایک نے دوسرے پر سو فیصلہ کر دے ہم میں انصاف کا اور دور نہ ڈال بات کو

وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾

اور بتلا دے ہم کو سیدھی راہ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (ان کے صبر کرنے والے واقعات میں سے) بھلا آپ کو ان اہل مقدمہ کی خبر بھی پہنچی ہے (جو داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ لائے تھے) جبکہ وہ لوگ (داؤد علیہ السلام کے) عبادت خانہ کی دیوار پھاند کر داؤد (علیہ السلام) کے پاس آئے (کیونکہ دروازے سے پہرہ داروں نے اس لئے نہیں آنے دیا کہ وہ وقت خاص آپ کی عبادت کا تھا، مقدمات کے فیصلے کا نہیں) تو وہ (ان کے اس بے قاعدہ آنے سے) گھبرا گئے (کہ کہیں یہ لوگ دشمن نہ ہوں جو قتل کے ارادے سے اس طرح تنہائی میں آ گھسے ہوں) وہ لوگ (داؤد سے) کہنے لگے کہ آپ ڈریں نہیں، ہم دو اہل

معاملہ ہیں کہ ایک نے دوسرے پر (کچھ) زیادتی کی ہے (اس کے فیصلے کے لئے ہم آئے ہیں، چونکہ پہرہ داروں نے دروازہ سے نہیں آنے دیا، اس لئے اس طرح بے قاعدہ آنے پر مجبور ہوئے) سو آپ ہم میں انصاف سے فیصلہ کر دیجئے، اور بے انصافی نہ کیجئے، اور ہم کو (معاملہ کی) سیدھی راہ بتلا دیجئے۔

فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوا لَا تَخَفْ: یعنی حضرت داؤدان سے گھبرا گئے، گھبرانے کی وجہ صاف ظاہر تھی کہ دو آدمیوں کا بے وقت پہرہ توڑ کر اس طرح گھس آنا عموماً کسی بری نیت ہی سے ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی خوفناک چیز سے طبعی طور پر گھبرا جانا نبوت اور ولایت کے منافی نہیں ہے، ہاں اس خوف کو دل ودماغ پر طاری کر کے اپنے فرائض کو چھوڑ دینا ضرور برا ہے، اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم میں انبیاء کی شان یہ بیان کی گئی ہے: لا یخشون احداً الا اللہ کہ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، پھر یہاں حضرت داؤد علیہ السلام کو خوف کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ڈرنے کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک ڈر تو موذی اشیاء کے تکلیف پہنچانے سے ہوتا ہے، اسے عربی میں ''خوف'' کہتے ہیں، دوسرا ڈر کسی بڑے کی عظمت، جلالت شان اور رعب کی وجہ سے ہوتا ہے اسے ''خشیت'' کہا جاتا ہے، خشیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہونی چاہئے، اور انبیاء علیہم السلام کی شان یہی ہوتی ہے کہ اللہ کے سوا اُن پر کسی کی خشیت طاری نہیں ہوتی، ہاں! خوف طبعی موذی اشیاء سے ہوسکتا ہے۔

وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ: آنے والے کا یہ انداز خطاب بظاہر بڑا گستاخانہ تھا، اول تو دیوار پھاند کر بے وقت آنا، پھر آ کر حضرت داؤد علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو انصاف کرنے اور ظلم سے بچنے کا درس دینا، اس پر الھڑ پن کی باتیں تھیں، لیکن حضرت داؤد علیہ السلام نے ان سب باتوں پر صبر فرمایا اور انہیں کچھ برا بھلا نہیں کہا، اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو اللہ نے کوئی بڑا مرتبہ دیا ہو، اور لوگوں کی ضروریات اس سے متعلق ہوں اسے چاہئے کہ وہ اہل حاجت کی بے قاعدگیوں اور گفتگو کی غلطیوں پر حتی الوسع صبر کرے کہ یہی اس کے مرتبہ کا تقاضا ہے، خاص طور سے حاکم، قاضی اور مفتی کو اس کا لحاظ رکھنا چاہئے، دوسری بات یہ بھی کہ اس انداز تخاطب میں اس شخص کے لیے عبرت ہے جسے اپنے تقدس پر ناز ہو کہ جب نبی معصوم سے یہ کہا جاتا ہے کہ حد سے تجاوز نہ کیجئے تو غیر معصوم یعنی عام لوگوں کو اپنے نفس پر یہ اعتماد کرنا کہ مجھ میں حد سے تجاوز ہونے کا احتمال نہیں کسی طرح بھی درست نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت داؤد علیہ السلام نے تین دن کی باری رکھی تھی: ① ایک دن دربار اور فصل خصومات کا ② ایک دن اپنے اہل وعیال کے پاس رہنے کا ③ ایک دن خالص اللہ کی عبادت کا، اس دن خلوت میں رہتے تھے دربان کسی کو آنے نہ دیتے۔

ایک دن عبادت میں مشغول تھے کہ ناگاہ کئی شخص دیوار پھاند کر ان کے پاس آ کھڑے ہوئے، داؤد (علیہ السلام) باوجود اپنی قوت وشوکت کے یہ ناگہانی ماجرا دیکھ کر گھبرا اُٹھے کہ یہ آدمی ہیں یا کوئی اور مخلوق ہے؟! آدمی ہیں تو ناوقت آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ دربانوں نے کیوں نہیں روکا؟ اگر دروازے سے نہیں آئے تو اتنی اونچی دیواروں کو پھاندنے کی کیا سبیل کی ہوگی؟ خدا جانے ایسے غیر معمولی طور پر کس نیت اور کس غرض سے آئے ہیں؟! غرض اچانک یہ عجیب ومہیب واقعہ دیکھ کر خیال دوسری طرف بٹ گیا اور عبادت میں جیسی یکسوئی کے ساتھ مشغول تھے، قائم نہ رہ سکی۔

فائدہ: ۲ آنے والوں نے کہا کہ آپ گھبرائیے نہیں اور ہم سے خوف نہ کھائیے، ہم دو فریق اپنے ایک جھگڑے کا فیصلہ کرانے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، آپ ہم میں منصفانہ فیصلہ کر دیجئے، کوئی بے راہی اور ٹالنے کی بات نہ ہو، ہم عدل وانصاف کی سیدھی راہ معلوم کرنے کے لیے آئے ہیں (شاید گفتگو کا یہ عنوان دیکھ کر حضرت داؤد زیادہ متعجب ہوئے ہوں)۔

إِنَّ هٰذَآ أَخِيْ قف لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ قف فَقَالَ أَكْفِلْنِيْهَا

یہ جو ہے بھائی ہے میرا، اِس کے یہاں ہیں ننانوے دنبیاں اور میرے یہاں ایک دنبی، پھر کہتا ہے حوالہ کر دے میرے وہ بھی

وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾

اور زبردستی کرتا ہے مجھ سے بات میں

خلاصہ تفسیر: (اور پھر ایک شخص بولا کہ مقدمہ کی صورت یہ ہے کہ) یہ شخص میرا بھائی ہے (یعنی دینی بھائی جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ سے منقول ہے اور) اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس (کل) ایک دنبی ہے، سو یہ کہتا ہے کہ وہ بھی مجھ کو دے ڈال اور بات چیت میں مجھ کو دباتا ہے (اور میری بات کو منہ زوری سے چلنے نہیں دیتا)۔

اِنَّ هٰذَآ اَخِیْ: بھائی ہے دین کے اعتبار سے یا میل جول کے اعتبار سے۔

* * *

فائدہ: یعنی جھگڑا یہ ہے کہ میرے اس بھائی کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے ہاں صرف ایک دنبی ہے، یہ چاہتا ہے کہ وہ ایک بھی کسی طرح مجھ سے چھین کر اپنی سو پوری کرلے، اور مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جیسے مال میں یہ مجھ سے زیادہ ہے، بات کرنے میں بھی مجھ سے تیز ہے، جب بولتا ہے تو مجھ کو دبا لیتا ہے اور لوگ بھی اسی کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں، غرض میرا حق چھیننے کے لیے زبردستی کی باتیں کرتا ہے۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ

بولا وہ بے انصافی کرتا ہے تجھ پر کہ مانگتا ہے تیری دنبی ملانے کو اپنی دنبیوں میں ۱؎ اور اکثر شریک زیادتی کرتے ہیں ایک

عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ

دوسرے پر مگر جو یقین لائے ہیں اور کام کئے نیک اور تھوڑے لوگ ہیں ایسے ۲؎ اور خیال میں آیا داؤد کے کہ ہم نے اس کو جانچا

السجدة ١٠

فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴿٢٤﴾

پھر گناہ بخشوانے لگا اپنے رب سے اور گر پڑا جھک کر اور رجوع ہوا

خلاصہ تفسیر: داؤد (علیہ السلام) نے کہا کہ یہ جو تیری دنبی اپنی دنبیوں میں ملانے کی درخواست کرتا ہے تو واقعی تجھ پر ظلم کرتا ہے اور اکثر شرکاء (کی عادت ہے کہ) ایک دوسرے پر (یوں ہی) زیادتی کیا کرتے ہیں، مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں، اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں (یہ بات آپ نے مظلوم کی تسلی کے لئے ارشاد فرمائی) اور داؤد (علیہ السلام) کو خیال آیا کہ (اس مقدمہ کو اس طرح پیش کرکے) ہم نے ان کا امتحان کیا ہے (کہ دیکھیں یہ کیسے صابر و متحمل ہیں، شرعی طور پر مقدمہ ثابت ہوجانے کے بعد داؤد علیہ السلام بجائے اس کے کہ صرف ظالم سے فرماتے کہ تو نے ظلم کیا، آپ نے مظلوم سے خطاب فرمایا کہ تجھ پر ظلم کیا گیا، جس میں ایک گونہ طرف داری کا وہم ہوتا ہے) سو (داؤد علیہ السلام انتہائی تقوی کی وجہ سے اتنی بات کو بھی صبر و تحمل اور کمال عدل و انصاف کے خلاف سمجھے) انہوں نے (اس سے بھی) اپنے رب کے سامنے توبہ کی اور سجدہ میں گر پڑے اور (خاص طور پر خدا کی طرف) رجوع ہوئے۔

وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ: یہاں لفظ الخلطاء سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں باہم شرکت ہوگی اور جو قصہ یہاں مذکور ہے ممکن ہے کہ ان دونوں میں یہ قصہ واقع ہوا ہو، یا نہ ہوا ہو ویسے ہی بات بنائی ہو، یا فرشتے ہوں جو کہ امتحان کے لیے بھیجے گئے ہوں اور فرضی طور پر انہوں نے یہ سوال کیا ہو اور یہ جھوٹ نہیں ہے۔

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ: کیونکہ ایسے بڑی جلیل القدر بادشاہ کے خاص خلوت خانہ میں کسی کا بے اجازت آگھسنا، پھر اس بے ڈھنگے پن سے آنا، پھر بات چیت اس طرز سے کرنا کہ اول تو یہ کہا کہ ڈرو مت، جس سے متکلم کا بڑا اور مخاطب کا چھوٹا ہونا مترشح ہوتا ہے، پھر یہ کہا کہ انصاف سے فیصلہ کرنا، بے انصافی نہ کرنا، جس سے وہم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ آپ سے بے انصافی ہونے کا بھی احتمال ہے، غرض ان کے اقوال و افعال میں نہایت درجہ

گستاخی تھی تو اس میں داود علیہ السلام کے صبر وتحمل کا امتحان ہوگیا کہ آیا سلطنت کے زور میں ان گستاخیوں پر دارو گیر کرتے ہیں اور اس مقدمہ کو ملتوی کر کے ان پر دوسرا مقدمہ حاکم کی توہین کا قائم کرتے ہیں، یا نور نبوت کے غلبہ سے ان کو معاف کرتے ہیں اور اس مقدمہ کو پورے انصاف سے غصہ کے شائبہ کے بغیر فیصلہ کرتے ہیں، چنانچہ وہ امتحان میں صابر و متحمل ثابت ہوئے کہ مقدمہ کو نہایت ٹھنڈے دل سے سنا اور فیصلہ فرمایا، لیکن انبیاء کی شان انصاف جس اعلیٰ درجہ پر ہوتی ہے اس کے اعتبار سے بظاہر ایک خفیف سی بات یہ پیش آگئی کہ شرعی طور پر مقدمہ ثابت ہوجانے کے بعد بجائے اس کے کہ صرف ظالم سے فرماتے کہ تو نے ظلم کیا، آپ نے مظلوم سے خطاب فرمایا کہ تجھ پر ظلم کیا گیا، جس میں ایک گونہ طرف داری کا وہم ہوتا ہے، اور اگرچہ مظلوم ہونے کی حیثیت سے یہ طرف داری بھی عبادت ہے، خاص کر مقدمہ ختم ہونے کے بعد، لیکن چونکہ وہ مظلوم مقدمہ کا فریق تھا اور فیصلہ کی مجلس ابھی تک بدلی نہیں تھی، اس لحاظ سے یہ وہمی طرف داری بھی اگر نہ ہوتی تو بہت ہی زیادہ انصاف اور کامل عدل ہوتا۔

ان آیتوں میں باری تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ ذکر فرمایا ہے، قرآن کریم میں یہ واقعہ جس انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت گاہ میں دو فریقوں کو جھگڑتے ہوئے بھیج کر ان کا کوئی امتحان کیا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام نے اس امتحان پر متنبہ ہو کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا اور سجدے میں گر پڑے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مغفرت فرمادی، قرآن کریم کا اصل مقصد چونکہ یہاں یہ بیان کرنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرماتے تھے، اور کبھی ذرا سی لغزش بھی ہوجائے تو فوراً استغفار کی طرف متوجہ ہوتے تھے، اس لئے یہاں یہ تفصیل بیان نہیں کی گئی کہ وہ امتحان کیا تھا؟ حضرت داؤد علیہ السلام سے وہ کونسی لغزش ہوئی تھی جس سے انہوں نے استغفار کیا؟ اور جسے اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا، اسی لئے بعض محقق اور محتاط مفسرین نے ان آیات کی تشریح میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص حکمت و مصلحت سے اپنے جلیل القدر پیغمبر کی اس لغزش اور امتحان کی تفصیل کو کھول کر بیان نہیں فرمایا، اس لئے ہمیں بھی اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے، اور جتنی بات قرآن کریم میں مذکور ہے، صرف اسی بات پر ایمان رکھنا چاہئے، حافظ ابن کثیر جیسے محقق مفسر نے اپنی تفسیر میں اسی پر عمل کرتے ہوئے واقعہ کی تفصیلات سے خاموشی اختیار کی ہے، اور کوئی شک نہیں کہ یہ سب سے زیادہ محتاط اور سلامتی کا راستہ ہے، اسی لئے علماء سلف سے منقول ہے کہ "أبهموا ما أبهمه الله"، یعنی جس چیز کو اللہ نے مبہم چھوڑا ہے تم بھی اس کو مبہم رہنے دو، اسی میں حکمت و مصلحت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس سے مراد ایسے معاملات کا ابہام ہے جن سے ہمارے عمل اور حلال و حرام کا تعلق نہ ہو اور جن معاملات سے مسلمانوں کے عمل کا تعلق ہو اس ابہام کو خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و عمل سے رفع کر دیا ہے۔

البتہ کچھ مفسرین نے فَتَنّٰهُ کی تفسیر میں روایات و آثار کی روشنی میں اس امتحان اور آزمائش کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلہ میں ایک عامیانہ روایت یا من گھڑت قصہ اوریا کا ذکر کیا جاتا ہے، لیکن یہ روایت بلاشبہ ان خرافات میں سے ہے جو یہودیوں کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی پھیل گئی تھیں، یہ روایت دراصل بائبل کی کتاب سموئیل دوم باب نمبر ۱۱ سے ماخوذ ہے، حالانکہ یہ کتاب سموئیل ہی سرے سے بے اصل ہے اور یہ روایت قطعی کذب و افتراء کی حیثیت رکھتی ہے، اسی وجہ سے تمام محقق مفسرین نے اس کی سخت تردید کی ہے، جمہور مفسرین نے بھی اسے کذب و افتراء قرار دیا ہے چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: "بعض مفسرین نے یہاں ایک قصہ ذکر کیا ہے جس کا اکثر حصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے آنحضرت ﷺ سے اس بارے میں کوئی ایسی بات ثابت نہیں جس کا اتباع واجب ہو، صرف ابن ابی حاتم نے یہاں ایک حدیث روایت کی ہے، مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے"۔

اس آزمائش اور لغزش کی تشریح اوپر گذر گئی کہ مقدمہ کے یہ دو فریق دیوار پھاند کر داخل ہوئے، اور طرز مخاطبت بھی انتہائی گستاخانہ اختیار کیا کہ شروع ہی میں حضرت داؤد علیہ السلام کو انصاف کرنے اور ظلم نہ کرنے کی نصیحتیں شروع کر دیں، اس انداز کی گستاخی کی بنا پر کوئی عام آدمی ہوتا تو انہیں جواب دینے کے بجائے الٹی سزا دیتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ امتحان فرمایا کہ وہ بھی غصہ میں آکر انہیں سزا دیتے ہیں یا پیغمبرانہ عفو و تحمل سے کام لے کر ان کی بات سنتے ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام اس امتحان میں پورا اترے، لیکن اتنی سی فروگذاشت ہوگئی کہ فیصلہ سناتے وقت ظالم کو خطاب کرنے کے بجائے مظلوم کو مخاطب فرمایا، جس سے ایک گونہ جانبداری مترشح ہوتی تھی مگر اس پر فوراً متنبہ ہوا اور سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں

معاف فرما دیا، بعض مفسرین نے لغزش کی یہ تشریح کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعا علیہ کو خاموش دیکھا تو اس کا بیان سنے بغیر صرف مدعی کی بات سن کر اپنی نصیحت میں ایسی باتیں فرمائیں جن سے فی الجملہ مدعی کی تائید ہوتی تھی، حالانکہ پہلے مدعا علیہ سے پوچھنا چاہئے تھا کہ اس کا موقف کیا ہے؟ حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ ارشاد اگرچہ صرف ناصحانہ انداز میں تھا اور ابھی تک مقدمہ کے فیصلے کی نوبت نہیں آئی تھی، تاہم ان جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان نہیں تھا، اسی بات پر آپ بعد میں متنبہ ہو کر سجدہ ریز ہوئے، بندہ نے جو تفسیر کی ہے اس کی بنیاد خود نص قرآنی ہے اور چند آیات قبل: اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ کے ساتھ اس قصہ کو یاد دلانا اس پر قرینہ ہے۔

اس واقعہ سے متعلق ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش خواہ کچھ رہی ہو، اللہ تعالیٰ براہ راست وحی کے ذریعہ بھی آپ کو اس پر متنبہ فرما سکتے تھے، لیکن اس کے بجائے ایک مقدمہ میں بھیج کر تنبیہ کے لئے یہ خاص طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟ درحقیقت اس طریقہ پر غور کرنے سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ کسی شخص کو اس کی غلطی پر تنبیہ کیلئے حکمت سے کام لینے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا زیادہ اچھا ہے جس سے متعلقہ شخص خود بخود اپنی غلطی کو محسوس کرلے اور اسے زبانی تنبیہ کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اور اس کے لئے ایسی تمثیلات سے کام لینا زیادہ موثر ہوتا ہے جس سے کسی کی دل آزاری بھی نہ ہو اور ضرورت بات بھی واضح ہوجائے۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت داؤد نے بقاعدہ شریعت ثبوت وغیرہ طلب کیا ہوگا، آخر میں یہ فرمایا کے بیشک (اگر یہ تیرا بھائی ایسا کرتا ہے تو) اس کی زیادتی اور ناانصافی ہے، چاہتا ہے کہ اس طرح اپنے غریب بھائی کا مال ہڑپ کر جائے (مطلب یہ کہ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے)۔

فائدہ: ۲ یعنی شرکاء کی عادت ہے ایک دوسرے پر ظلم کرنے کی، قوی حصہ دار چاہتا ہے کہ ضعیف کو کھا جائے، صرف اللہ کے ایماندار اور نیک بندے اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر وہ دنیا میں بہت ہی تھوڑے ہیں۔

فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

پھر ہم نے معاف کر دیا اس کو وہ کام ۱ اور اس کے لیے ہمارے پاس مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا ۲

خلاصہ تفسیر: سو ہم نے ان کو وہ (امر) معاف کر دیا (اور اس سے کامل ثواب میں جو کمی ہوتی نہ ہوئی) اور (ایسی خفیف بات پر توبہ اور سجدہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ) ہمارے یہاں ان کے لئے (خاص) قرب اور (اعلیٰ درجہ کی) نیک انجامی (یعنی جنت کا اونچا درجہ) ہے (اور مقربین کی یہی شان ہوتی ہے کہ تل برابر بات کو بھی اپنے لیے پہاڑ سمجھتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس قصہ کے بعد داؤد کو تنبہ ہوا کہ میرے حق میں یہ ایک فتنہ اور امتحان تھا، اس خیال کے آتے ہی اپنی خطا معاف کرانے کے لیے نہایت عاجزی کے ساتھ خدا کے سامنے جھک پڑے، آخر خدا نے ان کی وہ خطا معاف کر دی۔

داؤد علیہ السلام کی وہ خطا کیا تھی؟ جس کی طرف ان آیات میں اشارہ ہے، اس کے متعلق مفسرین نے بہت سے لمبے چوڑے قصے بیان کیے ہیں، مگر حافظ عماد الدین ابن کثیر ان کی نسبت لکھتے ہیں: "قد ذکر المفسرون ههنا قصة اکثرها ماخوذ من الاسرائیلیات ولم یثبت فیها عن المعصوم حدیث یجب اتباعه"، اور حافظ ابو محمد ابن حزم نے "کتاب الفصل" میں بہت شدت سے ان قصوں کی تردید کی ہے، باقی ابو حیان وغیرہ نے ان قصوں سے علیحدہ ہو کر آیات کا جو مجمل بیان کیا ہے، وہ بھی تکلف سے خالی نہیں۔

ہمارے نزدیک اصل بات وہ ہے جو ابن عباس سے منقول ہے۔ یعنی داؤد علیہ السلام کو یہ ابتلاء ایک طرح کے اعجاب کی بناء پر پیش آیا، صورت یہ ہوئی کہ داؤد علیہ السلام نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ اے پروردگار! رات اور دن میں کوئی ساعت ایسی نہیں، جس میں داؤد کے گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد تیری عبادت (یعنی نماز یا تسبیح و تکبیر) میں مشغول نہ رہتا ہو (یہ اس لیے کہا کہ انہوں نے روز و شب کے چوبیس گھنٹے اپنے گھر والوں پر

نوبت بہ نوبت تقسیم کررکھے تھے، تاکہ ان کا عبادت خانہ کسی وقت عبادت سے خالی نہ رہنے پائے) اور بھی کچھ اس قسم کی چیزیں عرض کیں (شاید اپنے حسن انتظام وغیرہ کے متعلق ہوں گی)، اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہوئی، ارشاد ہوا کہ داؤد! یہ سب کچھ ہماری توفیق سے ہے، اگر میری مدد نہ ہو تو تو اس چیز پر قدرت نہیں پاسکتا (ہزار کوشش کرے، نہیں نباہ سکے گا)، قسم ہے اپنے جلال کی میں تجھ کو ایک روز تیرے نفس کے سپرد کردوں گا (یعنی اپنی مدد ہٹالوں گا، دیکھیں اس وقت تو کہاں تک اپنی عبادت میں مشغول رہ سکتا اور اپنا نظام قائم رکھ سکتا ہے)، داؤد علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار! مجھے اس دن کی خبر کردیجئے، بس اسی دن فتنہ میں مبتلا ہوگئے (اخرج هذالاثر الحاكم فی المستدرك وقال صحيح الاسناد و اقر به الذهبی فی التلخيص) یہ روایت بتلاتی ہے کہ فتنہ کی نوعیت صرف اسی قدر ہونی چاہیے کہ جس وقت داؤد عبادت میں مشتغل ہوں، باوجود پوری کوشش کے مشتغل نہ رہ سکیں اور اپنا انتظام قائم نہ رکھ سکیں، چنانچہ آپ پڑھ چکے کہ کس بے قاعدہ اور غیر معمولی طریقہ سے چند اشخاص نے اچانک عبادت خانہ میں داخل ہوکر حضرت داؤد کو گھبرادیا اور ان کے شغل خاص سے ہٹا کر اپنے جھگڑے کی طرف متوجہ کرلیا، بڑے بڑے پہرے اور انتظامات ان کو داؤد کے پاس پہنچنے سے نہ روک سکے، تب داؤد کو خیال ہوا کہ اللہ نے میرے اس دعوے کی وجہ سے اس فتنہ میں مبتلا کیا۔

لفظ فتنہ کا اطلاق اس جگہ تقریباً ایسا سمجھو جیسے ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت حسنؓ و حسینؓ بچپن میں قمیص پہن کر لڑکھڑاتے ہوئے آرہے تھے، حضور ﷺ نے منبر پر سے دیکھا اور خطبہ قطع کرکے ان کو اوپر اٹھالیا اور فرمایا: "صدق الله : ﴿انما اموالكم واولادكم فتنة﴾ ۔

بعض آثار میں ہے کہ بندہ اگر کوئی نیکی کرکے کہتا ہے کہ: "اے پروردگار! میں نے یہ کام کیا، میں نے صدقہ کیا، میں نے نماز پڑھی، میں نے کھانا کھلایا"۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور میں نے تیری مدد کی اور میں نے تجھ کو توفیق دی"۔ اور جب بندہ کہتا ہے کہ: "اے پروردگار! تونے مدد کی، تونے مجھ کو توفیق بخشی اور تونے مجھ پر احسان فرمایا"۔ تو اللہ کہتا ہے: "اور تونے عمل کیا، تونے ارادہ کیا، تونے یہ نیکی کمائی"۔ (مدارج السالکین، ج ۱ ص ۹۹)۔

اسی سے سمجھ لو کہ حضرت داؤد علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کا اپنے حسن انتظام کو جتلاتے ہوئے یہ فرمانا کہ اے پروردگار! رات دن میں کوئی گھڑی ایسی نہیں جس میں میں یا میرے متعلقین تیری عبادت میں مشتغل نہ رہتے ہوں، کیسے پسند آسکتا تھا؟! بڑوں کی چھوٹی چھوٹی بات پر گرفت ہوتی ہے، اسی لیے ایک آزمائش میں مبتلا کردیے گئے، تاکہ متنبہ ہوکر اپنی غلطی کا تدارک کریں، چنانچہ تدارک کیا اور خوب کیا، میرے نزدیک آیت کی بے تکلف تقریر یہی ہے، باقی حضرت شاہ صاحبؒ نے اسی مشہور قصہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ "موضح القرآن" میں دیکھ لیا جائے۔

فائدہ: ۲ یعنی بدستور مقرب بارگاہ ہیں، اس غلطی سے تقرب اور مرتبہ میں فرق نہیں آیا، صرف تھوڑی سی تنبیہ کردی گئی، کیونکہ مقربین کی چھوٹی غلطی بھی بڑی سمجھی جاتی ہے: "حسنات الابرار سيئات المقربين".

گرچہ یک مو بد گنہ کو جستہ بود — لیک آں مو در دو دیدہ رستہ بود

بود آدم دیدہ نور قدیم — موئے در دیدہ بود کوہ عظیم

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى

اے داؤد ہم نے تجھ کو نائب ملک میں سو تو حکومت کر لوگوں میں انصاف سے اور نہ چل جی کی خواہش پر

فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ

پھر وہ تجھ کو بچلا دے اللہ کی راہ سے، مقرر جو لوگ بچلتے ہیں اللہ کی راہ سے ان کے لیے سخت عذاب ہے ۱

بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾ ع

اس بات پر کہ بھلا دیا انہوں نے دن حساب کا ۲

خلاصہ تفسیر: جب داود علیہ السلام اس امتحان میں پورے اترے تو ہم نے ان کا دل بڑھانے کو خاص طور پر خطاب فرمایا کہ:

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے، سو (جس طرح اب تک کرتے رہے ہو، اسی طرح آئندہ بھی) لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور (جس طرح اب تک کبھی نفسانی خواہش کی پیروی نہیں کی، اسی طرح آئندہ بھی) نفسانی خواہش کی پیروی مت کرنا کہ (اگر ایسا کرو گے تو) وہ خدا کے رستہ سے تم کو بھٹکا دے گی (اور) جو لوگ خدا کے رستہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہوگا اس وجہ سے کہ وہ روز حساب کو بھولے رہے (یہ بات دوسروں کو سنادی جو بھٹک رہے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی خدا نے تم کو زمین میں اپنا نائب بنالیا، لہذا اسی کے حکم پر چلو اور معاملات کے فیصلے عدل و انصاف کے ساتھ شریعت الٰہی کے موافق کرتے رہو، کبھی کسی معاملہ میں خواہش نفس کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ آنے پائے، کیونکہ یہ چیز آدمی کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دینے والی ہے اور جب انسان اللہ کی راہ سے بہکا تو پھر ٹھکانا کہاں۔

فائدہ: ۲ یعنی عموماً خواہشات نفسانی کی پیروی اسی لیے ہوتی ہے کہ آدمی کو حساب کا دن یاد نہیں رہتا، اگر یہ بات مستحضر رہے کہ ایک روز اللہ کے سامنے جانا اور ذرہ ذرہ عمل کا حساب دینا ہے تو آدمی کبھی اللہ کی مرضی پر اپنی خواہش کو مقدم نہ رکھے۔

تنبیہ: ممکن ہے کہ یوم الحساب کا تعلق لھم عذاب شدید کے ساتھ ہو، نسوا کے ساتھ نہ ہو، یعنی اللہ کے احکام بھلا دینے کے سبب سے ان پر سخت عذاب ہوگا حساب کے دن۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ

اور ہم نے نہیں بنایا آسمان اور زمین کو اور جو ان کے بیچ میں ہے نکما، یہ خیال ہے کہ ان کو جو منکر ہیں سو خرابی ہے

لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ ﴿۲۷﴾

منکروں کے لیے آگ سے

خلاصہ تفسیر: یہ آیتیں جن میں اسلام کے بنیادی عقائد، خاص طور سے آخرت کا اثبات کیا گیا ہے، حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے واقعات کے درمیان انتہائی لطیف ترتیب کے ساتھ آئی ہیں، حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ سے پہلے کفار کی ہٹ دھرمیوں کا ذکر چل رہا تھا جو یوم حساب یعنی آخرت کے ذکر پر ختم ہوا، اس کے فوراً بعد حضرت داود علیہ السلام کا قصہ شروع ہوا، ان کے واقعہ کو اس بات پر ختم کیا گیا کہ: "اے داؤد، ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تم لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا"، اب یہاں سے ایک غیر محسوس طریقہ پر آخرت کا اثبات کر دیا گیا کہ جو ذات زمین میں اپنے خلیفہ کو عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دے رہی ہے کیا وہ خود اس کائنات میں عدل و انصاف قائم نہیں کرے گا؟ یقیناً اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اچھے اور برے تمام لوگوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کے بجائے بدکاروں کو سزا دے، اور نیکوکاروں کو انعام عطا فرمائے، یہی اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے اور اس کے روبکار آنے کے لئے قیامت و آخرت کا وجود اس کی حکمت کے عین مطابق ہے، جو لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں وہ گویا زبان حال سے یہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات بے مقصد اور خالی از حکمت پیدا کر دی گئی ہے، اور اس میں اچھے برے تمام لوگ زندگی گزار کر مر جائیں گے اور پھر ان سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر ایمان رکھنے والا اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو چیزیں ان کے درمیان موجود ہیں ان کو خالی از حکمت پیدا نہیں کیا (بلکہ بہت سی حکمتیں ہیں، جن میں سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ ان سے توحید اور آخرت ثابت ہوتی ہے) یہ (یعنی ان کا حکمت سے خالی ہونا) ان لوگوں کا خیال ہے جو کافر ہیں (کیونکہ جب

توحید اور آخرت کی جزا و سزا کا انکار کیا تو کائنات کی تخلیق کی سب سے بڑی حکمت کا انکار کیا) سو کافروں کے لئے (آخرت میں) بڑی خرابی ہے یعنی دوزخ (کیونکہ وہ دلائل قائم ہونے کے باوجود توحید کا انکار کرتے تھے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس کا آگے کچھ نتیجہ نہ نکلے، بلکہ اس دنیا کا نتیجہ ہے آخرت، لہٰذا یہاں رہ کر وہاں کے لیے کچھ کام کرنا چاہیے، اور وہ کام یہ ہی ہے کہ انسان اپنی خواہشات کی پیروی چھوڑ کر حق وعدل کے اصول پر کار بند ہو اور خالق و مخلوق دونوں سے اپنا معاملہ ٹھیک رکھے، یہ نہ سمجھے کہ بس دنیا کی زندگی ہے، کھا پی کر ختم کر دیں گے، آگے حساب کتاب کچھ نہیں، یہ خیالات تو ان کے ہیں جنہیں موت کے بعد دوسری زندگی سے انکار ہے، سو ایسے منکروں کے لیے آگ تیار ہے۔

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ

کیا ہم دیں گے ایمان والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں برابر ان کے جو خرابی ڈالیں ملک میں ، کیا ہم کردیں گے

الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾

ڈرنے والوں کو برابر ڈھیٹ (بے باک) لوگوں کے

خلاصہ تفسیر: ہاں! (ایک غلطی ان کی یہ ہے کہ قیامت کے منکر ہیں، حالانکہ قیامت میں یہ حکمت ہے کہ نیکوں کو جزا اور مفسدوں کو سزا ملے، اب ان کے انکار قیامت سے لازم آتا ہے کہ یہ حکمت واقع نہ ہو بلکہ سب برابر رہیں) تو کیا ہم ان لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے ان کی برابر کر دیں گے جو (کفر وغیرہ کر کے) دنیا میں فساد کرتے پھرتے ہیں یا (بالفاظ دیگر کیا) ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں گے (یعنی ایسا نہیں ہوسکتا، لہٰذا قیامت ضرور آئے گی تاکہ نیکوں کو جزا اور بدکاروں کو سزا ملے)۔

اس آیت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جزا و سزا کا ہونا عقلی طور پر واجب ہے، یہ تو معتزلہ کا مذہب ہے، اہل سنت کے نزدیک عقلا خدا تعالیٰ کے ذمہ کچھ واجب نہیں، اور نہایت تعجب ہے کہ صاحب کشاف نے جو اس مقام کی تقریر کر دی تمام پچھلے مفسرین اسی کو نقل کرتے چلے گئے، اور کسی نے معتزلہ کی اس چال پر نظر نہیں کی، الحمدللہ! کہ حق تعالیٰ نے بندہ پر فضل فرمایا اور آیت کی تفسیر اہل سنت کے اصول کے مطابق قلب پر وارد فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ جزا و سزا کا ہونا خود واجب نہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی خبر دینے کے بعد اس کا واقع ہونا واجب ہو گیا۔

اگر اس تقریر پر یہ کہا جائے کہ قیامت کا واقع نہ ہونا تو حکمت کے خلاف ہے اور حکمت کے خلاف ہونا محال ہے تو پھر اس کا واقع ہونا تو عقلا واجب ہو گیا، جواب یہ ہے کہ خود اسی حکمت کا واقع ہونا ہی واجب نہیں، بلکہ جائز ہے، اور اگر قیامت واقع نہ ہوتی تو اس وقت اسی میں حکمت ہوتی، مگر چونکہ اس جائز حکمت کا واقع ہونا قطعی دلیل سے معلوم ہو چکا ہے اب اس کا انکار کرنا کفر ہے، اس آیت میں دوسرا عنوان اختیار کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کہ پہلا عنوان کفار کے نزدیک اس قدر واضح نہ تھا، کیونکہ وہ ایمان کو ایمان ہی نہ سمجھتے تھے، اور اپنے کفر کو فساد ہی نہ جانتے تھے، اور دوسرا عنوان نہایت واضح ہے، کیونکہ بہت سی باتیں عقلا قبیح ہیں جن سے مسلمانوں کا بچنا اور کفار کا ان میں مبتلا ہونا خود کفار بھی سمجھتے اور دیکھتے تھے تو اس مضمون کو وہ بہت آسانی کے ساتھ مان سکتے تھے کہ پرہیزگار اور بدکار برابر نہیں ہو سکتے۔

* * *

فائدہ: یعنی ہمارے عدل وحکمت کا اقتضاء یہ نہیں کہ نیک ایماندار بندوں کو شریروں اور مفسدوں کے برابر کر دیں، یا ڈرنے والوں کے ساتھ بھی وہ ہی معاملہ کرنے لگیں جو ڈھیٹ اور نڈر لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے، اسی لیے ضرور ہوا کہ کوئی وقت حساب وکتاب اور جزاء سزا کا رکھا جائے، لیکن دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے نیک اور ایماندار آدمی قسم قسم کی مصائب و آفات میں مبتلا رہتے ہیں اور کتنے ہی بدمعاش بے حیا مزے چین

اڑاتے ہیں، لامحالہ ماننا پڑے گا کہ موت کے بعد دوسری زندگی کی جوخبر مخبر صادق نے دی ہے عین مقتضائے حکمت ہے، وہاں ہی ہر نیک و بد کو اس کے برے بھلے کام کا بدلہ ملے گا، پھر ''یوم الحساب'' کی خبر کا انکار کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔

کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوۡۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۲۹﴾

ایک کتاب ہے جو اتاری ہم نے تیری طرف برکت کی تاکہ دھیان کریں لوگ اس کی باتیں اور تاکہ سمجھیں عقل والے

خلاصہ تفسیر: اب آگے بتلاتے ہیں کہ جس طرح توحید و قیامت دلیل سے ثابت ہیں اسی طرح رسالت بھی دلیل سے ثابت ہے جس کے لیے بڑا معجزہ قرآن ہے، کیونکہ:

یہ (قرآن) ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں (یعنی ان کے اعجاز کو بھی دیکھیں کہ کوئی شخص ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور ان کے نافع مضامین میں بھی غور کریں جو برکت کا حاصل ہے) اور تاکہ (غور سے اس کی حقیقت معلوم کر کے اس سے) اہل فہم نصیحت حاصل کریں (یعنی اس پر عمل کریں، جس میں رسالت کا اعتقاد بھی آ گیا اور بقیہ احکام بھی آ گئے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جب نیک اور بد کا انجام ایک نہیں ہوسکتا تو ضرور تھا کہ کوئی کتاب ہدایت مآب حق تعالیٰ کی طرف سے آئے، جو لوگوں کو خوب معقول طریقہ سے ان کے انجام پر آگاہ کر دے، چناچہ اس وقت یہ کتاب آئی جس کو قرآن مبین کہتے ہیں، جس کے الفاظ، حروف، نقوش اور معانی و مضامین ہر چیز میں برکت ہے اور جو اسی غرض سے اتاری گئی ہے کہ لوگ اس کی آیات میں غور کریں اور عقل رکھنے والے اس کی نصیحتوں سے منتفع ہوں، چنانچہ اس آیت سے پہلے ہی آیت میں دیکھ لو، کس قدر صاف، فطری اور معقول طریقہ سے مسئلہ معاد کو حل کیا ہے کہ تھوڑی عقل والا بھی غور کرے تو صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔

تنبیہ: شاید تدبر سے قوت علمیہ کی اور تذکر سے قوت عملیہ کی تکمیل کی طرف اشارہ ہو، یہ سب باتیں حضرت داؤد کے تذکرہ کے ذیل میں آ گئی تھی، آگے پھر ان کے قصہ کی تکمیل فرماتے ہیں:

وَوَهَبۡنَا لِدَاوٗدَ سُلَيۡمٰنَ ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿ؕ۳۰﴾

اور دیا ہم نے داؤد کو سلیمان [1] بہت خوب بندہ (ہماری طرف) وہ ہے رجوع رہنے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے کا مضمون قصوں کے درمیان میں آ گیا تھا، اب پھر قصوں کی طرف رجوع ہے۔

(دوسرا قصہ:) اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کو سلیمان (علیہ السلام بیٹا) عطا کیا بہت اچھے بندے تھے کہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہونے والے تھے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی سلیمان بیٹا دیا جو انہی کی طرح نبی اور بادشاہ ہوا۔

اِذۡ عُرِضَ عَلَيۡهِ بِالۡعَشِىِّ الصّٰفِنٰتُ الۡجِيَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّىۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَيۡرِ عَنۡ ذِكۡرِ رَبِّىۡ ۚ

جب دکھانے کو لائے اس کے سامنے شام کو گھوڑے بہت خاصے، تو بولا میں نے دوست رکھا مال کی محبت کو اپنے رب کی یاد سے

حَتّٰى تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوۡهَا عَلَىَّ ؕ فَطَفِقَ مَسۡحًۢا بِالسُّوۡقِ وَالۡاَعۡنَاقِ ﴿۳۳﴾

یہاں تک کہ سورج چھپ گیا اوٹ میں، پھیر لاؤ ان کو میرے پاس، پھر لگا جھاڑنے ان کی پنڈلیاں اور گردنیں [1]

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ ان کا وہ قصہ یادرکھنے کے لائق ہے) جبکہ شام کے وقت ان کے روبرو اصیل (اور) عمدہ گھوڑے (جو جہاد وغیرہ کی غرض سے رکھے جاتے تھے) پیش کئے گئے (اور ان کے ملاحظہ کرنے میں اس قدر دیر ہوگئی کہ دن چھپ گیا اور عبادت کی اقسام میں سے کوئی معمول فوت ہوگیا اور ہیبت وعظمت کی وجہ سے کسی خادم کو جرأت نہ ہوئی کہ آپ کو مطلع ومتنبہ کرے، پھر جب خود ہی تنبہ ہوا) تو کہنے لگے کہ (افسوس) میں اس مال کی محبت کی خاطر (لگ کر) اپنے رب کی یاد سے (یعنی نماز سے) غافل ہوگیا، یہاں تک کہ آفتاب پردہ (مغرب) میں چھپ گیا (پھر خادموں کو حکم دیا کہ) ان گھوڑوں کو ذرا پھر تو میرے سامنے لاؤ (چنانچہ لائے گئے) سوانہوں نے ان (گھوڑوں) کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار سے) ہاتھ صاف کرنا شروع کیا (یعنی ان کو ذبح کرڈالا، ایک قصہ تو ان کا یہ ہوا)۔

اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ: ان آیتوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے، اس واقعہ کی مشہور تفسیر وہی ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں ذکر کی گئی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے معائنہ میں ایسے مشغول ہوئے کہ اس وقت جو نماز پڑھنے کا معمول تھا وہ چھوٹ گیا، بعد میں متنبہ ہوکر آپ نے ان تمام گھوڑوں کو ذبح کرڈالا کہ ان کی وجہ سے یاد الٰہی میں خلل واقع ہوا تھا، یہ نماز نفلی بھی ہو سکتی ہے، اس صورت میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اتنی غفلت کی بھی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فرض نماز ہو اور معائنہ میں لگ کر بھول طاری ہوگئی ہو، بھول جانے کی صورت میں فرض نماز کے قضا ہونے سے گناہ تو نہیں ہوتا، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے بلند منصب کے پیش نظر اس کا بھی تدارک فرمایا۔

لیکن اس پر عموماً یہ شبہ ہوتا ہے کہ گھوڑے اللہ کا عطا کیا ہوا ایک انعام تھا، اور اپنے مال کو اس طرح ضائع کردینا ایک نبی کے شایان شان معلوم نہیں ہوتا، لیکن مفسرین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ گھوڑے حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذاتی ملکیت میں تھے، اور ان کی شریعت میں گائے، بکری، اونٹ کی طرح گھوڑوں کی قربانی بھی جائز تھی، لہٰذا انہوں نے گھوڑوں کو ضائع نہیں کیا، بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے نام پر قربان کردیا، جس طرح گائے، بکری کی قربانی سے ان کو ضائع کرنا لازم نہیں آتا، بلکہ یہ عبادت ہی کا ایک شعبہ ہے، اسی طرح یہاں بھی عبادت ہی کے طور پر ان کی قربانی پیش کی گئی، البتہ مذکورہ وجہ سے ہماری شریعت میں یہ ذبح وقطع جائز نہیں۔

فَطَفِقَ مَسْحًاۢ بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ: اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی یاد سے غفلت ہوجائے تو نفس کو سزا دینے کے لئے اسے کسی فعل مباح سے محروم کردینا جائز ہے اور حضرات صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اسے "غیرت" کہا جاتا ہے۔

ان آیات سے کئی مسئلے اخذ کیے جاتے ہیں: ① راحت وآرام کے لیے عمدہ سامان استعمال کرنا جائز ہے خصوصاً جبکہ اس میں دینی مصلحت بھی ہو ② مستحب عمل سے غفلت ہوجانا بڑوں سے بھی ممکن ہے ③ غفلت کی تلافی کے لیے غافل کردینے والی چیز کو اپنی ملکیت سے نکال کر صدقہ وخیرات کردینا درست ہے اور اس کو اصطلاح میں "غیرت" کہتے ہیں جو کہ عمدہ خصلت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نہایت اصیل، شائستہ اور تیز وسبک رفتار گھوڑے جو جہاد کے لیے پرورش کیے گئے تھے، ان کے سامنے پیش ہوئے، ان کا معائنہ کرتے ہوئے دیر لگ گئی، حتیٰ کہ آفتاب غروب ہوگیا، شاید اس شغل میں عصر کے وقت کا وظیفہ بھی نہ پڑھ سکے ہوں، اس پر کہنے لگے کوئی مضائقہ نہیں، اگر ایک طرف ذکر اللہ (یاد خدا) سے بظاہر علیحدگی رہی تو دوسری جانب جہاد کے گھوڑوں کی محبت اور دیکھ بھال بھی اسی کی یاد سے وابستہ ہے، جب جہاد کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے تو اس کے معدات ومبادی کا تفقد کیسے ذکر اللہ کے تحت میں داخل نہ ہوگا، آخر اللہ تعالیٰ جہاد اور آخرت اور آلات جہاد کے مہیا کرنے کی ترغیب نہ دیتا تو اس مال نیک سے ہم اس قدر محبت کیوں کرتے، اسی جذبہ جہاد کے جوش وافراط میں حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو پھر واپس لاؤ، چنانچہ واپس لائے گئے اور حضرت سلیمان غایت محبت واکرام سے ان کی گردنیں اور پنڈلیاں پونچھنے اور صاف کرنے لگے، آیت کی یہ تقریر بعض مفسرین کی ہے اور لفظ حب الخیر سے اس کی تائید ہوتی ہے، گویا "خیر" کا لفظ اسی مضمون کی طرف اشارہ کررہا ہے جو نبی کریم ﷺ نے حدیث میں

فرمایا:"الخیل معقود فی نواصیھا الخیر الیٰ یوم القیامۃ"۔

لیکن دوسرے علماء نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضرت سلیمان کو گھوڑوں کے معائنہ میں مشغول ہو کر اس وقت کی نماز یا وظیفہ سے ذہول ہو گیا اور ذہول ونسیان انبیاء کے حق میں محال نہیں (فرمایا کہ دیکھو!) مال کی محبت نے مجھ کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیا حتیٰ کہ غروب آفتاب تک میں اپنا وظیفہ ادا نہ کر سکا، یا مانا کہ اس مال کی محبت میں بھی ایک پہلو عبادت کا اور خدا کی یاد کا تھا، مگر خواص ومقربین کو یہ فکر بھی رہتی ہے کہ جس عبادت کا جو وقت مقرر ہے اس میں تخلف نہ ہو، اور ہوتا ہے تو صدمہ اور قلق سے بے چین ہو جاتے ہیں (گو عذر سے ہو):

گر ز باغِ دل خلالے کم بود بر دل سالک ہزاراں غم بود

''غزوہ خندق'' میں دیکھ لو نبی کریم ﷺ کی کئی نمازیں قضا ہو گئیں، باوجودیکہ آپ ﷺ عین جہاد میں مشغول تھے اور کسی قسم کا ذنب آپ پر نہ تھا، لیکن جن کفار کے سبب سے ایسا پیش آیا، آپ ﷺ ان کے حق میں: "ملا اللہ بیوتھم وقبورھم نارا" وغیرہ سے بددعا فرما رہے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ایک موقت عبادت کے فوت ہو جانے سے بیتاب ہو گئے، حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو واپس لاؤ (جو یادالٰہی کے فوت ہونے کا سبب بنے ہیں)، جب لائے گئے تو شدت غیرت اور غلبہ حب الٰہی میں تلوار لے کر ان کی گردنیں اور پنڈلیاں کاٹنا شروع کر دیں، تا کہ سبب غفلت کو اپنے سے اس طرح علیحدہ کریں کہ وہ فی الجملہ کفارہ اس غفلت کا ہو جائے، شاید ان کی شریعت میں قربانی گھوڑے کی جائز ہو گی اور ان کے پاس گھوڑے وغیرہ اس کثرت سے ہوں گے، ان چند گھوڑوں کے قربان کرنے سے مقصد جہاد میں کوئی خلل نہ پڑتا ہو گا اور لفظ **فطفق مسحًا** سے بھی یہ لازم نہیں آتا کہ سب گھوڑوں کو قتل ہی کر گزرے ہوں، محض اتنا ہے کہ یہ کام شروع کر دیا، واللہ اعلم۔ اس تقریر کی تائید ایک حدیث مرفوع سے ہوتی ہے جو طبرانی نے باسناد حسن ابی بن کعب سے روایت کی ہے (راجع روح المغانی وغیرہ)۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے جانچا سلیمان کو اور ڈال دیا اس کے تخت پر ایک دھڑ پھر وہ رجوع ہوا

خلاصہ تفسیر: اور (دوسرا قصہ یہ ہے کہ) ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کو (ایک اور طرح سے بھی) امتحان میں ڈالا اور ہم نے ان کے تخت پر ایک دھڑ لا ڈالا پھر انہوں نے (خدا کی طرف) رجوع کیا (اور ان شاء اللہ کے چھوٹ جانے سے توبہ کی)۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ: حدیث شیخین میں ہے کہ ایک بار حضرت سلیمان علیہ السلام نے سرداران لشکر پر جہاد میں کسی کوتاہی سے خفا ہو کر یہ فرمایا تھا کہ میں آج اپنی ستر بیویوں سے ہم بستر ہوں گا اور ستر مجاہد پیدا ہوں گے تو مجھے تمہاری پرواہ نہ رہے گی اور ان شاء اللہ کہنا یاد نہ رہا تو صرف ایک عورت حاملہ ہوئی اور اس سے بھی ادھورا بچہ پیدا ہوا جس کے ایک طرف کا دھڑ نہ تھا۔

ثُمَّ اَنَابَ: ایسی خفیف بات پر توبہ کرنا دین میں استقامت اور کامل ہونے کی دلیل ہے، اس کو امتحان میں پورا اُترنا کہیں گے، اور ان شاء اللہ زبان سے نہ کہنا بھی گناہ نہیں تھا، دل میں ہونا کافی تھا، لیکن انتہائی قرب کی وجہ سے اس پر بھی تنبیہ کی گئی۔

****

فائدہ: حدیث صحیح میں ہے کہ حضرت سلیمان نے ایک روز قسم کھائی کہ آج رات میں اپنی تمام عورتوں کے پاس جاؤں گا (جو تعداد میں ستر یا نوے یا سو کے قریب تھیں) اور ہر ایک عورت ایک بچہ جنے گی جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے گا، فرشتہ نے القاء کیا کہ ''ان شاء اللہ'' کہہ لیجئے، مگر (باوجود دل میں موجود ہونے کے) زبان سے نہ کہا، خدا کا کرنا کہ اس مباشرت کے نتیجے میں ایک عورت نے بھی بچہ نہ جنا، صرف ایک عورت سے ادھورا بچہ ہوا، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دایہ نے وہ ہی ادھورا بچہ ان کے تخت پر لا کر ڈال دیا کہ لو! یہ تمہاری قسم کا نتیجہ ہے، (اسی کو یہاں جسد (دھڑ) سے تعبیر کیا ہے)، یہ دیکھ کر حضرت سلیمان ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور ''ان شاء اللہ'' نہ کہنے پر استغفار کیا: ''نزدیکاں را بیش بود حیرانی''،

حدیث میں ہے کہ اگر "ان شاء اللہ" کہہ لیتے تو بیشک اللہ ویسا ہی کر دیتا جوان کی تمنا تھی۔

تنبیہ: اکثر مفسرین نے آیت کی تفسیر دوسری طرح کی ہے اور اس موقع پر بہت سے بے سروپا قصے سلیمان (علیہ السلام) کی انگشتری اور جنوں کے نقل کیے ہیں جسے دلچسپی ہو کتب تفاسیر میں دیکھ لے، ابن کثیر لکھتے ہیں: "ولقد رويت هذه القصة مطولة عن جماعة من السلف رضي الله عنهم وكلها متلقاة من قصص اهل الكتاب"، والله سبحانه تعالىٰ اعلم بالصواب.

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

بولا اے رب میرے معاف کر مجھ کو اور بخش مجھ کو وہ بادشاہی کہ مناسب نہ ہو (نہ پھبے کسی پر، نہ ملنی چاہیے کسی کو) کسی کو میرے پیچھے، بیشک تو ہے سب کچھ بخشنے والا

خلاصہ تفسیر: اس وقت سلیمان علیہ السلام کے دل میں خیال آیا کہ یہ دو لغزشیں جو مجھ سے جہاد کے متعلق ہوئیں: ایک سواریوں کے سامان جمع کرنے میں اور دوسری سواروں کو مہیا کرنے میں تو گزشتہ لغزشوں سے توبہ کر کے آئندہ کے لیے ایسی دعا کرنی چاہیے کہ اس سامان کی ضرورت ہی نہ پڑے جس میں پھر ایسی لغزش کا اندیشہ ہو اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے خدا سے:

دعا مانگی کہ اے میرے رب! میرا (پچھلا) قصور معاف کر اور (آئندہ کے لئے) مجھ کو ایسی سلطنت دے کہ میرے سوا (میرے زمانہ میں) کسی کو میسر نہ ہو (خواہ کوئی غیبی وہبی سامان عطا کر دیجئے، خواہ سلاطین زمانہ کو ویسے ہی دبا دیجئے تاکہ مقابلہ ہی نہ کر سکیں اور) آپ بڑے دینے والے ہیں (آپ کو اس دعا کا قبول کر لینا کچھ دشوار نہیں)۔

وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ: یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ دعا بھی باری تعالیٰ کی اجازت ہی سے مانگی تھی اور چونکہ اس کا منشاء محض طلب اقتدار نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نافذ کرنے اور کلمہ حق کو سربلند کرنے کا جذبہ کارفرما تھا، اور باری تعالیٰ کو معلوم تھا کہ حکومت ملنے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام انہی مقاصد عالیہ کے لئے کام کریں گے اور حب جاہ کے جذبات ان کے دل میں جگہ نہیں پائیں گے، اس لئے انہیں اس دعا کی اجازت بھی دے دی گئی اور اسے قبول بھی کر لیا گیا، لیکن عام لوگوں کے لئے از خود اقتدار کے طلب کرنے کو حدیث میں اس لئے منع کیا گیا ہے کہ اس میں حب جاہ و مال کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں، چنانچہ جہاں انسان کو اس قسم کے جذبات نفسانی سے خالی ہونے کا یقین ہو اور وہ واقعتاً اعلاء کلمۃ الحق کے سوا کسی اور مقصد سے اقتدار حاصل نہ کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے حکومت کی دعا مانگنا جائز ہے، اس آیت میں دلالت ہوئی کہ بعض چیزیں کاملین کو نقصان دہ نہیں ہوتی اور ناقص کمزوروں کو نقصان دہ ہوتی ہیں جیسے اس پر دلالت ہے کہ جاہ دینی کمال کے خلاف نہیں جبکہ جاہ میں دینی مصلحت بھی ہو۔

* * *

فائدہ: ① یعنی ایسی عظیم الشان سلطنت عنایت فرما جو میرے سوا کسی کو نہ ملے، نہ کوئی دوسرا اس کا اہل ثابت ہو۔
② یا یہ مطلب ہے کہ کسی کو حوصلہ نہ ہو کہ مجھ سے چھین سکے۔

تنبیہ: احادیث میں ہے کہ ہر نبی کی ایک دعاء جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اجابت کا وعدہ فرما لیا ہے، یعنی وہ دعا ضرور ہی قبول کریں گے، شاید حضرت سلیمان کی یہ وہی دعا ہو، آخر نبی زادے اور بادشاہ زادے تھے، دعا میں بھی یہ رنگ رہا کہ بادشاہت ملے اور اعجازی رنگ کی ملے، وہ زمانہ ملوک اور جبارین کا تھا، اس حیثیت سے بھی یہ دعا مذاق زمانہ کے موافق تھی اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد ملک حاصل کرنے سے اپنی شوکت وحشمت کا مظاہرہ کرنا نہیں، بلکہ اس دین کا ظاہر و غالب کرنا اور قانون سماوی کا پھیلانا ہوتا ہے، جس کے وہ حامل بنا کر بھیجے جاتے ہیں، لہٰذا اس کو دنیاداروں کی دعا پر قیاس نہ کیا جائے۔

فَسَخَّرۡنَا لَهُ الرِّيۡحَ تَجۡرِيۡ بِاَمۡرِهٖ رُخَآءً حَيۡثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾

پھر ہم نے تابع کر دیا اس کے ہوا کو چلتی تھی اس کے حکم سے نرم نرم جہاں پہنچنا چاہتا

وَالشَّيٰطِيۡنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيۡنَ مُقَرَّنِيۡنَ فِى الۡاَصۡفَادِ ﴿۳۸﴾

اور تابع کر دیئے شیطان سارے عمارت کرنے والے اور غوطے لگانے والے ١ بہت سے اور جو باہم جکڑے ہوئے ہیں بیڑیوں میں ٢

خلاصہ تفسیر: سو (ہم نے ان کی دعا قبول کی اور ان کی خطا بھی معاف کر دی اور نیز) ہم نے ہوا کو ان کے تابع کر دیا کہ وہ ان کے حکم سے جہاں وہ (جانا) چاہتے نرمی سے چلتی (کہ اس کے بعد ان کو گھوڑوں کی ضرورت نہ رہی) اور جنات کو بھی ان کے تابع کر دیا یعنی تعمیر بنانے والوں کو بھی اور (موتی وغیرہ کے لئے) غوطہ غوروں کو بھی، اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے (غالباً جو مفوضہ خدمات سے گریز یا اس میں کوتاہی کرتا ہوا اس جن کو قید کی سزا ہوتی ہوگی، چنانچہ ان جنات کے ذریعہ شہ سوار آدمیوں سے بھی مستغنی کر دیا اور سب بادشاہوں کو ان سے پست اور مغلوب کر دیا)۔

فَسَخَّرۡنَا لَهُ الرِّيۡحَ: ہوا کی تسخیر کے متعلق سورہ انبیاء آیت ۸۱ میں کچھ ضروری مضمون گذر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

وَالشَّيٰطِيۡنَ كُلَّ بَنَّآءٍ: بعض لوگ عملیات وغیرہ کے ذریعہ بعض جنات کو جو مسخر کر لیتے ہیں وہ اس کے منافی نہیں، کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تسخیر جنات سے اس کو کوئی نسبت نہیں، عملیات کے ماہرین دو ایک یا چند جنات کو تابع بنا لیتے ہیں، لیکن جس طرح کی ہمہ گیر حکومت حضرت سلیمان علیہ السلام کو حاصل تھی ویسی کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔

وَّاٰخَرِيۡنَ مُقَرَّنِيۡنَ فِى الۡاَصۡفَادِ: یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ سرکش جنات کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، اب ان زنجیروں کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ یہی نظر آنے والی لوہے کی زنجیریں ہوں، ہوسکتا ہے کہ جنات کو جکڑنے کے لئے کوئی اور لطیف طریقہ اختیار کیا گیا ہو، جسے آسانی سے سمجھانے کے لئے یہاں زنجیروں سے تعبیر کر دیا گیا ہو۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی جن ان کے حکم سے بڑی بڑی عمارتیں بنانے اور موتی وغیرہ نکالنے کے لیے دریاؤں میں غوطے لگاتے تھے، ہوا اور جنات کے تابع کرنے کے متعلق پہلے سورہ سبا وغیرہ میں کچھ تفصیل گزر چکی ہے۔

فائدہ: ٢ یعنی بہت سے جنات اور تھے جن کو سرکشی اور شرارت و تمرد کی وجہ سے قید کر کے ڈال دیا تھا۔

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامۡنُنۡ اَوۡ اَمۡسِكۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا لَزُلۡفٰى وَحُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾ ع ۱۲

یہ ہے بخشش ہماری اب تو احسان کر یا رکھ چھوڑ (اپنے پاس) کچھ حساب نہ ہوگا ١ اور اس (کیلئے) کا ہمارے یہاں مرتبہ ہے اور اچھا ٹھکانا ٢

خلاصہ تفسیر: (اور ہم نے یہ سامان دے کر ارشاد فرمایا کہ) یہ ہمارا عطیہ ہے سو خواہ (کسی کو) دو یا نہ دو تم سے کچھ داروگیر نہیں (یعنی جتنا سامان ہم نے آپ کو دیا ہے اس کا مالک بنا دیا ہے، خزانچی اور نگہبان نہیں بنایا، جیسا کہ دوسرے بادشاہ ملکی خزانوں کے مالک نہیں ہوتے، بلکہ منتظم ہوتے ہیں، پس تم مالکانہ تصرف کے مختار ہو) اور (دنیا میں جو سامان ان کو عطا ہوا تھا اس کے علاوہ) ان کے لئے ہمارے یہاں (خاص) قرب اور (اعلیٰ درجہ کی) نیک انجامی ہے (جس کا ثمرہ پورے طور پر آخرت میں ظاہر ہوگا)۔

فَامۡنُنۡ اَوۡ اَمۡسِكۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ: حضرت سلیمان علیہ السلام ان سارے ساز وسامان مال وجاہ کے امین، منتظم یا خزانچی نہیں بلکہ مالک

بنائے گئے تھے اور اس میں انہیں ہر طرح کا تصرف کرنے اختیار دیا گیا تھا چاہے کسی کو دیں یا نہ دیں، انہیں کوئی حساب و کتاب نہ دینا ہوگا، حکمت اس کی یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دل کو ادائے حقوق کی ذمہ داریوں میں مشغول نہ رکھنے کے لیے یہ کامل اختیار دے دیا تھا تاکہ وہ منصب نبوت کی تکمیل میں کامل طور پر مشغول ہوں، کیونکہ دنیاوی ساز و سامان کی وجہ سے تشویش اور پریشانی ہی اصل نقصان ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے بڑا سرمایہ جمعیت قلب یعنی دل کا پرسکون ہونا ہے، اللہ والوں کو اس کا خاص اہتمام رہا کرتا ہے کہ دل پراگندہ نہ ہونے پائے۔

یہاں سلیمان علیہ السلام کا قصہ اگر محض داود علیہ السلام کے قصہ کی تکمیل و تتمیم کے لیے ہے جیسا کہ پیچھے آیت: **ووھبنا لداود سلیمٰن** گزری تب تو حضرت سلیمان کے لیے مستقل طور پر صبر ثابت کرنے کی حاجت نہیں، لیکن اگر یہ قصہ مستقل طور پر مقصود ہے اور اس قصہ کو بھی **اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ** کی تائید کے لیے یاد دلایا گیا ہے تو اس میں صبر کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے، سو جہاد کے قصہ میں صبر یہ ہوا کہ اتنے کثیر مال کی کچھ پروا نہ کی اور اسے قربان کر دیا تو یہ دلیل ہے دین میں انتہائی ثابت قدمی کی اور صبر کی حقیقت بھی یہی ہے، اور دھڑ والے قصہ میں باوجود اس کے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کوئی معصیت یا گناہ سرزد نہ ہوا تھا لیکن پھر بھی انہوں نے توبہ کی تو یہ بھی دین میں ان کی ثابت قدمی کی دلیل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی کسی کو بخشش دو یا نہ دو تم مختار ہو، اس قدر بے حساب دیا اور حساب و کتاب کا مواخذہ بھی نہیں رکھا۔

حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''یہ اور مہربانی کی کہ اتنی دنیاوی اور مختار کر دیا، حساب معاف کر کے، لیکن وہ کھاتے تھے اپنے ہاتھ کی محنت سے ٹوکرے بنا کر''۔

فائدہ: ۲ یعنی بادشاہت کے باوجود جو روحانی تقرب اور مرتبہ ہمارے ہاں حاصل ہے اور فردوس بریں میں جو اعلیٰ سے اعلیٰ ٹھکانا تیار ہے وہ بجائے خود رہا۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿٤١﴾ ط (وقف لازم)

اور یاد کر ہمارے بندے ایوب کو، جب اس نے پکارا اپنے رب کو کہ مجھ کو لگا دی شیطان نے ایذا (بیماری) اور تکلیف

خلاصہ تفسیر: (تیسرا قصہ:) اور آپ ہمارے بندہ ایوب (علیہ السلام) کو یاد کیجئے جبکہ انہوں نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھ کو رنج اور آزار پہنچایا ہے۔

اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ: یہ رنج و آزار بعض مفسرین کے مطابق وہ ہے جو امام احمد نے کتاب الزہد میں ابن عباس ؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے زمانے میں ایک بار شیطان ایک طبیب کی شکل میں حضرت ایوب کی بیوی کو ملا تھا، اسے انہوں نے طبیب سمجھ کر ایوب علیہ السلام کے علاج کی اس سے درخواست کی، اس نے کہا اس شرط سے علاج کروں گا کہ اگر ان کو شفا ہو جائے تو یوں کہہ دینا کہ ''تو نے ان کو شفا دی میں اور کچھ نذرانہ نہیں چاہتا''، انہوں نے ایوب علیہ السلام سے ذکر کیا، انہوں نے فرمایا کہ بھلی مانس وہ تو شیطان تھا، میں عہد کرتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ کو شفا دے دے تو میں تجھ کو سو قمچیاں ماروں گا، پس آپ کو سخت رنج پہنچا کہ میری بیماری کی بدولت شیطان کا یہاں تک حوصلہ بڑھا کہ خاص میری بیوی سے ایسے کلمات کہلوانا چاہتا ہے، جو ظاہراً موجب شرک ہیں، اگرچہ تاویل کے بعد شرک نہ ہوں، آپ مرض زائل ہونے کی دعا پہلے بھی کرتے تھے جو کہ سورہ انبیاء آیت ۸۳ میں گذر چکی ہے، مگر اس واقعہ سے اور زیادہ خشوع اور خضوع سے دعا کی اور اسی وجہ سے یہاں ''نصب'' اور ''عذاب'' دو لفظ جمع کیے گئے۔

* * *

فائدہ: قرآن کریم کے تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن امور میں کوئی پہلو شر یا ایذاء کا یا کسی مقصد صحیح کے فوت ہونے کا ہو ان کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں آیا: **وما انسانیہ الا الشیطان ان اذکرہ** (سورہ کہف) کیونکہ اکثر اس قسم کی چیزوں

کا سبب قریب یا بعید کسی درجہ میں شیطان ہوتا ہے، اسی قاعدہ سے حضرت ایوب نے اپنی بیماری یا تکلیف یا آزار کی نسبت شیطان کی طرف کی گویا تواضعا وتأدبا یہ ظاہر کیا کہ ضرور مجھ سے کچھ تساہل یا کوئی غلطی اپنے درجہ کے موافق صادر ہوئی ہے، جس کے نتیجہ میں یہ آزار پیچھے لگا، یا حالت مرض وشدت میں شیطان القائے وساوس کی کوشش کرتا ہوگا اور یہ اس کی مدافعت میں تعب وتکلیف اٹھاتے ہوں گے، اس کو نصب وعذاب سے تعبیر فرمایا، واللہ اعلم۔

تنبیہ: حضرت ایوب کا قصہ سورہ انبیاء میں گزر چکا، وہاں ملاحظہ کرلیا جائے، مگر واضح رہے کہ قصہ گویوں نے حضرت ایوب کی بیماری کے متعلق جو افسانے بیان کیے ہیں ان میں مبالغہ بہت ہے، ایسا مرض جو عام طور پر لوگوں کے حق میں تنفر اور استقذار کا موجب ہو انبیاء علیہم السلام کی وجاہت کے منافی ہے، کما قال تعالیٰ: لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا (الاحزاب:۶۹) لہذا اسی قدر بیان قبول کرنا چاہیے جو منصب نبوت کے منافی نہ ہو۔

ارْكُضْ بِرِجْلِكَ ۖ هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ ﴿۴۲﴾

لات مار اپنے پاؤں سے، یہ چشمہ نکلا (نکل آیا) نہانے کو ٹھنڈا اور پینے کو

وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۴۳﴾

اور بخشے ہم نے اسکو اسکے گھر والے اور انکے برابر انکے ساتھ اپنی طرف کی مہربانی سے اور یاد رکھنے کو عقل والوں (عقل مندوں) کے

خلاصہ تفسیر: (پس ہم نے ان کی دعا قبول کرلی اور حکم دیا کہ) اپنا پاؤں (زمین پر) مارو (چنانچہ انہوں نے زمین پر پاؤں مارا تو وہاں سے ایک چشمہ پیدا ہوگیا پس ہم نے ان سے کہا کہ) یہ (تمہارے لئے) نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کا (یعنی اس میں غسل کرو اور پیو بھی، چنانچہ نہائے اور پیا بھی اور بالکل اچھے ہو گئے) اور ہم نے ان کو ان کا کنبہ عطا فرمایا اور ان کے ساتھ (گنتی میں) ان کے برابر اور بھی (دیئے) اپنی رحمت خاصہ کے سبب سے اور اہل عقل کے لئے یادگار رہنے کے سبب سے (یعنی اہل عقل یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ صابروں کو کیسی جزا دیتے ہیں)۔

أَهْلَهُ وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ: اس کے متعلق کچھ ضروری مضمون سورہ انبیاء آیت ۸۴ کے خلاصہ تفسیر میں گذر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: جب اللہ نے چاہا کہ ان کو چنگا کرے، حکم دیا کہ زمین پہ پاؤں ماریں، پاؤں مارنا تھا کہ قدرت نے وہاں سے ٹھنڈے پانی کا چشمہ نکال دیا، اسی سے نہایا کرتے اور پانی پیتے، وہ ہی ان کی شفاء کا سبب ہوا اور ان کے گھرانے کے لوگ جو چھت کے نیچے دب کر مر گئے تھے، اللہ نے اپنی مہربانی سے ان سے دگنے عطا کیے، تا عقل مند لوگ ان واقعات کو دیکھ کر سمجھیں کہ جو بندہ مصائب میں مبتلا ہو کر صبر کرتا اور خدائے واحد کی طرف رجوع ہوتا ہے حق تعالیٰ اس کی کس طرح کفالت واعانت فرماتے ہیں۔

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ ۗ إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ الْعَبْدُ ۖ

اور پکڑ اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا پھر اس سے مار لے اور قسم میں جھوٹا نہ ہو، ہم نے اس کو پایا جھیلنے (سہارنے) والا، بہت خوب بندہ،

إِنَّهُ أَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

تحقیق وہ ہے رجوع رہنے والا

خلاصہ تفسیر: پھر ایوب علیہ السلام نے اپنی قسم پوری کرنے کا ارادہ کیا مگر چونکہ ان کی بیوی نے ایوب علیہ السلام کی خدمت بہت کی تھی اور ان سے کوئی گناہ بھی صادر نہ ہوا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کے لئے ایک تخفیف فرمائی:

اور (ارشاد فرمایا کہ اے ایوب!) تم اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا سینکوں کا لو (جس میں سو سینکیں ہوں) اور (اپنی بیوی کو) اس سے مار لو اور (اپنی) قسم نہ توڑو (چنانچہ ایسا ہی ہوا، آگے ایوب علیہ السلام کی تعریف کی ہے کہ) بیشک ہم نے ان کو (بڑا) صابر پایا، اچھے بندے تھے کہ (خدا کی طرف) بہت رجوع ہوتے تھے۔

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا: اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کو سو قمچیاں مارنے کی قسم کھالے اور بعد میں سو قمچیاں الگ الگ مارنے کے بجائے تمام قمچیوں کا ایک گٹھا بنا کر ایک ہی مرتبہ مار دے تو اس سے قسم پوری ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت ایوب علیہ السلام کو ایسا کرنے کا حکم دیا گیا، یہی امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے، لیکن جیسا کہ علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ اس کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں: ① ایک تو یہ کہ اس شخص کے بدن پر ہر قمچی طولاً یا عرضاً ضرور لگ جائے ② دوسرے یہ کہ اس سے کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور ہو، اگر اتنے ہلکے سے قمچیاں بدن کو لگائی گئیں کہ بالکل تکلیف نہ ہوئی تو قسم پوری نہیں ہوگی، حضرت تھانویؒ نے یہاں بیان القرآن میں جو لکھا ہے کہ قسم پوری نہیں ہوگی، تو غالباً اس کی مراد یہی ہے کہ تکلیف بالکل نہ ہو یا کوئی قمچی بدن کو لگ جانے سے رہ جائے، ورنہ فقہائے حنفیہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر مذکورہ دو شرطوں کے ساتھ مارا جائے تو قسم پوری ہو جاتی ہے۔

فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ: اس قصہ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ احکام میں ہر جگہ حیلہ جائز ہے، بلکہ اس میں تو قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جس حیلہ سے کسی شرعی حکمت اور غرض کا باطل کرنا مقصود ہو وہ حرام ہے، اور جس میں یہ نہ ہو بلکہ کسی شرعی مطلوب کا حاصل کرنا مقصود ہو وہ جائز ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے حیلے اسی وقت جائز ہوتے ہیں جبکہ انہیں شرعی مقاصد کے ابطال کا ذریعہ نہ بنایا جائے، اور اگر حیلہ کا مقصد یہ ہو کہ کسی حقدار کا حق باطل کیا جائے، یا کسی صریح فعل حرام کو اس کی روح برقرار رکھتے ہوئے اپنے لئے حلال کر لیا جائے تو ایسا حیلہ بالکل ناجائز ہے، مثلاً زکوٰۃ سے بچنے کے لئے بعض لوگ یہ حیلہ کرتے ہیں کہ سال کے ختم ہونے سے ذرا پہلے اپنا مال بیوی کی ملکیت میں دے دیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد بیوی نے شوہر کی ملکیت میں دے دیا اور جب اگلا سال ختم ہونے کے قریب ہوا تو پھر شوہر نے بیوی کو ہبہ کر دیا، اس طرح کسی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، ایسا کرنا چونکہ مقاصد شرعیہ کو باطل کرنے کی ایک کوشش ہے، اس لئے حرام ہے اور شاید اس کا وبال ترک زکوٰۃ کے وبال سے زیادہ بڑا ہو۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا: چند آیات قبل اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ کی تائید اس قصہ میں: اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا کی صراحت سے ظاہر ہے اور یہاں یہ قصہ بھی صبر کی تائید کے لیے بیان کیا گیا اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا بھی مقصود ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت ایوب نے حالت مرض میں کسی بات پر خفا ہو کر قسم کھائی کہ تندرست ہو گئے تو اپنی عورت کو سو لکڑیاں ماریں گے، وہ بی بی اس حالت کی رفیق تھی اور چنداں قصور وار بھی نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے قسم سچی کرنے کا ایک حیلہ ان کو بتلا دیا، جو ان ہی کے لیے مخصوص تھا، آج اگر کوئی اس طرح کی قسم کھا بیٹھے تو اس کے پورا کرنے کے لیے اتنی بات کافی نہ ہوگی۔

تنبیہ: جس حیلہ سے کسی حکم شرعی یا مقصد دینی کا ابطال ہوتا ہو وہ جائز نہیں، جیسے اسقاط زکوٰۃ وغیرہ کے حیلے لوگوں نے نکالے ہیں، ہاں! جو حیلہ حکم شرعی کو باطل نہ کرے، بلکہ کسی معروف کا ذریعہ بنتا ہو، اس کی اجازت ہے، والتفصیل یطلب من مظانہ۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِى الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ

اور یاد کر ہمارے بندوں کو ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب ہاتھوں والے اور آنکھوں والے ۱؎ ہم نے امتیاز دیا ان کو

بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾

ایک چنی ہوئی بات کا وہ یاد اس گھر کی ۲؎ اور وہ سب ہمارے نزدیک ہیں چنے ہوئے نیک لوگوں میں

خلاصہ تفسیر: اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کو یاد کیجئے جو ہاتھوں (سے کام کرنے) والے

اور آنکھوں (سے دیکھنے) والے تھے (یعنی ان میں عمل کی قوت بھی تھی اور علم کی قوت بھی، اور) ہم نے ان کو ایک خاص بات کے ساتھ مخصوص کیا تھا کہ وہ یاد آخرت کی ہے (چنانچہ یہ ظاہر ہے کہ انبیاء میں یہ صفت سب سے زیادہ تام اور کامل ہوتی ہے، اور شاید یہ جملہ اس لئے بڑھادیا ہوتا کہ غافلوں کے کان ہوں کہ جب انبیاء اس فکر سے خالی نہ تھے تو ہم کس شمار میں ہیں) اور وہ (حضرات) ہمارے یہاں منتخب اور سب سے اچھے لوگوں میں سے ہیں (یعنی منتخب لوگوں میں بھی سب سے بڑھ کر، چناچہ ظاہر ہے کہ انبیاء، دوسرے اولیاء اور صلحا سے افضل ہوتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی عمل اور معرفت والے جو ہاتھ پاؤں سے بندگی کرتے اور آنکھوں سے خدا کی قدرتیں دیکھ کر یقین و بصیرت زیادہ کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲ انبیاء کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے برابر خدا کو اور آخرت کو یاد رکھنے والا کوئی نہیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے اللہ کے ہاں ان کو سب سے ممتاز مرتبہ حاصل ہے۔

وَاذْكُرْ إِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ﴿٤٨﴾

اور یاد کر اسماعیل کو اور الیسع کو اور ذوالکفل کو، اور ہر ایک تھا خوبی والا

خلاصہ تفسیر: اور اسماعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو بھی یاد کیجئے اور یہ سب بھی سب سے اچھے لوگوں میں سے ہیں۔

حضرت ذوالکفل کا قصہ سورہ انبیاء میں گذر چکا ہے اور الیسع علیہ السلام کو پہلے الیاس علیہ السلام نے بنی اسرائیل پر اپنا نائب مقرر کیا تھا، پھر ان کو نبوت عطا ہوگئی، یہاں ان حضرات کے تذکرہ سے بھی چند آیات قبل اِصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ کی تائید مقصود ہے، کیونکہ اخیار یعنی اچھائی کی صفت موقوف ہے صبر کے ساتھ اور مذکورہ تمام انبیاء کرام کو یہاں ''اخیار'' فرمایا گیا۔

* * *

فائدہ: حضرت اسماعیل اور ذوالکفل کا ذکر پہلے گزر چکا، اور الیسع کہتے ہیں کہ حضرت الیاس کے خلیفہ تھے ان کو بھی اللہ نے نبوت عطا فرمائی۔

هٰذَا ذِكْرٌ ؕ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿٤٩﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿٥٠﴾

ایک مذکور ہو چکا ۱ اور تحقیق ڈر (رکھنے) والوں کے لیے ہے اچھا ٹھکانا، باغ ہیں سدا بسنے کے کھول رکھے ہیں ان کے واسطے دروازے ۲

مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿٥١﴾

تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ان میں منگوائیں گے ان میں میوے بہت اور شراب ۳

خلاصہ تفسیر: مذکورہ انبیاء کے قصوں سے پہلے توحید، جزا و سزا اور رسالت کے متعلق مجمل مضمون تھا، اب آگے جزا و سزا کی کسی قدر تفصیل بیان کرتے ہیں۔

ایک نصیحت کا مضمون تو یہ ہو چکا (اس سے مراد انبیاء علیہم السلام کے واقعات ہیں کہ ان واقعات میں کافروں کے لئے عقیدہ رسالت کی تبلیغ ہے، اور مومنوں کے لئے اخلاق جمیلہ اور اعمال فاضلہ کی تعلیم ہے) اور (دوسرا مضمون آخرت کی جزا و سزا کے متعلق اب شروع ہوتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ) پرہیزگاروں کے لئے (آخرت میں) اچھا ٹھکانہ ہے، یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات جن کے دروازے ان کے واسطے کھلے ہوئے ہوں گے (بظاہر مراد یہ ہے کہ پہلے سے کھلے ہوں گے جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد ہے: حتی اذا جاءوها فتحت ابوابها) وہ ان باغوں میں تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے (اور) وہ وہاں (جنت کے خادموں سے) بہت سے میوے اور پینے کی چیزیں منگوائیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی یہ مذکور تو انبیاء کا تھا، آگے عام متقین کا انجام سن لو:
فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جب بہشت میں داخل ہوں گے ہر کوئی بدون بتائے اپنے گھر میں چلا جائے گا''۔
فائدہ: ۳ یعنی قسم قسم کے میوے، پھل اور پینے کی چیزیں حسب خواہش غلمان حاضر کریں گے۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾

اوران کے پاس عورتیں ہیں نیچی نگاہ والیاں ایک عمر کی ۱ یہ وہ ہے جو تم سے وعدہ کیا گیا حساب کے دن پر

اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾

یہ ہے روزی ہماری دی ہوئی اس کو نہیں نبڑنا (کم ہونا) ۲

خلاصہ تفسیر: اوران کے پاس نیچی نگاہ والیاں ہم عمر ہوں گی (مراد حوریں ہیں، اے مسلمانو!) یہ (جس کا اوپر ذکر ہوا) وہ (نعمت) ہے جس کا تم سے روز حساب آنے پر وعدہ کیا جاتا ہے، بیشک یہ ہماری عطا ہے، اس کا کہیں ختم ہی نہیں (یعنی دائمی اور ابدی نعمت ہے)۔

قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ: دنیا میں ہم عمر عورتوں کا بعض طبائع کو محبوب نہ ہونا بلکہ اپنے سے کم عمر کا محبوب ہونا اس لیے ہے کہ کم سن عورت میں حسن و جمال اور ناز و انداز زیادہ ہوتا ہے، چونکہ حوروں میں یہ صفت کامل درجہ میں ہوگی اس لیے ان کا ہم عمر ہونا محبوبیت سے مانع نہ ہوگا، بلکہ اور زیادہ انسیت کا ذریعہ ہوگا، اور یہ ہم عمری زمانہ کے اعتبار سے نہ ہوگی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ شکل، عادات اور ظاہری صورت میں سب ہم عمر معلوم ہوں گی۔
جنت کی ترغیب کے موقع پر حوروں کے حسن کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ مباح عورتوں یعنی بیویوں کی طرف رغبت کرنا نہ حب الٰہی کے خلاف ہے اور نہ کسی فضیلت کے خلاف ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سب عورتیں نوجوان ایک عمر ہوں گی، یا شکل وشمائل میں خوبو میں اپنے ازواج کی ہم عمر معلوم ہوں گی۔
فائدہ: ۲ یعنی غیر منقطع اور لازوال نعمتیں ہیں جن کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، رزقنا الله منها بفضله وكرمه فانه اكرم الاكرمين وارحم الراحمين.

هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾

یہ سن چکے ۱ اور تحقیق شریروں کے واسطے ہے برا ٹھکانا، دوزخ ہے، جس میں ان کو ڈالیں گے، سو کیا بری آرام کرنے کی جگہ ہے

هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ﴿۵۸﴾

یہ ہے اب اس کو چکھیں ۲ گرم پانی اور پیپ ۳ اور کچھ اور اسی شکل کی طرح طرح کی چیزیں

خلاصہ تفسیر: یہ بات تو ہو چکی (جو نیک بخت پرہیزگاروں کے متعلق تھی) اور (آگے کافروں کے متعلق مضمون ہے، وہ یہ کہ) سرکشوں کے لئے (یعنی جو کفر میں دوسروں کے رہنما تھے ان کے لئے) برا ٹھکانا ہے، یعنی دوزخ، اس میں داخل ہوں گے، سو وہ بہت ہی بری جگہ ہے، یہ کھولتا ہوا پانی اور پیپ (موجود) ہے، سو یہ لوگ اس کو چکھیں اور (اس کے علاوہ) اور بھی اس قسم کی (ناگوار اور تکلیف پہنچانی والی) طرح طرح کی چیزیں (موجود) ہیں (اس کو بھی چکھیں، اور جو لوگ ان سرداروں کے تابع تھے ان کے لئے بھی یہی چیزیں ہیں، اگرچہ مقدم و مؤخر اور کم یا زیادہ ہونے کا فرق ہو مگر عذاب میں سب شریک ہوں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی پرہیزگاروں کا انجام سن چکے، آگے شریروں کا انجام سن لو:

فائدہ: ۲ یعنی لو! یہ حاضر ہے، اب اس کا مزہ چکھیں۔

فائدہ: ۳ ① غساق سے بعض نے کہا دوزخیوں کے زخموں کی پیپ اور ان کی آلائش مراد ہیں، جس میں سانپوں بچھوؤں کا زہر ملا ہوگا۔ ② بعض کے نزدیک غساق حد سے زیادہ ٹھنڈے پانی کو کہتے ہیں جس کے پینے سے سخت اذیت ہو، گویا حمیم کی پوری ضد، واللہ اعلم۔

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾

یہ ایک فوج ہے دھنستی آرہی ہے تمہارے ساتھ، جگہ نہ ملیو ان کو، یہ ہیں گھسنے والے آگ میں

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۟ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾

وہ بولے بلکہ تم ہی ہو، کہ جگہ نہ ملیو تم کو، تم ہی پیش لائے ہمارے (ہم پر) یہ بلا، سو کیا بری ٹھہرنے کی جگہ (قرارگاہ) ہے ۱

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ کافروں کے سرداروں کے داخل ہونے کے بعد جب ان کے ماتحت لوگ جہنم میں داخل ہوں گے تو یہ سردار آپس میں کہیں گے کہ لو) یہ ایک جماعت اور آئی جو تمہارے ساتھ (عذاب میں شریک ہونے کے لئے جہنم میں) گھس رہے ہیں ان پر خدا کی مار یہ بھی دوزخ ہی میں آرہے ہیں (یعنی کوئی ایسا آتا جو عذاب کا مستحق نہ ہوتا تو اس کے آنے کی خوشی بھی ہوتی اور اس کی آؤ بھگت بھی کرتے، یہ تو خود ہی جہنمی ہیں، ان سے کیا امید، اور ان کے آنے کی کیا خوشی اور کیا آؤ بھگت؟) وہ (ماتحت پیروکار اپنے رہنماؤں سے) کہیں گے، بلکہ تمہارے ہی اوپر خدا کی مار (کیونکہ) تم ہی تو یہ (مصیبت) ہمارے آگے لائے (کیونکہ تم ہی نے ہم کو بہکایا تھا) سو (جہنم) بہت ہی برا ٹھکانہ ہے (جو تمہاری بدولت ہمارے آگے آیا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ گفتگو دوزخیوں کی آپس میں ہوگی، جس وقت فرشتے ان کو یکے بعد دیگرے لا لا کر دوزخ کے کنارے پر جمع کریں گے، پہلا گروہ سرداروں کا ہوگا، بعدہٗ ان کے مقلدین واتباع کی جماعت آئے گی، اس کو دور سے آتے ہوئے دیکھ کر پہلے لوگ کہیں گے کہ لو! یہ ایک اور فوج دھنستی اور کھپتی ہوئی تمہارے ساتھ دوزخ میں گرنے کے لیے چلی آرہی ہے، خدا کی مار ان پر، یہ بھی یہیں آکر مرنے کو تھے، خدا کرے ان کو کہیں کشادہ جگہ نہ ملے، اس پر وہ جواب دیں گے کہ کم بختو! تمہی پر خدا کی مار ہو، خدا تم کو ہی کہیں آرام کی جگہ نہ دے، تم ہی تھے جن کے اغواء واضلال کی بدولت آج ہم کو یہ مصیبت پیش آئی، اب بتاؤ کہاں جائیں، جو کچھ ہے، یہی جگہ ٹھہرنے کی ہے، جس طرح ہو، یہاں ہی سب مرو کھپو۔

قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِی النَّارِ ﴿۶۱﴾

وہ بولے اے رب ہمارے جو کوئی لایا ہمارے پیش یہ سو بڑھا دے اس کو دونا عذاب آگ میں

خلاصہ تفسیر: (اس کے بعد جب ان میں سے ہر شخص دوسرے پر الزام رکھنے لگے گا تو اس وقت یہ ماتحت لوگ اپنے سرداروں کو چھوڑ کر حق تعالیٰ سے) دعا کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار جو شخص اس (مصیبت) کو ہمارے آگے لایا ہو اس کو دوزخ میں دونا عذاب دیجیو۔

* * *

فائدہ: یعنی آپس میں لعن طعن کر کے پھر حق تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ اے پروردگار! جو اپنی شقاوت سے یہ بلا اور مصیبت ہمارے سر پر لایا، اس کو دوزخ میں دوگنا عذاب دیجئے، شاید سمجھیں گے کہ ان کا دگنا عذاب دیکھ کر ذرا دل ٹھنڈا ہو جائے گا، حالانکہ وہاں تسلی کا سامان کہاں؟ ایک دوسرے کو کوسنا اور پھٹکارنا یہ بھی ایک مستقل عذاب ہوگا۔

وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ

اور کہیں گے کیا ہوا کہ ہم نہیں دیکھتے ان مردوں کو کہ ہم ان کو شمار کرتے تھے برے لوگوں میں کیا ہم نے ان کو ٹھٹھے میں پکڑا تھا یا چوک گئیں

عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾ ع

ان سے ہماری آنکھیں ؎۱ یہ بات ٹھیک ہونی ہے (ہو کر رہے گی) جھگڑا کرنا آپس میں دوزخیوں کا ؎۲

خلاصہ تفسیر: اور وہ لوگ (یعنی متبعین یا سب دوزخی آپس میں) کہیں گے کہ کیا بات ہے ہم ان لوگوں کو (دوزخ میں) نہیں دیکھتے جن کو ہم برے لوگوں میں شمار کیا کرتے تھے (یعنی مسلمانوں کو بدراہ اور حقیر سمجھا کرتے تھے، وہ کیوں نظر نہیں آتے) کیا ہم نے (ناحق) ان کی ہنسی کر رکھی تھی (اور وہ اس قابل نہ تھے، یعنی کیا وہ واقع میں برے نہ تھے اس لیے جہنم میں نہیں آئے) یا (یہ کہ جہنم میں موجود ہیں مگر) ان (کے دیکھنے) سے نگاہیں چکرا رہی ہیں (کہ ان پر ہماری نظر نہیں جمتی، مطلب یہ کہ عذاب کے ساتھ یہ ایک اور حسرت ہوگی کہ جن لوگوں کو ہم برا سمجھتے تھے وہ عذاب سے بچ گئے، اور) یہ بات یعنی دوزخیوں کا آپس میں لڑنا جھگڑنا بالکل سچی بات ہے (کہ ضرور ہو کر رہے گی)۔

* * *

فائدہ: ؎۱ وہاں دیکھیں گے کہ سب جان پہچان والے لوگ ادنیٰ و اعلیٰ دوزخ میں جانے کے واسطے جمع ہوئے ہیں، مگر جن مسلمانوں کو پہچانتے تھے اور سب سے زیادہ برا جان کر مذاق اڑایا کرتے تھے، وہ اس جگہ نظر نہیں آتے، تو حیران ہو کر کہیں گے کہ کیا ہم نے غلطی سے ان کے ساتھ ٹھٹھا کیا تھا وہ اس قابل نہ تھے کہ آج دوزخ کے نزدیک رہیں؟ یا اسی جگہ کہیں ہیں پر ہماری آنکھیں چوک گئیں؟ ہمارے دیکھنے میں آتے۔

فائدہ: ؎۲ یعنی بظاہر یہ بات خلاف قیاس ہے کہ اس افراتفری میں ایک دوسرے سے جھگڑیں، عذاب کا ہولناک منظر کیسے دوسری طرف متوجہ رہنے دے گا، لیکن یاد رکھو! ایسا ہو کر رہے گا، یہ بالکل یقینی چیز ہے، جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور حقیقت میں یہ ان کے عذاب کی تکمیل ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾

تو کہہ میں تو یہی ہوں ڈر سنا دینے والا، اور حکم کوئی نہیں مگر اللہ اکیلا دباؤ والا

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾

رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو ان کے بیچ میں ہے زبردست گناہ بخشنے والا ؎۱

خلاصہ تفسیر: پیچھے جزا وسزا کی تفصیل بیان ہوئی، اب آگے نبوت اور توحید کا مضمون ہے اور چونکہ توحید کی تحقیق رسالت سے خوب ہوتی ہے اس لیے زیادہ کلام رسالت ہی کے متعلق ہے۔

آپ کہہ دیجئے کہ (تم جو رسالت اور توحید کے مسئلہ میں مخالفت وانکار کرتے ہو تو تمہارا ہی نقصان ہے میرا کچھ ضرر نہیں، کیونکہ) میں تو (تم کو صرف عذاب خداوندی سے) ڈرانے والا (پیغمبر) ہوں، اور (جیسے میرا رسول اور منذر ہونا واقعی ہے اسی طرح توحید بھی برحق ہے، یعنی) بجز اللہ واحد غالب کے کوئی لائق عبادت کے نہیں ہے، وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان میں ہیں (اور وہ) زبردست (اور گناہوں کا) بڑا بخشنے والا ہے۔

* * *

فائدہ: ؎۱ میرا کام تو اتنا ہی ہے کہ تم کو اس آنے والی خوفناک گڑھے سے ہوشیار کردوں اور جو بھیانک مستقبل آنے والا ہے اس سے بے

خبر نہ رہنے دوں، باقی سابقہ جس حاکم سے پڑنے والا ہے، وہ تو وہ ہی اکیلا خدا ہے، جس کے سامنے کوئی چھوٹا بڑا دم نہیں مار سکتا، ہر چیز اس کے آگے دبی ہوئی ہے، آسمان و زمین اور ان کے درمیان کوئی چیز نہیں جو اس کے زیر تصرف نہ ہو، جب تک چاہے ان کو قائم رکھے، جب چاہے توڑ پھوڑ کر برابر کر دے، اس عزیز و غالب کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے، اس کے زبردست قبضہ سے کون نکل کر بھاگ سکتا ہے اور ساتھ ہی اس کی لامحدود رحمت و بخشش کو کس کی مجال ہے، محدود کر دے۔

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌ ﴿٦٧﴾ أَنتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ﴿٦٨﴾

تو کہہ یہ ایک بڑی خبر ہے، کہ تم اس کو دھیان میں نہیں لاتے [1]

خلاصہ تفسیر: چونکہ توحید کو تو کسی درجہ میں وہ لوگ مانتے بھی تھے اور رسالت کے بالکل ہی منکر تھے، اس لئے رسالت کی مزید تحقیق کے لئے ارشاد ہے کہ اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

آپ کہہ دیجئے کہ یہ (یعنی اللہ تعالیٰ کا مجھ کو توحید اور احکام شریعت کی تعلیم کے لئے رسول بنانا) ایک عظیم الشان مضمون ہے جس (کا تم کو بڑا اہتمام چاہئے تھا، مگر افسوس کہ اس) سے تم (بالکل ہی) بے پرواہ ہو رہے ہو (اور اس کے عظیم الشان مضمون ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اعتقاد رکھے بغیر حقیقی سعادت کا حاصل ہونا محال ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی قیامت اور اس کے احوال کوئی معمولی چیز نہیں، بڑی بھاری اور یقینی خبر ہے جو میں تم کو دے رہا ہوں عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ (النباء:۱-۲) مگر افسوس ہے کہ تم اس کی طرف سے بالکل بےفکر ہو، جو کچھ تمہاری خیر خواہی کو کہا جاتا ہے دھیان نہیں لاتے، بلکہ الٹا مذاق اڑاتے ہو کہ کب آئے گی، کیونکر آئے گی اور اتنی دیر کیوں ہی ہو رہی ہے، اسے جلد کیوں نہیں بلا لیتے، وغیرہ ذالک۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٦٩﴾ إِن يُوحَىٰ إِلَيَّ إِلَّا أَنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٧٠﴾

مجھ کو کچھ خبر نہ تھی اوپر کی مجلس کی جب وہ آپس میں تکرار کرتے ہیں، مجھ کو تو یہی حکم آتا ہے کہ اور کچھ نہیں میں تو ڈر سنا دینے والا ہوں کھول کر [1]

خلاصہ تفسیر: (آگے آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت ثابت کرنے کی ایک دلیل ہے وہ یہ کہ) مجھ کو عالم بالا (کی بحث و گفتگو کی (کسی ذریعہ سے) کچھ بھی خبر نہ تھی جبکہ وہ (آدم کی پیدائش کے بارے میں۔ جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے) گفتگو کر رہے تھے (اب میں جو اس گفتگو کا واقعہ بتا رہا ہوں تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ مجھے یہ واقعہ کہاں سے معلوم ہوا؟ میں نے بچشم خود تو اسے دیکھا نہیں، اہل کتاب سے بھی میرا ایسا میل جول نہیں کہ ان سے معلوم کر لیتا، یقیناً مجھے یہ علم وحی کے ذریعہ ہی حاصل ہوا ہے، لہٰذا ثابت ہو گیا کہ) میرے پاس (جو) وحی (آتی ہے جس سے عالم بالا کے احوال بھی معلوم ہوتے ہیں، تو) محض اس سبب سے آتی ہے کہ میں (اللہ کی طرف سے) صاف صاف ڈرانے والا (کر کے بھیجا گیا) ہوں (یعنی چونکہ مجھے پیغمبری ملی ہے، اس لئے وحی نازل ہوتی ہے، پس واجب ہے کہ تم میری رسالت کی تصدیق کرو)۔

إِذْ يَخْتَصِمُونَ: فرشتوں کی گفتگو کو یہاں "اختصام" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، جس کے لفظی معنی ہیں جھگڑا یا بحث و تکرار، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ فرشتوں کا سوال کوئی اعتراض یا بحث و مباحثہ کے نقطۂ نظر سے نہ تھا، فرشتے آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں حق تعالیٰ سے اپنی تسلی کے لیے گفتگو کر رہے تھے جیسے شاگرد استاذ سے سوال کیا کرتا ہے، اس گفتگو کو یہاں مجازاً تکرار کہہ دیا، کیونکہ سوال و جواب کی ظاہری صورت اسی کے مشابہ تھی، ورنہ حقیقت میں تو ملائکہ تکرار سے پاک ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ''ملاءِ اعلیٰ'' (اوپر کی مجلس) ملائکہ مقربین وغیرہم کی مجلس ہے، جن کے توسط سے تدابیر الٰہیہ اور تصریفات کونیہ ظہور پذیر ہوتی ہیں، یعنی ''ملاءِ اعلیٰ'' میں نظام عالم کے فناء و بقاء کے متعلق جو تدبیریں یا بحثیں اور قیل و قال ہوتی ہے، مجھے اس کی کیا خبر تھی جو تم سے بیان کرتا، اللہ تعالیٰ نے جن اجزاء پر مطلع فرما دیا وہ بیان کر دیے، جو کچھ کہتا ہوں اسی کی وحی و اعلام سے کہتا ہوں، مجھ کو یہ ہی حکم ملا ہے کہ سب کو اس آنے والے خوفناک مستقبل سے خوب کھول کھول کر آگاہ کروں، رہا یہ کہ وہ وقت کب آئے گا اور قیامت کب قائم ہوگی؟ نہ اندازے کے لیے اس کی ضرورت ہے، نہ اس کی اطلاع کسی کو دی گئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ چند انبیاء علیہم السلام کے ایک اجتماع میں قیامت کا ذکر چلا کہ کب آئے گی؟ سب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حوالہ کیا، انہوں نے فرمایا کہ مجھے علم نہیں، پھر سب نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حوالہ کیا، ان کی طرف سے بھی وہ ہی جواب ملا، آخر سب نے حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف رجوع کیا فرمایا: ''وحية الساعة'' (عین قیامت کے وقوع کی گھڑی) تو مجھے بھی معلوم نہیں، البتہ حق تعالیٰ نے مجھ سے یہ وعدہ کیا ہے، الخ۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ حضرت مسیح نے حضرت جبرائیل سے قیامت کے آنے کا وقت دریافت کیا، فرمایا: ''ما المسؤول عنها باعلم من السائل'' یعنی میں تم سے زیادہ نہیں جانتا۔

معلوم ہوا کہ ''ملاءِ الاعلیٰ'' میں قیامت کے متعلق اس قسم کی کچھ بحث و تکرار رہتی ہے اور اس کے علاوہ اور بہت مسائل ہیں، جن میں ایک طرح کی تکرار اور قیل و قال ہوتی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں اللہ تعالیٰ کا آپ سے کئی مرتبہ سوال کرنا: ''فيم يختصم الملاء الاعلى'' اور آپ کا جواب دینا مذکور ہے، مگر وہاں کے مباحثات کا علم بجز وحی الٰہی کے اور کس طرح ہو سکتا ہے، یہ ہی ذریعہ ہے جس سے اہل نار کے تخاصم پر آپ کو اطلاع ہوئی، اسی سے ''ملاءِ الاعلیٰ'' کے اختصام کی خبر لگی، اور جو تخاصم ابلیس کا آدم کے معاملہ میں ہوا، جس کا ذکر آگے آتا ہے، وہ بھی اسی ذریعہ سے معلوم ہوا۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّن طِينٍ ﴿٧١﴾

جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو میں بناتا ہوں ایک انسان مٹی کا ۱؎

فَإِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُۥ سٰجِدِينَ ﴿٧٢﴾

پھر جب ٹھیک بنا چکوں اور پھونکوں اس میں ایک اپنی جان ۲؎ تو تم گر پڑو اس کے آگے سجدہ میں

خلاصہ تفسیر: پیچھے عالم بالا کی گفتگو بذریعہ وحی معلوم ہونے سے رسالت پر استدلال کیا گیا تھا، اب آگے آدم علیہ السلام کا قصہ ہے جس میں فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کی تھی اور اگرچہ اس قصہ میں وہ گفتگو مذکور نہیں لیکن اسی گفتگو کے زمانہ کے واقعات مذکور ہیں۔

(عالم بالا کی اللہ تعالیٰ سے گفتگو جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے اس وقت ہوئی تھی) جبکہ آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں گارے سے ایک انسان کو (یعنی اس کے پتلے کو) بنانے والا ہوں، سو میں جب اس کو (یعنی اس کے جسمانی اعضاء کو) پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی (طرف سے) جان ڈالوں تو تم سب اس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا۔

إِنِّي خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّن طِينٍ: آدم علیہ السلام کی پیدائش کا مادہ کہیں گارا بتلایا گیا ہے، کہیں مٹی، اور کہیں کھنکھناتی پختہ مٹی تو اس میں کچھ تعارض نہیں، کیونکہ وہ پہلے مٹی ہی تھی، پھر اس کا گارا بنایا گیا، پھر وہ پختہ ہو گئی تھی تو کہیں پہلی حالت بتلا دی اور کہیں بعد کی حالت بتلا دی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''ایک یہ بھی تکرار تھی فرشتوں کی جو بیان فرمایا''۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ڈھانچہ ٹھیک تیار کر کے اپنی طرف سے ایک روح پھونکوں، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''کہ روحی (اپنی جان) اس لیے فرمایا کہ آب و خاک سے نہیں بنی، عالم غیب سے آئی''، کچھ مضمون ''روح'' کے متعلق سورہ بنی اسرائیل میں گزرا ہے، وہاں روح کی اس اضافت پر روشنی ڈالی گئی ہے، ملاحظہ کر لیا جائے۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾

پھر سجدہ کیا فرشتوں نے سب نے اکٹھے ہوکر، مگر ابلیس نے ۱؎ غرور کیا اور تھا وہ منکروں میں (سے) ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو (جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بنالیا تو) سارے کے سارے فرشتوں نے (آدم (علیہ السلام) کو) سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہ وہ غرور میں آگیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔

***

فائدہ: ۱؎ یہ قصہ سورہ بقرہ، سورہ اعراف وغیرہ کئی سورتوں میں گزر چکا، اعراف کے فوائد میں ہم نے مفصل بحث کی ہے، اسے ایک مرتبہ دیکھ لیا جائے۔

فائدہ: ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ (ابلیس اصل سے) جن تھا جو اکثر خدا کے حکم سے منکر ہے، لیکن اب (اپنی کثرت عبادت وغیرہ کے سبب سے) رہنے لگا تھا فرشتوں میں''۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ

فرمایا اے ابلیس! کس چیز نے روک دیا تجھ کو کہ سجدہ کرے اس کو جس کو میں نے بنایا اپنے دونوں ہاتھوں سے ۱؎

اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿۷۵﴾

یہ تو نے غرور کیا یا تو بڑا تھا درجہ میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابلیس! جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا (یعنی جس چیز کو وجود میں لانے کے لئے عنایت ربانی خاص طور پر متوجہ ہوئی، پھر اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم بھی دیا گیا تو) اس کو سجدہ کرنے سے تجھ کو کون سی چیز مانع ہوئی، کیا تو غرور میں آگیا؟ (اور واقع میں بڑا نہیں ہے) یا یہ کہ تو (واقع میں ایسے) بڑے درجہ والوں میں سے ہے (جس کو سجدہ کا حکم کرنا ہی زیبا نہ تھا)۔

***

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی بدن کو ظاہر کے ہاتھ سے اور روح کو غیب (باطن) کے ہاتھ سے، اللہ غیب کی چیزیں ایک طرح کی قدرت سے اور ظاہر کی چیزیں دوسری طرح کی قدرت سے بناتا ہے، اس انسان میں دونوں طرح کی قدرت خرچ کی''۔ (سورہ مائدہ میں پارہ ششم کے ختم کے قریب بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ کا فائدہ ملاحظہ کرلیا جائے) ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کی نعوت وصفات میں سلف کا مسلک ہی اقوی واحوط ہے۔

فائدہ: ۲؎ یا جان بوجھ کر اپنے کو بڑا بنانا چاہا، یا واقعے میں تو اپنا مرتبہ ہی اونچا سمجھتا ہے۔

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۷۶﴾

بولا میں بہتر ہوں اس سے، مجھ کو بنایا تو نے آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے

خلاصہ تفسیر: کہنے لگا کہ (دوسری بات صحیح ہے، یعنی) میں آدم سے بہتر ہوں (کیونکہ) آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس (آدم) کو خاک سے پیدا کیا ہے (پس مجھ کو یہ حکم دینا کہ اس کے سامنے سجدہ کروں حکمت کے خلاف ہے)۔

***

فائدہ: سورہ اعراف میں اس کا بیان گزر چکا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''آگ ہے گرم پر جوش اور مٹی سرد ہے خاموش، ابلیس نے آگ کو اچھا سمجھا اللہ نے اس مٹی کو پسند رکھا''۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٧٧﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ﴿٧٨﴾

فرمایا تو تو نکل یہاں سے کہ تو مردود ہوا ۱ اور تجھ پر میری پھٹکار ہے اس جزا کے دن تک ۲

خلاصہ تفسیر: ارشاد ہوا تو (اچھا پھر) آسمان سے نکل کیونکہ بیشک تو (اس حرکت سے) مردود ہو گیا اور بیشک تجھ پر میری لعنت رہے گی قیامت کے دن تک (اور اس کے بعد رحمت ہونے کا احتمال ہی نہیں ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بہشت میں فرشتوں کی صحبت میں جانا تھا، اب نکالا گیا۔

فائدہ: ۲ یعنی اس وقت تک تیرے اعمال کی بدولت پھٹکار بڑھتی جائے گی، بعدہ کیا ہوگا؟ اس کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، آگے آتا ہے: لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ وہاں جو لعنت ہوگی یہاں کی لعنتیں اس کے سامنے گرد ہو جائیں گی۔

قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٧٩﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٨٠﴾ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٨١﴾

بولا اے رب مجھ کو ڈھیل دے جس دن تک کہ مردے جی اٹھیں ۱ فرمایا تو تجھ کو ڈھیل ہے، اسی وقت کے دن تک جو معلوم ہے ۲

خلاصہ تفسیر: کہنے لگا (کہ اگر مجھ کو آدم کی وجہ سے مردود کیا ہے) تو پھر مجھ کو (مرنے سے) مہلت دیجئے قیامت کے دن تک (تا کہ ان سے اور ان کی اولاد سے خوب بدلہ لوں) ارشاد ہوا (جب تو مہلت مانگتا ہے) تو (جا) تجھ کو معین وقت کی تاریخ تک مہلت دی گئی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی صور کے دوسرے نفخہ تک۔

فائدہ: ۲ یعنی پہلے نفخہ کے قریب تک، اس کے بعد نہیں۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾

بولا تو قسم ہے تیری عزت کی میں گمراہ کرونگا ان سب کو، مگر جو بندے ہیں تیرے ان میں چنے ہوئے

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُولُ ﴿٨٤﴾ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكَ وَمِمَّن تَبِعَكَ مِنْهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٥﴾

فرمایا تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں ۱ مجھ کو بھرنا ہے دوزخ تجھ سے اور جو ان میں تیری راہ چلے ان سب سے

خلاصہ تفسیر: کہنے لگا (جب مجھ کو مہلت مل گئی) تو (مجھ کو بھی) تیری (ہی) عزت کی قسم (ہے) کہ میں ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں (یعنی آپ نے ان کو میرے اثر سے محفوظ رکھا ہے) ارشاد ہوا کہ میں سچ کہتا ہوں اور میں تو (ہمیشہ) سچ ہی کہا کرتا ہوں کہ میں تجھ سے اور جو ان میں سے تیرا ساتھ دے ان سب سے دوزخ بھر دوں گا۔

اس قصہ کے قریب قریب الفاظ سورہ اعراف اور سورہ حجر میں بھی آئے ہیں، اس قصہ کے متعلق ضروری مضامین ان دو مقامات پر ملاحظہ فرما لیے جائیں۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی میری سب باتیں سچی اور ٹھیک ہی ہوتی ہیں۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿٨٦﴾

کہہ میں مانگتا نہیں تم سے اس پر کچھ بدلہ اور میں نہیں اپنے آپ کو (بہ تکلف) بنانے والا

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿٨٨﴾ ع

یہ تو ایک فہمائش ہے سارے جہان والوں کو، اور معلوم کرلو گے اس کا احوال تھوڑی دیر کے پیچھے مدت کے بعد لہ

خلاصہ تفسیر: سورت کی ابتدائی آیات سے واضح ہے کہ اس سورت کا بنیادی مقصد آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات ہے، اس موضوع پر دلائل تو دیئے جاچکے، اب ناصحانہ طریقہ پر ایمان لانے کی دعوت دے کر سورت کا خاتمہ فرماتے ہیں۔

آپ (اتمام حجت کے طور پر) کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس (قرآن کی تبلیغ) پر نہ کچھ معاوضہ چاہتا ہوں اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں ہوں (کہ بناوٹ کی راہ سے نبوت کا دعویٰ کیا ہو، اور کسی دوسرے کے کلام کو خدا کا کلام کہہ دیا ہو، ایسا ہرگز نہیں، کیونکہ اگر میں جھوٹ بولتا تو اس کا منشاء یا تو کوئی مادی نفع ہوتا جیسے معاوضہ جس کو یہاں ''اجر'' کہا گیا، یا کوئی طبعی عادت ہوتی جس کو ''تکلف'' کہا گیا، سو مجھ میں یہ دونوں باتیں نہیں بلکہ فی الواقع) یہ قرآن تو (اللہ کا کلام اور) دنیا جہان والوں کے لئے بس ایک نصیحت ہے (جس کے پہنچانے کے لئے مجھ کو نبوت ملی ہے اور جس میں سراسر تمہارا ہی نفع ہے) اور (اگر حق کے واضح ہونے کے باوجود بھی تم نہیں مانتے تو) تھوڑے دنوں پیچھے تم کو اس کا حال معلوم ہوجائے گا (یعنی مرنے کے ساتھ ہی حقیقت کھل جائے گی کہ یہ حق تھا اور اس کا انکار باطل تھا، مگر اُس وقت معلوم ہونے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا)۔

وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ: اس آیت سے تکلف کی مذمت ثابت ہوتی ہے جس میں آج کل اکثر لوگ مبتلا ہیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ: اس سورت میں قرآن کریم کی تین جگہ مدح ہے اور تینوں جگہ اس کو ''ذکر'' یعنی نصیحت فرمایا گیا: ① ایک تو سورت کے شروع میں: وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ② دوسرے سورت کے درمیان میں: وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ③ تیسرے یہاں سورت کے اخیر میں: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی نصیحت سے غرض یہ ہے کہ اپنے دشمن اور دوست میں تمیز کرو، شیطان لعین جو ازلی دشمن ہے اس کی راہ مت چلو، نبیوں کا کہنا مانو جو تمہاری بہی خواہی کے لیے آئے ہیں، میں تم سے اس نصیحت کا کوئی صلہ یا معاوضہ نہیں مانگتا، نہ خواہ مخواہ اپنی طرف سے بنا کر کوئی بات کہتا ہوں، اللہ نے ایک فہمائش کی، وہ تمہارے تک پہنچا دی، تھوڑی مدت کے بعد تم خود معلوم کرلو گے کہ جو خبریں دی گئیں کہاں تک درست ہیں اور جو نصیحت کی گئی کیسی سچی اور مفید تھی۔

(ایاتھا ۷۵) (۳۹ سُوْرَۃُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ ۵۹) (رکوعاتھا ۸)

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت میں زیادہ مضامین رسالت کے متعلق تھے، اس سورت میں زیادہ توحید کے متعلق ہیں، اور بقیہ مضامین اس کے تابع ہیں، جیسے قرآن کی حقانیت جس سے یہ سورت شروع ہوئی ہے گزشتہ سورت بھی اسی مضمون پر ختم ہوئی تھی، اس طرح ہر دو سورتوں کے مضمون میں ربط کے ساتھ سابقہ سورت کا خاتمہ اس سورت کی ابتداء سے ہی مربوط ہو گیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①

اتارنا ہے کتاب کا اللہ سے جو زبردست ہے حکمتوں والا

خلاصہ تفسیر: یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے (کہ غالب ہونے کا تقاضہ یہ تھا کہ جو اس کو جھٹلائے اس کو سزا دے دی جائے، مگر چونکہ حکیم بھی ہے اور مہلت میں مصلحت تھی، اس لئے سزا میں مہلت دے رکھی ہے)۔

* * *

فائدہ: چونکہ ''زبردست'' ہے، اس لیے اس کتاب کے احکام پھیل کر اور نافذ ہو کر رہیں گے، کوئی مقابل و مزاحم اس کے شیوع و نفاذ کو روک نہیں سکتا، اور ''حکیم'' ہے اس لیے دنیا کی کوئی کتاب اس کی خوبیوں اور حکمتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ② اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ

میں (ہم) نے اتاری ہے تیری طرف کتاب ٹھیک ٹھیک سو بندگی کر اللہ کی خالص کر کر اسکے واسطے بندگی، سنتا ہے اللہ ہی کیلئے ہے بندگی خالص ۱۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ (وقف لازم)

اور جنہوں نے پکڑ (بنا) رکھے ہیں اس سے ورے حمایتی کہ ہم تو انکو پوجتے ہیں اس واسطے کہ ہم کو پہنچا دیں اللہ کی طرف قریب (پاس) کے درجہ میں

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۬ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ③

بیشک اللہ فیصلہ کر دے گا ان میں جس چیز میں وہ جھگڑتے ہیں ۲۔ البتہ اللہ راہ (رستہ) نہیں دیتا اسکو جو ہو جھوٹا حق نہ ماننے والا (ناشکرا) ۳۔

خلاصہ تفسیر: ہم نے ٹھیک طور پر اس کتاب کو آپ کی طرف نازل کیا ہے سو آپ (قرآن کی تعلیم کے موافق) خالص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کرتے رہیے (جیسا اب تک کرتے رہے ہیں اور جب آپ پر بھی عبادت اور خالص اعتقاد واجب ہے تو اوروں پر کیوں واجب نہیں ہوگا، اے لوگو) یاد رکھو عبادت جو کہ (شرک وریا سے) خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے اور جن لوگوں نے (عبادت خالصہ چھوڑ کر) خدا کے سوا اور شرکاء تجویز کر رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں (یعنی ہماری حاجات وعبادات کو خدا کے حضور پیش کریں جیسا کہ دنیا میں بادشاہوں کے دربار میں وزراء اسی کام کے ہوتے ہیں) تو ان کے (اور ان کے مقابل اہل ایمان کے) باہمی اختلافات کا (قیامت کے روز) اللہ تعالیٰ (عملی) فیصلہ کر دے گا (کہ اہل توحید کو جنت میں اور اہل شرک کو دوزخ میں داخل کر دے گا، یعنی ان لوگوں

کے نہ ماننے پر آپ غم نہ کریں ان کا فیصلہ وہاں ہوگا، اور اس کا بھی تعجب نہ کریں کہ باوجود دلائل قائم ہونے کے یہ لوگ حق پر نہیں آتے کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو راہ پر نہیں لاتا جو (قولاً) جھوٹا اور (اعتقاداً) کافر ہو (یعنی منہ سے کفریہ اقوال بکتا ہو، اور دل سے کفریہ عقائد پر جما ہوا ہو، اور اس سے باز آنے اور حق طلب کرنے کا قصد ہی نہ کرتا ہو تو اس کے اس عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی اس کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا)۔

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ: اس میں اخلاص کا حکم ہے، جتنے بھی انسان کے رتبے اور درجے ہیں ان تمام تک پہنچنے کے لیے تمام امور کے اندر اخلاص کا ہونا ضروری ہے اور اسی کا آیت میں حکم ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ: اس میں دلالت ہے کہ اللہ کی صفات غیروں کے لیے ثابت کرنا مطلقا برا ہے، اس بارے میں بالذات وبالغیر (ما بالذات اور ما بالعرض) کی فلسفیانہ موشگافیاں کچھ نافع ومفید نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ: روح المعانی میں ہے کہ اس میں الفاظ کے عموم کی طرف نظر کرتے ہوئے اس شخص کے لیے دھمکی وتنبیہ کی طرف اشارہ ہے جو اپنے لیے ولایت کے کسی رتبہ کا جھوٹا دعوی کرے، اور لَا يَهْدِيْ میں اس کے محروم ہونے کی طرف اشارہ ہے (یعنی جو شخص ولایت کے کسی مرتبے کا جھوٹا دعوی کرے اس کے لیے ہمیشہ محرومی ہے، وہ توبہ کے بغیر راہ راست پر نہیں آسکتا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی حسب معمول اللہ کی بندگی کرتے رہیے، جو شوائب شرک وریاء وغیرہ سے پاک ہو، اسی کی طرف قولاً وفعلاً لوگوں کو دعوت دیجئے اور اعلان کر دیجئے کہ اللہ اسی بندگی کو قبول کرتا ہے جو خالص اسی کے لیے ہو، عمل خالی از اخلاص کی اللہ کے ہاں کچھ پوچھ نہیں۔

فائدہ: ۲؎ عموماً مشرک لوگ یہ ہی کہا کرتے ہیں کہ ان جھوٹے خداؤں اور دیوتاؤں کی پرستش کر کے ہم بڑے خدا سے نزدیک ہو جائیں گے اور وہ ہم پر مہربانی کرے گا، جس سے ہمارے کام بن جائیں گے، اس کا جواب دیا کہ ان لچر پوچ حیلوں سے توحید خالص میں جو جھگڑے ڈال رہے ہو، اور اہل حق سے اختلاف کر رہے ہو، اس کا عملی فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آگے چل کر ہو جائے گا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جس نے دل میں یہ ہی ٹھان لی کہ کبھی سچی بات کو نہ مانوں گا، جھوٹ اور ناحق ہی پر ہمیشہ اڑا رہوں گا، منعم حقیقی کو چھوڑ کر جھوٹے محسنوں ہی کی بندگی کروں گا، اللہ کی عادت ہے کہ ایسے بد باطن کو فوز وکامیابی کی راہ نہیں دیتا۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ④

اگر اللہ چاہتا کہ اولاد کرلے تو چن لیتا اپنی خلق میں سے جو کچھ چاہتا، وہ پاک ہے ۱؎ وہی ہے اللہ اکیلا دباؤ والا (زور آور) ۲؎

خلاصہ تفسیر: چونکہ مشرکین میں بعض خدا کی طرف اولاد کی نسبت کرتے تھے، جیسے مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، اب آگے ان کا رد ہے کہ:

اگر (بالفرض) اللہ تعالیٰ (کسی کو اپنی اولاد بناتا تو چونکہ ارادہ خداوندی کے بغیر کوئی فعل واقع نہیں ہوتا، اول اولاد بنانے کا ارادہ کرتا اور اگر) کسی کو اولاد بنانے کا ارادہ کرتا تو (چونکہ خدا کے سوا سب مخلوق ہیں، اور ظاہر ہے کہ مخلوق خالق کی جنس نہیں، اس لئے) ضرور اپنی مخلوق (ہی) میں سے جس کو چاہتا (اس امر کے لئے) منتخب فرماتا (اور لازم باطل ہے کیونکہ) وہ (عیوب سے) پاک ہے (اور اولاد کا غیر جنس ہونا بڑا عیب ہے اس لئے مخلوق میں سے کسی کا خدا کی اولاد ہونا محال ہے، پس شرک کی یہ صورت بھی باطل ہوگئی، اس طرح ثابت ہوگیا کہ) وہ ایسا اللہ ہے جو واحد ہے (کہ اس وقت۔ بالقوۃ۔ کوئی اس کا شریک نہیں اور) زبردست ہے (کہ نہ۔ بالفعل۔ آئندہ کوئی اس کا شریک ہوسکتا ہے، کیونکہ شریک ہونے کی صلاحیت کسی میں جب ہوتی جب کوئی ویسا ہی زبردست ہوتا، حالانکہ ایسا کوئی نہیں)۔

* * *

فائدہ: لہ یہاں سے ان کا رد ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے ہیں، جیسا کہ نصاریٰ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، اور ساتھ ہی تین خداؤں میں کا ایک خدا مانتے ہیں، یا عرب کے بعض قبائل فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، مطلب یہ ہے کہ اگر بفرض محال اللہ یہ ارادہ کرتا کہ اس کی کوئی اولاد ہو تو ظاہر ہے وہ اپنی مخلوق ہی میں سے کسی کو اس کام کے لیے چنتا، کیونکہ دلائل سے ثابت ہو چکا کہ ایک خدا کے سوا جو کوئی چیز ہے سب اسی کی مخلوق ہے، اب ظاہر ہے کہ مخلوق اور خالق میں کسی درجہ میں بھی نوعی یا جنسی اشتراک نہیں، پھر ایک دوسرے کا باپ یا بیٹا کیسے بن سکتا ہے؟! اور جب مخلوق و خالق میں یہ رشتہ محال ہے تو اللہ کی طرف سے ایسا ارادہ کرنا بھی محال ہوگا، علاوہ بریں فرض کیجیے یہ چیز محال نہ ہوتی تب بھی فرشتوں کو بیٹیاں بنانا تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا تھا، جب مخلوق میں سے انتخاب کی ٹھہرتی تو اس کا کیا مطلب کہ خدا اپنے لیے گھٹیا چیز انتخاب کرتا اور بڑھیا اولاد چن چن کر تمہیں دے دیتا۔

فائدہ: ۲ یعنی ہر چیز اسکے سامنے دبی ہوئی ہے، اس پر کسی کا دباؤ نہیں، نہ کسی چیز کی اسے حاجت، پھر اولاد بنانا آخر کس غرض سے ہوگا۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ

بنائے آسمان اور زمین ٹھیک، لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر لہ

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ⑤

اور کام میں لگا دیا سورج اور چاند کو، ہر ایک چلتا ہے ایک ٹھہری ہوئی مدت پر، سنتا ہے وہی ہے زبردست گناہ بخشنے والا ۲

خلاصہ تفسیر: (آگے توحید کے دلائل ارشاد فرماتے ہیں کہ) اس نے زمین اور آسمان کو حکمت سے پیدا کیا، وہ رات (کی ظلمت) کو دن (کی روشنی کے محل یعنی ہوا) پر لپیٹتا ہے (جس سے رات غائب اور دن آجاتا ہے) اور اس نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے کہ (ان میں) ہر ایک وقت مقررہ تک چلتا رہے گا یاد رکھو کہ (ان دلائل کے بعد توحید کے انکار سے عذاب کا اندیشہ ہے، اور اللہ تعالیٰ اس پر قادر بھی ہے کیونکہ) وہ زبردست ہے (لیکن اگر انکار کے بعد پھر کوئی توحید کو مان لے تو پہلے انکار پر عذاب نہ دے گا، کیونکہ وہ) بڑا بخشنے والا (بھی) ہے (اس میں توحید کی رغبت دلائی اور شرک سے ڈرایا)۔

يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ: روح المعانی میں ہے کہ اس میں سالکین یعنی اللہ والوں کے احوال کے تعاقب کی طرف اشارہ ہے جیسے قبض و بسط، صحو و سکر، جمع و فرق اور تجلی و استتار وغیرہ۔

* * *

فائدہ: لہ مغرب کے وقت مشرق کی طرف دیکھو، معلوم ہوگا کہ افق سے ایک چادر تاریکی کی اٹھتی ہوئی چلی آرہی ہے اور اپنے آگے سے دن کی روشنی کو مغرب کی طرف صف کی طرح لپیٹی جاتی ہے، اسی طرح صبح صادق کے وقت نظر آتا ہے کہ دن کا اجالا رات کی ظلمت کو مشرق سے دھکیلتا ہوا آرہا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''ایک پر دوسرا چلا آتا ہے، توڑ نہیں پڑتا''۔

فائدہ: ۲ یعنی اس زبردست قدرت سے یہ انتظام قائم کیا اور تھام رکھا ہے، لوگوں کی گستاخیاں اور شرارتیں تو ایسی ہیں کہ سب نظام درہم برہم کر دیا جائے لیکن وہ بڑا بخشنے والا اور درگزر کرنے والا ہے، اپنی شان عفو و مغفرت سے ایک دم ایسا نہیں کرتا۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ

بنایا تم کو ایک جی (شخص) سے پھر بنایا اسی سے اس کا جوڑا لہ اور اتارے تمہارے واسطے چوپاؤں سے آٹھ

آزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

نر مادہ ۲؎ بناتا ہے تم کو ماں کے پیٹ میں ایک طرح پر دوسری طرح کے پیچھے ۳؎ تین اندھیروں کے بیچ ۴؎ وہ اللہ ہے

رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝۶

رب تمہارا اسی کا راج ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا پھر کہاں سے پھرے جاتے ہو ۵؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے آفاقی یعنی تخلیق ونظام کائنات کے دلائل سے توحید پر استدلال تھا، اب آگے انسانی نفس سے توحید پر استدلال ہے، جس میں ضمنی طور پر کچھ آفاقی احوال بھی آ گئے ہیں۔

اس نے تم لوگوں کو تن واحد (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا (کہ اول آدم علیہ السلام کو تنہا پیدا کیا) پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا (مراد اس سے حوا ہیں، آگے پھر ان سے تمام آدمی پھیلا دیئے) اور (اس کے بعد) تمہارے (نفع وبقاء کے لئے) آٹھ نر و مادہ چار پایوں کے پیدا کئے (جن کا ذکر آٹھویں پارہ کی آیت ۱۴۳ و ۱۴۴ میں گذر چکا ہے، اب آگے نسل انسانی کے پیدا ہونے کی کیفیت بیان فرماتے ہیں کہ) وہ تم کو ماؤں کے پیٹ میں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر (اور دوسری کیفیت کے بعد تیسری کیفیت پر، یعنی یکے بعد دیگرے مختلف کیفیات پر) بناتا ہے (کہ اول نطفہ ہوتا ہے، پھر علقہ، پھر مضغہ الی آخرہ اور یہ بنانا) تین تاریکیوں میں (ہوتا ہے ایک تاریکی پیٹ کی، دوسری رحم کی، تیسری اس جھلی کی جس میں بچہ لپٹا ہوتا ہے، پس ان مختلف کیفیتوں میں پیدا کرنا کمال قدرت کی دلیل ہے اور تین تاریکیوں میں پیدا کرنا کمال علم کی دلیل ہے) یہ ہے اللہ تمہارا رب (جس کی صفات ابھی تم نے سنیں) اسی کی سلطنت ہے، اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، سو (ان دلائل کے بعد) تم کہاں (حق سے) پھرے چلے جا رہے ہو (بلکہ واجب ہے کہ توحید کو قبول کرو اور شرک کو چھوڑ دو)۔

مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ: ان آٹھ نر و مادہ کو خصوصیت سے شاید اس لیے بیان کیا کہ یہ مختلف اعتبار سے انسانوں کے زیادہ کام آتے ہیں، یہاں یہی وہ جز ہے جو آفاقی حالات ودلائل میں سے ضمنی طور پر مذکور ہوا، ضمنی طور پر اس لیے کہا گیا کیونکہ یہاں توحید پر استدلال کے لیے انسانی نفس کی بقا کو بیان کرنا مقصود ہے اور یہ چوپائے بھی انسانی بقا کے اسباب میں سے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا: یعنی آدم علیہ السلام اور ان کا جوڑا حضرت حواء۔

فائدہ: ۲؎ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ: یعنی تمہارے نفع اٹھانے کے لیے چوپایوں میں آٹھ نر و مادہ پیدا کیے، اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری جن کا ذکر سورہ انعام میں گزر چکا۔

فائدہ: ۳؎ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ: یعنی بتدریج پیدا کیا، مثلاً نطفہ سے علقہ بنایا، علقہ سے مضغہ بنایا، پھر ہڈیاں بنائیں اور ان پر گوشت منڈھا، پھر روح پھونکی۔

فائدہ: ۴؎ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ: ① ایک پیٹ اور ② دوسرا رحم ③ تیسری جھلی جس کے اندر بچہ ہوتا ہے، وہ جھلی بچہ کے ساتھ نکلتی ہے۔

فائدہ: ۵؎ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ: یعنی جب خالق، رب، مالک اور ملک وہ ہی ہے تو معبود اس کے سوا کون ہو سکتا ہے، خدائے واحد کے لیے ان صفات کا اقرار کرنے کے بعد دوسرے کی بندگی کیسی؟!! مطلب کے اتنا قریب پہنچ کر کدھر پھرے جاتے ہو؟!!۔

اِنۡ تَكۡفُرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنۡكُمۡ وَلَا يَرۡضٰى لِعِبَادِهِ الۡكُفۡرَ ۚ وَاِنۡ تَشۡكُرُوۡا يَرۡضَهُ لَكُمۡ ؕ

اگرتم منکر ہو گے تو اللہ پروا نہیں رکھتا تمہاری، اور پسند نہیں کرتا اپنے بندوں کا منکر ہونا ۱؎ اور اگر اسکا حق مانو گے تو اسکو (اسے) تمہارے لیے پسند

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ مَّرۡجِعُكُمۡ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ؕ

کریگا ۲؎ اور نہ اٹھائے گا کوئی اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا ۳؎ پھر اپنے رب کی طرف تم کو پھر جانا ہے تو وہ جتلائے گا تم کو جو تم کرتے تھے

اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۷

مقرر اس کو خبر ہے دلوں کی بات کی ۴؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال تھا، اب آگے کفر وشرک کی قباحت اور کفار کی مذمت اور کفر پر دھمکی اور ایمان کا پسندیدہ ہونا اور مخلص مسلمانوں کی تعریف اور ان کے لیے مزید لطف کا وعدہ بیان کیا جاتا ہے۔

(اے لوگو! تم نے شرک وکفر کا باطل ہونا سن لیا، اس کے بعد بھی) اگر تم کفر کرو گے (جس میں شرک بھی داخل ہے) تو خدا تعالیٰ (کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ وہ) تمہارا (اور تمہاری عبادت کا) حاجت مند نہیں (کہ تمہارے عبادت وتوحید اختیار نہ کرنے سے اس کو کچھ نقصان پہنچے) اور (یہ بات ضرور ہے کہ) وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا (کیونکہ کفر سے بندوں کو نقصان پہنچتا ہے) اور اگر تم شکر کرو گے (جس کی بڑی فرد ایمان ہے کہ اسی پر شکر کی تمام صورتیں موقوف ہیں) تو (اس کو کوئی نفع نہیں مگر چونکہ تمہارا نفع ہے اس لئے وہ) اس کو تمہارے لئے پسند کرتا ہے، اور (چونکہ ہمارے یہاں قاعدہ مقرر ہے کہ) کوئی کسی کا بوجھ (گناہ) کا نہیں اٹھاتا (اس لئے کفر کر کے یوں بھی نہ سمجھنا کہ ہمارا کفر دوسرے کے نامہ اعمال میں کسی وجہ سے درج ہوجائے گا اور ہم بری ہوجائیں گے، یا تو اس وجہ سے کہ ہم دوسروں کے متبع ہیں، خواہ اپنے زمانہ والوں کے یا پہلے باپ دادوں کے، یا اس وجہ سے کہ دوسرے لوگ ہمارا بوجھ اٹھانے کا وعدہ کررہے ہیں جیسا کہ بعض کفار کہا کرتے تھے: **ولنحمل خطیکم** کہ ہم تمہارے گناہ اپنے سر دھرلیں گے، غرض یہ نہ ہوگا بلکہ تمہارا کفر تمہارے ہی جرائم میں لکھا جائے گا) پھر اپنے پروردگار کے پاس تم کو لوٹ کر جانا ہوگا سو وہ تمہارے سب اعمال تم کو جتلا دے گا (اور سزا دے گا پس یہ گمان بھی غلط ہے کہ ان کے اعمال کی پیشی کا وقت نہ آئے گا، اور) وہ دلوں تک کی باتوں کو جاننے والا ہے (پس یہ گمان بھی مت کرنا کہ ہمارے کفر کی شاید اس کو اطلاع نہ ہو جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ بعض لوگوں میں گفتگو ہوئی کہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ ہماری باتیں سنتا ہے یا نہیں، کسی نے کچھ جواب دیا کسی نے کچھ جواب دیا جس پر یہ آیت نازل ہوئی: **وما کنتم تستترون ان یشھد** الخ)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی کافر بن کر اس کے انعامات وحقوق کا انکار کرو گے تو تمہارا ہی نقصان ہے، اس کا کچھ نہیں بگڑتا، ہاں! یہ ضرور ہے کہ وہ کفر سے راضی نہیں، اپنے بندوں کے کافر ومنکر بننے سے ناخوش ہوتا ہے اور اس چیز کو ان کے لیے ناپسند کرتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بندے اس کا حق مان کر مطیع وشکر گزار بنیں، یہ بات اس کو پسند ہے، جس کا نفع ان ہی [بندوں] کو پہنچتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ناشکری کوئی کرے اور پکڑا کوئی جائے، ایسا اندھیر اس کے یہاں نہیں، جو کرے گا سو بھرے گا۔

فائدہ: ۴؎ یعنی وہاں جا کر سب کے اچھے برے عمل سامنے رکھ دیئے جائیں گے، کوئی چھوٹا بڑا کام نہ ہوگا، کیونکہ خدا کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں، دلوں کی تہہ میں جو بات چھپی ہوئی ہو، اسے بھی جانتا ہے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ

اور جب آ لگے انسان کو سختی پکارے اپنے رب کو رجوع ہو کر اس کی طرف پھر جب بخشے اس کو نعمت اپنی طرف سے بھول جائے اس کو کہ جس کیلئے

يَدْعُوٓا إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ أَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ

پکار رہا تھا پہلے سے اور ٹھہرائے اللہ کے برابر اوروں کو تا کہ بہکائے اسکی راہ سے ۱؎ تو کہہ برت لے ساتھ اپنے کفر (باوجود اپنے منکر ہونے) کے

قَلِيلًا ۖ إِنَّكَ مِنْ أَصْحٰبِ النَّارِ ﴿٨﴾

تھوڑے دنوں، تو ہے دوزخ والوں میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (مشرک) آدمی (کی حالت یہ ہے کہ اس) کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب (حقیقی) کو اسی کی طرف رجوع ہو کر پکارنے لگتا ہے (اور اس کے سوا سب معبودوں کو بھول جاتا ہے) پھر جب اللہ تعالیٰ اس کو اپنے پاس سے (امن و آسائش کی) نعمت عطا فرما دیتا ہے تو جس (تکلیف کو ختم کرنے) کے لئے پہلے سے (خدا کو) پکار رہا تھا اس کو بھول جاتا ہے (اور غافل ہو جاتا ہے) اور خدا کے شریک بنانے لگتا ہے جس کا اثر (اپنے گمراہ ہونے کے علاوہ) یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے دوسروں کو (بھی) گمراہ کرتا ہے (اور اگر اس مصیبت کو پیش نظر رکھتا تو توحید میں اخلاص کو قائم رکھتا، یہ تو مشرک کی مذمت ہوگئی، آگے عذاب سے ڈرانا ہے کہ) آپ (ایسے شخص سے) کہہ دیجئے کہ اپنے کفر کی بہار تھوڑے دنوں اور لوٹ لے (پھر آخر کار) تو دوزخیوں میں سے ہونے والا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی انسان کی حالت عجیب ہے، مصیبت پڑنے پر تو ہمیں یاد کرتا ہے، کیونکہ دیکھتا ہے کوئی مصیبت کو ہٹانے والا نہیں، پھر جہاں اللہ کی مہربانی سے ذرا آرام و اطمینان نصیب ہوا، معاً وہ پہلی حالت بھول جاتا ہے، جس کے لیے ابھی ابھی ہم کو پکار رہا تھا، عیش و تنعم کے نشہ میں ایسا مست و غافل ہو جاتا ہے گویا کبھی ہم سے واسطہ ہی نہ تھا، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو دوسرے جھوٹے اور من گھڑت خداؤں کی طرف منسوب کرنے لگتا ہے اور ان کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو خدائے واحد کے ساتھ کرنا چاہیے تھے، اس طرح خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور اپنے قول و فعل سے دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اچھا کافر رہ کہ چند روز یہاں اور عیش اڑا لے اور خدا نے جب تک مہلت دے رکھی ہے دنیا کی نعمتوں سے تمتع کرتا رہ، اس کے بعد تجھے دوزخ میں رہنا ہے جہاں سے کبھی چھٹکارا نصیب نہ ہوگا۔

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ

بھلا ایک جو بندگی میں لگا ہوا ہے رات کی گھڑیوں میں سجدے کرتا ہوا اور کھڑا ہوا خطرہ رکھتا ہے آخرت کا اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی مہربانی کی

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ؕ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿٩﴾ ع ۱۵

تو کہہ کوئی برابر ہوتے ہیں سمجھ والے اور بے سمجھ، سوچتے وہی ہیں جن کو عقل ہے

خلاصہ تفسیر: (اب اہل توحید کی مدح و بشارت ہے) بھلا جو شخص (مذکورہ مشرک کے برعکس) اوقات شب میں (جو عموماً غفلت کا وقت ہوتا ہے) سجدہ و قیام (یعنی نماز) کی حالت میں عبادت کر رہا ہو (یہ تو اس کا ظاہر ہے، اور باطن یہ کہ) آخرت سے ڈر رہا ہو اور اپنے پروردگار کی رحمت کی امید (بھی) کر رہا ہو (کیا ایسا شخص اور مذکورہ مشرک برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ بندگی اور سجدہ و قیام کرنے والا اور اللہ

سے ڈرنے والا بھی ہے اور اس سے امید عفو و کرم رکھنے والا بھی، یہ اچھا ہے، اور مشرک جو مطلب نکال لینے کے بعد اخلاص و توحید کو چھوڑ دیتا ہے برا ہے، اور چونکہ ان عبادات کے چھوڑنے کو کفار برا نہ سمجھتے تھے، اس لئے اس فرق کی بناء پر اپنے برے ہونے اور مسلمانوں کے اچھے ہونے میں ان کو شبہ ہو سکتا تھا، اس لئے آگے اس سے زیادہ واضح عنوان سے اس حکم کو ثابت فرماتے ہیں، یعنی اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ (ان سے اس عنوان سے) کہیے کہ علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں (چونکہ جہل کو ہر شخص برا سمجھتا ہے، اس کے جواب میں ان کی طرف سے بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ جہل والے برے ہیں، اب یہ ثابت کرنا رہ جائے گا کہ صاحب علم وہ ہے جو عمل بھی کرتا ہے اور جو عمل سے اعراض کرے وہ جاہل ہے، سو یہ بات ذرا تامل سے ثابت ہے اور ہر چند کہ اس بیان سے کفر و اہل کفر کا برا ہونا اور ایمان و اہل ایمان کا اچھا ہونا ثابت ہو گیا لیکن پھر بھی) وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل (سلیم) ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جو بندہ رات کی نیند اور آرام چھوڑ کر اللہ کی عبادت میں لگا، کبھی اس کے سامنے دست بستہ کھڑا رہا، سجدہ میں گرا، ایک طرف آخرت کا خوف اس کے دل کو بے قرار کیے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اللہ کی رحمت نے ڈھارس بنا رکھی ہے، کیا یہ سعید بندہ اور وہ بد بخت انسان جس کا ذکر اوپر ہوا کہ مصیبت کے وقت خدا کو پکارتا ہے اور جہاں مصیبت کی گھڑی ٹلی خدا کو چھوڑ بیٹھا، دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں!! ایسا ہو تو یوں کہو کہ ایک عالم اور جاہل یا سمجھدار اور بے وقوف میں کچھ فرق نہ رہا، مگر اس بات کو بھی وہ سوچتے سمجھتے ہیں جن کو اللہ نے عقل دی ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ

تو کہہ اے بندوں میرے ۱ جو یقین لائے ہو ڈرو اپنے رب سے، جنہوں نے نیکی کی اس دنیا میں ان کے لیے بھلائی ۲ اور زمین اللہ کی

وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ⑩

کشادہ ہے، صبر کرنے (سہارنے) والوں ہی کو ملتا ہے ان کا ثواب بیشمار ۳

خلاصہ تفسیر: جب ایمان و اطاعت والوں کا اللہ کے ہاں اچھا ہونا معلوم ہو گیا تو اب اطاعت کی ترغیب دیتے ہیں:

آپ (مومنین کو میری طرف سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے ایمان والے بندوں! تم اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو (یعنی نیکی پر دوام اور گناہوں سے پرہیز کرو کہ یہ سب تقوی کی شاخیں ہیں، اب آگے اس کا ثمرہ ہے کہ) جو لوگ اس دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیک صلہ ہے (آخرت میں تو ضرور اور دنیا میں بھی باطنی راحت تو ضرور حاصل ہوتی ہے اور کبھی ظاہر میں بھی راحت میسر ہوتی ہے) اور (اگر تم کو وطن میں رہ کر نیک کام کرنے میں کوئی رکاوٹ ہو تو ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جاؤ کیونکہ) اللہ کی زمین فراخ ہے (اور اگر وطن چھوڑنے میں کچھ تکلیف پہنچے تو اس میں استقلال سے کام لو، کیونکہ دین میں) مستقل رہنے والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا (پس اس سے ترغیب اطاعت کی ہو گئی)۔

بے شمار کا مطلب یہ ہے کہ بہت زیادہ ملے گا، کیونکہ اشیاء کا متناہی ہونا ثابت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ کی طرف سے یہ پیغام پہنچا دو۔

فائدہ: ۲ ① یعنی جس نے دنیا میں نیکی کی آخرت میں اس کے لیے بھلائی دے ② یا یہ مطلب ہے کہ جس نے نیکی کی، اس کو آخرت سے پہلے اسی دنیا میں بھلائی ملے گی، ظاہری یا باطنی۔

فائدہ: ۳ یعنی اگر ایک ملک میں لوگ نیک راہ چلنے سے مانع ہوں تو خدا کی زمین کشادہ ہے، دوسرے ملک میں چلے جاؤ، جہاں آزادی

سے اس کے احکام بجالا سکو، بلاشبہ اس طرح ترک وطن کرنے میں بہت مصائب برداشت کرنا پڑیں گی اور طرح طرح کے خلاف عادت وطبیعت امور پر صبر کرنا پڑے گا، لیکن یاد رہے کہ بیشمار ثواب بھی ملے گا تو صرف صبر کرنے والوں ہی کو ملے گا، اس کے مقابلہ میں دنیا کی سب سختیاں اور تکلیفیں ہیچ ہیں۔

قُلْ إِنِّيٓ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۱۱﴾ وَأُمِرْتُ لِأَنْ أَكُوْنَ أَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲﴾

تو کہہ مجھ کو حکم ہے کہ بندگی کروں اللہ کی خالص کر کر اس کے لیے بندگی، اور حکم ہے کہ میں ہوں سب سے پہلے حکم بردار ۱؎

قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳﴾

کہہ میں ڈرتا ہوں اگر حکم نہ مانوں اپنے رب کا ایک بڑے دن کے عذاب سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے شرک وکفر کا برا ہونا مذکور تھا، اب صراحتاً ایمان کا حکم دیتے ہیں اور شرک وکفر سے اشارتاً منع فرماتے ہیں۔

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو (اللہ کی طرف سے) حکم ہوا ہے کہ میں اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھوں (یعنی اس میں شرک کا شائبہ نہ ہو) اور مجھ کو (یہ بھی) حکم ہوا ہے کہ (اس امت کے لوگوں میں) سب مسلمانوں میں اول (اسلام کو حق ماننے والا) میں ہوں (اور ظاہر ہے کہ نبی کا احکام قبول کرنے میں سب سے پہلے ہونا ضروری ہے، اور) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ اگر (بفرض محال) میں اپنے رب کا کہنا نہ مانوں تو میں ایک بڑے دن (یعنی قیامت) کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ: مطلب یہ کہ توحید خالص کا واجب ہونا اور اس کے چھوڑنے پر عذاب کا مستحق ہونا ایسا ہے کہ اس قاعدہ سے نبی معصوم بھی مستثنیٰ نہیں، حالانکہ نبی سے معصیت کا احتمال ہی نہیں، تو پھر غیر معصوم تو کس شمار میں ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ چنانچہ آپ "عالم شہادت" میں اس امت کے لحاظ سے، اور "عالم غیب" میں تمام اولین و آخرین کے اعتبار سے اللہ کے سب سے پہلے حکم بردار بندے ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

فائدہ: ۲؎ یعنی مجھ جیسا معصوم ومقرب بھی اگر بفرض محال نافرمانی کرے تو اس دن کے عذاب سے مامون نہیں تا بدیگراں چہ رسد۔

قُلِ اللّٰهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ ﴿۱۴﴾ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ۭ قُلْ إِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ

تو کہہ میں تو اللہ کو پوجتا ہوں خالص کر کر اپنی بندگی اسکے واسطے، اب تم پوجو جس کو چاہو اسکے سوا ۱؎ تو کہہ بڑے ہارنے والے وہ جو

خَسِرُوْٓا أَنْفُسَهُمْ وَأَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ أَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۵﴾ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ

ہار بیٹھے اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن، سنتا ہے یہی ہے صریح ٹوٹا ۲؎ ان کے واسطے اوپر سے

ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۭ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۭ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿۱۶﴾

بادل ہیں آگ کے اور نیچے سے بادل ۳؎ اس چیز سے ڈراتا ہے اللہ اپنے بندوں کو، اے بندوں میرے تو مجھ سے ڈرو ۴؎

خلاصہ تفسیر: اور آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (مجھے جس بات کا حکم ہوا ہے میں تو اسی پر کاربند ہوں چنانچہ) میں تو اللہ ہی کی عبادت اس طرح کرتا ہوں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھتا ہوں (جس میں شرک کا ذرا سا شائبہ نہیں) تو (اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم بھی ایسی ہی خالص عبادت کرو لیکن اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو اور) خدا کو چھوڑ کر تمہارا دل جس چیز (کی عبادت) کو چاہے اس کی عبادت کرو (قیامت کے روز اس کا

مزہ چکھو گے اور) آپ ان سے (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ پورے زیاں کار وہی لوگ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے قیامت کے روز خسارے میں پڑے (یعنی نہ اپنی جان سے ان کو کوئی فائدہ پہنچا کہ رحمت اور نجات نصیب ہوتی، اور نہ اپنے متعلقین سے فائدہ حاصل ہوا، کیونکہ وہ متعلقین بھی اگر انہیں کی طرح گمراہ تھے تو وہ بھی عذاب میں گرفتار ہوں گے دوسروں کو کیا فائدہ پہنچائیں گے اور اگر وہ مومن مخلص ہو کر جنت میں ہوں گے تو بھی وہ کافروں کی کوئی سفارش کر کے نفع نہیں پہنچا سکتے) یاد رکھو کہ کھلا ہوا خسارہ یہ ہے (کہ قیامت کے روز خسارہ میں واقع ہو)۔

(اس خسارہ کی کیفیت یہ ہے کہ) ان کے لئے ان کے اوپر سے بھی آگ کے شعلے ہوں گے اور ان کے نیچے سے بھی آگ کے محیط شعلے ہوں گے یہ وہی (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے (اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتلاتا ہے جو دین حق پر عمل کرنا ہے سو) اے میرے بندوں! مجھ سے (یعنی میرے عذاب سے) ڈرو (اور دین حق پر عمل کرو، یہ حال تو کفار و مشرکین کا ہوا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی میں تو خدا کے حکم کے موافق نہایت اخلاص سے اسی اکیلے کی بندگی کرتا ہوں، تم کو اختیار ہے جس کی چاہو پوجا کرتے پھرو، ہاں! اتنا سوچ لینا کہ انجام کیا ہوگا، آگے اسے کھولتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی مشرکین نہ اپنی جان کو عذاب الٰہی سے بچا سکے، نہ اپنے گھر والوں کو، سب کو جہنم کے شعلوں کی نذر کر دیا، اس سے زیادہ خسارہ کیا ہوگا۔

فائدہ: ۳ یعنی ہر طرف سے آگ محیط ہوگی، جیسے گھٹا چھا جاتی ہے۔

فائدہ: ۴ یعنی سمجھ لو، یہ چیز ڈرنے کے قابل ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اللہ کے غضب سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے۔

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾

اور جو لوگ بچے شیطانوں سے کہ ان کو پوجیں اور رجوع ہوئے اللہ کی طرف ان کے لیے ہے خوشخبری ۱ سو تو خوشی سنا دے میرے بندوں کو

الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ

جو سنتے ہیں بات پھر چلتے ہیں اس پر جو اس میں نیک ہے ۲ وہی ہیں جن کو راستہ دیا اللہ نے

وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۸﴾

اور وہی ہیں عقل والے ۳

خلاصہ تفسیر: (اب مسلمانوں کا حال بیان کیا جاتا ہے) اور جو لوگ شیطان کی عبادت سے بچتے ہیں (شیطان کی عبادت سے مراد غیر اللہ کی عبادت ہے) اور (ہمہ تن) اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہ مستحق خوشخبری سنانے کے ہیں، سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو (اس صفت کے ساتھ بھی موصوف ہیں کہ) اس کلام (الٰہی) کو کان لگا کر سنتے ہیں پھر اس کی اچھی باتوں پر (اور قرآن کے تمام احکام اچھے ہی ہیں، جیسا کہ آگے آیت: احسن الحدیث میں آتا ہے) چلتے ہیں، یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی ہے اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں (سو ان لوگوں کو بشارت دے دیجئے)۔

غیر اللہ کی عبادت کو شیطان کی عبادت اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں شیطان کی کامل اطاعت کی جاتی ہے اور یہی حقیقت ہے عبادت کی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جنہوں نے شیطانوں کا کہا نہ مانا اور سب شرکاء سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف رجوع ہوئے، ان کیلئے ہے بڑی بھاری خوشخبری۔

فائدہ: ۲؎ ① یعنی سب طرح کی باتیں سنتے ہیں، پر ان میں جو بات اچھی ہو اس پر چلتے ہیں ② یا یہ مطلب ہے کہ خدا کی بات سنتے ہیں اور اس میں جو ہدایات اعلیٰ سے اعلیٰ ہوں ان پر عمل کرتے ہیں، مثلاً ایک چیز رخصت واباحت کی سنی، دوسری عزیمت کی، تو عزیمت کی طرف جھپٹتے ہیں، رخصتوں کا تتبع نہیں کرتے ③ یا یوں ترجمہ کرو کہ اللہ کا کلام سن کر اس کی بہترین باتوں کا اتباع کرتے ہیں، کیونکہ اس کی ساری باتیں بہتر ہی ہیں، کذا قال المفسرون، حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک اور طرح اس کا مطلب بیان کیا ہے: ''چلتے ہیں اس کے نیک پر، یعنی حکم پر چلنا کہ اس کو کرتے ہیں، اور منع پر چلنا کہ اس کو نہیں کرتے، اس کا کرنا نیک ہے، اس کا نہ کرنا نیک ہے''۔

فائدہ: ۳؎ یعنی کامیابی کا راستہ ان ہی کو ملا ہے کیونکہ انہوں نے عقل سے کام لے کر توحید خالص اور انابت الی اللہ کا راستہ اختیار کیا۔

أَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۖ أَفَأَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ⑲ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ

بھلا جس پر ٹھیک ہو چکا عذاب کا حکم بھلا تو خلاص کر سکے گا اُسکو جو آگ میں پڑ چکا (اس آگ میں پڑے کو) ۱؎ لیکن جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے اُنکے

غُرَفٌ مِنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ وَعْدَ اللَّهِ ۖ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ الْمِيعَادَ ⑳

واسطے ہیں جھروکے ان کے اوپر اور جھروکے چنے ہوئے ۲؎ اُنکے نیچے بہتی (چلتی) ہیں ندیاں، وعدہ ہو چکا اللہ کا، اللہ نہیں خلاف کرتا اپنا وعدہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے ایمان والوں کو بشارت دینے کا ذکر ہے اس کا بیان اگلی آیت میں آگے آئے گا، اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینے کے لئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کافروں کا مومن بنا دینا آپ کے اختیار سے باہر ہے اس لئے اس پر کوئی غم نہ کریں کہ:

بھلا جس شخص پر عذاب کی (ازلی تقدیری) بات محقق ہو چکی تو کیا آپ ایسے شخص کو جو کہ (علم الٰہی میں) دوزخ میں ہے (موجبات جہنم سے) چھڑا سکتے ہیں (یعنی جو دوزخ میں جانے والے ہیں وہ آپ کی کوشش سے بھی گمراہی سے باز نہیں آئیں گے، اس لئے ان پر افسوس اور غم بے کار ہے) لیکن جو لوگ (ایسے ہیں کہ ان کے حق میں عذاب کی بات محقق نہیں ہوئی، اور اس وجہ سے وہ آپ سے احکام سن کر) اپنے رب سے ڈرتے رہے (یہ وہ لوگ ہیں جن کی اور بھی بہت سے صفات پیچھے گزر چکی ہیں، سو) ان کے لئے (جنت کے) بالاخانے ہیں جن کے اوپر اور بالاخانے ہیں جو بنے بنائے تیار ہیں (اور) ان کے نیچے نہریں چل رہی ہیں، یہ اللہ نے وعدہ کیا ہے (اور) اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا (پس ضرور ان کو یہ سب کچھ ملے گا، یہ مضمون اس بشارت کا ہے جس کا پیچھے آپ ﷺ کو حکم دیا گیا: فبشّر عباد)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جن پر ان کی ضد وعناد اور بداعمالیوں کی بدولت عذاب کا حکم ثابت ہو چکا، کیا وہ کامیابی کا راستہ پا سکتے ہیں؟! بھلا ایسے بدبختوں کو جو شقاوت ازلی کے سبب آگ میں گر چکے ہوں، کون آدمی راہ پر لا سکتا ہے اور کون آگ سے نکال سکتا ہے؟!۔

فائدہ: ۲؎ یہ جنت کے درجات کی طرف اشارہ ہوا، اور یہ کہ وہ سب تیار ہیں، نہ یہ کہ قیامت کے روز تیار کیے جائیں گے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُخْتَلِفًا

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی پھر چلایا وہ پانی چشموں میں زمین کے ۱؎ پھر نکالتا ہے اس سے کھیتی کئی کئی رنگ بدلتے (بدلنے والی)

أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ㉑ ع ۲/۱۶

اس پر ۲؎ پھر آئے تیاری پر تو تو دیکھے اس کا رنگ زرد، پھر کر ڈالتا ہے اسکو چورا چورا (ریزہ ریزہ) بیشک اس میں نصیحت ہے عقل مندوں کے واسطے ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے ان چیزوں کا بیان تھا جو ایمان پر آمادہ کرنے والی ہیں، یعنی آخرت کا لازوال ثواب اور عذاب، اب آگے ایمان سے روکنے والی چیزوں کو دور کرتے ہیں یعنی دنیا کا جلدی فنا ہو جانا بتلا کر اس میں منہمک ہونے سے منع فرماتے ہیں۔

(اے مخاطب!) کیا تو نے اس (بات) پر نظر نہیں کی اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین کے سوتوں میں (یعنی زمین کے اس حصہ میں جہاں سے پانی ابل کر کنوؤں اور چشموں کے ذریعہ نکلتا ہے) داخل کر دیتا ہے، پھر (جب وہ ابلتا ہے تو) اس کے ذریعہ سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں، پھر وہ کھیتی بالکل خشک ہو جاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے، پھر (اللہ تعالیٰ) اس کو چورا چورا کر دیتا ہے اس (نمونہ) میں اہل عقل کے لئے بڑی عبرت ہے (کہ بعینہ یہی حالت انسان کی دنیوی زندگی کی ہے، آخر کار سب کو فنا ہونا ہے، پھر اس میں منہمک ہو کر ہمیشہ کی راحت سے محروم رہنا اور دائمی مصیبت کو اپنے سر لینا نہایت حماقت ہے)۔

فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ: چشموں اور کنوؤں میں پانی کا جمع ہونا دو سبب سے ہوتا ہے: ① ایک یہ کہ زمین کی سردی سے بخارات پانی بن جاتے ہیں ② دوسرے بارش کا پانی زمین کے مسامات میں پیوست ہو کر سمٹ کر جمع ہو جاتا ہے، اس آیت میں ایک سبب کا ذکر ہے اور دوسرے سبب کا انکار نہیں، پس آیت کو فلسفی مسئلہ سے کوئی تعارض نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بارش کا پانی پہاڑوں اور زمینوں کے مسام میں جذب ہو کر چشموں کی صورت میں پھوٹ نکلتا ہے، باقی اگر چشموں کے حدوث کا کوئی اور سبب بھی ہو، اس کی نفی آیت سے نہیں ہوتی۔

فائدہ: ۲ یا مختلف قسم کی کھیتیاں، مثلاً گیہوں چاول وغیرہ۔

فائدہ: ۳ یعنی عقلمند آدمی کھیتی کا حال دیکھ کر نصیحت حاصل کرتا ہے کہ جس طرح اس کی رونق اور سرسبزی چند روزہ تھی، پھر چورا چورا کیا گیا، یہ ہی حال دنیا کی چہل پہل کا ہوگا، چاہیے کہ آدمی اس کی عارضی بہار پر مفتوں ہو کر انجام سے غافل نہ ہو جائے، جیسے کھیتی مختلف اجزاء سے مرکب ہے، مثلاً اس میں دانہ ہے، جو آدمیوں کی غذا بنتا ہے اور بھوسہ بھی ہے جو جانوروں کا چارہ بنتا ہے، اور ہر ایک جزء سے متنفع ہونا بدون اس کے ممکن نہیں کہ دوسرے اجزاء سے اس کو الگ کریں اور اپنے اپنے ٹھکانا پر پہنچائیں، اسی طرح دنیا کو سمجھو کہ اس میں نیکی، بدی، راحت، تکلیف وغیرہ سب ملی جلی ہیں، ایک وقت آئے گا کہ یہ کھیتی کٹے اور خوب چورا چورا کی جائے، پھر اس میں سے ہر ایک جزء کو اس کے مناسب ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے، نیکی اور راحت اپنے مرکز و مستقر پر پہنچ جائے اور بدی یا تکلیف اپنے خزانہ میں جا ملے، غرض کھیتی کے مختلف احوال دیکھ کر عقل مند لوگ بہت مفید سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

نیز مضمون آیت میں ادھر بھی اشارہ ہو گیا کہ جس خدا نے آسمانی بارش سے زمین میں چشمے جاری کر دیے، وہ ہی جنت کے محلات میں نہایت قرینہ کے ساتھ نہروں کا سلسلہ جاری کر دے گا۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ

بھلا جس کا سینہ کھول دیا اللہ نے دین اسلام کے واسطے سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے، سو خرابی ہے ان کو جن کے دل سخت ہیں

مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾

اللہ کی یاد سے، وہ پڑے پھرتے ہیں بھٹکتے (بہکتے) صریح

خلاصہ تفسیر: پیچھے حق کا اثبات اور باطل کا ابطال نہایت شافی کافی بلیغ طرز سے مذکور ہو چکا، اب آگے ان بیانات سے بعض کا متاثر ہونا اور بعض کا متاثر نہ ہونا بیان فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہمارا بیان اگرچہ نہایت بلیغ ہے مگر پھر بھی سب سننے والوں میں باہم بہت فرق ہے، سب یکساں نہیں ہیں:

سوجس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام (کے قبول کرنے) کے لئے کھول دیا (یعنی اسلام کے حق ہونے کا اس کو پورا یقین آ گیا) اور وہ اپنے پروردگار کے (عطا کئے ہوئے) نور (یعنی ہدایت کے مقتضا) پر (چل رہا) ہے (یعنی یقین لا کر اس کے موافق عمل کرنے لگا کیا وہ شخص اور اہل قساوت برابر ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے) سو جن لوگوں کے دل خدا کے ذکر سے (اس میں احکام و مواعید سب آ گئے) متاثر نہیں ہوتے (یعنی خدا کے وعدوں اور احکام پر ایمان نہیں لاتے) ان کے لئے (قیامت میں) بڑی خرابی ہے (اور دنیا میں) یہ لوگ کھلی گمراہی میں (گرفتار) ہیں۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ: حدیث میں اس نور اور شرح صدر کی علامت بیان ہوئی ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت: اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ تلاوت فرمائی تو ہم نے آپ سے شرح صدر کا مطلب پوچھا، آپ نے فرمایا کہ جب نور ایمان انسان کے قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس کا قلب وسیع ہو جاتا ہے (جس سے احکام الٰہیہ کا سمجھنا اور عمل کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے) ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اس (شرح صدر) کی علامت کیا ہے تو آپ نے فرمایا: ''ہمیشہ رہنے والے گھر یعنی آخرت کی طرف راغب اور مائل ہونا اور دھوکے کے گھر یعنی دنیا (کی لذائذ اور زینت) سے دور رہنا اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری کرنا''۔

فَوَیْلٌ لِّلْقٰسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ: یہاں آیت میں ''شرح صدر'' کے مقابلہ میں ''قسات'' یعنی سنگ دلی کا بیان ہونا شرح صدر کی حقیقت کو بتلاتا ہے، یعنی شرح صدر کے ان اثرات سے دل کا خالی ہونا جن کا پیچھے ذکر ہوا تو یہ قساوت اور سنگ دلی ہے، اس سے اس وہم کا فاسد ہونا معلوم ہوتا ہے جو بعض لوگوں کو ہو جاتا ہے کہ وہ طبعی رقت نہ ہونے کو قساوت سمجھ بیٹھتے ہیں جو کہ غلط ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی دونوں برابر کہاں ہو سکتے ہیں ایک وہ جس کا سینہ اللہ نے قبول اسلام کے لیے کھول دیا، نہ اسے اسلام کے حق ہونے میں کچھ شک وشبہ ہے، نہ احکام اسلام کی تسلیم سے انقباض، حق تعالیٰ نے اس کو توفیق و بصیرت کی ایک عجیب روشنی عطا فرمائی، جس کے اجالے میں نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اللہ کے راستہ پر اڑا چلا جا رہا ہے، دوسرا وہ بدبخت جس کا دل پتھر کی طرح سخت ہو، نہ کوئی نصیحت اس پر اثر کرے، نہ خیر کا کوئی قطرہ اس کے اندر گھسے، کبھی خدا کی یاد کی توفیق نہ ہو، یوں ہی اوہام واہوا، اور رسوم و تقلید آباء کی اندھیریوں میں بھٹکتا پھرے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ

اللہ نے اتاری بہتر بات کتاب ۱؎ آپس میں ملتی (سی) دوہرائی ہوئی ۲؎ بال کھڑے ہوتے ہیں اس سے کھال پر ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں

رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ قُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَی اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ

اپنے رب سے، پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کی یاد پر ۳؎ یہ ہے راہ دینا اللہ کا اس طرح راہ دیتا ہے جس کو چاہے

وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾

اور جس کو راہ بھلائے اللہ اس کو کوئی نہیں سجھانے والا ۴؎

خلاصہ تفسیر: (گزشتہ آیت میں ''نور'' اور ''ذکر'' گذرا، اب اس نور اور ذکر کا بیان ہے) اللہ تعالیٰ نے بڑا عمدہ کلام (یعنی قرآن) نازل فرمایا ہے جو ایسی کتاب ہے کہ (جو عبارت کے اعجاز اور معانی کی صحت کے اعتبار سے) باہم ملتی جلتی ہے (اور جس میں سمجھانے کے لئے بعض بعض بہت ضروری بات) بار بار دہرائی گئی (جیسا کہ ارشاد ہے: ولقد صرفنا الخ جس میں اس فائدہ کے علاوہ کہ مخاطب کے دل میں بار بار بیان کرنے سے مضمون پختہ ہو کر جم جاتا ہے ہر جگہ خاص خاص لطائف اور باریکیوں کا بھی لحاظ ہوتا ہے جس سے خالی تکرار نہیں رہتا) جس سے ان لوگوں کے جو کہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں بدن کانپ اٹھتے ہیں (یہ کنایہ ہے خوف سے اگرچہ دل ہی میں ہو بدن پر کوئی اثر نہ آئے) پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر

اللہ کے ذکر (یعنی کتاب اللہ پر عمل کرنے) کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں (یعنی ڈر کر ان اعمال کو توجہ سے بجالاتے ہیں جو کہ اعضاء اور دل کے متعلق ہیں اور) یہ (قرآن) اللہ کی ہدایت ہے جس کو وہ چاہتا ہے اس کے لئے ذریعہ ہدایت کرتا ہے (جیسا کہ ڈرنے والوں کا حال ابھی سنایا گیا) اور خدا جس کو گمراہ کرتا ہے اس کا کوئی ہادی نہیں (جیسا قاسین یعنی سخت دل کافروں کا حال ابھی سنایا گیا)۔

كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ: ''متشابہ'' سے مراد اس جگہ متماثل ہے، یعنی مضامین قرآنی ایک دوسرے سے مربوط اور مماثل ہیں کہ ایک آیت کی تشریح و تصدیق دوسری آیت سے ہو جاتی ہے، اس کلام میں تضاد و تعارض کا نام نہیں ہے، سورہ آل عمران میں جو بعض قرآن کو ''متشابہ'' فرمایا ہے وہاں اس سے دوسرا معنی مراد ہے جیسا کہ وہاں ترجمہ سے ظاہر ہے۔

اور ''مثانی''، یعنی قرآن میں بعض مضامین کا بار بار دھرایا جانا اس کے کمال ہدایت پر مشتمل ہونے کی اور انتہائی درجہ بلیغ ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ ایک بات کے بار بار دہرانے سے انسان کا کلام فصیح، بلیغ و شیریں نہیں رہتا اور اس سے طبیعت اکتا جاتی ہے، پس یہ قرآن کا کھلا معجزہ ہے کہ تکرار مضامین سے اس کی بلاغت و شوکت میں کچھ بھی فرق نہیں ہوا، بلکہ اس کے ساتھ اس کی حلاوت زیادہ ہی ہو گئی۔

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ: اہل تحقیق علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کے خوف سے مراد ایمانی و عقلی خوف ہے، جسمانی وظاہری خوف مراد نہیں، لہٰذا کلام اللہ کی تلاوت سے کسی کے جسم پر کوئی ظاہری اثر، کپکپی یا بے قراری پیدا نہ ہو تو یہ خوف الٰہی کے خلاف نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا: یعنی دنیا میں کوئی بات اس کتاب کی باتوں سے بہتر نہیں۔

فائدہ: ۲ مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ: یعنی صحیح، صادق، مضبوط، نافع، معقول اور فصیح و بلیغ ہونے میں کوئی آیت کم نہیں، ایک دوسری سے ملتی جلتی ہے، مضامین میں کوئی اختلاف و تعارض نہیں، بلکہ بہت سی آیات کے مضامین ایسے متشابہ واقع ہوئے ہیں کہ ایک آیت کو دوسری کی طرف لوٹانے سے صحیح تفسیر معلوم ہو جاتی ہے: ''القرآن یفسر بعضہ بعضًا'' اور مثانی یعنی دہرائی ہوئی کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے احکام اور مواعظ و قصص کو مختلف پیرایوں میں دہرایا گیا ہے تا کہ اچھی طرح دلنشین ہو جائیں، نیز تلاوت میں بار بار آیتیں دہرائی جاتی ہیں۔

اور بعض علماء نے متشابہ و مثانی کا مطلب یہ لیا ہے کہ بعض آیات میں ایک ہی طرح کے مضمون کا سلسلہ دور تک چلا جاتا ہے وہ متشابہ ہوئیں اور بعض جگہ ایک نوعیت کے مضمون کے ساتھ دوسرے جملہ میں اس کے مقابل کی نوعیت کا مضمون بیان کیا جاتا ہے، مثلاً: اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ (الانفطار: ۱۳) یا: نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ (الحجر: ۴۹) یا: ویحذرکم اللہ نفسہ واللہ رءوف بالعباد ایسی آیات کو ''مثانی'' کہیں گے کہ ان میں دو مختلف قسم کے مضمون بیان ہوئے۔

فائدہ: ۳ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ: یعنی کتاب اللہ سن کر اللہ کے خوف اور اس کے کلام کی عظمت سے ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کھالیں نرم پڑ جاتی ہیں، مطلب یہ کہ خوف و رعیت کی کیفیت طاری ہو کر ان کا قلب و قالب اور ظاہر و باطن اللہ کی یاد کے سامنے جھک جاتا ہے اور اللہ کی یاد ان کے بدن اور روح دونوں پر ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے، یہ حال اقویائے کاملین کا ہوا۔

اگر کبھی ضعفاء و ناقصین پر دوسری قسم کی کیفیات و احوال طاری ہو جائیں مثلاً غشی یا صعقہ وغیرہ تو اس کی نفی آیت سے نہیں ہوتی، اور نہ ان کی تفضیل ان پر لازم آتی ہے، بلکہ اس طرح از خود رفتہ اور بے قابو ہو جانا عموماً وارد کی قوت اور مورد کے ضعف کی دلیل ہے، جامع ترمذی میں ایک حدیث بیان کرتے وقت ابو ہریرہؓ پر اس قسم کے بعض احوال کا طاری ہونا مصرح ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۴ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ: یعنی جس کے لیے حکمت الٰہی مقتضی ہو اس طرح کامیابی کے راستے کھول دیے جاتے ہیں اور اس شان سے منزل مقصود کی طرف لے چلتے ہیں، اور جس کو سوء استعداد کی وجہ سے خدا تعالیٰ ہدایت کی توفیق نہ دے، آگے کون ہے جو اس کی دستگیری کر سکے۔

أَفَمَنْ يَتَّقِي بِوَجْهِهِ سُوْءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝24

بھلا ایک وہ جو روکتا (روک لیتا) ہے اپنے منہ پر برا عذاب دن قیامت کے، اور کہے گا بے انصافوں کو چکھو جو تم کماتے تھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے ڈرنے والوں اور سنگ دلوں کی حالت میں اثر قبول کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے فرق کا بیان تھا، اب آگے انجام کے اعتبار سے دونوں میں فرق بتلاتے ہیں۔

بھلا جو شخص اپنے منہ کو قیامت کے روز سخت عذاب کی سپر بنادے گا اور ایسے ظالموں کو حکم ہوگا کہ جو کچھ تم کیا کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو تو کیا یہ (عذاب میں گرفتار) اور جو ایسا نہ ہو برابر ہو سکتے ہیں۔

أَفَمَنْ يَتَّقِي بِوَجْهِهِ: ''سپر'' بنانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی عادت ہے کہ جب کوئی اس پر وار کرتا ہے تو وہ ہاتھ پر روکتا ہے مگر وہاں تو ہاتھ پاؤں جکڑے ہوں گے اس لیے سارا عذاب منہ پر ہی لے گا۔

* * *

فائدہ: آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب سامنے سے کوئی حملہ ہو تو ہاتھوں پر روکتا ہے، لیکن محشر میں ظالموں کے ہاتھ بندھے ہوں گے، اس لیے عذاب کی تھپیڑیں سیدھی منہ پر پڑیں گی، تو ایسا شخص جو بدترین عذاب کو اپنے منہ پر روکے اور اس سے کہا جائے کہ اب اس کام کا مزہ چکھ جو دنیا میں کیے تھے، کیا اس مومن کی طرح ہو سکتا ہے جسے آخرت میں کوئی تکلیف اور گزند پہنچنے کا اندیشہ نہیں، اللہ کے فضل سے مطمئن اور بے فکر ہے، ہرگز نہیں!!۔

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝25

جھٹلا چکے ہیں ان سے اگلے پھر پہنچا ان پر عذاب ایسی جگہ سے کہ ان کو خیال بھی نہ تھا (خبر بھی نہ تھی)

وقف لازم

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝26

پھر چکھائی ان کو اللہ نے رسوائی دنیا کی زندگی میں، اور عذاب آخرت کا تو بہت ہی بڑا ہے، اگر ان کو سمجھ ہوتی [1]

خلاصہ تفسیر: (کفار ان عذابوں کو سن کر انکار نہ کریں کیونکہ) جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انہوں نے بھی (حق کو) جھٹلایا تھا سو ان پر عذاب ایسے طور پر آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا سو اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی دنیوی زندگی میں بھی رسوائی کا مزہ چکھایا (کہ زمین میں دھنس جانے یا چہرہ بگڑ جانے یا آسمان سے پتھر برسنے وغیرہ کے عذاب سے دنیا میں بدنام ہوئے) اور آخرت کا عذاب اور بھی بڑا ہے کاش یہ لوگ سمجھ جاتے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی بہت قومیں تکذیب انبیاء کی بدولت دنیا میں ہلاک اور رسوا کی جا چکی ہیں اور آخرت کا اشد عذاب جوں کا توں رہا، تو کیا موجودہ مکذبین مطمئن ہیں کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا جائے گا، ہاں! سمجھ ہوتی تو کچھ فکر کرتے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝27

اور ہم نے بیان کی لوگوں کے واسطے اس قرآن میں سب چیز کی مثل تا کہ ہو دھیان کریں

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝28

قرآن ہے عربی زبان کا جس میں کجی نہیں تا کہ وہ بچ کر چلیں [1]

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: افمن شرح اللہ صدرہ میں یہ بیان ہوا تھا کہ قرآن سن کر بعض لوگ متاثر ہوتے ہیں بعض نہیں ہوتے، آگے آیت میں یہ بیان ہے کہ بعض لوگوں کا اس سے متاثر نہ ہونا ان کی اپنی قابلیت وصلاحیت کی کمی کی وجہ سے ہے، ورنہ قرآن فی نفسہ سب کے لئے برابر اثر رکھتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ فرق مخاطب کی قابلیت اور استعداد کے اعتبار سے ہے ورنہ قرآن کے مؤثر ہونے میں کچھ کمی نہیں۔

اور ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کیلئے اس قرآن میں ہر قسم کے (ضروری) عمدہ مضامین بیان کئے ہیں تا کہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ عربی قرآن ہے جس میں ذرا بھی کجی نہیں (اور یہ مضامین اسلئے لائے گئے) تا کہ یہ لوگ (ان سچے اور صاف مضامین کو سن کر) ڈریں۔ ''کجی'' کے معنی سورہ کہف کی پہلی آیت میں گزر چکے ہیں وہاں ملاحظہ کرلیا جائے، غرض معلوم ہوا کہ قرآن کریم کے کتاب ہدایت ہونے میں جن صفات کی ضرورت تھی وہ سب اس میں جمع ہیں کہ اس کے مضامین بھی سب سچے اور صاف واضح ہیں، اور زبان بھی عربی ہے جس کو موجودہ مخاطب بلاواسطہ سمجھ سکتے ہیں، پھر ان کے ذریعہ سے دوسروں کا سمجھ لینا بھی آسان ہے، غرض اس کتاب ہدایت میں تو کوئی کمی نہیں، کسی میں قبول کرنے کی استعداد اور صلاحیت ہی نہ ہو تو کیا کیا جائے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان کا نہ سمجھنا اپنی غفلت اور حماقت سے ہے، قرآن کے سمجھانے میں کوئی کمی نہیں، قرآن تو بات بات کو مثالوں اور دلیلوں سے سمجھاتا ہے، تا کہ لوگ ان میں دھیان کر کے اپنی عاقبت درست کریں، قرآن ایک صاف عربی زبان کی کتاب ہے، جو اس کے مخاطبین اولین کی مادری زبان تھی، اس میں کوئی ٹیڑھی ترچھی بات نہیں، سیدھی اور صاف باتیں ہیں جن کو عقل سلیم قبول کرتی ہے، کسی طرح کا اختلال اور کجی اس کے مضامین یا عبارت میں نہیں، جن باتوں کو منوانا چاہتا ہے، نہ ان کا ماننا مشکل، اور جن چیزوں پر عمل کرانا چاہتا ہے نہ ان پر عمل کرنا محال، غرض یہ ہے کہ لوگ بسہولت اس سے مستفید ہوں، اعتقادی وعملی غلطیوں سے بچ کر چلیں، اور صاف صاف نصیحتیں سن کر اللہ سے ڈرتے رہیں۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ

اللہ نے بتلائی ایک مثل ایک مرد ہے کہ اس میں شریک ہیں کئی ضدی اور ایک مرد ہے پورا ایک شخص کا، کیا برابر ہوتی ہیں دونوں مثل ۱؎

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾

سب خوبی اللہ کے لیے ہیں، پر وہ بہت لوگ سمجھ نہیں رکھتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے مؤمن ومشرک میں ہدایت وگمراہی کا فرق معلوم ہوا، اب ایک مثال سے اس فرق کو واضح کر کے توحید کو ثابت کرتے ہیں اور شرک سے عار دلاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے (موحد اور مشرک کے بارے میں) ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص ہے (غلام) جس میں کئی ساتھی ہیں جن میں باہم ضدا ضدی (بھی) ہے اور ایک اور شخص ہے کہ پورا ایک ہی شخص کا (غلام) ہے (تو) کیا ان دونوں کی حالت یکساں (ہوسکتی) ہے (اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں، پہلا شخص تکلیف میں ہے کہ ہمیشہ متحیر رہتا ہے کہ کس کا کہنا مانوں کس کا نہ مانوں، دوسرا آرام میں ہے کہ ایک ہی شخص سے تعلق ہے، پس پہلی مثال شرک کی ہے کہ ہمیشہ ڈانواں ڈول رہتا ہے، کبھی غیر اللہ کی طرف دوڑتا ہے، کبھی خدا کی طرف، پھر غیر اللہ میں بھی ایک پر اطمینان نہیں ہوتا، کبھی کسی کی طرف رجوع کرتا ہے، کبھی کسی کی طرف، اس سوال کا جواب کفار بھی اس کے سوا نہیں دے سکتے کہ مشترک غلام بڑی مصیبت میں رہتا ہے اس لئے ان پر حجت تمام ہوگئی، اس اتمام حجت پر فرمایا) الحمدللہ (حق ثابت ہوگیا، لیکن پھر بھی یہ لوگ قبول نہیں کرتے) بلکہ (قبول تو کیا) ان میں اکثر لوگ سمجھتے بھی نہیں (کیونکہ سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں کرتے)۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ: دنیا پرست انسان اور آخرت پسند انسان کی زندگی کی بھی یہی حالت اور مثال ہے، پہلا شخص دنیا کی کشاکشی میں مبتلا رہتا ہے تو دوسرا یعنی آخرت پسند انسان مطمئن اور پرسکون رہتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی کئی حصہ دار ایک غلام یا نوکر میں شریک ہیں اور ہر حصہ دار اتفاق سے کج خلق، بے مروت اور سخت ضدی واقع ہوا ہے، چاہتا ہے کہ غلام تنہا اس کے کام میں لگا رہے، دوسرے شرکاء سے سروکار نہ رکھے، اس کھینچ تان میں ظاہر ہے غلام سخت پریشان اور پراگندہ دل ہوگا، برخلاف اس کے جو غلام پورا ایک کا ہو، اسے ایک طرح کی یکسوئی اور طمانیت حاصل ہوگی اور کئی آقاؤں کو خوش رکھنے کی کشمکش میں گرفتار نہ ہوگا، اب ظاہر ہے کہ یہ دونوں غلام برابر نہیں ہوسکتے، اسی طرح کتنے ہی جھوٹے معبودوں کو خوش رکھنے کی فکر میں رہتا ہے، اس کے برخلاف موحد کی کل توجہات وخیالات اور دوا دوش کا ایک مرکز ہے، وہ پوری دلجمعی کے ساتھ اس کے خوش رکھنے کی فکر میں ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی خوشنودی کے بعد کسی کی خوشنودی کی ضرورت نہیں، اکثر مفسرین نے اس مثال کی تقریر اسی طرح کی ہے، مگر حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ: ''ایک غلام جو کئی کا ہو، کوئی اس کو اپنا نہ سمجھے، تو اس کی پوری خبر نہ لے، اور ایک غلام سارا ایک کا ہو، وہ اس کو اپنا سمجھے اور پوری خبر لے، یہ مثال ہے ان کی جو ایک رب کے بندے ہیں، اور جو کئی رب کے بندے ہیں''۔

فائدہ: ۲ یعنی سب خوبی اللہ کے لیے ہے کہ کیسے اعلیٰ مطالب وحقائق کو کیسی صاف اور دلنشین امثال وشواہد سے سمجھا دیتے ہیں، مگر اس پر بھی بہت بدنصیب ایسے ہیں جو ان واضح مثالوں کے سمجھنے کی توفیق نہیں پاتے۔

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿٣١﴾ ع

بیشک تو بھی مرتا ہے اور وہ بھی مرتے ہیں، پھر مقرر تم قیامت کے دن اپنے رب کے آگے جھگڑو گے ۱۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے جب ہر پہلو سے بحث کا فیصلہ ہوگیا اور سرکشوں نے اس فیصلہ کو قبول نہ کیا تو اب فیصلہ قیامت کا ذکر ہے جو آخری فیصلہ ہوگا، جس سے کوئی بھاگ نہیں سکے گا اور فیصلہ قیامت سے پہلے موت کی خبر دیتے ہیں، کیونکہ موت ہی مقدمہ اور طریقہ ہے آخرت تک پہنچنے کا اس لئے فرمایا:

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! یہ لوگ اگر دنیا میں کسی عقلی اور نقلی فیصلہ کو نہیں مانتے تو آپ غم نہ کیجئے، کیونکہ دنیا سے) آپ کو بھی مرجانا ہے اور ان کو بھی مرجانا ہے، پھر قیامت کے روز تم (دونوں فریق اپنے اپنے) مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کروگے (اس وقت عملی فیصلہ ہوجائے گا جس کے ظہور کا بیان اگلی آیت میں آتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جیسے مشرک اور موحد میں جو اختلاف ہے اس کا اثر قیامت کے دن علیٰ رؤس الاشہاد ظاہر ہوگا، جس وقت پیغمبر اور امتی سب اکٹھے کیے جائیں گے اور کفار، انبیاء اور مومنین کے مقابلہ میں جھگڑے اور حجتیں نکالیں گے، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''کافر منکر ہوں گے کہ ہم کو کسی نے حکم نہیں پہنچایا پھر فرشتوں کی گواہی اور زمین وآسمان کے ہاتھ کی گواہی سے ثابت ہوگا'' کہ اس ادعاء میں جھوٹے ہیں، اسی طرح دوسرے تمام جھگڑوں کا فیصلہ بھی اس دن پروردگار کے سامنے ہوگا، بہتر یہ ہی ہے کہ لفظ ''اختصام'' کو عام رکھا جائے تاکہ احادیث وآثار کے خلاف نہ ہو۔

منزل ٦ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَ كَذَّبَ بِالصِّدۡقِ اِذۡ جَآءَهٗ ؕ اَلَيۡسَ فِىۡ جَهَنَّمَ مَثۡوًى لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ۝۳۲

پھر اس سے ظالم زیادہ کون جس نے جھوٹ بولا اللہ پر اور جھٹلایا سچی بات کو جب پہنچی اس کے پاس، کیا نہیں دوزخ میں ٹھکانا منکروں کا

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت میں مقدمات پیش ہونے کا ذکر تھا، اب اس کا ظہور اور نتیجہ مذکور ہے۔

سو (اس قیامت کے دن یہ فیصلہ ہوگا کہ باطل پرستوں کو دوزخ کا عذاب اور حق پرستوں کو اجر عظیم نصیب ہوگا اور ظاہر ہے کہ) اس شخص سے زیادہ بے انصاف (اور باطل پرست) کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے (یعنی خدا تعالیٰ کے متعلق یہ کہے کہ اس کے ساتھ دوسرے بھی شریک ہیں) اور سچی بات (یعنی قرآن) کو جبکہ وہ اس کے پاس (رسول کے ذریعہ) پہنچی جھٹلادے (تو ایسے شخص کا بڑا ظالم ہونا بھی ظاہر ہے اور بڑے ظالم کا عظیم عذاب کا مستحق ہونا بھی ظاہر ہے اور بڑا عذاب جہنم کا ہے تو) کیا (قیامت کے دن) جہنم میں ایسے کافروں کا ٹھکانہ نہ ہوگا (یہ فیصلہ تو باطل پرستوں کا ہوا)۔

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ: یہ آیت اپنے الفاظ کے عموم سے ان نام نہاد صوفیوں کو بھی شامل ہے جو اپنی ولایت کے دعوے میں جھوٹے ہیں اور شریعت کو چھلکا کہہ کر پس پشت ڈال دیتے ہیں اور اپنی خود ساختہ طریقت و تصوف کو مغز اور جوہر بتلاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ''اللہ پر جھوٹ بولا''، یعنی اس کے شریک ٹھہرائے یا اولاد تجویز کی، یا وہ صفات اس کی طرف منسوب کیں جو واقع میں اس کے لائق نہ تھیں، ''اور جھٹلایا سچی بات کو جب پہنچی اس کے پاس''، یعنی انبیاء (علیہم السلام) جو سچی باتیں خدا کی طرف سے لائے، ان کو سنتے ہی جھٹلانے لگا، سوچنے سمجھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی، بلاشبہ جو شخص سچائی کا اتنا دشمن ہو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے، اور ایسے ظالموں کا ٹھکانا دوزخ کے سوا اور کہاں ہوگا، عموماً مفسرین نے آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے، مگر حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی اگر نبی نے (معاذ اللہ) جھوٹ خدا کا نام لیا تو اس سے برا کون اور اگر وہ سچا تھا اور تم نے جھٹلایا تو تم سے برا کون''، (گویا من کذب علی اللہ اور کذب بالصدق کا مصداق الگ الگ قرار دیا اور ایسا ہی آگے والذی جاء بالصدق میں آتا ہے)۔

وَالَّذِىۡ جَآءَ بِالصِّدۡقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ۝۳۳ لَهُمۡ مَّا يَشَآءُوۡنَ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ

اور جو لے کر آیا سچی بات اور سچ مانا جس نے اس کو، وہی لوگ ہیں ڈر والے ا۔ان کے لیے ہے جو وہ چاہیں اپنے رب کے پاس

ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۳۴ۚۖ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ اَسۡوَاَ الَّذِىۡ عَمِلُوۡا وَيَجۡزِيَهُمۡ اَجۡرَهُمۡ

یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا، تاکہ اتار دے اللہ ان پر سے برے سے برے کام جو انہوں نے کئے تھے اور بدلہ میں دے ان کو ثواب

بِاَحۡسَنِ الَّذِىۡ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝۳۵

بہتر کاموں کا جو وہ کرتے تھے ۲۔

خلاصہ تفسیر: (اب حق پرستوں کا فیصلہ مذکور ہے) اور (پہلے لوگوں کے برخلاف) جو لوگ سچی بات لے کر (خدا کی طرف سے یا رسول کی طرف سے لوگوں کے پاس) آئے اور (خود بھی) اس کو سچ جانا (یعنی یہ لوگ سچے بھی ہیں اور تصدیق کرنے والے بھی ہیں، جیسا کہ پہلے لوگ جھوٹے بھی تھے اور جھٹلانے والے بھی تھے) تو یہ لوگ پرہیزگار ہیں (ان کا فیصلہ یہ ہوگا کہ) وہ جو کچھ چاہیں گے ان کے لئے پروردگار کے پاس سب کچھ ہے، یہ صلہ ہے نیکوکاروں کا (اور یہ صلہ ان کے لئے اس واسطے تجویز کیا) تاکہ اللہ تعالیٰ ان سے برے عملوں کو دور کرے اور نیک کاموں کے عوض ان کو ان کا ثواب دے۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اس عام مضمون میں رسول اللہ ﷺ بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام جو کہ خدا کی طرف سے حق لے کر آئے اوران کے وہ متبعین جو رسول کی طرف سے حق بات لوگوں کو پہنچاتے ہیں سب داخل ہیں۔

اوراس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ جہنم میں جانا خدا پر جھوٹ باندھنے اور قرآن کو جھٹلانے دونوں پر موقوف ہے، اسی طرح جنت میں جانا سچ بولنے اور تصدیق کرنے دونوں پر موقوف ہے، بلکہ مقصود زیادہ مدح اور زیادہ مذمت ہے، چونکہ دونوں میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں یا موجود نہیں اس لیے ہر ایک کی دونوں صفتیں بیان کردی گئیں، ورنہ درحقیقت جنت میں جانا صرف تصدیق پر موقوف ہے اور جہنم میں جانے کے لیے خدا پر جھوٹ باندھنا بھی کافی ہے اور قرآن کا جھٹلانا بھی۔

لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ چونکہ برے اعمال کو دور کرنا اور نیک کاموں کا ثواب دینا مقصود تھا اس لیے ان سے وعدہ کیا گیا: لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ کہ وہ جو کچھ چاہیں گے وہی ان کو ملے گا، تاکہ وہ برے اعمال کی معافی اور نیک اعمال کے ثواب کی خواہش کریں تو حسب وعدہ ان کی یہ خواہش پوری کردی جائے اور مسلمانوں کو ایسی خواہش ہونا ظاہر ہی ہے۔

***

فائدہ: ۱؎ یعنی خدا سے ڈرنے والوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ سچی بات لائیں، ہمیشہ سچ کہیں، اور سچ کی تصدیق کریں، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی، اور جس نے سچ مانا وہ مومن ہے''۔ (گویا دونوں جملوں کا مصداق علیحدہ ہے)۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ متقین ومحسنین کو ان کے بہتر کاموں کا بدلہ دے گا اور غلطی سے جو برا کام ہوگیا وہ معاف کرے گا۔

تنبیہ: شاید اسوا اور احسن (صیغہ تفضیل) اس لیے اختیار فرمایا کہ بڑے درجہ والوں کی ادنیٰ بھلائی اوروں کی بھلائیوں سے اور ادنیٰ برائی اوروں کی برائیوں سے بھاری سمجھی جاتی ہے، واللہ اعلم۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ؀

کیا اللہ بس (کافی) نہیں اپنے بندوں کو، اور تجھ کو ڈراتے ہیں ان سے جو اسکے سوا ہیں، اور جس کو راہ بھٹلائے اللہ تو کوئی نہیں اسکو راہ دینے والا

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ؀

اور جس کو راہ سجھائے اللہ تو کوئی نہیں اس کو بھٹلانے والا، کیا نہیں ہے اللہ زبردست بدلہ لینے والا ۱؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے کئی آیتوں میں توحید کو ثابت اور شرک کو باطل کیا گیا، ایسے مضامین کو سن کر کفار مشرکین آپ ﷺ سے کہتے کہ ہمارے معبودوں سے گستاخی نہ کیجیے، ورنہ ہم ان سے درخواست کر کے آپ کو مجنون کرادیں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اسی طرح وہ اور بھی عناد ومخالفت کی باتیں کیا کرتے تھے جن سے آپ ﷺ غمگین ہوئے، اس لیے آگے آپ ﷺ کی تسلی کا مضمون ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ (خاص محمد ﷺ کی حفاظت) کے لئے کافی نہیں (یعنی وہ تو سب ہی کی حفاظت کے لئے کافی ہے تو اپنے محبوب خاص بندے کے لئے کیوں کافی نہ ہوگا) اور یہ لوگ (ایسے احمق ہیں کہ خدا کی حفاظت سے انجان بن کر) آپ کو ان (کمزور اور جھوٹے معبودوں) سے ڈرانے والے ہیں جو خدا کے سوا (تجویز کر رکھے) ہیں (حالانکہ وہ خود بے جان عاجز ہیں اور اگر قادر بھی ہوتے تو پھر بھی خدا کی حفاظت کے مقابلہ میں عاجز ہی ہوتے) اور (اصل بات یہ ہے کہ) جس کو خدا گمراہ کرے اس کا کوئی ہدایت کرنے والا نہیں اور جس کو وہ ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں (آگے خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ذکر کر کے ان کی حماقت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ) کیا خدا تعالیٰ (ان کے نزدیک) زبردست (اور) انتقام لینے (پر قدرت رکھنے) والا نہیں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت ناصریت بھی کامل اور بندہ کی صلاحیت منصوریت بھی کامل، اور جھوٹے معبودوں کا قدرت ونصرت سے عاجز ہونا بھی ظاہر، پھر آپ کو ان باتوں سے ڈرانا حماقت نہیں تو کیا ہے)۔

***

فائدہ: لہ چند آیات پہلے: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر:۲۹) میں شرک کا رد اور مشرکین کا جہل بیان کیا گیا تھا، اس پر مشرکین پیغمبر (علیہ السلام) کو اپنے بتوں سے ڈراتے تھے کہ دیکھو تم ہمارے دیوتاؤں کی توہین کر کے ان کو غصہ نہ دلاؤ، کہیں تم کو (معاذ اللہ) بالکل خبطی اور پاگل نہ بنا دیں، اس کا جواب دیا کہ جو شخص ایک زبردست خدا کا بندہ بن چکا، اسے ان عاجز اور بے بس خداؤں سے کیا ڈر ہو سکتا ہے؟ کیا اس عزیز منتقم کی امداد وحمایت اس کو کافی نہیں جو کسی دوسرے سے ڈرے یا لو لگائے، یہ بھی ان مشرکین کا خبط وضلال اور مستقل گمراہی ہے کہ خدائے واحد کے پرستار کو اس طرح کی گیدڑ بھبکیوں سے خوف زدہ کرنا چاہیں، سچ تو یہ ہے کہ ٹھیک راستہ پر لگا دینا یا نہ لگانا سب اللہ کے قبضہ میں ہے، جس کسی شخص کو اس کی بدتمیزی اور کجروی کی بناء پر اللہ تعالیٰ کامیابی کا راستہ نہ دے، وہ اسی طرح خبطی اور پاگل ہو جاتا ہے اور موٹی موٹی باتوں کے سمجھنے کی قوت بھی اس میں نہیں رہتی، کیا ان احمقوں کو اتنا نہیں سوجھتا کہ جو بندہ خداوند قدوس کی پناہ میں آ گیا، کون سی طاقت ہے جو اس کا بال بیکا کر سکے، جو طاقت مقابل ہوگی پاش پاش کر دی جائے گی، غیرت خداوندی مخلص وفاداروں کا بدلہ لیے بدون نہ چھوڑے گی۔

وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ

اور جو تو ان سے پوچھے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں اللہ نے، تو کہہ بھلا دیکھو تو جن کو پوجتے ہو

دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ

اللہ کے سوا اگر چاہے اللہ مجھ پر کچھ تکلیف تو وہ ایسے ہیں کہ کھول دیں تکلیف اسکی ڈالی ہوئی یا وہ چاہے مجھ پر مہربانی تو وہ ایسے ہیں کہ روک دیں

رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾

اس کی مہربانی کو، تو کہہ مجھ کو بس ہے اللہ، اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں بھروسہ رکھنے والے لہ

خلاصہ تفسیر: اور (عجیب بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور نصرت کے مقدمات کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے (اس لئے) آپ (ان سے) کہیئے کہ بھلا (جب تم اللہ کو تخلیق میں منفرد مانتے ہو تو) یہ بتلاؤ کہ خدا کے سوا جن معبودوں کو پوجتے ہو، اگر اللہ مجھ کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہے، کیا یہ معبود اس کی دی ہوئی تکلیف کو دور کر سکتے ہیں یا اللہ مجھ پر اپنی عنایت کرنا چاہے تو کیا یہ معبود اس کی عنایت کو روک سکتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ کو تنہا خالق ماننے کے بعد جس کو کمال قدرت لازم ہے کیا تم اس کے قائل ہو سکتے ہو کہ اس کا کوئی مقابلہ اور مزاحمت بھی کر سکتا ہے، ہرگز قائل نہیں ہو سکتے، کیونکہ اس سے خدا کے کمال قدرت کی نفی لازم آئے گی، حالانکہ تم اس کو پہلے خود تسلیم کر چکے ہو، آگے ارشاد ہے کہ جب اس تقریر سے اللہ تعالیٰ کی نصرت اور کمال قدرت ثابت ہو جائے تو) آپ کہہ دیجئے کہ (اس سے ثابت ہو گیا کہ) میرے لئے خدا کافی ہے (اور چونکہ وہ ایسا قادر وناصر ہے اس لیے) توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں (پس میں بھی اسی پر توکل اور بھروسہ رکھتا ہوں اور تمہاری مخالفت وعناد کی کوئی پرواہ نہیں کرتا)۔

کفار کے جواب میں اتنا کہہ دینا کافی تھا: هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ کہ کیا یہ معبود خدا کی عنایت کو مجھ سے روک سکتے ہیں، لیکن چونکہ کفار کے قول سے یہ بھی لازم آتا تھا کہ اگر آپ ان کے معبودوں کو کچھ نہیں کہیں گے تو وہ باطل معبود آپ کو نقصان پہنچنے نہ دیں گے، اس لیے جواب میں اتنا اور بڑھا دیا: هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ کہ اگر خدا مجھ کو کوئی تکلیف دینا چاہے تو کیا یہ معبود اس کو دور کر سکتے ہیں، خلاصہ یہ کہ وہ نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، نہ نقصان دے سکتے ہیں۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی ایک طرف تو خداوند قدوس جو خود تمہارے اقرار کے موافق تمام زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا ہے اور دوسری طرف پتھر کی بیجان مورتیں یا عاجز مخلوق جو سب مل کر بھی خدا کی بھیجی ہوئی ادنیٰ سے ادنیٰ تکلیف وراحت کو اس جگہ سے نہ ہٹا سکے، تم ہی بتاؤ، دونوں میں سے کس پر بھروسہ کیا جائے اور کس کو اپنی مدد کے لیے کافی سمجھا جائے، حضرت ہود (علیہ السلام) کی قوم نے بھی کہا تھا: اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ (ہود: ۵۴) جس کا جواب حضرت ہود نے یہ دیا: اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (ہود: ۵۴ تا ۵۶) اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا تھا: وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الانعام: ۸۰، ۸۱)

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾

تو کہہ اے قوم کام کیے جاؤ اپنی جگہ پر میں بھی کام کرتا ہوں، اب آگے جان لو گے

مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ﴿۴۰﴾

کس پر آتی ہے آفت کہ اس کو رسوا کرے اور اترتا ہے اس پر عذاب سدا رہنے والا لہ

خلاصہ تفسیر: چونکہ وہ لوگ ان سب باتوں کو سن کر بھی اپنے باطل خیال، جہالت اور گمراہی پر جمے ہوئے تھے اس لئے آپ کو آخری جواب کی تعلیم ہے کہ:

آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ (اگر اس پر بھی تم نہیں مانتے تو تم جانو) تم اپنی حالت پر عمل کئے جاؤ میں بھی (اپنے طرز پر) عمل کر رہا ہوں (یعنی جب تم اپنے باطل طریقہ کو نہیں چھوڑتے تو میں حق طریقہ کو کیسے چھوڑوں) سو اب جلد ہی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر (دنیا میں) ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا، اور (مرنے کے بعد) اس پر دائمی عذاب نازل ہوگا (چنانچہ دنیا میں غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے ان کو سزا ملی، اس کے بعد آخرت کا دائمی عذاب مرنے کے بعد بھگتنا ہوگا جو بہت سخت ہوگا)۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی عنقریب پتہ لگ جائے گا کہ خدائے واحد کا بندہ غالب آتا ہے یا صدہا دروازوں کے بھکاری کامیاب ہوتے ہیں، واقعات جلد بتادیں گے کہ جو بندہ اللہ کی حمایت اور پناہ میں آیا اس کا مقابلہ کرنے والے آخر کار سب ذلیل وخوار ہوئے۔

تنبیہ: عذاب یخزیہ سے دنیا کا اور عذاب مقیم سے آخرت کا عذاب مراد ہے۔ واللہ اعلم

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا

ہم نے اتاری ہے تجھ پر کتاب لوگوں کے واسطے سچے دین کے ساتھ، پھر جو کوئی راہ پر آیا سو اپنے بھلے کو، اور جو کوئی بہکا سو یہی بات ہے

ع یَضِلُّ عَلَیْهَا وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ﴿۴۱﴾

کہ بہکا اپنے برے کو، اور تو ان کا ذمہ دار نہیں (تجھ پر ان کا ذمہ نہیں) لہ

خلاصہ تفسیر: یہاں تک تو مخالفین کا خوف دور کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی، اب آگے آپ کو جو کفار اور عام خلق خدا کے

ساتھ شفقت کی بناپر ان کے کفر وانکار سے غم ہوتا تھا اس پر تسلی دیتے ہیں کہ:

ہم نے یہ کتاب آپ پر لوگوں کے (نفع کے) لئے اتاری جو حق کو لئے ہوئے ہے سو (آپ کا کام اس کو پہنچا دینا ہے پھر) جو شخص راہ راست پر آئے گا تو اپنے نفع کے واسطے اور جو شخص بے راہ رہے گا تو اس کا بے راہ ہونا اسی پر پڑے گا اور آپ ان پر مسلط (اس طرح) نہیں کئے گئے (کہ آپ سے ان کی بے راہی کی باز پرس ہونے لگے، تو پھر آپ ان کی گمراہی سے کیوں غمگین ہوتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی تیری زبان پر اس کتاب کے ذریعہ سے سچی بات نصیحت کی کہہ دی گئی اور دین کا راستہ ٹھیک بتلا دیا گیا، آگے ہر ایک آدمی اپنا نفع نقصان سوچ لے، نصیحت پر چلے گا تو اس کا بھلا ہے ورنہ اپنا ہی انجام خراب کرے گا، تجھ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں کہ زبردستی ان کو راہ پر لے آئے، صرف پیغام حق پہنچا دینا آپ کا فرض تھا وہ آپ نے ادا کر دیا، آگے معاملہ خدا کے سپرد کیجیے جس کے ہاتھ میں مارنا جلانا اور سلانا جگانا سب کچھ ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا

اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا، اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں، پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا

الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾

ٹھہرا دیا ہے اور بھیج دیتا ہے اوروں کو ایک وعدہ مقرر تک، اس بات میں پتے ہیں ان لوگوں کو جو دھیان کریں

خلاصہ تفسیر: پیچھے جیسے چند جگہ توحید کا ذکر تھا اب آگے پھر اسی کی طرف رجوع ہے۔

اللہ ہی قبض (یعنی معطل) کرتا ہے ان جانوں کو (جن کی موت کا وقت آجاتا ہے) ان کی موت کے وقت (مکمل طور پر کہ ان کی جانوں کو پوری طرح قبض کر لیتا ہے کہ حیات بالکل باقی نہیں رہتی) اور ان جانوں کو بھی جن کو موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت (مکمل طور پر تعطل نہیں ہوتا، کیونکہ سونے کے وقت حیات کے بعض آثار کم ہو جاتے ہیں، ایک حیثیت زندگی کی باقی رہ جاتی ہے مگر ادراک نہیں رہتا، اور موت کی صورت میں نہ ادراک رہتا ہے نہ جان رہتی ہے) پھر (اس معطل کرنے کے بعد) ان جانوں کو تو (بدن کی طرف لوٹنے سے) روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو (جو نیند کی وجہ سے معطل ہوگئی تھیں اور ابھی ان کی موت کا وقت نہیں آیا) ایک میعاد معین (یعنی مدت) تک کے لیے آزاد کر دیتا ہے (کہ وہ جاگ کر پھر واپس بدن میں جا کر بدستور تصرفات کرنے لگتی ہیں، کیونکہ ابھی ان کی موت کا وقت نہ آیا تھا) اس (تصرفات خداوندی کے مجموعہ) میں ان لوگوں کے لئے جو سوچنے کے عادی ہیں (خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور بلا شرکت غیرے تمام عالم کے انتظامات کرنے پر) دلائل ہیں (جن سے وہ اللہ کی توحید پر استدلال کرتے ہیں)۔

سورہ انعام آیت ٦٠ میں لفظ "توفی" کی تفسیر گذری ہے وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

* * *

فائدہ: [1] حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: "یعنی نیند میں ہر روز جان کھینچتا ہے پھر (واپس) بھیجتا ہے، یہ ہی نشان ہے آخرت کا، معلوم ہوا نیند میں بھی جان کھینچتی ہے، جیسے موت میں اگر نیند میں کھینچ کر رہ گئی وہ ہی موت ہے، مگر یہ جان وہ ہے جس کو (ظاہری) ہوش کہتے ہیں اور ایک جان جس سے سانس چلتی ہے اور نبضیں اچھلتی ہیں اور کھانا ہضم ہوتا ہے وہ دوسری ہے وہ موت سے پہلے نہیں کھینچتی" (موضح القرآن)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بغوی نے نقل کیا ہے کہ: "نیند میں روح نکل جاتی ہے، مگر اس کا مخصوص تعلق بدن سے بذریعہ شعاع کے رہتا ہے، جس سے حیات باطل ہونے نہیں پاتی" (جیسے آفتاب لاکھوں میل سے بذریعہ شعاعوں کے زمین کو گرم رکھتا ہے) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیند میں

بھی وہ ہی چیز نکلتی ہے جو موت کے وقت نکلتی ہے، لیکن تعلق کا انقطاع ویسا نہیں ہوتا جو موت میں ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ۝۴۳

کیا انہوں نے پکڑے ہیں اللہ کے سوا کوئی سفارش والے [1] تو کہہ اگر چہ (اور جو) ان کو اختیار نہ ہو کسی چیز کا اور نہ سمجھ (تو بھی) [2]

خلاصہ تفسیر: ہاں! کیا (توحید کے واضح دلائل قائم ہونے کے باوجود) ان لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو (معبود) قرار دے رکھا ہے جو (ان کی) سفارش کریں گے (جیسا کہ مشرکین اپنے بتوں کے متعلق کہا کرتے تھے: **ہولاء شفعاؤنا عند اللہ**) آپ کہہ دیجئے کہ اگر چہ یہ (تمہارے گھڑے ہوئے سفارشی) کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ بھی علم نہ رکھتے ہوں (کیا پھر بھی تم یہی سمجھتے چلے جاؤ گے کہ یہ تمہاری سفارش کریں گے، کیا اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ شفاعت کے لئے علم اور اس کے مناسب قدرت تو ضروری ہے جو ان میں مفقود ہے، کیونکہ یہ تو خود بے حس وحرکت جماد ہیں)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی بتوں کی نسبت مشرکین دعوے رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ان کے سفارشی ہیں، ان ہی کی سفارش سے کام بنتے ہیں، اسی لیے ان کی عبادت کی جاتی ہے، سو اول تو شفیع ہونے سے معبود ہونا لازم نہیں آتا، دوسرے شفیع بھی وہ بن سکتا ہے جسے اللہ کی طرف سے شفاعت کی اجازت ہو اور صرف اس کے حق میں شفاعت کر سکتا ہے جس کو خدا پسند کرے، خلاصہ یہ کہ شفیع کا ماذون ہونا اور مشفوع کا مرتضیٰ ہونا ضروری ہے، یہاں دونوں باتیں نہیں، نہ اصنام (بتوں) کا ماذون ہونا ثابت ہے، نہ کفار کا مرتضیٰ ہونا، لہذا ان کا دعویٰ غلط ہوا۔

فائدہ: [2] یعنی بتوں کو نہ اختیار ہے نہ سمجھ، پھر ان کو شفیع ماننا عجیب ہے۔

قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۝۴۴

تو کہہ اللہ کے اختیار میں ہے ساری سفارش، اسی کا راج ہے آسمان اور زمین میں، پھر اسی کی طرف پھیرے جاؤ گے

خلاصہ تفسیر: یہاں بعض مشرک یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ پتھر کے تراشے ہوئے بت ہمارا مقصود نہیں، بلکہ یہ مجسمے اور شکلیں فرشتوں کی یا جنات کی ہیں وہ تو ذی روح بھی ہیں قدرت اور علم بھی رکھتے ہیں، اس لئے اب اس کے جواب کی یہ تعلیم دی گئی کہ:

آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ سفارش تو تمام تر خدا ہی کے اختیار میں ہے (اس کی اجازت کے بغیر کسی فرشتے یا بشر کی مجال نہیں کہ کسی کی سفارش کر سکے اور سفارش کی اجازت کے لئے دو شرطیں ہیں: ایک شفاعت کرنے والے کا عند اللہ مقبول ہونا، دوسرے جس کی شفاعت کی جائے اس کا مغفرت کے قابل ہونا، پس جن بتوں کی شکلوں کو یہ لوگ معبود قرار دیتے ہیں اگر وہ جنات وشیاطین ہیں تب تو دونوں شرطیں مفقود ہیں، نہ شفاعت کرنے والے عند اللہ مقبول ہیں نہ یہ مشرک قابل مغفرت ہیں اور اگر ان شکلوں کو ملائکہ یا انبیاء کی شکلیں قرار دے رکھا ہے تو شفاعت کرنے والوں کے مقبول ہونے کی شرط تو موجود ہوئی، مگر دوسری شرط مفقود ہے کہ ان مشرکین میں صلاحیت مغفرت کی نہیں ہے، آگے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ) تمام آسمان وزمین کی سلطنت اسی کی ہے، پھر (جب یہ عالم ختم ہو جائے گا تو) تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے (اسی لئے سب کو چھوڑ کر اسی سے ڈرو اسی کی عبادت کرو)۔

کفار کو دنیاوی حوائج وضروریات میں تو اپنے معبودوں کی سفارش کا اعتقاد تھا ہی اور آخرت میں بطور فرض کے تھا کہ اگر بفرض محال آخرت کوئی چیز ہے تو ہمارے معبود وہاں بھی سفارش کریں گے جیسا کہ ان کا کہنا تھا کہ: **ولئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنی**

* * *

فائدہ: ۱ یعنی فی الحال بھی زمین وآسمان میں اس کی سلطنت ہے اور آئندہ بھی اس کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے تو اس کی اجازت و خوشنودی کے بغیر کس کی مجال ہے جو زبان ہلا سکے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اللہ کے روبرو سفارش ہے پر اللہ کے حکم سے، نہ تمہارے کہے سے جب موت آئے کسی کے کہے سے عزرائیل نہیں چھوڑتا''۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ

اور جب نام لیجئے خالص (ایک) اللہ کا رک جاتے ہیں دل ان کے جو یقین نہیں رکھتے پچھلے گھر کا، اور جب نام لیجئے اس کے سوا

مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

اوروں کا تب وہ لگیں خوشیاں کرنے

خلاصہ تفسیر: اب آگے یہ بتلاتے ہیں کہ توحید کے واضح دلائل قائم ہونے کے باوجود ان کفار و مشرکین کا حال یہ ہے کہ توحید ہی سے نفرت کرتے ہیں۔

اور جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (کہ وہ بلا شرکت غیرے تمام عالم کے سیاہ وسفید کا مالک مختار اور متصرف ہے) تو ان لوگوں کے دل منقبض ہوتے ہیں جو آخرت کا یقین نہیں رکھتے اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر آتا ہے (خواہ صرف انہیں کا ذکر ہو یا اللہ کے ذکر کے ساتھ، ان کا بھی ذکر ہو) تو اسی وقت وہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں (کیونکہ شرک ان کو محبوب ہے)۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ: مشرکین اللہ تعالی کے ذکر کو ناپسند کرتے ہیں اور غیروں کے تذکرے سے خوش ہوتے ہیں، چنانچہ بعض جاہل جو طریقت کے مدعی ہیں ان کی حالت بھی اسی کے مشابہ ہے کہ جب خالص توحید کا ذکر کیا جاتا ہے تو منقبض اور تنگ دل ہوتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں اولیاء کے ساتھ استغاثہ اور توسل کرنے والوں کی حکایات سے خوش ہوتے ہیں۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱ مشرک کا خاصہ ہے کہ گو بعض وقت زبان سے اللہ کی عظمت و محنت کا اعتراف کرتا ہے، لیکن اس کا دل اکیلے خدا کے ذکر اور حمد و ثناء سے خوش نہیں ہوتا، ہاں! دوسرے دیوتاؤں یا جھوٹے معبودوں کی تعریف کی جائے تو مارے خوشی کے اچھلنے لگتا ہے، جس کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں، افسوس یہی حال آج بہت سے نام نہاد مسلمانوں کا دیکھا جاتا ہے کہ خدائے واحد کی قدرت وعظمت اور اس کے علم کی لامحدود وسعت کا بیان ہو تو چہروں پر انقباض کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، مگر کسی پیر فقیر کا ذکر آ جائے اور جھوٹی سچی کرامات اناپ شناپ بیان کر دی جائیں تو چہرے کھل پڑتے اور دلوں میں جذبات مسرت وانبساط جوش مارنے لگتے ہیں، بلکہ بسا اوقات توحید خالص کا بیان کرنے والا ان کے نزدیک منکر اولیاء سمجھا جاتا ہے، فالی اللہ المشتکی وھو المستعان۔

قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ

تو کہہ اے اللہ پیدا کرنے والے آسمانوں کے اور زمین کے جاننے والے چھپے اور کھلے کے تو ہی فیصلہ کرے اپنے بندوں

فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

میں جس چیز میں وہ جھگڑ رہے تھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کے ضمن میں کفار کی ہٹ دھرمی کا بھی ذکر ہوا، چونکہ اس سے رسول اللہ ﷺ کو غم ہوتا تھا اس لیے آپ

کی تسلی کے لیے اب ایک دعا تعلیم فرماتے ہیں اور کفار کی سزا بیان کر کے دعا کے مضمون کو کامل کرتے ہیں۔

آپ (ان کی شدت عناد اور ہٹ دھرمی سے غم نہ کیجیے اور اللہ سے دعا میں یہ) کہیئے کہ اے اللہ! آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے باطن اور ظاہر کے جاننے والے آپ ہی (قیامت کے روز) اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں فیصلہ فرما دیں گے جن میں باہم وہ اختلاف کرتے تھے (یعنی آپ ان معاندین کی فکر میں نہ پڑیئے، بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیجیے وہ خود عملی فیصلہ کر دیں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جب ایسی موٹی باتوں میں بھی جھگڑے ہونے لگے اور اللہ کا اتنا وقار بھی دلوں میں باقی نہ رکھا تو اب تیرے ہی سے فریاد ہے، تو ہی ان جھگڑوں کا عملی فیصلہ فرمائے گا۔

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ

اور اگر گناہ گاروں کے پاس ہو جتنا کچھ کہ زمین میں ہے سارا اور اتنا ہی اور اسکے ساتھ تو سب دے ڈالیں اپنے چھڑوانے میں بری طرح کے

الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ

عذاب سے دن قیامت کے، اور نظر آئے ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال بھی نہ رکھتے تھے، اور نظر آئیں ان کو برے کام اپنے

مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٤٨﴾

جو کماتے تھے اور الٹ پڑے ان پر وہ چیز جس پر ٹھٹھا کرتے تھے ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور (اس فیصلہ کے وقت یہ حالت ہوگی) کہ اگر ظلم (یعنی شرک وکفر) کرنے والوں کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں اور ان چیزوں کے ساتھ اتنی چیزیں اور بھی ہوں تو وہ لوگ قیامت کے دن سخت عذاب سے چھوٹ جانے کے لئے (بے تامل) ان کو دینے لگیں (اگرچہ مقبول نہ ہو جیسا کہ سورہ مائدۃ میں گزر چکا ہے: ماتقبل منھم) اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا (کیونکہ اول تو وہ آخرت کے منکر تھے، پھر اس میں بھی ان کا یہ دعوی تھا کہ وہاں بھی ان کو عزت و دولت ملے گی) اور (اس وقت) ان کو تمام اپنے برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس (عذاب) کے ساتھ وہ استہزاء کیا کرتے تھے وہ ان کو آ گھیرے گا۔

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ: اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قیامت کے دن عذاب سے چھوٹنے کے لیے ایسا کریں گے، بلکہ مقصود صرف مثال بیان کرنا ہے کہ اس وقت ان کی ایسی حالت ہوگی کہ وہ یہ چاہیں گے کہ کسی طرح ہم عذاب سے بچ جائیں، مگر ان کے لیے عذاب ایسا لازم ہوگا کہ اگر بفرض محال وہ دنیا بھر کی دولت بھی اس کے معاوضہ میں دینے لگیں جب بھی اس سے نہ بچ سکیں گے۔

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ: اس سے اس شخص کی غلطی بھی معلوم ہوتی ہے جو اپنے اعمال ومجاہدات سے کشف کو مقصود سمجھتا ہے، اعمال ومجاہدات کا مقصود کشف نہیں، بلکہ اللہ تعالی کی رضا ہے، کیونکہ اگر کشف کوئی کمال ہوتا تو کفار حاصل نہ ہوتا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جب قیامت کے دن ان اختلافات کا فیصلہ سنایا جائے گا، اس وقت جو ظالم شرک کر کے خدا تعالیٰ کی شان گھٹاتے تھے ان کا سخت برا حال ہوگا، اگر اس روز فرض کیجیے کل روئے زمین کے خزانے بلکہ اس سے بھی زائد ان کے پاس موجود ہوں تو چاہیں گے کہ سب دے دلا کر کسی طرح اپنا پیچھا چھڑالیں، جو بدمعاشیاں دنیا میں کی تھیں، سب ایک ایک کر کے ان کے سامنے ہوں گی اور ایسے قسم قسم کے ہولناک عذابوں کا مزہ چکھیں گے جو کبھی ان کے خیال وگمان میں بھی نہ گزرے تھے، غرض توحید خالص اور دین حق سے جو ٹھٹھا کرتے تھے اس کا وبال پڑ کر رہے گا اور جس عذاب کا

مذاق اڑایا کرتے تھے وہ ان پر الٹ پڑے گا۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ز ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا لا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ

سو جب آ لگتی ہے آدمی کو کچھ تکلیف ہم کو پکارنے لگتا ہے ۱؎ پھر جب ہم بخشیں اسکو اپنی طرف سے کوئی نعمت کہتا ہے یہ تو مجھ کو ملی کہ

عَلٰی عِلْمٍ ط بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾

پہلے سے معلوم تھی (معلوم ہو چکی) ۲؎ کوئی نہیں یہ جانچ ہے پر وہ بہت سے لوگ نہیں سمجھتے ۳؎

خلاصه تفسير: پیچھے مشرکین کی ہٹ دھرمی اور توحید کے ذکر سے نفرت اور غیر اللہ کے ذکر سے خوشی کا حال بیان ہوا، اب اسی پر متفرع کر کے ان کی ایک دوسری حالت بیان فرماتے ہیں۔

پھر جس وقت (اس مشرک) آدمی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو (جن باطل معبودوں کے ذکر سے خوش ہوا کرتا تھا ان سب کو چھوڑ کر صرف) ہم کو پکارتا ہے (حالانکہ پہلے ہم سے نفرت تھی، یہ مشرکین کی باتوں اور ان کے احوال میں صریح تضاد ہے جس سے ان کی صاف حماقت و جہالت ظاہر ہونے کے علاوہ ان کا مذہب بھی باطل قرار پاتا ہے مگر) پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرما دیتے ہیں تو (جس توحید کا حق ہونا خود ان کے اقرار سے پہلے ثابت ہو چکا تھا اس پر قائم نہیں رہتا، چنانچہ اس نعمت کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کرتا بلکہ یوں) کہتا ہے کہ یہ تو مجھ کو (میری) تدبیر سے ملی ہے (چونکہ نسبت حق تعالیٰ کی طرف نہیں کرتا بلکہ اپنی تدبیر کا نتیجہ سمجھتا ہے اس لئے توحید پر قائم نہیں رہتا بلکہ اپنے قدیم طریقہ شرک کی طرف لوٹ کر غیر اللہ کی عبادت میں لگ جاتا ہے، آگے حق تعالیٰ اس کے قول انما اوتیتہ کو رد فرماتے ہیں کہ وہ نعمت اس کی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے) بلکہ وہ (نعمت خدا کی دی ہوئی ہے اور اس کی طرف سے انسان کی) ایک آزمائش ہے (کہ دیکھیں نعمت کے ملنے پر ہم کو بھول جاتا ہے اور کفر کرتا ہے، یا کہ یاد رکھتا ہے اور شکر کرتا ہے، اور اسی آزمائش کے لئے بعض نعمتوں میں ظاہری اسباب اور کسب کا واسطہ بھی رکھ دیا ہے، اس سے اور زیادہ آزمائش ہوگئی کہ دیکھیں انسان اس ظاہری سبب پر نظر کرتا ہے یا حقیقی علت پر) لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) سمجھتے نہیں (اس لئے اس کو اپنی تدبیر کا نتیجہ بتلا کر شرک میں مبتلا رہتے ہیں)۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ: اس میں اس شخص کی برائی بھی معلوم ہوگئی جو طریقت و عبادت کے ثمرات و فضائل کو جو کہ حقیقت میں اللہ کے انعامات ہیں اپنے عمل اور مجاہدہ کی طرف منسوب کرتا ہے اور اسی کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

* * *

فائده: ۱؎ یعنی جس کے ذکر سے چڑتا تھا مصیبت کے وقت اسی کو پکارتا ہے اور جن کے ذکر سے خوش ہوتا تھا انہیں بھول جاتا ہے۔

فائده: ۲؎ یعنی قیاس یہ ہی چاہتا تھا کہ یہ نعمت مجھ کو ملے، کیونکہ مجھ میں اس کی لیاقت تھی اور اس کی کمائی کے ذرائع کا علم رکھتا تھا اور خدا کو میری استعداد و اہلیت معلوم تھی، پھر مجھے کیوں نہ ملتی، غرض اپنی لیاقت اور عقل پر نظر کی، اللہ کے فضل و قدرت پر خیال نہ کیا۔

فائده: ۳؎ یعنی ایسا نہیں، بلکہ یہ نعمت خدا کی طرف سے ایک امتحان ہے کہ بندہ اسے لے کر کہاں تک منعم حقیقی کو پہچانتا اور اس کا شکر ادا کرتا ہے، اگر ناشکری کی گئی تو یہ ہی نعمت نقمت بن کر وبال جان ہو جائے گی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ جانچ ہے کہ عقل اس کی دوڑنے لگتی ہے تاکہ اپنی عقل پر بہکے، وہ ہی عقل رہتی ہے اور آفت آ پہنچتی ہے''، پھر کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی۔

قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا

کہہ چکے ہیں یہ بات ان سے اگلے پھر کچھ کام نہ آیا ان کو جو کماتے تھے، پھر پڑ گئیں (پڑیں) ان پر برائیاں جو

كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾

کمائی تھیں لے اور جو گناہ گار ہیں ان میں سے ان پر بھی اب پڑتی ہیں برائیاں جو کمائی ہیں، اور وہ نہیں تھکانے والے ۲

خلاصہ تفسیر: (آگے بطور نتیجہ اس پر دھمکی ہے کہ) یہ بات (بعض) ان لوگوں نے بھی کہی تھی جوان سے پہلے ہو گزرے ہیں (جیسا کہ قارون، نمرود اور فرعون وغیرہ کہا کرتے تھے) سوان کی کارروائی ان کے کچھ کام نہ آئی (اور خدا کے عذاب کو نہ روک سکی) پھر (عذاب کیا روکتی عذاب دور کرنے والی بھی نہ ہوئی بلکہ) ان کی تمام بداعمالیاں ان پر آ پڑیں (اور سزایاب ہوئے) اور (زمانہ حال کے لوگ یہ خیال نہ کریں کہ کچھ ہونا تھا اگلوں کے ساتھ ہو چکا بلکہ) ان میں بھی جو ظالم ہیں ان پر بھی ان کی بداعمالیاں ابھی پڑنے والی ہیں اور یہ (خدا تعالیٰ کو) ہرا نہیں سکتے (چنانچہ بدر میں خوب سزا ہوئی)۔

قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: جیسے قارون نے کہا تھا: انما اوتيته علىٰ علم عندی کہ یہ مال و دولت مجھے اپنے علم و تدبیر سے ملا ہے، اسی طرح جو لوگ خدا کے منکر تھے جیسے نمرود و فرعون وغیرہ ظاہر ہے کہ وہ بھی کسی نعمت کی نسبت خدا کی طرف نہ کرتے تھے، بلکہ جو نعمت بغیر محنت کے حاصل ہوتی اس کو نصیب اور اتفاق کی طرف منسوب کرتے اور جو نعمت محنت سے حاصل ہوتی اس کو ہنر اور تدبیر کا نتیجہ بتلاتے تھے۔

* * *

فائدہ: لے چنانچہ قارون نے یہی کہا تھا، اس کا جو حشر ہوا وہ پہلے گزر چکا۔

فائدہ: ۲ یعنی جیسے پہلے مجرموں پر ان کی شرارتوں کا وبال پڑا، موجود الوقت مشرکین پر بھی پڑنے والا ہے، جس وقت اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینا چاہے گا، یہ روپوش ہو کر یا اور کسی تدبیر سے اس کو تھکا نہیں سکتے۔

اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ ع

اور کیا نہیں جان چکے کہ اللہ پھیلاتا (دیتا) ہے روزی جس کے واسطے چاہے اور ناپ کر دیتا ہے، البتہ اس میں پتے ہیں ان لوگوں کے واسطے جو مانتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اب اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ بعض احمق جو نعمت و رزق کو اپنی تدبیر کی طرف منسوب کرتے ہیں تو:

کیا ان لوگوں کو (احوال میں غور کرنے سے) یہ معلوم نہیں ہوا کہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے زیادہ رزق دیتا ہے اور وہی (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی بھی کر دیتا ہے (رزق کی اس کشادگی و تنگی) میں (غور کرنے سے) ایمان والوں کے واسطے (کہ وہ سمجھدار ہوتے ہیں اس بات پر) نشانیاں (یعنی دلائل قائم) ہیں (کہ رزق میں کشادگی و تنگی کرنے والا وہی ہے، اچھی اور بری تدبیر اس میں حقیقی علت نہیں ہے، بلکہ یہ صرف اللہ کی طرف سے تقسیم ہے، پس ان دلائل کو جو شخص سمجھ لے گا وہ اپنی تدبیر کی طرف نسبت نہ کرے گا بلکہ خدا کے منعم ہونے سے ذہول نہ کرے گا جو کہ شرک میں مبتلا ہونے کا سبب ہو گیا تھا بلکہ وہ موحد رہے گا اور مصیبت و راحت میں اس کے حال اور باتوں میں تعارض نہ ہو گا)۔

* * *

فائدہ: لے یعنی دنیا میں محض روزی کا کشادہ یا تنگ ہونا کسی شخص کے مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی، نہ روزی کا ملنا کچھ عقل و ذہانت اور علم و لیاقت پر منحصر ہے، دیکھو کتنے بیوقوف یا بدمعاش چین اڑا رہے ہیں، اور کتنے عقلمند اور نیک آدمی فاقے کھینچتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یعنی عقل دوڑانے اور تدبیر کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتا، پھر ایک کو روزی کشادہ ہے ایک کو تنگ، جان لو کہ (صرف) عقل کا کام نہیں" (کہ اپنے او پر روزی کشادہ کر لے) بلکہ یہ تقسیم رزاق حقیقی کی حکمت و مصلحت کے تابع اور اسی کے ہاتھ میں ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ

کہہ دے اے بندو میرے جنہوں نے کہ زیادتی کی ہے اپنی جان پر آس مت توڑو اللہ کی مہربانی سے بیشک اللہ بخشتا ہے

الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

سب گناہ، وہ جو ہے وہی گناہ معاف کرنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: پیچھے شرک کی مذمت اور اس پر وعید بیان ہوئی جس سے توحید کی طرف دعوت مقصود ہے، ایسے مضامین سن کر بعض کو شبہ ہوا کہ جب مشرکین ایسی شدید وعید کے مستحق ہیں تو اگر آئندہ کے لیے توحید و ایمان بھی اختیار کرلیا تب بھی گزشتہ شرک کا وبال وعذاب تو بھگتنا ہی پڑے گا، پھر اسلام لانے سے کیا فائدہ؟ چنانچہ اب اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ یہ سب معاف ہوجائے گا اور ایمان لانے کے بعد گزشتہ گناہوں پر مطلق عذاب نہ ہوگا، اور اس معافی کا طریقہ بھی بتلادیا جو کہ شرک سے توبہ اور اسلام کی طرف رجوع ہے، اور اس کے ساتھ یہ بھی سنادیا کہ جیسے قبول اسلام پر نجات اور معافی کا وعدہ ہے اسی طرح اس کی ضد یعنی کفر پر شدید عذاب کے مستحق ہوں گے۔

آپ (ان سوال کرنے والوں کے جواب میں میری طرف سے) کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے (کفر وشرک کر کے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو (اور یہ خیال نہ کرو کہ ایمان لانے کے بعد گزشتہ کفر وشرک پر مواخذہ اور پکڑ ہوگی، سو یہ بات نہیں بلکہ) بالیقین اللہ تعالیٰ (اسلام کی برکت سے) تمام (گزشتہ) گناہوں کو (اگرچہ کفر وشرک ہی کیوں نہ ہو) معاف فرمادے گا واقعی وہ بڑا بخشنے والا، بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

* * *

فائدہ: یہ آیت ارحم الراحمین کی رحمت بے پایاں اور عفو ودرگزر کی شان عظیم کا اعلان کرتی ہے اور سخت سے سخت مایوس العلاج مریضوں کے حق میں اکسیر شفاء کا حکم رکھتی ہے، مشرک، ملحد، زندیق، مرتد، یہودی، نصرانی، مجوسی، بدعتی، بدمعاش، فاسق، فاجر کوئی ہو آیت ہذا کو سننے کے بعد خدا کی رحمت سے بالکلیہ مایوس ہوجانے اور آس توڑ کر بیٹھ جانے کی اس کے لیے کوئی وجہ نہیں، کیونکہ اللہ جس کے چاہے سب گناہ معاف کرسکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑسکتا، پھر بندہ ناامید کیوں ہو، ہاں! یہ ضرور ہے کہ اس کے دوسرے اعلانات میں تصریح کردی گئی کہ کفر وشرک کا جرم بدون توبہ کے معاف نہیں کرے گا، لہٰذا اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا کو لمن یشاء کے ساتھ مقید سمجھنا ضروری ہے، کما قال تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:۴۸) اس تقیید سے یہ لازم نہیں آتا کہ بدون توبہ کے اللہ تعالیٰ کوئی چھوٹا بڑا قصور معاف ہی نہ کرسکے اور نہ یہ مطلب ہوا کہ کسی جرم کے لیے توبہ کی ضرورت ہی نہیں، بدون توبہ کے سب گناہ معاف کردیئے جائیں گے، قید صرف مشیت کی ہے اور مشیت کے متعلق دوسری آیات میں بتلادیا گیا کہ وہ کفر وشرک سے بدون توبہ کے متعلق نہ ہوگی، چنانچہ آیت ہذا کا شان نزول بھی اس پر دلالت کرتی ہے، جیسا کہ اگلی آیت کے فائدہ سے معلوم ہوگا۔

وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاتَّبِعُوْٓا

اور رجوع ہوجاؤ اپنے رب کی طرف اور اس کی حکم برداری کرو پہلے اس سے کہ آئے تم پر عذاب پھر کوئی تمہاری مدد کو نہ آئے گا ۱ اور چلو

اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

بہتر بات پر جو اتری تمہاری طرف تمہارے رب سے پہلے اس سے کہ پہنچے تم پر عذاب اچانک اور تم کو خبر نہ ہو ۲

خلاصہ تفسیر: چونکہ اس معافی کی شرط اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ کفر سے توبہ کی جائے اور اسلام قبول کیا جائے، اس لئے اب آگے یہ طریقہ بتلاتے ہیں:

اور تم (کفر سے توبہ کرنے کے لئے) اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور (اسلام قبول کرنے میں) اس کی فرمانبرداری کرو قبل اس کے کہ (اسلام نہ لانے کی صورت میں) تم پر عذاب (الٰہی) واقع ہونے لگے (اور) پھر (اس وقت کسی کی طرف سے) تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے (یعنی جیسا اسلام لانے کی صورت میں سب کفروشرک معاف ہوجائے گا اسی طرح اسلام نہ لانے کی صورت میں اس کفروشرک پر عذاب ہوگا جس کا کوئی دفعیہ نہیں) اور (جب یہ بات ہے کہ اسلام نہ لانے کا یہ انجام ہے تو) تم (کو چاہئے کہ) اپنے رب کے پاس سے آئے ہوئے اچھے اچھے حکموں پر چلو قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آپڑے اور تم کو (اس کا) خیال بھی نہ ہو (اس سے مراد آخرت کا عذاب ہے)۔

اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ الۡعَذَابُ بَغۡتَۃً: اس کو "اچانک" یا تو اس لئے کہا کہ پہلی بار صور پھونکنے کے وقت سب روحیں مدہوش ہوجائیں گی، پھر دوسری بار صور پھونکنے کے وقت اچانک عذاب کا احساس ہونے لگے گا، یا "اچانک" اس لیے کہا کہ آخرت کا عذاب جیسا سخت ہوگا پہلے اس کی حقیقت معلوم نہ تھی اور ویسا گمان نہ تھا، گمان کے خلاف واقعہ سامنے آنے کو اچانک سے تعبیر کیا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱ مغفرت کی امید دلا کر یہاں سے توبہ کی طرف متوجہ فرمایا، یعنی گذشتہ غلطیوں پر نادم ہوکر اور اللہ کے بے پایاں جود وکرم سے ... کر کفر وعصیان کی راہ چھوڑ دو اور اس رب کریم کی طرف رجوع ہوکر اپنے کو بالکلیہ اسی کے سپرد کردو، اسکے احکام کے سامنے نہایت عجز واخلاص کے ساتھ گردن ڈال دو اور خوب سمجھ لو کہ حقیقت میں نجات محض اس کے فضل سے ممکن ہے، ہمارا رجوع وانابت بھی بدون اس کے فضل وکرم کے میسر نہیں ہوسکتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب کیا جو کفار دشمنی میں لگے رہے تھے، سمجھے کہ لاریب اس طرف اللہ ہے، یہ سمجھ کر اپنی غلطیوں پر پچھتائے، لیکن شرمندگی سے مسلمان نہ ہوئے کہ اب ہماری مسلمانی کیا قبول ہوگی، دشمنی کی، لڑائیاں لڑے اور کتنے خدا پرستوں کے خون کیے، تب اللہ نے یہ فرمایا کہ ایسا گناہ کوئی نہیں جس کی توبہ اللہ قبول نہ کرے، ناامید مت ہو، توبہ کرو اور رجوع ہو، بخشے جاؤ گے، مگر جب سر پر عذاب آیا، یا موت نظر آنے لگی اس وقت کی توبہ قبول نہیں"، نہ اس وقت کوئی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔

فائدہ: ۲ "بہتر بات" سے مراد قرآن کریم ہے، یعنی قرآنی ہدایت پر چل کر عذاب آنے سے پہلے اپنے مستقبل کی روک تھام کرلو، ورنہ معاً عذاب الٰہی اس طرح ایک دم آدبائے گا کہ خبر بھی نہ ہوگی کہاں سے آگیا۔

اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ یّٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰہِ وَ اِنۡ کُنۡتُ لَمِنَ السّٰخِرِیۡنَ ﴿۵۶﴾ اَوۡ تَقُوۡلَ

کہیں کہنے لگے کوئی جی (شخص) اے افسوس اس بات پر کہ میں کوتاہی کرتا رہا اللہ کی طرف سے اور میں تو ہنستا ہی رہا ۱ یا کہنے لگے

لَوۡ اَنَّ اللّٰہَ ہَدٰىنِیۡ لَکُنۡتُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۵۷﴾ اَوۡ تَقُوۡلَ حِیۡنَ تَرَی الۡعَذَابَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ کَرَّۃً

اگر اللہ مجھ کو راہ دکھاتا تو میں ہوتا ڈرنے والوں میں ۲ یا کہنے لگے جب دیکھے عذاب کو کسی طرح مجھ کو پھر جانا ملے

فَاَکُوۡنَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۸﴾

تو میں ہوجاؤں نیکی والوں میں ۳

خلاصہ تفسیر: (اور یہ اسلام کی طرف رجوع اور اتباع کا حکم اس لئے دیا جاتا ہے کہ) کبھی (کل قیامت کے روز) کوئی شخص کہنے لگے کہ افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے خدا کی جناب میں کی (یعنی اس کی اطاعت میں جو مجھ سے کوتاہی ہوئی) اور میں تو احکام خداوندی پر

ہنستا ہی رہا، یا کوئی یوں کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ (دنیا میں) مجھ کو ہدایت کرتا تو میں بھی پرہیزگاروں میں سے ہوتا (مگر ہدایت ہی سے محروم رہا اس لئے یہ تمام تر تقصیر و کوتاہی ہوئی جس میں معذور ہوں) یا کوئی عذاب کو دیکھ کر یوں کہنے لگے کہ کاش میرا (دنیا میں) پھر جانا ہو جائے پھر میں نیک بندوں میں ہو جاؤں۔

اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ: یہاں تین آیتوں میں کفار و مشرکین کی تین تمنائیں بیان کی گئیں ہیں، آخری بات میں ''عذاب دیکھنے'' کی قید بڑھانے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی دو باتیں عذاب دیکھنے سے پہلے ہوں گی، پس غالباً پہلے میدان حساب میں جب اپنے اعمال کی کوتاہی معلوم ہوگی اس وقت پہلی بات: یٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰہِ کہیں گے، پھر عذر اور بہانہ کے طور پر دوسری بات: لَوۡ اَنَّ اللّٰہَ هَدٰىنِیۡ لَکُنۡتُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ کہیں گے کہ ہم تو معذور تھے، جس میں اپنی کوتاہی کا سبب خدا کی طرف سے ہدایت نہ ہونے کو بتلائیں گے، پھر جب اس عذر کو نافع نہ پائیں گے اور عذاب ہی کا معائنہ ہو جائے گا تو اس وقت دنیا میں لوٹنے کی تمنا کریں گے، پس یہ تین قسم کی تمنائیں ہو سکتا ہے کہ مختلف لوگوں کی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تینوں تمنائیں یکے بعد دیگرے ایک ہی جماعت کے کفار کی طرف سے ہوں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہوا و ہوس، رسم و تقلید اور دنیا کے مزوں میں پڑ کر خدا کو کچھ سمجھا ہی نہیں، اس کے دین کی اور پیغمبروں کی اور جس ہولناک انجام سے پیغمبر ڈرایا کرتے تھے، سب کی ہنسی اڑاتا رہا، ان چیزوں کی کوئی حقیقت ہی نہ سمجھی، افسوس خدا کے پہنچاننے اور اس کا حق ماننے میں میں نے کس قدر کوتاہی کی، جس کے نتیجہ میں آج یہ براوقت دیکھنا پڑا (یہ بات کافر محشر میں کہے گا اور اگر آیت کا مضمون کفار و عصاۃ کو عام رکھا جائے تو وان کنت لمن الساخرین کے معنی: ''عملت عمل ساخرٍ مستهزئ'' کے ہوں گے، کما فسر به ابن کثیر)۔

فائدہ: ۲؎ جب حسرت و افسوس سے کام نہ چلے گا تو اپنا دل بہلانے کے لیے یہ عذر پیش کرے گا کہ کیا کہوں خدا نے مجھ کو ہدایت نہ کی، وہ ہدایت کرنا چاہتا تو میں بھی آج متقین کے درجہ میں پہنچ جاتا (اس کا جواب آگے آتا ہے: بَلٰی قَدۡ جَآءَتۡکَ اٰیٰتِیۡ فَکَذَّبۡتَ بِهَا وَاسۡتَکۡبَرۡتَ وَکُنۡتَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ (الزمر:۵۹) اور ممکن ہے یہ کلام بطریق اعتذار و احتجاج نہ ہو، بلکہ محض اظہار یاس کے طور پر ہو، یعنی میں اپنی سوء استعداد اور بدتمیزی کی وجہ سے اس لائق نہ تھا کہ اللہ مجھ کو راہ دکھا کر منزل مقصود تک پہنچا دیتا، اگر مجھ میں اہلیت و استعداد ہوتی اور اللہ میری دستگیری فرماتا تو میں بھی آج متقین کے زمرہ میں شامل ہوتا۔

فائدہ: ۳؎ جب حسرت و اعتذار دونوں بیکار ثابت ہوں گے اور دوزخ کا عذاب آنکھوں کے سامنے آجائے گا، اس وقت شدت اضطراب سے کہے گا کہ کس طرح مجھ کو ایک مرتبہ پھر دنیا میں جانے کا موقع دیا جائے تو دیکھو میں کیسا نیک بن کر آتا ہوں۔

بَلٰی قَدۡ جَآءَتۡکَ اٰیٰتِیۡ فَکَذَّبۡتَ بِهَا وَاسۡتَکۡبَرۡتَ وَکُنۡتَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۵۹﴾

کیوں نہیں پہنچ چکے تھے تیرے پاس میرے حکم، پھر تو نے ان کو جھٹلایا اور غرور کیا اور تو تھا منکروں میں

خلاصہ تفسیر: پیچھے دوسری بات میں جو یہ کہا گیا تھا کہ ''اگر مجھے ہدایت کی جاتی تو میں بھی متقی ہو جاتا'' یہ بظاہر دھوکہ اور تلبیس کا سبب ہے، چنانچہ اب اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

ہاں! بیشک تیرے پاس میری آیتیں پہنچی تھیں سو تو نے ان کو جھٹلایا اور (جھٹلانا کسی شبہ سے نہ تھا بلکہ) تو نے تکبر کیا اور (یہ بھی نہ ہوا کہ دوسرے وقت دماغ درست ہو جاتا بلکہ) کافروں میں (ہمیشہ) شامل رہا (اور اس لئے تیرا یہ کہنا غلط ہے کہ مجھے ہدایت نہیں پہنچی)۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ جبری ہدایت تو آزمائش کے خلاف ہے اس لیے جبری ہدایت اگر نہیں کی گئی تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہو سکتا، اور اختیاری ہدایت کا انکار کرنا غلط ہے، کیونکہ رسولوں اور آیتوں کا آنا بھی ہدایت ہے جس سے اگر تو چاہتا ہدایت حاصل کر سکتا تھا، پس خدا کی طرف سے توجہ

کو ہدایت ہوئی تھی مگر تو نے خود اپنے اختیار سے ایمان وتقویٰ کو چھوڑا، پس تیرا یہ عذر محض باطل ہے۔

فائدہ: یعنی غلط کہتا ہے کہ کیا اللہ نے راہ نہیں دکھلائی تھی اور اپنے پیغمبروں کو نشانات اور احکام دے کر نہیں بھیجا تھا، مگر تو نے تو ان کی کوئی بات ہی نہیں سنی، جو کچھ کہا گیا، غرور اور تکبر سے اسے جھٹلاتا رہا، تیری شیخی قبول حق سے مانع رہی، اور بات یہ ہے کہ اللہ کو ازل سے معلوم تھا کہ تو اس کی آیات کا انکار کرے گا اور تکبر وسرکشی سے پیش آئے گا، تیرے مزاج وطبیعت کی افتاد ہی ایسے ہے، اگر ہزار مرتبہ دنیا کی طرف لوٹا یا جائے تب بھی اپنی حرکات سے باز نہیں آسکتا: وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (الانعام: ۲۸) ایسے لوگوں کی نسبت خدا کی عادت نہیں کہ ان کو عروس کامیابی سے ہمکنار کرے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى

اور قیامت کے دن تو دیکھے ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر کہ ان کے منہ ہوں سیاہ ۱؎ کیا نہیں دوزخ میں ٹھکانا

لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾

غرور والوں کا ۲؎ اور بچائے گا اللہ ان کو جو ڈرتے رہے ان کے بچاؤ کی جگہ، نہ لگے ان کو برائی اور نہ وہ غمگین ہوں ۳؎

خلاصہ تفسیر: اب کفر پر جمے رہنے والوں کی سزا، اور توبہ کرنے والوں کی جزا کا مختصر طور پر ذکر فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر!

آپ قیامت کے روز ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھیں گے جنہوں نے خدا پر جھوٹ بولا تھا (اس میں دو باتیں آگئیں: ایک یہ کہ جو بات خدا نے نہیں کہی اس کو یہ کہنا کہ خدا نے کہی ہے جیسے شرک وغیرہ کی نسبت کفار کہتے تھے، دوسری یہ کہ جو بات خدا نے کہی ہے جیسے کلام الٰہی یعنی قرآن اس کو یہ کہنا کہ خدا نے نہیں کہی ہے) کیا ان متکبرین کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہے (جو کہ عناد اور تکبر سے خدا کی بات کو جھٹلاتے ہیں، ضرور ہے) اور جو لوگ (شرک وکفر سے) بچتے تھے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کامیابی کے ساتھ (جہنم سے) نجات دے گا ان کو (ذرا) تکلیف نہ پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے (کیونکہ جنت میں غم نہیں ہے)۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا: روح المعانی میں ہے کہ ان کے دلوں کی سیاہی ان کے چہروں پر منعکس یعنی ظاہر ہوجائے گی، راز اس میں یہ ہے کہ عالم آخرت کشف حقائق کا عالم ہے، وہاں ہر چیز کی حقیقت عیاں ہوکر سامنے آجائے گی (انسان دنیا میں جیسے اعمال کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت میں ان سب کی حقیقت کھول دے گا، لہذا انسان کو اچھے اعمال کر کے زندگی گذارنی چاہیے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اللہ کی طرف سے جو سچی بات آئے اس کو جھٹلانا، یہ ہی اللہ پر جھوٹ بولنا ہے، کیونکہ جھٹلانے والا دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ نے فلاں بات نہیں کہی، حالانکہ واقع میں کہی ہے، اس جھوٹ کی سیاہی قیامت کے دن ان کے چہروں پر ظاہر ہوگی۔

فائدہ: ۲؎ پہلے فکذبت بھا واستکبرت میں دو صفتیں کافر کی بیان ہوئی تھیں، تکذیب جو مشتمل ہے کذب پر اور استکبار وغرور، یہاں بتلا دیا کہ کذب ودروغ سے ان کے منہ کالے ہوں گے اور غرور وتکبر کا ٹھکانہ دوزخ کے سوا کہیں نہیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ متقین کو ان کے ازلی فوز وسعادت کی بدولت کامیابی کے اس بلند مقام پر پہنچائے گا، جہاں ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ اور ہر طرح کے فکر وغم سے آزاد ہوں۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ؗ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۶۲﴾

اللہ بنانے والا ہے ہر چیز کا اور وہ ہر چیز کا ذمہ لیتا ہے

لَهٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾

اسی کے پاس ہیں کنجیاں آسمانوں کی اور زمین کی، اور جو منکر ہوئے ہیں اللہ کی باتوں سے وہ لوگ جو ہیں وہی ہیں ٹوٹے میں پڑے ۱

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا حکم اور اس پر مزید لطف کا وعدہ اور شرک سے ممانعت اور اس پر سخت عذاب کی وعید مذکور تھی، اب آگے بعض آیات میں حق تعالیٰ کی بعض صفات بیان کر کے توحید، وعدہ اور وعید کی تائید فرماتے ہیں اور درمیان میں شرک کی مذمت فرماتے ہیں اور پھر قیامت کے بعض احوال کی تفصیل ہے۔

اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے (یعنی ان سب چیزوں کا موجد و خالق بھی وہی ہے اور ان کو باقی رکھنے والا، حفاظت کرنے والا بھی وہی ہے یہ مفہوم ہے لفظ ''وکیل'' کا، اور) اسی کے اختیار میں کنجیاں ہیں آسمان و زمین کی (یعنی ان سب مخلوقات میں تصرفات و انقلابات بھی اسی کا کام ہے، یہ مفہوم ہے: لَهٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا، کیونکہ جس کے ہاتھ میں خزانوں کی کنجیاں ہوتی ہیں، وہ ہی عادتاً ان میں تصرفات کا مالک ہوتا ہے اور جب ساری کائنات کا خالق بھی بلا شرکت غیرے وہی ہے، محافظ بھی وہی ہے، تصرفات کا مالک بھی وہی ہے تو عبادت بھی صرف اسی کی ہونی چاہئے اور سزا و جزا کا مالک بھی وہی ہونا چاہئے جو خلاصہ ہے توحید کا، پس اوپر کے دونوں مضمون یعنی توحید اور وعدہ و وعید کی اس تقریر سے تائید ہوگئی) اور (چونکہ خدا کا خالق و محافظ اور خزانوں کی کنجیوں کا مالک ہونا کفار کو بھی مسلم تھا تو ان مقدمات کے مان لینے سے مقصود یعنی توحید اور جزا وسزا کا تسلیم کر لینا اور زیادہ مؤکد ہو گیا، اس لئے فرمایا) جو لوگ (اس پر بھی) اللہ کی آیتوں کو (جو توحید اور جزا و سزاء کے مضمون پر مشتمل ہیں) نہیں مانتے وہ بڑے خسارے میں رہیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہر چیز کو اس نے پیدا کیا اور پیدا کرنے کے بعد اس کی بقاء و حفاظت کا ذمہ دار بھی وہ ہی ہوا، اور زمین و آسمان کی تمام چیزوں میں تصرف و اقتدار بھی اسی کو حاصل ہے، کیونکہ سب خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، پھر ایسے خدا کو چھوڑ کر آدمی کہاں جائے، چاہیے کہ اسی کے غضب سے ڈرے اور اسی کی رحمت کا امیدوار رہے، کفر و ایمان اور جنت و دوزخ سب اسی کے زیر تصرف ہیں، اس کی باتوں سے منکر ہو کر آدمی کا کہیں ٹھکانا نہیں، کیا اس سے منحرف ہو کر آدمی کسی فلاح کی امید رکھ سکتا ہے۔

قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَىِٕنْ

تو کہہ اب اللہ کے سوا کسی کو بتلاتے ہو کہ پوجوں اے نادانو ۱ اور حکم ہو چکا ہے تجھ کو اور تجھ سے اگلوں کو کہ اگر تو نے

اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۶۶﴾

شریک مان لیا تو اکارت جائیں گے تیرے عمل اور تو ہو گا ٹوٹے میں پڑا، نہیں بلکہ اللہ ہی کو پوج اور رہ حق ماننے والوں میں ۲

خلاصہ تفسیر: اب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ خود تو کفر و شرک میں ملوث تھے ہی، مگر ان کا حوصلہ یہاں تک بڑھا کہ نعوذ باللہ آپ کو بھی اپنے طریقہ پر لانے کے لئے فرمائش کرتے ہیں سوائے پیغمبر ﷺ !:

آپ (ان کے جواب میں) کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! کیا (بعد اس کے کہ دلائل سے توحید ثابت ہو چکی اور کفر و شرک باطل ہو چکا) پھر بھی تم

مجھ کو غیر اللہ کی عبادت کرنے کی فرمائش کرتے ہو، اور (اے پیغمبر! بھلا آپ سے نعوذ باللہ کفر و شرک کا صادر ہونا کیسے ممکن ہے جس کی وہ احمق توقع کرتے ہیں، کیونکہ) آپ کی طرف بھی اور جو پیغمبر آپ سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کی طرف بھی یہ (بات) وحی (میں) بھیجی جا چکی ہے (کہ اپنے ہر امتی کو پہنچا دیں) کہ اے عام مخاطب! اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا کام (سب) غارت ہو جائے گا اور تو خسارہ میں پڑے گا (اس لئے تو کبھی شرک کے پاس نہ جانا) بلکہ (ہمیشہ) اللہ ہی کی عبادت کرنا اور (اللہ کا) شکر گزار رہنا (اس میں شرک کی قباحت پر دلیل بیان کر دی کہ وہ سخت درجہ کی ناشکری ہے، پس جب انبیاء علیہم السلام کو شرک کی قباحت وحی سے معلوم ہے اور دوسروں تک اس کے پہنچا دینے کا ان کو حکم ہے اور آپ ﷺ بھی انبیاء میں سے ہیں تو آپ سے نعوذ باللہ شرک کا صادر ہونا کب ممکن ہے، پس کفار کا ایسی ہوس رکھنا ان کے دماغ کا خلل ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی انتہائی نادانی اور حماقت و جہالت یہ ہے کہ آدمی خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرے اور پیغمبر خدا سے (معاذ اللہ) یہ طمع رکھے کہ وہ اس کے راستہ پر جائیں گے، بعض روایات میں ہے کہ مشرکین نے حضور ﷺ کو اپنے دیوتاؤں کی پرستش کی طرف بلایا تھا، اس کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

فائدہ: ۲ یعنی عقلی حیثیت سے دیکھا جائے کہ تمام چیزوں کا پیدا کرنا باقی رکھنا اور ان میں ہر قسم کے تصرفات کرتے رہنا صرف اللہ کا کام ہے تو عبادت کا مستحق بجز اس کے کوئی نہیں ہو سکتا، اور نقلی حیثیت سے لحاظ کرو تو تمام انبیاء اللہ اور ادیان سماویہ توحید کی صحت اور شرک کے بطلان پر متفق ہیں، بلکہ ہر نبی کو بذریعہ وحی بتلا دیا گیا ہے کہ (آخرت میں) مشرک کے تمام اعمال اکارت ہیں اور شرک کا انجام خالص حرمان و خسران کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر ایک خدائے قدوس کو پوجے اور اس کا شکر گزار و وفادار بندہ بنے، اس کے عظمت و جلال کو سمجھے، عاجز و حقیر مخلوق کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے، اس کو اسی طرح بزرگ و برتر مانے، جیسا کہ وہ واقع میں ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ

اور نہیں سمجھے اللہ کو جتنا کچھ وہ ہے ۱ اور زمین ساری ایک مٹھی ہے اس کی دن قیامت کے اور آسمان لپٹے ہوئے ہوں

بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۶۷

اس کے داہنے ہاتھ میں، پاک ہے اور بہت اوپر ہے اس کے کہ شریک بتلاتے ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: اور (افسوس ہے کہ) ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ کی جیسا کہ عظمت کرنا چاہیے تھی (خدا کی عظمت کا حق توحید ہے اور اس حق کی بے قدری شرک ہے) حالانکہ (اس کی وہ شان ہے کہ) ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں (اور دوسرا کوئی ایسا نہیں، پس) وہ پاک اور برتر ہے ان کے شرک سے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ: توحید کو خدا کی عظمت کا حق عقائد کے اعتبار سے کہا گیا ہے، ورنہ اس کی عظمت کے حقوق اور بھی بہت سے ہیں، کچھ اسی میں منحصر نہیں، اور ان کو عظمت کا حق کہنا بندہ کی وسعت کے اعتبار سے ہے، ورنہ اس کی ذات کا حق کون ادا کر سکتا ہے۔

وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ: اس کی مزید تفسیر سورہ انبیاء آیت ۱۰۴ میں ملاحظہ کر لی جائے، اور خدا کے لیے مٹھی اور داہنے کا ثبوت متشابہات میں سے ہے، جس کا مطلب اور حقیقت خدا ہی کو معلوم ہے، سو ان کی کیفیت دریافت کیے بغیر ان پر ایمان لانا واجب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی مشرکین نے اس کے عظمت و جلال اور بزرگی و برتری کو وہاں تک نہ سمجھا اور ملحوظ نہ رکھا، جہاں تک ایک بندہ کو سمجھنا اور ملحوظ

رکھنا چاہیے تھا، اس کی شان رفیع اور مرتبہ بلند کا اجمالی تصور رکھنے والا، کیا عاجز ومحتاج مخلوق حتیٰ کہ پتھر کی بے جان مورتیوں کو اس کا شریک تجویز کرسکتا ہے، حاشا وکلا! آگے اس کی بعض شؤون عظمت وجلال کا بیان ہے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی جس کی عظمت شان کا یہ حال ہے کہ قیامت کے دن کل زمین اس کی ایک مٹھی میں اور سارے آسمان کاغذ کی طرح لپٹے ہوئے ایک ہاتھ میں ہوں گے، اس کی عبادت میں بے جان یا عاجز ومحتاج مخلوق کو شریک کرنا کہاں تک روا ہوگا، وہ شرکا تو خود اس کی مٹھی میں پڑے ہیں، جس طرح چاہے ان پر تصرف کرے، ذرا کان یا زبان نہیں ہلا سکتے۔

تنبیہ: مطویات بیمینہ کے متعلق سورہ انبیاء کی آیت: یوم نطوی السماء کا حاشیہ دیکھنا چاہیے، اور یمین وغیرہ الفاظ متشابہات میں سے ہیں جن پر بلا کیف ایمان رکھنا واجب ہے، بعض احادیث میں ہے: " فکلتا یدیه یمین" (اس کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں) اس سے تجسیم، تحیز اور جہت وغیرہ کی نفی ہوتی ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ

اور پھونکا جائے صور میں پھر بیہوش ہوجائے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور زمین میں مگر جس کو اللہ چاہے، پھر پھونکی جائے

فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿۶۸﴾

دوسری بار، تو فوراً کھڑے ہوجائیں ہر طرف دیکھتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کو ثابت کرنے اور شرک کو باطل کرنے کے ضمن میں جزا وسزا کے مضمون کی تمہید تھی، اور اس سے پہلے بھی بعض آیتوں میں اجمالا اس کا ذکر ہوا ہے، اب سورت کے اختتام تک تفصیل کے ساتھ یہی جزا وسزا کا مضمون ہے۔

اور (قیامت کے روز جس کا اوپر ذکر آیا ہے) صور میں پھونک ماری جائیگی جس سے تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جائیں گے (پھر زندہ تو مرجائیں گے اور مردوں کی روحیں بے ہوش ہوجائیں گی) مگر جس کو خدا چاہے (وہ اس بے ہوشی اور موت سے محفوظ رہے گا) پھر اس (صور) میں دوبارہ پھونک ماری جائیگی تو دفعتاً سب کے سب (ہوش میں آجائیں گے اور ارواح کا تعلق اجسام سے ہوجائے گا تو قبروں سے نکل) کھڑے ہوجائیں گے (اور) چاروں طرف دیکھنے لگیں گے (جیسا کہ نیا یا عجیب حادثہ ہونے کے وقت چاروں طرف دیکھنا طبعی عادت ہے)۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "① ایک بار نفخ صور ہے عالم کی فنا کا ② دوسرا ہے زندہ ہونے کا ③ یہ تیسرا بعد حشر کے ہے بیہوشی کا ④ چوتھا خبردار ہونے کا، اس کے بعد اللہ کے سامنے سب کی پیشی ہوگی"، الخ بتغییر یسیر۔

لیکن علمائے محققین کے نزدیک کل دو مرتبہ نفخ صور ہوگا: ① پہلی مرتبہ میں سب کے ہوش اڑ جائیں گے، پھر زندہ تو مردہ ہوجائیں گے اور جو مرچکے تھے ان کی ارواح پر بیہوشی کی کیفیت طاری ہوجائے گی ② بعدہ دوسرا نفخہ ہوگا، جس سے مردوں کی ارواح ابدان کی طرف واپس آجائیں گی اور بیہوشی کو افاقہ ہوگا، اس وقت محشر کے عجیب وغریب منظر کو حیرت زدہ ہوکر تکتے رہیں گے پھر خداوند قدوس کی پیشی میں تیزی کے ساتھ حاضر کیے جائیں گے۔

تنبیہ: الا من شاء اللہ سے بعض نے جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت مراد لیے ہیں، بعض نے ان کے ساتھ حملۃ العرش کو بھی شامل کیا ہے۔ بعض کے نزدیک انبیاء وشہداء مراد ہیں، واللہ اعلم۔ بہر حال یہ استثناء اس نفخہ کے وقت ہوگا، اس کے بعد ممکن ہے ان پر بھی فنا طاری کردی جائے: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (غافر:۱۶)

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ

اور چمکے زمین اپنے رب کے نور سے اور لادھریں دفتر اور حاضر آئیں پیغمبر اور گواہ اور فیصلہ ہو ان میں

بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۶۹﴾ وَوُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع

انصاف سے اوران پر ظلم نہ ہوگا ۱؎ اور پورا ملے ہر جی کو جو اس نے کیا ۲؎ اور اس کو خوب خبر ہے جو کچھ کرتے ہیں ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (پھر حق تعالیٰ حساب کے لئے اپنی شان کے مناسب زمین پر نزول وتجلی فرمائیں گے اور) زمین اپنے رب کے (بے کیف) نور سے روشن ہوجائے گی اور (سب کا) نامہ اعمال (ہر ایک کے سامنے) رکھ دیا جائے گا اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے (گواہ کا مفہوم عام ہے جس میں پیغمبر بھی داخل ہے اور فرشتے بھی اور امت محمدیہ بھی اور انسان کے اعضاء وجوارح بھی) اور سب (مکلفین) میں (حسب اعمال) ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا (کہ کوئی نیک کام چھپالیا جائے جو کہ شرعی قاعدہ کے مطابق ہوا ہو، یا کوئی برا کام بڑھا دیا جائے ایسا ہرگز نہ ہوگا) اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور وہ سب کے کاموں کو خوب جانتا ہے (پس اس کو ہر ایک کے موافق بدلہ دے دینا کچھ مشکل نہیں)۔

وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ: مراد یہ ہے کہ میدان حشر میں حساب وکتاب کے وقت سب انبیاء بھی موجود ہوں گے اور دوسرے سب گواہ بھی حاضر ہوں گے، ان گواہوں میں خود انبیاء علیہم السلام بھی ہوں گے، جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے: **جئنا من کل امۃ بشھید** اور فرشتے بھی گواہوں میں ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: **معھا سائق و شھید** کہ اس میں سائق اور شہید سے مراد فرشتے ہونا سورۃ ق میں مذکور ہے اور ان گواہوں میں امت محمدیہ بھی ہوگی جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: **لتکونوا شھداء علی الناس** اور ان گواہوں میں خود انسان کے اعضاء وجوارح بھی ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: **تکلمنا ایدیھم وتشھد ارجلھم**۔

وَوُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ: نیک کاموں میں بدلہ پورا ہونے کا یہ مطلب ہے کہ کمی نہ کی جائے گی، اور برے اعمال میں بدلہ پورا ہونے کا یہ مطلب ہے کہ زیادتی نہ کی جائے گی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس کے بعد حق تعالیٰ حساب کے لیے اپنی شان کے مناسب نزول اجلال فرمائیں گے (کما ورد فی بعض روایات الدر المنثور) اس وقت حق تعالیٰ کی تجلی اور نور بے کیف سے محشر کی زمین چمک اٹھے گی، حساب کا دفتر کھلے گا، سب کے اعمالنامے سامنے رکھ دیے جائیں گے، انبیاء (علیہم السلام) اور دوسرے گواہ دربار میں حاضر ہوں گے اور ہر شخص کے اعمال کا نہایت انصاف سے ٹھیک ٹھیک فیصلہ سنایا جائے گا، کسی پر کسی طرح کی زیادتی نہ ہوگی۔

تنبیہ: شھداء سے مراد علاوہ انبیاء (علیہم السلام) کے فرشتے، امت محمدیہ کے لوگ اور انسان کے ہاتھ پاؤں وغیرہ سب ہوسکتے ہیں، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے ہر امت کے نیک آدمی مراد لیے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی نیکی کے بدلہ میں کمی اور بدی کے بدلہ میں زیادتی نہ ہوگی، جس کا جتنا اچھا یا برا عمل ہے، سب خدا کے علم میں ہے، اسی کے موافق بدلہ ملے گا، جس کی کچھ تفصیل آگے آتی ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی گواہ آتے ہیں ان کے الزام کو، ورنہ اللہ سے کیا چیز پوشیدہ ہے۔ (کذا فی الموضح)

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ

اور ہانکے جائیں جو منکر تھے دوزخ کی طرف گروہ گروہ۱ یہاں تک کہ جب پہنچ جائیں اس پر کھولے جائیں اسکے دروازے۲ اور کہنے لگیں

لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ

ان کو اس کے داروغہ۳ کیا نہ پہنچے تھے تمہارے پاس رسول تم میں کے۴ پڑھتے تھے تم پر باتیں تمہارے رب کی اور ڈراتے تم کو

لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝71

اس تمہارے دن کی ملاقات سے، بولیں کیوں نہیں پر ثابت ہوا حکم عذاب کا منکروں پر۵

خلاصہ تفسیر: اب اس بدلہ کا بیان جو کہ فیصلہ کا نتیجہ ہے یہ ہے کہ:

اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر (دھکے دے کر ذلت وخواری کے ساتھ) ہانکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے تو (اس وقت) اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور ان سے دوزخ کے محافظ (فرشتے ملامت کے طور پر) کہیں گے کیا تمہارے پاس تم ہی لوگوں سے (جن سے استفادہ اور فیض لینا تمہارے لئے مشکل نہ تھا) پیغمبر نہ آئے تھے جو تم کو تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تم کو تمہارے اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے وہ کافر کہیں گے کہ ہاں! (رسول بھی آئے تھے اور انہوں نے ڈرایا بھی) لیکن عذاب کا وعدہ کافروں پر (جن میں ہم بھی داخل ہیں) پورا ہو کر رہا۔

اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا: گروہ گروہ اس لئے کہا کہ کفر کے درجے اور قسمیں مختلف ہیں، پس ایک ایک طرح کے کفار کا ایک ایک گروہ ہوگا۔

قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ: کفار یہ بات معذرت کے طور پر نہیں کہیں گے، بلکہ جرم کا اقرار واعتراف ہے کہ باوجود رسولوں کے پہنچانے کے ہم نے کفر کیا اور کافروں کے لیے جس عذاب کا وعدہ تھا وہ ہمارے سامنے آیا، واقعی ہم مجرم ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی تمام کافروں کو دھکے دے کر نہایت ذلت وخواری کے ساتھ دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا اور چونکہ کفر کی اقسام ومراتب بہت ہیں ہر قسم اور ہر درجہ کا گروہ الگ الگ کر دیا جائے گا۔

فائدہ: ۲ جس طرح دنیا میں جیل خانہ کا پھاٹک کھلا نہیں رہتا، جب کسی قیدی کو داخل کرنا ہوتا ہے کھول کر داخل کرتے اور پھر بند کر دیتے ہیں، ایسے ہی وہاں جس وقت دوزخی دوزخ کے قریب پہنچیں گے، دروازے کھول کر اس میں دھکیل دیا جائے گا، اس کے بعد دروازے بند کر دیے جائیں گے، کما قال تعالیٰ: علیہم نار موصدۃ۔

فائدہ: ۳ یعنی جو فرشتے دوزخ کے محافظ ہیں وہ کفار سے بطور ملامت یہ کہیں گے۔

فائدہ: ۴ یعنی جن سے تم کو بسبب ہم جنس ہونے کے فیض لینا بہت آسان تھا۔

فائدہ: ۵ یعنی پیغمبر کیوں نہیں آئے، ضرور آئے ہم کو اللہ کی باتیں سنائیں، اور آج کے دن سے بہت کچھ ڈرایا، لیکن ہماری بدبختی اور نالائقی کہ ہم نے ان کا کہنا نہ مانا، آخر خدا کی اٹل تقدیر سامنے آئی اور عذاب کا حکم ہم کافروں پر ثابت ہو کر رہا: فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (الملک:۱۱)۔

قِيلَ ادْخُلُوٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾

ہووے کہ داخل ہو جاؤ دروازوں میں دوزخ کے سدا رہنے کو اس میں سو کیا بری جگہ ہے رہنے کی غرور والوں کو

خلاصہ تفسیر: (پھر ان سے) کہا جائے گا (یعنی وہ فرشتے کہیں گے) کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو (اور) ہمیشہ اس میں رہا کرو غرض (خدا کے احکام سے) تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانہ ہے (پھر اس کے بعد وہ جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے اور دروازے بند کر دیے جائیں گے، جیسا کہ ارشادی باری ہے: انها عليهم مؤصدة)۔

* * *

فائدہ: یعنی تم نے شیخی اور غرور میں آ کر اللہ کی بات نہ مانی، اب ہمیشہ دوزخ میں پڑے اس کا مزہ چکھتے رہو۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا

اور ہانکے جائیں وہ لوگ جو ڈرتے رہے تھے اپنے رب سے جنت کو گروہ گروہ ۱ یہاں تک کہ جب پہنچ جائیں اس پر اور کھولے جائیں اسکے دروازے

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

اور کہنے لگیں ان کو داروغہ اس کے سلام پہنچے تم پر تم لوگ پاکیزہ ہو، سو داخل ہو جاؤ اس میں سدا رہنے کو ۲

خلاصہ تفسیر: (پیچھے کفار کا حال بیان ہوا) اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے (جس کا پہلا مرتبہ ایمان ہے پھر اس کے بعد مختلف مراتب و درجات ہیں) وہ گروہ گروہ ہو کر (کہ جس مرتبہ کا تقویٰ ہوگا اس مرتبہ کے متقی ایک جگہ کر دیئے جائیں گے اور) جنت کی طرف (شوق دلا کر جلدی) روانہ کئے جائیں گے یہاں تک کہ جب اس (جنت) کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے (پہلے سے) کھلے ہوئے ہوں گے (تا کہ ذرا بھی دیر نہ لگے اور نیز معزز لوگوں کے لئے ایسا ہی ہوتا ہے، چنانچہ عادت ہے کہ مہمان کے لئے پہلے سے دروازہ کھول دیا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: مفتحة لهم الابواب) اور وہاں کے محافظ (فرشتے) ان سے (اکرام و ثناء کے طور پر) کہیں گے کہ السلام علیکم تم مزہ میں رہو سو اس (جنت) میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ: بعض نے کہا ہے کہ میدان محشر میں ان کو ایک بار رویت باری تعالیٰ ہو چکی ہوگی جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے، اور ان کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ جنت میں بھی رویت ہوگی، اس لیے جنت میں جاتے ہوئے متردد ہوں گے، پس فرشتوں کے ذریعے ان کو جنت لے جانے کی نوبت آئے گی، اور بعض نے کہا ہے کہ اس لے جانے کا فاعل اور سبب شوق ہے، جب ان کو معلوم ہوگا کہ جنت میں رویت ہوگی تو اس شوق میں دوڑے ہوئے چلے جائیں گے اور دونوں قولوں میں مشترک بات ان کا رویت باری تعالیٰ کو مقصود سمجھنا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ایمان و تقویٰ کے مدارج چونکہ متفاوت ہیں، ہر درجہ کے مومنین متقین کی جماعت الگ ہوگی اور ان سب جماعتوں کو نہایت شوق دلا کر جلدی جلدی جنت کی طرف روانہ کیا جائے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی جس طرح مہمانوں کے لیے ان کی آمد سے پہلے مہمان خانہ کا دروازہ کھلا رکھا جاتا ہے، جنتی وہاں پہنچ کر جنت کے دروازے کھلے پائیں گے، کما قال فی موضع آخر: مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ (ص: ۵۰) اور خدا کے فرشتے نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ کلمات سلام و ثناء وغیرہ سے ان کا استقبال کریں گے اور جنت میں رہنے کی بشارت سنائیں گے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ ۚ

اور وہ بولیں شکر اللہ کا جس نے سچا کیا ہم سے اپنا وعدہ ا اور وارث کیا ہم کو اس زمین کا ۲ گھر لے لیویں بہشت میں سے جہاں چاہیں ۳

فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۷۴﴾

سو کیا خوب بدلہ ہے محنت کرنے والوں کا

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ متقی اس وقت جنت میں داخل ہوجائیں گے) اور (داخل ہوکر) کہیں گے کہ اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک بنادیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں مقام کریں (یعنی ہر شخص کو خوب فراغت کی جگہ ملے گی کہ خوب کھل کھل کر چلیں پھریں، بیٹھیں اٹھیں، قیام کے طور پر تو اپنی ہی جگہ میں اور سیر کے طور پر تمام جنت میں جہاں چاہیں پھریں) غرض (نیک) عمل کرنے والوں کا اچھا بدلہ ہے (یہ آخری جملہ خود اہل جنت کا ہو، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہو دونوں امکان ہیں)۔

* * *

فائدہ: ا یعنی خدا کا شکر جو وعدے انبیاء کی زبانی دنیا میں کیے گئے تھے، آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے۔

فائدہ: ۲ یعنی جنت کی زمین کا۔

فائدہ: ۳ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ان کو حکم ہے جہاں چاہیں جائیں، لیکن ہر کوئی وہ ہی جگہ چاہے گا جو اس کے واسطے پہلے سے رکھی ہے''، اور بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جنت میں سیر وملاقات کے لیے کہیں آنے جانے کی روک ٹوک نہ ہوگی۔

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ

اور تو دیکھے فرشتوں کو گھر رہے ہیں عرش کے گرد پاکی بولتے ہیں اپنے رب کی خوبیاں، اور فیصلہ ہوتا ہے ان میں انصاف کا

وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۵﴾ ع ۸

اور یہی بات کہتے ہیں کہ سب خوبی ہے اللہ کی جو رب ہے سارے جہان کا

خلاصہ تفسیر: اب سورت کے آخر میں شروع اجلاس سے اخیر فیصلہ تک کے اسی مضمون کو مختصر اور شوکت بھرے الفاظ میں خلاصہ کے طور پر بیان فرماتے ہیں:

اور آپ فرشتوں کو دیکھیں گے کہ (حساب کتاب کے اجلاس کے وقت) عرش کے گرداگرد حلقہ باندھے ہوں گے (اور) اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے ہوں گے اور تمام بندوں میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردیا جائے گا اور (اس فیصلہ کے ٹھیک ہونے پر ہر طرف سے جوش کے ساتھ یہی خروش ہوگا اور) کہا جائے گا کہ ساری خوبیاں خدا کو زیبا ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے (جس نے ایسا عمدہ فیصلہ کیا، پھر اس نعرہ تحسین پر دربار برخاست ہوجائے گا)۔

* * *

فائدہ: یعنی حق تعالیٰ جب حساب کتاب کے لیے نزول اجلال فرمائیں گے، اس وقت فرشتے عرش کے گرداگرد حلقہ باندھے اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے ہوں گے اور تمام بندوں میں ٹھیک ٹھیک انصاف کا فیصلہ کردیا جائے گا، جس پر ہر طرف سے جوش وخروش کے ساتھ الحمدللہ رب العالمین کا نعرہ بلند ہوگا، یعنی ساری خوبیاں اس خدا کو زیبا ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے (جس نے سارے جہان کا ایسا عمدہ فیصلہ کیا) اسی نعرہ تحسین پر دربار برخاست ہوجائے گا، عموماً مفسرین نے آیت کا یہ ہی مطلب بیان کیا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت کو حالت راہنہ پر حمل کیا اور قضی

بینھم کی ضمیر ملائکہ کی طرف راجع کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: ''فرشتوں میں فیصلہ یہ کہ ہر ایک فرشتہ (ملاء الاعلیٰ میں) اپنے قاعدہ سے ایک تدبیر بولتا ہے (کمایشیر الیه اختصام الملاء الاعلی و تفصیله فی حجة الله البالغه) پھر اللہ تعالیٰ ایک کی بات جاری کرتا ہے، وہ ہی ہوتی ہے حکمت کے موافق، یہ ماجرا اَب بھی ہے اور قیامت میں بھی''، والله تعالی اعلم بالصواب۔

ایاتھا ۸۵　　٤٠ سُوْرَةُ الْمُؤْمِنِ مَكِّيَّةٌ ٦٠　　رکوعاتھا ۹

خلاصہ تفسیر: مجموعی طور پر اس سورت کا حاصل تین مضمون ہیں: ① ایک مضمون توحید کے اثبات کا ہے ② دوسرا مضمون حق کی مخالفت کرنے والوں کو دھمکی ہے، اس حق کے عموم میں رسالت وغیرہ بھی داخل ہے، یہ دھمکی کہیں دنیوی عذاب سے دی گئی، اور کہیں اخروی عذاب سے ③ تیسرا مضمون رسول اللہ ﷺ کی تسلی کا ہے، اور اس دھمکی و تسلی کی تاکید و تائید کے لیے فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ کسی قدر تفصیل سے اور دیگر انبیاء کا مجمل عنوان سے بیان فرمایا۔

گزشتہ سورت کے اختتام پر مؤمنین اور کفار کی حالت میں آخرت کے اعتبار سے فرق مذکور تھا کہ ایک نجات پانے والے اور دوسرے عذاب میں مبتلا ہوں گے، اب اس سورت میں ان دونوں فریقوں کی حالت کا دنیا کے اعتبار سے فرق مذکور ہے کہ ایک مؤمن فرمانبردار ہے اور دوسرا گمراہی اور ضد میں گرفتار ہے، اور اس مضمون سے پہلے جو قرآن کی حقانیت اور رسول کی بعض صفات کا توحید کے ساتھ ذکر ہوا ہے وہ بطور تمہید کے ہے جس سے مؤمنین اور کفار کے محل اختلاف کو متعین کرنا مقصود ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ① تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ②

حم، اتارنا کتاب کا اللہ سے ہے جو زبردست ہے خبردار

غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③

گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ۱ سخت عذاب دینے والا ۲ کسی کی بندگی نہیں سوائے اس کے اسی کی طرف پھر جانا ہے ۳

خلاصہ تفسیر: حٰمٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ کتاب اتاری گئی ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے ہر چیز کا جاننے والا ہے، گناہ بخشنے والا ہے اور توبہ کا قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے، قدرت والا ہے، اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اس کے پاس (سب کو) جانا ہے۔

حٰمٓ: یہاں سے سورہ احقاف تک متصل سات سورتیں لفظ حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں، اور عجیب لطیفہ یہ ہے کہ ساتوں سورتوں کے شروع میں قرآن مجید کا اللہ کی طرف سے نازل ہونے کا مضمون ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی توبہ قبول کر کے گناہوں سے ایسا پاک وصاف کر دیتا ہے گویا کبھی گناہ کیا نہ تھا اور مزید برآں توبہ کو مستقل طاعت قرار دے کر اس پر اجر عنایت فرماتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی بے حد قدرت و وسعت اور غنا والا جو بندوں پر انعام و احسان کی بارشیں کرتا رہتا ہے۔

فائدہ: ۳ جہاں پہنچ کر ہر ایک کو اپنے کیے کا بدلہ ملے گا۔

مَا يُجَادِلُ فِيٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ④

وہی جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں جو منکر ہیں ۱ سو تجھ کو دھوکا نہ دے یہ بات کہ وہ چلتے پھرتے ہیں شہروں میں ۲

خلاصہ تفسیر: (پس قرآن مجید اور توحید کی حقانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں انکار اور جھگڑا نہ کیا جائے مگر پھر بھی) اللہ تعالیٰ کی ان آیتوں میں (یعنی قرآن میں جو توحید پر بھی مشتمل ہے) وہی لوگ (ناحق کے) جھگڑے نکالتے ہیں جو (اس کے) منکر ہیں (اور اس انکار کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کو سزا دی جاتی، لیکن ان کو جلدی سزا نہ ہونا استدراج یعنی چند روزہ مہلت دینا ہے) سو ان لوگوں کا شہروں میں (امن وامان سے دنیوی کاروبار کے لئے) چلنا پھرنا آپ کو اشتباہ میں نہ ڈالے (کہ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ اسی طرح سزا وعذاب سے بچے رہیں گے اور آرام سے رہیں گے اور آپ کو خطاب کر کے دوسروں کو سنانا مقصود ہے، غرض ان کی پکڑ ضرور ہوگی خواہ دنیا میں بھی، اور آخرت میں بھی، یا صرف آخرت میں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ کی باتیں اور اس کی عظمت وقدرت کے نشان ایسے نہیں جن میں کوئی جھگڑا کیا جائے، مگر جن لوگوں نے یہ ہی ٹھان لی ہے کہ روشن سے روشن دلائل وبراہین اور کھلی کھلی باتوں کا بھی انکار کیا جائے، وہ ہی سچی باتوں میں ناحق جھگڑے ڈالتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی ایسے منکر کا انجام تباہی اور ہلاکت ہے، گو فی الحال وہ شہروں میں چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے نظر آتے ہیں، اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امہال اور استدراج ہے کہ چند روز چل پھر کر دنیا کے مزے اڑا لیں، یا تجارتیں اور سازشیں کر لیں، پھر ایک روز غفلت کے نشہ میں پوری طرح مخمور ہو کر پکڑے جائیں گے، اگلی قوموں کا حال بھی یہ ہی ہوا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۪ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ

جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے قوم نوح کی اور کتنے فرقے ان سے پیچھے اور ارادہ کیا ہر امت نے اپنے رسول پر کہ اس کو پکڑ لیں

وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ⑤

اور لانے لگے جھوٹے جھگڑے کہ اس سے ڈگا دیں سچے دین کو پھر میں نے ان کو پکڑ لیا، پھر کیسا ہوا میرا سزا دینا

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ) ان سے پہلے نوح (علیہ السلام) کی قوم نے اور دوسرے گروہوں نے بھی جو ان کے بعد ہوئے (جیسے عاد وثمود وغیرہ نے بھی دین حق کو) جھٹلایا تھا اور ہر امت (میں سے جو لوگ ایمان نہ لائے تھے انہوں) نے اپنے پیغمبر کے گرفتار کرنے کا ارادہ کیا (تاکہ ان کو پکڑ کر قتل کر دیا جائے) اور ناحق کے جھگڑے نکالے تاکہ اس ناحق سے حق کو باطل کر دیں سو میں نے (آخر) ان پر دارو گیر (پکڑ) کی سو (دیکھو) میری طرف سے (ان کو) کیسی سزا ہوئی۔

وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ: پیچھے گذشتہ آیت میں بیان ہوا: مَا يُجَادِلُ فِيٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ تو اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ جدال جو اسلام میں ممنوع ہے وہ جدال ہے جو باطل اور ناحق ہو، یہاں اس آیت میں ارشاد فرمایا: وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ اس سے معلوم ہوا کہ جو جدال حق کے لیے اور حق کی تائید وحمایت کے لیے ہو تو ایسا جدال مطلوب وپسندیدہ ہے، جدال کی ان دونوں قسموں میں فرق ورعایت رکھنا اہل اللہ کے خواص میں سے ہے، اس لیے ان کا جدال ناحق نہیں ہوتا۔

* * *

فائدہ: یعنی ہر ایک امت کے شریروں نے اپنے پیغمبر کو پکڑ کر قتل کرنے یا ستانے کا ارادہ کیا اور چاہا کہ جھوٹے ڈھکوسلے کھڑے کر کے سچے دین کو شکست دیں، اور حق کی آواز کو ابھرنے نہ دیں، لیکن ہم نے ان کا داؤ چلنے نہ دیا اور اس کے بجائے کہ وہ پیغمبروں کو پکڑتے، ہم نے ان کو پکڑ کر سخت سزائیں دیں، پھر دیکھ لو ہماری سزا کیسی ہوئی کہ ان کی بیخ و بنیاد باقی نہ چھوڑی، آج بھی ان تباہ شدہ قوموں کے کچھ آثار کہیں کہیں موجود ہیں، ان ہی کو دیکھ کر انسان ان کی تباہی کا تصور کر سکتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝۶

اور اسی طرح ٹھیک ہو چکی بات تیرے رب کی منکروں پر کہ یہ ہیں دوزخ والے

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح ان کو دنیا میں سزا ہوئی) اسی طرح تمام کافروں پر آپ کے پروردگار کا یہ قول ثابت ہو چکا ہے کہ وہ لوگ (آخرت میں) دوزخی ہوں گے (یعنی یہاں بھی سزا ہوئی اور وہاں بھی ہوگی، اسی طرح کفر کی وجہ سے اس زمانہ کے کافروں کی بھی پکڑ اور سزا ہونے والی ہے خواہ دونوں عالم میں یا صرف آخرت میں)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس طرح اگلی قوموں پر عذاب آنے کی بات پوری اتر چکی، موجود الوقت منکروں پر بھی اتری ہوئی سمجھو اور جس طرح پیغمبروں کے اعلان کے موافق کافروں پر دنیاوی عذاب آ کر رہا، تیرے رب کی یہ بات بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ آخرت میں ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔

تنبیہ: بعض نے انھم اصحٰب النار کو "لأنهم" کے معنی میں لے کر یہ مطلب بیان کیا ہے کہ گذشتہ منکروں کی طرح موجودہ منکروں پر بھی اللہ کی بات سچی ہے، کیونکہ یہ بھی اصحاب النار میں سے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ

جو لوگ اٹھا رہے ہیں عرش کو اور جو اس کے گرد ہیں پاکی بولتے ہیں اپنے رب کی خوبیاں اور اس پر یقین رکھتے ہیں اور گناہ بخشواتے ہیں

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ

ایمان والوں کے لئے اے پروردگار ہمارے ہر چیز سمائی ہوئی ہے تیری بخشش اور خبر میں سو معاف کر ان کو جو توبہ کریں اور چلیں تیری راہ پر

وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۷

اور بچا ان کو آگ کے عذاب سے ؏

خلاصہ تفسیر: پیچھے انکار کرنے والوں کا حال بیان ہوا کہ وہ ذلت اور عذاب کے مستحق ہیں، اب مؤمنین کا حال بیان کرتے ہیں: جو فرشتے کہ عرش (الٰہی) کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو فرشتے اس کے گرداگرد ہیں وہ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لئے (اس طرح دعاء) استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! آپ کی (عام) رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے (پس اہل ایمان پر بدرجہ اولیٰ رحمت ہوگی اور آپ کو ان کے ایمان کا علم بھی ہے) سو ان لوگوں کو بخش دیجئے جنہوں نے (شرک و کفر سے) توبہ کر لی ہے اور آپ کے رستہ پر چلتے ہیں اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچا لیجئے (کہ مغفرت کا تقاضا یہی ہے، کیونکہ عذاب کا سبب گناہ ہیں، جب ان کے گناہ بخش دیے گئے تو عذاب بھی دور ہو جائے گا)۔

یعنی جولوگ موحد اور مؤمن ہیں وہ ایسے معزز اور مکرم ہیں کہ ملائکہ مقربین ان کے لئے دعا و استغفار کرنے میں مشغول رہتے ہیں، پھر آیت: یفعلون ما یؤمرون سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے خدا کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے، اس اعتبار سے یہ اس بات کی علامت ہے کہ فرشتے اللہ کی طرف سے اس پر مامور ہیں کہ مومنین کے لئے استغفار کیا کریں، اس سے مومنین کا عند اللہ محبوب و مقبول ہونا ثابت ہوتا ہے۔

وَيَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا: ایک اور آیت میں یستغفرون لمن فی الارض آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے سب زمین والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں تو اس میں یا تو زمین والوں سے مراد مسلمان ہی ہیں، اور اگر سب لوگ مراد ہوں تو استغفار کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین والوں پر جلدی عذاب نازل نہ کرنے کی دعا کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ پہلی آیات میں مجرمین و منکرین کا حال زبوں بیان ہوا تھا، یہاں ان کے مقابل مومنین و تائبین کا فضل و شرف بیان کرتے ہیں، یعنی عرش عظیم کو اٹھانے والے اور اس کے گرد طواف کرنے والے بے شمار فرشتے جن کی غذا صرف حق تعالیٰ کی تسبیح و تحمید ہے اور جو مقربین بارگاہ ہونے کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کا ایمان و یقین رکھتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کے آگے مومنین کے لیے استغفار کرتے ہیں، سبحان اللہ! اس عزت افزائی اور شرف و احترام کا کیا ٹھکانا ہے کہ فرش خاک پر رہنے والے مومنین سے جو خطائیں اور لغزشیں ہوگئیں ملائکہ بارگاہ عالی میں اس کے لیے غائبانہ معافی چاہیں اور جب ان کی شان میں: وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا يُؤۡمَرُوۡنَ (النحل: ۵۰) آیا ہے تو وہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر مامور ہوں گے۔

فائدہ: ۲۔ یہ فرشتوں کے استغفار کی صورت بتلائی، یعنی بارگاہ احدیت میں یوں عرض کرتے ہیں کہ: ''اے ہمارے پروردگار! آپ کا علم اور رحمت ہر چیز کو محیط ہے، پس جو کوئی تیرے علم محیط میں برائیوں کو چھوڑ کر سچے دل سے تیری طرف رجوع ہو اور تیرے راستہ پر چلنے کی کوشش کرتا ہو، اگر اس سے بمقتضائے بشریت کچھ کمزوریاں اور خطائیں سرزد ہو جائیں، آپ اپنے فضل و رحمت سے اس کو معاف فرما دیں، نہ دنیا میں ان پر دارو گیر ہو اور نہ دوزخ کا منہ دیکھنا پڑے''، باقی جو مسلمان توبہ و انابت کی راہ اختیار نہ کرے اس کا یہاں ذکر نہیں، آیت ہذا اس کی طرف سے ساکت ہے، بظاہر حاملین عرش ان کے حق میں دعا نہیں کرتے، اللہ کا ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ یہ دوسری نصوص سے طے کرنا چاہیے۔

رَبَّنَا وَاَدۡخِلۡهُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ ۣ الَّتِىۡ وَعَدْتَّهُمۡ وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَاَزۡوَاجِهِمۡ

اے رب ہمارے اور داخل کر ان کو سدا بسنے کے باغوں میں جن کا وعدہ کیا تو نے ان سے اور جو کوئی نیک ہو ان کے باپوں میں اور عورتوں میں

وَذُرِّيّٰتِهِمۡ ‌ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۙ‏ ﴿۸﴾

اور اولاد میں، بیشک تو ہی ہے زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر: اے ہمارے پروردگار! اور (دوزخ سے بچا کر) ان کو ہمیشہ رہنے کی بہشتوں میں جس کا آپ نے ان سے وعدہ کیا ہے داخل کر دیجئے اور ان کے ماں باپ اور بیویوں اور اولاد میں جو (جنت کے) لائق (یعنی مومن) ہوں (اگرچہ ان مومنین کے درجے کے نہ ہوں جن کے اوصاف پیچھے بیان ہوئے) ان کو بھی داخل کر دیجئے، بلا شک آپ زبردست حکمت والے ہیں (کہ مغفرت پر قادر ہیں اور ہر ایک کے مناسب اس کو درجہ عطا فرماتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی اگرچہ بہشت ہر کسی کو اپنے عمل سے ملتی ہے (جیسا کہ یہاں بھی و من صلح کی قید سے ظاہر ہے) بدون اپنے ایمان و صلاح کے بیوی، بیٹا اور ماں باپ کام نہیں آتے، لیکن تیری حکمتیں ایسی بھی ہیں کہ ایک کے سبب سے کتنوں کو ان کے عمل سے زیادہ اعلیٰ درجہ پر پہنچا دے، کما قال تعالیٰ: وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَاتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّيَّتُهُمۡ بِاِيۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَمَاۤ اَلَـتۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَمَلِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ (الطور: ۲۱) اور

گہری نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت میں وہ بھی ان ہی کے کسی عمل قلبی کا بدلہ ہو، مثلاً وہ آرزو رکھتے ہوں کہ ہم بھی اسی مرد صالح کی چال چلیں، یہ نیت اور نیکی کی حرص اللہ کے ہاں مقبول ہو جائے، یا اس مرد صالح کے اکرام و مدارات ہی کی ایک صورت یہ ہو کہ اس کے ماں باپ اور بیوی بچے بھی اس کے درجہ میں رکھے جائیں۔

وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَمَنۡ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمۡتَهٗ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝٩ ع

اور بچا ان کو برائیوں سے، اور جس کو تو بچائے برائیوں سے اُس دن اس پر مہربانی کی تو نے، اور یہ جو ہے یہی ہے بڑی مراد پانی

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح دوزخ کے بڑے عذاب سے ان کو بچانے کی آپ سے دعا ہے اسی طرح یہ بھی دعا ہے کہ) ان کو (قیامت کے دن ہر طرح کی) تکالیف سے بچائیے (اگرچہ وہ جہنم کی تکلیف سے ہلکی ہی ہوں جیسے میدان قیامت کی پریشانیاں وغیرہ) اور آپ جس کو اس دن تکلیف سے بچالیں تو اس پر آپ نے بہت مہربانی فرمائی اور یہ (جو پیچھے ذکر ہوا ہے یعنی مغفرت اور چھوٹے بڑے عذاب سے حفاظت اور جنت میں داخل ہونا یہی)) بڑی کامیابی ہے (پس اپنے مومن بندوں کو اس سے محروم نہ رکھئے)۔

* * *

فائدہ: یعنی محشر میں ان کو کوئی برائی (مثلاً گھبراہٹ اور پریشانی وغیرہ) لاحق نہ ہو اور یہ عظیم الشان کامیابی صرف تیری خاص مہربانی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، بعض مفسرین نے سیأت سے ''اعمال سیئہ'' مراد لیے ہیں، یعنی آگے کو انہیں برے کاموں سے محفوظ فرما دے اور ان کی خواہش ایسی کر دے کہ برائی کی طرف نہ جائیں، ظاہر ہے جو آج یہاں برائی سے بچ گیا، اس پر تیرا فضل ہو گیا، وہ ہی آخرت میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرے گا، اس تفسیر پر یومئذٍ کا ترجمہ بجائے ''اُس دن'' کے ''اِس دن'' ہونا چاہیے، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی تیری مہر ہی ہو کہ برائیوں سے بچے، اپنے عمل سے کوئی نہیں بچ سکتا، تھوڑی بہت برائی سے کون خالی ہے''، یہ الفاظ دونوں تفسیروں پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُنَادَوۡنَ لَمَقۡتُ اللّٰهِ اَكۡبَرُ مِنۡ مَّقۡتِكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ اِذۡ تُدۡعَوۡنَ

جو لوگ منکر ہیں ان کو پکار کر کہیں گے اللہ بیزار ہوتا تھا زیادہ اس سے جو تم بیزار ہوئے ہو اپنے جی سے جس وقت تم کو بلاتے تھے

اِلَى الۡاِيۡمَانِ فَتَكۡفُرُوۡنَ ۝١٠

یقین لانے کو پھر تم منکر ہوتے تھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کا دوزخ میں داخل ہونا مذکور تھا، اب دوزخ میں داخل ہونے کے بعد کا حال بیان کرتے ہیں۔

جو لوگ کافر ہوئے (وہ جب دوزخ میں جا کر اپنے شرک و کفر اختیار کرنے پر حسرت و افسوس کریں گے اور خود ان کو اپنے سے سخت نفرت ہوگی یہاں تک غصہ کے مارے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھائیں گے، اس وقت) ان کو پکارا جائے گا کہ جیسی تم کو (اس وقت) اپنے سے نفرت ہے، اس سے بڑھ کر خدا کو (تم سے) نفرت تھی جبکہ تم (دنیا میں) ایمان کی طرف بلائے جاتے تھے پھر (بلانے کے بعد) تم نہیں مانا کرتے تھے (اس کہنے سے ان کو زیادہ حسرت اور ندامت دلانا مقصود ہے)۔

* * *

فائدہ: یہ قیامت کے دن کہیں گے، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی آج تم اپنے (نفس سے بیزار ہو اور) اپنے جی کو پھٹکارتے ہو، دنیا میں جب کفر کرتے تھے (اس وقت) اللہ اس سے زیادہ تم کو پھٹکارتا تھا (اور تمہاری حرکات سے بیزار تھا) اسی کا بدلہ آج پاؤ گے''، اور بعض مفسرین نے مقتین کا زمانہ ایک مراد لے کر یوں معنی کیے ہیں کہ: ''تم کو دنیا میں بار بار ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا اور تم بار بار کفر کرتے تھے، آج اس کی سزا

بھگتنے کے وقت جس قدر تم اپنے جانوں سے بیزار ہو رہے ہو اللہ اس سے زیادہ تم سے بیزار ہے"۔

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى

بولیں گے اے رب ہمارے تو موت دے چکا ہم کو دو بار اور زندگی دے چکا دو بار ۱؎ اب ہم قائل ہوئے اپنے گناہوں کے ۲؎ پھر اب بھی ہے

خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ⑪

نکلنے کو کوئی راہ ۳؎

خلاصہ تفسیر: وہ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! (ہم جو دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کیا کرتے تھے اب ہم کو اپنی غلطی معلوم ہوگئی، چنانچہ دیکھ لیا کہ) آپ نے ہم کو دو مرتبہ مردہ رکھا (ایک مرتبہ پیدائش سے پہلے جبکہ ہم بالکل بے جان مادہ کی صورت میں تھے، اور دوسری مرتبہ اس عالم میں آنے اور زندہ ہونے کے بعد جس کو سب موت کہتے ہیں) اور دو مرتبہ زندگی دی (ایک دنیا کی زندگی اور دوسری آخرت کی زندگی، یہ چار حالتیں ہوئیں، اگرچہ انمیں سے انکار تو صرف ایک یعنی آخرت کی زندگی کا تھا، اور اس وقت اسی کا اقرار کرنا مقصود ہے، لیکن باقی تین حالتوں کا ذکر اس لئے کردیا کہ جس طرح وہ تین حالتیں یقینی تھیں، یہ چوتھی حالت بھی انہی کی طرح یقینی ہے) سو ہم اپنی خطاؤں کا (جن میں اصل خطا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا انکار تھا، باقی سب اسی کی فروع تھیں) اقرار کرتے ہیں تو کیا (یہاں سے) نکلنے کی کوئی صورت ہے (کہ دنیا میں پھر جا کر ان سب خطاؤں کا تدارک کرلیں، جواب میں ارشاد ہوگا کہ تمہارے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، بلکہ ہمیشہ یہیں رہنا ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "پہلے مٹی تھے یا نطفہ، تو مردے ہی تھے، پھر جان پڑی تو زندہ ہوئے، پھر مرے، پھر زندہ کر کے اٹھائے گئے، یہ ہیں دو موتیں اور دو حیاتیں"، قال تعالیٰ: كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (البقرة:۲۸) وقيل غير ذلك، والاظهر هو هذا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی انکار کیا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد پھر جینا نہیں، نہ حساب کتاب ہے نہ کوئی اور قصہ، اسی لیے گناہوں اور شرارتوں پر جری ہوتے تھے، اب دیکھ لیا کہ جس طرح پہلی موت کے بعد آپ نے ہم کو زندہ کیا اور عدم سے نکال کر وجود عطا فرمایا، دوسری موت کے بعد بھی پیغمبروں کے ارشادات کے موافق دوبارہ زندگی بخشی، آج بعث بعد الموت کے وہ سب مناظر جن کا ہم انکار کیا کرتے تھے سامنے ہیں اور بجز اس کے چارہ نہیں کہ ہم اپنی غلطیوں اور خطاؤں کا اعتراف کریں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی افسوس اب تو بظاہر یہاں سے چھوٹ کر نکل بھاگنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی، ہاں! آپ قادر ہیں کہ جہاں دو مرتبہ موت وحیات دے چکے ہیں، تیسری مرتبہ ہم کو پھر دنیا کی طرف واپس بھیج دیں، تاکہ اس مرتبہ وہاں سے ہم خوب نیکیاں سمیٹ کر لائیں۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ

یہ تم پر اس واسطے ہے کہ جب کسی نے پکارا اللہ کو اکیلا تو تم منکر ہوتے، اور جب اس کے ساتھ پکارتے شریک کو تو تم یقین لانے لگتے

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ⑫

اب حکم وہی جو کرے اللہ سب سے اوپر بڑا

خلاصہ تفسیر: (اور) وجہ اس کی یہ ہے کہ جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا تھا (یعنی توحید کا ذکر ہوتا تھا) تو تم انکار کیا کرتے تھے اور

اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے، سو (اس لئے) یہ فیصلہ اللہ کا (کیا ہوا) ہے جو عالیشان (اور) بڑے مرتبے والا ہے (یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور بلند مرتبہ کے اعتبار سے تمہارا جرم بہت بڑا تھا اس لئے فیصلہ میں سزا بھی بہت بڑی تجویز ہوئی، یعنی ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا)۔

* * *

فائدہ: یعنی بیشک اب دنیا کی طرف واپس کیے جانے کی کوئی صورت نہیں، اب تو تم کو اپنے اعمال سابقہ کا خمیازہ بھگتنا ہے، تمہارے متعلق ہلاکت ابدی کا یہ فیصلہ اس لیے ہوا ہے کہ تم نے اکیلے سچے خدا کی پکار پر کبھی کان نہ دھرا، ہمیشہ اس کا یا اس کی وحدانیت کا انکار ہی کرتے رہے، ہاں! کسی جھوٹے خدا کی طرف بلائے گئے تو فوراً آمنا وصدقنا کہہ کر اس کے پیچھے ہو لیے، اس سے تمہاری خو اور طبیعت کی افتاد کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر ہزار مرتبہ بھی واپس کیا جائے، پھر وہی کفر و شرک کما کر لاؤ گے، بس آج تمہارے جرم کی ٹھیک سزا یہی حبس دوام ہے جو اس بڑے زبردست خدا کی عدالت عالیہ سے جاری کی گئی، جس کا کہیں آگے مرافعہ (اپیل) نہیں، اس سے چھوٹنے کی تمنا عبث ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾

وہی ہے تم کو دکھلاتا اپنی نشانیاں اور اتارتا ہے تمہارے واسطے آسمان سے روزی، اور سوچ وہی کرے جو رجوع رہتا ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے شروع کی آیتوں میں توحید اور دھمکی کا مضمون تھا، اب پھر اسی کی طرف رجوع ہے۔

وہی ہے جو تم کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھاتا ہے (تاکہ تم ان سے توحید پر استدلال کرو، اور وہی ہے جو) آسمان سے تمہارے لئے رزق بھیجتا ہے (یعنی بارش بھیجتا ہے جس سے رزق پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے) اور (ان نشانیوں سے) صرف وہی شخص نصیحت قبول کرتا ہے جو (خدا کی طرف) رجوع (کرنے کا ارادہ) کرتا ہے (کیونکہ وہ رجوع کے ارادہ سے غور و فکر کرتا ہے، اور غور و فکر سے حق تک رسائی ہو جاتی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اس کی عظمت و وحدانیت کی نشانیاں ہر چیز میں ظاہر ہیں، ایک اپنی روزی ہی کے مسئلہ کو آدمی سمجھ لے، جس کا سامان آسمان سے ہوتا رہتا ہے تو سب کچھ سمجھ میں آجائے، لیکن جب ادھر رجوع ہی نہ ہو اور غور و فکر سے کام ہی نہ لے تو کیا خاک سمجھ حاصل ہو سکتی ہے۔

فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ

سو پکارو اللہ کو خالص کر کر اس کے واسطے بندگی اور پڑے برا مانیں منکر ۱؎ وہی ہے اونچے درجوں والا مالک عرش کا

يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾

اتارتا ہے بھید کی بات اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں ۲؎ تاکہ وہ ڈرائے ملاقات کے دن سے ۳؎

خلاصہ تفسیر: تو (جب توحید پر دلائل قائم ہیں تو) تم لوگ (کفر و شرک چھوڑ کر) خدا کو خالص اعتقاد کر کے (یعنی توحید کے ساتھ) پکارو (اور مسلمان ہو جاؤ) اگرچہ کافروں کو ناگوار (ہی کیوں نہ) ہو (یعنی ان کی پروانہ کرو، کیونکہ) وہ رفیع الدرجات ہے، وہ عرش کا مالک ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے وحی یعنی اپنا حکم بھیجتا ہے تاکہ وہ (صاحب وحی لوگوں کو) اجتماع کے دن (یعنی قیامت کے دن) سے ڈرائے۔

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ: رفیع الدرجات کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ① رفیع الدرجات یعنی درجے بلند کرنے والا، اس صورت میں رسالت اور قیامت کے مضمون سے اس کو مناسبت ہوگی کہ وہ کسی کا مرتبہ رسالت اور نبوت تک بڑھاتا ہے جیسا کہ آگے فرمایا ہے کہ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر

چاہتا ہے وحی بھیجتا ہے، اور اسی طرح قیامت میں نیک کام کرنے والوں کو مختلف درجے عطا فرمائے گا② دوسرے معنی ہیں مرتفع الدرجات یعنی وہ خود بلند درجوں والا ہے، اس صورت میں درجات سے مراد خدا تعالیٰ کی صفات ہیں کہ اس کی شان بہت بلند اور عظیم الشان ہے۔

يَوْمَ التَّلَاقِ: قیامت کے دن کو اجتماع کا دن کہنا ظاہر ہے کہ سب مخلوق اس میں جمع ہوں گی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بندوں کو چاہیے سمجھ سے کام لیں اور ایک خدا کی طرف رجوع ہو کر اسی کو پکاریں، اس کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کریں، بیشک محض بندوں کے اس موحدانہ طرز عمل سے کافر ومشرک ناک بھوں چڑھائیں گے کہ سارے دیوتا اڑا کر صرف ایک ہی خدا رہنے دیا گیا، مگر پکا موحد وہ ہی ہے جو مشرکین کے مجمع میں توحید کا نعرہ بلند کرے اور ان کے برا ماننے کی اصلاً پروانہ کرے۔

فائدہ: ۲ "بھید کی بات" سے وحی مراد ہے جو اول انبیاء (علیہم السلام) پر اترتی ہے اور ان کے ذریعہ سے دوسرے بندوں کو پہنچ جاتی ہے، چنانچہ قیامت تک اسی طرح پہنچتی رہے گی۔

فائدہ: ۳ یعنی جس دن تمام اولین و آخرین مل کر اللہ کی پیشی میں حاضر ہوں گے اور ہر ایک شخص اپنے اچھے یا برے عمل سے ملاقات کریگا۔

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ⑯

جس دن وہ لوگ نکل کھڑے ہونگے ۱ چھپی نہ رہے گی اللہ پر ان کی کوئی چیز ۲ کس کا راج ہے اس دن، اللہ کا جو اکیلا ہے دباؤ والا ۳

خلاصہ تفسیر: جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے آموجود ہوں گے (کہ) ان کی بات خدا سے مخفی نہ رہے گی، آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟! بس اللہ ہی کی ہوگی جو یکتا (اور) غالب ہے۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ: درمنثور کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ یہ دو بار فرمائیں گے: ① ایک مرتبہ پہلی بار صور پھونکنے کے بعد جبکہ سب فنا ہو جائیں گے ② دوسری مرتبہ دوسری بار صور پھونکنے کے بعد حساب شروع ہونے سے پہلے لیکن اس آیت کی تفسیر ان روایات پر موقوف نہیں، اور ظاہری مدلول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس وقت کی نداء کا نقل کرنا مقصود نہیں، بلکہ آیت میں مبالغہ کے طور پر اس دن کو موجود اور حاضر فرض کر کے استفہام تقریری کے طریقہ پر سوال کر کے خود ہی جواب ارشاد فرماتے ہیں، پس آیت کو نہ ان روایات کی ضرورت ہے اور نہ اس میں ان روایات کی نفی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قبروں سے نکل کر ایک کھلے کف دست میدان میں حاضر ہوں گے، جہاں کوئی آڑ پہاڑ حائل نہ ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی خوب سمجھ لو اس حاکم اعلیٰ کے دربار میں حاضر ہونا ہے، جس پر تمہاری کوئی حالت پوشیدہ نہیں، سب ظاہر و باطن احوال کھول کر رکھ دیئے جائیں گے۔

فائدہ: ۳ یعنی اس دن تمام وسائط و حجب اٹھ جائیں گے، ظاہری اور مجازی رنگ میں بھی کسی کی بادشاہت نہ رہے گی، اسی اکیلے شہنشاہ مطلق کا راج ہوگا جس کے آگے ہر ایک طاقت دبی ہوئی ہے۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ؕ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ⑰ وَاَنْذِرْهُمْ

آج بدلہ ملے گا ہر جی کو جیسا اس نے کمایا، بالکل ظلم نہیں آج، بیشک اللہ جلد لینے والا ہے حساب، اور خبر سنا دے ان کو اس نزدیک

يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ؕ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ؕ ⑱

آنے والے دن کی جس وقت دل پہنچیں گے گلوں کو تو وہ دبا رہے ہونگے ۱ کوئی نہیں گناہ گاروں کا دوست اور نہ سفارشی کہ جسکی بات مانی جائے ۲

خلاصہ تفسیر: آج ہر شخص کو اس کے کئے (ہوئے کاموں) کا بدلہ دیا جائے گا، آج (کسی پر) کچھ ظلم نہ ہوگا اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے، اور (جیسے سب پیغمبروں کو اس دن سے ڈرانے کا حکم ہے اسی طرح آپ کو بھی حکم ہے، اس لئے) آپ (ابھی) ان لوگوں کو ایک قریب آنے والی مصیبت کے دن (یعنی روز قیامت) سے ڈرائیے جس وقت کلیجے منہ کو آجائیں گے (غم سے) گھٹ گھٹ جائیں گے (اس روز) ظالموں (یعنی کافروں) کا نہ کوئی دلی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کا کہا مانا جائے۔

* * *

فائدہ:۱ یعنی خوف اور گھبراہٹ سے دل دھڑک کر گلوں تک پہنچ رہے ہوں گے اور لوگ دونوں ہاتھوں سے ان کو پکڑ کر دبائیں گے کہ کہیں سانس کے ساتھ باہر نہ نکل پڑیں۔

فائدہ:۲ یعنی ایسا کوئی سفارشی نہیں ہوگا جس کی بات ضرور ہی مانی جائے، سفارش وہ ہی کر سکے گا جس کو اجازت ہو اور اسی کے حق میں کرے گا جس کے لیے پسند ہو۔

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿۱۹﴾ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ

وہ جانتا ہے چوری کی نگاہ اور جو کچھ چھپا ہوا ہے سینوں میں، اور اللہ فیصلہ کرتا ہے انصاف سے ۱ اور جن کو پکارتے ہیں اس کے سوا

لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۲۰﴾ ع۷

نہیں فیصلہ کرتے کچھ بھی، بیشک اللہ جو ہے وہی ہے سننے والا دیکھنے والا ۲

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ (ایسا ہے کہ) آنکھوں کی چوری کو جانتا ہے اور ان (باتوں) کو بھی جو سینوں میں پوشیدہ ہیں (جن کو دوسرا نہیں جانتا، مطلب یہ ہے کہ وہ بندوں کے تمام کھلے اور چھپے اعمال سے باخبر ہے اور اسی پر سزا و جزا موقوف ہے) اور (چونکہ) اللہ تعالیٰ (کا علم اور تمام صفات کامل ہیں اس لیے وہ) ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا، اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارا کرتے ہیں وہ کسی طرح کا بھی فیصلہ نہیں کر سکتے (کیونکہ) اللہ ہی سب کچھ جاننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے (اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام صفات کمال سے موصوف اور جھوٹے معبود ان صفات کمال سے خالی اور بالکل کورے ہیں اس لئے فیصلہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کے بس میں نہیں)۔

اس مضمون سے دو باتیں ثابت ہوئیں: ① ایک یہ کہ جن کو کفار معبود سمجھتے ہیں وہ ان کی مدد کرنے سے عاجز ہیں ② دوسری بات شرک کی نفی۔

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ: یہ مضمون اپنے الفاظ کے مطلق ہونے سے اس کو بھی شامل ہے کہ محبوب حقیقی (اللہ تعالیٰ) کے علاوہ کسی اور پر استحسان و استلذاذ سے نظر کی جائے یا دل سے اس کی تمنا کی جائے تو وہ اس کو بھی جانتا ہے۔

* * *

فائدہ:۱ یعنی مخلوق سے نظر بچا کر چوری چھپے سے کسی پر نگاہ ڈالی، یا کن انکھیوں سے دیکھا، یا دل میں کچھ نیت کی، یا کسی بات کا ارادہ یا خیال آیا، ان میں سے ہر چیز کو اللہ جانتا ہے اور فیصلہ انصاف سے کرتا ہے۔

فائدہ:۲ یعنی فیصلہ کرنا اس کا کام ہو سکتا ہے جو سننے اور جاننے والا ہو، بھلا یہ پتھر کی بے جان مورتیں جنہیں تم خدا کہہ کر پکارتے ہو کیا خاک فیصلہ کریں گی، پھر جو فیصلہ بھی نہ کر سکے، وہ خدا کس طرح ہوا۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْا هُمْ

کیا وہ پھرے نہیں ملک میں کہ دیکھتے انجام کیسا ہوا ان کا جو تھے ان سے پہلے، وہ تھے

اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِى الۡاَرۡضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ ؕ وَمَا كَانَ لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ

ان سے سخت زور میں اور نشانیوں میں جو چھوڑ گئے زمین میں ۱؎ پھر انکو پکڑا اللہ نے انکے گناہوں پر، اور نہ ہوا انکو اللہ سے

مِنۡ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾

کوئی بچانے والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو فیصلہ اور جزا و سزا کے ایسے مضامین سن کر بھی کفر و شرک پر سزا ہونے سے انکار کرتے ہیں تو کیا ان کو پہلے کافروں کی حالت معلوم نہیں ہوئی۔

(یہ لوگ جو ان واضح دلائل کے بعد بھی انکار کرتے ہیں تو) کیا ان لوگوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں (اس شرک و کفر کی وجہ سے) ان کا کیسا انجام ہوا، وہ لوگ قوت اور ان نشانیوں پر جو زمین پر چھوڑ گئے ہیں (مثلاً عمارتیں اور باغات وغیرہ) ان (موجودہ لوگوں سے) سے بہت زیادہ تھے سو ان کے گناہوں کی وجہ سے خدا نے ان پر دار و گیر (پکڑ) فرمائی (یعنی عذاب نازل کیا) اور ان کا کوئی خدا (کے عذاب) سے بچانے والا نہ ہوا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بڑے مضبوط قلعے، عالی شان عمارتیں اور مختلف قسم کی یادگاریں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جب دنیا کے عذاب سے کوئی نہ بچا سکا، آخرت میں کون بچائے گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانَتۡ تَّاۡتِيۡهِمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوۡا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِىٌّ

یہ اس لیے کہ ان کے پاس آتے تھے ان کے رسول کھلی نشانیاں لے کر پھر منکر ہو گئے تو ان کو پکڑا اللہ نے، بیشک وہ زور آور ہے

شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۲﴾

سخت عذاب دینے والا

خلاصہ تفسیر: (آگے ان کے گناہوں کی تفصیل ہے کہ) یہ مواخذہ اس سبب سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں (یعنی معجزات جو کہ نبوت کے دلائل ہوتے ہیں) لے کر آتے رہے پھر انہوں نے نہ مانا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر مواخذہ فرمایا بیشک وہ بڑی قوت والا سخت سزا دینے والا ہے (پس جب پکڑ کا سبب کفر و شرک ہے جو کہ موجودہ کافروں میں بھی موجود ہے تو پھر یہ اس سے مطمئن اور بے فکر کیسے ہیں، کفر پر ان کی بھی پکڑ ضرور ہوگی خواہ دونوں جہاں میں یا صرف آخرت میں)۔

* * *

فائدہ: یعنی تم بھی ان کی طرح رسول کی تکذیب کر کے فلاح نہیں پا سکتے، آخر رسوا اور ہلاک ہو گئے اور خداوند قدوس اپنے زور و قوت سے پیغمبر کو غالب و منصور فرمائے گا، اسی مناسبت سے آگے موسیٰ اور فرعون کا قصہ بیان کرتے ہیں:

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوۡنَ

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر اور کھلی سند ۱؎ فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس ۲؎

فَقَالُوا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿٢٤﴾

پھر کہنے لگے یہ جادوگر ہے جھوٹا ۳ؔ

خلاصہ تفسیر: پیچھے جابجا توحید و رسالت کے منکروں کو دھمکی دیتے ہوئے ان کی عناد و مخالفت کا بھی ذکر ہوا ہے جس سے رسول اللہ ﷺ کو رنج ہونے کا احتمال ہوسکتا تھا، اب آگے آپ ﷺ کی تسلی کے لیے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ مذکور ہے جس میں توحید رسالت کا انکار کرنے والوں کے لیے دھمکی کے مضمون کی بھی تاکید ہوگئی۔

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے احکام اور کھلی دلیل (یعنی معجزہ) دے کر فرعون اور ہامان اور قارون کے پاس بھیجا تو ان لوگوں (میں سے بعض نے یا سب) نے کہا کہ (نعوذ باللہ) یہ جادوگر (اور) جھوٹا ہے (معجزہ کی وجہ سے "جادوگر" کہا، اور نبوت کے دعویٰ میں "جھوٹا" کہا)۔

فَقَالُوا سٰحِرٌ كَذَّابٌ: یہ قول فرعون، ہامان اور قارون تینوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر قارون چونکہ بنی اسرائیل میں سے تھا اور بظاہر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا تو قارون کا موسیٰ علیہ السلام کو ساحر کہنا بظاہر بعید ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ اس وقت بھی منافق ہو، موسیٰ علیہ السلام پر ظاہر میں ایمان کا دعویٰ کرتا ہو حقیقتاً نہ ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قول صرف فرعون و ہامان کا ہی ہو تغلیباً تینوں کی طرف نسبت کر دی گئی ہو، یعنی چونکہ اکثر نے یہ بات کہی تھی اس لیے مجموعہ کی طرف نسبت کر دی گئی۔

* * *

فائدہ: ۱ؔ "نشانیوں" سے معجزات اور "کھلی سند" سے شاید ان میں کے مخصوص و ممتاز معجزات مراد ہوں، یا "کھلی سند" معجزات کے سوا دوسری قسم کے دلائل و براہین کو فرمایا، یا "آیات" سے تعلیمات و احکام اور "سلطان مبین" سے معجزات مراد لیے جائیں، یا "سلطان مبین" اس قوت قدسیہ اور مخصوص تائید ربانی کا نام ہو، جس کے آثار پیغمبروں میں ہر دیکھنے والے کو نمایاں طور پر نظر آیا کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ؔ "ہامان" وزیر تھا فرعون کا اور "قارون" بنی اسرائیل میں سب سے بڑا مالدار اور تاجر تھا جو موسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف فرعون کی مرضی پر چلتا تھا، پہلے اس کا قصہ گزر چکا۔

فائدہ: ۳ؔ یعنی جادوگر ہے معجزات دکھانے میں، اور جھوٹا ہے دعویٰ رسالت میں، یہ بعض نے کہا ہوگا اور دوسروں نے اسکی تصدیق کی ہوگی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا

پھر جب پہنچا ان کے پاس لے کر سچی بات ہمارے پاس سے بولے مار ڈالو بیٹے ان کے جو یقین لائے ہیں اس کیساتھ اور جیتی رکھو

نِسَآءَهُمْ ۭ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿٢٥﴾

ان کی عورتیں ۱ؔ اور جو داؤ ہے منکروں کا سو غلطی میں ۲ؔ

خلاصہ تفسیر: پھر (اس کے بعد) جب وہ (عام) لوگوں کے پاس دین حق جو ہماری طرف سے تھا لے کر آئے (جس پر بعض لوگ مسلمان بھی ہوگئے) تو ان (مذکورہ) لوگوں نے (مشورہ کے طور پر) کہا کہ جو لوگ ان کے ساتھ (ہوکر) ایمان لے آئے ہیں ان کے بیٹوں کو قتل کر ڈالو (تاکہ ان کی جمعیت اور قوت نہ بڑھ جائے جس سے سلطنت کے زوال کا اندیشہ ہے) اور (چونکہ عورتوں سے ایسا اندیشہ نہیں اور نیز ہمارے گھروں میں خدمت وغیرہ کے لئے ان کی ضرورت ہے اس لئے) ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دو (غرض انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے غلبہ کا خطرہ محسوس کر کے اسے روکنے کی یہ تدبیر کی) اور ان کافروں کی تدبیر محض بے اثر رہی (چنانچہ آخر میں موسیٰ علیہ السلام ہی غالب آئے)۔

اُقْتُلُوْۤا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: بنی اسرائیل کے نوزائیدہ لڑکوں کے قتل کا حکم ایک تو موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے دیا گیا تھا جس کے نتیجہ میں موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالنے کی نوبت آئی اور قدرت نے اس بچہ کو خود فرعون کے گھر میں پلوایا، جبکہ یہاں آیت میں بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا یہ دوسرا فیصلہ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور نبوت کے بعد اس وقت کا ہے جبکہ ان کے معجزات دیکھ کر آل فرعون نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ ان کا جتھا بڑھ گیا تو ہماری سلطنت کی خیر نہیں، پھر یہ کسی روایت میں سے نظر سے نہیں گزرا کہ لڑکوں کے قتل کی یہ دوسری تدبیر عمل میں لائی گئی یا نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ حکم اب دوسری مرتبہ موسیٰ (علیہ السلام) کی تشریف آوری کے بعد دیا، تاکہ بنی اسرائیل کی تذلیل و توہین کریں، ان کی تعداد گھٹائیں اور ان کے دلوں میں یہ خیال جمادیں کہ یہ سب مصیبت ان پر موسیٰ کی بدولت آئی ہے، یہ خیال کرکے لوگ ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے اور دہشت انگیزی کی پالیسی کامیاب ہوجائے گی، آگے پتہ نہیں اس حکم پر عمل ہوا یا نہیں؟۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ایسے داؤ پیچ اور تدبیروں سے کیا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کی مدد فرما کر منکرین کے سب منصوبے غلط کردیتا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ

اور بولا فرعون مجھ کو چھوڑو کہ مار ڈالوں موسیٰ کو اور پڑا پکارے اپنے رب کو ۱؎ میں ڈرتا ہوں کہ بگاڑ دے تمہارا دین یا پھیلائے

فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾

ملک میں خرابی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پھر اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بارے میں گفتگو ہوئی) اور فرعون نے (اہل دربار سے) کہا کہ مجھ کو چھوڑو میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور اس کو چاہئے کہ اپنے رب کو (مدد کے لئے) پکارے، مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ (موسیٰ کہیں) تمہارا دین (نہ) بدل ڈالے یا ملک میں کوئی فساد (نہ) پھیلا دے (کہ پہلا دین کا نقصان ہے اور دوسرا دنیا کا نقصان کا ہے)۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰى: فرعون کا یہ کہنا کہ ذَرُوْنِیْۤ مجھ کو چھوڑو، یا تو اس وجہ سے تھا کہ اہل دربار نے شاید موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی رائے اس لیے نہ دی ہوگی کہ اس کو ملکی مصلحت کے خلاف سمجھا ہوگا کہ عام لوگوں میں چرچا ہوگا کہ ایک بے سروسامان شخص سے ڈر گئے، یا فرعون نے دھوکہ دینے کے لیے یہ بات کہی ہو تاکہ عام سننے والے یہ سمجھیں کہ اب تک موسیٰ علیہ السلام کے قتل میں تاخیر مشیروں کے روکنے کی وجہ سے ہوئی، اگرچہ واقع میں موسیٰ علیہ السلام کی خداداد ہیبت کی وجہ سے خود فرعون کو قتل پر جرأت نہ تھی، کیونکہ دل میں تو ان کو معجزات کی وجہ سے یقین ہو ہی گیا تھا، چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم کہ ظاہر میں وہ لوگ معجزات کے منکر تھے مگر ان کے دلوں کو ان کا یقین آ گیا تھا، ایک اور جگہ ارشاد ہے: ونجعل لكما سلطانا کہ ہم تم دونوں کو غلبہ اور رعب عطا کریں گے، اس لئے فرعون کو خطرہ تھا کہ اگر موسیٰ کو قتل کیا تو کسی آسمانی عذاب و بلا میں مبتلا ہوجاؤں گا مگر اپنے خوف کو درباریوں کے سر ڈالنے کے لئے ایسا کہا۔

وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ: اور اسی طرح ممکن ہے کہ فرعون کا یہ کہنا کہ: وليدع ربه یعنی موسیٰ کو چاہیے کہ اپنے رب کو مدد کے لیے پکارے، یہ بھی لوگوں پر محض اپنی بہادری جتلانے اور ظاہر کرنے کے لئے ہوگا، اگرچہ دل اندر سے تھرا رہا ہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''فرعون نے کہا مجھ کو چھوڑو، شاید اس کے ارکان سلطنت مار ڈالنے کا مشورہ نہ دیتے ہوں گے، کیونکہ معجزہ دیکھ کر ڈر گئے تھے، کہیں اس کا رب بدلہ نہ لے''، فرعون خود بھی دل میں ڈرا ہوا اور سہما ہوا تھا، لیکن لوگوں پر اپنی قوت و شجاعت کا اظہار کرنے کے لیے انتہاء درجہ کی شقاوت اور بے حیائی سے ایسا کہہ رہا تھا، تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کو قتل سے کوئی چیز مانع نہیں، اور اس کے ارادہ کو کوئی

طاقت نہیں روک سکتی۔

فائدہ: ۲ یعنی اسے زندہ چھوڑ دیا گیا تو دینی اور دنیاوی دونوں طرح کے نقصان کا اندیشہ ہے، ممکن ہے یہ اپنے وعظ وتلقین سے تمہارے مذہبی طور وطریق کو جو پہلے سے چلا آتا ہے بگاڑ ڈالے، یا سازش وغیرہ کا جال پھیلا کر ملک میں بدامنی پھیلا دے، جس کا انجام یہ ہو کہ تمہاری (یعنی قبطیوں کی) حکومت کا خاتمہ ہو کر ملک بنی اسرائیل کے ہاتھ میں چلا جائے۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٢٧﴾ ع

اور کہا موسیٰ نے میں پناہ لے چکا ہوں اپنے اور تمہارے رب کی ہر غرور والے سے ۱ جو یقین نہ کرے حساب کے دن کا ۲

خلاصہ تفسیر: اور موسیٰ (علیہ السلام نے جب قتل کی بات سنی خواہ روبروسنی ہو یا کسی ذریعہ سے تو جواب میں انہوں) نے کہا میں اپنے اور تمہارے (یعنی سب کے) پروردگار کی پناہ لیتا ہوں ہر خرد ماغ شخص (کے شر) سے جو روز حساب پر یقین نہیں رکھتا (اور اس لئے حق کا مقابلہ کرتا ہے)۔

اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّىْ وَرَبِّكُمْ: اگر یہ جواب فرعون کے سامنے دیا تو ربکم کا خطاب فرعون وغیرہ کو ہوگا اور خرد ماغ سے بھی وہی مراد ہوگا، اور دوسری صورت میں یہ خطاب خبر پہنچانے والوں کو ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ تم مطمئن رہو ان شاء اللہ مجھ پر کسی متکبر خرد ماغ کا ہاتھ نہیں پہنچ سکے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب ان کے مشوروں کی خبر پہنچی تو اپنی قوم سے فرمایا کہ مجھے ان دھمکیوں کی مطلق پروا نہیں، فرعون اکیلا تو کیا، ساری دنیا کے متکبرین وجبارین جمع ہو جائیں تب بھی میرا اور تمہارا پروردگار ان کے شر سے بچانے کے لیے کافی ہے، میں اپنے کو تنہا اسی کی پناہ میں دے چکا ہوں، وہ ہی میرا حامی ومددگار ہے، کما قال تعالیٰ: لَا تَخَافَآ اِنَّنِىْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى (طٰہٰ:۴۶)

فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "جس کو حساب کا یقین ہو وہ ظلم کاہے کو کرے گا"۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّىَ اللّٰهُ

اور بولا ایک مرد ایماندار فرعون کے لوگوں میں جو چھپاتا تھا اپنا ایمان کیا مار ڈالتے ہو ایک مرد کو اس بات پر کہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے

وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ

اور لایا تمہارے پاس کھلی نشانیاں تمہارے رب کی، اور اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر پڑے گا اس کا جھوٹ، اور اگر وہ سچا ہوگا تو تم پر پڑے گا

بَعْضُ الَّذِىْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿٢٨﴾

کوئی نہ کوئی وعدہ جو تم سے کرتا ہے ۱ بیشک اللہ راہ نہیں دیتا اس کو جو ہو بے لحاظ جھوٹا ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اس مجلس مشورہ میں) ایک مومن شخص نے جو کہ فرعون کے خاندان میں سے تھے (اور اب تک) اپنا ایمان پوشیدہ رکھتے تھے (یہ مشورہ سن کر لوگوں سے) کہا کیا تم ایک شخص کو (محض) اس بات پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے، حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف سے (اس دعوے پر) دلیلیں (بھی) لے کر آیا ہے (یعنی معجزات بھی دکھلاتا ہے جو دعویٰ نبوت کے سچ ہونے کی دلیل ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو خدا کی طرف سے توحید کی تعلیم دینے کا حکم ہے، اور دلیل کے ہوتے ہوئے دلیل والے کی مخالفت کرنا اور مخالفت بھی اس

درجہ کہ اس کے قتل کا قصد کیا جائے نہایت نازیبا ہے) اور اگر (بالفرض) وہ جھوٹا ہی ہو تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا (اور خود ہی اللہ کی طرف سے رسوا ہو جائے گا، قتل کرنے کی کیا ضرورت) اور اگر وہ سچا ہوا تو وہ جو کچھ پیشین گوئی کر رہا ہے (کہ ایمان نہ لانے کی صورت میں ایسا ایسا عذاب ہوگا) اس میں سے کچھ تو تم پر (ضرور ہی) پڑے گا (تو اس صورت میں قتل کرنے سے اور زیادہ بلا اپنے سر پر لینا ہے، غرض ان کے جھوٹے ہونے کی صورت میں تو قتل فضول ہے، اور سچے ہونے کی صورت میں قتل کرنا نقصان ہے، پھر ایسا کام کیوں کیا جائے، اور قاعدہ کلیہ ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو مقصود تک نہیں پہنچاتا جو (اپنی) حد سے گزر جانے والا (اور) بہت جھوٹ بولنے والا ہو۔

يَكْتُمُ إِيمَانَهُ: اس میں دلالت ہے کہ اہل باطل کے سامنے خوف کی وجہ سے حق بات کا چھپانا غلط نہیں، خاص طور پر جبکہ اس میں دینی ودعوتی مصلحت بھی ہو جبکہ اہل باطل ظالم اور جابر ہوں۔

وَإِن يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ: یعنی جھوٹے آدمی کی بات اگر چہ چند روز کے لیے چل جائے تو یہ ممکن ہے مگر اس کا انجام ناکامی اور ذلت ہے، پس اس قاعدہ کلیہ کے اعتبار سے اگر موسیٰ علیہ السلام بالفرض جھوٹے ہوں تو چونکہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور سخت جرأت ہے، کیونکہ ایسے جھوٹے پر اگر خدا کا قہر نازل نہ ہو تو اس سے مخلوق کو شبہ میں ڈالنا لازم آتا ہے اور یہ عقلاً حق تعالیٰ سے محال ہے، اس لیے یہ ضرور مغلوب اور رُسوا ہوں گے، پھر ان کے قتل کیا ضرورت ہے۔

وَإِن يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُم: اور اگر موسیٰ علیہ السلام سچے ہیں تو تم لوگ بالیقین جھوٹے ہو اور جھوٹ میں بھی حد سے گزرنے والے ہو کہ فرعون کی خدائی کا دعویٰ کرتے ہو اور حد سے گزرنے والے جھوٹے کو کامیابی نہیں ہوتی، پس تم لوگ موسیٰ کے قتل میں کامیاب نہ ہو گے، یا تو قدرت ہی نہ ہوگی، یا اس کا انجام برا ہوگا، بہر حال دونوں صورتیں میں نتیجہ یہی ہے کہ ان کو قتل نہ کیا جائے۔

اس تقریر پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ کبھی کسی مفسد کو قتل ہی نہ کیا جائے، کیونکہ ہر جگہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ جھوٹا ہے تو خدا تعالیٰ اسے خود ذلیل کر دیں گے، اور اگر سچا ہے تو سچے کا قتل کرنا برا ہے، جواب یہ ہے کہ یہ تقریر اس صورت میں ہے جہاں کسی کے سچے اور جھوٹے ہونے میں شبہ ہو، اور ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے اگر کسی کو یقین بھی نہ ہوا ہو تو کم از کم سچے ہونے کا احتمال تو ضرور تھا، اور جہاں قطعی دلائل سے کسی کا جھوٹا ہونا یقینی ہو گیا ہو اس موقع کے لیے یہ تقریر نہیں، واضح رہے کہ اس مومن کو موسیٰ علیہ السلام کے سچا ہونے کا پورا یقین تھا مگر اس نے دعوت میں نرمی اختیار کرنے کو ترجیح دی، اور اس طرز سے گفتگو کرنا لوگوں کی طبیعت کی رعایت سے تھا تاکہ وہ کچھ غور کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی ایک مرد مومن جس نے فرعون اور اس کی قوم سے اپنا ایمان ابھی تک مخفی رکھا تھا ذرونی اقتل موسیٰ کے جواب میں بول اٹھا: کیا تم ایک شخص کا ناحق خون کرنا چاہتے ہو، اس بات پر کہ وہ صرف ایک اللہ کو اپنا رب کیوں کہتا ہے، حالانکہ وہ اپنے دعوے کی صداقت کے کھلے کھلے نشان تم کو دکھلا چکا اور اس کے قتل کی تم کو کچھ ضرورت بھی نہیں، بلکہ ممکن ہے تمہارے لیے مضر ہو، فرض کرو! وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ثابت ہوا تو اتنے بڑے جھوٹ پر ضرور اللہ اس کو ہلاک یا رسوا کر کے چھوڑے گا، خدا کی عادت نہیں کہ وہ ایسے کاذب کو برابر پھولنے پھلنے دے، دنیا کو التباس سے بچانے کے لیے یقیناً ایک روز اس کی قلعی کھول دی جائے گی، ایسے حالات بروئے کار آئیں گے کہ دنیا اعلانیہ اس کی رسوائی و ناکامی اور کذب و دروغ کا تماشا دیکھ لے گی، اور تم کو خواہی نخواہی اس کے خون میں ہاتھ رنگنے کی ضرورت نہ رہے گی، اور اگر واقع وہ سچائی پر ہے تو دنیا و آخرت کے جس عذاب سے وہ اپنے مکذبین کو ڈراتا ہے، یقیناً اس کا کچھ نہ کچھ حصہ تم کو ضرور پہنچ کر رہے گا، لہذا پہلی شق پر اس کے قتل میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں اور دوسری شق پر اس کا قتل کرنا سراسر موجب نقصان و خسران ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اگر جھوٹا ہے تو جس پر جھوٹ بولتا ہے وہ ہی سزا دے رہے گا اور شاید سچا ہو تو اپنی فکر کرو''۔

تنبیہ: یہ تقریر اس صورت میں ہے جب کسی مفتری کا کذب صریحاً ظاہر نہ ہوا ہو اور اگر مدعی نبوت کا کذب وافتراء دلائل و براہین سے

روشن ہوجائے تو بلاشبہ واجب القتل ہے، اس زمانہ میں جبکہ پیغمبر عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خاتم النبیین ہونا دلائل قطعیہ سے ثابت ہو چکا، اگر کوئی شخص مدعی نبوت بن کر کھڑا ہوگا تو چونکہ اس کا یہ دعویٰ ایک قطعی الثبوت عقیدہ کی تکذیب کرتا ہے، لہذا اس کے متعلق کسی قسم کے تامل و تردد اور امہال و انتظار کی گنجائش نہ ہوگی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی موسیٰ اگر بالفرض جھوٹا ہوتا تو ہرگز اس کا اللہ راہ نہ دیتا کہ وہ برابر ایسے ایسے معجزات دکھاتا رہے اور کامیابی میں ترقی کرتا چلا جائے اور اگر تم جھوٹے ہو کہ ایک سچے کو جھوٹا بتلا رہے ہو تو انجام کار اللہ تعالیٰ تم کو ذلیل و ناکام کرے گا۔

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ

اے میری قوم! آج تمہارا راج ہے چڑھ رہے ہو ملک میں، پھر کون مدد کرے گا ہماری اللہ کی آفت سے اگر آگئی ہم پر ۱؎

قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝۲۹

بولا فرعون میں تو وہی بات سجھاتا ہوں تم کو جو سوجھی مجھ کو اور وہی راہ بتلاتا ہوں جس میں بھلائی ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے بھی اسی قتل سے روکنے کے متعلق مضمون ہے کہ) اے میرے بھائیو! آج تو تمہاری سلطنت ہے کہ اس سر زمین میں تم حاکم ہو سو خدا کے عذاب میں ہماری کون مدد کرے گا اگر (ان کے قتل کرنے سے) وہ ہم پر آ پڑا (جیسا کہ ان کے سچے ہونے کی صورت میں اس کا احتمال ہے) فرعون نے (یہ تقریر سن کر جواب میں) کہا کہ میں تو تم کو وہی رائے دوں گا جو خود سمجھ رہا ہوں (کہ ان کا قتل ہی مناسب ہے) اور میں تم کو عین طریق مصلحت بتلاتا ہوں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اپنے سامانوں اور لشکروں پر مغرور مت بنو، آج تمہاری یہ شان وشکوہ ہے، لیکن کل اگر خدا کے عذاب نے آگھیرا تو کوئی بچانے والا نہ ملے گا، یہ سب ساز وسامان یوں ہی رکھے رہ جائیں گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تمہاری تقریر سے میرے خیالات تبدیل نہیں ہوئے، جو کچھ میرے نزدیک مصلحت ہے وہ ہی تم کو سجھا رہا ہوں، میرے خیال میں بہتری کا راستہ یہ ہی ہے کہ اس شخص کا قصہ پہلے ہی قدم پر ختم کر دیا جائے۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝۳۰ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ

اور کہا اس ایماندار نے اے قوم میری میں ڈرتا ہوں کہ آئے تم پر دن اگلے فرقوں کا سا، جیسے حال ہوا قوم نوح کا

وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝۳۱

اور عاد اور ثمود کا اور جو لوگ ان کے پیچھے ہوئے، اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور اس مومن نے (جب دیکھا کہ نصیحت میں نرمی اور گفتگو میں مخاطب کے خیال کی رعایت سے کام نہیں چلتا تو اب اس نے ڈرانے دھمکانے سے کام لیا اور) کہا صاحبو مجھے تمہاری نسبت دوسری امتوں کے سے روز بد کا اندیشہ ہے، جیسا کہ قوم نوح اور عاد اور ثمود اور بعد والوں (یعنی قوم لوط وغیرہ) کا حال ہوا تھا اور خدا تعالیٰ تو بندوں پر کسی طرح کا ظلم کرنا نہیں چاہتا (لیکن جب تم حرکتیں ہی ایسی کرو گے تو ضرور ہی اپنی سزا کو پہنچو گے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اگر تم اسی طرح تکذیب وعداوت پر جمے رہے تو سخت اندیشہ ہے کہ تم کو بھی کہیں وہ ہی دن دیکھنا نہ پڑے جو پہلی قومیں اپنے انبیاء کا مقابلہ کر کے دیکھ چکی ہیں، یاد رکھو اللہ کے ہاں بے انصافی نہیں، اگر ایسے سخت جرائم پر تم کو یا دوسری قوموں کو اس نے تباہ کیا تو وہ عین عدل وانصاف کے تقاضا سے ہوگا، کون سی حکومت ہے جو اپنے سفراء کو قتل اور رسوا ہوتے دیکھتی رہے، اور قاتلین ومعاندین سے انتقام نہ لے۔

وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

اور اے قوم میری میں ڈرتا ہوں کہ تم پر آئے دن ہانک پکار کا۱ جس دن بھاگو گے پیٹھ پھیر کر۲ کوئی نہیں تم کو اللہ سے

مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

بچانے والا اور جس کو غلطی میں ڈالے اللہ تو کوئی نہیں اس کو سجھانے والا۳

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیت میں دنیا کے عذاب کی دھمکی تھی، اب آخرت کے عذاب کی دھمکی ہے۔

اور صاحبو مجھ کو تمہاری نسبت اس دن کا اندیشہ ہے جس میں کثرت سے ندائیں ہوں گی (یعنی اس دن بڑے بڑے واقعات ہوں گے، کیونکہ نداؤں کی کثرت یعنی ایک دوسرے کو آوازیں دینا بڑے واقعات میں ہی ہوتا ہے، آگے اس دن کی ایک حالت بیان کی گئی ہے کہ) جس روز (موقف حساب سے) پشت پھیر کر (دوزخ کی طرف) لوٹو گے (اور اس وقت) تم کو خدا (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا (اس مضمون کا تقاضا ہدایت قبول کرنے کا ہے لیکن) جس کو خدا ہی گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت کرنے والا نہیں۔

يَوْمَ التَّنَادِ: چنانچہ سب سے اول آواز صور پھونکنے کی ہوگی جس سے مردے زندہ ہو جائیں گے جیسا کہ ارشاد باری ہے: یوم ینادِ المنادِ من مکان قریب یوم یسمعون الصیحۃ، ایک پکار حساب کے لئے ہوگی جیسا کہ ارشاد ہے: یوم ندعوا کل اناس بامامھم، ایک ندا جنتی اور جہنمی لوگوں میں باہم ہوگی کہ ایک دوسرے کو پکاریں گے جیسا کہ سورہ اعراف میں ارشاد ہے: ونادیٰ اصحٰب الجنۃ الخ، ونادیٰ اصحٰب الاعراف الخ، ونادیٰ اصحٰب النار الخ، اور ایک پکار خیر میں موت کو ذبح کرنے کے وقت ہوگی کہ موت کو مینڈھے کی صورت میں سب کے سامنے ذبح کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ: "یا اھل الجنۃ خلود لاموت و یا اھل النار خلود لاموت" یعنی اے جنت والو! ہمیشہ رہو، اب موت نہیں، اور اے جہنم والو! ہمیشہ رہو، اب مرنا بھی نصیب نہ ہوگا، خلاصہ یہ کہ اس دن بڑے بڑے واقعات ہوں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ عموماً مفسرین یوم التناد (ہانک پکار کے دن) سے قیامت کا دن مراد لیتے ہیں، جبکہ محشر میں جمع ہونے اور حساب دینے کے لیے سب کی پکار ہوگی اور اہل جنت اہل نار اور اہل اعراف ایک دوسرے کو پکاریں گے اور آخر میں ندا آئے گی: "یا اھل الجنۃ خلود لاموت و یا اھل النار خلود لاموت"، کما ورد فی الحدیث لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے یوم التناد سے وہ دن مراد لیا ہے جس میں فرعونیوں پر عذاب آیا، چنانچہ لکھتے ہیں: "ہانک پکار کا دن ان پر آیا، جس دن بحر قلزم میں غرق ہوئے، اس وقت ڈوبتے ہوئے ایک دوسرے کو پکارنے لگا، (شاید) یہ اس مرد مومن کو کشف سے معلوم ہوا ہوگا، یا قیاس سے کہ ہر قوم پر عذاب اسی طرح آتا ہے"۔

فائدہ: ۲ یعنی محشر سے پیٹھ پھیر کر دوزخ کی طرف بھگائے جاؤ گے، یا نزول عذاب کے وقت اس سے بھاگنے کی ناکام کوشش کرو گے۔

فائدہ: ۳ یعنی میں تم کو سب نشیب وفراز پوری طرح سمجھا چکا، اس پر بھی تم نہ مانو تو سمجھ لو کہ تمہارے عناد وکج روی کی شامت سے اللہ تعالیٰ نے ارادہ ہی کر لیا ہے کہ تم کو تمہاری پسند کردہ غلطی اور گمراہی میں پڑا رہنے دے، پھر ایسے شخص کے سمجھنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَا

اور تمہارے پاس آچکا ہے یوسف اس سے پہلے کھلی باتیں لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی میں ان چیزوں سے جو وہ تمہارے پاس لیکر آیا یہاں تک کہ

هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۝۳۴

جب مرگیا لگے کہنے ہرگز نہ بھیجے گا اللہ اس کے بعد کوئی رسول ۱؎ اسی طرح بھٹکاتا ہے اللہ اس کو جو ہو بے باک شک کرنے والا

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ

وہ جو کہ جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے جو پہنچی ہو ان کو، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں اور ایمانداروں کے یہاں ۲؎

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝۳۵

اسی طرح مہر کر دیتا (لگا دیتا) ہے اللہ ہر دل پر غرور والے سرکش کے ۳؎

خلاصہ تفسیر: اب اس پر تنبیہ اور دھمکی ہے کہ تم موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ایک اور پیغمبر کو بھی جھٹلا چکے ہو:

اور اس سے قبل تم لوگوں کے پاس یوسف (علیہ السلام توحید ونبوت کے) دلائل لے کر آچکے ہیں (یعنی وہ بھی اسی قوم قبط میں آئے تھے جن میں سے تم بھی ہو اور اپنے باپ دادوں سے تم متواتر طریقہ سے ان کی خبر معلوم کر چکے ہو) سو تم ان امور میں بھی برابر شک (وانکار) ہی میں رہے جو وہ تمہارے پاس لے کر آئے تھے، حتیٰ کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو تم کہنے لگے کہ بس اب اللہ کسی رسول کو نہ بھیجے گا (یہ قول شرارت کے طور پر تھا، مطلب یہ کہ اول تو یوسف بھی رسول نہ تھے اور اگر بالفرض تھے بھی تو جب ہم نے ایک رسول کو نہ مانا تو اللہ میاں کہیں گے کہ دوسرے کو بھیجنے سے کیا فائدہ، تو ہمیشہ کے لئے رسالت کا جھگڑا پاک ہوگیا، اس بات سے ان کا اصل مقصود رسالت کا انکار تھا، جیسا کہ اگلے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس مسئلہ میں تم غلط کار ہو) اسی طرح اللہ تعالیٰ آپے سے باہر ہو جانے والے (اور) شبہات میں گرفتار رہنے والوں کو غلطی میں ڈالے رکھتا ہے جو بلا کسی سند کے جو ان کے پاس موجود ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑے نکالا کرتے ہیں، اس (کج بحثی) سے خدا تعالیٰ کو بھی بڑی نفرت ہے اور مومنین کو بھی، اور (جس طرح تمہارے دلوں پر مہر لگا رکھی ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مغرور وجابر کے پورے قلب پر مہر کر دیتا ہے (کہ اس میں حق سمجھنے کی اصلاً گنجائش رہتی)۔

یہ تقریر تھی ان مومن بزرگ کی جو فرعون کے خاندان میں سے تھے اور اب تک ایمان کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس تقریر سے ان بزرگ کا ایمان ظاہر ہوگیا، اور پہلے جو وہ اخفا کرتے تھے اب اخفا نہ رہا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی چلو قصہ ختم ہوا، نہ یہ رسول تھا، نہ اب اس کے بعد کوئی رسول آنے والا ہے، گویا سرے سے سلسلہ رسالت ہی کا انکار ہوا، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "حضرت یوسف کی زندگی میں (مصر والے ان کی نبوت کے) قائل نہ ہوئے، ان کی موت کے بعد جب مصر کی سلطنت کا بندوبست بگڑا تو کہنے لگے یوسف کا قدم اس شہر پر کیا مبارک تھا، ایسا نبی (آئندہ) کوئی نہ آئے، یا وہ انکار یا یہ اقرار، یہ ہی اسراف اور زیادہ گوئی ہے"۔ مرد مومن کی غرض یہ تھی کہ نعمت کی قدر زوال کے بعد ہوتی ہے، فی الحال تم کو موسیٰ کی قدر نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بدون حجت عقلیہ ونقلیہ کے اللہ کی باتوں میں جھگڑے ڈالتے ہیں، اس سے بڑھ کر زیادتی اور بے باکی کیا ہوگی، اسی لیے اللہ اور اس کے ایماندار بندے ان لوگوں سے سخت بیزار ہیں جو سبب ہے ان کے انتہائی ملعون ہونے کا۔

فائدہ: ۳؎ جو لوگ حق کے سامنے غرور سے گردن نہ جھکائیں اور پیغمبروں کے ارشادات سن کر سر نیچا نہ کریں، آخر کار ان کے دلوں پر اللہ

تعالیٰ اسی طرح مہر کر دیتا ہے کہ پھر قبول حق اور نفوذ خیر کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿٣٦﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ

اور بولا فرعون کے اے ہامان! بنا میرے واسطے ایک اونچا محل شاید میں جا پہنچوں راستوں میں، رستوں میں آسمانوں کے پھر جھانک کر دیکھوں

اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ۭ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْۗءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ۭ

موسیٰ کے معبود کو[1] اور میری اٹکل میں تو وہ جھوٹا ہے[2] اور اسی طرح بھلے دکھلا دیے فرعون کو اسکے برے کام اور روک دیا گیا سیدھی راہ سے[3]

وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿٣٧﴾ ع

اور جو داؤ تھا فرعون کا سو تباہ ہونے کے واسطے[4]

خلاصہ تفسیر: اور فرعون نے (جو یہ لاجواب تقریر سنی تو اس مومن کو کچھ جواب نہ دے سکا، اپنی بلکہ اپنی قدیم جہالت پر اپنے زعم میں ایک حجت قائم کرنے کے لئے ہامان سے) کہا اے ہامان! میرے لئے ایک بلند عمارت بنواؤ (میں اس پر چڑھ کر دیکھوں گا) شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں پھر (وہاں جا کر) موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو (اس کے دعویٰ میں) جھوٹا سمجھتا ہوں (آگے خلاصہ کے طور پر فرعون کی مجموعی حالت کی مذمت بیان فرماتے ہیں کہ اس کی ایک یہی جہالت نہ تھی) اور اسی طرح فرعون کی (اور) بدکرداریاں (بھی) اس کو مستحسن معلوم ہوئی تھیں اور (سیدھے) رستہ سے رک گیا، اور (موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اس نے بڑی بڑی تدبیریں کیں مگر) فرعون کی ہر تدبیر غارت ہی گئی (کسی میں کامیاب نہ ہوا)۔

"صرح" یعنی محل بننے نہ بننے کی تحقیق سورہ قصص آیت ۳۸ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: [1] یہ اس ملعون کی انتہائی بے شرمی اور بے باکی تھی، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے شاید اللہ تعالیٰ کی صفت علو وغیرہ کو سن کر یہ قرار دیا ہوگا کہ موسیٰ کا خدا آسمان پر رہتا ہے، اسی پر یہ استہزاء و تمسخر شروع کر دیا، سچ ہے چیونٹی کی موت آتی ہے تو پر لگ جاتے ہیں، سورہ قصص میں اس مقام کی تقریر گزر چکی۔

فائدہ: [2] یعنی دعوائے رسالت میں بھی اور اس دعوے میں بھی کہ سارے جہان کا کوئی اور معبود ہے، مجھے تو اپنے سوا دوسرا نظر نہیں آتا، کما قال: مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ (القصص:۳۸)

فائدہ: [3] برے کام کرتے کرتے آدمی کی یوں ہی عقل ماری جاتی ہے اور ایسی ہی مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگتا ہے، جس کے بعد راہ پر آنے کی کوئی صورت نہیں رہتی، یہی حال فرعون کا ہوا۔

فائدہ: [4] یعنی فرعون کے جس قدر داؤ پیچ اور منصوبے یا مشورے تھے سب بے حقیقت تھے، خود اپنی ہی تباہی کے لیے، موسیٰ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿٣٨﴾ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

اور کہا اسی ایماندار نے اے قوم راہ چلو میری اور پہنچا دوں تم کو نیکی کی راہ پر[1] اے میری قوم! یہ جو زندگی ہے دنیا کی

مَتَاعٌ ۫ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿٣٩﴾

سو کچھ برت لینا ہے، اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی ہے جم کر رہنے کا گھر ۲

خلاصہ تفسیر: اور اس مومن نے (جب دیکھا کہ فرعون سے کوئی معقول جواب نہیں بن پڑا تو پھر کرر) کہا کہ اے بھائیو! تم میری راہ پر چلو میں تم کو ٹھیک راستہ بتلاتا ہوں (یعنی فرعون نے جو کہا تھا کہ میں تمہیں سبیل الرشاد کی طرف ہدایت کرتا ہوں اس کا بتایا ہوا راستہ ہرگز سبیل الرشاد یعنی ہدایت کا راستہ نہیں، بلکہ سبیل الرشاد میرا بتلایا ہوا راستہ ہے) اے بھائیو! یہ دنیوی زندگی محض چندروزہ ہے اور (اصل) ٹھہرنے کا مقام تو آخرت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ چونکہ فرعون نے کہا تھا: **وما اهديكم الا سبيل الرشاد** اس کے جواب میں مرد مومن نے کہا کہ ''سبیل الرشاد'' (بھلائی اور بہتری کا راستہ) وہ نہیں جو فرعون تجویز کرتا ہے، بلکہ تم میرے پیچھے چلے آؤ، تاکہ بہتری کے راستہ پر چلنا نصیب ہو

فائدہ: ۲ یعنی فانی وزائل زندگی اور چندروزہ عیش و بہار میں پڑ کر آخرت کو نہ بھولو، دنیا کی زندگی بہر حال بھلی بری طرح ختم ہونے والی ہے، اس کے بعد وہ زندگی شروع ہوگی جس کا کبھی خاتمہ نہیں، عاقل کا کام یہ ہے کہ یہاں رہتے ہوئے اس کی درستی کی فکر کرے، ورنہ ہمیشہ کی تکلیف میں مبتلا رہنا پڑے گا:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ

جس نے کی ہے برائی تو وہی بدلہ پائے گا اس کے برابر، اور جس نے کی ہے بھلائی مرد ہو یا عورت اور وہ یقین رکھتا ہو

فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٤٠﴾

سو وہ لوگ جائیں گے بہشت میں روزی پائیں گے وہاں بیشمار

خلاصہ تفسیر: (اور آخرت میں بدلہ دینے کا یہ قانون ہے کہ) جو شخص گناہ کرتا ہے تو اس کو برابر سرابر ہی بدلہ ملتا ہے اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے (اور) وہاں ان کو بے حساب رزق ملے گا۔

* * *

فائدہ: یہ اخروی زندگی کی تھوڑی سی تفصیل بتلادی کہ وہ کس طرح درست ہوسکتی ہے، معلوم ہوا کہ وہاں ایمان اور عمل صالح درکار ہیں، مال ومتاع کو کوئی نہیں پوچھتا اور یہ بھی ظاہر ہوا کہ اللہ کی رحمت غضب پر غالب ہے، عقلمند کو چاہیے کہ موقع ہاتھ سے نہ دے۔

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ﴿٤١﴾ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ

اور اے قوم! مجھ کو کیا ہوا ہے بلاتا ہوں تم کو نجات کی طرف اور تم بلاتے ہو مجھ کو آگ کی طرف ۱ تم بلاتے ہو مجھ کو کہ منکر ہو جاؤں اللہ سے اور شریک

بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۫ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿٤٢﴾

ٹھہراؤں اس کا اس کو جس کی مجھ کو خبر نہیں ۲ اور میں بلاتا ہوں تم کو اس زبردست گناہ بخشنے والے کی طرف ۳

خلاصہ تفسیر: اس تقریر کے وقت اس مؤمن کو قوم کی حالت، یا ان کی باتوں سے یہ محسوس ہوا کہ یہ لوگ میری باتوں پر تعجب کر رہے ہیں اور بجائے میری بات ماننے کے مجھ کو ہی اپنے کفر کے طریقہ کی طرف بلانا چاہتے ہیں، اس لئے یہ بھی کہا کہ:

اور اے میرے بھائیو! یہ کیا بات ہے کہ میں تو تم کو (طریق) نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھ کو (طریق) دوزخ کی طرف بلاتے ہو (یعنی) تم مجھ کو اس بات کی طرف بلاتے ہو کہ (معاذ اللہ) میں خدا کے ساتھ کفر کروں اور ایسی چیز کو اس کا ساجھی بناؤں جس (کے ساجھی ہونے) کی میرے پاس کوئی دلیل بھی نہیں (بلکہ واقع میں بھی کوئی دلیل نہیں، حقیت میں اس کے خلاف پر دلائل قائم ہیں) اور میں تم کو خدائے زبردست خطا بخش کی طرف بلاتا ہوں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی میرا اور تمہارا معاملہ بھی عجیب ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم کو ایمان کے راستہ پر لگا کر خدا کے عذاب سے نجات دلاؤں اور تمہاری کوشش یہ ہے کہ اپنے ساتھ مجھے بھی دوزخ کی آگ میں دھکیل دو، ایک طرف سے ایسی دشمنی اور دوسری جانب سے یہ خیر خواہی۔

فائدہ: ۲ یعنی تمہاری کوشش کا حاصل تو یہ ہے کہ میں (معاذ اللہ) خدائے واحد کا انکار کر دوں، اس کے پیغمبروں کو اور ان کی باتوں کو نہ مانوں اور نادان جاہلوں کی طرح ان چیزوں کو خدا ماننے لگوں جن کی الوہیت کسی دلیل اور علمی اصول سے ثابت نہیں، نہ مجھے خبر ہے کہ کیونکر ان چیزوں کو خدا بنا لیا گیا، بلکہ میں جانتا ہوں کہ اس کے خلاف پر دلائل قطعیہ قائم ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی میرا منشاء یہ ہے کہ کسی طرح تمہارا سر اس خدائے واحد کی چوکھٹ پر جھکا دوں جو نہایت زبردست بھی ہے اور بہت زیادہ خطاؤں کا معاف کرنے والا بھی (مجرم کو پکڑے تو کوئی چھڑا نہ سکے اور معاف کرے تو کوئی روک نہ سکے) وہ ہی اس کا مستحق ہے کہ آدمی اس کے آگے ڈر کر اور امید باندھ کر سر عبودیت جھکائے، یاد رکھو میں اسی خدا کی پناہ میں آچکا ہوں جس کی طرف تمہیں بلا رہا ہوں۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ

آپ ہی ظاہر ہے کہ جس کی طرف تم مجھ کو بلاتے ہو اس کا بلاوا کہیں نہیں دنیا میں اور نہ آخرت میں ۱ اور یہ کہ ہم کو پھر جانا ہے اللہ کے پاس

وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾

اور یہ کہ زیادتی والے وہی ہیں دوزخ کے لوگ ۲

خلاصہ تفسیر: یقینی بات ہے کہ تم جس چیز (کی عبادت) کی طرف مجھ کو بلاتے ہو وہ نہ تو دنیا ہی میں (کسی دنیوی حاجت کے لئے) پکارے جانے کے لائق ہے اور نہ (عذاب دور کرنے کے لئے) آخرت ہی میں (کیونکہ معبود ہونے کے لیے علم کامل اور قدرت کامل ضروری ہے اور یہ شرط ان جھوٹے معبودوں میں موجود نہیں) اور (یقینی بات ہے کہ) ہم سب کو خدا کے پاس جانا ہے اور (یقینی بات ہے کہ) جو لوگ دائرہ (عبودیت) سے نکل رہے ہیں (جیسے غیر اللہ کی پرستش کرنے والے) وہ سب دوزخی ہوں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ماسوا خدا کے کوئی چیز ایسی نہیں جو دنیا یا آخرت میں ادنیٰ ترین نفع وضرر کی مالک ہو، پھر اس کی بندگی اور غلامی کا بلاوا دینا جہل وحماقت نہیں تو اور کیا ہے: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ (الاحقاف:۵) آخر ایسی عاجز اور بے بس چیزوں کی طرف آدمی کیا سمجھ کر دعوت دے اور تماشا یہ ہے کہ ان میں بہت چیزیں وہ ہیں جو خود بھی اپنی طرف دعوت نہیں دیتیں، بلکہ دعوت دینے کی قدرت بھی نہیں رکھتیں۔

فائدہ: ۲ یعنی انجام کار ہر پھر کر اسی خدائے واحد کی طرف جانا ہے، وہاں پہنچ کر سب کو اپنی زیادتیوں کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا، بتلاؤ! اس

سے بڑھ کر زیادتی کیا ہوگی کہ عاجز مخلوق کو خالق کا درجہ دے دیا جائے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۴۴

سو آگے یاد کرو گے جو میں کہتا ہوں تم کو ۱ اور میں سونپتا ہوں اپنا کام اللہ کو، بیشک اللہ کی نگاہ میں ہیں سب بندے ۲

خلاصہ تفسیر: سو (اب تو میرا کہنا تمہارے جی کو نہیں لگتا مگر) آگے چل کر تم میری بات کو یاد کرو گے اور (چونکہ اس مؤمن کو پہلے سے یہ احتمال تھا کہ یہ لوگ اس نصیحت پر میرے خلاف ہو جائیں گے اور تکلیف پہنچائیں گے اور ممکن ہے کہ اس وقت دھمکی کے کچھ آثار وعلامت بھی ان کی طرف سے سامنے آئے ہوں، کم از کم شبہ تو ضرور ہی تھا اس لئے اس مؤمن نے یہ بھی کہا کہ) میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد (اور حوالہ) کرتا ہوں، خدا تعالیٰ سب بندوں کا (خود) نگران ہے (میں تم سے بالکل نہیں ڈرتا)۔

＊＊＊

فائدہ: ۱ یعنی آگے چل کر جب اپنی زیادتیوں کا مزہ چکھو گے، اس وقت میری نصیحت کو یاد کرو گے کہ ہاں ایک مرد خدا جو ہم کو سمجھایا کرتا تھا وہ ٹھیک کہتا تھا، لیکن اس وقت یاد کر کے پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی میں خدا کی حجت تمام کر چکا اور نصیحت کی بات سمجھا چکا، تم نہیں مانتے تو میرا تم سے کچھ مطلب نہیں، اب میں اپنے کو بالکلیہ خدا کے سپرد کرتا ہوں، اسی پر میرا بھروسہ ہے، تم اگر مجھے ستانا چاہو گے تو وہ ہی خدا میرا حامی وناصر ہے، سب بندے اس کی نگاہ میں ہیں، وہ میرا اور تمہارا دونوں کا معاملہ دیکھ رہا ہے، کسی کی کوئی حرکت اس پر پوشیدہ نہیں، ایک مومن قانت کا کام یہ ہے کہ اپنی امکانی سعی کر چکنے کے بعد نتیجہ کو خدا کے سپرد کرے۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۗءُ الْعَذَابِ ۝۴۵ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا

پھر بچالیا موسیٰ کو اللہ نے برے داؤ سے جو کرتے تھے اور الٹ پڑا فرعون والوں پر بری طرح کا عذاب ۱ وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں ان کو

غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝۴۶

صبح اور شام ۲ اور جس دن قائم ہوگی قیامت حکم ہوگا داخل کرو فرعون والوں کو سخت سے سخت عذاب میں

خلاصہ تفسیر: پھر خدا تعالیٰ نے اس (مؤمن) کو ان کی مضر تدبیروں سے محفوظ رکھا (چنانچہ وہ ان کی ایذاؤں سے محفوظ رہا اور حضرت قتادہ کے قول کے مطابق اس کو بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ غرق سے نجات ہوئی) اور فرعون والوں پر (مع فرعون کے) تکلیف دینے والا عذاب نازل ہوا (جس کا بیان یہ ہے کہ) وہ لوگ (برزخ میں) صبح وشام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں (اور ان کو بتلایا جاتا ہے کہ تم قیامت کے روز اس میں داخل ہو گے) اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) کہ فرعون والوں کو (مع فرعون کے) نہایت سخت عذاب میں داخل کرو (چنانچہ وہ سخت عذاب میں داخل ہوں گے)۔

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا: اس آیت سے قبر کا عذاب ثابت ہوتا ہے، اس پر ابن کثیرؒ نے ایک سوال لکھا ہے کہ یہ آیتیں مکی ہیں اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں حضرت عائشہؓ نے کسی یہودی عورت کو کچھ دیا تو اس نے دعا دی کہ خدا تم کو عذاب قبر سے بچائے، حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا تو آپ نے اس کی نفی فرمائی، اس کے بعد فرمایا کہ ہاں! مجھ کو وحی سے معلوم ہوا کہ قبر میں عذاب ہوتا ہے، پس جب ان آیتوں سے جو مکہ میں نازل ہو چکی تھیں قبر میں عذاب ہونا معلوم ہو گیا تھا تو پھر آپ ﷺ نے نفی کیسے فرمائی؟ اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں، اچھا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مطلق طور پر نفی نہیں فرمائی تھی، بلکہ مؤمنین سے نفی فرمائی تھی، چنانچہ احمد کی روایت میں ہے: "انما یفتن یہود" پھر وحی کے بعد

بعض مؤمنین کے لیے بھی ہونا معلوم ہوا، چنانچہ اسی روایت میں ہے: "فلبثنا لیالی ثم قال رسول الله ﷺ: ألا إنكم تفتنون في القبور"۔
اور احقر کے نزدیک آسان جواب یہ ہے کہ اس آیت سے صرف آل فرعون کے لیے قبر کا عذاب ثابت ہوتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے دوسروں کی بابت نفی فرمادی تھی، پھر وحی سے دوسروں کے لیے بھی معلوم ہوگیا۔

اَشَدَّ الْعَذَابِ: اس سے مراد دوزخ ہے، اور پھر دوزخ کا بھی سخت طبقہ، اور قبر میں صرف اس آگ کا مشاہدہ ہوتا ہے اور کچھ اثر بھی پہنچتا ہے، اور قبر میں جس آگ سے عذاب ہوتا ہے وہ برزخی آگ ہے، خواہ اس کی حقیقت کچھ جدا ہو، یا وہ جہنم ہی کی آگ کا اثر ہو۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی حق و باطل کی اس کشمکش کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (اور ان کے ہمراہیوں کو جن میں یہ مومن آل فرعون بھی تھا) فرعونیوں کے منصوبوں سے محفوظ رکھا، کوئی داؤ ان کا چلنے نہ دیا، بلکہ ان کے داؤ پیچ خود ان ہی پہ الٹ پڑے، جس نے حق پرستوں کا تعاقب کیا مارا گیا اور قوم کی قوم کا بیڑا بحر قلزم میں غرق ہوا۔

فائدہ: ۲۔ یعنی دوزخ کا ٹھکانا جس میں وہ قیامت کے دن داخل کیے جائیں گے، ہر صبح و شام ان کو دکھلا دیا جاتا ہے، تا کہ نمونہ کے طور پر اس آنے والے عذاب کا کچھ مزہ چکھتے رہیں، یہ عالم برزخ کا حال ہوا اور احادیث سے ثابت ہے کہ اسی طرح ہر کافر کے سامنے دوزخ کا اور ہر مومن کے سامنے جنت کا ٹھکانا روزانہ صبح و شام پیش کیا جاتا ہے۔

تنبیہ: آیہ ہذا سے صرف فرعونیوں کا عالم برزخ میں معذب ہونا ثابت ہوا تھا، اس کے بعد حضور ﷺ کو معلوم کرایا گیا کہ جملہ کفار بلکہ عصاۃِ مومنین بھی برزخ میں معذب ہوتے ہیں (اعاذنا الله منه) کما ورد فی الاحادیث الصحیحہ، اور بعض آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح جنتیوں میں سے شہداء کی روحیں "طیور خضر" کے "حواصل" میں داخل ہو کر جنت کی سیر کرتی ہیں، اسی طرح دوزخیوں میں سے فرعونیوں کی ارواح کو "طیور سود" کے "حواصل" میں داخل کر کے ہر صبح شام دوزخ کی طرف بھیجا جاتا ہے (البتہ ارواح کا مع ان کے اجساد کے جنت یا دوزخ میں اقامت پذیر ہونا آخرت میں ہوگا) اگر یہ صحیح ہے تو فرعونیوں کے متعلق: اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا اور عام دوزخیوں کے متعلق حدیث: "عرض عليه مقعده بالغداة والعشي" کے الفاظ کا تفاوت شاید اسی بناء پر ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ

اور جب آپس میں جھگڑیں گے آگ کے اندر پھر کہیں گے کمزور غرور کرنے والوں کو ہم تھے تمہارے تابع پھر کچھ تم

مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ

ہم پر سے اٹھالو گے حصہ آگ کا۱۔ کہیں گے جو غرور کرتے تھے ہم سبھی پڑے ہوئے ہیں اس میں، بیشک اللہ

حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾

فیصلہ کر چکا بندوں میں ۲۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے چند جگہ کفار کو وعید سنائی گئی ہے، اب آگے جہنمیوں کے جہنم میں داخل ہونے کے بعد کی کچھ بیان کرتے ہیں، اور ان جہنمیوں میں آل فرعون بھی داخل ہیں جن کا قصہ ابھی بیان ہو چکا۔

اور (وہ وقت بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے) جبکہ کفار دوزخ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو ادنیٰ درجہ کے لوگ (یعنی پیروی کرنے والے تابعین) بڑے درجہ کے لوگوں سے (یعنی متبوعین سے جن کا وہ دنیا میں اتباع کیا کرتے تھے) کہیں گے کہ ہم (دنیا میں) تمہارے تابع تھے کیا

تم ہم سے آگ کا کوئی جز ہٹا سکتے ہو (یعنی جب دنیا میں تم نے ہمیں اپنا تابع اور پیرو بنا رکھا تھا تو آج تمہیں ہماری مدد کرنا چاہئے) وہ بڑے لوگ کہیں گے کہ ہم سب ہی دوزخ میں ہیں (یعنی ہم اپنا ہی عذاب کم نہیں کر سکتے تو تمہارا کیا کریں گے) اللہ تعالیٰ (اپنے) بندوں کے درمیان (قطعی) فیصلہ کر چکا (اب اس کے خلاف کرنے کی کس کو مجال ہے، اور اس فیصلہ میں ہم سب جہنمی ٹھہرے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دنیا میں ہم سے اپنی اطاعت اور اتباع کراتے رہے، جس کی بدولت آج ہم پکڑے گئے، اب یہاں ہمارے کچھ تو کام آؤ، آخر بڑوں کو چھوٹوں کی تھوڑی بہت خبر لینی چاہیے، دیکھتے نہیں ہم آج کس قدر مصیبت میں ہیں، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس مصیبت کا کوئی جزو ہم سے ہلکا کردو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جو دنیا میں بڑے بنتے تھے، جواب دیں گے کہ آج ہم اور تم سب اسی مصیبت میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ہر ایک کے جرم کے موافق سزا کا فیصلہ سنا دیا ہے جو بالکل قطعی اور اٹل ہے، اب موقع نہیں رہا کہ کوئی کسی کے کام آئے، ہم اپنی ہی مصیبت کو ہلکا نہیں کر سکتے، پھر تمہارے کیا کام آسکتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿٤٩﴾

اور کہیں گے جو لوگ پڑے ہیں آگ میں دوزخ کے داروغوں کو مانگو اپنے رب سے کہ ہم پر ہلکا کردے ایک دن تھوڑا عذاب

خلاصہ تفسیر: اور (اس کے بعد) جتنے لوگ دوزخ میں ہوں گے (یعنی بڑے اور چھوٹے تابع اور متبوع سب مل کر) جہنم کے موکل فرشتوں سے (درخواست کے طور پر) کہیں گے کہ تم ہی اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ کسی دن تو ہم سے عذاب ہلکا کردے (یعنی عذاب کے بالکل ہٹ جانے یا ہمیشہ کے لئے کم ہوجانے کی امید تو نہیں، کم از کم ایک روز کی تو کچھ چھٹی مل جایا کرے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اپنے سرداروں کی طرف سے مایوس ہو کر ان فرشتوں سے درخواست کریں گے جو دوزخ کے انتظام پر مسلط ہیں کہ تم ہی اپنے رب سے کہہ کر کوئی دن تعطیل کرا دو، جس میں ہم پر سے عذاب کچھ ہلکا ہو جایا کرے۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ

وہ بولے کیا نہ آتے تھے تمہارے پاس تمہارے رسول کھلی نشانیاں لے کر، کہیں گے کیوں نہیں، بولے پھر پکارو

ع۵ ۱۰ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿٥٠﴾

اور کچھ نہیں کافروں کا پکارنا مگر بھٹکنا

خلاصہ تفسیر: فرشتے کہیں گے کہ (یہ بتلاؤ) کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر معجزات لے کر نہیں آتے رہے (اور دوزخ سے بچنے کا طریقہ نہیں بتلاتے رہے تھے) دوزخی کہیں گے ہاں آتے تو رہے تھے (مگر ہم نے ان کا کہنا نہ مانا: **بلی قد جاءنا نذیر فکذبنا**) فرشتے کہیں گے کہ تو پھر (ہم تمہارے لئے دعا نہیں کر سکتے، کیونکہ کافروں کے لئے دعا کرنے کی ہم کو اجازت نہیں ہے) تم ہی (اگر جی چاہے تو خود) دعا کرلو، اور (تمہاری دعا کا بھی کچھ نتیجہ نہ ہوگا کیونکہ) کافروں کی دعا (اگرچہ وہ حق تعالیٰ ہی سے ہو آخرت میں) محض بے اثر ہے (کیونکہ آخرت میں کوئی دعا بغیر ایمان کے قبول نہیں ہو سکتی اور ایمان کا موقع دنیا ہی میں تھا وہ تم کھو چکے)۔

وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ: اور یہ جو ہم نے خلاصہ تفسیر میں کہا ہے کہ "دعا اگرچہ حق تعالیٰ ہی سے ہو" اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر خدا سے دعا کرنا تو دنیا میں بھی بے اثر ہے، چنانچہ سورہ رعد آیت ۱۴ میں ایسا ہی جملہ آیا ہے وہاں یہی معنی ہیں۔

خلاصہ تفسیر میں یہ جو کہا کہ "کافروں کی دعا آخرت میں محض بے اثر ہے" اس سے فائدہ یہ ہے کہ دنیا میں تو کافروں کی دعا بھی قبول ہو سکتی ہے اگر وہ خدا سے دعا کریں، جیسا کہ سب سے بڑا کافر ابلیس کی سب سے بڑی دعا قیامت تک زندہ رہنے کی قبول کرلی گئی۔

* * *

فائدہ: یعنی اس وقت ان کی بات نہ مانی اور انجام کی فکر نہ کی جو کچھ کام چلتا، اب موقع ہاتھ سے نکل چکا، اب کوئی سعی سفارش یا خوشامد درآمد کام نہیں دے سکتی، پڑے چیختے چلاتے رہو، نہ ہم ایسے معاملات میں سفارش کر سکتے ہیں، نہ تمہاری چیخ و پکار سے کوئی فائدہ ہے، حضرت شاہ صاحب لکھے ہیں: "دوزخ کے فرشتے کہیں گے سفارش کرنا ہمارا کام نہیں، ہم تو عذاب دینے پر مقرر ہیں، سفارش کا کام رسولوں کا، رسولوں سے تم برخلاف ہی تھے"۔

تنبیہ: آیہ ہذا سے معلوم ہوا کہ آخرت میں کافروں کی دعا کا کوئی اثر نہ ہوگا، باقی دنیا میں کافر کے مانگنے پر اللہ تعالیٰ کوئی چیز دے دیں وہ دوسری بات ہے، جیسے ابلیس کو قیامت تک کی مہلت دے دی۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿٥١﴾

ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگانی میں ۱؎ اور جب کھڑے ہوں گے گواہ ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے جا بجا کفار کی مخالفت اور خصومت کا ذکر ہوا ہے جس سے رسول اللہ ﷺ کو غم ہوتا تھا، اب آپ ﷺ کی تسلی کے لیے نصرت الٰہی کی خبر سناتے ہیں جس کی پیچھے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے بھی تائید کی گئی ہے، نیز بنی اسرائیل کی حالت سنا کر بھی تسلی فرماتے ہیں جس سے مسئلہ رسالت کی تائید بھی ہے۔

ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگانی میں بھی مدد کرتے ہیں (جیسا کہ پیچھے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے معلوم ہوا) اور اس روز بھی جس میں گواہی دینے والے (فرشتے جو کہ نامہ اعمال لکھتے تھے قیامت کے روز اس بات کی گواہی دیں گے کہ رسولوں نے احکام پہنچائے تھے اور کفار نے ان کو جھٹلایا تھا، غرض وہ فرشتے گواہی کے لئے) کھڑے ہوں گے (مراد اس سے قیامت کا دن ہے، وہاں رسولوں کی امداد کرنے کا حال بھی معلوم ہو چکا ہے کہ کفار کو جہنم کا عذاب ہوگا)۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا: دنیا میں غلبہ اور مدد کرنے کی تحقیق و تفصیل سورہ مائدہ آیت ۵۶: فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں، یہاں اس سے زیادہ اتنی بات تفسیر ابن کثیر میں اور نظر سے گزری کہ نصرت و امداد کی ایک صورت بدلہ اور انتقام لینا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ ہم رسولوں اور ایمان والوں کا بدلہ کفار سے لیا کرتے ہیں، چنانچہ جب کبھی کفار نے رسولوں اور مؤمنوں پر غلبہ پا کر ان کو قتل و ہلاک کیا ہے تو اگرچہ اس وقت اہل حق مغلوب ہو گئے ہوں مگر من جانب اللہ کسی وقت ان سے بھی بدلہ لیا گیا، چنانچہ قرآن و حدیث اور تاریخ سب اس پر شاہد ہیں اور یہ جواب احقر کو بہت پسند آیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دنیا میں ان کا بول بالا کرتا ہے، جس مقصد کے لیے وہ کھڑے ہوتے ہیں اللہ کی مدد سے اس میں کامیابی ہوتی ہے، حق پرستوں کی قربانیاں کبھی ضائع نہیں جاتیں، درمیان میں کتنے ہی اتار چڑھاؤ ہوں اور کیسے ہی امتحانات پیش آئیں، مگر آخر کار مشن کامیاب ہو کر رہتا ہے، علمی حیثیت سے حجت و برہان میں تو وہ ہمیشہ ہی منصور رہتے ہیں، لیکن مادی فتح اور ظاہری عزت و رفعت بھی آخر کار ان ہی کو حاصل ہوتی ہے، سچائی کے دشمن کبھی معزز نہیں رہ سکتے، ان کا علو اور عروج محض ہنڈیا کا جھاگ اور سوڈے کا ابال ہوتا ہے، انجام کار مومنین قانتین کے مقابلہ میں ان کو پست اور ذلیل ہونا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان سے اپنے اولیاء کا انتقام لیے بدون نہیں چھوڑتا، لیکن واضح رہے کہ آیت میں جن مومنین کے لیے وعدہ کیا گیا ہے شرط یہ ہے

کہ حقیقی مومن اور رسولوں کے متبع ہوں، کما قال تعالیٰ: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (آل عمران:۱۳۹) مومنین کی خصلتیں قرآن میں جا بجا مذکور ہیں، چاہیے کہ مسلمان اس کسوٹی پر اپنے کو کس کر دیکھ لیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی میدان حشر میں جبکہ اولین و آخرین جمع ہوں گے، حق تعالیٰ اپنے فضل سے علی الاشہادان کی سر بلندی اور عزت و رفعت کو ظاہر فرمائے گا، دنیا میں تو کچھ شبہ بھی رہ سکتا ہے اور التباس ہو جاتا ہے، وہاں ذرا بھی ابہام و التباس باقی نہ رہے گا۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾

جس دن کام نہ آئیں منکروں کو ان کے بہانے اور ان کو پھٹکار ہے اور ان کے واسطے برا گھر

خلاصہ تفسیر: (آگے اس دن کا بیان ہے یعنی) جس دن کہ ظالموں (یعنی کافروں) کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دے گی (یعنی اول تو وہ کوئی معقول معذرت نہ کر سکیں گے اور اگر حرکت مذبوحی کی طرح کچھ معذرت بھی کی تو وہ نافع نہ ہوگی) اور ان کے لئے لعنت ہوگی اور ان کے لئے اس عالم میں خرابی ہوگی (پس اس طرح آپ اور آپ کے متبعین بھی منصور ہوں گے اور مخالفین ذلیل و خوار ہوں گے تو آپ تسلی رکھئے)۔

* * *

فائدہ: یعنی ان کی کوئی مدد اور دستگیری نہ ہوگی، یہ مقبولین کے بالمقابل مطرودین کا انجام بیان فرما دیا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾

اور ہم نے دی موسیٰ کو راہ کی سوجھ اور وارث کیا بنی اسرائیل کو کتاب کا، سجھانے اور سمجھانے والی عقل مندوں کو ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور (آپ سے قبل) ہم موسیٰ (علیہ السلام) کو ہدایت نامہ (یعنی توریت) دے چکے ہیں اور (پھر) ہم نے وہ کتاب بنی اسرائیل کو پہنچائی تھی کہ وہ ہدایت اور نصیحت (کی کتاب) تھی، اہل عقل (سلیم) کے لئے (بخلاف بے عقلوں کے کہ وہ اس سے منتفع نہ ہوئے، پس موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ بھی صاحب رسالت اور صاحب وحی ہیں، اور بنی اسرائیل کی طرح آپ کے متبعین بھی آپ کی کتاب کی خدمت کریں گے، اور جیسے ان میں اہل عقل تصدیق اور اتباع کرنے والے تھے اور بے عقلوں نے انکار و مخالفت اختیار کی تھی اسی طرح آپ کی امت میں بھی دونوں طرح کے لوگ ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دنیا ہی میں دیکھ لو کہ فرعون اور اس کی قوم کو باوجود اس قدر طاقت و جبروت کے حق کی دشمنی نے کس طرح ہلاک و برباد کر کے چھوڑا اور موسیٰ علیہ السلا کی برکت و راہنمائی سے بنی اسرائیل کی مظلوم اور کمزور قوم کو کس طرح ابھارا اور اس عظیم الشان کتاب (تورات) کا وارث بنایا، جو دنیا کے عقلمندوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتی تھی۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾

سو تو ٹھہرا رہ بیشک وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے اور بخشوا اپنا گناہ اور پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں شام کو اور صبح کو

خلاصہ تفسیر: سو (اس سے بھی) آپ (تسلی حاصل کیجئے اور کفار کی ایذاؤں پر) صبر کیجئے بیشک اللہ کا وعدہ (جس کا پیچھے انا لننصر الخ میں ذکر ہوا ہے بالکل) سچا ہے اور (اگر کبھی کمال صبر میں کچھ کمی ہو جائے جو کہ شرعی قاعدہ کے موافق واقع میں تو گناہ نہیں، مگر آپ کے رتبہ عالی کے اعتبار سے وہ گناہ ہی کی طرح ہے، اس کا تدارک کیجئے وہ تدارک یہ ہے کہ) اپنے (اس) گناہ کی (جس کو مجازاً آپ کی شان عالی کے اعتبار سے

گناہ کہہ دیا گیا ہے) معافی مانگئے اور (ایسے کاموں میں مشغول رہیے کہ رنج دینے والی باتوں کی طرف التفات ہی نہ ہو، وہ شغل یہ ہے کہ) شام اور صبح (یعنی ہمیشہ اور پابندی سے) اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہیے۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ: اس میں صوفیاء کے اس مشہور قول کی تائید ملتی ہے جو وہ کہا کرتے ہیں: "حسنات الأبرار سيئات المقربين" یعنی عام مسلمانوں کی نیکیاں خاصانِ خدا کی تقصیرات ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی آپ بھی تسلی رکھیے، جو وعدہ آپ کے ساتھ ہے ضرور پورا ہو کر رہے گا، خداوند قدوس دارین میں آپ کو اور آپ کے طفیل میں آپ کے متبعین کو سر بلند رکھے گا، ضرورت اس کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے شدائد ومصائب پر صبر کریں اور جس سے جس درجہ کی تقصیر کا امکان ہو، اس کی معافی خدا سے چاہتے رہیں اور ہمیشہ رات دن صبح وشام اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کا قولاً وفعلاً ورد رکھیں، ظاہر و باطن میں اس کی یاد سے غافل نہ ہوں، پھر اللہ کی مدد یقینی ہے، یہ حضور ﷺ کو مخاطب بنا کر ساری امت کو سنایا، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ: "حضرت رسول اللہ ﷺ دن میں سو سو بار استغفار کرتے، ہر بندے کی تقصیر اس کے درجہ کے موافق ہے اسی لیے ہر کسی کو استغفار کرنا ضروری ہے"۔

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِيٓ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَٰنٍ أَتَىٰهُمْ ۙ إِن فِى صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا هُم

جو لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں بغیر کسی سند کے جو پہنچی ہو ان کو، اور کوئی بات نہیں ان کے دلوں میں غرور ہے کہ کبھی نہ

بِبَٰلِغِيهِ ۚ فَٱسْتَعِذْ بِٱللَّهِ ۖ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْبَصِيرُ ﴿٥٦﴾

پہنچیں گے اس تک ا سو تو پناہ مانگ اللہ کی بیشک وہ سنتا دیکھتا ہے ۲۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے آپ ﷺ کی تسلی کے متعلق مضمون تھا، اب انکار اور جھگڑا کرنے والوں کو دھمکی اور ان پر رد ہے، یعنی: جو لوگ بلا کسی سند کے جو ان کے پاس موجود ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑے نکالا کرتے ہیں (ان کو کسی وجہ سے اشتباہ نہیں ہے کہ وہ جھگڑا نکالنے کا سبب ہو، بلکہ) ان کے دلوں میں نری بڑائی (ہی بڑائی) ہے کہ وہ اس تک کبھی پہنچنے والے نہیں (اور وہی بڑائی جدال کا سبب ہے، کیونکہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں اس لیے اتباع سے عار آتا ہے، وہ خود اوروں ہی کو اپنا تابع بنانے کی ہوس رکھتے ہیں، لیکن ان کو یہ بڑائی نصیب نہ ہوگی بلکہ جلد ہی ذلیل و خوار ہوں گے، چنانچہ بدر وغیرہ میں مسلمانوں سے مغلوب ہوئے) سو (جب یہ خود بڑائی چاہتے ہیں تو آپ سے حسد وعداوت سب کچھ کریں گے لیکن) آپ (اندیشہ نہ کیجئے بلکہ ان کے شر سے) اللہ کی پناہ مانگتے رہیے، بیشک وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا (تو وہ اپنی صفت کمال کی وجہ سے اپنی پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو محفوظ رکھے گا)۔

* * *

فائدہ: ا یعنی جو لوگ اللہ کی دلائل توحید اور کتب سماویہ اور اس کے پیغمبروں کے معجزات وہدایات میں خواہ مخواہ جھگڑتے اور بے سند باتیں نکال کر حق کی آواز کو دبانا چاہتے ہیں ان کے ہاتھ میں کچھ حجت ودلیل نہیں، نہ فی الواقع ان کھلی ہوئی چیزوں میں شک وشبہ کا موقع ہے، صرف شیخی اور غرور مانع ہے کہ حق کے سامنے گردن جھکائیں اور پیغمبر کا اتباع کریں، وہ اپنے کو بہت اونچا کھینچتے ہیں، چاہتے یہ ہیں کہ پیغمبر سے اوپر ہو کر رہیں، یا کم از کم اس کے سامنے جھکنا نہ پڑے، لیکن یاد رکھیں کہ وہ اس مقصد کو کبھی نہیں پہنچ سکتے، پیغمبر کے سامنے سر اطاعت جھکانا پڑے گا، ورنہ سخت ذلیل و رسوا ہوں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کی پناہ مانگ کہ وہ ان مجادلین کے خیالات سے بچائے اور ان کے شر سے محفوظ رکھے۔

ربط: آگے بعض مسائل کی تحقیق ہے جن میں وہ لوگ جھگڑتے تھے، مثلاً بعث بعد الموت (موت کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا) کہ اس کو وہ محال سمجھتے تھے، یا توحید باری جس کا انکار کرتے تھے۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٧﴾

البتہ پیدا کرنا آسمانوں کا اور زمین کا بڑا ہے لوگوں کے بنانے سے لیکن بہت لوگ نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر: ان کا یہ جھگڑا تو آپ کو رسول ماننے میں تھا، اب قیامت کے متعلق ان کا جھگڑا مع رد مذکور ہے کہ یہ لوگ جو آدمیوں کے دوبارہ پیدا ہونے کے منکر ہیں بڑے کم عقل ہیں، اس واسطے کہ:

بالیقین آسمانوں اور زمین کا (ابتداً) پیدا کرنا آدمیوں کے (دوبارہ) پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے (تو جب بڑے کام پر قدرت ثابت ہوگئی تو چھوٹے پر بدرجہ اولیٰ ثابت ہے اور یہ دلیل ثبوت قدرت کے لئے کافی شافی ہے) لیکن اکثر آدمی (اتنی بات) نہیں سمجھتے (کیونکہ وہ غور ہی نہیں کرتے اور بعض ایسے بھی ہیں جو غور بھی کرتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی بظاہر مادی حیثیت سے آسمان و زمین کی عظمت و جسامت کے سامنے انسان کی کیا حقیقت ہے، لیکن مشرکین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا وہ ہی خداوند قدوس ہے، پھر جس نے اتنی بڑی مخلوقات کو پیدا کیا، اسے آدمیوں کا پہلی بار یا دوسری بار پیدا کر دینا کیا مشکل ہوگا، تعجب ہے کہ ایسی موٹی بات کو بہت لوگ نہیں سمجھتے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ

اور برابر نہیں اندھا اور آنکھوں والا، اور نہ ایمان دار اور جو بھلے کام کرتے ہیں اور نہ بدکار

قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٥٨﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٩﴾

تم بہت کم سوچ کرتے ہو، تحقیق قیامت آنی ہے اس میں دھوکا نہیں لیکن بہت لوگ نہیں مانتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے فرمایا تھا کہ "بہت لوگ نہیں سمجھتے" چنانچہ اسی سمجھنے اور ماننے میں فرق ہونے کی وجہ سے دو طرح کے لوگ ہوگئے، اس طرح قرآن کو سننے والوں کی بھی دو قسم ہوگئیں، ایک اس کو سمجھنے اور ماننے والے یہ صاحب بصیرت اور صاحب ایمان ہیں، دوسرے نہ سمجھنے اور نہ ماننے والے یہ مثل نابینا اور بدعمل کے ہیں، کیونکہ نہ سمجھنا اندھا پن ہے اور نہ ماننا بدعملی ہے۔

اور (ان دونوں قسموں کے آدمی یعنی ایک) بینا (دوسرا) نابینا اور (ایک) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور (دوسرے) بدکار باہم برابر نہیں ہوتے (اس مضمون میں آپ ﷺ کی تسلی بھی ہے کہ ہر قسم کے لوگ ہوا کرتے ہیں، سب کیسے سمجھنے لگیں اور منکرین پر عذاب قیامت کی وعید بھی ہے کہ ہم سب کو برابر نہ رکھیں گے، آگے منکرین کو یعنی ان لوگوں کو جو مثل نابینا کے اور بدعمل ہیں بطور التفات کے زجر ہے فرماتے ہیں کہ) تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو (ورنہ اندھے اور بدعمل نہ رہتے، قیامت کے متعلق جھگڑے کا جواب دے کر اب اس کے واقع ہونے کی خبر دیتے ہیں کہ) قیامت تو ضرور ہی آ کر رہے گی اس (کے آنے) میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں مگر اکثر لوگ (دلائل میں غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے اس کو) نہیں مانتے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایک اندھا جسے حق کا سیدھا راستہ نہیں سوجھتا، اور ایک آنکھوں والا جو نہایت بصیرت کے ساتھ صراط مستقیم کو دیکھتا اور سمجھتا ہے، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یا ایک نیکوکار مومن اور کافر بدکار کا انجام یکساں ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو ضرور ایک دن چاہیے جب ان کا باہمی فرق کھلے اور دونوں کے علم کے ثمرات اپنی اکمل ترین صورت میں ظاہر ہوں، مگر افسوس کہ تم اتنا بھی نہیں سوچتے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ

اور کہتا ہے تمہارا رب مجھ کو پکارو کہ پہنچوں تمہاری پکار کو ۱؎ بیشک جو لوگ تکبر کرتے ہیں میری بندگی سے

سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿٦٠﴾ ع

اب داخل ہوں گے دوزخ میں ذلیل ہوکر ۲؎

خلاصہ تفسیر: ان کا ایک جھگڑا توحید میں تھا کہ خدا کے ساتھ شریک کرتے تھے اب اس کے متعلق کلام ہے یعنی:

تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ (اپنی حاجات کے لیے غیروں کو مت پکارو بلکہ) مجھ کو پکارو میں (بجز اس درخواست کے جو کہ نامناسب ہو) تمہاری (ہر) درخواست قبول کروں گا (دعا کے متعلق آیت قرآنی: فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء کا یہی مطلب ہے کہ نامناسب درخواست و دعا کو رد کردیا جائے گا) جو لوگ (صرف) میری عبادت سے (جس میں مجھ سے دعا مانگنا بھی داخل ہے) سرتابی کرتے ہیں (اور غیروں کو پکارتے اور ان کی عبادت کرتے ہیں، حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ توحید سے اعراض کرکے شرک کرتے ہیں) وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ: اس میں عبدیت اور بندگی کی فضیلت ہے اور یہ بھی کہ دعا توکل و رضا کے خلاف نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی میری ہی بندگی کرو کہ اس کی جزاء دوں گا، مجھ ہی سے مانگو کہ تمہارا مانگنا خالی نہ جائے گا۔

فائدہ: ۲؎ بندگی کی شرط ہے اپنے رب سے مانگنا، نہ مانگنا غرور ہے، اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ بندوں کی پکار کو پہنچتا ہے، یہ بات تو بیشک برحق ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر بندے کی ہر دعا قبول کیا کرے، یعنی جو مانگے وہ ہی چیز دے دے، نہیں! اس کی اجابت کے بہت سے رنگ ہیں، جو احادیث میں بیان کردیے گئے ہیں، کوئی چیز دینا اس کی مشیت پر موقوف اور حکمت کے تابع ہے، کما قال فی موضع آخر: فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (الانعام: ۴۱) بہرحال بندہ کا کام ہے مانگنا اور یہ مانگنا خود ایک عبادت بلکہ مغز عبادت ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ

اللہ ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے رات کو کہ اس میں چین پکڑو اور دن بنایا دیکھنے کا ۱؎ اللہ تو فضل والا ہے لوگوں پر

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦١﴾

اور لیکن بہت لوگ حق نہیں مانتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا ذکر تھا، اب آگے بھی یہی مضمون ہے۔

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے (نفع کے) لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اسی نے دن کو (دیکھنے کے لئے) روشن بنایا (تاکہ اس میں بے تکلف معاش حاصل کرو) بیشک اللہ تعالیٰ کا لوگوں پر بڑا ہی فضل ہے (کہ ان کی مصلحتوں کی کیسی کیسی رعایت فرمائی) لیکن اکثر آدمی (ان نعمتوں کا) شکر نہیں کرتے (بلکہ الٹا شرک کرتے ہیں)۔

جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ: روح المعانی میں ہے کہ رات کے وقت ہر شخص کا سکون مختلف ہوا کرتا ہے، عوام کا سکون تو نفس و جسم کی راحت میں ہے، اور عبادت گذاروں کا سکون عبادت کی حلاوت و شیرینی ہوا کرتی ہے، اور اہل محبت و مغفرت کا سکون قلب کا ذوق و شوق ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ رات کی ٹھنڈ اور تاریکی میں عموماً لوگ سوتے اور آرام کرتے ہیں، جب دن ہوتا ہے تو تازہ دم ہو کر اس کے اجالے میں اپنے کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں، اس وقت دیکھنے بھالنے اور چلنے پھرنے کے لیے مصنوعی روشنیوں کی چنداں ضرورت نہیں پڑتی۔

فائدہ: ۲ یعنی منعم حقیقی کی حق شناسی یہ تھی کہ قول و فعل اور جان و دل سے اسکا شکر ادا کرتے جہت سے لوگ شکر کے بجائے شرک کرتے ہیں۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٦٢﴾

وہ اللہ ہے رب تمہارا ہر چیز بنانے والا، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، پھر کہاں سے پھرے جاتے ہو ۱

كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿٦٣﴾

اسی طرح پھرے جاتے ہیں جو لوگ کہ اللہ کی باتوں سے منکر ہوتے رہتے ہیں

خلاصہ تفسیر: یہ اللہ ہے تمہارا رب (جس کا ذکر ہوا، نہ وہ جن کو تم نے تراش رکھا ہے) وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو (توحید ثابت ہونے کے بعد) تم لوگ کہاں (شرک کر کے) الٹے چلے جا رہے ہو (اور الٹا چلنے میں کچھ ان ہی لوگوں کی تخصیص نہیں بلکہ جس طرح تعصب و عناد سے یہ الٹے چلے جا رہے ہیں) اسی طرح وہ (پہلے) لوگ بھی الٹے چلا کرتے تھے جو اللہ کی (تکوینی و تنزیلی) نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے۔

كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا: یہ مضمون ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک آیت میں ہے: تشابهت قلوبهم کہ ان سب کافروں کے دل (گمراہی میں) باہم ملتے جلتے ہیں، اس میں ایک گونہ حضور ﷺ کو تسلی بھی ہے کہ ہر زمانہ میں کفار کی یہی حالت رہی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی رات دن کی سب نعمتیں اس کی طرف سے مانتے ہو، تو بندگی بھی صرف اسی کی ہونی چاہیے، اس مقام پر پہنچ کر تم کہاں بھٹک جاتے ہو کہ مالک حقیقی تو کوئی ہو اور بندگی کسی کی کی جائے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ

اللہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو عمارت ۱ اور صورت بنائی تمہاری تو اچھی بنائیں صورتیں تمہاری

وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ښ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٤﴾

اور روزی دی تم کو ستھری چیزوں سے، وہ اللہ ہے رب تمہارا، سو بڑی برکت ہے اللہ کی جو رب ہے سارے جہان کا ۲

خلاصہ تفسیر: اللہ ہی ہے جس نے زمین کو (مخلوق کا) قرار گاہ بنایا اور آسمان کو (اوپر سے) چھت (کی طرح) بنایا، اور تمہارا نقشہ بنایا، سو عمدہ نقشہ بنایا (چنانچہ انسان کے اعضاء کے برابر کسی حیوان کے اعضاء میں تناسب نہیں اور یہ مشاہدہ و مسلم ہے) اور تم کو عمدہ عمدہ چیزیں کھانے کو دیں (پس) یہ اللہ ہے تمہارا رب سو بڑا عالی شان ہے اللہ جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قبہ کی طرح بنایا۔

فائدہ: ۲ سب جانوروں سے انسان کی صورت بہتر اور سب کی روزی سے اس کی روزی ستھری ہے۔

هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۵﴾

وہ ہے زندہ رہنے والا[1] کسی کی بندگی نہیں اسکے سوا، سو اسکو پکارو خالص کر کے اسکی بندگی، سب خوبی اللہ کو جو رب ہے سارے جہان کا[2]

خلاصہ تفسیر: وہی (ازلی ابدی) زندہ (رہنے والا) ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، سو تم (سب) خالص اعتقاد کر کے اس کو پکارا کرو (اور شرک نہ کیا کرو) تمام خوبیاں اسی اللہ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا۔

* * *

فائدہ: [1] جس پر کسی حیثیت سے کبھی فنا اور موت طاری نہیں ہوئی نہ ہو سکتی ہے، اور ظاہر ہے جب اس کی حیات ذاتی ہوئی، تو تمام لوازم حیات بھی ذاتی ہوں گے۔

فائدہ: [2] کمالات اور خوبیاں سب وجود حیات کے تابع ہیں، جو حی علی الاطلاق ہے وہ ہی عبادت کا مستحق اور تمام کمالات اور خوبیوں کا مالک ہوگا، اسی لیے ھو الحی کے بعد الحمد للہ رب العالمین فرمایا، جیسا کہ پہلی آیت میں نعمتوں کا ذکر کر کے فتبارك الله رب العالمین فرمایا تھا، بعض سلف سے منقول ہے کہ لا الہ الا الله کے بعد الحمد لله رب العالمین کہنا چاہیے، اس کا ماخذ یہ ہی آیت ہے۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ ز

تو کہہ مجھ کو منع کر دیا کہ پوجوں ان کو جن کو تم پکارتے ہو سوا اللہ کے جب پہنچ چکیں میرے پاس کھلی نشانیاں میرے رب سے

وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۶﴾

اور مجھ کو حکم ہوا کہ تابع رہوں جہان کے پروردگار کا

خلاصہ تفسیر: آپ (ان مشرکوں کو سنانے کے لئے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو اس سے ممانعت کر دی گئی ہے کہ میں ان (شرکاء) کی عبادت کروں جن کو خدا کے علاوہ تم پکارتے ہو جبکہ میرے پاس میرے رب کی نشانیاں آچکیں (مراد توحید کے نقلی وعقلی دلائل ہیں، مطلب یہ کہ شرک سے مجھے ممانعت ہوئی ہے) اور مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ میں (صرف) رب العالمین کے سامنے (عبادت میں) گردن جھکا لوں (مطلب یہ کہ مجھ کو توحید کا حکم ہوا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی کھلے کھلے نشانات دیکھنے کے بعد کیا حق ہے کہ کوئی آدمی خدائے واحد کے سامنے سر عبودیت نہ جھکائے اور خالص اسی کا تابع فرمان نہ ہو۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا

وہی ہے جس نے بنایا تم کو خاک سے[1] پھر پانی کی بوند سے پھر خون جمے ہوئے سے[2] پھر تم کو نکالتا ہے بچہ پھر جب تک کہ پہنچو

اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّی

اپنے پورے زور کو پھر جب تک کہ ہو جاؤ بوڑھے، اور کوئی تم میں ایسا ہے کہ مر جاتا ہے پہلے اس سے اور جب تک کہ پہنچو لکھے وعدے کو[3]

وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝۶۷

اور تا کہ تم سوچو۔

خلاصہ تفسیر: وہی ہے جس نے تم کو (یعنی تمہارے باپ کو) مٹی سے پیدا کیا، پھر (آگے ان کی نسل کو) نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے (جیسا کہ سورۃ حج میں بیان ہوا ہے) پھر تم کو بچہ کر کے (ماں کے پیٹ سے) نکالتا ہے، پھر (تم کو زندہ رکھتا ہے) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو، پھر (تم کو اور زندہ رکھتا ہے) تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ، اور کوئی کوئی تم میں سے (ان عمروں سے یعنی جوانی اور بڑھاپے سے) پہلے ہی مر جاتا ہے (یہ تو سب کا الگ الگ حال ہوا کہ کوئی جوان ہوا کوئی نہ ہوا، کوئی بوڑھا ہوا کوئی نہ ہوا) اور (یہ بات آئندہ سب میں مشترک ہے کہ تم میں سے ہر اک کو ایک خاص عمر دیتا ہے) تا کہ تم سب (اپنے اپنے) وقت مقرر (مقدر) تک پہنچ جاؤ (پس یہ امر کلی ہے اور جزئیات مختلفہ سب اسی کلی کے جزئی ہیں) اور (یہ سب کچھ اس لئے کیا) تا کہ تم لوگ (ان امور میں غور کر کے خدا تعالیٰ کی توحید کو) سمجھو۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی تمہارے باپ آدم کو، یا تم کو، اس طرح کہ نطفہ جس غذا کا خلاصہ ہے وہ خاک سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی بنی آدم کی اصل ایک پانی کی بوند (قطرہ منی) ہے جو آگے چل کر جما ہوا خون بنا دیا گیا۔

فائدہ: ۳ یعنی بچہ سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہوتا ہے۔ اور بعض آدمی جوانی یا بڑھاپے سے پہلے ہی گزر جاتے ہیں۔ بہر حال سب کو ایک معین میعاد اور لکھے ہوئے وعدے تک پہنچنا ہے۔ موت اور حشر سے کوئی مستثنیٰ نہیں:

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید　　　ز جام دہر مئے کل من علیہا فان

فائدہ: ۴ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی سوچو اتنے احوال (اور دور) تم پر گزرے، ممکن ہے ایک حال اور بھی گزرے، وہ مر کر جینا ہے''، آخر اسے کیوں محال سمجھتے ہو۔

هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝۶۸ ع ۸ / ۱۲

وہی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، پھر جب حکم کرے کسی کام کو تو یہی کہے اس کو کہ ہو جا وہ ہو جاتا ہے

خلاصہ تفسیر: وہی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، پھر جب وہ کسی کام کو (دفعتاً) پورا کرنا چاہتا ہے سو بس اس کی نسبت (اتنا) فرما دیتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے۔

كُنْ فَيَكُوْنُ: اس کی تحقیق پہلا پارہ سورہ بقرہ آیت ۱۱۷ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں، اور اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہر چیز کی تخلیق فوری کی جاتی ہے اور تدریجاً کوئی چیز پیدا نہیں کی جاتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا قادر ہے کہ اگر کسی چیز کو فوری اور دفعۃً پیدا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، پس تدریجاً پیدا کرنے پر تو بدرجہ اولیٰ قادر ہوگا، اس شبہ کا ایک اور جواب سورہ یاسین کے بالکل آخر آیت ۸۲ میں گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

* * *

فائدہ: یعنی اس کی قدرت کاملہ اور شان کن فیکون کے سامنے یہ کیا مشکل ہے کہ موت کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر دے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ۝۶۹ۚ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ

تو نے نہ دیکھا ان کو جو جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں کہاں سے پھیرے جاتے ہیں، وہ لوگ کہ جنہوں نے جھٹلایا اس کتاب کو

وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ

اور اس کو کہ بھیجا ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ، سو آخر جان لیں گے ۱ جب طوق پڑیں ان کی گردنوں میں اور زنجیریں بھی ۲

يُسْحَبُوْنَ ﴿۷۱﴾ فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾

گھسیٹے جائیں، جلتے پانی میں، پھر آگ میں ان کو جھونک دیں ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: انا لننصر رسلنا میں جس طرح کفار پر دھمکی اور رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی تھی اسی طرح اب آگے بھی یہی مضمون ہے مگر وہاں کفر کی سزا بطور اجمال مذکور تھی اور آگے کسی قدر تفصیل سے ہے، اور وہاں تسلی میں صرف موسیٰ علیہ السلام کا خاص طور پر ذکر تھا یہاں عام طور پر تمام رسولوں کا ذکر ہے۔

کیا آپ نے ان لوگوں (کی حالت) کو نہیں دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں (حق سے) کہاں پھرے چلے جا رہے ہیں، جن لوگوں نے اس کتاب (یعنی قرآن) کو جھٹلایا اور اس چیز کو بھی (جھٹلایا) جو ہم نے اپنے پیغمبروں کو دے کر بھیجا تھا (اس میں کتابیں اور احکام اور معجزات سب داخل ہوگئے کیونکہ مشرکین عرب اور کسی دوسرے پیغمبر کو بھی نہ مانتے تھے) سو ان کو ابھی (یعنی قیامت میں جو کہ قریب ہے) معلوم ہوا جاتا ہے جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور ان (طوقوں میں) زنجیریں (پروئی ہوئی ہوں گی، جن کا دوسرا سرا فرشتوں کے ہاتھ میں ہوگا اور ان زنجیروں سے) ان کو گھسیٹتے ہوئے کھولتے پانی میں پہنچائیں گے، پھر یہ آگ میں جھونک دیئے جائیں گے۔

كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ: اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ عذاب کا مدار ان دونوں کے جھٹلانے پر ہے، کیونکہ یقیناً ان میں سے کسی ایک کا جھٹلانا بھی دائمی عذاب کا سبب اور موجب ہے، بلکہ مقصود مشرکین کی حالت بیان کرنا ہے کہ وہ سب ہی کو جھٹلاتے ہیں۔

يُسْحَبُوْنَ فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ: یہاں اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف جہنم میں جھونکنے سے پہلے لے جایا جائے گا، اور ایک اور جگہ آیت: خذوہ فاعتلوہ الی سواء الجحیم ثم صبوا فوق راسہ من عذاب الحمیم سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم میں جھونکنے کے بعد کھولتے ہوئے پانی کا عذاب دیا جائے گا تو بات یہ ہے کہ ان دونوں میں کچھ تعارض نہیں، کیونکہ دوزخ میں قسم قسم کا عذاب ہوگا، کبھی دوزخ کی آگ کا، کبھی کھولتے ہوئے پانی کا، پس کبھی پانی کی طرف لائیں گے، اور کبھی آگ کی طرف تو عذاب کی ہر قسم ایک فرد کے اعتبار سے دوسری قسم سے مقدم بھی ہے اور دوسری فرد کے اعتبار سے مؤخر بھی ہے، اور دوزخ کبھی صرف آگ کو کہہ دیتے ہیں، کبھی آگ اور پانی کے مجموعہ کو کہہ دیتے ہیں، کیونکہ پانی کا کھولتا ہوا ہونا یہ بھی تو آگ ہی کے اثر سے ہے، پس پانی کی طرف جانا بھی دوزخ ہی میں جانا ہے، پس اس تقریر پر اگر پانی کو جہنم سے باہر بھی مانا جائے جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے تو یہ اشکال لازم نہ آئے گا کہ پانی پر جانے کے وقت کفار کا جہنم سے باہر نکلنا لازم آتا ہے، حالانکہ آیت: ماھم بخارجین من النار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہنم سے کبھی نہ نکلیں گے، کیونکہ ہم کہیں گے کہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف جانا یہ بھی جہنم ہی میں رہنا ہے، وہ بھی دوزخ ہی کا ایک عذاب ہے، اس تقریر پر تمام آیتیں جمع ہوگئیں، اور اس تقریر کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ھذہ جھنم التی یکذب بھا المجرمون یطوفون بینھا وبین حمیم اٰن یعنی یہ وہ جہنم ہے جس کو مجرم لوگ جھٹلاتے تھے، اب وہ اس کے اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان گھومتے رہیں گے، مفسر ابن کثیرؒ نے اس مقام پر لکھا ہے کہ وہ چہروں کے بل کبھی کھولتے ہوئے پانی کی طرف گھسیٹے جائیں گے، کبھی آگ کی طرف، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱ کہ اس تکذیب کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲ زنجیر کا ایک سرا طوق میں اٹکا ہوا اور دوسرا فرشتوں کے ہاتھ میں ہوگا، اس طرح مجرموں اور قیدیوں کی مانند لائے جائینگے۔

فائدہ: ۳ یعنی دوزخ میں کبھی جلتے پانی کا اور کبھی آگ کا عذاب دیا جائے گا۔ (اعاذنا اللہ منہما)

ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ

پھر ان کو کہیں کہاں گئے جن کو تم شریک بتلایا کرتے تھے، اللہ کے سوا ۱ بولیں وہ ہم سے چوک گئے ۲ کوئی نہیں ہم تو

نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾

پکارتے نہ تھے پہلے کسی چیز کو ۳ اسی طرح بچلاتا ہے اللہ منکروں کو ۴

خلاصہ تفسیر: پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ وہ (معبود) غیر اللہ کہاں گئے جن کو تم شریک (خدائی) ٹھہراتے تھے (یعنی اب وہ تمہاری مدد کیوں نہیں کرتے) وہ کہیں گے کہ وہ تو سب ہم سے غائب ہو گئے، بلکہ (سچ بات تو یہ ہے کہ) ہم اس کے قبل (دنیا میں جو بتوں کو پوجتے تھے تو اب معلوم ہوا کہ) کسی کو بھی نہیں پوجتے تھے (یعنی معلوم ہوا کہ وہ بے حقیقت اور لاشی محض تھے، کسی قابل بھی نہ تھے، آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:) اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کو غلطی میں پھنسائے رکھتا ہے (کہ جس چیز کے بے حقیقت اور غیر نافع ہونے کا وہاں خود اقرار کریں گے، آج یہاں ان کی عبادت میں مشغول ہیں)۔

قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا: ایسی بات غلطی ظاہر ہونے کے وقت کہی جاتی ہے، جیسے کسی شخص کو تجارت میں خسارہ ہو جائے اور اس سے کوئی پوچھے کہ تم کس مال کی تجارت کرتے ہو؟ اور وہ جھلا کر کہے کہ میں تو کسی مال کی بھی تجارت نہیں کرتا، یعنی جب اس سے فائدہ حاصل نہ ہو تو یوں سمجھنا چاہئے کہ میں کسی چیز کی بھی تجارت نہیں کرتا، گویا وہ عمل ہی نہ ہوا، اسی طرح کفار کہیں گے کہ جب ان معبودوں کی عبادت ہمارے کام نہ آئی تو یوں سمجھنا چاہیے کہ ہم کسی کو بھی نہ پوجتے تھے۔

اس پر ایک شبہ ہوتا ہے کہ دوسری آیتوں سے تو خود بتوں اور شیطانوں کا بھی دوزخ میں ہونا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: **انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم** پھر یہاں اس کے کیا معنی کہ وہ تو ہم سے غائب ہو گئے؟ جواب یہ ہے کہ یا تو اس وقت وہ مشرکین نظر سے پوشیدہ ہوں، یا مطلب یہ ہے کہ ان کی مدد ہم سے غائب ہو گئی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس وقت ان میں سے کوئی کام نہیں آتا، ہو سکے تو ان کو مدد کے لیے بلاؤ۔

فائدہ: ۲ یعنی ہم سے گئے گزرے ہوئے، شاید اس وقت عابدین اور معبودین الگ الگ کر دیے جائیں گے، یاضلوا عنا کا مطلب یہ ہو کہ گو موجود ہیں، مگر جب ان سے کوئی فائدہ نہیں تو ہوئے نہ ہوئے برابر ہیں۔

فائدہ: ۳ اکثر مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم جن کو دنیا میں پکارتے تھے، اب کھلا کہ وہ واقع میں کچھ چیز نہ تھے، گویا یہ بطور حسرت و افسوس کے اپنی غلطی کا اعتراف ہوگا، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ: ''مشرکین اول منکر ہو چکے تھے کہ ہم نے شریک ٹھہرائے ہی نہیں، اب گھبرا کر منہ سے نکل جائے گا ضلوا عنا، جس میں شریک ٹھہرانے کا اعتراف ہوگا، پھر کچھ سنبھل کر انکار کر دیں گے کہ ہم نے خدا کے سوا کسی کو پکارا ہی نہیں''۔

فائدہ: ۴ یعنی جس طرح یہاں انکار کرتے کرتے بچل گئے اور گھبرا کر اقرار کر لیا، یہ ہی حال ان کافروں کا دنیا میں تھا۔

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾

یہ بدلہ اس کا جو تم اتراتے پھرتے تھے زمین میں ناحق اور اس کا جو تم اکڑتے تھے ۱

اُدۡخُلُوۡۤا اَبۡوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ۚ فَبِئۡسَ مَثۡوَی الۡمُتَكَبِّرِیۡنَ ﴿۷۶﴾

داخل ہو جاؤ دروازوں میں دوزخ کے ۲؎ سدا رہنے کو اس میں، سو کیا برا ٹھکانا ہے غرور والوں کا

خلاصہ تفسیر: (ارشاد ہوگا کہ) یہ (سزا) اس کے بدلہ میں ہے کہ تم دنیا میں ناحق خوشیاں مناتے تھے اور اس کے بدلہ میں کہ تم اتراتے تھے (اور اس سے قبل ان کو حکم ہوگا کہ) جہنم کے دروازوں میں گھسو (اور) ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہو، سو متکبرین (عن آیات اللہ) کا وہ برا ٹھکانہ ہے۔

تَفۡرَحُوۡنَ - تَمۡرَحُوۡنَ: ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ "فرح" یعنی خوشی منانا دل کے متعلق ہے، اور "مرح" یعنی اترانا بدن کے متعلق ہے، حاصل یہ ہے کہ تم نے دنیاوی عیش کو اصل مقصود سمجھ کر اس کے حاصل کرنے میں کوشش کی اور اس پر دل میں ایسے خوش ہوتے تھے کہ خوشی کے آثار بدن پر بھی نمودار ہوتے تھے جیسے چال وغیرہ میں چنانچہ ارشاد ہے: **ولا تمش فی الارض مرحا۔**

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دیکھ لیا، ناحق کی شیخی اور غرور وتکبر کا انجام یہ ہوتا ہے اب وہ اکڑفوں کدھر گئی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہر قسم کے مجرم اس دروازے سے جو ان کے لیے تجویز شدہ ہے۔

فَاصۡبِرۡ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّكَ

سو تو ٹھہرا رہ بیشک وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے، پھر اگر ہم دکھلا دیں تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم ان سے کرتے ہیں یا قبض کر لیں تجھ کو

فَاِلَیۡنَا یُرۡجَعُوۡنَ ﴿۷۷﴾

ہر حالت میں ہماری ہی طرف پھر آئیں گے

خلاصہ تفسیر: (جب ان سے اس طرح انتقام لیا جائے گا) تو آپ (تھوڑا) صبر کیجئے بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے، پھر جس (عذاب) کا (مطلق طور پر) ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں (کہ کفر کا نتیجہ عذاب ہے) اس میں سے کچھ تھوڑا سا (عذاب) اگر ہم آپ کو دکھلا دیں (یعنی آپ کی زندگی میں ان پر وہ عذاب نازل ہو جائے) یا (اس عذاب کے نازل ہونے سے پہلے ہی) ہم آپ کو وفات دے دیں (پھر خواہ بعد میں عذاب نازل ہو یا نہ ہو) سو (دونوں احتمال ہیں، کوئی شق ضروری نہیں، لیکن ہر حال اور ہر احتمال پر) ہمارے ہی پاس ان کو آنا ہوگا (اور اس وقت یقیناً ان پر عذاب واقع ہوگا)۔

فَاِمَّا نُرِیَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُهُمۡ: خلاصہ یہ کہ ان سے مواخذہ ضرور ہوگا، خواہ آپ کی زندگی میں ہو جائے، یا آپ کے بعد ہو، یا دنیا میں نہ ہوا تو آخرت میں ضرور ہی ہوگا، یہاں یہ شبہ ہوگا کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ایسے رحیم و شفیق ہونے کے باوجود ان کے لیے عذاب چاہتے تھے، جواب یہ ہے کہ ان کے ایمان سے مایوس ہونے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے (جن کو ظالم کفار ستاتے تھے) کفار کے لیے عذاب کا چاہنا رحمت و شفقت کے خلاف نہیں، کیا ظالم کو اگر مظلوم کی ہمدردی میں سزا دی جائے تو کوئی اس کو رحمت و شفقت کے خلاف کہہ سکتا ہے، ہرگز نہیں اور اسی حکمت کے لیے جہاد بھی تو ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ نے ان کو عذاب دینے کا جو وعدہ فرمایا ہے، وہ یقیناً پورا ہو کر رہے گا، ممکن ہے کوئی وعدہ آپ کی موجودگی میں پورا ہو (جیسا کہ "بدر" اور "فتح مکہ" وغیرہ میں ہوا)، یا آپ ﷺ کی وفات کے بعد، بہرحال یہ ہم سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے، سب کا انجام ہمارے ہاتھ میں ہے،

اِس زندگی کے بعد عذاب کی تکمیل اُس زندگی میں ہوگی، چھٹکارا کسی صورت سے نہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ

اور ہم نے بھیجے ہیں بہت رسول تجھ سے پہلے بعضے ان میں وہ ہیں کہ سنایا ہم نے تجھ کو ان کا احوال اور بعضے ہیں کہ نہیں سنایا ۱ے

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ

اور کسی رسول کو مقدور نہ تھا کہ لے آتا کوئی نشانی مگر اللہ کے حکم سے ۲ے پھر جب آیا حکم اللہ کا فیصلہ ہو گیا انصاف سے اور ٹوٹے میں پڑے

هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾ ع

اس جگہ جھوٹے ۳ے

خلاصہ تفسیر: اور (اس بات کو یاد کر کے بھی تسلی حاصل کیجئے کہ) ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے (اجمالاً وتفصیلاً) بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور (اتنی بات سب میں مشترک ہے کہ) کسی رسول سے یہ نہ ہو سکا کہ کوئی معجزہ بدون اذن الٰہی کے ظاہر ہو سکے (اور امت کی ہر فرمائش پوری کر سکے، سو بعض لوگ اس لئے بھی رسولوں کی تکذیب کرتے رہے کہ رسول ان کی ہر فرمائش پوری نہ کرتے تھے، اسی طرح یہ لوگ آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ گزشتہ انبیاء کی حالت سے تسلی حاصل کیجیے اور صبر کیجئے) پھر جس وقت اللہ کا حکم (نزول عذاب کے لئے) آئے گا (خواہ دنیا میں یا آخرت میں جیسا کہ پیچھے گذرا: فاما نرينك بعض الذين نعدهم الخ) تو ٹھیک ٹھیک (عملی) فیصلہ ہو جائے گا اور اس وقت اہل باطل خسارہ میں رہ جائیں گے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ: جب انبیاء اپنی مرضی سے معجزات وتصرفات پر قادر نہیں تو پھر اولیاء اللہ بدرجہ اولی تصرفات پر قادر نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ے یعنی بعض کا تفصیلی حال تجھ سے بیان کیا بعض کا نہیں کیا (اور ممکن ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد ان کا بھی مفصل حال بیان کر دیا ہو) بہرحال جن کے نام معلوم ہیں، ان پر تفصیلاً اور جن کے نام وغیرہ معلوم نہیں ان پر اجمالاً ایمان لانا ضروری ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرۃ:۲۸۵)

فائدہ: ۲ے یعنی اللہ کے سامنے سب عاجز ہیں، رسولوں کو یہ بھی اختیار نہیں کہ جو معجزہ چاہیں دکھلا دیا کریں، صرف وہ ہی نشانات دکھلا سکتے ہیں جس کی اجازت حق تعالیٰ کی طرف سے ہو۔

فائدہ: ۳ے یعنی جس وقت اللہ کا حکم پہنچتا ہے رسولوں اور ان کی قوموں کے درمیان منصفانہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے، اس وقت رسول سرخرو اور کامیاب ہوتے ہیں اور باطل پرستوں کے حصہ میں ذلت وخسران کے سوا کچھ نہیں آتا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ

اللہ ہے جس نے بنا دیے تمہارے واسطے چوپائے تا کہ سواری کرو بعضوں پر اور بعضوں کو کھاتے ہو، اور ان میں تم کو بہت فائدے ہیں ۱ے

وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ

اور تا کہ پہنچو ان پر چڑھ کر کسی کام تک جو تمہارے جی میں ہو ۲ے اور ان پر اور کشتیوں پر لدے پھرتے ہو ۳ے اور دکھلاتا ہے تم کو اپنی نشانیاں

فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ۝۸۱

پھر کون کونسی نشانیوں کو اپنے رب کی نہ مانو گے ۴

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: الله الذی جعل لکم اللیل میں توحید کا مضمون تھا، اب توحید ہی کے مضمون پر سورت ختم کرتے ہیں، پھر اس کے انکار پر دھمکی دی ہے، اس کے بعد پہلی امتوں کا حال یاد دلا کر ڈراتے ہیں اور اسی سلسلہ میں عذاب کا معائنہ ہو جانے کے بعد شرک سے توبہ قبول نہ ہونے کا بیان ہے۔

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے مویشی بنائے تا کہ ان میں بعض سے سواری لو اور ان میں بعض (ایسے ہیں کہ ان کو) کھاتے بھی ہو اور تمہارے لئے ان میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں (کہ ان کے بال اور اون کام آتی ہے) اور (اس لئے بنائے) تا کہ تم ان پر (سوار ہو کر) اپنے مطلب تک پہنچو جو تمہارے دلوں میں ہے (جیسے کسی سے ملنے کے لئے جانا، تجارت کے لئے جانا وغیرہ وغیرہ) اور (سواری کے لیے کچھ ان جانوروں ہی کی تخصیص نہیں بلکہ) ان پر (بھی) اور کشتی پر (بھی) لدے لدے پھرتے ہو، اور (ان کے علاوہ) تم کو اپنی (قدرت کی) اور نشانیاں دکھلاتا رہتا ہے (چنانچہ ہر مخلوق خدا کی صنعت، قدرت اور صفت پر ایک نشان ہے) سو تم اللہ کی کون کون سی نشانوں کا انکار کرو گے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ: اس میں دلالت ہے کہ اسباب معیشت سے نفع اٹھانا سلوک وطریقت کے خلاف نہیں جیسا کہ بعض متشدد صوفیاء کا خیال ہے، اس میں ان جاہل صوفیاء کا رد ہے جو تجارت اور اسباب معیشت سے نفع اٹھانے کو طریق وسلوک کے خلاف سمجھتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ مثلاً ان کے چمڑے، بال اور اون وغیرہ سے طرح طرح کے فائدے اٹھاتے ہو۔

فائدہ: ۲ سواری کرنا بجائے خود ایک مقصد ہے اور سواری کے ذریعہ سے انسان بہت مقاصد دینی و دنیاوی حاصل کرتا ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی خشکی میں جانوروں کی پیٹھ پر اور دریا میں کشتیوں پر لدے پھرتے ہو۔

فائدہ: ۴ یعنی اس قدر کھلے نشان دیکھنے پر بھی آدمی کہاں تک انکار ہی کرتا چلا جائے گا (اور ابھی کیا معلوم اللہ اور کتنے نشان دکھلائے گا)۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ

کیا پھرے نہیں وہ ملک میں کہ دیکھ لیتے کیسا انجام ہوا ان سے پہلوں کا ،وہ تھے ان سے زیادہ

مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ۝۸۲

اور زور میں سخت اور نشانیوں میں جو چھوڑ گئے ہیں زمین پر، پھر کام نہ آیا ان کے جو وہ کماتے تھے

خلاصہ تفسیر: (اب فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو دلائل قائم ہونے کے بعد بھی توحید کے منکر ہیں تو کیا ان کو شرک کے وبال کی خبر نہیں اور:) کیا ان لوگوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو (مشرک) لوگ ان سے پہلے ہو کر گزرے ہیں (اس شرک کی بدولت) ان کا کیسا انجام ہوا (حالانکہ) وہ لوگ ان سے (عدد میں بھی) زیادہ تھے اور قوت اور نشانیوں میں (بھی) جو کہ زمین پر چھوڑ گئے ہیں (جیسے عمارتیں وغیرہ) بڑھے ہوئے تھے سو ان کی (یہ تمام تر) کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی (اور عذاب الہی سے نہ بچ سکے)۔

* * *

فائدہ: یعنی پہلے بہت قومیں گزر چکیں، جو جتھے میں اور زور وقوت میں ان سے بہت زیادہ تھیں، انہوں نے ان سے کہیں بڑھ کر زمین پر اپنی یادگاریں اور نشانیاں چھوڑیں، لیکن جب خدا کا عذاب آیا تو وہ زور وطاقت اور ساز وسامان کچھ بھی کام نہ آ سکا، یوں ہی تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔

فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا

پھر جب پہنچے ان کے پاس رسول ان کے کھلی نشانیاں لے کر اترانے لگے اس پر جو ان کے پاس تھی خبر اور الٹ پڑی ان پر وہ چیز

بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۸۳﴾

جس پر ٹھٹھا کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: غرض جب ان کے پیغمبران کے پاس کھلی دلیلیں لے کر آئے تو وہ لوگ اپنے (اس) علم (معاش) پر بڑے نازاں ہوئے جو ان کو حاصل تھا (یعنی دنیوی معاش کو مقصود سمجھ کر اور اس میں جو ان کو لیاقت اور سلیقہ حاصل تھا، اس پر خوش ہوئے اور آخرت کا انکار کر کے اس کی طلب کو دیوانگی ٹھہرایا اور اس کے انکار پر جب عذاب کی دھمکی دی گئی تو اس سے تمسخر کرنے لگے) اور (اس کے وبال میں) ان پر وہ عذاب آ پڑا جس کے ساتھ تمسخر کرتے تھے۔

فَرِحُوۡا بِمَا عِنۡدَهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ: اس آیت میں ایسے علم پر فخر کرنے کی مذمت ہے جو شریعت کے خلاف ہو، اور اسی کے تحت باطل تصوف بھی آجاتا ہے جو کم علموں میں رائج ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی وجوہ معاش اور مادی ترقیات کا جو علم ان کے پاس تھا اور جن غلط عقیدوں پر دل جمائے ہوئے تھے، اسی پر اتراتے رہے اور انبیاء (علیہم السلام) کے علوم و ہدایت کو حقیر سمجھ کر مذاق اڑاتے رہے، آخر ایک وقت آیا، جب ان کو اپنی ہنسی مذاق کی حقیقت کھلی، اور ان کا استہزاء و تمسخر خود ان ہی پر الٹ پڑا۔

فَلَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗ وَكَفَرۡنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشۡرِكِيۡنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمۡ يَكُ يَنۡفَعُهُمۡ

پھر جب انہوں نے دیکھ لیا ہماری آفت کو بولے ہم یقین لائے اللہ اکیلے پر اور ہم نے چھوڑ دیں وہ چیزیں جنکو شریک بتلاتے تھے ۱؎ پھر نہ ہوا کہ کام

اِيۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ قَدۡ خَلَتۡ فِىۡ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۸۵﴾ ع

آئے ان کو یقین لانا انکا جس وقت دیکھ چکے ہمارا عذاب ۲؎ رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آئی ہے اسکے بندوں میں اور خراب ہوئے اس جگہ منکر ۳؎

خلاصہ تفسیر: پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہنے لگے (اب) ہم خدائے واحد پر ایمان لائے اور ان سب چیزوں سے ہم منکر ہوئے جن کو ہم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، سو ان کا یہ ایمان لانا نافع نہ ہوا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا (کیونکہ وہ ایمان اضطراری یعنی مجبوری کی حالت میں تھا اور بندہ اختیاری ایمان کا مکلف ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی معمول مقرر کیا ہے جو اس کے بندوں میں پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے اور اس وقت (یعنی جبکہ ایمان نافع نہ ہوا) کافر خسارہ میں رہ گئے (پس ان مشرکین کو بھی یہ مضامین سمجھ کر ڈرنا چاہئے کہ ان کیلئے بھی یہی ہوگا، پھر کچھ تلافی نہ ہو سکے گی)۔

لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا: جب آخرت کا عذاب اور عذاب کے فرشتے نظر آجائیں پھر اس وقت ایمان قبول نہیں ہوتا، اس کو ''ایمان باس'' کہتے ہیں اور اس کی تحقیق سورہ نساء آیت ۱۷، ۱۸ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس وقت آفت آنکھوں کے سامنے آگئی اور عذاب الٰہی کا معائنہ ہونے لگا، تب ہوش آیا اور ایمان و توبہ کی سوجھی، اب پتہ

چلا کہ اکیلے خدائے بزرگ ہی سے کام چلتا ہے، جن ہستیوں کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھا سب عاجز اور بیکار ہیں، ہماری سخت حماقت اور گستاخی تھی کہ ان چیزوں کو تخت خدائی پر بٹھا دیا۔

فائدہ: ۲۔ یعنی اب پچھتانے اور تقصیر کا اعتراف کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، ایمان وتوبہ کا وقت گزر چکا، عذاب دیکھ لینے پر تو ہر کسی کو بے اختیار یقین آجاتا ہے، مگر یہ یقین موجب نجات نہیں، نہ اس یقین کی بدولت آیا ہوا عذاب ٹل سکتا ہے، قال تعالیٰ : ولیست التوبة للذین یعملون السیأات حتی اذا حضر احدھم الموت قال انی تبت الان ولا الذین یموتون وھم کفار (سورہ نساء) وقال فی قصة فرعون: آلئن وقد عصیت قبل و کنت من المفسدین ،وفی الحدیث :"ان اللہ تعالیٰ یقبل توبة العبد مالم یغرغر".

فائدہ: ۳۔ یعنی ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا رہا ہے کہ لوگ اول انکار واستہزاء سے پیش آتے ہیں، پھر جب عذاب میں پکڑے جاتے ہیں، اس وقت شور مچاتے اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہیں، اللہ کی عادت یہ ہے کہ اس بے وقت کی توبہ کو قبول نہیں فرماتا، آخر منکرین اپنے جرائم کی پاداش میں خراب وبرباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اللھم احفظنا من الخسران واحفظنا من غضبك وسخطك فی الدنیا والاخرة، آمین

ایاتها ٥٤ ۔ ٤١ سُوۡرَةُ حٰمٓ السَّجۡدَةِ مَكِّيَّةٌ ٦١ ۔ رکوعاتها ٦

خلاصہ تفسیر: یہ سورت کسی قدر تمہید کے بعض توحید کے مضمون سے شروع ہوئی ہے جس پر گزشتہ سورت ختم ہوئی تھی، اور توحید سے پہلے رسالت کا مضمون ہے جو اسی کی تمہید ہے، پھر توحید ورسالت کے انکار پر وعید اور دھمکی ہے، اور اسی کی مناسبت سے قیامت کے واقع ہونے کی تحقیق ہے اور مقابلہ کے طور پر چند جگہ اہل ایمان کے لیے بشارتیں بھی مذکور ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ① تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ② كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ③

حم، اتارا ہوا ہے بڑے مہربان رحم والے کی طرف سے ۱۔ ایک کتاب ہے کہ جدا جدا کی ہیں اسکی آیتیں ۲۔ قرآن عربی زبان کا ایک سمجھ والے لوگوں کو ۳۔

خلاصہ تفسیر: حٰمٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ کلام رحمن اور رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے، یہ (کلام) ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی (زبان میں) ہے (تاکہ جو براہ راست اس کے مخاطب ہیں، یعنی عرب لوگ وہ آسانی سے سمجھ لیں پھر دوسرے لوگ ان کے ذریعے سے سمجھ سکتے ہیں، اور) ایسے لوگوں کے لئے (نافع) ہے جو دانش مند ہیں (یعنی اگرچہ احکام کے مکلف اور مخاطب سبھی ہیں مگر ان سے نفع وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بہت ہی بڑی مہربانی اور رحمت بندوں پر ہے جو انکی ہدایت کیلئے ایسی عظیم الشان اور بے مثال کتاب نازل فرمائی۔

فائدہ: ۲۔ لفظی طور پر آیات کا جدا جدا ہونا تو ظاہر ہے، مگر معنوی حیثیت سے بھی سینکڑوں قسم کے علوم اور مضامین کی تفصیل الگ الگ آیات میں کی گئی ہے۔

فائدہ: ۳۔ یعنی قرآن کریم اعلیٰ درجہ کی صاف وشستہ عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے، جو اس کے مخاطبین اولین کی مادری زبان تھی، تاکہ ان لوگوں کو سمجھنے میں دقت نہ ہو، خود سمجھ کر دوسروں کو پوری طرح سمجھا سکیں، مگر اس کے باوجود بھی ظاہر ہے وہ ہی لوگ اس سے منتفع ہوسکتے ہیں جو سمجھ رکھتے

ہوں، ناسمجھ جاہل کو اس نعمت عظمیٰ کی کیا قدر ہو سکتی ہے۔

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ④

سنانے والا خوشخبری اور ڈرانے والا پر دھیان میں نہ لائے وہ بہت لوگ سو وہ نہیں سنتے ۲

خلاصہ تفسیر: (قرآن ایسے لوگوں کو) بشارت دینے والا ہے اور (نہ ماننے والوں کے لئے) ڈرانے والا ہے سو (قرآن کی صفات کمال کا تقاضا یہ تھا کہ سبھی اس پر ایمان لاتے مگر) اکثر لوگوں نے (اس سے) روگردانی کی پھر وہ سنتے ہی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قرآن اپنے ماننے والوں کو نجات و فلاح کی خوشخبری سناتا اور منکروں کو برے انجام سے ڈراتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی ان سب باتوں کے باوجود بھی تعجب ہے ان میں کے بہت لوگ اس کتاب کی بیش قیمت نصائح کی طرف دھیان نہیں کرتے اور جب ادھر دھیان ہی نہیں تو سننا کیوں چاہیں گے، فرض کیجیے کانوں سے سن بھی لیا، لیکن گوش دل سے نہ سنا اور قبول کرنے کی توفیق نہ ہوئی تو سنا ان سنا برابر ہے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ

اور کہتے ہیں ہمارے دل غلاف میں ہیں اس بات سے جس کی طرف تو ہم کو بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے اور ہمارے اور تیرے بیچ میں

حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ⑤

پردہ ہے سو تو اپنا کام کر ہم اپنا کام کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (جب آپ ان کو سناتے ہیں تو) وہ لوگ کہتے ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں ہمارے دل اس سے پردوں میں ہیں (یعنی آپ کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی) اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ (لگ رہی) ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب ہے سو آپ اپنا کام کئے جایئے ہم اپنا کام کر رہے ہیں (یعنی ہم سے قبول کی امید نہ رکھئے ہم اپنے طریقہ کار کو نہ چھوڑیں گے)۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے کفار کا یہ قول کہ "ہمارے دل پردوں میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگ رہی ہے" مذمت کے طور پر نقل فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ بات غلط اور جھوٹ تھی، حالانکہ بعض آیتوں میں حق تعالیٰ نے خود ان چیزوں کو کفار کے لیے ثابت کیا ہے: **وجعلنا علی قلوبھم اکنۃ ان یفقھوہ وفی اٰذانھم وقرا**، جواب یہ ہے کہ کفار کا مطلب ان باتوں سے یہ تھا کہ ہمارے اندر قرآن کے سننے اور سمجھنے کی مطلق استعداد نہیں، یعنی ہم تو مجبور اور معذور ہیں، لیکن ان کا یہ کہنا غلط ہے، جبکہ حق تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ ان لوگوں میں قریبی استعداد نہیں جس سے حق کو جلدی سمجھ لیں، اور اس کو اختیار کر لیں، اور یہ بات صحیح ہے، یعنی قرآن نے ان کو مجبور نہیں قرار دیا، بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ ان میں آیات الٰہیہ کو سننے اور سمجھنے کی پوری صلاحیت تھی، مگر جب انہوں نے کسی طرح ادھر کان بھی نہ لگائے اور سمجھنے کا ارادہ بھی نہ کیا تو سزا کے طور پر ان پر غفلت و جہالت مسلط کر دی گئی مگر وہ بھی اس درجہ میں نہیں کہ یہ لوگ مسلوب الاختیار ہو جائیں، بلکہ اب بھی ارادہ کر لیں تو پھر سننے اور سمجھنے کی صلاحیت عود کر آئے گی، دوسرا یہ کہ کفار کی غرض اس کلام سے یہ بتلانا تھا کہ ہم نے کفر پر جمے رہنے کا ارادہ کر لیا ہے اور یہ غرض یقیناً بری ہے اور اس اعتبار سے اس کا رد کیا گیا ہے، کیونکہ کسی کلام کا رد بھی صرف غرض کے اعتبار سے ہی ہوا کرتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی صرف اسی قدر نہیں کہ نصیحت کی طرف دھیان نہیں کرتے یا کان نہیں دھرتے، بلکہ ایسی باتیں کرتے ہیں جن کو سن کر ناصح

بالکلیہ مایوس ہوجائے اور آئندہ نصیحت سنانے کا ارادہ بھی ترک کردے، مثلاً کہتے ہیں ہمارے دلوں پر تو تمہاری باتوں کی طرف سے غلاف چڑھے ہوئے ہیں، اس لیے کوئی بات وہاں تک پہنچتی نہیں، اور جب تم بات کرتے ہو ہمارے کان اونچا سننے لگتے ہیں، ثقل سماع کی وجہ سے کچھ سنائی نہیں دیتا، اور ہمارے تمہارے درمیان ایسا پردہ ہے جو ایک کو دوسرے سے ملنے نہیں دیتا، دشمنی، اور عداوت کی جو دیواریں کھڑی ہیں وہ درمیان سے اٹھ جائیں اور جو خلیج حائل ہے وہ پُر ہو، تب ہم میں سے ایک دوسرے تک پہنچ سکے، لیکن ایسا ہونا ناممکن ہے، پھر تم کیوں اپنا مغز تھکاتے ہو، ہم کو ہمارے حال پر چھوڑ، تم اپنا کام کیے جاؤ، ہم اپنا کام کریں گے، اس کی توقع مت رکھو کہ ہم کبھی تمہاری نصیحتوں سے متاثر ہونے والے ہیں۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسۡتَقِيۡمُوۡۤا اِلَيۡهِ وَاسۡتَغۡفِرُوۡهُ ‌ؕ

تو کہہ میں بھی آدمی ہوں جیسے تم حکم آتا ہے مجھ کو کہ تم پر بندگی ایک حاکم کی ہے سو سیدھے رہو اس کی طرف اور اس سے گناہ بخشواؤ لے

وَوَيۡلٌ لِّلۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ‏ ﴿۶﴾ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ‏ ﴿۷﴾

اور خرابی ہے شریک کرنے والوں کو، جو نہیں دیتے زکوٰۃ اور وہ آخرت سے منکر ہیں ۲ے

خلاصہ تفسیر: آپ فرمادیجئے کہ (تمہیں ایمان پر مجبور کردینا تو میرے بس کی بات نہیں جو زبردستی قبول کراسکوں، کیونکہ) میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں (البتہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ امتیاز دیا ہے کہ) مجھ پر (وحی نازل ہوتی ہے اور وحی بھی ایسے مضامین کی ہے کہ ہر شخص غور کرے تو اس کا حق و معقول ہونا اس کی سمجھ میں آسکتا ہے، یعنی) یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے (یعنی میں صاحب وحی و نبوت ہوں، اور جب کہ میری نبوت اور وحی معجزات کے ذریعہ ثابت ہوچکی ہے جن میں سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، اور نبی ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر اس کی کوئی بات عقل سے بھی ثابت نہ ہو اس کو بھی ماننا چاہیے چہ جائیکہ مجھ پر جو وحی آتی ہے وہ عقلاً بھی قابل قبول ہے) سو (اس حالت میں تمہارے قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، ضرور قبول کرو اور) اس (معبود برحق) کی طرف سیدھ باندھ لو (یعنی اس کے سوا کسی اور کی عبادت کی طرف توجہ نہ کرو) اور (اب تک جو غیر اللہ کی عبادت کی ہے اس عبادت کی) اس سے معافی مانگو (یعنی توحید اختیار کرو اور گذشتہ کفر و شرک سے توبہ کرو) اور ایسے مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو (دلائل نبوت دیکھنے اور دلائل توحید کو سننے کے باوجود باطل طریقہ کو نہیں چھوڑتے اور) زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہی رہتے ہیں۔

وَوَيۡلٌ لِّلۡمُشۡرِكِيۡنَ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ: یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ کفار کو زکوۃ نہ دینے پر یہ وعید کیسی اور اس کے کیا معنی ہیں؟ کیونکہ وہ تو صرف ایمان کے مکلف ہیں اور کفر کی حالت میں وہ نماز زکوۃ وغیرہ کے مکلف نہیں ہیں؟ جواب یہ ہے کہ کفار کا زکوۃ نہ دینا چونکہ ایمان نہ لانے کی علامت ہے، اس لیے یہ عنوان اختیار کیا گیا، پس اصل مقصود کفر ہی پر مذمت اور وعید سنانا ہے اور ایمان نہ لانے کی اگرچہ اور بھی علامتیں ہیں مگر زکوۃ نہ دینے کو خاص طور پر شاید اس لیے ذکر فرمایا تا کہ معلوم ہوجائے کہ مال کی محبت ان لوگوں کو ایمان سے روک رہی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ زکوۃ تو مدینہ میں فرض ہوئی تھی، اور یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے تو یہاں زکوۃ سے کیا مراد ہے؟ جواب یہ ہے کہ زکوۃ کا لفظ مطلق نیک کام میں خرچ کرنے کے معنی میں پہلے سے بھی عرب میں مشہور تھا اور نیک کاموں میں خرچ کرنا بعض مواقع پر مکہ میں بھی واجب تھا، البتہ زکوۃ کی خاص مقدار اور خاص شرائط کے ساتھ فرضیت مدینہ میں ہوئی ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی نہ میں خدا ہوں کہ زبردستی تمہارے دلوں کو پھیر سکوں، نہ فرشتہ ہوں، جس کے بھیجے جانے کی تم فرمائش کیا کرتے ہو، نہ کوئی اور مخلوق ہوں، بلکہ تمہاری جنس و نوع کا ایک آدمی ہوں، جس کی بات کا سمجھنا تم کو ہم جنسی کی بناء پر آسان ہونا چاہیے، اور وہ آدمی ہوں جسے حق تعالیٰ نے اپنی آخری اور کامل ترین وحی کے لیے چن لیا ہے، بناءً علیہ خواہ تم کتنا ہی اعراض کرو اور کتنی ہی یاس انگیز باتیں کرو، میں خدائی پیغام تم کو ضرور پہنچاؤں گا

، مجھے بذریعہ وحی بتلایا گیا ہے کہ تم سب کا معبود اور حاکم علی الاطلاق ایک ہے جس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، لہذا سب کو لازم ہے کہ تمام شؤون واحوال میں سیدھے اسی خدائے واحد کی طرف رخ کر کے چلیں، اس کے راستہ سے ذرا ادھر ادھر نہ قدم نہ ہٹائیں اور پہلے اگر ٹیڑھے ترچھے چلے ہیں تو اپنے پروردگار سے اس کی معافی چاہیں اور اگلی پچھلی خطائیں بخشوائیں۔

فائدہ: ۲ جن لوگوں کا معاملہ اللہ کے ساتھ یہ ہے کہ عاجز مخلوق کو اس کی بندگی میں شریک کرتے ہیں، اور بندوں کے ساتھ یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کا پیسہ کسی محتاج مسکین پر خرچ کرنے کے روادار نہیں، ساتھ ہی انجام کی طرف سے بالکل غافل اور بے فکر ہیں، کیونکہ انہیں تسلیم ہی نہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی اور اچھے برے کا حساب کتاب بھی ہوگا، ایسوں کا مستقبل بجز ہلاکت اور خرابی و بربادی کے اور کیا ہونا ہے۔

تنبیہ: بعض سلف نے یہاں الزکوٰۃ سے مراد ''کلمہ طیبہ'' لیا ہے، اور بعض نے ''زکوٰۃ'' کے معنی ''پاکیزگی اور ستھرائی'' کے لیے ہیں، مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ اپنے نفس کو عقائد فاسدہ اور اخلاق ذمیمہ سے پاک وصاف نہیں کرتے، اس میں کلمہ طیبہ کا ترک اور زکوٰۃ وغیرہ کا ادا نہ کرنا بھی آگیا، وھذا کما قال: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ: ۱۴) وقال: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا (الشمس: ۹) وقال: وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً (مریم: ۱۳) وغیرہ ذالک، شاید یہ معنی اس لیے یہاں لیے گئے ہوں کہ: ① کفار مخاطب بالفروع نہیں ② یا اس لیے کہ آیت مکی ہے اور زکوٰۃ وغیرہ کی تشخیص مدینہ میں ہوئی، واللہ اعلم۔

ع ۱۵

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸

البتہ جو لوگ یقین لائے اور کیے بھلے کام ان کو ثواب ملنا ہے جو موقوف نہ ہو

خلاصہ تفسیر: (ان کفار ومشرکین کے برخلاف) جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے (آخرت میں) ایسا اجر ہے جو (کبھی) موقوف ہونے والا نہیں۔

روح المعانی میں سدیؒ سے منقول ہے کہ یہ آیت ان بوڑھوں اور مریضوں کے حق میں نازل ہوئی جو مرض یا کمزوری کی وجہ سے عبادات کی کثرت نہیں کر پاتے، ایسے لوگوں کو خوش خبری ہے کہ ان کو وہی ثواب دیا جائے گا جو صحت وقوت کی حالت میں عمل کرنے سے ملا کرتا تھا، اور مشائخ اسی سے سالکین کو تسلی دیتے ہیں کہ جب انہیں کوئی ایسا عذر پیش آجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ پورا عمل نہیں کر سکتے۔

* * *

فائدہ: یعنی کبھی منقطع نہ ہوگا، ابد الآباد تک جاری رہے گا، جنت میں پہنچ کر نہ ان کو فنا، نہ ان کے ثواب کو۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ

تو کہہ کیا تم منکر ہو اس سے جس نے بنائی زمین دو دن میں اور برابر کرتے ہو اس کے ساتھ اوروں کو

ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۹

وہ ہے رب جہان کا

خلاصہ تفسیر: پیچھے تمہید کے طور پر رسالت کا مضمون تھا، اب آگے توحید کا مضمون ہے۔

آپ (ان لوگوں سے) فرمائیے کہ کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو (باوجود اس کی بڑی وسعت کے) دو روز (کی مقدار وقت) میں پیدا کر دیا اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو یہی (خدا جس کی قدرت ابھی معلوم ہوئی) سارے جہاں کا رب ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ رب العالمین کی وحدانیت اور صفات کمالیہ کا انکار کرتے اور دوسری چیزوں کو اس کے برابر سمجھتے ہو جو ایک ذرہ کا اختیار نہیں رکھتیں۔

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَآ اَقْوَاتَهَا فِيٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ

اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ اوپر سے اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی ۱ چار دن میں

سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ⑩

پورا ہوا پوچھنے والوں کو۲

خلاصہ تفسیر: اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنا دیئے اور اس (زمین) میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں (جیسے نباتات وحیوانات وغیرہ) اور اس (زمین) میں اس کے رہنے والوں کی غذائیں تجویز کر دیں (جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ زمین کے ہر حصہ میں رہنے والوں کے لیے ان کے مناسب الگ الگ غذائیں ہیں، یعنی زمین میں ہر قسم کے غلے میوے پیدا کر دیئے کہیں کچھ کہیں کچھ جن کا سلسلہ برابر جاری ہے، یہ سب) چار دن میں (ہوا، دو دن میں زمین، دو دن میں پہاڑ وغیرہ جو شمار میں) پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے (یعنی ان لوگوں کے لئے جو تخلیق کائنات کی کیفیت اور کمیت کے متعلق آپ سے سوالات کرتے ہیں جیسا کہ یہود نے آپ ﷺ سے آسمان وزمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا تھا)۔

فِيٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ: یعنی زمین کا اور اس کی سب چیزوں کا چار دن میں پیدا ہونا ان کے ذہن میں جلدی آسکتا ہے بہ نسبت آسمان کے دو دن میں بننے کے، کیونکہ وہاں مدت کم ہے اور کم مدت میں زمین سے بڑی چیز بنائی گئی اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین کو دو دن میں پیدا کرنے کے بعد اس کے علاوہ چار دن میں پہاڑ وغیرہ پیدا کیے، کیونکہ اس طرح مجموعہ آٹھ دن ہو جائیں گے، حالانکہ تمام آسمان وزمین کا چھ دن میں بنانا چند جگہ صراحۃً مذکور ہوا ہے، بلکہ یہ چار دن پہلے دو دنوں کو ملا کر ہیں، اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے محاورات میں بولا جاتا ہے کہ دو سال میں تو اس لڑکے کا دودھ چھڑایا اور چار سال میں مکتب میں بٹھایا، ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ان دو سال کے علاوہ چار سال ہیں۔

سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ: یہ جو فرمایا کہ "چار دن شمار میں پورے ہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ جن دو دنوں میں آسمان بنایا گیا ہے وہ دو روز پورے نہیں تھے، بلکہ ان کی اخیر ساعت میں عصر کے بعد آدم علیہ السلام بنائے گئے اس لیے یہاں فرمادیا کہ یہ چار دن پورے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ "اور برکت رکھی اس کے اندر" یعنی قسم قسم کی کانیں، درخت، میوے، پھل، غلے اور حیوانات زمین سے نکلتے ہیں۔

اور "ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی" یعنی زمین پر بسنے والوں کی خوراکیں ایک خاص اندازہ اور حکمت سے زمین کے اندر رکھ دیں، چنانچہ ہر اقلیم اور ہر ملک میں وہاں کے باشندوں کی طبائع اور ضروریات کے موافق خوراکیں مہیا کر دی گئی ہیں۔

فائدہ: ۲ یہ سب کام چار دن میں ہوا، دو روز میں زمین پیدا کی گئی اور دو روز میں اس کے متعلقات کا بندوبست ہوا، جو پوچھے یا پوچھنے کا ارادہ رکھتا ہے اسے بتلا دو کہ یہ سب مل کر چار دن ہوئے، بدون کسر اور کمی بیشی کے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یعنی پوچھنے والوں کا جواب پورا ہوا"۔

تنبیہ: یہاں دنوں سے مراد ظاہر ہے معروف ومتبادر دن نہیں ہو سکتے، کیونکہ زمین اور سورج وغیرہ کی پیدائش سے قبل ان کا وجود متصور ہی نہیں، لامحالہ: ① ان دنوں کی مقدار مراد ہوگی ② یا وہ دن مراد ہو جس کی نسبت فرمایا ہے: وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (الحج: ۴۷)

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ

پھر چڑھا آسمان کو اور وہ دھواں ہو رہا تھا ۱؎ پھر کہا اس کو اور زمین کو آؤ تم دونوں خوشی سے یا زور سے

قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ⑪

وہ بولے ہم آئے خوشی سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پھر (یہ سب کچھ پیدا کر کے) آسمان (کے بنانے) کی طرف توجہ فرمائی اور وہ اس وقت دھواں سا تھا (یعنی آسمان کا مادہ دھویں کی شکل میں تھا، اور آسمان کا مادہ زمین کے مادہ کے بعد زمین کی موجودہ صورت سے پہلے بن چکا تھا) سو اس سے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں (کو ہماری اطاعت کی طرف آنا تو ضرور پڑے گا، اب تم کو اختیار ہے کہ) خوشی سے آؤ یا زبردستی سے دونوں نے عرض کیا کہ ہم خوشی سے (ان احکام کے لئے) حاضر ہیں۔

ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا: مطلب یہ ہے کہ ہمارے تقدیری احکام جو تم دونوں میں جاری ہوا کریں گے ان کا جاری و نافذ ہونا تو تمہارے اختیار سے خارج ہے وہ تو ہو کر رہیں گے، لیکن جو ادراک و شعور تم کو عطا ہوا ہے اس کے اعتبار سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ہمارے تقدیری احکام کو اپنی خوشی سے قبول کرو یا ان سے دل میں ناراض ہو اور وہ زبردستی تمہارے اندر نافذ کئے جائیں، جیسے انسان کے لئے امراض اور موت کا معاملہ ہے کہ ان کا ہونا تو تقدیری بات ہے جس کو انسان ٹال نہیں سکتا، مگر کوئی عقل منداس کو راضی خوشی قبول کرتا ہے اور صبر وشکر کے فوائد حاصل کرتا ہے، کوئی ناراض و ناخوش رہتا ہے، گھٹ گھٹ کر مرتا ہے، تو اب تم دیکھ لو کہ ہمارے ان احکام پر راضی رہا کرو گے یا کراہت رکھو گے، اور ان تقدیری احکام سے مراد جو آسمان وزمین میں جاری ہونے والے تھے یہ ہیں کہ آسمان ابھی صرف مادہ دھوئیں کی شکل میں تھا، اس کا سات آسمانوں کی صورت میں بننا حکم تقدیری تھا اور زمین اگرچہ بن چکی تھی مگر اس میں بھی ہزاروں انقلابات وتغیرات قیامت تک چلنے والے تھے۔

قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جمادات میں بھی ادراک وشعور پایا جاتا ہے، اور جمادات میں ادراک وشعور پائے جانے کے متعلق سورہ بنی اسرائیل آیت ۴۴ میں تحقیق گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا، جو اس وقت سارا ایک تھا، دھوئیں کی طرح اس کو بانٹ کر سات آسمان کیے، جیسا کہ آگے آتا ہے

تنبیہ: ممکن ہے دخان سے آسمانوں کے مادہ کی طرف اشارہ ہو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ارادہ کیا کہ ان دونوں (آسمان وزمین) کے ملاپ سے دنیا بسائے، خواہ اپنی طبیعت سے ملیں یا زور سے ملیں، (بہر حال دونوں کو ملا کر ایک نظام بنایا تھا) وہ دونوں آ ملے اپنی طبیعت سے آسمان سے سورج کی شعاع آئی، گرمی پڑی، ہوائیں اٹھیں، ان سے گرد اور بھاپ اوپر چڑھی، پھر پانی ہو کر مینہ برسا، جس کی بدولت زمین سے طرح طرح کی چیزیں پیدا ہوئیں۔

اور پہلے جو فرمایا تھا کہ: ''زمین میں اس کی خوراکیں رکھیں''، یعنی اس میں قابلیت ان چیزوں کے نکلنے کی رکھ دی تھی، واللہ اعلم۔

فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا

پھر کر دیے وہ سات آسمان دو دن میں ۱؎ اور اتارا ہر آسمان میں حکم اس کا ۲؎ اور رونق دی ہم نے سب سے ورلے آسمان کو

بِمَصَابِيۡحَ ۖ وَحِفۡظًا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ﴿۱۲﴾

چراغوں سے، اور محفوظ کر دیا یہ سادھا ہوا ہے زبردست خبردار کا ۳

خلاصہ تفسیر: سو دو روز میں اس کے سات آسمان بنا دیئے اور (چونکہ ساتوں آسمانوں کو فرشتوں سے آباد کر دیا گیا تھا اس لئے) ہر آسمان میں اس کے مناسب اپنا حکم (فرشتوں کو) بھیج دیا (یعنی جن فرشتوں سے جو کام لینا تھا وہ ان کو بتلا دیا) اور ہم نے اس قریب والے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور (شیاطین کو آسمانی خبریں چوری کرنے سے روکنے کے لئے) اس کی حفاظت کی (جب یہ قریب والا آسمان شیطان سے محفوظ ہے تو دوسرے آسمان بدرجہ اولیٰ محفوظ ہیں) یہ تجویز ہے (خدائے) زبردست عالم الکل کی طرف سے (پس عبادت کے لائق یہ ذات ہے جو کہ صفات میں کمال سے موصوف ہے، یا وہ چیزیں جو ذات وصفات دونوں میں ناقص ہیں؟!!)۔

آسمان وزمین کی پیدائش کی ترتیب اور اس میں ظاہری تعارض کے متعلق کچھ مضمون سورہ بقرہ آیت ۲۹ میں گذر چکا ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

آسمان دنیا کی تزئین کے متعلق کچھ تحقیق سورہ صافات آیت ۶، ۷ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

آسمانی خبروں کی حفاظت سے متعلق تحقیق سورہ حجر آیت ۱۷، ۱۸ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی چار دن وہ تھے اور دو دن میں آسمان بنائے، کل چھ دن ہو گئے، جیسا کہ دوسری جگہ **ستة ایام** کی تصریح ہے۔

تنبیہ: جن احادیث مرفوعہ میں تخلیق کائنات کے متعلق دونوں کی تعیین وترتیب آئی ہے کہ فلاں فلاں چیز اللہ نے ہفتہ کے فلاں فلاں دن میں پیدا کی، ان میں کوئی حدیث صحیح اب تک نظر سے نہیں گزری، حتیٰ کہ ابوہریرہؓ کی حدیث کے متعلق جو صحیح مسلم میں ہے ابن کثیرؒ لکھتے ہیں: "وھو من غرائب الصحیح وقد علله البخاری فی التاریخ فقال رواه بعضهم عن ابی هریرة عن کعب الاحبار وهو الاصح"۔ اور روح المعانی میں "فقال شافعی" سے نقل کیا ہے: "تفرد به مسلم و قد تکلم علیه الحفاظ علی ابن المدینی والبخاری وغیرهما وجعلوه من کلام کعب وان اباهریرة انما سمعه منه ولکن اشتبه علی بعض الرواة فجعله مرفوعًا"۔

باقی قرآن کریم کی اس آیت اور سورہ بقرہ کی آیت: ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰٮهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ سے جو ظاہر ہوتا ہے کہ سات آسمان زمین کی پیدائش کے بعد بنائے گئے اور سورہ نازعات میں: وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰٮهَا (النازعات: ۳۰) سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین آسمان کے بعد بچھائی گئی، اس کے جواب کئی طرح دیے گئے ہیں۔

احقر کو ابوحیانؒ کی تقریر پسند ہے، یعنی ضروری نہیں کہ پہلی آیت میں ثمّ اور دوسری میں بعد ذلك تراخی زمان کے لیے ہو، ممکن ہے ان الفاظ سے "تراخی فی الاخبار" یا "تراخی رتبی" مراد لیں، جیسے: ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ میں، یا دوسری جگہ: عُتُلٍّۢ بَعۡدَ ذٰلِكَ زَنِيۡمٍ میں یہ ہی معنی مراد لیے گئے ہیں، بہرحال قرآن کریم میں ترتیب زمانی کی تصریح نہیں، ہاں! نعمت کے تذکرہ میں زمین کا اور عظمت وقدرت کے تذکرہ میں آسمان کا ذکر مقدم رکھا ہے، جس کا نکتہ ادنیٰ تامل وتدبر سے معلوم ہو سکتا ہے، تفصیل کا یہاں موقع نہیں، یہ چند الفاظ اہل علم کی تنبیہ کے لیے لکھ دیے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی جو حکم جس آسمان کے مناسب تھا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یہ رب کو معلوم ہے کہ وہاں کون مخلوق بستی ہے اور ان کا کیا اسلوب (اور رنگ ڈھنگ) ہے، اتنی زمین میں ہزاروں ہزار کارخانے ہیں تو اتنے بڑے آسمان کب خالی پڑے ہوں گے"۔

فائدہ: ۳ یعنی دیکھنے میں معلوم ہوتا ہے کہ گویا سب ستارے اسی آسمان میں جڑے ہوئے ہیں، رات کو ان قدرتی چراغوں سے آسمان کیسا پر رونق معلوم ہوتا ہے، پھر محفوظ کتنا کر دیا ہے کہ کسی کی وہاں تک دسترس نہیں، فرشتوں کے زبردست پہرے لگے ہوئے ہیں، کوئی طاقت اس نظام

محکم میں رخنہ اندازی نہیں کرسکتی کیونکہ وہ سب سے بڑی زبردست اور باخبر ہستی کا قائم کیا ہوا ہے۔

فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَقُلۡ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوۡدَ ﴿۱۳﴾

پھر اگر وہ ٹلائیں تو تو کہہ میں نے خبر سنادی تم کو ایک سخت عذاب کی جیسے عذاب آیا عاد اور ثمود پر

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کو ثابت اور شرک کو باطل کیا تھا، اب منکرین توحید کو دنیوی عذاب کی دھمکی اور اخروی عذاب کی وعید سناتے ہیں اور ایک قصہ کے ضمن میں رسالت کے انکار پر بھی ملامت ہے۔

پھر (دلائل توحید سن کر بھی) اگر یہ لوگ (توحید سے) اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد وثمود پر (شرک وکفر کی وجہ سے) آفت آئی تھی (مراد عذاب سے ہلاک کرنا ہے جیسا کہ قریش مکہ کے سردار غزوہ بدر میں ہلاک اور قید کئے گئے)۔

مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوۡدَ: یہاں عاد وثمود کو بطور خاص اس لیے ذکر فرمایا کہ یمن اور شام کے سفر میں اہل عرب ان کے مساکن پر گزرتے تھے اور ان قوموں کو یہ لوگ جانتے بھی خوب تھے۔

* * *

فائدہ: یعنی کفار مکہ اگر ایسی عظیم الشان آیات سننے کے بعد بھی نصیحت قبول کرنے اور توحید واسلام کی راہ اختیار کرنے سے اعراض کرتے رہیں تو فرمادیجئے کہ میں تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ تمہارا انجام بھی "عاد" و "ثمود" وغیرہ اقوام معذبین کی طرح ہوسکتا ہے۔

اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوۡا لَوۡ

جب آئے ان کے پاس رسول آگے سے اور پیچھے سے کہ نہ پوجو کسی کو سوائے اللہ کے، کہنے لگے اگر

شَآءَ رَبُّنَا لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۴﴾

ہمارا رب چاہتا تو بھیجتا (اتارتا) فرشتے سو ہم تمہارا لایا ہوا (تمہارے ہاتھ بھیجا ہوا) نہیں مانتے

خلاصہ تفسیر: (اور یہ عاد وثمود کا قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ ان کے پاس ان کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی پیغمبر آئے (یعنی جو پیغمبران کی طرف بھیجے گئے اور انہیں سمجھانے میں جان توڑ کوشش کی، اور ان پیغمبروں نے یہی کہا کہ) بجز اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کرو، انہوں نے جواب دیا کہ (تم جو کہتے ہو کہ خدا نے ہم کو پیغمبر بنا کر اس لیے بھیجا ہے تاکہ توحید کی دعوت دیں خود یہی غلط ہے، کیونکہ) اگر ہمارے پروردگار کو (یہ) منظور ہوتا (کہ کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجے) تو فرشتوں کو بھیجتا اس لئے ہم اس (توحید) سے بھی منکر ہیں جس کو دے کر (تمہارے دعویٰ کے مطابق) تم (پیغمبری کے طور پر) بھیجے گئے ہو۔

اِذۡ جَآءَتۡهُمُ الرُّسُلُ: یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ مشہور تو یہ ہے کہ قوم عاد میں ہود علیہ السلام اور ثمود میں صالح علیہ السلام آئے تھے جبکہ یہاں آیت میں جمع کا صیغہ لایا گیا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان دو کے سوا ان میں اور بھی پیغمبر آئے تھے، جواب یہ ہے کہ ممکن ہے اور بھی کوئی رسول آئے ہوں اور وہ ان انبیاء میں داخل ہوں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہوا، یا ہود اور صالح علیہما السلام ہی کو تعظیم کے طور پر جمع کے صیغہ سے بیان فرمادیا ہو کہ ہر ایک نے گویا کئی کئی رسولوں کا کام کیا، یا یہ مطلب ہو کہ ان دونوں کے ذریعہ سے رسولوں کی خبر اور سب کا توحید میں متفق ہونا ان لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا۔

مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ: یعنی جو پیغمبران کی طرف مبعوث ہوئے تھے انہوں نے بڑی کوشش سے بار بار سمجھایا، جیسے کوئی شخص اپنے کسی عزیز کو کسی مصیبت وہلاکت کی طرف جاتا دیکھے تو وہ کبھی آگے سے آکر اسے روکتا ہے، کبھی پیچھے سے پکڑتا ہے، اور اس کی مثال قرآن میں ابلیس

کا یہ قول ہے کہ اس نے کہا تھا: لاٰتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم یعنی میں بنی آدم کو گمراہ کرنے ان کے آگے سے بھی آؤں گا ان کے پیچھے سے بھی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہر طرف سے، شاید بہت رسول آئے ہوں گے، مگر مشہور یہ ہی دو رسول ہیں: ① حضرت ہود اور ② حضرت صالح علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام، اور یاٰمِنۡ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ سے مراد یہ ہو کہ ان کو ماضی اور مستقبل کی باتیں سمجھاتے ہوئے آئے، کوئی جہت اور کوئی پہلو نصیحت وفہمائش کا نہیں چھوڑا۔

فائدہ: ۲ یعنی خدا کا رسول بشر کیسے ہو سکتا ہے، اگر اللہ کو واقعی رسول بھیجنا ہے تو آسمان سے کسی فرشتہ کو بھیجتا، بہر حال تم اپنے زعم کے موافق جو باتیں خدا کی طرف سے لائے ہو، ہم ان کے ماننے کے لیے تیار نہیں۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ وَقَالُوۡا مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ

جو عاد تھے وہ تو غرور کرنے لگے ملک میں ناحق اور کہنے لگے کون ہے ہم سے زیادہ زور میں ۱ کیا دیکھتے نہیں کہ اللہ

الَّذِىۡ خَلَقَهُمۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً ؕ وَكَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ ⑮

جس نے ان کو بنایا وہ زیادہ ہے ان سے زور میں، اور تھے ہماری نشانیوں سے منکر ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے سب کا مشترک قول بیان فرما کر اب آگے ہر قوم کے حال کی الگ الگ تفصیل ہے۔

پھر وہ جو عاد کے لوگ تھے وہ دنیا میں ناحق تکبر کرنے لگے اور (جب عذاب کی وعید سنی تو) کہنے لگے وہ کون ہے جو قوت میں ہم سے زیادہ ہے (کہ وہ ہمیں ایسے عذاب میں مبتلا کر سکے اور ہم اس کے دفع کرنے پر قادر نہ ہوں، آگے جواب ہے کہ) کیا ان لوگوں کو یہ نظر نہ آیا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا ہے وہ قوت میں ان سے بہت زیادہ ہے (اور وہ عذاب واقع کر سکتا ہے، مگر اس کے باوجود بھی وہ ایمان نہ لائے) اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے۔

* * *

فائدہ: ۱ شاید رسولوں نے جو عذاب کی دھمکی دی ہوگی، اس کے جواب میں یہ کہا ہو کہ ہم سے زیادہ زور آور کون ہے جس سے ہم خوف کھائیں؟ کیا ہم جیسے طاقتور انسانوں پر تم اپنا رعب جما سکتے ہو؟ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ان کے جسم بہت بڑے بڑے ہوتے تھے، بدن کی قوت پر غرور آیا، غرور کا دم بھرنا اللہ کے ہاں وبال لاتا ہے''۔

فائدہ: ۲ یعنی دل میں ان کا حق ہونا سمجھتے تھے، مگر ضد اور عناد سے انکار کرتے چلے جاتے تھے۔

فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيۡقَهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡىِ فِى الۡحَيٰوةِ

پھر بھیجی ہم نے ان پر ہوا بڑے زور کی کئی دن جو مصیبت کے تھے تاکہ چکھائیں ان کو رسوائی کا عذاب دنیا کی

الدُّنۡيَا ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَةِ اَخۡزٰى وَهُمۡ لَا يُنۡصَرُوۡنَ ⑯

زندگانی میں ۱ اور آخرت کے عذاب میں تو پوری رسوائی ہے اور ان کو کہیں مدد نہیں ۲

خلاصہ تفسیر: تو ہم نے ان پر ایک سخت ہوا ایسے دنوں میں بھیجی جو (عذاب الٰہی نازل ہونے کی وجہ سے ان کے حق میں)

منحوس تھے تا کہ ہم ان کو اس دنیوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھادیں اور آخرت کا عذاب اور بھی زیادہ رسوائی کا سبب ہے اور (اس عذاب کے وقت کسی طرف سے بھی) ان کو مدد نہ پہنچے گی۔

فِیْٓ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ: یعنی چونکہ ان دنوں میں ان پر عذاب نازل ہوا تھا، اس لیے خاص ان کے حق میں وہ دن منحوس تھے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ دن سب کے لیے منحوس ہوں، یہ ایام سات راتیں اور آٹھ دن تھے جیسا کہ سورہ حاقہ میں ہے، اس سے عوام میں معروف نحوست کا عقیدہ باطل ہوگیا، کیونکہ جب عذاب کے سات رات اور آٹھ دن گویا پورا ہفتہ بلکہ ایک دن مزید اضافی منحوس تھے تو پھر پورے ہفتے میں کوئی دن بھی نیک اور سعد نہ رہے گا، چنانچہ اصول اسلام اور احادیث رسول ﷺ سے ثابت ہے کہ کوئی دن یا رات اپنی ذات میں منحوس نہیں ہے، ایام کی نحوست کے متعلق مزید ضروری تحقیق سورہ صافات آیت ۸۸ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''ان کا غرور توڑنے کو ایک کمزور مخلوق سے ان کو تباہ کرادیا، سات رات اور آٹھ دن مسلسل ہوا کا طوفان چلتا رہا، درخت آدمی، مکان، مواشی کوئی چیز نہ چھوڑی۔

فائدہ: ۲ یعنی آخرت کی رسوائی تو بہت ہی بڑی ہے جو کسی کے ٹالے نہیں ٹلے گی، نہ وہاں کوئی مدد کر سکے گا، ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہوگی، محبت و ہمدردی کے بڑے بڑے مدعی آنکھیں چرائیں گے۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ

اور وہ جو ثمود تھے سو ہم نے ان کو راہ بتلائی پھر ان کو خوش لگا اندھا رہنا راہ سوجھنے سے ۱ پھر پکڑا ان کو کڑک نے ذلت کے عذاب کی

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع

بدلہ اس کا جو کماتے تھے ۲ اور بچادیا ہم نے ان لوگوں کو جو یقین لائے تھے اور بچ کر چلتے تھے ۳

خلاصہ تفسیر: اور وہ جو ثمود تھے تو (ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ) ہم نے ان کو (پیغمبر کے ذریعہ) رستہ بتلایا، سو انہوں نے گمراہی کو ہدایت کے مقابلہ میں پسند کیا تو ان کو سراپا ذلت کے عذاب کی آفت نے پکڑ لیا ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے، اور ہم نے (اس عذاب سے) ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور ہم سے ڈرتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نجات کا راستہ جو ہمارے پیغمبر نے بتلایا تھا اس سے آنکھیں بند کرلیں اور اندھا رہنے کو پسند کیا، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی پسند کی ہوئی حالت میں انہیں پڑا چھوڑ دیا۔

فائدہ: ۲ یعنی زلزلہ آیا، جس کے ساتھ سخت ہولناک آواز تھی، اس آواز سے جگر پھٹ گئے۔

فائدہ: ۳ یعنی جو لوگ ایمان لائے اور بدی کے راستہ سے بچ کر چلتے تھے، ان کو اللہ نے صاف بچالیا، نزول عذاب کے وقت ان پر ذرا آنچ بھی نہیں آئی۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ

اور جس دن جمع ہوں گے دشمن اللہ کے دوزخ پر تو ان کی جماعتیں بنائی جائیں گی ۱ یہاں تک کہ جب پہنچیں اس پر بتائیں گے ان کو

سَمۡعُهُمۡ وَاَبۡصَارُهُمۡ وَجُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۰﴾

ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے جو کچھ وہ کرتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: یہاں تک دنیوی عذاب کا ذکر تھا، اب آگے آخرت کے عذاب کا ذکر ہے:

اور (ان کو وہ دن بھی یاد دلائے) جس دن اللہ کے دشمن (یعنی کفار) دوزخ کی طرف جمع کر (نے) کے (لیے موقف حساب میں) لائے جائیں گے پھر (راستہ میں ان کی کثرت کی وجہ سے منتشر ہونے سے بچانے اور ایک ساتھ جمع رہنے کے لئے) وہ روکے جائیں گے (تاکہ پیچھے رہنے والے بھی ساتھ ہو جائیں جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں تمام جنود اور لشکروں کو جمع کرنے کے لئے **فھم یوزعون** فرمایا یعنی ان کو روکا جائے گا) یہاں تک کہ جب وہ (سب جمع ہو کر) اس (دوزخ) کے قریب آ جائیں گے (مراد میدان حساب ہے جہاں سے دوزخ قریب ہی نظر آئے گی جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ دوزخ کو میدان حساب میں حاضر کریں گے اور یہ کافر اپنے چاروں طرف آگ ہی آگ دیکھے گا، غرض یہ کہ جب میدان حساب میں آ جائیں گے اور حساب شروع ہو گا) تو ان کے کان اور آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

اَعۡدَآءُ اللّٰهِ: بعض تفاسیر میں لکھا ہے اور اچھا لکھا ہے کہ اس آیت میں "اللہ کے دشمنوں" سے خاص کفار یعنی اہل مکہ مراد ہیں، سب کفار مراد نہیں، کیونکہ ان کے بارے میں آگے آیا ہے کہ ان کے حق میں اللہ کا قول ان لوگوں کے ساتھ پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جن و انسان کافر گزرے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ صفت سب کفار میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ بعض کافر ایسے بھی ہیں کہ ان سے پہلے کوئی کافر نہ تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہر ایک قسم کے مجرموں کی الگ الگ جماعت ہو گی اور یہ سب جماعتیں ایک دوسرے کے انتظار میں جہنم کے قریب روکی جائیں گی۔

فائدہ: ۲؎ دنیا میں کانوں سے آیات تنزیلیہ سنیں اور آنکھوں سے آیات تکوینیہ دیکھیں، مگر کسی کو نہ مانا، ہر بن مو سے خدا کی نافرمانی کرتے رہے، یہ خبر نہ تھی کہ گناہوں کا یہ سارا ریکارڈ خود انہی کی ذات میں محفوظ ہے جو وقت پر کھول دیا جائے گا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں کفار اپنے جرائم کا زبان سے انکار کریں گے، اس وقت حکم ہو گا کہ ان کے اعضاء کی شہادت پیش کی جائے، جن کے ذریعہ سے گناہ کیے تھے، چنانچہ ہر ایک عضو شہادت دے گا اور اس طرح زبان کی تکذیب ہو جائے گی، تب مبہوت و حیران ہو کر اپنے اعضاء کو کہے گا (کم بختو!) دور ہو جاؤ! تمہاری ہی طرف سے تو میں جھگڑتا اور مدافعت کر رہا تھا (تم خود ہی اپنے جرموں کا اعتراف کرنے لگے)۔

وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ وَّهُوَ

اور وہ کہیں گے اپنے چمڑوں کو تم نے کیوں بتلایا ہم کو ۱؎ وہ بولیں گے ہم کو بلوایا اللہ نے جس نے بلوایا ہے ہر چیز کو ۲؎ اور اسی نے

خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۱﴾

بنایا تم کو پہلی بار اور اسی طرف پھیرے جاتے ہو ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (اس وقت) وہ لوگ (تعجب کے ساتھ) اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی (ہم تو دنیا میں سب کچھ تمہاری ہی راحت کے لئے کرتے تھے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ کافر اپنے اعضاء سے کہے گا: "فعنکن کنت اناضل" یعنی میں تمہارے ہی لئے سب کوشش کیا کرتا تھا) وہ (اعضاء) جواب دیں گے کہ ہم کو اس (قادر مطلق) نے گویائی دی جس نے ہر (گویا) چیز کو گویائی دی

(جس سے ہم نے اپنے اندر خود اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرلیا) اور اسی نے تم کو اول بار پیدا کیا تھا اور اسی کے پاس پھر (دوبارہ زندہ کرکے) لائے گئے ہو (اگرچہ تم دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے، پس جو خدا ایسا قادر اور عظیم الشان ہو اس کے سامنے اس کے پوچھنے پر ہم حق بات کو کیسے چھپا سکتے تھے، اس کی عظمت ہم کو اس سے روکتی تھی، اس لیے ہم نے گواہی دے دی)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جب میں زبان سے انکار کر رہا تھا تو تم پر ایسی کیا مصیبت پڑی تھی کہ خواہ مخواہ بتلانا شروع کر دیا اور آخر یہ بولنا تم کو سکھلایا کس نے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس کی قدرت نے ہر ناطق چیز کو بولنے کی قوت دی آج اسی نے ہم کو بھی گویا کر دیا، نہ بولتے اور بتلاتے تو کیا کرتے، جب وہ قادر مطلق بلوانا چاہے تو کس چیز کی مجال ہے کہ نہ بولے، جس نے زبان میں قوت گویائی رکھی، کیا ہاتھ پاؤں میں نہیں رکھ سکتا۔

فائدہ: ۳؎ یہ مقولہ یا ① اللہ تعالیٰ کا ہے ② یا جلود کا ہے، دونوں احتمال ہیں۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ

اور تم پرواہ نہ کرتے تھے اس بات سے کہ تم کو بتلائیں گے تمہارے کان اور نہ تمہاری آنکھیں اور نہ تمہارے چمڑے ۱؎ پر

ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

تم کو یہ خیال تھا کہ اللہ نہیں جانتا بہت چیزیں جو تم کرتے ہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (اس کے بعد حق تعالیٰ ان منکروں کو خطاب فرمائیں گے کہ) تم (دنیا میں) اس بات سے تو اپنے کو (کسی طرح) چھپا (اور بچا) ہی نہ سکتے تھے کہ تمہارے کان اور آنکھیں اور کھالیں تمہارے خلاف میں گواہی دیں (کیونکہ حق تعالیٰ کا اعضاء کو گویائی عطا کرنے پر قادر ہونا اور تمام اعمال کا جاننا واقع میں ثابت ہے جس کا تقاضہ یہ تھا کہ تم برے اعمال سے بچتے) لیکن تم (اس لئے نہ بچے کہ) اس گمان میں رہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر بھی نہیں۔

وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ: یہاں ''علم وخبر'' سے عام معنی مراد ہیں، کیونکہ بعض احمق تو خود علم ہی کے معتقد نہ تھے، وہ کہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کو ہمارے افعال کی اطلاع ہی نہ ہوتی ہوگی، جیسا کہ اس کی شان نزول میں روایت ہے، اور بعض یہ کہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کو ہمارے افعال پر التفات نہیں، یعنی وہ اس کے نزدیک سزا کے قابل نہیں، کیونکہ سزا ہوتی ہے برے کام پر، اور وہ کفریہ اعمال کو برا ہی نہ سمجھتے تھے، اور قیامت کے انکار کی وجہ سے جزا وسزا کے تو سب ہی منکر تھے، پس لفظ ''علم'' مجازی طور پر اس جگہ اطلاع والتفات وجزا سب کو شامل ہے۔

كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ: ''بہت سے اعمال'' کی قید اس لیے بڑھائی کہ ہر عمل کی بابت وہ خدا کے علم کا انکار کرتے تھے، چنانچہ جو اعمال کھلم کھلا کیے جاتے ہیں ان میں اطلاع کے سب معتقد تھے اور بعض اعمال کو برا بھی سمجھتے تھے اور ان پر دنیوی سزا کے بھی قائل تھے، چنانچہ قسامت میں جھوٹی قسم کھانے سے تباہ ہو جانے کا خوف کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی غیر سے چھپ کر گناہ کرتے تھے، یہ خبر نہ تھی کہ ہاتھ پاؤں بتلا دیں گے، ان سے بھی پردہ کریں، اور کرنا بھی چاہتے تو اس کی قدرت کہاں تھی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اصل میں تمہارے طرز عمل سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ گویا تم کو خدا تعالیٰ کے علم محیط کا یقین ہی نہ تھا، سمجھتے تھے کہ جو چاہو کرتے رہو، کون دیکھ بھال کرتا ہوگا؟! اگر پوری طرح یقین ہوتا کہ خدا ہماری تمہاری حرکات سے باخبر ہے اور اس کے ہاں ہماری پوری مسل محفوظ ہے تو

ہرگز ایسی شرارتیں نہ کرتے۔

وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ۝۲۳

اور یہ وہی تمہارا خیال ہے جو تم رکھتے تھے اپنے رب کے حق میں، اسی نے تم کو غارت کیا پھر آج ہو گئے ٹوٹے میں

فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ۝۲۴

پھر اگر وہ صبر کریں تو آگ ان کا گھر ہے اور اگر وہ منانا چاہیں تو ان کو کوئی نہیں مناتا۔ ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور تمہارے اسی گمان نے جو کہ تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا (کیونکہ اس گمان کی وجہ سے کفریہ اعمال کے مرتکب ہوئے اور وہ تباہی و بربادی کا سبب ہے) پھر تم (ابدی) خسارہ میں پڑ گئے، سو (اس حالت میں) اگر یہ لوگ (اس بربادی و خسارہ پر) صبر کریں (اور تن بتقدیر رہ کر عذر معذرت وغیرہ کچھ نہ کریں) تب بھی دوزخ ہی ان کا ٹھکانہ ہے (یہ نہیں کہ ان کی خاموشی اور صبر رحم کا سبب ہو جائے جیسا کہ کبھی دنیا میں ایسا ہو جاتا ہے) اور اگر وہ عذر کرنا چاہیں گے تو بھی مقبول نہ ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی دنیا میں بعض بلا صبر سے آسان ہوتی ہے، وہاں صبر کریں یا نہ کریں، دوزخ گھر ہو چکا (جہاں سے کبھی نکلنا نہیں) اور بعض منت خوشامد کرنے سے ٹلتی ہے، وہاں بہتیرا چاہیں کہ منت کریں، کوئی قبول نہیں کرتا''۔

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

اور لگا دیے ہم نے انکے پیچھے ساتھ رہنے والے پھر انہوں نے خوب صورت بنا دیا انکی آنکھوں میں اسکو جو انکے آگے ہے اور جو انکے پیچھے ہے ۱؎

وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ

اور ٹھیک پڑ چکی ان پر عذاب کی بات ان فرقوں کے ساتھ جو گزر چکے ان سے پہلے جنوں کے اور آدمیوں کے ۲؎

ع ۱۷ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ۝۲۵

بیشک وہ تھے ٹوٹے والے ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے (دنیا میں) ان (کفار) کے لئے کچھ ساتھ رہنے والے (شیاطین) مقرر کر رکھے تھے سو انہوں نے ان کے اگلے پچھلے اعمال ان کی نظر میں مستحسن کر رکھے تھے (اس لئے کفریہ کاموں پر جمے رہے) اور (کفر پر اصرار کرنے ہی کی وجہ سے) ان کے حق میں بھی ان لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول (یعنی عذاب کا وعدہ) پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جن اور انسان (کفار) ہو گزرے ہیں، بیشک وہ (سب) بھی خسارے میں رہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان پر شیطان تعینات تھے کہ ان کو برے کام جو پہلے کیے، یا آگے کرتے، بھلے کر کے دکھلائیں اور تباہ کن ماضی و مستقبل کو خوبصورت بنا کر ان کے سامنے پیش کریں۔ اور یہ شیطانوں کا تعینات کیا جانا بھی ان کے اعراض عن الذکر کا نتیجہ تھا، کما قال تعالیٰ: **وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ** (الزخرف:۳۶)

فائدہ: ؎۲ یعنی وہ ہی بات جو شروع میں کہی گئی تھی: لَاَمۡلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ (ہود:۱۱۹)

فائدہ: ؎۳ جب آدمی کو خسارہ آتا ہے تو اسی طرح آتا ہے اور ایسے ہی سامان ہو جاتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَالۡغَوۡا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ﴿۲۶﴾

اور کہنے لگے منکر مت کان دھرو اس قرآن کے سننے کو اور بک بک کرو اس کے پڑھنے میں شاید تم غالب ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے سورت کے شروع میں قرآن و رسالت کے متعلق مضمون تھا، اب اس کے انکار کرنے والوں پر ملامت اور دھمکی ہے۔

اور یہ کافر (آپس میں ایک دوسرے سے) یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی مت اور (اگر پیغمبر سنانے بھی لگیں تو) اس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو شاید (اس تدبیر سے) تم ہی غالب رہو (اور پیغمبر ہار کر خاموش ہو جائیں)۔

* * *

فائدہ: قرآن کریم کی آواز بجلی کی طرح سننے والوں کے دلوں میں اثر کرتی تھی، جو سنتا فریفتہ ہو جاتا، اس سے روکنے کی تدبیر کفار نے یہ نکالی کہ جب قرآن پڑھا جائے، ادھر کان مت دھرو اور اس قدر شور و غل مچاؤ کہ دوسرے بھی نہ سن سکیں، اس طرح ہماری بک بک سے قرآن کی آواز دب جائے گی، آج بھی جاہلوں کو ایسی ہی تدبیریں سوجھا کرتی ہیں کہ کام کی بات کو شور مچا کر سننے نہ دیا جائے، لیکن صداقت کی کڑک مچھروں اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے کہاں مغلوب ہو سکتی ہے، ان سب تدبیروں کے باوجود حق کی آواز قلوب کی گہرائیوں تک پہنچ کر رہتی ہے۔

فَلَنُذِيۡقَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا عَذَابًا شَدِيۡدًا ۙ وَّلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَسۡوَاَ الَّذِىۡ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ﴿۲۷﴾

ہم کو ضرور چکھانا ہے منکروں کو سخت عذاب اور ان کو بدلہ دینا ہے برے سے برے کاموں کا جو وہ کرتے تھے ؎۱

ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعۡدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمۡ فِيۡهَا دَارُ الۡخُلۡدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَجۡحَدُوۡنَ﴿۲۸﴾

یہ سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی آگ، ان کا اسی میں گھر ہے سدا کو، بدلہ اسکا جو ہماری باتوں سے انکار کرتے تھے ؎۲

خلاصہ تفسیر: تو (ان کے اس ناپاک ارادے اور عزم کے بدلہ میں) ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھا دیں گے، اور ان کو ان کے (ایسے) برے برے کاموں کی سزا دیں گے، یہی سزا ہے اللہ کے دشمنوں کی یعنی دوزخ، ان کے لئے وہاں ہمیشہ رہنے کا مقام ہوگا، اس بات کے بدلہ میں کہ وہ ہماری آیتوں میں انکار کیا کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: ؎۱ اس سے زیادہ برا کام کون سا ہوگا کہ خود نصیحت کی بات نہ سنے اور دوسروں کو بھی سننے نہ دے۔

فائدہ: ؎۲ یعنی دل میں سمجھتے تھے، لیکن ضد اور تعصب و عناد سے انکار ہی کرتے رہتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَيۡنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ نَجۡعَلۡهُمَا تَحۡتَ

اور کہیں گے وہ لوگ جو منکر ہیں اے رب ہمارے ہم کو دکھلا دے وہ دونوں جنہوں نے ہم کو بہکایا جو جن ہے اور جو آدمی کہ ڈالیں ہم انکو اپنے

اَقۡدَامِنَا لِيَكُوۡنَا مِنَ الۡاَسۡفَلِيۡنَ﴿۲۹﴾

پاؤں کے نیچے کہ وہ رہیں سب سے نیچے

خلاصہ تفسیر: (اور جب عذاب میں مبتلا ہوں گے تو) وہ کفار کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہم کو وہ دونوں شیطان اور انسان دکھلا دیجئے جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا ہم ان کو اپنے پیروں تلے روند ڈالیں تا کہ وہ خوب ذلیل ہوں۔

یعنی ان کو اس وقت ان لوگوں پر غصہ آئے گا جنہوں نے ان کو دنیا میں بہکایا تھا، خواہ وہ آدمی ہوں یا شیطان ہوں، اور ایک ایک ہوں یا متعدد ہوں، اور یوں تو یہ گمراہ کرنے والے بھی سب جہنم میں ہی ہوں گے، مگر اس گفتگو کے وقت وہ ان کے سامنے نہیں ہوں گے، اس لئے سامنے کی درخواست کی، کسی آیت میں یا روایت میں یہ مذکور نہیں دیکھا کہ ان کی یہ درخواست منظور ہوگی یا نہیں، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: یعنی خیر ہم تو آفت میں پھنسے ہیں، لیکن آدمیوں اور جنوں میں سے جن شیطانوں نے ہم کو بہکا بہکا کر اس آفت میں گرفتار کرایا ہے، ذرا انہیں ہمارے سامنے کر دیجئے کہ ان کو ہم اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں اور نہایت ذلت وخواری کے ساتھ جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں دھکیل دیں، تا کہ انتقام لے کر ہمارا دل کچھ تو ٹھنڈا ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا

تحقیق جنہوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر اسی پر قائم رہے ان پر اترتے ہیں فرشتے کہ تم مت ڈرو اور نہ غم کھاؤ

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور خوشخبری سنو اس بہشت کی جس کا تم سے وعدہ تھا

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی بدحالی اور برا انجام مذکور تھا، اب آگے مسلمانوں کی خوش حالی اور اچھا انجام مذکور ہے اور ساتھ ہی ان کو اخلاق حمیدہ وافعال حسنہ کا حکم اور ترغیب ہے جس سے ان کی خوش حالی میں ترقی ہو، دوسرے ایسے اخلاق کی ضرورت ایسے لوگوں کے مقابلہ میں بھی واقع ہوگی جو یہ کہتے تھے کہ قرآن کو نہ سنو اور شور وغل مچایا کرو۔

جن لوگوں نے (دل سے) اقرار کرلیا کہ ہمارا رب (حقیقی صرف) اللہ ہے (مطلب یہ ہے کہ شرک چھوڑ کر توحید اختیار کرلی) پھر (اس پر) مستقیم رہے (یعنی توحید کو چھوڑا نہیں) ان پر (اللہ کی طرف سے رحمت وخوش خبری کے) فرشتے اتریں گے (اول موت کے وقت، پھر قبر میں، پھر قیامت میں، اور کہیں گے) کہ تم نہ (آخرت کے آنے والے مصائب سے) اندیشہ کرو اور نہ (دنیا کے چھوڑنے پر) رنج کرو (کیونکہ آگے تمہارے لئے اس کا بہترین بدلہ اور امن وعافیت ہے) اور تم جنت (کے ملنے) پر خوش رہو جس کا تم سے (پیغمبر کی معرفت) وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔

ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: یہ آیت اپنے الفاظ کے مطلق ہونے کے اعتبار سے اس کو بھی شامل ہے کہ ظاہری یا باطنی امتحان کے اوقات میں ملائکہ ایسے اہل ایمان پر سکینہ وبرکت نازل کرتے ہیں، اور نیز ''استقامت'' اپنے اطلاق کے اعتبار سے استقامت کے تمام مراتب کو شامل ہے، یعنی ہر مسلمان کی استقامت اس کے حسب مرتبہ ہوگی، لہذا ہر مؤمن صاحب استقامت ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی دل سے اقرار کیا اور اس پر قائم رہے، اس کی ربوبیت والوہیت میں کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا، نہ اس یقین واقرار سے مرتے دم تک ہٹے، نہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلا، جو کچھ زبان سے کہا تھا، اس کے مقتضاء پر اعتقاداً اور عملاً جمے رہے، اللہ کی ربوبیت کاملہ کا حق پہچانا، جو عمل کیا خالص اس کی خوشنودی اور شکرگزاری کے لیے کیا، اپنے رب کے عائد کیے ہوئے حقوق وفرائض کو سمجھا اور ادا کیا، غرض ماسوا سے منہ موڑ کر سیدھے اسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی کے راستہ پر چلے، ایسے مستقیم الحال بندوں پر موت کے قریب اور قبر میں پہنچ کر اور اس کے بعد قبروں سے اٹھنے کے وقت اللہ کے فرشتے اترتے ہیں، جو تسکین وتسلی دیتے جنت کی بشارتیں سناتے ہیں، کہتے ہیں کہ اب تم کو ڈرنے اور گھبرانے کا کوئی موقع نہیں رہا، دنیائے فانی کے

سب فکروغم ختم ہوئے اور کسی آنے والی آفت کا اندیشہ بھی نہیں رہا، اب ابدی طور پر ہرقسم کی جسمانی وروحانی خوشی اور عیش تمہارے لیے ہے اور جنت کے جو وعدے انبیاء (علیہم السلام) کی زبانی کیے گئے تھے، وہ اب تم سے ایفا کیے جانے والے ہیں، یہ وہ دولت ہے جس کے ملنے کا یقین حاصل ہونے پر کوئی فکر اور غم آدمی کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔

تنبیہ: بہت ممکن ہے کہ متقین وابرار پر اس دنیاوی زندگی میں بھی ایک قسم کا نزول فرشتوں کا ہوتا ہو، جو اللہ کے حکم سے ان کے دینی و دنیاوی امور میں بہتری کی باتیں الہام کرتے ہوں، جو ان کے شرح صدر اور تسکین واطمینان کا موجب ہوجاتا ہو، جیسے ان کے بالمقابل ایک دو آیت پہلے گزر چکا ہے کہ کفار پر شیطان مسلط ہیں، جو تزئین قبائح سے ان کے اغواء کا سامان کرتے ہیں، چنانچہ دوسری جگہ شیاطین کے حق میں بھی لفظ تنزل استعمال ہوا ہے، قال تعالیٰ: تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (الشعراء:۲۲۲) بہر حال بعض مفسرین کے نزدیک یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں اور اس تقدیر پر اگلی آیت: نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ زیادہ چسپاں ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِىْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ

ہم ہیں تمہارے رفیق دنیا میں اور آخرت میں ۱؎ اور تمہارے لیے وہاں ہے جو چاہے جی تمہارا اور تمہارے لیے

فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿٣١﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿٣٢﴾ ع ۱۸

وہاں ہے جو کچھ مانگو ۲؎ مہمانی ہے اس بخشنے والے مہربان کی طرف سے ۳؎

خلاصہ تفسیر: ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے اور تمہارے لئے اس (جنت) میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے اور نیز تمہارے لئے اس میں جو مانگو گے موجود ہے (یعنی جو کچھ زبان سے مانگو گے وہ تو ملے ہی گا، بلکہ مانگنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی جس چیز کو تمہارا دل چاہے گا موجود ہوجائے گی) یہ بطور مہمانی کے ہوگا غفور رحیم کی طرف سے (یعنی یہ نعمتیں اکرام واعزاز کے ساتھ اس طرح ملیں گی جس طرح مہمانوں کو ملتی ہیں)۔

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ: دنیا میں فرشتوں کا رفیق ہونا یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں نیک کاموں کا الہام کرتے رہتے ہیں، اور کوئی تکلیف ومصیبت پیش آجائے تو اس پر صبر وسکون فرشتوں ہی کی رفاقت کا اثر ہوتا ہے، حدیث کے بیان کے مطابق وہ دنیا میں انسان کے ساتھ رہتے ہیں، اور آخرت میں رفیق ہونا تو آمنے سامنے کھل کر ہوگا، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: **وتتلقهم الملئكة** مسلمانوں سے فرشتے ملیں گے، اور دوسری آیت میں: **يدخلون عليهم من كل باب** اور ہر دروازے سے ان کے پاس پہنچیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ بعض نے اس کو اللہ کا کلام بتایا ہے، یعنی فرشتوں کا کلام اس سے پہلے ختم ہوچکا، اور اکثر کے نزدیک یہ بھی فرشتوں کا مقولہ ہے، گویا فرشتے یہ قول ان کے دلوں میں الہام کرتے ہیں اور ان کی ہمت بندھاتے ہیں، ممکن ہے اس زندگی میں بعض بندوں سے مشافہۃً بھی اتنے الفاظ کہتے ہوں اور ممکن ہے موت کے قریب یا اس کے بعد کہا جاتا ہو، اس وقت: نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم دنیا میں بھی تمہارے رفیق رہے ہیں کہ اللہ کے حکم سے باطنی طور پر تمہاری اعانت کرتے تھے، اور آخرت میں بھی رفیق رہیں گے کہ وہاں تمہاری شفاعت یا اعزاز وکرام کا انتظام کریں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس چیز کی خواہش ورغبت دل میں ہوگی یا جو زبان سے طلب کروگے سب کچھ ملے گا، اللہ کے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی سمجھ لو! وہ غفور رحیم اپنے مہمان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے گا اور یہ کتنی بڑی عزت وتوقیر ہے کہ ایک بندہ ضعیف رب

العزت کا مہمان ہو۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٣﴾

اوراس سے بہتر کس کی بات جس نے بلایا اللہ کی طرف اور کیا نیک کام اور کہا میں حکم بردار ہوں

خلاصہ تفسیر: مسلمانوں کی اچھی حالت بتلا کراب آگے ان کے اچھے اعمال بتلاتے ہیں:

اوراس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے اور (خود بھی) نیک عمل کرے اور (اظہار اطاعت کے لئے) کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں (یعنی بندگی کو اپنا فخر سمجھے، متکبرین کی طرح اس سے عار نہ کرے)۔

مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ داعی (جن میں شیخ، مربی، استاذ بھی شامل ہیں) کو خود بھی عامل و پابند ہونا چاہیے، ورنہ اس کی تعلیم میں برکت نہیں ہوتی، یعنی اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔

* * *

فائدہ: پہلے: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا میں ان مخصوص مقبول بندوں کا ذکر تھا جنہوں نے صرف ایک اللہ کی ربوبیت پر اعتقاد جما کر اپنی استقامت کا ثبوت دیا، یہاں ان کے ایک اور اعلیٰ مقام کا ذکر کرتے ہیں، یعنی بہترین شخص وہ ہے جو خود اللہ کا ہو رہے، اسی کی حکم برداری کا اعلان کرے، اسی کی پسندیدہ روش پر چلے اور دنیا کو اسی کی طرف آنے کی دعوت دے، اس کا قول و فعل بندوں کو خدا کی طرف کھینچنے میں موثر ہو، جس نیکی کی طرف لوگوں کو بلائے بذات خود اس پر عامل ہو، خدا کی نسبت اپنی بندگی اور فرمانبرداری کا اعلان کرنے سے کسی موقع پر اور کسی وقت نہ جھجکے، اس کا طغرائے قومیت صرف مذہب اسلام ہو اور ہر قسم کی تنگ نظری اور فرقہ ورانہ نسبتوں سے یکسو ہو کر اپنے مسلم خالص ہونے کی منادی کرے اور اسی اعلیٰ مقام کی طرف لوگوں کو بلائے جس کی دعوت دینے کے لیے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی عمریں صرف کی تھیں۔

وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ

اور برابر نہیں نیکی اور نہ بدی، جواب میں وہ کہہ جو اس سے بہتر ہو پھر تو دیکھ لے کہ تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی

كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ ﴿٣٤﴾ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿٣٥﴾

گویا دوست دار ہے قرابت والا اور یہ بات ملتی ہے انہی کو جو سہار (تحمل) رکھتے ہیں، اور یہ بات ملتی ہے اسی کو جس کی بڑی قسمت ہے

خلاصہ تفسیر: چونکہ دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق میں اکثر جاہلوں کی طرف سے ایذاؤں اور تکلیفوں کا سامنا ہوتا ہے اس لئے آگے ان کو ظلم کے مقابلہ میں انصاف اور برائی کے بدلہ میں بھلائی کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، نیز تجربہ سے ثابت ہے کہ دعوت کے موثر اور کامیاب ہونے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ مخالفین کی ایذاؤں پر صبر کر کے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اس لئے رسول اللہ ﷺ کو خاص خطاب کر کے فرمایا جس میں سب مسلمان ضمناً شامل ہیں:

اور (پہلے مقدمہ کے طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ) نیکی اور بدی (برائی) برابر نہیں ہوتی (بلکہ ہر ایک کا اثر جدا ہے، جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اب) آپ (مع اپنے متبعین کے) نیک برتاؤ سے (برائی کو) ٹال دیا کیجئے پھر یکایک (آپ دیکھیں گے کہ) آپ میں اور جس شخص میں عداوت تھی وہ ایسا ہو جاوے گا جیسا کوئی دلی دوست ہوتا ہے، اور یہ بات ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو (اخلاق کے اعتبار سے) بڑے مستقل (مزاج) ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی ہے جو (ثواب کے اعتبار سے) بڑا صاحب نصیب ہے (اس سے معلوم ہوا کہ حسن اخلاق کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے)۔

اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ: اس میں اخلاق کی تعلیم ہے، یعنی برائی کا بدلہ برائی سے دینے میں تو عداوت بڑھتی ہے اور نیکی اور بھلائی کرنے

سے دشمنی گھٹتی ہے بشرطیکہ دشمن کی طبیعت میں سلامتی ہو، یہاں تک کہ اکثر تو دشمنی بالکل ہی جاتی رہتی ہے اور اس معاملہ میں وہ دوست کے مشابہ ہوجاتا ہے اگرچہ دل سے دوست نہ ہو، یہاں ''طبیعت میں سلامتی'' کی قید عقلی دلیل سے بڑھائی گئی ہے، جس سے یہ خدشہ نہیں رہے گا کہ بعض دفعہ اس کے خلاف بھی مشاہدہ ہوتا ہے، جیسے بعض اوقات شریر آدمی پر نرمی کرنے کا الٹا اثر ہوتا ہے، کیونکہ یہ صرف ایسے لوگوں سے محتمل ہے جو اپنی سلامت طبع کھو بیٹھتے ہیں اور وہ شاذ و نادر ہوتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ان آیات میں ایک سچے داعی الی اللہ کو جس حسن اخلاق کی ضرورت ہے، اس کی تعلیم دیتے ہیں، یعنی خوب سمجھ لو، نیکی بدی کے اور بدی نیکی کے برابر نہیں ہوسکتی، دونوں کی تاثیر جداگانہ ہے، بلکہ ایک نیکی دوسری نیکی سے اور ایک بدی دوسری بدی سے اثر میں بڑھ کر ہوتی ہے، لہٰذا ایک مومن قانت اور خصوصاً داعی الی اللہ کا مسلک یہ ہونا چاہیے کہ برائی کا جواب برائی سے نہ دے، بلکہ جہاں تک گنجائش ہو برائی کے مقابلہ میں بھلائی سے پیش آئے، اگر کوئی اسے سخت بات کہے، یا برا معاملہ کرے تو اس کے مقابل وہ طرز اختیار کرنا چاہیے جو اس سے بہتر ہو، مثلاً غصہ کے جواب میں بردباری، گالی کے جواب میں تہذیب وشائستگی اور سختی کے جواب میں نرمی اور مہربانی سے پیش آئے، اس طرز عمل کے نتیجہ میں تم دیکھ لوگے کہ سخت سے سخت دشمن بھی ڈھیلا پڑ جائے گا اور گو دل سے دوست نہ بنے، تاہم ایک وقت آئے گا جب وہ ظاہر میں ایک گہرے اور گرمجوش دوست کی طرح تم سے برتاؤ کرنے لگے گا، بلکہ ممکن ہے کہ کچھ دنوں بعد سچے دل سے دوست بن جائے اور دشمنی وعداوت کے خیالات یکسر قلب سے نکل جائیں، کما قال: عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً (الممتحنہ: ۷)

ہاں! کسی شخص کی طبیعت کی افتاد ہی سانپ بچھو کی طرح ہو کہ کوئی نرم خوئی اور خوش اخلاقی اس پر اثر نہ کرے وہ دوسری بات ہے، مگر ایسے افراد بہت کم ہوتے ہیں، بہرحال دعوت الی اللہ کے منصب پر فائز ہونے والوں کو بہت زیادہ صبر واستقلال اور حسن خلق کی ضرورت ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بہت بڑا حوصلہ چاہیے کہ بری بات سہار کر بھلائی سے جواب دیں، یہ اخلاق اور اعلیٰ خصلت اللہ کے ہاں سے بڑے قسمت والے خوش نصیب اقبال مندوں کو ملتی ہے۔

ربط: یہاں تک اس حریف اور دشمن کے ساتھ معاملہ کرنا سکھلایا تھا جو حسن معاملہ اور خوش اخلاقی سے متاثر ہوسکتا ہے، لیکن ایک دشمن وہ ہے جو کسی حال اور کسی نہج سے دشمنی نہیں چھوڑ سکتا، تم کتنی ہی خوشامد یا نرمی برتو، اس کا نصب العین یہ ہے کہ تم کو ہر طرح نقصان پہنچائے، ایسے پکے شیطان سے محفوظ رہنے کی تدبیر آگے تلقین فرمائی ہے:

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۶

اور جو کبھی چوک لگے تجھ کو شیطان کے چوک لگانے سے تو پناہ پکڑ اللہ کی، بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: اور اگر (ایسے وقت میں) آپ کو شیطان کی طرف سے (غصہ کا) کچھ وسوسہ آنے لگے تو (فوراً) اللہ سے پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ: اس سے معلوم ہوا کہ شیطانی وساوس کا ورود کاملین پر بھی ہوسکتا ہے، اور یہ ان کے کمال کے خلاف نہیں، اور فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ میں اس طرف اشارہ ہے کہ شیطانی وسوسوں سے کسی وقت بھی بےفکر نہیں رہنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: یعنی ایسے شیطان کے مقابلہ میں نرمی اور عفو ودرگزر سے کام نہیں چلتا، بس اس سے بچنے کی ایک ہی تدبیر ہے کہ خداوند قدوس کی پناہ میں آجاؤ، یہ وہ مضبوط قلعہ ہے جہاں شیطان کی رسائی نہیں، اگر تم واقعی اخلاص وتضرع سے اللہ کو پکاروگے، وہ ضرور تم کو پناہ دے گا، کیونکہ وہ ہر ایک کی پکار سنتا ہے اور خوب جانتا ہے کہ کس نے کتنے اخلاص وتضرع سے اس کو پکارا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ اس آیت کا پہلی آیت سے ربط ظاہر کرنے کی غرض سے لکھتے ہیں: ''یعنی کبھی بے اختیار غصہ چڑھ آئے تو یہ شیطان کا دخل ہے''، وہ نہیں چاہتا کہ تم حسن اخلاق پر کار بند ہو کر دعوت الی اللہ کے مقصد میں کامیابی حاصل کرو۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ

اور اس کی قدرت کے نمونے ہیں رات اور دن اور سورج اور چاند ۱؎ سجدہ نہ کرو سورج کو اور چاند کو اور سجدہ کرو اللہ کو

الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝۳۷

جس نے ان کو بنایا اگر تم اسی کو پوجتے ہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے دوسرے رکوع میں توحید کا مضمون تھا، اب آگے پھر اسی کی طرف رجوع ہے، اور اس کے ختم پر زمین کو زندہ کرنے کا بیان ہے، اس کی مناسبت سے مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر فرمایا جس سے عذاب قیامت کی تاکید بھی ہوگئی جس کا اس سورت میں کفار کے لیے جابجا ذکر ہوا ہے۔

اور من جملہ اس کی (توحید وقدرت) کی نشانیوں کے رات اور دن ہے اور سورج ہے اور چاند ہے (پس) تم لوگ نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو (جیسا کہ صائبین وغیرہ بعض فرقے ستاروں کی عبادت کیا کرتے تھے) اور (صرف) اس خدا کو سجدہ کرو جس نے ان (سب) نشانیوں کو پیدا کیا اگر تم کو خدا کی عبادت کرنا ہے (یعنی اگر خدا کی عبادت کرنا ہے تو وہ صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو، مشرکین کی طرح اللہ کی عبادت کے ساتھ دوسروں کو عبادت میں شریک کر دیا تو پھر وہ اللہ کی عبادت نہیں رہتی)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ دعوت الی اللہ کے ساتھ چند دلائل سماویہ وارضیہ بیان فرماتے ہیں، جن سے داعی الی اللہ کو اللہ تعالیٰ کی عظمت و وحدانیت اور بعث بعد الموت وغیرہ اہم مسائل کے سمجھانے میں مدد ملے، اس ضمن میں ادھر بھی اشارہ ہو گیا کہ ایک طرف خدا کے مخصوص بندے اپنے قول و عمل سے خدا کی طرف بلا رہے ہیں اور دوسری طرف چاند، سورج اور آسمان و زمین کا عظیم الشان نظم ونسق سوچنے والوں کو اسی خدائے واحد کی طرف آنے کی دعوت دے رہا ہے: وفی کل شیء لہ ایۃ تدل علی انہ واحد۔ انسان کو چاہیے کہ ان تکوینی نشانیوں میں الجھ کر نہ رہ جائے، جیسے بہت سی قومیں رہ گئی ہیں، بلکہ لازم ہے کہ اس لامحدود قدرت والے مالک کے سامنے سر جھکائے جس کی یہ نشانیاں ہیں اور جس کے حکم سے ان کی ساری نمود ہے۔

اور ممکن ہے اس پر بھی تنبیہ ہو کہ جس طرح رات اور دن اور ان دونوں کی نشانیاں چاند اور سورج ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور اللہ تعالیٰ ان میں ردو بدل کرتا رہتا ہے، اسی طرح اس کو قدرت ہے کہ دعوت الی اللہ کی روشنی اور داعی کی علو ہمت اور خوش اخلاقی کی بدولت مخاطبین کی کایا پلٹ کر دے اور تاریک فضا کو ایک روشن ماحول سے بدل دے۔

فائدہ: ۲؎ سورج اور چاند وغیرہ کو پوجنے والے بھی زبان سے یہی کہتے تھے کہ ہماری غرض ان چیزوں کی پرستش سے اللہ کی پرستش ہے، مگر اللہ نے بتلا دیا کہ یہ چیزیں پرستش کے لائق نہیں، عبادت کا مستحق صرف ایک خدا ہے، کسی غیر اللہ کی عبادت کرنا خدائے واحد سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔

فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْــَٔمُوْنَ ۝۳۸ السجدۃ ۱۱

پھر اگر غرور کریں تو جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں پاکی بولتے رہتے ہیں اس کی رات اور دن اور وہ نہیں تھکتے

خلاصہ تفسیر: پھر اگر یہ لوگ (توحید کی عبادت اختیار کرنے اور اپنی آبائی شرکیہ رسوم کو چھوڑنے سے عار) اور تکبر کریں تو (ان

کی حماقت ہے، کیونکہ) جو فرشتے آپ کے رب کے مقرب ہیں (اور شان وعظمت میں ان لوگوں سے ہزار درجہ زیادہ ہیں) وہ شب وروز اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہ (اس سے ذرا) نہیں اکتاتے (جب ان فرشتوں کو عار نہیں تو ان احمقوں کو عار کرنے کا کیا موقع ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر غرور تکبر حق کے قبول کرنے سے مانع ہے اور باوجود وضوح دلائل توحید کے خدائے واحد کی عبادت کی طرف آنا نہیں چاہتے تھے تو نہ آئیں، اپنا ہی نقصان کریں گے، اللہ کو ان کی کیا پرواہ ہوسکتی ہے، بھلا جس کی عظمت وجبروت کا یہ عالم ہو کہ بے شمار ملائکہ مقربین شب وروز اس کی عبادت اور تسبیح وتقدیس میں مشغول رہتے ہیں، نہ کبھی تھکتے ہیں، نہ اکتاتے ہیں، اس کے سامنے یہ بیچارے کیا چیز ہیں اور ان کا غرور کیا چیز ہے، خواہ مخواہ کی جھوٹی شیخی کرکے اپنا ہی نقصان کررہے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِيْٓ

اور ایک اس کی نشانی یہ کہ تو دیکھتا ہے زمین کو دَبی پڑی پھر جب اتارا ہم نے اس پر پانی تازی ہوئی اور ابھری، بیشک جس نے

اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

اس کو زندہ کیا وہ زندہ کرے گا مردوں کو، وہ سب کچھ کرسکتا ہے

خلاصہ تفسیر: اور من جملہ اس کی (توحید وقدرت) کی نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے دبی دبائی (پڑی) ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی اور پھولتی ہے (اس سے توحید پر بھی استدلال ہوتا ہے اور بعث یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر بھی، کیونکہ) جس نے زمین کو (اس کے مناسب) زندہ کردیا وہی مردوں کو (ان کے مناسب) زندہ کردے گا، بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ دونوں باتیں ممکن ہونے میں برابر ہیں تو ان دونوں پر خدا کی قدرت بھی یکساں ہوگی، اور ان میں سے ایک پہلی بات کا آسان ہونا مشاہدہ سے معلوم ہے تو دوسری صورت یعنی مردوں کو زندہ کرنا بھی آسان ہوگی، پھر اس کو مشکل یا دشوار سمجھنا محض جہالت ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی زمین کو دیکھو بیچاری چپ چاپ، ذلیل وخوار بوجھ میں دبی ہوئی پڑی رہتی ہے، خشکی کے وقت ہر طرف خاک اڑتی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن جہاں بارش کا ایک چھینٹا پڑا، پھر اس کی تروتازگی رونق اور ابھار قابل دید ہوجاتا ہے، آخر یہ انقلاب کس کے دست قدرت کے تصرف کا نتیجہ ہے، جس خدا نے اس طرح مردہ زمین کو زندہ کردیا، کیا وہ مرے ہوئے انسانوں کے بدن میں دوبارہ جان نہیں ڈال سکتا؟!۔

اور کیا وہ قادر مطلق مرے ہوئے دلوں کو دعوت الی اللہ کی تاثیر سے از سر نو حیات تازہ عطا نہیں کرسکتا؟ بیشک وہ سب کچھ کرسکتا ہے، اس کی قدرت کے سامنے کوئی مانع ومزاحم نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ؕ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا

جو لوگ ٹیڑھے چلتے ہیں ہماری باتوں میں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں، بھلا ایک جو پڑتا ہے آگ میں وہ بہتر یا ایک جو آئے گا امن سے

يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴۰﴾

دن قیامت کے، کیے جاؤ جو چاہو، بیشک جو تم کرتے ہو وہ دیکھتا ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے بعض آیتوں میں توحید ورسالت کے منکروں کیلئے عذاب کی وعید بیان ہوئی، اب آگے پھر اسی کا بیان ہے۔

بلاشبہ جولوگ ہماری آیتوں میں کج روی کرتے ہیں (یعنی یہ کہ ہماری آیتوں کا تقاضا ان پر ایمان لانے، پھر ان پر استقامت رکھنے کا ہے، اس کو چھوڑ کر ان کی تکذیب کرتے ہیں) وہ لوگ ہم پر مخفی نہیں (ہمیں ان سب کا حال معلوم ہے اور ان کو ہم جہنم کا عذاب دیں گے) سو بھلا جو شخص جہنم میں ڈالا جائے (جیسے کافر) وہ اچھا ہے یا وہ شخص جو قیامت کے روز امن وامان کے ساتھ (جنت) میں آئے (آگے ان کو ڈرانے کے لئے ارشاد ہے کہ) جو جی چاہے (خوب) کرلو، وہ تمہارا سب کچھ کیا ہوا دیکھ رہا ہے (ایک دفعہ ہی سزا دے گا)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا: یہاں انکار کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا جس کا نام ''الحاد'' ہے، اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو قرآن کریم کی باطل اور غلط تفسیر کرتے ہیں، لحد اور الحاد کے لغوی معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں، قرآن وحدیث کی اصطلاح میں آیات قرآنی سے عدول و انحراف کو ''الحاد'' کہتے ہیں، لغوی معنی کے اعتبار سے تو یہ عام ہے صراحۃً کھلے طور پر انکار وانحراف کرے یا تلاوت فاسدہ کے بہانہ سے انحراف کرے، لیکن عام طور سے الحاد ایسے انحراف کو کہتے ہیں کہ ظاہر میں تو قرآن اور اس کی آیات پر ایمان وتصدیق کا دعویٰ کرے مگر ان کے معانی اپنی طرف سے ایسے گھڑے جو قرآن وسنت کی نصوص اور جمہور امت کے خلاف ہوں اور جس سے قرآن کا مقصد ہی الٹ جائے، حضرت ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں الحاد کے معنی یہی منقول ہیں فرمایا: ''الإلحاد هو وضع الكلام على غير موضعه'' اور آیت مذکورہ میں ارشاد: لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا بھی اس کا قرینہ ہے کہ الحاد کوئی ایسا کفر ہے جس کو یہ لوگ چھپانا چاہتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ہم سے اپنا کفر نہیں چھپا سکتے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کی زبان سے آیات تنزیلیہ سن کر اور قرطاس دہر پر خدا کی آیات کونیہ کو دیکھ کر بھی جو لوگ کج روی سے باز نہیں آتے اور سیدھی سیدھی باتوں کو واہی تباہی شبہات پیدا کرکے ٹیڑھی بناتے ہیں، یا خواہ مخواہ توڑ مروڑ کر ان کا مطلب غلط لیتے ہیں، یا یوں ہی جھوٹ موٹ کے عذر اور بہانے تراش کر ان آیات کے ماننے میں ہیر پھیر کرتے ہیں، ایسی ٹیڑھی چال چلنے والوں کو اللہ خوب جانتا ہے، ممکن ہے وہ لوگ اپنی مکاریوں اور چالاکیوں پر مغرور ہوں، مگر خدا سے ان کی کوئی چال پوشیدہ نہیں ہے، جس وقت سامنے جائیں گے دیکھ لیں گے، فی الحال اس نے ڈھیل دے رکھی ہے، مجرم کو ایک دم نہیں پکڑتا، اسی لیے آگے فرمادیا: اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ یعنی اچھا جو تمہاری سمجھ میں آئے کیے جاؤ، مگر یاد رہے کہ تمہاری سب حرکات اس کی نظر میں ہیں، ایک دن ان کا اکٹھا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، اب خود سوچ لو کہ ایک شخص جو اپنی شرارتوں کی بدولت جلتی آگ میں گرے، اور ایک جو اپنی شرافت وسلامت روی کی بدولت ہمیشہ امن چین سے رہے، دونوں میں کون بہتر ہے؟!۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾

جو لوگ منکر ہوئے نصیحت سے جب آئی ان کے پاس ۱؎ اور وہ کتاب ہے نادر

لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾

اس پر جھوٹ کا دخل نہیں آگے سے اور نہ پیچھے سے، اتاری ہوئی ہے حکمتوں والے سب تعریفوں والے کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے سورت کے شروع اور پھر اس کے بعد کچھ اوپر رسالت اور قرآن کے متعلق گفتگو ہوئی تھی، اب آگے پھر یہی گفتگو ہے اور اسی سلسلہ میں منکرین کے بعض اقوال کا جواب اور بعض مضامین سے جناب رسول اللہ ﷺ کو تسلی بھی دی گئی ہے۔

جو لوگ اس قرآن کا جبکہ وہ ان کے پاس پہنچتا ہے انکار کرتے ہیں (ان میں خود تدبر کی کمی ہے) اور (اس قرآن میں کوئی کمی نہیں کیونکہ) یہ (قرآن) بڑی باوقعت کتاب ہے جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے (یعنی اس میں کسی پہلو اور کسی جہت سے یہ احتمال نہیں کہ یہ قرآن خدا کی طرف سے نازل نہ ہوا ہو، اور خلاف واقع اس کو خدا کی طرف سے نازل شدہ کہا جاتا ہو جیسا کفار آپ

پر یہی شبہ کرتے تھے، حق تعالیٰ نے ایک قاعدہ کلیہ سے اس شبہ خاص کا ازالہ کردیا اس طرح کہ اس کا اعجاز سب کے نزدیک مسلم ہے اس لئے یہ ثابت ہوگیا کہ) یہ خدائے حکیم محمود (الذات والصفات) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی وہ خواہ مخواہ اپنی کج روی سے نصیحت کی بات میں شبہات پیدا کرتے ہیں، حالانکہ اس میں جھوٹ کی گنجائش کسی طرف سے نہیں، وہ نصیحت کیا ہے؟ ایک صاف واضح اور مضبوط و محکم کتاب جس کا انکار ایک احمق یا شریر آدمی کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس کی اتاری ہوئی کتاب میں جھوٹ آئے تو کدھر سے آئے اور جس کتاب کی حفاظت کا وہ ذمہ دار ہو، باطل کی کیا مجال ہے کہ اس کے پاس پھٹک سکے۔

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۴۳﴾

تجھے وہی کہتے ہیں جو کہہ چکے ہیں سب رسولوں سے تجھ سے پہلے، تیرے رب کے یہاں معافی بھی ہے اور سزا بھی ہے دردناک

خلاصہ تفسیر: (ان دلائل کے باوجود یہ لوگ جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو یہ معلوم کرکے تسلی کرلیجئے کہ) آپ کو وہی باتیں (تکذیب و ایذاء کی) کہی جاتی ہیں جو آپ سے پہلے رسولوں کو کہی گئی ہیں (انہوں نے صبر کیا تھا آپ بھی صبر کیجئے اور اس سے بھی تسلی حاصل کیجئے کہ) آپ کا رب بڑی مغفرت والا اور دردناک سزا دینے والا ہے (پس اگر یہ مخالف لوگ مخالفت سے باز آکر مغفرت کے مستحق نہ بنے تو میں ان کو سزا بھی دوں گا، پھر آپ کاہے کے لئے پریشان ہوں)۔

* * *

فائدہ: یعنی منکرین کا جو معاملہ آپ کے ساتھ ہے، یہ ہی ہر زمانہ کے منکرین کا پیغمبروں کے ساتھ رہا ہے، پیغمبروں نے ہمیشہ خیرخواہی کی ہے، انہوں نے اس کے جواب میں ہر طرح کی تکلیفیں پہنچائیں، پھر جس طرح پیغمبروں نے سختیوں پر صبر کیا، آپ بھی صبر کرتے رہیے، نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ لوگ توبہ کرکے راہ راست پر آجائیں گے، جن کے لیے خدا کے ہاں معافی ہے اور کچھ اپنی کج روی اور ضد پر قائم رہیں گے، جو آخرکار دردناک سزا کے مستوجب ہوں گے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ

اور اگر ہم اس کو کرتے قرآن اوپری زبان کا تو کہتے اس کی باتیں کیوں نہ کھولی گئیں، کیا اوپری زبان کی کتاب اور عربی لوگ ۱؎

قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ

تو کہہ یہ ایمان والوں کیلئے سوجھ ہے اور روگ کا دور کرنے والا ۲؎ اور جو یقین نہیں لاتے انکے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ قرآن انکے حق میں

عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾ ع ۱۹

اندھا پا ہے ۳؎ ان کو پکارتے ہیں دور کی جگہ سے ۴؎

خلاصہ تفسیر: اب کفار کے اس شبہ کا جواب ہے کہ وہ کہتے تھے کہ قرآن کا کچھ حصہ عجمی زبان میں بھی ہونا چاہئے تھا تا کہ اس کا اعجاز خوب ظاہر ہوجاتا کہ جو نبی عجمی زبان نہیں جانتے وہ عجمی زبان میں کلام کرتے ہیں، سو بات یہ ہے کہ:

اور اگر ہم اس کو (پورا یا کچھ حصہ) عجمی (زبان کا) قرآن بناتے (تو یہ ہرگز نہ ہوتا کہ اس کو مان لیتے، بلکہ اس میں ایک اور حجت نکالتے،

کیونکہ جب ماننے اور سمجھنے کا ارادہ نہیں ہوتا تو ہر صورت میں کچھ نہ کچھ شاخ نکال لی جاتی ہے چنانچہ اگر ایسا ہوتا) تو یوں کہتے کہ اس کی آیتیں (اس طرح) صاف صاف کیوں نہیں بیان کی گئیں (کہ ہم بھی سمجھ لیتے، یعنی عربی میں کیوں نہیں آیا، اور اگر کچھ حصہ عجمی ہوتا تو کہتے یہ حصہ بھی عربی کیوں نہ ہوا، اور یوں کہتے کہ) یہ کیا بات ہے کہ عجمی کتاب اور رسول عربی (خلاصہ یہ کہ اب جو قرآن عربی ہے تو کہتے ہیں کہ عجمی کیوں نہیں؟ اور اگر عجمی ہوتا تو کہتے عربی کیوں نہیں؟ کسی حال پر ان کو قرار نہیں، پھر عجمی ہونے سے کیا فائدہ، آگے جواب دینے کا حکم ہے کہ اے پیغمبر!) آپ کہہ دیجئے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لئے تو (نیک کاموں کے بتلانے میں) رہنما ہے اور (برے کاموں سے جو روگ دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں جب قرآن کی رہنمائی پر عمل کیا جائے تو یہ ان روگوں سے) شفا ہے (پس چونکہ ایمان والوں میں تدبر اور طلب حق کی کمی نہ تھی، ان کے حق میں قرآن اپنی حقانیت کی وجہ سے نافع ہوا) اور جو (حق ظاہر ہونے کے باوجود عناد کی وجہ سے) ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں ڈاٹ ہے (جس سے حق بات کو انصاف اور تدبر سے نہیں سنتے اور یہی ان میں کمی ہے) اور (اسی کمی کی وجہ سے) وہ قرآن ان کے حق میں نابینائی ہے (کیونکہ تدبر اور انصاف کی کمی سے تعصب کو قوت ہوتی ہے اور تعصب ہدایت قبول کرنے سے مانع بلکہ زیادہ گمراہی کا سبب ہو جاتا ہے، پس ان کے حق میں نابینائی کا سبب ہونا ایسا ہے جیسا کہ سورج عالم کو روشنی دیتا ہے چمگادڑ کو اندھا کر دیتا ہے، مگر یہ سورج کا قصور نہیں، بلکہ خود چمگادڑ کی آنکھ کا قصور ہے، اس کی نگاہ کمزور ہے، اور) یہ لوگ (حق بات سننے کے باوجود نفع سے محروم رہتے ہیں ایسے ہیں کہ گویا) کسی دور جگہ سے پکارے جا رہے ہیں (کہ آواز سنتے ہوں مگر سمجھتے نہ ہوں)۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا: رہا قرآن کا اعجاز سو وہ عربی ہونے کی صورت میں بھی موجود ہے، بلکہ اس حالت میں اس کا اعجاز اہل عرب پر زیادہ حجت ہے، کیونکہ وہ فن عربی میں ماہر ہیں اور اس کے باوجود قرآن کے مثل کلام لانے سے عاجز ہیں، اس وقت قرآن کا اعجاز تفصیل کے ساتھ ان کی سمجھ میں آسکتا ہے، اور عجمی ہونے کی صورت میں اجمالاً سمجھتے ہیں، اور اگرچہ اعجاز کا اجمالاً سمجھ لینا بھی کافی حجت ہے، جیسا کہ اہل عجم قرآن کے اعجاز کو اجمالاً ہی سمجھ سکتے ہیں اور ان کے حق میں یہی کافی حجت ہے، مگر ظاہر ہے کہ تفصیلاً سمجھنا زیادہ مؤثر اور بہت بڑی حجت ہے، الغرض یہ شبہات محض لغو ہیں، اصل مدار اعجاز پر ہے، جس کا پیچھے ذکر آچکا ہے، پس معلوم ہوا کہ قرآن کے حق ہونے میں تو کوئی کمی نہیں، اگر کوئی شخص نہ مانے تو اسی میں انصاف وغیرہ کی کمی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایک بات کو نہ ماننا ہو تو آدمی ہزار حیلے بہانے نکال سکتا ہے، کفار مکہ نے اور کچھ نہیں تو یہ ہی کہنا شروع کر دیا کہ صاحب! عربی پیغمبر کا معجزہ تو ہم اس وقت سمجھتے جب قرآن عربی کے سوا کسی اور زبان میں آتا، لیکن فرض کیجیے! اگر ایسا ہوتا تو جھٹلانے کے لیے یوں کہنے لگتے کہ بھلا صاحب! کہیں ایسی بے جوڑ بات بھی دیکھی ہے، کہ رسول عربی، اور اس کی قوم بھی جو اولین مخاطب ہے عرب، مگر کتاب بھیجی جائے ایسی زبان میں جس کا ایک حرف بھی عرب لوگ نہ سمجھ سکیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی لغو اور بیہودہ شبہات تو کبھی ختم نہیں ہوں گے، ہاں! اس قدر تجربہ ہر ایک آدمی کر سکتا ہے کہ یہ کتاب مقدس اپنے او پر ایمان لانے اور عمل کرنے والوں کی کیسی عجیب ہدایت وبصیرت اور سوجھ بوجھ عطا کرتی اور انکے قرنوں اور صدیوں کے روگ مٹا کر کس طرح بھلا چنگا کر دیتی ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جس طرح خفاش (شپرک) کی آنکھیں سورج کی روشنی میں چندھیا جاتی ہیں، ان منکروں کو بھی قرآن کی روشنی میں کچھ نظر نہیں آتا، اس میں قرآن کا کیا قصور ہے، منکروں کو چاہیے کہ اپنی نگاہ کا ضعف وقصور محسوس کر کے علاج کی طرف متوجہ ہوں۔

فائدہ: ۴؎ یعنی کسی کو دور سے آواز دو تو نہیں سنتا اور سنے تو اچھی طرح سمجھتا نہیں، اسی طرح منکرین قرآن بھی صداقت اور منبع صداقت سے اس قدر دور پڑے ہوئے ہیں کہ حق کی آواز ان کے دل کے کانوں تک نہیں پہنچتی اور کبھی پہنچتی ہے تو اسکا ٹھیک مطلب نہیں سمجھتے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ

اور ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اس میں اختلاف پڑا ۱؎ اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو پہلے نکل چکی تیرے رب کی طرف سے تو ان میں فیصلہ

بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝۴۵

ہو جاتا ۲؎ اور وہ ایسے دھوکے میں ہیں اس قرآن سے جو چین نہیں لینے دیتا ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے آپ ﷺ کی تسلی کے لیے اجمالی طور پر انبیاء کا ذکر ہوا، اب خاص طور پر موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوتا ہے: اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی سو اس میں بھی اختلاف ہوا (کسی نے مانا، کسی نے نہ مانا، یہ آپ کیلئے کوئی نئی بات نہیں ہوئی، اس لیے آپ مغموم نہ ہوں) اور (یہ منکرین ایسے مستحق عذاب ہیں کہ) اگر ایک بات نہ ہوتی جو آپ کے رب کی طرف سے پہلے ٹھہر چکی ہے (کہ پورا عذاب انکو آخرت میں دوں گا) تو ان کا (قطعی) فیصلہ (دنیا میں ہی) ہو چکا ہوتا اور یہ لوگ (دلائل قائم ہونے کے باوجود) ابھی تک اس (فیصلہ یعنی طے شدہ عذاب) کی طرف سے ایسے شک میں (پڑے) ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے (کہ انکو عذاب کا یقین ہی نہیں آتا، حالانکہ فیصلہ ضرور واقع ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جیسے آج قرآن کے ماننے اور نہ ماننے والوں میں اختلاف پڑ رہا ہے، پہلے تورات کے متعلق بھی ایسا ہی اختلاف پڑ چکا ہے، پھر دیکھ لو وہاں کیا انجام ہوا تھا۔

فائدہ: ۲؎ بات وہ ہی نکل چکی کہ فیصلہ آخرت میں ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی مہمل شکوک و شبہات ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتے، ہر وقت دل میں کھٹکتے رہتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۴۶

جس نے کی بھلائی سو اپنے واسطے اور جس نے کی برائی سو وہ بھی اسی پر، اور تیرا رب ایسا نہیں کہ ظلم کرے بندوں پر

خلاصہ تفسیر: (اور اس فیصلہ کا حاصل یہ ہے کہ) جو شخص نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے نفع کے لئے (یعنی وہاں اس کا نفع اور ثواب پائے گا) اور جو شخص برا عمل کرتا ہے اس کا وبال (یعنی ضرور عذاب) اسی پر پڑے گا، اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں (کہ کوئی نیکی جو شرائط کے مطابق عمل میں لائی گئی ہو اس کو شمار نہ کرے، یا کسی گناہ کو زیادہ شمار کر لے ایسا نہیں ہوگا)۔

* * *

فائدہ: یعنی خدا کے ہاں ظلم نہیں، ہر آدمی اپنے عمل کو دیکھ لے، جیسا کرے گا وہ ہی سامنے آئے گا، نہ کسی کی نیکی اس کے ہاں ضائع ہوگی نہ ایک کی بدی دوسرے پر ڈالی جائے گی۔

ربط: چونکہ نیکی بدی کا پورا پورا بدلہ قیامت کے دن ملے گا اور کفار اکثر سوال کرتے تھے کہ قیامت کب آئے گی؟ اس لیے اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۭ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ

اسی کی طرف حوالہ ہے قیامت کی خبر کا ۱؎ اور نہیں نکلتے کوئی میوے اپنے غلاف سے اور نہیں رہتا حمل مادہ کو اور نہ جنے کہ

اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَاۗءِيْ ۙ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ﴿٤٧﴾

جس کی اسکو خبر نہیں ۲؎ اور جس دن انکو پکارے گا کہاں ہیں میرے شریک ۳؎ بولیں گے ہم نے تجھ کو کہہ سنایا ہم میں کوئی اسکا اقرار نہیں کرتا ۴؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید ورسالت اور قرآن کے منکروں کو عذاب قیامت کی دھمکی دی گئی ہے، اب آگے ان تینوں کے متعلق مخلوط طور پر کلام ہے۔

(اوپر جس قیامت کا ذکر ہے کہ اس میں ان کو جزا ملے گی اس) قیامت کے علم کا حوالہ خدا ہی کی طرف دیا جاسکتا ہے (یعنی کفار جو انکار کے طور پر قیامت کا وقت دریافت کرتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ تو اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے، مخلوق کو اس کا علم نہ ہونے سے اس کا واقع نہ ہونا لازم نہیں آتا) اور (قیامت ہی کی کیا تخصیص ہے، اس کا علم تو ہر چیز کو محیط ہے حتیٰ کہ) کوئی پھل اپنے خول میں سے نہیں نکلتا اور نہ کسی عورت کو حمل رہتا ہے اور نہ وہ بچہ جنتی ہے مگر یہ سب اس کی اطلاع سے ہوتا ہے، اور (آگے قیامت کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس سے توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال بھی ہوتا ہے یعنی) جس روز اللہ تعالیٰ ان (مشرکین) کو پکارے گا (اور کہے گا) کہ (جن کو تم نے میرا شریک قرار دے رکھا تھا وہ) میرے شریک (اب) کہاں ہیں (ان کو بلاؤ کہ تم کو اس مصیبت سے بچائیں) وہ کہیں گے کہ (اب تو) ہم آپ سے یہی عرض کرتے ہیں کہ ہم میں کوئی (اس عقیدہ کا) مدعی نہیں (یعنی ہم اپنی غلطی کا اقرار کرتے ہیں، چونکہ وہاں سب عقائد کی حقیقتیں منکشف ہوجائیں گی، پس یہ اقرار یا تو بے اختیار ہوکر (اضطراری) کریں گے، یا اس لئے کہ اس سے کچھ نجات کی توقع ہو)۔

وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ: اس اطلاع کی وجہ یہ ہے کہ علم خدا کی ذاتی صفت ہے، جو اعلیٰ درجہ کا کمال ہونے کی وجہ سے توحید کی بھی دلیل ہے، اور چونکہ خدا کے علم کا تعلق تمام چیزوں کے ساتھ برابر ہے تو یہ اس کی بھی دلیل ہے کہ خدا کو قیامت کا علم ہے، پس اس سے دونوں مضمونوں کی تائید ہوگئی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اسی کو خبر ہے کہ قیامت کب آئے گی، بڑے سے بڑا نبی اور فرشتہ بھی اس کے وقت کی تعیین نہیں کرسکتا، جس سے دریافت کروگے یہی کہے گا: "ما المسئولُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّآئِلِ"۔

فائدہ: ۲؎ یعنی علم الٰہی ہر چیز کو محیط ہے، کوئی کھجور اپنے گابھے سے اور کوئی دانہ اپنے خوشہ اور کوئی میوہ یا پھل اپنے غلاف سے باہر نہیں آتا جس کی خبر خدا کو نہ ہو، نیز کسی عورت یا کسی مادہ (جانور) کے پیٹ میں جو بچہ موجود ہے اور جو چیز وہ جن رہی ہے سب کچھ اللہ کے علم میں ہے، اسی طرح سمجھ لو کہ موجودہ دنیا کے نتیجہ کے طور پر جو آخرت کا ظہور اور قیامت کا وقوع ہونے والا ہے، اس کا وقت بھی خدا ہی کو معلوم ہے کہ کب آئے گا، کوئی انسان یا فرشتہ اس کی خبر نہیں رکھتا، اور نہ اس کو خبر رکھنے کی ضرورت، ضرورت اس کی ہے کہ آدمی قیامت کی خبر پر اللہ کے فرمانے کے موافق یقین رکھے اور اس دن کی فکر کرے جب کوئی شریک کام نہ آئے گا اور کہیں مخلص نہ ملے گا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جن کو میری خدائی میں شریک ٹھہراتے تھے اب بلاؤ نا، وہ کہاں ہیں؟

فائدہ: ۴؎ یعنی ہم تو آپ سے صاف عرض کرچکے ہیں کہ ہم میں کوئی اقبالی مجرم نہیں جو اس جرم (شرک) کا اعتراف کرنے کو تیار ہو (گویا اس وقت نہایت دیدہ دلیری سے جھوٹ بول کر واقعہ کا انکار کرنے لگیں گے)۔

اور بعض نے شهيد کو بمعنی "شاہد" لے کر یہ مطلب لیا ہے کہ اس وقت ہم میں سے کوئی ان شرکاء کو یہاں نہیں دیکھتا۔

وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَظَنُّوۡا مَا لَهُمۡ مِّنۡ مَّحِيۡصٍ ﴿۴۸﴾

اور چوک گیا ان سے جو پکارتے تھے پہلے اور سمجھ گئے کہ ان کو کہیں نہیں خلاصی

خلاصہ تفسیر: اور جن جن کو یہ لوگ پہلے سے (یعنی دنیا میں) پوجا کرتے تھے وہ سب غائب ہو جائیں گے اور (جب یہ احوال دیکھیں گے تو) یہ لوگ سمجھ لیں گے کہ ان کے لئے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں (اس وقت جھوٹے خداؤں کا بے بس ہونا اور خدائے واحد کا حق ہونا معلوم ہو جائے گا)۔

وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَدۡعُوۡنَ: یا تو یہ مطلب ہے کہ حق واضح ہو جانے کی وجہ سے ان کے معبود ہونے کا اعتقاد سب کے ذہن سے غائب ہو جائے گا، یا یہ مراد ہے کہ وہ مدد نہ کر سکیں گے، اور بعض آیات میں جو آیا ہے کہ کفار سے کہا جائے گا کہ اپنے معبودوں کو پکارو اور وہ پکاریں گے فدعوهم فلم يستجيبوا لهم تو وہ اس آیت کے معارض نہیں، کیونکہ وہ پکارنا بدحواسی اور فرط حیرت سے ہوگا، اعتقاد سے نہ ہوگا۔

* * *

فائدہ: یعنی دنیا میں جنہیں خدا کا شریک بنا کر پکارتے تھے آج ان کا کہیں پتہ نہیں، وہ اپنے پرستاروں کی مدد کو نہیں آتے اور پرستاروں کے دلوں سے بھی وہ پکارنے کے خیالات اب غائب ہو گئے، انہوں نے بھی سمجھ لیا کہ خدائی سزا سے بچنے کی اب کوئی سبیل نہیں، اور گلوخلاصی کا کوئی ذریعہ نہیں، آخر آس توڑ کر بیٹھ رہے اور جن کی حمایت میں پیغمبروں سے لڑتے تھے، آج ان سے قطعاً بے تعلقی اور بیزاری کا اظہار کرنے لگے۔

لَا يَسۡـَٔمُ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ دُعَآءِ الۡخَيۡرِ ۫ وَاِنۡ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوۡسٌ قَنُوۡطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَئِنۡ اَذَقۡنٰهُ

نہیں تھکتا آدمی مانگنے سے بھلائی اور اگر لگ جائے اس کو برائی تو آس توڑ بیٹھے ناامید ہو کر، اور اگر ہم چکھائیں اس کو کچھ

رَحۡمَةً مِّنَّا مِنۡۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ لَيَقُوۡلَنَّ هٰذَا لِيۡ ۙ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنۡ رُّجِعۡتُ

اپنی مہربانی پیچھے ایک تکلیف کے جو اسکو پہنچی تھی تو کہنے لگے یہ ہے میرے لائق، اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آنے والی ہے، اور اگر میں پھر بھی گیا

اِلٰى رَبِّيۡۤ اِنَّ لِيۡ عِنۡدَهٗ لَلۡحُسۡنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِمَا عَمِلُوۡا ۫ وَلَنُذِيۡقَنَّهُمۡ

اپنے رب کی طرف بیشک میرے لیے ہے اس کے پاس خوبی لے سو ہم جتلا دیں گے منکروں کو جو انہوں نے کیا ہے، اور چکھائیں گے ان کو

مِّنۡ عَذَابٍ غَلِيۡظٍ ﴿۵۰﴾

ایک گاڑھا عذاب ۲ے

خلاصہ تفسیر: اب شرک وکفر کا ایک بڑا اثر جو انسانی طبیعت پر ہوتا ہے اس کو بیان فرماتے ہیں کہ:

(جو شخص توحید و ایمان سے بے بہرہ ہوتا ہے اس) آدمی (کے اخلاق، عقائد اور اعمال ایسے برے ہوتے ہیں کہ ایک تو کسی حالت میں یعنی فراخی اور تنگی دونوں میں) ترقی کی خواہش سے اس کا جی نہیں بھرتا (جو انتہائی حرص کی علامت ہے) اور (خاص تنگی وغیرہ کی حالت میں اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ) اگر اس کو کچھ تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید اور ہراساں ہو جاتا ہے (اور یہ انتہائی ناشکری اور اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کی علامت ہے) اور (جب تنگی دور ہو جاتی ہے تو اس وقت اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ) اگر ہم اس کو کسی تکلیف کے بعد جو کہ اس پر واقع ہوئی تھی اپنی مہربانی کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرے لئے ہونا ہی چاہئے تھا (کیونکہ یہ میری تدبیر، لیاقت اور فضیلت ہی کا نتیجہ ہے، اور یہ بھی انتہائی ناشکری اور تکبر ہے) اور (اس

نعمت میں یہاں تک پھولتا ہے اور بھولتا ہے کہ یوں بھی کہتا ہے کہ) میں قیامت کو آنے والا نہیں خیال کرتا، اور اگر (بفرض محال آئی بھی اور) میں اپنے رب کے پاس پہنچایا بھی گیا (جیسا کہ نبی کہتے ہیں) تو میرے لئے اس کے پاس بھی بہتری ہی ہے (کیونکہ میں حق پر ہوں اور اس کا مستحق ہوں، قیامت کا انکار جو انتہائی درجہ کفر ہے اور قیامت واقع ہونے کی صورت میں یہ گمان کہ وہاں بھی مجھے انعامات ملیں گے، یہ اللہ کے معاملے میں انتہائی دھوکہ میں مبتلا ہونا ہے، غرض کفر وشرک سے یہ مفاسد پیدا ہوئے) سو (یہ لوگ یہاں جو چاہیں اپنے حق پر ہونے یا اپنے مستحق ہونے کا دعوی کرلیں اب عنقریب) ہم ان منکروں کو ان کے (یہ) سب کردار ضرور بتلادیں گے اور ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھادیں گے۔

اس کے متعلق سورہ یونس آیت ۱۲: واذا مس الانسان الضر دعانا کے خلاصہ تفسیر میں ایک تحقیق گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی انسان کی طبیعت عجیب طرح کی ہے، جب دنیا کی ذرا سی بھلائی پہنچے اور کچھ عیش وآرام وتن درستی نصیب ہو، تو مارے حرص کے چاہتا ہے کہ اور زیادہ مزے اڑائے، کسی حد پر پہنچ کر اس کی حرص کا پیٹ نہیں بھرتا، اگر بس چلے تو ساری دنیا کی دولت لے کر اپنے گھر میں ڈال لے، لیکن جہاں ذرا کوئی افتاد پڑنا شروع ہوئی اور اسباب ظاہری کا سلسلہ اپنے خلاف دیکھا تو پھر مایوس اور ناامید ہوتے بھی دیر نہیں لگتی، اس وقت اس کا دل فوراً آس توڑ کر بیٹھ جاتا ہے، کیونکہ اس کی نظر صرف پیش آمدہ اسباب پر محدود ہوتی ہے، اس قادر مطلق مسبب الاسباب پر اعتماد نہیں رکھتا، جو چاہے تو ایک آن میں سلسلہ اسباب کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دے۔

اس مایوسی کے بعد اگر فرض کیجیے اللہ نے تکلیف ومصیبت دور کر کے اپنی مہربانی سے پھر عیش وراحت کا سامان کردیا تو کہنے لگتا ہے: ھذا لی یعنی میں نے فلاں تدبیر کی تھی، میری تدبیر اور لیاقت وفضیلت سے یوں ہی ہونا چاہیے تھا، اب نہ خدا کی مہربانی یاد رہی، نہ اپنی وہ مایوسی کی کیفیت جو چند منٹ پہلے قلب پر طاری تھی، اب عیش وآرام کے نشہ میں ایسا مخمور ہوجاتا ہے کہ آئندہ بھی کسی مصیبت اور تکلیف کے پیش آنے کا خطرہ نہیں رہتا، سمجھتا ہے کہ ہمیشہ اسی حالت میں رہوں گا اور اگر کبھی تاثرات کے دوران میں قیامت کا نام سن لیتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تو خیال نہیں کرتا کہ یہ چیز کبھی ہونے والی ہے اور فرض کرو ایسی نوبت آہی گئی اور مجھ کو لوٹ کر اپنے رب کی طرف جانا ہی پڑا، تب بھی مجھے یقین ہے وہاں میرا انجام بہتر ہوگا، اگر میں خدا کے نزدیک برا اور نالائق ہوتا تو دنیا میں مجھ کو یہ عیش وبہار کے مزے کیونکر ملتے؟! لہذا وہاں بھی توقع ہے کہ یہی معاملہ میرے ساتھ ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی خوش ہولو کہ اس کفر وغرور کے باوجود وہاں بھی مزے لوٹو گے؟ وہاں پہنچ کر پتہ لگ جائے گا کہ منکروں کو کیسی سخت سزا بھگتنا پڑتی ہے اور کس طرح عمر بھر کے کرتوت سامنے آتے ہیں۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَاۗءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾

اور جب ہم نعمتیں بھیجیں انسان پر تو ٹلا جائے اور موڑ لے اپنی کروٹ، اور جب لگے اس کو برائی تو دعائیں کرے چوڑی

خلاصہ تفسیر: اور (کفر وشرک کا ایک اثر یہ بھی ہے کہ) جب ہم (ایسے) آدمی کو نعمت عطا کرتے ہیں تو (ہم سے اور ہمارے احکام سے) منہ موڑ لیتا ہے اور کروٹ پھیر لیتا ہے (جو انتہائی درجہ کی ناشکری ہے) اور (تنگی وضرر کی حالت میں کفر وشرک کے آثار میں سے ایک یہ ہے کہ) جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو (نعمت کے چھن جانے پر بطور التجا نہیں، بلکہ جزع وفزع کے طور پر) خوب لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے (اور یہ انتہائی درجہ کی بے صبری اور دنیا کی محبت میں انہماک ہے)۔

فَذُوْ دُعَاۗءٍ عَرِيْضٍ: اس جگہ اس کافر انسان کی جو مذمت کی گئی ہے وہ درحقیقت طول دعا پر نہیں، بلکہ اس کی اس مجموعی مذموم خصلت پر ہے کہ جب اس پر اللہ تعالیٰ نعمت کی روانی فرمادیں تو تکبر اور غرور میں مدہوش ہوجائے اور جب مصیبت آئے تو اپنی پریشانی کو بار بار پکارتا اور کہتا پھرے جیسا غافل لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اللہ سے دعا کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ اپنا دکھڑا رونا اور لوگوں سے کہتے رہنا مقصود ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کی نعمتوں سے متمتع ہونے کے وقت تو منعم کی حق شناسی اور شکرگزاری سے اعراض کرتا اور بالکل بے پروا ہو کر ادھر سے کروٹ بدل لیتا ہے، پھر جب کوئی تکلیف اور مصیبت پیش آتی ہے تو اسی خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا کر لمبی چوڑی دعائیں مانگنے لگتا ہے، شرم نہیں آتی کہ اب اسے کس منہ سے پکارے اور تماشا یہ ہے کہ بعض اوقات اسباب پر نظر کر کے دل اندر سے مایوس ہوتا ہے، اس حالت میں بھی بدحواس اور پریشان ہو کر دعا کے ہاتھ بے اختیار خدا کی طرف اٹھ جاتے ہیں، قلب میں ناامیدی بھی ہے اور زبان پر ''یا اللہ!'' بھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ سب بیان ہے انسان کے نقصان (وقصور) کا، نہ سختی میں صبر ہے، نہ نرمی میں شکر۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾

تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر یہ ہو اللہ کے پاس سے پھر تم نے اس کو نہ مانا پھر اس سے گمراہ زیادہ کون جو دور چلا جائے مخالف ہو کر

خلاصہ تفسیر: آگے رسالت اور قرآن کی حقانیت کی طرف دعوت دینے کے لئے ارشاد ہے کہ اے پیغمبر ﷺ!:

آپ (ان منکرین سے) کہئے کہ (اے منکرو! قرآن کے حق ہونے پر جو دلائل قائم ہیں جیسے اس کا معجزہ ہونا اور غیب کی خبریں صحیح صحیح دینا وغیرہ، اگر تم غور و تدبر نہ کرنے کی وجہ سے ان کو یقین حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں سمجھتے تو کم از کم ان دلائل سے قرآن کے حق ہونے کا احتمال تو ضرور ہوگا، اور اس احتمال کے درجہ کا انکار تم بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ تمہارے پاس ایسی کوئی دلیل تو ہے نہیں جس سے تم قرآن کا من جانب اللہ نہ ہونا ثابت کر دو، سو) بھلا یہ بتلاؤ کہ اگر (مذکورہ احتمال کی بنا پر) یہ قرآن خدا کے یہاں سے آیا ہو اور پھر تم اس کا انکار کرو تو ایسے شخص سے زیادہ کون غلطی میں ہوگا جو (حق سے) ایسی دور دراز کی مخالفت میں پڑا ہو (جب اس میں حق ہونے کا احتمال ہے تو انکار اور تکذیب کی صورت میں تمہارے گمراہ ہونے کا بھی احتمال ہے، اور عقلاً گمراہی کے احتمال سے بھی بچنا واجب ہے، اور وہ اس پر موقوف ہے کہ تم قرآن میں غور و فکر اور تدبر کرو، پس انکار میں جلدی نہ کرو، بلکہ سوچ سمجھ سے کام لو تا کہ حق تم پر واضح اور متعین ہو جائے)۔

* * *

فائدہ: اوپر انسان کی طبیعت کا عجیب و غریب نقشہ کھینچ کر اس کی کمزوریوں اور بیماریوں پر نہایت موثر انداز میں توجہ دلائی تھی، اب تنبیہ کرتے ہیں کہ یہ کتاب جو تمہاری کمزوریوں پر آگاہ کرنے والی اور انجام کی طرف توجہ دلانے والی ہے، اگر خدا کے پاس سے آئی ہو (جیسا کہ واقع میں ہے) پھر تم نے اس کو نہ مانا، اور ایسی اعلیٰ اور بیش قیمت نصائح سے منکر رہ کر اپنی عاقبت کی فکر نہ کی، بلکہ حق کی مخالفت میں دور ہوتے چلے گئے تو کیا اس سے بڑھ کر گمراہی اور نقصان و خسارہ کچھ اور ہو سکتا ہے!!۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ

اب ہم دکھلائیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں اور خود انکی جانوں میں یہاں تک کہ کھل جائے ان پر کہ یہ ٹھیک ہے [1] کیا تیرا رب تھوڑا ہے

اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۵۳﴾

ہر چیز پر گواہ ہونے کے لیے [2]

خلاصہ تفسیر: (اور ان لوگوں سے تو کیا امید ہے کہ غور فکر اور تدبر کریں گے مگر خیر) ہم (خود ہی) عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں (جو کہ قرآن کے سچے ہونے پر دلالت کرتی ہوں) ان کے گرد و نواح میں بھی دکھائیں گے (کہ قرآن کی پیشین گوئی کے موافق عرب کے اطراف و جوانب سب فتح ہو جائیں گے) اور خود ان کی ذات (خاص) میں بھی (دکھلائیں گے کہ بدر میں مارے جائیں گے اور ان کا وطن مکہ بھی فتح

ہوجائے گا) یہاں تک کہ (ان پیشین گوئیوں کے سچ ہونے سے مجبور ہوکر بے اختیار) ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ وہ قرآن حق ہے (کہ اس کی پیشین گوئیاں کس طرح سچی ہورہی ہیں، غرض اس کی حقانیت ایک روز ظاہر ہوکر رہے گی، باقی فی الحال جو یہ لوگ آپ کی وحی و رسالت کا انکار کررہے ہیں اس سے آپ مغموم نہ ہوں، کیونکہ اگر یہ لوگ اس پر شہادت نہ دیں تو) کیا آپ کے رب کی بات (آپ کی حقانیت کی شہادت اور تسلی کے لئے) کافی نہیں کہ وہ ہر (واقعی) چیز کا شاہد ہے (اور اس نے جا بجا آپ کی رسالت کی شہادت دی ہے، قول سے بھی اور عمل سے بھی کہ آپ کی رسالت کی دلیل میں بہت سے معجزات ظاہر کیے ہیں، پس اس کی گواہی کافی ہے)۔

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ: اگرچہ یہ اضطراری و مجبوری علم اختیاری تصدیق کے بغیر معتبر نہیں، مگر اس سے حجت تمام کرنے میں تو قوت زیادہ ہوجائے گی، غرض اس کی حقانیت ایک روز ظاہر ہوکر رہے گی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قرآن کی حقانیت کے دوسرے دلائل و براہین تو بجائے خود ہیں، اب ہم ان منکروں کو خود ان کی جانوں میں اور ان کے چاروں طرف سارے عرب بلکہ ساری دنیا میں اپنی قدرت کے وہ نمونے دکھلائیں گے جن سے قرآن اور حامل قرآن کی صداقت بالکل روز روشن کی طرح آنکھوں سے نظر آنے لگے، وہ نمونے کیا ہیں؟ وہ ہی اسلام کی عظیم الشان اور محیر العقول فتوحات جو سلسلہ اسباب ظاہری کے بالکل برخلاف قرآنی پیشین گوئیوں کے عین مطابق وقوع پذیر ہوئیں۔ چنانچہ معرکہ بدر میں کفار مکہ نے خود اپنی جانوں کے اندر اور فتح مکہ میں مرکز عرب کے اندر اور خلفائے راشدین کے عہد میں تمام جہان کے اندر یہ نمونے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیات سے عام نشانہائے قدرت مراد ہوں، جو غور کرنے والوں کو اپنے وجود میں اور اپنے وجود سے باہر تمام دنیا کی چیزوں میں نظر آتے ہیں، جن سے حق تعالیٰ کی وحدانیت وعظمت کا ثبوت ملتا ہے اور قرآن کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے، جبکہ وہ ان سنن الٰہیہ اور نوامیس فطریہ کے موافق ثابت ہوتے ہیں جو اس عالم تکوین میں کارفرما ہیں، اس قسم کے تمام حقائق کونیہ اور آیات آفاقیہ وانفسیہ کا انکشاف چونکہ لوگوں کو دفعتاً نہیں ہوتا، بلکہ وقتاً فوقتاً بتدریج ان کے چہرہ سے پردہ اٹھتا رہتا ہے، اس لیے سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا سے تعبیر فرمایا۔

فائدہ: ۲ یعنی قرآن کی حقانیت کو فرض کرو کوئی نہ مانے، تو اس کیلئے خدا کی گواہی کیا تھوڑی ہے، جو ہر چیز پر گواہ ہے اور ہر چیز میں غور کرنے سے اس کی گواہی کا ثبوت ملتا ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝ ع

سنتا ہے وہ دھوکے میں ہیں اپنے رب کی ملاقات سے، سنتا ہے وہ گھیر رہا ہے ہر چیز کو

خلاصہ تفسیر: اب ان لوگوں کے انکار کی اصل وجہ بتلاتے ہیں جس سے آپ کو تسلی بھی زیادہ ہوسکتی ہے۔

یاد رکھو کہ وہ لوگ اپنے رب کے روبرو جانے کے طرف سے شک میں پڑے ہیں (اس لئے دل میں ڈر نہیں جس سے حق کو طلب کریں مگر) یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو (اپنے علم سے) احاطے میں لئے ہوئے ہے (پس وہ ان کے شک و شبہ کو بھی جانتا ہے اور اس پر سزا دے گا)۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ اس دھوکے میں ہیں کہ کبھی خدا سے ملنا اور اس کے سامنے جانا نہیں، حالانکہ خدا تعالیٰ ہر وقت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کسی وقت بھی اس کے قبضہ اور احاطہ سے نکل کر نہیں جاسکتے، اگر مرنے کے بعد ان کے بدن کے ذرات مٹی میں مل جائیں، یا پانی میں بہہ جائیں، یا ہوا میں منتشر ہوجائیں، تب بھی ایک ایک ذرہ پر اللہ کا علم اور قدرت محیط ہے، ان کو جمع کرکے از سر نو زندہ کردینا کچھ مشکل نہیں۔

آیاتہا ۵۳ ۔ ۴۲ سُوْرَۃُ الشُّوْرٰی مَکِّیَّۃٌ ۶۲ ۔ رکوعاتہا ۵

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ۝۱ عٓسٓقٓ ۝۲ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳

حم ، عسق ، اسی طرح وحی بھیجتا ہے تیری طرف اور تجھ سے پہلوں کی طرف اللہ زبردست حکمتوں والا

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۴

اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور وہی ہے سب سے اوپر بڑا [1]

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت توحید و رسالت اور قیامت و قرآن کی حقانیت کے بیان پر ختم ہوئی تھی، اور یہ سورت انہی مضامین سے شروع ہوئی ہے، پس دونوں میں تناسب ظاہر ہے۔

حٰمٓ عسق (اس کے معنی تو اللہ ہی کو معلوم ہیں، جس طرح اصول دین کی تحقیق اور عظیم فوائد کے لئے یہ سورت آپ پر نازل ہو رہی ہے) اسی طرح آپ پر اور جو (پیغمبر) آپ سے پہلے ہو چکے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ جو زبردست حکمت والا ہے (دوسری سورتوں اور کتابوں کی) وحی بھیجتا رہا ہے (اور اس کی یہ شان ہے کہ) اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہی سب سے برتر اور عظیم الشان ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جس طرح یہ سورت (جو نہایت اعلیٰ واکمل مضامین پر مشتمل ہے) آپ کی طرف وحی کی جا رہی ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی عادت آپ کی طرف اور دوسرے انبیاء کی طرف وحی بھیجنے کی رہی ہے، جس سے اس کی شان حکمت وحکومت کا اظہار ہوتا ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ

قریب ہے کہ پھوٹ پڑیں آسمان اوپر سے [1] اور فرشتے پاکی بولتے ہیں خوبیاں اپنے رب کی اور گناہ بخشواتے ہیں

لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵

زمین والوں کے [2] سنتا ہے وہی اللہ معاف کرنے والا مہربان [3]

خلاصہ تفسیر: (خدا کی عظمت شان کو اگر کچھ زمین والے نہ پہچانیں اور نہ مانیں مگر آسمانوں میں اس کی معرفت رکھنے والے اور عظمت کو پہچاننے والے فرشتے اس کثرت سے ہیں کہ) کچھ بعید نہیں کہ آسمان (ان کے بوجھ کی وجہ سے) اپنے اوپر سے (کہ بوجھ ادھر ہی سے پڑتا ہے) پھٹ پڑیں، اور (وہ) فرشتے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں، اور اہل زمین (میں جو لوگ خدا کی عظمت کا حق ادا نہیں کرتے، بلکہ شرک و کفر میں مبتلا ہیں اور اس وجہ سے وہ فوری عذاب کے مستحق ہیں تو فرشتے ان) کے لئے (ایک خاص وقت تک) معافی مانگتے ہیں (اس محدود معافی مانگنے سے مراد یہ ہے کہ فرشتے حق تعالیٰ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ دنیا میں کفار پر ایسا سخت عذاب نہ آجائے جس سے سبھی ہلاک ہو جائیں، اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کی اس دعاء و درخواست کو قبول فرما کر ان کو دنیا کے عذاب عام سے بچا لیتا ہے) خوب سمجھ لو کہ اللہ ہی معاف کرنے والا اور رحمت کرنے والا ہے (اگرچہ کفار کے لیے یہ محدود معافی اور رحمت صرف دنیا کی حد تک ہوتی ہے)۔

يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ: جیسا کہ حدیث میں ہے: "اطت السماء وحق لها ان تئط ما فيها موضع اربعة اصابع الا و ملك واضع جبهته ساجدا لله"، یعنی آسمان میں ایسی آواز پیدا ہونے لگی جیسی کسی چیز پر زیادہ بوجھ پڑ جانے سے ہوا کرتی ہے، اور اس میں ایسی ہی آواز ہونی چاہئے، کیونکہ پورے آسمانوں میں چار انگشت کی جگہ بھی ایسی نہیں جس میں کوئی فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے خدا کے سامنے سجدہ نہ کر رہا ہو، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں میں ثقل اور بوجھ بھی ہے، اور یہ کچھ بعید نہیں، کیونکہ فرشتوں کا اجسام ہونا تو قطعی دلائل سے ثابت ہے اگرچہ اجسام لطیفہ ہوں، اور اجسام لطیفہ جب بہت بڑی تعداد میں ہو جائیں تو ان کا ثقل یا بوجھ پڑنا کچھ تعجب کی بات نہیں، غرض آسمانوں میں فرشتے اس کثرت سے ہیں کہ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں۔

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ: یعنی حق تعالیٰ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ دنیا میں کفار پر ایسا عذاب نازل نہ کیا جائے جو ان کو بالکل جڑ ہی سے ختم کر دے، بلکہ ان کو کچھ مہلت دی جائے، پس دنیا کی معمولی سزائیں یا آخرت کا اصلی عذاب اس استغفار کے مفہوم سے خارج ہے، فرشتے اس سے معافی کی دعا نہیں کرتے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آسمان پھٹ پڑیں: ① اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کے زور سے ② یا بیشمار فرشتوں کے بوجھ سے ③ یا ان کے ذکر کی کثرت سے خاص تاثیر ہوا اور پھٹ پڑے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آسمانوں میں چار انگشت جگہ نہیں، جہاں کوئی فرشتہ سر بسجود نہ ہو، اور بعض نے آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ جب مشرکین خدا تعالیٰ کے لیے شریک اور بیٹے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں تو خداوند قدوس کی جناب میں یہ ایسی سخت گستاخی ہے جس سے کچھ بعید نہیں کہ آسمان کی اوپر والی سطح تک پھٹ کر ٹکڑے ہو جائے، كما قال تعالىٰ في سورة مريم: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (مریم: ۹۰-۹۱) مگر اللہ کی شان مغفرت ورحمت اور ملائکہ کی تسبیح واستغفار کی برکت سے یہ نظام تھما ہوا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کی خطاء ولغزش کو معاف فرمائے اور کفار کو دنیا میں ایک دم پکڑ کر بالکلیہ تباہ و برباد نہ کر دے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اپنی مہربانی سے فرشتوں کی دعا قبول کر کے مومنین کی خطاؤں کو معاف کرتا اور کافروں کو ایک عرصہ کے لیے مہلت دیتا ہے، ورنہ دنیا کا سارا کارخانہ چشم زدن میں درہم برہم ہو جائے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ⑥

اور جنہوں نے پکڑے ہیں اس کے سوا رفیق اللہ کو وہ سب یاد ہیں، اور تجھ پر نہیں ان کا ذمہ

خلاصہ تفسیر: اور (آپ دنیا میں ان کفار ومشرکین پر عذاب نازل نہ ہونے سے مغموم نہ ہوں، کیونکہ) جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز قرار دے رکھے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے (برے اعمال) کو دیکھ بھال رہا ہے (جس کی سزا اُن کو مناسب وقت پر ملے گی) اور آپ کو ان پر کوئی اختیار نہیں دیا گیا (کہ آپ جب چاہیں ان پر عذاب نازل کرا دیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی دنیا میں مشرکین کو مہلت تو دیتا ہے، لیکن یہ نہ سمجھو کہ وہ ہمیشہ کے لیے بچ گئے، ان کے سب اعمال واحوال اللہ کے ہاں محفوظ ہیں جو وقت پر کھول دیے جائیں گے، آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ یہ مانتے کیوں نہیں، اور نہ ماننے کی صورت میں فوراً تباہ کیوں نہیں کر دیے جاتے، آپ ان باتوں کے ذمہ دار نہیں صرف پیغامِ حق پہنچا دینے کے ذمہ دار ہیں، آگے ہمارا کام ہے وقت آنے پر ہم ان کا سب حساب چکا دیں گے۔

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ

اور اسی طرح اتارا ہم نے تجھ پر قرآن عربی زبان کا کہ تو ڈر سنا دے بڑے گاؤں کو اور اسکے آس پاس والوں کو ۱ اور خبر سنا دے جمع ہونے کے دن

لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ ⑦

کی اس میں دھوکا نہیں، ایک فرقہ بہشت میں اور ایک فرقہ آگ میں ۲

خلاصہ تفسیر: اور (آپ ان کے ایمان نہ لانے سے بھی غمگین نہ ہوں، کیونکہ آپ کا کام تبلیغ یعنی احکام کا پہنچا دینا ہے، وہ آپ کر چکے، اس سے زیادہ کی فکر آپ نہ کریں، چنانچہ) ہم نے اسی طرح (جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں) آپ پر قرآن عربی وحی کے ذریعہ سے (محض اس لئے) نازل کیا ہے تا کہ آپ (سب سے پہلے) مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے آس پاس (بستے) ہیں ان کو ڈرائیں اور (یہ ڈرانا بھی ایک بڑی چیز سے ہے یعنی) جمع ہونے کے دن سے ڈرائیں (مراد اس سے قیامت ہے جس میں سب اولین و آخرین ایک میدان میں جمع ہوں گے) جس (کے آنے میں) میں ذرا شک نہیں (جس میں فیصلہ یہ ہوگا کہ) ایک گروہ جنت میں (داخل) ہوگا ایک گروہ دوزخ میں (داخل) ہوگا (پس آپ کا کام محض ایسے دن سے ڈرانا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ اُمّ القریٰ (بڑا گاؤں) فرمایا مکہ معظمہ کو کہ سارے عرب کا مجمع وہاں ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اللہ کا گھر وہیں ہے اور وہی گھر روئے زمین پر سب سے پہلی عبادت گاہ قرار پائی، بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں اللہ تعالیٰ نے زمین کو اسی جگہ سے پھیلانا شروع کیا، جہاں خانہ کعبہ واقع ہے، اور مکہ کے آس پاس سے: ① اول ''ملک عرب''، اس کے بعد ② ''ساری دنیا'' مراد ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی آگاہ کر دیں کہ ایک دن آنے والا ہے، جب تمام اگلے پچھلے خدا کی پیشی میں حساب کے لیے جمع ہوں گے، یہ ایک یقینی اور طے شدہ بات ہے، جس میں کوئی دھوکا، فریب اور شک وشبہ کی گنجائش نہیں، چاہیے کہ اس دن کے لیے آدمی تیار ہو جائے، اس وقت کل آدمی دو فرقوں میں تقسیم ہوں گے: ایک فرقہ ① جنتی اور ایک ② دوزخی، سوچ لو کہ تم کو کس فرقہ میں شامل ہونا چاہیے اور اس میں شامل ہونے کے لیے کیا سامان کرنا چاہیے؟!۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِىْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ

اور اگر چاہتا اللہ تو سب لوگوں کو کرتا ایک ہی فرقہ لیکن وہ داخل کرتا ہے جس کو چاہے اپنی رحمت میں، اور گناہگار جو ہیں ان کا کوئی نہیں

مِّنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ⑧

رفیق اور نہ مددگار

خلاصہ تفسیر: اور (رہا ان کا ایمان لانا یا نہ لانا تو یہ مشیت الٰہی پر موقوف ہے) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو ان سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا (یعنی سب کو ایمان نصیب ہو جاتا جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: **ولو شئنا لاتینا کل نفس ھداھا** یعنی اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو صحیح ہدایت پر پہنچا دیتے) لیکن (بہت سی حکمتوں کی بنا پر اس کو یہ منظور نہیں ہوا، بلکہ) وہ جس کو چاہتا ہے (ایمان دے کر) اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے (اور جس کو چاہتا ہے کفر وشرک پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ رحمت میں داخل نہیں ہوتا) اور (ان) ظالموں کا (جو کہ کفر وشرک میں مبتلا ہیں قیامت کے روز) کوئی حامی اور مددگار نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی بیشک اس کو قدرت تھی، اگر چاہتا تو سب کو ایک طرح کا بنا دیتا اور ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا، لیکن اس کی حکمت اسی کو مقتضی ہوئی کہ اپنی رحمت وغضب دونوں قسم کی صفات کا اظہار فرمائے، اس لیے بندوں کے احوال میں اختلاف وتفاوت رکھا، کسی کو اس کی فرمانبرداری کی وجہ سے اپنی رحمت کا مورد بنایا اور کسی کو اس کے ظلم وعصیان کی بناء پر رحمت سے دور پھینک دیا، جو لوگ رحمت سے دور ہو کر غضب کے مستحق ہوئے اور حکمت الٰہیہ ان پر سزا جاری کرنے کو مقتضی ہوئی ان کا ٹھکانا کہیں نہیں، نہ کوئی رفیق اور مددگار ان کو مل سکتا ہے، جو اللہ کی سزا سے بچا دے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

کیا انہوں نے پکڑے ہیں اس سے ورے کام بنانے والے، سو اللہ جو ہے وہی ہے کام بنانے والا اور وہی جلاتا ہے مردوں کو، اور وہ ہر چیز کر سکتا ہے

خلاصہ تفسیر: (پیچھے شرک پر دھمکی تھی اب شرک کا ابطال کیا جاتا ہے) کیا ان لوگوں نے خدا کے سوا دوسرے کارساز قرار دے رکھے ہیں، سو (اگر کارساز بنانا ہے تو) اللہ ہی کارساز (بنانے کا مستحق) ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (تو کارساز بنانے کے لائق وہی ہے جو ہر چیز پر یہاں تک کہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے، اور اس کی قدرت کی خصوصیت یہ ہے کہ اور چیزوں پر تو برائے نام قدرت کچھ دوسروں کو بھی اس وقت حاصل ہے مگر مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت میں کوئی برائے نام بھی اس کا شریک نہیں تو اس وقت خدا تعالیٰ کی قدرت کامل طور پر ظاہر ہوگی)۔

* * *

فائدہ: یعنی رفیق ومددگار بنانا ہے تو اللہ کو بناؤ جو سارے کام بنا سکتا ہے، حتیٰ کہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، یہ بے چارے عاجز ومجبور رفیق تمہارا کیا ہاتھ بٹائیں گے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ

اور جس بات میں جھگڑا کرتے ہو تم لوگ کوئی چیز ہو اس کا فیصلہ ہے اللہ کے حوالے ۱؎ وہ اللہ ہے رب میرا اسی پر ہے مجھ کو بھروسہ

وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝۱۰

اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے تین مضمونوں میں جو توحید کا مضمون تھا اب آگے بھی اسی کی تاکید ہے۔

اور (آپ ان لوگوں سے جو توحید میں آپ سے اختلاف رکھتے ہیں یہ کہئے کہ) جس جس بات میں تم (اہل حق کے ساتھ) اختلاف کرتے ہو اس (سب) کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد ہے (وہ فیصلہ یہ ہے کہ دنیا میں دلائل ومعجزات کے ذریعہ توحید کا حق ہونا واضح فرما دیا، اور آخرت میں اس فیصلہ سے کہ ایمان والوں کو جنت اور ایمان نہ لانے والوں کو جہنم میں ڈالا جائے گا) یہ اللہ (جس کی یہ شان ہے) میرا رب ہے (اور تمہارے اختلاف ومخالفت سے جو کسی تکلیف ونقصان کے پہنچنے کا مجھے اندیشہ ہو سکتا ہے اس کے بارے میں) اسی پر توکل رکھتا ہوں اور (دنیا ودین کے سب کاموں میں) اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں (پس نہ ان نقصانات سے ڈرتا ہوں اور نہ توحید میں کوئی شبہ کرتا ہوں جس کو خدا نے حق کہہ دیا ہے، اس سے توحید کا مضمون خوب پختہ ہو گیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سب جھگڑوں کے فیصلے اسی کے سپرد ہونے چاہئیں، عقائد ہوں یا احکام، عبادات ہوں یا معاملات، جس چیز میں بھی اختلاف پڑ جائے، اس کا بہترین فیصلہ اللہ کے حوالہ ہے، وہ دلائل کونیہ کے ذریعہ سے، یا اپنی کتاب میں، یا اپنے رسولوں کی زبان پر صراحۃً، یا اشارۃً

جس مسئلہ کا جو فیصلہ فرما دے، بندہ کو حق نہیں کہ اس میں چون و چرا کرے، توحید جو اصل اصول ہے، اللہ تعالیٰ جب قولاً وفعلاً برابر اس کا حکم دیتا رہا ہے، پھر کیونکر جائز ہوگا کہ بندہ ایسے قطعی اور محکم فیصلہ میں جھگڑے ڈالے اور بے ہودہ شبہات نکال کر اس کے فیصلہ سے سرتابی کرے۔

فائدہ: ۲ یعنی میں اسی پر ہمیشہ سے بھروسہ رکھتا ہوں اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع ہوتا رہتا ہوں۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ

بنا نکالنے والا آسمانوں کا اور زمین کا، بنا دیے تمہارے واسطے تمہی میں سے جوڑے اور چوپایوں میں سے جوڑے ۱

يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪

بکھیرتا ہے تم کو اسی طرح ۲ نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی ۳ اور وہی ہے سننے والا دیکھنے والا ۴

خلاصہ تفسیر: (اب دوسری صفات کمال کے بیان سے توحید کی مزید تاکید کی جاتی ہے) وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (اور تمہارا بھی پیدا کرنے والا ہے، چنانچہ) اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس کے جوڑے بنائے اور (اسی طرح) مواشی کے جوڑے بنائے (اور) اس (جوڑے ملانے) کے ذریعہ تمہاری نسل چلاتا رہتا ہے (وہ ذات وصفات میں ایسا کامل ہے کہ) کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے (بخلاف دوسروں کے کہ ان کا سننا دیکھنا بہت محدود ہے، وہ کسی بات کو سنتے دیکھتے ہیں اور کسی کو نہیں سنتے دیکھتے، پس اس صفت میں بھی کوئی اس کے مثل نہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی چوپایوں میں سے ان کے جوڑے نر اور مادہ بنا دیے کہ وہ بھی تمہارے کام آئے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی آدمیوں کے الگ اور جانوروں کے الگ جوڑے بنا کر ان کی کتنی نسلیں پھیلا دیں، جو تمام روئے زمین پر اپنی روزی اور معیشت کی فکر میں جدوجہد کرتی ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی نہ ذات میں اس کا کوئی مماثل ہے، نہ صفات میں، نہ اس کے احکام اور فیصلوں کی طرح کسی کا حکم اور فیصلہ ہے، نہ اس کے دین کی طرح کوئی دین ہے، نہ اس کا کوئی جوڑا ہے، نہ ہمسر، نہ ہم جنس۔

فائدہ: ۴ یعنی بیشک ہر چیز کو دیکھتا سنتا ہے، مگر اس کا دیکھنا بھی مخلوق کی طرح نہیں، کمالات اس کی ذات میں سب ہیں، پر کوئی کمال ایسا نہیں جس کی کیفیت بیان کی جاسکے، کیونکہ اس کی نظیر کہیں موجود نہیں، وہ مخلوق کی مشابہت ومماثلت سے بالکلیہ پاک اور مقدس ومنزہ ہے، پھر اس کی صفات کی کیفیت کس طرح سمجھ میں آئے۔

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑫

اسی کے پاس ہیں کنجیاں آسمانوں کی اور زمین کی، پھیلا دیتا ہے روزی جس کے واسطے چاہے اور ناپ کر دیتا ہے، وہ ہر چیز کی خبر رکھتا ہے

خلاصہ تفسیر: اسی کے اختیار میں ہیں کنجیاں آسمانوں کی اور زمین کی (یعنی ان میں تصرف کرنے کا صرف اسی کو حق ہے جس میں سے ایک تصرف یہ ہے کہ) جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور (جس کو چاہے) کم دیتا ہے، بیشک وہ ہر چیز کا پورا جاننے والا ہے (کہ کس کے لیے کیا مصلحت ہے، پس ہر ایک کو مصلحت کے مطابق مناسب رزق دیتا ہے)۔

* * *

فائدہ: تمام خزانوں کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں، اسی کو قبضہ اور اختیار حاصل ہے کہ جس خزانہ میں سے جس کو جتنا چاہے مرحمت

فرمائے، تمام جانداروں کو وہ ہی روزی دیتا ہے، لیکن کم وبیش کی تعیین اپنی حکمت کے موافق کرتا ہے، اسی کو معلوم ہے کہ کون چیز کتنی عطا کی مستحق ہے اور اس کے حق میں کس قدر دینا مصلحت ہوگا، جو حال روزی کا ہے، وہ ہی دوسری عطایا میں سمجھو۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ

راہ ڈال دی تمہارے لیے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو

وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ

اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو ۱؎ یہ کہ قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں ۲؎ بھاری ہے شرک کرنے والوں کو وہ چیز جس کی طرف تو ان کو بلاتا

اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝۱۳

ہے، اللہ چن لیتا ہے اپنی طرف سے جس کو چاہے اور راہ دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع لائے ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ میں فرمایا تھا کہ تمام اختلافات کا فیصلہ حق تعالیٰ کے سپرد ہے جو کہ فیصلہ دنیوی واخروی دونوں کو شامل ہے، اب آگے دنیوی فیصلہ بیان فرماتے ہیں اور اسی مضمون سے رسالت کی بھی تاکید ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کو (مع ان کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی امتوں کو یہ کہا تھا) کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا (حاصل یہ کہ توحید، رسالت وغیرہ کی تعلیم دین قدیم ہے کہ شروع سے اس وقت تک تمام شریعتیں اس میں متفق رہی ہیں اور اسی کے ضمن میں نبوت کی بھی تائید ہوگئی، پس چاہئے تھا کہ اس کے قبول کرنے میں لوگوں کو ذرا پس وپیش نہ ہوتا مگر پھر بھی) مشرکین کو وہ بات (یعنی توحید) بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں (اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ) اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے (یعنی دین حق قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے) اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے (خلاصہ یہ کہ مشیت الٰہی کے بعد ایمان کی توفیق (اجتباء) ہوتی ہے، اور اس توفیق (اجتباء) کے بعد اگر خدا کی طرف رجوع اور اطاعت بھی ہو تو اس پر قرب الٰہی اور بے انتہا ثواب عطا ہوتا ہے، غرض مشرکین تو اعتراض اور بے رخی کرتے ہیں، اور مؤمنین کو خدا نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے)۔

اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ: اس جگہ ''دین'' سے مراد ''اصول دین'' ہیں جیسے توحید، رسالت اور قیامت وغیرہ کا عقیدہ جو کہ تمام شریعتوں میں مشترک ہے، اور ''قائم رکھنے'' سے مراد یہ ہے کہ اس کو تبدیل مت کرنا اور اس کو ترک مت کرنا، اور ''تفرقہ ڈالنا'' یہ ہے کہ کسی بات پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں، یا کوئی ایمان لائے اور کوئی نہ لائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں حکم اس دین مشترک اور متفق علیہ کے قائم رکھنے کا ہے، جس پر تمام انبیاء علیہم السلام متفق اور مشترک چلے آئے ہیں، اس میں اختلاف کو ''تفرق'' کے لفظ سے تعبیر کر کے ممنوع کیا گیا ہے، انہی قطعی احکام میں اختلاف وتفرق کو احادیث میں ایمان کے لئے خطرہ اور سبب ہلاکت فرمایا ہے، اس سے واضح ہوگیا کہ فروعی مسائل میں جہاں قرآن وحدیث میں کوئی واضح حکم موجود نہیں، یا نصوص قرآن وسنت میں کوئی ظاہری تعارض ہے، وہاں ائمہ مجتہدین کا اپنے اپنے اجتہاد سے کوئی حکم متعین کر لینا، جس میں باہم اختلاف ہونا، اختلاف رائے ونظر کی بنا پر لازمی ہے، اس ''تفرق ممنوع'' سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ایسا اختلاف صحابہ کرام میں خود عہد رسالت سے چلا آیا ہے اور وہ باتفاق فقہاء رحمت ہے، خلاصہ یہ کہ ائمہ مجتہدین کے فروعی اختلافات تفرق ممنوع میں داخل نہیں۔

اَللّٰہُ یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَہۡدِیۡۤ: روح المعانی میں ہے اس میں "جذب وسلوک" کی طرف اشارہ نکلتا ہے جو تصوف کی معروف اصطلاح ہے، وجہ یہ ہے کہ: یَجۡتَبِیۡۤ جبی کے معنی جذب اور کھینچ لینا ہیں جیسا کہ انبیاء کرام کو منتخب کرلیا جاتا ہے، اس میں ان کی عبادت ریاضت کو دخل نہیں ہوتا، وہ اپنی ذات میں ہدایت کے چراغ ہوا کرتے ہیں، اور: یَہۡدِیۡۤ ہدایت کے معنی سالک کو راہ دکھانا۔

* * *

فائدہ: ۱ آدم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے رسول ① حضرت نوح علیہ السلام ہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ فی الحقیقت تشریع احکام کا سلسلہ ان ہی سے شروع ہوا، اور آخری نبی ② حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن پر سلسلہ رسالت ونبوت منتہی ہوا، درمیان میں جو انبیاء ورسل آئے، ان میں ③ حضرت ابراہیم ④ حضرت موسیٰ اور ⑤ حضرت عیسیٰ علیہم السلام، یہ تین زیادہ مشہور ہوئے، جن کے نام لیوا ہر زمانہ میں بکثرت موجود رہے، ان پانچوں کو "اولوالعزم پیغمبر" کہتے ہیں، بہر حال اس جگہ حق تعالیٰ نے صاف طور پر بتلادیا کہ اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، کیونکہ عقائد، اخلاق اور اصول دیانات میں تمام متفق رہے ہیں، البتہ بعض فروع میں حسب مصلحت زمانہ کچھ تفاوت ہوا اور دین کے قائم کرنے کے طور وطریق ہر وقت میں اللہ نے جدا ٹھہرادیے ہیں، جس کو دوسری جگہ فرمادیا: لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا (المائدہ:۴۸)۔

فائدہ: ۲ یعنی سب انبیاء اور ان کی امتوں کو حکم ہوا کہ دین الٰہی کو اپنے قول وعمل سے قائم رکھیں اور اصل دین میں کسی طرح کے تفریق و اختلاف کو روا نہ رکھیں۔

فائدہ: ۳ یعنی آپ جس "دین توحید" کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، مشرکین پر وہ بھاری ہے، گویا آپ کوئی نئی اور انوکھی چیز پیش کر رہے ہیں، جو کسی نے پہلے پیش نہیں کی تھی، بھلا "توحید" جیسی صاف، معقول اور متفق علیہ چیز بھی جب بھاری معلوم ہونے لگی اور اس میں بھی لوگ اختلاف ڈالے بدون نہ رہے، تو جہالت اور بدبختی کی حد ہوگئی، سچ تو یہ ہے کہ ہدایت وغیرہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، جسے وہ چاہے بندوں میں سے چن کر اپنی طرف کھینچ لے اور اپنی رحمت وموہبت سے مقام قرب واصطفاء پر فائز فرمادے، اور جو لوگ اپنی حسن استعداد سے اس کی طرف رجوع ہوتے اور محنتیں کرتے ہیں، ان کی محنت کو ٹھکانے لگانا اور دستگیری کر کے کامیاب فرمانا بھی اسی کا کام ہے، قال اللہ تعالیٰ: وَرَبُّكَ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخۡتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ (القصص:۶۸) وقال: اَللّٰهُ يَصۡطَفِيۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ (الحج:۷۵) وقال: وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ (العنکبوت:۶۹)

بہر حال حکمت الٰہی جس کی ہدایت کو مقتضی ہو، وہ ہی ہدایت پاسکتا اور فائز المرام ہوسکتا ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡيًۢا بَيۡنَهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ

اور جنہوں نے اختلاف ڈالا سو سمجھ آچکنے کے بعد آپس کی ضد سے، اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو نکلی ہے تیرے رب سے

اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡرِثُوا الۡكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لَفِيۡ شَكٍّ

ایک مقررہ وعدہ تک تو فیصلہ ہوجاتا ان میں، اور جن کو ملی ہے کتاب ان کے پیچھے وہ البتہ اس کے دھوکے میں ہیں

مِّنۡهُ مُرِيۡبٍ ⑭

جو چین نہیں آنے دیتا

خلاصہ تفسیر: اب فرماتے ہیں کہ گذشتہ امتوں کو جو ہم نے یہ حکم دیا تھا کہ: اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ کہ دین توحید کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ مت ڈالو، تو بہت لوگ اس پر قائم نہ رہے اور متفرق ہوگئے، لیکن اس تفرقہ کا منشاء یہ نہ تھا کہ وہ کسی اشتباہ یا التباس

میں پڑ گئے ہوں جس سے ان کے معذور ہونے کا احتمال ہو، بلکہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔

اور وہ لوگ بعد اس کے کہ ان کے پاس (یعنی ان کے ذہن اور کانوں تک صحیح) علم پہنچ چکا تھا محض آپس کی ضد اضدی سے باہم متفرق ہو گئے (اس طرح کہ پہلے مال و دولت کی طلب اور جاہ وریاست کی خواہش سے اغراض مختلف ہوئیں، پھر فرقے بن گئے، ایسے وقت میں ایک دوسرے کی تحقیر اور تنقیص کے لیے دین کو آڑ بنایا کرتے، ہوتے ہوتے مذہب اور طریقہ مختلف ہو جاتا، حتی کہ فروع سے آگے بڑھ کر اصول میں بھی اختلاف کرنے لگتے ہیں) اور (یہ لوگ حق بات میں جان بوجھ کر اختلاف میں پڑے تو اس عظیم جرم کی وجہ سے ایسے سخت عذاب کے مستحق ہو گئے تھے کہ) اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک وقت معین تک (کے لئے مہلت دینے کی) ایک بات پہلے قرار نہ پا چکتی (کہ ان کو اصل عذاب آخرت میں ہوگا) تو (دنیا ہی میں) ان (کے اختلافات) کا فیصلہ ہو چکا ہوتا (یعنی عذاب سے ان سب کو ختم کر دیا جاتا، یہ قصہ تو پہلی امتوں کا ہوا) اور جن لوگوں کو ان (گذشتہ امتوں) کے بعد کتاب دی گئی ہے (مراد اس سے عہد نبوی کے مشرکین ہیں کہ آپ ﷺ کے ذریعہ سے ان کو قرآن پہنچا) وہ (لوگ) اس (کتاب) کی طرف سے ایسے (قوی) شک میں پڑے ہیں جس نے (ان کو) تردد میں ڈال رکھا ہے (مطلب یہ کہ جیسے پہلی امتوں میں سے بعض نے انکار کیا تھا اسی طرح اب ان موجودہ مشرکین کی نوبت آئی)۔

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ: اگرچہ پہلی امتوں پر ایسا عذاب آیا ہے کہ ان سب کو ختم کر دیا گیا لیکن وہ کفار پر آیا، مؤمنین میں سے جنہوں نے تفرقہ ڈالا ان پر ایمان کی برکت سے ایسا عذاب نہیں آیا کہ جس سے سب کے سب عذاب میں تباہ و برباد ہو گئے ہوں، اور اگر مسلمانوں میں سے کسی پر ایسا عذاب آنا ثابت ہو جائے تو وہ سب پر یقیناً نہیں آیا۔

* * *

فائدہ: یعنی ''توحید'' اور ''اصول دین'' میں جنہوں نے اختلاف ڈالا اور کتب سماویہ میں تحریف کی، وہ کچھ غلط فہمی یا اشتباہ کی وجہ سے نہ تھی، ایسی صاف وصریح اور مجمع علیہ تعلیمات میں اشتباہ والتباس کیا ہو سکتا تھا؟! محض نفسانیت، ضد، عداوت اور طلب مال وجاہ وغیرہ اسباب ہیں جو فی الحقیقت اس تفریق واختلاف مذموم کا باعث ہوئے ہیں، بعدہ جب اختلاف قائم ہو گئے اور مختلف مذاہب نے الگ الگ مورچے بنا لیے تو پیچھے آنے والی نسلیں عجیب خبط اور دھوکا میں پڑ گئیں اور ایسے شکوک وشبہات پیدا کر لیے گئے جو کسی حال ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتے، مگر یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے بندوں کو ڈھیل دی، اگر وہ چاہتا تو سارے اختلافات کو ایک دم میں ختم کر دیتا، لیکن ایسا کرنا تکوین کی غرض اصلی کے منافی تھا، اس کی حکمت بالغہ اسی کو مقتضی تھی کہ ان اختلافات کا عملی اور دوٹوک فیصلہ ایک وقت معین پر زندگی کے دوسرے دور میں کیا جائے، اگر یہ بات پہلے سے نہ نکل چکی ہوتی تو سب جھگڑے قصے فوراً ہاتھوں ہاتھ ختم کر دیے جاتے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ

سو تو اسی طرف بلا، اور قائم رہ جیسا کہ فرما دیا ہے تجھ کو، اور مت چل ان کی خواہشوں پر، اور کہہ میں یقین لایا ہر کتاب پر جو اتاری

اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

اللہ نے، اور مجھ کو حکم ہے کہ انصاف کروں تمہارے بیچ میں، اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا، ہم کو ملیں گے ہمارے کام اور تم کو

اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۵

تمہارے کام، کچھ جھگڑا نہیں ہم میں اور تم میں، اللہ اکٹھا کرے گا ہم سب کو، اور اسی کی طرف پھر جانا ہے

خلاصہ تفسیر: سو آپ (کسی کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، بلکہ جس توحید کی طرف آپ ان کو پہلے سے بلا رہے ہیں) اسی

طرف (ان کو برابر) بلاتے جایئے، اور جس طرح آپ کو حکم ہوا ہے (کہ: فلذلك فادع اس پر) مستقیم رہیے اور ان کی (فاسد) خواہشوں پر نہ چلئے (یعنی وہ مخالفت کر کے یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان کو کہنا چھوڑ دیں تو آپ چھوڑیئے نہیں) اور آپ کہہ دیجئے کہ (میں جس بات کی طرف تم کو بلاتا ہوں میں خود بھی اس پر عمل کرتا ہوں چنانچہ) اللہ نے جتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں (جن میں قرآن بھی داخل ہے) میں سب پر ایمان لاتا ہوں (جن کے متفق علیہ مضامین میں سے توحید بھی ہے) اور مجھ کو یہ (بھی) حکم ہوا ہے کہ (اپنے اور) تمہارے درمیان میں عدل (وانصاف) رکھوں (یعنی جس چیز کو تم پر واجب اور لازم کہوں اپنے اوپر بھی اس کو لازم سمجھوں، یہ نہیں کہ تم کو کلفت میں ڈالوں اور خود آزاد رہوں، ایسے مضامین اور ایسے معاملہ سے انصاف پسند طبیعتوں کو اتباع کی رغبت ہوا کرتی ہے، اور اس پر بھی اگر کوئی نرم نہ ہوں تو اس کے لیے اخیر بات یہ ہے کہ) اللہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے (یعنی وہ سب کا حاکم ہے اور) ہمارے عمل ہمارے لئے اور تمہارے عمل تمہارے لئے، ہماری تمہاری کچھ بحث نہیں، اللہ (جو سب کا مالک ہے قیامت میں) ہم سب کو جمع کرے گا، اور (اس میں شک نہیں کہ) اسی کے پاس جانا ہے (وہ سب کا فیصلہ اعمال کے موافق کرے گا اس وقت تم سے بحث فضول ہے ہاں توحید واحکام کی تبلیغ ہم کئے جائیں گے)۔

لَنَآ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ: یہ نصیحت ایسے موقع کیلئے ہے کہ جب بحث ومناظرہ ختم ہو جائے اور پھر بھی حق قبول کرنے سے مایوسی ہو۔

* * *

فائدہ: یعنی جب دین حق کے متعلق تفریق واختلاف کے طوفان چاروں طرف سے اٹھ رہے ہیں تو آپ کا فرض یہ ہے کہ غیر متزلزل عزم کے ساتھ اسی دین وآئین کی طرف لوگوں کو بلاتے رہیں، جس کی دعوت آدم ونوح اور ان کے بعد تمام انبیاء دیتے چلے آئے ہیں، آپ اپنے پروردگار کے حکم سے ذرا ادھر ادھر نہ ہوں، قولاً وفعلاً اور علماً وحالاً برابر اسی راستہ پر گامزن رہیں، جس پر اب تک رہے ہیں، مکذبین اور معاندین کی خواہشات کی ذرا پروانہ کریں اور صاف اعلان کر دیں کہ میں اللہ کی نازل کی ہوئی ہر کتاب پر خواہ وہ تورات ہو یا انجیل یا قرآن یا کوئی صحیفہ جو کسی زمانہ میں کسی پیغمبر پر نازل ہوا ہو، سچے دل سے یقین رکھتا ہوں، میرا کام پہلی صداقتوں کو جھٹلانا نہیں، بلکہ سب کو تسلیم کرنا اور باقی رکھنا ہے اور مجھ کو حکم ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں، جو اختلاف تم نے ڈالے ہیں، ان کا منصفانہ فیصلہ دوں اور تبلیغ احکام وشرائع یا فصل خصومات میں عدل ومساوات کا اصول قائم رکھوں، ہر وہ سچائی جو کسی جگہ یا کسی مذہب میں ملے اسے بے تکلف تسلیم کروں، جس طرح تم کو خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کی طرف بلاؤں، تم سے پہلے میں خود احکام الٰہی کی پوری تعمیل کر کے اس کا کامل فرمانبردار بندہ ہونا ثابت کروں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہارا اور ہمارا رب ایک ہی ہے، اس لیے ہم سب کو اسی کی خوشنودی کے لیے کام کرنا چاہیے، اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ہمارا تم سے کچھ تعلق نہیں، ہم دعوت وتبلیغ کا فرض ادا کر کے سبکدوش ہو چکے، ہم میں سے کوئی دوسرے کے عمل کا ذمہ دار نہیں، ہر ایک کا عمل اس کے ساتھ ہے، وہ ہی اس کے آگے آئے گا، چاہیے کہ اس کے نتائج برداشت کرنے کے لیے تیار رہے، آگے ہم کو تم سے جھگڑنے اور بحث وتکرار کی ضرورت نہیں، سب کو خدا کی عدالت میں حاضر ہونا ہے، وہاں جا کر ہر ایک کو پورا پتہ لگ جائے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کما کر لایا ہے۔

تنبیہ: یہ آیات مکی ہیں، قتال کی آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی۔

وَالَّذِيۡنَ يُحَآجُّوۡنَ فِى اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِيۡبَ لَهٗ حُجَّتُهُمۡ دَاحِضَةٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَعَلَيۡهِمۡ

اور جو لوگ جھگڑا ڈالتے ہیں اللہ کی بات میں جب لوگ اس کو مان چکے ان کا جھگڑا باطل ہے ان کے رب کے یہاں اور ان پر

غَضَبٌ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ ﴿۱۶﴾

غصہ ہے اور ان کو سخت عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت میں زندہ ہونے اور جزا وسزا ملنے کا ذکر تھا، اب آگے بھی اسی کے متعلق مضمون ہے جس میں منکرین توحید کو عذاب کی بھی خبر دی گئی ہے۔

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ (کے دین) کے بارے میں (مسلمانوں سے) جھگڑے نکالتے ہیں بعد اس کے کہ وہ مان لیا گیا (یعنی بہت سے سمجھدار اور عقل مند آدمی مسلمان ہو کر اس کو مان چکے ہیں، جس سے حجت زیادہ ظاہر ہوگئی، اور حجت واضح ہوجانے کے بعد انکار اور جھگڑا کرنا زیادہ برا ہے، سو) ان لوگوں کی حجت ان کے رب کے نزدیک (پہنچ کر ظاہر ہوجائے گا کہ) باطل ہے اور ان پر (خدا کی طرف سے) غضب (آنے والا) ہے اور ان کے لئے (قیامت میں) سخت عذاب (ہونے والا) ہے (اور اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کو اور اس کے دین کو مانو)۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کے دین، اس کی کتاب، اور اس کی باتوں کی سچائی جب اعلانیہ ظاہر ہو چکی، حتیٰ کہ بہت سے سمجھدار لوگ اس کو قبول کرچکے اور بہتیرے قبول نہ کرنے کے باوجود ان کی سچائی کا اقرار کرنے لگے، اس قدر ظہور وضوح حق کے بعد جو لوگ خواہ مخواہ جھگڑے ڈالتے، یا ماننے والوں سے الجھتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور سخت عذاب کے مستوجب ہیں اور ان کے سب جھگڑے جھوٹے اور سب بحثیں باطل ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ⑰

اللہ وہی ہے جس نے اتاری کتاب سچے دین پر اور ترازو بھی ۱ اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید وہ گھڑی پاس ہو ۲

خلاصہ تفسیر: اللہ اور اس کے دین کا ماننا یہ ہے کہ قرآن کو حق اور واجب العمل جانو جس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد سب بیان کیے گئے ہیں کیونکہ:

اللہ ہی ہے جس نے (اس) کتاب (یعنی قرآن) کو حق کے ساتھ اور (اس میں جو خاص حکم ہے) انصاف (کا اس) کو نازل فرمایا (جب قرآن اللہ کی کتاب ہے تو اللہ کو ماننا بغیر قرآن کے مانے ہوئے معتبر نہیں ہوسکتا، اور بغیر اللہ کے مانے ہوئے عذاب وغضب سے نجات نہیں ہوسکتی، پس نجات موقوف ہے قرآن کے ماننے پر، بعض غیر مسلم جو اپنے زعم میں اللہ کو ماننے کا تو دعویٰ کرتے ہیں مگر قرآن کو نہیں مانتے وہ نجات کے لئے کافی نہیں) اور (یہ لوگ جو آپ سے قیامت کا متعین وقت پوچھتے ہیں تو) آپ کو (اس کی) کیا خبر (لیکن آپ کو خبر نہ ہونے یا خبر نہ دینے سے قیامت کا انکار لازم نہیں آتا، بلکہ اس کا واقع ہونا یقینی ہے اور وقت کے تعین کے لئے اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ) عجب نہیں کہ قیامت قریب ہو۔

اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ: "میزان" یعنی انصاف سے مراد حقوق العباد ہیں، شبہ ہوسکتا ہے کہ کتاب یعنی قرآن میں تو یہ داخل ہیں پھر اسے الگ کیوں ذکر فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ ان کو الگ بیان کرنا اہتمام شان کے لیے ہے، اور شاید اس لیے بھی اس کو علیحدہ بیان فرمایا ہوتا کہ اس سے قرآن کی تصدیق میں زیادہ رغبت ہو کہ اس کتاب کے ماننے سے تو ہماری دنیوی مصالح کی بھی حفاظت رہے گی۔

لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ: اس کی تفسیر سورہ احزاب آیت ۶۳: يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

* * *

فائدہ: ۱ اللہ نے "مادی ترازو" بھی اتاری، جس میں اجسام تلتے ہیں اور "علمی ترازو" بھی جسے عقل سلیم کہتے ہیں اور "اخلاقی ترازو" بھی جسے صفت عدل وانصاف کہا جاتا ہے اور سب سے بڑی ترازو "دین حق" ہے، جو خالق ومخلوق کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ کرتا ہے اور جس میں بات پوری تلتی ہے نہ کم نہ زیادہ۔

فائدہ: ۲ یعنی اپنے اعمال واحوال کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر کس کر اور دین حق کے ترازو میں تول کر دیکھ لو، کہاں تک کھرے اور پورے اترتے ہیں، کیا معلوم ہے کہ قیامت کی گھڑی بالکل قریب ہی آ لگی ہو، پھر کچھ نہ ہوسکے گا، جو فکر کرنا ہے، اس کے آنے سے پہلے کرلو۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا

جلدی کرتے ہیں اس گھڑی کی وہ لوگ کہ یقین نہیں رکھتے اس پر، اور جو یقین رکھتے ہیں ان کو اس کا ڈر ہے، اور جانتے ہیں کہ وہ

الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ⑱

ٹھیک ہے، سنتا ہے جو لوگ جھگڑتے ہیں اس گھڑی کے آنے میں وہ بہک کر دور جا پڑے

خلاصہ تفسیر: (مگر) جو لوگ اس کا یقین نہیں رکھتے (وہ اس دن سے ڈرنے کے بجائے بطور استہزاء و انکار کے) اس کا تقاضا کرتے ہیں (کہ وہ جلد کیوں نہیں آجاتی) اور جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں وہ اس سے (کانپتے اور) ڈرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ برحق ہے، یاد رکھو کہ (ان دونوں قسم کے لوگوں میں پہلی قسم کے لوگ یعنی) جو لوگ قیامت کے (منکر ہیں اور اس کے) بارے میں جھگڑتے ہیں بڑی دور (دراز) کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا: مؤمنین کے جس خوف کا یہاں بیان ہے اس سے "اعتقادی خوف" مراد ہے جو دو باتوں کے اعتقاد سے پیدا ہوا ہے: ① ایک قیامت کے واقع ہونے کا اعتقاد ② دوسرے اپنے اعمال کی نسبت یہ اعتقاد کہ ان کے مردود ہونے کا بھی احتمال ہے، پس یہ اعتقادی خوف ہر مسلمان کو ہوتا ہے، اور اگر کسی کو غلبہ حال کی وجہ سے یا موت یا قیامت کا اشتیاق عارض ہو جائے تو وہ شوق طبعی اور اضطراری ہوتا ہے، اس وقت اعتقادی خوف بھی باقی رہتا ہے، کیونکہ دونوں میں کچھ منافات نہیں، اور یہ خوف دنیا میں ہوتا ہے، پس قبر میں کسی مردہ کا یہ کہنا کہ اے اللہ! قیامت جلدی قائم کر دے محل اشکال نہیں، کیونکہ وہاں یقینی بشارتیں سن کر اپنے اعمال کے مردود ہونے کا احتمال نہیں رہتا اس لیے خوف بھی زائل ہو جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جن کو قیامت پر یقین نہیں، وہ ہنسی مذاق کے طور پر نہایت بے فکری سے کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! وہ قیامت کب آئے گی؟ آخر دیر کیا ہے؟ جلدی کیوں نہیں آجاتی؟ لیکن جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان و یقین سے بہرہ ور کیا ہے، وہ اس ہولناک گھڑی کے تصور سے لرزتے اور کانپتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ یہ چیز ہونے والی ہے، کسی کے ٹلائے ٹل نہیں سکتی، اسی لیے اس کی تیاری میں لگے رہتے ہیں، اسی سے سمجھ لو کہ ان جھگڑنے والے منکرین کا حشر کیا ہونا ہے، جب ایک شخص کو قیامت کے آنے کا یقین ہی نہیں وہ تیاری کیا خاک کرے گا، ہاں! جتنا اس حقیقت کا مذاق اڑائے گا گمراہی میں اور زیادہ دور ہوتا چلا جائے گا۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ⑲ ع

اللہ نرمی رکھتا ہے اپنے بندوں پر، روزی دیتا ہے جس کو چاہے، اور وہی ہے زور آور زبردست

خلاصہ تفسیر: پیچھے ان لوگوں کی گمراہی کا ذکر تھا جو قیامت کے بارہ میں جھگڑے نکالتے ہیں، اب آگے اس انکار اور جھگڑے کی علت فرماتے ہیں جو کہ دنیا سے دھوکہ کھانا اور اس میں منہمک رہنا ہے، اور اس کے مقابلہ میں آخرت کی طلب کی ترغیب دیتے ہیں۔

(یہ لوگ جو دنیا کی ناز و نعمت پر مغرور ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھے ہیں اور یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اگر ہمارا عمل اللہ کی رضا کے خلاف ہوتا تو ہم کو یہ عیش و عشرت کیوں دیتا، خوب سمجھ لو کہ یہ ان کی حماقت اور بھول ہے، یہ دنیا کی دولت و نعمت رضامندی کی دلیل نہیں، بلکہ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ (دنیا میں) اپنے بندوں پر (عام طور سے) مہربان ہے (اسی عام رحمت کی وجہ سے دنیا میں سب کو روزی دیتا ہے، صحت و تندرستی دیتا ہے اگرچہ مصالح و حکمت کی بنا پر اس میں کمی بیشی بھی ہوتی رہتی ہے کہ) جس کو (جس قدر) چاہتا ہے روزی دیتا ہے (مگر نفس روزی سب میں مشترک ہے) اور (دنیا میں

اس لطف ومہربانی سے یہ سمجھ لینا کہ ان کا طریقہ حق ہے اور آخرت میں بھی ان پر لطف ومہربانی جاری رہے گی اور عذاب نہ ہوگا تو یہ سراسر دھوکہ ہے، بلکہ وہاں تو ان کی گمراہی اور برے اعمال کی وجہ سے ان پر عذاب ہوگا، اور ان کو عذاب دینا کوئی بعید بات نہیں، کیونکہ) وہ قوت والا زبردست ہے (اس کو سب قدرت ہے، وہ اکیلا ان سب کو سزا دے سکتا ہے)۔

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ: (یہاں آیت میں "لطیف" کے معنی اگر باریک بین لیے جائیں تو اس صورت میں تفسیر یہ ہوگی کہ کامیابی وکامرانی خدا تعالیٰ کی رضامندی کی دلیل نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ) حق تعالیٰ اپنے بندوں کے مخفی امور اور دقیق مصالح سے خوب آگاہ ہیں حسب مصلحت جس کو چاہتے ہیں (زیادہ) روزی دے دیتے ہیں (پس اس روزی دینے سے ان کا حق پر ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ یہ باطل پر ہیں اور اس وجہ سے عذاب کے مستحق ہوں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی باوجود تکذیب وانکار کے روزی کسی کی بند نہیں کرتا، بلکہ بندوں کے باریک سے باریک احوال کی رعایت کرتا اور نہایت نرمی اور تدبیر لطیف سے ان کی تربیت فرماتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ جس کو چاہے، جتنی چاہے دے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا

جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی زیادہ کریں اس کے واسطے اس کی کھیتی ۱؎ اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی اس کو دیویں ہم کچھ اس میں سے

وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾

اور اس کے لیے نہیں آخرت میں کچھ حصہ ۲؎

خلاصہ تفسیر: (غرض ان کی تمام تر خرابی کی وجہ دنیا میں انہماک ہے، سو ان لوگوں کو اس پر مغرور نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آخرت کی طلب اور فکر کریں، کیونکہ) جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو (یعنی آخرت کے ثواب کا طالب ہو، کھیتی سے مراد آخرت کا ثواب ہے جو کہ اعمال صالحہ کا ثمرہ ہے، اسی لیے اسے کھیتی کہہ دیا، کیونکہ کھیتی ثمرہ ہوتا ہے تخم یعنی بیج کا، مطلب یہ کہ ثواب کی امید پر آخرت کے لیے عمل کرے تو) ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے (یعنی اعمال پر ثواب دیں گے، اور اس کی ترقی یہ ہے کہ ثواب مضاعف ملے گا) اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو (یعنی ساری کوشش اور عمل کا مقصد دنیا کی متاع ہو، آخرت کے لئے کچھ کوشش نہ کرے حتیٰ کہ ایمان بھی نہ لائے) تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کو کچھ حصہ نہیں (کیونکہ اس کی شرط ایمان ہے اور وہ ان کے پاس ہے نہیں)۔

غرض اس حالت میں طلب کے قابل آخرت ہی ہے نہ کہ دنیا، کیونکہ دنیا تمنا کے موافق نصیب نہیں ہوتی، الٹا اس میں پڑ کر بندہ آخرت سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ایک نیکی کا دس گناہ ثواب دیں، بلکہ سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ، اور دنیا میں ایمان وعمل صالح کی برکت سے جو فراخی و برکت ملے وہ الگ رہی۔

فائدہ: ۲؎ دنیا کے واسطے جو محنت کرے موافق قسمت کے ملے، پھر اس محنت کا فائدہ آخرت میں کچھ نہیں، کما قال تعالیٰ: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (الاسراء:۱۸)

أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُا شَرَعُوا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَأْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ

کیاان کیلئے اور شریک ہیں کہ راہ ڈالی ہے انہوں نے انکے واسطے دین کی کہ جسکا حکم نہیں دیا اللہ نے ۱؎ اور اگر نہ مقرر ہو چکی ہوتی ایک بات فیصلہ کی

لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

تو فیصلہ ہو جاتا ان میں، اور بیشک جو گنا ہگار ہیں ان کو عذاب ہے دردناک ۲؎

خلاصہ تفسیر: پچھلے آیت: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ میں دین حق کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہونا بیان فرمایا تھا جو کہ توحید وغیرہ کو شامل ہے، اب آگے مشرکین و کفار کے دین باطل کا کسی صحیح دلیل سے ثابت نہ ہونا بیان فرماتے ہیں۔

(دین حق کو تو خدا نے مشروع و مقرر فرمایا ہے، مگر یہ لوگ جو اس کو نہیں مانتے تو) کیا ان کے (تجویز کئے ہوئے) کچھ شریک (خدائی) ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی (مطلب اس سوال سے یہ ہے کہ کوئی ذات اس قابل نہیں کہ خدا کے خلاف اس کا مقرر کیا ہوا دین معتبر ہو سکے) اور اگر (خدا کی طرف سے) ایک قول فیصل (ٹھہرا ہوا) نہ ہوتا (یعنی یہ کہ ان پر اصل عذاب موت کے بعد ہوگا) تو (دنیا ہی میں) ان کا (عملی) فیصلہ ہو چکا ہوتا اور (آخرت میں) ان ظالموں کو ضرور دردناک عذاب ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے نبیوں کی زبانی آخرت کا اور دین حق کا راستہ بتلا دیا، کیا اس کے سوا کوئی اور ہستی ایسی ہے جسے کوئی دوسرا راستہ مقرر کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہو کہ وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرا دے، پھر آخر ان مشرکین نے اللہ کی وہ راہ چھوڑ کر جو انبیاء علیہم السلام نے بتلائی تھی دوسری راہیں کہاں سے نکال لیں؟!!۔

فائدہ: ۲؎ یعنی فیصلہ کا وعدہ ہے اپنے وقت پر۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

تو دیکھے گا گناہ گاروں کو کہ ڈرتے ہوں گے اپنی کمائی سے اور وہ پڑ کر رہے گا ان پر ۱؎ اور جو لوگ یقین لائے اور بھلے کام کیے

فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾

باغوں میں ہیں جنت کے، ان کے لیے ہے جو وہ چاہیں اپنے رب کے پاس یہی ہے بڑی بزرگی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اس روز) آپ ان ظالموں کو دیکھیں گے کہ اپنے اعمال (کے وبال) سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ (وبال) ان پر (ضرور) پڑ کر رہے گا (یہ تو منکرین کا حال ہوگا) اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے (ہوں گے) وہ بہشتوں کے باغوں میں (داخل) ہوں گے، وہ جس چیز کو چاہیں ان کے رب کے پاس ان کو ملے گی، یہی بڑا انعام ہے (نہ وہ فانی عیش و عشرت جو دنیا میں موجود ہے)۔

فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ: یہاں بہشت یعنی جنت کو جمع اس لئے لائے کہ جنت کے مختلف طبقات اور درجات ہیں، ہر طبقہ ایک جنت ہے اور ہر طبقہ میں متعدد باغات ہیں، اپنے اپنے رتبہ کے مطابق کوئی کہیں ہوگا، کوئی کہیں ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اپنی کرتوت کے نتائج سے خواہ آج نہ ڈریں، مگر اس دن ڈرتے ہوں گے اور یہ ڈر ان پر ضرور پڑ کر رہے گا، کوئی سبیل رہائی اور فرار کی نہ ہوگی۔

فائدہ: ؎۲ یعنی جنت میں ہر قسم کی جسمانی اور روحانی راحتیں اور اپنے رب کا قرب، یہ ہی بڑا فضل ہے، دنیا کے عیش اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا

یہ ہے جو خوشخبری دیتا ہے اللہ اپنے ایماندار بندوں کو جو کرتے ہیں بھلے کام ؎۱ تو کہہ میں مانگتا نہیں تم سے اس پر کچھ بدلہ

اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝۲۳

مگر دوستی چاہیے قرابت میں ؎۲ اور جو کوئی کمائے گا نیکی ہم اس کو بڑھا دیں گے اس کی خوبی، بیشک اللہ معاف کرنے والا حق ماننے والا ہے ؎۳

خلاصہ تفسیر: یہی ہے جس کی بشارت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دے رہا ہے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے (اور چونکہ کفار کی عادت تھی کہ وہ پورا مضمون سننے سے پہلے ہی جھٹلانے لگتے تھے، اس لئے اس بشارت کا مضمون پورا کرنے سے پہلے ہی درمیان میں ایک جملہ معترضہ کے طور پر کفار کو تکذیب میں جلدی کرنے سے روکنے کے لیے حضور کو حکم فرماتے ہیں کہ ان کو ایک دل گداز مضمون سنا دیں، یعنی) آپ (ان سے) یوں کہئے کہ میں تم سے اور کچھ مطلب نہیں چاہتا بجز رشتہ داری کی محبت کے (یعنی اتنا چاہتا ہوں کہ میرے تمہارے درمیان رشتہ داری کے جو تعلقات ہیں، ان کے حقوق کا تو خیال رکھو، کیا رشتہ داری کا یہ حق نہیں کہ مجھ سے دشمنی میں جلدی نہ کرو، بلکہ اطمینان کے ساتھ میری پوری بات سن لو اور اس کو عقل اور دلیل صحیح کی میزان سے جانچو، اگر معقول ہو تو قبول کر لو، اور اگر کچھ شبہ ہو تو صاف کر لو، اور بفرض محال غلط ہو تو مجھ کو سمجھا دو، غرض جو بات ہو خیر خواہی سے ہو، یہ نہیں کہ فوراً ہی بھڑک اٹھو) اور (آگے مومنین کے لئے بشارت کا تتمہ ہے یعنی) جو شخص کوئی نیکی کرے گا ہم اس (نیکی) میں اور خوبی زیادہ کر دیں گے (یعنی اس نیکی کا فی نفسہ جس قدر ثواب ہے، ہم اس سے زیادہ ثواب دیں گے) بیشک اللہ (اطاعت گزار بندوں کے گناہوں کا) بڑا بخشنے والا (اور ان کی نیکیوں کا) بڑا قدردان (اور ثواب عطا کرنے والا) ہے۔

* * *

فائدہ: ؎۱ یعنی اللہ جو خوشخبری دے وہ لامحالہ واقع ہو کر رہے گی۔

فائدہ: ؎۲ یعنی قرآن جیسی دولت تم کو دے رہا ہوں اور ابدی نجات و فلاح کا راستہ بتلاتا اور جنت کی خوشخبری سناتا ہوں، یہ سب محض لوجہ اللہ ہے، اس خیر خواہی اور احسان کا تم سے کچھ بدلہ نہیں مانگتا، صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ تم سے جو میرے نسبی و خاندانی تعلقات ہیں کم از کم ان کو نظر انداز نہ کرو، آخر تمہارا معاملہ اقارب اور رشتہ داروں کے ساتھ کیا ہوتا ہے، بسا اوقات ان کی بے موقع بھی حمایت کرتے ہو، میرا کہنا یہ ہے کہ تم اگر میری بات نہیں مانتے نہ مانو، میرا دین قبول نہیں کرتے، یا میری تائید و حمایت میں کھڑے نہیں ہوتے، نہ سہی! لیکن کم از کم قرابت و رحم کا خیال کر کے ظلم و اذیت رسانی سے باز رہو، اور مجھ کو اتنی آزادی دو کہ میں اپنے پروردگار کا پیغام دنیا کو پہنچا تا رہوں، کیا اتنی دوستی اور فطری محبت کا بھی میں مستحق نہیں ہوں۔

تنبیہ: آیت کے یہ معنی حضرت ابن عباسؓ سے صحیحین میں منقول ہیں، ① بعض سلف نے: **اِلَّا المودّۃ فی القربیٰ** کا مطلب یہ لیا ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرو اور حق قرابت کو پہچانو ② اور بعض نے: قربیٰ سے اللہ کا قرب اور نزدیکی مراد لیا ہے، یعنی ان کاموں کی محبت جو خدا سے قریب کرنے والے ہوں، مگر صحیح اور راجح تفسیر وہ ہی ہے جو ہم نے اول نقل کی ہے ③ بعض علماء نے: **مودۃ فی القربیٰ** سے اہل بیت نبوی کی محبت مراد لے کر یوں معنی کیے ہیں کہ: ''میں تم سے تبلیغ پر کوئی بدلہ نہیں مانگتا، بس اتنا چاہتا ہوں کہ میرے اقارب کے ساتھ محبت کرو''۔

کوئی شبہ نہیں کہ اہل بیت اور اقارب نبی کریم ﷺ کی محبت و تعظیم اور حقوق شناسی امت پر لازم و واجب اور جز و ایمان ہے اور ان سے درجہ بدرجہ محبت رکھنا حقیقت میں حضور ﷺ کی محبت پر متفرع ہے، لیکن آیت ہذا کی تفسیر اس طرح کرنا شان نزول اور روایات صحیحہ کے خلاف ہونے

کے علاوہ حضور ﷺ کی شان رفیع کے مناسب نہیں معلوم ہوتا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳ یعنی انسان بھلائی اور نیکی کا راستہ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی بھلائی کو بڑھاتا ہے، آخرت میں تو اجر وثواب کے اعتبار سے اور دنیا میں نیک خوئی عطا فرما کر اور ایسے آدمی کی لغزشوں کو بھی معاف فرماتا ہے، شاید یہاں اس مضمون کا ذکر اس لیے فرمایا کہ کم از کم قرابت کی محبت مطلوب ہے، جس کا حاصل ایذاء اور ظلم سے روکنا تھا، لیکن جو اس سے زائد نیکی دکھلائے، وہ خوب سمجھ لے کہ خدا کے ہاں کسی کی نیکی ضائع نہیں جاتی، بلکہ بڑھتی رہتی ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۖ فَإِن يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۗ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ

کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے باندھا اللہ پر جھوٹ، سو اگر اللہ چاہے مہر کر دے تیرے دل پر، اور مٹاتا ہے اللہ جھوٹ کو

وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٢٤﴾

اور ثابت کرتا ہے سچ کو اپنی باتوں سے، اس کو معلوم ہے جو دلوں میں ہے

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں تین مضامین میں سے ایک مضمون وحی اور رسالت کی حقانیت بیان ہوئی تھی، درمیان میں بھی ضمناً اسی کی طرف اشارہ تھا، اب آگے پھر وحی و رسالت کی حقانیت کا مضمون ہے۔

کیا یہ لوگ (آپ کی نسبت نعوذ باللہ) یوں کہتے ہیں کہ انہوں نے خدا پر جھوٹ بہتان باندھ رکھا ہے (کہ نبوت اور وحی کا دعویٰ خلاف واقع کیا ہے) سو (ان کا یہ قول خود بہتان ہے، اس لئے کہ آپ کی زبان حق ترجمان سے اللہ کا یہ معجز کلام جاری ہو رہا ہے جو سچے نبی کے سوا کسی کی زبان پر جاری نہیں ہو سکتا، اگر معاذ اللہ آپ اپنے دعوائے رسالت میں سچے نہ ہوتے تو اللہ یہ کلام آپ پر جاری نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ) خدا (کو یہ قدرت حاصل ہے کہ) اگر (وہ) چاہے تو آپ کے دل پر بند لگا دے (اور یہ کلام آپ کے قلب پر نہ القا ہو، نہ باقی رہے، بلکہ سلب ہو جائے، اور آپ بالکل بھول جائیں، اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ زبان سے اس کا صدور ہو ہی نہیں سکتا) اور اللہ تعالیٰ (کی یہ عادت ہے کہ وہ نبوت کے) باطل (دعویٰ) کو مٹایا کرتا ہے (چلنے نہیں دیتا، یعنی ایسے جھوٹے مدعی کے ہاتھ پر معجزات ظاہر نہیں ہوتے) اور (نبوت کے) حق (دعویٰ) کو اپنے احکام سے ثابت (اور غالب) کیا کرتا ہے (پس آپ صادق اور وہ کاذب ہیں اور چونکہ) وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) دلوں (تک) کی باتیں جانتا ہے (چہ جائیکہ زبان کے اقوال اور جوارح کے افعال، پس اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں کے عقائد، اقوال اور اعمال سب کی خبر ہے، ان سب پر خوب سزا دے گا، ہاں! جو لوگ اپنے کفر اور بداعمالیوں سے توبہ کر لیں انہیں معاف کر دے گا، کیونکہ یہ اس کا قانون ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی بفرض محال اگر کوئی بات بھی خدا کی نسبت جھوٹ بنا کر کہہ دے تو اللہ کو قدرت ہے کہ تیرے دل پر مہر کر دے، پھر فرشتہ یہ کلام معجز لے کر تیرے قلب پر نہ اتر سکے اور سلسلہ وحی کا بند ہو جائے، بلکہ پہلا دیا ہوا بھی سلب کر لیا جائے، کما قال: وَلَئِن شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا ﴿﴾ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا (الاسراء: ۸٦) مگر چونکہ واقع میں قطعاً کذب و افتراء کا شائبہ نہیں، اس لیے محض بدبختوں کی قدر ناشناسی اور طعن و تشنیع کی بناء پر یہ فیض منقطع نہیں کیا جا سکتا، بیشک اللہ اس کو جاری رکھے گا اور اپنی باتوں سے عملی طور پر جھوٹ کو جھوٹ اور سچ کو سچ ثابت کر کے رہے گا، اس وقت سب کو صاف کھل جائے گا کہ فریقین میں جھوٹا اور مفتری کون ہے اور کس کے دل پر اللہ نے فی الواقع مہر لگا دی ہے کہ خیر کے اترنے اور حق کے قبول کرنے کی اس میں مطلقاً گنجائش نہیں رہی، رہا یہ سوال کہ اللہ کی وہ باتیں کیا ہیں، جن سے جھوٹ ملیامیٹ ہوا اور حق ثابت ہو جائے؟ تو میرے نزدیک وہ ہی دلائل و براہین ہیں جو قرآن اور پیغمبر کی صداقت پر اس نے قائم کی

ہیں، بالخصوص وہ آیات آنفسیہ وآفاقیہ جن کا ذکر سورہ حم السجدہ کے آخر پر: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ کے حاشیہ میں کیا گیا ہے، ان آیات کے ظاہر ہونے پر سب کھرے اور کھوٹے دلوں کا حال اعلانیہ واضح ہو جائے گا۔

تنبیہ: آیت ہذا کی تفسیر میں بہت اقوال ہیں، بندہ کے نزدیک بے تکلف یہ ہی مطلب ہے جو اوپر عرض کیا، اس تفسیر پر وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ جملہ مستانفہ ہوا، جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے اور اکثر محققین نے اسی کو اختیار کیا ہے، البتہ مضارع کے معنی مترجمؒ نے حال کے لیے ہیں جو بالکل صحیح ہیں، مگر بندہ کے خیال میں یہاں استقبال لینا زیادہ چسپاں ہے، واللہ اعلم۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ "کا عطف یختم علی قلبك پر کرر ہے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں: "یعنی اللہ اپنے او پر کیوں جھوٹ بولنے دے، دل کو بند کر دے کہ مضمون ہی نہ آئے جس کو باندھ سکے اور چاہے تو کفر کو مٹادے بے پیغام بھیجے، مگر وہ اپنی باتوں سے دین کو ثابت کرتا ہے، اس واسطے نبی پر اپنا کلام بھیجتا ہے"۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَيَسْتَجِيْبُ

اور وہی ہے جو قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں کی اور معاف کرتا ہے برائیاں اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو، اور دعا سنتا ہے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿۲۶﴾

ایمان والوں کی جو بھلے کام کرتے ہیں اور زیادہ دیتا ہے ان کو اپنے فضل سے ۱؎ اور جو منکر ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کئی جگہ منکرین پر تشنیع اور تنبیہ کی گئی ہے، اور اس تنبیہ سے مقصود یہی ہے کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں، چنانچہ اب توبہ کی برکت اور ایمان کی فضیلت مذکور ہے اور ان لوگوں کے لیے وعید بھی جو توبہ نہ کریں بلکہ کفر و شرک پر جمے رہیں۔

اور وہ ایسا (رحیم) ہے کہ اپنے بندوں کی توبہ (بشرطیکہ وہ توبہ حسب قاعدہ ہو) قبول کرتا ہے اور وہ (اس توبہ کی برکت سے) تمام (گزشتہ) گناہ معاف فرما دیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس (سب) کو جانتا ہے (پس اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ توبہ خالص کی ہے یا غیر خالص) اور (جب کوئی شخص کفر سے توبہ کر کے مسلمان ہو گیا تو اس کی جو عبادتیں پہلے قبول نہ ہوتی تھیں، اب قبول ہونے لگیں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ) ان لوگوں کی عبادت (بشرطیکہ اس میں ریاء نہ ہو) قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے (وہ عبادتیں یہی نیک عمل ہیں اور ان کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ثواب دیتا ہے) اور (اس نیک عمل کا فی نفسہ جس قدر ثواب ہے اس کے علاوہ) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (ثواب) دیتا ہے (یہ تو ایمان والوں کے لئے ہوا) اور جو لوگ کفر (پر اصرار) کر رہے ہیں (اور ایمان نہیں لائے) ان کے لئے سخت عذاب (مقرر) ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی نبی خدا کا پیغام پہنچاتا ہے، تم جھوٹ سمجھو یا سچ، اس کے بعد بندوں کا سارا معاملہ خدا سے ہر ایک بندہ سے دنیا اور آخرت میں اس کے حال و استعداد کے موافق معاملہ ہوتا ہے، توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور باوجود سب کچھ جاننے کے کتنی برائیوں سے درگزر کرتا ہے جو ایماندار اور نیک بندے اس کی بات سنتے ہیں، وہ ان کی دعائیں سنتا اور ان کی طاعات کو شرف قبولیت بخشتا ہے اور جس قدر اجر و ثواب کے وہ عام ضابطہ سے مستحق ہوں اپنے فضل سے اس سے کہیں زائد مرحمت فرماتا ہے، رہ گئے منکر اور پکے کافر جن کو مرتے دم تک رجوع و توبہ کی توفیق میسر نہیں ہوتی ان کا انجام اگلے جملہ میں مذکور ہے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ

اور اگر پھیلا دے اللہ روزی اپنے بندوں کو تو دھوم اٹھاویں ملک میں لیکن اتارتا ہے ناپ کر جتنی چاہتا ہے

إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿٢٧﴾

بیشک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھتا ہے دیکھتا ہے

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں توحید کا مضمون تھا، پھر چند آیتوں میں اس کی تاکید اور تائید تھی، اب آگے اپنی بعض صفات اور افعال کو بیان کر کے پھر اسی کی زیادہ تفصیل بیان فرماتے ہیں۔

اور (اللہ تعالیٰ کی صفت حکمت کے آثار میں سے یہ ہے کہ اس نے سب آدمیوں کو زیادہ مال نہیں دیا، کیونکہ) اگر اللہ تعالیٰ اپنے سب بندوں کے لیے (موجودہ حالت میں جیسی ان کی طبیعتیں ہیں) روزی فراخ کر دیتا تو وہ دنیا میں (بالعموم یعنی عام طور) شرارت کرنے لگتے (کیونکہ جب سارے انسان مالدار ہوتے اور کوئی کسی کا مطلق محتاج نہ ہوتا تو کوئی بھی کسی سے نہ دبتا) لیکن (یہ بھی نہیں کیا کہ بالکل ہی کسی کو کچھ نہ دیا ہو، بلکہ) جتنا رزق چاہتا ہے (مناسب) انداز سے (ہر ایک کے لئے) اتارتا ہے (کیونکہ) وہ اپنے بندوں کے (مصالح) کو جاننے والا (اور ان کا حال) دیکھنے والا ہے (اس میں حکیم ہونے کے علاوہ خبیر و بصیر دو صفتیں اور ثابت ہوئیں)۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ: خلاصہ تفسیر میں "موجودہ حالت" کی قید اس لیے بڑھائی کہ اگر اللہ تعالیٰ موجودہ طبیعتوں کو بدل دیں تو پھر روزی فراخ ہونے سے شرارت پیدا نہ ہوگی، جیسا کہ جنت میں تمام طبائع سلیم ہوں گی، یا مہدی علیہ السلام کے مبارک زمانہ کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ اس وقت ہر شخص غنی ہوگا، کوئی کسی کا صدقہ قبول نہ کرے گا، اس کے بعد آگے ایک قید "بالعموم" کی اور لگائی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بندوں سے مراد عام لوگ ہیں، خواص اور مقبولین یعنی انبیاء و اولیاء مراد نہیں، کیونکہ ان میں سرکشی اور شرارت سے مانع ایک بات موجود ہے کہ وہ مجاہدہ وریاضت سے ان کے اخلاق مہذب ہو چکے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ عام طبائع کے اعتبار سے اس وقت اکثر لوگ دبے رہنے کے زیادہ درجہ محتاج ہیں کہ امیر اپنے کام میں مدد لینے کے لیے غریبوں کے زیادہ محتاج ہیں تو وہ غریبوں سے دبتے رہیں، اس لیے جب مزدور اتفاق کر لیتے ہیں تو آخر بڑے بڑے کارخانہ والوں کو ان سے مغلوب ہونا پڑتا ہے، اور غریبوں کو امیروں سے روپیہ پیسہ لینے کی محتاجگی اور ضرورت ہے اس لیے وہ امیروں سے دبتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اگر سب لوگ غنی ہو جائیں تو مال کی ضرورت تو کسی کو کسی سے باقی نہ رہے اور کوئی کسی کا کام بھی نہ کرے تو دونوں طرف سے ایک دوسرے کی محتاجگی اور ضرورت باقی نہ رہتی، تو پھر کوئی کسی سے کیوں دبتا، اب یہاں یہ اعتراض قطعی فضول ہے کہ دنیا میں بھی مال و دولت کی فراوانی کر کے حرص و ہوس کے جذبات کیوں نہ ختم کر دیئے گئے؟ کیونکہ دنیا کی تخلیق کا مقصد ہی ایک ایسا جہان پیدا کرنا ہے جو خیر و شر دونوں قوتوں سے مرکب ہو، اس کے بغیر انسانوں کی وہ آزمائش ممکن ہی نہیں ہے جو تخلیق عالم کا اصل منشا ہے، لہٰذا اگر یہاں انسانوں میں سے یہ جذبات ختم کر دیئے جاتے تو دنیا کی پیدائش کا مقصد اصلی ہی فوت ہو جاتا، اس کے بر خلاف جنت خالص خیر پر مشتمل ہوگی، اس لئے وہاں یہ جذبات ختم کر دیئے جائیں گے۔

لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ: ظاہر ہے کہ ہر چیز ہر شخص کے پاس نہیں ہوا کرتی اور ہر چیز میں ہر ایک کو شوق و رغبت ہونے کا بھی احتمال ہے تو اس صورت میں اگر کسی کو کسی کا گھوڑا یا اور کوئی چیز پسند آ گئی اور وہ چیز ایک ہی ہے اور اس کے طلب گار دو ہیں تو ضرور ان میں جھگڑا ہوگا، اور ایک دوسرے سے چھیننے پر آمادہ ہوگا، اور کوئی کسی کی اعانت اور حفاظت اس لیے نہ کرے گا کہ ہر شخص دوسرے سے مستغنی ہے، کسی کو کسی ضرورت ہی نہیں، تو وہ دونوں خود ہی آپس میں لڑیں گے مریں گے، اسی طرح ہر شخص کے پاس کوئی نہ کوئی چیز ایسی ضرور ہوگی جس میں دوسرے کو شوق و رغبت ہو، اور یہی قصہ ہر ہر شخص میں پیدا ہوگا تو سرکشی اور شرارت کا عام ہو جانا ظاہر ہے، اس نقصان کی وجہ سے بندوں کے لیے روزی فراخ اور کشادہ نہیں کی گئی۔

جس طرح رزق کی کشادگی سے بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے ایسے ہی باطنی بسط (احوال قلب و انوارات کی کشادگی) کی کثرت بھی بعض کے حق میں نقصان دہ ہو جاتی ہے، لہٰذا اگر کسی کو قلب کی یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو اسے مغموم نہیں ہونا چاہیے۔

* * *

فائدہ: خدا کے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں، اگر چاہے تو اپنے تمام بندوں کو غنی اور تونگر بنا دے، لیکن اس کی حکمت مقتضی نہیں کہ سب کو بے اندازہ روزی دے کر خوش عیش رکھا جائے، ایسا کیا جاتا تو عموماً لوگ طغیان وتمرد اختیار کر کے دنیا میں اودھم مچا دیتے، نہ خدا کے سامنے جھکتے، نہ اس کی مخلوق کو خاطر میں لاتے، جو سامان دیا جاتا کوئی اس پر قناعت نہ کرتا، حرص اور زیادہ بڑھ جاتی، جیسا کہ ہم بحالت موجودہ بھی عموماً مرفہ الحال لوگوں میں مشاہدہ کرتے ہیں، جتنا آجائے اس سے زیادہ کے طالب رہتے ہیں، کوشش اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ سب کے گھر خالی کر کے اپنا گھر بھر لیں، ظاہر ہے کہ ان جذبات کے ماتحت عام غنا اور خوشحالی کی صورت میں کیسا عام اور زبردست تصادم ہوتا اور کسی کو کسی سے دبنے کی کوئی وجہ نہ رہتی، ہاں! دنیا کے عام مذاق و رجحان کے خلاف فرض کیجئے کسی وقت غیر معمولی طور پر کسی مصلح اعظم اور مامور من اللہ کی نگرانی میں عام خوشحالی اور فارغ البالی کے باوجود باہمی آویزش اور طغیان وسرکشی کی نوبت نہ آئے اور زمانہ کے انقلاب عظیم سے دنیا کی طبائع ہی میں انقلاب پیدا کر دیا جائے، وہ اس عادی اور اکثری قاعدہ سے مستثنیٰ ہوگا، بہرحال دنیا کو بحالت موجودہ جس نظام پر چلاتا ہے، اس کا مقتضی یہ ہی ہے کہ غناء عام نہ کیا جائے، بلکہ ہر ایک کو اس کی استعداد اور احوال کی رعایت سے جتنا مناسب ہو جانچ تول کر دیا جائے اور یہ خدا ہی کو خبر ہے کہ کس کے حق میں کیا صورت اصلح ہے، کیونکہ سب کے اگلے اور پچھلے حالات اسی کے سامنے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۲۸

اور وہی ہے جو اتارتا ہے مینہ بعد اس کے کہ آس توڑ چکے اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت، اور وہی ہے کام بنانے والا سب تعریفوں کے لائق

خلاصہ تفسیر: اور وہ ایسا (رحیم) ہے جو (بسا اوقات) لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد مینہ (بارش) برساتا ہے اور اپنی رحمت (کے آثار دنیا میں) پھیلاتا ہے (آثار سے مراد نباتات اور پھل پھول ہیں) اور وہ (سب کا) کارساز (اور اس کارسازی پر) قابل حمد (وثنا) ہے (گذشتہ آیت کی تین صفات کے ساتھ یہاں تین صفتیں اور ثابت ہوئیں: رحیم، ولی، حمید)۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا: یہاں خلاصہ تفسیر میں ''بسا اوقات'' کی قید اس لیے بڑھائی کہ بعض مرتبہ مایوسی اور ناامیدی سے پہلے بھی بارش ہو جاتی ہے اور بعض اوقات مایوسی اور ناامیدی کے بعد بھی نہیں ہوتی، آیت میں کوئی قرینہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ مایوسی کے بعد ہمیشہ بارش ہو جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی بہت مرتبہ ظاہری اسباب وحالات پر نظر کر کے جب لوگ بارش سے مایوس ہو جاتے ہیں اس وقت حق تعالیٰ باران رحمت نازل فرماتا اور اپنی مہربانی کے آثار وبرکات چاروں طرف پھیلا دیتا ہے، تاکہ بندوں پر ثابت ہو جائے کہ رزق کی طرح اسباب رزق بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں، جیسے وہ روزی ایک خاص اندازہ سے عطا کرتا ہے، بارش بھی خاص اوقات اور خاص مقدار میں مرحمت فرماتا ہے، بات یہ ہے کہ سب کام اسی کے اختیار میں ہیں اور جو کچھ وہ کرے عین حکمت وصواب ہے، کیونکہ تمام خوبیاں اور کمالات اس کی ذات میں جمع ہیں اور ہر قسم کی کارسازی اور اعانت وامداد وہیں سے ہو سکتی ہے۔

تنبیہ: اللہ کی رحمت وقدرت کی طرف سے مایوس ہو جانا کافروں کا شیوہ ہے، لیکن ایک مومن کی نظر میں اسباب کا سلسلہ یاس انگیز ہو سکتا ہے جیسے فرمایا: فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا (یوسف: ۸۰) اور: حَتّٰٓي اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (یوسف: ۱۱۰)

ع وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ قَدِيْرٌ ۝۲۹

اور ایک اسکی نشانی ہے بنانا آسمانوں کا اور زمین کا ۱ اور جس قدر بکھیرے ہیں ان میں جانور ۲ اور وہ جب چاہے ان سب کو اکٹھا کر سکتا ہے ۳

خلاصہ تفسیر: اور من جملہ اس کی (قدرت کی) نشانیوں کے پیدا کرنا ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جانداروں کا جو اس نے

زمین و آسمان میں پھیلا رکھے ہیں اور وہ (قیامت کے دن دوبارہ زندہ کر کے) ان (مخلوقات) کے جمع کر لینے پر بھی جب وہ (جمع کرنا) چاہے قادر ہے (گذشتہ دو آیتوں میں مذکور چھ صفات کے ساتھ یہاں دو صفتیں اور ثابت ہوئیں: خالق اور قدیر)۔

وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِن دَابَّةٍ: ''دابۃ'' اصل لغت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے اختیار سے چلنے اور حرکت کرنے والی ہو، بعد میں یہ لفظ صرف جانوروں کے لئے استعمال ہونے لگا ہے، اس آیت میں آسمان اور زمین دونوں کی طرف نسبت کر کے یہ کہا گیا ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی چلنے والی مخلوقات پیدا کی ہیں، زمین پر چلنے والی مخلوقات تو ظاہر ہیں، آسمان میں ان سے مراد ملائکہ بھی ہو سکتے ہیں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آسمانوں میں کچھ ایسے جانور موجود ہوں جو ابھی تک انسان کے علم میں نہیں آسکے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی جس طرح رزق پہنچانا اور اس کے اسباب (بارش وغیرہ کا) مہیا کرنا اس کے قبضہ میں ہیں، ان اسباب کے اسباب سماویہ و ارضیہ اور ان کے آثار و نتائج بھی اسی کی مخلوق ہیں۔

فائدہ: ۲۔ آیت سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی طرح آسمانوں پر بھی جانوروں کی قسم سے کوئی مخلوق پائی جاتی ہے۔

فائدہ: ۳۔ یعنی جس نے بکھیرے وہ سب کو اکٹھا کر سکتا ہے اور یہ قیامت کے دن ہوگا۔

وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ﴿۳۰﴾

اور جو پڑے تم پر کوئی سختی سو وہ بدلہ ہے اس کا جو کمایا تمہارے ہاتھوں نے اور معاف کرتا ہے بہت سے گناہ

خلاصہ تفسیر: اور (وہ انتقام لینے والا مگر ساتھ ہی معاف کرنے والا بھی ہے چنانچہ) تم کو (اے گناہگارو!) جو کچھ مصیبت (حقیقتاً) پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کئے گئے کاموں سے (پہنچتی ہے اور پھر بھی ہر گناہ پر نہیں، بلکہ بعض بعض گناہوں پر) اور بہت (سے گناہوں) سے درگزر ہی کر دیتا ہے (خواہ دونوں جہاں میں یا صرف دنیا میں، آٹھ صفات کے بعد یہاں مزید دو صفت اور ثابت ہوئیں: منتقم اور عفو)۔

وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ: یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ لفظ مَا کے عموم سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مصیبت گناہ ہی کی وجہ سے آتی ہے، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام پر بڑی بڑی آزمائشیں آئی ہیں جبکہ ان کا گناہوں سے پاک صاف ہونا معلوم ہے، جواب یہ ہے کہ یہاں خطاب عام نہیں ہے، یہ آیت صرف ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جن سے گناہ سرزد ہو سکتے ہیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جو گناہوں سے معصوم ہیں یا نابالغ بچے اور مجنون جن سے کوئی گناہ نہیں ہوتا، ان کو جو ظاہری تکلیف و مصیبت پہنچتی ہے وہ اس حکم میں داخل نہیں، نیز انبیاء علیہم السلام پر جو تکالیف آئیں اگرچہ وہ اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے مصیبت نظر آتی ہیں لیکن حقیقی اور معنوی اعتبار سے مصیبت نہیں بلکہ وہ نعمتیں ہیں جس سے وہ پریشان نہیں ہوتے، بلکہ وہ اپنے علوم و احوال اور درجات قرب میں اس سے ترقی کا مشاہدہ کر کے اس پر راضی رہتے ہیں، نیز اس کے دوسرے اسباب اور حکمتیں بھی ہوتی ہیں، مثلاً رفع درجات و مغفرت وغیرہ، اور درحقیقت ان کی حکمتوں کا احاطہ انسان نہیں کر سکتا، واللہ اعلم۔

جس طرح ظاہری مصیبت گناہ کے سبب ہوتی ہے اسی طرح باطنی مصیبت مثلاً قبض (نیکی میں دل نہ لگنا اور تنگ دل ہونا وغیرہ) کبھی گناہ کے سبب بھی ہوتا ہے، اسی طرح بعض اوقات قبض (دل کی تنگی) بعض باطنی مصالح کے لیے بھی ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جیسی نعمتیں ایک خاص اندازہ اور خاص اوقات و احوال کی رعایت سے دی جاتی ہیں، مصائب کا نزول بھی خاص اسباب و ضوابط کے ماتحت ہوتا ہے، مثلاً بندوں کو جو کوئی سختی اور مصیبت پیش آئے، اس کا سبب قریب یا بعید بندوں ہی کے بعض اعمال و افعال ہوتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے ایک آدمی غذا وغیرہ میں احتیاط نہ کرنے سے خود بیمار پڑ جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات ہلاک ہو جاتا ہے، یا بعض اوقات والدہ کی بدپرہیزی

بچہ کو مبتلائے مصیبت کر دیتی ہے، یا کبھی کبھی ایک محلے والے یا شہر والے کی بے تدبیری اور حماقت سے پورے محلہ اور شہر کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے، یہی حال روحانی اور باطنی بد پرہیزی اور بے تدبیری کا سمجھ لو، گو یا دنیا کی ہر مصیبت بندوں کے بعض اعمال ماضیہ کا نتیجہ ہے اور مستقبل میں ان کے لیے تنبیہ اور امتحان کا موقع بہم پہنچاتی ہے اور یہ اس پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بندوں کے بہت گناہوں سے درگزر کرتی ہے، اگر ہر ایک جرم پر گرفت ہوتی تو زمین پر کوئی متنفس بھی باقی نہ رہتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ خطاب عاقل بالغ لوگوں کو ہے، گناہ گار ہوں یا نیک، مگر نبی اس میں داخل نہیں (اور چھوٹے بچے بھی شامل نہیں) ان کے واسطے اور کچھ ہوگا اور سختی دنیا کی بھی آئے گی اور قبر کی اور آخرت کی''۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾

اور تم تھکا دینے والے نہیں بھاگ کر زمین میں، اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوا کام بنانے والا اور نہ مددگار

خلاصہ تفسیر: اور (اگر وہ سب پر مواخذہ کرنے لگے تو) تم زمین (کے کسی حصہ) میں (پناہ لے کر اس کو) ہرا نہیں سکتے اور (ایسے وقت میں) خدا کے سوا تمہارا کوئی حامی مددگار نہیں (ہو سکتا، اس میں گذشتہ دس صفات کے ساتھ اس کا عزیز ہونا بھی ثابت ہوا)۔

* * *

فائدہ: یعنی محض اپنی مہربانی سے معاف کرتا ہے، ورنہ جس جرم پر سزا دینا چاہے، مجرم بھاگ کر کہیں روپوش نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے سوا کوئی دوسرا حمایت و امداد کے لیے کھڑا ہو سکتا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ

اور ایک اسکی نشانی ہے کہ جہاز چلتے ہیں دریا میں جیسے پہاڑ ۱؎ اگر چاہے تھام دے ہوا کو پھر رہیں سارے دن ٹھہرے ہوئے اسکی پیٹھ پر ۲؎

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾

مقرر اس بات میں پتے ہیں ہر قائم رہنے والے کو جو احسان مانے ۳؎ یا تباہ کر دے ان کو بسبب انکی کمائی کے اور معاف بھی کرے بہتوں کو ۴؎

وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾

اور تا کہ جان لیں وہ لوگ جو جھگڑتے ہیں ہماری قدرتوں میں کہ نہیں ان کے لیے بھاگنے کی جگہ ۵؎

خلاصہ تفسیر: اور من جملہ اس کی (قدرت کی) نشانیوں کے جہاز ہیں سمندر میں (ایسے اونچے) جیسے پہاڑ (مراد یہ ہے کہ ان کا سمندر میں چلنا حق تعالیٰ کی عجیب صناعی کی دلیل ہے، ورنہ) اگر وہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ (جہاز) سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں (یہ اسی کا کام ہے کہ ہوا کو چلاتا ہے اور اس سے وہ جہاز چلتے ہیں) بیشک اس میں (قدرت پر دلالت کرنے والی) نشانیاں ہیں ہر صابر و شاکر (یعنی مومن) کے لئے (غرض اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کر کے جہازوں کو کھڑا کر دے) یا (اگر وہ چاہے زور کی ہوا چلا کر) ان جہازوں (کے سواروں) کو ان کے اعمال (بد یعنی کفر وغیرہ) کے سبب تباہ کر دے اور (ان میں) بہت سے آدمیوں میں سے درگزر کر جائے (یعنی اس وقت غرق نہ ہوں، اگر چہ آخرت میں سزا یاب ہوں) اور (اس تباہی کے وقت) ان لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں معلوم ہو جائے کہ (اب) ان کے لئے کہیں بچاؤ (کی صورت) نہیں (کیونکہ ایسے اوقات میں اپنے من گھڑت معبودوں کا عاجز ہونا وہ خود بھی سمجھتے تھے)۔

پیچھے بیان کردہ گیارہ صفات کے ساتھ حق تعالیٰ کا تمام افعال میں مستقل طور پر قادر متصرف ہونا ثابت ہو گیا۔

لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ: اس کی تشریح سورۃ لقمان آیت ۳۱: اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ میں اسی قسم کے جملہ کے تحت گزر چکی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جیسے زمین کی سطح پر پہاڑ اُبھرے ہوئے ہیں، سمندر کی سطح پر بڑے بڑے جہاز اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی ہوا بھی اللہ کے قبضہ میں ہے، اگر ہوا کو ٹھہرا رکھے، چلنے نہ دے تو تمام بادبانی جہاز دریا کی پیٹھ پر جہاں کے تہاں کھڑے رہ جائیں، غرض پانی اور ہوا سب اسی کے زیر فرمان ہیں۔

فائدہ: ۳ دریائی سفر میں موافق اور ناموافق دونوں قسم کے حالات سے سابقہ پڑتا ہے، اس لیے بہت ضروری ہے کہ انسان موافق حالات پر شکر اور ناموافق حالات پر صبر کرتا ہوا اللہ تعالیٰ کی قدرت اور نعمت کو پہچانے۔

فائدہ: ۴ یعنی چاہے تو مسافروں کے بعض اعمال کی پاداش میں جہازوں کو تباہ کر ڈالے اور اس تباہی کے وقت بھی بعض کو معاف فرما دے۔

فائدہ: ۵ یعنی تباہ اس لیے کیے جائیں کہ انکے بعض اعمال کا بدلہ ہو اور بڑے بڑے جھگڑالو بھی دیکھ لیں کہ ہاں! خدائی گرفت سے نکل کر بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جو لوگ ہر چیز اپنی تدبیر سے سمجھتے ہیں اس وقت عاجز رہ جائیں گے''، کوئی تدبیر بن نہ پڑے گی۔

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

سو جو کچھ ملا ہے تم کو کوئی چیز ہو سو وہ برت لینا ہے دنیا کی زندگانی میں، اور جو کچھ اللہ کے یہاں ہے بہتر ہے اور باقی رہنے والا واسطے ایمان والوں

وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۳۶

کے جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے دنیا سے مغرور ہونے کی مذمت اور طلب آخرت کی ترغیب بیان فرمائی تھی، اب آگے اس مذمت کی تائید کیلئے دنیا کی تحقیر مذکور ہے اور آخرت کی ترغیب کی تاکید کے لیے آخرت کی فضیلت اور اعمال حسنہ کے ذکر سے اس کی طلب کا طریقہ بیان فرماتے ہیں۔

(تم پیچھے سن چکے ہو کہ طالب دنیا کی ہر دنیوی تمنا پوری نہیں ہوتی اور دنیا میں انہماک کی وجہ سے وہ آخرت سے محروم رہتا ہے، اور طالب آخرت کو ہر دم ترقی ہوتی ہے، اور یہ بھی سن چکے ہو کہ زیادہ متاع دنیا کا انجام اچھا نہیں، اکثر اس سے برے اعمال پیدا ہوتے ہیں) سو (اس سے ثابت ہوا کہ مطلوب بنانے کے قابل دنیا نہیں، بلکہ آخرت ہی اس قابل ہے، اور باقی دنیا کی چیزوں میں سے) جو کچھ تم کو دیا دلایا گیا ہے (وہ محض چندروزہ) دنیوی زندگی کے برتنے کے لئے ہے (کہ عمر کے خاتمہ کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا) اور جو (اجر وثواب آخرت میں) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے (کیفیت کے اعتبار سے بھی) بہتر ہے اور (مقدار کے لحاظ سے بھی) زیادہ پائیدار (یعنی ہمیشہ رہنے والا ہے، پس دنیا کی طلب چھوڑ کر آخرت کی طلب کرو، مگر آخرت کے حصول کے لئے کم سے کم شرط تو ایمان لانا اور کفر کو چھوڑنا ہے، اور آخرت کا بلند درجہ حاصل کرنے کے لئے تمام واجبات وفرائض کو اختیار کرنا اور تمام گناہوں کو چھوڑنا ضروری ہے اور بہت زیادہ قرب حاصل کرنے کے لئے نفلی طاعات کو اختیار کرنا اور خلاف اولیٰ مباحات کو ترک کرنا بھی محبوب ہے، چنانچہ) وہ (ثواب جس کی تفصیل اوپر گزری) ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لے آئے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ تمام باتیں سننے کے بعد انسان کو چاہیے کہ اللہ کو راضی رکھنے کی فکر کرے، اس چندروزہ زندگانی اور عیش فانی پر مغرور نہ ہو اور

خوب سمجھ لے ایمانداروں کو جو عیش وآرام اللہ کے ہاں ملے گا، وہ اس دنیا کے عیش وآرام سے بہتر ہے اور پائدار بھی، نہ اس میں کسی طرح کی کدورت ہوگی، نہ فنا وزوال کا کھٹکا ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور جو لوگ کہ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی سے اور جب غصہ آوے تو وہ معاف کر دیتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور جو کبیرہ گناہوں سے اور (ان میں) بے حیائی کی باتوں سے (بالخصوص زیادہ) بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین مخلصین اور صالحین کی ایک خصوصیت ذکر فرمائی: **هم يغفرون** اس میں تو یہ بتلایا کہ یہ غصہ میں مغلوب نہیں ہوتے بلکہ رحم وکرم ان کے مزاج میں غالب رہتا ہے معاف کر دیتے ہیں۔

* * *

فائدہ: اس کا بیان سورہ نسا کی آیت: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ کے فوائد میں گزر چکا، وہاں ملاحظہ کر لیا جائے، شاید یہاں کبائر الاثم سے وہ بڑے گناہ مراد ہوں جو قوت نظریہ کی غلط کاری سے پیدا ہوئے ہیں، مثلاً ''عقائد بدعیہ'' اور ''فواحش'' وہ گناہ جن میں قوت شہوانیہ کی بے اعتدالی کو دخل ہو، آگے: وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ میں تو ظاہر ہے کہ قوت غضبیہ کی روک تھام کی گئی ہے، واللہ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

اور جنہوں نے کہ حکم مانا اپنے رب کا اور قائم کیا نماز کو اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے اور ہمارا دیا کچھ

يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾

خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ کہ جب ان پر ہووے چڑھائی تو وہ بدلہ لیتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور وہ نماز کے پابند ہیں اور ان کا ہر (اہم) کام (جس میں اللہ کی طرف سے کوئی معین حکم نہ ہو) آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جو ایسے (منصف) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے کچھ) ظلم واقع ہوتا ہے تو وہ (اگر بدلہ لیتے ہیں تو) برابر کا بدلہ لیتے ہیں (زیادتی نہیں کرتے، اور یہ مطلب نہیں کہ معاف نہیں کرتے)۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ: یہاں خلاصہ تفسیر میں ''اہم کام'' کی قید اس لیے بڑھائی کہ معمولی کاموں میں جیسے دو وقت کا کھانا کھانا وغیرہ تو اس میں مشورہ کرنا منقول نہیں، اور ''معین حکم نہ ہو'' کی قید اس لیے لگائی کہ جن کاموں کے لیے معین حکم موجود ہے ان میں بھی مشورہ نہیں، جیسے یہ مشورہ کرنا کہ پانچ وقت نماز پڑھا کروں یا نہ پڑھا کروں۔

هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنین مخلصین اور صالحین کی دوسری خصوصیت یہ بتلائی کہ: هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ یعنی یہ بھی انہیں صالحین کی خصوصیت ہے کہ اگر کبھی ظلم کا بدلہ لینے کا داعیہ ان کے دل میں پیدا بھی ہو اور بدلہ لینے لگیں تو اس میں حق سے تجاوز نہیں کرتے، اگرچہ معاف کر دینا ان کے لئے افضل ہے۔

هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ: روح المعانی میں ہے کہ یہ دونوں صفتیں اپنے اپنے مقام پر پسندیدہ ہیں، یعنی برائی پر انتقام لینا یا معاف ودرگزر کرنا مختلف حالات کے تحت ہے، اور اہل اللہ کے نزدیک یہ موقع ظلم زیادتی کرنے والے کی مصلحت سے بدلتا ہے، یعنی جو شخص ظلم کرنے کے بعد شرمندہ و افسوس کرتا ہو اس کو معاف کردینا افضل ہے، اور جو اپنی ضد وعناد پر قائم رہتا ہو اس سے انتقام لینا بہتر ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ مشورہ سے کام کرنا اللہ کو پسند ہے، دین کا ہو یا دنیا کا، نبی کریم ﷺ مہمات امور میں برابر اصحابؓ سے مشورہ فرماتے تھے اور صحابہ آپس میں مشورہ کرتے تھے، حروب وغیرہ کے متعلق بھی اور بعض مسائل واحکام کی نسبت بھی، بلکہ خلافت راشدہ کی بنیاد ہی شوریٰ پر قائم تھی، یہ ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت ان کاموں میں ہے جو مہتم بالشان ہوں اور جو قرآن وسنت میں منصوص نہ ہوں، جو چیز منصوص ہو اس میں رائے ومشورہ کے کوئی معنی نہیں اور ہر چھوٹے بڑے کام میں مشورہ ایسے شخص سے لیا جائے جو عاقل وعابد ہو، ورنہ اس کی بے وقوفی یا بددیانتی سے کام خراب ہوجانے کا اندیشہ رہے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جہاں معاف کرنا مناسب ہو معاف کرے، مثلاً ایک شخص کی حرکت پر غصہ آیا اور اس نے ندامت کے ساتھ اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرلیا، انہوں نے معاف کردیا، یہ محمود ہے اور جہاں بدلہ لینا مصلحت ہو، مثلاً کوئی شخص خواہ مخواہ چڑھتا ہی چلا آئے اور ظلم وزور سے دبانے کی کوشش کرے، یا جواب نہ دینے سے اس کا حوصلہ بڑھتا ہے، یا ہماری شخصی حیثیت سے قطع نظر کرکے دین کی اہانت یا جماعت مسلمین کی تذلیل ہوتی ہے، ایسی حالت میں بدلہ لیتے ہیں، وہ بھی بقدر اس کی زیادتی کے، جرم سے زائد سزا نہیں دیتے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٠﴾

اور برائی کا بدلہ ہے برائی ویسی ہی ۱؎ پھر جو کوئی معاف کرے اور صلح کرے سو اسکا ثواب ہے اللہ کے ذمہ، بیشک اسکو پسند نہیں آتے گناہگار ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (برابر کا بدلہ لینے کے لئے ہم نے یہ اجازت دے رکھی ہے کہ) برائی کا بدلہ برائی ہے ویسی ہی (بشرطیکہ وہ برائی بذات خود گناہ نہ ہو، کیونکہ ایسے کاموں میں ویسا ہی بدلہ لینا جائز نہیں، مثلاً کسی شخص نے اس کو جبراً شراب پلادی تو اس کے جواب میں اس کے لیے جائز نہ ہوگا کہ وہ اس کو زبردستی شراب پلادے) پھر (انتقام کی اجازت کے باوجود) جو شخص معاف کردے اور (باہمی معاملہ کی) اصلاح کرلے (جس سے دشمنی جاتی رہے اور دوستی ہوجائے کہ یہ معافی سے بھی بڑھ کر ہے) تو اس کا ثواب (حسب وعدہ) اللہ کے ذمہ ہے (اور جو بدلہ لینے میں زیادتی کرنے لگے تو یہ سن رکھے کہ) واقعی اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ بدلہ کے طور پر جو برائی کی جائے وہ حقیقتاً نہیں محض صورۃً برائی ہوتی ہے، سیئۃ کا اطلاق اس پر مشاکلۃً کیا گیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ظلم اور زیادتی تو اللہ کے ہاں کسی حالت میں پسند نہیں، بہترین خصلت یہ ہے کہ آدمی جتنا بدلہ لے سکتا ہے، اس سے بھی درگزر کرے، بشرطیکہ درگزر کرنے میں بات سنورتی ہو۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤١﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ

اور جو کوئی بدلہ لے اپنے مظلوم ہونے کے بعد سو ان پر بھی نہیں کچھ الزام ۱؎ الزام تو ان پر ہے جو

يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٤٢﴾

ظلم کرتے ہیں لوگوں پر ۲؎ اور دھوم اٹھاتے ہیں ملک میں ناحق، ان لوگوں کے لیے ہے عذاب دردناک

خلاصہ تفسیر: اور جو (زیادتی نہ کرے بلکہ) اپنے اوپر ظلم ہوچکنے کے بعد برابر کا بدلہ لے لے، سو ایسے لوگوں پر کوئی الزام نہیں، الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں (خواہ ابتدأ یا انتقام کے وقت) اور ناحق دنیا میں سرکشی اور (تکبر) کرتے (پھرتے) ہیں (اور یہی تکبر ظلم کا سبب ہوجاتا ہے، آگے اس الزام کا بیان ہے کہ) ایسوں کے لئے دردناک عذاب (مقرر) ہے۔

وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ: ''ناحق'' اس لئے کہا کہ سرکشی اور تکبر ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے، کیونکہ تکبر کرنے کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں، پس ناحق کی قید واقعی ہے، احترازی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مظلوم ظالم سے بدلہ لینا چاہے تو اس میں الزام اور گناہ کچھ نہیں۔ ہاں معاف کردینا افضل واحسن ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ابتداء ظلم کرتے ہیں، یا انتقام لینے میں حد استحقاق سے بڑھ جاتے ہیں۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿٤٣﴾ ع ۵

اور البتہ جس نے سہا (تحمل کیا) اور معاف کیا بیشک یہ کام ہمت کے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور جو شخص (دوسرے کے ظلم پر) صبر کرے اور معاف کردے، یہ البتہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے (یعنی ایسا کرنا بہتر اور اولوالعزمی کا تقاضا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی غصہ کو پی جانا اور ایذائیں برداشت کر کے ظالم کو معاف کردینا بڑی ہمت اور حوصلہ کا کام ہے، حدیث میں ہے کہ جس بندہ پر ظلم ہو اور وہ محض اللہ کے واسطے اس سے درگزر کرے تو ضرور ہے کہ اللہ اس کی عزت بڑھائے گا اور مدد کرے گا۔

وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَلِيٍّ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَتَرَى الظَّالِمِينَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ يَقُولُونَ

اور جس کو راہ نہ سجھائے اللہ تو کوئی نہیں اس کا کام بنانے والا اس کے سوا ۱؎ اور تو دیکھے گناہ گاروں کو جس وقت دیکھیں گے عذاب کہیں گے

هَلْ إِلَىٰ مَرَدٍّ مِنْ سَبِيلٍ ﴿٤٤﴾

کسی طرح پھر جانے کی بھی ہوگی کوئی راہ ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے طالب آخرت مسلمانوں کا اچھا انجام بیان فرمایا، اب آگے طالب دنیا کفار کا برا انجام بتاتے ہیں۔

(یہ حال تو اہل ہدایت کا تھا کہ وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے ہدایت اور آخرت میں ثواب سے مشرف ہوئے) اور (آگے گمراہوں کا حال سنو، وہ یہ ہے کہ) جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردے تو اس کے بعد اس شخص کا (دنیا میں بھی) کوئی چارہ ساز نہیں (کہ اس کو راہ پر لے آئے) اور (قیامت میں بھی اس کا برا حال ہوگا، چنانچہ اس روز) آپ (ان) ظالموں کو دیکھیں گے کہ جس وقت ان کے عذاب کا معائنہ ہوگا کہ (نہایت حسرت سے) کہتے ہوں گے کیا (دنیا میں) واپس جانے کی کوئی صورت (ہوسکتی) ہے (تاکہ پھر اچھے عمل کر کے آئیں، غرض نہایت حسرت سے دنیا میں آنے کی تمنا کریں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ کی توفیق ودستگیری ہی سے آدمی کو عدل وانصاف اور صبر وغفر کی اعلیٰ خصلتیں حاصل ہوسکتی ہیں، وہ ان بہترین اخلاق کی طرف راہ نہ دے تو کون ہے جو ہاتھ پکڑ اکر اخلاقی پستی اور رسوائی کے گڑھے سے ہم کو نکال سکے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کوئی ایسی سبیل بھی ہے کہ ہم دنیا کی طرف پھر واپس کردیے جائیں اور اس مرتبہ وہاں سے خوب نیک بن کر حاضر ہوں۔

وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ

اور تو دیکھے ان کو کہ سامنے لائے جائیں آگ کے آنکھیں جھکائے ہوئے ذلت سے دیکھتے ہوں گے چھپی نگاہ سے ۱؎ اور کہیں وہ لوگ جو

اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ

ایمان دار تھے مقرر ٹوٹے والے وہی ہیں جنہوں نے گنوایا اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن ۲؎ سنتا ہے گنہگار

فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَاۗءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ

پڑے ہیں سدا کے عذاب میں ،اور کوئی نہ ہوئے ان کے حمایتی جو مدد کرتے ان کی اللہ کے سوا، اور جس کو بھٹکائے اللہ

فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ﴿۴۶﴾

اس کے لیے کہیں نہیں راہ ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (نیز) آپ ان کو اس حالت میں دیکھیں گے کہ وہ دوزخ کے روبرو لائے جائیں گے، مارے ذلت کے جھکے ہوئے ہوں گے (اور وہ اس کو) ست (ست) نگاہ سے دیکھتے ہوں گے (جیسے خوف زدہ آدمی اسی طرح دیکھا کرتا ہے) اور (اس وقت) ایمان والے (اپنے بچنے پر شکر کرنے اور دوزخیوں پر ملامت کرنے کے لئے) کہیں گے کہ پورے خسارے والے وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں سے اور اپنے متعلقین سے (آج) قیامت کے روز خسارہ میں پڑے (اس کی تفسیر سورۃ زمر آیت ۱۵: قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا میں گزر چکی ہے) یاد رکھو کہ ظالم (یعنی مشرک و کافر) لوگ عذاب دائمی میں (گرفتار) رہیں گے، اور (وہاں) ان کے کوئی مددگار نہ ہوں گے جو خدا سے الگ (ہوکر) ان کی مدد کریں اور جس کو خدا گمراہ کر دے اس کی (نجات) کے لئے کوئی رستہ ہی نہیں (یعنی نہ معذرت کر سکیں گے، نہ ایک دوسرے کی مدد، نہ اور کچھ تدبیر کر سکیں گے)۔

يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ: ایک دوسری آیت میں جو نابینا ہونے کی خبر دی ہے وہ حشر کے وقت ہے، اور یہاں آیت میں اس کے بعد کا واقعہ ہے، چناچہ وہاں لفظ نحشرہ کی تصریح ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایک سہمے ہوئے مجرم کی طرح خوف اور ذلت وندامت کے مارے نیچی نظر سے دیکھتے ہوں گے، کسی سے پوری طرح آنکھ نہیں ملا سکیں گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بد بخت اپنے ساتھ اپنے متعلقین اور گھر والوں کو بھی لے ڈوبے، سبھی کو تباہ و برباد کر کے چھوڑا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی نہ دنیا میں ہدایت کی، نہ آخرت میں نجات کی۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ

مانو اپنے رب کا حکم اس سے پہلے کہ آئے وہ دن جس کو پھرنا نہیں اللہ کے یہاں سے ۱؎ نہیں ملے گا تم کو بچاؤ اس دن

وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾

اور نہ ملے گا الوپ (مکر جانا) ہو جانا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے ایمان نہ لانے پر عذاب قیامت کی وعید سنائی تھی، اب آگے تفریع کے طور پر اس وعید کے آنے سے پہلے ایمان لانے کا حکم فرماتے ہیں، اور ان کے ایمان نہ لانے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی کا مضمون سناتے ہیں۔

(آگے کافروں سے خطاب ہے کہ اے لوگو! جب تم نے قیامت کے یہ ہولناک حالات سن لئے تو) تم اپنے رب کا حکم (ایمان وغیرہ کا) مان لو قبل اس کے کہ ایسا دن آ پہنچے جس کے لئے خدا کی طرف سے ہٹنا نہ ہوگا (یعنی جس طرح دنیا میں عذاب ہٹتا جاتا ہے، آخرت میں ایسی کوئی صورت نہ ہوگی) نہ تم کو اس روز کوئی (اور) پناہ ملے گی اور نہ تمہارے بارے میں کوئی (خدا سے) روک ٹوک کرنے والا ہے (کہ اتنا ہی پوچھ لے کہ ان کا یہ حال کیوں بنایا گیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جیسے دنیا میں عذاب موخر ہوتا اور ٹلتا چلا جاتا ہے، اس دن نہیں ٹلے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی مکر جانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا اور ابن کثیرؒ نے یوں معنی کیے ہیں کہ کوئی موقع ایسا نہ ملے گا جب تم پہچانے نہ جاؤ۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ

پھر اگر وہ منہ پھیریں تو تجھ کو نہیں بھیجا ہم نے ان پر نگہبان، تیرا ذمہ تو بس یہی ہے پہنچا دینا ۱؎ اور ہم جب چکھاتے ہیں آدمی کو

مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾

اپنی طرف سے رحمت اس پر پھولا نہیں سماتا اور اگر پہنچتی ہے ان کو کچھ برائی بدلے میں اپنی کمائی کی تو انسان بڑا ناشکرا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب حضور ﷺ کو تسلی کا مضمون سناتے ہیں کہ اے پیغمبر ﷺ! ان لوگوں کو یہ سنا دیجئے کہ:

پھر اگر یہ لوگ (یہ سن کر بھی) اعراض کریں (اور ایمان نہ لائیں) تو (آپ فکر اور غم میں نہ پڑیں، کیونکہ) ہم نے آپ کو ان پر نگران کر کے نہیں بھیجا (جس سے باز پرس کا احتمال ہو کہ آپ کی نگرانی میں ان سے یہ امور کیوں صادر ہوئے، بلکہ) آپ کے ذمہ تو صرف (حکم کا) پہنچا دینا ہے (جس کو آپ کر رہے ہیں، پھر آپ اس سے زیادہ فکر کیوں کریں) اور (ان لوگوں کے حق سے اعراض کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق بہت کم ہے جس کی علامت یہ ہے کہ) ہم جب (اس قسم کے) آدمی کو کچھ اپنی عنایت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو وہ اس پر (اترا کر) خوش ہو جاتا ہے (اور منعم حقیقی پر نگاہ کر کے شکر نہیں کرتا) اور اگر (ایسے) لوگوں پر ان کے (ان) اعمال (بد) کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو (ایسا) آدمی ناشکری کرنے لگتا ہے (اور گناہوں سے توبہ کر کے حق تعالیٰ کی طرف دعا و التجا، عبادت و اطاعت وغیرہ سے رجوع نہیں کرتا)۔

مذکورہ دونوں حالتیں اس بات کی علامت ہیں کہ ان لوگوں کو اپنی نفسانی لذتوں کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق معدوم یا کمزور ہے اور اسی وجہ سے یہ کفر میں مبتلا ہوئے ہیں، اور چونکہ یہ حالت ان لوگوں کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے، اس لیے آپ ان سے ایمان کی توقع ہی کیوں رکھیں جو غم کا سبب ہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آپ ذمہ دار نہیں کہ زبردستی منوا کر چھوڑیں، آپ کا فرض پیغام الٰہی پہنچا دینا ہے، وہ آپ ادا کر رہے ہیں، یہ نہیں مانتے تو جائیں جہنم میں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان کے اعراض سے آپ غمگین نہ ہوں، انسان کی طبیعت ہی ایسی واقع ہوئی ہے (الا من شاء اللہ) کہ اللہ انعام واحسان

فرمائے تو اکڑنے اور اترانے لگتا ہے، پھر جہاں اپنی کرتوت کی بدولت کوئی افتاد پڑگئی، بس سب نعمتیں بھول جاتا ہے اور ایسا ناشکرا بن جاتا ہے کہ گویا کبھی اس پر اچھا وقت آیا ہی نہ تھا، خلاصہ یہ کہ فراخی اور عیش کی حالت ہو یا تنگی اور تکلیف کی، اپنی حد پر قائم نہیں رہتا، البتہ مومنین قانتین کا شیوہ یہ ہے کہ سختی پر صبر اور فراخی کی حالت میں منعم حقیقی کا شکر ادا کرتے ہیں اور کسی حال اس کے انعامات واحسانات کو فراموش نہیں کرتے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ

اللہ کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں، پیدا کرتا ہے جو چاہے، بخشا ہے جس کو چاہے بیٹیاں اور بخشا ہے جس کو چاہے

الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

بیٹے، یا ان کو دیتا ہے جوڑے بیٹے اور بیٹیاں، اور کردیتا ہے جس کو چاہے بانجھ، وہ ہے سب کچھ جانتا کرسکتا لے

خلاصہ تفسیر: پیچھے چند جگہ توحید کا ذکر ہوا ہے، اور قریب کی آیتوں میں بھی عذاب کے وقت کسی کا مشرکین کے کام نہ آنا بیان ہوا جس سے شرک کو باطل کیا گیا، اب آگے بھی توحید کا ذکر ہے۔

اللہ ہی کی ہے (سب) سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے (چنانچہ) جس کو چاہتا ہے بیٹیاں عطا فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹے عطا فرماتا ہے، یا ان کو (جس کے لئے چاہے) جمع کر دیتا ہے (کہ) بیٹے بھی (دیتا ہے) اور بیٹیاں بھی، اور جس کو چاہے بے اولاد رکھتا ہے، بیشک وہ بڑا جاننے والا بڑی قدرت والا ہے۔

اللہ کی سلطنت آسمانوں اور زمین میں ہونا تصرفات کو عام ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے اور ان میں سے ایک خاص تصرف بیٹے اور بیٹیاں دینے کے متعلق شاید اس لیے خاص طور پر بیان فرمادیا کہ اس کا ہر وقت مشاہدہ ہے اور اس سے استدلال خدا کی قدرت پر آسان ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی سختی ہو یا نرمی سب احوال خدا کے بھیجے ہوئے ہیں، آسمان وزمین میں سب جگہ اسی کی سلطنت اور اسی کا حکم چلتا ہے، جو چیز چاہے پیدا کرے اور جو چیز جس کو چاہے دے، جس کو چاہے نہ دے۔

دنیا کے رنگارنگ حالات کو دیکھ لو، کسی کو سرے سے اولاد نہیں ملتی، کسی کو ملتی ہے تو صرف بیٹیاں، کسی کو صرف بیٹے، کسی کو دونوں، جڑواں یا الگ الگ، اس میں کسی کا کچھ دعویٰ نہیں، وہ مالک حقیقی ہی جانتا ہے کہ کس شخص کو کس حالت میں رکھنا مناسب ہے اور وہ ہی اپنے علم وحکمت کے موافق تدبیر کرتا ہے، کسی کی مجال نہیں کہ اس کے ارادہ کو روک دے، یا اس کی تخلیق وتقسیم پر حرف گیری کرسکے، عاقل کا کام یہ ہے کہ ہر قسم کے نرم وگرم حالات میں اسی کی طرف رجوع کرے اور ہمیشہ اپنی ناچیز حقیقت کو پیش نظر رکھ کر تکبر یا کفران نعمت سے باز رہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ

اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچا دے اسکے حکم سے

مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾

جو وہ چاہے لے تحقیق وہ سب سے اوپر ہے حکمتوں والا ٢ے

خلاصہ تفسیر: پیچھے چند جگہ رسالت کا ذکر ہوا ہے اور متصل کی آیتوں میں بھی ان علیك الّا البلاغ فرمایا ہے، چونکہ کفار کو نبوت کے متعلق ایک شبہ یہ بھی تھا کہ ہم سے اللہ تعالی یا فرشتے آمنے سامنے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ یہ رسول ہیں، اس لیے اب آئندہ آیات میں اسی کا

جواب، اور اسی کے سلسلہ میں آپ کی نبوت کا ثبوت اور اس پر احسان جتلاتے ہیں اور قرآن کی عظمت شان اور اس کا عام و خاص فیضان بتلاتے ہیں اور اس کی اتباع واجب ہونے کی تاکید کے لیے خدا تعالیٰ کی عظمت کو صراحۃً اور جزا وسزا کا ذکر اشارۃً فرما کر سورت کو ختم فرماتے ہیں۔

اور کسی بشر (کی موجودہ حالت میں) یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرمائے مگر (تین طریق سے) یا تو الہام سے (کہ دل میں کوئی اچھی بات حواس طبعی کے واسطہ کے بغیر ڈال دے، خواہ بیداری میں یا خواب میں، اور وہ الہام خواہ قطعی ہو جیسے انبیاء کا الہام، خواہ قطعی نہ ہو جیسے انبیاء کے سوا دوسروں کا الہام) یا حجاب کے باہر سے (کچھ کلام سنا دے، جیسے موسیٰ علیہ السلام نے خدا کا کلام حجاب کے باہر سے سنا تھا، یا رسول اللہ ﷺ سے تجلی صفاتی کے حجاب کے ساتھ حق تعالیٰ نے بلا واسطہ یہ ارشاد فرمایا تھا: فیم یختصم الملاء الاعلی کہ فرشتوں کی معزز جماعت کس بات میں جھگڑا کر رہی ہے) یا کسی فرشتہ کو بھیج دے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہوتا ہے پیغام پہنچا دیتا ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ) وہ بڑا عالیشان ہے (اس سے جب تک وہ خود طاقت نہ دے کوئی ہم کلام نہیں ہوسکتا، مگر اس کے ساتھ) بڑی حکمت والا (بھی) ہے (اسی لئے بندوں کی مصلحت سے اس نے کلام کے تین مذکورہ طریقے مقرر فرما دیئے ہیں)۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ: یہ قانون جو آیت مذکورہ میں ارشاد ہے دنیا کے متعلق ہے کہ دنیا میں کوئی انسان اللہ تعالیٰ سے کلام مشافہۃً یعنی بے حجاب نہیں کرسکتا، اور یہاں انسان کا ذکر بطور خاص لیے ہے کہ گفتگو انسان ہی کے متعلق تھی، ورنہ ظاہر یہ ہے کہ فرشتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہ نہیں ہوتا، جیسا کہ ترمذی کی روایت میں جبرائیل علیہ السلام سے منقول ہے کہ میں بہت قریب ہو گیا تھا اور پھر بھی ستر ہزار حجاب رہ گئے تھے، کھلم کھلا آمنے سامنے کسی سے کلام کرنا عادت الٰہی کے اس لیے خلاف ہے کہ موجودہ حالت میں خود دیدار الٰہی کے تحمل کی قوت انسان کو حاصل نہیں ہے۔

اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ: یہ حجاب جو انسان کو دنیا میں حق تعالیٰ کی زیارت سے مانع ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو حق تعالیٰ کو چھپا سکے، یعنی وہ حجاب کوئی جسم نہیں جو کہ بندہ اور خدا کے درمیان حائل ہو، اور نہ یہ حجاب حق تعالیٰ کی ذات اور نور کو پوشیدہ کرسکتا ہے، کیونکہ اس کے نور محیط کو کوئی شے چھپا نہیں سکتی، بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا ادراک اور اس کی قوت بینائی کا ضعف ہی اس کے لیے زیارت حق کے درمیان حجاب ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان ادراک سے عاجز ہے، اور یہی وہ حجاب تھا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیدار سے مانع ہوا تھا، اور جنت میں جبکہ اس کی بینائی قوی کر دی جائے گی تو وہاں ہر جنتی حق تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہوگا، جیسا کہ احادیث صحیحہ کی تصریح کے مطابق اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے، بعض اکابر اس کے قائل ہیں کہ معراج میں جناب رسول اللہ ﷺ سے حق تعالیٰ نے کھلم کھلا کلام فرمایا تو اس وقت حضور ﷺ کو دیدار کے تحمل کی قوت عطا ہو گئی ہوگی، نیز وہ کلام اس عالم میں نہیں تھا، عالم سماوات میں تھا، پس خلاصہ تفسیر میں ''موجودہ حالت میں'' کی قید بڑھانے سے ان سب صورتوں سے احتراز ہو گیا۔

مشکوۃ میں جو ایک حدیث ہے: ''قسم الله رؤيته وكلامه بين موسى ومحمد عليهما السلام اونحوه'' کہ حق تعالیٰ نے اپنی ہم کلامی اور دیدار کو حضرت موسیٰ اور سیدنا محمد ﷺ میں تقسیم فرمایا جس سے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے تو بات یہ ہے کہ اس حدیث میں خاص طور پر کلام کرنا مراد ہے، جو کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھا، چنانچہ آیت: **وكلم الله موسى تكليما** میں لفظ **تكليما** کا بڑھانا اس پر قرینہ بھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے ایک خاص طور پر ہم کلامی ہوئی تھی اور ان ہی کے ساتھ مخصوص تھی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ رسول اللہ ﷺ سے حق تعالیٰ نے بلا واسطہ کلام نہیں فرمایا، پھر یہ بلا واسطہ کلام حجاب کے باہر سے اگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہو تو جو بات سنی جائے وہ قطعی ہوگی، اور اگر اولیاء کے لیے اس طرح کلام ہونا ثابت ہو جائے جیسا کہ روح المعانی میں حضرت عمرؓ کے لیے عبدالوہاب شعرانیؒ کے واسطہ سے ثابت کیا ہے اور کسی نص سے اس کی نفی بھی نہیں ہوتی تو اس صورت میں جو بات سنی جائے وہ قطعی نہیں ہوگی۔

اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا: اگر انبیاء کے سوا دوسروں کے لیے اس کا ثبوت ہو جائے جیسا کہ بعض کتابوں میں شیخ اکبر سے نقل کیا ہے اور مریم علیہا السلام کے ساتھ فرشتوں کی بات چیت سے اس کی تائید ہوتی ہے تو اس صورت میں بھی دو قسمیں نکلیں گی: ایک قطعی جو کہ انبیاء کے لیے مخصوص ہے دوسرے ظنی جو غیر انبیاء کے لیے ہے، اور اولیاء کے ساتھ فرشتوں کا جو کلام ہوا اس کو وحی کہنا جائز نہیں، غرض انسان کے ساتھ خدا تعالیٰ کی ہم کلامی کے یہ

تین طریقہ ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ کوئی بشر اپنی عنصری ساخت اور موجودہ قویٰ کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ خداوند قدوس اس دنیا میں اس کے سامنے ہو کر مشافہۃً کلام فرمائے اور وہ تحمل کر سکے، اسی لیے کسی بشر سے اس کے ہم کلام ہونے کی تین صورتیں ہیں:

(الف) بلا واسطہ پردہ کے پیچھے سے کلام فرمائے، یعنی نبی کی قوت سامعہ استماع کلام سے لذت اندوز ہو، مگر اس حالت میں آنکھیں دولت دیدار سے متمتع نہ ہو سکیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ الاسراء میں پیش آیا۔

(ب) بواسطہ فرشتہ کے حق تعالیٰ کلام فرمائے، مگر فرشتہ متجسد ہو کر آنکھوں کے سامنے نہ آئے، بلکہ براہ راست نبی کے قلب پر نزول کرے اور قلب ہی سے ادراک فرشتہ کا اور صوت کا ہوتا ہو، حواس ظاہرہ کو چنداں دخل نہ رہے۔

میرے خیال میں یہ صورت ہے جس کو عائشہ صدیقہؓ کی حدیث میں: "یاتینی فی مثل صلصلة الجرس" سے تعبیر فرمایا ہے اور صحیح بخاری کے ابواب بدء الخلق میں وحی کی اس صورت میں بھی اتیان ملک کی تصریح موجود ہے، اس کو حدیث میں: "وھو اشدہ علی" فرمایا اور شاید وحی قرآنی بکثرت اسی صورت میں آتی ہو، جیسا کہ: **نزل به الروح الامین علی قلبك** اور: **فانه نزله علی قلبك باذن الله** میں لفظ: **قلبك** سے اشارہ ہوتا ہے، اور چونکہ یہ معاملہ بالکل پوشیدہ طور پر اندر ہی اندر ہوتا تھا، پیغمبر کے وجود سے باہر کوئی علیحدہ ہستی نظر نہ آتی تھی اور نہ اس طرح کلام ہوتا تھا، جیسے ایک آدمی دوسرے سے بات کرتا ہو کہ پاس بیٹھنے والے سامعین بھی سمجھ لیں، اس لیے اس قسم کو خصوصیت کے ساتھ آیت ہذا میں لفظ: **وحیا** سے تعبیر کیا، کیونکہ لغت میں "وحی" کا لفظ "اخفاء" اور "اشارہ سریعہ" پر دلالت کرتا ہے۔

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ متجسد ہو کر نبی کے سامنے آ جائے اور اس طرح خدا کا کلام و پیام پہنچا دے جیسے ایک آدمی دوسرے سے خطاب کرتا ہے، چنانچہ حضرت جبرائیل ایک دو مرتبہ اپنی اصل صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اکثر مرتبہ حضرت دحیہ کلبیؓ کی صورت میں آتے تھے، اور کبھی کسی غیر معروف آدمی کی شکل میں بھی تشریف لائے ہیں، اس وقت آنکھیں فرشتہ کو دیکھتیں اور کان ان کی آواز سنتے تھے اور پاس بیٹھنے والے بھی بعض اوقات گفتگو سنتے اور سمجھتے تھے، عائشہ صدیقہؓ کی حدیث میں جو دو قسمیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے یہ دوسری صورت ہے، اور میرے خیال اسی کو آیہ ہذا میں: **او یرسل رسولا فیوحی باذنه ما یشآء** سے تعبیر فرمایا گیا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔ باقی حجاب والی صورت چونکہ بالکل نادر بلکہ اندر تھی اس لیے عائشہؓ کی حدیث میں اس سے تعرض نہیں کیا گیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس کا علو مانع ہے کہ بے حجاب کلام کرے اور حکمت مقتضی ہے کہ بعض صورتیں ہم کلامی کی اختیار کی جائیں۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ

اور اسی طرح بھیجا ہم نے تیری طرف ایک فرشتہ اپنے حکم سے ۱؎ تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان ۲؎ لیکن

جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾

ہم نے رکھی ہے یہ روشنی اس سے راہ سجھا دیتے ہیں جس کو چاہیں اپنے بندوں میں ۳؎ اور بیشک تو سجھاتا ہے سیدھی راہ ۴؎

صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ ع

راہ اللہ کی اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ۵؎ سنتا ہے اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سب کام ۶؎

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح بشر کے ساتھ ہمارے ہم کلام ہونے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے) اسی طرح (یعنی اس قاعدے

کے مطابق) ہم نے آپ کے پاس (بھی) وحی یعنی اپنا حکم بھیجا ہے (اور آپ کو نبی بنایا ہے، اور یہ وحی ایسا ہدایت نامہ ہے کہ آپ کے بے مثل علوم میں اسی کی بدولت ترقی ہوئی، چنانچہ اس سے پہلے) آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب (اللہ) کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان (کا مکمل ترین درجہ جو اَب حاصل ہے) کیا چیز ہے (اگرچہ نفس ایمان نبی کو نبوت سے پہلے بھی حاصل ہوتا ہے) لیکن ہم نے (آپ کو نبوت اور قرآن دیا اور) اس قرآن کو (آپ کے لئے اولاً اور دوسروں کے لئے ثانیاً) ایک نور بنایا (جس سے آپ کو یہ عظیم علوم اور بلند مرتبہ احوال حاصل ہوئے اور) جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں (پس اس کے نور عظیم ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اب جو اندھا ہی ہو وہ اس نور کے نفع سے محروم بلکہ اس کا منکر ہے، جیسے یہ معترضین) اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ (اس قرآن اور وحی کے ذریعہ سے عام لوگوں کو) ایک سیدھے رستہ کی ہدایت کر رہے ہیں، یعنی اس خدا کے رستہ کی کہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (آگے ان احکام کے ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزا و سزا کا ذکر ہے کہ) یاد رکھو سب امور اسی کی طرف رجوع ہوں گے (پس وہ سب پر جزا و سزا دے گا) ۔

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ (الی قولہ) وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ: اس میں دلالت ہے کہ ہر کامل اپنی ذات میں کمالات سے عاری ہے اور فضائل و کمالات سب کے سب وہبی (اللہ کا فضل وعطا) ہوا کرتے ہیں، جس میں انسان کی محنت اور کسب کا دخل نہیں ہوتا، اور جس ذات کو کمال عطا کرنے پر قدرت حاصل ہے اس کو کمال چھیننے کی بھی قدرت حاصل ہے، لہٰذا کسی صاحب کمال کو اپنے فضل و کمال پر ناز نہیں کرنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱ مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے اس جگہ ''روح'' سے مراد فرشتہ لیا ہے، یعنی ''جبرائیل امین''، اور یہ بعض مفسرینؒ کی رائے ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہاں خود قرآن کریم کو ''روح'' سے تعبیر فرمایا، کیونکہ اس کی تاثیر سے مردہ قلوب زندہ ہوتے ہیں، اور انسان کو ابدی حیات نصیب ہوتی ہے، دیکھ لو جو قومیں کفر وظلم اور بداخلاقی کی موت مر چکی تھیں کس طرح قرآن نے ان میں جان تازہ ڈال دی۔

فائدہ: ۲ یعنی ایمان اور اعمال ایمانیہ کی یہ تفاصیل جو بذریعہ وحی اب معلوم ہوئیں، پہلے سے کہاں معلوم تھیں؟! گو نفس ایمان کے ساتھ ہمیشہ سے متصف تھے۔

فائدہ: ۳ یعنی قرآن کی روشنی میں جن بندوں کو ہم چاہیں سعادت وفلاح کے راستہ پر لے چلتے ہیں۔

فائدہ: ۴ یعنی آپ تو سب بندوں کو قرآن کریم کے ذریعہ سے اللہ تک پہنچنے کی سیدھی راہ بتلاتے رہتے ہیں، کوئی اس پر چلے یا نہ چلے۔

فائدہ: ۵ یعنی سیدھی راہ وہ جس پر چل کر آدمی خدائے واحد تک پہنچتا ہے، جو اس راہ سے بھٹکا، خدا سے الگ ہوا۔

فائدہ: ۶ یعنی جب سب کاموں کا انجام اسی کی طرف ہے تو چاہیے کہ آدمی شروع سے اس انجام کو سوچ لے اور اپنے اختیار سے ایسے راستہ پر چلے جو سیدھا اس کی بارگاہ تک پہنچنے والا ہو۔

اللهم اهدنا الصراط المستقيم وثبتنا عليه

آیاتها ۸۹ | ۴۳ سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ مَكِّيَّةٌ ۶۳ | رکوعاتها ۷

خلاصہ تفسیر: سورۃ زخرف بھی مکی سورتوں میں ہے، اور مکی آیات وسورتوں کی طرح اس کے مضامین بھی بالعموم توحید ورسالت کے دلائل پر مشتمل ہیں، اور شرک کی عقلی وفطری دلائل سے تردید کی گئی، گزشتہ سورۃ شوریٰ کی ابتداء اثبات وحی سے تھی اور اسی پر اس کی انتہاء بھی ہوئی کہ رسالت ونبوت کو ثابت کرتے ہوئے وحی الٰہی کی قسموں کی تحقیق وتفصیل بیان فرمائی گئی، اب اس سورت کی ابتداء سورۃ سابقہ کی انتہا کے ساتھ مربوط ہے کہ ابتداء سورت میں کتاب الٰہی کی عظمت بیان کی جارہی ہے کہ وہ کتاب مبین ہے اور قرآن کریم کلام عربی ہے جس کے عربی ہونے کی وجہ سے اہل عرب اسکے اعجاز وحقانیت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور اس طرح ان کو قرآن کریم پر ایمان لانے اور اس کو کلام الٰہی ماننے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۳﴾

حم، قسم ہے اس کتاب واضح کی، ہم نے رکھا اس کو قرآن عربی زبان کا تا کہ تم سمجھو۔[1]

وَاِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ﴿۴﴾

اور تحقیق یہ قرآن لوح محفوظ میں ہمارے پاس ہے برتر مستحکم۔[2]

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورۃ کا اختتامی مضمون وحی الٰہی کی تحقیق اور نزول وحی کی صورتوں پر تھا، اب اس سورت کی ابتداء وحی الٰہی اور کتاب ربانی کی عظمت اور اوصاف عالیہ کے بیان سے کی جارہی ہے۔

حٰمٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم (ہے) اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تا کہ (اے عرب!) تم (آسانی سے) سمجھ لو اور وہ ہمارے پاس لوح محفوظ میں بڑے رتبہ کی اور حکمت بھری کتاب ہے (پس جب وہ سمجھنے میں آسان اور خاص ہماری زیر حفاظت اور اعجاز کی وجہ سے بڑے رتبے والی اور حکیمانہ مضامین پر مشتمل ہے تو ایسی کتاب کو ضرور ماننا چاہئے)۔

وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ: اس سے مراد قرآن کریم ہے، یہاں جو قرآن کی قسم ہے وہ تاکید کلام کے علاوہ خود جواب قسم کی دلیل بھی ہے، کیونکہ قرآن کی حالت میں غور کرنے سے اس کا اعجاز ظاہر ہوتا ہے اور یہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کی قسم کھاتے ہیں تو عموماً وہ چیز بعد کے دعوی کی دلیل ہوا کرتی ہے، یہاں قرآن کریم کی قسم کھا کر اسی طرف اشارہ فرمادیا گیا ہے، کیونکہ قرآن کریم بذات خود اپنے اعجاز کی وجہ سے اپنی حقانیت کی دلیل ہے۔

اور قرآن کو ''واضح'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وعظ و نصیحت پر مشتمل مضامین با آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں، لیکن جہاں تک اس سے احکام شرعیہ کے استنباط کا تعلق ہے وہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے، اجتہاد کی پوری صلاحیت کے بغیر انجام نہیں دیا جاسکتا، چنانچہ دوسری جگہ یہ بات واضح کردی گئی ہے: **ولقد یسّرنا القرآن للذّکر فھل من مدّکر** (اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے، پس کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا) اس میں فرمادیا گیا ہے کہ قرآن نصیحت اندوزی کے لئے آسان ہے، لہٰذا اس سے اجتہاد و استنباط کا آسان ہونا لازم نہیں آتا کہ ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت ہوجائے، بلکہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ اس کام کے لئے متعلقہ علوم میں پوری مہارت شرط ہے۔

قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا: قرآن کے عربی زبان ہونے سے اس کی دعوت کے عام نہ ہونے پر اشکال نہ کیا جائے، کیونکہ خاص عربی زبان میں نازل فرمانے کی یہ حکمت ہے کہ عرب قرآن کے اول مخاطب ہیں اور ان کے بعد تمام عالم اس کا مخاطب ہے جن کو اہل عرب کے واسطہ سے اس کا سمجھنا آسان ہے جیسا کہ مشاہد ہے۔

* * *

فائدہ: [1] کیونکہ عربی تمہاری مادری زبان ہے اور تمہارے ذریعہ سے دنیا کی قومیں اس کتاب کو سیکھیں گی۔

فائدہ: [2] یعنی وجوہ اعجاز اور اسرار عظیمہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نہایت بلند اور تبدیل و تحریف سے محفوظ رہنے کی وجہ سے نہایت مستحکم ہے، اسکے دلائل و براہین نہایت مضبوط اور اسکے احکام غیر منسوخ ہیں، کوئی حکم سے خالی نہیں اور تمام مضامین اصلاح معاش و معاد کی اعلیٰ ترین ہدایات پر مشتمل اور حکیمانہ خوبیوں سے مملو ہیں، اور قرآن کے ان تمام محاسن پر جو خود قرآن ہی شاہد ہے، آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

تنبیہ: قرآن اور تمام کتب سماویہ نزول سے پہلے لوح محفوظ میں لکھی گئی ہیں۔

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡكُمُ الذِّكۡرَ صَفۡحًا اَنۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِيۡنَ ۝٥

کیا پھیر دیں گے ہم تمہاری طرف سے یہ کتاب موڑ کر اس سبب سے کہ تم ہو ایسے لوگ کہ حد پر نہیں رہتے

خلاصہ تفسیر: (لیکن اگر تم نہ مانو تو تب بھی ہم اپنی حکمت کے مقتضا سے اس کا بھیجنا اور تم کو اس کا مخاطب بنانا نہ چھوڑیں گے چنانچہ ارشاد ہے کہ) کیا ہم تم سے اس نصیحت (نامہ) کو (محض) اس بات پر ہٹا دیں گے کہ تم حد (اطاعت) سے گزرنے والے ہو (اور اس کو نہیں مانتے، یعنی خواہ تم مانو یا نہ مانو مگر نصیحت تو برابر کی جائے گی اور یہ فیض کامل ہو کر رہے گا تاکہ اس سے مومنین کو نفع ہو اور تم پر حجت قائم ہو)۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اس سبب سے کہ تم نہیں مانتے کیا ہم حکم کا بھیجنا موقوف کریں گے''، یعنی ایسی توقع مت رکھو، اللہ کی حکمت ورحمت اسی کو مقتضی ہے کہ باوجود تمہاری زیادتیوں اور شرارتوں کے کتاب الٰہی کا نزول اور دعوت ونصیحت کا سلسلہ بند نہ کیا جائے، کیونکہ بہت سی سعید روحیں اس سے مستفید ہوتی ہیں اور منکرین پر کامل طور سے اتمام حجت ہوتا ہے۔

وَكَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِيٍّ فِى الۡاَوَّلِيۡنَ ۝٦ وَمَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ نَّبِىٍّ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝٧

اور بہت بھیجے ہیں ہم نے نبی پہلوں میں، اور نہیں آتا لوگوں کے پاس کوئی پیغام لانے والا جس سے ٹھٹھا نہیں کرتے [1]

فَاَهۡلَكۡنَاۤ اَشَدَّ مِنۡهُمۡ بَطۡشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝٨

پھر برباد کر ڈالے ہم نے ان سے سخت زور والے اور چلی آتی ہے مثال پہلوں کی [2]

خلاصہ تفسیر: اور ہم پہلے لوگوں میں (ان کے جھٹلانے کے باوجود) بہت سے نبی بھیجتے رہے ہیں (مگر یہ نہیں ہوا کہ ان کے جھٹلانے کی وجہ سے سلسلہ نبوت بند ہو جاتا) اور (اے پیغمبر ﷺ! جیسے ہم نے ان کے جھٹلانے کی پرواہ نہیں کی اسی طرح آپ بھی کچھ پروا اور غم نہ کیجئے، کیونکہ) ان (پہلے) لوگوں (کا بھی یہی حال تھا کہ ان) کے پاس کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انہوں نے استہزاء نہ کیا ہو، پھر ہم نے ان لوگوں کو جو کہ ان (اہل مکہ) سے زیادہ زور آور تھے (استہزاء اور جھٹلانے کی سزا میں) غارت کر ڈالا، اور پہلے لوگوں کی یہ حالت (ہلاکت وغارت کی) ہو چکی ہے (پس آپ غم نہ کریں، کیونکہ ان کا بھی ایسا ہی حال ہونا ہے جیسا کہ بدر وغیرہ میں ہوا اور نہ یہ بےفکر ہوں کہ نمونہ موجود ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی پہلے رسولوں کے ساتھ بھی استہزاء کیا گیا اور انکی تعلیمات کو جھٹلایا گیا، مگر اسکی وجہ سے پیغامبری کا سلسلہ مسدود نہیں ہوا۔

فائدہ: [2] یعنی عبرت کے لیے ان مکذبین کی تباہی کی مثالیں پیش آ چکیں اور پہلے مذکور ہو چکیں جو زور وقوت میں تم سے کہیں زیادہ تھے، جب وہ اللہ کی پکڑ سے نہ بچ سکے تو تم کاہے پر مغرور ہوتے ہو۔

ربط: آگے اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدرت اور کمال تصرف کا ذکر کرتے ہیں جو ایک حد تک ان کے نزدیک بھی مسلم تھا:

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ خَلَقَهُنَّ الۡعَزِيۡزُ الۡعَلِيۡمُ ۝٩ الَّذِىۡ

اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے بنائے آسمان اور زمین تو کہیں بنائے اس زبردست خبردار نے ، وہی ہے جس نے

جَعَلَ لَكُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا وَّجَعَلَ لَكُمۡ فِيۡهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ۝١٠ وَالَّذِىۡ نَزَّلَ

بنا دیا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور رکھ دیں تمہارے واسطے اس میں راہیں تاکہ تم راہ پاؤ [1] اور جس نے اتارا

مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ⑪

آسمان سے پانی ناپ کر ۲ پھر ابھار کھڑا کیا ہم نے اس سے ایک دیس مردہ کو، اسی طرح تم کو بھی نکالیں گے ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسالت کا مضمون تھا جس کی بڑی دعوت توحید ہے، اب آگے توحید کو ایسے دلائل سے ثابت کرتے ہیں جو انعام کو بھی شامل ہیں۔

اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور ہی کہیں گے کہ ان کو زبردست جاننے والے (خدا) نے پیدا کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ جس ذات نے تنہا یہ عظیم مخلوقات پیدا کی ہوں عبادت بھی تنہا اسی کی کرنی چاہئے، لہٰذا توحید خود ان کے اعتراف سے ثابت ہوگئی، آگے اللہ تعالیٰ توحید کو مزید مدلل کرنے کے لئے اپنے وہ افعال بیان فرماتے ہیں جو توحید پر دلالت کرنے والے ہیں، تاکہ توحید کی رغبت ہو، کیونکہ نعمت کا شکر یہی ہے، یعنی یہ زمین وآسمان اس نے پیدا کیا ہے) جس نے تمہارے (آرام کے) لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا (کہ اس پر آرام کرتے ہو) اور اس (زمین) میں اس نے تمہارے (منزل مقصود تک پہنچنے کے) لئے رستے بنائے تاکہ (ان راستوں پر چل کر) تم منزل مقصود تک پہنچ سکو، اور جس نے آسمان سے پانی ایک انداز (خاص) سے (اپنی مشیت اور حکمت کے مطابق) برسایا، پھر ہم نے اس (پانی) سے خشک زمین کو (اس کے مناسب) زندہ کیا (اور اس سے توحید پر دلالت کے علاوہ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ) اسی طرح تم (بھی اپنی قبروں سے) نکالے جاؤ گے (کہ توحید کے ساتھ اس کا بھی انکار کیا جاتا تھا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جہاں تک انسان بستے ہیں آپس میں مل سکیں، ایک دوسرے تک راہ پائیں اور چل پھر کر دنیاوی و آخروی مقاصد میں کامیابی کا راستہ معلوم کرلیں۔

فائدہ: ۲ یعنی ایک خاص مقدار میں جو اس کی حکمت کے مناسب اور اس کے علم میں مقدور تھی۔

فائدہ: ۳ یعنی جس طرح مردہ زمین کو بذریعہ بارش زندہ اور آباد کردیتا ہے، ایسے ہی تمہارے مردہ جسموں میں جان ڈال کر قبروں سے نکال کھڑا کرے گا۔

وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ⑫ لِتَسْتَوٗا

اور جس نے بنائے سب چیز کے جوڑے ۱ اور بنا دیا تمہارے واسطے کشتیوں اور چوپایوں کو جس پر تم سوار ہوتے ہو، تاکہ چڑھ بیٹھو تم

عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا

اس کی پیٹھ پر ۲ پھر یاد کرو اپنے رب کا احسان جب بیٹھ چکو اس پر اور کہو پاک ذات ہے وہ جس نے بس میں کر دیا ہمارے

هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ⑬ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ⑭

اس کو اور ہم نہ تھے اس کو قابو میں لا سکتے ۳ اور ہم کو اپنے رب کی طرف پھر جانا ہے ۴

خلاصہ تفسیر: اور جس نے (مختلف اجناس وانواع میں) تمام (مختلف) اقسام (یعنی اصناف) بنائیں اور تمہاری وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو، تاکہ تم ان (کشتیوں اور چارپایوں) کی (سطح اور) پیٹھ پر جم کر (اطمینان سے) بیٹھو پھر جب اس پر بیٹھ چکو

تو اپنے رب کی (اس) نعمت کو (دل سے) یاد کرو (اور زبان سے استحباباً) یوں کہو کہ اس کی ذات پاک ہے جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا اور ہم تو ایسے (طاقتور اور ہنر مند) نہ تھے جو ان کو قابو میں کر لیتے (کیونکہ ہم میں جانور سے زیادہ طاقت نہیں، اور خدا تعالیٰ کے دل میں ڈالے بغیر کشتی چلانے کی تدبیر سے ہم واقف نہیں تھے تو دونوں کے متعلق حق تعالیٰ نے تدبیر سکھادی) اور ہم کو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس لئے ہم اس پر سوار ہو کر شکر سے غفلت یا تکبر نہیں کرتے، کیونکہ شکر اور ناشکری دونوں کا بدلہ وہاں ملے گا)۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا: اس دعا کے سیاق سباق سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ یہ کلمات کشتی میں سوار ہو کر بھی پڑھے، اگرچہ حدیث میں صرف جانور کی سواری میں اس دعا کا پڑھنا منقول ہے، مگر حدیث میں کشتی کا انکار بھی نہیں ہے، اور شاید حدیث میں کشتی کا ذکر اس لیے منقول نہ ہوا ہو کہ اس وقت اس کا اتفاق کم ہو۔

وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ: یہاں رب کی طرف لوٹ کر جانے کا مضمون اس لیے بڑھا دیا کہ اسکا یاد کرنا شکر کے لیے محرک بن جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دنیا میں جتنی چیزوں کے جوڑے ہیں اور مخلوق کی جتنی قسمیں اور متماثل یا متقابل انواع ہیں، سب کو خدا ہی نے پیدا کیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی خشکی میں بعض چوپایوں کی پیٹھ پر اور دریا میں کشتی پر سوار ہوتے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی چوپایوں یا کشتی پر سوار ہوتے وقت اللہ کا احسان دل سے یاد کرو کہ ہم کو اس نے اس قدر قوی اور ہنر مند بنا دیا کہ اپنی عقل و تدبیر وغیرہ سے ان چیزوں کو قابو میں لے آئے، یہ محض خدا کا فضل ہے، ورنہ ہم میں اتنی طاقت اور قدرت کہاں تھی کہ ایسی ایسی چیزوں کو مسخر کر لیتے، نیز دلی یاد کے ساتھ زبان سے سواری کے وقت یہ الفاظ کہنے چاہئیں: وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ اور بھی اذکار و ادعیہ احادیث میں آئی ہیں جو کتب حدیث و تفسیر میں مذکور ہیں۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اس سفر سے آخرت کا سفر یاد کرو، آنحضرت ﷺ سوار ہوتے تو یہ ہی تسبیح کہتے تھے۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ⑮ ع ۵

اور ٹھہرائی ہے انہوں نے حق تعالیٰ کے واسطے اولاد اس کے بندوں میں سے، تحقیق انسان بڑا ناشکرا ہے صریح

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ⑯

کیا اس نے رکھ لیں اپنی مخلوقات میں سے بیٹیاں اور تم کو دے دیے چن کر بیٹے ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور (توحید کے دلائل واضح ہونے کے باوجود) ان لوگوں نے (شرک اختیار کر رکھا ہے اور وہ بھی کیسا قبیح کہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں پس ایک خرابی تو یہ ہوئی کہ انہوں نے) خدا کے بندوں میں سے (جو مخلوق ہوتے ہیں) خدا کا جزو ٹھہرایا (حالانکہ خدا کا کوئی جزو ہونا عقلاً محال ہے) واقعی (ایسا) انسان صریح ناشکرا ہے (کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ اتنا بڑا کفر کرتا ہے کہ اس کو صاحب اولاد مانتا ہے اور اولاد جزو ہوتی ہے، اور جس چیز میں سے اجزاء نکل سکیں وہ حادث ہوتی ہے جس سے خدا تعالیٰ کا معاذ اللہ ہونا حادث ہونا لازم آتا ہے، حالانکہ خدا قدیم ہے غرض ایک خرابی تو یہ ہوئی اور دوسری خرابی یہ کہ یہ لوگ لڑکی کو خود ناقص سمجھتے ہیں اور پھر خدا کے لئے بیٹیاں مانتے ہیں تو) کیا خدا نے اپنی مخلوق میں سے (تمہارے زعم میں اپنے لئے تو) بیٹیاں پسند کیں اور تم کو بیٹوں کے ساتھ مخصوص کیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی چاہیے تھا اللہ کی نعمتوں کو پہچان کر شکر ادا کرے، یہ صریح ناشکری پر اتر آیا اور اس کی جناب میں گستاخیاں کرنے لگا، اس

سے بڑی گستاخی اور ناشکری کیا ہوگی کہ اس کے لیے اولاد تجویز کی جائے، وہ بھی بندوں میں سے اور وہ بھی بیٹیاں۔

①اول تو اولاد باپ کے وجود کا ایک جز ہوتا ہے تو خداوند قدوس کے لیے اولاد تجویز کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ وہ اجزاء سے مرکب ہے اور مرکب کا حادث ہونا ضروری ہے ②دوسرے ولد اور والد میں مجانست ہونی چاہیے، دونوں ایک جنس نہ ہوں تو ولد یا والد کے حق میں عیب ہے، یہاں مخلوق وخالق میں مجانست کا تصور بھی نہیں ہوسکتا③ تیسرے لڑکی باعتبار قوائے جسمیہ وعقلیہ کے عموماً لڑکے سے ناقص اور کمزور ہوتی ہے، گویا معاذ اللہ خدا نے اپنے لیے اولاد بھی رکھی تو گھٹیا اور ناقص، کیا تم کو شرم نہیں آتی کہ اپنے حصہ میں عمدہ اور بڑھیا چیز اور خدا کے حصہ میں ناقص اور گھٹیا چیز لگاتے ہو۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿١٧﴾

اور جب ان میں کسی کو خوشخبری ملے اس چیز کی جس کو رحمان کے نام لگایا تو سارے دن رہے منہ اس کا سیاہ اور وہ دل میں گھٹ رہا ہے

خلاصہ تفسیر: حالانکہ (تم بیٹیوں کو اتنا برا سمجھتے ہو کہ) جب تم میں کسی کو اس چیز کے ہونے کی خبر دی جاتی ہے جس کو خدائے رحمان کا نمونہ (یعنی اولاد) بنا رکھا ہے (مراد بیٹی ہے) تو (اس قدر ناراض ہو کہ) سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہے (تو حیرت ہے کہ خدا کی طرف نقص کی نسبت کرتے ہو، یہاں تک ان کے فاسد عقیدے کی الزامی تردید اور الزامی جواب تھا جس کی تشریح سورۃ صافات آیت ۱۵۳: اَصۡطَفَى الۡبَنَاتِ عَلَى الۡبَنِيۡنَ میں گزر چکی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جو اولاد اناث خدا کے لیے تجویز کر رہے ہیں، وہ ان کے زعم میں ایسی عیب دار اور ذلیل وحقیر ہے کہ اگر خود نہیں اس کے ملنے کی خوشخبری سنائی جائے تو مارے رنج اور غصہ کے تیور بدل جائیں اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتے رہیں، اس کی پوری تقریر سورہ صافات کے اخیر رکوع میں گزر چکی ہے۔

أَوَمَن يُنَشَّأُ فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴿١٨﴾

کیا ایسا شخص کہ پرورش پاتا ہے زیور میں اور وہ جھگڑے میں بات نہ کہہ سکے

خلاصہ تفسیر: (اب اسی فاسد عقیدے کے متعلق ایک تحقیقی جواب دیا جاتا ہے کہ اگر چہ لڑکی ہونا بذات خود کوئی ذلت یا عار کی بات نہیں جیسا کہ تم سمجھتے ہو، لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی اصل خلقت اور فطرت کے اعتبار سے ناقص العقل اور ضعیف الرائے ضرور ہے جب یہ بات ہے تو) کیا (خدا نے اولاد بنانے کے لئے لڑکی کو پسند کیا ہے) جو کہ (عادتاً) آرائش (وزیبائش) میں نشوونما پائے (جو زیورات اور بناؤ سنگھار کی طرف اس کی رغبت کا سبب ہوتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ عقل ورائے کی ناپختگی ہے) اور وہ (فکری قوت کی کمزوری کی بناء پر) مباحثہ میں قوت بیانیہ (بھی) نہ رکھے (یہ دو خرابیاں ہوئیں)۔

اَوَمَنۡ يُّنَشَّؤُا فِي الۡحِلۡيَةِ: اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لئے زیور کا استعمال اور شریعت کے موافق آرائش کے طریقے اختیار کرنا جائز ہے، چنانچہ اس پر اجماع ہے لیکن ساتھ ہی پیرایہ بیان یہ بتارہا ہے کہ آرائش میں اتنا انہماک کہ صبح وشام بناؤ سنگھار ہی میں لگی رہے یہ مناسب نہیں، بلکہ یہ ضعف عقل ورائے کی علامت بھی ہے اور اس کا سبب بھی۔

وَهُوَ فِي الۡخِصَامِ غَيۡرُ مُبِيۡنٍ: مطلب یہ ہے کہ عورتوں کی اکثریت ایسی ہے کہ وہ مافی الضمیر کی قوت اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے پر مردوں کے برابر قادر نہیں ہوتی، اسی لئے اگر کہیں مباحثہ ہو جائے تو اپنے دعوے کو ثابت کرنا اور دوسرے کے دلائل کو رد کرنا اس کے لئے مشکل ہوتا ہے لیکن یہ حکم اکثریت کے اعتبار سے ہے، لہٰذا اگر کچھ عورتیں سلیقہ گفتار کی مالک ہوں اور اس معاملہ میں مردوں سے بھی بڑھ جائیں تو اس آیت کے منافی

نہیں، کیونکہ حکم اکثریت پر لگتا ہے اور اکثریت بلاشبہ ایسی ہی ہے، اور یہاں مباحثہ کی تخصیص اس وجہ سے کی کہ اس میں چونکہ قوت بیان کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اس لیے اس میں ان کا عاجز ہونا زیادہ ظاہر ہو جاتا ہے، سو ہر طویل کلام اسی کے حکم میں ہے، معمولی جملوں کا ادا ہو جانا قوت بیانیہ کی دلیل نہیں جیسے ''میں آئی تھی''، ''وہ گئی تھی''۔

* * *

فائدہ: یعنی کیا خدا نے اولاد بنانے کے لیے لڑکی کو پسند کیا ہے، جو عادۃً آرائش و زیبائش میں نشوونما پائے اور زیورات وغیرہ کے شوق میں مستغرق رہے جو دلیل ہے ضعف رائے و عقل کی، اور وہ بوجہ ضعف قوت فکریہ کے مباحثہ کے وقت قوت بیانیہ بھی نہ رکھے، چنانچہ عورتوں کی تقریروں میں ذرا غور کرنے سے مشاہدہ ہوتا ہے کہ نہ اپنے دعوے کو کافی بیان سے ثابت کر سکیں، نہ دوسرے کے دعوے کو گرا سکیں، ہمیشہ ادھوری بات کہیں گی، یا فضول باتیں اس میں ملا دیں گی، جن کو مطلوب میں کچھ دخل نہ ہو کہ اس سے بھی تبیین مقصود میں خلل پڑ جاتا ہے اور مباحثہ کی تخصیص اس حیثیت سے ہے کہ اس میں بوجہ بیان کی احتیاج زیادہ ہونے کے ان کا عجز زیادہ ظاہر ہو جاتا ہے، پس ہر کلام طویل اسی کے حکم میں ہے اور معمولی جملوں کا ادا ہو جانا مثلاً ''میں آئی تھی، وہ گئی تھی''، قوت بیانیہ کی دلیل نہیں۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ

اور ٹھہرایا انہوں نے فرشتوں کو جو بندے ہیں رحمان کے عورتیں ۱؎ کیا دیکھتے تھے ان کا بننا، اب لکھ رکھیں گے

شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾

ان کی گواہی اور ان سے پوچھ ہو گی ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (شرک لازم ہونے سے قطع نظر تیسری خرابی یہ ہے کہ) انہوں نے فرشتوں کو جو کہ خدا کے (مخلوق) بندے ہیں (اس لئے ان کی پوری حالت اور صفت اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اور چونکہ وہ نظر نہیں آتے اس لئے جب تک خدا تعالیٰ کسی کو ان کی حالت نہ بتلائے اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتی، اور اللہ نے کہیں یہ نہیں بتلایا کہ فرشتے عورت ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان کو بلا دلیل) عورت قرار دے رکھا ہے (اور ان کے عورت ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہے نہ نقلی، لہٰذا مشاہدہ ہونا چاہئے تو) کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے (اور دیکھ رہے تھے، جواب ظاہر ہے کہ انہوں نے فرشتوں کی تخلیق کا مشاہدہ نہیں کیا، لہٰذا ان کے اس احمقانہ دعوے کی حقیقت واضح ہو گئی) ان کا یہ دعویٰ (جو بلا دلیل ہے اعمال کے دفتر میں) لکھ لیا جاتا ہے اور (قیامت میں) ان سے باز پرس ہو گی (کیونکہ دعوی بلا دلیل جھوٹ ہے، خصوصاً عقائد کے بارے میں، پھر بالخصوص جبکہ اس کے ساتھ اور بھی خرابیاں شامل ہوں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ ان کا ایک اور جھوٹ ہے کہ فرشتوں کو عورتوں کی صف میں داخل کرتے ہیں، حالانکہ وہ نہ عورت نہ مرد، جنس ہی علیحدہ ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کوئی دلیل عقلی و نقلی تو ان کے پاس اس دعوے پر نہیں، پھر کیا اللہ نے جب فرشتوں کو بنایا تو یہ کھڑے دیکھ رہے تھے کہ مرد نہیں عورت بنایا ہے؟ بہت اچھا! ان کی یہ گواہی دفتر اعمال میں لکھ لی جاتی ہے، خدائی عدالت میں جس وقت پیش ہوں گے تب اس کے متعلق ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ایسا کیوں کہا تھا؟ اور کہاں سے کہا تھا؟۔

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾ؕ

اور کہتے ہیں اگر چاہتا رحمان تو ہم نہ پوجتے ان کو ۱؎ کچھ خبر نہیں ان کو اس کی، یہ سب اٹکلیں دوڑاتے ہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے فرشتوں کے عورت اور خدا کی اولاد ہونے کے متعلق گفتگو تھی، اب ان کے معبود ہونے کے متعلق بیان ہے۔
اور وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ (اس بات کو خوشی سے) چاہتا (کہ ملائکہ کی عبادت نہ ہو، یعنی اس عبادت سے وہ ناخوش ہوتا) تو ہم (کبھی) ان کی عبادت نہ کرتے (کیونکہ وہ کرنے ہی نہ دیتا، بلکہ جبراً روک دیتا، جب نہیں روکا تو معلوم ہوا کہ وہ ان کی عبادت نہ کرنے سے خوش نہیں بلکہ عبادت کرنے سے خوش ہے، آگے ان کی تردید ہے کہ) ان کو اس (بات) کی کچھ تحقیق نہیں (ہے) محض بے تحقیق بات کر رہے ہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو کسی فعل پر قدرت دے دینا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اس فعل پر راضی بھی ہے جیسے کہ سورہ انعام آیت ۱۴۹: سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ الخ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے)۔
لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ: کسی بات پر قادر کر دینا خدا کی رضامندی کی دلیل ہرگز نہیں ہے، جیسے خدا نے انسان کو زہر کھا لینے کی قدرت دی ہے تو کیا اسی دلیل سے مشرکین زہر کھا لینے پر پیش قدمی کر سکتے ہیں، اور کیا زہر کھانے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر خدا کو میرا زہر کھانا پسند نہ ہوتا تو وہ مجھ کو روک دیتا، مگر جب نہیں روکا تو معلوم ہوا کہ یہی اس کو پسند ہے، اس کا جواب ہر شخص یہی دے گا کہ خدا نے تو تم کو روکا تھا، کیونکہ اس نے تم کو عقل دی تھی، مگر تم نے خدا کے کہنے کو نہیں مانا، اور حماقت سے کام لیا، پس معلوم ہوا کہ زہر کھا لینے پر انسان کو قادر کر دینا خدا کی رضامندی پر دلیل نہیں ہو سکتا، اسی طرح یہاں سمجھو۔

* * *

فائدہ: ۱ اور لیجیے اپنی ان مشرکانہ گستاخیوں کے جواز واستحسان پر ایک دلیل عقلی بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم کو اپنے سوا دوسری چیزوں کی پرستش سے روک دیتا، جب ہم برابر کرتے رہے، نہ روکا تو ثابت ہوا کہ یہ کام بہتر ہیں اور اس کو پسند ہیں۔
فائدہ: ۲ یعنی یہ تو سچ ہے کہ بدون خدا کے چاہے کوئی چیز نہیں ہو سکتی، لیکن اس چیز کا ہمارے حق میں بہتر ہونا اس سے نہیں نکلتا، ایسا ہو تو دنیا میں کوئی کام اور کوئی چیز بری ہی نہ رہے، سارا عالم خیر محض ہو جائے، شر کا بیج ہی دستیاب نہ ہو، ہر ایک جھوٹا اور ظالم وخونخوار یہ کہہ دے گا کہ خدا چاہتا تو مجھے ایسا ظلم وستم نہ کرنے دیتا، جب کرنے دیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کام سے خوش اور راضی ہے، بہر حال مشیت اور رضاء میں لزوم ثابت کرنا کوئی اعلیٰ اصول نہیں، محض اٹکل کے تیر ہیں، جس کا بیان آٹھویں پارہ کے نصف سے پہلے آیت: سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا (الانعام :۱۴۹) کے حواشی میں گزر چکا۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ

کیا ہم نے کوئی کتاب دی ہے ان کو اس سے پہلے سو انہوں نے اسکو مضبوط پکڑ رکھا ہے، بلکہ کہتے ہیں ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر

وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور ہم انہی کے قدموں پر ہیں راہ پائے ہوئے ۱

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیت میں مشیت خداوندی سے جو ان لوگوں نے عقلی طور پر استدلال کیا تھا وہ تو لغو اور باطل ٹھہرا تو اب یہ بتلائیں کہ) کیا ہم نے ان کو اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب دے رکھی ہے کہ یہ (اس دعوی میں) اس سے استدلال کرتے ہیں (حقیقت یہ ہے کہ نہ ان کے پاس دلیل عقلی ہے نہ دلیل نقلی) بلکہ (محض اپنے باپ دادوں کی رسم کا اتباع کرتے ہیں، چنانچہ) وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے رستہ چل رہے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ عقلی دلیل کا حال تو سن چکے، اسے چھوڑ کر کیا کوئی نقلی دلیل اپنے دعوے پر رکھتے ہیں؟ یعنی خدا کی اتاری ہوئی کوئی کتاب ان کے

ہاتھ میں ہے؟ جس میں شرک کا پسندیدہ ہونا لکھا ہو، ظاہر ہے کہ ایسی کوئی سند ان کے پاس نہیں، پھر آگے باپ دادا کی اندھی تقلید کے سوا کیا باقی رہ گیا، وہ ہی ان کی سب سے زیادہ زبردست دلیل ہے، جس کو ہر زمانہ کے مشرک پیش کرتے آئے ہیں آگے اسی کا بیان ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا

اور اسی طرح جس کسی کو بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے ڈر سنانے والا کسی گاؤں میں سو کہنے لگے وہاں کے خوشحال لوگ ہم نے تو پایا اپنے باپ دادوں کو

عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿٢٣﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ

ایک راہ پر اور ہم انہی کے قدموں پر چلتے ہیں، وہ بولا اور جو میں لادوں تم کو اس سے زیادہ سوجھ کی راہ جس پر تم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ۱؎

قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٢٥﴾

تو یہی کہنے لگے ہم تمہارا لایا ہوا نہیں مانیں گے ۲؎ پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا، سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام جھٹلانے والوں کا

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح یہ لوگ بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل اپنی پرانی رسم کو بطور سند پیش کرتے ہیں) اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے (اولاً اور متبعین نے ثانیاً) یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی انہی کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں (اس پر) ان کے (اس) پیغمبر نے (ایسے) کہا کہ کیا (آبائی رسوم ہی کا اتباع کئے جاؤ گے) اگرچہ میں اس سے اچھا (منزل) مقصود پر پہنچا دینے والا طریقہ تمہارے پاس لایا ہوں کہ جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہو، وہ (براہ عناد) کہنے لگے کہ ہم تو اس (دین) کو مانتے ہی نہیں جس کو دے کر (بزعم تمہارے) تم کو بھیجا گیا ہے، سو (جب عناد حد سے بڑھ گیا اس وقت) ہم نے ان سے انتقام لیا سو دیکھئے تکذیب کرنے والوں کا کیسا (برا) انجام ہوا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پیغمبر نے فرمایا کہ تمہارے باپ دادوں کی راہ سے اچھی راہ تم کو بتلا دوں تو کیا پھر بھی تم اسی پرانی لکیر کے فقیر بنے رہو گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کچھ بھی ہو، ہم تمہاری بات نہیں مان سکتے اور پرانا آبائی طریقہ ترک نہیں کر سکتے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿٢٦﴾ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿٢٧﴾

اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ کو اور اسکی قوم کو میں الگ ہوں ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو، مگر جس نے مجھ کو بنایا سو وہ مجھ کو راہ سجھائے گا ۱؎

وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٨﴾

اور یہی بات پیچھے چھوڑ گیا اپنی اولاد میں تاکہ رجوع رہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا مضمون تھا، اب اس کی تاکید کے لیے یہ بتلاتے ہیں کہ توحید کا مضمون حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی منقول ہے جن کو اہل عرب بھی بزرگ اور معظم مانتے تھے اور وہ ان کے جد امجد بھی ہیں، اس سے ان کے اس دعوی کی بھی تردید ہوگئی کہ ہم تو اپنے باپ دادوں کا اتباع کرتے ہیں، کیونکہ دوسروں سے یہ جد امجد یقیناً زیادہ لائق اتباع ہیں، نیز بتلاتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے بعد ان کی اولاد میں بھی توحید منقول چلی آتی رہی، اور اب آخر زمانہ میں پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت اس کی تجدید کی گئی ہے اور اس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق ان کے ایک اعتراض کا جواب بھی مذکور ہے۔

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جبکہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے فرمایا کہ میں ان چیزوں (کی عبادت) سے بیزار (اور بے تعلق) ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ہاں (اس خدا سے تعلق رکھتا ہوں) جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو (میرے دین و دنیا کی مصلحتوں تک) رہنمائی کرتا ہے (مطلب یہ کہ ان لوگوں کو ابراہیم علیہ السلام کا حال یاد کرنا چاہئے کہ وہ خود بھی توحید کے معتقد تھے) اور (وصیت کے ذریعہ) وہ اس (عقیدہ) کو اپنی اولاد میں (بھی) ایک قائم رہنے والی بات کر گئے (یعنی اپنی اولاد کو بھی توحید کی وصیت کی جیسا کہ سورہ بقرہ میں آیت: **ووصّٰی بھا ابراھیم بنیہ** سے معلوم ہوا ہے جس کا اثر کچھ کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک بھی برابر رہا، یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی عرب میں بعض لوگ شرک سے نفرت کرتے تھے اور یہ وصیت انہوں نے اس لئے کی تھی) تاکہ (ہر زمانے میں مشرک) لوگ (موحدین سے توحید کا مضمون سن سن کر شرک سے) باز آتے رہیں (مگر یہ لوگ پھر بھی باز نہیں آتے اور اس طرف توجہ نہیں کرتے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی صرف ایک خدا سے میرا تعلق ہے، جس نے مجھے پیدا کیا اور وہ ہی مجھے منزل مقصود کے راستہ پر آخر تک لے چلے گا۔

تنبیہ: یہاں یہ قصہ اس پر بیان کیا کہ دیکھو تمہارے مسلم پیشوا نے باپ کی راہ غلط دیکھ کر چھوڑ دی تھی، تم بھی وہ ہی کرو اور اگر آباء واجداد کی تقلید ہی پر مرتے ہو تو اس باپ کی راہ پر چلو جس نے دنیا میں حق وصداقت کا جھنڈا گاڑ دیا تھا اور اپنی اولاد کو وصیت کر گیا تھا کہ میرے بعد ایک خدا کے سوا کسی کو نہ پوجنا، کما قال تعالیٰ: وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ (البقرۃ:۱۳۲)

فائدہ: ۲؎ یعنی ایک دوسرے سے توحید کا بیان اور دلائل سن کر راہ حق کی طرف رجوع ہوتا رہے۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾

کوئی نہیں پر میں نے برتنے دیا انکو اور انکے باپ دادوں کو یہاں تک کہ پہنچا انکے پاس دین سچا اور رسول کھول کر سنا دینے والا

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور جب پہنچا ان کے پاس سچا دین کہنے لگے یہ جادو ہے اور ہم اس کو نہ مانیں گے

خلاصہ تفسیر: بلکہ میں نے (جو) ان کو اور ان کے باپ دادوں کو (دنیا کا) خوب سامان دیا ہے (اس میں منہمک اور مشغول ہو کر حق سے غافل ہو رہے ہیں) یہاں تک کہ (اسی انہماک اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے) ان کے پاس سچا قرآن (جو معجز ہونے کی وجہ سے اپنی سچائی کی آپ ہی دلیل ہے) اور صاف صاف بتانے والا رسول (اللہ کی طرف سے) آیا، اور جب ان کے پاس یہ سچا قرآن پہنچا (اور اس کا اعجاز ظاہر ہوا) تو کہنے لگے کہ یہ جادو ہے اور ہم اس کو نہیں مانتے (یہ تو کافروں نے قرآن کے بارے میں کہا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی افسوس ابراہیم کی ارث حاصل نہ کی اور اس کی وصیت پر نہ چلے، بلکہ اللہ نے جو دنیا کا سامان دیا تھا، اس کے مزوں میں پڑ کر خداوند قدوس کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے، یہاں تک کہ ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے اپنا وہ پیغمبر بھیجا جس کی پیغمبری بالکل روشن اور واضح ہے، اس نے سچا دین پہنچایا، قرآن پڑھ کر سنایا اور اللہ کے احکام پر نہایت صفائی کے ساتھ مطلع کیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی قرآن کو جادو بتلانے لگے اور پیغمبر کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾

اور کہتے ہیں کیوں نہ اترا یہ قرآن کسی بڑے مرد پر ان دونوں بستیوں میں کے

خلاصہ تفسیر: اور (رسول اللہ ﷺ کے بارے میں) کہنے لگے کہ یہ قرآن (اگر کلام الٰہی ہے اور بحیثیت رسالت آیا ہے تو) ان دونوں بستیوں (یعنی مکہ اور طائف کے رہنے والوں) میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا (یعنی رسول کے لیے عظیم الشان ہونا ضروری ہے اور آنحضرت ﷺ مال اور ریاست نہیں رکھتے تو یہ پیغمبر نہیں ہو سکتے)۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ: کفار کا اس شبہ کی آڑ میں رسالت کا انکار کرنا مقصود تھا، اور دیہات والوں کو تو اس قابل نہیں سمجھا کرتے، کیونکہ ان کے میں سلیقہ کم ہونے کے علاوہ اکثر مال وجاہ بھی شہر والوں سے کم ہوتا ہے، اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ وہ لوگ تو نبوت اور بشریت میں ہی تضاد سمجھتے تھے، پھر انہوں نے یہ کیسے کہا کہ ان دو بستیوں میں سے بڑے آدمی پر قرآن کیوں نہ اترا؟ جواب یہ ہے کہ پہلا قول تو ان کا اصلی عقیدہ تھا اور یہ دوسرا قول بطریق تنزل تھا کہ خیر اگر آدمی نبی ہوسکتا ہے تو پھر کوئی بڑا رئیس آدمی ہونا چاہیے تھا۔

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ: جس طرح انبیاء کرام کو ان کی قوموں نے یہ طعنہ دیا تھا کہ وہ دولت وثروت، شان وشوکت نہیں رکھتے ایسے ہی اولیاء کے منکرین بھی اولیاء اللہ کو یہی طعنہ دیا کرتے ہیں اور جاہ وشرف نسبی نہ ہونے کے سبب ان کی ولایت وبزرگی سے انکار کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر قرآن کو اترنا ہی تھا تو مکہ یا طائف کے کسی بڑے سردار پر اترا ہوتا، یہ کیسے باور کرلیا جائے کہ بڑے بڑے دولت مند سرداروں کو چھوڑ کر خدا نے منصب رسالت کے لیے ایک ایسے شخص کو چن لیا ہو جو ریاست ودولت کے اعتبار سے کوئی امتیاز نہیں رکھتا۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا

کیا وہ بانٹتے ہیں تیرے رب کی رحمت کو ؎۱ ہم نے بانٹ دی ہے ان میں روزی ان کی دنیا کی زندگانی میں اور بلند کردیے

بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۳۲

درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے ایک دوسرے کو خدمت گار ؎۲ اور تیرے رب کی رحمت بہتر ہے ان چیزوں سے جو سمیٹتے ہیں ؎۳

خلاصہ تفسیر: (باری تعالیٰ ان کے اس شبہ کا رد فرماتے ہیں کہ) کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) کو (خود) تقسیم کرنا چاہتے ہیں (یعنی یہ چاہتے ہیں کہ نبوت ہماری رائے کے مطابق لوگوں کو ملنی چاہئے گویا اس کی ہوس کرنا ہے کہ یہ تقسیم ہمارے سپرد ہو، حالانکہ یہ ہوس محض نادانی ہے کیونکہ) دنیوی زندگی میں (تو) ان کی روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے اور (اس تقسیم میں) ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تاکہ (اس سے یہ مصلحت حاصل ہو کہ) ایک دوسرے سے کام لیتا رہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے) اور (ظاہر اور یقینی بات ہے کہ) آپ کے رب کی رحمت (خاصہ یعنی نبوت) بدرجہا اس (دنیوی مال ومتاع اور جاہ ومنصب) سے بہتر ہے کہ جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں (پس جب دنیوی معیشت کی تقسیم ہم نے ان کی رائے پر نہیں رکھی، حالانکہ وہ ادنیٰ درجہ کی چیز ہے، تو نبوت جو خود بھی اعلیٰ درجہ کی چیز ہے اور اس کے مصالح بھی نہایت عظیم درجہ کے ہیں وہ کیونکر ان کی رائے پر تقسیم کی جاتی)۔

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ: یہاں آیت میں مذکور جواب یہ سے نہ سمجھا جائے کہ انبیاء کے انتخاب میں دنیوی وقعت کا لحاظ بالکل نہیں ہوتا، کیونکہ حدیث بخاری قصہ ہرقل میں خود آیا ہے: "كذلك الرسل تبعث في نسب قومها" کہ رسول اپنی قوم کے اعلیٰ خاندان میں مبعوث ہوتے ہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ وقعت بقدر ضرورت کافی ہے تاکہ وہ عام نظروں میں حقیر نہ سمجھا جائے جس سے اتباع میں عار ہوتا ہے، باقی اس سے زیادہ محض ترفع ہے، اور جس جاہ کی مذمت آئی ہے اس سے یہی دوسرا مرتبہ ترفع مراد ہے جو قدر ضرورت سے زیادہ ہو، پہلا مرتبہ مراد نہیں کہ اس کا حاصل کرنا تو ضروری اور مقصود ہے۔

* * *

فائدہ: 1 یعنی نبوت ورسالت کے مناصب کی تقسیم کیا تمہارے ہاتھ میں دے دی گئی ہے جو انتخاب پر بحث کر رہے ہو۔

فائدہ: 2 یعنی کسی کو غنی، کسی کو فقیر کر دیا، ایک کو بیشمار دولت دے دی، ایک کو اس سے کم، کوئی تابع ہے، کوئی متبوع۔

فائدہ: 3 یعنی نبوت ورسالت کا شرف تو ظاہری مال وجاہ اور دنیاوی ساز وسامان سے کہیں اعلیٰ ہے، جب اللہ نے دنیا کی روزی ان کی تجویز پر نہیں بانٹی، پیغمبری ان کی تجویز پر کیونکر دے، آگے دنیا کے مال ودولت اور مادی سامان کا اللہ کے ہاں بے وقعت اور حقیر ہونا بیان کرتے ہیں۔

وَلَوْلَآ اَنْ یَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ یَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ سب لوگ ہو جائیں ایک دین پر تو ہم دیتے ان لوگوں کو جو منکر ہیں رحمان سے انکے گھروں کے واسطے چھت چاندی کی

وَّمَعَارِجَ عَلَیْهَا یَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِبُیُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْهَا یَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ؕ وَاِنْ كُلُّ

اور سیڑھیاں جن پر چڑھیں، اور ان کے گھروں کے واسطے دروازے اور تخت جن پر تکیہ لگا کر بیٹھیں، اور سونے کے 1 اور یہ سب کچھ

ع

ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۳۵﴾

نہیں ہے مگر برتنا دنیا کی زندگانی کا اور آخرت تیرے رب کے یہاں انہی کے لیے ہے جو ڈرتے ہیں 2

خلاصہ تفسیر: دنیا کی دولت وجاہ ہمارے نزدیک کوئی چیز نہیں، وہ نہایت درجہ حقیر وذلیل ہے، اس لیے اس پر نبوت کا موقوف ہونا غلط ہے، چنانچہ اب دنیا کی ذلت کا بیان ہے۔

(رہی یہ بات کہ نبوت کے لیے صلاحیت ہونا تو ضروری ہے اور صلاحیت مال وریاست پر موقوف ہے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اعلی درجہ کی چیز کو کسی اعلی درجہ کی چیز پر ہی موقوف ہونا چاہیے) اور (دنیا کی دولت وجاہ ہمارے نزدیک اس قدر حقیر ہے کہ) اگر یہ بات (متوقع) نہ ہوتی کہ (قریب قریب) تمام آدمی ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے (یعنی کافر ہو جائیں گے) تو جو لوگ خدا کے ساتھ کفر کرتے ہیں (اور خدا کے نزدیک سخت مبغوض ہیں) ہم ان (سب) کے لئے ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر چڑھا (اُترا) کرتے اور ان کے گھروں کے کواڑ بھی (چاندی کے کر دیتے) اور تخت بھی (چاندی کے کر دیتے) جن پر تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں اور (یہی چیزیں) سونے کی بھی (کر دیتے، یعنی کچھ چاندی کی کچھ سونے کی) اور (دنیا کی حقارت کی ایک بالکل ظاہر وجہ بیان فرماتے ہیں کہ) یہ سب (ساز وسامان جس کا اوپر ذکر ہوا) کچھ بھی نہیں، صرف دنیوی زندگی کی چندروزہ کامرانی ہے (پھر فنا، آخر فنا) اور آخرت (جو ابدی ہے اور اس لئے اس سے بہتر ہے وہ) آپ کے پروردگار کے ہاں خدا ترسوں کے لئے ہے (پس جو چیز فانی ہو وہ نہ قدر کے قابل ہے اور نہ طلب کے قابل ہے، البتہ آخرت جو کہ باقی رہنے والی ہے وہ بیشک قابل قدر ہے اور اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ اعمال اور طاعات اور باطنی کمالات ہیں، اور نبوت کی صلاحیت کا مدار بھی ان ہی پر ہے، کیونکہ وہ آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ ان کمالات سے پوری طرح متصف ہیں)۔

یہ سامان سب کفار کو اس لئے نہیں دیا کہ اکثر انسانوں کی طبیعت میں مال ومتاع کی حرص غالب ہے اور اس مفروضہ صورت میں مال ومتاع کفر کے ذریعہ سے خوب ملتا، پس چند تھوڑے سے آدمیوں کو چھوڑ کر قریب قریب سبھی کفر اختیار کر لیتے، اس لئے ہم نے تمام کافروں کو مال ودولت کی یہ وسعت نہیں دی، بلکہ کچھ کو دی، کچھ کو نہیں دی اور کچھ کو کم دی، ورنہ اگر یہ مصلحت نہ ہوتی تو ہم سب کو بڑا مالدار کر دیتے، اور ظاہر ہے کہ دشمن کو عمدہ چیز نہیں دیا کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی مال ومتاع حقیقت میں کوئی عظیم الشان چیز نہیں، پس وہ نبوت جیسے منصب عظیم کے لئے صلاحیت کی شرط بھی

نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کا مدار ان خاص کمالات پر ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتے ہیں اور یہ کمالات محمد ﷺ میں پورے طور پر موجود ہیں، پس نبوت ان ہی کے لئے زیبا تھی نہ کہ مکہ اور طائف کے رئیسوں کے لئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ کے ہاں دنیاوی مال ودولت کی کوئی قدر نہیں، نہ اس کا دیا جانا کچھ قرب ووجاہت عند اللہ کی دلیل ہے، یہ تو ایسی بے قدر اور حقیر چیز ہے کہ اگر ایک خاص مصلحت مانع نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافروں کے مکانوں کی چھتیں، زینے، دروازے، چوکھٹ، قفل اور تخت چوکیاں سب چاندی اور سونے کی بنا دیتا، مگر اس صورت میں لوگ یہ دیکھ کر کافروں ہی کو ایسا سامان ملتا ہے، عموماً کفر کا راستہ اختیار کر لیتے (الا ماشاء اللہ) اور یہ چیز مصلحت خداوندی کے خلاف ہوتی، اس لیے ایسا نہیں کیا گیا، حدیث میں ہے کہ اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر ایک مچھر کے بازو کے برابر ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی کا نہ دیتا، بھلا جو چیز خدا کے نزدیک اس قدر حقیر ہو، اسے سیادت ووجاہت عند اللہ اور نبوت ورسالت کا معیار قرار دینا کہاں تک صحیح ہوگا۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ”یعنی کافر کو اللہ نے پیدا کیا، تو اس کو آرام دے، آخرت میں تو دائمی عذاب ہے، کہیں تو آرام ملتا، مگر ایسا ہوتو سب وہ ہی کفر کا راستہ پکڑ لیں“۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دنیا کی بہار میں تو سب شریک ہیں مگر آخرت مع اپنی ابدی نعماء وآلاء کے متقین کے لیے مخصوص ہے۔

وَمَنۡ يَّعۡشُ عَنۡ ذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَيِّضۡ لَهٗ شَيۡطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيۡنٌ ﴿۳۶﴾

اور جو کوئی آنکھیں چرائے رحمان کی یاد سے ہم اس پر مقرر کر دیں ایک شیطان پھر وہ رہے اس کا ساتھی

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید ورسالت کے منکروں کی گمراہی اور کفر وشرک کا بیان تھا، اب آگے اسی گمراہی اور کفر پر رسول اللہ ﷺ کو جو غم ہوتا تھا اس کو دور کرنے اور تسلی کے لیے اس گمراہی کی علت بتلاتے ہیں۔

اور جو شخص اللہ کی نصیحت (یعنی قرآن اور وحی) سے (جان بوجھ کر) اندھا بن جائے (جیسے یہ کفار ہیں کہ کافی شافی دلائل کے ہوتے ہوئے تجاہل اور غفلت سے کام لیتے ہیں جیسا فرعون کا حال تھا: وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار کرتے رہا، حالانکہ دل سے یقین کر چکے تھا) ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، سو وہ (ہر وقت) اس کے ساتھ رہتا ہے۔

وَمَنۡ يَّعۡشُ عَنۡ ذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ: ذکر الٰہی سے منہ موڑنے اور اعراض کرنے پر اگر چہ فوری گرفت نہ ہو، لیکن گناہوں میں ترقی ہوتی رہتی ہے اور یہ بھی عذاب سے کم نہیں۔

نُقَيِّضۡ لَهٗ شَيۡطٰنًا: اگر یہ شبہ ہو کہ احادیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص پر ایک ایک شیطان مقرر ہے پھر قرآن سے اندھا بننے والوں ہی کی کیا تخصیص رہی، کیونکہ شیطان تو ہر شخص پر مقرر ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہاں صرف مقرر کرنا مراد نہیں، بلکہ خاص طور پر مسلط کرنا مراد ہے جس سے گمراہی ضرور پیدا ہو جائے، سو ہر شخص پر شیطان کو اس طرح مسلط نہیں کیا جاتا، دوسرے یہاں ساتھ رہنے سے ہر وقت ساتھ رہنا مراد ہے، سو یہ بھی کفار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ مؤمن جب ذکر اللہ کرتا ہے تو شیطان اس سے ہٹ جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جو شخص سچی نصیحت اور یاد الٰہی سے اعراض کرتا رہتا ہے، اس پر ایک شیطان خصوصی طور سے مسلط کر دیا جاتا ہے، جو ہر وقت اغوا کرتا اور اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے، یہ شیطان دوزخ تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

وَاِنَّهُمۡ لَيَصُدُّوۡنَهُمۡ عَنِ السَّبِيۡلِ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيۡتَ

اور وہ ان کو روکتے رہتے ہیں راہ سے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہ پر ہیں ۱؎ یہاں تک کہ جب آئے ہمارے پاس کہے کسی طرح

بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ۝٣٨ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ

مجھ میں اور تجھ میں فرق ہو مشرق مغرب کا سا کہ کیا برا ساتھی ہے ۲ اور کچھ فائدہ نہیں تم کو آج کے دن جب کہ تم ظالم ٹھہر چکے اس بات سے کہ تم

فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝٣٩

عذاب میں شامل ہو ۳

خلاصہ تفسیر: اور وہ (ساتھ رہنے والے شیاطین) ان (قرآن سے اعراض کرنے والوں) کو (برابر) راہ (حق) سے روکتے رہتے ہیں (اور تسلط کا یہی اثر ہے) اور یہ لوگ (راہ حق سے دور ہونے کے باوجود) یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ہم) راہ (راست) پر ہیں (سو جس کی گمراہی کی یہ صورت اور یہ حالت ہو اس کے راہ پر آنے کی کیا امید ہے، سو غم کیوں کیا جائے، اور یہ بھی تسلی رکھئے کہ ان کا یہ تغافل جلدی ہی ختم ہوگا اور جلد ہی ان کو اپنی غلطی ظاہر ہو جائے گی کیونکہ یہ تغافل صرف دنیا ہی دنیا تک ہے) یہاں تک کہ جب ایسا شخص ہمارے پاس آئے گا (اور اس کی غلطی ظاہر ہوگی) تو (اس شیطان قرین سے) کہے گا کہ کاش میرے اور تیرے درمیان میں (دنیا میں) مشرق و مغرب کے برابر فاصلہ ہوتا (کیوں) کہ (تو تو) برا ساتھی تھا (کہ تو نے مجھ کو گمراہ کیا، مگر یہ حسرت اس وقت کام نہ آئے گی) اور (نیز ان سے کہا جائے گا کہ) جب کہ تم (دنیا میں) کفر کر چکے تھے تو (جس طرح آج حسرت تمہارے کام نہیں آئی اسی طرح) آج یہ بات (بھی) تمہارے کام نہ آئے گی کہ تم (اور شیاطین) سب عذاب میں شریک ہو (جیسے دنیا میں بعض اوقات دوسرے کو مصیبت میں شریک دیکھ کر ایک گونہ تسلی ہو جاتی ہے وہاں چونکہ عذاب بہت زیادہ شدید ہوگا اس لئے دوسرے کی طرف توجہ بھی نہ ہوگی، ہر شخص اپنے حال میں مبتلا ہوگا اور اپنے ہی کو سب سے زیادہ عذاب میں مبتلا سمجھے گا)۔

وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ: اگر یہ شبہ ہو کہ گزشتہ آیت: وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حق اور باطل تو جانتے تھے اور جان بوجھ کر اندھے بنتے تھے اور یہاں: وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ غلط راستہ کو سیدھا راستہ سمجھتے تھے، جواب یہ ہے کہ اضطراری طور پر تو وہ حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھتے تھے، مگر اختیاری طور پر باطل کو حق سمجھتے تھے اور باطل پر جمنے میں اپنی طرف سے کچھ مصلحتیں گھڑ رکھی تھیں اور حق کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرتے تھے جیسا کہ اہل عناد کا طریقہ ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی شیطان ان کو نیکی کی راہ سے روکتے رہتے ہیں، مگر ان کی عقلیں ایسی مسخ ہو جاتی ہیں کہ اسی کو ٹھیک راستہ سمجھتے ہیں، بدی اور نیکی کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی۔

فائدہ: ۲ یعنی خدا کے ہاں پہنچ کر کھلے گا کہ کیسے برے ساتھی تھے، اس وقت حسرت اور غصہ سے کہے گا کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا، اور ایک لحہ تیرے صحبت میں نہ گزرتا کم بخت! اب تو مجھ سے دور ہو، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی دنیا میں شیطان کے مشورہ پر چلتا ہے اور وہاں اس کی صحبت سے پچھتائے گا، اس طرح کا ساتھی شیطان کسی کو جن بن کر ملتا ہے کسی کو آدمی''۔

فائدہ: ۳ دنیا کا قاعدہ ہے کہ جس مصیبت میں عام طور پر چھوٹے بڑے سب شریک ہوں تو کچھ ہلکی معلوم ہونے لگتی ہے، مشہور ہے: ''مرگ انبوہ جشنے دارد''، مگر دوزخ میں تمام شیاطین الانس والجن اور تابعین ومتبوعین کا عذاب میں شریک ہونا کسی کو کچھ فائدہ نہ دے گا، عذاب کی شدت ایسی ہوگی کہ اس طرح کی سطحی باتوں سے تسلی اور تخفیف نہیں ہو سکتی، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی کافر کہیں گے کہ انہوں نے ہم کو عذاب میں ڈلوایا، خوب ہوا، یہ بھی نہ بچے، لیکن اگر دوسرا بھی پکڑا گیا تو اس کو کیا فائدہ''۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٤٠﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا

سو کیا تو سنائے گا بہروں کو یا سمجھائے گا اندھوں کو اور صریح غلطی میں بھٹکتوں کو، پھر اگر کبھی ہم تجھ کو یہاں سے لے جائیں تو ہم کو

مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿٤١﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿٤٢﴾ فَاسْتَمْسِكْ

ان سے بدلہ لینا ہے، یا تجھ کو دکھا دیں جو ان سے وعدہ ٹھہرایا ہے تو یہ ہمارے بس میں ہیں، سو تو مضبوط پکڑے رہ

بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤٣﴾

اسی کو جو تجھ کو حکم پہنچا، تو ہے بیشک سیدھی راہ پر ۱ے

خلاصہ تفسیر: سو (آپ کو جب ان کی یہ حالت معلوم ہوگئی کہ ان کی ہدایت کی کوئی امید نہیں تو) کیا آپ (ایسے) بہروں کو سنا سکتے ہیں یا (ایسے) اندھوں کو اور ان لوگوں کو جو کہ صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں راہ پر لا سکتے ہیں (یعنی ان کی ہدایت آپ کے اختیار سے باہر ہے آپ درپے نہ ہوں) پھر (ان کی یہ سرکشی خالی جانے والی نہیں، بلکہ اس پر ضرور سزا مرتب ہونے والی ہے خواہ آپ کی حیات میں ہو خواہ آپ کی وفات کے بعد ہو، پس) اگر ہم (دنیا سے) آپ کو اٹھا لیں تو بھی ہم ان (کافروں) سے بدلہ لینے والے ہیں، یا اگر ان سے جو ہم نے عذاب کا وعدہ کر رکھا ہے وہ (آپ کی حیات میں ان پر نازل کر کے) آپ کو (بھی) دکھلا دیں تب بھی (کچھ بعید نہیں کیونکہ) ہم کو ان پر ہر طرح کی قدرت ہے (مطلب یہ ہے کہ عذاب ضرور ہوگا خواہ کب ہی ہو اور جب یہ بات ہے) تو آپ (تسلی رکھئے اور اطمینان سے) اس قرآن پر قائم رہئے جو آپ پر وحی کے ذریعہ سے نازل کیا گیا ہے (کیونکہ) آپ بیشک سیدھے رستہ پر ہیں (مطلب یہ کہ اپنا کام کئے جایئے اور دوسروں کا غم نہ کیجئے)۔

* * *

فائدہ: ۱ے یعنی اندھوں کو راہ حق دکھلا دینا، بہروں کو حق کی آواز سنا دینا اور جو صریح غلطی اور گمراہی میں پڑے بھٹک رہے ہوں، ان کو تاریکی سے نکال کر سچائی کی صاف سڑک پر چلا دینا، آپ کے اختیار میں نہیں، ہاں! خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ جو چاہے آپ کی آواز میں تاثیر پیدا کردے، بہرحال آپ اس غم میں نہ رہیے کہ یہ سب لوگ حق کو کیوں قبول نہیں کرتے، اور کیوں اپنا انجام خراب کر رہے ہیں، ان کا معاملہ خدا کے سپرد کیجئے، وہ ہی ان کے اعمال کی سزا دے گا، اگر آپ کی وفات کے بعد دی تب اور آپ کو دکھلا کر دی تب، بہر صورت نہ ہمارے قابو سے نکل کر جا سکتے ہیں اور نہ ہم ان کو سزا دیے بدون چھوڑیں گے، آپ کا کام یہ ہے کہ جو وحی آئے اور جو حکم ملے، اس پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور برابر اپنا فرض ادا کیے جائیں، کیونکہ دنیا کہیں اور کسی راستہ پر جائے، آپ اللہ کے فضل سے سیدھی راہ پر ہیں، جس سے ایک قدم ادھر ادھر ہٹنے کی ضرورت نہیں، نہ کسی ہوا پرست کی خواہش و آرزو کی طرف التفات کرنے کی حاجت ہے۔

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿٤٤﴾

اور یہ مذکور رہے گا تیرا اور تیری قوم کا ۱ے اور آگے تم سے پوچھ ہوگی ۲ے

خلاصہ تفسیر: اور یہ قرآن (جس پر قائم رہنے کو ہم کہتے ہیں) آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے بڑے شرف کی چیز ہے (آپ کے لئے تو اس لئے کہ آپ بلا واسطہ براہ راست مخاطب ہیں اور قوم کے لئے اس لیے کہ وہ آپ کے واسطہ سے مخاطب ہیں، عام بادشاہوں سے ہم کلامی بڑا شرف سمجھی جاتی ہے چہ جائیکہ ملک الملوک یعنی بادشاہوں کے بادشاہ کا مخاطب بننا، یعنی اس کے ذریعہ سے احکم الحاکمین کے خطاب کا شرف

حاصل ہوا) اور عنقریب (قیامت کے دن) تم سب (اپنے اپنے ذمہ کے واجب حقوق سے) پوچھے جاؤ گے (پس آپ سے صرف تبلیغ کے متعلق سوال ہوگا جس کو آپ خوب ادا کر چکے ہیں اور عمل کے متعلق ان سے سوال ہوگا، پس جب آپ سے ان کے اعمال کے بارے میں باز پرس نہ ہوگی تو آپ غم کیوں کرتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی قرآن کریم تیرے اور تیری قوم کے لیے خاص فضل وشرف کا سبب ہے، اس سے بڑی عزت اور خوش نصیبی کیا ہوگی کہ اللہ کا کلام اور ساری دنیا کی نجات وفلاح کا ابدی دستور العمل ان کی زبان میں اترا اور وہ اس کے اولین مخاطب قرار پائے، اگر عقل ہو تو یہ لوگ اس نعمت عظمیٰ کی قدر کریں اور قرآن جو ان سب کے لیے بیش بہا نصیحت نامہ ہے، اس کی ہدایات پر چل کر سب سے پہلے دنیاوی واخروی سعادتوں کے مستحق ہوں۔

فائدہ: ۲ یعنی آگے چل کر پوچھ ہوگی کہ اس نعمت عظمیٰ کی کیا قدر کی تھی؟ اور اس فضل وشرف کا کیا شکر ادا کیا تھا؟

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿٤٥﴾ ع

اور پوچھ دیکھ جو رسول بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے کبھی ہم نے رکھے ہیں رحمان کے سوائے اور حاکم کہ پوجے جائیں

خلاصہ تفسیر: اور (ہم نے جو آپ پر نازل ہونے والی وحی کو حق قرار دیا ہے اس میں کفار کو سب سے بڑا اعتراض عقیدہ توحید پر ہے جس کے حق ہونے میں ان کو بڑا کلام ہے، سو در حقیقت توحید ایسا امر حق ہے کہ اس پر تمام انبیاء علیہم السلام کا اجماع ہے اور چونکہ انبیاء عقلی ونقلی دلائل کے جامع ہیں اس لئے گویا اس پر ہزاروں عقلی ونقلی دلائل قائم ہیں، چنانچہ اگر آپ کا جی چاہے تو) آپ ان سب پیغمبروں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے پوچھ لیجئے (یعنی ان کی کتابوں اور صحیفوں سے جن کا کچھ بقیہ اب بھی موجود ہے تحقیق کر لیجئے) کہ کیا ہم نے خدائے رحمان کے سوا (کبھی بھی) دوسرے معبود ٹھہرا دیئے تھے کہ ان کی عبادت کی جائے۔

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ: اس سے در حقیقت دوسروں کو سنانا مقصود ہے کہ جس کا جی چاہے تحقیق کر لے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کو اس کی کیا ضرورت تھی، اور کتابوں میں دیکھنے کو رسولوں سے پوچھنا مجازاً کہہ دیا۔

* * *

فائدہ: یعنی آپ کا راستہ وہی ہے جو پہلے انبیاء علیہم السلام کا تھا، شرک کی تعلیم کسی نبی نے نہیں دی، نہ اللہ تعالیٰ نے کسی دین میں اس بات کو جائز رکھا کہ اس کے سوا دوسرے کی پرستش کی جائے۔

اور یہ ارشاد کہ: "پوچھ دیکھو" یعنی جس وقت ان سے ملاقات ہو (جیسے شب معراج میں ہوئی) یا ان کے احوال کتابوں سے تحقیق کرو، بہر حال جو ذرائع تحقیق وتفتیش کے ہوں، ان کو استعمال میں لانے سے صاف ثابت ہو جائے گا کہ کسی دین سماوی میں کبھی شرک کی اجازت نہیں ہوئی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٦﴾ فَلَمَّا

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس تو کہا میں بھیجا ہوا ہوں جہان کے رب کا، پھر جب

جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫

لایا ان کے پاس ہماری نشانیاں وہ تو لگے ان پر ہنسنے لہ اور جو دکھلاتے گئے ہم ان کی نشانی سو پہلی سے بڑی ۲

وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور پکڑا ہم نے ان کو تکلیف میں تاکہ وہ باز آئیں ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے تسلی کا مضمون تھا، اب آگے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے اس کی تائید فرماتے ہیں، نیز پیچھے توحید و رسالت اور کفار کی دھمکی کے مضامین مذکور ہوئے ہیں اس سے ان کی بھی تائید ہوتی ہے۔

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام کو) اپنے دلائل (یعنی معجزات عصا اور ید بیضا) دے کر فرعون کے اور اس کے امراء کے پاس بھیجا تھا، سو انہوں نے (ان لوگوں کے پاس آکر) فرمایا کہ میں رب العالمین کی طرف سے (تم لوگوں کی ہدایت کے لیے) پیغمبر (ہو کر آیا) ہوں (مگر فرعون اور اس کے متبعین نے نہیں مانا) پھر (ہم نے دوسرے دلائل و معجزات سزاؤں کے رنگ میں ان کی نبوت ثابت کرنے کے لیے ظاہر کئے، یعنی قحط سالی وغیرہ مگر ان لوگوں کی پھر بھی یہ حالت رہی کہ) جب موسیٰ (علیہ السلام) ان کے پاس ہماری (وہ) نشانیاں لے کر آئے (جو ''آیات تسعہ'' یعنی نو نشانیاں کہلاتی ہیں) تو وہ یکایک ان (معجزات) پر لگے ہنسنے (کہ یہ کیا اچھے معجزے ہیں، محض معمولی واقعات و حوادث ہیں کیونکہ قحط وغیرہ ویسے بھی ہو جاتا ہے مگر یہ ان کی حماقت تھی، کیونکہ دوسرے قرائن سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ واقعات غیر معمولی ہیں اور معجزہ کے طور پر ہو رہے ہیں، اسی لئے انہوں نے ان پر جادو کی تہمت لگائی تھی جیسا کہ سورۃ اعراف میں :لتسحرنا بھا کے الفاظ اس پر شاہد ہیں) اور (ان نشانیوں کی کیفیت یہ تھی کہ) ہم ان کو جو نشانی دکھلاتے تھے وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر ہوتی تھی (مطلب یہ کہ سب نشانیاں بڑی ہی تھیں) اور ہم نے (ان نشانیوں کے واقع کرنے سے) ان لوگوں کو عذاب میں پکڑا تھا تاکہ وہ (اپنے کفر سے) باز آجائیں (یعنی وہ نشانیاں نبوت کی دلیل بھی تھیں اور ان کے لئے سزا بھی تھیں مگر وہ لوگ باز نہ آئے، باوجودیکہ ہر نشانی کے واقع ہونے پر اس کا چند بار عہد بھی کیا)۔

اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ: ان نو نشانیوں کا بیان سورہ اعراف میں گذر چکا ہے، جن میں بعض واقعات تو ظاہر میں بھی معمولی نہیں، پس یا تو ان پر فرعونیوں نے ہنسی نہ اڑائی ہو، محض بعض واقعات پر ہنسی اڑائی ہو جیسے قحط اور پھل وغیرہ کا نقصان، اور بعد کے واقعات پر عاجزی کا اظہار کیا ہو، اور یا سب پر ہنسی اڑائی ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ ابتداء میں ہنستے رہے ہوں، پھر جب وہ واقعہ مدت تک رہا اور سخت تکلیف ہوئی اس وقت خوشامد شروع کی ہو۔

اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا: یہاں یہ مطلب نہیں کہ ہر نشانی ہر نشانی سے بڑی تھی، بلکہ یہ ایک محاورہ ہے جب کئی چیزوں کا کمال بیان کرنا چاہتے ہیں تو یوں ہی بولتے ہیں کہ ''ایک سے ایک بڑھ کر'' اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعتاً بھی ہر آنے والی نشانیاں پچھلی نشانی سے کچھ فضیلت رکھتی ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی معجزات کا مذاق اڑانے لگے۔

فائدہ: ۲ یعنی ایک سے ایک بڑھ کر نشان اپنی قدرت کا اور موسیٰ کی صداقت کا دکھلایا۔

فائدہ: ۳ یعنی آخر وہ نشان بھیجے جو ایک طرح کے عذاب کا رنگ اپنے اندر رکھتے تھے، جیسا کہ سورہ اعراف میں گزرا: فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ (الاعراف: ۱۳۳) غرض یہ تھی کہ ڈر کر اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور کہنے لگے اے جادوگر ۱ پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو جیسا سکھلا رکھا ہے تجھ کو ہم پر ور راہ پر آجائیں گے ۲

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۵۰﴾

پھر جب اٹھا لی ہم نے ان پر سے تکلیف تبھی وہ وعدہ توڑ ڈالتے ۳

خلاصہ تفسیر: اور انہوں نے (موسیٰ علیہ السلام سے ہر نشانی پر یہ) کہا کہ اے جادوگر! (یہ لفظ ان کی سابقہ عادت کے مطابق فرط بدحواسی سے ان کے منہ سے نکل جاتا ہوگا، ورنہ ایسی عاجزانہ درخواست کے موقع پر شرارت کا لفظ بولنا بعید معلوم ہوتا ہے، بہرحال مطلب یہ تھا کہ اے موسیٰ!) ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے (اور وہ بات یہ تھی کہ اگر یہ لوگ نافرمانی سے باز آجائیں تو عذاب دور ہو جائے گا، یعنی ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر آپ اس عذاب کو دور کرا دیں تو) ہم ضرور راہ پر آجاویں گے، پھر (جب) ہم نے وہ عذاب ان سے ہٹا دیا تب ہی انہوں نے (اپنا) عہد توڑ دیا۔

* * *

فائدہ: ۱ ''ساحر'' ان کے محاورات میں ''عالم'' کو کہتے تھے، کیونکہ بڑا ''علم'' ان کے نزدیک یہ ہی ''سحر'' تھا، شاید اس خوشامد اور لجاجت کے وقت حضرت موسیٰ کو بظاہر تعظیمی لقب سے پکارا ہو اور خبث باطن سے اشارہ اس طرف بھی کیا ہو کہ ہم تجھ کو نبی اب بھی نہیں سمجھتے، صرف ایک ماہر جادوگر سمجھتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی تیرے رب نے جو طریقہ دعا کا بتلایا ہے اور جو کچھ تجھ سے عہد کر رکھا ہے، اس کے موافق ہمارے حق میں دعاء کرو کہ یہ عذاب ہم سے دفع ہو، اگر تیری دعاء سے ایسا ہو گیا تو ہم ضرور راہ پر آجائیں گے اور تیری بات مان لیں گے۔

فائدہ: ۳ یعنی جہاں تکلیف رفع ہوئی اور مصیبت کی گھڑی ختم ہوئی، ایک دم اپنے قول وقرار سے پھر گئے، گویا کچھ وعدہ کیا ہی نہ تھا۔

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ

اور پکارا فرعون نے اپنی قوم میں بولا اے میری قوم بھلا میرے ہاتھ میں نہیں حکومت مصر کی اور یہ نہریں چل رہی ہیں میرے محل کے نیچے

اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾

کیا تم نہیں دیکھتے ۱ بھلا میں ہوں بھی بہتر اس شخص سے جس کو کچھ عزت نہیں اور صاف نہیں بول سکتا ۲

خلاصہ تفسیر: اور فرعون نے (غالباً اس خیال سے کہ کہیں یہ زبردست معجزات دیکھ کر عام لوگ مسلمان ہو جائیں) اپنی قوم میں منادی کرائی (اور اس منادی میں) یہ بات کہی (یعنی کہلوائی) کہ اے میری قوم! کیا مصر (مع توابع) کی سلطنت میری نہیں ہے اور (دیکھو) یہ نہریں میرے (محل کے) پائیں میں بہہ رہی ہیں کیا تم (یہ چیزیں) دیکھتے نہیں ہو (اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس کچھ بھی سامان نہیں تو بتلاؤ میں افضل اور قابل اتباع ہوں یا موسیٰ علیہ السلام) بلکہ میں (ہی) افضل ہوں اس شخص سے (یعنی موسیٰ علیہ السلام سے) جو کہ (مال وجاہ کے اعتبار سے) کم قدر (آدمی) ہے اور قوت بیانیہ بھی نہیں رکھتا۔

وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ: یعنی موسی قوت بیانیہ بھی نہیں رکھتے، یا تو فرعون کی یہ بات جھوٹ ہے، یا ممکن ہے کہ موسی علیہ السلام کی زبان میں کچھ رکاوٹ رہ گئی ہو، یا رکاوٹ بالکل نہ ہو مگر بہت تیزی اور روانی بھی نہ ہو، جیسا کہ خود موسی علیہ السلام کا قول ہے: **واخی هرون هو افصح منی لسانا** کہ میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ صاف ہے، اس مضمون کی زیادہ تحقیق سورہ طٰہٰ آیت ۲۷ و ۲۸: **وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ** میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں "قوت بیانیہ" سے مراد زبان کی روانی کے بجائے دلائل کی قوت و وضاحت ہو اور فرعون کا مطلب یہ ہو کہ حضرت موسیٰ کے پاس ایسے کافی دلائل نہیں ہیں جو مجھے مطمئن کر سکیں، حالانکہ یہ فرعون کا نرا اتہام تھا، ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دلائل و براہین کے مقابلہ میں فرعون کو قطعی لاجواب کر دیا تھا۔

اس میں دلالت ہے کہ زبان آوری اور طلاقت لسانی یا عرفی ورواجی کمالات کا نہ ہونا عیب یا نقص کی علامت نہیں اور نہ ہی یہ کمال کے خلاف

ہے، موسیٰ علیہ السلام میں ایسی کمی نہ تھی جو کہ فصاحت میں مخل ہوتی مگر ہارون علیہ السلام ان سے زیادہ فصیح تھے۔

* * *

فائدہ: لے اسکے گردوپیش کے ملکوں میں مصر کا حاکم بہت بڑا سمجھا جاتا تھا اور نہریں اسی نے بنائی تھیں، دریائے نیل کا پانی کاٹ کر اپنے باغ میں لایا تھا، مطلب یہ ہے کہ ان سامانوں کی موجودگی میں کیا ہماری حیثیت ایسی ہے کہ موسیٰ جیسے معمولی حیثیت والے آدمی کے سامنے گردن جھکا دیں۔

فائدہ: ۲ یعنی موسیٰ کے پاس نہ روپیہ نہ پیسہ، نہ حکومت نہ عزت، نہ کوئی ظاہری کمال، حتیٰ کہ بات کرتے ہوئے بھی زبان پوری طرح صاف نہیں چلتی۔

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ﴿۵۳﴾

پھر کیوں نہ آپڑے ان پر کنگن سونے کے یا آتے اس کے ساتھ فرشتے پر باندھ کر لے

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ﴿۵۴﴾

عقل کھودی اپنی قوم کی، پھر اسی کا کہنا مانا مقرر وہ تھے لوگ نافرمان ۲

خلاصہ تفسیر: (اور اگر یہ شخص اپنے آپ کو پیغمبر بتاتا ہے) تو اس کے (ہاتھوں میں) سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے (جیسے شاہان دنیا کی عادت ہے کہ جب کسی پر خاص عنایت کرتے ہیں تو اس کو عام دربار میں سونے کے کنگن پہناتے ہیں، مطلب یہ کہ اگر اس شخص کو نبوت عطا ہوتی تو خدا کی طرف سے اس کے ہاتھ میں سونے کے کنگن ہوتے) یا فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر آئے ہوتے (جیسا کہ خاص امراء شاہی کا جلوس اس طرح نکلتا ہے) غرض اس نے (ایسی باتیں کر کے) اپنی قوم کو مغلوب (العقل) کر دیا اور وہ اس کے کہنے میں آ گئے (اور) وہ لوگ (کچھ پہلے بھی) شرارت کے بھرے تھے (اس وجہ سے فرعون کی باتوں کا ان پر زیادہ اثر ہوا)۔

فَلَوْلَآ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ: مطلب یہ کہ اگر موسیٰ علیہ السلام خدا کے خاص بھیجے ہوئے ہیں تو ان میں خصوصیت کی مذکورہ علامات تو ظاہر ہوتیں، حالانکہ حقیقت میں یہ محض فرعون کی حماقت تھی، کیونکہ نبوت جس قسم کا کمال ہے اور اس میں جو خصوصیت ہے اسی قسم کے علامات اور دلائل اس کے ساتھ ہونے چاہئیں، سو وہ موسیٰ علیہ السلام میں پورے طور پر موجود تھے۔

* * *

فائدہ: لے کہتے ہیں کہ وہ خود جواہرات کے کنگن پہنتا تھا اور جس امیر وزیر پر مہربان ہوتا سونے کے کنگن پہناتا تھا اور اس کے سامنے فوج پرا باندھ کر کھڑی ہوتی تھی، مطلب یہ تھا کہ ہم کسی کو عزت دیتے ہیں تو ایسا کرتے ہیں، کیا خدا کسی کو اپنا نائب بنا کر بھیجے تو اس کے ہاتھ میں سونے کے کنگن اور جلو میں فرشتوں کی فوج بھی نہ ہو؟!!۔

فائدہ: ۲ یعنی اپنی ابلہ فریب باتوں سے قوم کو الو بنا لیا، وہ سب احمق اسی کی بات ماننے لگے، حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی طبائع میں خدا کی نافرمانی پہلے سے رچی ہوئی تھی، اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہو گیا۔

فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ ﴿۵۶﴾

پھر جب ہم کو غصہ دلایا لے تو ہم نے ان سے بدلہ لیا پھر ڈبو دیا ان سب کو، پھر کر ڈالا ان کو گئے گزرے اور ایک نظیر پچھلوں کے واسطے ۲

خلاصہ تفسیر: پھر جب ان لوگوں نے (برابر کفر و عناد پر اصرار کر کے) ہم کو غصہ دلایا تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور ان سب کو ڈبو دیا اور ہم نے ان کو آئندہ آنے والوں کے لئے خاص طور کے متقدمین اور نمونہ (عبرت) بنا دیا (''نمونہ عبرت'' بنانا یہ سلفاً کی تفسیر کے طور پر ہے، یعنی

خاص طور کے متقدمین بنانے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ان کا قصہ یاد کر کے ایک دوسرے کو عبرت دلاتے ہیں کہ دیکھو متقدمین میں ایسے ایسے ہوئے ہیں اور ان کا ایسا ایسا حال ہوا)۔

* * *

فائدہ: لے یعنی وہ کام کیے جن پر عادۃً خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲ے یعنی پیچھے آنے والی نسلوں کے لیے ان کا قصہ ایک عبرتناک نظیر کے طور پر بیان ہوتا ہے۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ۝٥٧

اور جب مثال لائے مریم کے بیٹے کی تبھی قوم تیری اس سے چلانے لگتے ہیں

وَقَالُوٓا ءَأٰلِهَتُنَا خَيْرٌ أَمْ هُوَ ۚ مَا ضَرَبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ۝٥٨

اور کہتے ہیں ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ لے یہ مثال جو ڈالتے ہیں تجھ پر سو جھگڑنے کو، بلکہ یہ لوگ ہیں جھگڑالو

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا میں شرک کو باطل کیا اور اس سے پہلے بھی جابجا توحید کو ثابت اور شرک کو باطل کیا، اب آگے اس مضمون کے متعلق کفار کے ایک معاندانہ اعتراض کا جواب ہے، جس کا بیان یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت محمد ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا جتنوں کی ناحق عبادت کی جاتی ہے ان میں کسی میں کوئی خیر نہیں، اس پر قریش کے بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ نصرانی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں مگر ان کے بارے میں آپ بھی مانتے ہیں کہ ان میں خیر ہی خیر تھی اس کے جواب میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اور جب (عیسیٰ) ابن مریم (علیہ السلام) کے متعلق (ایک معترض کی طرف سے) ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا (عجیب اس لئے فرمایا کہ اس اعتراض کا غلط اور باطل ہونا سرسری نظر خود ان کو معلوم ہو سکتا تھا، پس عقل رکھ کر ایسا اعتراض کرنا بہت عجیب تھا، غرض جب یہ اعتراض کیا گیا) تو یکایک آپ کی قوم کے لوگ اس (اعتراض کے سننے) سے (مارے خوشی کے) چلانے لگے اور (اس معترض کے ساتھ متفق ہو کر) کہنے لگے کہ (بتلایئے آپ کے نزدیک) ہمارے معبود زیادہ بہتر ہیں یا عیسیٰ (علیہ السلام بہتر ہیں، مقصد یہ ہے کہ آپ عیسیٰ علیہ السلام کو تو یقیناً بہتر سمجھتے ہیں حالانکہ آپ نے جو یہ کہا تھا کہ اللہ کے سوا جتنوں کی ناحق عبادت کی جاتی ہے ان میں کوئی خیر نہیں، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بالکل بھلائی نہ ہو اس سے ایک تو آپ کا یہ قول۔ معاذ اللہ۔ درست نہیں رہا، دوسرے معلوم ہوا کہ جن کو آپ خیر کہتے ہیں خود ان کی بھی عبادت ہوئی ہے، اس لئے اس سے شرک کی صحت ثابت ہوگئی، آگے اس اعتراض کا جواب ہے، پہلے اجمالاً پھر تفصیلاً، اجمالی جواب تو یہ ہے کہ) ان لوگوں نے جو یہ (عجیب اعتراض) آپ سے بیان کیا ہے تو محض جھگڑنے کی غرض سے (نہ کہ طلب حق کے لئے، ورنہ خود ان پر اس اعتراض کا لغو و بے کار ہونا پوشیدہ نہ رہتا اور ان لوگوں کا جھگڑنا کچھ اسی اعتراض کے ساتھ مخصوص نہیں) بلکہ یہ لوگ (اپنی عادت سے) ہیں ہی جھگڑالو (کہ اکثر حق باتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں)۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ جن معبودوں کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ ان میں خیر نہیں، اس سے مراد وہ ہیں جن میں بھلائی کی کوئی وجہ موجود نہیں، نیز وہ جو کہ اپنی عبادت سے لوگوں کو منع نہیں کرتے، بلکہ خود معبود بننا چاہتے ہیں جیسا کہ شیاطین وغیرہ ہیں، اور عیسیٰ علیہ السلام چونکہ نبی ہیں اور خدا کے مقبول بندے ہیں وہ بھلائی سے خالی نہیں ہو سکتے، دوسرے انہوں نے تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیا ہے، اور اس کے سوا دوسروں کی عبادت سے منع کیا ہے، پس ان کی ممانعت کے باوجود اگر کسی نے ان کی عبادت کی ہو تو اس سے ان پر کوئی الزام نہیں۔

* * *

فائدہ: لے حضرت مسیح علیہ السلام کا جب ذکر آتا تو عرب کے مشرکین خوب شور مچاتے اور قسم قسم کی آوازیں اٹھاتے تھے۔

روایات میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قرآن کی یہ آیت پڑھی: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ (الانبیاء:۹۸) کہنے لگے نصاریٰ حضرت مسیح کی عبادت کرتے ہیں، اب بتاؤ! تمہارے خیال میں ہمارے معبود اچھے ہیں، یا مسیح (علیہ السلام) ظاہر ہے تم مسیح کو اچھا کہو گے، جب وہ ہی (معاذ اللہ) آیت کے عموم میں داخل ہوئے تو ہمارے معبود بھی سہی۔

بعض روایات میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا: " لیس احد یُعبد من دون الله فیه خیر" کہنے لگے کیا مسیح میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں؟ ظاہر ہے کہ آیت کا اور حضور ﷺ کے اِن الفاظ کا مطلب اُن چیزوں سے متعلق تھا جن کی پرستش لوگ کرتے ہیں اور وہ ان کو اس سے نہیں روکتے اور اپنی بیزاری کا اظہار نہیں کرتے، مگر ان معترضین کا منشا تو محض جھگڑے نکالنا اور کٹ حجتی کر کے حق کو رلانا تھا، اس لیے جان بوجھ کر ایسے معنی پیدا کرتے تھے جو مراد متکلم کے مخالف ہوں، کبھی کہتے تھے کہ بس معلوم ہو گیا، آپ بھی اسی طرح ہم سے اپنی پرستش کرانا چاہتے ہیں، جیسے نصاریٰ حضرت مسیح کی کرتے ہیں۔

شاید کبھی یہ بھی کہتے ہوں گے کہ خود قرآن نے مسیح کی مثال یہ بیان کی ہے: اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (آل عمران:۵۹) اب دیکھ لو ہمارے معبود اچھے ہیں یا مسیح؟ انہیں کیوں بھلائی سے یاد کرتے ہو؟ اور ہمارے معبودوں کو برا کہتے ہو؟ اور خدا جانے کیا کیا کچھ کہتے ہوں گے، ان سب باتوں کا جواب آگے دیا گیا ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۵۹﴾ؕ

وہ کیا ہے ایک بندہ کہ ہم نے اس پر فضل کیا اور کھڑا کر دیا اس کو بنی اسرائیل کے واسطے

خلاصہ تفسیر: (اب تفصیلی جواب ہے یعنی) عیسیٰ (علیہ السلام) تو محض ایک ایسے بندے ہیں جن پر ہم نے (مقبولیت اور کمالات نبوت دے کر اپنا) فضل کیا اور ان کو بنی اسرائیل کے لئے (اولاً اور دوسروں کیلئے بھی ثانیاً) ہم نے (اپنی قدرت کا) ایک نمونہ بنایا تھا (تاکہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ خدا تعالیٰ کو اس طرح بغیر باپ کے پیدا کرنا بھی کچھ مشکل نہیں، اس سے ان کے دونوں اعتراضات کا جواب نکل آیا)۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ: ان کے اعتراض کا جواب مذکورہ آیات سے اس طرح نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا تھا کہ اللہ کے سوا جتنوں کو لوگوں نے معبود بنا رکھا ہے وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے، یا حضور نے جو فرمایا تھا کہ ان میں خیر نہیں، اس سے مراد وہ معبود تھے جو یا تو بے جان ہوں جیسے پتھر کے بت، یا جاندار ہوں مگر خود اپنی عبادت کا حکم دیتے یا اسے پسند کرتے ہوں جیسے شیاطین، فرعون اور نمرود وغیرہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں جبکہ وہ کسی بھی مرحلہ پر اپنی عبادت کو پسند نہیں کرتے تھے، نصاریٰ ان کی کسی ہدایت کی بنا پر ان کی عبادت نہیں کرتے، بلکہ انہیں ہم نے اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنا کر بغیر باپ کے پیدا کیا تھا تاکہ لوگوں پر یہ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی تخلیق میں اسباب کے کسی واسطے کی ضرورت نہیں، لیکن نصاریٰ نے اس کا غلط مطلب لے کر انہیں معبود بنا لیا، حالانکہ ان کا یہ معبود بنانا عقلاً بھی غلط تھا اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بالکل خلاف تھا، کیونکہ انہوں نے ہمیشہ توحید کی تعلیم دی تھی، غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی عبادت سے بیزار ہونا اس بات سے مانع ہے کہ انہیں دوسرے باطل معبودوں کی صف میں شامل کیا جائے، یعنی جن لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت شروع کر دی ہے انہوں نے نہ کسی خدائی حکم سے ایسا کیا، نہ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ خواہش تھی اور نہ قرآن ان کی تائید کرتا ہے، انہیں تو حضرت عیسیٰ کے باپ کے بغیر پیدا ہونے سے مغالطہ لگا تھا اور قرآن اس مغالطہ کی تردید کرتا ہے، اس سے کفار کا یہ اعتراض بھی ختم ہو گیا جس کا ذکر خلاصہ تفسیر میں آیا ہے کہ جن کو آپ خود خیر کہتے ہیں (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) ان کی بھی عبادت ہوئی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی عبادت کچھ بری بات نہیں، مذکورہ آیات میں اس کا جواب واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو عبادت ہوئی، وہ اللہ کی مرضی کے بھی خلاف تھی اور خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی، لہٰذا اس سے شرک کی صحت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ روح المعانی میں سورہ انبیاء کی تفسیر میں آپ ﷺ کا جواب سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ: "بل هم عبدوا الشياطين التي امرتهم بذلك" اس جواب کا حاصل غور وفکر سے اسی تقریر کی طرف لوٹتا ہے جو یہاں خلاصہ تفسیر میں لکھا گیا ہے، اور اگر اس روایت سے قطع نظر کرلیا جائے تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ اعتراض بدیہی طور پر فاسد اور محض عناد پر مبنی تھا اس لیے وضاحتی جواب کی حاجت نہ تھی اگر چہ جواب دیا جانا جائز تھا، اور اسی جواز کی بنا پر قرآن میں جواب نازل بھی ہوا۔

* * *

فائدہ: یعنی کچھ اسی ایک مسئلہ میں نہیں، ان کی طبیعت ہی جھگڑالو واقع ہوئی ہے، سیدھی اور صاف بات کبھی ان کے دماغوں میں نہیں اترتی، یوں ہی مہمل بحثیں اور دور از کار جھگڑے نکالتے رہتے ہیں، بھلا کہاں وہ شیطان جو لوگوں سے اپنی عبادت کراتے اور اس پر خوش ہوتے ہیں، یا وہ پتھر کی بے جان مورتیں جو کسی کو کفر وشرک سے روکنے پر اصلاً قدرت نہیں رکھتیں اور کہاں وہ خدا کا مقبول بندہ جس پر اللہ نے خاص فضل فرمایا اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے واسطے کھڑا کیا، جس کو اپنے بندہ ہونے کا اقرار تھا اور جو اپنی امت کو اسی چیز کی طرف بلاتا تھا کہ: اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ کیا اس مقبول بندہ کو العیاذ باللہ حصب جهنم یا " ليس فيه خير " کہا جا سکتا ہے؟ یا یہ پتھر کی مورتیاں اس کی ہمسری کر سکتی ہیں؟ یاد رکھو! قرآن کریم کسی بندہ کو بھی خدائی کا درجہ نہیں دیتا، اس کا تو سارا جہاد ہی اس مضمون کے خلاف ہے، ہاں! یہ بھی نہیں کر سکتا کہ محض احمقوں کے خدا بنا لینے سے ایک مقرب ومقبول بندہ کو پتھروں اور شریروں کے برابر کر دے۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿٦٠﴾

اور اگر ہم چاہیں نکالیں تم میں سے فرشتے رہیں زمین میں تمہاری جگہ

خلاصہ تفسیر: (ظاہر ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی بغیر باپ کے ولادت محض حکمتوں کی وجہ سے ہوئی تھی، ایک حکمت تو یہ کہ ہماری قدرت پر استدلال ہو کہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے، سو اس سے عیسی علیہ السلام کی الوہیت پر استدلال کرنا حماقت ہے) اور (ہم تو اس سے زیادہ عجیب وغریب امور پر قادر ہیں، چنانچہ) اگر ہم چاہتے تو ہم تم سے فرشتوں کو پیدا کر دیتے (جس طرح تم سے تمہارے بچے پیدا ہوتے ہیں) کہ وہ زمین پر (انسان کی طرح) یکے بعد دیگرے رہا کرتے (یعنی پیدائش بھی آدمیوں کی طرح ہوتی اور موت بھی، پس بغیر باپ کے پیدا ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے زیر قدرت نہیں رہے، لہٰذا یہ بات حضرت عیسیٰ کے معبود ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی)۔

یہ نصاریٰ کے اس مغالطہ کا جواب ہے جس کی بنا پر انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود قرار دیا تھا، انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے ان کی خدائی پر استدلال کیا تھا، باری تعالیٰ ان کی تردید میں فرماتے ہیں کہ یہ تو محض ہماری قدرت کا ایک مظاہرہ تھا اور ہم تو اس سے بھی بڑھ کر خلاف عادت کاموں پر قادر ہیں، بغیر باپ کے پیدا ہونا تو کوئی بہت زیادہ خلاف عادت نہیں، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام تو بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے، اگر ہم چاہیں تو ایسا کام بھی کر سکتے ہیں جس کی اب تک کوئی نظیر نہیں اور وہ یہ کہ انسانوں سے فرشتے پیدا کریں۔

* * *

فائدہ: یعنی عیسیٰ علیہ السلام میں آثار فرشتوں کے سے تھے (جیسا کہ سورۃ مائدہ، آل عمران، اور کہف کے فوائد میں اشارہ کیا جا چکا ہے) اتنی بات سے کوئی شخص معبود نہیں بن جاتا، اگر ہم چاہیں تو تمہاری نسل سے ایسے لوگ پیدا کریں، یا تمہاری جگہ آسمان سے فرشتوں ہی کو لا کر زمین پر آباد کر دیں، ہم کو سب قدرت حاصل ہے۔

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾

اور وہ نشان ہے قیامت کا، سو اس میں شک مت کرو اور میرا کہا مانو، یہ ایک سیدھی راہ ہے

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٢﴾

اور نہ روک دے تم کو شیطان، وہ تو تمہارا دشمن ہے صریح ۲

خلاصہ تفسیر: (بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کو اس طرح پیدا کرنے میں بعض حکمتیں تھیں جن میں سے ایک تو اوپر بیان ہوئی کہ انہیں اپنی قدرت کا ایک نمونہ بنانا تھا) اور (دوسری حکمت یہ تھی کہ) وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام اس طرح پیدا ہونے میں امکان) قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں (اس طرح کہ قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے میں اس سے زیادہ اور کیا بعد ہے کہ دوبارہ زندگی خلاف عادت ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے ہونے سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ خلاف عادت امور کے صادر کرنے پر قادر ہے، پس اس سے قیامت و آخرت کے عقیدے کا صحیح ہونا ثابت ہو گیا اور جب تم نے عقیدہ آخرت کی یہ دلیل سن لی) تو تم لوگ اس (کی صحت) میں شک مت کرو، اور (توحید اور آخرت وغیرہ عقائد میں) تم لوگ میرا اتباع کرو، یہ (مجموعہ جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں) سیدھا رستہ ہے، اور تم کو شیطان (اس راہ پر آنے سے) روکنے نہ پائے وہ بیشک تمہارا صریح دشمن ہے۔

اکثر مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ آسمان سے نازل ہونا قیامت کی علامت ہے، اس مسئلہ کی کچھ تفصیل سورۃ آل عمران آیت: انی متوفیك و رافعك الی میں اور کچھ سورۃ مائدہ میں گزر چکی ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حضرت مسیح کا اول مرتبہ آنا تو خاص بنی اسرائیل کے لیے ایک نشان تھا کہ بدون باپ کے پیدا ہوئے اور عجیب وغریب معجزات دکھلائے اور دوبارہ آنا قیامت کا نشان ہوگا، ان کے نزول سے لوگ معلوم کرلیں گے کہ قیامت بالکل نزدیک آ لگی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی قیامت کے آنے میں شک نہ کرو اور جو سیدھی راہ ایمان و توحید کی بتلا رہا ہوں اس پر چلے آؤ، مبادا تمہارا ازلی دشمن شیطان تم کو اس راستہ سے روک دے۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ

اور جب آئے عیسیٰ نشانیاں لے کر بولا میں لایا ہوں تمہارے پاس پکی باتیں ۱ اور بتلانے کو بعضی وہ چیز جس میں تم جھگڑتے

فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٦٣﴾

تھے ۲ سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو

خلاصہ تفسیر: اور (یہاں تک تو کفار کے مذکورہ اعتراض کا جواب تھا، اب آگے خود عیسیٰ علیہ السلام کے مضمون دعوت سے توحید کا ثبوت اور شرک کے باطل ہونے کی تائید ہے یعنی) جب عیسیٰ (علیہ السلام کھلے کھلے) معجزے لے کر آئے تو انہوں نے (لوگوں سے) کہا کہ میں تمہارے پاس سمجھ کی باتیں لے کر آیا ہوں (تاکہ تمہارے عقائد کی اصلاح کروں) اور تاکہ بعض باتیں (حلال و حرام کی) جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم سے بیان کردوں (جس سے وہ اختلاف واشتباہ دور ہو جائے، جب میں اس طرح آیا ہوں) تو تم لوگ اللہ سے ڈرو (اور میری نبوت کا انکار نہ کرو، کیونکہ یہ خدا کی مخالفت ہے) اور میرا کہا مانو (کیونکہ نبوت کی تصدیق کے لئے یہ ضروری ہے)۔

وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ: اور تاکہ میں بیان کروں تم سے بعض وہ باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو، چونکہ بنی اسرائیل میں سرکشی اور ہٹ دھرمی کا غلبہ تھا اس لئے انہوں نے بعض احکام شرعیہ میں تحریف کر ڈالی تھی، عجب نہیں کہ کسی نے حلال کو حرام، اور حرام کو حلال کرلیا ہو، عیسیٰ علیہ السلام نے اسکی حقیقت واضح فرمادی، اور چونکہ بعض باتیں اپنی اصلی حالت پر بھی ہوں گی اس لیے یہاں عیسیٰ علیہ السلام نے "بعض باتیں"

فرمایا، یا "بعض باتیں" اس لئے کہا کہ بعض امور خالص دنیوی تھے، عیسیٰ علیہ السلام نے ان میں اختلاف دور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پکی باتیں، دانائی اور حکمت کی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دینی باتیں یا بعض وہ چیزیں جن کو شریعت موسویہ نے حرام ٹھہرایا تھا، ان کا حلال ہونا بیان کرتا ہوں: **وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ** (آل عمران: ۵۰)

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۶۴

بیشک اللہ جو ہے وہی ہے رب میرا اور رب تمہارا سو اسی کی بندگی کرو، یہ ایک سیدھی راہ ہے ۱؎

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝۶۵

پھر پھٹ گئے کتنے فرقے ان کے بیچ سے ۲؎ سو خرابی ہے گناہ گاروں کو آفت سے دکھ والے دن کی

خلاصہ تفسیر: (اور عیسیٰ علیہ السلام نے یہ بھی کہا کہ) بیشک اللہ ہی میرا بھی رب ہے، اور تمہارا بھی رب ہے، سو (صرف) اسی کی عبادت کرو (اور) یہی (توحید) سیدھا رستہ ہے (پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس دعوت سے خود توحید کی تائید ہوگئی، لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ناحق عبادت سے شرک کے صحیح ہونے پر معترض کا استدلال کرنا "مدعی سست، گواہ چست" کی مثال ہے) سو (عیسیٰ علیہ السلام کے اس واشگاف بیان توحید کے باوجود پھر بھی) مختلف گروہوں نے (اس بارے میں) باہم اختلاف ڈال لیا (یعنی توحید کے خلاف طرح طرح کے مذاہب ایجاد کر لئے، چنانچہ نصاریٰ وغیرہ کا توحید میں اختلاف بھی معلوم ہے) سو ان ظالموں (یعنی مشرکین اہل کتاب وغیر اہل کتاب) کے لیے ایک پر درد دن کے عذاب سے بڑی خرابی (ہونے والی) ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ تعلیم تھی حضرت مسیح علیہ السلام کی، دیکھو کیسی صفائی سے خدائے واحد کی ربوبیت اور معبودیت کو بیان فرمایا ہے اور اسی توحید اور اتقاء واطاعت رسول کو صراط مستقیم قرار دیا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اختلاف پڑ گیا، یہود ان کے منکر ہوئے اور نصاریٰ قائل ہوئے، پھر نصاریٰ آگے چل کر کئی فرقے بن گئے، کوئی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا بتلاتا ہے، کوئی ان کو تین خداؤں میں ایک کہتا ہے، کوئی کچھ اور کہتا ہے، حضرت مسیح کی اصل تعلیم پر ایک بھی نہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۶۶

اب یہی ہے کہ راہ دیکھتے ہیں قیامت کی کہ آ کھڑی ہو ان پر اچانک اور ان کو خبر بھی نہ ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کے دن سے مشرکین کو دھمکی تھی، اب آگے بھی اسی کا مضمون ہے اور مؤمنین وکفار کے لیے وعدہ اور وعید مذکور ہے۔

یہ لوگ (حق واضح ہونے کے باوجود باطل پر اصرار کر رہے ہیں تو) بس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان پر دفعتاً آ پڑے اور ان کو خبر بھی نہ ہو (چونکہ وہ لوگ قیامت کے منکر تھے اس لیے انکار کے باوجود انتظار سے مراد یہ ہے کہ ان کا دلائل کو نہ ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص مشاہدہ کا منتظر ہو کہ جب آنکھوں سے دیکھ لوں گا تب مانوں گا)۔

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ: "خبر بھی نہ ہو" کا مطلب یہ ہے کہ قبر میں اگرچہ قیامت کا یقین ہو جائے گا مگر زیادہ انکشاف اور عین الیقین قیامت

ہی میں ہوگا۔

***

فائدہ: ایسے ایسے کھلے بیانات اور واضح ہدایات کے باوجود بھی جولوگ نہیں مانتے آخر وہ کا ہے کے منتظر ہیں، ان کے احوال کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بس قیامت ایک دم ان کے سر پر آ کھڑی ہو تب مانیں گے، حالانکہ اس وقت کا ماننا کچھ کام نہ دے گا۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾ ع ۱۲

جتنے دوست ہیں اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر جو لوگ ہیں ڈر والے

خلاصہ تفسیر: (اور اس روز قیامت کے واقعات یہ ہیں کہ) تمام (دنیا کے) دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے بجز خدا سے ڈرنے والوں (یعنی اہل ایمان) کے (کیونکہ اس دن باطل کی دوستی کا نقصان محسوس ہوگا تو لامحالہ اس سے کراہت اور ان برے دوستوں سے نفرت ہوگی کہ یہ لوگ نقصان کا سبب ہوئے اور حق کی دوستی کا نفع اور ثواب محسوس ہوگا اس لئے وہ باقی رہے گی)۔

***

فائدہ: اس دن دوست سے دوست بھاگے گا کہ اس کے سبب سے کہیں میں نہ پکڑا جاؤں، دنیا کی سب دوستیاں اور محبتیں منقطع ہو جائیں گی، آدمی پچھتائے گا کہ فلاں شریر آدمی سے دوستی کیوں کی تھی جو اس کے اکسانے سے آج گرفتار مصیبت ہونا پڑا، اس وقت بڑا اگر مجوش محب محبوب کی صورت دیکھنے سے بیزار ہوگا، البتہ جن کی محبت اور دوستی اللہ کے واسطے تھی اور اللہ کے خوف پر مبنی تھی وہ کام آئے گی۔

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿٦٩﴾

اے بندوں میرے نہ ڈر ہے تم پر آج کے دن اور نہ تم غمگین ہو گے ۱؎ جو یقین لائے ہماری باتوں پر اور رہے حکم بردار ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور ان مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا ہوگی) اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف (کی بات واقع ہونے والی) نہیں، اور نہ تم غمگین ہو گے یعنی وہ بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے اور (علماً و عملاً ہمارے) فرمانبردار تھے۔

ایمان والوں کو خوف اور غم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ گناہ گاروں کو سزا نہ ہوگی، کیونکہ ایمان کے مختلف درجے ہیں، کامل ایمان سے جنت میں فوراً داخل ہونا نصیب ہوگا اور ناقص ایمان سے کسی وقت جنت میں داخل ہونا نصیب ہو جائے گا۔

***

فائدہ: ۱؎ یعنی نہ آگے کا ڈر، نہ پیچھے کا غم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دل سے یقین کیا اور جوارح سے اس کے حکمبردار رہے، یہاں سے "ایمان" اور "اسلام" کا فرق ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث جبرائیل میں اس کا مفصل بیان ہوا ہے۔

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿٧٠﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ

چلے جاؤ بہشت میں تم اور تمہاری عورتیں کہ تمہاری عزت کریں، لیے پھریں گے ان کے پاس رکابیاں سونے کی اور آب خورے ۱؎

وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٧١﴾

اور وہاں ہے جو دل چاہے اور جس سے آنکھیں آرام پائیں ۲؎ اور تم ان میں ہمیشہ رہو گے

خلاصہ تفسیر: تم اور تمہاری (ایمان دار) بیویاں خوش بخوش جنت میں داخل ہو جاؤ (اور جنت میں جانے کے بعد ان کے لئے یہ ہوگا کہ) ان کے پاس سونے کی رکابیاں (کھانے کی چیزوں سے بھری ہوئی) اور گلاس (مشروبات سے بھرے ہوئے سونے کے یا اور کسی چیز کے) لائے جائیں گے (یعنی غلمان لائیں گے) اور وہاں وہ چیزیں ملیں گی جن کو جی چاہے گا اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی اور (ان سے کہا جائے گا کہ) تم یہاں ہمیشہ رہو گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی غلمان لیے پھریں گے۔

فائدہ: ۲؎ سب سے اعلیٰ چیز جس سے آنکھیں آرام پائیں گی وہ دیدار ہے حق سبحانہ وتعالیٰ کا (رزقنا الله بفضله ومنه)

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور یہ وہی بہشت ہے جو میراث پائی تم نے بدلے میں ان کاموں کے جو کرتے تھے ۱؎

لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾

تمہارے واسطے ان میں بہت میوے ہیں ان میں سے کھاتے رہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (یہ بھی کہا جائے گا کہ) یہ وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنا دیئے گئے (تم سے کبھی نہ لی جائے گی) اپنے (نیک) اعمال کے عوض میں (اور) تمہارے لئے اس میں بہت سے میوے ہیں جن میں سے کھا رہے ہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تمہارے باپ آدم کی میراث واپس مل گئی، تمہارے اعمال کے سبب سے اور اللہ کے فضل سے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی چن چن کر۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾

البتہ جو لوگ کہ گناہ گار ہیں وہ دوزخ کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، نہ ہلکا ہوتا ہے ان پر سے اور وہ اسی میں پڑے ہیں آس ٹوٹے ۱؎

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن تھے وہی بے انصاف ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے ایمان والوں کا حال بیان ہوا، اب آگے کفار کا ذکر ہے کہ) بیشک نافرمان (یعنی کافر) لوگ عذاب دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ (عذاب) ان (پر) سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اسی (عذاب) میں مایوس پڑے رہیں گے اور (آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) ہم نے ان پر (ذرا) ظلم نہیں کیا (کہ ناحق عذاب دیا ہو) لیکن یہ خود ہی ظالم تھے (کہ کفر و شرک کر کے اپنا نقصان کر لیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی عذاب نہ کسی وقت ملتوی ہوگا نہ ہلکا کیا جائے گا، دوزخی ناامید ہو جائیں گے کہ اب یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہم نے دنیا میں بھلائی برائی کے سب پہلو سمجھا دیے تھے اور پیغمبروں کو بھیج کر حجت تمام کر دی تھی، کوئی معقول عذر ان کے لیے باقی نہیں چھوڑا تھا، اس پر بھی نہ مانے اور اپنی زیادتیوں سے باز نہ آئے، ایسوں کو سزا دی جائے تو ظلم کون کہہ سکتا ہے۔

وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾

اور پکاریں گے اے مالک کہیں ہم پر فیصل کر چکے تیرا رب ا۔ وہ کہے گا تم کو ہمیشہ رہنا ہے ۲۔

خلاصہ تفسیر: اور (آگے ان کا بقیہ حال مذکور ہے کہ جب نجات سے بالکل مایوس ہوجائیں گے اس وقت موت کی تمنا کریں گے اور دوزخ کے داروغہ "مالک" نامی فرشتہ کو) پکاریں گے کہ اے مالک! (تم ہی دعا کرو کہ) تمہارا پروردگار (ہم کو موت دے کر) ہمارا کام ہی تمام کر دے، وہ (فرشتہ) جواب دے گا کہ تم ہمیشہ اسی حال میں رہو گے (نہ نکلو گے نہ مرو گے)۔

* * *

فائدہ: ا۔ "مالک" نام ہے فرشتہ کا جو دوزخ کا داروغہ ہے، دوزخی اس کو پکاریں گے کہ ہم نہ مرتے ہیں نہ چھوٹتے ہیں، اپنے رب سے کہہ کر ایک دفعہ عذاب دے کر ہمارا کام ہی تمام کردے، گویا نجات سے مایوس ہو کر موت کی تمنا کریں گے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی چلانے سے کچھ فائدہ نہیں، تم کو اسی حالت میں ہمیشہ رہنا ہے، کہتے ہیں دوزخی ہزار برس چلائیں گے تب وہ یہ جواب دیگا۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾

ہم لائے ہیں تمہارے پاس سچا دین پر تم بہت لوگ سچی بات سے برا مانتے ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار و مشرکین کے عذاب کا تفصیلی ذکر تھا اور جرم کا اجمالی، اب آگے سورت کے خاتمہ میں جرم کا تفصیلی ذکر ہے اور عذاب کا اجمالی۔

(اور پیچھے جن سزاؤں کا بیان ہوا اُن کی وجہ یہ ہے کہ) ہم نے سچا دین (جس کا رکن اعظم توحید و رسالت کا اعتقاد ہے) تمہارے پاس پہنچایا، لیکن تم میں سے اکثر آدمی سچے دین سے نفرت رکھتے ہیں (سچے دین سے نفرت کرنے میں شرک بھی داخل ہے اور رسول کی مخالفت بھی)۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ: "اکثر آدمی" یا تو اس لئے کہا کہ بعض لوگ خدا کے علم میں آئندہ ایمان لانے والے تھے، یا اس لئے کہ نفرت تو صحیح معنی میں بعض ہی کو تھی، دوسرے بعض محض تقلیداً یعنی دوسروں کے دیکھا دیکھی راہ حق کو چھوڑے ہوئے تھے۔

* * *

فائدہ: یعنی وہ سزا اس جرم پر ملی کہ تم میں سے اکثر سچائی سے چڑتے تھے (اور بہت سے اندھوں کی طرح انکے پیچھے ہو لیے)۔

اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ

کیا انہوں نے ٹھہرائی ہے ایک بات تو ہم بھی کچھ ٹھہرائیں گے ا۔ کیا خیال رکھتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے ان کا بھید اور ان کا مشورہ

بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾

کیوں نہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے رہتے ہیں ۲۔

خلاصہ تفسیر: (اب شرک اور رسول دونوں سے نفرت کی تفصیل ہے کہ) ہاں! کیا انہوں نے (رسول کو نقصان پہنچانے کے بارے میں) کوئی انتظام درست کیا ہے، سو ہم نے بھی ایک انتظام درست کیا ہے (اور ظاہر ہے کہ خدائی انتظام کے سامنے ان کا انتظام نہیں چل سکتا، چنانچہ آپ محفوظ رہے اور وہ لوگ ناکام، اور آخر کو بدر میں ہلاک ہوئے، اس کا مفصل ذکر سورۃ انفال آیت: واذ یمکر بك الذین کفروا میں ہے) ہاں! (یہ لوگ جو آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے خفیہ تدبیریں کرتے ہیں) کیا ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم ان کی چپکی چپکی (کہی ہوئی) باتوں کو اور ان

کے (خفیہ) مشوروں کونہیں سنتے (ورنہ اگر ہم کو سننے والا سمجھتے ہیں تو پھر ایسی جرأت کیوں کرتے ہیں؟ ممکن ہے کہ بعض احمق ایسا ہی سمجھتے ہوں کہ اللہ تعالیٰ سنتا نہیں جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، آگے ان کے اس خیال کی تردید فرماتے ہیں کہ) ہم ضرور سنتے ہیں اور (اس کے علاوہ) ہمارے فرشتے (جو اعمال کو لکھنے والے ہیں) ان کے پاس ہیں وہ بھی لکھتے ہیں (اگرچہ اس کی ضرورت نہ ہو، لیکن عام عادت یہ ہے کہ خود حاکم کے معائنہ سے پولیس کی لکھی ہوئی رپورٹ مجرم پر زیادہ حجت ہوتی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ے کفار عرب پیغمبر کے مقابلہ میں طرح طرح کے منصوبے گانٹھتے اور تدبیریں کرتے تھے، مگر اللہ کی خفیہ تدبیر ان کے سب منصوبوں پر پانی پھیر دیتی تھی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''کافروں نے مل کر مشورہ کیا کہ تمہارے تغافل سے اس نبی کی بات بڑھی، آئندہ جو اس دین میں آئے اسی کے رشتہ دار اس کو مار مار کر الٹا پھیریں اور جو اجنبی شخص شہر میں آئے اس کو پہلے سنا دو کہ اس شخص کے پاس نہ بیٹھے''، یہ بات انہوں نے ٹھہرائی اور اللہ نے ٹھہرایا ان کو ذلیل ورسوا کرنا اور اپنے دین اور پیغمبر کو عروج دینا، آخر اللہ کا ارادہ غالب رہا۔

فائدہ: ۲ے یعنی ان کے دلوں کے بھید ہم جانتے اور ان کے خفیہ مشورے ہم سنتے ہیں اور حکومت کے انتظامی ضابطہ کے موافق ہمارے فرشتے (کراماً کاتبین) ان کے سب اعمال وافعال لکھتے جاتے ہیں، یہ ساری مسل قیامت میں پیش ہوگی۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿٨١﴾

تو کہہ اگر ہو رحمان کے واسطے اولاد تو میں سب سے پہلے پوجوں

خلاصہ تفسیر: پیچھے ان کی مخالفت رسول کا بیان ہوا، اب توحید کی مخالفت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اے پیغمبر ﷺ! آپ (ان مشرکین سے) کہئے کہ (تم جو اپنے بعض مشرکانہ اقوال میں حق تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہو تو) اگر (بفرض محال ایسا ہو یعنی) خدائے رحمن کے اولاد ہو تو سب سے اول اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں۔

فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ: یعنی جس طرح تم فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھ کر ان کی عبادت کرتے ہو، اسی طرح میں بھی اس صورت میں خدا کی اولاد کی عبادت کرتا، مطلب یہ کہ مجھ کو تمہاری طرح حق بات کے ماننے سے انکار اور عار نہیں، تم اگر ثابت کردو کہ خدا کی اولاد ہے تو سب سے پہلے میں اس کو مانوں گا، اور جب اس کو خدا کی اولاد مان لوں تو چونکہ خدا کی اولاد بھی خدا ہی ہونی چاہئے اور خدا مستحق عبادت ہے، اس لئے میں اس کی عبادت بھی کروں، مگر چونکہ یہ بات غلط اور باطل محض ہے اور درحقیقت خدا اس سے پاک ہے اس لئے نہ میں مانوں گا اور نہ خدا کے سوا کسی عبادت کروں گا۔

* * *

فائدہ: یعنی اس سے بڑا ظلم کیا ہوگا کہ اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کی جائیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اگر بفرض محال خدا کے اولاد ہوتو پہلا شخص میں ہوں جو اس کی اولاد کی پرستش کرے۔ کیونکہ میں دنیا میں سب سے زیادہ خدا کی عبادت کرنے والا ہوں۔ اور جس کو جس قدر علاقہ خدا کے ساتھ ہوگا اسی نسبت سے اس کی اولاد کے ساتھ ہونا چاہیے۔ پھر جب میں باوجود اول العابدین ہونے کے کسی ہستی کو اس کی اولاد نہیں مانتا تو تم کون سے اللہ کا حق ماننے والے ہو جو اس کی فرضی اولاد تک کے حقوق پہچانو گے۔

تنبیہ: بعض مفسرین نے آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ اگر تمہارے اعتقاد میں اللہ کی کوئی اولاد ہے تو یاد رکھو! کہ تمہارے مقابلہ میں اس اکیلے خدا کی عبادت کرنے والا ہوں جو اولاد واحفاد سے منزہ ومقدس ہے۔

بعض نے ''عابد'' کے معنی لغۃً ''جاحد'' (منکر) کے بتلائے ہیں، یعنی اس فاسد عقیدہ کا سب سے پہلا انکار کرنے اور رد کرنے والا میں ہوں۔

بعض کے نزدیک ''ان'' نافیہ ہے، یعنی رحمان کے کوئی اولاد نہیں، مگر یہ کچھ زیادہ قوی نہیں اور بھی احتمالات ہیں جن کے استیعاب کا یہاں موقع نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

سُبۡحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۸۲﴾

پاک ذات ہے وہ رب آسمانوں کا اور زمین کا صاحب عرش کا ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (اب شرک سے اللہ تعالیٰ کے پاک ہونے کا بیان ہے یعنی) آسمانوں اور زمین کا مالک جو کہ عرش کا بھی مالک ہے ان باتوں سے منزہ ہے جو یہ (مشرک) لوگ (اس کی جناب میں) بیان کر رہے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جن باتوں کی نسبت یہ لوگ اس کی طرف کرتے ہیں۔ مثلاً اولاد وغیرہ، اس سے خدا تعالیٰ کی ذات برتر اور منزہ ہے۔ اس کی ذات میں یہ امکان ہی نہیں کہ معاذ اللہ کسی کا باپ یا بیٹا بنے۔

فَذَرۡهُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَیَلۡعَبُوۡا حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۸۳﴾

اب چھوڑ دے ان کو بک بک کریں اور کھیلیں یہاں تک کہ ملیں اپنے اس دن سے جس کا ان کو وعدہ دیا ہے

خلاصہ تفسیر: (جب یہ لوگ حق کے واضح ہونے کے باوجود اپنے عناد سے باز نہیں آتے) تو آپ ان کو اسی شغل اور تفریح میں رہنے دیجئے، یہاں تک کہ ان کو اپنے اس دن سے سابقہ واقع ہو جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے (اس وقت سب حقیقت معلوم ہو جائے گی)۔

فَذَرۡهُمۡ یَخُوۡضُوۡا: ''رہنے دیجئے'' کا مطلب یہ نہیں کہ تبلیغ نہ کیجئے اور احکام نہ سنایئے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کی مخالفت کی طرف التفات نہ کیجئے اور ان کے ایمان نہ لانے سے غمگین نہ ہوں۔

* * *

فائدہ: یعنی غفلت وحماقت کے نشہ میں جو کچھ بکتے ہیں بکنے دیجئے۔ یہ لوگ چندروز اور دنیا کے کھیل تماشے میں گزار لیں، آخر وہ موعود دن آنا ہے جس میں ایک ایک کر کے ان کی گستاخیوں اور شرارتوں کا مزہ چکھایا جائے گا۔

وَهُوَ الَّذِیۡ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ ؕ وَهُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۴﴾

اور وہی ہے جس کی بندگی ہے آسمان میں اور اس کی بندگی ہے زمین میں، اور وہی ہے حکمت والا سب سے خبردار

خلاصہ تفسیر: اور (اب شرک کے جرم کو مؤکد کرنے کے لیے توحید کی تاکید ہے کہ یہ لوگ ایسی پختہ بات کی مخالفت کرتے ہیں جو ایسے ایسے مضبوط دلائل سے ثابت ہے غرض ارشاد ہوتا ہے کہ) وہی ذات جو آسمانوں میں بھی قابل عبادت ہے اور زمین میں بھی قابل عبادت ہے اور وہی بڑی حکمت والا اور بڑے علم والا ہے (اور کوئی علم وحکمت میں اس کا شریک نہیں، پس خدائی بھی اسی کے ساتھ خاص ہے)۔

* * *

فائدہ: نہ آسمان میں فرشتے اور شمس وقمر معبود بن سکتے ہیں، نہ زمین میں اصنام واوثان وغیرہ، سب زمین وآسمان والوں کا معبود اکیلا وہی خدا ہے جو فرش سے عرش تک کا مالک اور تمام عالم کون میں اپنے علم واختیار سے متصرف ہے۔

وَتَبٰرَکَ الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَهُمَا ۚ وَعِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ۚ

اور بڑی برکت ہے اسکی جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جو کچھ انکے بیچ میں ہے اور اسی کے پاس ہے خبر قیامت کی

وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾

اور اسی تک پھر کر پہنچ جاؤ گے ۲

خلاصہ تفسیر: اور وہ ذات بڑی عالیشان ہے جس کے لئے آسمانوں کی اور زمین کی اور جو (مخلوق) ان کے درمیان میں ہے اس کی سلطنت ثابت ہے اور (علم ایسا کامل ہے کہ) اس کو قیامت کی خبر (بھی) ہے (جس کا کسی مخلوق کو پتہ نہیں) اور (جزا و سزا کا مالک بھی وہی ہے چنانچہ) تم سب اسی کے پاس لوٹ کر جاؤ گے (اور اس کو حساب دو گے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قیامت کب آئے گی؟ اس کا علم صرف اسی مالک کو ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی وہاں پہنچ کر سب کی نیکی بدی کا حساب ہو جائے گا۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾

اور اختیار نہیں رکھتے وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں سفارش کا مگر جس نے گواہی دی سچی اور ان کو خبر تھی

خلاصہ تفسیر: اور (اس وقت اللہ تعالیٰ کا بلا شرکت غیرے جزا و سزا کا مالک ہونا ایسا ظاہر و باہر ہوگا کہ) خدا کے سوا جن معبودوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سفارش (تک) کا اختیار نہ رکھیں گے ہاں جن لوگوں نے حق بات (یعنی کلمہ ایمان) کا اقرار کیا تھا اور وہ (دل سے) تصدیق بھی کرتے تھے (وہ البتہ خدا تعالیٰ کی اجازت سے اہل ایمان کی سفارش کر سکیں گے مگر اس سے کفار کو کیا فائدہ؟)۔

* * *

فائدہ: یعنی اتنی سفارش کر سکتے ہیں کہ جس نے ان کے علم کے موافق کلمہ اسلام کہا اس کی گواہی دیں، بغیر کلمہ اسلام کسی کے حق میں ایک حرف سفارش کا نہیں کہہ سکے اور اتنی سفارش بھی صالحین کریں گے جو سچائی کو جانتے اور اس کو زبان و دل سے مانتے ہیں، دوسروں کو اجازت نہیں۔

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٨٧﴾

اور اگر تو ان سے پوچھے کہاں کو کس نے بنایا تو کہیں گے اللہ نے پھر کہاں سے الٹ جاتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (ہم نے جو پیچھے توحید کا مضمون بیان کیا ہے جس میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں، سو اس کے مقدمات کو یہ بھی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو (یعنی تم کو) کس نے پیدا کیا ہے تو یہی کہیں گے کہ اللہ نے (پیدا کیا ہے) سو (ایک مقدمہ تو خود ان کے اقرار سے ثابت ہوا اور دوسرا مقدمہ بدیہی طور پر عقل سے ثابت ہے کہ عبادت کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جو حقیقت میں پیدا کرنے پر قادر ہو، پس) یہ لوگ (مقدمات کو تو مانتے ہیں مگر پھر نتیجہ کے ماننے کے وقت خدا جانے) کدھر الٹے چلے جاتے ہیں (اس سے اور بھی جرم پختہ ہو گیا کہ ان کا یہ اختلاف محض عناد سے ہے اور ظاہر ہے کہ ہٹ دھرم زیادہ مجرم ہوتا ہے، ان تمام باتوں سے واضح ہے کہ ان کافروں کے جرائم کس قدر سخت ہیں، لہٰذا سزا بھی یقیناً سخت ہوگی)۔

* * *

فائدہ: یعنی جب بنانے والا ایک اللہ ہے تو بندگی کا مستحق کوئی دوسرا کیوں کر ہو گیا۔ عبادت نام ہے انتہائی تذلل کا۔ وہ اسی کا حق ہونا چاہیے جو انتہائی عظمت رکھتا ہے۔ عجیب بات ہے مقدمات کو تسلیم کرتے ہیں اور نتیجہ سے انکار۔

وقف لازم

وَقِيۡلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوۡمٌ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾

قسم ہے رسول کے اس کہنے کی کہ اے رب یہ لوگ ہیں کہ یقین نہیں لاتے ۱؎

ع ۱۸

فَاصۡفَحۡ عَنۡهُمۡ وَقُلۡ سَلٰمٌ ؕ فَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾

سوتو منہ پھیر لے ان کی طرف سے اور کہہ سلام ہے ۲؎ اب آخر کو معلوم کر لیں گے ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (آگے سزا کی سختی کو اور زیادہ موکد کرنے کے لئے ایک اور بات کا بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح خدا تعالیٰ کو قیامت کی خبر ہے اسی طرح) اس کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے میرے رب! یہ ایسے لوگ ہیں کہ (باوجود میری اس درجہ فہمائش کے) ایمان نہیں لاتے (اس سے سزا کی سختی اور بڑھ گئی کہ ان کے جرائم تو سخت تھے ہی ان کے ساتھ رسول کی نالش بھی موجود ہے، پس ایسی حالت میں سمجھ لینا چاہئے کہ کیسا سخت عذاب ہوگا، جب آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ ان کا انجام یہ ہونے والا ہے) تو آپ ان سے بے رخ رہیے (یعنی ان کے ایمان کی ایسی امید نہ رکھئے جو بعد میں رنج کا سبب ہو، کیونکہ جب ان کی تقدیر میں یہ انجام ہے تو یہ کیا خاک ایمان لائیں گے) اور (اگر وہ آپ سے مخالفت اور جہالت کی بات کریں تو آپ رفع شر کے لئے) یوں کہہ دیجئے کہ تم کو سلام کرتا ہوں (اور کچھ نہیں کہتا اور نہ کچھ واسطہ رکھتا ہوں، آگے حق تعالیٰ تسلی کے لیے فرماتے ہیں کہ آپ چندے صبر کیجئے) سو ان کو ابھی (مرتے ہی) معلوم ہوجائے گا۔

وَقِيۡلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ: اس تفسیر کے مطابق **وقیلہ** ایک آیت پہلے کے لفظ الساعۃ پر معطوف ہے، اس آیت کی اور بھی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں، مثلاً یہ کہ یہاں واؤ عطف کی نہیں بلکہ قسم کی ہے یٰرب "قیل" کا مقولہ ہے اور انّ ھولاء الخ جواب قسم ہے، ان تفسیروں کی تفصیل اہل علم روح المعانی وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نبی کا یہ کہنا بھی اللہ کو معلوم ہے اور اس کی اس مخلصانہ التجاء اور درد بھری آواز کی اللہ قسم کھاتا ہے کہ وہ اس کی ضرور مدد کرے گا۔ اور اپنی رحمت سے اس کو غالب و منصور کرے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی غم نہ کھا، اور زیادہ ان کے پیچھے نہ پڑ، فرض تبلیغ ادا کر کے ادھر سے منہ پھیر لے اور کہہ دے کہ اچھا نہیں مانتے تو ہمارا سلام لو۔

فائدہ: ۳؎ یعنی آخر کار ان کو پتہ لگ جائے گا کہ کس غلطی میں پڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ کچھ تو دنیا ہی میں لگ گیا۔ اور پوری تکمیل آخرت میں ہونے والی ہے۔

ایاتہا ۵۹ | ۴۴ سُوۡرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ ۶۴ | رکوعاتہا ۳

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ﴿۲﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ ﴿۳﴾

حم، قسم ہے اس کتاب واضح کی، ہم نے اس کو اتارا ایک برکت کی رات میں ۱؎ ہم ہیں کہہ سنانے والے ۲؎

خلاصہ تفسیر: یہ سورت رسالت اور توحید سے شروع ہوئی ہے، پچھلی سورت اسی پر ختم ہوئی تھی۔

حٰمٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم ہے اس کتاب واضح (المعنی) کی کہ ہم نے اس کو (لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر) ایک برکت والی

رات (یعنی شب قدر) میں اتارا ہے (کیونکہ) ہم (شفقت کی وجہ سے اپنے ارادہ میں اپنے بندوں کو) آگاہ کرنے والے تھے (یعنی ہم کو یہ منظور ہوا کہ ان کومضرتوں سے بچالینے کے لئے خیروشر کی اطلاع کردیں، یہ قرآن کونازل کرنے کا مقصد تھا)۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ: اس رات کی تفسیر اکثر نے شب قدر سے کی ہے اوراس کے بارہ میں آثار بھی ہیں، چنانچہ سعید بن جبیرؒ نے فرمایا ہے کہ پورا قرآن اوپر کے آسمان سے آسمان دنیا پر شب قدر میں آگیا تھا، پھر تھوڑا تھوڑا کئی سال میں نازل ہوتا رہا، اور ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ سال بھر میں جو کچھ ہونے والا ہوتا ہے رزق، موت وحیات اور بارش وغیرہ وہ سب شب قدر میں لوح محفوظ سے نقل کرلیا جاتا ہے، پہلی روایت سے اس شبہ کا بھی جواب ہوگیا کہ قرآن تھوڑا تھوڑا تیئس سال میں آیا ہے، پھر شب قدر میں نازل ہونے کے کیا معنی؟ جواب ظاہر ہے کہ شب قدر میں آسمان دنیا پر نازل ہونا مراد ہے، اور بعض نے لیلة مبارکة کی تفسیر شب براءت سے کی ہے، کیونکہ اس کی نسبت بھی یہ آیا ہے کہ اس میں سالانہ واقعات کا فیصلہ ہوتا ہے، لیکن چونکہ کسی روایت سے قرآن کا اس رات میں نازل ہونا معلوم نہیں ہوا، اور شب قدر میں نازل ہونا خود قرآن میں مذکور ہے: **انا انزلنه فی لیلة القدر** اس لیے یہ تفسیر صحیح معلوم نہیں ہوتی، شب براءت میں سالانہ واقعات کا فیصلہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہاں قرآن میں جو لیلة مبارکة آیا ہے اس سے یہی شب براءت مراد ہو، لیکن اس بات کا قائل ہونا پڑے گا کہ دونوں راتوں میں واقعات کے فیصلے ہوتے ہوں تو یہ کچھ بعید بھی نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ شب براءت میں واقعات لکھ لیے جاتے ہوں اور شب قدر میں سپرد کردیے جاتے ہوں جیسا کہ روح المعانی میں ابن عباسؓ کا ایک قول بعینہ یہی نقل کیا ہے اور احتمال کے لیے ثبوت کی حاجت نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ ''برکت کی رات'' شب قدر ہے، کما قال تعالیٰ: اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ (القدر:۱) اور جو رمضان میں واقع ہے، لقولہ تعالیٰ: شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰى وَالۡفُرۡقَانِ (البقرۃ:۱۸۵) اس رات میں قرآن کریم لوح محفوظ سے سمائے دنیا پر اتار گیا، پھر بتدریج تیئس سال میں پیغمبر پر اترا، نیز اسی شب میں پیغمبر پر اس کے نزول کی ابتداء ہوئی۔

فائدہ: ۲ یعنی کہہ سنایا ہمیشہ ہمارا دستور رہا ہے، اسی کے موافق پر قرآن اتارا۔

فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ ۝۴ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرۡسِلِيۡنَ ۝۵ رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ

اسی میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا، حکم ہوکر ہمارے پاس سے ۱ ہم ہیں بھیجنے والے ۲ رحمت سے تیرے رب کی

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝۶ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ۘ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّوۡقِنِيۡنَ ۝۷

وہی ہے سننے جاننے والا ۳ رب آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ ہے، اگر تم کو یقین ہے ۴

خلاصہ تفسیر: (آگے اس رات کے برکات ومنافع کا بیان ہے کہ) اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم (صادر) ہوکر طے کیا جاتا ہے (یعنی سال بھر کے معاملات جو سارے کے سارے ہی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کو کرنا منظور ہوتا ہے اس طریقے کو متعین کرکے ان کی اطلاع متعلقہ فرشتوں کو کرکے ان کے سپرد کردیئے جاتے ہیں، چونکہ وہ رات ایسی ہے اور نزول قرآن سب سے زیادہ حکمت والا کام تھا اس لئے اس کے لئے بھی یہی رات منتخب کی گئی اور یہ قرآن اس لئے نازل کیا گیا کہ) ہم بوجہ رحمت کے جو آپ کے رب کی طرف سے ہوتی ہے آپ کو پیغمبر بنانے والے تھے (تاکہ آپ کی معرفت اپنے بندوں کو آگاہ کردیں) بیشک وہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے (اس لئے بندوں کی مصلحت کی رعایت کرتا ہے، اور وہ ایسا ہے) جو کہ مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو (مخلوق) ان دونوں کے درمیان میں ہے اس کا بھی اگر تم یقین لانا چاہو (تو یہ توحید کے دلائل یقین لانے کے لئے کافی موجود ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سال بھر کے متعلق قضاء وقدر کے حکیمانہ اور اٹل فیصلے اسی عظیم الشان رات میں ''لوح محفوظ'' سے نقل کر کے ان فرشتوں کے حوالہ کیے جاتے ہیں جو شعبہ ہائے تکوینیات میں کام کرنے والے ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعبان کی پندرھویں رات ہے جسے ''شب برات'' کہتے ہیں، ممکن ہے وہاں سے اس کام کی ابتداء اور ''شب قدر'' پر انتہاء ہوئی ہو، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی فرشتوں کو ہر کام پر جوان کے مناسب ہو، چناچہ جبرائیل کو قرآن دے کر محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی تمام عالم کے حالات سے باخبر ہے اور ان کی پکار سنتا ہے، اسی لیے عین ضرورت کے وقت خاتم النبیین ﷺ کو قرآن دے کر اور عالم کے لیے رحمت کبریٰ بنا کر بھیج دیا۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اگر تم میں کسی چیز پر یقین رکھنے کی صلاحیت ہے تو سب سے پہلی چیز یقین رکھنے کے قابل اللہ کی ربوبیت عامہ ہے جس کے آثار ذرہ ذرہ میں روز روشن سے زیادہ ہوا ہیں۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝٨ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝٩

کسی کی بندگی نہیں سوائے اسکے جلاتا ہے اور مارتا ہے، رب تمہارا اور رب تمہارے اگلے باپ دادوں کا ۱؎ کوئی نہیں وہ دھوکے میں ہیں کھیلتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب توحید کا صراحۃً بیان ہے کہ) اس کے سوا کوئی لائق عبادت کے نہیں، وہی جان ڈالتا ہے وہ ہی جان نکالتا ہے، وہ تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی پروردگار ہے (اور اس واضح بیان کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ لوگ مان لیتے مگر یہ لوگ پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ وہ (توحید جیسے حقائق کی طرف سے) شک میں (پڑے) ہیں (اور دنیا کے) کھیل (کود) میں مصروف ہیں (آخرت کی فکر نہیں جو حق کو طلب کریں اس میں غور سے کام لیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس کے قبضہ میں مارنا جلانا اور وجود وعدم کی باگ ہو اور سب اولین وآخرین جس کے زیر تربیت ہوں، کیا اس کے سوا دوسرے کی بندگی جائز ہو سکتی ہے؟ یہ ایک ایسی صاف حقیقت ہے جس میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان واضح نشانات اور دلائل کا اقتضاء تو یہ تھا کہ یہ لوگ مان لیتے، مگر پھر بھی نہیں مانتے، بلکہ وہ توحید وغیرہ عقائد حقہ کی طرف سے شک میں پڑے ہیں اور دنیا کے کھیل کود میں مصروف ہیں، آخرت کی فکر نہیں جو حق کو طلب کریں اور اس میں غور وفکر سے کام لیں، یہ اس دھوکے میں ہیں کہ ہمیشہ یوں ہی رہنا ہے، خدا کے سامنے کبھی پیشی نہیں ہوگی، اس لیے نصیحت کی باتوں کو ہنسی کھیل میں اڑا دیتے ہیں۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۝١٠ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١١

سو تو انتظار کر اس دن کا کہ لائے آسمان دھواں صریح، جو گھیر لیوے لوگوں کو یہ ہے عذاب دردناک ۱؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید ورسالت اور قرآن کا حق ہونا مذکور تھا، اب آگے ان حق باتوں کا انکار کرنے والوں کے لیے وعید ہے۔

(اور جب یہ لوگ حق کے واضح ہونے کے باوجود نہیں مانتے) سو آپ (ان کے لئے) اس روز کا انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف سے ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو جو ان سب لوگوں پر عام ہو جائے یہ (بھی) ایک دردناک سزا ہے (جو ان کو ہوگی)۔

يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ: اس سے مراد غلہ کا قحط ہے جس میں اہل مکہ مبتلا ہوئے تھے، جس کا حقیقی سبب رسول اللہ ﷺ کی بد دعا تھی، جبکہ وہ سرکشی میں بڑھنے لگے، اور یہ بد دعا ایک مرتبہ مکہ میں ہوئی تھی اور ایک بار مدینہ میں، اور ظاہری سبب اس کا یہ تھا کہ جب ثمامہ بن اثال حنفیؓ رئیس یمامہ مسلمان ہو گئے اور کفار مکہ نے ان پر ملامت کی تو انہوں نے یمامہ سے غلہ آنا بند کر دیا اور مکہ میں غلہ کی آمد وہیں سے تھی اور بارش بھی بند ہو گئی تو

اہل مکہ بھوکے مرنے لگے اور قاعدہ ہے کہ بھوک کی شدت اور خشکی کی حالت میں آسمان و زمین کے درمیان آنکھوں کے سامنے دھواں سا نظر آیا کرتا ہے، اسی کو ''دخان'' فرمایا، غرض اہل مکہ اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور لگے عاجزی کرنے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک دھواں قیامت کے قریب آئے گا، مگر ابن مسعودؓ نے اس آیت کی تفسیر اس سے کرنا پسند نہیں کی، اور کسی صحیح سند سے بھی یہ ثابت نہیں کہ قیامت کے قریب ظاہر ہونے والے دھویں کو اس آیت کی تفسیر کے طور پر فرمایا گیا ہو اور جو تفسیر پہلے اختیار کی ہے اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قحط کے زمانہ میں جو دھواں سا نظر آتا وہ تو خیالی ہوتا ہے، پھر اس کو ''دخان مبین'' (صاف نظر آنے والا دھواں) کیسے فرمایا؟ اصل یہ ہے کہ وہ خیالی نہیں ہوتا بلکہ واقعی ہوتا ہے، کیونکہ حقیقت میں وہ بخارات ہوتے ہیں۔

* * *

فائدہ: لہ ''دھویں'' سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس میں سلف کے دو قول ہیں:

① ابن عباسؓ وغیرہ کہتے ہیں کہ قیامت کے قریب ایک دھواں اٹھے گا جو تمام لوگوں کو گھیر لے گا، نیک آدمی کو اس کا اثر خفیف پہنچے گا، جس سے زکام سا ہو جائے گا، اور کافر و منافق کے دماغ میں گھس کر بیہوش کر دے گا، وہ یہاں مراد ہے، شاید یہ دھواں وہ ہی سماوات کا مادہ ہو جس کا ذکر: **ثم استوىٰ الى السماء وهى دخان** میں ہوا ہے، گویا آسمان تجلّی تحلیل ہو کر اپنی پہلی حالت کی طرف عود کرنے لگیں گے اور یہ اس کی ابتدا ہوگی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

② اور ابن مسعود زور و شور کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آیت سے مراد وہ ''دھواں'' نہیں جو علامات قیامت میں سے ہے، بلکہ قریش کے تمرد و طغیان سے تنگ آ کر نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی تھی کہ ان پر بھی سات سال کا قحط مسلط کر دے، جیسے یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصریوں پر مسلط ہوا تھا، چنانچہ قحط پڑا جس میں مکہ والوں کو مردار اور چمڑے ہڈیاں کھانے کی نوبت آ گئی، غالباً اسی دوران میں ''یمامہ'' کے رئیس ثمامہ ابن آثالؓ مشرف باسلام ہوئے اور وہاں سے غلہ کی جو بھرتی مکہ کو جاتی تھی بند کر دی، غرض اہل مکہ بھوکوں مرنے لگے اور قاعدہ ہے کہ شدت کی بھوک اور مسلسل خشک سالی کے زمانہ میں جو یعنی زمین و آسمان کے درمیان دھواں سا آنکھوں کے سامنے نظر آیا کرتا ہے اور ویسے بھی مدت دراز تک بارش بند رہنے سے گرد و غبار وغیرہ چڑھ کر آسمان پر دھواں سا معلوم ہونے لگتا ہے، اس کو یہاں ''دخان'' سے تعبیر فرمایا، اس تقدیر پر **یغشی الناس** میں ''لوگوں'' سے مکہ والے ہوں گے، گویا یہ ایک پیشین گوئی تھی (كما يدل عليه قول فارتقب) جو پوری ہوئی۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ⑫ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ⑬

اے رب! کھول دے ہم پر سے یہ آفت ہم یقین لاتے ہیں لہ کہاں ملے ان کو سمجھنا اور آ چکا ان کے پاس رسول کھول کر سنانے والا

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ⑭ وقف لازم

اس سے پیٹھ پھیری اور کہنے لگے سکھایا ہوا ہے باؤلا ٢

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ پیشین گوئی کے طور پر فرماتے ہیں کہ اس وقت جناب باری میں عرض کریں گے کہ) اے ہمارے رب! ہم سے اس مصیبت کو دور کر دیجئے ہم ضرور ایمان لے آئیں گے (اب ان کے اس وعدے کا سچے دل سے نہ ہونا ارشاد فرماتے ہیں کہ) ان کو (اس سے) کب نصیحت ہوتی ہے (جس سے ان کے ایمان کی توقع کی جائے) حالانکہ (اس سے قبل) ان کے پاس ظاہر شان کا پیغمبر آیا (یعنی جس کی نبوت کی شان ظاہر تھی) پھر بھی یہ لوگ اس سے سرتابی کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ (کسی دوسرے بشر کا) سکھایا ہوا ہے (اور) دیوانہ ہے (تو جب اتنے بڑے رسول کے آنے پر یہ لوگ ایمان نہیں لائے جس کے دلائل اور معجزات میں کوئی تاویل ہی نہیں ہو سکتی تو قحط ہونے پر کب ایمان لانے کی امید ہے جس میں ایک بے انصاف آدمی یہ احتمال بھی نکال سکتا ہے کہ یہ ایک معمولی اور اتفاقی واقعہ ہے جو طبعی اسباب کے تحت ہوا ہے، کفر کی سزا نہیں ہے)۔

یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ ابوسفیان اور دیگر قریش نے آپ کو لکھا بھی اور مدینہ بھی آئے کہ آپ دعا کریں اور ثمامہ رئیس یمامہ کو جس نے غلہ بند کردیا تھا سمجھائیں، اور صاحب روح المعانی نے ابوسفیان کا وعدہ ایمان بھی نقل کیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس عذاب میں مبتلا ہو کر یوں کہیں گے کہ اب تو اس آفت سے نجات دیجئے، آگے کو ہماری توبہ! ہم کو اب یقین آگیا، پھر شرارت نہ کریں گے، پکے مسلمان بن کر رہیں گے، آگے اس کا جواب دیا ہے:

فائدہ: ۲؎ یعنی اب موقع سمجھنے اور نصیحت سے فائدہ اٹھانے کا کہاں رہا، اس وقت تو مانا نہیں جب ہمارا پیغمبر کھلے کھلے نشان اور کھلی ہدایات لے کر آیا تھا۔ اس وقت کہتے تھے کہ یہ باؤلا ہے۔ کبھی کہتے کہ کسی دوسرے سے سیکھ کر اس نے یہ کتاب تیار کرلی ہے (ابن عباس ؓ کی تفسیر پر یہ مطلب ہوا) اور ابن مسعودؓ کی تفسیر کے موافق یہ معنی ہوں گے کہ اہل مکہ نے قحط وغیرہ سے تنگ آکر درخواست کی کہ یہ آفت ہم سے دور کیجیے۔

بعض روایات میں ہے کہ ابوسفیان وغیرہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں فریاد کی کہ آپ تو کہتے ہیں کہ میں رحمت ہوں اور یہ آپ کی قوم قحط وخشک سالی سے تباہ ہورہی ہے، ہم آپ ﷺ کو رحم اور قرابت کا واسطہ دیتے ہیں کہ اس مصیبت کے دور ہونے کی دعا کیجیے، اگر ایسا ہوگیا تو ہم ایمان لے آئیں گے، چنانچہ آپ کی دعا سے بارش ہوئی اور ثمامہ نے جو غلہ روک دیا تھا وہ بھی آپ ﷺ نے کھلوا دیا پھر بھی وہ ایمان نہ لائے، اسی کو فرماتے ہیں: انی لھم الذکریٰ یعنی یہ لوگ ان باتوں سے ماننے والے کہاں ہیں، اس قسم کی چیزوں میں تو ہزار تاویلیں گھڑ لیں جو چیز بالکل کھلی ہوئی آفتاب اور زیادہ روشن تھی یعنی آپ کی پیغمبری، اسی کو نہ مانا، کوئی مجنون بتلانے لگا، کسی نے کہا کہ صاحب! فلاں رومی غلام سے کچھ مضامین سیکھ آئے ہیں، ان کو اپنی عبادت میں ادا کردیتے ہیں، ایسے متعصب معاندین سے سمجھنے کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔

وقف لازم إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿١٥﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ ۚ إِنَّا مُنتَقِمُونَ ﴿١٦﴾

ہم کھولے دیتے ہیں یہ عذاب تھوڑی مدت تک تم پھر وہی کرو گے ۱؎ جس دن پکڑیں گے ہم بڑی پکڑ تحقیق ہم بدلہ لینے والے ہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: (ان کا یہ ایمان لانے کا وعدہ محض دفع الوقتی ہے مگر خیر) ہم (حجت تمام کرنے کے لئے) چندے اس عذاب کو ہٹا دیں گے (مگر) تم پھر اپنی اسی (پہلی) حالت (تکبر اور کفر) پر آجاؤ گے (اور اس عاجزی اور بے چارگی کو بھول جاؤ گے، چنانچہ ارشاد ہے کہ) جس روز ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے (اس روز) ہم (پورا) بدلہ لے لیں گے (یعنی آخرت میں پوری سزا ہوگی)۔

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا: چنانچہ یہ پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی اور بارش ہوئی، اور ثمامہ کو بھی خط لکھا کہ غلہ آنے دیں، بند نہ کریں، اور مکہ والوں کو فارغ البالی میسر ہوئی، مگر ایمان تو کیا لاتے وہ نرمی اور عاجزی بھی جاتی رہی، پھر وہی زور وشور شروع ہوگیا، اور یہ جو فرمایا کہ ''ہم چندے اس عذاب کو ہٹا دیں گے'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عذاب کے ہٹنے کی حد محض دنیوی زندگی تک ہے، اور دنیا کی راحت قلیل ہی ہے، پھر مرنے کے بعد جو مصیبت آئے گی اس کا کہیں خاتمہ نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے عذاب ہٹا لیں، پھر وہی حرکتیں کریں گے جو پہلے کرتے تھے۔ اور ابن مسعودؓ کی تفسیر پر یہ مطلب ہوگا کہ لو! اچھا ہم تھوڑی مدت کے لیے یہ عذاب ہٹا لیتے ہیں، پھر دیکھ لینا، وہی کریں گے جو پہلے کرتے تھے۔

فائدہ: ۲؎ ابن عباسؓ کے نزدیک ''بڑی پکڑ'' قیامت ہوگی، غرض یہ ہے کہ آخرت کا عذاب نہیں ٹلتا۔

اور ابن مسعودؓ کے نزدیک ''بڑی پکڑ'' سے معرکہ بدر کا واقعہ مراد ہے، بدر میں ان لوگوں سے بدلہ لے لیا گیا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿١٧﴾ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ

اور جانچ چکے ہیں ہم ان سے پہلے فرعون کی قوم کو اور آیا ان کے پاس رسول عزت والا ۱؎ کہ حوالے کرو میرے بندے خدا کے ۲؎

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٨﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٩﴾

میں تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر، اور یہ کہ چڑھے نہ جاؤ اللہ کے مقابل میں لاتا ہوں تمہارے پاس سند کھلی ہوئی ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے منکرین کی وعید تھی اب آگے عذاب فرعون کے قصہ سے اس وعید کی تاکید ہے۔

اور ہم نے ان سے پہلے قوم فرعون کو آزمایا تھا اور (وہ آزمائش یہ تھی کہ) ان کے پاس ایک معزز پیغمبر (یعنی موسیٰ علیہ السلام) آئے تھے (پیغمبر کے آنے سے آزمائش ہی ہوتی ہے کہ کون ایمان لاتا ہے اور کون نہیں لاتا، انہوں نے آکر فرعون اور فرعون کی قوم سے فرمایا) کہ ان اللہ کے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو (جن کو تم نے طرح طرح کی تکالیف میں پھنسا رکھا ہے) میرے حوالے کردو (اور ان سے دست بردار ہوجاؤ کہ میں جہاں اور جس طرح مناسب ہوا ان کو آزاد کر کے رکھوں) میں تمہاری طرف (خدا کا) فرستادہ (ہوکر آیا) ہوں (اور) دیانتدار ہوں (کوئی بات وحی سے کم یا زیادہ نہیں کرتا، جو حکم ہوتا ہے پہنچاتا ہوں پس تم کو ماننا چاہئے) اور یہ (بھی فرمایا) کہ تم خدا سے سرکشی مت کرو (پیچھے حق العباد کا حکم تھا اور یہاں حق اللہ کا حکم ہے) میں تمہارے سامنے (اپنی نبوت کی) ایک واضح دلیل پیش کرتا ہوں (مراد اس سے عصا اور ید بیضاء وغیرہ کا معجزہ ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے ان کا امتحان کیا گیا کہ اللہ کے پیغام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی خدا کے بندوں کو اپنا بندہ مت بناؤ، بنی اسرائیل کو غلامی سے آزادی دو اور میرے حوالہ کرو، میں جہاں چاہوں لے جاؤں۔

فائدہ: ۳؎ ''کھلی سند'' وہ معجزات تھے جو حضرت موسیٰ نے دکھائے ''عصا'' اور ''ید بیضا'' وغیرہ۔

وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿٢٠﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿٢١﴾

اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو ۱؎ اور اگر تم نہیں یقین کرتے مجھ پر تو مجھ سے پرے ہوجاؤ ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (جب فرعون اور اس کی قوم نے نہ مانا بلکہ آپس میں آپ کے قتل کا مشورہ ہوا اس وقت آپ نے سن کر فرمایا کہ) میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں اس سے کہ تم لوگ مجھ کو پتھر (وغیرہ) سے قتل کرو، اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو تم مجھ سے الگ ہی رہو (یعنی مجھے تکلیف پہنچانے کے درپے مت ہو، کیونکہ مجھ کو تو کوئی نقصان نہ پہنچے گا، مجھ سے اللہ کا وعدہ ہے: **فلا یصلون الیکما الخ** لیکن مجھے ایذا دینے سے تمہارا جرم اور زیادہ سخت ہوجائے گا، اس لئے خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ ایسا مت کرو، مگر وہ کب باز آتے تھے)۔

وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ: اللہ کے آگے التجا کرتے رہنا اور اپنی قوت وطاقت کا دعویٰ نہ کرنا بندگی اور عبدیت کا اظہار ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ ان کی دھمکیوں کا جواب دیا، یعنی میں تمہارے ظلم وایذاء سے خدا کی پناہ حاصل کر چکا ہوں وہ میری حمایت پر ہے اور اسی کی حفاظت پر مجھے بھروسہ ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اگر میری بات نہیں مانتے تو کم از کم مجھے ایذاء دے کر اپنے جرم کو سنگین مت کرو: ''مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں''۔

اور حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اپنی قوم کو لے جاؤں تم راہ نہ روکو''۔

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

پھر دعا کی اپنے رب سے کہ یہ لوگ گناہ گار ہیں، پھر لے نکل رات سے میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے ؎۱

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾

اور چھوڑ جا دریا کو تھما ہوا، البتہ وہ لشکر ڈوبنے والے ہیں ؎۲

خلاصہ تفسیر: تب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ بڑے سخت مجرم لوگ ہیں (جرم سے باز نہیں آتے، اب ان کا فیصلہ کر دیجئے، ارشاد ہوا کہ ہم نے تمہاری دعا قبول کی اور ان کے فیصلہ کا وقت آ گیا) تو اب میرے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو تم رات ہی رات میں لے کر چلے جاؤ (کیونکہ) تم لوگوں کا (فرعون کی طرف سے) تعاقب (بھی) ہوگا (اس لئے رات میں نکل جانے سے اتنی دور تو نکل جاؤ گے کہ یہ تعاقب کر کے تم کو پا نہ سکے) اور (سفر کے دوران جو دریا حائل ہوگا) تم اس دریا کو (اول عصا مارنا کہ وہ خشک ہو کر رستہ دے دے گا، پھر پار ہونے کے بعد جب اس کو اسی حالت پر دیکھو تو یہ فکر نہ کرنا کہ شاید فرعون بھی اسی طرح پار ہو جائے گا بلکہ تم اس کو اسی) سکون کی حالت میں (یعنی پانی کے ہٹ جانے اور راستہ کے خشک ہو جانے سے دریا کی جو ہیئت پیدا ہوئی ہے اسی ہیئت پر) چھوڑ دینا (اور بے فکر رہنا، کیونکہ اس کے اس حالت میں رہنے کی یہ حکمت ہے کہ) ان (فرعونیوں) کا سارا لشکر (اس دریا میں) ڈبو یا جائے گا (اس طرح کہ وہ بھی اس میں آ گھسیں گے اور جب اس میں آ جائیں گے تو چاروں طرف سے پانی آ ملے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پار ہو گئے اور فرعونی غرق ہوئے)۔

* * *

فائدہ: ؎۱ یعنی آخر مجبور ہو کر اللہ سے فریاد کی کہ یہ لوگ اپنے جرائم سے باز آنے والے نہیں اب آپ میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دیجیے وہاں کیا دیر تھی۔ حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ فرعونیوں کو اطلاع کیے بدون بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات مصر سے چلے جاؤ۔ کیونکہ دن ہونے پر جب انہیں اطلاع ہوگی اس وقت تمہارا پیچھا کریں گے۔ لیکن یاد رہے راستہ میں سمندر پڑے گا۔ اس پر عصا مارنے سے پانی ادھر ادھر ہٹ جائے گا اور درمیان میں خشکی و صاف راستہ نکل آئے گا۔ اسی راستہ سے اپنی قوم کو لے کر گزر جاؤ۔

فائدہ: ؎۲ یعنی اس کی فکر مت کرو کہ دریا میں خدا کی قدرت سے جو راستہ بن گیا وہ باقی نہ رہے، اس کو اسی حالت میں چھوڑ دے، یہ راستہ دیکھ کر تو فرعون کے لشکر اس میں گھسنے کی ہمت کریں گے۔ چنانچہ وہ سب خشک راستہ دیکھ کر اندر گھسے، اس کے بعد خدا کے حکم سے سمندر کا پانی چاروں طرف سے آ کر مل گیا۔ سارا لشکر اس طرح غرقاب ہوا۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۲۶﴾

بہت سے چھوڑ گئے باغ اور چشمے، اور کھیتاں اور گھر خاصے

وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۲۸﴾

اور آرام کا سامان جس میں باتیں بنایا کرتے تھے، یونہی ہوا اور وہ سب ہاتھ لگا دیا ہم نے ایک دوسری قوم کے ؎۱

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ لوگ کتنے ہی باغ اور (کتنے ہی) چشمے (یعنی نہریں) اور (کتنی ہی) کھیتیاں اور (کتنے ہی) عمدہ مکانات (اور کتنے ہی) آرام کے سامان جس میں وہ خوش رہا کرتے تھے چھوڑ گئے (یہ قصہ) اسی طرح ہوا، اور ہم نے ایک دوسری قوم کو ان کا مالک

بنادیا (مراد بنی اسرائیل ہیں)۔

وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ: حسن بصریؒ اس کے قائل ہیں کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے غرق ہونے کے بعد مصر میں آئے تھے، اور قتادہؒ نے اس کا اس لیے انکار کیا کہ مشہور تواریخ اس کے خلاف ہیں، اس صورت میں مالک بنانے کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ ان کو تصرف پر قادر کردیا کہ وہ فرعونیوں کے سامان کو جو چاہتے کرسکتے تھے، اور یہ واپسی ہی پر موقوف نہ ہی، اور بعض نے حسنؒ کے قول کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ وہ بظاہر قرآن کے موافق ہے اور کہا ہے کہ تواریخ کا اور یہود کی کتابوں کا کچھ اعتبار نہیں، اس کے متعلق مزید تفصیل سورہ اعراف آیت ۱۳۷: **وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ** اور کچھ تفصیل سورہ شعراء آیت ۵۹: **كَذٰلِكَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ** میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں دے دیا، جیسا کہ سورۃ شعراء میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ فرعون کے غرق ہوئے بعد مصر میں نبی اسرائیل کا دخل ہوا، اور اگر یہ ثابت نہ ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جس قسم کے سامان فرعونیوں نے چھوڑے تھے اسی طرح کے ہم نے بنی اسرائیل کو دیے، واللہ اعلم۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۱۲

نہ رویا ان پر آسمان اور زمین لہ اور نہ ملی ان کو ڈھیل

خلاصہ تفسیر: سو (چونکہ وہ نہایت مبغوض تھے، یعنی خدا کو ان سے نفرت تھی اس لئے) نہ تو ان پر آسمان وزمین کو رونا آیا اور نہ ان کو (عذاب سے کچھ اور) مہلت دی گئی (یعنی اگر کچھ دنوں اور جیتے تو جہنم کے عذاب سے کچھ دن اور بچے رہتے)۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ: مؤمن کے واسطے آسمان وزمین کا رونا حدیث میں آیا ہے، ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن جب مرتا ہے تو آسمان کا ایک دروازہ جس سے اس کا عمل اوپر جاتا تھا اور ایک دروازہ جس سے اس کا رزق نازل ہوتا تھا اس پر روتے ہیں، اور آپ نے یہ آیت تلاوت کی، اور روح المعانی میں بیہقی سے منقول ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ زمین مؤمن کے مرنے پر چالیس دن روتی ہے، اور ابن منذرؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ جب مؤمن مرجاتا ہے تو زمین میں اس کی نماز پڑھنے کی جگہ اور آسمان میں اس کا عمل جانے کی جگہ اس پر روتی ہے، پس اس آیت میں تاویل کی ضرورت نہیں، بعض حضرات نے آیت کے الفاظ کو مجاز واستعارہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ آسمان وزمین کا حقیقۃً رونا مراد نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کا وجود ایسا ناقابل التفات تھا کہ اس کے ختم ہوجانے پر کسی کو افسوس نہیں ہوا، لیکن مذکورہ روایات کی روشنی میں راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آسمان وزمین کا حقیقۃً رونا مراد ہے، کیونکہ جب آیت کے حقیقی معنی ممکن ہیں اور روایات سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے تو خواہ مخواہ اسے مجاز واستعارہ پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں، اور حقیقی معنی مراد لینے کے لیے کوئی امر مانع بھی نہیں ہے، رہا یہ شبہ کہ آسمان وزمین میں شعور کہاں ہے جو وہ رو سکیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں میں بقدر ضرورت شعور ہونا ثابت ہے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل آیت ۴۴: **وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ** میں لکھا جاچکا ہے وہاں ملاحظہ کریں، اور اب رفتہ رفتہ جدید سائنس بھی اسی نتیجے پر پہنچ رہی ہے، ہاں! یہ ضروری نہیں کہ آسمان وزمین کا رونا ویسا ہی ہو جیسے انسانوں کا رونا ہوتا ہے، ان کے رونے کی کیفیت یقیناً مختلف ہوگی جس کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں۔

* * *

فائدہ: لہ روایات میں ہے کہ مؤمن کے مرنے پر آسمان کا وہ دروازہ روتا ہے جس سے اس کی روزی اترتی تھی، یا جس سے اس کا عمل صالح اوپر چڑھتا تھا اور زمین روتی ہے جہاں وہ نماز پڑھتا تھا یعنی افسوس وہ سعادت ہم سے چھن گئی، کافر کے پاس عمل صالح کا بیج ہی نہیں، پھر اس پر آسمان یا زمین کیوں روئے۔ بلکہ شاید خوش ہوتے ہوں گے کہ چلو پاپ کٹا: ''خس کم جہاں پاک''۔

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۳۰﴾

اور ہم نے بچا نکالا بنی اسرائیل کو ذلت کی مصیبت سے

مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

جو فرعون کی طرف سے تھی ۱؎ بیشک وہ تھا چڑھ رہا حد سے بڑھ جانے والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے (اس طرح) بنی اسرائیل کو سخت ذلت کے عذاب یعنی فرعون (کے ظلم وستم) سے نجات دی، واقعی وہ (فرعون) بڑا سرکش (اور) حد (عبودیت) سے نکل جانے والوں میں سے تھا (ایک نعمت تو بنی اسرائیل پر یہ ہوئی)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ بلکہ فرعون کا وجود ایک مجسم مصیبت تھا۔ **فائدہ:** ۲؎ یعنی بڑا متکبر اور سرکش تھا۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

اور ان کو ہم نے پسند کیا جان بوجھ کر جہان کے لوگوں سے ۱؎ اور دیں ہم نے ان کو نشانیاں جن میں تھی مدد صریح ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (اس کے علاوہ) ہم نے بنی اسرائیل کو (اور بھی نعمتیں دے کر) اپنے علم (اور حکمت) کی رو سے (بعض امور میں تمام) دنیا جہان والوں پر (یا تمام امور میں ایک بڑے حصہ مخلوق پر مثلاً اس زمانے کے لوگوں پر) فوقیت دی، اور (ان نعمتوں میں انعام ہونے کے علاوہ اللہ کی قدرت پر دلالت بھی تھی جس کا حاصل یہ ہے کہ) ہم نے ان کو (اپنی قدرت کی) ایسی (بڑی بڑی) نشانیاں دیں جن میں صریح انعام (پایا جاتا) تھا (یعنی جو احسان ان پر کیا گیا اس میں دو وصف پائے جاتے تھے، انعام ہونا بھی اور دلیل قدرت ہونا بھی، پھر بعض ان میں ظاہری اور حسی نعمتیں تھیں جیسے فرعون سے نجات دلانا اور بعض معنوی تھیں جیسے علم وکتاب ومشاہدہ معجزات وغیرہ)۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ: ''اپنے علم کی رو سے'' کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے، پس ان کو فوقیت دینا چونکہ ہمارے علم میں حکمت ومصلحت کا تقاضا تھا، اس لئے ہم نے ان کو فوقیت دے دی ہے۔

عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: ''اور ہم نے بنی اسرائیل کو دنیا جہان والوں پر فوقیت دی''، اس سے بنی اسرائیل کا امت محمدیہ پر فائق ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ اس سے مراد اس زمانے کے دنیا جہان والے ہیں اور اس وقت بلاشبہ وہ تمام اقوام سے افضل تھے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت مریم کے لئے ''نساء العالمین'' پر فضیلت کا قرآن کریم نے ذکر فرمایا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص پہلو سے بنی اسرائیل کو تمام دنیا اور ہر زمانے کے لوگوں پر کوئی فضیلت حاصل ہو لیکن مجموعی حیثیت سے افضلیت امت محمدیہ ہی کو حاصل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگرچہ بنی اسرائیل کی کمزوریاں بھی ہم کو معلوم تھیں، تاہم ان کو ہم نے اس زمانہ کے تمام لوگوں سے فضیلت دی اور بعض فضائل جزئیہ تو وہ ہیں جو آج تک کسی قوم کو میسر نہیں ہوئے مثلاً اتنے بیشمار انبیاء کا ان میں اٹھایا جانا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے مثلاً ''من وسلویٰ'' کا اتارنا، بادل کا سایہ کرنا وغیرہ ذلک۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اِنْ هِىَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ

یہ لوگ کہتے ہیں، اور کچھ نہیں ہمارا یہی مرنا ہے پہلا اور ہم کو پھر اٹھنا نہیں ۱؎ بھلا لے تو آؤ ہمارے باپ دادوں کو

اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۝۳۶

اگر تم سچے ہو ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے فرعون کے قصہ سے پہلے کفار مکہ کو قیامت میں انتقام کی وعید فرمائی تھی اور اسی کی تاکید کے لیے فرعون کا قصہ آ گیا تھا، وہ لوگ قیامت میں انتقام کے مضامین سن کر قیامت کا انکار کیا کرتے تھے اس لیے پہلے ان کا انکار اور پھر عذاب کا مستحق ہونا بیان کرتے ہیں۔

یہ لوگ (قیامت کی وعیدیں سن کر قیامت کا انکار کرتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ اخیر حالت بس یہی ہمارا دنیا کا مرنا ہے اور ہم دوبارہ زندہ نہ ہوں گے (مطلب یہ کہ اخیر حالت وہ اخروی زندگی نہیں، بلکہ یہ دنیوی موت ہی اخیر حالت ہے جس کے بعد کچھ ہونا نہیں ہے) سو (اے مسلمانو!) اگر تم (آخرت کے دعوے میں) سچے ہو تو (انتظار کون کرے، ابھی) ہمارے باپ دادوں کو (زندہ کرا کے) لا موجود کرو۔

فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ: یعنی اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لا موجود کرو، قرآن کریم نے ان کے اس اعتراض کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ بالکل ظاہر تھا اور وہ یہ کہ تمام انسانوں کی دوبارہ زندگی کا دعویٰ آخرت میں کیا جا رہا ہے اسی وقت اللہ تعالیٰ سب کو زندہ کرے گا، دنیا میں موت وحیات قدرت کے مخصوص قوانین اور مصالح کی پابند ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس وقت کسی کو دوسری زندگی عطا نہیں فرماتا تو یہ اس بات کی دلیل کیسے بن گئی کہ آخرت میں بھی وہ دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا، منطقی اصطلاح میں اس جواب کو یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ مقید کا عدم وقوع مطلق کے عدم وقوع کو مستلزم نہیں ہو سکتا۔

* * *

فائدہ: ۱ درمیان میں حضرت موسیٰ کی قوم کا ذکر استطراداً آ گیا تھا، یہاں سے پھر حضور ﷺ کی قوم کا تذکرہ ہوتا ہے، یعنی یہ کہتے ہیں کہ ہماری آخری حالت بس یہ ہی ہے کہ موت آ جائے، موت کے بعد سب قصہ ختم، موجودہ زندگی کے سوا دوسری زندگی کوئی نہیں، کہاں کا حشر، اور کیسا حساب کتاب۔

فائدہ: ۲ یعنی پیغمبر اور مومنین سے کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے عقیدہ میں سچے ہو کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے تو اچھا ہمارے مرے ہوئے باپ دادوں کو ذرا زندہ کر کے دکھا دو، تب ہم جانیں۔

اَهُمۡ خَيۡرٌ اَمۡ قَوۡمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ۝۳۷

بھلا یہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم ۱ اور جو ان سے پہلے تھی ہم نے ان کو غارت کر دیا بیشک وہ تھے گناہ گار ۲

خلاصہ تفسیر: (آگے ان کی ایسی کفریات پر دھمکی ہے کہ ان کو ذرا سوچنا چاہئے کہ) یہ لوگ (قوت وشوکت میں) زیادہ بڑھے ہوئے ہیں یا تبع (بادشاہ یمن) کی قوم اور جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں (مثلاً عاد وثمود وغیرہ یعنی وہ قومیں ان سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں مگر) ہم نے اُن کو (بھی) ہلاک کر ڈالا (محض اس لئے کہ) وہ نافرمان تھے (سو یہ لوگ بھی اگر نافرمانی سے باز نہ آئے تو اسی طرح ہلاک ہوں گے)۔

اَمۡ قَوۡمُ تُبَّعٍ: ''تبع'' یمن کے بادشاہ کا لقب ہوتا تھا، اور اس لقب کے بہت سے بادشاہ گذرے ہیں، جس تبع کا یہاں ذکر ہے اس کا نام تاریخ میں اسعد لکھا ہے، اور حدیث میں ہے کہ وہ اسلام لے آیا تھا اور اسلام لانے کے بعد اپنی قوم کو بھی ایمان کی طرف دعوت دی، قوم والے بت پرست تھے انہوں نے نہ مانا، ان پر آگ کا عذاب آیا جس سے ان کے بت وغیرہ جل گئے، پھر بعض مسلمان ہو گئے، بعض بطور ذمی کے مطیع ہو گئے، اور بعض نے کہا کہ یہ تبع اول تھا، تبابع کی کثرت کی وجہ سے یہ لقب ہو گیا تھا، پھر اس کے بعد یمن کے تمام بادشاہوں کا یہ لقب ہو گیا، اس تبع کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل کا تھا، یہ سب روح المعانی میں ہے، ان باتوں کے بعض اجزاء میں کچھ کچھ اختلاف بھی ہے مگر چونکہ قرآن میں نفی یا اثبات کسی اعتبار سے تفصیل نہیں اس لیے کسی قول پر اشکال نہیں۔

* * *

فائدہ: ؎۱ ''تبع'' لقب تھا یمن کے بادشاہ کا، جس کی حکومت سبا اور حضرموت وغیرہ سب پر تھی، ''تبع'' بہت گزرے ہیں، اللہ جانے یہاں کون سا مراد ہے، بہرحال اتنا ظاہر ہوا کہ اس کی قوم بہت قوت و جبروت والی تھی جو اپنی سرکشی کی بدولت تباہ کی گئی، ابن کثیرؒ نے اس سے قوم سبا مراد لی ہے، جس کا ذکر سورۃ سبا میں گزر چکا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ؎۲ مثلاً عاد وثمود وغیرہ، ان سب کو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر کے چھوڑا، کیا تم ان سے بہتر یا ان سے زیادہ طاقتور ہو کہ تم کو ہلاک نہ کرے گا یا نہ کر سکے گا؟

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾

اور ہم نے جو بنایا آسمان اور زمین اور جو ان کے بیچ ہے کھیل نہیں بنایا

مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾

ان کو تو بنایا ہم نے ٹھیک کام پر بہت لوگ نہیں سمجھتے ؎۱

خلاصہ تفسیر: اور (اب قیامت کی صحت اور حکمت کا بیان ہے کہ) ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں (بلکہ) ہم نے ان دونوں کو (ان کی دوسری مخلوقات سمیت) کسی حکمت ہی سے بنایا ہے (مثلاً ان سے ایک تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت ہوتی ہے، دوسرے جزا وسزا کا ثبوت ملتا ہے) لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (کہ جو ذات ایسے عظیم اجسام کو ابتداء پیدا کرنے پر قادر ہو وہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے)۔

* * *

فائدہ: ؎۱ یعنی اتنا بڑا کارخانہ کوئی کھیل تماشا نہیں بلکہ بڑی حکمت سے بنایا گیا ہے، جس کا نتیجہ ایک دن نکل کر رہے گا، وہ ہی نتیجہ آخرت ہے۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾

تحقیق فیصلہ کا دن وعدہ ہے ان سب کا ؎۱ جس دن کام نہ آئے کوئی رفیق کسی رفیق کے کچھ بھی اور نہ ان کو مدد پہنچے ؎۲

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۲﴾ ع

مگر جس پر رحمت کرے اللہ بیشک وہی ہے زبردست رحم والا ؎۳

خلاصہ تفسیر: بیشک فیصلہ کا دن (یعنی قیامت کا دن) ان سب (کے دوبارہ زندہ ہونے اور جزاء وسزا ملنے) کا وقت مقرر ہے (جو اپنے موقع پر ضرور آئے گا، اب آگے قیامت کے کچھ واقعات ہیں، یعنی) جس دن کوئی علاقہ (تعلق) والا کسی علاقہ والے کے ذرا کام نہ آئے گا اور نہ (ہی کسی کی طرف سے، مثلاً ان کے مزعومہ خداؤں کی طرف سے) ان کی کچھ حمایت کی جائے گی، ہاں! مگر جس پر اللہ رحم فرمادے (کہ رحمت سے اس کے حق میں باری تعالیٰ کی اجازت کے بعد سفارش کام آئے گی اور اللہ اس کا مددگار ہوگا) وہ (اللہ) زبردست ہے (کافروں سے انتقام لے گا) مہربان ہے (مسلمانوں پر رحمت فرمادے گا)۔

* * *

فائدہ: ؎۱ یعنی اس دن سب کا حساب بیک وقت ہوجائے گا۔

فائدہ: ؎۲ یعنی نہ کسی اور طرف سے مدد پہنچ سکے گی۔

فائدہ: ۳ یعنی بس جس پر اللہ کی رحمت ہو جائے وہ ہی بچے گا، کما ورد فی الحدیث: "الا ان یتغمدنی اللہ برحمته".

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿٤٤﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿٤٥﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿٤٦﴾

مقرر درخت سیہنڈ ھ کا، کھانا ہے گنہگار کا ۱ جیسے پگھلا ہوا تانبا کھولتا ہے پیٹوں میں، جیسے کھولتا پانی

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کے واقعات کا اجمالی بیان تھا، اب آگے ان کی کسی قدر تفصیل ہے۔

بیشک زقوم کا درخت بڑے مجرم (یعنی کافر) کا کھانا ہوگا جو (صورت کے مکروہ ہونے میں) تیل کی تلچھن جیسا ہوگا (اور) وہ پیٹ میں ایسا کھولے گا جیسا تیز گرم پانی کھولتا ہے۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ: ''زقوم'' کی حقیقت سے متعلق کچھ باتیں سورۂ صافات آیت ۶۲: اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ کے تحت گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمائی جائیں، یہاں اتنی بات قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم کی آیات سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ کفار کو زقوم دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کھلایا جائے گا کیونکہ یہاں زقوم کھلانے کے بعد آگے یہ حکم مذکور ہے کہ "اسے کھینچ کر دوزخ کے بیچوں بیچ لے جاؤ" اس کے علاوہ سورۂ واقعہ کی آیت: هٰذا نزلهم یوم الدین سے بھی بعض حضرات نے یہی سمجھا ہے کیونکہ "نزل" ان کے نزدیک اصلاً مہمان کی اس خاطر تواضع کو کہا جاتا ہے جو اصل دعوت سے پہلے کی جائے، بعد کے کھانے کو "ضیافة" یا "مادبة" کہتے ہیں، یوں قرآنی الفاظ میں احتمال اس کا بھی ہے کہ زقوم کا کھلانا دخول جہنم کے بعد ہو، اس صورت میں "نزل" کا استعمال دعوت کے اصل کھانے کے معنی میں توسعاً ہوگا اور آیت زیر تفسیر میں جو اس کے بعد جہنم کی طرف گھسیٹ لے جانے کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تھا تو پہلے بھی جہنم ہی میں، لیکن زقوم کھلانے کے بعد اسے مزید تذلیل اور ایذا رسانی کے لئے دوزخ کے وسط میں لے جایا جائے گا، واللہ اعلم۔

مفید حکایت: ایک مجلس میں احقر اور دو عالم جو اصل میں ہندی ہیں اور ان کی رہائش مکہ میں ہے مجمع کثیر کے ساتھ موجود تھے، ان دونوں میں سے ایک عالم نے کہا کہ مکہ میں زقوم کا پھل کھایا جاتا ہے جس کو ''برشومی'' کہتے ہیں اور قرآن کریم سے وہ جہنمیوں کا کھانا معلوم ہوتا ہے، سو ایسی لذیذ چیز سے کیا وعید ہوئی؟ احقر نے کہا کہ قرآن کریم میں لفظ شجرة الزقوم یعنی ''زقوم کا درخت'' آیا ہے، ثمرة الزقوم یعنی ''زقوم کا پھل'' نہیں آیا، اور درخت نہیں کھایا جاتا، اس جواب کو ان دونوں حضرات اور دیگر اہل مجلس نے بہت پسند کیا، لیکن اس جواب کی ضرورت بھی اس وقت ہے جبکہ برشومی اسی زقوم کا پھل ہو جس کا ذکر قرآن میں ہے، اور اگر یہ کوئی دوسری قسم کا پھل ہے تو پھر سوال ہی واقع نہیں ہوتا۔

روح المعانی میں ہے کہ یہ دنیا کی محبت اور حرص و ہوس کا درخت ہے جو قیامت کے دن اس شکل میں ظاہر ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱ کسی ادنیٰ مشابہت کی وجہ سے اس کو زقوم (سیہنڈ) کہا گیا ہے ورنہ دوزخ کے سیہنڈ کی کیفیت اللہ ہی کو معلوم ہے، جیسے بعض نعمائے جنت اور نعمائے دنیاوی میں اشتراک اسمی ہے، اسی طرح جہنم کے متعلق سمجھ لو۔

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿٤٨﴾

پکڑو اس کو اور دھکیل کر لے جاؤ بیچوں بیچ دوزخ کے ۱ پھر ڈالو اس کے سر پر جلتے پانی کا عذاب ۲

ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿٤٩﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿٥٠﴾

یہ چکھ، تو ہی ہے بڑا عزت والا سردار ۳ یہ وہی ہے جس میں تم دھوکے میں پڑے تھے ۴

خلاصہ تفسیر: (اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس کو پکڑو پھر گھسیٹتے ہوئے دوزخ کے بیچوں بیچ تک لے جاؤ، پھر اس کے سر کے اوپر

تکلیف دینے والا گرم پانی چھوڑو (اور اس سے استہزاء کے طور پر کہا جائے گا کہ) لے چکھ، تو بڑا معزز مکرم ہے (یہ تیری تعظیم ہو رہی ہے جیسا تو دنیا میں اپنے آپ کو معظم ومکرم سمجھ کر ہمارے احکام سے عار کیا کرتا تھا، اور دوزخیوں سے کہا جائے گا کہ) یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک (وانکار) کیا کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ حکم فرشتوں کو ہوگا جو تعذیب مجرمین پر مامور ہیں۔

فائدہ: ۲؎ وہ پانی دماغ سے اتر کے آنتوں کو کاٹتا ہوا باہر نکل آئے گا۔ (اعاذنا اللہ منہ)

فائدہ: ۳؎ یعنی تو وہ ہی ہے جو دنیا میں بڑا معزز ومکرم سمجھا جاتا اور اپنے کو سردار ثابت کیا کرتا تھا، اب وہ عزت اور سرداری کہاں گئی۔

فائدہ: ۴؎ یعنی تم کو کہاں یقین تھا کہ یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔ اسی دھوکہ میں تھے کہ بس زندگی یونہی کھیلتے کودتے گزر جائے گی۔ آخر مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے، آگے کچھ بھی نہیں۔ اب دیکھ لیا کہ وہ باتیں سچی تھیں جو پیغمبروں نے بیان کی تھیں۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴿٥١﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٥٢﴾ يَلْبَسُونَ مِن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ

بیشک ڈرنے والے گھر میں ہیں چین کے ۱؎ باغوں میں اور چشموں میں، پہنتے ہیں پوشاک ریشمی پتلی اور گاڑھی

مُّتَقَابِلِينَ ﴿٥٣﴾ كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ ﴿٥٤﴾ يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ ﴿٥٥﴾

ایک دوسرے کے سامنے ۲؎ اسی طرح ہوگا، اور بیاہ دیں ہم ان کو حوریں بڑی آنکھوں والیاں ۳؎ منگوائیں گے وہاں ہر میوہ دلجمعی سے ۴؎

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک تو کافر دوزخیوں کا حال ہوا، اب اہل ایمان کا ذکر ہے) بیشک خدا سے ڈرنے والے امن (چین) کی جگہ میں ہوں گے، یعنی باغوں میں اور نہروں میں (اور) وہ لباس پہنیں گے باریک اور دبیز ریشم کا، آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے (اور یہ) بات اسی طرح ہے اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں سے بیاہ کر دیں گے (اور) وہاں اطمینان سے ہر قسم کے میوے منگاتے ہوں گے۔

وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ: "تزویج" کے معنی اصل میں ہیں "کسی کو کسی کا جوڑا قرار دے دینا" بعد میں یہ لفظ نکاح کرانے کے معنی میں بکثرت استعمال ہونے لگا ہے، اس جگہ بھی اس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں، حوروں سے نکاح ہونا یا تو متعارف طریقہ کے مطابق ہوگا کہ جنتی مردوں کا حور عین سے باقاعدہ عقد نکاح کرا دیا جائے گا، یا اس سے لغوی معنی مراد ہوں یعنی جوڑا ملا دینا، تو مطلب یہ ہوگا کہ حور عین کو جنتی مرد کا جوڑا قرار دے دیا جائے گا اور وہ جنتی عورتیں بطور ہبہ انہیں عطا کر دی جائیں گی، پہلی صورت پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جنت میں تو احکام کے مکلف نہ ہوں گے پھر نکاح کے کیا معنی؟ جواب یہ ہے کہ اگر ایسا ہوگا تو طبیعت کی رغبت خود اسی کی طرف ہو جائے گی کہ وہ لوگ خود ہی نکاح کرنا چاہیں گے، اور یہ نکاح بطور اعزاز واکرام کے ہوگا، اس صورت میں آزمائش اور تکلیف کے معنی باقی نہیں رہیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو یہاں اللہ سے ڈرتے ہیں وہاں امن چین سے ہوں گے۔ کسی طرح کا خوف اور غم پاس نہ آئے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان کی پوشاک باریک اور دبیز ریشم کی ہوگی، اور ایک جنتی دوسرے سے اعراض نہ کرے گا بے تکلف دوستوں کی طرح آمنے سامنے بیٹھیں گے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ان سے جوڑے ملا دیں گے۔

فائدہ: ۴؎ یعنی جس میوے کو جی چاہے گا فوراً حاضر کرا دیا جائے گا، کوئی فکر نہ ہوگی، پوری دلجمعی سے کھائیں پئیں گے۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ ۖ وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿٥٦﴾

نہ چکھیں گے وہاں موت مگر جو پہلے آ چکی ۱؎ اور بچایا ان کو دوزخ کے عذاب سے

فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۵۷﴾

فضل سے تیرے رب کے، یہی ہے بڑی مراد ملنی ۲

خلاصہ تفسیر: (اور) وہاں وہ بجز اس موت کے جو دنیا میں آ چکی تھی اور موت کا ذائقہ بھی نہ چکھیں گے (یعنی مریں گے نہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ کے عذاب سے (بھی) بچالے گا (اور) یہ سب کچھ آپ کے رب کے فضل سے ہوگا، بڑی کامیابی یہی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو موت پہلے آ چکی وہ آ چکی، اب آگے کبھی موت نہیں دائماً اسی عیش و نشاط میں رہنا ہے نہ ان کو فنا، نہ ان کے سامانوں کو۔

فائدہ: ۲ اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ عذاب الٰہی سے محفوظ و مامون رہے اور ابدالآباد کے لیے مورد الطاف و افضال بنے۔

فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۵۸﴾ فَارۡتَقِبۡ اِنَّهُمۡ مُّرۡتَقِبُوۡنَ ﴿۵۹﴾ ع ۳ ۱۷ ۱۲

سو یہ قرآن آسان کیا ہم نے اس کو تیری بولی میں تاکہ وہ یاد رکھیں ۱ اب تو راہ دیکھ وہ بھی راہ تکتے ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: سورت میں عظیم الشان اہم مضامین بیان فرما کر سورت کے اختتام پر اجمالاً بطور خلاصہ کے انہی کا اعادہ ہے اور کفار کا ان مضامین کو نہ ماننا چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رنج کا سبب تھا اس لیے تسلی کا مضمون بھی ارشاد ہے۔

(اور اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کا کام اتنا ہے کہ آپ ان کو کہتے رہیے) سو (اسی غرض سے) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں آسان کر دیا تاکہ یہ (اس کو سمجھ کر اس سے) نصیحت قبول کریں تو (اگر یہ لوگ نہ مانیں تو) آپ (ان پر مصیبت نازل ہونے کے) منتظر رہیے، یہ لوگ بھی (آپ پر مصیبت نازل ہونے کے) منتظر ہیں (پس آپ تبلیغ سے زیادہ فکر میں نہ پڑیے، نہ مخالفت پر رنج کیجئے، ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے صبر کیجئے، وہ خود سمجھ لے گا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اپنی مادری زبان میں آسانی سمجھ لیں اور یاد رکھیں۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر نہ سمجھیں تو آپ چندے انتظار کیجئے، ان کا بدانجام سامنے آ جائے گا، یہ تو منتظر ہیں کہ آپ پر کوئی افتاد پڑے، لیکن آپ دیکھتے جایئے کہ ان کا کیا حال بنتا ہے۔

اٰیاتها ۳۷ | ۴۵ سُوۡرَةُ الۡجَاثِيَةِ مَكِّيَّةٌ ۶۵ | رکوعاتها ۴

خلاصہ تفسیر: اس سورت کا خلاصہ تین مضمون ہیں: توحید، نبوت، آخرت، دیگر بعض مضامین ان ہی کی مناسبت سے آ گئے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ

حم، اتارنا کتاب کا ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے حکمتوں والا، بیشک آسمانوں میں اور زمین میں بہت نشانیاں ہیں

لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۳﴾ وَفِىۡ خَلۡقِكُمۡ وَمَا يَبُثُّ مِنۡ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۴﴾

ماننے والوں کے واسطے ۱ اور تمہارے بنانے میں اور جس قدر پھیلا رکھے ہیں جانور نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو یقین رکھتے ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے اختتام پر بطور خلاصہ کے اور اس سورت کے شروع میں بطور تمہید کے قرآن کریم کا ذکر ہے جس میں دونوں میں باہمی مناسبت حاصل ہے۔

حٰمٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے، اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے (اور جب یہ ایسی کتاب ہے تو اس کے مضامین کو خوب توجہ سے سننا چاہیے، چنانچہ اس مقام پر ایک مضمون تو توحید کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے (استدلال کے) لئے بہت سے دلائل (قدرت اور توحید کے) ہیں، اور (اسی طرح) خود تمہارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جن کو (زمین پر) پھیلا رکھا ہے (نیز) دلائل (قدرت وتوحید) ہیں ان لوگوں کے (سمجھنے کے) لئے جو یقین رکھتے ہیں۔

اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ: باوجود یکہ یہ سب دلائل عقلی ہیں جن کا سمجھنا ایمان ویقین پر موقوف نہیں، پھر جو یہ فرمایا کہ ''ان میں اہل ایمان واہل یقین کے لیے دلائل ہیں''، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے منتفع وہی لوگ ہوں گے جو اس وقت ایمان والے ہیں، ان میں ایمان کی صلاحیت اور طلب ہے، کیونکہ عقلی دلیل میں بھی نظر وفکر اور طلب حق کی ضرورت ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آدمی ماننا چاہے تو اسی آسمان وزمین کی پیدائش اور ان کے محکم نظام میں غور کر کے مان سکتا ہے کہ ضرور کوئی ان کا پیدا کرنے والا اور تھامنے والا ہے، جس نے کمال حکمت وخوبی سے ان کو بنایا اور لامحدود قدرت سے ان کی حفاظت کی: "البعرة تدل علی البعیر والأقدام تدل علی المسیر فکیف لا یدل هذا النظام العجیب الغریب علی الصانع اللطیف الخبیر".

فائدہ: ۲؎ یعنی انسان خود اپنی بناوٹ اور دوسرے حیوانات کی ساخت میں غور کرے تو درجہ عرفان وایقان تک پہنچانے والی ہزارہا نشانیاں اس کو ملیں گی۔

وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا

اور بدلنے میں رات دن کے اور جو اتاری اللہ نے آسمان سے روزی ۱؎ پھر زندہ کر دیا اس سے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد

وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۵

اور بدلنے میں ہواؤں کے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو سمجھ سے کام لیتے ہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (اسی طرح) یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اور (اسی طرح) اُس (مادہ) رزق میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا (مراد بارش ہے) پھر اس (بارش) سے زمین کو تروتازہ کیا اس کے خشک ہوئے پیچھے اور (اسی طرح) ہواؤں کے بدلنے میں (سمت اور کیفیت کے اعتبار سے کہ کبھی ہوا شرقی ہے اور کبھی غربی ہے، کبھی گرم ہے کبھی سرد، غرض ان سب چیزوں میں) دلائل (قدرت وتوحید موجود) ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں (اس سے توحید پر استدلال کا طریقہ سورہ بقرہ آیت ۱۶۴: ان فی خلق السموات الخ میں گزر چکا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پانی آسمان کی طرف سے اتارا جو مادہ ہے روزی کا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ذرا بھی سمجھ سے کام لیں تو معلوم ہو جائے کہ یہ امور بجز اس زبردست قادر حکیم کے اور کسی کے بس میں نہیں۔ جیسا کہ پہلے متعدد مواضع میں اس کی تقریر گزر چکی۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

یہ باتیں ہیں اللہ کی ہم سناتے ہیں تجھ کو ٹھیک ٹھیک، پھر کونسی بات کو اللہ اور اس کی باتوں کو چھوڑ کر مانیں گے

خلاصہ تفسیر: (اور دوسرا مضمون نبوت کا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں (جس سے نبوت ثابت ہوتی ہے لیکن اتنی بڑی دلیل معجزہ کے باوجود بھی اگر یہ لوگ نہیں مانتے) تو پھر اللہ اور اس کی (ایسی) آیتوں کے بعد اور کون سی بات (اس سے بڑھ کر ہوگی جس) پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کو چھوڑ کر دوسرا کون ہے اور اس کی باتیں چھوڑ کر کس کی بات ماننے کے قابل ہے، جب اس بڑے مالک کی ایسی سچی اور صاف باتیں بھی کوئی بدبخت قبول نہ کرے تو آخر کس چیز کا منتظر ہے جسے قبول کرے گا۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝۷ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ

خرابی ہے ہر جھوٹے گناہ گار کے لیے، کہ سنتا ہے باتیں اللہ کی اس کے پاس پڑھی جاتی ہیں، پھر ضد کرتا ہے غرور سے گویا سنا ہی نہیں [1]

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۸

سو خوشخبری سنا دے اس کو ایک عذاب دردناک کی

خلاصہ تفسیر: (اور تیسرا مضمون آخرت کا ہے جس میں ان مخالفین حق کو سزا بھی ہوگی جس کا بیان یہ ہے کہ) بڑی خرابی ہوگی ہر ایسے شخص کے لئے جو (عقائد سے متعلق باتوں میں) جھوٹا ہو (اور اعمال میں) نافرمان ہو جو (باوجودیکہ) خدا کی آیتوں کو سنتا (بھی) ہے جبکہ وہ اس کے روبرو پڑھی جاتی ہیں (اور) پھر بھی وہ تکبر کرتا ہوا (اپنے کفر پر) اس طرح اڑا رہتا ہے جیسے اس نے ان (آیتوں) کو سنا ہی نہیں، سو ایسے شخص کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی ضد اور غرور کی وجہ سے اللہ کی بات نہیں سنتا۔ اس کی شیخی اجازت نہیں دیتی کہ اپنی جہالت سے ہٹے۔ حق کو سن کر اس طرح منہ پھیر لیتا ہے گویا سنا ہی نہیں۔

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹ۭ مِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ۚ

اور جب خبر پائے ہماری باتوں میں سے کسی کی اس کو ٹھہرائے ٹھٹھا، ایسوں کو ذلت کا عذاب ہے [1] پرے ان کے دوزخ ہے

وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـــًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَاۗءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۰ۭ ع

اور کام نہ آئیگا ان کے جو کمایا تھا ذرا بھی اور نہ وہ کہ جن کو پکڑا تھا اللہ کے سوائے رفیق [2] اور ان کے واسطے بڑا عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: اور (اس شخص کی شرارت کا یہ حال ہے کہ) جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی آیت کی خبر پاتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے ایسے لوگوں کے لئے (آخرت میں) ذلت کا عذاب (ہونے والا) ہے (مطلب یہ کہ جن آیتوں کو تلاوت میں سنتا ہے ان کو بھی جھٹلاتا ہے اور جن آیتوں کی ویسے ہی خبر سن لیتا ہے ان کو بھی جھٹلاتا ہے، غرض آیتوں کے جھٹلانے میں بہت بڑھا ہوا ہے، آگے اس عذاب کی تعیین ہے یعنی) ان کے

آ گے جہنم (آ رہی) ہے اور (اس وقت) نہ تو اس کے وہ چیزیں ذرا کام آئیں گی جو (دنیا میں) کما گئے تھے (اس میں مال اور اعمال سب آ گئے) اور نہ وہ (کام آئیں گے) جن کو انہوں نے اللہ کے سوا کارساز (اور معبود) بنا رکھا تھا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا۔

فائدہ: ۱؎ یعنی جس طرح وہ آیات اللہ کے ساتھ اہانت واستخفاف کا معاملہ کرتا ہے، سزا بھی سخت اہانت وذلت کی ملے گی جو آ گے آ رہی ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اموال واولاد وغیرہ کوئی چیز اس وقت کام نہ آئے گی۔ نہ وہ کام آئیں گے جن کو اللہ کے سوا معبود یا رفیق و مددگار بنا رکھا تھا اور جن سے بہت کچھ اعانت وامداد کی توقعات تھیں۔

هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾

یہ سجھا دیا، اور جو منکر ہیں اپنے رب کی باتوں سے ان کے لیے عذاب ہے ایک بلا کا دردناک

خلاصہ تفسیر: (اور وجہ اس عذاب کی یہ ہے کہ) یہ قرآن سراسر ہدایت (اور واجب التسلیم ہے) اور (اس کا تقاضہ اور مطالبہ یہی ہے کہ) جو لوگ اپنے رب کی (ان) آیتوں کو نہیں مانتے ان کے لئے سختی کا دردناک عذاب ہوگا۔

فائدہ: یعنی یہ قرآن عظیم الشان ہدایت ہے جو سب طرح کی برائی بھلائی انسان کو سمجھانے کے لیے آتی ہے جو اس کو نہ مانیں وہ سخت غلیظ اور دردناک عذاب بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ

اللہ وہ ہے جس نے بس میں کر دیا تمہارے دریا کو چلیں اس میں جہاز اس کے حکم سے ۱؎ اور تاکہ تلاش کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم

تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

حق مانو ۲؎ اور کام میں لگا دیا تمہارے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں سب کو اپنی طرف سے ۳؎ اس میں نشانیاں ہیں

لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

ان لوگوں کے واسطے جو دھیان کرتے ہیں ۴؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے تین مضامین میں توحید کا بھی مضمون تھا، اب آ گے نعمتوں کے بیان کے ضمن میں پھر اسی کی طرف رجوع ہے۔

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) لئے دریا کو مسخر (قدرت) بنایا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ (ان کشتیوں میں سفر کر کے) تم اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ (وہ روزی حاصل کر کے) تم شکر کرو، اور (اسی طرح) جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے (یعنی اپنے حکم اور فضل سے) مسخر (قدرت) بنایا (تاکہ تمہارے منافع کا سبب ہو) بیشک ان باتوں میں ان لوگوں کے لئے دلائل (قدرت) ہیں جو غور کرتے رہتے ہیں۔

فائدہ: ۱؎ یعنی سمندر جیسی مخلوق کو ایسا مسخر کر دیا کہ تم بے تکلف اپنی کشتیاں اور جہاز اس میں لیے پھرتے ہو۔ میلوں کی گہرائیوں کو پایاب کر رکھا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بحری تجارت کرو، یا شکار کھیلو، یا اس کی تہ میں سے موتی نکالو۔ اور یہ سب منافع وفوائد حاصل کرتے وقت منعم حقیقی کو نہ بھولو۔ اس کا حق پہچانو، زبان ودول اور قلب وقالب سے شکرادا کرو۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اپنے حکم اور قدرت سے سب کو تمہارے کام میں لگا دیا، یہ اسی کی مہربانی ہے کہ ایسی ایسی عظیم الشان مخلوقات انسان کی خدمت گزاری میں لگی ہوئی ہیں۔

فائدہ: ۴؎ آدمی دھیان کرے تو سمجھ سکتا ہے کہ یہ چیز اس کے بس کی نہ تھی محض اللہ کے فضل اور اس کی قدرت کاملہ سے یہ اشیاء ہمارے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ تو لامحالہ ہم کو بھی کسی کے کام میں لگنا چاہیے وہ کام یہ ہی ہے کہ اس منعم حقیقی اور محسن علی الاطلاق کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری میں اپنی حیات مستعار کے لمحات صرف کردیں تاکہ آئندہ چل کر ہمارا انجام درست ہو۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۱۴﴾

کہہ دے ایمان والوں کو درگزر کریں ان سے جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی ۱؎ تاکہ وہ سزا دے ایک قوم کو بدلہ اس کا جو کماتے تھے ۲؎

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ﴿۱۵﴾

جس نے بھلا کام کیا تو اپنے واسطے اور جس نے برا کیا سو اپنے حق میں ۳؎ پھر اپنے رب کی طرف پھیرے جاؤ گے ۴؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت میں کفار کے جھوٹ، نافرمانی اور تکبر وغیرہ کا ذکر تھا، چونکہ ان کی ان شرارتوں پر بعض اوقات مسلمانوں کو غصہ آجایا کرتا تھا، اس لیے آگے مسلمانوں کو درگزر کرنے کا حکم ہے اور ان کی تسلی کے لیے قیامت میں کفار سے انتقام لینے کا ذکر ہے۔

آپ ایمان والوں سے فرما دیجئے کہ ان لوگوں سے درگزر کریں جو خدا تعالیٰ کے معاملات (یعنی آخرت کی جزا وسزا) کا یقین نہیں رکھتے، تاکہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو (یعنی مسلمانوں کو) ان کے (اس) عمل (نیک) کا (اچھا) صلہ دے (کیونکہ وہاں کا قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص نیک کام کرتا ہے سو اپنے ذاتی نفع (وثواب) کے لئے (کرتا ہے) اور جو شخص برا کام کرتا ہے اس کا وبال اسی پر پڑتا ہے، پھر (سب نیک اور بدکام کرنے کے بعد) تم کو اپنے پروردگار کے پاس لوٹ کر جانا ہے (پس وہاں تم کو تمہارے اچھے اعمال واخلاق کا بہترین صلہ اور تمہارے مخالفین کو ان کے کفر اور گناہوں پر بدترین سزا دی جائیگی، لہٰذا تم کو یہاں درگزر ہی مناسب ہے)۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ: واضح رہے کہ اس آیت سے جہاد کی نفی ثابت نہیں ہوتی اور اس کا جہاد کے حکم سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ یہاں آیت میں اس انتقام سے روکا ہے جس میں اعلاء کلمۃ اللہ مقصود نہ ہو، بلکہ انتقام سے محض اپنے غصہ کی تسکین مقصود ہو، جبکہ جہاد میں اصل مقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہوتا ہے، یہاں آیت میں تو عام معاشرت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا انتقام نہ لینے کی تعلیم ہے جو ہر زمانے کے لیے عام ہے اور آج بھی اس کا حکم باقی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ایام اللہ (اللہ کے دنوں) سے مراد وہ دن ہیں جن میں اللہ اپنے دشمنوں کو کوئی خاص سزا دے، یا اپنے فرمانبرداروں کو کسی خصوصی انعام واکرام سے سرفراز فرمائے، لہٰذا: لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ سے وہ کفار مراد ہوئے جو اس کی رحمت سے ناامید اور اس کے عذاب سے بےفکر ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی مسلمان آپ سے بدلہ لینے کی فکر نہ کریں۔ اللہ پر چھوڑ دیں، وہ ان کی شرارتوں پر کافی سزا، اور مومنین کے صبر وتحمل اور عفو ودرگزر کا مناسب صلہ دے گا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی بھلے کام کا فائدہ کام کرنے والے کو پہنچتا ہے، اللہ کو اس کی کیا ضرورت؟ اور بدی کرنے والا خود اپنے حق میں برا بیج بو رہا ہے،

ایک کی برائی دوسرے پر نہیں پڑتی، غرض ہر شخص اپنے نفع نقصان کی فکر کر لے اور جو عمل کرے یہ سمجھ کر کرے کہ اس کا سود وزیاں اسی کی ذات کو پہنچے گا۔

فائدہ: ۴ یعنی وہاں پہنچ کر سب برائی بھلائی سامنے آ جائے گی۔ اور ہر ایک اپنی کرتوت کا پھل چکھے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ

اور ہم نے دی بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور پیغمبری اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں ۱ اور بزرگی دی ان کو

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ

جہان پر ۲ اور دیں ان کو کھلی باتیں دین کی ۳ پھر انہوں نے پھوٹ جو ڈالی تو سمجھ آ چکنے کے بعد

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۷

آپس کی ضد سے، بیشک تیرا رب فیصلہ کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں وہ جھگڑتے تھے ۴

خلاصہ تفسیر: پیچھے تین مضامین میں نبوت کا بھی مضمون تھا، اب آگے پھر اسی کی طرف رجوع ہے۔

اور (نبوت کوئی انوکھی چیز نہیں جو اس کا انکار کیا جائے، چنانچہ اس سے قبل) ہم نے بنی اسرائیل کو (آسمانی) کتاب اور حکمت (یعنی علم احکام) اور نبوت دی تھی (یعنی ان میں انبیاء پیدا کئے تھے) اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں (اس طرح سے کہ میدان تیہ میں من وسلویٰ نازل کیا، پھر ان کو ملک شام کا مالک بنایا جو زمین کی برکتوں کا معدن ہے) اور ہم نے (بعض امور میں مثلاً سمندر کو ان کے لیے پھاڑ دیا، ان پر بادلوں کا سایہ کرنا وغیرہ) ان کو دنیا جہان والوں پر فوقیت دی، اور ہم نے ان کو دین کے بارے میں کھلی کھلی دلیلیں دیں (یعنی ان کو بڑے صریح معجزات دکھلائے، غرض ظاہری، باطنی اور علمی ہر طرح کی نعمتیں دیں) سو (چاہئے تو یہ تھا کہ خوب اطاعت کرتے مگر) انہوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ آپس کی ضدا ضدی کے (جس کا بیان سورہ بقرہ آیت ۲۱۳: كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً الخ میں ہو چکا ہے، مطلب یہ ہے کہ جو علم اختلافات ختم کرنے کا سبب ہونا چاہئے تھا انہوں نے اس کو محض نفسانفسی کی وجہ سے اختلاف کا سبب بنالیا، یہ نہیں کہ دلائل واحکام میں ان کو کچھ شک وشبہ تھا، سو) آپ کا رب ان کے آپس میں قیامت کے روز ان امور میں (عملی) فیصلہ کر دے گا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے۔

مذکورہ بالا دو آیتوں کے مضمون سے دو باتیں حاصل ہوئیں: ① ایک بنی اسرائیل کو کتاب اور حکام اور نبوت ملنے سے آپ ﷺ کی نبوت کی تائید ② دوسرے آپ ﷺ کو تسلی دی گئی کہ جو وجہ اختلاف کی بنی اسرائیل کو پیش آئی تھی وہی وجہ آپ کی قوم کو آپ سے اختلاف کرنے میں پیش آئی، یعنی حب دنیا، حسد اور نفسانیت، یہ نہیں کہ آپ کے دلائل یا احکام کے واضح ہونے میں کچھ کمی ہے، پس آپ غم نہ کریں، یہ قصہ یاد کیا کریں کہ بنی اسرائیل کے کیا کیا واقعات ہوئے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی تورات دی اور سلطنت یا قوت فیصلہ یا دانائی کی باتیں یا دین کی سمجھ عطا کی، اور کس قدر کثرت سے پیغمبر ان میں سے اٹھائے یہ تو روحانی غذا ہوئی، جسمانی غذا دیکھو تو وہ بھی بہت افراط سے دی گئی حتی کہ ''من وسلویٰ'' اتارا گیا۔

فائدہ: ۲ یعنی اس زمانہ میں سارے جہان پر ان کو فضیلت کلی حاصل تھی اور بعض فضائل جزئیہ کے اعتبار سے تو ''اس زمانہ'' کی قید لگانے کی بھی ضرورت نہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی نہایت واضح اور مفصل احکام، کھلے کھلے معجزات جو دین کے باب میں بطور حجت وبرہان کے پیش کیے جاتے ہیں۔

فائدہ: ۴ یعنی آپس کی ضد اور نفسانیت سے اصل کتاب کو چھوڑ کر بیشمار فرقے بن گئے۔ جن کا عملی فیصلہ قیامت کے دن کیا جائے گا اس

وقت پتہ لگے کہ ان کا منشاء نفس پروری اور ہوا پرستی کے سوا کچھ نہ تھا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾

پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک راستہ پر دین کے کام کے سوا تو اسی پر چل اور مت چل خواہشوں پر نادانوں کی

خلاصہ تفسیر: پھر (بنی اسرائیل میں دور نبوت ختم ہونے کے بعد) ہم نے آپ کو (نبوت دی اور آپ کو) دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا، سو آپ اسی طریقے پر چلے جایئے (یعنی عمل میں بھی اور تبلیغ میں بھی) اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلئے (یعنی ان کی خواہش تو یہ ہے کہ آپ تبلیغ اور احکام بیان کرنا چھوڑ دیں، اور اسی لئے یہ طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں تاکہ آپ تنگ ہو کر تبلیغ چھوڑ دیں، سو آپ سے اگرچہ یہ احتمال نہیں مگر اہتمام اور تاکید کے طور پر آپ کو پھر بھی اس تبلیغ کا حکم ہوتا ہے)۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ: ''پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقے پر کر دیا''، یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ دین اسلام کے کچھ تو اصولی عقائد ہیں مثلاً توحید و آخرت وغیرہ، اور کچھ عملی زندگی سے متعلق احکام ہیں، جہاں تک اصولی عقائد کا تعلق ہے وہ تو ہر نبی کی امت میں یکساں رہے ہیں اور ان میں کبھی ترمیم اور تبدیلی نہیں ہوئی، لیکن عملی احکام مختلف انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے بدلتے رہے ہیں، آیت مذکورہ میں انہی دوسری قسم کے احکام کو ''دین کے ایک خاص طریقے'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اسی وجہ سے فقہاء نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ امت محمدیہ کے لئے صرف شریعت محمدی ہی کے احکام واجب العمل ہیں، پچھلی امتوں کو جو احکام دیئے گئے تھے وہ ہمارے لئے اس وقت تک واجب العمل نہیں ہیں جب تک قرآن وسنت سے ان کی تائید نہ ہو جائے، پھر تائید کی ایک شکل تو یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں صراحۃً یہ فرمایا گیا ہو کہ فلاں نبی کی امت کا یہ حکم ہمارے لئے بھی واجب العمل ہے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن کریم یا آنحضرت ﷺ کسی پچھلی امت کا کوئی حکم بطور تحسین و مدح بیان فرمائیں اور اس کے بارے میں یہ نہ فرمائیں کہ یہ حکم ہمارے زمانے میں منسوخ ہو گیا ہے، اس سے بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حکم ہماری شریعت میں بھی جاری ہے اور درحقیقت اس حکم کا واجب العمل ہونا بھی اس صورت میں شریعت محمدی کا ایک جز ہونے کی حیثیت ہی سے ہوتا ہے، یہاں اتنی بات مسئلہ کی حقیقت سمجھنے کے لئے کافی ہے، تفصیلات اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا: جب رسول اللہ ﷺ کو شریعت کی اتباع کا حکم دیا جا رہا ہے تو دوسرا اور کون ہو گا کہ وہ شریعت کی مخالفت کرے اور پھر یہ دعویٰ کرے کہ مجھے کمالات اور قرب خداوندی حاصل ہے، ایسا دعویٰ بالکل باطل ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی ان اختلافات اور فرقہ وارانہ کشمکش کی موجودگی میں ہم نے آپ کو دین کے صحیح راستہ پر قائم کر دیا تو آپ کو اور آپ کی امت کو چاہیے کہ اس راستہ پر برابر مستقیم رہے، کبھی بھول کر بھی جاہلوں اور نادانوں کی خواہشات پر نہ چلے، مثلاً ان کی خواہش یہ ہے کہ آپ ان کے طعن و تشنیع اور ظلم و تعدی سے تنگ آ کر دعوت و تبلیغ ترک کر دیں، یا مسلمانوں میں بھی ویسا ہی اختلاف و تفریق پڑ جائے جس میں وہ لوگ خود مبتلا ہیں، اندریں صورت واجب ہے کہ ان کی خواہشات کو بالکل پامال کر دیا جائے۔

اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾

وہ ہرگز کام نہ آئیں گے تیرے اللہ کے سامنے ذرا بھی ۱؎ اور بے انصاف ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اور اللہ رفیق ہے ڈرنے والوں کا ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب اسی طرز پر اس تبلیغ کے حکم کی علت فرماتے ہیں کہ) یہ لوگ خدا کے مقابلے میں آپ کے ذرا کام نہیں آ سکتے (پس ان کا اتباع نہ ہونے پائے) اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں (اور ایک دوسرے کا کہنا مانتے ہیں) اور اللہ دوست ہے اہل تقویٰ

کا (اور اہل تقویٰ اس کا کہنا مانا کرتے ہیں، سو جب آپ ظالم نہیں ہیں بلکہ متقیوں کے سردار ہیں تو آپ کو ان کی اتباع سے کیا نسبت؟ البتہ احکام الٰہی کی اتباع سے آپ کو خاص نسبت ہے، غرض آپ صاحب نبوت و شریعت حقہ ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان کی طرف جھکنا تم کو خدا کے ہاں کچھ کام نہ دے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی منصف اور راستی پسند مسلمان، ظالم اور بے راہ و کافروں کے رفیق نہیں ہو سکتے۔ وہ تو اللہ کے مطیع بندے ہیں اور اللہ ہی ان کا رفیق و مددگار ہے، لازم ہے کہ اسی کی راہ چلیں اور اسی پر بھروسہ رکھیں۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿٢٠﴾

یہ سوجھ کی باتیں ہیں لوگوں کے واسطے اور راہ کی اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین لاتے ہیں ۱؎

خلاصہ تفسیر: (اور) یہ قرآن (جو آپ کو ملا ہے یہ) عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین (یعنی ایمان) لانے والوں کے لئے بڑی رحمت (کا سبب) ہے (اور ظاہر ہے کہ قرآن سے علم اور "ہدایت" کا فیض تو عام ہے کہ وہ سب کو حق کا راستہ بتلاتا ہے، لیکن "رحمت" جو کہ عمل کا نتیجہ ہے وہ صرف ایمان والوں کے لیے خاص ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی قرآن بڑی بڑی بصیرت افروز حقائق پر مشتمل ہے۔ لوگوں کو کام کی باتیں اور کامیابی کی راہ سجھاتا ہے۔ اور جو خوش قسمت اس کی ہدایات و نصائح پر یقین کر کے عمل پیرا ہوتے ہیں ان حق میں میں خصوصی طور پر قرآن ورحمت و برکت ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ

کیا خیال رکھتے ہیں جنہوں نے کمائی ہیں برائیاں کہ ہم کردیں گے ان کو برابر ان لوگوں کی جو کہ یقین لائے اور کیے بھلے کام

سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿٢١﴾ ع ۲ / ۱۸

ایک سا ہے ان کا جینا اور مرنا، برے دعوے ہیں جو کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے تین مضامین میں آخرت کا بھی ذکر تھا، اب آگے پھر اسی کی طرف رجوع ہے جس میں پہلے آخرت کی حکمت بتلاتے ہیں، پھر اس کا ممکن ہونا ساتھ دوسری حکمت کے، پھر اس کے منکرین کی مذمت، پھر ان کے قول کی ایک حکایت، پھر اس کا جواب، پھر اس جواب کی تائید، پھر قیامت کے بعض واقعات مذکور ہیں۔

یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ جو برے برے کام (کفر و شرک، ظلم و معصیت) کرتے (رہتے) ہیں، کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح اختیار کیا کہ ان سب کا جینا اور مرنا یکساں ہوجائے، یہ برا حکم لگاتے ہیں (کیونکہ صحیح دلائل سے اس کا باطل ہونا ثابت ہو چکا ہے، پس آخرت کے وجود میں یہ حکمت ہوئی کہ ہر ایک کو اس کے اعمال کے ثمرات مل جائیں)۔

سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ: یعنی مومنین کا مرنا جینا تو اس طرح برابر ہوجائے کہ جس طرح زندگی میں انہوں نے لذتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا اسی طرح موت کے بعد بھی محروم رہیں، اور کافروں کا مرنا جینا بھی اس طرح برابر ہوجائے کہ جیسے اس زندگی میں وہ عذاب اور تکلیفوں سے بچے رہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی عذاب سے محفوظ رہیں، مطلب یہ کہ آخرت کے انکار سے یہ لازم آتا ہے کہ اطاعت شعار بندوں کو کہیں اطاعت کا پھل نہ ملے اور مخالفین پر کبھی مخالفت کا وبال نہ پڑے، اور یہ بات فی نفسہ اگرچہ ممکن ہے مگر چونکہ شرعی دلائل سے یہ ثابت ہے کہ حکمت کا

تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنے اعمال کے مناسب پھل ملے، اس لیے اس حکمت کا واقع ہونا ضروری ہو گیا، اور دنیا میں اس کا وقوع ہوا نہیں، پس لامحالہ آخرت کا موجود ہونا ضروری ہو گیا۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ کی شؤون حکمت پر نظر کرتے ہوئے کیا کوئی عقلمند یہ گمان کر سکتا ہے کہ ایک بدمعاش آدمی، اور ایک مرد صالح کے ساتھ خداوند تعالیٰ یکساں معاملہ کرے گا اور دونوں کا انجام برابر کرے گا؟ ہرگز نہیں! نہ اس زندگی میں دونوں برابر ہو سکتے ہیں نہ مرنے کے بعد، جو حیات طیبہ مومن صالح کو یہاں نصیب ہوتی ہے اور جس نصرت اور علو و رفعت کے وعدے دنیا میں اس سے کیے گئے، وہ ایک کافر بدکار کو کہاں میسر ہیں، اس کے لیے دنیا میں معیشۃ ضنکًا اور آخرت میں لعنت و خسران کے سوا کچھ نہیں، الغرض یہ دعویٰ بالکل غلط اور یہ خیال بالکل مہمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکوں اور بدوں کا مرنا اور جینا برابر کرے گا، اس کی حکمت اس کو مقتضی نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ دونوں کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ ظاہر ہو کر رہے اور ہر ایک کی نیکی یا بدی کے آثار فی الجملہ یہاں بھی مشاہد ہوں اور ان کا پوری طرح مکمل معائنہ موت کے بعد ہو۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾

اور بنائے اللہ نے آسمان اور زمین جیسے چاہئیں اور تاکہ بدلہ پائے ہر کوئی اپنی کمائی کا اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصہ تفسیر: اور اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا (جس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ ان عظیم الشان مخلوقات کے پیدا کرنے پر خدا کی قدرت دیکھ کر ہر ذی عقل یہ بھی سمجھ لے گا کہ جو پہلی مرتبہ ان چیزوں کو پیدا کر سکتا ہے وہ ان کو فنا کر کے دوبارہ بھی اسی طرح طرح موجود کر سکتا ہے جس سے قیامت و آخرت کا وجود ثابت ہوتا ہے) اور (دوسری حکمت یہ ہے کہ) تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے (اور یہ سب جانتے ہیں کہ دنیا میں پورا بدلہ ہے نہیں اس لئے آخرت کا ہونا ضروری ہو گیا، وہاں بدلہ ملے گا) اور (اس بدلہ میں) ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ: گذشتہ آیت اور اس آیت میں جو حکمت مذکور ہے اصل حاصل دونوں کا ایک ہے، یعنی اطاعت کرنے والوں کو اطاعت کا بدلہ ملنا اور مخالفین کو مخالفت کی سزا ملنا، لیکن اس آیت میں صرف یہ بتلایا گیا ہے کہ عمل فی نفسہ بدلہ کو چاہتا ہے اور اطاعت اور مخالفت یہ دونوں عمل برابر نہیں ہیں، اس لیے ہر ایک کا بدلہ الگ الگ ہونا چاہیے، اور پہلی آیت میں اتنی بات زیادہ ہے کہ قیامت واقع نہ ہونے کی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ نیک کام کرنے والے اور برے کام کرنے والے برابر ہو جائیں اور یہ طبعاً خود ایک مستقل خرابی ہے، چنانچہ عادتاً دیکھا جاتا ہے کہ اگر کسی کے پاس ایک ہی نوکر ہو اور وہ ہر طرح سے اطاعت کرتا ہو مگر اس کو کوئی انعام نہ دیا جائے تو اس کو اس قدر شکایت نہیں ہوتی، جیسے اس صورت میں ہوتی ہے کہ ایک دوسرا شریر نوکر آ جائے اور وہ طرح طرح کی شرارتیں کرے اور اس کو شرارت پر بھی کوئی سزا نہ دی جائے، اس وقت تابع دار نوکر کے دل میں خیال ہوگا کہ میری اطاعت کرنے سے کیا فائدہ ہوا، اگر اس شریر کو سزا ملتی تو میں یہی سمجھتا کہ خیر اطاعت میں اگر انعام نہیں تو یہی فائدہ سہی کہ سزا سے حفاظت رہتی ہے اور جبکہ اس کو سزا بھی نہیں تو میری اطاعت بے کار ہی ہو گئی، خوب سمجھ لو۔

* * *

فائدہ: یعنی زمین و آسمان کو یوں ہی بیکار پیدا نہیں کیا، بلکہ نہایت حکمت سے کسی خاص مقصد کے لیے بنایا ہے تاکہ ان کے احوال میں غور کر کے لوگ معلوم کر سکیں کہ بیشک جو چیز بنائی گئی ٹھیک موقع سے بنائی اور تاکہ اندازہ کر لیا جائے کہ ضرور ایک دن اس کارخانہ ہستی کا کوئی عظیم الشان نتیجہ نکلنے والا ہے، اسی کو آخرت کہتے ہیں، جہاں ہر ایک کو اس کی کمائی کا پھل ملے گا اور جو بویا تھا وہ بھی کاٹنا پڑے گا:

گندم از گندم بروید جو ز جو　　　از مکافات عمل غافل مشو

أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ

بھلا دیکھ تو جس نے ٹھہرا لیا اپنا حاکم اپنی خواہش کو اور راہ سے بچلا دیا اسکو اللہ نے جانتا بوجھتا ۱؎ اور مہر لگا دی اسکے کان پر اور دل پر اور ڈال دی

عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

اس کی آنکھ پر اندھیری، پھر کون راہ پر لائے اس کو اللہ کے سوا، سو کیا تم غور نہیں کرتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو کیا (توحید و آخرت کے ان واضح بیانات کے بعد) آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے (کہ علم و عمل کے اعتبار سے جو دل میں آتا ہے اسی کے پیچھے چلتا رہتا ہے) اور خدا تعالیٰ نے اس کو باوجود سمجھ بوجھ کے گمراہ کر دیا ہے (کہ حق کو سنا اور سمجھا بھی مگر نفسانی خواہش کی پیروی سے گمراہ ہو گیا) اور (خدا تعالیٰ نے) اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے (یعنی نفس پرستی کی بدولت حق بات قبول کرنے کی استعداد نہایت کمزور ہو گئی) سو ایسے شخص کو بعد خدا کے (گمراہ کر دینے کے) کون ہدایت کرے (اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی بھی ہے، آگے ان منکرین کو دھمکی کے طور پر خطاب ہے کہ) کیا تم (ان بیانات کو سن کر) پھر بھی نہیں سمجھتے (یعنی ایسا سمجھنا جو کہ مفید اور نافع ہو، اگرچہ عام معنی کے اعتبار سے وہ سمجھتے ہی تھے)۔

أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهٗ هَوٰىهُ: اس میں نفسانی خواہشات کی اتباع اور پیروی کی مذمت ظاہر ہے، اور دوسرا جملہ اس شخص کی برائی پر دلالت کرتا ہے جو حق واضح ہونے کے باوجود پھر بھی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ جانتا تھا کہ اس کی استعداد خراب ہے اور اسی قابل ہے کہ سیدھی راہ سے ادھر ادھر بھٹکتا پھرے، یا یہ مطلب ہے کہ وہ بد بخت علم رکھنے کے باوجود اور سمجھنے بوجھنے کے بعد گمراہ ہوا۔

فائدہ: ۲؎ جو شخص محض خواہش نفس کو اپنا حاکم اور معبود ٹھہرا لے، جدھر اس کی خواہش لے چلے ادھر چل پڑے اور حق و ناحق کے جانچنے کا معیار اس کے پاس یہ ہی خواہش نفس رہ جائے، اللہ تعالیٰ بھی اسے اس کی اختیار کردہ گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ پھر اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ نہ کان نصیحت کی بات سنتے ہیں، نہ دل سچی بات کو سمجھتا ہے، نہ آنکھ سے بصیرت کی روشنی نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ جس کو اس کے کرتوت کی بدولت ایسی حالت پر پہنچا دے، کون سی طاقت ہے جو اس کے بعد اس راہ پر لے آئے۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ

اور کہتے ہیں اور کچھ نہیں بس یہی ہے ہمارا جینا دنیا کا ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم جو مرتے ہیں سو زمانہ سے ۱؎ اور ان کو کچھ خبر

مِنْ عِلْمٍ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾

نہیں اس کی محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ یوں کہتے ہیں کہ بجز ہماری اس دنیاوی زندگی کے اور کوئی زندگی (آخرت میں) نہیں ہے ہم (یہی ایک مرنا) مرتے ہیں اور (یہی ایک جینا) جیتے ہیں (مقصود یہ کہ موت کی طرح زندگی بھی دنیا ہی کے ساتھ خاص ہے) اور ہم کو صرف زمانہ (کی گردش) سے موت آ جاتی ہے، اور ان لوگوں کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں ہے محض اٹکل سے ہانک رہے ہیں (یعنی

اخروی زندگی کے انکار پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں)۔

وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ: کفار کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی اور موت کا خدا کے حکم اور مشیت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ طبعی اسباب کے تابع ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اعضاء انسانی اور جسمانی قوتیں استعمال کے سبب خرچ ہوتی اور گھٹتی رہتی ہیں اور ان طبعی اسباب کی وجہ سے موت آجاتی ہے، اسی پر زندگی کو بھی قیاس کرلو کہ ہماری زندگی کا سبب بھی طبعی اسباب ہیں، زندگی بھی کسی خدائی حکم سے نہیں بلکہ مادہ کی طبعی حرکتوں سے حاصل ہوتی ہے، پس جب زندگی اور موت کا مدار طبعی اسباب پر ہے اور طبعی اسباب آخرت کی زندگی کا تقاضا نہیں کرتے تو آخرت کی زندگی نہ ہوگی، کفار کے اس قول سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خدا کے منکر ہوں، لیکن فلاسفہ یونان کی طرح وہ طبعی اسباب کو فاعل اور مؤثر مانتے تھے۔

اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ: آخرت کے انکار پر کفار نے جو دلیل یہاں ذکر کی ہے کہ: ''ہمیں صرف زمانہ کی گردش کی وجہ سے موت آتی ہے'' تو یہ بات خود دلیل کی محتاج ہے، کیونکہ یہ بدیہی تو ہے نہیں جس کو بے دلیل مان لیا جائے، بلکہ اس کے خلاف پر دلیل قائم ہے، چنانچہ علم کلام میں ثابت ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ ہی مؤثر اور فاعل مختار ہیں۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی اس دنیا کی زندگی کے سوا کوئی دوسری زندگی نہیں، بس یہ ہی ایک جہان ہے جس میں ہمارا مرنا اور جینا ہے، جیسے بارش ہونے پر سبزہ زمین سے اگا، خشکی ہوئی تو سوکھ کر ختم ہو گیا، یہ ہی حال آدمی کا سمجھو، ایک وقت آتا ہے پیدا ہوتا ہے، پھر معین وقت تک زندہ رہتا ہے، آخر زمانہ کا چکرا سے ختم کر دیتا ہے، یہ ہی سلسلہ موت وحیات کا دنیا میں چلتا رہتا ہے، آگے کچھ نہیں۔

فائدہ: ٢ یعنی ''زمانہ'' نام ہے ''دہر'' کا، وہ کچھ کام کرنے والا نہیں، کیونکہ ان میں حس نہ شعور نہ ارادہ، لامحالہ وہ کسی اور چیز کو کہتے ہوں گے جو معلوم نہیں ہوتی، لیکن دنیا میں اس کا تصرف چلتا ہے، پھر اللہ ہی کو کیوں نہ کہیں جس کا وجود اور متصرف علی الاطلاق ہونا دلائل فطریہ اور براہین عقلیہ و نقلیہ سے ثابت ہو چکا ہے اور زمانہ کا الٹ پھیر اور رات دن کا ادل بدل کرنا اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اسی معنی سے حدیث میں بتلایا گیا کہ: ''دہر [زمانہ] اللہ ہے اس کو برا نہ کہنا چاہیے''، کیونکہ جب آدمی ''دہر'' کو برا کہتا ہے، اسی نیت سے کہتا ہے کہ حوادث دہر اس کی طرف منسوب ہیں، حالانکہ تمام حوادث دہر اللہ کے ارادے اور مشیت سے ہیں تو دہر کی برائی کرنے سے حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی جناب میں گستاخی ہوتی ہے، اعاذنا اللہ منہ۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ

اور جب سنائی جائیں ان کو ہماری آیتیں کھلی کھلی اور کچھ دلیل نہیں ان کی مگر یہی کہ کہتے ہیں لے آؤ ہمارے باپ دادوں کو، اگر تم

صٰدِقِيْنَ ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ

سچے ہو ١ تو کہہ کہ اللہ ہی جلاتا ہے تم کو پھر مارے گا تم کو پھر اکٹھا کرے گا تم کو قیامت کے دن تک اس میں کچھ شک نہیں پر

ع اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٦﴾

بہت لوگ نہیں سمجھتے ٢

خلاصہ تفسیر: اور (نہ تو ان کے پاس کوئی دلیل ہے، اور نہ اہل حق کی دلیل کا وہ کچھ جواب دے سکتے ہیں، چنانچہ) جس وقت (اس بارہ میں) ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیتیں (جس کے صحیح ہونے پر خود قرآن کا اعجاز ہی دلیل ہے جو کہ اس کی ذاتی صفت ہے) پڑھی جاتی ہیں (جو مطلوب ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں) تو ان کا (اس پر) بجز اس کے اور کوئی جواب نہیں ہوتا کہ کہتے ہیں کہ ہمارے باپ دادوں کو (زندہ کرکے)

سامنے لے آؤ اگر تم (اس دعوے میں) سچے ہو (اور اس کے سوا کوئی اور جواب نہیں دے سکتے، مثلاً یہ کہ کسی عقلی دلیل سے قیامت کا محال ہونا ثابت کر دیتے یا قرآن کا مثل لے آتے تا کہ اس کے اعجاز کا جواب ہو جاتا، مگر ان میں سے تو کوئی جواب نہ بن پڑا، اور جو جواب دیا وہ محض نامعقول، کیونکہ دنیا میں مردوں کے زندہ ہونے سے یہ کیونکر لازم آ گیا کہ وہ کسی وقت بھی زندہ نہ ہو سکیں گے، چنانچہ آگے اسی کے جواب لیے حضور کو ارشاد ہے) آپ (ان کے جواب میں) یوں کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو (جب تک چاہتا ہے) زندہ رکھتا ہے پھر (جب چاہے گا) تم کو موت دے گا، پھر قیامت کے دن جس (کے واقع ہونے میں) میں ذرا شک نہیں تم کو (زندہ کر کے) جمع کرے گا (پس دعویٰ قیامت میں زندہ کرنے کا ہے اور دنیا میں مردوں کو زندہ نہ کرنے سے قیامت میں زندہ کرنے کی نفی لازم نہیں آتی) لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے (کہ نہ خود کوئی دلیل قائم کرتے ہیں، نہ مخالف کی دلیل کا جواب دیتے ہیں اور بلا دلیل حق کا انکار کرتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جب قرآن کی آیات یا بعث بعد الموت کے دلائل اس کو سنائی جاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میں کسی دلیل کو نہیں مانوں گا، بس اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ہمارے مرے ہوئے باپ دادوں کو زندہ کر کے دکھلا دو، تب ہم تسلیم کریں گے کہ بیشک موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا حق ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس نے ایک مرتبہ زندہ کیا پھر مارا، اسے کیا مشکل ہے کہ دوبارہ زندہ کر کے سب کو ایک جگہ اکٹھا کر دے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور اللہ ہی کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور جس دن قائم ہوگی قیامت اس دن خراب ہوں گے جھوٹے

خلاصہ تفسیر: اور (پیچھے جو کہا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ تم کو جمع کرے گا" تو اس کو کچھ مشکل نہ سمجھا جائے، کیونکہ) اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں میں اور زمین میں (تو وہ جو چاہے تصرف کرے، پس تمہیں موت کے بعد زندہ کر کے جمع کرنا بھی اس کے لئے کوئی مشکل نہیں) اور جس روز قیامت قائم ہوگی اس روز اہل باطل خسارہ میں پڑیں گے۔

* * *

فائدہ: اس دن ذلیل و خوار ہو کر پتہ لگے گا کہ کس دھوکہ میں پڑے ہوئے تھے۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۟ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور تو دیکھے ہر فرقہ کو کہ بیٹھے ہیں گھٹنوں کے بل ۱؎ ہر فرقہ بلایا جائے اپنے اپنے دفتر کے پاس آج بدلہ پاؤ گے جیسا تم کرتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور آپ (اس روز) ہر فرقہ کو دیکھیں گے کہ (مارے خوف کے) زانو کے بل گر پڑیں گے، ہر فرقہ اپنے نامہ اعمال (میں لکھے ہوئے اعمال کے حساب) کی طرف بلایا جائے گا (یہ مطلب ہے نامہ اعمال کی طرف بلانے کا، ورنہ نامہ اعمال تو خود ان کے پاس ہوں گے، اور ان سے کہا جائے گا کہ) آج تم کو تمہارے کئے کا بدلہ ملے گا۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً: اگر اس آیت میں لفظ كُلَّ اُمَّةٍ سب کے لیے عام ہو تو اس سے بظاہر مقبول بندوں کے لیے بھی قیامت کا ہول ثابت ہوتا ہے، یعنی خوف کی یہ صورت تمام اہل محشر مومن کافر نیک و بد سب کو پیش آئے گی، لیکن ممکن ہے کہ مقبول بندوں کے لیے یہ حالت بہت تھوڑی دیر کے لیے ہو اسی لیے قابل اعتبار نہ ہو، پس جن آیتوں میں نیک بندوں کے لیے قیامت میں خوف نہ ہونا مذکور ہے ان سے تعارض نہ ہوگا، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ كُلَّ اُمَّةٍ سے مراد عام اہل محشر نہ ہوں، بلکہ اکثر مراد ہوں جیسا کہ لفظ "کل" بعض اوقات اکثر کے لئے بولا جاتا ہے، اور اگر دوسرے مفسرین کی طرح اس کے معنی یہ کہے جائیں کہ حساب کے وقت ادب کی وجہ سے دوزانو بیٹھے ہوں گے تو پھر کچھ اشکال ہی نہیں رہتا، کیونکہ یہ نشست خوف

کی نہیں ادب کی نشست ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آیت سب کے لیے عام نہ ہو، بلکہ صرف کفار و فساق کے لیے ہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی خوف وہیبت سے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اعمالنامہ کی طرف بلایا جائے گا کہ آؤ اس کے موافق حساب دو، آج ہر ایک کو اسی کا بدلہ ملے گا جو اس نے دنیا میں کمایا تھا۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۹

یہ ہمارا دفتر ہے بولتا ہے تمہارے کام ٹھیک ۱؎ ہم لکھواتے جاتے تھے جو کچھ تم کرتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور کہا جائے گا کہ) یہ (نامہ اعمال) ہمارا (لکھایا ہوا) دفتر ہے جو تمہارے مقابلے میں ٹھیک ٹھیک بول رہا ہے (یعنی تمہارے اعمال کو ٹھیک ٹھیک ظاہر کر رہا ہے اور) ہم (دنیا میں) تمہارے (سب) اعمال کو (فرشتوں سے) لکھواتے جاتے تھے (اور یہ ان ہی کا مجموعہ ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو کام کیے تھے یہ اعمالنامہ ٹھیک ٹھیک وہ ہی بتلاتا ہے، ذرہ بھر کمی بیشی نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہمارے علم میں تو ہر چیز ازل سے ہے، مگر ضابطہ میں ہمارے فرشتے لکھنے پر مامور تھے ان کی لکھی ہوئی مکمل رپورٹ آج تمہارے سامنے ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰

سو جو لوگ یقین لائے ہیں اور بھلے کام کیے سو ان کو داخل کرے گا ان کا رب اپنی رحمت میں یہ جو ہے یہی ہے صریح مراد ملنی ۱؎

وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۱

اور جو منکر ہوئے، کیا تم کو سنائی نہ جاتی تھیں باتیں میری پھر تم نے غرور کیا اور ہوگئے تم لوگ گناہ گار ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو (حساب کے بعد فیصلہ یہ ہوگا کہ) جو لوگ ایمان لائے تھے اور انہوں نے اچھے کام کئے تھے تو ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہ صریح کامیابی ہے، اور جو لوگ کافر تھے (ان سے کہا جائے گا کہ) کیا میری آیتیں تم کو پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں سو تم نے (ان کے قبول کرنے سے) تکبر کیا تھا اور (اس وجہ سے) تم بڑے مجرم تھے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جنت میں جہاں اعلیٰ درجہ کی رحمت اور ہر قسم کی مہربانیاں ہوں گی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہماری طرف سے نصیحت وفہمائش اور تمام حجت کا کوئی دقیقہ اٹھا کر نہ رکھا گیا، اس پر بھی تمہارے غرور کی گردن نیچی نہ ہوئی، آخرت کے پکے مجرم بن کر رہے، یا: **و کنتم قوماً مجرمین** کا مطلب یہ لیا جائے کہ تم پہلے ہی سے جرائم پیشہ تھے۔

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ

اور جب کہیے کہ وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے اور قیامت میں کچھ شبہ نہیں تم کہتے تھے ہم نہیں سمجھتے کیا ہے قیامت، ہم کو آتا تو ہے

نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ ﴿۳۲﴾ وَبَدَا لَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا

ایک خیال سا اور ہم کو یقین نہیں ہوتا ۱۔ اور کھل جائیں ان پر برائیاں ان کاموں کی جو کیے تھے اور الٹ پڑے ان پر وہ چیز

كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۳﴾

جس پر ٹھٹھا کرتے تھے ۲۔

خلاصہ تفسیر: اور (تمہارا یہ حال تھا کہ) جب (تم سے) کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ (دوبارہ زندہ کرکے جزا وسزا دینے کا) حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں ہے تو تم (نہایت بے پروائی سے) کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے (صرف سننے سنانے سے) محض ایک خیال سا تو ہم کو بھی ہوتا ہے اور ہم کو (اس کا) یقین (حاصل) نہیں، اور (اس وقت) ان پر اپنے تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے اور جس (عذاب) کے ساتھ وہ استہزا کیا کرتے تھے وہ ان کو آگھیرے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہم نہیں جانتے قیامت کیسی ہوتی ہے، تم جو کچھ قیامت کے عجیب وغریب احوال بیان کرتے ہو ہم کو کسی طرح ان کا یقین نہیں ہوتا، یوں سنی سنائی باتوں سے کچھ ضعیف سا امکان اور دھندلا سا خیال کبھی آجائے وہ دوسری بات ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی جب قیامت آئے گی ان کی تمام بدکاریاں اور ان کے نتائج سامنے آجائیں گے اور عذاب وغیرہ کی دھمکیوں کا جو مذاق اڑایا کرتے تھے وہ خود ان پر ہی الٹ پڑے گا۔

وَقِيۡلَ الۡيَوۡمَ نَنۡسٰىكُمۡ كَمَا نَسِيۡتُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا وَمَاۡوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۳۴﴾

اور حکم ہوگا کہ آج ہم تم کو بھلا دیں گے جیسے تم نے بھلا دیا تھا اپنی اس دن کی ملاقات کو ۱ اور گھر تمہارا دوزخ ہے اور کوئی نہیں تمہارا مددگار

خلاصہ تفسیر: اور (ان سے) کہا جائے گا کہ آج ہم تم کو بھلائے دیتے ہیں (یعنی رحمت سے محروم کئے دیتے ہیں جس کو بھلانا مجازاً کہہ دیا) جیسا تم نے اپنے اس دن کے آنے کو بھلا رکھا تھا اور (آج سے) تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی دنیا میں تم نے آج کے دن کو یاد نہ رکھا تھا۔ آج ہم تم کو مہربانی سے یاد نہ کریں گے۔ ہمیشہ کے لیے اسی طرح عذاب میں پڑا چھوڑ دیں گے۔ جیسے تم نے اپنے کو دنیا کے مزوں میں پھنسا کر چھوڑ دیا تھا۔

ذٰلِكُمۡ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذۡتُمۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتۡكُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا ۚ فَالۡيَوۡمَ لَا يُخۡرَجُوۡنَ مِنۡهَا

یہ تم پر اس واسطے کہ تم نے پکڑا اللہ کی باتوں کو ٹھٹھا اور بہکے رہے دنیا کی زندگانی پر ۱ سو آج نہ ان کو نکالنا منظور ہے وہاں سے

وَلَا هُمۡ يُسۡتَعۡتَبُوۡنَ ﴿۳۵﴾

اور نہ ان سے مطلوب ہے توبہ ۲۔

خلاصہ تفسیر: یہ (سزا) اس وجہ سے ہے کہ تم نے خدا تعالیٰ کی آیتوں کی ہنسی اڑائی تھی اور تم کو دنیاوی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا (کہ اس میں مشغول ہوکر آخرت سے بالکل غافل بلکہ منکر ہوگئے تھے) سو آج یہ لوگ نہ تو دوزخ سے نکالے جائیں اور نہ ان سے خدا کی خفگی کا

تدارک چاہا جائے گا (یعنی اس کا موقع نہ دیا جائے گا کہ توبہ کر کے خدا کو راضی کر لیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دنیا کے مزوں میں پڑ کر خیال ہی نہ کیا کہ یہاں سے کبھی جانا اور خدا کے سامنے پیش ہونا بھی ہے اور اگر کبھی کچھ خیال آیا بھی تو یوں سمجھ کر دل کی تسلی کر لی کہ جس طرح دنیا میں ہم مسلمانوں سے مقابل ہیں، وہاں بھی ہمارا یہی زور رہے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی نہ ان کو دوزخ سے نکالا جائے گا نہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اب خدا کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٦﴾

سو اللہ ہی کے واسطے ہے سب خوبی جو رب ہے آسمانوں کا اور رب ہے زمین کا رب سارے جہان کا

ع ۴ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣٧﴾

اور اسی کے لئے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمت والا۱

خلاصہ تفسیر: پیچھے سورت کے مضامین میں توحید سے خدا تعالیٰ کی عظمت و عزت اور نبوت سے رحمت و حکمت اور قیامت کے ذکر سے لطف و ہیبت ضمناً معلوم ہو چکی ہے، اب خاتمہ میں اس مضمون کو صراحۃً بیان فرماتے ہیں۔

(جب گذشتہ تمام مضامین سن لئے) سو (ان سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا کہ) تمام خوبیاں اللہ ہی کے لئے (ثابت) ہیں جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور پروردگار ہے زمین کا (اور صرف آسمان و زمین ہی کا بطور خاص کیا ذکر وہ تو) پروردگار ہے تمام عالم کا (چنانچہ زمین و آسمان اور تمام عالم کا پروردگار ہونے سے اس کی رحمت معلوم ہوئی، کیونکہ پیدا کرنا اور باقی رکھنا یہ اصل رحمت ہے) اور اسی کو بڑائی ہے (جس کا ظہور آثار و علامات سے) آسمان و زمین میں (ہو رہا ہے) اور وہی زبردست ہے حکمت والا ہے (اس سے باقی صفات کا معلوم ہونا ظاہر ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ چاہیے آدمی اسی کی طرف متوجہ ہو، اس کے احسانات و انعامات کی قدر کرے، اسی کی ہدایت پر چلے، سب کو چھوڑ کر اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر رکھے اور اس کی بزرگی و عظمت کے سامنے ہمیشہ باختیار خود مطیع و منقاد رہے، کبھی سرکشی و تمرد کا خیال دل میں نہ لائے۔

حدیث قدسی میں ہے: "الكبرياء ردائي والعظمة ازاري فمن نازعني واحدًا منهما قذفته في النار" (کبریائی میری چادر اور عظمت میرا تہہ بند ہے، لہٰذا جو کوئی ان دونوں میں سے کسی میں مجھ سے منازعت اور کشمکش کرے گا، میں اسے اٹھا کر آگ میں پھینک دوں گا)

اللهم اجعلنا مطيعين لامرك وجنبنا غضبك وقنا عذاب النار انك سميع قريب مجيب الدعوات

(ایاتها ۳۵) (٤٦ سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ مَكِّيَّةٌ ٦٦) (رکوعاتها ٤)

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت اور اس سورت میں توحید اور آخرت کا بیان مشترک ہے، پس دونوں میں مناسبت ظاہر ہے، مگر گزشتہ سورت میں آخرت کا بیان تفصیلی اور توحید کا بیان اجمالی تھا، اور اس سورت میں اس کا برعکس ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الجزء ٢٦ حٰمٓ ۞ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۞ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا

حم، اتارنا کتاب کا ہے اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے ،ہم نے جو بنائے آسمان اور زمین اور جو

بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّاۤ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ۞

ان کے بیچ میں ہے سو ٹھیک کام پر اور ایک ٹھہرے وعدہ پر ۱؎ اور جو لوگ منکر ہیں وہ ڈر کو سن کر منہ پھیر لیتے ہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: حٰمٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) یہ کتاب اللہ زبردست حکمت والے کی طرف سے بھیجی گئی ہے (اس لئے اس کے مضامین قابل غور ہیں، آگے توحید اور آخرت کا بیان ہے کہ) ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں حکمت کے ساتھ اور ایک میعاد معین (تک) کے لئے پیدا کیا ہے (وہ حکمت یہ ہے کہ ان سے توحید اور جزا وسزا ہونے پر دلالت ہوتی ہے اور وہ میعاد قیامت ہے) اور جو لوگ کافر ہیں ان کو جس چیز سے ڈرایا جاتا ہے (یعنی جب ان سے یہ کہا جائے کہ توحید کے انکار پر تم کو قیامت میں عذاب ہوگا تو) وہ اس سے بے رخی (اور بے التفاتی) کرتے ہیں (اور توحید کو قبول نہیں کرتے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آسمان وزمین، اور یہ سب کارخانہ اللہ تعالیٰ نے بیکار نہیں بنایا، بلکہ کسی خاص غرض ومقصد کے لیے پیدا کیا ہے جو ایک معین میعاد اور ٹھہرے ہوئے وعدہ تک یوں ہی چلتا رہے گا تا آنکہ اس کا نتیجہ ظاہر ہو اسی کو ''آخرت'' کہتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی برے انجام سے ڈرتے نہیں اور آخرت کی تیاری نہیں کرتے، جب آخرت کی بات سنی ایک کان سنی دوسرے کان نکال دی۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ

کہہ بھلا دیکھو تو جن کو پکارتے ہو اللہ کے سوا دکھلاؤ تو مجھ کو انہوں نے کیا بنایا زمین میں یا ان کا کچھ ساجھا ہے

فِى السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَاۤ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞

آسمانوں میں ۱؎ لاؤ میرے پاس کوئی کتاب اس سے پہلے کی یا کوئی علم جو چلا آتا ہو اگر ہو تم سچے ۲؎

خلاصہ تفسیر: آپ (ان سے توحید کے بارہ میں) کہئے کہ یہ تو بتلاؤ جن چیزوں کی تم خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو (ان کے مستحق عبادت ہونے کی کیا دلیل ہے، اگر کوئی عقلی دلیل ہے تو) مجھ کو یہ دکھلاؤ کہ انہوں نے کون سی زمین پیدا کی ہے یا ان کا آسمانوں (کے پیدا کرنے) میں کچھ حصہ ہے (اور ظاہر ہے کہ تم بھی ان کو خالق نہیں مانتے جو کہ مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے، بلکہ مخلوق کہتے ہو جو کہ مستحق عبادت

ہونے کے خلاف ہے پس تمہارے پاس عقلی دلیل تو کوئی نہیں، اور اگر تمہارے پاس کوئی نقلی دلیل ہے تو) میرے پاس کوئی (صحیح) کتاب (لاؤ جس میں شرک کا حکم ہو اور) جو اس (قرآن) سے پہلے کی ہو (کیونکہ تم بھی جانتے ہو کہ قرآن میں شرک کی نفی ہے تو کسی اور ہی کتاب کی ضرورت ہوگی) یا (اگر کتاب نہ ہو تو) کوئی اور (معتبر) مضمون (جوزبانی) منقول (ہوتا چلا آتا ہو اور کتاب میں لکھا ہوا نہ ہو) لاؤ اگر تم (شرک کے دعویٰ میں) سچے ہو۔

اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ: مطلب یہ کہ نقلی دلیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اصل جہاں سے وہ منقول ہو رہا ہے صحیح اور قابل تصدیق ہو، خواہ وہ اصل خود حق تعالی کی طرف سے آئی ہو جیسے آسمانی کتابیں تورات، انجیل اور قرآن وغیرہ، یا اللہ کے منتخب کردہ رسول و نبی کا زبانی قول ہو جس کی صحیح سند موجود ہو۔

اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ (الی قولہ) اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ: اس میں اس پر دلالت ہے کہ دین کے بارے میں کوئی بھی دعوی معتبر دلیل کے بغیر قابل قبول نہیں، سو دین کے بارے میں کشف و الہام کا دعوی بھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ے یعنی خداوند قدوس نے تو آسمان و زمین اور کل مخلوقات بنائی کیا سچے دل سے کہہ سکتے ہو کہ زمین کا کوئی ٹکڑا یا آسمان کا کوئی حصہ کسی اور نے بھی بنایا ہے یا بنا سکتا ہے، پھر ان کو خدا کے ساتھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کیوں پکارا جاتا ہے۔

فائدہ: ۲ے یعنی اگر اپنے دعوائے شرک میں سچے ہو تو کسی آسمانی کتاب کی سند لاؤ یا کسی ایسے علمی اصول سے ثابت کرو جو عقلاء کے نزدیک مسلّم چلا آتا ہو جس چیز پر کوئی نقلی یا عقلی دلیل نہ ہو آخر اسے کیونکر تسلیم کیا جائے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ

اور اس سے زیادہ گمراہ کون جو پکارے اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ پہنچے اس کی پکار کو دن قیامت تک اور ان کو

دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ۝۵ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ۝۶

خبر نہیں ان کے پکارنے کی ۱ے اور جب لوگ جمع ہوں گے وہ ہوں گے ان کے دشمن اور ہوں گے ان کے پوجنے سے منکر ۲ے

خلاصہ تفسیر: ظاہر ہے کہ شرک پرستند، معتبر اور صحیح دلیل کوئی پیش نہیں کر سکا، مگر جو اپنی غلطی اور باطل عقیدے سے پھر بھی باز نہ آئے تو ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

اور اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو (شخص دلیل سے عاجز ہو کر بلکہ اس کے خلاف شرک کے بطلان پر دلیل قائم ہونے کے باوجود) خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے جو قیامت تک بھی اس کا کہنا نہ کرے (کیونکہ بتوں میں تو سننے ہی کی قابلیت نہیں اور جو معبود جاندار ہیں ان میں کامل قدرت نہیں، اور فرشتے وغیرہ ان کے شرکیہ افعال سے راضی نہیں) اور ان کو ان کے پکارنے (تک) کی بھی خبر نہ ہو (کیونکہ بے جان معبودوں میں تو سننے ہی کی قدرت نہیں، اور جانداروں کو بھی ویسی خبر نہیں جیسا کہ کفار کا عقیدہ ہے کہ وہ ہمیشہ اور ضرور سنتے ہیں اور ان بتوں سے ان کو فائدہ پہنچے گا سو یہ کچھ بھی نہیں) اور (پھر) جب (قیامت میں) سب آدمی (حساب کے لئے) جمع کئے جائیں تو وہ (باطل معبود) ان (عبادت کرنے والوں) کے دشمن ہو جائیں اور ان کی عبادت ہی کا انکار کر بیٹھیں۔

جیسا کہ سورہ یونس میں ہے: قال شرکاؤھم ما کنتم ایانا تعبدون یعنی ان کے معبود کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہ کرتے تھے، پس ایسے معبودوں کی عبادت کرنا اس سے بڑھ کر کیا غلطی ہو سکتی ہے کہ ان کی عبادت کی صحیح وجہ ایک بھی نہیں، اور ان کے معبود نہ ہونے پر بہت سے دلائل موجود ہیں۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی اس سے بڑی حماقت اور گمراہی کیا ہوگی کہ خدا کو چھوڑ کر ایک ایسی بے جان یا بے اختیار مخلوق کو اپنی حاجت برآری کے لیے پکارا جائے جو اپنے مستقل اختیار سے کسی کو پکار کر نہیں پہنچ سکتی، بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو پکارنے کی خبر بھی ہو، پتھر کی مورتیوں کا تو کہنا ہی کیا، فرشتے اور پیغمبر بھی وہی بات سن سکتے اور وہی کام کر سکتے ہیں جس کی اجازت اور قدرت حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو۔

فائدہ: ٢ یعنی محشر میں جبکہ امداد و اعانت کی زیادہ حاجت ہوگی، یہ بیچارے معبود اپنے عابدین کی مدد تو کیا کر سکتے، ہاں دشمن بن کر ان کے مقابل کھڑے ہوں گے اور سخت بیزاری کا اظہار کریں گے بلکہ یہاں تک کہہ دیں گے کہ: مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ (القصص: ٦٣) یہ لوگ ہماری پرستش کرتے ہی نہ تھے اس وقت سوچو کیسی حسرت و ندامت کا سامنا ہوگا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اور جب سنائی جائیں ان کو ہماری باتیں کھلی کھلی کہتے ہیں منکر سچی بات کو جب ان تک پہنچی یہ جادو ہے صریح

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید اور آخرت کا ثبوت تھا، اب آگے رسالت و نبوت کا مضمون ہے۔

اور جب ہماری کھلی کھلی آیتیں (جو کہ معجزہ ہونے کے باعث رسالت کی دلیل ہیں) ان (منکر رسالت) لوگوں کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو یہ منکر لوگ اس سچی بات کی نسبت جبکہ وہ ان تک پہنچتی ہے یوں کہتے ہیں کہ یہ صریح جادو ہے (حالانکہ جادو کا مقابلہ اور جواب ہو سکتا ہے، اور قرآن کی نظیر اور مقابلہ ناممکن اور محال ہونا اس قول کے باطل ہونے کی صریح دلیل ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی ان لوگوں کو فی الحال انجام کی کچھ فکر نہیں کسی نصیحت وفہمائش پر کان نہیں دھرتے بلکہ جب قرآن کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو اسے جادو کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ هُوَ اَعْلَمُ

کیا کہتے ہیں یہ بنا لایا ہے ١ تو کہہ اگر میں بنا لایا ہوں تو تم میرا بھلا نہیں کر سکتے اللہ کے سامنے ذرا بھی ٢ اس کو خوب خبر ہے

بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

جن باتوں میں تم لگ رہے ہو وہ کافی ہے حق بتانے والا میرے اور تمہارے بیچ ٣ اور وہی ہے بخشنے والا مہربان ٤

خلاصہ تفسیر: (اس سے بڑھ کر اور سنو) کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے (یعنی آپ نے نعوذ باللہ) اس (قرآن) کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے (اور خدا کی طرف منسوب کر دیا، آگے اس قول کا جواب ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہوگا (اور خدا کے ذمہ لگا دیا ہوگا) تو (خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو دھوکہ سے پوری طرح بچانے کے لیے وہ مجھ کو نبوت کے جھوٹے دعوی پر جلدی ہلاک کر دے گا) پھر (جب وہ مجھ کو ہلاک کرنے لگے گا تو) تم (یا اور) لوگ مجھ کو خدا (کے عذاب) سے ذرا بھی نہیں بچا سکتے (مطلب یہ کہ نبوت کے جھوٹے دعوے پر عذاب کا ہونا ایسا لازمی ہے کہ میرا کوئی حامی و مددگار بھی اسے نہیں ہٹا سکتا، مگر مجھ کو عذاب نہیں ہوا، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ میں اپنے دعوئ نبوت میں جھوٹا نہیں اور جب میں جھوٹا نہیں تو یہ سمجھ رکھو کہ) وہ خوب جانتا ہے تم قرآن میں جو جو باتیں بنا رہے ہو (اس لیے تم کو سزا ہوگی، غرض یہ کہ) میرے اور تمہارے درمیان میں (سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرنے کے لئے) وہ کافی گواہ (یعنی باخبر) ہے (لہٰذا اگر میں جھوٹا ہوں گا تو مجھ کو فوراً عذاب دے گا اور اگر تم جھوٹے ہو گے تو تم کو جلد یا بدیر عذاب دے گا) اور (اگر کسی کو یہ شبہ ہوا کہ جب وہ ہماری باتوں سے واقف ہے اور پھر بھی ہم پر عذاب نہیں آیا تو جس طرح نبوت کے مدعی پر عذاب نہ آنا اس کی سچائی کی دلیل ہے، اسی طرح ہم منکروں پر عذاب نہ آنا ہماری سچائی کی دلیل بن سکتی

ہےتو اس کا جواب یہ ہے کہ) وہ بڑی مغفرت والا ہے (پس ایک قسم کی مغفرت ورحمت کفار پر بھی ہوتی ہے کہ دنیا میں بعض دفعہ ان کو عذاب نہیں ہوتا، اور) بڑی رحمت والا ہے (اس لئے رحمت کی بعض اقسام۔جس کو رحمت عامہ کہتے ہیں۔کفار کے لئے بھی واقع کر دیتا ہے)۔

پس منکرین کے انکار پر دنیا میں عذاب نہ ہونا ان کے سچا ہونے کی دلیل ہرگز نہیں، اور یہ احتمال نبوت کے مدعی میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ نبوت کے جھوٹے دعوی پر دنیا میں عذاب نازل ہونا عادتا لازم ہے، اور مقصد اس کا یہ ہے کہ حق اور باطل کی تحقیق کا اخیر ذریعہ نبوت ہے، اور جس بات پر حق اور باطل کی پہچان کا اخیر دارومدار ہو اس کو نہایت واضح ہونا چاہیے، اس لیے نبوت میں ذرا سے دھوکہ کو بھی گوارا نہیں کیا گیا، اس کے جھوٹے دعوی پر عذاب نازل ہوجاتا ہے، اور جب عذاب نہ آنے سے نبوت میں دھوکہ نہ رہا تو پھر کفار کی حالت میں بھی دھوکہ نہیں رہ سکتا، کیونکہ دو مخالف باتوں میں سے ایک کے سچے ہوجانے سے دوسرے کا جھوٹا ہونا خود لازم آجائے گا، اس لیے کفار کے انکار پر عذاب نازل ہونا لازم نہیں ہوا، بلکہ اکثر ڈھیل دینے کے لیے ان پر جلدی عذاب نہیں بھیجا جاتا، اور یہ نہ سمجھا جائے کہ مسئلہ نبوت کا دارومدار صرف اسی مضمون پر ہے، بلکہ اصلی مدار تو معجزہ ظاہر کرنے پر ہے جو کہ ہو چکا تھا، یہ تو صرف ان کی ہٹ دھرمی کا آخری جواب ہے۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ۱؎ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ: یعنی جادو کہنے سے زیادہ قبیح وشنیع ان کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن مجید آپ خود بنالائے ہیں اور جھوٹ طوفان خدا کی طرف منسوب کررہے ہیں، العیاذ باللہ۔

فائدہ: ۲؎ فَلَا تَمۡلِكُوۡنَ لِىۡ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا: یعنی خدا پر جھوٹ لگانا انتہائی جرم ہے، اگر بفرض محال میں ایسی جسارت کروں تو گویا جان بوجھ کر خود کو اللہ کے غضب اور اس کی سخت ترین سزا کے لیے پیش کررہا ہوں، بھلا خیال کرو جو شخص ساری عمر بندوں پر جھوٹ نہ لگائے اور ذرا ذرا سے معاملہ میں اللہ کے خوف سے کانپتا ہو، کیا وہ ایک دم بیٹھے بٹھائے اللہ پر جھوٹ طوفان باندھ کر اپنے کو ایسی عظیم ترین آفت ومصیبت میں پھنسائے گا، جس سے بچانے والی اور پناہ دینے والی کوئی طاقت دنیا میں موجود نہیں، اگر میں جھوٹ سچ بنا کر فرض کرو تمہیں اپنا تابع کرلوں تو کیا تم خدا کے غضب وقہر سے جو جھوٹے مدعیان نبوت پر ہوتا ہے، مجھ کو نجات دے سکو گے؟ اور جب اللہ مجھ کو برائی پہنچانا چاہے گا تم میرا کچھ بھلا کرسکو گے؟ آخر میرے چہل سالہ حالات وسوانح سے اتنا تو تم بھی جانتے ہو کہ میں اس قدر بے خوف اور بے باک نہیں ہوں اور نہ ایسا بے عقل ہوں کہ بعض انسانوں کو خوش کر کے خداوند قدوس کا غصہ مول لے لوں، بہرحال اگر میں معاذ اللہ کاذب ومفتری ہوں تو اس کا وبال مجھ پر پڑے گا۔

فائدہ: ۳؎ كَفٰى بِهٖ شَهِيۡدًاۢ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ: یعنی جو باتیں تم نے شروع کر رکھی ہیں اللہ ان کو بھی خوب جانتا ہے، لہذا لغو اور دور از کار خیالات چھوڑ کر اپنے انجام کی فکر کرو، اگر خدا کے سچے رسول کو جھوٹا اور مفتری کہا تو سمجھ لو اس کا حشر کیا ہوگا، خدا پر میری اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں، وہ اپنے علم صحیح ومحیط کے موافق ہر ایک کے ساتھ معاملہ کرے گا، میں اسی کو اپنے اور تمہارے درمیان گواہ ٹھہراتا ہوں وہ اپنے قول وفعل سے بتلا رہا ہے اور آئندہ بتلادے گا کہ کون حق پر ہے اور کون جھوٹ بول رہا، افتراء کررہا ہے۔

فائدہ: ۴؎ وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ: یعنی اب بھی باز آؤ تو بخشے جاؤ، اور یہ بھی اس کی مہربانی اور بردباری سمجھو کہ باوجود جرائم پر مطلع ہونے اور کامل قدرت رکھنے کے تم کو فوراً ہلاک نہیں کردیتا۔

قُلۡ مَا كُنۡتُ بِدۡعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَاۤ اَدۡرِىۡ مَا يُفۡعَلُ بِىۡ وَلَا بِكُمۡ ؕ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ

تو کہہ میں کچھ نیا رسول نہیں آیا ۱؎ اور مجھ کو معلوم نہیں کیا ہونا ہے مجھ سے اور تم سے میں اسی پر چلتا ہوں جو حکم آتا ہے مجھ کو

وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۞ ۹

اور میرا کام تو یہی ہے ڈر سنادینا کھول کر ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب اثبات نبوت کی تاکید ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں (کہ تمہارے لئے تعجب کا باعث ہو، کیونکہ مجھ سے پہلے بہت سے پیغمبر آ چکے ہیں جن کی خبر تواتر سے تم نے بھی سنی ہے) اور (اسی طرح میں کسی اور عجیب بات کا بھی دعویٰ نہیں کرتا جیسے علم غیب کا دعویٰ، چنانچہ میں خود کہتا ہوں کہ غیب کی باتوں میں سے مجھے صرف وہ معلوم ہیں جو وحی سے مجھے بتادی گئی ہیں، غیب کی اور کسی بات کی خبر مجھے نہیں حتیٰ کہ) میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ (یہ معلوم کہ) تمہارے ساتھ (کیا کیا جائے گا، لہٰذا جب اپنے اور تمہارے آئندہ حالات کے علم کا بھی مجھے دعویٰ نہیں، حالانکہ ان حالات سے میرا تعلق بھی بہت زیادہ ہے، تو دور کی غیبی باتوں کے بارے میں کیا دعویٰ کرتا، یہ وہی چیز ہے جو ایک اور جگہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمائی: قل لا اقول لکم عندی خزآئن اللہ ولا اعلم الغیب، البتہ جن باتوں کا علم وحی سے ہوگیا ہے خواہ وہ اپنے متعلق ہوں یا غیروں کے، اور خواہ دنیا کے حالات ہوں یا آخرت کے ان کا علم بیشک کامل ہے، چنانچہ آگے ارشاد ہے کہ) میں تو (علم وعمل میں) صرف اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے آتا ہے اور (اسی کی تبلیغ بھی کرتا ہوں اور اگر تم اس کو نہیں مانتے تو میرا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ) میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں (جس کو میں دلائل سے ثابت کر چکا ہوں)۔

وَمَآ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ بِیۡ وَلَا بِکُمۡ: اس آیت سے عقیدت میں افراط کا رد نکلتا ہے، آیت میں رسول اللہ ﷺ کا پورا تعارف بیان کر دیا گیا ہے، تو پھر اولیاء اللہ کو ہر کلی و جزئی کا علم جاننے والا سمجھنا کس قدر گمراہی کی بات ہے (یعنی اولیاء سے عقیدت رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہر بات کے بارے میں کہنا کہ ان کو معلوم ہے، کیونکہ جب نبی اکرم ﷺ کو فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے ساتھ کیا کیا جائے گا اور آپ کی امت کے ساتھ کیا کیا جائے گا تو کسی ولی کامل کو کیونکر یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ ہر بات کو جاننے والا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی میری باتوں سے اس قدر بدکتے کیوں ہو؟ میں کوئی انوکھی چیز لے کر تو نہیں آیا، مجھ سے پہلے بھی دنیا میں سلسلہ نبوت و رسالت کا جاری رہا ہے، وہ ہی میں کہتا ہوں کہ ان سب رسولوں کے بعد مجھ کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے جس کی خبر پہلے رسول دیتے چلے آئے ہیں، اس حیثیت سے بھی یہ کوئی نئی بات نہ رہی، بلکہ بہت پرانی بشارات کا مصداق آج سامنے آ گیا، پھر اس کے ماننے میں اشکال کیا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں کہ میرے کام کا آخری نتیجہ کیا ہونا ہے، میرے ساتھ اللہ کیا معاملہ کرے گا اور تمہارے ساتھ کیا کرے گا، نہ میں اس وقت پوری پوری تفاصیل اپنے اور تمہارے انجام کے متعلق بتلا سکتا ہوں کہ دنیا اور آخرت میں کیا کیا صورتیں پیش آئیں گی، ہاں ایک بات کہتا ہوں کہ میرا کام صرف وحی الٰہی کا اتباع اور حکم خداوندی کا امتثال کرنا اور کفر وعصیان کے سخت خطرناک نتائج سے خوب کھول کر آگاہ کر دینا ہے، آگے چل کر دنیا یا آخرت میں میرے اور تمہارے ساتھ کیا کچھ پیش آئے گا اس کی تمام تفصیلات فی الحال میں نہیں جانتا نہ اس بحث میں پڑنے سے مجھے کچھ مطلب، بندہ کا کام نتیجہ سے قطع نظر کر کے مالک کے احکام کی تعمیل کرنا ہے اور بس۔

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ اِنۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَ کَفَرۡتُمۡ بِہٖ وَشَہِدَ شَاہِدٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ عَلٰی مِثۡلِہٖ

تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر یہ آیا ہو اللہ کے یہاں سے اور تم نے اس کو نہیں مانا اور گواہی دے چکا ایک گواہ بنی اسرائیل کا ایک ایسی کتاب کی

فَاٰمَنَ وَاسۡتَکۡبَرۡتُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۰﴾ ع

پھر وہ یقین لایا اور تم نے غرور کیا، بیشک اللہ راہ نہیں دیتا گناہ گاروں کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے جس افتراء و بہتان کے الزام کی تردید ھُوَ اَعۡلَمُ بِمَا تُفِیۡضُوۡنَ فِیۡہِ سے اجمالاً کی گئی تھی اب اس کی تفصیل کے طور پر ارشاد ہے کہ:

آپ کہہ دیجئے کہ تم مجھ کو یہ بتلا دو کہ اگر یہ قرآن من جانب اللہ ہو اور (پھر) تم اس کے منکر ہو اور (کسی دلیل سے اس کے اللہ کی طرف سے ہونے کی مزید تائید بھی ہو جائے مثلاً ایسی دلیل سے کہ) بنی اسرائیل (کے علماء) میں سے کوئی (معتبر) گواہ (جو علم و دیانت کے اعتبار سے مسلم و معتبر ہو اور ایک ہو یا زیادہ، ماضی میں ہو یا حال میں یا مستقبل میں) اسی جیسی کتاب (یعنی اس کتاب کے اللہ کی طرف سے ہونے) پر گواہی دے کر ایمان لے آئے اور تم (باوجود بے علم ہونے کے اس کتاب پر ایمان لانے سے) تکبر ہی میں رہو (تو اس صورت میں تم سے زیادہ بے انصاف کون ہوگا، اور بے انصاف لوگوں کی یہ حالت ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو (ان کے عناد کے باعث) ہدایت نہیں کیا کرتا (بلکہ ہمیشہ گمراہی میں رہتے ہیں اور گمراہی کا انجام دوزخ کی آگ ہے)۔

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ: اس آیت کا مضمون تقریباً وہی ہے جو سورہ شعراء آیت ۱۹۷: **أَوَلَمۡ يَكُن لَّهُمۡ ءَايَةً أَن يَعۡلَمَهُۥ عُلَمَٰٓؤُاْ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ** میں گزر چکا ہے، خلاصہ یہ کہ اول تو میں دلائل قائم کر کے اور شبہات کا جواب دے کر ثابت کر چکا ہوں کہ یہ کتاب میری گھڑی ہوئی نہیں، پھر اگر اس کی تائید کسی معتبر اسرائیلی عالم کی زبانی ہو جائے جو دیانت اور علم میں مسلم ہو، خواہ ایک ہو یا کئی ہوں اور وہ اس کتاب کا اللہ کی طرف سے ہونا تسلیم کر لیں تب تو تم کو اپنی فکر کرنا چاہیے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبوت کا ثابت ہونا اس گواہی پر موقوف ہے، بلکہ زیادہ تاکید کے لیے اس کو بڑھا دیا ہے، اس آیت میں ''گواہ'' سے مراد کوئی خاص شخص نہیں، بلکہ بنی اسرائیل کے تمام معتبر علماء کو شامل ہے، خواہ وہ اس آیت سے پہلے ایمان لائے ہوں یا بعد میں، اور بعض روایات سے جو اس آیت کا عبداللہ بن سلامؓ کے بارہ میں نازل ہونا آیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی اس میں داخل ہیں، پس یہ آیت خواہ مکی ہو یا مدنی اب اس پر کوئی اشکال نہیں۔

* * *

فائدہ: اس زمانہ میں عرب کے جاہل مشرک بنی اسرائیل کے علم و فضل سے مرعوب تھے، جب حضور ﷺ کی نبوت کا چرچا ہوا تو مشرکین نے اس باب میں علمائے بنی اسرائیل کا عندیہ لینا چاہا، غرض یہ تھی کہ وہ لوگ آپ ﷺ کی تکذیب کر دیں تو کہنے کو ایک بات ہاتھ آ جائے کہ دیکھو اہل علم اہل کتاب بھی ان کی باتوں کو جھوٹا کہتے ہیں، مگر اس مقصد میں مشرکین ہمیشہ ناکام رہے، خدا تعالیٰ نے ان ہی بنی اسرائیل کی زبانوں سے حضور ﷺ کی تصدیق و تائید کرائی، نہ صرف اتنی بات سے کہ وہ لوگ بھی قرآن کی طرح تورات کو آسمانی کتاب اور آنحضرت ﷺ کی طرح حضرت موسیٰ کو پیغمبر کہتے تھے اور اس طرح حضور ﷺ کا دعوائے رسالت اور قرآن کی وحی کوئی انوکھی چیز نہیں رہتی بلکہ اس طرح کہ بعض علمائے یہود نے صریحاً اقرار کیا اور گواہی دی کہ بیشک ہمارے ہاں اس ملک (عرب) سے ایک عظیم الشان رسول اور کتاب کے آنے کی خبر دی گئی ہے اور یہ رسول وہ ہی معلوم ہوتا ہے اور یہ کتاب اسی طرح کی ہے جس کی خبر دی گئی تھی، علمائے یہود کی یہ شہادتیں فی الحقیقت ان پیشین گوئیوں پر مبنی تھیں، جو باوجود ہزار ہا تحریف و تبدل کے آج بھی تورات وغیرہ میں موجود چلی آتی ہیں، جن سے ہویدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا سب سے بڑا گواہ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) ہزاروں برس پہلے خود گواہی دے چکا ہے کہ بنی اسرائیل کے اقارب اور بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے اسی کی مثل ایک رسول آنے والا ہے: **إِنَّآ أَرۡسَلۡنَآ إِلَيۡكُمۡ رَسُولٗا شَٰهِدًا عَلَيۡكُمۡ كَمَآ أَرۡسَلۡنَآ إِلَىٰ فِرۡعَوۡنَ رَسُولٗا** (المزمل: ۱۵) یہ ہی سبب تھا کہ بعض منصف و حق پرست احبار یہود مثلاً عبداللہ بن سلام وغیرہ حضور ﷺ کا چہرہ دیکھتے ہی اسلام لے آئے اور بول اٹھے کہ: ''اِنَّ هٰذَا الْوَجْهَ لَيْسَ بِوَجْهِ كَاذِبٍ'' (یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں) انہوں نے قرآن جیسی واضح الاعجاز کتاب کے حق ہونے کی گواہی دے، پھر جب موسیٰ (علیہ السلام) ایک چیز پر وقوع سے ہزاروں برس پہلے ایمان رکھیں، علمائے یہود اس کے صدق کی گواہی دیں، بعض احبار یہود زبانی و قلبی شہادت دے کر مشرف با اسلام ہو جائیں، اور ان سب شہادتوں کے باوجود تم اپنی شیخی اور غرور سے اس کو قبول نہ کرو تو سمجھ لو اس سے بڑھ کر ظلم اور گناہ کیا ہوگا اور ایسے ظالم اور گنہگار کی نجات و فلاح کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ

اور کہنے لگے منکر ایمان والوں کو اگر یہ دین بہتر ہوتا تو یہ نہ دوڑتے اس پر ہم سے پہلے ۱؎ اور جب راہ پر نہیں آئے اس کے بتلانے سے

فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ⑪

تو یہ اب کہیں گے یہ جھوٹ ہے بہت پرانا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے نبوت کی تحقیق میں جو مضامین مذکور تھے اب آگے ان میں سے بعض کا اجمالی اور بعض کا تفصیلی بیان ہے جس سے گزشتہ مضامین کی تاکید ہو جائے گی۔

اور یہ کافر ایمان والوں (کے ایمان لانے) کی نسبت یوں کہتے ہیں کہ اگر یہ قرآن (جس پر یہ لوگ ایمان لائے ہیں) کوئی اچھی (یعنی سچی) چیز ہوتا تو یہ (کم درجہ کے) لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ کرتے (یعنی ہم لوگ بڑے عقل مند ہیں اور یہ مسلمان کم عقل ہیں، اور حق بات کو عقل مند پہلے قبول کرتا ہے، اور اگر یہ حق ہوتا تو ہم پہلے مانتے، جب ہم نے نہیں مانا تو یہ حق نہیں، یہ مسلمان بے عقلی سے ادھر دوڑنے لگے ہیں، کافروں کا یہ قول ان کے انتہائی تکبر کی دلیل ہے جس کا ذکر پیچھے استکبر تم میں آیا ہے) اور جب (عناد و تکبر کے سبب) ان لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو (اپنی جہالت، عناد اور ضد کی بنا پر) یہیں کہیں گے کہ یہ (بھی مثل) قدیمی (جھوٹے مضامین کے ایک) جھوٹ (مضمون) ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی کمزور و ذلیل اور لونڈی غلام مسلمان ہوتے ہیں، اگر یہ دین بہتر ہوتا تو بہتر لوگ اس کی طرف جھپٹتے، کیا یہ چیز اچھی ہوتی تو اس کے حاصل کرنے میں ہم جیسے عقل مند اور عزت و دولت والے ان لونڈی غلاموں سے پیچھے رہ جاتے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہمیشہ کچھ لوگ ایسی باتیں بناتے چلے آئے ہیں، شاید یہ جواب ہوگا: وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور: مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (الاحقاف:۹) کا۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ

اور اس سے پہلے کتاب موسیٰ کی تھی راہ ڈالنے والی اور رحمت اور یہ کتاب ہے اس کی تصدیق کرتی ۱؎ عربی زبان میں تاکہ ڈر سنائے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ⑫

گناہ گاروں کو، اور خوشخبری نیکی والوں کو

خلاصہ تفسیر: اور اس (قرآن) سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب (نازل ہو چکی) ہے جو (موسیٰ علیہ السلام کی امت کے لئے بالعموم) رہنما (تھی) اور (اہل ایمان کے لئے بالخصوص) رحمت تھی (اور جس طرح توریت میں اس کی پیشین گوئی ہے) یہ (اسی طرح کی) ایک کتاب ہے جو اس (کی پیشین گوئی) کو سچا کرتی ہے (اور) عربی زبان میں (ہے) ظالموں کو ڈرانے کے لئے اور نیک لوگوں کو بشارت دینے کے لئے (نازل ہوئی ہے، اس سے ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین کی وضاحت ہوگئی)۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى: اس آیت سے ایک تو: ما کنت بدعا من الرسل کا ثبوت ملا کہ آپ کوئی انوکھے رسول اور قرآن کوئی انوکھی کتاب نہیں کہ ان پر ایمان لانے میں لوگوں کو اشکال ہو، بلکہ آپ سے پہلے موسیٰ علیہ السلام رسول ہو کر آ چکے ہیں اور ان پر تورات نازل ہو چکی ہے جس کو یہ کفار یہود و نصاریٰ سبھی تسلیم کرتے ہیں، دوسرے پیچھے جو: شھد شاھد من بنی اسرائیل آیا ہے اس کی بھی تقویت ہوگئی، کیونکہ موسیٰ علیہ

السلام اور تورات خود قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کے شاہد ہیں۔

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ پرانا جھوٹ نہیں بلکہ بہت پرانا سچ ہے، نزول قرآن سے سینکڑوں برس پہلے تورات نے بھی اصولی تعلیم یہ ہی دی تھی جس کی انبیاء و اولیاء اقتداء کرتے رہے اور اس نے پیچھے آنے والی نسلوں کیلئے اپنی تعلیمات و بشارات سے راستہ وہدایت کی راہ ڈال دی اور رحمت کے دروازے کھول دیے اب قرآن اترا تو اس کو سچا ثابت کرتا ہوا، غرض دونوں کتابیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اور یہی حال دوسری کتب سماویہ کا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٣﴾

مقرر جنہوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے تو نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱؎

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾

وہ لوگ ہیں بہشت والے سدا رہیں گے اس میں بدلہ ہے ان کاموں کا جو کرتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے ظالموں کے حق میں وعید اور محسنین یعنی ایمان والوں کے حق میں بشارت کا وعدہ بیان ہوا، اب آگے اس ظلم واحسان کی اور اس وعدہ اور وعید کی کسی قدر تفصیل ہے۔

جن لوگوں نے (سچے دل سے) کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے (یعنی توحید کو رسول کی تعلیم کے مطابق قبول کیا) پھر (اس پر) مستقیم رہے (یعنی اس کو چھوڑا نہیں) سو (یقیناً اس کا نتیجہ یہ ہے کہ) ان لوگوں پر (آخرت میں) کوئی خوف (کی بات واقع ہونے والی) نہیں اور نہ وہ (وہاں) غمگین ہوں گے (یہ تو ان کے نقصان سے بچنے کا بیان تھا، اب اس فائدہ کا ذکر ہے جو ان کو ملنے والا ہے کہ) یہ لوگ اہل جنت ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے بعوض ان (نیک) کاموں کے جو کہ وہ کرتے تھے (جن میں سے ایمان لانے اور اس پر قائم رہنے کا اوپر ذکر ہے)۔

فائدہ: ۱؎ اس طرح کی آیت "حٰم السجدۃ" میں چوبیسویں پارہ میں گزر چکی ہے، وہاں کے فوائد دیکھ لیے جائیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اپنے نیک کاموں کے سبب حق تعالیٰ کی رحمت سے ہمیشہ بہشت میں رہیں گے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ

اور ہم نے حکم کر دیا انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی کا ۱؎ پیٹ میں رکھا اسکو اسکی ماں نے تکلیف سے اور جنا اسکو تکلیف سے ۲؎ اور حمل میں رہنا اسکا

وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي

اور دودھ چھوڑنا تیس مہینوں میں ہے ۳؎ یہاں تک کہ جب پہنچا اپنی قوت کو اور پہنچ گیا چالیس برس کو ۴؎ کہنے لگا اے رب میرے میری قسمت میں کر

أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي

کہ شکر کروں تیرے احسان کا جو تو نے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر اور یہ کہ کروں نیک کام جس سے تو راضی ہو اور مجھ کو دے نیک

فِي ذُرِّيَّتِي ۖ إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿١٥﴾

اولاد میری، میں نے توبہ کی تیری طرف اور میں ہوں حکم بردار ۵؎

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح ہم نے حقوق اللہ کو واجب کیا ہے جس کا ذکر ہو چکا اسی طرح حقوق العباد کو بھی واجب کیا ہے، چنانچہ ان میں سے ایک بہت بڑا حق والدین کا ہے اس لئے) ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے (اور بالخصوص ماں کے ساتھ اور زیادہ کیونکہ) اس کی ماں نے اس کو بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور (پھر) بڑی مشقت کے ساتھ اس کو جنا اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کا دودھ چھڑانا (اکثر) تیس مہینہ (میں پورا ہوتا) ہے (اتنے دنوں طرح طرح کی مصیبت اٹھاتی ہے اور کم وبیش ان مصیبتوں میں باپ کی بھی شرکت ہوتی ہے، بلکہ اکثر امور کا انتظام عادتاً باپ ہی کو کرنا پڑتا ہے اور اپنے آرام میں خلل آجانا یہ دونوں کو برابر طور پر پیش آتا ہے اس لئے بھی ماں باپ کا حق انسان پر زیادہ واجب کیا گیا ہے، غرض اس کے بعد نشوونما پاتا ہے) یہاں تک کہ جب (نشوونما پاتے پاتے) اپنی جوانی کو (یعنی بلوغ کو) پہنچ جاتا ہے اور (پھر بلوغ کے بعد ایک زمانہ میں) چالیس برس (کی عمر) کو پہنچتا ہے تو (جو سعادت مند ہوتا ہے وہ) کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو اس پر مداومت دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر کیا کروں جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں (اگر ماں باپ مسلمان ہیں تب تو دین کی نعمت بھی، ورنہ دنیا کی نعمت تو ظاہر ہی ہے، اور ماں باپ کی نعمت کا اثر اولاد پر بھی پہنچتا ہے، چنانچہ والدین کا وجود اور زندگی جو دنیاوی نعمت ہے اس کی بدولت تو خود اولاد کا وجود ہی ہوتا ہے، اور دینی نعمت کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت اولاد کے لئے علم وعمل کا ذریعہ بنتی ہے) اور (وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مجھ کو اس کی بھی پابندی نصیب کیجئے کہ) میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں، اور میری اولاد میں بھی میرے (نفع کے) لئے صلاحیت پیدا کر دیجئے (اولاد کی صلاحیت سے دنیاوی نفع یہ کہ ان کو دیکھ دیکھ کر راحت ہو، اور آخرت کا نفع یہ کہ اجر وثواب ہو، اور) میں آپ کی جناب میں (گناہوں سے بھی) توبہ کرتا ہوں اور میں (آپ کا) فرمانبردار ہوں (مقصود اس سے اپنی غلامی وبندگی کا اقرار ہے نہ کہ دعویٰ)۔

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا: شروع آیت میں حسن سلوک کا حکم ماں اور باپ دونوں کے لئے ہے مگر اس جگہ صرف ماں کی محنت و مشقت کا ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ماں کی محنت ومشقت ہر حال میں لازمی اور ضروری ہے، باپ کے لئے پرورش پر محنت اٹھانا اتنا لازمی وضروری نہیں، ہوسکتا ہے کہ کسی باپ کو اولاد کی تربیت میں کوئی بھی محنت مشقت اٹھانی نہ پڑے جبکہ وہ مالدار صاحب حشم وخدم ہو، دوسروں سے اولاد کی خدمت لے یا وہ کسی دوسرے ملک میں چلا گیا اور خرچ بھیجتا رہا، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد پر ماں کے حق کو سب سے زیادہ رکھا ہے، یہاں یہ واضح رہے کہ اگر ماں اتنی مشقتیں نہ اٹھائے، یا باپ بالکل بھی مشقت نہ اٹھائے تب بھی والدین کا حق اولاد کے ذمہ ہے۔

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا: یعنی بچے کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس مہینے میں ہے، یہ جمہور کے نزدیک اس حساب پر مبنی ہے کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے، اور رضاعت کی مدت زیادہ سے زیادہ دو سال یعنی چوبیس مہینے ہیں، تو دونوں کا مجموعہ ڈھائی سال یعنی تیس مہینے ہو گئے۔

یہاں آیت میں حمل کی تو اقل مدت کا بیان کیا گیا اور رضاعت کی اکثر مدت کا، اس میں اشارہ ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ متعین ہے اس سے کم میں صحیح سالم بچہ پیدا نہیں ہوسکتا مگر زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ بچہ حمل میں رہ سکتا ہے اس میں عادتیں مختلف ہیں یہ متعین نہیں، اسی طرح رضاعت کی زیادہ سے زیادہ مدت متعین ہے کہ دو سال تک دودھ پلایا جاسکتا ہے، کم سے کم مدت کچھ متعین نہیں، بعض عورتوں کے دودھ ہوتا ہی نہیں، بعض کا دودھ چند مہینوں میں خشک ہوجاتا ہے، بعض بچے ماں کا دودھ زیادہ نہیں پیتے یا ان کو مضر ہوتا ہے تو دوسرا دودھ پلانا پڑتا ہے، آسان صورت یہ ہے کہ حمل اور رضاعت کی مدت کے مجموعہ کو غالب عادت پر محمول کیا جائے کہ عموماً حمل کی مدت نو مہینے اور رضاعت کی مدت اکیس مہینے یعنی پونے دو سال ہوتی ہے، کیونکہ اکثر خواتین دو سال سے قبل بچے کا دودھ چھڑوا دیتی ہیں، اس ترتیب سے مجموعہ تیس ماہ بن جاتے ہیں۔

تفسیر مدارک میں امام اعظمؒ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ: "وحمله بالاکف" یعنی گود میں اور ہاتھوں پر لئے پھرنا جو کہ عام طور پر شیر خوارگی کے زمانہ میں ہوتا ہے، سو اس تفسیر پر اس آیت کی دلالت مدت رضاعت کے ڈھائی سال ہونے پر ہوگی جیسا کہ امام اعظمؒ کا مذہب ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ سے مدت رضاعت ڈھائی سال بیان کی گئی ہے، اس صورت میں یہاں آیت میں بیان کردہ امور میں ترتیب اس طرح ہوگی کہ پہلے حمل، پھر بچہ جننا، پھر اسے ہاتھ اور گود میں لینا اور پھر اس کا دودھ چھڑانا۔

مذکورہ تفسیر پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ سورۃ بقرہ کی آیت: یرضعن اولادھن حولین کاملین میں تو رضاعت کی مدت کامل دو سال بتائی گئی ہے، سواس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ وہاں مطلق رضاعت کی مدت نہیں بیان کی، بلکہ دو سال کی مدت اجرت کے لحاظ سے بیان فرمائی گئی ہوگی کہ اگر بچہ کو کسی دائی سے دودھ پلوانا ہے تو اس سے سے زائد مدت کی رضاعت کے مصارف والد کے ذمہ نہ ہوں گے، احقر کہتا ہے کہ اگر چہ فتویٰ جمہور کے قول پر ہے مگر عمل میں احتیاط کرنا بہتر ہے، احتیاط یہ ہے کہ دودھ پلانے میں تو دو سال سے زائد نہ پلائیں گے، اور اگر کسی نے دو سال کے بعد دودھ پیا ہو تو اس سے نکاح میں احتیاط برتی جائے۔

وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً: چالیس سال کی قید کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے کم عمر میں یہ فکر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ چالیس سال کے بعد پھر غفلت نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ جوانی میں عقل مغلوب ہوتی ہے، اور چالیس سال پر عقل کامل اور غالب ہوتی ہے تو اس وقت خدا کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے، اور اگر آیت کا شان نزول کوئی خاص قصہ ہے جیسا کہ درمنثور میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان میں نازل ہوئی اور انہوں نے چالیس سال کی عمر میں یہ بات کہی تھی تب تو چالیس سال کی خصوصیت کی وجہ ظاہر ہے، اور یہ دعا اس طرح پوری ہوئی ہے کہ حضرت صدیق خود تو مع اولاد کے پہلے ہی اسلام لے آئے تھے اور فتح مکہ کے بعد ان کے والد ابوقحافہ بھی مسلمان ہو گئے تھے اور ان کی والدہ ام الخیر بھی مسلمان ہوگئی تھیں، اس تفسیر کی رو سے اگر چہ یہ سب حالات صدیق اکبرؓ کے بیان ہوئے، مگر حکم عام ہے سب مسلمانوں کو اس کی ہدایت کرنا مقصود ہے کہ آدمی کی عمر جب چالیس سال کے قریب ہوجائے تو اس کو آخرت کی فکر غالب ہوجانی چاہیے، پچھلے گناہوں سے توبہ کی تجدید کرے اور آئندہ کے لیے ان سے بچنے کا پورا اہتمام کرے، کیونکہ عادت اور تجربہ یہ ہے کہ چالیس سال عمر میں جو اخلاق و عادات کسی شخص کی ہوجاتی ہیں پھر ان کا بدلنا مشکل ہوتا ہے۔

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ: حاصل یہ ہوا کہ جو شخص نیک بخت ہوتا ہے وہ اللہ کا حق بھی ادا کرتا ہے اور والدین کے حقوق بھی جو کہ حقوق العباد میں سے ہیں، کیونکہ والدین کے ذریعہ سے جو نعمت اس پر ہوئی ہے وہ بھی خدا کی نعمت ہے اور اس کا پورا شکر والدین کی خدمت پر موقوف ہے، اور اس کے ہمیشہ ادا ہوتے رہنے کی دعا کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس شخص کو اس کی رغبت ہے اور اس کا ارادہ ہے، اور رغبت و ارادہ سے عادتاً ہر کام کی توفیق ہوجاتی ہے، ان سب باتوں سے معلوم ہوگیا کہ ایسا شخص والدین کے حقوق ادا کرتا رہتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ـ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا: قرآن میں کئی جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کے ساتھ ماں باپ کا حق بیان فرمایا ہے، کیونکہ موجد حقیقی تو اللہ ہے، لیکن عالم اسباب میں والدین اولاد کے وجود کا سبب ظاہری اور حق تعالیٰ کی شان ربوبیت کا مظہر خاص بنتے ہیں، یہاں بھی پہلے :اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (الاحقاف: ۱۳) میں اللہ تعالیٰ کے حقوق کا ذکر تھا، اب والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے، ان کی تعظیم و محبت اور خدمت گزاری کو اپنی سعادت سمجھے، دوسری جگہ بتلایا ہے کہ اگر والدین مشرک ہوں تب بھی ان کے ساتھ دنیا میں معاملہ اچھا رکھنا چاہیے، خصوصاً ماں کی خدمت گزاری کے بعض وجوہ سے اس کا حق باپ سے بھی فائق ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ اس پر دال ہیں۔

فائدہ: ۲ـ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا: یعنی حمل جب کئی مہینہ کا ہوجاتا ہے اس کا ثقل محسوس ہونے لگتا ہے اس حالت میں اور تولد کے وقت ماں کیسی کیسی صعوبتیں برداشت کرتی ہے، پھر دودھ پلاتی اور برسوں تک اس کی ہر طرح نگہداشت رکھتی ہے، اپنی آسائش و راحت کو اس کی آسائش و راحت پر قربان کردیتی ہے، باپ بھی بڑی حد تک ان تکلیفوں میں شریک رہتا اور سامان تربیت فراہم کرتا ہے، بیشک یہ سب کام فطرت کے تقاضے سے ہوتے ہیں، مگر اسی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اولاد ماں باپ کی شفقت و محبت کو محسوس اور ان کی محنت و ایثار کی قدر کرے۔

تنبیہ: حدیث میں ماں کی خدمت گزاری کا تین مرتبہ حکم فرما کر باپ کی خدمت گزاری کا ایک مرتبہ حکم فرمایا ہے، لطف یہ ہے کہ آیہ ہٰذا میں ''والد'' کا ذکر صرف ایک مرتبہ لفظ: والدیہ میں ہوا، اور ''والدہ'' کا تین مرتبہ ذکر لفظ: وَالِدَيْهِ میں، پھر: حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ میں، پھر: وَضَعَتْهُ میں۔

فائدہ: ۳ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا: شاید یہ بطور عادت اکثر یہ کے فرمایا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''لڑکا اگر قوی ہو تو اکیس مہینہ میں دودھ چھوڑتا ہے اور نو مہینے ہیں حمل کے''، یا یوں کہو کہ کم از کم مدت حمل چھ مہینے ہیں اور دو برس میں عموماً بچوں کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے، اس طرح کل مدت تیس مہینے ہوئے، مدت رضاع کا اس سے زائد ہونا نہایت قلیل و نادر ہے۔

فائدہ: ۴ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً: چالیس برس کی عمر میں عموماً انسان کی عقلی اور اخلاقی قوتیں پختہ ہو جاتی ہیں اسی لیے انبیاء علیہم السلام کی بعثت چالیس برس سے پہلے نہ ہوتی تھی۔

فائدہ: ۵ وَاِنِّىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ: یعنی سعادت مند آدمی ایسا ہوتا ہے کہ جو احسانات اللہ تعالی کے اس پر اور اس کے ماں باپ پر ہو چکے ان کا شکر ادا کرنے اور آئندہ نیک عمل کرنے کی توفیق خدا سے چاہے اور اپنی اولاد کے حق میں بھی نیکی کی دعا مانگے، جو کوتاہی حقوق اللہ یا حقوق العباد میں رہ گئی ہو، اس سے توبہ کرے اور از راہ تواضع و بندگی اپنی مخلصانہ عبودیت و فرمانبرداری کا اعتراف کرے۔

تنبیہ: صحابہؓ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، بڑے ہی خوش قسمت تھے کہ خود ان کو، ان کے ماں باپ کو اور اولاد کو ایمان کے ساتھ صحبت نبی ﷺ کا شرف میسر ہوا، دیگر صحابہ میں یہ خصوصیت کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ

یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم قبول کرتے ہیں بہتر سے بہتر کام جو کئے ہیں اور معاف کرتے ہیں ہم برائیاں انکی رہنے والے جنت کے لوگوں میں

وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ⑯

سچا وعدہ جو ان سے کیا جاتا تھا

خلاصہ تفسیر: (گزشتہ آیت میں مذکور نیک اعمال کا اب نتیجہ بیان فرماتے ہیں کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ ہم ان کے نیک کاموں کو قبول کرلیں گے اور ان کے گناہوں سے درگزر کردیں گے اس طور پر کہ یہ اہل جنت میں سے ہوں گے (اور یہ سب) اس وعدہ صادقہ کی وجہ سے (ہوا) جس کا ان سے (دنیا میں) وعدہ کیا جاتا تھا۔

وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ: پیچھے آیت تبت الیك میں توبہ کا ذکر آیا ہے، اس کے بعد یہاں گناہوں سے درگزر کرنے کا وعدہ بیان ہوا ہے، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ بغیر توبہ کے گناہ معاف نہیں ہوتے، کیونکہ محض فضل سے بھی معافی ہو جاتی ہے، اصل یہ ہے کہ یہاں یہ مقصود نہیں کہ معافی توبہ پر موقوف ہے، بلکہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ توبہ پر معافی کا وعدہ موقوف ہے، بغیر توبہ کے معافی کا وعدہ نہیں، لیکن گناہوں کا معاف ہونا وعدہ ہی پر موقوف نہیں ہے، بغیر وعدہ کے بھی معافی ہو سکتی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی ایسے بندوں کی نیکیاں قبول اور کوتاہیاں معاف ہوتی ہیں اور ان کا مقام اللہ کے سچے وعدہ کے موافق جنت میں ہے۔

وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ۚ

اور جس شخص نے کہا اپنے ماں باپ کو میں بیزار ہوں تم سے ۱ کیا مجھ کو وعدہ دیتے ہو کہ میں نکالا جاؤں گا قبر سے اور گزر چکی ہیں بہت جماعتیں مجھ سے پہلے ۲

وَهُمَا يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَيَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ⑰

اور وہ دونوں فریاد کرتے ہیں اللہ سے کہ اے خرابی تیری تو ایمان لے آ، بیشک وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے ۳ پھر کہتا ہے یہ سب نقلیں ہیں پہلوں کی ۴

خلاصہ تفسیر: یہاں تک تو محسنین اور خوش بخت لوگوں کا بیان ہوا، اب آگے ظالم اور بد بخت لوگوں کا ذکر ہے یعنی:
اور جس نے (حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو پامال کر دیا جیسا اس کے اس حال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے) اپنے ماں باپ سے کہا (جن کے حق کی حقوق العباد میں سب سے زیادہ تاکید ہے خصوصاً جبکہ وہ مسلمان بھی ہوں اور خصوصاً جبکہ وہ اولاد کو بھی اسلام کی دعوت دے رہے ہوں) کہ تف ہے تم پر کیا تم مجھ کو یہ وعدہ (یعنی خبر) دیتے ہو کہ میں (قیامت میں دوبارہ زندہ ہو کر) قبر سے نکالا جاؤں گا حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی امتیں گزر گئیں (جن کو ہر زمانے میں ان کے پیغمبر یوں ہی خبریں دیتے چلے آئے مگر آج تک کسی وعدہ کا ظہور نہ ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں) اور وہ دونوں (غریب ماں باپ اس کے اس انکار سے کہ جو کفر عظیم ہے گھبرا کر) اللہ سے فریاد کر رہے ہیں (اور نہایت دردمندی سے اس سے کہہ رہے ہیں) کہ ارے تیرا ناس ہو ایمان لا (اور قیامت کو بھی برحق سمجھ) بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے، تو یہ (اس پر بھی) کہتا ہے کہ یہ بے سند باتیں اگلوں سے منقول چلی آ رہی ہیں (مطلب یہ کہ ایسا شقی اور بدنصیب ہے کہ اس نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو ضائع کیا، یعنی کفر اور ماں باپ کی نافرمانی اور ان سے بدسلوکی دونوں کا مرتکب ہے، اور بدسلوکی بھی اس درجہ کی کہ ماں باپ کی نافرمانی کے ساتھ ان سے گفتگو میں بھی بدتمیزی کرتا ہے)۔

وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ: مروان نے جو اس آیت کا مصداق حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو اپنے کسی خطبے میں کہا تھا اس کی تکذیب صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے، مروان نے محض عداوت سے کہہ دیا تھا، اور اگلی آیت سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے، صحیح بات یہی ہے کہ آیت کا مفہوم عام ہے کسی صحیح روایت میں کسی فرد کا مصداق آیت ہونا منقول نہیں۔

* * *

فائدہ: ١ سعادت مند اولاد کے مقابلہ میں یہ بے ادب، نافرمان، اور نالائق اولاد کا ذکر فرمایا کہ ماں باپ اس کو ایمان کی بات سمجھاتے ہیں، وہ نہیں سمجھتا نہایت گستاخانہ خطاب کر کے ایذاء پہنچاتا ہے۔

فائدہ: ٢ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی دھمکیوں سے میں نہیں ڈرتا، بھلا کتنی قومیں اور جماعتیں مجھ سے پہلے گزر چکی ہیں، کوئی شخص بھی ان میں سے اب تک دوبارہ زندہ ہو کر واپس آیا؟ لوگ ہمیشہ سے یونہی سنتے چلے آتے ہیں مگر آج تک تو اس خبر کا تحقق ہوا نہیں، پھر میں کیونکر اعتبار کر لوں۔

فائدہ: ٣ یعنی اس کی گستاخیوں پر ایک طرف اللہ سے فریاد کرتے اور دعا مانگتے ہیں کہ اسے قبول حق کی توفیق ملے اور دوسری طرف اس کو سمجھاتے ہیں کہ کم بخت تیرا ستیاناس! اب بھی باز آ جا! دیکھ اللہ کا وعدہ بالکل سچا ہے بعث بعد الموت کی جو خبر اس نے دی ہے ضرور اپنے وقت پر پوری ہو کر رہے گی، اس وقت تیرا یہ انکار رنگ لائے گا۔

فائدہ: ٤ یعنی ایسی کہانیاں بہت سنی ہیں، پرانے وقتوں کے قصے اسی طرح مشہور ہو جاتے ہیں اور واقع میں ان کا مصداق کچھ نہیں ہوتا۔

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ

یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر ثابت ہوئی بات عذاب کی شامل اور فرقوں میں جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے جنوں کے اور آدمیوں کے ١

اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝١٨

بیشک وہ تھے ٹوٹے میں پڑے ٢

خلاصہ تفسیر: (گزشتہ آیت میں مذکور برے اعمال کا اب انجام بیان فرماتے ہیں کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے حق میں بھی ان لوگوں کے ساتھ اللہ کا قول (یعنی عذاب کا وعدہ) پورا ہو کر رہا جو ان سے پہلے جن اور انسان (کفار) ہو گزرے ہیں، بیشک یہ (سب) خسارہ میں رہے۔

* * *

فائدہ: ل ''عذاب کی بات'' وہ ہی ہے: لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ (السجدہ: ۱۳) یعنی جس طرح بہت سی جماعتیں جنوں اور آدمیوں کی ان سے پہلے جہنم کی مستحق ہو چکی ہیں، یہ بدبخت بھی ان ہی میں شامل ہیں۔

فائدہ: ۲ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہر آدمی کے دل میں فطری طور پر جو بیج ایمان وسعادت کا بکھیرا تھا وہ بھی ان بدبختوں نے ضائع کر دیا، اس سے زیادہ ٹوٹا اور خسارہ کیا ہوگا کہ کوئی شخص تجارت میں بجائے منافع حاصل کرنے کے راس المال کو بھی اپنی غفلت اور حماقت سے ضائع کر بیٹھے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمۡ اَعۡمَالَهُمۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ⑲

اور ہر فرقہ کے کئی درجے ہیں اپنے کئے کاموں کے موافق ل اور تاکہ پورے دے ان کو کام ان کے اور ان پر ظلم نہ ہوگا ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے بیان کردہ تفصیلی مضمون کو اب خلاصہ واجمال کے طور پر بیان فرماتے ہیں کہ:

اور (مذکورہ دونوں فریقوں میں سے) ہر ایک (فریق) کے لئے ان کے (مختلف) اعمال کی وجہ سے الگ الگ درجے (کسی کو جنت کے، کسی کو دوزخ کے) ملیں گے، اور (مختلف درجے اس لئے ملیں گے) تاکہ اللہ تعالیٰ سب کو ان کے اعمال (کی جزا) پوری کر دے اور ان پر (کسی طرح کا) ظلم نہ ہوگا۔

* * *

فائدہ: ل یعنی اعمال کے تفاوت کی وجہ سے اہل جنت کے کئی درجے ہیں اور اسی طرح اہل دوزخ کے بھی۔

فائدہ: ۲ نہ کسی نیکی کا ثواب کم کیا جائے گا نہ کسی جرم کی سزا حد مناسب سے زائد کی جائے گی۔

وَيَوۡمَ يُعۡرَضُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا عَلَى النَّارِ ؕ اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا

اور جس دن لائے جائیں گے منکر آگ کے کنارہ پر، ضائع کیے تم نے اپنے مزے دنیا کی زندگانی میں

وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا ۚ فَالۡيَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡهُوۡنِ بِمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَكۡبِرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ

اور ان کو برت چکے ل اب آج سزا پاؤ گے ذلت کا عذاب بدلہ اس کا جو تم غرور کرتے تھے ملک میں ناحق

بِغَيۡرِ الۡحَقِّ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَفۡسُقُوۡنَ ⑳ ع ۲

اور اس کا جو تم نافرمانی کرتے تھے ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے محسنین یعنی نیک کاروں کی جزا میں تو جنت کو متعین طور پر سے بیان کر دیا گیا تھا مگر ظالمین کا عذاب متعین کر کے نہیں بتا صرف اشارہ کر دیا تھا کہ: حق علیهم القول اور كانوا خسرين، چنانچہ اب ظالمین کے لیے عذاب کو صاف طور پر معین فرماتے ہیں۔

اور وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) کہ تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے (یہاں کوئی لذت تم کو نصیب نہ ہوگی) اور ان کو خوب برت چکے (حتیٰ کہ ان میں پڑ کر ہم کو بھی بھول گئے) سو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی (چنانچہ سزا کے لئے جہنم ہے اور ذلت کے لیے یہ ملامت اور پھٹکار ہے) اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے (تکبر سے مراد ایسا تکبر ہے جو ایمان سے باز رکھے کیونکہ دائمی عذاب اسی کے ساتھ خاص ہے) اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانیاں کیا کرتے تھے (اس میں کفر، فسق، ظلم اور ان کی تمام صورتیں داخل ہو گئیں)۔

اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا: اس میں زہد کی ترغیب دلالت ہے اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دنیا کی لذتوں میں اس

قدر توسع کرنا کہ معاصی اور گناہوں میں ابتلا ہو جائے تو یہ خطرے کی بات ہے۔

بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ: یہاں فی الارض کی قید سے اس طرف اشارہ ہے کہ زمین پر رہ کر تکبر کرنا اور بھی زیادہ برا ہے، اور ''ناحق'' کی قید واقعی ہے، کیونکہ مخلوق سے تکبر کا ظاہر ہونا ہمیشہ ناحق ہی ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ کافر کے کسی نیک کام میں ایمان کی روح نہیں ہوتی، محض صورت اور ڈھانچہ نیکی کا ہوتا ہے، ایسی فانی نیکیوں کا اجر بھی فانی ہے جو اسی زندگی میں مال، اولاد، حکومت، تندرستی، عزت وشہرت وغیرہ کی شکل میں مل جاتا ہے، اس کو فرمایا کہ تم اپنی صوری نیکیوں کے مزے دنیا میں لے چکے اور وہاں کی لذتوں سے تمتع کر چکے، جو عیش وآرام ایمان لانے کی تقدیر پر آخرت میں ملتا، گویا اس کی جگہ بھی دنیا میں مزے اڑا لیے، اب یہاں کے عیش میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جن لوگوں نے آخرت نہ چاہی فقط دنیا ہی چاہی ان کی نیکیوں کا بدلہ اسی دنیا میں مل چکا''۔

فائدہ: ۲؎ یعنی آج تمہاری جھوٹی شیخی اور نافرمانیوں کی سزا میں ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب دیا جائے گا، یہ ہی ایک چیز تمہارے لیے یہاں باقی ہے آگے بعض زور آور اور متکبر قوموں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ آخرت سے پہلے دنیا ہی میں ان کا انجام کیا ہوا۔

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖۤ

اور یاد کر عاد کے بھائی کو ۱؎ جب ڈرایا اپنی قوم کو احقاف میں ۲؎ اور گزر چکے تھے ڈرانے والے اس کے آگے سے اور پیچھے سے

اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾

کہ بندگی نہ کرو کسی کی، اللہ کے سوا میں ڈرتا ہوں تم پر آفت سے ایک بڑے دن کی ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے مکہ والوں کو سنانے کے لیے کفر کی اور تمام دنیا میں منہمک ہونے مذمت اور قباحت مذکور تھی، اب آگے قوم عاد کا قصہ یاد دلاتے ہیں کہ وہ بھی عرب تھے جس سے پیچھے کے مضمون کی تاکید مقصود ہے۔

اور آپ قوم عاد کے بھائی (یعنی ہود علیہ السلام) کا (ان سے) ذکر کیجئے جبکہ انہوں نے اپنی قوم کو جو کہ ایسے مقام پر رہتے تھے کہ وہاں ریگ کے مستطیل خم دار تودے تھے (یہ مقام کی نشان دہی اس لئے کی گئی تا کہ سننے والوں کے ذہن میں استحضار ہو جائے) اس (بات) پر (عذاب الٰہی سے) ڈرایا کہ تم خدا کے سوا کسی کی عبادت مت کرو (ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا) اور (یہ ایسی ضروری اور صحیح بات ہے کہ) ان (ہود علیہ السلام) سے پہلے اور ان کے پیچھے (اسی مضمون کے متعلق) بہت سے ڈرانے والے (پیغمبر اب تک) گزر چکے ہیں (اس جملہ کے بڑھانے سے توحید کے مضمون کی تاکید مقصود ہے، اور عجب نہیں کہ ہود علیہ السلام نے تمام انبیاء کا توحید کی دعوت میں متفق ہونا ان کے سامنے بیان بھی کیا ہو، اور ہود علیہ السلام نے انذار میں یہ فرمایا کہ) مجھ کو تم پر ایک بڑے (سخت) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (اگر اس سے بچنا ہے تو توحید قبول کرلو)۔

اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ: قوم عاد کی سکونت اکثر کے بقول یمن کے شہروں میں تھی، اور وہاں ریت کے ٹیلے تھے، عرب کے لوگ تجارت کے لیے اکثر سفر کرتے تو ان مقامات پر گزرتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہود علیہ السلام جو ''عاد'' کے قومی بھائی تھے۔

فائدہ: ۲؎ مؤلف ''ارض القرآن''، بلاد ''الاحقاف'' کے تحت میں لکھتا ہے: ''یمامہ، عمان، بحرین، حضر موت اور مغربی یمن کے بیچ میں جو صحرائے اعظم ''الدہنا'' یا ''ربع خالی'' کے نام سے واقع ہے گو وہ آبادی کے قابل نہیں، لیکن اس کے اطراف میں کہیں کہیں آبادی کے لائق تھوڑی زمین ہے، خصوصاً اس حصہ میں جو حضر موت سے نجران تک پھیلا ہوا ہے، گو اس وقت وہ بھی آباد نہیں تاہم عہد قدیم میں اسی حضر موت اور نجران کے

درمیان حصہ میں "عادِارم" کا مشہور قبیلہ آباد تھا جس کو خدا نے اس کی نافرمانی کی پاداش میں نیست ونابود کردیا"۔

فائدہ: ۳ یعنی ہود علیہ السلام سے پہلے اور پیچھے بہت ڈرانے والے آئے، سب نے وہ ہی کہا جو حضرت ہود علیہ السلام نے کہا تھا یعنی ایک خدا کی بندگی کرو اور کفر ومعصیت کے برے انجام سے ڈرو، ممکن ہے قوم عاد میں بھی حضرت ہود علیہ السلام کے علاوہ اور نذیر آئے ہوں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٢﴾

بولے کیا تو آیا ہے ہمارے پاس کہ پھیر دے ہم کو ہمارے معبودوں سے، سو لے آ ہم پر جو وعدہ کرتا ہے اگر ہے تو سچا ۱

قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿٢٣﴾

کہا یہ خبر تو اللہ ہی کی ہے، اور میں تو پہنچا دیتا ہوں جو کچھ بھیج دیا میرے ہاتھ لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ نادانی کرتے ہو ۲

خلاصہ تفسیر: وہ کہنے لگے کیا تم ہمارے پاس اس ارادے سے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے پھیر دو، سو (ہم تو پھرنے والے ہیں نہیں، باقی) اگر تم سچے ہو تو جس (عذاب) کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو اس کو ہم پر واقع کردو، انہوں نے فرمایا کہ پورا علم تو خدا ہی کو ہے (کہ عذاب کب تک آئے گا) اور مجھ کو تو جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے میں تم کو وہ پہنچا دیتا ہوں (چنانچہ اس میں مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ تم پر عذاب آئے گا میں نے تم کو اطلاع کردی، اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم ہے اور نہ قدرت) لیکن میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نری جہالت کی باتیں کرتے ہو (کہ ایک تو توحید کو قبول نہیں کرتے، پھر اپنے منہ سے بلا مانگتے ہو، پھر مجھ سے اس کی فرمائش کرتے ہو، البتہ میں اپنے سچے ہونے کا مدعی ہوں جس پر دلیل قائم کرچکا ہوں، اور جس چیز میں تم کو شبہ ہے اس کے واقع ہونے کا وقت مجھ کو نہیں بتلایا گیا، ہاں جب عذاب آئے گا تو اس وقت اللہ چاہے تو دیکھ لینا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہم اپنے آبائی طریقہ سے ہٹنے والے نہیں، اگر تو اپنی دھمکیوں میں سچا ہے تو دیر کیا ہے جو زبان سے کہتا ہے کر کے دکھلا دے۔

فائدہ: ۲ یعنی اس قسم کا مطالبہ کرنا تمہاری نادانی اور جہالت ہے، میں خدا کا پیغمبر ہوں جو پیام میرے ہاتھ بھیجا گیا وہ پہنچا رہا ہوں، اس سے زائد کا نہ مجھے علم نہ اختیار، یہ علم خدا ہی کو ہے کہ منکر قوم کس وقت دنیاوی سزا کی مستوجب ہوتی ہے اور کس وقت تک اسے مہلت ملنی چاہیے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَمَا

پھر جب دیکھا اس کو ابر سامنے آیا ان کے نالوں کے، بولے یہ ابر ہے ہم پر برسے گا ۱ کوئی نہیں یہ تو وہ چیز ہے

اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٤﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا

جس کی تم جلدی کرتے تھے، ہوا ہے جس میں عذاب ہے دردناک ۲ اکھاڑ پھینکے ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے پھر کل کو رہ گئے

لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٢٥﴾

کہ کوئی نظر نہیں آتا تھا سوائے ان کے گھروں کے، یوں ہم سزا دیتے ہیں گناہ گار لوگوں کو ۳

خلاصہ تفسیر: غرض جب کسی طرح انہوں نے حق کو قبول نہ کیا تو عذاب کا سامان اس طرح شروع ہوا کہ اول ایک بادل اٹھا: سو ان لوگوں نے جب اس بادل کو اپنی وادیوں کے مقابل آتا دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا (ارشاد ہوا کہ) نہیں

(برسنے والا بادل نہیں) بلکہ یہ وہی (عذاب) ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے (کہ وہ عذاب جلدی لاؤ اور اس بادل میں) ایک آندھی ہے جس میں درد ناک عذاب ہے، وہ (آندھی) ہر چیز کو (جس کے ہلاک کرنے کا حکم ہوگا) اپنے رب کے حکم سے ہلاک کر دے گی، چنانچہ (وہ آندھی آدمیوں اور جانوروں کو اٹھا اٹھا کر پٹخ دیتی تھی جس سے) وہ ایسے (تباہ) ہو گئے کہ بجز ان کے مکانات کے اور کچھ (آدمی اور حیوان) نہ دکھلائی دیتا تھا، ہم مجرموں کو یوں ہی سزا دیا کرتے ہیں۔

عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ: ''وادی'' کہتے ہیں نشیبی زمین کو جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے کبھی اس کا ترجمہ میدان سے کیا جاتا ہے اور کبھی اس کا ترجمہ ندی نالہ سے کیا جاتا ہے۔

درمنثور میں آدمیوں اور جانوروں کا اس ہوا میں اڑے اڑے پھرنا حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سامنے سے بادل اٹھتا ہوا دکھائی دیا، سمجھے کہ سب ندی نالے بھر جائیں گے م کہنے لگے کہ بہت برسا ؤ گھٹا اٹھی ہے، اب کام بن جائے گا، اس وقت طویل خشک سالی کی وجہ سے پانی کی بہت ضرورت تھی۔

فائدہ: ۲ یعنی یہ برساؤ بادل نہیں بلکہ عذاب الٰہی کی آندھی ہے وہ ہی جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔

فائدہ: ۳ سات رات اور آٹھ دن مسلسل ہوا کا وہ غضب ناک طوفان چلا جس کے سامنے درخت، آدمی اور جانوروں کی حقیقت تنکوں سے زیادہ نہ تھی، ہر چیز ہوا نے اکھاڑ پھینکی اور چاروں طرف تباہی نازل ہوگئی، آخر مکانوں کے کھنڈرات کے سوا کوئی چیز نظر نہ آتی تھی، دیکھ لیا! اللہ کے مجرموں کا حال یہ ہوتا ہے، چاہیے کہ ان واقعات کو سن کر ہوش میں آؤ، ورنہ تمہارا بھی یہ ہی حال ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ

اور ہم نے مقدور دیا تھا ان کو ان چیزوں کا جنکا تم کو مقدور نہیں دیا ۱ اور ہم نے ان کو دیے تھے کان اور آنکھیں اور دل پھر کام نہ آئے انکے

سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ

کان ان کے اور آنکھیں ان کی اور نہ دل ان کے کسی چیز میں ۲ اس لیے کہ منکر ہوتے تھے اللہ کی باتوں سے الٹ پڑی ان پر

ع مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾

جس بات سے کہ وہ ٹھٹھا کرتے تھے ۳

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے ان (یعنی قوم عاد کے) لوگوں کو ان باتوں میں قدرت دی تھی کہ تم کو ان باتوں میں قدرت نہیں دی (مراد ان باتوں سے وہ کام ہیں جو جسمانی اور مالی قوت پر موقوف ہیں) اور ہم نے ان کو کان اور آنکھ اور دل (سب ہی کچھ) دیئے تھے، سو چونکہ وہ لوگ آیات الٰہیہ کا انکار کرتے تھے اس لئے (جب ان پر عذاب آیا ہے تو) نہ ان کے کان ان کے ذرا کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل اور جس (عذاب) کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اسی نے ان کو آ گھیرا (یعنی نہ ان کے حواس ان کو عذاب سے بچا سکے اور نہ ان کی تدبیر جس کا ادراک دل سے ہوتا ہے، نہ ان کی قوت پس تمہاری تو کیا حقیقت ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی مال، اولاد، جتھے، اور جسمانی طاقت جو ان کو دی گئی تھی، تم کو نہیں دی گئی، مگر جب عذاب آیا، کوئی چیز کام نہ آئی، پھر تم کس بات پر مغرور ہو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی نصیحت سننے کے لیے کان اور قدرت کی نشانیاں دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سمجھنے بوجھنے کے لیے دل دیے گئے تھے، پر وہ کسی قوت کو کام میں نہ لائے، اندھے، بہرے اور پاگل بن کر پیغمبروں کے مقابل ہو گئے، آخر انجام یہ ہوا کہ یہ قوتیں سب موجود ہیں اور عذاب الٰہی نے آگھیرا، کوئی اندرونی یا بیرونی قوت اس کو دفع نہ کر سکی۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جس عذاب کی ہنسی اڑایا کرتے تھے وہ ان پر واقع ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ان کو دل اور کان اور آنکھ دی تھی، یعنی دنیا کے کام میں عقلمند تھے، وہ عقل نہ آئی جس سے آخرت بھی درست ہو''۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٧﴾

اور ہم غارت کر چکے ہیں جتنی تمہارے آس پاس ہیں بستیاں ۱؎ اور طرح طرح پھیر کر سنائیں ان کو باتیں تاکہ وہ لوٹ آئیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے قوم عاد کا قصہ کچھ تفصیل سے بیان ہوا، اب آگے دوسری ایسی ہی قوموں کا ذکر ہے جن پر عذاب آئے اور ہلاک ہوئے، ان کی اجڑی ہوئی بستیاں بھی اہل مکہ کے سفر کے وقت راستے میں آتی تھیں، عبرت حاصل کرنے کے لیے ان کا اجمالی بیان ہے۔

اور ہم نے تمہارے آس پاس کی اور بستیاں بھی (اس کفر وشرک کے سبب) غارت کی ہیں (جیسے ثمود اور قوم لوط کہ ملک شام کو جاتے ہوئے ان بستیوں سے گزرتے تھے اور چونکہ مکہ سے ایک طرف یمن ہے دوسری جہت میں شام ہے اس لئے ''آس پاس'' فرما دیا) اور ہم نے (ہلاک کرنے سے پہلے ان کے سمجھانے کے لئے) بار بار اپنی نشانیاں (ان کو) بتلا دی تھیں تاکہ وہ (کفر وشرک سے) باز آئیں (مگر باز نہ آئے اور ہلاک ہوئے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ''عاد'' کے سوا ''قوم ثمود'' اور ''قوم لوط'' وغیرہ کی بستیاں بھی اسی طرح تباہ کی جا چکی ہیں، جو تمہارے آس پاس واقع تھیں، یہ مکہ والوں کو فرمایا، کیونکہ سفروں میں ان کا گزر ان مقامات کی طرف ہوتا تھا۔

فائدہ: ۲؎ مگر اتنا سمجھانے پر بھی وہ باز نہ آئے۔

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ

پھر کیوں نہ مدد پہنچی ان کو ان لوگوں کی طرف سے جن کو پکڑا تھا اللہ سے ورے معبود بڑے درجے پانے کو ۱؎ کوئی نہیں گم ہو گئے ان سے ۲؎

وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٨﴾

اور یہ جھوٹ تھا ان کا اور جو اپنے جی سے باندھتے تھے ۳؎

خلاصہ تفسیر: سو خدا کے سوا جن جن چیزوں کو انہوں نے خدا تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنا معبود بنا رکھا تھا (کہ یہ مصیبت میں ہمارے کام آئیں گے، ہلاکت وعذاب کے وقت) انہوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی بلکہ وہ سب ان سے غائب ہو گئے، اور وہ (معبود اور شفیع سمجھنا) محض ان کی تراشی ہوئی اور گھڑی ہوئی بات ہے (اور کہیں واقع میں وہ سفارش کرنے والے یا معبود تھوڑا ہی تھے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جن بتوں کی نسبت کہا کرتے تھے کہ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ سے نزدیک کر دیں اور بڑے بڑے درجے دلائیں وہ اس آڑے وقت میں کیوں کام نہ آئے، اب ذرا ان کو بلایا ہوتا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی آج ان کا کہیں پتہ نہیں، نہ عذاب کے وقت ان کو پکارا جاتا ہے آخر وہ گئے کہاں جو ایسی مصیبت میں بھی کام نہیں آتے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ظاہر ہوا کہ بتوں کو خدا بنانا اور ان سے امیدیں قائم کرنا، محض جھوٹی اور من گھڑت باتیں تھیں، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے

پھر وہ چلے کیسے۔

ربط: اوپر کی آیات میں انسانوں کے تمرد وسرکشی کی داستان تھی، آگے اس کے مقابل جنوں کی اطاعت وفرمانبرداری کا حال سناتے ہیں، تا کہ معلوم ہو کہ جو قوم طبعی طور پر سخت متمرد اور سرکش واقع ہوئی ہے اسکے بعض افراد کس طرح اللہ کا کلام سن کر موم ہو جاتے ہیں۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ

اور جس وقت متوجہ کر دیئے ہم نے تیری طرف کتنے لوگ جنوں میں سے سننے لگے قرآن، پھر جب وہاں پہنچ گئے بولے چپ رہو

فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٢٩﴾

پھر جب ختم ہوا اُلٹے پھرے اپنی قوم کو ڈر سناتے ہوئے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار مکہ کو سنانے کے لیے کفر اور تکبر کی مذمت بیان ہوئی، اب آگے اسی کی تاکید کے لیے عار دلانے کو بعض جنات کے اسلام لانے کا قصہ بیان فرمایا جاتا ہے جس کا حاصل مقصود یہ ہے کہ جنات جو تکبر میں انسان سے زیادہ ہوتے ہیں وہ تکبر کو چھوڑ کر کفر سے دست بردار ہو گئے مگر تم جو کہ انسان ہو تکبر اور کفر سے باز نہیں آتے۔

اور (ان سے اس وقت کا قصہ ذکر کیجئے) جبکہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو (اخیر میں یہاں پہنچ کر) قرآن سننے لگے تھے، غرض جب وہ لوگ قرآن (کے پڑھے جانے کے موقع) کے پاس آ پہنچے تو (آپس میں) کہنے لگے کہ خاموش رہو (اور اس کلام کو سنو) پھر جب قرآن پڑھا جا چکا (یعنی جتنا اس وقت پیغمبر ﷺ کو نماز میں پڑھنا تھا ختم ہو چکا) تو وہ لوگ (اس پر ایمان لے آئے اور) اپنی قوم کے پاس (اس کی) خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ: جنات کے قرآن سننے اور ایمان لانے کا واقعہ صحیح احادیث میں اس طرح آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت جب جنات کو آسمانی خبریں سننے سے روک دیا گیا تو آپ کی نبوت وبعثت کے بعد جو جن آسمانی خبریں سننے کے لئے اوپر جاتا تو اس پر شہاب ثاقب پھینک کر دفع کر دیا جانے لگا، جنات میں اس کا تذکرہ ہوا کہ اس کا سبب معلوم کرنا چاہئے کہ کون سا نیا واقعہ دنیا میں ہوا ہے جس کی وجہ سے جنات کو آسمانی خبروں سے روک دیا گیا، جنات کے مختلف گروہ دنیا کے مختلف خطوں میں اس کی تحقیقات کے لئے پھیل گئے، ان کا ایک گروہ حجاز کی طرف بھی پہنچا اس روز آنحضرت ﷺ اپنے چند صحابہ کے ساتھ مقام بطن نخلہ میں تشریف فرما تھے اور سوق عکاظ کی طرف جانے کا قصد تھا، رسول اللہ ﷺ غالباً دعوت وتبلیغ اسلام کے لئے اس طرف تشریف لے جا رہے تھے، اس مقام بطن نخلہ میں آپ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے کہ وہ جنات یہاں پہنچے، قرآن سن کر کہنے لگے کہ بس وہ نئی بات یہی ہے جو ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حائل ہوئی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ جنات جب یہاں آئے تو باہم کہنے لگے کہ خاموش ہو کر قرآن سنو، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو اسلام کی حقانیت پر یقین وایمان لا کر اپنی قوم کے پاس واپس گئے اور ان کو اس واقعہ کے اصلی سبب کی اور اس کی خبر دی کہ ہم تو مسلمان ہو گئے، تم کو بھی چاہئے کہ ایمان لے آؤ، مگر رسول اللہ ﷺ کو ان جنات کے آنے جانے اور قرآن سن کر ایمان لے آنے کی خبر نہیں ہوئی یہاں تک کہ سورۃ جن کا نزول ہوا جس میں آپ کو اس واقعہ کی خبر دی گئی۔

اور ایک روایت میں ہے کہ یہ جنات مقام نصیبین کے رہنے والے تھے اور کل نو یا بعض روایات کے مطابق سات تھے، جب انہوں نے اپنی قوم کو یہ خبر سنائی اور ایمان لانے کی ترغیب دی تو پھر ان میں سے تین سو اشخاص اسلام لانے کے لئے حاضر خدمت ہوئے، اور دوسری حدیثوں میں جنات کے آنے کی روایت دوسری طرح کی بھی آئی ہیں مگر چونکہ یہ متعدد واقعات مختلف اوقات میں پیش آئے ہیں اس لئے کوئی تعارض نہیں اور اس کی

تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو طبرانی نے اوسط میں اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بار بار حاضر ہوئے، خفاجی نے فرمایا کہ احادیث کی روایات جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرنے کے واقعات چھ مرتبہ پیش آئے ہیں، اسی واقعہ کی تفصیل یہاں آیات میں بیان کی گئی ہے۔

* * *

فائدہ: بعثت محمدی ﷺ سے قبل جنوں کو کچھ آسمانی خبریں معلوم ہو جاتی تھیں، جب حضور ﷺ پر وحی آنا شروع ہوئی وہ سلسلہ تقریباً بند ہو گیا اور بہت کثرت سے شہاب کی مار پڑنے لگی، جنوں کو خیال ہوا کہ ضرور کوئی نیا واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے آسمانی خبروں پر بہت سخت پہرے بٹھلائے گئے ہیں، اسی کی جستجو کے لیے جنوں کے مختلف گروہ مشرق و مغرب میں پھیل پڑے، ان میں سے ایک جماعت ''بطن نخلہ'' کی طرف گزری، وہاں اتفاق سے اس وقت حضور پرنور ﷺ اپنے چند اصحاب کے ساتھ نماز فجر ادا کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے جنوں کی اس ٹکڑی کا رخ قرآن سننے کے لیے ادھر پھیر دیا، قرآن کی آواز انہیں بہت عجیب اور موثر و دلکش معلوم ہوئی اور اس کی عظمت و ہیبت دلوں پر چھا گئی، آپس میں کہنے لگے کہ چپ رہو اور خاموشی کے ساتھ یہ کلام پاک سنو، آخر قرآن کریم نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا، وہ سمجھ گئے کہ یہ ہی نئی چیز ہے جس نے جنوں کو آسمانی خبروں سے روکا ہے، بہر حال جب حضور ﷺ قرآن پڑھ کر فارغ ہوئے، یہ لوگ اپنے دلوں میں ایمان و ایقان لے کر واپس گئے اور اپنی قوم کو نصیحت کی، ان کی مفصل باتیں سورہ جن میں آئیں گی۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ حضور ﷺ کو ان کے آنے جانے اور سننے سنانے کا پتہ نہیں لگا، ایک درخت نے باذن اللہ کچھ اجمالی اطلاع آپ ﷺ کو دی اور مفصل حال اس کے بعد وحی کے ذریعہ سے معلوم کرایا گیا، کما قال تعالیٰ: قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (الجن: ۱) بعدہ بہت بڑی تعداد میں جن مسلمان ہوئے اور حضور ﷺ سے ملاقات کرنے اور دین سیکھنے کے لیے ان کے وفود حاضر خدمت ہوئے، خفاجی نے روایات کی بناء پر دعویٰ کیا ہے کہ چھ مرتبہ آپ ﷺ نے جنوں سے ملاقات کی، اس لیے روایات میں جو اختلاف ان کے عدد یا دوسرے امور کے متعلق معلوم ہوتا ہے اس کو تعدد وقائع پر حمل کرنا چاہیے۔

قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ

بولے اے قوم ہماری ہم نے سنی ایک کتاب جو اتری ہے موسیٰ کے بعد ۱ سچا کرنے والی سب اگلی کتابوں کو ۲ سجھاتی ہے سچا دین

وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾

اور ایک راہ سیدھی ۳

خلاصہ تفسیر: (اور واپس جا کر دوسرے جنات سے) کہنے لگے اے بھائیو! ہم ایک (عجیب) کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد نازل کی گئی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے (اور دین) حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى: ''موسیٰ علیہ السلام کے بعد'' یہ کہنے سے بعض علماء نے یہ سمجھا ہے کہ وہ جن یہودی تھے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد تو عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل ہوئی اس کا ذکر نہیں، لیکن اس کی کوئی نقلی دلیل نہیں، اور انجیل کا ذکر نہ کرنے سے ان کے یہودی ہونے پر استدلال ناکافی ہے، کیونکہ انجیل کے ذکر نہ کرنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ انجیل اکثر احکام میں توریت کے تابع ہے اور قرآن تورات کی طرح مستقل کتاب ہے، پس مقصود یہ ہے کہ جیسی مستقل کتاب موسیٰ پر آئی تھی اس شان کی کتاب موسیٰ کے بعد اب یہ آئی، اور یہ بات ان کو تھوڑا سا قرآن سن کر اس کے طرز بیان اور جلالت شان سے معلوم ہوگئی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱ کتب سابقہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب (تورات) کے برابر کوئی کتاب احکام و شرائع کو حاوی نہیں تھی، اسی پر انبیائے بنی اسرائیل کا عمل رہا، حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی یہ ہی فرمایا کہ میں تورات کو بدلنے کے لیے نہیں آیا بلکہ اس کی تکمیل کے لیے آیا ہوں، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت سے جنوں میں تورات ہی مشہور چلی آتی تھی، اس لیے اس موقع پر انہوں نے اسی کی طرف اشارہ کیا، خود تورات میں بھی جو پیشین گوئی نبی کریم ﷺ کی آئی ہے اس کے لفظ یہ ہیں کہ (اے موسیٰ) ''تیری مانند ایک نبی اٹھاؤں گا''۔

فائدہ: ۲ شاید اس وقت قرآن کا جو حصہ حضور ﷺ نے تلاوت فرمایا تھا اس میں ایسا مضمون آیا ہوگا، یا قرائن سے سمجھے ہوں۔

فائدہ: ۳ یعنی سچے عقیدے اور عمل کا سیدھا راستہ۔

يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾

اے قوم ہماری مانو اللہ کے بلانے والے کو اور اس پر یقین لاؤ ۱ کہ بخشے تم کو کچھ تمہارے گناہ ۲ اور بچا دے تم کو ایک عذاب دردناک سے

خلاصہ تفسیر: یہاں تک تو ان جنات کی طرف سے دین اسلام کی حقانیت کا اظہار تھا، اب آگے اس کے قبول کرنے کا حکم ہے اول ترغیب سے، پھر خوف دلا کر، یعنی:

اے بھائیو! تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو (''داعی'' سے مراد یا تو قرآن ہے یا نبی ذی شان ہیں) اور (کہنا ماننا یہ ہے کہ) اس پر ایمان لے آؤ (اس میں اشارہ ہوگیا کہ وہ ایمان لانے کی طرف داعی ہے، کسی دنیوی غرض کی طرف نہیں بلاتا، پس اگر تم ایسا کرو گے تو) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردے گا اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھے گا۔

يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ: حرف ''من'' اصل میں تبعیض یعنی جزئیت کے معنی کے لیے آتا ہے، چنانچہ بعض کے نزدیک یہاں ''من'' تبعیضیہ ہے، اس لیے بعض علماء نے مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ سے بعض گناہ مراد لیے ہیں، مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے سے تمہارے وہ گناہ معاف ہوجائیں گے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، کیونکہ حقوق العباد کی معافی کے لیے ایمان لانے کے بعد بھی یہ شرط ہے کہ جو حقوق ادائیگی کے قابل ہیں ان کو ادا کرے جیسے مالی واجبات، اور جو قابل ادائیگی نہیں جیسے زبان یا ہاتھ سے کسی کو تکلیف پہنچائی تو اس سے معاف کرائے، اس صورت میں حرف ''من'' کے بڑھانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ اسلام قبول کرلینے سے حقوق العباد معاف نہیں ہوتے، اس لئے یہ فرمانا مناسب ہوا کہ بعض گناہ یعنی حقوق اللہ معاف ہوجاتے ہیں، جبکہ بعض نے اس سے ''من'' زائدہ مراد لیا ہے، اور اسلام سے سب گناہ معاف ہوجانے کی صورت میں اس پر حقوق العباد معاف نہ ہونے سے اشکال نہیں پڑتا، کیونکہ جو حقوق گناہ ہیں جیسے قتل وغیرہ، ان کے معاف ہوجانے پر تو سب کا اتفاق ہے، اور جو حقوق گناہ نہیں جیسے قرض وغیرہ تو وہ اس میں داخل ہی نہیں، پھر بعض گناہ (من تبعیض) مراد لینے کی کوئی حاجت نہیں۔

یہاں ثواب کا ذکر نہ فرمانا شاید اس طرف اشارہ ہو کہ بندہ کا نجات پا جانا یہ بھی اس کے استحقاق سے زیادہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو درجات کا اہل ہی کیوں سمجھے، اور قلندروں (حقیقی اللہ والوں) کا عین یہی مزاج ہوتا ہے۔

وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ: جنات کو کفر اور معصیت سے عذاب ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور ایمان و اعمال صالحہ پر ان کو جنت اور ثواب ملنے میں اختلاف ہے، اکثر علماء تو اس کے قائل ہیں کہ ایمان اور نیک اعمال سے ان کو جنت اور ثواب ملے گا، کیونکہ شریعت کی عام نصوص اور حق تعالیٰ کے ارشاد سے بالخصوص: لم یطمثھن انس قبلھم ولا جان سے یہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حق تعالیٰ حوروں کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ ان کو نہ اس سے پہلے کسی انسان نے چھوا نہ جن نے، تو اگر جنات کے چھونے کا احتمال ہی نہ تھا تو ان کے ذکر کی اس جگہ کیا ضرورت تھی، معلوم ہوا کہ جنات بھی حوروں کو چھو سکتے ہیں، دوسرے سورہ انعام میں انسان اور جنات کے ذکر کے بعد حق تعالیٰ نے فرمایا: لکل درجت مما عملوا کہ ہر ایک کو اپنے اعمال کے سبب درجے ملیں گے، چونکہ اس بارہ میں کوئی صاف اور صریح نص موجود نہ تھی اس لیے امام ابوحنیفہؒ نے انتہائی احتیاط کی وجہ سے اس میں توقف

فرمایا ہے، اور یہ جو امام صاحبؒ کا قول مشہور ہوگیا ہے کہ وہ جنات کے جنت میں نہ جانے کے قائل ہیں تو غالباً اسی توقف کے بیان میں ناقلین کو غلطی ہوئی ہو، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس کی بات مانو جو اللہ کی طرف بلا رہا ہے اور اس کی رسالت پر یقین کرو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جو گناہ حالت کفر میں کر چکے ہو، اسلام کی برکت سے سب معاف ہو جائیں گے، آئندہ سے نیا کھاتہ شروع ہوگا، لیکن یاد رہے کہ یہاں ذنوب کا ذکر ہے، حقوق العباد کا معاف ہونا اس سے نہیں نکلتا۔

وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ؕ اُولٰٓئِكَ

اور جو کوئی نہ مانے گا اللہ کے بلانے والے کو تو وہ نہ تھکا سکے گا بھاگ کر زمین میں اور کوئی نہیں اس کا اس کے سوا مددگار ۱؎ وہ لوگ

فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾

بھٹکتے ہیں صریح

خلاصہ تفسیر: اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانے گا تو وہ زمین (کے کسی حصہ) میں (بھاگ کر خدا کو) ہرا نہیں سکتا (یعنی اس طرح کہ ہاتھ نہ آئے) اور (جیسا وہ خود نہیں بچ سکتا اسی طرح) خدا کے سوا اور کوئی اس کا حامی بھی نہ ہوگا (کہ وہ اس کو بچا سکے اور) ایسے لوگ صریح گمراہی میں (مبتلا) ہیں (کہ داعی کے حق پر دلائل قائم ہونے کے باوجود پھر بھی اس کا کہنا نہیں مانتے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نہ خود بھاگ کر خدا کی مار سے بچ سکے نہ کوئی دوسرا بچا سکے، حضرت شاہ صاحبؒ فی الارض کی قید پر لکھتے ہیں کہ: ''(شیاطین کو) اوپر سے فرشتے مارتے ہیں تو زمین ہی کو بھاگتے ہیں''۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ

کیا نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے بنائے آسمان اور زمین اور نہ تھکا ان کے بنانے میں ۱؎ وہ قدرت رکھتا ہے کہ زندہ کرے

الْمَوْتٰى ؕ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾

مردوں کو، کیوں نہیں وہ ہر چیز کر سکتا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کی جزا و سزا کا بیان تھا اور اس کے بعد کی آیتوں میں بھی اس طرف اشارہ تھا، چونکہ بعض خود قیامت کے امکان ہی کے منکر تھے اس لیے اب آگے پہلے قیامت کا امکان، پھر اس کا واقع ہونا بیان فرماتے ہیں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور صبر کی تعلیم ہے۔

کیا ان لوگوں نے یہ نہ جانا کہ جس خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے میں ذرا نہیں تھکا وہ اس پر (بدرجہ اولیٰ) قدرت رکھتا ہے کہ مردوں کو (قیامت میں) زندہ کر دے (اور وہ اس پر قادر) کیوں نہ ہو، بیشک وہ (تو) ہر چیز پر قادر ہے (یہ تو امکان ثابت ہوا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اس لفظ میں ''یہود'' کے عقیدے کا رد ہے جو کہتے تھے کہ چھ دن میں اللہ نے زمین و آسمان پیدا کیے ''ثم استراح'' (پھر ساتویں دن آرام کرنے لگا) العیاذ باللہ۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بڑا عذاب مرنے کے بعد ہوگا اور اس دھوکا میں نہ رہیں کہ مر کر کہاں زندہ ہوتے ہیں، اللہ کو یہ کچھ مشکل نہیں، جو آسمان و

زمین کے پیدا کرنے سے نہ تھکا، اس کو تمہارا دوبارہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ

اور جس دن سامنے لائیں منکروں کو آگ کے کیا یہ ٹھیک نہیں کہیں گے کیوں نہیں قسم ہے ہمارے رب کی ۱؎

قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾

کہا تو چکھو عذاب بدلہ اس کا جو تم منکر ہوتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور جس روز (قیامت واقع ہوگی اور) کافر لوگ دوزخ کے سامنے لائے جائیں گے (اور ان سے پوچھا جائے گا کہ) کیا یہ دوزخ امر واقعی نہیں ہے (جیسا کہ دنیا میں اس کے واقع ہونے کا انکار کرتے تھے: **و ما نحن بمعذبين** کہ ہمیں عذاب نہ ہوگا) وہ کہیں گے کہ ہم کو اپنے پروردگار کی قسم ضرور امر واقعی ہے ارشاد ہوگا (اچھا) تو اپنے کفر کے بدلہ میں (جس میں دوزخ کا انکار بھی آ گیا) اس (دوزخ) کا عذاب چکھو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس وقت کہا جائے گا کہ دوزخ کا وجود اس کا عذاب کیا واقعی چیز نہیں؟ آخر سب ذلیل ہو کر اقرار کریں گے کہ بیشک واقعی ہے (ہم غلطی پر تھے جو اس کا انکار کیا کرتے تھے)۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس وقت کہا جائے گا کہ اچھا اب اس انکار و تکذیب کا مزہ چکھتے رہو۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ

سو تو ٹھہرا رہ جیسے ٹھہرے رہے ہیں ہمت والے رسول اور جلدی نہ کر ان کے معاملہ میں ۱؎ یہ لوگ جس دن دیکھ لیں گے اس چیز

مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع ۴

کو جس کا ان سے وعدہ ہے جیسے ڈھیل نہ پائی تھی مگر ایک گھڑی دن کی ۲؎ یہ پہنچا دینا ہے، اب وہی غارت ہوں گے جو لوگ نافرمان ہیں ۳؎

خلاصہ تفسیر: اب رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینے کے لئے فرمایا کہ:

(جب ان سے کفر کا انتقام لیا جانا معلوم ہو گیا) تو آپ (ویسا ہی) صبر کیجئے جیسا اور ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا تھا اور ان لوگوں کے لئے (انتقام الٰہی کی) جلدی نہ کیجئے (جسے آپ مسلمانوں کی دلجوئی اور غلبہ کے لئے چاہتے تھے اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ مستحقین عذاب خود جلد بازی کرتے ہیں، کیونکہ مدعی اگر مدعا علیہ کی سزا جلدی چاہے تو بعید نہیں، لیکن مدعا علیہ اگر سزا جلدی چاہے تو نہایت عجیب بات ہے، سو اگرچہ حکمت الٰہیہ کی وجہ سے عذاب فوری نہیں ہوگا لیکن مشاہدہ کے وقت ان پر اس کا وہی اثر ہوگا جو فوری عذاب کا ہوتا ہے کیونکہ) جس روز یہ لوگ اس چیز کو (یعنی عذاب کو) دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو (اس وقت عذاب کی انتہائی شدت سے ایسا معلوم ہوگا کہ) گویا یہ لوگ (دنیا میں) دن بھر میں ایک گھڑی رہے ہیں (یعنی دنیا کی طویل مدت بہت چھوٹی معلوم ہوگی اور یہی محسوس ہوگا کہ فوراً ہی عذاب آ گیا، اب آگے کفار کو تنبیہ ہے کہ) یہ (خدا کی طرف سے اتمام حجت کے لئے) پہنچا دینا ہے (جو رسول اللہ ﷺ کی معرفت ہو چکا) سو (اس کے بعد) وہی برباد ہوں گے جو نافرمانی کریں گے (کیونکہ تبلیغ کے بعد اب کوئی عذر نہ رہا، اور رسول کا اس میں کوئی نقصان نہیں، اس سے تسلی کی تاکید بھی ہو گئی)۔

اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ: اس میں من الرسل کا حرف ''من''، محققین کے نزدیک بیانیہ ہے تبعیض کے لئے نہیں، یعنی سب پیغمبر مراد ہیں، معنی یہ ہیں کہ تمام رسول صاحب عزم و ہمت ہی ہوتے ہیں، معلوم ہوا کہ صاحب عزم و ہمت ہونا سبھی انبیاء کی صفت ہے، البتہ رسولوں کے درمیان صفات کے درجات میں تفاضل اور کمی بیشی خود قرآن کے ارشاد سے ثابت ہے: تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض اس لئے جو انبیاء علیہم السلام صفت عزم و ہمت میں دوسروں سے زیادہ امتیاز رکھتے ہیں خاص ان رسولوں کے لئے یہ لقب کے طور پر مشہور ہوگیا، اور ان کی تعیین میں بھی اختلاف ہے، اکثر کا قول یہ ہے کہ ''اولوالعزم'' کا لقب جن کو دیا گیا ہے یہ وہ حضرات ہیں جن کا ذکر سورۃ احزاب کی اس آیت میں ہے: واذا اخذنا من النبين ميثاقهم ومنك ومن نوح وابراهيم وموسىٰ وعيسىٰ ابن مريم الخ۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جب معلوم ہو چکا کہ منکرین کو سزا ضرور ملتی ہے، آخرت میں ملے یا دنیا میں بھی تو آپ ان کے معاملہ میں جلدی نہ کریں، بلکہ ایک میعاد معین تک صبر کرتے رہیں جیسے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا۔

تنبیہ: بعض سلف نے کہا کہ سب رسول اولوالعزم (ہمت والے) ہیں اور عرف میں پانچ پیغمبر خصوصی طور پر ''اولوالعزم'' کہلاتے ہیں:

① حضرت نوح علیہ السلام ② حضرت ابراہیم علیہ السلام ③ حضرت موسیٰ علیہ السلام ④ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ⑤ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ۔

فائدہ: ۲؎ ''ڈھیل نہ پائی تھی'' دنیا میں یعنی اب تو دیر سمجھتے ہیں کہ عذاب جلد کیوں نہیں آتا، اس دن جانیں گے کہ بہت شتاب آیا، دنیا میں ہم ایک ہی گھڑی رہے، یا عالم قبر کا رہنا ایک گھڑی معلوم ہوگا، قاعدہ ہے کہ گزری ہوئی مدت تھوڑی معلوم ہوا کرتی ہے، خصوصاً سختی اور مصیبت کے وقت عیش و آرام کا زمانہ بہت کم نظر آنے لگتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ہم نے نصیحت کی بات پہنچا دی اور سب نیک و بد سمجھا دیا، اب جو نہ مانیں گے وہ ہی تباہ و برباد ہوں گے، ہماری طرف سے حجت تمام ہو چکی اور کسی کو بے قصور ہم نہیں پکڑتے اسی کو غارت کرتے ہیں جو غارت ہونے ہی پر کمر باندھ لے۔

ایاتها ۳۸ | ٤٧ سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ مَّدَنِيَّةٌ ٩٥ | رکوعاتها ٤

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ①

جو لوگ کہ منکر ہوئے اور روکا اوروں کو اللہ کی راہ سے ۱؎ کھو دیے اللہ نے ان کے کام ۲؎

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت کے بالکل آخر میں فاسقین یعنی کفار کی مذمت تھی، اور اس سے پیچھے جنات کے بیان میں مؤمنین کی فضیلت اور کفار کی مذمت کا ذکر تھا، چنانچہ اس سورت کے شروع میں بھی یہی مضمون ہے۔

جو لوگ (خود بھی) کافر ہوئے اور (دوسروں کو بھی) اللہ کے راستہ سے روکا (جیسا رؤسائے کفار کی عادت تھی کہ اسلام کا راستہ روکنے میں جان و مال سے ہر طرح کی کوشش کرتے تھے، سو) خدا نے ان کے عمل کالعدم کر دیئے (یعنی جن کاموں کو وہ نیک سمجھ رہے ہیں ایمان نہ ہونے کی وجہ سے وہ مقبول نہیں، بلکہ ان میں سے بعض کام اور الٹے موجب عتاب ہیں جیسے اللہ کے راستے پر چلنے سے روکنے میں خرچ کرنا: فسينفقونها ثم تكون عليهم حسرة الخ)۔

اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ: واضح رہے کہ ایمان کے غارت ہونے کے لیے صرف کفر بھی کافی ہے، دوسروں کو روکنا اس کے لیے شرط نہیں، لیکن یہاں ان کی واقعی حالت بیان فرما دی، نیز یہاں فرمایا کہ ''اللہ نے ان کے عمل کالعدم کر دیے''، جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہے: فمن يعمل مثقال

ذرّۃ خیرا یرہ کہ ''جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا''، بظاہر ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، جواب یہ ہے کہ نیکی ایمان کے ساتھ مشروط ہے، یعنی جو ایمان کی حالت میں نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا اور اس کا بدلہ پائے گا۔

* * *

فائدہ: لہ جیسا کہ روسائے کفار کی عادت تھی کہ جان، مال اور ہر طرح سے اس میں کوشش کرتے تھے۔

فائدہ: ٢ہ یعنی جن اعمال کو وہ نیک سمجھ رہے ہیں بوجہ عدم ایمان کے وہ مقبول نہیں، بلکہ ان میں سے بعض کام اور الٹے موجب عتاب ہوتے ہیں، جیسے لوگوں کو اسلام سے روکنے میں پیسہ خرچ کرنا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ

اور جو یقین لائے اور کیے بھلے کام اور مانا اس کو جو اترا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور وہی ہے سچا دین ان کے رب کی طرف سے

كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝

ان پر سے اتاریں ان کی برائیاں اور سنوارا ان کا حال

خلاصہ تفسیر: اور (ان کے برخلاف) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور (ان کے ایمان کی تفصیلی کیفیت یہ ہے کہ) وہ اس سب پر ایمان لائے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا گیا ہے اور وہ (جو نازل کیا گیا ہے وہ) ان کے رب کے پاس سے (آیا ہوا) امر واقعی (بھی) ہے (جس کا ماننا ہے بھی ضروری، سو) اللہ تعالیٰ ان کے گناہ ان پر سے اتار دے گا (یعنی معاف کر دے گا) اور (دونوں جہان میں) ان کی حالت درست رکھے گا (دنیا میں تو اس طرح کہ ان کو اعمال صالحہ کی توفیق بڑھتی جائے گی اور آخرت میں اس طرح کہ ان کو عذاب سے نجات اور جنت میں داخلہ ملے گا)۔

* * *

فائدہ: یعنی برائیوں کی عادت چھڑا کر اللہ تعالیٰ ان کا حال سنوار دیتا ہے کہ یوماً فیوماً نیکی میں ترقی کرتے رہتے ہیں اور آخرت میں ان کی کوتاہیوں سے درگزر فرما کر اچھے حال میں رکھتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''پہلے زمانہ میں ساری مخلوق ایک شریعت کی مکلف نہ تھی، اس وقت سب جہان کو ایک حکم ہے، اب سچا دین یہی ہے اور برے بھلے کام مسلمان بھی کرتے ہیں اور کافر بھی، لیکن سچا دین ماننے کو یہ قبولیت ہے کہ نیکی ثابت اور برائی معاف، اور نہ ماننے کی یہ سزا ہے کہ نیکی برباد گناہ لازم''۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ

یہ اس لیے کہ جو منکر ہیں وہ چلے جھوٹی بات پر اور جو یقین لائے انہوں نے مانی سچی بات اپنے رب کی طرف سے

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝

یوں بتلاتا ہے اللہ لوگوں کو ان کے احوال

خلاصہ تفسیر: (اور) یہ (جو پیچھے مومنین کی خوشحالی اور کفار کی بدحالی بیان کی گئی) اس وجہ سے ہے کہ کافر تو غلط راستہ پر چلے اور اہل ایمان صحیح راستہ پر چلے جو ان کے رب کی طرف سے (آیا) ہے (اور غلط راستہ سے ناکامی ہونا اور صحیح راستہ سے کامیابی ہونا ظاہر ہے اس لئے کفار ناکام ہوئے اور مومنین کامیاب ہوئے، اور) اللہ تعالیٰ اسی طرح (جیسے یہ حالت بیان فرمائی) لوگوں کے (نفع وہدایت کے) لئے ان (مذکورین) کے

حالات بیان فرماتا ہے (تاکہ ترغیب وترہیب کے دونوں طریقوں سے ہدایت کی جائے)۔

اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ: اگر اسلام کے صحیح راستہ ہونے میں کوئی شبہ ہوتو اس کا جواب: من ربھم سے ہو گیا کہ اس کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ من جانب اللہ ہے اور اس کا من جانب اللہ ہونا تمام معجزات سے خاص کر قرآنی معجزہ سے ثابت ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اس طرح کھول کھول کر اللہ تعالی لوگوں کو ان کے بھلے برے احوال پر متنبہ کرتا ہے، تا کہ باطل پرستی کی نحوست وشامت اور حق پرستی کی برکت ان کو پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ

سو جب تم مقابل ہو منکروں کے تو مارو گردنیں، یہاں تک کہ جب خوب قتل کر چکو ان کو تو مضبوط باندھ لو قید

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ

پھر یا احسان کیجیو اور یا معاوضہ لیجیو۔ جب تک کہ رکھ دے لڑائی اپنے ہتھیار۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے مسلمانوں کا مصلح ہونا اور کفار کا مفسد ہونا بیان ہوا ہے، اب آگے مصلحین کے ہاتھوں سے مفسدوں کا فساد دبانے کے لیے جہاد کے متعلق بعض احکام ارشاد ہوتے ہیں۔

(جب کفار ایسے مفسد ہیں تو ہم ان کا فساد ختم کرنے کے لیے حکم دیتے ہیں) سو جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو جائے تو ان کی گردنیں مارو (یعنی قتل کرو) یہاں تک کہ جب تم ان کی خوب خونریزی کر چکو (جس کی حد یہ ہے کہ کفار کی شوکت وقوت ٹوٹ جائے اور قتال بند کرنے سے مسلمانوں کے نقصان یا کفار کے غلبہ کا خوف نہ رہے) تو (اس وقت کفار کو قید کر کے) خوب مضبوط باندھ لو پھر اس کے بعد (تم کو دو باتوں کا اختیار ہے) یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دینا اور یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینا (اور یہ قید اور قتل کا حکم اس وقت تک ہے) جب تک کہ لڑنے والے (دشمن) اپنے ہتھیار نہ رکھ دیں (مراد اس سے اسلام یا استسلام ہے، یعنی یا تو اسلام قبول کرلیں یا مسلمانوں کا ذمی ہو کر رہنا قبول کرلیں تو پھر نہ قتل جائز ہے نہ قید)۔

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً: یعنی ان باتوں میں سے ایک بات کا اختیار ہے، پس دونوں کو جمع نہ کیا جائے، ہاں یہ جائز ہے کہ سرے سے چھوڑا ہی نہ جائے، بلکہ غلام بنالیا جائے یا قتل کر دیا جائے، احناف کے نزدیک یہ آیت سورہ براءت سے منسوخ ہے، کیونکہ سورہ براءت اس کے بعد نازل ہوئی، اب چھوڑنا کسی طرح جائز نہیں، بہر حال اس آیت سے بعض خواہش پرستوں کا مسئلہ غلامی کے غلط ہونے پر استدلال کرنا محض باطل ہے، کیونکہ اول تو یہ آیت منسوخ ہے، دوسرے اس کا یہ مطلب کیونکر سمجھ لیا گیا کہ چھوڑنا معاوضہ لے کر یا بلا معاوضہ ضروری ہے، اور بچے اور عورتیں قتل کے حکم سے مستثنی ہیں، ان کا قتل ناجائز ہے، اس مقام کی تحقیق سورہ انفال کی آیت ۶۷: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى کے تحت ملاحظہ ہو۔

رہا یہ اشکال کہ اسلام جو حقوق انسانیت کا سب سے بڑا محافظ ہے، اس نے غلامی کی اجازت کیوں دی؟ سو در حقیقت یہ اشکال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی جائز کی ہوئی غلامی کو دیگر مذاہب واقوام کی غلامی پر قیاس کر لیا گیا ہے، حالانکہ اسلام نے غلاموں کو جو حقوق عطا کئے اور معاشرے میں ان کو جو مقام دیا اس کے بعد وہ صرف نام کی غلامی رہ گئی ورنہ حقیقت میں وہ بھائی چارہ بن گیا ہے، اور اگر اس کی حقیقت اور روح پر نظر کی جائے تو بہت سی صورتوں میں جنگی قیدیوں کے ساتھ اس سے بہتر سلوک ممکن نہیں، حقیقت یہ ہے کہ بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں قیدیوں کو غلام بنانے سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا، کیونکہ اگر غلام نہ بنایا جائے تو تین ہی صورتیں عقلاً ممکن ہیں، یا قتل کر دیا جائے، یا آزاد چھوڑ دیا جائے یا دائمی قیدی بنا کر رکھا جائے، اور بسا اوقات یہ تینوں صورتیں مصلحت کے خلاف ہوتی ہیں، قتل کرنا اس لئے مناسب نہیں ہوتا کہ قیدی اچھی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے، آزاد چھوڑ دینے میں بعض مرتبہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ دار الحرب میں پہنچ کر وہ مسلمانوں کے لئے دوبارہ عظیم خطرہ بن جائے، اب دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا تو اسے دائمی قیدی بنا

کر آج کل کی طرح کسی الگ تھلگ جزیرے میں ڈال دیا جائے یا پھر غلام بنا کر اس کی صلاحیتوں سے کام لیا جائے اور اس کے حقوق انسانی کی پوری نگہداشت کی جائے، ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ ان میں سے بہتر صورت کونسی ہے؟ بالخصوص جبکہ غلاموں کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر وہ ہے جو ایک معروف حدیث میں سرکار دوعالم ﷺ نے بالفاظ ذیل بیان فرمایا ہے: ''تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جنہیں اللہ نے تمہارے زیردست کردیا ہے، پس جس کا بھائی اس کے زیردست ہو اسے چاہئے کہ اس کو بھی اسی میں سے کھلائے جو وہ خود کھاتا ہے اور اسی میں سے پہنائے جسے وہ خود پہنتا ہے اور اس کو ایسے کام کی زحمت نہ دے جو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو، اور اگر اسے ایسے کام کی تکلیف دے تو خود بھی اس کی مدد کرے''۔

معاشرتی اور تمدنی حقوق کے اعتبار سے اسلام نے غلاموں کو جو مرتبہ عطا کیا وہ آزاد افراد کے قریب قریب مساوی ہے، چنانچہ دوسری اقوام کے برخلاف اسلام نے غلاموں کو نکاح کی نہ صرف اجازت دی بلکہ آقاؤں کو: انکحوا الایامی منکم والی آیت کے ذریعہ اس کی تاکید کی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ آزاد عورتوں سے بھی نکاح کرسکتا ہے، مال غنیمت میں اس کا حصہ آزاد مجاہدین کے برابر ہے اور دشمن کو امان دینے میں اس کا قول اسی طرح معتبر ہے جس طرح آزاد افراد کا، قرآن وحدیث میں ان کے ساتھ حسن سلوک کے اتنے احکام آئے ہیں کہ ان کو جمع کرنے سے ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے۔

پھر اس نام کی غلامی کو بھی رفتہ رفتہ ختم یا کم کرنے کے لئے غلاموں کو آزاد کرنے کے اتنے فضائل قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں کہ شاید ہی کوئی نیکی اس کی ہمسری کرسکے، مختلف فقہی احکام میں غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے بہانے ڈھونڈے گئے ہیں، کفارہ صوم، کفارہ قتل، کفارہ ظہار، کفارہ یمین ان تمام صورتوں میں سب سے پہلا حکم یہ مذکور ہے کہ کوئی غلام آزاد کیا جائے، یہاں تک کہ حدیث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی نے غلام کو ناحق تھپڑ ماردیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اسے آزاد کردیا جائے، چنانچہ صحابہ کرام کثرت کے ساتھ غلام آزاد کیا کرتے تھے، چنانچہ صاحب ''النجم الوھاج'' نے بعض صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف سات صحابہ نے انتالیس ہزار دوسو انسٹھ غلام آزاد کئے، اور ظاہر ہے کہ دوسرے ہزاروں صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد اس سے کہیں زائد ہوگی، غرض اسلام نے غلامی کے نظام میں جو ہمہ گیر اصلاحات کیں جو شخص بھی انہیں بنظر انصاف دیکھے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسے دوسری اقوام کے احکام غلامی پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے اور ان اصلاحات کے بعد جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت ان پر ایک عظیم احسان بن گئی ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا حکم صرف اباحت اور جواز کی حد تک ہے یعنی اگر اسلامی حکومت مصالح کے مطابق سمجھے تو انہیں غلام بنا سکتی ہے ایسا کرنا مستحب یا واجب فعل نہیں ہے بلکہ قرآن وحدیث کے مجموعی ارشادات سے آزاد کرنے کا افضل ہونا سمجھ میں آتا ہے اور یہ اجازت بھی اس وقت تک کے لئے ہے جب تک اس کے خلاف دشمن سے کوئی معاہدہ نہ ہو اور اگر دشمن سے یہ معاہدہ ہوجائے کہ نہ وہ ہمارے قیدیوں کو غلام بنائیں گے نہ ہم ان کے قیدیوں کو، تو پھر اس معاہدہ کی پابندی لازم ہوگی، ہمارے زمانے میں دنیا کے بہت سے ملکوں نے ایسا معاہدہ کیا ہوا ہے، لہٰذا جو اسلامی ممالک اس معاہدے میں شریک ہیں ان کے لئے غلام بنانا اس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ معاہدہ قائم ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی حق اور باطل کا مقابلہ تو رہتا ہی ہے جس وقت مسلمانوں اور کافروں میں جنگ ہوجائے تو مسلمانوں کو پوری مضبوطی اور بہادری سے کام لینا چاہیے، باطل کا زور جب ہی ٹوٹے گا کہ بڑے بڑے شریر مارے جائیں اور ان کے جتھے توڑ دیئے جائیں، اس لیے ہنگامہ کارزار میں کسل، سستی، بزدلی اور توقف وتردد کو راہ نہ دو، اور دشمنان خدا کی گردنیں مارنے میں کچھ باک نہ کرو، کافی خون ریزی کے بعد جب تمہاری دھاک بیٹھ جائے اور ان کا زور ٹوٹ جائے اس وقت قید کرنا بھی کفایت کرتا ہے، قال تعالیٰ: مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهٗٓ أَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ (الانفال: ٦٧) یہ قید وبند ممکن ہے ان کے لیے تازیانہ عبرت کا کام دے اور مسلمانوں کے پاس رہ کر ان کو اپنی اور تمہاری حالت کے جانچنے اور اسلامی تعلیمات میں غور کرنے کا موقع بہم پہنچائے، شدہ شدہ وہ لوگ حق وصداقت کا راستہ اختیار کرلیں، یا مصلحت سمجھو تو بدون کسی معاوضہ کے ان پر احسان کر کے قید سے رہا کردو، اس صورت میں بہت سے افراد ممکن ہے تمہارے احسان اور خوبی اخلاق سے متاثر ہوکر تمہاری طرف راغب ہوں اور تمہارے دین سے محبت کرنے لگیں، اور یہ بھی کرسکتے ہو کہ زرفدیہ لے کر، یا مسلمان قیدیوں کے مبادلہ میں ان قیدیوں کو چھوڑ دو، اس میں کئی طرح کے فائدے ہیں۔

بہر حال اگر ان اسیران جنگ کو انکے وطن کی طرف واپس کرو تو دو ہی صورتیں ہیں: ① معاوضہ میں چھوڑ نا یا ② بلا معاوضہ رہا کرنا، ان میں جو صورت امام کے نزدیک اصلح ہو اختیار کر سکتا ہے، حنفیہ کے ہاں بھی فتح القدیر اور شامی وغیرہ میں اس طرح کی روایات موجود ہیں، ہاں! اگر قیدیوں کو ان کے وطن کی طرف واپس کرنا مصلحت نہ ہو، تو پھر تین صورتیں ہیں: ① ذمی بنا کر بطور رعیت کے رکھنا۔ ② یا غلام بنالینا۔ ③ یا قتل کر دینا۔

احادیث سے قیدی کو قتل کرنے کا ثبوت صرف خاص خاص حالات میں ملتا ہے، جب کہ وہ کسی ایسے سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہو جس کی سزا قتل سے کم نہیں ہو سکتی تھی، البتہ غلام یا رعیت بنا کر رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی یہ حرب وضرب اور قید و بند کا سلسلہ برابر جاری رہے گا تا آنکہ لڑائی اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دے اور جنگ موقوف ہو جائے۔

ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۟ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ

یہ سن چکے، اور اگر چاہے اللہ تو بدلہ لے ان سے پر جانچنا چاہتا ہے تمہارے ایک سے دوسرے کو۔ ۱

وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ④

اور جو لوگ مارے گئے اللہ کی راہ میں تو نہ ضائع کرے گا وہ ان کے کیے کام

خلاصہ تفسیر: پیچھے مسلمانوں کو کفار سے جہاد کرنے کا حکم تھا، اب آگے اس حکم کی تاکید اور اس کی حکمت اور جہاد میں مسلمانوں کے قتل ہونے کے متعلق بشارت اور جہاد کی ترغیب اور کفار کی مذمت اور وعید وغیرہ مذکور ہے۔

یہ حکم (جہاد کا جو پیچھے مذکور ہوا) بجالانا، اور (جو بعض صورتوں میں کفار سے انتقام لینے کے لیے جہاد کا طریقہ مقرر کیا، یہ خاص حکمت کی وجہ سے ہے، ورنہ) اگر اللہ چاہتا تو ان سے (خود ہی آسمانی اور زمینی عذابوں کے ذریعہ) انتقام لے لیتا (جیسے پچھلی امتوں سے اسی طرح انتقام لیا، کسی پر پتھر برسے کسی پر ہوا کا طوفان آیا، کسی کو غرق کیا گیا، اگر ایسا ہوتا تو تم کو جہاد نہ کرنا پڑتا) لیکن (تم کو جہاد کرنے کا حکم اس لئے دیا) تاکہ تمہارا ایک دوسرے کے ذریعہ امتحان کرے (مسلمانوں کا امتحان یہ کہ کون حکم الٰہی پر اپنی جان کو ترجیح دیتا ہے، اور کفار کا امتحان یہ کہ قتال و جہاد کی سزا سے متنبہ ہو کر کون حق کو قبول کرتا ہے، پس جہاد میں یہ بھی حکمت ہے) اور (جہاد میں جیسے کفار کو قتل کرنا کامیابی ہے اسی طرح خود مقتول ہونا بھی ناکامی نہیں، کیونکہ) جو لوگ اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں مارے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو (جن میں یہ عمل جہاد بھی داخل ہے) ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ: غرض ظاہر میں یہ وہم ہو سکتا ہے کہ جب وہ کافروں پر غالب نہ آسکا اور مارا گیا تو اس کے جہاد پر کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوا، اور اس کا عمل جہاد ضائع ہو گیا، سو بتا دیا کہ واقع میں اس کا جہاد ضائع ہرگز نہیں ہوا، کیونکہ اس کے عمل پر دوسرا نتیجہ جو ظاہری نتیجہ سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے وہ مرتب ہوا جس کا اگلی آیت میں بیان ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی خدا کو قدرت ہے کہ ان کافروں کو کوئی آسمانی عذاب بھیج کر عاد و ثمود وغیرہ کی طرح ہلاک کر ڈالے، لیکن جہاد و قتال مشروع کر کے اسے بندوں کا امتحان کرنا تھا، وہ دیکھتا ہے کہ کتنے مسلمان اللہ کے نام پر جان و مال نثار کرنے کے لیے تیار ہیں اور کفار میں سے کتنے ان تنبیہی کارروائیوں سے بیدار ہوتے اور اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو اللہ نے دے رکھی ہے کہ پہلی قوموں کی طرح ایک دم پکڑ کر استیصال نہیں کر دیتا۔

سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ⑤ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ⑥

ان کو راہ دے گا اور سنوارے گا ان کا حال ۱ اور داخل کرے گا ان کو بہشت میں جو معلوم کرا دی ہے ان کو ۲

خلاصہ تفسیر: (وہ نتیجہ یہ کہ) اللہ تعالیٰ ان کو (منزل) مقصود تک (جس کا بیان آگے آتا ہے) پہنچا دے گا اور ان کی حالت

(قبر اور حشر اور پل صراط اور تمام مواقع آخرت میں) درست رکھے گا (کہیں کوئی خرابی اور نقصان ان کو نہ پہنچے گا) اور (اس منزل مقصود تک پہنچنے کا بیان یہ ہے کہ) ان کو جنت میں داخل کرے گا جس کی ان کو پہچان کرا دے گا (خواہ خود بخود یا کسی فرشتہ کے ذریعہ سے کہ ہر جنتی اپنے اپنے مقررہ مکان پر بغیر کسی تلاش تفتیش کے بے تکلف جا پہنچے گا، اس سے ثابت ہوا کہ جہاد میں ظاہری ناکامی یعنی خود مقتول ہو جانا بھی بڑی کامیابی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو لوگ اللہ کے راستہ میں شہید ہوئے، خواہ بظاہر یہاں کامیاب نظر نہ آتے ہوں، لیکن حقیقۃً وہ کامیاب ہیں، اللہ ان کے کام ضائع نہ کرے گا، بلکہ انجام کار ان کی محنت ٹھکانے لگائے گا، ان کو جنت کی طرف راہ دے گا اور آخرت کے تمام منازل و مواقف میں ان کا حال درست رکھے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس جنت کا حال ان کو انبیاء علیہم السلام کی زبان اور اپنے وجدان صحیح سے معلوم ہو چکا تھا اس میں داخل کیے جائیں گے اور وہاں پہنچ کر ہر جنتی اپنے ٹھکانے کو خود بخود پہچان لے گا اس کے دل کی کشش ادھر ہی ہوگی جہاں اس کو رہنا ہے۔

تنبیہ: ابن عباسؓ نے عَرَّفَهَا لَهُمْ کے معنی "طَيَّبَهَا لَهُمْ" کے لیے ہیں، یعنی جنت ان کے لیے خوشبوؤں سے مہکا دی گئی ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن تَنصُرُواْ ٱللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ۝٧

اے ایمان والو اگر تم مدد کرو گے اللہ کی ۱؎ تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور جما دے گا تمہارے پاؤں ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب جہاد کے دنیوی فوائد و فضائل کا ذکر کر کے اس کی ترغیب ہے کہ:

اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا (جس کا نتیجہ دنیا میں بھی مجموعی طور پر مسلمانوں کا کفار پر غالب آنا ہے خواہ شروع ہی میں یا کچھ عرصہ کے بعد انجام کار میں) اور (اسی طرح دشمنوں کے مقابلہ میں) تمہارے قدم جما دے گا (اس طرح کا مطلب یہ ہے کہ سارے مسلمان مجموعی طور پر تمام کفار کے مقابلہ میں خواہ شروع ہی سے یا وقتی پسپائی کے بعد آخر میں ثابت قدم رہ کر کفار پر غالب آجائیں گے جیسا کہ بار بار اس کا مشاہدہ دنیا میں ہو چکا ہے)۔

إِن تَنصُرُواْ ٱللَّهَ يَنصُرْكُمْ: بعض مسلمانوں کا مارا جانا یا کسی معرکہ میں مسلمانوں کی جماعت کا وقتی طور پر مغلوب ہو جانا اس کے منافی نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ کے دین کی اور اس کی پیغمبر کی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جہاد میں اللہ کی مدد سے تمہارے قدم نہیں ڈگمگائیں گے اور اسلام و طاعت پر ثابت قدم رہو گے جس کے نتیجہ میں "صراط" پر ثابت قدمی نصیب ہوگی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "اللہ چاہے تو خود ہی کافروں کو مسلمان کر ڈالے پر یہ بھی منظور نہیں کہ جانچنا منظور ہے، سو بندہ کی طرف سے کمر باندھنا اور اللہ کی طرف سے کام بنانا"۔

وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ فَتَعْسًا لَّهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَٰلَهُمْ ۝٨

اور جو لوگ کہ منکر ہوئے وہ گرے منہ کے بل اور کھو دیے ان کے کیے کام

خلاصہ تفسیر: (پیچھے مسلمانوں کا حال بیان کیا گیا) اور جو لوگ کافر ہیں ان کے لئے (دنیا میں جبکہ مومنین سے مقابلہ کریں) تباہی (اور مغلوبیت) ہے اور (آخرت میں) ان کے اعمال کو خدا تعالیٰ کالعدم کر دے گا (جیسا کہ سورت کے شروع میں بیان ہوا، غرض کفار دونوں جہان میں خسارے میں رہے)۔

وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ : پیچھے بھی اعمال کے کالعدم کرنے کا بیان ہوا ہے، وہاں خود اسی کا بتلانا مقصود تھا اور یہاں اس حیثیت سے بیان کیا گیا ہے کہ دونوں جہاں کے خسارہ کا وہ بھی ایک جزو ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جس طرح مومنین کے قدم جما دیے جاتے ہیں اس کے برعکس منکروں کو منہ کے بل گرا دیا جاتا ہے اور جیسے خدا کی طرف سے مومنین کی مدد کی جاتی ہے، اس کے خلاف کافروں کے کام برباد کر دیے جاتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝٩

یہ اس لیے کہ ان کو پسند نہ ہوا جو اتارا اللہ نے پھر اکارت کر دیے ان کے کیے کام

خلاصہ تفسیر: (اور) یہ (کفار کا خسارہ اور اعمال کی بربادی) اس سبب سے ہوئی کہ انہوں نے اللہ کے اتارے ہوئے احکام کو ناپسند کیا (عقیدہ کے اعتبار سے بھی اور عمل کے اعتبار سے بھی) سو اللہ نے ان کے اعمال کو (پہلے ہی سے) اکارت کر دیا (کیونکہ کفر کا یہی اثر ہے جو کہ اعلیٰ درجہ کی بغاوت ہے)۔

فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ : یہ مراد نہیں کہ وہ اعمال پہلے صحیح تھے پھر اکارت ہو گئے، کیونکہ جب وہ اول ہی سے کافر ہیں تو ان کے اعمال کسی وقت صحیح ہوئے ہی نہیں، اس لیے خلاصہ تفسیر میں لفظ ''پہلے ہی سے'' بڑھا دیا گیا۔

* * *

فائدہ: یعنی جب انہوں نے اللہ کی باتوں کو ناپسند کیا تو اللہ انکے کام کیوں پسند کرے گا، اور جو چیز خدا کو ناپسند ہو وہ محض اکارت ہے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۡ

کیا وہ پھرے نہیں ملک میں کہ دیکھیں کیسا ہوا انجام ان کا جو ان سے پہلے تھے ہلاکی ڈالی اللہ نے ان پر

ع وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝١٠ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝١١

اور منکروں کو ملتی رہتی ہیں ایسی چیزیں [1] یہ اس لیے کہ اللہ رفیق ہے ان کا جو یقین لائے اور یہ کہ جو منکر ہیں ان کا رفیق نہیں کوئی [2]

خلاصہ تفسیر: (اور یہ لوگ جو ان وعیدوں اور عذاب الٰہی کے واقع ہونے کو بعید سمجھتے ہیں اس کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ کفر کا اللہ کے نزدیک مبغوض اور ناگوار ہونا تسلیم نہیں کرتے، مگر اس کا انکار کرنا ایک کھلی ہوئی بدیہی بات کا انکار ہے، ورنہ) کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں اور انہوں نے دیکھا نہیں کہ جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا انجام کیسا ہوا کہ خدا تعالیٰ نے ان پر کیسی تباہی ڈالی (جو ان کے اجڑے ہوئے محلات و مکانات سے ظاہر ہے، یہ صاف دلیل ہے کفر کے برے اور مبغوض ہونے پر) اور (جب کفر کا اللہ کے نزدیک برا اور مبغوض ہونا ثابت ہو گیا تو ان کو بھی بے فکر نہیں رہنا چاہیے اور عذاب کے واقع ہونے کو بعید نہیں سمجھنا چاہیے، کیونکہ) ان کافروں کے لئے بھی اسی قسم کے معاملات ہونے کو ہیں (کیونکہ جب کفر دونوں میں مشترک ہے تو عذاب بھی دونوں کو ہونا چاہیے، خواہ دنیا میں بھی ہو، یا صرف آخرت میں ہو، آگے فریقین کے حال کا اجمالی ذکر ہے کہ) یہ (مسلمانوں کی کامیابی اور کافروں کی تباہی) اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا کارساز ہے اور کافروں کا کوئی (ایسا) کارساز نہیں (کہ خدا کے مقابلہ میں ان کے کام بنا سکے اس لئے کفار دونوں جہان میں ناکام رہتے ہیں)۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا : ''اسی قسم کے معاملات'' سے مراد مطلق سزا ہے، بالکل پچھلوں جیسی سزا مراد نہیں، چنانچہ کفار مکہ کو مسلمانوں کے ہاتھوں دنیا میں بھی سزا ہوئی، جیسا کہ ارشاد ہے: قاتلوهم يعذبهم الله بايديكم تم ان سے جہاد کرو خدا تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے ان کو عذاب

دے گا، اور آخرت میں عذاب تو ظاہر ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: ہاں! یہ ممکن ہے کہ دنیا میں کبھی مسلمانوں کو بظاہر ناکامی ہوجائے اور کفار کو بظاہر کامیابی ہوجائے، لیکن اعتبار حقیقت اور انجام کا ہے، سواس کے اعتبار سے مسلمان ہمیشہ کامیاب اور کافر ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔

لفظ مولی کے دو معنی ہیں: ① کارساز و مددگار ② مالک، پس حق تعالی پہلے معنی کے اعتبار سے کفار کے مولی نہیں ہیں، اور دوسرے معنی کے اعتبار سے وہ ان کے بھی مولی ہیں، کیونکہ مالک تو وہ سب کے ہیں، مؤمن کافر کوئی اس سے خارج نہیں، پس دوسری جگہ جو فرمایا ہے: **ثم ردوا الی الله مولهم الحق** کہ پھر سب کفار حق تعالی یعنی اپنے مولی حقیقی کی طرف لے جائے جائیں گے، سو وہاں "مولی" کے معنی مالک کے ہیں، اور یہاں جو فرمایا ہے کہ کفار کے لیے کوئی "مولی" نہیں، یہاں مددگار اور کارساز کے معنی ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دنیا ہی میں دیکھ لو منکروں کی کیسی گت بنی اور کس طرح ان کے منصوبے خاک میں ملا دیے گئے، کیا آجکل کے منکروں کو ایسی سزائیں نہیں مل سکتیں۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ مومنین صالحین کا رفیق ہے جو وقت پر انکی مدد کرتا ہے، کافروں کا ایسا رفیق کون ہے، جو اللہ کے مقابلہ میں کام آسکے، غزوہ احد، میں ابوسفیان نے پکارا تھا: " لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ " آپ ﷺ نے فرمایا: پکارو: "اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ".

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ

مقرر اللہ داخل کرے گا ان کو جو یقین لائے اور کیے بھلے کام باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ⑫

اور جو لوگ منکر ہیں برت رہے ہیں اور کھاتے ہیں جیسے کہ کھائیں چوپائے اور آگ ہے گھر ان کا

خلاصہ تفسیر: پیچھے آخرت کے متعلق مسلمانوں کی کامیابی اور کفار کی ناکامی اجمالا بیان ہوئی، اب اسکی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

بیشک اللہ تعالی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، اور جو لوگ کافر ہیں وہ (دنیا میں) عیش کر رہے ہیں اور اس طرح (آخرت سے بے فکر ہوکر) کھاتے (پیتے) ہیں جس طرح چوپائے کھاتے ہیں (کہ وہ نہیں سوچتے کہ ہم کو کیوں کھلایا پلایا جاتا ہے اور ہمارے ذمہ اس کا کیا حق واجب ہے) اور جہنم ان لوگوں کا ٹھکانا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی دنیا کا سامان عبرت رہے اور مارے حرص کے بہائم کی طرح اناپ شناپ کھاتے چلے جاتے ہیں، نتیجہ کی خبر نہیں کہ کل یہ کھایا پیا کس طرح نکلے گا، اچھا چند روز مزے اڑالیں، آگے ان کے لیے آگ کا گھر تیار ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ⑬

اور کتنی تھیں بستیاں جو زیادہ تھیں زور میں اس تیری بستی سے جس نے تجھ کو نکالا ہم نے ان کو غارت کر دیا پھر کوئی نہیں ان کا مددگار

خلاصہ تفسیر: پیچھے جو کفار کے دنیا میں عیش کرنے کا ذکر ہوا ہے اس سے آپ کے مخالفین کو دھوکہ نہیں کھانا چاہئے اور نہ آپ کو ان کی اس غفلت پر کچھ غم وافسوس ہونا چاہئے جو ان کی مخالفت کا سبب بنی ہوئی ہے یہاں تک کہ آپ کو تنگ کر کے مکہ میں بھی نہیں رہنے دیا کیونکہ:

بہت سی بستیاں ایسی تھیں جو قوت (جسم اور قوت مال وجاہ) میں آپ کی اس بستی سے بڑھی ہوئی تھیں جس کے رہنے والوں نے آپ کو گھر

سے بے گھر کر دیا کہ ہم نے ان کو (عذاب سے) ہلاک کر دیا سو ان کا کوئی مددگار نہ ہوا (تو یہ بیچارے کیا چیز ہیں، ایسی حالت میں ان کو مغرور نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ چاہیں ان کی صفائی کر سکتے ہیں، اور آپ ان کے چند روزہ عیش سے غمگین ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی کفر اور آپ کی مخالفت کی وجہ سے مقررہ وقت پر سزا دینے والے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی دوسری قوموں کو جو زور و طاقت میں مکہ والوں سے کہیں بڑھ کر تھیں ہم نے تباہ کر چھوڑا اور کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا، پھر یہ کس بات پر اتراتے ہیں۔

تنبیہ: قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ سے مراد ''مکہ معظمہ ہے''، وہاں کے لوگوں نے ایسی حرکات کیں کہ آپ ﷺ کو وطن مالوف و محبوب چھوڑنا پڑا، حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے رخصت ہوتے وقت مکہ معظمہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ: ''خدا کی قسم! تو تمام شہروں میں اللہ کے نزدیک اور میرے نزدیک محبوب ترین شہر ہے اور اگر میری قوم مجھ کو تیرے اندر سے نہ نکالتی میں تجھ کو نہ چھوڑتا''۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾

بھلا ایک جو چلتا ہے واضح راستہ پر اپنے رب کے برابر ہے اس کے جس کو بھلا دکھلایا اس کا برا کام اور چلتے ہیں اپنی خواہشوں پر

خلاصہ تفسیر: (یہ لوگ جو کہ باطل پر ہیں آپ کے اور تمام اہل حق کے مقابلہ میں کیونکر سزا کے قابل نہ ہوں گے جبکہ یہ محض خواہش نفس کی راہ پر ہیں اور اہل حق خدا کی راہ پر ہیں تو جب اعمال میں یہ فرق ہے) تو جو لوگ اپنے پروردگار کے واضح (اور دلیل سے ثابت) راستہ پر ہوں کیا وہ ان شخصوں کی طرح ہو سکتے ہیں جن کی بدعملی ان کو بھلی معلوم ہوتی ہو اور جو اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہوں (یعنی جب اہل حق اور اہل باطل کے اعمال میں فرق ہے تو ان کے انجام میں بھی فرق ضروری ہوگا، پس جس طرح اہل حق ثواب کے مستحق ہیں تو اہل باطل عذاب کے مستحق ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی ایک شخص نہایت شرح صدر اور فہم و بصیرت کے ساتھ سچائی کی صاف اور کشادہ سڑک پر بے کھٹکے چلا جا رہا ہے، اور دوسرا اندھیرے میں پڑا ٹھوکریں کھاتا ہے، جس کو سیاہ و سفید یا نیک و بد کی کچھ تمیز نہیں، حتیٰ کہ اپنی بدتمیزی سے برائی کو بھلائی سمجھتا ہے اور خواہشات کی پیروی میں اندھا ہو رہا ہے، کیا ان دونوں کا مرتبہ اور انجام برابر ہو جائے گا؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ حق تعالیٰ کی شان حکومت و عدل کے منافی ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ

احوال اس بہشت کا جسکا وعدہ ہوا ہے ڈرنے والوں سے، اس میں نہریں ہیں پانی کی جو بو نہیں کر گیا [1] اور نہریں ہیں دودھ کی جسکا مزہ نہیں پھرا [2]

طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ

اور نہریں ہیں شراب کی جس میں مزہ ہے پینے والوں کے واسطے [3] اور نہریں ہیں شہد کی جھاگ اتارا ہوا [4] اور ان کیلئے وہاں سب طرح کے

وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾

میوے ہیں [5] اور معافی ہے انکے رب سے [6] یہ برابر ہے اسکے جو سدا رہے آگ میں اور پلایا جائے انکو کھولتا پانی تو کاٹ نکالے انکی آنتیں [7]

خلاصہ تفسیر: پیچھے بیان ہوا کہ اہل حق ثواب کے اور اہل باطل عذاب کے مستحق ہیں، چنانچہ اس ثواب و عذاب کا بیان یہ ہے کہ:

جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں بہت سی نہریں تو ایسے پانی کی ہیں جس میں ذرا تغیر نہیں ہوگا (نہ بو

میں، نہ رنگ میں، نہ مزے میں) اور بہت سی نہریں دودھ کی ہیں جن کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا نہ ہوگا، اور بہت سی نہریں ہیں شراب کی جو پینے والوں کو بہت لذیذ معلوم ہوں گی اور بہت سی نہریں ہیں شہد کی جو بالکل (میل کچیل سے پاک) صاف ہوگا اور ان کے لئے وہاں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور (اس میں داخل ہونے سے پہلے) ان کے رب کی طرف سے (گناہوں کی) بخشش ہوگی، کیا ایسے لوگ ان جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، اور کھولتا ہوا پانی ان کو پینے کو دیا جائے گا تو وہ ان کی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا (غرض یہ کہ جب ان دونوں کے اعمال میں فرق ہے تو انجام میں یہ فرق ہوگا جس کا اب بیان ہوگیا)۔

فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ: چونکہ دنیا کا پانی کبھی رنگ، کبھی مزہ اور کبھی بو میں متغیر ہو جاتا ہے، اسی طرح دنیا کا دودھ بگڑ جاتا ہے، اور دنیا کی شراب اکثر بدمزہ اور کڑوی ہوتی ہے، صرف بعض خاص منافع کے خیال سے پی جاتی ہے، جیسے تمبا کو کڑوا ہونے کے باوجود کھایا جاتا ہے، پھر عادت پڑ جاتی ہے، اسی طرح دنیا کے شہد میں میل کچیل موم وغیرہ سے مل جاتا ہے اس لیے وہاں کی نہروں میں ان باتوں کا نہ ہونا بیان فرما دیا، اور صحیح بات یہ ہے کہ جنت کی نہروں کی یہ چاروں قسمیں، پانی، دودھ، شراب، شہد اپنے حقیقی معنی میں ہیں، بلا وجہ مجازی معنی لینے کی ضرورت نہیں، البتہ یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ جنت کی چیزوں کو دنیا کی چیزوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، وہاں کی ہر چیز کی لذت و کیفیت کچھ اور ہی ہوگی جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں۔

اہل اشارہ نے پانی کو حیات روحانی کی، دودھ کو علم حقانی کی، شراب کو شوق و محبت کی، اور شہد کو وصل و قرب کی صورت فرمایا ہے، اور ممکن ہے کہ یہ ان حوال کی مثالی صورتیں ہوں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی طول مکث یا کسی چیز کے اختلاط سے اس کی بو نہیں بدلی، شہد سے زیادہ شیریں اور دودھ سے زیادہ سفید ہے، کسی طرح کے تغیر کو اس کی طرف راہ نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی دنیا کے دودھ پر قیاس نہ کرو، اتنی مدت گزرنے پر بھی اس کے مزے میں فرق نہیں آیا۔

فائدہ: ۳ یعنی وہاں کی شراب میں خالص لذت اور مزہ ہی ہے، نہ نشہ ہے، نہ شکستگی، نہ تلخی، نہ سر گرانی، نہ کوئی اور عیب و نقصان۔

فائدہ: ۴ یعنی صاف و شفاف شہد جس میں تکدر تو کہاں ہوتا جھاگ تک نہیں۔

تنبیہ: یہاں چار قسم کی نہروں کا ذکر ہوا جن میں پانی تو ایسی چیز ہے کہ انسان کی زندگی اس سے ہے اور دودھ غذائے لطیف کا کام دیتا ہے اور شراب سرور و نشاط کی چیز ہے، اور شہد کو شفاء للناس فرمایا گیا ہے۔

فائدہ: ۵ مشروبات کے بعد یہ ماکولات کا ذکر فرما دیا۔

فائدہ: ۶ یعنی سب خطائیں معاف کر کے جنت میں داخل کریں گے وہاں پہنچ کر کبھی خطاؤں کا ذکر بھی نہ آئے گا جو ان کی کلفت کا سبب بنے، اور نہ آئندہ کسی بات پر گرفت ہوگی۔

فائدہ: ۷ یعنی کھولتا ہوا پانی جب دوزخیوں کو پلائیں گے تو آنتیں کٹ کر باہر آ پڑیں گی۔ (اعاذنا اللہ منہ)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا

اور بعض ان میں ہیں کہ کان رکھتے ہیں تیری طرف، یہاں تک کہ جب نکلیں تیرے پاس سے کہتے ہیں ان کو جن کو علم ملا ہے کیا

قَالَ اٰنِفًا ۣ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۝١٦ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا

کہا تھا اس شخص نے ابھی ۱ یہ وہی ہیں جن کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اللہ نے اور چلے ہیں اپنی خواہشوں پر ۲ اور جو لوگ راہ پر آئے ہیں

زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰـهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾

ان کو اور بڑھ گئی اس سے سوجھ اور ان کو اس سے ملا بچ کر چلنا ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل ایمان اور کفار کے احوال واعمال، وعدے اور وعیدیں بیان ہوئیں، اب آگے منافقین کی حالت، مذمت اور ان کے لیے وعید کا بیان ہے، درمیان میں مزید معرفت کے لیے منافقین کے مقابلہ میں اہل ایمان کی حالت بیان فرمائی۔

اور (اے نبی ﷺ!) بعض آدمی ایسے ہیں (مراد منافقین ہیں) کہ وہ (آپ کی تبلیغ وتعلیم کے وقت ظاہر میں تو) آپ کی طرف کان لگاتے ہیں (لیکن دل سے بالکل متوجہ نہیں ہوتے) یہاں تک کہ جب وہ لوگ آپ کے پاس سے (اٹھ کر مجلس سے) باہر جاتے ہیں تو دوسرے اہل علم (صحابہ) سے کہتے ہیں کہ حضرت نے ابھی (جب ہم مجلس میں تھے) کیا بات فرمائی تھی (ان کا یہ کہنا بھی ایک قسم کا استہزاء ہی تھا کہ اس سے یہ جتلانا تھا کہ ہم آپ کی گفتگو کو توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھتے، یہ بھی نفاق ہی کا ایک شعبہ تھا، ارشاد ہوتا ہے کہ:) یہ وہ لوگ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے (پس ہدایت سے دور ہو گئے) اور اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں، اور (انہی کی قوم میں سے) جو لوگ راہ پر ہیں (یعنی مسلمان ہو چکے ہیں) اللہ تعالیٰ ان کو (احکام سننے کے وقت) اور زیادہ ہدایت دیتا ہے (کہ وہ گزشتہ کے ساتھ ساتھ ان جدید احکام پر بھی ایمان لاتے ہیں، یعنی ان کی ایمانیات کی تعداد بڑھ گئی، یا یہ کہ ان کے ایمان کو اور زیادہ قوی اور پختہ کر دیتے ہیں جو عمل صالح کا خاصہ ہے کہ اس سے ایمان میں مزید پختگی پیدا ہوتی ہے، یہ **طبع اللہ** کے مقابلہ میں ہے) اور ان کو ان کے تقویٰ کی توفیق دے دیتا ہے (یعنی ایمان لانے کے بعد ان احکام پر عمل بھی کرتے ہیں، یہ **واتبعوا اھواءھم** کا مقابل ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اوپر مومنوں اور کافروں کا حال مذکور تھا، ایک قسم کافروں کی وہ ہے جسے ''منافق'' کہتے ہیں، یعنی ظاہر میں اسلام کا دعویٰ اور باطن میں اس سے انحراف، اس آیت میں اس کا ذکر ہے، یعنی یہ لوگ بظاہر پیغمبر کی بات سننے کے لیے کان رکھتے ہیں، مگر نہ دلی توجہ ہے نہ سمجھ، نہ یاد، جب مجلس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو اہل علم سے کہتے ہیں کہ اس شخص (یعنی پیغمبر ﷺ) نے ابھی ابھی کیا بیان کیا تھا، شاید اس دریافت کرنے سے مقصود ادھر تعریض کرنا ہوگا کہ ان کی بات کو لائق اعتناء نہیں سمجھتے نہ توجہ سے سنتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ایسی نالائق حرکتوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اللہ ان کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے، پھر نیکی کی توفیق قطعاً نہیں ہوتی محض خواہشات کی پیروی رہ جاتی ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی سچائی کے راستہ پر چلنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی روز بروز ہدایت میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے اور اس کی سوجھ بوجھ اور پرہیزگاری بڑھتی جاتی ہے۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ

اب یہی انتظار کرتے ہیں قیامت کا کہ آ کھڑی ہو ان پر اچانک، سو آ چکی ہیں اس کی نشانیاں، پھر کہاں نصیب ہوگا ان کو

اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿۱۸﴾

جب وہ آ پہنچے ان پر سمجھ پکڑنا

خلاصہ تفسیر: اب ان منافقین کے لئے وعید ہے کہ یہ جو قرآن اور احکام الٰہیہ سن کر بھی متاثر نہیں ہوتے:

سو (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ لوگ بس قیامت کے منتظر ہیں کہ وہ ان پر دفعتاً آ پڑے (یہ بطور زجر وتوبیخ کے فرمایا کہ اب بھی متاثر نہیں ہوتے تو

کیا قیامت میں تذکر اور ہدایت حاصل کریں گے) سو (یاد رکھو کہ قیامت بھی نزدیک ہے چنانچہ) اس کی (متعدد) علامتیں تو آچکی ہیں (چنانچہ حدیث کی رو سے حضور ﷺ کی بعثت و نبوت بھی علامات قیامت میں سے ہے اور شق قمر نبی کریم ﷺ کا معجزہ ہونے کے علاوہ قیامت کی علامات میں سے بھی ہے، یہ سب علامات زمانہ نزول قرآن میں موجود ہو چکی تھیں، آگے اس کا بیان ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت پانے میں قیامت کا انتظار کرنا محض جہالت ہے کیونکہ وہ وقت سمجھنے اور عمل کرنے کا نہیں ہوگا، فرمایا:) تو جب قیامت ان کے سامنے آکھڑی ہوئی اس وقت ان کو سمجھنا کہاں میسر ہوگا (یعنی مفید نہیں ہوگا)۔

* * *

فائدہ: یعنی قرآن کی نصیحتیں، گذشتہ اقوام کی عبرتناک مثالیں اور جنت و دوزخ کے وعدہ و وعید سب سن چکے اب ماننے کے لیے کس وقت کا انتظار ہے، یہی کہ قیامت کی گھڑی ان کے سر پر اچانک آکھڑی ہو، سو قیامت کی کئی نشانیاں تو آچکیں، اور جب خود قیامت آکھڑی ہوگی، اس وقت ان کے لیے سمجھ حاصل کرنے اور ماننے کا موقع کہاں باقی رہے گا، یعنی وہ سمجھنا اور ماننا بے کار ہے کیونکہ اس پر نجات نہیں ہو سکتی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''بڑی نشانی قیامت کی ہمارے نبی ﷺ کا پیدا ہونا ہے، سب نبی خاتم النبیین کی راہ دیکھتے تھے، جب وہ آچکے (مقصود تخلیق عالم کا حاصل ہو چکا) اب قیامت ہی باقی ہے''، حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: '' اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ '' (میں اور قیامت اس طرح ہیں) گویا میں قیامت سے اتنا آگے نکل آیا ہوں جتنا بیچ کی انگلی شہادت کی انگلی سے آگے نکلی ہوئی ہے، شرح صحیح مسلم میں ہم نے اس کی مفصل تقریر کی ہے، یہاں گنجائش نہیں۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

سو تو جان لے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایماندار مردوں اور عورتوں کیلئے [۱] اور اللہ کو معلوم ہے

ع مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿١٩﴾

بازگشت تمہاری اور گھر تمہارا [۲]

خلاصہ تفسیر: شروع سورت سے یہاں تک مؤمنین، کافرین اور منافقین کے احوال اور ان کے انجام مذکور ہوئے، اب آگے دوسروں کو سنانے کے لیے آپ کو دین پر مستقیم رہنے اور جن باتوں سے دین ناقص ہوتا ہے استغفار وغیرہ کے ذریعے ان کی تلافی کرنے کا خطاب ہے، اور آپ کو بظاہر مخاطب بنانے کا یہ فائدہ ہے کہ مبالغہ کے ساتھ اس حکم کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہو جائے کہ جب معصوم کو بھی اس کا حکم ہے تو دوسرے کس شمار میں ہیں، اور دوسروں کو سنانے کا قرینہ: مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ کی ضمیر ہے کہ اس میں سب کو خطاب ہے اور ماقبل سے اس کا ربط یہ ہے کہ جب دین کی جزا اور کفر و نافرمانی کی سزا سن لی تو سامعین کو چاہیے کہ دین و ایمان پر قائم رہیں اور جو چیزیں کہ ایمان کو ناقص بھی کرتی ہوں چاہیے زائل نہ کریں جیسے تمام گناہ، اولا ان سے بچیں اور اگر کبھی ہو جائیں تو فوراً استغفار سے تلافی کریں۔

(جب آپ خدا تعالیٰ کے تابعدار اور نافرمان دونوں کا حال و انجام سن چکے) تو آپ اس کا (اکمل طریقہ پر) یقین رکھئے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں (اس میں دین کے تمام اصول و فروع آگئے، کیونکہ علم سے مراد علم کامل اکمل ہے اور کامل علم کے لئے تمام احکام پر عمل کرنا لازم ہے، یہ عنوان اس لیے اختیار کیا گیا کہ توحید تمام احکام کی اصل بنیاد ہے، حاصل یہ ہے کہ تمام احکام الٰہیہ کی بجا آوری پر مداومت رکھو) اور (اگر کبھی کوئی خطا سرزد ہو جائے جو آپ کی عصمت نبوت کی بناء پر درحقیقت گناہ نہیں بلکہ صرف ترک افضل ہی ہوگا مگر آپ کی بلند شان کے اعتبار سے صورۃ خطا ہوگی اس لئے) آپ اپنی (اس ظاہری) خطا کی معافی مانگتے رہئے اور (کمال دین میں خلل ڈالنے والی ایسی باتیں آپ کی امت سے بھی صادر ہو سکتی

ہیں اور ان کی خطائیں واقع میں بھی گناہ ہوسکتی ہیں اس لیے آپ) سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لئے بھی (بخشش کی دعا مانگے رہئے تاکہ کمال دین کا جو درجہ آپ کی شان کے مناسب ہے اور جو امت کی شان کے مناسب ہے وہ محفوظ رہے اور جو چیزیں اس میں خلل پیدا کریں ان کا تدارک ہوتا رہے) اور (یہ بھی یاد رہے کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے چلنے پھرنے اور رہنے سہنے کی (یعنی سب اعمال واحوال کی) خبر رکھتا ہے (پس اس کے وعدہ کے امیدوار اور اس کی وعید سے ڈرنا چاہیے)۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ سمجھ لیجئے کہ اللہ کے سوا اور کوئی قابل عبادت نہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ علم تو ہر مومن مسلمان کو بھی حاصل ہے سید الانبیاء کو کیوں حاصل نہ ہوتا، پھر اس علم کے حاصل کرنے کا حکم دینا یا تو اس پر ثابت قدم رہنے کے معنی میں ہے، اور یا اس کے مقتضیات پر عمل کرنا مراد ہے، یہاں آیت مذکورہ میں اگر چہ یہ علم رسول اللہ ﷺ کو پہلے سے حاصل تھا مگر مقصود اس سے اس کے مقتضیٰ پر عمل ہے اسی لئے اس کے بعد: **واستغفر** کا حکم دیا گیا، اور رسول اللہ ﷺ سے بوجہ عصمت نبوت کے اس کے خلاف کرنے کا اگر چہ احتمال نہیں تھا، لیکن احکام سنانا معصوم ہونے کے منافی نہیں، معصوم کو بھی احکام سنائے جاتے ہیں جس سے کبھی محض بتلانا مقصود ہوتا ہے، اور اگر آپ کو پہلے سے وہ حکم معلوم ہو تو بغرض اہتمام دوسروں کو سنانا مقصود ہوتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام سے معصوم ہونے کے باوجود بعض اوقات اجتہاد میں خطا ہوجاتی ہے اور اجتہادی خطا قانون شرع میں گناہ نہیں، بلکہ اس پر بھی اجر ملتا ہے مگر انبیاء علیہم السلام کو اس خطا پر متنبہ ضرور کر دیا جاتا ہے اور ان کی شان عالی کے اعتبار سے اس کو لفظ ذنب سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ سورۃ عبس میں جو رسول اللہ ﷺ پر ایک قسم کا عتاب نازل ہوا وہ بھی اسی خطاء اجتہادی کی ایک مثال تھی جس کی تفصیل سورۃ عبس میں آئے گی کہ وہ اجتہادی خطا اگر چہ کوئی گناہ نہ تھا، بلکہ ایک اجر اس پر بھی ملنے کا وعدہ تھا، مگر آپ کی شان عالی کے لئے اس کو پسند نہیں کیا گیا اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا، آیت مذکورہ میں اسی طرح کا ''ذنب'' مراد ہوسکتا ہے، اور ایسی ہی باتوں کو سورہ الفتح کے شروع میں گناہ سے تعبیر کر کے مغفرت کی بشارت دی گئی ہے، خوب سمجھ لو۔

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ: اس سے اشارہ ملتا ہے کہ مشائخ اپنی دعاؤں میں اپنے ساتھ اپنے متبعین اور متعلقین کے لیے بھی دعا کیا کریں۔

* * *

فائدہ: لے ہر ایک کا ذنب (گناہ) اس کے مرتبہ کے موافق ہوتا ہے، کسی کام کا بہت اچھا پہلو چھوڑ کر کم اچھا پہلو اختیار کرنا گو وہ حدود جواز و استحسان میں ہو، بعض اوقات مقربین کے حق میں ذنب (گناہ) سمجھا جاتا ہے ''حسنات الابرار سیأت المقربین'' کے یہی معنی ہے، حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ دن میں سو بار استغفار فرماتے تھے۔

تنبیہ: فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ کا خطاب ہر ایک مخاطب کو ہے، اور اگر خاص نبی کریم ﷺ مخاطب ہوں تو مطلب یہ ہے کہ اس علم پر برابر جمے رہیے اور استغفار کرتے رہیے، اور **فاعلم** کی تفریع ماقبل پر اس طرح ہے کہ قیامت آنے کے بعد کسی کو ایمان و توبہ وغیرہ نافع نہیں، تو آدمی کو چاہیے کہ اس کے آنے سے قبل صحیح معرفت حاصل کرے اور ایمان و استغفار کے طریق پر مستقیم رہے۔

فائدہ: ۲ یعنی جتنے پردوں میں پھرو گے پھر بہشت یا دوزخ میں پہنچو گے جو تمہارا اصلی گھر ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ

اور کہتے ہیں ایمان والے کیوں نہ اتری ایک سورت لے پھر جب اتری ایک سورت جانچی ہوئی ۲ اور ذکر ہوا اس میں لڑائی کا

رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ

تو تو دیکھتا ہے ان کو جن کے دل میں روگ ہے تکتے ہیں تیری طرف جیسے تکتا ہے کوئی بیہوش پڑا ہوا مرنے کے وقت

فَاَوۡلٰی لَهُمۡ ﴿۲۰﴾

سوخرابی ہے ان کی سے

خلاصہ تفسیر: پیچھے مؤمنین اور کفار کے ذکر کے بعد منافقین کا ذکر تھا، اب آگے بھی منافقین کے حال کی زیادہ تفصیل ہے، اور یہاں شروع میں مؤمنین کا قول تمہید کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (تو ہمیشہ اس بات کے مشتاق رہتے ہیں کہ کلام الٰہی اور نازل ہو، تاکہ ایمان تازہ ہو اور جدید احکام آئیں تو ان کا ثواب بھی حاصل کریں اور اگر احکام سابقہ کی تاکید ہو تو اور زیادہ ثبات حاصل ہو اور اس اشتیاق میں) کہتے رہتے ہیں کہ کوئی (نئی) سورت کیوں نہ نازل ہوئی (اگر نازل ہو تو تمنا پوری ہو) سو جس وقت کوئی صاف صاف (مضمون کی) سورت نازل ہوتی ہے اور (اتفاق سے) اس میں جہاد کا بھی (صاف صاف) ذکر ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف اس طرح (بھیانک نگاہوں سے) دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو (اس طرح دیکھنے کا سبب خوف اور بزدلی ہے کہ اب اپنے ایمان کے دعوی کو نبھانے کے لئے جہاد میں جانا پڑا اور مصیبت آئی، اور وہ جو اس طرح خدا کے حکم سے جی چراتے ہیں) سو (اصل یہ ہے کہ) عنقریب ان کی کم بختی آنے والی ہے (خواہ دنیا میں بھی کسی وبال میں گرفتار ہوں، ورنہ موت کے بعد تو ضروری ہی ہے)۔

فَاِذَآ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ مُّحۡكَمَةٌ: یہاں سورۃ محکمۃ میں جو "محکمۃ" کی قید ہے یہ محکم متشابہ کے مقابل ہے جیسا کہ سورہ آل عمران کے شروع میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں ہے، "محکمۃ" کے لفظی معنی مضبوط و مستحکم کے ہیں، اس لغوی معنی کے اعتبار سے تو قرآن کی ہر سورت محکمہ ہے، لیکن اصطلاح شرع میں محکم بمقابلہ منسوخ استعمال ہوتا ہے، یہاں سورۃ کے ساتھ محکمہ کی قید کا اضافہ اس لئے ہے کہ عمل کا شوق تو جبھی پورا ہو سکتا ہے جبکہ وہ سورت منسوخ نہ ہو، اس قید کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر معنی کے اعتبار سے خفی کوئی آیت جہاد کے بارے میں نازل ہوتی تو ان منافقین کو بہانہ مل سکتا تھا کہ ہم اس کے معنی نہیں سمجھے، اور محکم میں چونکہ اس بہانہ کی گنجائش نہ تھی اس لیے ان پر سخت شاق ہوتا تھا، اگر شبہ ہو کہ جہاد کا حکم ایک بار نازل ہونا بھی منافقین کی ناگواری کے لیے کافی تھا تو متعدد بار نزول کا بھی اس میں کیا فائدہ ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اکثر آیتیں جہاد کی ایسی ہیں کہ جب کوئی نیا قصہ پیش آیا اور خاص کسی قوم سے جہاد کی ضرورت ہوئی تو خاص اس کے متعلق آیتیں آگئیں، پس اگر نئی آیتیں نہ آتیں تو وہ اس سے بےفکر رہتے کہ گذشتہ آیات کا موقع محل تو ختم ہو چکا، اب اس نئے واقعہ میں تو جہاد کا حکم نہیں ہوا ہے، مگر جب اس نئے واقعہ میں بھی جہاد کی آیت کا نزول ہوتا تو پھر ان کی جان کو بنتی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ایسی سورت جس میں جہاد کی اجازت ہو۔

فائدہ: ۲ یعنی جچے تلے احکام پر مشتمل ہے جو غیر منسوخ ہیں اور ٹھیک اپنے وقت پر اترتے ہیں۔

فائدہ: ۳ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "مسلمان سورت مانگتے تھے یعنی کافروں کی ایذاء سے عاجز ہو کر آرزو کرتے کہ اللہ جہاد کا حکم دے تو جو ہم سے ہو سکے کر گزریں، جب جہاد کا حکم آیا تو منافق اور کچے لوگوں پر بھاری ہوا، خوفزدہ اور بےرونق آنکھوں سے پیغمبر کی طرف دیکھنے لگے کہ کاش ہم کو اس حکم سے معاف رکھیں، بےحد خوف میں بھی آنکھ کی رونق نہیں رہتی، جیسے مرتے وقت آنکھوں کا نور جاتا رہتا ہے"۔

طَاعَةٌ وَّقَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ ۫ فَاِذَا عَزَمَ الۡاَمۡرُ ۫ فَلَوۡ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ ﴿۲۱﴾

حکم ماننا ہے اور بھلی بات کہنی پھر جب تاکید ہو کام کی تو اگر سچے رہیں اللہ سے تو ان کا بھلا ہے

خلاصہ تفسیر: (اور اگرچہ فرصت میں یہ لوگ اطاعت اور خوشامد کی بنا پر بہت باتیں بنایا کرتے ہیں، لیکن) ان کی اطاعت اور

بات چیت (کی حقیقت) معلوم ہے (جس کا اب قتال کا حکم نازل ہونے کے وقت ان کی حالت سے سب ہی پر واضح ہو گیا) پھر (جہاد کا حکم نازل ہونے کے بعد) جب سارا کام (اور لڑائی کا سامان) تیار ہو ہی جاتا ہے تو (اس وقت بھی) اگر یہ لوگ (ایمان کے دعوی میں) اللہ سے سچے رہتے (یعنی دعویٰ ایمان کے مقتضا پر عمل کرتے جس میں تمام احکام شرعیہ عموماً اور حکم جہاد خصوصاً شامل ہے اور صدق دل سے جہاد کرتے) تو ان کے لئے بہت ہی بہتر ہوتا (یعنی ابتداء میں اگر منافق تھے تو اخیر ہی میں نفاق سے تائب ہو جاتے تب بھی ایمان مقبول ہو جاتا، اور انتہاء کو اسی میں منحصر نہ سمجھا جائے، کیونکہ موت کے وقت تک صدق دل سے توبہ مقبول ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی ظاہر میں یہ لوگ فرمانبرداری کا اظہار اور زبان سے اسلام و احکام اسلام کا اقرار کرتے ہیں۔ مگر کام کی بات یہ ہے کہ عملاً خدا و رسول کا حکم مانیں اور بات اچھی اور معقول کہیں، پھر جب جہاد وغیرہ میں کام کی تاکید اور زور آپڑے اس وقت اللہ کے سامنے سچے ثابت ہوں تو یہ صورت ان کی بہتری اور بھلائی کی ہوگی۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی حکم شرع کو نہ ماننے سے کافر ہو جاتا ہے، اللہ کا حکم ہر طرح ماننا ہی چاہیے، پھر رسول بھی جانتا ہے کہ نامردوں کو کیوں لڑوائے، ہاں جب بہت ہی تاکید آپڑے اسی وقت لڑنا ضروری ہوگا نہیں تو لڑنے والے بہت ہیں''۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾

پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو خرابی ڈالو ملک میں اور قطع کرو اپنی قرابتیں ۱؎

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾

ایسے لوگ ہیں جن پر لعنت کی اللہ نے پھر کر دیا ان کو بہرا اور اندھی کر دیں ان کی آنکھیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب جہاد کی تاکید اور اس سے پیچھے رہنے والوں کو خطاب کر کے ترک جہاد پر بیان فرماتے ہیں کہ تم لوگ جو جہاد سے کراہت کرتے ہو) سو (اس میں ایک دنیوی نقصان بھی ہے چنانچہ) اگر تم (اور اسی طرح سب جہاد سے) کنارہ کش رہو تو آیا تم کو یہ احتمال بھی ہے (یعنی ہونا چاہئے) کہ تم (یعنی تمام آدمی) دنیا میں فساد مچادو اور آپس میں قطع قرابت کر دو (اب ان مذکورہ منافقین کی مذمت ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اپنی رحمت سے دور کر دیا (اس لئے اس کے احکام پر عمل کی توفیق نہ رہی) پھر (رحمت سے دور کرنے پر یہ امر مرتب ہوا کہ) ان کو (احکام الٰہیہ سننے سے) بہرا کر دیا اور (راہ حق کے دیکھنے سے) ان کی (باطنی) آنکھوں کو اندھا کر دیا۔

أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ: یعنی جہاد سے بڑا فائدہ اقامت عدل و اصلاح و امن کا ہے، اگر اس کو چھوڑ دیا جائے تو مفسدین کا غلبہ ہو جائے، اور کوئی انتظام جس میں تمام لوگوں کے مصالح کی حفاظت ہو نہ رہے گا، اور ایسا انتظام نہ ہونے کی صورت میں فساد عام اور حقوق کا ضائع کرنا لازم ہے، پس جس جہاد میں دنیوی فائدہ بھی بہت بڑا ہو تو اس سے پیچھے ہٹنا اور بھی زیادہ عجیب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی حکومت و اقتدار کے نشہ میں لوگ عموماً اعتدال و انصاف پر قائم نہیں رہا کرتے، دنیا کی حرص اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، پھر جاہ و مال کی کشمکش اور غرض پرستی میں جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں، جن کا آخری نتیجہ ہوتا ہے عام فتنہ و فساد اور ایک دوسرے سے قطع تعلق۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی جان سے تنگ ہو کر جہاد کی آرزو کرتے ہو اور اگر اللہ تم ہی کو غالب کر دے تو فساد نہ کرنا''۔

تنبیہ: ① مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے **تولّیتم** کا ترجمہ ''حکومت مل جانے'' سے کیا ہے جیسا کہ بہت سے مفسرین کی رائے ہے ② دوسرے علماء ''تولّی'' کو بمعنی ''اعراض'' لے کر یوں مطلب لیتے ہیں کہ اگر تم اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے اعراض کرو گے تو ظاہر ہے دنیا میں امن و

انصاف قائم نہیں ہوسکتا اور جب دنیا میں امن وانصاف نہ رہے گا تو ظاہر ہے فساد، بدامنی اور حق ناشناسی کا دور دورہ ہوگا۞ اور بعض نے اس طرح تفسیر کی ہے کہ اگر تم ایمان لانے سے اعراض کروگے تو زمانہ جاہلیت کی کیفیت عود کر آئے گی جو خرابیاں اور فساد اس وقت تھے اور ادنیٰ بات پر رشتے ناتے قطع ہوجاتے تھے، وہ ہی سب نقشہ پھر قائم ہوجائے گا۞ اور اگر آیت میں خاص منافقین سے خطاب مانا جائے تو ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر جہاد سے اعراض کروگے تو تم سے یہ ہی توقع کی جاسکتی ہے کہ اپنی منافقانہ شرارتوں سے ملک میں خرابی مچاؤگے اور جن مسلمانوں سے تمہاری قرابتیں ہیں ان کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے کھلے کافروں کے مددگار بنوگے۔

فائدہ: ۲ یعنی حکومت کے غرور میں اندھے بہرے ہوکر ظلم کرنے لگے، پھر کسی کا سمجھایا نہ سمجھے، خدا کی پھٹکار نے بالکل ہی سنگدل بنادیا اور یہ سب کچھ ان ہی کے سوءِ اختیار اور قصورِ استعداد سے ہوا۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۞

کیا دھیان نہیں کرتے قرآن میں یا دلوں پر لگ رہے ہیں ان کے قفل

خلاصہ تفسیر: اب ان کو دھمکی ہے کہ جب قرآن میں جہاد اور دیگر احکام کا واجب ہونا ثابت ہے اور دلائل کے ساتھ قرآن کی حقانیت بھی ثابت ہے، اور احکام الٰہیہ کے دنیوی اور اخروی مصالح اور منافع اور ان کی مخالفت پر وعیدیں بھی اس میں مذکور ہیں تو اس سب کے باوجود یہ لوگ جو قرآن کی طرف توجہ نہیں کرتے:

تو کیا یہ لوگ قرآن (کے اعجاز اور مضامین) میں غور نہیں کرتے (اس لئے ان کو انکشاف نہیں ہوتا) یا (غور کرتے ہیں مگر) دلوں پر (غیبی) قفل لگ رہے ہیں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا: یعنی ان دونوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں یہ دونوں باتیں جمع ہوں، اور واقع میں یہاں دونوں باتیں جمع ہیں، اول ان کی طرف سے ایک فعل ہوا، یعنی انکار کی وجہ سے قرآن میں غور نہ کرنا، پھر اس کے وبال میں ان کے دلوں پر قفل (تالا) لگ گیا جس کو طبع اور ختم (یعنی مہر لگادینا) بھی کہا گیا ہے اور اس ترتیب کی دلیل یہ آیت ہے: **ذلك بانهم امنوا ثم كفروا فطبع على قلوبهم** اور پھر اس مجموعہ پر آخر میں: **فهم لا يفقهون** مرتب ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی منافق قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کی شرارتوں کی بدولت دلوں پر قفل پڑگئے ہیں کہ نصیحت کے اندر جانے کا راستہ ہی نہیں رہا، اگر قرآن کے سمجھنے کی توفیق ملتی تو باآسانی سمجھ لیتے کہ جہاد میں کس قدر دنیاوی واخروی فوائد ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ

بیشک جو لوگ الٹے پھر گئے اپنی پیٹھ پر بعد اس کے کہ ظاہر ہوچکی ان پر سیدھی راہ شیطان نے بات بنائی ان کے دل میں

وَاَمْلٰى لَهُمْ ۞

اور دیر کے وعدے کئے

خلاصہ تفسیر: (اب اس غور وفکر اور تدبر کے نہ ہونے کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ) جو لوگ (حق سے) پشت پھیر کر ہٹ گئے بعد اس کے سیدھا راستہ ان کو (عقلی دلائل سے جیسے قرآن کا اعجاز، اور چونکہ اکثر منافقین یہودی تھے تو نقلی دلائل سے بھی جیسے پہلی کتابوں کی پیشین گوئی سے) صاف معلوم ہوگیا شیطان نے ان کو چکمہ دیا ہے اور ان کو دور دور کی سوجھائی ہے (کہ ایمان لانے سے فلاں فلاں موجودہ مصلحتیں یا جو مصلحتیں

آئندہ متوقع ہیں وہ فوت ہو جائیں گی۔ یہ املاء ہے۔ اس لیے ایمان نہ لانا ہی بہتر ہے۔ یہ تسویل ہے۔)۔

الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ: اس میں شیطان کی طرف دو کاموں کی نسبت کی گئی: ① ایک تسویل جس کے معنی تزئین کے ہیں کہ بری چیز یا برے عمل کو کسی کی نظروں میں اچھا اور مزین کر دے ② دوسرا املاء، جس کے معنے امہال اور مہلت دینے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ شیطان نے اول تو ان کے برے اعمال کو ان کی نظروں میں اچھا اور مزین کر کے دکھلایا پھر ان کو ایسی طویل آرزوؤں اور امیدوں میں الجھا دیا جو پوری ہونے والی نہیں، حاصل یہ ہوا کہ اس غور نہ کرنے کی وجہ عناد ہے کہ ہدایت کے واضح ثبوت کے بعد پھر یہ الٹے پاؤں لوٹے جا رہے ہیں، اور اس عناد کے بعد تسویل شیطانی ہوئی، یعنی شیطان نے ان کی نظروں میں اس غلط اور مہلک عمل کو مزین کر کے دکھلایا، اور اس تسویل کی سے عدم تدبر ہوا، اور عدم تدبر کی وجہ سے ختم اور طبع یعنی دلوں پر مہر ہوئی۔

* * *

فائدہ: یعنی منافقین اسلام کا اقرار کرنے اور اس کی سچائی ظاہر ہو چکنے کے بعد وقت آنے پر اپنے قول و قرار سے پھرے جاتے ہیں اور جہاد میں شرکت نہیں کرتے، شیطان نے ان کو یہ بات سجھا دی ہے کہ لڑائی میں نہ جائیں گے تو دیر تک زندہ رہیں گے، خواہ مخواہ جا کر مرنے سے کیا فائدہ اور نہ معلوم کیا کچھ سجھاتا اور دور دراز کے لمبے چوڑے وعدے دیتا ہے وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (الاسراء: ٦٤)

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ

یہ اس واسطے کہ انہوں نے کہا ان لوگوں سے جو بیزار ہیں اللہ کی اتاری کتاب سے ہم تمہاری بات بھی مانیں گے بعضے کاموں میں

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿٢٦﴾

اور اللہ جانتا ہے ان کا مشورہ کرنا

خلاصہ تفسیر: (پھر) یہ (ہدایت سامنے آجانے کے باوجود اس سے پیٹھ موڑنا اور دور ہونا) اس سبب سے ہوا کہ ان لوگوں نے ایسے لوگوں سے جو کہ خدا کے اتارے ہوئے احکام کو (حسد کی وجہ سے) ناپسند کرتے ہیں (مراد اس سے یہود یوں کے روساء و سردار ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے حسد کرتے تھے اور حق پہچاننے کے باوجود اتباع سے عار کرتے تھے، حاصل یہ کہ ان منافقین نے رؤسائے یہود سے) یہ کہا بعض باتوں میں ہم تمہارا کہنا مان لیں گے (یعنی تم جو ہم کو محمد ﷺ کی اتباع سے منع کرتے ہو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ ظاہر میں بھی اتباع نہ کریں دوسرے یہ کہ باطن میں اتباع نہ کریں، سو پہلی صورت میں تو مصلحت کی وجہ سے ہم تمہارا کہنا نہیں مان سکتے، لیکن دوسری صورت میں مان لیں گے، کیونکہ عقائد میں ہم تمہارے ساتھ ہیں، مطلب یہ ہوا کہ حق سے پھرنے کا سبب قومی تعصب اور اندھی تقلید ہے) اور (اگرچہ اس قسم کی باتیں یہ منافقین خفیہ کرتے ہیں مگر) اللہ تعالیٰ ان کی خفیہ باتیں کرنے کو (خوب) جانتا ہے (اور بعض امور پر وحی سے آپ کو مطلع کر دیتا ہے)۔

* * *

فائدہ: منافقوں نے یہود وغیرہ سے کہا کہ گو ہم ظاہر میں مسلمان ہو گئے ہیں، لیکن مسلمانوں کے ساتھ ہر گز تم سے نہ لڑیں گے بلکہ موقع ملا تو تم کو مدد دیں گے اور اس قسم کے کاموں میں تمہاری بات مانیں گے۔

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿٢٧﴾

پھر کیسا ہوگا حال جب کہ فرشتے جان نکالیں گے ان کی مارتے جاتے ہوں ان کے منہ پر اور پیٹھ پر۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾ ع

یہ اس لیے کہ وہ چلے اس راہ جس سے اللہ بیزار ہے اور ناپسند کی اس کی خوشی پھر اس نے اکارت کر دیے ان کے کام ۲

خلاصہ تفسیر: اب وعید ہے جو پیچھے آیت: اولی لھم کی تفسیر کے طور پر ہوسکتی ہے، یعنی یہ لوگ جو ایسی حرکتیں کر رہے ہیں اپنے انجام سے بے خبر ہیں۔

سو ان کا کیا حال ہوگا جبکہ فرشتے ان کی جان قبض کرتے ہوں گے اور ان کے مونہوں پر اور پشتوں پر مارتے جاتے ہوں گے (اور) یہ (سزا) اس سبب سے (ہوگی) کہ جو طریقہ خدا کی ناراضی کا موجب تھا یہ اسی پر چلے اور اس کی رضا (کے کاموں) سے نفرت کیا کئے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے سب اعمال (نیک اول ہی سے) کالعدم کر دیئے (پس اس سزا کے مستحق ہو گئے، اور اگر کسی کے پاس کوئی عمل مقبول ہوتو اس کی برکت سے سزا میں کچھ تو کمی ہو بھی جاتی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس وقت موت سے کیونکر بچیں گے، بیشک اس وقت نفاق کا مزہ چکھیں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کی خوشنودی کا راستہ پسند نہ کیا، اسی راہ چلے جس سے وہ ناراض ہوتا تھا، اس لیے موت کے وقت ہی بھیانک سماں دیکھنا پڑا اور اللہ نے ان کے کفر وطغیان کی بدولت سب عمل بیکار کر دیے، کسی عمل نے ان کو دوسری زندگی میں فائدہ نہ پہنچایا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾

کیا خیال رکھتے ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہ اللہ ظاہر نہ کر دے گا ان کے کینے

خلاصہ تفسیر: جن لوگوں کے دلوں میں مرض (نفاق) ہے (اور وہ اس کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں) کیا یہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کرے گا (یعنی ان کو یہ اطمینان کیسے ہوگیا جبکہ حق تعالیٰ کا عالم الغیب ہونا ثابت اور مسلم ہے، اس آیت میں واللہ یعلم اسرارھم کی شرح ہوگئی)۔

* * *

فائدہ: یعنی منافقین اپنے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جو حاسدانہ عداوتیں اور کینے رکھتے ہیں، کیا یہ خیال ہے کہ وہ دلوں میں پنہاں ہی رہیں گے؟ اللہ ان کو طشت از بام نہ کرے گا؟ اور مسلمان ان کے مکر وفریب پر مطلع نہ ہوں گے؟ ہرگز نہیں! ان کا خبث باطن ضرور ظاہر ہو کر رہے گا اور ایسے امتحان کی بھٹی میں ڈالے جائیں گے جہاں کھوٹا کھرا بالکل الگ ہو جائے گا۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ

اور اگر ہم چاہیں تجھ کو دکھلا دیں وہ لوگ سو تو پہچان تو چکا ہے ان کو ان کے چہرہ سے اور آگے پہچان لے گا بات کے ڈھب سے ۱

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾

اور اللہ کو معلوم ہیں تمہارے سب کام ۲

خلاصہ تفسیر: اور ہم (تو) اگر چاہتے تو آپ کو ان کا پورا پتہ بتلا دیتے سو آپ ان کو ان کے حلیہ سے پہچان لیتے (پورے پتہ کا مطلب یہی ہے کہ ہر ایک کا پورا حلیہ بتا دیتے، اور حلیہ کا مفہوم اگرچہ عام ہوتا ہے، مگر جس عام مفہوم کا مصداق ایک ہی شخص ہو اس کا بتلا دینا بمنزلہ اس

شخص کی طرف اشارہ کے ہوتا ہے) اور (اگرچہ مصلحت کی وجہ سے ہم نے اس طرح نہیں بتلایا لیکن) آپ ان کو طرز کلام سے (اب بھی) ضرور پہچان لیں گے (کیونکہ ان کا کلام سچائی پر مبنی نہیں اور آپ کو حق تعالیٰ نے نور فراست سے سچ اور جھوٹ کی پہچان دی ہے کہ سچ کا اثر دل پر اور ہوتا ہے اور جھوٹ کا اثر اور ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ صدق اطمینان بخش ہوتا ہے اور جھوٹ دل میں شک پیدا کرتا ہے) اور (آگے مومنین و منافقین سب کو خطاب میں جمع کر کے بطور ترغیب و ترہیب کے فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے (پس مسلمانوں کو ان کے اخلاص پر جزا، اور منافقین کو ان کے نفاق اور دھوکہ پر سزا دے گا)۔

وَلَتَعۡرِفَنَّهُمۡ فِىۡ لَحۡنِ الۡقَوۡلِ: درمنثور میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ پھر حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کا پتہ بتلا دیا، پھر آپ منافقین کا نام تک بھی بتلا دیا کرتے تھے، سو یہ روایت اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ یہ طرز کلام سے بھی پتہ چل سکتا ہے، اور روح المعانی میں حضرت انسؓ سے بلا سند روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کو علامت سے پہچان لیا کرتے تھے، اگر یہ روایت ثابت ہو تو بظاہر منافی ہے لیکن یہاں **لو نشاء** ماضی کے معنی میں ہے، اس سے آئندہ بتلا دینے کی نفی لازم نہیں آتی، سو ممکن ہے کہ اس آیت کے بعد علامت کے ساتھ بھی پہچان بتلا دی گئی ہو، اور حضرت حذیفہ کا منافقین کو بتلا دینا جو بعض روایات سے سمجھا جاتا ہے اس میں آپ کی پہچان کے متعلق دونوں احتمال ہیں۔

فَلَعَرَفۡتَهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ: اس آیت سے فراست مؤمن کی اصل معلوم ہوتی ہے، لیکن فراست کی بنا پر کسی کے بارے میں تجسس کرنا جائز نہیں، البتہ مرشد و مصلح جیسے استاذ، شیخ اور والدین کو تفتیش کرنا جائز ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ چاہے تو تمام منافقین کو باشخاصہم معین کر کے آپ کو دکھلا دے اور نام بنام مطلع کر دے کہ مجمع میں فلاں فلاں آدمی منافق ہیں مگر اس کی حکمت بالفعل اس دوٹوک اظہار کو مقتضی نہیں، ویسے اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ درجہ کا نور فراست دیا ہے کہ ان کے چہرے بشرے سے آپ پہچان لیتے ہیں، اور آگے چل کر ان لوگوں کے طرز گفتگو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید شناخت ہو جائے گی، کیونکہ منافق اور مخلص کی بات کا ڈھنگ الگ الگ ہوتا ہے، جو زور، شوکت، پختگی اور خلوص کا رنگ مخلص کی باتوں میں جھلکتا ہے، منافق کتنی ہی کوشش کرے اپنے کلام میں پیدا نہیں کر سکتا۔

تنبیہ: مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے **فَلَعَرَفۡتَهُمۡ** کو **وَلَوۡ نَشَآءُ** کے نیچے نہیں رکھا، عامہ مفسرین اس کو **وَلَوۡ نَشَاءُ** کے تحت میں رکھ کر **لَاَرَيۡنٰكَهُمۡ** پر متفرع کرتے ہیں، یعنی "اگر ہم چاہیں تو تجھ کو دکھلا دیں وہ لوگ، پھر تو ان کو پہچان جائے صورت دیکھ کر"، احقر کے خیال میں مترجمؒ کی تفسیر زیادہ لطیف ہے، واللہ اعلم۔ بعض احادیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے منافقین کو نام بنام پکارا اور اپنی مجلس سے اٹھا دیا، ممکن ہے وہ شناخت **لَحۡنِ الۡقَوۡلِ** اور **سِيۡمَا** وغیرہ سے حاصل ہوئی ہو، یا آیہ ہذا کے بعد حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض منافقین کے اسماء پر تفصیل و تعیین کے ساتھ مطلع فرما دیا ہو، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بندوں سے کوئی بات چھپی رہے، ممکن ہے مگر اللہ کے علم میں تمہارے سب کام ہیں خواہ کھل کر کرو یا چھپا کر۔

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ حَتّٰى نَعۡلَمَ الۡمُجٰهِدِيۡنَ مِنۡكُمۡ وَالصّٰبِرِيۡنَ ۙ وَنَبۡلُوَا۟ اَخۡبَارَكُمۡ ۝۳۱

اور البتہ ہم تم کو جانچیں گے تا کہ معلوم کر لیں جو تم میں لڑائی کرنے والے ہیں اور قائم رہنے والے ۱؎ اور تحقیق کر لیں تمہاری خبریں ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب مشقت والے احکام مثلاً جہاد وغیرہ کی ایک حکیمانہ حکمت ارشاد ہے جیسا کہ پیچھے آیت: **فهل عسيتم الخ** میں ایک حکیمانہ حکمت ارشاد فرمائی تھی یعنی:

اور ہم (ایسے مشقت والے کاموں کا حکم دے کر) ضرور تمہاری سب کی آزمائش کریں گے تا کہ ہم (ظاہری طور پر بھی) ان لوگوں کو معلوم (اور ممیز) کر لیں جو تم میں جہاد کرنے والے ہیں اور جو (جہاد میں) ثابت قدم رہنے والے ہیں اور تا کہ تمہاری حالتوں کی جانچ کر لیں (یہ اس لئے بڑھا

دیا تا کہ حکم جہاد کے علاوہ اور احکام بھی داخل ہو جائیں اور حالت مجاہدہ وصبر کے علاوہ دوسرے حالات بھی داخل ہو جائیں)۔

ظاہری طور پر جان لینے کا مطلب سورہ بقرہ آیت ۱۴۳: اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ کی تفسیر میں گذر چکا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی جہاد وغیرہ کے احکام سے آزمائش مقصود ہے، اسی سخت آزمائش میں کھلتا ہے کہ کون لوگ اللہ کے راستہ میں لڑنے والے اور شدید ترین امتحانات میں ثابت قدم رہنے والے ہیں اور کون ایسے نہیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی ہر ایک کے ایمان اور اطاعت وانقیاد کا وزن معلوم ہو جائے اور سب کے اندرونی احوال کی خبریں عملاً محقق ہو جائیں۔

تنبیہ: حتیٰ نعلم سے جو شبہ حدوث علم کا ہوتا ہے اس کا مفصل جواب پارہ سیقول کے شروع: اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ (البقرۃ: ۱۴۳) کے حواشی میں ملاحظہ کیا جائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْــٴًـا ؕ وَ سَیُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾

جو لوگ منکر ہوئے اور روکا انہوں نے اللہ کی راہ سے اور مخالف ہوگئے رسول سے بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکی ان پر سیدھی راہ، نہ بگاڑ سکیں گے اللہ کا کچھ، اور وہ اکارت کر دے گا ان کے سب کام

خلاصہ تفسیر: پیچھے سورت کے شروع سے مسلمانوں کی تعریف اور کفار کی مذمت اور درمیان میں کفار سے جہاد کا حکم مذکور ہوا ہے، اب آگے خاتمہ میں ان مضامین کا کچھ خلاصہ اور کچھ تتمہ اور کچھ کی تاکید ہے۔

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے (اوروں کو بھی) اللہ کے رستہ (یعنی دین حق) سے روکا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کی بعد اس کے کہ ان کو (دین کا) راستہ (عقلی دلائل سے مشرکین کے لئے اور نقلی دلائل سے بھی اہل کتاب کے لئے) نظر آ چکا تھا یہ لوگ اللہ (کے دین) کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے (بلکہ یہ دین ہر حال میں پورا ہو کر رہے گا چنانچہ ہوا) اور اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو (جو دین حق کے مٹانے کے لئے عمل میں لا رہے ہیں) مٹا دے گا۔

* * *

فائدہ: یعنی اپنا ہی نقصان کرتے ہیں، اللہ کا کیا نقصان ہے، نہ اس کے دین اور پیغمبر کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں، وہ قدرت والا ان کے سارے منصوبے غلط اور تمام کام اکارت کر دے گا اور سب کوششیں خاک میں ملا دے گا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾

اے ایمان والو حکم پر چلو اللہ کے اور حکم پر چلو رسول کے اور ضائع مت کرو اپنے کیے ہوئے کام

خلاصہ تفسیر: اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور (چونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ ہی کا حکم بتلاتے ہیں خواہ وہی خاص حکم وحی سے معلوم ہوا ہو، یا یہ کہ وحی سے ایک کلی ضابطہ یا عام حکم معلوم ہو گیا ہو جس سے خاص خاص واقعات کا حکم آپ نے خود سمجھ کر بیان فرما دیا ہو اس لیے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی (بھی) اطاعت کرو اور (کفار کی طرح اللہ و رسول کی مخالفت کر کے) اپنے اعمال کو برباد مت کرو۔

وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ: اگر اللہ اور رسول کی مخالفت اعتقاد کے درجہ میں ہے اور پہلے ہی سے کافر ہے تب تو اعمال کا برباد ہونا اس لیے ہے کہ کفر کے ساتھ کوئی بھی نیک عمل قبول ہی نہیں ہوتا، اور اگر بعد میں کافر ہوا یعنی اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا تو زمانہ اسلام کے اعمال اگرچہ لائق

قبول تھے مگر اس کے کفر و ارتداد نے ان سب اعمال کو بھی اکارت کر دیا، اور اگر مخالفت اعتقاد میں نہیں، بلکہ صرف عمل کے درجہ میں ہے تب برباد ہونے کی یہ صورت ہے کہ اس عمل کے صحیح ہونے یا باقی رہنے کی جو شرط ہے اس میں خلل ڈالا جائے، مثلاً بعض اعمال صالحہ کے لیے کچھ دوسرے اعمال صالحہ شرط ہیں، تو جس شخص نے اس شرط کو ضائع کر دیا تو اس کا یہ عمل صالح بھی ضائع ہو گیا جو اس شرط کے ساتھ مشروط تھا، مثلاً ہر عمل صالح کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ خالص اللہ کے لیے ہو، ریا اور شہرت اس میں نہ ہو، تو جس شخص کے نیک اعمال ریا و نمود کے لیے ہوں وہ عمل اللہ کے نزدیک باطل ہو جائے گا، جیسے صدقات کے بارے میں خود قرآن نے تصریح فرما دی کہ اپنے صدقات کو احسان جتلا کر یا غریب کو ایذا دے کر باطل نہ کرو، اور چونکہ مخالفت خواہ کسی وجہ کی ہو یہ کام اصل میں کافروں کا ہے اس لیے دھمکی کے موقع میں یہ کہنا کہ ''کفار کی طرح'' مخالفت کر کے اعمال کو برباد نہ کرو جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں کیا گیا ہے تو یہ صحیح ہے اگرچہ مسلمانوں کی مخالفت اس درجہ کی نہیں ہوتی۔

روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر میں امام قتادہؒ کا قول ہے کہ گناہ کر کے اپنا عمل برباد نہ کرو، تو عمل سے مراد نفس عمل نہیں بلکہ نور عمل مراد ہے کیونکہ معصیت و نافرمانی سے عمل کے انوارات و برکات کمزور اور ماند پڑ جاتے ہیں جب تک کہ توبہ نہ کر لی جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی جہاد، یا اللہ کی راہ میں اور کوئی محنت و ریاضت کرنا اس وقت مقبول ہے جب اللہ و رسول کے حکم کے موافق ہو، محض اپنی طبیعت کے شوق یا نفس کی خواہش پر کام نہ کرو، ورنہ ایسا عمل یوں ہی بیکار ضائع جائے گا، مسلمان کا کام نہیں کہ جو نیک کام کر چکا یا کر رہا ہے اس کو کسی صورت سے ضائع ہونے دے، نیک کام کو نہ بیچ میں چھوڑ دو، نہ ریاء و نمود اور اعجاب و غرور وغیرہ سے ان کو برباد کرو، بھلا ارتداد کا تو ذکر کیا ہے جو ایک دم تمام اعمال کو حبط کر دیتا ہے، العیاذ باللہ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾

جو لوگ منکر ہوئے اور روکا لوگوں کو اللہ کی راہ سے پر مرگئے اور وہ منکر ہی رہے تو ہرگز نہ بخشے گا ان کو اللہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کے دنیوی خسارے اور نقصان کا ذکر تھا، اب ان کے آخرت کے خسارہ اور نقصان کا بتاتے ہیں۔

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے اللہ کے رستہ سے روکا پھر وہ کافر ہی رہ کر مر (بھی) گئے، سو خدا تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشے گا۔

فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ: واضح رہے کہ مغفرت نہ ہونے کے لیے کفر کے ساتھ دوسروں کو بھی دین سے روکنا شرط نہیں ہے، بلکہ موت تک صرف کافر رہنے کا بھی یہی اثر ہے کہ اس کی مغفرت نہ ہوگی، لیکن زیادہ ملامت کے لیے یہ قید بڑھا دی ہے، کیونکہ اس وقت کے بڑے بڑے کافروں میں یہ بات بھی تھی کہ وہ کفر کے ساتھ دوسروں کو بھی دین سے روکتے تھے۔

* * *

فائدہ: یعنی کسی کافر کی اللہ کے ہاں بخشش نہیں، خصوصاً ان کافروں کی جو دوسروں کو خدا کے راستہ سے روکنے میں لگے ہوئے ہیں۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ ۖ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ۖ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۵﴾

سو تم بودے نہ ہوئے جاؤ اور لگو پکارنے صلح [1] اور تم ہی رہو گے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور نقصان نہ دیگا تم کو تمہارے کاموں میں [2]

خلاصہ تفسیر: اب آگے مومنین کی تعریف اور کفار کی برائی بیان فرماتے ہیں۔

(جب معلوم ہو گیا کہ مسلمان خدا کے محبوب اور کفار مبغوض ہیں) تو (اے مسلمانو!) تم (کفار کے مقابلہ میں) ہمت مت ہارو اور (ہمت ہار کر ان کو) صلح کی طرف مت بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے (اور وہ مغلوب ہوں گے کیونکہ تم محبوب ہو اور وہ مبغوض ہیں) اور اللہ تمہارے ساتھ ہے (یہ تو تم کو دنیا کی کامیابی ہوئی) اور (آخرت میں یہ کامیابی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ) تمہارے اعمال (کے ثواب) میں ہرگز کمی نہ کرے گا۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ: اس آیت میں کفار کو صلح کی دعوت دینے کی ممانعت کی گئی ہے اور قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے: وان جنحوا للسلم فاجنح لها یعنی اگر کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی مائل ہو جایئے جس سے صلح کی اجازت معلوم ہوتی ہے، اس لئے بعض حضرات نے فرمایا کہ صلح کی اجازت والی آیت اس شرط کے ساتھ ہے کہ کفار کی طرف سے صلح جوئی کی ابتدا ہو، اور یہاں اس آیت میں جس صلح کو منع کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے صلح کی درخواست کی جائے اس لئے دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں، مگر صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ابتداً صلح کر لینا بھی جائز ہے جبکہ مصلحت مسلمانوں کی اس میں دیکھی جائے، محض بزدلی اور عیش کوشی اس کا سبب نہ ہو اور اس آیت نے شروع میں فلا تھنوا کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ ممنوع وہ صلح ہے جس کا منشاء بزدلی اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے فرار ہو اس لئے اس میں بھی کوئی تعارض نہیں کہ وان جنحوا للسلم کی آیت کے حکم کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا جائے جس میں صلح جوئی کا سبب وہن اور سستی بزدلی نہ ہو بلکہ خود مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا ہو، واللہ اعلم۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ: یہاں جو مسلمانوں کو غلبہ کی بشارت دی ہے اگر یہ خاص مخاطب کے اعتبار سے ہے تب تو کچھ اشکال ہی نہیں، کیونکہ اسی طرح واقع بھی ہوا ہے، اور اگر عام مؤمنین کے اعتبار سے غلبہ کی بشارت دی گئی ہے تو قرآن کریم میں دوسری جگہ وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین میں غالب ہونے کو کامل ایمان کے ساتھ مقید فرمایا ہے، اور اس کی پوری تحقیق سورہ مائدۃ آیت ۵۶: وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کی تفسیر میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مسلمانوں کو چاہیے کہ کفار کے مقابلہ میں سست اور کم ہمت نہ بنیں اور جنگ کی سختیوں سے گھبرا کر صلح کی طرف نہ دوڑیں، ورنہ دشمن شیر ہو کر دباتے چلے جائیں گے اور جماعت اسلام کو مغلوب و رسوا ہونا پڑے گا، ہاں کسی وقت اسلام کی مصلحت اور اہل اسلام کی بھلائی صلح میں نظر آئے تو اس وقت صلح کر لینے میں مضائقہ نہیں جیسا کہ آگے سورۂ فتح میں آتا ہے، بہر حال صلح کی بناء پر اپنی کم بختی اور نامردی پر نہ ہونی چاہیے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی گھبرانے کی کچھ بات نہیں، اگر صبر و استقلال دکھاؤ گے اور خدا کے احکام پر ثابت قدم رہو گے تو خدا تمہارے ساتھ ہے وہ تم کو آخر کار غالب کرے گا اور کسی حالت میں بھی تم کو نقصان اور گھاٹے میں نہ رہنے دے گا۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْـَٔــلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝۳۶

یہ دنیا کا جینا تو کھیل ہے اور تماشا، اور اگر تم یقین لاؤ گے اور بچ کر چلو گے، دے گا تم کو تمہارا بدلہ اور نہ مانگے گا تم سے مال تمہارے

خلاصہ تفسیر: پیچھے ہمت افزائی کر کے جہاد کی ترغیب تھی، اب آگے دنیا کے فانی ہونے کا ذکر کر کے جہاد کی ترغیب اور انفاق فی سبیل اللہ کی تمہید ہے۔

یہ دنیوی زندگی تو محض ایک لہو و لعب ہے (اگر اس میں جان اور مال کو اپنے فائدہ کے لئے بچانا چاہئے تو وہ فائدہ ہی کتنے دن کا ہے اور کیا اس کا حاصل) اور اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو (جس میں جہاد بالنفس والمال بھی آ گیا) تو (تم کو تو اپنے پاس سے نفع پہنچا دے گا اس طرح کہ) تم کو تمہارا اجر عطا کرے گا اور (تم سے کسی نفع کا طالب نہ ہوگا چنانچہ) تم سے تمہارے مال (تک بھی جو کہ جان سے بھی کم تر ہیں اپنے نفع کے لئے) طلب نہیں کرے گا (جب تم سے ایسی چیز نہیں طلب کرتا جس کا دینا آسان ہے تو جان جس کا دینا مشکل ہے وہ تو کیوں طلب کرے گا، چنانچہ ظاہر ہے کہ ہمارے جان و مال کے خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نفع نہیں اور نہ یہ ممکن ہے)۔

وَلَا يَسْـَٔــلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ: اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال طلب نہیں کرتا، مگر پورے قرآن میں زکوٰۃ و صدقات کے احکام اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے بیشمار مواقع آئے ہیں اور خود اس کے بعد ہی دوسری آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید آ رہی ہے اس

لئے بظاہران دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، اس لئے بعض حضرات نے لا یسئلکم کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اموال تم سے کسی اپنے نفع کے لئے نہیں مانگتا، بلکہ تمہارے ہی فائدہ کے لئے مانگتا ہے جس کا ذکر اسی آیت میں بھی یُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ کے الفاظ سے کر دیا گیا ہے کہ تم سے جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کیلئے کہا گیا وہ اس لئے ہے کہ آخرت میں جہاں تمہیں سب سے زیادہ ضرورت نیکیوں کی ہوگی اس وقت یہ خرچ کرنا تمہارے کام آئے وہاں تمہیں اس کا اجر ملے، مذکور الصدر خلاصہ تفسیر میں اسی مفہوم کو اختیار کیا گیا ہے، اور بعض حضرات نے اس آیت کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ لا یسئلکم سے مراد پورا مال طلب کر لینا ہے کہ شریعت میں تمام مال دینا واجب نہیں، اس کا قرینہ اگلی آیت ہے جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی حقیقت ایک کھیل تماشا جیسی ہے، اگر تم ایمان وتقویٰ اختیار کرو گے اور اس کھیل تماشہ سے ذرا بچ کر چلو گے تو اللہ تم کو اس کا پورا بدلہ دے گا اور تمہارا مال بھی تم سے طلب نہیں کرے گا، اسے کیا حاجت ہے، وہ تو خود دینے والا ہے کما قال: مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (الذاریات: ۵۷-۵۸) اگر طلب بھی کرے تو مالک حقیقی وہ ہے تمام مال اس کا ہے، مگر اس کے باوجود دین کے معاملہ میں جب خرچ کرنے کو کہتا ہے تو سارے مال کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ ایک تھوڑا سا حصہ طلب کیا جاتا ہے، وہ بھی اپنے لئے نہیں بلکہ تمہارے فائدہ کو۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''حق تعالیٰ نے ملک فتح کرا دیے مسلمانوں کو تھوڑے ہی دن (اپنی گرہ سے) پیسہ خرچ کرنا پڑا، پھر جتنا خرچ کیا تھا اس سے سو گنا ہاتھ لگا، اس مطلب سے (قرآن کریم میں کئی جگہ) فرمایا ہے کہ اللہ کو قرض دو''۔

اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾

اگر مانگے تم سے وہ مال پھر تم کو تنگ کرے تو بخل کرنے لگو اور ظاہر کر دے تمہارے دل کی خفگیاں

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ) اگر (امتحان کے طور پر) تم سے تمہارے مال طلب کرے پھر انتہا درجہ تک تم سے طلب کرتا رہے (یعنی سب مال طلب کرنے لگے) تو تم (یعنی تم سے اکثر) بخل کرنے لگو (یعنی دینا گوارا نہ کرو) اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواری ظاہر کر دے (یعنی مال نہ دینے سے جو کہ ظاہری فعل ہے تمہاری باطنی ناگواری یعنی دل کی حالت کھل جائے اس لئے یہ فرد ممکن بھی واقع نہیں کی گئی)۔

اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ: یحف احفاء سے مشتق ہے جس کے معنی مبالغہ اور کسی کام میں آخر تک پہنچ جانے کے ہیں، اس آیت کا مفہوم سب کے نزدیک یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے اموال پورے طلب کرتا تو تم بخل کرنے لگتے اور اس حکم کی تعمیل تمہیں ناگوار ہوتی، یہاں تک کہ ادائیگی کے وقت تمہاری یہ ناگواری ظاہر ہو جاتی، خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں لا یسئلکم سے مراد یہی ہے جو اس آیت میں فیحفکم کی قید کے ساتھ آیا ہے تو مطلب ان دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ مالی فرائض زکوٰۃ وغیرہ تم پر عائد کئے ہیں اول تو وہ خود تمہارے ہی فائدہ کیلئے ہیں، اللہ تعالیٰ کا کوئی اپنا فائدہ نہیں، دوسرے پھر ان فرائض میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے مال کا اتنا تھوڑا سا جز وفرض کیا ہے جو کسی طرح بار خاطر نہ ہونا چاہیے، زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ، زمین کی پیداوار میں دسواں یا بیسواں حصہ، سو بکریوں میں سے ایک بکری، تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے پورے اموال تو طلب نہیں کئے جن کا دینا ناگوار اور بار خاطر طبعاً ہوتا بلکہ اس کا قدر قلیل طلب فرمایا ہے اس لئے تمہارا فرض ہے کہ اس کو خوشدلی کے ساتھ ادا کیا کرو۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر اللہ تعالیٰ سختی کے ساتھ کل مال طلب کرنے لگے جو تم کو دے رکھا ہے تو کتنے مردان خدا ہیں جو کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے اس حکم پر لبیک کہیں گے، اکثر تو وہی ہوں گے جو بخل اور تنگدلی کا ثبوت دیں گے مال خرچ کرنے کے وقت ان کے دل کی خفگی باہر ظاہر ہو جائے گی۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ

سنتے ہو تم لوگ تم کو بلاتے ہیں کہ خرچ کرو اللہ کی راہ میں ۱؎ پھر تم میں کوئی ایسا ہے کہ نہیں دیتا اور جو کوئی نہ دے گا

فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا

سو نہ دے گا آپ کو ۲؎ اور اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو ۳؎ اور اگر تم پھر جاؤ گے تو بدل لے گا اور لوگ

غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۳۸ ع

تمہارے سوا پھر وہ نہ ہوں گے تمہاری طرح کے ۴؎

خلاصہ تفسیر: (اور) ہاں! (تمہارے اس بخل اور ناگواری ظاہر ہونے کی صاف دلیل ہے کہ) تم لوگ ایسے ہو کہ تم کو اللہ کی راہ میں (جس کا نفع بھی تمہاری طرف لوٹنا یقینی ہے تھوڑا سا حصہ مال کا) خرچ کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے (اور بقیہ اکثر تمہارے قبضہ میں چھوڑ دیا جاتا ہے) سو (اس پر بھی) بعض تم میں سے وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں (اگرچہ ایسے لوگ تھوڑے ہی سہی، مگر اس سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اگر سارا مال خرچ کرنے کا حکم ہوتا تو جیسے اب تھوڑے بخل کرتے اس وقت اکثر لوگ بخل کرتے جیسا کہ طبیعتوں کے انداز سے صاف ظاہر ہے) اور (آگے تھوڑا مال خرچ کرنے میں بخل کی مذمت ہے کہ) جو شخص (ایسی جگہ خرچ کرنے سے) بخل کرتا ہے تو وہ (درحقیقت) خود اپنے سے بخل کرتا ہے (یعنی اپنے ہی کو اس کے دائمی نفع سے محروم رکھتا ہے) اور (نہیں تو) اللہ تو کسی کا محتاج نہیں (کہ اس کے نقصان کا احتمال ہو) اور (بلکہ) تم سب (اس کے) محتاج ہو (اور تمہاری اس ضرورت کی رعایت سے تم کو خرچ کرنے کا حکم کیا گیا، کیونکہ آخرت میں تم کو ثواب کی ضرورت ہوگی اور اس کا طریقہ یہی اعمال ہیں، اب تم اپنا نفع نقصان دیکھ لو، اور اول تو ہمیں کسی کے عمل ہی کی حاجت نہیں) اور اگر (بعض حکمتوں کی وجہ سے دنیا میں ایسے لوگوں کو رکھنا ہی ہوگا جو کہ اعمال صالحہ کریں اور) تم (ہمارے احکام سے) روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا (اور) پھر وہ تم جیسے (روگردانی کرنے والے) نہ ہوں گے (بلکہ نہایت فرمانبردار ہوں گے، دین کا کام ان سے لیا جائے گا اور اس طرح وہ حکمت پوری ہو جائے گی)۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا: بظاہر اس پوری آیت کے مخاطب مسلمان ہیں، کیونکہ اِنْ تَتَوَلَّوْا کے متعلق ترمذی کی ایک حدیث میں صحابہ کا یہ سوال مروی ہے: "من هؤلاء الذين اذا تولينا استبدلوا بنا" یہ کون لوگ ہیں کہ اگر ہم بے رخی کرنے لگیں تو وہ ہماری جگہ پیدا کیے جائیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ لوگ مسلمانان اہل فارس ہوں گے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِنْ تَتَوَلَّوْا میں مسلمانوں کو خطاب ہے، اور ظاہر ہے کہ سب ضمیروں کا مخاطب ایک ہی ہونا مناسب ہے، تو شروع آیت میں بخل کے متعلق بھی مسلمانوں ہی کو مخاطب کہنا مناسب ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ بخل کے متعلق منافقین سے خطاب ہے، کیونکہ مسلمانوں سے بخل کا صادر ہونا بعید ہے، مگر اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم بجز انبیاء اور ملائکہ کے کسی کو معصوم نہیں کہتے، دوسرے یہ کیا ضروری ہے کہ مسلمانوں سے بخل صادر نہ ہوا ہو، ممکن ہے کہ خرچ کرنے میں انقباض اور تنگ دلی پیدا ہوئی ہو، اور یہ کوئی گناہ نہیں ہے اگر اس کے مقتضا پر عمل نہ کیا جائے، لیکن یہ انقباض چونکہ کسی وقت بخل کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے اس لیے اس پر عتاب ہوا ہو کہ اس کا زائل کرنا ضروری ہے، اور یہ بات یقینی ہے کہ صحابہ کرام سے احکام الٰہی میں بے رخی صادر نہیں ہوئی، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دوسری قوم پیدا نہ کی گئی ہو، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ صحابہ کی جگہ پیدا نہیں ہوئی، پس حدیث میں جو اس قوم کی تفسیر اہل فارس سے آئی ہے جو کہ پیدا کیے گئے اس میں کوئی اشکال نہیں۔

يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ: اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ انسان کسی بھی دینی خدمت کو اپنی ذات پر موقوف نہ سمجھے کہ یہ کام میری وجہ سے ہو رہا ہے، جیسے بعض خود پسند اپنی ذات کو دین کا مدار سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایک حصہ خدا کے دیے ہوئے مال کا اس کے راستہ میں اپنے نفع کی خاطر۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تمہارا دینا خود اپنے فائدہ کے لیے ہے، نہ دو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، اللہ کو تمہارے دینے نہ دینے کی کیا پروا۔

فائدہ: ۳؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی مال خرچ کرنے کی جو تاکید سنتے ہو یہ نہ سمجھو کہ اللہ یا اس کا رسول مانگتا ہے، نہیں یہ تمہارے بھلے کو فرماتا ہے، پھر ایک کے ہزار ہزار پاؤ گے، ورنہ اللہ کو اور اس کے رسول کو کیا پروا ہے''۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اللہ تعالیٰ جس حکمت و مصلحت سے بندوں کو خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے اس کا حاصل ہونا کچھ تم پر منحصر نہیں، فرض کیجیے تم اگر بخل کرو اور اس کے حکم سے روگردانی کرو گے وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم کھڑی کر دے گا، جو تمہاری طرح بخیل نہ ہو گی بلکہ نہایت فراخ دلی سے اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی راہ میں خرچ کرے گی، بہر کیف اللہ کی حکمت و مصلحت تو پوری ہو کر رہے گی، ہاں تم اس سعادت سے محروم ہو جاؤ گے، حدیث میں ہے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! وہ دوسری قوم کون ہے جس کی طرف اشارہ ہوا ہے''، آپ ﷺ نے حضرت سلمان فارسیؓ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''اس کی قوم'' اور فرمایا: ''خدا کی قسم اگر ایمان ثریا پر جا پہنچے تو فارس کے لوگ وہاں سے بھی اس کو اتار لائیں گے''۔

الحمدللہ! صحابہ رضوان اللہ عنہم نے اس بے نظیر ایثار اور جوش ایمانی کا ثبوت دیا کہ ان کی جگہ دوسری قوم کو لانے کی نوبت نہ آئی تاہم فارس والوں نے اسلام میں داخل ہو کر علم اور ایمان کا وہ شاندار مظاہرہ کیا اور ایسی زبردست دینی خدمات انجام دیں جنہیں دیکھ کر ہر شخص کو ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بیشک حضور ﷺ کی پیشین گوئی کے موافق یہ ہی قوم تھی جو بوقت ضرورت عرب کی جگہ پر کر سکتی تھی، ہزار ہا علماء و آئمہ سے قطع نظر کر کے تنہا امام اعظم ابوحنیفہؒ کا وجود ہی اس پیشین گوئی کے صدق پر کافی شہادت ہے، بلکہ اس بشارت عظمیٰ کا کامل اور اولین مصداق امام صاحب ہی ہیں، رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

ایاتھا ۲۹ ۔ ۴۸ سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ ۱۱۱ ۔ رکوعاتھا ۴

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت کے اختتام پر اللہ کے راستہ میں جان و مال خرچ کرنے کی ترغیب تھی، اور اس تمام سورت میں اس کے چند مواقع مذکور ہیں، اور اس سورت میں چند واقعات کی طرف اشارہ ہے، سہولت کے لیے ان کو لکھ دینا مناسب ہے۔

① پہلا واقعہ: حضور ﷺ نے مدینہ میں خواب دیکھا کہ ہم مکہ میں امن وامان کے ساتھ گئے اور عمرہ کر کے حلق و قصر کیا، آپ ﷺ نے یہ خواب صحابہ سے بیان فرمایا اگرچہ آپ نے مدت کی تعیین نہ فرمائی تھی مگر شدت اشتیاق سے اکثروں کو یہ خیال ہوا کہ ہم کو اسی سال عمرہ میسر ہو گا اور اتفاقاً آپ ﷺ کا عمرہ کا ارادہ بھی ہو گیا۔

② دوسرا واقعہ: آپ ﷺ ڈیڑھ ہزار صحابہ اور قربانی کے جانوروں کو ساتھ لے کر مکہ روانہ ہوئے، جب یہ خبر مکہ میں پہنچی تو قریش نے بہت سارے لوگ جمع کر کے اتفاق کر لیا کہ آپ ﷺ کو مکہ میں نہ آنے دیں گے، چنانچہ آپ ﷺ نے حدیبیہ میں جو مکہ سے قریب ہے قیام فرمایا۔

③ تیسرا واقعہ: آپ ﷺ نے مکہ ایک قاصد بھیجا کہ ہم لڑنے نہیں آئے، ہمیں آنے دو عمرہ کر کے واپس چلے جائیں گے، مگر اس کا کچھ جواب نہ ملا، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اس کام کے لیے بطور سفیر حضرت عثمانؓ کو بھیجا، اور ان کی زبانی بھی قریش کو یہ پیغام بھجوایا، اور بعض مسلمان مرد اور عورت جو مکہ میں مغلوب و مظلوم تھے ان کو بشارت بھجوادی کہ اب عنقریب مکہ میں اسلام غالب ہو جائے گا، حضرت عثمانؓ کو قریش نے روک لیا، یہاں دیر ہونے سے مشہور ہو گیا کہ عثمان قتل ہو گئے تو اس وقت آپ ﷺ نے اس خیال سے کہ شاید لڑائی کا موقع آجائے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سب صحابہ سے جہاد کی بیعت لی، جب قریش نے بیعت کی خبر سنی تو ڈر گئے اور حضرت عثمانؓ کو واپس بھیج دیا۔

④ چوتھا واقعہ: پھر مکہ کے چند سردار صلح کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صلح نامہ لکھنا قرار پایا، جس پر اول بسم اللہ ہی میں قریش نے بحث و تکرار کی کہ ہم ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' نہیں لکھنے دیں گے، وہاں پرانا کلمہ "باسمك اللهم" ہی لکھوایے، پھر آپ ﷺ کے نام کے ساتھ ''رسول اللہ'' لکھنے پر تکرار کی کہ صرف ''محمد ابن عبداللہ'' لکھنا چاہیے، اس پر گفتگو ہوتی رہی اور صحابہ کرام کو غصہ بھی آیا، اور جوش ہوا کہ تلوار سے

معاملہ ایک طرف کر دیا جائے، لیکن آخر آپ ﷺ نے ان دونوں باتوں کو منظور فرمایا اور صحابہ کرام نے بھی ضبط کیا اور صلح نامہ لکھا گیا، جس میں ایک شرط یہ تھی کہ آپ اس سال واپس چلے جائیں اور آئندہ سال آ کر عمرہ کریں، اور ایک شرط یہ بھی تھی کہ دس سال تک لڑائی نہ ہوگی، چنانچہ آپ ﷺ نے حدیبیہ ہی میں قربانی کی اور حلق وقصر کر کے احرام کھول دیا اور مدینہ واپس ہوئے۔

⑤ **پانچواں واقعہ:** حدیبیہ میں صلح سے قبل مکہ والوں کی ایک مسلح جماعت یہاں خفیہ اس ارادہ سے آئی کہ موقع پا کر نعوذ باللہ آپ ﷺ کا کام تمام کردیں گے، صحابہ نے ان کو دیکھ لیا اور پکڑ لیا، مگر حضور ﷺ نے ان کو رہا فرما دیا۔

⑥ **چھٹا واقعہ:** جب آپ ﷺ مدینہ سے مکہ کی طرف چلنے لگے تھے تو آپ کو بھی قریش کی طرف سے لڑائی کا شبہ تھا، اس لیے آپ نے زیادہ مجمع کے ساتھ جانا مصلحت سمجھا، چنانچہ دیہات والوں میں بھی حضور ﷺ نے ساتھ چلنے کا حکم بھیج دیا تھا کہ تمہیں بھی چلنا چاہیے، مگر وہ نفاق کی وجہ سے نہیں آئے، اور آپس میں کہنے لگے کہ مکہ میں بڑا مجمع ہے، ہم ان کے مقابلہ میں نہیں جاتے، اور ایمان والوں کے بارے میں کہا کہ یہ لوگ بھی بچ کر نہیں آئیں گے، جب آپ ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو حاضر ہو کر وہ لوگ جھوٹے عذر کرنے لگے۔

⑦ **ساتواں واقعہ:** حدیبیہ سے مدینہ کو واپسی کے وقت یہ سورت یا اسکا اکثر حصہ نازل ہوا، یہ سب واقعات ذی قعدہ سن ۶ ھ میں ہوئے۔

⑧ **آٹھواں واقعہ:** حدیبیہ سے واپس تشریف لا کر محرم سن ۷ ھ میں خیبر فتح کیا جو مدینہ سے چار منزل کے فاصلہ پر یہود کا شہر تھا، اس میں حدیبیہ والوں کے سوا کوئی شریک نہ تھا۔

⑨ **نواں واقعہ:** معاہدہ کے مطابق آئندہ سال ذی قعدہ سن ۷ ھ میں آپ ﷺ نے امن کے ساتھ عمرہ فرمایا۔

⑩ **دسواں واقعہ:** صلح نامہ میں دس سال تک لڑائی موقوف رہنے کا معاہدہ قریش نے توڑ دیا، آپ ﷺ نے مکہ پر چڑھائی کی اور رمضان سن ۸ ھ میں اس کو فتح کر لیا جس کی تفصیل سورہ براءۃ کے شروع میں فائدہ دوم کے تحت گذر چکی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا ۙ﴿۱﴾

ہم نے فیصلہ کر دیا تیرے واسطے صریح

خلاصہ تفسیر: بیشک ہم نے (اس صلح حدیبیہ سے) آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی (یعنی صلح حدیبیہ سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ سبب ہوگئی مکہ کی، اس لحاظ سے یہ صلح ہی فتح ہوگئی)۔

فَتۡحًا مُّبِیۡنًا: فتح مکہ کو "فتح مبین" اس لئے کہا گیا کہ فتح سے مقصود شریعت اسلام میں کوئی حکمرانی نہیں، بلکہ دین اسلام کا غلبہ مقصود ہوتا ہے، اور فتح مکہ سے یہ مقصود بڑی حد تک حاصل ہو گیا، کیونکہ تمام قبائل عرب اس بات کے منتظر تھے کہ اگر آپ اپنی قوم پر غالب آ گئے تو ہم بھی اطاعت کرلیں گے، جب مکہ فتح ہوا تو چاروں طرف سے عرب کے قبائل امنڈ پڑے اور خود یا بواسطہ اپنے وفود کے اسلام لانا شروع کیا، چونکہ غلبہ اسلام کے بڑے آثار فتح مکہ سے نمایاں ہوئے اس لئے اس کو "فتح مبین" فرمایا گیا، اور صلح حدیبیہ اس فتح مکہ کا سبب اور ذریعہ اس طرح ہوگئی کہ اہل مکہ سے آئے دن لڑائی رہا کرتی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنی قوت اور سامان بڑھانے کی مہلت وفرصت نہ ملتی تھی، حدیبیہ کے واقعہ میں جو صلح ہوگئی تو اطمینان کے ساتھ مسلمانوں نے کوشش کی جس سے بہت سے نئے آدمی مسلمان ہو گئے اور مجمع مسلمانوں کا بڑھ گیا اور فتح خیبر وغیرہ سے سامان بھی درست ہو گیا اور ایسے ہو گئے کہ دوسروں پر دباؤ پڑ سکے، پھر قریش کی طرف سے عہد شکنی ہوئی تو آپ دس ہزار صحابہ کرام کے ساتھ مقابلے کے لئے چلے، اہل مکہ اس قدر مرعوب ہوئے کہ زیادہ لڑائی بھی نہیں ہوئی اور اطاعت قبول کر لی اور جو لڑائی ہوئی بھی تو اتنی کم اور خفیف کہ اہل علم کا اس میں اختلاف ہو گیا کہ مکہ مکرمہ صلح کے ساتھ فتح ہوا یا

جنگ سے، غرض اس طرح یہ صلح سبب فتح ہوگئی اس لئے مجازی طور پر اس صلح کو بھی ''فتح'' فرمادیا گیا جس میں فتح مکہ کی پیشین گوئی بھی ہے۔

* * *

فائدہ: اس سورت کی مختلف آیات میں متعدد واقعات کی طرف اشارہ ہے، بغرض سہولت فہم انکو مختصراً یہاں لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

(الف) آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں خواب دیکھا کہ ہم مکہ میں امن وامان کے ساتھ داخل ہوئے اور عمرہ کر کے حلق وقصر کیا، آپ ﷺ نے یہ خواب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بیان فرمایا، گو آپ ﷺ نے مدت کی تعیین نہیں فرمائی تھی، مگر شدت اشتیاق سے اکثروں کا خیال اس طرف گیا کہ امسال عمرہ میسر ہوگا اتفاقاً آپ ﷺ کا قصد بھی عمرہ کا ہوگیا۔

(ب) آپ ﷺ تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمیوں کو ہمراہ لے کر بغرض عمرہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور ''ہدی'' بھی آپ کے ساتھ تھی، یہ خبر مکہ پہنچی تو قریش نے بہت سا مجمع کر کے اتفاق کرلیا کہ آپ ﷺ کو مکہ میں نہ آنے دیں گے، حالانکہ ان کے ہاں حج وعمرہ سے دشمن کو بھی روکا نہیں جاتا تھا، بہرحال ''حدیبیہ'' پہنچ کر جو مکہ سے قریب ہے آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی اور کسی طرح اٹھنے کا نام نہ لیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيْلِ'' اور فرمایا کہ خدا کی قسم اہل مکہ مجھ سے جس بات کا مطالبہ کریں گے جس میں حرمات اللہ کی تعظیم قائم رہے میں منظور کروں گا، آخر آپ ﷺ نے وہیں قیام فرمایا (اسی مقام کو آجکل ''شمیسہ'' کہتے ہیں)۔

(ج) آپ ﷺ نے مکہ والوں کے پاس قاصد بھیجا کہ ہم لڑنے نہیں آئے، ہم کو آنے دو، عمرہ کر کے چلے جائیں گے جب اس کا کچھ جواب نہ ملا تو آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو وہ ہی پیغام دے کر بھیجا اور بعض مسلمان مرد وعورت جو مکہ میں مغلوب ومظلوم تھے ان کو بشارت پہنچائی کہ اب عنقریب مکہ میں اسلام غالب ہوجائے گا، حضرت عثمانؓ کو قریش نے روک لیا، ان کی واپسی میں جو دیر لگی یہاں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمانؓ قتل کردیے گئے، اس وقت آپ ﷺ نے اس خیال سے کہ شاید لڑائی کا موقع ہوجائے سب صحابہ سے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر جہاد کی بیعت لی، جب قریش نے بیعت کی خبر سنی تو ڈر گئے اور حضرت عثمانؓ کو واپس بھیج دیا۔

(د) پھر مکہ کے چند رؤساء بغرض صلح آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صلح نامہ لکھنا قرار پایا، اس سلسلہ میں بعض امور پر بحث و تکرار بھی ہوئی اور مسلمانوں کو غصہ اور جوش آیا کہ تلوار سے معاملہ ایک طرف کردیا جائے، لیکن آخر حضور ﷺ نے مکہ والوں کے اصرار کے موافق سب باتیں منظور فرمالیں اور مسلمانوں نے بھی بے انتہا ضبط وتحمل سے کام لیا اور صلح نامہ تیار ہوگیا جس میں ایک شرط کفار کی طرف سے یہ تھی کہ آپ اس سال واپس چلے جایئے اور سال آئندہ غیر مسلح آکر عمرہ کرلیجیے، اور یہ کہ فریقین میں دس سال تک لڑائی نہ ہوگی، اس مدت میں جو ہمارے ہاں سے تمہارے پاس جائے اسے آپ اپنے پاس نہ رکھیں، اور جو تمہارا آدمی ہمارے ہاں آئے گا ہم واپس نہ کریں گے، صلح کا تمام معاملہ طے ہوجانے پر آپ ﷺ نے ''حدیبیہ'' میں ہی ہدی کا جانور ذبح کیا اور حلق وقصر کر کے احرام کھول دیا اور مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

(ہ) راستہ میں یہ سورت (الفتح) نازل ہوئی، اور یہ سب واقعہ اواخر ۶ ھ میں پیش آیا۔

(و) حدیبیہ سے واپس تشریف لاکر اوائل ۷ ھ میں آپ ﷺ نے ''خیبر'' فتح کیا جو مدینہ سے شمالی جانب چار منزل پر شام کی سمت یہود کا ایک شہر تھا، اس حملہ میں کوئی شخص ان صحابہ کے علاوہ شریک نہ تھا جو حدیبیہ میں آپ کے ہمراہ تھے۔

(ز) سال آئندہ یعنی ذیقعدہ ۷ ھ میں آپ حسب معاہدہ عمرۃ القضاء کیلئے تشریف لے گئے اور امن وامان کے ساتھ مکہ پہنچ کر عمرہ ادا فرمایا۔

(ح) عہد نامہ میں جو دس سال تک لڑائی بند رکھنے کی شرط تھی قریش نے نقض عہد کیا، آپ ﷺ نے مکہ پر چڑھائی کردی اور رمضان ۸ ھ میں اس کو فتح کرلیا۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ

تاکہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہوچکے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے ۱ اور پورا کردے تجھ پر اپنا احسان ۲

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ﴿٢﴾ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿٣﴾

اور چلائے تجھ کو سیدھی راہ ۳ اور مدد کرے تیری اللہ زبردست مدد ۴

خلاصہ تفسیر: (آگے اس فتح کے دینی اور دنیوی ثمرات و برکات کا بیان ہے کہ یہ فتح اس لئے میسر ہوئی) تاکہ (تبلیغ دین اور دعوت حق میں آپ کی کوششوں کا نتیجہ اس طرح ظاہر ہو کہ کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں اور اس سے آپ کا اجر بہت بڑھ جائے اور کثرت اجر و قرب کی برکت سے) اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی (صوری) خطائیں معاف فرمادے اور آپ پر (جو اللہ تعالیٰ) اپنے احسانات (کرتا آتا ہے مثلاً آپ کو نبوت دی، قرآن دیا، بہت سے علوم دیئے بہت سے اعمال کا ثواب دیا ان احسانات) کی (اور زیادہ) تکمیل کردے (اس طرح کہ آپ کے ہاتھ پر بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہوں جس سے آپ کا اجر اور مقام قرب اور بلند ہو یہ دو نعمتیں تو آخرت سے متعلق ہیں) اور (دو نعمتیں دنیوی ہیں ایک یہ کہ) آپ کو (بغیر کسی روک ٹوک کے دین کے) سیدھے راستہ پر لے چلے (اور اگرچہ آپ کا صراط مستقیم پر چلنا پہلے یقینی ہے مگر اس میں کفار کی مزاحمت ہوتی تھی اب یہ مزاحمت نہیں رہے گی) اور (دوسری دنیوی نعمت یہ ہے کہ) اللہ آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزت ہی عزت ہو (یعنی جس کے بعد آپ کو کبھی کسی سے دبنا نہ پڑے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ تمام جزیرۃ العرب پر آپ کا تسلط ہو گیا)۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ: اس لیغفر کا لام اگر تعلیل یعنی بیان علت کے لئے لیا جائے تو حاصل اس کا یہ ہے کہ یہ فتح مبین آپ کو اس لئے دی گئی ہے تاکہ آپ کو یہ تین کمالات حاصل ہو جائیں جن کا اس آیت میں ذکر ہے، ان میں پہلی چیز تمام اگلی پچھلی لغزشوں اور خطاؤں کی معافی ہے، سورۃ محمد میں پہلے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انبیاء علیہم السلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، ان کی طرف قرآن میں جہاں کہیں ذنب یا عصیان وغیرہ کے الفاظ منسوب کئے گئے وہ ان کے مقام عالی کی مناسبت سے ایسے کاموں کے لئے استعمال کئے گئے جو خلاف اولیٰ تھے مگر نبوت کے مقام بلند کے اعتبار سے غیر افضل پر عمل کرنا بھی ایسی لغزش ہے جس کو قرآن نے بطور تہدید کے ذنب و گناہ سے تعبیر کیا ہے، اور فتح مبین کا اس مغفرت کے لئے سبب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس فتح مبین سے بہت لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوں گے اور اسلام کی دعوت کا عام ہو جانا آپ کی زندگی کا مقصد عظیم اور آپ کے اجر و ثواب کو بہت بڑھانے والا ہے اور اجر و ثواب کی زیادتی سبب ہوتی ہے کفارہ سیئات کی۔

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا: یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ صراط مستقیم پر تو آپ اول ہی سے ہیں، اور نہ صرف خود صراط مستقیم پر ہیں بلکہ دنیا کو اسی صراط مستقیم کی دعوت دینا آپ کا رات دن کا مشغلہ ہے تو ہجرت کے چھٹے سال فتح مبین کے ذریعہ صراط مستقیم کی ہدایت کے کیا معنی ہیں؟ اس کا جواب سورۃ فاتحہ کی تفسیر لفظ ہدایت کی تحقیق میں گزر چکا ہے کہ ہدایت ایک ایسا مفہوم عام ہے کہ جس کے درجات غیر متناہی ہیں، وجہ یہ ہے کہ ہدایت کے معنی منزل مقصود کا راستہ دکھلانا یا اس پر پہنچانا ہے، اور اصل منزل مقصود ہر انسان کی حق تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل کرنا ہے، اور اس رضا و قرب کے مختلف درجات بیشمار ہیں، ایک درجہ حاصل ہونے کے بعد دوسرے اور تیسرے درجہ کی ضرورت باقی رہتی ہے جس سے کوئی بڑے سے بڑا ولی بلکہ نبی و رسول بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

* * *

فائدہ: لِمَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ: ''حدیبیہ'' کی صلح بظاہر ذلت و مغلوبیت کی صلح نظر آتی ہے اور شرائط صلح پڑھ کر بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ کفار قریش کے حق میں ہوا، چنانچہ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ بھی صلح کی ظاہری سطح دیکھ کر سخت محزون و مضطرب تھے، وہ خیال کرتے تھے کہ اسلام کے چودہ پندرہ سو سرفروش سپاہیوں کے سامنے قریش اور ان کے طرفداروں کی جمعیت کیا چیز ہے، کیوں تمام نزاعات کا فیصلہ تلوار سے نہیں کر دیا جاتا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں ان احوال و نتائج کو دیکھ رہی تھیں جو دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل تھے اور اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ سخت سے سخت ناخوشگوار واقعات پر تحمل کرنے کے لیے کھول دیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے مثال استغناء اور توکل و تحمل کے ساتھ ان کی

ہر شرط قبول فرماتے رہے اور اپنے اصحاب کو ''اللّٰہ وَرَسُولُه اعْلَمُ'' کہہ کر تسلی دیتے رہے، یعنی اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے، تا آنکہ یہ سورت نازل ہوئی اور خداوند قدوس نے اس صلح اور فیصلہ کا نام ''فتح مبین'' رکھا لوگ اس پر بھی تعجب کرتے تھے کہ: یارسول اللہ! کیا یہ فتح ہے؟ فرمایا: ہاں! بہت بڑی فتح، حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کی بیعت جہاد اور معمولی چھیڑ چھاڑ کے بعد کفار معاندین کا مرعوب ہو کر صلح کی طرف جھکنا اور نبی کریم ﷺ کا باوجود جنگ اور انتقام پر کافی قدرت رکھنے کے ہر موقع پر اغماض اور عفو و درگزر سے کام لینا اور محض تعظیم بیت اللہ کی خاطر ان کے بیہودہ مطالبات پر قطعاً برافروختہ نہ ہونا، یہ واقعات ایک طرف اللہ کی خصوصی مدد و رحمت کے استجلاب کا ذریعہ بنتے تھے اور دوسری جانب دشمنوں کے قلوب پر اسلام کی اخلاقی و روحانی طاقت اور پیغمبر ﷺ کی شان پیغمبری کا سکہ بٹھلا رہے تھے، گو عہد نامہ لکھتے وقت ظاہر بینوں کو کفار کی جیت نظر آتی تھی، لیکن ٹھنڈے دل سے فرصت میں بیٹھ کر غور کرنے والے خوب سمجھتے تھے کہ فی الحقیقت تمام تر فیصلہ حضور ﷺ کے حق میں ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ''فتح مبین'' رکھ کر متنبہ کر دیا کہ یہ صلح اس وقت بھی فتح ہے اور آئندہ کے لیے بھی آپ کے حق میں بے شمار فتوحات ظاہری و باطنی کا دروازہ کھولتی ہے، اس صلح کے بعد کافروں اور مسلمانوں کو باہم اختلاط اور بے تکلف ملنے جلنے کا موقع ہاتھ آیا، کفار، مسلمانوں کی زبان سے اسلام کی باتیں سنتے اور ان مقدس مسلمانوں کے احوال و اطوار کو دیکھتے تو خود بخود ایک کشش اسلام کی طرف ہوتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ سے فتح مکہ تک یعنی تقریباً دو سال کی مدت میں اتنی کثرت سے لوگ مشرف با اسلام ہوئے کہ کبھی اس قدر نہ ہوئے تھے، خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے نامور صحابہ اسی دوران میں اسلام کے حلقہ بگوش بنے، یہ جسموں کو نہیں، دلوں کو فتح کر لینا اسی صلح حدیبیہ کی اعظم ترین برکت تھی، اب جماعت اسلام چاروں طرف اس قدر پھیل گئی اور اتنی بڑھ گئی تھی کہ مکہ معظمہ کو فتح کر کے ہمیشہ کے لیے شرک کی گندگی سے پاک کر دینا بالکل سہل ہو گیا، حدیبیہ میں حضور ﷺ کے ہمراہ صرف ڈیڑھ ہزار جانباز تھے لیکن دو برس کے بعد مکہ معظمہ کی فتح عظیم کے وقت دس ہزار لشکر جرار آپ کے ہم رکاب تھا، سچ تو یہ ہے کہ نہ صرف فتح مکہ اور فتح خیبر، بلکہ آئندہ کی کل فتوحات اسلامیہ کے لیے صلح حدیبیہ بطور اساس و بنیاد اور زریں دیباچہ کے تھی، اور اس تحمل و توکل اور تعظیم حرمات اللہ کی بدولت جو صلح کے سلسلہ میں ظاہر ہوئی، جن علوم و معارف قدسیہ اور باطنی مقامات و مراتب کا فتح باب ہوا ہو گا اس کا اندازہ تو کون کر سکتا ہے، ہاں! تھوڑا سا اجمالی اشارہ حق تعالیٰ نے ان آیتوں میں فرمایا ہے یعنی جیسے سلاطین دنیا کسی بہت بڑے فاتح جنرل کو خصوصی اعزاز و اکرام سے نوازتے ہیں۔

خداوند قدوس نے اس فتح مبین کے صلہ میں آپ کو چار چیزوں سے سرفراز فرمایا، جن میں پہلی چیز ''غفران ذنوب'' ہے (ہمیشہ سے ہمیشہ تک کی سب کوتاہیاں جو آپ کے مرتبہ رفیع کے اعتبار سے کوتاہی سمجھی جائیں بالکلیہ معاف ہیں) یہ بات اللہ تعالیٰ نے اور کسی بندہ کے لیے نہیں فرمائی، مگر حدیث میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور ﷺ اس قدر عبادت اور محنت کرتے تھے کہ راتوں کو کھڑے کھڑے پاؤں سوج جاتے تھے، اور لوگوں کو دیکھ کر رحم آتا تھا، صحابہ عرض کرتے کہ یارسول اللہ! آپ اس قدر محنت کیوں کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ تو آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما چکا، فرماتے: ''اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا'' (تو کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں) ظاہر ہے، اللہ بھی ایسی بشارت اسی بندہ کو سنائیں گے جو سن کر نڈر نہ ہو جائے بلکہ اور زیادہ خدا تعالیٰ سے ڈرنے لگے، شفاعت کی طویل حدیث میں ہے کہ جب مخلوق جمع ہو کر حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس جائے گی تو وہ فرمائیں گے کہ محمد ﷺ کے پاس جاؤ جو خاتم النبیین ہیں اور جن کی اگلی پچھلی سب خطائیں اللہ تعالیٰ معاف کر چکا ہے (یعنی اس مقام شفاعت میں اگر بالفرض کوئی تقصیر بھی ہو جائے تو وہ بھی عفو عام کے تحت میں پہلے ہی آ چکی ہے (بجز ان کے اور کسی کا یہ کام نہیں)۔

فائدہ: ۲ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ: یعنی صرف تقصیرات سے درگزر نہیں بلکہ جو کچھ ظاہری و باطنی اور مادی و روحی انعام و احسان اب تک ہو چکے ہیں ان کی پوری تکمیل و تتمیم کی جائے گی۔

فائدہ: ۳ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا: یعنی تجھ کو ہدایت و استقامت کی سیدھی راہ پر ہمیشہ قائم رکھے گا، معرفت و شہود کے غیر محدود مراتب پر فائز ہونے اور ابدان و قلوب پر اسلام کی حکومت قائم کرنے کی راہ میں تیرے لیے کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو سکے گی، لوگ جوق در جوق تیری ہدایت سے اسلام کے سیدھے راستہ پر آئیں گے، اور اس طرح تیرے اجور و حسنات کے ذخیرہ میں بیشمار اضافہ ہو گا۔

فائدہ: ۵ وَّيَنۡصُرَكَ اللّٰهُ نَصۡرًا عَزِيۡزًا: یعنی اللہ کی ایسی مدد آئیگی جسے کوئی نہ روک سکے گا نہ دبا سکے گا، اور اسی کی مدد سے فتح وظفر تیرے قدموں کے ساتھ ساتھ ہوگی، سورۃ نصر میں فرمایا کہ جب خدا کی طرف سے مدد اور فتح آجائے اور لوگ دین الٰہی میں فوج درفوج داخل ہونے لگیں تو اللہ کی تسبیح وتحمید اور اس سے استغفار کیجیے۔ ظاہر ہے کہ اس فتح مبین پر بھی آپ نے استغفار کیا ہوگا تو اس کے جواب میں :لِيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ الخ کا مضمون اور بھی زیادہ صاف ہوجاتا ہے۔ نبه عليه ابن جرير رحمه الله تعالى۔

هُوَ الَّذِيۡۤ اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِيۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ

وہی ہے جس نے اتارا اطمینان دل میں ایمان والوں کے تاکہ اور بڑھ جائے ان کو ایمان اپنے ایمان کے ساتھ ۱؎ اور اللہ کے ہیں سب لشکر

السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۝۴

آسمانوں کے اور زمین کے اور اللہ ہے خبردار حکمت والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے ان نعمتوں کا ذکر تھا جو اس واقعہ میں آپ ﷺ کے متعلق تھیں، اب آگے ان نعمتوں کا ذکر ہے جو اس واقعہ میں آپ کے ہمراہی یعنی صحابہ کرام کے متعلق ہیں۔

وہ خدا ایسا ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل پیدا کیا (جس کے دو اثر ہیں: ایک بیعت جہاد کے وقت اس کی طرف مسابقت اور عزم وہمت جیسا کہ بیعت کے واقعہ میں پیچھے ذکر آچکا ہے، اور دوسرا اثر کفار کی بے جا ضد کے وقت اپنے جوش اور غیظ وغضب کو قابو میں رکھنا جس کا ذکر پیچھے چوتھے واقعہ میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے اور آگے بھی: فانزل الله سكينته على رسوله میں آئے گا) تاکہ ان کے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو (کیونکہ دراصل اطاعت رسول ایمان کے نور میں اضافہ کا ذریعہ ہے، اور اس واقعہ میں ہر پہلو سے مکمل اطاعت رسول کا امتحان ہوگیا کہ جب رسول نے دعوت جہاد کے لئے بلایا اور بیعت لی تو بڑی خوش دلی اور مسابقت کے ساتھ سب نے بیعت کی اور جہاد کے لئے تیار ہوگئے اور جب حکمت ومصلحت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے قتال سے روکا اور سب صحابہ جوش جہاد میں قتال کے لئے بے قرار تھے مگر اطاعت رسول میں سر تسلیم خم کردیا اور قتال سے باز رہے) اور آسمان وزمین کے سب لشکر (جیسے ملائکہ اور سب مخلوقات) اللہ ہی کے (لشکر) ہیں (اس لئے کفار کی شکست اور دین اسلام کی سربلندی کے لئے اللہ تعالیٰ تمہارے قتال وجہاد کا محتاج نہیں وہ اگر چاہیں تو اپنے فرشتوں کے لشکر بھیج دیں جیسا کہ بدر، احزاب، حنین کے غزوات میں اس کا مشاہدہ ہو چکا اور یہ لشکر بھیجنا بھی مسلمانوں کی ہمت بڑھانے کے لئے ہے، ورنہ ایک فرشتہ بھی سب کیلئے کافی ہے اس لئے تم لوگوں کو نہ تو کفار کی کثرت دیکھ کر جہاد وقتال میں کوئی تردد ہونا چاہئے اور نہ جس وقت اللہ ورسول کا حکم ترک قتال کا ہو اس وقت ترک قتال میں بھی کوئی تردد ہونا چاہئے کہ افسوس صلح ہوگئی اور کفار بچ گئے ان کو سزا نہ ہوئی اور قتال یا ترک قتال کے نتائج کو اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (مصلحتوں کا) بڑا جاننے والا حکمت والا ہے (جب قتال میں حکمت ہوتی ہے اس کا حکم دیتا ہے اور جب ترک قتال میں مصلحت ہوتی ہے اس کا حکم فرماتا ہے اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ دونوں حالتوں میں اپنے جذبات کو امر رسول کے تابع رکھیں جو سبب ہے زیادت ایمان کا)۔

اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِيۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: سکینہ ایک ایسی چیز ہے جس میں نور، قوت اور روح ہوتی ہے، جس سے سکون بھی حاصل ہوتا ہے، اور جس کے نتیجہ میں اعمال آسان ہوجاتے ہیں اور احوال میں ضبط وتحمل پیدا ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ''اطمینان اتارا''، یعنی باوجود خلاف طبع ہونے کے رسول کے حکم پر جمے رہے، ضدی کافروں کے ساتھ ضد نہیں کرنے لگے، اس کی برکت سے ان کے ایمان کا درجہ بڑھا اور مراتب عرفان وایقان میں ترقی ہوئی، انہوں نے اول بیعت جہاد کر کے ثابت کردیا تھا کہ ہم اللہ کی راہ

میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہیں، یہ ایمان کا ایک رنگ تھا اس کے بعد جب پیغمبر علیہ السلام نے مسلمانوں کے جذبات کے خلاف اللہ کے حکم سے صلح منظور کرلی تو ان کے ایمان کا دوسرا رنگ یہ تھا کہ اپنے پرجوش جذبات وعواطف کو زور سے دبا کر اللہ ورسول کے فیصلہ کے آگے گردن انقیاد خم کردی۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

فائدہ: ٢۔ یعنی وہ ہی جانتا ہے کہ کس وقت قتال کا حکم دینا تمہارے لیے مصلحت ہے اور کس موقع پر قتال سے باز رکھنا اور صلح کرنا حکمت ہے، تم کو اگر قتال کا حکم ہو تو کبھی کفار کی کثرت کا خیال کر کے پس وپیش نہ کرنا کیونکہ آسمان وزمین کے لشکروں کا مالک وہ ہی ہے جو تمہاری قلت کے باوجود اپنے غیبی لشکروں سے مدد کرسکتا ہے جیسے "بدر"، "احزاب" اور "حنین" وغیرہ میں کی، اور اگر صلح کرنے اور قتال سے رکنے کا حکم دے تو اسی کی تعمیل کرو، یہ خیال نہ کرنا کہ افسوس صلح ہوگئی اور کفار بچ نکلے ان کو سزا نہ ملی اگر قتال کا حکم ہوجاتا تو ہم ان کو ہلاک کر ڈالتے، کیونکہ ان کا ہلاک ہونا کچھ تم پر موقوف نہیں، ہم چاہیں تو اپنے دوسرے لشکروں سے ہلاک کرسکتے ہیں، بہر حال زمین وآسمان کے لشکروں کا مالک اگر صلح کا حکم دے گا تو ضرور اسی میں بہتری اور حکمت ہوگی۔

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ

تا کہ پہنچا دے ایمان والے مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو باغوں میں بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں ہمیشہ رہیں ان میں اور اتار دی ان پر سے

سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝٥

ان کی برائیاں ١۔ اور یہ ہے اللہ کے یہاں بڑی مراد ملنی ٢۔

خلاصہ تفسیر: (آگے زیادتی ایمان کے ثمرہ کا بیان ہے یعنی) تا کہ اللہ تعالیٰ (اس اطاعت کی بدولت) مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو ایسی بہشتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور تا کہ (اس اطاعت کی بدولت) ان کے گناہ دور کردے (کیونکہ اطاعت رسول میں گناہوں سے توبہ اور اعمال صالحہ سب داخل ہیں جو تمام سیئات اور گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں) اور یہ (جو کچھ مذکور ہوا) اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے۔

یہ بھی اسی سکینہ اور تحمل کا ثمرہ ہے جس کا پچھلی آیت میں بیان ہوا، اللہ نے پہلے مؤمنین کے دلوں پر سکینہ اور تحمل نازل کرنے کا انعام ذکر فرمایا، پھر وہ سکینہ اطاعت رسول کے ذریعہ ایمان کی زیادتی کا سبب بنا، اور اطاعت رسول سبب ہے جنت میں جانے کا، چنانچہ یہ سب امور مؤمنین کے قلوب میں نزول سکینہ پر مرتب ہوئے۔

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ: یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس بشارت میں عورتوں کو کیوں شامل کیا گیا؟ کیونکہ وہ تو حدیبیہ میں شریک نہ تھیں؟ بات یہ ہے کہ فضیلت کا مدار اطاعت پر ہے، خواہ کسی خاص کام میں ہو، یا دوسرے کاموں میں ہو تو اس میں مسلمان عورتیں بھی شریک ہیں، دوسرے اس کے بڑھا دینے سے ایک گونہ عورتوں کی تسلی بھی ہے کہ حدیبیہ والوں کے فضائل سن کر شاید ان کو یہ خیال ہوتا کہ ہم ان فضائل سے محروم ہیں، اس لیے بتلا دیا کہ مدار اطاعت پر ہے، تو جو احکام تمہارے متعلق ہیں تم ان میں اطاعت کرو تو تم بھی ان کی مستحق ہوگی، تیسرا یہ کہ مسلمانوں کے غلبہ سے ان کی عورتیں بھی دل سے خوش ہوتیں اور دعا کرتی تھیں تو وہ بھی اس ثواب میں شریک ہیں، اور چونکہ اس جگہ سکینہ کرنے کا بیان مسلمانوں کی مدح میں ہوا ہے اور مدح اکثر ایسی چیز کے ساتھ کی جاتی ہے جو ممدوح کے ساتھ خاص ہو، اس لیے اس آیت سے یہ بھی سمجھا گیا کہ کفار کے قلب پر سکینہ نازل نہیں کیا گیا۔

* * *

فائدہ: ١۔ جب حضور ﷺ نے اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا پڑھ کر صحابہ کو سنائی تو انہوں نے آپ کی خدمت میں مبارکباد عرض کی اور کہا، یا رسول اللہ! یہ تو آپ ﷺ کے لیے ہوا، ہمارے لیے کیا ہے؟ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں یعنی اللہ نے اطمینان وسکینہ اتار کر مومنین کا ایمان

بڑھایا۔ تاکہ انہیں نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ جنت میں داخل کرے اور ان کی برائیوں اور کمزوریوں کو معاف فرمادے۔ حدیث میں ہے کہ جن اصحاب نے حدیبیہ میں بیعت کی ان میں سے ایک بھی دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔

تنبیہ: مومنات کا ذکر تعمیم کے لیے ہے، یعنی مرد ہو یا عورت کسی کی محبت اور ایمانداری ضائع نہیں جاتی، احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت ام سلمہؓ اس سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھیں۔

فائدہ: ۲ بعض نقال صوفی یا کوئی مغلوب الحال بزرگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ جنت طلب کرنا ناقصوں کا کام ہے، یہاں سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں یہ ہی بڑا کمال ہے۔

وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ

اور تاکہ عذاب کرے دغاباز مردوں کو اور دغاباز عورتوں کو اور شرک والے مردوں کو اور شرک والی عورتوں کو ۱ جو اٹکلیں کرتے ہیں اللہ پر بری اٹکلیں ۲

عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝۶

انہی پر پڑے پھیر مصیبت کا ۳ اور غصہ ہوا اللہ ان پر اور لعنت کی ان کو اور تیار کی ان کے واسطے دوزخ اور بری جگہ پہنچے

خلاصہ تفسیر: (آگے اسی سکینہ پر مرتب کرکے منافقین کی اس سے محرومی) اور (اس محرومی کے سبب عذاب میں گرفتار ہونا بیان فرماتے ہیں، یعنی یہ سکینہ مسلمانوں کے قلوب پر نازل فرمایا اور کفار کے دلوں پر بالکل سکینہ نازل نہیں کیا گیا، کیونکہ ان کو ایمان کی بھی توفیق نہ ہوئی) تاکہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو (ان کے کفر کی وجہ سے) عذاب دے جو کہ اللہ کے ساتھ برے برے گمان رکھتے ہیں (اس برے گمان سے مراد باعتبار سیاق کلام کے ان لوگوں کا گمان ہے جن کو عمرہ کے لئے حدیبیہ کے سفر کی دعوت دی گئی اور انہوں نے انکار کر دیا اور باہم یہ کہا کہ یہ لوگ اہل مکہ سے ہمیں لڑانا چاہتے ہیں ان کو جانے دو، یہ ان کے ہاتھ سے بچ کر نہیں آئیں گے ایسا کہنے والے لوگ منافقین ہی ہو سکتے ہیں اور اپنے مفہوم عام کے اعتبار سے سارے عقائد کفریہ شرکیہ اسی گمان بد میں داخل ہیں، ان سب کے لئے وعید ہے کہ دنیا میں) ان پر برا وقت پڑنے والا ہے (چنانچہ مشرکین چند ہی روز کے بعد قتل اور قید ہوئے اور منافقین کی تمام عمر حسرت و پریشانی میں کٹی کہ اسلام بڑھتا تھا اور وہ گھٹتے جاتے تھے یہ تو دنیا میں ہوا) اور (آخرت میں) اللہ تعالیٰ ان پر غضبناک ہوگا اور ان کو رحمت سے دور کر دے گا اور ان کے لئے اس نے دوزخ تیار کر رکھی ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ: برے گمان میں کفر اور شرک کے عقائد، رسول کی نبوت کا انکار اور غلبہ اسلام کے وعدہ کو جھوٹا سمجھنا سب داخل ہے، اس میں کفار مکہ کی طرف بھی اشارہ ہے جنہوں نے اس واقعہ میں آپ سے ضد باندھی اور منافقین مدینہ پر بھی اشارہ ہے کہ وہ دشمنی اور عداوت کی وجہ سے تمنا کرتے تھے کہ مسلمان بچ کر نہ آئیں، اور غلبہ اسلام کی نسبت خدا کے وعدوں کو غلط سمجھتے تھے اور چونکہ عذاب کا مدار کفر پر ہے اس لیے منافق اور کافر عورتوں کو بھی شامل کر لیا، نیز اس واقعہ میں بالخصوص آپ کی مخالفت میں یہ عورتیں بھی شریک ہیں اگرچہ دل سے ہی سہی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی مومنین کے دلوں میں صلح کی طرف سے اطمینان پیدا کرکے اسلام کی جڑ مضبوط کر دی اور اسلامی فتوحات و ترقیات کا دروازہ کھول دیا جو انجام کار سبب ہے کافروں اور منافقوں پر مصیبت ٹوٹنے اور ان کو پوری طرح سزا ملنے کا۔

فائدہ: ۲ ''بری اٹکلیں'' یہ کہ مدینے سے چلتے وقت منافق (بجز ایک جد بن قیس کے) مسلمانوں کے ساتھ نہیں آئے، بہانے کرکے بیٹھ رہے۔ دل میں سوچا کہ مڈبھیڑ ضرور ہو کر رہے گی۔ یہ مسلمان لڑائی میں تباہ ہوں گے۔ ایک بھی زندہ واپس نہ آئے گا۔ کیونکہ وطن سے دور، فوج کم، اور

دشمن کا دیس ہوگا ہم کیوں ان کے ساتھ اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں اور کفار مکہ نے یہ خیال کیا کہ مسلمان بظاہر "عمرے" کے نام سے آ رہے ہیں اور فریب و دغا سے چاہتے ہیں کہ مکہ معظمہ ہم سے چھین لیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی زمانہ کی گردش اور مصیبت کے چکر میں آ کر رہیں گے کہاں تک احتیاطیں اور پیش بندیاں کریں گے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

اور اللہ کے ہیں سب لشکر آسمانوں کے اور زمین کے، اور ہے اللہ زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر: اور (اب گزشتہ آیت میں مذکور وعید کی تاکید ہے کہ) آسمان اور زمین کے سب لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ تعالیٰ زبردست (یعنی پوری قدرت والا ہے، اگر چاہتا اپنے کسی بھی لشکر سے ان سب کی ایک دم صفائی کر دیتا کہ یہ اس کے مستحق ہیں لیکن چونکہ وہ) حکمت والا ہے (اس لئے مصلحت کی وجہ سے سزا میں مہلت دیتا ہے)۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یہ مضمون پیچھے بھی آ چکا ہے، مگر وہاں مقصود یہ تھا کہ ہم مسلمانوں کے غالب کرنے پر قادر ہیں جس میں تسلی تھی، اور یہاں مقصود یہ ہے کہ ہم کفار کو مغلوب و مقہور کرنے پر قادر ہیں جس میں دھمکی ہے، اسی لیے یہاں حکیما کے ساتھ عزیزا بھی فرمایا جو قہر پر دلالت کرتا ہے، جبکہ پیچھے عزیزا کا لفظ نہ تھا، سو اس میں تکرار نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی وہ سزا دینا چاہے تو کون بچا سکتا ہے۔ خدائی لشکر ایک لحہ میں پیس کر رکھ دے۔ مگر وہ زبردست ہونے کے ساتھ حکمت والا بھی ہے۔ حکمت الٰہی مقتضی نہیں کہ فوراً ہاتھوں ہاتھ ان کا استیصال کیا جائے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ

ہم نے تجھ کو بھیجا احوال بتانے والا اور خوشی اور ڈر سنانے والا ۱؎ تاکہ تم لوگ یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کی مدد کرو

وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝

اور اس کی عظمت رکھو ۲؎ اور اس کی پاکی بولتے رہو صبح اور شام ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے مسلمانوں پر انعامات کا ذکر تھا، چونکہ وہ انعامات حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے عطا ہوئے ہیں اس لیے آگے اللہ و رسول کے حقوق، اور ان کے بجالانے والوں کی فضیلت اور نہ ماننے والوں کی مذمت کا بیان ہے۔

(اے محمد ﷺ) ہم نے آپ کو (قیامت کے دن امت کے اعمال پر) گواہی دینے والا (عموماً) اور (دنیا میں خصوصاً مسلمانوں کے لئے) بشارت دینے والا اور (کافروں کے لئے) ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے (اور اے مسلمانو! ہم نے ان کو اس لئے رسول بنا کر بھیجا ہے) تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس (کے دین) کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو (عقیدہ سے بھی کہ اللہ تعالیٰ کو تمام کمالات کے ساتھ موصوف اور تمام نقائص اور عیوب سے پاک سمجھو اور اعمال میں بھی اس کی اطاعت کرو) اور صبح و شام اس کی تسبیح (و تقدیس) میں لگے رہو (اگر اس تسبیح کی تفسیر نماز سے کی جائے تو صبح شام کی فرض نمازیں مراد ہوں گی ورنہ مطلق ذکر اگرچہ مستحب ہی ہو مراد ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آپ اللہ کے فرمانبرداروں کو خوشی اور نافرمانوں کو ڈر سناتے ہیں اور خود اپنے احوال بتلاتے ہیں جیسے انا فتحنا سے یہاں تک تینوں قسم کے مضامین آ چکے۔ اور آخرت میں بھی اپنی امت پر نیز انبیاء علیہم السلام کے حق میں گواہی دیں گے۔

فائدہ: ۲ تُعَزِّرُوْهُ اور تُوَقِّرُوْهُ کی ضمیریں اگر اللہ کی طرف راجع ہوں تو اللہ کی مدد کرنے سے مراد اس کے دین اور پیغمبر کی مدد کرنا ہے اور اگر رسول کی طرف راجع ہوں تو پھر کوئی اشکال نہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی اللہ کی پاکی بیان کرتے رہو۔ خواہ نمازوں کے ضمن میں یا نمازوں سے باہر۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ

تحقیق جو لوگ بیعت کرتے ہیں تجھ سے وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے، اللہ کا ہاتھ ہے اوپر انکے ہاتھ کے ا۔ پھر جو کوئی قول توڑے سو توڑتا ہے

ع عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۰﴾

اپنے نقصان کو، اور جو کوئی پورا کرے اس چیز کو جس پر اقرار کیا اللہ سے تو وہ اس کو دے گا بدلہ بہت بڑا ۲۔

خلاصہ تفسیر: (آگے بعض حقوق خاصہ کے متعلق ارشاد ہے کہ) جو لوگ آپ سے (حدیبیہ کے روز اس بات پر) بیعت کر رہے ہیں (یعنی بیعت کر چکے ہیں کہ جہاد سے بھاگیں گے نہیں) تو وہ (واقع میں) اللہ تعالیٰ سے بیعت کر رہے ہیں (کیونکہ آپ سے بیعت کرنے کا یہی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام بجالائیں گے اور جب یہ بات ہے تو گویا) خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، پھر (بیعت کے بعد) جو شخص عہد توڑے گا (یعنی بجائے اطاعت کے مخالفت کرے گا) تو اس کے عہد توڑنے کا وبال اسی پر پڑے گا، اور جو شخص اس بات کو پورا کرے گا جس پر (بیعت میں) خدا سے عہد کیا ہے تو عنقریب خدا اس کو بڑا اجر دے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ: اس بیعت کا ذکر سورت کے شروع میں تیسرے واقعہ میں گذر چکا ہے، لفظ ''بیعت'' دراصل کسی خاص کام پر عہد لینے کا نام ہے، اس کا قدیم اور مسنون طریقہ باہم عہد کرنے والوں کا ہاتھ پر ہاتھ رکھنا ہے اگرچہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنا شرط اور ضروری نہیں، بہرحال جس کام کا کسی سے عہد کیا جائے اس کی پابندی شرعاً واجب و ضروری ہے اور خلاف ورزی حرام ہے، چونکہ الفاظ عام ہیں اس لیے جس عہد کا پورا کرنا شرعاً واجب ہو اس کے توڑنے پر یہی وعید ہے، واضح رہے کہ پیری مریدی کی بیعت توڑنے کو یہ وعید شامل نہیں، کیونکہ اگر ایک پیر سے قطع تعلق کر دیا لیکن احکام الٰہی میں اعتقادی یا عملی خلل واقع نہیں کیا تو ذرہ برابر گناہ نہیں، البتہ شرعی ضرورت کے بغیر ایسا کرنا بے برکتی کا سبب ضرور ہے، اور ممکن ہے کہ یہ بالواسطہ گناہ تک بھی پہنچا دے، اور کسی شرعی ضرورت کی وجہ سے قطع تعلق واجب ہے، مثلاً کسی غیر متشرع سے بیعت ہو گیا تو ایسی بیعت کا توڑنا واجب ہے۔

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ: ''اللہ کا ہاتھ'' متشابہات میں سے ہے جس کی کیفیت اور حقیقت نہ کسی کو معلوم ہے اور نہ ہی معلوم کرنے کی فکر میں رہنا درست ہے، یہاں اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ بیعت کے وقت ہاتھ میں ہاتھ لینا ضروری ہے، یا یہ کہ بیعت لینے والے شیخ کا ہاتھ اوپر ہی ہونا ضروری ہے، لفظ ''بیعت'' دراصل کسی خاص کام پر عہد لینے کا نام ہے۔

* * *

فائدہ: ا۔ لوگ حضور ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بیعت کرتے تھے اس کو فرمایا کہ نبی کے ہاتھ پر بیعت کرنا گویا خدا سے بیعت کرنا ہے کیونکہ حقیقت میں نبی خدا کی طرف سے بیعت لیتا ہے اور اسی کے احکام کی تعمیل و تاکید بیعت کے ذریعہ سے کراتا ہے، فہذا کما قال: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء:۸۰) وَكَمَا قَالَ: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:۱۷) جب بیعت نبوی کی حقیقت یہ ہوئی تو یقیناً خدا تعالیٰ کا دست شفقت و حمایت ان کے ہاتھوں کے اوپر ہوگا۔

تنبیہ: حضور ﷺ صحابہ سے بھی اسلام پر کبھی جہاد پر کبھی کسی دوسرے امر پر بیعت لیتے تھے، اگر بطریق مشروع ہو تو اسی لفظ کے تحت میں مندرج ہوگی، حدیبیہ میں اس بات پر بیعت لی گئی کہ مرتے دم تک میدان جہاد سے نہیں بھاگیں گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بیعت کے وقت جو قول وقرار کیا ہے، اگر کوئی اس کو توڑے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا، اللہ ورسول کو کچھ ضرر نہیں پہنچتا، اسی کو عہد شکنی کی سزا ملے گی اور جس نے استقامت دکھلائی اور اپنے عہد و پیمان کو مضبوطی کے ساتھ پورا کیا تو اس کا بدلہ بھی بہت پورا ملے گا۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ

اب کہیں گے تجھ سے پیچھے رہ جانے والے گنوار ہم کام میں لگے رہ گئے اپنے مالوں کے اور گھر والوں کے سو ہمارا گناہ بخشوا ۱؎ وہ کہتے ہیں

بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْــًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا

اپنی زبان سے جو ان کے دل میں نہیں ۲؎ تو کہہ کس کا کچھ بس چلتا ہے اللہ سے تمہارے واسطے اگر وہ چاہے تمہارا نقصان

اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۭ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ⑪

یا چاہے تمہارا فائدہ، بلکہ اللہ ہے تمہارے سب کاموں سے خبردار ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے حدیبیہ میں شامل ہونے والوں کی تعریف تھی، اب آگے اس سے پیچھے رہنے والوں کی مذمت ہے جس کا ذکر سورت کے شروع میں چھٹے واقعہ میں بیان ہو چکا۔

جو دیہاتی (اس سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے (شریک سفر نہیں ہوئے) وہ عنقریب (جب کہ آپ مدینہ پہنچیں گے) آپ سے (بات بنانے کے طور پر) کہیں گے کہ (ہم جو آپ کے ساتھ شریک نہیں ہوئے وجہ اس کی یہ ہوئی کہ) ہم کو ہمارے مال اور عیال نے فرصت نہ لینے دی (یعنی ان کی ضروریات میں مشغول رہے ورنہ شرکت کا ارادہ تھا) سو ہمارے لئے (اس کوتاہی کی) معافی کی دعا کر دیجئے (آگے حق تعالیٰ ان کی تکذیب فرماتے ہیں کہ) یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں (آگے آپ کو تلقین ہے کہ یہ لوگ جب آپ سے یہ عذر پیش کریں تو) آپ کہہ دیجئے کہ (اول تو یہ عذر اگر سچا بھی ہوتا تو بھی اللہ ورسول کے قطعی حکم کے مقابلہ میں محض عذر لنگ اور باطل ہوتا) سو (ہم پوچھتے ہیں کہ) وہ کون ہے جو خدا کے سامنے تمہارے لئے (نفع ونقصان میں) کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی نقصان یا کوئی نفع پہنچانا چاہے (یعنی تمہاری ذات یا تمہارے مال اور عیال میں جو نفع یا نقصان تقدیر الٰہی میں مقدر ہو چکا ہے اس کے خلاف کرنے کا کسی کو اختیار نہیں، البتہ شریعت اسلام نے بہت سے مواقع پر اس طرح کے خطرات کا عذر قبول کر کے رخصت دے دی ہے بشرطیکہ وہ عذر واقعی ہو اور جہاں شریعت نے اس عذر کو قبول نہیں کیا اور رخصت نہیں دی بلکہ حکم قطعی کر دیا جیسا کہ مسئلہ زیر بحث میں ہے کہ سفر حدیبیہ کے لئے اللہ ورسول نے گھر بار کے مشاغل کو قابل قبول عذر قرار نہیں دیا اگر چہ وہ واقعی ہو، دوسرے یہ عذر جو تم کر رہے ہو واقعی اور سچا بھی نہیں جیسا کہ آگے آتا ہے اور تم سمجھتے ہو گے کہ مجھ کو اس جھوٹ کی خبر نہیں ہوئی) بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ (نے جو کہ) تمہارے سب اعمال پر مطلع ہے (مجھ کو بذریعہ وحی اطلاع کر دی ہے کہ تمہاری غیر حاضری کی وجہ وہ نہیں جو تم بیان کر رہے ہو)۔

فَاسْتَغْفِرْ لَنَا: صحیح عذر کے ہوتے ہوئے استغفار کی درخواست اگر غیر مخلص کرے تو وہ اخلاص میں ریاء ہے، اور اگر مخلص درخواست کرے تو اس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ عذر کا عذر ہونا اکثر اپنی رائے سے سمجھا جاتا ہے جس میں بعض اوقات نفس اور شیطان کے دھوکہ سے تامل میں یا اس کے موافق عمل کرنے میں کوتاہی ہو جاتی ہے اس لیے استغفار کی حاجت ہوتی ہے۔

مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ: مطلب یہ کہ ان کے عذر میں کئی مضمون ہیں: ① ایک یہ کہ ہم کو فرصت نہ تھی ② دوسرے یہ کہ ہمارا شریک ہونے کا ارادہ تھا ③ تیسرے ہم آپ کے استغفار کو مفید سمجھتے ہیں، حالانکہ خود اپنے دل میں صحیح نہیں سمجھتے، کیونکہ پہلی دو باتیں تو واقع کے خلاف ہیں، اور تیسری بات میں اس لیے جھوٹے ہیں کہ ان کو نبوت کا اعتقاد ہی نہیں۔

فائدہ: ۱؎ مدینہ سے روانہ ہوتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی روانگی کا اعلان کر دیا اور مسلمانوں کو ساتھ چلنے کے لیے ابھارا تھا۔ شاید قرائن سے آپ کو بھی لڑائی کا احتمال ہو، اس پر دیہاتی گنوار جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہ ہوا تھا، جان چرا کر بیٹھ رہے، اور آپس میں کہنے لگے کہ بھلا ہم ایسی قوم کی طرف جائیں گے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر (مدینہ) میں آ کر ان کے کتنے ساتھیوں کو قتل کر گئی، اب ہم اس کے گھر جا کر اس سے لڑیں گے؟ تم دیکھ لینا اب یہ اور ان کے ساتھی اس سفر سے واپس آنے والے نہیں سب وہیں کھیت رہیں گے، ان آیات میں حق تعالیٰ نے ان کے نفاق کا پردہ فاش کیا ہے آپ کو مدینہ پہنچنے سے قبل راستہ میں بتلا دیا کہ تمہارے صحیح وسالم واپس جانے پر وہ لوگ اپنی غیر حاضری کے جھوٹے عذر اور حیلے بہانے کرتے ہوئے آئیں گے اور کہیں گے کہ کیا کہیے ہم کو گھر بار کے دھندوں سے فرصت نہ ملی، کوئی ہمارے پیچھے مال اور اہل وعیال کی خبر لینے والا نہ تھا بہر حال ہم سے کوتاہی ضرور ہوئی، اب اللہ سے ہمارا قصور معاف کرا دیجئے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دل میں جانتے ہیں کہ یہ عذر بالکل غلط ہے اور استغفار کی درخواست کرنا بھی محض ظاہر داری کے لیے ہے، سچے دل سے نہیں وہ دل میں نہ اس کو گناہ سمجھتے ہیں نہ آپ پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ہر طرح کا نفع ونقصان اللہ کے قبضہ میں ہے جس کی مشیت وارادہ کے سامنے کسی کا کچھ بس نہیں چلتا، اس کو منظور نہیں تھا کہ تم کو اس سفر مبارک کی شرکت کے فوائد نصیب ہوں، نہ اب یہ منظور ہے کہ میں تمہارے لیے استغفار کروں، اس نے تمہاری حیلہ تراشی سے قبل ہی ہم کو ان جھوٹے اعذار پر مطلع کر دیا تھا، بہر حال اس نے ارادہ کر لیا ہے کہ تمہارے اعمال وحرکات کی بدولت "غزوہ حدیبیہ" کی گوناگوں برکات وفوائد کی طرف سے تم کو نقصان اور گھاٹے میں رکھے اور وہاں تم کہتے ہو کہ اپنے مال اور گھر والوں کی حفاظت کی وجہ سے سفر میں نہ جا سکے، تو کیا خدا اگر تمہارے مال واولاد وغیرہ میں نقصان پہنچانے کا ارادہ کرے، تم گھر میں رہ کر اسے روک دو گے، یا فرض کرو اللہ تم کو کچھ فائدہ مال وعیال میں پہنچانا چاہے اور تم سفر میں ہو، تو کیا اسے کوئی روک سکتا ہے، جب نفع ونقصان کو کوئی روک نہیں سکتا تو اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی کے مقابلہ میں ان چیزوں کی پروا کرنا محض حماقت وضلالت ہے، ان حیلوں بہانوں سے مت سمجھو کہ ہم اللہ کو خوش کر لیں گے بلکہ یاد رکھو اللہ تمہارے سب کھلے چھپے اعمال واحوال کی پوری خبر رکھتا ہے۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

کوئی نہیں تم نے تو خیال کیا تھا کہ پھر کر نہ آئے گا رسول اور مسلمان اپنے گھر کبھی اور کھب گیا تمہارے دل میں یہ خیال

وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۚ وَكُنْتُمْ قَوْمًا ۢ بُوْرًا ⑫

اور اٹکل کی تم نے بری اٹکلیں، اور تم لوگ تھے تباہ ہونے والے

خلاصہ تفسیر: بلکہ (تمہاری غیر حاضری کی اصل وجہ یہ ہے کہ) تم نے یہ سمجھا کہ رسول اور مومنین اپنے گھر والوں میں کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے (بلکہ مشرکین سب کی صفائی کر دیں گے) اور یہ بات تمہارے دلوں میں اچھی بھی معلوم ہوتی تھی (اللہ ورسول کے ساتھ دشمنی کی وجہ سے تمہاری دلی تمنا بھی تھی) اور تم نے برے برے گمان کئے (جس کا بیان پیچھے آیت: الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ میں گزر چکا ہے) اور تم (ان برے گمانوں کی وجہ سے جو کہ خیالات کفریہ ہیں) برباد ہونے والے لوگ ہو گئے۔

* * *

فائدہ: یعنی واقع میں تمہارے نہ جانے کا سبب یہ نہیں جو بیان کر رہے ہو بلکہ تمہارا خیال یہ تھا کہ اب پیغمبر اور مسلمان اس سفر سے بچ کر واپس نہ آئیں گے، یہی تمہاری دلی آرزو تھی اور یہ غلط اور تخمینہ تمہارے دلوں میں خوب جم گیا تھا، اسی لیے اپنی حفاظت اور نفع کی صورت تم نے علیحدہ رہنے میں سمجھی، حالانکہ یہ صورت تمہارے خسران اور تباہی کی تھی اور اللہ جانتا تھا کہ یہ تباہ وبرباد ہونے والے ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اور جو کوئی یقین نہ لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر تو ہم نے تیار رکھی ہے منکروں کے واسطے دہکتی آگ، اور اللہ کے لیے ہے راج آسمانوں کا

وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾

اور زمین کا، بخشے جس کو چاہے اور عذاب میں ڈالے جس کو چاہے، اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور (اگر ان وعیدوں کو سن کر تم اب بھی دل سے ایمان لے آؤ تو خیر ورنہ) جو شخص اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائے گا تو ہم نے کافروں کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے، اور (مومن وغیر مومن کے لئے مذکورہ قانون مقرر کرنے سے تعجب نہ کیا جائے کیونکہ) تمام آسمان وزمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے سزا دے (چنانچہ مؤمن کے لیے مغفرت اور کافر کے لیے عذاب چاہا اور اسی طرح قانون ٹھہرا دیا) اور (کافر اگرچہ عذاب کا مستحق ہوتا ہے لیکن) اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے (کہ وہ بھی سچے دل سے ایمان لے آئیں تو ان کو بھی بخش دیتا ہے، بعض تفاسیر میں ہے کہ ان منافقوں میں سے بہت سے تائب اور مخلص ہو گئے تھے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس کو وہ بخشنا چاہے، میں کیسے بخشواؤں، ہاں اس کی مہربانی ہو تو تم کو توبہ کی توفیق مل جائے اور بخشش ہو جائے، اس کی رحمت بہرحال غضب پر سابق ہے۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ

اب کہیں گے پیچھے رہ گئے ہوئے جب تم چلو گے غنیمتیں لینے کو چھوڑو ہم بھی تمہارے ساتھ چاہتے ہیں کہ

يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ

بدل دیں کہا اللہ کا، تو کہہ دے تم ہمارے ساتھ ہرگز نہ چلو گے یونہی کہہ دیا اللہ نے پہلے سے ۱؎ پھر اب کہیں گے نہیں

تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾

تم تو جلتے ہو ہمارے فائدہ سے ۲؎ کوئی نہیں پر وہ نہیں سمجھتے ہیں مگر تھوڑا سا ۳؎

خلاصہ تفسیر: اوپر حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق گفتگو کا حکم تھا، اب آگے مزید دو واقعوں کے متعلق ان سے گفتگو کا حکم ہے۔

جو لوگ (سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے وہ عنقریب جب تم (خیبر کی) غنیمتیں لینے چلو گے (مطلب یہ ہے کہ خیبر فتح کرنے کے لئے چلو گے جہاں غنیمت ملنے والی ہے، پس وہ گویا غنیمت کے لیے جانا ہے، تو یہ لوگ تم سے) کہیں گے کہ ہم کو بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں (وجہ اس درخواست کی مال غنیمت کی لالچ تھی جس کے وہاں حاصل ہونے کی قرائن سے ان کو امید تھی بخلاف سفر حدیبیہ کے کہ اس میں زحمت بلکہ ہلاکت کا اندیشہ تھا، اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا کہ) وہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ خدا کے حکم کو (جو کہ اس واقعہ کے متعلق ہوا ہے اور وہ حکم یہ ہے کہ حدیبیہ والوں کے سوا خیبر اور کوئی نہ جائے، خصوصاً حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والے لوگ اس حکم کو) بدل ڈالیں (یعنی مسلمانوں سے اس کی درخواست کرنا گویا یہ درخواست ہے کہ مسلمان خدا کے حکم کے خلاف کریں جو کہ شرعاً ان کے لیے ممنوع ہے، حاصل یہ ہوا کہ وہ یوں چاہتے ہیں کہ تم گناہ کے مرتکب ہو کر ہم کو

بھی ساتھ لے چلو) سو آپ کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے (یعنی تمہاری یہ درخواست ہم منظوری نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں خدا تعالیٰ کے حکم کی تبدیلی کا گناہ ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یوں ہی فرما دیا ہے (یعنی حدیبیہ سے واپسی ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے دیا تھا کہ غزوہ خیبر میں اہل حدیبیہ کے سوا کوئی نہ جائے گا، اب ان کے جواب کی اطلاع پیشین گوئی کے طور پر فرماتے ہیں کہ جب آپ ان کو یہ جواب دیں گے) تو وہ لوگ کہیں گے (ظاہر یہ ہے کہ آپ کے سامنے کہنا مراد نہیں بلکہ اوروں سے کہیں گے کہ ہمارے ساتھ نہ لینے کو جو خدا کا حکم بتلایا جاتا ہے بات یہ نہیں) بلکہ تم لوگ ہم سے حسد کرتے ہو (اس لئے ہمارا شریک ہونا گوارا نہیں، حالانکہ مسلمانوں میں حسد کا کوئی شائبہ نہیں) بلکہ خود یہ لوگ بہت کم بات سمجھتے ہیں (اگر سمجھ پوری ہوتی تو اللہ کے اس حکم کی حکمت بآسانی سمجھ سکتے تھے کہ حدیبیہ میں ان حضرات نے ایک بہت بڑے خطرہ اور بڑے امتحان کا کام کیا، منافقین نے اپنی دنیوی اغراض کو مقدم رکھا، چنانچہ مسلمانوں کی تخصیص اور منافقین کی محرومی کی یہی وجہ ہے)۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ: اس حکم میں تبدیلی کے واقع ہونے سے افعالٰ وصفات خداوندی میں تو کوئی نقص نہیں آتا، کیونکہ وہ حکم شرعی تھا، لیکن مسلمانوں کا گناہ گار ہونا لازم آتا ہے، اور مراد اس حکم سے غزوہ خیبر اور اس کے مغانم کا صرف اہل حدیبیہ کے ساتھ مخصوص ہونا ہے۔

قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا: اس میں جو تاکیدی طور پر حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کو یہ فرمایا ہے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں ہو سکتے یہ صرف غزوہ خیبر کے ساتھ مخصوص ہے، آگے کسی اور جہاد میں بھی شریک نہ ہو سکیں یہ اس سے لازم نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ حدیبیہ میں پیچھے رہ جانے والوں میں سے قبائل مزنیہ اور جہینہ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے۔

كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ: غزوہ خیبر میں حدیبیہ والوں کے سوا کوئی نہ جائے گا یہ حکم خداوندی بظاہر قرآن کریم میں مذکور نہیں، اور یہاں: **كذلكم قال الله من قبل** میں بھی اہل حدیبیہ کی تخصیص کا قول ہے، مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تو کہیں اس تخصیص کا ذکر ہے نہیں، پھر اس تخصیص کے وعدہ کو ''کلام اللہ'' اور ''قال اللہ'' کہنا کیسے صحیح ہوا؟ علماء نے فرمایا کہ اہل حدیبیہ کی تخصیص کا یہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے اس کا قرآن میں کہیں صراحۃً ذکر نہیں، بلکہ یہ تخصیص اہل حدیبیہ کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے وحی غیر متلو کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر حدیبیہ میں فرمایا تھا، اسی کو اس جگہ ''کلام اللہ'' اور ''قال اللہ'' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علاوہ احکام قرآن کے جو احکام احادیث صحیحہ میں مذکور ہیں وہ بھی حسب تصریح اس آیت کے ''کلام اللہ'' اور ''قال اللہ'' میں داخل ہیں، جو ملحدین احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجت دین نہیں مانتے یہ آیتیں ان کے الحاد کو کھولنے کے لئے کافی ہیں، رہا یہ معاملہ کہ اسی سورت میں جو سفر حدیبیہ کے شروع میں نازل ہوئی ہے یہ الفاظ قرآن میں موجود ہیں: **واثابهم فتحا قريبا**، اور باتفاق مفسرین یہاں ''فتح قریب'' سے فتح خیبر مراد ہے تو اس طرح قرآن میں فتح خیبر کا اور اس کے غنائم اہل حدیبیہ کو ملنے کا وعدہ آ گیا وہی اس لفظ کلام اللہ اور قال اللہ کی مراد ہو سکتی ہے، تو حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں غنیمت کا وعدہ تو ہے مگر اس کا کہیں ذکر نہیں کہ یہ غنیمت اہل حدیبیہ کے ساتھ مخصوص ہو گی دوسرے اس میں شریک نہ ہو سکیں گے، یہ تخصیص تو بلاشبہ حدیث رسول ہی سے معلوم ہوئی ہے وہی ''کلام اللہ'' اور ''قال اللہ'' کا مصداق ہے اور بعض حضرات نے جو سورۃ توبہ کی آیت کو اس کا مصداق قرار دیا ہے یعنی: **فاستاذنوك للخروج فقل لن تخرجوا معي ابدا ولن تقاتلوا معي عدوا** تو اس لئے صحیح نہیں کہ یہ آیات غزوہ تبوک کے متعلق آئی ہیں اور وہ غزوہ خیبر کے بعد سن ۹ ہجری میں ہوا ہے۔

* * *

فائدہ: ١ہ ''حدیبیہ'' سے واپس ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر پر چڑھائی کرنے کا حکم ہوا، جہاں غدار یہود آباد تھے جو بدعہدی کر کے جنگ احزاب میں کافر قوموں کو مدینہ پر چڑھا لائے تھے، حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ وہ گنوار جو حدیبیہ نہیں گئے، اب خیبر کے معرکہ میں تمہارے ساتھ چلنے کو کہیں گے، کیونکہ وہاں خطرہ کم اور غنیمت کی امید زیادہ ہے، آپ ان سے فرما دیں کہ تمہاری استدعا سے پیشتر اللہ ہم کو کہہ چکا ہے کہ تم (اس سفر میں) ہمارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤ گے، اندریں صورت کیا تم ہمارے ساتھ جا سکتے ہو، اگر جاؤ گے تو یہ معنی ہوں گے کہ گویا اللہ کا کہا بدل دیا گیا جو کسی طرح ممکن نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اللہ نے کچھ بھی نہیں فرمایا، محض یہ چاہتے ہو کہ ہمارا فائدہ نہ ہو، سب مال غنیمت بلاشرکت غیرے تمہارے ہی ہاتھ آجائے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی بہت تھوڑی سمجھ ہے، احمق یہ نہیں سمجھتے کہ مسلمانوں کے زہد وقناعت کا کیا حال ہے، کیا وہ مال کے حریص ہیں؟ جو تم پر حسد کریں گے؟ اور پیغمبر از راہ حسد خدا پر جھوٹ بول دے گا؟ العیاذ باللہ۔

قُلۡ لِّلۡمُخَلَّفِيۡنَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ سَتُدۡعَوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ تُقَاتِلُوۡنَهُمۡ

کہہ دے پیچھے رہ جانے والے گنواروں سے آئندہ تم کو بلائیں گے ایک قوم پر بڑے سخت لڑنے والے تم ان سے لڑو گے

اَوۡ يُسۡلِمُوۡنَ ۚ فَاِنۡ تُطِيۡعُوۡا يُؤۡتِكُمُ اللّٰهُ اَجۡرًا حَسَنًا ۚ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا كَمَا تَوَلَّيۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ

یا وہ مسلمان ہوں گے، پھر اگر حکم مانو گے دے گا تم کو اللہ بدلہ اچھا ۱؎ اور اگر پلٹ جاؤ گے جیسے پلٹ گئے تھے پہلی بار

يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶﴾

دے گا تم کو ایک عذاب دردناک ۲؎

خلاصہ تفسیر: یہاں تک خیبر کے متعلق مضمون تھا، اب آگے ایک دوسرے واقعہ کے متعلق گفتگو کے لئے ارشاد ہوتا ہے کہ:

آپ ان پیچھے رہنے والے دیہاتیوں سے (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (اگر ایک خیبر میں نہ گئے تو نہ سہی ثواب حاصل کرنے کے اور بھی مواقع آنے والے ہیں چنانچہ) عنقریب تم لوگ ایسے لوگوں (سے لڑنے) کی طرف بلائے جاؤ گے جو سخت لڑنے والے ہوں گے (مراد اس سے فارس وروم کے غزوات ہیں، کیونکہ ان کی فوجیں تربیت یافتہ اور باسامان تھیں کہ) یا تو ان سے لڑتے رہو یا وہ مطیع (اسلام) ہو جائیں (خواہ اسلام قبول کر کے یا اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینا قبول کر کے، مطلب یہ کہ تم اس کام کے لئے بلائے جاؤ گے) سو (اس وقت) اگر تم اطاعت کرو گے (اور ان سے جہاد کرو گے) تو تم کو اللہ تعالیٰ نیک بدلہ دے گا اور اگر تم (اُس وقت بھی) روگردانی کرو گے جیسا اس کے قبل (حدیبیہ وغیرہ میں) روگردانی کر چکے ہو تو وہ دردناک عذاب کی سزا دے گا (مراد دوزخ ہے)۔

سَتُدۡعَوۡنَ اِلٰى قَوۡمٍ اُولِىۡ بَاۡسٍ: تاریخ اسلام شاہد ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں پیش نہیں آیا، کیونکہ اولاً تو آپ کا اس کے بعد اعراب کو کسی غزوہ میں دعوت شرکت دینا ثابت نہیں، ثانیاً اس کے بعد کسی ایسی قوم سے مقابلہ بھی نہیں ہوا جس کے بہادر اور سخت ہونے کا قرآن نے ذکر فرمایا ہے، کیونکہ غزوہ تبوک میں اگرچہ مقابلہ ایسی قوم سے تھا مگر نہ اس غزوہ میں اعراب کو دعوت دینا ثابت ہے اور نہ اس میں قتال کی نوبت آئی، کیونکہ مقابل آدمیوں پر اللہ نے رعب ڈال دیا وہ مقابلہ پر نہیں آئے، آنحضرت ﷺ اور صحابہ بغیر قتال کے واپس آئے اور غزوہ حنین میں بھی نہ ان کو دعوت دینا ثابت ہے اور نہ اس وقت مقابل کوئی ایسی قوم تھی جو سخت اور ساز وسامان والی ہو، اس لئے ائمہ تفسیر میں سے بعض نے فرمایا ہے کہ مراد اس سے فارس اور روم یعنی کسریٰ وقیصر کی قومیں ہیں جن کے ساتھ جہاد حضرت فاروق اعظم کے عہد میں ہوا ہے، اور حضرت رافع بن خدیج نے فرمایا کہ ہم قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے اور ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس قوم سے کون سی قوم مراد ہے یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کے بعد صدیق اکبر نے اپنی خلافت کے زمانے میں ہمیں بنوحنیفہ اہل یمامہ یعنی مسیلمہ کذاب کی قوم کے ساتھ جہاد کرنے کی دعوت دی اس وقت ہم سمجھے کہ یہی قوم اس آیت میں مراد تھی مگر ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد وتعارض نہیں، ہوسکتا ہے کہ سبھی قومیں اس میں داخل ہوں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ذرا صبر کرو، اس لڑائی میں تو نہیں جا سکتے لیکن آگے بہت معرکے پیش آنے ہیں، بڑی سخت جنگجو قوموں سے مسلمانوں کے مقابلے ہوں گے جن کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وہ قومیں مسلمان ہو کر یا جزیہ وغیرہ دے کر اسلام کی مطیع ہو جائیں، اگر واقعی تم کو

شوق جہاد ہے تو اس وقت میدان میں آ کر دادِ شجاعت دینا، اس موقع پر خدا کا حکم مانو گے تو اللہ بہترین بدلہ دے گا۔

تنبیہ: ''ان جنگجو قوموں'' سے ''بنو حنیفہ'' وغیرہ مراد ہیں جو ''مسلیمہ کذاب'' کی قوم تھی، یا ''ہوازن'' و ''ثقیف'' وغیرہ جن سے حنین میں مقابلہ ہوا یا وہ مرتدین جن پر صدیق اکبرؓ نے فوج کشی کی، یا فارس و روم اور کرد وغیرہ جن سے خلفائے راشدین کے زمانہ میں لڑائیاں ہوئیں، ان میں بہت سے بے لڑے بھڑے مسلمان ہوئے اور مال غنیمت بھی بہت آیا۔

فائدہ: ۲ یعنی جیسے پہلے حدیبیہ جانے سے پیچھے ہٹ گئے تھے اگر آئندہ ان معرکوں سے پیچھے ہٹے تو اللہ سخت دردناک سزا دے گا، شاید آخرت سے پہلے دنیا ہی میں مل جائے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ

اندھے پر تکلیف نہیں اور نہ لنگڑے پر تکلیف اور نہ بیمار پر تکلیف ۱ اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا

وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾ ع

اور اسکے رسول کا اس کو داخل کرے گا باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں اور جو کوئی پلٹ جائے اس کو عذاب دے گا دردناک ۲

خلاصہ تفسیر: (البتہ دعوت جہاد سے معذور لوگ مستثنیٰ بھی ہیں چنانچہ) نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے، اور (پیچھے جو مجاہدین کے لئے جنت و نعمت کے وعدے اور جہاد سے جان چرانے والوں کے لئے وعیدیں مذکور ہیں ان میں کچھ انہی لوگوں کی تخصیص نہیں بلکہ یہ وعدہ و وعید ہر مطیع و نافرمان کے لیے عام ہے، چنانچہ قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مانے گا اس کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو شخص (حکم سے) روگردانی کرے گا اس کو دردناک عذاب کی سزا دے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جہاد ان معذور لوگوں پر فرض نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی تمام امور اور معاملات میں عام ضابطہ یہ ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ

تحقیق اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب بیعت کرنے لگے تجھ سے اس درخت کے نیچے ۱ پھر معلوم کیا جو ان کے جی میں تھا ۲ پھر اتارا

السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾

ان پر اطمینان اور انعام دیا ان کو ایک فتح نزدیک، اور بہت غنیمتیں جن کو وہ لیں گے ۳ اور ہے اللہ زبردست حکمت والا ۴

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کی مذمت تھی، اب آگے مخلصین کے لیے بشارتیں ہیں۔

تحقیق اللہ ان مسلمانوں سے (جو آپ کے ہم سفر ہیں) خوش ہوا جبکہ یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے (جہاد میں ثابت قدم رہنے پر) بیعت کر رہے تھے اور ان کے دلوں میں جو کچھ (اخلاص اور عہد کو پورا کرنے کا عزم) تھا اللہ کو وہ بھی معلوم تھا اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ نے ان (کے قلب) میں اطمینان پیدا کر دیا (جس سے ان کو خدا کا حکم ماننے میں ذرا پس و پیش یا تردد نہیں ہوا، یہ تو معنوی نعمتیں ہوئیں) اور (اس کے ساتھ کچھ ظاہری نعمتیں بھی دی گئیں، چنانچہ) ان کو ایک لگتے ہاتھ فتح دے دی (مراد اس فتح سے فتح خیبر ہے) اور (اس فتح میں) بہت سی **غنیمتیں** بھی (دیں) جن کو یہ لوگ لے رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا زبردست (اور) بڑا حکمت والا ہے (کہ اپنی قدرت اور حکمت سے جس وقت جس کے لئے مناسب سمجھتا

ہے فتح دے دیتا ہے)۔

وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا: غزوہ خیبر حدیبیہ سے واپسی کے بعد ہوا، پس اگر یہ آیتیں بھی رستہ ہی میں نازل ہوئی ہیں تب تو اس آیت میں فتح کی پیشین گوئی ہے جس کو یہاں مجازاً صیغہ ماضی کے ساتھ بیان فرمایا، اور اگر یہ آیتیں فتح خیبر کے بعد نازل ہوئی تو اس سورت کا حدیبیہ سے واپسی مدینہ کے وقت نازل ہونا اکثر اجزاء کے اعتبار سے ہے، چنانچہ سورت کے شروع میں ساتویں واقعہ میں اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔

فائدہ: ۱؎ وہ کیکر کا درخت تھا حدیبیہ میں غالباً: لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ الخ فرمانے کی وجہ ہی سے اس بیعت کو "بیعت الرضوان" کہتے ہیں، شروع سورت میں اس کا مفصل قصہ گزر چکا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ظاہر کا اندیشہ اور دل کا توکل، حسن نیت، صدق و اخلاص اور حب اسلام وغیرہ۔

تنبیہ: عموماً مفسرین نے مافی قلوبھم سے یہی مراد لیا ہے، مگر ابوحیان کہتے ہیں کہ صلح اور شرائط صلح کی طرف سے دلوں میں جو رنج و غم اور اضطراب تھا وہ مراد ہے اور آگے: فانزل السکینۃ علیھم اس پر زیادہ چسپاں ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ یعنی فتح خیبر جو حدیبیہ سے واپسی کے بعد فوراً مل گئی اور مال غنیمت بہت آیا جس سے صحابہ آسودہ ہو گئے۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اپنے زور و حکمت سے حدیبیہ کی کسر یہاں نکال دی اور اسی طرح کا قصہ فتح مکہ اور حنین میں ہوا۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ

وعدہ کیا ہے تم سے اللہ نے بہت غنیمتوں کا کہ تم ان کو لو سو جلدی پہنچا دی تم کو یہ غنیمت ۱؎ اور روک دیا لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے ۲؎

وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲۰

اور تا کہ ایک نمونہ ہو قدرت کا مسلمانوں کے واسطے ۳؎ اور چلائے تم کو سیدھی راہ ۴؎

خلاصہ تفسیر: (اور کچھ اسی فتح خیبر پر بس نہیں بلکہ) اللہ تعالیٰ نے تم سے (اور بھی) بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کو تم لوگے سو (ان میں سے) سردست تم کو یہ دے دی ہے اور (اس کے دینے کے لئے خیبر اور حلفاء خیبر کے) لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیئے (یعنی خیبر والوں کے دلوں پر رعب ڈال دیا کہ ان کو زیادہ مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی اور اس سے تمہارا دنیوی نفع بھی مقصود تھا تا کہ آرام اور فراغت ملے) اور (دینی نفع بھی مقصود تھا) تا کہ یہ (واقعہ) اہل ایمان کے لیے (دوسرے وعدوں کے سچے ہونے کا) ایک نمونہ ہو جائے (یعنی خدا کے وعدوں کے سچا ہونے پر اور زیادہ ایمان پختہ ہو جائے) اور تا کہ (اس نمونہ کے ذریعہ) تم کو (آئندہ کے لئے ہر کام میں) ایک سیدھے راستہ پر ڈال دے (مراد اس راستہ سے توکل اور اللہ پر بھروسہ ہے، یعنی ہمیشہ کے لئے اس واقعہ کو سوچ کر اللہ پر اعتماد سے کام لیا کرو)۔

پس اس طرح دینی نفع دو ہو گئے: ایک علمی اور اعتقادی جس کو ولتکون سے بیان فرمایا یعنی خدا کے وعدوں کو ہمیشہ سچا سمجھو، دوسرا عملی و اخلاقی جس کو یھدیکم کے الفاظ سے ارشاد فرمایا کہ ہمیشہ خدا پر بھروسہ رکھو۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً: جتنی غنیمتیں بھی اس آیت کے نزول کے بعد حاصل ہوئیں سب اس میں داخل ہیں، اور ان میں اگرچہ فتح مکہ بھی داخل ہے، مگر اس کا ذکر خاص طور پر اگلی آیت: وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا میں کیا گیا، کیونکہ وہ صحابہ کو خصوصیت کے ساتھ مطلوب تھی تو اس کا خاص اہتمام سے بیان ہوا۔

فائدہ: ۱؎ یعنی آگے چل کے بیشمار غنیمتیں ملنے والی ہیں، ان میں کا یہ ایک حصہ غزوہ خیبر میں دلوا دیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی عام لڑائی نہ ہونے دی اور حدیبیہ یا خیبر میں کفار کے ہاتھوں سے تم کو کچھ ضرر نہ پہنچنے دیا اور تمہاری غیبت میں تمہارے اہل وعیال وغیرہ پر کوئی دست درازی نہ کر سکا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی مسلمان سمجھیں کہ اللہ کی قدرت کیسی ہے اور ان کا درجہ اس کے ہاں کیا ہے اور یہ کہ اسی طرح آئندہ کے وعدہ بھی پورے ہو کر رہیں گے۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اللہ کے وعدوں پر وثوق اور اس کی لامحدود قدرت پر بھروسہ ہوگا تو اور زیادہ طاعت وفرمانبرداری کی ترغیب ہوگی، یہ ہی سیدھی راہ ہے۔

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾

اور ایک فتح اور جو تمہارے بس میں نہ آئی وہ اللہ کے قابو میں ہے، اور اللہ ہر چیز کر سکتا ہے

خلاصہ تفسیر: اور ایک فتح اور بھی (موعود) ہے جو (اس وقت تک) تمہارے قابو میں نہیں آئی (مراد اس سے فتح مکہ ہے جواب تک واقع نہیں ہوئی تھی مگر) خدا تعالیٰ اس کو احاطہ (قدرت) میں لئے ہوئے ہے (جب چاہے گا تم کو عطا کر دے گا) اور (اسی کی کیا تخصیص ہے) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (چنانچہ جب مصلحت ہوئی مکہ بھی فتح ہو گیا جس کا ذکر سورت کے شروع میں دسویں واقعہ میں لکھا گیا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اس بیعت کے انعام میں فتح خیبر دی اور مکہ کی فتح جو اس وقت ہاتھ نہ لگی وہ بھی مل ہی چکی ہے، کیونکہ اللہ نے اس کا وعدہ کر لیا اور فی الحقیقت عالم اسباب میں وہ نتیجہ اسی صلح حدیبیہ کا ہے۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾

اور اگر لڑتے تم سے کافر تو پھیرتے پیٹھ پھر نہ پاتے کوئی حمایتی اور نہ مددگار ۱؎

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ښ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آتی ہے پہلے سے اور تو ہرگز نہ دیکھے گا اللہ کی رسم کو بدلتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے مکہ کا اس وقت تک فتح نہ ہونا اور آئندہ فتح ہونے کا وعدہ بیان ہوا، اب آگے بتلاتے ہیں کہ اگرچہ بعض باتیں اس نوعیت کی تھی کہ مکہ اسی وقت فتح ہو جاتا، مگر بعض دوسری حکمتوں کی وجہ سے ایسا نہ ہوا، چنانچہ ان حکمتوں کو بیان فرماتے ہیں۔

اور (چونکہ ان کفار کے مغلوب ہونے کے اسباب موجود تھے جو آگے آتے ہیں اس لئے) اگر (تم میں یہ صلح نہ ہوتی بلکہ) تم سے یہ کافر لڑتے تو (ان اسباب کی وجہ سے وہ) ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے، پھر نہ ان کو کوئی یار ملتا نہ مددگار (اور) اللہ تعالیٰ نے (کفار کے لئے) یہی دستور کر رکھا ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے (کہ مقابلہ کے وقت اہل حق غالب اور باطل والے مغلوب ہوتے رہے ہیں اور کبھی کسی وقت کسی حکمت ومصلحت کی وجہ سے اس میں توقف ہو جانا غلبہ کے منافی نہیں) اور آپ خدا کے دستور میں (کسی شخص کی طرف سے) ردوبدل نہ پائیں گے (کہ خدا تعالیٰ کوئی کام کرنا چاہے اور کوئی اس کو نہ ہونے دے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی لڑائی ہوتی تو تم ہی غالب رہتے اور کفار پیٹھ پھیر کر بھاگتے کوئی مدد کر کے ان کو آفت سے نہ بچا سکتا، مگر اللہ کی حکمت اسی کو مقتضی ہوئی کہ فی الحال صلح ہو جائے، اور اس کی عظیم الشان برکات سے مسلمان مستفید ہوں۔

فائدہ: ۲ یعنی جب اہل حق اور باطل کا کسی فیصلہ کن موقع پر مقابلہ ہو جائے تو آخر کار اہل حق غالب اور اہل باطل مغلوب و مقہور کیے جاتے ہیں یہ ہی عادت اللہ کی ہمیشہ سے چلی آتی ہے جس میں کوئی تبدل وتغیر نہیں، ہاں! یہ شرط ہے کہ اہل حق بحیثیت مجموعی پوری طرح حق پرستی پر قائم رہیں، اور بعض نے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا کے معنی یوں کیے ہیں کہ اللہ کی عادت کوئی دوسرا نہیں بدل سکتا، یعنی کسی اور کو قدرت نہیں کہ وہ کام نہ ہونے دے جو سنت اللہ کے موافق ہونا چاہیے تھا

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ

اور وہی ہے جس نے روک رکھا ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے بیچ شہر مکہ کے بعد اس کے کہ تمہارے ہاتھ لگا دیا

عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾

ان کو ۱ اور ہے اللہ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھتا ۲

خلاصہ تفسیر: اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ان کے ہاتھ تم سے (یعنی تمہارے قتل سے) اور تمہارے ہاتھ ان (کے قتل) سے عین مکہ (کے قریب) میں (یعنی حدیبیہ میں) روک دیئے بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا (یہ اشارہ اس پانچویں واقعہ کی طرف ہے جس کا بیان سورت کے شروع میں ہو چکا ہے، اور اگرچہ گذشتہ آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرما دیا ہے کہ اگر جنگ ہو بھی جاتی تو فتح مسلمانوں ہی کی ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں مسلمانوں کی بڑی مصلحت اس میں تھی کہ اس وقت جنگ نہ ہو، اس لئے اس طرف مسلمانوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ ان کے قیدیوں کو قتل نہ کریں اس طرح مسلمانوں کے ہاتھ ان کے قتل سے روک دیئے، دوسری طرف قریش کے دلوں پر اللہ نے مسلمانوں کا رعب ڈال دیا کہ انہوں نے صلح کی طرف مائل ہو کر سہیل کو آپ کی خدمت میں بھیجا، اس طرح حق تعالیٰ کی حکمت نے دوطرفہ انتظام جنگ نہ ہونے کا کر دیا) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو (اس وقت) دیکھ رہا تھا (اور ان کاموں کے نتائج کو جانتا تھا اس لئے ایسا کام نہیں ہونے دیا جس سے جنگ چھڑ جائے)۔

بِبَطْنِ مَكَّةَ: مکہ کے قریب سے مراد حدیبیہ ہے جس کو انتہائی قرب کی وجہ سے ''بطن مکہ'' بمعنی عین مکہ فرما دیا، اور اس سے بظاہر حنفیہ کے قول کی تائید ہو سکتی ہے جو حدیبیہ کا ایک حصہ حرم میں داخل مانتے ہیں، اس پر یہ شبہ ہوگا کہ اگلی آیت میں: وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے جانور اپنے اصلی موقع پر نہیں پہنچے تھے تو اصلی موقع سے مراد مطلق حرم نہیں ہے، کیونکہ حدیبیہ میں جانوروں کا پہنچنا یقینی ہے اور حدیبیہ کا ایک حصہ حنفیہ کے نزدیک حرم ہے، بلکہ اس سے مراد منیٰ یا مکہ ہو سکتا ہے جہاں قربانی کرنے کی اکثر عادت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ مشرکین کی کچھ ٹولیاں حدیبیہ پہنچی تھیں کہ موقع پا کر حضور ﷺ کو شہید کر دیں یا اکیلے دکیلے مسلمان کو ستائیں، چنانچہ کچھ چھیڑ چھاڑ بھی کی بلکہ ایک مسلمان کو قتل بھی کر ڈالا اور اشتعال انگیز کلمات بکتے پھرے، آخر صحابہؓ نے ان کو زندہ گرفتار کر کے نبی کریم ﷺ کے حضور میں پیش کر دیا، آپ ﷺ نے ان کو معاف فرما دیا اور کچھ انتقام نہیں لیا، آیہ ہذا میں اس قسم کے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

اور ببطن مکۃ (بیچ شہر مکہ کے) یعنی شہر کے قریب، گویا شہر کا بیچ ہی سمجھو۔

فائدہ: ۲ یعنی ان کی شرارتیں اور تمہارا عفو و تحمل سب کچھ اللہ دیکھ رہا ہے۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۭ

یہ وہی لوگ ہیں جو منکر ہوئے اور روکا تم کو مسجد حرام سے اور نیاز کی قربانی کو بھی بند پڑی ہوئی اس بات سے کہ پہنچے اپنی جگہ تک ۱

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ

اور اگر نہ ہوتے کتنے ایک مرد ایمان والے اور کتنی عورتیں ایمان والیاں جو تم کو معلوم نہیں یہ خطرہ کہ تم ان کو پیس ڈالتے پھر تم ان کی وجہ سے

مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

خرابی پڑ جاتی بے خبری سے، کہ اللہ کو داخل کرنا ہے اپنی رحمت میں جس کو چاہے ۲؎ اگر وہ لوگ ایک طرف ہو جاتے تو آفت ڈالتے ہم منکروں

مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾

پر عذاب دردناک کی ۳؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے ان اسباب کا بیان ہے کہ اگر جنگ ہو جاتی تو کفار کی مغلوبیت کس طرح اور کیوں ہوتی؟

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے (خدا کے ساتھ) کفر کیا اور تم کو (عمرہ کرنے کے لئے) مسجد حرام سے روکا (مراد مسجد حرام اور صفا مروہ کے درمیان کا میدان جہاں سعی ہوتی ہے دونوں ہی ہیں مگر چونکہ طواف اصل اور اول ہے اور وہ مسجد حرام میں ہوتا ہے اس لئے اس سے روکنے کے ذکر پر اکتفا کیا گیا) اور (نیز) قربانی کے جانور کو جو (حدیبیہ میں) رکا ہوا رہ گیا اس کو اس کے موقع (یعنی منیٰ) میں پہنچنے سے روکا (جانوروں کی قربانی کا موقع منیٰ ہے ان لوگوں نے جانوروں کو منیٰ تک نہیں جانے دیا، یہ اشارہ ہے دوسرے واقعہ کی طرف، ان کے ان جرائم) اور (حرم محترم میں بیٹھ کر ایسا ظلم کرنے کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کو جنگ کا حکم دے کر ان کو مغلوب کر دیا جاتا، لیکن بعض حکمتیں اس تقاضے کو پورا کرنے سے مانع ہو گئیں، ان حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس وقت مکہ میں بہت سے مسلمان کفار کے ہاتھوں محبوس اور مظلوم تھے جیسا کہ سورت کے شروع میں تیسرے واقعہ سے معلوم ہوا تھا، اگر اس وقت جنگ چھڑ جاتی تو غیر شعوری طور پر ان مسلمانوں کو بھی نقصان پہنچ جاتا اور ممکن تھا کہ ان کے ہاتھ سے ہی وہ قتل ہو جاتے اور عام مسلمانوں کو پھر اس پر ندامت و افسوس ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ جنگ نہ ہو، اسی مضمون کو آگے فرمایا ہے کہ) اگر (مکہ میں اس وقت) بہت سے مسلمان مرد اور بہت سی مسلمان عورتیں نہ ہوتیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی یعنی ان کے پس جانے کا احتمال نہ ہوتا جس پر ان کی وجہ سے تم کو بھی بے خبری میں (رنج و افسوس کا) ضرر پہنچتا (گناہ بھی ہوتا اور جی بھی برا ہوتا، پس اگر یہ بات نہ ہوتی) تو (کفار کی شرارتوں کا تقاضا یہ تھا کہ ابھی) سب قصہ طے کر دیا جاتا، لیکن ایسا اس لئے نہیں کیا گیا تا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے داخل کرے (چنانچہ جنگ نہ ہونے سے ان مسلمانوں کی جان بچی اور تم ان کے قتل کے گناہ اور پھر اس پر رنج و افسوس سے بچے البتہ) اگر یہ (مذکورہ مسلمان مکہ سے کہیں) ٹل گئے ہوتے تو ان (اہل مکہ) میں جو کافر تھے ہم ان کو (مسلمانوں کے ہاتھ سے) دردناک سزا دیتے (اور ان کو قتل کرا دیتے)۔

فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ: اگر یہ شبہ ہو کہ بے خبری میں گناہ کیوں ہوتا؟ جواب یہ ہے کہ جہاں بے خبری دور کرنے پر قدرت ہو اور اس میں کوشش نہ کی جائے تو اس کا گناہ ہوگا، اگر کہا جائے کہ صحابہ میں یہ احتمال کب ہے کہ وہ کوشش میں کوتاہی کرتے ہوں گے؟ جواب یہ ہے کہ بعض اوقات اس طرف التفات نہیں ہوتا کہ ہم سے کوتاہی ہوئی ہے، اور صحابہ سے بے التفاتی ہو جانے میں کوئی اشکال نہیں۔

یہاں سوال یہ ہے کہ جب بے خبری میں ان کے ہاتھ سے اہل ایمان پامال ہو جاتے تو اس میں لاعلمی کی وجہ سے کوئی معصیت نہ ہوتی پھر **مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ** کا کیا مطلب؟ اس میں کئی اقوال ہیں، حاصل یہ ہے کہ بغیر علم کے اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے وہ گناہ تو نہیں مگر ایک عیب، عار اور ندامت و افسوس کا سبب ضرور ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے صحابہ کی اس سے بھی حفاظت فرمائی، تو یہاں معصیت مراد ہی نہیں، اور میرے نزدیک اقرب یہ ہے کہ اگرچہ معصیت نہ ہو مگر خود اس عمل میں جو کہ لاعلمی میں ہو جائے یہ خاصیت ہے کہ اگر علم ہونے کے بعد اس کا

تدارک نہ کیا جائے تو صالح استعداد کمزور ہوجاتی ہے جس کا اثر اعمال میں سستی ہے اور اس کا نقصان ہونا ظاہر ہے اور اہل قلوب اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے ساتھ حق تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اگرچہ انبیاء کی طرح معصوم تو نہیں مگر عام طور پر ان کو خطاؤں اور عیبوں سے بچانے کا قدرتی انتظام ہوجاتا ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی حرم کے اس حصہ تک قربانی کے جانور پہنچنے نہ دیے جہاں لے جاکر ذبح کرنے کا عام دستور اور معمول ہے، حدیبیہ ہی میں رکے پڑے رہے۔

فائدہ: ۲ یعنی کچھ مسلمان مرد وعورت جو مکہ میں مظلوم ومقہور تھے اور مسلمان ان کو پوری طرح جانتے نہ تھے وہ لڑائی میں بے خبری سے پیس دیے جائیں گے، اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو فی الحال لڑائی کا حکم دے دیا جاتا، لیکن ایسا ہوتا تو تم خود اس قومی نقصان پر متاسف ہوتے، اور کافروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ دیکھو! مسلمان مسلمانوں کو بھی نہیں چھوڑتے، اس خرابی کے باعث لڑائی موقوف رکھی گئی تاکہ وہ مسلمان محفوظ رہیں، اور تم پر اس بے مثال صبر وتحمل کی بدولت خدا اپنی رحمت نازل فرمائے نیز کافروں میں سے جن لوگوں کا اسلام لانا مقدر ہے ان کو بھی لڑائی کی خطرناک گڑبڑ سے بچا کر اپنی رحمت میں داخل کرلے، حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''اس تمام قصے میں ساری ضد اور کعبہ کی بے ادبی ان ہی (مشرکین) سے ہوئی، تم باادب رہے، انہوں نے عمرہ والوں کو منع کیا اور قربانی اپنے ٹھکانے پر نہ پہنچنے دی، بیشک وہ جگہ اس قابل تھی کہ اسی وقت تمہارے ہاتھ سے فتح کرائی جاتی مگر بعض مسلمان مرد وزن مکہ میں چھپے ہوئے تھے اور بعض لوگ جن کا مسلمان ہونا اب مقدر تھا، اس وقت کی فتح مکہ میں وہ پیسے جاتے، آخر دو برس کی صلح میں جتنے مسلمان ہونے کو تھے ہوچکے اور نکلنے والے نکل آئے تب اللہ نے مکہ فتح کرا دیا''۔

فائدہ: ۳ یعنی اگر کفار مسلمانوں سے الگ ہوتے اور مسلمان ان میں رلے ملے نہ ہوتے تو تم دیکھ لیتے کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھوں سے کافروں کو کیسی دردناک سزا دلواتے ہیں۔

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ

جب رکھی منکروں نے اپنے دلوں میں کدنادانی کی ضد پھر اتارا اللہ نے اپنی طرف کا اطمینان اپنے رسول پر

وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ

اور مسلمانوں پر لے اور قائم رکھا ان کو ادب کی بات پر اور وہی تھے اس کے لائق اور اس کام کے اور ہے اللہ ہر

شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٢٦﴾ ع ۱۱

چیز سے خبردار ۲

خلاصہ تفسیر: (ان کفار کے مغلوب ومقتول ہونے کا ایک قابل ذکر سبب اور بھی تھا جو اس وقت واقع ہوا تھا) جبکہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں عار کو جگہ دی اور عار بھی جاہلیت کی (اس عار سے وہ ضد مراد ہے جو ''بسم اللہ'' اور لفظ ''رسول اللہ'' کے لکھنے پر انہوں نے مسلمانوں سے کی تھی، جیسا کہ سورت کے شروع میں چوتھے واقعہ میں اس کا ذکر آچکا ہے، یہاں اس عار کو جاہلیت سے مقید فرمایا ورنہ ہر حمیت اور عار بری نہیں) سو (اس ضد کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان جوش میں آکر لڑ پڑتے مگر) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اور مومنین کو اپنی طرف سے تحمل عطا فرمایا (جس کی وجہ سے انہوں نے اس کلمہ کے لکھنے پر اصرار چھوڑ دیا اور صلح ہوگئی) اور (اس وقت) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا (تقویٰ کی بات سے مراد کلمہ طیبہ یعنی توحید ورسالت کا اقرار ہے) اور وہ (مسلمان) اس (کلمہ تقویٰ) کے (دنیا میں بھی) زیادہ مستحق ہیں (کیونکہ ان کے دلوں میں حق کی طلب

ہے اور یہ طلب ہی ایمان تک پہنچاتی ہے) اور (آخرت میں بھی) اس (کے ثواب) کے اہل ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (اس لیے ان حکمتوں کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل پیدا کر دیا)۔

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى: کلمہ تقوی پر جمائے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ توحید ورسالت کے اعتقاد کا تقاضا اللہ اور رسول کی اطاعت ہے، اور مسلمانوں کا یہ صبر وضبط اپنے جذبات کے خلاف صرف اس وجہ سے تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ضبط وصبر کا حکم فرمایا تھا، ایسے سخت مرحلہ میں اپنے جذبات کے خلاف رسول کی اطاعت ہی کا نام کلمہ تقویٰ پر جمنا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ نادانی کی ضد یہ ہی کہ: ① امسال عمرہ نہ کرنے دیا اور یہ کہ ② جو مسلمان مکہ سے ہجرت کر جائے اسے پھر واپس بھیج دو ③ اگلے دو سال عمرہ کو آؤ تو تین دن سے زیادہ مکہ میں نہ ٹھہرو ④ اور ہتھیار رکھلے نہ لاؤ ⑤ صلح نامہ میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ لکھو ⑥ اور بجائے ''محمد رسول اللہ'' کے صرف ''محمد بن عبداللہ'' تحریر کرو، حضرت ﷺ نے یہ سب باتیں قبول کیں اور مسلمانوں نے سخت انقباض واضطراب کے باوجود پیغمبر کے ارشاد کے آگے سر تسلیم جھکا دیا اور بالآخر اسی فیصلہ پر ان کے قلوب مطمئن ہو گئے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ سے ڈر کر نافرمانی کی راہ سے بچے اور کعبہ کے ادب پر مضبوطی سے قائم رہے، اور کیوں نہ رہتے، وہ دنیا میں خدائے واحد کے سچے پرستار اور کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے زبردست حامل تھے، ایک پکا موحد اور پیغمبر کا مطیع و وفادار ہی اپنے جذبات و رجحانات کو عین جوش وخروش کے وقت اللہ کی خوشنودی اور اس کے شعائر کی تعظیم پر قربان کر سکتا ہے، حقیقی توحید یہ ہی ہے کہ آدمی اس اکیلے مالک کا حکم سن کر اپنی ذلت وعزت کے سب خیالات بالائے طاق رکھ دے، شاید اسی لیے حدیث میں **كلمة التقوىٰ** کی تفسیر ''لا الہ الا اللہ'' سے کی گئی ہے، کیونکہ تمام تر تقویٰ وطہارت کی بنیاد یہ ہی کلمہ ہے، جس کے اٹھانے اور حق ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اصحاب رسول ﷺ کو چن لیا تھا، اور بلاشبہ اللہ کے علم میں وہ ہی اس کے مستحق اور اہل تھے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ

اللہ نے سچ دکھلایا اپنے رسول کو خواب تحقیق کہ تم داخل ہو رہو گے مسجد حرام میں اگر اللہ نے چاہا آرام سے

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ

بال مونڈتے ہوئے اپنے سروں کے اور کترتے ہوئے بے کھٹکے ۱ پھر جانا وہ جو تم نہیں جانتے پھر مقرر کر دی اس سے ورے

فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾

ایک فتح نزدیک ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے جس واقعہ کا ذکر ہے اس سے قبل مدینہ میں آپ ﷺ نے ایک خواب دیکھا تھا جس کا ذکر سورت کے شروع میں پہلے واقعہ میں ہو چکا، جب حدیبیہ میں رک گئے تو بعض صحابہ نے اس خواب کی تعبیر پوری نہ ہونے پر آپ ﷺ سے سوال کیا اور آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں نے یہ نہیں کہا کہ اسی سال اس کی تعبیر پوری ہوگی، دوسری طرف کفار ومنافقین نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تمہارے رسول کا خواب صحیح نہ ہوا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس خواب کی تحقیق اور اس جواب کی تصدیق ارشاد ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا ہے جو (بالکل) مطابق واقعہ کے ہے تم لوگ مسجد حرام (یعنی مکہ) میں ان شاء اللہ ضرور جاؤ گے امن وامان کے ساتھ کہ تم میں کوئی سر منڈاتا ہوگا کوئی بال کترتا ہوگا (اس سے مراد عمرہ کرنا ہے کہ اس میں حلق وقصر ہوتا ہے، اور اول سے آخر

تک) تم کو کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا (مطلب یہ کہ خواب کی تعبیر ضرور واقع ہوگی ، چنانچہ آئندہ سال ایسا ہی ہوا، رہی یہ بات کہ جس سال خواب دیکھا تھا اسی سال تعبیر ہو جاتی) سو (بات یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کو وہ باتیں (اور حکمتیں) معلوم ہیں جو تم کو معلوم نہیں (چونکہ اس تاخیر میں حکمت تھی اس لیے مؤخر فرمادیا) پھر (اس تاخیر سے جو رنج ہوا تھا اس کی تلافی کے لیے) اس (خواب کی تعبیر واقع ہونے) سے پہلے تم کو ایک قریبی فتح (خیبر کی) دے دی (تاکہ اس سے مسلمانوں کو قوت اور سامان حاصل ہو جائے اور وہ پورے اطمینان کے ساتھ عمرہ ادا کریں جیسا کہ ایسا ہی واقع ہوا)۔

اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ: یہاں لفظ ''ان شاء اللہ'' تحقیق اور تاکید کے لیے ہے، تعلیق اور شرط کے لیے نہیں۔

فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ فَتۡحًا قَرِيۡبًا: یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خیبر کا فتح ہو جانا بھی اس تاخیر کی ایک حکمت ہے، کیونکہ اگر اسی سال عمرہ ہوتا تو لڑائی ضرور ہوتی، اور صلح نہ ہوتی، اور اس میں دوسری حکمتیں فوت ہونے کے علاوہ ایک حکمت یہ بھی فوت ہوتی کہ خیبر کی غنیمتیں ہاتھ نہ آتیں، کیونکہ اول تو مکہ والوں کی لڑائی سے تعب اور مشقت پہنچتی تو دو ہی مہینہ کے بعد دوسری معرکہ آرائی مشکل تھی، دوسرے خیبر کے سفر میں مکہ والوں کی طرف سے اندیشہ لگا رہتا کہ کہیں وہ مدینہ پر چڑھائی نہ کر دیں تو سفر کرنا دشوار ہوتا، پس خواب کی تعبیر میں تاخیر ہونے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اہل مکہ سے صلح ہو کر خیبر کی فتح جلد نصیب ہوگئی۔

* * *

فائدہ: ۱ ابتدائے سورت میں ذکر ہو چکا ہے کہ مدینہ میں حضور ﷺ نے خواب دیکھا تھا کہ ہم مکہ میں داخل ہوئے اور سر منڈا کر اور بال کترا کر حلال ہو رہے ہیں، ادھر اتفاق سے آپ کا قصد اسی سال عمرہ کا ہو گیا، صحابہ نے عموماً یہ خیال جمالیا کہ اسی سال ہم مکہ پہنچیں گے اور عمرہ ادا کریں گے، جس وقت صلح مکمل ہو کر حدیبیہ سے واپسی ہوئی اور بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ نے نہیں فرمایا تھا کہ ہم امن وامان سے مکہ میں داخل ہوں گے اور عمرہ کریں گے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ امسال ایسا ہوگا، عرض کیا نہیں، فرمایا تو بیشک یوں ہی ہو کر رہے گا تم امن وامان سے مکہ پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کرو گے، اور تم میں سے کوئی سر منڈوا کر، کوئی بال کترا کر احرام کھولے گا اور وہاں جانے کے بعد کسی طرح کا کھٹکا نہ ہوگا، چناچہ حدیبیہ سے اگلے سال یوں ہی ہوا آیہ ہذا میں اسی کو فرمایا ہے کہ بالتحقیق اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا۔

باقی: اِنۡ شَآءَ اللّٰه فرمانا ابن کثیرؒ کے نزدیک تحقیق وتوکید کے لیے ہے اور سیبویہ کے نزدیک اس قسم کے موافق میں قطعی طور پر ایک چیز کا بتلانا کسی مصلحت سے مقصود نہیں ہوتا اور کرنا منظور ہوتا ہے وہاں یہ عنوان اختیار کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی پھر اللہ نے اپنے علم محیط کے موافق واقعات کا سلسلہ قائم کیا وہ جانتا تھا کہ خواب کی تعبیر ایک سال بعد ظاہر کرنے میں کس قدر مصالح ہیں جن کی تمہیں خبر نہیں، اس لیے خواب کا وقوع امسال نہ ہونے دیا اور اس کے وقوع سے قبل تم کو لگتے ہاتھ ایک اور فتح عنایت کر دی، یعنی فتح خیبر یا صلح حدیبیہ جسے صحابہ ''فتح مبین'' کہتے تھے جیسا کہ سورۃ ہذا کے پہلے فائدہ میں ہم مفصل لکھ چکے ہیں۔

هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا ؕ ۲۸

وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول سیدھی راہ پر اور سچے دین پر ۱ تاکہ اوپر رکھے اس کو ہر دین سے ۲ اور کافی ہے اللہ حق ثابت کرنے والا ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے جو فتوحات اور مال غنیمت کے وعدے، بشارتیں اور فضائل حدیبیہ والوں کو خصوصاً اور صحابہ کو عموماً سنائے گئے ہیں اب آگے خاتمہ میں ان مضامین کی تاکید اور خلاصہ ہے، اور وعدوں کا عام ہونا اس سے ظاہر ہے کہ پیچھے: **وعدکم اللہ مغانم کثیرۃ** میں جن غنیمتوں کا وعدہ کیا اسی طرح: **واخری لم تقدروا علیھا** میں جو فتح مکہ کا وعدہ کیا ہے ان میں حدیبیہ والوں کے سوا اور صحابہ بھی شریک تھے، اسی طرح آگے آیت: **والذین معہ اشداء** عام عنوان ہے جو سب صحابہ پر صادق آتا ہے، اور چونکہ یہ سب نعمتیں اور بشارتیں حضور ﷺ کی اطاعت اور تصدیق کی بدولت عطا ہوئی ہیں اس لیے اس پر ثابت قدم رہنے کی مزید تاکید کے لیے نیز صلح کے وقت لفظ ''رسول اللہ'' لکھنے پر کفار کی ضد سے

رسالت کا انکار معلوم ہوتا ہے اس کو رد کرنے کے لیے رسالت محمدیہ کی حقانیت صاف طور پر بیان کرتے ہیں۔

وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (اسلام) دے کر بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو تمام دینوں پر غالب کردے، اور (حمیت جاہلیت والے لوگ اگر آپ کے نام کے ساتھ ''رسول'' کا لفظ لکھنے سے گریز کرتے ہیں تو آپ مغموم نہ ہوں، کیونکہ آپ کی رسالت پر) اللہ کافی گواہ ہے (جس نے آپ کی رسالت کو واضح دلائل اور کھلے ہوئے معجزات سے ثابت کردکھایا)۔

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ: یہ غلبہ حجت و دلیل کے اعتبار سے تو دائمی اور ہمیشہ ہی رہے گا اور شوکت وسلطنت کے اعتبار سے بھی غلبہ رہے گا مگر ایک شرط کے ساتھ وہ یہ کہ اہل دین یعنی مسلمان باصلاحیت ہوں، جب یہ شرط نہیں ہوگی تو غلبہ ظاہری کا وعدہ نہیں، اور چونکہ صحابہ کرام میں یہ شرط موجود تھی جیسا کہ اگلی آیت جو صحابہ کے متعلق آرہی ہیں ان میں اس صلاحیت کا ذکر ہے اس لئے یہاں اس آیت میں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی بشارت ہے ایسا ہی صحابہ کرام کے لئے فتوحات کی بشارت ہے جیسا کہ مشاہدہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات پر پچیس سال گزرنے نہ پائے تھے کہ اسلام اور قرآن دنیا کے گوشہ گوشہ میں فاتحانہ طور پر پہنچ گیا۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا: اللہ کافی گواہ ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ دلائل کی ضرورت نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کا انکار نقصان دہ نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی گواہی یہی ہے کہ اس نے آپ ﷺ کی رسالت پر دیگر معجزات اور اعجاز قرآن سے دلائل قائم فرمائے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اصول وفروع اور عقائد واحکام کے اعتبار سے یہ ہی دین سچا اور یہ ہی راہ سیدھی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔

فائدہ: ۲؎ اس دین کو اللہ نے ظاہر میں بھی سینکڑوں برس تک سب مذاہب پر غالب کیا اور مسلمانوں نے تمام مذاہب والوں پر صدیوں تک بڑی شان وشوکت سے حکومت کی، اور آئندہ بھی دنیا کے خاتمہ کے قریب ایک وقت آنے والا ہے جب ہر چہار طرف دین برحق کی حکومت ہوگی، باقی حجت ودلیل کے اعتبار سے تو دین اسلام ہمیشہ ہی غالب رہا اور رہے گا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اللہ اس دین کی حقانیت کا گواہ ہے اور وہ ہی اپنے فعل سے اس کو حق ثابت کرنے والا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا

محمد رسول اللہ کا اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں زور آور ہیں کافروں پر ۱؎ نرم دل ہیں آپس میں ۲؎ تو دیکھے ان کو رکوع میں اور سجدہ میں

يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ

ڈھونڈھتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی ۳؎ نشانی ان کی ان کے منہ پر ہے سجدہ کے اثر سے ۴؎ یہ شان ہے ان کی

فِي التَّوْرٰىةِ ۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى

تورات میں اور مثال ان کی انجیل میں ۵؎ جیسے کھیتی نے نکالا اپنا پٹھا پھر اس کی کمر مضبوط کی پھر موٹا ہوا، پھر کھڑا ہوگیا

عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اپنی نال پر ۶؎ خوش لگتا ہے کھیتی والوں کو ۷؎ تاکہ جلائے ان سے جی کافروں کا ۸؎ وعدہ کیا ہے اللہ نے ان سے جو یقین لائے ہیں اور کیے ہیں کام

ع ۱۲ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

بھلے معافی کا اور بڑے ثواب کا ۹؎

خلاصہ تفسیر: (پس تمام دلائل ومعجزات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ) محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں (اس جگہ ''محمد رسول اللہ'' کا پورا جملہ لانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ حمیت جاہلیت والوں نے ان کے نام کے ساتھ ''رسول اللہ'' لکھنا گوارا نہ کیا تو کیا پروا ہے، اللہ نے یہ کلمہ آپ کے نام کے ساتھ لکھ دیا جو قیامت تک پڑھا جائے گا، آگے آپ کی متبعین صحابہ کے فضائل وبشارات مذکور ہیں کہ) اور جو لوگ آپ کی صحبت پائے ہوئے ہیں (یہ لفظ تمام صحابہ کرام کو شامل ہے خواہ ان کی صحبت طویل میسر ہو یا قلیل اور خصوصاً جو صحابہ حدیبیہ میں آپ کے ساتھ تھے وہ اصلاً اس کے مصداق ہیں، حاصل یہ ہے کہ سب صحابہ کرام ان صفات کمال کے ساتھ موصوف ہیں کہ) وہ کافروں کے مقابلہ میں تیز ہیں (اور) آپس میں (یعنی مسلمانوں کے ساتھ) مہربان ہیں (اور) اے مخاطب! تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں کبھی سجدہ کر رہے ہیں (اور) اللہ تعالیٰ کے فضل (یعنی ثواب) اور رضامندی (یعنی قرب) کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں، ان (کی بندگی اور عبدیت) کے آثار (ان کے) سجدہ کی تاثیر سے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں (مراد ان آثار سے خشوع وخضوع کے انوار ہیں جو مومن متقی کے چہرہ میں عموماً مشاہدہ کیے جاتے ہیں) یہ ان کے اوصاف (جو بیان ہوئے) توراۃ میں (موجود) ہیں، اور انجیل میں ان کا یہ وصف (مذکور) ہے کہ جیسے کھیتی کہ اس نے (اول زمین سے) اپنی سوئی نکالی پھر اس نے (مٹی، پانی، ہوا وغیرہ سے غذا پا کر اپنی) اس (سوئی) کو قوی کیا (یعنی وہ کھیتی قوی ہوگئی) پھر وہ کھیتی اور موٹی ہوئی پھر اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوگئی کہ (اپنے ہرے بھرے ہونے سے) کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی (اسی طرح صحابہ میں اول ضعف تھا پھر روزانہ قوت بڑھتی گئی، اس میں بھی فتوحات اسلامیہ کی بشارت ہے، اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو یہ نشو ونما اس لئے دیا) تا کہ ان (کی اس حالت) سے کافروں کو (حسد میں) جلائے (اور آخرت میں) اللہ نے ان صاحبوں سے جو کہ ایمان لائے ہیں اور نیک کام کر رہے ہیں (گناہوں کی) مغفرت اور (طاعات پر) اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ: صحابہ کرام کے کفار کے مقابلہ پر سخت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کبھی کسی کافر پر رحم نہیں کرتے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر اللہ ورسول کا حکم کفار پر سختی کرنے کا ہوتا ہے وہاں ان کو اپنے رشتے ناتے یا دوستی وغیرہ کے علاقے اس کام میں مانع نہیں اور جہاں تک ان کے ساتھ رحم وکرم کے معاملہ کا تعلق ہے وہ تو خود قرآن نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے کہ: لاینھکم اللہ (الیٰ) ان تبروھم وتقسطوا الیھم، یعنی جو کفار مسلمانوں کے درپے آزار اور مقاتلہ پر نہیں ان کے ساتھ احسان کا سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ منع نہیں کرتا، چنانچہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے بے شمار واقعات ہیں جن میں ضعیف ومجبور یا ضرورت مند کفار کے ساتھ احسان وکرم کے معاملات کئے گئے ہیں اور ان کے معاملہ میں عدل وانصاف کو برقرار رکھنا تو اسلام کا عام حکم ہے، عین میدان کارزار میں بھی عدل وانصاف کے خلاف کوئی کارروائی جائز نہیں۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ: کامل مؤمن صفات جلال وصفات جمال کا جامع ہوا کرتا ہے۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ: صحابہ کرام کی جو علامت یہاں بیان فرمائی ہے کہ سجدوں اور نمازوں کا نور ان کی پیشانیوں کی علامت ہے اس آیت میں فرمایا کہ ان کی یہی مثال توراۃ میں بیان کی گئی ہے، پھر فرمایا کہ انجیل میں ان کی ایک اور مثال یہ دی گئی ہے کہ وہ ایسے ہیں جیسے کوئی کاشتکار زمین میں بیج اگائے تو اول وہ ایک ضعیف سی سوئی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے پھر اس میں شاخیں نکلتی ہیں پھر وہ اور قوی ہوتا ہے پھر اس کا مضبوط تنہ بن جاتا ہے، اس آیت میں تین احتمال ہیں:

① ایک یہ کہ فِي التَّوْرٰىةِ پر وقف کیا جائے اور پچھلی مثال یعنی چہروں کا نور تو یہ علامت توراۃ کے حوالہ سے بیان ہوئی، آگے **وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ** پر وقف نہ کریں بلکہ ملا کر پڑھیں تو معنی یہ ہوں گے کہ صحابہ کی مثال انجیل میں اس کھیتی یا درخت کی ہے جو شروع میں نہایت کمزور ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ قوی تناور ہو جاتا ہے۔

② دوسرا احتمال یہ ہے کہ فِي التَّوْرٰىةِ پر وقف نہ ہو بلکہ فِي الْاِنْجِيْلِ پر وقف کیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ سابقہ نشانی چہروں کے نور کی توراۃ میں بھی ہے انجیل میں بھی، اور پھر آگے کزرع اخرج کی مثال کو ایک الگ مثال قرار دیا جائے۔

③ تیسرا احتمال یہ ہے کہ فِي التَّوْرٰىةِ پر کلام ختم ہو نہ فِي الْاِنْجِيْلِ پر اور لفظ ذٰلِكَ اگلی مثال کی طرف اشارہ ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ تورات و انجیل دونوں میں صحابہ کی مثال زرع یعنی کھیتی کی دی گئی ہے۔

اگر اس زمانہ میں تورات وانجیل اپنی اصلی حالت میں ہوتیں تو ان کو دیکھ کر مراد قرآنی متعین ہو جاتی، لیکن ان میں تحریفات کا سلسلہ بے حد و بے شمار رہا ہے، اس لئے کوئی یقینی فیصلہ نہیں ہو سکتا، مگر اکثر حضرات مفسرین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے جس میں پہلی مثال تورات میں اور دوسری انجیل میں ہونا معلوم ہے، امام بغوی نے فرمایا کہ صحابہ کرام کی یہ مثال انجیل میں ہے کہ شروع میں قلیل ہوں گے پھر بڑھیں گے اور قوی ہوں گے جیسا کہ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ صحابہ کرام کی یہ مثال انجیل میں لکھی ہوئی ہے کہ "ایک قوم ایسی نکلے گی جو کھیتی کی طرح بڑھے گی اور وہ نیک کاموں کا حکم اور برے کاموں سے منع کیا کرے گی"، موجودہ زمانہ کی تورات وانجیل میں بھی بے شمار تحریفات کے باوجود اس کی پیشین گوئی کے حسب ذیل الفاظ موجود ہیں، تورات باب استثناء 123-1 تا 3 کے یہ الفاظ ہیں: "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا، وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں تیری بات مانیں گے"۔

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ فتح مکہ کے وقت صحابہ کرام کی تعداد دس ہزار تھی جو فاران سے طلوع ہونے والے اس نورانی پیکر کے ساتھ شہر خلیل میں داخل ہوئے تھے، اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی کے لفظ سے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، وہ اپنے لوگوں سے محبت کرے گا کے لفظ سے رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا مضمون سمجھا جاتا ہے، اس کی پوری تفصیل مع دوسرے حوالوں کے اظہار الحق جلد سوم باب ششم ص 256 میں ہے ، یہ کتاب عیسائیت کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے پادری فنڈر کے مقابلہ پر تحریر فرمائی تھی، اس کتاب میں انجیل کی تمثیل کا اس طرح ذکر ہے، انجیل متی باب 13 آیت 31 میں یہ الفاظ ہیں: "اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانہ کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں"، اور انجیل مرقس 4:26 کے یہ الفاظ ہیں جو الفاظ قرآنی کے زیادہ قریب ہیں: "اس نے کہا کہ خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے، پہلے پتی پھر بالیں پھر بالوں میں تیار دانے پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا" (اظہار الحق جلد 3) باب ششم ص 310 آسمان کی بادشاہی سے مراد نبی آخر الزماں کا ہونا انجیل کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا: یہاں منهم کا حرف "من" اس جگہ باتفاق مفسرین بیانیہ ہے، اور معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جو ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ سب صحابہ کرام ایمان اور عمل صالح کے جامع ہیں، دوسرے یہ کہ ان سب سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ ہے اور یہ "من بیانیہ" قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے، جیسے ارشاد ہے :فاجتنبوا الرجس من الاوثان تو من الاوثان، اس میں "من" بیان ہے لفظ الرجس کا، اسی طرح یہاں منهم بیان ہے الذین امنوا کا ، اور روافض نے جو اس جگہ حرف "من" کو تبعیض کے لئے یہ کہہ کر مطلب نکالا ہے کہ ان میں سے جو بعض لوگ ایمان و عمل صالح پر ہیں ان سے یہ وعدہ ہے یہ سراسر سیاق کلام اور اوپر کی آیات کے منافی ہے، کیونکہ اس آیت کے مفہوم میں وہ صحابہ کرام تو بلاشبہ داخل اور آیت کے پہلے مصداق ہیں جو سفر حدیبیہ اور بیعت رضوان میں شریک تھے ان سب کے متعلق اوپر کی آیات میں حق تعالیٰ نے اپنی رضا اور خوشنودی کا اعلان فرما دیا ہے: لقد رضی الله عن المومنین اذ یبایعونك تحت الشجرة اور رضائے الٰہی کا یہ اعلان اس کی ضمانت ہے کہ یہ سب مرتے دم تک ایمان و عمل صالح پر قائم رہیں گے، کیونکہ اللہ تو علیم وخبیر ہے، اگر کسی کے متعلق اس کو یہ معلوم ہو کہ یہ کسی وقت ایمان سے پھر جانے والا ہے تو اس سے اپنی رضا کا اعلان نہیں فرما سکتے، ابن عبدالبر نے مقدمہ استیعاب میں اسی آیت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ: "ومن رضی الله عنه لم یسخط علیه ابدا" یعنی اللہ جس سے راضی

ہو جائے پھر اس پر کبھی ناراض نہیں ہوتا اور رسول اللہ ﷺ نے اسی آیت کی بنا پر ارشاد فرمایا کہ بیعت رضوان میں شریک ہونے والوں میں سے کوئی آگ میں نہ جائے گا، تو یہ وعدہ اصالۃً انہی کے لئے کیا گیا ہے ان میں سے بعض کا مستثنیٰ ہونا قطعاً باطل ہے اسی لئے امت کا اس پر اجماع ہے کہ صحابہ کرام سب کے سب عادل وثقہ ہیں۔

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اس کی تصریحات ہیں جن میں چند آیات تو اسی سورت میں آ چکی ہیں: لقد رضی اللہ عن المومنین اور الزمهم كلمته التقوى و كانوا احق بها واهلها، ان کے علاوہ اور بہت سی آیات میں یہ مضمون مذکور ہے: یوم لا یخزی اللہ النبی والذین امنوا معه اور والسبقون الاولون من المهجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضی اللہ عنهم و رضوا عنه اور سورۃ حدید میں حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا ہے: وکلا وعد اللہ الحسنیٰ یعنی ان سب سے اللہ نے حسنیٰ کا وعدہ کیا ہے، پھر سورۃ انبیاء میں حسنیٰ کے متعلق فرمایا: ان الذین سبقت لهم منا الحسنی اولئك عنها مبعدون یعنی جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ کا فیصلہ پہلے ہو چکا ہے وہ جہنم کی آگ سے دور رکھے جائیں گے

* * *

فائدہ: ۱ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ: یعنی کافروں کے مقابلہ میں سخت مضبوط اور قوی، جس سے کافروں پر رعب پڑتا اور کفر سے نفرت و بیزاری کا اظہار ہوتا ہے، قال تعالیٰ: وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (التوبہ: ۱۲۳) وقال تعالیٰ: وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (التوبہ: ۷۳) وقال تعالیٰ: اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (المائدہ: ۵۴)

حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''جو تندی اور نرمی اپنی خو ہو وہ سب جگہ برابر چلے اور جو ایمان سے سنور کر آئے وہ تندی اپنی جگہ اور نرمی اپنی جگہ''، علماء نے لکھا ہے کہ کسی کافر کے ساتھ احسان اور حسن سلوک سے پیش آنا اگر مصلحت شرعی ہو کچھ مضائقہ نہیں، مگر دین کے معاملہ میں وہ تم کو ڈھیلا نہ سمجھے۔

فائدہ: ۲ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ: یعنی اپنے بھائیوں کے ہمدرد مہربان، ایک کے سامنے نرمی سے جھکنے والے اور تواضع و انکساری سے پیش آنے والے حدیبیہ میں صحابہ کی یہ دونوں شانیں چمک رہی تھیں: وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح: ۲۹)

فائدہ: ۳ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا: یعنی نمازیں کثرت سے پڑھتے ہیں، جب دیکھو رکوع وسجود میں پڑے ہوئے اللہ کے سامنے نہایت اخلاص کے ساتھ وظیفۂ عبودیت ادا کر رہے ہیں، ریاء ونمود کا شائبہ نہیں، بس اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش ہے۔

فائدہ: ۴ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ: یعنی نمازوں کی پابندی خصوصاً تہجد کی نماز سے ان کے چہروں پر خاص قسم کا نور اور رونق ہے، گویا خشیت وخشوع اور حسن نیت واخلاص کی شعاعیں باطن سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر کو روشن کر رہی ہیں، حضرت ﷺ کے اصحاب اپنے چہروں کے نور اور متقیانہ چال ڈھال سے لوگوں میں الگ پہچانے جاتے تھے۔

فائدہ: ۵ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ: یعنی پہلی کتابوں میں خاتم الانبیاء ﷺ کے ساتھیوں کی ایسی ہی شان بیان کی گئی تھی، چنانچہ بہت سے غیر متعصب اہل کتاب ان کے چہرے اور طور وطریق دیکھ کر بول اٹھتے تھے کہ واللہ یہ تو مسیح علیہ السلام کے حواری معلوم ہوتے ہیں۔

فائدہ: ۶ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ: حضرت شاہ صاحب ؒ کھیتی کی مثال کی تقریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''یعنی اول اس دین پر ایک آدمی تھا، پھر دو ہوئے پھر آہستہ آہستہ قوت بڑھتی گئی، حضرت ﷺ کے وقت میں پھر خلفاء کے عہد میں''۔

بعض کہتے ہیں کہ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ میں عہد صدیقی فَاٰزَرَهٗ میں عہد فاروقی فَاسْتَغْلَظَ میں عہد عثمانی اور فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ میں عہد مرتضوی کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ بعض دوسرے بزرگوں نے: وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا کو علی الترتیب خلفائے اربعہ پر تقسیم کر دیا ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت تمام جماعت صحابہؓ کی بحیثیت مجموعی مدح ومنقبت پر مشتمل ہے خصوصاً اصحاب بیعت الرضوان کی جن کا ذکر آغاز سورت سے برابر چلا آ رہا ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۷ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ: کھیتی کرنے والے چونکہ اس کام کے مبصر [دیکھنے والے] ہوتے ہیں اس لیے انکا ذکر خصوصیت سے کیا، جس ایک چیز کا مبصر اس کو پسند کرے دوسرے کیوں نہ کریں گے۔

فائدہ: ۸ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ: یعنی اسلام کھیتی کی یہ تازگی اور رونق و بہار دیکھ کر کافروں کے دل غیظ و حسد سے جلتے ہیں، اس آیت سے بعض علماء نے یہ نکالا کہ صحابہ سے جلنے والا کافر ہے۔

فائدہ: ۹ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ وعدہ دیا ان کو جو ایمان والے ہیں اور بھلے کام کرتے ہیں، حضرت ﷺ کے سب اصحاب ایسے ہی تھے، مگر خاتمہ کا اندیشہ رکھا حق تعالیٰ بندوں کو ایسی صاف خوشخبری نہیں دیتا کہ نڈر ہو جائیں، اس مالک سے اتنی شاباش بھی غنیمت ہے''۔

رکوعاتها ۲ | ۴۹ سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۶ | ایاتها ۱۸

خلاصہ تفسیر: اس سے پہلی دو سورتوں میں جہاد کے احکام تھے جس سے اصلاح عالم وآفاق مقصود ہے، اس سورت میں ارشاد وہدایت سے اصلاح نفس کے احکام وآداب مذکور ہیں، خصوصاً وہ احکام جو آداب معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں، اور سورت کے مجموعہ میں سید المرسلین ﷺ اور عام مؤمنین کے حقوق کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

اے ایمان والو آگے نہ بڑھو اللہ سے اور اس کے رسول سے ۱ـ اور ڈرتے رہو اللہ سے، اللہ سنتا ہے جانتا ہے ۲ـ

خلاصہ تفسیر: واقعہ ان آیتوں کے نزول کا یہ ہے کہ ایک بار بنی تمیم کے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ میں آپ ﷺ کے سامنے باہم اس بات میں گفتگو ہوگئی کہ ان لوگوں پر حاکم کس کو بنایا جائے؟ حضرت ابوبکر نے قعقاع بن معبد کی نسبت رائے دی، اور حضرت عمر نے اقرع بن حابس کی نسبت رائے دی اور گفتگو بڑھ کر دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں اس پر یہ حکم نازل ہوا۔

اے ایمان والو! اللہ اور رسول (ﷺ کی اجازت) سے پہلے تم (کسی قول یا فعل میں) سبقت نہ کیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ (تمہارے سب اقوال کو) سننے والا (اور تمہارے افعال کو) جاننے والا ہے۔

لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: حاصل یہ ہے کہ جب تک قوی قرائن سے یا صراحۃً گفتگو کی اجازت نہ ہو گفتگو مت کرو جیسا کہ اس مذکورہ واقعہ میں انتظار کرنا چاہئے تھا کہ یا تو آپ ﷺ خود کچھ فرماتے، یا آپ حاضرین مجلس سے پوچھتے، بغیر انتظار کے از خود گفتگو شروع کر دینا درست نہیں تھا، کیونکہ گفتگو کا جواز اجازت پر موقوف تھا، چونکہ بغیر انتظار کے سبقت کرنے میں احتمال تھا کہ شاید یہ جلدی آپ کی مرضی کے خلاف ہو تو جائز نہ ہوگا۔

بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: بین الیدین کے اصل معنی دو ہاتھوں کے درمیان کے ہیں، مراد اس سے سامنے کی جہت ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کے سامنے تقدم اور پیش قدمی نہ کرو، کس چیز میں پیش قدمی کو منع فرمایا ہے، قرآن کریم نے اسکو ذکر نہیں کیا جس میں اشارہ عموم کی طرف ہے کہ کسی قول یا فعل میں آنحضرت ﷺ سے پیش قدمی نہ کرو، بلکہ انتظار کرو کہ رسول اللہ ﷺ کیا جواب دیتے ہیں، ہاں آپ ہی کسی کو جواب کے لئے مامور فرما دیں تو وہ جواب دے سکتا ہے، اسی طرح اگر آپ چل رہے ہیں تو کوئی آپ سے آگے نہ بڑھے، کھانے کی مجلس ہے تو آپ سے پہلے کھانا شروع نہ کرے، مگر یہ کہ

آپ کی تصریح یا قوی قرائن سے یہ ثابت ہو جائے کہ آپ خود ہی کسی کو آگے بھیجنا چاہتے ہیں جیسے سفر اور جنگ میں کچھ لوگوں کو آگے چلنے پر مامور کیا جاتا تھا۔

اس آیت میں احکام الٰہی اور احترام رسول کا ادب سکھایا گیا ہے، یعنی شریعت کے مطابق اپنے کو تابع بنایا جائے اور اپنی طبیعت کے تقاضوں کو نبی کی موجودگی میں مغلوب رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، بعض علماء نے فرمایا ہے کہ علماء کرام و مشائخ دین کا بھی یہی حکم ہے، کیونکہ وہ وارث انبیاء ہیں، اس لئے علماء نے فرمایا کہ اپنے استاذ اور مرشد کے ساتھ بھی یہی ادب ملحوظ رکھنا چاہئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس معاملہ میں اللہ و رسول کی طرف سے حکم ملنے کی توقع ہو، اس کا فیصلہ پہلے ہی آگے بڑھ کر اپنی رائے سے نہ کر بیٹھو بلکہ حکم الٰہی کا انتظار کرو، جس وقت پیغمبر (علیہ السلام) کچھ ارشاد فرمائیں، خاموشی سے کان لگا کر سنو، ان کے بولنے سے پہلے خود بولنے کی جرأت نہ کرو، جو حکم ادھر سے ملے اس پر بے چون و چرا اور بلا پس و پیش عامل بن جاؤ، اپنی اغراض اور اہواء و آراء کو ان کے احکام پر مقدم نہ رکھو، بلکہ اپنی خواہشات و جذبات کو احکام سماوی کے تابع بناؤ۔

تنبیہ: اس سورت میں مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کے آداب و حقوق اور اپنے بھائی مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم رکھنے کے طریقے سکھلائے ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کا جماعتی نظام کن اصول پر کاربند ہونے سے مضبوط و مستحکم رہ سکتا ہے اور اگر کبھی اس میں خرابی اور اختلال پیدا ہو تو اس کا علاج کیا ہے، تجربہ شاہد ہے کہ بیشتر نزاعات و مناقشات خود رائی اور غرضوں کو کسی ایک بلند معیار کے تابع کر دیں، ظاہر ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کے ارشادات سے بلند کوئی معیار نہیں ہو سکتا، ایسا کرنے میں خواہ وقتی اور عارضی طور پر کتنی ہی تکلیف اٹھانا پڑے لیکن اس کا آخری انجام یقینی طور پر دارین کی سرخروئی اور کامیابی ہے۔

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ و رسول کی سچی فرمانبرداری اور تعظیم اسی وقت میسر ہو سکتی ہے جب خدا کا خوف دل میں ہو، اگر دل میں ڈر نہیں، تو بظاہر دعوائے اسلام کو نباہنے کے لیے اللہ و رسول کا نام بار بار زبان پر لائے گا اور بظاہر ان کے احکام کو آگے رکھے گا لیکن فی الحقیقت ان کو اپنی اندرونی خواہشات و اغراض کی تحصیل کے لیے ایک حیلہ اور آلہ کار بنائے گا، سو یاد رہے کہ جو زبان پر ہے اللہ اسے سنتا اور جو دل میں ہے اسے جانتا ہے، پھر اس کے سامنے یہ فریب کیسے چلے گا چاہیے کہ آدمی اس سے ڈر کر کام کرے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ

اے ایمان والو! بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اوپر اور اس سے نہ بولو تڑخ کر

كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲

جیسے تڑختے ہو ایک دوسرے پر کہیں اکارت نہ ہو جائیں تمہارے کام اور تم کو خبر بھی نہ ہو

خلاصہ تفسیر: (اور) اے ایمان والو! تم اپنی آوازیں پیغمبر (ﷺ) کی آواز سے بلند مت کیا کرو اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں کھل کر ایک دوسرے سے بولا کرتے ہو (یعنی جب آپ ﷺ کے سامنے آپس میں کوئی بات کرنا ہو تو بلند آواز سے نہ بولو، اور جب خود آپ ﷺ سے خطاب کرنا ہو تو برابر کی آواز سے نہ بولو) کبھی تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ: مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات آواز کا بلند کرنا جو کہ بظاہر بے باکی اور بے پروائی ہے اور بلند آواز سے اس طرح باتیں کرنا جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف باتیں کرتے ہیں یہ ایک قسم کی گستاخی ہے آپ ﷺ کی ناگواری اور کلفت کا سبب ہو سکتا ہے، کیونکہ تم تابع ہو اور حضور ﷺ متبوع اور مخدوم ہیں، اور تابع کو ادب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اور اس میں ادب کا التزام نہیں رہتا، اپنے متبوع اور مخدوم سے اس طرح کی گفتگو ناگوار اور تکلیف دہ ہو سکتی ہے اور اللہ کے رسول کو ایذا پہنچانے نے تمام اعمال برباد ہو جاتے ہیں اگرچہ دوسرے گناہوں

سے برباد نہیں ہوتے، لیکن رسول کی شان بہت بڑی ہے، ان کو تکلیف پہنچانے کا اثر یہی ہے۔

اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ: البتہ بعض اوقات جبکہ طبیعت میں زیادہ انبساط ہو یہ امور ناگوار نہیں ہوتے، اس وقت عدم ایذا رسول کی وجہ سے یہ گفتگو اعمال کے برباد ہونے کا سبب نہیں ہوگی، لیکن متکلم کو یہ معلوم کرنا کہ اس وقت ہماری ایسی گفتگو ناگوار خاطر اور موجب ایذا نہیں ہوگی آسان نہیں، ہوسکتا ہے کہ متکلم تو یہ سمجھ کر کلام کرے کہ اس سے آنحضرت ﷺ کو ایذا نہیں ہوگی مگر واقع میں اس سے ایذا پہنچ جائے تو گفتگو اس کے اعمال کو حبط اور برباد کردے گی اگرچہ اس کو گمان بھی نہ ہوگا کہ میری اس گفتگو سے مجھے کتنا بڑا خسارہ ہوگیا، لا یشعرون کے یہی معنی ہیں، اسی وجہ سے مطلقاً آواز بلند کرنے اور کھل کر بولنے کو منع فرمادیا، کیونکہ ایسی گفتگو کے بعض افراد اگرچہ کلفت اور اعمال کے برباد ہونے کا سبب نہیں ہوں گے مگر اس کی تعیین کیسے ہوگی اس لئے مطلقاً جہر بالقول کے تمام افراد کو ترک کردینا چاہئے۔

اس جگہ کلیات شرعیہ اور اصول مسلمہ کے اعتبار سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں: ① ایک یہ کہ حبط اعمال یعنی اعمال صالحہ کو ضائع کردینے والی چیز تو باتفاق اہل سنت والجماعت صرف کفر ہے، کسی ایک معصیت اور گناہ سے دوسرے اعمال صالحہ ضائع نہیں ہوتے اور یہاں خطاب مومنین اور صحابہ کرام کو ہے اور لفظ یا ایھا الذین امنوا کے ساتھ ہے جس سے اس فعل کا کفر نہ ہونا ثابت ہوتا ہے تو حبط اعمال کیسے ہوا؟ ② دوسرے یہ کہ جس طرح ایمان ایک فعل اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے اختیار سے ایمان نہ لائے مومن نہیں ہوتا اسی طرح کفر بھی امر اختیاری ہے جب تک کوئی شخص اپنے قصد سے کفر کو اختیار نہ کرے وہ کافر نہیں ہوسکتا اور یہاں آیت کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ **وانتم لا تشعرون** یعنی تمہیں خبر بھی نہ ہو تو حبط اعمال جو خالص کفر کی سزا ہے وہ کیسے جاری ہوئی؟۔

چنانچہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مسلمانو! تم رسول اللہ ﷺ کی آواز سے اپنی آواز بلند کرنے اور بے محابا جہر کرنے سے بچو، کیونکہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال حبط اور ضائع ہوجائیں اور وہ خطرہ اس لئے ہے کہ رسول سے پیش قدمی یا ان کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کرکے غالب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسول کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونے کا بھی احتمال ہے جو سبب ہے ایذائے رسول کا اگرچہ صحابہ کرام سے یہ وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپ کی ایذا کا سبب بنے، لیکن بعض اعمال وافعال جیسے تقدم اور رفع صوت اگرچہ بقصد ایذا نہ ہوں پھر بھی ان سے ایذا کا احتمال ہے، اسی لئے ان کو مطلقاً ممنوع اور معصیت قرار دیا ہے اور بعض معصیتوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے کرنے والے سے توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہوجاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہوکر انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے جو سبب ہے حبط اعمال کا، کسی اپنے دینی مقتداء استاد یا مرشد کی ایذا رسانی ایسی ہی معصیت ہے جس سے سلب توفیق کا خطرہ ہوتا ہے، اس طرح یہ افعال یعنی تقدم علی النبی اور رفع الصوت ایسی معصیت ٹھہریں کہ جن سے خطرہ ہے کہ توفیق سلب ہوجائے اور یہ خذلان آخر کار کفر تک پہنچادے جس سے تمام اعمال صالحہ ضائع ہوجاتے ہیں اور کرنے والے نے چونکہ قصد ایذا کا نہ کیا تھا اس لئے اس کو اس کی خبر بھی نہ ہوگی کہ اس ابتلاء کفر اور حبط اعمال کا اصل سبب کیا تھا، اس تقریر سے معتزلہ اور خوارج کو اپنے مذہب پر استدلال کرنے کی گنجائش نہ رہی اور اہل حق کی طرف سے بہ تکلف جواب دینے کی حاجت بھی نہیں۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اگر کسی صالح بزرگ کو کسی نے اپنا مرشد بنایا ہو اس کے ساتھ گستاخی وبے ادبی کا بھی یہی حال ہے کہ بعض اوقات وہ سلب توفیق اور خذلان کا سبب بن جاتی ہے جو انجام کار متاع ایمان کو بھی ضائع کردیتی ہے، نعوذ باللہ منہ۔

* * *

فائدہ: یعنی حضور ﷺ کی مجلس میں شور نہ کرو اور جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف چہک کر یا تڑخ کر بات کرتے ہو، حضور ﷺ کے ساتھ یہ طریقہ اختیار کرنا خلاف ادب ہے، آپ سے خطاب کرو تو نرم آواز سے تعظیم واحترام کے لہجہ میں ادب وشائستگی کے ساتھ، دیکھو ایک مہذب بیٹا اپنے باپ سے، لائق شاگرد استاد سے، مخلص مرید پیر ومرشد سے، اور ایک سپاہی اپنے افسر سے کس طرح بات کرتا ہے، پیغمبر کا مرتبہ تو ان سب سے کہیں بڑھ کر ہے، آپ ﷺ سے گفتگو کرتے وقت پوری احتیاط رکھنی چاہیے، مبادا بے ادبی ہوجائے اور آپ کو تکدر پیش آئے تو حضور ﷺ کی

ناخوشی کے بعد مسلمان کا ٹھکانا کہاں ہے، ایسی صورت میں تمام اعمال ضائع ہونے اور ساری محنت اکارت جانے کا اندیشہ ہے۔

تنبیہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سننے اور پڑھنے کے وقت بھی یہ ہی ادب چاہیے اور جو قبر شریف کے پاس حاضر ہو وہاں بھی ان آداب کو ملحوظ رکھے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء علمائے ربانیین اور اولوالامر کے ساتھ درجہ بدرجہ اسی ادب سے پیش آنا چاہیے تاکہ جماعتی نظام قائم رہے، فرق مراتب نہ کرنے سے بہت مفاسد اور فتنوں کا دروازہ کھلتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ

جو لوگ دبی آواز سے بولتے ہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس وہی ہیں جن کے دلوں کو جانچ لیا ہے اللہ نے

لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٣﴾

ادب کے واسطے [1] ان کے لیے معافی ہے اور ثواب بڑا [2]

خلاصہ تفسیر: یہاں تک تو آواز بلند کرنے سے ڈرایا گیا ہے، اب آگے آواز پست کرنے کی ترغیب ہے:

بیشک جو لوگ اپنی آوازوں کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پست رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خالص کر دیا ہے (یعنی ان کے دلوں میں تقویٰ کے خلاف کوئی چیز آتی ہی نہیں، آگے ان کے عمل کے اخروی فائدہ کا بیان ہے) ان لوگوں کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ حضرات کمال تقویٰ کے ساتھ متصف ہیں کیونکہ ترمذی کی حدیث مرفوع میں کمال تقویٰ کا بیان ان الفاظ میں آیا ہے: " لا يبلغ العبد ان يكون من المتقين حتى يدع ما لا بأس به حذراً لما به بأس"، یعنی بندہ کمال تقویٰ کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ کچھ ایسی چیزوں کو بھی جن میں کوئی گناہ نہیں اس احتیاط کی بناء پر چھوڑ دے کہ یہ جائز کام کہیں مجھے کسی ناجائز کام میں مبتلا نہ کر دے، مراد وہ مشتبہ امور ہیں جن میں گناہ کا خطرہ اور شبہ ہو، جیسا کہ آواز بلند کرنے کی ایک فرد ایسی ہے جس میں گناہ نہیں، یعنی وہ جس میں مخاطب کو ایذا نہ ہو، اور ایک فرد وہ ہے جس میں گناہ ہے یعنی جس سے ایذا پہنچے، تو کمال تقویٰ اس میں ہے کہ آدمی مطلقاً آواز بلند کرنے کو چھوڑ دے۔

ان آیتوں کے نزول کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قسم ہے کہ اب مرتے دم تک آپ سے اس طرح بولوں گا کہ جیسے کوئی کان میں بات کیا کرتا ہے، اور حضرت عمرؓ اس قدر آہستہ بولنے لگے کہ بعض دفعہ دوبارہ پوچھنا پڑتا، اور حضرت ثابت بن قیسؓ طبعی طور پر بہت بلند آواز تھے مگر یہ سن کر وہ بہت ڈرے اور روئے اور نہایت تکلف کر کے اپنی آواز کو گھٹایا۔

جس طرح تقدم علی النبی کی ممانعت میں علمائے دین بحیثیت وارث انبیاء ہونے کے داخل ہیں اسی طرح رفع صوت کا بھی یہی حکم ہے کہ اکابر علماء کی مجلس میں اتنی بلند آواز سے نہ بولے جس سے ان کی آواز دب جائے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تواضع اور ادب و تعظیم سے بولتے اور نبی کی آواز کے سامنے اپنی آوازوں کو پست کرتے ہیں یہ وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے ادب کی تخم ریزی کے لیے پرکھ لیا اور مانجھ کر خالص تقویٰ و طہارت کے واسطے تیار کر دیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ چار چیزیں اعظم شعائر اللہ سے ہیں: ① قرآن ② پیغمبر ③ کعبہ ④ نماز، ان کی تعظیم وہی کرے گا جس کا دل تقویٰ سے مالا مال ہو: ذَٰلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ (الحج: ۳۲) یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا خلاف ادب ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ارشادات سننے کے بعد ان کے خلاف آواز اٹھانا کس درجہ کا گناہ ہو گا۔

فائدہ: [2] یعنی اس اخلاص و حق شناسی کی برکت سے پچھلی کوتاہیاں معاف ہوں گی اور بڑا بھاری ثواب ملے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ④

جولوگ پکارتے ہیں تجھ کو دیوار کے پیچھے سے وہ اکثر عقل نہیں رکھتے

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑤

اور اگر وہ صبر کرتے جب تک تو نکلتا ان کی طرف تو ان کے حق میں بہتر ہوتا، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔[1]

خلاصہ تفسیر: ان آیتوں کا قصہ یہ ہے کہ وہ ہی بنو تمیم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ باہر تشریف فرما نہ تھے، بلکہ ازواج مطہرات کے حجرات میں سے کسی مکان میں تھے، یہ لوگ غیر مہذب گاؤں والے تھے باہر ہی سے کھڑے ہو کر آپ کا نام لے کر پکارنے لگے کہ: "یا محمد اخرج الینا"، یعنی اے محمد ہمارے لئے باہر آیئے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

جولوگ حجروں کے باہر سے آپ کو پکارتے ہیں ان میں اکثروں کو عقل نہیں ہے (کہ عقل ہوتی تو آپ کا ادب کرتے اس طرح نام لے کر باہر سے پکارنے کی جرات نہ کرتے) اور اگر یہ لوگ (ذرا) صبر (اور انتظار) کرتے یہاں تک کہ آپ خود باہر ان کے پاس آجاتے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا (کیونکہ یہ ادب کی بات تھی) اور (اگر اب بھی توبہ کرلیں تو معاف ہو جائے، کیونکہ) اللہ غفور رحیم ہے۔

اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ: یہاں اکثرھم فرمانے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بعض پکارنے والے فی نفسہ جری نہ ہوں گے، دوسروں کے ساتھ دیکھا دیکھی لگ گئے اس طرح ان سے بھی یہ غلطی ہوگئی، اور یا اگرچہ سب ایک ہی طرح کے ہوں مگر اکثرھم کا لفظ فرمانے سے کسی کو اشتعال نہیں ہوگا، کیونکہ ہر شخص یہ خیال کرسکتا ہے کہ شاید مجھ کو کہنا مقصود نہ ہو، اور وعظ و نصیحت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ ایسے کلمات سے احتیاط کی جائے جن سے مخاطب کو اشتعال پیدا ہو۔

حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ: یہاں الیھم کی قید بڑھانے سے یہ ثابت ہوا کہ صبر و انتظار اس وقت تک کرنا ہے جب تک کہ آپ لوگوں سے ملاقات و گفتگو کے لئے باہر تشریف لائیں، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا باہر تشریف لانا کسی دوسری ضرورت سے ہو اس وقت بھی آپ سے اپنے مطلب کی بات کرنا مناسب نہیں، بلکہ اس کا انتظار کریں کہ جب آپ ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوں اس وقت بات کریں۔

❁ ❁ ❁

فائدہ: [1] بنی تمیم ملنے کو آئے، حضور ﷺ حجرہ مبارک میں تشریف رکھتے تھے، وہ لوگ باہر سے آوازیں دینے لگے کہ: "یا محمد اخرج الینا" (اے محمد! باہر آیئے) یہ بے عقلی اور بے تہذیبی کی بات تھی، رسول اللہ ﷺ کے مرتبہ کو نہیں سمجھتے تھے، کیا معلوم ہے اس وقت آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہو، یا کسی اور اہم کام میں مشغول ہوں، آپ ﷺ کی ذات منبع البرکات تو مسلمانوں کے تمام دینی و دنیاوی امور کا مرکز و ملجا تھی، کسی معمولی ذمہ دار آدمی کے لیے بھی کام کرنا سخت مشکل ہو جائے اگر اس کا کوئی نظام الاوقات نہ ہو، اور آخر پیغمبر کا ادب و احترام بھی کوئی چیز ہے چاہیے تھا کہ کسی کی زبانی اندر اطلاع کراتے اور آپ ﷺ کے باہر تشریف لانے تک صبر کرتے، جب آپ ﷺ باہر تشریف لا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے اس وقت خطاب کرنا چاہیے تھا، ایسا کیا جاتا تو ان کے حق میں بہتر اور قابل ستائش ہوتا، تاہم بے عقلی اور نادانستگی سے جو بات اتفاقاً سرزد ہو جائے اللہ اس کو اپنی مہربانی سے بخشنے والا ہے، چاہیے کہ اپنی تقصیر پر نادم ہو کر آئندہ ایسا رویہ اختیار نہ کریں، حضور ﷺ کی تعظیم و محبت ہی وہ نقطہ ہے جس پر قوم مسلم کی تمام پراگندہ قوتیں اور منتشر جذبات جمع ہوتے ہیں اور یہ ہی وہ ایمانی رشتہ ہے جس پر اسلامی اخوت کا نظام قائم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ

اے ایمان والو! اگر آئے تمہارے پاس کوئی گناہ گار خبر لے کر تو تحقیق کرلو کہیں جا نہ پڑو کسی قوم پر نادانی سے

فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ⑥

پھر کل کو اپنے کئے پر لگو پچھتانے

خلاصہ تفسیر: پیچھے آداب نبویہ میں حکم تھا: لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو، یعنی اجازت سے قبل کسی بھی کام میں سبقت اور جلدی مت کرو، اب آگے اس عام حکم سے ایک خاص بات کو ذکر فرما کر اس حکم شرعی سے سبقت کرنے کی ممانعت فرماتے ہیں، اور وہ خاص حکم کسی شخص یا مجمع کی شکایت پہنچنا ہے، اور اجازت سے قبل بلا تحقیق اس شکایت کے تقاضہ پر عمل کرنا سبقت ہے۔

اس آیت کے نزول کا واقعہ اس طرح ہوا کہ حضور ﷺ نے ولید بن عقبہ کو قبیلہ بنو مصطلق سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا، اور ایک روایت میں بنی وکیعہ آیا ہے، ولید میں اور ان قبیلہ والوں میں زمانہ جاہلیت میں کچھ عداوت تھی، اس وجہ سے ولید کو وہاں جاتے ہوئے کچھ اندیشہ ہوا، اس قبیلہ کے لوگوں کو چونکہ یہ معلوم تھا کہ اس تاریخ پر حضور ﷺ کا قاصد آئے گا، یہ تعظیماً بستی سے باہر نکلے کہ ان کا استقبال کریں، ولید کو یہ گمان ہوا کہ یہ لوگ قتل کے ارادہ سے آئے ہیں، واپس آ کر اپنے خیال کے مطابق یہ عرض کر دیا کہ وہ لوگ زکوۃ دینے کے لیے تیار نہیں اور اسلام کے خلاف ہو گئے، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو تحقیق حال کے لئے بھیجا اور فرمادیا کہ خوب تحقیق کرنا، اور اقدام میں جلدی مت کرنا، چنانچہ انہوں نے وہاں بجز اطاعت اور خیر کے کچھ نہ دیکھا، واپس آ کر آپ ﷺ کو یہ سارا واقعہ بتلایا اور مطمئن کر دیا، اس پر یہ حکم نازل ہوا، اور بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ لوگ خود حاضر خدمت ہوئے اور آپ ﷺ کو اطمینان دلایا۔

اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے (جس میں کسی کی شکایت ہو) تو (بغیر تحقیق کے اس پر عمل نہ کیا کرو، جیسا کہ حضور ﷺ نے ولید بن عقبہ کی خبر پر عمل کرنے میں جلدی نہیں کی، بلکہ اگر عمل کرنا مقصود ہو تو) خوب تحقیق کر لیا کرو کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے (اس آیت سے ایک حکم شرعی ثابت ہو گیا کہ بغیر تحقیق کے ایسی خبر پر عمل نہیں کرنا چاہئے)۔

اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی فاسق کی خبر کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک دوسرے ذرائع سے تحقیق کر کے اس کا صدق ثابت نہ ہو جائے، کیونکہ اس آیت میں ایک قرات تو فتثبتوا کی ہے، جس کے معنی ہیں کہ اس پر عمل کرنے اور اقدام میں جلدی نہ کرو، بلکہ ثابت قدم رہو، جب تک دوسرے ذرائع سے اس کا صدق ثابت نہ ہو جائے اور جب فاسق کی خبر کو قبول کرنا جائز نہ ہوا تو شہادت کو قبول کرنا بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگا، کیونکہ ہر شہادت ایک خبر ہوتی ہے جو حلف وقسم کے ساتھ موکد کی جاتی ہے، اسی لئے جمہور علماء کے نزدیک فاسق کی خبر یا شہادت شرعاً مقبول نہیں، البتہ بعض معاملات اور حالات میں فاسق کی خبر اور شہادت کو بھی قبول کر لیا جاتا ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ آیت قرآن میں اس حکم کی ایک خاص علت منصوص ہے یعنی: اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ تو جن معاملات میں یہ علت موجود نہیں وہ آیت کے حکم میں داخل نہیں یا مستثنیٰ ہیں، مثلاً یہ کہ کوئی فاسق بلکہ کافر بھی کوئی چیز لائے اور یہ کہے کہ فلاں شخص نے یہ آپ کو ہدیہ بھیجا ہے تو اس کی خبر پر عمل جائز ہے۔

اس آیت کا ولید بن عقبہ کے متعلق نازل ہونا صحیح روایات سے ثابت ہے اور آیت میں ان کو ''فاسق'' کہا گیا ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں کوئی فاسق بھی ہو سکتا ہے اور یہ اس مسلمہ اور متفق علیہ ضابطہ کے خلاف ہے کہ: ''الصحابة كلهم عدول''، یعنی صحابہ کرام سب کے سب ثقہ ہیں، ان کی کسی خبر وشہادت پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی، علامہ آلوسی نے روح المعانی میں فرمایا کہ اس معاملے میں حق بات وہ ہے جس کی طرف جمہور علماء گئے ہیں کہ صحابہ کرام معصوم نہیں ان سے گناہ کبیرہ بھی سرزد ہو سکتا ہے جو فسق ہے، اور اس گناہ کے وقت ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں یعنی شرعی سزا جاری کی جائے گی اور اگر کذب ثابت ہوا تو ان کی خبر وشہادت رد کر دی جائے گی، لیکن اہل سنت والجماعت کا نصوص قرآن وسنت کی بنا پر عقیدہ یہ ہے کہ صحابی سے گناہ تو ہو سکتا ہے مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو گناہ سے توبہ کر کے پاک نہ ہو گیا ہو، قرآن کریم نے علی الاطلاق ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے: رضي الله عنهم ورضوا عنه الآیۃ، اور رضائے الٰہی گناہوں کی معافی کے بغیر نہیں ہوتی،

جیسا کہ قاضی ابویعلی نے فرمایا کہ رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدیمہ ہے، وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انہی کے لئے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ ان کی وفات موجبات رضا پر ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی عظیم الشان جماعت میں سے گنے چنے چند آدمیوں سے کبھی کوئی گناہ سرزد بھی ہوا ہے تو ان کو فوراً توبہ نصیب ہوئی ہے، حق تعالیٰ نے ان کو رسول کریم ﷺ کی صحبت کی برکت سے ایسا بنادیا تھا کہ شریعت ان کی طبیعت بن گئی تھی، خلاف شرع کوئی کام یا گناہ سرزد ہونا انتہائی شاذونادر تھا ان کے اعمال صالحہ، نبی کریم ﷺ اور اسلام پر اپنی جانیں قربان کرنا اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے اتباع کو وظیفہ زندگی بنانا اور اس کے لئے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر پچھلی امتوں میں نہیں ملتی، ان بے شمار اعمال صالحہ اور فضائل وکمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہو جانا اس کو خود ہی کالعدم کر دیتا ہے، دوسرے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت وعظمت اور ادنیٰ سے گناہ کے وقت ان کا خوف خشیت اور فوراً توبہ کرنا، بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لئے خود پیش کر دینا، کہیں اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا وغیرہ روایات حدیث میں معروف مشہور ہیں اور بحکم حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے کہ جیسے گناہ کیا ہی نہیں، تیسرے حسب ارشاد قرآن اعمال صالحہ اور حسنات خود بھی گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں: ان الحسنٰت یذھبن السیاٰت خصوصاً جبکہ ان کے حسنات عام لوگوں کی طرح نہیں، اس لئے ان سے صدور گناہ کے وقت اگرچہ سزا وغیرہ میں معاملہ وہی کیا گیا جو اس جرم کے لئے مقرر تھا مگر اس کے باوجود بعد میں کسی کے لئے جائز نہیں کہ ان میں سے کسی کو فاسق قرار دے، اس لئے اگر آنحضرت ﷺ کے عہد میں کسی صحابی سے کوئی گناہ موجب فسق سرزد بھی ہوا اور اس وقت ان کو ''فاسق'' کہا بھی گیا تو اس سے یہ جائز نہیں ہو جاتا کہ اس فسق کو ان کے لئے مستمر سمجھ کر معاذ اللہ فاسق کہا جائے۔

اور آیت مذکورہ میں تو قطعاً یہ ضروری نہیں کہ ولید بن عقبہ کو ''فاسق'' کہا گیا ہو، سبب نزول خواہ ان کا معاملہ ہی سہی، مگر لفظ ''فاسق'' ان کے لئے استعمال کیا گیا یہ ضروری نہیں، وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تو ولید بن عقبہ سے کوئی ایسا کام ہوا نہ تھا جس کے سبب ان کو فاسق کہا جائے اور اس واقعہ میں بھی جو انہوں نے بنی المصطلق کے لوگوں کی طرف ایک بات غلط منسوب کی وہ بھی اپنے خیال کے مطابق صحیح سمجھ کر کی اگرچہ واقع میں غلط تھی، اس لئے آیت مذکورہ کا مطلب بے تکلف وہ بن سکتا ہے جو خلاصہ تفسیر میں اوپر گزرا ہے کہ اس آیت نے قاعدہ کلیہ فاسق کی خبر کے نامقبول ہونے کے متعلق بیان کیا ہے اور واقعہ مذکورہ پر اس آیت کے نزول سے اس کی مزید تاکید اس طرح ہوگئی کہ ولید بن عقبہ اگرچہ فاسق نہ تھے مگر ان کی خبر قرائن کی وجہ سے قابل اعتبار سے ناقابل قبول نظر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے محض ان کی خبر پر کسی اقدام سے گریز کر کے خالد بن ولید کو تحقیقات پر مامور فرمادیا تو جب ایک ثقہ اور صالح آدمی کی خبر میں قرائن کی بنا پر شبہ ہو جانے کا معاملہ یہ ہے کہ اس پر قبل از تحقیق عمل نہیں کیا گیا تو فاسق کی خبر کو قبول نہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا اور زیادہ واضح ہے۔

فَتَبَيَّنُوٓا اَنْ تُصِيبُوا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ: اس سے معلوم ہوا کہ مطلب یہ نہیں ہے کہ اس خبر کی ضرور تحقیق کی جائے، کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ اگر ہم کسی شخص کی برائی سن کر بالکل التفات اور توجہ نہ کریں تو یہ جائز ہے، بلکہ بعض جگہ تو تجسس حرام ہے، یہاں مقصود یہ ہے کہ اس پر بلا تحقیق عمل نہ کیا جائے، پس عمل کرنے کے لیے تحقیق ضروری ہے، اور اگر عمل ہی نہ کرنا ہو تو تحقیق بھی ضروری نہیں، اور یہ مسئلہ مستقل ہے کہ تحقیق کہاں واجب ہے، کہاں جائز اور کہاں ممنوع ہے؟ اس میں اجمالی قول یہ ہے کہ: ① جہاں تحقیق نہ کرنے سے کوئی واجب شرعی فوت ہوتا ہو تو وہاں تحقیق واجب ہے، مثلاً حاکم نے سنا کہ فلاں شخص فلاں کو قتل کرنا چاہتا ہے تو چونکہ حاکم ہونے کی وجہ سے رعایا کی حفاظت اس کے ذمہ واجب ہے اس لیے اس معاملہ کی تحقیق اور انتظام واجب ہے ② جہاں تحقیق نہ کرنے سے کوئی واجب فوت نہ ہوتا ہو اور تحقیق کرنے سے اس شخص کا بھی نقصان نہیں ہوتا جس کی شکایت سنی ہے تو وہاں جائز ہے، جیسے یہ سنا کہ فلاں شخص مجھے مارے گا تو اس کی تحقیق جائز ہے ③ جہاں تحقیق نہ کرنے سے اپنا کوئی نقصان نہیں اور تحقیق کرنے سے اس دوسرے کو ناگواری ہو تو وہاں تحقیق حرام ہے، جیسے سنا کہ فلاں شخص خفیہ شراب پیتا ہے تو تحقیق نہ کرنے سے اپنا تو کوئی نقصان نہیں، اور تحقیق کرنے سے وہ رسوا ہوتا ہے تو یہاں تحقیق حرام ہے، خوب سمجھ لو۔

* * *

فائدہ: اکثر نزاعات ومناقشات کی ابتداء جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے۔ اس لیے اول اختلاف وتفریق کے اسی چشمہ کو بند کرنے کی تعلیم

دی یعنی کسی خبر کو یوں ہی بے تحقیق قبول نہ کرو۔ فرض کیجیے ایک بے راہرو اور تکلیف دہ آدمی نے اپنے کسی خیال اور جذبہ سے بے قابو ہو کر کسی قوم کی شکایت کی۔ تم محض اس کے بیان پر اعتماد کر کے اس قوم پر چڑھ دوڑے، بعدہ ظاہر ہوا کہ اس شخص نے غلط کہا تھا، تو خیال کرو اس وقت کس قدر پچھتانا پڑے گا۔ اور اپنی جلد بازی پر کیا کچھ ندامت ہوگی اور اس کا نتیجہ جماعت اسلام کے حق میں کیسا خراب ہوگا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ

اور جان لو کہ تم میں رسول ہے اللہ کا، اگر وہ تمہاری بات مان لیا کرے بہت کاموں میں تو تم پر مشکل پڑے ۱ پر اللہ نے محبت ڈال دی

اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ

تمہارے دل میں ایمان کی اور کھبا دیا اس کو تمہارے دلوں میں اور نفرت ڈال دی تمہارے دل میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کی

اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۷ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۸

وہ لوگ وہی ہیں نیک راہ پر، اللہ کے فضل سے اور احسان سے ۲ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے حکمتوں والا ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادب یہ بتلایا گیا ہے کہ کسی کام میں آپ کے حکم سے سبقت نہ کی جائے، اس حکم کے بعض افراد یا اجزاء ایسے ہیں جو دینی نہیں، بلکہ دنیاوی امور ہیں جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب اور ان کے بھائی کو فرمایا تھا کہ زید بن حارثہ سے زینب کا نکاح کر دیا جائے تو ایسے امور میں دنیاوی ہونے کی وجہ سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ ان میں حضور سے سبقت جائز ہو اور اطاعت واجب نہ ہو، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ یہ امور رائے اور تدبیر کے متعلق ہیں، ان میں خود حضور کو ہماری رائے کی موافقت مناسب ہے، چنانچہ اب آگے اسی کے متعلق ارشاد ہے:

اور جان رکھو کہ تم میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما) ہیں (جو خدا کی بڑی نعمت ہیں کما قال تعالیٰ: لقد من اللہ الخ اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ کسی بات میں تم آپ کے خلاف مت کرو اگرچہ دنیاوی ہی کیوں نہ ہو، اور اس فکر میں مت پڑو کہ دنیاوی امور میں خود حضور ہماری رائے کی موافقت فرمایا کریں کیونکہ) بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ اس میں تمہارا کہنا مانا کریں تو تم کو بڑی مضرت پہنچے (کیونکہ وہ مصلحت کے خلاف ہو تو ضرور اس کے مطابق عمل کرنے میں نقصان ہوگا، بخلاف اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے پر عمل کیا جائے، بہر حال اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں کی موافقت کرتے تو تم بڑی مصیبت میں پڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ نے (تم کو مصیبت سے بچالیا اس طرح سے کہ) تم کو ایمان (کامل) کی محبت دی اور اس (کے حاصل کرنے کو) کو تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا اور کفر و فسق (یعنی گناہ کبیرہ) اور (مطلق) عصیان (یعنی گناہ صغیرہ) سے تم کو نفرت دے دی (جس سے تم کو ہر وقت رضائے رسول کی جستجو رہتی ہے اور جس کی وجہ سے تم ان احکام کو مان لیتے ہو جو رضائے رسول کا سبب ہیں، چنانچہ جب تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ دنیاوی امور میں بھی رسول کی اطاعت واجب ہے اور مطلق اطاعت کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا اور ایمان کامل کی تحصیل کی رغبت پہلے سے موجود ہے پس تم نے فوراً اس حکم کو بھی قبول کر لیا اور قبول کر کے ایمان کی اور تکمیل کر لی) ایسے لوگ (جو کہ تکمیل ایمان کے محب ہیں) خدا تعالیٰ کے فضل اور انعام سے راہ راست پر ہیں اور اللہ تعالیٰ (نے جو یہ احکام فرمائے ہیں تو وہ ان کی مصلحتوں کو) جاننے والا (ہے اور چونکہ) حکمت والا ہے (اس لئے ان احکام کو واجب کر دیا ہے)۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ: یہ الفاظ بظاہر اس کا قرینہ ہیں کہ ایسے امر کا بیان کرنا مقصود ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ساتھ مخصوص تھا، اور وہ احقر کے نزدیک دنیاوی امور میں اطاعت کرنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دنیاوی کام میں بھی آپ کی اطاعت کرنی چاہیے، اور زندگی کی تخصیص کی یہ وجہ نہیں کہ اگر آپ اپنے بعد کے لیے ایسا احکام فرماتے تو اطاعت واجب نہ ہوتی، بلکہ تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ایسے واقعات خاص

ہوتے ہیں اور آپ نے جو شریعت چھوڑی ہے وہ قانون کلی کے طور پر عام احکام ہیں، ان میں خاص خاص واقعات کے متعلق آپ نے صراحۃً احکام بیان نہیں فرمائے تو اب بعض احکام ایسے بھی ہیں جن کو شریعت نے ہماری رائے پر چھوڑ دیا ہے، مثلاً یہ کہ بیٹی کا نکاح کس شخص سے کیا جائے زید سے عمرو سے، اس کو ہماری رائے پر چھوڑ دیا گیا، البتہ عام حکم یہ فرمادیا ہے کہ دین داری اور کفر ہونے کا خیال رکھا جائے۔

لَوۡ يُطِيۡعُكُمۡ فِىۡ كَثِيۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ: مقصد یہ ہے کہ مشورہ طلب امور میں کوئی رائے دے دینا تو درست ہے لیکن یہ کوشش کرنا کہ رسول اللہ ﷺ تمہاری رائے کے مطابق ہی عمل کریں یہ درست نہیں، کیونکہ دنیاوی امور میں اگرچہ شاذ و نادر رسول کی رائے خلاف مصلحت ہونے کا امکان ضرور ہے جو شان نبوت کے خلاف نہیں، لیکن حق تعالیٰ نے جو فراست اور دانش اپنے رسول کو عنایت فرمائی ہے وہ تمہیں حاصل نہیں ہے، اس لئے اگر رسول اللہ ﷺ تمہاری رائے پر چلا کریں تو بہت سے معاملات میں نقصان و مصیبت میں پڑ جاؤ گے، اور کہیں شاذ و نادر تمہاری رائے ہی میں مصلحت ہو اور تم اطاعت رسول کیلئے اپنی رائے کو چھوڑ دو جس سے تمہیں کچھ دنیوی نقصان بھی پہنچ جائے تو اس میں اتنی مضرت نہیں جتنی تمہاری رائے کے تابع ہو کر چلنے میں ہے، کیونکہ اس صورت میں اگر کچھ دنیوی نقصان ہو بھی گیا تو اطاعت رسول کا اجر و ثواب اس کا بہتر بدل موجود ہے،، اس تقریر سے ''کثیر'' کی قید کا فائدہ بھی معلوم ہو گیا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اگر رسول اللہ ﷺ تمہاری کسی خبر یا رائے پر عمل نہ کریں تو برا نہ مانو، حق لوگوں کی خواہشوں یا رایوں کے تابع نہیں ہوسکتا، ایسا ہو تو زمین و آسمان کا سارا کارخانہ ہی درہم برہم ہو جائے کما قال تعالیٰ: **وَلَوِ اتَّبَعَ الۡحَقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ** (المؤمنون: ۷۱) الغرض خبروں کی تحقیق کیا کرو اور حق کو اپنی خواہش اور رائے کے تابع نہ بناؤ، بلکہ اپنی خواہشات کو حق کے تابع رکھو، اس طرح تمام جھگڑوں کی جڑ کٹ جائے گی، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی تمہارا مشورہ قبول نہ ہو تو برا نہ مانو، رسول عمل کرتا ہے اللہ کے حکم پر، اسی میں تمہارا بھلا ہے، اگر تمہاری بات نہ مانا کرے تو ہر کوئی اپنے بھلے کی کہے، پھر کس کس کی بات پر چلے''۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ پیغمبر ﷺ تمہاری ہر بات مانا کریں تو بڑی مشکل ہو، لیکن اللہ کا شکر کرو کہ اس نے اپنے فضل و احسان سے مومنین قانتین کے دلوں میں ایمان کو محبوب بنادیا اور کفر و معصیت کی نفرت ڈال دی جس سے وہ ایسی بیہودگی کے پاس بھی نہیں جاسکتے، جس مجمع میں اللہ کا رسول جلوہ افروز ہو وہاں کسی کی رائے و خواہش کی پیروی کہاں ہوسکتی ہے، آج گو حضور ﷺ ہمارے درمیان میں نہیں مگر حضور ﷺ کی تعلیم اور آپ کے وارث و نائب یقیناً موجود ہیں اور رہیں گے۔

فائدہ: ۳ یعنی وہ سب کی استعداد کو جانتا ہے اور ہر ایک کو اپنی حکمت سے وہ احوال و مقامات مرحمت فرماتا ہے جو اس کی استعداد کے مناسب ہوں۔

وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى

اور اگر دو فریق مسلمانوں کے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں ملاپ کرا دو، پھر اگر چڑھا چلا جائے ایک ان میں سے دوسرے پر

فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ

تو تم سب لڑو اس چڑھائی والے سے یہاں تک پھر آئے اللہ کے حکم پر، پھر اگر پھر آیا تو ملاپ کرا دو ان میں برابر

وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۝۹

اور انصاف کرو، بیشک اللہ کو خوش آتے ہیں انصاف والے ۱

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں رسول اللہ ﷺ کے حقوق اور آداب اور ایسے اعمال سے پرہیز کا بیان تھا جن سے آنحضرت ﷺ کو ایذا پہنچے، آگے عام معاشرت کے آداب و احکام ہیں جن میں اجتماعی اور انفرادی دونوں طرح کے آداب اور باہمی حقوق کا بیان ہے اور سب میں قدر مشترک ایذا رسانی سے اجتناب ہے۔

اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو (یعنی جھگڑے کی بنیاد کو دور کر کے لڑائی موقوف کرادو) پھر اگر (اصلاح کی کوشش کے بعد بھی) ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے (اور لڑائی بند نہ کرے) تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے (حکم خدا سے مراد لڑائی بند کرنا ہے) پھر اگر وہ (زیادتی کرنے والا فرقہ حکم خدا کی طرف) رجوع ہو جائے (یعنی لڑائی بند کر دے) تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو (یعنی حدود شرعیہ کے موافق اس معاملہ کو طے کر دو، محض لڑائی بند کرنے پر اکتفا نہ کرو، اگر صلح مصالحت نہ ہوئی تو پھر بھی لڑائی کا احتمال رہے گا) اور انصاف کا خیال رکھو (یعنی کسی نفسانی غرض کو غالب نہ ہونے دو) بیشک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے۔

ان آیات کے سبب نزول میں مفسرین نے متعدد واقعات بیان فرمائے ہیں جن میں خود مسلمانوں کے دو گروہوں میں باہم تصادم ہوا، اور کوئی بعید نہیں کہ یہ سبھی واقعات کا مجموعہ سبب نزول ہوا ہو، یا نزول کسی ایک واقعہ میں ہوا، دوسرے واقعات کو اس کے مطابق پا کر ان کو بھی سبب نزول میں شریک کر دیا گیا، اس آیت کے اصل مخاطب وہ اولوالامر اور ملوک ہیں جن کو قتال و جہاد کے وسائل حاصل ہیں، اور بالواسطہ تمام مسلمان اس کے مخاطب ہیں کہ وہ اس معاملے میں اولوالامر کی اعانت کریں اور جہاں کوئی امام و امیر یا بادشاہ و رئیس نہیں، وہاں حکم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو دونوں کو فہمائش کر کے ترک قتال پر آمادہ کیا جائے اور دونوں نہ مانیں تو دونوں لڑنے والے فرقوں سے الگ رہے، نہ کسی کے خلاف کرے نہ موافقت۔

مسلمانوں کے دو گروہوں کی باہمی لڑائی کی چند صورتیں ہوتی ہیں: ① ایک یہ کہ دونوں جماعتیں امام المسلمین کے تحت ولایت ہیں ② یا دونوں نہیں ③ یا ایک ہے ایک نہیں، پہلی صورت میں عام مسلمانوں پر لازم ہے کہ سمجھا بجھا کر ان کو باہمی جنگ سے روکیں، اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو امام المسلمین پر اصلاح کرنا واجب ہے، اگر حکومت اسلامیہ کی مداخلت سے دونوں فریق جنگ سے باز آ گئے تو قصاص و دیت کے احکام جاری ہوں گے، اور باز نہ آئیں تو دونوں فریق کے ساتھ باغیوں کا سا معاملہ کیا جائے، اور ایک باز آ گیا دوسرا ظلم و تعدی پر جما رہا تو دوسرا فریق باغی ہے، اس کے ساتھ باغیوں کا معاملہ کیا جائے، اور جس نے اطاعت قبول کر لی وہ فریق عادل کہلائے گا، اور باغیوں کے احکام کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے، اور مختصر جامع حکم یہ ہے کہ قبل قتال ان کے ہتھیار چھین لئے جائیں گے، اور ان کو گرفتار کر کے توبہ کرنے کے وقت تک قید رکھیں گے، اور عین قتال کی حالت میں اور قتال کے بعد ان کی ذریت کو غلام یا لونڈی نہ بنا دیں گے اور ان کا مال مال غنیمت نہیں ہوگا، البتہ توبہ کرنے تک اموال کو محبوس رکھا جائے گا، توبہ کے بعد واپس دے دیا جائے گا۔

آیات مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے: فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا، یعنی اگر بغاوت کرنے والا فرقہ بغاوت اور قتال سے باز آ جائے تو صرف جنگ بند کر دینے پر اکتفا نہ کرو، بلکہ اسباب جنگ اور باہمی شکایات کے ازالہ کی فکر کرو، تاکہ دلوں سے بغض و عداوت نکل جائے اور ہمیشہ کے لئے بھائی چارے کی فضا قائم ہو جائے، اور چونکہ یہ لوگ امام المسلمین کے خلاف بھی جنگ کر چکے ہیں اس لئے ہو سکتا تھا کہ ان کے بارے میں پورا انصاف نہ ہو اس لئے قرآن نے تاکید فرمائی کہ دونوں فریق کے حقوق میں عدل و انصاف کی پابندی کی جائے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی ان تمام پیش بندیوں کے باوجود اگر اتفاق سے مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو پوری کوشش کرو کہ اختلاف رفع ہو جائے، اس میں اگر کامیابی نہ ہو اور کوئی فریق دوسرے پر چڑھا چلا جائے اور ظلم و زیادتی ہی پر کمر باندھ لے تو یکسو ہو کر نہ بیٹھ رہو، بلکہ جس کی زیادتی ہو سب مسلمان مل کر اس سے لڑائی کریں، یہاں تک کہ وہ فریق مجبور ہو کر اپنی زیادتیوں سے باز آئے اور خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو کر صلح کے

لیے اپنے کو پیش کر دے، اس وقت چاہیے کہ مسلمان دونوں فریق کے درمیان مساوات و انصاف کے ساتھ صلح اور میل ملاپ کرادیں، کسی ایک کی طرف داری میں جادہ حق سے ادھر ادھر نہ جھکیں۔

تنبیہ: آیت کا نزول صحیحین کی روایت کے موافق "انصار" کے دو گروہ اوس وخزرج کے ایک وقتی ہنگامے کے متعلق ہوا ہے، حضور ﷺ نے ان کے درمیان اسی آیت کے ماتحت صلح کرادی، جو لوگ خلیفہ کے مقابلہ میں بغاوت کریں وہ بھی عموم آیت میں داخل ہیں، چنانچہ قدیم سے علمائے سلف بغاوت کے مسئلہ میں اسی سے استدلال کرتے آئے ہیں، لیکن جیسا کہ شان نزول سے ظاہر ہوتا ہے یہ حکم مسلمانوں کے تمام جماعتی مناقشات ومشاجرات کو شامل ہے، باقی باغیوں کے متعلق احکام شرعیہ کی تفصیل فقہ میں دیکھنی چاہیے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٠﴾ ع

مسلمان جو ہیں سو بھائی ہیں سو ملاپ کرادو اپنے دو بھائیوں میں اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم پر رحم ہو

خلاصہ تفسیر: (اور باہمی اصلاح کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ) مسلمان تو سب (دینی اشتراک یعنی دین میں متفق ہونے کی وجہ سے جو روحانی اور معنوی رشتہ ہے، اس رشتہ سے ایک دوسرے کے) بھائی ہیں اس لئے اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کر دیا کرو (تاکہ یہ اسلامی برادری قائم رہے) اور (اصلاح کے وقت) اللہ سے ڈرتے رہا کرو (یعنی حدود شرعیہ کی رعایت رکھا کرو) تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی صلح اور جنگ کی ہر ایک حالت میں یہ ملحوظ رہے کہ دو بھائیوں کی لڑائی دو بھائیوں کی مصالحت ہے، دشمنوں اور کافروں کی طرح برتاؤ نہ کیا جائے، جب دو بھائی آپس میں ٹکرا جائیں تو یوں ہی ان کے حال پر نہ چھوڑ دو، بلکہ اصلاح ذات البین کی پوری کوشش کرو اور ایسی کوشش کرتے وقت خدا سے ڈرتے رہو کہ کسی کی بے جا طرف داری یا انتقامی جذبہ سے کام لینے کی نوبت نہ آئے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ

اے ایمان والو ٹھٹھا نہ کریں ایک لوگ دوسروں سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے اور نہ عورتیں

مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ

دوسری عورتوں سے شاید وہ بہتر ہوں ان سے، اور عیب نہ لگاؤ ایک دوسرے کو اور نام نہ ڈالو چڑانے کو ایک دوسرے کے ۱ے

بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿١١﴾

برا نام ہے گنہگاری پیچھے ایمان کے ۲ے اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہیں بے انصاف ۳ے

خلاصہ تفسیر: سورۂ حجرات کے شروع میں نبی کریم ﷺ کے حقوق اور آداب کا بیان آیا، پھر عام مسلمانوں کے باہمی حقوق و آداب معاشرت کا بیان شروع ہوا، سابقہ دو آیتوں میں ان کی اجتماعی و جماعتی اصلاح کے احکام بیان ہوئے، مذکور الصدر آیتوں میں اشخاص و افراد کے باہمی حقوق و آداب معاشرت کا ذکر ہے، ان میں تین چیزوں کی ممانعت فرمائی گئی ہے: ① اول کسی مسلمان کے ساتھ تمسخر و استہزاء کرنا ② دوسرے کسی پر طعنہ زنی کرنا ③ تیسرے کسی کو ایسے لقب سے ذکر کرنا جس سے اس کی توہین ہوتی ہو یا وہ اس سے برا مانتا ہو۔

اے ایمان والو! نہ تو مردوں کو مردوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ ان (ہنسنے والوں) سے (خدا کے نزدیک) بہتر ہوں (پھر وہ تحقیر کیسے کرتے ہیں) اور نہ عورتوں کو عورتوں پر ہنسنا چاہئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان (ہنسنے والیوں) سے (خدا کے نزدیک)

بہتر ہوں (پھر وہ تحقیر کیسے کرتی ہیں) اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو، اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو (کیونکہ یہ سب باتیں گناہ کی ہیں اور) ایمان لانے کے بعد (مسلمان پر) گناہ کا نام لگنا (ہی) برا ہے (یعنی یہ گناہ کر کے تمہاری شان میں یہ کہا جاسکے کہ فلاں مسلمان جس سے تم مراد ہو گناہ یعنی خدا کی نافرمانی کرتا ہے نفرت کی بات ہے تو اس سے بچو) اور جو (ان حرکتوں سے) باز نہ آئیں گے تو وہ ظلم کرنے والے (اور حقوق العباد کو تلف کرنے والے) ہیں (جو سزا ظالموں کو ملے گی وہی ان کو ملے گی)۔

لَا يَسْخَرْ: "تمسخر" کسی شخص کی تحقیر و توہین کے لئے اس کے کسی عیب کو اس طرح ذکر کرنا جس سے لوگ ہنسنے لگیں اس کو سخریہ، تمسخر، استہزا کہا جاتا ہے، اور یہ جیسے زبان سے ہوتا ہے ایسے ہی ہاتھوں پاؤں وغیرہ سے اس کی نقل اتارنے یا اشارہ کرنے سے بھی ہوتا ہے اور اس طرح بھی کہ اس کا کلام سن کر بطور تحقیر کے ہنسی اڑائی جائے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سخریہ و تمسخر کسی شخص کے سامنے اس کا اسی طرح ذکر کرنا ہے کہ اس سے لوگ ہنس پڑیں اور یہ سب چیزیں بنص قرآن حرام ہیں، اور جس سے دوسرے کا جی خوش ہو اور اس میں کسی کی تحقیر یا عیب نہ ہو تو وہ مزاح کہلاتا ہے اور یہ جائز ہے۔

وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ: قرآن میں مردوں کا مردوں کے ساتھ اور عورتوں کا عورتوں کے ساتھ استہزاء کرنے اور اس کی حرمت کا ذکر فرمایا حالانکہ کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ یا کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ استہزاء کرے تو وہ بھی اس حرمت میں داخل ہے مگر اس کا ذکر نہ کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ تمسخر چونکہ اکثر ہم جنسوں ہی میں ہوا کرتا ہے شاید اس لیے یہ صورت بیان نہ کی گئی ہو، دوسرے اس کا حکم خود اسی سے معلوم ہو سکتا ہے، کیونکہ اس میں تمسخر کے علاوہ بے غیرتی اور بے حیائی بھی ہے کہ عورتوں اور مردوں کا اختلاط ہی شرعاً ممنوع اور مذموم ہے جب اختلاط نہیں تو تمسخر کا تحقق ہی نہیں ہوگا، حاصل آیت کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے بدن یا صورت یا قد و قامت وغیرہ میں کوئی عیب نظر آئے تو کسی کو اس پر ہنسنے یا استہزاء کرنے کی جرات نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید وہ اپنے صدق و اخلاص وغیرہ کے سبب اللہ کے نزدیک اس سے بہتر اور افضل ہو، کیونکہ دوسرا شخص اگرچہ اس وقت کیسا ہی ہو مگر خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں کہ کس کا اچھا ہوگا کس کا برا، اس لیے ہر حال میں ممکن ہے کہ دوسرا شخص اپنے سے اچھا ہو، اس آیت کو سن کر سلف صالحین کا حال یہ ہو گیا تھا کہ عمرو بن شرجیل نے فرمایا کہ میں اگر کسی شخص کو بکری کے تھنوں سے منہ لگا کر دودھ پیتے دیکھوں اور اس پر مجھے ہنسی آجائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں بھی ایسا ہی نہ ہو جاؤں، حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ میں اگر کسی کتے کے ساتھ بھی استہزاء کروں تو مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں خود کتا نہ بنا دیا جاؤں۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: لمز کے معنی کسی میں عیب نکالنے اور عیب ظاہر کرنے یا عیب پر طعنہ زنی کرنے کے ہیں، آیت میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، یعنی تم اپنے عیب نہ نکالو، یہ ارشاد ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم میں ہے: لا تقتلوا انفسکم، جس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، دونوں جگہ اپنے آپ کو قتل کرنے یا اپنے عیب نکالنے سے مراد یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو، اور اس عنوان سے تعبیر کرنے میں حکمت یہ بتلانا ہے کہ کسی دوسرے کو قتل کرنا ایک حیثیت سے اپنے آپ ہی کو قتل کرنا ہے، کیونکہ اکثر تو ایسا واقع ہو ہی جاتا ہے کہ ایک نے دوسرے کو قتل کیا دوسرے کے حمایتی لوگوں نے اس کو قتل کر دیا اور اگر یہ بھی نہ ہو تو اصل بات یہ ہے کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں اپنے بھائی کو قتل کرنا گویا خود اپنے آپ کو قتل کرنا اور بے دست و پا بنانا ہے، یہی معنی یہاں: وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ میں ہیں کہ تم جو دوسروں کے عیب نکالو اور طعنہ دو تو یاد رکھو کہ عیب سے تو کوئی انسان عادۃً خالی نہیں ہوتا، تم اس کے عیب نکالو گے تو وہ تمہارے عیب نکالے گا جیسا کہ بعض علماء نے فرمایا کہ: " وفیك عیوب و للناس اعین "، یعنی تم میں بھی کچھ عیوب ہیں اور لوگوں کی آنکھیں ہیں جو ان کو دیکھتی ہیں تم کسی کے عیب نکالو گے اور طعنہ زنی کرو گے تو وہ تم پر یہی عمل کریں گے اور بالفرض اگر اس نے صبر بھی کیا تو بات وہی ہے کہ اپنے ایک بھائی کی بدنامی اور تذلیل پر غور کریں تو اپنی ہی تذلیل و تحقیر ہے، علماء نے فرمایا ہے کہ انسان کی سعادت اور خوش نصیبی اس میں ہے کہ اپنے عیوب پر نظر رکھے ان کی اصلاح کی فکر میں لگا رہے اور جو ایسا کرے گا اس کو دوسروں کے عیب نکالنے اور بیان کرنے کی فرصت ہی نہ ملے گی۔

وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ: تیسری چیز جس سے آیت میں ممانعت کی گئی ہے وہ کسی دوسرے کو برے لقب سے پکارنا ہے جس سے وہ

ناراض ہوتا ہو، جیسے کسی کو لنگڑا، لولا، یا اندھا کانا کہہ کر پکارنا، یا اس لفظ سے اس کا ذکر کرنا، اسی طرح جو نام کسی شخص کی تحقیر کے لئے استعمال کیا جاتا ہو اس نام سے اس کو پکارنا، اور حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ آیت میں تنابزو بالالقاب سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی گناہ یا برا عمل کیا ہو اور پھر اس سے تائب ہو گیا ہو، اس کے بعد اس کو اس برے عمل کے نام سے پکارنا، مثلاً چور یا زانی یا شرابی وغیرہ جس نے چوری، زنا، شراب سے توبہ کر لی ہو اس کو اس پچھلے عمل سے عار دلانا اور تحقیر کرنا حرام ہے۔

بعض لوگوں کے ایسے نام مشہور ہو جاتے ہیں جو فی نفسہ برے ہیں مگر وہ بغیر اس لفظ کے پہچانا ہی نہیں جاتا تو اس کو اس نام سے ذکر کرنے کی اجازت پر علماء کا اتفاق ہے بشرطیکہ ذکر کرنے والے کا قصد اس سے تحقیر و تذلیل کا نہ ہو جیسے بعض محدثین کے نام کے ساتھ اعرج یا احدب مشہور ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مومن کا حق دوسرے مومن پر یہ ہے کہ اس کا ایسے نام و لقب سے ذکر کرے جو اس کو زیادہ پسند ہو اس لئے عرب میں کنیت کا رواج عام تھا اور آنحضرت ﷺ نے بھی اس کو پسند فرمایا، خود آنحضرت ﷺ نے خاص خاص صحابہ کو کچھ لقب دیئے ہیں، صدیق اکبر کو عتیق اور حضرت عمر کو فاروق اور حضرت حمزہ کو اسد اللہ اور خالد بن ولید کو سیف اللہ فرمایا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ اول مسلمانوں میں نزاع و اختلاف کو روکنے کی تدابیر بتلائی تھیں، پھر بتلایا کہ اگر اتفاقاً اختلاف رونما ہو جائے تو پر زور اور موثر طریقہ سے اس کو مٹایا جائے لیکن جب تک نزاع کا خاتمہ نہ ہو کوشش ہونی چاہیے کہ کم از کم جذبات منافرت و مخالفت زیادہ تیز اور مشتعل نہ ہونے پائیں، عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جہاں دو شخصوں یا دو جماعتوں میں اختلاف رونما ہوا، بس ایک دوسرے کا تمسخر اور استہزاء کرنے لگتا ہے، ذرا سی بات ہاتھ لگ گئی اور ہنسی مذاق اڑانا شروع کر دیا، حالانکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید جس کا مذاق اڑا رہا ہے، وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو، بلکہ بسا اوقات یہ خود بھی اختلاف سے پہلے اس کو بہتر سمجھتا ہوتا ہے، مگر ضد و نفسانیت میں دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، اس طریقہ سے نفرت و عداوت کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی رہتی ہے، اور قلوب میں اس قدر بعد ہو جاتا ہے کہ صلح و ائتلاف کی کوئی امید باقی نہیں رہتی، آیہ ہذا میں خداوند قدوس نے اسی قسم کی باتوں سے منع فرمایا ہے، یعنی ایک جماعت دوسری جماعت کے ساتھ نہ مسخرا پن کرے، نہ ایک دوسرے پر آوازیں کسی جائیں، نہ کھوج لگا کر عیب نکالے جائیں، اور نہ برے ناموں اور برے القاب سے فریق مقابل کو یاد کیا جائے، کیونکہ ان باتوں سے دشمنی اور نفرت میں ترقی ہوتی ہے اور فتنہ و فساد کی آگ زیادہ تیزی سے پھیلتی ہے، سبحان اللہ! کیسی بیش بہا ہدایات ہیں، آج اگر مسلمان سمجھیں تو ان کے سب سے بڑے مرض کا مکمل علاج اسی ایک سورۂ حجرات میں موجود ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی کسی کا برا نام ڈالنے سے آدمی خود گنہگار ہوتا ہے، اسے تو واقع میں عیب لگا یا نہ لگا، لیکن اس کا نام بد تہذیب، فاسق، گنہگار اور مردم آزار پڑ گیا، خیال کرو، ''مومن'' کے بہترین لقب کے بعد یہ نام کیا اچھے معلوم ہوتے ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ جب ایک شخص ایمان لا چکا اور مسلمان ہو گیا اس کو مسلمانی سے پہلے کی باتوں پر طعن دینا یا اس وقت کے بدترین القاب سے یاد کرنا مثلاً یہودی یا نصرانی وغیرہ کہہ کر پکارنا نہایت مذموم حرکت ہے، اسی طرح جو شخص کسی عیب میں مبتلا ہو اور وہ اس کا اختیاری نہ ہو، یا ایک گناہ سے فرض کیجیے توبہ کر چکا ہے، چڑانے کے لیے اس کا ذکر کرنا بھی جائز نہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی جو پہلے ہو چکا اب توبہ کر لو، اگر یہ احکام و ہدایات سننے کے بعد بھی ان جرائم سے توبہ نہ کی تو اللہ کے نزدیک اصلی ظالم یہ ہی ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا

اے ایمان والو! بچتے رہو بہت تہمتیں کرنے سے مقرر بعضی تہمت گناہ ہے اور بھید نہ ٹٹولو کسی کا

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ

اور برا نہ کہو پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو ۱ بھلا خوش لگتا ہے تم میں کسی کو کہ کھائے گوشت اپنے بھائی کا جو مردہ ہو سو گھن آتا ہے تم کو اس سے ۲

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

اور ڈرتے رہو اللہ سے، بیشک اللہ معاف کرنے والا ہے مہربان ﴿۱۲﴾

خلاصہ تفسیر: یہ آیت بھی باہمی حقوق اور آداب معاشرت کے متعلق احکام پر مشتمل ہے، اس میں بھی تین چیزوں کو حرام قرار دیا ہے: ① اول ظن جس کی تفصیل آگے آتی ہے ② دوسرے تجسس یعنی کسی پوشیدہ عیب کا سراغ لگانا ③ تیسرا غیبت یعنی کسی غیر حاضر آدمی کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو اگر وہ سنتا تو اس کو ناگوار ہوتی۔

اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں (اس لئے ظن و گمان کی جتنی قسمیں ہیں ان سب کے اقسام کے احکام کی تحقیق کرلو کہ کون سا گمان جائز ہے کون سا ناجائز، پھر جائز کی حد تک رہو) اور (کسی کے عیب کا) سراغ نہ لگایا کرو اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے (آگے غیبت کی مذمت ہے کہ) کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے اس کو تو تم (ضرور) برا سمجھتے ہو (تو سمجھ لو کہ کسی بھائی کی غیبت بھی اسی کے مشابہ ہے، اس سے بھی نفرت ہونی چاہیے) اور اللہ سے ڈرتے رہو (غیبت چھوڑ دو توبہ کرلو) بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا (اور) مہربان ہے۔

اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ: ظن کے معنی گمان غالب کے ہیں، اس کے متعلق قرآن کریم نے اول تو یہ ارشاد فرمایا کہ "بہت سے گمانوں سے بچا کرو" پھر اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ "بعض گمان گناہ ہوتے ہیں" جس سے معلوم ہوا کہ ہر گمان گناہ نہیں تو یہ ارشاد سننے والوں پر اس کی تحقیق واجب ہوگئی کہ کون سے گمان گناہ ہیں تا کہ ان سے بچیں اور جب تک کسی گمان کا جائز ہونا معلوم نہ ہو جاوے اس کے پاس نہ جائیں، علماء و فقہاء نے اس کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں، چنانچہ ظن اور گمان کی چار قسمیں ہیں ایک حرام ہے، دوسری مامور بہ اور واجب ہے، تیسری مستحب اور مندوب ہے، چوتھی مباح اور جائز ہے:

① ظن حرام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی رکھے کہ وہ مجھے عذاب ہی دے گا یا مصیبت ہی میں رکھے گا اس طرح کہ اللہ کی مغفرت اور رحمت سے گویا مایوس ہے حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "لا يموتن احدكم الا وهو يحسن الظن بالله"، یعنی تم میں سے کسی کو اس کے بغیر موت نہ آنی چاہئے کہ اس کا اللہ کے ساتھ اچھا گمان ہو، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ حسن ظن فرض ہے اور بدگمانی حرام ہے، اسی طرح ایسے مسلمان جو ظاہری حالت میں نیک دیکھے جاتے ہیں، ان کے متعلق بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا حرام ہے، حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اياكم والظن فان الظن اكذب الحديث"، یعنی گمان سے بچو کیونکہ گمان جھوٹی بات ہے، یہاں ظن سے مراد باتفاق کسی مسلمان کے ساتھ بلا کسی قوی دلیل کے بدگمانی کرنا ہے۔

② ظن واجب یہ ہے کہ جو کام ایسے ہیں کہ ان میں کسی جانب پر عمل کرنا شرعاً ضروری ہے اور اس کے متعلق قرآن و سنت میں کوئی دلیل واضح موجود نہیں، وہاں پر ظن غالب پر عمل کرنا واجب ہے، جیسے باہمی منازعات و مقدمات کے فیصلہ میں ثقہ گواہوں کی گواہی کے مطابق فیصلہ دینا، کیونکہ حاکم اور قاضی جس کی عدالت میں مقدمہ دائر ہے اس پر اس کا فیصلہ دینا واجب و ضروری ہے اور اس خاص معاملے کے لئے کوئی نص قرآن و حدیث میں موجود نہیں تو ثقہ آدمیوں کی گواہی پر عمل کرنا اس کے لئے واجب ہے اگرچہ یہ امکان و احتمال وہاں بھی ہے کہ شاید کسی ثقہ آدمی نے اس وقت جھوٹ بولا ہو اس لئے اس کا سچا ہونا صرف ظن غالب ہے اور اسی پر عمل واجب ہے، اسی طرح جہاں سمت قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی نہ ہو جس سے معلوم کی جا سکے وہاں اپنے ظن غالب پر عمل ضروری ہے، اسی طرح کسی شخص پر کسی چیز کا ضمان دینا واجب ہوا تو اس ضائع شدہ چیز کی قیمت میں ظن غالب ہی پر عمل کرنا واجب ہے۔

③ ظن مباح ایسا ہے جیسے نماز کی رکعتوں میں شک ہو جائے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو اپنے ظن غالب پر عمل کرنا جائز ہے اور اگر وہ ظن غالب کو چھوڑ کر امر یقینی پر عمل کرے یعنی تین رکعت قرار دے کر چوتھی پڑھ لے تو یہ بھی جائز ہے، یا جیسے امور معاش میں گمان کرنا، یا ایسے شخص سے بدگمانی کرنا جس میں فسق کی علامتیں اعلانیہ پائی جاتی ہوں، جیسے کسی کا فاحشہ عورتوں کے مکانوں پر آمد و رفت کرنا اور اس کے متعلق فسق کا گمان ہو جانا مگر یقین نہ

کرے، اسی طرح جو بدگمانی بلا اختیار پیدا ہوجائے اس میں بھی گناہ نہیں، بشرطیکہ حتی الامکان اس کو دفع کرے۔

④ ظن مستحب ومندوب یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ نیک گمان رکھے کہ اس پر ثواب ملتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: **لولا اذسمعتموہ ظن المومنون والمومنت بانفسھم خیرا**، اس میں ایمان والوں کے بارے میں حسن ظن کی تاکید آئی ہے۔

چونکہ ظن اور گمان کی سب قسمیں حرام نہیں، اس لیے فرمایا کہ ''بہت سی بدگمانیوں سے بچا کرو''، کیونکہ جن گمانوں میں لوگ زیادہ تر مبتلا ہیں وہ حرام ہی ہیں، اور یہ جو مشہور ہے کہ: ''ان من الحزم سوء الظن'' یعنی احتیاط کی بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بدگمانی رکھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملہ ایسا کرے جیسے بدگمانی کی صورت میں کیا جاتا ہے کہ بغیر قوی اعتماد کے اپنی چیز کسی کے حوالہ نہ کرے، یہ مطلب نہیں کہ اس کو چور سمجھے اور اس کی تحقیر وتنقیص کرے، خلاصہ یہ ہے کہ کسی شخص کو چور یا غدار سمجھے بغیر اپنے معاملہ میں احتیاط برتے۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا: پیچھے آیت :اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ سنی ہوئی بات کی تحقیق کہاں واجب، کہاں جائز اور کہاں حرام ہے، چھپ کر باتیں سننا، یا اپنے کو سوتا ہوا بنا کر باتیں سن لینا یہ سب بھی تجسس میں داخل ہے، البتہ اگر کسی سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو اور اپنی یا دوسرے کسی مسلمان کی حفاظت کی غرض سے اس نقصان پہنچانے والے شخص کی تدبیروں اور ارادوں کا تجسس کرلے تو یہ جائز ہے۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا: تیسری چیز جس سے اس آیت میں منع فرمایا گیا ہے وہ کسی کی غیبت کرنا ہے، یعنی اس کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہنا جس کو وہ سنتا تو اس کو ایذا ہوتی اگرچہ وہ سچی بات ہی ہو، کیونکہ جو غلط الزام لگائے وہ تہمت ہے جس کی حرمت الگ قرآن کریم سے ثابت ہے، اور غیبت کی تعریف میں اس شخص کی غیر موجودگی کی قید سے یہ نہ سمجھا جائے کہ موجودگی کی حالت میں ایسی رنجیدہ بات کہنا جائز ہے، کیونکہ وہ غیبت تو نہیں مگر لمز میں داخل ہے جس کی حرمت اس سے پہلی آیت میں آچکی ہے۔

اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ: اس آیت نے کسی مسلمان کی آبروریزی اور توہین وتحقیر کو اس کا گوشت کھانے کی مثال ومشابہ قرار دیا ہے اگر اس کے وہ شخص سامنے ہو تو ایسا ہے جیسے کسی زندہ انسان کا گوشت نوچ کر کھایا جائے، اس کو قرآن میں بلفظ لمز تعبیر کرکے حرام قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی گزرا: **ولا تلمزوا انفسکم** اور آگے آئے گا: **ویل لکل همزة لمزة** اور وہ آدمی غائب ہو اس کے پیچھے اس کے متعلق ایسی بات کہنا جس سے اس کی آبرو میں خلل آئے اور اس کی تحقیر ہو یہ ایسا ہے جیسے کسی مردہ انسان کا گوشت کھایا جائے کہ جیسے مردہ کا گوشت کھانے سے مردے کو کوئی جسمانی اذیت نہیں ہوتی ایسے ہی اس غائب کو جب تک غیبت کی خبر نہیں ہوتی اس کو بھی کوئی اذیت نہیں ہوتی مگر جیسا کسی مردہ مسلمان کا گوشت کھانا حرام اور بڑی خست ودناءت کا کام ہے اسی طرح غیبت حرام بھی ہے اور خست ودناءت بھی کہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہنا کوئی بہادری کا کام نہیں۔

اس آیت میں ظن اور تجسس اور غیبت تین چیزوں کی حرمت کا بیان ہے مگر غیبت کی حرمت کا زیادہ اہتمام فرمایا کہ اس کو کسی مردہ مسلمان کا گوشت کھانے سے تشبیہ دے کر اس کی حرمت اور خست ودنائت کو واضح فرمایا، حکمت اس کی یہ ہے کہ کسی کے سامنے اس کے عیوب ظاہر کرنا بھی اگرچہ ایذا رسانی کی بنا پر حرام ہے، مگر اس کی مدافعت وہ آدمی خود بھی کرسکتا ہے اور مدافعت کے خطرہ سے ہر ایک کی ہمت بھی نہیں ہوتی اور وہ عادۃً زیادہ دیر رہ بھی نہیں سکتا بخلاف غیبت کے کہ وہاں کوئی مدافعت کرنے والا نہیں ہر کمتر سے کمتر آدمی بڑے سے بڑے کی غیبت کرسکتا ہے اور چونکہ کوئی مدافعت نہیں ہوتی اس لئے اس کا سلسلہ بھی عموماً طویل ہوتا ہے اور اس میں ابتلاء بھی زیادہ ہے، اس لئے غیبت کی حرمت زیادہ موکد کی گئی اور عام مسلمانوں پر لازم کیا گیا کہ جو سنے وہ اپنے غائب بھائی کی طرف سے بشرط قدرت مدافعت کرے اور مدافعت پر قدرت نہ ہو تو کم از کم اس کے سننے پر پرہیز کرے، کیونکہ غیبت کا بقصد واختیار سننا بھی ایسا ہی ہے جیسے خود غیبت کرنا۔

حضرت ابوسعید اور جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''الغیبة اشد من الزنا''، یعنی غیبت زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یہ کیسے، تو آپ نے فرمایا کہ ایک شخص زنا کرتا ہے پھر توبہ کرلیتا ہے تو اس کا گناہ معاف ہوجاتا ہے اور غیبت کرنے والے کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص معاف نہ کرے، جس کی غیبت کی گئی ہے، اس حدیث سے ثابت ہوا کہ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جس میں حق اللہ کی بھی مخالفت ہے اور حق العبد بھی ضائع ہوتا ہے، اس لئے جس کی غیبت کی گئی ہے اس سے معاف کرانا ضروری ہے، اور بعض علماء نے فرمایا

کہ غیبت کی خبر جب تک صاحب غیبت کو نہ پہنچے اس وقت تک وہ حق العبد نہیں ہوتی، اس لئے اس سے معافی کی ضرورت نہیں، اس صورت میں اگر چہ اس شخص سے معافی مانگنا ضروری نہیں، مگر جس شخص کے سامنے یہ غیبت کی تھی اس کے سامنے اپنی تکذیب کرنا یا اپنے گناہوں کا اقرار کرنا ضروری ہے، اور اگر وہ شخص مرگیا ہے یا اس کا پتہ نہیں تو اس کا کفارہ حضرت انس کی حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان من كفارة الغيبة ان يستغفر لمن اغتابه تقول اللهم اغفرلنا وله" یعنی کفارہ غیبت کا یہ ہے کہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرے اور یوں کہے کہ یا اللہ ہمارے اور اس کے گناہوں کو معاف فرما۔

مسئلہ: بچے اور مجنون اور کافر ذمی کی غیبت بھی حرام ہے، کیونکہ اس کی ایذا بھی حرام ہے، اور جو کافر حربی ہیں اگر چہ ان کی ایذا حرام نہیں مگر اپنا وقت ضائع کرنے کی وجہ سے پھر بھی غیبت مکروہ ہے۔

مسئلہ: غیبت جیسے قول اور کلام سے ہوتی ہے ایسے ہی فعل یا اشارہ سے بھی ہوتی ہے، جیسے کسی لنگڑے کی چال بنا کر چلنا جس سے اس کی تحقیر یا تنقیص ہو۔

مسئلہ: بعض روایات سے ثابت ہے کہ آیت میں جو غیبت کی عام حرمت کا حکم ہے یہ مخصوص البعض ہے، یعنی بعض صورتوں میں اس کی اجازت ہوئی ہے، مثلاً کسی شخص کی برائی کسی ضرورت یا مصلحت سے کرنا پڑے تو وہ غیبت میں داخل نہیں بشرطیکہ وہ ضرورت و مصلحت شرعاً معتبر ہو جیسے کسی ظالم کی شکایت کسی ایسے شخص کے سامنے کرنا جو ظلم کو دفع کر سکے، یا کسی کی اولاد و بیوی کی شکایت اس کے باپ اور شوہر سے کرنا جو ان کی اصلاح کر سکے، یا کسی واقعہ کے متعلق فتویٰ حاصل کرنے کے لئے صورت واقعہ کا اظہار یا مسلمانوں کو کسی شخص کے دینی یا دنیوی شر سے بچانے کے لئے کسی کا حال بتلانا، یا کسی معاملے کے متعلق مشورہ لینے کے لئے اس کا حال ذکر کرنا، یا جو شخص سب کے سامنے کھلم کھلا گناہ کرتا ہے اور اپنے فسق کو خود ظاہر کرتا پھرتا ہے اس کے اعمال بد کا ذکر بھی غیبت میں داخل نہیں، مگر بلا ضرورت اپنے اوقات ضائع کرنے کی بنا پر مکروہ ہے، اور ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ کسی کی برائی اور عیب ذکر کرنے سے مقصود اس کی تحقیر نہ ہو بلکہ کسی ضرورت و مجبوری سے ذکر کیا گیا ہو۔

* * *

فائدہ: ١ اختلاف و تفریق باہمی کے بڑھانے میں ان امور کو خصوصیت سے دخل ہے ایک فریق دوسرے فریق سے ایسا بدگمان ہو جاتا ہے کہ حسن ظن کو کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا، مخالف کی کوئی بات ہو اس کا محمل اپنے خلاف نکال لیتا ہے، اس کی بات میں ہزار احتمال بھلائی کے ہوں اور صرف ایک پہلو برائی کا نکلتا ہو، ہمیشہ اس کی طبیعت برے پہلو کی طرف چلے گی اور اسی برے اور کمزور پہلو کو قطعی اور یقینی قرار دے کر فریق مقابل پر تہمتیں اور الزام لگانا شروع کر دے گا، پھر نہ صرف یہ ہی کہ ایک بات حسب اتفاق پہنچ گئی، بدگمانی، سے اس کو غلط معنی پہنا دیے گئے نہیں، اس جستجو میں رہتا ہے کہ دوسری طرف کے اندرونی بھید معلوم ہوں جس پر ہم خوب حاشیے چڑھائیں اور اس کی غیبت سے اپنی مجلس گرم کریں، ان تمام خرافات سے قرآن کریم منع کرتا ہے، اگر مسلمان اس پر عمل کریں تو جو اختلافات بدقسمتی سے پیش آجاتے ہیں وہ اپنی حد سے آگے نہ بڑھیں اور ان کا ضرر بہت محدود ہو جائے، بلکہ چند روز میں نفسانی اختلافات کا نام و نشان باقی نہ رہے حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں،" الزام لگانا اور بھید ٹٹولنا اور پیٹھ پیچھے برا کہنا کسی جگہ بہتر نہیں، مگر جہاں اس میں کچھ دین کا فائدہ ہو اور نفسانیت کی غرض نہ ہو،" وہاں اجازت ہے جیسے رجال حدیث کی نسبت ائمہ جرح و تعدیل کا معمول رہا ہے کیونکہ اس کے بدون دین کا محفوظ رکھنا محال تھا۔

فائدہ: ٢ یعنی مسلمان بھائی کی غیبت کرنا ایسا گندہ اور گھناؤنا کام ہے جیسے کوئی اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھائے، کیا اس کو کوئی انسان پسند کرے گا؟ بس سمجھ لو غیبت اس سے بھی زیادہ شنیع حرکت ہے۔

فائدہ: ٣ یعنی ان نصیحتوں پر کار بند وہ ہی ہوگا جس کے دل میں خدا کا ڈر ہو یہ نہیں تو کچھ نہیں، چاہیے کہ ایمان و اسلام کا دعویٰ رکھنے والے واقعی طور پر خداوند قہار کے غضب سے ڈریں اور ایسی ناشائستہ حرکتوں کے قریب نہ جائیں، اگر پہلے کچھ غلطیاں اور کمزوریاں سرزد ہوئی ہیں، اللہ کے سامنے صدق دل سے توبہ کریں وہ اپنی مہربانی سے معاف فرما دے گا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّاُنۡثٰى وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآٮِٕلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ

اے آدمیو ! ہم نے تم کو بنایا ایک مرد اور ایک عورت سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے تاکہ آپس کی پہچان ہو

اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰٮكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌ خَبِيۡرٌ ﴿۱۳﴾

تحقیق عزت اللہ کے یہاں اسی کو بڑی جس کو ادب بڑا ۱؎ اللہ سب کچھ جانتا ہے خبردار ۲؎

خلاصہ تفسیر: اوپر کی آیات میں انسانی اور اسلامی حقوق اور آداب معاشرت کی تعلیم کے سلسلے میں چھ چیزوں کو حرام وممنوع کیا گیا ہے جو باہمی منافرت اور عداوت کا سبب ہوتی ہیں، اس آیت میں ایک جامع تعلیم انسانی مساوات کی ہے کہ کوئی انسان دوسرے کو کمتر یا رذیل نہ سمجھے اور اپنے نسب اور خاندان یا مال و دولت وغیرہ کی بنا پر فخر نہ کرے، کیونکہ یہ چیزیں درحقیقت تفاخر کی ہیں نہیں، پھر اس تفاخر سے باہمی منافرت اور عداوت کی بنیادیں پڑتی ہیں اس لئے فرمایا کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں اور خاندان اور قبائل یا مال و دولت کے اعتبار سے جو فرق اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے وہ تفاخر کے لئے نہیں بلکہ تعارف کے لئے ہے۔

اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی آدم وحوا) سے پیدا کیا (اس لئے اس میں تو سب انسان برابر ہیں) اور (پھر جس بات میں فرق رکھا ہے کہ) تم کو مختلف قومیں اور (پھر ان قوموں میں) مختلف خاندان بنایا (یہ محض اس لئے) تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو (جس میں بہت سی مصلحتیں ہیں، نہ اس لئے کہ ایک دوسرے پر تفاخر کرو، کیونکہ) اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو (اور پرہیزگاری ایسی چیز ہے جس کا پورا حال کسی کو معلوم نہیں، بلکہ اس کے حال کو محض) اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا (اور وہی اس سے) پورا خبردار ہے (اس لئے کسی نسب اور قومیت پر فخر نہ کرو)۔

وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآٮِٕلَ لِتَعَارَفُوۡا: ''شعوب''، شعب کی جمع ہے، بہت بڑی جماعت کو ''شعب'' کہتے ہیں جو کسی ایک اصل پر مجتمع ہوں، پھر ان میں مختلف قبائل اور خاندان ہوتے ہیں، پھر خاندانوں میں بھی بڑے خاندان اور اس کے مختلف حصوں کے عربی زبان میں الگ الگ نام ہیں، سب سے بڑا حصہ ''شعب'' اور سب سے چھوٹا حصہ ''عشیرہ'' کہلاتا ہے اوابورواق کا قول ہے کہ ''شعب'' اور شعوب عجمی قوموں کے لئے بولا جاتا ہے جس کے انساب محفوظ نہیں اور لفظ ''قبائل'' عرب کے لوگوں کے لئے جن کے انساب محفوظ چلے آتے ہیں اور لفظ ''اسباط'' بنی اسرائیل کے لئے۔

چنانچہ نسبی اور وطنی یا لسانی امتیاز میں حکمت ومصلحت تعارف کی ہے، قرآن کریم نے اس آیت میں واضح کردیا کہ حق تعالیٰ نے اگرچہ سب انسانوں کو ایک ہی باپ اور ماں سے پیدا کر کے سب کو بھائی بھائی بنادیا ہے، مگر پھر اس کی تقسیم مختلف قوموں قبیلوں میں جو حق تعالیٰ ہی نے فرمائی ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ لوگوں کا تعارف اور شناخت آسان ہوجائے، مثلاً ایک نام کے دو شخص ہیں تو خاندان کے تفاوت میں ان میں امتیاز ہوسکتا ہے، اور اس سے دور اور قریب کے رشتوں کا علم ہوسکتا ہے اور نسبی قرب وبعد کی مقدار پر ان کے حقوق شرعیہ ادا کئے جاتے ہیں، عصبات کا قرب وبعد معلوم ہوتا ہے جس کی ضرورت تقسیم میراث میں پیش آتی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ نسبی تفاوت کو تعارف کیلئے استعمال کرو تفاخر کے لئے نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اکثر غیبت، طعن وتشنیع اور عیب جوئی کا منشاء کبر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اس کو بتلاتے ہیں کہ اصل میں انسان کا بڑا چھوٹا یا معزز وحقیر ہونا ذات پات اور خاندان ونسب سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ جو شخص جس قدر نیک خصلت، مودب اور پرہیزگار ہو اسی قدر اللہ کے ہاں معزز ومکرم ہے، نسب کی حقیقت تو یہ ہے کہ سارے آدمی ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم (علیہ السلام) وحوا کی اولاد ہیں شیخ، سید، مغل، پٹھان اور صدیقی، فاروقی، عثمانی، انصاری سب کا سلسلہ آدم وحوا پر منتہی ہوتا ہے یہ ذاتیں اور خاندان اللہ تعالیٰ نے محض تعارف اور شناخت کے لیے مقرر کیے ہیں، بلاشبہ جس کو حق تعالیٰ کسی شریف اور بزرگ ومعزز گھرانے میں پیدا کردے وہ ایک موہوب شرف ہے، جیسے کسی کو خوبصورت بنادیا جائے، لیکن یہ چیز ناز اور

فخر کرنے کے لائق نہیں کہ اسی کو معیار کمال اور فضیلت کا ٹھہرالیا جائے اور دوسروں کو حقیر سمجھا جائے، ہاں! شکر کرنا چاہیے کہ اس نے بلا اختیار وکسب ہم کو یہ نعمت مرحمت فرمائی، شکر میں یہ بھی داخل ہے کہ غرور وتفاخر سے باز رہے اور اس نعمت کو کمینہ اخلاق اور بری خصلتوں سے خراب نہ ہونے دے، بہرحال مجد وشرف اور فضیلت وعزت کا اصلی معیار نسب نہیں تقویٰ وطہارت ہے اور متقی آدمی دوسروں کو حقیر کب سمجھے گا؟

فائدہ: ۲ یعنی تقویٰ اور ادب اصل میں دل سے ہے اللہ ہی کو خبر ہے کہ جو شخص ظاہر میں متقی اور مودب نظر آتا ہے وہ واقع میں کیسا ہے اور آئندہ کیسا رہے گا، انما العبرة للخواتیم۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ

کہتے ہیں گنوار کہ ہم ایمان لائے تو کہہ تم ایمان نہیں لائے پر تم کہو ہم مسلمان ہوئے اور ابھی نہیں گھسا ایمان

فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ

تمہارے دلوں میں ۱ے اور اگر حکم پر چلو گے اللہ کے اور اس کے رسول کے کاٹ نہ لے گا تمہارے کاموں میں کچھ

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾

اللہ بخشتا ہے مہربان ہے ۲ے

خلاصہ تفسیر: سابقہ آیات میں بتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت وشرافت کا مدار تقویٰ پر ہے جو ایک باطنی چیز ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتے ہیں کسی شخص کے لئے اپنے تقدس کا دعویٰ جائز نہیں، آگے ایک ایسی ہی خاص جماعت کی قباحت مذکور ہے جنہوں نے دکھاوے کے طور پر تقدس کا اظہار اور دعوی کیا تھا، اور چونکہ وہ جھوٹے تھے اس لیے زیادہ مذمت کی گئی، اور اس میں علاوہ ریا اور جھوٹ ہونے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی بھی ہے، کیونکہ ان کا یہ دعوی احسان جتلانے کے طور پر تھا، پس اس آیت کو شروع سورت سے بھی ربط ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب مذکور ہیں اور سورت کا آپ کے آداب سے شروع ہونا اور اسی پر ختم ہونا آپ کی عظمت شان کی طرف اشارہ ہے، نیز اس پوری سورت میں اول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق تعظیم وتکریم کا پھر باہمی حقوق اور آداب معاشرت کا ذکر آیا ہے، ختم سورت پر یہ بتلایا گیا کہ آخرت میں سب اعمال کی مقبولیت کا مدار ایمان اور تصدیق قلبی اور اللہ ورسول کی اطاعت پر ہے۔

یہ (بنی اسد وغیرہ کے بعض) گنوار (آپ کے پاس آکر جو ایمان کا دعوی کرتے ہیں اس میں انہوں نے کئی گناہوں کا ارتکاب کیا، ایک تو جھوٹ کا کہ تصدیق قلبی کے بغیر محض زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرما دیجئے کہ تم ایمان تو نہیں لائے (کیونکہ ایمان دل کی تصدیق پر موقوف ہے، اور ان کے دل میں تصدیق نہیں جیسا عنقریب آتا ہے: ولما یدخل الایمان) لیکن (ہاں) یوں کہو کہ (ہم مخالفت چھوڑ کر) مطیع ہو گئے (اور اطاعت۔ بمعنی ترک مخالفت۔ محض ظاہری موافقت سے بھی ثابت ہو جاتی ہے) اور (باقی) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا (اس لئے ایمان کا دعویٰ مت کرو) اور (اگرچہ اب تک تم ایمان نہیں لائے لیکن اب بھی) اگر تم اللہ ورسول کا (سب باتوں میں) کہنا مان لو (جس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ دل سے ایمان لے آؤ) تو اللہ تمہارے اعمال میں سے (جو کہ ایمان کے بعد ہوں گے اس گزشتہ وقت کے کفر اور جھوٹ کی وجہ سے) ذرا بھی کم نہ کرے گا (کیونکہ سچے ایمان سے گزشتہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں، بلکہ سب کا پورا پورا ثواب دے گا، کیونکہ) بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔

وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا: چونکہ ان کے دلوں میں ایمان نہ تھا، جھوٹا دعویٰ صرف ظاہری افعال کی بناء پر کر رہے تھے اس لئے قرآن نے ان کے ایمان کی نفی اور دعوائے ایمان کے غلط ہونے کو بیان کر کے یہ فرمایا کہ تمہارا آمنا کہنا تو جھوٹ ہے، تم زیادہ سے زیادہ اسلمنا کہہ سکتے ہو، کیونکہ اسلام کے لفظی معنی ظاہری افعال میں اطاعت کرنے کے ہیں اور یہ لوگ اپنے دعوائے ایمان کو سچا ثابت کرنے کے لئے کچھ اعمال مسلمانوں جیسے کرنے

لگے تھے، اس لئے لفظی اعتبار سے ایک درجہ کی اطاعت ہوگئی اس لئے لغوی معنی کے اعتبار سے اسلمنا کہنا صحیح ہوسکتا ہے۔

اسلام وایمان ایک ہیں یا کچھ فرق ہے؟ اوپر کی تقریر سے معلوم ہوگیا کہ اس آیت میں اسلام کے لغوی معنی مراد ہیں، اصطلاحی معنی مراد ہی نہیں اس لئے اس آیت سے اسلام اور ایمان میں اصطلاحی فرق پر کوئی استدلال نہیں ہوسکتا، اور اصطلاحی ایمان اور اصطلاحی اسلام اگرچہ مفہوم ومعنی کے اعتبار سے الگ الگ ہیں کہ ایمان اصطلاح شرع میں تصدیق قلبی کا نام ہے، یعنی اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول کی رسالت کو سچا ماننا، اور اسلام نام ہے اعمال ظاہرہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کا، لیکن شریعت میں تصدیق قلبی اس وقت تک قابل اعتبار نہیں جب تک اس کا اثر جوارح کے اعمال وافعال تک نہ پہنچ جائے جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ زبان سے کلمہ اسلام کا اقرار کرے، اس طرح اسلام اگرچہ اعمال ظاہرہ کا نام ہے لیکن شریعت میں وہ اس وقت تک معتبر نہیں جب تک کہ دل میں تصدیق نہ آجائے، ورنہ وہ نفاق ہے، اس طرح اسلام وایمان مبدا اور منتہی کے اعتبار سے تو الگ الگ ہیں کہ ایمان باطن اور قلب سے شروع ہوکر ظاہر اعمال تک پہنچتا ہے اور اسلام افعال ظاہرہ سے شروع ہوکر باطن کی تصدیق تک پہنچتا ہے مگر مصداق کے اعتبار سے ان دونوں میں تلازم ہے کہ ایمان اسلام کے بغیر معتبر نہیں اور اسلام ایمان کے بغیر شرعاً معتبر نہیں، شریعت میں یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص مسلم تو ہو مومن نہ ہو یا مومن ہو مسلم نہ ہو، مگر یہ کلام اصطلاحی ایمان واسلام میں ہے، لغوی معنی کے اعتبار سے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص مسلم ہو مومن نہ ہو جیسے تمام منافقین کا یہی حال تھا کہ ظاہری اطاعت احکام کی بنا پر مسلم کہلاتے تھے مگر دل میں ایمان نہ ہونے کے سبب مومن نہ تھے، واللہ اعلم۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا: اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اپنے اعمال پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور جو حق بات بھی دل میں آئے یا ملے، یا حق راستہ کی طرف چلے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہاں یہ بتلاتے کہ ایمان ویقین جب پوری طرح دل میں راسخ ہوجائے اور جڑ پکڑ لے اس وقت غیبت اور عیب جوئی وغیرہ کی خصلتیں آدمی سے دور ہوجاتی ہیں، جو شخص دوسروں کے عیب ڈھونڈنے اور آزار پہنچانے میں مبتلا ہو، سمجھ لو کہ ابھی تک ایمان اس کے دل میں پوری طرح پیوست نہیں ہوا، ایک حدیث میں ہے: "يَا مَعْشَرَ مَنْ اٰمَنَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ يُفْضِ الْاِيْمَانُ اِلٰى قَلْبِهٖ لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِيْنَ وَلَا تَتَّبِعُوْا عَوْرَاتِهِمْ" الخ (ابن کثیر، ۸/ ۲٤) حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "ایک کہتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں یعنی دین مسلمان ہم نے قبول کیا، اس کا مضائقہ نہیں، اور ایک کہتا ہے کہ ہم کو پورا یقین ہے، جو یقین پورا ہے تو اس کے آثار کہاں؟ جس کو واقعی پورا یقین حاصل ہو وہ تو ایسے دعوے کرنے سے ڈرتا اور شرماتا ہے"۔

تنبیہ: اس آیت سے ایمان واسلام کا فرق ظاہر ہوتا ہے، اور یہ ہی بات حدیث جبرائیل وغیرہ سے ثابت ہوئی ہے، ہم نے شرح صحیح مسلم میں اس موضوع پر کافی بحث کی ہے، یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اب بھی اگر فرمانبرداری کا راستہ اختیار کروگے تو پچھلی کمزوریوں کی وجہ سے تمہارے کسی عمل کے ثواب میں کمی نہ کرے گا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر، پھر شبہ نہ لائے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵

وہ لوگ جو ہیں وہی ہیں سچے

خلاصہ تفسیر: آگے بتاتے ہیں کہ اب ہم سے سنو کہ کامل مومن کون ہیں تاکہ اگر تم کو مومن بننا ہے تو ویسے بنو، سو:

پورے مومن وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (ایمان پر مستمر بھی رہے، یعنی عمر بھر کبھی) شک نہیں کیا اور اپنے مال اور جان سے خدا کے راستہ میں (یعنی دین کے لئے) محنت اٹھائی (جس میں جہاد وغیرہ سب آگیا، سو) یہ لوگ ہیں سچے (یعنی پورے سچے)۔

اور یوں اگر صرف تصدیق ہی ہو تب بھی ایمان ہو جائے گا، اور تمہارے میں تو ایمان کا ادنی درجہ بھی نہیں اور دعوی کرتے ہو کامل ایمان کا، پس ایک جرم تو ان سے یہ جھوٹ کا صادر ہوا، کما قال تعالیٰ: ومن الناس من یقول امنا (الی قولہ) وما ھم بمومنین۔

* * *

فائدہ: یعنی سچے مومن کی شان یہ ہوتی ہے کہ اللہ و رسول پر پختہ اعتقاد رکھتا ہو، اور ان کی راہ میں ہر طرح جان و مال سے حاضر رہے۔

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

تو کہہ کیا تم جتلاتے ہو اللہ کو اپنی دینداری اور اللہ کو تو خبر ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾

اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے

خلاصہ تفسیر: اور جھوٹ کے علاوہ دوسرا جرم یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتے ہو، کما قال تعالیٰ: یخدعون اللہ، سو: آپ (ان سے) فرما دیجئے کہ کیا خدا تعالیٰ کو اپنے دین (قبول کرنے) کی خبر دیتے ہو (یعنی اللہ تعالیٰ تو جانتے ہیں کہ تم نے ایمان قبول نہیں کیا، اس کے باوجود جو تم ایمان قبول کرنے کا دعوی کرتے ہو تو اس سے لازم آتا ہے کہ علم خداوندی کے خلاف خدا تعالیٰ کو ایک بات بتلاتے ہو) حالانکہ (یہ محال ہے، کیونکہ) اللہ کو تو سب آسمان اور زمین کی سب چیزوں کی (پوری) خبر ہے، اور (آسمان و زمین کے علاوہ) اللہ (اور بھی) سب چیزوں کو جانتا ہے (تو اس کو کوئی کیا بتلائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو جو تمہارے متعلق علم ہے کہ تم ایمان نہیں لائے وہی صحیح ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر واقعی سچا دین اور پورا یقین تم کو حاصل ہے تو کہنے سے کیا ہوگا جس سے معاملہ ہے وہ آپ خبردار ہے۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ

تجھ پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوئے [1] تو کہہ مجھ پر احسان نہ رکھو اپنے اسلام لانے کا بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو راہ دی

لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ

ایمان کی اگر سچ کہو [2] اللہ جانتا ہے چھپے بھید آسمانوں کے اور زمین کے، اور اللہ دیکھتا ہے

بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ ع ۱۴

جو تم کرتے ہو [3]

خلاصہ تفسیر: اور تیسرا جرم جس کے یہ لوگ مرتکب ہوتے ہیں یہ ہے کہ:

یہ لوگ اپنے اسلام لانے کا آپ پر احسان رکھتے ہیں (جو نہایت درجہ گستاخی ہے کہ دیکھئے ہم نہ لڑے نہ بھڑے مسلمان ہو گئے اور دوسرے لوگ بہت پریشان کر کر کے مسلمان ہوئے ہیں سو) آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ رکھو (اس لئے کہ قطع نظر گستاخی کے تمہارے اسلام سے میرا کیا فائدہ، اور تمہارے اسلام نہ لانے سے میرا کیا نقصان، اگر تم اس دعوی میں سچے ہوتے تو تمہاری ہی آخرت کا نفع ہوتا، اور جھوٹے ہونے میں بھی تمہارا ہی دنیا کا نفع ہے کہ قتل و قید سے بچ گئے، سو مجھ پر احسان رکھنا محض جہالت ہے) بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کی ہدایت دی بشرطیکہ تم (اس دعوی ایمان میں) سچے ہو (کیونکہ ایمان بڑی نعمت ہے اور حق تعالیٰ کی تعلیم و توفیق کے بغیر ایمان نصیب نہیں ہوتا تو

اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ ایسی بڑی نعمت عطا فرمادی، پس جھوٹ، فریب اور احسان جتلانے سے باز آؤ اور یہ یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کی سب مخفی باتوں کو جانتا ہے اور (اسی علم محیط کی وجہ سے) تمہارے سب اعمال کو بھی جانتا ہے (اور ان ہی کے موافق تم کو جزا دے گا، پھر اس کے سامنے باتیں بنانے سے کیا فائدہ)۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا: یہاں ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تو آمنّا کہا تھا، اسلمنا تو نہیں کہا تھا، جیسا کہ پیچھے گذرا: **قالت الاعراب آمنا**، تو پھر یہاں ان اسلموا کیوں فرمایا گیا؟ جواب یہ ہے کہ اگر یہاں ان اسلمنا ہوتا تو پھر یہ شبہ ہوسکتا تھا، جبکہ یہاں آیت میں تو غائب کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو ان کا کلام ہو ہی نہیں سکتا تھا، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کے ایمان کو چونکہ پیچھے اسلام فرمایا ہے: **قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا** اور وہ اسی کے دعوے دار تھے اسی لیے اسلموا سے یہ مقصود ہے کہ وہ اپنی ظاہری اطاعت کا جس کو واقع اور حقیقت میں اسلام کہنا زیادہ زیبا ہے وہ اس کو ایمان کہتے ہیں اور آپ پر احسان رکھتے ہیں۔

اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ: یہاں لفظ ''ایمان'' فرمانے سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان کا ایمان ہونا تسلیم کرلیا گیا، بات یہ ہے کہ یہاں بطور فرض کے گفتگو ہے جس میں ان کی طرف سے حکایت کی گئی ہے جیسا کہ: ان کنتم صدقین میں قرینہ ہے، یعنی اگر بالفرض تمہارے دعوی کے مطابق اس کو ایمان مان لیا جائے تو بھی خدا ہی کا احسان ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ بعض گنوار آ کر کہتے تھے کہ دیکھئے ہم تو بدون لڑے بھڑے مسلمان ہوگئے گویا احسان جتلاتے تھے، اسکا جواب آگے دیتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر واقعی تم دعوائے اسلام وایمان میں سچے ہو تو یہ تمہارا احسان نہیں، اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ایمان کی طرف آنے کا راستہ دیا اور دولت اسلام سے سرفراز کیا اگر سچی بات کہو تو واقعہ اس طرح ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جو نیکی اپنے ہاتھ سے ہو، اپنی تعریف نہیں رب کی تعریف ہے جس نے وہ نیکی کروائی''، گویا خاتمہ سورت پر متنبہ کردیا کہ اگر تم کو قرآنی آیات اور اسلامی تعلیمات پر کاربند ہونے کی توفیق ہو تو احسان نہ جتلاؤ بلکہ اللہ کے احسان وانعام کا شکر ادا کرو جس نے ایسی توفیق ارزانی فرمائی۔

فائدہ: ۳ یعنی دلوں کے بھید اور ظاہر کا عمل سب کو خدا جانتا ہے، اس کے سامنے باتیں نہ بناؤ۔

ایاتها ٤٥ | ٥٠ سُوْرَةُ قٓ مَكِّيَّةٌ ٣٤ | ركوعاتها ٣

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے ختم پر واللہ بصیر بما تعملون میں جزاوسزا واقع ہونے کی طرف اشارہ تھا اور اس سورت میں تمام تر یہی مضمون ہے کہ قیامت کا امکان، اس کا واقع ہونا اور اس کے واقعات اور اسی کے مناسب مضامین مذکور ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بےحد مہربان نہایت رحم والا ہے

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ① بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا

قسم ہے اس قرآن بڑی شان والے کی، بلکہ انکو تعجب ہوا کہ آیا ان کے پاس ڈر سنانے والا انہی میں سے ہوگا تو کہنے لگے منکر یہ

شَيْءٌ عَجِيْبٌ ② ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ③

تعجب کی چیز ہے، کیا جب ہم مرچکیں اور ہوجائیں مٹی یہ پھر آنا بہت دور ہے ۱

خلاصہ تفسیر: قٓ (اس کے معنی اللہ کو معلوم ہیں) قسم ہے قرآن مجید کی (یعنی جس کو دوسری کتابوں پر فضیلت وشرف ہے کہ ہم

نے آپ کو قیامت کے عذاب سے ڈرانے کے لئے بھیجا ہے مگر ان لوگوں نے نہ مانا) بلکہ ان کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس انہی (کی جنس) میں سے (یعنی انسانوں میں سے) ایک ڈرانے والا (پیغمبر) آ گیا (جس نے ان کو قیامت کے دن سے ڈرایا) سو (اس پر) کافر لوگ کہنے لگے کہ (اول تو خود) یہ (ایک) عجیب بات ہے (کہ انسان پیغمبر ہو، دوسرے پھر دعویٰ بھی عجیب بات کا کرے کہ ہم دوبارہ زندہ ہوں گے، بھلا) جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے تو کیا دوبارہ زندہ ہوں گے یہ دوبارہ زندہ ہونا (امکان سے) بہت ہی بعید ہے (خلاصہ یہ ہے کہ اول تو وہ ہم جیسے انسان ہیں ان کو پیغمبری کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں، پھر وہ اپنے دعوے میں ایک محال چیز کا دعویٰ کرتے ہیں کہ مرنے اور مٹی ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اس محال دعویٰ سے تو رسالت کی مزید نفی ہوتی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی قرآن کی بزرگی اور عظمت شان کا کیا کہنا جس نے آخر سب کتابوں کو منسوخ کر دیا اور اپنی اعجازی قوت اور لامحدود اسرار و معارف سے دنیا کو محوِ حیرت بنا دیا، یہی بزرگی والا قرآن بذاتِ خود شاہد ہے کہ اس کے اندر کوئی نقص و عیب نہیں نہ کہیں انگلی رکھنے کی جگہ ہے، لیکن منکرین پھر بھی اس کو قبول نہیں کرتے اس لیے نہیں کہ ان کے پاس اس کے خلاف کوئی حجت و برہان ہے بلکہ محض اپنے جہل اور حماقت سے اس پر تعجب کرتے ہیں کہ ان ہی کے خاندان اور نسل کا ایک آدمی ان کی طرف رسول ہو کر آیا اور بڑا بن کر سب کو نصیحتیں کرنے لگا، اور بات بھی ایسی عجیب کہی جسے کوئی باور نہ کر سکے، بھلا جب ہم مر کر مٹی ہو گئے، کیا پھر زندگی کی طرف واپس کیسے جائیں گے؟ یہ واپسی تو عقل سے بہت دور اور امکان و عادت سے بالکل بعید ہے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝۴

ہم کو معلوم ہے جتنا گھٹاتی ہے زمین ان میں سے ۱۔ اور ہمارے پاس کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے ۲۔

خلاصہ تفسیر: ان کی بات کے جواب میں حق تعالیٰ اب مرنے کے بعد زندہ ہونے کا امکان ثابت کر کے ان کے محال کہنے کو رد فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ دوبارہ زندہ ہونے کو تم جو غیر ممکن کہتے ہو اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں، یا تو یہ کہ جن چیزوں کے زندہ ہونے کو کہا گیا ہے ان میں زندہ ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو، یہ تو مشاہدہ سے غلط ہے، کیونکہ وہ اس وقت تمہارے سامنے زندہ موجود ہیں، اگر زندگی کی صلاحیت ہی نہ ہوتی تو اس وقت کیسے زندہ ہیں، دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت اس لئے نہ ہو کہ جو اجزاء مردہ کے مٹی ہو کر منتشر اور ریزہ ریزہ ہو گئے وہ اس کو معلوم نہ ہوں کہ کہاں بکھرے ہیں، تو اس کے جواب میں فرمایا کہ ہمارے علم کی تو یہ شان ہے کہ:

ہم ان کے ان اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی (کھاتی ہے اور) کم کرتی ہے اور (یہی نہیں کہ ہم آج سے جانتے ہیں، بلکہ ہمارا علم تو قدیم ہے، حتیٰ کہ ہم نے عالم کے پیدا ہونے سے پہلے ہی تمام چیزوں کے حالات ایک کتاب یعنی لوح محفوظ میں لکھ دیئے تھے اور اب تک) ہمارے پاس (وہ) کتاب (یعنی لوح) محفوظ (موجود) ہے (جس میں ان منتشر اجزاء اور ریزوں کی جگہ، ہیئت، مقدار اور حالت سب کچھ ہے، سو اگر علم قدیم کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو یوں ہی سمجھ لے کہ وہ دفتر جس میں سب کچھ ہے، حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی ساری مٹی نہیں ہو جاتی، جان سلامت رہتی ہے اور بدن کے اجزاء تحلیل ہو کر جہاں کہیں منتشر ہو گئے ہیں وہ سب اللہ کے علم میں ہیں، اس کو قدرت ہے کہ ہر جگہ سے اجزائے اصلیہ کو جمع کر کے ڈھانچہ کھڑا کر دے اور دوبارہ اس میں جان ڈال دے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی یہ نہیں کہ آج سے معلوم ہے بلکہ ہمارا علم قدیم ہے حتیٰ کہ ان میں قبل وقوع ہی سب اشیاء کے سب حالات ایک کتاب میں جو "لوح محفوظ" کہلاتی ہے لکھ دیے تھے اور اب تک ہمارے پاس وہ کتاب موجود چلی آتی ہے، پس اگر علم قدیم کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو یوں ہی سمجھ لے وہ دفتر جس میں سب کچھ لکھا ہے حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہے، یا اس کو پہلے جملہ کی تاکید سمجھو، کیونکہ جو چیز کسی کے علم میں ہو اور قلم بند بھی کر لی جائے وہ

لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ مؤکد سمجھی جاتی ہے، اسی طرح یہاں مخاطبین کے محسوسات کے اعتبار سے متنبہ کردیا کہ ہر چیز خدا کے علم میں ہے اور اس کے ہاں لکھی ہوئی ہے جس میں ذرا کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ⑤

کوئی نہیں پر جھٹلاتے ہیں سچے دین کو جب ان تک پہنچا سو وہ پڑ رہے ہیں الجھی ہوئی بات میں

خلاصہ تفسیر: (مگر یہ لوگ پھر بھی بلاوجہ تعجب ہی میں ہیں، اور صرف تعجب ہی نہیں) بلکہ سچی بات کو (جس میں مسئلہ نبوت اور آخرت کی زندگی بھی ہے) جبکہ وہ ان کو پہنچتی ہے جھٹلاتے ہیں، غرض یہ کہ وہ ایک متزلزل حالت میں ہیں (کہ کبھی تعجب کرتے ہیں، کبھی جھٹلاتے ہیں، یہ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر تھا)۔

* * *

فائدہ: یعنی صرف تعجب نہیں بلکہ کھلی ہوئی تکذیب ہے، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قرآن اور بعث بعد الموت، ہر چیز کو جھٹلاتے ہیں اور عجب الجھی ہوئی باتیں کرتے ہیں، بیشک جو شخص سچی باتوں کو جھٹلاتا ہے، اسی طرح شک واضطراب اور تردد وتحیر کی الجھنوں میں پڑ جایا کرتا ہے۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ⑥

کیا نہیں دیکھتے آسمان کو اپنے اوپر کیسا ہم نے اس کو بنایا اور رونق دی اور اس میں نہیں کوئی سوراخ

خلاصہ تفسیر: (اب قدرت کا بیان ہے یعنی) کیا ان لوگوں (کو ہماری قدرت کا علم نہیں ہے اور کیا انہوں) نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا (اونچا اور بڑا) بنایا اور (ستاروں سے) اس کو آراستہ کیا اور اس میں (مضبوطی اور استحکام کی وجہ سے) کوئی رخنہ تک نہیں (جیسا کہ اکثر تعمیرات میں زمانہ دراز کے بعد رخنہ پڑ جاتا ہے، یہ تو خدا کی قدرت آسمان میں ہوئی)۔

دوسری آیت میں جو آسمان کے دروازوں کا ذکر آیا ہے وہ رخنے نہیں ہیں، اور اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان نظر آتا ہے اور یہ جو مشہور ہے کہ یہ نیلا رنگ جو نظر آتا ہے یہ ہوا کا رنگ ہے تو ممکن ہے کہ اس کے رنگ میں آسمان کا رنگ بھی ملا ہوا ہو، اور اس کے اندر آسمان بھی نظر آتا ہو، اس کے علاوہ آیت میں نظر سے مراد نظر عقلی بمعنی غور وفکر بھی مراد ہوسکتی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی آسمان کو دیکھ لو، نہ بظاہر کوئی کھمبا نظر آتا ہے نہ ستون، اتنا بڑا عظیم الشان جسم کیسا مضبوط ومستحکم کھڑا ہے اور رات کو جب اس پر ستاروں کی قندیل اور جھاڑ فانوس روشن ہوتے ہیں تو کس قدر پر رونق اور خوبصورت نظر آتا ہے، پھر لطف یہ ہے کہ ہزاروں لاکھوں برس گزر گئے نہ اس چھت میں کہیں سوراخ ہوا، نہ کوئی کنگرہ گرا، نہ پلاسٹر ٹوٹا، نہ رنگ خراب ہوا، آخر کون سا ہاتھ ہے جس نے یہ مخلوق بنائی اور بنا کر اس کی ایسی حفاظت کی۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ⑦

اور زمین کو پھیلایا اور ڈالے اس میں بوجھ اور اگائی اس میں ہر ہر قسم کی رونق کی چیز سمجھانے کو

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ⑧

اور یاد دلانے کو اس بندہ کے لیے جو رجوع کرے

خلاصہ تفسیر: اور زمین (میں یہ قدرت ظاہر ہے کہ اس) کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جما دیا اور اس میں ہر قسم کی

خوش نما چیزیں اگائیں جو ذریعہ ہے بینائی اور دانائی کا (یعنی ہماری قدرت کی معرفت کا) ہر رجوع ہونے والے بندے کے لئے (یعنی ایسے شخص کے لئے جو اسی غرض سے مخلوقات اور مصنوعات میں دیکھے اور فکر کرے کہ ان کی طرف متوجہ ہونا عین خدا کی طرف متوجہ کرنا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو آدمی خدا کی طرف رجوع کرتا ہو محض ان ہی محسوسات کے دائرہ میں الجھ کر نہ رہ جائے اس کے لیے آسمان وزمین کی تخلیق وتنظیم میں دانائی وبینائی کے کتنے سامان ہیں جن میں ادنیٰ غور کرنے سے صحیح حقیقت تک پہنچ سکتا ہے اور بھولے ہوئے سبق اس کو یاد آسکتے ہیں، پھر خدا جانے ایسی روشن نشانیوں کی موجودگی میں بھی یہ لوگ کیونکر حق کو جھٹلانے کی جرأت کرتے ہیں۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝۹ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ

اور اتارا ہم نے آسمان سے پانی برکت کا پھر اگائے ہم نے اس سے باغ اور اناج جس کا کھیت کاٹا جاتا ہے ۱؎ اور کھجوریں لمبی

لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝۱۰ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝۱۱

ان کا خوشہ ہے تہ پر تہ ۲؎ روزی دینے کو بندوں کے، اور زندہ کیا ہم نے اس ایک مُردہ دیس کو، یونہی ہوگا نکل کھڑے ہونا ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (ہماری قدرت اس سے ظاہر ہے کہ) ہم نے آسمان سے برکت (یعنی نفع) والا پانی برسایا پھر اس سے بہت سے باغ اگائے اور کھیتی کا غلہ، اور لمبی لمبی کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے ہوتے ہیں، بندوں کے رزق دینے کے لئے، اور ہم نے اس (بارش) کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندہ کیا (پس) اسی طرح (سمجھ لو کہ مردوں کا) زمین سے نکلنا ہوگا

کیونکہ خدا کی ذاتی قدرت کے سامنے تو تمام چیزیں برابر ہیں،، بلکہ جو ذات بڑی چیزوں پر قادر ہے اس کا چھوٹی چیزوں پر قادر ہونا اور زیادہ ظاہر ہے، اسی لئے آسمان وزمین کا یہاں ذکر کیا گیا، کہ ان کی تخلیق ایک مردہ کو دوبارہ زندہ کرنے سے بہت بڑی بات ہے کما قال تعالیٰ: لخلق السمٰوٰت والارض اکبر تو جب ان بڑے بڑے کاموں پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ثابت ہوگئی تو مردہ کو زندہ کردینے پر کیوں نہ ہوگی، تو معلوم ہوا کہ مردوں کو زندہ کرنا محال نہیں، ممکن ہے اور زندہ کرنے والا فاعل مختار بڑی قدرت والا ہے، پھر اس میں تعجب یا تکذیب کی کیا بات ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اناج وہ ہے جس کے ساتھ اس کا کھیت بھی کٹ جائے اور باغ پھل ٹوٹ کر قائم رہتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بڑی کثرت وافراط سے جن کا خوشہ دیکھنے میں بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی بارش برسا کر مردہ زمین کو زندہ کردیا۔ اسی طرح قیامت کے دن مردے زندہ کردیے جائیں گے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۝۱۲ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۝۱۳

جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے نوح کی قوم اور کنوئیں والے اور ثمود، اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی

وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝۱۴

اور بن کے رہنے والے اور تبع کی قوم ۱؎ ان سب نے جھٹلایا رسولوں کو پھر ٹھیک پڑا میرا ڈرانا ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب جھٹلانے والوں کو ڈرانے کے لئے پچھلی امتوں کے واقعات بتلا کر وعید کی گئی ہے کہ جس طرح یہ لوگ قیامت کے انکار سے رسول کی تکذیب کرتے ہیں اسی طرح) ان سے پہلے قوم نوح اور اصحاب الرس اور ثمود، اور عاد اور فرعون اور قوم لوط، اور اصحاب

ایکہ اور قوم تبع تکذیب کر چکے ہیں (یعنی) سب نے پیغمبروں کو (یعنی اپنے اپنے پیغمبر کو توحید، رسالت اور قیامت کے معاملہ میں) جھٹلایا سو میری وعید (ان پر) محقق ہوگئی (کہ ان سب پر غذاب نازل ہوا، اسی طرح ان جھٹلانے والوں پر بھی عذاب آئے گا، خواہ دنیا میں بھی یا صرف آخرت میں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ان اقوام کے قصے سورۃ حجر، فرقان، دخان وغیرہ میں گزر چکے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تکذیب انبیاء پر جس انجام سے ڈرایا گیا تھا وہ ہی سامنے آکر رہا۔

ع ۱۵/۱۵

أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٥﴾

اب کیا ہم تھک گئے پہلی بار بنا کر، کوئی نہیں ان کو دھوکا ہے ایک نئے بنانے میں

خلاصہ تفسیر: (وعید کے بعد اب پھر پہلے مضمون کی طرف دوسرے طور پر رجوع ہے کہ) کیا ہم پہلی بار کے پیدا کرنے میں تھک گئے (کہ دوبارہ زندہ نہ کر سکیں، یعنی ایک مانع یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کام بھی ممکن ہو اور کرنے والے کو قدرت بھی پوری ہو، مگر کوئی عارضی مانع پیش آجائے جیسے کرنے والا تھک گیا ہو، اس لئے یہ کام نہیں کر سکا، اس آیت میں اس کی بھی نفی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ اس طرح کے عیوب سے پاک ہے اور وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا، نہ اس کو تکان ہونے کا کوئی امکان ہے، اس لئے قیامت میں دوبارہ زندہ ہونا دلائل سے ثابت ہو گیا اور یہ لوگ جو انکار کر رہے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے) بلکہ یہ لوگ از سرِ نو پیدا کرنے کی طرف سے (محض بے دلیل) شبہ میں (پڑے ہوئے) ہیں (جو دلائل کے سامنے کسی طرح قابل التفات نہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی دوبارہ نئے سرے سے پیدا کرنے میں انہیں فضول دھوکا لگ رہا ہے، جس نے پہلی بار پیدا کیا دوسری مرتبہ پیدا کر دینا کیا مشکل ہے؟ کیا یہ گمان کرتے ہو کہ (معاذ اللہ) وہ پہلی دفعہ دنیا کو بنا کر تھک گیا ہوگا؟ اس قادرِ مطلق کی نسبت ایسے تو ہمات قائم کرنا سخت جہالت اور گستاخی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴿١٦﴾

اور البتہ ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں ۱؎ اور ہم اس سے نزدیک ہیں دھڑکتی رگ سے زیادہ ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت میں مردوں کے زندہ ہونے کا امکان ثابت ہو چکا، اب آگے اس کا واقع ہونا بتلاتے ہیں، اور چونکہ دوبارہ زندہ کرنے سے غرض جزا و سزا دینا ہے اور یہ اس پر موقوف ہے کہ جزا و سزا دینے والے کو اعمال کا کامل علم ہو اور عمل کرنے والے پر کامل قدرت بھی ہو اس لیے پہلے اس کا بیان ہے۔

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (جو اعلیٰ درجہ کی دلیل ہے قدرت پر) اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان (تک) کو (بھی) جانتے ہیں (تو جو افعال ان کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے صادر ہوں ان کو تو بدرجہ اولیٰ جانتے ہیں) اور (بلکہ ہم کو تو اس کے احوال کا ایسا علم ہے کہ اس کو خود بھی اپنے احوال کا ایسا علم نہیں، پس علم کے اعتبار سے) ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ (جس کے کٹ جانے سے انسان مر جاتا ہے اور اس کی روح نکل جاتی ہے)۔

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ: اس کا جمہور مفسرین نے یہی مطلب قرار دیا ہے کہ قرب سے مراد قرب علمی اور احاطہ علمی ہے قرب مسافت مراد نہیں، یعنی اس سے رب اور بندہ کے درمیان مشترک قرب ذاتی پر استدلال کرنا صحیح نہیں، جبکہ صوفیائے کرام کے نزدیک ''قرب'' سے مراد اس جگہ صرف

قرب علمی اور احاطہ علمی ہی نہیں، بلکہ ایک خاص قسم کا اتصال ہے، جس کی حقیقت اور کیفیت تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی، مگر یہ قرب و اتصال بلا کیف موجود ضرور ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **واسجد واقترب** یعنی "سجدہ کرو اور ہمارے قریب ہو جاؤ" اور ہجرت کے واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے فرمایا: "**الله معنا**" یعنی اللہ ہمارے ساتھ ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا: **ان معی ربی** یعنی میرا رب میرے ساتھ ہے، اور حدیث میں ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہو۔

مذکورہ قرب و تقرب جو عبادات کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اور انسان کے لئے کسب و عمل کا نتیجہ ہوتا ہے وہ صرف مومن کے لئے مخصوص ہے اور ایسے مومنین "اولیاء اللہ" کہلاتے ہیں جن کو حق تعالیٰ کے ساتھ یہ تقرب حاصل ہو، یہ اتصال و قرب اس قرب کے علاوہ ہے جو حق تعالیٰ کو ہر انسان مومن و کافر کی جان کے ساتھ یکساں ہے، غرض مذکورہ آیا ور وایات اس پر شاہد ہیں کہ انسان کو اپنے خالق و مالک کے ساتھ ایک خاص قسم کا اتصال حاصل ہے اگرچہ ہم اس کی حقیقت اور کیفیت کا ادراک نہ کر سکیں، مولانا رومی نے اسی کو فرمایا ہے:

اتصالے بے مثال و بے قیاس — ہست رب الناس را با جان ناس

یہ قرب و اتصال آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ فراست ایمانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے، تفسیر مظہری میں اسی قرب و اتصال کو اس آیت کا مفہوم قرار دیا ہے اور جمہور مفسرین کا قول پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اتصال سے مراد اتصال علمی اور احاطہ علمی ہے اور ابن کثیر نے ان دونوں معنی سے الگ ایک تیسری تفسیر یہ اختیار کی ہے کہ آیت میں لفظ نحن سے خود حق تعالیٰ کی ذات مراد نہیں، بلکہ اس کے فرشتے مراد ہیں جو انسان کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں، وہ انسان کی جان سے اتنے باخبر ہوتے ہیں کہ خود انسان بھی اپنی جان سے اتنا باخبر نہیں ہوتا، واللہ اعلم۔

مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ: چونکہ لوگوں کی عام عادت میں جان اور روح نکالنے کے لئے گردن کاٹنے ہی کا طریقہ رائج ہے، اس لئے یہ تعبیر اختیار کی گئی، لفظ "ورید" عربی زبان میں ہر جاندار کی وہ رگیں ہیں جن سے خون کا سیلان تمام بدن میں ہوتا ہے، طبی اصطلاح میں یہ دو قسم کی رگیں ہیں، ایک وہ جو جگر سے نکلتی ہیں اور خالص خون سارے بدن انسانی میں پہنچاتی ہیں، طبی اصطلاح میں صرف انہی رگوں کو "ورید" اور جمع کو "اوردہ" کہا جاتا ہے، دوسری قسم وہ رگیں جو حیوان کے قلب سے نکلتی ہیں اور خون کی وہ لطیف بھاپ جس کو طبی اصطلاح میں "روح" کہا جاتا ہے وہ اسی طرح تمام بدن انسانی میں پھیلاتی اور پہنچاتی ہیں ان کو "شریان" اور "شرائین" کہا جاتا ہے، پہلی قسم کی رگیں موٹی اور دوسری باریک ہوتی ہیں، یہاں "شریان" مراد لینا زیادہ مناسب ہے کیونکہ ان میں روح غالب اور خون مغلوب رہتا ہے، اور "ورید" میں اس کے برعکس ہوتا ہے، اور یہاں آیت میں جس کو روح میں زیادہ دخل ہو اس کا مراد لینا مناسب ہے، اور وہ شریانیں ہیں، اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سورہ حاقہ میں لفظ "وتین" فرمایا ہے جو دل کی رگ ہے، کیونکہ جو رگیں دل سے نکلتی ہیں وہ شرائین ہیں اور اگرچہ یہاں قرآن میں لفظ "ورید" ہے مگر معنی لغوی اس کے عام ہیں جس میں دل سے نکلنے والی رگیں شرائین بھی داخل ہیں اور جگر سے نکلنے والی رگیں ورید بھی۔

چنانچہ آیت مذکورہ میں یہ ضروری نہیں کہ "ورید" کا لفظ طبی اصطلاح کے مطابق اس رگ کے لئے لیا جائے جو جگر سے نکلتی ہے، بلکہ قلب سے نکلنے والی رگ کو بھی لغت کے اعتبار سے "ورید" کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں بھی ایک قسم کا خون ہی دوران کرتا ہے اور اس جگہ چونکہ مقصود آیت کا انسان کے قلبی خیالات اور احوال سے مطلع ہونا ہے، اس لئے وہ زیادہ انسب ہے اور بہر حال خواہ "ورید" باصطلاح طب جگر سے نکلنے والی رگ کے معنی میں ہو یا قلب سے نکلنے والی "شریان" کے معنی میں، بہر دو صورت جاندار کی زندگی اس پر موقوف ہے، یہ رگیں کاٹ دی جائیں تو جاندار کی روح نکل جاتی ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ ہم علم کے اعتبار سے اس کی روح اور نفس سے بھی زیادہ نزدیک ہیں، یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے، یعنی جس چیز پر انسان کی زندگی موقوف ہے ہم اس چیز سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں، یعنی اس کی ہر چیز کا علم رکھتے ہیں، چنانچہ انسان کو اپنی بہت سی حالتوں کا تو علم ہی نہیں ہوتا اور جن کا علم ہوتا ہے ان میں بھی بعض اوقات نسیان یا ان سے ذہول ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ میں ان

احتمالات کی گنجائش ہی نہیں اور ظاہر ہے کہ جو علم ہر حالت میں ہو اس کا تعلق بہ نسبت اس کے کہ ایک حالت میں ہو زیادہ ہوگا، غرض انسان کے تمام احوال کے ساتھ علم الٰہی کا متعلق ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس کے ہر قول وفعل سے ہم خبردار ہیں حتیٰ کہ جو وساوس وخطرات اس کے دل میں گزرتے ہیں ان کا بھی ہم کو علم ہے: اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ (الملک: ۱۴)

فائدہ: ۲؎ گردن کی رگ مراد ہے جسے "شہ رگ" کہتے ہیں اور جس کے کٹنے سے انسان مرجاتا ہے، شاید یہ کنایہ ہو جان اور روح سے، مطلب یہ ہوا کہ ہم (باعتبار علم کے) اس کی روح اور نفس سے بھی نزدیک تر ہیں، یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے، نیز علت اور منشاء کو معلول اور ناشئی کے ساتھ وہ قرب حاصل ہوتا ہے جو معلول اور ناشئی کو خود اپنے نفس سے بھی نہیں ہوتا، اس کا کچھ مختصر بیان: اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ وَ اَزۡوَاجُہٗۤ اُمَّہٰتُہُمۡ (الاحزاب: ۶) کے حواشی میں ہو چکا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "اللہ اندر سے نزدیک ہے اور رگ آخر باہر ہے جان سے"، وَلَنِعۡمَ مَاقِیۡلَ:

جاں نہاں در جسم واو در جاں نہاں   اے نہاں اندر نہاں اے جان جاں!

اِذۡ یَتَلَقَّی الۡمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الۡیَمِیۡنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ ﴿۱۷﴾

جب لیتے جاتے ہیں دو لینے والے داہنے بیٹھا اور بائیں بیٹھا ۱؎

مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ﴿۱۸﴾

نہیں بولتا کچھ بات جو نہیں ہوتا اس کے پاس ایک راہ دیکھنے والا تیار ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب مزید تاکید کے لئے یہ بیان فرمایا کہ انسان کے اعمال واحوال صرف یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں محفوظ ہوں بلکہ ظاہری حجت تمام کرنے کے لئے وہ اعمال فرشتوں کے ذریعہ لکھوا کر بھی محفوظ کئے گئے، سو ان کو اس وقت کی بھی حالت بتلادیجئے کہ:

جب دو اخذ کرنے والے فرشتے (انسان کے اعمال کو جب وہ اس سے صادر ہوتے ہیں) اخذ کرتے رہتے ہیں جو کہ داہنی اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں (اور برابر ہر عمل کو لکھتے رہتے ہیں، لقولہ تعالیٰ: ان رسلنا یکتبون ما تمکرون، یہاں تک کہ سب کاموں میں ہلکا اور آسان انسان کی گفتگو اور کلام ہے، مگر اس کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار (موجود ہوتا) ہے (اگر وہ نیکی کی بات ہوئی تو داہنے والا اس کو ضبط اور تحریر میں لاتا ہے، اگر بدی کی بات ہوئی تو بائیں والا لکھتا ہے، جب زبان سے نکلنے والی ایک ایک بات تک لکھی جاتی ہے جو اور کاموں سے آسان اور ہلکی ہے تو دوسرے اعمال کیوں نہ لکھے جائیں گے)۔

وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیۡدٌ: یہاں اعمال لکھنے والے فرشتوں کو قعید یعنی بیٹھا ہوا فرمایا تو ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان بیٹھتا ہے تو وہ فرشتے بیٹھ جاتے ہیں اور جب چلتا ہے تو ایک فرشتہ آگے اور ایک پیچھے ہو جاتا ہے، اور جب لیٹتا ہے تو ایک سرہانے اور ایک پیروں کی طرف ہوتا ہے، اور قضائے حاجت وغیرہ کے وقت جدا ہو جاتے ہیں، مگر خدا نے ان کو اعمال کی کوئی ایسی پہچان دی ہے کہ اس وقت جو آدمی نے کام کیے ہیں ان کو معلوم کر لیتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دو فرشتے خدا کے حکم سے ہر وقت اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں جو لفظ اس کے منہ سے نکلے وہ لکھ لیتے ہیں، نیکی داہنے والا، اور بدی بائیں والا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی لکھنے کو تیار ہے۔

تنبیہ: دونوں فرشتے کہاں رہتے ہیں؟ اور علاوہ اقوال کے کیا کیا کچھ لکھتے ہیں؟ اس کی تفصیل احادیث و آثار سے ملے گی۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾

اور وہ آئی بیہوشی موت کی تحقیق ۱؎ یہ وہ ہے جس سے تو ٹلتا رہتا تھا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اصل مقصود تو قیامت اور جزا و سزا کے واقع ہونے کو بتلانا ہے، چونکہ آخرت کی زندگی اور اعمال کی جزا و سزا سب کا مقدمہ موت ہے، اس لئے انسان کو متنبہ کرنے کے لئے پہلے اس کا ذکر ہے، اگرچہ موت کا کسی کو انکار نہیں، مگر قیامت سے انکار در حقیقت موت سے غفلت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، موت کا نصب العین ہونا انسان کو فکر اور طلب حق کی طرف متوجہ کر دیتا ہے جس کے بعد دلائل میں غور کر کے قیامت کا قائل ہو سکتا ہے، پس ارشاد ہے کہ لو ہوشیار ہو جاؤ۔

اور موت کی سختی حقیقۃً (قریب) آپہنچی (یعنی ہر شخص کی موت قریب ہے چنانچہ ظاہر ہی ہے) یہ (موت) وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا (اور بھاگتا) تھا۔

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ: موت سے بھاگنا طبعی طور پر تو ہر نیک و بد میں یکساں ہے، بدکار تو دنیا کی محبت کی وجہ سے اور نیک آدمی طبعی خوف کی وجہ سے، البتہ کافر فاجر کا موت سے بھاگنا دنیا کی محبت کی وجہ سے اور بھی زیادہ واضح ہے، کسی خاص بندہ پر اللہ سے ملنے کے شوق کا غلبہ ہو کر موت کا لذیذ اور مطلوب ہو جانا اس کے منافی نہیں، کیونکہ یہ عارضی بات ہے جبکہ یہاں اس کا ذاتی اثر بیان کرنا مقصود ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی لو! ادھر مسل تیار ہوئی، ادھر موت کی گھڑی آپہنچی، اور مرنے والا نزع کی بیہوشیوں اور جاں کنی کی سختیوں میں ڈبکیاں کھانے لگا، اس وقت وہ سب سچی باتیں نظر آنا شروع ہو گئیں جن کی خبر اللہ کے رسولوں نے دی تھی، اور میت کی سعادت و شقاوت سے پردہ اٹھنے لگا اور ایسا پیش آنا قطعی اور یقینی تھا، کیونکہ حکیم مطلق کی بہت سی حکمتیں اس سے متعلق تھیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی آدمی نے موت کو بہت کچھ ٹالنا چاہا، اور اس ناخوشگوار وقت سے بہت کچھ بھاگتا اور کتراتا رہا پر یہ گھڑی ٹلنے والی کہاں تھی، آخر سر پر آ کھڑی ہوئی کوئی تدبیر اور حیلہ دفع الوقتی کا نہ چل سکا۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۗ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾

اور پھونکا گیا صور، یہ ہے دن ڈرانے کا

خلاصہ تفسیر: مقدمہ یعنی موت کے بیان کے بعد اب قیامت کے واقع ہونے کا بیان ہے، جو کہ اصل مقصود تھا۔

اور (قیامت کے دن دوبارہ) صور پھونکا جائے گا (تو سب زندہ ہو جائیں گے) یہی دن ہوگا وعید کا (جس سے لوگوں کو ڈرایا جاتا تھا)۔

* * *

فائدہ: چھوٹی قیامت تو موت کے وقت ہی آچکی تھی، اس کے بعد بڑی قیامت حاضر ہے، بس صور پھونکا گیا اور وہ ہولناک دن آموجود ہوا، جس سے انبیاء و رسل برابر ڈراتے چلے آتے تھے۔

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾

اور آیا ہر ایک جی اس کے ساتھ ہے ایک ہانکنے والا اور ایک احوال بتلانے والا

خلاصہ تفسیر: اب آگے قیامت کے ہولناک واقعات اور حالات کا بیان ہے۔

اور ہر شخص اس طرح (میدان قیامت میں) آئے گا کہ اس کے ساتھ (دو فرشتے ہوں گے جن میں) ایک (تو میدان قیامت کی طرف)

اس کو اپنے ہمراہ لائے گا اور ایک (اس کے اعمال کا) گواہ ہوگا۔

مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ: مرفوع حدیث میں ہے کہ یہ سائق اور شہید وہی دو فرشتے ہیں جو زندگی میں انسان کے دائیں اور بائیں اس کے اعمال کو لکھتے تھے، اور اگر یہ حدیث محدثین کی شرائط کے مطابق قوی نہ ہو تو احتمال ہے کہ کوئی اور دو فرشتے ہوں جیسا کہ بعض قائل ہوئے ہیں اگرچہ اس صورت میں بھی حدیث کے ساتھ موافقت کی وجہ سے پہلا احتمال ہی راجح ہوگا۔

* * *

فائدہ: یعنی محشر میں اس طرح حاضر کیے جائیں گے کہ ایک فرشتہ پیشی کے میدان کی طرف دھکیلتا ہوگا اور دوسرا اعمالنامہ لیے ہوگا، جس میں اس کی زندگی کے سب احوال درج ہوں گے، شاید یہ وہ ہی دو فرشتے ہوں جو "کراماً کاتبین" کہلاتے ہیں اور جن کی نسبت فرمایا تھا: اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ (ق: ۱۷) اور ممکن ہے کوئی اور ہوں۔

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾

تو بے خبر رہا اس دن سے اب کھول دی ہم نے تجھ پر سے تیری اندھیری سو تیری نگاہ آج تیز ہے

خلاصہ تفسیر: (جب وہ میدان قیامت میں حاضر ہوں گے تو ان میں جو کافر ہوں گے ان سے خطاب ہوگا کہ) تو اس دن سے بے خبر تھا (یعنی اس کا قائل نہ تھا) سو اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (غفلت اور انکار کا) ہٹا دیا (اور قیامت کا معائنہ کرا دیا) سو آج (تو) تیری نگاہ بڑی تیز ہے (کہ قیامت کے معائنہ سے کوئی چیز مانع نہیں، کاش دنیا میں بھی تو اس غفلت کے پردہ کو دور کر دیتا تو تیرے دن بھلے ہوتے)۔

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ: اس سے کفار کے لیے بھی بغیر کسی ریاضت ومجاہدہ کے کشف کا حاصل ہوجانا معلوم ہوتا ہے تو پھر ایسی چیز مؤمن کے لیے مطلوب اور مقصود نہیں ہونی چاہیے (یعنی مؤمن کو ایسی چیز کا طالب بننا چاہیے جو عام نہ ہو، یعنی کفار کو شامل نہ ہو، کیونکہ کشف کا حصول تو ہر ایک کو عطا ہوسکتا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اس وقت کہا جائے گا کہ دنیا کے مزوں میں پڑ کر تو آج کے دن سے بیخبر تھا اور تیری آنکھوں کے سامنے شہوات وخواہشات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، پیغمبر جو سمجھاتے تھے، تجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، آج ہم نے تیری آنکھ سے وہ پردے ہٹا دیے اور نگاہ خوب تیز کر دی، اب دیکھ لے جو باتیں کہی گئی تھیں، صحیح ہیں یا غلط۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿۲۳﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۲۴﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ

اور بولا فرشتہ اس کے ساتھ والا یہ ہے جو میرے پاس تھا حاضر ۱؎ ڈال دو تم دونوں دوزخ میں ہر ناشکر مخالف کو، نیکی سے روکنے والا

مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ﴿۲۵﴾ الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿۲۶﴾

حد سے بڑھنے والا شبہ ڈالنے والا ۲؎ جس نے ٹھہرایا اللہ کے ساتھ اور کو پوجنا سو ڈال دو اس کو سخت عذاب میں ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (اس کے بعد اعمال لکھنے والا) فرشتہ (یہاں بھی ایک قول میں سائق یا شاہد آیا ہے) جو اس کے ساتھ رہتا تھا (نامہ اعمال حاضر کر کے) عرض کرے گا کہ یہ وہ (روزنامچہ) ہے جو میرے پاس تیار ہے (چنانچہ اس روزنامچہ کے موافق کافروں کے بارے میں دو فرشتوں کو خواہ وہ مذکورہ سائق وشہید ہوں یا کوئی اور دو فرشتے ہوں حکم ہوگا کہ) ہر ایسے شخص کو جہنم میں ڈال دو جو کفر کرنے والا ہو اور (حق سے) ضد رکھتا ہو اور نیک کام سے روکتا ہو اور حد (عبدیت) سے باہر ہوجانے والا ہو اور (دین میں) شبہ پیدا کرنے والا ہو، جس نے خدا کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کیا

ہو سوایسے شخص کو سخت عذاب میں ڈال دو۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ: ابن جریج نے یہاں ''قرین'' کی تفسیر میں فرشتہ اور آگے آنے والی آیت میں ''قرین'' کی تفسیر میں شیطان کہا ہے، یہاں ''قرین'' سے مراد وہ فرشتہ ہے جو انسان کے ساتھ اس کے اعمال لکھنے کے لئے رہتا تھا اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کاتب اعمال دو فرشتے ہوتے ہیں، مگر قیامت میں انسان کی حاضری کے وقت ایک کو ''سائق'' دوسرے کو ''شہید'' اس سے پہلے آیت میں فرمایا ہے، اس لئے نسق کلام سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کاتب اعمال دو فرشتوں کو میدان حشر میں اس کی حاضری کے وقت دو کام سپرد کر دیئے گئے ہیں، ایک کے ذمہ اس کے پیچھے رہ کر اس کو میدان حشر میں پہنچا نا لگایا گیا، جس کو آیت میں ''سائق'' کا نام دیا گیا ہے دوسرے کے سپرد اس کے نامہ اعمال کر دیئے گئے جس کو ''شہید'' کے نام سے تعبیر کیا گیا، تو میدان حشر میں پہنچنے کے بعد نامہ اعمال والا فرشتہ یعنی ''شہید'' یہ عرض کرے گا هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ یعنی اس کے اعمال میرے پاس لکھے ہوئے موجود ہیں اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں فرمایا کہ یہاں لفظ "قرین" سائق اور شہید دونوں کو شامل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی فرشتہ اعمالنامہ حاضر کرے گا اور بعض نے قرین سے مراد ''شیطان'' لیا ہے، یعنی شیطان کہے گا کہ یہ مجرم حاضر ہے جس کو میں نے اغواء کیا اور دوزخ کے لیے تیار کر کے لایا ہوں، مطلب یہ کہ اغواء تو میں نے کیا، مگر میرا ایسا زور تسلط نہ تھا کہ زبر دستی اس کو شرارت میں ڈال دیتا، یہ اپنے ارادہ اختیار سے گمراہ ہوا۔

فائدہ: ۲؎ بارگاہ ایزدی سے یہ حکم دو فرشتوں کو ہوگا کہ ایسے لوگوں کو جہنم میں جھونک دو (اعاذنا اللہ منہا)۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ایسے لوگ جہنم میں سخت ترین عذاب کے مستحق ہیں۔

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾

بولا شیطان اس کا ساتھی اے رب! ہمارے میں نے اس کو شرارت میں نہیں ڈالا پر یہ تھا راہ کو بھولا دور پڑا ہوا

خلاصہ تفسیر: جب کفار کو معلوم ہوگا کہ اب وہ ہمیشہ کے لیے خسارہ میں پڑنے والے ہیں تو اس وقت اپنے بچاؤ کے واسطے گمراہ کرنے والوں کے ذمہ الزام رکھیں گے کہ ہمارا قصور نہیں، ہمیں تو دوسروں نے گمراہ کیا ہے، اور چونکہ ان گمراہ کرنے والوں میں شیاطین بھی داخل ہیں، اب آگے ان کا جواب مذکور ہے:

وہ شیطان جو اس کے ساتھ رہتا تھا کہے گا کہ اے ہمارے پروردگار! میں نے اس کو (جبراً) گمراہ نہیں کیا تھا (جیسا کہ اس کے الزام رکھنے سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس کے اپنے اختیار کو بالکل دخل نہ ہو) لیکن (بات یہ ہے کہ) یہ خود ہی دور دراز کی گمراہی میں (باختیار خود) تھا (اگرچہ بہکایا میں نے بھی جس میں کوئی جبر نہ تھا، اس لئے اس کی گمراہی کا اثر مجھ پر نہ ہونا چاہئے)۔

قَالَ قَرِيْنُهٗ: یہاں ''قرین'' سے مراد شیطان ہے، فرشتہ اور شیطان دونوں کو ''قرین'' کہنا اس معنی میں ہے کہ مسلم کی حدیث میں صراحت ہے کہ ہر شخص کے ساتھ دو قرین ہیں: ایک فرشتہ، ایک شیطان، اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ فرشتہ نیک باتیں بتلاتا ہے اور شیطان بری باتیں۔

* * *

فائدہ: یعنی میری کچھ زبردستی اس پر نہ چلتی تھی، ذرا شہ دی تھی کہ یہ کم بخت خود گمراہ ہو کر نجات وفلاح کے راستہ سے دور جا پڑا، شیطان یہ کہہ کر اپنا جرم ہلکا کرنا چاہتا ہے۔

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾

فرمایا جھگڑا نہ کرو میرے پاس اور میں پہلے ہی ڈرا چکا تھا تم کو عذاب سے ۱؎

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴿۲۹﴾ ع

بدلتی نہیں بات میرے پاس اور میں ظلم نہیں کرتا بندوں پر ۲؎

خلاصہ تفسیر: ارشاد ہوگا کہ میرے سامنے جھگڑے کی باتیں مت کرو (کہ بے فائدہ ہیں) اور میں تو پہلے ہی تمہارے پاس وعید بھیج چکا تھا (کہ جو کفر کرے گا چاہے ازخود یا کسی کے بہکانے سے، اسی طرح جو کفر کا حکم کرے گا خواہ اپنی مرضی سے یا کسی کے جبر سے سب کو جہنم کی سزا دوں گا اگرچہ ہر ایک کا درجہ مختلف ہوگا، سو) میرے ہاں (وہ) بات (وعید کی) نہیں بدلی جائے گی (بلکہ تم سب دوزخ میں جھونکے جاؤ گے) اور میں (اس تجویز میں) بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں (بلکہ بندوں نے خود ایسے ناشائستہ کام کئے جس کی سزا آج بھگت رہے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بک بک مت کرو، دنیا میں سب کو نیک و بد سے آگاہ کر دیا گیا تھا، اب ہر ایک کو اس کے جرم کے موافق سزا ملے گی، جو گمراہ ہوا اور جس نے اغواء کیا سب اپنی حرکتوں کا خمیازہ بھگتیں گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہمارے یہاں ظلم نہیں، جو کچھ فیصلہ ہوگا عین حکمت اور انصاف سے ہوگا۔

''اور بات نہیں بدلتی''، یعنی کافر بخشا نہیں جاتا، بھلا شیطان اکفر کی بخشش تو کہاں۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴿۳۰﴾

جس دن ہم کہیں دوزخ کو تو بھر چکی اور وہ بولے کچھ اور بھی ہے ۱؎

خلاصہ تفسیر: (یہاں سے محشر کے بقیہ واقعات کا بیان ہے کہ وہ دن لوگوں کو یاد دلایئے) جس دن کہ ہم دوزخ سے (کفار کو اس میں داخل کرنے کے بعد) کہیں گے کہ تو بھر بھی گئی اور وہ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے۔

هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ: یہ پوچھنا شاید کفار کو اور زیادہ ڈرانے کے لئے ہو کہ جواب سن کر ان کے دل میں دوزخ کی اور بھی زیادہ ہول پیدا ہو جائے کہ ہم کیسے غضب کے ٹھکانے پر پہنچے ہیں جو سب کو کھا جانا چاہتا ہے اور جہنم کی طرف سے هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کا جواب میں غالباً اسی غیظ و غضب کا مظاہرہ ہے جو جہنم کو خدا کے دشمن کفار کے ساتھ ہے، جہنم نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میرا پیٹ نہیں بھرا بلکہ مزید کی فرمائش غیظ و غضب کی وجہ سے کی، اس جواب کے بعد حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ اس پر اپنا قدم رکھ دیں گے اور وہ دب جائے گی اور سمٹ جائے گی اور عرض کرے گی کہ بس بس بھر گئی، اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: لاملئن جهنم من الجنة والناس اجمعين یعنی میں جہنم کو جنات اور انسانوں سے بھر دوں گا، جبکہ یہاں آیت: هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھرے گی نہیں، جواب یہ ہے کہ اخیر میں تو بھر جائے گی، اگرچہ پہلے پہل نہ بھرے، پس وہ وعدہ انتہا کے اعتبار سے ہے، اور اس آیت کے منافی نہیں، اگر یہ کہا جائے کہ یہ بھرنا تو قدم سے ہوگا، آدمیوں اور جنوں سے نہ ہوگا، جواب یہ ہے کہ بھرے گی تو آدمیوں اور جنات ہی سے، قدم کا صرف تصرف ہوگا، جیسے گیلی مٹی کے برتن میں کنکر وغیرہ تھوڑے سے بھرے جائیں کہ وہ اوچھا رہے، پھر اس کو ہاتھ سے دبایا جائے کہ وہ چاروں طرف سے دب دبا کر اندر سے اتنا رہ جائے کہ وہ کنکر منہ تک آ جائیں، اور قدم کے معنی متشابہات میں سے ہیں، اس کی تفتیش نہیں کرنی چاہیے، معنی آیت کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ سابقہ لاملئن کے لئے جنات اور انسانوں کو جہنم میں ڈالتے جائیں گے اور جہنم یہی کہتی رہے گی کہ کچھ اور بھی ہے؟؟!۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دوزخ کا پھیلاؤ اس قدر لوگوں سے نہ بھرے گا اور شدت غیظ سے اور زیادہ کافروں اور نافرمانوں کو طلب کرے گی۔

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ﴿۳۱﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ﴿۳۲﴾

اور نزدیک لائی جائے بہشت ڈرنے والوں کے واسطے دور نہیں [1] یہ ہے جسکا وعدہ ہوا تھا تم سے ہر ایک رجوع رہنے والے یاد رکھنے والے کے واسطے

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ﴿۳۳﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ﴿۳۴﴾

جو ڈرا رحمان سے بن دیکھے اور لایا دل رجوع ہونے والا ، چلے جاؤ اس میں سلامت [2] یہ دن ہمیشہ رہنے کا [3]

خلاصہ تفسیر: اور (جنت کا بیان یہ ہے کہ وہ) جنت متقیوں کے قریب کردی جائے گی کہ کچھ دور نہ رہے گی (اور متقیوں سے کہا جائے گا کہ) یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے (اس عنوان سے) وعدہ کیا جاتا تھا وہ ہر ایسے شخص کے لئے ہے جو (خدا کی طرف دل سے) رجوع ہونے والا (اور رجوع ہو کر اعمال وطاعات کی) پابندی کرنے والا ہو (غرض یہ کہ) جو خدا سے بے دیکھے ڈرتا ہوگا اور (اللہ کے پاس) رجوع ہونے والا دل لے کر آئے گا (ان کو حکم ہوگا کہ) اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہ دن ہے ہمیشہ رہنے (کے لئے حکم ہونے) کا۔

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ: جنت کے قریب کرنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں: ① یا تو اس جگہ سے منتقل کر کے میدان قیامت میں لے آئیں، اور اللہ کو سب قدرت ہے، اس صورت میں اُدْخُلُوْهَا کے معنی یہ نہیں کہ ابھی چلے جاؤ، بلکہ بشارت اور وعدہ ہے کہ تم حساب و کتاب وغیرہ کے بعد اس میں جانا ② دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ حساب سے فراغت کے بعد ان لوگوں کو جنت کے قریب پہنچا کر باہر ہی سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، پھر اور قریب کر کے کہا جائے گا کہ اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جنت اس سے دور نہ ہوگی، بہت قریب سے اس کی تروتازگی اور بناؤ سنگار دیکھیں گے۔

فائدہ: [2] یعنی جنہوں نے دنیا میں خدا کو یاد رکھا اور گناہوں سے محفوظ ہو کر اس کی طرف رجوع ہوئے، اور بے دیکھے اس کے قہر و جلال سے ڈرے اور ایک پاک وصاف رجوع ہونے والا دل لے کر حاضر ہوئے، اس جنت کا وعدہ ایسے لوگوں سے کیا گیا تھا وقت آ گیا ہے کہ سلامتی و عافیت کے ساتھ اس میں داخل ہوں، فرشتے ان کو سلام کریں اور ان کے پروردگار کا سلام پہنچائیں۔

فائدہ: [3] حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اس دن جس کو جو کچھ ملا سو، ہمیشہ کے لیے ہے، اس سے پہلے ایک بات پر ٹھہراؤ نہ تھا''۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴿۳۵﴾

ان کے واسطے وہ جو وہاں چاہیں گے اور ہمارے پاس کچھ زیادہ بھی ہے

خلاصہ تفسیر: ان کو بہشت میں سب کچھ ملے گا جو جو چاہیں گے اور ہمارے پاس (ان کی چاہی ہوئی چیزوں سے) اور بھی زیادہ (نعمت) ہے (کہ وہاں تک جنتی کا ذہن بھی نہ پہنچے گا)۔

جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے متعلق فرمایا کہ ''وہ ایسی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا خیال آیا''، اور ان نعمتوں میں سے ایک نعمت باری تعالیٰ کی تجلی ہے، اور بعض حوریں ہوں گی وہ کہیں گی کہ ہم ''مزید'' نعمتوں میں سے ہوں)۔

* * *

فائدہ: یعنی جو چاہیں گے وہ ملے گا اس کے علاوہ وہ نعمتیں ملیں گی جو ان کے خیال میں بھی نہیں، مثلاً دیدار الٰہی کی لذت بے قیاس اور ممکن ہے: وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ سے یہ غرض ہو کہ ہمارے پاس بہت ہے، جنتی کتنا ہی مانگیں سب دیا جائے گا، اللہ کے ہاں اتنا دینے پر بھی کوئی کمی نہیں آتی، نہ اس

کے لیے کوئی رکاوٹ ہے، پس اتنی بے حساب و بیشمار عطایا کو مستبعد نہ سمجھو، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ۭ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٦﴾

اور کتنی تباہ کر چکے ہم ان سے پہلے جماعتیں کہ ان کی قوت زبردست تھی ان سے پھر لگے کریدنے شہروں میں کہیں ہے بھاگ جانے کو ٹھکانہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کے واقع ہونے اور اس کے واقعات کا ذکر تھا جس میں کفار کی سزا بھی مذکور تھی، چونکہ عذاب ہونا کفر کے مبغوض اور برا ہونے پر موقوف ہے اور کفار اس کے بھی منکر تھے اس لیے آگے کفر کی برائی پہلے عذاب کے ذریعہ کافروں کے ہلاک ہونے سے ثابت کرتے ہیں اور اس پر بھی ان لوگوں کا انکار چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث رنج تھا اس لیے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے۔

اور ہم ان (اہل مکہ) سے پہلے بہت سی امتوں کو (ان کے کفر کی شامت سے) ہلاک کر چکے ہیں جو قوت میں ان سے (کہیں) زیادہ تھے اور (دنیا کا سامان بڑھانے کے لئے) تمام شہروں کو چھانتے پھرتے تھے (یعنی قوت کے ساتھ اسباب معیشت میں بھی بہت ترقی کی تھی، لیکن جب ہمارا عذاب نازل ہوا تو ان کو) کہیں بھاگنے کی جگہ بھی نہ ملی (یعنی کسی طرح بچ نہ سکے)۔

* * *

فائدہ: پہلے کفار کی تعذیب اخروی کا بیان تھا، درمیان میں ان کے مقابلہ پر اہل جنت کے تنعم کا ذکر آ گیا، اب پھر کفار کی سزا دہی کا ذکر کرتے ہیں، یعنی آخرت سے پہلے دنیا ہی میں ہم کتنی شریر و سرکش قوموں کو تباہ کر چکے ہیں جو زور وقوت میں موجود اقوام کفار سے بڑھ چڑھ کر تھیں، اور جنہوں نے بڑے بڑے شہر چھان مارے تھے، پھر جب عذاب الٰہی آیا تو بھاگ جانے کو روئے زمین پر کہیں ٹھکانہ نہ ملا، یا یہ مطلب ہے کہ عذاب کے وقت اپنی بستیوں میں کھوج لگانے لگے کہ کہیں پناہ ملے، مگر کوئی ٹھکانہ نہ پایا، وهذا هو الظاهر من الترجمة والأول ما اختاره جمهور المفسرين، والله أعلم۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿٣٧﴾

اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہے یا لگائے کان دل لگا کر

خلاصہ تفسیر: اس (ہلاک کرنے کے واقعہ) میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے، جس کے پاس (سمجھدار) دل ہو یا (اگر سمجھدار نہ ہو تو کم از کم یہی ہو کہ) وہ (دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو (اور سننے کے بعد اجمالاً حقانیت کا معتقد ہو کر اہل فہم کا اتباع کر کے حق بات کو قبول کر لیتا ہو، حاصل اس عبرت کا یہ ہے کہ ان لوگوں کی ہلاکت سے کفر کا عند اللہ مبغوض ہونا معلوم ہو گیا، پس عذاب کا انکار اس بنا پر تو باطل ٹھہرا جو کفار کا خیال ہے کہ کفر بری چیز نہیں)۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى: اس میں استاذ اور شیخ کا کلام نافع اور مفید ہونے کی شرائط ہیں، یعنی کوئی بھی بات آیت میں مذکور شرائط کے ساتھ سنی جائے تو وہ نافع اور مفید ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی ان عبرتناک واقعات میں غور وفکر کر کے وہ ہی لوگ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں جن کے سینہ میں سمجھنے والا دل ہو کہ از خود ایک بات کو سمجھ لیں، یا کم از کم کسی سمجھانے والے کے کہنے پر دل کو حاضر کر کے کان دھریں، کیونکہ یہ بھی ایک درجہ ہے کہ آدمی خود متنبہ نہ ہو، تو دوسرے کے متنبہ کرنے پر ہوشیار ہو جائے، جو شخص نہ خود سمجھے نہ کسی کے کہنے پر توجہ کے ساتھ کان لگائے اس کا درجہ اینٹ پتھر سے زیادہ نہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾

اور ہم نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن میں ۱؎ اور ہم کو نہ ہوا کچھ تکان ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (اگر قیامت کا انکار اس بنا پر ہے کہ تم اللہ کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں سمجھتے تو وہ اس لئے باطل ہے کہ ہماری قدرت ایسی ہے کہ) ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس سب کو چھ دن (کی مقدار کے موافق زمانہ) میں پیدا کیا اور ہم کو تکان نے چھوا تک نہیں (پھر آدمی کا دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے جیسا کہ سورہ احقاف میں ہے: اولم یروا ان اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض ولم یعی بخلقھن بقدر علی ان یحی الموتی، چونکہ قیامت کے امکان میں بہت شور وشغب تھا اس لیے امکان کو دوبارہ تاکید کے لیے ثابت کردیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اس کا بیان پہلے کئی جگہ گزر چکا ہے۔

فائدہ: ۲؎ جب پہلی مرتبہ بنانے سے نہ تھکے تو دوسری مرتبہ کیوں تھکیں گے اور تباہ وبرباد کردینا تو بنانے سے کہیں آسان ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾

سو تو سہتا رہ جو وہ کہتے ہیں اور پاکی بولتا رہ خوبیاں اپنے رب کی ۱؎ پہلے سورج کے نکلنے سے اور پہلے ڈوبنے سے

وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾

اور کچھ رات میں بول اس کی پاکی ۲؎ اور پیچھے سجدہ کے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اور ان قطعی جوابوں کے باوجود یہ لوگ پھر بھی انکار ہی پر اڑے ہیں) سو ان کی باتوں پر صبر کیجئے (یعنی رنج نہ کیجئے) اور (چونکہ جب تک دل کو کسی طرف مشغول نہ کیا جائے وہ غم کی بات دل سے نہیں نکلتی اور بار بار یاد آ کر دل کو غمگین کرتی ہے، اس لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) اپنے رب کی تسبیح وتحمید کرتے رہیے (اس میں نماز بھی داخل ہے) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً صبح کی نماز) اور (اس کے) چھپنے سے پہلے (مثلاً ظہر وعصر) اور رات میں بھی اس کی تسبیح (وتحمید) کیا کیجئے (اس میں مغرب اور عشاء آ گئیں) اور (فرض) نمازوں کے بعد بھی (اس میں نوافل واوراد آ گئے، حاصل یہ ہوا کہ ذکر اللہ میں اور اس کی فکر میں لگے رہئے تاکہ ان کے اقوال کفریہ کی طرف دھیان ہی نہ ہو)۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ: اس میں واضح دلالت ہے کہ مصائب ومشکلات کے وقت تسلی وسکون کا قوی ذریعہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو جانا ہے (یعنی جب بھی کوئی مشکل یا تکلیف پیش آئے تو ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرے ان شاء اللہ اطمینان حاصل ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایسی موٹی باتوں کو یہ لوگ نہ سمجھیں تو آپ غمگین نہ ہوں، بلکہ ان کی بیہودہ بکواس پر صبر کرتے رہیں، اور اپنے پروردگار کی یاد میں دل لگائے رکھیں جو تمام زمین وآسمان کا پیدا کرنے والا اور ہر چیز کے بنانے اور بگاڑنے پر قدرت رکھتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یہ وقت اللہ کی یاد کے ہیں، ان میں دعاء اور عبادت بہت قبول ہوتی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں آپ ﷺ پر تین ہی نمازیں فرض تھیں، فجر اور عصر اور تہجد، بہرحال اب بھی ان تینوں وقتوں کو خصوصی فضل وشرف حاصل ہے نماز یا ذکر ودعاء وغیرہ سے ان اوقات کو معمور رکھنا چاہیے، حدیث میں ہے: "عَلَيْكُمْ بِالْغُدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ".

بعض نے کہا کہ قَبْلَ طُلُوْعِ سے نماز فجر، قَبْلَ الْغُرُوْبِ سے ظہر وعصر اور وَمِنَ الَّيْلِ سے مغرب وعشاء مراد ہیں، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ یعنی نماز کے بعد کچھ تسبیح وتہلیل کرنا چاہیے، یا نوافل مراد ہوں جو فرائض کے بعد پڑھے جاتے ہیں۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿٤١﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ

اور کان رکھ جس دن پکارے پکارنے والا نزدیک کی جگہ سے [1] جس دن سنیں گے چنگھاڑ محقق وہ

يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿٤٢﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿٤٣﴾

دن نکل پڑنے کا [2] ہم ہیں جلاتے اور مارتے اور ہم تک ہے سب کو پہنچنا [3]

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کا ممکن ہونا مکرر بیان کیا گیا تھا، اب آگے قیامت کے آنے کا تاکید کے لیے مکرر ذکر ہے اور اس کے بعد پھر مکرر تسلی ہے اور تسلی پر سورت کا اختتام ہے۔

اور (اے مخاطب! تو اس اگلی بات کو توجہ سے) سن رکھ کہ جس دن ایک پکارنے والا (فرشتہ یعنی اسرافیل علیہ السلام نفخ صور کے ذریعہ مردوں کو قبروں سے نکلنے کے لئے) پاس ہی سے پکارے گا (پاس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آواز سب کو بے تکلف پہنچے گی، گویا پاس سے ہی کوئی پکار رہا ہے اور جیسے اکثر دور کی آواز کسی کو پہنچتی ہے کسی کو نہیں پہنچتی تو ایسا نہ ہوگا) جس روز اس چیخنے کو بالیقین سب سن لیں گے، یہ دن ہوگا (قبروں سے) نکلنے کا، ہم ہی (اب بھی) جلاتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف پھر لوٹ کر آنا ہے (اس میں بھی مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت کی طرف اشارہ ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] کہتے ہیں صور پھونکا جائے گا بیت المقدس کے پتھر پر اس لیے نزدیک کہا، یا یہ مطلب ہے کہ اس کی آواز ہر جگہ نزدیک لگے گی اور سب کو یکساں سنائی دے گی، باقی صور پھونکنے کے سوا اور بھی ندائیں حق تعالیٰ کی طرف سے اس روز ہوں گی، بعض نے آیت سے وہ مراد لی ہے، مگر ظاہر نفخ صور ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: [2] یعنی دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سب زمین سے نکل کھڑے ہوں گے۔

فائدہ: [3] یعنی بہرحال موت وحیات سب خدا کے ہاتھ میں ہے اور پھر کر آخر کار اسی کی طرف سب کو جانا ہے، بچ کر کوئی نہیں نکل سکتا۔

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿٤٤﴾

جس دن زمین پھٹ کر نکل پڑیں وہ سب دوڑتے ہوئے یہ اکٹھا کرنا ہم کو آسان ہے

خلاصہ تفسیر: جس روز زمین ان (مردوں) پر سے کھل جائے گی جبکہ وہ (نکل کر میدان قیامت کی طرف) دوڑتے ہوں گے، یہ (جمع کر لینا) ہمارے نزدیک ایک آسان جمع کر لینا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی زمین پھٹے گی اور مردے اس سے نکل کر میدان حشر کی طرف جھپٹیں گے، خدا تعالیٰ سب اگلوں پچھلوں کو ایک میدان میں اکٹھا کر دے گا اور ایسا کرنا اس کو کچھ مشکل نہیں۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۫ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿٤٥﴾ ع

ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ وہ کہتے ہیں اور تو نہیں ہے ان پر زور کرنے والا، سو تو سمجھا قرآن سے اس کو جو ڈرے میرے ڈرانے سے

خلاصہ تفسیر: (غرض بار بار قیامت کا ممکن اور واقع ہونا سب ثابت ہو چکا، مگر اس پر بھی جو لوگ نہ مانیں تو آپ غم نہ کیجئے کیونکہ) جو کچھ یہ لوگ (قیامت وغیرہ کے بارے میں) کہہ رہے ہیں ہم خوب جانتے ہیں (ہم خود سمجھ لیں گے) اور آپ ان پر (اللہ کی طرف سے)

جبر کرنے والے (کر کے) نہیں (بھیجے گئے) ہیں (بلکہ صرف مبلغ اور ڈرانے والے ہیں، جب یہ بات ہے) تو آپ قرآن کے ذریعہ سے (عام تذکیر سے سب کو اور خاص تذکیر نافع سے صرف) ایسے شخص کو نصیحت کرتے رہے جو میری وعید سے ڈرتا ہو (اس مفعول کی تقیید سے اشارہ ہو گیا کہ آپ اگرچہ عام نصیحت فرماتے ہیں جیسا مشاہدہ ہے لیکن پھر بھی اللہ کی وعید سے ڈرنے والا کوئی کوئی ہوتا ہے، پس ثابت ہوا کہ یہ آپ کے اختیار میں نہیں کہ سب نصیحت قبول کرلیں، جب آپ کے اختیار میں نہیں پھر بے اختیار بات کی فکر ہی کیا)۔

* * *

فائدہ: یعنی جو لوگ حشر کا انکار کرتے اور واہی تباہی کلمات بکتے ہیں بکنے دو، اور ان کا معاملہ ہمارے سپرد کرو، ہم کو سب معلوم ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں، آپ کا یہ منصب نہیں کہ زور زبردستی سے ہر ایک کو یہ باتیں منوا کر چھوڑیں، ہاں قرآن سنا سنا کر بالخصوص ان کو نصیحت اور فہمائش کرتے رہیے جو اللہ کے ڈرانے سے ڈرتے ہیں، ان معاندین کے پیچھے زیادہ نہ پڑیے۔

آیاتها ٦٠ | ٥١ سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ مَكِّيَّةٌ ٦٧ | ركوعاتها ٣

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ﴿۴﴾

قسم ہے ان ہواؤں کی جو بکھیرتی ہیں اڑا کر، پھر اٹھانے والیاں بوجھ کو، پھر چلنے والیاں نرمی سے، پھر بانٹنے والیاں حکم سے لے

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۶﴾

بیشک جو وعدہ کیا ہے تم سے سو سچ ہے، اور بیشک انصاف ہونا ضرور ہے ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں قیامت کا ذکر تھا، اس سورت کا زیادہ حصہ بھی اسی مضمون کے متعلق ہے، چنانچہ اسی مضمون سے یہ سورت بھی شروع ہوئی ہے۔

قسم ہے ان ہواؤں کی جو غبار وغیرہ کو اڑاتی ہیں، پھر ان بادلوں کی جو بوجھ (یعنی بارش کو) اٹھاتے ہیں، پھر ان کشتیوں کی جو نرمی سے چلتی ہیں، پھر ان فرشتوں کی جو (حکم کے موافق اہل ارض میں) چیزیں تقسیم کرتے ہیں (مثلاً جہاں جس قدر بارش کا حکم ہوتا ہے جو وسیلہ ہے رزق کا وہاں بادلوں کے ذریعہ سے اسی قدر پہنچاتے ہیں، اسی طرح رحم مادر میں بچہ کی صورت میں لڑکا یا لڑکی حق تعالیٰ سے پوچھ کر بناتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے، اور سکینہ اور رعب بھی تقسیم کرتے ہیں، آگے ان قسموں کا جواب ہے کہ) تم سے جس (قیامت) کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہے، اور (اعمال کی) جزا (وسزا) ضرور ہونے والی ہے (ان قسموں میں اشارہ ہے دلیل کی طرف، یعنی یہ سب عجیب تصرفات قدرت الٰہیہ سے ہوتے ہیں، تو یہ خدا کی عظیم الشان قدرت کے دلائل ہیں، پھر ایسی بڑی قدرت والے کو قیامت کا لانا کیا مشکل ہے)۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا: مخلوقات کی قسم کھانے کی توجیہ سورت صافات کے شروع میں گذر چکی ہے، مذکورہ آیات میں جن کلمات کی قسم کھائی گئی ہے ان کلمات کی تفسیر درمنثور میں حدیث مرفوع سے اسی طرح نقل کی ہے جیسا کہ اوپر خلاصہ تفسیر میں گذرا، اور خاص ان چیزوں کی قسم شاید اس لئے ہو کہ اس میں مخلوقات کی مختلف اصناف کی طرف اشارہ ہو گیا، چنانچہ "فرشتے" آسمانی مخلوقات میں سے، "ہوائیں اور کشتیاں" زمینی مخلوقات میں سے، اور "بادل" کائنات جو یعنی فضائی مخلوقات میں سے ہیں، یہاں زمینی مخلوقات میں دو چیزیں بیان کیں، جن میں ایک یعنی کشتی آنکھ سے نظر آتی ہے، دوسری

یعنی ہوا آنکھ سے نظر نہیں آتی، یہ شاید اس لئے کہ قیامت کے متعلق ایک مضمون پر خود آسمان کی قسم ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اول زور کی ہوائیں اور آندھیاں چلتی ہیں جن سے غبار وغیرہ اڑتا ہے اور بادل بنتے ہیں، پھر ان میں پانی بنتا ہے، اس بوجھ کو اٹھائے پھرتی ہیں، پھر برسنے کے قریب نرم ہوا چلی ہے پھر اللہ کے حکم کے موافق بارش میں جس جگہ کہ جتنا حصہ ہوتا ہے وہ تقسیم کرتی ہیں، ان ہواؤں کی اللہ قسم کھاتا ہے، بعض علماء نے **ذاریات** سے ''ہوائیں''، **حاملات** سے ''بادل''، **جاریات** سے ''ستارے'' اور **مقسّمات** سے ''فرشتے'' مراد لیے ہیں، گویا مقسم بہ کی ترتیب نیچے سے اوپر کو ہوئی، اور حضرت علیؓ وغیرہ سے منقول ہے کہ **ذاریات** ''ہوائیں''، **حاملات** ''بادل''، **جاریات** ''کشتیاں'' اور **مقسّمات** ''فرشتے ہیں جو اللہ کے حکم سے رزق وغیرہ تقسیم کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یہ ہواؤں اور بارش وغیرہ کا نظام شاہد ہے کہ آخرت کا وعدہ سچا، اور انصاف ہونا ضروری ہے، جب اس دنیا میں ہوا تک بے نتیجہ نہیں چلتی تو کیا اتنا بڑا کارخانہ یوں ہی بے نتیجہ چل رہا ہے؟ یقیناً اس کا کوئی عظیم الشان انجام ہوگا، اسی کو آخرت کہتے ہیں۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝٧ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝٨ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝٩

قسم ہے آسمان جال دار کی ۱؎ تم پڑ رہے ہو ایک جھگڑے کی بات میں، اس سے باز رہے وہی جو پھیرا گیا ۲؎

خلاصہ تفسیر: جیسے پیچھے آسمانی مخلوقات کی قسم تھی اسی طرح قیامت کے مضمون کے متعلق خود آسمان کی قسم ہے یعنی:

قسم ہے آسمان کی جس میں (فرشتوں کے چلنے کے) راستے ہیں (جیسا کہ ارشاد ہے: **ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق**، آگے جواب قسم ہے) کہ تم (یعنی سب) لوگ (قیامت کے بارے میں) مختلف گفتگو میں ہو (کوئی تصدیق کرتا ہے، کوئی جھٹلاتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے: **عن النبا العظیم الذی هم فیه مختلفون**، آسمان کی قسم سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جنت آسمان میں ہے اور آسمان میں راستہ بھی ہے مگر جو حق میں اختلاف کرے گا اس کے لئے راہ بند ہو جائے گی، اور ان اختلاف والوں میں) اس (قیامت کے آنے سے اور جزا و سزا کے اعتقاد) سے وہی پھرتا ہے جس کو (بالکلیہ خیر و سعادت ہی سے) پھرنا ہوتا ہے (جیسا کہ حدیث میں ہے: ''من حرمه فقد حرم الخیر کله''، یعنی جو شخص اس سے محروم رہا وہ ہر خیر سے محروم رہا، اور دوسری جماعت یعنی تصدیق کرنے والوں کا حال اسی کے مقابلہ سے معلوم ہو گیا کہ وہ خیر و سعادت سے پھرے ہوئے نہیں ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی صاف و شفاف، خوبصورت، مضبوط اور پر رونق آسمان کی قسم جس پر ستاروں کا جال بچھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور جس پر ستاروں کی اور فرشتوں کی راہیں پڑی ہوئی ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی قیامت اور آخرت کی بات میں خواہ مخواہ جھگڑے ڈال رکھے ہیں۔ اس کو وہ ہی تسلیم کرے گا جسے بارگاہ ربوبیت سے کچھ تعلق ہو۔ جو شخص راندہ درگاہ ہے اور خیر و سعادت کے راستوں سے پھیر دیا گیا ہے وہ اس چیز کے تسلیم اور قبول کرنے سے ہمیشہ باز رہے گا۔ حالانکہ اگر صرف آسمان کے نظم و نسق میں غور کرے تو یقین ہو جائے کہ اس مسئلہ میں جھگڑنا محض حماقت ہے۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۝١٠ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۝١١ يَسْــَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ۝١٢

مارے پڑے اٹکل دوڑانے والے ۱؎ وہ جو غفلت میں ہیں بھول رہے ۲؎ پوچھتے ہیں کب ہے دن انصاف کا ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے ان پھرنے والوں کی مذمت ہے) غارت ہو جائیں بے سند باتیں کرنے والے (یعنی جو قیامت کا بلا دلیل انکار کرتے ہیں) جو کہ جہالت میں بھولے ہوئے ہیں (بھولنے سے مراد اختیاری غفلت ہے، اور وہ لوگ بطور استہزا و استعجال کے) پوچھتے ہیں کہ

روز جزا کب ہوگا؟۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دین کی باتوں میں انکلیں دوڑاتے ہیں اور محض اپنے ظن وتخمین سے قطعیات کو رد کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی دنیا کے مزوں نے آخرت سے اور خدا سے غافل کر رکھا ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی انکار اور ہنسی کے طور پر پوچھتے ہیں کہ ہاں صاحب! وہ انصاف کا دن کب آئے گا؟ آخر اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴿١٣﴾ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿١٤﴾

جس دن وہ آگ پر الٹے سیدھے پڑیں گے، چکھو مزا اپنی شرارت کا، یہ ہے جس کی تم جلدی کرتے تھے ۱

خلاصہ تفسیر: (آگے جواب ہے کہ وہ اس دن ہوگا) جس دن (کہ) وہ لوگ آگ پر تپائے جائیں گے (اور کہا جائے گا کہ) اپنی اس سزا کا مزہ چکھو، یہی ہے جس کی تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ: کفار کے گذشتہ سوال کے جواب میں یہ جواب اس طرز کا ہے جیسے کسی مجرم کو پھانسی کا حکم سنا دیا جائے، مگر وہ احمق محض اس وجہ سے کہ اس کو تاریخ نہیں بتلائی گئی جھٹلائے ہی جائے اور کہے کہ اچھا وہ دن کب آئے گا؟ چونکہ ان کا سوال محض سرکشی کے طور پر ہے اس لیے جواب میں تاریخ بتلانے کے بجائے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ وہ دن اس وقت آئے گا جب تم پھانسی پر لٹکا دیے جاؤ گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو جواب دیا گیا، یعنی ذرا صبر کرو، وہ دن آیا چاہتا ہے، جب تم آگ میں الٹے سیدھے کیے جاؤ گے اور خوب جلا تپا کر کہا جائے گا کہ لو اب اپنی شرارت اور استہزاء کا مزہ چکھو، جس دن کی جلدی مچا رہے تھے وہ آ گیا۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٥﴾ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴿١٦﴾

البتہ ڈرنے والے باغوں میں ہیں اور چشموں میں ہیں، اور چشموں میں لیتے ہیں جو دیا انکو انکے رب نے ۱ وہ تھے اس سے پہلے نیکی والے ۲

خلاصہ تفسیر: اب آگے دوسرے فریق یعنی مومنین و مصدقین کے ثواب کا ذکر ہے جو پھرنے والے نہیں۔

بیشک متقی لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے (اور) ان کے رب نے ان کو جو (ثواب) عطا کیا ہوگا وہ اس کو (خوشی خوشی) لے رہے ہوں گے (اور کیوں نہ ہو؟) وہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیا میں) نیکوکار تھے (پس آیت: هل جزآء الاحسان الا الاحسان کے وعدہ کے مطابق ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا گیا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی خوشی خوشی ان نعمتوں کو قبول کرتے ہیں جو ان کے پروردگار نے ارزانی فرمائی ہیں

فائدہ: ۲ یعنی دنیا سے نیکیاں سمیٹ کر لائے تھے، آج ان کا نیک پھل مل رہا ہے، آگے ان نیکیوں کی قدرے تفصیل ہے:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿١٧﴾ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿١٨﴾

وہ تھے رات کو تھوڑا سوتے، اور صبح کے وقتوں میں معافی مانگتے ۱

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿١٩﴾

اور ان کے مال میں حصہ تھا مانگنے والوں کا اور ہارے ہوئے کا ۲

خلاصہ تفسیر: (اب آگے ان کے نیک کاموں کی کسی قدر تفصیل ہے) وہ لوگ (فرائض وواجبات سے ترقی کر کے نوافل کی بھی ایسی پابندی کرنے والے تھے کہ) رات کو بہت کم سوتے تھے (یعنی رات کا زیادہ حصہ عبادت میں صرف کرتے تھے) اور (پھر اس محنت ومشقت کے باوجود اپنی عبادت پر نظر نہ کرتے تھے، بلکہ) اخیر شب میں (اپنے آپ کو عبادت میں کوتاہی کرنے والا سمجھ کر) استغفار کیا کرتے تھے (یہ تو جسمانی عبادت میں ان کی حالت تھی) اور (مالی عبادت کی یہ کیفیت تھی کہ) ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی سب کا حق تھا (یعنی ایسے التزام سے دیتے تھے جیسے ان کے ذمہ کسی کا کچھ آتا ہو، مراد اس سے زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقات ہیں)۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ: ایک روایت میں اس کی تفسیر یہ آئی ہے کہ عشاء پڑھے بغیر نہ سوتے تھے، تو مطلب یہ ہوگا کہ ساری رات سوئے نہیں رہتے جیسا کہ اکثر کفار سوتے تھے بلکہ عشاء بھی پڑھتے تھے، پس اس تفسیر پر تہجد مراد نہیں ہوگی، واضح رہے یہاں یہ مطلب نہیں کہ جنت اور اس کی نعمتوں کا ملنا نوافل پر موقوف ہے بلکہ یہاں بڑے درجہ والوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی رات کا اکثر حصہ عبادت الٰہی میں گزارتے اور سحر کے وقت جب رات ختم ہونے کو آتی اللہ سے اپنی تقصیرات کی معافی مانگتے کہ الٰہی حق عبودیت ادا نہ ہوسکا۔ جو کوتاہی رہی اپنی رحمت سے معاف فرما دیجیے۔ کثرت عبادت ان کو مغرور نہ کرتی تھی۔ بلکہ جس قدر بندگی میں ترقی کرتے جاتے خشیت وخوف بڑھتا جاتا تھا۔

فائدہ: ۲ے ''ہارا ہوا'' وہ جو محتاج ہے اور مانگتا نہیں پھرتا۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے (زکوٰۃ کے علاوہ) اپنے مال میں اپنی خوشی سے سائلوں اور محتاجوں کا حصہ مقرر کر رکھا تھا جو التزام کی وجہ سے گویا ایک حق لازم سمجھا گیا۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے واسطے، اور خود تمہارے اندر، سو کیا تم کو سوجھتا نہیں لے

خلاصہ تفسیر: چونکہ کفار قیامت کے ممکن ہونے کا انکار کرتے تھے اس لئے آگے اس کی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ:
اور یقین لانے (کی کوشش اور طلب کرنے) والوں کے لئے (قیامت کے ممکن اور واقع ہونے پر) زمین (کی کائنات) میں بہت نشانیاں (اور دلیلیں) ہیں، اور خود تمہاری ذات میں بھی (یعنی تمہارے ظاہری وباطنی مختلف حالات میں بھی قیامت کے ممکن ہونے دلائل ہیں، اور چونکہ ان دلائل کی دلالت بہت واضح تھی، اس لئے بطور دھمکی فرماتے ہیں کہ جب ایسے دلائل موجود ہیں) تو کیا تم کو (مطلوب پھر بھی) دکھلائی نہیں دیتا۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ: تمہارے اور اسی طرح تمام عالم کے احوال یقینا قدرت کے تحت داخل ہیں، پس یہ ان کے ممکن ہونے کی دلیل ہے، اور چونکہ قیامت کے محال ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں، اس لیے وہ ممکنات میں سے ہے، اور حق تعالیٰ کی ذاتی قدرت کو تمام ممکنات کے ساتھ یکساں نسبت ہے پس وہ بھی قدرت میں داخل ہے، چنانچہ جب قیامت کے ناممکن ہونے کی کوئی دلیل نہیں تو قیامت بھی ممکنات سے ہے، پس وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی یہ شب بیداری، استغفار اور محتاجوں پر خرچ کرنا اس یقین کی بناء پر ہونا چاہیے کہ خدا موجود ہے اور اس کے ہاں کسی کی نیکی ضائع نہیں جاتی اور یہ یقین وہ ہے جو آفاقی وانفسی آیات میں غور کرنے سے بسہولت حاصل ہوسکتا ہے، انسان اگر خود اپنے اندر یا روئے زمین کے حالات میں غور وفکر کرے تو بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ ہر نیک وبد کی جزاء کسی نہ کسی رنگ میں ضرور مل کر رہے گی، جلد یا بدیر۔

ع ۱۸ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿٢٢﴾ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ ﴿٢٣﴾

اور آسمان میں ہے روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا ۱؎ سو قسم ہے رب آسمان اور زمین کی کہ یہ بات تحقیق ہے جیسے کہ تم بولتے ہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: رہا یہ کہ قیامت کا خاص وقت معلوم نہ ہونے سے اس کے واقع نہ ہونے پر جو استدلال کیا جاتا ہے تو اب آگے اس کی نسبت ارشاد ہے:

اور تمہارا رزق اور جو تم سے (قیامت کے متعلق) وعدہ کیا جاتا ہے (ان) سب (کا معین وقت) آسمان میں (جو لوح محفوظ ہے اس میں درج) ہے (زمین والوں کو کسی مصلحت کی وجہ سے اس کا یقینی علم نہیں دیا گیا، چنانچہ مشاہدہ بھی ہے کہ یقینی تعیین کسی کو معلوم نہیں کہ رزق کب اور کتنا ملے گا؟ آگے نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں کہ جب قیامت کے محال ہونے کی کوئی دلیل نہیں اور ثابت ہونے کی دلیل موجود ہے) تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ وہ (روز جزا) برحق ہے (اور ایسا یقینی) جیسا تم باتیں کر رہے ہو (کبھی اس میں شک نہیں ہوتا، اسی طرح اس کو یقینی سمجھو)۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ: جب معین وقت معلوم نہ ہونے کے باوجود رزق کے وجود کا یقین ہے، تو پھر معین وقت معلوم نہ ہونے سے قیامت کا نہ ہونا کیسے لازم آ گیا، اور اسی دلیل کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں ما توعدون کے ساتھ ''رزق'' کا بیان بڑھا دیا گیا، ورنہ اس کا ذکر یہاں خود مقصود نہ تھا۔

مِّثْلَ مَآ أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ: اس مثال میں ایک نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ زبان مثل زمین کے ہے، اور اس سے ایک حرف کا پیدا ہونا انسان کی پہلی پیدائش کے مثل ہے، اور اس حرف کا ختم ہو کر فنا ہو جانا انسانی موت کے مشابہ ہے، پھر اس حرف کا دوبارہ پیدا ہو جانا انسان کے دوبارہ زندہ ہونے کے مشابہ ہے، پس اس میں قیامت کی ایک نظیر کی طرف اشارہ ہو گیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سائلوں اور محتاجوں پر خرچ کرنے سے اس لیے نہیں ڈرنا چاہیے کہ خرچ کر کے ہم کہاں سے کھائیں گے اور نہ خرچ کر کے ان مساکین پر احسان جتلائے کیونکہ تمہاری سب کی روزی اور اجر و ثواب کے جو وعدے کیے گئے ہیں آسمان والے کے ہاتھ میں ہیں، ہر ایک کی روزی پہنچ کر رہے گی کسی کے روکے نہیں رک سکتی اور خرچ کرنے والوں کو ثواب بھی مل کر رہے گا، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''آنے والی جو بات ہے اس کا حکم آسمان ہی سے اترتا ہے''۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جیسے اپنے بولنے میں شبہ نہیں، ویسا ہی اس کلام میں شبہ نہیں۔ یقینا روزی پہنچ کر رہے گی، قیامت قائم ہو گی، آخرت آ کر رہے گی، اور خدا کے وعدے ضرور پورے ہوں گے۔

ربط: آگے: وَفِيٓ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُومِ کی مناسبت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کا قصہ سناتے ہیں جو تمہید ہے لوط علیہ السلام کے قصہ کی، دونوں قصوں سے یہ بھی ظاہر ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ دنیا میں ''محسنین'' کے ساتھ کیا ہے اور ''مکذبین'' کے ساتھ اس نے کیسا برتاؤ کیا۔

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ﴿٢٤﴾ وقف لازم

کیا پہنچی ہے تجھ کو بات ابراہیم کے مہمانوں کی جو عزت والے تھے ۱؎

إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ۖ قَالَ سَلَامٌ قَوْمٌ مُّنكَرُونَ ﴿٢٥﴾

جب اندر پہنچے اس کے پاس تو بولے سلام وہ بولا سلام ہے یہ لوگ ہیں اوپرے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے کافروں کی مذمت کے ساتھ مؤمنوں کی تعریف بھی تھی، اب آگے ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے اس طرف اشارہ ہے کہ حق ماننے والوں کو اخروی فلاح کے ساتھ دنیوی فلاح بھی عطا ہوتی ہے، پھر کفار کے لیے سزا ثابت کرنے کے لیے پہلی ہلاک شدہ امتوں کے چند قصے بیان فرماتے ہیں۔

(اے محمد ﷺ!) کیا ابراہیم (علیہ السلام) کے معزز مہمانوں کی حکایت آپ تک پہنچی ہے (اور یہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ وہ (مہمان) ان کے پاس آئے پھر ان کو سلام کیا، ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی (جواب میں) کہا سلام (اور کہنے لگے کہ) انجان لوگ (معلوم ہوتے) ہیں (بظاہر یہ بات اپنے دل میں کہی، اس کا قرینہ یہ ہے کہ آگے فرشتوں کا جواب مذکور نہیں اور بعید احتمال یہ بھی ہے کہ پوچھنے کے طور پر انہی سے کہہ دیا ہو کہ آپ لوگوں کو پہچانا نہیں اور انہوں نے جواب نہ دیا ہو اور ابراہیم علیہ السلام نے جواب کا انتظار نہ کیا ہو)۔

ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ: ''معزز'' یا تو اس لئے کہا کہ وہ ملائکہ تھے جن کی شان میں ہے: **بل عباد مکرمون** یا اس لئے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عادت اور شان کے موافق انکا اکرام کیا تھا اور ''مہمان'' کہنا انکی ظاہری حالت کی بنا پر ہے کیونکہ وہ انسانی شکل میں آئے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی فرشتے تھے جن کو ابراہیم علیہ السلام اول انسان سمجھے ان کی بڑی عزت کی اور اللہ کے ہاں تو فرشتے معزز و مکرم ہیں ہی، کما قال: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (الانبیاء:۲۶)

فائدہ: ۲ یعنی سلام کا جواب سلام سے دیا اور دل میں یا آپس میں کہا کہ یہ لوگ کچھ اوپرے سے معلوم ہوتے ہیں۔

فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾

پھر دوڑا اپنے گھر کو تو لے آیا ایک بچھڑا گھی میں تلا ہوا، پھر ان کے سامنے رکھا کہا کیوں تم کھاتے نہیں ۱

خلاصہ تفسیر: (غرض یہ سلام و کلام ہو کر) پھر اپنے گھر کی طرف چلے اور ایک فربہ بچھڑا (تلا ہوا لقولہ تعالیٰ: **بعجل حنیذ**) لائے اور اس کو ان کے پاس (یعنی سامنے) لا کر رکھا (چونکہ وہ فرشتے تھے، کیوں کھاتے، وہ تو نور محض اور مخلوق نوری تھے، اس وقت ابراہیم علیہ السلام کو شبہ ہوا اور) کہنے لگے کہ آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نہایت اہتمام سے مہمانی شروع کر دی اور نہایت مہذب و شائستہ پیرایہ میں کہا کہ کیوں حضرات! تم کھانا نہیں کھاتے؟ وہ فرشتے تھے، کھاتے کس طرح؟ آخر ابراہیم علیہ السلام سمجھے کہ یہ آدمی نہیں ہیں۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

پھر جی میں گھبرایا ان کے ڈر سے بولے تو مت ڈر اور خوشخبری دی اس کو ایک لڑکے ہشیار کی ۱

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾

پھر سامنے سے آئی اس کی عورت بولتی ہوئی پھر پیٹا اپنا ماتھا اور کہنے لگی کہیں بڑھیا بانجھ ۲

خلاصہ تفسیر: (جب پھر بھی نہ کھایا) تو ان سے دل میں خوف زدہ ہوئے (کہ یہ لوگ کہیں مخالف اور دشمن نہ ہوں) انہوں نے کہا کہ تم ڈرو مت (ہم آدمی نہیں ہیں فرشتے ہیں) اور (یہ کہہ کر) ان کو ایک فرزند کی بشارت دی جو بڑا عالم (یعنی نبی) ہوگا (کیونکہ مخلوق میں سب سے زیادہ علم انبیاء کو ہوتا ہے اور مراد اس سے اسحاق علیہ السلام ہیں، یہ گفتگو ان سے ہو رہی تھی کہ) اتنے میں ان کی بی بی (حضرت سارہ جو کہیں کھڑی سن رہی

تھیں لقولہ تعالیٰ: **وامراتہ قائمۃ** اولاد کی خبر سن کر) بولتی پکارتی آئیں پھر (جب فرشتوں نے ان کو بھی یہ خبر سنائی لقولہ تعالیٰ: **فبشرناھا باسحٰق** تو تعجب سے) ماتھے پر ہاتھ مارا اور کہنے لگیں کہ (اول تو میں) بڑھیا (پھر) بانجھ (اس وقت بچہ پیدا ہونا بھی عجیب بات ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ قصہ سورۃ ہود اور حجر میں گزر چکا ہے، وہاں تفصیل ملاحظہ کر لی جائے۔

فائدہ: ۲؎ حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی ایک طرف گوشہ میں کھڑی سن رہی تھیں لڑکے کی بشارت سن کر چلاتی ہوئی دوسری طرف متوجہ ہوئیں اور تعجب سے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہنے لگیں کہ (کیا خوب) ایک بڑھیا بانجھ جس کی جوانی میں اولاد نہ ہوئی، اب بڑھاپے میں بچہ جنے گی؟

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾

وہ بولے یوں ہی کہا تیرے رب نے وہ جو ہے وہی ہے حکمت والا خبردار

خلاصہ تفسیر: فرشتے کہنے لگے کہ (تعجب مت کر لقولہ تعالیٰ: اتعجبین) تمہارے پروردگار نے ایسا ہی فرمایا ہے (اور) کچھ شک نہیں کہ وہ بڑا حکمت والا بڑا جاننے والا ہے (یعنی اگر چہ فی نفسہ یہ بات تعجب کی ہے مگر تم تو خاندان نبوت میں رہتی ہو اور علم و فہم سے مشرف ہو، تم کو یہ معلوم کر کے کہ خدا کا ارشاد ہے جس کا علم و حکمت اور قدرت مسلم بھی ہے تعجب نہ رہنا چاہئے)۔

* * *

فائدہ: یعنی ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے بلکہ تیرے رب نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ وہ ہی جانتا ہے کہ کس کو کس وقت کیا چیز دینا چاہیے۔ (پھر تم بیت نبوت سے ہو کر اس بشارت پر تعجب کیا کرتی ہو)

تنبیہ: مجموعہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لڑکا حضرت اسحاق (علیہ السلام) ہیں جن کی بشارت ماں اور باپ دونوں کو دی گئی۔

الجزء ۲۷ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ ۙ

بولا پھر کیا مطلب ہے تمہارا اے بھیجے ہوؤ ۱؎ وہ بولے ہم کو بھیجا ہے ایک گناہ گار قوم پر، کہ چھوڑیں ہم ان پر پتھر مٹی کے ۲؎

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ ۙ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾

نشان پڑے ہوئے تیرے رب کے یہاں سے حد سے نکل چلنے والوں کے لیے ۳؎

خلاصہ تفسیر: ابراہیم (علیہ السلام کو نبوت کی فراست سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بشارت کے علاوہ ان کے آنے سے اور بھی کچھ مقصود ہے تو ان سے) کہنے لگے (کہ) اچھا تو (یہ بتلاؤ کہ) تم کو بڑی مہم کیا درپیش ہے، اے فرشتو! فرشتوں نے کہا کہ ہم ایک مجرم قوم (یعنی قوم لوط) کی طرف بھیجے گئے ہیں تا کہ ہم ان پر کنکر کے پتھر برسائیں جن پر آپ کے رب کے پاس (یعنی عالم غیب میں) خاص نشان بھی ہے (جس کا بیان سورۃ ہود میں ہوا ہے اور وہ) حد سے گزرنے والوں کے لیے (ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ابراہیم نے فرشتوں سے پوچھا کہ آخر تم کس مہم کے لیے آئے ہو، انداز سے سمجھے ہوں گے کہ ضرور کسی اور اہم مقصد کے لیے ان کا نزول ہوا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی قوم لوط کی سزا ہی کے لیے بھیجے گئے ہیں، تا کہ کنکر کے پتھر برسا کر ان کو ہلاک کریں، من طین کی قید سے معلوم ہو گیا

کہ یہ اولوں کی بارش نہ تھی جس کو توسعاً پتھر کہہ دیا جاتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پتھروں پر نشان کر دیئے گئے ہیں، یہ عذاب کے پتھر خاص ان ہی کو لگیں گے جو عقل، دین اور فطرت کی حد سے نکل چکے ہیں۔

فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٣٥﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٣٦﴾

پھر بچا نکالا ہم نے جو تھا وہاں ایمان والا، پھر نہ پایا ہم نے اس جگہ سوائے ایک گھر کے مسلمانوں سے ۱؎

وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٣٧﴾

اور باقی رکھا ہم نے اس میں نشان ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں عذاب دردناک سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب ان بستیوں پر عذاب کا وقت قریب آیا) تو ہم نے جتنے ایمان دار تھے سب کو وہاں سے علیحدہ کر دیا، سو بجز مسلمانوں کے ایک گھر کے اور کوئی گھر (مسلمانوں کا) ہم نے نہیں پایا (یہ کنایہ ہے کہ وہاں کوئی اور گھر مسلمانوں کا تھا ہی نہیں، اگر ہوتا تو خدا کو ضرور معلوم ہوتا، کیونکہ جس چیز کا وجود اللہ کے علم میں نہ ہو وہ موجود ہو ہی نہیں سکتی) اور ہم نے اس واقعہ میں (ہمیشہ کے واسطے) ایسے لوگوں کے لئے ایک عبرت رہنے دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس بستی میں صرف ایک حضرت لوط کا گھرانا مسلمانی کا گھرانا تھا، اس کو ہم نے عذاب سے محفوظ رکھا اور صاف بچا نکالا۔ باقی سب تباہ کر دیئے گئے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اب تک وہاں تباہی کے نشان موجود ہیں اور ان کی غیر معمولی ہلاکت کے قصہ میں ڈرنے والوں کیلئے عبرت کا سامان ہے۔

وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ﴿٣٩﴾

اور نشانی ہے موسیٰ کے حال میں جب بھیجا ہم نے اسکو فرعون کے پاس دیکر کھلی سند ۱؎ پھر اس نے منہ موڑلیا اپنے زور پر اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ۲؎

فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ﴿٤٠﴾

پھر پکڑا ہم نے اس کو اور اس کے لشکروں کو پھر پھینک دیا ان کو دریا میں اس پر لگا الزام ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (آگے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ سنو کہ) موسیٰ (علیہ السلام) کے قصہ میں بھی عبرت ہے جب کہ ہم نے ان کو فرعون کے پاس ایک کھلی ہوئی دلیل (یعنی معجزہ) دے کر بھیجا سو اس نے مع اپنے ارکان سلطنت کے سرتابی کی اور کہنے لگا کہ یہ ساحر یا مجنون ہیں، سو ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو پکڑ کر دریا میں پھینک دیا (یعنی غرق کر دیا) اور اس نے کام ہی ملامت کا کیا تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی معجزات و براہین۔

فائدہ: ۲؎ یعنی زور و قوت پر مغرور ہو کر حق کی طرف سے منہ پھیر لیا، اور اپنی قوم اور ارکان سلطنت کو بھی ساتھ لے ڈوبا، کہنے لگا کہ موسیٰ یا تو چالاک جادوگر ہے اور یا دیوانہ ہے، دو حال سے خالی نہیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ہم نے زیادتی نہیں کی، الزام اسی پر ہے کہ اس نے کفر اور سرکشی اختیار کی، سمجھانے پر بھی باز نہ آیا، آخر جو بویا تھا وہی کاٹا۔

وَفِيْ عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾

اور نشانی ہے عاد میں جب بھیجی ہم نے ان پر ہوا خیر سے خالی نہیں چھوڑتی کسی چیز کو جس پر گزرے کہ نہ کر ڈالے اس کو جیسے چورا لے

خلاصہ تفسیر: اور (آگے عاد کا قصہ سنو کہ) عاد کے قصہ میں بھی عبرت ہے جب کہ ہم نے ان پر نا مبارک آندھی بھیجی جس چیز پر گزرتی تھی (یعنی ان اشیاء میں سے کہ جن کو ہلاک کرنے کا حکم تھا جس پر گزرتی تھی) اس کو ایسا کر چھوڑتی تھی جیسے کوئی چیز گل کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی عذاب کی آندھی آئی جو خیر و برکت سے یکسر خالی تھی، اس نے مجرموں کی جڑ کاٹ ڈالی اور جس چیز پر گزری اس کا چورا کر کے رکھ دیا۔

وَفِيْ ثَمُوْدَ إِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ

اور نشانی ہے ثمود میں جب کہا ان کو برت لو ایک وقت تک لے پھر شرارت کرنے لگے اپنے رب کے حکم سے پھر پکڑا اُن کو کڑک نے

وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ط

اور وہ دیکھتے تھے، پھر نہ ہو سکا ان سے کہ اٹھیں، اور نہ ہوئے کہ بدلہ لیں ۲ے اور ہلاک کیا نوح کی قوم کو اس سے پہلے

إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾ ع

تحقیق وہ تھے لوگ نافرمان

خلاصہ تفسیر: اور (آگے ثمود کا قصہ سنو) ثمود کے قصہ میں بھی عبرت ہے جبکہ ان سے کہا گیا (یعنی صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ) اور تھوڑے دنوں چین کر لو (یعنی کفر سے باز نہیں آؤ گے تو چند دن بعد ہلاک ہو جاؤ گے) سو (اس ڈرانے پر بھی) ان لوگوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی، سو ان کو عذاب نے آلیا اور وہ (اس عذاب کے آثار کو) دیکھ رہے تھے (یعنی یہ عذاب کھلے طور پر آیا) سو نہ تو کھڑے ہی ہو سکے (بلکہ اوندھے منہ گر گئے لقولہ تعالیٰ: جاثمین) اور نہ (ہم سے) بدلہ لے سکے، اور ان سے پہلے قوم نوح کا یہی حال ہو چکا تھا (یعنی اس سبب سے کہ) وہ بڑے نافرمان لوگ تھے (ان کو بھی ہلاک کیا تھا)۔

تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ: یہاں آیت میں جس چین و آرام کا ذکر کیا گیا ہے یہ وہ نہیں ہے جو دوسری آیت میں تین دن کی قید کے ساتھ ہے یعنی: تمتعوا فی دارکم ثلثة ایام، کیونکہ یہاں تَمَتَّعُوْا کے بعد فعتوا عن امر ربھم بھی فرمایا ہے کہ صالح علیہ السلام کے اس کہنے کے بعد ان لوگوں نے سرکشی کی، اور تمتعوا فی دارکم ثلثة ایام یقیناً اس سرکشی کے بعد کہا گیا تھا، پس یہاں آیت میں جس چین و آرام کے لیے کہا گیا وہ سرکشی سے پہلے تھا، اور دوسری جگہ جس چین و آرام کے لیے کہا تو وہ سرکشی کے بعد تھا۔

* * *

فائدہ: لے یعنی حضرت صالح نے فرمایا کہ اچھا کچھ دن اور دنیا کے مزے اڑا لو اور یہاں کا سامان برت لو آخر عذاب الٰہی میں پکڑے جاؤ گے۔

فائدہ: ۲ے یعنی ان کی شرارت روز بروز بڑھتی گئی، آخر عذاب الٰہی نے آلیا ایک کڑک ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سب ٹھنڈے ہو گئے، وہ سب زور و طاقت اور متکبرانہ دعوے اور طنطنے خاک میں مل گئے کسی سے اتنا بھی نہ ہوا کہ پچھاڑ کھانے کے بعد ذرا اٹھ کھڑا ہوتا، بھلا بدلہ تو کیا لے سکتے تھے اور اپنی مدد پر کسے بلاتے۔

فائدہ: ۳ یعنی ان اقوام سے پہلے نوح کی قوم اپنی بغاوت اور سرکشی کی بدولت تباہ کی جا چکی ہے وہ لوگ بھی نافرمانی میں حد سے نکل گئے تھے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور بنایا ہم نے آسمان ہاتھ کے بل سے اور ہم کو سب مقدور ہے ۱ اور زمین کو بچھایا ہم نے سو کیا خوب بچھانا جانتے ہیں ہم ۲

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے تا کہ تم دھیان کرو ۳

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں قیامت کی تحقیق اور اس کے ساتھ ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزا و سزا، اور تکذیب کی مناسبت سے پہلی امتوں کا ذکر آ گیا تھا، اب آگے توحید و رسالت کی تحقیق ہے اور رسالت کے ساتھ تسلی کا مضمون ہے۔

اور ہم نے آسمان کو (اپنی) قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں، اور ہم نے زمین کو فرش (کے طور پر) بنایا سو ہم (کیسے) اچھے بچھانے والے ہیں (یعنی اس میں کیسے کیسے فائدے رکھے ہیں) اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم کا بنایا تا کہ تم (ان مصنوعات سے توحید کو) سمجھو۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ: دو قسم سے مراد مقابل اور ضد ہے، ظاہر ہے کہ ہر چیز میں کوئی نہ کوئی ایسی صفت اعتبار کی جاتی ہے جس میں دوسری چیز اس کے مقابل نقیض یا ضد شمار کی جاتی ہے، جیسے آسمان زمین، گرمی سردی، چھوٹی بڑی، خوش نما بد نما، سفیدی سیاہی، روشنی تاریکی، جوہر عرض یعنی مستقل اور غیر مستقل وغیرہ وغیرہ، پس دو دو قسم بنانے سے یہی مراد ہے کہ ہر چیز ایک دوسری کے مقابل اور ضد ہے۔

***

فائدہ: ۱ یعنی آسمان جیسی وسیع چیز اپنی قدرت سے پیدا کی اور اس سے بھی بڑی چیزیں پیدا کرے تو کیا مشکل ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی زمین و آسمان سب خدا کے پیدا کیے ہوئے اور اسی کے قبضہ میں ہیں، پھر اس کا مجرم بھاگ کر کہاں پناہ لے سکتا ہے، نیز خالق کائنات کی عجیب و غریب کاریگری میں آدمی غور کرے تو اسی کا ہو رہے۔

فائدہ: ۳ یعنی ''نر'' اور ''مادہ''، جیسا کہ ابن زید نے کہا اور آج جدید حکماء اسکا اعتراف کر رہے ہیں کہ ہر ایک نوع میں نر اور مادہ کی تقسیم پائی جاتی ہے اور یا **زوجین** سے متقابل و متضاد چیزیں مراد ہیں، مثلاً رات دن، زمین آسمان، اندھیرا اُجالا، سیاہی سفیدی، صحت و مرض، کفر و ایمان وغیرہ ذالک۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ۚ

سو بھاگو اللہ کی طرف میں تم کو اس کی طرف سے ڈر سناتا ہوں کھول کر

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۱﴾ۚ

اور مت ٹھہراؤ اللہ کے ساتھ اور کسی کو معبود میں تم کو اس کی طرف سے ڈر سناتا ہوں کھول کر ۱

خلاصہ تفسیر: (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے فرما دیجئے کہ جب یہ مصنوعات وحدت صانع پر دلالت کر رہی ہیں) تو تم (کو چاہئے کہ ان سے استدلال کر کے) اللہ ہی کی (توحید کی) طرف دوڑو (یعنی اول تو ان دلائل کی وجہ سے خود عقل ہی توحید کے اعتقاد کو ضروری بتلا رہی ہے، پھر اوپر سے) میں (بھی) تمہارے (سمجھانے کے) واسطے اللہ کی طرف سے صاف طور پر ڈرانے والا (ہو کر آیا) ہوں (کہ توحید سے انکار کرنے والے کو عذاب ہوگا، پس عذاب کے خوف سے توحید کا اعتقاد اور بھی ضروری ہو گیا) اور (پھر اور زیادہ وضاحت سے کہتا ہوں کہ) خدا کے ساتھ کوئی اور معبود قرار نہ دو (اس میں زیادہ وضاحت اس لیے ہوئی کہ پہلے توحید کی طرف دوڑنے کا حکم تھا جس سے شرک کی ممانعت لازم آ گئی، اس آیت میں صراحۃ

شرک کی ممانعت ہے اور چونکہ توحید کا عنوان اس آیت میں بدل گیا اس لیے ڈرانے کا مضمون پھر تاکید کے واسطے لایا گیا کہ) میں تمہارے (سمجھانے کے) واسطے اللہ کی طرف سے کھلا ڈرانے والا (ہو کر آیا) ہوں۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ: اس میں ''فرار'' کی تعبیر سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اللہ کی طرف توجہ نہایت ذوق وشوق کے ساتھ ہونی چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جب زمین و آسمان اور تمام کائنات ایک اللہ کی پیدا کی ہوئی اور اسی کے زیر حکومت ہے تو بندہ کو چاہیے ہر جانب سے ہٹ کر اسی کی طرف بھاگے، اگر اس کی طرف نہ بھاگا اور رجوع نہ ہوا تو یہ بہت ڈر کی چیز ہے، یا کسی اور ہستی کی طرف رجوع ہو گیا تو یہ بھی ڈر کی بات ہے ان دونوں صورتوں کے خوفناک انجام سے میں تم کو صاف صاف ڈراتا ہوں۔

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾

اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو رسول آیا اس کو یہی کہا کہ جادوگر ہے یا دیوانہ ۱؎

اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾

کیا یہی وصیت کر مرے ہیں ایک دوسرے کو، کوئی نہیں پر یہ لوگ شریر ہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: آگے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپ واقع میں بلا شبہ صاف صاف ڈرانے والے ہیں جیسا ابھی مذکور ہوا، لیکن یہ آپ کے مخالفین ایسے جاہل ہیں کہ نعوذ باللہ آپ کو کبھی جادوگر کبھی مجنون بتلاتے ہیں، سو آپ صبر کیجئے کیونکہ جس طرح یہ آپ کو کہہ رہے ہیں: اسی طرح جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو انہوں نے (یعنی سب نے یا بعض نے) ساحر یا مجنون نہ کہا ہو (آگے اس بات یعنی ساحر او مجنون پر تمام کفار کے متفق ہونے سے تعجب دلاتے ہیں کہ) کیا اس بات کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے چلے آئے تھے (یعنی یہ اجماع واتفاق تو ایسا ہو گیا جیسے ایک دوسرے کو کہتے چلے آئے ہوں کہ دیکھو جو رسول آئے تم بھی ہماری طرح کہنا، آگے حقیقت واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ وصیت تو نہیں کی، کیونکہ بعض قومیں بعض قوموں سے ملیں بھی نہیں) بلکہ (اس اجماع واتفاق کی وجہ یہ ہوئی کہ) یہ سب کے سب سرکش لوگ ہیں (یعنی اس قول کا سبب سرکشی ہے، اور وہ چونکہ ان سب میں مشترک ہے اس لئے سب باتیں بھی ایک سی کرتے ہیں)۔

اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ: یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ جن رسولوں کو لوگوں نے جھٹلایا ہے تو بعض لوگوں نے ان رسولوں کی تصدیق بھی تو کی ہے، پھر یہاں قالوا میں سب کی طرف نسبت کیسے کی گئی؟ جواب خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہے کہ ساری قوم نے یا بعض نے ایسا ضرور کہا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایسی صاف تنبیہ وانذار پر اگر یہ منکرین کان نہ دھریں تو غم نہ کیجیے، ان سے پہلے جن کافر قوموں کی طرف کوئی پیغمبر آیا، اسی طرح جادوگر یا دیوانہ کہہ کر اس کی نصیحتوں کو ہنسی میں اڑا دیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہر زمانے کے کافر اس بات میں ایسے متفق اللفظ رہے کہ گویا ایک دوسرے کو وصیت کر مرے ہیں کہ جو رسول آئے اسے ساحر یا مجنون کہہ کر چھوڑ دینا، اور واقع میں وصیت تو کہاں کرتے، البتہ شرارت کے عنصر میں سب شریک ہیں، اور یہ ہی اشتراک پچھلے شریروں سے وہ الفاظ کہلاتا جو اگلے شریروں نے کہے تھے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾

سو تو لوٹ آ ان کی طرف سے اب تجھ پر نہیں ہے الزام، اور سمجھاتا رہ کہ سمجھانا کام آتا ہے ایمان والوں کو ۱؎

خلاصہ تفسیر: سو (جب پہلے لوگ بھی ایسے گزرے ہیں اور معلوم ہو گیا کہ اس کا سبب انہی کی سرکشی ہے تو) آپ ان کی طرف التفات نہ کیجئے (یعنی ان کے جھٹلانے کی پرواہ اور غم نہ کیجئے) کیونکہ آپ پر کسی طرح کا الزام نہیں (کقولہ تعالیٰ: **ولا تسئل عن اصحٰب الجحیم**) اور (اطمینان کے ساتھ اپنے منصبی کام میں لگے رہئے فقط) سمجھاتے رہئے کیونکہ سمجھانا (جن کی قسمت میں ایمان نہیں ان پر تو حجت تمام ہو جائے گی، اور جن کی قسمت میں ایمان ہے ان) ایمان (لانے) والوں کو (بھی، اور جو پہلے سے مومن ہیں ان کو بھی) نفع دے گا۔

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى: تذکیر یعنی سمجھانے میں عام فوائد اور حکمتیں سب کے اعتبار سے ہیں، جن کی قسمت میں ایمان نہیں ان پر حجت تمام ہو جائے گی، اور جن کی قسمت میں ایمان ہے وہ ایمان لے آئیں گے، اور جو ایمان لا چکے ہیں ان کو بھی نفع ہوگا، پس نصیحت کیے جایئے اور کسی کے ایمان نہ لانے کا غم نہ کیجئے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی آپ فرض دعوت وتبلیغ کما حقہ ادا کر چکے، اب زیادہ پیچھے پڑنے اور غم کرنے کی ضرورت نہیں، نہ ماننے کا جو کچھ الزام رہے گا ان ہی معاندین پر رہے گا، ہاں سمجھانا آپ کا کام ہے، سو یہ سلسلہ جاری رکھیے جس کی قسمت میں ایمان لانا ہوگا اس کو یہ سمجھانا کام دے گا جو ایمان لا چکے ہیں ان کو مزید نفع پہنچے گا اور منکروں پر خدا کی حجت تمام ہوگی۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ

اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو لے میں نہیں چاہتا ان سے روزینہ اور نہیں چاہتا

اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ﴿٥٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿٥٨﴾

کہ مجھ کو کھلائیں، اللہ جو ہے وہی ہے روزی دینے والا زور آور مضبوط ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے زیادہ تر قیامت، توحید ورسالت اور بعض آیتوں میں نیک کاموں کا ذکر تھا، اور یہ سب اعتقادی اور عملی عبادتیں ہیں، اب سورت کے ختم پر ایک جامع عنوان سے عبادت کا مطلوب ہونا بیان فرماتے ہیں، اور رغبت اور خوف دلا کر اس کی تاکید فرماتے ہیں، پھر جو عبادت فرض ہے اس کا مؤکد ہونا تو ظاہر ہ اور جو نفل ہے اس کے شرعاً مقرر ہونے کا اعتقاد واجب ہے۔

اور میں نے جن اور انسان کو (دراصل) اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں (باقی) میں ان سے (مخلوق کی) رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں، اللہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے والا ہے (تو ہم کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ ہم مخلوقات کی روزی رسانی ان کے متعلق کرتے اور وہ) قوت والا نہایت قوت والا ہے (کہ اس میں عجز وکمزوری اور کسی قسم کی احتیاج کا عقلی احتمال بھی نہیں تو اپنے لیے کھانا مانگنے کا کوئی امکان ہی نہیں حاصل یہ کہ عبادت کے مقرر کرنے سے ہماری خود کوئی غرض نہیں، بلکہ صرف بندوں ہی کا نفع ہے تو ان کو اس میں پس وپیش نہیں کرنی چاہیے)۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ: ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں انسان اور جن کی پیدائش کے مقصد کو صرف عبادت میں منحصر کر دیا گیا ہے، حالانکہ ان کی پیدائش میں عبادت کے علاوہ دوسرے فوائد اور حکمتیں بھی تو موجود ہیں؟ جواب یہ ہے کہ انسان اور جن کو عبادت کے لیے پیدا کرنا اس سے دوسرے منافع اور فوائد کی نفی نہیں کرتا۔

دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ جب جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے کسی خاص کام کے لئے پیدا کیا اور اس کا ارادہ یہی ہے کہ یہ مخلوق اس کام کو کرے تو عقلی طور پر یہ ناممکن ومحال ہوگا کہ پھر وہ مخلوق اس کام سے انحراف کر سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ ومشیت کے خلاف کوئی کام محال ہے، حالانکہ ہم دیکھتے

ہیں کہ بہت سے جن اور انسان اس مقصد سے منحرف ہیں اور عبادت نہیں کرتے؟ اس اشکال کے جواب میں بعض حضرات مفسرین نے اس مضمون کو صرف مومنین کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، یعنی ہم نے مومن جنات اور مومن انسانوں کو بجز عبادت کے اور کسی کام کے لئے نہیں بنایا اور مومنین ظاہر ہے کہ عبادت کے کم وبیش پابند ہوتے ہیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ارادہ الٰہیہ سے مراد تکوینی ارادہ یعنی مجبور کرنا مراد نہیں ہے جس کے خلاف کا وقوع محال ہوتا ہے، بلکہ یہاں تشریعی ارادہ مراد ہے، یعنی یہ کہ ہم نے ان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ ہم ان کو عبادت کے لیے مامور کریں، یعنی اللہ تعالی نے تو عبادت کا حکم سب کو دیا ہے مگر ساتھ ہی اختیار بھی دیا ہے، اس لیے کسی نے اپنے خداداد اختیار کو صحیح خرچ کیا اور عبادت میں لگ گیا، کسی نے اس اختیار کو غلط استعمال کیا اور عبادت سے منحرف ہوگیا، اس صورت میں ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ مجھ کو مطلوب شرعی ان سے عبادت کرانا ہے، یا اس آیت سے مراد یہ ہے کہ ہم نے جن اور انسان کی تخلیق اس انداز پر کی ہے کہ ان میں عبادت کرنے کی استعداد اور صلاحیت ہو، چنانچہ ہر جن وانس کی فطرت میں یہ استعداد قدرتی موجود ہے، پھر کوئی اس استعداد کو صحیح مصرف میں خرچ کر کے کامیاب ہوتا ہے، کوئی اس استعداد کو اپنے معاصی اور شہوات میں ضائع کر دیتا ہے، اس صورت میں اس کا یہ مفہوم ہوسکتا ہے کہ جن وانس کے ہر فرد میں اللہ تعالی نے عبادت کی استعداد اور صلاحیت رکھی ہے، واللہ اعلم۔

یہاں صرف جن اور انسان کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا کہ اس جگہ عبادت سے مراد وہ عبادت ہے جو اختیار کے ساتھ کی جائے، اور اس سے آزمائش مقصود ہو، اور فرشتوں میں اگرچہ عبادت ہے مگر ان کا امتحان مقصود نہیں، اور دوسری مخلوقات مثلاً حیونات ونباتات وغیرہ میں اختیار کی صفت نہیں۔

اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ: مجاہدؒ سے لِيَعْبُدُوْنِ کی تفسیر "لیعرفون" کے ساتھ منقول ہے، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ عبادت بغیر معرفت کے قابل لحاظ نہیں ہوتی، اسی طرح معرفت بھی بغیر عبادت کے حاصل نہیں ہوتی، اب اہل ظاہر نے صرف صورت عبادت کو لے لیا ہے اور جاہل صوفیہ نے صرف معرفت کا دعوی کیا ہے (دونوں ہی ناقص ہیں، اصل یہ ہے کہ بندہ عبادت اور معرفت دونوں کا جامع ہو)۔

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ: اگر اس پر یہ شبہ ہو کہ اہل وعیال کو رزق پہنچانا تو واجب کیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم ان سے ایسا رزق کموانا نہیں چاہتے جو عبادت سے مانع ہو، جیسا کہ سورہ طٰہ میں آیت ۱۳۲: لا نسالك رزقا کی بندہ نے تفسیر کی ہے، دوسرے یہ کہ اہل وعیال کے واسطے صرف کمانا اور خرچ کرنا واجب ہے اور اسے رزق پہنچانا نہیں کہہ سکتے، رازق پھر بھی اللہ تعالی ہے، کیونکہ اگر کمانے سے رزق حاصل نہ ہوا تو انسان کیا کرسکتا ہے، یا رزق حاصل ہونے کے بعد اگر پہنچانے پر قادر نہ ہو تو کیا کرسکتا ہے، یا پہنچانے کے بعد غذا کا حلق سے اترنا، یا پھر اس سے قوت حاصل کرنا جو کہ رزق سے مقصود ہے یہ تو کسی کی قدرت میں نہیں، پس حقیقت میں بندہ کسی طرح رازق نہیں، اور اس کے کمانے اور خرچ کرنے سے کچھ خدا کا نفع نہیں، نہ اس کو کچھ سہارا لگتا ہے کہ اس نے اپنے ذمہ جو مخلوق کو رزق پہنچانا رکھا ہے بندہ کے خرچ کرنے سے کچھ اس کو مدد مل گئی ہو، بلکہ اس کا نفع خود خرچ کرنے والے کو ہوتا ہے کہ ثواب ملتا ہے اور یہاں: مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ سے مقصود یہی ہے کہ خدا تعالی کو کسی کے کمانے اور خرچ کرنے سے نفع نہیں پہنچتا۔

فائدہ: ۱ یعنی انکے پیدا کرنے سے شرعاً بندگی مطلوب ہے، اسی لیے ان میں خلقۃً ایسی استعداد رکھی ہے کہ چاہیں تو اپنے اختیار سے بندگی کی راہ پر چل سکیں یوں ارادہ کونیہ قدریہ کے اعتبار سے تو ہر چیز اسکے حکم تکوینی کے سامنے عاجز اور بے بس ہے، لیکن ایک وقت آئے گا جب سب بندے اپنے ارادہ سے تخلیق عالم کی اس غرض شرعی کو پورا کریں گے بہر حال آپ ﷺ سمجھاتے رہیے کہ سمجھانے سے ہی یہ مطلوب شرعی حاصل ہوسکتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی ان کی بندگی سے میرا کچھ فائدہ نہیں، ان ہی کا نفع ہے، میں وہ مالک نہیں جو غلاموں سے کہے میرے لیے کما کر لاؤ یا میرے سامنے کھانا لا کر رکھو، میری ذات ان تخیلات سے پاک اور برتر ہے، میں ان سے اپنے لیے روزی کیا طلب کرتا، خود ان کو اپنے پاس سے روزی پہنچاتا ہوں بھلا مجھ جیسے زور آور اور قادر وتوانا کو تمہاری خدمات کی کیا حاجت ہوسکتی ہے بندگی کا حکم صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ تم میری شہنشائی وعظمت وکبریائی کا قولاً فعلاً اعتراف کر کے میرے خصوصی الطاف ومراحم کے مورد مستحق بنو۔

فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا یَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾

سو ان گناہ گاروں کا بھی ڈول بھر چکا ہے جیسے ڈول بھرا ان کے ساتھیوں کا اب مجھ سے جلدی نہ کریں ۱؎

فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ یَّوْمِهِمُ الَّذِیْ یُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع

سو خرابی ہے منکروں کو ان کے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ ہو چکا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے ترغیب ہوگئی، اب آگے ترہیب ہے کہ جب عبادت کا وجوب ثابت ہوگیا اور عبادت کا اہم رکن ایمان ہے تو اگر یہ لوگ اب بھی شرک وکفر پر مصر رہیں گے) تو (سن رکھیں کہ) ان ظالموں کی (سزا کی) بھی باری (علم الٰہی میں مقرر) ہے جیسے ان کے (گزشتہ) ہم مشربوں کی باری (مقرر) تھی (یعنی ہر مجرم ظالم کے لئے اللہ کے علم میں خاص خاص وقت مقرر ہے، اس طرح باری باری ہر مجرم کی باری آتی ہے تو وہ عذاب میں پکڑا جاتا ہے، کبھی دنیا وآخرت دونوں میں، اور کبھی صرف آخرت میں) سو مجھ سے (عذاب) جلدی طلب نہ کریں (جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ وعیدیں سن کر جھٹلانے کے طور پر عذاب کا جلد تقاضا کرنے لگتے ہیں) غرض (جب وہ باری کے دن آئیں گے جن میں سب سے سخت قیامت کا دن ہے تو) ان کافروں کے لئے اس دن کے آنے سے بڑی خرابی ہوگی جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے (چنانچہ خود یہ سورت بھی اسی وعدے سے شروع ہوتی ہے: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ، اور اس سے سورت کے آغاز وانجام کا حسن ظاہر ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگر یہ ظالم بندگی کی طرف نہیں آتے تو سمجھ لو کہ دوسرے ظالموں کی طرح ان کا ڈول بھی بھر چکا ہے، بس اب ڈوبا چاہتا ہے، خواہ مخواہ سزا میں جلدی نہ مچائیں، جیسے دوسرے کافروں کو خدائی سزا کا حصہ پہنچا، ان کو بھی پہنچ کر رہے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی قیامت کا دن یا اس سے پہلے ہی کوئی دن سزا کا آجائے، چنانچہ مشرکین مکہ کو ''بدر'' میں خاصی سزا مل گئی۔

(ایاتها ۴۹) (۵۲ سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ ۷۶) (رکوعاتها ۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالطُّوْرِ ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴿۲﴾ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ﴿۳﴾ وَّالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ﴿۵﴾

قسم ہے طور کی ۱؎ اور لکھی ہوئی کتاب کی، کشادہ ورق میں ۲؎ اور آباد گھر کی ۳؎ اور اونچی چھت کی ۴؎

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴿۸﴾

اور ابلتے ہوئے دریا کی ۵؎ بیشک عذاب تیرے رب کا ہو کر رہے گا، اس کو کوئی نہیں ہٹانے والا ۶؎

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت قیامت کی وعید پر ختم ہوئی ہے، اور یہ سورت اسی سے شروع ہوتی ہے، پھر وعید کے بعد قرآن کی عادت کے موافق مؤمنین کے لیے وعدہ مذکور ہے۔

قسم ہے طور (پہاڑ) کی، اور اس کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ میں لکھی ہے (مراد اس سے نامہ اعمال ہے جس کی نسبت دوسری آیت میں آیا ہے: كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا اور جس چیز میں وہ لکھا ہوا ہے اس کو کاغذ سے تشبیہ دے دی) اور (قسم ہے) بیت المعمور کی (جو کہ ساتویں آسمان میں

فرشتوں کا عبادت خانہ ہے) اور (قسم ہے) اونچی چھت کی (مراد آسمان ہے، قال تعالیٰ :وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا) اور (قسم ہے) دریائے شور کی جو (پانی سے) پر ہے (اب آگے جواب قسم ہے) کہ بیشک آپ کے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہے گا، کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا۔

اور ان قسموں میں اس مقصد کو ذہن کے قریب لانا ہے جس کے لئے قسم کھائی گئی، اور ان قسموں کی خصوصیت کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ قیامت کے واقع ہونے کی اصل غرض اور وجہ جزا وسزا ہے، اور جزا وسزا میں مدار کار احکام شرعیہ ہیں، پس طور کی قسم کھانے میں اس طرف اشارہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام اور احکام نازل کیے ہیں، پھر جزا وسزا موقوف ہے احکام کی مخالفت وموافقت پر، نامہ اعمال کی قسم سے اس طرف اشارہ ہو گیا کہ تمہارے سب کام محفوظ ہیں، پھر جزا وسزا اس پر بھی موقوف ہے کہ عبادت ضروری ہو، چنانچہ بیت المعمور کی قسم سے اشارہ ہو گیا کہ عبادت ایسی ضروری ہے کہ فرشتوں کو بھی اس سے چھوڑا نہیں گیا، حالانکہ فرشتوں کے لیے جزا وسزا بھی نہیں، پھر جزا وسزا کے دو نتیجے ہیں: جنت اور دوزخ، آسمان کی قسم میں جنت کی طرف اشارہ ہو گیا کہ وہ بھی ایسی ہی بلند جگہ ہے، اور دریائے شور کی قسم میں دوزخ کی طرف اشارہ ہے وہ بھی ایسی ہی خوفناک چیز ہے جیسے سمندر۔

قسم کے متعلق کچھ کلام سورۃ حجر آیت ۷۲:لعمرك انهم لفي سكرتهم کے ذیل میں اور سورۃ صافات کے شروع میں گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَالطُّوْرِ: یعنی کوہ ''طور'' جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے کلام کیا۔

فائدہ: ۲۔ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ: اس ''کتاب'' سے شاید ① ''لوح محفوظ'' مراد ہو ② یا لوگوں کا اعمالنامہ ③ یا قرآن کریم ④ یا طور کی مناسبت سے تورات ⑤ یا عام کتب سماویہ، سب احتمالات ہیں۔

فائدہ: ۳۔ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ: شاید ① کعبہ کو کہا ② یا ساتویں آسمان پر خانہ کعبہ کی ٹھیک محاذات میں فرشتوں کا کعبہ ہے، اس کو ''بیت معمور'' کہتے ہیں، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔

فائدہ: ۴۔ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ: یعنی ① آسمان کی قسم جو زمین کے اوپر ایک چھت کی طرح ہے اور ② یا سقف مرفوع عرش عظیم کو کہا جو تمام آسمانوں کے اوپر ہے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت کی چھت ہے۔

فائدہ: ۵۔ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ: ① دنیا کے ابلتے ہوئے دریا مراد ہوں ② یا وہ عظیم الشان دریا مراد ہو جس کا وجود عرش عظیم کے نیچے اور آسمانوں کے اوپر روایات سے ثابت ہوا ہے۔

فائدہ: ۶۔ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ: یعنی یہ تمام چیزیں جن کی قسم کھائی شہادت دیتی ہیں کہ وہ خدا بہت بڑی قدرت وعظمت والا ہے، پھر اس کی نافرمانی کرنے والوں پر عذاب کیوں نہیں آئے گا اور کس کی طاقت ہے جو اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو الٹا واپس کر دے گا۔

يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ؕ﴿۱۰﴾

جس دن لرزے آسمان کپکپا کر ۱۔ اور پھریں پہاڑ چل کر ۲۔

خلاصہ تفسیر: (اور یہ عذاب اس روز واقع ہوگا) جس روز آسمان تھر تھرانے لگے گا، اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹ جائیں گے (مراد قیامت کا دن ہے)۔

تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا: آسمان کے تھرانے سے یا تو مشہور معنی مراد ہیں، یا پھٹ جانا مراد ہے جو دوسری آیت میں مذکور ہے: فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ ، روح المعانی میں ابن عباسؓ سے دونوں تفسیریں نقل کی ہیں اور دونوں میں کوئی تعارض نہیں، آگے پیچھے دونوں کا تحقق ہوسکتا ہے اور یہاں پہاڑوں کا ہٹنا مذکور ہے اور دوسری آیتوں میں ریزہ ریزہ ہو کر پھر اڑ جانا بھی آیا ہے: يَنْسِفُهَا رَبِّيْ، اسی طرح: وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَآءً۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آسمان لرز کر اور کپکپا کر پھٹ پڑے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ دیں گے اور روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔

وقف لازم

فَوَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۱۲﴾

سو خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کو، جو باتیں بناتے ہیں کھیلتے ہوئے ۱؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے اس دن کے بعض واقعات ارشاد فرماتے ہیں کہ جب یہ ثابت ہوا کہ مستحقین عذاب کے لئے عذاب ضرور واقع ہوگا) تو جو لوگ (قیامت کے اور دیگر حق باتیں یعنی توحید و رسالت کے) جھٹلانے والے ہیں (اور) جو (جھٹلانے کے) مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگ رہے ہیں (جس سے وہ مستحق عذاب ہو گئے ہیں) ان کی اس روز بڑی کم بختی آئے گی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو آج کھیل کود میں مشغول ہو کر طرح طرح کی باتیں بناتے اور آخرت کی تکذیب کرتے ہیں، ان کے لیے اس روز سخت خرابی اور تباہی ہے۔

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾

جس دن کہ دھکیلے جائیں دوزخ کی طرف دھکیل کر، یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھوٹ جانتے تھے ۱؎

اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۱۵﴾

اب بھلا یہ جادو ہے یا تم کو نہیں سوجھتا ۲؎

خلاصہ تفسیر: جس روز کہ ان کو آتش دوزخ کی طرف دھکے دے دے کر لائیں گے (کیونکہ خوشی سے ایسی جگہ کون آتا ہے، پھر جب ان کے ڈالنے کا وقت ہوگا تو اس حالت سے پکڑ کے ڈال دیئے جائیں گے: فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ اور ان کو دوزخ دکھلا کر بطور دھمکی کہا جائے گا کہ) یہ وہی دوزخ ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے (یعنی جن آیتوں میں اس کی خبر تھی ان کو تم جھٹلاتے تھے، اور نیز ان آیات کو جادو کہا کرتے تھے، خیر وہ تو تمہارے نزدیک جادو تھا) تو کیا یہ (بھی) سحر ہے (دیکھ کر بتلاؤ) یا یہ کہ تم کو (اب بھی) نظر نہیں آتا (جیسا کہ دنیا میں نظر نہ آنے کی وجہ سے منکر ہو گئے تھے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی فرشتے ان کو سخت ذلت کے ساتھ دھکیلتے ہوئے دوزخ کی طرف لے جائیں گے اور وہاں پہنچا کر کہا جائے گا کہ یہ وہ آگ حاضر ہے جس کو تم جھوٹ جانتے تھے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تم دنیا میں انبیاء کو جادوگر اور ان کی وحی کو جادو کہا کرتے تھے، ذرا اب بتلاؤ کہ یہ دوزخ جس کی خبر انبیاء نے دی تھی کیا واقعی جادو یا نظر بندی ہے یا جیسے دنیا میں تم کو کچھ سوجھتا نہ تھا، اب بھی نہیں سوجھتا۔

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

چلے جاؤ اس کے اندر پھر تم صبر کرو یا نہ صبر کرو، تم کو برابر ہے، وہی بدلہ پاؤ گے جو کچھ تم کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: (اچھا تو اب) اس میں داخل ہو پھر خواہ (اس کی) سہار کرنا یا سہار نہ کرنا، تمہارے حق میں دونوں برابر ہیں (نہ یہ

ہوگا کہ تمہاری ہائے واویلا سے نجات ہوجائے ،اور نہ یہ ہوگا کہ تمہاری خاموشی اور اطاعت پر رحم کر کے نکال دیا جائے ، بلکہ ہمیشہ اسی میں رہنا ہوگا اور) جیسا تم کرتے تھے ویسا ہی بدلہ تم کو دیا جائے گا (تم کفر کیا کرتے تھے جو سب سے بڑی نافرمانی اور اللہ تعالیٰ کے حقوق اور بے انتہا کمالات کی بے قدری اور ناشکری ہے، اس کے بدلہ میں ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہنا ہوگا جس کا عذاب بہت سخت اور کبھی ختم نہ ہونے والا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی دوزخ میں پڑ کر اگر گھبراؤ اور چلاؤ گے، تب کوئی فریاد کو پہنچنے والا نہیں، اور بفرض محال صبر کر کے چپ ہو رہو تب تم پر کوئی رحم کھانے والا نہیں، غرض دونوں حالتیں برابر ہیں، اس جیل خانہ سے نکلنے کی تمہارے لیے کوئی سبیل نہیں، جو کرتوت دنیا میں کیے ان کی سزا یہی حبس دوام اور ابدی عذاب ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ⑰ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ⑱

ڈرنے والے ہیں وہ باغوں میں ہیں اور نعمت میں، میوے کھاتے ہوئے جو انکو دیے انکے رب نے اور بچایا انکے رب نے دوزخ کے عذاب سے۔[1]

خلاصہ تفسیر: (اب آگے ان کے مقابل لوگوں کا بیان ہے یعنی) متقی لوگ بلاشبہ (بہشت کے) باغوں اور سامان عیش میں ہوں گے (اور) ان کو جو چیزیں (عیش و آرام کی) ان کے پروردگار نے دی ہوں گی اس سے خوش دل ہوں گے، اور ان کا پروردگار ان کو عذاب دوزخ سے محفوظ رکھے گا۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جو دنیا میں اللہ سے ڈرتے تھے، وہاں بالکل مامون اور بےفکر ہوں گے، ہر قسم کے عیش و آرام کے سامان ان کے لیے حاضر رہیں گے اور یہی انعام کیا کم ہے کہ دوزخ کے عذاب سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے گا۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔـۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ⑲

کھاؤ اور پیو رچتا ہوا بدلہ ان کاموں کا جو تم کرتے تھے

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ⑳

تکیہ لگائے بیٹھے تختوں پر برابر بچھے ہوئے قطار باندھ کر[1] اور بیاہ دیں ہم نے ان کو حوریں بڑی آنکھوں والیاں

خلاصہ تفسیر: (اور متقی لوگوں کو جنت میں داخل کر کے فرمائے گا کہ) خوب کھاؤ اور پیو مزہ کے ساتھ اپنے (ان نیک) عملوں کے بدلہ میں (جو دنیا میں کیا کرتے تھے) تکیہ لگائے ہوئے تختوں پر جو برابر بچھائے ہوئے ہیں، اور ہم ان کا گوری گوری بڑی آنکھوں والیوں سے (یعنی حوروں سے) بیاہ کر دیں گے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جنتیوں کی مجلس اس طرح ہوگی کہ سب جنتی بادشاہوں کی طرح اپنے اپنے تخت پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے اور ان کی ترتیب نہایت قرینہ سے ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ

اور جو لوگ یقین لائے اور ان کی راہ پر چلی ان کی اولاد ایمان سے پہنچا دیا ہم نے ان تک ان کی اولاد کو اور گھٹایا نہیں ہم نے ان سے ان کا کیا

مِنْ شَيْءٍ ط كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾

ذرا بھی لے ہر آدمی اپنی کمائی میں پھنسا ہے لے

خلاصہ تفسیر: پیچھے تو عام مسلمانوں کا حال بیان ہوا، اب آگے ان خاص مؤمنین کا ذکر ہے جن کی اولاد بھی مؤمن تھی، پس ارشاد ہے کہ:

اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا (یعنی اولاد بھی مؤمن تھی مگر اعمال میں وہ اپنے مؤمن آباء یعنی باپ دادا کے رتبہ ومقام تک نہیں پہنچے، جس کا قرینہ یہ ہے کہ اس جگہ اولاد کے اعمال کا ذکر نہیں، اور احادیث میں توصراحتہً یہ مضمون موجود ہے، پس اگرچہ اولاد کے اعمال کم ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ ان کا درجہ بھی کم ہوتا، لیکن ان کے مسلمان آباء یعنی باپ دادوں کے اکرام اور ان کو خوش کرنے کے لیے) ہم ان کی اولاد کو بھی (درجہ میں) ان کے ساتھ شامل کردیں گے، اور (اس شامل کرنے کے لئے) ہم ان (اہل جنت باپ دادوں) کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہیں کریں گے (یعنی یہ صورت نہ ہوگی کہ ان بڑوں کے کچھ اعمال لے کر چھوٹوں کو دے کر دونوں کو برابر کردیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بڑے کو اس کے درجہ سے کچھ نیچے لائیں اور چھوٹے کو کچھ اوپر لے جائیں اور یہ دونوں ایک درمیانی درجہ میں رکھے جائیں، بلکہ کریموں کی شان کے لائق یہ ہے کہ بڑے لوگوں کو اپنے بلند درجوں میں بدستور رکھیں گے اور چھوٹوں کو بھی وہاں پہنچادیا جائے گا، اور باپ دادا، اور ان کی اولاد و ذریت میں ایمان کی شرط اس لئے ہے کہ اگر وہ ذریت مؤمن نہیں تو مؤمن باپ دادا کے ساتھ الحاق نہیں ہوسکتا، کیونکہ کافروں میں سے) ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) میں محبوس (یعنی دوزخ میں قید اور ماخوذ) رہے گا (کقولہ تعالیٰ: كل نفس بما كسبت رهينة الا اصحب اليمين، یعنی کفر سے نجات کی کوئی صورت نہیں، چنانچہ کافر اولاد اپنے مسلمان باپ دادوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی، اس لیے اولاد کو باپ دادوں سے ملانے کے لیے ایمان شرط ہے)۔

وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ: حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "ذریت" سے ہر ماتحت اور تابع مراد ہے، جیسے ازواج، احباب، شاگرد، مرید اور محبت کرنے والے، کیونکہ حدیث میں اولاد کا ذکر ذریت کے بعد کیا گیا ہے، اس صورت میں آیت کا مفہوم بہت وسیع ہوجائے گا، باقی جو شخص کسی درجہ میں دوسرے کا تابع ہو کر پہنچ جائے گا پھر اس کے تابع ہو کر اور کوئی اس درجہ میں نہ جائے گا، ورنہ لازم آئے گا کہ سارے مسلمان ایک ہی درجہ میں پہنچ جائیں، کیونکہ اس تابع کے بھی تابع ہوں گے، پھر ان کے بھی تابع ہوں گے، پھر تو کوئی انتہا ہی نہ رہے گی۔

ذریت واولاد نیک اعمال کے اعتبار سے اپنے نیک آباء واجداد کے رتبہ ومقام تک نہیں پہنچ رہے ہوتے، اس بات کا قرینہ یہ ہے کہ اس جگہ اولاد کے اعمال کا ذکر نہیں اور احادیث میں توصراحتہً یہ مضمون موجود ہے کہ: "كانوا دونه فی العمل، وكانت منازل ابائهم ارفع، ولم يبلغوا درجتك و عملك".

وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ: متبوعین یعنی نیک باپ دادا کے بعض اعمال لے کر ان کی ذریت واولاد کو دے کر دونوں کو برابر کردیں گے، جیسے مثلاً ایک شخص کے پاس چھ سو روپے ہوں اور ایک کے پاس چار سو روپے، اور دونوں کو برابر کرنا مقصود ہو تو اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ چھ سو روپے والے سے ایک سو روپے لے کر اس چار سو والے کو دے دیے جائیں کہ دونوں کے پاس پانچ پانچ سو روپے ہوجائیں، اور دوسری صورت جو کریموں کی شان کے لائق ہے یہ ہے کہ چھ سو والے سے کچھ نہ لیا جائے، بلکہ اس چار سو والے کو دو سو روپے اپنے پاس سے دیدیں اور دونوں کو برابر کردیں، پس مطلب یہ ہے کہ وہاں پہلی صورت واقع نہ ہوگی جس کی صورت یہ ہوتی کہ باپ دادا کو ان کے درجہ سے کچھ نیچے لاتے اور اولاد و ذریت کو کچھ اوپر لے جاتے اور دونوں ایک متوسط درجہ میں رہتے تو یہ صورت نہ ہوگی، بلکہ دوسری صورت واقع ہوگی اور باپ دادا بدستور اپنے بلند درجوں میں رہیں گے، اور اولاد کو فضل وکرم سے وہاں پہنچادیا جائے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نسبی شرافت آخرت میں کام آئے گی، لیکن یہ شرافت دینی وایمانی ہو، عرفی ودنیوی شرافت مراد نہیں ہے۔

فائدہ: ۱؎ یعنی کاملوں کی اولاد اور متعلقین اگر ایمان پر قائم ہوں اور ان ہی کاموں کی راہ پر چلیں، جو خدمات ان کے بزرگوں نے انجام دی تھی یہ بھی ان کی تکمیل میں ساعی ہوں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو جنت میں ان ہی کے ساتھ ملحق کر دے گا، گو ان کے اعمال واحوال سے کما وکیفا فروتر ہوں، تاہم ان بزرگوں کے اکرام اور عزت افزائی کے لیے ان تابعین کو ان متبوعین کے جوار میں رکھا جائے گا، اور ممکن ہے بعض کو بالکل ان ہی کے مقام اور درجہ پر پہنچا دیا جائے جیسا کہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے، اور اس صورت میں یہ گمان نہ کیا جائے کہ ان کاملین کی بعض نیکیوں کا ثواب کاٹ کر ذریت کو دے دیا جائے گا، نہیں یہ محض اللہ کا فضل واحسان ہوگا کہ قاصرین کو ذرا اُبھار کر اوپر کاملین کے مقام تک پہنچا دیا جائے۔

تنبیہ: احقر نے **واتبعتهم ذريتهم** کا جو مطلب لیا ہے صحیح بخاری کی یہ حدیث اس کے مناسب معلوم ہوتی ہے، قالت الانصار یا رسول الله ان لكل قوم اتباعا وانا قد اتبعناك فادع الله ان يجعل اتباعنا منا، قال النبی ﷺ اللهم اجعل اتباعهم منهم۔

فائدہ: ۲؎ اوپر فضل کا بیان تھا یہاں عدل کا ضابطہ بتلا دیا یعنی عدل کا مقتضی یہ ہے کہ جس آدمی نے جو کچھ اچھا یا برا عمل کیا ہے اسی کے موافق بدلہ پائے، آگے اللہ کا فضل ہے کہ وہ کسی کی تقصیر معاف فرما دے یا کسی کا درجہ بلند کر دے۔

وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٢٢﴾ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿٢٣﴾

اور تار لگا دیا ہم نے ان پر میووں کا اور گوشت کا جس چیز کو جی چاہے ۱؎ جھپٹتے ہیں وہاں پیالہ نہ بکنا ہے اس شراب میں اور نہ گناہ میں ڈالنا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (آگے پھر سب اہل ایمان اور جنتیوں کا بیان ہے کہ) ہم ان کو میوے اور گوشت جس قسم کا ان کو مرغوب ہو روز افزوں دیتے رہیں گے (اور) وہاں آپس میں (بطور خوش طبعی کے) جام شراب میں چھینا جھپٹی بھی کریں گے کہ اس (شراب) میں نہ بک بک لگے گی (کیونکہ نشہ نہ ہوگا) اور نہ کوئی بیہودہ بات (عقل ومتانت کے خلاف) ہوگی۔

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قریبی دوستوں میں کھانا پینا اور مزاح برا نہیں جیسا کہ بعض خشک زاہد اسے وقار کے خلاف سمجھتے ہیں، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی اپنے قریبی کی طیب خاطر یعنی خوشی کے ساتھ دلی رضامندی کا یقین ہو تو اس کے مال میں تصرف بھی کیا جا سکتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس قسم کا گوشت مرغوب ہو اور جس جس میوے کو دل چاہے بلا توقف لگا تار حاضر کیے جائیں گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی شراب طہور کا دور جب چلے گا تو جنتی بطور خوش طبعی کے ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کریں گے، لیکن اس شراب میں محض نشاط اور لذت ہوگی، نشہ بکواس اور فتور عقل وغیرہ کچھ نہ ہوگا نہ کوئی گناہ کی بات ہوگی۔

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿٢٤﴾

اور پھرتے ہیں ان کے پاس چھوکرے ان کے گویا وہ موتی ہیں اپنے غلاف کے اندر

خلاصہ تفسیر: اور ان کے پاس (پھل میوے وغیرہ لانے کے لئے) ایسے لڑکے آئیں جائیں گے (یہ لڑکے کون ہوں گے اس کی تحقیق تفسیر آگے سورۃ واقعہ میں آئے گی) جو خاص انہی (کی خدمت) کے لئے ہوں گے (اور انتہائی حسن وجمال کی وجہ سے ایسے ہوں گے کہ) گویا وہ حفاظت سے رکھے ہوئے موتی ہیں (کہ ان پر ذرا گرد وغبار نہیں ہوتا اور آب وتاب اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جیسے موتی اپنے غلاف کے اندر بالکل صاف وشفاف رہتا ہے گرد وغبار کچھ نہیں پہنچتا، یہ ہی حال انکی صفائی اور پاکیزگی کا ہوگا۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ۝۲۵ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ۝۲۶

اور منہ کیا بعضوں نے دوسروں کی طرف آپس میں پوچھتے ہوئے، بولے ہم بھی تھے اس سے پہلے اپنے گھروں میں ڈرتے رہتے

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ۝۲۷ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ۝۲۸ ع

پھر احسان کیا اللہ نے ہم پر اور بچا دیا ہم کو لو کے عذاب سے، ہم پہلے سے پکارتے تھے اس کو بیشک وہی ہے نیک سلوک والا مہربان ؎

خلاصہ تفسیر: اور (ان کو روحانی مسرت بھی ہوگی، چنانچہ اس میں سے ایک کا بیان یہ ہے کہ) وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے (اور گفتگو کے دوران) یہ بھی کہیں گے کہ (بھائی) ہم تو اس سے پہلے اپنے گھر (یعنی دنیا میں انجام کار سے) بہت ڈرا کرتے تھے سو خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیا (اور) ہم اس سے پہلے (یعنی دنیا میں) اس سے دعائیں مانگا کرتے تھے (کہ ہم کو دوزخ سے بچا کر جنت میں لے جائے، سو اللہ نے دعا قبول کر لی) واقعی وہ بڑا محسن مہربان ہے (اور اس مضمون سے مسرت وخوشی ہونا ظاہر ہے)۔

چونکہ جنت میں پہنچنا دو حیثیت سے انعام تھا: ① ایک فی نفسہ عذاب کی مصیبت سے بچانا ② دوسرے ہم ناکاروں کی ناچیز دعا قبول کر لینا، اس لئے اس نعمت کو دو الگ عنوانوں سے تعبیر کیا گیا۔

* * *

فائدہ: ؎ یعنی جنتی اس وقت ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باتیں کریں گے اور غایت مسرت وامتنان سے کہیں گے کہ بھائی ہم دنیا میں ڈرتے رہتے تھے کہ دیکھیے مرنے کے بعد کیا انجام ہو، یہ کھٹکا برابر لگا رہتا تھا، اللہ کا احسان دیکھو کہ آج اس نے کیسا مامون ومطمئن کر دیا کہ دوزخ کی بھاپ بھی ہم کو نہیں لگی، ہم اپنے رب کو ڈر کر اور امید باندھ کر پکارا کرتے تھے، آج دیکھ لیا کہ اس نے اپنی مہربانی سے ہماری پکار سنی اور ہمارے ساتھ کیسا اچھا سلوک کیا۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ۝۲۹ ط

اب تو سمجھا دے کہ تو اپنے رب کے فضل سے نہ جنوں سے خبر لینے والا ہے اور نہ دیوانہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے جھٹلانے کی سزا مذکور تھی، اب آگے جھٹلانے والوں کا رد ہے اور جن باتوں کو وہ جھٹلایا کرتے تھے ان میں اصل تین چیزیں تھیں: توحید، رسالت اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونا، آگے آنے والی آیتوں میں ان تینوں کی بابت ان کے عقائد، اقوال اور خیالات کا رد ہے اور سورت کے اختتام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے۔

(جب آپ پر ایسے مضامین کی وحی کی جاتی ہے جن کی تبلیغ واجب ہے جیسے پیچھے جنت ودوزخ کے مستحقین کی تفصیل کی گئی ہے) تو آپ (ان مضامین سے لوگوں کو) سمجھاتے رہئے کیونکہ آپ بفضلہ تعالیٰ نہ تو کاہن ہیں اور نہ مجنون ہیں (جیسا کہ مشرکین کا قول سورۃ والضحیٰ کی شان نزول میں منقول ہے کہ: "قد ترکك شیطانك"، جواب کا حاصل یہ ہے کہ آپ کاہن نہیں ہو سکتے، کیونکہ کاہن شیاطین سے خبریں حاصل کرتا ہے اور آپ کا شیطان سے کوئی واسطہ نہیں اور ایک آیت میں ہے: وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ، چنانچہ یہاں آیت میں آپ سے جنون کی بھی نفی کر دی گئی، مطلب یہ کہ آپ نبی ہیں اور نبی کا کام ہمیشہ نصیحت کرتے رہنا ہے، اگرچہ لوگ کچھ ہی بکیں)۔

* * *

فائدہ: کفار، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی دیوانہ کہتے، کبھی کاہن، یعنی جنوں اور شیطانوں سے کچھ جھوٹی سچی خبریں لے کر دیتے ہیں، اتنا نہیں سمجھتے تھے کہ آج تک کسی کاہن اور دیوانے نے ایسی اعلیٰ درجہ کی نصیحتیں اور حکیمانہ اصول، اس طرح کے صاف، شستہ اور شائستہ طرز میں بیان نہیں کیے

ہیں، اسی لیے فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بھلا برا سمجھاتے رہیے اور پیغمبرانہ نصیحتیں کرتے رہیے، ان کی بکواس سے دلگیر نہ ہوں، جب اللہ کے فضل ورحمت سے نہ آپ کاہن ہیں نہ مجنون بلکہ اسکے مقدس رسول ہیں تو نصیحت کرتے رہنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی ہے۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ ﴿۳۰﴾

کیا کہتے ہیں یہ شاعر ہیں ہم منتظر ہیں اس پر گردش زمانہ کے ۱ے

قُلۡ تَرَبَّصُوۡا فَاِنِّیۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُتَرَبِّصِیۡنَ ﴿۳۱﴾

تو کہہ تم منتظر رہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں ۲ے

خلاصہ تفسیر: ہاں! کیا یہ لوگ (کاہن اور مجنون کہنے کے علاوہ آپ کی نسبت) یوں (بھی) کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں (اور) ہم ان کے بارے میں حادثہ موت کا انتظار کررہے ہیں (جیسا کہ درمنثور میں ہے کہ قریش دار الندوہ میں جمع ہوئے اور آپ کے بارے میں یہ مشورہ قرار پایا کہ جیسے اور شعراء مرکر ختم ہوگئے آپ بھی ان ہی میں سے ایک ہیں، اسی طرح آپ بھی ہلاک ہوجائیں گے تو اسلام کا قصہ ختم ہوجائے گا) آپ فرمادیجئے (بہتر) تم منتظر رہو سو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں (یعنی تم میرا انجام دیکھو میں تمہارا انجام دیکھتا ہوں)۔

قُلۡ تَرَبَّصُوۡا فَاِنِّیۡ مَعَكُمۡ: اس جواب میں پیشین گوئی کی طرف اشارہ ہے کہ میرا انجام فلاح وکامیابی ہے، اور تمہارا انجام خسارہ اور ناکامی ہے، یہاں جواب میں یہ مقصود نہیں کہ تم مروگے میں نہ مروں گا، بلکہ ان مشرکین اور کفار کا یہ کہنا کہ ''ہم ان کے بارے میں حادثہ موت کا انتظار کررہے ہیں'' تو ان کا اس کہنے یہ مقصود تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین چلے گا نہیں، یہ مرجائیں گے تو دین بھی مٹ جائے گا، اس لیے جواب میں اس کا رد مقصود ہے، چنانچہ یوں ہی ہوا۔

* * *

فائدہ: ۱ے یعنی پیغمبر جو اللہ کی باتیں سناتا اور نصیحت کرتا ہے، کیا یہ لوگ اس لیے قبول نہیں کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک شاعر سمجھتے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ جس طرح قدیم زمانہ کے بہت سے شعراء گردش زمانہ سے یونہی مرمرا کر ختم ہوگئے ہیں، یہ بھی ٹھنڈے ہوجائینگے، کوئی کامیاب مستقبل ان کے ہاتھ میں نہیں، محض چندروز کی وقتی واہ واہ ہے اور بس۔

فائدہ: ۲ے یعنی اچھا تم میرا انجام دیکھتے رہو، میں تمہارا دیکھتا ہوں، عنقریب کھل جائے گا کہ کون کامیاب ہے، کون خائب وخاسر۔

اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۳۲﴾

کیا ان کی عقلیں یہی سکھلاتی ہیں ان کو یا یہ لوگ شرارت پر ہیں

خلاصہ تفسیر: (اور یہ لوگ جو ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں تو) کیا ان کی عقلیں (جس کا یہ بہت دعوی کرتے ہیں) ان کو ان باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ ہے کہ یہ شریر لوگ ہیں (ان کا عقل ودانش کا دعوے دار ہونا ان کے اس قول سے ثابت ہے جیسا کہ سورہ احقاف میں ہے: لَوۡ كَانَ خَیۡرًا مَّا سَبَقُوۡنَاۤ اِلَیۡهِ، کہ اگر اسلام حق ہوتا تو یہ غریب مسلمان ہم سے پہلے اس پر سبقت نہ کرجاتے، بلکہ ہم ہی اول قبول کرتے، کیونکہ ہم عقل مند ہیں)۔

معالم کی نقل سے اس بات کی اور تائید ہوتی ہے کہ قریش کے سردار لوگوں میں بڑے عقل مند مشہور تھے، پس اس آیت میں ان کی عقل کی حالت دکھلائی گئی ہے کہ کیوں صاحب بس یہی عقل ہے جو ایسی تعلیم دے رہی ہے اور اگر یہ عقل کی تعلیم نہیں ہے تو نری شرارت اور ضد ہے، ظاہر یہ ہے کہ

اس آیت میں ان کی تینوں باتوں کا رد ہے کاہن، مجنون اور شاعر کہنے کا، پس پہلے ہر بات کا الگ الگ جواب بھی دیا گیا پھر یہاں عام جواب بھی ہے۔

***

فائدہ: یعنی پیغمبر کو مجنون کہہ کر گویا اپنے کو بڑا عقلمند ثابت کرتے ہیں، کیا ان کی عقل و دانش نے یہ ہی سکھلایا ہے کہ ایک انتہائی صادق، امین، عاقل و فرزانہ اور سچے پیغمبر کو شاعر یا کاہن یا دیوانہ قرار دے کر نظر انداز کر دیا جائے، اگر شاعروں اور پیغمبروں کے کلام میں تمیز بھی نہیں کر سکتے تو کیسے عقلمند ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دل میں سمجھتے سب کچھ ہیں مگر محض شرارت اور کجروی سے باتیں بناتے ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾ ط

یا کہتے ہیں یہ قرآن خود بنا لایا کوئی نہیں پر وہ یقین نہیں کرتے، پھر چاہیے کہ لے آئیں کوئی بات اسی طرح کی اگر وہ سچے ہیں ۱

خلاصہ تفسیر: ہاں! کیا وہ یہ (بھی) کہتے ہیں کہ انہوں نے اس (قرآن) کو خود گھڑ لیا ہے (سو تحقیقی جواب تو اس کا یہ ہے کہ یہ بات نہیں ہے) بلکہ (یہ بات صرف اس وجہ سے کہتے ہیں کہ) یہ لوگ (عناد کی وجہ سے اس کی) تصدیق نہیں کرتے (اور قاعدہ ہے کہ جس چیز کی آدمی تصدیق نہیں کرتا ہزار وہ حق ہو مگر وہ اس کا ہمیشہ انکار ہی کیا کرتا ہے اور دوسرا الزامی جواب یہ ہے کہ اچھا اگر یہ ان کا بنایا ہوا ہے) تو یہ لوگ (بھی عربی دان اور بڑے فصیح و بلیغ اور قادر الکلام ہیں) اس طرح کا کوئی کلام (بنا کر) لے آئیں اگر یہ (اس دعوے میں) سچے ہیں (غرض ان کے اس دعوی کے بھی دو جواب ہو گئے، پہلا جواب تحقیقی اور واقعی، پھر دوسرا جواب الزامی)۔

***

فائدہ: ۱ یعنی کیا یہ خیال ہے کہ پیغمبر جو کچھ سنا رہا ہے وہ اللہ کا کلام نہیں؟ بلکہ اپنے دل سے گھڑ لایا؟ اور جھوٹ موٹ خدا کی طرف منسوب کر دیا؟ سو نہ ماننے کے ہزار بہانے، جو شخص ایک بات پر یقین نہ رکھے اور اسے تسلیم نہ کرنا چاہے وہ اسی طرح کے بے سروپا احتمالات نکالا کرتا ہے ورنہ آدمی ماننا چاہے تو اتنی بات سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ وہ دنیا کی تمام طاقتوں کو اکٹھا کر کے بھی اس قرآن کا مثل نہیں لا سکتے، اور جیسے خدا کی زمین جیسی زمین، اور اس کے آسمان جیسا آسمان بنانا کسی سے ممکن نہیں، اس کے قرآن جیسا قرآن بنالانا بھی محال ہے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ ط اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿۳۶﴾ ط

کیا وہ بن گئے ہیں آپ ہی آپ یا وہی ہیں بنانے والے، یا انہوں نے بنایا آسمانوں کو اور زمین کو، کوئی نہیں پر وہ یقین نہیں کرتے ۱

خلاصہ تفسیر: پیچھے سب مضامین رسالت کے متعلق تھے، اب آگے توحید کے متعلق گفتگو ہے کہ:

(یہ لوگ جو توحید کے منکر ہیں تو) کیا یہ لوگ بدون کسی خالق کے خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے خالق ہیں یا (یہ کہ نہ اپنے خالق ہیں اور نہ بلا خالق پیدا ہوئے ہیں، لیکن) انہوں نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے (اور اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت میں شریک ہیں، حاصل یہ کہ جو شخص صفت خالقیت صرف حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونے اور خود اپنے آپ کا بھی محتاج خالق ہونے کا اعتقاد رکھے تو عقلاً اس پر لازم ہے کہ توحید کا بھی قائل ہو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دے، اور توحید کا انکار وہ شخص کر سکتا ہے جو صفت خالقیت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہ جانے یا اپنی مخلوقیت کا منکر ہو اور چونکہ یہ لوگ غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے یہ نہیں جانتے تھے کہ خالق جب ایک ہے تو معبود بھی ایک ہی ہونا لازم ہے، اس لئے آگے ان کے اس جہل کی طرف اشارہ ہے کہ واقع میں ایسا نہیں) بلکہ یہ لوگ (جہل کی وجہ سے توحید کا) یقین نہیں لاتے (وہ جہل یہی ہے کہ اس میں غور نہیں کرتے کہ خالقیت اور معبودیت میں تلازم ہے)۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ: حاصل یہ کہ توحید کا انکار وہ شخص کر سکتا ہے جو خدا تعالیٰ کے تنہا خالق ہونے، یا اپنے مخلوق

ہونے کا منکر ہو، اور اس کی تین صورتیں ہیں: ① ایک یہ کہ اپنے آپ کو کسی خالق کا محتاج نہ سمجھے، یہ صورت اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ میں بیان ہوئی ② دوسری صورت یہ کہ اپنے آپ کو خالق کا محتاج جانے، مگر خالق اپنے آپ ہی کو مانے، یہ صورت اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ میں بیان ہوئی ③ تیسری صورت یہ کہ اپنے آپ کو خالق کا محتاج سمجھے مگر حق تعالی کو تنہا خالق نہ مانے، بلکہ کسی دوسرے کو بھی خالق ہونے میں شریک کرے، خواہ اپنے آپ ہی کو یا کسی اور کو، اپنے آپ کو خالق سمجھنے کا رد اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ میں ہوگیا، اور کسی دوسرے کو شریک ماننے کا رد قرآن کریم کی دیگر آیتوں میں مذکور ہے، اور چونکہ وہ اپنے خالق نہ ہونے کو جلد ہی مان لیں گے اس لیے اس جگہ صرف اسی کا رد کیا گیا، پھر ان کے خود خالق نہ ہونے کی جو دلیل ہے وہی دوسروں کے خالق نہ ہونے کی بھی دلیل ہے، تو دوسروں کا خالق نہ ہونا اس کے بعد آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔

چونکہ ان تینوں صورتوں کا باطل ہونا ظاہر تھا اس لیے یہاں تفصیل کے ساتھ رد نہیں کیا گیا، صرف استفہام انکاری پر اکتفا کیا گیا، چنانچہ پہلی صورت تو اس لیے باطل ہے کہ تمام عالم ممکن ہے جس میں خود یہ لوگ بھی داخل ہیں، اور ممکن کا وجود اور عدم (یعنی ہونا نہ ہونا) برابر ہوتا ہے تو وجود کی ترجیح کے لیے وہ یقیناً کسی مرجح کا محتاج ہوگا، اس لیے ہر شخص خالق کا ضرور محتاج ہے، اور دوسری صورت اس لیے باطل ہے کہ ایک ہی چیز علت اور معلول اپنی ذات کے واسطے نہیں ہوسکتی، اس لیے ہر شخص خود ہی خالق اور خود ہی مخلوق نہیں ہوسکتا، اور تیسری صورت اس لیے باطل ہے کہ صانع عالم کا متعدد ہونا عقلی دلائل سے محال ہو چکا، چنانچہ سورہ بقرہ آیت ۱۶۴: اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور ان دلائل کے علاوہ عرب والے خدا تعالی کو تنہا خالق اور اپنے آپ کو خالق کا محتاج مانتے تھے، لیکن غور نہ کرنے کی وجہ سے یہ نہ سمجھتے تھے کہ اس اعتقاد سے توحید لازم آگئی اس کو بھی ماننا چاہیے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی پیغمبر خدا کی بات کیوں نہیں مانتے، کیا ان کے اوپر کوئی خدا نہیں جس کی بات ماننا ان کے ذمہ لازم ہو، کیا بغیر کسی پیدا کرنے والے کے خود بخود پیدا ہوگئے ہیں؟ یا خود اپنے آپ کو خدا سمجھتے ہیں؟ یا یہ خیال ہے کہ آسمان وزمین ان کے بنائے ہوئے ہیں لہٰذا اس قلم رو میں جو چاہیں کرتے پھریں، کوئی ان کو روکنے ٹوکنے کا اختیار نہیں رکھتا، یہ سب خیالات باطل اور مہمل ہیں، وہ بھی دلوں میں جانتے ہیں کہ ضرور خدا موجود ہے جس نے ان کو اور تمام زمین وآسمان کو نیست سے ہست کیا، مگر اس علم کے باوجود جو ایمان ویقین شرعاً مطلوب ہے اس سے محروم اور بے بہرہ ہیں۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

کیا ان کے پاس ہیں خزانے تیرے رب کے یا وہی داروغہ ہیں لے

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر سن آتے ہیں، تو چاہیے لے آئے جو سنتا ہے ان میں ایک سند کھلی ہوئی ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کے متعلق گفتگو ہوئی، اب آگے رسالت کے متعلق ان کے دوسرے خیالات کا رد ہے، چنانچہ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر نبوت ہی ملنی تھی تو مکہ وطائف کے فلاں فلاں سردار کو ملتی، چنانچہ حق تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ:

کیا ان لوگوں کے پاس تمہارے رب (کی نعمتوں اور رحمتوں) کے (جن میں نبوت بھی داخل ہے) خزانے ہیں (کہ جس کو چاہو نبوت دے دو، کقولہ تعالیٰ: اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ) یا یہ لوگ (اس محکمہ نبوت کے) حاکم ہیں (کہ جسے چاہیں نبوت دلوا دیں، یعنی دینے دلانے کی دو صورتیں ہیں: ① ایک تو یہ کہ مثلاً خزانہ اپنے قبضہ میں ہو ② دوسری یہ کہ خزانہ تو قبضہ میں نہ ہو مگر خزانہ کے نگران اس کے محکوم ہوں کہ اس کے دستخط دیکھ کر دیتے ہوں، تو یہاں دونوں کی نفی فرمادی، اب آگے نقلی دلیل کی بھی نفی فرماتے ہیں یعنی) کیا ان لوگوں کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر (چڑھ کر آسمان کی) باتیں سن لیا کرتے ہیں (یعنی نقلی دلیل تو آسمانی وحی ہے اور اس کے علم کے دو طریقے ہیں: ① یا تو وحی کسی شخص پر آسمان سے نازل ہو ② یا

صاحب وحی آسمان پر چڑھے اور ان لوگوں سے ان دونوں باتوں کی نفی ہونا ظاہر ہے، آگے اس کے متعلق ایک عقلی احتمال کو باطل فرماتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ لوگ یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ ہم آسمان پر چڑھ جاتے اور وہاں کی باتیں سنتے ہیں) تو ان میں جو (وہاں کی) باتیں سن آتا ہو وہ (اس دعویٰ پر) کوئی صاف دلیل پیش کرے (جس سے ثابت ہو کہ یہ شخص وحی سے مشرف ہوا ہے، جیسے ہمارے نبی اپنی وحی پر یقینی دلائل رکھتے ہیں)۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ: حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ جو رسالت محمدیہ کے منکر ہیں اور مکہ و طائف کے سرداروں کو رسالت کا مستحق قرار دیتے ہیں ان کے پاس اس کی کوئی دلیل عقلی تو ہے نہیں، بلکہ خود اس کے عکس پر عقلی دلائل قائم ہیں اور اسی لئے یہاں محض استفہام انکاری پر اکتفا فرمایا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی کیا یہ خیال ہے کہ زمین و آسمان گو خدا کے بنائے ہوئے ہیں مگر اس نے اپنے خزانوں کا مالک ان کو بنا دیا ہے؟ یا اس ملک اور خزانوں پر انہوں نے زور سے تسلط اور قبضہ حاصل کر لیا ہے، پھر ایسے صاحب تصرف واقتدار ہو کر وہ کسی کے مطیع ومنقاد کیوں بنیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی کیا یہ دعویٰ ہے کہ وہ زینہ لگا کر آسمان پر چڑھ جاتے اور وہاں سے ملاء اعلیٰ کی باتیں سن آتے ہیں، پھر جب ان کی رسائی براہ راست اس بارگاہ تک ہو تو کسی بشر کا اتباع کرنے کی کیا ضرورت رہی، جس کا یہ دعویٰ ہو تو بسم اللہ اپنی سند اور حجت پیش کرے۔

اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾

کیا اس کے یہاں بیٹیاں ہیں اور تمہارے یہاں بیٹے ۱۔ کیا تو مانگتا ہے ان سے کچھ بدلہ، سو ان پر تاوان کا بوجھ ہے ۲۔

خلاصہ تفسیر: (اب پھر توحید کے بارے میں ایک خاص مضمون کے متعلق کلام ہے، یعنی منکرین توحید جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر شرک کرتے ہیں تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ) کیا خدا کے لئے بیٹیاں (تجویز کی جائیں) اور تمہارے لئے بیٹے (تجویز ہوں، یعنی اپنے لئے تو وہ چیز پسند کرتے ہو جس کو اعلیٰ درجہ کا سمجھتے ہو اور خدا کے لئے وہ چیز تجویز کرتے ہو جس کو ادنیٰ درجہ کی سمجھتے ہو، جس کا بیان سورۃ صافات کے اخیر میں مفصل مدلل گزر چکا ہے، اب پھر رسالت کے متعلق کلام ہے کہ ان لوگوں کو جو آپ کی حقانیت ثابت ہو جانے کے باوجود آپ کی پیروی کرنا اس قدر ناگوار ہے تو) کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ (احکام کی تبلیغ کا) مانگتے ہیں کہ وہ تاوان ان کو گراں معلوم ہوتا ہے (جیسا کہ ارشاد باری ہے: ام تسئلھم خرجا الخ)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی کیا (معاذ اللہ) خدا کو اپنے سے گھٹیا سمجھتے ہیں جیسا کہ بیٹے اور بیٹیوں کی اس تقسیم سے مترشح ہوتا ہے اور اس لیے اس کے احکام و ہدایات کے سامنے سر تسلیم جھکانا اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی کیا یہ لوگ آپ کی بات اس لیے نہیں مانتے کہ خدا نکردہ آپ ان سے اس ارشاد و تبلیغ پر کوئی بھاری معاوضہ طلب کر رہے ہیں جس کے بوجھ سے وہ دبے جاتے ہیں۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾

کیا ان کو خبر ہے بھید کی سو وہ لکھ رکھتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (آگے قیامت اور جزاء کے متعلق کلام ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اول تو قیامت ہوگی نہیں اور اگر بالفرض ہوگی بھی تو ہم وہاں بھی اچھی حالت میں رہیں گے، جیسے کہ ارشاد ہے: وما اظن الساعة قائمة ولئن رجعتُ الیٰ ربی ان لی عندہ للحسنیٰ، تو ہم اس کے متعلق ان سے پوچھتے ہیں کہ) کیا ان کے پاس غیب (کا علم) ہے کہ یہ (اس کو محفوظ رکھنے کے واسطے) لکھ لیا کرتے ہیں۔

فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ: یہاں یہ لفظ یَکْتُبُوْنَ احقر کے نزدیک کنایہ ہے یحفظون سے، کیونکہ لکھنا یادر کھنے کا ہی ایک طریقہ ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ جس دعوی پر کوئی دلیل قائم نہ ہوتو وہ غیب ہی کا دعوی ہوسکتا ہے، اور یہ دعوی وہ کرے جس کو کسی واسطہ یا ذریعہ سے اس غیب پر مطلع کیا گیا ہو، اور پھر مطلع ہونے کے بعد وہ اس کو محفوظ بھی رکھے، اس لئے کہ اگر معلوم ہونے کے بعد محفوظ نہ ہوتب بھی حکم اور دعویٰ بلاعلم ہوگا، پس تم جو قیامت کا انکار اور اپنے لئے آخرت میں اچھی حالت کے قائل ہوتو کیا تم کو غیب پر کسی واسطہ سے اطلاع دی گئی ہے جیسا کہ ہمارے نبی کو قیامت کے وقوع اور آخرت میں تمہاری بری حالت کی خبر غیبی وحی دی گئی ہے اور وہ اس کو محفوظ رکھ کر اوروں کو پہنچا رہے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی کیا خود ان پر اللہ اپنی وحی بھیجتا اور پیغمبروں کی طرح اپنے بھید پر مطلع کرتا ہے جسے یہ لوگ لکھ لیتے ہیں جیسے انبیاء کی وحی لکھی جاتی ہے، اس لیے ان کو آپ کی پیروی کی ضرورت نہیں۔

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾

کیا چاہتے ہیں کچھ داؤ کرنا، سو جو منکر ہیں وہی آتے ہیں داؤ میں ۱؎

اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾

کیا ان کا کوئی حاکم ہے اللہ کے سوا، وہ اللہ پاک ہے ان کے شریک بنانے سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب رسالت کے متعلق ایک اور کلام ہے وہ یہ کہ) کیا یہ لوگ (صاحب رسالت کے ساتھ) کچھ برائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں (جس کا بیان دوسری آیت میں ہے: وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ) سو یہ کافر خود ہی (اس) برائی (کے وبال) میں گرفتار ہوں گے (چنانچہ کفار اس ارادہ میں ناکام ہوئے اور بدر میں خود ہی مارے گئے، اب آگے پھر توحید کے متعلق کلام ہے کہ) کیا ان کا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟! اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے پاک ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان میں سے کوئی بات نہیں تو کیا پھر یہ ہی ارادہ ہے کہ پیغمبر کے ساتھ داؤ پیچ کھیلیں اور مکر وفریب اور خفیہ تدبیریں گانٹھ کر حق کو مغلوب یا نیست و نابود کر دیں، ایسا ہے تو یاد رہے کہ یہ داؤ پیچ سب ان ہی پر الٹنے والے ہیں عنقریب پتہ لگ جائے گا کہ حق مغلوب ہوتا ہے یا وہ نابود ہوتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کیا خدا کے سوا کوئی اور حاکم اور معبود تجویز کر رکھے ہیں جو مصیبت پڑنے پر انکی مدد کریں گے؟ اور جن کی پرستش نے خدا کی طرف سے انکو بے نیاز کر رکھا ہے؟ سو یاد رہے کہ یہ سب اوہام و وساوس ہیں، اللہ کی ذات اس سے پاک ہے کہ کوئی اسکا شریک و مثیل یا مقابل و مزاحم ہو۔

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾

اور اگر دیکھیں ایک تختہ آسمان سے گرتا ہوا کہیں یہ بادل ہے گاڑھا

خلاصہ تفسیر: اب آگے پھر رسالت کے متعلق ایک کلام ہے، وہ یہ کہ یہ لوگ رسالت کے انکار کیلئے ایک بات یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ ہم تو آپ کو اس وقت رسول جانیں جب ہم پر ایک آسمان کا ٹکڑا گرا دو: **وقالوا لن نومن لك (الی قوله) او تسقط السمآء كما زعمت. الخ** سو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو کسی بھی دعویٰ پر خواہ وہ رسالت کا دعوی ہو یا کوئی اور دعوی، مطلق صحیح دلیل قائم کر دینا کافی ہے اور ایسی دلیل رسالت کے دعوی ہی کے وقت سے بلا کسی بحث کے قائم ہے، دعوی پر کسی خاص دلیل کا قائم ہونا ضروری نہیں، مطلق صحیح دلیل کے موجود ہوتے ہوئے کسی خاص دلیل نہ

ہونے سے نبوت کے دعوی پر کوئی رد وقدح لازم نہیں آتا، البتہ احسان کے طور پر اگر کوئی فرمائشی دلیل قائم کی جائے تو یہ اس وقت ہے جب اس میں کوئی مصلحت بھی ہو، مثلاً فرمائشی دلیل کی درخواست کرنے والا حق کا طالب ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ خیر اسی ذریعہ سے اس کو ہدایت ہو جائے گی اور کوئی خاص حکمت ہوگی، یہاں کفار کی فرمائش میں تو یہ مصلحت بھی نہیں، کیونکہ ان کی فرمائش حق کی طلب کے لیے نہیں بلکہ محض عناد اور طعنہ کے طور پر ہے۔

اور (وہ ایسے ضدی ہیں کہ) اگر (ان کا یہ فرمائشی معجزہ واقع بھی ہو جائے اور) وہ آسمان کے ٹکڑے کو دیکھ (بھی لیں) کہ گرتا ہوا آرہا ہے تو (اس کو بھی) یوں کہہ دیں کہ یہ تو تہ بتہ جما ہوا بادل ہے (جیسا کہ ارشاد ہے: ولو فتحنا علیهم باباً من السمآء فظلوا فیه یعرجون)۔

پس جب اس میں کوئی مصلحت بھی نہیں ہے، بلکہ ان فرمائشی معجزات کا واقع کرنا حکمت کے خلاف ہے، سو جب ضرورت بھی نہیں اور مصلحت بھی نہیں، بلکہ مصلحت کے خلاف ہے تو پھر کیوں واقع کیا جائے، بلکہ کسی فرمائشی معجزہ کے واقع نہ ہونے سے نبوت کا انکار نہیں ہوتا، حاصل یہ کہ ان کو عناد کی وجہ سے کوئی حق بات نظر نہیں آتی، پھر ان کے فرمائشی معجزات پر کیوں توجہ کی جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی حقیقت میں ان میں سے کوئی بات نہیں، صرف ایک چیز ہے "ضد اور عناد" جس کی وجہ سے یہ لوگ ہر سچی بات کے جھٹلانے پر تلے ہوئے ہیں، ان کی کیفیت تو یہ ہے کہ اگر ان کی فرمائش کے موافق فرض کیجیے آسمان سے ایک تختہ ان پر گرا دیا جائے تو دیکھتی آنکھوں اسکو بھی کوئی تاویل کر دیں گے، مثلاً کہیں گے کہ آسمان سے نہیں آیا، بادل کا ایک حصہ گاڑھا اور منجمد ہو کر گر پڑا ہے جیسے بڑے بڑے اولے کبھی کبھی گرتے ہیں بھلا ایسے متعصب معاندوں سے ماننے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿٤٥﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا

سو تو چھوڑ دے ان کو یہاں تک کہ دیکھ لیں اپنے اس دن کو جس میں ان پر پڑے گی بجلی کی کڑک، جس دن کام نہ آئیگا ان کو ان کا داؤ ذرا بھی

وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾

اور نہ ان کو مدد پہنچے گی ۱ے اور ان گناہ گاروں کے لیے ایک عذب ہے اس سے ورے پر بہت ان میں کے نہیں جانتے ۲ے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ کئی آیات سے ان کا کفر پر اصرار، اور آخر کی آیت سے ان کے عناد کی شدت عناد معلوم ہوتی ہے، چنانچہ اب نتیجہ کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے، فرماتے ہیں کہ:

(جب یہ لوگ ایسے شدید سرکش اور باغی ہیں) تو (ان سے ایمان کی توقع کر کے رنج میں نہ پڑیئے بلکہ) ان کو (انہی کی حالت پر) رہنے دیجئے یہاں تک کہ ان کو اپنے اس دن سے سابقہ (واقع) ہو جس میں ان کے ہوش اڑ جائیں گے (مراد قیامت کا دن ہے، آگے اس دن کا بیان ہے یعنی) جس دن ان کی تدبیریں (جو دنیا میں اسلام کی مخالفت اور اپنی کامیابی کے بارے میں کیا کرتے تھے) ان کے کچھ بھی کام نہ آئیں گی اور نہ (کہیں سے) ان کو مدد ملے گی (نہ تو مخلوق کی طرف سے مدد ملے گی کہ اس کا امکان ہی نہیں اور نہ خالق کی طرف سے کہ اس کا وقوع نہیں، یعنی اس روز ان کو حقیقت معلوم ہو جائے گی، باقی اس سے ادھر ایمان لانے والے نہیں) اور (آخرت میں تو یہ مصیبت ان پر آئے ہی گی لیکن) ان ظالموں کے لئے قبل اس (عذاب) کے بھی عذاب ہونے والا ہے (یعنی دنیا میں، جیسے قحط اور غزوہ بدر میں قتل ہونا) لیکن ان میں اکثر کو معلوم نہیں (''اکثر'' کا لفظ شاید اس لئے فرمایا ہو کہ بعضوں کے لئے ایمان مقدر تھا)۔

حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ: اس بے ہوشی کی تفصیل سورۃ زمر کی آیت ۶۸: وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ کی تفسیر میں، اور حتیٰ کے معنی کی تحقیق سورۃ زخرف آیت ۸۳: فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایسے معاندوں کے پیچھے پڑنے کی زیادہ ضرورت نہیں، چھوڑ دیجیے کہ چند روز اور کھیل لیں اور باتیں بنالیں، آخر وہ دن آتا ہے جب قہر الٰہی کی کڑک بجلی سے ان کے ہوش وحواس جاتے رہیں گے اور بچاؤ کی کوئی تدبیر کام نہ دے گی، نہ کسی طرف سے مدد پہنچے گی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان میں سے اکثروں کو خبر نہیں کہ آخرت کے عذاب سے ورے دنیا میں بھی ان کے لیے ایک سزا ہے جو مل کر رہے گی، شاید یہ معرکہ بدر وغیرہ کی سزا ہو۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝٤٨

اور تو ٹھہرا رہ منتظر اپنے رب کے حکم کا تو تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے ۱؎ اور پاکی بیان کر اپنے رب کی خوبیاں جس وقت تو اٹھتا ہے ۲؎

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ۝٤٩ ع

اور کچھ رات میں بول اس کی پاکی اور پیٹھ پھیرتے وقت تاروں کے ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ ہم ان کی سزا کے لئے ایک وقت معین کر چکے ہیں تو) آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے (اور ان لوگوں کے لیے خدائی انتقام کی جلدی نہ کیجئے جس کو آپ مسلمانوں کے غلبہ کے واسطے چاہتے تھے، اور نہ اس خیال سے انتقام میں جلدی کیجئے کہ یہ لوگ مہلت کی مدت میں آپ کو کوئی نقصان پہنچا سکیں گے سو اس کا بھی اندیشہ نہ کیجئے کیوں) کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں (پھر کا ہے کا ڈر، اللہ آپ کا محافظ ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا) اور (اگر ان کے کفر کا غم دل پر آئے تو اس کا علاج یہ ہے کہ توجہ الی اللہ رکھا کیجئے، مثلاً یہ کہ) اٹھتے وقت (یعنی مجلس سے یا سونے سے اٹھتے وقت، مثلاً تہجد میں) اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیا کیجئے، اور رات (کے کسی حصہ) میں بھی اس کی تسبیح کیا کیجئے (مثلاً عشاء کے وقت) اور ستاروں (کے غروب ہونے) سے پیچھے بھی (مثلاً نماز صبح)۔

ان اوقات کا خاص طور پر ذکر اہتمام ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ ان اوقات میں خدا کی طرف زیادہ توجہ کی جائے، مثلاً نماز پڑھی جائے، اور مطلق ذکر بھی اس میں آ گیا، حاصل یہ کہ اپنے دل کو ادھر مشغول رکھئے پھر فکر وغم کا غلبہ نہ ہو گا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا: اس سے معلوم ہوا کہ صبر، سکون اور اطمینان کے حصول میں "مراقبہ حضوری" کا اثر قوی ہوتا ہے ("مراقبہ حضوری" کا یہ مطلب ہے کہ نفس یہ یقین کرے کہ اللہ تعالیٰ پر میرا ظاہر وباطن کھلا ہوا ہے، کوئی حرکت وسکون اس سے پوشیدہ نہیں، وہ ہر وقت ہر آن مجھے دیکھ رہا ہے، اس دائمی فکر کو "مراقبہ حضوری" کہا جاتا ہے، گویا حدیث: "ان تعبداللہ کانك تراہ ، فإن لم تك تراہ فإنه یراك" کی عملی صورت مراقبہ حضوری ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی صبر واستقامت کے ساتھ اپنے رب کے حکم تکوینی وتشریعی کا انتظار کیجیے جو عنقریب آپ ﷺ کے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا، اور آپ ﷺ کو مخالفین کی طرف سے کچھ بھی نقصان نہ پہنچے گا، کیونکہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے زیر حفاظت ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی صبر تحمل اور سکون واطمینان کے ساتھ ہمہ وقت اللہ کی تسبیح وتحمید اور عبادت گزاری میں لگے رہیے، خصوصاً جس وقت آپ سو کر اٹھیں یا نماز کے لیے کھڑے ہوں، یا مجلس سے اٹھ کر تشریف لے جائیں، ان حالات میں تسبیح وغیرہ کی مزید ترغیب وتاکید آئی ہے۔

فائدہ: ۳؎ "رات کے حصہ" سے مراد شاید تہجد کا وقت ہو، اور "تاروں کے پیٹھ پھیرنے کا وقت" صبح کا وقت ہے، کیونکہ صبح کا اجالا ہوتے ہی ستارے غائب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

اٰیاتھا ٦٢ • ٥٣ سُوْرَۃُ النَّجْمِ مَکِّیَّۃٌ ٢٣ • رکوعاتھا ٣

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ① مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ②

قسم ہے تارے کی جب گرے [1]، بہکا نہیں تمہارا رفیق اور نہ بے راہ چلا [2]۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں توحید، رسالت اور قیامت کا بیان تھا، اس سورت میں بھی یہی مضامین ہیں۔

قسم ہے ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے (یعنی کوئی بھی ستارہ ہو، آگے جواب قسم ہے کہ) یہ تمہارے (ہمہ وقت) ساتھ کے (اور سامنے) رہنے والے (پیغمبر ہیں جن کے تمام احوال وافعال تم کو معلوم ہیں جن سے بشرط انصاف ان کی سچائی اور حقانیت پر استدلال کرسکتے ہو یہ پیغمبر) نہ راہ (حق) سے بھٹکے اور نہ غلط راستے ہو لئے (''ضلال'' یہ کہ بالکل راستہ بھول کر کھڑا رہ جائے اور ''غوایت'' یہ کہ غلط راستہ کو صحیح راستہ سمجھ کر غلط سمت میں چلتا رہے، یعنی جیسے تم ان کو نبوت اور اسلام کے دعوی میں بے راہ سمجھتے ہو تو یہ بات نہیں ہے، بلکہ آپ نبی برحق ہیں)۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی: ستارہ کی اس قسم میں جواب قسم: مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے، یعنی جس طرح ستارہ طلوع سے غروب تک تمام مسافت میں اپنی باقاعدہ رفتار سے ادھر ادھر نہیں ہوتا، اسی طرح آپ بھی زندگی بھر گمراہی سے محفوظ ہیں، نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جیسے ستارہ سے رستہ کا پتہ چلتا ہے اسی طرح آپ ﷺ سے بھی راہ حق کی ہدایت ہوتی ہے، اور ستارہ سے ہدایت جبھی ہوتی ہے جب کہ وہ افق سے نزدیک ہو، کیونکہ بیچ آسمان میں ہونے کے وقت سمت کا پتہ نہیں چلتا، اور اگرچہ افق کے قریب طلوع کے وقت بھی ہوتا ہے، لیکن غروب میں یہ بات زیادہ ہے کہ رستہ ڈھونڈنے والے اس وقت اس کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اگر رستہ معلوم کرنے میں ذرا توقف کیا تو پھر غائب ہوجائے گا، اور طلوع کے وقت بےفکری ہوتی ہے، پس اس میں اس طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ حضور ﷺ سے ہدایت حاصل کرنے کو غنیمت سمجھو اور شوق سے دوڑو۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی: یہ جواب قسم ہے، یعنی یہ وہ مضمون ہے جس کے لیے پہلی آیت میں قسم کھائی گئی ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی غروب ہو۔

فائدہ: [2] ''رفیق'' سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں، یعنی نہ آپ غلط فہمی کی بناء پر راستہ سے بہکے، نہ اپنے قصد واختیار سے جان بوجھ کر بے راہ چلے، بلکہ جس طرح آسمان کے ستارے طلوع سے لے کر غروب تک ایک مقرر رفتار سے معین راستہ پر چلے جاتے ہیں کبھی ادھر ادھر ہٹنے کا نام نہیں لیتے، آفتاب نبوت بھی اللہ کے مقرر کیے ہوئے راستہ پر برابر چلا جاتا ہے، ممکن نہیں کہ ایک قدم ادھر یا ادھر پڑ جائے، ایسا ہو تو ان کی بعثت سے جو غرض متعلق ہے وہ حاصل نہ ہو، انبیاء علیہم السلام آسمان نبوت کے ستارے ہیں جن کی روشنی اور رفتار سے دنیا کی راہنمائی ہوتی ہے اور جس طرح تمام ستاروں کے غائب ہونے کے بعد آفتاب درخشاں طلوع ہوتا ہے، ایسے ہی تمام انبیاء کی تشریف بری کے بعد آفتاب محمدی مطلع عرب سے طلوع ہوا، پس اگر قدرت نے ان ظاہری ستاروں کا نظام اس قدر محکم بنایا ہے کہ اس میں کسی طرح کے تزلزل اور اختلال کی گنجائش نہیں تو ظاہر ہے کہ ان باطنی ستاروں اور روحانی آفتاب وماہتاب کا انتظام کس قدر مضبوط ومحکم ہونا چاہیے، جن سے ایک عالم کی ہدایت وسعادت وابستہ ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿٣﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿٤﴾

اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے، یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔

خلاصہ تفسیر: اور نہ آپ اپنی نفسانی خواہش سے باتیں بناتے ہیں (جیسا تم لوگ کہتے ہو کہ قرآن خود گھڑلیا ہے، بلکہ) ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے (خواہ الفاظ وحی کیے گئے ہوں جو قرآن کہلاتا ہے، یا صرف معانی کی وحی ہو جو سنت کہلاتی ہے، اور خواہ وحی کسی خاص جزئی مسئلہ کی ہو یا کسی قاعدہ کلیہ کی وحی ہو، جس سے آپ دوسرے واقعات کے لیے اجتہاد فرماتے ہوں، پس اس سے اجتہاد اور قیاس کی نفی نہیں ہوتی، اس مقام پر اصل مقصود کفار کے باطل خیال کا انکار ہے، خلاصہ یہ کہ آپ خدا کی طرف غلط بات کی نسبت نہیں کرتے)۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى: یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ کی طرف منسوب کریں اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں، بلکہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیا ہوا ہوتا ہے، وحی کی بہت سی اقسام احادیث بخاری سے ثابت ہیں، ان میں ایک قسم وہ ہے جس کے معنی اور الفاظ سب حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، جس کا نام قرآن ہے، دوسری وہ کہ صرف معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی کو اپنے الفاظ میں ادا فرماتے ہیں اس کا نام حدیث اور سنت ہے، پھر حدیث میں جو مضمون حق تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے کبھی وہ کسی معاملہ کا صاف اور واضح فیصلہ اور حکم ہوتا ہے، کبھی کوئی قاعدہ کلیہ بتلایا جاتا ہے، جس سے احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اجتہاد سے نکالتے اور بیان کرتے ہیں، اس اجتہاد میں اس کا امکان رہتا ہے کہ کوئی غلطی ہو جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کی یہ خصوصیت ہے کہ جو احکام وہ اپنے اجتہاد سے بیان فرماتے ہیں ان میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے وہ اپنے غلط اجتہاد پر قائم نہیں رہ سکتے، بخلاف دوسرے علماء مجتہدین کے کہ ان سے اجتہاد میں خطا ہو جائے تو وہ اس پر قائم رہ سکتے ہیں اور ان کی یہ خطا بھی عند اللہ صرف معاف ہی نہیں بلکہ دین کے سمجھنے میں جو اپنی پوری توانائی وہ خوچ کرتے ہیں اس پر بھی ان کو ایک ثواب ملتا ہے۔

اس تقریر سے آیت مذکورہ پر اس شبہ کا جواب بھی ہو گیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب اللہ کی طرف سے وحی ہوتا ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ آپ اپنی رائے اور اجتہاد سے کچھ نہیں فرماتے، حالانکہ احادیث صحیحہ میں متعدد واقعات ایسے مذکور ہیں کہ شروع میں آپ نے کوئی حکم دیا پھر بذریعہ وحی اس کو بدلا گیا، جو اس کی علامت ہے کہ یہ حکم اللہ کی طرف سے نہیں تھا، بلکہ آپ کی رائے اور اجتہاد سے تھا، جواب اوپر آچکا ہے کہ بعض اوقات وحی کسی قاعدہ کلیہ کی شکل میں آتی ہے، جس سے احکام کا استخراج کرنے میں پیغمبر کو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا پڑتا ہے، چونکہ یہ قاعدہ کلیہ اللہ کی طرف سے آیا ہے اس لئے ان سب احکام کو بھی وحی من اللہ کہا گیا ہے، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: یعنی کوئی کام تو کیا، ایک حرف بھی آپ کے دہن مبارک سے ایسا نہیں نکلتا جو خواہش نفس پر مبنی ہو، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ دین کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے حکم کے مطابق ہوتا ہے، اس میں وحی متلو کو "قرآن" اور غیر متلو کو "حدیث" کہا جاتا ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ﴿٥﴾ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ﴿٦﴾ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ﴿٧﴾

اس کو سکھلایا ہے سخت قوتوں والے نے زور آور نے ۱ پھر سیدھا بیٹھا، اور وہ تھا اونچے کنارہ پر آسمان کے ۲

خلاصہ تفسیر: (اب وحی آنے کا واسطہ اور ذریعہ بتلاتے ہیں کہ) ان کو ایک فرشتہ (اس وحی کی من جانب اللہ) تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے (اور وہ اپنی کوشش و محنت سے طاقتور نہیں ہوا، بلکہ) پیدائشی طاقتور ہے (مطلب یہ کہ یہ کلام کسی شیطان کے ذریعہ سے آپ تک نہیں پہنچا کہ کاہن ہونے کا احتمال ہو، بلکہ ایک قوی فرشتہ کے ذریعہ سے آیا، پھر وحی نازل ہونے کے بعد خود حق تعالیٰ نے وعدہ کر لیا ہے کہ آپ کے دل میں محفوظ

کردیں گے اور آپ کی زبان سے بعینہ ادا کرادیں گے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ، آگے اس شبہ کا جواب ہے کہ وحی لانے والے کا فرشتہ اور جبریل ہونا اس وقت معلوم ہوسکتا ہے، جب آپ ان کو پہچانتے ہوں اور پوری صحیح پہچان اصل صورت میں دیکھنے پر موقوف ہے، تو کیا آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصلی صورت پر دیکھا ہے؟ اس کی نسبت فرماتے ہیں کہ ہاں یہ بھی ہوا ہے، جس کی کیفیت یہ ہے کہ چند بار تو دوسری صورت میں دیکھا) پھر (ایک بار ایسا بھی ہوا کہ) وہ فرشتہ (اپنی) اصلی صورت پر (آپ کے روبرو) نمودار ہوا، ایسی حالت میں کہ وہ (آسمان کے) بلند کنارہ پر تھا (ایک روایت میں افق شرقی سے اس کی تفسیر آئی ہے، اور افق میں دکھلا دینے کی غالباً یہ حکمت ہے کہ آسمان کے وسط میں دیکھنا مشقت وتکلف سے خالی نہیں اور اعلیٰ میں غالباً یہ حکمت تھی کہ بالکل نیچے افق پر بھی پوری چیز نظر نہیں آتی، اس لئے ذرا اونچے پر نظر آئے)۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى: جیسا کہ ایک روایت میں خود جبرئیل علیہ السلام نے اپنی طاقت کا بیان فرمایا کہ میں نے قوم لوط کی بستیوں کو جڑ سے اکھاڑ کر آسمان کے قریب اس کو لے جا کر چھوڑ دیا، اور یہاں شدید القوی کا ذکر فرمانے میں یہ مقصود ہو کہ وہ فرشتہ بھی ایسا قوی ہے کہ شیطان کی مجال نہیں کہ اس فرشتے کے پاس پھٹک سکے، اس لیے یہ احتمال ہرگز نہیں ہوسکتا کہ فرشتہ وحی لے کر چلا ہو اور راستہ میں کوئی شیطانی تصرف ہو گیا ہو۔

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى: اس دیکھنے کا قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک بار حضور ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام سے خواہش کی کہ مجھ کو اپنی اصلی صورت دکھلا دیں، انہوں نے حراء کے پاس اور ایک روایت میں ہے کہ محلہ جیاد میں وعدہ ٹھہرا، آپ وہاں تشریف لے گئے تو ان کو مشرقی افق کی جانب میں دیکھا کہ ان کے چھ سو بازو ہیں اور اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ مغربی افق کی جانب تک گھیر رکھا ہے، آپ بیہوش ہو کر گر پڑے، اس وقت جبرئیل علیہ السلام بشری صورت میں آپ کے پاس تسکین کے لئے اتر آئے جس کا آگے ذکر ہے، حاصل یہ کہ وہ فرشتہ پہلے اصلی صورت میں افق اعلیٰ پر نمودار ہوا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وحی بھیجنے والا تو اصل میں اللہ تعالیٰ ہے، لیکن جس کے ذریعہ سے وہ وحی آپ ﷺ تک پہنچتی ہے اور جو بظاہر آپ ﷺ کو سکھلاتا ہے وہ بہت سخت قوتوں والا، بڑا زور آور حسین و وجیہ فرشتہ ہے جسے "جبرائیل امین" کہتے ہیں، چنانچہ سورۃ التکویر میں جبرائیل کی نسبت فرمایا:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (التکویر: ۱۹-۲۰)

فائدہ: ۲ "اونچے کنارے" سے اکثروں نے افق شرقی مراد لیا ہے، جدھر سے صبح صادق نمودار ہوتی ہے نبی کریم ﷺ کو ابتدائے نبوت میں ایک مرتبہ حضرت جبرائیل اپنی اصلی صورت میں ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے نظر آئے، اس وقت آسمان ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ان کے وجود سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا، یہ غیر معمولی اور مہیب منظر پہلی مرتبہ آپ ﷺ نے دیکھا تھا، دیکھ کر گھبرائے تو سورۃ مدثر اتری۔

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝٨ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝٩ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝١٠

پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا، پھر رہ گیا فرق دو کمان کے برابر یا اس سے بھی نزدیک، پھر حکم بھیجا اللہ نے اپنے بندہ پر جو بھیجا۔

خلاصہ تفسیر: پھر (جب آپ بے ہوش ہو گئے تو) وہ فرشتہ (آپ کے) نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا، سو (قرب کی وجہ سے) دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا، بلکہ (انتہائی قرب کی وجہ سے) اور بھی کم (فاصلہ رہ گیا، غرض یہ کہ جبریل کے تسلی دینے سے آپ کو تسکین ہوئی اور افاقہ ہوا) پھر (افاقہ کے بعد) اللہ تعالیٰ نے (اس فرشتہ کے ذریعہ سے) اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمانا تھی (جس کی تعیین خاص طور پر معلوم نہیں اور نہ معلوم ہونے کی ضرورت ہے)۔

قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى: دو کمانوں کا مطلب یہ ہے کہ اہل عرب کی عادت تھی کہ جب دو شخص باہم انتہائی درجہ کا اتفاق کرنا چاہتے تو دونوں اپنی اپنی کمانیں لے کر ان کی تانت یعنی ڈوری کو باہم ملا دیتے، اور اس ملانے میں بھی بعض اجزاء کے اعتبار سے کچھ نہ کچھ فاصلہ ضرور باقی رہتا ہے، چنانچہ اس محاورہ کی وجہ سے یہ قرب واتحاد سے کنایہ ہو گیا، اور چونکہ یہ ملانا محض ظاہری اتفاق کی علامت تھی تو اگر روحانی اور قلبی اتفاق بھی ہو تو وہاں اور بھی

کم فاصلہ ہوگا، تو قاب قوسین کہنے کے بعد او ادنیٰ بڑھانے سے اشارہ ہوگیا کہ ظاہری قرب کے علاوہ آپ ﷺ اور جبریل علیہ السلام میں روحانی مناسبت بھی تھی، غرض جبریل کی تسلی سے آپ کو تسکین ہوئی اور افاقہ ہوا۔

فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى: باوجودیکہ اصل مقصود اس وقت وحی نازل کرنا نہیں تھا، بلکہ جبرئیل کو ان کی اصلی صورت میں دکھلا کر ان کی پوری معرفت آپ ﷺ کو عطا کرنی تھی، مگر اس وقت بھی وحی نازل فرمانا شاید اس لئے ہو کہ اس سے معرفت میں اور زیادہ قوت حاصل ہو، کیونکہ جب آپ اس وقت کی وحی کو جو جبریل علیہ السلام کی اصلی صورت دیکھنے کے بعد ہوئی اور دوسرے اوقات کی وحی کو جبکہ جبریل انسانی شکل میں آتے تھے ایک ہی شان پر دیکھیں گے تو یقین میں اور زیادہ قوت ہوگی کہ دونوں حالتوں میں وحی لانے والا واسطہ یعنی فرشتہ ایک ہی ہے، جیسا کہ ہم کسی آدمی کے لہجہ اور طرز کلام سے جب خوب آگاہ ہوں تو اگر وہ کبھی صورت بدل کر بھی بولتا ہے تو صاف پہچانا جاتا ہے۔

مذکورہ اور آگے آنے والی آیات کے بارے میں ائمہ تفسیر سے دو تفسیریں منقول ہیں، ایک تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ ان سب آیات کو واقعہ معراج کا بیان قرار دے کر حق تعالیٰ سے تعلیم بلا واسطہ اور رویت وقرب حق تعالیٰ کے ذکر پر محمول فرمایا، اور **شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى** اور **دَنَا فَتَدَلّٰى** سب کو حق تعالیٰ کی صفات وافعال قرار دیا اور آگے بھی جو رویت ومشاہدہ کا ذکر ہے اس سے بھی حق تعالیٰ کی رویت وزیارت مراد لی، صحابہ کرام میں حضرت انسؓ اور ابن عباسؓ سے یہ تفسیر منقول ہے، دوسری تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ بہت سے حضرات صحابہ وتابعین اور ائمہ تفسیر نے ان آیات کو جبرئیل علیہ السلام کے ان کی اصلی صورت میں دیکھنے کا بیان قرار دیا ہے، **شَدِيْدُ الْقُوٰى** اور **دَنَا فَتَدَلّٰى** وغیرہ جبرئیل امین کی صفات بتلائی ہیں، اس کی بہت سی وجہ ہیں، اصل وجہ یہ ہے کہ حدیث مرفوع میں خود رسول اللہ ﷺ سے ان آیات کی تفسیر رویت جبرئیل سے منقول ہے، جس کے الفاظ مسند احمد میں یہ ہیں: "عن الشعبي عن مسروق قال كنت عند عائشة فقلت: اليس الله يقول ﴿ولقد راه بالافق المبين﴾ ﴿ولقد راه نزلة اخرى﴾ فقالت: انا اول هذه الامة سالت رسول الله ﷺ عنها، فقال: انما ذاك جبرئيل لم يره في صورته التي خلق عليها الا مرتين راه منهبطا من السمآء الى الارض سادا عظم خلقه ما بين السمآء والارض"، شعبی حضرت مسروق سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ایک روز حضرت صدیقہ عائشہؓ کے پاس تھے (رویت باری تعالیٰ کے مسئلہ میں گفتگو تھی) مسروق کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **ولقد راه بالافق المبين**، **ولقد راه نزلة اخرى** حضرت صدیقہ نے فرمایا کہ پوری امت میں سب سے پہلے میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا ہے، آپ نے فرمایا کہ جس کے دیکھنے کا آیت میں ذکر ہے وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ نے صرف دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے، آیت میں جس رویت کا ذکر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے جبرئیل امین کو آسمان سے زمین کی طرف اترتے ہوئے دیکھا کہ ان کے جثے نے زمین وآسمان کے درمیان کی فضا کو بھر دیا تھا، صحیح مسلم میں بھی یہ روایت تقریباً انہی الفاظ سے منقول ہے اور فتح الباری کتاب التفسیر میں حافظ نے ابن مردویہ سے یہی روایت اسی سند کے ساتھ نقل کی ہے، جس میں صدیقہ کے الفاظ یہ ہیں: "انا اول من سال رسول الله ﷺ عن هذا، فقلت يا رسول الله هل رايت ربك؟ فقال لا انما رايت جبرئيل منهبطا"، یعنی صدیقہ عائشہ فرماتی ہیں کہ اس آیت کے متعلق سب سے پہلے میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ میں نے جبرئیل کو اترتے ہوئے دیکھا ہے۔

چنانچہ سورۃ نجم کی آیات مذکورہ میں رویت اور قرب سے مراد جبرئیل کی رویت اور قرب ہے، یہ قول صحابہ کرام میں سے حضرت ام المومنین عائشہ اور عبداللہ بن مسعود، ابوذر غفاری، ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کا ہے، اور ان آیات میں جس رویت اور قرب کا ذکر ہے وہ رویت وقرب جبرئیل امین کی مراد ہے جبکہ ان کو رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا تھا، پھر دوسری مرتبہ شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے قریب دیکھا اور یہ پہلی رویت نبوت کے بالکل ابتدائی زمانہ میں ہوئی، خلاصہ یہ ہے کہ اکثر مفسرین نے خود تفسیر مرفوع اور صحابہ کرام کے اقوال کی بنا پر سورۃ نجم کی آیات مذکورہ کی تفسیر یہی قرار دی ہے کہ اس میں رویت اور قرب جبرئیل کا مراد ہے اور یہ پہلی رویت ہے جو اسی عالم میں مکہ مکرمہ کے افق پر ہوئی، بعض روایات

میں اس رویت کی یہ تفصیل آئی ہے کہ جبرئیل امین کو پہلی مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھ کر رسول اللہ ﷺ پر غشی طاری ہوگئی، تو پھر جبرئیل امین آدمی کی صورت میں آپ کے قریب آئے اور بہت قریب آ گئے، دوسری رویت کا تذکرہ آگے سورۂ نجم ہی کی آیت وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى میں آیا ہے، جو شب معراج میں ہوئی، مذکور الصدر وجوہ کی بناء پر عامہ مفسرین حضرات نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جبرائیل اپنے اصلی مستقر سے تعلق رکھنے کے باوجود نیچے اترے اور آنحضرت ﷺ سے اس قدر نزدیک ہو گئے کہ دونوں کے درمیان دو ہاتھ یا دو کمانوں سے زیادہ فاصلہ نہ تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندہ (محمد رسول اللہ ﷺ) پر وحی بھیجی، غالباً اس سے مراد سورۂ مدثر کی یہ آیات ہیں: يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ (المدثر: ۱-۲) یا کچھ اور احکام ہوں گے۔

تنبیہ: فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى میں محققین کے نزدیک "أو" شک کے لیے نہیں، بلکہ اس قسم کی ترکیب پوری تاکید اور مبالغہ کے ساتھ زیادہ کی نفی کے لیے ہوتی ہے، یعنی تعیین کر کے یہ بتلانا مقصود نہیں کہ "قوسین" کا فاصلہ تھا یا اس سے بھی کم، وہاں اتنا ظاہر کر دینا ہے کہ کسی حال اور کسی طرح اس سے زائد نہ تھا، وفيه اقوال آخر ذكرها المفسرون۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾

جھوٹ نہیں کہا رسول کے دل نے جو دیکھا ۱؎ اب کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو اس نے دیکھا ۲؎

خلاصہ تفسیر: آگے اس دیکھنے کے متعلق ایک شبہ کا جواب ہے وہ شبہ یہ ہے کہ اصلی صورت میں دیکھنے کے باوجود یہ بھی تو احتمال ہو سکتا ہے کہ قلب کے ادراک و احساس میں غلطی ہو جائے جیسا کہ احساسات میں غلطی ہو جانا اکثر مشاہدہ کیا جاتا ہے، مجنون باوجود سلامت حس کے بعض اوقات پہچانے ہوئے لوگوں کو دوسرا شخص بتلانے لگتا ہے، پس یہ صحیح رویت تھی یا نہیں؟ آگے اسی شبہ کا جواب ہے۔

(یعنی وہ صحیح رویت تھی کہ اس کے دیکھنے کے وقت) قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں غلطی نہیں کی (چونکہ اس انتہائی درجہ ثبوت کے باوجود پھر بھی مخالفین جدال و خلاف سے باز نہ آتے تھے، اسی لئے آگے بطور تعجب اور دھمکی کے ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تم نے ایسے شافی کافی بیان سے معرفت و رویت کا ثبوت سن لیا) تو کیا ان (پیغمبر) سے ان کی دیکھی (بھالی) ہوئی چیز میں نزاع کرتے ہو (یعنی جن چیزوں کا علم و ادراک انسان کو ہوتا ہے ان میں محسوسات جیسی چیزیں شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہیں، غضب کی بات ہے کہ تم محسوسات میں بھی اختلاف کرتے ہو، پھر یوں تو تمہاری محسوسات میں بھی ہزاروں خدشے نکل سکتے ہیں)۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ: شبہ ہوتا ہے کہ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ دل نے غلطی نہیں کی؟ سو بات یہ ہے کہ اگر مطلقاً ایسے احتمالات قابل توجہ ہونے لگیں تو محسوسات کا کبھی اعتبار ہی نہ رہے، پھر تو ساری دنیا کے معاملات ہی مختلف ہو جائیں، ہاں! کسی کے پاس شبہ کے لیے قابل اعتبار منشاء موجود ہو تو اس پر غور کیا جاتا ہے، اور خطائے قلبی کے احتمال کا منشاء یہ ہو سکتا ہے کہ ادراک کرنے والے کی عقل میں خلل واقع ہو، جبکہ حضور ﷺ کا صحیح العقل، فطین وذہین، صاحب فراست ہونا مشاہد اور ظاہر تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جبرائیل کو آپ ﷺ نے آنکھ سے دیکھا اور اندر سے دل نے کہا کہ اس وقت آنکھ ٹھیک ٹھیک جبرائیل کو دیکھ رہی ہے، کوئی غلطی نہیں کر رہی کہ کچھ کا کچھ نظر آتا ہو، ایسا کہنے میں آپ کا دل سچا تھا، حق تعالیٰ اسی طرح پیغمبروں کے دلوں میں فرشتہ کی معرفت ڈال دیتے ہیں ورنہ رسول کو خود اطمینان نہ ہو تو دوسروں کو اطمینان کہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی وحی بھیجنے والا اللہ، لانے والا فرشتہ جس کی صورت و سیرت نہایت پاکیزہ اور فہم و حفظ وغیرہ کی تمام قوتیں کامل، پھر اتنا قریب ہو کر وحی پہنچائے، پیغمبر اس کو اپنی آنکھ سے دیکھے، اس کا صاف اور روشن دل اس کی تصدیق کرے، تو کیا ایسی دیکھی بھالی چیز میں تم کو حق ہے کہ اس

سے فضول بحث وتکرار کرو اور جھگڑے نکالو:

اِذَا لَمْ تَرَ الْھِلَالَ فَسَلِّمْ لِنَّاسٍ رَاَوْہُ بِالْاَبْصَارِ

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ⑬ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ⑭ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ⑮

اور اس کو اس نے دیکھا ہے اترتے ہوئے ایک بار اور بھی، سدرۃ المنتہٰی کے پاس، اس کے پاس ہے بہشت آرام سے رہنے کی۔ [1]

خلاصہ تفسیر: اور (اگر یہ مہمل خدشہ ہو کہ جس چیز کو ایک ہی بار دیکھا ہو تو اس کی پہچان کیسے ہو سکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ اول تو یہ ضروری نہیں کہ ایک بار دیکھنے سے پہچان نہ ہو، اور اگر مان لیا جائے کہ شناخت کے لئے بار بار دیکھنا ہی ضروری ہے تو) انہوں نے (یعنی پیغمبر ﷺ نے) اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی (اصلی صورت میں) دیکھا ہے (پس اب تو وہ خدشہ بھی دور ہو گیا، کیونکہ دونوں صورتوں میں مطابقت سے پوری تعیین ہو گئی کہ ہاں جبرئیل علیہ السلام یہی ہیں، آگے اس دوبارہ دیکھنے کی جگہ بتلاتے ہیں کہ کہاں دیکھا؟ یعنی شب معراج میں دیکھا ہے) سدرۃ المنتہٰی کے پاس (دیکھنے کی جگہ تو بتلادی، اب اس جگہ کا شرف بتلاتے ہیں کہ) اس (سدرۃ المنتہٰی) کے قریب جنت الماوی ہے (''ماویٰ'' کے معنی رہنے کی جگہ، چونکہ جنت نیک بندوں کے رہنے کی جگہ ہے اس لئے ''جنت الماویٰ'' کہتے ہیں، حاصل یہ کہ وہ سدرۃ المنتہٰی ایک ممتاز موقع پر ہے)۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى: مذکورہ آیت کی تفسیر بعض مفسرین نے حق تعالیٰ کی رؤیت کے ساتھ کی ہے، مگر مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے سورہ نجم کی ان آیات کی تفسیر جبرئیل علیہ السلام کی رؤیت کے ساتھ خود حضور ﷺ سے منقول ہے، اس کی تفصیل پیچھے گذر چکی ہے۔

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى: ''سدرۃ'' کہتے ہیں بیری کے درخت کو، اور ''منتہیٰ'' کے معنی ہیں انتہا کی جگہ، حدیث میں آیا ہے کہ یہ ساتویں آسمان میں بیری کا درخت ہے، عالم بالا سے جو احکام اور رزق وغیرہ آتے ہیں وہ پہلے سدرۃ المنتہٰی تک پہنچتے ہیں، پھر وہاں سے ملائکہ زمین پر لاتے ہیں، اسی طرح یہاں زمین سے جو اعمال اوپر کو جاتے ہیں وہ بھی پہلے سدرۃ المنتہٰی تک پہنچتے ہیں، پھر وہاں سے اوپر اٹھا لئے جاتے ہیں، دنیا میں اس کی مثال ڈاک خانہ کی سی ہے کہ خطوط کی آمد و برآمد وہاں سے ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: [1] جس طرح جنت کے انگور، انار وغیرہ کو دنیا کے پھلوں اور میووں پر قیاس نہیں کر سکتے محض اشتراک اسمی ہے، اس بیری کے درخت کو بھی یہاں کی بیریوں پر قیاس نہ کیا جائے اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ بیری کس طرح کی ہوگی، بہرحال وہ درخت ادھر ادھر کی سرحد پر واقع ہے جو اعمال وغیرہ ادھر سے چڑھتے ہیں، اور جو احکام وغیرہ ادھر سے اترتے ہیں سب کا منتہی وہ ہی ہے، مجموعہ روایات سے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان میں پھیلاؤ ساتویں آسمان میں ہوگا، واللہ اعلم۔

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ⑯

جب چھا رہا تھا اس بیری پر جو کچھ چھا رہا تھا

خلاصہ تفسیر: اب رؤیت یعنی دیکھنے کی جگہ کی تعیین کے بعد دیکھنے کا زمانہ بتلاتے ہیں کہ رؤیت کب ہوئی؟ پس فرماتے ہیں کہ: جب اس سدرۃ المنتہٰی کو لپٹ رہی تھیں جو چیزیں لپٹ رہی تھیں۔

ایک روایت میں ہے کہ سونے کے پروانے تھے، یعنی صورت پروانہ کی سی تھی، ایک روایت میں ہے کہ وہ فرشتے تھے، یعنی حقیقت ان کی یہ تھی کہ سونے کے پروانوں کی صورت میں فرشتے تھے، اور ایک روایت میں ہے کہ ملائکہ نے حق تعالیٰ سے اجازت چاہی تھی کہ ہم بھی حضور ﷺ کی زیارت کریں ان کو اجازت ہو گئی، وہ اس سدرہ پر جمع ہو گئے تھے، اس میں بھی حضور ﷺ کے معزز و مکرم ہونے کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی حق تعالیٰ کے انوار وتجلیات اس درخت پر چھا رہے تھے اور فرشتوں کی کثرت وہجوم کا یہ عالم تھا کہ ہر پتے کے ساتھ ایک فرشتہ نظر آتا تھا، بعض روایات میں ہے کہ مَا يَغْشٰى سنہری پروانے تھے، یعنی نہایت خوش رنگ جن کے دیکھے سے دل کھنچا جائے، اس وقت درخت کی بہار اور رونق اور اس کا حسن وجمال ایسا تھا کہ کسی مخلوق کی طاقت نہیں کہ لفظوں میں بیان کر سکے۔

شاید ابن عباسؓ وغیرہ کے قول کے موافق معراج میں جو اللہ کا دیدار حضور ﷺ کو ہوا، اُس کا بیان اسی آیت کے ابہام میں منطوی ومندرج ہو، کیونکہ پہلی آیتوں کے متعلق تو عائشہ صدیقہؓ کی احادیث میں تصریح ہے کہ ان سے رویت رب مراد نہیں، محض رویت جبرائیل مراد ہے۔

ابن کثیرؒ نے مجاہدؒ سے جو ابن عباسؓ کے اخص اصحاب میں سے ہیں اسی آیت کے تحت میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں: "كَانَ اَغْصَانُ السِّدْرَةِ لُؤْلُؤًا وَ يَاقُوْتًا وَزَبَرْجَدًا فَرَاٰهَا مُحَمَّدٌ ﷺ وَرَاٰى رَبَّه بِقَلْبِهٖ". اور یہ رویت چونکہ صرف قلب سے نہ تھی، بلکہ قلب اور بصر دونوں کو دیدار سے حصہ مل رہا تھا، جیسا کہ: مَازَاغَ الْبَصَرُ سے ظاہر ہوتا ہے، شاید اسی لیے ابن عباسؓ نے طبرانیؒ کی بعض روایات میں فرمایا: "رَاٰهُ مَرَّتَيْنِ مَرَّةً بِقَلْبِهٖ وَمَرَّةً بِبَصَرِهٖ" یہاں دو مرتبہ دیکھنے کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی وقت میں دو طرح دیکھا (کما قالوا فی حدیث اِنْشَقَّ الْقَمَرُ بِمَكَّةَ مَرَّتَيْنِ) ① ظاہری آنکھ سے بھی اور ② دل کی آنکھوں سے بھی۔

لیکن یاد رہے کہ یہ رویت وہ نہیں جس کی نفی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ میں کی گئی ہے، کیونکہ اس سے غرض احاطہ کی نفی کرنا ہے، یعنی نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں، علاوہ بریں ابن عباسؓ سے جب سوال کیا گیا کہ "دعوائے رویت" آیت لا تدرکہ الابصار کے مخالف ہے؟ تو فرمایا: "وَيْحَكَ ذَاكَ اِذَا تَجَلّٰى بِنُوْرِهِ الَّذِيْ هُوَ نُوْرُه" (رواہ الترمذی)۔

معلوم ہوا کہ خداوند قدوس کی تجلیات وانوار متفاوت ہیں، بعض انوار قاہرہ للبصر ہیں بعض نہیں، اور رویت رب فی الجملہ دونوں درجوں پر صادق آتی ہے اور اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ جس درجہ کی رویت مومنین کو آخرت میں نصیب ہوگی، جبکہ نگاہیں تیز کر دی جائیں گی جو اس تجلی کو برداشت کر سکیں وہ دنیا میں کسی کو حاصل نہیں، ہاں! ایک خاص درجہ کی رویت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں ابن عباسؓ کی روایات کے موافق میسر ہوئی اور اس خصوصیت میں کوئی بشر آپ ﷺ کا شریک وسہیم نہیں، نیز ان ہی انوار وتجلیات کے تفاوت وتنوع پر نظر کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ عائشہؓ اور ابن عباسؓ کے اقوال میں کوئی تعرض نہیں، شاید وہ نفی ایک درجہ میں کرتی ہوں اور یہ اثبات دوسرے درجہ میں کر رہے ہوں اور اسی طرح ابوذرؓ کی روایات "رأیت نورًا" اور "نور انی اراہ" میں تطبیق ممکن ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ⑰

بہکی نہیں نگاہ اور نہ حد سے بڑھی

خلاصہ تفسیر: اب ایک احتمال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی حیرت انگیز چیزیں دیکھ کر نگاہ چکرا جاتی ہے، پوری طرح ادراک پر قدرت نہیں رہتی، پس اس صورت میں جبرئیل علیہ السلام کی صورت کا کیا ادراک ہوا ہوگا؟ جب یہ ادراک معتبر نہ ہوا تو پھر پیچھے اس خدشہ کا جو جواب **لقد راٰہ نزلۃ اخری** سے دیا گیا ہے وہ بھی کافی نہ ہوا، چنانچہ اس احتمال کو دور کیلئے فرماتے ہیں کہ آپ ان عجائب کو دیکھ کر ذرا نہیں چکرائے اور بالکل متحیر نہیں ہوئے:

(چنانچہ جن چیزوں کے دیکھنے کا حکم تھا ان کی طرف نظر کرنے سے آپ کی) نگاہ نہ تو ہٹی (بلکہ ان چیزوں کو خوب دیکھا) اور (جن چیزوں کے دیکھنے کا حکم جب تک نہ ہوا) نہ (ان کی طرف دیکھنے کو آپ کی نگاہ) بڑھی (یعنی اجازت سے قبل نہیں دیکھا، یہ دلیل ہے آپ ﷺ کے انتہائی ضبط وتحمل کی، کیونکہ عجیب چیزوں میں آ کر آدمی یہی دو حرکتیں کیا کرتا ہے، یعنی جن چیزوں کے دیکھنے کو کہا جاتا ہے ان کو تو دیکھتا نہیں اور جن کے لئے نہیں کہا گیا ان کو تکتا رہتا ہے، غرض اس میں ڈھنگ اور قابو نہیں رہتا)۔

* * *

فائدہ: یعنی آنکھ نے جو کچھ دیکھا، پورے تمکن واتقان سے دیکھا، نہ نگاہ ٹیڑھی ترچھی ہو کر داہنے بائیں ہٹی نہ مبصر سے تجاوز کر کے آگے بڑھی، بس اسی چیز پر جمی رہی جس کا دکھلانا منظور تھا، بادشاہوں کے دربار میں جو چیز دکھلائی جائے اس کو نہ دیکھنا اور جو نہ دکھلائی جائے اس کو تاکنا دونوں عیب ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں سے پاک تھے۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ۱۸

بیشک دیکھے اس نے اپنے رب کے بڑے نمونے

خلاصہ تفسیر: اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ضبط وتحمل کی قوت بیان کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ:

انہوں نے (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے) اپنے پروردگار (کی قدرت) کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے (مگر ہر چیز کے دیکھنے میں آپ کی یہی شان رہی کہ: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی، یعنی نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی)۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی: وہ بڑے عجائبات معراج سے متعلق احادیث میں آئے ہیں، مثلاً انبیاء علیہم السلام کو دیکھنا، ارواح کو دیکھنا، جنت وغیرہ کو دیکھنا، پس ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں انتہائی درجہ کا ضبط وتحمل ہے، سو حیرت زدہ ہو جانے کا احتمال نہیں، پس پیچھے خدشہ کا جو جواب: وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی میں مذکور تھا وہ اپنی جگہ سالم رہا، غرض تمام تر تقریر سے جبرئیل علیہ السلام کی رؤیت ومعرفت کے متعلق شبہ دور ہو کر معاملہ رسالت ثابت ہوا جو کہ اس مقام پر مقصود بھی تھا۔

* * *

فائدہ: اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ کے فائدہ میں جو بیان ہو چکا ہے اس کے علاوہ جو نمونے دیکھے ہوں گے وہ اللہ ہی جانتا ہے۔

بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد　　　اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں

اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی ۱۹ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی ۲۰

بھلا تم دیکھو تو لات اور عزیٰ کو، اور منات تیسرے پچھلے کو ۱؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسالت کے ثبوت کا مضمون تھا، اب آگے توحید کا مضمون ہے۔

(اے مشرکو! جب کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ناطق حق اور متبع وحی ہونا ثابت ہو گیا اور آپ اس وحی سے توحید کا حکم فرماتے ہیں جو کہ عقلی دلائل سے بھی ثابت ہے، اور تم پھر بھی بتوں کی پرستش کرتے ہو تو) بھلا تم نے (کبھی ان بتوں کے مثلاً) لات اور عزیٰ اور ایک تیسرے منات کے حال میں غور بھی کیا ہے (تا کہ تم کو معلوم ہوتا کہ وہ قابل پرستش ہیں یا نہیں، پس کلمہ فاء سے یہ فائدہ ہوا کہ آپ کی تنبیہ کے بعد متنبہ ہونا چاہئے تھا)۔

اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوةَ: مشرکین عرب کے بت جن کی ہو وہ پرستش کرتے تھے بے شمار ہیں مگر ان میں سے یہ تین زیادہ مشہور تھے،، اور ان تین بتوں کو مشرکین قابل عظمت بھی سمجھتے تھے، جب یہ بھی باطل ہیں تو اوروں کی خدائی کا باطل ہونا بدرجہ اولی ثابت ہو گیا، ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''لات'' اہل طائف کا بت تھا جو کہ ایک منقش پتھر تھا اور اس پر ایک عمارت بنا رکھی تھی، ''عزیٰ'' ایک درخت تھا اس پر بھی ایک عمارت بنا رکھی تھی، مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ کے علاقہ میں تھا، اور ''مناۃ'' کو در منثور میں پتھر لکھا ہے، اور اس کا مقام ابن کثیرؒ نے مکہ مدینہ کے درمیان قدید کے پاس مشلل بتلایا ہے، دیگر مفسرین نے اور مقامات بھی بتلائے ہیں، لیکن ممکن ہے کہ ہندوؤں کی طرح جو کہ ہر جگہ دیوی اور مہادیو کی شکلیں بنا لیتے ہیں مشرکین عرب نے بھی کئی کئی جگہ بت بنا رکھے ہوں، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس لامحدود عظمت وجلال والے خدا کے مقابلہ میں ان حقیر وذلیل چیزوں کا نام لینے سے شرم آنی چاہیے۔

تنبیہ: ''لات''،''عزیٰ''،''منات'' ان کے بتوں اور دیویوں کے نام ہیں، ان میں ① ''لات'' طائف والوں کے ہاں بہت معظم تھا ② ''منات'' اوس وخزرج اور خزاعہ کے ہاں اور ③ ''عزیٰ'' کو قریش اور بنی کنانہ وغیرہ ان دونوں سے بڑا سمجھتے تھے، ان کے نزدیک اول ''عزیٰ'' جو مکہ کے قریب نخلہ میں تھا، پھر ''لات'' جو طائف میں تھا، پھر سب سے پیچھے تیسرے درجہ میں ''منات'' جو مکہ سے بہت دور مدینہ کے نزدیک واقع تھا۔

علامہ یاقوتؒ نے معجم البلدان میں یہ ترتیب نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ قریش کعبہ کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہتے تھے: "واللات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری ھوءلاء الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجی"، کتب تفسیر میں اس موقع پر ایک قصہ نقل کیا گیا ہے جو جمہور محدثین کے اصول پر درجہ صحت کو نہیں پہنچتا، اگر فی الواقع اس کی کوئی اصل ہے تو شاید یہ ہی ہوگی کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں اور کافروں کے مخلوط مجمع میں یہ سورت پڑھی، کفار کی عادت تھی کہ لوگوں کو قرآن سننے نہ دیں اور بیچ میں گڑبڑ مچادیں، کما قال تعالیٰ: وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (فصلت:٢٦) جب یہ آیت پڑھی تو کسی کافر شیطان نے آپ ﷺ کی آواز میں آواز ملا کر آپ ﷺ ہی کے لب ولہجہ سے وہ الفاظ کہہ دیے ہوں گے جو ان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے: " تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلیٰ " آگے تعبیر وادا میں تصرف ہوتے ہوتے کچھ کا کچھ بن گیا، ورنہ ظاہر ہے نبی کی زبان پر شیطان کو ایسا تسلط کب حاصل ہوسکتا ہے اور جس چیز کا ابطال آگے کیا جارہا ہے اس کی مدح سرائی کے کیا معنی۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿٢٢﴾

کیا تم کو تو ملے بیٹے اور اس کو بیٹیاں، یہ بانٹا تو بہت بھونڈا[1]

خلاصہ تفسیر: (اور توحید کے متعلق ایک اور بات قابل غور ہے کہ تم جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر معبود کہتے ہو تو:) کیا تمہارے لئے تو بیٹے (تجویز) ہوں اور خدا کے لئے بیٹیاں (تجویز ہوں، یعنی جن لڑکیوں کو تم ننگ وعار اور قابل نفرت سمجھتے ہو وہ خدا کی طرف نسبت کی جائیں) اس حالت میں تو یہ بہت بے ڈھنگی تقسیم ہوئی (کہ اچھی چیز تمہارے حصے میں اور بری چیز خدا کے حصہ میں، نعوذ باللہ منہ، یہ کفار کے عرف کی بناء پر فرمایا، ورنہ خدا تعالیٰ کے لئے بیٹا تجویز کرنا بھی بے ڈھنگی بات ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] یاقوتؒ نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ کفار ان بتوں کو خدا کے بیٹیاں کہتے تھے، سو اول تو خدا لم یلد ولم یولد ہے اور بالفرض اولاد کا نظریہ تسلیم کیا جائے تب بھی یہ تقسیم کس قدر بھونڈی اور مہمل ہے کہ تم خود تو بیٹے لے جاؤ اور خدا کے حصہ میں بیٹیاں لگا دو۔

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ

یہ سب نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے اللہ نے نہیں اتاری ان کی کوئی سند[1] محض اٹکل پر چلتے ہیں

اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿٢٣﴾

اور جو جیوں کی امنگ ہے، اور پہنچی ہے ان کو ان کے رب سے راہ کی سوجھ[2]

خلاصہ تفسیر: یہ (باطل معبودات یعنی بت وملائکہ اس باطل عقیدہ کے ساتھ) نرے نام ہی نام ہیں (یعنی یہ لات، عزیٰ اور منات خدا ہونے کی حیثیت سے کوئی موجود چیز ہی نہیں، بلکہ ان ناموں کی طرح ہیں جن کا کہیں کوئی مصداق نہ ہو) جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرا لیا ہے خدا تعالیٰ نے تو ان (کے معبود ہونے) کی کوئی دلیل (عقلی یا نقلی) بھیجی نہیں (بلکہ) یہ لوگ (غیر اللہ کو خدا سمجھنے کے عقیدہ

میں) صرف بے اصل خیالات پر اور اپنے نفس کی خواہش پر (جو کہ ان بے اصل خیالات سے پیدا ہوتی ہے) چل رہے ہیں (دونوں میں فرق یہ ہوا کہ ہر عمل سے پہلے ایک عقیدہ ہوتا ہے، اور ایک عزم وارادہ جو اس عمل کے لئے محرک ہوتا ہے، پس دونوں سے دونوں کی طرف اشارہ ہے) حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے (رسول ﷺ کے واسطہ سے جو کہ حق گو اور وحی الٰہی کے پیرو ہیں، آپ سے امر واقعی کی) ہدایت آ چکی ہے (یعنی خود اپنے دعوے پر تو کوئی دلیل نہیں رکھتے، اور اس دعوت کی تفصیل پر رسول کے ذریعہ سے دلیل سنتے ہیں اور پھر نہیں مانتے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی پتھروں اور درختوں کے کچھ نام رکھ چھوڑے ہیں جن کی خدائی کی کوئی سند نہیں، بلکہ اس کے خلاف پر دلائل قائم ہیں، ان کو اپنے خیال میں خواہ بیٹیاں کہہ لو، یا بیٹے یا اور کچھ محض کہنے کی جس کے نیچے حقیقت کچھ نہیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی باوجودیکہ اللہ کے پاس سے ہدایت کی روشنی آ چکی اور وہ سیدھی راہ دکھا چکا، مگر یہ احمق ان ہی اوہام واہواء کی تاریکیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، جو کچھ اٹکل پچو ذہن میں آ گیا اور دل میں امنگ پیدا ہو کر گزرے، تحقیق وبصیرت کی راہ سے کچھ سروکار نہیں۔

ع۵ أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ﴿٢٤﴾ فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ﴿٢٥﴾

کہیں آدمی کو ملتا ہے جو کچھ چاہے، سو اللہ کے ہاتھ ہے سب بھلائی پچھلی اور پہلی ۱۔

خلاصہ تفسیر: (پیچھے اللہ کے سوا معبودوں کے باطل ہونے میں گفتگو تھی، اب آگے بت پرستی کی غایت کو باطل فرماتے ہیں، یعنی تم نے جو بتوں کو اس غرض سے معبود مانا ہے کہ یہ اللہ کے پاس تمہاری سفارش کریں گے یہ غرض بھی محض دھوکہ اور باطل ہے، سو چوکہ) کیا انسان کو اس کی ہر تمنا مل جاتی ہے (واقعہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ ہر تمنا) سو خدا ہی کے اختیار میں ہیں آخرت (کی بھی) اور دنیا (کی بھی، پس وہ جس کو چاہیں پورا فرما دیں، اور نص قطعی میں یہ بتلا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس باطل تمنا کو پورا کرنا نہیں چاہیں گے نہ دنیا میں کہ ان کی دنیوی حاجات میں سفارش کریں، نہ آخرت میں کہ وہاں عذاب سے نجات کی سفارش کریں اس لئے یقیناً وہ پوری نہ ہوگی)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی سمجھتے ہیں کہ یہ بت ہمارے سفارشی بنیں گے، یہ خالی خیالات اور آرزوئیں ہیں، کیا انسان جو تمنا کرے وہ ہی مل جائے گا، یاد رہے دنیا اور آخرت کی سب بھلائی اللہ کے ہاتھ ہے، حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: "یعنی بت پوجنے سے کیا ملتا ہے، ملے وہ ہی جو اللہ دے"۔

وَكَمْ مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِن بَعْدِ أَن يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَن

اور بہت فرشتے ہیں آسمانوں میں کچھ کام نہیں آتی ان کی سفارش مگر جب حکم دے اللہ جس کے واسطے

يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ ﴿٢٦﴾

چاہے اور پسند کرے

خلاصہ تفسیر: اور (بیچارے بت تو کیا سفارش کرتے کہ ان میں خود سفارش کی اہلیت ہی نہیں، اس دربار میں تو جو لوگ اہل ہیں ان کی بھی بلا اجازت حق کچھ نہیں چلتی چنانچہ) بہت سے فرشتے آسمانوں میں موجود ہیں (آسمان میں ہونے سے شاید ان کی بلندی شان کی طرف اشارہ ہو، مگر باوجود اس بلندی شان کے) ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آ سکتی (بلکہ خود سفارش ہی نہیں پائی جا سکتی) مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں اجازت دے دیں اور (اس کے لئے سفارش کرنے سے) راضی ہوں۔

لِمَن يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ: یہاں لفظ یرضیٰ اس لئے بڑھا دیا کہ بعض دفعہ انسان بلا رضامندی کے بھی کسی دباؤ یا مصلحت سے اجازت دے دیا

کرتا ہے، اللہ جل شانہ کے معاملہ میں اس کا بھی دور کا کوئی احتمال نہیں کہ وہ کسی دباؤ سے مجبور ہو کر راضی ہو جائیں، سوخدا پر کسی کا دباؤ نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی ان بتوں کی تو حقیقت کیا ہے آسمان کے رہنے والے مقرب فرشتوں کی سفارش بھی کچھ کام نہیں دے سکتی، ہاں اللہ ہی جس کے حق میں سفارش کرنے کا حکم دے اور اس سے راضی ہو تو وہاں سفارش بیشک کام دے گی، ظاہر ہے اس نے نہ بتوں کو سفارش کا حکم دیا اور نہ وہ کفار سے راضی ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿٢٧﴾ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ

اور جو لوگ یقین نہیں رکھتے آخرت کا وہ نام رکھتے ہیں فرشتوں کے زنانے نام، اور ان کو اس کی کچھ خبر نہیں

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿٢٨﴾

محض اٹکل پر چلتے ہیں، اور اٹکل کچھ کام نہ آئے ٹھیک بات میں لے

خلاصہ تفسیر: (اب آگے اس کا بیان ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دے دینا کفر ہے کہ) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (بلکہ اس کے انکار کی وجہ سے کافر ہیں) وہ فرشتوں کو (خدا کی) بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں (یہاں انثیٰ بیٹی کے معنی میں ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى، اور جب فرشتوں کو خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانا کفر ہے تو بتوں کو شریک ٹھہرانا بدرجہ اولیٰ کفر ہے اس لئے صرف اسی پر اکتفا کیا گیا، آگے اس کا بیان ہے کہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی لڑکیاں قرار دینے کا عقیدہ باطل ہے) حالانکہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں، اور یقیناً بے اصل خیالات امر حق (کو ثابت کرنے) میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: ان کے کفر کے بیان میں "آخرت" کا ذکر شاید اس لیے کیا گیا ہو کہ یہ سب گمراہیاں آخرت کی بے فکری سے پیدا ہوئی ہیں، ورنہ آخرت پر اعتقاد رکھنے والے کو اپنی نجات کی ضرور فکر ہوتی ہے۔

لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ: پیچھے فرشتوں کا ذکر ہو چکا، مگر یہاں دوبارہ فرشتوں کا ذکر لانا شاید اس لیے ہو کہ ان کے مقبول و مقرب ہونے کی وجہ سے ان میں خدا کا شریک اور سفارش کرنے والا ہونے کا احتمال زیادہ ہو سکتا ہے۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ: یہ مضمون چند آیات پہلے بھی آیا ہے اور یہاں بھی، مگر دونوں جگہ میں فرق یہ ہے کہ پیچھے نقلی دلیل کا نہ ہونا بیان فرمایا تھا، اور یہاں نقلی اور عقلی دونوں یا مقابلہ کی وجہ سے صرف عقلی دلیل کا نہ ہونا مراد ہے، پس تکرار نہ رہا۔

وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ: لفظ "ظن" عربی زبان میں مختلف معانی کے لئے بولا جاتا ہے، ایک معنی یہ بھی ہیں کہ "بے بنیاد" خیالات کو "ظن" کہا جاتا ہے، یہاں آیت میں یہی مراد ہے اور یہی مشرکین مکہ کی بت پرستی کا سبب تھا، اسی کے ازالہ کے لئے یہ فرمایا گیا ہے، دوسرے معنی "ظن" کے وہ ہیں جو "یقین" کے بالمقابل آتے ہیں، "یقین" کہا جاتا ہے اس علم قطعی مطابق للواقع کو جس میں کسی شک و شبہ کی راہ نہ ہو، جیسے قرآن کریم یا احادیث متواترہ سے حاصل شدہ علم، اس کے مقابل ظن اس علم کو کہا جاتا ہے جو بے بنیاد خیالات تو نہیں دلیل کی بنیاد پر قائم ہے، مگر یہ دلیل اس درجہ قطعی نہیں جس میں کوئی دوسرا احتمال ہی نہ رہے، جیسے عام روایات حدیث سے ثابت ہونے والے احکام، اسی لئے قسم اول کے مسائل کو قطعیات اور یقینیات کہا جاتا ہے، اور دوسری قسم کو ظنیات، اور یہ ظن شریعت میں معتبر ہے، قرآن و حدیث میں اس کے معتبر ہونے کے شواہد موجود ہیں اور تمام امت کے نزدیک واجب العمل ہے، آیت مذکورہ میں "ظن" کو جو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے اس سے مراد ظن بمعنی "بے بنیاد بے دلیل خیالات" ہیں، اس لئے کوئی اشکال نہیں۔

اس آیت کے خلاصہ تفسیر سے معلوم ہو گیا کہ جو لوگ قیاس اور اجتہاد شرعی کے باطل ہونے پر اس آیت سے استدلال کرتے ہیں بالکل غلط

ہے، کیونکہ قیاس شرعی کو بے اصل خیالات ہرگز نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس کا ماخذ قرآنی آیات واحادیث نبوی ہوتی ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جن کو آخرت کا یقین نہیں وہ سزا کی طرف سے بے فکر ہو کر ایسی گستاخیاں کرتے ہیں، مثلاً فرشتوں کو زنانہ قرار دے کر خدا کی بیٹیاں کہہ دیا، یہ ان کی محض جہالت ہے، بھلا فرشتوں کو مرد اور عورت ہونے سے واسطہ، اور خدا کے لیے اولاد کیسی، کیا سچی اور ٹھیک بات پر قائم ہونا ہو تو ایسی اٹکلوں اور پادر ہوا اوہام سے کام چل سکتا ہے، اور کیا تخمینے اور اٹکلیں حقائق ثابتہ کے قائم مقام ہو سکتی ہیں؟

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۞۲۹ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ

سو تو دھیان نہ کر اس پر جو منہ موڑے ہماری یاد سے اور کچھ نہ چاہے مگر دنیا کا جینا، بس یہیں تک پہنچی ان کی

الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰی ۞۳۰ ع

سمجھ ۱؎ تحقیق تیرا رب ہی خوب جانے اس کو جو بہکا اس کی راہ سے، اور وہی خوب جانے اس کو جو راہ پر آیا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید و رسالت کا اور کفار کے نہ ماننے کا ذکر تھا، اب آگے اس ماننے نہ ماننے کی جزا و سزا کا ذکر ہے اور چونکہ اس کے نہ ماننے سے حضور ﷺ کو رنج ہوتا تھا اس لیے تسلی سے اس مضمون کو شروع فرمایا ہے۔

(پیچھے جب اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ اور جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰی سے مشرکین عرب کا ہٹ دھرم ہونا معلوم ہو گیا کہ قرآن اور ہدایت آنے کے باوجود یہ اپنے گمان اور خواہش پر چلتے ہیں، اور ہٹ دھرم سے قبول حق کی امید نہیں ہوتی) تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اس کو کوئی (اخروی مطلب) مقصود نہ ہو (جس کی وجہ آخرت پر ایمان نہ ہونا ہے جو پیچھے لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ سے سمجھ میں آتا ہے، اور) ان لوگوں کے فہم کی رسائی کی حد بس یہی (دنیوی زندگی) ہے (جب ان کی بدفہمی اور بے فکری کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے تو ان کی فکر نہ کیجئے، ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کیجئے بس) تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ہی اس کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ راست پر ہے (اس سے تو اللہ کا علم ثابت ہوا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس کا اوڑھنا بچھونا یہی دنیا کی چند روزہ زندگی ہو کہ اس میں منہمک ہو کر کبھی خدا کو اور آخرت کو دھیان میں نہ لائے، آپ ﷺ اس کی بکواس کو دھیان میں نہ لائیں، وہ خدا سے منہ موڑتا ہے، آپ ﷺ اس کی شرارت اور کجروی کی طرف سے منہ پھیر لیں، سمجھانا تھا سو سمجھا دیا، ایسے بدطینت اشخاص سے قبول حق کی توقع رکھنا اور ان کے غم میں اپنے کو گھلانا بیکار ہے، ان کی سمجھ تو بس اسی دنیا کے فوری نفع نقصان تک پہنچتی ہے اس سے آگے ان کی رسائی نہیں، وہ کیا سمجھیں کہ مرنے کے بعد مالک حقیقی کی عدالت میں حاضر ہو کر ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہے، ان کی تمام ترعلمی جدوجہد صرف بہائم کی طرح پیٹ بھرنے اور شہوت فرو کرنے کے لیے ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جو گمراہی میں پڑا رہا اور جو راہ پر آیا، ان سب کو اور ان کی مخفی استعدادوں کو اللہ تعالیٰ ازل سے جانتا ہے، اسی کے موافق ہو کر رہے گا، ہزار جتن کرو، اس کے علم کے خلاف ہرگز واقع نہیں ہو سکتا، نیز وہ اپنے علم محیط کے موافق ہر ایک سے ٹھیک ٹھیک اس کے احوال کے مناسب معاملہ کرے گا، لہٰذا آپ یکسو ہو کر ان معاندین کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ

اور اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، تاکہ وہ بدلہ دے برائی والوں کو ان کے کیے کا اور بدلہ دے

اَحۡسَنُوۡا بِالۡحُسۡنٰى ۚ﴿۳۱﴾

بھلائی والوں کو بھلائی سے

خلاصہ تفسیر: اور (اللہ کی قدرت اس سے ثابت ہے کہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے (جب وہ علم اور قدرت دونوں میں کامل ہے اور اس کے قانون اور احکام پر عمل کرنے کے اعتبار سے لوگوں کی دو قسمیں ہیں: گمراہ اور ہدایت پر عمل کرنے والے تو) انجام کار یہ ہے کہ برا کام کرنے والوں کو ان کے (برے) کام کے عوض میں (خاص طور کی) جزاء دے گا اور نیک کام کرنے والوں کو ان کے نیک کاموں کے عوض میں (خاص طور کی) جزا دے گا (اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اسی کے حوالہ کیجئے)۔

* * *

فائدہ: یعنی ہر شخص کا حال اس کو معلوم اور زمین و آسمان کی ہر چیز پر اس کا قبضہ، پھر نیک و بد کا بدلہ دینے سے کیا چیز مانع ہو سکتی ہے، بلکہ غور سے دیکھو تو زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ اس کے نتیجہ میں زندگی کا ایک دوسرا غیر فانی سلسلہ قائم کیا جائے جہاں بروں کو ان کی برائی کا بدلہ ملے اور نیکوں کے ساتھ ان کی بھلائی کے صلہ میں بھلائی کی جائے۔

اَلَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ‌ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الۡمَغۡفِرَةِ‌ ؕ هُوَ

جو کہ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے مگر کچھ آلودگی ۱؎ بیشک تیرے رب کی بخشش میں بڑی سمائی ہے ۲؎ وہ

اَعۡلَمُ بِكُمۡ اِذۡ اَنۡشَاَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ وَاِذۡ اَنۡتُمۡ اَجِنَّةٌ فِىۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ‌ ۚ فَلَا تُزَكُّوۡۤا

تم کو خوب جانتا ہے، جب بنا نکالا تم کو زمین سے اور جب تم بچے تھے ماں کے پیٹ میں، سو مت بیان کرو اپنی

اَنۡفُسَكُمۡ‌ ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۚ﴿۳۲﴾ ع ۲

خوبیاں، وہ خوب جانتا ہے اس کو جو بچ کر چلا

خلاصہ تفسیر: (اب ان لوگوں کا بیان ہے جو نیکوکار محسنین ہیں) وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور (ان میں) بے حیائی کی باتوں سے (خاص طور پر زیادہ) بچتے ہیں مگر ہلکے ہلکے گناہ (کبھی کبھار ہو جائیں تو ان سے نیکی میں خلل نہیں آتا، گذشتہ آیت میں جو بدکاروں کو سزا دینے کا بیان آیا اس سے گناہ گاروں کو ناامیدی اور مایوسی کا وہم ہو سکتا ہے جس سے ایمان اور توبہ ہی کی ہمت ہار دیں اور اس آیت سے نیک لوگوں کو اپنے اچھے ہونے کا اور عجب و غرور میں مبتلا ہونے کا خطرہ اور وہم ہو سکتا ہے اس لیے اب آگے دونوں کو وہموں کو دور کرتے ہیں) بلاشبہ آپ کے رب کی مغفرت بڑی وسیع ہے (گناہ گاروں کو گناہ کے تدارک یعنی توبہ وغیرہ سے ہمت نہیں ہارنی چاہئے، اللہ اگر چاہے تو شرک و کفر کے سوا تمام گناہوں کو محض فضل سے معاف کر دے تو توبہ سے کیوں معاف نہ کرے گا، اسی طرح محسنین یعنی نیک لوگوں کو عجب اور فخر و غرور نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ نیک کاموں میں بعض دفعہ نفس کی ایسی مخفی آمیزش وغیرہ ہو جاتی ہے جس سے وہ قابل قبول نہیں رہتے اور نیکی کا مدار قبولیت ہی پر تھا، جب وہ قبول ہی نہ ہوئے تو پھر اپنے کو اچھا سمجھنا کیسا، اور بعض دفعہ نیک عمل کرنے والے کو بھی اس مخفی خرابی کی خبر نہیں ہوتی مگر خدا کو تو معلوم ہے، اور تم کو تمہاری کسی بات کا معلوم نہ ہونا اور خدا کو معلوم ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ پہلے سے ہی ایسا ہوتا آ رہا ہے، چنانچہ:) وہ تم کو (اور تمہارے احوال کو اس وقت سے) خوب جانتا ہے جب تم کو (یعنی تمہارے جدامجد آدم علیہ السلام کو) زمین (کی خاک) سے پیدا کیا تھا (جن کے ضمن میں بواسطہ تم بھی مٹی سے پیدا ہوئے) اور جب تم اپنی ماؤں کے

پیٹ میں بچے تھے (اور ان دونوں حالتوں میں تم کو خود اپنا علم بالکل نہ تھا، اور ہم کو علم تھا، پس اسی طرح اب بھی تمہاری کسی حالت کو تمہارا نہ جاننا اور ہمارا جاننا کوئی تعجب کی بات نہیں، جب یہ بات ہے) تو تم اپنے کو مقدس مت سمجھا کرو (کیونکہ) تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے (کہ فلاں متقی ہے فلاں نہیں، اگرچہ تقویٰ کے افعال ظاہر میں دونوں سے صادر ہوتے ہوں)۔

اِلَّا اللَّمَمَ: اس آیت میں ہدایت ربانی کی پیروی کرنے والے محسنین یعنی نیک لوگوں کا ذکر مقام مدح میں فرما کر ان کی پہچان یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے عموماً اور فحش و بے حیائی کے کاموں سے بالخصوص دور رہتے ہیں، اس میں ایک استثناء، بلفظ اللمم فرمایا گیا ہے، جس کی تشریح آگے آتی ہے، اور حاصل اس استثناء کا وہی ہے جو اوپر خلاصہ تفسیر میں لکھا گیا کہ ان لوگوں کو جو محسن یعنی نیکوکار کا خطاب دیا گیا ہے، صغیرہ گناہوں میں ابتلاء ان کو اس خطاب سے محروم نہیں کرتا، مطلب اس استثناء کا یہ ہے کہ پیچھے آیت: الذین احسنوا میں محسنین کا ذکر ہوا، جن کی اس آیت میں مدح کی گئی ہے اور ان کے محبوب عنداللہ ہونے کا اظہار کیا گیا ہے اس کا مصداق بننے اور نیک کہلانے کے لیے کبیرہ گناہوں سے بچنا تو شرط ہے، لیکن صغیرہ گناہ کا کبھی کبھی ہو جانا اس محبوبیت کے منافی نہیں، یعنی صغیرہ گناہ اگر کبھی کبھی ہو جائیں تو ان سے نیکی میں خلل نہیں آتا، البتہ صغیرہ گناہوں میں بھی یہ شرط ہے کہ ان کی عادت نہ ڈال لے اور ان پر اصرار نہ کرے، کبھی اتفاقی طور پر ہو جائے، ورنہ اصرار اور عادت سے صغیر گناہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے، اس استثناء کا یہ مطلب نہیں کہ صغیرہ گناہوں کی اجازت ہے، اور نہ یہ سمجھا جائے کہ نیک کام پر ثواب ملنا کبیرہ گناہوں سے بچنے پر موقوف ہے، کیونکہ کبیرہ گناہ کرنے والا بھی جو نیکی کرے گا اس کی جزا پائے گا، جیسا کہ ارشاد ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ، بلکہ کبیرہ گناہوں سے بچنا متقی اور محبوب بننے کے لیے شرط ہے جس پر احسنوا کا عنوان دلالت کرتا ہے خوب سمجھ لو۔

اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ: اس کے خلاصہ تفسیر کے مضمون پر اگر یہ شبہ ہو کہ اس حالت پر قیاس کرنا غلط ہے، کیونکہ اس وقت تو ہم کو شعور نہ تھا اور اب شعور ہے، تو اس وقت کی حالت کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں، جواب یہ ہے کہ ہر چیز کے انکشاف کے لیے صرف شعور ہونا کافی نہیں، بلکہ معلومات کے ساتھ شعور کا متعلق ہونا بھی شرط ہے، اور ممکن ہے کہ کسی حالت کے ساتھ شعور متعلق نہ ہو، چنانچہ بہت حالات میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے اور آیت کا مقصود صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا علم ذاتی ہونے کے سبب کامل اور ہر حالت میں برابر ہے، اور تمہارا علم حادث ہونے کی وجہ سے ناقص ہے اور کسی وقت نہیں بھی تھا، پس نیک اعمال میں مخفی خرابیوں کا تم سے پوشیدہ رہ جانا تعجب کی بات نہیں۔

اور اس مقام کی یہ تقریر بھی ہو سکتی ہے کہ محسنین یعنی نیک کاروں کو عجب نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ نیک ہونے کا مدار خاتمہ پر ہے اور اپنے خاتمہ کا حال تم کو معلوم نہیں، صرف اللہ کو معلوم ہے، جیسا کہ تمہیں اپنی ابتدا کی حالت معلوم نہیں اور اللہ کو معلوم ہے، پھر تعجب کیوں کیا جائے، اور ایک حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، وہ یہ کہ حضور ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ "اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ماں کے پیٹ میں نیک بخت اور بد بخت کر دیا ہے" اس پر یہ آیت: هو اعلم بکم اذانشا کم نازل ہوئی۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى: یعنی تم اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہ کرو، کیونکہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون کیسا ہے اور کس درجہ کا ہے، کیونکہ فضیلت کا مدار تقویٰ پر ہے، ظاہری اعمال پر نہیں اور تقویٰ بھی وہ معتبر ہے جو موت تک قائم رہے، چنانچہ اس آیت سے اپنے آپ مقدس اور پاکیزہ سمجھنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ گناہ "کبیرہ" اور "صغیرہ" کا فرق سورۃ نساء کے فوائد میں مفصل گزر چکا۔

اللمم کی تفسیر میں کئی قول ہیں: ① بعض نے کہا کہ جو خیالات وغیرہ گناہ کے دل میں آئیں مگر انکو عمل میں نہ لائے وہ لمم ہیں ② بعض نے صغیرہ گناہ مراد لیے ہیں ③ بعض نے کہا کہ جس گناہ پر اصرار نہ کرے یا اس کی عادت نہ ٹھہرائے یا جس گناہ سے توبہ کر لے وہ مراد ہے۔

ہمارے نزدیک بہترین تفسیر وہی ہے جو مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے سورۃ نساء کے فوائد میں اختیار کی ہے، لیکن یہاں ترجمہ میں دوسرے

معانی کی بھی گنجائش رکھی ہے۔

فائدہ: ۲ اسی لیے بہت سے چھوٹے موٹے گناہوں سے درگزر فرماتا ہے اور توبہ قبول کرتا ہے، گناہ گار کو مایوس نہیں ہونے دیتا، اگر ہر چھوٹی بڑی خطا پر پکڑنے لگے تو بندہ کا ٹھکانا کہاں، یعنی اگر تقویٰ کی کچھ توفیق اللہ نے دی تو شیخی نہ مارو اور اپنے کو بہت بزرگ نہ بناؤ، وہ سب کی بزرگی اور پاکبازی کو خوب جانتا ہے اور اس وقت سے جانتا ہے جب تم نے ہستی کے اس دائرہ میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔

آدمی کو چاہیے کہ اپنی اصل کو نہ بھولے، جس کی ابتداء مٹی سے تھی، پھر بطن مادر کی تاریکیوں میں ناپاک خون سے پرورش پاتا رہا، اس کے بعد کتنی جسمانی و روحانی کمزوریوں سے دوچار ہوا، آخر میں اگر اللہ نے اپنے فضل سے ایک بلند مقام پر پہنچا دیا تو اس کو اس قدر بڑھ چڑھ کر دعوے کرنے کا استحقاق نہیں، جو واقعی متقی ہیں وہ دعویٰ کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب بھی پوری طرح کمزوریوں سے پاک ہو جانا بشریت کی حد سے باہر ہے، کچھ نہ کچھ آلودگی سب کو ہو جاتی ہے الا من عصمہ اللہ۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾

بھلا تو نے دیکھا اس کو جس نے منہ پھیر لیا ۱ اور لایا تھوڑا سا اور سخت نکالا ۲ کیا اس کے پاس خبر ہے غیب کی سو وہ دیکھتا ہے ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا میں بدکاروں اور نیک کاروں کا اجمالاً ذکر تھا، پھر اس کے بعد نیک لوگوں کی نیکی کی کچھ وضاحت تھی، اب آگے بدکاروں کی برائی کی کچھ وضاحت فرماتے ہیں، اس کا شان نزول یہ کہ کوئی شخص اسلام لے آیا تھا، اس کے کسی ساتھی نے اس کو ملامت کی کہ تو نے اپنے باپ دادا کے دین کو کیوں چھوڑ دیا؟ اس نے کہا کہ میں اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہوں، وہ بولا کہ تو مجھے کچھ دے دے، میں آخرت کا تیرا عذاب اپنے سر لے لوں گا، چنانچہ اس نے کچھ دے دیا، اس نے اور مانگا تو کچھ پس و پیش کے بعد اور بھی کچھ دے دیا، اور بقیہ کی دستاویز مع گواہوں کے لکھ دی، روح المعانی میں اس شخص کا نام ولید بن مغیرہ لکھا ہے، اس کا کچھ میلان اسلام کی طرف ہو چلا تھا، اور ظاہر ہے کہ جس شخص کی ایسی حالت ہو یہ آیت ان سب کو شامل ہے۔

(آپ نے نیک لوگوں کی صفات تو سن لیں) تو بھلا آپ نے ایسے شخص کو بھی دیکھا جس نے (دین حق سے) روگردانی کی (یعنی اسلام سے ہٹ گیا) اور تھوڑا مال دیا اور (پھر) بند کر دیا (یعنی جس شخص نے اپنے مطلب کے واسطے مال دینے کا وعدہ کیا تھا وہ بھی پورا نہ دیا، اور اسی سے سمجھ لو کہ دوسروں کو نفع پہنچانے کے لیے تو وہ کیا خرچ کرے گا جب اپنے ہی مطلب کے لیے پورا خرچ نہ کر سکا، جس کا حاصل اس شخص کا بخیل ہونا ہے) کیا اس شخص کے پاس (کسی صحیح ذریعہ سے) علم غیب ہے کہ اس کو دیکھ رہا ہے (جس کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ فلاں شخص میری طرف سے میرے گناہوں کا عذاب اپنے سر لے کر مجھے عذاب سے بچا دے گا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اپنی اصل کو بھول کر خالق و مالک حقیقی کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی تھوڑا سا ایمان لانے لگا پھر اس کا دل سخت ہو گیا''۔

مجاہدؒ وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ آیات ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں، حضور ﷺ کی باتیں سن کر اس کو اسلام کی طرف تھوڑی سی رغبت ہو چلی تھی اور کفر کی سزا سے ڈر کر قریب تھا کہ مشرف باسلام ہو جائے، ایک کافر نے کہا کہ ایسا مت کر، میں تیرے سب جرائم اپنے اوپر لیتا ہوں، تیری طرف سے میں سزا بھگت لوں گا، بشرطیکہ اس قدر مال مجھ کو دیا جائے، اس نے وعدہ کر لیا اور مقررہ رقم کی کچھ قسط ادا کر کے باقی سے انکار کر دیا، اس صورت میں وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى کے معنی یہ ہوں گے کہ: ''کچھ مال دیا، پھر ہاتھ کھینچ لیا''۔

فائدہ: ۳ یعنی کیا یہ غیب کی بات دیکھ آیا ہے کہ آئندہ اسکو کفر کی سزا نہ ملے گی اور دوسرے کو اپنی جگہ پیش کر کے چھوٹ جائے گا۔

أَمۡ لَمۡ يُنَبَّأۡ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ﴿٣٦﴾ وَإِبۡرَٰهِيمَ ٱلَّذِي وَفَّىٰٓ ﴿٣٧﴾ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٞ وِزۡرَ أُخۡرَىٰ ﴿٣٨﴾

کیا اسکو خبر نہیں پہنچی اسکی جو ہے ورقوں میں موسیٰ کے اور ابراہیم کے جس نے کہ اپنا قول پورا اُتارا ۱ کہ اٹھاتا نہیں کوئی اٹھانے والا بوجھ کسی دوسرے کا ۲

خلاصہ تفسیر: کیا اس کو اس مضمون کی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے صحیفوں میں ہے (درمنثور کی روایت کے مطابق یہ دس صحیفے تورات کے علاوہ ہیں) اور نیز ابراہیم (علیہ السلام) کے (صحیفوں میں ہے) جنہوں نے احکام کی پوری بجا آوری کی (اور وہ مضمون) یہ (ہے) کہ کوئی شخص کسی کا گناہ اپنے اوپر (ایسے طور سے) نہیں لے سکتا (کہ گناہ کرنے والا بالکل بری ہوجائے، پھر یہ شخص کیسے سمجھ گیا کہ میرا سارا گناہ یہ ملامت کرنے والا شخص اپنے سر رکھ لے گا، خلاصہ تفسیر کی تقریر سے معلوم ہوگیا کہ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ گمراہ کرنے والے کو گناہ نہ ہوگا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ گمراہ کرنے کا عذاب بھگتے گا)۔

بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ وَإِبۡرَٰهِيمَ: اب یہاں سے آگے اٹھارہ آیتوں میں ان خاص تعلیمات کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ وابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں تھیں، حضرت موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں کی تفصیل ان شاء اللہ آگے سورۃ الاعلیٰ میں آئے گی۔

یہاں صحف موسیٰ وابراہیم علیہما السلام کے حوالے سے دو مسئلے بیان کئے گئے ہیں: ایک یہ کہ ایک شخص کے گناہ کا عذاب کسی دوسرے کو نہیں پہنچے گا اور ایک کے گناہ میں دوسرا کوئی نہ پکڑا جائے گا، دوسرا مسئلہ اگلی آیت میں آرہا ہے وہ یہ کہ ہر شخص پر جن اعمال کی شرعی ذمہ داری ہے اس سے سبکدوشی خود اسی کے اپنے عمل سے ہوگی، دوسرے کا عمل اس کو سبکدوش نہ کرے گا، یہ دونوں حکم اگرچہ دوسرے انبیاء کی شریعتوں میں بھی تھے مگر حضرت موسیٰ وابراہیم علیہما السلام کی خصوصیت شاید اس بناء پر کی گئی کہ ان کے زمانہ میں یہ جاہلانہ رسم جاری ہوگئی تھی کہ باپ کے بدلے میں بیٹے کو اور بیٹے کے بدلے میں باپ کو یا بھائی بہن وغیرہ کو قتل کر دیا جاتا تھا، ان دونوں بزرگوں کی شریعتوں نے اس رسم جاہلیت کو مٹایا تھا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ابراہیم اپنے قول وقرار اور عہد و پیمان کی پابندی میں پورا اترا اور اللہ کے حقوق پوری طرح ادا کیے اور اس کے احکام کی تعمیل میں ذرہ بھر تقصیر نہ کی۔

فائدہ: ۲ یعنی موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں یہ مضمون تھا کہ خدا کے ہاں کوئی مجرم دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، ہر ایک کو اپنی اپنی جوابدہی بذات خود کرنا ہوگی۔

وَأَن لَّيۡسَ لِلۡإِنسَٰنِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ﴿٣٩﴾ وَأَنَّ سَعۡيَهُۥ سَوۡفَ يُرَىٰ ﴿٤٠﴾ ثُمَّ يُجۡزَىٰهُ ٱلۡجَزَآءَ ٱلۡأَوۡفَىٰ ﴿٤١﴾

اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے کمایا ۱ اور یہ کہ اس کی کمائی اس کو دکھلائی ضرور ہے، پھر اس کو بدلہ ملنا ہے اس کا پورا بدلہ ۲

خلاصہ تفسیر: اور یہ (مضمون ہے) کہ انسان کو (ایمان کے بارے میں) صرف اپنی ہی کمائی ملے گی (یعنی کسی دوسرے کا ایمان اس کے کام نہ آئے گا، پس اگر اس ملامت کرنے والے کے پاس ایمان ہوتا تب بھی اس شخص کے کام نہ آتا، چہ جائے کہ وہاں بھی ایمان ندارد) اور یہ (مضمون ہے) کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھی جائے گی، پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا (پھر باوجود اس کے یہ شخص اپنی فلاح کی محنت کوشش سے کیسے غافل ہوگیا)۔

وَأَن لَّيۡسَ لِلۡإِنسَٰنِ إِلَّا مَا سَعَىٰ: جبکہ اوپر یہ معلوم ہو چکا کہ آیت مذکورہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے فرائض ایمان ونماز و روزہ کو ادا کر کے دوسرے کو سبکدوش نہیں کرسکتا، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایک شخص کے نفلی عمل کا کوئی فائدہ اور ثواب دوسرے شخص کو نہ پہنچ سکے، ایک شخص کی دعا اور صدقہ کا ثواب دوسرے شخص کو پہنچنا نصوص شرعیہ سے ثابت اور تمام امت کے نزدیک اجماعی مسئلہ ہے، یہاں خلاصہ تفسیر کی تقریر سے

واضح ہوگیا کہ ایصال ثواب یعنی ثواب پہنچانے سے ثواب پہنچ جاتا ہے، اس آیت سے ایصال ثواب کی نفی نہیں ہوتی۔

جمہور ائمہ اور امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک جس طرح دعا اور صدقہ کا ثواب دوسرے کو پہنچایا جاسکتا ہے اسی طرح تلاوت قرآن اور ہر نفلی عبادت کا ثواب دوسرے شخص کو بخشا جاسکتا ہے اور وہ اس کو ملے گا، بہت ساری احادیث اس پر شاہد ہیں کہ مومن کو دوسرے شخص کی طرف سے عمل صالح کا ثواب پہنچتا ہے، تفسیر مظہری میں اس جگہ ان احادیث کو جمع کردیا ہے، جن سے ایصال ثواب کا فائدہ دوسرے کو پہنچنا ثابت ہوتا ہے۔

آیت مذکورہ کی اس تفسیر پر کوئی فقہی اشکال اور شبہ عائد نہیں ہوتا، کیونکہ زیادہ سے زیادہ شبہ حج اور زکوٰۃ کے مسئلہ میں یہ ہوسکتا ہے کہ ضرورت کے وقت شرعاً ایک شخص دوسرے کی طرف سے حج بدل کرسکتا ہے یا دوسرے کی زکوٰۃ اس کی اجازت سے ادا کرسکتا ہے، مگر غور کیا جائے تو یہ اشکال اس لئے صحیح نہیں کہ کسی کو اپنی جگہ حج بدل کے لئے بھیج دینا اور اس کے مصارف خود ادا کرنا، یا کسی شخص کو اپنی طرف سے زکوٰۃ ادا کردینے کے لئے مامور کردینا بھی درحقیقت اس حکم دینے والے شخص کے اپنے عمل اور سعی کا جز ہے، اس لئے لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ کے منافی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آدمی جو کچھ کوشش کر کے کماتا ہے وہ ہی اس کا ہے، کسی دوسرے کی نیکیاں لے اڑے یہ نہیں ہوسکتا، باقی کوئی خود اپنی خوشی سے اپنے بعض حقوق دوسرے کو ادا کردے اور اللہ تعالیٰ اس کو منظور کرلے وہ الگ بات ہے، جس کی تفصیل حدیث وفقہ سے معلوم ہوسکتی ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہر ایک کی سعی وکوشش اس کے سامنے رکھ دی جائے گی اور اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ ﴿٤٢﴾ وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَىٰ ﴿٤٣﴾ وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتَ وَأَحْيَا ﴿٤٤﴾

اور یہ کہ تیرے رب تک سب کو پہنچنا ہے ۱؎ اور یہ کہ وہی ہے ہنساتا اور رلاتا، اور یہ کہ وہی ہے مارتا اور جلاتا

خلاصہ تفسیر: اور یہ (مضمون ہے) کہ (سب کو) آپ کے پروردگار ہی کے پاس پہنچنا ہے (پھر وہ شخص کیسے نڈر ہوگیا) اور یہ (مضمون ہے) کہ وہی ہنساتا اور رلاتا ہے، اور یہ (مضمون ہے) کہ وہی مارتا ہے اور جلاتا ہے۔

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ: بعض حضرات مفسرین نے اس جملہ کا یہ مطلب قرار دیا ہے کہ انسانی غور وفکر کا سلسلہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر پہنچ کر ختم ہوجاتا ہے، اس کی ذات وصفات کی حقیقت کسی غور وفکر سے نہ حاصل کی جاسکتی ہے اور نہ اس میں غور وفکر کی اجازت، جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور وفکر کرو، اس کی ذات میں غور وفکر نہ کرو، بلکہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کرو، وہ تمہارے بس کا نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تمام علوم وافکار اور سلسلہ وجود کی انتہاء اسی پر ہوتی ہے اور سب کو آخر کار اسی کے پاس پہنچنا ہے، وہیں سے ہر ایک کو نیکی بدی کا پھل ملے گا۔

وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ﴿٤٥﴾ مِن نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ﴿٤٦﴾ وَأَنَّ عَلَيْهِ النَّشْأَةَ الْأُخْرَىٰ ﴿٤٧﴾

اور یہ کہ اس نے بنایا جوڑا نر اور مادہ ۱؎ ایک بوند سے جب ٹپکائی جائے، اور یہ کہ اس کے ذمہ ہے دوسری دفعہ اٹھانا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور یہ (مضمون ہے) کہ وہی دونوں قسم یعنی نر اور مادہ کو نطفہ سے بناتا ہے جب (وہ رحم میں) ڈالا جاتا ہے (یعنی تمام تصرفات کا مالک خدا ہی ہے، دوسرا نہیں، پھر وہ شخص کیسے سمجھ گیا کہ قیامت کے روز مجھے عذاب سے بچانا کسی دوسرے کے قبضہ میں ہوجائے گا) اور یہ (مضمون ہے) کہ دوبارہ پیدا کرنا (حسب وعدہ) اس کے ذمہ ہے (یعنی ایسا ضروری ہونے والا ہے جیسے کسی کے ذمہ ہو تو اس شخص کے نڈر ہونے کی وجہ یہ بھی نہیں ہونی چاہئے کہ قیامت نہ آئے گی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس عالم میں تمام متضاد و متقابل احوال اسی نے پیدا کیے ہیں، خیر وشر کا خالق وہ ہی ہے جو خوشی یا غم کی کیفیات بھیجتا ہنساتا رلاتا، مارتا، جلاتا اور کسی کو نر کسی کو مادہ بنانا اسی کا کام ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی جس نے ایک قطرہ آب سے نر و مادہ پیدا کر دیے، دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے (یہ درمیان میں ایک پیدائش سے دوسری پیدائش پر متنبہ کر دیا)۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی ﴿۴۹﴾

اور یہ کہ اس نے دولت دی اور خزانہ ۱ اور یہ کہ وہی ہے رب شعریٰ کا ۲

خلاصہ تفسیر: اور یہ (مضمون ہے) کہ وہی غنی کرتا ہے (یعنی سرمایہ دیتا ہے) اور سرمایہ (دے کر محفوظ اور) باقی رکھتا ہے، اور یہ کہ وہی مالک ہے ستارہ شعریٰ کا بھی (جس کی عبادت جاہلیت میں بعض لوگ کرتے تھے)۔

یعنی ان تصرفات و اشیاء کا مالک بھی وہی ہے جیسے پہلے تصرفات کا مالک وہی ہے، اور پیچھے آیتوں میں مذکور تصرفات خود انسان کے اپنے وجود میں ہیں اور بعد کے تصرفات متعلقات انسان میں ہیں، چنانچہ مال اور ستارہ دونوں انسانی وجود سے خارج ہیں، اور شاید ان دو کے ذکر میں اس طرف اشارہ ہو کہ جن چیزوں کو تم اپنا معین و مددگار سمجھتے ہو جیسے مال اور ستارے جن کی پرستش لوگ کرتے ہیں ان کے مالک اور رب بھی ہم ہی ہیں، پھر قیامت میں کسی دوسرے کو کیا اختیار پہنچ سکتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ① مال، خزانہ، جائیدادیں سب اسی کی دی ہوئی ہیں ② اور بعض نے اَقْنٰی کے معنی "اَفْقَر" کیے ہیں، یعنی اسی نے کسی کو غنی اور کسی کو فقیر بنا دیا، یہ معنی پہلے سیاق کے مناسب معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ متقابل چیزوں کا ذکر چلا آ رہا ہے، اور اگر پہلا مطلب لیا جائے تو اس کے مقابل اہلاک کو رکھا جائے جس کا ذکر آگے آتا ہے، یعنی خزانے اور مال و دولت دے کر وہ ہی بڑھاتا ہے اور وہ ہی بڑی بڑی دولت مند اور طاقتور قوموں کو تباہ و برباد کرتا ہے۔

فائدہ: ۲ "شعریٰ" ایک بہت بڑا ستارہ ہے، جس کو بعض عرب پوجتے تھے اور سمجھتے تھے کہ عالم کے احوال میں اس کی بہت بڑی تاثیر ہے، یہاں بتلا دیا کہ "شعریٰ" کا رب بھی اللہ ہے، دنیا کی تمام الٹ پھیر اسی کے دست قدرت میں ہیں، "شعریٰ" غریب بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح اس کا حکم بجا لاتا ہے، اس میں مستقل تاثیر کچھ بھی نہیں۔

وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰی ﴿۵۰﴾ وَثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰی ﴿۵۱﴾

اور یہ کہ اس نے غارت کیا عاد پہلے کو ۱ اور ثمود کو پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا

وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰی ﴿۵۲﴾

اور نوح کی قوم کو پہلے ان سے وہ تو تھے اور بھی ظالم اور شریر ۲

خلاصہ تفسیر: اور یہ (مضمون ہے) کہ اس نے قدیم قوم عاد کو (اس کے کفر کی وجہ سے) ہلاک کیا، اور ثمود کو بھی کہ (ان میں سے) کسی کو باقی نہ چھوڑا، اور ان سے پہلے قوم نوح کو (ہلاک کیا) بیشک وہ سب سے بڑھ کر ظالم اور شریر تھے (کہ ساڑھے نو سو برس کی دعوت میں بھی راہ ہدایت پر نہ آئے)۔

وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادًا الْاُوْلٰى: قوم عاد دنیا کی قوی اور سخت ترین قوم ہے، ان کے دو طبقے یکے بعد دیگرے ''اولیٰ'' اور ''اخریٰ'' کے نام سے موسوم ہیں، یہاں ''اولیٰ'' کہنے کی ایک توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اولی بمعنی قدیم کے حقیقت واقعی ہو، پس اس کے مقابلہ میں عاد اخری کا ہونا ضروری نہ ہوگا، اس کی کچھ تفصیل سورہ اعراف آیت ۷۲: فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا میں گذری ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

وَثَمُوْدَاۡ فَمَآ اَبْقٰى: یعنی ثمود میں کسی کو باقی نہ چھوڑا، یہ یا تو عام ہے اور تمام قوم ثمود کو شامل ہے کہ سب کو ہلاک کر ڈالا، یا پھر خاص ہے بڑے کفار کے ساتھ کہ ان کے بڑے کفار میں سے کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی حضرت ہود علیہ السلام کی قوم۔

فائدہ: ۲؎ کہ سینکڑوں برس تک خدا کے پیغمبر نوح علیہ السلام کو سخت ترین ایذائیں پہنچاتے رہے، جن کو پڑھ کر کلیجہ پھٹتا ہے، اور آنے والوں کے لیے بری راہ ڈال گئے۔

وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾

اور الٹی بستی کو پٹک دیا، پھر آ پڑا اس پر جو کچھ کہ آ پڑا ۱؎ اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلائے گا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (قوم لوط علیہ السلام کی) الٹی ہوئی بستیوں کو بھی پھینک مارا تھا، پھر ان بستیوں کو گھیر لیا جس چیز نے کہ گھیر لیا (یعنی اوپر سے پتھر برسنا شروع ہوئے، پس یہ شخص اگر ان قصوں میں غور کرتا تو عذاب کفر سے ڈرتا اور بے فکر نہ ہوتا، پیچھے بیان کردہ سب مضامین پر اب آگے بطور نتیجہ فرماتے ہیں کہ اے انسان! جب ایسے ایسے مضامین سے تجھ کو آگاہ کیا جاتا ہے جن میں سے ہر مضمون ہدایت کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ایک مستقل نعمت ہے) تو تو اپنے رب کی کون کونسی نعمت میں شک (وانکار) کرتا رہے گا (اور ان مضامین کی تصدیق کر کے فائدہ نہ اٹھائے گا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پتھروں کا مینہ (یہ قوم لوط کی بستیوں کا ذکر ہے)۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ایسے مفسد ظالموں اور باغیوں کا تباہ کر ڈالنا بھی اللہ کا بڑا بھاری انعام ہے، کیا ایسی نعمتوں کو دیکھ کر بھی انسان اپنے رب کو جھٹلاتا ہی رہے گا۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾

یہ ایک ڈر سنانے والا ہے پہلے سنانے والوں میں کا ۱؎ آ پہنچی آنے والی، کوئی نہیں اس کو اللہ کے سوا کھول کر دکھانے والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید، رسالت اور جزا و سزا کی تفصیل تھی، اب آگے خاتمہ میں بھی یہی تینوں مضامین اجمالی طور پر ملے جلے انداز میں بیان فرمائے گئے ہیں۔

یہ (پیغمبر) بھی پہلے پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر ہیں (ان کو مان لو، کیونکہ) وہ جلدی آنے والی چیز قریب آ پہنچی ہے (مراد قیامت ہے اور جب وہ آئے گی تو) کوئی غیر اللہ اس کا ہٹانے والا نہیں (پس کسی کے بھروسہ پر بے فکری کی گنجائش ہی نہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی حضرت محمد ﷺ مجرموں کو اسی طرح برے انجام سے ڈرانے والے ہیں جیسے ان سے پیشتر دوسرے نبی ڈرا چکے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی قیامت قریب ہی آ لگی ہے جس کا ٹھیک وقت اللہ کے سوا کوئی کھول کر نہیں بتا سکتا اور جب وقت معین آ جائے تو کوئی طاقت اس کو دفع نہیں کر سکتی، اللہ ہی چاہے تو ہٹے، مگر وہ چاہے گا نہیں۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾

کیا تم کو اس بات سے تعجب ہوتا ہے، اور ہنستے ہو اور روتے نہیں، اور تم کھلاڑیاں کرتے ہو ۱؎

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾ السجدة ۱۳ ع

سو سجدہ کرو اللہ کے آگے اور بندگی ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو کیا (ایسی خوف کی باتیں سن کر بھی) تم لوگ اس کلام (الٰہی) سے تعجب کرتے ہو، اور (مذاق اڑاتے ہوئے) ہنستے ہو اور (عذاب کے خوف سے) روتے نہیں ہو، اور تم (اطاعت سے) تکبر کرتے ہو، سو (اس تکبر و غفلت سے باز آؤ، اور ان پیغمبر کی تعلیم مطابق) اللہ کی اطاعت کرو اور (اس کی بلاشرکت) عبادت کرو (تاکہ تم کو نجات ہو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی قیامت اور اس کے قرب کا ذکر سن کر چاہیے تھا خوف خدا سے رونے لگتے اور گھبرا کر اپنے بچاؤ کی تیاری کرتے، مگر تم اس کے برخلاف تعجب کرتے اور ہنستے ہو اور غافل و بےفکر ہو کر کھلاڑیاں کرتے ہو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی غافل کو زیبا نہیں کہ انجام سے غافل ہو کر نصیحت و فہمائش کی باتوں پر ہنسے اور مذاق اڑائے، بلکہ لازم ہے کہ بندگی کی راہ اختیار کرے اور مطیع و منقاد ہو کر جبین نیاز خداوند قہر کے سامنے جھکا دے۔

تنبیہ: روایات میں ہے سورۃ نجم پڑھ کر آپ ﷺ نے سجدہ کیا اور تمام مسلمان اور مشرک جو حاضر تھے سجدہ میں گر پڑے، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ لکھتے ہیں کہ: ''اس وقت سب کو ایک غاشیہ الٰہیہ نے گھیر لیا تھا، گویا ایک غیبی اور قہری تصرف سے طوعاً و کرہاً سب کو سربسجود ہونا پڑا، صرف ایک بدبخت جس کے دل پر سخت مہر تھی اس نے سجدہ نہ کیا، مگر زمین سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر اس نے بھی پیشانی کو لگالی اور کہا مجھے اسی قدر کافی ہے''۔

ایاتہا ۵۵ ۔ ۵۴ سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ ۳۷ ۔ رکوعاتہا ۳

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے اختتام پر آیت: اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ میں قیامت کے قریب ہونے کا مضمون تھا، اور اسی مضمون سے یہ سورت شروع ہوتی ہے، اس کے بعد شق قمر کے معجزہ کا ذکر ہے جس سے قرب قیامت کی تاکید ہوتی ہے، اس کے ساتھ جھٹلانے والوں کی حالت پر آپ ﷺ کی تسلی اور قیامت کے واقعات سے منکروں کو دھمکی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ﴿۱﴾

پاس آ لگی قیامت اور پھٹ گیا چاند

خلاصہ تفسیر: (ان کفار کے لئے ڈرانے والی یعنی غلطی پر متنبہ کرنے والی بات تو اعلیٰ درجہ کی ثابت ہے، چنانچہ) قیامت نزدیک آ پہنچی (جس کو جھٹلانے پر بڑی مصیبت آئے گی) اور (اس قرب قیامت کی خبر دینے کا مصداق بھی واقع ہوگیا، چنانچہ) چاند شق ہوگیا (جو کہ قیامت کے قریب ہونے کی تصدیق کرتا ہے)۔

اس سے قرب قیامت کی تصدیق اس طرح ہوتی ہے کہ شق قمر رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے جس سے آپ کی نبوت ثابت ہوتی ہے اور نبی کا

ہر قول سچا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ قیامت کے قریب آنے کی خبر جو آپ نے دی ہے وہ بھی سچی ہے، اس سے ڈرانے والی چیز کا پایا جانا یقینی ہو گیا۔

وَانْشَقَّ الْقَمَرُ: کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے آپ کی نبوت و رسالت کے لئے کوئی نشانی معجزہ کی طلب کی، حق تعالیٰ نے آپ کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ معجزہ شق قمر ظاہر فرمایا، اس معجزہ کا ثبوت قرآن کریم کی اس آیت میں بھی موجود ہے، اور احادیث صحیحہ جو صحابہ کرام کی ایک جماعت کی روایت سے آئی ہیں جن میں حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، جبیر بن مطعم، ابن عباس، انس بن مالک رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہ شامل ہیں، اور حضرت عبداللہ بن مسعود خود اپنا اس وقت میں موجود ہونا اور معجزہ کا مشاہدہ کرنا بھی بیان فرماتے ہیں، محدثین نے واقعہ شق قمر کی روایات کو متواتر قرار دیا ہے، اس لئے اس معجزہ نبوی کا وقوع دلائل سے ثابت ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ معجزہ شق قمر مکہ مکرمہ میں دو مرتبہ پیش آیا، مگر روایات صحیحہ سے ایک ہی مرتبہ کا ثبوت ملتا ہے، صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو کر ایک ٹکڑا پہاڑ پر تھا اور ایک اس سے ہٹا ہوا تھا، اور حضور ﷺ نے سب حاضرین سے یہ بھی فرمایا کہ گواہ ہو جاؤ، بیہقی کی روایت میں ہے کہ چاروں طرف کے آنے والے مسافروں سے پوچھا، انہوں نے بھی اپنا دیکھنا بیان کیا، بعض لوگوں نے بلا دلیل محض وہم کی وجہ سے محال اور بعید سمجھ کر اور تاریخ میں منقول نہ ہونے کی بنا پر اس واقعہ میں تاویل کی ہے کہ قیامت میں ایسا ہوگا، لیکن معجزہ تو ہمیشہ عادت سے بعید ہوتا ہے، اس سے امکان کی نفی تو نہیں ہوتی اور تواریخ میں منقول نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بعض جگہ تو اختلاف مطالع کی وجہ سے چاند غائب ہوگا اور یہ تھوڑی دیر کی بات تھی، کوئی شخص ہر وقت چاند کو تکا نہیں کرتا، اور اس وقت تاریخ کا اس قدر اہتمام بھی نہ تھا، رہا بعید ہونا یہ تو قیامت میں بھی مشترک ہے، پھر وہاں ماننا اور یہاں نہ ماننا زبردستی ہے، اور صیغہ ماضی سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شق قمر ہو چکا اور اگلی آیت بھی اس کی تائید کرتی ہے، کیونکہ اگر قیامت میں شق قمر ہوا تو اس وقت کوئی اس کو جادو نہ کہے گا، اس وقت سب کو قدرت الٰہی کا پورا یقین ہوگا۔

* * *

فائدہ: ہجرت سے پیشتر نبی کریم ﷺ ''منیٰ'' میں تشریف فرما تھے کفار کا مجمع تھا، انہوں نے آپ ﷺ سے کوئی نشانی طلب کی، آپ ﷺ نے فرمایا آسمان کی طرف دیکھو، ناگاہ چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا، ایک ٹکڑا ان میں سے مغرب کی طرف اور دوسرا مشرق کی طرف چلا گیا۔

وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝۲

اور اگر وہ دیکھیں کوئی نشانی تو ٹلا جائیں اور کہیں یہ جادو ہے پہلے سے چلا آتا

خلاصہ تفسیر: اور (اس شق قمر کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ) یہ لوگ (اس سے ڈرتے اور متاثر ہوتے، لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ) اگر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ٹال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے جو ابھی ختم ہوا جاتا ہے (یہ کنایہ ہے اسکے باطل ہونے سے، یعنی یہ باطل ہے اس کا اثر باقی نہ رہے گا، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ، مطلب یہ کہ قرب قیامت سے ڈرنا اور نصیحت حاصل کرنا تو نبوت محمدیہ کے اعتقاد پر موقوف ہے، یہ لوگ خود اس کی دلیل ہی کو غور و فکر کی نظر سے نہیں دیکھتے اور اس کو باطل سمجھتے ہیں تو پھر اس سے ان پر کیا اثر ہوتا اور کیا ڈرتے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اس طرح کے جادو مدعیان نبوت نے پہلے بھی کیے ہیں، پھر جس طرح وہ جاتے رہے یہ بھی جاتا رہے گا۔

وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳

اور جھٹلایا اور چلے اپنی خوشی پر اور ہر کام ٹھہرا رکھا ہے وقت پر

خلاصہ تفسیر: اور (اس اعراض اور معجزہ کو باطل کہنے میں خود) ان لوگوں نے (باطل پر مصر ہو کر حق کو) جھٹلایا اور اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی (یعنی ان کا اعراض کسی صحیح دلیل کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اس اعراض کا سبب نفسانی خواہش کا اتباع اور عناد و ہٹ دھرمی کی وجہ

سے حق کو جھٹلانا ہے) اور (یہ معجزات کو جادو کہتے ہیں جس کا اثر جلد ختم ہو جاتا ہے، سو قاعدہ ہے کہ) ہر بات کو (کچھ عرصہ بعد ہر بات کو اپنی اصلی حالت پر آ کر) قرار آ جاتا ہے (یعنی حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا، اسباب و آثار سے عام طور پر متعین ہو جاتا ہے)۔

مطلب یہ کہ اگرچہ حق اس وقت بھی متعین اور واضح ہے، مگر کم فہموں کی سمجھ میں اگر ابھی نہیں آتا تو چند دنوں کے بعد ان کو بھی معلوم ہو جائے گا بشرطیکہ وہ غور سے کام لیں کہ یہ ختم ہونے والا جادو ہے یا باقی رہنے والا سچا طریقہ ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی انکا عذاب بھی اپنے وقت پر آئے گا اور اللہ کے علم میں انکی گمراہی اور ہلاکت ٹھہر چکی ہے وہ کسی صورت سے ٹلنے والی نہیں۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝٤ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝٥

اور پہنچ چکے ہیں ان کے پاس احوال جن میں ڈانٹ ہو سکتی ہے ۱۔ پوری عقل کی بات ہے پھر ان میں کام نہیں کرتے ڈر سنانے والے

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝٦ وقف لازم

سو تو ہٹ آ ان کی طرف سے ۲۔ جس دن پکارے پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف ۳۔

خلاصہ تفسیر: اور (اس ڈرانے والی بات کے علاوہ) ان لوگوں کے پاس (تو گذشتہ قوموں کی بھی) خبریں اتنی پہنچ چکی ہیں کہ ان میں (کافی) عبرت یعنی اعلیٰ درجہ کی دانشمندی (حاصل ہو سکتی) ہے سو (ان کی یہ کیفیت ہے کہ) خوف دلانے والی چیزیں ان کو کچھ فائدہ ہی نہیں دیتیں (اور جب یہ حال ہے) تو آپ ان کی طرف سے کچھ خیال نہ کیجئے (اس میں آپ کی تسلی ہے کہ جب قیامت اور عذاب کا وہ وقت جس سے ان کو ڈرایا جاتا ہے آ جائے گا تو خود معلوم ہو جائے گا، آگے اس روز کا بیان ہے، یعنی) جس روز ایک بلانے والا فرشتہ (ان کو) ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی قرآن کے ذریعہ سے ہر قسم کے احوال اور تباہ شدہ قوموں کے واقعات معلوم کرائے جا چکے ہیں جن میں اگر غور کریں تو خداوند قہار کی طرف سے بڑی ڈانٹ ہے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی قرآن کریم پوری حکمت اور عقل کی باتوں کا مجموعہ ہے، کوئی ذرا نیک نیتی سے توجہ کرے تو دل میں اترتی چلی جائیں مگر افسوس اتنے سامان ہدایت کی موجودگی میں اس پر کچھ اثر نہیں، کوئی نصیحت و فہمائش وہاں کام نہیں دیتی، کتنا ہی سمجھاؤ پتھر پر جونک نہیں لگتی، لہذا ایسے سنگدل بدبختوں کو آپ ﷺ بھی منہ نہ لگایئے، آپ فرض تبلیغ و دعوت باحسن اسلوب ادا کر چکے، اب زیادہ تعاقب کرنے کی ضرورت نہیں، ان کو ان کے ٹھکانے کی طرف چلنے دیں۔

فائدہ: ۳۔ یعنی میدان حشر کی طرف حساب دینے کو۔

خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝٧

آنکھیں جھکائے ۱۔ نکل پڑے قبروں سے جیسے ٹڈی پھیلی ہوئی

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝٨

دوڑتے جائیں اس پکارنے والے کے پاس ۲۔ کہتے جائیں منکر یہ دن مشکل آیا ۳۔

خلاصہ تفسیر: ان کی آنکھیں (ذلت اور ہیبت کے مارے) جھکی ہوئی ہوں گی (اور) قبروں سے اس طرح نکل رہے ہوں گے

جیسے ٹڈی پھیل جاتی ہے (اور پھر نکل کر) بلانے والے کی طرف (یعنی موقف حساب کی طرف جہاں جمع ہونے کے لئے بلانے والے نے پکارا ہے) دوڑے چلے جارہے ہوں گے (اور وہاں کی سختیاں دیکھ کر) کافر کہتے ہوں گے کہ یہ دن بڑا سخت ہے۔

خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ: یہاں فرمایا کہ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، جبکہ ایک اور آیت میں آیا ہے کہ: **مقنعی رؤوسهم لا يرتد اليهم طرفهم** یعنی سر جھکاتے ہوئے جائیں گے، آنکھیں جھپکتی بھی نہ ہوں گی، بلکہ پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، سو ان دونوں میں مطابقت اس طرح ہے کہ وہاں مختلف حالتیں ہوں گی، کبھی حیرت کے آثار کا غلبہ ہوگا، کبھی ذلت اور ہیبت کے آثار کا غلبہ ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس وقت خوف و ہیبت کے مارے ذلت و ندامت کے ساتھ آنکھیں جھکائے ہوں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی تمام اگلے پچھلے قبروں سے نکل کر ٹڈی دَل کی طرح پھیل پڑیں گے، اور خداوند قدوس کی عدالت میں حاضری دینے کے لیے تیزی کے ساتھ دوڑتے ہوں گے۔

فائدہ: ۳ یعنی اس دن کے ہولناک احوال و شدائد اور اپنے جرائم کا تصور کر کے کہیں گے کہ یہ دن بڑا سخت آیا ہے دیکھئے آج کیا گزرے گی آگے بتلاتے ہیں کہ قیامت اور آخرت کا عذاب تو اپنے وقت پر آئے گا بہت سے مکذبین کیلئے اس سے پہلے دنیا ہی میں ایک سخت دن آچکا ہے۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ۝٩

جھٹلا چکی ہے ان سے پہلے نوح کی قوم پھر جھوٹا کہا ہمارے بندہ کو اور بولے دیوانہ ہے اور جھڑک لیا اس کو ۱

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝١٠

پھر پکارا اپنے رب کو کہ میں عاجز ہو گیا ہوں تو بدلہ لے ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے بیان ہوا ہے کہ لوگوں کے پاس عبرت آمیز خبریں آچکی ہیں، اب آگے بعض عبرت کی خبروں کا بیان ہے۔ ان لوگوں سے پہلے قوم نوح نے تکذیب کی یعنی ہمارے بندہ (خاص نوح علیہ السلام) کی تکذیب کی اور (ان کے بارے میں) کہا کہ یہ مجنون ہیں اور (محض اس بیہودہ بات ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان سے ایک بیہودہ فعل بھی سرزد ہوا یعنی) نوح (علیہ السلام) کو (ان کی طرف سے) دھمکی (بھی) دی گئی (جس کا ذکر سورۃ شعراء میں ہے: لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ) تو نوح (علیہ السلام) نے اپنے رب سے دعا کی کہ میں (محض) درماندہ ہوں (ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا) سو آپ (ان سے) انتقام لے لیجئے (یعنی ان کو ہلاک کر دیجئے، جیسا کہ ارشاد ہے: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا)۔

* * *

فائدہ: ۱ کہنے لگے اے نوح! اگر تم اپنی باتوں سے باز نہ آئے تو تم کو سنگسار کر دیا جائے گا، گویا دھمکیوں ہی میں اس کی بات رلا دی اور بعض نے **وازدجر** کے معنی یوں کیے ہیں کہ یہ دیوانہ ہے آسیب زدہ، جن اس کی عقل لے اڑے ہیں۔ (العیاذ باللہ)

فائدہ: ۲ یعنی سینکڑوں برس سمجھانے پر بھی جب کوئی نہ پسیجا تو بددعا کی، اور کہا اے پروردگار! میں ان سے عاجز آچکا ہوں، ہدایت و فہمائش کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، اب آپ اپنے دین اور پیغمبر کا بدلہ لیجئے اور زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ چھوڑیے۔

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝١١ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝١٢

پھر ہم نے کھول دیئے دہانے آسمان کے پانی ٹوٹ کر برسنے والے سے، اور بہا دیئے زمین سے چشمے پھر مل گیا سب پانی ایک کام پر جو ٹھہر چکا تھا ۱

خلاصہ تفسیر: پس ہم نے کثرت سے برسنے والے پانی سے آسمان کے دروازے کھول دیئے، اور زمین سے چشمے جاری کردیئے پھر (آسمان اور زمین کا) پانی اس کام کے (پورا ہونے کے) لئے مل گیا جو (علم الٰہی میں) تجویز ہو چکا تھا (مراد اس کام سے کفار کی ہلاکت ہے، یعنی دونوں پانی مل کر طوفان بڑھا، جس میں سب غرق ہو گئے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پانی اس قدر ٹوٹ کر برسا، گویا آسمان کے دہانے کھل گئے اور نیچے سے زمین کے پردے پھٹ پڑے، اتنا پانی ابلا گویا ساری زمین چشموں کا مجموعہ بن کر رہ گئی، پھر اوپر اور نیچے کا یہ سب پانی مل کر اس کام کے لیے اکٹھا ہو گیا، جو پہلے سے اللہ کے ہاں ٹھہر چکا، یعنی قوم نوح کی ہلاکت اور غرقابی۔

وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾

اور ہم نے اسکو سوار کردیا ایک تختوں اور کیلوں والی پر، بہتی تھی ہماری آنکھوں کے سامنے ۱؎ بدلہ لینے کو اسکی طرف سے جس کی قدر نہ جانی تھی ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (طوفان سے محفوظ رکھنے کے لئے) تختوں اور میخوں والی کشتی پر جو کہ ہماری نگرانی میں (پانی کی سطح پر) رواں تھی (مومنین کے ساتھ) سوار کیا، یہ سب کچھ اس شخص کا بدلہ لینے کے لئے کیا جس کی بے قدری کی گئی تھی (مراد نوح علیہ السلام ہیں)۔

جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ: چونکہ رسول اور اللہ تعالیٰ کے حقوق میں تلازم ہے، یعنی رسول کی بے قدری سے خدا کے ساتھ بھی کفر لازم آ گیا، پس یہ شبہ نہ رہا کہ یہ غرق کرنا کفر باللہ کے سبب نہ ہوا تھا۔

جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ: اس میں اس پر بھی دلالت ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو ایذاء و تکلیف نہیں پہنچانی چاہیے، کیونکہ اللہ اپنے مقبول بندوں کا انتقام خود لیا کرتے ہیں (اس لیے نیکوں کو اپنے کام میں مشغول رہنا چاہیے، مخالفوں کے ستانے اور پریشان کرنے پر توجہ نہیں دینی چاہیے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس ہولناک طوفان کے وقت نوح کی کشتی ہماری حفاظت اور نگرانی میں نہایت امن چین سے چلی جا رہی تھی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی بے قدری کی اور اللہ کی باتوں کا انکار کیا، یہ اس کی سزا ملی۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾

اور اس کو ہم نے رہنے دیا نشانی کے لیے، پھر کوئی ہے سوچنے والا ۱؎ پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے اس واقعہ کو عبرت کے واسطے (حکایات اور تذکروں میں) رہنے دیا سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے (مقصود اس سے نصیحت حاصل کرنے کی ترغیب ہے) پھر (دیکھو) میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا ہوا (یعنی جس چیز سے ڈرایا تھا وہ کیسا پورا ہو کر رہا، تو اس ڈرانے کا حاصل بھی عذاب ہی ہو گیا، غرض عذاب الٰہی کے دو عنوان ہو گئے، ایک خود عذاب اور دوسرا وعدہ الٰہی کا پورا ہونا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سوچنے والوں کے لیے اس واقعہ میں عبرت کی نشانیاں ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ آج کشتی کا وجود دنیا میں اس کشتی کے قصہ کو یاد دلانے والا اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا نشان ہے، اور بعض نے کہا کہ بعینہ وہ ہی کشتی نوح کے بعد مدت تک رہی ''جودی'' پہاڑ پر نظر آتی تھی، اس امت کے لوگوں نے بھی دیکھی، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دیکھ لیا، میرا عذاب کیسا ہولناک اور میرا ڈرانا کس قدر سچا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے قرآن کو (جو کہ ایسے واقعات پر مشتمل ہے) نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا (سب لوگوں کے لئے واضح بیان ہونے کی وجہ سے عموما، اور اہل عرب کے لیے عربی زبان ہونے کی وجہ سے خصوصا) سو کیا (اس قرآن میں نصیحت کے ایسے مضامین دیکھ کر) کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے (یعنی کفار مکہ کو بالخصوص ان قصوں سے ڈر جانا چاہئے)۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ: بعض لوگوں کو اس آیت پر سرسری نظر کرنے سے مجتہد بننے کی ہوس ہوئی، لیکن عبرت و نصیحت کے لیے آسان کر دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے احکام کا استنباط کرنا بھی آسان ہے، چنانچہ اس آیت میں يَسَّرْنَا کے ساتھ لِلذِّكْرِ کی قید لگا کر یہ بتلا دیا گیا ہے کہ قرآن کو حفظ کرنے اور اس کے مضامین سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی حد تک اس کو آسان کر دیا گیا ہے، جس سے ہر عالم و جاہل، چھوٹا اور بڑا یکساں فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم سے مسائل اور احکام کا استنباط بھی ایسا ہی آسان ہو، وہ اپنی جگہ ایک مستقل اور مشکل فن ہے جس میں عمریں صرف کرنے والے علماء راسخین کو ہی حصہ ملتا ہے ہر ایک کا وہ میدان نہیں، اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو قرآن کریم کے اس جملے کا سہارا لے کر قرآن کی مکمل تعلیم، اس کے اصول و قواعد سے حاصل کئے بغیر مجتہد بننا اور اپنی رائے سے احکام و مسائل کا استخراج کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کھلی گمراہی کا راستہ ہے، آیت کا واضح مطلب یہ ہے کہ ترغیب و ترہیب کے متعلق جو مضامین قرآن میں ہیں وہ نہایت واضح ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی قرآن سے نصیحت حاصل کرنا بالکل آسان ہے کیونکہ جو مضامین ترغیب و ترہیب اور انذاز و تبشیر سے متعلق ہیں وہ بالکل صاف، سہل اور موثر ہیں، پر کوئی سوچنے سمجھنے کا ارادہ کرے تو سمجھے۔

تنبیہ: آیت کا یہ مطلب نہیں قرآن محض ایک سطحی کتاب ہے جس کے اندر کوئی دقائق و غوامض نہیں، اس علیم و خبیر کے کلام کی نسبت ایسا گمان کیونکر کیا جا سکتا ہے، کیا یہ فرض کر لیا جائے کہ جب اللہ بندوں سے کلام کرتا ہے تو معاذ اللہ اپنے غیر متناہی علوم سے کورا ہو جاتا ہے؟ یقینا اس کے کلام میں وہ گہرے حقائق اور باریکیاں ہوں گی جن کا کسی دوسرے کلام میں تلاش کرنا بیکار ہے، اسی لیے حدیث میں آیا ہے: "لا تنقضی عَجَآئِبه" (قرآن کے عجائب و اسرار کبھی ختم ہونے والے نہیں) علمائے امت اور حکمائے ملت نے اس کتاب کے دقائق و اسرار کا پتہ لگانے اور ہزار ہا احکام مستنبط کرنے میں عمریں صرف کر دیں، تب بھی اس کی آخری تہ تک نہیں پہنچ سکے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾

جھٹلایا عاد نے پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾

ہم نے بھیجی ان پر ہوا تند ایک نحوست کے دن جو چلے گئی لے

خلاصہ تفسیر: عاد نے (بھی اپنے پیغمبر کی) تکذیب کی سو (اس کا قصہ سنو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا (اور وہ قصہ یہ ہے کہ) ہم نے ان پر ایک سخت ہوا بھیجی ایک مسلسل نحوست کے دن میں (یعنی یہ زمانہ ان کے حق میں ہمیشہ کے لئے اس لئے منحوس رہا کہ اس روز جو عذاب آیا وہ عذاب برزخ سے متصل ہو گیا، پھر عذاب آخرت اس سے متصل ہو گیا، پھر ان سے یہ عذاب کبھی منقطع نہ ہوگا)۔

فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ: یہاں ''یوم'' سے مطلق زمانہ مراد ہے، پس دوسری جگہ جو ایّام یعنی چند دن مذکور ہوئے ہیں اس سے تعارض نہیں، اور نحوست کی تحقیق سورہ صافات آیت ۸۸: فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ کے تحت گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: لے حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی نحوست نہ اٹھی جب تک تمام نہ ہو چکے، اور یہ نحوست کا دن ان ہی کے حق میں تھا، یہ نہیں کہ ہمیشہ کو وہ دن منحوس سمجھ لیے جائیں''، جیسا کہ جاہلوں میں مشہور ہے اور اگر وہ دن عذاب آنے کی وجہ سے ہمیشہ کیلئے منحوس بن گیا ہے، تو مبارک دن کون سا رہے گا، قرآن کریم میں تصریح ہے کہ وہ عذاب سات رات اور آٹھ دن برابر رہا، بتلایئے اب ہفتہ کے دنوں میں کون سا دن نحوست سے خالی رہے گا۔

تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۝۲۰

اکھاڑ مارا لوگوں کو گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی اکھڑی پڑی لے

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝۲۱ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝۲۲ ع

پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا، اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ ہوا لوگوں کو اس طرح (ان کی جگہ سے) اکھاڑ اکھاڑ کر پھینکتی تھی کہ گویا وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں (اس تشبیہ میں ان کے پھینکے جانے کے علاوہ ان کے لمبے قد اور بڑے جثہ کی طرف بھی اشارہ ہے) سو (دیکھو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا (ہولناک) ہوا، اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ - وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ: یہ دونوں آیتیں آگے بھی کئی واقعات میں آئی ہیں، اس سے تنبیہ ہے کہ ہر واقعہ مستقل غور و فکر اور عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے قابل ہے، البتہ یہاں قوم عاد کے قصہ میں: فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ دو مرتبہ ارشاد فرمایا، سو پہلے سے قصہ کی تمہید اور سامعین کو متوجہ کرنا مقصود ہے، اور دوسرے سے عذاب سے ڈرانا مقصود ہے جیسا کہ خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہے، پس تکرار نہ رہا۔

* * *

فائدہ: لے ''قوم عاد'' کے لوگ بڑے تنومند اور قد آور تھے، لیکن ہوا کا جھکڑ ان کو اٹھا کر اس طرح زمین پر پٹکتا تھا جیسے کھجور کا تنہ جڑ سے اکھاڑ کر زمین پر پھینک دیا جائے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝۲۳ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝۲۴

جھٹلایا ثمود نے ڈر سنانے والوں کو لے پھر کہنے لگے کیا ایک آدمی ہم میں کا اکیلا ہم اس کے کہے پر چلیں گے تو ہم غلطی میں پڑے اور سودا میں ۲

خلاصہ تفسیر: ثمود نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی (کیونکہ ایک پیغمبر کو جھٹلانے سے سب پیغمبروں کو جھٹلانا لازم آتا ہے) اور کہنے لگے کیا ہم ایسے شخص کا اتباع کریں گے جو ہماری جنس کا آدمی ہے اور (خدام و حشم سے) اکیلا ہے (یعنی یا تو فرشتہ ہوتا تو ہم دین میں اتباع کرتے یا خدام و حشم والا ہوتا تو دنیوی امور میں اس کو بڑا بناتے، لیکن جبکہ وہ بشر ہے اور وہ بھی اکیلا، تو نہ دنیوی امور میں بڑا بننے کے قابل ہے، نہ دینی امور میں اتباع کے قابل ہے) تو اس صورت میں ہم بڑی غلطی اور (بلکہ) جنون میں پڑ جائیں۔

* * *

فائدہ: لے یعنی حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا اور ایک نبی کا جھٹلانا سب کا جھٹلانا ہے، کیونکہ اصول دین میں سب ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی کوئی آسمان کا فرشتہ نہیں، بلکہ ہم ہی جیسا ایک آدمی اور وہ بھی اکیلا جس کے ساتھ کوئی قوت اور جتھا نہیں، چاہتا ہے کہ ہمیں دبالے اور سب کو اپنا تابع بنالے، یہ کبھی نہ ہوگا، اگر ہم اس پھندے میں پھنس جائیں تو ہماری بڑی غلطی اور حماقت بلکہ جنون ہوگا، وہ تو ہم کو ڈراتا ہے کہ مجھے نہ مانو گے تو آگ میں گرو گے، اور واقعہ یہ ہے کہ ہم اس کے تابع ہو جائیں تو گویا خود اپنے کو آگ میں گرا رہے ہیں۔

ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿۲۶﴾

کیا اتری اسی پر نصیحت ہم سب میں سے کوئی نہیں یہ جھوٹا ہے بڑائی مارتا ہے ۱ اب جان لیں گے کل کو کون ہے جھوٹا بڑائی مارنے والا ۲

خلاصہ تفسیر: کیا ہم سب میں سے (منتخب ہو کر) اسی (شخص) پر وحی نازل ہوئی ہے (ہرگز ایسا نہیں) بلکہ یہ بڑا جھوٹا اور شیخی باز ہے (شیخی یعنی تکبر کے مارے ایسی بڑائی کیبا تیں کرتا ہے تاکہ لوگ مجھ کو سردار بنالیں، حق تعالیٰ نے صالح علیہ السلام سے فرمایا کہ تم ان کے بکنے پر رنج مت کرو) ان کو عنقریب (مرتے ہی) معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا شیخی باز کون تھا (یعنی یہی لوگ شیخی باز تھے کہ نبوت کے انکار میں جھوٹے تھے اور شیخی کی وجہ سے نبی کی اتباع سے عار کرتے تھے)۔

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ: جب کسی کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے اور وہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو تو جواب میں مناظرے اور جھگڑے کے بجائے ایسے ہی طرز اور عنوان سے جواب دینا چاہیے جو اس آیت میں بیان کیا گیا (عنقریب معلوم ہو جائے گا) چنانچہ اللہ والے مخالفین اور معاندین کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی پیغمبری کے لیے بس یہی رہ گیا تھا؟ سب جھوٹ ہے، خواہ مخواہ بڑائی مارتا ہے کہ خدا نے مجھے اپنا رسول بنادیا، اور ساری قوم کو میری اطاعت کا حکم دیا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی بہت جلد معلوم ہوا چاہتا ہے کہ دونوں فریق میں جھوٹا اور بڑائی مارنے والا کون ہے۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾

ہم بھیجتے ہیں اونٹنی ان کے جانچنے کے واسطے ۱ سو انتظار کر ان کا اور سہتا رہ ۲

خلاصہ تفسیر: (اور یہ لوگ جو اونٹنی کا معجزہ طلب کرتے تھے تو) ہم (ان کی درخواست کے مطابق پتھر میں سے) اونٹنی کو نکالنے والے ہیں، ان کی آزمائش (ایمان) کے لئے سو ان (کی حرکتوں) کو دیکھتے بھالتے رہنا اور صبر سے بیٹھے رہنا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ان کی فرمائش کے موافق ہم پتھر سے اونٹنی نکال کر بھیجتے ہیں، اس کے ذریعہ سے جانچا جائے گا کہ کون اللہ و رسول کی بات مانتا ہے اور کون نفس کی خواہش پر چلتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی دیکھتا رہ، کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾

اور سنا دے ان کو کہ پانی کا بانٹا ہے ان میں ہر باری پر پہنچنا چاہیے ۱ پھر پکارا انہوں نے اپنے رفیق کو پھر ہاتھ چلایا اور کاٹ ڈالا ۲

خلاصہ تفسیر: اور ان لوگوں کو (جب اونٹنی پیدا ہو تو) یہ بتلا دینا کہ (کنویں کا) پانی بانٹ دیا گیا ہے (یعنی تمہارے مویشی جانور اور اونٹنی کی باری مقرر ہوگئی ہے) ہر ایک باری پر باری والا حاضر ہوا کرے (یعنی اونٹنی اپنی باری میں پانی پیے اور مویشی جانور اپنی باری میں،

چنانچہ اونٹنی پیدا ہوئی اور صالح علیہ السلام نے اسی طرح فرمادیا) سو (اس باری سے وہ لوگ تنگ آ گئے اور) انہوں نے (اونٹنی کو قتل کرنے کی غرض سے) اپنے رفیق (قدار) کو بلایا سو اس نے (اونٹنی پر) وار کیا اور (اس کو) مار ڈالا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''وہ اونٹنی جس پانی پر جاتی سب جانور بھاگتے، تو اللہ نے باری ٹھہرادی، ایک دن وہ جائے، اور ایک دن سب جانور''۔

فائدہ: ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ایک بدکار عورت تھی اس کے مویشی بہت تھے اپنے ایک آشنا کو اکسادیا، اس نے اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں''۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٠﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿٣١﴾

پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا، ہم نے بھیجی ان پر ایک چنگھاڑ پھر رہ گئے جیسے روندی ہوئی باڑ کانٹوں کی ۱؎

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٣٢﴾

اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا

خلاصہ تفسیر: سو (دیکھو) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا (جس کا بیان آگے آتا ہے وہ یہ کہ) ہم نے ان پر ایک ہی نعرہ (فرشتہ کا) مسلط کیا سو وہ (اس سے) ایسے ہو گئے جیسے کانٹوں کی باڑ لگانے والے (کی باڑ) کا چورا (یعنی کھیت یا مویشی وغیرہ کی حفاظت کیلئے جیسے کانٹوں وغیرہ کی باڑ لگا دیتے ہیں اور چند روز بعد سب چورا چورا ہو جاتا ہے اسی طرح وہ ہلاک و تباہ ہو گئے، عرب کے لوگ اس مشبہ بہ کو یعنی کھیت کے گرد کی باڑ کو رات دن دیکھتے تھے تو وہ اس تشبیہ کو خوب سمجھتے تھے) اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ فرشتے نے ایک چیخ ماری، کلیجے پھٹ گئے اور سب چورا ہو کر رہ گئے، جیسے کھیت کے گرد کانٹوں کی باڑ لگا دیتے ہیں اور چند روز کے بعد پائمال ہو کر اس کا چورا ہو جاتا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ ۖ نَّجَّيْنَاهُم بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾

جھٹلایا لوط کی قوم نے ڈر سنانے والوں کو ۱؎ نے بھیجی ان پر آندھی پتھر برسانے والی سوائے لوط کے گھر کے، انکو ہم نے بچا دیا پچھلی رات سے

نِّعْمَةً مِّنْ عِندِنَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ ﴿٣٥﴾

فضل سے اپنی طرف کے، ہم یوں بدلہ دیتے ہیں اس کو جو حق مانے ۲؎

خلاصہ تفسیر: قوم لوط نے (بھی) پیغمبروں کی تکذیب کی (کیونکہ ایک پیغمبر کو جھٹلانے سے سب پیغمبروں کو جھٹلانا لازم آتا ہے) ہم نے ان پر پتھروں کا مینہ برسایا بجز متعلقین لوط (علیہ السلام) کے (یعنی بجز ایمان والوں کے) کہ ان کو اخیر شب میں (بستی سے باہر کر کے عذاب سے) بچا لیا اپنی جانب سے فضل کر کے، جو شکر کرتا ہے (یعنی ایمان لاتا ہے) ہم اس کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (کہ قہر سے بچا لیتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی حضرت لوط علیہ السلام کو جھٹلایا اور ایک نبی کی تکذیب سب انبیاء کی تکذیب ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی وہ پچھلی رات میں اپنے گھر والوں کو لے کر صاف نکل گئے، ان کو ہم نے عذاب کی ذرا بھی آنچ نہ لگنے دی، اور یہ ہی ہماری عادت ہے، حق شناس اور شکر گزار بندوں کو ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ

اور وہ ڈرا چکا تھا ان کو ہماری پکڑ سے پھر لگے مکرانے ڈرانے کو ۱ اور اس سے لینے لگے اس کے مہمانوں کو پس ہم نے مٹا دیں ان کی آنکھیں

فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۳۹﴾

اب چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا ۲ اور پڑا اُن پر صبح کو سویرے عذاب جو ٹھہر چکا تھا، اب چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا ۳

ع ۹/۸ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾

اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو پھر ہے کوئی سوچنے والا

خلاصہ تفسیر: اور عذاب آنے سے پہلے) لوط (علیہ السلام) نے ان کو ہماری دارو گیر سے ڈرایا تھا سو انہوں نے اس ڈرانے میں جھگڑے پیدا کئے (یعنی یقین نہ لائے) اور (جب لوط علیہ السلام کے پاس ہمارے فرشتے مہمان کی شکل میں آئے اور ان لوگوں کو حسین لڑکوں کا آنا معلوم ہوا تو یہاں آ کر) ان لوگوں نے لوط (علیہ السلام) سے ان کے مہمانوں کو بری نیت سے لینا چاہا (جس سے لوط علیہ السلام پہلے گھبرائے مگر وہ فرشتے تھے) سو ہم نے (ان فرشتوں کو حکم دے کر) ان کی آنکھیں چوپٹ کر دیں (یعنی جبرائیل علیہ السلام نے اپنے پر ان کی آنکھوں پر پھیر دیئے جس سے اندھے بھٹ ہو گئے، اور بزبان قال یا حال ان سے کہا گیا کہ) لو میرے عذاب اور ڈرانے کا مزہ چکھو (پہلے تو یہ واقعہ اندھا کرنے کا پیش آیا) اور (پھر) صبح سویرے ہی ان پر دائمی عذاب آ پہنچا (اور ارشاد ہوا) کہ لو میرے ڈرانے اور عذاب کا مزہ چکھو (یہی جملہ پہلے اندھے ہونے کے عذاب پر کہا گیا تھا اور یہاں ہلاکت کے عذاب پر ہے، اس لئے کوئی تکرار نہیں) اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس کی باتوں میں واہی تباہی شبہ اور جھگڑے کھڑے کر کے جھٹلانے لگے۔

فائدہ: ۲ یعنی فرشتے جو حسین لڑکوں کی شکل میں آئے تھے، ان کو آدمی سمجھ کر اپنی خوئے بد کی وجہ سے قبضانا چاہا، ہم نے ان کو اندھا کر دیا کہ ادھر ادھر دھکے کھاتے پھرتے تھے، کچھ نظر نہ آتا تھا، اور کہا لو! پہلے اس عذاب کا مزہ چکھو۔

فائدہ: ۳ یعنی اندھا کرنے کے بعد ان کی بستیاں الٹ دی گئیں اور اوپر سے پتھر برسائے گئے، اس چھوٹے عذاب کے بعد یہ بڑا عذاب تھا۔

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

اور پہنچے فرعون والوں کے پاس ڈرانے والے ۱ جھٹلایا انہوں نے ہماری نشانیوں کو سب کو پھر پکڑا ہم نے انکو پکڑنا زبردست کا قابو میں لیکر ۲

خلاصہ تفسیر: اور (فرعون اور) فرعون والوں کے پاس بھی ڈرانے کی بہت سی چیزیں پہنچیں (مراد موسیٰ علیہ السلام کے ارشادات اور معجزات ہیں کہ ارشادات سے تشریعی طور پر اور معجزات سے تکوینی طور پر ان کو ڈرایا گیا مگر) ان لوگوں نے ہماری تمام (ان) نشانیوں کو (جو ان کے پاس آئی تھیں وہ ''آیات تسعہ'' نو معجزے مشہور ہیں) جھٹلایا (یعنی ان سے جو مقصود تھا موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور توحید کو ثابت کرنا اس کو جھٹلایا،

ورنہ واقعات کے پائے جانے کی تکذیب تو ہو نہیں سکتی) سو ہم نے ان کو زبردست صاحب قدرت کا پکڑنا پکڑا (عزیز مقتدر سے مراد اللہ تعالیٰ ہے، یعنی جب ہم نے ان کو قہر اور غلبہ سے پکڑا تو اس پکڑ کو کوئی دفع نہیں کر سکا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت موسیٰ اور ہارون اور ان کے ڈرانے والے نشان۔

فائدہ: ۲؎ یعنی خدا کی پکڑ بڑے زبردست کی پکڑ تھی، جس کے قابو میں نکل کر کوئی بھاگ نہیں سکتا، دیکھ لو! تمام فرعونیوں کا بیڑہ کس طرح بحر قلزم میں غرق کیا کہ ایک بچ کر نہ نکل سکا۔

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾

اب تم میں جو منکر ہیں کیا یہ بہتر ہیں ان سب سے یا تمہارے لیے فارغ خطی لکھ دی گئی ورقوں میں، کہتے ہیں ہم سب کا مجمع ہے بدلہ لینے والا ۱؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے عذاب سے ہلاک ہونے والوں کے واقعات مذکور تھے، اب آگے کفار مکہ کا مستحق عذاب ہونا بتلاتے ہیں، کیونکہ کفر جو عذاب کی علت ہے ان میں بھی موجود تھا اور اخیر میں مقابلہ کے طور پر متقین کو بشارت بھی دی گئی ہے، حاصل یہ کہ کفر کی وجہ سے گذشتہ کفار پر عذاب آنے کے یہ واقعات تو تم نے سن لیے، اب جبکہ تم بھی اسی کفر کے جرم میں مبتلا ہو تو تمہارے عذاب سے بچنے کی کوئی وجہ نہیں:

کیا تم میں جو کافر ہیں ان میں ان (مذکورہ پچھلے) لوگوں سے کچھ فضیلت ہے (جس کی وجہ سے تم کفر کا جرم کرنے کے باوجود سزا نہ پاؤ) یا تمہارے لئے (آسمانی) کتابوں میں کوئی معافی (نامہ لکھ دیا) ہے (اگرچہ کوئی فضیلت نہ ہو) یا (ان میں کوئی ایسی قوت ہے جو ان کو عذاب سے بچالے جیسا) یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری ایسی جماعت ہے جو غالب ہی رہیں گے (اور جب کہ ان کے مغلوب ہونے کے دلائل واضح موجود ہیں اور ان کو خود بھی اپنی مغلوبیت کا یقین ہے تو پھر ان کی اس بات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عذاب کو روکنے کی کوئی قوت ہے)۔

ان کے عذاب سے بچنے کے مذکورہ تین احتمال ہیں، اب بتاؤ کہ ان میں سے کون سی صورت واقع میں ہے، پہلے دو احتمال کا باطل ہونا تو بالکل ظاہر ہے، رہا تیسرا احتمال سو عادی اسباب کے اعتبار سے اگرچہ یہ فی نفسہ ممکن ہے مگر دلائل سے ثابت ہے کہ وہ یقیناً مغلوب ہوں گے، چنانچہ اس وقت ان کا جھوٹا ہونا ظاہر ہو جائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ گذشتہ اقوام کے واقعات سنا کر موجودہ لوگوں کو خطاب ہے یعنی تم میں سے کافر کیا ان پہلے کافروں سے کچھ اچھے ہیں جو کفر و طغیان کی سزا میں تباہ نہیں کیے جائیں گے؟ یا اللہ کے ہاں سے کوئی پروانہ لکھ دیا گیا ہے کہ تم جو چاہو شرارت کرتے رہو، سزا نہیں ملے گی؟ یا یہ سمجھتے ہوئے ہیں کہ ہمارا مجمع اور جتھا بہت بڑا ہے، اور سب مل کر جب ایک دوسرے کی مدد پر آجائیں گے تو سب بدلہ لے کر چھوڑیں گے اور کسی کو اپنے مقابلہ میں کامیاب نہ ہونے دیں گے۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾

اب شکست کھائے گا یہ مجمع اور بھاگیں پیٹھ پھیر کر ۱؎ بلکہ قیامت ہے ان کے وعدہ کا وقت اور وہ گھڑی بڑی آفت ہے اور بہت کڑوی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (ان کا اپنے دعوی میں جھوٹا ہونا اس طرح ظاہر ہوگا کہ) عنقریب (ان کی) یہ جماعت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے (یہ پیشین گوئی غزوہ بدر و احزاب وغیرہ میں واقع ہوئی اور یہی نہیں کہ اس دنیوی عذاب پر بس ہو کر رہ جائے گا) بلکہ (بڑا عذاب) قیامت (میں ہوگا کہ) ان کا (اصل) وعدہ (وہی) ہے اور قیامت (کو کوئی ہلکی چیز نہ سمجھو، بلکہ وہ) بڑی سخت اور ناگوار چیز ہے (اور یہ سخت اور ناگوار قیامت کا وعدہ ضرور واقع ہونے والا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی عنقریب ان کو اپنے مجمع کی حقیقت کھل جائے گی جب مسلمانوں کے سامنے سے شکست کھا کر اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، چنانچہ بدر اور احزاب میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اس وقت نبی کریم ﷺ کی زبان پر یہ آیت جاری تھی: سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ

فائدہ: ۲؎ یعنی یہاں کیا شکست کھائیں گے، ان کی شکست کا اصلی وقت تو وہ ہوگا جب قیامت سر پر آ کھڑی ہوگی، وہ بہت سخت مصیبت کا وقت ہوگا۔

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَٰلٍ وَسُعُرٍ ﴿٤٧﴾ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ﴿٤٨﴾

جو لوگ گناہ گار ہیں غلطی میں پڑے ہیں اور سودا میں ۔جس دن گھسیٹے جائیں گے آگ میں اوندھے منہ چکھو مزا آگ کا ۱؎

خلاصہ تفسیر: (اور اس قیامت کے انکار میں) یہ مجرمین (یعنی کفار) بڑی غلطی اور بے عقلی میں (پڑے) ہیں (اور وہ غلطی عنقریب ان کو کھلی آنکھوں ظاہر ہو جائے گی، اور وہ اس طرح ہوگا کہ) جس روز یہ لوگ اپنے مونہوں (چہروں) کے بل جہنم میں گھسیٹے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ (کی آگ) کے لگنے کا مزہ چکھو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس وقت غفلت کے نشہ میں پاگل بن رہے ہیں، یہ سودا دماغ میں سے اس وقت نکلے گا جب اوندھے منہ دوزخ کی آگ میں گھسیٹے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ لو! اب ذرا اس کا مزہ چکھو۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَٰهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾ وَمَآ أَمْرُنَآ إِلَّا وَٰحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿٥٠﴾

ہم نے ہر چیز بنائی پہلے ٹھہرا کر ۱؎ اور ہمارا کام تو یہی ایک دم کی بات ہے جیسے لپک نگاہ کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور اگر ان کو اس سے شبہ پیدا ہو کہ قیامت ابھی کیوں نہیں آجاتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ:

ہم نے ہر چیز کو (وقت اور زمانہ وغیرہ کے اعتبار سے ایک خاص) انداز سے پیدا کیا ہے (جو ہمارے علم میں ہے، یعنی ہر چیز کا وقت وغیرہ اپنے علم میں مقرر کیا ہے، اسی طرح قیامت کے آنے کا بھی ایک وقت معین ہے، پس ابھی قیامت کا نہ آنا اس وجہ سے ہے کہ ابھی وقت نہیں آیا، یہ دھوکہ نہیں کھانا چاہیے کہ قیامت کبھی نہ آئے گی) اور (جب قیامت کا وقت آجائے گا تو اس وقت) ہمارا حکم (اس وقوع کے متعلق) بس ایسا یک بارگی ہو جائے گا جیسے آنکھ کا جھپکانا (غرض قیامت کا انکار تو باطل ٹھہرا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہر چیز جو پیش آنے والی ہے اللہ کے علم میں پہلے سے ٹھہر چکی ہے دنیا کی عمر اور قیامت کا وقت بھی اس کے علم میں ٹھہرا ہوا ہے اس سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہم چشم زدن میں جو چاہیں کر ڈالیں کسی چیز کے بنانے یا بگاڑنے میں ہم کو دیر نہیں لگتی نہ کچھ مشقت ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَآ أَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٥١﴾

اور ہم برباد کر چکے ہیں تمہارے ساتھ والوں کو پھر ہے کوئی سوچنے والا

خلاصہ تفسیر: اور (اگر تم کو یہ شبہ ہو کہ ہمارا طریقہ خدا کے نزدیک ناپسند اور مبغوض نہیں ہے تو اگر قیامت آئی بھی تب بھی ہم کو نقصان نہیں تو اس بارے میں سن رکھو کہ) ہم تمہارے ہم طریقہ لوگوں کو (اپنے عذاب سے) ہلاک کر چکے ہیں (جو اللہ کے ہاں اس طریقہ کے ناپسند ہونے کی دلیل ہے، اور وہی طریقہ تمہارا بھی ہے، پس لامحالہ خدا کو تمہارا طریقہ ناپسند ہے اور یہ دلیل نہایت واضح ہے) سو کیا (اس دلیل سے) کوئی

نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی تمہاری قماش کے بہت سے کافروں کو پہلے تباہ کر چکے ہیں، پھر تم میں کوئی اتنا سوچنے والا نہیں کہ ان کے حال سے عبرت حاصل کر سکے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾

اور جو چیز انہوں نے کی ہے لکھی گئی ورقوں میں ۱؎ اور ہر چھوٹا اور بڑا لکھا جا چکا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ان کے اعمال خدا کے علم سے غائب رہ جائیں تا کہ کفر کے مبغوض اور ناپسند ہونے کے باوجود پھر بھی سزا سے بچنے کا احتمال ہو، بلکہ) جو کچھ بھی یہ لوگ کرتے ہیں سب (حق تعالیٰ کو معلوم ہے اور حجت پوری کرنے کے لیے) اعمال ناموں میں (بھی درج) ہے، اور (یہ نہیں کہ ان میں کچھ لکھ لیا گیا ہو، کچھ رہ گیا ہو، بلکہ) ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے (پس ان پر عذاب کے واقع ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہر ایک نیکی بدی عمل کے بعد ان کے اعمالناموں میں لکھی گئی ہے، وقت پر ساری مسل سامنے کر دی جائے گی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس سے قبل ہر چھوٹی بڑی چیز کی تفصیل لوح محفوظ میں لکھی جا چکی، تمام دفاتر باقاعدہ مرتب ہیں کوئی چھوٹی موٹی چیز بھی ادھر ادھر نہیں ہوسکتی۔

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾ ع ۱۵

جو لوگ ڈرنے والے ہیں باغوں میں ہیں اور نہروں میں بیٹھے، سچی بیٹھک میں نزدیک بادشاہ کے جس کا سب پر قبضہ ہے ۱؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے تو کفار کا حال بیان ہوا، اور جو) پرہیزگار لوگ (ہیں وہ بہشت کے) باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے، ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس (یعنی جنت کے ساتھ ان کو حق تعالیٰ کا قرب بھی ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ مجرمین کے بعد یہ متقین کا انجام بیان فرما دیا کہ وہ اپنی سچائی کی بدولت اللہ و رسول کے سچے وعدوں کے موافق ایک پسندیدہ مقام میں ہوں گے جہاں اس شہنشاہ مطلق کا قرب حاصل ہوگا: اَللّٰھُمَّ اِنَّكَ مَلِيْكٌ مُقْتَدِرٌ ، مَاتَشَآءُ مِنْ اَمْرٍ يَكُوْنُ فَاسْعِدْنِيْ فِي الدَّارَيْنِ وَكُنْ لِّيْ وَلَا تَكُنْ عَلَيَّ وَاٰتِنِيْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنِيْ عَذَابَ النَّارِ .

رکوعاتها ۳ | ۵۵ سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِيَّةٌ ۹۷ | اٰیاتها ۷۸

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں زیادہ مضمون عذاب کا تھا اور اول و آخر میں نعمتوں کا بھی کچھ مضمون تھا، اب اس سورت میں زیادہ مضمون نعمتوں کا ہے، کچھ دنیوی اور کچھ اخروی، اور درمیان میں کچھ مضمون عذاب کا بھی ہے، اگرچہ اس حیثیت سے کہ وہ ہدایت کا سبب ہو جاتا ہے وہ بھی نعمتوں میں داخل ہے، اسی وجہ سے نعمتوں کی طرح اس کے بعد بھی: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ فرمایا ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: واضح رہے کہ یہ آیت اس پوری سورت میں اکتیس ۳۱ جگہ آئی ہے، چونکہ ہر جگہ جدا جدا نعمتیں مراد ہیں اس لیے معنوی تکرار نہیں ہے، صرف لفظی تکرار معلوم ہوتا ہے، اور کسی لفظ یا جملہ کا ظاہری تکرار بھی تاکید کا فائدہ دیتا ہے، اس لئے وہ بھی فصاحت و بلاغت کے

خلاف نہیں، خصوصاً قرآن کریم کی ان دونوں سورتوں میں جس جملے کا تکرار ہوا ہے وہ توصورت کے اعتبار سے تکرار ہے، حقیقت کے اعتبار سے ہر ایک جملہ ایک نئے مضمون سے متعلق ہونے کی وجہ سے مکرر محض نہیں ہے، کیونکہ سورۂ قمر میں ہر نئے عذاب کے بعد اس کے متعلق: فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ آیا ہے، اسی طرح سورۂ رحمٰن میں ہر نئی نعمت کے بیان کے بعد: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ کا تکرار کیا گیا ہے جو ایک نئے مضمون کے متعلق ہونے کے سبب تکرار محض نہیں۔

اور اس قسم کا تکرار جو کہ قند مکرر سے بھی زیادہ شیریں ہے عرب وعجم کے کلام نثر ونظم میں بکثرت بلا انکار کے مستعمل ہے، چنانچہ اپنے انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے تمام اہل زبان اس طرح گفتگو کرتے ہیں: "ألم أحسن إليك بأن خولتك فى الأموال ، ألم أحسن إليك بأن فعلت بك كذا وكذا" یعنی کیا میں نے تجھ پر یہ احسان نہیں کیا کہ بہت سا مال تجھ کو دیا گیا، کیا میں نے تجھ پر یہ احسان نہیں کیا کہ تیرے ساتھ یہ سلوک کیے، اس جیسے مواقع پر یہ لفظ بار بار کہا جاتا ہے کہ کیا میں نے تجھ پر یہ یہ احسان نہیں کیا، اور مہلہل شاعر کلیب کے مرثیہ میں: "على ان ليس عدلا من كليب" اس مصرعہ کو سات جگہ مکرر لایا ہے، چنانچہ اس قسم کا تکرار فصحاء و بلغاء عرب کے کلام میں مستحسن اور شیریں سمجھا گیا، نثر اور نظم دونوں میں استعمال ہوتا ہے، اور صرف عربی نہیں، فارسی، اردو وغیرہ زبانوں کے مسلم شعراء کے کلام میں بھی اس کی نظائر پائی جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں یہ کہ اگر اس آیت کے مکرر ہونے سے فصاحت و بلاغت میں ذرا بھی کمی آتی تو سب سے پہلے وہ کفار عرب جو ہر وقت قرآن مجید میں عیب نکالنے کے لیے تیار رہتے تھے جن کو غیرت دلا دلا کر یہ کہا گیا تھا کہ قرآن کی مثل ایک ہی آیت بنا کر لے آؤ وہ ضرور اس جگہ کلام کرتے، مگر کسی نے اس سورت پر کچھ بھی اعتراض نہیں کیا، کیونکہ وہ کھلی آنکھوں دیکھتے تھے کہ جس جگہ: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ لایا گیا اگر اس کو وہاں سے حذف کردیا تو کلام کی شیرینی باقی نہ رہے گی، بلکہ یہ آیت ہر جگہ قند مکرر سے بھی زیادہ شیریں ہے جس کو اہل زبان ہی خوب سمجھتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلرَّحْمٰنُ ۝١ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝٢

رحمان نے، سکھلایا قرآن [1]

خلاصہ تفسیر: رحمٰن (کی بے شمار نعمتیں ہیں، ان میں سے ایک روحانی نعمت یہ ہے کہ اسی) نے (اپنے بندوں کو احکام) قرآن کی تعلیم دی (یعنی قرآن نازل کیا تاکہ اس کے بندے اس کے اوپر ایمان لائیں اور اس کا علم حاصل کر کے اس پر عمل کریں تاکہ دائمی عیش و راحت کا سامان حاصل ہو)۔

* * *

فائدہ: [1] جو اس کے عطایا میں سب سے بڑا عطیہ اور اس کی نعمتوں میں سب سے اونچی نعمت ورحمت ہے، انسان کی بساط اور اس کے ظرف پر خیال کرو اور علم قرآن کے اس دریائے ناپیدا کنار کو دیکھو، بلاشبہ ایسی ضعیف البنیان ہستی کو آسمانوں اور پہاڑوں سے زیادہ بھاری چیز کا حامل بنادینا رحمان ہی کا کام ہوسکتا ہے، ورنہ کہاں بشر اور کہاں خدا کا کلام۔

تنبیہ: سورہ النجم میں فرمایا تھا: علمه شديد القوى یہاں کھول دیا کہ قرآن کا اصلی معلم اللہ ہے گو فرشتہ کے توسط سے ہو۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝٣ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝٤

بنایا آدمی، پھر سکھلایا اس کو بات کرنا [1]

خلاصہ تفسیر: (اب ایک جسمانی نعمت کا ذکر ہے جس پر وہ روحانی نعمت موقوف ہے، جسمانی نعمت یہ ہے کہ) اسی نے انسان کو

پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھلائی (جس پر ہزاروں منافع مرتب ہوتے ہیں، جن میں سے ایک قرآن کریم کا دوسرے کی زبان سے پہنچنا اور دوسروں کو پہنچانا بھی ہے)۔

* * *

فائدہ: لے ''ایجاد'' (وجود عطا فرمانا) اللہ کی بڑی نعمت بلکہ نعمتوں کی جڑ ہے اس کی دو قسمیں ہیں: ① ایجاد ذات اور ② ایجاد صفت تو اللہ تعالیٰ نے آدمی کی ذات کو پیدا کیا اور اس میں علم بیان کی صفت بھی رکھی، یعنی قدرت دی کہ اپنے مافی الضمیر کو نہایت صفائی اور حسن وخوبی سے ادا کر سکے اور دوسروں کی بات سمجھ سکے، اسی صفت کے ذریعہ سے وہ قرآن سیکھتا سکھاتا ہے، اور خیر وشر، ہدایت وضلالت، ایمان وکفر اور دنیا وآخرت کی باتوں کو واضح طور پر سمجھتا اور سمجھاتا ہے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝۶

سورج اور چاند کے لیے ایک حساب ہے لے اور جھاڑ اور درخت مشغول ہیں سجدہ میں ۲ے

خلاصہ تفسیر: (اور ایک کائناتی نعمت یہ ہے کہ اس کے حکم سے) سورج اور چاند حساب کے ساتھ (چلتے) ہیں (سورج اور چاند کا چلنا تو اس لئے نعمت ہے کہ اس پر دن رات، سردی وگرمی، مہینے اور سال کا حساب مرتب ہوتا ہے اور ان کے فوائد ظاہر ہیں) اور بے تنہ کے (بیل دار) درخت اور تنہ دار درخت دونوں (اللہ کے) مطیع ہیں (درختوں کا سجدہ اس لئے نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں بے شمار منافع پیدا فرمائے ہیں، اور وہ تابع دار ہو کر ان منافع کی پیدائش کو قبول کرتے ہیں، پھر وہ منافع استعمال میں آتے ہیں، درختوں کے سجدہ سے مراد اطاعت اور تابع داری ہے)۔

* * *

فائدہ: لے یعنی دونوں کا طلوع وغروب، گھٹنا بڑھنا، یا ایک حالت پر قائم رہنا، پھر ان کے ذریعہ سے فصول ومواسم کا بدلنا اور سفلیات پر مختلف طرح سے اثر ڈالنا، یہ سب کچھ ایک خاص حساب اور ضابطہ اور مضبوط نظام کے ماتحت ہے، مجال نہیں کہ اس کے دائرہ سے باہر قدم رکھ سکیں اور اپنے مالک وخالق کے دیے ہوئے احکام سے روگردانی کر سکیں، اس نے اپنے بندوں کی جو خدمات اور ڈیوٹیاں سپرد کر دی ہیں، ان میں کوتاہی نہیں کر سکتے، ہمہ وقت ہماری خدمت میں مشغول ہیں۔

فائدہ: ۲ے یعنی علویات کی طرح سفلیات بھی اپنے مالک کی مطیع ومنقاد ہیں، چھوٹے جھاڑ، زمین پر پھیلی ہوئی بیلیں اور اونچے درخت سب اس کے حکم تکوینی کے سامنے سربسجود ہیں، بندے ان کو اپنے کام میں لائیں تو انکار نہیں کر سکتے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝۷ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝۸

اور آسمان کو اونچا کیا اور رکھی ترازو، کہ زیادتی نہ کرو ترازو میں

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝۹

اور سیدھی ترازو تولو انصاف سے اور مت گھٹاؤ تول کو لے

خلاصہ تفسیر: اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے آسمان کو اونچا کیا (جس میں آسمان سے متعلق دیگر منافع کے علاوہ ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر انسان اس کے بنانے والے کی عظمت شان پر استدلال کرے، جیسا کہ ارشاد ہے: يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ الخ) اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے (دنیا میں) ترازو رکھ دی تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو، اور (جب یہ ایسی بڑی منفعت کے لئے مقرر کی گئی کہ حقوق

کے ادا کرنے اور وصول کرنے کا ذریعہ ہے جس سے ہزاروں ظاہری اور باطنی خرابیاں دور ہوتی ہیں تو تم اس نعمت کا خاص طور پر شکر ادا کرو اور اسی شکر یہ میں سے یہ بھی ہے کہ) انصاف (اور حق رسانی) کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کو گھٹاؤ مت۔

* * *

فائدہ: لے اوپر سے دو دو چیزوں کے جوڑے بیان ہوتے چلے آ رہے تھے، یہاں بھی آسمان کی بلندی کے ساتھ آگے زمین کی پستی کا ذکر ہے، درمیان میں میزان (ترازو) کا ذکر شاید اس لیے ہو کہ عموماً ترازو کو تولتے وقت آسمان وزمین کے درمیان معلق رکھنا پڑتا ہے، یہ اس تقدیر پر ہے کہ میزان سے مراد ظاہری اور حسی ترازو ہو، چونکہ اس کے ساتھ بہت سے معاملات کی درستی اور حقوق کی حفاظت وابستہ تھی، اس لیے ہدایت فرمادی کہ وضع میزان کی یہ غرض جب ہی حاصل ہوسکتی ہے کہ نہ لیتے وقت زیادہ تولو، نہ دیتے وقت کم، ترازو کے دونوں پلے اور باٹ بٹی میں کمی بیشی نہ ہو، نہ تولتے وقت ڈنڈی ماری جائے، بلکہ بدون کم بیشی کے دیانتداری کے ساتھ بالکل ٹھیک ٹھیک تولا جائے۔

تنبیہ: اکثر سلف نے ''وضع میزان'' سے اس جگہ ''عدل کا قائم کرنا'' مراد لیا ہے یعنی اللہ نے آسمان سے زمین تک ہر چیز کو حق وعدل کی بنیاد پر اعلیٰ درجہ کے توازن وتناسب کے ساتھ قائم کیا، اگر عدل وحق ملحوظ نہ رہے تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے، لہٰذا ضروری ہے کہ بندے بھی عدل وحق کے جادہ پر مستقیم رہیں، اور انصاف کی ترازو کو اٹھنے یا جھکنے نہ دیں، نہ کسی پر زیادتی کریں نہ کسی کا حق دبائیں، حدیث میں آیا ہے کہ عدل ہی سے زمین وآسمان قائم ہیں۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿١٠﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿١١﴾

اور زمین کو بچھایا واسطے خلق کے لے اس میں میوہ ہے اور کھجوریں جن کے میوہ پر غلاف

وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿١٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿١٣﴾

اور اس میں اناج ہے جس کے ساتھ بھس ہے اور پھول خوشبودار ۲ پھر کیا کیا نعمتیں رب اپنے کی جھٹلاؤ گے تم دونوں ۳

خلاصہ تفسیر: اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے خلقت کے (فائدہ کے) واسطے زمین کو (اس کی جگہ) رکھ دیا کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن (کے پھل) پر غلاف (چڑھا) ہوتا ہے، اور (اس میں) غلہ ہے جس میں بھوسہ (بھی) ہوتا ہے اور (اس میں) اور غذا کی چیز (بھی) ہے (جیسے بہت سی ترکاریاں وغیرہ) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (یعنی منکر ہونا بڑی ہٹ دھرمی، بلکہ بدیہی اور محسوس نعمتوں کا انکار ہے)۔

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اس کے مخاطب انسان اور جن ہیں، جس کا قرینہ یہ ہے کہ سورہ رحمن کی متعدد آیتوں میں جنات کا ذکر ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: نعمتوں کی مختلف انواع کے مضامین کے بعد اس آیت کا آنا حتیٰ کہ آگے بعض ایسے مضامین کے بعد بھی یہ آیت لائی گئی جن کا نعمت ہونا ظاہر بھی نہیں تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ نعمت کی مختلف قسمیں ہیں، کوئی حسی ہے تو کوئی معنوی، اور اہل بصیرت ہی اس کو اپنے اوقات وحالات میں سمجھ سکتے ہیں، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا مطلوب ہے، یہ زہد اور تعلق مع اللہ کے خلاف نہیں جیسا کہ بعض متشدد لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔

* * *

فائدہ: لے کہ اس پر آرام سے چلیں پھریں اور کاروبار جاری رکھیں۔

فائدہ: ۲ یعنی پھل میوے بھی زمین سے نکلتے ہیں اور غلہ اناج بھی، پھر غلہ میں دو چیزیں ہیں: ① دانہ جو انسانوں کی غذا ہے اور ② بھوسہ جو جانوروں کے لیے ہے، اور بعض چیزیں زمین میں وہ پیدا ہوتی ہیں جو کھانے کے کام نہیں آتیں لیکن ان کی خوشبو وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی اے جن وانس! اوپر کی آیات میں تمہارے رب کی جو عظیم الشان نعمتیں اور قدرت کی نشانیاں بیان کی گئیں تم میں سے کس کس کے جھٹلانے کی جرأت کروگے؟ کیا یہ نعمتیں اور نشانیاں ایسی ہیں جن میں سے کسی کا انکار کیا جاسکے؟

علماء نے ایک حدیث صحیح کی بناء پر لکھا ہے کہ جب کوئی شخص یہ آیت: فبای الاء رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰن سنے تو جواب دے: "لاَ بِشَیْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ" (اے ہمارے رب! ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، سب حمد وثنا تیرے ہی لیے ہے)

تنبیہ: گو "جن" کا ذکر تصریحاً پہلے نہیں ہوا، لیکن "انام" میں وہ شامل ہیں اور: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات: ۵۶) میں دونوں کا عبادت کے لیے پیدا ہونا مذکور ہے، یہ اس آیت کے بعد متصل ہی آدمی اور جن کی کیفیت تخلیق بتلائی گئی ہے، اور چند آیات کے بعد: سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ اور يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ میں صریحاً جن وانس کو مخاطب کیا گیا ہے، یہ قرائن دلالت کرتے ہیں کہ یہاں مخاطب وہ ہی دونوں ہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾

بنایا آدمی کو کھنکھناتی مٹی سے جیسے ٹھیکرا، اور بنایا جن کو آگ کی لپیٹ سے ۱

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے تم دونوں ۲

خلاصہ تفسیر: (اور ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے انسان (کی اصل اول یعنی آدم علیہ السلام) کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح (کھن کھن) بجتی تھی پیدا کیا (جس کا اجمالا چند آیت میں پیچھے ذکر آیا ہے) اور جنات (کی اصل اول) کو خالص آگ سے (جس میں دھواں نہ تھا) پیدا کیا (اور پھر دونوں کی نسل توالد اور تناسل کے ذریعہ سے چلی، اس کی شرح سورۃ حجر آیت ۲۷: وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ میں گزر چکی ہے) سو اے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اس کی مراد پیچھے گزر چکی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سب آدمیوں کے باپ آدم کو مٹی اور جنوں کے باپ کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا۔

فائدہ: ۲ اٰلَآءِ کا ترجمہ عموماً "نعمت" کیا گیا ہے لیکن ابن جریرؒ نے بعض سلف سے "قدرت" کے معنی نقل کیے ہیں، اس لیے جس مقام پر جو معنی زیادہ چسپاں ہوں وہ اختیار کیے جائیں، یہاں اس سے پہلی آیت میں دونوں مطلب ہو سکتے ہیں، کیونکہ انس وجن کو خلعت وجود سے سرفراز فرمانا اور جماد لایعقل سے عاقل بنا دینا اللہ کی بڑی نعمت ہے اور اس کی لامحدود قدرت کی نشانی بھی ہے۔

تنبیہ: یہ جملہ: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ اس سورت میں اکتیس مرتبہ آیا ہے اور ہر مرتبہ کسی خاص نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یا شؤون عظمت وقدرت میں سے کسی خاص شان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اس قسم کی تکرار عرب وعجم کے کلاموں میں بکثرت پائی جاتی ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾

مالک دو مشرق کا اور مالک دو مغرب کا ۱ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ دونوں مشرق اور دونوں مغرب کا مالک (حقیقی) ہے (مراد اس سے سورج اور چاند کے طلوع وغروب

کی جگہ ہے، اس میں بھی نعمت کی وجہ ظاہر ہے کہ رات اور دن کے شروع اور ختم ہونے کے ساتھ بہت سی اغراض متعلق ہیں) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ جاڑے اور گرمی میں جس جس نقطہ سے سورج طلوع ہوتا ہے وہ دو مشرق اور جہاں جہاں غروب ہوتا ہے وہ دو مغرب ہوئیں، ان ہی مشرقین اور مغربین کے تغیر وتبدیل سے موسم اور فصلیں بدلتی ہیں اور طرح طرح کے انقلابات ہوتے ہیں، زمین والوں کے ہزار ہا فوائد و مصالح ان تغیرات سے وابستہ ہیں تو ان کا ادل بدل بھی خدا کی بڑی نعمت اور اس کی قدرت عظیمہ کی نشانی ہوئی۔

تنبیہ: آیت سے پہلے اور پیچھے دور تک دو دو چیزوں کے جوڑے بیان ہوئے ہیں اس لیے یہاں مشرقین ومغربین کا ذکر نہایت ہی لطف دیتا ہے۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾

چلائے دو دریا مل کر چلنے والے، ان دونوں میں ہے ایک پردہ جو ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی نے دو دریاؤں کو (صورتاً) ملایا کہ (ظاہر میں) باہم ملے ہوئے ہیں (اور حقیقۃً) ان دونوں کے درمیان میں ایک (قدرتی) حجاب ہے کہ (اس کی وجہ سے) دونوں (اپنے اپنے موقع سے) بڑھ نہیں سکتے (جس کی شرح سورۃ فرقان آیت ۵۳: وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ میں گزر چکی ہے اور نمکین اور میٹھے پانی کے منافع بھی ظاہر ہیں، اور دونوں کے ملنے میں یہ نعمت بھی ہے کہ اس سے خدا کی قدرت پر استدلال ہوتا ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایسا نہیں کہ میٹھا اور کھاری پانی ایک دوسرے پر چڑھائی کر کے اس کی خاصیت وغیرہ کو بالکلیہ زائل کر دے یا دونوں مل کر دنیا کو غرق کر ڈالیں، اس آیت کے مضمون کے متعلق کچھ تقریر سورۃ فرقان کے اواخر میں گزر چکی ہے، اس کو ملاحظہ کر لیا جائے۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾

نکلتا ہے ان دونوں سے موتی اور مونگا، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

النصف ع ۱ ۲۵ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

اور اسی کے ہیں جہاز اونچے کھڑے دریا میں جیسے پہاڑ ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور دو دریاؤں کے متعلق ایک یہ نعمت ہے کہ) ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے (موتی مونگے کے منافع اور ان کا نعمت ہونا ظاہر ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے، اور (ایک نعمت یہ ہے کہ) اسی کے (اختیار اور ملک میں) ہیں جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے (نظر آتے) ہیں (ان کی منفعت بھی بالکل ظاہر ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ: معروف یہ ہے کہ موتی اور جواہرات نمکین اور کھارے دریا سے نکلتے ہیں، میٹھے دریا سے نہیں، جبکہ یہاں اس آیت

میں دونوں سے نکلنا بیان فرمایا ہے، اس کی توجیہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ موتی دونوں ہی دریاؤں میں پیدا ہوتے ہوں، مگر شیریں اور میٹھے دریا سب جاری ہوتے ہیں ان سے موتی کا نکالنا آسان نہیں، اور شیریں دریا سب جا کر کھارے دریا میں گر جاتے ہیں اور وہیں سے موتی نکالے جاتے ہیں، اس لئے موتیوں کا منبع نمکین دریا کو کہا جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی کشتیاں اور جہاز گو بظاہر تمہارے بنائے ہوئے ہیں، مگر خود تم کو اللہ نے بنایا، اسی نے وہ قوتیں اور سامان عطا کیے جن سے جہاز تیار کرتے ہو، لہٰذا تم اور تمہاری مصنوعات سب کا مالک وہ خالق وہ ہی خدا ہوا اور یہ سب اسی کی نعمتیں اور قدرت کی نشانیاں ہوئی۔

تنبیہ: یہ جملہ پہلے جملہ: يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ کے مقابل ہے، یعنی دریا کے نیچے سے وہ نعمتیں نکلتی ہیں اور اوپر یہ نعمتیں موجود ہیں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٨﴾

جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونے والا ہے، اور باقی رہے گا منہ تیرے رب کا بزرگی اور عظمت والا ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: پیچھے دنیوی نعمتوں کا ذکر تھا جن کا تقاضا شکر، اطاعت اور ایمان کا واجب اور ضروری ہونا ہے، اور کفر، معصیت اور سرکشی کا حرام ہونا، اس تقاضا اور مطالبہ پر بعض عمل کرتے ہیں، بعض عمل نہیں کرتے، اس لیے اب آگے دونوں فرقوں کا انجام جو کہ جہنم اور جنت ہے بیان فرماتے ہیں، چنانچہ آگے آیت: **ولمن خاف مقام** تک عذاب کا اور اس کے بعد سورت کے اختتام تک ثواب کا ذکر ہے۔

(خلاصہ یہ کہ جتنی نعمتیں تم لوگوں نے سنی ہیں تم کو توحید و اطاعت بجالا کر ان کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور کفر و معصیت سے ناشکری نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ اس عالم کے فنا ہونے کے بعد ایک دوسرا عالم آنے والا ہے جہاں ایمان و کفر پر جزا و سزا واقع ہوگی جس کا بیان آئندہ آیات کے ضمن میں ہے، پس ارشاد ہے کہ:) جتنے (انسان و جنات) روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور (صرف) آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت (والی) اور (باوجود عظمت کے) احسان والی ہے باقی رہ جائے گی (اس جگہ اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں عظمت و احسان اس لئے ذکر کی گئیں کہ ایک صفت ذاتی دوسری اضافی ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ اکثر اہل عظمت دوسروں کے حال پر توجہ نہیں کیا کرتے، مگر حق تعالیٰ اس عظمت کے باوجود اپنے بندوں پر رحمت و فضل فرماتے ہیں اور چونکہ یہ عالم کا فنا ہونا اور اس کے بعد جزا و سزا کی خبر دینا انسان کو ایمان کی دولت بخشتا ہے، اس لئے یہ مجموعہ بھی ایک بڑی نعمت ہے اس لئے فرمایا) سوائے جن و انس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کی منکر ہو جاؤ گے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ: اس میں علیھا کی ضمیر "ارض" یعنی زمین کی طرف راجع ہے، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے: **وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ** اس کے علاوہ زمین ان عام اشیاء میں سے ہے جس کی طرف ضمیر راجع کرنے کے لئے پہلے مرجع کا ذکر لازم نہیں ہے، معنی اس کے یہ ہوئے کہ جو جنات اور انسان زمین پر ہیں سب فنا ہونے والے ہیں، اس میں صرف ثقلین یعنی جنات و انسان کے ذکر کو اس لیے خاص کیا کیونکہ یہاں انہی کو تنبیہ کرنا مقصود ہے اور یہ سب روئے زمین پر پائے جاتے ہیں، نیز اس سورت میں مخاطب بھی یہی دونوں ہیں، اس لیے یہاں فانی ہونے میں صرف زمین والوں کا ذکر کیا گیا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آسمان اور آسمان والی مخلوقات فانی نہیں ہیں، کیونکہ دوسری آیت میں حق تعالیٰ نے عام لفظوں میں پوری مخلوقات کا فانی ہونا بھی واضح فرما دیا ہے: **كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ**۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی زمین و آسمان کی تمام مخلوق زبان حال و قال سے اپنی حاجات اسی خدا سے طلب کرتی ہے، کسی کو ایک لحہ کے لیے اس سے استغناء نہیں اور وہ بھی سب کی حاجت روائی اپنی حکمت کے موافق کرتا ہے، ہر وقت اس کا الگ کام اور ہر روز اس کی نئی شان ہے، کسی کو مارنا، کسی کو جلانا، کسی کو بیمار کرنا، کسی کو تندرست کر دینا، کسی کو بڑھانا، کسی کو گھٹانا کسی کو دینا، کسی سے لینا اس کی شؤن میں داخل ہیں، وقس علیٰ ہذا۔

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝٢٩ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٣٠

اس سے مانگتے ہیں جو کوئی ہیں آسمانوں میں اور زمین میں ہر روز اس کو ایک دھندا ہے ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (آگے ایک خاص طور پر حق تعالیٰ کی عظمت و اکرام کے متعلق مضمون ہے یعنی وہ ایسا باعظمت ہے کہ) اسی سے (اپنی اپنی حاجتیں) سب آسمان و زمین والے مانگتے ہیں (زمین والوں کی حاجتیں تو ظاہر ہیں اور آسمان والے اگرچہ کھانے پینے کے محتاج نہ ہوں، لیکن رحمت و عنایت کے تو سب ہی محتاج ہیں، آگے اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کو ایک دوسرے عنوان سے بیان کیا گیا ہے) وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے (یعنی عالم کے جملہ تصرفات اس کے قبضہ میں ہیں، پس عظمت کے باوجود ایسا اکرام و احسان فرمانا یہ بھی ایک عظیم نعمت ہے) سوائے جن و انس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ افعال کا صادر ہونا اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے، ورنہ تو حادث کا قدیم ہونا لازم آئے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عالم میں جتنے تصرفات واقع ہو رہے ہیں وہ سب اسی کے تصرفات ہیں، جن میں اس کے انعامات و احسانات بھی داخل ہیں، جیسے پیدا کرنا اور باقی رکھنا جو کہ رحمت عام ہے، اولاد اور رزق دینا جو کہ دنیاوی رحمتیں ہیں، علم و عمل کی توفیق اور ہدایت دینا جو کہ دینی رحمتیں ہیں، غرض عالم کے جملہ تصرفات اسی کے قبضہ میں ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دنیا کے یہ کام اور دھندے عنقریب ختم ہونے والے ہیں، اس کے بعد ہم دوسرا دور شروع کریں گے، جب تم دونوں بھاری قافلوں (جن و انس) کا حساب کتاب ہوگا مجرموں کی پوری طرح خبر لی جائے گی، اور وفاداروں کو پورا صلہ دیا جائے گا۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۝٣١ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٣٢ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ

جلد فارغ ہونے والے ہیں تمہاری طرف سے اے دو بھاری قافلو، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، اے گروہ جنوں کے اور انسانوں کے

اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ

اگر تم سے ہو سکے کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے کناروں سے تو نکل بھاگو، نہیں نکل سکنے کے

اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝٣٣ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝٣٤

بدون سند کے ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے خالق کی عظمت و اکرام کے متعلق بیان ہوا، اب مخلوق کے فانی ہونے کے متعلق ارشاد ہے کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ پھر وہ فنا ہمیشہ کے لیے طاری ہو جائے گا اور عذاب و ثواب نہ ہوگا، بلکہ ہم تم کو دوبارہ زندہ کریں گے اور جزا و سزا دیں گے، اسی کو اس طرح فرماتے ہیں کہ:

اے جن و انس! ہم عنقریب تمہارے (حساب و کتاب کے) لئے خالی ہوئے جاتے ہیں (یعنی حساب و کتاب لینے والے ہیں، اور پہلے کی طرح آگے ارشاد ہے کہ یہ حساب کتاب کی خبر دینا بھی ایک عظیم نعمت ہے) سوائے جن و انس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (آگے حساب و کتاب کی تاکید کے لئے یہ بتلاتے ہیں کہ اس وقت یہ بھی احتمال نہیں کہ کوئی کہیں بچ کر نکل جائے، چنانچہ ارشاد ہے کہ:) اے گروہ جن اور انسانوں کے اگر تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو (ہم بھی دیکھیں)

نکلو (مگر) بدون زور کے نہیں نکل سکتے (اور زور ہے نہیں، پس نکلنا بھی ممکن نہیں، اور بالکل یہی حالت قیامت میں بھی ہوگی، بلکہ وہاں تو یہاں سے بھی زیادہ ضعف اور عجز ہوگا، غرض حساب وکتاب میں یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ کوئی کہیں بچ کر نکل جائے، اور یہ بات بتلا دینا بھی ہدایت کا سبب اور عظیم نعمت ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ: یہ فراغ سے مشتق ہے، جس کے معنی کسی شغل سے فارغ اور خالی ہونے کے ہیں، ''فراغ'' کا مقابل لغت میں ''شغل'' ہے اور لفظ ''فراغ'' دو چیزوں کی خبر دیتا ہے: اول یہ کہ کسی شغل میں مشغول تھا، دوسرے یہ کہ اب اس شغل کو ختم کر کے فارغ ہوگیا، یہ دونوں باتیں مخلوقات میں تو معروف ومشہور ہیں، انسان کبھی ایک شغل میں لگا ہوا ہوتا ہے، پھر اس سے فارغ ہو جاتا ہے، مگر حق تعالیٰ ان دونوں سے بری ہیں، نہ ان کو ایک شغل دوسرے شغل سے مانع ہوتا ہے، نہ وہ کبھی اس طرح فارغ ہوتے ہیں جس طرح انسان فارغ ہوا کرتا ہے، اس کی جس وقت جس طرف توجہ ہوتی ہے تام اور کامل ہی ہوتی ہے، وہاں ناقص توجہ کا احتمال ہی نہیں، یہاں مجاز اور مبالغہ کے طور پر اس کو خالی ہونے سے تعبیر فرمادیا، چنانچہ آیت مذکورہ میں سنفرغ کا لفظ ایک تشبیہ واستعارہ کے طور پر لایا گیا ہے جو عام انسانوں میں رائج ہے کہ کسی کام کی اہمیت بتلانے کے لئے کہا جاتا ہے کہ ہم اس کام کے لئے فارغ ہوگئے، یعنی اب پوری توجہ اسی کام پر ہے اور جو آدمی کسی کام پر اپنی پوری توجہ خرچ کرتا ہے اس کے لئے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ اس کو تو اس کے سوا کوئی کام نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ کی حکومت سے کوئی چاہے کہ نکل بھاگے تو بدون قوت اور غلبہ کے کیسے بھاگ سکتا ہے کیا خدا سے زیادہ کوئی قوی اور زور آور ہے، پھر نکل کر جائے گا کہاں، دوسری قلمرو کون سی ہے جہاں پناہ لے گا، نیز دنیا کی معمولی حکومتیں بدون سند اور پروانہ راہداری کے اپنی قلمرو سے نکلنے نہیں دیتیں تو اللہ بدون سند کے کیوں نکلنے دے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی اس طرح کھول کھول کر سمجھانا اور تمام نشیب وفراز پر متنبہ کرنا کتنی بڑی نعمت ہے، کیا اس نعمت کی تم قدر نہیں کرو گے اور اللہ کی ایسی عظیم الشان قدرت کو جھٹلاؤ گے۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿٣٥﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٦﴾

چھوڑے جائیں تم پر شعلے آگ کے صاف، اور دھواں ملے ہوئے، پھر تم بدلہ نہیں لے سکتے ۱ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے ۲

خلاصہ تفسیر: (اب آگے عذاب کے وقت انسان کے عاجز ہونے کا ذکر فرماتے ہیں، جیسے پیچھے حساب کے وقت اس کے عاجز ہونے کا ذکر تھا، یعنی اے جن وانس کے مجرمو!) تم دونوں پر (قیامت کے روز) آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا پھر تم (اس کو) ہٹا نہ سکو گے (یہ شعلہ اور دھواں غالباً وہ ہے، جن کا ذکر آگے سورۃ المرسلات میں ہے: اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ (الی قولہ) اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ، اس میں ظل یہی دھواں ہے اور شرر یہی شعلہ، اور اس کا بتلانا بھی ہدایت کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ایک عظیم نعت ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جس وقت مجرموں پر آگ کے صاف شعلے اور دھواں ملے ہوئے شرارے چھوڑے جائیں گے کوئی ان کو دفع نہ کر سکے گا، اور نہ وہ اس سزا کا کچھ بدلہ لے سکیں گے۔

فائدہ: ۲ مجرموں کو سزا دینا بھی وفاداروں کے حق میں انعام ہے اور اس سزا کا بیان کرنا تا کہ لوگ سن کر اس جرم سے باز رہیں، یہ مستقل انعام ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ہر آیت میں نعمت جتائی، کوئی اب نعمت ہے اور کسی کی خبر دینا نعمت ہے، کہ اس سے بچیں''۔

فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾

پھر جب پھٹ جائے آسمان تو ہوجائے گلابی جیسے نری (تیل کی تلچھٹ) ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾

پھر اس دن پوچھ نہیں اس کے گناہ کی کسی آدمی سے اور نہ جن سے ۲؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: جب ہمارا حساب لینا اور تمہارا حساب وکتاب اور عذاب کے وقت عاجز ہونا معلوم ہوگیا تو اس سے قیامت کے دن حساب وعذاب کا واقع ہونا ثابت ہوگیا، چنانچہ اب آگے اسی کا بیان ہے:

غرض جب (قیامت آئے گی جس میں) آسمان پھٹ جائے گا اور ایسا سرخ ہوجائے گا جیسے سرخ نری (یعنی سرخ چمڑا، شاید یہ رنگ اس لئے ہوکہ یہ غصہ کی علامت ہے اور غصہ کے وقت چہرہ سرخ ہوجاتا ہے، اس روز آسمان کی سرخی حق تعالیٰ کے غضب کی علامت ہوگی، اور یہ خبر دینا بھی ایک نعمت ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے (یہ تو حساب کا واقع ہونا اور اس کا وقت بتلایا گیا، اب آگے حساب کی کیفیت اور فیصلہ کا طریقہ بیان فرماتے ہیں، یعنی جس روز یہ واقعات ارسال شواظ ونحاس وانشقاق سماء وغیرہ ہوں گے) تو اس روز (اللہ تعالیٰ کے معلوم کرنے کے لئے) کسی انسان اور جن سے اس کے جرم کے متعلق نہ پوچھا جائے گا (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سب معلوم ہے، یعنی حساب اس غرض سے نہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ کو معلوم ہوجائے، بلکہ خود مخلوق کو معلوم کرانے اور جتلانے کے لئے سوال اور حساب ہوگا جیسا کہ ارشاد ہے: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ، اور یہ خبر دینا بھی ایک نعمت ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے۔

فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ: یہ آسمان کا پھٹنا وہ ہے جو دوسری بار صور پھونکنے کے بعد فرشتوں کے اترنے کے لیے آسمان کھلے گا، اس وقت فرشتے اتریں گے اور بادل میں حق تعالیٰ کی تجلی ہوگی اور حساب وکتاب شروع ہوجائے گا جس کا بیان سورہ فرقان کی اس آیت میں ہوا ہے: وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ الخ۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی قیامت کے دن آسمان پھٹے گا اور رنگ میں لال تری کی طرح ہوجائے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کسی آدمی یا جن سے اس کے گناہوں کے متعلق معلوم کرنے کی غرض سے سوال نہ کیا جائے گا کیونکہ خدا کو پہلے سے سب کچھ معلوم ہے، ہاں بطور الزام وتوبیخ ضابطہ کا سوال کریں گے، کما قال: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (الحجر: ۹۲) یا یہ مطلب ہوکہ قبروں سے اٹھتے وقت سوال نہ ہوگا بعد میں ہونا اس کے منافی نہیں۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾

پہچانے پڑیں گے گناہ گار اپنے چہرے سے ۱؎ پھر پکڑا جائے گا پیشانی کے بال سے اور پاؤں سے ۲؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: پیچھے حساب وکتاب کی کیفیت بیان ہوئی کہ وہ سرزنش، زجر اور توبیخ کے طور پر ہوگا، اب آگے یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تو مجرمین اور ان کے جرائم معلوم ہیں اس لیے تحقیق کی ضرورت نہ ہوگی، لیکن فرشتوں کو مجرموں کی تعیین کیسے ہوگی؟ پس ارشاد فرماتے ہیں کہ:

مجرم لوگ اپنے حلیہ سے (کہ چہرہ کی سیاہی اور آنکھوں کا نیلگوں ہونا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ - وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ

يَوْمَئِذٍ زُرْقًا) پہچانے جائیں گے سو (ان کے) سر کے بال اور پاؤں پکڑ لئے جائیں گے (اور ان کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، یعنی کسی کا سر پکڑیں گے کسی کی ٹانگ جیسے جس کے اعمال ہوں گے، یا کبھی ایک ہی شخص کا سر پکڑیں گے کبھی ٹانگ، تاکہ قسم قسم کا عذاب دیا جائے، اور یہ خبر دینا بھی ایک نعمت ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی چہروں کی سیاہی اور آنکھوں کی نیلگونی سے مجرم خود بخود پہچانے جائیں گے جیسے مومنین کی شناخت سجدہ اور وضو کے آثار و انوار سے ہوگی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کسی کے بال اور کسی کی ٹانگ پکڑ کر جہنم کی طرف گھسیٹا جائے گا، یا ہر ایک مجرم کی ہڈیاں پسلیاں توڑ کر پیشانی کو پاؤں سے ملا دیں گے اور زنجیر وغیرہ سے جکڑ کر دوزخ میں ڈالیں گے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾

یہ دوزخ ہے جس کو جھوٹ بتاتے تھے گناہ گار ۱؎ پھریں گے بیچ اس کے اور کھولتے پانی کے ۲؎

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اب آگے اصلی عذاب بتلاتے ہیں اگرچہ شعلہ کا چھوڑنا بھی ایک عذاب تھا، یعنی مجرموں سے اس وقت کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جہنم جس کو مجرم لوگ (یعنی تم) جھٹلاتے تھے وہ لوگ دوزخ کے اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر لگاتے ہوں گے (یعنی کبھی آگ کا عذاب ہوگا، کبھی کھولتے ہوئے پانی کا، اور یہ خبر دینا بھی ایک نعمت ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ: اس کے متعلق کچھ تحقیق سورۃ مؤمن آیت ۷۱، ۷۲: يُسْحَبُوْنَ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس وقت کہا جائے گا کہ یہ وہ ہی دوزخ ہے جس کا دنیا میں انکار کیا کرتے تھے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کبھی آگ کا اور کبھی کھولتے پانی کا عذاب ہوگا۔ (اعاذنا الله منهما ومن سائر انواع العذاب)

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾

اور جو کوئی ڈرا کھڑے ہونے سے اپنے رب کے آگے اس کے لیے ہیں دو باغ ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں مجرمین کی سزاؤں کا ذکر تھا، اب یہاں سے مومنین صالحین کی جزا وثواب کا ذکر شروع ہوتا ہے، یہاں ان آیتوں میں دو باغوں کا ذکر: وَلِمَنْ خَافَ سے شروع ہوا ہے اور اس کے بعد مزید دو باغوں کا ذکر آگے: وَمِنْ دُوْنِهِمَا سے، پہلے دو باغ خواص مقربین کے ہیں اور آگے دو باغ عام مومنین کے لئے، اس تعیین وتقسیم کے دلائل آگے لکھ دیئے جائیں گے، یہاں صرف تفسیر لکھی جاتی ہے۔

اور (اہل جنت کا حال یہ ہے کہ ان میں دو قسم ہیں، خواص اور عوام پس) جو شخص (خواص میں سے ہو اور) اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے (ہر وقت) ڈرتا رہتا ہو (اور ڈر کر شہوات اور گناہوں سے بچتا رہتا ہو، مطلب یہ کہ خاص لوگوں میں سے ہو، کیونکہ یہ شان خواص ہی کی ہوتی

ہے،عوام پر تو کبھی کبھی خوف طاری ہو جاتا ہے اور کبھی ان سے گناہ بھی سرزد ہو جاتے ہیں اگر چہ توبہ کر لیں، غرض جو شخص ایسا متقی ہو) اس کے لئے (جنت میں) دو باغ ہوں گے (یعنی ہر متقی کے لئے دو باغ ہوں گے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ: غالباً دو دو باغ ہونے میں حکمت یہ ہے کہ ان کا اکرام ظاہر ہو اور صاحب دولت و نعمت ہونا معلوم ہو، جیسا کہ دنیا میں دولت والوں کے پاس اکثر ایک قسم کی چیزیں کئی کئی ہوا کرتی ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس کو دنیا میں ڈر لگا رہا کہ ایک روز اپنے رب کے آگے کھڑا ہونا اور رتی رتی کا حساب دینا ہے اور اسی ڈر کی وجہ سے اللہ کی نافرمانی سے بچتا رہا اور پوری طرح تقویٰ کے راستوں پر چلا اس کے لیے وہاں دو عالیشان باغ ہیں جن کی صفات آگے بیان کی گئی ہیں۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾

جن میں بہت سی شاخیں ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾

ان دونوں میں دو چشمے بہتے ہیں ۲؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور وہ) دونوں باغ کثیر شاخوں والے ہوں گے (اس میں سایہ کی گنجائش، پھل اور میووں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) ان دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے کہ (دور تک) بہتے چلے جائیں گے، سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مختلف قسم کے پھل ہوں گے اور درختوں کی شاخیں نہایت پر میوہ اور سایہ دار ہوں گی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جو کسی وقت تھمتے نہیں، نہ خشک ہوتے ہیں۔

فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا

ان دونوں میں ہر میوہ قسم قسم کا ہوگا، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، لگائے بیٹھے بچھونوں پر جن کے استر

مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾

تافتے کے ۱؎ اور میوہ ان باغوں کا جھک رہا ۲؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور) ان دو باغوں میں ہر میوہ کی دو قسمیں ہوں گی (کہ اس میں زیادہ لذت حاصل ہوگی، کبھی ایک قسم کا مزہ لے لیا کبھی دوسری قسم کا) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) وہ لوگ تکیہ لگائے ایسے فرشوں پر بیٹھے ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے (اور قاعدہ ہے کہ اوپر کا کپڑا بہ نسبت استر کے زیادہ نفیس ہوتا ہے، پس جب استر دبیز ریشم کا ہوگا تو اوپر کا کپڑا کیسا کچھ ہوگا) اور ان دونوں باغوں کا پھل بہت نزدیک ہوگا (کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر طرح بلا مشقت ہاتھ

آسکتا ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

* * *

فائدہ: ۱ے جب ان کا استر دبیز ریشم کا ہوگا تو ابرے کو اسی سے قیاس کرلو، کیسا کچھ ہوگا۔

فائدہ: ۲ے جس کے چننے میں کلفت نہ ہوگی، کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہر حالت میں بے تکلف متمتع ہو سکیں گے۔

فِيهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴿٥٦﴾

ان میں عورتیں ہیں نیچی نگاہ والیاں نہیں قربت کی ان سے کسی آدمی نے ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے ۱ے

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٧﴾ كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٥٨﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٩﴾

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، وہ کیسی جیسے کہ لعل اور مونگا ۲ے پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور) ان (باغوں کے مکانات اور محلات) میں نیچی نگاہ والیاں (یعنی حوریں) ہوں گی کہ ان (جنتی) لوگوں سے پہلے ان پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جن نے (یعنی بالکل محفوظ و غیر مستعمل ہوں گی) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور رنگت اس قدر صاف وشفاف ہوگی کہ) گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں (ممکن ہے کہ سرخی میں بھی تشبیہ دینا منظور ہو، اور چند تشبیہیں دینا غالباً اہتمام کے لیے ہے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

* * *

فائدہ: ۱ے یعنی ان کی عصمت کو کسی نے بھی چھوا، نہ انہوں نے اپنے ازواج کے سوا کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

فائدہ: ۲ے یعنی ایسی خوش رنگ اور بیش بہا۔

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ﴿٦٠﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦١﴾

اور کیا بدلہ ہے نیکی کا مگر نیکی ۱ے پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اب گذشتہ مضمون کی تقریر وتاکید ہے کہ) بھلا غایت اطاعت کا بدلہ بجز غایت عنایت کے کچھ اور بھی ہو سکتا ہے (انہوں نے انتہائی درجہ اطاعت کی، اس لئے صلہ میں انتہائی عنایت کے مستحق ہوئے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ: خواص ومقربین کے دو باغوں کی کچھ تفصیل ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ احسان عمل کا بدلہ احسان جزاء ہی ہو سکتا ہے، اس کے سوا کوئی احتمال نہیں، سو اس کو بدلہ فرمانا اور استفہام یعنی سوال کی صورت میں اس کے ضروری ہونے کی طرف بھی اشارہ فرمانا یہ سب فضل واحسان کے طور پر ہے، ورنہ عقلاً خدا کے ذمہ کچھ واجب نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ے یعنی نیک بندگی کا بدلہ نیک ثواب کے سوا کیا ہو سکتا ہے، ان جنتیوں نے دنیا میں اللہ کی انتہائی عبادت کی تھی، گویا وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے، اللہ نے ان کو انتہائی بدلہ دیا: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (السجدہ:۱۷)

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾

اور ان دو کے سوا اور دو باغ ہیں ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے گہرے سبز جیسے سیاہ ۲؎

فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾

پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے، ان میں دو چشمے ہیں ابلتے ہوئے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: پیچھے خاص لوگوں کے باغوں کے اوصاف بیان ہوئے، آگے عام مؤمنین کے باغوں کا ذکر ہے یعنی:

اور ان (مذکورہ) دونوں باغوں سے کم درجہ میں دو باغ اور ہیں (جو عام مؤمنین کے لئے ہیں اور ہر ایک کو دو دو ملیں گے) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اب آگے ان باغوں کی صفت ہے کہ) وہ دونوں باغ گہرے سبز ہوں گے، سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے، ان دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے کہ جوش مارتے ہوں گے، سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ: یہاں عام مؤمنین کے باغوں میں: ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ نہیں فرمایا، جس سے اشارہ ہے کہ یہ دونوں باغ اس صفت میں پہلے باغوں سے کچھ کم ہیں، یعنی ان کا پھل اور سایہ اتنا نہ ہوگا، جبکہ پیچھے خاص لوگوں کے باغ میں اس کا ذکر تھا کہ ان کا پھل اور سایہ زیادہ ہوگا۔

مُدْهَآمَّتٰنِ: یہاں عام مؤمنین کے باغوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ گہرے سبز ہوں گے، یہ صفت اگرچہ پیچھے خاص لوگوں کے باغوں میں ذکر نہیں کی گئی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان میں یہ صفت نہ ہوگی، اور ان کے باغ کچھ کم سرسبز ہوں گے، بلکہ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ جو وہاں کی صفت بتلائی ہے، اس میں مُدْهَآمَّتٰنِ کی صفت بھی شامل ہے، خلاصہ یہ کہ یہ صفت مقام کے قرینہ سے دونوں میں مشترک ہے۔

عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ: جوش مارنا چونکہ چشموں کے لیے لازم ہے، اس لیے یہ صفت پیچھے خواص کے چشموں میں بھی مشترک ہے، البتہ پیچھے خاص لوگوں کے چشمہ میں: تَجْرِيٰنِ یعنی ان چشموں کا جاری ہونا بھی بیان فرمایا ہے، اور یہاں یہ صفت نہیں بیان فرمائی، پس یہ اس کا قرینہ ہے کہ یہ چشمے جاری ہونے کی صفت میں ان سے کم ہیں، اور یہ باغ ان باغوں سے کم درجہ میں ہیں۔

نیز پیچھے خاص لوگوں کے باغ کی صفت میں خوف بمعنی تقوی کامل اور جزائے احسان بمعنی اخلاص ذکر فرمائی، اور یہاں ایسی کوئی صفت بیان نہ فرمانا بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ عام مؤمنین کے لیے ہے، اس لیے کسی خاص صفت کی قید بڑھانے کی ضرورت نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ شاید پہلے دو باغ مقربین کے لیے تھے اور یہ دونوں اصحاب یمین کے لیے ہیں۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ سبزی جب زیادہ گہری ہوتی ہے تو سیاہی مائل ہو جاتی ہے۔

فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾

ان میں میوے ہیں اور کھجوریں اور انار ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾

ان سب باغوں میں اچھی عورتیں ہیں خوب صورت ۲؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور) ان دونوں باغوں میں میوے اور کھجوریں اور انار ہوں گے، سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) ان (باغوں کے مکانات) میں خوب سیرت خوب صورت عورتیں ہوں گی (یعنی حوریں) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ: یہاں مطلق میوہ کا ذکر ہے، اور پھر اس کی تفصیل میں کھجور وانار پر اکتفا فرمایا، جبکہ پیچھے: **کل فاکھة** کا لفظ ہر قسم کے میوہ کو صراحۃً شامل ہے، پھر پیچھے لفظ **زوجان** فرمانے سے ہر میوہ کی متعدد قسمیں ہونا اور بھی زیادہ کثرت پر دلالت کرتا ہے، یہ بھی اس کا قرینہ ہے کہ پیچھے بیان کردہ باغ ان بعد والوں سے افضل واعلیٰ ہیں، وہ خاص ومقربین کے لیے ہے اور یہ عام مؤمنین کے لیے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ مگر یہاں کے انار اور کھجوروں پر قیاس نہ کیا جائے، ان کی کیفیت اللہ ہی جانے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اچھے اخلاق کی خوبصورت اور خوب سیرت۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾

حوریں رکی رہنے والیاں خیموں میں ۱؎ پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۵﴾

نہیں ہاتھ لگایا ان کو کسی آدمی نے ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

خلاصہ تفسیر: وہ عورتیں گوری رنگت والی ہوں گی (اور) خیموں میں محفوظ ہوں گی، سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے (اور) ان (جنتی) لوگوں سے پہلے ان پر نہ تو کسی آدمی نے تصرف کیا ہوگا اور نہ کسی جن نے (یعنی غیر مستعمل ہوں گی) سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہو جاؤ گے۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ: پیچھے حوروں کو یاقوت ومرجان سے تشبیہ دی گئی تھی جو کہ مبالغہ پر دلالت کرتا ہے، جبکہ یہاں حوروں کو صرف خوب صورت کہنے پر اکتفا فرمایا، یہ بھی اس کا قرینہ ہے پہلے بیان کردہ حوریں ان بعد والیوں سے افضل ہیں، اور حوروں کی باقی جتنی صفات یہاں مذکور ہیں وہ سب وہاں بھی صراحۃً یا اشارۃً مذکور ہیں، مثلاً خوش سیرت ہونا ''قاصرات الطرف'' (نیچی نگاہ والی) سے سمجھا جاتا ہے، کیونکہ نیچی نگاہ والی باحیا اور باعفت ہوگی، جس کے لیے خوش سیرت ہونا لازم ہے، اور لفظ مقصورات (خیمہ میں محفوظ) سے زیادہ عفت وحیا پر قاصرات الطرف (نیچی نگاہ والی) کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ جو ایسی ہوگی وہ ضرور گھر ہی میں رہے گی، اور حور ہونا مقام کے قرینہ سے سب میں مشترک ہے۔

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ: بظاہر ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن وانس دونوں جنت میں جائیں گے اور حوریں بھی دونوں کو ملیں گی اور: لَمْ يَطْمِثْهُنَّ کی تفسیر یہ ہوگی کہ جو حوریں انسان کے لیے خاص ہیں ان کو کسی انسان نے پہلے سے نہیں چھوا ہوگا، اور جن کے چھونے کا تو احتمال ہی نہیں، کیونکہ وہ انسان کے لیے خاص ہیں، اور جو حوریں جنوں کے لیے خاص ہیں ان کو کسی جن نے پہلے سے نہیں چھوا ہوگا، اور انسان کے چھونے کا تو احتمال ہی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت ذات کی خوبی گھر میں رکے رہنے ہی سے ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿۷۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾

تکیہ لگائے بیٹھے سبز مسندوں پر اور قیمتی بچھونے نفیس پر، پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے

ع ۱۲

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾

بڑی برکت ہے نام کو تیرے رب کی جو بڑائی والا اور عظمت والا ہے [1]

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ لوگ سبز مشجر (درختوں اور پھولوں کے نقش ونگار والے) اور عجیب خوبصورت کپڑوں (کے فرشوں) پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے، سوائے جن وانس! (نعمتوں کی اس کثرت اور عظمت کے باوجود) تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کے منکر ہوجاؤ گے (آگے خاتمہ میں حق تعالیٰ کی ثناوصفت ہے جس میں ان تمام مضامین کی جو سورۃ رحمٰن میں مفصل بیان ہوئے ہیں تائید وتاکید ہے کہ) بڑا بابرکت نام ہے آپ کے رب کا جو عظمت والا اور احسان والا ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ: اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرش پہلے جنتیوں کے فرش سے کم درجہ ہوں گے، کیونکہ پیچھے ان کے ریشمی ہونے کی تصریح ہے اور پھر دوہرا ہونے یعنی کپڑا کے ساتھ استر ہونے کی بھی، اور یہاں یہ نہیں ہے، پہلے باغوں کے افضل ہونے کے یہ سب تو لفظی قرائن تھے، اب دلائل لکھتا ہوں، درمنثور میں ولمن خاف اور و من دونهما کی تفسیر میں مرفوعا روایت ہے: "قال ﷺ جنتان من ذهب للمقربين و جنتان من ورق لأصحاب اليمين" کہ پہلے دو باغ سونے کے ہیں مقربین کے لیے، اور دو باغ چاندی کے ہیں اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنین کے لیے، اور براء بن عازب سے موقوفا روایت ہے: "قال العينان اللتان تجريان خير من النضاختين" یعنی پہلے دو باغوں کے چشمے جن کے بارے میں تجریان فرمایا ہے وہ بہتر ہے دوسرے دو باغوں کے چشموں سے جن کے متعلق نضّاختان فرمایا ہے، کیونکہ نضّاختان کے معنی ہیں ابلنے والے دو چشمے، تو یہ صفت ہر چشمہ میں ہوتی ہے، لیکن پہلے دو میں جن کو تجریان کے عنوان سے بیا کیا ہے ان میں ابلنے کے علاوہ دور تک سطح زمین پر جاری رہنے کی صفت مزید ہے۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ: یہاں "نام" سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں جو کہ ذات کی غیر نہیں، اور شاید لفظ "اسم" یعنی نام کے بڑھانے سے مقصود مبالغہ ہو کہ وہ خود تو کیسا کچھ کامل اور بابرکت ہوگا اسکا تو نام ہی مبارک اور کامل ہے، پس اسکا حاصل حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے کامل ہونے کی ثناء ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جس نے اپنے وفاداروں پر ایسے احسان وانعام فرمائے اور غور کرو تو تمام نعمتوں میں اصلی خوبی اسی کے نام پاک کی برکت سے ہے، اسی کا نام لینے سے یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں پھر سمجھ لو جس کے اسم میں اس قدر برکت ہے مسمّی میں کیا کچھ ہوگی۔

وَنَسْئَالُ اللّٰهَ الْكَرِيْمَ الْوَهَّابَ ذَاالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ اَنْ يَّجْعَلَنَا مِنْ اَهْلِ الْجَنَّتَيْنِ الْاَوَّلَيَيْنِ، اٰمين.

آیاتھا ۹۶ ۞ ۵۶ سُوۡرَةُ الۡوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ ۴۶ ۞ رکوعاتھا ۳

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ① لَيۡسَ لِوَقۡعَتِهَا كَاذِبَةٌ ② خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ③ وقف لازم

جب ہو پڑے ہو پڑنے والی، نہیں ہے اس کے ہو پڑنے میں کچھ جھوٹ ۱ پست کرنے والی ہے بلند کرنے والی ۲

خلاصہ تفسیر: یہ سورت مضامین کے اعتبار سے گذشتہ سورت کے قریب قریب مشابہ ہی ہے۔

جب قیامت آئے گی جس کے واقع ہونے میں کوئی خلاف نہیں (بلکہ اس کا واقع ہونا بالکل صحیح اور حق ہے) تو وہ (بعض کو) پست کردے گی (اور بعض کو) بلند کردے گی (یعنی اس دن کفار کی ذلت و پستی کا اور مومنین کی رفعت و بلندی کا ظہور ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قیامت جب ہو پڑے گی اس وقت کھل جائے گا کہ یہ کوئی جھوٹی بات نہیں، نہ اسے کوئی ٹال سکے گا، نہ واپس کر سکے گا اور: لَا يَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ يَّمُوۡتُ (النحل: ۳۸) وغیرہ کے جھوٹے دعوے سب ختم ہو جائیں، کوئی شخص جھوٹی تسلیوں سے اس دن کی ہولناک سختیوں کو گھٹانا چاہے یہ بھی نہ ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی ایک گروہ کو نیچے لے جاتی ہے اور ایک گروہ کو اوپر اٹھاتی ہے، بڑے بڑے متکبروں کو جو دنیا میں بہت معزز اور سربلند سمجھے جاتے تھے اسفل السافلین کی طرف دھکیل کر دوزخ میں پہنچادے گی اور کتنے ہی متواضعین کو جو دنیا میں پست اور حقیر نظر آتے تھے، ایمان و عمل صالح کی بدولت جنت کے اعلیٰ مقامات پر فائز کرے گی۔

إِذَا رُجَّتِ الۡأَرۡضُ رَجًّا ④ وَّبُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ⑤ فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡبَثًّا ⑥

جب لرزے زمین کپکپا کر، اور ریزہ ریزہ ہوں پہاڑ ٹوٹ پھوٹ کر، پھر ہو جائیں غبار اڑتا ہوا ۱

وَّكُنۡتُمۡ أَزۡوَاجًا ثَلٰثَةً ⑦

اور تم ہو جاؤ تین قسم پر ۲

خلاصہ تفسیر: جبکہ زمین کو سخت زلزلہ آئے گا، اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، پھر وہ پراگندہ غبار (کی طرح) ہو جائیں گے، اور تم (سب آدمی جو اس وقت موجود ہو یا پہلے گزر چکے ہیں یا آئندہ آنے والے ہیں) تین قسم ہو جاؤ گے (جن کی تفصیل آگے آتی ہے)۔

وَّكُنۡتُمۡ أَزۡوَاجًا ثَلٰثَةً: تمام مکلفین گذشتہ اور آئندہ تین قسم کے ہو جائیں گے: ① خواص مومنین ② عوام مومنین ③ کفار، سورۃ رحمن میں بھی یہی تین قسمیں مذکور ہیں، اب آگے آیات میں خواص مؤمنین کو ''مقربین'' اور ''سابقین'' کہا ہے، عوام مومنین کو ''اصحاب الیمین'' اور کفار کو ''اصحاب الشمال'' کہا ہے، آگے ان تینوں قسموں کے احکام الگ الگ مذکور ہیں، پہلے اجمالا، پھر تفصیلا۔

شروع سے یہاں تک ان آیات میں بعض واقعات نفخہ اولیٰ یعنی پہلے صور کے وقت کے بیان فرمائے ہیں جیسے: رُجَّتِ اور وَّبُسَّتِ جیسا کہ سورۃ حجر کے شروع میں آیا ہے، اور بعض واقعات نفخہ ثانیہ یعنی دوسرے صور کے وقت کے ہیں جیسے: خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ اور وَّكُنۡتُمۡ أَزۡوَاجًا ثَلٰثَةً، اور بعض واقعات مشترک ہیں جیسے: إِذَا وَقَعَتِ اور لَيۡسَ لِوَقۡعَتِهَا، چونکہ نفخہ اولیٰ سے نفخہ ثانیہ تک کا تمام وقت ایک وقت کے حکم میں ہے، اس لئے

ہر جزءِ وقت کو ہر واقعہ کا وقت کہا جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی زمین میں سخت زلزلہ آئے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر غبار کی طرح اڑتے پھریں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی وقوع قیامت کے بعد کل آدمیوں کی تین قسمیں کردی جائیں گی: ① دوزخی ② عام جنتی ③ اور خواص مقربین جو جنت کے نہایت اعلیٰ درجات پر فائز ہوں گے، آگے تینوں کا مجملاً ذکر کرتے ہیں، پھر ان کے احوال کی تفصیل بیان ہوگی۔

فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝۸ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝۹

پھر داہنے والے کیا خوب ہیں داہنے والے ۱ اور بائیں والے کیا برے لوگ ہیں بائیں والے ۲

خلاصہ تفسیر: اب ان تینوں قسموں کے احکام الگ الگ بیان کیے جاتے ہیں، پہلے اجمالا، پھر اس کے بعد تفصیلا:

(تین قسمیں جو مذکور ہیں) سو (ان میں ایک قسم یعنی) جو داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں (مراد اس سے وہ لوگ ہیں جن کے نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے، یہ صفت اگرچہ مقربین میں بھی مشترک ہے، لیکن یہاں صرف اسی صفت پر اکتفا کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ ان میں اصحاب الیمین ہونے سے زیادہ کوئی اور صفت خاص قرب کی نہیں پائی جاتی، اس لیے اس سے مراد عوام مؤمنین ہوئے، یہاں اجمالاً ان کی حالت کا اچھا ہونا بتلا دیا، آگے آیت: **فی سدر مخضود** الخ سے اس کی تفصیل کی گئی ہے) اور (دوسری قسم یعنی) جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے برے ہیں (مراد اس سے وہ لوگ ہیں جن کے نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے یعنی کفار، اس میں اجمالاً ان کی حالت کا برا ہونا بتلا دیا، آگے آیت: **فی سموم** الخ سے اس اجمال کی تفصیل کی گئی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو لوگ عرش عظیم کی داہنی طرف ہوں گے جن کو اخذ میثاق کے وقت آدم کے داہنے پہلو سے نکالا گیا تھا اور ان کا اعمال نامہ بھی داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور فرشتے بھی ان کو داہنی طرف سے لیں گے، اس روز ان کی خوبی و برکت کا کیا کہنا، شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی کی نسبت دیکھا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی داہنی طرف نظر کر کے ہنستے ہیں اور بائیں طرف دیکھ کر روتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یہ لوگ آدم کے بائیں پہلو سے نکالے گئے، عرش کے بائیں جانب کھڑے کیے جائیں گے، اعمالنامہ بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور فرشتے بائیں طرف سے ان کو پکڑیں گے، ان کی نحوست اور بدبختی کا کیا ٹھکانہ۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝۱۰ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝۱۱ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۱۲

اور اگاڑی والے تو اگاڑی والے، وہ لوگ ہیں مقرب، باغوں میں نعمت کے ۱

خلاصہ تفسیر: اور (تیسری قسم یعنی) جو اعلیٰ درجہ کے ہیں وہ و اعلی درجہ کے ہی ہیں (اور) وہ (خدا تعالیٰ کے ساتھ) خاص قرب رکھنے والے ہیں (اس میں تمام اعلیٰ درجہ کے بندے داخل ہیں جیسے، انبیاء، اولیاء، صدیقین اور کامل متقی، اس میں اجمالا ان کی حالت کا بلند ہونا بتلا دیا، اب اس اجمال کی تفصیل کی جاتی ہے، یعنی) یہ (مقرب) لوگ آرام کے باغوں میں ہوں گے (جس کی مزید تفصیل: **علیٰ سرر** سے آتی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو لوگ کمالات علمیہ وعملیہ اور مراتب تقویٰ میں دوڑ کر اصحاب یمین سے آگے نکل گئے، وہ حق تعالیٰ کی رحمتوں اور مراتب قرب و وجاہت میں بھی سب سے آگے ہیں: "وَهُمُ الْاَنْبِيَآءُ وَالرُّسُلُ وَالصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَاءُ يَكُوْنُوْنَ بَيْنَ يَدَى رَبِّهِمْ عَزّ وجل"، کما قال ابن کثیر)

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾

انبوہ ہے پہلوں میں سے، اور تھوڑے ہیں پچھلوں میں سے ل

خلاصہ تفسیر: اب درمیان میں ان خواص مقربین میں بہت سی جماعتوں کا شامل ہونا بتلاتے ہیں کہ:
ان (مقربین) کا ایک بڑا گروہ تو اگلے لوگوں میں سے ہوگا، اور تھوڑے پچھلے لوگوں میں سے ہوں گے (''اگلوں'' سے مراد متقدمین ہیں، یعنی آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر حضور ﷺ تک، اور ''پچھلوں'' سے مراد حضور ﷺ کے وقت سے لے کر قیامت تک)۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ: گذشتہ اور متقدمین لوگوں میں مقربین کی کثرت اور متاخرین یعنی بعد والوں میں مقربین کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ خواص ہر زمانہ میں کم ہوتے ہیں، اور متقدمین یعنی آدم علیہ السلام کے وقت سے خاتم الانبیاء ﷺ تک کا زمانہ بہت زیادہ طویل ہے، بہ نسبت امت محمدیہ کے زمانہ سے جو کہ قرب قیامت میں پیدا ہوئی ہے، پس جس قدر خواص اُس طویل زمانہ میں ہوئے ہیں اس کے مقابلہ میں امت محمدیہ کے خواص اس تھوڑے زمانہ میں عادتاً اُن سے کم ہی ہوں گے، کیونکہ اُس طویل زمانہ میں دو لاکھ یا کم وبیش تو انبیاء ہی ہیں، جبکہ خاتم الانبیاء ﷺ کے زمانہ میں کوئی اور نبی نہیں، اس لیے خواص مقربین کا بڑا گروہ متقدمین کا ہوگا، اور متاخرین یعنی امت محمدیہ میں اس سے کم ہوگا۔

بعض روایات میں جو آیا ہے: ''هما جميعا من هذه الامة'' یعنی یہ دونوں جماعتیں اسی امت محمدیہ میں سے ہوں گی، تو اس کی تاویل اس طور پر کی جائے گی کہ اس روایت میں آیت کی تفسیر مقصود نہ ہو، بلکہ مطلب یہ ہو کہ جس طرح قرآن میں مذکور ہے کہ متقدمین اولین میں مقربین زیادہ ہیں اور آخرین میں کم، اسی طرح خود اس امت میں بھی یہی نسبت ہوگی کہ امت محمدیہ کے قرون اولی میں مقربین زیادہ ہوں گے اور متاخرین میں کم، اگرچہ یہ قرآن کا مدلول نہ ہو، اسے خوب سمجھ لو، چنانچہ یہاں آیت: وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ کا خاص مقربین کے بارے میں ہونا اور آگے آنے والی آیت: وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ کا اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنین کی شان میں ہونا صاف مدلول قرآنی ہے۔

* * *

فائدہ: ل حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''پہلے کہا، پہلی امتوں کو، اور پچھلی یہ امت (محمدیہ ﷺ) یا پہلے اسی امت کے (مراد ہوں) یعنی اعلیٰ درجہ کے لوگ پہلے بہت ہو چکے ہیں، پیچھے کم ہوتے ہیں''۔

تنبیہ: اکثر مفسرین نے آیت کی تفسیر میں یہ دونوں احتمال بیان کیے ہیں، حافظ ابن کثیرؒ نے دوسرے احتمال کو ترجیح دی اور روح المعانی میں طبرانی وغیرہ سے ایک حدیث ابوبکرہ کی بسند حسن نقل کی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے آیت کے متعلق فرمایا: ''هُمَا جَمِيْعًا مِنْ هٰذِهِ الامة''، واللہ اعلم۔
ابن کثیرؒ نے ایک تیسرا مطلب آیت کا بیان کیا ہے، احقر کو وہ پسند ہے، یعنی ہر امت کے پہلے طبقہ میں نبی کی صحبت یا قرب عہد کی برکت سے اعلیٰ درجہ کے مقربین جس کثرت سے ہوئے ہیں، پچھلے طبقوں میں وہ بات نہیں رہی، کما قال ﷺ: ''خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُم'' ہاں! اگر ابوبکرہ کی حدیث صحیح ہو جیسا کہ روح المعانی میں ہے تو ظاہر ہے وہ ہی مطلب متعین ہوگا۔

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾

بیٹھے ہیں جڑاؤ تختوں پر ل تکیہ لگائے ان پر ایک دوسرے کے سامنے ۲

خلاصہ تفسیر: (آگے مقربین خواص کے لئے جو آرام اور نعمتیں مقرر ہیں ان کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ (مقرب) لوگ سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے (حضرت ابن عباسؓ سے لفظ موضونۃ کی یہی تفسیر نقل کی گئی ہے)۔

* * *

فائدہ: ل جو سونے کے تاروں سے بنے گئے ہیں۔
فائدہ: ۲ یعنی نشست ایسی ہوگی کہ کسی ایک کی پیٹھ دوسرے کی طرف نہ رہے گی۔

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾

لیے پھرتے ہیں ان کے پاس لڑکے سدا رہنے والے ۱؎ آبخورے اور کوزے اور پیالہ نتھری شراب کا

لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

جس سے نہ سر دکھے اور نہ بکواس لگے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور) ان کے پاس ایسے لڑکے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے یہ چیزیں لے کر آمد و رفت کیا کریں گے آبخورے اور آفتابے اور ایسا جام شراب جو بہتی ہوئی شراب سے بھرا جائے گا (اس کی تحقیق سورۃ صافات میں گزر چکی ہے) نہ اس سے ان کو درد سر ہوگا اور نہ اس سے عقل میں فتور آئے گا (یہ بھی سورۃ صافات میں گزر چکا ہے)۔

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ: ان ولدان یا غلمان یعنی لڑکوں کے بارہ میں راجح قول جس کو خازن نے صحیح اور ظنی طور پر حق کو اس میں منحصر کیا ہے یہ ہے کہ وہ حوروں کی طرح جنت کی ایک مستقل مخلوق ہے، اور "ولدان" میں ولادت کے معنی ماخوذ نہیں جس سے یہ شبہ ہو کہ وہ بطور ولادت کے پیدا ہوئے ہیں، اور ان لڑکوں کے خادم بنانے میں حکمت محض فرحت ہے بلا شہوت کے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی خدمت کے لیے لڑکے ہوں گے جو سدا ایک حالت پر رہیں گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی نتھری اور صاف شراب جس کے قدرتی چشمے جاری ہوں گے اس کے پینے سے نہ سر گرانی ہوگی نہ بکواس لگے گی کیونکہ اس میں نشہ نہ ہوگا، خالص سرور اور لذت ہوگی۔

وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾

اور میوہ جونسا پسند کرلیں، اور گوشت اڑتے جانوروں کا جس قسم کا جی چاہے ۱؎ اور عورتیں گوری بڑی آنکھوں والیاں

كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءً ۢبِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

جیسے موتی کے دانے اپنے غلاف کے اندر ۲؎ بدلہ ان کاموں کا جو کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: اور میوے جن کو وہ پسند کریں، اور پرندوں کا گوشت جو ان کو مرغوب ہو، اور ان کے لئے گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی (مراد حوریں ہیں جن کی رنگت ایسی صاف شفاف ہوگی) جیسے (حفاظت سے) پوشیدہ رکھا ہوا موتی، یہ ان کے اعمال کے صلہ میں ملے گا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس وقت جو میوہ پسند ہوا اور جس قسم کا گوشت مرغوب ہو بدون محنت و تعب کے پہنچے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی صاف موتی کی طرح جس پر گرد و غبار کا ذرا بھی اثر نہ آیا ہو۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾

نہیں سنیں گے وہاں بکواس اور نہ گناہ کی بات، مگر ایک بولنا سلام سلام ۱؎

خلاصہ تفسیر: (اور) وہاں نہ بک بک سنیں گے اور نہ وہ کوئی اور بیہودہ بات (سنیں گے، یعنی شراب پی کر یا ویسے بھی ایسی چیزیں نہ پائی جائیں گے جن سے عیش مکدر ہوتا ہے) بس (ہر طرف سے) سلام ہی سلام کی آواز آئے گی (جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ، نیز ارشاد ہے: وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ اور ہر طرف سے سلام کی آواز آنا اکرام و تعظیم کی دلیل ہے، غرض روحانی جسمانی ہر طرح کی لذت و مسرت اعلیٰ درجہ کی ہوگی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی لغو اور واہیات باتیں وہاں نہیں ہوں گی نہ کوئی جھوٹ بولے گا نہ کسی پر جھوٹی تہمت رکھے گا، بس ہر طرف سے سلام سلام کی آوازیں آئیں گی، یعنی جنتی ایک دوسرے کو اور فرشتے جنتیوں کو سلام کریں گے، اور رب کریم کا سلام پہنچے گا جو بہت ہی بڑے اعزاز و اکرام کی صورت ہے اور سلام کی یہ کثرت اس کی طرف اشارہ ہے کہ اب یہاں پہنچ کر تم تمام آفات اور مصائب سے محفوظ اور صحیح و سالم رہو گے نہ کسی طرح کا آزار پہنچے گا نہ موت آئے گی نہ فنا۔

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾

اور داہنے والے کیا کہنے داہنے والوں کے، رہتے ہیں بیری کے درختوں میں جن کا کانٹا نہیں ۱ اور کیلے تہہ پر تہہ، اور سایہ لمبا ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے سابقین اور خاص مقربین کا اجر و ثواب بیان کیا گیا، اب آگے اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنین کے اجر و ثواب اور جزا کی تفصیل ہے۔

اور جو داہنے والے ہیں وہ داہنے والے کیسے اچھے ہیں (یہ اجمالی مضمون پہلے بھی آچکا ہے، لیکن چونکہ درمیان میں فاصلہ ہوگیا تھا اس لیے دوبارہ لایا گیا، اب آگے ان کے اچھے ہونے کا بیان ہے کہ) وہ ان باغوں میں ہوں گے جہاں بے خار (کانٹوں کے بغیر) بیریاں ہوں گی، اور تہہ بتہ کیلے ہوں گے، اور لمبا لمبا سایہ ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱ جو قسم قسم کے مزیدار پھلوں سے لدے ہوں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی نہ دھوپ ہوگی نہ گرمی سردی لگے گی، نہ اندھیرا ہوگا، صبح کے بعد اور طلوع شمس سے پہلے جیسا درمیانی وقت ہوتا ہے ایسا معتدل سایہ سمجھو اور لمبا پھیلا ہوا اتنا کہ بہترین تیز رفتار گھوڑا سو برس تک متواتر چلتا رہے تو ختم نہ ہو۔

وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾

اور پانی بہتا ہوا، اور میوہ بہت، نہ اس میں سے ٹوٹا اور نہ روکا ہوا ۱ اور بچھونے اونچے ۲

خلاصہ تفسیر: اور چلتا ہوا پانی ہوگا اور کثرت سے میوے ہوں گے جو نہ ختم ہوں گے (جیسے دنیا کے میوے فصل ختم ہونے سے ختم ہوجاتے ہیں) اور نہ ان کی روک ٹوک ہوگی (جیسے دنیا میں باغ والے اس کی روک تھام کرتے ہیں) اور اونچے اونچے فرش (کیونکہ جن درجوں میں وہ بچھے ہوں گے وہ درجے بلند) ہوں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ بہت قسم کا میوہ، نہ پہلے اس میں سے کسی نے توڑا نہ دنیا کے موسمی میووں کی طرح آئندہ ختم ہو نہ اس کے لینے میں کسی قسم کی روک ٹوک پیش آئے۔

فائدہ: ۲ یعنی بے حد دبیز اور اونچے ظاہر میں بھی اور رتبہ میں بھی۔

إِنَّآ أَنْشَأْنٰهُنَّ إِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ أَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا أَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ لِّأَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۳۸﴾ ۱۴۷۱۴ع

ہم نے اٹھایا ان عورتوں کو ایک اچھی اٹھان پر، پھر کیا ان کو کنواریاں، پیار دلانے والیاں ہم عمر واسطے داہنے والوں کے لے

ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾

انبوہ ہے پہلوں میں سے، اور انبوہ ہے پچھلوں میں سے ۲

خلاصہ تفسیر: چونکہ اس مقام پر عیش و آرام کا ذکر ہے اور عیش و آرام عورتوں کے بغیر کامل نہیں ہوتا، اس وجہ سے ان اسباب عیش کے ذکر ہی سے عورتوں کا وہاں ہونا بھی معلوم ہو گیا، چنانچہ اب جنت کی عورتوں کی طرف أَنْشَأْنٰهُنَّ کی ضمیر راجع کر کے ان کا ذکر فرمایا جاتا ہے کہ:

ہم نے (وہاں کی) ان عورتوں کو (جن میں جنت کی حوریں بھی شامل ہیں اور دنیا کی عورتیں بھی، ان سے مراد وہ عورتیں ہیں جو دنیا میں بوڑھی یا بدشکل تھیں، ان کے متعلق فرمایا کہ ہم نے ان عورتوں کو) خاص طور پر بنایا ہے (جن کی تفصیل آگے ہے) یعنی ہم نے ان کو ایسا بنایا کہ وہ کنواریاں ہیں (یعنی صحبت کے بعد پھر کنواری ہو جائیں گی، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی مرفوع حدیث سے ثابت ہے اور) محبوبہ ہیں (یعنی حرکات و شمائل، ناز و انداز، حسن و جمال سب چیزیں ان کی دلکش ہیں، اور اہل جنت کی) ہم عمر ہیں (اس کی تحقیق سورۂ ص میں گزر چکی ہے) یہ سب چیزیں داہنے والوں کے لئے ہیں (آگے یہ بتلاتے ہیں کہ داہنے والے بھی مختلف قسم کے لوگ ہوں گے یعنی) ان (اصحاب الیمین) کا ایک بڑا گروہ اگلے لوگوں میں سے ہوگا اور ایک بڑا گروہ پچھلے لوگوں میں سے ہوگا (بلکہ متاخرین یعنی بعد والوں میں اصحاب الیمین کی تعداد متقدمین یعنی گذشتہ زمانہ کے لوگوں سے زیادہ ہوگی)۔

إِنَّآ أَنْشَأْنٰهُنَّ إِنْشَآءً: یہ عام ہے حوروں کو بھی اور دنیا کی عورتوں کو بھی، جیسا کہ ترمذی وغیرہ میں مرفوعاً روایت ہے: "ان المنشآت اللاتی کن فی الدنیا عجائز عمشا رمصا" یعنی اس آیت میں جن عورتوں کی جدید تخلیق کا ذکر ہے ان سے مراد وہ عورتیں ہیں جو دنیا میں بوڑھی یا بدشکل تھیں۔

وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ: چنانچہ احادیث میں تصریح ہے کہ اس امت کے مؤمنین کا مجموعہ پچھلی تمام امتوں کے مؤمنین کے مجموعہ سے زیادہ ہوگا، اور اس کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنین اس امت میں ان سے زیادہ ہوں، کیونکہ خواص مقربین کا متقدمین یعنی گذشتہ لوگوں میں زیادہ ہونا تو پیچھے آیت سے معلوم ہو چکا ہے، اور جب اصحاب الیمین مرتبہ میں مقربین سے کم ہیں تو ان کی جزا بھی کم ہوگی، سو اس کی توجیہ یہ ہے کہ پیچھے مقربین کی جزا میں وہ سامان عیش زیادہ مذکور ہے جو شہر والوں کو زیادہ مرغوب ہوتا ہے، اور یہاں اصحاب الیمین کی جزا میں وہ سامان عیش زیادہ مذکور ہے جو دیہات و قصبات والوں کو مرغوب ہوتا ہے، پس اس میں اس طرف اشارہ ہو گیا کہ ان دونوں میں ایسا فرق و تفاوت ہوگا جیسا کہ شہر والوں اور دیہات والوں میں ہوتا ہے، بعض روایات میں ہے کہ پیچھے جب آیت: وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ نازل ہوئی تو صحابہ کرام کو شاق ہوا کہ خواص مقربین امت محمدیہ میں سے کم ہوں گے تو اس پر مذکورہ آیت: وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ نازل ہوئی، اس روایت سے شبہ ہوتا ہے کہ پھر تو قلیل اور ثلۃ کا مصداق ایک ہی ہوا، کیونکہ دونوں جگہ امت محمدیہ ہی مراد ہے، تو اس کی بھی اسی طرح تاویل کی جائے گی کہ صحابہ کرام نے جب پہلے خواص مقربین کے بارہ میں آیت: وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ سنی تو انہیں یہ گمان ہوا کہ شاید یہی نسبت گذشتہ امتوں اور اس امت محمدیہ کے عام مؤمنین میں بھی ہوگی کہ وہ متقدمین میں سے زیادہ ہوں اور اس امت محمدیہ میں کم، اس لیے یہاں اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ وہ نسبت صرف مقربین میں ہے اور اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنین میں دوسری نسبت ہے جو یہاں خلاصہ تفسیر میں بیان کر دی گئی۔

* * *

فائدہ: لے یعنی حوریں اور دنیا کی عورتیں جو جنت میں ملیں گی وہاں ان کی پیدائش اور اٹھان خدا کی قدرت سے ایسی ہوگی کہ ہمیشہ خوبصورت جوان بنی رہیں گی، جن کی باتوں اور طرز و انداز پر بے ساختہ پیار آئے اور سب کو آپس میں ہم عمر رکھا جائے گا اور ان کے ازواج کے ساتھ بھی

عمر کا تناسب برابر قائم رہے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی اصحاب یمین پہلوں میں بھی بکثرت ہوئے ہیں اور پچھلوں میں بھی ان کی بہت کثرت ہوگی۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾

اور بائیں والے کیسے بائیں والے، تیز بھاپ میں اور جلتے پانی میں

وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿۴۴﴾

اور سایہ میں دھوئیں کے، نہ ٹھنڈا اور نہ عزت کا ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور (اب آگے کفار کا اور ان کے عذاب کا ذکر ہے، یعنی) جو بائیں والے ہیں وہ بائیں والے کیسے برے ہیں (اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ) وہ لوگ آگ میں ہوں گے اور کھولتے ہوئے پانی میں، اور سیاہ دھویں کے سایہ میں، جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ فرحت بخش ہوگا (یعنی سایہ سے ایک تو جسمانی نفع ہوتا ہے راحت اور ٹھنڈک، اور ایک روحانی نفع ہوتا ہے لذت و فرحت، وہاں دونوں نہ ہوں گے، یہ وہی دھواں ہے جس کا ذکر پیچھے سورۂ رحمٰن میں نُحَاس کے لفظ سے آیا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دوزخ کے آگے سے کالا دھواں اٹھے گا، اس کے سائے میں رکھے جائیں گے، جس سے کوئی جسمانی یا روحانی آرام نہ ملے گا، نہ ٹھنڈک پہنچے گی، نہ وہ عزت کا سایہ ہوگا، ذلیل وخوار اس کی تپش میں بھنتے رہیں گے، یہ ان کی دنیاوی خوشحالی کا جواب ہوا جس کے غرور میں اللہ و رسول سے ضد باندھی تھی۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾

وہ لوگ تھے اس سے پہلے خوش حال، اور ضد کرتے تھے اس بڑے گناہ پر ۱؎

خلاصہ تفسیر: (آگے اس عذاب کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ) وہ لوگ اس کے قبل (یعنی دنیا میں) بڑی خوشحالی میں رہتے تھے اور (اس خوشحالی کے گھمنڈ میں) بڑے بھاری گناہ (یعنی شرک وکفر) پر اصرار کیا کرتے تھے (مطلب یہ کہ ایمان نہیں لاتے تھے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ وہ بڑا گناہ کفر و شرک ہے اور تکذیب انبیاء یا جھوٹی قسمیں کھا کر یہ کہنا کہ مرنے کے بعد ہرگز کوئی زندگی نہیں، کما قال تعالیٰ: وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ (النحل:۳۸)

وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور کہا کرتے تھے کیا جب ہم مر گئے اور ہو چکے مٹی اور ہڈیاں کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گا، اور کیا ہمارے اگلے باپ دادے بھی ۱؎

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾

تو کہہ دے کہ اگلے اور پچھلے، سب اکٹھے ہونے والے ہیں ایک دن مقرر کے وقت پر ۲؎

خلاصہ تفسیر: ان کو حق کی طلب نہ ہونے اور قیامت کا انکار کرنے میں کفر کا زیادہ دخل ہے، چنانچہ اب آگے اسی کا بیان ہے:

اور یوں کہا کرتے تھے کہ جب ہم مرگئے اور مٹی اور ہڈیاں (ہوکر) رہ گئے تو کیا (اس کے بعد) ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی (زندہ ہوں گے، چونکہ منکرین قیامت میں بعض کفار پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں بھی تھے اس لئے اس کے متعلق ارشاد ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ سب اگلے اور پچھلے، جمع کئے جائیں گے ایک معین تاریخ کے وقت پر۔

* * *

فائدہ: [۱] جو ہم سے بھی پہلے مرچکے، یعنی یہ بات کسی کی سمجھ میں آسکتی ہے۔

فائدہ: [۲] یعنی قیامت کے دن جس کا وقت اللہ کے علم میں مقرر ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿٥١﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿٥٢﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿٥٣﴾

پھر تم جو ہو اے بہکے ہوؤ جھٹلانے والو، البتہ کھاؤ گے ایک درخت سینڈھ کے سے، پھر بھرو گے اس سے پیٹ [۱]

فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿٥٤﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿٥٥﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٥٦﴾

پھر پیو گے اس پر ایک جلتا پانی، پھر پیو گے جیسے پئیں اونٹ تونس سے ہوئے [۲] یہ مہمانی ہے ان کی انصاف کے دن [۳]

خلاصہ تفسیر: پھر (جمع ہونے کے بعد) تم کو اے گمراہو! جھٹلانے والو! درخت زقوم سے کھانا ہوگا، پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا، پھر اس پر کھولتا ہوا پانی پینا ہوگا، پھر پینا بھی پیاسے اونٹوں کا سا (غرض) ان لوگوں کی قیامت کے روز یہ مہمانی ہوگی۔

* * *

فائدہ: [۱] یعنی جب بھوک سے مضطر ہوں گے تو یہ درخت کھانے کو ملے گا اور اسی سے پیٹ بھرنا پڑے گا۔

فائدہ: [۲] یعنی گرمی میں تونسا ہوا اونٹ جیسے پیاس کی شدت سے ایک دم پانی چڑھاتا چلا جاتا ہے، یہی حال دوزخیوں کا ہوگا لیکن وہ گرم پانی جب منہ کے قریب پہنچائیں گے تو منہ کو بھون ڈالے گا، اور پیٹ میں پہنچے گا تو آنتیں کٹ کر باہر آپڑیں گی۔ (العیاذ باللہ)

فائدہ: [۳] یعنی انصاف کا مقتضاء یہی تھا کہ ان کی مہمانی اس شان سے کی جائے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿٥٧﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿٥٨﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿٥٩﴾

ہم نے تم کو بنایا پھر کیوں نہیں سچ مانتے [۱] بھلا دیکھو تو جو پانی تم ٹپکاتے ہو، اب تم اس کو بناتے ہو یا ہم ہیں بنانے والے [۲]

خلاصہ تفسیر: پیچھے عذاب کی علت بیان فرماتے ہوئے کفار کا شرک وکفر اور قیامت کا انکار بیان کیا تھا، اب آگے خدا کے بعض تصرفات یاد دلا کر اس کفر و انکار کو اس طرح باطل فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ تصرفات نعمت بھی ہیں، پھر شرک وکفر کیسے کرتے ہو، اور یہ تصرفات قدرت کے دلائل بھی ہیں، پھر قیامت کے ممکن ہونے کا کیسے انکار کرتے ہو۔

ہم نے تم کو (پہلی بار) پیدا کیا ہے (جس کو تم بھی تسلیم کرتے ہو) تو پھر تم (اس کے نعمت ہونے کی وجہ سے توحید کو کیوں نہیں مانتے، اور دلیل قدرت ہونے کی وجہ سے دوبارہ زندہ ہونے کی) تصدیق کیوں نہیں کرتے (آگے اس پیدائش کی پھر باقی رکھنے کے اسباب کی تفصیل وتذکیر ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہنچاتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں (اور ظاہر ہے کہ ہم ہی بناتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: [۱] یعنی اس بات کو کیوں نہیں مانتے کہ پہلے بھی اس نے پیدا کیا اور وہ ہی دوبارہ پیدا کرے گا۔

فائدہ: [۲] یعنی رحم مادر میں نطفہ سے انسان کون بناتا ہے،؟ وہاں تو تمہارا کسی کا ظاہری تصرف بھی نہیں چلتا، پھر ہمارے سوا کون ہے جو پانی کے قطرہ پر ایسی خوبصورت تصویر کھینچتا اور اس میں جان ڈالتا ہے۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿٦٠﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ

ہم ٹھہرا چکے تم میں مرنا ۱؎ اور ہم عاجز نہیں، اس بات سے کہ بدلے میں لے آئیں تمہاری طرح کے لوگ اور اٹھا کھڑا کریں تم کو

فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾

وہاں جہاں تم نہیں جانتے ۲؎ اور تم جان چکے ہو پہلا اٹھان پھر کیوں نہیں یاد کرتے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اور) ہم ہی نے تمہارے درمیان میں موت کو (معین وقت پر) ٹھہرا رکھا ہے (مطلب یہ کہ بنانا اور اس بنائے ہوئے کو ایک وقت خاص تک باقی رکھنا یہ سب ہمارا ہی کام ہے، آگے یہ بتلاتے ہیں کہ جیسا انسان کی ذات کا پیدا کرنا اور باقی رکھنا ہمارا کام ہے، اسی طرح تمہاری موجودہ صورت کو باقی رکھنا بھی ہمارا ہی کام ہے) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ تو تم جیسے اور (آدمی) پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت بنا دیں جن کو تم جانتے بھی نہیں (یعنی مثلاً آدمی سے جانور کی صورت میں مسخ کر دیں جس کا گمان بھی نہ ہو) اور (آگے تنبیہ ہے اس کی دلیل پر یعنی) تم کو اول پیدائش کا علم حاصل ہے (کہ وہ ہماری قدرت سے ہے) پھر تم کیوں نہیں سمجھتے (کہ سمجھ کر اس نعمت کا شکر ادا کرو اور توحید کا اقرار کرو اور قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے پر بھی استدلال کرو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جلانا مارنا سب ہمارے قبضے میں ہے جب وجود و عدم کی باگ ہمارے ہاتھ میں ہوئی تو مرنے کے بعد اٹھا دینا کیا مشکل ہوگا۔

فائدہ: ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یعنی تم کو اور جہان میں لے جائیں۔ تمہاری جگہ یہاں اور خلقت بسا دیں"۔

فائدہ: ۳؎ یعنی پہلی پیدائش کو یاد کر کے دوسری کو بھی سمجھ لو۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿٦٣﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا

بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو، کیا تم اس کو کرتے ہو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کر دینے والے ۱؎ اگر ہم چاہیں تو کر ڈالیں اس کو روندا ہوا گھانس

فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٦٧﴾

پھر تم سارے دن رہو باتیں بناتے، ہم تو قرض دار رہ گئے، بلکہ ہم بے نصیب ہو گئے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے ایک دوسری تنبیہ ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ تم جو کچھ (بیج تخم وغیرہ) بوتے ہو اس کو تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں؟ (یعنی زمین میں بیج ڈالنے میں تو تم کو کچھ دخل ہے بھی، لیکن اس کو زمین سے نکالنا یہ کس کا فعل ہے؟ اب آگے یہ بتلاتے ہیں کہ زمین سے درخت اگانا جیسے ہمارا کام ہے، آگے اس درخت سے تمہارا فائدہ اٹھانا بھی ہماری قدرت و حکمت پر موقوف ہے، جیسا اوپر بھی فرمایا تھا یعنی) اگر ہم چاہیں تو اس (پیداوار) کو چورا چورا کر دیں (یعنی دانہ کچھ نہ پڑے، پتی خشک ہو کر ریزہ ہو جائے) پھر تم متعجب ہو کر رہ جاؤ کہ (اب کے تو) ہم پر تاوان ہی پڑ گیا (یعنی سرمایہ میں نقصان آ گیا، اور نقصان کیا) بلکہ بالکل ہی محروم رہ گئے (یعنی سارا ہی سرمایہ گیا گزرا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بظاہر بیج زمین میں تم ڈالتے ہو لیکن زمین کے اندر اس کی پرورش کرنا پھر باہر نکال کر ایک لہلہاتی کھیتی بنا دینا کس کا کام ہے اس کے متعلق تو ظاہری اور سطحی دعویٰ بھی تم نہیں کر سکتے کہ ہماری تیار کی ہوئی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی کھیتی پیدا کرنے کے بعد اس کا محفوظ اور باقی رکھنا بھی ہمارا ہی کام ہے، ہم چاہیں تو کوئی آفت بھیج دیں جس سے ایک دم میں ساری کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے پھر تم سر پکڑ کر روؤ اور آپس میں بیٹھ کر باتیں بنانے لگو کہ میاں ہمارا تو بڑا بھاری نقصان ہو گیا، بلکہ سچ پوچھو تو بالکل خالی ہاتھ ہو گئے۔

أَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِى تَشْرَبُونَ ﴿٦٨﴾ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ﴿٦٩﴾

بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو، کیا تم نے اتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اتارنے والے ۱

لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنَٰهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٧٠﴾

اگر ہم چاہیں کر دیں اس کو کھارا پھر کیوں نہیں احسان مانتے ۲

خلاصہ تفسیر: (آگے تیسری تنبیہ ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برسانے والے ہیں؟ (پھر اس پانی کو پینے کے قابل بنانا ہماری دوسری نعمت ہے کہ) اگر ہم چاہیں اس کو کڑوا کر ڈالیں تو تم شکر کیوں نہیں کرتے (اور بڑا شکر عقیدہ توحید پر ایمان اور شرک و کفر کو چھوڑ دینا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بارش بھی ہمارے حکم سے آتی ہے اور زمین کے خزانوں میں وہ پانی ہم ہی جمع کرتے ہیں، تم کو کیا قدرت تھی کہ پانی بنا لیتے یا خوشامد اور زبردستی کر کے بادل سے چھین لیتے۔

فائدہ: ۲ یعنی ہم چاہیں تو میٹھے پانی کو بدل کر کھاری کڑوا بنا دیں جو نہ پی سکو نہ کھیتی کے کام آئے، پھر احسان نہیں مانتے کہ ہم نے میٹھے پانی کے کتنے خزانے تمہارے ہاتھ میں دے رکھے ہیں، بعض روایات میں ہے کہ نبی کریم ﷺ پانی پی کر فرماتے تھے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ سَقَانَاهُ عَذْبًا فُرَاتًا بِرَحْمَتِهٖ وَلَمْ يَجْعَلْهُ مِلْحًا أُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا". (ابن کثیر)

أَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِى تُورُونَ ﴿٧١﴾ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ أَمْ نَحْنُ الْمُنشِـُٔونَ ﴿٧٢﴾

بھلا دیکھو تو آگ جس کو تم سلگاتے ہو، کیا تم نے پیدا کیا اس کو درخت یا ہم ہیں پیدا کرنے والے ۱

نَحْنُ جَعَلْنَٰهَا تَذْكِرَةً وَمَتَٰعًا لِّلْمُقْوِينَ ﴿٧٣﴾

ہم نے ہی تو بنایا وہ درخت یاد دلانے کو ۲ اور برتنے کو جنگل والوں کے ۳

خلاصہ تفسیر: (آگے چوتھی تنبیہ ہے یعنی) اچھا پھر یہ بتلاؤ جس آگ کو تم سلگاتے ہو اس کے درخت کو (جس میں سے یہ آگ جھڑتی ہے جس کا بیان سورۃ یس کے آخر میں آ چکا ہے اور اسی طرح جن ذرائع سے یہ آگ پیدا ہوتی ہے ان ذرائع کو) تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے اس کو (دوزخ کی آگ نمونہ یا اپنی عجیب قدرت کی) یاددہانی کی چیز (یہ دینی فائدہ ہوا) اور مسافروں کے لئے فائدہ کی چیز بنایا ہے (یہ دنیاوی فائدہ ہوا کہ کھانا پکانے کے علاوہ سفر وغیرہ میں اس سے کام بھی نکلتے ہیں)۔

وَمَتَٰعًا لِّلْمُقْوِينَ: یہاں بطور خاص صرف مسافر کا ذکر اس لیے کیا کہ سفر میں آگ کی ضرورت بہت پڑتی ہے اور کم ملنے کی وجہ سے بڑی عجیب چیز معلوم ہوتی ہے اور سفر میں اس کی قدر بھی بہت ہوتی ہے، چنانچہ سفر یا مسافر میں حصر مقصود نہیں ہے، اور مَتَٰعًا کے لفظ سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ آگ سے فائدہ اٹھانا بھی ہماری قدرت ہی کی وجہ سے ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ عرب میں کئی درخت سبز ایسے ہیں جن کو رگڑنے سے آگ نکلتی ہے جیسے ہمارے ہاں بانس، پہلے سورۃ یس میں اس کا بیان ہو چکا، یعنی ان درختوں میں آگ کس نے رکھی ہے، تم نے یا ہم نے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یہ آگ دیکھ کر دوزخ کی آگ کو یاد کریں کہ یہ بھی اسی کا ایک حصہ اور ادنیٰ نمونہ ہے اور سوچنے والے کو یہ بات بھی یاد آسکتی ہے کہ جو خدا سبز درخت سے آگ نکالنے پر قادر ہے وہ یقیناً مردہ کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہوگا۔

فائدہ: ۳؎ جنگل والوں اور مسافروں کو آگ سے بہت کام پڑتا ہے خصوصاً جاڑے کے موسم میں اور یوں تو سب ہی کا کام اس سے چلتا ہے۔

تنبیہ: بعض روایات کی بناء پر علماء نے مستحب سمجھا ہے کہ ان آیات میں ہر جملہ استفہامیہ کو تلاوت کرنے کے بعد کہے "بل انت یارب"۔

ع ۲ ۱۵ فَسَبِّحۡ بِٱسۡمِ رَبِّكَ ٱلۡعَظِيمِ ﴿٧٤﴾

سو بول پاکی اپنے رب کے نام کی جو سب سے بڑا

خلاصہ تفسیر: سو (جس کی ایسی قدرت ہے) اپنے (اُس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (وتحمید) کیجئے (کیونکہ ذات وصفات کا کامل ہونا اس بات کا تقاضا اور مطالبہ کرتا ہے کہ ایسا خدا حمد وثنا کا ضرور مستحق ہے اور پیچھے بیان کردہ سب نعمتیں توحید کو بھی ثابت کرتی ہیں اور قیامت کے ممکن ہونے کے بھی دلائل ہیں)۔

فَسَبِّحۡ بِٱسۡمِ رَبِّكَ: "نام کی تسبیح" وغیرہ کی تحقیق سورۃ رحمن کی آخری آیت میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایے۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: جس نے ایسی مختلف اور کارآمد چیزیں پیدا کیں اور خالص اپنے فضل واحسان سے ہم کو منتفع کیا اس کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور منکرین کی گھڑی ہوئی خرافات سے اس کی اور اس کے نام مبارک کی پاکی بیان کرنا چاہیے، تعجب ہے کہ لوگ ایسی آیات باہرہ دیکھنے کے بعد بھی اس کی قدرت و وحدانیت کو کماحقہ نہیں سمجھتے۔

فَلَآ أُقۡسِمُ بِمَوَٰقِعِ ٱلنُّجُومِ ﴿٧٥﴾ وَإِنَّهُۥ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُونَ عَظِيمٌ ﴿٧٦﴾

سو میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے ڈوبنے کی ۱؎ اور یہ قسم ہے اگر سمجھو تو بڑی قسم

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید اور قیامت پر عقلی دلائل بیان کیے گئے ہیں، چونکہ ان لوگوں کو قرآن میں بھی کلام تھا جس میں یہ سب دلائل بیان ہوئے، اس لیے آگے قرآن کی حقانیت ثابت کرتے ہیں، اس طرح عقلی دلائل کے ساتھ نقلی دلیل بھی قائم ہو جائے گی جس سے قیامت کا واقع ہونا ثابت ہوتا ہے، اس کے بعد پھر قیامت اور جزا وسزا کا واقع ہونا اور کسی قدر اس کی تفصیل ارشاد ہے، اور اس مضمون سے توحید بھی ثابت ہوتی ہے۔

(عقلی دلائل سے بعث یعنی مر کر زندہ ہونے کا امکان ثابت ہونے کے بعد قرآن سے اس کا واقع ہونا ثابت ہے اور تم اس قرآن ہی کو نہیں مانتے) سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے۔

فَلَآ أُقۡسِمُ بِمَوَٰقِعِ ٱلنُّجُومِ: یہاں ستاروں کے چھپنے کی قسم کھانا اپنے مقصود ومفہوم کے اعتبار سے ویسا ہی ہے جیسے سورہ والنجم کے شروع میں ہے، جس میں اشارہ ہے رسول اللہ ﷺ کے رہنما ہونے کی طرف، یعنی جیسا کہ ستاروں سے راستہ معلوم کیا کرتے ہیں اسی طرح آپ ﷺ سے بھی راہ حق کی ہدایت ہوتی ہے۔

وَإِنَّهُۥ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُونَ عَظِيمٌ: قرآن کریم میں جتنی بھی قسمیں ہیں مطلوب ومقصود پر دلالت کرنے کی وجہ سے سب ہی بڑی اور عظیم ہیں، لیکن کہیں کہیں مقصود کے خاص اہتمام اور اس پر زیادہ تنبیہ کرنے کے واسطے عظیم ہونے کی تصریح بھی کر دی، جیسا کہ اس جگہ اور سورۃ الفجر میں، حاصل

مقام کا اجمالاً وہ ہے جو تفصیل سے سورۃ شعراء کے اخیر رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ قسم کھاتا ہوں آیتوں کے اترنے کی پیغمبروں کے دلوں میں (موضح) یا آیات قرآن کے اترنے کی آسمان سے زمین پر، آہستہ آہستہ، تھوڑی تھوڑی۔

إِنَّهُ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝

بیشک یہ قرآن ہے عزت والا لکھا ہوا ہے، ایک پوشیدہ کتاب میں، اس کو وہی چھوتے ہیں جو پاک بنائے گئے ہیں ۱؎

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اتارا ہوا ہے پروردگار عالم کی طرف سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور قسم اس بات کی کھاتا ہوں) کہ یہ (قرآن جو پیغمبر ﷺ پر نازل ہوتا ہے اللہ کی طرف سے نازل ہونے کی وجہ سے) ایک مکرم قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں (پہلے سے) درج ہے (اور وہ لوح محفوظ ایسا ہے) کہ بجز اس کو پاک فرشتوں کے (جو کہ گناہوں سے بالکل پاک ہیں) کوئی (شیطان وغیرہ) ہاتھ نہیں لگانے پاتا (اس کے مضامین پر مطلع ہونا تو دور کی بات ہے، پھر وہاں سے یہاں خاص طور پر آنا فرشتہ ہی کے ذریعے سے ہے اور یہی نبوت ہے، اور شیاطین اس کو لا ہی نہیں سکتے کہ کہانت وغیرہ کے احتمال سے نبوت میں شبہ ہو، جیسا کہ ارشاد ہے: نزل به الروح الامين، نیز ارشاد ہے: وما تنزلت به الشيطين اس سے ثابت ہوا کہ) یہ رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے (جو کہ اشارۃ کریم کا مدلول تھا)۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ: وہاں سے یہاں فرشتوں کے ذریعہ آنے میں ''خاص طور پر'' کی قید اس لیے بڑھائی کہ لوح محفوظ پر کشف کے واسطہ سے یا فرشتہ کے خبر دینے کے ذریعہ مطلق اطلاع ہونے سے نبوت لازم نہیں آتی اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ نبی کے سوا کسی اور کے لیے ایسا بھی ہوسکتا ہے، ورنہ اس قید ہی کی ضرورت نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''یعنی فرشتے اس کتاب کو ہاتھ لگاتے ہیں، وہ کتاب یہ ہی قرآن لکھا ہوا ہے، فرشتوں کے ہاتھوں میں یا لوح محفوظ میں''، اور بعض نے لَا يَمَسُّهٗٓ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع کی ہے، یعنی ''اس قرآن کو نہیں چھوتے مگر پاک لوگ''، یعنی جو صاف دل اور پاک اخلاق رکھتے ہیں، وہ ہی اس کے علوم وحقائق تک ٹھیک رسائی پاسکتے ہیں، یا ''اس قرآن کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ''، یعنی بدون وضو کے ہاتھ لگانا جائز نہیں، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے، اس وقت لا يمسه کی نفی ''نہی'' کے لیے ہوگی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یہ کوئی جادو ٹوٹکا نہیں، نہ کاہنوں کی زٹیل اور بے سروپا باتیں ہیں، نہ شاعرانہ تک بندیاں، بلکہ بڑی مقدس ومعزز کتاب ہے جو رب العالمین نے عالم کی ہدایت وتربیت کے لیے اتاری، جس خدا نے چاند سورج اور تمام ستاروں کا نہایت محکم اور عجیب وغریب نظام قائم کیا، یہ ستارے ایک اٹل قانون کے ماتحت اپنے روزانہ غروب سے اسی کی عظمت ووحدانیت اور قاہرانہ تصرف واقتدار کا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہیں (کما احتج به ابراهيم على قومه) اور زبان حال سے شہادت دیتے ہیں کہ جس اعلیٰ وبرتر ہستی اور سلطۂ غیبیہ کے ہاتھ میں ہماری باگ ہے وہ ہی اکیلا زمین، بادل، پانی، آگ، ہوا، مٹی اور کائنات کے ذرے ذرے کا مالک وخالق ہوگا۔

کیا ایسے روشن آسمانی نشانات کو دیکھ کر ان مضامین کی صداقت میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے جو پہلے رکوع میں بیان ہوئے ہیں اور کیا ایک عاقل اس عظیم الشان نظام فلکی پر نظر ڈال کر اتنا نہیں سمجھ سکتا کہ ایک دوسرا باطنی نظام شمسی بھی جو قرآن کریم اور اس کی آیات یا تمام کتب وصحف سماویہ سے

عبارت ہے، اسی پروردگار عالم کا قائم کیا ہوا ہے جس نے اپنی قدرت ورحمت کاملہ سے یہ ظاہری نظام قائم فرمایا، وہ ہی پاک خدا ہے جس نے روحانی ستاروں کے غروب ہونے کے بعد آفتاب قرآن کو چمکایا، اور اپنی مخلوق کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا، آج تک یہ آفتاب برابر چمک رہا ہے، کس کی مجال ہے جو اس کو بدل سکے یا غائب کردے، اس کے انوار اور شعاعیں ان ہی دلوں میں پوری طرح منعکس ہوتی ہیں جو مانجھ کر پاک وصاف کر لیے جائیں۔

أَفَبِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ ﴿٨١﴾ وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ ﴿٨٢﴾

اب کیا اس بات میں تم سستی کرتے ہو، اور اپنا حصہ تم یہی لیتے ہو کہ اس کو جھٹلاتے ہو۔ ١

خلاصہ تفسیر: سو (جب اس کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہے تو) کیا تم لوگ اس کلام کو سرسری بات سمجھتے ہو (یعنی اس کی تصدیق کو واجب نہیں جانتے) اور (اس مداہنت سے بڑھ کر یہ کہ) تکذیب کو اپنی غذا بنا رہے ہو (اس لئے توحید اور قیامت کے آنے کا بھی انکار کرتے ہو)۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی کیا یہ ایسی دولت ہے جس سے منتفع ہونے میں تم سستی اور کاہلی کرو اور اپنا حصہ اتنا ہی سمجھو کہ ان کو اور اس کے بتلائے ہوئے حقائق کو جھٹلاتے رہو، جیسے بارش کو دیکھ کر کہہ دیا کرتے ہو کہ فلاں ستارہ فلاں برج میں آ گیا تھا، اس سے بارش ہوگئی، گویا خدا سے کوئی مطلب ہی نہیں، اسی طرح اس باران رحمت کی قدر نہ کرنا جو قرآن کی صورت میں نازل ہوئی ہے اور یہ کہہ دینا کہ وہ اللہ کی اتاری ہوئی نہیں، سخت بدبختی اور حرماں نصیبی ہے، کیا ایک نعمت کی شکر گزاری یہ ہی ہے کہ اس کو جھٹلایا جائے۔

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ﴿٨٣﴾ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ ﴿٨٤﴾ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ وَلَٰكِن

پھر کیوں نہیں جس وقت جان پہنچے حلق کو، اور تم اس وقت دیکھ رہے ہو، اور ہم اس کے پاس ہیں تم سے زیادہ پر

لَّا تُبْصِرُونَ ﴿٨٥﴾ فَلَوْلَا إِن كُنتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُونَهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٨٧﴾

تم نہیں دیکھتے، پھر کیوں نہیں اگر تم نہیں ہو کسی کے حکم میں، تو کیوں نہیں پھیر لیتے اس روح کو اگر ہو تم سچے۔ ١

خلاصہ تفسیر: سو (اگر تمہارا یہ انکار حق ہے تو) جس وقت (مرنے کے قریب کسی شخص کی) روح حلق تک آ پہنچتی ہے اور تم اس وقت (بیٹھے حسرت آلودہ نگاہ سے) تکا کرتے ہو اور ہم (اس وقت) اس (مرنے والے) شخص کے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں (یعنی تم سے بھی زیادہ اس شخص کے حال سے واقف ہوتے ہیں، کیونکہ تم تو صرف ظاہری حالت دیکھتے ہو اور ہم اس کی باطنی حالت پر بھی مطلع ہوتے ہیں) لیکن (علم کے اعتبار سے ہمارے اس نزدیک ہونے کو اپنے جہل اور کفر کی وجہ سے) تم سمجھتے نہیں ہو تو (واقع میں) اگر تمہارا حساب کتاب ہونے والا نہیں ہے (جیسا تمہارا خیال ہے) تو تم اس روح کو (بدن کی طرف) پھر کیوں نہیں لوٹا لاتے ہو (جس کی اس وقت تم کو تمنا بھی ہوا کرتی ہے) اگر (اس قیامت وحساب کے انکار میں) تم سچے ہو۔

حاصل یہ کہ قرآن سچا ہے اور وہ قیامت کا آنا بتلاتا ہے، پس دلیل موجود ہے، اور مانع کوئی ہے نہیں تو قیامت کا آنا ثابت ہوگیا، اور اس پر بھی تمہارا انکار کرتے چلے جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ گویا تم روح کو اپنے بس میں سمجھتے ہو کہ اگرچہ خدا تعالیٰ قیامت میں دوبارہ روح ڈالنا چاہیں مگر ہم نہ ڈالنے دیں گے، اور دوبارہ زندہ نہ ہونے دیں گے، جب ہی تو ایسی شدت سے انکار کرتے ہو، ورنہ جو اپنے کو عاجز سمجھے وہ دلائل کے بعد ایسی شدت کی بات کیوں کہے، سو اگر تم روح کو اپنے بس میں سمجھتے ہو تو ذرا اپنا زور اسی وقت دکھلا دو جبکہ موت کے قریب مرنے والے کو زندہ رہنے کی تم کو تمنا بھی ہوتی ہے اور دیکھ دیکھ کر رحم بھی آتا ہے، دلگیر بھی ہوتے ہو، اور وہ زور دکھلانا یہ کہ اس روح کو نکلنے نہ دو، بدن میں لوٹا دو، جب تمہارا اس پر بس نہیں کہ روح کو بدن سے

نکلنے نہ دو تو اس کو دوبارہ زندہ کرنے سے روکنے پر بھی تمہارا بس نہیں، جو روح کو اندر سے باہر نکالتا ہے وہ باہر سے اندر بھی دوبارہ داخل کر سکتا ہے، پھر ایسے بیہودہ دعوے کیوں کرتے ہو، چونکہ یہ کافی دلیل ان کے لیے شافی نہ ہوئی اس لیے لا تبصرون میں سرزنش بھی فرمادی، اس تقریر سے چونکہ قدرت کا ثبوت بھی ہو گیا اس لیے بعث یعنی دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل کے ساتھ یہ توحید کی بھی دلیل ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی ایسی بے فکری اور بے خوفی سے اللہ کی باتوں کو جھٹلاتے ہو، گویا تم کسی دوسرے کے حکم اور اختیار میں نہیں، یا کبھی مرنا اور خدا کے ہاں جانا ہی نہیں، اچھا! جس وقت تمہارے کسی عزیز و محبوب کی جان نکلنے والی ہو، سانس حلق میں اٹک جائے، موت کی سختیاں گزر رہی ہوں اور تم پاس بیٹھے اس کی بے بسی اور درماندگی کا تماشا دیکھتے ہو، اور دوسری طرف خدا یا اس کے فرشتے تم سے زیادہ اس کے نزدیک ہیں جو تمہیں نظر نہیں آتے، اگر تم کسی دوسرے کے قابو میں نہیں تو اس وقت کیوں اپنے پیارے کی جان کو اپنی طرف نہیں پھیر لیتے اور کیوں با دل نخواستہ اپنے سے جدا ہونے دیتے ہو دنیا کی طرف واپس لا کر اسے آنے والی سزا سے کیوں بچا نہیں لیتے، اگر اپنے دعووں میں سچے ہو تو ایسا کر دکھاؤ!!۔

فَأَمَّآ إِن كَانَ مِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ ﴿٨٨﴾ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ ﴿٨٩﴾

سو جو اگر وہ مردہ ہوا مقرب لوگوں میں، تو راحت ہے اور روزی ہے اور باغ نعمت کا

وَأَمَّآ إِن كَانَ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْيَمِينِ ﴿٩٠﴾ فَسَلَٰمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْيَمِينِ ﴿٩١﴾

اور جو اگر وہ ہوا داہنے والوں میں، تو سلامتی پہنچے تجھ کو داہنے والوں سے لے

خلاصہ تفسیر: (آگے جزا و سزا کی کیفیت ارشاد ہے، یعنی یہ تو ثابت ہو چکا کہ قیامت اپنے وقت پر ضرور آئے گی) پھر (جب قیامت واقع ہو گی تو) جو شخص مقربین میں سے ہوگا (جن کا ذکر پیچھے آیت: والسابقون السابقون میں آیا ہے) اس کے لئے تو راحت ہے اور (فراغت کی) غذائیں ہیں اور آرام کی جنت ہے، اور جو شخص داہنے والوں میں سے ہوگا (جن کا ذکر پیچھے آیت: واصحب الیمین میں آیا ہے) تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرے لئے (ہر آفت اور خطرہ سے) امن و امان ہے کہ تو داہنے والوں میں سے ہے (اور یہ کہنا خواہ ابتداءً ہو اگر فضل یا توبہ کے سبب پہلے ہی مغفرت ہو جائے یا انتہاءً ہو اگر سزا کے بعد مغفرت ہو اور یہاں روح و ریحان کا ذکر نہ فرمانا نفی کے لئے نہیں بلکہ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سابقین سے ان امور میں کم ہوگا)۔

فَسَلَٰمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْيَمِينِ: اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنین سے یہ بات یا تو شروع ہی میں کہی جائے گی اگر فضل و رحمت یا توبہ کے سبب ان کی پہلے ہی مغفرت ہو جائے، یا بعد میں کہی جائے گی اگر سزا کے بعد مغفرت ہو، اور یہاں عام مؤمنین میں روح و ریحان یعنی راحت و آرام کے ذکر نہ فرمانے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے لیے راحت و آرام نہ ہوگا، بلکہ اس طرف اشارہ ہے کہ مقربین سے ان باتوں میں یہ لوگ کم ہوں گے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی تم ایک منٹ کے لیے نہیں روک سکتے، اس کو اپنے ٹھکانے پر پہنچنا ضروری ہے، اگر وہ مردہ ''مقربین'' میں سے ہوگا تو اعلیٰ درجہ کی روحانی و جسمانی راحت و عیش کے سامانوں میں پہنچ جائے گا، اور ''اصحاب یمین'' میں سے ہو تب بھی کچھ کھٹکا نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی خاطر جمع رکھ ان کی طرف سے''، یا یہ مطلب ہے کہ ''اصحاب یمین'' کی طرف سے اس کو سلام پہنچے گا، یا اس کو کہا جائے گا کہ تیرے لیے آئندہ سلامتی ہی سلامتی ہے، اور تو ''اصحاب یمین'' میں شامل ہے، بعض احادیث میں ہے کہ موت سے پہلے ہی مرنے والے کو یہ بشارتیں مل جاتی ہیں اور اسی طرح مجرموں کو ان کی بدحالی کی اطلاع دے دی جاتی ہے۔

وَاَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٩٣﴾

اور جو اگر وہ ہوا جھٹلانے والوں بہکنے والوں میں سے، تو مہمانی ہے جلتا پانی

وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿٩٤﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٩٥﴾

اور ڈالنا آگ میں [1] بیشک یہ بات ہے لائق یقین کے [2]

خلاصہ تفسیر: اور جو شخص جھٹلانے والوں (اور) گمراہوں میں سے ہوگا تو کھولتے ہوئے پانی سے اس کی دعوت ہوگی، اور دوزخ میں داخل ہونا ہوگا، بیشک یہ (جو کچھ مذکور ہوا) تحقیقی یقینی بات ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی اس کا انجام یہ ہوگا کہ مرنے سے پہلے خبر سنا دی جائے گی۔

فائدہ: [2] یعنی تمہاری تکذیب سے کچھ نہیں ہوتا، جو کچھ اس صورت میں مومنین اور مجرمین کی خبر دی گئی ہے بالکل یقینی ہے، اسی طرح ہو کر رہے گا، خواہ مخواہ شبہ پیدا کر کے اپنے نفس کو دھوکا نہ دو، بلکہ آنے والے وقت کی تیاری کرو۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٩٦﴾ ع ۲۲/۱۲

سو بول پاکی اپنے رب کے نام سے جو سب سے بڑا

خلاصہ تفسیر: سو (جس کے یہ تصرفات ہیں) اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (وتحمید) کیجئے۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ: "نام کی تسبیح" وغیرہ کی تحقیق سورۃ رحمن کی آخری آیت میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: یعنی تسبیح وتحمید میں مشغول رہو کہ یہی وہاں کی بڑی تیاری ہے اس نیک مشغلہ میں لگ کر مکذبین کی دل آزار بیہودہ گیوں سے بھی یکسوئی رہتی ہے اور ان کے باطل خیالات کا ردبھی ہوتا ہے۔

یہاں سورت کے خاتمہ پر جی چاہتا ہے کہ وہ حدیث نقل کر دی جائے جس پر امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کو ختم فرمایا ہے: "عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: "كلمتان خفيفتان على اللسان، ثقيلتان فی الميزان، حبيبتان الى الرحمن، سبحان الله و بحمده سبحان الله العظيم".

ایاتها ۲۹ | ۵۷ سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ مَدَنِيَّةٌ ۹۴ | رکوعاتها ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١﴾

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں [1] اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢﴾

اسی کے لیے ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا، جلاتا ہے اور مارتا ہے، اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے [2]

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے اختتام پر تسبیح کا حکم تھا، اس سورت کے شروع میں بھی تسبیح کا ذکر ہے، وہاں حکم تھا اور یہاں خبر ہے، اور مقصود اس خبر سے اور دوسرے افعال وصفات کی خبر سے توحید ثابت کرنا ہے۔

اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں (زبان قال سے یا زبان حال سے) اور وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے، اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، وہی حیات دیتا ہے اور (وہی) موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی زبان حال سے یا قال یا دونوں سے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی آسمان وزمین میں سب جگہ اسی کا حکم اور اختیار چلتا ہے ایجاد واعدام کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہے، کوئی طاقت اس کے تصرف تکوینی کو روک نہیں سکتی۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ③

وہی ہے سب سے پہلا اور سب سے پچھلا ۱؎ اور باہر اور اندر اور وہ سب کچھ جانتا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: وہی (سب مخلوق سے) پہلے ہے اور وہی پیچھے (یعنی سب کے فنا ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہے گا، مطلب اس پر نہ پہلے کبھی عدم طاری ہوا جیسے سب مخلوق پر طاری ہوا ہے، اور نہ آئندہ کبھی اس پر عدم طاری ہو سکتا ہے جیسے کہ عالم فنا ہونے کے وقت سب مخلوق پر طاری ہوجائے گا، اس لئے سب سے آخر میں بھی وہی ہے) اور وہی (مطلق وجود کے اعتبار سے دلائل کی روشنی میں نہایت) ظاہر ہے اور وہی (حقیقت کے اعتبار سے نہایت) مخفی ہے (یعنی اس کی ذات وحقیقت کا کوئی ادراک نہیں کرسکتا) اور (اگرچہ وہ خود تو ایسا ہے کہ مخلوق کو تو اس کا علم کسی قدر ہے اور کسی قدر نہیں، لیکن اس کو سب مخلوق کا پوری طرح علم ہے اور) وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ: لفظ ''اوّل'' کے معنی تو تقریباً متعین ہیں، یعنی وجود کے اعتبار سے تمام موجودات وکائنات سے مقدم اور پہلا ہے، کیونکہ ساری موجودات اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اس لئے وہ سب سے اوّل ہے، اور ''آخر'' کے معنی بعض حضرات نے یہ کئے ہیں کہ تمام موجودات کے فنا ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہے گا، جیسا کہ آیت: كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ میں اس کی تصریح ہے، اور فنا سے مراد عام ہے خواہ فنا وعدم کا وقوع ہوجائے، جیسا قیامت کے روز عام مخلوقات فنا ہوجائے گی، یا فنا کا وقوع نہ ہو، مگر اس کی فنا وعدم ممکن ہو اور وہ اپنی ذات میں عدم کے خطرہ سے خالی نہ ہو، اس کو موجود ہونے کے وقت بھی فانی کہہ سکتے ہیں، اس کی مثال جنت ودوزخ اور ان میں داخل ہونے والے اچھے برے انسان ہیں کہ ان کا وجود فنا نہیں ہوگا مگر باوجود وقوعاً فنا نہ ہونے کے امکان واحتمال فنا سے پھر بھی خالی نہیں، صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے جس پر کسی حیثیت اور کسی مفہوم سے نہ پہلے کبھی عدم طاری ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس کا امکان ہے، اس لئے اس کو سب سے ''آخر'' کہتے ہیں، نیز مخلوق ہر حال میں ممکن ہے، اور ممکن اپنی ذات کے درجہ میں وجود سے خالی ہے، جو کچھ اس کا ظاہری وجود ہے وہ اس کا ذاتی نہیں، بلکہ خدا کا دیا ہوا ہے، اور حق تعالیٰ کی ذات کے لیے وجود ہمیشہ ضروری ہے، کیونکہ وہ اس کا ذاتی وجود ہے، پس اس وجہ سے سب سے ''آخر'' وہی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ جب کوئی نہ تھا، وہ موجود تھا، اور کوئی نہ رہے وہ موجود رہے گا۔

فائدہ: ۲؎ ہر چیز کا ''وجود ظہور'' اس کے ''وجود'' سے ہے، لہٰذا اس کا ''وجود'' اگر ''ظاہر'' وباہر نہ ہو تو اور کس کا ہوگا، عرش سے فرش تک اور ذرہ سے آفتاب تک ہر چیز کی ہستی اس کی ہستی کی روشن دلیل ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس کی کنہ ذات اور حقائق صفات تک عقل وادراک کی رسائی نہیں، کسی ایک صفت کا احاطہ بھی کوئی نہیں کرسکتا، نہ اپنے قیاس ورائے سے اس کی کچھ کیفیت بیان کرسکتا ہے، بایں لحاظ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے زیادہ ''باطن'' اور پوشیدہ

کوئی نہیں، بہر حال وہ اندر بھی باہر بھی، ظاہر بھی باطن بھی، کھلے اور چھپے ہر قسم کے احوال کا جاننے والا ہے۔

''ظاہر'' (بمعنی غالب) ایسا کہ اس سے اوپر کوئی قوت نہیں، ''باطن'' ایسا کہ اس سے پرے کوئی موقع نہیں جہاں اس کی آنکھ سے اوجھل ہو کر پناہ مل سکے، فَفِی الْحَدِیْث : وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَیْسَ فَوْقَكَ شَیْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَكَ شَیْءٌ۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا

وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں پھر قائم ہوا تخت پر[1] جانتا ہے جو

یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ

اندر جاتا ہے زمین کے اور جو اس سے نکلتا ہے[2] اور جو کچھ اترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے[3] اور وہ تمہارے ساتھ ہے

اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ④

جہاں کہیں تم ہو، اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے[4]

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ ایسا (قادر) ہے کہ اس نے آسمان اور زمین کو چھ روز (کی مقدار) میں پیدا کیا پھر عرش پر (جو کہ تخت سلطنت کے مشابہ ہے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو اس کی شان کے لائق ہے اور) وہ سب کچھ جانتا ہے جو چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے (مثلاً بارش) اور جو چیز اس میں سے نکلتی ہے (مثلاً نباتات) اور جو چیز آسمان سے اترتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے (مثلاً فرشتے جو کہ اترتے چڑھتے ہیں، اور مثلاً احکام جن کا نزول ہوتا ہے اور بندوں کے اعمال آسمان کی طرف چڑھتے ہیں) اور (جس طرح ان چیزوں کا اس کو علم ہے اسی طرح تمہارے تمام احوال کا بھی اس کو علم ہے چنانچہ) وہ (علم واطلاع کے اعتبار سے) تمہارے ساتھ رہتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی ہو (یعنی تم کسی جگہ اس سے چھپ نہیں سکتے) اور وہ تمہارے سب اعمال کو بھی دیکھتا ہے۔

* * *

فائدہ:[1] اس کا بیان سورۃ اعراف میں آٹھویں پارے کے ختم سے کچھ پہلے گزر چکا ہے۔

فائدہ:[2] مثلاً بارش کا پانی اور بیج زمین کے اندر جاتا ہے، اور کھیتی درخت وغیرہ اس سے باہر نکلتے ہیں، اس کا بیان سورۃ سبا میں گزر چکا۔

فائدہ:[3] آسمان کی طرف سے اترتے ہیں فرشتے، احکام، قضاء وقدر کے فیصلے اور بارش وغیرہ، اور چڑھتے ہیں بندوں کے اعمال اور ملائکۃ اللہ۔

فائدہ:[4] یعنی کسی وقت تم سے غائب نہیں، بلکہ جہاں کہیں تم ہو اور جس حال میں ہو وہ خوب جانتا ہے اور تمام کھلے چھپے اعمال کو دیکھتا ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ⑤

اسی کے لیے ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا، اور اللہ ہی تک پہنچتے ہیں سب کام

خلاصہ تفسیر: اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، اور اللہ ہی کی طرف سب امور (جوہری وعرضی) لوٹ جائیں گے (یعنی قیامت میں پیش ہو جائیں گے، اسی میں توحید کے ساتھ ضمناً قیامت کا بھی اثبات ہو گیا)۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: پیچھے دو آیت قبل بھی سلطنت کا ذکر تھا، اور یہاں پھر سلطنت کا ذکر ہے، بظاہر اس سے تکرار معلوم ہوتا

ہے، جواب یہ ہے کہ پیچھے سلطنت کا ذکر اس بات کو ثابت کرنے کے لیے تھا کہ خدا ہی جلاتا ہے اور مارتا ہے، اور یہاں سلطنت کا ذکر قیامت کو ثابت کرنے کے لیے ہے، پس تکرار نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی اس کی قلمرو سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتے، تمام آسمان و زمین میں اسی اکیلے کی حکومت ہے، اور آخر کار سب کاموں کا فیصلہ وہیں سے ہوگا۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۭ وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶

داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں ۱ اور اس کو خبر ہے جیوں کی بات کی ۲

خلاصہ تفسیر: وہی رات (کے اجزاء) کو دن میں داخل کرتا ہے (جس سے دن بڑا ہو جاتا ہے) اور وہی دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کرتا ہے (جس سے رات بڑی ہو جاتی ہے) اور (اس قدرت کے ساتھ اس کا علم ایسا ہے کہ) وہ دل کی باتوں (تک) کو جانتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی کبھی دن کو گھٹا کر رات بڑی کر دیتا ہے اور کبھی اس کے برعکس رات کو گھٹا کر دن بڑا کر دیتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی دلوں میں جو نیتیں اور ارادے پیدا ہوں یا خطرات و وساوس آئیں، وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ

یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اس میں سے جو تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اپنا نائب کر کر ۱ سو جو لوگ تم پر یقین لائے ہیں

وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷

اور خرچ کرتے ہیں ان کو بڑا ثواب ہے ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کو ثابت کیا، اب آگے توحید قبول کرنے اور ساتھ رسول پر ایمان لانے کا حکم ہے، کیونکہ رسول پر ایمان لائے بغیر صرف توحید سے نجات نہیں ہو سکتی، اور اسکے ساتھ اللہ کی راہ یعنی جہاد میں خرچ کرنے کا بھی حکم ہے جو کہ ایمان کامل ہونے کی علامت اور اشاعت اسلام میں مددگار ہے اور یہی جہاد سے اصل مقصود ہے، پس حاصل یہ ہوگا کہ خود بھی ایمان لاؤ اور دوسروں کے ایمان لانے کے واسطے بھی کوشش کرو۔

تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور (ایمان لا کر) جس مال میں تم کو اس نے دوسروں کا قائم مقام بنایا ہے اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو (اس قائم مقام بنانے کے عنوان میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مال تم سے پہلے اور کسی کے پاس تھا اور اسی طرح تمہارے بعد کسی اور کے ہاتھ میں چلا جائے گا، بس جب یہ سدا رہنے والی چیز نہیں تو اس کو اس طرح جوڑ جوڑ کر رکھنا کہ ضروری مصرف میں بھی خرچ نہ کیا جائے حماقت کے سوا کیا ہے) سو (اس حکم کے موافق) جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور (ایمان لا کر اللہ کی راہ میں) خرچ کریں ان کو بڑا ثواب ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو مال تمہارے ہاتھ میں ہے اس کا مالک اللہ ہے تم صرف امین اور خزانچی ہو، لہٰذا جہاں وہ مالک بتلائے وہاں اس کے نائب کی حیثیت سے خرچ کرو، اور یہ بھی ملحوظ رکھو کہ پہلے یہ مال دوسروں کے ہاتھ میں تھا ان کے جانشین تم بنے، ظاہر ہے تمہارا جانشین کوئی نہ کوئی اور بنایا جائے گا، پھر جب معلوم ہے کہ یہ چیز نہ پہلوں کے پاس رہی نہ تمہارے پاس رہے گی، تو ایسی زائل و فانی چیز سے استادل لگانا مناسب نہیں کہ ضروری اور مناسب مواقع میں بھی آدمی خرچ کرنے سے کترائے۔

فائدہ: ۲ لہذا ضروری ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفت وخصلت موجود نہیں، اپنے اندر پیدا کریں اور جن میں موجود ہے اس پر ہمیشہ مستقیم رہیں اور ایمان کے مقتضی پر عمل رکھیں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ

اور تم کو کیا ہوا کہ یقین نہیں لاتے اللہ پر اور رسول بلاتا ہے تم کو کہ یقین لاؤ اپنے رب پر اور لے چکا ہے تم سے عہد پکا

إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۸﴾

اگر ہو تم ماننے والے

خلاصہ تفسیر: اور (جو لوگ ایمان نہ لائیں ان سے ہم پوچھتے ہیں کہ) تمہارے لئے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے (اسی میں ایمان بالرسل بھی آ گیا) حالانکہ (ایمان لانے کے قوی اسباب موجود ہیں وہ یہ کہ) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم جن کی رسالت دلائل سے ثابت ہے) تم کو اس بات کی طرف بلا رہے ہیں کہ تم اپنے رب پر (اسی کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق) ایمان لاؤ (ایک سبب تو یہ ہوا) اور (دوسرا سبب یہ کہ) خود خدا نے تم سے (ایمان لانے کا میثاق الست بربکم میں) عہد لیا تھا (جس کا اجمالی اثر تمہاری فطرت میں بھی موجود ہے، اور اللہ کے رسول جو معجزات اور دلائل لے کر آئے انہوں نے بھی اس کی یاد دہانی کی سو) اگر تم کو ایمان لانا ہو (تب تو یہ اسباب کافی ہیں، ورنہ پھر ایمان لانے کے لئے کس مطالبہ وسبب کا انتظار ہے جیسا کہ ارشاد ہے: فبای حدیث بعد اللہ وایاتہ یومنون)۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ پر ایمان لانے یا یقین ومعرفت کے راستوں پر چلنے والے سے کیا چیز مانع ہوسکتی ہے اور اس معاملہ میں سستی یا تقاعد کیوں ہو جبکہ خدا کا رسول تم کو کسی اجنبی اور غیر معقول چیز کی طرف نہیں بلکہ تمہارے حقیقی پرورش کرنے والے کی طرف دعوت دے رہا ہے جس کا اعتقاد تمہاری اصل فطرت میں ودیعت کر دیا گیا اور جس کی ربوبیت کا اقرار تم دنیا میں آنے سے پہلے کر چکے ہو، چنانچہ آج تک اس اقرار کا کچھ نہ کچھ اثر بھی قلوب بنی آدم میں پایا جاتا ہے، پھر دلائل وبراہین اور ارسال رسل کے ذریعہ سے اس ازلی عہد وپیمان کی یاد دہانی اور تجدید بھی کی گئی اور انبیائے سابقین نے اپنی امتوں سے یہ عہد بھی لیا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں گے اور تم میں بہت سے وہ بھی ہیں جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر سمع و اطاعت اور انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ امور ایمانیہ پر کاربند رہنے کا پکا عہد کر چکے ہیں، پس ان مبادی کے بعد کہاں گنجائش ہے کہ جو ماننے کا ارادہ رکھتا ہو وہ نہ مانے اور جو مان چکا ہو وہ اس سے انحراف کرنے لگے۔

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ

وہی ہے جو اتارتا ہے اپنے بندے پر آیتیں صاف کہ نکال لائے تم کو اندھیروں سے اجالے میں

وَإِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۹﴾

اور اللہ تم پر نرمی کرنے والا ہے مہربان

خلاصہ تفسیر: (پیچھے رسول کے بلانے کو بیان کیا تھا، اب آگے اسی مضمون کی مزید شرح ہے کہ) وہ ایسا (رحیم) ہے کہ اپنے بندہ (خاص محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر صاف صاف آیتیں بھیجتا ہے (جو عبارت کے حسن اور مخصوص اعجاز کی وجہ سے مقصود پر واضح دلالت کرتی ہے) تاکہ وہ (خاص

بندہ) تم کو (کفر وجہل کی) تاریکیوں سے (ایمان اور علم وحقائق کی) روشنی کی طرف لائے (جیسا کہ ارشاد ہے: لتخرج الناس من الظلمت الی النور باذن ربهم) اور بیشک اللہ تمہارے حال پر بڑا شفیق مہربان ہے (کہ اس نے ایسا اندھیریوں سے نکالنے والا تمہاری طرف بھیجا)۔

* * *

فائدہ: یعنی قرآن اتارا اور صداقت کے نشان دیے تا کہ ان کے ذریعہ سے تم کو کفر وجہل کے اندھیروں سے نکال کر ایمان وعلم کے اجالے میں لے آئے، یہ اللہ کی بہت ہی بڑی شفقت اور مہربانی ہے، اگر سختی کرتا تو ان ہی اندھیروں میں پڑا چھوڑ کر تم کو ہلاک کر دیتا، یا ایمان لانے کے بعد بھی پچھلی خطاؤں کو معاف نہ کرتا۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ

اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں اور اللہ ہی کو بچ رہتی ہے ہر شے آسمانوں میں اور زمین میں [1] برابر نہیں تم میں

مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ

جس نے کہ خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے [2] اور لڑائی کی، ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان سے جو کہ خرچ کریں اس کے بعد

وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۰﴾ ع

اور لڑائی کریں، اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا [3] اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو [4]

خلاصہ تفسیر: اور (پیچھے مضمون میں تو ایمان نہ لانے پر سوال تھا، آگے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے پر سوال ہے کہ ہم پوچھتے ہیں کہ) تمہارے لئے اس کا کون سبب ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ (اس کا بھی ایک قوی سبب ہے وہ یہ کہ) سب آسمان وزمین اخیر میں اللہ ہی کا رہ جائے گا (جب سب مالک مرجائیں گے اور وہی رہ جائے گا، پس جب سب مال ایک روز چھوڑنا ہے تو خوشی سے کیوں نہ دیا جائے کہ ثواب بھی ہو، یہ مضمون تو لفظ مستخلفین کی شرح کے طور پر ہو گیا، اب آگے خرچ کرنے والوں کے درجات کا فرق بتلاتے ہیں کہ اگرچہ ایمان لانے کے بعد خرچ کرنے کا ثواب تو سب کو ملے گا، لیکن پھر بھی بعض وجوہ سے درجوں میں فرق ہے وہ یہ کہ) جو لوگ فتح مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کر چکے اور (فی سبیل اللہ) لڑ چکے (اور جو فتح مکہ کے بعد لڑے اور خرچ کیا دونوں) برابر نہیں (بلکہ) وہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے (فتح مکہ کے) بعد میں خرچ کیا اور لڑے اور (یوں) اللہ تعالیٰ نے بھلائی (یعنی ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (اس لئے دونوں وقت کے عمل پر ثواب دیں گے)۔

وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ: شبہ ہوتا ہے کہ یہاں خرچ کرنے کے مضمون میں آسمان کا ذکر کیوں کیا گیا جبکہ مخلوق میں سے کوئی بھی اس کا مالک نہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہاں آسمان کا ذکر شاید اس نکتہ کے لیے ہو کہ جیسے آسمان بلا کسی شرکت کے اسی کی ملک ہے اسی طرح زمین بھی حقیقت کے اعتبار سے تو فی الحال بھی بلا کسی شرکت کے اس کی ملک ہے اور آخر کار ظاہری طور پر بھی اسی کی ملک رہ جائے گی۔

لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ: فتح مکہ سے پہلے اور بعد میں قتال اور خرچ کرنے میں فرق کی وجہ روح المعانی میں یہ لکھی ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جان ومال سے مدد کرنے کی زیادہ حاجت تھی، کیونکہ مسلمان کم تھے اور دشمن زیادہ تھے، اور غنیمت وغیرہ کی بھی امید نہ تھی، اس لیے اس وقت خرچ کرنا اور لڑنا زیادہ مفید بھی تھا اور نفس پر گراں بھی زیادہ تھا، فتح مکہ کے بعد ان باتوں میں فرق ہو گیا، کیونکہ حالات بدل گئے اور مسلمانوں کو قوت حاصل ہو گئی، یہاں تک کہ پورے عرب پر اسلام کی حکومت قائم ہو گئی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مالک فنا ہو جاتا ہے اور ملک اللہ کا بچ رہتا ہے اور ویسے تو ہمیشہ اسی کا مال تھا، پھر اس کے مال میں سے اس کے حکم کے موافق خرچ کرنا بھاری کیوں معلوم ہو، خوشی اور اختیار سے نہ دو گے تو بے اختیار اسی کے پاس پہنچے گا، بندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ خوش دلی سے پیش کرے اور اس کی راہ میں خرچ کرتے ہوئے فقر افلاس سے نہ ڈرے، کیونکہ زمین و آسمان کے خزانوں کا مالک اللہ ہے، کیا اس کے راستہ میں خوشدلی سے خرچ کرنے والا بھوکا رہے گا؟ "وَلاَ تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلاَلاً"۔

فائدہ: ۲؎ اور بعض نے فتح سے مراد صلح حدیبیہ لی ہے اور بعض روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی یوں تو اللہ کے راستہ میں کسی وقت بھی خرچ کیا جائے اور جہاد کیا جائے وہ اچھا ہے خدا اس کا بہترین بدلہ دنیا یا آخرت میں دے گا، لیکن جن مقدر والوں نے فتح مکہ یا حدیبیہ سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا، وہ بڑے درجے لے اڑے، بعد والے مسلمان ان کو نہیں پہنچ سکتے کیونکہ وہ وقت تھا کہ حق کے ماننے والے اور اس پر لڑنے والے اقل قلیل تھے اور دنیا کافروں اور باطل پرستوں سے بھری ہوئی تھی، اس وقت اسلام کو جانی اور مالی قربانیوں کی ضرورت زیادہ تھی اور مجاہدین کو بظاہر اسباب اموال وغنائم وغیرہ کی توقعات بہت کم، ایسے حالات میں ایمان لانا اور خدا کے راستہ میں جان ومال لٹا دینا بڑے اولوالعزم اور پہاڑ سے زیادہ ثابت قدم انسانوں کا کام ہے، رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ ورزقنا اللہ اتباعھم وجھم. آمین۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اللہ کو سب خبر ہے کہ کس کا عمل کس درجہ کا ہے اور اس میں اخلاص کا وزن کتنا ہے، اپنے اسی علم کے موافق ہر ایک سے معاملہ کریگا۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ﴿۱۱﴾

کون ہے ایسا کہ قرض دے اللہ کو اچھی طرح، پھر وہ اس کو دونا کر دے اس کے واسطے اور اس کو ملے ثواب عزت کا

خلاصہ تفسیر: (اس لئے جن لوگوں کو فتح مکہ سے قبل خرچ کا موقع نہیں ملا ہم ان کو بھی بطور ترغیب کہتے ہیں کہ:) کوئی شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح (یعنی خلوص کے ساتھ) قرض کے طور پر دے پھر خدا تعالیٰ اس (دیئے ہوئے ثواب) کو اس شخص کے لئے بڑھاتا چلا جائے اور (بڑھانے کے ساتھ) اس کے لئے اجر پسندیدہ (تجویز کیا گیا) ہے (''مضاعفت'' سے تو مقدار بڑھا دینے کو بیان کیا گیا اور لفظ ''کریم'' سے اس جزا و بدلہ کی کیفیت بہتر ہونے کی طرف اشارہ ہے)۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''قرض کے معنی یہ کہ اس وقت جہاد میں خرچ کرو، پھر تم ہی دولتیں برتو گے (اور آخرت میں بڑے مرتبے پاؤ گے) یہی معنی ہیں ''دونے'' کے، ورنہ مالک میں اور غلام میں سود بیاج نہیں، جو دیا سو اس کا جو نہ دیا سو اس کا''۔

یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ

جس دن تو دیکھے ایمان والے مردوں کو اور ایمان والی عورتوں کو دوڑتی ہوئی چلتی ہے انکی روشنی انکے آگے اور ان کے داہنے ۱؎ خوشخبری ہے تم کو

الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾

آج کے دن باغ ہیں کہ نیچے بہتی ہیں جن کے نہریں سدا رہو ان میں، یہ جو ہے یہی ہے بڑی مراد ملنی ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے ایمان کا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم تھا، اب آگے بتلاتے ہیں کہ ایمان وہ مطلوب ہے جو کامل ہو، یعنی اس میں اقرار کے ساتھ دل سے بھی تصدیق ہو، اس لیے کہ جن کو دل سے ایمان نصیب نہ تھا یعنی منافقین ان کی محرومی اور ناکامی کا ذکر کیا گیا، اس کے بعد خشوع کے چھوڑنے پر عتاب ہے جس سے اعمال میں کوتاہی ہو جاتی ہے، اس کے بعد ایمان کامل اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت اور اس پر بشارت ذکر کرنا مقصود ہے، اگرچہ پیچھے بھی اجمالاً اس کی فضیلت بیان ہوئی، مگر وہاں حکم کو مضبوط کرنے کے لیے تھی اور یہاں مستقل طور پر بھی مقصود ہے،

پھر عنوان بھی جدا ہے اس لیے تکرار نہ رہا۔

(وہ دن بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن آپ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا (یہ نور پل صراط پر سے گزرنے کے لئے ان کے ہمراہ ہوگا، اور ایک روایت میں ہے کہ بائیں طرف بھی ہوگا، اور ان سے کہا جائے گا کہ) آج تم کو بشارت ہے ایسے باغوں کی جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے (ظاہر یہ ہے کہ یہ بات بھی یا اُسی وقت کہی جائے گی اور ابھی بطور خبر دینے کے کہی جا رہی ہے)۔

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ: ایک روایت میں ہے کہ یہ نور بائیں طرف بھی ہوگا، تو یہاں داہنی طرف کو خصوصیت کے ساتھ شاید اس لیے بیان فرمایا ہو کہ اس طرف زیادہ قوی نور ہو، اور شاید یہ علامت ہو ان کے نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دیے جانے کی، اور ایسے موقع پر سامنے نور ہونا تو عام عادت کے موافق ہے۔

بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ: یہ کہنے والے غالباً فرشتے ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا الخ، یا حق تعالیٰ خود اس خطاب سے مشرف فرمائیں۔

* * *

فائدہ: ۱ میدان حشر میں جس وقت پل صراط پر جائیں گے سخت اندھیرا ہوگا تب اپنے ایمان اور عمل صالح کی روشنی ساتھ ہوگی، شاید ایمان کی روشنی میں جس کا محل قلب ہے آگے ہو اور عمل صالح کی داہنے کیونکہ نیک عمل داہنی طرف جمع ہوتے ہیں، جس درجہ کا کسی کا ایمان و عمل ہوگا اسی درجہ کی روشنی ملے گی، اور غالباً اس امت کی روشنی اپنے نبی کے طفیل دوسری امتوں کی روشنی سے زیادہ صاف اور تیز ہوگی، بعض روایات سے بائیں جانب بھی روشنی کا ہونا معلوم ہوا ہے، اس کا مطلب شاید یہ ہوگا کہ روشنی کا اثر ہر طرف پہنچے گا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ کیونکہ جنت اللہ کی خوشنودی کا مقام ہے، جو وہاں پہنچ گیا سب مرادیں مل گئیں۔

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ

جس دن کہیں گے دغا باز مرد اور عورتیں ایمان والوں کو راہ دیکھو ہماری ہم بھی روشنی لے لیں تمہارے نور سے

قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ

کوئی کہے گا لوٹ جاؤ پیچھے پھر ڈھونڈ لو روشنی، پھر کھڑی کر دی جائے ان کے بیچ میں ایک دیوار جس میں ہوگا دروازہ، اس کے اندر رحمت ہوگی

وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ؕ ⑬

اور باہر کی طرف عذاب

خلاصہ تفسیر: (اور یہ وہ دن ہوگا) جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں سے (پل صراط پر) کہیں گے کہ (ذرا) ہمارا انتظار کر لو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں (یہ اس وقت ہوگا جبکہ مسلمان اپنے ایمان اور اعمال کی برکت سے بہت آگے بڑھ جائیں گے اور منافقین جو کہ پل صراط پر مسلمانوں کے ساتھ چڑھائے جائیں گے پیچھے اندھیرے میں رہ جائیں گے، خواہ ان کے پاس پہلے ہی سے نور نہ ہو، یا ایک روایت میں ہے کہ ان کے پاس بھی کسی قدر نور ہو اور پھر وہ بجھ جائے، غرض وہ مسلمانوں سے ٹھہرنے کو کہیں گے) ان کو جواب دیا جائے گا (یہ جواب دینے والے خواہ فرشتے ہوں یا مومنین ہوں) کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ (اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پل صراط پر چڑھنے کے وقت سخت

اندھیرے کی وجہ سے نور تقسیم ہوا تھا) پھر (وہاں سے) روشنی تلاش کرو (یعنی نور تقسیم ہونے کی جگہ وہ ہے وہاں جا کرلو، چنانچہ وہ ادھر جائیں گے جب وہاں بھی کچھ نہ ملے گا، پھر ادھر ہی آئیں گے) پھر (مسلمانوں کے پاس نہ پہنچ سکیں گے، بلکہ) ان (فریقین) کے درمیان میں ایک دیوار قائم کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ (بھی) ہوگا (جس کی کیفیت یہ ہے کہ) اس کے اندرونی جانب میں رحمت (جنت) ہوگی اور بیرونی جانب کی طرف عذاب (دوزخ کا) ہوگا۔

انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ: خلاصہ تفسیر میں بیان ہوا کہ اس وقت ان منافقین کے پاس بھی کسی قدر نور ہو، تو ان منافقین کو نور دینے میں شاید یہ حکمت ہو کہ یہ ان کے نفاق اور فریب ہی کی سزا ہے کہ پہلے ان کو نور مل گیا، پھر خلاف امید گم ہو گیا یا بجھ گیا، جیسا کہ وہ دنیا میں ظاہری اعمال کے اعتبار سے تو مسلمانوں کے ساتھ رہا کرتے تھے مگر عقیدہ کے اعتبار سے مسلمانوں سے جدا تھے اور دل میں کفر چھپائے ہوئے تھے، اس لئے منافقین کو پہلے ان ظاہری اعمال کی وجہ سے نور تو مل جائے مگر پھر دل میں ایمان وتصدیق نہ ہونے کے سبب وہ نور گم ہو جائے۔

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ: یہ دیوار اعراف ہے، اور اندر کی جانب سے مراد مسلمانوں کی جانب یعنی جنت ہے، اور باہر کی جانب سے مراد کافروں کی جانب یعنی دوزخ ہے، شاید یہ دروازہ بات چیت کے لیے ہو، یا اسی دروازہ سے جنت میں جانے کا راستہ ہو، اور اعراف کی تحقیق آٹھویں پارے سورۃ اعراف میں گزری ہے، وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: یعنی مومنین اور منافقین کے بیچ میں دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہوگا، اس دروازے سے مومن جنت کی طرف جا کر منافقوں کی نظر سے اوجھل ہو جائیں گے، دروازہ کے اندر پہنچ کر جنت کا سماں ہوگا اور ادھر دروازہ سے باہر عذاب الٰہی کا منظر دکھائی دے گا۔

يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ

یہ انکو پکاریں گے کیا ہم نہ تھے تمہارے ساتھ ؎ کہیں گے کیوں نہیں لیکن تم نے بچلا دیا اپنے آپ کو اور راہ دیکھتے رہے اور دھوکے میں پڑے

وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾

اور بہک گئے اپنے خیالوں پر یہاں تک کہ آ پہنچا حکم اللہ کا اور تم کو بہکا دیا اللہ کے نام سے اس دغاباز نے ؎

خلاصہ تفسیر: (غرض جب منافقین اور مسلمانوں کے درمیان دیوار حائل ہو جائے گی اور منافقین خود تاریکی میں رہ جائیں گے تو اس وقت) یہ (منافق) ان (مسلمانوں) کو پکاریں گے کہ کیا (دنیا میں) ہم تمہارے ساتھ نہ تھے (یعنی اعمال اور طاعات میں تمہارے ساتھ شریک رہا کرتے تھے، تو آج بھی رفاقت کرنا چاہئے) وہ (مسلمان) کہیں گے کہ (ہاں!) تھے تو سہی لیکن (ایسا ساتھ ہونا کس کام کا؟ کیونکہ محض ظاہر میں ساتھ تھے اور باطنی حالت تمہاری یہ تھی کہ) تم نے اپنے کو گمراہی میں پھنسا رکھا تھا اور (وہ گمراہی یہ تھی کہ تم پیغمبر اور مسلمانوں سے عداوت رکھتے تھے اور ان پر مصائب اور حوادث واقع ہونے کے) تم منتظر (اور متمنی) رہا کرتے تھے اور (اسلام کے حق ہونے میں) تم شک رکھتے تھے اور تم کو تمہاری بیہودہ تمناؤں نے دھوکہ میں ڈال رکھا تھا (مراد بیہودہ تمناؤں سے یہ ہے کہ اسلام مٹ جائے گا اور یہ کہ ہمارا مذہب حق اور نجات دینے والا ہے، اور) یہاں تک کہ تم پر خدا کا حکم آ پہنچا (خدا کے حکم سے مراد موت ہے، یعنی تم عمر بھر ان ہی کفریات پر جمے رہے تو بہ بھی نہ کی) اور تم کو دھوکہ دینے والے (یعنی شیطان) نے اللہ کے ساتھ دھوکہ میں ڈال رکھا تھا (دھوکہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم سے مواخذہ نہ کریں گے، حاصل مجموعہ کا یہ ہے کہ ان کفریات کی وجہ سے تمہارا ظاہر میں ہمارے ساتھ ہونا نجات کے لیے کافی نہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ قصہ یہ ہے کہ کھلے ہوئے کافر پل صراط پر نہیں چلیں گے پہلے ہی دوزخ میں اس کے دروازوں سے دھکیل دیے جائیں گے، ہاں! جو کسی نبی کی امت میں ہیں سچے یا کچے انہیں پل صراط سے گزرنے کا حکم ہوگا، اس پر چڑھنے سے پہلے ایک سخت اندھیری لوگوں کو گھیر لے گی، اس وقت ایمان والوں کے ساتھ روشنی ہوگی، منافق بھی ان کی روشنی میں پیچھے پیچھے چلنا چاہیں گے لیکن مومن جلد آگے بڑھ جائیں گے اس لیے ان کی روشنی منافقین سے دور ہوتی جائے گی تب وہ پکاریں گے کہ میاں ذرا ٹھہرو، ہم کو اندھیرے میں پیچھے چھوڑ کر مت جاؤ، تھوڑا انتظار کرو کہ ہم بھی تم سے مل جائیں اور تمہاری روشنی سے استفادہ کریں، آخر ہم دنیا میں تمہارے ساتھ ہی رہتے تھے اور ہمارا شمار بھی بظاہر مسلمانوں میں ہوتا تھا اب اس مصیبت کے وقت ہم کو اندھیرے میں پڑا چھوڑ کر کہاں جاتے ہو کیا رفاقت کا حق یہی ہے، جواب ملے گا کہ پیچھے لوٹ کر روشنی تلاش کرو اگر مل سکے تو وہاں سے لے آؤ، یہ سن کر پیچھے ہٹیں گے اتنے میں دیوار دونوں فریق کے درمیان حائل ہو جائے گی، یعنی روشنی دنیا میں کمائی جاتی ہے وہ جگہ پیچھے چھوڑ آئے، یا پیچھے سے وہ جگہ مراد ہو جہاں پل صراط پر چڑھنے سے پہلے نور تقسیم کیا گیا تھا۔

فائدہ: ۲ یعنی بیشک دنیا میں بظاہر تم ہمارے ساتھ تھے اور زبان سے دعویٰ اسلام کا کرتے تھے، لیکن اندرونی حال یہ تھا کہ لذات و شہوات میں پڑ کر تم نے نفاق کا راستہ اختیار کیا اور اپنے نفس کو دھوکا دے کر ہلاکت میں ڈالا، پھر توبہ نہ کی بلکہ راہ دیکھتے رہے کہ کب اسلام اور مسلمانوں پر کوئی افتاد پڑتی ہے اور دین کے متعلق شکوک وشبہات کی دلدل میں پھنسے رہے، یہی دھوکا رہا کہ آگے ان منافقانہ چالوں کا کچھ خمیازہ بھگتنا نہیں، بلکہ یہ خیالات اور امیدیں پکالیں کہ چند روز میں اسلام اور مسلمانوں کا یہ سب قصہ ٹھنڈا ہو جائے گا، آخر ہم ہی غالب ہوں گے، رہا آخرت کا قصہ سو وہاں بھی کسی نہ کسی طرح چھوٹ ہی جائیں گے، ان ہی خیالات میں مست تھے کہ اللہ کا حکم آپہنچا اور موت نے آدبایا اور اس بڑے دغاباز (شیطان) نے تم کو بہکا کر ایسا کھو دیا کہ اب سبیل رستگاری کی نہیں رہی۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ

سو آج تم سے قبول نہ ہوگا فدیہ دینا اور نہ منکروں سے، تم سب کا گھر دوزخ ہے وہی ہے رفیق تمہاری

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑮

اور بری جگہ جا پہنچے

خلاصہ تفسیر: غرض آج نہ تم سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ کافروں سے (یعنی اول تو معاوضہ دینے کے واسطے تمہارے پاس کوئی چیز ہی نہیں، لیکن بالفرض اگر ہوتی بھی تب بھی مقبول نہ ہوتی کیونکہ یہ بدلہ اور جزا کا مقام ہے، عمل کی جگہ نہیں، اور) تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے وہی تمہاری (ہمیشہ کے لئے) رفیق ہے اور وہ (واقعی) برا ٹھکانا ہے (یہ قول یا تو مومنین کا ہوگا، یا حق تعالیٰ کا)۔

* * *

فائدہ: یعنی بالفرض اگر آج تم (منافق) اور جو کھلے بندوں کافر تھے کچھ معاوضہ وغیرہ دے کر سزا سے بچنا چاہو تو اس کے منظور کیے جانے کی کوئی صورت نہیں، بس تم سب کو اب اسی گھر میں رہنا ہے، یہی دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے اور یہی رفیق ہے، کسی دوسرے سے رفاقت کی توقع مت رکھو۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ

کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گڑگڑائیں ان کے دل اللہ کی یاد سے اور جو اترا ہے سچا دین ۱ اور نہ ہوں ان جیسے جن کو

اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ⑯

کتاب ملی تھی اس سے پہلے پھر دراز گزری ان پر مدت پھر سخت ہوگئے ان کے دل اور بہت ان میں نافرمان ہیں ۲۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ تمام تر بیان سے ثابت ہوگیا کہ جس ایمان میں طاعات ضروریہ کی کمی ہو وہ اگرچہ کالعدم نہیں، لیکن کامل بھی نہیں، اس لئے اگلی آیات میں اس کی تکمیل کا حکم عتاب کی صورت میں مسلمان کو فرماتے ہیں کہ:

کیا ایمان والوں (میں سے جو لوگ ضروری طاعات میں کمی کرتے ہیں جیسے گناہ گار مسلمانوں کی حالت ہوتی ہے تو کیا ان) کے لئے (اب بھی) اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق (اللہ کی طرف سے) نازل ہوا ہے (کہ وہی نصیحت خداوندی ہے) اس کے سامنے جھک جائیں (یعنی دل سے ضروری طاعات کی پابندی اور گناہوں کے چھوڑنے کا پختہ عزم کرلیں) اور (اس مذکورہ خشوع میں دیر کرنے سے جس کا حاصل توبہ میں دیر کرنا ہے وہ) ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جن کو ان کے قبل (آسمانی) کتاب ملی تھی (یعنی یہود و نصاریٰ کہ انہوں نے بھی اپنی کتابوں کے خلاف شہوات اور گناہوں میں انہماک شروع کردیا) پھر (اسی حالت میں) ان پر ایک زمانہ دراز گزر گیا (اور توبہ نہ کی) پھر (اس توبہ نہ کرنے سے) ان کے دل (خوب ہی) سخت ہوگئے (کہ ندامت اور اضطراری ملامت بھی دل میں پیدا نہ ہوتی تھی) اور (اس کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسی قساوت وسختی کی بدولت) بہت سے آدمی ان میں سے (آج) کفار ہیں (مطلب یہ کہ مسلمان کو جلدی توبہ کرلینی چاہیے، کیونکہ بعض اوقات پھر توبہ کی توفیق نہیں رہتی، اور بعض اوقات کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے)۔

اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ: اس کو خشوع بمعنی سکون اس لئے کہا کہ دل کا حالت مطلوبہ یعنی اپنی اصلی حالت پر رہنا سکون ہے، اور گناہ کی طرف جانا حرکت کے مشابہ ہے، اس سے یہ باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں: ① خشوع یعنی دل کی نرمی کو لازم پکڑنا ② طول غفلت سے دل میں قساوت اور سختی پیدا ہوجاتی ہے ③ اور دل کی سختی ذکر اللہ کی کثرت سے دور ہوجاتی ہے۔

وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ: کیونکہ گناہوں سے سختی پیدا ہوکر پھر ان کی عادت ہوجاتی ہے، اور گناہوں پر جمے رہنے سے پھر ان کو اچھا سمجھنے لگتے ہیں، جس سے حق بات قبول کرنے سے عار آنے لگتا ہے اور نبی برحق کی عداوت اکثر کفر کا سبب بن جاتی ہے، مطلب یہ کہ مسلمان کو جلدی توبہ کرلینی چاہیے، کیونکہ بعض اوقات پھر توبہ کی توفیق نہیں رہتی، اور بعض اوقات کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وقت آگیا ہے کہ مومنین کے دل قرآن اور اللہ کی یاد اور اسکے سچے دین کے سامنے جھک جائیں، اور نرم ہوکر گڑگڑانے لگیں۔

فائدہ: ۲ یعنی ایمان وہی ہے کہ دل نرم ہو، نصیحت اور خدا کی یاد کا اثر جلد قبول کرے، شروع میں اہل کتاب یہ باتیں پیغمبروں کی صحبت میں پاتے تھے، مدت کے بعد غفلت چھاتی گئی، دل سخت ہوگئے وہ بات نہ رہی، اکثروں نے سخت سرکشی اور نافرمانیاں شروع کردیں، اب مسلمانوں کی باری آئی ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی صحبت میں رہ کر نرم دلی، انقیاد کامل اور خشوع لذکر اللہ کی صفات سے متصف ہوں اور اس مقام بلند پر پہنچیں جہاں کوئی امت نہ پہنچی تھی۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ⑰

جان رکھو کہ اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مرجانے کے بعد ہم نے کھول کر سنا دیئے تم کو پتے اگر تم کو سمجھ ہے

خلاصہ تفسیر: (اب آگے فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگوں کے دلوں میں گناہوں کی وجہ سے کوئی خرابی کم وبیش پیدا ہوگئی ہو تو اس وہم سے توبہ سے نہ رکو کہ اب توبہ سے کیا اصلاح ہوگی بلکہ:) یہ بات جان لو کہ اللہ تعالیٰ (کی ایسی شان ہے کہ وہ) زمین کو اس کے خشک ہوئے پیچھے زندہ

کردیتا ہے (بس اسی طرح توبہ کرنے پر اپنی رحمت سے مردہ دل کو زندہ اور درست کردیتا ہے، اس لیے مایوس نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ) ہم نے تم سے (اس کے) نظائر بیان کردیئے ہیں تا کہ تم سمجھو۔

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ: نظائر اور نمونہ سے مراد یہی زمین کا زندہ کرنا ہے، اور یہاں جمع کا صیغہ: اَلْاٰيٰتِ شاید اس لیے لایا گیا ہو کہ یہ نظیر بار بار پیش آتی رہتی ہے اس لیے بمنزلہ نظائر کے ہوگئی۔

* * *

فائدہ: یعنی عرب لوگ جاہل اور گمراہ تھے جیسے مردہ زمین، اب اللہ نے ان کو ایمان اور علم کی روح سے زندہ کیا، اور ان میں سب کمال پیدا کردیے، غرض کسی مردہ سے مردہ انسان کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، سچی توبہ کرلے تو اللہ پھر اس کے قالب میں روح حیات پھونک دے گا۔

إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَأَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿١٨﴾

تحقیق جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں، مرد اور عورتیں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھی طرح ان کو ملتا ہے دونا اور ان کو ثواب ہے عزت کا

خلاصہ تفسیر: (اب آگے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت ارشاد ہے یعنی) بلا شبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور یہ (صدقہ دینے والے) اللہ کو خلوص کے ساتھ قرض دے رہے ہیں وہ صدقہ (ثواب کے اعتبار سے) ان کے لئے بڑھا دیا جائے گا اور (بڑھانے کے ساتھ) ان کے لئے اجر پسندیدہ (تجویز کیا گیا) ہے (اس کی تفسیر چند آیات قبل گزر چکی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جو اللہ کے راستہ میں خالص نیت سے اس کی خوشنودی کی خاطر خرچ کریں اور غیر اللہ سے کسی بدلہ یا شکریہ کے طلبگار نہ ہوں گویا وہ اللہ کو قرض دیتے ہیں، سو اطمینان رکھیں کہ ان کا دیا ہوا ضائع نہ ہوگا، بلکہ کئی گنا کر کے لوٹایا جائے گا۔

وَالَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ أُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ لَهُمْ

اور جو لوگ یقین لائے اللہ پر اور اسکے سب رسولوں پر وہی ہیں سچے ایمان والے اور لوگوں کا احوال بتلانے والے اپنے رب کے پاس ان کے

أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَآ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ الْجَحِيمِ ﴿١٩﴾ ع ۱۸

واسطے ہے ان کا ثواب اور ان کی روشنی ۱۔ اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری باتوں کو وہ ہیں دوزخ کے لوگ ۲۔

خلاصہ تفسیر: اور (اب آگے ایمان کی فضیلت ارشاد ہے کہ) جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر (پورا) ایمان رکھتے ہیں (یعنی جن میں ایمان، تصدیق اور طاعات کی پابندی کامل طریقہ پر ہو) ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں (جس کا بیان سورۃ نساء آیت: ۷۰ میں آچکا ہے، یعنی یہ کمال کے مرتبے ایمان کامل ہی کی بدولت حاصل ہوتے ہیں) ان کے لئے (جنت میں) ان کا اجر (خاص) اور (پل صراط پر) ان کا نور (خاص) ہوگا، اور (آگے کفار کا ذکر فرماتے ہیں کہ) جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا یہی لوگ دوزخی ہیں۔

هُمُ الصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ: شہید کا حاصل اپنی جان اللہ کے راستہ میں لگا دینا ہے، یعنی جو اپنی جان کو اللہ کی راہ میں پیش کردے اگرچہ قتل نہ ہو، کیونکہ مقتول ہونا اختیار سے باہر ہے، نیز صدیقین وشہداء تو دراصل مؤمنین کے مخصوص اعلیٰ طبقات کے لوگ ہیں جو بڑی صفات عالیہ کے حامل ہیں، مگر یہاں مؤمنین کو مطلق صدیق اور شہید قرار دینا اس بات کی علامت ہے کہ صدیقین اور شہداء میں بھی مراتب اور درجات ہیں، اور سب سے ادنی درجہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، جیسا کہ ولایت عامہ کا ادنی درجہ ہر مؤمن کو حاصل ہے، یعنی ہر مؤمن بھی ایک حیثیت سے صدیقین وشہداء کے حکم میں ہے اور ان کے زمرہ میں لاحق سمجھا جائے گا۔

لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ: پل صراط پر کافروں کا حال اس لیے نہیں بیان کیا کہ وہ آیت: **ادخلوا ابواب جھنم** کے ظاہر معنی کے مطابق پل صراط پر نہ چڑھیں گے، بلکہ دروازہ سے داخل ہوں گے، حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اس کی تصریح فرمائی ہے، اور تفسیر درمنثور کی بعض تصریحات بھی اس مقام پر ان کی مؤید ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ مترجم محقق نے بظاہر اَلشُّهَدَاء کا عطف اَلصِّدِّيْقُوْنَ پر مانا ہے، یعنی جو لوگ اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر پوری طرح یقین لائے (اور اس یقین کا اثر ان کے اعمال و احوال میں ظاہر ہونا چاہیے) تو سچے اور پکے ایماندار یہ ہی ہیں اور اللہ کے ہاں یہ ہی حضرات بطور گواہ کے دوسرے لوگوں کا حال بتلائیں گے، کما قال: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرۃ: ۱۴۳) آخرت میں ان سچے ایمان داروں کو اپنے اپنے عمل اور درجہ ایمان کے موافق ثواب اور روشنی عطا ہوگی (آیت کی تفسیر اور بھی کئی طرح کی گئی ہے مگر رعایت اختصار ان کے نقل کی اجازت نہیں دیتی۔)

فائدہ: ۲ یعنی دوزخ اصل میں ان ہی کے لیے بنی ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ

جان رکھو کہ دنیا کہ زندگانی یہی ہے کھیل اور تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس میں اور بہتات ڈھونڈنی مال کی

وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ

اور اولاد کی، جیسے حالت ایک مینہ کی جو خوش لگا کسانوں کو اس کا سبزہ پھر زور پر آتا ہے پھر تو دیکھے زرد ہوگیا پھر ہوجاتا ہے

حُطَامًا ؕ وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ

روندا ہوا گھاس اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور معافی بھی ہے اللہ سے اور رضامندی اور دنیا کی زندگانی

اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰

تو یہی ہے مال دغا کا

خلاصہ تفسیر: پیچھے آخرت کے عذاب و ثواب کا ذکر تھا، اب آگے آخرت کا باقی ہونا اور اس کا اہتمام واجب ہونا، اور دنیا کا ناقابل التفات اور فانی ہونا بتلاتے ہیں کہ دنیا کی مشغولیت ہی آخرت کے اہتمام سے روکتی ہے۔

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی حیات (ہرگز مشغول ہونے کے قابل چیز نہیں، کیونکہ) محض لہو و لعب اور (ایک ظاہری) زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا (قوت، جمال اور دنیوی ہنر و کمال میں) اور اموال اور اولاد میں ایک کا دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے (یعنی دنیا کے مقاصد یہ ہیں کہ بچپن میں لہو و لعب کا غلبہ رہتا ہے، جوانی میں زینت اور فخر کا، بڑھاپے میں مال و دولت، آل و اولاد کو گنوانا، اور یہ سب مقاصد فانی اور محض خوب و خیال ہیں جس کی مثال ایسی ہے) جیسے مینہ (بارش برستی) ہے کہ اس کی پیداوار (کھیتی) کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ (کھیتی) خشک ہوجاتی ہے سو اس کو تو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چورا چورا ہوجاتی ہے (اسی طرح دنیا کی بہار چند روزہ ہے، پھر زوال اور فنا ہے، یہ تو دنیا کی حالت ہوئی) اور آخرت (کی کیفیت یہ ہے کہ اس) میں (دو چیزیں ہیں ایک تو کفار کے لئے) عذاب شدید ہے اور (دوسری اہل ایمان کے لئے) خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے (اور یہ دونوں باقی ہیں، پس آخرت تو باقی ہے) اور دنیوی زندگانی محض (فانی ہے، جیسے یوں سمجھو کہ ایک)

دھوکہ کا اسباب ہے (اس کی تفسیر سورہ آل عمران کے اخیر میں آیت ۱۸۵: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ میں گذر چکی ہے)۔

* * *

فائدہ: آدمی کو: ① اول عمر میں کھیل چاہیے ② پھر تماشا ③ پھر بناؤ سنگار (اور فیشن) ④ پھر ساکھ بڑھانا اور نام و نمود حاصل کرنا ⑤ پھر موت کے دن قریب آئیں تو مال و اولاد کی فکر کہ پیچھے میرا گھر بار بنا رہے اور اولاد آسودگی سے بسر کرے، مگر یہ سب ٹھاٹھ سامان فانی اور زائل ہیں، جیسے کھیتی کی رونق و بہار چند روزہ ہوتی ہے اور پھر زرد پڑ جاتی ہے اور آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں، اس شادابی اور خوبصورتی کا نام و نشان نہیں رہتا، یہی حال دنیا کی زندگانی اور اس کے ساز و سامان کا سمجھو کہ وہ فی الحقیقت ایک دغا کی پونجی اور دھوکے کی ٹٹی ہے، آدمی اس کی عارضی بہار سے فریب کھا کر اپنا انجام تباہ کر لیتا ہے، حالانکہ موت کے بعد یہ چیزیں کام آنے والی نہیں، وہاں کچھ اور ہی کام آئے گا، یعنی ایمان اور عمل صالح، جو شخص دنیا سے یہ چیز کما لے گا، سمجھو بیڑا پار ہے، آخرت میں اس کے لیے مالک کی خوشنودی و رضامندی اور جو دولت ایمان سے تہی دست رہا اور کفر و عصیان کا بوجھ لے کر پہنچا اس کے لیے سخت عذاب اور جس نے ایمان کے باوجود اعمال میں کوتاہی کی اس کے لیے جلد یا بدیر دھکے مکے کھا کر معافی ہے، دنیا کا خلاصہ وہ تھا، آخرت کا یہ ہوا۔

سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ

دوڑو اپنے رب کی معافی کی طرف کو اور بہشت کو ۱؎ جس کا پھیلاؤ ہے جیسے پھیلاؤ آسمان اور زمین کا ۲؎ تیار رکھی ہے واسطے ان کے

اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾

جو یقین لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، یہ فضل اللہ کا ہے دے اس کو جس کو چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (پس جب دنیا کا مال و متاع فانی اور آخرت کی دولت باقی ہے جو ایمان کی بدولت نصیب ہوتی ہے تو تم کو چاہئے کہ) تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو اور (نیز) ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے (یعنی اس سے کم ہونے کا انکار ہے، زیادہ ہونے کی نفی نہیں اور) وہ ان لوگوں کے واسطے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں (اور) یہ (مغفرت اور رضامندی جس کا پچھلی آیت میں ذکر ہوا) اللہ کا فضل ہے وہ اپنا فضل جس کو چاہیں عنایت کریں اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ: اس میں اشارہ ہے کہ اپنے اعمال پر کوئی غرور نہ کرے اور اپنے اعمال کی بنا پر جنت کے مستحق ہونے کا دعویٰ بھی نہ کرے، یہ محض فضل و انعام ہے، جس کا مدار اللہ کی مشیت پر ہے، مگر حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان اعمال کے بجالانے والوں کے ساتھ اپنی مشیت متعلق کر دی ہے، اگر چاہتے نہ بھی کرتے، کیونکہ قدرت دو جانبوں کے ساتھ متعلق ہوا کرتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی موت سے پہلے وہ سامان کر لو جس سے کوتاہیاں معاف ہوں اور بہشت ملے، اس کام میں سستی اور دیر کرنا مناسب نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی آسمان اور زمین دونوں کو اگر ملا کر رکھا جائے تو اس کے برابر جنت کا عرض ہوگا، طول کتنا ہوگا؟ یہ اللہ ہی جانے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ایمان و عمل بیشک حصول جنت کے اسباب ہیں، لیکن حقیقت میں ملتی ہے اللہ کے فضل سے، اس کا فضل نہ ہو تو سزا سے چھوٹنا ہی مشکل ہے، جنت ملنے کا تو ذکر کیا۔

مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ

کوئی آفت نہیں پڑتی ملک میں اور نہ تمہاری جانوں میں جو لکھی نہ ہو ایک کتاب میں پہلے اس سے کہ پیدا کریں ہم اس کو دنیا میں ۱؎

إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ ﴿٢٢﴾

بیشک یہ اللہ پر آسان ہے۔۲

خلاصہ تفسیر: دنیا کی دو حالتیں ہیں: راحت اور تکلیف، اور یہ دونوں مختلف حیثیتوں سے آخرت کی فکر سے مانع بن جاتی ہیں، پیچھے راحت ونعمت کا ذکر تھا کہ ان کے فنا کو سامنے رکھتے ہوئے آخرت سے غفلت نہیں ہونی چاہیے، اب آگے تکلیف اور مصیبت کا ذکر ہے کہ ان کے مقدر ہونے کو پیش نظر رکھ کر آخرت سے بے رخی نہیں کرنی چاہیے اور چونکہ نعمت سے فخر، غرور اور بخل وغیرہ جیسی بری بری صفات پیدا ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے کبھی حق سے اعراض کی نوبت آجاتی ہے، اس لیے اب ان پر وعید بھی فرماتے ہیں۔

کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ (سب) ایک کتاب میں (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہیں قبل اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں (یعنی تمام مصیبتیں خارجی ہوں یا داخلی، وہ سب مقدر ہیں، اور) یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے (کہ واقع ہونے سے پہلے ہی سب لکھ دیا، کیونکہ اس کو علم غیب حاصل ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ ملک میں جو عام آفت آئے مثلاً قحط، زلزلہ وغیرہ اور خود تم کو جو مصیبت لاحق ہو مثلاً مرض وغیرہ وہ سب اللہ کے علم میں قدیم سے طے شدہ ہے اور لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے، اسی کے موافق دنیا میں ظہور ہو کر رہے گا، ایک ذرہ بھر کم وبیش یا پس وپیش نہیں ہو سکتا۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کو ہر چیز کا علم ذاتی ہے کچھ محنت سے حاصل کرنا نہیں پڑا پھر اپنے علم محیط کے موافق تمام واقعات وحوادث کو قبل از وقوع کتاب (لوح محفوظ) میں درج کر دینا اس کے لیے کیا مشکل ہے۔

لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ﴿٢٣﴾

تاکہ تم غم نہ کھایا کرو اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور نہ شیخی کیا کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا۱ اور اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اترانے والا بڑائی مارنے والا

خلاصہ تفسیر: (اور ہم نے یہ بات اس واسطے بتلا دی ہے) تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے (تندرستی یا اولاد یا مال) تم اس پر (اتنا) رنج نہ کرو (جو خدا کی رضا حاصل کرنے اور آخرت کے کاموں میں مشغول ہونے میں رکاوٹ بن جائے البتہ طبعی رنج وتکلیف کا مضائقہ نہیں) اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے (اس کی نسبت بھی یہی سمجھنا چاہیے کہ خدا نے اپنے فضل ورحمت سے ان چیزوں کا عطا فرمانا ہمارے لیے تجویز کر دیا تھا اور اسی نے ہم کو دی ہے) اس پر اتراؤ نہیں (کیونکہ اترائے تو وہ جس کی اہلیت وقابلیت ذاتی ہو، اور جب دوسرے کی مشیت اور حکم سے ایک چیز ملی ہے تو اس پر اترانے کا کیا حق ہے) اور (آگے اس اترانے پر وعید ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ: اس میں غم وحزن کا علاج بتایا گیا ہے کہ ایسے وقت تقدیر کو یاد کر لیا جائے رنج وغم دور ہو جائیں گے، اور اس میں ضرور ہمارے لیے ہی بہتری ہے اگرچہ ہمیں تفصیل معلوم نہ ہو، یہاں عامل "اخبرناکم" مقدر ہے: لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ: "أي أخبرناكم بذلك لئلا تحزنوا"۔

مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ: ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ "اختیال" کا لفظ اکثر اندرونی وباطنی فضائل پر اترانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور "فخر" کا لفظ اکثر خارجی اشیاء یعنی مال ومرتبہ وغیرہ پر اترانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس حقیقت پر اس لیے مطلع کر دیا کہ تم خوب سمجھ لو کہ جو بھلائی تمہارے لیے مقدر ہے ضرور پہنچ کر رہے گی اور جو مقدر نہیں وہ کبھی ہاتھ نہیں آسکتی، جو کچھ اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں ٹھہر چکا ہے، ویسا ہی ہو کر رہے گا، لہذا جو فائدہ کی چیز ہاتھ نہ لگے اس پر غمگین ومضطرب ہو کر پریشان

نہ ہواور جوقسمت سے ہاتھ لگ جائے اس پر اکڑ واور اتراؤ نہیں بلکہ مصیبت و ناکامی کے وقت صبر و تسلیم اور راحت و کامیابی کے وقت شکر و تحمید سے کام لو۔

تنبیه: پہلے اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (الحدید: ۲۰) میں بتلایا تھا کہ دنیا کے سامان عیش وطرب میں پڑ کر آدمی کو آخرت سے غافل نہ ہونا چاہیے، آیت ہذا میں متنبہ فرمادیا کہ یہاں کی تکالیف ومصائب میں گھر کر چاہیے کہ حد اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

وہ جو کہ آپ نہ دیں اور سکھلائیں لوگوں کو بھی نہ دینا ۱؎ اور جو کوئی منہ موڑے اللہ آپ ہے بے پروا سب خوبیوں کے ساتھ موصوف ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے بخل کی مذمت ہے کہ) جوایسے ہیں کہ (دنیا کی محبت کی وجہ سے) خود بھی (خدا کے نزدیک پسندیدہ حقوق میں خرچ کرنے سے) بخل کرتے ہیں (اگر چہ اپنی خواہشات و گناہوں میں کتنا ہی اسراف کریں) اور (اس گناہ کے مرتکب بھی ہوتے ہیں کہ) دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہیں، اور (یہی دنیا کی محبت کبھی حق سے روگردانی کرنے تک پہنچا دیتی ہے، جس کے حق میں یہ وعید ہے کہ) جو شخص (دین حق سے جس کی ایک شاخ انفاق فی سبیل اللہ بھی ہے) اعراض کرے گا تو اللہ تعالیٰ (کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ وہ سب کی عبادت اور اموال سے) بے نیاز ہیں (اور اپنی ذات وصفات میں کامل اور) سزاوار حمد ہیں۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذمت اور وعید ان افعال کے مجموعہ کے ساتھ متعلق ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر بری خصلت اور ہر بری عادت پر وعید ہے، بلکہ اشارہ اس طرف ہے کہ دنیا کی محبت ایسی چیز ہے جس سے اکثر بری عادتیں اور بری صفات جمع ہو جاتی ہیں جیسے تکبر اور فخر وغرور بھی اور بخل وغیرہ بھی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اکثر متکبر مالداروں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ بڑائی اور شیخی تو بہت ماریں گے مگر خرچ کرنے کے نام پیسہ جیب سے نہ نکلے گا، کسی اچھے کام میں خود دینے کی توفیق نہ ہوگی اور اپنے قول وفعل سے دوسروں کو بھی یہی سبق پڑھائیں گے، موقع پر بڑھ کر خرچ کرنا متوکلوں اور ہمت والوں کا کام ہے جو پیسہ سے محبت نہیں کرتے اور جانتے ہیں کہ سختی اور نرمی سب اسی مالک علی الاطلاق کی طرف سے ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تمہارے خرچ کرنے یا نہ کرنے سے اس کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچتا، وہ تو بے نیاز اور بے پرواذات ہے، تمام خوبیاں علی وجہ الکمال اس کی ذات میں جمع ہیں، تمہارے کسی فعل سے اس کی کسی خوبی میں اضافہ نہیں ہوتا، جو کچھ نفع نقصان ہے تمہارا ہے، خرچ کرو گے خود فائدہ اٹھاؤ گے، نہ کرو گے گھاٹے میں رہو گے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں

بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ

انصاف پر ۱؎ اور ہم نے اتارا لوہا ۲؎ اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں ۳؎ اور تاکہ معلوم کرے اللہ کون مدد کرتا ہے اس کی

ع ۱۹ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾

اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے ۴؎ بیشک اللہ زور آور ہے زبردست ۵؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے دنیا کا نا قابل التفات ہونا اور آخرت کا مہتم بالشان ہونا بتلایا تھا، اب آگے بھی آخرت کے مہتم بالشان ہونے کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ اصل میں ہم نے آخرت کے درست کرنے کے لیے ہی رسولوں کو بھیجا اور احکام مقرر کیے اور دین کی امداد کے لیے بالخصوص لوہے کو پیدا کیا اور ان چیزوں میں ضمناً تمہارے لیے دنیاوی فائدے بھی رکھ دیے، پس اصل مقصود آخرت ہے اور دنیا ضمناً مقصود ہے۔

ہم نے (اسی آخرت کی اصلاح کے لئے) اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور (اس کتاب میں خاص طور پر) انصاف کرنے (کے حکم) کو (جس کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے) نازل کیا تا کہ لوگ (حقوق اللہ اور حقوق العباد میں) اعتدال پر قائم رہیں (اس میں ساری شریعت آ گئی جو معتدل یعنی افراط وتفریط سے پاک ہے) اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے (تا کہ اس کے ذریعہ سے عالم کا انتظام رہے، کیونکہ ڈر سے بہت سی بے انتظامیاں دور ہو جاتی ہیں) اور (اس کے علاوہ) لوگوں کے اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں (چنانچہ اکثر آلات لوہے سے بنتے ہیں) اور (اس لئے لوہا پیدا کیا) تا کہ اللہ تعالیٰ (ظاہری طور پر) جان لے کہ بے (اس خدا کو) دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی (یعنی دین کی) کون مدد کرتا ہے (کیونکہ لوہا جہاد میں بھی کام آتا ہے تو یہ بھی آخرت کا نفع ہوا، اور جہاد کا حکم اس لئے نہیں کہ اللہ اس کا محتاج ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ (خود) قوی زبردست ہے (بلکہ تمہارے ثواب کے لئے ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ ''کتاب اور ترازو''، شاید اسی تولنے کی ترازو کو کہا کہ اس کے ذریعہ سے بھی حقوق ادا کرنے اور لین دین میں انصاف ہوتا ہے، یعنی ''کتاب اللہ'' اس لیے اتاری کہ لوگ عقائد اور اخلاق و اعمال میں سیدھے انصاف کی راہ چلیں، افراط وتفریط کے راستہ پر قدم نہ ڈالیں اور ''ترازو'' اس لیے پیدا کی کہ بیع وشراء وغیرہ معاملات میں انصاف کا پلہ کسی طرف اٹھا، یا جھکا نہ رہے۔

اور ممکن ہے ''ترازو'' شریعت کو فرمایا ہو، جو تمام اعمال قلبیہ وقالبیہ کے حسن وقبح کو ٹھیک جانچ تول کر بتلاتی ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ یعنی اپنی قدرت سے پیدا کیا اور زمین میں اس کی کانیں رکھ دیں۔

فائدہ: ۳ یعنی لوہے سے لڑائی کے سامان (اسلحہ وغیرہ) تیار ہوتے ہیں، اور لوگوں کے بہت سے کام چلتے ہیں۔

فائدہ: ۴ یعنی جو آسمانی کتاب سے راہ راست پر نہ آئیں اور انصاف کی ترازو کو دنیا میں سیدھا نہ رکھیں، ضرورت پڑے گی کہ ان کی گوشمالی کی جائے اور ظالم وکج رو معاندین پر اللہ ورسول کے احکام کا وقار واقتدار قائم رکھا جائے، اس وقت شمشیر کے قبضہ پر ہاتھ ڈالنا اور ایک خالص دینی جہاد میں اسی لوہے سے کام لینا ہوگا، اس وقت کھل جائے گا کہ کون سے وفادار بندے ہیں جو بن دیکھے خدا کی محبت میں آخرت کے غائبانہ اجر وثواب پر یقین کر کے اس کے دین اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔

فائدہ: ۵ یعنی جہاد کی تعلیم وترغیب اس لیے نہیں دی گئی کہ اللہ کچھ تمہاری امداد واعانت کا محتاج ہے، بھلا اس زور آور اور زبردست ہستی کو کمزور مخلوق کی کیا حاجت ہو سکتی تھی، ہاں تمہاری وفاداری کا امتحان مقصود ہے تا کہ جو بندے اس میں کامیاب ہوں ان کو اعلیٰ مقامات پر پہنچایا جائے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اور ابراہیم کو اور ٹھہرا دی دونوں کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب ۱ پھر کوئی ان میں راہ پر ہے

وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور بہت ان میں نافرمان ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسولوں کا مخلوق کی اصلاح کی غرض سے بھیجنے کا اجمالی ذکر تھا، اب آگے بعض خاص رسولوں کا امتوں کی

اصلاح کے لیے بھیجنا اور ان امتوں میں سے بعض کا اصلاح قبول کرنا اور بعض کا قبول نہ کرنا بیان فرماتے ہیں، اور ساتھ میں موجودہ آدمیوں کو اصلاح قبول کرنے کا حکم ہے۔

اور ہم نے (مخلوق کی آخرت کی اصلاح کے لئے) نوح (علیہ السلام) اور ابراہیم (علیہ السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور ہم نے ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب جاری رکھی (یعنی ان کی اولاد میں بھی بعض پیغمبر اور ان میں سے بعض صاحب کتاب بھی ہوئے) سو (جن جن لوگوں کے پاس یہ پیغمبر آئے) ان لوگوں میں بعض تو ہدایت یافتہ ہوئے اور بہت سے ان میں نافرمان تھے۔

وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ: مطلب یہ کہ یہ مذکورہ پیغمبر تو مستقل شریعت والے تھے، خواہ وہ صاحب کتاب بھی ہوں جیسے موسیٰ علیہ السلام جو حضرت نوح اور ابراہیم علیہما السلام دونوں کی اولاد میں تھے، یا صاحب کتاب نہ ہوں جیسے حضرت ہود اور صالح علیہما السلام کہ ان کی شریعت مستقل تھی مگر ان کا صاحب کتاب ہونا منقول نہیں، اور اگر صاحب کتاب ہوں تب بھی اس آیت کے خلاف نہیں، غرض بہت سے نبی تو مستقل شریعت والے بھیجے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی پیغمبر اور کتاب کے لیے ان دونوں کی نسل کو چن لیا کہ ان کے بعد یہ دولت ان کی ذریت سے باہر نہ جائے گی۔

فائدہ: ۲۔ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجے گئے تھے یا یوں کہو کہ ان دونوں کی اولاد میں سے بعضے راہ پر رہے اور اکثر نافرمان ثابت ہوئے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا

پھر پیچھے بھیجے ان کے قدموں پر اپنے رسول ۱۔ اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو اور اس کو ہم نے دی انجیل ۲۔ اور رکھ دی

فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا

اس کے ساتھ چلنے والوں کے دل میں نرمی اور مہربانی ۳۔ اور ایک ترک کرنا دنیا کا جو انہوں نے نئی بات نکالی تھی ہم نے نہیں لکھا تھا یہ مگر ان پر کیا

ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ

چاہنے کو اللہ کی رضامندی پھر نہ نباہا اس کو جیسا چاہیے تھا نباہنا ۴۔ پھر دیا ہم نے ان لوگوں کو جو ان میں ایماندار تھے ان کا بدلہ

وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۷

اور بہت ان میں نافرمان ہیں ۵۔

خلاصہ تفسیر: پھر ان کے بعد اور رسولوں کو (جو کہ مستقل شریعت والے نہ تھے) یکے بعد دیگرے بھیجتے رہے (جیسے موسیٰ علیہ السلام کے بعد تورات کے احکام کی تعمیل کرانے کے لئے بہت سے پیغمبر آئے) اور ان کے بعد (پھر ایک مستقل شریعت والے کو یعنی) عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ہم نے ان کو انجیل دی اور (ان کی امت میں دو قسم کے لوگ ہوئے: ① ایک ان کی اتباع کرنے والے یعنی ان پر ایمان لانے والے ② دوسرے انکار کرنے والے) اور جن لوگوں نے ان کا اتباع کیا تھا (یعنی پہلی قسم) ہم نے ان کے دلوں میں شفقت اور رحم (ایک دوسرے کے ساتھ جو کہ اخلاق حمیدہ میں سے ہے) پیدا کر دیا (جیسا کہ صحابہ کی شان میں فرمایا ہے: رحماء بینھم کہ آپس میں مہربان ہیں، غرض ان پر شفقت و رحمت غالب تھی) اور (ہماری طرف سے تو ان لوگوں کو صرف احکام میں اتباع کرنے کا حکم ہوا تھا، لیکن ان اتباع کرنے والوں میں بعض وہ ہوئے کہ) انہوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا (رہبانیت کا حاصل یہ ہے میل جول نہ کرنا، نکاح اور جائز لذتوں کا چھوڑ دینا) ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا لیکن

انہوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے (اپنے دین کو محفوظ رکھنے کے لئے) اس کو اختیار کرلیا تھا سو (پھران راہبوں میں زیادہ وہ لوگ ہوئے کہ) انہوں نے اس (رہبانیت) کی پوری رعایت نہ کی (یعنی جس غرض سے رہبانیت کو اختیار کیا تھا کہ خدا کی رضامندی حاصل ہو اس کا اہتمام نہ کیا، یعنی اصل احکام کی بجا آوری نہ کی، اگرچہ صورتا رہبان رہے اور بعض احکام کی بجا آوری کا اظہار کرتے رہے، اس طرح رہبانوں میں دو قسم کے لوگ ہو گئے: ① احکام کی رعایت کرنے والے ② احکام کی رعایت نہ کرنے والے، چنانچہ جو لوگ حضور ﷺ کے زمانہ میں تھے ان کے حق میں رہبانیت یعنی احکام کی رعایت کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ حضور ﷺ پر ایمان لائیں، پس جو حضور ﷺ پر ایمان لائے وہ تو رہبانیت کا حق ادا کرنے والے تھے اور جو ایمان نہیں لائے وہ اس کی پوری رعایت کرنے والے نہ تھے) سو ان میں سے جو (حضور ﷺ پر) ایمان لائے ہم نے ان کو ان کا اجر (وعدہ کیا ہوا) دیا (مگر ایسے کم تھے) اور زیادہ ان میں نافرمان ہیں (کہ آپ پر ایمان نہیں لائے، اکثریت کے عمل کو سب کی طرف منسوب کردینا عام عرف ہے)۔

اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً: یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب جن کو "حواریین" کہا جاتا ہے ان کی خصوصی صفت رافت و رحمت بیان فرمائی گئی ہے، جیسا کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہ کرام کی چند صفات سورۂ فتح میں بیان فرمائی ہیں، جن میں ایک صفت رحماء بینھم بھی ہے، مگر وہاں اس صفت سے پہلے صحابہ کرام کی خاص صفت: اشدآء علی الکفار بھی بیان فرمائی ہے، اور یہاں یہ صفت نہیں بیان فرمائی، سو اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں کفار سے جہاد و قتال کے احکام نہ تھے، اس لئے کفار کے مقابلہ میں شدت و سختی ظاہر کرنے کا یہاں کوئی محل نہ تھا، واللہ اعلم۔

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا: رہبانیت، رہبان کی طرف منسوب ہے، راہب اور رہبان کے معنی ہیں ڈرنے والا، رہبانیت کی ایجاد کا سبب یہ ہوا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب بنی اسرائیل میں فسق و فجور عام ہو گیا، خصوصاً بادشاہ اور سرداروں نے احکام انجیل سے کھلی بغاوت شروع کردی، ان میں جو کچھ علماء و صلحاء تھے انہوں نے اس بدعملی سے روکا تو ان کو قتل کردیا گیا، جو کچھ بچ رہے انہوں نے دیکھا کہ اب منع کرنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں، اگر ہم ان لوگوں میں مل جل کر رہے تو ہمارا دین بھی برباد ہوگا، اس لئے ان لوگوں نے اپنے اوپر یہ بات لازم کرلی کہ اب دنیا کی سب جائز لذتیں اور آرام بھی چھوڑ دیں، نکاح نہ کریں، کھانے پینے کے سامان جمع کرنے کی فکر نہ کریں، رہنے سہنے کے لئے مکان اور گھر کا اہتمام نہ کریں، لوگوں سے دور کسی جنگل پہاڑ میں بسر کریں، یا پھر خانہ بدوشوں کی طرح زندگی سیاحت میں گزار دیں، تاکہ دین کے احکام پر آزادی سے پورا پورا عمل کرسکیں، ان کا یہ عمل چونکہ خدا کے خوف سے تھا، اس لئے ایسے لوگوں کو راہب یا رہبان کہا جانے لگا، ان کی طرف نسبت کرکے ان کے طریقہ کو رہبانیت سے تعبیر کرنے لگے، اور اس مقام پر یہی ذکر ہے کہ انہوں نے رہبانیت کو از خود ایجاد کرلیا۔

ان کا یہ طریقہ چونکہ حالات سے مجبور ہوکر اپنے دین کی حفاظت کے لئے تھا اس لئے اصالۃً کوئی مذموم چیز نہ تھی، البتہ ایک چیز کو اللہ کے لئے اوپر لازم کر لینے کے بعد اس میں کوتاہی اور خلاف ورزی بڑا گناہ ہے، جیسے نذر اور منت کا حکم ہے کہ وہ اصل سے تو کسی پر لازم و واجب نہیں ہوتی، خود کوئی شخص اپنے اوپر کسی چیز کو نذر کرکے حرام یا واجب کرلیتا ہے تو پھر شرعاً اس کی پابندی واجب اور خلاف ورزی گناہ ہو جاتی ہے، مگر ان میں سے بعض لوگوں نے رہبانیت کا نام رکھ کر دنیا طلبی اور عیش و عشرت کا ذریعہ بنا لیا، کیونکہ عام آدمی ایسے لوگوں کے معتقد ہوئے، تحفے تحائف اور نذرانے آنے لگے، لوگوں کا ان کی طرف رجوع ہوا تو فواحش کی نوبت آنے لگی، قرآن کریم نے آیت مذکورہ میں ان کی اسی بات نکیر فرمائی، کہ خود ہی تو اپنے اوپر ترک لذات کو لازم کیا تھا، جو اللہ کی طرف سے ان پر لازم نہ کیا گیا تھا اور جب لازم کرلیا تو پھر اس کی پابندی ان کو کرنا چاہئے تھی، لیکن اس کی خلاف ورزی کی۔

فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا: آیت مذکورہ کی اس تفسیر کا حاصل یہ ہوا کہ جس طرح کی رہبانیت ابتداءً اختیار کرنے والوں نے اختیار کی تھی وہ اپنی ذات سے مذموم اور بری چیز نہ تھی، البتہ وہ کوئی حکم شرعی بھی نہیں تھا، ان لوگوں نے اپنی مرضی و خوشی سے اسکو اپنے اوپر لازم کرلیا تھا، برائی اور مذمت کا پہلو یہاں سے شروع ہوا کہ اس التزام کے بعد بعض لوگوں نے اس کو نبھایا نہیں اور چونکہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی زیادہ ہو گئی تھی، اس لئے: "للاکثر حکم الکل" یعنی اکثریت کے عمل کو کل کی طرف منسوب کردینا عرف عام ہے، اس قاعدہ کے موافق قرآن نے عام بنی اسرائیل کی طرف یہ منسوب کیا

کہ انہوں نے جس رہبانیت کو اپنے اوپر لازم کرلیا تھا اسکو نبھایا نہیں اور اسکی شرائط کی رعایت نہیں کی، اسی کو فرمایا: فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس رہبانیت کے متعلق جو قرآن نے فرمایا: ابتدعوھا یعنی اس کو انہوں نے ایجاد کرلیا، اس لفظ "ابتداع" جو بدعت سے مشتق ہے وہ اس جگہ اپنے لغوی معنی یعنی اختراع وایجاد کے لئے بولا گیا ہے، شریعت کی اصطلاحی بدعت مراد نہیں ہے جس کے بارے میں حدیث میں ارشاد ہے: "کل بدعة ضلالة" یعنی ہر بدعت گمراہی ہے۔

قرآن کریم کے نسق ونظم میں غور کریں تو یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے سب سے پہلے تو اس جملے پر نظر ڈالیے: وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً، جس میں حق تعالیٰ نے اپنی نعمت کے اظہار کے سلسلے میں فرمایا کہ ہم نے ان کے دلوں میں رافت، رحمت، رہبانیت پیدا کردی، نسق کلام بتلاتا ہے کہ جس طرح رافت ورحمت مذموم نہیں اسی طرح ان کی اختیار کردہ رہبانیت بھی اپنی ذات سے کوئی مذموم چیز نہ تھی، ورنہ مقام احسان میں رافت ورحمت کے ساتھ رہبانیت کا ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، اسی لئے جن حضرات نے مطلقاً رہبانیت کو مذموم وممنوع قرار دیا ان کو اسی جگہ رہبانیت کے عطف میں غیر ضروری تاویل کرنا پڑی کہ اس کو رافت ورحمت پر عطف نہیں مانا بلکہ ایک مستقل جملہ یہاں محذوف قرار دیا یعنی: "ابتداعوا"، لیکن مذکورہ تفسیر پر اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں رہتی، آگے بھی قرآن کریم نے ان کے اس ابتداع پر کوئی نکیر اور رد نہیں فرمایا، بلکہ نکیر اس پر کی گئی کہ انہوں نے اس اختیار کردہ رہبانیت کو نبھایا نہیں، اس کے حقوق وشرائط کی رعایت نہیں کی، یہ بھی جب ہی ہوسکتا ہے کہ ابتداع کو لغوی معنی میں لیا جائے، شرعی اور اصطلاحی معنی ہوتے تو قرآن خود اس پر بھی نکیر کرتا، کیونکہ بدعت اصطلاحی خود ایک گمراہی ہے۔

کیا رہبانیت مطلقاً مذموم وناجائز ہے یا اس میں کچھ تفصیل ہے: صحیح بات یہ ہے کہ لفظ رہبانیت کا عام اطلاق ترک لذات وترک مباحات کے لئے ہوتا ہے، اس کے چند درجے ہیں: ① ایک درجہ یہ کہ کسی مباح وحلال چیز کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار دے، یہ تو دین کی تحریف وتغییر ہے، اس معنی کے اعتبار سے رہبانیت قطعاً حرام ہے اور آیت قرآن: یایھا الذین امنوا لا تحرموا طیبت ما احل اللہ لکم اور اس کی امثال میں اسی کی ممانعت وحرمت کا بیان ہے، اس آیت کا عنوان لا تحرموا خود یہ بتلا رہا ہے کہ اس کی ممانعت اس لئے ہے کہ یہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار دے رہا ہے جو احکام الٰہیہ میں تبدیل وتحریف کے مترادف ہے۔

② دوسرا درجہ یہ ہے کہ مباح کے کرنے کو اعتقاداً یا عملاً حرام قرار نہیں دیتا، مگر کسی دنیوی یا دینی ضرورت کی وجہ سے اس کو چھوڑنے کی پابندی کرتا ہے، دنیوی ضرورت جیسے کسی بیماری کے خطرہ سے کسی مباح چیز سے پرہیز کرے اور دینی ضرورت یہ کہ یہ محسوس کرے کہ میں نے اس مباح کو اختیار کیا تو انجام کار میں کسی گناہ میں مبتلا ہوجاؤں گا، جیسے جھوٹ، غیبت وغیرہ سے بچنے کے لئے کوئی آدمی لوگوں سے اختلاط ہی چھوڑ دے، یا کسی نفسانی رذیلہ کے علاج کے لئے چند روز بعض مباحات کو ترک کردے اور اس ترک کی پابندی بطور علاج ودوا کے اس وقت تک کرے جب تک یہ رذیلہ دور نہ ہوجائے، جیسے صوفیائے کرام مبتدی کو کم کھانے، کم سونے، کم اختلاط کی تاکید کرتے ہیں کہ یہ ایک مجاہدہ ہوتا ہے نفس کو اعتدال پر لانے کا جب نفس پر قابو ہوجاتا ہے کہ ناجائز تک پہنچنے کا خطرہ نہ رہے تو یہ پرہیز چھوڑ دیا جاتا ہے، یہ درحقیقت رہبانیت نہیں، تقویٰ ہے جو مطلوب فی الدین اور اسلاف کرام صحابہ وتابعین اور ائمہ دین سے ثابت ہے۔

③ تیسرا درجہ یہ ہے کہ کسی مباح کو حرام تو قرار نہیں دیتا مگر اس کا استعمال جس طرح سنت سے ثابت ہے اس طرح کے استعمال کو بھی چھوڑنا ثواب اور افضل جان کر اس سے پرہیز کرتا ہے، یہ ایک قسم کا غلو ہے، جس سے احادیث کثیرہ میں رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے اور جس حدیث میں "لا رھبانیة فی الاسلام" آیا ہے یعنی اسلام میں رہبانیت نہیں، اس سے مراد ایسا ہی ترک مباحات ہے کہ ان کے ترک کو افضل وثواب سمجھے، بنی اسرائیل میں جو رہبانیت اول شروع ہوئی وہ اگر حفاظت دین کی ضرورت سے تھی تو دوسری قسم یعنی تقویٰ میں داخل ہے لیکن اہل کتاب میں غلو فی الدین کی آفت بہت تھی، وہ اس غلو میں پہلے درجہ میں تحریم حلال تک پہنچے تو حرام کے مرتکب ہوئے اور تیسرے درجہ تک رہے تو بھی ایک مذموم فعل کے مجرم بنے۔

وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ: چونکہ اکثریت نافرمانوں کی تھی اس لئے سب ہی کی طرف رعایت نہ کرنا منسوب کردیا گیا، اس لیے عام طور پر:

فما رعوھا فرمادیا، معلوم ہوا کہ رعایت کی نفی اکثر کے اعتبار سے ہے، اور قلیل جو ایمان لائے تھے ان کا بیان آیت کے اخیر میں: فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْھُمْ اَجْرَھُمْ میں بیان فرمایا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی پچھلے رسول ان ہی پہلوں کے نقش قدم پر تھے اصولی حیثیت سے سب کی تعلیم ایک تھی۔

فائدہ: ۲ یعنی آخر میں انبیائے بنی اسرائیل کے خاتم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دے کر بھیجا۔

فائدہ: ۳ یعنی حضرت مسیح کے ساتھ جو واقعی ان کے طریقہ پر چلنے والے تھے ان کے دلوں میں اللہ نے نرمی رکھی تھی، وہ خلق خدا کے ساتھ محبت وشفقت کا برتاؤ کرتے اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے تھے۔

فائدہ: ۴ یعنی آگے چل کر حضرت مسیح کے متبعین نے بے دین بادشاہوں سے تنگ ہو کر اور دنیا کے مخمصوں سے گھبرا کر ایک بدعت رہبانیت کی نکالی، جس کا حکم اللہ کی طرف سے نہیں دیا گیا تھا، مگر نیت ان کی یہ ہی تھی کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کریں، پھر اس کو پوری طرح نباہ نہ سکے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یہ فقیری اور تارک الدنیا بننا، نصاریٰ نے رسم نکالی، جنگل میں تکیہ بنا کر بیٹھے، نہ جورو رکھتے نہ بیٹا، نہ کماتے نہ جوڑتے محض عبادت میں لگے رہتے، خلق سے نہ ملتے، اللہ نے بندوں کو یہ حکم نہیں دیا (کہ اس طرح دنیا چھوڑ کر بیٹھ رہیں) مگر جب اپنے اوپر ترک دنیا کا نام رکھا، پھر اس پردے میں دنیا چاہنا بڑا وبال ہے"، شریعت حقہ اسلامیہ نے اس اعتدال فطری سے متجاوز رہبانیت کی اجازت نہیں دی، ہاں بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ "اس امت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے"، کیونکہ مجاہد اپنے سب حظوظ وتعلقات سے واقعی الگ ہو کر اللہ کے راستہ میں نکلتا ہے۔

تنبیہ: "بدعت" کہتے ہیں ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب وسنت اور قرون مشہود لہا بالخیر میں نہ ہو، اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے۔

فائدہ: ۵ یعنی ان میں اکثر نافرمان ہیں اسی لیے خاتم الانبیاء ﷺ پر باوجود دل میں یقین رکھنے کے ایمان نہیں لاتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور یقین لاؤ اس کے رسول پر دے گا تم کو دو حصے اپنی رحمت سے اور رکھ دے گا تم میں

نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۸

روشنی جس کو لیے پھرو اور تم کو معاف کرے گا، اور اللہ معاف کرنے والا ہے مہربان

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک عیسائیوں میں سے ایمان لانے اور ایمان نہ لانے والوں کی دو قسموں کا ذکر تھا، اب آگے ایمان والوں کا حکم ہے کہ) اے (عیسیٰ علیہ السلام پر) ایمان رکھنے والو! تم اللہ سے ڈرو اور (اس ڈر کے مطالبہ اور تقاضا پر عمل کرو یعنی) اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی رحمت سے (ثواب کے) دو حصے دے گا (جیسے سورۃ قصص میں ہے: اولئك یوتون اجرھم مرتین) اور تم کو ایسا نور عنایت کرے گا کہ تم اس کو لئے ہوئے چلتے پھرتے ہو گے (یعنی ایسا ایمان دے گا جو ہر وقت ساتھی رہے گا یہاں سے پل صراط تک) اور تم کو بخش دے گا (کیونکہ اسلام سے زمانہ کفر کے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں) اور اللہ غفور رحیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ: اس آیت میں یایھا الذین امنوا سے مراد اہل کتاب ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، قرآن کریم کی عام عادت یہ ہے کہ الذین امنوا کا لفظ صرف مسلمانوں کے لئے بولا جاتا ہے، یہود ونصاریٰ کے لئے "اہل کتاب" کا لفظ آتا ہے، کیونکہ صرف حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام پر ان کا ایمان کافی اور معتبر نہیں جب تک آنحضرت ﷺ پر ایمان نہ لائیں، اس لئے وہ الذین امنوا کہلانے کے مستحق نہیں، مگر یہاں اس عام عادت کے خلاف یہ لفظ نصاریٰ کے لئے بولا گیا، شاید اس میں حکمت یہ ہو کہ آگے ان کو حکم کیا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پر

صحیح ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ پر بھی ایمان لاؤ اور جب وہ ایسا کر لیں تو الذین امنوا کے خطاب کے مستحق ہو گئے، یعنی رسول ﷺ پر ایمان لانے کے بعد ان کا ایمان مقبول ہو جائے گا۔

* * *

فائدہ: یعنی اس رسول کے تابع رہو کہ یہ نعمتیں پاؤ، گذشتہ خطاؤں کی معافی اور ہر عمل کا دوگنا ثواب اور روشنی لیے پھرو، یعنی تمہارا وجود ایمان وتقویٰ سے نورانی ہو جائے، اور آخرت میں یہ ہی تمہارے آگے اور داہنی طرف چلے۔

تنبیہ: احقر کے خیال میں یہ خطاب ان اہل کتاب کو ہے جو حضور ﷺ پر ایمان لا چکے تھے، اس تقدیر پر **وامنوا برسولہ** سے ایمان پر ثابت و مستقیم رہنا مراد ہوگا، باقی اہل کتاب کو دونا ثواب ملنے کا کچھ بیان سورۂ قصص میں گزر چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ

تاکہ نہ جانیں کتاب والے کہ پا نہیں سکتے کوئی چیز اللہ کے فضل میں سے اور یہ کہ بزرگی اللہ کے ہاتھ ہے

يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ ع

دیتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ کا فضل بڑا ہے

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیت میں بیان کردہ یہ دولتیں تم کو اس لئے عنایت کرے گا) تاکہ (جس وقت ان عطایا کا ظہور ہو یعنی قیامت کے روز اس وقت) اہل کتاب کو (یعنی جو ایمان نہیں لائے ان کو) یہ بات معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کو اللہ کے فضل کے کسی جزو پر بھی (بغیر ایمان لائے) دسترس نہیں اور یہ (بھی معلوم ہو جائے) کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے دے دے (چنانچہ اس نے یہ فضل مسلمانوں کو دینا چاہا تو ان کو عنایت فرما دیا) اور اللہ بڑے فضل والا ہے (مطلب یہ کہ ان کا غرور اور زعم ٹوٹ جائے کیونکہ وہ موجودہ حالت میں بھی اپنے کو فضل کا حق دار اور مغفرت کا محل سمجھتے ہیں)۔

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ: اس میں لا زائدہ ہے، معنی: "لیعلم اھل الکتاب" کے ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ مذکور الصدر احکام اس لئے بیان کئے گئے تاکہ اہل کتاب سمجھ لیں کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں کہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان ہے، رسول اللہ ﷺ پر نہیں، اس حالت میں وہ اللہ کے کسی فضل کے مستحق نہیں جب تک حضرت خاتم الانبیاء پر ﷺ ایمان نہ لے آئیں۔

* * *

فائدہ: یعنی اہل کتاب پہلے پیغمبروں کے احوال سن کر پچھتاتے تھے کہ افسوس ہم ان سے دور پڑ گئے، ہم کو وہ درجے ملنے محال ہیں جو نبیوں کی صحبت سے حاصل ہوتے ہیں، سو یہ رسول، اللہ نے کھڑا کیا اس کی صحبت میں پہلے سے دونا کمال اور بزرگی مل سکتی ہے، اور اللہ کا فضل بند نہیں ہو گیا۔

تنبیہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے، لیکن اکثر سلف سے یہ منقول ہے کہ یہاں: لِئَلَّا يَعْلَمَ بمعنی "لِكَيْ يَعْلَمَ" کے ہے، یعنی "تاکہ جان لیں اہل کتاب (جو ایمان نہیں لائے) کہ وہ دسترس نہیں رکھتے اللہ کے فضل پر اور فضل صرف اللہ کے ہاتھ ہے جس پر چاہے کر دے"، چنانچہ اہل کتاب میں سے جو خاتم الانبیاء پر ایمان لائے ان پر یہ فضل کر دیا کہ ان کو دوگنا اجر ملتا ہے اور گزشتہ خطاؤں کی معافی اور روشنی مرحمت ہوتی ہے، اور جو ایمان نہیں لائے وہ ان انعامات سے محروم ہیں۔

ایاتها ۲۲ ۵۸ سُورَةُ الْمُجَادَلَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۵ رکوعاتها ۳

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے ختم پر رسالت کا مضمون اور اس سورت کے شروع میں حق تعالیٰ کا تمام باتوں کو سننا جو کہ مسائل توحید میں سے ہے مذکور ہے، نیز گذشتہ سورت کے ختم پر مسلمانوں کے اوپر اخروی فضل کا بیان تھا اور اس سورت کے شروع میں دنیوی فضل واحسان کا ذکر ہے کہ مسئلہ ظہار میں جو پہلے سختی تھی اس کو دور کر دیا، ابتدائی آیات کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت اوسؓ بن صامت نے غصہ میں ایک بار اپنی بیوی حضرت خولہؓ کو یوں کہہ دیا: "انت علی کظھر امی" کہ تو میرے حق میں ایسی حرام ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ مجھ پر حرام ہے، اور حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے جاہلیت میں اس لفظ سے بیوی ہمیشہ کے لیے حرام یعنی طلاق سے بھی بڑھ کر سمجھی جاتی تھی، خولہؓ مسئلہ دریافت کرنے کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ ﷺ نے اس وجہ سے کہ ابھی تک اس مشہور قول کے خلاف وحی نازل نہ ہوئی تھی اس قول کو قابل عمل خیال کر کے فرما دیا کہ میری رائے میں تو اپنے شوہر پر حرام ہوگئی، وہ یہ سن کر واویلا کرنے لگیں کہ پھر میرا اور میرے بچوں کا گذارا کیسے ہوگا؟ ایک روایت میں ہے کہ خولہؓ نے کہا کہ میرے شوہر نے "طلاق" کا لفظ تو نہیں کہا پھر طلاق کیسے ہوگئی؟ ایک روایت میں ہے کہ خولہؓ نے اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ: "اللهم إني أشكوا إليك"، ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ابھی تک تمہارے اس مسئلہ کے متعلق مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا، ان سب روایات میں کوئی تضاد وتعارض نہیں، سبھی اقوال صحیح ہو سکتے ہیں، چنانچہ اس پر اس سورت کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ قَوۡلَ الَّتِىۡ تُجَادِلُكَ فِىۡ زَوۡجِهَا وَتَشۡتَكِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ ‌ۖ وَاللّٰهُ يَسۡمَعُ

سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں اور جھینکتی تھی اللہ کے آگے ۱؎ اور اللہ سنتا تھا

تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ ①

سوال وجواب تم دونوں کا، بیشک اللہ سنتا ہے دیکھتا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: بیشک اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے معاملے میں جھگڑتی تھی (مثلاً وہ یہ کہتی تھی کہ میرے شوہر نے "طلاق" کا لفظ تو ذکر نہیں کیا پھر حرمت کیسے ہوگئی؟) اور (اپنے رنج وغم کی) اللہ تعالیٰ سے شکایت کرتی تھی (مثلاً اس نے یہ کہا تھا: "اللهم انی اشکو الیك" اے اللہ! میں آپ سے اپنی حالت کی شکایت کرتی ہوں) اور اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا (اور) اللہ تعالیٰ (تو) سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے (تو اس کی بات کو کیسے نہ سنتا)۔

قَدۡ سَمِعَ اللّٰهُ: یہاں سمع اللہ سے خدا تعالیٰ کا مقصود اپنے لئے "سمع" ثابت کرنا نہیں ہے، بلکہ اس عورت کی تکلیف کو ختم کرنا اور اس کی عاجزی کو قبول کرنا مقصود ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اسلام سے پہلے مرد اگر اپنی عورت کو کہتا کہ تو میری ماں ہے تو سمجھتے تھے کہ ساری عمر کے لیے اس پر حرام ہوگئی پھر کوئی صورت ان کے ملنے کی نہ تھی، آنحضرت ﷺ کے وقت میں ایک مسلمان (اوس بن الصامت) اپنی عورت (خولہ بنت ثعلبہ) کو یہی کہہ بیٹھا، عورت حضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچی اور سب ماجرا کہہ سنایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے ابھی تک کوئی خاص حکم نہیں دیا، میں خیال کرتا ہوں کہ تو اس پر حرام ہوگئی، اب تم دونوں کیونکر مل سکتے ہو، وہ شکوہ وزاری کرنے لگی کہ گھر ویران ہوتا ہے اولاد پریشان ہوتی ہے، کبھی حضور ﷺ سے

جھگڑتی کہ یارسول اللہ! اس نے ان الفاظ سے طلاق کا ارادہ نہیں کیا تھا، کبھی اللہ کے آگے رونے جھینکنے لگتی کہ اللہ! میں اپنی تنہائی اور مصیبت کی فریاد تجھ سے کرتی ہوں، ان بچوں کو اگر اپنے پاس رکھوں تو بھوکے مریں گے، اس کے پاس چھوڑوں تو یوں ہی (کسمپرسی میں) ضائع ہو جائیں گے، اے اللہ! تو اپنے نبی کی زبان سے میری مشکل کو حل کر، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، اور ''ظہار'' کا حکم اترا۔

تنبیہ: حنفیہ کے نزدیک ظہار یہ ہے کہ اپنی بیوی کو محرمات ابدیہ (ماں بہن وغیرہ) کے کسی ایسے عضو سے تشبیہ دے جس کی طرف دیکھنا اسکو منع ہو، مثلاً یوں کہے: "انت علیّ کظھْرِ اُمّی" (تو مجھ پر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ) ''ظہار'' کے احکام کی تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ کی جائے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ تو سب ہی کچھ سنتا دیکھتا ہے، جو گفتگو آپ ﷺ کے اور اس عورت کے درمیان ہوئی وہ کیوں نہ سنتا، بیشک وہ مصیبت زدہ عورت کی فریاد کو پہنچا، اور ہمیشہ کے لیے اس قسم کے حوادث سے عہدہ برآ ہونے کا راستہ بتلا دیا، جو آگے آتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ

جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں تم میں سے اپنی عورتوں کو وہ نہیں ہو جاتیں ان کی مائیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا

وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ②

اور وہ بولتے ہیں ایک ناپسند بات اور جھوٹی ۱ اور اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: اب ظہار کے حکم کا بیان ہے جس میں اس شکایت کرنے والی کی آہ وزاری کے قبول کرنے کا بیان ہے۔

تم میں جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں (مثلاً یوں کہہ دیتے ہیں "انت علی کظھر امی") وہ (بیویاں) ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں تو بس وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے (اس لئے یہ الفاظ کہنے سے یہ عورتیں یعنی بیویاں ان کی مائیں نہیں بن جائیں گی کہ ماں کی طرح ہمیشہ کے لیے حرمت ثابت ہو، اور کوئی دوسرا سبب بھی ہمیشہ کی حرمت ثابت کرنے والا کسی دلیل سے ثابت نہیں، مثلاً تحریم نسب، رضاعت یا حرمت مصاہرۃ وغیرہ، پس دائمی حرمت کی نفی ہوگئی) اور وہ لوگ (جو کہ بیویوں کو ''ماں'' کہتے ہیں) بلاشبہ ایک نامعقول اور جھوٹ بات کہتے ہیں (اس لئے گناہ ضرور ہوگا) اور (اگر اس گناہ کا تدارک توبہ اور کفارہ سے ادا کر دیا جائے تو وہ گناہ معاف بھی ہو جائے گا، کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دینے والے بخش دینے والے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ: ''ظہار'' کے معنی ہیں اپنی بیوی کو کسی ایسی عورت (جو اس شخص پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جیسے ماں، بہن، بیٹی وغیرہ) کے ایسے عضو سے تشبیہ دینا جس کو دیکھنا اس کے لیے جائز نہیں، ماں کی پشت بھی اس کی ایک مثال ہے، جیسے پیٹ، پیٹھ اور ران وغیرہ، زمانہ جاہلیت میں یہ لفظ دائمی حرمت کے لیے بولا جاتا تھا اور طلاق کے لفظ سے بھی زیادہ شدید سمجھا جاتا تھا، کیونکہ طلاق کے بعد تو رجوع یا نکاح جدید ہو کر پھر بیوی بن سکتی ہے، مگر ظہار کی صورت میں رسم جاہلیت کے مطابق ان کے آپس میں میاں بیوی ہو کر رہنے کی قطعی کوئی صورت نہ تھی۔

واضح رہے کہ ظہار کرنے سے گناہ گار ہوگا، بلکہ بعض نے تو اسے گناہ کبیرہ کہا ہے، بغیر کفارہ ادا کیے صحبت اور اس کے مقدمات جائز نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بیوی (جس نے اس کو جنا نہیں) وہ اس کی واقعی ماں کیونکر بن سکتی ہے جو محض اتنے لفظ پر ہمیشہ کے لیے حقیقی ماں کی طرح حرام ہو جائے؟ ہاں آدمی جب اپنی بدتمیزی سے ایک جھوٹی نامعقول اور بیہودہ بات کہہ دے اس کا بدلہ یہ ہے کہ کفارہ دے، تب اس کے پاس جائے ورنہ نہ جائے، پر عورت اسی کی رہی، محض ظہار سے طلاق نہیں پڑ گئی۔

فائدہ: ۲ یعنی جاہلیت میں جو ایسی حرکت کر چکے وہ معاف ہے، اب ہدایت آچکنے کے بعد ایسا مت کرو، اگر غلطی سے کر گزرے تو توبہ کر کے اللہ سے معاف کرائے، اور عورت کے پاس جانے سے پہلے کفارہ ادا کرو۔

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ

اور جو لوگ ماں کہہ بیٹھیں اپنی عورتوں کو پھر کرنا چاہیں وہی کام جس کو کہا ہے تو آزاد کرنا چاہیے ایک بردہ پہلے اس سے کہ

يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ③

آپس میں ہاتھ لگائیں ۱؎ اس سے تم کو نصیحت ہوگی ۲؎ اور اللہ خبر رکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۳؎

خلاصہ تفسیر: اب اس تدارک یعنی ظہار کے کفارہ کا بعض صورتوں کے اعتبار سے بیان ہے۔

اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اپنی کہی ہوئی بات کی (جو کہ بیوی کی حرمت ہے) تلافی کرنا چاہتے ہیں (یعنی بیویوں سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں) تو ان کے ذمہ ایک غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا ہے قبل اس کے کہ دونوں (میاں بیوی) باہم اختلاط کریں (صحبت سے یا اسباب صحبت سے) اس (کفارہ کا حکم کرنے) سے تم کو نصیحت کی جاتی ہے (کفارہ سے تکفیر سیئات کے علاوہ یہ بھی نفع ہے کہ اس سے آئندہ کو تمہیں تنبیہ ہوجائے گی) اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (کہ کفارہ کے متعلق احکامات کی پوری بجا آوری کرتے ہو یا نہیں)۔

پس کفارہ میں دو حکمتیں ہوگئیں: ① ایک گناہ کی معافی جس کی طرف گذشتہ آیت کے آخر میں **لعفو غفور** سے اشارہ ہے ② دوسری زجرو تنبیہ یعنی آئندہ ایسی حرکت سے رک جانا جس کا یہاں **توعظون** میں بیان ہے اور کفارہ کی تینوں قسموں میں یہ دوسری حکمت بھی ہے، لیکن غلام یا لونڈی آزاد کرنا چونکہ کفارہ کے اقسام میں ذکراً مقدم ہے، اس لئے اس دوسری حکمت کو اس کے ساتھ ذکر کردیا گیا۔

ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفارہ کا وجوب بیوی کے ساتھ میل جول اور صحبت حلال ہونے کی غرض سے ہے اس کے بغیر حلال نہیں، اور اگر صحبت وغیرہ کا کسی وجہ سے ارادہ نہ ہو مثلاً اس بیوی کو طلاق ہی دے دی یا وہ مرگئی تو اس گناہ کی معافی کے لیے صرف توبہ کافی ہے، کیونکہ کفارہ واجب ہونے کے لیے صحبت وغیرہ کا ارادہ کرنا شرط ہے، خود ظہار اس کفارہ کی علت نہیں، اور اگر صحبت وغیرہ کے ارادہ کے بغیر بھی کفارہ ادا کرے تو کفارہ ادا ہوجائے گا اور صحبت حلال ہوگی، البتہ صحبت وغیرہ کے ارادہ کے بغیر کفارہ واجب نہیں ہوتا، پس **ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا** کا مطلب یہ ہے کہ بغیر کفارہ ادا کیے صحبت جائز نہیں، یہ مطلب نہیں کہ صحبت کے ارادہ کے بغیر کفارہ ادا بھی نہ ہوگا۔

ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ: ظہار کے کفارہ کو وعظ و زجر کا سبب قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ نفس کی اصلاح میں مالی بوجھ کو بھی دخل ہے، یعنی اگر کسی سے کوئی غلطی یا غفلت ہوجائے تو اپنے نفس پر مالی جرمانہ مقرر کرے تاکہ آئندہ نہ ہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ لفظ: "اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّی" (تو مجھ پر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ) کہا صحبت موقوف کرنے کو، پھر صحبت کرنا چاہیں تو پہلے ایک غلام آزاد کرلیں اس کے بعد ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔

تنبیہ: حنفیہ کے ہاں کفارہ دینے سے پہلے جماع اور دواعی جماع دونوں ممنوع ہیں، بعض احادیث میں ہے: "اَمَرَہٗ اَنْ لَّا یقْرُبَھَا حَتّٰی یُکَفِّرَ"۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کفارہ کی مشروعیت تمہاری تنبیہ و نصیحت کے لیے ہے کہ پھر ایسی غلطی نہ کرو، اور دوسرے بھی باز آئیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی تمہارے احوال کے مناسب احکام بھیجتا ہے اور خبر رکھتا ہے کہ تم کس حد تک ان پر عمل کرتے ہو۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ

پھر جو کوئی نہ پائے تو روزے ہیں دو مہینے کے لگاتار ۱؎ پہلے اس سے کہ آپس میں چھوئیں، پھر جو کوئی یہ نہ کرسکے تو کھانا دینا ہے

سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ

ساٹھ محتاجوں کا ۲ یہ حکم اس واسطے کہ تابعدار ہو جاؤ اللہ کے اور اس کے رسول کے ۳ اور یہ حدیں باندھی ہیں اللہ کی اور منکروں کے واسطے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴﴾

عذاب ہے دردناک

خلاصہ تفسیر: پھر جس کو (غلام، لونڈی) میسر نہ ہو تو اس کے ذمہ پے در پے (یعنی لگاتار) دو مہینے کے روزے ہیں قبل اس کے کہ دونوں (میاں بیوی) باہم اختلاط کریں، پھر جس سے یہ بھی نہ ہو سکیں تو اس کے ذمہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے (اب آگے دوسرے احکام کی طرح اس حکم کی تصدیق کا واجب ہونا اس لیے بیان فرماتے ہیں کہ اس حکم کا مقصد قدیم رسم اور جاہلیت کے حکم کو توڑنا ہے، اس لئے اہتمام مناسب ہوا، پس ارشاد ہوا کہ) یہ حکم اس لئے (بیان کیا گیا) ہے تاکہ (اس حکم سے متعلق مصلحتوں کے حاصل کرنے کے علاوہ) اللہ اور رسول پر ایمان (بھی) لے آؤ (یعنی ان احکام میں خدا اور رسول کی تصدیق بھی کر دو تاکہ جو مصلحتیں ایمان کے متعلق ہیں وہ بھی حاصل ہوں) اور (آگے مزید تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) یہ اللہ کی حدیں (باندھی ہوئی) ہیں (یعنی خداوندی ضابطے ہیں) اور کافروں کے لئے (جو کہ ان احکام کی تصدیق نہیں کرتے بالخصوص) سخت دردناک عذاب ہوگا (اور مطلق عذاب تو عمل میں خلل ڈالنے والے کو بھی ہو سکتا ہے، یعنی تھوڑا بہت عذاب اس شخص کو بھی ہو سکتا ہے جو عمل میں کوتاہی کرے)۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا: اگر غلام آزاد کرنے یا روزے رکھنے کے درمیان میں صحبت کر لی تو کفارہ پھر سے ادا کرنا ہوگا، اور آزاد کرنے کے بیچ میں صحبت کرنے کی یہ صورت ہے کہ پہلے آدھا آزاد کر دیا اور صحبت کر لی پھر باقی آدھا بعد میں آزاد کر دیا، اور کھانا کھلانے کے بیچ میں صحبت کر لی تو صرف گناہ ہوگا، کفارہ پھر سے ادا کرنا واجب نہ ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بیچ میں دم نہ لے۔

فائدہ: ۲ ''بردہ'' (غلام) آزاد کرنے کا مقدور نہ ہو، تب روزے رکھ سکتا ہے، اور روزے رکھنے سے مجبور ہو تب کھانا دے سکتا ہے، تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ کی جائے۔

فائدہ: ۳ یعنی جاہلیت کی باتیں چھوڑ کر اللہ و رسول کے احکام پر چلو، جو مومن کامل کی شان ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ

جو لوگ کہ مخالفت کرتے ہیں اللہ کی اور اسکے رسول کی وہ خوار ہوئے جیسے کہ خوار ہوئے ہیں وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے اور ہم نے اتاری ہیں

اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵﴾

آیتیں بہت صاف اور منکروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا

خلاصہ تفسیر: (اور دردناک عذاب صرف اسی حکم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ) جو لوگ اللہ اور رسول کی مخالفت کرتے ہیں (خواہ کسی بھی حکم میں مخالفت کریں جیسے کفار مکہ) وہ (دنیا میں بھی) ایسے ذلیل ہوں گے جیسے ان سے پہلے لوگ ذلیل ہوئے (چنانچہ کئی غزوات میں اس کا ظہور ہوا) اور (سزا کیسے نہ ہو کیونکہ) ہم نے کھلے کھلے احکام (جن کا صحیح ہونا قرآن کے اعجاز سے ثابت ہے) نازل کئے ہیں (تو ان کا انکار لامحالہ سزا کا

سبب ہوگا اور یہ سزا تو دنیا میں ہوگی) اور کافروں کو (آخرت میں بھی) ذلت کا عذاب ہوگا۔

فائدہ: یعنی مومنین کا کام نہیں کہ اللہ کی باندھی ہوئی حدود سے تجاوز کریں، باقی رہے کافر جو حدود اللہ کی پروا نہیں کرتے اور خود اپنی رائے وخواہش سے حدیں مقرر کرتے ہیں، انہیں چھوڑیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے، ایسے لوگ پہلے زمانہ میں بھی ذلیل وخوار ہوئے اور اب بھی ہو رہے ہیں، اللہ کی روشن اور صاف صاف آیتیں سن لینے کے بعد انکار پر جمے رہنا اور خدائی احکام کی عزت واحترام نہ کرنا اپنے کو ذلت کے عذاب میں پھنسانے کے مترادف ہے۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ

جس دن کہ اٹھائے گا اللہ ان سب کو پھر جتلائے گا ان کو ان کے کیے کام ۱؎ اللہ نے وہ سب گن رکھے ہیں اور وہ بھول گئے

وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ ع

اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے اس عذاب کا وقت بتلاتے ہیں کہ یہ اس روز ہوگا) جس روز ان سب کو اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا پھر ان سب کا کیا ہوا اُن کو بتلا دے گا (کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے وہ محفوظ کر رکھا ہے اور یہ لوگ اس کو بھول گئے ہیں (یا وہ واقعی بھول گئے، یا بے فکری اور بے التفاتی کے اعتبار سے) اور اللہ ہر چیز پر مطلع ہے (خواہ ان کے اعمال ہوں یا اور کچھ)۔

فائدہ: ۱؎ یعنی جو کام کیے تھے ان سب کا نتیجہ سامنے آجائے گا کوئی ایک عمل بھی غائب نہ ہوگا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان کو اپنی عمر بھر کے بہت سے کام یاد بھی نہیں رہے، یا ان کی طرف توجہ نہیں رہی، لیکن اللہ کے ہاں وہ سب ایک ایک کر کے محفوظ ہیں، وہ سارا دفتر اس دن کھول کر سامنے رکھ دیا جائے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ

تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، کہیں نہیں ہوتا مشورہ تین کا

اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ

جہاں وہ نہیں ہوتا ان میں چوتھا اور نہ پانچ کا جہاں وہ نہیں ہوتا ان میں چھٹا اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ جہاں وہ

اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

نہیں ہوتا ان کے ساتھ جہاں کہیں ہوں ۱؎ پھر جتلا دے گا ان کو جو کچھ انہوں نے کیا قیامت کے دن، بیشک اللہ کو معلوم ہے ہر چیز

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَاۗدُّوْنَ اللّٰهَ میں اللہ ورسول کے خلاف کرنے والوں کے لیے وعید بیان ہوئی، اور یہ خلاف کرنے والے دو قسم کے ہیں: ① ایک کھلے کافر ② دوسرے منافق، پیچھے کھلے کافروں کا بیان تھا، اب آگے منافقوں کی اور کھلے کافروں میں سے بالخصوص یہود کی مذمت مذکور ہے کہ منافق بھی ان ہی میں سے تھے، شان نزول یہ ہے کہ یہود اور مسلمانوں میں صلح تھی، لیکن یہود جب کسی مسلمان کو دیکھتے تو اس کے خیالات پریشان کرنے کے لئے آپس میں سرگوشی کرنے لگتے، وہ مسلمان سمجھتا کہ میرے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں، حضور ﷺ

نے یہود کو اس سے منع فرمایا مگر وہ باز نہ آئے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئی۔

کیا آپ نے اس پر نظر نہیں فرمائی (مطلب دوسروں کو سنانا ہے جو ممانعت کے بعد سرگوشی سے باز نہ آتے تھے) کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے (اور اسی میں ان کی سرگوشی بھی داخل ہے پس) کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) نہ ہو اور نہ پانچ کی (سرگوشی) ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو، اور نہ اس (عدد) سے کم (میں ہوتی ہے جیسے دو یا چار آدمیوں میں) اور نہ اس سے زیادہ (میں ہوتی ہے، جیسے چھ سات یا زیادہ آدمیوں میں) مگر وہ (ہر حالت میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (خواہ) وہ لوگ کہیں بھی ہوں، پھر ان (سب) کو قیامت کے روز ان کے کئے ہوئے کام بتلا دے گا، بیشک اللہ تعالیٰ کو ہر بات کی پوری خبر ہے (یعنی یہ مسلمانوں کو تکلیف دینے کے لئے باطل سرگوشی کرنے والے خدا سے ڈرتے نہیں کہ خدا کو سب خبر ہے اور وہ ان کو سزا دے گا، اس آیت کا عام مضمون اگلے خاص خاص جزئی مضامین کی تمہید ہے جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے)۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی صرف ان کے اعمال ہی پر کیا منحصر ہے، اللہ کے علم میں تو آسمان و زمین کی ہر چھوٹی بڑی چیز ہے، کوئی مجلس، کوئی سرگوشی اور کوئی خفیہ سے خفیہ مشورہ نہیں ہوتا جہاں اللہ اپنے علم محیط کے ساتھ موجود نہ ہو جہاں تین آدمی چھپ کر مشورہ کرتے ہوں نہ سمجھیں کہ وہاں کوئی چوتھا نہیں سن رہا، اور پانچ کی کمیٹی خیال نہ کرے کہ کوئی چھٹا سننے والا نہیں، خوب سمجھ لو تین ہوں یا پانچ یا اس سے کم زیادہ، کہیں ہوں، کسی حالت میں ہوں، اللہ تعالیٰ ہر جگہ اپنے علم محیط سے ان کے ساتھ ہے کسی وقت ان سے جدا نہیں۔

تنبیہ: مشورہ میں اگر صرف دو شخص ہوں تو بصورت اختلاف ترجیح دشوار ہوتی ہے، اسی لیے عموماً معاملات مہمہ میں طاق عدد رکھتے ہیں اور ایک کے بعد پہلا طاق عدد تین تھا پھر پانچ، شاید اس لیے ان دو کو اختیار فرمایا اور آگے: وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ سے تعمیم فرما دی۔

باقی حضرت عمر کا شوریٰ خلافت کو چھ بزرگوں میں دائر کرنا (حالانکہ چھ کا عدد طاق نہیں) اس لیے ہوگا کہ اس وقت یہ ہی چھ خلافت کے سب سے زیادہ اہل اور مستحق تھے، جن میں سے کسی کو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا، نیز خلیفہ کا انتخاب ان ہی چھ میں سے ہو رہا تھا تو ظاہر ہے جس کا نام آتا، اس کے سوائے رائے دینے والے تو پانچ ہی رہتے ہیں، پھر بھی احتیاطاً حضرت عمر نے بصورت مساوات ایک جانب کی ترجیح کے لیے عبداللہ بن عمر کا نام لے دیا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ

تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جن کو منع ہوئی کانا پھوسی پھر بھی وہی کرتے ہیں جو منع ہو چکا ہے اور کان میں باتیں کرتے ہیں گناہ کی

وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَاِذَا جَاۗءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ

اور زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کی لہ اور جب آئیں تیرے پاس تجھ کو وہ دعا دیں جو دعا نہیں دی تجھ کو اللہ نے اور کہتے ہیں

فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۸

اپنے دل میں کیوں نہیں عذاب کرتا ہم کو اللہ اس پر جو ہم کہتے ہیں کافی ہے ان کو دوزخ داخل ہوں گے اس میں سو بری جگہ پہنچے ۲

خلاصہ تفسیر: اس آیت میں آنے والی چند ہدایات کا شان نزول یہ ہے کہ جب یہود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو از راہ شرارت بجائے "السلام علیکم" کہنے کے "السام علیکم" کہتے، "سام" بمعنی موت کے ہیں، منافقین بھی اسی طرح کہتے، ان دونوں واقعوں پر: وَاِذَا جَاۗءُوْكَ حَيَّوْكَ الخ نازل ہوئی، اور ابن کثیر نے امام احمد کی روایت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہود اس طرح سلام کر کے خفیہ کہتے: لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ،

یعنی اگر ہم نے یہ گناہ کیا ہے تو ہم پر فوراً عذاب کیوں نہیں آ جاتا۔

(اب آگے وہ جزئی مضامین ہیں، یعنی) کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جن کو سرگوشی سے منع کر دیا گیا تھا (مگر) پھر (بھی) وہ وہی کام کرتے ہیں جس سے ان کو منع کر دیا گیا تھا اور گناہ اور ظلم اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں (یعنی ایسی سرگوشی کرتے ہیں جس میں ممانعت کی وجہ سے "گناہ" بھی ہے، اور مسلمانوں کو غمگین کرنے کی وجہ سے "عدوان" یعنی ظلم بھی ہے، اور بوجہ اس کے کہ حضور ﷺ منع فرما چکے تھے رسول کی "نافرمانی" بھی ہے) اور وہ لوگ (ایسے ہیں کہ) جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو ایسے لفظ سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں فرمایا (یعنی اللہ تعالیٰ کے الفاظ تو یہ ہیں: سلٰم علی المرسلین یعنی رسولوں پر سلام ہو، اور سلام علی عبادہ الذین اصطفی خدا کے برگزیدہ بندوں پر سلام ہو، صلوا علیہ وسلموا تسلیما یعنی رسول پر درود و سلام بھیجا کرو، اور وہ کہتے ہیں "السام علیک" جس کے معنی موت کے ہیں) اور اپنے جی میں (یا اپنے آپس میں) کہتے ہیں کہ (اگر یہ پیغمبر ہیں تو) اللہ تعالیٰ ہم کو ہمارے اس کہنے پر (جس میں سراسر آپ کی بے ادبی ہے) سزا (فوراً) کیوں نہیں دیتا (آگے ان کے اس فعل پر وعید اور اس بات کا جواب ہے کہ بعض حکمتوں کے سبب جلدی عذاب نہ آنے سے مطلقاً عذاب نہ دینا لازم نہیں آتا) ان (کی سزا) کے لئے جہنم کافی ہے اس میں یہ لوگ (ضرور) داخل ہوں گے سو وہ برا ٹھکانا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت ﷺ کی مجلس میں بیٹھ کر منافق سرگوشیاں کرتے، مجلس والوں کا مذاق اڑاتے، ان پر عیب پکڑتے، ایک دوسرے کے کان میں اس طرح بات کہتا اور آنکھوں سے اشارے کرتا جس سے مخلص مسلمانوں کو تکلیف ہوتی، اور حضرت ﷺ کی بات سن کر کہتے: "یہ مشکل کام ہم سے کہاں ہو سکے گا"، پہلے سورہ نساء میں اس طرح کی سرگوشیوں سے منع کیا جا چکا تھا، لیکن یہ موذی بے حیاء پھر بھی اپنی حرکتوں اور زیادتیوں سے باز نہ آئے، اس پر یہ آیتیں اتریں۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ نے تو آپ کو دوسرے انبیاء کے ساتھ یہ دعائیں دی ہیں: وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (الصافات: ۱۸۱) اور: وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى (النمل: ۵۹) اور مومنین کی زبانوں سے: " اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّها النَّبِیّ وَرَحْمَةُ الله بَرَكَاتُه"، مگر بعض یہود جب آپ کے پاس آتے تو بجائے "السلام علیکم" کے دبی زبان سے " السَّامُ عَلَيْكَ " کہتے، جس کے معنی ہیں: "تجھے موت آئے"، گویا اللہ نے جو سلامتی کی دعا، آپ کو دی تھی، اس کے خلاف بددعا دیتے تھے، پھر آپس میں کہتے کہ اگر یہ واقعی رسول ہے تو ایسا کہنے سے ہم پر فوراً عذاب کیوں نہیں آتا، اس کا جواب دیا: حسبہم جہنم یعنی جلدی نہ کرو، ایسا کافی عذاب آئے گا جس کے سامنے دوسرے عذاب کی ضرورت نہ ہوگی۔

تنبیہ: احادیث میں "یہود" کے متعلق آیا ہے کہ "السلام" کی جگہ "السام" کہتے تھے، ممکن ہے بعض منافقین بھی ایسا کہتے ہوں گے، کیونکہ منافق عموماً یہودی تھے، حضور ﷺ کی عادت تھی کہ جب کوئی یہودی یہ کہتا آپ جواب میں صرف "وعلیک" فرما دیتے، ایک مرتبہ عائشہ صدیقہؓ نے "السام علیک" کے جواب میں یہودی کو "علیك السام واللعنة" کہا تو حضور ﷺ کو کمال خلق سے یہ جواب پسند نہ آیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ

اے ایمان والوں جب تم کان میں بات کرو تو مت کرو بات گناہ کی اور زیادتی کی اور رسول کی نافرمانی کی

وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

اور بات کرو احسان کی اور پرہیزگاری کی ۱ اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم کو جمع ہونا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: اسی طرح منافقین بھی باہم سرگوشی کیا کرتے اس پر یہ آیت اور اگلی آیت انما النجوی الخ نازل ہوئی، چنانچہ

اب آگے ایمان والوں کو خطاب ہے جس سے منافقین کے ساتھ مشابہت کرنے سے ان کو بھی ممانعت کی گئی ہے اور منافقین کو بھی سنانا منظور ہے کہ تم تو ایمان کے مدعی ہو تو ایمان کے مقتضا پر عمل کرو پس ارشاد ہے کہ:

اے ایمان والوں! جب تم (کسی ضرورت سے) سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں مت کرو (ان الفاظ کی تفسیر گذشتہ آیت میں گزری ہے) اور نفع رسانی اور پرہیزگاری کی باتوں کی سرگوشیاں کرو، اور اللہ سے ڈرو جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے۔

وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى: آیت میں ''بر'' عدوان کے مقابلہ میں ہے، اس سے مراد وہ نفع ہے جو دوسروں تک پہنچے، اور ''تقویٰ'' اثم اور معصیت الرسول یعنی رسول کی نافرمانی کا مقابل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سچے مسلمانوں کو منافقین کی خو سے بچنا چاہیے، ان کی سرگوشیاں اور مشورے ظلم و عدوان اور اللہ و رسول کی نافرمانی کے لیے نہیں، بلکہ نیکی اور تقویٰ اور معقول باتوں کی اشاعت کے لیے ہونے چاہئیں جیسا کہ سورۃ نساء میں گزرا: لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (النساء: ۱۱۴)

فائدہ: ۲ یعنی سب کو اللہ کے سامنے جمع ہو کر ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہے، اس سے کسی کا ظاہر و باطن پوشیدہ نہیں، لہذا اس سے ڈر کر نیکی اور پرہیزگاری کی بات کرو۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط

یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے تا کہ دل گیر کرے ایمان والوں کو اور وہ ان کا کچھ نہ بگاڑے گا بدون اللہ کے حکم کے

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾

اور اللہ پر چاہیے کہ بھروسہ کریں ایمان والے

خلاصہ تفسیر: ایسی سرگوشی محض شیطان کی طرف سے (یعنی اس کے بہکانے سے) ہے تا کہ مسلمانوں کو رنج میں ڈالے (جیسا کہ پیچھے بیان ہوا) اور (آگے ان مسلمانوں کو تسلی ہے کہ ان کی سرگوشیوں سے رنجیدہ نہ ہوا کریں، کیونکہ) وہ (شیطان) بدون خدا کے ارادہ کے ان (مسلمانوں) کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتا (مطلب یہ کہ اگر بالفرض وہ شیطان کے بہکانے سے تمہارے خلاف ہی کوئی تدبیر کر رہے ہیں تب بھی باری تعالیٰ کی مشیت کے بغیر تم کو وہ نقصان نہیں پہنچ سکتا، پھر کیوں فکر میں پڑتے ہو) اور مسلمانوں کو (ہر معاملہ میں) اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔

* * *

فائدہ: یعنی منافقین کی کانا پھوسی (سرگوشی) اس غرض سے تھی کہ ذرا مسلمان رنجیدہ اور دلگیر ہوں اور گھبرا جائیں کہ نہ معلوم یہ لوگ ہماری نسبت کیا منصوبے سوچ رہے ہوں گے، یہ کام شیطان ان سے کرارہا تھا، مگر مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ شیطان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اس کے قبضہ میں کیا چیز ہے، نفع و نقصان سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کا حکم نہ ہو تو کتنے ہی مشورے کرلیں اور منصوبے گانٹھ لیں، تمہارا بال بیکا نہ ہوگا، لہذا تم کو غمگین و دل گیر ہونے کے بجائے اپنے اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

تنبیہ: احادیث میں ممانعت آئی ہے کہ مجلس میں ایک آدمی کو چھوڑ کر دو شخص کانا پھوسی کرنے لگیں، کیونکہ وہ تیسرا غمگین ہوگا، یہ مسئلہ بھی ایک طرح آیہ ہذا کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''مجلس میں دو شخص کان میں بات کریں تو دیکھنے والے کو غم ہو کہ مجھ سے کیا حرکت ہوئی جو یہ چھپ کر کہتے ہیں''۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ

اے ایمان والوجب کوئی تم کو کہے کہ کھل کر بیٹھو مجلسوں میں تو کھل جاؤ اللہ کشادگی دے تم کو ۲

وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

اور جب کوئی کہے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو ۳ اللہ بلند کرے گا ان کے لیے جو کہ ایمان رکھتے ہیں تم میں سے اور علم ان کے

دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑪

درجے میں ۴ اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۵

خلاصہ تفسیر: ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم صفہ مسجد میں تشریف رکھتے تھے اور مجلس میں مجمع زیادہ تھا، چند صحابہ جو غزوہ بدر کے شرکاء میں سے تھے آئے تو ان کو کہیں جگہ نہ ملی اور نہ اہل مجلس نے ایسا کیا کہ مل مل کر بیٹھ جاتے جس سے جگہ کھل جاتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا تو بعض آدمیوں کو مجلس سے اٹھنے کے لئے فرما دیا، منافقین نے طعن کیا کہ یہ کونسی انصاف کی بات ہے اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے بھائی کے لئے جگہ کھول دے، سو لوگوں نے جگہ کھول دی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، روایت کے تمام اجزاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اول آپ نے جگہ کھولنے کے لئے فرمایا ہوگا، بعضوں نے تو جگہ کھول دی، جو کافی نہ ہوئی ہوگی اور بعضوں نے جگہ نہیں کھولی، آپ نے تادیباً جیسے شاگرد اور طلبہ میں ہوتا ہے ان کو اٹھ جانے کے لئے فرمایا جو کہ منافقین کو ناگوار ہوا، چنانچہ اب اسی واقعہ کے متعلق حکم ہے۔

اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں یا اولوالامر یا جن کی اطاعت واجب ہوتی ہے ان لوگوں میں سے کوئی کہے) کہ مجلس میں جگہ کھول دو (جس میں آنے والے کو بھی جگہ مل جائے) تو تم جگہ کھول دیا کرو (اور آنے والے کو جگہ دے دیا کرو) اللہ تعالیٰ تم کو (جنت میں) کھلی جگہ دے گا، اور جب (کسی ضرورت سے) یہ کہا جائے کہ (مجلس سے) اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو (خواہ اٹھنے کے لئے اس غرض سے کہا جائے کہ آنے والے کے لئے جگہ کھل جائے، یا اس وجہ سے کہا جائے کہ صدر مجلس کو اس وقت کسی مصلحت، مشورہ خاص یا کسی ضرورت آرام یا عبادت وغیرہ سے تنہائی کی ضرورت ہو جو بغیر تنہائی کے حاصل نہ ہو سکیں، غرض حکم یہ دیا گیا کہ صدر مجلس کے کہنے سے اٹھ جایا کرو) اللہ تعالیٰ (اس حکم کی اطاعت سے) تم میں ایمان والوں کے اور (ایمان والوں میں) ان لوگوں کے (اور زیادہ) جن کو علم (دین) عطا ہوا ہے (اخروی) درجے بلند کردے گا، اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے (کہ کس کا عمل ایمان کے ساتھ ملا ہوا ہے اور کس میں ایمان نہیں، پھر مؤمنین میں کس کے عمل میں کم خلوص ہے اور کس کے عمل میں زیادہ خلوص ہے، اس لئے ہر ایک کی جزاء وثواب میں فرق وتفاوت رکھا)۔

وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا: یعنی صدر مجلس کے کھڑے ہونے کے حکم سے اٹھ جانا چاہئے اور یہ حکم غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی عام ہے، پس صاحب مجلس کو ضرورت کے وقت اس کی اجازت ہے کہ کسی شخص کو اٹھ جانے کے لئے کہہ دے، البتہ آنے والے کے لیے یہ مناسب نہیں کہ کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ بیٹھ جائے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ: یعنی اس حکم کو ماننے والے تین قسم کے لوگ ہیں: ① ایک تو بے ایمان جیسے منافقین وغیرہ جو کسی دنیوی مصلحت سے مان لیں، وہ تو لفظ منکم کی بنا پر اس وعدہ سے خارج ہیں ② دوسرے وہ اہل ایمان جو اصحاب علم نہ ہوں، ان کے لئے محض رفع درجات یعنی درجے بلند ہونے کا وعدہ ہے ③ تیسرے وہ اہل ایمان جو اہل علم بھی ہوں، ان کے لیے زیادہ درجے بلند ہونے کا وعدہ ہے، کیونکہ ان کو علم ومعرفت حاصل ہے، وہ زیادہ خلوص اور زیادہ خشیت سے حکم کو مانتے ہیں جس سے علم کا ثواب بڑھ جاتا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ

یہاں اہل علم مسلمانوں کو عام مسلمانوں کے بعد خاص طور پر ذکر فرمایا ہے چنانچہ ان کے لیے مزید رفع درجات ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اِذَا قِیۡلَ لَکُمۡ تَفَسَّحُوۡا: یعنی اس طرح بیٹھو کہ جگہ کھل جائے اور دوسروں کو بھی موقع بیٹھنے کا ملے۔

فائدہ: ۲۔ فَافۡسَحُوۡا یَفۡسَحِ اللّٰہُ لَکُمۡ: یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری تنگیوں کو دور کرے گا اور اپنی رحمت کے دروازے کشادہ کردے گا۔

فائدہ: ۳۔ وَ اِذَا قِیۡلَ انۡشُزُوۡا فَانۡشُزُوۡا: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ آداب ہیں مجلس کے، کوئی آئے اور جگہ نہ پائے تو چاہیے سب تھوڑا تھوڑا ہٹیں تا کہ مکان حلقہ کا کشادہ ہوجائے، یا (اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوں اور) پرے ہٹ کر حلقہ کرلیں (یا بالکل چلے جانے کو کہا جائے تو چلے جائیں) اتنی حرکت میں غرور (یا بخل) نہ کریں، خوئے نیک پر اللہ مہربان ہے اور خوئے بد سے بیزار''۔

تنبیہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم پرنور کی مجلس میں ہر شخص آپ کا قرب چاہتا تھا جس سے کبھی مجلس میں تنگی پیش آتی تھی، حتی کہ بعض مرتبہ اکابر صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب جگہ نہ ملتی، اس لیے یہ احکام دیے گئے، تا کہ ہر ایک کو درجہ بدرجہ استفادہ کا موقع ملے، اور نظم وضبط قائم رہے، اب بھی اس قسم کی انتظامی چیزوں میں صدر مجلس کے احکام کی اطاعت کرنا چاہیے، اسلام ابتری اور بدنظمی نہیں سکھلاتا بلکہ انتہائی نظم وشائستگی سکھلاتا ہے، اور جب عام مجالس میں یہ حکم ہے تو میدان جہاد اور صفوف جنگ میں تو اس سے کہیں بڑھ کر ہوگا۔

فائدہ: ۴۔ وَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ: یعنی سچا ایمان اور صحیح علم انسان کو ادب وتہذیب سکھلاتا اور متواضع بناتا ہے، اہل علم و ایمان جس قدر کمالات ومراتب میں ترقی کرتے ہیں، اسی قدر جھکتے اور اپنے کو ناچیز سمجھتے جانتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ ان کے درجے اور زیادہ بلند کرتا ہے: ''مَنۡ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ''، یہ متکبر بددین یا جاہل گنوار کا کام ہے کہ اتنی سی بات پر لڑے کہ مجھے یہاں سے کیوں اٹھادیا اور وہاں کیوں بٹھا دیا، یا مجلس سے اٹھ جانے کو کیوں کہا، افسوس کہ آج بہت سے بزرگ اور عالم کہلانے والے اسی خیالی اعزاز کے سلسلہ میں غیر مختتم جنگ آزمائی اور مورچہ بندی شروع کردیتے ہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔

فائدہ: ۵۔ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ: یعنی ہر ایک کو اس کے کام اور لیاقت کے موافق درجے عطا کرتا ہے اور وہ ہی جانتا ہے کہ کون واقعی ایماندار اور اہل علم ہیں۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نَاجَیۡتُمُ الرَّسُوۡلَ فَقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیۡ نَجۡوٰىکُمۡ صَدَقَۃً ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ

اے ایمان والو تم کان میں بات کہنا چاہو رسول سے تو آگے بھیجو اپنی بات کہنے سے پہلے خیرات یہ بہتر ہے

لَّکُمۡ وَ اَطۡہَرُ ؕ فَاِنۡ لَّمۡ تَجِدُوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲﴾

تمہارے حق میں اور بہت ستھرا، پھر اگر نہ پاؤ تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: اب سرگوشی کے متعلق پھر ایک حکم ہے، اس کا شان نزول یہ ہے کہ بعض امیر لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر بڑی دیر تک آپ سے سرگوشی کیا کرتے جس سے غریبوں کو استفادہ کا موقع کم ملتا، آپ کو ان لوگوں کا دیر تک بیٹھنا اور دیر تک سرگوشی کرنا ناگوار گزرتا اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور ایک روایت میں یہ ہے کہ یہود ومنافقین بلاضرورت آپ سے سرگوشیاں کرتے، مسلمانوں کو اس خیال سے کہ شاید کسی نقصان دہ بات کی سرگوشی ہو ناگوار گزرتا، اس پر ان کو منع کیا گیا، جس کا ذکر پیچھے آیت: نُہُوۡا عَنِ النَّجۡوٰی میں ہے، مگر جب وہ باز نہ آئے تو پھر یہ حکم نازل ہوا کہ: اِذَا نَاجَیۡتُمُ الرَّسُوۡلَ الخ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل باطل اس سرگوشی سے رک گئے، کیونکہ حُب مال کی وجہ سے صدقہ ان کو گوارا نہ تھا، سرگوشی سے متعلق اس آیت میں مذکور حکم پیچھے بیان کردہ پہلے اور دوسرے واقعہ سے مربوط ہے، یعنی:

اے ایمان والو! جب تم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سرگوشی (کرنے کا ارادہ) کیا کرو تو اپنی اس سرگوشی سے پہلے کچھ خیرات (مساکین کو)

دے دیا کرو (جس کی مقدار آیت میں متعین نہیں اور روایات حدیث میں مختلف مقداریں آئی ہیں، اور ظاہر یہ ہے کہ مقدار کچھ متعین بھی نہ تھی، مگر کوئی معقول مقدار ضرور ہے) یہ تمہارے لئے (ثواب حاصل کرنے کے واسطے) بہتر ہے اور (گناہوں سے) پاک ہونے کا اچھا ذریعہ ہے (کیونکہ اطاعت سے گناہ معاف ہوتے ہیں، آگے فرماتے ہیں کہ یہ حکم تو وسعت اور گنجائش کی حالت میں ہے) پھر اگر تم کو (صدقہ دینے کا) مقدور نہ ہو (اور سرگوشی کی ضرورت پڑے) تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (اس صورت میں اس نے تم کو معاف کر دیا ہے، اس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ صدقہ کا حکم واجب تھا، مگر ناداری کی صورت مستثنیٰ تھی، اگرچہ بعد میں صدقہ کا یہ حکم اگلی آیت کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا)۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ : یہ مصلحت غنی مالدار مسلمانوں کے اعتبار سے ہے، اور غریب مسلمانوں کے اعتبار سے یہ مصلحت ہے کہ ان کو مالی نفع پہنچے گا، جیسے لفظ ''صدقہ'' سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ صدقہ کے مصارف فقراء اور غریب ہی ہیں اور وہ صدقہ غریبوں ہی کو ملتا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے یہ مصلحت ہے کہ اس میں آپ کی شان کی بلندی ہے، منافقین اور متکبروں کی سرگوشی سے آپ کو جو تکلیف ہوتی تھی اس سے نجات اور راحت ہو جائے گی، کیونکہ ان کو سرگوشی کی ضرورت تو تھی نہیں، اور بے ضرورت محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے خرچ کرنا ان کو بے حد گراں تھا، اور غالباً اس صدقہ میں حکم یہ ہوگا کہ سب کے سامنے صدقہ کریں تا کہ نہ کرنے والا دھوکہ نہ دے سکے، ورنہ ہر شخص صدقہ ادا کر دینے کا دعویٰ کر سکتا۔

* * *

فائدہ: منافق بے فائدہ باتیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کان میں کرتے کہ لوگوں میں اپنی بڑائی جتائیں اور بعض مسلمان غیر مبہم باتوں میں سرگوشی کر کے اپنا وقت لے لیتے تھے کہ دوسروں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفید ہونے کا موقع نہ ملتا تھا، یا کسی وقت آپ خلوت چاہتے تو اس میں تنگی ہوتی تھی، لیکن مروت واخلاق کے سبب کسی کو منع نہ فرماتے، اس وقت یہ حکم ہوا کہ جو مقدرت والا آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنا چاہے وہ اس سے پہلے کچھ خیرات کر کے آیا کرے، اس میں کئی فائدے ہیں، غریبوں کی خدمت، صدقہ کرنے والے کے نفس کا تزکیہ، مخلص ومنافق کی تمیز، سرگوشی کرنے والوں کی تقلیل، وغیر ذلک، ہاں جس کے پاس خیرات کرنے کو کچھ نہ ہو، اس سے یہ قید معاف ہے، جب یہ حکم اترا منافقین نے مارے بخل کے وہ عادت چھوڑ دی اور مسلمان بھی سمجھ گئے کہ زیادہ سرگوشیاں کرنا اللہ کو پسند نہیں، اسی لیے یہ قید لگائی گئی ہے، آخر یہ حکم اگلی آیت سے منسوخ فرما دیا۔

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ

کیا تم ڈر گئے کہ آگے بھیجا کرو کان کی بات سے پہلے خیراتیں، سو جب تم نے نہ کیا اور اللہ نے معاف کر دیا تم کو

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑬ ع

تو اب قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور حکم پر چلو اللہ کے اور اس کے رسول کے، اور اللہ کو خبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا حکم ہوا تو بہت سے آدمی ضروری بات کرنے سے بھی رک گئے، اس پر یہ آیت ءاشفقتم نازل ہوئی، اور صدقہ کا حکم منسوخ کر دیا گیا، اگرچہ صدقہ دینے کے حکم میں پہلے سے بھی فان لم تجدوا میں ناداروں کو رخصت دے دی گئی تھی کہ بغیر صدقہ دیے سرگوشی کر لیں، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نہ تو بالکل نادار ہوتے ہیں اور نہ پورے صاحب ثروت ہوتے ہیں، غالباً ایسے لوگوں کو تنگی پیش آئی ہوگی کہ وسعت کم ہونے کی وجہ سے تو خرچ کرنا گراں ہوا اور اپنی ناداری میں بھی شبہ ہوا، اس لئے نہ صدقہ دے سکے اور اپنے لیے رخصت واجازت بھی نہ سمجھ سکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنا کوئی عبادت نہ تھی کہ اس کا چھوڑنا ملامت کا سبب ہو سکے، اس لئے یہ حضرات ضروری بات کرنے سے بھی رک گئے۔

(اب آگے آنے والا واقعہ گذشتہ واقعہ سے مربوط ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ:) کیا تم (یعنی تم میں سے بعض جن کا بیان پیچھے ہوا ہے) اپنی سرگوشی کے قبل خیرات دینے سے ڈر گئے، سو (خیر) جب تم (اس کو) نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے حال پر عنایت فرمائی (کہ اس حکم کو منسوخ

کر کے صدقہ معاف فرما دیا جس کی حکمت ظاہر ہے کہ جس مصلحت کے واسطے یہ حکم واجب ہوا تھا وہ مصلحت حاصل ہوگئی، کیونکہ مقصود سرگوشی کا دروازہ بند کرنا تھا، یہ مصلحت صدقہ منسوخ ہونے کے بعد بھی باقی رہی کہ لوگ احتیاط کرنے لگے، کیونکہ منافقین اور متکبرین اگر پھر سرگوشی کرتے تو ان پر تکبر اور بڑائی کا صریح اعتراض لازم آتا کہ جب تک صدقہ کا حکم تھا اس وقت تک تو کبھی سرگوشی نہ کی، صدقہ دینے میں عار اور بخل کرتے رہے، صدقہ معاف ہونے کے بعد پھر سرگوشیاں کرنے چلے، اس وجہ سے آئندہ ان کو جرات نہ ہوسکتی تھی، غرض ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ فرما دیا) تو تم (دوسری عبادت کے پابند رہو یعنی) نماز کے پابند رہو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ رسول کا کہنا مانا کرو (مطلب یہ ہے کہ یہ صدقہ منسوخ ہونے کے بعد تمہارے قرب ومقبولیت اور نجات کے لیے بقیہ احکام پر استقامت کے ساتھ جمارہنا ہی کافی ہے) اور اللہ کو تمہارے سب اعمال کی (اور ان کی ظاہری وباطنی حالت کی) پوری خبر ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی صدقہ کا حکم دینے سے جو مقصد تھا، حاصل ہوگیا، اب ہم نے یہ وقتی حکم اٹھالیا ہے چاہیے کہ ان احکام کی اطاعت میں ہمہ تن لگے رہو جو کبھی منسوخ ہونے والے نہیں، مثلاً نماز وزکوٰۃ وغیرہ اسی سے کافی تزکیہ نفس ہوجائے گا۔

تنبیہ: فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم پر عام طور سے عمل کرنے کی نوبت نہیں آتی، بعض روایات میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس حکم پر امت میں سے صرف میں نے عمل کیا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جو دوست ہوئے ہیں اس قوم کے جن پر غصہ ہوا ہے اللہ ۱ نہ وہ تم میں ہیں اور نہ ان میں ہیں ۲ اور قسمیں کھاتے

عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ⑭ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑮

ہیں جھوٹ بات پر اور ان کو خبر ہے ۳ تیار رکھا ہے اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب ۴ بیشک وہ برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں ۵

خلاصہ تفسیر: آگے منافقین اور یہود اور دوسرے کفار کی مذمت ہے جس کو مسلمانوں کی مدح پر ختم فرمایا ہے۔

کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں فرمائی جو ایسے لوگوں سے دوستی کرتے ہیں جن پر اللہ نے غضب کیا ہے (پہلے "لوگوں" سے مراد منافقین ہیں اور دوسرے "لوگوں" سے مراد یہود اور تمام کھلے کافر ہیں، منافقین چونکہ یہودی تھے اس لئے ان کی دوستی یہود سے اور اسی طرح دیگر کفار سے بھی تعلقات مشہور ومعلوم ہے) یہ (منافق) لوگ نہ تو (پورے پورے) تم میں ہیں اور نہ (پورے پورے) ان ہی میں (بلکہ ظاہر میں تو تم سے ملے ہوئے ہیں اور دل سے اور عقیدہ سے کفار کے ساتھ ہیں) اور جھوٹی بات پر قسمیں کھا جاتے ہیں (وہ جھوٹی بات یہی ہے کہ ہم مسلمانوں میں شامل ہیں: و یحلفون باللہ انھم لمنکم وماھم منکم) اور وہ (خود بھی) جانتے ہیں (کہ ہم جھوٹے ہیں، اب آگے ان کے لئے وعید ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے (کیونکہ) بیشک وہ برے برے کام کیا کرتے تھے (چنانچہ کفر اور نفاق سے بدتر کونسا کام ہوگا؟)۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ لوگ منافق ہیں اور وہ قوم یہود ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی منافق نہ پوری طرح تم مسلمانوں میں شامل کیونکہ دل سے کافر ہیں، اور نہ پوری طرح ان میں شریک، کیونکہ بظاہر زبان سے اپنے کو مسلمان کہتے ہیں: مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النساء: ۱۴۳)

فائدہ: ۳ یعنی بے خبری اور غفلت سے نہیں، جان بوجھ کر جھوٹی بات پر قسمیں کھاتے ہیں، مسلمان سے کہتے ہیں: انھم لمنکم کہ وہ تم میں سے ہیں اور تمہاری طرح سچے ایماندار ہیں، حالانکہ ایمان سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں۔

فائدہ: ۴ جس کو دوسری جگہ فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: ۱۴۵)

فائدہ: ۵ یعنی خواہ ابھی ان کو نظر نہ آئے لیکن نفاق کے کام کر کے وہ اپنے حق میں بہت برا بیج بو رہے ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝١٦ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ

بنا رکھا ہے اپنی قسموں کو ڈھال پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے تو ان کو ذلت کا عذاب ہے، کام نہ آئیں گے ان کو

اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝١٧

ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی، وہ لوگ ہیں دوزخ کے، وہ اسی میں پڑے رہیں گے ۱

خلاصہ تفسیر: (کفار و منافقین کے انہی برے کاموں میں سے ایک برا کام یہ ہے کہ) انہوں نے اپنی (ان جھوٹی) قسموں کو (اپنے بچاؤ کے لئے) ڈھال بنا رکھا ہے (تاکہ مسلمان ہمیں مسلمان سمجھ کر ہماری جان و مال سے بری طرح پیش نہ آئیں) پھر (اوروں کو بھی) خدا کی راہ (یعنی دین) سے روکتے رہتے ہیں (یعنی بہکاتے رہتے ہیں) سو (اس وجہ سے) ان کیلئے ذلت کا عذاب ہونے والا ہے (یعنی وہ عذاب جیسا شدید ہوگا ایسا ہی ذلیل کرنے والا بھی ہوگا اور جب وہ عذاب ہونے لگے گا تو) ان کے اموال اور اولاد اللہ (کے عذاب) سے ان کو ذرا نہ بچا سکیں گے (اور) یہ لوگ دوزخی ہیں (اس میں اس سخت اور رُسوا کن عذاب کی تعیین فرما دی کہ وہ دوزخ ہے، اور) وہ لوگ اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جھوٹی قسمیں کھا کر مسلمانوں کے ہاتھوں سے اپنی جان و مال کو بچاتے ہیں اور اپنے کو مسلمان ظاہر کر کے دوستی کے پیرایہ میں دوسروں کو اللہ کی راہ پر آنے سے روکتے ہیں، سو یاد رہے کہ یہ لوگ اس طرح کچھ عزت نہیں پا سکتے، سخت ذلت کے عذاب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور جب سزا کا وقت آئے گا، اللہ کے ہاتھ سے کوئی نہ بچا سکے گا، نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد، جن کی حفاظت کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے پھرتے ہیں۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ

جس دن جمع کرے گا اللہ ان سب کو پھر قسمیں کھائیں گے اسکے آگے جیسے کھاتے ہیں تمہارے آگے اور خیال رکھتے ہیں کہ وہ کچھ بھلی راہ پر ہیں ۱

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝١٨

سنتا ہے وہی ہیں اصل جھوٹے ۲

خلاصہ تفسیر: (اب عذاب کا وقت بتلاتے ہیں کہ وہ عذاب اس روز ہوگا) جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو (دیگر مخلوقات کے ساتھ) دوبارہ زندہ کرے گا سو یہ اس کے روبرو بھی (جھوٹی) قسمیں کھا جائیں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھا جاتے ہیں (جیسا کہ مشرکین کا قیامت کے دن جھوٹی قسم کھانا اس آیت میں مذکور ہے: واللہ ربنا ما کنا مشرکین کہ خدائے پروردگار کی قسم ہم مشرک نہ تھے) اور یوں خیال کریں گے کہ ہم کسی اچھی حالت میں ہیں (کہ اس جھوٹی قسم کی بدولت بچ جائیں گے) خوب سن لو یہ لوگ بڑے ہی جھوٹے ہیں (کہ خدا کے سامنے بھی جھوٹ بولنے سے نہ چوکے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی یہاں کی عادت پڑی ہوئی وہاں بھی نہ جائے گی، جس طرح تمہارے سامنے جھوٹ بول کر بچ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے ہوشیار ہیں اور بڑی اچھی چال چل رہے ہیں، اللہ کے سامنے بھی جھوٹی قسمیں کھانے کو تیار ہو جائیں گے کہ پروردگار! ہم تو ایسے نہ تھے، ویسے

تھے، شاید وہاں بھی خیال ہو کہ اتنا کہہ دینے سے رہائی ہو جائے گی۔

فائدہ: ۲ بیشک اصل اور ڈبل جھوٹا وہ ہی ہے جو خدا کے سامنے بھی جھوٹ کہنے سے نہ شرمائے۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ

قابو کرلیا ہے ان پر شیطان نے پھر بھلا دی ان کو اللہ کی یاد ۱ وہ لوگ ہیں گروہ شیطان کا، سنتا ہے جو گروہ ہے

الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

شیطان کا وہی خراب ہوتے ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: (منافقین و کفار کی جو حرکتیں پیچھے بیان ہوئیں اس کی وجہ یہ ہے کہ) ان پر شیطان نے پورا تسلط کرلیا ہے (کہ اس کے کہنے پر عمل کر رہے ہیں) سو اس نے ان کو خدا کی یاد بھلا دی (یعنی اس کے احکام کو چھوڑ بیٹھے، واقعی) یہ لوگ شیطان کا گروہ ہے، خوب سن لو کہ شیطان کا گروہ ضرور برباد ہونے والا ہے (آخرت میں تو ضرور، اور کبھی دنیا میں بھی)۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ: اس سے معلوم ہوا کہ اگر کبھی اللہ کی یاد سے بھول یا غفلت محسوس ہو تو فوری ذکر سے اس کا تدارک کرلیا جائے، کیونکہ یہ غفلت شیطان کے غلبہ کا اثر ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ شیطان جس پر پوری طرح قابو کرلے اس کا دل و دماغ اسی طرح مسخ ہو جاتا ہے اسے کچھ یاد نہیں رہتا کہ خدا بھی کوئی چیز ہے، بھلا اللہ کی عظمت اور بزرگی و مرتبہ کو وہ کیا سمجھے، شاید محشر میں بھی جھوٹ پر قدرت دے کر اس کی بے حیائی اور حماقت کا اعلان کرنا ہو کہ اس ممسوخ کو اتنی سمجھ نہیں کہ اللہ کے آگے میرا جھوٹ کیا چلے گا۔

فائدہ: ۲ شیطانی لشکر کا انجام یقیناً خراب ہے، نہ دنیا میں ان کے منصوبے آخری کامیابی کا منہ دیکھ سکتے ہیں، نہ آخرت میں عذاب شدید سے نجات پانے کی کوئی سبیل ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ ﴿۲۰﴾

جو لوگ خلاف کرتے ہیں اللہ کا، اور اس کے رسول کا، وہ لوگ ہیں سب سے بے قدر لوگوں میں

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۱﴾

اللہ لکھ چکا کہ میں غالب ہوں گا اور میرے رسول، بیشک اللہ زور آور ہے زبردست ۱

خلاصہ تفسیر: (اور منافقین و کفار کی یہ حالت کیوں نہ ہو کہ یہ اللہ اور رسول کے مخالف ہیں اور قاعدہ کلیہ ہے کہ) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں یہ لوگ (اللہ کے نزدیک) سخت ذلیل لوگوں میں ہیں (جب اللہ کے نزدیک ذلیل ہیں تو ان کا برباد ہونا یقینی ہے اور جس طرح خدا تعالیٰ نے ان کے لئے ذلت تجویز کر رکھی ہے اسی طرح اطاعت کرنے والوں کے لئے عزت ہے، کیونکہ وہ لوگ اللہ اور رسول کے تابع دار ہیں اور) اللہ تعالیٰ نے یہ بات (اپنے حکم ازلی میں) لکھ دی ہے کہ میں اور میرے پیغمبر غالب رہیں گے (جو کہ عزت کی حقیقت ہے، مقصود اس جگہ رسولوں کا غلبہ بیان کرنا ہے، اپنا ذکر حق تعالیٰ نے انبیاء کو مشرف کرنے کے لئے فرما دیا، پس جب رسول عزت والے ہیں تو ان کا اتباع کرنے والے بھی صاحب عزت ہیں) بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا غلبہ والا ہے (اس لئے وہ جس کو چاہے غالب کردے)۔

''غلبہ'' کے معنی اور مزید تفصیل سورۃ مائدہ آیت ۵۶: فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ، اور سورۃ مؤمن آیت ۵۱: اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا کے ذیل میں گزر چکے ہیں، وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی اللہ و رسول کا مقابلہ کرنے والے جو حق و صداقت کے خلاف جنگ کرتے ہیں سخت ناکام اور ذلیل ہیں، اللہ لکھ چکا ہے کہ آخر کار حق ہی غالب ہو کر رہے گا اور اس کے پیغمبر ہی مظفر و منصور ہوں گے، اس کی تقریر پہلے کئی جگہ گزر چکی ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا

تو نہ پائے گا کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ایسوں سے جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اسکے رسول کے خواہ وہ

اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ

اپنے باپ ہوں یا اپنے بیٹے یا اپنے بھائی یا اپنے گھرانے کے ان کے دلوں میں اللہ نے لکھ دیا ہے ایمان لے

وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ

اور انکی مدد کی ہے اپنے غیب کے فیض سے ۲ اور داخل کریگا انکو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں ان میں اللہ ان سے راضی

عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾ ع

اور وہ اس سے راضی ۳ وہ لوگ ہیں گروہ اللہ کا، سنتا ہے جو گروہ ہے اللہ کا وہی مراد کو پہنچے ۴

خلاصہ تفسیر: اب آگے کفار کی دوستی کے بارے میں منافقین کے خلاف سچے اہل ایمان کا حال بیان فرماتے ہیں کہ:

جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں، آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ وہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور رسول کے برخلاف ہیں اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہو، ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور ان (کے دلوں) کو اپنے فیض سے قوت دی ہے (''فیض'' سے مراد نور ہے، یعنی ظاہر میں ہدایت کے تقاضے پر عمل کرتے ہیں اور باطن میں سکون واطمینان ہے، اور آیت: فھو علی نور من ربه میں بھی اسی فیض کا ذکر ہے، چونکہ اس نور سے معنوی اور باطنی حیات زیادہ ہوتی ہے اس لیے اس کو ''روح'' سے تعبیر فرمایا، یہ دولت تو ان کو دنیا میں ملی جیسا کہ ارشاد ہے: اولٓئك علی هدی من ربهم) اور (آخرت میں ان کو یہ نعمت ملے گی کہ) ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے، یہ لوگ اللہ کا گروہ ہے، خوب سن لو کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے (جیسا کہ ارشاد ہے: اولٓئك هم المفلحون)۔

کفار سے دوستی رکھنے کی تحقیق سورۃ آل عمران آیت ۲۸: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: اس میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ جس شخص کو اللہ سے محبت ہوگی تو محبت الٰہی کا لازمی تقاضا ہے کہ اللہ کے ساتھ مخالفت کرنے والے سے اس شخص کو نفرت ہوگی۔

وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ: یہ ''روح'' قلب کا نور ہے، جس کو سکینہ اور نسبت بھی کہتے ہیں جو من جانب اللہ مؤمن کو ملتا ہے اور وہی اس کے عمل صالح اور قلب کے سکون واطمینان کا ذریعہ ہوتا ہے، اور یہ سکون واطمینان ہی بڑی قوت ہے، چونکہ اسی نور سے قلب کی زندگی ہے اسی لیے اس کو ''روح'' سے تعبیر فرمایا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایمان ان کے دلوں میں جما دیا اور پتھر کی لکیر کی طرح ثبت کر دیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ①غیبی نور عطا فرمایا جس سے قلب کو ایک خاص قسم کی معنوی حیات ملتی ہے ②یا روح القدس (جبرائیل) سے اُنکی مدد فرمائی۔

فائدہ: ۳؎ یعنی یہ لوگ اللہ کے واسطے سب سے ناراض ہوئے تو اللہ ان سے راضی ہوا، پھر جس سے اللہ راضی ہو، اسے اور کیا چاہیے۔

فائدہ: ۴؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی جو دوستی نہیں رکھتے اللہ کے مخالف سے اگر چہ باپ بیٹے ہوں وہ ہی سچے ایمان والے ہیں، ان کو یہ درجے ملتے ہیں''، صحابہؓ کی شان یہ ہی تھی کہ اللہ و رسول کے معاملہ میں کسی چیز اور کسی شخص کی پروا نہیں کی، اسی سلسلہ میں ابوعبیدہؓ نے اپنے باپ کو قتل کر دیا، جنگ احد میں ابوبکر صدیقؓ اپنے بیٹے عبدالرحمن کے مقابلہ میں نکلنے کو تیار ہو گئے، مصعب بن عمیرؓ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو، عمر بن الخطابؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو، علی بن ابی طالبؓ، حمزہؓ، عبیدۃ بن الحارثؓ نے اپنے اقارب عتبہ، شیبہ، اور ولید بن عتبہ کو قتل کیا اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہؓ نے جو مخلص مسلمان تھے، عرض کیا کہ: ''یارسول اللہ! اگر آپ (ﷺ) حکم دیں تو اپنے باپ کا سر کاٹ کر خدمت میں حاضر کروں؟''، آپ ﷺ نے منع فرما دیا، فَرَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ورزقنا الله حُبَّهُمْ واتباعهم واماتنا عليه، آمين.

ایاتها ٢٤ ۝ ٥٩ سُوْرَةُ الْحَشْرِ مَدَنِيَّةٌ ١٠١ ۝ ركوعاتها ٣

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے اخیر حصہ میں زیادہ تر منافقین کی مذمت اور ان کا یہود کے ساتھ دوستی رکھنا مذکور تھا، اس سورت کے ابتدائی حصہ میں زیادہ تر یہود کی دنیا میں سزا یعنی جلاوطنی اور آخرت کا عذاب مذکور ہے، نیز منافقین کی دوستی ان کے کام نہ آنے کا ذکر ہے، اور جلاوطنی کی مناسبت سے یہاں مال غنیمت کے بعض احکام بیان کر دیے۔

قصہ ان یہود کا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ جب مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو یہود سے صلح کا معاہدہ ہو چکا تھا، ان یہودیوں کے مختلف قبائل میں ایک قبیلہ بنونضیر کا تھا وہ بھی معاہدہ صلح میں داخل تھا، یہ لوگ مدینہ طیبہ سے دو میل کے فاصلہ پر رہتے تھے، ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ سے دو قتل ہو گئے تھے جس کا خون بہا سب کو مل کر ادا کرنا تھا، آپ نے اپنے مسلمانوں سے اس کے لئے چندہ حاصل کیا، پھر یہ ارادہ ہوا کہ یہود بھی صلح نامہ کی رو سے مسلمانوں کے ساتھ ہیں چنانچہ خون بہا کی رقم میں ان کو بھی شریک کیا جائے، اس کام کے لئے آنحضرت ﷺ یہودی قبیلہ بنونضیر کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے یہ سازش کی کہ آپ کو قتل کر دینے کا موقع ہمارے ہاتھ آ گیا، اس لئے آنحضرت ﷺ کو ایک جگہ بٹھلا دیا اور کہا کہ ہم خون بہا کی رقم جمع کرنے کا انتظام کرتے ہیں اور خفیہ مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جس دیوار کے نیچے آپ تشریف فرما ہیں کوئی شخص اوپر چڑھ کر کوئی بڑا بھاری پتھر آپ کے اوپر چھوڑ دے کہ آپ کا کام تمام ہو جائے، آپ کو فوراً بذریعہ وحی ان کی یہ سازش معلوم ہو گئی، آپ وہاں سے اٹھ کر واپس تشریف لائے اور ان سے کہلا بھیجا کہ تم نے عہد شکنی کر کے صلح توڑ دی اس لئے اب تمہیں دس روز کی مہلت دی جاتی ہے اس میں تم جہاں چاہو چلے جاؤ، اس مدت کے بعد جو شخص یہاں نظر آئے گا اس کی گردن ماری جائے گی، انہوں نے چلے جانے کا ارادہ کیا تو عبداللہ بن ابی منافق نے ان کو روکا کہ کہیں نہ جاؤ، میرے پاس دو ہزار آدمیوں کی جمعیت ہے جو اپنی جان دیدیں گے، تم پر آنچ نہ آنے دیں گے، وہ لوگ ان کے کہنے میں آ گئے اور آنحضرت ﷺ سے کہلا بھیجا کہ ہم کہیں نہیں جائیں گے، آپ سے جو کچھ ہو سکے کر لیجئے، آپ صحابہ کرام کے ساتھ اس قبیلہ پر حملہ آور ہوئے اور یہ لوگ قلعہ میں بند ہو گئے اور منافقین منہ چھپا کر بیٹھ گئے، آپ نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور ان کے درخت جلوا دیئے، کچھ کٹوا دیئے، آخر تنگ آ کر انہوں نے جلاوطن ہونا منظور کر لیا، آپ نے اس حال میں بھی ان کے ساتھ یہ رعایت کی کہ حکم دے دیا کہ جتنا سامان تم ساتھ لے جا سکتے ہو لے جاؤ، سوائے ہتھیار کے وہ ضبط کر لئے جائیں گے، یہ لوگ نکل کر کچھ شام میں چلے گئے، کچھ خیبر میں، اور حرص دنیا کی وجہ سے اپنے گھروں کی کڑیاں، تختے، کواڑ تک اکھاڑ کر لے گئے اور یہ قصہ غزوہ احد کے بعد ربیع الاول سن ۴ھ میں پیش آیا، پھر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو دوسرے یہود کے ساتھ ملک شام کی طرف نکال دیا، یہ دونوں جلاوطنی حشر اول اور حشر ثانی کہلاتی ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱﴾

اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور وہی ہے زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر: اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں سب جو کچھ آسمانوں اور زمین میں (مخلوقات) ہیں (خواہ زبان سے یا حال سے) اور وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔

* * *

فائدہ: چناچہ اس کے زبردست غلبہ اور حکمت کے آثار میں سے ایک واقعہ آگے بیان کیا جا تا ہے:

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ھُوَ الَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَھۡلِ الۡکِتٰبِ مِنۡ دِیَارِھِمۡ لِاَوَّلِ الۡحَشۡرِ ؕ مَا ظَنَنۡتُمۡ

وہی ہے جس نے نکال دیا ان کو جو منکر ہیں کتاب والوں میں ان کے گھروں سے ۱ پہلے ہی اجتماع پر لشکر کے ۲ تم نہ اٹکل کرتے تھے

اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا وَظَنُّوۡۤا اَنَّھُمۡ مَّانِعَتُھُمۡ حُصُوۡنُھُمۡ مِّنَ اللّٰہِ فَاَتٰىھُمُ اللّٰہُ مِنۡ حَیۡثُ لَمۡ

کہ نکلیں گے اور وہ خیال رکھتے تھے کہ ان کو بچا لیں گے ان کے قلعے اللہ کے ہاتھ سے، پھر پہنچا ان پر اللہ جہاں سے

یَحۡتَسِبُوۡا ٭ وَقَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمُ الرُّعۡبَ یُخۡرِبُوۡنَ بُیُوۡتَھُمۡ بِاَیۡدِیۡھِمۡ وَاَیۡدِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ٭

ان کو خیال نہ تھا اور ڈال دی ان کے دلوں میں دھاک ۳ اُجاڑنے لگے اپنے گھر اپنے ہاتھوں اور مسلمانوں کے ہاتھوں ۴

فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ ﴿۲﴾

سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو ۵

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ اس کی بلند شان، قدرت اور حکمت کا ایک اثر یہ ہے کہ) وہی ہے جس نے (ان) کفار اہل کتاب (یعنی یہودی قبیلہ بنی نضیر) کو ان کے گھروں سے پہلی ہی بار اکٹھا کر کے نکال دیا (کیونکہ بقول زہری اس سے قبل ان پر یہ مصیبت واقع نہ ہوئی تھی، جلاوطنی کی یہ مصیبت ان پر پہلی بار ہی آئی ہے جو ان کی بیہودہ حرکتوں کا نتیجہ ہے اور اس میں ایک لطیف اشارہ ہے ان کے دوبارہ جلاوطن کیے جانے کی طرف، چناچہ دوبارہ حضرت عمرؓ نے تمام یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دیا، ان کا گھروں سے نکال دینا مسلمان کی طاقت اور غلبہ کا اثر تھا، آگے اس کی تقریر ہے کہ اے مسلمانوں! ان کا سامان وشوکت دیکھ کر) تمہارا گمان بھی نہ تھا کہ وہ (کبھی اپنے گھروں سے) نکلیں گے اور (خود) انہوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ (کے انتقام) سے بچا لیں گے (یعنی ان کو اپنے قلعوں کی مضبوطی پر ایسا ناز واطمینان تھا کہ ان کے دل میں انتقام غیبی کا خطرہ بھی نہ آتا تھا، پس ان کی حالت ایسے شخص کے مشابہ تھی جس کا یہ گمان ہو کہ ان کے قلعے اللہ کی گرفت سے بچا لیں گے، یعنی بنی نضیر کا یہ خیال تھا کہ سب یہود کو ان کے قلعے حوادث سے بچا لیں گے، ان سب یہود میں یہ بھی آ گئے کہ اپنے قلعہ کو اپنا محافظ سمجھتے تھے) سو ان پر خدا (کا عقاب) ایسی جگہ سے پہنچا کہ ان کو خیال (اور گمان) بھی نہ تھا (مراد اس جگہ سے یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں نکالے گئے جن کی بے سروسامانی پر نظر کر کے اس کا احتمال بھی نہ تھا کہ یہ بے سامان

مسلمان ان سامان والے یہودیوں پر غالب آجائیں گے) اور ان کے دلوں میں (اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا) رعب ڈال دیا کہ (اس رعب کی وجہ سے نکلنے کا قصد کیا اور اس وقت یہ حالت تھی کہ) اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی اجاڑ رہے تھے (یعنی خود بھی کڑی تختہ لے جانے کے لیے اپنے مکانوں کو گرار ہے تھے اور مسلمان بھی ان کے قلب کو صدمہ پہنچانے کے لیے منہدم کرتے تھے) سوائے دانش مندو! (اس حالت کو دیکھ کر) عبرت حاصل کرو (کہ خدا اور رسول کی مخالفت کا انجام بعض اوقات دنیا میں بھی نہایت برا ہوتا ہے)۔

مِنۡ دِيَارِهِمۡ لِاَوَّلِ الۡحَشۡرِ : بنونضیر کی اس جلاوطنی کو قرآن کریم نے اول الحشر فرمایا، ''حشر'' کے معنی اٹھ جانے کھڑے ہوجانے کے ہیں، اول حشر کہنے کی ایک وجہ خلاصہ تفسیر میں بیان ہوچکی ہے کہ یہ لوگ زمانہ قدیم میں ایک جگہ آباد تھے، نقل مکانی اور جلاوطنی کا یہ واقعہ ان کو پہلی بار پیش آیا، اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام کا اصل حکم آگے یہ آنے والا تھا کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلموں سے خالی کرایا جائے، تاکہ وہ اسلام کا ایک مستحکم قلعہ بن سکے، اس کے نتیجہ میں ایک دوسرا حشر آئندہ بشکل جلاوطنی ہونے والا تھا، جو عملاً حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں ہوا کہ ان میں سے جو لوگ منتقل ہوکر خیبر میں آباد ہوگئے تھے ان کو جزیرۃ العرب سے باہر چلے جانے کا حکم دیا گیا، اس لحاظ سے بنونضیر کی یہ جلاوطنی پہلا حشر اور دوسری جلاوطنی بعہد عمری دوسرا حشر ہوا۔

وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ مَّانِعَتُهُمۡ حُصُوۡنُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ: اگر خاص قبیلہ بنونضیر کے قلعے متعدد نہ ہوں تو حصونہم میں جمع کی ضمیر مطلق یہود کی طرف راجع ہوگی اور انّھم کی ضمیر بھی مطلق یہود کی طرف، اس صورت میں صرف ظنّوا کی ضمیر بنی نضیر کی طرف ہوجائے گی۔

يُخۡرِبُوۡنَ بُيُوۡتَهُمۡ بِاَيۡدِيۡهِمۡ وَاَيۡدِى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: مسلمانوں کے منہدم کرنے کو بھی ان یہودیوں کی طرف اس لیے منسوب کیا کہ اس گرانے کا سبب وہی لوگ تھے، کیونکہ انہوں نے عہد شکنی کی جو خود ان یہودیوں کا فعل ہے، تو یہ مصیبت خود انہوں نے اپنے سر لی، پس اسناد سبب کی طرف ہوگئی اور مسلمانوں کا ہاتھ بمنزلہ آلہ کے ہوگیا۔

مَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدابیر میں مستقل تاثیر و قوت نہیں کہ وہ ضرور کامیاب ہوں، عارفین کا مزاج بھی یہی ہوا کرتا ہے۔

* * *

فائدہ: لے مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مِنۡ دِيَارِهِمۡ : مدینہ سے مشرقی جانب چند میل کے فاصلہ پر ایک قوم یہود بستی تھی جس کو ''بنی نضیر'' کہتے تھے، یہ لوگ بڑے جتھے والے اور سرمایہ دار تھے، اپنے مضبوط قلعوں پر ان کو ناز تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو شروع میں انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کا معاہدہ کرلیا، کہ ہم آپ کے مقابلہ پر کسی کی مدد نہ کریں گے، پھر مکہ کے کافروں سے نامہ و پیام کرنے لگے، حتیٰ کہ ان کے ایک بڑے سردار کعب بن اشرف نے چالیس سواروں کے ساتھ مکہ پہنچ کر بیت اللہ شریف کے سامنے مسلمانوں کے خلاف قریش سے عہد و پیمان باندھا، آخر چند روز بعد اللہ و رسول کے حکم سے محمد بن مسلمہ نے اس غدار کا کام تمام کردیا، پھر بھی ''بنی نضیر'' کی طرف سے بدعہدی کا سلسلہ جاری رہا، کبھی دغابازی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چند رفیقوں کے ساتھ بلا کر اچانک قتل کرنا چاہا، ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں بیٹھے تھے اوپر سے بھاری چکی کا پاٹ ڈال دیا، اگر لگے تو آدمی مرجائے، مگر سب مواقع پر اللہ کے فضل نے حفاظت فرمائی، آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو جمع کیا، ارادہ کیا کہ ان سے لڑیں، جب مسلمانوں نے نہایت سرعت و مستعدی سے مکانوں اور قلعوں کا محاصرہ کرلیا، وہ مرعوب و خوفزدہ ہوگئے، عام لڑائی کی نوبت نہ آئی، انہوں نے گھبرا کر صلح کی التجا کی، آخر یہ قرار پایا کہ وہ مدینہ خالی کردیں، ان کی جانوں سے تعرض نہ کیا جائے گا، اور جو مال اسباب اٹھا کر لے جاسکتے ہیں لے جائیں، باقی مکان، زمین، باغ، وغیرہ پر مسلمان قابض ہوئے، حق تعالیٰ نے وہ زمین مال غنیمت کی طرح تقسیم نہ کرائی، صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار پر رکھی، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثر اراضی مہاجرین پر تقسیم کردی، اس طرح انصار پر سے ان کا خرچ ہلکا ہوا، اور مہاجرین و انصار دونوں کو فائدہ پہنچا، نیز حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کا اور وارد و صادر کا سالانہ خرچ بھی اسی سے لیتے تھے اور جو بچ رہتا اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے تھے، اس سورت میں یہی قصہ مذکور ہے۔

فائدہ: ۲؎ **لِاَوَّلِ الْحَشْرِ** : یعنی ایک ہی ہلہ میں گھبرا گئے اور پہلی ہی مڈبھیڑ پر مکان اور قلعے چھوڑ کر نکل بھاگنے کو تیار ہو بیٹھے، کچھ بھی ثابت قدمی نہ دکھلائی۔

تنبیہ: اوّل الحشر سے بعض مفسرین کے نزدیک یہ مراد ہے کہ اس قوم کے لیے اس طرح ترک وطن کرنے کا یہ پہلا موقع تھا، قبل ازیں ایسا واقعہ پیش نہ آیا تھا، یا اوّل الحشر میں اس طرف اشارہ ہوا کہ ان یہود کا پہلا حشر یہ ہے کہ مدینہ چھوڑ کر بہت سے خیبر وغیرہ چلے گئے اور دوسرا حشر وہ ہوگا جو حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیش آیا، یعنی دوسرے یہود و نصاریٰ کی معیّت میں یہ لوگ بھی خیبر سے ملک شام کی طرف نکالے گئے جہاں آخری حشر بھی ہونا ہے، اسی لیے ''شام کو ''أرض المحشر'' بھی کہتے ہیں۔

فائدہ: ۳؎ **وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ** : یعنی ان کے ساز وسامان، مضبوط قلعے اور جنگجویانہ اطوار دیکھ کر نہ تم کو اندازہ تھا کہ اس قدر جلد اتنی آسانی سے وہ ہتھیار ڈال دیں گے اور نہ ان کو خیال تھا کہ مٹھی بھر بے سروسامان لوگ اس طرح قافیہ تنگ کر دیں گے، وہ اسی خواب خرگوش میں تھے کہ مسلمان (جن کے سروں پر اللہ کا ہاتھ ہے) ہمارے قلعوں تک پہنچنے کا حوصلہ نہ کر سکیں گے، اور اس طرح گویا اللہ کے ہاتھ سے بچ نکلیں گے، مگر انہوں نے دیکھ لیا کہ کوئی طاقت اللہ کے حکم کو نہ روک سکی، ان کے اوپر اللہ کا حکم وہاں سے پہنچا، جہاں سے ان کو خیال وگمان بھی نہ تھا، یعنی دل کے اندر سے خدا تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، اور بے سروسامان مسلمانوں کی دھاک بٹھلا دی، ایک تو پہلے ہی اپنے سردار کعب بن اشرف کے ناگہانی قتل سے مرعوب وخوفزدہ ہو رہے تھے، اب مسلمانوں کے اچانک حملہ نے رہے سہے حواس بھی کھو دیے۔

فائدہ: ۴؎ **بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ** : یعنی حرص اور غیظ وغضب کے جوش میں مکانوں کے کڑے، تختے، کواڑ اکھاڑنے لگے تاکہ کوئی چیز جو ساتھ لے جا سکتے ہیں رہ نہ جائے اور مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگے، اس کام میں مسلمانوں نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا، ایک طرف سے وہ خود گراتے تھے دوسری طرف سے مسلمان، اور غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے ہاتھوں جو تباہی وویرانی عمل میں آئی وہ بھی ان ہی بدبختوں کی بدعہدیوں اور شرارتوں کا نتیجہ تھی۔

فائدہ: ۵؎ **فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ** : یعنی اہل بصیرت کے لیے اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے، اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ کفر، ظلم، شرارت اور بدعہدی کا انجام کیسا ہوتا ہے، اور یہ کہ محض ظاہری اسباب پر تکیہ کر کے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے غافل ہو جانا عقلمند کا کام نہیں۔

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاۗءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ③

اور اگر نہ ہوتی یہ بات کہ لکھ دیا تھا اللہ نے ان پر جلاوطن ہونا تو ان کو عذاب دیتا دنیا میں اور آخرت میں ہے ان کے لیے آگ کا عذاب ۱؎

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ④

یہ اس لیے کہ وہ مخالف ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے اور جو کوئی مخالف ہو اللہ سے تو اللہ کا عذاب سخت ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور اگر اللہ تعالیٰ ان کی قسمت میں جلاوطن ہونا نہ لکھ چکتا تو ان کو دنیا ہی میں (قتل کی) سزا دیتا (جس طرح ان کے بعد بنی قریظہ کے ساتھ معاملہ کیا گیا) اور (اگرچہ دنیا میں قتل کے عذاب سے بچ گئے لیکن) ان کے لئے آخرت میں دوزخ کا عذاب (تیار) ہے (اور) یہ (دنیا میں جلاوطنی کی اور آخرت میں جہنم کی سزا) اس سبب سے ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو شخص اللہ کی مخالفت کرتا ہے (اور وہی مخالفت رسول کی بھی ہے) تو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے (یہ مخالفت دو طرح سے ہوئی: ایک عہد توڑنے سے جس کی سزا جلاوطنی ہوئی، اور دوسرے ایمان نہ لانے سے جس سے آخرت میں جہنم کا عذاب ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱ے یعنی ان کی قسمت میں جلا وطنی کی سزا لکھی تھی، یہ بات نہ ہوتی تو کوئی دوسری سزا دنیا میں دی جاتی، مثلاً بنی قریظہ کی طرح مارے جاتے، غرض سزا سے بچ نہیں سکتے، یہ خدا کی حکمت ہے قتل کے بجائے محض جلا وطنی پر اکتفا کیا گیا، لیکن یہ تخفیف صرف دنیاوی سزا میں ہے آخرت کی ابدی سزا کسی طرح ان کافروں سے ٹل نہیں سکتی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''جب یہ قوم ملک شام سے بھاگ کر یہاں آئی تھی تو ان کے بڑوں نے کہا تھا کہ ایک دن تم کو یہاں سے ویران ہو کر پھر شام میں جانا پڑے گا، چنانچہ اس وقت اجڑ کر (بعض شام میں چلے گئے اور بعض) خیبر میں رہے، پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہاں سے اجڑ کر شام میں گئے''۔

فائدہ: ۲ے یعنی ایسے مخالفوں کو ایسی سخت سزا ملتی ہے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۞

جو کاٹ ڈالا تم نے کھجور کا درخت یا رہنے دیا کھڑا اپنی جڑ پر سو اللہ کے حکم سے ۱ے اور تا کہ رسوا کرے نافرمانوں کو ۲ے

خلاصہ تفسیر: اب آگے یہودیوں کے ایک طعنہ کا جواب ہے، جب مسلمانوں نے ان کے درخت کاٹ دیے اور جلا دیے تو انہوں نے کہا کہ یہ فساد ہے، اور فساد بری چیز ہے، اور بعض مسلمانوں نے بھی اجازت کے باوجود یہ سمجھا کہ درختوں کا چھوڑ دینا بھی جائز ہے، کیونکہ آخر میں یہ مسلمانوں ہی کے کام آئیں گے تو ان کا باقی رہنا ہی بہتر ہے تو انہوں نے درخت نہیں کاٹے، اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ یہود کا دل دکھے گا درخت کاٹ ڈالے، اب جواب کے ساتھ ان دونوں فعلوں کا درست ہونا بتلاتے ہیں، پس ارشاد ہے کہ:

جو کھجوروں کے درخت تم نے کاٹ ڈالے (اسی طرح جو جلا دیئے) یا ان کو ان کی جڑوں پر (اپنے حال پر) کھڑا رہنے دیا سو (دونوں باتیں) خدا ہی کے حکم (اور رضا) کے موافق ہیں اور تا کہ کافروں کو ذلیل کرے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا: یعنی درختوں کے کاٹنے جلانے یا ان کو باقی چھوڑنے کے دونوں مختلف عمل میں مصلحت ہے، چنانچہ درختوں کو اپنے حال پر چھوڑنے میں بھی مسلمانوں کی ایک کامیابی اور کفار کو غیظ میں ڈالنا ہے کہ یہ مسلمان اس کو برتیں گے، اور درختوں کو کاٹنے اور جلا دینے میں بھی مسلمانوں کی دوسری کامیابی یعنی غلبہ کے آثار کا ظہور اور کفار کو غیظ میں ڈالنا ہے کہ مسلمان ہماری چیزوں میں کیسے تصرفات کر رہے ہیں، پس دونوں باتیں جائز ہیں اور حکمت پر مبنی ہونے کے سبب ان میں کوئی قباحت نہیں۔

اس آیت میں ان درختوں کے کاٹنے جلانے یا ان کو باقی چھوڑنے کے دونوں مختلف عملوں کو ''اللہ کے حکم سے'' فرمایا ہے، حالانکہ قرآن کی کسی آیت میں دونوں میں سے کوئی بھی حکم مذکور نہیں، ظاہر تو یہ ہے کہ دونوں حضرات نے جو عمل کیا، وہ اپنے اجتہاد سے کیا، زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی ہو مگر قرآن نے اس اجازت کو جو کہ ایک حدیث تھی ''اذن اللہ'' قرار دے کر واضح کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ کی طرف سے تشریع احکام کا اختیار دیا گیا ہے اور جو حکم آپ جاری فرما دیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم میں داخل ہے اس کی تعمیل قرآنی آیات کی تعمیل کی طرح فرض ہے، دوسرا اہم اصول اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ مسلک کا اختلاف جبکہ شرعی حدود کے اندر اور خلوص کے ساتھ ہو تو نقصان دہ نہیں، یعنی جو لوگ اجتہاد شرعی کی صلاحیت رکھتے ہیں، اگر ان کا اجتہاد کسی مسئلے میں مختلف ہو جائے تو یہ مضر نہیں، اور اسی میں صوفیہ کے مسالک کا اختلاف بھی آ گیا، پس کسی ایک کو دوسرے پر عیب لگانے کا حق نہیں۔

مسئلہ: جنگ کی حالت میں کفار کے گھروں کو منہدم کرنا یا جلانا اسی طرح درختوں، کھیتوں کو برباد کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ فقہا کے مختلف اقوال ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ سے بحالت جنگ ان سب کاموں کا جائز ہونا منقول ہے، مگر شیخ ابن ہمامؒ نے فرمایا کہ یہ جواز اس وقت میں ہے جبکہ اس کے بغیر کفار پر غلبہ پانا مشکل ہو، یا اس صورت میں جبکہ مسلمانوں کی فتح کا گمان غالب نہ ہو، تو یہ سب کام اس لئے جائز ہیں کہ ان سے کفار کی طاقت وشوکت کو توڑنا مقصود ہے، یا عدم فتح کی صورت میں ان کے مال کو ضائع کرنا بھی ان کی قوت کو کمزور کر دینے کے لئے اس میں داخل ہے۔

فائدہ: ۱۔ جب وہ لوگ قلعہ بند ہو گئے تو حضرت محمد ﷺ نے اجازت دی کہ ان کے درخت کاٹے جائیں اور باغ اجاڑے جائیں تا کہ اس کے درد سے باہر نکل کر لڑنے پر مجبور ہوں اور کھلی ہوئی جنگ کے وقت درختوں کی رکاوٹ باقی نہ رہے، اس پر کچھ درخت کاٹے گئے اور کچھ چھوڑ دیے گئے کہ فتح کے بعد مسلمانوں کے کام آئیں گے، کافروں نے طعن کرنا شروع کیا کہ خود تو فساد سے منع کرتے ہیں، کیا درختوں کا کاٹنا اور جلانا فساد نہیں؟ اس پر یہ آیت اتری، یعنی یہ سب کچھ اللہ جل شانہ کے حکم سے ہے، حکم الٰہی کی تعمیل کو فساد نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ گہری حکمتوں اور مصلحتوں پر مشتمل ہوتا ہے، چنانچہ اس حکم کے بعض مصالح اوپر بیان ہو چکیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی تا کہ مسلمانوں کو عزت دے اور کافروں کو ذلیل کرے، چنانچہ جو درخت چھوڑ دیے گئے اس میں مسلمانوں کی ایک کامیابی اور کفار کو غیظ میں ڈالنا ہے کہ یہ مسلمان ان کو برتیں گے اور نفع اٹھائیں گے اور جو کاٹے یا جلائے گئے اس میں مسلمانوں کی دوسری کامیابی یعنی ظہور آثار غلبہ اور کفار کو غیظ و غضب میں ڈالنا ہے کہ مسلمان ہماری چیزوں میں کیسے تصرفات کر رہے ہیں، لہذا دونوں امر جائز اور حکمت پر مشتمل ہیں۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ

اور جو مال کو لوٹا دیا اللہ نے اپنے رسول پر ان سے سو تم نے نہیں دوڑائے اس پر گھوڑے اور نہ اونٹ لیکن اللہ غلبہ دیتا ہے

رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝6

اپنے رسولوں کو جس پر چاہے، اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے

خلاصہ تفسیر: (پیچھے جو بیان ہوا وہ تو بنی نضیر کی جانوں کے ساتھ معاملہ تھا) اور (ان کے اموال کے ساتھ جو معاملہ ہوا اُس کا بیان یہ ہے کہ) جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے دلوا دیا سو (اس میں تم کو کوئی مشقت نہیں پڑی، چنانچہ) تم نے اس پر (یعنی اس کے حاصل کرنے کے لیے) نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ (مطلب یہ کہ نہ سفر کی مشقت ہوئی، کیونکہ مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے اور نہ قتال کی، اور برائے نام جو مقابلہ کیا گیا وہ قابل شمار نہ تھا، اس لئے اس مال میں تمہاری ملکیت اور تقسیم کا اس طرح حق نہیں جس طرح مال غنیمت میں ہوتا ہے) لیکن اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) اپنے رسولوں کو (اپنے دشمنوں میں سے) جس پر چاہے (خاص طور پر) مسلط فرما دیتا ہے (یعنی محض رعب سے مغلوب کر دیتا ہے، جس میں کسی کو کچھ مشقت اٹھانی نہیں پڑتی، چنانچہ ان رسولوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو بنی نضیر کے اموال پر اسی طرح مسلط فرما دیا، اس لئے اس میں تمہارا کوئی حق نہیں بلکہ اس میں مالکانہ تصرف کرنے کا مکمل اختیار آپ ﷺ کو ہی ہے) اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (پس وہ جس طرح چاہے دشمنوں کو مغلوب کرے اور جس طرح چاہے اپنے رسول کو اختیار اور تصرف دے)۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ: لفظ افاء "فئ" سے مشتق ہے جس کے معنی لوٹنے (رجوع) کے ہیں، اموال غنیمت جو کفار سے حاصل ہوتے ہیں ان سب کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے باغی ہو جانے کی وجہ سے ان کے اموال بحق سرکار ضبط ہو جاتے ہیں اور ان کی ملکیت سے نکل کر پھر مالک حقیقی حق تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتے ہیں، اس لئے ان کے حاصل ہونے کو افاء کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ کفار سے حاصل ہونے والے تمام قسم کے اموال کو "فئ" ہی کہا جاتا، مگر جو مال جہاد و قتال کے ذریعہ حاصل ہوا اُس میں انسانی عمل اور جد و جہد کو بھی ایک قسم کا دخل ہے، اس لئے اس کو تو لفظ "غنیمت" سے تعبیر فرمایا گیا: **واعلموا انما غنمتم من شيء**، لیکن جس کے حصول میں جہاد و قتال کی بھی کوئی ضرورت نہ پڑی اس کو لفظ "فئ" سے تعبیر فرمایا گیا، اس آیت کا حاصل یہ ہوا کہ جو مال بغیر جہاد و قتال کے حاصل ہوا ہے وہ مجاہدین و غانمین میں مال غنیمت کے قانون کے مطابق تقسیم نہیں ہوگا، بلکہ اس میں کلی اختیار رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہوگا جس کو جتنا چاہیں عطا فرما دیں یا اپنے لئے رکھیں، البتہ یہ پابندی لگا دی گئی کہ چند اقسام مستحقین کی متعین کر دی گئیں کہ اس مال کی تقسیم انہیں اقسام میں دائر رہنی چاہئے، جس کا بیان اگلی آیت میں آرہا ہے۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''کہ یہ ہی فرق رکھا ہے ''غنیمت'' میں اور ''فیئ'' میں، جو مال لڑائی سے ہاتھ لگا وہ ''غنیمت'' ہے اس میں پانچواں حصہ اللہ کی نیاز (جس کی تفصیل دسویں پارہ کے شروع میں گزر چکی ہے) اور چار حصے لشکر کو تقسیم کیے جاتے ہیں، اور جو بغیر جنگ کے ہاتھ آیا وہ سب کا سب مسلمانوں کے خزانہ میں رہے (ان کی مصالح عامہ میں) اور جو کام ضروری ہو اس پر خرچ ہو''۔

تنبیہ: اگر قدرے جنگ ہونے کے بعد کفار مرعوب ہو کر صلح کی طرف مسارعت کریں اور مسلمان قبول کرلیں، اس صورت میں جو اموال صلح سے حاصل ہوں گے وہ بھی حکم ''فیئ'' میں داخل ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اموال ''فیئ'' خالص حضور کے اختیار و تصرف میں ہوتے تھے، ممکن ہے کہ یہ اختیار مالکانہ ہو جو صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص تھا جیسا کہ آیت حاضرہ میں علی رسولہ کے لفظ سے متبادر ہوتا ہے اور احتمال ہے کہ محض حاکمانہ ہو، بہر حال اللہ تعالیٰ نے ان اموال کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگلی آیت میں ہدایت فرما دی کہ وجوباً یا ندباً فلاں فلاں مصارف میں صرف کیے جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ اموال ''امام'' کے اختیار و تصرف میں چلے جاتے ہیں، لیکن اس کا تصرف مالکانہ نہیں ہوتا، محض حاکمانہ ہوتا ہے، وہ ان کو اپنی صوابدید اور مشورہ سے مسلمانوں کی عام ضروریات و مصالح میں خرچ کرے گا۔

باقی اموال غنیمت کا حکم اس سے جداگانہ ہے، وہ خمس نکالے جانے کے بعد خالص لشکر کا حق ہوتا ہے، کما یدل علی قولہ تعالیٰ: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ (الانفال: ۴۱) لشکری اپنی خوشی سے چھوڑ دیں تو وہ علیحدہ بات رہی، البتہ شیخ ابوبکر رازی حنفیؒ نے ''احکام القرآن'' میں نقل کیا ہے کہ یہ حکم ''اموال منقولہ'' کا ہے، ''غیر منقولہ'' میں امام کو اختیار ہے کہ مصلحت سمجھے تو لشکر پر تقسیم کر دے اور مصلحت نہ سمجھے تو مصالح عامہ کے لیے رہنے دے، جیسا کہ سواد عراق میں حضرت عمرؓ نے بعض جلیل القدر صحابہ کے مشورہ سے یہ ہی عمل درآمد رکھا۔

اسی مسلک کے موافق شیخ ابوبکر رازیؒ نے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ (الانفال: ۴۱) کو ''اموال منقولہ'' پر اور سورۃ حشر کی آیات کو ''اموال غیر منقولہ'' پر حمل کیا ہے، اس طرح کی پہلی آیت: وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ (الحشر: ۶) حکم ''فیئ'' پر اور دوسری آیت: مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى (الحشر: ۷) حکم ''غنیمت'' پر محمول ہے، اور لغۃً ''غنیمت'' کو لفظ ''فیئ'' سے تعبیر کر سکتے ہیں، واللہ اعلم۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ

جو مال لوٹایا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں سے سو اللہ کے واسطے اور رسول کے ۱ اور قرابت والے کے ۲ اور یتیموں کے اور محتاجوں کے

وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ

اور مسافر کے تاکہ نہ آئے لینے دینے میں دولت مندوں کے تم میں سے ۳ اور جو دے تم کو رسول سو لے لو

وقف لازم　وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۷

اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو ۴ اور ڈرتے رہو اللہ سے، بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے ۵

خلاصہ تفسیر: (اور جیسے بنو نضیر کے اموال کا یہ حکم ہے اسی طرح) جو کچھ اللہ تعالیٰ (اسی طور پر) اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے (کافر) لوگوں سے دلوا دے (جیسا باغ فدک اور خیبر کا ایک حصہ اسی طرح ہاتھ آیا) سو (اس میں بھی تمہارا کوئی ملکیت کا حق نہیں، بلکہ) وہ (بھی) اللہ کا حق ہے (یعنی وہ جس طرح چاہے اس میں حکم دے جیسا کہ اور سب چیزوں میں اسی طرح اللہ کا حق ہے یہاں تخصیص حصر کے لئے نہیں) اور رسول کا (حق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صوابدید سے مالکانہ تصرفات کرنے کا اختیار دے دیا ہے) اور (آپ کے) قرابت داروں کا (حق ہے) اور یتیموں کا (حق ہے) اور غریبوں کا (حق ہے) اور مسافروں کا (حق ہے، یعنی یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب صوابدید اس مال کے

مصرف ہیں اوران میں بھی انحصار نہیں، رسول اللہ ﷺ جس کو اپنی رائے سے دینا چاہیں وہ بھی اس میں شامل ہے، اور یہ مذکورہ حکم اس لئے مقرر کر دیا) تا کہ وہ (مال فئی) تمہارے مالداروں کے قبضہ میں نہ آجائے (جیسا کہ جاہلیت میں لڑائی اور جنگ کی سب آمدنی اور مال غنیمت اصحاب اقتدار بااختیار لوگ کھا جاتے تھے اور فقراء بالکل محروم رہ جاتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کی رائے پر رکھا اور اس کے مصارف بھی بتلا دیئے کہ آپ ﷺ مالک ہونے کے باوجود پھر بھی محتاجوں اور مصلحت عامہ کے موقع میں خرچ فرما دیں گے) اور (جب یہ معلوم ہوگیا کہ رسول ﷺ کی رائے پر ہونے میں حکمت ہے تو) رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو، اور جس چیز (کے لینے) سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو (اور الفاظ کے عموم کی وجہ سے تمام افعال واحکام میں بھی یہی حکم ہے) اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ تعالیٰ (مخالفت کرنے پر) سخت سزا دینے والا ہے۔

مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى: اس میں ''اہل قریٰ'' سے مراد بنو نضیر اور ان جیسے دوسرے قبائل بنوقریظہ وغیرہ ہیں جن کے اموال بغیر قتال کے حاصل ہوئے، پھر آگے مصارف ومستحقین کی پانچ قسمیں بتلائی گئیں ہیں۔

فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ: یہاں مذکورہ مصارف واقسام کا خاص طور پر ذکر شاید اس لے کیا گیا کہ ان کے بارے میں یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ جب شرکاء جہاد کا اس مال میں کچھ حق نہیں تو یہ مصارف واقسام جو جہاد میں شریک بھی نہیں تھیں ان کا بھی حق نہیں ہوگا، مگر آیت میں ان کا ذکر خاص اوصاف یتیم، غریب، مسافر وغیرہ کے ساتھ کر کے اشارہ کر دیا کہ یہ لوگ اپنے ان اوصاف کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے اختیار سے اس مال کے مصرف ہوسکتے ہیں، جہاد کی شرکت سے اس کا تعلق نہیں۔

مذکوہ آیات میں فئی کے احکام، اس کے مستحقین اوران میں تقسیم کا طریقہ کار بیان فرمایا ہے مال غنیمت اور فئی کا فرق یہ ہے کہ ''غنیمت'' اس مال کو کہا جاتا ہے جو کفار سے جہاد وقتال کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے اور ''فئی'' وہ مال ہے جو بغیر جہاد وقتال کے ان سے حاصل ہو، خواہ اس طرح کہ وہ اپنا مال چھوڑ کر بھاگ گئے یا رضامندی سے بصورت جزیہ وخراج یا تجارتی ڈیوٹی وغیرہ کے ذریعہ ان سے حاصل ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ سورۃ انفال کی آیت ۴۱ میں جو الفاظ خمس غنیمت کے متعلق آئے ہیں تقریباً وہی الفاظ یہاں مال فئی کے بارے میں ہیں، سورۃ انفال میں ہے: واعلموآ انما غنمتم من شی فان للہ خمسه وللرسول ولذی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل، چنانچہ ان دونوں آیتوں میں مال کے حقداروں میں چھ نام ذکر کئے گئے: ① اللہ ② رسول ③ ذوی، القربیٰ ④ یتیم ⑤ مسکین ⑥ مسافر، یہ ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہ تو دنیا وآخرت اور تمام مخلوقات کا مالک حقیقی ہے، اس کا نام مبارک تو حصوں کے بیان میں محض تبرکا اس فائدہ کے لئے ہے کہ اس سے اس مال کی شرافت وفضیلت اور حلال وطیب ہونے کی طرف اشارہ ہوجائے، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام اس جگہ ذکر کرنے سے اشارہ اس طرف ہے کہ یہ سارا مال دراصل اللہ کا ہے، اس کی طرف سے مستحقین کو دیا جاتا ہے، یہ کسی کا صدقہ وخیرات نہیں، اب مستحقین اور مصارف کل پانچ رہ گئے: ① رسول ② ذوی القربیٰ ③ یتیم ④ مسکین ⑤ مسافر، یہی پانچ مصارف مال غنیمت کے خمس کے ہیں، جس کا بیان سورۃ انفال میں آیا ہے اور یہی مصارف مال فئی کے ہیں اور دونوں کا حکم یہ ہے کہ یہ سب اموال درحقیقت رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے مکمل اختیار میں ہوتے ہیں، وہ چاہیں تو ان سب اموال کو عام مسلمانوں کے مفاد کے لئے روک لیں اور بیت المال میں جمع کر دیں، کسی کو کچھ نہ دیں اور چاہیں تقسیم کر دیں، البتہ تقسیم کئے جائیں تو ان پانچ اقسام میں دائر رہیں، خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام کے تعامل سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں تو مال فئی آپ کے اختیار میں تھا، آپ کی صواب دید کے مطابق صرف کیا جاتا تھا، آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے اختیار اور صواب دید پر رہا۔

وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى: یہاں مصارف میں رسول اللہ ﷺ کا جو حصہ اس مال میں رکھا گیا تھا وہ آپ کی وفات کے بعد ختم ہوگیا، اور ذوی القربی یعنی رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتہ داروں کو اس مال میں سے دینے کی دو وجہ تھیں: ① ایک نصرت رسول یعنی اسلامی کاموں میں رسول اللہ ﷺ کی مدد کرنا، اس لحاظ سے اغنیاء یعنی مالدار ذوی القربیٰ کو بھی اس میں حصہ دیا جاتا تھا ② دوسرے یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے ذوی القربیٰ

پر مال صدقہ حرام کر دیا گیا ہے، تو ان کے فقراء و مساکین کو صدقہ کے بدلہ میں مال فئی سے حصہ دیا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد نصرت و امداد کا سلسلہ ختم ہو گیا، تو یہ وجہ باقی نہ رہی، اس لئے اغنیاء ذوی القربیٰ کا حصہ بھی حصہ رسول کی طرح ختم ہو گیا، البتہ فقراء وغریب ذوی القربیٰ کا حصہ فقر واحتیاج کی وجہ سے اس مال میں باقی رہا، اور وہ اس مال میں دوسرے فقراء و مساکین کے مقابلہ میں مقدم رکھے جائیں گے۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ: ''اور رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو'' یہاں یہ آیت اگرچہ مال فئی کی تقسیم کے سلسلے میں آئی ہے، لیکن آیت کے الفاظ عام ہیں، صرف اموال کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ احکام بھی اس میں داخل ہیں، اس لئے عام انداز میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی حکم یا مال یا اور کوئی چیز آپ کسی کو عطا فرما دیں تو وہ اس کو لے لینا چاہئے اور اس کے مطابق عمل کے لئے تیار ہو جانا چاہئے اور جس چیز سے روک دیں اس سے رکنا چاہئے، بہت سے صحابہ کرام نے اسی عام مفہوم کو اختیار کر کے رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم کو اس آیت کی بنا پر قرآن ہی کا حکم اور واجب التعمیل قرار دیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ: پہلی آیت میں صرف اموال ''بنی نضیر'' کا ذکر تھا، اب اموال ''فئے'' کے متعلق عام ضابطہ بتلاتے ہیں، یعنی ''فئے'' پر قبضہ رسول کا اور رسول کے بعد امام کا اسی پر یہ خرچ پڑتے ہیں، باقی اللہ کا ذکر تبرکاً ہوا، وہ تو سب ہی کا مالک ہے، وہاں کعبہ کا خرچ اور مسجدوں کا بھی جو اللہ کے نامزد ہیں ممکن ہے اس میں درج ہو۔

فائدہ: ۲؎ وَلِذِي الْقُرْبٰى: یعنی حضرت کے قرابت والوں کے، چنانچہ حضور ﷺ اپنے زمانہ میں اس مال میں سے ان کو بھی دیتے تھے اور ان میں فقیر کی بھی قید نہیں تھی، اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو جو دولت مند تھے آپ ﷺ نے حصہ عطا فرمایا، اب آپ ﷺ کے بعد حنفیہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے قرابت دار جو صاحب حاجت ہوں امام کو چاہیے کہ انہیں دوسرے محتاجوں سے مقدم رکھے۔

فائدہ: ۳؎ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ: یعنی یہ مصارف اس لیے بتلائے کہ ہمیشہ یتیموں، محتاجوں، بے کسوں اور عام مسلمانوں کی خبر گیری ہوتی رہے اور عام اسلامی ضروریات سرانجام پاسکیں، یہ اموال محض دولت مندوں کے الٹ پھیر میں پڑ کر ان کی مخصوص جاگیر بن کر نہ رہ جائیں جن سے سرمایہ دار مزے لوٹیں اور غریب فاقوں پر مریں۔

فائدہ: ۴؎ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا: یعنی مال و جائداد وغیرہ جس طرح پیغمبر اللہ کے حکم سے تقسیم کرے اسے بخوشی ورغبت قبول کرو، جو ملے لے لو، جس سے روکا جائے رک جاؤ اور اسی طرح اس کے تمام احکام اور اوامر و نواہی کی پابندی رکھو۔

فائدہ: ۵؎ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: یعنی رسول ﷺ کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے، ڈرتے رہو کہیں رسول ﷺ کی نافرمانی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کوئی سخت عذاب مسلط نہ کر دے۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ

واسطے ان مفلسوں وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے آئے ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے ڈھونڈتے آئے ہیں اللہ کا فضل

وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۸

اور اس کی رضا مندی اور مدد کرنے کو اللہ کی اور اس کے رسول کی، وہ لوگ وہی ہیں سچے

خلاصہ تفسیر: (اور یوں تو مال فئی میں مطلقاً سب غریب مسکینوں کا حق ہے لیکن) ان حاجت مند مہاجرین کا (بالخصوص) حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے (جبراً وظلماً) جدا کر دیئے گئے (یعنی کفار نے ان کو اس قدر تنگ کیا کہ گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے اور اس ہجرت سے) وہ اللہ تعالیٰ کے فضل (یعنی جنت) اور رضامندی کے طالب ہیں (یعنی کسی دنیوی غرض سے ہجرت نہیں کی) اور وہ (لوگ)

اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں (اور) یہی لوگ (ایمان کے) سچے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی یوں تو اس مال سے عام مسلمانوں کی ضروریات وحوائج متعلق ہیں، لیکن خصوصی طور پر ان ایثار پیشہ جاں نثاروں اور سچے مسلمانوں کا حق مقدم ہے، جنہوں نے محض اللہ کی خوشنودی اور رسول کی محبت و اطاعت میں اپنے گھر بار اور مال و دولت سب کو خیر باد کہا اور بالکل خالی ہاتھ ہو کر وطن سے نکل آئے تا کہ اللہ ورسول کے کاموں میں آزادانہ مدد کر سکیں۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ

اور جو لوگ جگہ پکڑ رہے ہیں اس گھر میں اور ایمان میں ان سے پہلے سے [1] وہ محبت کرتے ہیں اس سے جو وطن چھوڑ کر آئے انکے پاس [2]

وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ

اور نہیں پاتے اپنے دل میں تنگی اس چیز سے جو مہاجرین کو دی جائے، اور مقدم رکھتے ہیں ان کو اپنی جان سے اور اگر چہ ہو اپنے او پر فاقہ [3]

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٩﴾

اور جو بچایا گیا اپنے جی کے لالچ سے سو وہی لوگ ہیں مراد پانے والے [4]

خلاصہ تفسیر: اور (نیز) ان لوگوں کا (بھی مال فئی میں حق ہے) جو دار الاسلام (یعنی مدینہ طیبہ) میں اور ایمان میں ان (مہاجرین) کے (آنے کے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں (مراد اس سے انصاری حضرات ہیں، مدینہ میں ان کا پہلے قرار پکڑنا تو ظاہر ہے کہ وہ یہیں کے باشندے تھے، اور ایمان میں پہلے قرار پکڑنے کا یہ مطلب نہیں کہ سب انصار کا ایمان سب مہاجرین سے مقدم ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ مہاجرین کے مدینہ میں آنے سے پہلے ہی یہ حضرات مشرف باسلام ہو چکے تھے، خواہ انصار کا اصل ایمان بعض مہاجرین کے ایمان سے مؤخر ہی ہو) جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو (مال غنیمت وغیرہ میں سے) جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار محبت کی وجہ سے) اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور (بلکہ اس سے بھی بڑھ کر محبت کرتے ہیں کہ کھلانے پلانے وغیرہ میں ان کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگر چہ ان پر فاقہ ہی ہو (یعنی خود بسا اوقات فاقہ سے بیٹھے رہتے ہیں اور مہاجرین کو کھلا دیتے ہیں) اور (واقعی) جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے (جیسے یہ لوگ ہیں کہ خدا نے ان کو حرص اور اس کے مقتضا پر عمل کرنے سے بچا رکھا ہے) ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ: اپنے وطن یعنی مدینہ میں قرار پکڑنا، اس صفت کو فضیلت میں یہ دخل ہے کہ اپنے وطن میں علوم وکمالات حاصل کرنا خصوصاً اطاعت اور تابع داری کرنا کمال کی بات ہے، کیونکہ وطن میں ان امور کو حاصل کرنے سے اکثر رکاوٹیں اور موانع پیش آ جاتے ہیں، نیز اپنی ریاست اور وجاہت کی وجہ سے عار بھی آتی ہے۔

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ: اس سے ایثار کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، ایثار یعنی اپنی ضرورتوں کو دبا کر دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنا، لیکن اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس ایثار سے کوئی شرعی واجب فوت نہ ہوتا ہو۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ: واضح رہے کہ یہاں طبعی اور جبلی حرص پر ملامت نہیں، البتہ اس کے ناجائز تقاضا پر عمل کرنا گناہ ہے۔

* * *

فائدہ: [1] اس گھر سے مراد ہے ''مدینہ طیبہ'' اور یہ لوگ ''انصار مدینہ'' ہیں جو مہاجرین کی آمد سے پہلے مدینہ میں سکونت پذیر تھے، اور ایمان وعرفان کی راہوں پر بہت مضبوطی کے ساتھ مستقیم ہو چکے تھے۔

فائدہ: ۲ یعنی محبت کے ساتھ مہاجرین کی خدمت کرتے ہیں حتی کہ اپنے اموال وغیرہ میں ان کو برابر کا شریک بنانے کے لیے تیار ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی مہاجرین کو اللہ تعالیٰ جو فضل و شرف عطا فرمائے یا اموال فئے وغیرہ میں سے حضور ﷺ جو کچھ عنایت کریں، اسے دیکھ کر انصار دل تنگ نہیں ہوتے نہ حسد کرتے ہیں، بلکہ خوش ہوتے ہیں اور ہر اچھی چیز میں ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں، خود سختیاں اور فاقے اٹھا کر بھی اگر ان کو بھلائی پہنچا سکیں تو دریغ نہیں کرتے، ایسا بے مثال ایثار آج تک دنیا کی کس قوم نے کس کے لیے دکھلایا۔

فائدہ: ۴ یعنی بڑے کامیاب اور بامراد ہیں وہ لوگ جن کو اللہ کی توفیق و دستگیری نے ان کے دل کے لالچ اور حرص و بخل سے محفوظ رکھا، لالچی اور بخیل آدمی اپنے بھائیوں کے لیے کہاں ایثار کر سکتا ہے اور دوسروں کو پھلتا پھولتا دیکھ کر کب خوش ہوتا ہے؟

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ

اور واسطے ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد ۱ کہتے ہوئے اے رب بخش ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں

وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۰ ع ۲

اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں بیر ایمان والوں کا اے رب تو ہی ہے نرمی والا مہربان ۲

خلاصہ تفسیر: اور ان لوگوں کا (بھی اس مال فئی میں حق ہے) جو (دار الاسلام میں یا ہجرت میں یا دنیا میں) ان (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے (یا آئیں گے) جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو (بھی) جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں (خواہ نفس ایمان یا کامل ایمان جو کہ ہجرت پر موقوف تھا) اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے (یہ دعاء گزشتہ لوگوں کے علاوہ اپنے زمانہ والوں کو بھی شامل ہے، حاصل یہ ہوا کہ پہلے بزرگوں کی فضیلت کے معتقد رہیں اور اپنے ہم عصر لوگوں سے بھی محبت رکھیں) اے ہمارے رب! آپ بڑے شفیق رحیم ہیں (ہماری دعا قبول فرمالیجیے)۔

مذکورہ اور گزشتہ آیتوں میں جو اوصاف بیان ہوئے ان کو یہاں بیان کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ جس میں یہ صفات نہ ہوں وہ مال فئے کا حقدار نہیں، بلکہ مقصود ان کے بیان کرنے سے محض رغبت دلانا ہے کہ بعد کے لوگوں کو ایسا ہونا چاہیے کہ ان اوصاف کے بغیر وہ کامل مستحق اور پورے مصرف نہیں ہوں گے، پس گزشتہ آیات کے مجموعہ سے ان لوگوں کا مصارف ہونا اور خرچ کا اختیار آپ ﷺ کی رائے پر ہونا معلوم ہوا، چونکہ آپ ﷺ کے بعد آپ کی رائے پر رہنا ممکن نہیں، اس لیے وفات نبوی کے بعد یہ اختیار خلفاء اسلام کو حاصل ہوا، مگر اتنا فرق ہے کہ امام کا مالکانہ تصرف نہ ہوگا، بلکہ حاکمانہ اختیار شرعی قانون کی پابندی کے ساتھ حاصل ہوگا۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ: اس میں گزشتہ لوگوں کے لیے دعاء کرنے کی ترغیب ہے، اور اہل اللہ صوفیاء حضرات کے ہاں اپنے بزرگوں کے لیے دعائے خیر اور ایصال ثواب کرتے رہنا معمولات میں شامل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ① ان مہاجرین و انصار کے بعد عالم وجود میں آئے ② یا ان کے بعد حلقہ اسلام میں آئے ③ یا مہاجرین سابقین کے بعد ہجرت کر کے مدینہ آئے، والظاھر ھو الاول۔

فائدہ: ۲ یعنی سابقین کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور کسی مسلمان بھائی کی طرف سے دل میں بیر اور بغض نہیں رکھتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "یہ آیت سب مسلمانوں کے واسطے ہے جو اگلوں کا حق مانیں اور انہی کے پیچھے چلیں اور ان سے بیر نہ رکھیں"، امام مالکؒ نے یہیں سے فرمایا کہ جو شخص صحابہ سے بغض رکھے اور ان کی بدگوئی کرے اس کے لیے مال فئے میں کچھ حصہ نہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ

کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دغا باز ہیں کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو جو کہ کافر ہیں اہل کتاب میں سے اگر تم کو

أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا ۙ وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ط

کوئی نکال دیگا تو ہم بھی نکلیں گے تمہارے ساتھ اور کہانہ مانیں گے کسی کا تمہارے معاملہ میں کبھی اور اگر تم سے لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے ۱

وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ⑪

اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیات میں مال فئی اور اس کے مستحقین کا ذکر کرتے ہوئے ان اہل ایمان واخلاص کا بیان فرمایا جو اپنے ایمانی اوصاف میں وہ عظمت وبلندی حاصل کرنے والے ہیں کہ ان کو قرآن کریم نے صادقون اور مفلحون کے لقب سے یاد کیا، ان کے برعکس اب ایک گروہ منافقین وکاذبین کا بیان ہے جن کے قبائح اور بدترین خصلتوں کو ذکر کرکے ان کی ذلت وناکامی کو بیان فرمایا جارہا ہے۔

کیا آپ نے ان منافقین (یعنی عبداللہ بن ابی وغیرہ) کی حالت نہیں دیکھی کہ اپنے (ہم مذہب) بھائیوں سے کہ کفار اہل کتاب ہیں (یعنی بنی نضیر سے) کہتے ہیں (یعنی کہتے تھے، کیونکہ یہ سورت بنی نضیر کے واقعہ جلاوطنی کے بعد نازل ہوئی ہے) کہ واللہ (ہم ہر حال میں تمہارے ساتھ ہیں، پس) اگر تم (اپنے وطن سے جبراً) نکالے گئے تو ہم (بھی) تمہارے ساتھ (اپنے وطن سے) نکل جائیں گے اور تمہارے معاملہ میں ہم کبھی کسی کا کہنا نہ مانیں گے (یعنی ہم کو خواہ کوئی کیسا ہی سمجھائے کہ جلاوطنی یا لڑائی میں ہم تمہارا ساتھ نہ دیں، مگر ہم ان کی نہ مانیں گے، پس جملہ لا نطیع سیاق وسباق دونوں کے متعلق ہے) اور اگر تم سے کسی کی لڑائی ہوئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے، اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ عبداللہ بن ابی وغیرہ منافقین نے یہود "بنی النضیر" کو خفیہ پیغام بھیجا تھا کہ گھبرانا نہیں اور اپنے کو اکیلا مت سمجھنا۔ اگر مسلمانوں نے تم کو نکالا، ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے اور لڑائی کی نوبت آئی تو تمہاری مدد کریں گے، یہ ہمارا بالکل اٹل اور قطعی فیصلہ ہے، اس کے خلاف تمہارے معاملہ میں ہم کسی کی بات ماننے والے اور پروا کرنے والے نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی دل سے نہیں کہہ رہے، محض مسلمانوں کے خلاف اکسانے کے لیے باتیں بنارہے ہیں، اور جو کچھ زبان سے کہہ رہے ہیں ہرگز اس پر عمل نہیں کریں گے۔

لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ لَيُوَلُّنَّ

اگر وہ نکالے جائیں یہ نہ نکلیں گے ان کے ساتھ، اور اگر ان سے لڑائی ہوئی یہ نہ مدد کریں گے ان کی ۱ اور اگر مدد کریں گے تو بھاگیں گے

الْأَدْبَارَ قف ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ⑫

پیٹھ پھیر کر پھر کہیں مدد نہ پائیں گے ۲

خلاصہ تفسیر: (پیچھے منافقین کے جھوٹے ہونے کا اجمالاً بیان ہوا، اب آگے تفصیلاً فرماتے ہیں کہ) واللہ اگر اہل کتاب نکالے گئے تو یہ (منافقین) ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے، اور اگر ان سے لڑائی ہوئی تو یہ ان کی مدد نہ کریں گے، اور اگر (بفرض محال) ان کی مدد بھی کی (اور لڑائی میں شریک ہوئے) تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، پھر (ان کے بھاگ جانے کے بعد) ان (اہل کتاب) کی کوئی مدد نہ ہوگی (کیونکہ جو مددگار تھے جب

وہی بھاگ گئے تو دوسرا بھی کوئی مددگار نہ ہوگا، پس لامحالہ مغلوب و مقہور ہوں گے)۔

مطلب یہ کہ منافقین کی جو غرض ہے کہ اپنے ان بھائیوں پر کوئی آفت نہ آنے دیں گے، اس میں ہر طرح ناکامی رہے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب آخر میں بنی نضیر نکالے گئے تو منافقین ان کے ساتھ نکلے نہیں اور جب اول میں بنی نضیر کا محاصرہ کیا گیا جس میں لڑائی اور قتال کا احتمال تھا تو اس میں منافقین نے مدد نہیں کی۔

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ: واقعہ پیش آنے کے بعد اس طرح فرمانا جو کہ آئندہ مستقبل میں واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس سورت کا نزول واقعہ سے پہلے ہوا ہے تب تو مذکورہ آیتوں پر کوئی اشکال ہی نہیں، اور اگر واقعہ کے بعد سورت کا نزول ہوا ہے تو اس طرح کلام فرمایا کہ ''اگر وہ نکالے جائیں گے تو منافقین ساتھ میں نہ نکلیں گے'' یعنی یہ گذشتہ صورت کو ذہن میں حاضر کرنے کے لیے ہے تاکہ منافقین کا وعدہ خلافی کرنا اور یہودیوں کا بے یار و مددگار ہو جانا خوب پیش نظر ہو جائے۔

وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ: حق تعالیٰ کے یہ فرما دینے کے بعد کہ ''منافقین ان کی مدد نہ کریں گے'' پھر مدد کرنے کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے فوراً ہی بعد یہاں: **وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ** فرض محال کے طور پر مدد کرنے کی فرضی صورت کا بھی ذکر فرما دیا تاکہ فرضی اور واقعی تمام صورتوں پر مقصود ثابت ہو جائے کہ منافقین کسی طرح ان کے کام نہیں آ سکتے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ چنانچہ لڑائی کا سامان ہوا اور ''بنی نضیر'' محصور ہو گئے، ایسی نازک صورت حال میں کوئی منافق ان کی مدد کو نہ پہنچا، اور آخر کار جب وہ نکالے گئے یہ اس وقت آرام سے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے رہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اگر بفرض محال منافق ان کی مدد کو نکلے بھی تو نتیجہ کیا ہوگا، بجز اس کے کہ مسلمانوں کے مقابلہ سے پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، پھر ان کی مدد تو کیا کر سکتے، خود ان کی مدد کو بھی کوئی نہ پہنچے گا۔

لَاَانْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ⑬

البتہ تمہارا ڈر زیادہ ہے ان کے دلوں میں اللہ کے ڈر سے یہ اس لیے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے

خلاصہ تفسیر: (اب منافقین کے اس ساتھ نہ دینے کا سبب فرماتے ہیں کہ) بیشک تم لوگوں کا خوف ان (منافقین) کے دلوں میں اللہ سے بھی زیادہ ہے (یعنی ایمان کا دعویٰ کر کے جو یہ اپنا خدا سے ڈرنا بیان کرتے ہیں وہ تو غلط ہے، ورنہ دل میں کفر ہی کیوں چھپاتے، ہاں! تمہارا واقعی خوف ہے، پس اس خوف کی وجہ سے یہ لوگ بنو نضیر کا ساتھ نہیں دے سکتے اور) یہ (ان کا تم سے ڈرنا اور خدا سے ڈرنا) اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ (کفر کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی عظمت کو) سمجھتے نہیں۔

لَاَانْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ: خدا سے نہ ڈرنے کا مطلب ایمان نہ لانا ہے، اور اسی پر انہیں ملامت ہے، ورنہ طبعی طور پر مخلوق کا خوف خدا کے خوف سے زیادہ ہونا گناہ کا سبب نہیں، البتہ عقلی طور پر خدا کا خوف سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کی عظمت کو سمجھتے اور دل میں اس کا ڈر ہوتا، تو کفر و نفاق کیوں اختیار کرتے، ہاں مسلمانوں کی شجاعت و بسالت سے ڈرتے ہیں، اسی لیے ان کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتے نہ میدان جنگ میں ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔

لَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَیْنَهُمْ شَدِیْدٌ ۭ

لڑ نہ سکیں گے تم سے سب مل کر مگر بستیوں کے کوٹ میں یا دیواروں کی اوٹ میں ۱؎ ان کی لڑائی آپس میں سخت ہے ۲؎

تَحۡسَبُهُمۡ جَمِيۡعًا وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۴﴾

تو سمجھے وہ اکٹھے ہیں اور ان کے دل جدا جدا ہو رہے ہیں، یہ اس لیے کہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے ۳

خلاصہ تفسیر: (یہ یہودی - خواہ بنونضیر کے ہوں یا اس کے علاوہ - اور منافقین الگ الگ تو تمہارے مقابلہ کا کیا حوصلہ کرتے) یہ لوگ (تو) سب مل کر بھی تم سے نہ لڑیں گے مگر حفاظت والی بستیوں میں یا دیوار (قلعہ وشہر پناہ) کی آڑ میں (حفاظت سے مراد عام ہے، خندق سے ہو یا قلعہ وغیرہ سے، اور ان کے بعض قبائل جیسے اوس وخزرج کی آپس کی خانہ جنگیوں کے واقعات دیکھ کر یہ اندیشہ نہ کیا جائے کہ شاید اسی طرح اہل اسلام کے مقابلہ میں کسی وقت یہ کارنمایاں کرسکیں، بات یہ ہے کہ) ان کی لڑائی آپس (ہی) میں بڑی تیز ہے (مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہیں، اور اسی طرح یہ احتمال بھی نہ کیا جائے کہ اگرچہ مسلمانوں کے مقابلہ میں یہ تنہا ضعیف ہوں مگر بہت سے کمزور مل کر قوی ہوجاتے ہیں، شاید اس طرح یہ سب جمع ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کرسکیں، تو یہ احتمال اس لئے قابل توجہ نہیں کہ) اے مخاطب! تو ان کو (ظاہر میں) متفق خیال کرتا ہے، حالانکہ ان کے قلوب غیر متفق ہیں (یعنی اگرچہ اہل حق سے عداوت ان سب میں ایک مشترک وجہ ضرور ہے، مگر خود ان میں بھی عقائد کے اختلاف کی وجہ سے فرقہ بندی اور دشمنی ہے، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے: **والقينا بينهم العداوة والبغضاء** الخ پس وہ اجتماعی قوت کا احتمال بھی نہ رہا، اور اس احتمال کا دور کرنا محض تاکید کے لیے ہے، ورنہ جب حق تعالیٰ کی مشیت میں ان کا مغلوب ہونا ہے تو اگر اتفاق بھی ہوتا تو کیا کام آتا، اب آگے اس نااتفاقی کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ) یہ (دلوں میں نااتفاقی) اس وجہ سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کی) عقل نہیں رکھتے (اس لئے اپنے پریشان خیالات کا اتباع کرتے ہیں اور متفرق خیالات کی وجہ سے دلوں کا اختلاف ہونا لازمی ہے)۔

اِلَّا فِیۡ قُرًی مُّحَصَّنَةٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ: اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کبھی ایسا واقعہ بھی پیش آیا ہو کہ منافقین نے مسلمانوں کا مقابلہ کسی قلعہ اور محفوظ مقام سے کیا ہو، کیونکہ مقصود یہ ہے کہ اگر کبھی یہود یا منافقین اکیلے اکیلے یا جمع ہو کر تمہارے مقابلہ میں آئے بھی تو ان کا مقابلہ محفوظ قلعوں میں یا شہر پناہ کی دیوار کے پیچھے سے ہوگا، چنانچہ یہود بنی قریظہ واہل خیبر اسی طرح مقابلہ میں پیش آئے اگرچہ منافقین نہ ان کے ساتھ ہوئے، اور نہ ان کا کبھی اتنا حوصلہ ہوا کہ کھل کر مسلمانوں کے مقابلہ پر آئیں، اس میں مسلمانوں کی تشجیع یعنی ہمت افزائی بھی ہے کہ ان سے اندیشہ نہ رکھیں۔

وَّقُلُوۡبُهُمۡ شَتّٰى: اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بے دینوں میں تو بسا اوقات بہت اتفاق دیکھا جاتا ہے، بات یہ ہے کہ یہاں قاعدہ کلیہ بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ خاص ان میں جو نااتفاقی تھی اس کا سبب بیان کرنا مقصود ہے کہ ان کے لئے یہی امر سبب ہو گیا تھا، جیسا کہ ظاہر ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی چونکہ ان لوگوں کے دل مسلمانوں سے مرعوب اور خوفزدہ ہیں، اس لیے کھلے میدان میں جنگ نہیں کرسکتے، ہاں گنجان بستیوں میں قلعہ نشین ہو کر یا دیواروں اور درختوں کی آڑ میں چھپ کر لڑ سکتے ہیں، ہمارے ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے، کہ یورپ نے مسلمانوں کی تلوار سے عاجز ہو کر قسم قسم کے آتشبار اسلحہ اور طریق جنگ ایجاد کیے ہیں، تاہم اب بھی اگر کسی وقت دست بدست جنگ کی نوبت آجاتی ہے تو چند ہی منٹ میں دنیا: **لَا یُقَاتِلُوۡنَكُمۡ جَمِيۡعًا اِلَّا فِیۡ قُرًی مُّحَصَّنَةٍ اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ** کا مشاہدہ کرلیتی ہے، باقی اس قوم کا تو کہنا ہی کیا جس کے نزدیک چھتوں پر چڑھ کر اینٹ پتھر پھینکنا اور تیزاب کی پچکاریاں چلانا ہی سب سے بڑی علامت بہادری کی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی آپس میں لڑائی میں بڑے تیز اور سخت ہیں جیسا کہ اسلام سے پہلے "اوس" و "خزرج" کی جنگ میں تجربہ ہو چکا، مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کی ساری بہادری اور شیخی کرکری ہوجاتی ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کے ظاہری اتفاق واتحاد سے دھوکہ مت کھاؤ، ان کے دل اندر سے پھٹے ہوئے ہیں، ہر ایک اپنی غرض وخواہش کا بندہ، اور خیالات میں ایک دوسرے سے جدا ہے پھر حقیقی یک جہتی کہاں میسر آسکتی ہے، اگر عقل ہو تو سمجھیں کہ یہ نمائشی اتحاد کس کام

کا، اتحاد اسے کہتے ہیں جو مومنین قانتین میں پایا جاتا ہے کہ تمام اغراض وخواہشات سے یکسو ہو کر سب نے ایک اللہ کی رسی کو تھام رکھا ہے، اور ان سب کا مرنا جینا اسی خدائے واحد کے لیے ہے۔

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۵﴾

جیسے قصہ ان لوگوں کا جو ہو چکے ہیں ان سے پہلے قریب ہی چکھی انہوں نے سزا اپنے کام کی اور ان کے لیے عذاب دردناک ہے

خلاصہ تفسیر: اب آگے بالخصوص بنونضیر کی اور ان منافقین کی جنہوں نے مدد ونصرت کا وعدہ کر کے بنونضیر کو دھوکہ میں ڈالا اور عین وقت پر دغا دی ان کی مثال کا بیان ہے، ان کے مجموعہ کی دو مثالیں ہیں، ایک مثال خاص بنی نضیر کی اور دوسری منافقین کی۔

(بنی نضیر کی مثال تو) ان لوگوں کی سی مثال ہے جو ان سے کچھ ہی پہلے ہوئے ہیں جو (دنیا میں بھی) اپنے کردار کا مزہ چکھ چکے ہیں اور (آخرت میں بھی) ان کے لئے دردناک عذاب (ہونے والا) ہے (مراد ان لوگوں سے یہود بنی قینقاع ہیں)۔

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا: یہود بنی قینقاع کا قصہ یہ ہوا کہ واقعہ بدر کے بعد سن ۲ ہجری میں انہوں نے عہد توڑ کر آپ سے جنگ کی، پھر مغلوب ومقہور ہوئے اور قلعہ سے آپ کے فیصلہ پر باہر نکلے اور سب کی مشکیں باندھی گئیں، پھر عبداللہ بن ابی کے اصرار والحاح کی وجہ سے اس شرط پر ان کی جان بخشی کی گئی کہ مدینہ سے چلے جائیں، چنانچہ وہ اذرعات شام کی طرف نکل گئے اور ان کے اموال مال غنیمت کی طرح تقسیم کئے گئے۔

* * *

فائدہ: یعنی ابھی قریب زمانہ میں یہود "بنی قینقاع" اپنی غداری کا مزہ چکھ چکے ہیں، جب انہوں نے بدعہدی کی تو مسلمانوں نے ایک مختصر لڑائی کے بعد نکال باہر کیا، اور اس سے پیشتر ماضی قریب میں مکہ والے بدر کے دن سزا پا چکے ہیں، وہی انجام "بنی نضیر" کا دیکھ لو کہ دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں میں سزا مل چکی اور آخرت کا دردناک عذاب جوں کا توں رہا۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ

جیسے قصہ شیطان کا جب کہے انسان کو تو منکر ہو، پھر جب وہ منکر ہوگیا کہے میں الگ ہوں تجھ سے میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو

رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾ ع

رب سارے جہان کا، پھر انجام دونوں کا یہی کہ وہ دونوں ہیں آگ میں ہمیشہ رہیں اسی میں اور یہی ہے سزا گناہ گاروں کی ۔

خلاصہ تفسیر: (اور ان منافقین کی مثال) شیطان کی سی مثال ہے کہ (پہلے تو) انسان سے کہتا ہے کہ تو کافر ہو جا پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے (اور کفر کے وبال میں گرفتار ہوتا ہے خواہ دنیا میں خواہ آخرت میں) تو (اس وقت صاف جواب دے دیتا ہے اور) کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں (دنیا میں ایسی بیزاری کا قصہ تو سورۃ انفال آیت: **و اذ زین لھم الشیطن اعمالھم الخ** میں گزر چکا ہے اور آخرت میں گمراہ کرنے والوں کی گمراہ ہونے والوں سے بے زاری متعدد آیات میں مذکور ہے) سو آخری انجام دونوں کا یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے جہاں ہمیشہ رہیں گے (ایک گمراہ ہونے کی وجہ سے دوسرا گمراہ کرنے کی وجہ سے) اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔

پس جس طرح شیطان پہلے انسان کو بہکاتا ہے، پھر وقت پر ساتھ نہیں دیتا اور دونوں خسارہ میں پڑ جاتے ہیں، اسی طرح ان منافقین نے پہلے بنونضیر کو برا مشورہ دیا کہ تم کہیں مت جاؤ، ہم تمہارے ساتھ ہیں، پھر عین وقت پر ان کو دھوکہ دیا اور دونوں بلا میں پھنسے، بنی نضیر تو جلاوطنی کی مصیبت میں، اور منافقین ناکامی کی ذلت میں مبتلا ہوئے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی شیطان اول انسان کو کفر و معصیت پر ابھارتا ہے، جب انسان دام اغواء میں پھنس جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تجھ سے الگ اور تیرے کام سے بیزار ہوں مجھے تو اللہ سے ڈر لگتا ہے (یہ کہنا بھی ریاء اور مکاری سے ہوگا) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود بھی دوزخ کا کندہ بنا اور اسے بھی بنایا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''شیطان آخرت میں یہ بات کہے گا اور بدر کے دن بھی ایک کافر کی صورت میں لوگوں کولڑواتا تھا، جب فرشتے نظر آئے تو بھاگا، جس کا ذکر سورۃ انفال میں گزر چکا ہے، یہی مثال منافقوں کی ہے، وہ بنی نضیر کو اپنی حمایت و رفاقت کا یقین دلا دلا کر بھرے پر چڑھاتے رہے، آخر جب وہ مصیبت میں پھنس گئے، آپ الگ ہو بیٹھے، لیکن کیا وہ اس طرح اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! دونوں کا ٹھکانا دوزخ ہے''۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور چاہیے کہ دیکھ لے ہر ایک جی کیا بھیجتا ہے کل کے واسطے لے اور ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو ۲

خلاصہ تفسیر: اب آگے مسلمانوں کو کفار کے ایسے افعال سے نفرت اور خوف دلانے کی غرض سے آخرت کی تیاری کرنے اور احکام الٰہی کی مخالفت سے بچنے کا حکم فرماتے ہیں، اور اس حکم کی مضبوطی کے لیے اپنے جلال و جمال کی صفات بیان فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! (تم نے نافرمانوں کا انجام سن لیا، سو تم) اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر ہر شخص دیکھ بھال لے کہ کل (قیامت) کے واسطے اس نے کیا (ذخیرہ) بھیجا ہے (یعنی اعمال صالحہ میں کوشش کرو جو کہ ذخیرہ آخرت ہیں) اور (جس طرح طاعات و اعمال صالحہ میں تقویٰ کا حکم ہے، اسی طرح گناہوں سے بچنے کے بارے میں بھی تم کو حکم ہے کہ) اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے (پس گناہوں کے ارتکاب سے عذاب کا اندیشہ ہے)۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ: خلاصہ تفسیر سے واضح ہو گیا کہ اس آیت میں پہلا: اتَّقُوا اللّٰهَ اعمال صالحہ کے متعلق ہے جس کا قرینہ آگے قَدَّمَتْ لِغَدٍ ہے، اور دوسرا: اتَّقُوا اللّٰهَ گناہوں کے متعلق ہے، جس کا قرینہ آگے: خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ہے۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ: اس سے صراحۃً مراقبہ کی اصل ثابت ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی اللہ سے ڈر کر طاعات اور نیکیوں کا ذخیرہ فراہم کرو اور سوچو کل کے لیے کیا سامان تم نے آگے بھیجا ہے جو مرنے کے بعد وہاں پہنچ کر تمہارے کام آئے۔

فائدہ: ۲ یعنی تمہارا کوئی کام اللہ سے پوشیدہ نہیں لہٰذا اس سے ڈر کر تقویٰ کا راستہ اختیار کرو اور معاصی سے پرہیز رکھو۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور مت ہو ان جیسے جنہوں نے بھلا دیا اللہ کو پھر اللہ نے بھلا دیئے ان کو ان کے جی، وہ لوگ وہی ہیں نافرمان

خلاصہ تفسیر: اور (آگے ان احکام کی مزید تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے اللہ (کے احکام) سے بے پروائی کی (یعنی ان لوگوں نے احکام پر عمل ترک کر دیا، جس بات کا ان کو حکم دیا گیا اس کو پورا نہ کیا، اور جس سے منع کیا گیا اس کا ارتکاب کیا) سو (اثر اس کا یہ ہوا کہ) اللہ تعالیٰ نے خود ان کی جان سے ان کو بے پرواہ بنا دیا (یعنی ان کی ایسی عقل ماری گئی کہ خود اپنے حقیقی نفع کو نہ سمجھا اور نہ حاصل کیا) یہی لوگ نافرمان ہیں (اور اس نافرمانی کی سزا بھگتیں گے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جنھوں نے اللہ کے حقوق بھلا دیے، اس کی یاد سے غفلت اور بے پروائی برتی، اللہ نے خود کی جانوں سے ان کو غافل اور بے خبر کر دیا کہ آنے والی آفات سے اپنے بچاؤ کی کچھ فکر نہ کی اور نافرمانیوں میں غرق ہو کر دائمی خسارے اور ابدی ہلاکت میں پڑ گئے۔

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ⑳

برابر نہیں دوزخ والے اور بہشت والے، بہشت والے جو ہیں وہی ہیں مراد پانے والے

خلاصہ تفسیر: (پیچھے دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا ہے، یعنی متقیوں کا اور نافرمانوں کا، ان میں ایک جنت والے ہیں اور ایک دوزخ والے، اور) اہل نار اور اہل جنت باہم برابر نہیں (بلکہ) جو اہل جنت ہیں وہ لوگ کامیاب ہیں (اور اہل نار یعنی دوزخ والے ناکام ہیں جیسا کہ پچھے آیت: **اولئك هم الفسقون** سے معلوم ہوا، پس تمہیں جنت والوں میں سے ہونا چاہئے، دوزخ والوں میں سے نہیں ہونا چاہئے)۔

* * *

فائدہ: یعنی چاہیے کہ آدمی جب اپنے کو بہشت کا مستحق ثابت کرے جسکا راستہ قرآن کریم کی ہدایات کے سامنے جھکنے کے سوا کچھ نہیں۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ

اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر تو تو دیکھ لیتا کہ وہ دب جاتا پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے [1]

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ㉑

اور یہ مثالیں ہم سناتے ہیں لوگوں کو تاکہ وہ غور کریں [2]

خلاصہ تفسیر: (اور یہ مفید نصیحتیں جس قرآن کے ذریعہ سے تم کو سنائے جاتی ہیں وہ ایسا ہے کہ) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے (اور اس میں سمجھنے کا مادہ رکھ دیتے اور شہوات کا مادہ نہ رکھتے) تو (اے مخاطب!) تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا (یعنی قرآن فی نفسہ ایسا قوی اور موثر ہے، مگر انسان میں غلبہ شہوت کی وجہ سے استعداد اور قابلیت خراب ہوگئی جس کی وجہ سے اثر نہیں ہوتا، پس انسان کو چاہئے کہ نیک اعمال کی بجا آوری اور گناہوں کے چھوڑنے سے اپنی شہوت کو مغلوب کرے، تاکہ قرآن کی نصیحتوں سے اس کو اثر ہو، اور احکام میں پختگی، استقامت اور ذکر و فکر نصیب ہو جس کا اوپر حکم ہوا ہے) اور ان مضامین عجیبہ کو ہم لوگوں کے (فائدہ کے) لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں (اور نفع حاصل کریں، اور اسی لئے یہ مضمون: لو انزلنا هذا القرآن الخ یہاں بیان کیا گیا)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی مقام حسرت و افسوس ہے کہ آدمی کے دل پر قرآن کا اثر کچھ نہ ہو، حالانکہ قرآن کی تاثیر اس قدر زبردست اور قوی ہے کہ اگر وہ پہاڑ جیسی سخت چیز پر اتارا جاتا اور اس میں سمجھ کا مادہ موجود ہوتا تو وہ بھی متکلم کی عظمت کے سامنے دب جاتا اور مارے خوف کے پھٹ کر پارہ پارہ ہو جاتا، میرے والد مرحوم نے ایک طویل نظم کے ضمن میں یہ تین شعر لکھے تھے:

سنتے سنتے نغمہ ہائے محفل بدعات کو — کان بہرے ہوگئے دل بدمزہ ہونے کو ہے
آؤ سنوائیں تمہیں وہ نغمہ مشروع بھی — پارہ جس کے لحن سے طور ہدیٰ ہونے کو ہے
حیف گر تاثیر اس کی تیرے دل پر کچھ نہ ہو — کوہ جس سے خاشعا متصدعاً ہونے کو ہے

فائدہ: [2] حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یعنی کافروں کے دل بڑے سخت ہیں کہ یہ کلام سن کر بھی ایمان نہیں لاتے، اگر پہاڑ سمجھے تو وہ بھی دب جائے"۔

تنبیہ: یہ تو کلام کی عظمت کا ذکر تھا، آگے متکلم کی عظمت و رفعت کا بیان ہے:

هُوَاللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾

وہ اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں کسی کی، جانتا ہے جو پوشیدہ ہے اور جو ظاہر ہے، وہ ہے بڑا مہربان رحم والا

هُوَاللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ

وہ اللہ ہے جس کے سوا بندگی نہیں کسی کی، وہ بادشاہ ہے پاک ذات سب عیبوں سے سالم ۱؎ امان دینے والا ۲؎ پناہ میں لینے والا زبردست

الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾

دباؤ والا صاحب عظمت، پاک ہے اللہ ان کے شریک بتلانے سے ۳؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے حق تعالیٰ کی صفات کمال بیان کئے جاتے ہیں جن سے حق تعالیٰ کی عظمت قلب پر نقش ہو کر احکام بجالانے میں مددگار ثابت ہو، پس ارشاد ہے کہ:

وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود (بننے کے لائق) نہیں، وہ جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا، وہی بڑا مہربان رحم والا ہے (اور چونکہ توحید نہایت مہتم بالشان چیز ہے، اس لئے تاکید کے لئے اس کو مکرر فرمایا کہ:) وہ ایسا معبود ہے کہ اس کے سوا کوئی اور معبود (بننے کے لائق) نہیں، وہ بادشاہ ہے (سب عیبوں سے) پاک ہے (یعنی زمانہ ماضی میں بھی اس میں کوئی عیب نہیں ہوا) سالم ہے (اور آئندہ بھی اس میں کسی عیب کا احتمال نہیں، اپنے بندوں کو خوف کی چیزوں سے) امن دینے والا ہے (اپنے بندوں کی خوف کی چیزوں سے) نگہبانی کرنے والا ہے (یعنی آفت بھی نہیں آنے دیتا اور آئی ہوئی کو بھی دور کر دیتا ہے) زبردست ہے خرابی کا درست کر دینے والا ہے بڑی عظمت والا ہے، اللہ تعالیٰ (جس کی یہ شان ہے کہ) لوگوں کے شرک سے پاک ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سب نقائص اور کمزوریوں سے پاک، اور سب عیوب و آفات سے سالم، نہ کوئی برائی اسکی بارگاہ تک پہنچی نہ پہنچے۔

فائدہ: ۲؎ ① ''مومن'' کا ترجمہ ''امان دینے والا'' کیا ہے ② اور بعض مفسرین کے نزدیک ''مصدق'' کے معنی ہیں یعنی اپنی اور اپنے پیغمبروں کی قولاً و فعلاً تصدیق کرنے والا ③ یا مومنین کے ایمان پر مہر تصدیق ثبت کرنے والا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اس کی ذات و صفات اور افعال میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔

هُوَاللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ

وہ اللہ ہے بنانے والا نکال کھڑا کرنے والا ۱؎ صورت کھینچنے والا ۲؎ اسی کے ہیں سب نام خاصے ۳؎ پاکی بول رہا ہے اسکی جو کچھ ہے آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَالْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۴﴾ ع

اور زمین میں ۴؎ اور وہی ہے زبردست حکمتوں والا ۵؎

خلاصہ تفسیر: وہ معبود (برحق) ہے، پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک ٹھیک بنانے والا ہے (یعنی ہر چیز کو حکمت کے موافق بناتا ہے) صورت (شکل) بنانے والا ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں (جو اچھی اچھی صفتوں پر دلالت کرتے ہیں) سب چیزیں اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتی ہیں (زبان سے یا حال سے) جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے (پس ایسے عظمت والے خدا کے احکام کا بجالانا ضروری اور

نہایت ضروری ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ''خالق'' و''باری'' کے فرق کی طرف ہم نے سورۃ بنی اسرائیل کی آیت: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ کے فوائد میں کچھ ارشاد کیا ہے۔

فائدہ: ۲؎ جیسا کہ نطفہ پر انسان کی تصویر کھینچ دی۔

فائدہ: ۳؎ یعنی وہ نام جو اعلیٰ درجہ کی خوبیوں اور کمالات پر دلالت کرتے ہیں۔

فائدہ: ۴؎ یعنی زبان حال سے یا قال سے بھی جس کو ہم نہیں سمجھتے۔

فائدہ: ۵؎ تمام کمالات وصفات الٰہیہ کا مرجع ان دو صفتوں ''عزیز'' اور ''حکیم'' کی طرف ہے، کیونکہ ''عزیز'' کمال قدرت پر، اور ''حکیم'' کمال علم پر دلالت کرتا ہے، جتنے کمالات ہیں علم اور قدرت سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہیں، روایات میں سورۃ حشر کی ان تین آیتوں (ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو سے آخر تک) کی بہت فضیلت آئی ہے، مومن کو چاہیے کہ صبح وشام ان آیات کی تلاوت پر مواظبت رکھے۔

ایاتها ۱۳ ۶۰ سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ مَدَنِيَّةٌ ۹۱ رکوعاتها ۲

خلاصہ تفسیر: اس سورت کی ابتدائی آیات ایک قصہ کے متعلق ہیں، وہ یہ کہ جب آپ ﷺ نے کفار مکہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر کے اس کی خفیہ تیاریاں شروع کر رکھی تھی، ادھر مہاجرین اولین میں ایک صحابی حاطب بن ابی بلتعہ نے جو کہ بدر والوں میں سے بھی تھے، اصل میں یمن کے رہنے والے تھے، مکہ میں آکر مقیم ہو گئے تھے، مکہ میں ان کا کوئی قبیلہ یا کنبہ نہ تھا، وہیں مسلمان ہو گئے، پھر ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گئے، ان کے بھائی، والد، والدہ، اور اہل عیال اور مال ابھی تک مکہ میں تھے، انہوں نے مکہ والوں کے نام ایک خط لکھا کہ حضور ﷺ تم پر چڑھائی کرنے والے ہیں، اور یہ خط ایک عورت کو دے دیا کہ مکہ والوں کو پہنچا دے، آپ ﷺ کو وحی سے یہ بات معلوم ہوگئی، آپ نے حضرت علیؓ اور چند صحابہ کو حکم دیا کہ فلاں جگہ ایک عورت ملے گی، اس سے وہ خط لے آؤ، یہ حضرات گئے، وہ عورت اسی جگہ ملی اور ان کے دھمکانے سے اس عورت نے خط دے دیا، وہ خط لے کر آئے تو آپ ﷺ نے حاطب سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ واقعی خط میرا لکھا ہوا ہے، لیکن خدا نہ کرے میں نے اسلام کی مخالفت کے سبب یہ خط نہیں لکھا، بلکہ میں جانتا تھا کہ اسلام کو تو اس سے کوئی نقصان نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ضرور اس کو غالب کرنے والا ہے، آپ کو ضرور فتح ہوگی، اور میرا نفع ہو جائے گا کہ مکہ والے اس کا احسان مان کر میرے اہل وعیال اور اموال کی حفاظت کریں گے اور ان کو تکلیف یا نقصان نہ پہنچائیں گے، کیونکہ ان سے میری کوئی اور قرابت نہیں ہے جس سے وہ میری رعایت کرتے، بلکہ میں بالکل اجنبی اور پردیسی آدمی ہوں، اس پر حضرت عمرؓ کو غصہ آیا اور آپ ﷺ سے ان کی گردن مارنے کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بدر والوں میں سے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے بدر والوں کے سب گناہ معاف فرما دیے ہیں، یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس واقعہ کی بنا پر اس سورت کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا

۱؎ اے ایمان والو نہ پکڑو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست تم ان کو پیغام بھیجتے ہو دوستی سے ۲؎ اور وہ منکر ہوئے ہیں

بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ

اس سے جو تمہارے پاس آیا سچا دین ۳؎ نکالتے ہیں رسول کو اور تم کو اس بات پر کہ تم مانتے ہو اللہ کو جو رب ہے تمہارا ۴؎ اگر تم

خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِيْ ڰ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ڰ وَاَنَا اَعْلَمُ

نکلے ہو لڑنے کو میری راہ میں اور طلب کرنے کو میری رضامندی ۵ تم ان کو چھپا کر بھیجتے ہو دوستی کے پیغام اور مجھ کو خوب معلوم ہے

بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ①

جو چھپایا تم نے اور جو ظاہر کیا تم نے ۶ اور جو کوئی تم میں یہ کام کرے تو وہ بھول گیا سیدھی راہ ۷

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں منافقین کی یہود سے دوستی کرنے کی مذمت تھی، اس سورت کے شروع اور آخر میں مسلمانوں کو کفار سے دوستی کے تعلقات رکھنے اور بالخصوص مشرک عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت ہے، اور مشرک اور مؤمن عورتوں میں امتیاز کے لیے صرف ظاہری امتیاز پر کفایت کرنے کا حکم ہے۔

اے ایمان والو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو (یعنی اگر چہ دل سے دوستی نہ ہو مگر ایسا دوستانہ برتاؤ بھی مت کرو) حالانکہ تمہارے پاس جو دین حق آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں (جس سے ان کا دشمن خدا ہونا معلوم ہوا جو آیت میں عَدُوِّيْ کے لفظ سے بیان کیا گیا) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور تم کو اس بنا پر کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے شہر بدر کر چکے ہیں (یہ بیان ہے عَدُوَّكُمْ کا، یعنی وہ صرف اللہ کے دشمن نہیں تمہارے بھی دشمن ہیں، غرض ایسے لوگوں سے دوستی مت کرو) اگر تم میرے راستہ میں جہاد کرنے کی غرض سے اور میری رضامندی ڈھونڈنے کی غرض سے (اپنے گھروں سے) نکلے ہو (کفار کی دوستی جس کا حاصل کفار کو راضی کرنے کی فکر کرنا ہے خدا کی رضا مندی طلب کرنے کے خلاف ہے) تم ان سے چپکے چپکے دوستی کی باتیں کرتے ہو (یعنی اول تو دوستی ہی بری چیز ہے، پھر خفیہ پیغام بھیجنا جو خصوصی ربط وتعلق کی علامت ہے یہ اور زیادہ برا ہے) حالانکہ مجھ کو سب چیزوں کا خوب علم ہے تم جو کچھ چھپا کر کرتے ہو اور جو ظاہر کر کے کرتے ہو (یعنی دوسرے موانع کے ساتھ یہ بات بھی ان کی دوستی سے مانع ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کی خبر ہے) اور (آگے اس پر وعید ہے کہ) جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا وہ راہ راست سے بہک گیا (اور گمراہوں کا انجام معلوم ہی ہے)۔

لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۗءَ: یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے مخالف سے قطع تعلق رکھا جائے۔

* * *

فائدہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح مکہ والوں سے ہوئی تھی جس کا ذکر انا فتحنا (سورہ فتح) میں آچکا، دو برس یہ صلح قائم رہی، پھر کافروں کی طرف سے ٹوٹی، تب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی کے ساتھ فوج جمع کر کے مکہ فتح کرنے کا ارادہ کیا، خبروں کی بندش کر دی گئی، مبادا کفار مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاریوں سے آگاہ ہو کر لڑائی کا سامان شروع کر دیں، اور اس طرح حرم شریف میں جنگ کرنا ناگزیر ہو جائے، ایک مسلمان حاطب بن ابی بلتعہ نے (جو مہاجرین بدریین میں سے تھے) مکہ والوں کو خط لکھ بھیجا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر اندھیری رات اور سیل بے پناہ کی طرح تم پر ٹوٹنے والا ہے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے معلوم ہو گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ وغیرہ چند صحابہ کو حکم دیا کہ ایک عورت مکہ کے راستہ میں سفر کرتی ہوئی فلاں مقام پر ملے گی، اس کے پاس ایک خط ہے، وہ حاصل کر کے لاؤ، یہ لوگ تیزی سے روانہ ہوئے اور عورت کو ٹھیک اسی مقام پر پالیا، اس نے بہت لیت ولعل اور ردوکد کے بعد خط ان کے حوالے کیا، پڑھنے سے معلوم ہوا کہ حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے کفار مکہ کے نام ہے، اور مسلمانوں کے حملہ کی اطلاع دی گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے، بولے یا رسول اللہ! نہ میں نے کفر اختیار کیا ہے نہ اسلام سے پھرا ہوں، سچی بات یہ ہے کہ میرے اہل وعیال مکہ میں ہیں، وہاں ان کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں، میں نے کافروں پر ایک احسان کر کے یہ چاہا کہ وہ لوگ

اس کے معاوضہ میں میرے اہل وعیال کی خبر لیتے رہیں اور ان سے اچھا سلوک کریں (میں نے سمجھا کہ اس سے میرا کچھ فائدہ ہو جائے گا اور اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا) فتح ونصرت کے جو وعدے اللہ نے آپ ﷺ سے کیے ہیں، وہ یقینا پورے ہو کر رہیں گے، کسی کے روکے رک نہیں سکتے، چنانچہ نفس خط میں بھی یہ مضمون تھا کہ: ''خدا کی قسم! اگر رسول اللہ ﷺ تن تنہا بھی تم پر حملہ آور ہوں تو اللہ ان کی مدد کرے گا اور جو وعدے ان سے کیے ہیں پورے کر کے چھوڑے گا''، بلاشبہ حاطب سے یہ بہت بڑی خطا ہوئی لیکن رحمۃ للعالمین نے فرمایا: ''لا تقولوا له الا خیرًا'' بھلائی کے سوا اسکو کچھ مت کہو، اور فرمایا حاطب بدریین میں سے ہے، تمہیں کیا معلوم ہے کہ اللہ نے بدریین کی خطائیں معاف فرما دیں، سورۃ ہذا کا بڑا حصہ اسی قصہ میں نازل ہوا۔

فائدہ: ۲ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ: یعنی کفار مکہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے بھی، ان سے دوستانہ برتاؤ کرنا اور دوستانہ پیغام انکی طرف بھیجنا ایمان والوں کو زیبا نہیں۔

فائدہ: ۳ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ: اس لیے اللہ کے دشمن ہوئے۔

فائدہ: ۴ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ: یعنی پیغمبر کو اور تم کو کیسی کیسی ایذائیں دے کر ترک وطن پر مجبور کیا، محض اس قصور پر کہ تم ایک اللہ کو جو تمہارا سب کا رب ہے، کیوں مانتے ہو، اس سے بڑی دشمنی اور ظلم کیا ہوگا، تعجب ہے، کہ ایسوں کی طرف تم دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہو۔

فائدہ: ۵ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ: یعنی تمہارا گھر سے نکلنا اگر میری خوشنودی اور میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے ہے اور خالص میری رضا کے واسطے تم نے سب کو دشمن بنایا ہے تو پھر انہی دشمنوں سے دوستی گانٹھنے کا کیا مطلب، کیا جنہیں ناراض کر کے اللہ کو راضی کیا تھا اب انہیں راضی کر کے اللہ کو ناراض کرنا چاہتے ہو؟ العیاذ باللہ۔

فائدہ: ۶ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ: یعنی آدمی ایک کام تمام دنیا سے چھپا کر کرنا چاہے تو کیا اس کو اللہ سے بھی چھپا لے گا؟ دیکھو! حاطب نے کس قدر کوشش کی کہ خط کی اطلاع کسی کو نہ ہو، مگر اللہ نے اپنے رسول کو مطلع فرما دیا اور راز قبل از وقت فاش ہو گیا۔

فائدہ: ۷ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ: یعنی مسلمان ہو کر کوئی ایسا کام کرے اور سمجھے کہ میں اس کے پوشیدہ رکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا سخت غلطی اور بہت بڑی بھول ہے۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ

اگر تم ان کے ہاتھ آ جاؤ ہو جائیں تمہارے دشمن اور چلائیں تم پر اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برائی کے ساتھ

وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝۲

اور چاہیں کہ کسی طرح تم بھی منکر ہو جاؤ

خلاصہ تفسیر: (اب ان کی دشمنی کا بیان ہے کہ وہ تمہارے ایسے سخت دشمن ہیں کہ) اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو (فوراً) اظہار عداوت کرنے لگیں اور (وہ اظہار عداوت یہ کہ) تم پر برائی (اور ضرر رسانی) کے ساتھ دست درازی اور زبان درازی کرنے لگیں (یہ تو دنیوی نقصان ہے) اور (دینی نقصان یہ کہ) وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ تم کافر (ہی) ہو جاؤ (پس ایسے لوگ کب دوستی کے قابل ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی ان کافروں سے بحالت موجودہ کسی بھلائی کی امید مت رکھو، خواہ تم کتنی ہی رواداری اور دوستی کا اظہار کرو گے، وہ کبھی مسلمان کے خیر خواہ نہیں ہو سکتے، باوجود انتہائی رواداری کے اگر تم پر ان کا قابو چڑھ جائے تو کسی قسم کی برائی اور دشمنی سے درگزر نہ کریں، زبان سے، ہاتھ سے ہر طرح ایذا پہنچائیں اور یہ چاہیں کہ جیسے خود صداقت سے منکر ہیں، کسی طرح تم کو بھی منکر بنا ڈالیں، کیا ایسے شریر و بد باطن اس لائق ہیں کہ ان کو دوستانہ پیغام بھیجا جائے۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ

ہرگز کام نہ آئیں گے تمہارے کنبے والے اور نہ تمہاری اولاد قیامت کے دن وہ فیصلہ کرے گا تم میں

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ③

اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے

خلاصہ تفسیر: (اور اگر تم کو دوستی کا خیال اپنے اہل وعیال کی وجہ سے ہو تو خوب سمجھ لو کہ) تمہارے رشتہ دار اور اولاد قیامت کے دن تمہارے (کچھ) کام نہ آئیں گے خدا (ہی) تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ تمہارے سب اعمال کو خوب دیکھتا ہے (پس ہر عمل کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک کرے گا، پس اگر تمہارے اعمال سزا کے قابل ہوں گے تو اس سزا سے اولاد اور رشتہ دار بچا نہ سکیں گے، پھر ان کی رعایت میں خدا کے حکم کے خلاف کرنا بہت بری بات ہے، اور اس سے اموال کا قابل رعایت نہ ہونا اچھی طرح ظاہر ہو گیا)۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ: یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ دنیاوی تعلقات کی رعایت رکھنا دین میں ناجائز ہے۔

* * *

فائدہ: حاطب نے وہ خط اپنے اہل وعیال کی خاطر لکھا تھا، اس پر تنبیہ فرمائی کہ اولاد اور رشتہ دار قیامت کے دن کچھ کام نہ آئیں گے، اللہ تعالیٰ سب کا رتی رتی عمل دیکھتا ہے، اسی کے موافق فیصلہ فرمائے گا اس کے فیصلہ کو کوئی بیٹا، پوتا، اور عزیز واقارب ہٹا نہیں سکے گا، پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ ایک مسلمان اہل وعیال کی خاطر اللہ کو ناراض کر لے، یاد رکھو! ہر چیز سے مقدم اللہ کی رضامندی ہے، وہ راضی ہو تو اس کے فضل سے سب کام ٹھیک ہو جاتے ہیں لیکن وہ ناخوش ہو تو کوئی کچھ کام نہ آئے گا۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ

تم کو چال چلنی چاہیے اچھی ابراہیم کی اور جو اس کے ساتھ تھے جب انہوں نے کہا اپنی قوم کو ہم الگ ہیں تم سے

وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا

اور ان سے کہ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا ۱؎ ہم منکر ہوئے تم سے ۲؎ اور کھل پڑی ہم میں اور تم میں دشمنی اور بیر ہمیشہ کو

حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ

یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ اکیلے پر ۳؎ مگر ایک کہنا ابراہیم کا اپنے باپ کو کہ میں مانگوں کا معافی تیرے لیے اور مالک نہیں میں تیرے نفع کا

اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ④

اللہ کے ہاتھ سے کسی چیز کا ۴؎ اے رب ہمارے ہم نے تجھ پر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع ہوئے اور تیری طرف ہے سب کو پھر آنا ۵؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے کفار سے ترک موالات کی تائید وتاکید کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ ان کا تو سارا خاندان مشرکین کا تھا، انہوں نے سب سے بیزاری اور برات کا ہی نہیں بلکہ عداوت کا اعلان کر دیا، چنانچہ ارشاد ہے:

تمہارے لئے ابراہیم (علیہ السلام) میں اور ان لوگوں میں جو کہ (ایمان واطاعت میں) ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے (یعنی اس بارے میں کفار سے ایسا برتاؤ رکھنا چاہئے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے کیا) جبکہ ان سب نے (مختلف اوقات میں) اپنی قوم

(کے لوگوں) سے کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں (''مختلف اوقات'' اس لئے کہا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت اول یہ بات اپنی قوم سے کہی تھی اس وقت وہ بالکل تنہا تھے، پھر جو جو آپ کے ساتھ ہوتے گئے کفار سے قطع تعلق کرتے چلے گئے، اب آگے اس بیزاری کا بیان ہے کہ) ہم تمہارے (یعنی کفار اور ان کے معبودین کے) منکر ہیں (یعنی تمہارے عقائد کے اور تمہارے معبودوں کی عبادت کے منکر ہیں، یہ تو عقیدہ کے اعتبار سے بیزاری ہوئی) اور (معاملہ اور برتاؤ کے اعتبار سے بیزاری یہ ہے کہ) ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض (زیادہ) ظاہر ہو گیا (کیونکہ بغض اور دشمنی کا سبب عقائد کا اختلاف ہے، اور اب اس کا خوب کھلم کھلا اعلان ہو گیا تو دشمنی بھی خوب ظاہر ہو گئی، اور یہ دشمنی ہم کو تم سے ہمیشہ رہے گی) جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ (غرض ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین نے کفار سے صاف قطع تعلق کر دیا) لیکن ابراہیم (علیہ السلام) کی اتنی بات تو اپنے باپ سے ہوئی تھی (جس سے ظاہر میں ان کے ساتھ تعلق کا احتمال تھا) کہ میں تمہارے لئے استغفار ضرور کروں گا اور تمہارے لئے (استغفار سے زیادہ) مجھ کو خدا کے آگے کسی بات کا اختیار نہیں (کہ دعا کو قبول کرا لوں، یا ایمان نہ لانے کے باوجود تم کو عذاب سے بچا لوں، یہ گفتگو تو ابراہیم کی اپنی قوم سے ہوئی، آگے ان کی دعا کا مضمون ہے، یعنی کفار سے قطع تعلق کر کے انہوں نے اس بارے میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ) اے ہمارے پروردگار! ہم (کفار سے بےزاری اور دشمنی کے اعلان کے معاملے میں) آپ پر توکل کرتے ہیں اور (آپ ہی ہماری تمام مہمات و مشکلات کی کفالت اور دشمنوں کی ایذاؤں سے حفاظت فرما دیں گے و نیز ایمان لانے میں) آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور (اعتقاد رکھتے ہیں کہ) آپ ہی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے (پس اس اعتقاد کی وجہ سے ہم نے جو کچھ کفار سے بےزاری وغیرہ ظاہر کی ہے محض خلوص سے کی ہے، اس میں کوئی دنیوی غرض نہیں ہے، اور اسی سبب سے جو کچھ ہم دعا میں عرض کر رہے ہیں یہ تفاخر کے طور پر نہیں، بلکہ عرض حال بغرض سوال ہے)۔

إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ: مطلب یہ ہے کہ اتنی بات تو ابراہیم علیہ السلام نے کہی تھی جس کا مطلب تم میں سے بعض لوگ مطلق استغفار سمجھ گئے، حالانکہ یہاں استغفار کے دوسرے معنی ہیں، یعنی ہدایت کی دعا کرنا، یعنی ان کے لئے یہ دعا کرنا کہ وہ ایمان لا کر مغفرت کے مستحق بن جائیں جس کی سب کو اجازت ہے اور واقع میں ہدایت کی دعا کرنا قطع تعلق کے خلاف بھی نہیں مگر تعلق کی ظاہری صورت اور استغفار کے ظاہری معنی کے اعتبار سے صورتاً اس کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کے لیے استغفار کی مزید تحقیق سورہ برأت آیت: ۱۱۳ و ۱۱۴ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

إِنَّا بُرَءَٰٓؤُا مِنكُمْ (الی قوله) إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس بات میں اس پر بھی دلالت ہے کہ جو بغض اللہ کی خاطر ہو تو اس بغض فی اللہ میں بھی شفقت اور خیر خواہی شامل ہوتی ہے بخلاف بغض نفسانی کے، یعنی جو بغض فقط نفسانی خواہش کی وجہ سے ہو تو اس میں شفقت اور خیر خواہی نہیں ہوتی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو لوگ مسلمان ہو کر ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوتے گئے اپنے اپنے وقت پر سب نے قولاً یا فعلاً اسی علیحدگی اور بےزاری کا اعلان کیا۔

فائدہ: ۲ یعنی تم اللہ سے منکر ہو اور اسکے احکام کی پروا نہیں کرتے ہم تمہارے طریقہ سے منکر ہیں اور ذرہ برابر تمہاری پروا نہیں کرتے۔

فائدہ: ۳ یعنی یہ دشمنی اور بیر اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب تم شرک چھوڑ کر اسی ایک آقا کے غلام بن جاؤ جس کے ہم ہیں۔

فائدہ: ۴ یعنی صرف دعا ہی کر سکتا ہوں، کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں، خدا جو کچھ پہنچانا چاہے اسے میں نہیں روک سکتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی پھر اپنی قوم کی طرف منہ نہیں کیا، تم بھی وہی کرو، ایک ابراہیم نے دعا چاہی تھی، باپ کے واسطے، جب تک معلوم نہ تھا، تم کو معلوم ہو چکا، لہذا تم کافر کی بخشش نہ مانگو''۔

تنبیہ: باپ کے حق میں ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کا قصہ سورۃ براۃ میں گزر چکا، آیت: **وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ**

اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ (التوبہ: ۱۱۴) کے فوائد میں دیکھ لیا جائے۔

فائدہ: ۵ یعنی سب کو چھوڑ کر تجھ پر بھروسہ کیا اور قوم سے ٹوٹ کر تیری طرف رجوع ہوئے اور خوب جانتے ہیں کہ سب کو پھر کر تیری ہی طرف آنا ہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۵

اے رب ہمارے مت جانچ ہم پر کافروں کو ۱ اور ہم کو معاف کر اے رب ہمارے ۲ تو ہی ہے زبردست حکمت والا ۳

خلاصہ تفسیر: (اور) اے ہمارے پروردگار! ہم کو کافروں کا تختۂ مشق نہ بنا (یعنی اس بے زاری اور قطع تعلق سے یہ کافر ہم پر ظلم نہ کرنے پائیں) اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ معاف کر دیجئے بیشک آپ زبردست حکمت والے ہیں (اور ہر طرح کی قدرت آپ کو حاصل ہے)۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: دعا کا یہ عنوان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ فتنہ کے ایسے اسباب سے بھی بچنا مطلوب ہے جس سے اہل حق پر اہل باطل ہونے کا یا اہل باطل پر اہل حق ہونے کا شبہ ہو، رہی یہ بات کہ ان اسباب میں تو بعض اوقات غیر اختیاری چیزیں بھی ہوتی ہیں تو ان سے بچنا یہ ہے کہ مذکورہ دعا مانگی جائے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہم کو کافروں کے واسطے محل آزمائش اور تختۂ مشق نہ بنا اور ایسے حال میں مت رکھ جس کو دیکھ کر کافر خوش ہوں، اسلام اور مسلمانوں پر آوازیں کسیں اور ہمارے مقابلہ میں اپنی حقانیت پر استدلال کرنے لگیں۔

فائدہ: ۲ یعنی ہماری کوتاہیوں کو معاف فرما اور تقصیرات سے درگزر کر۔

فائدہ: ۳ تیری زبردست قوت اور حکمت سے یہی توقع ہے کہ اپنے وفاداروں کو دشمنوں کے مقابلہ میں مغلوب و مقہور نہ ہونے دیگا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ

البتہ تم کو بھلی چال چلنی چاہیے ان کی جو کوئی امید رکھتا ہو اللہ کی اور پچھلے دن کی، اور جو کوئی منہ پھیرے

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶　ع

تو اللہ وہی ہے بے پرواسب تعریفوں والا

خلاصہ تفسیر: بیشک ان لوگوں میں (یعنی ابراہیم علیہ السلام اور ان کے متبعین میں) تمہارے لئے یعنی ایسے شخص کے لئے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ (کے سامنے جانے) کا اور قیامت کے دن (کے آنے) کا اعتقاد رکھتا ہو (یعنی یہ عقیدہ ابراہیم کی اتباع کا مطالبہ کرتا ہے) اور (آگے دوسرے طرز پر وعید ہے جیسے اس سے پہلے ومن یفعلہ منکم میں وعید آ چکی ہے یعنی) جو شخص (اس حکم سے) روگردانی کرے گا سو (اسی کا نقصان ہوگا کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تو) بالکل بے نیاز اور (جامع الکمالات ہونے کی وجہ سے) سزاوار حمد ہے (یعنی بذات خود قابل تعریف ہے، پس اس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ دوسروں کی عبادت سے اس کا کچھ نفع ہو)۔

* * *

فائدہ: یعنی تم مسلمانوں کو یا بالفاظ دیگر ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ سے ملنے اور آخرت کے قائم ہونے کے امیدوار ہیں، ابراہیم علیہ السلام اور اسکے رفقاء کی چال اختیار کرنی چاہیے، دنیا خواہ تم کو کتنا ہی متعصب اور سنگدل کہے، تم اس راستہ سے منہ نہ موڑو جود نیا کے موحد اعظم نے اپنے طرز عمل

سے قائم کردیا، مستقبل کی ابدی کامیابی اسی راستہ پر چلنے سے حاصل ہوسکتی ہے، اگر اسکے خلاف چلو گے اور خدا کے دشمنوں سے دوستانہ گانٹھو گے تو خود نقصان اٹھاؤ گے، اللہ تعالیٰ کو کسی کی دوستی یا دشمنی کی کیا پروا ہے وہ تو بذات خود تمام کمالات اور ہر قسم کی خوبیوں کا مالک ہے، اس کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ

امید ہے کہ کردے اللہ تم میں اور جو دشمن ہیں تمہارے ان میں دوستی، اور اللہ سب کچھ کرسکتا ہے

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷

اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں کفار سے دوستانہ تعلق رکھنے کی سخت ممانعت وحرمت کا بیان آیا ہے اگرچہ وہ کفار رشتہ وقرابت میں کتنے ہی قریب ہوں، صحابہ کرام اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کے معاملہ میں نہ ذاتی خواہش کی پروا کرتے تھے نہ کسی خویش وعزیز کی، اس پر عمل کیا گیا، جس کے نتیجہ میں گھر گھر یہ صورت پیش آئی کہ باپ مسلمان، بیٹا کافر یا اس کے برعکس ہے تو دوستانہ تعلق قطع کردیا گیا، ظاہر ہے انسانی فطرت اور طبیعت پر یہ عمل آسان نہ تھا، اس لئے آیات مذکورہ میں حق تعالیٰ نے ان کی اس مشکل کو عنقریب آسان کردینے کی خبر سنادی۔

(چونکہ ان کی عداوت ودشمنی سن کر مسلمانوں کو فکر ہوسکتی تھی اور کچھ قطع تعلق سے طبعاً رنج ہوسکتا تھا، اس لئے بطور خوش خبری کے آگے پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ:) اللہ تعالیٰ سے امید ہے (یعنی ادھر سے وعدہ ہے) کہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تمہاری عداوت ہے دوستی کردے (اگرچہ بعض ہی سے سہی، یعنی ان کو مسلمان کردے جس سے دشمنی دوستی کے ساتھ بدل جائے) اور (اس کو کچھ بعید نہ سمجھو کیونکہ) اللہ کو بڑی قدرت ہے (چنانچہ فتح مکہ کے روز بہت سے آدمی خوشی سے مسلمان ہوگئے) اور (اب تک جو کسی سے اس حکم کے خلاف خطا ہوگئی ہے جس سے اب وہ تائب ہو چکا ہے تو) اللہ تعالیٰ (اس کے لئے) غفور رحیم ہے (اس کی خطا معاف کردی جائے گی)۔

مطلب یہ کہ اگر مکہ والوں سے قطع تعلق ہمیشہ کے لیے ہوتا تب بھی حکم ہونے کی وجہ سے اس پر عمل واجب تھا، پھر خاص کر جبکہ تھوڑی ہی مدت کے لیے کرنا پڑے، اور پھر بعد میں ان کے ایمان لے آنے سے دوستی اور تعلق بدستور لوٹ آئے گا تو کوئی فکر کی بات نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کی قدرت ورحمت سے کچھ بعید نہیں کہ جو آج بدترین دشمن ہیں کل انہیں مسلمان کردے اور اس طرح تمہارے اور ان کے درمیان دوستانہ اور برادرانہ تعلقات قائم ہوجائیں، چنانچہ فتح مکہ میں ایسا ہی ہوا، تقریباً سب مکہ والے مسلمان ہوگئے اور جو لوگ ایک دوسرے پر تلوار اٹھا رہے تھے اب ایک دوسرے پر جان قربان کرنے لگے، اس آیت میں مسلمانوں کی تسلی کردی کہ مکہ والوں کے مقابلہ میں یہ ترک موالات کا جہاد صرف چند روز کے لیے ہے، پھر اس کی ضرورت نہیں رہے گی، چاہیے کہ بحالت موجودہ تم مضبوطی سے ترک موالات پر قائم رہو اور جس سے کوئی بے اعتدالی ہوگئی ہو اللہ سے اپنی خطا معاف کرائے، وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ

اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ

تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۸

ان سے کرو بھلائی اور انصاف کا سلوک، بیشک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک تو دوستانہ تعلقات کی نسبت حکم فرمایا تھا کہ ان کا قطع تعلق واجب ہے، اب آگے احسان کے تعلق کے حکم کی تفصیل فرماتے ہیں وہ یہ کہ:) اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا (مراد ان سے وہ کافر ہیں جو ذمی یا صلح کرنے والے ہوں، یعنی ان کے ساتھ احسان کا یہ برتاؤ جائز ہے، باقی رہا عدل وانصاف کا منصفانہ برتاؤ تو اس میں ذمی یا مصالح کی شرط نہیں، بلکہ وہ تو ہر کافر بلکہ جانور کے ساتھ بھی واجب ہے، اس آیت میں عدل و انصاف سے مراد خاص احسان کا برتاؤ کرنا ہے اس لئے ذمی اور مصالحین کے ساتھ مخصوص کیا گیا، اب آگے اس برتاؤ کی ترغیب ہے کہ) اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ: بزرگوں کی عادت ہے کہ بسا اوقات بعض کفار سے نرمی، مہربانی یا قبول ہدیہ کا برتاؤ کرتے ہیں تو یہ جائز ہے۔

* * *

فائدہ: مکہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آپ مسلمان نہ ہوئے اور مسلمان ہونے والوں سے ضد اور پرخاش بھی نہیں رکھی، نہ دین کے معاملہ میں ان سے لڑے نہ ان کو ستانے اور نکالنے میں ظالموں کے مددگار بنے، اس قسم کے کافروں کے ساتھ بھلائی اور خوش خلقی سے پیش آنے کو اسلام نہیں روکتا، جب وہ تمہارے ساتھ نرمی اور رواداری سے پیش آتے ہیں، انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور دنیا کو دکھلا دو کہ اسلامی اخلاق کا معیار کس قدر بلند ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہیں کہ اگر کافروں کی ایک قوم مسلمانوں سے برسر پیکار ہے تو تمام کافروں کو بلاتمیز ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دیں، ایسا کرنا حکمت وانصاف کے خلاف ہوگا، ضروری ہے کہ عورت، مرد، بچے، بوڑھے، جوان اور معاند ومسالم میں ان کے حالات کے اعتبار سے فرق کیا جائے، جس کی قدرے تفصیل سورۃ "مائدہ" اور "آل عمران" کے فوائد میں گزر چکی۔

اِنَّمَا يَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ قٰتَلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَاَخۡرَجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ وَظٰهَرُوۡا عَلٰٓى

اللہ تو منع کرتا ہے تم کو ان سے جو لڑے تم سے دین پر اور نکالا تم کو تمہارے گھروں سے اور شریک ہوئے

اِخۡرَاجِكُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ ۚ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۞۹

تمہارے نکالنے میں کہ ان سے کرو دوستی اور جو کوئی ان سے دوستی کرے، سو وہ لوگ وہی ہیں گناہ گار

خلاصہ تفسیر: (البتہ) صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی (یعنی بر واحسان) کرنے سے اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑے ہوں (خواہ عمل سے اس وقت شریک ہوں یا آئندہ عزم وارادہ ہو) اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہو اور (اگر نکالا نہ بھی ہو لیکن) تمہارے نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی ہو (یعنی ان کے ساتھ شریک ہوں، خواہ ان کے عمل میں شرکت کی ہو یا اس کا عزم وارادہ رکھتے ہوں، اس میں وہ سب کافر آ گئے جن سے مسلمانوں کا کوئی صلح کا معاہدہ یا عقد ذمہ نہیں تھا، ان کے ساتھ بر واحسان کا معاملہ جائز نہیں، بلکہ ان سے جنگ اور مقابلہ مطلوب ہے) اور جو شخص ایسوں سے دوستی (کا برتاؤ یعنی بر واحسان کا برتاؤ) کرے گا سو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔

اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ: اس آیت میں دوستی کرنے سے مراد احسان والا یعنی محسنانہ برتاؤ کرنا ہے، اس کو دوستی کہنا اس معنی کر ہے کہ یہ دشمنی نہیں ہے، پس دوستی کے ایک تو اصلی وجودی معنی ہیں یعنی دل سے محبت والفت کرنا، یہ تو ہر کافر سے ناجائز ہے، اور ایک عدمی معنی ہیں یعنی دشمنی نہ کرنا، یہ ان کافروں سے جائز ہے جو ذمی ہوں یا جن سے مصالحت ہو، اور حربی کافروں سے دشمنی نہ کرنا بھی جائز نہیں، بلکہ ان سے دشمنی رکھنا واجب ہے۔

کفار کے ساتھ دوستی اور احسان کے معاملہ کی تفصیل سورہ آل عمران آیت ۲۸: لَا يَتَّخِذِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الۡكٰفِرِيۡنَ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: یعنی ایسے ظالموں سے دوستانہ برتاؤ کرنا بیشک سخت ظلم اور گناہ کا کام ہے۔

ربط: یہاں تک کفار کے دوفریق (معاند اور مسالم) کے ساتھ معاملہ کرنے کا ذکر تھا، آگے بتلاتے ہیں کہ ان عورتوں کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے جو "دارالحرب" سے "دارالاسلام" میں آئیں یا "دارالحرب" میں مقیم رہیں۔

قصہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ میں مکہ والوں نے یہ قرار دیا کہ ہمارا جو آدمی تمہارے پاس جائے اس کو واپس بھیجنا ہوگا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرمالیا تھا، چنانچہ کئی مرد آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کر دیا، پھر کئی مسلمان عورتیں آئیں، ان کو واپس کرتے تو کافر مرد کے گھر مسلمان عورتیں حرام میں پڑتیں، اس پر یہ اگلی آیتیں اتریں، معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد عورتوں کی واپسی پر کفار نے اصرار نہیں کیا ورنہ صلح قائم نہ رہتی۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ

اے ایمان والو! جب آئیں تمہارے پاس ایمان والی عورتیں وطن چھوڑ کر ان کو جانچ لو، اللہ خوب جانتا ہے ان کے ایمان کو [1]

فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ

پھر اگر جانو کہ وہ ایمان پر ہیں تو مت پھیرو ان کو کافروں کی طرف، نہ یہ عورتیں حلال ہیں ان کافروں کو اور نہ وہ کافر حلال ہیں

لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ

ان عورتوں کو، اور دے دو ان کافروں کو جو ان کا خرچ ہوا ہو، اور گناہ نہیں تم کو کہ نکاح کر لو ان عورتوں سے جب ان کو دو ان کے مہر [2]

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ

اور نہ رکھو اپنے قبضہ میں ناموس کافر عورتوں کے اور تم مانگ لو جو تم نے خرچ کیا اور وہ کافر مانگ لیں جو انہوں نے خرچ کیا، یہ اللہ کا

اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾

فیصلہ ہے، تم میں فیصلہ کرتا ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے [3]

خلاصہ تفسیر: یہ آیتیں بھی ایک خاص موقع کے متعلق ہیں اور وہ موقع صلح حدیبیہ کا ہے، جس کا بیان سورۂ فتح کے آغاز میں ہوا ہے، من جملہ ان شرطوں کے جو صلح نامہ میں لکھی گئی تھیں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جو شخص مسلمانوں میں سے کافروں کی طرف چلا جائے وہ واپس نہ دیا جائے، اور جو شخص کافروں میں سے مسلمانوں کی طرف چلا جائے وہ واپس دے دیا جائے، چنانچہ بعض مسلمان مرد آئے اور وہ واپس کر دیئے گئے، پھر بعض عورتیں مسلمان ہو کر آئیں، ان کے اقارب نے ان کی واپسی کی درخواست کی، اس پر یہ آیتیں حدیبیہ ہی میں نازل ہوئیں، جس میں عورتوں کے واپس کرنے کی ممانعت کی گئی، پس صلح نامہ کا وہ عام مضمون اس حکم سے مخصوص اور منسوخ ہو گیا، اور اس کے ساتھ کچھ خاص احکام ایسی عورتوں کے بارے میں مقرر کئے گئے جو پہلے مسلمانوں کے نکاح میں تھیں مگر اسلام نہ لائیں اور مکہ ہی میں رہ گئیں، اور چونکہ ان احکام کا مدار آنے والی عورتوں کے مسلمان ہونے پر ہے، اس لئے طریق امتحان بھی بتلایا گیا، ان احکام کا خلاصہ آگے آرہا ہے اس سے قبل آیت کا خلاصہ تفسیر ملاحظہ فرمایئے۔

(عام خطاب کے ذریعہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:) اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں (دارالحرب سے) ہجرت کر کے آئیں (خواہ مدینہ میں آئیں جو کہ دارالاسلام ہے، یا حدیبیہ میں کیونکہ اسلامی لشکر کی قیام گاہ بھی دارالاسلام کے حکم میں ہے) تو تم ان (کے مسلمان ہونے) کا امتحان کر لیا کرو (جس کا طریقہ آگے خاص خطاب: یا یھا النبی میں آتا ہے اور اس امتحان میں ظاہری امتحان پر اکتفا کیا کرو، زیادہ کھود کرید نہ کرو،

کیونکہ) ان کے (حقیقی) ایمان کو (تو) اللہ ہی خوب جانتا ہے (تم کو تحقیق ہو ہی نہیں سکتی) پس اگر ان کو (اس امتحان کی رو سے) مسلمان سمجھو تو ان کو کفار کی طرف واپس مت کرو (کیونکہ) نہ تو وہ عورتیں ان کافروں کے لئے حلال ہیں، اور نہ وہ کافر ان عورتوں کے لئے حلال ہیں (کیونکہ مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے بالکل نہیں رہتا، یہ پہلا حکم ہوا) اور (اس صورت میں) ان کافروں نے جو کچھ (مہر کے بابت ان مسلمان ہونے والی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ ان کو ادا کرو (جیسا کہ تیسرے حکم میں آئے گا) اور تم کو ان عورتوں سے نکاح کرنے میں کچھ گناہ نہ ہوگا جبکہ تم ان کے مہر ان کو دے دو (خواہ ادا کر دو، یا اپنے ذمہ لازم کر لو، مطلب یہ ہے کہ مہر نکاح کے لیے لازم ہے، یہ مطلب نہیں کہ نکاح کا صحیح ہونا مہر ادا کرنے پر موقوف ہے، نکاح بغیر مہر مقرر کیے بھی صحیح ہوسکتا ہے مگر لازم ہر صورت میں ہوگا) اور (اے مسلمانو!) تم کافر عورتوں کے تعلقات کو باقی مت رکھو (یعنی جو تمہاری بیویاں دارالحرب میں کفر کی حالت میں رہ گئیں ان کا نکاح تم سے زائل ہوگیا، ان کے تعلقات کا کوئی اثر باقی مت سمجھو، جیسا کہ دوسرے حکم میں آئے گا) اور (اس صورت میں) جو کچھ تم نے (ان عورتوں کے مہر میں) خرچ کیا ہو (ان کافروں سے) مانگ لو (جیسا کہ چوتھے حکم میں آئے گا) اور (اسی طرح) جو کچھ ان کافروں نے (مہر کے بابت) خرچ کیا ہو وہ (تم سے) مانگ لیں (جیسا اوپر ارشاد ہوا ہے: وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا، کہ جو مہر کافروں نے خرچ کیا ہے وہ ان کو دے دو، دوبارہ اس حکم کو شاید اس لیے بیان فرمایا ہو کہ جو حق دوسروں کا تمہارے ذمہ ہو اس کو زیادہ ضروری سمجھو) یہ (جو کچھ کہا گیا) اللہ کا حکم ہے (اس کا اتباع کرو) وہ تمہارے درمیان (ایسا ہی مناسب) فیصلہ کرتا ہے اور اللہ بڑا علم اور حکمت والا ہے (علم و حکمت کے مناسب احکام مقرر فرماتا ہے)۔

ان احکام کا خلاصہ یہ ہے: ① جو عورت دارالحرب سے مسلمان ہوکر آئے اس کا نکاح کافر شوہر سے ٹوٹ جائے گا، اسی طرح جس کافر عورت کا شوہر مسلمان ہوجائے، اس کا نکاح بھی فوراً ٹوٹ جائے گا۔

② جو عورت مسلمان ہوکر آئے اس کا نکاح مسلمان مرد سے جائز ہے، اگر حاملہ ہے تو بچہ جننے کے بعد بالاتفاق، اور اگر حاملہ نہیں ہے تو امام صاحبؒ کے نزدیک بغیر عدت کے، اور صاحبینؒ کے نزدیک عدت کے بعد، اور جس کافر عورت کا شوہر مسلمان ہوجائے اس پر کسی کے نزدیک عدت نہیں، حتی کہ شوہر کو فوراً اس کی بہن وغیرہ سے جن کا نکاح عدت وغیرہ میں جائز نہیں ہوتا نکاح کرنا جائز ہے، اور یہ حکم اب بھی باقی ہے۔

③ مسلمان ہونے والی عورت کو کافر شوہر نے جس قدر مہر دیا ہو مسلمان وہ مہر اس شوہر کو واپس کر دیں، اگر کوئی خاص شخص نکاح کرے تو وہ واپس کرے ورنہ بیت المال سے واپس دیا جائے، یہ حکم صلح کی وجہ سے اسی وقت کے لیے خاص تھا تاکہ کافروں کو اشتعال نہ ہو جس سے صلح ٹوٹ جائے، اب یہ حکم باقی نہیں۔

④ اسی طرح جس کافر عورت کا شوہر مسلمان ہوجائے تو کافر اس کا مہر مسلمان شوہر کو ادا کریں، یہ حکم بھی اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص تھا۔

⑤ اگر کفار ایسی عورتوں کا مہر ان کے مسلمان شوہروں کو واپس نہ کریں تو جو مہر کفار کا مسلمانوں کی طرف آتا ہو وہ ان کفار کی جگہ ان مسلمان شوہروں کو دیا جائے، برابری کی صورت میں تو کچھ تکلیف ہی نہیں، اور کمی بیشی کی صورت میں یہ حکم تھا کہ جو کفار کا بچے وہ کفار کو دے دیا جائے اور جو اپنا رہے اس کا مطالبہ ان سے کیا جائے، اور یہ حکم بھی اسی واقعہ کے لیے مخصوص تھا، اور ان احکام کے اس واقعہ کے ساتھ مخصوص ہونے کی دلیل اجماع ہے، دوسرے یہ کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور جگہ یہ برتاؤ نہیں کیا۔

یہاں اگر یہ شبہ ہو کہ اس عام مضمون کو خاص کر دینے سے اس معاہدہ کا توڑنا لازم آتا ہے اور معاہدہ کا توڑنا تو جائز نہیں؟ جواب یہ ہے کہ معاہدہ کا توڑنا عذر اور دھوکہ سے جائز نہیں، اور بغیر عذر کے خود صلح ہی کا توڑنا جائز ہے، اور معاہدہ کی کسی خاص دفعہ کا توڑنا تو اس سے بھی آسان ہے، اور فریق ثانی کو اس میں مجبور نہیں کیا گیا، وہ اگر نہ مانتے تو بہت بہت صلح باقی نہ رہتی، اور پھر اس میں کوئی خرابی لازم نہیں آتی لیکن جب فریق ثانی نے بھی اس کو مان لیا تو اتفاق کے ساتھ صلح ہوگئی۔

فائدہ: ۱؎ یعنی دل کا حال تو اللہ ہی خوب جانتا ہے، لیکن ظاہری طور سے ان عورتوں کی جانچ کرلیا کرو، آیا واقعی وہ مسلمان ہیں اور محض اسلام کی خاطر وطن چھوڑ کر آئی ہیں، کوئی دنیاوی یا نفسانی غرض تو ہجرت کا سبب نہیں ہوا، بعض روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ ان کا امتحان کرتے تھے اور حضور ﷺ کی طرف سے ان سے بیعت لیتے تھے اور کبھی حضور ﷺ خود بہ نفس نفیس بیعت لیا کرتے تھے جو آگے: یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (الممتحنہ:۱۲) میں مذکور ہے۔

فائدہ: ۲؎ یہ حکم ہوا کہ زوجین میں اگر ایک مسلمان اور دوسرا مشرک ہو تو اختلاف دارین کے بعد تعلق نکاح قائم نہیں رہتا، پس اگر کسی کافر کی عورت مسلمان ہو کر ''دارالاسلام'' میں آجائے تو جو مسلمان اس سے نکاح کرے اس کے ذمہ ہے کہ اس کافر نے جتنا مہر عورت پر خرچ کیا تھا وہ اسے واپس کردے، اور اب عورت کا جو مہر قرار پائے وہ جدا اپنے ذمہ رکھے تب نکاح میں لاسکتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ پہلے حکم کے مقابل دوسری طرف یہ حکم ہوا کہ جس مسلمان کی عورت کافر رہ گئی ہے وہ اس کو چھوڑ دے، پھر جو کافر اس سے نکاح کرے اس مسلمان کا خرچ کیا ہوا مہر واپس کرے، اس طرح دونوں فریق ایک دوسرے سے اپنا حق طلب کرلیں، جب یہ حکم اترا تو مسلمان تیار ہوئے دینے کو بھی اور لینے کو بھی، لیکن کافروں نے دینا قبول نہ کیا، تب اگلی آیت نازل ہوئی۔

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَیْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ

اور اگر جاتی رہیں تمہارے ہاتھ سے کچھ عورتیں کافروں کی طرف پھر تم ہاتھ مارو تو دے دو ان کو جن کی عورتیں جاتی رہی ہیں

مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ⑪

جتنا انہوں نے خرچ کیا تھا، اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر تم کو یقین ہے

خلاصہ تفسیر: اور اگر تمہاری بیویوں میں سے کوئی بیوی کافروں میں رہ جانے سے (بالکل ہی) تمہارے ہاتھ نہ آئے (یعنی وہ نہ ملے اور نہ اس کا معاوضہ یعنی مہر ملے جو چوتھے حکم کے مطابق کافروں پر تمہارا حق تھا، اور) پھر (کافروں کو مہر دینے کی) تمہاری نوبت آئے (یعنی تیسرے حکم کے مطابق تمہارے ذمہ کسی کافر کا مہر ادا کرنا واجب ہو) تو (تم وہ مہر ان کافروں کو نہ دو، بلکہ) جن (مسلمانوں) کی بیویاں ہاتھ سے نکل گئیں (جن کا ابھی **فاتکم** میں ذکر ہوا) جتنا (مہر) انہوں نے (ان بیویوں پر) خرچ کیا تھا اس کے برابر (اس واجب الادا رقم میں سے) تم ان کو دے دو (یعنی اگر تمہاری طرف کافروں کا کچھ مہر آتا ہو تو وہ ان کو مت دو، بلکہ اس میں سے ان مسلمان شوہروں کا مہر ادا کردو جن کی بیویاں کفار کے پاس رہ گئی ہیں اور کفار نے ان کا مہر ان مسلمانوں کو نہیں دیا، جیسا کہ پیچھے پانچویں حکم میں گذرا) اور اللہ سے کہ جس پر تم ایمان رکھتے ہو ڈرتے رہو (اور احکام واجبہ میں خلل مت ڈالو)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس مسلمان کی عورت گئی اور کافر اس کا خرچ کیا ہوا نہیں پھیرتے تو جس کافر کی عورت مسلمان کے ہاں آئے اس کا جو خرچ دینا تھا اس کافر کو نہ دیں، بلکہ اسی مسلمان کو دیں جس کا حق مارا گیا ہے، ہاں! اس مسلمان کا حق دے کر جو بچ رہے وہ واپس کردیں، بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کافر کا خرچ کیا ہوا واپس نہیں کرسکتا تو بیت المال سے دیا جائے، اللہ اکبر! کس قدر عدل و انصاف کی تعلیم ہے، لیکن اس پر کاربند وہی ہوگا جس کے دل میں اللہ کا ڈر ہو اور اس پر ٹھیک ٹھیک ایمان رکھتا ہو۔

تنبیہ: **فَعَاقَبْتُمْ** کے دو ترجمے مترجم محقق نے کیے: ① ''پھر تم ہاتھ مارو'' اور ② ''پھر تمہاری باری آئے''۔

ہم نے دوسرے ترجمے کے لحاظ سے مطلب کی تقریر کی ہے، پہلے ترجمہ کے موافق بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد مال غنیمت کا حاصل ہونا ہے، یعنی مال غنیمت میں سے اس مسلمان کا خرچ کیا ہوا لوٹا یا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ

اے نبی جب آئیں تیرے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو اس بات پر کہ شریک نہ ٹھہرائیں اللہ کا کسی کو اور چوری نہ کریں

وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ

اور بدکاری نہ کریں اور اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں [1] اور طوفان نہ لائیں باندھ کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں [2]

وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑫

اور تیری نافرمانی نہ کریں کسے بھلے کام میں تو ان کو بیعت کر لے [3] اور معافی مانگ ان کے واسطے اللہ سے، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے [4]

خلاصہ تفسیر: (آگے حضور کو خطاب فرما کر ایمان کے امتحان کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ:) اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس (اس غرض سے) آئیں کہ آپ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ کوئی بہتان کی اولاد لائیں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (شوہر کے نطفہ سے جنی ہوئی اولاد ہونے کا دعویٰ کر کے) بنالیں (جیسا کہ جاہلیت میں بعض عورتوں کا دستور تھا کہ کسی غیر کا بچہ اٹھا لائیں اور کہہ دیا کہ میرے خاوند کا ہے، یا کسی سے بدکاری کی اور اس نطفہ حرام کو اپنے خاوند کا بتلا دیا کہ اس میں زنا کے گناہ کے علاوہ اپنے شوہر کے ساتھ غیر کے بچہ کو لاحق کرنا ہے جس پر حدیث میں بھی وعید آئی ہے) اور مشروع باتوں میں وہ آپ کے خلاف نہ کریں گی (اس میں سب احکام شرعیہ آ گئے، پس وہ عورتیں اگر ان شرطوں کو قبول کر لیں جن کا اعتقاد رکھنا ایمان کی شرط ہے اور عمل کے التزام سے ایمان کامل ہوتا ہے) تو آپ ان کو بیعت کر لیا کیجئے اور ان کے لئے اللہ سے (پچھلے گناہوں کی) مغفرت طلب کیا کیجئے، بیشک اللہ غفور رحیم ہے (مطلب یہ کہ جب ان احکام کے حق اور واجب العمل سمجھنے کا اظہار کریں تو ان کو مسلمان سمجھئے)۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ: بیعت کے اغراض و مقاصد کے بارے میں مذکورہ آیت واضح بیان ہے اور یہ سارے احکام مرد اور عورت دونوں میں مشترک ہیں، علاوہ ازیں اس آیت سے رسمی بیعت کا باطل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے جس میں عمل کا اہتمام ہی نہ ہو (صرف رسمی پیری مریدی ہوا کرتی ہے، ایسی بیعت فریب، دھوکہ اور نفع خوری کے سوا کچھ نہیں)۔

وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ: گذشتہ گناہوں کی مغفرت اگرچہ اسلام ہی سے ہو جاتی ہے مگر یہاں استغفار کا حکم حضور کو فرمانا یا تو اس لیے ہے تا کہ مغفرت کے آثار کامل طور پر مرتب ہوں، یا مطلب اس کا یہ ہے کہ ان کے ایمان قبول ہونے کی دعا کیجیے جس پر مغفرت موقوف ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد اور مرید کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ اسکا استاذ اور شیخ اس کی اصلاح و فلاح کے لیے دعا کیا کرے۔

* * *

فائدہ: [1] جیسا کہ جاہلیت میں رواج تھا کہ رسمی ننگ و عار کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے اور بعض اوقات فقر و فاقہ کے خوف سے لڑکوں کو بھی قتل کر ڈالتے تھے۔

فائدہ: [2] طوفان باندھنا ہاتھ پاؤں میں، یہ کہ کسی پر جھوٹا دعویٰ کریں یا جھوٹی گواہی دیں یا کسی معاملہ میں اپنی طرف سے بنا کر جھوٹی قسم کھائیں، اور ایک معنی یہ کہ بیٹا جنا ہو کسی اور سے اور منسوب کر دیں خاوند کی طرف، یا کسی دوسری عورت کی اولاد لے کر مکر و فریب سے اپنی طرف نسبت

کرلیں، حدیث میں ہے کہ جو کوئی ایک کا بیٹا دوسرے کی طرف لگائے جنت اس پر حرام ہے۔

فائدہ: ۳ پہلے فرمایا تھا کہ مسلمان عورتوں کی (جو ہجرت کر کے آئیں) جانچ کی جائے، یہاں بتلا دیا کہ ان کا جانچنا یہی ہے کہ جو احکام اس آیت میں ہیں وہ قبول کرلیں تو ان کا ایمان ثابت رکھو، یہ "آیت بیعت" کہلاتی ہے، حضرت کے پاس عورتیں بیعت کرتی تھیں تو یہی اقرار لیتے تھے لیکن بیعت کے وقت کبھی کسی عورت کے ہاتھ نے آپ کے ہاتھ کو مس نہیں کیا۔

فائدہ: ۴ یعنی ان امور میں جو کوتاہیاں پہلے ہو چکیں یا امتثال احکام میں آئندہ کچھ تقصیر رہ جائے اس کے لیے آپ ﷺ ان کے حق میں دعائے مغفرت فرمائیں، اللہ آپ ﷺ کی برکت سے ان کی تقصیر معاف فرمائے گا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَوَلَّوْا۟ قَوْمًا غَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا۟ مِنَ ٱلْءَاخِرَةِ كَمَا يَئِسَ

اے ایمان والو مت دوستی کرو ان لوگوں سے کہ غصہ ہوا ہے اللہ ان پر ۱ وہ آس توڑ چکے ہیں پچھلے گھر سے جیسے آس توڑی

ٱلْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْقُبُورِ ﴿١٣﴾ ع ۸

منکروں نے قبر والوں سے ۲

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں اور اس کے بعد مطلقاً کفار سے تعلقات رکھنے کا بیان تھا جس میں زیادہ مضامین مشرکوں کے متعلق تھے، چونکہ یہودی مدینہ میں بکثرت تھے، اس لیے اب سورت کے اختتام پر یہودیوں سے دوستی کی ممانعت فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! ان لوگوں سے (بھی) دوستی مت کرو جن پر اللہ تعالیٰ نے غضب فرمایا ہے (مراد اس سے یہود ہیں، جیسا کہ سورہ مائدہ میں ارشاد ہے: **من لعنه الله و غضب عليه الخ**) کہ وہ آخرت (کے خیر و ثواب) سے ایسے ناامید ہو گئے ہیں جیسا کفار جو قبروں میں (مدفون) ہیں (آخرت کے خیر و ثواب سے) ناامید ہیں۔

لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ: چونکہ کافر کو مرنے کے بعد آخرت کا معائنہ ہو جاتا ہے اس لیے وہ حقیقت پر یقین کے ساتھ مطلع ہو کر جان لیتا ہے کہ اب میری ہرگز بخشش نہ ہوگی، اور یہود چونکہ آپ کی نبوت کو اور اسی طرح مخالف رسول کے کافر ہونے اور نجات نہ پانے کو خوب جانتے تھے اگرچہ حسد اور عار کی وجہ سے اتباع نہ کرتے تھے جیسا کہ آیت: **يعرفونه كما يعرفون ابنآء هم** میں مذکور ہے، اس لیے ان کو دل سے یقین تھا کہ ہماری نجات نہ ہوگی، اگرچہ شیخی کے مارے بظاہر اس کے خلاف کہتے تھے، پس حاصل یہ ہوا کہ جن کی گمراہی ایسی مسلم ہے کہ وہ خود بھی دل سے اس کو تسلیم کرتے ہیں تو ایسے گمراہوں سے تعلق رکھنا کیا ضروری ہے، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جو اشد درجہ گمراہ نہ ہو تو اس کے ساتھ دوستی جائز ہے، دوستی کا تعلق اگرچہ ہر کافر کے ساتھ ناجائز ہے اگرچہ اس درجہ کا گمراہ نہ ہو، مگر ایسوں کے ساتھ دوستی کرنا اور بھی سخت بری بات ہے، اور خاص یہود کا ذکر اس جگہ شاید اس لیے ہو کہ وہ مدینہ میں زیادہ آباد تھے دوسرے وہ لوگ شریر اور فسادی بھی بہت تھے۔

* * *

فائدہ: ۱ شروع سورت میں جو مضمون تھا، خاتمہ پر پھر یاد دلا دیا، یعنی مومن کی شان نہیں کہ جس پر خدا ناراض ہو اس سے دوستی اور رفاقت کا معاملہ کرے، جس پر خدا کا غصہ ہو، خدا کے دوستوں کا بھی غصہ ہونا چاہیے۔

فائدہ: ۲ یعنی منکروں کو توقع نہیں کہ قبر سے کوئی اٹھے گا اور پھر دوسری زندگی میں ایک دوسرے سے ملیں گے، یہ کافر بھی ویسے ناامید ہیں۔

تنبیہ: بعض مفسرین کے نزدیک **من اصحب القبور** "کفار" کا بیان ہے، یعنی جس طرح کافر جو قبر میں پہنچ چکے وہاں کا حال دیکھ کر اللہ کی مہربانی اور خوشنودی سے بالکلیہ مایوس ہو چکے ہیں اسی طرح یہ کافر بھی آخرت کی طرف سے مایوس ہیں۔

ایاتھا ۱۴ ۶۱ سُوْرَۃُ الصَّفِّ مَدَنِیَّۃٌ ۱۰۹ رکوعاتھا ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں کفار سے دوستی نہ رکھنے کا ذکر تھا، اس سورت میں کفار سے قتال کا ذکر ہے اور کچھ مضمون اس کے تابع ہو کر بیان کیے گئے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور وہی ہے زبردست حکمت والا، اے ایمان والو کیوں

تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

کہتے ہو منہ سے جو نہیں کرتے، بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو، اللہ چاہتا ہے

الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④

ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی ۔ا

خلاصہ تفسیر: سب چیزیں اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں (زبان سے یا حال سے) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں اور وہی زبردست حکمت والا ہے (پس جو ایسا باعظمت وشان ہو اس کی اطاعت ہر حکم میں ضروری ہے، جن میں سے ایک حکم جہاد کا ہے، جو اس سورت میں مذکور ہے، جس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ایک بار بعض مسلمانوں نے باہم تذکرہ کیا کہ اگر ہم کو کوئی ایسا عمل معلوم ہو جو حق تعالیٰ کے نزدیک نہایت محبوب ہے تو ہم اس کو اپنے عمل میں لائیں اور اس سے قبل جنگ احد میں بعض جہاد سے بھاگ چکے تھے جس کا قصہ سورۃ آل عمران میں ہے اور نیز جہاد کا حکم نازل ہونے کے وقت بعض کو وہ حکم گراں گزرا تھا، جس کا قصہ سورۃ نساء میں ہے، اس پر یہ ارشاد نازل ہوا:) اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناراضی کی ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں، اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو (خاص طور پر) پسند کرتا ہے جو اس کے راستہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک عمارت ہے جس میں سیسہ پلایا گیا ہے (یعنی جس طرح یہ عمارت مضبوط، مستحکم اور ناقابل شکست ہوتی ہے، اسی طرح وہ مجاہدین دشمن کے مقابلہ سے ہٹتے نہیں)۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ: مطلب یہ ہوا کہ تم جو کہتے ہو کہ ہمیں وہ کام معلوم ہوتا جو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہے تو یہ عمل تو جہاد ہے پھر اس کا حکم نازل ہونے کے وقت گرانی کیوں ہوئی تھی اور احد میں کیوں بھاگ گئے تھے؟! ان تمام باتوں کے پیش نظر ہوتے ہوئے ایسے دعویٰ کی باتیں کرنا نہایت نازیبا اور خدا کو ناپسند ہیں، یہاں دعویٰ کرنے پر دھمکی ہے، اس سے وعظ بے عمل کی ممانعت لازم نہیں آتی، وعظ بے عمل اس کے مفہوم سے خارج ہے۔

مذکورہ تفسیر سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان آیات کا تعلق دعوے سے ہے کہ جو کام آدمی کو کرنا نہیں ہے اس کا دعویٰ کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے، رہا معاملہ دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کا کہ جو کام آدمی خود نہیں کرتا اس کی نصیحت دوسروں کو کرے اور اس کی طرف دوسرے مسلمانوں کو دعوت دے، وہ اس آیت کے مفہوم میں تو شامل نہیں، اس کے احکام دوسری آیات اور احادیث میں مذکور ہیں، مثلاً قرآن کریم نے فرمایا: **اتامرون الناس بالبر و**

تنسون انفسکم، یعنی تم لوگوں کو تو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو کہ خود اس نیکی پر عمل نہیں کرتے، اس آیت نے امر بالمعروف اور وعظ ونصیحت کرنے والوں کو اس بات پر شرمندہ کیا ہے کہ لوگوں کو ایک نیک کام کی دعوت دو اور خود اس پر عمل نہ کرو اور مقصد یہ ہے کہ جب دوسروں کو نصیحت کرتے ہو تو خود اپنے آپ کو نصیحت کرنا اس سے مقدم ہے جس کام کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو خود بھی اس پر عمل کرو۔

لیکن یہ نہیں فرمایا کہ جب خود نہیں کرتے تو دوسروں کو کہنا بھی چھوڑ دو، اس سے معلوم ہوا کہ جس نیک کام کے خود کرنے کی ہمت وتوفیق نہیں ہے اس کی طرف دوسروں کو بلانے اور نصیحت کرنے کا سلسلہ نہ چھوڑے، امید ہے کہ اس وعظ ونصیحت کی برکت سے کسی وقت اس کو بھی عمل کی توفیق ہوجائے، جیسا کہ بکثرت تجربہ ومشاہدہ میں آیا ہے، البتہ اگر وہ عمل واجب یا سنت مؤکدہ کے درجہ میں ہو تو آیات مذکورہ پر نظر کر کے اپنے نفس میں نادم وشرمندہ ہونے کا سلسلہ جاری رکھنا بھی واجب ہے اور اگر مستحبات کے متعلق ہے تو یہ سلسلہ ندامت بھی مستحب ہے۔

* * * *

فائدہ: ۱؎ بندہ کو لاف زنی اور دعوے کی بات سے ڈرنا چاہیے کہ پیچھے مشکل پڑتی ہے، زبان سے ایک بات کہہ دینا آسان ہے، لیکن اس کا نباہنا آسان نہیں، اللہ تعالیٰ اس شخص سے سخت ناراض اور بیزار ہوتا ہے جو زبان سے کہے بہت کچھ اور کرے کچھ نہیں، روایات میں ہے کہ ایک جگہ مسلمان جمع تھے، کہنے لگے ہم کو اگر معلوم ہوجائے کہ کون سا کام اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے تو وہ ہی اختیار کریں، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، یعنی دیکھو! سنبھل کر کہو، لو! ہم بتلائے دیتے ہیں کہ اللہ کو سب سے زیادہ ان لوگوں سے محبت ہے جو اللہ کی راہ میں اس کے دشمنوں کے مقابلہ پر ایک آہنی دیوار کی طرح ڈٹ جاتے ہیں اور میدان جنگ میں اس شان سے صف آرائی کرتے ہیں کہ گویا وہ سب مل کر ایک مضبوط دیوار ہیں جس میں سیسہ پلا دیا گیا ہے، اور جس میں کسی جگہ کوئی رخنہ نہیں پڑسکتا، اب اس معیار پر اپنے کو پرکھ لو، بیشک تم میں بہت ایسے ہیں جو اس معیار پر کامل واکمل اتر چکے ہیں، مگر بعض مواقع ایسے بھی نکلیں گے جہاں بعضوں کے زبانی دعوؤں کی ان کے عمل نے تکذیب کی ہے آخر جنگ احد میں وہ بنیان مرصوص کہاں قائم رہی، اور جس وقت حکم قتال اترا تو یقیناً بعض نے یہ بھی کہا: رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (النساء:۷۷)

بہر حال زبان سے زیادہ دعوے مت کرو بلکہ خدا کی راہ میں قربانی پیش کرو جس سے اعلیٰ کامیابی نصیب ہو، موسیٰ کی قوم کو نہیں دیکھتے کہ زبان سے تعلّی وتفاخر کی باتیں، بہت بڑھ چڑھ کر بناتے تھے لیکن عمل کے میدان میں صفر تھا، جہاں کوئی موقع کام کا آیا فوراً پھسل گئے اور نہایت تکلیف دہ باتیں کرنے لگے، نتیجہ جو کچھ ہوا اس کو آگے بیان فرماتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم میری کیوں ستاتے ہو مجھ کو اور تم کو معلوم ہے کہ میں اللہ کا بھیجا آیا ہوں تمہارے پاس ۱؎

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

پھر جب وہ پھر گئے تو پھیر دیے اللہ نے ان کے دل، اور اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے بتلاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب، مخالفت اور ایذا رسانی کی وجہ سے کفار قتل وقتال کے مستحق ہیں، اور اسی مناسبت سے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کا قصہ ذکر فرماتے ہیں:

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جبکہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ کو کیوں ایذا پہنچاتے ہو حالانکہ تم کو معلوم ہے کہ میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں (وہ ایذائیں مختلف طور پر تھیں جن میں سے بعض بعض قرآن مجید میں بھی خصوصاً سورۃ بقرہ میں مذکور ہیں اور حاصل ان سب کا سرکشی اور مخالفت ہے) پھر جب (اس سمجھانے پر بھی) وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے (اور سیدھے رستہ پر نہ آئے) تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اور (زیادہ) ٹیڑھا کر دیا (یعنی مخالفت اور نافرمانی کا مادہ اور زیادہ بڑھ گیا جیسا کہ قاعدہ ہے کہ ہمیشہ گناہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف قلب کا

میلان اور اس کی اطاعت کا جذبہ کم ہوتا چلا جاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ (کا معمول ہے کہ وہ) ایسے نافرمانوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا (اسی طرح یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو مخالفت سے ایذائیں پہنچاتے ہیں، اس لئے ان کا ٹیڑھا پن اور فسق زیادہ ہوتا جاتا ہے کہ اصلاح کی امید نہیں رہی، پس ان کا فساد مٹانے کے لئے قتال کا حکم دینا ہی مصلحت ہوا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی روشن دلائل اور کھلے کھلے معجزات دیکھ کر تم دل میں یقین رکھتے ہو کہ میں اللہ کا سچا پیغمبر ہوں، پھر سخت نازیبا اور رنجیدہ حرکتیں کر کے مجھے کیوں ستاتے ہو، یہ معاملہ تو کسی معمولی ناصح اور خیر خواہ کے ساتھ بھی نہ ہونا چاہیے، چہ جائیکہ ایک اللہ کے رسول کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو، کیا میرے دل کو تمہاری ان گستاخانہ حرکات سے دکھ نہیں پہنچتا کہ کبھی بے جان بچھڑا بنا کر پوجنے لگے اور اس کو اپنا اور موسیٰ کا خدا بتلانے لگے، کبھی ''عمالقہ'' پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تو کہنے لگے ہم تو کبھی نہیں جائیں گے، تم اور تمہارا خدا جا کر لڑ لو، ہم یہاں بیٹھے ہیں، وغیر ذلک من الخرافات، چنانچہ اسی سے تنگ ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَاَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَبَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ (المائدہ:۲۵)۔

فائدہ: ۲؎ بدی کرتے کرتے قاعدہ ہے کہ دل سخت اور سیاہ ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ نیکی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، یہی حال ان کا ہوا، جب ہر بات میں رسول سے ضد ہی کرتے رہے اور برابر ٹیڑھی چال چلتے رہے تو آخر مردود ہوئے، اور اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا کہ سیدھی بات قبول کرنے کی صلاحیت نہ رہی، ایسے ضدی نافرمانوں کے ساتھ اللہ کی یہی عادت ہے۔

وَاِذۡ قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ

اور جب کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے اے بنی اسرائیل میں بھیجا ہوا آیا ہوں اللہ کا تمہارے پاس یقین کرنے والا اس پر جو مجھ سے آگے ہے

مِنَ التَّوۡرٰىۃِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ

تورات ۱؎ اور خوشخبری سنانے والا ایک رسول کی جو آئے گا میرے بعد اس کا نام ہے احمد ۲؎ پھر جب آیا ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر

قَالُوۡا ہٰذَا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۶﴾

کہنے لگے یہ جادو ہے صریح ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (اسی طرح وہ وقت بھی قابل تذکرہ ہے) جبکہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے (ارشاد) فرمایا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو توراۃ (آچکی) ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور میرے بعد جو ایک رسول آنے والے ہیں جن کا نام (مبارک) احمد ہوگا میں ان کی بشارت دینے والا ہوں (اور اس بشارت کا عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہونا خود اہل کتاب کے بیان سے حدیثوں میں ثابت ہے، غرض عیسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا) پھر جب (یہ تمام مضامین ارشاد فرما کر اپنی نبوت کے اثبات کے لئے) وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان لوگوں کے پاس کھلی دلیلیں لائے تو وہ لوگ (ان دلائل یعنی معجزات کے بارے میں) کہنے لگے کہ یہ صریح جادو ہے (اور جادو بتا کر نبوت کی تکذیب کی، جیسا کہ سورہ مائدۃ میں ہے: واذ کففتُ بنی اسرآئیل عنك اذ جئتھم بالبینٰت الخ، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے بعد پھر رسول اللہ ﷺ کے دور رسالت میں اس وقت کے کافروں نے آپ کی تکذیب و مخالفت کی اور یہی بڑا ظلم ہے، پس اس ظلم کو روکنے کے لئے قتال کا حکم دینا مصلحت ہوا)۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرٰىۃِ: احقر کے نزدیک مطلب اس سے اپنی شریعت کے احکام اور اس کے باقی رہنے کی مدت بتلانا

ہے، یعنی میری شریعت تو تورات کے احکام ہیں، بجز بعض احکام کے جو عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے منسوخ ہو گئے تھے جیسا کہ: **واحل لکم بعض الذی حرم علیکم** سے معلوم ہوتا ہے اور حضور کی بشارت دینے سے اپنی شریعت کے بقاء کی غایت بتلادی کہ جو رسول میرے بعد آئیں گے ان کے آنے تک میری شریعت رہے گی، اور چونکہ وہ رسول مستقل ہیں جیسا کہ خود عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے اس لیے ان کا پہلی شریعتوں کو منسوخ کر دینا بھی ضروری ہے اور مقصود اس کے بتلانے سے اپنی امت کی ہدایت مکمل کرنا ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو کہ اس وقت مجھ پر ایمان لا کر پھر اس رسول کا انکار کر کے کافر ہو جائیں۔

وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ يَّاۡتِىۡ مِنۡۢ بَعۡدِى اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ: عیسیٰ علیہ السلام سے اس بشارت کا منقول ہونا خود اہل کتاب کے بیان سے حدیثوں میں ثابت ہے، چنانچہ ابوداود کی روایت میں نجاشی بادشاہ حبشہ کا جو کہ نصاریٰ کے عالم بھی تھے، یہ قول آیا ہے کہ ''واقعی آپ ہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی'' اور ترمذی میں عبداللہ بن سلام کا قول آیا ہے جو کہ علماء یہود میں سے تھے کہ ''تورات میں رسول اللہ ﷺ کی صفت لکھی ہے اور یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام آپ کے ساتھ مدفون ہوں گے'' اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام تورات کے مبلغ تھے، اس لئے توراۃ میں اس بشارت کا ہونا نیز عیسیٰ علیہ السلام سے منقول کہا جائے گا، اور مولانا رحمت اللہ صاحب نے ''اظہار الحق'' میں خود توراۃ کے موجودہ نسخوں سے متعدد بشارتیں نقل کی ہیں جلد دوم صفحہ 164 مطبوعہ قسطنطنیہ، اور موجودہ انجیلوں میں ان مضامین کا نہ ہونا اس لیے مضر نہیں کہ محققین کے نزدیک انجیلوں کے نسخے محفوظ نہیں رہے، مگر تاہم جو کچھ موجود ہیں ان میں بھی اس قسم کا مضمون موجود ہے، چنانچہ یوحنا کی انجیل مترجم عربی مطبوعہ لندن سن 1831ء وسن 1833ء کے چودہویں باب میں ہے کہ ''تمہارے لئے میرا جانا ہی بہتر ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے، پس اگر میں جاؤں تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا'' فارقلیط احمد کا ترجمہ ہے، اہل کتاب کی عادت ہے کہ وہ ناموں کا بھی ترجمہ کر دیتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام نے عبرانی میں احمد فرمایا تھا، جب یونانی میں ترجمہ ہوا تو بیرکلوطوس لکھ دیا جس کے معنی ہیں ''احمد'' یعنی بہت سراہا گیا، بہت حمد کرنے والا، پھر جب یونانی سے عبرانی میں ترجمہ کیا تو اس کو فارقلیط کر دیا اور بعض عبرانی نسخوں میں اب تک نام مبارک احمد موجود ہے، دیکھو پادری پار کہرست کی یہ عبارت دبادحمہ خل ہکوٹیم از حمایت الاسلام مطبوعہ بریلی سن 1873ء ص 8481 ترجمہ ایالوجی گاڈفری ہینگنس مطبوعہ لندن سن 1829ء، اور اس فارقلیط کی نسبت اس انجیل یوحنا میں یہ الفاظ ہیں: ''وہ تمہیں سب چیزیں سکھادے گا''، ''اس جہاں کا سردار آتا ہے''، ''وہ آکر دنیا کو گناہ پر اور راستی اور عدالت (کے خلاف) پر سزا دے گا''، یہ ہیں وہ الفاظ جو نبی مستقل ہونے پر دال ہیں اور اس مقام کی پوری بحث تفسیر حقانی میں ہے اس کا ایک تھوڑا حصہ یہاں نقل کیا گیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اصل تورات کے من اللہ ہونے کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کے احکام و اخبار پر یقین رکھتا ہوں اور جو کچھ میری تعلیم ہے فی الحقیقت ان ہی اصول کے ماتحت ہے جو تورات میں بتلائے گئے تھے۔

تنبیہ: ابن کثیرؒ وغیرہ نے: **مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ** کا مطلب یہ لیا ہے کہ میرا وجود تورات کی باتوں کی تصدیق کرتا ہے، کیونکہ میں ان چیزوں کا مصداق بن کر آیا ہوں جن کی خبر تورات شریف میں دی گئی تھی، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی پچھلے کی تصدیق کرتا ہوں اور اگلے کی بشارت سناتا ہوں، یوں تو دوسرے انبیاء سابقین بھی خاتم الانبیاء ﷺ کی تشریف آوری کا مژدہ برابر سناتے آئے ہیں، لیکن جس صراحت و وضاحت اور اہتمام کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام نے آپ ﷺ کی آمد کی خوشخبری دی وہ کسی اور سے منقول نہیں، شاید قریب عہد کی بناء پر یہ خصوصیت انکے حصہ میں آئی ہوگی، کیونکہ انکے بعد نبی آخر الزمان کے سوا کوئی دوسرا نبی آنے والا نہ تھا۔

یہ سچ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی مجرمانہ غفلت اور معتمدانہ دستبرد نے آج دنیا کے ہاتھوں میں اصل تورات و انجیل وغیرہ کا کوئی صحیح نسخہ باقی نہیں چھوڑا جس سے ہم کو ٹھیک پتہ لگ سکتا کہ انبیائے سابقین خصوصاً مسیح علیٰ نبینا وعلیہ السلام نے خاتم الانبیاء ﷺ کی نسبت کن الفاظ میں اور کس عنوان سے بشارت دی تھی، اور اسی لیے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ قرآن کریم کے صاف و صریح بیان کو اس تحریف شدہ بائبل میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے

جھٹلانے لگے، تاہم یہ بھی خاتم الانبیاء ﷺ کا معجزہ سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے محرفین کو اس قدر قدرت نہیں دی کہ وہ اس کے آخری پیغمبر کے مطلق تمام پیشین گوئیوں کو بالکلیہ محو کر دیں کہ ان کا کچھ نشان باقی نہ رہے۔

موجودہ بائبل میں بھی بیسیوں مواضع ہیں جہاں آنحضرت ﷺ کا ذکر قریب تصریح کے موجود ہے اور عقل و انصاف والوں کے لیے اس میں تاویل و انکار کی قطعاً گنجائش نہیں، اور انجیل یوحنا میں تو فارقلیط (یا پیرکلوطوس) والی بشارت اتنی صاف ہے کہ اس کا بے تکلف مطلب بجز احمد (بمعنی محمود و ستودہ) کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا، چنانچہ بعض علمائے اہل کتاب کو بھی ناگزیر اس کا اعتراف یا نیم اقرار کرنا پڑا ہے کہ اس پیشین گوئی کا انطباق پوری طرح نہ روح القدس پر اور نہ بجز سرور دو عالم ﷺ کسی اور پر ہوسکتا ہے، علمائے اسلام نے بحمد اللہ بشارات پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور تفسیر حقانی کے مولف فاضل نے ''فارقلیط'' والی بشارت اور تحریف بائبل پر سورۂ صف کی تفسیر میں نہایت مشبع بحث کی ہے، اللہ جزائے خیر دے۔

فائدہ: ۳ یعنی حضرت مسیح کھلی نشانیاں لے کر آئے یا جن کی بشارت دی تھی حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفے ﷺ وہ کھلے نشان لے کر آئے تو لوگ اسے جادو بتلانے لگے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَھُوَ یُدْعٰۤی اِلَی الْاِسْلَامِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی

اور اس سے زیادہ بے انصاف کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ اور اس کو بلاتے ہیں مسلمان ہونے کو ۱ اور اللہ راہ نہیں دیتا

الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۷

بے انصاف لوگوں کو ۲

خلاصہ تفسیر: اور (واقعی) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، حالانکہ وہ اسلام کی طرف بلایا جاتا ہو اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیا کرتا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ: اللہ پر جھوٹ باندھنا یہ ہے کہ نبوت کو جھٹلایا، کیونکہ ثابت شدہ بات کا انکار کرنا اور جو ثابت نہ ہو اس کو ثابت کرنا دونوں میں خدا پر جھوٹ باندھنا ہے۔

وَھُوَ یُدْعٰۤی اِلَی الْاِسْلَامِ: یہاں وھو یدعی اس لیے بڑھایا تاکہ زیادہ قباحت ظاہر ہو کہ نہ تو خود متنبہ ہوا، نہ دوسرے کی تنبیہ کرنے سے متنبہ ہوا۔

وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ: یہاں واللہ لا یھدی اس لئے بڑھایا کہ ان کی موجودہ حالت اصلاح سے بہت دور ہوگئی اس لئے قتال کی سزا ہی تجویز کیا جانا بہتر ہے، چنانچہ جس کو اب بھی اسلام کی خبر نہ پہنچی ہو تو پہلے اس کو اسلام کی طرف دعوت دینی چاہیے، جب اس سے انکار کرے جو کہ بظاہر ناامیدی کی علامت ہے تب جہاد جائز ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جب مسلمان ہونے کو کہا جاتا ہے تو حق کو چھپا کر اور جھوٹی باتیں بنا کر حضور ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کر دیتے ہیں، وہ خدا کو بشر یا بشر کو خدا بنانے کا جھوٹ تو ایک طرف رہا، کتب سماویہ میں تحریف کر کے جو چیزیں واقعی موجود تھیں ان کا انکار کرتے اور جو نہیں تھیں ان کو درج کرتے ہیں، اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی ایسے بے انصافوں کو ہدایت کہاں نصیب ہوتی ہے اور ممکن ہے لا یھدی میں ادھر بھی اشارہ ہو کہ یہ ظالم کتنا ہی انکار اور تحریف و تاویل کریں، خدا ان کو کامیابی کی راہ نہ دے گا، گویا حضور ﷺ کے متعلق جن خبروں کو وہ چھپانا یا مٹانا چاہتے ہیں، چھپ یا مٹ نہ سکیں گی، چنانچہ باوجود ہزاروں طرح کی قطع و برید کے آج بھی نبی آخر الزمان ﷺ کی نسبت بشارات کا ایک کثیر ذخیرہ موجود ہے۔

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۸ هُوَ الَّذِيْٓ
چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کی روشنی اپنے منہ سے اور اللہ کو پوری کرنی ہے اپنی روشنی اور پڑے برا مانیں منکر ۱؎ وہی ہے جس نے
اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۝۹ ع
بھیجا اپنا رسول راہ کی سوجھ دے کر اور سچا دین کہ اس کو اوپر کرے سب دینوں سے اور پڑے برا مانیں شرک کرنے والے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے جہاد کی ترغیب کے لیے نصرت اور غلبہ کا حق کا وعدہ اور باطل کے مغلوب ہونے کا وعدہ ہے۔

یہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں (یعنی عملی تدبیر کے ساتھ منہ سے بھی تردید و اعتراض کی باتیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ دین حق کو فروغ نہ ہو، اور بعض اوقات زبانی شبہات موثر ہو جاتے ہیں، یا یہ تمثیل ہے کہ ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی منہ سے نور الٰہی کو بجھانا چاہتا ہو یعنی ایسے طریقہ سے بجھائے جس میں ناکام رہے) حالانکہ اللہ اپنے نور (مذکور یعنی دین اسلام) کو کمال تک پہنچا کر رہے گا اگرچہ کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے جس نے (اسی اتمام نور کے لئے) اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو (جو کہ نور ہے) تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کر دے (کہ یہی اتمام ہے) اگرچہ مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ: ایسی ہی ایک آیت سورہ براءت میں گذر چکی ہے، چنانچہ دین اسلام کو کمال تک پہنچانے کی چند صورتیں سورہ براءت آیت ۳۲: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ میں گذر چکی ہیں وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی منکر پڑے برا مانا کریں اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، مشیت الٰہی کے خلاف کوئی کوشش کرنا ایسا ہے جیسے کوئی احمق نور آفتاب کو منہ سے پھونک مار کر بجھانا چاہے، یہی حال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کا اور ان کی کوششوں کا ہے۔

تنبیہ: شاید بِاَفْوَاهِهِمْ کے لفظ سے یہاں اس طرف بھی اشارہ کرنا ہو کہ بشارات کے انکار و اخفاء کے لیے جو جھوٹی باتیں بناتے ہیں وہ کامیاب ہونے والی نہیں، ہزار کوشش کریں کہ ''فارقلیط'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں، لیکن اللہ منوا کر چھوڑے گا کہ اس کا مصداق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

فائدہ: ۲؎ اس آیت پر سورۃ براۃ کے فوائد میں کلام ہو چکا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
اے ایمان والو میں بتلاؤں تم کو ایسی سوداگری جو بچائے تم کو ایک عذاب دردناک سے، ایمان لاؤ اللہ پر
وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
اور اس کے رسول پر اور لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور اپنی جان سے، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم
تَعْلَمُوْنَ۝۱۱ۙ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً
سمجھ رکھتے ہو، بخشے گا وہ تمہارے گناہ اور داخل کرے گا تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ۱؎ اور ستھرے گھروں میں

فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾

بسنے کے باغوں کے اندر ۲ یہ ہے بڑی مراد ملنی

خلاصہ تفسیر: آگے اول جہاد کا ثمرہ و پھل آخرت میں اور پھر دنیوی ثمرہ و پھل کا وعدہ کر کے ترغیب دیتے ہیں کہ:

اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی سوداگری بتلاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے (وہ یہ ہے کہ) تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو (جب ایسا کرو گے تو) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں (داخل کرے گا) جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں (بنے) ہوں گے یہ بڑی کامیابی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس دین کو تمام ادیان پر غالب کرنا تو اللہ کا کام ہے، لیکن تمہارا فرض یہ ہے کہ ایمان پر پوری طرح مستقیم رہ کر اس کے راستہ میں جان و مال سے جہاد کرو، یہ سوداگری ہے جس میں کبھی خسارہ نہیں، دنیا میں لوگ سینکڑوں طرح کے بیوپار اور تجارتیں کرتے ہیں اور اپنا کل سرمایہ اس میں لگا دیتے ہیں محض اس امید پر کہ اس سے منافع حاصل ہوں گے اور اس طرح راس المال گھٹنے اور تلف ہونے سے بچ جائے گا، پھر وہ بذات خود اور اس کے اہل و عیال تنگدستی و افلاس کی تلخیوں سے محفوظ رہیں گے، لیکن مومنین اپنے جان و مال کا سرمایہ اس اعلیٰ تجارت میں لگائیں گے تو صرف چند روز افلاس سے نہیں، بلکہ آخرت کے دردناک عذاب اور تباہ کن خسارہ سے مامون ہو جائیں گے، اگر مسلمان سمجھے تو یہ تجارت دنیا کی سب تجارتوں سے بہتر ہے، جس کا نفع کامل مغفرت اور دائمی جنت کی صورت میں ملے گا، جس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی وہ ستھرے مکانات ان باغوں کے اندر ہوں گے جن میں مومنین کو آباد ہونا ہے، یہ تو آخرت کی کامیابی رہی، آگے دنیا کی اعلیٰ اور انتہائی کامیابی کا ذکر ہے۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

اور ایک اور چیز دے جس کو تم چاہتے ہو مدد اللہ کی طرف سے اور فتح جلدی ۱ اور خوشی سنا دے ایمان والوں کو ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اس اخروی حقیقی پھل کے علاوہ) ایک اور ثمرہ (دنیوی) بھی ہے کہ تم اس کو (بھی خاص طور پر) پسند کرتے ہو (یعنی) اللہ کی طرف سے مدد اور جلدی فتح یابی ہے (جلد فتح یابی کا خاص طور پر محبوب ہونا اس لئے ہے کہ انسان طبعی اور فطری پر نتیجہ اور پھل جلدی بھی چاہتا ہے) اور (اے پیغمبر ﷺ) آپ (ان تمام باتوں کی) مومنین کو بشارت دے دیجئے (چنانچہ فتح و نصرت کی پیشین گوئی کا ظہور اسلامی فتوحات سے ظاہر ہے)۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ: چونکہ اس نصرت اور غلبہ کا پسندیدہ ہونا دین کی مدد کے لیے تھا تو اس سے معلوم ہوا کہ جس دنیا سے دین کو تقویت ملے تو ایسی طلب مذموم نہیں، اس کو طلب کیا جا سکتا ہے، البتہ وہ دنیا طلبی مذموم ہے جس سے دین کو نقصان پہنچتا ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اصل اور بڑی کامیابی تو وہ ہی ہے جو آخرت میں ملے گی جس کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت کوئی چیز نہیں لیکن دنیا میں بھی ایک چیز جسے تم طبعاً محبوب رکھتے ہو، دی جائے گی وہ کیا ہے: نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (اللہ کی طرف سے ایک مخصوص امداد اور جلد حاصل ہونے والی فتح و ظفر، جن میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ دامن کا تعلق رکھتی ہے) دنیا نے دیکھ لیا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے ساتھ یہ وعدہ کیسی صفائی سے پورا ہوا اور آج بھی مسلم قوم اگر سچے معنی میں ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ پر ثابت قدم ہو جائے تو یہ ہی

کامیابی ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہے۔

فائدہ: ۲ کیونکہ یہ خوشخبری سنانا ایک مستقل انعام ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ

اے ایمان والو تم ہوجاؤ مددگار اللہ کے ۱ جیسے کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے اپنے یاروں کو کون ہے کہ مدد کرے میری

اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ

اللہ کی راہ میں، بولے یار ہم ہیں مددگار اللہ کے ۲ پھر ایمان لایا ایک فرقہ بنی اسرائیل سے اور منکر ہوا

طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ۠ ﴿۱۴﴾ ع۲

ایک فرقہ، پھر قوت دی ہم نے ان کو جو ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں پر پھر ہو رہے غالب ۳

خلاصہ تفسیر: اب آگے اصحاب عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ یاد دلا کر نصرت دین کی ترغیب دیتے ہیں کہ:

اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ (اس طریقہ سے جو تمہارے لئے مقرر ہے یعنی جہاد) جیسا کہ (حواریین اپنی شریعت کے مطابق دین کے حامی ہوئے تھے جبکہ اس وقت لوگ کثرت سے عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن اور مخالف تھے، اور جبکہ) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے (ان) حواریین سے فرمایا کہ اللہ کے واسطے میرا کون مددگار ہوتا ہے، وہ حواری بولے ہم اللہ (کے دین) کے مددگار ہیں (چنانچہ ان حواریین نے دین کی یہ مدد کی کہ اس کی اشاعت میں کوشش کی) سو (اس کوشش کے بعد) بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگ منکر رہے (پھر عیسائیوں میں باہم مذہبی اختلاف سے عداوت اور خانہ جنگیاں ہوئیں یا مذہبی گفتگو ہوئی) سو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی سو وہ غالب ہو گئے (اسی طرح تم دین محمدی کے لئے کوشش اور جہاد کرو، اور اگر ان خانہ جنگیوں کی ابتداء کفار کی طرف سے ہو تو اس سے دین عیسوی میں جہاد کا ہونا لازم نہیں آتا)۔

حواریین اور عموم بعثت کے متعلق ایک شبہ کا جواب سورہ آل عمران آیت ۵۲: فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ کی تفسیر میں گذر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس کے دین اور اس کے پیغمبر کے مددگار بن جاؤ، اس حکم کی تعمیل خدا کے فضل و توفیق سے مسلمانوں نے ایسی کی کہ ان میں سے ایک جماعت کا تو نام ہی "انصار" پڑ گیا۔

فائدہ: ۲ "حواریین" (یاران مسیح) تھوڑے سے گنے چنے آدمی تھے جو اپنے نسب وحسب کے اعتبار سے کچھ معزز نہیں سمجھے جاتے تھے، انہوں نے حضرت مسیح کو قبول کیا اور ان کی دعوت کو بڑی قربانیاں کر کے دیار وامصار میں پھیلایا۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: "حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ان کے یاروں نے بڑی محنتیں کی ہیں ان کا دین نشر ہوا، ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بھی خلفاء نے اس سے زیادہ کیا"، والحمد للہ علی ذلک۔

فائدہ: ۳ یعنی "بنی اسرائیل" میں دو فرقے ہو گئے: ① ایک ایمان پر قائم ہوا ② دوسرے نے انکار کیا، پھر حضرت مسیح کے بعد آپس میں دست وگریبان رہے، آخر اللہ تعالیٰ نے اس بحث ومناظرہ اور خانہ جنگیوں میں مومنین کو منکرین پر غالب کیا، حضرت مسیح کے نام لیوا (نصاریٰ) یہود پر غالب رہے اور نصاریٰ میں سے ان کی عام گمراہی کے بعد جو بچے کھچے افراد صحیح عقیدہ پر قائم رہ گئے تھے ان کو حق تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کے ذریعہ سے دوسروں

پر غلبہ عنایت فرمایا، حجت وبرہان کے اعتبار سے بھی اور قوت وسلطنت کی حیثیت سے بھی، فللّٰہ الحمد والمنة۔

آیاتہا ١١ — ٦٢ سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ مَدَنِيَّةٌ ١١٠ — رکوعاتہا ٢

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں توحید، رسالت کا اثبات اور جھٹلانے والوں کا مستحق سزا یعنی قتل ہونا مذکور تھا، اس سورت کے شروع میں توحید ورسالت کا اثبات اور جھٹلانے والوں میں سے یہود کا مذمت اور وعید کا مستحق ہونا مذکور ہے، اور ان یہودیوں کا تذکرہ گذشتہ سورت میں قوم موسیٰ کے عنوان سے تھا، چونکہ ان یہود کا اصل مرض دنیا کی محبت تھا اس لیے مسلمانوں کو اس سے بچانے کے لیے اس سورت کے دوسرے رکوع میں جمعہ کے احکام کے ضمن میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا حکم اور اس کے خلاف کرنے سے منع کیا، پس دونوں سورتوں کے اخیر میں تجارت کا ذکر ہے، گذشتہ سورت میں دینی تجارت کا اور اس سورت میں دنیوی تجارت کا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① هُوَ الَّذِيْ

اللہ کی پاکی بولتا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں بادشاہ پاک ذات زبردست حکمتوں والا، وہی ہے جس نے

بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ

اٹھایا ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں کا پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور عقل مندی

وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ②

اور اس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں [1]

خلاصہ تفسیر: سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں (اپنی زبان یا حال سے) اللہ کی پاکی بیان کرتی ہیں جو کہ بادشاہ ہے (عیبوں سے) پاک ہے زبردست ہے حکمت والا ہے، وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں انہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (باطل عقائد اور برے اخلاق سے) پاک کرتے ہیں اور ان کتاب اور دانشمندی (کی باتیں جس میں سب ضروری دینی علوم آگئے) سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے (یعنی شرک وکفر میں اور مراد اکثر ہیں، کیونکہ جاہلیت میں بھی بعض موحد تھے، مگر تاہم تکمیل ہدایت کے وہ بھی محتاج تھے)۔

بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا: اس میں دلالت ہے کہ علوم کی فیض رسانی عادی اسباب پر موقوف نہیں، پس ولایت کا اُمّیت کے ساتھ جمع ہونا ممکن ہے، یعنی اُمّی شخص بھی ولی ہوسکتا ہے، البتہ ایسے شخص کو ضروری شرعی باتوں کا علم ضروری ہے، خواہ وہ علم مستند علماء کی صحبت ومجلسوں سے حاصل کیا ہو۔

* * *

فائدہ: [1] اُمِّيّٖنَ (ان پڑھ) ''اہل عرب'' کو کہا، جن میں علم وہنر کچھ نہ تھا، نہ کوئی آسمانی کتاب تھی، معمولی لکھنا پڑھنا بھی بہت کم آدمی جانتے تھے، ان کی جہالت ووحشت ضرب المثل تھی، خدا کو بالکل بھولے ہوئے تھے، بت پرستی، اوہام پرستی، اور فسق وفجور کا نام ''ملت ابراہیمی'' رکھ چھوڑا تھا اور تقریباً ساری قوم صریح گمراہی میں پڑی بھٹک رہی تھی، ناگہاں اللہ تعالیٰ نے اسی قوم میں سے ایک رسول کو اٹھایا جس کا امتیازی لقب ''نبی

اُمّی“ ہے، لیکن باوجود اُمّی ہونے کے اپنی قوم کو اللہ کی سب سے زیادہ عظیم الشان کتاب پڑھ کر سناتا اور عجیب وغریب علوم ومعارف اور حکمت ودانائی کی باتیں سکھلا کر ایسا حکیم وشائستہ بناتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے حکیم ودانا اور عالم وعارف اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں۔

تنبیہ: اس طرح کی آیت سورۃ بقرہ اور آل عمران میں گزر چکی ہے، وہاں کے فوائد ملاحظہ کر لیے جائیں۔

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ③

اور اٹھایا اس رسول کو ایک دوسرے لوگوں کے واسطے بھی انہی میں سے جو ابھی نہیں ملے ان میں ۱؎ وہی ہے زبردست حکمت والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (ان موجودہ لوگوں کے علاوہ) دوسروں کے لئے بھی (آپ کو مبعوث فرمایا) جو (اسلام لا کر) ان میں سے ہونے والے ہیں لیکن ہنوز ان میں شامل نہیں ہوئے (خواہ اس وجہ سے کہ موجود ہیں مگر اسلام نہیں لائے، یا اس وجہ سے کہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے، اس میں تمام امت قیامت تک عربی وعجمی سب آ گئے اور ان کو منھم اسلام کے اعتبار سے فرمایا، کیونکہ سب مسلمان رشتہ اسلام میں منسلک اور متحد ہیں) اور وہ زبردست حکمت والا ہے (کہ اپنی قدرت اور حکمت سے ایسا نبی بھیجا)۔

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ: اگر آخرین کا عطف گذشتہ آیت میں: یعلّمھم کی ضمیر منصوب پر ہو تو بقول بعض اس میں اشارہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض امت پر قیامت تک ختم نہ ہوگا، اور اولیاء اللہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ورثہ ہیں، اسی طرح ان کا فیض بھی بعد وفات جاری رہتا ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: پیچھے ایک آیت قبل بھی ان صفات کا ذکر تھا اور ایک آیت بعد یہاں پھر ان صفات کا دوبارہ ذکر کیا گیا جس سے تکرار کا شبہ ہوتا ہے، جواب یہ ہے کہ پیچھے ان صفات کا فی نفسہ حق تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا مقصود تھا اور یہاں خاص رسول کے بھیجنے میں قدرت وحکمت کا ثابت کرنا مقصود ہے، پس تکرار نہ رہا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ ہی رسول دوسرے آنے والے لوگوں کے واسطے بھی ہے جن کو مبدأ ومعاد اور شرائع سماویہ کا پورا اور صحیح علم نہ رکھنے کی وجہ سے ان پڑھ ہی کہنا چاہیے، مثلاً فارس، روم، چین اور ہندوستان وغیرہ کی قومیں جو بعد کو امیین کے دین اور اسلامی برادری میں شامل ہو کر ان ہی میں سے ہو گئیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ”حق تعالیٰ نے اول عرب پیدا کیے اس دین کے تھامنے والے، پیچھے عجم میں ایسے کامل لوگ اٹھے“، حدیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے: وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ کی نسبت سوال کیا گیا تو سلمان فارسیؓ کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اگر علم یا دین ثریا پر جا پہنچے گا تو (اس کی قوم فارس کا مرد وہاں سے بھی لے آئے گا) شیخ جلال الدین سیوطیؒ وغیرہ نے تسلیم کیا ہے کہ اس پیشین گوئی کے بڑے مصداق حضرت امام اعظم ابوحنیفۃ النعمانؒ ہیں، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

فائدہ: ۲؎ جس کی زبردست قوت وحکمت نے اس جلیل القدر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے قیامت تک کے لیے عرب وعجم کی تعلیم وتزکیہ کا انتظام فرمایا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ④

یہ بڑائی اللہ کی ہے دیتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ کا فضل بڑا ہے

خلاصہ تفسیر: (اور) یہ (رسول کے ذریعہ سے گمراہی سے نکل کر کتاب وحکمت وہدایت کی طرف آنا) خدا کا فضل ہے وہ فضل جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے (اگر سب کو بھی عنایت کرے تو وسعت ہے مگر وہ اپنی حکمت سے جس کو چاہے اس کو خاص فرماتا ہے اور جس کو چاہے بے بہرہ رکھتا ہے، جیسا کہ پیچھے امیین کے ایمان لانے سے اور آئندہ کی آیت میں علماء یہود کے ایمان نہ لانے سے یہ بات ظاہر ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی رسول کو یہ بڑائی دی اور اس امت کو اتنے بڑے مرتبہ والا رسول دیا، فللہ الحمد و المنة علی ما انعم، چاہیے کہ مسلمان اس انعام و اکرام کی قدر پہچانیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تعلیم و تزکیہ سے مستفید و منتفع ہونے میں کوتاہی نہ کریں۔

ربط: آگے عبرت کیلئے یہود کی مثال بیان فرماتے ہیں جنہوں نے اپنی کتاب اور پیغمبر سے استفادہ کرنے میں سخت غفلت اور کوتاہی برتی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ

مثال ان لوگوں کی جن پر لادی تورات پھر نہ اٹھائی انہوں نے جیسے مثال گدھے کی کہ پیٹھ پر لے چلتا ہے کتابیں [1] بری مثال ہے

الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

ان لوگوں کی [2] جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی باتوں کو [3] اور اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو [4]

خلاصہ تفسیر: (آگے بعض مکذبین رسالت کی مذمت اور برائی ہے کہ) جن لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا پھر انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا ان کی حالت اس گدھے کی سی حالت ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہے (مگر ان کتابوں کے نفع سے محروم ہے، اسی طرح علم کا اصل نفع اور مقصود عمل ہے، جب عمل ہی نہ ہو تو علم کے صرف حصول اور یاد کرنے میں تھکن ہی تھکن ہے تو بالکل ایسی ہی مثال ہوگئی، اور خاص گدھے کا ذکر اس لئے ہے کہ وہ جانوروں میں بے وقوف مشہور ہے تو اس میں زیادہ نفرت دلانا ہوگئی، غرض) ان لوگوں کی بری حالت ہے جنہوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا (جیسے یہ یہود ہیں) اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیا کرتا (کیونکہ جان کر عناد کرتے ہیں اور اگر ہدایت ہوگی تو عناد چھوڑنے کے بعد ہوگی)۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ: تورات پر عمل کرنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا لازم ہے جیسا کہ اس آیت میں حکم ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا تورات پر عمل نہ کرنے کو مستلزم ہے، اور اس آیت میں اس شخص کی بدحالی کی طرف بھی اشارہ ہے جو علم کے باوجود انکار پر جما رہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی یہود پر "تورات" کا بوجھ رکھا گیا تھا اور وہ اس کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے، لیکن انہوں نے اس کی تعلیمات و ہدایات کی کچھ پروا نہ کی، نہ اس کو محفوظ رکھا، نہ دل میں جگہ دی، نہ اس پر عمل کر کے اللہ کے فضل و انعام سے بہرہ ور ہوئے، بلاشبہ تورات جس کے لوگ حامل بنائے گئے تھے حکمت و ہدایت کا ایک ربانی خزینہ تھا مگر جب اس سے منتفع نہ ہوئے تو وہ یہ مثال ہوگئی:

نہ محقق شدی نہ دانشمند چار پائے برو کتابے چند

ایک گدھے پر علم و حکمت کی پچاسوں کتابیں لاد دو، اس کو بوجھ میں دبنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں، وہ تو صرف ہری گھاس کی تلاش میں ہے۔ اس بات سے کچھ سروکار نہیں رکھتا کہ پیٹھ پر لعل و جواہر لدے ہوئے ہیں یا خزف و سنگریزے، اگر محض اسی پر فخر کرنے لگے کہ دیکھو! میری پیٹھ پر کیسی کیسی عمدہ اور قیمتی کتابیں لدی ہوئی ہیں لہٰذا میں بڑا عالم اور معزز ہوں تو یہ اور زیادہ گدھا پن ہوگا۔

فائدہ: [2] یعنی بری قوم ہے وہ جس کی مثال یہ ہے، اللہ ہم کو پناہ میں رکھے۔

فائدہ: [3] یعنی اللہ تعالیٰ نے تورات وغیرہ میں جو بشارات نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی دی تھیں اور جو دلائل و براہین کی رسالت پر قائم کیں، ان کو جھٹلانا آیات اللہ کو جھٹلانا۔

فائدہ: [4] یعنی ایسے معاند، ہٹ دھرم و بے انصاف لوگوں کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

تو کہہ اے یہودی ہونے والو اگر تم کو دعویٰ ہے کہ تم دوست ہو اللہ کے سب لوگوں کے سوا تو مناؤ اپنے مرنے کو

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

اگر تم سچے ہو، اور وہ کبھی نہ منائیں گے اپنا مرنا ان کاموں کی وجہ سے جن کو آگے بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ اور اللہ کو خوب معلوم ہیں سب گناہ گار۔[۱]

خلاصہ تفسیر: اب اس بات کا جواب ہے کہ اگر یہ یہودی یہ کہیں کہ ہم اس حالت کے باوجود بھی اللہ کے مقبول ہیں تو:

آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اے یہودیو! اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم بلا شرکت غیرے اللہ کے مقبول (محبوب) ہو تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر (کے دکھلا) دو اگر تم (اس دعوی میں) سچے ہو، اور (ہم ساتھ ہی یہ کہہ دیتے ہیں کہ) وہ (اپنی مقبولیت کا دعوی کرنے والے) کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے بوجہ (سزا کے خوف سے) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی (جب مقدمہ کی تاریخ آئے گی، فرد قرارداد جرم سنا کر سزا کا حکم کردیا جائے گا)۔

موت کی تمنا کے مضمون سے متعلق کچھ تحقیق و تفصیل سورہ بقرہ آیت ۹۴: قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ کی تفسیر میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ: اس میں دلالت ہے کہ لقاء رب کے شوق میں موت کی تمنا کرنا ولایت و بزرگی کی علامات میں سے ہے، جیسا کہ بعض صحابہ اور انبیاء نے بھی تمنا کی ہے، البتہ دنیا کے رنج وغم کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا ممنوع اور برا ہے۔

* * *

فائدہ: [۱] یعنی اس گدھے پن اور جہل و حماقت کے باوجود دعویٰ یہ ہے کہ بلا شرکت غیرے ہم ہی اللہ کے دوست اور ولی، اور تنہا جنت کے حق دار ہیں بس دنیا سے چلے اور جنت میں پہنچے، لیکن اگر واقعی دل میں یہ ہی یقین ہے اور اپنے دعوے میں سچے ہیں تو ضروری تھا کہ دنیا کے مکدر عیش سے دل برداشتہ ہو کر محبوب حقیقی کے اشتیاق اور جنت الفردوس کی تمنا میں مرنے کی آرزو کرتے، جس کو یقینا معلوم ہو جائے کہ میرا اللہ کے ہاں بڑا درجہ ہے اور کوئی خطرہ نہیں، وہ بیشک مرنے سے خوش ہوگا اور موت کو ایک پل سمجھے گا جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے اس کی زبان پر تو یہ الفاظ ہوں گے: "غَدًا نَلقی الاحِبَّة، مُحَمَّدًا وَحِزْبَه"، اور "یا حَبَّذَا الْجَنَّةُ وَاقترابها طیبة و بارد شرابها" اور "حبیب جاء علی فاقة" اور "یا بنی لا یُبالِی ابوك سقط علی الموت ام سقط علیه الموت" وغیرذلک۔

یہ ان اولیاء اللہ کے کلمات ہیں جو دنیا کی کسی سختی یا مصیبت سے گھبرا کر نہیں، خالص لقاء اللہ اور جنت کے اشتیاق میں موت کی تمنا رکھتے تھے، اور ان کے افعال و حرکات خود شہادت دیتے تھے کہ موت ان کو دنیا کی تمام لذائذ سے زیادہ لذیذ ہے، قال النبی ﷺ: "لَوَدِدْتُّ اَنِّی اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللہ ثُمَّ اُحیی ثُمَّ اُقْتَلُ" اس کے بالمقابل ان جھوٹے مدعیوں کے افعال و حرکات پر نظر ڈالو کہ ان سے بڑھ کر موت سے ڈرنے والا کوئی نہیں، وہ مرنے کا نام سن کر گھبراتے اور بھاگتے ہیں، اس لیے نہیں کہ زیادہ دن زندہ رہیں تو زیادہ نیکیاں کمائیں گے، محض اس لیے کہ دنیا کی حرص سے ان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا اور دل میں سمجھتے ہیں کہ جو کرتوت کیے ہیں، یہاں سے چھوٹتے ہی ان کی سزا میں پکڑے جائیں گے، غرض ان کے تمام افعال واطوار سے روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے موت کی آرزو نہیں کر سکتے، اور ممکن تھا کہ اس زمانہ کے پہلو قرآن کے اس دعویٰ کو جھٹلانے کے لیے جھوٹ موٹ زبان سے موت کی تمنا کرنے لگتے، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت بھی ان کو نہ دی، روایات میں ہے کہ اگر (ان میں سے) کوئی یہودی موت کی تمنا کر گزرتا تو اسی وقت گلے میں اچھو لگ کر ہلاک ہو جاتا۔

تنبیہ: اس مضمون کی آیت سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے، اس کے فوائد دیکھ لیے جائیں، بعض سلف کے نزدیک "تمنی موت" کا مطلب

مباہلہ تھا، یعنی معاند یہود سے کہا گیا کہ اگر وہ واقعی اپنے اولیاء ہونے کا یقین رکھتے ہیں اور مسلمانوں کو باطل پر سمجھتے ہیں تو تمنا کریں کہ فریقین میں جو جھوٹا ہو، مر جائے، لیکن وہ کبھی ایسا نہ کریں گے کیونکہ ان کو اپنے کذب وظلم کا یقین حاصل ہے، ابن کثیرؒ اور ابن قیمؒ وغیرہ نے یہ ہی توجیہ اختیار کی ہے، واللہ اعلم۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ

تو کہہ موت وہ جس سے تم بھاگتے ہو سو وہ تم سے ضرور ملنے والی ہے پھر تم پھیرے جاؤ گے اس چھپے اور کھلے جاننے والے کے پاس

فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ ع

پھر جتلا دے گا تم کو جو تم کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: (اور اس سزا کے وعدہ کی تاکید کے لیے) آپ (ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو (اور اپنی مقبولیت کے دعوی کے باوجود موت کی تمنا اس لئے نہیں کرتے ہو کہ سزا بھگتنا ہوگی) وہ (موت ایک روز) تم کو آ پکڑے گی پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے (خدا) کے پاس لے جائے جاؤ گے پھر وہ تم کو تمہارے سب کئے ہوئے کام بتلا دے گا (اور سزا دے گا)۔

* * *

فائدہ: یعنی موت سے ڈر کر کہاں بھاگ سکتے ہو، ہزار کوشش کرو، مضبوط قلعوں میں دروازے بند کر کے بیٹھ رہو، وہاں بھی موت چھوڑنے والی نہیں، اور موت کے بعد پھر وہی اللہ کی عدالت ہے اور تم ہو۔

ربط: یہود کی بڑی خرابی یہ تھی کہ کتابیں پیٹھ پر لدھی ہوئی ہیں، لیکن ان سے منتفع نہیں ہوتے دین کی بہت سی باتیں سمجھتے بوجھتے، پر دنیا کے واسطے چھوڑ بیٹھتے، دنیا کے دھندوں میں منہمک ہو کر اللہ کی یاد اور آخرت کے تصور کو فراموش کر دیتے، ایسی روش سے ہم کو منع کیا گیا، جمعہ کا تقید بھی ایسا ہی ہے کہ اس وقت دنیا کے کام میں نہ لگو بلکہ پوری توجہ اور خاموشی سے خطبہ سنو اور نماز ادا کرو، حدیث میں ہے کہ: ''جو کوئی خطبہ کے وقت بات کرے وہ اس گدھے کی طرح ہے جس پر کتابیں لدی ہوں''، یعنی اس کی مثال یہود کی سی ہوئی، العیاذ باللہ۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ

اے ایمان والو جب اذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کی یاد کو اور چھوڑ دو خرید و فروخت [1]

ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹﴾

یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے [2]

خلاصہ تفسیر: اب جمعہ کے احکام اور اس کے ضمن میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا حکم ہے اور اسکے خلاف سے منع کیا جاتا ہے۔

اے ایمان والو! جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز وخطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو اور خرید وفروخت (اور اسی طرح دوسرے مشاغل جو جمعہ میں رکاوٹ بنیں) چھوڑ دیا کرو (یہاں خاص طور پر خرید وفروخت کا ذکر زیادہ اہتمام کی وجہ سے کیا، کیونکہ اس کے چھوڑنے کو فائدہ ضائع ہونے کا سبب سمجھا جاتا ہے) یہ (خرید وفروخت وغیرہ کے مشاغل کو چھوڑ کر چل پڑنا) تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (کیونکہ اس کا نفع باقی رہنے والا ہے، اور خرید وفروخت کا نفع فانی ہے)۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا: یہاں خطاب ان لوگوں کو ہے جن پر جمعہ فرض ہے، کیونکہ بعض پر بالاجماع فرض نہیں جیسے مسافر۔

اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ: اذان سے مراد وہ اذان ہے جو آیت نازل ہونے کے وقت تھی، یعنی جو امام کے سامنے ہوتی ہے،

کیونکہ پہلی اذان صحابہ کے اجماع سے بعد میں مقرر ہوئی لیکن بیع وغیرہ کے حرام ہونے میں پہلی اذان کا حکم بھی دوسری اذان کی طرح ہے، البتہ دوسری اذان میں یہ حکم قطعی ہے، اور پہلی اذان میں ظنی ہے، اس سے تمام علمی اشکالات دور ہوجاتے ہیں۔

فَاسۡعَوۡا اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ: یہاں ''سعی'' سے مراد دوڑنا نہیں صرف چلنا مراد ہے، مبالغہ اور اہتمام کے لیے ''سعی'' فرمادیا، کیونکہ نماز کے لیے دوڑتے ہوئے آنے کو رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا، اور یہ ارشاد فرمایا کہ جب نماز کے لیے آؤ تو سکینت اور وقار کے ساتھ آؤ۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''ہر اذان کا یہ حکم نہیں، کیونکہ جماعت پھر بھی ملے گی اور جمعہ ایک ہی جگہ ہوتا تھا، پھر کہاں ملے گا''، اور اللہ کی یاد سے مراد ''خطبہ'' ہے اور نماز بھی اس کے عموم میں داخل ہے، یعنی ایسے وقت جائے کہ خطبہ سنے، اس وقت خرید وفروخت حرام ہے، اور ''دوڑنے'' سے مراد پورے اہتمام اور مستعدی کے ساتھ جانا ہے، بھاگنا مراد نہیں۔

تنبیہ: نودی سے مراد قرآن میں وہ اذان ہے جو نزول آیت کے وقت تھی، یعنی جو امام کے سامنے ہوتی ہے، کیونکہ اس سے پہلی اذان بعد کو حضرت عثمانؓ کے عہد میں صحابہ کے اجماع سے مقرر ہوئی ہے، لیکن حرمت بیع میں اس اذان کا حکم بھی اذان قدیم کے ہے، کیونکہ اشتراک علت سے حکم میں اشتراک ہوتا ہے، البتہ اذان قدیم میں یہ حکم منصوص وقطعی ہوگا اور اذان حادث میں یہ حکم مجتہد فیہ اور ظنی رہے گا، اس تقریر سے تمام علمی اشکالات مرتفع ہوگئے، نیز واضح رہے کہ: یا ایھا الذین اٰمنوا یہاں ''عام مخصوص منہ البعض'' ہے، کیونکہ بالاجماع بعض مسلمانوں (مثلاً مسافر ومریض وغیرہ) پر جمعہ فرض نہیں۔

فائدہ: ۲ ظاہر ہے کہ منافع آخرت کے سامنے دنیاوی فوائد کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا

پھر جب تمام ہوچکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا اور یاد کرو اللہ کو بہت سا

لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۝۱۰

تا کہ تمہارا بھلا ہو

خلاصہ تفسیر: پھر جب نماز (جمعہ کی) پوری ہوچکے (حاصل یہ کہ نماز اور خطبہ پورا ہوجائے) تو (اس وقت تم کو اجازت ہے کہ) تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو (یعنی اس وقت دنیا کے کاموں کے لئے چلنے پھرنے کی اجازت ہے) اور (اس میں بھی) اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو (یعنی دنیاوی اشغال میں ایسے منہمک مت ہوجاؤ کہ ضروری احکام وعبادات سے غافل ہوجاؤ) تا کہ تم کو فلاح ہو۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ: اگر اس وقت خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا تو نماز پوری ہونے سے مراد یہ ہے کہ جمعہ اپنے تمام متعلقات کے ساتھ پورا ہوجائے، جس کا حاصل یہ ہے کہ نماز اور خطبہ دونوں ہوچکیں۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ: یعنی ''پھر جب نماز پوری ہوچکے تو تم زمین پر چلو پھرو''، اس میں دلالت ہے کہ بسا اوقات کسی دینی مصلحت مثلاً عبادات میں نشاط اور چستی کی غرض سے کسی جائز اور مباح امور میں مشغول ہونا بھی مطلوب ہے، یہ زہد کے خلاف نہیں، بشرطیکہ دین پر اس کو ترجیح نہ دی جائے۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہود کے ہاں عبادت کا دن ہفتہ تھا، سارا دن سودا منع تھا اس لیے فرمادیا کہ تم نماز کے بعد روزی تلاش کرو، اور روزی کی تلاش میں بھی اللہ کی یاد نہ بھولو''۔

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ

اور جب دیکھیں سودا بکتا کچھ تماشہ متفرق ہو جائیں اس کی طرف اور تجھ کو چھوڑ جائیں کھڑا، تو کہہ جو اللہ کے پاس ہے سو بہتر ہے تماشہ سے

وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ⑪ ع ۲

اور سوداگری سے اور اللہ بہتر ہے روزی دینے والا

خلاصہ تفسیر: اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ ایک بار آپ ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ مدینہ میں ایک قافلہ غلہ لے کر آیا، ایسے موقع پر اعلان کے لیے دف بجتا تھا، بہت سے لوگ خطبہ چھوڑ کر غلہ خریدنے چلے اور بارہ آدمی رہ گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور ایک روایت میں ہے کہ اس وقت خطبہ نماز کے بعد ہوا کرتا تھا، لوگ یوں سمجھے کہ نماز اصل مقصود ہے وہ تو ہو چکی، خطبہ اگر نہ سنا جائے تو کچھ حرج نہیں، اور اگر ثابت ہو جائے کہ خطبہ اس وقت بھی نماز سے پہلے تھا تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کا ارادہ فوراً واپس آجانے کا ہوگا۔

اور (بعض لوگوں کا یہ حال ہے کہ) وہ لوگ جب کسی تجارت یا مشغولی کی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑنے کے لئے بکھر جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ جو چیز (تقرب اور ثواب میں سے) خدا کے پاس ہے وہ ایسے مشغلہ اور تجارت سے بدرجہا بہتر ہے اور (اگر تجارت وغیرہ سے رزق زیادہ ہونے کی طمع ہو تو سمجھ لو کہ) اللہ سب سے اچھا روزی پہنچانے والا ہے (اس کی ضروری طاعات میں مشغول رہنے سے یہ رزق مقدر بھی ملتا ہے، پھر اس کے احکام کو کیوں ترک کیا جائے)۔

انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا: جو صحابہ اٹھ کر چلے گئے تھے ان کی ابتدائی حالت تھی، پھر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قحط اور بھوک کا تھا، مدینہ میں اشیاء ضرورت کی کمی اور سخت گرانی تھی، پھر بڑے صحابہ سے اس کا صدور نہ ہوا تھا، سو اجتہادی غلطی تھی اس لیے اعتراض کی گنجائش نہیں۔

* * *

فائدہ: ایک مرتبہ جمعہ میں حضرت محمد ﷺ خطبہ فرما رہے تھے، اسی وقت تجارتی قافلہ باہر سے غلہ لے کر آ پہنچا، اسکے ساتھ اعلان کی غرض سے نقارہ بجتا تھا، پہلے سے شہر میں اناج کی کمی تھی، لوگ دوڑے کہ اس کو ٹھہرائیں (خیال کیا ہوگا کہ خطبہ کا حکم عام وعظوں کی طرح ہے جس میں سے ضرورت کے لیے اٹھ سکتے ہیں، نماز پھر آ کر پڑھ لیں گے، یا نماز ہو چکی ہوگی جیسا کہ بعض کا قول ہے کہ اس وقت نماز جمعہ خطبہ سے پہلے ہوتی تھی، بہر حال خطبہ کا حکم معلوم نہ تھا) اکثر لوگ چلے گئے حضرت کے ساتھ بارہ آدمی (جن میں خلفائے راشدین ؓ بھی تھے) باقی رہ گئے، اس پر یہ آیت اتری۔

یعنی سوداگری اور دنیا کا کھیل تماشا کیا چیز ہے، وہ ابدی دولت حاصل کرو جو اللہ کے پاس ہے اور جو پیغمبر کی صحبت اور مجالس ذکر وعبادت میں ملتی ہے، باقی قحط کی وجہ سے روزی کا کھٹکا جس کی بناء پر تم اٹھ کر چلے گئے، سو یاد رکھو روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہی بہترین روزی دینے والا ہے اس مالک کے غلام کو یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہیے، اس تنبیہ وتادیب کے بعد صحابہ کی شان وہ تھی جو سورۃ نور میں ہے: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيتَاءِ الزَّكٰوةِ (النور:37)

تنبیہ: ''لہو'' کہتے ہیں ہر اس چیز کو اللہ کی یاد سے مشغول (غافل) کر دے، جیسے کھیل تماشا، شاید اس نقارہ کی آواز کو ''لہو'' سے تعبیر فرمایا ہو۔

ایاتها ١١ ٦٣ سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ ١٠٤ رکوعاتها ٢

خلاصه تفسیر: گذشتہ سورت میں یہودیوں کا ذکر تھا، اس سورت میں منافقین کا ذکر ہے، اور اکثر منافق یہودی تھے، گذشتہ سورت میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا حکم تھا، وہی اس سورت کے اخیر میں ہے، منافقین اپنے مال اور خدام وحشم پر گھمنڈ کرتے تھے جیسا کہ آگے معلوم ہوگا اس لیے مال واولاد کے ساتھ زیادہ دل لگانے سے منع فرمایا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وقف لازم

جب آئیں تیرے پاس منافق کہیں ہم قائل ہیں تو رسول ہے اللہ کا ١ اور اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ ①

اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں ٢

خلاصه تفسیر: جن آیتوں میں منافقین کا ذکر ہے ان کا شان نزول یہ ہے کہ کسی غزوہ میں انصار ومہاجرین میں کچھ تکرار ہوگئی، اس پر عبداللہ بن ابی بگڑا کہ تم نے ان پردیسیوں (مہاجرین) کو روٹیاں کھلا کھلا کر بگاڑ دیا، اب کے مدینہ پہنچ کر ان لوگوں کو خرچ دینا بند کردو خود ہی چلے جائیں گے، اور یہ بھی کہا کہ ہم عزت والے ہیں ان ذلت والوں کو نکال دیں گے، یہ بات زید بن ارقم صحابی نے سن کر حضور ﷺ سے جا کر کہی، آپ نے عبداللہ بن ابی اور اس کے رفقاء کو بلا کر پوچھا تو وہ صاف مکر گیا اور قسمیں کھانے لگا، زید بن ارقم کو بڑا رنج ہوا، چنانچہ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، جن لوگوں کو اس کا کہنا معلوم تھا انہوں نے اس سے کہا کہ تو جا کر حضرت کے سامنے توبہ کرلے، اس نے انکار کر دیا، اور چونکہ سب منافقین اس قول کے پسند کرنے میں شریک اور ہمراہی تھے اس لیے سب کی طرف نسبت کر دی۔

جب آپ کے پاس یہ منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (دل سے) گواہی دیتے ہیں کہ آپ بیشک اللہ کے رسول ہیں، اور یہ تو اللہ کو معلوم ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں (اس میں تو ان کے قول کی تکذیب نہیں کی جاتی) اور (اس کے باوجود) اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین (اس کہنے میں) جھوٹے ہیں (کہ ہم دل سے گواہی دیتے ہیں، کیونکہ وہ گواہی محض زبانی ہے، دل کے اعتقاد سے نہیں)۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی ہم دل سے اعتقاد رکھتے ہیں آپ (ﷺ) کے رسول ہونے پر۔

فائدہ: ٢ یعنی جھوٹ کہتے ہیں کہ ان کو دل سے اعتقاد ہے، واقع میں وہ آپ کی رسالت کے قائل نہیں محض اپنی اغراض کے پیش نظر زبان سے باتیں بناتے ہیں اور دل میں سمجھتے ہیں کہ جھوٹ بول رہے ہیں، پھر اسی ایک بات پر کیا منحصر ہے، جھوٹ بولنا ان کی امتیازی خصلت اور شعار بن چکا ہے، بات بات میں کذب ودروغ سے کام لیتے ہیں، چناچہ اسی سورت میں ایک واقعہ کا ذکر آیا چاہتا ہے جس میں انہوں نے صریح جھوٹ بولا، اور اللہ نے آسمان سے ان کی تکذیب کی۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ②

انہوں نے رکھا ہے اپنی قسموں کو ڈھال بنا کر ١ پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے یہ لوگ برے کام ہیں جو کر رہے ہیں ٢

خلاصه تفسیر: ان لوگوں نے اپنی قسموں کو (اپنی جان ومال کو بچانے کے لئے) ڈھال بنا رکھا ہے (کیونکہ اگر کفر کا اظہار کرتے

تو ان کی حالت بھی دوسرے کفار کی طرح ہو جاتی کہ منافقین سے بھی جہاد کیا جاتا اور قتل و غارت ہوتا) پھر (اس لازمی خرابی کے ساتھ متعدی خرابی بھی ہے کہ) یہ لوگ (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، بیشک ان کے یہ اعمال بہت ہی برے ہیں۔

* * *

فائدہ: ؎ یعنی جھوٹی قسمیں کھا لیتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مجاہدین اسلام کے ہاتھوں سے اپنی جان و مال محفوظ رکھنے کیلئے ان ہی قسموں کی آڑ پکڑتے ہیں، جہاں کوئی بات قابل گرفت ان سے سرزد ہوئی اور مسلمانوں کی طرف سے مواخذہ کا خوف ہوا، فوراً جھوٹی قسمیں کھا کر بری ہو گئے۔

فائدہ: ؎ یعنی اسلام اور مسلمانوں کی نسبت طعن و تشنیع اور عیب جوئی کر کے دوسروں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور لوگ ان کو بظاہر مسلمان دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں، تو ان کی جھوٹی قسموں کا ضرر فساد ان ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ دوسروں تک متعدی ہوتا ہے، اس سے بڑھ کر برا کام اور کیا ہوگا (لیکن ایک شخص جب تک بظاہر ضروریات دین کا اقرار کرتا ہے خواہ جھوٹ اور فریب ہی سے کیوں نہ ہو، اسلام اس کے قتل کی اجازت نہیں دیتا)۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳

یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے پھر منکر ہو گئے، پھر مہر لگ گئی ان کے دل پر سو وہ اب کچھ نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر: (ہمارا) یہ (کہنا کہ ان کے اعمال بہت ہی برے ہیں) اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ (اول ظاہر میں) ایمان لے آئے پھر (اپنے شیاطین کے پاس جا کر کفریہ کلمات: **انا معکم انما نحن مستھزءون** کہہ کر) کافر ہو گئے (مطلب یہ کہ ہمارا ان پر برے اعمال کا حکم لگانا ان کے نفاق کی وجہ سے ہے کیونکہ نفاق بدترین کفریہ اعمال میں سے ہے) سو (اس نفاق کی وجہ سے) ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی تو یہ (حق بات کو) نہیں سمجھتے۔

* * *

فائدہ: یعنی زبان سے ایمان لائے، دل سے منکر رہے اور مدعی ایمان ہو کر کافروں جیسے کام کیے اس بے ایمانی اور انتہائی فریب و دغا کا اثر یہ ہوا کہ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی، جن میں ایمان و خیر اور حق و صداقت کے سرایت کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں رہی، ظاہر ہے کہ اب اس حالت پر پہنچ کر ان سے سمجھنے کی کیا توقع کی جا سکتی ہے، جب آدمی کا قلب اس کی بدکاریوں اور بے ایمانیوں سے بالکل مسخ ہو جائے پھر نیک و بد کے سمجھنے کی صلاحیت کہاں باقی رہے گی۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۚ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۚ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۚ

اور جب تو دیکھے ان کو تو اچھے لگیں تجھ کو ان کے ڈیل اور اگر بات کہیں سنے تو ان کی بات ؎ کیسے ہیں جیسے کہ لکڑی لگا دی دیوار سے ؎

يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۴

جو کوئی چیخے جانیں ہم ہی پر بلا آئی ؎ وہی ہیں دشمن ان سے بچتا رہ ؎ گردن مارے ان کی اللہ کہاں سے پھرے جاتے ہیں ؎

خلاصہ تفسیر: اور (ظاہر میں یہ ایسے چکنے چپڑے ہیں کہ) جب آپ ان کو دیکھیں (تو ظاہری شان و شوکت کی وجہ سے) ان کے قد و قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں، اور (باتوں میں ایسے ہیں کہ) اگر یہ باتیں کرنے لگیں تو آپ ان کی بات (انتہائی فصاحت و شیرینی کی وجہ سے) سن لیں (لیکن چونکہ اندر خاک بھی نہیں ہے، اس لئے ظاہری قد و قامت کے ساتھ باطنی کمالات سے خالی ہونے کے سبب ان کی ایسی مثال ہے کہ) گویا یہ لکڑیاں ہیں جو (دیوار کے) سہارے سے لگائے ہوئی (کھڑی) ہیں (کہ جثہ میں تو لمبی چوڑی موٹی موٹی، مگر محض بے جان، اور چونکہ

اخلاص اور ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ہروقت ان کو اندیشہ رہتا ہے کہ کبھی مسلمانوں کو ہمارے حال کی اطلاع کسی قرینہ سے یا وحی کے ذریعہ سے نہ ہوجائے اور دیگر کفار کی طرح ہم پر بھی جہاد وغیرہ نہ ہونے لگے تو اس خیال سے ایسے ڈرتے رہتے ہیں کہ) ہر غل پکار کو (اگرچہ کسی بھی وجہ سے ہو) اپنے ہی اوپر (پڑنے والی) خیال کرنے لگتے ہیں (یعنی جب کوئی شور وغل ہوتا ہے تو یہی سمجھتے ہیں کہ کہیں ہمارے اوپر بھی افتاد پڑنے والی نہ ہو، حقیقت میں) یہی لوگ (تمہارے پورے) دشمن ہیں آپ ان سے ہوشیار رہئے (یعنی ان کی کسی بات پر اعتماد نہ کیجئے) خدا ان کو غارت کریں کہاں (دین حق سے) پھرے چلے جاتے ہیں (یعنی روزانہ دور ہی ہوتے جاتے ہیں)۔

كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ: عام عادت یہ ہے کہ اکثر جو لکڑی فی الحال کام میں نہیں لگتی وہ اسی طرح دیوار سے سہارا لگا کر رکھ دی جاتی ہے، ایسی لکڑی بالکل بے فائدہ ہوتی ہے، اسی طرح یہ لوگ ظاہری دیکھنے میں تو شاندار ہیں لیکن اندر سے یعنی باطنی طور پر محض بیکار۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دل تو مسخ ہو چکے ہیں، لیکن جسم دیکھو تو بہت ڈیل ڈول کے، چکنے چپڑے، بات کریں تو بہت فصاحت اور چرب زبانی سے، نہایت لچھے دار کہ خواہ مخواہ سننے والا ادھر متوجہ ہو، اور کلام کی ظاہری سطح دیکھ کر قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے، کسی نے خوب کہا ہے:

از بروں چوں گور کافر پر خلل — واندروں قہر خدائے عز وجل

از بروں طعنہ زنی بر بایزید — واز درونت ننگ میدارد یزید

فائدہ: ۲ خشک اور بیکار لکڑی جو دیوار سے لگا کر کھڑی کردی جائے محض بے جان اور لا یعقل، دیکھنے میں کتنی موٹی، مگر ایک منٹ بھی بدون سہارے کے کھڑی نہیں رہ سکتی، ہاں ضرورت پڑے تو جلانے کے کام آسکتی ہے، یہ ہی حال ان لوگوں کا ہے، ان کے موٹے فربہ جسم، اور تن وتوش سب ظاہری خول ہیں، اندر سے خالی اور بے جان، محض دوزخ کا ایندھن بننے کے لائق۔

فائدہ: ۳ یعنی بزدل، نامرد، ڈرپوک، ذرا کہیں شور وغل ہو تو دل دہل جائے، سمجھیں ہم ہی پر کوئی بلا آئی، سنگین جرموں اور بے ایمانیوں کی وجہ سے ہروقت ان کے دل میں دغدغہ لگا رہتا ہے کہ دیکھیے کہیں ہماری دغابازیوں کا پردہ تو چاک نہیں ہو گیا، یا ہماری حرکات کی پاداش میں کوئی افتاد تو پڑنے والی نہیں۔

فائدہ: ۴ یعنی بڑے خطرناک دشمن یہ ہیں ان کی چالوں سے ہوشیار رہو۔

فائدہ: ۵ یعنی ایمان کا اظہار کر کے یہ بے ایمانی، اور حق وصداقت کی روشنی آچکنے کے بعد یہ ظلمت پسندی کس قدر عجیب ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ

اور جب کہیے ان کو آؤ معاف کرا دے تم کو رسول اللہ کا مٹکاتے ہیں اپنے سر اور تو دیکھے کہ وہ رکتے ہیں

وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ ۝ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط لَن يَغْفِرَ

اور وہ غرور کرتے ہیں ۱ برابر ہے ان پر تو معافی چاہے ان کی یا نہ معافی چاہے ہرگز نہ معاف کرے گا

اللَّهُ لَهُمْ ط إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝

ان کو اللہ، بیشک اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو ۲

خلاصہ تفسیر: اور (ان کے تکبر اور شرارت کی یہ کیفیت ہے کہ) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (رسول اللہ ﷺ کے پاس) آؤ تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ) استغفار کردیں تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ (اس خیر خواہی اور استغفار رسول سے) تکبر

کرتے ہوئے بے رخی کرتے ہیں (جب ان کے کفر کی یہ حالت ہے تو) ان کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں خواہ آپ ان کے لئے استغفار کریں یا ان کے لئے استغفار نہ کریں، اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہ بخشے گا (مطلب یہ کہ اگر وہ آپ کے پاس آتے بھی اور آپ ان کی ظاہری حالت کے اعتبار سے استغفار بھی فرماتے تب بھی ان کو کچھ نفع نہ ہوتا، یہ تو گذشتہ زمانے کے اعتبار سے ان کی حالت ہوئی، اور آئندہ کے لئے یہ ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ ایسے نافرمان لوگوں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ بعض دفعہ جب ان منافقوں کی کوئی شرارت صاف طور پر کھل جاتی اور کذب وخیانت کا پردہ فاش ہوجاتا تو لوگ کہتے کہ (اب بھی وقت نہیں گیا) آؤ! رسول اللہ (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوکر اللہ سے اپنا قصور معاف کرالو، حضور ﷺ کے استغفار کی برکت سے حق تعالیٰ تمہاری خطا معاف فرمادے گا، تو غرور وتکبر سے اس پر آمادہ نہ ہوتے اور بے پروائی سے گردن ہلا کر اور سر مٹکا کر رہ جاتے، بلکہ بعض بدبخت صاف کہہ دیتے کہ ہم کو رسول اللہ کے استغفار کی ضرورت نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ممکن ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غایت رحمت وشفقت سے ان کے لیے بحالت موجودہ معافی طلب کریں، مگر اللہ کسی صورت سے ان کو معاف کرنے والا نہیں، اور نہ ایسے نافرمانوں کو اس کے ہاں سے ہدایت کی توفیق ملتی ہے، اس طرح کی آیت سورۃ برأت میں آچکی ہے، وہاں کے فوائد دیکھ لیے جائیں۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ

وہی ہیں جو کہتے ہیں مت خرچ کرو ان پر جو پاس رہتے ہیں رسول اللہ کے یہاں تک کہ متفرق ہوجائیں ۱؎ اور اللہ کے ہیں خزانے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۷

آسمانوں کے اور زمین کے لیکن منافق نہیں سمجھتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: یہ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ (ﷺ) کے پاس (جمع) ہیں ان پر کچھ خرچ مت کرو یہاں تک کہ یہ آپ ہی منتشر ہوجائیں گے اور (ان کا یہ کہنا محض جہل ہے، کیونکہ) اللہ ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں اور زمین کے ولیکن منافق سمجھتے نہیں ہیں (کہ اہل شہر کے نفقات یعنی دینے دلانے اور خرچ کرنے کو رزق کا مدار سمجھتے ہیں)۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا: اس آیت میں مال ودولت کی کمی کے باعث اہل اللہ یعنی اللہ کے نیک بندوں کو حقیر اور بے قدر سمجھنے کی مذمت اور برائی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ایک سفر میں دو شخص لڑ پڑے ایک مہاجرین میں کا اور ایک انصار کا، دونوں نے اپنی حمایت کے لیے اپنی جماعت کو پکارا جس پر خاصا ہنگامہ ہوگیا، یہ خبر رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو پہنچی کہنے لگا اگر ہم ان (مہاجرین) کو اپنے شہر میں جگہ نہ دیتے تو ہم سے مقابلہ کیوں کرتے تم ہی خبر گیری کرتے ہو تو یہ لوگ رسول کے ساتھ جمع رہتے ہیں، خبر گیری چھوڑ دو، ابھی خرچ سے تنگ آکر متفرق ہوجائیں، اور سب مجمع بچھڑ جائے، یہ بھی کہا کہ اس سفر سے واپس ہوکر ہم مدینہ پہنچیں تو جس کا اس شہر میں زور واقتدار ہے چاہیے کہ ذلیل بے قدروں کو نکال دے (یعنی ہم لوگ جو معزز لوگ ہیں ذلیل مسلمانوں کو نکال دیں گے) ایک صحابی زید بن ارقم نے یہ باتیں سن کر حضرت محمد ﷺ کے پاس نقل کردیں، آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی وغیرہ کو بلا کر تحقیق کی تو قسمیں کھا گئے کہ زید بن ارقم نے ہماری دشمنی سے جھوٹ کہہ دیا ہے، لوگ زید پر آوازیں کسنے لگے وہ بیچارے سخت محجوب اور نادم تھے، اس وقت

یہ آیات نازل ہوئیں حضور ﷺ نے زید کو فرمایا کہ اللہ نے تجھے سچا کیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی احمق اتنا نہیں سمجھتے کہ تمام آسمان و زمین کے خزانوں کا مالک تو اللہ ہے کیا جو لوگ خالص اس کی رضا جوئی کے لیے اس کے پیغمبر کی خدمت میں رہتے ہیں وہ ان کو بھوکوں مار دے گا، اور لوگ اگر ان کی امداد بند کر لیں گے تو وہ بھی اپنی روزی کے سب دروازے بند کر لے گا؟ سچ تو یہ ہے کہ جو بندے ان اللہ والوں پر خرچ کر رہے ہیں وہ بھی اللہ ہی کراتا ہے، اس کی توفیق نہ ہو تو نیک کام میں کوئی ایک پیسہ خرچ نہ کر سکے۔

يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ

کہتے ہیں البتہ اگر ہم پھر گئے مدینہ کو تو نکال دے گا جس کا زور ہے وہاں سے کمزور لوگوں کو، اور زور تو اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا

ع ۱۴

وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۟۸

اور ایمان والوں کا لیکن منافق نہیں جانتے

خلاصہ تفسیر: (اور) یہ (لوگ) یوں کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ میں لوٹ کر جائیں گے تو عزت والا وہاں سے ذلت والے کو باہر نکال دے گا (یعنی ہم ان مسافر پردیسیوں کو نکال باہر کر دیں گے) اور (اس بات میں جو اپنے کو عزت والا اور مسلمانوں کو ذلت والا کہتے ہیں یہ محض جہل ہے، بلکہ) اللہ ہی کی ہے عزت (اپنی ذات کے اعتبار سے) اور اس کے رسول کی (اللہ کے ساتھ تعلق کے واسطہ سے) اور مسلمانوں کی (اللہ اور رسول کے ساتھ تعلق کے واسطہ سے) ولیکن منافق جانتے نہیں (بلکہ عزت کا مدار مال، خدام و حشم وغیرہ کو سمجھتے ہیں جو کہ فانی چیزیں ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی منافق یہ نہیں جانتے کہ زور آور اور عزت والا کون ہے، یاد رکھو اصلی اور ذاتی عزت تو اللہ کی ہے، اس کے بعد اسی سے تعلق رکھنے کی بدولت درجہ بدرجہ رسول کی اور ایمان والوں کی، روایات میں ہے کہ عبداللہ بن ابی کے وہ الفاظ (کہ عزت والا ذلیل کو نکال دے گا) جب اس کے بیٹے حضرت عبداللہؓ بن عبداللہ کو پہنچے (جو مخلص مسلمان تھے) تو باپ کے سامنے تلوار لے کر کھڑے ہو گئے، بولے جب تک اقرار نہ کرلے گا تو رسول اللہ عزت والے ہیں اور تو ذلیل ہے، زندہ نہ چھوڑوں گا اور نہ مدینہ میں گھسنے دوں گا، آخر اقرار کرا کر چھوڑا (رضی اللہ عنہ)۔

ربط: منافقین کی توبیخ و تقبیح کے بعد آگے مؤمنین کو چند ہدایات کی گئی ہیں، یعنی تم دنیا میں پھنس کر اللہ کی اطاعت اور آخرت کی یاد سے غافل نہ ہو جانا جس طرح یہ لوگ ہو گئے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ

اے ایمان والو غافل نہ کر دیں تم کو تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے، اور جو کوئی یہ کام کرے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹

تو وہی لوگ ہیں ٹوٹے میں

خلاصہ تفسیر: پیچھے بیان ہوا کہ منافقین اپنے مال اور خدام و حشم پر گھمنڈ کرتے تھے، چنانچہ مؤمنین کو اب مال و اولاد کے ساتھ زیادہ دل لگانے سے منع کیا جاتا ہے۔

اے ایمان والو! تم کو تمہارے مال اور اولاد (مراد اس سے مجموعہ دنیا ہے) اللہ کی یاد (اور اطاعت) سے (مراد اس سے مجموعہ دین ہے) غافل نہ کرنے پائیں (یعنی دنیا میں ایسے منہمک مت ہو جانا کہ دین میں خلل پڑنے لگے) اور جو ایسا کرے گا ایسے لوگ ناکام رہنے والے ہیں (کیونکہ

دنیاوی نفع تو ختم ہو جائے گا، اور اخروی خسارہ اور نقصان ہمیشہ باقی رہ جائے گا)۔

* * *

فائدہ: یعنی آدمی کیلئے بڑے خسارے اور ٹوٹے کی بات ہے کہ باقی کو چھوڑ کر فانی میں مشغول ہو اور اعلیٰ سے ہٹ کر ادنیٰ میں پھنس جائے، مال واولاد وہی اچھی ہے جو اللہ کی یاد اور اس کی عبادت سے غافل نہ کرے، اگر ان دھندوں میں پڑ کر خدا کی یاد سے غافل ہو گیا تو آخرت بھی کھوئی اور دنیا میں قلبی سکون واطمینان نصیب نہ ہوا: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ:۱۲۴)

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ

اور خرچ کرو کچھ ہمارا دیا ہوا اس سے پہلے کہ آپہنچے تم میں کسی کو موت تب کہے اے رب کیوں نہ ڈھیل دی تو نے مجھ کو

اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ⑩ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ

ایک تھوڑی سی مدت کہ میں خیرات کرتا اور ہو جاتا نیک لوگوں میں، اور ہرگز نہ ڈھیل دے گا اللہ کسی جی کو جب آپہنچا اس کا وعدہ ۱

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑪ ع ۱۴

اور اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اب طاعات میں سے ایک مالی اطاعت کا حکم کیا جاتا ہے جو کہ گذشتہ آیت کے عام مضمون میں سے ایک خاص جزء ہے، یعنی) ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے (واجب حقوق کو) اس سے پہلے پہلے خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو پھر وہ (تمنا وحسرت کے طور پر) کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو اور تھوڑے دنوں مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا، اور (اس کی یہ تمنا وحسرت اس لئے غیر مفید ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جبکہ اس کی میعاد (عمر کے ختم ہونے پر) آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے (ویسی ہی جزاء کے مستحق ہو گے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ شاید منافقوں کے قول: لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (المنافقون:۷) کا جواب ہوا کہ خرچ کرنے میں خود تمہارا بھلا ہے جو کچھ صدقہ خیرات کرنا ہے جلدی کرو، ورنہ موت سر پر آپہنچے گی تو پچھتاؤ گے کہ ہم نے کیوں خدا کے راستہ میں خرچ نہ کیا، اس وقت (موت کے قریب) بخیل تمنا کرے گا کہ اے پروردگار! چند روز اور میری موت کو ملتوی کر دیتے کہ میں خوب صدقہ خیرات کر کے اور نیک بن کر حاضر ہوتا، لیکن وہاں التواء کیسا؟ جس شخص کی جس قدر عمر لکھ دی اور جو میعاد مقرر کر دی ہے، اسکے پورا ہو جانے پر ایک لمحہ کی ڈھیل اور تاخیر نہیں ہو سکتی۔

تنبیہ: ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ وہ اس تمنا کو قیامت کے دن پر حمل کرتے ہیں، یعنی محشر میں یہ آرزو کرے گا کہ کاش مجھے پھر دنیا کی طرف تھوڑی مدت کے لیے لوٹا دیا جائے تو خوب صدقہ کر کے اور نیک بن کر آؤں۔

فائدہ: ۲ اس کو یہ بھی خبر ہے کہ اگر بالفرض تمہاری موت ملتوی کر دی جائے یا محشر سے پھر دنیا کی طرف واپس کریں تب تم کیسے عمل کرو گے، وہ سب کی اندرونی استعدادوں کو جانتا ہے اور سب کے ظاہری و باطنی اعمال سے پوری طرح خبردار ہے، اسی کے موافق ہر ایک سے معاملہ کرے گا۔

اٰیاتها ۱۸　　٦٤ سُوْرَةُ التَّغَابُنِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۸　　رکوعاتها ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے اخیر میں آخرت کی ترغیب اور اس کی فکر نہ کرنے سے ڈرایا تھا، اب اس سورت میں آخرت کی فکر کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کی جزا کی تفصیل ہے، جس سے ترغیب اور دونوں کامل ہوگئیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①

پاکی بول رہا ہے اللہ کی جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، اسی کا راج ہے اور اسی کو تعریف ہے، اور وہی ہر چیز کر سکتا ہے

فائدہ: اور جس کسی کا راج دنیا میں دکھائی دیتا ہے وہ اسی کا دیا ہوا اور جس کی تعریف کی جاتی ہے وہ حقیقت میں اسی کی تعریف ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ②

وہی ہے جس نے تم کو بنایا پھر کوئی تم میں منکر ہے اور کوئی تم میں ایمان دار [1] اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے

خلاصہ تفسیر: سب چیزیں جو کچھ کہ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ کہ زمین میں ہیں اللہ کی پاکی (زبان سے یا اپنے حال سے) بیان کرتی ہیں، اسی کی سلطنت ہے اور وہی تعریف کے لائق ہے، اور وہ ہر شے پر قادر ہے (یہ تمہید ہے اگلے بیان کی کہ جب وہ ایسی صفات کمال کے ساتھ متصف ہے تو اس کی اطاعت واجب اور نافرمانی قبیح ہے) وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا (جس کا تقاضا یہ تھا کہ سب ایمان لاتے) سو (اس کے باوجود بھی) تم میں بعض کافر ہیں اور بعض مومن ہیں، اور اللہ تعالیٰ تمہارے (ایمانی وکفریہ) اعمال کو دیکھ رہا ہے (پس ہر ایک کے مناسب جزا دے گا)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی اسی نے سب آدمیوں کو بنایا، چاہیے تھا کہ سب اس پر ایمان لاتے اور اس منعم حقیقی کی اطاعت کرتے، مگر ہوا یہ کہ بعض منکر بن گئے اور بعض ایماندار، بیشک اللہ تعالیٰ نے آدمی میں دونوں طرف جانے کی استعداد اور قوت رکھی تھی، مگر اولاً سب کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا تھا پھر کوئی اس فطرت پر قائم رہا اور کسی نے گرد وپیش کے حالات سے متاثر ہو کر اس کے خلاف راہ اختیار کر لی اور ان دونوں کا علم اللہ کو ہمیشہ سے تھا کہ کون اپنے ارادہ اور اختیار سے کس طرف جائے گا، اور پھر اسی کے موافق سزا یا انعام واکرام کا مستحق ہوگا، یہ ہی چیز اپنے علم کے موافق اس کی قسمت میں لکھ دی تھی کہ ایسا ہوگا، اللہ کا علم محیط اس کو مستلزم نہیں کہ دنیا میں ارادہ واختیار کی قوت باقی نہ رہے، یہ مسئلہ دقیق ہے اور ہم اس پر ایک مستقل مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، واللہ الموفق والمعین۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③ يَعْلَمُ مَا

بنایا آسمانوں کو اور زمین کو تدبیر سے اور صورت کھینچی تمہاری پھر اچھی بنائی تمہاری صورت [1] اور اس کی طرف سب کو پھر جانا ہے، جانتا ہے جو

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ④

کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو کھول کر کرتے ہو اور اللہ کو معلوم ہے جیوں کی بات

خلاصہ تفسیر: اسی نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر (یعنی حکمت ومنفعت سے بھرپور) پیدا کیا اور تمہارا نقشہ بنایا سو عمدہ نقشہ

بنایا (کیونکہ انسانی اعضاء کے برابر کسی حیوان کے اعضاء میں تناسب نہیں) اور اس کے پاس (سب کو) لوٹنا ہے (اور) وہ سب چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سب چیزوں کو جانتا ہے جو تم پوشیدہ کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو، اور اللہ تعالیٰ دلوں تک کی باتوں کو جاننے والا ہے (اور یہ تمام امور اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ تم اس کی اطاعت کیا کرو)۔

* * *

فائدہ: لے سب جانوروں سے انسان کی خلقت اچھی ہے، دیکھنے میں بھی خوبصورت، اور ملکات وقویٰ میں بھی تمام عالم سے ممتاز، بلکہ سب کا مجموعہ اور خلاصہ، اسی لیے صوفیہ اسے ''عالم صغیر'' کہتے ہیں۔

اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫ فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِہِمۡ وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۵﴾

کیا پہنچی نہیں تم کو خبر ان لوگوں کی جو منکر ہو چکے ہیں پہلے، پھر انہوں نے چکھی سزا اپنے کام کی اور ان کو عذاب دردناک ہے

خلاصہ تفسیر: (مذکورہ تقاضوں اور مطالبوں کے علاوہ) کیا تم کو ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی (کہ وہ خبر پہنچنا بھی اطاعت کے لازم ہونے کو چاہتا ہے) جنہوں نے (تم سے) پہلے کفر کیا، پھر انہوں نے اپنے (ان) اعمال کا وبال (دنیا میں بھی) چکھا اور (اس کے علاوہ آخرت میں بھی) ان کے لئے عذاب دردناک ہونے والا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی تم سے پہلے بہت قومیں عاد وثمود وغیرہ ہلاک کی گئیں اور آخرت کا عذاب الگ رہا، یہ خطاب اہل مکہ کو ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہٗ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَقَالُوۡۤا اَبَشَرٌ یَّہۡدُوۡنَنَا ۫ فَکَفَرُوۡا وَتَوَلَّوۡا

یہ اس لیے کہ لاتے تھے ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں پھر کہتے کیا آدمی کو راہ سمجھائیں گے پھر منکر ہوئے اور منہ موڑ لیا لے

وَّاسۡتَغۡنَی اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۶﴾

اور اللہ نے بے پروائی کی اور اللہ بے پروا ہے سب تعریفوں والا ۲ے

خلاصہ تفسیر: یہ (دنیا میں وبال اور آخرت میں عذاب) اس سبب سے ہے کہ ان لوگوں کے پاس ان کے پیغمبر دلائل واضحہ لے کر آئے تو ان لوگوں نے (ان رسولوں کی نسبت) کہا کہ کیا آدمی ہم کو ہدایت کریں گے (یعنی بشر کہیں پیغمبر یا ہادی ہو سکتا ہے) غرض انہوں نے کفر کیا اور اعراض کیا اور خدا نے (بھی ان کی کچھ) پرواہ نہ کی (بلکہ عذاب میں گرفتار کر لیا) اور اللہ (سب سے) بے نیاز (اور) ستودہ صفات (بذات خود قابل تعریف) ہے (اس کو نہ کسی کے گناہ سے نقصان اور نہ کسی کی اطاعت سے نفع، خود اطاعت کرنے والے کا فائدہ اور گناہ کرنے والے کا نقصان ہے)۔

* * *

فائدہ: لے یعنی کیا ہم ہی جیسے آدمی ہادی بنا کر بھیجے گئے، بھیجنا تھا تو آسمان سے کسی فرشتہ کو بھیجتے گویا ان کے نزدیک بشریت اور رسالت میں منافات تھی، اسی لیے انہوں نے کفر اختیار کیا اور رسولوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

تنبیہ: اس آیت سے یہ ثابت کرنا کہ رسول کو بشر کہنے والا کافر ہے انتہائی جہل والحاد ہے، اس کے برعکس اگر کوئی یہ کہہ دے کہ آیت ان لوگوں کے کفر پر دلالت کر رہی ہے جو رسل بنی آدم کے بشر ہونے کا انکار کریں، تو یہ دعویٰ پہلے دعوے سے زیادہ قوی ہوگا۔

فائدہ: ۲ے یعنی اللہ کو کیا پرواہ تھی، انہوں نے منہ موڑ لیا تو اللہ نے ادھر سے نظر رحمت اٹھالی۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ

دعویٰ کرتے ہیں منکر کہ ہرگز انکو کوئی نہ اٹھائے گا ۱؎ تو کہہ کیوں نہیں قسم ہے میرے رب کی تم کو بیشک اٹھانا ہے پھر تم کو جتلانا ہے جو کچھ تم نے کیا

وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷

اور یہ اللہ پر آسان ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور) یہ کافر (آخرت کے عذاب کا مضمون سن کر جیسا کہ پیچھے مذکور ہے) یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہرگز دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے (اب اس عذاب کا واقع ہونا بتلایا جاتا ہے) آپ کہہ دیجئے کہ کیوں نہیں، واللہ ضرور دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے پھر جو کچھ تم نے کیا ہے تم سب کو جتلا دیا جائے گا (اور اس پر سزا دی جائے گی) اور یہ (بعث و جزاء) اللہ کو (کمال قدرت کی وجہ سے) بالکل آسان ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ رسالت کی طرح بعث بعد الموت کا بھی انکار ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دوبارہ اٹھانا اور سب کا حساب کر دینا اللہ کو کیا مشکل ہے پوری طرح یقین رکھو کہ یہ ضرور ہو کر رہے گا، کسی کے انکار کرنے سے وہ آنے والی گھڑی ٹل نہیں سکتی، لہذا مناسب ہے کہ انکار چھوڑ کر اس وقت کی فکر کرو۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۸

سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے اتارا ۱؎ اور اللہ کو تمہارے سب کام کی خبر ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو (جب یہ ایمان کے تقاضے اور مطالبے جمع ہیں تو تم کو چاہئے کہ) تم اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر (یعنی قرآن پر) جو ہم نے نازل کیا ہے ایمان لاؤ، اور اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی قرآن کریم پر۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ایمان کے ساتھ عمل بھی ہونا چاہیے۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ

جس دن تم کو اکٹھا کرے گا جمع ہونے کے دن وہ دن ہے ہار جیت کا ۱؎ اور جو کوئی یقین لائے اللہ پر اور کرے کام بھلا اتار دے گا اس پر

سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۹

اس کی برائیاں ۲؎ اور داخل کرے گا اس کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں ندیاں رہا کریں ان میں ہمیشہ یہی ہے بڑی مراد ملنی ۳؎

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۰ ع ۱۵

اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلائیں انہوں نے ہماری آیتیں وہ لوگ ہیں دوزخ والے رہا کریں اسی میں، اور بری جگہ جا پہنچے

خلاصہ تفسیر: (اور اس دن کو یاد کرو) جس دن کہ تم سب کو اس جمع ہونے کے دن میں جمع کرے گا یہی دن ہے سود و زیاں (نفع و نقصان کے ظاہر ہونے) کا (یعنی مسلمانوں کا نفع اور کافروں کا نقصان اس روز عملاً ظاہر ہو جائے گا) اور (بیان اس کا یہ ہے کہ) جو شخص اللہ پر ایمان

رکھتا ہوگا اور نیک کام کرتا ہوگا اللہ اس کے گناہ دور کرے دے گا اور اس کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے، اور جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا یہ لوگ دوزخی ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس دن دوزخی ہاریں گے اور جنتی جیتیں گے، ہارنا یہ ہی کہ اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو بے موقع خرچ کر کے رأس المال بھی کھو بیٹھے اور جیتنا یہ کہ ایک ایک کے ہزاروں پائے آگے اسی کی کچھ تفصیل ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جو تقصیرات ہوئی ہیں ایمان اور نیک کاموں کی برکت سے معاف کر دی جائیں گی۔

فائدہ: ۳؎ جو جنت میں پہنچ گیا سب مرادیں مل گئیں، اللہ کی رضا اور دیدار کا مقام بھی وہ ہی ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑪

نہیں پہنچتی کوئی تکلیف بدون حکم اللہ کے اور جو کوئی یقین لائے اللہ پر وہ راہ بتلائے اس کے دل کو ۱؎ اور اللہ کو ہر چیز معلوم ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: جس طرح کفر آخرت کی فلاح سے بالکل روکتا ہے اسی طرح مصیبت میں پڑ کر یا اولاد اور بیوی کی محبت میں مشغول ہو کر خدا کے احکام میں کوتاہی کرنا بھی آخرت کی فلاح سے کسی قدر روکتا ہے، پس پہلے مصیبت کے لیے ایک تعلیم فرماتے ہیں کہ:

(اس مصیبت کے وقت میں یہ سمجھنا چاہئے کہ) کوئی مصیبت بدون خدا کے حکم کے نہیں آتی (یہ سمجھ کر صبر و رضا اختیار کرنا چاہئے) اور جو شخص اللہ پر (پورا) ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو (صبر و رضا کی) راہ دکھا دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (کہ کس نے صبر و رضا اختیار کیا اور کس نے نہیں کیا اور ہر ایک کو حکمت کے مطابق جزاء و سزا دیتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ دنیا میں کوئی مصیبت اور سختی اللہ کی مشیت و ارادہ کے بدون نہیں پہنچتی، مومن کو جب اس بات کا یقین ہے تو اس پر غمگین اور بددل ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ بہر صورت مالک حقیقی کے فیصلہ پر راضی رہنا چاہیے اور یوں کہنا چاہیے:

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اس طرح اللہ تعالیٰ مومن کے دل کو صبر و تسلیم کی راہ بتلا دیتا ہے، جس کے بعد عرفان و ایقان کی عجیب و غریب راہیں کھلتی ہیں، اور باطنی ترقیات اور قلبی کیفیات کا دروازہ مفتوح ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جو تکلیف و مصیبت اس نے بھیجی عین علم و حکمت سے بھیجی، اور وہی جانتا ہے کہ کون تم میں سے واقعی صبر و استقامت اور تسلیم و رضا کی راہ پر چلا، اور کس کا دل کن احوال و کیفیات کا مورد بننے کے قابل ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑫

اور حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا، پھر اگر تم منہ موڑو تو ہمارے رسول کا تو یہی کام ہے پہنچا دینا کھول کر ۱؎

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑬

اللہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور اللہ پر چاہیے بھروسہ کریں ایمان والے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر معاملہ میں جس میں مصائب بھی داخل ہیں) اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور اگر تم

(اطاعت سے) اعراض کرو گے تو (یاد رکھو کہ) ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (جس کو وہ بہترین طریقے سے کر چکے ہیں، اس لئے ان کا تو کوئی نقصان نہیں، تمہارا ہی نقصان ہوگا، چونکہ اللہ کو تو نقصان پہنچنے کا احتمال ہی نہیں اس لئے اس کو یہاں بیان نہیں کیا، تم لوگوں کو اور خصوصا اہل مصیبت کو یوں سمجھنا چاہئے کہ) اللہ کے سوا کوئی معبود (بننے کے قابل) نہیں (پس اسی کو معبود سمجھنا چاہیے) اور مسلمانوں کو اللہ ہی پر (مصائب وغیرہ میں) توکل رکھنا چاہئے۔

* * *

فائدہ: ۱ے یعنی نرمی وسختی اور تکلیف وراحت، غرض ہر حالت میں اللہ ورسول کا حکم مانو، اگر ایسا نہ کرو گے تو خود تمہارا نقصان ہے، رسول سب نیک وبد سمجھا کر اپنا فرض ادا کر چکا، اللہ کو تمہاری اطاعت ومعصیت سے کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

فائدہ: ۲ے یعنی معبود اور مستعان تنہا اسی کی ذات ہے، نہ کسی اور کی بندگی نہ کوئی دوسرا بھروسہ کے لائق۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا

اے ایمان والو تمہاری بعض جوروئیں اور اولاد دشمن ہیں تمہارے ۱ے سو ان سے بچتے رہو اور اگر معاف کرو

وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾

اور درگزر رو اور بخشو تو اللہ ہے بخشنے والا مہربان ۲ے

خلاصہ تفسیر: اے ایمان والو! (جیسے مصیبت میں تم کو صبر ورضا کا حکم کیا گیا ہے تاکہ وہ آخرت سے مانع نہ ہو، اسی طرح نعمت کے بارے میں تم کو حکم کیا جاتا ہے کہ اس میں منہمک نہ ہو، تاکہ وہ بھی آخرت سے مانع نہ ہو، پس نعمت کے بارے میں یوں سمجھنا چاہئے کہ:) تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہارے (دین کے) دشمن ہیں (جبکہ وہ اپنے دنیاوی فائدہ کی خاطر تم کو ایسی بات کا حکم کریں جو تمہارے لئے اخروی اعتبار سے نقصان دہ ہو) سو تم ان سے (یعنی ایسوں سے) ہوشیار رہو (اور ان کے ایسے حکم پر عمل مت کرو) اور اگر (تم کو ایسی فرمائشوں پر غصہ آئے تو اس وقت ان پر سختی نہ کرو، اور وہ معذرت اور توبہ کریں تو) تم (ان کی وہ خطا) معاف کر دو (یعنی سزا نہ دو) اور درگزر کر جاؤ (یعنی زیادہ ملامت نہ کرو) اور بخش دو (یعنی اس کو دل اور زبان سے بھلا دو) تو اللہ تعالیٰ (تمہارے گناہوں کا) بخشنے والا (اور تمہارے حال پر) رحم کرنے والا ہے۔

اس میں درگزر و معافی کی ترغیب ہے، یہ معافی بعض اوقات واجب ہے جبکہ سزا سے غالب احتمال بے باکی کا ہو، اور بعض اوقات مستحب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ے بہت مرتبہ آدمی بیوی بچوں کی محبت اور فکر میں پھنس کر اللہ کو اور اس کے احکام کو بھلا دیتا ہے، ان تعلقات کے پیچھے کتنی برائیوں کا ارتکاب کرتا اور کتنی بھلائیوں سے محروم رہتا ہے، بیوی اور اولاد کی فرمائشیں اور رضا جوئی اسے کسی وقت دم نہیں لینے دیتی، اس چکر میں پڑ کر آخرت سے غافل ہو جاتا ہے، ظاہر ہے جو اہل وعیال اتنے بڑے خسارے اور نقصان کا سبب بنیں، وہ حقیقۃً اس کے دوست نہیں کہلا سکتے بلکہ بدترین دشمن ہیں، جن کی دشمنی کا احساس بھی بسا اوقات انسان کو نہیں ہوتا، اسی لیے حق تعالیٰ نے متنبہ فرمادیا کہ ان دشمنوں سے ہوشیار رہو اور ایسا رویہ اختیار کرنے سے بچو جس کا نتیجہ ان کی دنیا سنوارنے کی خاطر اپنا دین برباد کرنے کے سوا کچھ نہ ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں سب بیویاں اور ساری اولاد اسی قماش کی ہوتی ہے، بہت اللہ کی بندیاں ہیں جو اپنے شوہروں کے دین کی حفاظت کرتی اور نیک کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتی ہیں، اور کتنی ہی سعادت مند اولاد ہے جو اپنے والدین کے لیے باقیات صالحات بنتی ہے، جعلنا اللہ منهم بِفَضْلِهٖ وَمَنِّهٖ۔

فائدہ: ۲ے یعنی اگر انہوں نے تمہارے ساتھ دشمنی کی اور تم کو دینی یا دنیاوی نقصان پہنچ گیا تو اس کا اثر یہ نہ ہونا چاہیے کہ تم انتقام کے درپے ہو جاؤ، اور ان پر نامناسب سختی شروع کر دو، ایسا کرنے سے دنیا کا انتظام درہم برہم ہو جائے گا، جہاں تک عقلاً وشرعاً گنجائش ہو ان کی حماقتوں اور

کوتاہیوں کو معاف کرو اور عفو و درگزر سے کام لو، ان مکارم اخلاق پر اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ مہربانی کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرمائے گا۔

إِنَّمَآ أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِندَهُۥٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿١٥﴾

تمہارے مال اور تمہاری اولاد یہی ہیں جانچنے کو اور اللہ جو ہے اس کے پاس ہے ثواب بڑا

خلاصہ تفسیر: (اب اولاد کے ساتھ اموال کے متعلق بھی اسی قسم کا مضمون ہے کہ) تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے (کہ دیکھیں کون ان میں پڑ کر خدا کے احکام کو بھول جاتا ہے اور کون یاد رکھتا ہے) اور (جو شخص ان میں پڑ کر اللہ کو یاد رکھے گا تو) اللہ کے پاس (اس کے لئے) بڑا اجر ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ مال و اولاد دے کر تم کو جانچتا ہے کہ کون ان فانی اور زائل چیزوں میں پھنس کر آخرت کی باقی و دائم نعمتوں کو فراموش کرتا ہے اور کس نے ان سامانوں کو اپنی آخرت کا ذخیرہ بنایا ہے اور وہاں کے اجر عظیم کو یہاں کے حظوظ و مالوفات پر ترجیح دی ہے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ ۗ وَمَن يُوقَ شُحَّ

سو ڈرو اللہ سے جہاں تک ہو سکے اور سنو اور مانو۱ اور خرچ کرو اپنے بھلے کو۲ اور جس کو بچا دیا

نَفْسِهِۦ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٦﴾

اپنے جی کے لالچ سے سو وہ لوگ وہی مراد کو پہنچے ۳

خلاصہ تفسیر: تو (ان سب باتوں کو سن کر) جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام) سنو اور مانو اور (خصوصاً جہاں خرچ کرنے کا موقع اور حکم ہو وہاں) خرچ (بھی) کیا کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا (غالباً خرچ کرنے کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے بیان کیا کہ یہ نفس پر زیادہ گراں اور شاق ہے) اور جو شخص نفسانی حرص سے محفوظ رہا ایسے ہی لوگ (آخرت میں) فلاح پانے والے ہیں۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ: اس میں دلالت ہے کہ سلوک و اصلاح نفس میں تدریجی اقدام کافی ہے (تکمیل ہو ہی جاتی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ سے ڈر کر جہاں تک ہو سکے اس جانچ میں ثابت قدم رہو اور اس کی بات سنو اور مانو۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے تمہارا ہی بھلا ہوگا۔

فائدہ: ۳ یعنی مراد کو وہ ہی شخص پہنچتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے دل کے لالچ سے بچا دے اور حرص و بخل سے محفوظ رکھے۔

إِن تُقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٧﴾

اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح پر قرض دینا وہ دونا کر دے تم کو اور تم کو بخشے۱ اور اللہ قدردان ہے تحمل والا۲

عَٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَٰدَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٨﴾ ع

جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا زبردست حکمت والا ۳

خلاصہ تفسیر: (اب خرچ کرنے کو بہتر اور فلاح و کامیابی کا سبب ہونا بیان کرتے ہیں کہ) اگر تم اللہ کو اچھی طرح (خلوص کے

ساتھ) قرض دو گے تو وہ اس کو تمہارے لئے بڑھاتا چلا جائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا قدردان ہے (کہ عمل صالح کو قبول فرماتا ہے اور)
بڑا بردبار ہے (کہ گناہ پر فوری پکڑ اور مواخذہ نہیں فرماتا، اور) پوشیدہ اور ظاہر (اعمال) کا جاننے والا ہے (اور) زبردست ہے (اور) حکمت والا ہے۔
شکور سے حکیم تک تمام مضامین اس سورت کے لئے بمنزلہ علت کے ہیں، سورت کے سب مضامین ان پر مرتب و متفرع ہو سکتے ہیں۔

* * *

فائدہ: لے یعنی اللہ کی راہ میں اخلاص اور نیک نیتی سے طیب مال خرچ کرو تو اللہ اس سے کہیں زیادہ دے گا اور تمہاری کوتاہیوں کو معاف فرمائے گا، اس طرح کا مضمون پہلے کئی جگہ گزر چکا ہے، وہیں ہم نے پوری تقریر کی ہے۔
فائدہ: ٢ قدردانی کی بات یہ ہے کہ تھوڑے عمل پر بہت سا ثواب دیتا ہے، اور تحمل یہ کہ گناہ دیکھ کر فوراً عذاب نہیں بھیجتا، پھر بہت سے مجرموں کو بالکل معاف اور بہتیروں کی سزا میں تخفیف کرتا ہے۔
فائدہ: ٣ یعنی اسی کو ظاہری اعمال اور باطنی نیتوں کی خبر ہے اپنی زبردست قوت اور حکمت سے اس کے مناسب بدلہ دے گا۔

ایاتها ١٢ — ٦٥ سُوْرَةُ الطَّلَاقِ مَدَنِيَّةٌ ٩٩ — رکوعاتها ٢

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے اخیر میں بعض بیویوں اور اولاد کا دشمن ہونا مذکور تھا، چونکہ بعض دفعہ یہ دشمنی کا خیال ان کے واجب حقوق ادا کرنے سے بھی مانع ہوجاتا ہے، خصوصاً جبکہ طلاق وغیرہ سے علیحدگی بھی ہوجائے، اس لیے اب اس سورت میں مطلقہ عورتوں اور شیرخوار بچوں کے بعض احکام بیان کرنے سے اس کی اصلاح ہوگئی کہ جب علیحدگی میں بھی حقوق کی رعایت واجب ہے تو موافقت اور ساتھ رہنے کی صورت میں تو بدرجہ اولی واجب ہوگی، اور چونکہ ان احکام کے درمیان میں چار جگہ تقوی کا حکم اور ترغیب ہے اس لیے دوسرے رکوع میں تقوی کی تاکید ہے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دنیاوی معاملات میں بھی شرعی احکام کی رعایت واجب ہے، بخلاف بعض جاہلوں کے کہ وہ دنیاوی معاملات کو شریعت سے خارج سمجھتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ

اے نبی جب تم طلاق دو عورتوں کو تو ان کو طلاق دو ان کی عدت پر لے اور گنتے رہو عدت کو ٢ اور ڈرو اللہ سے جو رب ہے تمہارا

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ

مت نکالو ان کو ان کے گھروں سے ٣ اور وہ بھی نہ نکلیں مگر جو کریں صریح بےحیائی ٤ اور یہ حدیں ہیں باندھی ہوئی

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ①

اللہ کی اور جو کوئی بڑھے اللہ کی حدوں سے تو اس نے برا کیا اپنا ۵ اس کو خبر نہیں ٦ شاید اللہ پیدا کر دے اس طلاق کے بعد نئی صورت ٧

خلاصہ تفسیر: اے پیغمبر! (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) جب تم لوگ (ایسی) عورتوں کو طلاق دینے لگو (جن سے صحبت یا خلوت وتنہائی ہوچکی ہو، کیونکہ تنہائی سے بھی عدت واجب ہوجاتی ہے چاہے صحبت نہ کی ہو، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: **ثم طلقتموهن من قبل ان تمسوهن فمالكم عليهن من عدة**) تو ان کو (زمانہ) عدت (یعنی حیض) سے پہلے (یعنی طہر میں) طلاق دو (یعنی اس طہر میں صحبت نہ ہو جس میں طلاق دینی ہے) اور (طلاق دینے کے بعد) تم عدت کو یاد رکھو (یعنی مرد وعورت سب یاد رکھیں) اور اللہ سے ڈرتے رہو جو تمہارا رب ہے

(یعنی ان ابواب میں جو اللہ کے احکام ہیں ان کے خلاف نہ کرو، مثلاً یہ کہ تین طلاق ایک ساتھ مت دو، اور حالت حیض میں بھی طلاق مت دو جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے، اور یہ کہ عدت میں) ان عورتوں کو ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو (کیونکہ مطلقہ عورت کا حق سکونت بالکل اسی طرح واجب ہے جیسے کہ منکوحہ عورت کا) اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں (کیونکہ سکونت کا حق صرف شوہر کا حق نہیں جو اس کی رضامندی سے ساقط ہو جائے، بلکہ شرعی حق ہے) مگر ہاں! کوئی کھلی بے حیائی کریں تو اور بات ہے (مثلاً بدکاری یا چوری کا ارتکاب کریں تو بطور سزا نکالی جائیں) اور یہ سب خدا کے مقرر کئے ہوئے احکام ہیں، اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کرے گا (مثلاً اس عورت کو گھر سے نکال دے تو) اس نے اپنے اوپر ظلم کیا (یعنی گناہگار ہوا، اب آگے طلاق دینے والے کو ترغیب دیتے ہیں کہ طلاق میں طلاق رجعی بہتر ہے، پس ارشاد ہے کہ اے طلاق دینے والے!) تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ بعد اس (طلاق دینے) کے کوئی نئی بات (تیرے دل میں) پیدا کر دے (مثلاً طلاق دینے کے بعد شرمندگی ہو تو طلاق رجعی میں اس کا تدارک آسانی سے ہو سکے گا)۔

فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ: عدت (حیض) سے پہلے طلاق دو، مطلب یہ کہ حیض کی حالت میں طلاق نہ دو، بلکہ ایسے طہر میں طلاق دو جس میں صحبت نہ کی ہو، اور یہ بات صحیح احادیث سے ثابت ہے، یہ تفسیر مذہب حنفی پر ہے کہ ان کے نزدیک عدت حیض سے شمار کی جاتی ہے، اور شوافع کے نزدیک معنی یہ ہوں گے کہ ان کو شروع عدت میں طلاق دو، یعنی طہر ہی عدت ہے، طہر ہی میں طلاق دو، پس حدیث کے مطابق یہاں سب کے نزدیک **لِعِدَّتِهِنَّ** کے معنی ''فی قبل عدتھن'' ہیں (یعنی ان کی عدت سے پہلے) مضاف محذوف ہے، پھر ''قبل'' کے معنی میں حنفیہ و شافعیہ کا اختلاف ہے، حنفیہ کے نزدیک عدت حیض سے شمار ہوتی ہے تو ان کے نزدیک ''قبل'' کے معنی استقبال اور آمد کے ہیں، مطلب یہ ہوا کہ حیض آنے سے پہلے یعنی طہر میں طلاق دو، مطلب جس طہر میں طلاق دینے کا ارادہ ہو اس میں عورت سے صحبت نہ کرے اور آخر طہر میں حیض شروع ہونے سے پہلے طلاق دے دے، اور شافعیہ کے نزدیک عدت طہر ہی سے شروع ہے تو ان کے نزدیک ''قبل'' کے معنی ابتداء کے ہیں، یعنی بالکل شروع طہر میں طلاق دے دی جائے، اس کا حاصل بھی وہی ہوا کہ طلاق طہر میں ہونی چاہئے، لیکن جس طہر میں طلاق دی جائے گی حنفیہ کے نزدیک وہ عدت میں شمار نہ ہوگا، بلکہ عدت حیض سے شمار ہوگی اور شافعیہ کے نزدیک وہ طہر بھی عدت میں شمار ہوگا۔

وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ: معنی یہ ہیں کہ عدت کے ایام کو اہتمام کے ساتھ یاد رکھنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ بھول میں پڑ کر اختتام عدت سے پہلے ہی ختم سمجھ لے، اور یہ ذمہ داری ایام عدت کو محفوظ رکھنے کی مرد و عورت دونوں پر عائد ہے، مگر یہاں صیغہ مذکر استعمال کیا گیا، کیونکہ عام طور پر جو احکام مرد و عورت میں مشترک ہیں ان میں عموماً خطاب بصیغہ مذکر ہی آتا ہے عورتیں تبعاً اس میں داخل سمجھی جاتی ہیں اور اس خاص مسئلہ میں مردوں کو مخاطب کرنے میں حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عورتوں میں غفلت کا عنصر غالب ہوتا ہے تو مردوں کو بھی عدت کے ایام کو یاد رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے، اس لئے براہ راست ذمہ داری مردوں پر ڈال دی گئی۔

اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ: بعض علماء کے بقول بدکاری اور چوری کے علاوہ اگر زبان درازی، اور ہر وقت کی بحث و تکرار رکھتی ہوں تو ان کو نکال دینا بھی جائز ہے۔

لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا: یعنی تجھ کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ بعد اس کے کوئی نئی بات پیدا کر دے، اس میں جس طرح طلاق رجعی کی ترغیب دی گئی ہے اسی طرح یہاں آیت میں مذکور بقیہ احکام کے لیے بھی یہ جملہ صراحۃً یا اشارۃً علت کے طور پر بھی ہو سکتا ہے، مثلاً عدت یاد رکھنے میں علت اس طرح ہے کہ اگر عدت یاد نہ ہو تو اب طلاق سے رجوع کر کے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لیے عدت کا شمار یاد رکھنا چاہیے، اسی طرح ایک ساتھ تین طلاق نہ دینے کی علت اس طرح ہے کہ اگر ایک طلاق دیتا تو بعد میں رجوع کی گنجائش موجود تھی، لیکن جب تین طلاق ایک ساتھ دے دیں تو اب رجوع نہیں کر سکتا، اسی طرح حیض میں طلاق نہ دینے کی علت اس طرح ہے کہ شاید حیض کی وجہ سے دوری طلاق کا باعث ہو، پھر طہر کی حالت میں وہ دوری ختم ہو جائے اور طبیعت میں رغبت اور آمادگی پیدا ہو جائے اور نکاح میں رکھنے کا ارادہ ہو تو اپنی حماقت پر افسوس، ندامت اور حسرت

ہو، اور گھر سے نکالنے سے جو منع کیا تو اس میں علت اس طرح ہوگی کہ گھر سے نکالنے کی صورت میں بعض رجوع یا تجدید نکاح میں رکاوٹ پیش آجاتی ہے، عورت خود بھی گھر سے نہ نکلے تو اس میں علت اس طرح ہوگی کہ بعض اوقات مرد کو نفرت بڑھ جاتی ہے اور ایک جگہ رہنے میں ممکن ہے کہ مرد کو رجوع یا تجدید نکاح کا خیال پیدا ہو جائے، سو لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا اِن سب کو عام ہو جائے گا، یعنی آیت میں مذکور احکامات کی خلاف ورزی کر کے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پھر بعد میں پچھتاؤ۔

آیت کے اس آخری جملہ میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ جس معاملہ کی مختلف شقوں میں مختلف مصلحتیں ہوں تو اس کے متعلق قطعی اور یقینی فیصلہ میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔

* * *

فائدہ: لے يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ: نبی کو مخاطب بنا کر یہ ساری امت سے خطاب ہے، یعنی جب کوئی شخص (کسی ضرورت اور مجبوری سے) اپنی عورت کو طلاق دینے کا ارادہ کرے تو چاہیے کہ عدت پر طلاق دے، سورۃ بقرہ میں آچکا کہ مطلقہ کی عدت تین حیض ہیں (کما ھو مذھب الحنفیہ) لہٰذا حیض سے پہلے حالت طہر میں طلاق دینا چاہیے تا کہ سارا حیض گنتی میں آئے، اگر فرض کیجیے حالت حیض میں طلاق دے گا تو دو حال سے خالی نہیں: ① جس حیض میں طلاق دی ہے اس کو عدت میں شمار کریں گے ② یا [عدت میں شمار] نہ کریں گے۔

پہلی صورت میں ایقاع طلاق سے پہلے جس قدر وقت حیض کا گزر چکا، وہ عدت میں سے کم ہو جائے گا اور پورے تین حیض عدت کے باقی رہیں گے، اور دوسری صورت میں جب موجودہ حیض کے علاوہ تین حیض لیں گے تو یہ حیض تین سے زائد ہوگا، اس لیے مشروع طریقہ یہ ہے کہ طہر میں طلاق دی جائے اور حدیث سے یہ قید بھی ثابت ہے کہ اس طہر میں صحبت نہ کی ہو۔

فائدہ: ۲ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ: یعنی مرد و عورت دونوں کو چاہیے کہ عدت کو یاد رکھیں، کہیں غفلت و سہو کی وجہ سے کوئی بے احتیاطی اور گڑبڑ نہ ہو جائے، نیز طلاق ایسی طرح دیں کہ ایام عدت کی گنتی میں کمی بیشی لازم نہ آئے، جیسا کہ اوپر کے فائدہ میں بتلایا جا چکا ہے۔

فائدہ: ۳ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ: یعنی اللہ سے ڈر کر احکام شریعت کی پابندی رکھنی چاہیے جن میں سے ایک حکم یہ ہے کہ ① حالت حیض میں طلاق نہ دی جائے اور ② تین طلاقیں ایک دم نہ ڈالی جائیں اور ③ مطلقہ عورت کو اس کے رہنے کے گھر سے نہ نکالا جائے، وغیر ذلک۔

فائدہ: ۴ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ: یعنی عورتیں خود بھی اپنی مرضی سے نہ نکلیں، کیونکہ یہ سکنیٰ محض حق العبد نہیں کہ اس کی رضا سے ساقط ہو جائے، بلکہ حق الشرع ہے، ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں مثلاً بدکاری یا سرقہ کی مرتکب ہوں یا بقول بعض علماء زبان درازی کریں اور ہر وقت کا رنج و تکرار رکھتی ہوں تو نکالنا جائز ہے اور اگر بے وجہ نکلیں گی تو یہ خود صریح بے حیائی کا کام ہوگا۔

فائدہ: ۵ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ: یعنی گنہگار ہو کر اللہ کے ہاں سزا کا مستوجب ہوا۔

فائدہ: ۶ لَا تَدْرِيْ: لا تدری کا ترجمہ ''اس کو خبر نہیں'' بصیغہ غائب کیا ہے تا معلوم ہو جائے کہ خطاب اسی طلاق دینے والے کو ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نہیں۔

فائدہ: ۷ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا: یعنی شاید پھر دونوں میں صلح ہو جائے اور طلاق پر ندامت ہو۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ

پھر جب پہنچیں اپنے وعدہ کو تو رکھ لو ان کو دستور کے موافق یا چھوڑ دو ان کو دستور کے موافق لے اور گواہ کرلو دو معتبر

مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

اپنے میں کے ۲ اور سیدھی ادا کرو گواہی اللہ کے واسطے ۳ یہ بات جو ہے اس سے سمجھ جائے گا جو کوئی یقین رکھتا ہو گا اللہ پر اور پچھلے دن پر ۴

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝۲

اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے وہ کر دے اس کا گزارہ ۵

خلاصہ تفسیر: پھر جب وہ (مطلقہ) عورتیں (جبکہ ان کو طلاق رجعی دی ہو آگے فامسکوھن کے قرینہ کی وجہ سے) اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں (اور عدت ختم نہیں ہوئی) تو (تم کو دو اختیار ہیں: یا تو) ان کو قاعدہ کے موافق (رجوع کر کے) نکاح میں رہنے دو یا قاعدہ کے موافق ان کو رہائی دو (یعنی عدت ختم ہونے تک رجوع نہ کرو، مطلب یہ کہ تیسرا کام مت کرو کہ رکھنا بھی مقصود نہ ہو مگر فقط عورت کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے عدت بڑھانے کے لیے رجوع کر لو) اور (جو کچھ بھی کرو یعنی رجوع یا علیحدگی تو اس پر) آپس میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کر لو (یہ گواہ کرنا مستحب ہے، رجوع اس پر موقوف نہیں) اور (اے گواہو! اگر گواہی کی ضرورت پڑے تو) تم ٹھیک ٹھیک اللہ کے واسطے (کسی رورعایت کے بغیر) گواہی دو، اس مضمون سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور یوم قیامت پر یقین رکھتا ہو (مطلب یہ کہ ایماندار ہی نصائح سے فائدہ اٹھاتے ہیں ورنہ نصائح تو سب کے لئے عام ہیں) اور (پیچھے جو تقویٰ کا حکم ہے احکام کے درمیان اس کی متعدد فضیلتیں ارشاد فرماتے ہیں، ایک فضیلت یہ کہ) جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے (نقصانات میں) نجات کی شکل نکال دیتا ہے (اور منافع عطا فرماتا ہے)۔

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ: گواہ کر لینا رجوع کرنے کی صورت میں تو اس لئے ہے کہ عدت ختم ہونے کے بعد کہیں عورت اختلاف نہ کرنے لگے، یعنی رجوع سے انکار کر کے اس کے نکاح سے نکل جانے کا دعویٰ نہ کرنے لگے، اور علیحدگی یعنی نکاح ختم ہو جانے کی صورت میں گواہ اس لیے کہ کہیں کل کو خود مرد کا نفس شرارت نہ کرنے لگے کہ جھوٹا دعویٰ کر دے کہ میں تو عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر چکا تھا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ: یعنی طلاق رجعی میں جب عدت ختم ہونے کو آئے تو تم کو دو باتوں میں ایک کا اختیار ہے: ① یا عدت ختم ہونے سے پہلے عورت کو دستور کے موافق رجعت کر کے اپنے نکاح میں رہنے دو ② یا عدت منقضی [ختم] ہونے پر معقول طریقہ سے اس کو جدا کر دو، مطلب یہ ہے کہ رکھنا ہو تب اور الگ کرنا ہو تب، ہر حالت میں آدمیت اور شریعت کا برتاؤ کرو، یہ بات مت کرو کہ رکھنا بھی مقصود نہ ہو اور خواہ مخواہ تطویل عدت کے لیے رجعت کر لیا کرو، یا در رکھنے کی صورت میں اسے ایذاء پہنچاؤ اور طعن و تشنیع کرو۔

فائدہ: ۲۔ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ: یعنی طلاق دے کر عدت ختم ہونے سے پہلے اگر نکاح میں رکھنا چاہے تو رجعت پر وہ گواہ کرے تاکہ لوگوں میں متہم نہ ہو۔

فائدہ: ۳۔ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ: یہ گواہوں کو ہدایت ہے کہ شہادت کے وقت ٹیڑھی ترچھی بات نہ کریں سچی اور سیدھی بات کہنی چاہیے۔

فائدہ: ۴۔ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: زمانہ جاہلیت میں عورتوں پر بہت ظلم ہوتا تھا، بعض لوگ عورت کو سو سو مرتبہ طلاق دیتے تھے اور اس کے بعد بھی اس کی مصیبت کا خاتمہ نہ ہوتا تھا، قرآن نے جابجا وحشیانہ مظالم اور بے رحمیوں کے خلاف آواز بلند کی، اور نکاح وطلاق کے حقوق وحدود پر نہایت صاف روشنی ڈالی، بالخصوص اس سورت میں منجملہ دوسری حکیمانہ ہدایات ونصائح کے ایک نہایت ہی جامع مانع اور ہمہ گیر اصول: **فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ** (الطلاق: ۲) بیان فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کو رکھو تو معقول طریقہ سے رکھو اور چھوڑو تب بھی معقول طریقہ سے چھوڑو لیکن ان زریں نصیحتوں سے منتفع وہ ہی شخص ہو سکتا ہے جس کو خدا اور یوم آخرت پر یقین ہو، کیونکہ یہ ہی یقین انسان کے دل میں اللہ کا ڈر پیدا کرتا ہے اور اسی ڈر سے آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جس طرح ایک کمزور عورت بخت واتفاق سے ہمارے قبضہ واقتدار میں آئی ہے، ہم سب کسی قہار ہستی کے قبضہ واقتدار میں ہیں، یہ ہی ایک خیال ہے جو آدمی کو ہر حالت میں ظلم وتعدی سے روک سکتا اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر ابھارتا ہے، اسی لیے سورۃ ہذا میں خصوصی طور پر اتقاء (پرہیزگاری اور خدا کے خوف) پر بہت زور دیا گیا ہے۔

فائدہ:۵ **وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا:** یعنی اللہ سے ڈر کر اس کے احکام کی بہر حال تعمیل کرو، خواہ کتنی ہی مشکلات وشدائد کا سامنا کرنا پڑے، حق تعالیٰ تمام مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دے گا، اور سختیوں میں بھی گزارہ کا سامان کر دے گا۔

وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ

اور روزی دے اس کو جہاں سے اس کو خیال بھی نہ ہو ؁ا اور جو کوئی بھروسہ رکھے اللہ پر تو وہ اس کو کافی ہے، تحقیق اللہ پورا کر لیتا ہے اپنا کام

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝۳

اللہ نے رکھا ہے ہر چیز کا اندازہ ؁۲

خلاصہ تفسیر: اور (اللہ نقصان میں نجات کی شکل نکال کر منافع عطا فرماتا ہے، چنانچہ ایک بڑا فائدہ رزق ہے، سو) اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور (اس تقویٰ کا ایک شعبہ توکل ہے، اس کی یہ خاصیت ہے کہ) جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس (کی مشکلات میں درستی، آسانی اور انتظام) کے لئے کافی ہے (یعنی اس کی مشکلیں آسان کرنے میں اپنے کافی ہونے کا خاص اثر ظاہر فرماتا ہے، ورنہ اس کی کفایت تو تمام عالم کے لئے ہے، وہ سب ہی کو کافی ہے، اور یہ مشکلات میں درستی اور آسانی بھی عام ہے حسی ہو یا باطنی، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنا کام (جس طرح چاہتا ہے) پورا کر کے رہتا ہے (اور اسی طرح مشکلات میں درستی اور آسانی کا وقت بھی اسی کے ارادہ پر ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کا ایک انداز (اپنے علم میں) مقرر کر رکھا ہے (اور اسی کے موافق اس کا واقع ہونا مصلحت اور قرین حکمت ہوتا ہے)۔

وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ: اگر نفع، نقصان اور رزق آخرت کا مراد لیا جائے تب تو یہ معنی ہوں گے کہ عذاب سے نجات دے گا اور جنت کا رزق دے گا جس کی شان یہ ہے: "لا خطرت علی قلب بشر" کہ اس تک کسی کا گمان بھی نہیں پہنچ سکتا، اسی کو یہاں: **مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ** فرما دیا، اور اگر نفع، نقصان اور رزق دنیا کا مراد ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں: ایک ظاہری اور حسی جو اکثر ہوتی ہے کہ بلائیں اور آزمائشیں ٹل جائیں، اور رزق وغیرہ میں کشادگی ہو جائے، دوسری باطنی جو ہمیشہ تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے کہ اس آزمائش پر صبر و رضا نصیب ہو جائے کہ یہ بھی نجات ہے اس تقویٰ کے اثر سے، اور تھوڑے رزق پر قناعت ہو جائے کہ اس سے بھی اطمینان وسکون ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ بہت رزق سے، اور اس کو: **مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ** فرمانا اس معنی کر ہوگا کہ چونکہ نفس کے اطمینان کا طریقہ رزق میں کشادگی ہے تو قناعت سے سکون واطمینان اس کے گمان سے بھی زیادہ ہوا، اس لیے **لَا يَحْتَسِبُ** اس کو بھی شامل ہے، اور یہ دنیاوی نفع ونقصان کی جو دو صورتیں ذکر کی ہیں ایک حسی اور دوسری باطنی، ان میں سے ایک نہ ایک کا واقع ہونا ضروری ہے، دونوں صورتیں ہی واقع نہ ہوں تو ایسا نہیں ہو سکتا، ہاں! دونوں صورتوں کا ایک ساتھ جمع ہونا ممکن ہے۔

* * *

فائدہ:۱ اللہ کا ڈر دارین کے خزانوں کی کنجی اور تمام کامیابیوں کا ذریعہ ہے اسی سے مشکلیں آسان ہوتی ہیں، بے قیاس وگمان روزی ملتی ہے گناہ معاف ہوتے ہیں، جنت ہاتھ آتی ہے اجر بڑھتا ہے اور ایک عجیب قلبی سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے، جس کے بعد کوئی سختی، سختی نہیں رہتی، اور تمام پریشانیاں اندر ہی اندر کافور ہو جاتی ہیں ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "اگر تمام دنیا کے لوگ اس آیت کو پکڑ لیں تو ان کو کافی ہو جائے"۔

فائدہ:۲ یعنی اللہ پر بھروسہ رکھو، محض اسباب پر تکیہ مت کرو، اللہ کی قدرت ان اسباب کی پابند نہیں، جو کام اسے کرنا ہو، وہ پورا ہو کر رہتا ہے، اسباب بھی اسی کی مشیت کے تابع ہیں، ہاں! ہر چیز کا اس کے ہاں ایک اندازہ ہے، اسی کے موافق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے، اس لیے اگر کسی چیز کے حاصل ہونے میں دیر ہو تو متوکل کو گھبرانا نہیں چاہیے۔

وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ

اور جو عورتیں ناامید ہوگئیں حیض سے تمہاری عورتوں میں اگر تم کو شبہ رہ گیا تو ان کی عدت ہے تین مہینے اور ایسے ہی جن کو

لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ

حیض نہیں آیا ۱؎ اور جن کے پیٹ میں بچہ ہے ان کی عدت یہ ہے کہ جن لیں پیٹ کا بچہ ۲؎ اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے کر دے

مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ④

وہ اس کے کام میں آسانی

خلاصہ تفسیر: اب پھر احکام کی طرف رجوع ہے، پیچھے عدت کا ذکر اجمالی تھا آگے اس کی تفصیل ہے، وہ یہ کہ:

اور تمہاری (مطلقہ) بیویوں میں سے جو عورتیں (عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے) حیض آنے سے ناامید ہو چکی ہیں اگر تم کو (ان کی عدت کے تعین میں) شبہ ہو (جیسا کہ واقع میں صحابہ کو شبہ ہوا تھا اور اسی لیے پوچھا تھا) تو ان کی عدت تین مہینے ہیں، اور اسی طرح جن عورتوں کو (اب تک کم عمری کی وجہ سے) حیض نہیں آیا (ان کی عدت بھی تین مہینے ہیں) اور حاملہ عورتوں کی عدت ان کے اس حمل کا پیدا ہو جانا ہے (خواہ وہ کامل ہو یا ناقص بشرطیکہ کوئی عضو بن گیا ہو اگر چہ ایک انگلی ہی سہی) اور (چونکہ تقویٰ خود بھی مہتم بالشان ہے اور مذکورہ احکام جو کہ دنیاوی معاملات سے متعلق ہیں ان کے بارے میں عام لوگوں کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ان دنیاوی معاملات کا دین سے کیا تعلق؟ ہم جس طرح چاہیں کر لیں، اس لیے اب آگے پھر تقوی کا مضمون ہے، یعنی) جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی کر دے گا (آخرت کی یا دنیا کی، ظاہر میں یا باطن میں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مطلقہ کی عدت قرآن نے تین حیض بتلائی (کما فی سورۃ البقرۃ) اگر شبہ رہا ہو کہ جس کو حیض نہیں آیا، یا بڑی عمر کے سبب موقوف ہوا، اس کی عدت کیا ہوگی؟ تو بتلا دیا کہ تین مہینے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ جمہور کے نزدیک حامل کی عدت وضع حمل تک ہے، خواہ ایک منٹ کے بعد ہو جائے یا کتنی ہی طویل مدت کے بعد ہو، اس میں مطلقہ اور متوفی عنہا زوجہا دونوں کا ایک حکم ہے کما ھو مصرح فی الاحادیث۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ⑤

یہ حکم ہے اللہ کا جو اتارا تمہاری طرف، اور جو کوئی ڈرتا رہے اللہ سے اتار دے اس پر سے اس کی برائیاں اور بڑھا دے اس کو ثواب

خلاصہ تفسیر: (اب آگے پھر احکام بجالانے کی تاکید کے لئے ارشاد ہے کہ) یہ (جو کچھ مذکور ہوا) اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہارے پاس بھیجا ہے اور جو شخص (ان معاملات میں اور دوسرے امور میں بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے گناہ دور کر دے گا (جو سب سے بڑے نقصان سے نجات ہے) اور اس کو بڑا اجر دے گا (جو سب سے بڑے منفعت اور فائدے کا حصول ہے)۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ: شروع سورت سے یہاں تک چار مرتبہ تقوی اور اس کے ساتھ ایک جگہ توکل کا حکم ہے، چنانچہ ان آیات میں جو تقویٰ کے فضائل و برکات کا بیان آیا اس کا خلاصہ پانچ چیزیں ہیں: ① ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ متقی کے لئے دنیا و آخرت کے مصائب و مشکلات سے نجات کا راستہ نکال دیتے ہیں ② دوسرے یہ کہ اس کے لئے رزق کے ایسے دروازے کھول دیتے ہیں جن کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں جاتا ③ تیسرے یہ کہ اس کے سب کاموں میں آسانی پیدا فرما دیتے ہیں ④ چوتھے یہ کہ اس کے گناہوں کا کفارہ کر دیتے ہیں ⑤ پانچویں یہ کہ اس کا اجر بڑھا دیتے ہیں اور ایک

دوسری جگہ تقوی کی یہ برکت بھی بتلائی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کو حق و باطل کی پہچان آسان ہوجاتی ہے: ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا کا یہی مطلب ہے، تقوی اور توکل کی ان مذکورہ برکات کو اہل طریق ہر وقت مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

تقوی کے فضائل میں جو آیتیں اس سورت میں آئی ہیں ان میں بلیغ ربط یہ ہوسکتا ہے کہ سب سے پہلے: وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ میں تقوی کا حکم دیا گیا، پھر دوسری جگہ: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا میں یہ بتایا کہ تقوی کی وجہ سے دنیاوی اور اخروی برکتیں جمع ہوجاتی ہیں، اور تیسری جگہ: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا میں تقوی کی دنیاوی برکت بیان کی گئی، اور یہاں چوتھی جگہ: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا میں تقوی کی اخروی برکت بیان کی گئی، پس دنیاوی اور اخروی برکتوں میں پہلے اجمالی طور پر ذکر ہوا، پھر اس کے بعد آخری دو مقامات پر اس اجمال کی تفصیل بیان کردی گئی۔

* * *

فائدہ: جملہ کے بعد اتقاء اور اللہ کے ڈر کا مضمون مختلف پیرایوں میں دہرایا گیا ہے تاکہ پڑھنے والا بار بار متنبہ ہو کہ عورتوں کے معاملات میں اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَاِنْ كُنَّ

ان کو گھر دو رہنے کے واسطے جہاں تم آپ رہو اپنے مقدور کے موافق ۱؎ اور ایذا دینا نہ چاہو ان کو تاکہ تنگ پکڑ و ان کو ۲؎ اور اگر رکھتی ہوں

اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ

پیٹ میں بچہ تو ان پر خرچ کرو جب تک جنیں پیٹ کا بچہ ۳؎ پھر اگر وہ دودھ پلائیں تمہاری خاطر، تو دو ان کو ان کا بدلہ

وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۝۶ ؕ

اور سکھاؤ آپس میں نیکی ۴؎ اور اگر ضد کرو آپس میں تو دودھ پلائے گی اس کی خاطر اور کوئی عورت ۵؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے پھر مطلقہ عورتوں کے احکام کا بیان ہے، یعنی گھر میں رکھنے اور عدت لمبی نہ کرنے کے علاوہ ان کے کچھ اور بھی حقوق ہیں، وہ یہ کہ:

تم ان (مطلقہ) عورتوں کو اپنی وسعت کے موافق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو (یعنی عدت میں بھی مطلقہ کا حق سکونت شوہر کے ذمہ واجب ہے، البتہ طلاق بائن میں ایک مکان میں خلوت وتنہائی کے ساتھ دونوں کا رہنا جائز نہیں، بلکہ پردہ حائل ہونا ضرور ہے) اور ان کو تنگ کرنے کے لئے (سکونت ورہائش کے بارے میں) تکلیف مت پہنچاؤ (مثلاً کوئی ایسی بات کرنے لگو جس سے وہ پریشان ہو کر نکل جائیں) اور اگر وہ (مطلقہ) عورتیں حمل والیاں ہوں تو حمل پیدا ہونے تک ان کو (کھانے پینے کا) خرچ دو (بخلاف ان عورتوں کے جنہیں حمل نہ ہو، ان کا نفقہ وخرچہ کی حد تین حیض یا تین ماہ ہیں، اور یہ احکام تو عدت کے متعلق تھے) پھر اگر (عدت کے بعد) وہ (مطلقہ) عورتیں (جبکہ پہلے سے بچہ والیاں ہوں، یا بچہ ہی پیدا ہونے سے ان کی عدت ختم ہوئی ہو) تمہارے لئے (بچہ کو اجرت پر) دودھ پلادیں تو تم ان کو (مقررہ) اجرت دو، اور (اجرت کے بارے میں) باہم مناسب طور پر مشورہ کرلیا کرو (یعنی نہ تو عورت اس قدر زیادہ مانگے کہ مرد کو دوسری انا ڈھونڈھنی پڑے، اور نہ مرد اس قدر کم دینا چاہے کہ عورت اپنا کام نہ چل سکے، بلکہ حتی الامکان دونوں اس کا خیال رکھیں کہ ماں ہی دودھ پلائے کہ اس میں بچہ کے لیے زیادہ مصلحت اور بہتری ہے) اور اگر تم باہم کشمکش کرو گے تو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی (مقصود اس خبر سے حکم دینا ہے، یعنی کسی اور انا کو تلاش کرلیا جائے، نہ ماں کو مجبور کیا جائے نہ باپ کو)۔

وَاِنۡ كُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ: غرض یہاں مقصود نفقہ وخرچہ کی انتہا بتلانا ہے کہ حمل والیوں کا نفقہ حمل جننے تک واجب ہے، مگر خرچ کرنے کا حکم بھی خاص طور پر اس لیے کر دیا کہ ممکن ہے شروع حمل میں طلاق دی ہو تو بچہ جننے تک کی مدت تین حیض یا غالبا تین ماہ سے زیادہ ہوگی، اور اتنے دنوں تک نفقہ دینا نفس پر گراں ہوتا ہے، اس لیے اس کو صراحۃً فرمادیا، اور طلاق والی عورتوں کے لیے مطلقا نفقہ اور رہائش عدت تک دینا یہ احناف کا مذہب ہے، اور بعض ائمہ کے نزدیک جس کو طلاق بائن دی گئی ہو اور وہ حاملہ نہ ہو اس کے لیے نہ سکونت ورہائش دینا واجب ہے نہ نفقہ۔

وَاۡتَمِرُوۡا بَيۡنَكُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ: اس میں ماں باپ دونوں کو خطاب ہے، اور عورت سے مشورہ لینے میں اس کی دل جوئی بھی ہے، اور یہ احتمال بھی کہ عورت سے بھی ٹھیک رائے مل جاتی ہے اور یہ دونوں باتیں مطلوب ہیں اور اللہ والوں کی بھی یہی عادت ہے۔

وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰى: یہ حکم خبر کی صورت دینے میں یہ نکتہ ہے کہ مرد کو کم اجرت تجویز کرنے پر عتاب ہے کہ آخر کوئی اور عورت پلائے گی تو وہ بھی غالبا بہت کم نہ لے گی، پھر یہ کمی ماں ہی کے لیے کیوں تجویز کی اجائے، اور عورت کو زیادہ اجرت مانگنے پر عتاب ہے کہ اگر تم نہ پلاؤ گی تو کوئی اور پلانے والی عورت میسر ہو جائے گی، کیا دنیا میں ایک تم ہی ہو جو اس قدر گراں بنتی ہو۔

آیت کے اس آخری جملہ میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ ایسی تنگی اور حرج میں خود بھی نہ پڑے اور نہ دوسروں کو ڈالے کہ جس کی وجہ سے اپنی یا دوسرے کی آزادی میں خلل پڑے، اور اس کا پورا پورا لحاظ اہل طریق میں ہے۔

* * *

فائدہ: لہ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ: مرد کے ذمہ ضروری ہے کہ مطلقہ کو عدت تک رہنے کے لیے مکان دے (اس کو "سکنیٰ" کہتے ہیں) اور جب سکنیٰ واجب ہے تو نفقہ بھی اس کے ذمہ ہونا چاہیے، کیونکہ عورت اتنے دنوں تک اسی کی وجہ سے مکان میں مقید و محبوس رہے گی، قرآن کریم کے الفاظ: اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا عَلَيۡهِنَّ میں بھی اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، کہ اس کو اپنے مقدور اور حیثیت کے موافق اپنے گھر میں رکھو، ظاہر ہے کہ مقدور کے موافق رکھنا اس کو بھی متضمن ہے کہ اس کے کھانے کپڑے کا مناسب بندوبست کرے، چنانچہ مصحف ابن مسعودؓ میں یہ آیت اس طرح تھی: "اَسْكِنُوهن مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَ انفِقُوْا عَلَيْهِنّ مِنْ وُّجْدِكُمْ"

حنفیہ کے نزدیک یہ حکم سکنیٰ اور نفقہ کا ہر قسم کی مطلقہ کو عام ہے، رجعیہ کی قید نہیں، کیونکہ پہلے سے جو بیان چلا آتا ہے مثلاً آئسہ، صغیرہ، اور حاملہ کی عدت کا مسئلہ اس میں کوئی تخصیص نہیں تھی، پھر اس میں بلا وجہ کیوں تخصیص کی جائے، رہی فاطمہؓ بنت قیس کی حدیث جس میں وہ کہتی ہیں کہ: "میرے زوج نے تین طلاقیں دے دی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے مجھے سکنیٰ اور نفقہ نہیں دلایا"۔

① اول تو اس حدیث میں فاروق اعظمؓ، عائشہ صدیقہؓ اور دوسرے صحابہ وتابعین نے انکار فرمایا، بلکہ فاروق اعظمؓ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم ایک عورت کے کہنے سے اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے، ہم کو معلوم نہیں کہ وہ عورت بھول گئی یا اس نے یاد رکھا؟! معلوم ہوا کہ فاروق اعظمؓ کتاب اللہ سے یہی سمجھے ہوئے تھے کہ مطلقہ ثلاث کے لیے نفقہ وسکنیٰ واجب ہے اور اس کی تائید میں رسول اللہ کی کوئی سنت بھی ان کے پاس موجود تھی، چنانچہ طحاویؒ وغیرہ نے روایات نقل کی ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے تصریحاً بیان کیا ہے کہ یہ مسئلہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا اور دار قطنی میں جابرؓ کی ایک حدیث بھی اس بارے میں صریح ہے، گو اس کے بعد رواۃ میں اور رفع ووقف میں کلام کیا گیا ہے۔

② دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ حضور ﷺ نے فاطمہؓ بنت قیس کے لیے سکنیٰ اس لیے تجویز نہ کیا ہو کہ یہ اپنے سسرال والوں سے زبان درازی اور سخت کلامی کرتی تھی، جیسا کہ بعض روایات میں ہے، لہذا آپ ﷺ نے حکم دے دیا کہ ان کے گھر سے چلی جائے، پھر جب سکنیٰ نہ رہا تو نفقہ بھی ساقط ہو گیا، جیسے ناشزہ کا (جو شوہر کی نافرمانی کر کے گھر سے نکل جائے) نفقہ ساقط ہو جاتا ہے، تاوقتیکہ گھر واپس نہ آئے (نبہ علیہ ابو بکر الرازی فی احکام القرآن)۔

③ نیز جامع ترمذی وغیرہ کی بعض روایات میں ہے کہ اسکو کھانے پینے کے لیے غلہ دیا گیا تھا، اس نے اس مقدار سے زائد کا مطالبہ کیا جو منظور نہ ہوا تو مطلب یہ ہوگا کہ حضور ﷺ نے اس سے زائد نفقہ تجویز نہیں فرمایا جو مرد کی طرف سے دیا جا رہا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔

ہاں! یہ یاد رہے کہ نسائی، طبرانی، اور مسند احمد کی بعض روایات میں فاطمہؓ بنت قیس نے حضور ﷺ کا صریح ارشاد نقل کیا ہے کہ سکنیٰ اور نفقہ صرف اس مطلقہ کے لیے ہے جس سے رجعت کا امکان ہو، ان روایات کی سندیں زیادہ قوی نہیں، زیلعیؒ نے تخریج ہدایہ میں اس پر بحث کی ہے، فلیراجع۔

فائدہ: ۲ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ: یعنی ستاؤ نہیں کہ وہ تنگ آکر نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔

فائدہ: ۳ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ: حمل کی مدت کبھی بہت طویل ہو جاتی ہے، اس کو خصوصیت سے بتلا دیا کہ خواہ کتنی ہی طویل ہو، وضع حمل تک اس کو نفقہ دینا ہوگا، یہ نہیں کہ مثلاً تین مہینے نفقہ دے کر بند کر لو۔

فائدہ: ۴ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ: یعنی وضع حمل کے بعد اگر عورت تمہاری خاطر بچہ کو دودھ پلائے تو جو اجرت کسی دوسری انا کو دیتے وہ اس کو دی جائے اور معقول طریقہ سے دستور کے موافق باہم مشورہ کر کے قرار داد کر لیں خواہ مخواہ ضد اور کج روی اختیار نہ کریں، ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا برتاؤ رکھیں نہ عورت دودھ پلانے سے انکار کرے نہ مرد اس کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے پلوائے۔

فائدہ: ۵ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى: یعنی اگر آپس کی ضد اور تکرار سے عورت دودھ پلانے پر راضی نہ ہو تو کچھ اس پر موقوف نہیں کوئی دوسری عورت دودھ پلانے والی مل جائے گی، اس کو اتنا گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے اور اگر مرد خواہ مخواہ بچہ کو اس کی ماں سے دودھ پلوانا نہیں چاہتا تو بہر حال کوئی دوسری عورت دودھ پلانے کو آئے گی، آخر اس کو بھی کچھ دینا پڑے گا، پھر وہ بچہ کی ماں ہی کو کیوں نہ دے۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ

چاہیے خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے موافق، اور جس کو نپی تلی ملتی ہے اس کی روزی تو خرچ کرے جیسا کہ دیا ہے اس کو اللہ نے

ع ۱۷ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝۷

اللہ کسی پر تکلیف نہیں رکھتا مگر اسی قدر جو اس کو دیا، اب کر دے گا اللہ سختی کے پیچھے کچھ آسانی

خلاصہ تفسیر: (اب بچہ کے نفقہ کے بارے میں ارشاد ہے کہ) وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق (بچہ پر) خرچ کرنا چاہئے اور جس کی آمدنی کم ہو تو اس کو چاہئے کہ اللہ نے اس کو جتنا دیا ہے اس میں سے خرچ کرے (یعنی امیر آدمی اپنی حیثیت کے موافق خرچ اٹھائے اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے موافق، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا جتنا اس کو دیا ہے (اور تنگدست آدمی خرچ کرنے میں اس سے نہ ڈرے کہ خرچ کرنے سے بالکل ہی کچھ نہ رہے گا جیسے بعض لوگ اس خوف سے اولاد کو قتل کر ڈالتے ہیں، پس ارشاد ہے کہ) خدا تعالیٰ تنگی کے بعد جلدی فراغت بھی دے گا (اگرچہ صرف اس کی ضرورت اور حاجت کے بقدر ہی سہی، جیسا کہ ارشاد ہے: **ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم**)۔

* * *

فائدہ: یعنی بچہ کی تربیت کا خرچ باپ پر ہے، وسعت والے کو اپنی وسعت کے موافق اور کم حیثیت کو اپنی حیثیت کے مناسب خرچ کرنا چاہیے، اگر کسی شخص کو زیادہ فراخی نصیب نہ ہو محض نپی تلی روزی اللہ نے دی ہو، وہ اسی میں سے اپنی گنجائش کے موافق خرچ کیا کرے، اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، جب تنگی کی حالت میں اس کے حکم کے موافق خرچ کرو گے، وہ تنگی کو فراخی اور آسانی سے بدل دے گا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا

اور کتنی بستیاں کہ نکل چلیں حکم سے اپنے رب کے اور اسکے رسولوں کے پھر ہم نے حساب میں پکڑا ان کو سخت حساب میں اور آفت ڈالی ان پر

عَذَابًا نُّكۡرًا ۝۸ فَذَاقَتۡ وَبَالَ اَمۡرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمۡرِهَا خُسۡرًا ۝۹

بن دیکھی آفت ۱؎ پھر چکھی انہوں نے سزا اپنے کام کی اور آخر کو ان کے کام میں ٹوٹا آ گیا ۲؎

خلاصہ تفسیر: شروع سورت سے یہاں تک احکام کے درمیان چار جگہ تقوی کا حکم اور ترغیب بیان ہوئی، اس لیے اب آگے اسی تقوی کی تاکید کی جاتی ہے۔

اور بہت سی بستیاں تھیں جنہوں نے اپنے رب کے حکم (ماننے) سے اور اس کے رسولوں سے سرتابی کی سو ہم نے ان (کے اعمال) کا سخت حساب کیا (مطلب یہ کہ ان کے اعمال کفریہ میں سے کسی عمل کو معاف نہیں کیا، بلکہ سب پر سزا تجویز کی، یہاں حساب سے صرف پوچھ گچھ کے طور پر حساب مراد نہیں) اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سزا دی (کہ عذاب کے ذریعہ ہلاک کئے گئے) غرض انہوں نے اپنے اعمال کا وبال چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ ہی ہوا (یہ تو دنیا میں ہوا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی احکام شریعت کی (خصوصاً عورتوں کے بارے میں) پوری پابندی رکھو، اگر نافرمانی کرو گے تو یاد رہے کہ کتنی ہی بستیاں اللہ و رسول کی نافرمانی کی پاداش میں تباہ کی جا چکی ہیں جس وقت لوگ تکبر کر کے حد سے نکل گئے ہم نے ان کا جائزہ لیا اور سختی سے لیا کہ ایک عمل کو بھی معاف نہیں کیا، پھر ان کو ایسی نرالی آفت میں پھنسایا جو آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی عمر بھر جو سودا کیا تھا آخر اس میں سخت خسارہ اٹھایا اور جو پونجی تھی سب کھو کر رہے۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ عَذَابًا شَدِيۡدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِى الۡاَلۡبَابِ ۛۚ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۛۚ قَدۡ اَنۡزَلَ اللّٰهُ

تیار رکھا ہے اللہ نے واسطے ان کے سخت عذاب ۱؎ سو ڈرتے رہو اللہ سے اے عقل والو جن کو یقین ہے ۲؎ بیشک اللہ نے اتاری ہے

اِلَيۡكُمۡ ذِكۡرًا ۝۱۰ ۙ رَّسُوۡلًا يَّتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخۡرِجَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا

تم پر نصیحت ۳؎ رسول ہے جو پڑھ کر سناتا ہے تم کو اللہ کی آیتیں کھول کر سنانے والی ۴؎ تاکہ نکالے ان لوگوں کو جو کہ یقین لائے اور کیے

الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ وَيَعۡمَلۡ صَالِحًا يُّدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ

بھلے کام، اندھیروں سے اجالے میں ۵؎ اور جو کوئی یقین لائے اللہ پر اور کرے کچھ بھلائی اس کو داخل کرے باغوں میں

تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدۡ اَحۡسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزۡقًا ۝۱۱

نیچے بہتی ہیں جن کے نہریں سدا رہیں ان میں ہمیشہ، البتہ خوب دی اللہ نے اس کو روزی ۶؎

خلاصہ تفسیر: (اور آخرت میں) اللہ تعالی نے ان کے لئے ایک سخت عذاب تیار رکھا ہے (اور جب نافرمانی کا انجام یہ ہے) تو اے سمجھدارو! جو کہ ایمان لائے ہو تم خدا سے ڈرو (کہ ایمان بھی اسی کا مطالبہ کرتا ہے، اور ڈرنا یہ کہ اطاعت کرو، اور اسی اطاعت کا طریقہ بتلانے کے لئے) خدا نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا (اور وہ نصیحت نامہ دے کر) ایک ایسا رسول (بھیجا) جو تم کو اللہ کے صاف صاف احکام پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کو کہ جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں (کفر و جہل کی) تاریکیوں سے (ایمان اور علم و عمل کے) نور کی طرف لے آئیں (مطلب یہ کہ جو نصیحت اس رسول کے ذریعہ سے پہنچے اس پر عمل کرنا بھی اطاعت ہے) اور (آگے اطاعت یعنی ایمان و عمل صالح پر وعدہ ہے کہ) جو

شخص اللہ پر ایمان لائے گا اور اچھے عمل کرے گا خدا اُس کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے بیشک اللہ نے (ان کو بہت) اچھی روزی دی۔

* * *

فائدہ: ۱ عَذَابًا شَدِيدًا: پہلے دنیاوی عذاب کا ذکر تھا اب اخروی عذاب بیان کیا۔

فائدہ: ۲ الَّذِينَ آمَنُوا: یعنی یہ عبرتناک واقعات سن کر ایمانداروں کو ڈرتے رہنا چاہیے کہیں ہم سے ایسی بے اعتدالی نہ ہو جائے کہ خدا کی پکڑ میں آجائیں، العیاذ باللہ۔

فائدہ: ۳ قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا: یعنی قرآن، یا "ذکر" بمعنی "ذاکر" ہو تو خود رسول ﷺ مراد ہوں گے۔

فائدہ: ۴ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ: یعنی صاف آیتیں جن میں اللہ کے احکام کھول کھول کر سنائے گئے ہیں۔

فائدہ: ۵ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ: یعنی کفر و جہل کے اندھیروں سے نکال کر ایمان اور علم و عمل کے اجالے میں لے آئے۔

فائدہ: ۶ قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا: جنت سے زیادہ بہتر روزی کہاں ملے گی۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا

اللہ وہ ہے جس نے بنائے سات آسمان اور زمین بھی اتنی ہی ۱ اترتا ہے اس کا حکم ان کے اندر ۲ تاکہ تم جانو

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾ ع ۱۸

کہ اللہ ہر چیز کر سکتا ہے، اور اللہ کے علم میں سمائی ہے ہر چیز کی ۳

خلاصہ تفسیر: (اب آگے اللہ کا واجب الاطاعت ہونا بیان کیا جاتا ہے، یعنی) اللہ ایسا ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ان ہی کی طرح زمین بھی (سات پیدا کی، اور) ان سب (آسمانوں اور زمینوں) میں (اللہ تعالیٰ کے) احکام (تشریعی یا تکوینی یا دونوں) نازل ہوتے رہتے ہیں (اور یہ اس لئے بتلا دیا گیا) تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے، اور اللہ ہر چیز کو (اپنے) احاطہ علمی میں لئے ہوئے ہے (اس لئے اللہ تعالیٰ کا واجب الاطاعت ہونا ظاہر ہے)۔

وَمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ: یعنی زمینیں بھی سات پیدا کیں، جیسا کہ ترمذی وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ ایک زمین کے نیچے دوسری زمین ہے، اس کے نیچے تیسری زمین ہے، اسی طرح سات زمینیں ہیں، اور ان میں یہ بھی احتمال ہے کہ نظر نہ آتی ہوں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ نظر آتی ہوں اور لوگ ان کو ستارے سمجھتے ہوں، جیسا کہ مریخ کی نسبت بعض کا گمان ہے کہ اس میں پہاڑ، نہریں اور آبادی ہے، اور حدیث میں جو اُن زمینوں کا اِس زمین کے نیچے ہونا وارد ہے ممکن ہے کہ وہ بعض حالات کے اعتبار سے ہو، کبھی زمینیں اس سے اوپر ہو جاتی ہوں۔

يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ: یعنی اللہ کا حکم ان ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے، حکم الٰہی کی دو قسم ہیں:

① ایک تشریعی جو اللہ کے مکلف بندوں کے لئے وحی کے ذریعہ سے بواسطہ انبیاء بھیجا جاتا ہے، جیسے زمین میں انسان اور جن کے لئے آسمانوں سے فرشتے یہ تشریعی احکام انبیاء تک لے کر آتے ہیں، جن میں عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت کے قوانین ہوتے ہیں، ان کی پابندی پر ثواب اور خلاف ورزی پر عذاب ہوتا ہے۔

② دوسری قسم حکم کی حکم تکوینی ہے، یعنی تقدیر الٰہی کے جاری اور نافذ کرنے سے متعلق احکام جس میں کائنات کی تخلیق اور اس کی تدریجی ترقی اور اس میں کمی بیشی اور موت و حیات داخل ہیں، یہ احکام تمام مخلوقات الہیہ پر حاوی ہیں، اس لئے اگر ہر دو زمینوں کے درمیان فضاء اور فاصلہ اور اس میں کسی مخلوق کا آباد ہونا ثابت ہو جائے خواہ مخلوق مکلف احکام شرعیہ کی نہ ہو تو اس پر بھی يتنزل الامر صادق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا امر تکوینی اس پر بھی حاوی

ہے، حاصل یہ کہ احکام نازل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں میں بھی انسان وغیرہ مکلفین آباد ہوں، کیونکہ تکوینی احکام بغیر مکلفین کے بھی نازل ہو سکتے ہیں، چنانچہ آسمانوں میں فرشتوں پر احکام کا نازل ہونا ظاہر ہے، حالانکہ فرشتے مکلف نہیں، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی زمینیں بھی سات پیدا کی جیسا کہ ترمذی وغیرہ کی احادیث میں ہے ان میں احتمال ہے کہ نظر آتی ہوں اور ان میں احتمال ہے کہ نظر نہ آتی ہوں مگر لوگ ان کو وا کب سمجھتے ہیں جیسا کہ مریخ وغیرہ کی نسبت آج کل حکمائے یورپ کا گمان ہے کہ اس میں پہاڑ دریا اور آبادیاں ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی عالم کے انتظام و تدبیر کے لیے اللہ کے احکام تکوینیہ و تشریعیہ آسمانوں اور زمینوں کے اندر اترتے رہتے ہیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی آسمان و زمین کے پیدا کرنے اور ان میں انتظامی احکام جاری کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات و علم وقدرت کا اظہار ہو (نبّه علیه ابن قیم فی بدائع الفوائد) بقیہ صفات ان ہی دو صفتوں سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتی ہیں، صوفیا کے ہاں جو ایک حدیث نقل کرتے ہیں: "کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیا فَاحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ" گو محدثین کے نزدیک صحیح نہیں، مگر اس کا مضمون شاید اس آیت کے مضمون سے ماخوذ و مستفاد ہو، واللہ اعلم۔

ایاتها ۱۲ | ٦٦ سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۷ | رکوعاتها ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کی طرح اس سورت میں بھی عورتوں کے متعلق مضامین ہیں مگر پچھلی سورت میں عام عورتوں کے متعلق تھے، اس سورت میں خاص ازواج مطہرات کے متعلق ہیں، پیچھے طلاق کے احکام تھے، یہاں ازواج مطہرات کو طلاق کی دھمکی ہے، اور جیسے پچھلی سورت کے اخیر میں اطاعت کی عام تاکید تھی، یہاں ازواج مطہرات کو خطاب کرنے کے بعد اسی طرح عام طور پر سب کو رجوع الی اللہ کی تاکید ہے۔

سورت کی ابتدائی آیات کا سبب نزول صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول شریف تھا کہ عصر کے بعد کھڑے کھڑے سب ازواج کے پاس (خبر گیری کے لئے) تشریف لاتے تھے، ایک روز حضرت زینب کے پاس معمول سے زیادہ ٹھہرے اور شہد پیا تو مجھ کو رشک آیا، میں نے حفصہؓ سے مشورہ کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس تشریف لائیں وہ یوں کہے کہ آپ نے "مغافیر" نوش فرمایا ہے، مغافیر ایک خاص قسم کا گوند ہے جس میں کچھ بدبو ہوتی ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تو شہد پیا ہے، ان بی بی نے کہا کہ شاید کوئی مکھی مغافیر کے درخت پر بیٹھی گئی ہوگی اور اس کا رس چوس لیا ہوگا (اسی وجہ سے شہد میں بھی بدبو آنے لگی) رسول اللہ ﷺ بدبو کی چیزوں سے بہت پرہیز فرماتے تھے اس لیے آپ نے قسم کھالی کہ پھر میں شہد نہ پیوں گا، اور اس خیال سے کہ حضرت زینبؓ کا جی برا نہ ہو اس بات کو چھپانے کی تاکید فرمائی، مگر ان زوجہ نے دوسری سے کہہ دیا، اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت حفصہؓ شہد پلانے والی ہیں اور حضرت عائشہؓ اور حضرت سودہؓ اور حضرت صفیہؓ صلاح مشورہ کرنے والی ہیں، اور بعض روایات میں یہ قصہ دوسری طرح بھی آیا ہے، ممکن ہے کئی واقعے ہوں اور ان سب کے بعد یہ آیتیں نازل ہوئی ہوں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ①

۱؎ اے نبی تو کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر چاہتا ہے تو رضامندی اپنی عورتوں کی ۲؎ اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان ۳؎

خلاصہ تفسیر: اے نبی! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھا کر) اس کو (اپنے اوپر) کیوں حرام فرماتے ہیں؟ (پھر وہ بھی) اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (یعنی اگرچہ کسی مباح کام کا ترک کر دینا جائز ہے، اور اس ترک کرنے کو قسم کے ذریعہ پختہ کر دینا بھی کسی مصلحت سے جائز ہے، لیکن تاہم خلاف اولیٰ ہے، خصوصاً جبکہ اس کا سبب بھی ضعیف ہو، یعنی ایسے کام میں بیویوں کی

خوشنودی کہ جس میں ان کا راضی کرنا ضروری نہ تھا) اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (کہ گناہ تک کو معاف کر دیتا ہے اور آپ سے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہوا، اس لیے یہ عتاب نہیں بلکہ شفقت عنایت کے طور پر آپ سے کہا جاتا ہے کہ آپ نے ایک جائز نفع کو ترک کر کے کیوں تکلیف اٹھائی)۔

اس میں اس پر دلالت ہے کہ کسی کی اتنی رورعایت اور نرمی نہ کی جائے کہ اس سے خود کو دینی یا دنیاوی نقصان پہنچنے لگے، اور اس کا خیال نہ کرنے سے دوسروں کے اخلاق بھی خراب ہوتے ہیں۔

* * *

فائدہ: لے سورۃ احزاب کے فوائد میں گزر چکا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتوحات عنایت فرمائیں اور لوگ آسودہ ہو گئے تو ازواج مطہرات کو بھی خیال آیا کہ ہم کیوں آسودہ نہ ہوں، اس سلسلہ میں انہوں نے مل کر حضور ﷺ سے زیادہ نفقہ کا مطالبہ شروع کیا، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے: "وهن حولی یطلبننی النفقة"، اور بخاری کے ابواب المناقب میں ہے: "وحوله نسوة یکلمنه و یستکثرنه" اس پر ابوبکرؓ نے عائشہؓ کو اور عمرؓ نے حفصہؓ کو ڈانٹ بتلائی، آخر ازواج نے وعدہ کیا کہ آئندہ ہم آپ ﷺ سے اس چیز کا مطالبہ نہیں کریں گی جو آپ ﷺ کے پاس نہیں ہے، پھر بھی رفتار واقعات کی ایسی رہی جس سے آپ ﷺ کو ایک ماہ کے لیے ازواج سے "ایلاء" کرنا پڑا، تا آنکہ آیہ تخییر نے جو سورہ احزاب میں ہے نازل ہو کر اس قصہ کا خاتمہ کر دیا۔

اس درمیان میں کچھ واقعات اور بھی پیش آئے، جس سے حضور ﷺ کی طبع مبارک پر گرانی ہوئی، اصل یہ ہے کہ ازواج مطہرات کو جو محبت اور تعلق حضور ﷺ کے ساتھ تھا، اس نے قدرتی طور پر آپس میں ایک طرح کی کشمکش پیدا کر دی تھی، ہر ایک زوجہ کی تمنا اور کوشش تھی کہ وہ زائد از زائد حضور ﷺ کی توجہات کا مرکز بن کر دارین کی برکات و فیوض سے متمتع ہو، مرد کے لیے یہ موقع تحمل اور تدبر اور خوش اخلاقی کے امتحان کا نازک ترین موقع ہوتا ہے، مگر اس نازک موقع پر بھی حضور ﷺ کی ثابت قدمی ویسی ہی غیر متزلزل ثابت ہوئی جس کی توقع سید الانبیاء ﷺ کی پاک سیرت سے ہوسکتی تھی۔

آپ ﷺ کی عادت تھی کہ عصر کے بعد سب ازواج کے ہاں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لے جاتے، ایک روز حضرت زینبؓ کے ہاں کچھ دیر لگی، معلوم ہوا کہ انہوں نے شہد پیش کیا تھا اس کے نوش فرمانے میں وقفہ ہوا پھر کئی روز یہ معمول رہا، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے مل کر تدبیر کی کہ آپ ﷺ وہاں شہد پینا چھوڑ دیں، آپ ﷺ نے چھوڑ دیا اور حفصہؓ سے فرمایا کہ میں نے زینبؓ کے ہاں شہد پیا تھا، مگر اب قسم کھاتا ہوں کہ پھر نہیں پیوں گا، نیز یہ خیال فرما کر کہ زینبؓ کو اس کی اطلاع ہوگی تو خواہ مخواہ دل گیر ہوں گی، حفصہؓ کو منع کر دیا کہ اس کی اطلاع کسی کو نہ کرنا۔

اسی طرح کا ایک قصہ ماریہ قبطیہؓ کے متعلق (جو آپ کے حرم سے تھی جن کے بطن سے صاحبزادے ابراہیم تولد ہوئے) پیش آیا، اس میں آپ ﷺ نے ازواج کی خاطر قسم کھالی کہ ماریہؓ کے پاس نہ جاؤں گا، یہ بات آپ ﷺ نے حضرت حفصہؓ کے سامنے کہی تھی اور تاکید کر دی تھی کہ دوسروں کے سامنے اظہار نہ ہو، حضرت حفصہؓ نے ان واقعات کی اطلاع چپکے سے حضرت عائشہؓ کو دی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اور کسی سے نہ کہنا، حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مطلع فرما دیا آپ ﷺ نے حفصہؓ کو جتلایا کہ تم نے فلاں بات کی اطلاع عائشہؓ کو دی حالانکہ منع کر دیا تھا، وہ متعجب ہو کر کہنے لگیں کہ آپ ﷺ سے کس نے کہا؟ شاید عائشہؓ کی طرف خیال گیا ہوگا، حضور ﷺ نے فرمایا: نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ یعنی حق تعالیٰ نے مجھے اطلاع دی، ان ہی واقعات کے سلسلہ میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

فائدہ: ٢ حلال کو اپنے اوپر حرام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کو عقیدۃً حلال و مباح سمجھتے ہوئے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ اس کو استعمال نہ کروں گا، ایسا کرنا اگر کسی مصلحت صحیحہ کی بناء پر ہو تو شرعاً جائز ہے، مگر حضور ﷺ کی شان رفیع کے مناسب نہ تھا کہ بعض ازواج کی خوشنودی کے لیے اس طرح کا اسوہ قائم کریں جو آئندہ امت کے حق میں تنگی کا موجب ہو، اس لیے حق تعالیٰ نے متنبہ فرما دیا کہ ازواج کے ساتھ بیشک خوش اخلاقی برتنے کی ضرورت ہے، مگر اس حد تک ضرورت نہیں کہ ان کی وجہ سے ایک حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر کے تکلیف اٹھائیں۔

فائدہ: ٣ کہ گناہ کو معاف کر دیتا ہے اور آپ ﷺ سے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہوا، محض اپنے درجہ میں ایک خلاف اولیٰ بات ہوئی۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾

مقرر کر دیا اللہ نے تمہارے لیے کھول ڈالنا تمہاری قسموں کا، اور اللہ مالک ہے تمہارا، اور وہی ہے سب کچھ جانتا حکمت والا

خلاصہ تفسیر: چونکہ آپ نے قسم کھالی تھی اس لیے عام خطاب سے قسم کا کفارہ دینے کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں کہ:

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کھولنا (یعنی قسم توڑنے کے بعد اس کے کفارہ کا طریقہ) مقرر فرما دیا ہے اور اللہ تمہارا کارساز ہے اور وہ بڑا جاننے والا بڑی حکمت والا ہے (اس لیے وہ اپنے علم وحکمت سے تمہاری مصلحتوں اور ضرورتوں کو جان کر تمہاری بہت سی دشواریوں کو آسان کر دینے کے طریقے مقرر فرما دیتا ہے، چنانچہ کفارہ کے ذریعہ قسم کی پابندی کی تکلیف کا علاج کر دیا)۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ: مذکورہ واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے قسم کھالی تھی، آیت نازل ہونے کے بعد اس قسم کو توڑا اور کفارہ ادا فرمایا جیسا کہ درمنثور کی روایت میں ہے آپ نے قسم کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کیا۔

کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرنے کی صورتیں اور ان کے احکام سورہ مائدہ آیت ۸۷: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ کی تفسیر میں گذر چکے ہیں، وہاں ملاحظہ فرمایئے، اور آپ ﷺ نے جو حلال کو اپنے اوپر حرام فرمایا یہ حرام کرنا ممنوع نہ تھا، بلکہ یہ قسم تھی جو ایک زوجہ کی وجہ سے کی گئی تھی، مگر خلاف اولیٰ ہونے کی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس قسم کو توڑنے کا حکم فرمایا، اور گذشتہ شریعتوں میں قسم کی یہ صورت خلاف اولیٰ بھی نہ تھی جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے اوپر اونٹ کے گوشت کو حرام کر لینا جس کی تفصیل سورہ آل عمران آیت ۹۳: كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: یعنی اس مالک نے اپنے علم وحکمت سے تمہارے لیے مناسب احکام وہدایات بھیجے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نامناسب چیز پر قسم کھالے تو کفر دے کر (جس کا ذکر سورۃ مائدہ میں آچکا) اپنی قسم کھول سکتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''اب جو کوئی اپنے مال کو کہے یہ مجھ پر حرام ہے تو قسم ہوگئی، کفارہ دے، تو اس کو کام میں لائے، کھانا ہو یا کپڑا یا لونڈی''۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ

اور جب چھپا کر کہی نبی نے اپنی کسی عورت سے ایک بات، پھر جب اس نے خبر کر دی اسکی اور اللہ نے جتلا دی نبی کو وہ بات تو جتلائی نبی نے اس میں

وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۳﴾

سے کچھ اور ٹلا دی کچھ، پھر جب وہ جتلائی عورت کو بولی تجھ کو کس نے بتلا دی یہ، کہا مجھ کو بتایا اس خبر والے واقف نے

خلاصہ تفسیر: اور (آگے بیویوں کو سناتے ہیں کہ وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ پیغمبر (ﷺ) نے اپنی کسی بیوی سے چپکے سے ایک بات فرمائی (وہ بات یہی تھی کہ میں پھر شہد نہ پیوں گا مگر کسی سے کہنا نہیں) پھر جب اس بیوی نے وہ بات (دوسری زوجہ کو) بتلادی اور پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے (بذریعہ وحی) اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے (اس ظاہر کر دینے والی بیوی کو) تھوڑی سی بات تو جتلا دی (کہ تو نے ہماری یہ بات دوسری سے کہہ دی) اور تھوڑی بات کو ٹال گئے (یعنی آپ کا کرم اس انتہائی درجہ کا ہے کہ اپنے حکم کے خلاف کرنے پر جو بیوی کی شکایت کرنے بیٹھے تو شکایت کے وقت بھی پوری بات نہیں فرمائی کہ تم نے میری یہ بات کہہ دی اور یہ بھی کہہ دی کہ اس سے ان زوجہ کو زیادہ شرمندگی ہوتی، بلکہ کچھ باتوں کا ذکر کیا اور کچھ کا نہیں کیا، تاکہ جو زوجہ مخاطب ہیں ان کو یہ گمان ہو کہ آپ ﷺ کو صرف اتنی ہی بات کی خبر ہوئی ہے زیادہ کی نہیں تو شرمندگی کم ہو) سو جب پیغمبر نے اس بیوی کو وہ بات جتلائی تو وہ کہنے لگی کہ آپ کو اس کی کس نے خبر کر دی؟ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بڑے جاننے والے بڑے خبر رکھنے والے (یعنی

خدا) نے خبر کردی (یہ بیویوں کو شاید اس لئے سنایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورے راز پر مطلع ہونا سن کر آپ کے کریمانہ معاملہ سے اپنی کارروائی پر زیادہ شرمندہ ہوں اور توبہ کریں)۔

وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ: یعنی تھوڑی بات کو ٹال گئے، اس کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کرم تھی کہ مکمل بات بتانے سے وہ زوجہ مطہرہ زیادہ شرمندہ ہوتی، اور یہ اللہ والوں کی طبعی عادات میں سے ہے کہ وہ اپنی وجہ سے دوسروں کو شرمندہ ہونے سے بھی بچاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: شروع سورت میں ہم شہد کا اور ماریہ قبطیہؓ کا قصہ لکھ چکے ہیں، اس آیت میں بتلا دیا کہ بندے ایک بات کو چھپانے کی کتنی ہی کوشش کریں، اللہ جب ظاہر کرنا چاہے تو ہرگز مخفی نہیں رہ سکتی، نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن معاشرت اور وسعت اخلاق کا اس سے ثبوت ملتا ہے کہ آپ خلاف طبع کارروائیوں پر کس قدر تساہل اور اغماض برتتے اور کس طرح از راہ عفو وکرم بعض باتوں کو ٹلا جاتے تھے، گویا شکایت کے موقع پر بھی پورا الزام نہ دیتے تھے، "موضح القرآن" میں ہے کہ بعض کہتے ہیں: "اس حرم (ماریہ قبطیہ) کا موقوف کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ سے کہا اور کسی کو خبر کرنے سے منع کیا اور اس کے ساتھ کچھ اور بات بھی کہی تھی انہوں نے حضرت عائشہؓ کو سب خبر کر دی، کیونکہ دونوں باتوں میں دونوں کا مطلب تھا، پھر وحی سے معلوم کر کے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بی بی حفصہؓ کو حرم کی بات کا الزام دیا اور دوسری بات ذکر میں نہ لائے، وہ دوسری بات کیا تھی؟ شاید یہ تھی کہ تیرا باپ عائشہؓ کے باپ کے بعد خلیفہ ہوگا۔ الغیب عند اللہ۔ جو بات اللہ اور رسول نے ٹلا دی ہم کیا جانیں، اسی واسطے ٹلا دی کہ بے ضرورت چرچا نہ ہوتا کہ اور لوگ برا نہ مانیں"، یہ مضمون "خلافت" کا بعض ضعیف روایات میں آیا ہے جسے بعض علماء شیعہ نے بھی تسلیم کیا۔

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ

اگر تم دونوں توبہ کرتی ہو تو جھک پڑے ہیں دل تمہارے ۱ اور اگر تم دونوں چڑھائی کرو گی اس پر تو اللہ ہے اس کا رفیق اور جبرائیل

وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴿۴﴾

اور نیک بخت ایمان والے، اور فرشتے اس کے پیچھے مددگار ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ اب آگے خود بیویوں کو توبہ وغیرہ کے لیے خطاب ہے کہ) اے (پیغمبر کی) دونوں بیبیوں! اگر تم اللہ کے سامنے توبہ کرلو تو (بہتر ہے کیونکہ توبہ کا تقاضا موجود ہے وہ یہ کہ) تمہارے دل (اس طرف) مائل ہو رہے ہیں (کہ تم حضور کو دوسری بیویوں سے ہٹا کر اپنا ہی بنالینا چاہتی ہو، چونکہ اس کی اصل وجہ رسول کی محبت ہے اس لیے فی نفسہ یہ بات بری نہ تھی، مگر اس سے دوسروں کے حقوق کا ضائع کرنا اور دل توڑنا لازم آتا ہے اس وجہ سے بری بات ہے اور توبہ کے لائق ہے) اور اگر (اسی طرح) پیغمبر کے مقابلے میں تم دونوں کارروائیاں کرتی رہیں تو (یاد رکھو کہ) پیغمبر کا رفیق اللہ ہے اور جبرئیل ہیں اور نیک مسلمان ہیں، اور ان کے علاوہ فرشتے (آپ کے) مددگار ہیں (مطلب یہ کہ تمہاری ان سازشوں سے آپ کا کوئی نقصان نہیں ہے بلکہ تمہارا ہی نقصان ہے، کیونکہ جس شخص کے ایسے حامی ہوں اس کے خلاف مزاج کارروائیاں کرنے کا انجام ظاہر ہے کہ برا ہی برا ہے)۔

فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا: اس سے ازواج مطہرات پر جو اعتراض ہوسکتا ہے اس کا جواب خود خلاصہ تفسیر کی تقریر سے واضح ہو گیا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ: اس میں جو سب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رفیق فرمایا تو ہر ایک کی رفاقت جدا ہے، حق تعالیٰ تو حقیقی رفیق اور مددگار ہیں، جبرائیل کی رفاقت یہ ہے کہ وہ فیوض و برکات میں واسطہ ہیں، فرشتوں کی رفاقت یہ ہے کہ وہ سکینہ ورحمت نازل کرتے ہیں، اور مؤمنین کی رفاقت یہ ہے کہ وہ خادم اور تابع ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ عائشہؓ وحفصہؓ کو خطاب ہے کہ اگر تم توبہ کرتی ہو تو بیشک توبہ کا موقع ہے، کیونکہ تمہارے دل جادہ اعتدال سے ہٹ کر ایک

طرف کو جھک گئے ہیں، لہذا آئندہ ایسی بے اعتدالیوں سے پرہیز رکھا جائے۔

فائدہ: ۲۔ زوجین کے خانگی معاملات بعض اوقات ابتداءً بہت معمولی اور حقیر نظر آتے ہیں، لیکن اگر ذرا باگ ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو آخرکار نہایت خطرناک اور تباہ کن صورت اختیار کر لیتے ہیں، خصوصاً عورت اگر کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتی ہو تو اس کو طبعاً اپنے باپ بھائی اور خاندان پر بھی گھمنڈ ہوسکتا ہے، اس لیے متنبہ فرما دیا کہ دیکھو اگر تم دونوں اسی طرح کی کارروائیاں اور مظاہرے کرتی رہیں تو یاد رکھو ان سے پیغمبر کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا کیونکہ اللہ اور فرشتے اور نیک بخت ایماندار درجہ بدرجہ جس کے رفیق و مددگار ہوں اس کے سامنے کوئی انسانی تدبیر کامیاب نہیں ہوسکتی ہاں تم کو نقصان پہنچ جانے کا امکان ہے۔

تنبیہ: بعض سلف نے صالح المومنین کی تفسیر میں ابوبکرؓ وعمرؓ کا نام لیا ہے، شاید یہ عائشہؓ اور حفصہؓ کی مناسبت سے ہوگا، واللہ اعلم۔

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ

اور اگر نبی چھوڑ دے تم سب کو ابھی اسکا رب بدلے میں دیدے اسکو عورتیں تم سے بہتر حکم بردار یقین رکھنے والیاں نماز میں کھڑی ہونے والیاں

تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝۵

توبہ کرنے والیاں بندگی بجالانے والیاں روزہ رکھنے والیاں بیاہیاں اور کنواریاں

خلاصہ تفسیر: چونکہ ان آیات کے بعض اسباب نزول میں حضرت عائشہؓ وحفصہؓ کے علاوہ اور ازواج مطہرات بھی شریک تھیں جیسے حضرت سودہؓ وحضرت صفیہؓ، اس لئے آگے صیغہ جمع سے خطاب فرماتے ہیں کہ تم یہ وسوسہ دل میں نہ لانا کہ آخر تو مرد کو بیویوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم سے بہتر عورتیں کہاں ہیں اس لئے چاروناچار ہماری سب باتیں سہی جائیں گی سو یہ سمجھ لو کہ:

اگر پیغمبر تم عورتوں کو طلاق دے دیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے ان کو تم سے اچھی بیویاں دی دے گا جو اسلام والیاں ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں (بعض مصالح سے بیوہ بھی مرغوب ہوتی ہے، جیسے تجربہ سلیقہ ہم عمری وغیرہ اس لئے اس کو بھی مرغوب بہ اوصاف میں شمار فرمایا)۔

اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ: یہ جو فرمایا کہ تم سے اچھی بیویاں دے گا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس وقت ان ازواج سے بہتر کوئی عورت موجود تھی، ہوسکتا ہے کہ اس وقت نہ ہوں، جب ضرورت پڑے اور حق تعالیٰ بدلنا چاہیں تو دوسری عورتوں کو ان سے بہتر بنا دیں۔

* * *

فائدہ: وسوسہ دل میں نہ لانا کہ آخر تو مرد کو بیبیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم سے بہتر عورتیں کہاں ہیں اس لیے ناگزیر ہماری سب باتیں سہی جائیں گی، یاد رکھو! اللہ چاہے تو تم سے بھی بہتر بیبیاں اپنے نبی کے لیے پیدا کر دے، اس کے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔

تنبیہ: ثیّبات (بیواؤں) کا ذکر شاید اسی لیے کیا کہ بعض حیثیات سے آدمی ان کو ابکار (کنواریوں) پر ترجیح دیتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ

اے ایمان والو بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کی چھپٹیاں ہیں آدمی اور پتھر ۱؎ اس پر مقرر ہیں فرشتے

غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝۶

تندخو زبردست ۲؎ نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جو بات فرمائے ان کو اور وہی کام کرتے ہیں جو ان کو حکم ہو ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے معلوم ہوگیا کہ جب رسول کی بیویوں کو بھی عمل صالح اور اطاعت سے چارہ نہیں اور رسول اللہ ﷺ بھی اس پر مامور ہیں کہ اپنی ازواج کو نصیحت کر کے عمل صالح پر آمادہ کریں تو باقی سب امت پر بھی یہ فریضہ اور زیادہ موکد ہوگیا کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی اصلاح اعمال واخلاق میں غفلت نہ برتیں اس لیے حکم دیا گیا کہ:

اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو (دوزخ کی) اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن (جلاہوا) آدمی اور پتھر ہیں (اپنے کو بچانا خود احکام کی اطاعت کرنا اور گھر والوں کو بچانا ان کو احکام الٰہیہ کا سکھانا اور ان پر عمل کرانے کے لئے زبان سے ہاتھ سے بقدر امکان کوشش کرنا ہے، آگے اس آگ کی دوسری حالت کا بیان ہے کہ) جس پر تندخو (اور) مضبوط (قوی) فرشتے (متعین) ہیں (کہ نہ وہ کسی پر رحم کریں، نہ کوئی ان کا مقابلہ کر کے بچ سکے) جو خدا کی (ذرا) نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے، اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو (فوراً) بجالاتے ہیں (غرض اس دوزخ پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو کافروں کو دوزخ میں داخل کر کے چھوڑیں گے)۔

لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ: بظاہر اس میں تکرار معلوم ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ یہاں عصیان ونافرمانی سے مراد قلبی عصیان ہے جو کہ اطاعت کا مقابل ہے کہ وہ اطاعت بھی قلبی ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوا کہ نہ تو دل میں نافرمانی کا خیال ہوتا ہے اور نہ اپنے عمل سے نافرمانی کرتے ہیں، یا یوں کہا جائے کہ اس معنی کر بھی نافرمانی نہیں کرتے کہ حکم کے خلاف کریں اور سستی اور دیر بھی نہیں کرتے، پس دونوں تقریروں پر تکرار لازم نہیں آتا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ہر مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی دین کی راہ پر لائے سمجھا کر، ڈرا کر، پیار سے، مار سے جس طرح ہو سکے دیندار بنانے کی کوشش کرے، اس پر بھی اگر وہ راہ راست پر نہ آئیں تو ان کی کم بختی، یہ بے قصور ہے، **وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ** کی تفسیر پارہ الم کے شروع میں گزر چکی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی مجرموں کو نہ رحم کھا کر چھوڑیں نہ ان کی زبردست گرفت سے کوئی چھوٹ کر بھاگ سکے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی نہ حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں نہ اسکے احکام بجالانے میں سستی اور دیر ہوتی ہے نہ امتثال حکم سے عاجز ہیں۔

ع ۱۹ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لَا تَعْتَذِرُوا۟ ٱلْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝٧

اے منکر ہونے والو مت بہانے بتلاؤ آج کے دن، وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: (اور اس وقت کافروں سے کہا جائے گا کہ) اے کافرو! تم آج عذر (ومعذرت) مت کرو (کہ بے فائدہ ہے) بس تم کو تو اسی کی سزا مل رہی ہے جو کچھ تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: یعنی قیامت کے دن جب جہنم کا عذاب سامنے ہوگا، اس وقت منکروں سے کہا جائے گا کہ حیلے بہانے مت بتلاؤ، آج کوئی بہانہ چلنے والا نہیں بلکہ جو کچھ کرتے تھے اس کی پوری پوری سزا بھگتنے کا دن ہے، ہماری طرف سے کوئی ظلم زیادتی نہیں، تمہارے ہی اعمال ہیں جو عذاب کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ تُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ

اے ایمان والو توبہ کرو اللہ کی طرف صاف دل کی توبہ ۱؎ امید ہے تمہارا رب اتار دے تم پر سے تمہاری برائیاں

وَ يُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

اور داخل کرے تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں، جس دن کہ اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی کو اور ان لوگوں کو جو یقین لائے ہیں

مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ

اسکے ساتھ ۲؎ انکی روشنی دوڑتی ہے انکے آگے اور انکے داہنے ۳؎ کہتے ہیں اے رب ہمارے پوری کر دی ہم کو ہماری روشنی اور معاف کر ہم کو

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۸

بیشک تو سب کچھ کر سکتا ہے ۴؎

خلاصہ تفسیر: اب دوزخ سے بچنے کا طریقہ بتلاتے ہیں اور وہی اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچانے کا طریقہ ہے:

اے ایمان والو! اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو (یعنی دل میں گناہ پر کامل ندامت ہو اور آئندہ اس کے نہ کرنے کا پختہ قصد ہو، اس میں تمام احکام دین فرائض واجبات بھی داخل ہو گئے کہ ان کا چھوڑنا گناہ ہے اور تمام محرمات ومکروہات بھی آ گئے کہ ان کا کرنا گناہ ہے، اب توبہ کا نتیجہ بیان فرماتے ہیں) امید (یعنی وعدہ) ہے کہ تمہارا رب (اس توبہ کی بدولت) تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو (جنت کے) ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور یہ اس روز ہوگا) جس دن کہ اللہ نبی (ﷺ) کو اور جو مسلمان (ایمان اور دین کی رو سے) ان کے ساتھ ہیں ان کو رسوا نہ کرے گا (چونکہ عام رسوائی کا موقع میدان قیامت ہے، اس لیے یہاں اس رسوائی کی حالت کو پل صراط سے پہلے میدان قیامت کے متعلق کہا جائے گا، اب پل صراط کے اعتبار سے ان کی حالت کا بیان ہے کہ) ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا (جیسا کہ سورۃ حدید میں گزر چکا ہے اور وہ) یوں دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے لئے ہمارے اس نور کو اخیر تک رکھئے (یعنی راستہ میں بجھ نہ جائے) اور ہماری مغفرت فرما دیجئے آپ ہر شئے پر قادر ہیں۔

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہاں اصل مقصود صرف مؤمنین کا حال بیان کرنا ہے کہ اللہ مؤمنین کو رسوا نہ کرے گا، اور نبی کریم ﷺ کا ذکر ساتھ ملا دینا اس حکم کی تقویت کے لیے ہے، یعنی جیسے پیغمبر کی رسوائی نہ ہونا بلاشبہ یقینی ہے ایسے ہی مؤمنین کے لیے بھی رسوائی نہ ہونا یقینی ہے، رسوائی سے یہاں وہ خاص رسوئی مراد ہے جو کفر کی جزا ہے جیسے کہ ایک اور جگہ ارشاد ہے: ان الخزی الیوم والسوء علی الکافرین، اور مؤمنین سے یہاں مطلق مؤمنین مراد ہیں۔

رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا: نور کو باقی رکھنے کی دعا اس لیے کریں گے کہ پل صراط کے پاس پہنچ کر منافقوں کا نور بجھ جائے گا جس کا ذکر سورہ حدید میں گذرا ہے، تو اس وقت مؤمنین یہ دعا کریں گے کہ منافقین کی طرح کہیں ہمارا نور بھی سلب نہ ہو جائے، غرض رسوائی نہ ہونے کی طرح نور کا باقی رہنا بھی سب مؤمنین کے لیے عام ہے، اور اس سے گناہ گار مسلمانوں کا جہنم میں داخل ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ ممکن ہے کہ اس نور کے باقی رہنے کے باوجود پھر گناہوں کی وجہ سے آگ میں داخل ہوں، اس پر شبہ ہوتا ہے کہ پھر نور کے باقی رہنے سے کیا فائدہ؟ سو ممکن ہے کہ وہ نور اصل میں ان کے ایمان کی مثالی صورت ہو جس کا ایمان کے ساتھ باقی رہنا لازم ہوگا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے انس کا حاصل ہونا مقصود ہو جس سے گناہ گار مسلمانوں کو جہنم میں کفار کی سی وحشت نہ ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ''صاف دل کی توبہ'' یہ کہ دل میں پھر اس گناہ کا خیال نہ رہے، اگر توبہ کے بعد ان ہی خرافات کا خیال پھر آیا تو سمجھو کہ توبہ میں کچھ کسر رہ گئی ہے، اور گناہ کی جڑ دل سے نہیں نکلی، رزقنا اللہ منها حظا وافرا بفضله وعونه وهو علی کل شیئ قدیر۔

فائدہ: ۲ یعنی نبی کا تو کہنا کیا اس کے ساتھیوں کو بھی ذلیل نہ کرے گا بلکہ نہایت اعزاز و اکرام سے فضل و شرف کی بلند مناصب پر سرفراز فرمائے گا۔

فائدہ: ۳ اس کا بیان سورۃ حدید میں ہو چکا۔

فائدہ: ۴ یعنی سورۃ حدید میں بیان ہو چکا کہ روشنی بجھ جائے گی اور اندھیرے میں کھڑے رہ جائیں گے، مفسرین نے عموماً یہی لکھا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ اتمم لنا نورنا کی مراد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''روشنی ایمان کی دل میں ہے، دل سے بڑھے تو سارے بدن میں پھر گوشت پوست میں'' (سرایت کرے)۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

اے نبی لڑائی کر منکروں سے دغابازوں سے اور سختی کر ان پر ۱ اور ان کا گھر دوزخ ہے اور بری جگہ جا پہنچے ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: يَآيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے کفار کا مبغوض اور ناپسندیدہ ہونا معلوم ہوا، اب نتیجہ کے طور پر رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے اور ان کفار و منافقین کے جہنمی ہونے کی بھی خبر ہے، پس ارشاد ہے کہ:

اے نبی! (ﷺ) کفار (سے بذریعہ تلوار) اور منافقین سے (بذریعہ زبان اور حجت کے بیان سے) جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے (دنیا میں تو یہ اس سزا کے مستحق ہوئے) اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت کا خلق اور نرم خوئی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ اوروں کو فرماتا ہے تحمل کرو اور آپ کو فرماتا ہے کہ سختی کرو۔

فائدہ: ۲ پہلے مومنین کا ٹھکانا بتلایا تھا، یہاں اس کے بالمقابل کفار و منافقین کا گھر بتلا دیا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ

اللہ نے بتلائی ایک مثل منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے

عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ

ہمارے نیک بندوں میں سے پھر انہوں نے ان سے چوری کی پھر وہ کام نہ آئے انکے اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں

الدّٰخِلِيْنَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ

جانے والوں کے ساتھ، اور اللہ نے بتلائی ایک مثل ایمان والوں کے لیے عورت فرعون کی ۱ جب بولی اے رب بنا میرے واسطے

عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

اپنے پاس ایک گھر بہشت میں ۲ اور بچا نکال مجھ کو فرعون سے اور اس کے کام سے اور بچا نکال مجھ کو ظالم لوگوں سے ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل و عیال کی اصلاح کا حکم تھا، اب آگے یہ بتلاتے ہیں کہ آخرت میں ہر شخص کو اپنا ہی ایمان کام آئے گا، کافر کو کسی ان کے خویش و عزیز کا ایمان عذاب سے نہ بچائے گا، اسی طرح مومن کے خویش و عزیز کافر ہوں تو مومن کو اس کا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اللہ تعالیٰ کافروں (کی عبرت) کے لئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کا حال بیان فرماتا ہے، وہ دونوں ہمارے خاص بندوں میں سے دو

نیک بندوں کے نکاح میں تھیں سوان عورتوں نے ان دونوں بندوں کا حق ضائع کیا (یعنی نبی ہونے کی وجہ سے ان کا حق یہ بھی تھا کہ ان پر ایمان لاتیں اور دینی احکام میں ان کی اطاعت کرتیں جوانہوں نے نہیں کی) تو وہ دونوں نیک بندے اللہ کے مقابلے میں ان کے ذرا کام نہ آسکے اوران دونوں عورتوں کو (کافر ہوجانے کی وجہ سے) حکم ہوگیا کہ تم دونوں بھی دوسرے جہنم میں داخل ہونے والوں کے ساتھ جہنم میں داخل ہوجاؤ (یہاں تک کافروں کی عبرت کے لئے واقعہ بیان کیا گیا تھا، آگے مسلمانوں کے اطمینان کے لئے فرمایا) اللہ تعالیٰ مسلمانوں (کی تسلی) کے لئے فرعون کی بیوی (حضرت آسیہ) کا حال بیان کرتا ہے (اور خاص کر وہ عجیب حال جو اس وقت واقع ہوا تھا) جبکہ ان بی بی نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! میرے واسطے جنت میں اپنے قرب میں مکان بنائیے اور مجھ کو فرعون (کے شر) سے اور اس کے عمل (کفر کے نقصان اور اثر) سے محفوظ رکھئے اور مجھ کو تمام ظالم (یعنی کافر) لوگوں (کے ظاہری اور باطنی نقصان) سے محفوظ رکھئے۔

پیچھے آیت: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا میں مردوں کو اپنے اہل وعیال کی اصلاح کا حکم دیا گیا، اس سے دو باتوں کا واجب ہونا معلوم ہوا: ① ایک تو اہل وعیال کی اصلاح صاحب خانہ یعنی مردوں پر واجب ہونا ② دوسرے خود صاحب خانہ یعنی مردوں پر اپنی اصلاح کا واجب ہونا، اس دوسرے کے حکم واجب ہونے پر غالباً عورتوں کی طرف سے تین وسوسوں کا گمان ہوسکتا تھا:

① ایک وسوسہ صلحاء اور نیک لوگوں کی خواتین اور بیویوں کو ہوسکتا تھا کہ اگر ہم خود صالح نہ بھی ہوں تب بھی ہمارے نیک مردوں کی نسبت سے ہمیں آخرت میں فلاح وکامیابی ہوجائے گی، چنانچہ یہاں حضرت نوح اور لوط علیہما السلام کے واقعہ سے تو یہ پہلا وسوسہ دور فرمادیا، چونکہ اس پہلے وسوسہ میں خواتین زیادہ مبتلا ہوتی ہیں اس لیے شاید اسے دور کرنے کے لیے دو واقعات بیان فرمادیے، حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کے اس واقعہ میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ صلحاء اور نیک لوگوں کے ساتھ نسبت ہونے پر ناز اور فخر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ بغیر اطاعت اور عمل صالح کے فقط نسبت کام نہیں آئے گی۔

② دوسرا وسوسہ عام گناہ گار اور فاسق لوگوں کی خواتین اور بیویوں کو ہوسکتا تھا کہ ہم اگرچہ نیک بھی ہوجائیں تب بھی ہمارے گناہ گار یا غیر صالح مردوں کی وجہ سے کہیں ہماری اخروی فلاح وکامیابی خطرے میں نہ پڑ جائے، چنانچہ فرعون کی بیوی کے واقعہ سے یہ دوسرا وسوسہ بھی دور فرمادیا۔

اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ یہ دعوی کرنا کہ یہ واقعات ازواج مطہرات کو سنائے گئے ہیں یہ دعوی بلا دلیل ہے، اور بالکل غلط ہے، کیونکہ یہ قصہ ازواج مطہرات کے متعلق نہیں، بلکہ یہ واقعات پیچھے آیت: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ کے مضمون کے متعلق ہیں جیسا کہ بیان ہوا۔

رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا: حضرت آسیہ کی یہ دعا یا تو مطلق احوال میں کی تھی، یا اس وقت جبکہ فرعون نے ان کے مؤمن ہونے کی خبر سن کر ان کو تکلیفیں پہنچائیں تو ان کو جنت میں اپنا مکان نظر آگیا جس سے وہ تکلیفیں ہلکی ہوگئیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حضرت نوح اور حضرت لوط کیسے نیک بندے، مگر دونوں کے گھر میں ان کی بیویاں منافق تھیں، بظاہر ان کے ساتھ تعلق تھا لیکن دل سے کافروں کے شریک حال تھیں، پھر کیا ہوا؟ عام دوزخیوں کے ساتھ انکو بھی اللہ نے دوزخ میں دھکیل دیا پیغمبروں کا رشتہ، زوجیت ذرا بھی عذاب الٰہی سے نہ بچا سکا، ان کے برعکس فرعون کی بیوی حضرت آسیہ بنت مزاحم، پکی ایماندار، ولی کامل، اور اسکا شوہر خدا کا سب سے بڑا باغی، وہ نیک بیوی میاں کو خدا کے عذاب سے نہ چھڑا سکی، نہ میاں کی شرارت وبغاوت کے جرم میں بیوی کو کچھ آنچ پہنچی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اپنا ایمان درست کرو، نہ خاوند بچا سکے نہ جورو، یہ (قانون عام طور پر) سب کو سنا دیا ہے، یہ وہم نہ کیا جائے کہ (معاذ اللہ) حضرت کی بیبیوں پر کہا، ان کے لیے تو وہ کہا ہے (جو سورۃ نور میں ہے) الطیبات لطیبین'' اور اگر بفرض محال ایسا وہم کیا جائے تو امرأۃ فرعون کی مثال کس پر چسپاں کروگے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ!!۔

فائدہ: ۲ یعنی اپنا قرب عنایت فرما، اور بہشت میں میرے لیے مکان تیار کر۔

فائدہ: ۳ یعنی فرعون کے پنجہ سے چھڑا اور اس کے ظلم سے نجات دے، حضرت موسیٰ کو انہوں نے پرورش کیا تھا اور ان کی مددگار تھیں،

کہتے ہیں کہ فرعون کو جب حال کھلا تو ان کو چومیخا کر کے طرح طرح کی ایذائیں دیتا تھا، اس حالت میں اللہ کی طرف سے جنت کا محل ان کو دکھلایا جاتا، جس سے سب سختیاں آسان ہو جاتی تھیں، آخر فرعون نے ان کو سیاسۃً قتل کر دیا، اور جام شہادت نوش کر کے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئیں، حدیث صحیح میں نبی کریم ﷺ نے ان کے کامل ہونے کا اعلان فرمایا ہے، اور حضرت مریم کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، ہزاروں ہزار رحمتیں ہوں اس پاک روح پر۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ

اور مریم بیٹی عمران کی جس نے روکے رکھا اپنی شہوت کی جگہ کو ۱ پھر ہم نے پھونک دی اس میں ایک اپنی طرف سے جان ۲ اور سچا جانا

بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿۱۲﴾ ع

اپنے رب کی باتوں کو اور اس کی کتابوں کو ۳ اور وہ تھی بندگی کرنے والوں میں ۴

خلاصہ تفسیر: اور (نیز مسلمانوں کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ) عمران کی بیٹی حضرت مریم کا حال بیان کرتا ہے جنہوں نے اپنے ناموس کو (حرام اور حلال دونوں سے) محفوظ رکھا (اس میں ان کی عفت، پاکیزگی اور نزاہت کا بیان ہے) سو ہم نے ان کے چاک گریبان میں (جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے) اپنی روح پھونک دی اور انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کی (جوان کو ملائکہ کے ذریعے سے پہنچے تھے جیسا کہ ارشاد ہے: یمریم ان اللہ اصطفك، اسی طرح ارشاد ہے: انما انا رسول ربك) اور اس کی کتابوں کی (جن میں سے تورات وانجیل بھی ہیں) تصدیق کی (یہ بیان ہے ان کے عقائد کا) اور وہ اطاعت والوں میں سے تھیں (یہ بیان ہے ان کے اعمال کا)۔

③ تیسرا وسوسہ ان کنواری یا بیوہ عورتوں کو ہوسکتا تھا جو وقتی طور پر کسی کی تابع نہ ہوں، انہیں یہ وسوسہ ہوسکتا تھا کہ شاید عورتوں کی کامل اصلاح مردوں کی اصلاح پر موقوف ہے اور شاید اسی وجہ سے پیچھے آیت میں براہ راست مردوں کو ہی خطاب کیا گیا، اس وسوسہ کا جواب یہ ہے کہ براہ راست مردوں کو خطاب محض آسانی وسہولت کے لیے ہے، یہ مطلب نہیں کہ عورتوں کی اصلاح موقوف ہو مردوں کی اصلاح پر۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حلال وحرام سب سے محفوظ رکھا۔

فائدہ: ۲ یعنی فرشتہ کے ذریعہ سے ایک روح پھونک دی، حضرت جبرائیل نے گریبان میں پھونک ماری، جس کا نتیجہ استقرار حمل ہوا، اور حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے۔

تنبیہ: نفخ کی نسبت اپنی طرف اس لیے کی کہ فاعل حقیقی اور موثر علی الاطلاق وہی ہے، آخر ہر عورت کے رحم میں جو بچہ بنتا ہے، اس کا بنانے والا اس کے سوا کون ہے! بعض محققین نے یہاں فرج کے معنی چاک گریبان کے لیے ہیں، اس وقت اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کے معنی یہ ہوں گے کہ "کسی کا ہاتھ اپنے گریبان تک نہیں پہنچنے دیا" اور یہ نہایت بلیغ کنایہ ان کی عصمت وعفت سے ہوگا، جیسے ہمارے محاورات میں کہتے ہیں کہ "فلاں عورت بہت پاک دامن ہے" اور عرب میں کہا جاتا ہے "نقی الحبیب طاهر الذیل" اس سے عفیف النفس ہونا مراد ہوتا ہے، کپڑے کا دامن مراد نہیں ہوتا، اس تقدیر پر فنفخنا فیہ میں ضمیر لفظ "فرج" کی طرف اس کے لغوی معنی کے اعتبار سے راجع ہوگی، واللہ اعلم بالصواب۔

فائدہ: ۳ رب کی باتیں وہ ہوں گی جو فرشتوں کی زبانی سورۃ آل عمران میں بیان ہوئی ہیں: وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران: ۴۲)۔

اور "کتابوں" سے عام کتب سماویہ مراد لی جائیں، تخصیص کی ضرورت نہیں۔

فائدہ: ۴ یعنی کامل مردوں کی طرح بندگی وطاعت پر ثابت قدم تھی، یا یوں کہو کہ قانتین کے خاندان سے تھی۔

ایاتها ۳۰ ﴿ ۶۷ سُوْرَةُ الْمُلْكِ مَكِّيَّةٌ ۷۷ ﴾ رکوعاتها ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں رسالت کے حقوق کا بیان تھا، اس سورت میں توحید کے حقوق کا بیان ہے اور ان کے پورا کرنے یا نہ کرنے پر جزا و سزا کا بیان ہے، سورت کے شروع میں حق تعالیٰ کی صفات اور قدرت کا بیان اور پھر اس کے بعد اس کے دلائل ہیں، غرض اس پوری سورت میں اصل مضمون حق تعالیٰ کے وجود اور اس کے کمال علم وقدرت پر کائنات عالم کے مشاہدہ سے دلائل پیش کرنا ہے، ضمناً دوسرے مضامین کفار کی سزا اور مومنین کی جزا کے بھی آ گئے ہیں، خود انسان کے نفس میں جو دلائل اللہ تعالیٰ کے کمال علم وقدرت کے ہیں ان کی طرف بھی ہدایت فرمائی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ۝۱ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ

بڑی برکت ہے اس کی جس کے ہاتھ میں ہے راج اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے ۱ جس نے بنایا مرنا اور جینا

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝۲

تا کہ تم کو جانچے کون تم میں اچھا کرتا ہے کام ۲ اور وہ زبردست ہے بخشنے والا ۳

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں حق تعالیٰ کے لئے چار صفات کا دعویٰ ہے: ① اس کا موجود ہونا ② انتہائی درجے کی صفات کمال کا مالک اور سب سے بالا و برتر ہونا ③ آسمان وزمین پر اس کی حکومت ہونا ④ ہر چیز پر اس کا قادر ہونا، اگلی آیات میں اس دعوے کے دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہی میں غور وفکر کرنے سے واضح ہوتے ہیں، اس لئے اگلی آیات میں تمام کائنات ومخلوقات کی مختلف انواع واصناف سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید پر اور اس کے کمال علم وقدرت پر استدلال کیا گیا ہے سب سے پہلے اشرف المخلوقات انسان کے اپنے وجود میں جو دلائل قدرت ہیں ان کی طرف متوجہ فرمایا: الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ الخ میں اس کا بیان ہے۔

وہ (خدا) بڑا عالی شان ہے جس کے قبضہ میں تمام سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے، اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے (کہ اعمال غیر حسنہ پر سزا وعقاب اور اعمال حسنہ پر مغفرت وثواب مرتب فرماتا ہے)۔

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ: احوال انسانی میں سے یہاں صرف دو چیزیں موت وحیات بیان کی گئیں، کیونکہ یہی دونوں انسان کے تمام عمر کے احوال وافعال پر حاوی ہیں، حیات کے لئے پیدا کرنے کا لفظ تو اپنی جگہ ظاہر ہے کہ حیات ایک وجودی چیز ہے، تخلیق وتکوین کا اس سے متعلق ہونا ظاہر ہے، لیکن موت جو بظاہر ایک عدم کا نام ہے اس کے ساتھ تخلیق کا تعلق کس طرح ہوا، زیادہ واضح بات یہ ہے کہ موت عدم محض کا نام نہیں بلکہ روح اور بدن کا تعلق منقطع کر کے روح کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کرنے کا نام ہے اور یہ ایک وجودی چیز ہے، غرض جس طرح حیات ایک حال ہے جو جسم انسانی پر طاری ہوتا ہے اسی طرح موت بھی ایک ایسا ہی حال ہے، نیز موت اگرچہ عدمی چیز ہے، مگر عدم محض نہیں، بلکہ ایسی چیز کا عدم ہے جس کو وجود میں کسی وقت آنا ہے اور ایسے تمام معدومات کی شکلیں عالم مثال میں قبل از وجود نا سوتی موجود ہوتی ہیں جن کو اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے، ان اشکال کی وجہ سے ان کو قبل الوجود بھی ایک قسم کا وجود حاصل ہے اور عالم مثال کے موجود ہونے پر بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہے واللہ اعلم۔

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا: حسن عمل میں موت کا تو دخل یہ ہے کہ موت کی فکر سے انسان دنیا کو فانی اور قیامت کے اعتقاد سے

آخرت کو باقی سمجھ کر وہاں کے ثواب حاصل کرنے اور وہاں کے عذاب سے بچنے کے لئے مستعد ہوسکتا ہے، اور حیات کا دخل یہ ہے کہ اگر حیات نہ ہوتو عمل کس وقت کرے، پس حسن عمل کے لئے موت بمنزلہ شرط کے اور حیات بمنزلہ ظرف کے ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سب ملک اس کا ہے اور تنہا اسی کا اختیار ساری سلطنت میں چلتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی مرنے جینے کا سلسلہ اسی نے قائم کیا، ہم پہلے کچھ نہ تھے (اسے موت ہی سمجھو) پھر پیدا کیا، اس کے بعد موت بھیجی، پھر مرے پیچھے زندہ کر دیا، کما قال: كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (البقرۃ:۲۸) موت وحیات کا یہ سارا سلسلہ اس لیے ہے کہ تمہارے اعمال کی جانچ کرے کہ کون برے کام کرتا ہے کون اچھے، اور کون اچھے سے اچھے، پہلی زندگی میں یہ امتحان ہوا اور دوسری زندگی میں اس کا مکمل نتیجہ دکھلا دیا گیا، فرض کرو اگر پہلی زندگی نہ ہوتی تو عمل کون کرتا، اور موت نہ آتی تو لوگ مبداء و منتہی سے غافل اور بے فکر ہو کر عمل چھوڑ بیٹھتے اور دوبارہ زندہ نہ کیے جاتے تو بھلا برے کا بدلہ کہاں ملتا۔

فائدہ: ۳ یعنی زبردست ہے جس کی پکڑ سے کوئی نہیں نکل سکتا اور بخشنے والا بھی بہت بڑا ہے۔

الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ

جس نے بنائے سات آسمان تہ پر تہ ۱ کیا دیکھتا ہے تو رحمان کے بنانے میں کچھ فرق ۲ پھر دوبارہ نگاہ کر

هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳

کہیں نظر آتی ہے تجھ کو دراڑ ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے انسان کے وجود میں دلائل قدرت بیان ہوئے، اب آگے چند آیتوں میں آسمانوں کی تخلیق میں غور وفکر سے استدلال فرماتے ہیں۔

جس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے (جیسے صحیح حدیث میں ہے کہ ایک آسمان سے اوپر طویل فاصلہ کے بعد دوسرا آسمان ہے، پھر اسی طرح اس سے اوپر تیسرا، اسی طرح اسی اوپر، اب آسمان کی مضبوطی بیان فرماتے ہیں کہ اے دیکھنے والے!) تو خدا کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا، سو (اب کی بار) پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے (یعنی بلا تامل تو بہت بار دیکھا ہوگا، اب کی بار تامل سے نگاہ کر)۔

* * *

فائدہ: ۱ حدیث میں آیا کہ ایک آسمان کے اوپر دوسرا آسمان، دوسرے پر تیسرا، اسی طرح سات آسمان اوپر نیچے ہیں اور ہر ایک آسمان سے دوسرے تک پانچ سو برس کی مسافت ہے، نصوص میں یہ تصریح نہیں کی گئی کہ اوپر جو نیلگونی چیز ہم کو نظر آتی ہے وہ ہی آسمان ہے ہوسکتا ہے کہ ساتوں آسمان اس کے اوپر ہوں اور یہ نیلگونی چیز آسمان کی چھت گیری کا کام دیتی ہو۔

فائدہ: ۲ یعنی قدرت نے اپنے انتظام اور کاریگری میں کہیں فرق نہیں کیا ہر چیز میں انسان سے لے کر حیوانات، نباتات، عناصر، اجرام علویہ، سبع سماوات اور نیرات تک یکساں کاریگری دکھلائی ہے، یہ نہیں کہ بعض اشیاء کو حکمت وبصیرت سے اور بعض کو یونہی کیف ما اتفق، بے تکا یا بے کار و فضول بنا دیا ہو (العیاذ باللہ) اور جہاں کسی کو ایسا وہم گزرے سمجھو اس کی عقل ونظر کا قصور ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی ساری کائنات نیچے سے اوپر تک ایک قانون اور مضبوط نظام میں جکڑی ہوئی ہے اور کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے، کہیں درز یا دراڑ نہیں، نہ کسی صنعت میں کسی طرح کا اختلال پایا جاتا ہے، ہر چیز ویسی ہے جیسا اسے ہونا چاہیے، اور اگر یہ آیتیں صرف آسمان سے متعلق ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اے مخاطب! اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ کہیں اونچ نیچ یا درز اور شگاف نہیں پائے گا، بلکہ ایک صاف ہموار، متصل، مربوط اور

منظم چیز نظر آئے گی جس میں باوجود مرورِ دہور اور تطاول ازمان کے آج تک کوئی فرق اور تفاوت نہیں آیا۔

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيرٌ ④

پھر لوٹا کر نگاہ کر دوبارہ لوٹ آئے گی تیرے پاس تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر

خلاصہ تفسیر: پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ (آخر کار) نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی (اور کوئی رخنہ نظر نہ آئے گا یعنی وہ جس چیز کو جیسا چاہے بنا سکتا ہے، چنانچہ آسمان کو مضبوط بنانا چاہا تو کیسا بنایا کہ اتنا طویل زمانہ گزرنے کے باوجود اب تک اس میں کوئی خلل نہیں آیا جیسا کہ ارشاد ہے: **ومالها من فروج** اسی طرح کسی چیز کو کمزور اور جلد متاثر ہونے والا بنا دیا، غرض اس کو ہر طرح کی قدرت ہے)۔

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ: آسمان سے متعلق مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا والے آسمان کو آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، اور یہ ضروری نہیں کہ نیلگوں فضا جو دکھائی دیتی ہے یہی آسمان ہو، بلکہ ہوسکتا ہے آسمان اس سے بہت اوپر ہو اور یہ نیلگوں رنگ ہوا اور فضا کا ہو جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں، مگر اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ آسمان انسان کو نظر ہی نہ آئے، ہوسکتا ہے کہ یہ نیلگوں فضا شفاف ہونے کے سبب اصل آسمان کو جو اس سے بہت اوپر ہے دیکھنے میں مانع نہ ہو، اور اگر کسی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ دنیا میں رہتے ہوئے آسمان کو آنکھ سے نہیں دیکھا جاسکتا تو پھر یہاں رؤیت سے مراد رویت عقلی یعنی غور وفکر ہوگا، بعض نے کہا ہے کہ مذکورہ آیات آسمان کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر مخلوق کو عام ہے، یعنی کسی چیز میں بہت غور وفکر کے ساتھ دیکھنے سے بھی کوئی بات خلاف حکمت معلوم نہیں ہوگی، لیکن پھر بھی اگر کسی کو اس کا وہم ہوتا ہے تو اس کی وجہ گہری نظر اور غور وفکر کی کمی ہوگی۔

اگر شبہ ہو کہ آسمان میں دروازے کیوں نظر نہیں آتے؟ تو ممکن ہے کہ دروازے اتنے بڑے نہ ہوں کہ اتنی دور سے نظر آئیں، اور اگر شبہ ہو کہ شاید وہ رخنہ اور شگاف بھی چھوٹے ہوں اس لیے نظر نہ آتے ہوں؟ تو جواب یہ ہے کہ عادتاً بڑی عمارت میں شگاف بھی بڑا پڑتا ہے، پھر وہ شگاف تھوڑا تھوڑا بڑھتا چلا جاتا ہے، آخر ایک طویل زمانہ گذرنے کے بعد تو اس شگاف میں اتنی گنجائش اور کشادگی ضرور واقع ہو جاتی ہے جو مرئی یعنی دکھائی دینے کے قابل ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی ممکن ہے ایک آدھ مرتبہ دیکھنے میں نگاہ خطا کر جائے، اس لیے پوری کوشش سے بار بار دیکھ، کہیں کوئی رخنہ تو دکھائی نہیں دیتا خوب غور وفکر اور نظر ثانی کر کہ قدرت کے انتظام میں کہیں انگلی رکھنے کی جگہ تو نہیں۔ یاد رکھ! تیری نگاہ تھک جائے گی اور ذلیل و درماندہ ہو کر واپس آجائے گی۔ لیکن خدائی مصنوعات وانتظامات میں کوئی عیب وقصور نہ نکال سکے گی۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ

اور ہم نے رونق دی سب سے ورلے آسمان کو چراغوں سے [1] اور ان سے کر رکھی ہے ہم نے پھینک مار شیطانوں کے واسطے [2] اور رکھا ہے

عَذَابَ السَّعِيرِ ⑤

ان کے واسطے عذاب دہکتی آگ کا [3]

خلاصہ تفسیر: اور (ہماری قدرت کی دلیل یہ ہے کہ) ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں (یعنی ستاروں) سے آراستہ کر رکھا ہے اور ہم نے ان (ستاروں) کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بنایا ہے (جس کی حقیقت سورۃ حجر میں گزر چکی ہے) اور ہم نے ان (شیاطین) کے

لئے (شہاب کی مار کے علاوہ جو کہ دنیا میں ہوتا ہے آخرت میں ان کے کفر کی وجہ سے) دوزخ کا عذاب (بھی) تیار کر رکھا ہے۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی آسمان کی طرف دیکھو! رات کے وقت ستاروں کی جگمگاہٹ سے کیسی رونق وشان معلوم ہوتی ہے۔ یہ قدرتی چراغ ہیں جن سے دنیا کے بہت سے منافع وابستہ ہیں۔

فائدہ: ٢ یہ مضمون سورۂ حجر وغیرہ میں کئی جگہ بہت تفصیل سے گزر چکا ہے۔

فائدہ: ٣ یعنی دنیا میں تو شہاب پھینکے جاتے ہیں اور آخرت میں ان کے لیے دوزخ کی آگ تیار ہے۔

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۞٦ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا

اور جو لوگ منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے واسطے ہے عذاب دوزخ کا اور بری جگہ جا پہنچے ١ جب اس میں ڈالے جائیں گے سنیں گے اسکا

شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۞٧ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ؕ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ

دھاڑنا اور وہ اچھل رہی ہوگی ٢ ایسا لگتا ہے کہ پھٹ پڑے گی جوش سے جس وقت پڑے اس میں ایک گروہ پوچھیں ان سے دوزخ کے داروغہ

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۞٨

کیا نہ پہنچا تھا تمہارے پاس کوئی ڈر سنانے والا ٣

خلاصہ تفسیر: یہاں تک مختلف مخلوقات میں غور وفکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کے کمال علم وقدرت کے دلائل بیان ہوئے، اب منکرین اور کفار کا عذاب اور پھر مؤمنین اور اطاعت شعار لوگوں کا ثواب بیان کرتے ہیں، اور اس کے بعد پھر وہی علم وقدرت کا بیان آئے گا۔

اور جو لوگ اپنے رب (کی توحید) کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور وہ بری جگہ ہے، جب یہ لوگ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس کی ایک بڑی زور کی آواز سنیں گے اور وہ اس طرح جوش مارتی ہوگی جیسے معلوم ہوتا ہے کہ (ابھی) غصہ کے مارے پھٹ پڑے گی (اور) جب اس میں کوئی گروہ (کافروں کا) ڈالا جائے گا تو اس کے محافظ ان لوگوں سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں آیا تھا؟ (جس نے تم کو اس عذاب سے ڈرایا ہو جس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس سے ڈرتے اور بچنے کا سامان کرتے، یہ سوال بطور دھمکی کے ہے، یعنی پیغمبر تو آئے تھے اور یہ سوال ہر نئے جانے والے گروہ سے ہوگا، کیونکہ دوزخ میں مراتب کفر کے فرق کے اعتبار سے کفار کے سب فرقے یکے بعد دیگرے جائیں گے)۔

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ: یا تو اللہ تعالیٰ اس میں ادراک اور غصہ پیدا کر دے گا کہ حق سے بغض رکھنے والوں پر اس کو بھی غیظ آئے گا اور یا مقصود تمثیل ہے، یعنی جیسے کوئی غصہ سے جوش میں آتا ہے اسی طرح وہ شدت اشتعال سے جوش میں آئے گی۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی کافروں کا ٹھکانا بھی شیاطین کے ساتھ اسی دوزخ میں ہے۔

فائدہ: ٢ یعنی اس وقت دوزخ کی آواز سخت کریہہ اور خوفناک ہوگی اور بے انتہا جوش واشتعال سے ایسا معلوم ہوگا گویا غصہ میں آکر پھٹی پڑتی ہے، اعاذنا الله منها بلطفه وکرمه۔

فائدہ: ٣ یہ پوچھنا اور زیادہ ذلیل ومحجوب کرنے کے لیے ہوگا یعنی تم جو اس مصیبت میں آکر پھنسے ہو، کیا کسی نے تم کو متنبہ نہ کیا تھا؟ اور ڈرایا نہ تھا کہ اس راستے سے مت چلو ورنہ سیدھے دوزخ میں گرو گے جہاں ایسے ایسے عذاب ہوں گے۔

قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۚۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

اور وہ بولیں کیوں نہیں ہمارے پاس پہنچا تھا ڈر سنانے والا، پھر ہم نے جھٹلایا اور کہا نہیں اتاری اللہ نے کوئی چیز، تم تو پڑے ہوئے

فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝۹

ہو بڑے بہکاوے میں

خلاصہ تفسیر: وہ کافر (بطور اعتراف کے) کہیں گے کہ واقعی ہمارے پاس ڈرانے والا (پیغمبر) آیا تھا سو (ہماری شامت تھی کہ) ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا تعالیٰ نے (کتب اور احکام کی قبیل سے) کچھ نازل نہیں کیا (اور ہم نے پیغمبروں کو یوں کہہ دیا کہ) تم بڑی غلطی میں پڑے ہو (حاصل یہ ہے کہ کافروں نے اپنے اپنے زمانہ کے رسول کو یوں کہہ دیا)۔

* * *

فائدہ: کھسیانے ہو کر حسرت و ندامت سے جواب دیں گے کہ بیشک ڈرانے والے آئے تھے، مگر ہم نے ان کی بات نہ مانی برابر جھٹلایا کیے کہ تم سب غلط کہتے ہو، نہ اللہ نے تم کو بھیجا، نہ تم پر وحی اتاری، بلکہ تم عقل و فہم کے راستہ سے بہک کر بڑی سخت گمراہی میں جا پڑے ہو۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰

اور کہیں گے اگر ہم ہوتے سنتے یا سمجھتے تو نہ ہوتے دوزخ والوں میں لے

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۱

سو قائل ہو گئے اپنے گناہ کے اب دفع ہو جائیں دوزخ والے ۲ے

خلاصہ تفسیر: اور (وہ کافر فرشتوں سے یہ بھی) کہیں گے کہ ہم اگر سنتے یا سمجھتے (یعنی پیغمبروں کے کہنے کو قبول کرتے اور مانتے) تو ہم اہل دوزخ میں (شامل) نہ ہوتے، غرض اپنے جرم کا اقرار کریں گے سو اہل دوزخ پر لعنت ہے۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ: اس سے معلوم ہوا کہ فلاح و کامیابی کے دو طریقے ہیں: ① تقلید ② تحقیق، یعنی بے علم یا کم علم انسان کو کسی محقق عالم کی تقلید کرنی چاہیے، دوسرے یہ کہ اگر خود علم و حکمت اور تحقیق رکھتا ہو تو براہ راست قرآن و سنت کی پیروی کرنی چاہیے، پس جس میں تحقیق کی قابلیت ہی نہیں تو اس کو اپنے شیخ یا استاذ اور محقق عالم سے مزاحمت یا دلیل کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی کیا خبر تھی کہ یہ ڈرانے والے ہی سچے نکلیں گے، اگر ہم اس وقت کسی ناصح کی بات سنتے یا عقل سے کام لے کر معاملہ کی حقیقت کو سمجھ لیتے تو آج دوزخیوں کے زمرہ میں کیوں شامل ہوتے اور تم کو یہ طعن دینے کا موقع کیوں ملتا۔

فائدہ: ۲ے یعنی خود اقرار کر لیا کہ بیشک ہم مجرم ہیں یوں ہی بے قصور ہم کو دوزخ میں نہیں ڈالا جا رہا لیکن اس ناوقت کے اقرار و اعتراف سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، ارشاد ہوگا: فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (اب دفع ہو جائیں دوزخ والے) ان کے لیے جوار رحمت میں کہیں ٹھکانا نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۲

جو لوگ ڈرتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے لے ان کے لیے معافی ہے اور ثواب بڑا

خلاصہ تفسیر: (اب اطاعت کرنے والوں کی جزا کا ذکر ہے) بیشک جو لوگ اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں (اور

ایمان واطاعت اختیار کرتے ہیں) ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم (مقرر) ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ کو دیکھا نہیں، مگر اس پر اور اس کی صفات پر پورا یقین رکھتے ہیں اور اس کی عظمت وجلال کے تصور سے لرزتے اور اس کے عذاب کا خیال کر کے تھرتھراتے ہیں، یا بالغیب کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے مجمع سے الگ ہو کر خلوت وعزلت میں اپنے رب کو یاد کر کے لرزاں وترساں رہتے ہیں۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑬ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ

اور تم چھپا کر کہو اپنی بات یا کھول کر، وہ خوب جانتا ہے جیوں کے بھید ۱؎ بھلا وہ نہ جانے جس نے بنایا

وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ⑭ ع

اور وہی ہے بھید جاننے والا خبردار ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار اور ان کے لیے دوزخ کے عذاب کا ذکر تھا، اس کے بعد اطاعت کرنے والوں کی جزا کا بیان ہوا، اب یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں فریقوں کے احوال سے بخوبی واقف ہیں اور ہر فریق کو اس کے عمل کے مطابق جزا دیں گے۔

اور تم لوگ خواہ چھپا کر بات کہو یا پکار کر کہو (اس کو سب خبر ہے، کیونکہ) وہ دلوں کی باتوں سے خوب آگاہ ہے (اور بھلا) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین ہے (اور) پورا باخبر ہے۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ: استدلال کا حاصل یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا خالق مختار ہے، پس تمہارے افعال، احوال اور اقوال کا بھی خالق ہے، اور اور کسی چیز کی تخلیق بغیر علم کے نہیں ہوسکتی اس لئے اللہ کو ہر چیز کا علم ضروری ہوا، اور خاص صرف تمہاری باتیں ہی مقصود نہیں، بلکہ اس کا علم ہر چیز کو عام ہے، تمہارے افعال بھی اس میں داخل ہیں، اور یہاں خصوصیت کے ساتھ باتوں کا ذکر شاید اس لیے کیا گیا ہو کہ باتیں کثرت سے واقع ہوتی ہیں، غرض اس کو سب کا علم ہے، وہ ہر ایک کو مناسب جزا دے گا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی گو تم اس کو نہیں دیکھتے مگر وہ تم کو دیکھ رہا ہے اور تمہاری ہر کھلی چھپی بات خلوت میں ہو یا جلوت میں سب کو جانتا ہے بلکہ دلوں میں اور سینوں میں جو خیالات گزرتے ہیں ان کی بھی خبر رکھتا ہے۔ غرض وہ تم سے غائب ہے پر تم اس سے غائب نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تمہارا اور تمہارے افعال واقوال ہر چیز کا خالق ومختار وہ ہے اور خالق ومختار جس چیز کو پیدا کرے ضروری ہے کہ اس کا پورا علم اسے حاصل ہو، ورنہ پیدا کرنا ممکن نہیں، پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ جس نے بنایا وہ ہی نہ جانے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ⑮

وہی ہے جس نے کیا تمہارے آگے زمین کو پست اب چلو پھرو اسکے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ اس کی دی ہوئی روزی اور اسی کی طرف جی اٹھنا ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کے دلائل میں آسمان کی تخلیق کا بیان تھا، اب دوبارہ اسی کی طرف رجوع ہے، اور آسمان کے بعد اب زمین کی تخلیق اور اس کے متعلقہ فوائد میں غور وفکر کا بیان ہے، نیز بعض احسانات اور نعمتوں کے ضمن میں ایمان وتوحید کی ترغیب دیتے ہیں۔

وہ ایسا (منعم) ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کر دیا (کہ تم اس میں ہر طرح کے تصرفات کر سکتے ہو) سو تم اس کے رستوں میں چلو (پھرو) اور خدا کی روزی میں سے (جو زمین میں پیدا کی ہے) کھاؤ (پیو) اور (کھا پی کر اس کو یاد رکھنا کہ) اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے

(پس اس کو تقاضا یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو جس کا طریقہ ایمان واطاعت ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی زمین کو تمہارے سامنے کیسا پست وذلیل ومسخر ومنقاد کردیا کہ جو چاہو اس میں تصرف کرو تو چاہے کہ اس پر اور اس کے پہاڑوں پر چلو پھرو اور روزی کماؤ، مگر اتنا یاد رکھو کہ جس نے روزی دی ہے اسی کی طرف پھر لوٹ کر جانا ہے۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿١٦﴾

کیا تم نڈر ہو گئے اس سے جو آسمان میں ہے اس سے کہ دھنسا دے تم کو زمین میں پھر تبھی وہ لرزنے لگے

خلاصہ تفسیر: پیچھے انعامات یاد دلائے تھے، اب انتقام سے ڈراتے ہیں، نیز پیچھے آخری آیت میں یہ بتایا تھا کہ آخر کار قیامت میں اللہ کی طرف لوٹنا ہے، اب آگے اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ زمین پر رہنے بسنے کے وقت بھی اللہ کا عذاب آسکتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

کیا تم لوگ اس سے بےخوف ہو گئے جو کہ آسمان میں (بھی اپنا حکم اور تصرف رکھتا) ہے کہ وہ تم کو (قارون کی طرح) زمین میں دھنسا دے پھر وہ زمین تھرتھرا (کر الٹ پلٹ ہو) نے لگے (جس سے تم اور نیچے ہو جاؤ اور زمین کے اجزاء تمہارے اوپر آکر مل جائیں)۔

* * *

فائدہ: پہلے انعامات یاد دلائے تھے، اب شان قہر وانتقام یاد دلا کر ڈرانا مقصود ہے، یعنی زمین بیشک تمہارے لیے مسخر کر دی گئی، مگر یاد رہے اس پر حکومت اسی آسمان والے کی ہے، وہ اگر چاہے تو تم کو زمین میں دھنسا دے، اس وقت زمین بھونچال سے لرزنے لگے اور تم اس کے اندر اترتے چلے جاؤ، لہذا آدمی کو جائز نہیں کہ اس مالک مختار سے نڈر ہو کر شرارتیں شروع کر دے اور اس کے ڈھیل دینے پر مغرور ہو جائے۔

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿١٧﴾

یا نڈر ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے اس بات سے کہ برسا دے تم پر مینہ پتھروں کا ۱؎ سو جان لو گے کیسا ہے میرا ڈرانا ۲؎

خلاصہ تفسیر: یا تم لوگ اس سے بےخوف ہو گئے ہو جو کہ آسمان میں (بھی اپنا حکم اور تصرف رکھتا) ہے کہ وہ تم پر (عاد کی طرح) ایک ہوائے تند بھیج دے (جس سے تم ہلاک ہو جاؤ، یعنی تمہارے کفر کا تقاضا تو یہی ہے) سو (اگر کسی مصلحت سے فوری عذاب تم پر نہیں آیا تو کیا ہوا) عنقریب (مرتے ہی) تم کو معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا (عذاب سے) کیسا (واقع اور صحیح) تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بیشک زمین پر چلو پھرو اور روزی کماؤ، لیکن خدا کو نہ بھولو ورنہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر ایک سخت آندھی بھیج دے۔ یا پتھروں کا مینہ برسا دے۔ پھر تم کیا کرو گے ساری دوڑ دھوپ یوں ہی رکھی رہ جائے گی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس عذاب سے ڈرایا جاتا تھا وہ کیسا تباہ کن اور ہولناک ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿١٨﴾

اور جھٹلا چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے پھر کیسا ہوا میرا انکار

خلاصہ تفسیر: آگے فرماتے ہیں کہ اگر فوری عذاب آئے بغیر کفر کا برا ہونا ان کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کا نمونہ بھی موجود ہے:

اور ان سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں انہوں نے (دین حق کو) جھٹلایا تھا سو (دیکھ لو ان پر) میرا عذاب کیسا (واقع) ہوا (جس سے صاف معلوم ہوا کہ کفر قابل نفرت ہے، پس اگر کسی مصلحت سے یہاں عذاب ٹل گیا تو دوسرے عالم میں حسب وعید ضرور واقع ہوگا)۔

* * *

فائدہ: یعنی عاد وثمود وغیرہ کے ساتھ جو معاملہ ہو چکا ہے اس سے عبرت پکڑو۔ دیکھ لو! ان کی حرکات پر ہم نے انکار کیا تھا تو وہ انکار کیسے عذاب کی صورت میں ظاہر ہو کر رہا۔

وقف غفران

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الطَّیۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقۡبِضۡنَ ؕۘ مَا یُمۡسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ

وقف لازم وقف منزل

اور کیا نہیں دیکھتے ہوا اڑتے جانوروں کو اپنے اوپر پر کھولے ہوئے اور پر جھپکتے ہوئے، ان کو کوئی نہیں تھام رہا رحمان کے سوا

اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیۡءٍۭ بَصِیۡرٌ ﴿۱۹﴾

اس کی نگاہ میں ہے ہر چیز

خلاصہ تفسیر: اب پھر سورت کے اصل مضمون کی طرف رجوع ہے کہ ممکنات ومخلوقات کے حالات سے حق تعالیٰ کی توحید اور علم و قدرت پر استدلال ہے، چنانچہ سورت کے شروع سے اب تک توحید کے وہ دلائل بیان ہوئے جو آسمان کے متعلق تھے، پھر زمین کے متعلق چیزوں کا بیان ہوا، اب آگے فضائے آسمانی سے متعلق توحید کے دلائل کا بیان ہے۔

کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر پرندوں کی طرف نظر نہیں کی کہ پر پھیلائے ہوئے (اڑتے پھرتے) ہیں اور (کبھی اسی حالت میں) پر سمیٹ لیتے ہیں (اور دونوں حالتوں میں بوجھ اور وزنی ہونے کے باوجود زمین اور آسمان کی درمیانی فضا میں پھرتے رہتے ہیں زمین پر نہیں گر جاتے اور) بجز (خدائے) رحمان کے ان کو کوئی تھامے ہوئے نہیں ہے، بیشک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے (اور جس طرح چاہے اس میں تصرف کر رہا ہے)۔

* * *

فائدہ: پہلے آسمان وزمین کا ذکر ہوا تھا۔ یہاں درمیانی چیز کا ذکر ہے یعنی خدا کی قدرت دیکھو پرندے زمین وآسمان کے درمیان کبھی پر کھول کر اور کبھی باز و سمیٹے ہوئے کس طرح اڑتے رہتے ہیں۔ اور باوجود جسم ثقیل مائل الی المرکز ہونے کے نیچے نہیں گر پڑتے نہ زمین کی قوت جاذبہ اس ذرا سے پرندے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ بتلاؤ رحمان کے سوا کس کا ہاتھ ہے جس نے انہیں فضاء میں تھام رکھا ہے۔ بیشک رحمان نے اپنی رحمت و حکمت سے ان کی ساخت ایسی بنائی اور اس میں وہ قوت رکھی جس سے وہ بے تکلف ہوا میں گھنٹوں ٹھہر سکیں۔ وہ ہی ہر چیز کی استعداد کو جانتا اور تمام مخلوق کو اپنی نگاہ میں رکھتا ہے، شاید پرندوں کی مثال بیان کرنے سے یہاں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ اللہ آسمان سے عذاب بھیجنے پر قادر ہے اور کفار اپنے کفر وشرارت سے اس کے مستحق بھی ہیں، لیکن جس طرح رحمان کی رحمت نے پرندوں کو ہوا میں روک رکھا ہے، عذاب بھی اسی کی رحمت سے رکا ہوا ہے۔

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّکُمۡ یَنۡصُرُکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ اِنِ الۡکٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ ﴿۲۰﴾ۚ

بھلا وہ کون ہے جو فوج ہے تمہاری مدد کرے تمہاری رحمان کے سوا، منکر پڑے ہیں بڑے بہکائے ہیں

خلاصہ تفسیر: یہاں تک ممکنات وموجودات کی مختلف اصناف کے حالات میں غور وفکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کے وجود اور توحید اور بے نظیر علم وقدرت کے دلائل جمع فرمائے گئے جن میں ذرا بھی غور وفکر کرنے والے کو حق تعالیٰ پر ایمان لانے کے سوا چارہ نہیں رہتا، اب آگے ختم سورت تک کفار وفجار منکرین اور بدعمل لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا ہے، خلاصہ یہ کہ پیچھے توحید کا بیان تھا، اب شرک کا باطل ہونا بیان کرتے ہیں۔

ہاں! (خدا کے تصرفات تو سن لئے اب بتلاؤ کہ) رحمٰن کے سوا وہ کون ہے کہ وہ تمہارا لشکر بن کر (آفات سے) تمہاری حفاظت کر سکے (اور) کافر (جو اپنے معبودوں کی نسبت ایسا خیال رکھتے ہیں) تو (وہ) نرے دھوکہ میں ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی منکر سخت دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے باطل معبودوں اور فرضی دیوتاؤں کی فوج ان کو اللہ کے عذاب اور آنے والی آفت سے بچا لے گی؟ خوب سمجھ لو! رحمان سے الگ ہو کر کوئی مدد کو نہ پہنچے گا۔

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ يَرۡزُقُكُمۡ اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ ۚ بَلۡ لَّجُّوۡا فِىۡ عُتُوٍّ وَّنُفُوۡرٍ ﴿۲۱﴾

بھلا وہ کون ہے جو روزی دے تم کو اگر وہ رکھ چھوڑے اپنی روزی ۱؎ کوئی نہیں پر اڑ رہے ہیں شرارت اور بدکنے پر ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور) ہاں! (یہ بھی بتلاؤ کہ) وہ کون ہے جو تم کو روزی پہنچائے اگر اللہ تعالیٰ اپنی روزی بند کر لے (مگر یہ لوگ اس سے بھی متاثر نہیں ہوتے) بلکہ یہ لوگ سرکشی اور (حق سے) نفرت پر جم رہے ہیں (خلاصہ یہ کہ تمہارے باطل معبود یعنی بت وغیرہ نہ کسی نقصان کو دور کرنے پر قادر ہیں یہاں ینصرکم سے یہی مراد ہے، اور نہ فائدہ پہنچانے پر قادر ہیں یرزقکم سے یہی مراد ہے، پھر ان کی عبادت محض بے وقوفی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ اگر روزی کے سامان بند کر لے تو کس کی طاقت ہے جو تم پر روزی کا دروازہ کھول دے؟۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دل میں یہ لوگ بھی سمجھتے ہیں کہ اللہ سے الگ ہو کر نہ کوئی نقصان کو روک سکتا ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے۔ مگر محض شرارت اور سرکشی ہے کہ توحید و اسلام کی طرف آتے ہوئے بدکتے ہیں۔

اَفَمَنۡ يَّمۡشِىۡ مُكِبًّا عَلٰى وَجۡهِهٖۤ اَهۡدٰٓى اَمَّنۡ يَّمۡشِىۡ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۲۲﴾

بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر

خلاصہ تفسیر: پیچھے مؤمن اور کافر کا ذکر ہوا، آگے نتیجہ کے طور پر یہ بتلاتے ہیں کہ ہدایت یافتہ اور گمراہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے: (جس کافر کا حال پیچھے تم نے: اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِىۡ غُرُوۡرٍ اور بَلۡ لَّجُّوۡا فِىۡ عُتُوٍّ وَّنُفُوۡرٍ میں سنا) سو (اس کو سن کر سوچو کہ) کیا جو شخص (راستہ کی ناہمواری کی وجہ سے ٹھوکریں کھاتا ہوا اور) منہ کے بل گرتا ہوا چل رہا ہو وہ منزل مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہوگا یا وہ شخص (زیادہ منزل مقصود پر پہنچنے والا ہوگا) جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جا رہا ہو (یہی حال ہے مومن و کافر کا کہ مومن کے چلنے کا رستہ بھی دین مستقیم ہے، اور وہ چلتا بھی ہے وہ سیدھا کر ہو کر افراط و تفریط سے بچ کر، اور کافر کے چلنے کا رستہ بھی زیغ و ضلالت کا ہے اور چلنے میں بھی ہر وقت خوف و ہلاکت میں گرتا جاتا ہے پس ایسی حالت میں کیا منزل پر پہنچے گا)۔

* * *

فائدہ: یعنی ظاہری کامیابی کی راہ طے کر کے وہی مقصد اصلی تک پہنچے گا جو سیدھے راستہ پر آدمیوں کی طرح سیدھا ہو کر چلے۔ جو شخص ناہموار راستہ پر اوندھا ہو کر منہ کے بل چلتا ہو اس کے منزل مقصود تک پہنچنے کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ یہ مثال ایک موحد اور ایک مشرک کی ہوئی۔ محشر میں بھی دونوں کی چال میں ایسا ہی فرق ہوگا۔

قُلۡ هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ وَجَعَلَ لَـكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۲۳﴾

تو کہہ وہی ہے جس نے تم کو بنا کھڑا کیا اور بنا دیے تمہارے واسطے کان اور آنکھیں اور دل تم بہت تھوڑا حق مانتے ہو ۱؎

قُلۡ هُوَ الَّذِىۡ ذَرَاَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَاِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

تو کہہ وہی ہے جس نے کھنڈا دیا تم کو زمین میں اور اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے جو دلائل توحید بیان ہوئے وہ کائنات سے متعلق تھے، اب آگے نفس انسانی کے متعلق دلائل توحید بیان

فرماتے ہیں:

آپ (ان سے) کہئے کہ وہی (ایسا قادر ومنعم) ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تم کو کان اور آنکھیں اور دل دیئے (مگر) تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو (اور) آپ (یہ بھی) کہئے کہ وہی ہے جس نے تم کو روئے زمین پر پھیلایا اور تم اسی کے پاس (قیامت کے روز) اکٹھے کئے جاؤ گے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی اللہ نے سننے کے لیے کان، دیکھنے کے لیے آنکھیں، اور سمجھنے کے لیے دل دیئے تھے کہ اس کا حق مان کر ان قوتوں کو ٹھیک مصرف میں لگاتے، اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری میں خرچ کرتے مگر ایسے شکر گزار بندے بہت کم ہیں۔ کافروں کو دیکھ لو کہ ان نعمتوں کا کیسا حق ادا کیا؟ اس کی دی ہوئی قوتیں اسی کے مقابلہ میں استعمال کیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی ابتداء بھی اس سے ہوئی انتہاء بھی اسی پر ہوگی، جہاں سے آئے تھے وہیں جانا ہے۔ چاہیے تھا کہ اس سے ایک دم غافل نہ ہوتے اور ہمہ وقت اس کی فکر رکھتے کہ مالک کے سامنے خالی ہاتھ نہ جائیں مگر ایسے بندے بہت تھوڑے ہیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٥﴾

اور کہتے ہیں کب ہوگا یہ وعدہ اگر تم سچے ہو ۱

قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٦﴾

تو کہہ خبر تو ہے اللہ ہی کے پاس اور میرا کام تو یہی ڈر سنا دینا ہے کھول کر ۲

خلاصہ تفسیر: اور یہ لوگ (جب قیامت کا ذکر سنتے ہیں جیسے پیچھے گذرا: الیہ النشور اور اسی طرح: الیہ تحشرون تو) کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم (یعنی پیغمبر ﷺ اور آپ کے متبعین مؤمنین) سچے ہو (تو بتلاؤ) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ یہ (تعیین کا) علم تو خدا ہی کو ہے اور میں تو محض (اجمالی طور پر مگر) صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی اکٹھے کب کیے جائیں گے؟ اور قیامت کب آئے گی اسے جلدی بلا لو۔

فائدہ: ۲۔ یعنی وقت کی تعیین میں نہیں کرسکتا۔ اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔ البتہ جو چیز یقینا آنے والی ہے اس سے آگاہ کر دینا اور خوفناک مستقبل سے ڈرا دینا میرا فرض تھا وہ میں ادا کر چکا۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿٢٧﴾

جب دیکھیں گے کہ وہ پاس آلگا تو بگڑ جائیں گے منہ منکروں کے اور کہے گا یہی ہے جس کو تم مانگتے تھے

خلاصہ تفسیر: پھر جب اس (عذاب قیامت) کو پاس آتا ہوا دیکھیں گے (پاس آتا ہوا دیکھنا یہ کہ اعمال کا محاسبہ ہوگا، دوزخ میں جانے کا حکم ہوگا جس سے یقین ہوجائے گا کہ اب عذاب سر پر آ گیا، غرض جب اس کو پاس آتا ہوا دیکھیں گے) تو (مارے غم کے) کافروں کے منہ بگڑ جائیں گے (جیسا کہ ارشاد ہے: وجوہ یومئذ علیہا غبرۃ ترھقھا قترۃ) اور (ان سے) کہا جائے گا یہی ہے وہ جس کو تم مانگا کرتے تھے (کہ عذاب لاؤ، عذاب لاؤ)۔

* * *

فائدہ: یعنی اب تو جلدی مچا رہے لیکن جس وقت وہ وعدہ قریب آ لگے گا، بڑے بڑے سرکشوں کے منہ بگڑ جائیں گے اور چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں گی۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہلاک کر دے مجھ کو اللہ اور میرے ساتھ والوں کو یا ہم پر رحم کرے پھر وہ کون ہے جو بچائے منکروں کو عذاب دردناک سے

خلاصہ تفسیر: توحید اور قیامت کے متعلق یہ حق اور سچے مضامین سن کر کفار کہتے تھے: شاعر نتربص به ریب المنون اسی طرح: ان كاد ليضلنا عن الهتنا لولا ان صبرنا عليها کہ یہ شاعر ہیں ہم ان پر موت کے حادثہ کا انتظار کر رہے ہیں، مرتے ہیں سب باتیں ختم ہو جائیں گی، حاصل یہ کہ آپ کی موت کا انتظار اور نعوذ باللہ آپ کو گمراہی کی طرف منسوب کرنا تھا، اب آگے اس کا جواب بتلاتے ہیں جس میں کفار کے عذاب کو ثابت کرتے ہوئے دوسرے مضامین سے اس کو مکمل کر دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

آپ (ان سے) کہئے کہ تم یہ بتاؤ کہ اگر خدا تعالیٰ مجھ کو اور میرے ساتھ والوں کو (تمہاری تمنا کے مطابق) ہلاک کر دے یا (ہماری امید اور اپنے وعدہ کے مطابق) ہم پر رحمت فرما دے تو (دونوں حالت میں اپنی خبر لو اور یہ بتلاؤ کہ) کافروں کو عذاب دردناک سے کون بچا لے گا۔

یعنی ہماری تو جو حالت ہوگی دنیا میں ہوگی اور انجام اس کا ہر حال میں اچھا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: هل تربصون بنا الا احدى الحسنيين الخ مگر اپنی کہو کہ تم پر جو عظیم مصیبت آنے والی ہے اس کو کون روکے گا؟ اور ہماری دنیوی حوادث سے تمہاری وہ مصیبت کیسے ٹل جائے گی تو اپنی فکر چھوڑ کر ہمارے حوادث کا انتظار ایک فضول حرکت ہے، یہ تو جواب ہوا: شاعر نتربص به ریب المنون والی بات کا۔

* * *

فائدہ: کفار تمنا کرتے تھے کہ کہیں جلد مر مرا کر ان کا قصہ ختم ہو جائے (العیاذ باللہ) اس کا جواب دیا کہ فرض کرو تمہارے زعم کے موافق میں اور میرے ساتھی دنیا میں سب ہلاک کر دیے جائیں یا ہمارے عقیدے کے موافق مجھ کو اور میرے رفقاء کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کامیاب و بامراد کرے، ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، مگر تم کو اس سے کیا فائدہ ہے، ہمارا انجام دنیا میں جو کچھ ہو، بہر حال آخرت میں بہتری ہے کہ اس کے راستہ میں جد و جہد کر رہے ہیں۔ لیکن تم اپنی فکر کرو کہ اس کفر و سرکشی پر جو دردناک عذاب آنا یقینی ہے، اس سے کون بچائے گا۔ ہمارا اندیشہ چھوڑ دو، اپنی فکر کرو، کیونکہ کافر کسی طرح بھی خدائی عذاب سے نہیں چھوٹ سکتا۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۹﴾

تو کہہ وہی رحمان ہے، ہم نے اس کو مانا اور اسی پر بھروسہ کیا [1] سو اب تم جان لو گے کون پڑا ہے صریح بہکائے میں [2]

خلاصہ تفسیر: (اور) آپ (ان سے یہ بھی) کہئے کہ وہ بڑا مہربان ہے، ہم اس پر (اس کے حکم کے مطابق) ایمان لائے اور ہم اس پر توکل کرتے ہیں (پس ایمان کی برکت سے تو وہ ہم کو عذاب آخرت سے محفوظ رکھے گا اور توکل کی برکت سے دنیاوی حوادث کو دفع یا آسان کر دے گا یہ بھی: شاعر نتربص به کے جواب کی تکمیل ہے) سو (جب تم پر دردناک عذاب آنے والا ہے اور ہم ان شاء اللہ تعالیٰ ایمان کی برکت سے اس عذاب سے محفوظ رہنے والے ہیں تو) عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا (جب اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا اور ہم کو اس سے محفوظ دیکھو گے) کہ صریح گمراہی میں کون ہے (یعنی تم ہو جیسا کہ ہم کہتے ہیں، یا ہم ہیں جیسا کہ تم کہتے ہو، یہ جواب ہے: ان كاد ليضلنا عن الهتنا الخ والی بات کا)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جب ہمارا ایمان اس پر ہے تو ایمان کی بدولت نجات یقین ہے اور جب ہم صحیح معنی میں اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں تو مقاصد میں کامیابی یقینی ہے: وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ (الطلاق: ۳) تم میں دونوں چیزیں نہیں، نہ ایمان، نہ توکل، پھر تو کیسے بے فکر ہو؟

فائدہ: [2] یعنی ہم جیسا کہ تمہارا گمان ہے یا تم جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے۔

ع ۲
قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾

تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر ہو جائے صبح کو پانی تمہارا خشک پھر کون ہے جو لائے تمہارے پاس پانی نتھرا

خلاصہ تفسیر: اب آگے اوپر کے مضامین کی تاکید ہے، یعنی یہ جو کہا گیا ہے کہ تم کو دردناک عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا تو اگر ان کو اپنے باطل معبودوں پر گھمنڈ ہے کہ وہ بچالیں گے تو اس گمان کو باطل کرنے کے لیے آگے اس کا جواب دیا جاتا ہے کہ:

آپ (ان سے یہ) کہہ دیجئے کہ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تمہارا پانی (جو کنوؤں میں ہے) نیچے کو (اتر کر) غائب ہی ہو جائے سو وہ کون ہے جو تمہارے پاس سوت کا پانی لے آئے (یعنی کنوئیں کی سوت کو جاری کردے اور تہہ میں سے اوپر لے آئے)۔

اور اگر کسی کو کنواں مزید کھود لینے پر ناز ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اس کو اور نیچے غائب کرے، پس جب خدا کے مقابلہ میں کسی کو اتنی بھی قدرت نہیں کہ معمولی طبعی واقعات میں تصرف کر سکے تو عذاب آخرت سے بچانے کی تو کیا قدرت ہوگی۔

* * *

فائدہ: یعنی زندگی اور ہلاکت کے سب اسباب اسی اللہ کے قبضہ میں ہیں۔ ایک پانی ہی کو لے لو، جس سے ہر چیز کی زندگی ہے، اگر فرض کرو! چشموں اور کنوؤں کا پانی خشک ہو کر زمین کے اندر اتر جائے جیسا کہ اکثر موسم گرما میں پیش آجاتا ہے تو اس کی قدرت ہے کہ موتی کی طرح صاف شفاف پانی اس قدر کثیر مقدار میں مہیا کردے جو تمہاری زندگی اور بقاء کے لیے کافی ہو۔ لہٰذا ایک مومن متوکل کو اسی خالق الکل مالک علی الاطلاق پر بھروسہ رکھنا چاہیے، یہیں سے یہ بھی سمجھ لو کہ جب ہدایت کے سب چشمے خشک ہو چکے، اس وقت ہدایت و معرفت کا خشک نہ ہونے والا چشمہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں جاری کر دینا بھی اسی رحمان مطلق کا کام ہو سکتا ہے۔ جس نے اپنے فضل و انعام سے تمام جانداروں کی ظاہری و باطنی زندگی کے سامان پیدا کیے ہیں اگر فرض محال یہ چشمہ خشک ہو جائے، جیسا کہ اشقیاء کی تمنا ہے، تو کون ہے جو مخلوق کے لیے ایسا پاک و صاف نتھرا پانی مہیا کر سکے۔

ایاتها ۵۲ • ۶۸ سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ ۲ • رکوعاتها ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور توحید اور علم و قدرت کے دلائل بیان ہوئے، اور اس ضمن میں کفار اور منکرین توحید کی طرف زیادہ روئے سخن تھا، اور ان کے لیے سخت عذاب کا ذکر ہوا، اب اس سورت میں نبوت میں طعن کرنے والوں کی طرف زیادہ روئے سخن ہے، یعنی اس سورت میں کفار کے طعنوں کا جواب ہے، اور چونکہ نبوت کا انکار بھی کفر ہے، اس لیے کفار کی اخروی اور دنیوی سزا کا بھی بعض آیتوں میں بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿۱﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲﴾ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ﴿۳﴾

ن، قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں، تو نہیں اپنے رب کے فضل سے دیوانہ ۱ے اور تیرے واسطے بدلہ ہے بے انتہا ۲ے

خلاصہ تفسیر: نٓ (اس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) قسم ہے قلم کی (یعنی قلم تقدیر جس سے مخلوق کی تقدیریں لوح محفوظ پر لکھی گئیں) اور (قسم ہے) ان (فرشتوں) کے لکھنے کی (جو کہ کاتب اعمال ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ''قلم'' اور ''لکھنے'' کی یہی تفسیر فرمائی ہے، آگے جواب قسم ہے:) کہ آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں (جیسا کہ منکرین نبوت کہتے ہیں) اور بیشک آپ کے لئے (اس تبلیغ احکام پر) ایسا اجر (ملنے والا) ہے جو (کبھی) ختم ہونے والا نہیں۔

وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ: مطلب یہ کہ آپ ﷺ نبی برحق ہیں، اور یہ قسمیں اس مدعا کے لیے نہایت مناسب ہیں، کیونکہ تقدیر میں سے ایک نزول قرآن بھی ہے، پس اس آیت میں اشارہ ہے کہ آپ کی نبوت علم الٰہی میں پہلے ہی سے محقق ومؤکد ہے، پس اس کا ثبوت یقینی ہوا، اور اعمال لکھنے والے فرشتے آپ ﷺ کے مصدقین ومنکرین کے اعمال کو لکھ رہے ہیں، پس انکار نبوت پر سزا ہوگی، اس سے ڈر کر ایمان لانا واجب ہے۔

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ: اس میں بھی نبوت کے ثبوت کی تقریر ہے، یعنی مذکورہ طعنے کو دور کر کے نبوت کو ثابت کیا، اور ساتھ اس میں تسلی بھی ہے کہ آپ چند روز برداشت کر لیجیے کہ اس کا انجام عظیم اجر ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ مشرکین مکہ حضور ﷺ کو (العیاذ باللہ) دیوانہ کہتے تھے، کوئی کہتا کہ شیطان کا اثر ہے جو یک بیک تمام قوم سے الگ ہو کر ایسی باتیں کرنے لگے ہیں جن کو کوئی نہیں مان سکتا، حق تعالیٰ نے اس خیال باطل کی تردید اور آپ ﷺ کی تسلی فرما دی، یعنی جس پر اللہ تعالیٰ کے ایسے ایسے فضل وانعام ہوں جن کو ہر آنکھ والا مشاہدہ کر رہا ہے، مثلاً اعلیٰ درجہ کی فصاحت اور حکمت ودانائی کی باتیں، مخالف وموافق کے دل میں اس قدر قوی تاثیر اور اتنے بلند اور پاکیزہ اخلاق کیا اسے دیوانہ کہنا خود اپنی دیوانگی کی دلیل نہیں؟ دنیا میں بہت دیوانے ہوئے ہیں اور کتنے عظیم الشان مصلحین گزرے ہیں جن کو ابتداء قوم نے دیوانہ کہہ کر پکارا ہے، مگر قلم نے تاریخی معلومات کا جو ذخیرہ بطون اوراق میں جمع کیا ہے وہ بانگ دہل شہادت دیتا ہے کہ واقعی دیوانوں، اور ان دیوانہ کہلانے والوں کے حالات میں کس قدر زمین وآسمان کا تفاوت ہے۔

آج آپ کو (العیاذ باللہ) مجنون کے لقب سے یاد کرنا بالکل وہی رنگ رکھتا ہے کہ جس رنگ میں دنیا کے تمام جلیل القدر اور اولوالعزم مصلحین کو ہر زمانہ کے شریروں اور بے عقلوں نے یاد کیا ہے، لیکن جس طرح تاریخ نے ان مصلحین کے اعلیٰ کارناموں پر بقاء ودوام کی مہر ثبت کی، اور ان مجنون کہنے والوں کا نام ونشان باقی نہ چھوڑا، قریب ہے کہ قلم اور اس کے ذریعہ سے لکھی ہوئی تحریریں آپ ﷺ کے ذکر خیر اور آپ ﷺ کے بے مثال کارناموں اور علوم ومعارف کو ہمیشہ کے لیے روشن رکھیں گی، اور آپ ﷺ کو دیوانہ بتلانے والوں کا وجود صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ کر رہے گا، ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا آپ ﷺ کی حکمت ودانائی کی داد دے گی اور آپ ﷺ کے کامل ترین انسان ہونے کو بطور ایک اجماعی عقیدہ کے تسلیم کرے گی، بھلا خداوند قدوس جس کی فضیلت وبرتری کو ازل الآزال میں اپنے قلم نور سے لوح محفوظ کی تختی پر نقش کر چکا، کسی کی طاقت ہے کہ محض مجنون ومفتون کی پھبتیاں کس کر اس کے ایک شوشہ کو مٹا سکے؟ جو ایسا خیال رکھتا ہو پرلے درجہ کا مجنون یا جاہل ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی آپ غمگین نہ ہوں، ان کے دیوانہ کہنے سے آپ کا اجر بڑھتا ہے اور غیر محدود فیض ہدایت بنی نوع انسان کو آپ کی ذات سے پہنچنے والا ہے، اس کا بے انتہاء اجر وثواب آپ ﷺ کو یقیناً ملنے والا ہے، کیا دیوانوں اور پاگلوں کا مستقبل ایسا پائدار اور شاندار کسی نے دیکھا ہے؟ یا کسی مجنون کی اسکیم اس طرح کامیاب ہوتے سنی ہے؟ پھر جس کا رتبہ اللہ کے ہاں اتنا بڑا ہو اس کو چند احمقوں کے دیوانہ کہنے کی کیا پرواہ ہونی چاہیے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾

اور تو پیدا ہوا ہے بڑے خلق پر

خلاصہ تفسیر: اور بیشک آپ اخلاق (حسنہ) کے اعلیٰ پیمانے پر ہیں (کہ آپ کا ہر فعل اعتدال کے ساتھ موصوف اور حق تعالیٰ کی رضا کے موافق ہے، اور مجنون میں اخلاق کا کمال کہاں ہوتا ہے یہ بھی مذکورہ طعنہ کا جواب ہے)۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے: "یرضی لرضاہ، و یسخط بسخطہ" یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا پر آپ راضی رہتے ہیں، اور جس چیز پر اللہ تعالیٰ کی ناراضی ہے آپ بھی اس سے ناراض رہتے ہیں، اس میں اشارہ ہے تخلق باخلاق اللہ کی طرف جس کا حاصل فنا فی اللہ ہے، نیز یہ: **مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ** کے بعد اخلاق حسنہ کے ذکر سے اس طرف اشارہ ہے کہ بداخلاقی ایک قسم کا جنون ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ نے جن اعلیٰ اخلاق و ملکات پر آپ ﷺ کو پیدا فرمایا، کیا دیوانوں میں ان اخلاق و ملکات کا تصور کیا جا سکتا ہے، ایک دیوانے کے اقوال و افعال میں قطعاً نظم و ترتیب نہیں ہوتی، نہ اس کا کلام اس کے کاموں پر منطبق ہوتا ہے برخلاف اس کے آپ ﷺ کی زبان قرآن ہے اور آپ ﷺ کے اعمال و اخلاق قرآن کی خاموش تفسیر، قرآن جس نیکی جس خوبی اور بھلائی کی طرف دعوت دیتا ہے وہ آپ ﷺ میں فطرۃً موجود اور جس بدی و زشتی سے روکتا ہے آپ طبعاً اس سے نفور و بیزار ہیں، پیدائشی طور پر آپ ﷺ کی ساخت اور تربیت ایسی واقع ہوئی ہے کہ آپ کی کوئی حرکت اور کوئی چیز حد تناسب و اعتدال سے ایک انچ ادھر ادھر ہٹنے نہیں پاتی، آپ ﷺ کا حسن اخلاق اجازت نہ دیتا تھا کہ جاہلوں اور کمینوں کے طعن و تشنیع پر کان دھریں جس شخص کا خلق اس قدر عظیم اور مطمح نظر اتنا بلند ہو بھلا وہ کسی مجنون کے مجنون کہہ دینے پر کیا التفات کرے گا، آپ ﷺ تو اپنے دیوانہ کہنے والوں کی نیک خواہی اور دردمندی میں اپنے کو گھلائے ڈالتے تھے جس کی بدولت فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (الکہف:۶) کا خطاب سننے کی نوبت آتی تھی۔

فی الحقیقت اخلاق کی عظمت کا سب سے زیادہ عمیق پہلو یہ ہے کہ آدمی دنیا کی ان حقیر ہستیوں سے معاملہ کرتے وقت خداوند قدوس کی عظیم ہستی سے غافل و ذاہل نہ ہو، جب تک یہ چیز قلب میں موجود رہے گی تمام معاملات عدل و اخلاق کی میزان میں پورے اتریں گے، کیا خوب فرمایا شیخ جنید بغدادیؒ نے: "سمی خلقه عظيما اذ لم تكن له همة سوى الله تعالىٰ عاشر الخلق بِخُلْقِهٖ وزايلهم بقلبه فكان ظاهره مع الخلق و باطنه مع الحق"، وفی وصيته بعض الحكماء: "عَلَيْكَ بِالْخُلْقِ مَعَ الْخَلْقِ وَ بِالصِّدْقِ مَعَ الْحَقِّ".

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝۵ بِاَيِّىكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝۶

سو اب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لے گا، کہ کون ہے تم میں جو بچل رہا ہے [1]

خلاصہ تفسیر: (آگے تسلی ہے، یعنی یہ جو ایسے مہملات بکتے ہیں) سو (اس کا غم نہ کیجئے، کیونکہ) عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں کس کو جنون (حقیقی) تھا (کیونکہ جنون کی حقیقت ہے عقل کا زائل ہونا، اور عقل کی غرض و غایت ہے نفع و نقصان کا سمجھنا، اور نفع و نقصان زیادہ معتبر وہ ہے جو ہمیشہ کے لیے ہو، پس قیامت میں ان کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ عاقل اہل حق تھے جنہوں نے ہمیشہ کے نفع کو اختیار کیا، اور پاگل یہ خود تھے جو اس نفع سے محروم رہ کر ہمیشہ کے لیے نقصان میں مبتلا ہوئے)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی دل میں تو پہلے سمجھتے ہیں، لیکن عنقریب فریقین کو آنکھوں سے نظر آجائے گا دونوں میں سے کون ہوشیار اور عاقبت اندیش تھا اور کس کی عقل ماری گئی تھی جس کی وجہ سے پاگلوں کی طرح بہکی بہکی باتیں کرتا تھا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۠ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝۷

بیشک تیرا رب وہی خوب جانے اس کو جو بہکا اس کی راہ سے، اور وہی خوب جانتا ہے راہ پانے والوں کو

خلاصہ تفسیر: (اور چونکہ) آپ کا پروردگار اس شخص کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ راہ (راست) پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے (اس لئے ہر ایک کو اس کے مناسب جزا و سزا دے گا، اور اس جزا و سزا کے مناسب ہونے کو یہ منکرین بھی اس وقت سمجھ لیں گے جب حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ عاقل کون تھا اور مجنون کون تھا)۔

* * *

فائدہ: یعنی پوری طرح علم تو اللہ ہی کو ہے کہ کون لوگ راہ پر آنے والے ہیں اور کون بھٹکنے والے، لیکن نتائج جب سامنے آئیں گے تو سب کو نظر آجائے گا کہ کون کامیابی کی منزل پر پہنچا اور کون شیطان کی رہزنی کی بدولت ناکام و نامراد رہا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ⑧ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ⑨

سوتو کہنا مت مان جھٹلانے والوں کا، وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہوتو وہ بھی ڈھیلے ہوں [1]

خلاصہ تفسیر: آگے منکرین کی مذمت اور برائی کا مضمون ہے کہ جب آپ حق پر ہیں اور یہ لوگ باطل پر ہیں:

تو آپ ان تکذیب کرنے والوں کا کہنا نہ مانئے (جیسا کہ اب تک نہیں مانا، اور وہ کہنا یہ ہے جو آگے مفہوم ہوتا ہے یعنی) یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ آپ (نعوذ باللہ اپنے منصبی کام میں جو کہ تبلیغ ہے ذرا) ڈھیلے ہوجائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہوجائیں (آپ کا ڈھیلا ہونا یہ کہ بت پرستی کی مذمت نہ کریں، اوران کا ڈھیلا ہونا یہ کہ آپ کی مخالفت نہ کریں، سورۃ کافرون کی تفسیر میں ابن عباسؓ نے ڈھیلے ہونے کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی راہ پر آنے والے نہ آنے والے سب اللہ کے علم محیط میں طے شدہ ہیں، لہذا دعوت وتبلیغ کے معاملہ میں کچھ رو رعایت کی ضرورت نہیں، جس کو راہ پر آنا ہوگا آرہے گا اور جو محروم ازلی ہے وہ کسی لحاظ و مروت سے ماننے والا نہیں۔

کفار مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بت پرستی کی نسبت اپنا سخت رویہ ترک کردیں اور ہمارے معبودوں کی تردید نہ کریں، ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا کی تعظیم کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طور وطریق اور مسلک ومشرب سے متعارض نہ ہوں گے، ممکن تھا کہ ایک مصلح اعظم کے دل میں جو "خلق عظیم" پر پیدا کیا گیا ہے، نیک نیتی سے یہ خیال آجائے کہ تھوڑی سی نرمی اختیار کرنے اور ڈھیل دینے سے کام بنتا ہے تو برائے چندے نرم روش اختیار کرنے میں کیا مضائقہ ہے، اس پر حق تعالیٰ نے متنبہ فرمادیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان مکذبین کا کہنا نہ مانیے، ان کی غرض محض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھیلا کرنا ہے، ایمان لانا اور صداقت کو قبول کرنا مقصود نہیں، آپ کی بعثت کی اصلی غرض اس صورت میں حاصل نہیں ہوتی، آپ تو ہر طرف سے قطع نظر کرکے اپنا فرض ادا کرتے رہیے، کسی کو منوا دینے اور راہ پر لے آنے کے آپ ذمہ دار نہیں۔

تنبیہ: "مداہنت" اور "مدارات" میں بہت باریک فرق ہے، اول الذکر مذموم ہے، اور آخر الذکر محمود، فلا تغفل۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ⑩ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ⑪ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ⑫

اور تو کہا مت مان کسی قسمیں کھانے والے بے قدر کا [1] طعنے دے چغلی کھاتا پھرے، بھلے کام سے روکے حد سے بڑھے بڑا گنہگار

عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ⑬ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ⑭

اُجڈ ان سب کے پیچھے بدنام [2] اس واسطے کہ رکھتا ہے مال اور بیٹے [3]

خلاصہ تفسیر: اور آپ (خاص طور پر) کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا ہو (مراد جھوٹی قسم کھانے والا ہے، اکثر جھوٹے آدمی قسمیں بہت کھایا کرتے ہیں اور جو اپنی قبیح اور بری حرکات کی وجہ سے اللہ اور مخلوق کے نزدیک) بے وقعت ہو (دل دکھانے کے لئے) طعنہ دینے والا ہو چغلیاں لگاتا پھرتا ہو، نیک کام سے روکنے والا ہو حد (اعتدال) سے گزرنے والا ہو گناہوں کا (ارتکاب) کرنے والا ہو، سخت مزاج ہو (اور) اس (سب) کے علاوہ حرام زادہ (بھی) ہو (مراد حرام زادہ سے یہ ہے کہ اس کے اور اخلاق وافعال بھی خبیث ہوں، خلاصہ یہ کہ اول تو مطلقاً جھٹلانے والوں کا، پھر خصوصاً جبکہ وہ جھٹلانے والے ان برائیوں کے ساتھ بھی متصف ہوں جیسا کہ آپ کے جھٹلانے والوں میں سے بعض بڑے بڑے ایسے ہی تھے اور اس درخواست میں شریک بلکہ اس کے بانی تھے، غرض آپ ایسے شخص کا کہنا نہ مانیے اور وہ بھی محض) اس سبب سے کہ وہ مال اور اولاد والا ہو (یعنی دنیا کی وجاہت رکھتا ہو سو اس وجہ سے اس کا کہنا نہ مانیے)۔

زَنِيۡمٍ: چونکہ غالباً حرام زادہ کے اخلاق وافعال اچھے نہیں ہوتے اس لئے مجازاً اس سے یہ مراد لیا گیا۔
ان آیات میں برے اخلاق کے اصول ہیں تاکہ نیک لوگ ان سے بچیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس کے دل میں خدا کے نام کی عظمت نہیں، جھوٹی قسم کھالینا ایک معمولی بات سمجھتا ہے اور چونکہ لوگ اس کی باتوں پر اعتبار نہیں کرتے۔ اس لیے یقین دلانے کے لیے بار بار قسمیں کھا کر بےقدر اور ذلیل ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان خصلتوں کے ساتھ بدنام اور رسوائے عالم بھی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''یہ سب کافر کے وصف ہیں، آدمی اپنے اندر دیکھے اور یہ خصلتیں چھوڑے''۔

تنبیہ: زنیم کے معنی بعض سلف کے نزدیک ولد الزنا اور حرام زادے کے ہیں، جس کافر کی نسبت یہ آیتیں نازل ہوئیں وہ ایسا ہی تھا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ایک شخص اگر دنیا میں طالع مند اور خوش قسمت نظر آتا ہے، مثلاً مال واولاد وغیرہ رکھتا ہے تو محض اتنی بات سے اس لائق نہیں ہوجاتا کہ اس کی بات مانی جائے، اصل چیز انسان کے اخلاق وعادات ہیں، جس شخص میں شرافت اور خوش اخلاقی نہیں اللہ والوں کا کام نہیں کہ اس کی ابلہ فریب باتوں کی طرف التفات کریں۔

اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الۡخُرۡطُوۡمِ ﴿۱۶﴾

جب سنائے اس کو ہماری باتیں کہے یہ نقلیں ہیں پہلوں کی ۱؎ اب داغ دیں گے ہم اس کو سونڈ پر ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور ایسے خبیث شخص کی اطاعت سے اس لئے منع کیا جاتا ہے کہ اس شخص کی یہ عادت ہے کہ) جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے یہ بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول چلی آتی ہیں (مطلب یہ کہ آیات کی تکذیب کرتا اور ان کو جھٹلاتا ہے، خلاصہ یہ کہ ان کی اطاعت سے منع کرنے کی اصل وجہ اور علت ان کی تکذیب ہے، اب آگے ایسے شخص کی سزا کا بیان ہے کہ) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگا دیں گے (یعنی قیامت میں اس کے چہرے اور ناک پر اس کے کفر کی وجہ سے کوئی علامت ذلت اور پہچان کی لگا دیں گے جس سے وہ خوب رسوا ہوگا حدیث مرفوع میں ایسا ہی وارد ہے)۔

خلاصہ یہ کہ ان کی اطاعت سے منع کرنے کی اصل علت ان کی تکذیب ہے اور اسی بناء پر پیچھے پہلے عام انداز میں: فَلَا تُطِعِ الۡمُكَذِّبِيۡنَ فرمایا گیا، پھر ان جھٹلانے والوں میں سے بعض میں اور بھی بری عادتیں اور خصلتیں تھیں ان کی اطاعت سے پھر خاص طور پر منع فرمایا، کیونکہ ظاہر ہے کہ جس شخص میں آیات الٰہی کو جھٹلانے کے ساتھ اور بھی قبیح عادتیں ہوں اس کی اطاعت اور بھی زیادہ سخت ممنوع ہوگی، لیکن اصل اطاعت سے منع کرنے کی وجہ جھٹلانا ہی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ کی باتوں کو یہ کہہ کر جھٹلاتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ کہتے ہیں قریش کا ایک سردار ولید بن مغیرہ تھا، اس میں یہ سب اوصاف مجتمع تھے۔

ناک پر داغ دینے سے مراد اس کی رسوائی اور روسیاہی ہے، شاید دنیا میں حسی طور پر بھی کوئی داغ پڑا ہو، یا آخرت میں پڑے گا۔

اِنَّا بَلَوۡنٰهُمۡ كَمَا بَلَوۡنَاۤ اَصۡحٰبَ الۡجَـنَّةِ ۚ اِذۡ اَقۡسَمُوۡا لَيَصۡرِمُنَّهَا مُصۡبِحِيۡنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسۡتَثۡنُوۡنَ ﴿۱۸﴾

ہم نے ان کو جانچا ہے جیسے جانچا تھا باغ والوں کو ۱؎ جب ان سب نے قسم کھائی کہ اس کا میوہ توڑیں گے صبح ہوتے، اور ان شاء اللہ نہ کہا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے اہل مکہ کو ایک قصہ سنا کر کفر کے سبب وبال وعذاب سے ڈرایا جاتا ہے:

ہم نے (جو اِن اہل مکہ کو سامان عیش دے رکھا ہے جس پر یہ مغرور ہو رہے ہیں تو ہم نے) ان کی آزمائش کر رکھی ہے (کہ دیکھیں یہ نعمتوں کے شکر میں ایمان لاتے ہیں یا ناشکری و بے قدری کر کے کفر کرتے ہیں) جیسا (ان سے پہلے نعمتیں دے کر) ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی (یہ قصہ اہل مکہ میں مشہور ومعروف تھا، جن باغ والوں کا یہ قصہ ہے ان کے والد کا اپنے وقت میں معمول تھا کہ اس باغ کے پھل کا ایک بڑا حصہ مساکین میں صرف کیا کرتا تھا جب والد مر گیا تو ان لوگوں نے کہا کہ ہمارا باپ احمق تھا کہ اس قدر زیادہ آمدنی مسکینوں کو دے دیتا تھا، اگر یہ سب بھی گھر آئے کس قدر فراغت ہو، چنانچہ ان آیتوں میں ان کا بقیہ قصہ مذکور ہے، یعنی یہ واقعہ اس وقت ہوا) جبکہ ان لوگوں نے (یعنی ان میں سے اکثر یا بعض نے: **قال اوسطھم** باہم) قسم کھائی کہ اس (باغ) کا پھل ضرور صبح چل کر توڑ لیں گے اور (ایسا وثوق ہوا کہ) انہوں نے ان شاءاللہ بھی نہیں کہا۔

اَصۡحٰبَ الۡجَنَّۃِ: حضرت ابن عباسؓ کے بقول یہ باغ ملک حبشہ میں تھا اور بقول سعید بن جبیر یہ باغ یمن میں تھا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی مال واولاد کی کثرت کوئی مقبولیت کی علامت نہیں، نہ اللہ کے ہاں اس کی کچھ قدر وقیمت ہے، لہذا کفار مکہ اس چیز پر مغرور نہ ہوں، یہ تو اللہ کی طرف سے ان کی آزمائش اور جانچ ہے، جیسے پہلے بعض لوگوں کی جانچ کی گئی۔

فائدہ: ۲ کئی بھائی جن کے باپ نے ترکہ میں میوے کا ایک باغ چھوڑا تھا، اس میں کھیتی بھی ہوتی ہوگی، سارا گھر اس کی پیداوار سے آسودہ تھا، باپ کے زمانہ میں عادت تھی کہ جس دن میوہ توڑا جاتا، یا کھیتی کٹتی تو شہر کے سب فقیر محتاج جمع ہو جاتے، یہ سب کو تھوڑا بہت دے دیتا، اسی سے برکت تھی، اس کے انتقال کے بعد بیٹوں کو خیال ہوا کہ فقیر جو اتنا مال لے جاتے ہیں، وہ اپنے ہی کام آئے تو خوب ہو، کیونکر ہم ایسی تدبیر نہ کریں کہ فقیروں کو کچھ دینا نہ پڑے اور ساری پیداوار گھر میں آجائے، پھر آپس میں مشورہ کر کے یہ رائے قرار پائی کہ صبح سویرے ہی توڑ کر گھر لے آئیں، فقیر جائیں گے تو وہاں کچھ نہ پائیں گے اور اپنی اس تدبیر پر ایسا یقین جمایا کہ ''ان شاءاللہ'' بھی نہ کہا۔

فَطَافَ عَلَيۡهَا طَآئِفٌ مِّنۡ رَّبِّكَ وَهُمۡ نَآئِمُوۡنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصۡبَحَتۡ كَالصَّرِيۡمِ ﴿۲۰﴾

پھر پھیرا کر گیا اس پر کوئی پھر جانے والا تیرے رب کی طرف سے اور وہ سوتے ہی رہے، پھر صبح تک ہو رہا جیسے ٹوٹ چکا ۱

خلاصہ تفسیر: سو اس باغ پر آپ کے رب کی طرف سے ایک پھرنے والا (عذاب) پھر گیا (اور وہ ایک آگ تھی، خواہ خالص آگ ہو یا ہوا میں ملی ہوئی ہو جیسے لو) اور وہ سو رہے تھے، پھر صبح کو وہ باغ ایسا رہ گیا جیسے کٹا ہوا کھیت (کہ خالی زمین رہ جاتی ہے اور بعض جگہ کاٹ کر جلا بھی دیا جاتا ہے مگر ان کو اس کی کچھ خبر نہیں تھی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی رات کو بگولا اٹھا، آگ لگی، یا اور کوئی آفت پڑی، سب کھیت اور باغ صاف ہو رہا۔

فَتَنَادَوۡا مُصۡبِحِيۡنَ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰى حَرۡثِكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰرِمِيۡنَ ﴿۲۲﴾

پھر آپس میں بولے صبح ہوتے، کہ سویرے چلو اپنے کھیت پر اگر تم کو توڑنا ہے

فَانۡطَلَقُوۡا وَهُمۡ يَتَخَافَتُوۡنَ ﴿۲۳﴾ اَنۡ لَّا يَدۡخُلَنَّهَا الۡيَوۡمَ عَلَيۡكُمۡ مِّسۡكِيۡنٌ ﴿۲۴﴾

پھر چلے اور آپس میں کہتے تھے چپکے چپکے، کہ اندر نہ آنے پائے اس میں آج تمہارے پاس کوئی محتاج

وَّغَدَوۡا عَلٰى حَرۡدٍ قٰدِرِيۡنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوۡهَا قَالُوۡۤا اِنَّا لَضَآلُّوۡنَ ﴿۲۶﴾ بَلۡ نَحۡنُ مَحۡرُوۡمُوۡنَ ﴿۲۷﴾

اور سویرے چلے لپکتے ہوئے زور کے ساتھ ۱ پھر جب اس کو دیکھا بولے ہم تو راہ بھول آئے نہیں ہماری تو قسمت پھوٹ گئی ۲

خلاصہ تفسیر: سو صبح کے قوت (سو کر جو اٹھے تو) ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ اپنے کھیت پر سویرے چلو اگر تم کو پھل توڑنا ہے (کھیت یا تو مجازاً کہہ دیا ہو، یا اس میں ایسی چیزیں بھی ہوں جو تنہ دار نہیں ہوتیں جیسے انگور وغیرہ، یا اس باغ کے ساتھ کھیت بھی ہو) پھر وہ لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے چلے کہ آج تم تک کوئی محتاج نہ آنے پائے اور (بزعم خود) اپنے کو اس کے نہ دینے پر قادر سمجھ کر چلے (کہ سب پھل گھر لے آئیں گے اور کسی کو نہ دیں گے) پھر جب (وہاں پہنچے اور) اس باغ کو (اس حالت میں) دیکھا تو کہنے لگے کہ بیشک ہم رستہ بھول گئے (کہیں اور نکل آئے، کیونکہ یہاں تو باغ واغ کچھ بھی نہیں، پھر جب مقام اور حدود کو دیکھ کر یقین کیا کہ وہی جگہ ہے تو اس وقت کہنے لگے کہ ہم بھولے نہیں) بلکہ جگہ تو وہی ہے لیکن) ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی (کہ باغ کا یہ حال ہوگیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ یقین کرتے ہوئے کہ اب جا کر سب پیداوار اپنے قبضہ میں کرلیں گے۔

فائدہ: ۲؎ وہ زمین کھیتی اور درختوں سے ایسی صاف ہوچکی تھی کہ وہاں پہنچ کر پہچان نہ سکے، سمجھے کہ ہم راہ بھول کر کہیں اور نکل آئے، پھر جب غور کیا تو سمجھے کہ نہیں، جگہ تو وہی ہے، مگر ہماری قسمت پھوٹ گئی اور حق تعالیٰ کی درگاہ سے ہم محروم کیے گئے۔

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾

بولا بچلا ان کا میں نے تم کو نہ کہا تھا کہ کیوں نہیں پاکی بولتے اللہ کی

خلاصہ تفسیر: ان میں جو (کسی قدر) اچھا آدمی تھا وہ کہنے لگا کیوں میں نے تم کو کہا نہ تھا (کہ ایسی نیت مت کرو، مساکین کے دینے سے برکت ہوتی ہے، اسی لئے اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اچھا کہا، مگر عملی طور پر یہ شخص بھی قلبی کراہت کے باوجود سب کے ساتھ شریک ہوگیا تھا، اس لئے احقر نے لفظ "کسی قدر" بڑھا دیا لأن الأوسط أمر إضافي، پھر پہلی بات کو یاد دلا کر اس شخص نے کہا کہ اپنی شامت اعمال تو بھگت لی مگر) اب (توبہ اور) تسبیح (وتقدیس) کیوں نہیں کرتے (تاکہ وہ گناہ معاف ہو اور اس سے زیادہ وبال نہ آجائے)۔

* * *

فائدہ: منجھلا بھائی ان میں زیادہ ہشیار تھا، اس نے مشورہ کے وقت متنبہ کیا ہوگا کہ اللہ کو مت بھولو، یہ سب اسی کا انعام سمجھو اور فقیر محتاج کی خدمت سے دریغ نہ کرو، جب کسی نے اس کی بات پر کان نہ دھرا، چپ ہو رہا اور ان ہی کا شریک حال ہوگیا، اب یہ تباہی دیکھ کر اس نے وہ پہلی بات یاد دلائی۔

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

بولے پاک ذات ہے ہمارے رب کی ہم ہی تقصیروار تھے، پھر منہ کر کر ایک دوسرے کی طرف لگے الاہنا (الزام) دینے ۱؎

خلاصہ تفسیر: سب (توبہ کے طور پر) کہنے لگے کہ ہمارا پروردگار پاک ہے (یہ خدا کی تنزیہ اور تعریف ہے جو استغفار کی تمہید ہے) بیشک ہم قصور وار ہیں (یہ استغفار ہے) پھر ایک دوسرے کو مخاطب بنا کر باہم الزام دینے لگے (جیسے کام بگڑنے کے وقت اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر شخص دوسرے کو غلط رائے کا بانی اور ذمہ دار بتلایا کرتا ہے کہ یہ رائے تو نے دی تھی)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اب اپنی تقصیر کا اعتراف کر کے رب کی طرف رجوع ہوئے اور جیسا کہ عام مصیبت کے وقت قاعدہ ہے، ایک دوسرے کو الزام دینے لگے، ہر ایک دوسرے کو اس مصیبت اور تباہی کا سبب گردانتا تھا۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿٣١﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿٣٢﴾

بولے ہائے خرابی ہماری ہم ہی تھے حد سے بڑھنے والے، شاید ہمارا رب بدل دے ہم کو اس سے بہتر ہم اپنے رب سے آرزو رکھتے ہیں ۱؎

خلاصہ تفسیر: (پھر سب متفق ہوکر) کہنے لگے کہ بیشک ہم (سب ہی) حد سے نکلنے والے تھے (کسی ایک کی خطا نہ تھی، ایک دوسرے پر الزام بیکار ہے، سب ملکر توبہ کرلو) شاید (توبہ کی برکت سے) ہمارا پروردگار ہم کو اس سے اچھا باغ بدلے میں دے دے (اب) ہم اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے ہیں (یعنی توبہ کرتے ہیں)۔

عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ: یہ بدلہ ملنا عام ہے، خواہ دنیا میں نعم البدل مل جائے، خواہ آخرت میں، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مؤمن تھے، معصیت کے مرتکب ہوئے تھے، اور یہ بات کہیں سند کے ساتھ نظر سے نہیں گزری کہ آیا اس باغ کے عوض ان کو دنیا میں کوئی باغ ملا یا نہیں؟ البتہ روح المعانی میں بلا سند ابن مسعودؓ کا قول لکھا ہے کہ اس سے اچھا باغ ان کو عطا کیا گیا تھا، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ آخر میں سب مل کر کہنے لگے کہ واقعی ہماری سب کی زیادتی تھی کہ ہم نے فقیروں محتاجوں کا حق مارنا چاہا اور حرص وطمع میں آکر اصل بھی کھو بیٹھے، یہ جو کچھ خرابی آئی، اس میں ہم ہی قصوروار ہیں، مگر اب بھی ہم اپنے رب سے ناامید نہیں، کیا عجب ہے وہ اپنی رحمت سے پہلے باغ سے بہتر باغ ہم کو عطا کردے۔

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾

یوں آتی ہے آفت، اور آخرت کی آفت تو سب سے بڑی ہے، اگر ان کو سمجھ ہوتی

خلاصہ تفسیر: (آگے قصہ کی غرض یعنی خبردار کرنا ہے کہ خلاف حکم کرنے پر) اسی طرح عذاب ہوا کرتا ہے (جب ہوا کرتا ہے، یعنی اے اہل مکہ! تم بھی ایسے عذاب کے مستحق ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ کے، کیونکہ مذکورہ عذاب تو محض معصیت پر تھا اور تم تو کفر کرتے ہو) اور آخرت کا عذاب اس (دنیوی عذاب) سے بھی بڑھ کر ہے کیا خوب ہوتا کہ یہ لوگ (اس بات کو) جان لیتے (تاکہ ایمان لے آتے)۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ تو دنیا کے عذاب کا ایک چھوٹا سا نمونہ تھا، جسے کوئی ٹال نہ سکا، بھلا آخرت کی اس بڑی آفت کو تو کون ٹال سکتا ہے، سمجھ ہو تو آدمی یہ بات سمجھے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٣٤﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٥﴾

البتہ ڈرنے والوں کو ان کے رب کے پاس باغ ہیں نعمت کے ۱؎ کیا ہم کردیں گے حکم برداروں کو برابر گناہ گاروں کے

مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٦﴾

کیا ہو گیا تم کو کیسے ٹھہراتے ہو بات ۲؎

خلاصہ تفسیر: آگے ان سزاؤں کو پختہ کرنے کے لئے کفار کا یہ خیال باطل فرماتے ہیں کہ وہ کہتے تھے: لئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنی مطلب یہ کہ اگر قیامت آئی جب بھی ہم آرام میں رہیں گے، چنانچہ ارشاد ہے:

بیشک پرہیزگاروں کے لئے ان کے رب کے نزدیک آسائش کی جنتیں ہیں (یعنی جنت میں جانے کا سبب تقویٰ ہے، اور اس سے کافر خالی

ہیں تو ان کو جنت کیسے مل جائے گی) کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانبرداروں کے برابر کر دیں گے (یعنی اگر کافروں کو نجات ہو تو فرمانبرداروں اور نافرمانوں میں کیا فرق و امتیاز رہ جائے گا، حالانکہ فرمانبرداروں کی فضیلت ثابت ہے جیسا کہ ارشاد ہے: **ام نجعل الذین امنوا و عملوا الصلحت کالمفسدین الخ**) تم کو کیا ہوا تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

* * *

فائدہ: لے یعنی دنیا کے باغ و بہار کو کیا لیے پھرتے ہو، جنت کے باغ ان سے کہیں بہتر ہیں جن میں ہر قسم کی نعمتیں جمع ہیں، وہ خاص متقین کے لیے ہیں۔

فائدہ: ۲ کفار مکہ نے غرور و تکبر سے اپنے دل میں یہ ٹھہرا رکھا تھا کہ اگر قیامت کے دن مسلمانوں پر عنایت و بخشش ہو گی تو ہم پر ان سے بہتر اور بڑھ کر ہوگی، اور جس طرح دنیا میں ہم کو اللہ نے عیش و رفاہیت میں رکھا ہے وہاں بھی یہ ہی معاملہ رہے گا، اس کو فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا ہو تو یہ مطلب ہوگا کہ ایک وفادار غلام جو ہمیشہ اپنے آقا کی حکم برداری کے لیے تیار رہتا ہے، اور ایک جرائم پیشہ باغی دونوں کا انجام یکساں ہو جائے، بلکہ مجرم اور باغی، وفاداروں سے اچھے رہیں یہ وہ بات ہے جس کو عقل سلیم اور فطرت صحیحہ رد کرتی ہے۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ

کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں پڑھ لیتے ہو، اس میں ملتا ہے تم کو جو تم پسند کر لو، کیا تم نے ہم سے قسمیں لے لی ہیں ٹھیک پہنچنے والی

اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾

قیامت کے دن تک کہ تم کو ملے گا جو کچھ تم ٹھہراؤ گے، پوچھ ان سے کون سا ان میں اس کا ذمہ لیتا ہے لے

خلاصہ تفسیر: کیا تمہارے پاس کوئی (آسمانی) کتاب ہے جس میں پڑھتے ہو کہ اس میں تمہارے لئے وہ چیز (لکھی) ہو جو تم پسند کرتے ہو (یعنی اس میں لکھا ہو کہ تم کو آخرت میں حسنی یعنی جنت ملے گی) کیا ہمارے ذمہ کچھ قسمیں چڑھی ہوئی ہیں جو تمہارے لئے کھائی گئی ہوں اور وہ قسمیں قیامت تک باقی رہنے والی ہوں (جن کا یہ مضمون ہو) کہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جو تم فیصلہ کر رہے ہو (یعنی ثواب اور جنت) ان سے پوچھئے ان میں اس کا کون ذمہ دار ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی یہ بات کہ مسلم اور مجرم دونوں برابر کر دیے جائیں ظاہر ہے عقل و فطرت کے خلاف ہے۔ پھر کیا کوئی نقلی دلیل اس کی تائید میں تمہارے پاس ہے؟ کیا کسی معتبر کتاب میں یہ مضمون پڑھتے ہو کہ جو تم اپنے لیے پسند کر لو گے وہ ہی ملے گا؟ اور تمہاری من مانی خواہشات پوری کی جائیں گی۔ یا اللہ نے قیامت تک کے لیے کوئی قسم کھا لی ہے کہ تم جو کچھ اپنے دل سے ٹھہرالو گے وہ ہی دیا جائے گا؟ اور جس طرح آج عیش و رفاہیت میں ہو۔ قیامت تک اسی حال میں رکھے جاؤ گے؟ جو شخص ان میں سے ایسا دعویٰ کرے اور اس کے ثابت کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے، لاؤ، اسے سامنے کرو۔ ہم بھی تو دیکھیں کہ وہ کہاں سے کہتا ہے۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾

کیا ان کے واسطے کوئی شریک ہیں پھر تو چاہیے لے آئیں اپنے اپنے شریکوں کو اگر وہ سچے ہیں

خلاصہ تفسیر: کیا ان کے ٹھہرائے ہوئے کچھ شریک (خدائی) ہیں (کہ انہوں نے ان کو ثواب دینے کا ذمہ لیا ہے) سو ان کو چاہئے کہ یہ اپنے ان شریکوں کو پیش کریں اگر یہ سچے ہیں (غرض جب یہ مضمون کسی آسمانی کتاب میں نہیں ہے، اور ویسے بلا کتاب دوسرے کسی وحی کے

طریقہ سے بھی ہمارا وعدہ نہیں جو قسم کی طرح ہوتا ہے، پھر ایسی حالت میں کوئی شخص ان میں سے یا ان کے شرکاء میں سے ذمہ داری لے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، پھر دعویٰ کس بناء پر ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر عقلی ونقلی دلیل کوئی نہیں، محض جھوٹے دیوتاؤں کے بل بوتے پر یہ دعوے کیے جارہے ہیں کہ وہ ہم کو یوں کر دیں گے اور یوں مرتبے دلا دیں گے، کیونکہ وہ خود خدائی کے شریک اور حصہ دار ہیں تو اس دعوے میں ان کا سچا ہونا اسی وقت ثابت ہوگا جب وہ ان شرکاء کو خدا کے مقابلہ پر بلا لائیں اور اپنی من مانی کارروائی کرادیں۔ لیکن یاد رہے کہ وہ معبود عابدوں سے زیادہ عاجز اور بے بس ہیں۔ وہ تمہاری کیا مدد کریں گے، خود اپنی مدد بھی نہیں کرسکتے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿٤٢﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ

جس دن کہ کھولی جائے پنڈلی اور وہ بلائے جائیں سجدہ کرنے کو پھر نہ کرسکیں ا؎ جھکی پڑتی ہوں گی ان کی آنکھیں ۲؎

تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿٤٣﴾

چڑھی آتی ہوگی ان پر ذلت اور پہلے ان کو بلاتے رہے سجدہ کرنے کو اور وہ تھے اچھے خاصے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (آگے ان لوگوں کی قیامت کی رسوائی کا ذکر ہے، وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن کہ ساق کی تجلی فرمائی جائے گی اور سجدہ کی طرف لوگوں کو بلایا جائے گا (اس کا قصہ حدیث شیخین میں مرفوعا اس طرح آیا ہے کہ حق تعالیٰ قیامت کے میدان میں اپنی ساق ظاہر فرمادے گا، "ساق" کہتے ہیں پنڈلی کو، یہ کوئی خاص صفت ہے جس کو کسی مناسبت سے "ساق" فرمایا، جیسے قرآن کریم میں ہاتھ آیا ہے، اور اسی حدیث میں ہے کہ اس تجلی کو دیکھ کر تمام مؤمنین مؤمنات سجدے میں گر پڑیں گے مگر جو شخص ریا سے سجدہ کرتا تھا اس کی کمر تختہ کی طرح رہ جائے گی سجدہ نہ کرسکے گا، اور کفار کا اس وقت سجدہ پر بدرجہ اولی قادر نہ ہونا اس بات سے سمجھ میں آتا ہے جس کا آگے ذکر ہے، یعنی کفار بھی سجدہ کرنا چاہیں گے) سو یہ (کافر) لوگ سجدہ نہ کرسکیں گے (اور) ان کی آنکھیں (شرمندگی کے مارے) جھکی ہوں گی (اور) ان پر ذلت چھائی ہوگی اور (وجہ اس کی یہ کہ) یہ لوگ (دنیا میں) سجدہ کی طرف بلائے جایا کرتے تھے (اس طرح کہ ایمان لاکر عبادت کریں) اور وہ صحیح سالم تھے (یعنی سجدہ پر قادر بھی تھے چنانچہ ظاہر ہے کہ دنیا میں ایمان، عبادت اور سجدہ اختیاری فعل ہے، پس دنیا میں حکم کی تعمیل نہ کرنے سے ان کو قیامت کے دن یہ رسوائی اور ذلت ہوئی)۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ: یعنی جس دن ساق کی تجلی فرمائی جائے گی، صوفیاء کرام نے اس تجلی کو ظاہر پر محمول کرکے "تجلی صوری" کے جواز پر استدلال کیا ہے، لیکن دیگر علماء نے اس کو اور اس جیسی آیت کو متشابہات میں شمار کیا ہے جن کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے، "ساق" اور اس جیسے دیگر مفہومات "متشابہات" کہلاتے ہیں۔

وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ: سجدے کی طرف بلائے جانے پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قیامت کا دن احکام کے مکلف بنائے جانے کا دن تو ہے نہیں پھر کیوں سجدہ کی طرف بلایا جائے گا؟ جواب یہ ہے کہ سجدہ کی طرف بلائے جانے سے مراد یہ نہیں کہ سجدہ کا حکم دیا جائے گا، بلکہ ساق کی تجلی میں یہ اثر ہوگا کہ سب بے اختیار خود بخود سجدہ کرنا چاہیں گے تو مؤمن اس پر قادر ہوں گے اور ریاکار، منافقین اور کفار سجدہ پر قادر نہ ہوں گے۔

خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ: یعنی ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی، قرآن کریم کی دوسری آیت میں جو نگاہ کا اوپر اٹھا رہنا آیا ہے وہ اس آیت کے معارض نہیں، کیونکہ کبھی حیرت کے غلبہ سے ویسا ہوگا کہ نگاہ اوپر اٹھ جائے گی، اور کبھی ندامت کے غلبہ سے ایسا ہوگا کہ نگاہ جھک جائے گی۔

* * *

فائدہ: ا؎ اس کا قصہ حدیث شیخین میں مرفوعا اس طرح آیا ہے کہ حق تعالیٰ میدان قیامت میں اپنی ساق ظاہر فرمائے گا "ساق" (پنڈلی)

کو کہتے ہیں اور یہ کوئی خاص صفت یا حقیقت ہے صفات وحقائق الٰہیہ میں سے جس کو کسی خاص مناسبت سے ''ساق'' فرمایا، جیسے قرآن میں ''ید'' (ہاتھ) ''وجہ'' (چہرہ) کا لفظ آیا ہے، یہ مفہومات متشابہات میں سے کہلاتے ہیں، ان پر اسی طرح بلا کیف ایمان رکھنا چاہیے جیسے اللہ کی ذات، وجود، حیات اور سمع و بصر وغیرہ صفات پر ایمان رکھتے ہیں، اسی حدیث میں ہے کہ اس تجلی کو دیکھ کر تمام مومنین ومومنات سجدہ میں گر پڑیں گے، مگر جو شخص ریا، سے سجدہ کرتا تھا، اس کی کمر نہیں مڑے گی، تختہ سی ہو کر رہ جائے گی، اور جب اہل ریاء ونفاق سجدہ پر قادر نہ ہوں گے تو کفار کا اس پر قادر نہ ہونا بطریق اولیٰ معلوم ہو گیا، یہ سب کچھ محشر میں اس لیے کیا جائے گا کہ مومن وکافر اور مخلص ومنافق صاف طور پر کھل جائیں اور ہر ایک کی اندرونی حالت حسی طور پر مشاہد ہو جائے۔

تنبیہ: ''متشابہات'' پر پہلے کلام کیا جا چکا ہے، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اس آیت ''کشف ساق'' کی تفسیر میں نہایت عالی اور عجیب تبصرہ متشابہات پر کیا ہے، فلیراجع۔

فائدہ: ۲ یعنی ندامت اور شرمندگی کے مارے آنکھ اوپر نہ اٹھ سکے گی۔

فائدہ: ۳ یعنی دنیا میں سجدہ کا حکم دیا گیا تھا جس وقت اچھے خاصے تندرست تھے اور باختیار خود سجدہ کر سکتے تھے، وہاں کبھی اخلاص سے سجدہ نہ کیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ استعداد ہی باطل ہو گئی، اب چاہیں بھی تو سجدہ نہیں کر سکتے۔

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اب چھوڑ دے مجھ کو اور ان کو جو کہ جھٹلائیں اس بات کو اب ہم سیڑھی سیڑھی اتاریں گے ان کو جہاں سے ان کو پتہ بھی نہیں ۱

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾

اور ان کو ڈھیل دیے جاتا ہوں بیشک میرا داؤ پکا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: (اب آگے کفار کے اس خیال کا رد ہے کہ وہ عذاب میں ڈھیل ہونے کو اپنے مقبول ہونے کی دلیل سمجھتے تھے اور اس کے ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی ہے، یعنی جب ان کا مستحق عذاب ہونا اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا) تو مجھ کو اور جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں ان کو (اس موجودہ حال پر) رہنے دیجئے (یعنی عذاب میں دیر ہونے سے رنج نہ کیجئے) ہم ان کو بتدریج (جہنم کی طرف) لیے جا رہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں اور (دنیا میں ان پر عذاب نازل کر ڈالنے سے) ان کو مہلت دیتا ہوں بیشک میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔

فَذَرْنِيْ: یہاں چھوڑ دینا ایک محاورہ کے طور پر فرمایا گیا ہے، اس کا حاصل بقول جار اللہ یہ ہے کہ خدا پر بھروسہ کر کے اس پر سب کام چھوڑ دیجیے، کیونکہ جو شخص کسی کو کسی کام کے لیے کافی سمجھتا ہے وہ اس کام کو اس پر چھوڑ دیتا ہے، سورہ اعراف آیت ۱۸۲: وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کے تحت اس کی تفسیر گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ان کو عذاب ہونا تو یقینی ہے لیکن چندے عذاب کے توقف سے رنج نہ کیجیے اور ان کا معاملہ میرے اوپر چھوڑ دیجیے، میں خود ان سے نبٹ لوں گا اور اس طرح بتدریج آہستہ آہستہ دوزخ کی طرف لے جاؤں گا کہ ان کو پتہ بھی نہیں چلے گا، یہ اپنی حالت پر مگن رہیں گے اور اندر ہی اندر سکھ کی جڑیں کٹتی چلی جائیں گیں۔

فائدہ: ۲ یعنی میری لطیف اور خفیہ تدبیر ایسی پکی ہے، جس کو یہ لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے بھلا اس کا توڑ تو کیا کر سکتے ہیں۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾

کیا تو مانگتا ہے ان سے کچھ حق سو ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے، کیا ان کے پاس خبر ہے غیب کی، سو وہ لکھ لاتے ہیں ۱

خلاصہ تفسیر: (آگےان کے انکارنبوت پر تعجب ہے) کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ مانگتے ہیں کہ وہ اس تاوان سے دبے جاتے ہیں (اس لئے آپ کی اطاعت سے نفرت ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ام تسلھم خرجا) یا ان کے پاس غیب (کا علم) ہے کہ یہ (اس کو محفوظ رکھنے کے واسطے) لکھ لیا کرتے ہیں (یعنی کیا ان کو احکام خداوندی خود کسی طریقے سے معلوم ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ صحاب وحی کی اتباع سے بے نیازی برتتے ہیں اور ظاہر ہے کہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو پھر انکار نبوت عجیب ہے)۔

* * *

فائدہ: لے یعنی افسوس اور تعجب کا مقام ہے کہ یہ لوگ اس طرح تباہی کی طرف چلے جارہے ہیں، لیکن آپ کی بات نہیں مانتے، آخر نہ ماننے کی وجہ کیا ہے؟ کیا آپ ان سے کچھ معاوضہ (تنخواہ یا کمیشن وغیرہ) طلب کرتے ہیں؟ جس کے بوجھ میں وہ دبے جارہے ہیں، یا خود ان کے پاس غیب کی خبریں اور اللہ کی وحی آتی ہے؟ جسے وہ حفاظت کے لیے قرآن کی طرح لکھ لیتے ہیں، اس لیے آپ کی اتباع کی ضرورت نہیں سمجھتے، آخر کچھ سبب تو ہونا چاہیے، جب ان پر کچھ بار بھی ڈالا نہیں جاتا اس چیز سے استغنا بھی نہیں تو نہ ماننے کا سبب بجز عناد اور ہٹ دھرمی کے اور کیا ہوسکتا ہے۔

وقف لازم

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿٤٨﴾

اب تو استقلال سے راہ دیکھتا رہ اپنے رب کے حکم کی اور مت ہو جیسا وہ مچھلی والا لے جب پکارا اُس نے اور وہ غصہ میں بھرا تھا ۲ے

خلاصہ تفسیر: (آگے آپ ﷺ کو تسلی ہے، یعنی جب ان کا کفر اور اس کفر کی وجہ سے ان کا مستحق عذاب ہونا معلوم ہوگیا، اور یہ کہ ان کی مہلت استدراج یعنی ایک قسم کی ڈھیل ہے اور وقت مقررہ پر عذاب ہوگا) تو آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے اور (تنگدلی میں) مچھلی (کے پیٹ میں جانے) والے (پیغمبر یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہوجایئے (کہ وہ عذاب نازل نہ ہونے سے تنگدل ہوئے اور کہیں چلے گئے جس کا قصہ کئی جگہ آچکا ہے، یہاں اس مضمون سے فقط تشبیہ مقصود ہے، اب آگے قصہ کی تکمیل کے طور پر ارشاد ہے کہ وہ وقت بھی یاد کیجئے) جبکہ یونس (علیہ السلام) نے (اپنے رب سے) دعا کی اور وہ غم سے گھٹ رہے تھے (یہ غم کئی غموں کا مجموعہ تھا: ① قوم کے ایمان نہ لانے کا ② عذاب کے ٹل جانے کا ③ حق تعالیٰ کی صریح اجازت کے بغیر وہاں سے چلے آنے کا ④ مچھلی کے پیٹ میں محبوس یعنی قید ہونے کا)۔

اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ: وہ دعا یہ ہے: لا الہ الا انت سبحنك انی کنت من الظلمین جس سے مقصود استغفار و معافی اور حبس یعنی مچھلی کے پیٹ سے نجات طلب کرنا ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی مچھلی کے پیٹ میں جانے والے پیغمبر (حضرت یونس علیہ السلام) کی طرح مکذبین کے معاملہ میں تنگ دلی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کیجیے۔ ان کا قصہ پہلے کئی جگہ تھوڑا تھوڑا گزر چکا ہے۔

فائدہ: ۲ے یعنی قوم کی طرف سے غصہ میں بھرے ہوئے تھے جھنجھلا کر شتابی عذاب کی دعا بلکہ پیشن گوئی کر بیٹھے۔

تنبیہ: مکظوم کے معنی بعض مفسرین نے یہ کیے ہیں کہ وہ غم سے گھٹ رہے تھے اور یہ غم مجموعہ تھا کئی غموں کا: قوم کے ایمان نہ لانے کا، ایک عذاب کے ٹل جانے کا، ایک بلا اذن صریح شہر چھوڑ کر چلے آنے کا، ایک مچھلی کے پیٹ میں محبوس رہنے کا، اس وقت اللہ کو پکارا، اور یہ دعا کی: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الانبیاء: ۸۷) اس پر اللہ کا فضل ہوا اور مچھلی کے پیٹ سے نجات ملی۔

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿٤٩﴾ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٥٠﴾

اگر نہ سنبھالتا اُسکو احسان تیرے رب کا تو پھینکا گیا ہی تھا چٹیل میدان میں الزام کھا کر لے پھر نوازا اُسکے رب نے پھر کر دیا اسکو نیکوں میں ۲ے

خلاصہ تفسیر: چنانچہ اس دعا پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا، اور مچھلی کے پیٹ سے نجات ہوئی اسی کی نسبت ارشاد ہے کہ:

اگر خداوندی احسان ان کی دستگیری نہ کرتا تو وہ (جس میدان میں مچھلی کے پیٹ سے نکال کر ڈال دیئے گئے تھے اس) میدان میں بدحالی کے ساتھ ڈالے جاتے (دستگیری سے مراد توبہ کی قبولیت ہے، اور بدحالی سے مراد یہ ہے کہ ان کی اجتہادی غلطی پر اللہ کی طرف سے ان کو ملامت ہوئی) پھر ان کے رب نے ان کو (اور زیادہ) برگزیدہ کر لیا اور ان کو (زیادہ رتبہ کے) صالحین میں سے کر دیا (قصہ کے اس تتمہ سے شاید یہ بھی مقصود ہو کہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنا ان کے لیے کیسا مضر ہوا، اور توکل کرنا کیسا مفید ثابت ہوا، اسی طرح عذاب کے بارے میں آپ بھی اپنی رائے سے جلدی نہ کیجئے، بلکہ اللہ تعالیٰ پر توکل کیجئے کہ انجام بہتر ہوگا)۔

لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ: حاصل اس کا اور سورۃ صافات کی آیت کا یہ ہے کہ اگر وہ توبہ واستغفار نہ کرتے تب تو مچھلی کے پیٹ سے نجات نہ ہوتی، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: فلولا انه كان من المسبحين للبث فی بطنه الی یوم یبعثون، اور اگر توبہ واستغفار کرتے مگر اللہ تعالیٰ قبول نہ فرماتا تو اس توبہ واستغفار سے اتنی دنیوی برکت تو ہوتی کہ مچھلی کے پیٹ سے نجات مل جاتی، اور میدان میں بھی اسی طرح ڈالے جاتے، لیکن اس صورت میں وہ ڈالا جانا مذموم ہوتا، مگر توبہ قبول ہونے کے بعد میدان میں ڈالے جانے کی صورت میں ملامت اور مذمت بھی باقی نہ رہی، کیونکہ توبہ قبول ہونے کے بعد خطا پر مذمت وملامت نہیں ہوا کرتی۔

* * *

فائدہ: ل یعنی اگر قبول توبہ کے بعد اللہ کا مزید فضل واحسان دستگیری نہ کرتا تو اسی چٹیل میدان میں جہاں مچھلی کے پیٹ سے نکال کر ڈالے گئے تھے الزام کھائے ہوئے پڑے رہتے اور وہ کمالات وکرامات باقی نہ رہنے دیے جاتے جو محض خدا کی مہربانی سے اس ابتلاء کے وقت بھی باقی رہے۔

فائدہ: ۲ یعنی پھر ان کا اور زیادہ رتبہ بڑھایا اور اعلیٰ درجہ کے نیک وشائستہ لوگوں میں داخل رکھا، حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ: تم میں سے کوئی شخص نہ کہے کہ میں (محمد ﷺ) یونس بن متیٰ سے بہتر ہوں۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿٥١﴾

اور منکر تو لگے ہی ہیں کہ پھسلا دیں تجھ کو اپنی نگاہوں سے جب سنتے ہیں قرآن اور کہتے ہیں وہ تو باؤلا ہے ل

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٥٢﴾

اور یہ قرآن تو یہی نصیحت ہے سارے جہان والوں کو ۲

خلاصہ تفسیر: آگے آپ ﷺ کی شان میں کفار کے مجنون کہنے کا ایک دوسرے انداز میں باطل ہونا بیان کرتے ہیں، سورت کے شروع میں بھی ان کے اس قول کو باطل کیا تھا، لیکن اب دوسرے انداز سے بیان کرتے ہیں:

اور یہ کافر جب قرآن سنتے ہیں تو (عداوت ودشمنی کی شدت سے) ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا آپ کو اپنی نگاہوں سے پھسلا کر گرا دیں گے (یہ ایک محاورہ ہے جیسے بولتے ہیں کہ فلاں شخص اس طرح دیکھتا ہے جیسے کھا جائے گا) اور (اسی دشمنی کی وجہ سے آپ کی نسبت) کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) یہ مجنون ہیں، حالانکہ یہ قرآن (جس کے ساتھ آپ تکلم فرماتے ہیں) تمام جہان کے واسطے نصیحت ہے (اور مجنون آدمی کے متعلق اصلاح کے امور ایسے عام نہیں ہو سکتے، اس میں جنون کے طعنہ کا جواب تو ظاہر ہے اور دشمنی کے بیان سے بھی اس طعنہ کا کھوٹا ہونا ثابت ہو گیا، کیونکہ جس بات کا منشاء دشمنی اور عداوت کی شدت ہو وہ بات تو التفات اور توجہ کے بھی قابل نہیں)۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اس میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ اہل باطل سے بھی تصرفات صادر ہو سکتے ہیں، اور وہ کبھی اہل حق پر طبعی اثرات مرتب کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں، پس کسی پر طبعی یا نفسیاتی اثرات پیدا کرنا بزرگی یا ولایت کی علامت نہیں ہے (یعنی کسی کی طبعی یا

نفسیاتی طاقت مؤثر کرنے والی ہے تو اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ یہ ولایت و بزرگی کا حصہ ہے، کیونکہ نظر کا لگنا برحق ہے، خواہ جس سے نظر لگی ہو وہ اہل باطل سے ہی کیوں نہ ہو اور ایسا ممکن ہے)۔

لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ: یعنی یہ کافر گویا آپ کو نگاہوں سے پھسلا کر گرادیں گے، جیسا کہ روح المعانی میں ہے کہ عرب کہا کرتے ہیں: "نظر الی نظرا یکاد یصرعنی أو یکاد یأکلنی" مطلب یہ کہ شدت عداوت سے آپ کو بری بری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قرآن سن کر غیظ وغضب میں بھر جاتے ہیں اور اس قدر تیز نظروں سے تیری طرف گھورتے ہیں جانے تجھ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیں گے، زبان سے بھی آوازے کستے ہیں کہ یہ شخص تو مجنون ہو گیا ہے، اس کی کوئی بات قابل التفات نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ اس طرح آپ کو گھبرا کر مقام صبر واستقلال سے ڈگمگادیں، مگر آپ برابر اپنے مسلک پر جمے رہیے اور تنگدل ہو کر کسی معاملہ میں گھبراہٹ یا جلدی یا مداہنت اختیار نہ کیجیے۔

تنبیہ: بعض نے لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ سے یہ مطلب لیا ہے کہ کفار نے بعض لوگوں کو جو نظر لگانے میں مشہور تھے اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ آپ کو نظر لگائیں، چنانچہ جس وقت حضور ﷺ قرآن تلاوت فرمار ہے تھے، ان میں سے ایک آیا اور پوری ہمت سے نظر لگانے کی کوشش کی، آپ نے لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا اور وہ ناکام و نامراد واپس چلا گیا، باقی نظر لگنے یا لگانے سے مسئلہ پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں، اور آج کل جبکہ "مسمریزم" ایک باقاعدہ فن بن چکا ہے، اس میں مزید رد وکد کرنا بیکار سا معلوم ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی قرآن میں جنون اور باؤلے پن کی بات کون سی ہے جس کو تم جنون کہہ رہے ہو، وہ تو تمام عالم کے لیے اعلیٰ ترین پند و نصیحت کا ذخیرہ ہے، اسی سے بنی نوع انسان کی اصلاح اور دنیا کی کایا پلٹ ہوگی اور وہ ہی لوگ دیوانے قرار پائیں گے جو اس کلام کے دیوانے نہیں ہیں۔

ایاتها ۵۲ | ۶۹ سُوْرَةُ الْحَاۤقَّةِ مَكِّيَّةٌ ۷۸ | رکوعاتها ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں رسالت کو ثابت کرنے کے ساتھ کفار کی سزا کا بیان تھا، اس سورت میں جزا وسزا کی تحقیق، اس کا وقت اور واقعات مذکور ہیں، سورت کے اختتام پر قرآن کی حقانیت کا بیان ہے جس سے جزا وسزا بھی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ قرآن اس پر بھی دلالت کرتا ہے، اور دلیل کے سچا ہونے سے مدلول کا سچا ہونا لازم ہے، نیز گذشتہ سورت کے مضمون رسالت سے بھی اس سورت کو مناسبت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَاۤقَّةُ ۟ۙ مَا الْحَاۤقَّةُ ۟ۚ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۤقَّةُ ۟ؕ

وہ ثابت ہو چکنے والی، کیا ہے وہ ثابت ہو چکنی والی، اور تو نے کیا سوچا کیا ہے وہ ثابت ہو چکنے والی ۱

خلاصہ تفسیر: وہ ہونے والی چیز، کیسی کچھ ہے وہ ہونے والی چیز؟ اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ کیسی کچھ ہے وہ ہونے والی چیز؟ (مقصود اس سے قیامت کی عظمت اور ہولناکی بیان کرنا ہے کہ وہ سخت ہولناک ہے، یہ سوالیہ انداز ڈرانے کے لئے ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وہ قیامت کی گھڑی جس کا آنا ازل سے علم الٰہی میں ثابت اور مقرر ہو چکا ہے جبکہ حق باطل سے بالکل واشگاف طور پر بدون کسی طرح کے اشتباہ و التباس کے جدا ہو جائے گا اور تمام حقائق اپنے پورے کمال وسبوغ کے ساتھ نمایاں ہوں گے، اور اس کے وجود میں جھگڑا کرنے والے سب اس وقت مغلوب و مقہور ہو کر رہیں گے، جانتے ہو وہ گھڑی کیا چیز ہے؟ اور کس قسم کے احوال و کیفیات اپنے اندر رکھتی ہے۔

كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ وَعَادٌۢ بِالۡقَارِعَةِ ④ فَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَاُهۡلِكُوۡا بِالطَّاغِيَةِ ⑤

جھٹلایا ثمود اور عاد نے اس کوٹ ڈالنے والی کو۱ سو وہ جو ثمود تھے سو غارت کردیئے گئے اچھال کر۲

خلاصہ تفسیر: ثمود اور عاد نے اس کھڑکھڑانے والی چیز (یعنی قیامت) کی تکذیب کی، سو ثمود تو ایک زور کی آواز سے ہلاک کردیئے گئے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قوم ثمود و عاد نے اس آنے والی گھڑی کو جھٹلایا تھا جو تمام زمین، آسمان، چاند سورج، پہاڑوں اور انسانوں کو کوٹ کر رکھ دے گی اور سخت سے سخت مخلوق کو ریزہ ریزہ کر ڈالے گی، پھر دیکھ لو! دونوں کا انجام کیا ہوا۔

فائدہ: ۲ یعنی سخت بھونچال سے جو ایک نہایت ہی سخت آواز کے ساتھ آیا، سب تہ و بالا کردیے گئے۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِيَةٍ ⑥ سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ سَبۡعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ

اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے نکلی جائے ہاتھوں سے ۱ مقرر کردیا اس کو ان پر سات رات اور آٹھ دن تک لگا تار

حُسُوۡمًا فَتَرَى الۡقَوۡمَ فِيۡهَا صَرۡعٰى ۙ كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِيَةٍ ۚ ⑦ فَهَلۡ تَرٰى لَهُمۡ مِّنۡۢ بَاقِيَةٍ ⑧

پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اس میں بچھڑ گئے گویا وہ ڈھنڈ ہیں کھجور کے کھوکھلے ۲ پھر تو دیکھتا ہے کوئی ان میں کا بچا ۳

خلاصہ تفسیر: اور عاد جو تھے سو وہ ایک تیز و تند ہوا سے ہلاک کئے گئے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان پر سات رات اور آٹھ دن متواتر مسلط کردیا تھا سو (اے مخاطب! اگر) تو (اس وقت وہاں موجود ہوتا تو) اس قوم کو اس طرح گرا ہوا دیکھتا کہ گویا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے (پڑے) ہیں (کیونکہ وہ بہت دراز قد تھے) سو کیا تجھ کو ان میں کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے (یعنی کوئی نہیں بچا، جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد ہے: **ھل تحس منھم من احد او تسمع لھم رکزا**)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وہ ہوا اس قدر تیز و تند تھی جس پر کسی مخلوق کا قابو نہ چلتا تھا، حتیٰ کہ فرشتے جو ہوا کے انتظام پر مسلط ہیں ان کے ہاتھوں سے نکلی جاتی تھی۔

فائدہ: ۲ یعنی جو قوم لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں یہ کہتی ہوئی اتری تھی: مَنۡ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے) وہ ہماری ہوا کا مقابلہ نہ کرسکی، اور ایسے گرانڈیل پہلوان ہوا کے تھپیڑوں سے اس طرح پچھاڑ کھا کر گرے گویا کھجور کے کھوکھلے اور بے جان تنے ہیں جن کا سر اوپر سے کٹ گیا ہو۔

فائدہ: ۳ یعنی ان قوموں کا بیج بھی باقی رہا؟ اس طرح صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کردی گئیں۔

وَجَآءَ فِرۡعَوۡنُ وَمَنۡ قَبۡلَهٗ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتُ بِالۡخَاطِئَةِ ۚ ⑨

اور آیا فرعون اور جو اس سے پہلے تھے اور الٹ جانے والی بستیاں خطائیں کرتے ہوئے

فَعَصَوۡا رَسُوۡلَ رَبِّهِمۡ فَاَخَذَهُمۡ اَخۡذَةً رَّابِيَةً ⑩

پھر حکم نہ مانا اپنے رب کے رسول کا پھر پکڑا ان کو پکڑنا سخت ۱

خلاصہ تفسیر: اور (اسی طرح) فرعون نے اور اس سے پہلے لوگوں نے (جن میں قوم نوح و عاد و ثمود سب آ گئے) اور (قوم لوط کی) الٹی ہوئی بستیوں نے بڑے بڑے قصور کئے (یعنی کفر و شرک کیا، اس پر ان کے پاس رسول بھیجے گئے) سو انہوں نے اپنے رب کے رسول کا (جوان کی طرف بھیجا گیا تھا) کہنا نہ مانا (اور کفر و شرک سے باز نہ آئے جس میں قیامت کو جھٹلانا بھی داخل ہے) تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سخت پکڑا (جن میں سے عاد و ثمود کا قصہ تو ابھی آ چکا ہے اور قوم لوط کی سزا کی طرف بھی مؤتفکٰت کے لفظ میں اشارہ ہے کہ ان کی بستیاں الٹ دی گئیں اور فرعون کی سزا بہت سی آیتوں میں پہلے آ چکی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی عاد و ثمود کے بعد فرعون بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا ہوا آیا اور اس سے پہلے اور کئی قومیں گناہ سمیٹتی ہوئی آئیں (مثلاً قوم نوح، قوم شعیب، اور قوم لوط، جن کی بستیاں الٹ دی گئی تھیں) ان سبھوں نے اپنے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی، اور خدا سے مقابلے باندھے، آخر سب کو خدا نے بڑی سخت پکڑ سے پکڑا، اس کے آگے کسی کی کچھ بھی پیش نہ چلی۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِیَةِ ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِیَهَآ اُذُنٌ وَّاعِیَةٌ ﴿۱۲﴾

ہم نے جس وقت پانی ابلا لاد لیا تم کو چلتی کشتی میں، تا کہ رکھیں اسکو تمہاری یادگاری کے واسطے اور سینت کر رکھے اسکو کان سینت کر رکھنے والا ۱

خلاصہ تفسیر: (قوم نوح کی سزا آگے ایک احسان کے ضمن میں مذکور ہے یعنی) ہم نے جبکہ (نوح علیہ السلام کے وقت میں) پانی کو طغیانی ہوئی تم کو (یعنی تمہارے بزرگوں کو جو مومن تھے اور ان کا نجات پانا تمہارے وجود کا سبب ہوا) کشتی میں سوار کیا (اور باقیوں کو غرق کر دیا) تا کہ ہم اس معاملہ کو تمہارے لئے ایک یادگار (اور عبرت) بنائیں اور یاد رکھنے والے کان اس کو یاد رکھیں (کان کو یاد رکھنے والا مجازاً کہہ دیا، حاصل یہ کہ اس کو یاد رکھ کر سزا کے اسباب سے بچیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نوح کے زمانہ میں جب پانی کا طوفان آیا تو بظاہر اسباب تم انسانوں میں سے کوئی بھی نہ بچ سکتا تھا، یہ ہماری قدرت و حکمت اور انعام و احسان تھا کہ سب منکروں کو غرق کر کے نوح کو مع اس کے ساتھیوں کے بچا لیا، بھلا ایسے عظیم الشان طوفان میں ایک کشتی کے سلامت رہنے کی کیا توقع ہو سکتی تھی، لیکن ہم نے اپنے قدرت و حکمت کا کرشمہ دکھلایا، تا کہ لوگ رہتی دنیا تک اس واقعہ کو یاد رکھیں اور جو کان کوئی معقول بات سن کر سمجھتے اور محفوظ رکھتے ہیں وہ کبھی نہ بھولیں کہ اللہ کا ہم پر ایک زمانہ میں یہ احسان ہوا ہے اور سمجھیں کہ جس طرح دنیا کے ہنگامہ دار و گیر میں فرمانبرداروں کو نافرمان مجرموں سے علیحدہ رکھا جاتا ہے، یہ ہی حال قیامت کے ہولناک حاقہ میں ہوگا، آگے اسی کی طرف کلام منتقل کرتے ہیں:

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾

پھر جب پھونکا جائے صور میں ایک بار پھونکنا، اور اٹھائی جائے زمین اور پہاڑ پھر کوٹ دیئے جائیں ایک بار

فَیَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾

پھر اس دن ہو پڑے وہ ہو پڑنے والی ۱

خلاصہ تفسیر: پیچھے تو مکذبین قیامت کے واقعات بیان ہوئے، اب آگے قیامت کے ہول و خوف کا بیان ہے یعنی:

پھر جب صور میں یک بارگی پھونک ماردی جائے گی (مراد پہلی بار صور پھونکنا ہے) اور (اس وقت) زمین اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) اٹھا لئے جائیں گے (یعنی اپنے مرکز سے ہٹا دیئے جائیں گے) پھر دونوں ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے تو اس روز وہ ہونے والی چیز ہو

پڑے گی۔

فائدہ: ۱؎ یعنی صور پھنکنے کے ساتھ زمین اور پہاڑ اپنے حیز کو چھوڑ دیں گے اور سب کو کوٹ پیٹ کر ایک دم ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ بس وہ ہی وقت ہے قیامت کے ہو پڑنے کا۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿١٦﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ

اور پھٹ جائے آسمان پھر وہ اس دن بکھر رہا ہے، اور فرشتے ہوں گے اس کے کناروں پر ۱؎ اور اٹھائیں گے تخت تیرے رب کا

فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿١٧﴾ؕ

اپنے اوپر اس دن آٹھ شخص ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور آسمان پھٹ جائے گا اور وہ (آسمان) اس روز بالکل بودا ہوگا (چنانچہ پھٹ جانا خود بودے اور کمزور ہونے کی دلیل ہے، یعنی جیسا اس وقت وہ مضبوط ہے اور اس میں کہیں سوراخ اور شگاف نہیں، اس روز اس میں یہ بات نہ رہے گی بلکہ کمزور ہو کر پھٹ جائے گا) اور فرشتے (جو آسمان میں پھیلے ہوئے ہیں جس وقت وہ پھٹنا شروع ہوگا) اس کے کناروں پر آ جائیں گے (اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آسمان بیچ میں سے پھٹ کر چاروں طرف سمٹنا شروع ہوگا، اس لیے فرشتے بھی بیچ میں سے کناروں پر آ جائیں گے پھر آیت: **فصعق من فی السموت ومن فی الارض** الخ کے مطابق ان فرشتوں پر بھی موت مسلط ہو جائے گی، اور یہ سب واقعات تو پہلی بار صور پھونکنے کے وقت ہیں) اور (آگے دوسری بار صور پھونکنے کے واقعات ہیں کہ) آپ کے پروردگار کے عرش کو اس روز آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے (حدیث میں ہے کہ ابھی عرش کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں، قیامت کو آٹھ فرشتے اٹھائیں گے، غرض آٹھ فرشتے عرش کو اٹھا کر میدان قیامت میں لائیں گے اور حساب شروع ہوگا)۔

وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ: اگرچہ بظاہر آیت کے الفاظ سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ آئندہ کے واقعات بھی پہلی بار صور پھونکنے کے وقت ہوں گے، مگر بات یہ ہے کہ قیامت ایک وسیع وقت ہے اور اس کے سب اوقات مجموعی طور پر ایک ہی وقت کے حکم میں ہیں، اس لیے دوسری بار صور پھونکنے کے واقعات کو بھی مجازاً پہلی بار صور پھونکنے کے واقعات کہہ سکتے ہیں، کیونکہ وہ سب قیامت ہی کے واقعات ہیں اور قیامت پہلی بار صور پھونکنے سے شروع ہو جائے گی۔

فائدہ: ۱؎ یعنی آج جو آسمان اس قدر مضبوط و محکم ہے کہ لاکھوں سال گزرنے پر بھی کہیں ذرا سا شگاف نہیں پڑا اُس روز پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، اور جس وقت درمیان سے پھٹنا شروع ہوگا تو فرشتے اس کے کناروں پر چلے جائیں گے۔

فائدہ: ۲؎ اب عرش عظیم کو چار فرشتے اٹھا رہے ہیں جن کی بزرگی اور کلانی کا علم اللہ ہی کو ہے، اس دن ان چار کے ساتھ چار اور لگیں گے، تفسیر عزیزی میں اس عدد کی حکمتوں اور ان فرشتوں کے حقائق پر بہت دقیق و بسیط بحث کی گئی ہے، جس کو شوق ہو وہاں دیکھ لے۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ

اس دن سامنے کیے جاؤ گے چھپی نہ رہے گی تمہاری کوئی چھپی بات ۱؎ سو جس کو ملا اس کا لکھا داہنے ہاتھ میں وہ کہتا ہے لیجیو

اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿١٩﴾ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾ۚ

پڑھیو میرا لکھا ۲؎ میں نے خیال رکھا اس بات کا کہ مجھ کو ملے گا میرا حساب ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے حساب وکتاب کا بیان ہے یعنی) جس روز تم (خدا کے روبرو حساب کے واسطے) پیش کئے جاؤ گے (اور) تمہاری کوئی بات (اللہ تعالیٰ سے) پوشیدہ نہ ہوگی پھر (نامہ اعمال اڑ اگر ہاتھ میں دیئے جائیں گے تو) جس شخص کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ تو (خوشی کے مارے آس پاس والوں سے) کہے گا کہ میرا نامہ اعمال پڑھ لو، میرا (تو پہلے ہی سے) اعتقاد تھا کہ مجھ کو میرا حساب پیش آنے والا ہے (یعنی میں قیامت اور حساب کا معتقد تھا، مطلب یہ کہ میں ایمان اور تصدیق رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے آج مجھ کونوازا)۔

* * *

فائدہ: لے یعنی اس دن اللہ کی عدالت میں حاضر کیے جاؤ گے اور کسی کی کوئی نیکی یا بدی مخفی نہ رہے گی، سب منظر عام پر آجائے گی۔

فائدہ: ٢ے یعنی اس دن جس کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا گیا جو ناجی ومقبول ہونے کی علامت ہے، وہ خوشی کے مارے ہر کسی کو دکھاتا پھرتا ہے کہ لوآؤ! یہ میرا اعمال نامہ پڑھو۔

فائدہ: ٣ے یعنی میں نے دنیا میں خیال رکھا تھا کہ ایک دن ضرور میرا حساب کتاب ہونا ہے اس خیال سے میں ڈرتا رہا اور اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہا، آج اس کا دل خوش کن نتیجہ دیکھ رہا ہوں کہ خدا کے فضل سے میرا حساب بالکل صاف ہے۔

فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٢١﴾ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿٢٢﴾ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾

سو وہ ہیں من مانتے گزران میں، اونچے باغ میں، جس کے میوے جھکے پڑے ہیں لے

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيٓـًٔا بِمَآ أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾

کھاؤ اور پیو رچ کر بدلہ اس کا جو آگے بھیج چکے ہو تم پہلے دنوں میں ٢ے

خلاصہ تفسیر: غرض وہ شخص پسندیدہ عیش یعنی بہشت بریں میں ہوگا جس کے میوے (اس قدر) جھکے ہوں گے (کہ جس حالت میں چاہیں گے لے سکیں گے اور حکم ہوگا) کہ کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلہ میں جو تم نے بامید صلہ گزشتہ ایام (یعنی دنیا میں قیام کے زمانہ) میں کئے ہیں۔

* * *

فائدہ: لے جو کھڑے بیٹھے، لیٹے، ہر حالت میں نہایت سہولت سے چنے جاسکتے ہیں۔

فائدہ: ٢ے یعنی دنیا میں تم نے اللہ کے واسطے اپنے نفس کی خواہشوں کو روکا تھا اور بھوک پیاس وغیرہ کی تکلیفیں اٹھائی تھیں، آج کوئی روک ٹوک نہیں، خوب رچ پچ کر کھاؤ پیو، نہ طبیعت منغص ہوگی نہ بدہضمی نہ بیماری نہ زوال کا کھٹکا۔

وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ﴿٢٥﴾ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿٢٦﴾

اور جس کو ملا اس کا لکھا بائیں ہاتھ میں وہ کہتا ہے کیا اچھا ہوتا جو مجھ کو نہ ملتا میرا لکھا، اور مجھ کو خبر نہ ہوتی کہ کیا ہے حساب میرا

يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ﴿٢٧﴾ مَآ أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ﴿٢٨﴾ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ﴿٢٩﴾

کسی طرح وہی موت ختم کر جاتی، کچھ کام نہ آیا مجھ کو میرا مال، برباد ہوئی مجھ سے حکومت میری لے

خلاصہ تفسیر: اور جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا سو وہ (نہایت حسرت سے) کہے گا کیا اچھا ہوتا کہ مجھ کو میرا نامہ اعمال ہی نہ ملتا، اور مجھ کو یہ ہی خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے، کیا اچھا ہوتا کہ (پہلی) موت ہی خاتمہ کر چکتی (اور دوبارہ زندہ نہ ہوتے جس پر نامہ

اعمال اور حساب ہونے کی نوبت آئی، افسوس) میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا، میرا جاہ (بھی) مجھ سے گیا گزرا (یعنی مال و جاہ سب بے سود ٹھہرے)۔

* * *

فائدہ: لے یعنی پیٹھ کی طرف سے بائیں ہاتھ میں جس کا اعمالنامہ دیا جائے گا، سمجھ لے گا کہ کم بختی آئی، اس وقت نہایت حسرت سے تمنا کرے گا کہ کاش! میرے ہاتھ میں اعمالنامہ نہ دیا جاتا اور مجھے کچھ خبر نہ ہوتی کہ حساب کتاب کیا چیز ہے، کاش! موت میرا قصہ ہمیشہ کے لیے تمام کر دیتی، مرنے کے بعد پھر اٹھنا نصیب نہ ہوتا، یا اٹھا تو اب موت آکر میرا لقمہ کر لیتی، افسوس وہ مال دولت اور جاہ و حکومت کچھ کام نہ آئی، آج ان میں سے کسی چیز کا پتہ نہیں، نہ میری کوئی حجت اور دلیل چلتی ہے نہ معذرت کی گنجائش ہے۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝٣٠ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝٣١ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝٣٢

اس کو پکڑو پھر طوق ڈالو، پھر آگ کے ڈھیر میں اس کو ڈالو، پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر گز ہے اس کو جکڑ دو لے

خلاصہ تفسیر: (ایسے شخص کے لئے فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) اس شخص کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق پہنا دو، پھر دوزخ میں اس کو داخل کرو، پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر گز ہے اس کو جکڑ دو (اس گز کی مقدار خدا کو معلوم ہے کیونکہ یہ گز وہاں کا ہوگا)۔

* * *

فائدہ: لے فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے پکڑو، طوق گلے میں ڈالو، پھر دوزخ کی آگ میں غوطہ دو اور اس زنجیر میں جس کا طول ستر گز ہے اس کو جکڑ دو، تاکہ جلنے کی حالت میں ذرا بھی حرکت نہ کر سکے، کہ ادھر ادھر حرکت کرنے سے بھی جلنے والا قدرے تخفیف محسوس کیا کرتا ہے (تنبیہ) گز سے وہاں کا گز مراد ہے جس کی مقدار اللہ ہی جانے۔

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝٣٣ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣٤ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ

وہ تھا کہ یقین نہ لاتا تھا اللہ پر جو سب سے بڑا، اور تاکید نہ کرتا تھا فقیر کے کھانے پر لے سو کوئی نہیں آج اس کا

هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝٣٥ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝٣٦ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ۝٣٧ ع

یہاں دوستدار ۲ اور نہ کچھ ملے کھانا مگر زخموں کا دھوون، کوئی نہ کھائے اس کو مگر وہی گناہ گار ۳

خلاصہ تفسیر: (اب اس عذاب کی وجہ بتلاتے ہیں کہ) یہ شخص خدائے بزرگ پر ایمان نہ رکھتا تھا (یعنی جس طرح ایمان لانا انبیاء کی تعلیم کے مطابق ضروری تھا وہ ایمان نہ رکھتا تھا) اور (خود تو کسی کو کیا دیتا اوروں کو بھی) غریب آدمی کے کھلانے کی ترغیب نہ دیتا تھا (حاصل یہ کہ خدا کی عظمت اور مخلوق کی شفقت جو کہ ان عبادات میں اصل ہیں جن کا تعلق خدا اور بندوں کے ساتھ ہے یہ ان دونوں کو چھوڑنے والا اور ان کا منکر تھا اس لئے مستحق عذاب ہوا) سو آج اس شخص کا نہ کوئی دوست دار ہے، اور نہ اس کو کوئی کھانے کی چیز نصیب ہے بجز زخموں کے دھوون کے (یعنی کھانے میں ایسی چیز دی جائے گی جو کراہت اور صورت میں دھوون یعنی زخموں کی پیپ کی طرح ہوگی، مقصود یہ ہے کہ مرغوب کھانے نہ ملیں گے) جس کو بجز بڑے گناہ گاروں کے کوئی نہ کھائے گا۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ: یہاں کھانا کھلانے اور ترغیب دینے سے مراد وہ مرتبہ ہے جو کہ واجب ہے، اور اس کے چھوڑ دینے سے مراد یہ ہے کہ ایمان نہ لانے کے سبب وہ ان کو واجب بھی نہ سمجھتا تھا۔

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ: یہ حصر اضافی ہے، یعنی مقصود یہ ہے کہ دوزخ میں مرغوب کھانے نہ ملیں گے، یہ مقصد نہیں کہ دھوون یعنی زخموں کی پیپ کے علاوہ کچھ نہ ملے گا، کیونکہ دوزخیوں کو کھانے میں زقوم وغیرہ کا ملنا خود قرآن سے ثابت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس نے دنیا میں رہ کر نہ اللہ کو جانا نہ بندوں کے حقوق کو پہچانے، فقیر محتاج کی خود تو کیا خدمت کرتا دوسروں کو بھی ادھر ترغیب نہ دی، پھر جب اللہ پر جس طرح چاہیے ایمان نہ لایا تو نجات کہاں؟ اور جب کوئی بھلائی کا چھوٹا بڑا کام بن نہ پڑا تو عذاب میں تخفیف کی بھی کوئی صورت نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی جب اللہ کو دوست نہ بنایا تو آج اس کا دوست کون بن سکتا ہے جو حمایت کر کے عذاب سے بچا دے یا مصیبت کے وقت کچھ تسلی کی بات کرے۔

فائدہ: ۳ کھانے سے بھی انسان کو قوت پہنچتی ہے مگر دوزخیوں کو کوئی ایسا مرغوب کھانا نہ ملے گا جو راحت وقوت کا سبب ہو، ہاں! دوزخیوں کے زخموں کی پیپ دی جائے گی جسے ان گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھا سکتا اور وہ بھی بھوک پیاس کی شدت میں غلطی سے یہ سمجھ کر کھائیں گے کہ اس سے کچھ کام چلے گا، بعد کو ظاہر ہوگا کہ اس کا کھانا بھوک کے عذاب سے بڑا عذاب ہے (أعاذنا الله من سائر أنواع العذاب في الدنيا والاخرة، آمین)۔

فَلَآ اُقۡسِمُ بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ﴿۴۰﴾

سو قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو دیکھتے ہو، اور جو چیزیں کہ تم نہیں دیکھتے، یہ کہا ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا ۱

خلاصہ تفسیر: اب آگے قرآن کریم کی حقانیت بیان کی جاتی ہے جس میں قیامت کے دن جزاء وسزا ہونے کا بیان ہے اور اس کو جھٹلانا بھی عذاب کا سبب ہے۔

پھر (جزا وسزا کے مضمون کے بعد) میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی بھی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے (کیونکہ بعض مخلوقات اس وقت آنکھوں سے نظر آتی ہیں یا نظر آنے کے قابل ہیں، اور بعض مخلوقات اس وقت نظر نہیں آتیں اور نظر آنے کے قابل بھی نہیں، اس قسم کو مقصود سے ایک خاص مناسبت ہے، کیونکہ قرآن مجید کا لانے والا فرشتہ تو نظر نہ آتا تھا، اور جن پر قرآن نازل ہوتا تھا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ نظر آتے تھے، مراد یہ کہ تمام مخلوقات کی قسم ہے) کہ یہ قرآن (اللہ کا) کلام ہے ایک معزز فرشتہ کا لایا ہوا (پس جس پر یہ کلام نازل ہوا وہ ضرور رسول ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو کچھ جنت ودوزخ وغیرہ کا بیان ہوا، یہ کوئی شاعری نہیں، نہ کاہنوں کی اٹکل پچو باتیں ہیں، بلکہ یہ قرآن ہے اللہ کا کلام جس کو آسمان سے ایک بزرگ فرشتہ لے کر ایک بزرگ ترین پیغمبر پر اترا، جو آسمان سے لایا وہ اور جس نے زمین والوں کو پہنچایا دونوں رسول کریم ہیں، ایک کا کریم ہونا تو تم آنکھوں سے دیکھتے ہو، اور دوسرے کی کرامت وبزرگی پہلے کریم کے بیان سے ثابت ہے۔

تنبیہ: عالم میں دو قسم کی چیزیں ہیں: ① ایک جس کو آدمی آنکھوں سے دیکھتا ہے ② دوسری جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی، عقل وغیرہ کے ذریعہ سے ان کے تسلیم کرنے پر مجبور ہے، مثلاً ہم کتنا ہی آنکھیں پھاڑ کر زمین کو دیکھیں، وہ چلتی ہوئی نظر نہ آئے گی لیکن حکماء کے دلائل وبراہین سے عاجز ہو کر ہم اپنی آنکھ کو غلطی پر سمجھتے ہیں اور اپنی عقل کے یا دوسرے عقلاء کی عقل کے ذریعہ سے حواس کی ان غلطیوں کی تصحیح واصلاح کر لیتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کی عقل بھی غلطیوں اور کوتاہیوں سے محفوظ نہیں، آخر اس کی غلطیوں کی اصلاح اور کوتاہیوں کی تلافی کس سے ہو، بس تمام عالم میں ایک وحی الٰہی کی قوت ہے جو خود غلطی سے محفوظ ومعصوم رہتے ہوئے تمام عقلی قوتوں کی اصلاح وتکمیل کر سکتی ہے، جس طرح حواس جہاں پہنچ کر عاجز ہوتے ہیں وہاں عقل کام دیتی ہے، ایسے ہی جس میدان میں عقل مجرد کام نہیں دیتی یا ٹھوکریں کھاتی ہے اس جگہ وحی الٰہی اس کی دستگیری کر کے ان بلند حقائق سے روشناس کرتی ہے، شاید اسی لیے یہاں: بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ کی قسم کھائی، یعنی جو حقائق جنت ودوزخ وغیرہ کی پہلی آیات میں بیان ہوئی ہیں، اگر دائرہ محسوسات سے بلند تر ہونے کی وجہ سے تمہاری سمجھ میں نہ آئیں تو اشیاء میں مبصرات وغیر مبصرات یا بالفاظ دیگر محسوسات وغیرہ محسوسات کی تقسیم سے سمجھ لو کہ یہ رسول کریم کا کلام ہے جو بذریعہ وحی الٰہی دائرہ حس وعقل سے بالاتر حقائق کی خبر دیتا ہے، جب ہم بہت سی غیر محسوس بلکہ مخالف حس چیزوں کو اپنی عقل یا دوسروں کی تقلید سے مان لیتے ہیں تو بعض بہت اونچی چیزوں کو رسول کریم کے کہنے سے ماننے میں کیا اشکال ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور نہیں ہے یہ کہا کسی شاعر کا تم تھوڑا یقین کرتے ہو ۱ اور نہیں ہے کہا پریوں والے کا تم بہت کم دھیان کرتے ہو ۲

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾

یہ اتارا ہوا ہے جہان کے رب کا ۳

خلاصہ تفسیر: اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے (جیسا کہ کفار آپ کو شاعر کہتے تھے مگر) تم بہت کم ایمان لاتے ہو (یہاں کمی سے مراد بالکل نہ ہونا ہے، یعنی نہ تم کو ایمان ہے نہ سمجھ) اور یہ نہ کسی کاہن کا کلام ہے (جیسا بعض کفار آپ کو کہتے تھے مگر) تم بہت کم سمجھتے ہو (یہاں بھی کمی سے مراد بالکل نہ ہونا ہے، غرض یہ قرآن نہ شعر ہے نہ کہانت، بلکہ) رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا (کلام) ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قرآن کے کلام اللہ ہونے کی نسبت کبھی کبھی یقین کی کچھ جھلک تمہارے دلوں میں آتی ہے، مگر بہت کم جو نجات کے لیے کافی نہیں، آخر اس کو شاعری وغیرہ کہہ کر اڑا دیتے ہو، کیا واقعی انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ یہ کسی شاعر کا کلام ہو سکتا ہے اور شعر کی قسم سے ہے، شعر میں وزن و بحر وغیرہ ہونا لازم ہے، قرآن میں اس کا پتہ نہیں، شاعروں کا کلام اکثر بے اصل ہوتا ہے اور اس کے اکثر مضامین محض وہمی اور خیالی ہوتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم میں تمام تر حقائق ثابتہ اور اصول محکمہ کو قطعی دلیلوں اور یقینی حجتوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی پوری طرح دھیان کرو تو معلوم ہو جائے کہ یہ کسی کاہن کا کلام نہیں، کاہن عرب میں وہ لوگ تھے جو بھوت پریت، جنوں اور چڑیلوں سے تعلق یا مناسب رکھتے تھے، وہ ان کو غیب کی بعض جزئی باتیں ایک مقفی و مسجع کلام کے ذریعہ سے بتلاتے تھے، لیکن جنوں کا کلام معجز نہیں ہوتا کہ ویسا دوسرا نہ کر سکے، بلکہ ایک جن کسی کاہن کو ایک بات سکھلاتا ہے، دوسرا جن بھی ویسی بات دوسرے کاہن کو سکھلا سکتا ہے اور یہ کلام یعنی قرآن ایسا معجز ہے کہ سب جن وانس مل کر بھی اس کے مشابہ کلام نہیں بنا سکتے، دوسرے کاہنوں کے کلام میں محض قافیہ اور سجع کی رعایت کے لیے بہت الفاظ بھرتی کے بالکل بیکار اور بے فائدہ ہوتے ہیں، اور اس کلام معجز نظام میں ایک حرف یا ایک شوشہ بھی بیکار و بے فائدہ نہیں، پھر کاہنوں کی باتیں چند مبہم، جزئی اور معمولی خبروں پر مشتمل ہوتی ہیں، لیکن علوم و حقائق پر مطلع ہونا اور ادیان و شرائع کے اصول و قوانین اور معاش معاد کے دستور و آئین کا معلوم کر لینا اور فرشتوں کے اور آسمانوں کے چھپے ہوئے بھیدوں پر سے آگاہی پانا ان سے نہیں ہو سکتا، بخلاف قرآن کریم کے وہ ان ہی مضامین سے پر ہے۔

فائدہ: ۳ اسی لیے سارے جہان کی تربیت کے اعلیٰ اور محکم ترین اصول اس میں بیان ہوئے ہیں۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ۡ

اور اگر یہ بنا لاتا ہم پر کوئی بات، تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ، پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن

فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾

پھر تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے بچا لے ۱

خلاصہ تفسیر: اب آگے قرآن کی حقانیت کی ایک عقلی دلیل ارشاد فرماتے ہیں کہ:

اور اگر یہ (پیغمبر) ہمارے ذمہ کچھ (جھوٹی) باتیں لگا دیتے (یعنی جو کلام ہمارا نہ ہوتا اس کو ہمارا کلام کہتے اور جھوٹا دعویٰ نبوت کا کرتے) تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے، پھر ہم ان کی رگ دل کاٹ ڈالتے، پھر تم میں کوئی ان کا اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا (دل کی رگ کاٹنے سے آدمی مر

جاتا ہے مراد اس سے قتل ہے)۔

لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ: سیدھا ہاتھ پکڑنے اور دل کی رگ کاٹنے سے فنا کرنا مراد ہے، خواہ جان کا، یا حجت اور دلیل کا، پس مطلب یہ ہے کہ جھوٹے مدعی نبوت کی تائید حجت سے نہیں ہوتی، بلکہ ہلاک ہوتا ہے، یا جھوٹ ظاہر ہو جانے سے ذلیل و رسوا ہو کر ایسا ہو جاتا ہے جیسے دل کی رگ کاٹ دی گئی ہو، نبوت چونکہ ایک ظاہری و کھلی حقیقت ہے، اس لیے اسکا جھوٹا مدعی بھی ظاہر میں ہلاک کر دیا جاتا ہے اور عوام میں مردود ہو جاتا ہے، لیکن ولایت و بزرگی کا جھوٹا مدعی باطنی طور پر ہلاک ہو جاتا ہے، جس کا ادراک اہل اللہ کرتے ہیں، یہ اس لیے کہ ولایت و بزرگی ایک قلبی و باطنی چیز ہے اور اسکی علامتوں میں سے ظلمت اور نیک عمل کی توفیق چھن جانا ہے، پس جس ولایت و بزرگی کے مدعی سے اکثر اہل اللہ دور ہوں تو ایسے مدعی سے دور رہنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱ے حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اگر جھوٹ بناتا اللہ پر تو اول اس کا دشمن اللہ ہوتا اور ہاتھ پکڑتا یہ دستور ہے گردن مارنے کا کہ جلاد اس کا داہنا ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر پکڑ رکھتا ہے تا کہ سرک نہ جائے''۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ: ''تَقَوَّلَ کی ضمیر رسول کی طرف لوٹتی ہے، یعنی اگر رسول بالفرض کوئی حرف اللہ کی طرف منسوب کر دے یا اس کے کلام میں اپنی طرف سے ملا دے جو اللہ نے نہ کہا ہو تو اسی وقت اس پر یہ عذاب کیا جائے (العیاذ باللہ)، کیونکہ اس کی تصدیق اور سچائی آیات بینات اور دلائل و براہین کے ذریعہ سے ظاہر کی جاچکی ہے، اب اگر اس قسم کی بات پر فوراً عذاب اور سزا نہ کی جائے تو وحی الٰہی سے امن اٹھ جائے گا اور ایسا التباس و اشتباہ پڑ جائے گا جس کی اصلاح ناممکن ہو جائے گی، جو حکمت تشریع کے منافی ہے، بخلاف اس شخص کے جس کا رسول ہونا آیات و براہین سے ثابت نہیں ہوا، بلکہ کھلے ہوئے قرائن و دلائل اعلانیہ اس کی رسالت کی نفی کر چکے ہیں تو اس کی بات بھی بیہودہ اور خرافات ہے کوئی عاقل اس کو درخور اعتناء نہ سمجھے گا اور نہ بحمد اللہ دین الٰہی میں کوئی التباس و اشتباہ واقع ہوگا، ہاں! ایسے شخص کی معجزات وغیرہ سے تصدیق ہونا محال ہے، ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جھوٹا ثابت کرنے اور رسوا کرنے کے لیے ایسے امور بروئے کار لائے جو اس کے دعوئے رسالت کے مخالف ہوں، اس کی مثال یوں سمجھو کہ جس طرح بادشاہ ایک شخص کو کسی منصب پر مامور کر کے اور سند و فرمان وغیرہ دے کر کسی طرف روانہ کرتے ہیں، اب اگر اس شخص سے اس خدمت میں کچھ خیانت ہوئی یا بادشاہ پر کچھ جھوٹ باندھا اس سے ثابت ہوا تو اسی وقت بلا توقف اس کا تدارک کرتے ہیں، لیکن اگر سڑک کوٹنے والا مزدور یا جھاڑو دینے والا بھنگی بکتا پھرے کہ گورنمنٹ کا میرے لیے یہ فرمان ہے یا میرے ذریعہ سے یہ احکام دیے گئے ہیں تو کون اس کی بات پر کان دھرتا ہے اور کون اس کے دعوں سے تعرض کرتا ہے۔

بہرحال آیت ہذا میں حضور ﷺ کی نبوت پر استدلال نہیں کیا گیا، بلکہ یہ بتلایا گیا ہے کہ قرآن کریم خالص اللہ کا کلام ہے جس میں ایک حرف یا ایک شوشہ نبی کریم ﷺ بھی اپنی طرف سے شامل نہیں کر سکتے اور نہ باوجود پیغمبر ہونے کے آپ ﷺ کی یہ شان ہے کہ کوئی بات اللہ کی طرف منسوب کر دیں جو اس نے نہ کہی ہو، تورات سفر استثناء کے اٹھارویں باب میں بیسواں فقرہ یہ ہے: ''لیکن وہ نبی ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے''، خلاصہ یہ ہے کہ جو نبی ہوگا اس سے ایسا ممکن نہیں: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (البقرۃ: ۱۲۰)

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِیْنَ ﴿۴۹﴾ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ﴿۵۰﴾

اور یہ نصیحت ہے ڈرنے والوں کو، اور ہم کو معلوم ہے کہ تم میں بعضے جھٹلاتے ہیں، اور وہ جو ہے پچھتاوا ہے منکروں پر ۱ے

ع ۲ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ﴿۵۲﴾

اور وہ جو ہے یقین کرنے کے قابل ہے، اب بول پاکی اپنے رب کے نام کی جو ہے سب سے بڑا ۲ے

خلاصہ تفسیر: اور بلاشبہ یہ قرآن متقیوں کے لئے نصیحت ہے (یعنی قرآن کا فی نفسہ حق ہونا اس کی ذاتی وکمالی صفت ہے، یعنی قرآن فی نفسہ اپنی ذات کے اعتبار سے حق ہے، اور قرآن کا موجب نصیحت ہونا اس کی اضافی وکمالی صفت ہے، یعنی پڑھنے والوں کے لیے موجب نصیحت ہے) اور (آگے جھٹلانے والوں کے لیے وعید ہے کہ) ہم کو معلوم ہے کہ تم میں سے بعض تکذیب کرنے والے بھی ہیں (پس ہم ان کو اس کی سزا دیں گے) اور (اس اعتبار سے) یہ قرآن کافروں کے حق میں موجب حسرت ہے (کیونکہ ان کے لئے جھٹلانے کی وجہ سے عذاب کا سبب ہوگیا) اور یہ قرآن تحقیقی یقینی بات ہے، سو (جس کا یہ کلام ہے) اپنے (اس) عظیم الشان پروردگار کے نام کی تسبیح (وتحمید) کیجئے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی خدا سے ڈرنے والے اس کلام کو سن کر نصیحت حاصل کریں گے اور جن کے دل میں ڈر نہیں وہ جھٹلائیں گے، لیکن ایک وقت آنے والا ہے کہ یہی کلام اور ان کا یہ جھٹلانا سخت حسرت و پشیمانی کا موجب ہوگا، اس وقت پچھتائیں گے کہ افسوس کیوں ہم نے اس سچی بات کو جھٹلایا تھا جو آج یہ آفت دیکھنی پڑی۔

فائدہ: لے یعنی یہ کتاب تو ایسی چیز ہے جس پر یقین سے بھی بڑھ کر یقین رکھا جائے، کیونکہ اس کے مضامین سرتاپا سچ اور ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہیں، لازم ہے کہ آدمی اس پر ایمان لا کر اپنے رب کی تسبیح وتحمید میں مشغول ہو۔

ایاتها ٤٤ | ٧٠ سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ مَكِّيَّةٌ ٧٩ | رکوعاتها ٢

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کی طرح اس سورت میں بھی جزاوسزا کا اور ان اعمال کا بیان ہے جو کہ جزاوسزا کا سبب ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾

مانگا ایک مانگنے والے نے عذاب پڑنے والا، منکروں کے واسطے کوئی نہیں اسکو ہٹانے والا لے آئے اللہ کی طرف سے جو چڑھتے درجوں والا ہے ٢

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾

چڑھیں گے اس کی طرف فرشتے اور روح ٣ اس دن میں جس کا لنباؤ پچاس ہزار برس ہے ٤

خلاصہ تفسیر: ایک مانگنے والا (انکار کی غرض سے) وہ عذاب مانگتا ہے جو کہ کافروں پر واقع ہونے والا ہے (اور) جس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں (اور) جو اللہ کی طرف سے واقع ہوگا جو کہ سیڑھیوں کا (یعنی آسمانوں کا) مالک ہے (جن سیڑھیوں سے) فرشتے اور (اہل ایمان کی) روحیں اس کے پاس چڑھ کر جاتی ہیں (اس کے پاس سے مراد وہ جگہ ہے جو عالم بالا میں ان کے چڑھنے کی انتہا قرار دیا گیا ہے، اور چونکہ اس چڑھنے کا رستہ آسمان ہیں اس لیے ان کو معارج یعنی سیڑھیاں فرمادیا، اور وہ عذاب) ایسے دن میں (واقع) ہوگا جس کی مقدار (دنیا کے) پچاس ہزار سال (کی برابر) ہے (مراد قیامت کا دن ہے)۔

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ: نسائی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ مانگنے والا سائل نضر بن حارث تھا جس نے قرآن اور رسول ﷺ کی تکذیب میں اس جرأت سے کام لیا کہ کہنے لگا: **اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندك فامطر علینا حجارۃ من السمآء او ائتنا بعذاب الیم** یعنی گستاخی کی غرض سے کہا کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن ہی حق ہے اور آپ کی طرف سے، تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کوئی دوسرا سخت عذاب بھیج دے، اس کا مقصود فوری عذاب تھا، حق تعالیٰ نے یہاں پہلے اس کی درخواست کو نقل فرمایا پھر اس کا جواب اس طرح ارشاد

فرمایا کہ یہاں دنیا کی سزا کیا سزا ہے، خواہ وہ واقع ہو یا نہ ہو، اصلی سزا کا انتظار کرو جو ایسے دن میں واقع ہوگی جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی، مراد قیامت کا دن ہے، ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دیا تو وہ اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ اصل عذاب تو آخرت میں ہی ہوگا، اور اس سے پہلے دنیا میں عذاب کے واقع ہونے سے آخرت کے عذاب کی نفی لازم نہیں آتی، اس شخص نے اللہ تعالیٰ کا جو عذاب اپنے منہ مانگا تھا آگے اس کی کچھ حقیقت کا بیان ہے کہ یہ عذاب کافروں پر ضرور واقع ہو کر رہے گا۔

فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ: اس دن سے قیامت کا دن مراد ہے، چنانچہ یہاں فی یوم کا عامل مقدر ہے یعنی: "یقع العذاب بهم فی یوم" الخ، قیامت کا دن اپنی درازی اور سختی سے کفار کو اتنا لمبا محسوس ہوگا، اور چونکہ کفر کے مراتب میں فرق ہونے کی وجہ سے اس دن کی سختی میں بھی فرق ہوگا، کسی کے لیے بہت زیادہ، کسی کے لیے کچھ کم، اس لیے ایک اور آیت میں: کان مقدارہ الف سنة یعنی ہزار سال کے برابر فرمایا، تو بعض کافروں کو ہزار سال کے برابر معلوم ہوگا، تو اس دن کا دراز ہونا مختلف گروہوں کے اعتبار سے مختلف ہوگا، اور کافروں کی تخصیص اس لیے ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ مؤمن کو وہ دن اتنا ہلکا معلوم ہوگا جیسے فرض نماز پڑھنے کا وقت، قیامت کے دن کی مقدار سے متعلق ایک تحقیق سورہ حج آیت ۴۷: وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یعنی پیغمبر نے تم پر عذاب مانگا ہے وہ کسی سے نہ ہٹایا جائے گا، یا عذاب مانگنے والے کفار ہوں جو کہا کرتے تھے کہ آخر جس عذاب کا وعدہ ہے وہ جلدی کیوں نہیں آتا؟ اے اللہ! اگر محمد (ﷺ) کا کہنا سچ ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے، یہ باتیں انکار و تمسخر کی راہ سے کہتے تھے اس پر فرمایا کہ عذاب مانگنے والے ایک ایسی آفت مانگ رہے ہیں جو بالیقین ان پر پڑنے والی ہے کسی کے روکے رک نہیں سکتی، کفار کی انتہائی حماقت یا شوخ چشمی ہے جو ایسی چیز کا اپنی طرف سے مطالبہ کرتے ہیں"۔

فائدہ: ۲؎ یعنی فرشتے اور مومنین کی روحیں تمام آسمانوں کو درجہ بدرجہ طے کر کے اس کی بارگاہ قرب تک چڑھتی ہیں، یا اس کے بندے اس کے حکموں کی تابعداری میں جان و دل سے کوشش کر کے اور اچھی خصلتوں سے آراستہ ہو کر قرب و وصول کے روحانی مرتبوں اور درجوں سے ترقی کرتے ہوئے اس کی حضوری سے مشرف ہوتے ہیں اور وہ درجے مسافت کی دوری اور نزدیکی میں مختلف اور متفاوت ہیں، بعض ایسے ہیں کہ ایک پلک مارنے میں ان کے سبب سے ترقی ہوسکتی ہے جیسے اسلام کا کلمہ زبان سے کہنا، اور بعض ایسے ہیں کہ ایک ساعت میں ان سے ترقی حاصل ہوتی ہے جیسے نماز ادا کرنا، اور بعض سے پورے ایک دن میں، جیسے روزہ، یا ایک مہینہ میں، جیسے پورے رمضان کے روزے، یا ایک سال میں جیسے حج ادا کرنا وعلی ہذا القیاس، اور اسی طرح فرشتوں اور روحوں کا عروج جو کسی کام پر مقرر ہیں اس کام سے فراغت پانے کے بعد مختلف و متفاوت ہے اور اس خداوند قدس کی تدبیر و انتظام کا اتار چڑھاؤ بیشمار درجے رکھتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی فرشتے اور لوگوں کی روحیں پیشی کے لیے حاضر ہوں گی۔

فائدہ: ۴؎ پچاس ہزار برس کا دن قیامت کا ہے، یعنی پہلی مرتبہ صور پھونکنے کے وقت سے لے کر بہشتیوں کے بہشت میں، اور دوزخیوں کے دوزخ میں قرار پکڑنے تک پچاس ہزار برس کی مدت ہوگی اور کل فرشتے اور تمام قسم کی مخلوقات کی روحیں اس تدبیر میں بطور خدمت گار کے شریک ہونگی، پھر اس بڑے کام کے سرانجام کی مدت گزرنے پر ان کو عروج ہوگا۔

تنبیه: حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "خدا کی قسم ایماندار آدمی کو وہ (اتنا لمبا) دن ایسا چھوٹا معلوم ہوگا جتنی دیر میں ایک نماز فرض ادا کر لیتا ہے"۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۵ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۷

سو تو صبر کر بھلی طرح کا صبر کرنا ۱؎ وہ دیکھتے ہیں اس کو دور، اور ہم دیکھتے ہیں اس کو نزدیک ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو (جب عذاب کا آنا ثابت ہے تو) آپ (ان کی مخالفت پر) صبر کیجئے اور صبر بھی ایسا جس میں شکایت کا نام نہ ہو (یعنی ان کی مخالفت وکفر سے ایسے تنگ نہ ہوجائے کہ شکایت حکایت زبان پر آجائے، بلکہ یہ سمجھ کر تحمل کیجئے کہ ان کو سزا ہونے والی ہے، اور اس سزا کے دن کا جوان کو انکار ہے سو) یہ لوگ اس دن کو (قیامت پر ایمان نہ ہونے کے سبب اس کے واقع ہونے کو) بعید دیکھ رہے ہیں اور ہم (کو اس کا واقع ہونا یقینی معلوم ہے اس لئے) اس کو (وقوع سے) قریب دیکھ رہے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ کافر اگر ازراہ انکار وتمسخر عذاب کے لیے جلدی مچائیں، تب بھی آپ جلدی نہ کریں بلکہ صبر واستقلال سے رہیں، نہ تنگدل ہوں، نہ حرف شکایت زبان پر آئے، آپ کا صبر اور ان کا تمسخر ضرور رنگ لائے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان کے خیال میں قیامت کا آنا بعید از مکان اور دور از عقل ہے، اور ہم کو اس قدر قریب نظر آرہی ہے گویا آئی رکھی ہے۔

يَوۡمَ تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ ۝٨ وَتَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ ۝٩

جس دن ہوگا آسمان جیسے تانبا پگھلا ہوا ۱؎ اور ہوں گے پہاڑ جیسے اون رنگی ہوئی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور وہ عذاب اس روز واقع ہوگا) جس دن (کہ) آسمان (رنگ میں) تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوجائے گا (غرض آسمان سیاہ ہوجائے گا اور پھٹ بھی جائے گا) اور پہاڑ رنگین اون کی طرح (جو کہ دھنکی ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: **كالعهن المنفوش**) ہو جائیں گے (یعنی اڑتے پھریں گے اور رنگین سے تشبیہ اس لئے دی گی کہ پہاڑ بھی مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں: جیسا کہ ارشاد ہے: **ومن الجبال جدد بيض حمر مختلف الوانها وغرابيب سود**)۔

تَكُوۡنُ السَّمَآءُ كَالۡمُهۡلِ: ایک اور آیت میں **وردة كالدهان** آیا ہے جس کی تفسیر ادیم احمر یعنی سرخ چمڑے سے کی گئی ہے تو دونوں اس طرح جمع ہوسکتے ہیں کہ سرخی کی شدت سے بھی سیاہی کے مشابہ رنگ پیدا ہوجاتا ہے پس سرخ اور سیاہ دونوں کہنا صحیح ہے، یا اول ایک رنگ ہو پھر دوسرا بدل جائے جیسا کہ ابن کثیرؒ نے سورہ رحمن کی تفسیر میں حسن سے نقل کیا ہے، اور اگر اس کی تفسیر بھی بقول بعض دردی زیت یعنی زیتون کے تیل کی تلچھٹ سے کی جائے، تو دونوں کا مفہوم متحد ہوجائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ بعض نے ''مہل'' کا ترجمہ تیل کی تلچھٹ سے کیا ہے۔

فائدہ: ۲؎ اون مختلف رنگ کی ہوتی ہے اور پہاڑوں کی رنگتیں بھی مختلف ہیں، کما قال تعالیٰ: وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ وَّحُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَغَرَابِيۡبُ سُوۡدٌ (فاطر: ۲۷) دوسری جگہ فرمایا: كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ (القارعۃ) یعنی پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی طرح اڑتے پھریں گے۔

وَلَا يَسۡـَٔلُ حَمِيۡمٌ حَمِيۡمًا ۝١٠ يُّبَصَّرُوۡنَهُمۡ ؕ يَوَدُّ الۡمُجۡرِمُ لَوۡ يَفۡتَدِىۡ مِنۡ عَذَابِ يَوۡمِئِذٍۢ بِبَنِيۡهِ ۝١١

اور نہ پوچھے گا دوستدار دوست دار کو، سب نظر آجائیں گے انکو ۱؎ چاہے گا گناہگار کسی طرح چھڑوائی میں دے کر اس دن کے عذاب سے اپنے بیٹے کو

وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيۡهِ ۝١٢ وَفَصِيۡلَتِهِ الَّتِىۡ تُـئْوِيۡهِ ۝١٣ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ۙ ثُمَّ يُنۡجِيۡهِ ۝١٤

اور اپنی ساتھ والی کو اور اپنے بھائی کو، اور اپنے گھرانے کو جس میں رہتا تھا، اور جتنے زمین پر ہیں سب کو، پھر اپنے آپ کو بچالے

كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝

ہرگز نہیں ۲ وہ تپتی ہوئی آگ ہے، کھینچ لینے والی کلیجہ ۳ پکارتی ہے اس کو جس نے پیٹھ پھیر لی اور پھر کر چلا گیا، اور جوڑا اور سینت کر رکھا ۴

خلاصہ تفسیر: اور (اس روز) کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا (ایک اور جگہ ارشاد ہے: لایتساءلون) باوجودیکہ ایک دوسرے کو دکھا بھی دیئے جائیں گے (یعنی ایک دوسرے کو دیکھیں گے مگر کوئی کسی کی ہمدردی نہ کرے گا، اس روز) مجرم (یعنی کافر) اس بات کی تمنا کرے گا کہ اس روز کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹوں کو، اور بیوی کو اور بھائی کو، اور کنبہ کو جن میں وہ رہتا تھا، اور تمام اہل زمین کو اپنے فدیہ میں دے دے پھر یہ (فدیہ میں دے دینا) اس کو (عذاب سے) بچالے (یعنی اس روز ایسی نفسانفسی ہوگی کہ ہر شخص کو اپنی فکر پڑ جائے گی اور کل تک جن پر جان دیتا تھا آج ان کو اپنے فائدے کے لئے عذاب کے سپرد کردینے کو تیار ہوگا اگر اس کے قابو کی بات ہو لیکن) یہ ہرگز نہ ہوگا (یعنی عذاب سے مطلق نجات نہ ہوگی، بلکہ) وہ آگ ایسی شعلہ زن ہے جو کھال (تک) اتار دے گی (اور) وہ اس شخص کو (خود) بلائے گی جس نے (دنیا میں حق سے) پیٹھ پھیری ہوگی اور (طاعت سے) بے رخی کی ہوگی اور (دوسروں کا حق مار مار کر یا حرص کی غرض سے مال) جمع کیا ہوگا پھر اس کو اٹھا اٹھا رکھا ہوگا (مطلب یہ کہ حقوق اللہ وحقوق العباد ضائع کئے ہوں گے، یا اشارہ ہے عقائد اور اخلاق کے خراب ہونے کی طرف، خلاصہ یہ کہ ایسی صفات جہنم میں لے جانے والی ہیں، اور اس کافر میں یہ صفات پائی جاتی تھیں پھر عذاب سے نجات کیونکر ہوسکتی ہے!)۔

وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا يُّبَصَّرُوْنَهُمْ: سورہ صافات میں جو جہنمیوں کے باہم سوال وجواب اور گفتگو کرنے کا ذکر ہے تو وہ ان میں باہمی اختلاف کے طور پر ہوگا، ہمدردی کے طور پر نہیں، اس لئے وہ اس آیت کے منافی نہیں۔

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى: جہنم کا بلانا حقیقی معنی پر محمول ہوسکتا ہے۔

وَجَمَعَ فَاَوْعٰى: یعنی مال جمع کیا پھر اس کو اٹھا رکھا، اس پر شبہ ہوتا ہے کہ کفار تو فروعی احکام کے مکلف نہیں تو پھر اس وجہ سے ان پر عذاب کیوں ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ اس سے کفار کا فروعی احکام کا مکلف ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ کفار کو صرف ان رذائل اور بری عادتوں کی وجہ سے نفس عذاب نہ ہوگا، بلکہ ان بری عادتوں کی وجہ سے ان پر عذاب مزید سخت کردیا جائے گا، نفس عذاب تو ان پر کفر کی وجہ سے ہوگا، بخلاف گناہ گار مؤمنین کے کہ ان کو گناہوں پر نفس عذاب بھی ہوسکتا ہے، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''سب نظر آجائیں گے، یعنی دوستی ان کو نکمی تھی''، ایک دوسرے کا حال دیکھے گا مگر کچھ مدد و حمایت نہ کرسکے گا، ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔

فائدہ: ۲ یعنی چاہے گا کہ بس چلے تو سارے کنبہ بلکہ ساری دنیا کو فدیہ میں دے کر اپنی جان بچالے، مگر یہ ممکن نہ ہوگا۔

فائدہ: ۳ یعنی وہ آگ مجرم کو کہاں چھوڑتی ہے، وہ تو کھال اتار کر اندر سے کلیجہ نکال لیتی ہے۔

فائدہ: ۴ یعنی دوزخ کی طرف سے ایک کشش اور پکار ہوگی، بس جتنے لوگ دنیا میں حق کی طرف سے پیٹھ پھیر کر چل دیے تھے اور عمل صالح کی طرف سے اعراض کرتے اور مال سمیٹنے اور سینت کر رکھنے میں مشغول رہے تھے وہ سب دوزخ کی طرف کھنچے چلے آئیں گے، بعض آثار میں ہے کہ دوزخ اول زبان قال سے پکارے گی: ''اِلَیَّ یا کافر! اِلَیَّ یا منافق! اِلَیَّ یا جامع المال!'' (یعنی او کافر! او منافق! او مال سمیٹ کر رکھنے والے! ادھر آ) لوگ ادھر ادھر بھاگیں گے، اس کے بعد ایک بہت لمبی گردن نکلے گی جو کفار کو چن چن کر اس طرح اٹھالے گی جیسے جانور زمین سے دانہ اٹھا لیتا ہے (العیاذ باللہ)۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾

بیشک آدمی بنا ہے جی کا کچا، جب پہنچے اس کو برائی تو بے صبرا، اور جب پہنچے اس کو بھلائی تو بے توفیقا ؎۱

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

مگر وہ نمازی، جو اپنی نماز پر قائم ہیں ؎۲

خلاصہ تفسیر: (اب آگے دوسرے برے افعال کا ذکر ہے جو عذاب کا سبب ہوتے ہیں اور اہل ایمان کو ان سے مستثنیٰ کر کے پھر آگے ان کا ثواب بتلاتے ہیں) انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے (آئندہ کے استثنا کو ملانے کے بعد اس جگہ انسان سے کافر مراد ہے، یہاں طبعی کم ہمتی مراد نہیں ہے، بلکہ کم ہمتی پر جو برے آثار اس کے اپنے اختیار سے مرتب ہوتے ہیں وہ مراد ہیں جن کو آگے بیان فرماتے ہیں، یعنی:) جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو (جائز حد سے زیادہ) جزع فزع کرنے لگتا ہے، اور جب اس کو فارغ البالی ہوتی ہے تو (ضروری حقوق سے) بخل کرنے لگتا ہے (ظاہر ہے کہ یہ دونوں آثار کسی قدر کم ہمتی کی وجہ سے انسان کے اپنے اختیار سے پیدا ہوتے ہیں، یہ عذاب کے بقیہ اسباب کا بیان ہو گیا جو پیچھے آیت: **تدعوا من ادبر** سے شروع ہوئے تھے) مگر وہ نمازی (یعنی مومن ان عذاب کے اسباب سے مستثنیٰ ہیں) جو اپنی نماز پر برابر توجہ رکھتے ہیں (یعنی نماز میں ظاہری یا باطنی طور پر دوسری طرف توجہ نہیں کرتے، جس کو آیت: **قد افلح المومنون** میں **خاشعون** سے تعبیر فرمایا ہے)۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا: پیدا ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پیدائش کے وقت سے ہی انسان ایسا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت پر پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنے وقت پر پہنچ کر یعنی بلوغت کے بعد ان بری صفات کا عادی ہو کر کم ہمت ہو جاتا ہے، اور چونکہ اس کم ہمتی میں اس کے اختیار کا بھی دخل ہے اس لیے اس پر مواخذہ ہو گا، چنانچہ یہاں طبعی کم ہمتی مراد نہیں ہے، بلکہ کم ہمتی پر جو برے آثار اس کے اپنے اختیار سے مرتب ہوتے ہیں وہ مراد ہیں۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اس کو پیدا ہی اس حال میں کیا ہے اور یہ عیب اس کی تخلیق میں رکھے ہیں تو پھر اس کا کیا قصور ہوا؟ وہ مجرم کیوں قرار دیا گیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ مراد اس سے انسانی فطرت اور جبلت میں رکھی ہوئی استعداد اور مادہ ہے، سو اس میں حق تعالیٰ نے ہر خیر و صلاح کا مادہ اور استعداد بھی رکھی ہے اور شر و فساد کی بھی، اور اس کو عقل و ہوش بھی عطا فرمایا اور اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعہ ہر ایک کام کا انجام بھی بتلا دیا تو اپنے اختیار سے مادہ شر و فساد کی پرورش کی اپنے اختیاری اعمال کو اس رخ پر ڈال دیا تو وہ مجرم ان اختیاری اعمال کی وجہ سے قرار پایا جو مادہ اس کی پیدائش میں ودیعت رکھا گیا تھا اس کی وجہ سے اس کو مجرم نہیں قرار دیا گیا جیسا کہ آگے "ہلوع" کے معنی کی تشریح خود قرآن کریم نے کی ہے ان میں صرف اختیاری افعال کا ذکر فرمایا ہے۔

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ: یہاں پہلے کافر انسان کی تین بری عادتیں یا اوصاف بیان کیے گئے: ① کم ہمت ہونا ② جزع فزع کرنا ③ بخل اور کنجوسی کرنا، اس کے بعد مؤمن نمازیوں کو ان بری عادتوں سے مستثنیٰ کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر انسان کی پست اخلاقی اور بری عادتوں سے مسلمان نمازیوں کا علیحدہ ہونا یعنی مؤمنین کا بد ہمت، بزدل اور کنجوس نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ طاعات کا دل کی تقویت اور سختیوں کو برداشت کرنے میں بڑا دخل اور اثر ہوتا ہے، اور اس کا بخوبی مشاہدہ بھی کیا جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ؎۱ یعنی کسی طرف پختگی اور ہمت نہیں دکھلاتا، فقر فاقہ، بیماری اور سختی آئے تو بے صبر ہو کر گھبرا اٹھے، بلکہ مایوس ہو جائے گویا اب کوئی سبیل مصیبت سے نکلنے کی باقی نہیں رہی اور مال و دولت تندرستی اور فراخی ملے تو نیکی کے لیے ہاتھ نہ اٹھے، اور مالک کے راستہ میں خرچ کرنے کی توفیق نہ ہو، ہاں وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

فائدہ: ؎۲ یعنی گنڈے دار نہیں بلکہ مداومت و التزام سے نماز پڑھتے ہیں اور نماز کی حالت میں نہایت سکون کے ساتھ برابر اپنی نماز ہی

کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ

اور جن کے مال میں حصہ مقرر ہے ، مانگنے والے اور ہارے ہوئے کا ۱؎ اور جو یقین کرتے ہیں انصاف کے دن پر ۲؎

الدِّیْنِ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾

اور جو لوگ کہ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں ۳؎ بیشک ان کے رب کے عذاب سے کسی کو نڈر نہ ہونا چاہیے ۴؎

خلاصہ تفسیر: اور جن کے مالوں میں سوالی اور بے سوالی سب کا حق ہے (اس کے متعلق سورۃ ذاریات آیت ۱۹ میں گزر چکا ہے) اور جو قیامت کے دن کا اعتقاد رکھتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں (اور) واقعی ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں (یہ جملہ معترضہ کے طور پر ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ سورۃ المومنون میں اس کی تفسیر گزر چکی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس یقین کی بناء پر اچھے کام کرتے ہیں جو اس دن کام آئیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اس سے ڈر کر برائیوں کو چھوڑتے ہیں۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اللہ کا عذاب ایسی چیز نہیں کہ بندہ اس کی طرف سے مامون اور بےفکر ہو کر بیٹھ رہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں ، مگر اپنی جوروؤں سے یا اپنے ہاتھ کے مال سے سو ان پر

غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾

نہیں کچھ الاہنا، پھر جو کوئی ڈھونڈے اس کے سوا سو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور جو اپنی شرمگاہوں کو (حرام سے) محفوظ رکھنے والے ہیں لیکن اپنی بیبیوں سے یا اپنی (شرعی) لونڈیوں سے (حفاظت نہیں کرتے) کیونکہ ان پر (اس میں) کوئی الزام نہیں ہاں جو اس کے علاوہ (شہوت رانی کی اور جگہ کا) طلب گار ہو ایسے لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بیوی اور باندی کے سوا جو اور کوئی جگہ قضائے شہوت کے لیے ڈھونڈے وہ حد اعتدال اور حد جواز سے باہر قدم نکالتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور جو لوگ کہ اپنی امانتوں اور اپنے قول کو نباہتے ہیں ۱؎ اور جو اپنی گواہیوں پر سیدھے ہیں ۲؎

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ع

اور جو اپنی نماز سے خبردار ہیں ۳؎ وہی لوگ ہیں باغوں میں عزت سے ۴؎

خلاصہ تفسیر: اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں (ان میں کمی بیشی نہیں کرتے) اور جو اپنی (فرض) نماز کی پابندی کرتے ہیں (پس) ایسے لوگ بہشتوں میں عزت سے داخل ہوں گے (ان تمام آیات کی تفسیر سورۃ مؤمنون میں دیکھ لی جائے)۔

* * *

فائدہ: ۱ اس میں اللہ کے اور بندوں کے سب حقوق آ گئے، کیونکہ آدمی کے پاس جس قدر قوتیں ہیں سب اللہ کی امانت ہیں، ان کو اسی کی بتلائے ہوئے مواقع میں خرچ کرنا چاہیے اور جو قول و قرار ازل میں باندھ چکا ہے اس سے پھرنا نہیں چاہیے۔

فائدہ: ۲ یعنی ضرورت پڑے تو بلا کم و کاست اور بے رو رعایت گواہی دیتے ہیں، حق پوشی نہیں کرتے۔

فائدہ: ۳ یعنی نمازوں کے اوقات اور شروط و آداب کی خبر رکھتے ہیں اور اس کی صورت و حقیقت کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں۔

فائدہ: ۴ جنتیوں کی یہ آٹھ صفتیں ہوئیں جن کو نماز سے شروع ہی پر ختم کیا گیا ہے، تاکہ معلوم ہو کہ نماز اللہ کے ہاں کس قدر مہتم بالشان عبادت ہے جس میں یہ صفات ہوں گی وہ "ہلوع" (کچے دل کا) نہ ہوگا بلکہ عزم و ہمت والا ہوگا۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾

پھر کیا ہوا ہے منکروں کو تیری طرف دوڑتے ہوئے آتے ہیں، داہنے سے اور بائیں سے غول کے غول

اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾

کیا طمع رکھتا ہے ہر ایک شخص ان میں کہ داخل ہو جائے نعمت کے باغ میں، ہرگز نہیں ۱ ہم نے ان کو بنایا ہے جس سے وہ بھی جانتے ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: اب آگے کفار کی حالت کا عجیب ہونا اور قیامت کے واقع ہونے کا بعید نہ ہونا بیان فرماتے ہیں، یعنی: (سعادت اور بدبختی کے اسباب تو پیچھے واضح دلائل سے معلوم ہو چکے) تو (دلیل سے معلوم ہونے کے بعد پھر) کافروں کو کیا ہوا کہ (ان مضامین کو جھٹلانے کے لئے) آپ کی طرف کو داہنے اور بائیں سے جماعتیں بن بن کر دوڑے آ رہے ہیں (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ ان مضامین کی تصدیق کرتے، لیکن یہ لوگ متفق ہو ہو کر آپ کے پاس اس غرض سے آتے ہیں کہ ان مضامین کی تکذیب اور ان کے ساتھ استہزاء کریں جیسا کہ کفارِ عرب نبوت کی خبریں سن سن کر اسی غرض سے آتے تھے اور اسلام کو باطل سمجھنے کے ساتھ خود کو حق پر سمجھتے تھے اور حق ہونے کا ثمرہ جنت میں جانا ہے، اس بناء پر وہ خود کو مستحق جنت بھی سمجھتے تھے جیسا کہ ارشاد ہے: ولئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنیٰ، اس لئے اس کے متعلق بطور انکار فرماتے ہیں کہ) کیا ان میں ہر شخص اس کی ہوس رکھتا ہے کہ وہ آسائش کی جنت میں داخل کر لیا جائے گا؟ یہ ہرگز نہ ہوگا (کیونکہ عذاب کے اسباب ہوتے ہوئے جنت کیسے مل جائے گی، اور یہ لوگ ان مضامین کو جھٹلانے کے ساتھ نفس قیامت کو بھی جھٹلاتے اور اس کو محال سمجھتے تھے، آگے اسی کے متعلق ارشاد ہے کہ ان کا قیامت کو محال یا بعید سمجھنا محض بے وقوفی ہے، کیونکہ) ہم نے ان کو ایسی چیز سے پیدا کیا ہے جس کی ان کو بھی خبر ہے (پس جب ان کو معلوم ہے کہ نطفہ سے آدمی کو بنایا ہے اور ظاہر ہے کہ نطفہ سے کہ جس میں کبھی حیات نہیں آئی آدمی بننے تک جتنا بعد اور دوری ہے اتنا بعد اور دوری اجزاءِ میت سے دوسری بار آدمی بننے تک نہیں ہے، کیونکہ ان اجزاء میں ایک بار پہلے حیات آ چکی ہے اس کو محال سمجھنا ان کی بے وقوفی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قرآن کی تلاوت اور جنت کا ذکر سن کر کفار ہر طرف سے ٹولیاں بنا کر تیری طرف امڈے چلے آتے ہیں، پھر ہنسی اور ٹھٹھا کرتے ہیں، کیا اس کے باوجود یہ بھی طمع رکھتے ہیں کہ وہ سب جنت کے باغوں میں داخل کیے جائیں گے؟ جیسا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہم کو لوٹ کر

خدا کی طرف جانا ہواتو وہاں بھی ہمارے لیے بہتری ہی بہتری ہے، ہرگز نہیں! اُس خداوند عادل وحکیم کے ہاں ایسا اندھیر نہیں ہوسکتا۔

تنبیه: ابن کثیرؒ نے ان آیات کا مطلب یہ لیا ہے کہ تیری طرف کے ان منکروں کو کیا ہوا کہ تیزی کے ساتھ دوڑے چلے جاتے ہیں داہنے اور بائیں، غول کے غول، یعنی قرآن سن کر ایسے کیوں بدکتے اور بھاگتے ہیں، پھر کیا اس وحشت ونفرت کے باوجود یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ ان میں ہر شخص بے کھٹکے جنت میں جا گھسے گا؟ ہرگز نہیں، وھذا کما قال تعالیٰ: فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ (المدثر:51-50-49)۔

فائده: ۲ یعنی مٹی جیسی حقیر یا منی جیسی گھناؤنی چیز سے پیدا ہوا وہ کہاں لائق ہے بہشت کے، مگر ہاں جب ایمان کی بدولت پاک وصاف اور معظم ومکرم ہو، اور ممکن ہے: إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِمَّا يَعْلَمُونَ سے اشارہ ہو إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا کی طرف جو چند آیات پہلے اسی سورت میں آچکی ہیں، یعنی وہ پیدا تو ہوا ہے ان صفات پر اور: إِلَّا الْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ کے استثناء میں اپنے کو شامل نہ کیا، پھر بہشت کا مستحق کیسے ہو، اس تقدیر پر مِمَّا يَعْلَمُونَ کی ترکیب خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ کے قبیل سے ہوگی۔

فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ إِنَّا لَقَادِرُونَ ﴿٤٠﴾ عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ خَيْرًا مِنْهُمْ

سو میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی ۱ تحقیق ہم کر سکتے ہیں، کہ بدل کر لے آئیں ان سے بہتر

وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٤١﴾

اور ہمارے قابو سے نکل نہ جائیں گے ۲

خلاصه تفسیر: پھر (دوسرے طور پر قیامت کے واقع ہونے کو بعید یا محال سمجھنے کے لیے) میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی (اس کے معنی سورۃ صافات کے شروع میں گزرے ہیں، آگے جواب قسم ہے) کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ (دنیا ہی میں) ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں (یعنی پیدا کر دیں) اور ہم (اس سے) عاجز نہیں ہیں (پس جب نئی مخلوق اور وہ بھی ایسی کہ جس میں صفات کمال زیادہ ہوں جن میں حالت کے اعتبار سے زیادہ اشیاء پیدا کرنی پڑیں وہ ہم کو پیدا کرنا آسان ہے تو ہم کو دوبارہ پیدا کرنا کونسا مشکل ہے، پہلا استدلال خود ان منکرین کی حالت کے اعتبار سے ہے، اور دوسرا استدلال ان کے امثال ونظائر کی تخلیق کے ممکن ہونے کے اعتبار سے ہے)۔

* * *

فائده: ۱ آفتاب ہر روز ایک نئے نقطہ سے طلوع ہوتا اور نئے نقطہ پر غروب ہوتا ہے، ان کو ''مشارق'' و''مغارب'' کہا۔

فائده: ۲ یعنی جب ان کی جگہ ان سے بہتر لا سکتے ہو تو خود ان کو دوبارہ کیوں پیدا نہیں کر سکتے؟ کیا وہ ہمارے قابو سے نکل کر کہیں جا سکتے ہیں؟ یا خَيْرًا مِنْهُمْ سے مراد ان ہی کا دوبارہ پیدا کرنا ہو، کیونکہ عذاب ہو یا ثواب، دوسری زندگی اس زندگی سے بہر حال اکمل ہوگی، یا یہ مطلب ہو کہ ان کفار مکہ کو ہنسی ٹھٹھا کرنے دیجئے، ہم خدمت اسلام کے لیے اس سے بہتر قوم لے آئیں گے چنانچہ ''قریش'' کی جگہ اس نے ''انصار مدینہ'' کو کھڑا کر دیا اور مکہ والے پھر بھی اس کے قابو سے نکل کر کہیں نہ جا سکے، آخر اپنی شرارتوں کے مزے چکھنے پڑے۔

تنبیه: مشارق ومغارب کی قسم شاید اس لیے کھائی کہ خدا ہر روز مشرق ومغرب کو بدلتا رہتا ہے، اُس کو تمہارا تبدیل کرنا کیا مشکل ہے۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿٤٢﴾ يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ

سو چھوڑ دے ان کو کہ باتیں بنائیں اور کھیلا کریں یہاں تک کہ مل جائیں اپنے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ ہے ۱ جس دن نکل پڑیں گے

الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ

قبروں سے دوڑتے ہوئے جیسے کسی نشانی پر دوڑتے جاتے ہیں ۲؎ جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں چڑھی آتی ہوگی ان پر ذلت

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾ ع

یہ ہے وہ دن جس کا ان سے وعدہ تھا ۳؎

خلاصہ تفسیر: (جب دلائل سے حق واضح ہونے کے باوجود یہ لوگ اپنے انکار وعناد سے باز نہیں آتے) تو آپ ان کو اسی شغل اور تفریح میں رہنے دیجئے، یہاں تک کہ ان کو اپنے اس دن سے سابقہ واقع ہو جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے جس دن یہ قبروں سے نکل کر اس طرح دوڑیں گے جیسے کسی پرستش گاہ کی طرف دوڑے جاتے ہیں (اور) ان کی آنکھیں (شرمندگی کے مارے) نیچے کو جھکی ہوں گی (اور) ان پر ذلت چھائی ہوگی (بس) یہ ہے ان کا وہ دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا (جو کہ اب واقع ہو گیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تھوڑے دن کی ڈھیل ہے، پھر سزا ہونی یقینی ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کسی خاص نشان اور علامت کی طرف جیسے تیزی سے دوڑتے ہیں اور ایک دوسرے سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرتا ہے، یا ''نصب'' سے بت مراد ہوں جو کعبہ کے گرد کھڑے کیے ہوئے تھے، ان کی طرف بھی بہت عقیدت اور شوق کے ساتھ لپکتے ہوئے جاتے تھے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی قیامت کا دن۔

ایاتها ۲۸ — ۷۱ سُوْرَةُ نُوْحٍ مَّكِّيَّةٌ ۷۱ — رکوعاتها ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں عذاب کے اسباب کا بیان تھا، ان میں سے ایک رسول کا جھٹلانا ہے، اس سورت میں نوح علیہ السلام کے قصہ کے ضمن میں اسی کا بیان ہے، اور نیز اخروی عذاب کے ساتھ جس کا ذکر گذشتہ سورت میں ہوا ہے، اس سورت میں کفر کی وجہ سے دنیوی عذاب کا مستحق ہونا بھی ثابت کیا ہے، نیز اس سورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی بھی کی گئی ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی رسول کو جھٹلایا تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱﴾

ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے ان پر عذاب دردناک ۱؎

خلاصہ تفسیر: ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کے پاس (پیغمبر بنا کر) بھیجا تھا کہ تم اپنی قوم کو (وبال کفر سے) ڈراؤ قبل اس کے کہ ان پر دردناک عذاب آئے (یعنی ان سے کہو کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر دردناک عذاب آئے گا، خواہ دنیوی یعنی طوفان، یا اخروی یعنی دوزخ)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس سے پہلے کہ کفر وشرارت کی بدولت دنیا میں طوفان کے اور آخرت میں دوزخ کے عذاب کا سامنا ہو۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۳﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ

بولا اے قوم میری تم کو ڈر سناتا ہوں کھول کر، کہ بندگی کرو اللہ کی اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ۱؎ تاکہ بخشے وہ تم کو کچھ

ذُنُوۡبِكُمۡ وَيُؤَخِّرۡكُمۡ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ④

گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک مقرر وعدہ تک ۲؎ وہ جو وعدہ کیا ہے اللہ نے جب آ پہنچے گا اس کو ڈھیل نہ ہوگی ۳؎ اگر تم کو سمجھ ہے ۴؎

خلاصہ تفسیر: (غرض) انہوں نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اے میری قوم! میں تمہارے لئے صاف صاف ڈرانے والا ہوں (اور کہتا ہوں) کہ تم اللہ کی عبادت (یعنی توحید اختیار) کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو، وہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا، اور تم کو وقت مقرر (یعنی موت کے وقت) تک (بلا عذاب) مہلت دے گا (یعنی ایمان نہ لانے پر جس عذاب کا مرنے سے پہلے وعدہ کیا جاتا ہے اگر ایمان لے آئے تو وہ عذاب نہ آئے گا اور باقی موت کے لئے جو) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت (ہے) جب (وہ) آ جائے گا تو ٹلے گا نہیں (یعنی موت تو آنا ہر حال میں ضروری ہے ایمان میں بھی اور کفر میں بھی، لیکن دونوں حالتوں میں اتنا فرق ہے کہ کفر کی صورت میں آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی عذاب ہوگا، اور ایمان کی صورت میں دنیا و آخرت دونوں کے عذاب سے محفوظ رہو گے) کیا خوب ہوتا اگر تم (ان باتوں کو) سمجھتے۔

مِنۡ ذُنُوۡبِكُمۡ سے متعلق ایک تحقیق سورۃ احقاف آیت ۳۱: يٰقَوۡمَنَاۤ اَجِيۡبُوۡا دَاعِىَ اللّٰهِ میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

وَيُؤَخِّرۡكُمۡ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى: دنیاوی عذاب نہ ہونے کو بطور خاص ذکر کیا، اس میں یہ نکتہ ہے کہ ایمان لانے کی صورت میں آخرت کے عذاب سے تو محفوظ رہتا ہی ہے، مگر بعض اوقات ایمان کے باوجود بھی دنیاوی کلفتیں آزمائشیں پیش آ جاتی ہیں، پس اس کی نفی سے ایمان لانے پر مزید فضل کا وعدہ ہو گیا۔

اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ: یعنی اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آ جائے گا تو ٹلے گا نہیں، یہ بات تو ظاہر ہی ہے لیکن اس کے باوجود اس پر متنبہ کرنے سے یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ موت کے اشتراک سے ایمان اور کفر دونوں کے ثمرات ایک جیسے ہونے کا شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ موت تو ہر حال میں آنا ضروری ہے، ایمان لانے کی وجہ سے موت نہیں ٹل سکتی، البتہ عذاب نہ آنا یہ یقیناً ایمان کا ثمرہ و برکت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ سے ڈر کر کفر و معصیت چھوڑو اور طاعت و عبادت کا راستہ اختیار کرو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ایمان لے آؤ گے تو اس سے پہلے اللہ کے جو حقوق تلف کیے ہیں وہ معاف کر دے گا، اور کفر و شرارت پر جو عذاب آنا مقدر ہے ایمان لانے کی صورت میں وہ نہ آئے گا، بلکہ ڈھیل دی جائے گی کہ عمر طبعی تک زندہ رہو حتی کہ جانداروں کی موت و حیات کے عام قانون کے موافق اپنے مقرر وقت پر موت آئے، کیونکہ اس سے تو بہر حال کسی نیک و بد کو چارہ نہیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ایمان نہ لانے کی صورت میں عذاب کا جو وعدہ ہے اگر وہ سر پر آ کھڑا ہوا تو کسی کے ٹالے نہیں ٹلے گا، نہ ایک منٹ کی ڈھیل دی جائے گی، یا یہ مطلب ہو کہ موت کا وقت معین پر آنا ضروری ہے اس میں تاخیر نہیں ہو سکتی والظاہر ھو الاول، حضرت شاہ صاحبؒ ان آیات کی تقریر ایک اور طرح کرتے ہیں: ''یعنی بندگی کرو کہ نوع انسان دنیا میں قیامت تک رہے، اور قیامت کو تو دیر نہ لگے گی اور جو سب مل کر بندگی چھوڑ دو تو سارے ابھی ہلاک ہو جاؤ''، طوفان آیا تھا ایسا ہی کہ ایک آدمی نہ بچے، حضرت نوح کی بندگی سے ان کا بچاؤ ہو گیا۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اگر تم کو سمجھ ہے تو یہ باتیں سمجھنے اور عمل کرنے کی ہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّىۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِىۡ لَيۡلًا وَّنَهَارًا ۙ⑤ فَلَمۡ يَزِدۡهُمۡ دُعَآءِىۡۤ اِلَّا فِرَارًا ⑥

بولا اے رب! میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن، پھر میرے بلانے سے اور زیادہ بھاگنے لگے ۱؎

خلاصہ تفسیر: (جب طویل مدت تک ان نصائح کا قوم پر کچھ اثر نہ ہوا تو) نوح (علیہ السلام) نے (حق تعالیٰ سے) دعا (اور

التجا) کی کہ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات کو بھی اور دن کو بھی (دین حق کی طرف) بلایا، سو میرے بلانے پر (دین سے) اور زیادہ بھاگتے رہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی نوح علیہ السلام ساڑھے نوسو برس تک ان کو سمجھاتے رہے، جب امید کی کوئی جھلک باقی نہ رہی تو مایوس اور تنگ دل ہو کر بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ بارخدایا! میں نے اپنی طرف سے دعوت وتبلیغ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، رات کی تاریکی میں اور دن کے اجالے میں برابر ان کو تیری طرف بلاتا رہا، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں تیرے طرف آنے کو کہا گیا یہ بدبخت اور زیادہ ادھر سے منہ پھیر کر بھاگے اور جس قدر میری طرف سے شفقت ودل سوزی کا اظہار ہوا، ان کی جانب سے نفرت اور بیزاری بڑھتی گئی۔

وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ

اور میں نے جب کبھی ان کو بلایا تاکہ تو ان کو بخشے ڈالنے لگے انگلیاں اپنے کانوں میں لے اور لپیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑا ٢

وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝٧

اور ضد کی اور غرور کیا بڑا غرور

خلاصہ تفسیر: اور (وہ بھاگنا یہ ہوا کہ) میں نے جب کبھی ان کو (دین حق کی طرف) بلایا تاکہ (ان کے ایمان کے سبب) آپ ان کو بخش دیں تو ان لوگوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیں (تاکہ حق بات سنیں بھی نہیں اور یہ نفرت کی انتہا ہے) اور (نیز انتہائی بغض سے انہوں نے) اپنے کپڑے (اپنے اوپر) لپیٹ لئے (تاکہ حق بات کہنے والے کو دیکھیں بھی نہیں اور کہنے والا بھی ان کو نہ دیکھے) اور (انہوں نے اپنے کفر وانکار پر) اصرار کیا اور (میری اطاعت سے) غایت درجہ کا تکبر کیا۔

* * *

فائدہ: لے کیونکہ میری بات سننا ان کو گوارا نہیں، چاہتے ہیں کہ یہ آواز کان میں نہ پڑے۔

فائدہ: ٢ تاوہ میری اور میں ان کی صورت نہ دیکھوں، نیز انگلیاں اگر کسی وقت کانوں میں ڈھیلی پڑ جائیں تو کچھ کپڑوں کی روک رہے، غرض کوئی بات کسی عنوان سے دل میں اترنے نہ پائے، یعنی کسی طرح اپنے طریقہ سے ہٹنا نہیں چاہتے اور ان کا غرور اجازت نہیں دیتا کہ میری بات کی طرف ذرا بھی کان دھریں۔

ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝٨ ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝٩

پھر میں نے ان کو بلایا برملا لے پھر میں نے ان کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے ٢

خلاصہ تفسیر: (مگر ان کی بے زاری اور تکبر کے باوجود) پھر (بھی میں ان کو مختلف طریقوں سے نصیحت کرتا رہا چنانچہ) میں نے ان کو (دین حق کی طرف) با آواز بلند بلایا (مراد اس سے خطاب اور عام وعظ ہے جس میں عادۃ آواز بلند ہوتی ہے) پھر میں نے ان کو (خطاب خاص کے طور پر) علانیہ بھی سمجھایا اور ان کو بالکل خفیہ بھی سمجھایا (یعنی جتنے طریقے نفع کے ہو سکتے تھے سب ہی طرح سمجھایا)۔

نوح علیہ السلام نے ہر طریقے سے اپنی قوم والوں کو سمجھانے کی کوشش فرمائی، غرض اوقات میں بھی عموم کیا، یعنی دن رات ان کو دعوت دینے میں مصروف عمل رہے، جیسا کہ ارشاد ہوا: **لیلاً ونهاراً**، عمومی اور خصوصی ہر دو طریقے سے انہیں مخاطب کیا اور کیفیات میں بھی یعنی اعلانیہ اور خفیہ ہر

طرح سے کوشش فرمائی، جیسا کہ ارشاد ہے: دعوتهم جهاراً اور وَاَسۡرَرۡتُ لَهُمۡ اِسۡرَارًا (الخ)۔

حضرت نوح علیہ السلام کا یہ خیر خواہانہ انداز ظاہر کرتا ہے کہ نبی اپنی امت کے لیے کیسا کچھ خیر خواہ و مشفق ہوا کرتا ہے، نادان اور جاہل کے ساتھ ایسے ہی شفقت وعنایت کا معاملہ کرنا چاہیے، یہاں ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ قرآن کریم کی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کی ہدایت، صلاح وفلاح کے لیے اس قدر درپے ہونا پیچھے لگنا مناسب نہیں کہ بس یہ ایک کام رہ جائے اور باقی کام معطل ہوجائیں، ایسے عمل کو ''تصدی'' کہا جاتا ہے جو شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں، بات یہ ہے کہ یہاں دو علیحدہ باتیں ہیں: ① دعوت وتبلیغ ② دعوت وتبلیغ کے نتائج وثمرات، سو دعوت وتبلیغ میں تو سراپا مشغول رہنا چاہیے، البتہ نتائج وثمرات کے درپے نہیں ہونا چاہیے، مذکورہ آیات میں نوح علیہ السلام کی جدوجہد دعوت وتبلیغ کی ہے، نتائج وثمرات سے متعلق نہیں، لہٰذا یہ وہ تصدی یعنی درپے ہونا نہیں جسے ناپسند کیا گیا۔

فائدہ: لے یعنی ان کے مجمعوں میں خطاب کیا اور مجلسوں میں جا کر سمجھایا۔

فائدہ: ۲ یعنی مجمع کے سوا اُن سے علیحدگی میں بات کی، صاف کھول کر اور اشاروں میں بھی، زور سے بھی اور آہستہ بھی، غرض نصیحت کا کوئی عنوان اور کوئی رنگ نہیں چھوڑا۔

فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝١٠ يُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا ۝١١

تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے، بیشک وہ ہے بخشنے والا لے چھوڑ دے گا آسمان کی تم پر دھاریں

وَّيُمۡدِدۡكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ جَنّٰتٍ وَّيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ اَنۡهٰرًا ۝١٢

اور بڑھادے گا تم کو مال اور بیٹوں سے اور بنادے گا تمہارے واسطے باغ اور بنادے گا تمہارے لیے نہریں ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اس سمجھانے میں) میں نے (ان سے یہ) کہا کہ تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ (یعنی ایمان لے آؤ تاکہ گناہ بخشے جائیں) بیشک وہ بخشنے والا ہے (اگر تم ایمان لے آؤ گے تو اخروی نعمت کے علاوہ جو) کہ (مغفرت ہے دنیوی نعمتیں بھی تم کو عطا کرے گا، چنانچہ) کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغ لگادے گا اور تمہارے لئے نہریں بہادے گا۔

وَّيُمۡدِدۡكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ: یہاں ان نعمتوں کے ذکر سے شاید یہ فائدہ ہو کہ اکثر طبیعتوں میں دنیاوی منافع یعنی نقد اور جلد حاصل ہونے والی چیزوں کی طلب زیادہ ہوتی ہے، چنانچہ درمنثور میں قتادہؒ کا قول ہے کہ وہ لوگ دنیا کے زیادہ حریص تھے اس لئے یہ فرمایا۔

اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بسا اوقات ایمان واستغفار کے باوجود یہ دنیاوی منافع ظاہر اور مرتب ہوتے نظر نہیں آتے؟ بات یہ ہے کہ یا تو یہ وعدہ خاص ان ہی لوگوں کے لیے ہوگا، اور اگر وعدہ عام بھی ہو تو قاعدہ ہے کہ وعدہ کی چیز سے بہتر اور افضل کوئی چیز مل جانا یہ بھی وعدہ پورا ہونا ہی ہے، بلکہ اس صورت میں وعدہ مزید اضافہ کے ساتھ پورا ہوگا، چنانچہ ایمان کامل اور استغفار پر روحانی مسرت، قناعت اور تقدیر پر رضامندی ضرور عطا ہوتی ہے، جو ان دنیاوی چیزوں سے بھی افضل واکمل ہے، بلکہ دنیاوی منافع سے بھی مقصود یہی کیفیات یعنی دل کا سکون وآرام حاصل کرنا ہی ہے۔

فائدہ: لے یعنی باوجود سینکڑوں برس سمجھانے کے اب بھی اگر میری بات مان کر اپنے مالک کی طرف جھکو گے اور اس سے اپنی خطائیں معاف کراؤ گے تو وہ بڑا بخشنے والا ہے، پچھلے سب قصور یک قلم معاف کر دے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی ایمان واستغفار کی برکت سے قحط وخشک سالی (جس میں وہ برسوں سے مبتلا تھے) دور ہوجائے گی، اللہ تعالیٰ دھواں دار برسنے والا بادل بھیج دے گا جس سے کھیت اور باغ خوب سیراب ہوں گے، غلے، پھل، میوہ کی افراط ہوگی، مواشی وغیرہ فربہ ہوجائیں گے، دودھ گھی بڑھ

جائے گا اور عورتیں جو کفر و معصیت کی شامت سے بانجھ ہو رہی ہیں اولاد کو جننے لگیں گی، غرض آخرت کے ساتھ دنیا کے عیش و بہار سے بھی وافر حصہ دیا جائے گا۔

تنبیہ: امام ابوحنیفہؒ نے اس آیت سے یہ نکالا ہے کہ استسقاء کی اصل حقیقت اور روح استغفار وانابت ہے، اور نماز اس کی کامل ترین صورت ہے، جو سنت صحیحہ سے ثابت ہوئی۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾

کیا ہوا ہے تم کو کیوں نہیں امید رکھتے اللہ سے بڑائی کی ۱؎ اور اس نے بنایا تم کو طرح طرح سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے نوح علیہ السلام کے کلام کا بقیہ حصہ ہے، یعنی میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ) تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو حالانکہ (اس کی عظمت کے اعتقاد کے تقاضے اور مطالبے موجود ہیں کہ) اس نے تم کو طرح طرح سے بنایا (کہ عناصر اربعہ یعنی پانی، آگ، ہوا اور مٹی سے تمہاری غذا، پھر غذا سے نطفہ، اور نطفہ کے بعد جما ہوا خون، پھر گوشت کی بوٹی وغیرہ کی مختلف صورتوں سے گزر کر مکمل انسان بنا، یہ دلیل تو خود انسان کی ذات سے متعلق تھی)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اللہ کی بڑائی سے امید رکھنا چاہیے کہ تم اس کی فرمانبرداری کرو گے تو تم کو بزرگی اور عزت و وقار عنایت فرمائے گا، یا یہ مطلب ہے کہ تم اللہ کی بڑائی کا اعتقاد کیوں نہیں رکھتے اور اس کی عظمت وجلال سے ڈرتے کیوں نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ماں کے پیٹ میں تم نے طرح طرح کے رنگ بدلے، اور اصلی مادہ سے لے کر موت تک آدمی کتنی پلٹیاں کھاتا ہے اور کتنے اطوار وادوار اور اتار وچڑھاؤ ہیں جن میں کو گزرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ

کیا تم نے نہیں دیکھا کیسے بنائے اللہ نے سات آسمان تہ پر تہ ۱؎ اور رکھا چاند کو ان میں اجالا اور رکھا

الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾

سورج کو چراغ جلتا ہوا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے انسان کی ذات سے متعلق دلیل تھی، اب آگے کائناتی اور آفاقی دلیل آفاقی فرماتے ہیں کہ:

کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے اور ان میں چاند کو نور (کی چیز) بنایا اور سورج کو (مثل) چراغ (روشن کے) بنایا۔

وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا: چاند اگرچہ تمام آسمانوں میں تو نہیں ہے مگر یہاں فیھن آسمانوں کے مجموعہ کے اعتبار سے فرمادیا، اور اس کے متعلق کچھ تحقیق سورۂ فرقان آیت ۶۱: وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایک کے اوپر ایک۔

فائدہ: ۲؎ سورج کا نور تیز اور گرم ہوتا ہے جس کے آتے ہی رات کی تاریکی کافور ہو جاتی ہے، شاید اس لیے اس کو جلتے چراغ سے تشبیہ دی، اور چاند کے نور کو اسی چراغ کی روشنی کا پھیلاؤ سمجھنا چاہیے جو جرم قمر کے توسط سے ٹھنڈی اور دھیمی ہو جاتی ہے، واللہ اعلم۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾

اور اللہ نے اگایا تم کو زمین سے جما کر ا؎ پھر مکرر ڈالے گا تم کو اس میں اور نکالے گا تم کو باہر ۲؎

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾ ع

اور اللہ نے بنا دیا تمہارے لیے زمین کو بچھونا، تا کہ چلو اس میں کشادہ راستے ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا (یا تو اس طرح کہ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے، اور یا اس طرح کہ انسان نطفہ سے بنا اور نطفہ غذا سے اور غذا عناصر سے بنی اور عناصر میں غالب اجزاء زمین کے ہیں) پھر تم کو (مرنے کے بعد) زمین ہی میں لے جائے گا اور (قیامت میں پھر اسی زمین سے) تم کو باہر لے آئے گا اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے زمین کو (مثل) فرش (کے) بنایا تا کہ تم اس کے کھلے رستوں میں چلو (کیونکہ زمین میں چلنا اس پر موقوف ہے کہ اس پر قدم جم سکیں، ورنہ بجائے چلنے کے دھنسا کرتے)۔

* * *

فائدہ: ا؎ یعنی زمین سے خوب اچھی طرح جماؤ کے ساتھ پیدا کیا، اول ہمارے باپ آدم مٹی سے پیدا ہوئے، پھر نطفہ جس سے بنی آدم پیدا ہوتے ہیں غذا کا خلاصہ ہے جو مٹی سے نکلتی ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی مرے پیچھے مٹی میں مل جاتے ہیں، پھر قیامت کے دن اسی سے نکالے جائیں گے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اس پر لیٹو، بیٹھو، چلو، پھرو ہر طرف کشادہ راستے نکال دیے ہیں، ایک شخص چاہے اور وسائل ہوں تو ساری زمین کے گرد گھوم سکتا ہے، راستہ کی کوئی رکاوٹ نہیں۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾

کہا نوح نے اے رب میرے انہوں نے میرا کہنا نہ مانا اور مانا ایسے کا جس کو اس کے مال اور اولاد سے اور زیادہ ہو ٹوٹا ا؎

وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾

اور داؤ کیا ہے بڑا داؤ ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے تمام وہ کلام گذرا جو نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا اور اس کی حکایت حق تعالیٰ سے فریاد کے طور پر کی، اور یہ سب حکایت عرض کر کے) نوح (علیہ السلام) نے (یہ) کہا کہ اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے میرا کہنا نہیں مانا اور ایسے شخصوں کی پیروی کی کہ جن کے مال اور اولاد نے ان کو نقصان ہی زیادہ پہنچایا (ان شخصوں سے مراد رؤسا و سردار ہیں جن کی عام لوگ اتباع کیا کرتے ہیں اور مال اور اولاد کا ان رؤسا کو نقصان پہنچانا اس طرح ہے کہ مال و اولاد سرکشی کا سبب بن گئے) اور (انہوں نے جن بڑوں اور سرداروں کی اتباع اور پیروی کی ہے وہ ایسے ہیں) جنہوں نے (حق کے مٹانے میں) بڑی بڑی تدبیریں کیں۔

* * *

فائدہ: ا؎ یعنی اپنے رئیسوں اور مالداروں کا کہا مانا جن کے مال و اولاد میں کچھ خوبی اور بہتری نہیں، بلکہ وہ ان پر ٹوٹا ہے، ان ہی کے سبب دین سے محروم رہے اور غایت تمرد وتجبر سے اوروں کو بھی محروم رکھا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی سب کو سمجھا دیا کہ اس کی بات نہ مانو اور طرح طرح کی ایذاء رسانی کے درپے رہے۔

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾

اور بولے ہرگز نہ چھوڑیو اپنے معبودوں کو ۱؎ اور نہ چھوڑیو ودّ کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق اور نسر کو ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور جنہوں نے (اپنی پیروی کرنے والے تابعین سے یہ) کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ (بالخصوص) ودکو اور سواع کو اور یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا (خاص طور پر ان بتوں کو اس لیے ذکر کیا کہ یہ بت زیادہ مشہور تھے)۔

وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا: بعض روایات میں مذکور ہے کہ قوم نوح کے یہ بت دراصل بزرگان دین تھے، ان کی وفات کے بعد شیطان کے بہکاوے میں انکی یادگار کے طور پر انکی تصویریں عام کیں، پھر رفتہ رفتہ انکا تقدس عام ہوا، آخر کار ایک زمانہ گذرنے کے بعد ان کی بت پرستی کی بھیانک صورت میں ظاہر ہوا، نیک اور صالح لوگوں کی تصویریں رکھنے کا یہ انجام ہوا اور یہ تصویر اس وقت جائز تھی، اس سے معلوم ہوا کہ صلحاء اور نیک لوگوں کے آثار و تبرکات رکھنے کا زیادہ اہتمام کرنا جبکہ اس میں دینی بگاڑ نہ ہوتا ہو تو یہ دینی امور کے منافی نہیں ہے، لیکن جب دینی بگاڑ اور فساد کا خوف ہو تو اس اہتمام کو چھوڑ دینا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اپنے معبودوں کی حمایت پر جمے رہنا، نوح کے بہکائے میں نہ آنا، کہتے ہیں کہ سینکڑوں برس تک ہر ایک اپنی اولاد اور اولاد دراولاد کو وصیت کر جاتا تھا کہ کوئی اس بڈھے نوح کے فریب میں نہ آئے اور اپنے آبائی دین سے قدم نہ ہٹائے۔

فائدہ: ۲؎ یہ ان کے بتوں کے نام ہیں، ہر مطلب کا ایک الگ بت بنا رکھا تھا، وہ ہی بت پھر عرب میں آئے اور ہندوستان میں بھی، اسی قسم کے بت بشنو، برہما، اندر، شیو اور ہنومان وغیرہ کے ناموں سے مشہور ہیں، اس کی مفصل تحقیق حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تفسیر عزیزی میں کی، بعض روایات میں ہے کہ پہلے زمانہ میں کچھ بزرگ لوگ تھے، ان کی وفات کے بعد شیطان کے اغواء سے قوم نے ان کی تصویریں بطور یادگار بنا کر کھڑی کرلیں، پھر ان کی تعظیم ہونے لگی، شدہ شدہ پرستش کرنے لگے (العیاذ باللہ)۔

وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿٢٤﴾

اور بہکا دیا بہتوں کو اور تو نہ زیادہ کرنا بے انصافوں کو مگر بھٹکنا

خلاصہ تفسیر: اور ان (رئیس سردار) لوگوں نے بہتوں کو (بہکا بہکا کر) گمراہ کر دیا (وہ مکر کبار یہی گمراہ کرنا ہے) اور (چونکہ مجھ کو آپ کے ارشاد: لن یومن من قومك الا من قد امن سے معلوم ہوگیا کہ یہ اب ایمان نہ لائیں گے اس لئے یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ) ان ظالموں کی گمراہی اور بڑھا دیجئے (تاکہ یہ لوگ ہلاکت کے مستحق ہو جائیں)۔

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا: یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کا فرض منصبی قوم کو ہدایت کرنے کا ہے، نوح علیہ السلام نے ان کی گمراہی کی بددعا کیسے کی؟ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس کی تو خبر دے دی تھی: لن یومن من قومك کہ اب ان میں کوئی مسلمان نہیں ہوگا اس لئے ان کا گمراہی اور کفر پر مرنا تو یقینی تھا حضرت نوح علیہ السلام نے ان کی گمراہیہ بڑھا دینے کی دعا اس لئے فرمائی کہ جلد ان کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور ہلاک کر دیئے جائیں، اس سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں گمراہی کی دعا کرنا مقصود نہیں، بلکہ ان کی جلدی ہلاکت کی بددعا مقصود ہے کہ گمراہی زیادہ ہونے سے جلدی ہلاکت کے مستحق ہو جائیں گے، کیونکہ اب ان کے باقی رہنے میں کچھ نفع نہیں، بلکہ نقصان کا اندیشہ ہے، اس جیسی دعا کی تحقیق سورۃ یونس آیت ۸۸: رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ میں موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں گزری ہے، وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

اپنے مخالفین کی گمراہی یا ہلاکت کی بددعا کرنا صرف صاحب وحی یعنی پیغمبر کے ساتھ خاص ہے، ان کے علاوہ دوسروں کو یہ حق نہیں کہ اپنے مخالفین کے لیے ایسی بددعا کریں جیسا کہ بعض نادان ولایت اور بزرگی کے دعوے داروں کی عادت ہے۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں: ''یعنی (بھٹکتے رہیں) کوئی تدبیر (سیدھی) بن نہ پڑے''، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں کہ: ''استدراج کے طور پر بھی ان کو اپنی معرفت سے آشنا نہ کر''، اور عامہ مفسرین نے ظاہری معنی لیے ہیں، یعنی اے اللہ! ان ظالموں کی گمراہی کو اور بڑھا دیجیے تا کہ جلد شقاوت کا پیمانہ لبریز ہو کر عذاب الٰہی کے مورد بنیں، مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ بددعا ان کی ہدایت سے بکلی مایوس ہو کر کی، خواہ مایوسی ہزار سالہ تجربہ کی بنا پر ہو یا حق تعالیٰ کا یہ ارشاد سن چکے ہوں گے: اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ہود: ۳۶) بہر حال ایسی مایوسی کی حالت میں تنگ دل اور غضبناک ہو کر یہ دعاء کرنا کچھ مستبعد نہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں کہ جب کسی شخص یا جماعت کے راہ راست پر آنے کی طرف سے قطعاً مایوسی ہو جائے اور نبی ان کی استعداد کو پوری طرح جانچ کر سمجھ لے کہ خیر کے نفوذ کی ان میں مطلق گنجائش نہیں، بلکہ ان کا وجود ایک عضو فاسد کی طرح ہے جو یقیناً باقی جسم کو بھی فاسد اور مسموم کر ڈالے گا تو اس وقت ان کے کاٹ ڈالنے اور صفحہ ہستی سے محو کر دینے کے سوا دوسرا کیا علاج ہے، اگر قتال کا حکم ہو تو قتال کے ذریعہ سے ان کو فنا کیا جائے، یا قوت توڑ کر ان کے اثر بد کو متعدی نہ ہونے دیا جائے، ورنہ آخری صورت یہ ہے کہ اللہ سے دعاء کی جائے کہ وہ ان کے وجود سے دنیا کو پاک کر دے اور ان کے زہریلے جراثیم سے دوسروں کو محفوظ رکھے کما قال: اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ بہر حال نوح کی دعاء اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی دعاء جو سورۃ یونس میں گزری، اسی قبیل سے تھی، واللہ اعلم۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾

کچھ وہ اپنے گناہوں سے دبائے گئے پھر ڈالے گئے آگ میں [1] پھر نہ پائے اپنے واسطے انہوں نے اللہ کے سوا کوئی مددگار [2]

خلاصہ تفسیر: (غرض ان لوگوں کا انجام یہ ہوا کہ) اپنے ان ہی گناہوں کے سبب وہ غرق کئے گئے پھر (برزخی یا اخروی غرق ہونے کے بعد) دوزخ میں داخل کئے گئے اور خدا کے سوا اُن کو کچھ حمایتی بھی میسر نہ ہوئے۔

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا یعنی یہ لوگ اپنی خطاؤں کفر و شرک کی وجہ سے پانی میں غرق کئے گئے تو یہ آگ میں داخل ہو گئے، یہ متضاد عذاب کہ ڈوبے پانی میں اور نکلے آگ میں، حق تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں جہنم کی آگ تو مراد نہیں، کیونکہ اس میں داخلہ تو قیامت کے حساب کتاب کے بعد ہوگا یہ برزخی آگ ہے جس میں داخل ہونے کی قرآن کریم نے خبر دی ہے۔

پیچھے نوح علیہ السلام کی دعا بیان ہوئی تھی، اگلی آیت میں بھی انہی کی دعا کا بیان ہے، یہاں دعاؤں کے درمیان ان کے غرق ہونے کا حال بیان فرمانا شاید اس لیے ہو کہ اس دعا کا جلدی قبول ہونا معلوم ہو جائے، یا ان خطاؤں کا عذاب کے لیے سبب ہو جانا معلوم ہو جائے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی طوفان آیا اور بظاہر پانی میں ڈبائے گئے، لیکن فی الحقیقت برزخ کی آگ میں پہنچ گئے۔

فائدہ: [2] یعنی وہ بت (ود، سواع، یغوث وغیرہ) اس آڑے وقت میں کچھ بھی مدد نہ کر سکے، یونہی کس مپرسی کی حالت میں مرکھپ گئے۔

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾

اور کہا نوح نے اے رب نہ چھوڑ یو زمین پر منکروں کا ایک گھر بسنے والا مقرر

اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

اگر تو چھوڑ دے گا ان کو بہکائیں گے تیرے بندوں کو اور جو جنیں گے سو ڈھیٹھ حق کا منکر [1]

خلاصہ تفسیر: اور نوح (علیہ السلام) نے (یہ بھی) کہا کہ اے میرے پروردگار! کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی

مت چھوڑ (بلکہ سب کو ہلاک کر دے، آگے اس دعا کی علت ہے کیونکہ) اگر آپ ان کو روئے زمین پر رہنے دیں گے تو (آپ کے ارشاد: لن یومن من قومك الا من قد امن کے مطابق الخ) یہ لوگ آپ کے بندوں کو گمراہ کریں گے اور (آگے بھی) ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی۔

عموم ہلاکت وعموم بعثت کی بحث سورۃ صافات آیت ۷۷: وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ کے تحت گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایک کافر کو زندہ نہ چھوڑیے، ان میں کوئی اس لائق نہیں کہ باقی رکھا جائے، جو کوئی رہے گا میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ اس کے نطفہ سے بھی بے حیا ڈھیٹ منکر حق اور ناشکرے پیدا ہوں اور جب تک ان میں سے کوئی موجود رہے گا خود تو راہ راست پر کیا آتا دوسرے ایمانداروں کو بھی گمراہ کرے گا۔

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط

اے رب معاف کر مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو آئے میرے گھر میں ایماندار اور سب ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو ۱؎

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾ ع

اور گناہ گاروں پر بڑھتا رکھ یہی برباد ہونا

خلاصہ تفسیر: (کافروں کے لئے بددعا کرنے کے بعد مؤمنین کے لئے دعا فرمائی کہ) اے میرے رب! مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو مومن ہونے کی حالت میں میرے گھر میں داخل ہیں ان کو (یعنی اہل وعیال بجز بیوی اور بیٹے کنعان کے) اور تمام مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بخش دیجئے اور (چونکہ اس مقام میں مقصود کافروں کے لئے بددعا ہے اور مومنین کے لئے دعا مقابلہ کی مناسبت سے ہوگئی تھی اس لئے پھر بددعا کے مضمون کی طرف رجوع ہے جس میں وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا کے مقصود کی تفسیر ہے یعنی) ان ظالموں کی ہلاکت اور بڑھا دیجئے (یعنی ان کی نجات کی کوئی صورت نہ رہے ہلاک ہی ہو جائیں اور یہی مقصود تھا پیچھے اس دعا سے کہ ان کی گمراہی بڑھا دی جائے)۔

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے والدین مومن تھے اور اگر اس کے خلاف ثابت ہو جائے تو والدین سے دور کے آباء وامہات مراد ہوں گے، اور ان دور والوں میں مؤمنین کا ہونا یقینی ہے۔

پہلے اپنے نفس کے لئے دعا کی، پھر اصول یعنی آباء وامہات کے لئے، پھر اہل وعیال کے لئے اور پھر عام تابعین کے لئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی میرے مرتبہ کے موافق مجھ سے جو تقصیر ہوئی ہو، اپنے فضل سے معاف کیجئے، اور میرے والدین اور جو میری کشتی یا میرے گھر یا میری مسجد میں مومن ہو کر آئے ان سب کی خطاؤں سے درگزر فرمایئے، بلکہ قیامت تک جس قدر مرد اور عورتیں مومن ہوں سب کی مغفرت کیجئے۔

الٰہ! نوح کی دعاء کی برکت سے اس بندہ عاصی وخاطی کو بھی اپنی رحمت وکرم سے مغفور کر کے بدون تعذیب دنیاوی واخروی اپنی رضاء وکرامت کے محل میں پہنچایئے، إنك سميع قريب مجيب الدعوات، آمین یا رب۔

اٰیاتھا ۲۸ ۷۲ سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ ٤٠ رکوعاتھا ۲

گذشتہ سورت میں نوح علیہ السلام کی قوم کے کفر اور عذاب کے قصہ سے اس وقت کے کافروں کو ایمان نہ لانے پر ڈرایا تھا، اور اس سورت میں جنات کے ایمان لانے اور توحید، رسالت اور قیامت کے متعلق تقریر کرنے کے قصہ سے ان کافروں کو توحید وایمان کی رغبت دلاتے ہیں کہ جنات جو آگ سے بنے ہوئے ہیں وہ تو باوجود تکبر وغیرہ کے ایمان لے آئے تو انسان جو مٹی سے بنا ہے یہ اپنی پستی اور عاجزی کے باوجود ایمان کیوں نہیں لاتا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ①

تو کہہ مجھ کو حکم آیا کہ سن گئے کتنے لوگ جنوں کے۱ پھر کہنے لگے ہم نے سنا ہے ایک قرآن عجیب

يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ②

کہ سجھاتا ہے نیک راہ سو ہم اس پر یقین لائے اور ہرگز نہ شریک بتلائیں گے ہم اپنے رب کا کسی کو۲

خلاصہ تفسیر: آیات کی تفسیر سے پہلے چند واقعات جاننے کے قابل ہیں جن کی ضرورت تفسیر میں پیش آئے گی:

① پہلا واقعہ بر سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے شیاطین آسمان تک پہنچ کر فرشتوں کی باتیں سنتے تھے، آپ کی بعثت کے بعد ان کو شہاب ثاقب کے ذریعہ اس سننے سے روک دیا گیا اور اسی حادثہ کی تحقیق کے ضمن میں یہ جنات آپ تک پہنچے جیسا کہ سورۃ احقاف میں گذرا۔

② دوسرا واقعہ بزمانہ جاہلیت میں عادت تھی کہ جب کسی جنگل یا وادی میں دوران سفر قیام کی نوبت آتی تو اس اعتقاد سے کہ جنات کے سردار ہماری حفاظت کریں گے یہ الفاظ کہا کرتے تھے: "اعوذ بعزیز ھذا الوادی من شر سفھاء قومه" یعنی میں اس جنگل کے سردار کی پناہ لیتا ہوں اس کی قوم کے بیوقوف شریر لوگوں سے۔

③ تیسرا واقعہ: مکہ مکرمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے قحط پڑا تھا اور کئی سال تک رہا۔

④ چوتھا واقعہ: جب آپ نے دعوت اسلام شروع کی تو کفار مخالفین کا آپ کے خلاف ہجوم اور نرغہ ہوا، پہلے دو واقعے تفسیر درمنثور سے اور آخری دو تفسیر ابن کثیر سے لئے گئے ہیں۔

آپ (ان لوگوں سے) کہئے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا پھر (اپنی قوم میں واپس جا کر) انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست بتلاتا ہے سو ہم تو اس پر ایمان لے آئے، اور ہم (اب) اپنے رب کے ساتھ کسی کو ہرگز شریک نہ بنائیں گے (یہ بیان ہے آمنا به کا)۔

قُرْاٰنًا عَجَبًا: "قرآن" ہونا تو اس کے مضمون سے معلوم ہوا، اور "عجیب" ہونا اس بات سے کہ یہ انسانی کلام کے مشابہ نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ جنوں کے وجود اور حقیقت پر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے سورۃ ہذا کی تفسیر میں نہایت مبسوط و مفصل بحث کی ہے۔ اور عربی میں "آکام المرجان فی احکام الجان" اس موضوع پر نہایت جامع کتاب ہے جس کو شوق ہو مطالعہ کرے، یہاں گنجائش نہیں کہ اس قسم کے مباحث درج کیے جائیں۔

فائدہ: ۲ سورۃ احقاف میں گزر چکا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں قرآن پڑھ رہے تھے، کئی جن ادھر کو گزرے اور قرآن کی آواز پر

فریفتہ ہوکر سچے دل سے ایمان لے آئے، پھر اپنی قوم سے جا کر سب ماجرا بیان کیا کہ ہم نے ایک کلام سنا ہے جو (اپنی فصاحت و بلاغت، حسن اسلوب، قوت تاثیر، شیریں بیانی، طرز موعظت اور علوم ومضامین کے اعتبار سے) عجیب وغریب ہے، معرفت ربانی اور رشد وفلاح کی طرف رہبری کرتا ہے اور طالب خیر کا ہاتھ پکڑ کر نیکی اور تقویٰ کی منزل پر پہنچا دیتا ہے، اس لیے ہم سنتے ہی بلا توقف اس پر یقین لائے اور ہم کو کچھ شک وشبہ نہیں رہا کہ ایسا کلام اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہوسکتا، اب ہم اس کی تعلیم وہدایت کے موافق عہد کرتے ہیں کہ آئندہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے، ان کے اس تمام بیان کی آخر تک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر وحی فرمائی، اس کے بعد بہت مرتبہ جن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر ملے، ایمان لائے اور قرآن سیکھا۔

وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ﴿۳﴾ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ﴿۴﴾

اور یہ کہ اونچی ہے شان ہمارے رب کی نہیں رکھی اس نے جورو نہ بیٹا ۱؎ اور یہ کہ ہم میں کا بیوقوف اللہ پر بڑھا کر باتیں کہا کرتا تھا ۲؎

خلاصہ تفسیر: جنوں نے ان مضامین کا بھی باہم تذکرہ کیا جو ذیل میں آتے ہیں اور وہ مضامین یہ ہیں کہ:

اور ہمارے پروردگار کی بڑی شان ہے اس نے نہ کسی کو بیوی بنایا اور نہ اولاد (کیونکہ ایسا ہونا عقلاً محال ہے، یہ بیان ہے لن نشرك كا) اور ہم میں جو احمق ہوئے ہیں وہ اللہ کی شان میں حد سے بڑھی ہوئی باتیں کہتے تھے (مراد اس سے شرکیہ کفریہ کلمات ہیں جیسے خدا کی بیوی اور اولاد ہونا وغیرہ ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جورو بیٹا رکھنا اس کی عظمت شان کے منافی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''جو گمراہیاں آدمیوں میں پھیلی ہوئی تھیں وہ جنوں میں بھی تھیں (عیسائیوں کی طرح) اللہ کے جورو بیٹا بتاتے تھے''۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہم جو بیوقوف ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی نسبت ایسی لغو باتیں اپنی طرف سے بڑھا کر کہتے تھے، اور ان میں سب سے بڑا بیوقوف ابلیس ہے شاید خاص وہی اس جگہ لفظ سفیہ سے مراد ہو۔

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۵﴾

اور یہ کہ ہم کو خیال تھا کہ ہرگز نہ بولیں گے آدمی اور جن اللہ پر جھوٹ

خلاصہ تفسیر: اور ہمارا (پہلے) یہ خیال تھا کہ انسان اور جنات کبھی خدا کی شان میں جھوٹ بات نہ کہیں گے (کیونکہ بڑی بے باکی کی بات ہے، اس میں اپنے مشرک ہونے کی وجہ بیان کی کہ چونکہ اکثر جن وانس شرک کرتے تھے، اس لیے ہم سمجھے کہ خدا کی شان میں اتنے لوگوں نے جھوٹ پر اتفاق نہ کیا ہوگا، بس ہم نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کرلیا، حالانکہ لوگوں کا نہ مطلق اتفاق کوئی حجت یا حقانیت کی دلیل ہے، اور نہ ہر اتفاق کی پیروی کوئی عذر ومجبوری ہے، یہ مذکورہ شرک تو مشترک اور عام شرک تھا)۔

* * *

فائدہ: یعنی ہم کو یہ خیال تھا کہ اس قدر کثیر التعداد جن اور آدمی مل کر جن میں بڑے بڑے عاقل اور دانا بھی ہیں اللہ تعالیٰ کی نسبت جھوٹی بات کہنے کی جرأت نہ کریں گے، یہی خیال کر کے ہم بھی بہک گئے، اب قرآن سن کر قلعی کھلی اور اپنے پیشرووں کی اندھی تقلید سے نجات ملی۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴿۶﴾

اور یہ کہ تھے کتنے مرد آدمیوں میں کے پناہ پکڑتے تھے کتنے مردوں کی جنوں میں کے پھر تو وہ اور زیادہ سر چڑھنے لگے

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیت میں عام شرک کا بیان تھا، ایک شرک خاص تھا بعض آدمیوں کے ساتھ جس سے جنات کا کفر اور

بڑھ گیا تھا وہ یہ کہ) اور بہت سے لوگ آدمیوں میں سے ایسے تھے کہ وہ جنات میں سے بعض لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے (جیسا کہ دوسرے واقعہ میں گذرا) سوان آدمیوں نے ان جنات کی بد دماغی اور بڑھادی (کہ وہ اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ ہم جنات کے سردار تو پہلے سے تھے، اب آدمی بھی ہم کو ایسا بڑا سمجھتے ہیں، بس اس سے بد دماغی بڑھی اور کفر وعناد پر اور زیادہ مصر ہو گئے)۔

بعض لوگ جو زبردستی صوفیاء میں شمار کیے جاتے ہیں وہ ایسے تعویذات اور عملیات میں مشغول ہیں کہ جن میں جنات وموکلات کی نداء یا ان سے پناہ حاصل کی جاتی ہے ایسے اعمال کا مذموم ہونا اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: عرب میں یہ جہالت بہت پھیلی ہوئی تھی، جنوں سے غیب کی خبریں پوچھتے، ان کے نام کی نذر و نیاز کرتے چڑھاوے چڑھاتے، اور جب کسی قافلہ کا گزر یا پڑاؤ کسی خوفناک وادی میں ہوتا تو کہتے کہ "اس حلقہ کے جنوں کا جو سردار ہے ہم اس کی پناہ میں آتے ہیں" تا کہ وہ اپنے ماتحت جنوں سے ہماری حفاظت کرے، ان باتوں سے جن اور زیادہ مغرور ہو گئے اور سر چڑھنے لگے، دوسری طرف اس طرح کی شرکیات سے آدمیوں کے عصیان وطغیان میں بھی اضافہ ہوا، جب انہوں نے خود اپنے اوپر جنوں کو مسلط کر لیا تو وہ ان کے اغوا میں کیا کمی کرتے، آخر قرآن نے آکر ان خرابیوں کی جڑ کاٹی۔

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝

اور یہ کہ ان کو بھی خیال تھا جیسا تم کو خیال تھا کہ ہرگز نہ اٹھائے گا اللہ کسی کو

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک توحید کے متعلق مضمون تھا، آگے بعثت یعنی قیامت کے متعلق ہے، یعنی ان جنات نے باہم یہ بھی تذکرہ کیا کہ) اور جیسا تم نے خیال کر رکھا تھا ویسا ہی آدمیوں نے بھی خیال کر رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو دوبارہ زندہ نہ کرے گا (مگر یہ مضمون بھی غلط ثابت ہوا، اور آخرت وقیامت کا حق ہونا معلوم ہوا)۔

* * *

فائدہ: مسلمان جن یہ سب گفتگو اپنی قوم سے کر رہے ہیں، یعنی جیسا تمہارا خیال ہے، بہت آدمیوں کا بھی یہی خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو ہرگز قبروں سے نہ اٹھائے گا، یا آئندہ کوئی پیغمبر مبعوث نہ کرے گا، جو رسول پہلے ہو چکے سو ہو چکے، اب قرآن سے معلوم ہوا کہ اس نے ایک عظیم الشان رسول بھیجا ہے جو لوگوں کو بتلاتا ہے کہ تم سب موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے اور رتی رتی کا حساب دینا ہوگا۔

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا

اور یہ کہ ہم نے ٹٹول دیکھا آسمان کو پھر پایا اس کو بھر رہے ہیں اس میں چوکیدار سخت اور انگارے، اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے

مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝

ٹھکانوں میں سننے کے واسطے پھر جو کوئی اب سننا چاہے وہ پائے اپنے واسطے ایک انگارا گھات میں لگا

خلاصہ تفسیر: اب آگے رسالت کے متعلق مضمون ہے، یعنی ان جنات نے ایک دوسرے سے یہ بھی تذکرہ کیا کہ:

اور ہم نے آسمان (کی خبروں) کی (اپنی سابقہ عادت کے مطابق) تلاشی لینا چاہا سو ہم نے اس کو سخت پہرہ (یعنی محافظ فرشتوں) اور شعلوں سے (کہ ان کے ذریعہ سے حفاظت کی جاتی ہے) بھرا ہوا پایا (یعنی اب پہرہ ہو گیا کہ کوئی جن آسمانی خبر نہ لے جانے پائے، اور جو جائے شہاب ثاقب سے مارا جائے) اور (اس سے قبل) ہم آسمان (کی خبر سننے) کے موقعوں میں (خبر) سننے کے لئے جا بیٹھا کرتے تھے (اور یہ مواقع خواہ آسمان کے اجزاء یعنی اس کے اندر ہی ہوں، یا خلاء، یا ملاء اور ہوا وغیرہ کے کرہ میں آسمان کے قریب ہوں، اور جنات اپنی لطافت کی وجہ سے اس پر ٹھہر

سکتے ہیں، جیسے بعض پرندے ہوا میں چلتے پھرتے ٹھہر جاتے ہیں) سو جو کوئی اب سننا چاہتا ہے تو اپنے لئے ایک تیار شعلہ پاتا ہے۔

یہ مضمون رسالت کے متعلق ہے، مطلب یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رسالت دی ہے اور شبہ یا التباس دور کرنے کے لئے کہانت کا دروازہ بند کر دیا ہے، تاکہ کوئی جن آسمان سے قرآن کی آیتوں کو سن کر کاہنوں تک نہ پہنچائے، پھر وہ قرآن کے مقابلہ میں اس کو پیش کر دیں اور اس دروازہ کا بند ہونا ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جنات کے پہنچنے کا سبب ہوا جیسا کہ پہلے واقعہ میں گذرا۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شہاب ثاقب جس کو عرف میں ستارہ ٹوٹنا یا عربی میں "انقضاص الکوکب" کہتے ہیں یہ تو دنیا میں قدیم زمانہ سے ہوتا آیا ہے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد نبوی کی تخصیص ہے، جواب یہ ہے کہ شہاب ثاقب کا وجود تو پہلے سے تھا خواہ اس کی حقیقت وہ ہو جو فلاسفہ بیان کرتے ہیں کہ زمین سے کچھ آتشیں مادے فضا میں پہنچتے ہیں وہ کسی وقت بھڑک اٹھتے ہیں، یا یہ ہو کہ خود کسی ستارہ اور سیارہ سے یہ آتشیں مادہ نکلتا ہو، بہر حال اس کا وجود اگرچہ ابتداء عالم سے ہے مگر اس آتشیں مادہ سے شیاطین کو دفع کرنے کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوا، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جتنے شہاب ثاقب نظر آتے ہیں سب سے ہی یہ کام لیا جاتا ہو، اس کی پوری تفصیل سورۃ حجر آیت ۱۷: وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہم اڑ کر آسمان کے قریب تک پہنچے تو دیکھا کہ آج کل بہت سخت جنگی پہرے لگے ہوئے ہیں جو کسی شیطان کو غیب کی خبر سننے نہیں دیتے، اور جو شیطان ایسا ارادہ کرتا ہے اس پر انگارے برستے ہیں، اس سے پیشتر اتنی سختی اور روک ٹوک نہ تھی جن اور شیاطین آسمان کے قریب گھات میں بیٹھ کر ادھر کی کچھ خبر سن کر آیا کرتے تھے، مگر اب اس قدر سخت ناکہ بندی اور انتظام ہے کہ جو سننے کا ارادہ کرے فوراً شہاب ثاقب کے آتشیں گولے سے اس کا تعاقب کیا جاتا ہے، اس کی بحث پہلے سورۃ حجر وغیرہ میں گزر چکی وہاں دیکھ لیا جائے۔

وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝۱۰

اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ برا ارادہ ٹھہرا ہے زمین کے رہنے والوں پر یا چاہا ان کے حق میں ان کے رب نے راہ پر لانا

خلاصہ تفسیر: اور ہم نہیں جانتے کہ (ان جدید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث فرمانے سے) زمین والوں کو کوئی تکلیف پہنچانا مقصود ہے یا ان کے رب نے ان کو ہدایت کرنے کا قصد فرمایا ہے۔

یعنی رسول بھیجنے سے شرعاً تو رشد و ہدایت ہی مقصود ہے، کیونکہ رسول کی اتباع سے فلاح و ہدایت ہوتی ہے اور مخالفت سے نقصان اور عذاب، اور ہمیں معلوم نہیں کہ لوگ آئندہ اتباع یا مخالفت کیا اختیار کریں گے؟ اس لئے ہم یہ نہیں جانتے کہ رسول کو بھیجنے سے قوم کو سزا دینا مقصود ہے یا ہدایت دینا؟ شاید اس سے اپنی قوم کو ڈرانا مقصود ہو کہ ایمان نہ لانے سے عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے، اور جنوں سے علم غیب کی نفی کر کے توحید کے مضمون تقویت دی کہ دیکھو بعض لوگ علم غیب کو جنات کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر ان کو اتنی بھی خبر نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی یہ جدید انتظامات اور سخت ناکہ بندی خدا جانے کس غرض سے عمل میں آئی ہیں، یہ تو ہم سمجھ چکے کہ قرآن کریم کا نزول اور پیغمبر عربی کی بعثت اس کا سبب ہوا، لیکن نتیجہ کیا ہونے والا ہے؟ آیا زمین والے قرآن کو مان کر راہ پر آئیں گے اور اللہ ان پر الطاف خصوصی مبذول فرمائے گا؟ یا یہی ارادہ ٹھہر چکا ہے کہ لوگ قرآنی ہدایات سے اعراض کرنے کی پاداش میں تباہ و برباد کیے جائیں؟ اس کا علم اسی علام الغیوب کو ہے، ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾

اور یہ کہ کوئی ہم میں نیک ہیں اور کوئی اس کے سوا، ہم تھے کئی راہ پر پھٹے ہوئے ۱

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾

اور یہ کہ ہمارے خیال میں آ گیا کہ ہم چھپ نہ جائیں گے اللہ سے زمین میں اور نہ تھکا دیں گے اس کو بھاگ کر ۲

خلاصہ تفسیر: اور ہم میں (پہلے سے بھی) بعض نیک (ہوتے آئے) ہیں اور بعض اور طرح کے (ہوتے آئے) ہیں (غرض) ہم مختلف طریقوں پر تھے (اسی طرح ان نبی کی خبر سن کر اب بھی ہم میں دونوں طریقے کے لوگ موجود ہیں) اور (ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ) ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم زمین (کے کسی حصہ) میں (جا کر) اللہ تعالیٰ کو ہرا نہیں سکتے اور نہ (اور کہیں) بھاگ کر اس کو ہرا سکتے ہیں (شاید اس سے بھی مقصود ڈرانا ہے کہ اگر کفر کریں گے تو خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتے)۔

كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا اپنے پہلے مختلف طریقوں کے بیان کرنے سے شاید یہ مقصود ہو کہ حق واضح ہو جانے کے بعد بعض کا ایمان نہ لانا حق کے حق ہونے میں شبہ نہیں ڈال سکتا، کیونکہ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا بھاگنے سے مراد زمین کے علاوہ آسمان وغیرہ میں بھاگ جانا ہے جو فی الارض کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد ہے: ما انتم بمعجزین فی الارض ولا فی السماء۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نزول قرآن سے پہلے بھی سب جن ایک راہ پر نہ تھے، کچھ نیک اور شائستہ تھے، اور بہت سے بدکار و ناہنجار، ان میں بھی فرقے اور جماعتیں ہوں گی، کوئی مشرک، کوئی عیسائی، کوئی یہودی وغیر ذلک، اور عملی طور پر ہر ایک کی راہ عمل جدا ہوگی، اب قرآن آیا جو اختلافات اور تفرقوں کو مٹانا چاہتا ہے، لیکن لوگ ایسے کہاں ہیں کہ سب کے سب حق کو قبول کر کے ایک راستہ پر چلنے لگیں، لامحالہ اب بھی اختلاف رہے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر ہم نے قرآن کو نہ مانا تو اللہ کی سزا سے بچ نہیں سکتے، نہ زمین میں کسی جگہ چھپ کر، نہ ادھر اُدھر بھاگ کر یا ہوا میں اڑ کر۔

وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾

اور یہ کہ جب ہم نے سن لی راہ کی بات تو ہم نے اسکو مان لیا ۱ پھر جو کوئی یقین لائیگا اپنے رب پر سو وہ نہ ڈرے گا نقصان سے اور نہ زبردستی سے ۲

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے جب ہدایت کی بات سن لی تو ہم نے تو اس کا یقین کر لیا سو (ہماری طرح) جو شخص اپنے رب پر ایمان لے آئے گا تو اس کو نہ کسی کمی کا اندیشہ ہوگا اور نہ زیادتی کا (کمی یہ کہ اس کی کوئی نیکی لکھنے سے رہ جائے، اور زیادتی یہ کہ کوئی گناہ زیادہ لکھ لیا جائے، شاید مقصود اس سے ترغیب ہو)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہمارے لیے فخر کا موقع ہے کہ جنوں میں سب سے پہلے ہم نے قرآن سن کر بلا توقف قبول کیا، اور ایمان لانے میں ایک منٹ کی دیر نہیں کی۔

فائدہ: ۲ یعنی سچے ایماندار کو اللہ کے ہاں کوئی کھٹکا نہیں، نہ نقصان کا کہ اس کی کوئی نیکی اور محنت یونہی رائیگاں چلی جائے، نہ زیادتی کا کہ زبردستی کسی دوسرے کے جرم اس کے سر تھوپ دیے جائیں، غرض وہ نقصان، تکلیف اور ذلت و رسوائی سب سے مامون و محفوظ ہے۔

وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾

اور یہ کہ کچھ ہم میں حکم بردار ہیں اور کچھ ہیں بے انصاف، سو جو لوگ حکم میں آ گئے سو انہوں نے اٹکل کر لیا نیک راہ کو

وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾

اور جو بے انصاف ہیں وہ ہوئے دوزخ کے ایندھن [1]

خلاصہ تفسیر: اور ہم میں بعض تو (یہی مضامین انداز وترغیب کو سمجھ کر) مسلمان (ہو گئے) ہیں اور بعضے ہم میں (پہلے کی طرح) بے راہ ہیں، سو جو شخص مسلمان ہو گیا انہوں نے تو بھلائی کا راستہ ڈھونڈ لیا (جس پر ثواب مرتب ہوگا) اور جو بے راہ ہیں وہ دوزخ کے ایندھن ہیں۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی نزول قرآن کے بعد ہم میں دو طرح کے لوگ ہیں: ① ایک وہ جنہوں نے اللہ کا پیغام سن کر قبول کیا اور اس کے احکام کے سامنے گردن جھکا دی، یہی ہیں جو تلاش حق میں کامیاب ہوئے اور اپنی تحقیق وتفحص سے نیکی کے راستہ پر پہنچ گئے ② دوسرا گروہ بے انصافوں کا ہے جو کج روی وبے انصافی کی راہ سے اپنے پروردگار کے احکام کو جھٹلاتا اور اس کی فرمانبرداری سے انحراف کرتا ہے، یہ وہ ہیں جن کو جہنم کا کندا اور دوزخ کا ایندھن کہنا چاہیے۔

ربط: یہاں تک مسلمان جنوں کا کلام نقل فرمایا جو انہوں نے اپنی قوم سے کیا، آگے حق تعالیٰ اپنی طرف سے چند نصیحت کی باتیں ارشاد فرماتے ہیں گویا: وَاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا الخ کا عطف اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ پر ہوا، مترجم محقق نے ترجمہ میں اور یہ "حکم آیا" کے الفاظ بڑھا کر بتلا دیا کہ یہاں سے اخیر تک قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ کے تحت میں داخل ہے۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ

اور یہ حکم آیا کہ اگر لوگ سیدھے رہتے راہ پر تو ہم پلاتے ان کو پانی بھر کر، تا کہ ان کو جانچیں اس میں [1]

وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾

اور جو کوئی منہ موڑے اپنے رب کی یاد سے وہ ڈال دے گا اس کو چڑھتے عذاب میں [2]

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک جنات کا کلام ختم ہو گیا جو معمول ہے قالوا کا) اور (آگے اوحی الیّ کے دوسرے معمولات ہیں، یعنی مجھ کو ان مضامین کی بھی وحی ہوئی ہے ایک یہ کہ) اگر یہ (مکہ والے) لوگ (سیدھے) رستے پر قائم ہو جاتے تو ہم ان کو فراغت کے پانی سے سیراب کرتے، تا کہ اس میں ان کا امتحان کریں (کہ نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں یا ناشکری ونافرمانی کرتے ہیں، مطلب یہ کہ اگر اہل مکہ شرک نہ کرتے جس کی مذمت پیچھے جنات کے کلام کے ضمن میں آ چکی ہے تو ان پر قحط مسلط نہ ہوتا جیسا کہ تیسرے واقعہ میں مذکور ہے مگر انہوں نے بجائے ایمان کے اعراض کیا اس لئے قحط میں مبتلا ہوئے) اور (کفر کے سبب عذاب صرف اہل مکہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ) جو شخص اپنے پروردگار کی یاد (یعنی ایمان واطاعت) سے روگردانی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی اگر جن وانس حق کی سیدھی راہ پر چلتے تو ہم ان کو ایمان وطاعت کی بدولت ظاہری وباطنی برکات سے سیراب کر دیتے اور اس میں بھی ان کی آزمائش ہوتی کہ نعمتوں سے بہرہ ور ہو کر شکر بجا لاتے اور طاعت میں مزید ترقی کرتے ہیں، یا کفران نعمت کر کے اصل سرمایہ بھی کھو

بیٹھتے ہیں، بعض روایات میں ہے کہ اس وقت مکہ والوں کے ظلم وشرارت کی سزا میں حضور ﷺ کی دعاء سے کئی سال کا قحط پڑا تھا، لوگ خشک سالی سے پریشان ہورہے تھے، اس لیے متنبہ فرمادیا کہ اگر سب لوگ ظلم وشرارت سے باز آکر اللہ کے راستہ پر چلیں جیسے مسلمان جنوں نے طریقہ اختیار کیا ہے تو قحط دور ہو اور باران رحمت سے ملک سرسبز وشاداب کردیا جائے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کی یاد سے منہ موڑ کر آدمی کو چین نصیب نہیں ہوسکتا وہ تو ایسے راستہ پر چل رہا ہے جہاں پریشانی اور عذاب ہی چڑھتا چلا آتا ہے۔

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾

اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے واسطے ہیں سومت پکارو اللہ کے ساتھ کسی کو

خلاصہ تفسیر: اور (ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ) جتنے سجدے ہیں وہ سب اللہ کا حق ہے (یعنی یہ جائز نہیں کہ کوئی سجدہ اللہ کو کیا جائے اور کوئی سجدہ غیر اللہ کو جیسا مشرکین کرتے تھے) سو اللہ کے ساتھ کسی کی عبادت مت کرو (اس مضمون میں بھی توحید کی تقریر ہے جس کا پیچھے ذکر تھا)۔

* * *

فائدہ: یوں تو خدا کی ساری زمین اس امت کے لیے مسجد بنادی گئی ہے، لیکن خصوصیت سے وہ مکانات جو مسجدوں کے نام سے خاص عبادتِ الٰہی کے لیے بنائے جاتے ہیں، ان کو اور زیادہ امتیاز حاصل ہے، وہاں جاکر اللہ کے سوا کسی ہستی کو پکارنا ظلم عظیم اور شرک کی بدترین صورت ہے، مطلب یہ ہے کہ خالص خدائے واحد کی طرف آؤ اور اس کا شریک کرکے کسی کو کہیں بھی مت پکارو خصوصاً مساجد میں جو اللہ کے نام پر تنہا اسی کی عبادت کے لیے بنائی گئی ہیں، بعض مفسرین نے ''مساجد'' سے مراد وہ اعضا لیے ہیں جو سجدہ کے وقت زمین پر رکھے جاتے ہیں، اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ یہ خدا کے دیے ہوئے اور اس کے بنائے ہوئے اعضاء ہیں، جائز نہیں کہ ان کو اس مالک وخالق کے سوا کسی دوسرے کے سامنے جھکاؤ۔

وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾ ع

اور یہ کہ جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ ۱ کہ اس کو پکارے لوگوں کا بندھنے لگتا ہے اس پر ٹھٹھ ۲

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾

تو کہہ میں تو پکارتا ہوں بس اپنے رب کو اور شریک نہیں کرتا اس کا کسی کو ۳

خلاصہ تفسیر: اور (ان وحی شدہ مضامین میں سے ایک یہ ہے کہ) جب خدا کا خاص بندہ (مراد رسول اللہ ﷺ ہیں) خدا کی عبادت کرنے کھڑا ہوتا ہے تو یہ (کافر) لوگ اس بندہ پر بھیڑ لگانے کو ہوجاتے ہیں (یعنی تعجب وعداوت سے ہر شخص اس طرح دیکھتا ہے جیسے اب حملہ کرنے کے لئے بھیڑ لگا چاہتی ہے، یہ بھی توحید کے مضمون کا تتمہ ہے، کیونکہ اس میں مشرکین کی مذمت ہے کہ توحید سے ان کو عداوت اور نفرت ہے، اب آگے اس تعجب اور عداوت کے متعلق جواب دینے کے لئے آپ کو ارشاد ہے:) آپ (ان سے) یہ کہہ دیجئے کہ میں تو صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا (سو یہ کوئی تعجب اور عداوت کی بات نہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بندہ کامل محمد رسول اللہ ﷺ۔

فائدہ: ۲ یعنی آپ جب کھڑے ہوکر قرآن پڑھتے ہیں تو لوگ ٹھٹھ کے ٹھٹھ آپ پر ٹوٹے پڑتے ہیں، مومنین تو شوق ورغبت سے قرآن

سننے کی خاطر اور کفار عداوت وعناد سے آپ پر ہجوم کرنے کے لیے۔

فائدہ: ۳ یعنی کفار سے کہہ دیجیے کہ تم مخالفت کی راہ سے بھیڑ کیوں کرتے ہو، کون سی بات ایسی ہے جس پر تمہاری خفگی ہے، میں کوئی بری اور نامعقول بات تو نہیں کہتا، صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کا شریک کسی کو نہیں سمجھتا، تو اس میں لڑنے جھگڑنے کی کون سی بات ہے اور اگر تم سب مل کر مجھ پر ہجوم کرنا چاہتے ہو تو یاد رکھو میرا بھروسہ اکیلے اسی خدا پر ہے جو ہر قسم کی شرکت سے پاک اور بے نیاز ہے۔

قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾

تو کہہ میرے اختیار میں نہیں تمہارا برا اور نہ راہ پر لانا

خلاصہ تفسیر: (پیچھے توحید کے متعلق مضمون تھا، اب آگے رسالت کے متعلق مضمون ہے کہ) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تمہارے نہ کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا (یعنی تم جو ایسی فرمائشیں کرتے ہو کہ اگر آپ رسول ہیں تو ہم پر عذاب نازل کریں دیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے اختیار میں نہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی میرے اختیار میں نہیں کہ تم کو بھی راہ پر لے آؤں، اور نہ آؤ تو کچھ نقصان پہنچا دوں، سب بھلائی برائی اور سود وزیاں اسی خدائے واحد کے قبضہ میں ہے۔

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ

تو کہہ مجھ کو نہ بچائے گا اللہ کے ہاتھ سے کوئی اور نہ پاؤں گا اسکے سوا کہیں سرک رہنے کو جگہ ۱ مگر پہنچانا ہے اللہ کی طرف سے

وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ﴿۲۳﴾ حَتّٰۤی اِذَا

اور اسکے پیغام لانے ۲ اور جو کوئی حکم نہ مانے اللہ کا اور اسکے رسول کا سو اس کیلئے آگ ہے دوزخ کی رہا کریں اس میں ہمیشہ ۳ یہاں تک کہ جب

رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾

دیکھیں گے جو کچھ ان سے وعدہ ہوا تب جان لیں گے کس کے مددگار کمزور ہیں اور گنتی میں تھوڑے ۴

خلاصہ تفسیر: (اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک طرح ہم آپ کو رسول مان لیں اگر آپ توحید وقرآن کے مضامین میں کچھ تبدیلی وتغیر کر دیں تو اس کے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ (اگر خدانخواستہ میں ایسا کروں تو) مجھ کو خدا (کے غضب) سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے سوا کوئی پناہ (کی جگہ) پا سکتا ہوں (مطلب یہ کہ نہ تو کوئی میرا بچانے والا ہوگا اور نہ میری تلاش سے کوئی پناہ دینے والا مل سکے گا، کفار کی طرف سے عذاب جلد طلب کرنے یا قرآن اور دین کو تبدیل کرنے کی ایسی فرمائشیں قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہیں، پیچھے آیت: لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا میں نفع ونقصان کے اختیار کی نفی فرمائی تھی، اب آگے منصب رسالت کو ثابت فرماتے ہیں کہ نفع ونقصان میرے قبضہ میں نہیں اور نہ ہی یہ نبوت کے لیے لازم ہے) لیکن خدا کی طرف سے پہنچانا اور اس کے پیغاموں کا ادا کرنا یہ میرا کام ہے، اور (آگے توحید ورسالت دونوں کے متعلق مضمون ہے کہ) جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہیں مانتے تو یقینا ان لوگوں کے لئے آتش دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (مگر کفار اس وقت ان مضامین سے متاثر نہیں ہوتے، بلکہ الٹا مسلمانوں کو ذلیل وحقیر سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں: ای الفریقین خیر مقاما و احسن ندیا اور یہ اس جہالت

سے باز نہ آئیں گے) یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اس وقت جانیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کس کی جماعت کم ہے (یعنی کافر ہی ایسے ہوں گے جن کے کوئی کام نہ آئے گا)۔

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ: ''بلاغ'' اور ''رسالت'' میں فرق یہ ہے کہ ''بلاغ'' کسی ایک حکم کے عام طور پر پہنچانے کو بولتے ہیں، اور ''رسالت'' تمام کے احکام کے متعلق پہنچانے کو کہتے ہیں، چاہے خاص خاص لوگوں کو ہی پہنچا دیا جائے، اس لیے دونوں کو جمع کر دیا کہ نبی کے ذمہ تمام احکام کو عام طور پر پہنچانا واجب ہے۔

مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا: یہاں ''جماعت'' سے مراد مطیعین یعنی اطاعت کرنے والوں کی جماعت ہے، اضعف ناصرا میں نفع اعلی کی نفی ہوگئی، اور اقل عددا میں نفع ادنی کی نفی ہوگئی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تم کو نفع نقصان پہنچانا تو کجا، اپنا نفع وضرر میرے قبضہ میں نہیں، اگر بالفرض میں اپنے فرائض میں تقصیر کروں تو کوئی شخص نہیں جو مجھ کو اللہ کے ہاتھ سے بچالے اور کوئی جگہ نہیں جہاں بھاگ کر پناہ حاصل کر سکوں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اللہ کی طرف سے پیغام لانا اور اس کے بندوں کو پہنچا دینا، یہی چیز ہے جو اس نے میرے اختیار میں دی اور یہی فرض ہے جس کے ادا کرنے سے میں اس کی حمایت اور پناہ میں رہ سکتا ہوں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی تمہارے نفع نقصان کا مالک میں نہیں، لیکن اللہ کی اور میرے نافرمانی کرنے سے نقصان پہنچنا ضروری ہے۔

فائدہ: ۴؎ یعنی تم جو جتھے باندھ کر ہم پر ہجوم کرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ محمد ﷺ اور اس کے ساتھی تھوڑے سے آدمی ہیں وہ بھی کمزور تو جب وعدہ کا وقت آئے گا اس وقت پتہ لگے گا کہ کس کے ساتھی کمزور اور گنتی میں تھوڑے تھے۔

قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾

تو کہہ میں نہیں جانتا کہ نزدیک ہے جس چیز کا تم سے وعدہ ہوا ہے یا کر دے اس کو میرا رب ایک مدت کے بعد

خلاصہ تفسیر: اب آگے قیامت کے متعلق کلام ہے کہ یہ لوگ قیامت کا وقت بطور انکار کے دریافت کرتے ہیں تو:

آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو معلوم نہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آیا وہ نزدیک (آنے والی) ہے یا میرے پروردگار نے اس کے لئے کوئی مدت دراز مقرر کر رکھی ہے (لیکن ہر حال میں وہ آئے گی ضرور، رہا اس کی تعیین کا علم سو وہ محض غیب ہے)۔

اس آیت میں صراحت سے یہ نفی کر دی گئی ہے کہ مستقل قدرت اور علم غیب کسی مخلوق کو حاصل نہیں، نفع ونقصان اور غیب کا علم صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے (البتہ اللہ تعالی اپنا غیب کسی نبی ورسول پر ظاہر کر دیتا ہے اور یہ انباء الغیب یا اظہار علی الغیب یا اطلاع علی الغیب کہلاتا ہے علم غیب نہیں، اس کی مزید تفصیل اگلی آیات کے آخر میں آرہی ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: یعنی اس کا علم مجھے نہیں دیا گیا کہ وعدہ جلد آنے والا ہے، یا ایک مدت کے بعد، کیونکہ قیامت کا وقت معین کر کے اللہ تعالی نے کسی کو نہیں بتلایا، یہ ان غیوب میں سے ہے جو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ

جاننے والا بھید کا سو نہیں خبر دیتا اپنے بھید کی کسی کو، مگر جو پسند کر لیا کسی رسول کو تو وہ چلاتا ہے

مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ رَصَدًا ﴿٢٧﴾ لِّیَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ اَبۡلَغُوۡا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمۡ وَاَحَاطَ بِمَا

اس کے آگے اور پیچھے چوکیدار ۱ تا کہ جانے کہ انہوں نے پہنچائے پیغام اپنے رب کے ۲ اور قابو میں رکھا ہے

لَدَیۡهِمۡ وَاَحۡصٰی كُلَّ شَیۡءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾ ع

جو ان کے پاس ہے اور گن لی ہے ہر چیز کی گنتی ۳

خلاصہ تفسیر: (اور) غیب کا جاننے والا وہی ہے سو (جس غیب پر کسی کو مطلع کرنا مصلحت نہیں ہوتا) وہ اپنے (ایسے) غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا (اور قیامت کے وقت کا علم ایسا ہی ہے کہ اس پر کسی کو مطلع کرنے میں کوئی مصلحت نہیں، کیونکہ وہ نبوت کے متعلقہ علوم میں سے نہیں جن کے حصول کو قرب الٰہی میں دخل ہوتا ہے، پس ایسے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا) ہاں! مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو (اگر کسی ایسے علم پر مطلع کرنا چاہتا ہے جو کہ علم نبوت سے ہو خواہ نبوت کو ثابت کرنے والے ہوں جیسے پیشین گوئیاں، خواہ نبوت کے فروعی اور ضمنی علوم میں سے ہوں جیسے علم احکام) تو (اس طرح اطلاع دیتا ہے کہ) اس پیغمبر کے آگے اور پیچھے (یعنی تمام جہات میں وحی کے وقت) محافظ فرشتے بھیج دیتا ہے (تا کہ وہاں شیاطین کا گذر نہ ہو جو کہ وحی کو فرشتہ سے سن کر کسی اور سے جا کہیں، یا کسی وسوسہ وغیرہ کا القاء کر سکیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایسے پہرہ دار فرشتے چار تھے، اور یہ انتظام اس لئے کیا جاتا ہے) تا کہ (ظاہری طور پر) اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جائے کہ ان فرشتوں نے اپنے پروردگار کے پیغام (رسول تک حفاظت سے) پہنچا دیئے (اور اس میں کسی کا دخل اور تصرف نہیں ہوا، اور پہنچانے والا تو صرف وحی کا فرشتہ ہے، لیکن ساتھ ہونے کی وجہ سے ''رصد'' یعنی محافظ فرشتوں کی طرف بھی فعل کی نسبت کر دی) اور اللہ تعالیٰ ان (پہرہ داروں) کے تمام احوال کا احاطہ کئے ہوئے ہے (اس لئے پہرہ دار ایسے مقرر کئے گئے ہیں جو اس کام کے پورے پورے اہل ہیں) اور اس کو ہر چیز کی گنتی معلوم ہے (پس وحی کے سب اجزاء ایک ایک کر کے اس کو معلوم ہیں، اور وہ سب کی پوری حفاظت کرتا ہے، فرشتوں اور انبیاء کے ذہنوں میں اس کو جما دیتا ہے)۔

شروع سے آخر تک سب حفاظتوں کا انتظام ہو گیا، پس یَسۡلُكُ میں شیاطین کی چوری کی وجہ سے شبہ اور التباس سے حفاظت ہے، اَحَاطَ میں درمیانی واسطوں کی صلاحیت کے اعتبار سے حفاظت ہو گئی، اور اَحۡصٰی میں بھول اور نسیان سے بھی حفاظت ہو گئی، چنانچہ شروع سے آخر تک تمام حفاظتوں کی رعایت رکھی گئی، حاصل مقام یہ کہ تعیین کے ساتھ قیامت کے وقت کا علم نبوت کے علوم میں سے نہیں، اس لیے رسول کو اس کا علم نہ ہونے سے نبوت پر اعتراض یا قیامت کا نہ آنا لازم نہیں آتا، البتہ رسول کو نبوت کے علوم عطا کیے جاتے ہیں اور وہی مقصود بھی ہیں، اور ان میں خطا کا احتمال نہیں ہوتا تو ایسے علوم سے فائدہ حاصل کرو اور زائد باتوں کی تحقیق کو چھوڑ دو۔

اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ بعض ناواقف ''غیب'' اور ''انباء الغیب'' میں فرق نہیں سمجھتے، اس لئے وہ انبیاء اور خصوصاً خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب کلی ثابت کرتے ہیں اور آپ کو بالکل اللہ تعالیٰ کی طرح عالم الغیب ہر ذرہ کائنات کا علم رکھنے والا کہنے لگتے ہیں جو کھلا ہوا شرک اور رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے، (نعوذ باللہ منہ) اگر کوئی شخص اپنا خفیہ راز کسی اپنے دوست کو بتلا دے جو اور کسی کے علم میں نہ ہو تو اس سے دنیا میں کوئی بھی اس دوست کو عالم الغیب نہیں کہہ سکتا، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو ہزاروں غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلا دینا ان کو عالم الغیب نہیں بنا دیتا خوب سمجھ لیا جائے، جاہل عوام جو ان دونوں باتوں میں فرق نہیں کرتے جب ان کے سامنے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب نہیں، وہ اس کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ آپ کو معاذ اللہ کسی غیب کی چیز کی خبر نہیں جس کا دنیا میں کوئی قائل نہیں اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ ایسا ہونے سے تو خود نبوت و رسالت کی نفی ہو جاتی ہے جس کا کسی مومن سے امکان نہیں، اس کے متعلق مزید تفصیل سورہ آل عمران آیت ۱۷۹: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُطۡلِعَكُمۡ عَلَی الۡغَیۡبِ میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: ا یعنی اپنے بھید کی پوری خبر کسی کو نہیں دیتا، ہاں! رسولوں کو جس قدر ان کی شان ومنصب کے لائق ہو بذریعہ وحی خبر دیتا ہے، اس وحی کے ساتھ فرشتوں کے پہرے اور چوکیاں رکھی جاتی ہیں کہ کسی طرف سے شیطان اس میں دخل کرنے نہ پائے، اور رسول کا اپنا نفس بھی غلط نہ سمجھے، یہی معنی ہیں اس بات کے کہ پیغمبروں کو (اپنے علوم واخبار میں) عصمت حاصل ہے، اوروں کو نہیں، انبیاء کی معلومات میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی، دوسروں کو معلومات میں کئی طرح کے احتمال ہیں، اسی لیے محققین صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ولی اپنے کشف کو قرآن وسنت پر عرض کر کے دیکھے اگر ان کے مخالف نہ ہو تو غنیمت سمجھے، ورنہ بے تکلف رد کر دے۔

تنبیہ: اس آیت کی نظیر آل عمران میں ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران:۱۷۹) اور کئی سورتوں میں علم غیب کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہیں ہم فوائد میں اس پر مفصل کلام کر چکے ہیں، فلیراجع۔

فائدہ: ۲ یعنی یہ زبردست انتظامات اس غرض سے کیے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ لے کہ فرشتوں نے پیغمبروں کو یا پیغمبروں نے دوسرے بندوں کو اس کے پیغامات ٹھیک ٹھیک بلا کم وکاست پہنچا دیے ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی ہر چیز اس کی نگرانی اور قبضہ میں ہے، کسی کی طاقت نہیں کہ وحی الٰہی میں تغیر وتبدل یا قطع وبرید کر سکے، اور یہ پہرے چوکیاں بھی شان حکومت کے اظہار اور سلسلہ، اسباب کی محافظت کے لیے بہت سی حکمتوں پر مبنی ہیں، ورنہ جس کا علم اور قبضہ ہر چیز پر حاوی ہو اس کو ان چیزوں کی کوئی احتیاج نہیں۔

ایاتها ۲۰ • ۷۳ سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ ۳ • رکوعاتها ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں کفار کو توحید، رسالت اور قیامت پر ایمان لانے کی ترغیب تھی، اس سورت میں ان کے ایمان نہ لانے پر حضور ﷺ کو تسلی ہے، اور تسلی کو پختہ کرنے کے لیے آپ کو کثرت ذکر اور رات میں نماز پڑھنے کا حکم ہے، اور یہ سب مضمون سورت کی شروع کی آیتوں کا ہے، اور اخیر کی ایک لمبی آیت میں جو کہ ابتدائی آیتوں سے ایک سال بعد نازل ہوئی تہجد کی فرضیت کو منسوخ فرما دیا، خواہ صرف امت کے ذمہ سے، یا رسول اللہ ﷺ کے ذمہ سے بھی جیسا کہ سورہ اسراء میں آیت ۷۹: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ کی تفسیر میں گذر چکا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾

اے کپڑے میں لپٹنے والے ا کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات ۲ آدھی رات یا اس میں سے کم کر دے تھوڑا سا

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ﴿۴﴾

یا زیادہ کر اس پر ۳ اور کھول کھول کر پڑھ قرآن کو صاف ۴

خلاصہ تفسیر: اے کپڑوں میں لپٹنے والے! (اس عنوان سے خطاب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائے نبوت میں قریش نے دار الندوہ میں جمع ہو کر آپ ﷺ کے بارے میں مشورہ کیا کہ آپ کی حالت کے مناسب کوئی لقب تجویز کرنا چاہئے کہ اس پر سب متفق رہیں، کسی نے کہا کہ کاہن ہیں، کسی نے مجنون کہا، کسی نے ساحر کہا، پھر بعض نے اس کو بھی رد کر دیا لیکن پھر یہی کہنے لگے کہ ساحر اس لئے ہیں کہ دوست کو دوست سے جدا کر دیتے ہیں، آپ ﷺ کو یہ خبر پہنچ کر رنج ہوا اور رنج کی حالت میں کپڑوں میں لپٹ گئے، اس لئے آپ کو خوش کرنے اور لطف کا اظہار کرنے کے لئے اس عنوان سے خطاب فرمایا، غرض آپ کو خطاب ہے کہ ان باتوں کا رنج نہ کرو، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف مداومت کے ساتھ اور زیادہ توجہ رکھو اس طرح

سے کہ) رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات (کہ اس میں آرام کرو) یا اس نصف سے کسی قدر کم کردو (یعنی نصف سے کم قیام کرو، اور نصف سے زیادہ آرام کرو، اور اس نصف سے کم کا مصداق ایک تہائی ہے، کیونکہ حق تعالی نے بعد میں ثلثه فرمایا ہے یعنی تہائی رات) یا نصف سے کچھ بڑھا دو (یعنی نصف سے زیادہ قیام کرو، اور نصف سے کم آرام کرو، اور اس نصف سے زیادہ کا مصداق دو تہائی کے قریب ہے، کیونکہ بعد میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ادنی من ثلثی اللیل ،غرض رات کا قیام تو وجوبی حکم سے فرض ہوا، مگر قیام کے وقت کی مقدار میں تین صورتوں میں اختیار ہے: نصف شب، دو تہائی شب، ایک تہائی شب) اور (اس قیام لیل یعنی تہجد میں) قرآن کو خوب صاف صاف پڑھو (کہ ایک ایک حرف الگ الگ ہو اور یہی حکم نماز کے علاوہ میں بھی ہے لیکن یہاں مقام کی وجہ سے بطور خاص اس کو ذکر فرمایا)۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ: نبوت کی ابتداء میں قریش نے دار الندوہ میں جمع ہو کر آپ ﷺ کے بارے میں مشورہ کیا کہ آپ کی حالت کے مناسب کوئی لقب تجویز کرنا چاہئے تاکہ اس پر سب متفق رہیں، کسی نے کہا کہ کاہن ہیں، اس کو دوسروں نے رد کر دیا، کسی نے مجنوں کہا، پھر اس کو بھی سب نے غلط قرار دیا، پھر ساحر کہا، پھر بعض نے اس کو بھی رد کر دیا لیکن پھر یہی کہنے لگے کہ ساحر اس لئے ہیں کہ دوست کو دوست سے جدا کر دیتے ہیں، آپ کو یہ خبر پہنچ کر رنج ہوا اور رنج کی حالت میں کپڑوں میں لپٹ گئے، اکثر سوچ اور رنج میں آدمی اس طرح کر لیتا ہے، اس لئے آپ کو خوش کرنے اور لطف کا اظہار کرنے کے لئے اس عنوان سے خطاب فرمایا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ابوتراب فرمایا تھا۔

* * *

فائدہ: ۱ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ: یہ سورت ابتدائی سورتوں میں سے ہے جو مکہ میں نازل ہوئیں، روایات صحیحہ میں ہے کہ شروع میں جب وحی کی دہشت اور ثقل سے آپ ﷺ کا بدن کانپنے لگا تو آپ ﷺ نے گھر والوں سے فرمایا: " زمّلونی زمّلونی "(مجھے کپڑا اڑھاؤ کپڑا اڑھاؤ) چنانچہ کپڑا اڑھا دیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اور اس سے اگلی سورت میں آپ کو وہی نام لے کر پکارا، اور بعض روایات میں ہے کہ قریش نے دار الندوہ میں جمع ہو کر آپ ﷺ کے متعلق مشورہ کیا کہ آپ ﷺ کی حالت کے مناسب کوئی لقب تجویز کرنا چاہیے کسی نے "کاہن" کہا، کسی نے "جادوگر"، کسی نے "مجنون" مگر اتفاق رائے کسی چیز پر نہ ہوا، اخیر میں "ساحر" کی طرف رجحان تھا، آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو رنجیدہ اور غمگین ہوئے اور کپڑوں میں لپٹ گئے، جیسا کہ اکثر سوچ اور غم میں مغموم آدمی اس طرح کر لیتا ہے، اس پر حق تعالیٰ نے تأنیس و ملاطفت کے لیے اس عنوان سے خطاب فرمایا جیسے آپ ﷺ نے حضرت علی کو ایک مرتبہ "قم ابا تراب" فرمایا تھا جبکہ وہ گھر سے رنجیدہ ہو کر چلے گئے اور مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں کہ "اس سورت میں خرقہ پوشی کے لوازم و شروط بیان ہوئی ہیں"، گویا یہ سورت اس شخص کی سورت ہے جو درویشوں کا خرقہ پہنے اور اپنے تئیں اس رنگ میں رنگے، لغت عرب میں "مزمل" اس شخص کو کہتے ہیں جو بڑے کشادہ کپڑے کو اپنے اوپر لپیٹ لے، اور آنحضرت ﷺ کا معمول ایسا تھا کہ جب نماز تہجد اور قرآن شریف کی تلاوت کے لیے رات کو اٹھتے تھے تو ایک کمبل دراز اوڑھ لیتے تھے تاکہ سردی سے بدن محفوظ رہے اور وضو و نماز کی حرکات میں کسی طرح کا حرج واقع نہ ہو، نیز اس عنوان کے اختیار کرنے میں ان لوگوں کو ہوشیار کرنا ہے جو کپڑوں میں لپٹے ہوئے رات کو آرام کر رہے ہوں کہ رات کا ایک معتد بہ حصہ اللہ کی عبادت میں گزاریں۔

فائدہ: ۲ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا یعنی کسی رات اتفاق سے نہ ہو سکے تو معاف ہے اور اکثر مفسرین کے نزدیک الا قلیلا کا مطلب یہ ہے کہ رات کو اللہ کی عبادت میں کھڑے رہو، ہاں! تھوڑا سا حصہ شب کا اگر آرام کرو، تو مضائقہ نہیں، غالباً تھوڑے سے مراد یہاں نصف ہوگا کیونکہ رات جو آرام کے لیے تھی جب آدھی عبادت میں گزار دی تو اس کے اعتبار سے باقی صف کو "تھوڑا" ہی کہنا موزوں تھا۔

فائدہ: ۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ یعنی آدھی رات سے کچھ کم جو تہائی تک پہنچ سکتی ہے، یا آدھی سے زیادہ جو دو تہائی تک ہو، بقرینۃ قولہ تعالیٰ فیما بعد: اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ۔

فائدہ: ؎ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا: یعنی تہجد میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کہ ایک ایک حرف صاف سمجھ میں آئے، اس طرح پڑھنے سے فہم وتدبر میں مدد ملتی ہے اور دل پر اثر زیادہ ہوتا ہے اور ذوق وشوق بڑھتا ہے۔

اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ⑤

ہم ڈالنے والے ہیں تجھ پر ایک بات وزن دار

خلاصہ تفسیر: (آگے قیام اللیل یعنی تہجد کے حکم کی علت اور مصلحت کا بیان ہے کہ) ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں۔

قَوْلًا ثَقِيْلًا: بھاری کلام سے مراد قرآن مجید ہے جو نزول کے وقت بھی آپ کی حالت کو متغیر کر دیتا تھا، جیسا حدیثوں میں ہے کہ ایک بار آپ کی ران زید بن ثابتؓ کی ران پر رکھی تھی، اس وقت وحی نازل ہوئی تو زید بن ثابتؓ کی ران پھٹنے لگی، اور جب آپ نزول وحی کے وقت اونٹنی پر سوار ہوتے تو وہ گردن ڈال دیتی اور حرکت نہ کر سکتی، اور شدت کے جاڑوں میں آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے، پھر اس کے علاوہ اس کا محفوظ رکھنا، اور پھر دوسروں تک پہنچانے میں کلفتیں برداشت کرنا ان اعتبارات سے بھی ''ثقیل'' کہا گیا، اور اس میں تہجد کی فرضیت کی علت بیان کرنا اور اس کو آسان کر کے بتانا مقصود ہے، آسان کرنا تو اس طرح ہے کہ رات کے اٹھنے کو تم بھاری نہ سمجھو، ہم تو اس سے بھاری بھاری کام تم سے لینے والے ہیں، اور علت یہ بیان کی کہ رات کے اٹھنے کا حکم اس لیے کرتے ہیں تاکہ آپ ریاضت کے عادی ہو جائیں جس سے نفس کی استعداد کامل اور مضبوط ہو جائے، کیونکہ ہم آپ پر بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں تو اس کے لیے اپنی استعداد کو قوی کرنا ضروری ہے۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی ریاضت کر تو بھاری بوجھ آسان ہو''، اور وہ بوجھ ایسا ہے کہ جس کے سامنے شب بیداری کو سہل سمجھنا چاہیے، مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد پے بہ پے قرآن تم پر نازل کریں گے جو اپنی قدر و منزلت کے اعتبار سے بہت قیمتی اور وزن دار اور اپنی کیفیات ولوازم کے اعتبار سے بہت بھاری اور گراں بار ہے، احادیث میں ہے کہ نزول قرآن کے وقت آپ ﷺ پر بہت گرانی اور سختی گزرتی تھی، جاڑے کے موسم میں آپ ﷺ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے، اگر اس وقت کسی سواری پر سوار ہوتے تو سواری تحمل نہیں کر سکتی تھی، ایک مرتبہ آپ کی فخذ مبارک زید بن ثابتؓ کی ران پر تھی، اس وقت وحی نازل ہوئی، زید بن ثابتؓ کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کی ران بوجھ سے پھٹ جائے گی، اس کے علاوہ اس ماحول میں قرآن کی دعوت وتبلیغ اور اس کے حقوق پوری طرح ادا کرنا اور اس راہ میں تمام سختیوں کو کشادہ دلی سے برداشت کرنا بھی سخت مشکل اور بھاری کام تھا، اور جس طرح ایک حیثیت سے یہ کلام آپ ﷺ پر بھاری تھا دوسری حیثیت سے کافروں اور منکروں پر شاق تھا، غرض ان تمام وجوہ کا لحاظ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ جس قدر قرآن اتر چکا ہے، اس کی تلاوت میں رات کو مشغول رہا کریں اور اس عبادت خاص کے انوار سے اپنے تئیں مشرف کر کے اس فیض اعظم کی قبولیت کی استعداد اپنے اندر مستحکم فرمائیں۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۭ ⑥

البتہ اٹھنا رات کو سخت روندتا ہے اور سیدھی نکلتی ہے بات

خلاصہ تفسیر: (آگے قیام لیل یعنی تہجد کی دوسری علت ہے کہ) بیشک رات کا اٹھنا خوب موثر ہے (نفس کے) کچلنے میں اور (دعا ہو یا قرات، ہو ظاہری و باطنی اعتبار سے) بات خوب ٹھیک نکلتی ہے (ظاہری تو اس طرح کہ فرصت کا وقت ہوتا ہے، دعاء وقراءت کے الفاظ خوب اطمینان سے ادا ہوتے ہیں، اور باطنی اس طرح کہ جی خوب لگتا ہے اور دل وزبان کی موافقت کا یہی مطلب ہے اور اس کا علت ہونا ظاہر ہے)۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ: بظاہر نصف، تہائی اور دو تہائی رات میں اول اور آخر شب دونوں میں اختیار تھا، البتہ یہاں: نَاشِئَةَ الَّيْلِ سے آخر شب کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی رات کو اٹھنا کچھ آسان کام نہیں، بڑی بھاری ریاضت اور نفس کشی ہے جس سے نفس روندا جاتا ہے اور نیند آرام وغیرہ و خواہشات پامال کی جاتی ہیں، نیز اس وقت دعا اور ذکر سیدھا دل سے ادا ہوتا ہے، زبان اور دل موافق ہوتے ہیں، جو بات زبان سے نکلتی ہے ذہن میں خوب جمتی چلی جاتی ہے، کیونکہ ہر قسم کے شور وغل اور چیخ پکار سے یکسو ہونے اور خداوند قدوس کے آسمان دنیا پر نزول فرمانے سے قلب کو ایک عجیب قسم کے سکون وقرار اور لذت واشتیاق کی کیفیت میسر ہوتی ہے۔

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝٧ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝٨

البتہ تجھ کو دن میں شغل رہتا ہے لمبا ۱؎ اور پڑھے جا نام اپنے رب کا اور چھوٹ کر چلا آ اسکی طرف سب سے الگ ہو کر ۲؎

خلاصہ تفسیر: آگے تہجد کی ایک تیسری علت ہے جس میں رات کو خاص کرنے کی حکمت کا بیان ہے، وہ یہ کہ:

بیشک تم کو دن میں بہت کام رہتا ہے (دنیوی بھی جیسے گھریلو امور کی تدبیر وانتظام، اور دینی بھی جیسے تبلیغ، اس لئے ان کاموں کے لئے رات تجویز کی گئی) اور (قیام لیل یعنی تہجد کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی) اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے (تعلق) قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ رہو (یعنی ذکر اور قطع تعلقات یہ ہر وقت کا فرض ہے، اور تعلق قطع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خالق کا تعلق مخلوق کے سب تعلقات پر غالب رہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دن میں لوگوں کو سمجھانا اور دوسرے کئی طرح کے مشاغل رہتے ہیں، گو وہ بھی آپ ﷺ کے حق میں بالواسطہ عبادت ہیں، تاہم بلا واسطہ پروردگار کی عبادت اور مناجات کے لیے رات کا وقت مخصوص رکھنا چاہیے، اگر عبادت میں مشغول ہو کر رات کی بعض حوائج چھوٹ جائیں تو کچھ پروا نہیں دن میں ان کی تلافی ہو سکتی ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی علاوہ قیام لیل کے دن میں بھی (گو بظاہر مخلوق سے معاملات وعلائق رکھنے پڑتے ہیں) لیکن دل سے اسی پروردگار کا علاقہ سب پر غالب رکھے اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اسی کی یاد میں مشغول رہیے غیر اللہ کا کوئی تعلق ایک آن کے لیے ادھر سے توجہ کو ہٹنے نہ دے بلکہ سب تعلقات کٹ کر باطن میں اسی ایک کا تعلق باقی رہ جائے یا یوں کہو کہ سب تعلقات اسی ایک تعلق میں مدغم ہو جائیں جسے صوفیہ کے ہاں ''بے ہمہ و باہمہ'' یا ''خلوت در انجمن'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝٩

مالک مشرق ومغرب کا ۱؎ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں سو پکڑ لے اس کو کام بنانے والا ۲؎

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝١٠

اور سہتا رہ جو کچھ کہتے رہیں ۳؎ اور چھوڑ دے ان کو بھلی طرح کا چھوڑنا ۴؎

خلاصہ تفسیر: (آگے توحید کے ساتھ اس مضمون کی تاکید اور تصریح ہے یعنی) وہ مشرق ومغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں تو اسی کو اپنے کام سپرد کرنے کے لئے قرار دیئے رہو، اور یہ لوگ جو جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ ہو جاؤ (''الگ ہونا'' یہ کہ کوئی تعلق نہ رکھو، اور ''خوبصورتی'' سے یہ کہ ان کی شکایت اور انتقام کی فکر میں مت پڑو)

* * *

فائدہ: ۱؎ مشرق دن کا اور مغرب رات کا نشان ہے، گویا اشارہ کر دیا کہ دن اور رات دونوں کو اسی مالک مشرق ومغرب کی یاد اور رضا جوئی میں لگانا چاہیے۔

فائدہ: ۲ یعنی بندگی بھی اس کی اور توکل بھی اسی پر ہونا چاہیے، جب وہ وکیل و کارساز ہو تو دوسروں سے کٹ جانے اور الگ ہونے کی کیا پرواہ ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی کفار آپ ﷺ کو ساحر، کاہن اور مجنون و مسحور وغیرہ کہتے ہیں، ان باتوں کو صبر و استقلال سے سہتے رہیے۔

فائدہ: ۴ ''بھلی طرح کا چھوڑنا'' یہ کہ ظاہر میں ان کی صحبت ترک کرو اور باطن میں ان کے حال سے خبردار رہو کہ کیا کرتے ہیں اور کیا کہتے ہیں اور مجھ کو کس طور سے یاد کرتے ہیں، دوسرے ان کی بدسلوکی کی شکایت کسی کے سامنے نہ کرو، نہ انتقام لینے کے درپے ہو، نہ گفتگو یا مقابلہ کے وقت کج خلقی کا اظہار کرو، تیسرے یہ کہ باوجود جدائی اور مفارقت کے ان کی نصیحت میں قصور نہ کیجیے، بلکہ جس طرح بن پڑے ان کی ہدایت و راہنمائی میں سعی کرتے رہیے، حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں: ''یعنی خلق سے کنارہ کر، لیکن لڑ بھڑ کر نہیں، سلوک سے'' مگر یاد رہے کہ یہ آیت مکی اور آیات قتال کا نزول مدینہ میں ہوا ہے۔

وَذَرۡنِیۡ وَالۡمُکَذِّبِیۡنَ اُولِی النَّعۡمَۃِ وَمَهِّلۡهُمۡ قَلِیۡلًا ﴿۱۱﴾ اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡکَالًا وَّجَحِیۡمًا ﴿۱۲﴾ وَّطَعَامًا

اور چھوڑ دے مجھ کو اور جھٹلانے والوں کو جو آرام میں رہے ہیں اور ڈھیل دے ان کو تھوڑی سی ۱ البتہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور آگ کا ڈھیر اور کھانا

ذَا غُصَّۃٍ وَّعَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۳﴾ یَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ وَکَانَتِ الۡجِبَالُ کَثِیۡبًا مَّهِیۡلًا ﴿۱۴﴾

گلے میں اٹکنے والا اور عذاب دردناک ۲ جس دن کہ کانپے گی زمین اور پہاڑ اور ہو جائیں گے پہاڑ ریت کے تودے پھسلتے ۳

خلاصہ تفسیر: اب آگے ان کے عذاب کی خبر دے کر رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

اور مجھ کو اور ان جھٹلانے والوں کو ناز و نعمت میں رہنے والوں کو (موجودہ حالت پر) چھوڑ دو (یعنی رہنے دو) اور ان لوگوں کو تھوڑے دنوں اور مہلت دے دو (یہ کنایہ ہے صبر و انتظار سے، یعنی کچھ دن اور صبر کر لیجئے عنقریب ان کو سزا ہونے والی ہے، کیونکہ) ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے (ایک اور جگہ ارشاد ہے: **یتجرّعہ ولا یکاد یسیغہ**) اور دردناک عذاب ہے (پس ان لوگوں کو ان چیزوں سے سزا دی جائے گی اور یہ سزا اُس روز ہوگی) جس روز زمین و پہاڑ ہلنے لگیں اور پہاڑ (ریزہ ریزہ ہو کر) ریگ رواں ہو جائیں گے (پھر اڑتے پھریں گے)۔

وَذَرۡنِیۡ: اس کی تفسیر پیچھے سورہ قلم آیت ۴۴: فَذَرۡنِیۡ وَمَنۡ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ میں گذر چکی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حق و صداقت کو جھٹلانے والے جو دنیا میں عیش و آرام کر رہے ہیں ان کا معاملہ میرے سپرد کیجیے، میں خود ان سے نبٹ لوں گا، مگر تھوڑی سی ڈھیل ہے۔

فائدہ: ۲ عذاب دردناک سانپوں اور بچھوؤں کا اور خدا جانے کس کس قسم کا (العیاذ باللہ)۔

فائدہ: ۳ یعنی اس عذاب کی تمہید اس وقت سے شروع ہوگی جب پہاڑوں کی جڑیں ڈھیلی ہو جائیں گی اور وہ کانپ کر گر پڑیں گے اور ریزہ ریزہ ہو کر ایسے ہو جائیں گے جیسے ریت کے تودے جن پر قدم جم نہ سکے۔

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاهِدًا عَلَیۡکُمۡ کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ﴿۱۵﴾

ہم نے بھیجا تمہاری طرف رسول بتلانے والا تمہاری باتوں کا ۱ جیسے بھیجا فرعون کے پاس رسول ۲

فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾

پھر کہا نہ مانا فرعون نے رسول کا پھر پکڑی ہم نے اس کو وبال کی پکڑ ۳

خلاصہ تفسیر: (اب آگے جھٹلانے والوں کو التفات کے طور پر خطاب ہے جس میں رسالت کو ثابت کرنے کے ساتھ عذاب کا یقینی ہونا بھی بیان کرتے ہیں، یعنی) بیشک ہم نے تمہارے پاس ایک ایسا رسول بھیجا ہے جو تم پر (قیامت کے روز) گواہی دیں گے (کہ ان لوگوں نے تبلیغ کے بعد کیا برتاؤ کیا) جیسا ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول بھیجا تھا، پھر فرعون نے اس رسول کا کہنا نہ مانا تو ہم نے اس کو سخت پکڑنا پکڑا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی یہ پیغمبر اللہ کے ہاں گواہی دے گا کہ کس نے اس کا کہنا مانا اور کس نے نہیں مانا تھا۔

فائدہ: ۲ یعنی حضرت موسیٰ کی طرح تم کو مستقل دین اور عظیم الشان کتاب دے کر بھیجا، شاید یہ اس پیشین گوئی کی طرف اشارہ ہے جو تورات سفر استثناء میں ہے کہ "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا"۔

فائدہ: ۳ جب موسیٰ کے منکر کو ایسا سخت پکڑا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کو کیوں نہ پکڑے گا جو تمام انبیاء سے افضل اور برتر ہیں۔

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ط

پھر کیونکر بچو گے اگر منکر ہو گئے اس دن سے جو کر ڈالے لڑکوں کو بوڑھا ۱ آسمان پھٹ جائے گا اس دن میں

كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾ ع ۱ ۱۹/۱۲

اس کا وعدہ ہونے والا ہے ۲ یہ تو نصیحت ہے پھر جو کوئی چاہے بنا لے اپنے رب کی طرف راہ ۳

خلاصہ تفسیر: سو اگر تم (بھی رسول کی بعثت کے بعد نافرمانی اور) کفر کرو گے تو (اسی طرح ایک روز تم کو بھی مصیبت بھگتنا پڑے گی، چنانچہ وہ مصیبت کا دن آنے والا ہے سو تم) اس دن (کی مصیبت) سے کیسے بچو گے جو (اپنی سختی اور طول کی وجہ سے) بچوں کو بوڑھا کر دے گا (یہ کنایہ ہے سختی اور شدت سے، مقصود یہ ہے کہ وہ دن بہت سخت ہوگا) جس میں آسمان پھٹ جائے گا بیشک اس کا وعدہ ضرور ہو کر رہے گا (یہ بھی احتمال نہیں ہے کہ وہ وقت ٹل جائے) یہ (تمام مضمون) ایک (بلیغ) نصیحت ہے سو جس کا جی چاہے اپنے پروردگار کی طرف رستہ اختیار کرے (یعنی اس تک پہنچنے کے لئے دین کا رستہ قبول کرے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دنیا میں اگر بچ گئے تو اس دن کیونکر بچو گے جس دن کی شدت اور درازی بچوں کو بوڑھا کر دینے والی ہوگی، خواہ فی الحقیقت بچے بوڑھے نہ ہوں، لیکن اس روز کی سختی اور لمبائی کا اقتضاء یہی ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کا وعدہ اٹل ہے ضرور ہو کر رہے گا، خواہ تم اس کو کتنا ہی بعید از امکان سمجھو۔

فائدہ: ۳ یعنی نصیحت کر دی گئی، اب جو اپنا فائدہ چاہے اس نصیحت پر عمل کر کے اپنے رب سے مل جائے، راستہ کھلا پڑا ہے، کوئی روک ٹوک نہیں، نہ خدا کا کچھ فائدہ ہے، تم سو دفعہ اپنا فائدہ سمجھو تو سیدھے لے آؤ۔

ربط: رات کے جاگنے کا حکم جو شروع سورت میں تھا تقریباً ایک سال تک رہا، پھر اگلی آیت سے منسوخ ہوا:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ط

بیشک تیرا رب جانتا ہے کہ تو اٹھتا ہے نزدیک دو تہائی رات کے اور آدھی رات کے اور تہائی رات کے اور کتنے لوگ تیرے ساتھ کے ۱

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ

اور اللہ ماپتا ہے رات کو اور دن کو، اس نے جانا کہ تم اس کو پورا نہ کرسکو گے سو تم پر معافی بھیج دی اب پڑھو جتنا تم کو آسان ہو قرآن سے ۲

خلاصہ تفسیر: اب آگے اس قیام لیل یعنی تہجد کی فرضیت کو منسوخ کیا جاتا ہے جو سورت کے شروع میں مذکور تھا یعنی:

آپ کے رب کو معلوم ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھ والوں میں سے بعض آدمی (کبھی) دو تہائی رات کے قریب اور (کبھی) آدھی رات اور (کبھی) تہائی رات (نماز میں) کھڑے رہتے ہیں، اور رات اور دن کا پورا اندازہ اللہ ہی کرسکتا ہے، اس کو معلوم ہے کہ تم اس (وقت کی مقدار) کو ضبط نہیں کرسکتے (اور اس وجہ سے تم کو سخت مشقت لاحق ہوتی ہے، کیونکہ اندازہ سے تخمینہ کرنے میں تو کمی کا شبہ رہتا ہے، اور اندازہ سے زیادہ کرنے میں تمام رات کے قریب صرف ہوجاتی ہے تاکہ مقررہ وقت یقیناً پورا ہوجائے اور ان دونوں صورتوں میں روحانی یا جسمانی شدید مشقت ہے اور وقت جاننے کے آلات موجود نہ تھے) تو (ان اسباب کی وجہ سے) اس نے تمہارے حال پر عنایت کی (اور اُس پہلے حکم کو منسوخ فرمادیا) سو (اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو (مراد اس قرآن پڑھنے سے تہجد پڑھنا ہے کہ اس میں قرآن پڑھا جاتا ہے، اور یہ مستحب حکم ہے، مطلب یہ کہ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی، اب جس قدر وقت تک آسان ہو مستحب کے طور پر اگر چاہو پڑھ لیا کرو، اور حکم منسوخ ہونے کی اصل علت مشقت ہے جس پر علم ان لن تحصوہ کا قرینہ دلالت کرتا ہے اور اس سے پہلے یعنی آیت کے شروع کا مضمون اس کی تمہید ہے)۔

وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ: بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تہجد کی فرضیت عام تھی، یہاں لفظ طائفة سے یہ شبہ نہ ہو کہ فقط بعض پر فرض تھی، کیونکہ لفظ مِنْ بیان کا احتمال بھی رکھتا ہے، یا ممکن ہے کہ یہ طائفہ آپ کے ساتھ قیام کرتے ہوں اور باقی خود انفرادی الگ الگ، اور حکم منسوخ ہونا بھی بظاہر عام معلوم ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی اور امت کے حق میں بھی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے اس کے حکم کی پوری تعمیل کی، کبھی آدھی کبھی تہائی اور کبھی دو تہائی رات کے قریب اللہ کی عبادت میں گزاری، چنانچہ روایات میں ہے کہ صحابہ کے پاؤں راتوں کو کھڑے کھڑے سوج جاتے اور پھٹنے لگتے تھے، بلکہ بعض تو اپنے بال رسی سے باندھ لیتے تھے کہ نیند آئے تو جھٹکا لگ کر تکلیف سے آنکھ کھل جائے۔

فائدہ: ۲ یعنی رات اور دن کی پوری پیمائش تو اللہ کو معلوم ہے وہی ایک خاص اندازہ سے کبھی رات کو دن سے گھٹاتا کبھی بڑھاتا اور کبھی دونوں کو برابر کردیتا ہے، بندوں کو اس نیند اور غفلت کے وقت روزانہ آدھی، تہائی، اور دو تہائی رات کی پوری طرح حفاظت کرنا خصوصاً جبکہ گھڑی گھنٹوں کا سامان نہ ہو، سہل کام نہیں تھا، اسی لیے بعض صحابہ رات بھر نہ سوتے تھے کہ کہیں نیند میں ایک تہائی رات بھی جاگنا نصیب نہ ہو، اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے معافی بھیج دی اور فرمادیا کہ تم اس کو ہمیشہ پوری طرح نباہ نہ سکو گے، اس لیے اب جس کو اٹھنے کی توفیق ہو، وہ جتنی نماز اور اس میں جتنا قرآن چاہے پڑھ لے، اب امت کے حق میں نہ نماز تہجد فرض ہے نہ وقت کی یا مقدار تلاوت کی کوئی قید ہے۔

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ

جانا کہ کتنے ہو تم میں سے بیمار، اور کتنے لوگ پھریں گے ملک میں ڈھونڈتے اللہ کے فضل کو

وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

اور کتنے لوگ لڑتے ہوں گے اللہ کی راہ میں، سو پڑھ لیا کرو جتنا آسان ہو اس میں سے، اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ ۱

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ

اور قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دینا[۲] اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے واسطے کوئی نیکی اس کو پاؤ گے اللہ کے پاس

خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۰ ع

بہتر اور ثواب میں زیادہ[۳] اور معافی مانگو اللہ سے، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے[۴]

خلاصہ تفسیر: (اب آگے تہجد کا حکم منسوخ ہونے کی دوسری علت کا بیان ہے کہ) اس کو (یہ بھی) معلوم ہے کہ بعض آدمی تم میں بیمار ہوں گے، اور بعض تلاش معاش کے لئے ملک میں سفر کریں گے، اور بعض اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے (اس لئے بھی اس حکم کو منسوخ کر دیا، کیونکہ ان حالتوں میں تہجد اور اس کے اوقات کی پابندی مشکل تھی) سو (اس لئے بھی تم کو اجازت ہے کہ اب) تم لوگ جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جاسکے پڑھ لیا کرو (اس کی تفسیر ابھی گذری ہے، اور چونکہ اس حکم کو ہر علت پر مستقل طور پر مرتب کیا ہے اس لیے تکرار نہ رہا) اور (اگرچہ تہجد کا حکم منسوخ ہوگیا، مگر یہ احکام اب بھی باقی ہیں یعنی یہ کہ) نماز (فرض) کی پابندی رکھو اور زکوۃ دیتے رہو اور اللہ کو اچھی طرح (یعنی اخلاص سے) قرض دو اور جو نیک عمل اپنے لئے آگے (ذخیرہ آخرت کا بنا کر) بھیج دو گے اس کو اللہ کے پاس پہنچ کر اس سے اچھا اور ثواب میں بڑا پاؤ گے (یعنی دنیوی اغراض میں خرچ کرنے سے جو عوض اور نفع حاصل ہوتا ہے نیک کاموں میں خرچ کرنے سے اس سے بہتر اور بڑا نفع ملے گا) اور اللہ سے گناہ معاف کراتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (استغفار بھی انہی باقی احکام میں سے ہے)۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: اس کی تفسیر سورہ مؤمنون آیت ۴: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: [۱] یعنی اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ تم میں بیمار بھی ہوں گے اور مسافر بھی جو ملک میں روزی یا علم وغیرہ کی تلاش کرتے پھریں گے اور وہ مرد مجاہد بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے، ان حالات میں شب بیداری کے احکام پر عمل کرنا سخت دشوار ہوگا، اس لیے تم پر تخفیف کر دی کہ نماز میں جس قدر قرآن پڑھنا آسان ہو پڑھ لیا کرو، اپنی جان کو زیادہ تکلیف میں ڈالنے کی ضرورت نہیں، ہاں فرض نمازیں نہایت اہتمام سے باقاعدہ پڑھتے رہو، اور زکوۃ دیتے رہو، اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے رہو کہ ان ہی باتوں کی پابندی سے، بہت کچھ روحانی فوائد اور ترقیات حاصل ہوسکتی ہیں۔

تنبیہ: اولین صحابہ سے ایک سال تک بہت تاکید و تحتّم کے ساتھ یہ ریاضت شاقہ شاید اس لیے کرائی کہ وہ لوگ آئندہ تمام امت کے ہادی و معلم بننے والے تھے، ضرورت تھی کہ وہ اس قدر منجھ جائیں اور روحانیت کے رنگ میں ایسے رنگے جائیں کہ تمام دنیا ان کے آئینہ میں کمالات محمدی ﷺ کا نظارہ کر سکے اور یہ نفوس قدسیہ ساری امت کی اصلاح کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

فائدہ: [۲] پورے اخلاص سے اللہ کی راہ میں اس کے احکام کے موافق خرچ کرنا یہی اس کو اچھی طرح قرض دینا ہے، بندوں کو اگر قرض حسن دیا جائے وہ بھی اس کے عموم میں داخل سمجھو کما ثبت فضله فی الحديث۔

فائدہ: [۳] یعنی جو نیکی یہاں کرو گے، اللہ کے ہاں اس کو نہایت بہتر صورت میں پاؤ گے اور بہت بڑا اجر اس پر ملے گا تو یہ مت سمجھو کہ جو نیکی ہم کرتے ہیں یہیں ختم ہو جاتی ہے، نہیں، وہ سب سامان تم سے آگے اللہ کے ہاں پہنچ رہا ہے جو عین حاجت کے وقت تمہارے کام آئے گا۔

فائدہ: [۴] یعنی تمام احکام بجالا کر پھر اللہ سے معافی مانگو، کیونکہ کتنا ہی محتاط شخص ہو اس سے بھی کچھ نہ کچھ تقصیر ہو جاتی ہے، کون ہے جو دعویٰ کر سکے کہ میں نے اللہ کی بندگی کا حق پوری طرح ادا کر دیا، بلکہ جتنا بڑا ابندہ ہو اسی قدر اپنے کو تقصیروار سمجھتا ہے اور اپنی کوتاہیوں کی معافی چاہتا ہے، اے غفور و رحیم تو اپنے فضل سے میری خطاؤں اور کوتاہیوں کو بھی معاف فرما (آمین)۔

ایاتها ٥٦ ۞ ٧٤ سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ ٤ ۞ رکوعاتها ٢

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں اصل مقصود حضور ﷺ کی تسلی تھی اور ضمن میں کفار کو ڈرانا بھی تھا، اس سورت میں اصل مقصود ڈرانا ہے اور ضمن میں حضور ﷺ کو تسلی بھی ہے، اس سورت کی ابتدائی آیات کا شان نزول یہ ہے کہ احادیث میں ہے کہ سب سے پہلے سورہ اقرا کے شروع کی چند آیتیں نازل ہو کر بعض حکمتوں کی وجہ سے کچھ عرصہ وحی نازل نہ ہوئی، پھر ایک جنگل میں آپ ﷺ کو ایک آواز سنائی دی، اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو جبرائیل علیہ السلام آسمان وزمین کے درمیان ایک تخت پر بیٹھے ہیں، آپ ہیبت سے گھبرا کر لوٹ آئے اور کپڑوں میں لپٹ گئے، اس پر اس سورت کی شروع کی آیتیں نازل ہوئیں، لفظ ''مدثر'' اسی کی طرف اشارہ ہے، اور سورت کی شروع کی آیتیں نبوت کے ابتدائی زمانہ کی ہیں، بقیہ سورت کا نزول بعد میں ہوا ہے، الاتقان سے معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ سورت کا نزول سورہ مزمل کے بعد ہوا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿١﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿٢﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿٣﴾

اے لحاف میں لپٹنے والے ۱ کھڑا ہو پھر ڈر سنا دے ۲ اور اپنے رب کی بڑائی بول ۳

خلاصہ تفسیر: اے کپڑے میں لپٹنے والے! اٹھو (یعنی اپنی جگہ سے اٹھو یا یہ کہ مستعد ہو جاؤ) پھر (کافروں کو) ڈراؤ (جو کہ نبوت کا فرض منصبی ہے) اور اپنے رب کی بڑائیاں کرو (کہ تبلیغ میں سب سے پہلی چیز توحید ہے)۔

قُمْ فَاَنْذِرْ: یہاں بشارت دینے کو اس لیے نہیں فرمایا کہ یہ آیت بالکل شروع زمانہ نبوت کی ہے، اس وقت بجز ایک دو کے کوئی مسلمان نہ تھا اس لیے ڈرانا ہی زیادہ مناسب تھا۔

* * *

فائدہ: ۱ اس کے لیے سورۃ مزمل کا پہلا فائدہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

فائدہ: ۲ یعنی وحی کے ثقل اور فرشتہ کی ہیبت سے آپ کو گھبرانا اور ڈرنا نہیں چاہیے، آپ کا کام تو یہ ہے کہ سب آرام وچین چھوڑ کر دوسروں کو خدا کا خوف دلائیں اور کفر و معصیت کے برے انجام سے ڈرائیں۔

فائدہ: ۳ کیونکہ رب کی بڑائی بولنے اور بزرگی وعظمت بیان کرنے ہی سے اس کا خوف دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تقدیس ہی وہ چیز ہے جس کی معرفت سب اعمال واخلاق سے پہلے حاصل ہونی چاہیے، بہرحال اس کے کمالات وانعامات پر نظر کرتے ہوئے نماز میں اور نماز سے باہر اس کی بڑائی کا اقرار واعلان کرنا تمہارا کام ہے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿٤﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿٥﴾

اور اپنے کپڑے پاک رکھ، اور گندگی سے دور رہ ۱

خلاصہ تفسیر: اور (آگے بعض ضروری اعمال وعقائد اور اخلاق کی تعلیم ہے جس پر خود بھی عمل کرنا چاہئے کہ تبلیغ کے ساتھ اپنی اصلاح بھی ضروری ہے یعنی ایک تو) اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے (یہ اعمال میں سے ہے، اور چونکہ بالکل ابتداء میں نماز نہ تھی اس لئے اس کا حکم نہیں ہوا) اور (دوسرے یہ کہ) بتوں سے الگ رہو (جس طرح کہ اب تک الگ ہو، یہ عقائد میں سے ہے، یعنی سابقہ دستور کے مطابق توحید پر دوام رکھو)۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ: باوجودیکہ رسول اللہ ﷺ سے شرک میں مبتلا ہونے کا کوئی احتمال نہ تھا پھر بھی یہ حکم اس لئے دیا گیا تا کہ عقیدہ توحید کی اہمیت معلوم ہو کہ معصوم پیغمبر کو بھی باوجود احتیاج نہ ہونے کے اس کی تعلیم کی جاتی ہے تو غیر معصوم تو بدرجہ اولی اس کا مکلف ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱ اس سورت کے نازل ہونے پر حکم ہوا کہ مخلوق کو خدا کی طرف بلائیں، پھر نماز وغیرہ کا حکم ہوا، نماز کے لیے شرط ہے کہ کپڑے پاک ہوں اور گندگی سے احتراز کیا جائے، ان چیزوں کو یہاں بیان فرمادیا، یہ ظاہر ہے کہ جب کپڑوں کا حسی و معنوی نجاستوں سے پاک رکھنا ضروری ہے تو بدن کی پاکی بطریق اولیٰ ضروری ہوگی اس لیے اس کے بیان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، بعض علماء نے کپڑوں کو پاک رکھنے سے نفس کا برے اخلاق سے پاک رکھنا مراد لیا ہے، اور گندگی سے دور رہنے کے معنی یہ لیے ہیں کہ بتوں کی گندگی سے دور رہیے جیسے اب تک دور ہیں، بہرحال آیہ ہذا میں طہارت ظاہری و باطنی کی تاکید مقصود ہے، کیونکہ بدون اس کے رب کی بڑائی کما حقہ دلنشین نہیں ہوسکتی۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝٦ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝٧

اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بدلہ بہت چاہے، اور اپنے رب سے امید رکھ ۱

خلاصہ تفسیر: اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ (دوسرے وقت) زیادہ معاوضہ چاہو (یہ اخلاق کے متعلق ہے) اور پھر (انذار و تبلیغ میں جو تکلیف پیش آئے اس پر) اپنے رب (کی خوشنودی) کے واسطے صبر کیجئے (یہ خاص اخلاق تبلیغ سے متعلق ہے، پس یہ آیتیں جامع ہو گئیں اصلاح اعمال و اخلاق کو اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی)۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ: اگرچہ دوسروں کے لئے یہ بات جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے جیسا سورۃ روم کی آیت: **وما اتیتم من ربا الخ** کی تفسیر سے معلوم ہوسکتا ہے، لیکن حضور ﷺ کی شان چونکہ اعلیٰ وارفع ہے اس لئے آپ ﷺ پر اس کو بھی حرام کردیا گیا جیسا کہ روح المعانی میں ہے: "والأصح أن النهى للتحريم وأنه من خواصه عليه الصلوة والسلام".

بعض نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ بدلہ اور جواب میں زیادہ چاہنے کے خیال سے مت دو، بعض نے کہا ہے کہ دے کر زیادہ مت سمجھو، اور بعض نے کہا ہے کہ اپنی نیکیوں کو زیادہ سمجھ کر مت جتلاؤ۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ ہمت اور اولوالعزمی سکھلائی کہ جو کسی کو دے (روپیہ پیسہ یا علم و ہدایت وغیرہ) اس سے بدلہ نہ چاہیے، محض اپنے رب کے دیے پر شاکر و صابر رہ اور جو شدائد دعوت و تبلیغ کے راستہ میں پیش آئیں ان کو اللہ کے واسطے صبر و تحمل سے برداشت کر اور اسی کے حکم کی راہ دیکھ کہ یہ عظیم الشان کام بدون اعلیٰ درجہ کی حوصلہ مندی اور صبر و استقلال کے انجام نہیں پائے گا، ان آیتوں کی تفسیر اور بھی کئی طرح کی گئی ہے، لیکن احقر کے خیال میں یہی بے تکلف ہے۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝٨ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝٩ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ۝١٠

پھر جب بجنے لگے وہ کھوکھری چیز ۱ پھر وہ اس دن مشکل دن ہے ۲ منکروں پر نہیں آسان ۳

خلاصہ تفسیر: پھر (اس ڈرانے کے بعد جو کوئی ایمان نہ لائے اس کے لئے یہ وعید ہے کہ) جس وقت صور پھونکا جائے گا سو وہ وقت یعنی وہ دن کافروں پر ایک سخت دن ہوگا جس میں ذرا آسانی نہ ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی صور پھونکا جائے۔

فائدہ: ۲ یعنی اس دن کے واقعات میں سے صور کا پھونکا جانا گویا ایک مستقل دن ہے جو سرتا پا مشکلات اور سختیوں سے بھرا ہوگا۔

فائدہ: ۳ یعنی منکروں پر کسی طرح کی آسانی نہ ہوگی، بلکہ اس دن کی سختی دم بدم ان پر بڑھتی جائے گی، بخلاف مومنین کے کہ اگر سختی بھی دیکھیں گے تو کچھ مدت کے بعد پھر آسانی کر دی جائے گی۔

ذَرۡنِیۡ وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ﴿۱۱﴾ وَّ جَعَلۡتُ لَہٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ﴿۱۲﴾

چھوڑ دے مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے بنایا اکیلا ۱ اور دیا میں نے اس کو مال پھیلا کر

وَّ بَنِیۡنَ شُہُوۡدًا ﴿۱۳﴾ وَّ مَہَّدۡتُّ لَہٗ تَمۡہِیۡدًا ﴿۱۴﴾

اور بیٹے مجلس میں بیٹھنے والے ۲ اور تیاری کر دی اس کے لیے خوب تیاری ۳

خلاصہ تفسیر: آگے آنے والی آیات کا شان نزول یہ ہے کہ ولید بن مغیرہ کافر بڑا مال دار تھا، اس کے دس بیٹے تھے جو اس کے پاس رہتے تھے، مالی کشادگی کی وجہ سے ان کو معاش کی تلاش میں کہیں جانا نہ پڑتا تھا، وہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے اس کو قرآن پڑھ کر سنایا، وہ کسی قدر متاثر ہوا، مگر ابوجہل نے اس کو ورغلایا اور قریش میں تذکرہ ہوا کہ اگر ولید مسلمان ہوگا تو بڑی خرابی ہوگی، اسی ولید کے بارہ میں یہ آیات نزل ہوئی، اور یہاں ذرنی ومن خلقت سے سا صلیہ سقر سے کچھ آگے تک اسی کے متعلق مضمون ہے۔

(آگے بعض خاص کفار کا ذکر ہے یعنی) مجھ کو اور اس شخص کو (اپنے اپنے حال پر) رہنے دو (کہ ہم اس سے نمٹ لیں گے) جس کو میں نے (مال واولاد سے خالی اور) اکیلا پیدا کیا (جیسا کہ پیدا ہونے کے وقت آدمی کے پاس نہ مال ہوتا ہے اور نہ اولاد، مراد اس سے ولید بن مغیرہ ہے جس کا قصہ ابھی گذر چکا) اور اس کو کثرت سے مال دیا اور پاس رہنے والے بیٹے (دیئے) اور سب طرح کا سامان اس کے لئے مہیا کر دیا۔

وَمَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا: ولید بن مغیرہ کو "وحید" کہنے میں ایک نکتہ کی بھی رعایت ہے، وہ قریش میں مال واولاد کی کثرت کی وجہ سے منفرد تھا اور قریش میں اس جیسا کوئی دوسرا شخص نہ تھا اس وجہ سے وہ قریش میں "وحید" مشہور تھا، لیکن یہاں اللہ تعالی نے دوسرے معنی کے اعتبار سے وحید فرمایا جو کہ اس کی عاجزی اور ذلت پر دلالت کرتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ ہر انسان ماں کے پیٹ سے اکیلا اور جریدہ آتا ہے، مال، اولاد، فوج لشکر، سامان وغیرہ کچھ ساتھ نہیں لاتا، یا "وحید" سے مراد خاص ولید بن مغیرہ ہو جس کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں ہیں، وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور دنیاوی ثروت ولیاقت کے اعتبار سے عرب میں فرد اور یکتا سمجھا جاتا تھا، مطلب یہ ہے کہ ایسے منکروں کے معاملہ میں جلدی نہ کیجیے، نہ ان کو مہلت ملنے سے تنگدل ہوں، بلکہ ان کا قصہ میرے سپرد کرو، میں سب کا بھگتان کر دوں گا، آپ کو غمگین و پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی مال واولاد کا پھیلاوا بہت ہوا، دسوں بیٹے ہمہ وقت آنکھوں کے سامنے رہتے اور محفلوں میں باپ کی توقیر بڑھاتے اور دھاک بٹھلاتے تھے، تجارتی کاروبار اور دوسرے کام کاج کے لیے نوکر چاکر بہت تھے، ضرورت نہیں تھی کہ بیٹے باپ کی نظر سے غائب ہوں۔

فائدہ: ۳ یعنی دنیا میں جو خوب عزت جمادی اور مسند حکومت وریاست اچھی طرح تیار کر دی، چنانچہ تمام قریش ہر مشکل میں کام میں اسی کی طرف رجوع کرتے اور اس کو اپنا حاکم جانتے تھے۔

ثُمَّ یَطۡمَعُ اَنۡ اَزِیۡدَ ﴿۱۵﴾ کَلَّا ؕ اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیۡدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرۡہِقُہٗ صَعُوۡدًا ﴿۱۷﴾

پھر لالچ رکھتا ہے کہ اور بھی دوں ۱ ہر گز نہیں وہ ہے ہماری آیتوں کا مخالف ۲ اب اس سے چڑھواؤں گا بڑی چڑھائی ۳

خلاصہ تفسیر: پھر بھی (اس کثرت سے مال واولاد ہونے کے باوجود وہ شکر بجانہ لایا کہ ایمان لے آتا، بلکہ اس وافر نعمت کو کفر اور ناقدری کی وجہ سے کم سمجھ کر) اس بات کی ہوس رکھتا ہے کہ (اس کو) اور زیادہ دوں، ہرگز (وہ زیادہ دینے کے قابل) نہیں! (کیونکہ) وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے (اور مخالفت کے ساتھ ناقابل معافی ہونا ظاہر ہے، اگرچہ ڈھیل کے طور پر مہلت دے دی جائے تو وہ الگ ہے، لیکن اس آیت کے نازل ہونے کے وقت سے اس شخص کی ظاہری ترقی بھی بند ہوگئی، چنانچہ پھر نہ کوئی اولاد ہوئی، نہ کچھ مال بڑھا، اور یہ سزا تو دنیا میں ہے اور آخرت میں) اس کو عنقریب (یعنی مرنے کے بعد) دوزخ کے پہاڑ پر چڑھاؤں گا۔

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا: حدیث ترمذی میں مرفوع روایت ہے کہ ''صعود'' دوزخ میں ایک پہاڑ ہے، ستر برس میں اس کی چوٹی پر پہنچے گا، پھر وہاں سے گر پڑے گا، پھر اسی طرح ہمیشہ چڑھے گا اور گرے گا اور وجہ اس سزا کی وہی عناد ہے جو پیچھے بیان ہوئی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی باوجود کثرت نعمت وثروت کے کبھی حرف شکر زبان سے نہ نکالا، بلکہ ہمیشہ بت پرستی اور زیادہ مال جمع کرنے کی حرص میں منہمک رہتا اور اگر رسول کریم ﷺ کبھی اس کے سامنے بہشت کی نعمتوں کا ذکر فرماتے تو کہتا تھا کہ اگر یہ شخص اپنے بیان میں سچا ہے تو یقین کامل ہے کہ وہاں کی نعمتیں بھی مجھے ہی ملیں گی، اس کو فرماتے ہیں کہ باوجود اس قدر ناشکری اور حق ناشناسی کے یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا وآخرت کی نعمتیں اور زیادہ دے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی جب وہ منعم حقیقی کی آیتوں کا مخالف ہے تو اسے ہرگز حق نہیں پہنچتا کہ ایسی توقع باندھے اور خیالی پلاؤ پکائے، کہتے ہیں کہ ان آیات کے نزول کے بعد پے بہ پے اس کے مال واسباب میں نقصان ہونا شروع ہوا، آخر فقیر ہو کر ذلت کے ساتھ مر گیا۔

فائدہ: ۳ یعنی ابھی اس کو بہت بڑی چڑھائی چڑھنا اور سخت ترین مصائب میں گرفتار ہونا ہے، بعض روایات میں ہے کہ ''صعود'' دوزخ میں ایک پہاڑ ہے جس پر کافر کو ہمیشہ چڑھائیں گے اور گرائیں گے یہ بھی عذاب کی ایک قسم ہے۔

ربط: ولید ایک بار آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے قرآن پڑھ کر سنایا، جس سے کسی قدر متاثر ہوا، مگر ابوجہل نے اس کو ورغلایا اور قریش میں چرچا ہونے لگا کہ اگر ولید مسلمان ہو گیا تو بڑی خرابی ہوگی، غرض سب جمع ہوئے اور آپ ﷺ کے بارے میں گفتگو ہوئی کسی نے کہا شاعر ہیں کسی نے کاہن بتلایا ولید بولا کہ میں شعر میں خود بڑا ماہر ہوں اور کاہنوں کی باتیں بھی سب سنی ہیں، قرآن نہ شعر ہے نہ کہانت، لوگوں نے کہا کہ آخر تیری کیا رائے ہے کہنے لگا ذرا سوچ لوں، آخر تیوری بدل کر اور منہ بنا کر کہا کچھ نہیں جادو ہے جو بابل والوں سے نقل ہوتا چلا آیا ہے، حالانکہ پیشتر قرآن سن کر کہہ چکا تھا کہ یہ سحر بھی نہیں نہ دیوانے کی بڑ معلوم ہوتی ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے مگر محض برادری کو خوش کرنے کے لیے اب یہ بات بنادی، آگے اسی گفتگو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ

اس نے فکر کیا اور دل میں ٹھہرا لیا، سو مارا جائیو کیسا ٹھہرایا، پھر مارا جائیو کیسا ٹھہرایا ۱ پھر نگاہ کی، پھر تیوری چڑھائی

وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾

اور منہ تھتھایا، پھر پیٹھ پھیری اور غرور کیا، پھر بولا اور کچھ نہیں یہ جادو ہے چلا آتا، اور کچھ نہیں یہ کہا ہوا ہے آدمی کا ۲

خلاصہ تفسیر: ایک بار یہی ولید بن مغیرہ اور دیگر کفار جمع ہوئے اور آپ ﷺ کے بارہ میں گفتگو ہوئی، کسی نے کہا آپ شاعر ہیں، کسی نے کہا آپ کاہن ہیں، ولید نے کہا کہ میں شعر گوئی میں خود بڑا ماہر ہوں، اور کاہنوں کی باتیں بھی سب سنی ہیں، قرآن نہ شعر ہے نہ کہانت، لوگوں نے پوچھا کہ تیری کیا رائے ہے؟ کہا کہ سوچ لوں، چنانچہ سوچ کر کہنے لگا کہ مجھ کو تو ساحر معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ دوستوں میں تفریق پیدا کرنا ہے

جوسورہ مزمل کے شروع میں بھی بیان ہوئی، جبکہ اس سے قبل ولید یہ بھی کہہ چکا تھا کہ یہ ساحر بھی نہیں، اور مجنون کلام بھی نہیں، یہ کلام اللہ ہے، مگر محض اپنی برادری کو خوش کرنے کے لیے اب یہ بات بنائی، چنانچہ اب آگے اسی کے متعلق ارشاد ہے۔

(آگے بھی اسی ولید کی کچھ تفصیل ہے وہ یہ کہ) اس شخص نے (اس بارے میں) سوچا (کہ قرآن کی شان میں کیا بات تجویز کروں؟) پھر (سوچ کر) ایک بات تجویز کی (جس کا بیان آگے آتا ہے) سواس پر خدا کی مار ہو کیسی بات تجویز کی (اور) پھر (مکرر) اس پر خدا کی مار ہو کیسی تجویز کی (یہ بار بار تعجب اس کی سخت مذمت کے لیے ہے، یعنی کیسی بے جوڑ بات تجویز کی جس کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا) پھر (حاضرین کے چہروں کو) دیکھا (کہ وہ تجویز کی ہوئی بات ان سے کہوں) پھر منہ بنایا (تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ اس کو قرآن سے بہت کراہت وانقباض ہے) اور زیادہ منہ بنایا، پھر منہ پھیرا اور تکبر ظاہر کیا (جیسا عادت ہے کہ جس چیز کو اعراض کے قابل سمجھتے ہیں تو اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی گردن پھیر لیتے ہیں اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں) پھر بولا کہ بس یہ تو جادو ہے (جو اوروں سے) منقول (ہے) بس یہ تو آدمی کا کلام ہے (یہ بیان ہے اس کی تجویز کا، مطلب یہ کہ اللہ کا کلام نہیں، بلکہ بشر کا کلام ہے جس کو آپ کسی جادوگر سے نقل کردیتے ہیں، یا آپ خود مصنف ہیں، لیکن یہ مضامین گذشتہ انبیاء سے منقول ہیں اور اس کی عبارت کا اسلوب نعوذ باللہ آپ کے سحر کا اثر ہے)۔

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ: بے جوڑ بات اس لیے تجویز کی کیونکہ جادو عادی امور میں سے ہے اور ایک حد تک اس کی قوت ہوتی ہے، لیکن اس میں اتنی قوت نہیں کہ غائب لوگوں پر بھی مؤثر ہوجائے، اور گذشتہ اور بعد والوں پر بھی اثر کرجائے، کیونکہ گذشتہ لوگوں کے کلام میں سے کوئی اس کا مثل پیش نہ کرسکا، اور بعد والوں کی نسبت بھی دعوی کیا جائے کہ کوئی اس کے مثل نہیں بنا سکتا، اور جھوٹے کو ایسے دعوی کی اولاتو جرات کہاں، پھر آئندہ چل کر بہت جلد اس کی تکذیب ہوجاتی ہے، غرض نہایت مہمل بات تجویز کی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بدبخت نے دل میں سوچ کر ایک بات تجویز کی کہ قرآن جادو ہے، خدا غارت کرے کیسی مہمل تجویز کی، پھر خدا غارت کرے کہ اپنی قوم کے جذبات کے لحاظ سے کیسی برمحل تجویز نکالی جس کو سن کر سب خوش ہوجائیں۔

فائدہ: ۲ یعنی مجمع پر نگاہ ڈالی پھر خوب منہ بنایا، تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ اس کو قرآن سے بہت کراہت اور انقباض ہے، پھر پیٹھ پھیرلی، گویا بہت ہی قابل نفرت چیز کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے، حالانکہ اس سے قبل اس کی حقانیت کا اقرار کرچکا تھا، اب برادری کی خوشنودی کے لیے اس سے پھر گیا، آخر نہایت غرور وتکبر کے انداز میں کہنے لگا، بس اور کچھ نہیں یہ جادو ہے جو پہلوں سے نقل ہوتا چلا آتا ہے، اور یقینا یہ آدمی کا کلام ہے جو جادو بن کر باپ کو بیٹے سے، میاں کو بیوی سے، اور دوست کو دوست سے جدا کردیتا ہے۔

سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾

اب اس کو ڈالوں گا آگ میں ۱ اور تو کیا سمجھا کیسی ہے آگ، نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے ۲

خلاصہ تفسیر: (اب آگے اس عناد کی سزا دتفصیلا بیان فرماتے ہیں جیسا کہ پیچھے: سارھقه صعودا میں اجمالاً فرمایا تھا یعنی) میں اس کو جلدی دوزخ میں داخل کروں گا، اور تم کو کچھ خبر ہے کہ دوزخ کیسی چیز ہے؟ (وہ ایسی ہے کہ) نہ تو (داخل ہونے کے بعد داخل ہونے والے کی کوئی چیز جلانے سے) باقی رہنے دے گی اور نہ (جو کفار اس وقت باہر ہوں گے نہ ان میں سے کسی کو بغیر اپنے اندر لیے ہوئے) چھوڑے گی۔

پیچھے آیت: انه كان لأيتنا عنيدا میں جرم کا اور سارھقه صعودا میں سزا کا ذکر اجمالی طور پر تھا، اور اس کے بعد آگے چل کر انه فكر وقدر میں عنیدا کی تفصیل تھی، اور پھر یہاں ساصلیه سقر میں سارھقه کی تفصیل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی عنقریب اس کو آگ میں ڈال کر عناد و تکبر کا مزا چکھاؤں گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دوزخیوں کی کوئی چیز باقی نہ رہنے دے گی جو جلنے سے بچ جائے، پھر جلانے کے بعد اس حالت پر بھی نہ چھوڑے جائیں بلکہ دوبارہ اصلی حالت پر لوٹائے جائیں گے اور جلیں گے، یہی سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا (العیاذ باللہ)۔

تنبیہ: اکثر سلف سے یہی معنی منقول ہیں، بعض مفسرین نے دوسری طرح توجیہ کی ہے۔

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾

جلا دینے والی ہے آدمیوں کو ۱؎ اس پر مقرر ہیں انیس فرشتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ (دوزخ کی آگ جلا کر) بدن کی حیثیت بگاڑ دے گی (اور) اس پر انیس فرشتے (جو اس کے نگران ہیں جن میں ایک کا نام ''مالک'' ہے مقرر) ہوں گے (جو کافروں کو انواع و اقسام کے عذاب دیں گے)۔

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ: حاصل یہ کہ فرشتے جن کی قوت معلوم ہے باوجودیکہ ان میں ایک فرشتہ بھی تمام اہل جہنم کو عذاب دینے کے لئے کافی ہے پھر انیس فرشتوں کے مقرر ہونے سے ظاہر ہے کہ عذاب کا بہت زیادہ ہی اہتمام ہوگا اور خاص انیس کے عدد میں نکتہ حقیقۃً اللہ ہی کو معلوم ہے، لیکن دوسرے حضرات نے جو ذکر کیا ہے اس سب میں اقرب وہ ہے جو اللہ نے اس حقیر کے دل میں القاء فرمایا ہے وہ یہ کہ اصلاً کفار کو عذاب عقائد حق کی مخالفت پر ہوگا، اور قطعی عقائد جو عملیات کے متعلق نہیں رسالہ ''فروع الایمان'' کی تفصیل کے مطابق نو ہیں: ① اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ② یہ عقیدہ رکھنا کہ عالم حادث (نو پیدا شدہ) ہے ③ فرشتوں پر ایمان ④ تمام آسمانی کتابوں پر ایمان ⑤ تمام پیغمبروں پر ایمان ⑥ تقدیر پر ایمان ⑦ قیامت کے دن پر ایمان ⑧ جنت کا یقین کرنا ⑨ دوزخ کا یقین کرنا، باقی سب عقائد انہی کی شاخیں ہیں یا انہی سے ملحق ہیں، اور قطعی عقائد جو عملیات کے متعلق ہیں وہ دس ہیں: جن میں سے پانچ مامورات کے متعلق ہیں، یعنی ان کے واجب ہونے کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے، وہ پانچ مامورات جو شعائر اسلام ہیں یہ ہیں: ① تلفظ بالشہادتین ② اقامت صلوٰۃ ③ ایتاء زکوٰۃ ④ صوم رمضان ⑤ حج بیت اللہ اور پانچ منہیات کے متعلق ہیں، یعنی ان کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھنا واجب ہے، اور وہ پانچ منہیات جو کہ آیت امتحان وغیرہ میں مذکور ہیں یہ ہیں: ① چوری ② زنا ③ قتل، خصوصاً قتل اولاد ④ بہتان ⑤ عصیان فی المعروف جس میں غیبت و ظلم، یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھانا وغیرہ سب آ گیا، پس یہ سب عقائد ملا کر انیس ہوئے، شاید ایک ایک عقیدہ کے مقابلے میں ایک ایک فرشتہ معین ہو، چونکہ ان سب میں ایک عقیدہ سب سے بڑا ہے یعنی توحید اس لیے ان فرشتوں میں بھی ایک فرشتہ سب سے بڑا مقرر ہوا ہو، یعنی ''مالک''، واللہ علم باسرارہ۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بدن کی کھال جھلس کر حیثیت بگاڑ دے گی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جیسے دہکتا لوہا سرخ نظر آتا ہے آدمی کی پنڈلی پر وہ سرخی نظر آئے گی''۔

فائدہ: ۱؎ یعنی دوزخ کے انتظام پر جو فرشتوں کا لشکر ہوگا اس کے افسر انیس فرشتے ہوں گے، جن میں سب سے بڑے ذمہ دار کا نام ''مالک'' ہے۔

تنبیہ: حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے نہایت تفصیل سے انیس کے عدد کی حکمتیں بیان کی ہیں جو قابل دید ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ جہنم میں مجرموں کو عذاب دینے کے لیے انیس قسم کے فرائض ہیں جن میں سے ہر فرض کی انجام دہی ایک ایک فرشتہ کی سرکردگی میں ہوگی، کوئی شبہ نہیں کہ فرشتہ کی طاقت بہت بڑی ہے اور ایک فرشتہ وہ کام کر سکتا ہے جو لاکھوں آدمی مل کر نہیں کر سکتے، لیکن یاد رہے کہ ہر فرشتہ کی یہ قوت اسی دائرہ میں محدود ہے جس میں کام کرنے کے لیے وہ مامور ہوا ہے، مثلاً ملک الموت لاکھوں آدمیوں کی جان ایک آن میں نکال سکتا ہے، مگر عورت کے پیٹ میں ایک بچہ کے اندر جان

نہیں ڈال سکتا، حضرت جبرائیل چشم زدن میں وحی لا سکتے ہیں لیکن پانی برسانا ان کا کام نہیں، جس طرح کان دیکھ نہیں سکتا آنکھ سن نہیں سکتی، اگرچہ اپنی قسم کے کام کتنے ہی سخت ہوں کر سکتے ہیں، مثلاً کان ہو سکتا ہے کہ ہزاروں آوازیں سن لے اور نہ تھکے، آنکھ ہزاروں رنگ دیکھ لے اور عاجز نہ ہو، اسی طرح اگر ایک فرشتہ عذاب کے واسطے دوزخیوں پر مقرر ہوتا اس سے ایک ہی قسم کا عذاب دوزخیوں پر ہو سکتا تھا، دوسری قسم کا عذاب جو اس کے دائرہ استعداد سے باہر ہے ممکن نہ تھا اس لیے انیس قسم کے عذابوں کے لیے (جن کی تفصیل تفسیر عزیزی میں ہے) انیس ذمہ دار فرشتے مقرر ہوئے ہیں، علماء نے اس عدد کی حکمتوں پر بہت کچھ کلام کیا ہے مگر احقر کے نزدیک حضرت شاہ صاحبؒ کا کلام بہت عمیق ولطیف ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۠ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ

اور ہم نے جو رکھے ہیں دوزخ پر داروغہ وہ فرشتے ہی ہیں ؎۱ اور ان کو جو گنتی رکھی ہے سو جانچنے کو منکروں کے ؎۲

لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

تاکہ یقین کرلیں وہ لوگ جن کو ملی ہے کتاب اور بڑھے ایمانداروں کا ایمان اور دھوکا نہ کھائیں جن کو ملی ہے

الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ

کتاب اور مسلمان ؎۳ اور تاکہ کہیں وہ لوگ جن کے دل میں روگ ہے اور منکر ؎۴ کیا غرض تھی اللہ کو

بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ

اس مثل سے ؎۵ یوں بچلاتا ہے جس کو چاہتا ہے اور راہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ؎۶ اور کوئی نہیں جانتا تیرے رب کے لشکر کو مگر خود ہی ؎۷

وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝۳۱ ع ۱۵

وہ تو سمجھاتا ہے لوگوں کے واسطے ؎۸

خلاصہ تفسیر: اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ گذشتہ آیت: عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ کو جب کفار نے سنا تو ایک بیہودہ کافر جس کا نام ابوالاشد بن اسید بن کلاۃ جمحی تھا، بہت طاقت ور تھا، بول اٹھا کہ اے قوم قریش! تم اس سے ڈرنا مت، اور کچھ فکر نہ کرو، ان انیس فرشتوں کے لئے تو میں اکیلا کافی ہوں، میں اپنے داہنے بازو سے دس کو بائیں بازو سے نو کو دفع کر کے ان انیس کا خاتمہ کردونگا، اور ایک روایت میں ہے کہ ابوجہل نے کہا کہ وہ فرشتے تو انیس ہی ہیں اور تم لوگ تعداد میں بہت زیادہ ہو، کیا دس آدمی بھی ایک ایک فرشتہ کو کافی نہ ہوں گے تو اس پر یہ اگلی آیت نازل ہوئی۔

اور (گذشتہ آیت کا مضمون سن کر جو کفار نے تمسخر کیا جس کا بیان ابھی گذر چکا اس پر یہ مضمون نازل ہوا کہ) ہم نے دوزخ کے کارکن (آدمی نہیں بلکہ) صرف فرشتے بنائے ہیں (جن میں سے ایک ایک فرشتہ میں تمام انسان وجنات کے برابر قوت ہے) اور ہم نے جو ان کی تعداد (ذکر وحکایت میں) صرف ایسی رکھی ہے جو کافروں کو گمراہی کا ذریعہ ہو (مراد اس سے انیس کا عدد ہے) تو اس لئے (کہ یہ نتائج اس پر مرتب ہوں یعنی) تاکہ اہل کتاب (سننے کے ساتھ) یقین کرلیں اور ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے اور اہل کتاب اور مومنین شک نہ کریں، اور تاکہ جن لوگوں کے دلوں میں (شک کا) مرض ہے وہ اور کافر لوگ کہنے لگیں کہ اس عجیب مضمون سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصود ہے؟ (آگے فریقین کے حال پر نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں کہ جس طرح حق تعالیٰ نے ایمان والوں کو اس باب میں خاص ہدایت کی اور کافروں کو اس باب میں خاص گمراہ کیا) اسی طرح اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کردیتا ہے، اور (آگے گذشتہ مضمون کی تکمیل ہے کہ جہنم کے نگران فرشتوں کا عدد انیس ایک خاص

حکمت کی بنا پر ہے ورنہ) تمہارے رب کے (ان) لشکروں (کی یعنی فرشتوں کی تعداد اس کثرت سے ہے کہ اس) کو بجز رب کے کوئی نہیں جانتا (اگر وہ چاہتے تو بے انتہا فرشتوں کو نگران بنا دیتے اور اب بھی اگر چہ نگران انیس ہیں مگر ان کے معاونین اور مددگار بہت کثرت سے ہیں، چنانچہ حدیث مسلم میں ہے کہ جہنم کو اس حال میں حاضر کیا جائے گا کہ اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے پکڑے ہوں گے) اور (جہنم کا حال بیان کرنے سے جو اصل مقصود ہے وہ عدد کی کمی یا کثرت یا دیگر باتوں پر موقوف نہیں، اصل مقصود تو یہ ہے کہ) دوزخ (کا حال بیان کرنا) صرف آدمیوں کی نصیحت کے لیے ہے (تا کہ وہاں کے عذاب کو سن کر ڈریں اور ایمان لائیں اور یہ مقصود کسی خاص خصوصیات پر موقوف نہیں، پس عقل کا تقاضا اور مطالبہ بھی یہی ہے کہ اصل مقصود کو محفوظ وملحوظ رکھ کر دیگر باتوں کے درپے نہ ہوں)۔

لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: تا کہ اہل کتاب یقین کرلیں، اہل کتاب کے یقین کی دو توجیہ ہوسکتی ہیں: ① ایک توجیہ یہ کہ ان کی کتاب میں بھی یہ عدد لکھا ہو تو وہ فوراً مان لیں گے، اور اگر اب ان کی کتابوں میں یہ عدد نہ ہو تو ممکن ہے کہ کتابوں کے ضائع اور محرف ہونے سے ضائع ہوگیا ہو ② دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ یہ عدد ان کی کتاب میں نہ ہو، لیکن وہ فرشتوں کی قوت کے قائل تھے، دوسری بہت سی باتیں جن کی حکمت خدا ہی کو معلوم ہے ان کی کتابوں میں بھی موجود تھیں تو ان کے پاس انکار کی کوئی وجہ اور سبب نہیں، پس یقین سے انکار و استہزاء کا نہ ہونا مراد ہوگا۔

وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا: اہل ایمان کے ایمان بڑھنے کی بھی دو توجیہ ہوسکتی ہیں: ① ایک یہ کہ اہل کتاب کے مان لینے کو دیکھ کر ان کا ایمان قوی ہو کہ آپ ﷺ اہل کتاب سے میل جول نہ ہونے کے باوجود گذشتہ اور سابقہ وحی کے مطابق خبر دیتے ہیں تو آپ ضرور نبی برحق ہیں ② دوسری توجیہ یہ کہ جب کوئی نیا مضمون نازل ہوتا تھا مسلمان اس پر ایمان لاتے تھے تو ایک مضمون ایمان میں اور بڑھ گیا، پس ایمان کی مقدار بڑھ گئی۔

وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ: اہل کتاب کے یقین اور اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ کے بیان کے بعد یہاں پھر وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ کو تاکید کے لئے بڑھایا تا کہ یقین کا اثبات اور شک کی نفی دونوں کی صراحت ہو جائے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: مرض کے معنی میں دو احتمال ہیں: ① ایک تو شک کا معنی، کیونکہ ظہور حق کے بعد بعض جاحد اور منکر ہوتے ہیں، بعض متردد ہوتے ہیں تو اہل مکہ بھی ایسے لوگ ہوں گے ② دوسرا معنی نفاق تو اس میں پیشین گوئی ہوگی کہ مدینہ میں منافق ہوں گے اور ان کا یہ قول ہوگا اور مومنین اور اہل کتاب کے اثبات اور شک کی نفی کو جدا جدا اس لئے بیان فرمایا کہ اہل کتاب کا یقین اور شک کی نفی لغوی ہے اور مومنین کی شرعی۔

* * *

فائدہ: ۱ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً: انیس کا عدد سن کر مشرکین ٹھٹھا کرنے لگے کہ ہم ہزاروں ہیں، انیس ہمارا کیا کرلیں گے، بہت ہوا ہم میں سے دس دس ان کے ایک ایک کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں گے، ایک پہلوان بولا کہ سترہ کو تو میں اکیلا کافی ہوں، دو کا تم مل کر تیا پانچا کر لینا، اس پر یہ آیت اتری، یعنی وہ انیس تو ہیں مگر آدمی نہیں فرشتہ ہیں، جن کی قوت کا یہ حال ہے کہ ایک فرشتہ نے قوم لوط کی ساری بستی کو ایک بازو پر اٹھا کر پٹک دیا تھا۔

فائدہ: ۲ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یعنی کافروں کو عذاب دینے کے لیے انیس کی گنتی خاص حکمت سے رکھی ہے جس کی طرف عليها تسعة عشر کے فائدہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس گنتی کے بیان کرنے میں منکروں کی جانچ ہے، دیکھتے ہیں کہ کون اس کو سن کر ڈرتا ہے اور کون ہنسی مذاق اڑاتا ہے۔

فائدہ: ۳ وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ: اہل کتاب کو پہلے سے یہ عدد معلوم ہوگا جیسا کہ ترمذی کی ایک روایت میں ہے یا کم از کم کتب سماویہ کے ذریعہ اتنا تو جانتے تھے کہ فرشتوں میں کس قدر طاقت ہے، انیس بھی تھوڑے نہیں، اور یہ کہ انواع تعذیب کے اعتبار سے مختلف فرشتے دوزخ پر مامور ہونے چاہئیں یہ کام تنہا ایک کا نہیں، بہر حال اس بیان سے اہل کتاب کے دلوں میں قرآن کی حقیقت کا یقین پیدا ہوگا، اور یہ دیکھ کر مومنین کا ایمان بڑھے گا اور ان دونوں جماعتوں کو قرآن کے بیان میں کوئی شک و تردد نہیں رہے گا، نہ مشرکین کے استہزاء و تمسخر سے وہ کچھ دھوکا کھائیں گے۔

فائدہ: ۴؎ **الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ** : سے منافقین یا ضعیف الایمان مراد ہیں اور **وَالْكٰفِرُوْنَ** سے کھلے ہوئے منکر۔

فائدہ: ۵؎ **مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا** : یعنی انیس کے بیان سے کیا غرض تھی، بھلا ایسی بے تکی اور غیر موزوں بات کو کون مان سکتا ہے (العیاذ باللہ)۔

فائدہ: ۶؎ **كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ** : یعنی ایک ہی چیز سے بد استعداد آدمی گمراہ ہوجاتا ہے اور سلیم الطبع راہ پا لیتا ہے جسے ماننا مقصود نہ ہو وہ کام کی بات کو ہنسی مذاق میں اڑا دیتا ہے اور جس کے دل میں خوف خدا اور نور توفیق ہو اسکے ایمان و یقین میں ترقی ہوتی ہے۔

فائدہ: ۷؎ **وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ** : یعنی اللہ کے بے شمار لشکروں کی تعداد اسی کو معلوم ہے، انیس تو صرف کارکنان جہنم کے افسر بتلائے ہیں۔

فائدہ: ۸؎ **وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ** : یعنی دوزخ کا ذکر صرف عبرت و نصیحت کے لیے ہے کہ اس کا حال سن کر لوگ غضب الٰہی سے ڈریں اور نافرمانی سے باز آئیں۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾

سچ کہتا ہوں اور قسم ہے چاند کی، اور رات کی جب پیٹھ پھیرے، اور صبح کی جب روشن ہووے، وہ ایک ہے بڑی چیزوں میں کی ۱؎

نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾

ڈرانے والی ہے لوگوں کو، جو کوئی چاہے تم میں سے کہ آگے بڑھے یا پیچھے رہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: آگے جہنم کی سزا کا کسی قدر بیان ہے جس میں ذکری للبشر کے اجمال کی تفصیل ہے، پس ارشاد ہے کہ:

باتحقیق قسم ہے چاند کی، اور رات کی جب جانے لگے، اور صبح کی جب روشن ہوجائے کہ وہ دوزخ بڑی بھاری چیز ہے، جو انسان کے لئے بڑا ڈراوا ہے یعنی تم میں جو (خیر کی طرف) آگے بڑھے اس کے لئے بھی یا جو (خیر سے) پیچھے ہٹے اس کے لئے بھی۔

مطلب یہ کہ تمام انسان اور جنات کے لیے ''نذیر'' یعنی ڈرانے والی ہے، چونکہ اس ڈرانے کا نتیجہ قیامت میں ظاہر ہوگا اس لیے ایسی چیزوں کی قسم کھائی گئی جو قیامت کے بہت ہی مناسب ہے، چنانچہ چاند کا پہلے بڑھنا پھر گھٹنا اس عالم کے نشوونما، اور پھر کمزوری اور فنا ہونے کا نمونہ ہے، یہاں تک کہ چاند کے مٹنے یعنی بے نور ہوجانے کی طرح یہ عالم بھی بالکل فنا ہوجائے گا، اسی طرح اِس عالم دنیا کو اُس عالم آخرت کے ساتھ حقائق کے پوشیدہ اور ظاہر ہونے میں ایسی نسبت ہے جیسے رات کو دن کے ساتھ، پس اِس عالم دنیا کا ختم ہونا رات گذر جانے کے مشابہ ہے، اور اُس عالم آخرت کا ظاہر ہونا صبح چمکنے کے مشابہ ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو بڑی بڑی ہولناک اور عظیم الشان چیزیں ظاہر ہونے والی ہیں دوزخ ان میں کی ایک چیز ہے۔

فائدہ: ۲؎ آگے بڑھے نیکی یا بہشت کی طرف اور پیچھے رہے بدی میں پھنسا ہوا یا دوزخ میں پڑا ہوا، بہر حال مقصود یہ ہے کہ دوزخ سب مکلفین کے حق میں بڑے ڈراوے کی چیز ہے اور چونکہ اس ڈرانے کے عواقب و نتائج قیامت میں ظاہر ہوں گے، اس لیے قسم ایسی چیزوں کی کھائی جو قیامت کے بہت ہی مناسب ہے، چنانچہ چاند کا اول بڑھنا پھر گھٹنا نمونہ ہے اس عالم کے نشوونما اور اضمحلال و فنا کا، اسی طرح اس عالم دنیا کو عالم آخرت کے ساتھ حقائق کے اختفاء و انکشاف میں ایسی نسبت ہے جیسے رات کو دن کے ساتھ، گویا اس عالم کا ختم ہوجانا رات کے گزر جانے اور اس عالم کا ظہور نور صبح کے پھیل جانے کے مشابہ ہے، واللہ اعلم۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّآ أَصْحٰبَ الْيَمِينِ ﴿٣٩﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٤٠﴾

ہر ایک جی اپنے کیے کاموں میں پھنسا ہوا ہے، مگر داہنی طرف والے، باغوں میں ہیں مل کر پوچھتے ہیں

عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٤١﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿٤٢﴾

گناہ گاروں کا حال ۱؎ تم کا ہے سے جا پڑے دوزخ میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے دنیا اور اہل دنیا کے بعض احوال کا بیان ہے یعنی) ہر شخص اپنے اعمال (کفریہ) کے بدلہ میں (دوزخ میں) محبوس ہوگا مگر داہنے والے (یعنی مؤمنین جس کی تفصیل سورۃ واقعہ میں گزر چکی ہے، اور چونکہ یہاں اصحاب الیمین کا ذکر بائیں والوں یعنی کافروں کے مقابلہ میں کہا گیا ہے تو مقربین بھی اس میں شامل ہیں، حاصل یہ کہ مومنین اس قید سے مستثنیٰ ہیں) کہ وہ بہشتوں میں ہوں گے (اور) مجرموں (یعنی کفار) کا حال (خود ان کفار ہی سے) پوچھتے ہوں گے (اور یہ سوال زجر و تنبیہ کے لئے ہوگا، حاصل یہ کہ مومنین کفار سے پوچھیں گے کہ) تم کو دوزخ میں کس بات نے داخل کیا؟۔

فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ: جنت اور دوزخ میں تو بہت دوری اور بعد ہوگا پھر اس کے باوجود ان کے درمیان گفتگو اور کلام کی کیفیت کیسے ہوگی؟ اس کا جواب سورہ اعراف کی آیت ۴۶: وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ کی تفسیر میں گذر چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو لوگ میثاق کے دن حضرت آدم کی پشت سے داہنی طرف سے نکلے تھے اور دنیا میں بھی سیدھی چال چلتے رہے اور موقف میں بھی عرش کے داہنی طرف جدھر بہشت ہے کھڑے ہوئے اور اسی طرف روانہ ہوئے اور ان کے نامہ اعمال بھی داہنے ہاتھ میں آئے وہ لوگ البتہ قید میں پھنسے ہوئے نہیں، بلکہ جنت کے باغوں میں آزاد ہیں اور نہایت بے فکر اور فارغ البال ہو کر آپس میں ایک دوسرے سے یا فرشتوں سے گنہگاروں کا حال پوچھتے ہیں کہ وہ لوگ کہاں گئے جو نظر نہیں پڑتے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جب سنیں گے کہ گنہگاروں کو دوزخ میں داخل کیا گیا ہے، تب ان گنہگاروں کی طرف متوجہ ہو کر یہ سوال کریں گے کہ باوجود عقل و دانائی کے تم اس دوزخ کی آگ میں کیسے آ پڑے۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿٤٥﴾

وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے، اور نہ تھے کھانا کھلاتے محتاج کو، اور ہم تھے باتوں میں دھنستے دھنسنے والوں کے ساتھ

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤٦﴾ حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿٤٧﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾

اور ہم تھے جھٹلاتے انصاف کے دن کو، یہاں تک کہ آ پہنچی ہم پر وہ یقینی بات ۱؎ پھر کام نہ آئے گی ان کی سفارش سفارش کرنے والوں کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: وہ (دوزخی جواب میں) کہیں گے کہ ہم نہ تو نماز پڑھا کرتے تھے، اور نہ غریب کو (جس کا حق واجب تھا) کھانا کھلایا کرتے تھے، اور (جو لوگ دین حق کو باطل ثابت کرنے میں مشغول رہتے تھے ان) مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی (اس دین کو باطل ثابت کرنے کے) مشغلہ میں رہا کرتے تھے، اور قیامت کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے، یہاں تک کہ (اسی حالت میں) ہم کو موت آگئی (اور ہم ان حرکتوں سے باز نہ آئے یعنی خاتمہ اسی نافرمانی پر ہوا، اس وجہ سے ہم دوزخ میں آئے) سو (حالت مذکورہ میں) ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع

نہ دے گی (اور نفع نہ پہنچنا سفارش کے نہ ہونے سے ثابت ہوجائے گا، یعنی کوئی ان کافروں کی شفاعت ہی نہ کر سکے گا جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد ہے: فمالنا من شافعين)۔

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ: اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفار فروعی احکام یعنی نماز، روزہ وغیرہ کے بھی مکلف ہوں، کیونکہ جہنم میں دو چیزیں ہیں: ایک مطلق عذاب ایک عذاب کی زیادتی، تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کفار کو نماز و روزہ وغیرہ چھوڑنے پر مستقل عذاب نہ ہوگا، بلکہ مستقل عذاب تو کفر کی وجہ سے ہوگا اور عذاب میں زیادتی ان فروعی احکام کو چھوڑنے کی وجہ سے ہوگی، کیونکہ اصول کے ضمن میں وہ ان فروع کے بھی مکلف ہیں، یعنی اصول کے ضمن میں وہ فروع بھی تبعاً آہی جاتے ہیں، اس لیے ضمنی طور پر مکلف ہونا عذاب کی زیادتی کا سبب ہوسکتا ہے، اور مسلمان چونکہ مستقل طور پر فروعات کے بھی مکلف ہیں ان کو محض ان فروع کے چھوڑ دینے سے بھی مستقل طور پر عذاب ہوسکتا ہے، اس کے متعلق کچھ تفصیل سورہ معارج آیت ۱۸: وَجَمَعَ فَأَوْعٰى کے خلاصہ تفسیر میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی نہ اللہ کا حق پہچانا نہ بندوں کی خبر لی۔ البتہ دوسرے لوگوں کی طرح حق کے خلاف بحثیں کرتے رہے اور بد صحبتوں میں رہ کر شکوک وشبہات کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم کو یقین نہ ہوا کہ انصاف کا دن بھی آنے والا ہے۔ ہمیشہ اس بات کو جھٹلایا کیے یہاں تک کہ موت کی گھڑی سر پر آن پہنچی اور آنکھوں سے دیکھ کر ان باتوں کا یقین حاصل ہوا جن کی تکذیب کیا کرتے تھے۔

فائدہ: ۲ے کافر کے حق میں کوئی سفارش نہ کرے گا اور کرے گا تو قبول نہ ہوگی۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾

پھر کیا ہوا ہے ان کو کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں لے گویا کہ وہ گدھے ہیں بدکنے والے، بھاگے ہیں غل مچانے سے ۲ے

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾

بلکہ چاہتا ہے ہر ایک مرد ان میں کا کہ ملیں اس کو ورق کھلے ہوئے ۳ے

خلاصہ تفسیر: (اب آگے ان کے اعراض پر زجر وتنبیہ ہے کہ جب کفر واعراض کی بدولت ان کی یہ گت بننے والی ہے) تو ان کو کیا ہوا کہ اس نصیحت (قرانی) سے روگردانی کرتے ہیں کہ گویا وہ وحشی گدھے ہیں جو شیر سے بھاگے جا رہے ہیں (اور اس بھاگنے کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ لوگ اس قرآن کو بزعم خود حجیت میں کافی نہیں سمجھتے) بلکہ ان میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے (آسمانی) نوشتے دیئے جائیں (جیسا در منثور میں قتادہ سے مروی ہے کہ بعض کفار نے آپ ﷺ سے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کا اتباع کریں تو خاص ہمارے نام آسمان سے ایسے نوشتے آئیں جن میں آپ کی اتباع کا حکم لکھا ہوا ہو، چنانچہ ارشاد ہے: حتى تنزّل علينا كتٰبا نقرؤه)۔

كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ: کفار کو وحشی گدھے سے تشبیہ دینے میں کئی باتوں کی رعایت ہے: ① اول تو گدھا بے وقوفی اور حماقت میں مشہور ہے ② دوسرے اس کو وحشی فرض کیا جس کو گورخر کہتے ہیں کہ وہ جو چیزیں ڈرنے کی نہیں ہوتیں ان سے بلاوجہ ڈرتا اور بدکتا بھاگتا ہے ③ تیسرے شیر سے اس کا ڈرنا فرض کیا کہ اس صورت میں ان کا بھاگنا انتہا درجہ ہوگا۔

صُحُفًا مُّنَشَّرَةً: یہاں مُنشّرة کا بڑھانا مقصود کی وضاحت کے لئے ہے، یعنی جیسے خطوط ہوتے ہیں کہ کھولے جاتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں ایسے ہی نوشتے ہمارے پاس آنے چاہئیں۔

* * *

فائدہ: لے یعنی یہ مصیبتیں سامنے ہیں، مگر نصیحت سن کر ٹس سے مس نہیں ہوتے بلکہ سننا بھی نہیں چاہتے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی حق کا شور و غل اور شیران خدا کی آوازیں سن کر جنگلی گدھوں کی طرح بھاگے جاتے ہیں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی پیغمبر کی بات ماننا نہیں چاہتے بلکہ ان میں ہر شخص کی آرزو یہ ہے کہ خود اس پر اللہ کے کھلے ہوئے صحیفے اتریں اور پیغمبر بنایا جائے حَتّٰی نُؤْتٰی مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ (الانعام: ۱۲۴) یا یہ کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس براہ راست ایک نوشتہ خدا کی طرف سے آئے جس میں محمد ﷺ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہو: حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (الاسراء: ۹۳)۔

كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾

ہرگز نہیں ۱؎ پر وہ ڈرتے نہیں آخرت سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے کفار کی درخواست کا ذکر تھا کہ ہمارے نام آسمانی نوشتے اتارے جائیں جس میں آپ کی اتباع کا حکم ہو، چنانچہ اب آگے ان کی اس بیہودہ درخواست کا رد ہے کہ یہ) یہ ہرگز نہیں (ہوسکتا، کیونکہ نہ اس کی ضرورت، اور نہ ہی یہ لوگ اس لائق ہیں، خاص طور پر اس وجہ سے کہ ان کی اس درخواست کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں یہ ارادہ ہو کہ اگر ایسا ہوگا تو اتباع کر لیں گے) بلکہ (سبب یہ ہے کہ) یہ لوگ آخرت (کے عذاب) سے نہیں ڈرتے (اس لئے حق کی طلب ہی نہیں ہے اور یہ درخواستیں محض ضد اور ہٹ دھرمی سے ہیں حتیٰ کہ اگر یہ درخواستیں بالفرض پوری بھی ہو جائیں تب بھی یہ لوگ اتباع نہیں کریں گے جیسا کہ ارشاد ہے: ولو نزلنا علیك كتبا فی قرطاس فلمسوه بایدیهم لقال الذین كفروا ان هذا الا سحر مبین)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ نہ ان میں لیاقت نہ اس کی ضرورت۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یہ بیہودہ درخواستیں بھی کچھ اس لیے نہیں کہ ایسا کر دیا جائے تو واقعی مان جائیں گے، بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ یہ لوگ آخرت کے عذاب سے نہیں ڈرتے اسلئے حق کی طلب نہیں اور یہ درخواستیں محض تعنت سے ہیں، اگر یہ درخواستیں بالفرض پوری کر دی جائیں تب بھی اتباع نہ کریں کما قال تعالیٰ: وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الانعام: ۷)

كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ

کوئی نہیں یہ تو نصیحت ہے ۱؎ پھر جو کوئی چاہے اس کو یاد کرے ۲؎ اور وہ یاد جبھی کریں کہ چاہے اللہ ۳؎

ع ۲ ۱۶ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

وہی ہے جس سے ڈرنا چاہیے اور وہی ہے بخشنے کے لائق ۴؎

خلاصہ تفسیر: اب آگے بطور نتیجہ کے اس کا رد اور اس پر زجر ہے کہ جب اس درخواست کا بیہودہ ہونا ثابت ہو گیا تو یہ: ہرگز نہیں (ہوسکتا، بلکہ) یہ قرآن (ہی) نصیحت (کے لئے کافی) ہے (دوسرے صحیفوں کی حاجت نہیں) سو (اس حالت میں) جس کا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے (اور جس کا جی چاہے نہ کرے جہنم میں جائے، ہم کو کوئی ضرورت نہیں کہ مطلوبہ قسم کے نوشتے نازل کریں) اور (قرآن کے تذکرہ یعنی ہدایت ہونے میں اس سے شبہ نہ کیا جائے کہ بعض لوگوں کو اس سے تذکرہ و ہدایت نہیں ہوتی، بات یہ ہے کہ قرآن اگرچہ فی نفسہ اپنی ذات کے اعتبار سے تذکرہ ہے لیکن) بدون خدا کے چاہے یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کریں گے (اور اس نہ چاہنے میں بعض حکمتیں ہیں، لیکن قرآن فی نفسہ تذکرہ ضرور ہے، پس اس سے تذکرہ حاصل کرو اور خدا کی اطاعت کرو کیونکہ) وہی ہے جس (کے عذاب) سے ڈرنا چاہئے اور (وہی ہے) جو

(بندوں کے گناہ) معاف کرتا ہے (جیسا کہ ارشاد ہے: ان ربك لسريع العقاب وانه لغفور رحيم)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہر ایک کو الگ الگ کتاب دی جائے، ایسا نہیں ہوسکتا، یہ ایک کتاب (قرآن کریم) ہی نصیحت کے لیے کافی ہے۔

فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی (یہ کتاب) ایک پر اتری تو کیا ہوا، کام تو سب کے آتی ہے''۔

فائدہ: ۳ اور اللہ کا چاہنا نہ چاہنا سب حکمتوں پر مبنی ہے، جن کا احاطہ کوئی بشر نہیں کرسکتا، وہی ہر شخص کی استعداد ولیاقت کو کما حقہ جانتا ہے اور اس کے موافق معاملہ کرتا ہے۔

فائدہ: ۴ یعنی آدمی کتنے ہی گناہ کرے، لیکن پھر جب تقویٰ کی راہ چلے گا اور اس سے ڈرے گا، وہ اس کے سب گناہ بخش دے گا، اور اس کی توبہ کو قبول کرے گا، انس ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس مقام پر بطور حاشیہ منہیہ کے، ایک عبارت اس آیت کی تلاوت کے بعد نقل فرمائی جس کے الفاظ یہ ہیں: ''قال ربكم عزوجل انا اهل ان اتقى فلا يشرك بی شیءٌ فاذا اتقانی العبد فانا اهل ان اغفر له''، یعنی میں اس لائق ہوں کہ بندہ مجھ سے ڈرے اور میرے ساتھ کسی کو کسی کام میں شریک نہ کرے، پھر جب بندہ مجھ سے ڈرا (اور شرک سے پاک ہوا) تو میری شان یہ ہے کہ میں اس کے گناہوں کو بخش دوں، حق تعالیٰ اپنے فضل ورحمت سے ہم کو توحید ایمان پر ہمیشہ قائم رکھے اور اپنی مہربانی سے ہمارے گناہ معاف فرمائے، آمین۔

ایاتها ۴۰ | ۷۵ سُورَةُ الْقِيٰمَةِ مَكِّيَّةٌ ۳۱ | رکوعاتها ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے ختم پر ارشاد تھا کہ یہ لوگ آخرت سے نہیں ڈرتے اور اس سے پہلے آخرت کے کچھ احوال بھی بیان ہوئے، اب اس سورت میں آخرت کے احوال کی تفصیل ہے اور اس کے ضمن میں موت کے وقت کا حال بھی مذکور ہے جو کہ آخرت کا مقدمہ اور تمہید ہے، اور دوبارہ زندہ ہونے کو ذہن میں قریب کرنے کے لیے ابتدائے پیدائش کا حال بھی بیان کیا ہے اور آیت: يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ سے چونکہ حق تعالیٰ کا انسان کے احوال واعمال کو محفوظ رکھنا باوجود انسان کے یاد نہ رکھنے کے ثابت ہوتا ہے اس کی مناسبت سے آیت: لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ میں حضور ﷺ کو وحی کے وقت زبان کو حرکت دینے سے منع فرمایا کہ ہم اس وحی کو آپ کے دل میں محفوظ کردیں گے، آپ اس فکر میں نہ پڑیں، اور یہ ربط وہی ہے جس کا بیان آگے آئے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ① وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ②

قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی ۱ اور قسم کھاتا ہوں جی کی کہ جو ملامت کرے برائی پر ۲

خلاصہ تفسیر: میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی، اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے (یعنی نیکی کرکے یہ کہے کہ میں نے کیا کیا ہے، اس میں اخلاص نہ تھا، اس میں فلانی خرابی رہ گئی تھی اور گناہ ہو جائے تو بہت ہی نادم ہو، پس اس معنی کے اعتبار سے یہ نفس مطمئنہ کو بھی شامل ہے)۔

یہاں جواب قسم محذوف ہے یعنی ''تم ضرور دوبارہ زندہ ہوگے''، اور ان دونوں قسموں کا اس مقام کے مناسب ہونا ظاہر ہے، قیامت کا تو اس لئے کہ وہ دوبارہ زندہ ہونے کا وقت ہے اور نفس لوامہ کا اس لیے کہ ایسا نفس قیامت کی عملی تصدیق کرنے والا ہوتا ہے۔

بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ: نفس انسانی کی تین قسمیں ہیں: ① ''نفس امارہ'' وہ ہے جو برائی کا حکم کرے ② ''نفس مطمئنہ'' وہ ہے جو خیر اور نیکی پر قرار پکڑ لے ③ ''نفس لوامہ'' سے مراد وہ نفس ہے جو خود اپنے اعمال کا محاسبہ کر کے اپنے آپ کو ملامت کرتا رہے، یعنی جو گناہ سرزد ہوا یا عمل واجب میں کوتاہی ہوئی اس پر خود اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اور اعمال خیر اور حسنات کے متعلق بھی اپنے آپ کو اس پر ملامت کرے کہ اس سے زیادہ نیک کام کر کے اعلیٰ درجات کیوں نہ حاصل کیے؟ غرض مومن کامل اپنے ہر عمل خیر و شر اور حسنات وسیئات میں اپنے آپ کو ہمیشہ ملامت ہی کرتا ہے، اور نفس لوامہ کی اس تفسیر کے مطابق یہ نفس مطمئنہ کو بھی شامل ہے لوامہ اور مطمئنہ دونوں نفس متقی کے لقب ہیں۔

نفس اپنی جبلت وفطرت کے اعتبار سے امارۃ بالسوء ہوتا ہے یعنی انسان کو برے کاموں کی طرف بلانے اور اس میں مبتلا کرنے کا داعی ہوتا ہے مگر ایمان اور عمل صالح اور ریاضت ومجاہدہ سے یہ نفس لوامہ بن جاتا ہے کہ برائی اور کوتاہی پر نادم ہونے لگتا ہے، مگر برائی سے بالکلیہ انقطاع اس کا نہیں ہوتا، آگے عمل صالح میں ترقی اور قرب حق تعالیٰ کے حصول میں کوشش کرتے کرتے جب اس کا یہ حال ہوجائے کہ شریعت اس کی طبیعت بن جائے اور خلاف شرع کام طبعی نفرت بھی ہونے لگے تو اس نفس کا لقب مطمئنہ ہوجاتا ہے، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قیامت کا دن جس کا ممکن ہونا عقل سے اور متیقن الوقوع ہونا ایسے مخبر صادق کی خبر سے ثابت ہو چکا ہے جس کے صدق پر دلائل قطعیہ قائم ہیں اس کی قسم کھاتا ہوں کہ تم یقیناً مرے پیچھے اٹھائے جاؤ گے اور ضرور بھلے برے کا حساب ہوگا۔

تنبیہ: واضح ہو کہ دنیا میں کئی قسم کی چیزیں ہیں جن کی قسم لوگ کھاتے ہیں، اپنے معبود کی، کسی معظم ومحترم ہستی کی، کسی مہتم بالشان چیز کی، کسی محبوب یا نادر شے کی، اس کی خوبی یا ندرت جتانے کے لیے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں کی قسمت کی قسم کھائیے، پھر بلغاء یہ بھی رعایت کرتے ہیں کہ مقسم بہ مقسم علیہ کے مناسب ہو، یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ مقسم بہ کو مقسم علیہ کے لیے شاہد ہی گردانا جائے، جیسے ذوق نے کہا ہے:

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندہ احساں   سر میرا ترے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا

یہاں اپنے سر کے نہ اٹھ سکنے پر محبوب کے سر کی قسم کھانا کس قدر موزوں ہے، شریعت حقہ نے غیر اللہ کی قسم کھانا بندوں کے لیے حرام کر دیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی شان بندوں سے جداگانہ ہے، وہ اپنے غیر کی قسم کھاتا ہے اور عموماً ان چیزوں کو جو اس کے نزدیک محبوب یا نافع یا وقیع ومہتم بالشان ہوں، یا مقسم علیہ کے لیے بطور شاہد وحجت کے کام دے سکیں، یہاں یوم قیامت کی قسم اس کے نہایت وقیع ومہتم بالشان ہونے کی وجہ سے ہے اور جس مضمون پر قسم کھائی ہے اس سے مناسبت ظاہر ہے، کیونکہ بعث ومجازات کا ظرف ہی یوم قیامت ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ محققین نے لکھا ہے کہ آدمی کا نفس ایک چیز ہے لیکن اس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین نام ہو گئے ہیں، اگر نفس عالم علوی کی طرف مائل ہو اور اللہ کی عبادت وفرمانبرداری میں اس کو خوشی حاصل ہوئی اور شریعت کی پیروی میں سکون اور چین محسوس کیا اس کو ''نفس مطمئنہ'' کہتے ہیں: يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ارۡجِعِيۡۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً (الفجر: 28-27) اور اگر عالم سفلی کی طرف جھک پڑا اور دنیا کی لذات وخواہشات میں پھنس کر بدی کی طرف رغبت اور شریعت کی پیروی سے بھاگا اس کو ''نفس امارہ'' کہتے ہیں، کیونکہ وہ آدمی کو برائی کا حکم کرتا ہے: وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِيۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيۡ (یوسف: 53) اور اگر کبھی عالم سفلی کی طرف جھکتا اور شہوت وغضب میں مبتلا ہوتا ہے اور کبھی عالم علوی کی طرف مائل ہو کر ان چیزوں کو برا جانتا ہے اور ان سے دور بھاگتا ہے اور کوئی برائی یا کوتاہی ہوجانے پر شرمندہ ہو کر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے اس کو ''نفس لوامہ'' کہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''آدمی کا جی اول کھیل میں اور مزوں میں غرق ہوتا ہے، ہرگز نیکی کی طرف رغبت نہیں کرتا، ایسے جی کو **امّارۃ بالسوء** کہتے ہیں، پھر ہوش پکڑا، نیک وبد سمجھا تو باز آیا کبھی (غفلت ہوئی تو) اپنی خو پر دوڑ پڑا، پیچھے کچھ سمجھ آئی تو اپنے کیے پر پچھتانے اور ملامت کرنے لگا، ایسا نفس (جی) ''لوامہ'' کہلاتا ہے، پھر جب پورا سنور گیا، دل سے رغبت نیکی ہی پر ہوگئی، بیہودہ کام سے خود بخود بھاگنے لگا اور بدی کے

ارتکاب بلکہ تصور سے تکلیف پہنچنے لگی وہ نفس ''مطمئنہ'' ہو گیا'' اھ بتغیر یسیر، یہاں ''نفس لوامہ'' کی قسم کھا کر اشارہ فرما دیا کہ اگر فطرت صحیح ہو تو خود انسان کا نفس دنیا ہی میں برائی اور تقصیر پر ملامت کرتا ہے، یہی چیز ہے جو اپنی اعلیٰ و اکمل ترین صورت میں قیامت کے دن ظاہر ہو گی۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝٣ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝٤

کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ جمع نہ کریں گے ہم اس کی ہڈیاں [1]۔ کیوں نہیں ہم ٹھیک کر سکتے ہیں اس کی پوریاں [2]۔

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝٥ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝٦

بلکہ چاہتا ہے آدمی کہ ڈھٹائی کرے اس کے سامنے، پوچھتا ہے کب ہو گا دن قیامت کا [3]۔

خلاصہ تفسیر: (اب آگے منکرین قیامت پر رد ہے یعنی) کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں ہرگز جمع نہ کریں گے (انسان سے مراد کافر ہے، اور ہڈیوں کو خاص طور پر اس لیے بیان کیا کہ بدن کی اصل قوت انہی پر ہے، آگے اس انکار کا جواب ہے یعنی) ہم ضرور جمع کریں گے (اور یہ جمع کرنا ہم کو کچھ دشوار نہیں) کیونکہ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پوریوں تک درست کر دیں (پس جو اس پر قادر ہو گا وہ آسان پر بدرجہ اولیٰ قادر ہو گا، لیکن پھر بھی بعض آدمی قدرت الٰہیہ میں غور نہیں کرتے اور قیامت کا قائل نہیں ہوتے) بلکہ (ایسا) بعض آدمی (قیامت کا منکر ہو کر) یوں چاہتا ہے کہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی (بے خوف وخطر ہو کر) فسق و فجور کرتا رہے (اس لئے بطور انکار کے) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا؟ (یعنی چونکہ اپنی عمر معاصی و شہوات میں گزارنا طے کر چکا ہے اس لئے اس کو طلب حق کی نوبت ہی نہیں آتی کہ قیامت کا ہونا اس کو ثابت ہوا، اس لئے انکار پر مصر ہے اور انکار کے طور پر پوچھتا ہے کہ کب آئے گی؟)۔

نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ: پوروں کو بطور خاص ذکر کرنا دو وجہ سے ہے: ایک یہ کہ وہ بدن کے تمام اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ہر شے کا کامل طور پر بننا اطراف ہی سے ہوتا ہے، چنانچہ ہمارے محاورہ میں بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں کہ میرے پور پور میں درد ہے، یعنی تمام بدن میں درد ہے، دوسرے یہ کہ پوروں کے چھوٹا ہونے کے باوجود ان میں صنعت کی رعایت زیادہ ہے، اور یہ عادۃً زیادہ دشوار ہے تو جو اس پر قادر ہو گا وہ آسان پر بدرجہ اولیٰ قادر ہو گا۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی یہ خیال ہے کہ ہڈیوں تک کا چورا ہو گیا اور ان کے ریزے مٹی وغیرہ کے ذرات میں جا ملے، بھلا اب کس طرح اکٹھے کر کے جوڑ دیے جائیں گے؟ یہ چیز تو محال معلوم ہوتی ہے۔

فائدہ: [2] یعنی ہم تو انگلیوں کی پوریاں بھی درست کر سکتے ہیں اور پوریوں کی تخصیص شاید اس لیے کی کہ یہ اطراف بدن ہیں اور ہر چیز کے بننے کی تکمیل اس کے اطراف پر ہوتی ہے، چنانچہ ہمارے محاورہ میں ایسے موقع پر بولتے ہیں کہ میری پور پور میں درد ہے، اس سے مراد تمام بدن ہوتا ہے، دوسرے پوریوں میں باوجود چھوٹی ہونے کے صنعت کی رعایت زیادہ اور عادۃً یہ زیادہ دشوار اور باریک کام ہے، لہٰذا جو اس پر قادر ہو گا وہ آسان پر بطریق اولیٰ قادر ہو گا۔

فائدہ: [3] یعنی جو لوگ قیامت کا انکار کرتے اور دوبارہ زندہ کیے جانے کو محال جانتے ہیں اس کا سبب یہ نہیں کہ یہ مسئلہ بہت مشکل ہے اور اللہ کی قدرت کاملہ کے دلائل ونشانات غیر واضح ہیں، بلکہ آدمی چاہتا ہے کہ قیامت کے آنے سے پہلے اپنی اگلی عمر میں جو باقی رہ گئی ہے بالکل بے باک ہو کر فسق و فجور کرتا رہے اگر کہیں قیامت کا اقرار کر لیا اور اعمال کے حساب کتاب کا خوف دل میں بیٹھ گیا تو فسق و فجور میں اس قدر بے باکی اور ڈھٹائی اس سے نہ ہو سکے گی، اس لیے ایسا خیال دل میں آنے ہی نہیں دیتا، جس سے عیش منغص ہو اور لذت میں خلل پڑے، بلکہ استہزاء و تعنت اور سینہ زوری سے سوال کرتا ہے کہ ہاں صاحب وہ آپ کی قیامت کب آئے گی، اگر واقعی آنے والی ہے تو بقید سنہ و ماہ اس کی تاریخ تو بتلایئے۔

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿۷﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿۸﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿۹﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ

پھر جب چندھیانے لگے آنکھ ۱؎ اور گہ جائے چاند ۲؎ اور اکٹھے ہوں سورج اور چاند ۳؎ کہے گا آدمی اس دن

اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿۱۰﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿۱۱﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ ﴿۱۲﴾

کہاں چلا جاؤں بھاگ کر، کوئی نہیں کہیں نہیں ہے بچاؤ، تیرے رب تک ہے اس دن جا ٹھہرنا ۴؎

خلاصہ تفسیر: سو جس وقت (حیرت کے مارے) آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی (اور وجہ اس حیرت کی یہ ہوگی کہ جن باتوں کو جھٹلاتا تھا وہ اچانک نظر آ جائیں گی) اور چاند بے نور ہو جائے گا اور (چاند کی کیا تخصیص ہے بلکہ) سورج اور چاند (دونوں) ایک حالت کے ہو جائیں گے (یعنی دونوں بے نور ہو جائیں گے) اس روز انسان کہے گا کہ اب کدھر بھاگوں؟ (ارشاد ہوتا ہے کہ) ہرگز (بھاگنا ممکن) نہیں (ہوگا، کیونکہ) کہیں پناہ کی جگہ نہیں (ہوگی) اس دن صرف آپ ہی کے رب کے پاس (جانے کا) ٹھکانا ہے (پھر خواہ جنت میں بھیجیں یا دوزخ میں)۔

وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ: یعنی سورج اور چاند دونوں بے نور ہو جائیں گے، جیسا کہ حدیث بخاری میں آیا ہے: "تکوّران و معنی کوّرت قال ابن عباس أظلمت، رواهما في الدر المنثور سورة التكوير"، یہاں آیت میں چاند کو بطور خاص الگ بیان کرنا شاید اس لئے ہو کہ عرب کو قمری حساب رکھنے کی وجہ سے چاند کا حال دیکھنے کا زیادہ اہتمام تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی حق تعالیٰ کی تجلی قہری سے جب آنکھیں چندھیانے لگیں گی اور مارے حیرت کے نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی اور سورج بھی سر کے قریب آ جائے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بے نور ہو جائے، چاند کو شاید الگ اس لیے ذکر کیا کہ عرب کو بوجہ قمری حساب رکھنے کے اسکا حال دیکھنے کا زیادہ اہتمام تھا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی بے نور ہونے میں دونوں شریک ہوں گے۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اب تو کہتا ہے کہ وہ دن کہاں ہے؟ اور اس وقت بدحواس ہو کر کہے گا کہ آج کدھر بھاگوں اور کہاں پناہ لوں؟ ارشاد ہوگا کہ آج نہ بھاگنے کا موقع ہے نہ سوال کرنے کا، آج کوئی طاقت تیرا بچاؤ نہیں کر سکتی، نہ پناہ دے سکتی ہے، آج کے دن سب کو اپنے پروردگار کی عدالت میں حاضر ہونا اور اسی کی پیشی میں ٹھہرنا ہے، پھر وہ جس کے حق میں جو کچھ فیصلہ کرے۔

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿۱۳﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿۱۴﴾

جتلا دیں گے انسان کو اس دن جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا ۱؎ بلکہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے

وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿۱۵﴾

اور پڑا لا ڈالے اپنے بہانے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (رب کے سامنے جانے کے وقت) اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا ہوا جتلا دیا جائے گا (اور انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا) بلکہ انسان خود اپنی حالت پر (حقیقت ظاہر ہونے کی وجہ سے) خوب مطلع ہوگا اگرچہ (اپنی طبیعت کے تقاضا کی وجہ سے اس وقت بھی) اپنے حیلے (حوالے) پیش لائے (جیسے کفار کہیں گے: واللہ ربنا ما کنا مشرکین، کہ خدا کی

قسم ہم مشرک نہ تھے، مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں، غرض انسان اپنے سب حال کو خوب جانتا ہوگا، اس لئے یہ جتلانا خبر دینے کے لئے نہیں ہوگا، بلکہ دھمکانے، حجت تمام کرنے اور جواب قطع کرنے کے لیے ہوگا)۔

فائدہ: ل یعنی سب اگلے پچھلے اعمال نیک ہوں یا بد، اس کو جتلا دیے جائیں گے۔

فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اپنے احوال میں غور کرے تو رب کی وحدانیت جانے (اور یہ کہ سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے) اور جو کہے میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ سب بہانے ہیں''، لیکن اکثر مفسرین نے اس کا تعلق يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ سے رکھا ہے، یعنی جتلانے پر بھی موقوف نہیں، انسان اپنی حالت پر خود مطلع ہوگا گو باقتضائے طبیعت وہاں بھی بہانے بنائے اور حیلے حوالے پیش لائے، جیسے کفار کہیں گے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ، بلکہ یہاں دنیا میں بھی وہ انسان جس کا ضمیر بالکل مسخ نہ ہوگیا ہو اپنی حالت کو خوب سمجھتا ہے، گو دوسروں کے سامنے حیلے بہانے بنا کر اس کے خلاف ثابت کرنے کی کتنی ہی کوشش کرے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾

نہ چلا تو اس کے پڑھنے پر اپنی زبان تا کہ جلدی اس کو سیکھ لے، وہ تو ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع رکھنا تیرے سینہ میں اور پڑھنا تیری زبان سے

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾

پھر جب ہم پڑھنے لگیں فرشتہ کی زبانی تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے، پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اس کو کھول کر بتلانا ل

خلاصہ تفسیر: گذشتہ دو آیتوں: يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ اور: بَلِ الْاِنْسَانُ سے دو مضمون حاصل ہوئے: ① ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے جاننے والے ہیں اور سب کو محیط ہیں، چنانچہ قیامت میں انسان کو اس کے کیے ہوئے سب کام بتلا دیں گے ② دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب حکمت کا تقاضہ ہوتا ہے تو بہت سے غائب علوم کو مخلوق کے ذہن میں حاضر کر دیتا ہے اگرچہ ان غائب باتوں کا حاضر ہو جانا طبعی عادت کے خلاف ہو، چنانچہ قیامت میں اس کا ظہور بھی ہوگا کہ جن باتوں کو انسان بھول گیا ہوگا وہ بھی اس دن یاد آ جائیں گی، جب یہ بات ہے تو اب آگے حضور ﷺ کو خطاب ہے کہ وحی نازل ہونے کے وقت جیسا کہ اب تک آپ کی عادت ہے اس قدر مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں کہ سنتے بھی ہیں، پڑھتے بھی ہیں، دھیان بھی رکھتے ہیں، محض اس احتمال سے کہ شاید کچھ مضمون میرے ذہن سے نکل جائے، کیونکہ جب ہم نے آپ کو نبی بنایا ہے اور آپ سے جو احکام پہنچانے کا کام لینا ہے تو حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ مضامین آپ کے ذہن میں حاضر رکھے جائیں اور ہمارا سب چیزوں کا محفوظ رکھنا ظاہر ہے، اس لیے آپ مشقت برداشت نہ کیا کیجیے۔

(اور) اے پیغمبر (ﷺ! جب وحی نازل ہوا کرے تو) آپ (وحی کے ختم ہونے سے پہلے) قرآن پر اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تا کہ آپ اس کو جلدی جلدی لیں (کیونکہ) ہمارے ذمہ ہے (آپ کے دل میں) اس کا جمع کر دینا اور (آپ کی زبان سے) اس کا پڑھوا دینا (جب یہ ہمارے ذمہ ہے) تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ (اپنے ذہن سے اور فکر سے ہمہ تن) اس کے تابع ہو جایا کیجئے (یعنی ادھر ہی متوجہ ہو جایا کیجئے اور اس کے دوہرانے میں مشغول نہ ہوا کیجئے جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد ہے: **ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیك وحیه**) پھر (آپ کی زبان سے لوگوں کے سامنے) اس کا بیان کرا دینا (بھی) ہمارے ذمہ ہے (یعنی آپ کو یاد کرا دینا اور آپ کی زبان پر جاری کر دینا، پھر تبلیغ کے وقت بھی اس کا یاد رکھوانا اور لوگوں کے سامنے پڑھوا دینا یہ سب ہمارے ذمہ ہے)۔

فائدہ: ل شروع میں جس وقت حضرت جبرائیل اللہ کی طرف سے قرآن لاتے، ان پر پڑھنے کے ساتھ حضرت ﷺ بھی دل میں

پڑھتے جاتے تھے تاکہ جلد اسے یاد کرلیں اور سیکھ لیں، مبادا جبرائیل چلے جائیں اور وحی پوری طرح محفوظ نہ ہوسکے، مگر اس صورت میں آپ ﷺ کو سخت مشقت ہوتی تھی، جب تک پہلا لفظ کہیں اگلا سننے میں نہ آتا، اور سمجھنے میں بھی ظاہر ہے دقت پیش آتی ہوگی، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس وقت پڑھنے اور زبان ہلانے کی حاجت نہیں، ہمہ تن متوجہ ہوکر سننا ہی چاہیے، یہ فکر مت کرو کہ یاد نہیں رہے گا، پھر کیسے پڑھوں گا، اور لوگوں کو کس طرح سناؤں گا، اس کا تمہارے سینے میں حرف بحرف جمع کردینا اور تمہاری زبان سے پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے، جبرائیل جس وقت ہماری طرف سے پڑھیں آپ ﷺ تو خاموشی سے سنتے رہیے، آگے اس کا یاد کرانا اور اس کے علوم و معارف کا تمہارے اوپر کھولنا اور تمہاری زبان سے دوسروں تک پہنچانا، ان سب باتوں کے ہم ذمہ دار ہیں، اس کے بعد حضور ﷺ نے جبرائیل کے ساتھ ساتھ پڑھنا ترک کردیا، یہ بھی ایک معجزہ ہوا، کہ ساری وحی سنتے رہے اس وقت زبان سے ایک لفظ نہ دہرایا، لیکن فرشتے کے جانے کے بعد پوری وحی لفظ بہ لفظ کامل ترتیب کے ساتھ بدون ایک زبر زیر کی تبدیلی کے فر فر سنادی اور سمجھادی، یہ اس دنیا میں ایک چھوٹا سا نمونہ ہوا: يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ کا یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اپنی وحی فرشتے کے چلے جانے کے بعد پوری ترتیب کے ساتھ حرف بحرف بدون ادنیٰ فروگذاشت کے اپنے پیغمبر کے سینے میں جمع کردے، کیا اس پر قادر نہیں کہ بندوں کے اگلے پچھلے اعمال جن میں سے بعض کو کرنیوالا بھی بھول گیا ہوگا سب جمع کر کے ایک وقت میں سامنے کردے اور ان کو خوب طرح یاد دلادے اور اسی طرح ہڈیوں کے منتشر ذرات کو سب جگہ سے اکٹھا کر کے ٹھیک پہلی ترتیب کو ازسرنو وجود عطا فرمادے، بیشک وہ اس پر اور اس سے کہیں زیادہ پر قادر ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴿٢١﴾

کوئی نہیں پر تم چاہتے ہو جو جلد آئے، اور چھوڑتے ہو جو دیر میں آئے ل

خلاصہ تفسیر: (پیچھے کا مضمون استطرادًا یعنی ضمنی طور پر آ گیا تھا، اب آگے پھر منکرین کو خطاب ہے یعنی) اے منکرو! (انسان کا گذشتہ اور آئندہ اعمال پر مطلع کیا جانا قیامت میں ضرور ہے اور جیسا تم سمجھ رہے ہو کہ قیامت نہ ہوگی) ہرگز ایسا نہیں (اور نہ تمہارے پاس اس انکار کی کوئی دلیل ہے) بلکہ (صرف بات یہ ہے کہ) تم دنیا سے محبت رکھتے ہو، اور (اس محبت میں منہمک ہوکر) آخرت (سے غافل ہو اور غفلت کے سبب اس) کو چھوڑ بیٹھے ہو (پس تمہارے قیامت کے انکار کی بنیاد محض فاسد ہے، سو قیامت ضرور ہوگی اور ہر ایک کو اس کے اعمال پر مطلع کر کے ان اعمال کے مناسب جزا ملے گی)۔

* * *

فائدہ: ل یعنی تمہارا قیامت وغیرہ سے انکار کرنا ہرگز کسی دلیل صحیح پر مبنی نہیں، بلکہ دنیا میں انہماک اس کا سبب ہے، دنیا چونکہ نقد اور جلد ملنے والی چیز ہے اسی کو تم چاہتے ہو، اور آخرت کو ادھار سمجھ کر چھوڑتے ہو کہ اس کے ملنے میں ابھی دیر ہے، انسان کی طبیعت میں جلد بازی داخل ہے: خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء: 37) فرق اتنا ہے کہ نیک لوگ پسندیدہ چیزوں کے حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں جس کی ایک مثال ابھی لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ میں گزری اور بدتمیز آدمی اس چیز کو پسند کرتے ہیں جو جلد ہاتھ آئے خواہ آخر کار اس کا نتیجہ ہلاکت ہی کیوں نہ ہو۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾

کتنے منہ اس دن تازہ ہیں، اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ل اور کتنے منہ اس دن اداس ہیں ۲

تَظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾

خیال کرتے ہیں کہ ان پر وہ آئے جس سے ٹوٹے کمر ۳

خلاصہ تفسیر: (آخرت میں بدلہ ملنے کی تفصیل یہ ہے کہ) بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف

دیکھتے ہوں گے (یہ تو مؤمنین کا حال ہوا) اور بہت سے چہرے اس روز بدرونق ہوں گے (اور وہ لوگ) خیال کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا معاملہ کیا جائے گا (یعنی اس کو عذاب شدید ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ آخرت کا بیان ہوا، یعنی مؤمنین کے چہرے اس روز تروتازہ اور ہشاش بشاش ہوں گے اور ان کی آنکھیں محبوب حقیقی کے دیدار مبارک سے روشن ہوں گی، قرآن کریم اور احادیث متواترہ سے یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، گمراہ لوگ اس کے منکر ہیں، کیونکہ یہ دولت ان کے نصیب میں نہیں، اللھم لا تحرمنا من ھذا النعمۃ التی لیس فوقھا نعمۃ،آمین۔

فائدہ: ۲؎ یعنی پریشان اور بے رونق ہوں گے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی یقین رکھتے ہیں کہ اب وہ معاملہ ہونے والا ہے اور وہ عذاب بھگتنا ہے جو بالکل ہی کمر توڑ دے گا۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾

ہرگز نہیں جس وقت جان پہنچے ہانس تک ۱؎ اور لوگ کہیں کون ہے جھاڑنے والا ۲؎ اور وہ سمجھا کہ اب آیا وقت جدائی کا ۳؎

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ ع

اور لپٹ گئی پنڈلی پر پنڈلی ۴؎ تیرے رب کی طرف ہے اس دن کھنچ کر چلا جانا ۵؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے دنیا کی محبت پر زجر وتنبیہ ہے کہ تم جو دنیا کو محبوب اور آخرت کو چھوڑنے کے قابل سمجھ رہے ہو) ہرگز ایسا نہیں (کیونکہ دنیا سے ایک روز جانا ہے اور بالآخر آخرت میں پہنچنا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) جب جان ہنسلی تک پہنچ جاتی ہے اور (نہایت حسرت سے اس وقت) کہا جاتا ہے (یعنی تیمار دار کہتے ہیں) کہ (ارے) کوئی جھاڑ (پھونک کرنے) والا بھی ہے؟ (مطلق معالج مراد ہے، چونکہ عرب میں جھاڑ پھونک کا زیادہ چرچا تھا اس لئے ''راق'' سے تعبیر کیا) اور (اس وقت) وہ (مردہ) یقین کر لیتا ہے کہ یہ (دنیا سے) مفارقت کا وقت ہے اور (حالت نزع کی سختی کی وجہ سے) ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ لپٹ جاتی ہے (مراد اس سے موت کی سختی کے آثار کا ظاہر ہونا ہے، پنڈلیوں کے لپٹنے کا ذکر خاص طور پر مقصود نہیں، اس کا بیان محض مثال کے طور پر ہے، جب یہ حالتیں پیش آتی ہیں تو اے شخص!) اس روز تیرے رب کی طرف جانا ہوتا ہے (پس ایسی حالت میں دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت کس قدر نادانی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ: یعنی آخرت کو ہرگز دور مت سمجھو، اس سفر آخرت کی پہلی منزل تو موت ہے جو بالکل قریب ہے، یہیں سے باقی منزلیں طے کرتے ہوئے آخری ٹھکانے پر جا پہنچو گے، گویا ہر آدمی کی موت اس کے حق میں بڑی قیامت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، جہاں مریض کی روح سمٹ کر ہنسلی تک پہنچی اور سانس حلق میں رکنے لگی سمجھو کہ سفر آخرت شروع ہوگیا۔

فائدہ: ۲؎ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ: ایسی مایوسی کے وقت طبیبوں اور ڈاکٹروں کی کچھ نہیں چلتی جب لوگ ظاہری علاج وتدبیر سے عاجز آجاتے ہیں تو جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کی سوجھتی ہے، کہتے ہیں کہ میاں کوئی ایسا شخص ہے جو جھاڑ پھونک کر کے اس کو مرنے سے بچالے اور بعض سلف نے کہا کہ من راق فرشتوں کا کلام ہے جو ملک الموت کے ساتھ روح قبض کرنے کے وقت آتے ہیں، وہ آپس میں پوچھتے ہیں کہ کون اس مردے کی روح کو لے جائے گا رحمت کے فرشتے یا عذاب کے؟ اس تقدیر پر راق، ''رقی'' سے مشتق ہوگیا، جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، ''رقیہ'' سے نہ ہوگا، جو افسوس کے معنی میں ہے۔

فائدہ: ۳ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ: یعنی مرنے والا سمجھ چکا کہ تمام عزیز و اقارب اور محبوب و مالوف چیزوں سے اب اس کو جدا ہونا ہے یا یہ مطلب کہ روح بدن سے جدا ہونے والی ہے۔

فائدہ: ۴ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ: یعنی بعض اوقات سکرات موت کی سختی سے ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ لپٹ جاتی ہے، نیز نیچے کے بدن سے روح کا تعلق منقطع ہونے کے بعد پنڈلیوں کا ہلانا اور ایک کو دوسرے سے جدا رکھنا اس کے اختیار میں نہیں رہتا، اس لیے ایک پنڈلی دوسری پر بے اختیار جا گرتی ہے، اور بعض سلف نے کہا کہ عرب کے محاورات میں "ساق" کنایہ ہے سخت مصیبت سے، تو آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ "ملی ایک سختی دوسری سختی کے ساتھ" کیونکہ مرنے والے کو اس وقت دو سختیاں پیش آتی ہیں، پہلی سختی تو یہی دنیا سے جانا، مال و اسباب، اہل و عیال، جاہ و حشم، سب کو چھوڑنا دشمنوں کی خوشی و طعنہ زنی، اور دوستوں کے رنج و غم کا خیال آنا، اور دوسری اس سے بڑی قبر اور آخرت کے احوال کی ہے، جس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔

فائدہ: ۵ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ الْمَسَاقُ: یعنی سفر آخرت کی ابتداء یہاں سے ہے گویا بندہ اپنے رب کی طرف کھنچنا شروع ہوا مگر افسوس اپنی غفلت و حماقت سے کوئی سامان سفر کا پہلے سے درست نہ کیا نہ اتنے بڑے سفر کے لیے کوئی توشہ ساتھ لیا۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾

پھر نہ یقین لایا اور نہ نماز پڑھی، پھر جھٹلایا اور منہ موڑا، پھر گیا اپنے گھر کو اکڑتا ہوا ۱

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾

خرابی تیری خرابی پر خرابی تیری، پھر خرابی تیری خرابی پر خرابی تیری ۲

خلاصہ تفسیر: (پھر اس روز خدا کے پاس پہنچنے کے بعد اگر وہ کافر ہے) تو (اس کا برا حال ہوگا کیونکہ) اس نے نہ تو (خدا اور رسول کی) تصدیق کی تھی اور نہ نماز پڑھی تھی، لیکن (خدا اور رسول کی) تکذیب کی تھی اور (احکام سے) منہ موڑا تھا، پھر (اس پر طرہ یہ کہ داعی حق سے منہ موڑ کر اس پر فخر اور) ناز کرتا ہوا اپنے گھر چل دیتا تھا (مطلب یہ کہ اول تو کفر اور نافرمانی، پھر اس پر ندامت نہیں بلکہ الٹا فخر کرتا تھا کہ ہم نے اس طرح حق کو رد کیا اور باطل پر جمے رہے، اور پھر اس کے بعد طلب حق نہیں، بلکہ اپنے خدام و حشم میں جا کر اور زیادہ مغرور اور غافل ہو جاتا تھا، اب آگے اس کافر کی بدحالی کا بیان ہے کہ ایسے شخص سے کہا جائے گا کہ) تیری کم بختی آنے والی ہے پھر (مکرر سن لے کہ) تیری کم بختی پر کم بختی آنے والی ہے (تکرار اور تاکید پر تاکید، یہ کمال غضب اور شدید وعید کے اظہار کے لئے ہے، مفرد تکرار سے مقدار کی زیادتی مستفاد ہوئی اور مجموعی تکرار سے کیفیت کی زیادتی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بجائے سچا سمجھنے اور یقین لانے کے پیغمبروں کو جھوٹا بتلاتا رہا، اور بجائے نماز پڑھنے اور مالک کی طرف متوجہ ہونے کے ہمیشہ ادھر سے منہ موڑ کر چلا، نہ صرف یہی بلکہ اپنی اس سرکشی اور بدبختی پر اتراتا اور اکڑتا ہوا اپنے متعلقین کے پاس جاتا تھا، گویا کوئی بہت بڑی بہادری اور ہنرمندی کا کام کر کے آرہا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی او بدبخت! اب تیری کم بختی آئی، ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ، اب تیرے لیے خرابی پر خرابی اور تباہی پر تباہی ہے، تجھ سے بڑھ کر اللہ کی نئی نئی سزاؤں کا مستحق اور کون ہوگا۔

تنبیہ: شاید اول خرابی یقین نہ لانے اور نماز نہ پڑھنے پر، دوسری اس سے بڑھ کر جھٹلانے اور منہ موڑنے، پر تیسری اور چوتھی ان دونوں امور میں سے ہر ایک کو قابل فخر سمجھنے پر ہو، جس کی طرف ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى میں اشارہ ہے، واللہ اعلم۔

اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ يُّتۡرَكَ سُدًى ؕ﴿۳۶﴾ اَلَمۡ يَكُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِىٍّ يُّمۡنٰى ۙ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ

کیا خیال رکھتا ہے آدمی کہ چھوٹا رہے گا بےقید ۱؎ بھلا نہ تھا وہ ایک بوند منی کی جو ٹپکی ۲؎ پھر تھا لہو جما ہوا پھر اس نے بنایا

ع ۱۸ فَسَوّٰى ۙ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَيۡنِ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰى ؕ﴿۳۹﴾ اَلَـيۡسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰى ﴿۴۰﴾

اور ٹھیک کر اٹھایا، پھر کیا اس میں جوڑا نر اور مادہ ، کیا یہ خدا زندہ نہیں کرسکتا مردوں کو ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے جس سزا کا ذکر ہوا، اس سزا کا واقع ہونا دو باتوں پر موقوف ہے: ① ایک انسان کا مکلف ہونا ② دوسرے اس کا مرکر دوبارہ زندہ ہونا جس کے ممکن ہونے میں ان کو شک تھا، اس لیے اب آگے دونوں مضمون ہیں، یعنی:

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا (نہ اس پر احکام عائد کئے جائیں گے اور نہ اس سے حساب کتاب ہوگا، بلکہ مکلف ہونا بھی یقینی ہے اور اس پر باز پرس ہونا بھی یقینی، اور یہ جو دوبارہ زندہ ہونے کو محال سمجھتا ہے یہ بھی اس کی حماقت ہے) کیا یہ شخص (ابتداء میں محض) ایک قطرہ منی نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا تھا پھر وہ خون کا لوتھڑا ہوگیا، پھر اللہ تعالیٰ نے (اس کو انسان) بنایا، پھر اعضا درست کئے پھر اس (انسان) کی دو قسمیں کردیں مرد اور عورت (یہ فاتفسیر یہ ہے، تو) کیا وہ (خدا جس نے ابتداء میں اپنی قدرت سے یہ سب کچھ کیا) اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کردے (حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا پہلے پیدا کرنے کی نسبت آسان ہے اور خدا کے نزدیک تو دونوں برابر ہیں، پس ان دلائل سے قیامت اور جزا و سزا کا ثبوت ہوگیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی کیا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس کو یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ اور امر و نہی کی کوئی قید اس پر نہ ہوگی؟ یا میرے پیچھے اٹھایا نہ جائے گا؟ اور سب نیک و بد کا حساب نہ لیں گے؟

فائدہ: ۲؎ یعنی عورت کے رحم میں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی نطفہ سے جمے ہوئے خون کی شکل میں آیا، پھر اللہ نے اس کی پیدائش کے سب مراتب پورے کرکے انسان بنادیا اور تمام ظاہری اعضاء اور باطنی قوتیں ٹھیک کردیں، ایک نطفہ بے جان سے انسان عاقل بن گیا، پھر اسی نطفہ سے عورت اور مرد دو قسم کے آدمی پیدا کیے جن میں سے ہر ایک قسم کی ظاہری و باطنی خصوصیات جدا گانہ ہیں، کیا وہ قادر مطلق جس نے اولاً سب کو ایسی حکمت و قدرت سے بنایا، اس پر قادر نہیں کہ دوبارہ زندہ کردے؟ "سبحانك اللهم فبلیٰ" پاک ہے تیری ذات اے خدا! کیوں نہیں، تو بیشک قادر ہے۔

ایاتہا ۳۱ | ۷۶ سُوۡرَةُ الدَّهۡرِ مَدَنِيَّةٌ ۹۸ | رکوعاتہا ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں جزا و سزا کا زیادہ بیان اور کچھ اس کی تفصیل تھی، اب اس سورت میں بھی زیادہ تر اسی جزا و سزا کی تفصیل ہے جس میں شاید ترغیب کے لیے ایمان کی جزا کا زیادہ بیان ہے، اور چونکہ کفار کے انکار قیامت سے آپ ﷺ کو رنج ہوتا تھا اس لیے درمیان سورت میں آپ ﷺ کو تسلی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

هَلۡ اَتٰى عَلَى الۡاِنۡسَانِ حِيۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ يَكُنۡ شَيۡـًٔـا مَّذۡكُوۡرًا ﴿۱﴾

کبھی گزرا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں کہ نہ تھا وہ کوئی چیز جو زبان پر آتی

خلاصہ تفسیر: بیشک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے جس میں وہ کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھا (یعنی انسان نہ تھا بلکہ نطفہ تھا، اور اس سے قبل غذا، اور اس سے پہلے عناصر کا جز تھا)۔

* * *

فائدہ: بیشک انسان پر ایک وقت گزر چکا ہے۔ جب اس کا کچھ نام ونشان نہ تھا۔ پھر کتنے ہی دور طے کر کے نطفہ کی شکل میں آیا۔ وہ حالت بھی اس کی موجودہ شرافت وکرامت کو دیکھتے ہوئے اس قابل نہیں کہ زبان پر لائی جائے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۲﴾

ہم نے بنایا آدمی کو ایک دو رنگی بوند سے ۱؎ ہم پلٹتے رہے اس کو پھر کر دیا اس کو ہم نے سننے والا دیکھنے والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا (یعنی مرد اور عورت دونوں کے نطفے سے، کیونکہ عورت کی منی بھی اندر ہی اندر عورت کے رحم میں گرتی ہے، پھر کبھی رحم کے منہ سے خارج ہو کر ضائع ہو جاتی ہے اور کبھی اندر رہ جاتی ہے، غرض ہم نے اس کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا) اس طور پر کہ ہم اس کو مکلف بنائیں تو (اسی واسطے) ہم نے اس کو سنتا دیکھتا (سمجھتا) بنایا (مطلب یہ کہ ہم نے انسان کو ایسی ہیئت وصفات کے ساتھ پیدا کیا تاکہ اس میں شرعی احکام کا مکلف بننے کی قابلیت ہو)۔

نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ: ''مخلوط نطفہ'' کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ مختلف اجزاء سے مرکب ہے، چنانچہ منی کا مختلف اجزاء سے مرکب ہونا واضح اور ظاہر ہے۔

سَمِيْعًا بَصِيْرًا: چونکہ محاورہ میں ''سمیع وبصیر'' کا استعمال عاقل کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے یہاں مکلف ہونے کا مدار یعنی عقل دینے کی صراحت نہیں فرمائی گئی مگر وہ بھی مراد ہے، مطلب یہ کہ ہم نے انسان کو ایسی ہیئت وصفات کے ساتھ پیدا کیا تا کہ اس میں شرعی احکام کا مکلف بننے کی قابلیت ہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مرد اور عورت کے دو رنگے پانی سے پیدا کیا۔

تنبیہ: امشاج کے معنی مخلوط کے ہیں، نطفہ جن غذاؤں کا خلاصہ ہے وہ مختلف چیزوں سے مرکب ہوتی ہیں اس لیے عورت کے پانی قطع نظر کر کے بھی اس کو امشاج کہہ سکتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی نطفہ سے جما ہوا خون، پھر اس سے گوشت کا لوتھڑا بنایا، اسی طرح کئی طرح کے الٹ پھیر کرنے کے بعد اس درجہ میں پہنچا دیا کہ اب وہ کانوں سے سنتا اور آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ان قوتوں سے وہ کام لیتا ہے جو کوئی دوسرا حیوان نہیں لے سکتا، گویا اور سب اس کے سامنے بہرے اور اندھے ہیں۔

تنبیہ: نبتلیہ کے معنی اکثر مفسرین نے امتحان وآزمائش کے لیے ہیں، یعنی آدمی کا بنانا اس غرض سے تھا کہ اس کو احکام کا مکلف اور امرونہی کا مخاطب بنا کر امتحان لیا جائے اور دیکھا جائے کہ کہاں تک مالک کے احکام کی تکمیل میں وفاداری دکھلاتا ہے اسی لئے اسکو سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی وہ قوتیں دی گئی ہیں جن پر تکلیف شرعی کا مدار ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾

ہم نے اس کو سجھائی راہ یا حق مانتا ہے اور یا ناشکری کرتا ہے

خلاصہ تفسیر: (اس کے بعد جب مکلف ہونے کا وقت آ گیا تو) ہم نے اس کو (بھلائی برائی پر مطلع کر کے) راستہ بتلایا (یعنی

احکام کا مخاطب بنایا، پھر) یا تو وہ شکر گزار (اور مؤمن) ہوگیا یا ناشکر (اور کافر) ہوگیا (یعنی جس رستہ پر چلنے کو اس کو کہا گیا تھا جو اس پر چلا وہ مؤمن ہوگیا، جو بالکل نہ چلا وہ کافر ہوگیا)۔

* * *

فائدہ: یعنی اولاً اصل فطرت اور پیدائشی عقل وفہم سے، پھر دلائل عقلیہ ونقلیہ سے نیکی کی راہ سجھائی، جس کا مقتضی یہ تھا کہ سب انسان ایک راہ پر چلتے، لیکن گردوپیش کے حالات اور خارجی عوارض سے متاثر ہوکر سب ایک راہ پر نہ رہے، بعض نے اللہ کو مانا اور اس کا حق پہچانا، اور بعض نے ناشکری اور ناحق کوشی پر کمر باندھ لی، آگے دونوں کا انجام مذکور ہے:

اِنَّآ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِیۡنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغۡلٰلًا وَّسَعِیۡرًا ﴿۴﴾ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ كَاۡسٍ كَانَ

ہم نے تیار کر رکھی ہیں منکروں کے واسطے زنجیریں اور طوق اور آگ دہکتی ۱؎ البتہ نیک لوگ پیتے ہیں پیالہ

مِزَاجُهَا كَافُوۡرًا ﴿۵﴾ عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوۡنَهَا تَفۡجِیۡرًا ﴿۶﴾

جس کی ملونی ہے کافور، ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں بندے اللہ کے ۲؎ چلاتے ہیں وہ اس کی نالیاں ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے فریقین کی جزا کا ذکر ہے کہ) ہم نے کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور آتش سوزاں تیار کر رکھی ہے (اور) جو نیک (لوگ) ہیں وہ ایسے جام شراب سے (شرابیں) پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی یعنی ایسے چشمے سے (پئیں گے) جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے (اور) جس کو وہ (خاص بندے جہاں چاہیں گے) بہا کر لے جائیں گے۔

كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوۡرًا: یہ دنیا کا کافور نہیں، بلکہ جنت کا کافور ہے جو سفیدی اور خنکی اور دل ودماغ کی تفریح وتقویت میں اس کا مشارک ہے، شراب میں خاص کیفیات حاصل کرنے کے لئے بعض مناسب چیزوں کے ملانے کی عادت ہے، پس وہاں اس جام میں کافور ملایا جائے گا اور وہ شراب کا جام ایسے چشمے سے بھرا جائے گا جس سے مقرب بندے پئیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا ہوگا، سو اس سے ابرار کی بشارت میں تقویت ہوگئی۔

عِبَادُ اللّٰهِ: اگر ابرار و عباد اللہ کا مصداق ایک ہی ہو تو دو جگہ بیان کرنے سے جدا جدا مقصود ہے، ایک جگہ اس کی آمیزش بتلانا ہے دوسری جگہ اس کا کثیر ومسخر ہونا کہ اسباب عیش کی کثرت اور طبیعت کے تابع ہونا لذت عیش کو بڑھا دیتا ہے۔

یُفَجِّرُوۡنَهَا تَفۡجِیۡرًا: یہ جنتیوں کی ایک کرامت ہوگی کہ جنت کی نہریں ان کے تابع ہوں گی جیسا کہ درمنثور میں ابن شوذب سے مروی ہے کہ جنتیوں کے ہاتھ میں سونے کی چھڑیاں ہوں گی اور وہ چھڑیوں سے جس طرف اشارہ کردیں گے نہریں اسی طرف چلنے لگیں گی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو لوگ رسم ورواج اور اوہام وظنون کی زنجیروں میں جکڑے رہے اور غیر اللہ کی حکومت واقتدار کے طوق اپنے گلوں سے نہ نکال سکے، بلکہ حق وحاملین حق کے خلاف دشمنی اور لڑائی کی آگ بھڑکانے میں عمریں گزار دیں، کبھی بھول کر اللہ کی نعمتوں کو یاد نہ کیا، نہ اس کی سچی فرمانبرداری کا خیال دل میں لائے، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں دوزخ کے طوق وسلاسل اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جام شراب پئیں گے جس میں تھوڑا سا کافور ملایا جائے گا، یہ کافور دنیا کا نہیں بلکہ جنت کا ایک خاص چشمہ ہے جو خاص طور پر اللہ کے مقرب ومخصوص بندوں کو ملے گا، شاید اس کو ٹھنڈا، خوشبودار، مفرح اور سفید رنگ ہونے کی وجہ سے کافور کہتے ہوں گے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی وہ چشمہ ان بندوں کے اختیار میں ہوگا جدھر اشارہ کریں گے اسی طرف کو اس کی نالی بہنے لگے گی، بعض کہتے ہیں کہ اس کا اصل منبع حضور ﷺ پر نور محمد رسول اللہ ﷺ کے قصر میں ہوگا، وہاں سے سب انبیاء ومومنین کے مکانوں تک اس کی نالیاں پہنچائی جائیں گی، واللہ اعلم، آگے ابرار کی خصلتیں بیان فرمائی ہیں:

يُوفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ⑦

پورا کرتے ہیں منت کو ۱ اور ڈرتے ہیں اس دن سے کہ اس کی برائی پھیل پڑے گی ۲

خلاصہ تفسیر: (اب آگے ان ابرار کی صفات مذکور ہیں کہ) وہ لوگ واجبات کو پورا کرتے ہیں اور (ادا بھی خلوص سے کرتے ہیں، کیونکہ وہ) ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی عام ہوگی (یعنی کم وبیش سب پر اسکی سختی کا اثر ہوگا، مراد قیامت کا دن ہے الا من شاء اللہ)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو منت مانی ہوا سے پورا کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ جب خود اپنی لازم کی ہوئی چیز کو پورا کریں گے تو اللہ کی لازم کی ہوئی باتوں کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی اس دن کی سختی اور برائی درجہ بدرجہ سب کو عام ہوگی، کوئی شخص بالکلیہ محفوظ نہ رہے گا الا من شاء اللہ۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ⑧ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ

اور کھلاتے ہیں کھانا اس کی محبت پر محتاج کو اور یتیم کو اور قیدی کو ۱ ہم جو تم کو کھلاتے ہیں سو خالص اللہ کی خوشی چاہنے کو

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ⑨ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ⑩

نہ تم سے ہم چاہیں بدلہ اور نہ چاہیں شکر گزاری ۲ ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے ایک دن اداسی والے کی سختی سے ۳

خلاصہ تفسیر: اور (وہ لوگ ایسے مخلص ہیں کہ مالی عبادات میں بھی جس میں اکثر اخلاص کم ہوتا ہے دیگر دنیاوی اغراض زیادہ ہوتی ہیں مگر وہ اس میں بھی کمال درجہ کا اخلاص رکھتے ہیں چنانچہ) وہ لوگ (محض) خدا کی محبت سے غریب اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور وہ لوگ کھانا کھلا کر زبان سے یا دل سے یوں کہتے ہیں کہ) ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لیے کھانا کھلاتے ہیں نہ ہم تم سے (اس کا عملی) بدلہ چاہیں اور نہ (اس کا زبانی) شکریہ (چاہیں، اور ہم خدا کی رضامندی کے لئے اس واسطے تم کو کھانا کھلاتے ہیں کہ) ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں (تو امید رکھتے ہیں کہ ان مخلصانہ اعمال کی بدولت اس دن کی تلخی اور سختی سے محفوظ رہیں، اور اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کے خوف سے کوئی کام کرنا اخلاص اور رضائے الٰہی کی طلب کے خلاف نہیں ہے)۔

وَّاَسِيْرًا: قیدی اگر مظلوم ہے یعنی بطور ظلم قید کیا گیا ہے تب تو اس کی مدد واعانت کا پسندیدہ و مستحسن ہونا ظاہر ہے، اور اگر قیدی ظالم ہے یعنی ظلم کی سزا میں قید ہوا ہے تو شدت حاجت کے وقت اس کو بھی کھانا کھلانا پسندیدہ و مستحسن ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ کی محبت کے جوش میں اپنا کھانا باوجود خواہش اور احتیاج کے نہایت شوق اور خلوص سے مسکینوں یتیموں اور قیدیوں کو کھلا دیتے ہیں۔

تنبیہ: قیدی عام ہے مسلم ہو یا کافر، حدیث میں ہے کہ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضور ﷺ نے حکم دیا کہ جس مسلمان کے پاس کوئی قیدی رہے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، چنانچہ صحابہ اس حکم کی تعمیل میں قیدیوں کو اپنے سے بہتر کھانا کھلاتے تھے حالانکہ وہ قیدی مسلمان نہ تھے، مسلمان بھائی کا حق تو اس سے بھی زیادہ ہے اگر لفظ اسیر میں ذرا توسع کر لیا جائے تب تو یہ آیت غلام اور مدیون کو بھی شامل ہوسکتی ہے کہ وہ بھی ایک طرح سے قید میں ہیں۔

فائدہ: ۲ یہ کھلانے والے زبان حال سے کہتے ہیں اور کہیں مصلحت ہو تو زبان قال سے بھی کہہ سکتے ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی کیوں نہ کھلائیں اور کھلانے کے بعد کیونکر بدلہ یا شکریہ کے امیدوار رہیں جبکہ ہم کو اپنے پروردگار کا اور اس دن کا خوف لگا ہوا ہے جو بہت سخت اداس اور غصہ سے چیں بہ چیں ہوگا، ہم تو اخلاص کے ساتھ کھلانے پلانے کے بعد بھی ڈرتے ہیں کہ دیکھئے ہمارا عمل مقبول ہوا یا نہیں، مبادا اخلاص وغیرہ میں کمی رہ گئی ہو اور الٹا منہ پر مارا جائے۔

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً

پھر بچا لیا ان کو اللہ نے برائی سے اس دن کی اور ملا دی ان کو تازگی اور خوش وقتی ۱ اور بدلہ دیا ان کو ان کے صبر پر باغ

وَّحَرِيْرًا ﴿۱۲﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَدَانِيَةً

اور پوشاک ریشمی ۲ تکیہ لگائے بیٹھیں اس میں تختوں کے اوپر ۳ نہیں دیکھتے وہاں دھوپ اور نہ ٹھر ۴ اور جھک رہیں

عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾

ان پر اس کی چھائیں اور پست کر رکھے ہیں اس کے گچھے لٹکا کر ۵

خلاصہ تفسیر: سو اللہ تعالیٰ ان کو (اس اطاعت واخلاص کی برکت سے) اس دن کی سختی سے محفوظ رکھے گا اور ان کو تازگی اور خوشی عطا فرمادے گا (یعنی چہروں پر تازگی اور دلوں میں خوشی دے گا) اور ان کی پختگی (یعنی دینی استقامت) کے بدلہ میں ان کو جنت اور ریشمی لباس دے گا اس حالت میں کہ وہ وہاں (جنت میں) مسہریوں پر (آرام وعزت سے) تکیہ لگائے ہوں گے (اور) نہ وہاں تپش (اور گرمی) پائیں گے اور نہ جاڑا (بلکہ فرحت بخش معتدل موسم ہوگا) اور یہ حالت ہوگی کہ (وہاں کے یعنی جنت کے) درختوں کے سائے ان (جنتیوں) پر جھکے ہوں گے (یعنی قریب ہوں گے اور سایہ بھی عیش ونعمت کے اسباب میں سے ہے، اور اس کا قریب ہونا زیادہ راحت وعیش کا سبب ہے) اور ان کے میوے ان کے اختیار میں ہوں گے (کہ ہر وقت ہر طرح بلا مشقت لے سکیں گے)۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا: شبہ ہوتا ہے کہ جنت میں سورج چاند نہیں ہوں گے تو پھر سایہ کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ سایہ سے وہاں سورج کا ہونا لازم نہیں آتا، ہوسکتا ہے کہ دوسرے نورانی اجسام کی روشنی سے سایہ مقصود ہو، اور غالباً سایہ کا فائدہ وہاں یہ ہوگا کہ عیش کے مختلف سامان بدلتے رہیں تاکہ حالات بدلتے رہیں، ورنہ وہاں سایہ کی کچھ ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ ہر شے میں ایک الگ لذت ہوتی ہے، ایک حال کتنے بھی آرام ولذت کا ہو آخر کار اس سے طبیعت اکتا ہی جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جس چیز سے وہ ڈرتے تھے۔ اللہ نے اس سے محفوظ و مامون رکھا۔ اور ان کے چہروں کو تازگی اور دلوں کو سرور عطا کیا۔

فائدہ: ۲ یعنی از بسکہ یہ لوگ دنیا کی تنگیوں اور سختیوں پر صبر کر کے معاصی سے رکے اور طاعت پر جمے رہے تھے۔ اس لیے اللہ نے ان کو عیش کرنے کے لیے جنت کے باغ اور لباس ہائے فاخرہ مرحمت فرمائے۔

فائدہ: ۳ بادشاہوں کی طرح۔

فائدہ: ۴ یعنی جنت کا موسم نہایت معتدل ہوگا نہ گرمی کی تکلیف نہ سردی کی۔

فائدہ: ۵ یعنی درختوں کی شاخیں مع اپنے پھول پھل وغیرہ کے ان پر جھکی پڑتی ہوں گی اور پھلوں کے خوشے ایسی طرح لٹکے ہوں گے اور ان کے قبضہ میں کر دیے جائیں گے جنتی جس حالت میں چاہے کھڑے بیٹھے، لیٹے بے تکلف چن سکے۔

تنبیہ: شاید درختوں کی شاخوں کو یہاں ''ظلال'' سے تعبیر فرمایا ہے یا واقعی سایہ ہو، کیونکہ آفتاب کی دھوپ نہ سہی، کوئی دوسری قسم کا نور تو

وہاں ضرور ہوگا، اس کے سایہ میں بہشتی تفنن تفریح کی غرض سے کبھی بیٹھنا چاہیں گے، واللہ اعلم۔

وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ﴿١٥﴾

اور لوگ لیے پھرتے ہیں ان کے پاس برتن چاندی کے اور آب خورے جو ہو رہے ہیں شیشے کے

قَوَارِيرَا مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿١٦﴾

شیشے ہیں چاندی کے ۱؎ ناپ رکھا ہے ان کا ناپ ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور ان کے پاس (کھانے پینے کی چیزیں پہنچانے کے لئے) چاندی کے برتن لائے جائیں گے اور آب خورے جو شیشے کے ہوں گے (اور) وہ شیشے چاندی کے ہوں گے جن کو بھرنے والوں نے مناسب انداز سے بھرا ہوگا (یعنی اس میں مشروب ایسے انداز سے بھرا ہوگا کہ نہ اس وقت کی خواہش میں کمی رہے اور نہ اس سے بچے کہ دونوں میں بے لطفی ہوتی ہے)۔

قَوَارِيرَا مِن فِضَّةٍ: دنیا میں چاندی کا برتن کثیف ہوتا ہے آئینہ کی طرح نہیں ہوسکتا، اور جو کانچ سے تیار کیا جاتا ہے وہ چاندی نہیں ہوسکتا، ان دونوں میں تضاد ہے، مگر یہ جنت کی خصوصیت ہے کہ وہاں کی چاندی آئینہ کی طرف شفاف ہوگی، یعنی چاندی کے شیشے کے یہ معنی ہیں کہ سفیدی تو چاندی جیسی ہوگی اور شفافی آئینہ جیسی ہوگی، اور دنیا کی چاندی میں آر پار نظر نہیں آتا اور یہاں دنیا میں شیشے میں ایسی سفیدی بھی نہیں ہوتی پس یہ ایک عجیب چیز ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آب خورے اصل میں چاندی کے بنے ہوں گے نہایت سفید، بے داغ اور فرحت بخش، لیکن صاف وشفاف اور چمکدار ہونے میں شیشے کی طرح معلوم ہوں گے، ان کے اندر کی چیز باہر سے صاف نظر آئے گی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جنتی کو جس قدر پینے کی خواہش ہوگی ٹھیک اس کے اندازے کے موافق بھرے ہوں گے کہ نہ کمی رہے نہ بچے، یا بہشتیوں نے اپنے دل سے جیسا اندازہ کرلیا ہوگا بلا کم وکاست اسی کے موافق آئیں گے۔

وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿١٧﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ﴿١٨﴾

اور ان کو وہاں پلاتے ہیں پیالے جس کی ملونی ہے سونٹھ ۱؎ ایک چشمہ ہے اس میں اس کا نام کہتے ہیں سلسبیل ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور وہاں ان کو (پیچھے مذکور جام شراب کے علاوہ جس میں کافور کی آمیزش تھی ایک اور بھی) ایسا جام شراب پلایا جائے گا جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی (کہ طبعی حرارت کے بڑھانے اور منہ کا مزہ بدلنے کے لئے شراب میں اس کو بھی ملاتے ہیں) یعنی ایسے چشمے سے (ان کو پلایا جائے گا) جو وہاں ہوگا جس کا نام (وہاں) سلسبیل (مشہور) ہوگا۔

كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا: پیچھے کے مقام: كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا، اور اس مقام کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیچھے بیان کردہ چشمہ کی شراب کے ساتھ کافور ملایا جائے گا، اور یہاں اس چشمہ کی شراب میں سونٹھ کی سی آمیزش ہوگی، واللہ اعلم باسرارہ۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایک جام شراب وہ تھا جس کی ملونی کافور ہے، دوسرا وہ ہوگا، جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی، مگر یہ دنیا کی سونٹھ نہ سمجھے، وہ ایک چشمہ ہے جنت میں جس کو "سلسبیل" کہتے ہیں، سونٹھ کی تاثیر گرم ہے اور وہ حرارت غریزیہ میں انتعاش [چستی] پیدا کرتی ہے، عرب کے لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے، بہرحال کسی خاص مناسبت سے اس چشمہ کو زنجبیل کا چشمہ کہتے ہیں، ابرار کے پیالہ میں اس کی تھوڑی سی آمیزش کی جائے گی، اصل

میں وہ چشمہ بڑے عالی مقام مقربین کے لیے ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ اس نام کے معنی ہیں پانی صاف بہتا ہوا، کذا فی الموضح۔

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾

اور پھرتے ہیں ان کے پاس لڑکے سدا رہنے والے ۱ جب تو ان کو دیکھے خیال کرے کہ موتی ہیں بکھرے ہوئے ۲

وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾

اور جب تو دیکھے وہاں تو دیکھے نعمت اور سلطنت بڑی ۳

خلاصہ تفسیر: اور ان (جنتیوں) کے پاس (یہ چیزیں لے کر) ایسے لڑکے آمد و رفت کریں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے (اور وہ اس قدر حسین ہیں کہ) اے مخاطب! اگر تو ان کو (چلتے پھرتے) دیکھے تو یوں سمجھے کہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں (موتی سے تو تشبیہ صفائی اور چمک میں ہے، اور بکھرے ہوئے کا وصف ان کے چلنے پھرنے کے لحاظ سے ہے، جیسے بکھرے موتی منتشر ہو کر کوئی ادھر جا رہا ہے کوئی ادھر جا رہا ہے اور یہ اعلیٰ درجہ کی تشبیہ ہے) اور (صرف یہی مذکورہ نعمتیں ہی نہیں، بلکہ وہاں اور بھی ہر سامان اس کثرت اور رفعت کیساتھ ہوگا کہ) اے مخاطب! اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھ کو بڑی نعمت اور بڑی سلطنت دکھلائی دے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہمیشہ لڑکے رہیں گے یا جنتیوں سے کبھی چھینے نہ جائیں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی اپنے حسن و جمال صفائی اور آب و تاب میں ادھر ادھر پھرتے ہوئے ایسے خوش منظر معلوم ہوں گے گویا بہت سے چمکدار خوبصورت موتی زمین پر بکھیر دیے گئے۔

فائدہ: ۳ یعنی جنت کا حال کیا کہا جائے، کوئی دیکھے تو معلوم ہو کہ کیسی عظیم الشان نعمت اور کتنی بھاری بادشاہت ہے جو ادنیٰ ترین جنتی کو نصیب ہوگی رَزَقْنَا اللہ مِنْهَا بِمَنِّهٖ وَفَضْلِهٖ۔

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ

اوپر کی پوشاک ان کی کپڑے ہیں باریک ریشم کے سبز اور گاڑھے ۱ اور ان کو پہنائے جائیں گے کنگن چاندی کے ۲ اور پلائے ان کو انکا

شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ ع ۱۹

رب شراب جو پاک کرے دل کو ۳ یہ ہے تمہارا بدلہ اور کمائی تمہاری ٹھکانے لگی ۴

خلاصہ تفسیر: (اور) ان جنتیوں پر باریک ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے اور دبیز ریشم کے کپڑے ہوں گے (کیونکہ ہر لباس میں الگ لطف ہوتا ہے) اور ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب (جو ان کو شراب پینے کو دے گا جس کا پیچھے ذکر آیا ہے تو دنیا کی شراب کی طرح ناپاک، نشہ آور اور عقل زائل کرنے والی نہ ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ) ان کو پاکیزہ شراب پینے کو دے گا (جس میں نجاست نہ ہوگی اور نہ کدورت جیسا کہ ارشاد ہے: لا یصدعون عنها ولا ینزفون، اور ان سب نعمتوں کو دے کر اہل جنت سے روحانی مسرت بڑھانے کے لئے کہا جائے گا کہ) یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری کوشش (جو دنیا میں کیا کرتے تھے) مقبول ہوئی۔

اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ: اس سورت میں تین جگہ چاندی کے سامان کا ذکر آیا ہے اور دوسری آیات میں سونے کا بھی ذکر ہے، نیز اس آیت میں

چندی کے کنگن کا ذکر ہے اور ایک دوسری آیت میں اساور من ذھب آیا ہے یعنی کنگن سونے کے، ان دونوں میں کوئی تعارض وتضاد نہیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت چاندی کے کسی وقت سونے کے کنگن استعمال کئے جائیں یا بعض کے کنگن سونے کے ہوں بعض کے چاندی کے، یعنی دونوں طرح کا سامان ہوگا اور حکمت اس کی وہی ہے جو پیچھے گذر چکی کہ عیش کے مختلف سامان بدلتے رہیں تا کہ حالات بدلتے رہیں، کیونکہ ہر چیز میں ایک الگ لذت ہوتی ہے، ایک چیز کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو آخر کار اس سے طبیعت اکتا ہی جاتی ہے۔

مگر ایک سوال اس جگہ بہر حال ہے کہ چاندی کے کنگن ہوں یا سونے کے بہر حال یہ زیور ہیں جو عورتوں کے استعمال کے لئے ہوتے ہیں، مردوں کے لئے ایسے زیور پہننا عیب سمجھا جاتا ہے، جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا عورتوں یا مردوں کے لئے مخصوص ہونا اور ان کے لئے مستحسن یا عیب ہونا یہ چیز عرف وعادت کے تابع ہوتی ہے، بعض ملکوں یا قوموں میں ایک چیز بڑی عیب اور بری سمجھی جاتی ہے، دوسری قوموں میں وہ بڑا احسن سمجھا جاتا ہے، دنیا میں ملوک کسریٰ ہاتھوں میں کنگن اور سینے اور تاج میں زیورات استعمال کرتے تھے اور یہ ان کا خاص امتیاز واعزاز سمجھا جاتا تھا، ملک کسریٰ فتح ہونے کے بعد جو خزائن کسریٰ مسلمانوں کو ہاتھ آئے ان میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے، جب دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں کے معمولی جغرافیائی اور قومی تفاوت سے یہ معاملہ مختلف ہوسکتا ہے تو جنت کو دنیا پر قیاس کرنے کے کوئی معنی نہیں ہوسکتا ہے کہ وہاں زیور مردوں کے لئے بھی مستحسن سمجھا جائے، خلاصہ یہ کہ ہر مقام کا تقاضہ اور مطالبہ الگ ہوتا ہے، ایک چیز دنیا میں تو عیب ہوسکتی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہی چیز جنت میں بھی عیب سمجھی جائے۔

شَرَابًا طَهُوْرًا: اس سورت میں تین جگہ شراب کا ذکر آیا ہے اور ہر جگہ الگ غرض ہے، جیسا کہ خلاصہ تفسیر سے واضح ہے، چنانچہ پہلے مقام پر فرمایا: **يَشْرَبُوْنَ** کہ وہ خود پئیں گے، دوسری جگہ فرمایا: **يُسْقَوْنَ** کہ پلائے جائیں گے جو زیادہ تعظیم، اکرام اور اعزاز پر دلالت کرتا ہے، اور یہاں تیسری جگہ فرمایا: **سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ** کہ حق تعالیٰ ان کو شراب دے گا جس میں نہایت درجہ تشریف وتکریم ہے، پس تکرار کا شبہ نہ رہا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی باریک اور دبیز دونوں قسم کے ریشم کے لباس جنتیوں کو ملیں گے۔

فائدہ: ۲؎ اس سورت میں تین جگہ چاندی کے برتنوں اور زیور وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ دوسری جگہ سونے کے بیان کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے یہ بھی ہوں اور وہ بھی، کسی کو یہ ملیں، کسی کو وہ۔ یا کبھی یہ کبھی وہ۔

فائدہ: ۳؎ یعنی سب نعمتوں کے بعد شراب طہور کا ایک جام محبوب حقیقی کی طرف سے ملے گا، جس میں نہ نجاست ہوگی نہ کدورت، نہ سرگرانی، نہ بدبو، اس کے پینے سے دل پاک اور پیٹ صاف ہوں گے، پینے کے بعد بدن سے پسینہ نکلے گا جس کی خوشبو مشک کی طرح مہکنے والی ہوگی۔

فائدہ: ۴؎ یعنی مزید اعزاز واکرام اور تطییب قلوب کے لیے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے۔ تمہاری کوشش مقبول ہوئی۔ اور محنت ٹھکانے لگی۔ اس کو سن کر جنتی اور زیادہ خوش ہوں گے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾

ہم نے اتارا تجھ پر قرآن سہج سہج اتارنا، سو تو انتظار کر اپنے رب کے حکم کا ۱؎ اور کہنا مت مان ان میں سے کسی گناہ گار کا یا ناشکر کا ۲؎

خلاصہ تفسیر: دونوں فریق کی جزا ذکر کرنے کے بعد اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے، یعنی ان مخالفین کی سزا آپ نے سن لی، پس آپ ان کی مخالفت سے غم نہ کیجیے اور اپنی طاعات میں لگے رہیے کہ طاعت کے ساتھ ساتھ اس سے دل کو بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔

(اور اس اطاعت کا بیان یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے (تا کہ تھوڑا تھوڑا لوگوں کو پہنچاتے رہیں اور ان کو اس سے فائدہ اٹھانے میں آسانی ہو جیسا کہ سورۃ اسراء کے آخر میں ہے: **وقرانا فرقنه لتقراه الخ**) سو آپ اپنے پروردگار کے حکم پر (کہ اس میں تبلیغ بھی داخل ہے) مستقل رہئے اور ان میں سے کسی فاسق یا کافر کے کہنے میں نہ آیئے (یعنی جو تبلیغ سے منع کرتے ہیں ان کی موافقت نہ کیجئے، مقصود اس

سے تبلیغ کا مہتم بالشان ہونا ظاہر کرنا ہے، ورنہ آپ ﷺ سے ان کی موافقت کرنے کا کوئی احتمال ہی نہیں تھا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ تا کہ آپ ﷺ کا دل مضبوط رہے اور لوگ بھی آہستہ آہستہ اپنے نیک و بد کو سمجھ لیں، اور معلوم کرلیں کہ جنت کن اعمال کی بدولت ملتی ہے، اگر اس طرح سمجھانے پر بھی نہ مانیں اور اپنی ضد وعناد ہی پر قائم رہیں تو آپ ﷺ اپنے پروردگار کے حکم پر برابر جمے رہیے اور آخری فیصلہ کا انتظار کیجیے۔

فائدہ: ۲؎ عتبہ اور ولید وغیرہ کفار قریش آپ ﷺ کو دنیاوی لالچ دے کر اور چکنی چپڑی باتیں بنا کر چاہتے تھے کہ فرض تبلیغ ودعوت سے باز رکھیں، اللہ نے متنبہ فرمادیا کہ آپ ﷺ ان میں سے کسی کی بات نہ مانیں، کیونکہ کسی گنہگار فاسق یا ناشکر کافر کا کہنا ماننے سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں، ایسے شریروں اور بدبختوں کی بات پر کان دھرنا نہیں چاہیے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٢٥﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿٢٦﴾

اور لیتا رہ نام اپنے رب کا صبح اور شام ۱؎ اور کسی وقت رات کو سجدہ کر اس کو ۲؎ اور پاکی بول اس کی بڑی رات تک ۳؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے اس عبادت کا بیان ہوا جس کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے، اب آگے اس عبادت کا حکم ہے جس کا اثر انسان کی اپنی ذات تک ہے، یعنی) اور اپنے پروردگار کا صبح وشام نام لیا کیجیے اور کسی قدر رات کے حصے میں بھی اس کو سجدہ کیا کیجئے (یعنی نماز فرض پڑھا کیجئے) اور رات کے بڑے حصے میں اس کی تسبیح (وتقدیس) کیا کیجیے (مراد اس سے تہجد ہے فرائض کے علاوہ)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہمہ وقت اس کو یاد رکھو خصوصاً ان دو وقتوں میں، سب خرخشوں کا علاج یہی ذکر خدا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی نماز پڑھ، شاید مغرب وعشاء مراد ہو یا تہجد۔

فائدہ: ۳؎ اگر وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ سے تہجد مراد لیا جائے تو یہاں تسبیح سے اس کے معنیٰ متبادر مراد لیں گے، یعنی شب کو تہجد کے علاوہ بہت زیادہ تسبیح وتہلیل میں مشغول رہیے اور اگر پہلے مغرب وعشاء مراد تھی تو یہاں تسبیح سے تہجد مراد لے سکتے ہیں۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿٢٧﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ

یہ لوگ چاہتے ہیں جلدی ملنے والے کو اور چھوڑ رکھا ہے اپنے پیچھے ایک بھاری دن کو ۱؎ ہم نے ان کو بنایا اور مضبوط کیا

اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿٢٨﴾

ان کو جوڑ بندی کو اور جب ہم چاہیں بدل لائیں ان جیسے لوگ بدل کر ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے تسلی کی مزید تقویت کے لئے ایک اور مضمون ہے جس میں کفار کی مذمت بھی ہے، یعنی ان لوگوں کی مخالفت کی اصل وجہ آپ کے ساتھ یہ ہے کہ) یہ لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (آنے والے) ایک بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں (پس دنیا کی محبت نے اندھا کر رکھا ہے اس لئے حق کہنے سے بغض رکھتے ہیں، اور یوم ثقیل یعنی آخرت کے بھاری دن کا ذکر س کر چونکہ ان کے انکار کا احتمال تھا اس لئے اب آگے اس بھاری دن کے محال اور بعید سمجھنے کو دور فرماتے ہیں یعنی) ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ہم ہی نے ان کے جوڑ بند مضبوط کئے اور (نیز) جب ہم چاہیں ان ہی جیسے لوگ ان کی جگہ بدل دیں (پہلی بات یعنی جوڑ بند کی مضبوطی تو مشاہد ہے اور دوسری بات ادنی تنبیہ سے معلوم ہوسکتی ہے، پس دونوں باتوں سے قدرت الٰہیہ ظاہر ہے، پھر مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے ہی میں کون بات زیادہ دشوار ہے کہ اس پر قدرت نہ ہو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ لوگ جو آپ ﷺ کی نصیحت و ہدایت قبول نہیں کرتے اس کا سبب حب دنیا ہے، دنیا چونکہ جلد ہاتھ آنے والی چیز ہے اسی کو یہ چاہتے ہیں اور قیامت کے بھاری دن سے غفلت میں ہیں اس کی کچھ فکر نہیں، بلکہ اس کے آنے کا یقین بھی نہیں، سمجھتے ہیں کہ مر کر جب گل سڑ گئے پھر کون دوبارہ ہم کو ایسا ہی بنا کر کھڑا کر دے گا؟ آگے اس کا جواب دیا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اول پیدا ہم نے کیا اور سب جوڑ بند درست کیے، آج ہماری وہ قدرت سلب نہیں ہوگئی، ہم جب چاہیں ان کی موجودہ ہستی کو ختم کر کے دوبارہ ایسی ہی ہستی بنا کر کھڑی کر دیں، یا یہ مطلب ہے کہ یہ لوگ نہ مانیں گے تو ہم قادر ہیں کہ جب چاہیں ان کی جگہ دوسرے ایسے ہی آدمی لے آئیں جو ان کی طرح سرکش نہ ہوں گے۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿٢٩﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

یہ تو نصیحت ہے پھر جو کوئی چاہے کر رکھے اپنے رب تک راہ ۱؎ اور تم نہیں چاہو گے مگر جو چاہے اللہ بیشک اللہ

كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٣٠﴾ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٣١﴾ ع

ہے سب کچھ جاننے والا حکمتوں والا ۲؎ داخل کر لے جس کو چاہے اپنی رحمت میں ۳؎ اور جو گناہ گار ہیں تیار ہے ان کے واسطے عذاب دردناک

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ تمام مضامین پر اب آگے نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں کہ) یہ (سب جو بیان ہوا کافی) نصیحت ہے، سو جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کر لے (سورہ مزمل میں اس کی تفسیر گذر چکی ہے) اور (قرآن کے تذکرہ ہونے میں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بعض کو اس سے ہدایت نہیں ہوتی، بات یہ ہے کہ قرآن فی نفسہ تذکرہ اور ہدایت کافی ہے لیکن) بدون خدا کے چاہے تم لوگ کوئی بات چاہ نہیں سکتے (اور بعض لوگوں کے لئے خدا کے نہ چاہنے میں بعض حکمتیں ہوتی ہیں، کیونکہ) خدا تعالیٰ بڑا علم والا اور حکمت والا ہے وہ جس کو چاہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور (جس کو چاہے کفر میں مبتلا رکھتا ہے، پھر) ظالموں کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جبر و زور سے منوا دینا آپ کا کام نہیں، قرآن کے ذریعہ نصیحت کر دیجئے، آگے ہر ایک کو اختیار ہے جس کا جی چاہے اپنے رب کی خوشنودی تک پہنچنے کا راستہ بنا رکھے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تمہارا چاہنا بھی اللہ کے چاہے بدون نہیں ہوسکتا، کیونکہ بندہ کی مشیت اللہ کی مشیت کے تابع ہے وہ جانتا ہے کہ کس کی استعداد و قابلیت کس قسم کی ہے اسی کے موافق اس کی مشیت کام کرتی ہے، پھر وہ جس کو اپنی مشیت سے راہ راست پر لائے، اور جس کو گمراہی میں پڑا چھوڑ دے عین صواب و حکمت ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جن کی استعداد اچھی ہوگی ان کو نیکی پر چلنے کی توفیق دے گا اور اپنی رحمت و فضل کا مستوجب بنائے گا،

(آیاتها ۵۰) (۷۷ سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ ۳۳) (رکوعاتها ۲)

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں قیامت کا واقع ہونا، اس کے اسباب کی تفصیل، اور جزا و سزا کی کیفیت مذکور تھی، اب اس سورت میں بھی یہی مضمون ہے، اتنا فرق ہے کہ پیچھے ترغیب کا مضمون زیادہ تھا اور یہاں ڈرانے کا مضمون زیادہ ہے، اسی لیے اس سورت میں دس جگہ آیت: مکرر آئی ہے، اور چونکہ مختلف تکذیبوں پر یہ آیت لائی گئی ہے اس لیے معنوی اعتبار سے یہ تکرار نہیں، اور ظاہری تکرار بھی تاکید کا فائدہ دیتی ہے جیسا کہ سورہ رحمٰن میں تفصیل سے مذکور ہوا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالۡمُرۡسَلٰتِ عُرۡفًا ۙ﴿۱﴾ فَالۡعٰصِفٰتِ عَصۡفًا ۙ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشۡرًا ۙ﴿۳﴾ فَالۡفٰرِقٰتِ فَرۡقًا ۙ﴿۴﴾

قسم ہے چلتی ہواؤں کی دل کو خوش آتی، پھر جھونکا دینے والیوں کی زور سے ۱؎ پھر ابھارنے والیوں کی اٹھا کر، پھر پھاڑنے والیوں کی بانٹ کر ۲؎

خلاصہ تفسیر: قسم ہے ان ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کے لئے بھیجی جاتی ہیں، پھر ان ہواؤں کی جو سختی سے چلتی ہیں (جس سے خطرات کا احتمال ہوتا ہے) اور ان ہواؤں کی جو بادلوں کو (اٹھا کر) پھیلاتی ہیں (جس کے بعد بارش ہونے لگتی ہے) پھر ان ہواؤں کی جو بادلوں کو متفرق کر دیتی ہیں (جیسے بارش کے بعد ہوتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اول ہوا نرم اور خوشگوار چلتی ہے، جس سے مخلوق کی بہت سی توقعات اور منافع وابستہ ہوتے ہیں، پھر کچھ دیر بعد وہی ہوا ایک تند آندھی اور طوفان جھکڑ کی شکل اختیار کر کے وہ خرابی اور غضب ڈھاتی ہے کہ لوگ بلبلا اٹھتے ہیں، یہی مثال دنیا و آخرت کی سمجھو، کتنے ہی کام ہیں جن کو لوگ فی الحال مفید اور نافع تصور کرتے ہیں اور ان پر بڑی بڑی امیدیں باندھتے ہیں، لیکن وہی کام جب قیامت کے دن اپنی اصلی اور سخت ترین خوفناک صورت میں ظاہر ہوں گے تو لوگ پناہ مانگنے لگیں گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان ہواؤں کی قسم جو بخارات وغیرہ کو اٹھا کر اوپر لے جاتی ہیں اور ابر کو ابھار کر جو میں پھیلا دیتی ہیں پھر جہاں جہاں پہنچانا ہے اللہ کے حکم سے اس کے حصے کر کے بانٹتی ہیں اور بارش کے بعد بادلوں کو پھاڑ کر ادھر ادھر متفرق کرتی ہیں اور کچھ ابر کے ساتھ مخصوص نہیں، ہوا کی عام خاصیت یہ ہے کہ اشیاء کی کیفیات مثلاً بدبو وغیرہ کو پھیلائے ان کے لطیف اجزا کو جدا کر کے لے اڑے اور ایک چیز کو اٹھا کر دوسری چیز سے جا ملائے، غرض یہ جمع و تفریق جو ہوا کا خاصہ ہے ایک نمونہ ہے آخرت کا، جہاں حشر و نشر کے بعد لوگ جدا کیے جائیں گے اور ایک جگہ جمع ہونے کے بعد الگ الگ ٹھکانوں پر پہنچا دیے جائیں گے: هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ۔

فَالۡمُلۡقِیٰتِ ذِکۡرًا ۙ﴿۵﴾ عُذۡرًا اَوۡ نُذۡرًا ۙ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾

پھر فرشتوں کی جو اتار کر لائیں وحی ۱؎ الزام اتارنے کو یا ڈر سنانے کو ۲؎ مقرر جو تم سے وعدہ ہوا وہ ضرور ہونا ہے ۳؎

خلاصہ تفسیر: پھر ان ہواؤں کی جو (دل میں) اللہ کی یاد یعنی توبہ کا یا ڈرانے کا القاء کرتی ہیں (اب آگے جواب قسم ہے) کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور ہونے والی ہے (مراد قیامت ہے اور یہ سب قسمیں قیامت کے نہایت مناسب ہیں کیونکہ پہلی بار صور پھونکنے کے بعد جو فنا ہوگا وہ سخت آندھی اور ہوا کے مشابہ ہے، اور دوسری بار صور پھونکنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا واقعہ نافع اور مفید ہوا کے مشابہ ہے جس سے بارش اور بارش سے حیات نباتی ابھرتی ہے)۔

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا: یعنی یہ مذکورہ ہوائیں حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کی وجہ سے خالق کائنات کی طرف متوجہ ہو جانے کا سبب ہو جاتی ہیں اور وہ توجہ دو طرح سے ہوتی ہے: ① ایک خوف سے جبکہ ان ہواؤں سے خوف کے آثار نمایاں ہوں ② دوسرا توبہ و معذرت سے اور یہ خوف و رجاء کی دونوں صورت میں ہو سکتا ہے، اگر ہوائیں نفع بخش ہوں تب تو خدا کی نعمتوں کو یاد کر کے اس کا شکر اور اپنی کوتاہیوں سے عذر کرتے ہیں، اور اگر وہ ہوائیں خوفناک ہوں تو خدا کے عذاب سے ڈر کر اپنے معاصی سے توبہ کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحب عبدالعزیزؒ نے اَلۡمُلۡقِيٰتِ ذِكۡرًا سے بھی ہوائیں مراد لی ہیں کیونکہ وحی کی آواز کا لوگوں کے کانوں تک پہنچانا بھی ہوا کے ذریعہ سے ہے۔

تنبیہ: اَلۡمُرۡسَلٰتِ، اَلۡعٰصِفٰتِ، اَلنّٰشِرٰتِ، اَلۡفٰرِقٰتِ، اَلۡمُلۡقِيٰتِ پانچوں کا مصداق کسی نے ہواؤں کو ٹھہرایا ہے، کسی نے فرشتوں کو، کسی نے پیغمبروں کو، اور بعض مفسرین نے پہلی چار سے ہوائیں مراد لیں ہیں اور پانچویں سے فرشتے، جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے اور بھی اقوال ہیں جن سب کی تفصیل روح المعانی میں ملے گی۔

فائدہ: ۲؎ حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں: ''کہ (وحی سے) کافروں کا الزام اتارنا منظور ہے کہ (سزا کے وقت) نہ کہیں ہم کو خبر نہ تھی اور جن کی قسمت میں ایمان ہے ان کو ڈرسنانا تاکہ ایمان لائیں''، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ جو کلام الٰہی امر ونہی اور عقائد واحکام پر مشتمل ہے، وہ عذر کرنے کے واسطے ہے، تاکہ اعمال کی باز پرس کے وقت اس شخص کے لیے عذر اور دستاویز ہو کہ میں نے فلاں کام حق تعالیٰ کے حکم کے بموجب کیا اور فلاں کام اس کے حکم سے ترک کیا، اور جو کلام الٰہی قصص واخبار وغیرہ پر مشتمل ہو وہ عموماً منکرین کو ڈرانے اور خوف دلانے کے لیے ہے اور اس سورت میں روئے سخن بیشتر مکذبین ومنکرین کی طرف تھا، اس لیے بشارت کا ذکر نہیں کیا گیا، واللہ اعلم۔ بہرحال وحی لانے والے فرشتے اور وحی پہنچانے والی ہوائیں شاہد ہیں کہ ایک وقت ضرور آنا چاہیے جب مجرموں کو ان کی حرکات پر ملزم کیا جائے اور خدا سے ڈرنے والوں کو بالکلیہ مامون وبے فکر کر دیا جائے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی قیامت کا اور آخرت کے حساب وکتاب اور جزا وسزا کا وعدہ۔

فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتۡ ⑧ وَإِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتۡ ⑨ وَإِذَا الۡجِبَالُ نُسِفَتۡ ⑩

پھر جب تارے مٹائے جائیں، اور آسمان میں جھروکے پڑ جائیں ۱؎ اور جب پہاڑ اڑا دیے جائیں ۲؎

وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتۡ ⑪

اور جب رسولوں کا وقت مقرر ہو جائے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (آگے قیامت کے واقع ہونے پر بطور نتیجہ فرماتے ہیں) سو جب ستارے بے نور ہو جائیں گے، اور جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب پہاڑ اڑتے پھریں گے، اور جب سب پیغمبر وقت معین پر جمع کئے جائیں گے (اس وقت سب کا فیصلہ ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تارے بے نور ہو جائیں، آسمان پھٹ پڑیں اور پھٹنے کی وجہ سے ان میں دریچیاں اور جھروکے سے نظر آنے لگیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی روئی کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں۔

فائدہ: ۳؎ تا آگے پیچھے وقت مقرر کے موافق اپنی اپنی امتوں کے ساتھ رب العزت کی سب سے بڑی پیشی میں حاضر ہوں۔

لِأَيِّ يَوۡمٍ أُجِّلَتۡ ⑫ لِيَوۡمِ الۡفَصۡلِ ⑬ وَمَآ أَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ ⑭

کس دن کے واسطے ان چیزوں میں دیر ہے، اس فیصلے کے دن کے واسطے ۱؎ تو نے کیا بوجھا کیا ہے فیصلے کا دن

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِينَ ⑮

خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب اس دن کا ہولناک ہونا بیان کرتے ہیں کہ کچھ معلوم ہے) کس دن کے لئے پیغمبروں کا معاملہ ملتوی رکھا گیا

ہے؟ (آگے جواب ہے کہ) فیصلہ کے دن کے لئے (ملتوی رکھا گیا ہے) اور (آگے اس فیصلہ کے دن کا ہولناک ہونا مذکور ہے کہ) آپ کو معلوم ہے کہ وہ فیصلہ کا دن کیسا کچھ ہے؟ (یعنی بہت سخت ہے اور جو لوگ اس امر حق یعنی قیامت کے واقع ہونے کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ لِيَوْمِ الْفَصْلِ: اس سوال و جواب کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار جو رسولوں کو جھٹلاتے آئے ہیں اور اب بھی اس امت کے کفار رسول اللہ ﷺ کو جھٹلا رہے ہیں اور جب اس پر وہ آخرت کے عذاب سے ڈرائے جاتے ہیں تو پھر آخرت کو بھی جھٹلاتے ہیں، ان کا یہ جھٹلانا فی نفسہ اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ رسولوں کا جو قصہ کفار سے پیش آرہا ہے اس کا فیصلہ ابھی ہوجائے اور اس کی تاخیر سے کفار کو مزید انکار و تکذیب کا موقع ملتا ہے اور مسلمانوں کو طبعی طور پر اس کے جلد ہوجانے کی خواہش ہوتی ہے، پس اس آیت میں اس جلد تقاضے کا جواب ہے کہ حق تعالیٰ نے بعض حکمتوں سے اس کو موخر کر رکھا ہے لیکن واقع ضرور ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جانتے ہو؟ ان امور کو کس دن کے لیے اٹھا رکھا ہے؟ اس دن کے لیے جس میں ہر بات کا بالکل اور دوٹوک فیصلہ ہوگا، بیشک اللہ چاہتا تو ابھی ہاتھوں ہاتھ ہر چیز کا فیصلہ کر دیتا لیکن اس کی حکمت مقتضی نہیں ہوئی کہ ایسا کیا جائے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کچھ مت پوچھو، فیصلہ کا دن کیا چیز ہے، بس یہ سمجھ لو کہ جھٹلانے والوں کو اس روز سخت تباہی اور مصیبت کا سامنا ہوگا، کیونکہ جس چیز کی انہیں امید نہ تھی جب وہ یکایک اپنی ہولناک صورت میں آن پہنچے گی تو ہوش پراں ہو جائیں گے، اور حیرت و ندامت سے حواس باختہ ہوں گے۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾

کیا ہم نے نہیں مار کھپایا پہلوں کو، پھر ان کے پیچھے بھیجتے ہیں پچھلوں کو، ہم ایسا ہی کرتے ہیں گناہ گاروں کے ساتھ ۱؎

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾

خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے گذشتہ نظائر واقعات کے ذریعہ موجودہ لوگوں کو ڈراتے ہیں) کیا ہم اگلے (گذشتہ کافر) لوگوں کو (عذاب سے) ہلاک نہیں کر چکے پھر پچھلوں (بعد والوں) کو بھی (عذاب میں) ان (پہلوں) ہی کے ساتھ ساتھ کر دیں گے (یعنی آپ کی امت کے کفار پر بھی وبال ہلاکت نازل کریں گے جیسا بدر وغیرہ کے غزوات میں ہوا) ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں (یعنی ان کے کفر پر سزا دیتے ہیں خواہ دنیا و آخرت دونوں میں، خواہ دار آخرت میں، اور جو اس امر حق یعنی کفر پر مستحق عذاب ہونے کو جھٹلا رہے ہیں تو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ منکرین قیامت سمجھتے تھے کہ اتنی بڑی دنیا کہاں ختم ہوتی ہے؟ بھلا کون باور کرے گا کہ سب آدمی بیک وقت مر جائیں گے اور نسل انسانی بالکل نابود ہو جائے گی؟ یہ دوزخ اور عذاب کے ڈراوے سب فرضی اور بناوٹی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس کا جواب دیا کہ پہلے کتنے آدمی مر چکے اور کتنی قومیں اپنے گناہوں کی پاداش میں تباہ کی جا چکی ہیں، پھر ان کے پیچھے بھی موت و ہلاکت کا یہ سلسلہ برابر جاری ہے، جب ہماری قدیم عادت مجرموں کی نسبت معلوم ہو چکی تو سمجھ لو کہ دور حاضر کے کفار کو بھی ہم ان ہی اگلوں کے پیچھے چلتا کر دیں گے، جو ہستی الگ الگ زمانوں میں بڑے بڑے مضبوط آدمیوں کو مار سکتی اور طاقتور مجرموں کو پکڑ کر ہلاک کر سکتی ہے، وہ اس پر کیوں قادر نہ ہوگی کہ سب مخلوق کو ایک دم میں فنا کر دے، اور تمام مجرموں کو بیک وقت عذاب کا مزہ چکھائے۔

فائدہ: ۲ یعنی جو قیامت کی آمد کو اس لیے جھٹلاتے ہیں کہ سب انسان ایک دم کیسے فنا کر دیے جائیں گے اور کس طرح سب مجرموں کو بیک وقت گرفتار کر کے سزا دیں گے۔

اَلَمۡ نَخۡلُقۡکُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلۡنٰهُ فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۲۲﴾

کیا ہم نے نہیں بنایا تم کو ایک بے قدر پانی سے، پھر رکھا اس کو ایک جمے ہوئے ٹھکانے میں ۱ ایک وعدہ مقرر تک ۲

فَقَدَرۡنَا ۖ فَنِعۡمَ الۡقٰدِرُوۡنَ ﴿۲۳﴾ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۲۴﴾

پھر ہم اس کو پورا کر سکے سو ہم کیا خوب سکت والے ہیں ۳ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۴

خلاصہ تفسیر: اب قیامت کے واقع ہونے اور مردوں کے زندہ کرنے کو ذہنوں کے قریب کرنے کے لئے فرماتے ہیں: کیا ہم نے تم کو ایک بے قدر پانی (یعنی نطفہ) سے نہیں بنایا؟ (یعنی ابتداء میں تم نطفہ تھے) پھر ہم نے اس کو ایک وقت مقرر تک ایک محفوظ جگہ (یعنی عورت کے رحم) میں رکھا، غرض ہم نے (ان سب تصرفات کا) اندازہ ٹھہرایا، سو ہم کیسے اچھے اندازہ ٹھہرانے والے ہیں (اس سے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت ثابت ہوئی، پھر جو لوگ اس امر حق یعنی مردوں کے زندہ کرنے کی قدرت کو جھٹلا رہے ہیں تو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں محفوظ رکھا، مراد اس سے رحم مادر ہے جسے ہمارے محاورات میں "بچہ دانی" کہتے ہیں۔

فائدہ: ۲ اکثر وہاں ٹھہرنے کی مدت نو مہینے ہوتی ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی اس پانی کی بوند کی بتدریج پورا کر کے انسان عاقل بنا دیا، اس سے ہماری قدرت اور سکت کو سمجھ لو، تو اسی انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے؟

تنبیہ: بعض نے قَدَرۡنَا کے معنی اندازہ کرنے کے لیے ہیں "اندازہ کیا ہم نے اور ہم کیا خوب اندازہ کرنے والے ہیں" کہ اتنی مدت میں کوئی ضروری چیز رہ نہیں جاتی اور کوئی زائد و بیکار چیز پیدا نہیں ہوتی۔

فائدہ: ۴ جو یوں کہا کرتے تھے کہ مٹی میں مل کر جب ہماری ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہو جائیں گی، پھر کس طرح زندہ کر دیے جائیں گے؟ اس وقت اپنے لچر پوچ شبہات پر شرمائیں گے اور ندامت سے ہاتھ کاٹیں گے۔

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحۡيَآءً وَّاَمۡوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّجَعَلۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسۡقَيۡنٰكُمۡ

کیا ہم نے نہیں بنائی زمین سمیٹنے والی، زندوں کو اور مردوں کو ۱ اور رکھے ہم نے زمین میں بوجھ کے لیے پہاڑ اونچے اور پلایا ہم نے تم کو

مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۲۸﴾

پانی میٹھا پیاس بجھانے والا ۲ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۳

خلاصہ تفسیر: (آگے اپنی بعض وہ نعمتیں ذکر فرماتے ہیں جن سے اطاعت و ایمان کی ترغیب ہو یعنی) کیا ہم نے زمین کو زندہ اور مردوں کی سمیٹنے والی نہیں بنایا (کہ زندگی اسی پر بسر ہوتی ہے، مرنے کے بعد دفن اور غرق ہو جانے اور جل جانے کی صورت میں بالآخر زمین کے اجزاء بن کر اسی میں کھپ جاتے ہیں) اور ہم نے اس (زمین) میں اونچے اونچے پہاڑ بنائے (جن سے بہت سے منافع متعلق ہیں) اور ہم نے تم کو میٹھا پانی

پلایا (اس نعمت کوخواہ مستقل کہا جائے یا زمین ہی کے متعلق کہا جائے کیونکہ پانی کا مرکز بھی زمین ہی ہے اوران نعمتوں کا تقاضہ اور مطالبہ توحید کا واجب ہونا ہے، پس جولوگ اس امرحق یعنی توحید کے واجب ہونے کو جھٹلا رہے ہیں تو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا: موت کے بعد کی حالت کا نعمت ہونا اس طرح ہے کہ اگر مردے خاک نہ ہوجایا کرتے تو زندے پریشان ہوکر مردوں سے بھی بدتر ہوجاتے اور زندوں کواپنے بسنے بلکہ چلنے پھرنے کی بھی جگہ نہ ملتی

* * *

فائدہ: ۱ یعنی زندہ مخلوق اسی زمین میں بسر کرتی ہے اور مردے بھی اس مٹی میں پہنچ جاتے ہیں، انسان کو زندگی بھی اس خاک سے ملی اور موت کے بعد بھی یہی اس کا ٹھکانا ہوا، تو دوبارہ اسی خاک سے اس کو اٹھا دینا کیوں مشکل ہوگا؟!!۔

فائدہ: ۲ یعنی اس زمین میں پہاڑ جیسی وزنی اور سخت چیز پیدا کردی جو اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہیں کھاتے اور اسی زمین میں پانی کے چشمے جاری کردیے جو نرم وسیال ہونے کی وجہ سے برابر بہتے رہتے ہیں، اور بڑی سہولت سے پینے والے کو سیراب کرتے ہیں، پس جو خدا اس حقیر زمین میں اپنی قدرت کے متضاد نمونے دکھلاتا ہے اور موت وحیات اور سختی ونرمی کے مناظر پیش کرتا ہے، کیا وہ میدان حشر میں سختی ونرمی اور نجات و ہلاکت کے مختلف مناظر نہیں دکھلاسکتا، نیز جس کے قبضہ میں پیدا کرنا، ہلاک کرنا، اور حیات وبقاء کے سامان فراہم کرنا یہ سب کام ہوئے اس کی قدرت ونعمت کو جھٹلانا کیوں کر جائز ہوگا۔

فائدہ: ۳ جو سمجھتے تھے کہ ایک جگہ اور ایک وقت میں تمام اولین وآخرین کی اثابت وتعذیب کے اس قدر مختلف اور متضاد کام کیونکر سرانجام پائیں گے۔

اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰى مَا كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ﴿۲۹﴾ اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِىۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾

چل کر دیکھو جس چیز کو تم جھٹلاتے تھے ۱ چلو ایک چھاؤں میں جس کی تین پھانکیں ہیں ۲

لَا ظَلِيۡلٍ وَّلَا يُغۡنِىۡ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرۡمِىۡ بِشَرَرٍ كَالۡقَصۡرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفۡرٌ ﴿۳۳﴾

نہ گہری چھاؤں اور نہ کچھ کام آئے تپش میں ۳ وہ آگ پھینکتی ہے چنگاریاں جیسے محل ۴ گویا وہ اونٹ ہیں زرد ۵

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ﴿۳۴﴾

خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۶

خلاصہ تفسیر: (اب قیامت کی بعض سزاؤں کا بیان ہے یعنی قیامت کے روز کفار سے کہا جائے گا کہ) تم اس عذاب کی طرف چلو جس کو جھٹلایا کرتے تھے (جس کی ایک سزا وہ ہے جس کا بیان اس حکم میں ہے کہ) ایک سائبان کی طرف چلو جس کی تین شاخیں ہیں جس میں نہ (ٹھنڈا) سایہ ہے اور نہ وہ گرمی سے بچاتا ہے (مراد اس سائبان سے ایک دھواں ہے جو جہنم سے نکلے گا اور چونکہ کثرت سے ہوگا اس لئے بلند ہوکر پھٹ کر تین ٹکڑے ہوجائیں گے، حساب سے فارغ ہونے تک کفار اسی دھویں کے احاطہ میں رہیں گے جیسا کہ مقبولین عرش کے سایہ میں ہوں گے، آگے اس دھویں کا اور حال مذکور ہے کہ) وہ انگارے برسائے گا جیسے بڑے بڑے محل جیسے کالے کالے اونٹ (پھر جو لوگ اس امرحق یعنی اس واقعہ کو جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

ذِىۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ: حشر کے اس دھویں کو تین شاخوں والا کہا گیا، روح المعانی میں ہے کہ بطور خاص تین کے عدد میں یہ نکتہ ملحوظ ہے کہ صحیح علم

کی راہ میں تین طرح کے حجاب یا رکاوٹیں ہوا کرتی ہیں: ① حس ② خیال ③ وہم، اسی طرح صحیح عمل کی راہ تین طرح کے حجاب یا رکاوٹیں ہوا کرتی ہیں: ① قوت وہمیہ ② قوت غضبیہ ③ قوت شہوانیہ، یہی تقاضے گمراہی و بے عملی کے اسباب بنتے ہیں، اس عنوان کو اس طرح بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ عذاب کی طرف لے جانے والی تین قوتوں کا غلط استعمال ہے: ① عقل وادراک کی گمراہیاں ② جذبات وشہوات کی لغزشیں ③ قوت ارادی کی کج راہیاں۔

اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ: قاعدہ ہے کہ جب چنگاری آگ سے جھڑتی ہے تو بڑی ہوتی ہے، پھر بہت سے چھوٹے ٹکڑے ہو کر زمین پر گرتی ہے، پس پہلی تشبیہ ابتدائی حالت کے اعتبار سے ہے اور دوسری تشبیہ انتہائی حالت کے اعتبار سے ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی قیامت کے دن یوں کہا جائے گا۔

فائدہ: ۲؎ قتادہؒ وغیرہ سے مروی ہے کہ کافروں کے سایہ کے لیے ایک دھواں دوزخ سے اٹھے گا، جو پھٹ کر کئی ٹکڑے ہو جائے گا کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر شخص کو تین طرف سے گھیرے گا، ایک ٹکڑا سر کے اوپر سائبان کی طرح ٹھہر جائے گا، دوسرا ٹکڑا داہنے اور تیسرا بائیں ہو جائے گا، حساب سے فارغ ہونے تک وہ لوگ اسی سایہ کے نیچے رہیں گے، اور ایمان دار نیک کردار عرش اعظم کے سایہ میں آرام سے کھڑے ہوں گے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی محض برائے نام سیاہ ہو گا، گہری چھاؤں نہیں ہوگی، جس سے آفتاب کی گرمی یا آگ کی تپش سے نجات ملے یا اندر کی گرمی اور پیاس میں کمی ہو۔

فائدہ: ۴؎ یعنی اونچی ہوتی ہیں، چنگاریاں بڑے اونچے محل کے برابر، یا اس کے انگارے کلانی میں محل کے برابر ہوں گے۔

فائدہ: ۵؎ یعنی اگر قصر کے ساتھ تشبیہ بلندی میں تھی تو اونٹ کے ساتھ کلانی میں ہوگی، اور اگر وہ تشبیہ کلانی میں ہو تو كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ کا مطلب یہ ہوگا کہ ابتداءً چنگاریاں محل کے برابر ہوں گی پھر ٹوٹ کر اور چھوٹی ہو کر اونٹ کے برابر ہو جائیں گی، یا اونٹ کے ساتھ رنگت میں تشبیہ ہو، لیکن اس صورت میں جِمٰلت صُفر کا ترجمہ جنہوں نے "کالے اونٹوں" سے کیا ہے وہ زیادہ چسپاں ہوگا، کیونکہ روایات سے جہنم کی آگ کا سیاہ وتاریک ہونا ثابت ہو چکا ہے، اور عرب کالے اونٹ کو "صفر" اس لیے کہتے ہیں کہ عموماً وہ زردی مائل ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۶؎ جو سمجھتے تھے کہ قیامت آنے والی نہیں، اور اگر آئی تو ہم وہاں بھی آرام سے رہیں گے۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

یہ وہ دن ہے کہ نہ بولیں گے ۱؎ اور نہ ان کو حکم ہو کہ توبہ کریں ۲؎ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۳؎

خلاصہ تفسیر: (آگے کفار کے متعلق اور واقعہ ہے یعنی) یہ وہ دن ہوگا جس میں وہ لوگ نہ بول سکیں گے اور نہ ان کو (عذر پیش کرنے کی) اجازت ہوگی سو عذر بھی نہ کر سکیں گے (کیونکہ واقع میں کوئی معقول عذر ہوگا ہی نہیں، اور جو لوگ اس حق واقعہ کو بھی جھٹلا رہے ہیں سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی محشر کے بعض مواطن میں بالکل بول نہ سکیں گے اور جن مواطن میں بولیں گے وہ نافع نہ ہوگا، اس لحاظ سے بولنا نہ بولنا برابر ہوا۔

فائدہ: ۲؎ کیونکہ معذرت اور توبہ کے قبول ہونے کا وقت گزر گیا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جنہوں نے دنیا کی عدالتوں پر قیاس کر کے سمجھ رکھا ہوگا کہ اگر ایسا موقع پیش آ گیا وہاں بھی زبان چلا کر اور کچھ عذر معذرت کر کے چھوٹ جائیں گے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٨﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿٣٩﴾

یہ ہے دن فیصلے کا جمع کیا ہم نے تم کو اور اگلوں کو ا۔ پھر اگر کچھ داؤ ہے تمہارا تو چلا لو مجھ پر ۲۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٠﴾ ع

خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۳۔

خلاصہ تفسیر: (آگے بھی اسی دن کا بیان ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ) یہ ہے فیصلہ کا دن (جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے) ہم نے (آج) تم کو اور اگلوں کو (فیصلے کے لئے) جمع کر لیا سو اگر تمہارے پاس (آج کے نتیجے اور فیصلے سے بچنے کی) کوئی تدبیر ہو تو مجھ پر تدبیر چلا لو (اور یہ کفار اس حق واقعہ کو بھی جھٹلاتے ہیں تو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ا۔ تاکہ سب کو اکٹھا کر کے پھر الگ الگ کر دیں اور آخری فیصلہ سنائیں۔

فائدہ: ۲۔ لو! سب کو ہم نے یہاں جمع کر دیا آپس میں مل کر اور مشورے کر کے جو داؤ تدبیر ہماری گرفت سے نکلنے کی کر سکتے ہو کر دیکھو! دنیا میں حق کو دبانے کی بہت تدبیریں کی تھیں، آج ان میں سے کوئی یاد کرو۔

فائدہ: ۳۔ جو دوسروں پر بھروسہ کیے ہوئے تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہم کو چھڑا لیں گے اور بعض گستاخ تو دوزخ کے فرشتوں کی تعداد انیس سن کر یہاں تک کہہ گزرتے تھے کہ ان میں سے سترہ کو میں اکیلا کافی ہوں۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿٤١﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٤٢﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔا بِمَا كُنْتُمْ

البتہ جو ڈرنے والے ہیں وہ سایہ میں ہیں ا۔ اور نہروں میں، اور میوے جس قسم کے وہ چاہیں، کھاؤ اور پیو مزے سے بدلہ ان کاموں کا

تَعْمَلُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٥﴾

جو تم نے کیے تھے ۲۔ ہم یونہی دیتے ہیں بدلہ نیکی والوں کو، خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۳۔

خلاصہ تفسیر: (اب کفار کے مقابلہ میں اہل ایمان کے ثواب کا بیان ہے یعنی) پرہیزگار لوگ سایوں میں اور چشموں میں اور مرغوب میووں میں ہوں گے (اور ان سے کہا جائے گا کہ) اپنے (نیک) اعمال کے صلہ میں خوب مزے سے کھاؤ پیو، ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں (اور یہ کفار جنت کی نعمتوں کو بھی جھٹلاتے ہیں تو سمجھیں رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ا۔ یعنی اول عرش کے پھر جنت کے سایوں میں۔

فائدہ: ۲۔ مکذبین کے مقابل یہ متقین کا حال بیان فرمادیا کہ: "الأشياء تعرف بأضدادها"۔

فائدہ: ۳۔ جو دنیا میں مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر مرنے کے بعد دوسری زندگی ہے تو وہاں بھی ہم تم سے اچھے رہیں گے، اب ان کو عیش میں اور اپنے کو تکلیف میں دیکھ کر اور زیادہ جلیں گے اور ذلیل و رسوا ہوں گے۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ۝۴۶ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۝۴۷

کھالو اور برت لوتھوڑے دنوں بیشک تم گناہ گار ہو ۱؎ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے پھر کفار کو زجر وتنبیہ ہے کفار کو، یعنی اے کافرو!) تم (دنیا میں) تھوڑے دن اور کھال اور برت لو (عنقریب کم بختی آنے والی ہے، کیونکہ) تم بیشک مجرم ہو (اور مجرم کا یہی حال ہونے والا ہے اور جو لوگ جرم کی سزا کو جھٹلاتے ہیں تو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ خطاب مکذبین کو ہے کہ چند روز اور مزے اڑا لو، آخر یہ کھایا پیا بہت بری طرح نکلے گا، کیونکہ تم اللہ کے مجرم ہو جس کی سزا حبس دوام اور عذاب الیم کے سوا کچھ نہیں، گویا: كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا فرمانا ایسا ہوا جیسے ایک مجرم کو جس کے لیے پھانسی کا حکم ہو چکا ہو، پھانسی دینے سے قبل کہہ دیتے ہیں کہ کوئی خواہش ہو تو ظاہر کرو تا کہ اس کے پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

فائدہ: ۲؎ جو دنیا کے عیش و بہار اور لذتوں پر ریجھ رہے تھے، یہ خبر نہ تھی کہ جس چیز کو پھولوں کا ہار سمجھ کر گلے میں ڈال رہے ہیں وہ کالا ناگ ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ۝۴۸ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ۝۴۹

اور جب کہیے ان کو کہ جھک جاؤ نہیں جھکتے ۱؎ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی ۲؎

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ۝۵۰ ع ۲۲

اب کس بات پر اس کے بعد یقین لائیں گے ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (ان کافروں کی سرکشی اور جرم کی یہ حالت ہے کہ) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (خدا کی طرف) جھکو (یعنی ایمان اور بندگی اختیار کرو) تو نہیں جھکتے (اس سے زیادہ کیا جرم ہوگا؟! اور یہ لوگ اس کے جرم ہونے کو بھی جھٹلاتے ہیں تو سمجھ رکھیں کہ) اس روز (حق کے) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی (قرآن کی ان تنبیہات اور دھمکیوں کا تقاضہ تو یہ تھا کہ کفار سنتے ہی ڈر کر ایمان لے آتے مگر جب اس پر بھی ان کو اثر نہیں ہوتا) تو پھر اس (بلیغ و نذیر قرآن) کے بعد اور کونسی بات پر ایمان لائیں گے؟ (اس میں کفار پر ڈانٹ ہے اور ان کے ایمان سے آپ ﷺ کو مایوس کرنا ہے)۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ: یعنی تواضع، عاجزی اور خشوع اختیار کرو، حق بات کو قبول کرنے میں تکبر اور نخوت جو رکاوٹ ہے اسے چھوڑ دو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نماز میں یا اللہ کے عام احکام کے سامنے۔

فائدہ: ۲؎ اس دن پچھتائیں گے کہ دنیا میں احکام الٰہی کے سامنے کیوں نہ جھکے، وہاں سر جھکاتے تو آج یہاں سربلند ہوتے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی قرآن سے بڑھ کر کامل اور موثر بیان کس کا ہوگا، اگر یہ مکذبین اس پر یقین نہیں لاتے تو اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟ کیا قرآن کے بعد کسی اور کتاب کے منتظر ہیں جو آسمان سے اترے گی؟

اٰیاتھا ۴۰ ۷۸ سُوْرَۃُ النَّبَاِ مَکِّیَّۃٌ ۸۰ رکوعاتھا ۲

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں بھی گذشتہ سورت کی طرح قیامت کا ممکن ہونا، واقع ہونا اور جزا و سزا کے واقعات مذکور ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ ۚ﴿۱﴾ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ﴿۲﴾ الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ ﴿۳﴾ الجزء ۳۰

کیا بات پوچھتے ہیں لوگ آپس میں ۱؎ پوچھتے ہیں اس بڑی خبر سے، جس میں وہ مختلف ہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: یہ (قیامت کا انکار کرنے والے) لوگ کس چیز کا حال دریافت کرتے ہیں؟ اس بڑے واقعہ کا حال دریافت کرتے ہیں جس میں یہ لوگ (اہل حق کے ساتھ) اختلاف کر رہے ہیں (مراد قیامت ہے، اور دریافت کرنے سے مراد یہ ہے کہ انکار کے طور پر دریافت کرتے ہیں اور اس سوال و جواب سے ذہنوں کو ادھر متوجہ کرنا مقصود ہے، اجمال کے بعد تفصیل کر کے اس کا اہتمام شان ظاہر کرنا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی لوگ کس بات کا کھوج لگانے اور کس چیز کی تحقیق و تفتیش میں مشغول ہیں، کیا ان میں ایسی استعداد ہے کہ بہت پوچھ پاچھ کرنے سے وہ چیز ان کی سمجھ میں آجائے گی، ہرگز نہیں، یا یہ مطلب ہے کہ کفار جواز راہ انکار و استہزاء آپس میں ایک دوسرے سے نیز پیغمبر اور مومنین سے سوال کرتے ہیں کہ ہاں صاحب! وہ قیامت کب آئے گی؟ ابھی کیوں نہیں آجاتی؟ جانتے ہو یہ کس چیز کی نسبت سوال کر رہے ہیں؟ وہ بہت عظیم الشان چیز ہے جس کا علم ان کو عنقریب ہو جائے گا، جب اپنی آنکھ سے اس کے ہولناک مناظر دیکھیں گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی قیامت کی خبر جس میں لوگوں کا اختلاف ہے، کوئی اس کے آنے پر یقین رکھتا ہے، کوئی منکر ہے، کوئی شک میں پڑا ہے، کوئی کہتا ہے بدن اٹھے گا، کوئی کہتا ہے کہ سب عذاب و ثواب روح پر گزرے گا بدن سے کچھ تعلق نہیں، الیٰ غیر ذٰلک من الاختلافات۔

کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۴﴾ ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾

ہرگز نہیں اب جان لیں گے، پھر بھی ہرگز نہیں اب جان لیں گے ۱؎

خلاصہ تفسیر: آگے ان کے اختلاف کی کمزوری ظاہر کر کے اسکو باطل کرتے ہیں کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہ آئے گی: ہرگز ایسا نہیں (بلکہ قیامت آئے گی اور) ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے (یعنی جب دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ان پر عذاب واقع ہوگا تب ان پر قیامت کی حقیقت منکشف ہو جائے گی اور ہم) پھر (دوبارہ کہتے ہیں کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہ آئے گی) ہرگز ایسا نہیں (بلکہ آئے گی اور) ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پیغمبروں نے ابتداء دنیا سے آج تک بہت کچھ سمجھایا، مگر لوگ اپنے اختلافات اور پوچھ پاچھ سے ہرگز باز آنے والے نہیں، اب قریب ہے کہ وہ ہولناک منظر ان کے سامنے آجائے اس وقت جان لیں گے کہ قیامت کیا چیز ہے اور ان کے سوالات و اختلافات کی حیثیت کیا تھی۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِھٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۪ۙ﴿۷﴾ وَّخَلَقْنٰکُمْ اَزْوَاجًا ۙ﴿۸﴾

کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو بچھونا ۱؎ اور پہاڑوں کو میخیں ۲؎ اور تم کو بنایا ہم نے جوڑے جوڑے ۳؎

خلاصہ تفسیر: چونکہ وہ لوگ قیامت کو دشوار یا محال سمجھتے ہیں، اب آگے اس کا ممکن اور واقع ہونا ثابت کرتے ہیں کہ اس کو محال سمجھنے سے ہماری قدرت کا انکار لازم آتا ہے اور ہماری قدرت کا انکار نہایت عجیب ہے کیونکہ:

کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو (زمین) کی میخیں نہیں بنایا (یعنی میخوں کی طرح بنایا، جیسے کسی چیز میں میخیں لگا دینے سے وہ چیز اپنی جگہ سے نہیں ہلتی اسی طرح زمین کو پہاڑوں سے مستقر کر دیا، جس کو دوسری آیت میں: رواسی سے تعبیر فرمایا اس کی تحقیق سورۂ نحل آیت ۱۵: وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ کے تحت گزر چکی ہے) اور (اس کے علاوہ ہم نے اپنی قدرت کے اور بھی دلائل ظاہر فرمائے چنانچہ) ہم ہی نے تم کو جوڑا جوڑا (یعنی مرد وعورت) بنایا۔

* * *

فائدہ: ۱ جس پر سکون واطمینان سے آرام کرتے اور کروٹیں بدلتے ہیں۔

فائدہ: ۲ جیسا کسی چیز میں میخ لگا دینے سے وہ چیز اپنی جگہ سے نہیں ملتی، ایسے ہی ابتداء میں زمین جو کانپتی اور لرزتی تھی، اللہ نے پہاڑ پیدا کر کے اس کے اضطراب اور کپکپی کو دور کیا، گویا زمین کو ایک طرح کا سکون پہاڑوں سے حاصل ہوا۔

فائدہ: ۳ یعنی مرد کے سکون و راحت کے لئے عورت کو اس کا جوڑا بنایا: وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم: ۲۱) یا ازواج سے مراد طرح طرح کی اشکال والوان وغیرہ ہوں۔

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝۹ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝۱۰ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝۱۱

اور بنایا نیند کو تمہاری تھکان دفع کرنے کے لیے ۱ اور بنایا رات کو اوڑھنا ۲ اور بنایا دن کمائی کرنے کو ۳

خلاصہ تفسیر: اور ہم ہی نے تمہاری نیند کو راحت کی چیز بنایا، اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا، اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دن بھر کی دوڑ دھوپ سے تھک کر جب آدمی نیند لیتا ہے تو سب تعب اور تکان دور ہو جاتا ہے، گویا نیند تو نام ہی سکون و استراحت کا ہے، آگے نیند کی مناسبت سے رات کا ذکر کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲ جیسے آدمی کپڑا اُوڑھ کر اپنے بدن کو چھپالیتا ہے اسی طرح رات کی تاریکی مخلوق کی پردہ داری کرتی ہے اور جو کام چھپانے کے لائق ہوں عموماً رات کے اندھیرے میں کئے جاتے ہیں، اور حسی طور پر بھی شب کو کپڑا اوڑھنے کی ضرورت دن سے زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ نسبتاً وہ وقت خنکی اور ٹھنڈک کا ہوتا ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی عموماً کاروبار اور کمائی کے دھندے دن میں کئے جاتے ہیں جن کا مقصد یہ ہی ہے کہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی حوائج کی طرف سے دل کو سکون واطمینان نصیب ہو۔

ربط: آگے رات دن کی مناسبت سے آسمانوں اور سورج کا ذکر فرماتے ہیں، یا یوں کہو کہ زمین کے مقابل آسمان کا بیان ہے:

وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝۱۲ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝۱۳

اور چنی ہم نے تم سے اوپر سات چنائی مضبوط ۱ اور بنایا ایک چراغ چمکتا ہوا ۲

خلاصہ تفسیر: اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور ہم ہی نے (آسمان میں) ایک روشن چراغ بنایا (مراد

سورج ہے، ایک اور جگہ ارشاد ہے: وجعل الشمس سراجًا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سات آسمان بہت مضبوط بنائے، جن میں آج تک اس قدر مدت گزرنے کے باوجود کوئی رخنہ نہیں پڑا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی آفتاب جس میں روشنی اور گرمی دونوں وصف موجود ہیں۔

وَّاَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ﴿۱۴﴾ لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ﴿۱۶﴾

اور اتارا نچڑنے والی بدلیوں سے پانی کا ریلا ۱؎ تاکہ ہم نکالیں اس سے اناج اور سبزہ، اور باغ پتوں میں لپٹے ہوئے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور ہم ہی نے پانی بھرے بادلوں سے بہت پانی برسایا تاکہ ہم اس پانی کے ذریعہ سے غلہ اور سبزی اور گنجان باغ پیدا کریں (اور ان سب سے ہماری قدرت کا کمال ظاہر ہے، پھر قیامت پر ہمارے قادر ہونے کا کیوں انکار کیا جاتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ نچڑنے والی بدلیاں یا نچوڑنے والی ہوائیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی نہایت گنجان اور گھنے باغ، یا یہ مراد ہو کہ ایک ہی زمین میں مختلف قسم کے درخت اور باغ پیدا کئے۔

تنبیہ: قدرت کی عظیم الشان نشانیاں بیان فرما کر بتلا دیا کہ جو خدا ایسی قدرت وحکمت والا ہے، کیا اسے تمہارا دوسری مرتبہ پیدا کر دینا اور حساب وکتاب کے لئے اٹھانا کچھ مشکل ہوگا؟ اور کیا اس کی حکمت کے یہ بات منافی نہ ہوگی کہ اتنے بڑے کارخانہ کو یوں ہی غلط ملط بے نتیجہ پڑا چھوڑ دیا جائے؟ یقیناً دنیا کے اس طویل سلسلہ کا کوئی صاف نتیجہ اور انجام ہونا چاہیے، اسی کو ہم ''آخرت'' کہتے ہیں، جس طرح نیند کے بعد بیداری اور رات کے بعد دن آتا ہے، ایسے ہی سمجھ لو کہ دنیا کے خاتمہ پر آخرت کا آنا یقینی ہے۔

اِنَّ يَوۡمَ الۡفَصۡلِ كَانَ مِيۡقَاتًا ﴿۱۷﴾ يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا ﴿۱۸﴾

بیشک دن فیصلے کا ہے ایک وقت ٹھہرا ہوا ۱؎ جس دن پھونکی جائے صور پھر تم چلے آؤ جُٹ کے جُٹ ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کے ممکن ہونے کا بیان ہوا، اب آگے قیامت کے واقع ہونے کا ذکر ہے کہ:

بیشک فیصلہ کا دن ایک معین وقت ہے یعنی جس دن صور پھونکا جائے گا پھر تم لوگ گروہ گروہ ہو کر آؤ گے (یعنی ہر امت جدا جدا ہوگی، پھر مومن جدا، کافر جدا، پھر ابرار جدا، اشرار جدا، سب ایک دوسرے سے ممتاز ہو کر میدان قیامت میں حاضر ہوں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ فیصلہ کا دن وہ ہوگا جس میں نیک کو بد سے بالکلیہ الگ کر دیا جائے کہ کسی قسم کا اشتراک واجتماع باقی نہ رہے، ہر نیکی اپنے معدن میں اور ہر بدی اپنے مرکز پر جا پہنچے، ظاہر ہے کہ ایسا کامل امتیاز وافتراق اس دنیا میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہاں رہتے ہوئے زمین، آسمان، چاند، سورج، رات دن، سونا جاگنا، بارش، بادل، باغ، کھیت، اور بیوی بچے تمام نیکوں اور بدوں میں مشترک ہیں، ہر کافر اور مسلم ان سامانوں سے یکساں منتفع ہوتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ ''یوم الفصل'' ایک دن موجودہ نظام عالم کے ختم کئے جانے کے بعد ہو، اس کا تعین اللہ کے علم میں ٹھہرا ہوا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کثرت سے الگ الگ جماعتیں اور ٹولیاں بن کر جن کی تقسیم ان کے ممتاز عقائد واعمال کی بناء پر ہوگی۔

وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتۡ اَبۡوَابًا ﴿۱۹﴾ وَّسُيِّرَتِ الۡجِبَالُ فَكَانَتۡ سَرَابًا ﴿۲۰﴾

اور کھولا جائے آسمان تو ہو جائیں اس میں دروازے ۱؎ اور چلائے جائیں گے پہاڑ تو ہو جائیں گے چمکتا ریتا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور آسمان کھل جائے گا پھر اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے (یعنی اس قدر بہت سا کھل جائے گا

جیسے بہت سے دروازے ملا کر بہت بڑی جگہ کھلی ہوتی ہی، یہ کلام تشبیہ پر مبنی ہے، اب یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ دروازے تو آسمان میں اب بھی ہیں، پھر اس دن دروازے ہونے کے کیا معنی، اور یہ کھلنا فرشتوں کے اترنے کے لئے ہوگا) اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) ہٹا دیئے جائیں گے سو وہ ریت کی طرح ہوجائیں گے (جیسا کہ ارشاد ہے: کثیباً مھیلاً)۔

وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا: فرشتوں کے اترنے کے لیے آسمان کھلنا اس کی کچھ تفصیل سورۃ فرقان آیت ۲۵: وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ کے تحت گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا: یہ واقعات نفخہ ثانیہ یعنی دوسری بار صور پھونکنے کے وقت ہوں گے، البتہ پہاڑوں کا ہٹانا یہاں بھی اور قرآن میں جہاں کہیں بھی واقع ہوا ہے اس میں دونوں احتمال ہیں، یا تو نفخہ ثانیہ کے بعد ہو کہ اس سے سارا عالم اپنی ہیئت پر لوٹ آئے گا، اور جب حساب کا وقت آئے گا پہاڑوں کو زمین کے برابر کردیا جائے گا تا کہ زمین پر پہاڑ کی کوئی آڑ نہ رہے، سب آدمی ایک ہی میدان میں نظر آئیں کہ اس کو ہیبت میں زیادہ دخل ہے، یا پہاڑوں کا ہٹانا نفخہ اولی یعنی پہلی بار صور پھونکنے کے وقت ہوگا جس سے خود فنا کردینا ہی مقصود ہوگا، پھر اس تقدیر پر قیامت کے دن میں ان سب واقعات کو بتلانا اس بنا پر ہوگا کہ نفخہ اولی سے نفخہ ثانیہ تک کا مجموعہ ایک دن قرار دے لیا گیا، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آسمان پھٹ کر ایسا ہوجائے گا گویا دروازے ہی دروازے ہیں، شاید اس کی طرف اشارہ ہے جو دوسری جگہ فرمایا: وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا (الفرقان: ۲۵)۔

فائدہ: ۲؎ جیسے چمکتی ریت پر دور سے پانی کا گمان ہوجاتا ہے، ایسے ہی ان پر پہاڑوں کا گمان ہوگا، حالانکہ واقع میں وہ پہاڑ نہیں رہیں گے محض ریت کے تودے رہ جائیں گے۔

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾ لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾

بیشک دوزخ ہے تاک میں ، شریروں کا ٹھکانا ۱؎ رہا کریں اس میں قرنوں ۲؎

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾

نہ چکھیں وہاں کچھ مزہ ٹھنڈک کا اور نہ پینا ملے کچھ، مگر گرم پانی اور بہتی پیپ ۳؎ بدلہ ہے پورا

خلاصہ تفسیر: (آگے اس یوم الفصل میں جو فیصلہ ہوگا اس کا بیان ہے یعنی) بیشک دوزخ ایک گھات کی جگہ ہے (یعنی عذاب کے فرشتے انتظار اور تاک میں ہیں کہ کافر آئیں تو ان کو پکڑتے ہی عذاب دینے لگیں اور وہ) سرکشوں کا ٹھکانا (ہے) جس میں وہ بے انتہا زمانوں (پڑے) رہیں گے (اور) اس میں نہ تو وہ کسی ٹھنڈک (یعنی راحت) کا مزہ چکھیں گے (اس سے زمہریر یعنی سخت سردی کی نفی نہیں ہوئی) اور نہ پینے کی چیز کا (جس سے پیاس بجھے) بجز گرم پانی اور پیپ کے، یہ (ان کو) پورا بدلہ ملے گا۔

لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا: احقاب "حقبہ" کی جمع ہے، زمانہ دراز کو حقبہ کہا جاتا ہے، اس کی مقدار میں اقوال مختلف ہیں، ابن جریر نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے اس کی مقدار اسی سال نقل کی اور ہر سال بارہ مہینے کا اور ہر مہینہ تیس دن کا اور ہر دن ایک ہزار سال کا، اس طرح تقریباً دو کروڑ اٹھاسی لاکھ سال کا ایک حقبہ اور حضرت ابوہریرہ، عبداللہ بن عمر، ابن عباس وغیرہ نے مقدار حقبہ اسی کے بجائے ستر سال قرار دی باقی حساب وہی ہے، اتنی بات روایتوں میں مشترک ہے کہ حقبہ یا حقب بہت ہی زیادہ طویل زمانے کا نام ہے اسی لئے بیضاوی نے احقابا کی تفسیر "دھور متتابعہ" سے کی ہے یعنی پے در پے بہت سے زمانے۔

حقبہ کی مقدار کتنی بھی طویل سے طویل قرار دی جائے بہر حال وہ متناہی اور محدود ہے، اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس مدت طویلہ کے بعد کفار اہل جہنم بھی جہنم سے نکل جائیں گے حالانکہ یہ قرآن مجید کی دوسری واضح نصوص کے خلاف ہے جن میں: خلدین فیھا ابدا کے الفاظ آئے ہیں اور اسی لئے امت کا اس پر اجماع ہے کہ نہ جہنم کبھی فنا ہوگی، نہ کفار کبھی اس سے نکالے جائیں گے، بہر حال اس آیت میں احقاباً کے لفظ سے جو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ چند احقاب کے بعد کفار اہل جہنم بھی جہنم سے نکال لئے جائیں گے، تمام نصوص اور اجماع امت کے خلاف ہونے کی بنا پر یہ مفہوم معتبر نہیں ہوگا، کیونکہ اس آیت میں اس کی تصریح تو ہے نہیں کہ احقاب کے بعد کیا ہوگا، صرف اتنا ذکر ہے کہ مدت احقاب ان کو جہنم میں رہنا پڑے گا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ احقاب کے بعد جہنم نہیں رہے گی یا یہ لوگ اس سے نکال لئے جائیں گے، اسی لئے حضرت حسن نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے اہل جہنم کے لئے جہنم کی کوئی میعاد اور مدت مقرر نہیں فرمائی جس کے بعد ان کا اس سے نکل جانا سمجھا جائے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب ایک حقبہ زمانے کا گزر جائے گا تو دوسرا شروع ہوجائیگا، اسی طرح دوسرے کے بعد تیسرا چوتھا یہاں تک کہ ابدالآباد یہی سلسلہ رہے گا اور سعید بن جبیر نے قتادہ سے بھی یہی تفسیر روایت کی ہے کہ احقاب سے مراد وہ زمانہ ہے جس کا انقطاع اور انتہا نہیں، بلکہ ایک حقب ختم ہوگا تو دوسرا حقب آجائے گا اور یہی سلسلہ ابد تک رہے گا۔

اور ایک جماعت مفسرین نے ایک دوسرا احتمال اس آیت کی تفسیر میں یہ قرار دیا ہے کہ اس آیت کے بعد کا جملہ: لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًاۙ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا یہ احقاباً سے جملہ حالیہ ہوا اور معنی آیت کے یہ ہوں کہ احقاب کے زمانہ دراز تک یہ لوگ نہ ٹھنڈی لذیذ ہوا کا ذائقہ چکھیں گے نہ کسی کھانے اور پینے کی چیزیں کا بجز حمیم اور غساق، پھر احقاب گزرنے کے بعد ہوسکتا ہے کہ یہ حال بدل جائے اور دوسری اقسام کے عذاب ہونے لگیں، ''حمیم'' وہ کھولتا ہوا گرم پانی ہے کہ جب چہرہ کے قریب آئے گا تو اس کا گوشت جل جائے گا اور جب پیٹ میں ڈالا جائے گا تو اندرونی اعضاء کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے اور ''غساق'' وہ خون اور پیپ وغیرہ جو اہل جہنم کے زخموں سے نکلے گی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دوزخ شریروں کی تاک میں ہے اور ان ہی کا ٹھکانا ہے۔

فائدہ: ۲ جن کا کوئی شمار نہیں، قرن پہ قرن گزرتے چلے جائیں گے اور ان کی مصیبت کا خاتمہ نہ ہوگا۔

فائدہ: ۳ یعنی نہ ٹھنڈک کی راحت پائیں گے، نہ کوئی خوشگوار چیز پینے کو ملے گی، ہاں! گرم پانی ملے گا جس کی سوزش سے منہ جھلس جائیں گے اور آنتیں کٹ کر پیٹ سے باہر آپڑیں گیں اور دوسری چیز پیپ ملے گی جو دوزخیوں کے زخموں سے نکل کر بہے گی، اعاذنا الله منها و من سائر انواع العذاب فی الدنیا والاخرة، آمین۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًاۙ ۝٢٧ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝٢٨

ان کو توقع نہ تھی حساب کی، اور جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو مکرا کر ۱

ع وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًاۙ ۝٢٩ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۝٣٠

اور ہر چیز ہم نے گن رکھی ہے لکھ کر ۲ اب چکھو کہ ہم نہ بڑھاتے جائیں گے تم پر مگر عذاب ۳

خلاصہ تفسیر: (اور وہ اعمال جن کی سزا پیچھے بیان ہوئی یہ ہیں کہ) وہ لوگ حساب (قیامت) کا اندیشہ نہ رکھتے تھے اور ہماری (ان) آیتوں کو (جن میں حساب اور دیگر حق باتوں کی خبر تھی) خوب جھٹلاتے تھے اور ہم نے (ان کے اعمال میں سے) ہر چیز کو (ان کے نامہ اعمال میں) لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے، سو (ان اعمال پر ان کو مطلع کر کے کہا جائے گا کہ اب ان اعمال کا) مزہ چکھو کہ ہم تم کو سزا ہی بڑھاتے چلے جائیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جس چیز کی امید ان کو نہ تھی وہ ہی سامنے آئی اور جس بات کو جھٹلاتے تھے آنکھوں سے دیکھ لی، اب دیکھیں کیسے جھٹلاتے

اور مکر تے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے اور اسی علم محیط کے موافق دفاتر میں باقاعدہ مندرج ہے، کوئی نیک و بد عمل اس کے احاطہ سے باہر نہیں، رتی رتی کا بھگتان کیا جائے گا۔

فائدہ: ۳ یعنی جیسے تم تکذیب و انکار میں برابر بڑھتے چلے گئے اور اگر بے اختیار موت نہ آجاتی تو ہمیشہ بڑھتے ہی چلے جاتے، اب بڑے عذاب کا مزہ چکھتے رہو، ہم بھی عذاب بڑھاتے ہی چلے جائیں گے جس میں کبھی تخفیف نہ ہوگی۔

اِنَّ لِلۡمُتَّقِيۡنَ مَفَازًا ۙ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَاَعۡنَابًا ۙ﴿۳۲﴾ وَّكَوَاعِبَ اَتۡرَابًا ۙ﴿۳۳﴾

بیشک ڈر والوں کو ان کی مراد ملنی ہے، باغ ہیں اور انگور، اور نوجوان عورتیں ایک عمر کی سب ۱

خلاصہ تفسیر: (پیچھے کافروں کے متعلق فیصلہ بیان ہوا، آگے اہل ایمان کا فیصلہ مذکور ہے کہ) خدا سے ڈرنے والوں کے لئے بیشک کامیابی ہے یعنی (کھانے اور سیر کو) باغ (جن میں طرح طرح کے میوے ہوں گے) اور انگور (یہ عموم کے بعد خاص طور پر انگور کا ذکر اہتمام شان کے لئے ہے) اور (دل بہلانے کو) نوخاستہ ہم عمر عورتیں ہیں۔

اِنَّ لِلۡمُتَّقِيۡنَ مَفَازًا: اس میں جنت کی نعمتوں کو کامیابی قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ جنت سے لاپرواہی یا استغنا ظاہر کرنا باطل اور گمراہی ہے، البتہ جن متبع سنت بزرگوں سے ایسا ثابت ہے یہ ان کا اپنا غلبہ حال ہے جس میں وہ معذور ہیں اور دوسروں کے لیے قابل حجت نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نوساختہ عورتیں جن کی جوانی پورے ابھار پر ہوگی، اور سب ایک ہی سن و سال کی ہوں گی۔

وَّكَاۡسًا دِهَاقًا ؕ﴿۳۴﴾ لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۚ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنۡ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۙ﴿۳۶﴾

اور پیالے چھلکتے ہوئے ۱ نہ سنیں گے وہاں بک بک اور نہ مکرانا ۲ بدلہ ہے تیرے رب کا ۳ دیا ہوا حساب سے ۴

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا الرَّحۡمٰنِ لَا يَمۡلِكُوۡنَ مِنۡهُ خِطَابًا ۚ﴿۳۷﴾

جو رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے بڑی رحمت والا قدرت نہیں کہ کوئی اس سے بات کرے ۵

خلاصہ تفسیر: اور (پینے کو) لبالب بھرے ہوئے جام شراب (اور) وہاں نہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ جھوٹ (کیونکہ یہ باتیں وہاں محض معدوم ہیں) یہ (ان کو ان کی نیکیوں کا) بدلہ ملے گا جو کہ کافی انعام ہوگا آپ کے رب کی طرف سے جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو دونوں کے درمیان میں ہیں (اور جو) رحمان ہے (اور) کسی کو اس کی طرف سے (مستقل) اختیار نہ ہوگا کہ (اس کے سامنے) عرض معروض کر سکے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: اس آیت میں کئی صفتیں ارشاد ہوئی: ① آسمان و زمین وغیرہ کا مالک ہونا، اس سے قیامت کے دن کے واقعات اور تصرفات پر قادر اور مالک ہونا معلوم ہوا ② رحمن، یہ صفت مؤمنین کی جزا کے مناسب ہے کہ ان پر رحمت کی جائے گی ③ کسی کو مستقل اختیار نہ ہونا، یہ کفار کو خوف دلانے کے لیے مناسب ہے اور مستقل کی قید کے لیے آگے دلیل آتی ہے کہ جن کو بولنے کی اجازت بھی ہوگی وہ محدود ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱ وَّكَاۡسًا دِهَاقًا: یعنی شراب طہور کے لبریز جام۔

فائدہ: ۲ لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا كِذّٰبًا: یعنی جنت میں بیہودہ بکواس یا جھوٹ فریب کچھ نہ ہوگا نہ کوئی کسی سے جھگڑے گا کہ

جھوٹ بولنے اور مکرنے کی ضرورت پیش آئے۔

فائدہ: ۳ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ: یہ بدلہ بھی محض بخشش اور رحمت سے ہے، ورنہ ظاہر ہے اللہ پر کسی کا قرض یا جبر نہیں، آدمی اپنے عمل کی بدولت عذاب سے بچ جائے یہی مشکل ہے، رہی جنت وہ تو خالص اس کے فضل و رحمت سے ملتی ہے اس کو ہمارے عمل کا بدلہ قرار دینا یہ دوسری ذرہ نوازی اور عزت افزائی ہے۔

فائدہ: ۴ عَطَآءً حِسَابًا: یعنی رتی رتی کا حساب ہو کر بدلہ ملے گا اور بہت کافی بدلہ ملے گا۔

فائدہ: ۵ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا: یعنی باوجود اس قدر لطف و رحمت کے عظمت و جلال ایسا ہے کہ کوئی اسکے سامنے لب نہیں ہلا سکتا۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾

جس دن کھڑی ہو روح اور فرشتے قطار باندھ کر ۱ کوئی نہیں بولتا مگر جس کو حکم دیا رحمان نے اور بولا بات ٹھیک ۲

خلاصہ تفسیر: جس روز تمام ذی ارواح اور فرشتے (خدا کے روبرو) صف بستہ (خشوع و خضوع کے ساتھ) کھڑے ہوں گے (اس روز) کوئی بول نہ سکے گا بجز اس کے جس کو رحمان (بولنے کی) اجازت دے دے اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے (ٹھیک بات سے مراد وہ بات ہے جس کی اجازت دی گئی ہے، یعنی بولنا بھی محدود و مقید ہوگا، یہ نہیں کہ جو چاہے بولنے لگے اور مستقل اختیار سے پیچھے یہی مراد ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ ''روح'' فرمایا جانداروں کو، یا ''روح القدس'' (جبرائیل) مراد ہوں، اور بعض مفسرین کے نزدیک وہ روح اعظم مراد ہے جس سے بے شمار روحوں کا انشعاب ہوا ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ یعنی اس کے دربار میں جو بولے گا اس کے حکم سے بولے گا اور بات بھی وہ ہی کہے گا، جو ٹھیک اور معقول ہو، مثلاً کسی غیر مستحق کی سفارش نہ کرے گا، مستحق سفارش کے وہ ہی ہیں جنہوں نے دنیا میں سب باتوں سے زیادہ سچی اور ٹھیک بات کہی تھی یعنی لا الٰہ الا اللہ۔

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ

وہ دن ہے برحق پھر جو کوئی چاہے بنا رکھے اپنے رب کے پاس ٹھکانا ۱ ہم نے خبر سنادی تم کو ایک آفت نزدیک آنے والی کی جس دن دیکھ لے گا

الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾ ع ۲

آدمی جو آگے بھیجا اس کے ہاتھوں نے ۲ اور کہے گا کافر کسی طرح میں مٹی ہوتا ۳

خلاصہ تفسیر: (اب اوپر کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے) یہ (دن جس کا اوپر ذکر ہوا) یقینی دن ہے سو جس کا جی چاہے (اس کے حالات سن کر) اپنے رب کے پاس (اپنا) ٹھکانا بنا رکھے (یعنی نیک عمل کرے کہ وہاں نیک ٹھکانا ملے، آگے حجت پوری کرنے کے لیے سب لوگوں کو خطاب ہے کہ لوگو) ہم نے تم کو ایک نزدیک آنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے (جو کہ ایسے دن میں واقع ہونے والا ہے) جس دن ہر شخص ان اعمال کو (اپنے سامنے حاضر) دیکھ لے گا جو اس نے اپنے ہاتھوں کئے ہوں گے اور کافر (حسرت سے) کہے گا کہ کاش! میں مٹی ہو جاتا (تاکہ عذاب سے بچتا اور یہ اس وقت کہے گا جب چوپائے جانور مٹی کر دیئے جائیں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وہ دن آنا تو ضروری ہے، اب جو کوئی اپنی بہتری چاہے اس وقت کی تیاری کر رکھے۔

فائدہ: ۲ یعنی سب اچھے برے، اگلے پچھلے اعمال سامنے ہوں گے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی مٹی ہی رہتا آدمی نہ بنتا کہ آدمی بن کر ہی اس حساب وکتاب کی مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا۔

ایاتہا ٤٦ • ٧٩ سُوۡرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ ٨١ • رکوعاتہا ٢

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کی طرح اس سورت میں بھی قیامت کے واقعات اور اس کا ممکن ہونا بیان کیا، اور پھر جھٹلانے والوں کو دھمکی اور درمیان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ﴿۳﴾

قسم ہے گھسیٹ لانے والوں کی غوطہ لگا کر ۱؎ اور بند چھڑا دینے والوں کی کھول کر ۲؎ اور تیرنے والوں کی تیزی سے

وقف لازم

فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ﴿۴﴾ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ﴿۵﴾

پھر آگے بڑھنے والوں کی دوڑ کر ۳؎ پھر کام بنانے والوں کی حکم سے ۴؎

خلاصہ تفسیر: قسم ہے ان فرشتوں کی جو (کافروں کی) جان سختی سے نکالتے ہیں، اور جو (مسلمانوں کی روح آسانی سے نکالتے ہیں گویا ان کا) بند کھول دیتے ہیں، اور جو (روحوں کو لے کر زمین سے آسمان کی طرف اس طرح تیزی وسہولت سے چلتے ہیں جیسے گویا) تیرتے ہوئے چلتے ہیں، پھر (جب روحوں کو لے کر پہنچتے ہیں تو ان ارواح کے بارہ میں جو خدا کا حکم ہوتا ہے اس کی بجا آوری کے لئے) تیزی کے ساتھ دوڑتے ہیں، پھر (ان ارواح کے متعلق ثواب کا حکم ہو یا عذاب کا دونوں حکموں میں سے) ہر امر کی تدبیر کرتے ہیں۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا: یہاں کفار کی جان کا سختی سے اور مسلمانوں کی جان کا آسانی سے نکلنا معلوم ہوا ہے، اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بعض اوقات کفار کا نزع آسان اور مؤمنین کا نزع سخت دیکھا جاتا ہے، تو اصل یہ ہے کہ یہ سختی اور سہولت جسمانی اور ظاہری ہوتی ہے، جبکہ یہاں آیت میں روحانی سختی اور آسانی مراد ہے، یعنی مراد اس سختی سے روحانی سختی اور تکلیف ہے، یہ ضروری نہیں کہ دیکھنے والوں کو بھی اس سختی کا احساس ہو، اسی لئے بسا اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کافر کی روح بظاہر آسانی سے نکلتی ہے مگر یہ آسانی ہمارے دیکھنے میں ہے جو سختی اس کی روح پر ہو رہی ہے اس کو کون دیکھ سکتا ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی خبر دینے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا: یہاں بھی روحانی آسانی مراد ہے جسمانی نہیں، اس لئے کسی مسلمان بلکہ مرد صالح کو موت کے وقت نزع روح میں دیر لگنے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر سختی ہو رہی ہے اگرچہ جسمانی طور پر یہ سختی دیکھی جاتی ہے، اصل وجہ یہ ہے کہ کافر کو نزع روح کے وقت ہی سے برزخ کا عذاب سامنے آ جاتا ہے، اس کی روح اس سے گھبرا کر بدن میں چھپنا چاہتی ہے، فرشتے کھینچ کر نکالتے ہیں، اور مومن کی روح کے سامنے عالم برزخ کا ثواب، نعمتیں اور بشارتیں آتی ہیں تو اس کی روح تیزی سے ان کی طرف جانا چاہتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ **وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا:** یعنی ان فرشتوں کی قسم جو کافر کی رگوں میں گھس کر اس کی جان سختی سے گھسیٹ کر نکالیں۔

فائدہ: ۲؎ **وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا:** یعنی جو فرشتے مومن کے بدن سے جان کی گرہ کھول دیں، پھر وہ اپنی خوشی سے عالم پاک کی طرف دوڑے، جیسے کسی کے بند کھول دیے جائیں تو آزاد ہو کر بھاگتا ہے، مگر یاد رہے یہ ذکر روح کا ہے بدن کا نہیں، نیک خوشی سے عالم قدس کی طرف دوڑتا ہے، بد بھاگتا ہے، پھر گھسیٹا جاتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ **فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا:** یعنی جو فرشتے روحوں کو لے کر زمین سے آسمان کی طرف اس سرعت وسہولت سے چلتے ہیں گویا بے روک ٹوک پانی پر تیر رہے ہیں، پھر ان ارواح کے باب میں جو خدا کا حکم ہوتا ہے اس کے امتثال کے لئے تیزی کے ساتھ دوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔

فائدہ: ۴؎ **فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا:** یعنی اس کے بعد ان ارواح کے متعلق ثواب کا حکم ہو یا عقاب کا دونوں امروں میں سے ہر امر کی تدبیر و انتظام کرتے ہیں، یا مطلقاً وہ فرشتے مراد ہوں جو عالم تکون کی تدبیر وانتظام پر مسلط ہیں والظاھر ھو الاول، **والنازعات، والنشطت** وغیرہ کی تعیین میں بہت اقوال ہیں، ہم نے مترجمؒ کے مذاق پر تقریر کر دی۔

یَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾ تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ ؕ﴿۷﴾ قُلُوۡبٌ یَّوۡمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾ اَبۡصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ﴿۹﴾

جس دن کانپے کانپنے والی ۱؎ اس کے پیچھے آئے دوسری ۲؎ کتنے دل اس دن دھڑکتے ہیں، ان کی آنکھیں جھک رہی ہیں ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اب جواب قسم ہے، ان سب کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ) قیامت ضرور آئے گی جس روز ہلا دینے والی چیز ہلا ڈالے گی (پہلی بار صور پھونکنا مراد ہے) جس کے بعد ایک پیچھے آنے والی چیز آ جائے گی (دوسری بار صور پھونکنا مراد ہے) بہت سے دل اس روز دھڑک رہے ہوں گے ان کی آنکھیں (ندامت کے مارے) جھک رہی ہوں گی (مگر یہ لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی زمین میں بھونچال آئے، پہلی دفعہ صور پھنکنے سے۔

فائدہ: ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی لگا تار (یکے بعد دیگرے) بھونچال چلے آئیں''، اور اکثر مفسرین نے **رادفة** سے صور کا دوسرا نفخہ مراد لیا ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اضطراب اور گھبراہٹ سے دل دھڑکتے ہوں گے اور ذلت وندامت کے مارے آنکھیں جھک رہی ہوں گی۔

یَقُوۡلُوۡنَ ءَاِنَّا لَمَرۡدُوۡدُوۡنَ فِی الۡحَافِرَةِ ؕ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ﴿۱۱﴾ قَالُوۡا تِلۡكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۘ﴿۱۲﴾

لوگ کہتے ہیں کیا ہم پھر آئیں گے الٹے پاؤں، کیا جب ہم ہو چکیں ہڈیاں کھوکھری، بولے تو یہ پھر آنا ہے ٹوٹے کا ۱؎

خلاصہ تفسیر: (اور) کہتے ہیں کہ کیا ہم پہلی حالت میں پھر واپس ہوں گے (پہلی حالت سے مراد موت سے پہلے کی زندگی ہے، یعنی کیا موت کے بعد پھر دوبارہ زندگی ہوگی؟ مقصود قیامت کو بعید سمجھنا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے) کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے پھر (حیات کی طرف) واپس ہوں گے (مقصود قیامت کو مشکل سمجھنا ہے کہ یہ سخت دشوار ہے) کہنے لگے کہ (اگر ایسا ہوا تو) اس صورت میں یہ واپسی (ہمارے لئے) بڑے خسارہ کی ہوگی (کیونکہ ہم نے تو اس کے لئے کچھ سامان نہیں کیا)۔

اس سے مقصود اہل حق کے اس عقیدہ کے ساتھ تمسخر تھا، یعنی ان کے عقیدہ پر ہم بڑے خسارہ میں ہوں گے، جیسے کوئی شخص کسی کو خیر خواہی سے ڈرائے کہ اس راستہ کو مت جانا شیر ملے گا، اور مخاطب اس کو جھٹلانے اور تمسخر کے لیے کسی سے کہے کہ ''بھائی! ادھر مت جانا شیر کھا جائے گا''، مطلب یہ کہ وہاں شیر ویر کچھ بھی نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ''قبر کے گڑھے میں پہنچ کر کیا پھر ہم الٹے پاؤں زندگی کی طرف واپس کئے جائیں گے، ہم تو نہیں سمجھ سکتے کہ کھوکھری ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑ جائے گی، ایسا ہوا تو یہ صورت ہمارے لئے بڑے ٹوٹے اور خسارہ کی ہوگی، کیونکہ ہم نے اس زندگی کے لئے کوئی سامان نہیں کیا''، یہ تمسخر سے کہتے تھے، یعنی مسلمان ہماری نسبت ایسا سمجھتے ہیں، حالانکہ وہاں مرنے کے بعد سرے سے دوسری زندگی ہی نہیں، نقصان اور خسارہ کا کیا ذکر۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجۡرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمۡ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾

سو وہ تو صرف ایک جھڑکی ہے، پھر تبھی وہ آرہیں میدان میں لے

خلاصہ تفسیر: (اب آگے ان پر رد ہے کہ یہ لوگ جو قیامت کو بعید اور مشکل کہتے ہیں) تو (یہ سمجھ رکھیں کہ ہم کو کچھ مشکل نہیں بلکہ) وہ بس ایک ہی سخت آواز ہوگی جس سے سب لوگ فوراً ہی میدان میں آموجود ہوں گے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی یہ لوگ اسے بہت مشکل کام سمجھ رہے ہیں، حالانکہ اللہ کے ہاں یہ سب کام دم بھر میں ہوجائیں گے، جہاں ایک ڈانٹ پلائی، یعنی صور پھنکا، اسی وقت بلا توقف سب اگلے پچھلے میدان حشر میں کھڑے دکھائی دیں گے۔

ربط: آگے اس کی ایک مختصر سی جھڑکی اور معمولی سی ڈانٹ کا ذکر کیا جاتا ہے جو دنیا میں ایک بڑے متکبر کو دی گئی تھی، یا یوں کہیے کہ ان منکرین کو سنایا جارہا ہے کہ تم سے پہلے بڑے زبردست منکروں کا کیا حشر ہوا۔

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ﴿۱۵﴾ اِذۡ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾ اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ

کیا پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی لے جب پکارا اُسکو اسکے رب نے پاک میدان میں جس کا نام طویٰ ہے ۲ جا فرعون کے پاس

اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى ﴿۱۹﴾

اس نے سر اٹھایا، پھر کہہ تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے، اور راہ بتلاؤں تجھ کو تیرے رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو ۳

خلاصہ تفسیر: اب آگے جھٹلانے والوں کو دھمکی اور تکذیب پر آپ ﷺ کی تسلی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ فرعون کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، پس فرماتے ہیں کہ:

کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) کا قصہ پہنچا ہے جبکہ ان کو ان کے پروردگار نے ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں (یہ اس کا نام ہے) پکارا کہ تم فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے، سو اس سے (جا کر) کہو کہ کیا تجھ کو اس بات کی خواہش ہے کہ تو درست ہوجائے، اور (تیری درستی کی غرض سے) میں تجھ کو تیرے رب کی طرف (ذات وصفات کی) رہنمائی کروں تو تو (ذات وصفات کو سن کر اس سے) ڈرنے لگے (اور اس ڈر سے درستی ہوجائے، غرض یہ حکم سن کر موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے اور جا کر پیغام ادا کیا)۔

* * *

فائدہ: لے یہ قصہ کئی جگہ مفصل گزر چکا۔

فائدہ: ۲ یعنی کوہ طور کے پاس۔

فائدہ: ۳ یعنی اگر تجھے سنورنے کی خواہش ہو تو اللہ کے حکم سے سنوار سکتا ہوں اور ایسی راہ بتا سکتا ہوں جس پر چلنے سے تیرے دل میں اللہ کا خوف اور اس کی کامل معرفت جم جائے، کیونکہ خوف کا ہونا بدون کمال معرفت کے متصور نہیں، معلوم ہوا حضرت موسیٰ کی بعثت کا مقصد فرعون کی اصلاح بھی تھی، محض بنی اسرائیل کو قید سے چھڑانا ہی نہ تھا۔

فَاَرٰىهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدۡبَرَ يَسۡعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾

پھر دکھلائی اس کو وہ بڑی نشانی لے پھر جھٹلایا اس نے اور نہ مانا، پھر چلا پیٹھ پھیر کر تلاش کرتا ہوا ۲ پھر سب کو جمع کیا، پھر پکارا

فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿٢٤﴾

تو کہا میں ہوں رب تمہارا سب سے اوپر ۳

خلاصہ تفسیر: پھر (جب فرعون نے نبوت کی دلیل طلب کی تو) اس کو بڑی نشانی (نبوت کی) دکھلائی (مراد عصا کا معجزہ ہے، یا مطلق معجزہ مراد ہو تو عصا اور ید کا مجموعہ مراد ہے) تو اس (فرعون) نے (موسیٰ کو) جھٹلایا اور (ان کا) کہنا نہ مانا، پھر (موسیٰ علیہ السلام سے) جدا ہو کر (ان کے خلاف) کوشش کرنے لگا، اور (لوگوں کو) جمع کیا پھر (ان کے سامنے) با آواز بلند تقریر کی اور کہا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى: ''اعلیٰ'' کی قید سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ فرعون اپنے سوا کسی اور کو بھی چھوٹا معبود سمجھتا ہو، بلکہ اس کا مقصود یہ تھا کہ فقط میں ہی تمہارا رب ہوں، اور ''اعلیٰ'' کی قید محض اپنی تعریف کے لیے بڑھادی، پس یہ قید واقعی تھی، احترازی نہ تھی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وہاں پہنچ کر اللہ کا پیغام پہنچایا اور اس پر حجت تمام کرنے کے لئے وہ سب سے بڑا معجزہ عصا کے اژدہا بننے کا دکھلایا۔

فائدہ: ۲ یعنی وہ ملعون ماننے والا کہاں تھا، اس فکر میں چلا کہ لوگوں کو جمع کرے اور جادوگروں کو تلاش کر کے بلوائے کہ وہ موسیٰ کے معجزات کا مقابلہ کریں۔

فائدہ: ۳ یعنی سب سے بڑا رب تو میں ہوں، یہ موسیٰ کسی کا بھیجا ہوا آیا ہے۔

ع ۲ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿٢٥﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿٢٦﴾

پھر پکڑا اُس کو اللہ نے سزا میں آخرت کی اور دنیا کی ۱ بیشک اس میں سوچنے کی جگہ ہے جس کے دل میں ڈر ہے ۲

خلاصہ تفسیر: سو اللہ تعالیٰ نے اس کو آخرت کے اور دنیا کے عذاب میں پکڑا (دنیوی عذاب تو غرق ہے اور اخروی عذاب حرق یعنی جلنا ہے) بیشک اس (واقعہ) میں ایسے شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جو (اللہ تعالیٰ سے) ڈرے۔

اس واقعہ کی ابتدا: هَلْ اَتٰىكَ سے تسلی مقصود ہے اور اخیر میں کفار کو دھمکی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی یہاں پانی میں ڈوبا، وہاں آگ میں جلے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی اس قصہ میں بہت سی باتیں سوچنے اور عبرت پکڑنے کی ہیں بشرطیکہ آدمی کے دل میں تھوڑا بہت ڈر ہو۔

ربط: موسیٰ اور فرعون کا قصہ درمیان میں استطرادا آ گیا تھا، آگے پھر اسی مضمون قیامت کی طرف عود کرتے ہیں:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾

کیا تمہارا بنانا مشکل ہے یا آسمان کا ۱ اُس نے اس کو بنالیا، اونچا کیا اس کا ابھار پھر اس کو برابر کیا

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿٢٩﴾

اور اندھیری کی رات اس کی اور کھول نکالی اس کی دھوپ ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کا قیامت کو دشوار اور بعید سمجھنا مذکور تھا، اس کا نقلی جواب بیان کر کے آگے عقلی جواب دیتے ہیں، یعنی: بھلا تمہارا (دوسری بار) پیدا کرنا (فی نفسہ) زیادہ سخت ہے یا آسمان کا (ظاہر ہے کہ آسمان ہی کا پیدا کرنا زیادہ سخت ہے، پھر جب اس کو پیدا کر دیا تو تمہارا پیدا کرنا کیا مشکل ہے، اور فی نفسہ اس لئے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اعتبار سے تو سب برابر ہیں، آگے آسمان کے پیدا کرنے کی

کیفیت بیان فرماتے ہیں کہ) اللہ نے اس کو بنایا (اس طرح سے کہ) اس کی چھت کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا (کہ کہیں اس میں سوراخ، شگاف، پھٹا ہوا یا جوڑ پیوند نہیں) اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کے دن کو ظاہر کیا (رات اور دن کو آسمان کی طرف اس لئے منسوب کیا کہ رات اور دن سورج کے طلوع اور غروب سے ہوتے ہیں اور سورج آسمان سے متعلق ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تمہارا پیدا کرنا (اور وہ بھی ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد) آسمان و زمین اور پہاڑوں کے پیدا کرنے سے زیادہ مشکل تو نہیں، جب اتنی بڑی بڑی چیزوں کا خالق اس کو مانتے ہو، پھر اپنی دوبارہ پیدائش میں کیوں تردد ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی آسمان کو خیال کرو کس قدر اونچا، کتنا مضبوط، کیسا صاف ہموار، اور کس درجہ مرتب و منظم ہے، کس قدر زبردست انتظام اور باقاعدگی کے ساتھ اس نے سورج کی رفتار سے رات اور دن کا سلسلہ قائم کیا ہے، رات کے اندھیرے میں اس کا سماں کچھ اور ہے اور دن کے اجالے میں ایک دوسری ہی شان نظر آتی ہے۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿٣١﴾

اور زمین کو اس کے پیچھے صاف بچھا دیا ۱؎ باہر نکالا زمین سے اس کا پانی اور چارا ۲؎

وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿٣٢﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾

اور پہاڑوں کو قائم کر دیا ۳؎ کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کو ۴؎

خلاصہ تفسیر: اور اس کے بعد زمین کو بچھایا (اور بچھا کر) اس سے اس کا پانی اور چارہ نکالا، اور پہاڑوں کو (اس پر) قائم کر دیا تمہارے اور تمہارے مواشی کے فائدہ پہنچانے کے لئے۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ: اگرچہ اصل استدلال تو آسمان کی تخلیق سے تھا مگر زمین کا ذکر شاید اس لیے کر دیا کہ اس کے احوال ہر وقت پیش نظر ہیں اور اگرچہ آسمان کے برابر نہ سہی، لیکن فی نفسہ انسان کی پیدائش کے مقابلہ میں زمین کی پیدائش زیادہ سخت ہے، پس حاصل استدلال کا یہ ہوا کہ جب ایسی ایسی چیزیں ہم نے بنا دیں تو تمہارا دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے، آسمان اور زمین کی پیدائش کی ترتیب سورہ بقرہ آیت ۲۹: **ھو الذی خلقکم ما فی الارض جمیعا** کے ذیل میں گذر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا: آسمان اور زمین میں پہلے کون پیدا کیا گیا؟ اس کے متعلق ہم پیشتر کسی جگہ کلام کر چکے ہیں، غالباً سورۃ فصلت میں۔

تنبیہ: دحی کے معنی راغبؒ نے کسی چیز کو اس کے مقر (جائے قرار) سے ہٹا دینے کے لکھے ہیں، تو شاید اس لفظ میں ادھر اشارہ ہو جو آج کل کی تحقیق ہے کہ زمین اصل میں کسی بڑے جرم سماوی کا ایک حصہ ہے جو اس سے الگ ہو گیا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا: یعنی دریا اور چشمے جاری کئے، پھر پانی سے سبزہ پیدا کیا۔

فائدہ: ۳؎ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا: جو اپنی جگہ سے جنبش نہیں کھاتے اور زمین کو بھی بعض خاص قسم کے اضطرابات سے محفوظ رکھنے والے ہیں۔

فائدہ: ۴؎ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ: یعنی یہ انتظام نہ ہو تو تمہارا اور تمہارے جانوروں کا کام کیسے چلے؟ ان تمام اشیاء کا پیدا کرنا تمہاری حاجت روائی اور راحت رسانی کے لئے ہے، چاہیے کہ اس منعم حقیقی کا شکر ادا کرتے رہو، اور سمجھو کہ جس قادر مطلق اور حکیم برحق نے ایسے زبردست انتظامات کئے ہیں کیا وہ تمہاری بوسیدہ ہڈیوں میں روح نہیں پھونک سکتا، لازم ہے کہ آدمی اس کی قدرت کا اقرار کرے، اور اس کی نعمتوں کی

شکر گذاری میں لگے ورنہ جب وہ بڑا ہنگامہ قیامت کا آئے گا اور سب کیا کرایا سامنے ہوگا سخت پچھتانا پڑے گا۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ

پھر جب آئے وہ بڑا ہنگامہ ، جس دن کے یاد کرے گا آدمی جو اس نے کمایا ، اور نکال ظاہر کردیں دوزخ کو

لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾

جو چاہے دیکھے ۱؎ سو جس نے کی ہو شرارت، اور بہتر سمجھا ہو دنیا کا جینا ۲؎ سو دوزخ ہی ہے اس کا ٹھکانا

خلاصہ تفسیر: اب آگے قیامت کے دن کے جو واقعات جزا و سزا کے متعلق ہوں گے ان کی تفصیل ہے، یعنی:

(قیامت کا ممکن اور واقع ہونا تو ثابت ہو گیا) سو جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا، یعنی جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کرے گا، اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ ظاہر کی جائے گی، تو (اس روز یہ حالت ہوگی کہ) جس شخص نے (حق سے) سرکشی کی ہوگی اور (آخرت کا منکر ہو کر اس پر) دنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی، سو دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دوزخ کو اس طرح منظر عام پر لائیں گے کہ ہر دیکھنے والا دیکھ سکے گا، کوئی آڑ پہاڑ درمیان میں حائل نہ رہے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دنیا کو آخرت پر ترجیح دی اسے بہتر سمجھ کر اختیار کیا اور اسے بھلا دیا۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾

اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہو اس نے اپنے جی کو خواہش سے، سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانا ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا (کہ قیامت، آخرت اور حساب کتاب پر اس کا ایمان مکمل ہو) اور نفس کو (حرام) خواہش سے روکا (یعنی صحیح عقیدہ کے ساتھ عمل بھی صالح کیا) ہوگا، سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا (جنت میں جانا عمل صالح پر موقوف نہیں، یہ صرف ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو اس بات کا خیال کر کے ڈرا کہ مجھے ایک روز اللہ کے سامنے حساب کے لئے کھڑا ہونا ہے اور اسی ڈر سے اپنے نفس کی خواہش پر نہ چلا، بلکہ اسے روک کر اپنے قابو میں رکھا اور احکام الٰہی کے تابع بنایا تو اس کا ٹھکانا بہشت کے سوا کہیں نہیں۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾

تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی کب ہوگا قیام اس کا ۱؎ تجھ کو کیا کام اس کے ذکر سے ، تیرے رب کی طرف ہے پہنچ اس کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: چونکہ کفار انکار کی غرض سے قیامت کا وقت پوچھا کرتے تھے، اب آگے اس کا جواب ہے یعنی:

یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ (سو) اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق؟ (کیونکہ بیان کرنا علم پر موقوف ہے، اور قیامت کا معین وقت ہم نے کسی کو بتلایا نہیں، بلکہ) اس (کے علم کی تعیین) کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آخر وہ گھڑی کب آئے گی اور قیامت کب قائم ہوگی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس کا وقت ٹھیک متعین کر کے بتلانا آپ کا کام نہیں کتنے ہی سوال جواب کرو، آخر کار اس کا علم خدا ہی پر حوالہ کرنا ہے،

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''پوچھتے پوچھتے اسی تک پہنچتا ہے، پیچھے سب بے خبر ہیں''۔

إِنَّمَآ أَنتَ مُنذِرُ مَن يَخْشَىٰهَا ﴿٤٥﴾ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوٓا۟ إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَىٰهَا ﴿٤٦﴾ ع

تو تو ڈر سنانے کے واسطے ہے اسکو جو اس سے ڈرتا ہے ۱۔ ایسا لگے گا جس دن دیکھیں گے اسکو کہ نہیں ٹھہرے تھے دنیا میں مگر ایک شام یا صبح اسکی ۲۔

خلاصہ تفسیر: (اور) آپ تو صرف (اجمالی خبر سے) ایسے شخص کے ڈرانے والے ہیں جو اس سے ڈرتا ہو (اور ڈر کر ایمان لانے والا ہو، اور یہ لوگ جو جلدی مچا رہے ہیں تو سمجھ لیں کہ) جس روز یہ اس کو دیکھیں گے تو (ان کو) ایسا معلوم ہوگا کہ گویا (دنیا میں) صرف ایک دن کے آخری حصہ میں یا اس کے اول حصہ میں رہے ہیں۔

یعنی اُس وقت دنیا کی مدت دراز بہت کم معلوم ہوگی، اور یوں سمجھیں گے کہ عذاب بہت جلدی آ گیا جس کی یہ درخواست کرتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ جلدی کیوں مچاتے ہو؟ جب عذاب آئے گا اس وقت تم اس کو جلدی ہی سمجھو گے، اور جس دیر کو ابھی دیر سمجھ رہے ہو یہ دیر معلوم نہ ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی آپ کا کام قیامت کی خبر سنا کر لوگوں کو ڈرا دینا ہے، اب جس کے دل میں اپنے انجام کی طرف سے کچھ خوف ہوگا یا خوف آخرت کی استعداد ہوگی وہ سن کر ڈرے گا اور ڈر کر تیاری کرے گا، گویا آپ کا ڈرانا نتیجہ کے اعتبار سے صرف ان ہی لوگوں کے حق میں ہوا جو اس سے منتفع ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں، ورنہ نااہل لوگ تو انجام سے غافل ہو کر ان ہی فضول بحثوں میں پڑے ہوئے ہیں کہ قیامت کس تاریخ، کس دن، کس سن میں آئے گی۔

فائدہ: ۲۔ یعنی اب تو شور مچا رہے ہیں کہ قیامت کے آنے میں دیر کیوں ہے؟ جلد کیوں نہیں آ جاتی؟ مگر اس وقت معلوم ہوگا کہ بہت جلد آئی، بیچ میں دیر کچھ نہیں لگی۔

آیاتها ٤٢ — (٨٠) سُورَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ (٢٤) — رکوعها ١

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت کے اخیر میں اور اس سے پہلے قیامت ہی کا مضمون زیادہ ہے، اس قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی آخرت کا مضمون ہی زیادہ مقصود ہے، چونکہ اس سورت میں کافر کی سخت سزا کا ذکر ہے اس کو ثابت کرنے کے لیے سورت کے درمیان میں آیت: قتل الانسان ما اکفرہ میں یہ بتلا کر کہ شکر کے اسباب بھی موجود ہیں اور اس میں رکاوٹ بھی کوئی چیز نہیں ہے اس کے کفر کا سخت ہونا ظاہر کر دیا، اور ایسے سخت کافروں کی ہدایت میں حضور ﷺ کو کاوش اور اہتمام کرنے سے جو کوفت ہوتی تھی حتی کہ ایک بار ایک نابینا صحابی کا ایسا موقع پا کر بولنا اسی وجہ سے کلفت کا سبب ہوا تھا کہ آپ اس وقت کافروں کی ہدایت کا اہتمام فرما رہے تھے، اس لیے سورت کے شروع میں ایک محبوبانہ انداز کے ساتھ جس کو لوگ عتاب کہتے ہیں اس قدر اہتمام سے منع اور سچے طالبوں کے حال پر توجہ کرنے کا حکم فرماتے ہیں، پس سورت کا شروع سورت کے درمیان کی تمہید ہے، اور سورت کا درمیان سورت کے آخر کی تمہید ہے، اور سورت کا آخر مقصود ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰٓ ﴿١﴾ أَن جَآءَهُ ٱلْأَعْمَىٰ ﴿٢﴾ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُۥ يَزَّكَّىٰٓ ﴿٣﴾ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ ٱلذِّكْرَىٰٓ ﴿٤﴾

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا ۱۔ اس بات سے کہ آیا اُسکے پاس اندھا ۲۔ اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا، یا سوچتا تو کام آتا اُسکے سمجھانا ۳۔

خلاصہ تفسیر: ان آیات کے نزول کا قصہ یہ ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ بعض روسائے مشرکین کو سمجھا رہے تھے، بعض

روایات میں ان میں سے بعض کے نام بھی آئے ہیں، ابوجہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، ابی بن خلف، امیہ بن خلف، شیبہ کہ اتنے میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا صحابی حاضر ہوئے اور کچھ پوچھا، یہ قطع کلام آپ کو ناگوار ہوا، اور آپ نے ان کی طرف التفات نہیں کیا، اور ناگواری کی وجہ سے آپ چیں بجبیں ہوئے، جب اس مجلس سے اٹھ کر آپ گھر جانے لگے تو وحی کے آثار نمودار ہوئے اور یہ آیتیں عبس و تولی الخ نازل ہوئیں، اس کے بعد جب وہ صحابی آپ ﷺ کے پاس آتے تو آپ بڑی خاطر کرتے تھے۔

(مذکورہ واقعہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ) پیغمبر (ﷺ) چین بجبیں ہو گئے اور متوجہ نہ ہوئے، اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا (شروع میں تو غائب کے صیغہ سے یعنی غائبانہ انداز میں کلام فرمایا جس سے متکلم کی غایت حیاء، کرم اور مخاطب کی انتہائی عزت و کرامت معلوم ہوتی ہے کہ اس معاملہ کی نسبت روبرو نہیں فرمائی) اور (آگے خطاب کا صیغہ بطور التفات و توجہ کے اس لیے اختیار کیا تا کہ اعراض کا شبہ نہ ہو، ارشاد ہوتا ہے کہ) آپ کو کیا خبر شاید وہ (نابینا آپ کی تعلیم سے پورے طور پر) سنور جاتا، یا (کم سے کم کسی خاص معاملہ میں) نصیحت قبول کرتا سو اس کو نصیحت کرنا (کچھ نہ کچھ) فائدہ پہنچاتا۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰى: عبس کے معنی ترش روئی اختیار کرنا، یعنی چہرہ سے اظہار ناگواری کرنا اور تولّٰی کے معنی رخ پھیر لینے ہیں، اس جگہ موقع اس کا تھا کہ یہ الفاظ آپ ﷺ کو بصیغہ خطاب کہے جاتے کہ آپ نے ایسا کیا، لیکن قرآن کریم نے صیغہ خطاب کے بجائے صیغہ غائب اختیار کیا، جس میں عتاب کی حالت میں بھی رسول اللہ ﷺ کا اکرام ملحوظ رکھا گیا اور صیغہ غائب اختیار کر کے یہ ایہام کیا کہ جیسے یہ کام کسی اور نے کیا ہو، اشارہ اس طرف ہے کہ یہ کام آپ کے شایان شان نہیں اور دوسرے جملے میں خود رسول اللہ ﷺ کے عذر کی طرف اشارہ فرما دیا: وما يدريك (یعنی آپ کو کیا خبر) اس میں بتلا دیا کہ اعراض کی وجہ یہ پیش آئی ہے کہ آپ کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ یہ صحابی کو کچھ دریافت کر رہے ہیں اس کا اثر یقینی ہے اور غیروں سے گفتگو کا اثر موہوم، اور اس دوسرے جملے میں صیغہ غائب چھوڑ کر صیغہ خطاب کا اختیار فرمانے میں بھی رسول اللہ ﷺ کی تکریم اور دل جوئی ہے کہ اگر بالکل خطاب کا صیغہ استعمال نہ ہوتا تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اس طرز عمل کی ناپسندیدگی ترک خطاب کا سبب بن گئی جو آنحضرت ﷺ کے لئے ایک ناقابل برداشت رنج والم ہوتا، اس لئے جس طرح پہلے جملہ میں خطاب کے بجائے غائب کا صیغہ استعمال کرنا رسول اللہ ﷺ کی تکریم ہے، اسی طرح دوسرے جملے میں خطاب کرنا بھی آپ کی تکریم اور دل جوئی ہے۔

اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى: ''نابینا'' سے تعبیر کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اندھا ہونے کی وجہ سے وہ توجہ کے قابل اور رحم کے لائق تھا۔

لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ: مطلب یہ کہ اس کی پوری اصلاح ہوتی، یا کچھ اصلاح ہوتی، بہر حال نفع ہی ہوتا، اور یہاں لعلّہ یعنی ''شاید'' کا لفظ مبالغہ کے لیے ہے کہ اگر اس صحابی کی حالت کے سنورنے یا نصیحت قبول کرنے کا گمان یا احتمال بھی ہوتا تب بھی اس سے بے توجہی نہیں کرنی چاہیے تھی، چہ جائیکہ نفع یقینی ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص سے کسی عذر یا بے خبری کی وجہ سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو اس سے روگردانی یا ناراضی کا اظہار نہ کرے۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ طرز عمل اپنے اجتہاد پر مبنی تھا کہ جو مسلمان آداب مجلس کے خلاف طرز گفتگو اختیار کرے اس کو کچھ تنبیہ ہونی چاہئے تا کہ آئندہ وہ آداب مجلس کی رعایت کرے اس کے لئے تو آپ نے حضرت ابن ام مکتوم سے رخ پھیر لیا، اور دوسری بات یہ تھی کہ بظاہر حال کفر و شرک سب سے بڑے گناہ ہیں ان کے ازالہ کی فکر مقدم ہونا چاہئے بمقابلے دین کے فروعی احکام کی تعلیم کے جو عبداللہ ابن ام مکتوم چاہتے تھے، مگر حق تعالیٰ جل شانہ نے آپ کے اس اجتہاد کو درست قرار نہیں دیا اور اس پر متنبہ فرمایا کہ یہاں قابل غور یہ بات تھی کہ ایک شخص جو آپ سے دینی تعلیم کا طلب ہو کر سوال کر رہا ہے اس کے جواب کا فائدہ تو یقینی ہے اور جو آپ کا مخالف ہے آپ کی بات سننا بھی پسند نہیں کرتا اس سے گفتگو کا فائدہ موہوم ہے، موہوم کو یقینی پر ترجیح نہیں ہونی چاہئے اور عبداللہ بن ام مکتوم سے جو آداب مجلس کے خلاف بات سرزد ہوئی ان کا عذر قرآن نے لفظ ''اعمیٰ'' کہہ کر بتلا دیا کہ وہ نابینا تھے اس لئے ان کو نہ دیکھ سکتے تھے کہ آپ اس وقت کس شغل میں ہیں، کن لوگوں سے گفتگو چل رہی ہے اس لئے وہ معذور تھے، مستحق اعراض نہیں تھے، اس

سے معلوم ہوا کہ کسی معذور آدمی سے بے خبری میں کوئی بات آداب مجلس کے خلاف ہوجائے تو وہ قابل عتاب نہیں ہوتا۔

اس موقع پر یہ تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو کام بیک وقت آ گئے: ① ایک مسلمان کو تعلیم اور اس کی تکمیل اور دلجوئی ② دوسرے غیر مسلموں کی ہدایت کے لئے ان کی طرف توجہ، قرآن کریم کے اس ارشاد نے یہ واضح کر دیا کہ پہلا کام دوسرے کام پر مقدم ہے، دوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا کوئی خلل ڈالنا درست نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح کی فکر غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدم ہے، اس میں ان علما کے لئے ایک اہم ہدایت ہے جو غیر مسلموں کے شبہات کے ازالے اور ان کو اسلام سے مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھے ہیں جن سے عام مسلمانوں کے دلوں میں شوک شبہات یا شکایات پیدا ہوجاتی ہے ان کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی حفاظت اور اصلاح حال کو مقدم رکھنا چاہیے۔، اکبر مرحوم نے خوب فرمایا:

بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو ۔۔۔ دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

* * *

فائدہ: ۱؎ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی: آنحضرت ﷺ بعض سرداران قریش کو مذہب اسلام کے متعلق کچھ سمجھا رہے تھے، اتنے میں ایک نابینا مسلمان (جن کو ابن ام مکتومؓ کہتے ہیں) حاضر خدمت ہوئے اور اپنی طرف متوجہ کرنے لگے کہ فلاں آیت کیونکر ہے؟ یارسول اللہ ﷺ! مجھے اس میں سے کچھ سکھائیے جو اللہ نے آپ ﷺ کو سکھلایا ہے، حضرت کو ان کا بے وقت کا پوچھنا گراں گزرا، آپ ﷺ کو خیال ہوا ہوگا کہ میں ایک بڑے مہم کام میں مشغول ہوں، قریش کے یہ بڑے بڑے سردار اگر ٹھیک سمجھ کر اسلام لے آئیں تو بہت لوگوں کے مسلمان ہونے کی توقع ہے، ابن ام مکتومؓ بہر حال مسلمان ہے اس کو سمجھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے ہزار مواقع حاصل ہیں، اس کو دکھائی نہیں دیتا کہ میرے پاس ایسے بااثر اور بارسوخ لوگ بیٹھے ہیں جن کو اگر ہدایت ہوجائے تو ہزاروں اشخاص ہدایت پر آ سکتے ہیں، میں ان کو سمجھا رہا ہوں، یہ اپنی کہتا چلا جاتا ہے، اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ اگر ان لوگوں کی طرف ہٹ کر گوشۂ التفات اس کی طرف کروں گا تو ان لوگوں پر کس قدر شاق ہوگا، شاید پھر وہ میری بات سننا بھی پسند نہ کریں، غرض آپ ﷺ منقبض ہوئے اور انقباض کے آثار چہرے پر ظاہر ہونے لگے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، روایات میں ہے کہ اس کے بعد جب وہ نابینا آپ ﷺ کی خدمت میں آتے، آپ ﷺ بہت تعظیم وتکریم سے پیش آتے اور فرماتے: "مرحبا بمن عاتبني فيه ربي"۔

فائدہ: ۲؎ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی: یعنی پیغمبر نے ایک اندھے کے آتے پر چیں بجبیں ہو کر منہ پھیر لیا، حالانکہ اس کو اندھے کی معذوری، شکستہ حالی اور طلب صادق کا لحاظ زیادہ کرنا چاہیے تھا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: یہ کلام گویا اوروں کے سامنے گلہ ہے رسول کا (اسی لئے بصیغہ غائب ذکر کیا) آگے خود رسول کو خطاب فرمایا ہے"، اور محققین کہتے ہیں کہ یہ غایت تکرم واستحیاء متکلم کا، اور غایت کرامت مخاطب کی ہے کہ عتاب کے وقت بھی رو در رو اس امر کی نسبت آپ ﷺ کی طرف نہیں فرمائی اور آگے خطاب کا صیغہ بطور التفات کے اس لئے اختیار کیا کہ شبہ اعراض کا نہ ہو، نیز وہ مضمون پہلے مضمون سے ہلکا ہے واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی: یعنی وہ اندھا طالب صادق تھا، تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے فیض توجہ سے اس کا حال سنور جاتا اور اس کا نفس مزکی ہوجاتا، یا تمہاری کوئی بات کان میں پڑتی، اس کو اخلاص سے سوچتا سمجھتا اور آخر وہ بات کسی وقت اس کے کام آجاتی۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ⑤ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ⑥ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی ⑦

وہ جو پروا نہیں کرتا، سو تو اس کی فکر میں ہے، اور تجھ پر کچھ الزام نہیں کہ وہ نہیں درست ہوتا ۱؎

خلاصہ تفسیر: تو جو شخص (دین سے) بے پرواہی کرتا ہے، آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں، حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ نہ سنورے (اس کی بے پرواہی اور استغناء ذکر کر کے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دینے کی ہدایت ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جولوگ اپنے غرور اور شیخی سے حق کی پروانہیں کرتے اوران کا تکبر اجازت نہیں دیتا کہ اللہ و رسول کے سامنے جھکیں آپ ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ یہ کسی طرح مسلمان ہوجائیں تا کہ ان کے اسلام کا اثر دوسروں پر پڑے، حالانکہ اللہ کی طرف سے آپ (ﷺ) پر کوئی الزام نہیں کہ یہ مغرور اور شیخی باز آپ کی ہدایت سے درست کیوں نہ ہوئے، آپ کا فرض دعوت وتبلیغ کا تھا، وہ ادا کر چکے اور کر رہے ہیں، آگے ان لاپروا متکبروں کی فکر میں اس قدر انہماک کی ضرورت نہیں کہ سچے طالب اور مخلص ایماندار توجہ سے محروم ہونے لگیں، یا معاملہ کی ظاہری سطح دیکھ کر بے سوچے سمجھے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوجائے کہ پیغمبر صاحب کی توجہ امیروں اور تونگروں کی طرف زیادہ ہے، شکستہ حال غریبوں کی طرف نہیں اس مہمل خیال کے پھیلنے سے جو ضرر دعوت اسلام کے کام کو پہنچ سکتا ہے، وہ اس نفع سے کہیں بڑھ کر ہے جس کی ان چند متکبرین کے مسلمان ہونے سے توقع کی جاسکتی ہے۔

وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ﴿٨﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ﴿٩﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ﴿١٠﴾

اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا، اور وہ ڈرتا ہے ۱ سو تو اس سے تغافل کرتا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: اور جو شخص آپ کے پاس (دین کے شوق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے، اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے، آپ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔

وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى: ان آیات میں آپ کی اجتہادی لغزش پر آپ کو مطلع کیا گیا ہے، منشا اس اجتہاد کا یہ تھا کہ یہ بات یقینی طور پر ثابت ہے کہ اہم کام کو مقدم کرنا چاہیے، آپ ﷺ نے کفر کے علاج کو زیادہ اہم سمجھا، کیونکہ کفر سخت مرض ہے، جیسے دو بیماروں میں ایک کو ہیضہ ہو اور دوسرے کو زکام، تو ہیضہ والے کا علاج پہلے ہوگا، اور اللہ تعالی کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ سخت مرض کا علاج اس وقت مقدم ہے جبکہ مریض علاج کا مخالف نہ ہو، ورنہ جو مریض علاج کا طالب ہے اگرچہ اس کو ہلکا خفیف مرض مثلا زکام ہو، وہ اس ہیضہ کے مریض سے مقدم ہوگا جو علاج ہی نہ چاہتا ہو، بلکہ الٹا علاج کا مخالف ہو اگرچہ وہ سخت مرض میں مبتلا ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ سے ڈرتا ہے یا ڈر لگا ہے کہ آپ ﷺ کی ملاقات میسر ہو یا نہ ہو، پھر اندھا ہے کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں، اندیشہ ہے کہیں راستہ میں ٹھوکر لگے، یا کسی چیز سے ٹکرا جائے، یا یہ سمجھ کر کہ آپ ﷺ کے پاس جا رہا ہے دشمن ستانے لگیں۔

فائدہ: ۲ حالانکہ ایسے ہی لوگوں سے امید ہوسکتی ہے کہ ہدایت سے منتفع ہوں گے اور اسلام کے کام آئیں گے، کہتے ہیں کہ یہی نابینا بزرگ زرہ پہنے اور جھنڈا ہاتھ میں لئے جنگ قادسیہ میں شریک تھے، آخر اسی معرکہ میں شہید ہوئے، رضی اللہ عنہ۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿١٢﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ (وقف لازم)

یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے، پھر جو کوئی چاہے اس کو پڑھے ۱ لکھا ہے عزت کے ورقوں میں

مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾

اونچے رکھے ہوئے نہایت ستھرے ۲ ہاتھوں میں لکھنے والوں کے، جو بڑے درجہ والے نیک کار ہیں ۳

خلاصہ تفسیر: (آگے ان مشرکین کی طرف اس قدر توجہ ضروری نہ ہونے کو ارشاد فرماتے ہیں کہ آپ آئندہ) ہرگز ایسا نہ کیجئے (کیونکہ) قرآن (محض ایک) نصیحت کی چیز ہے (اور آپ کے ذمہ صرف اس کی تبلیغ ہے) سو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے (اور جو قبول نہ کرے وہ جانے، آپ کا کوئی نقصان نہیں، پھر آپ اس قدر اہتمام کیوں فرماتے ہیں، آگے قرآن کے اوصاف بیان فرماتے ہیں کہ) وہ (قرآن لوح محفوظ

کے) ایسے صحیفوں میں (ثبت) ہے جو (عنداللہ) مکرم ہیں (یعنی پسندیدہ ومقبول ہیں، اور) رفیع المکان ہیں (یعنی بلند جگہ میں ہیں، کیونکہ لوح محفوظ عرش کے نیچے ہے، اور وہ) مقدس ہیں (شیاطین خبیث کی وہاں تک رسائی نہیں جیسا کہ ارشاد ہے: **لا یمسه الا المطهرون**) جو ایسے لکھنے والوں (یعنی فرشتوں) کے ہاتھوں میں (رہتے) ہیں کہ وہ مکرم (اور) نیک ہیں (یہ سب صفات قرآن کے من جانب اللہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ سورۃ واقعہ کی آیت: **لا یمسه الا المطهرون** میں بیان ہوا ہے)۔

فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ: لوح محفوظ حالانکہ ایک ہے، مگر اس کو یہاں جمع کے صیغہ "صحف" سے تعبیر اس لیے کیا گیا کہ اس میں سب صحائف آسمانی لکھتے ہوتے ہیں، یا اس کے اجزاء کی وجہ سے اس کو "صحف" سے تعبیر فرمادیا، یا اس لیے کہ فرشتے اپنے صحیفے اس سے نقل کرتے ہیں، اور ان فرشتوں کو "کاتب" اس لیے کہا کہ وہ لوح محفوظ سے بحکم الٰہی نقل کرنے والے ہیں، حاصل آیات کا یہ ہوا کہ قرآن من جانب اللہ نصیحت کے لئے ہے، آپ نصیحت کر کے اپنے فرض سے فارغ ہو جائیں گے خواہ کوئی ایمان لائے یا نہ لائے، پس اس قسم کے اہتمام یا تقدیم وتاخیر کی ضرورت نہیں۔

* * *

فائدہ: لے یعنی متکبر اغنیاء اگر قرآن کو نہ پڑھیں اور اس نصیحت پر کان نہ دھریں تو اپنا ہی برا کریں گے، قرآن کو ان کی کچھ پروا نہیں، نہ آپ کو اس درجہ ان کے درپے ہونے کی ضرورت ہے، ایک عام نصیحت تھی سو کر دی گئی جو اپنا فائدہ چاہے اس کو پرکھے اور سمجھے۔

فائدہ: ۲ یعنی کیا ان مغرور سر پھروں کے ماننے سے قرآن کی عزت ووقعت ہوگئی؟ قرآن تو وہ ہے جس کی آیتیں آسمان کے اوپر نہایت معزز، بلند مرتبہ اور صاف ستھرے ورقوں میں لکھی ہوئی ہیں اور زمین پر مخلص ایماندار بھی اس کے اوراق نہایت عزت واحترام اور تقدیس وتطہیر کے ساتھ اونچی جگہ رکھتے ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی وہاں فرشتے اس کو لکھتے ہیں اسی کے موافق وحی اترتی ہے اور یہاں بھی اوراق میں لکھنے اور جمع کرنے والے دنیا کے بزرگ ترین پاکباز نیکوکار اور فرشتہ خصلت بندے ہیں جنہوں نے ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف وتبدیل سے اس کو پاک رکھا ہے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾

مارا جائیو آدمی کیسا ناشکرا ہے لے کس چیز سے بنایا اس کو، ایک بوند سے ۲ بنایا اس کو پھر اندازہ پر رکھا اس کو ۳

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک تبلیغ ونصیحت کرنے کے آداب بیان ہوئے، اب آگے نصیحت قبول نہ کرنے پر کفار کی مذمت ہے کہ منکر) آدمی پر (جو ایسے تذکرہ سے نصیحت حاصل نہ کرے جیسے ابوجہل وغیرہ جن کو آپ سمجھاتے تھے اور وہ نہیں سمجھے تو ایسے شخص پر) خدا کی مار کہ وہ کیسا ناشکرا ہے (وہ دیکھتا نہیں کہ) اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی (حقیر) چیز سے پیدا کیا؟ (آگے جواب ہے کہ) نطفہ سے (پیدا کیا، آگے اس کی کیفیت مذکور ہے کہ بہت سے انقلابات اور تغیرات کے بعد) اس کی صورت بنائی پھر اس (کے اعضا) کو انداز سے بنایا (جیسا کہ سورۃ القیامہ کی آیت ۳۸: **ثم کان علقة فخلق فسوی** میں گزر چکا ہے)۔

* * *

فائدہ: لے یعنی قرآن جیسی نعمت عظمیٰ کی کچھ قدر نہ کی اور اللہ کا حق کچھ نہ پہچانا۔

فائدہ: ۲ یعنی ذرا اپنی اصل پر تو غور کیا ہوتا کہ وہ پیدا کس چیز سے ہوا ہے، ایک ناچیز اور بے قدر قطرہ آب سے جس میں حس وشعور، حسن و جمال اور عقل وادراک کچھ نہ تھا، سب کچھ اللہ نے اپنی مہربانی سے عطا فرمایا، جس کی حقیقت کل اتنی ہو کیا اسے یہ طمطراق زیبا ہے کہ خالق ومنعم حقیقی ایسی عظیم الشان نصیحت اتارے اور یہ بے شرم اپنی اصل حقیقت اور مالک کی سب نعمتوں کو فراموش کر کے اسکی کچھ پروا نہ کرے اور احسان فراموش! کچھ تو شرمایا ہوتا۔

فائدہ: ۳ یعنی ہاتھ پاؤں وغیرہ سب اعضاء وقویٰ ایک خاص اسلوب اور اندازے سے رکھے، کوئی چیز یوں ہی بے تکی اور بے ڈھنگی خلاف حکمت نہیں رکھ دی۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾

پھر راہ آسان کر دی اس کی ۱ پھر اس کو مردہ کیا پھر قبر میں رکھوا دیا اس کو ۲ پھر جب چاہا اٹھا نکالا اس کو ۳

خلاصہ تفسیر: پھر اس کو (نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا (چنانچہ ظاہر ہے کہ ایسی تنگ جگہ سے اچھے خاصے تنومند بچہ کا صحیح سالم نکل آنا اللہ کے قادر اور بندہ کے مقدور ہونے کی صاف دلیل ہے) پھر (عمر پوری ہونے کے بعد) اس کو موت دی پھر اس کو قبر میں لے گیا (خواہ پہلے ہی سے خاک یعنی قبر میں رکھ دیا جائے، یا کچھ دنوں کے بعد خاک میں مل جائے) پھر جب اللہ چاہے گا اس کو دوبارہ زندہ کر دے گا (مطلب یہ کہ یہ سب تصرفات انسان کے قدرت الہیہ کے تحت داخل ہونے کی دلیل بھی ہیں اور نعمتیں بھی ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ایمان وکفر اور بھلے برے کی سمجھ دی، یا ماں کے پیٹ میں سے نکالا آسانی سے۔

فائدہ: ۲ یعنی مرنے کے بعد اس کی لاش کو قبر میں رکھنے کی ہدایت کر دی، تاکہ زندوں کے سامنے یوں ہی بے حرمت نہ ہو۔

فائدہ: ۳ یعنی جس نے ایک مرتبہ جلایا اور مارا، اسی کو اختیار ہے کہ جب چاہے دوبارہ زندہ کر کے قبر سے نکالے، کیونکہ اس کی قدرت اب کسی نے سلب نہیں کر لی (العیاذ باللہ) بہرحال پیدا کر کے دنیا میں لانا، پھر مار کر برزخ میں لے جانا، پھر زندہ کر کے میدان حشر میں کھڑا کر دینا، یہ امور جس کے قبضہ میں ہوئے کیا اس کی نصیحت سے اعراض وانکار اور اس کی نعمتوں کا استحقار کسی آدمی کے لئے زیبا ہے۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾

ہرگز نہیں پورا نہ کیا جو اس کو فرمایا ۱ اب دیکھ لے آدمی اپنے کھانے کو ۲ کہ ہم نے ڈالا پانی اوپر سے گرتا ہوا

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾

پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر ۳ پھر اگایا اس میں اناج، اور انگور اور ترکاری، اور زیتون اور کھجوریں

وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾

اور گھن کے باغ، اور میوہ اور گھاس، کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے ۴

خلاصہ تفسیر: (بعض نعمتیں ظاہری وحسی اور بعض نعمتیں باطنی ومعنوی دیں، جن کا تقاضا اور مطالبہ تھا ایمان واطاعت کا واجب ہونا مگر اس نے) ہرگز (شکر) نہیں (ادا کیا اور) اس کو جو حکم کیا تھا اس کو بجا نہیں لایا، سو انسان کو چاہیے کہ (اپنی پیدائش کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے کے بعد اپنی بقاء اور عیش وعشرت کے اسباب پر نظر کرے، مثلا) اپنے کھانے کی طرف نظر کرے (تاکہ وہ حق شناسی اور ایمان واطاعت کا باعث ہو، آگے نظر کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں وہ یہ) کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا، پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا، پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارہ پیدا کیا (بعض چیزیں) تمہارے اور (بعض چیزیں) تمہارے مواشی کے فائدہ کے لئے (اور یہ سب بھی نعمت اور دلیل قدرت ہیں، اور اس مجموعہ میں ہر ہر جزو ایمان اور شکر کے واجب ہونے کا تقاضا اور مطالبہ کرتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ: یعنی انسان نے ہرگز اپنے مالک کا حق نہیں پہچانا اور جو کچھ حکم ہوا تھا ابھی تک اس کو بجا نہیں لایا۔

تنبیہ: ابن کثیرؒ نے کلا لما یقض ما امرہ کو ثم اذا شاء انشرہ سے متعلق رکھا ہے، یعنی جب چاہے گا زندہ کر کے اٹھائے گا،

ابھی ایسا نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ دنیا کی آبادی کے متعلق اس کا جو حکم کونی وقدری ہے وہ ابھی تک اس نے ختم نہیں کیا۔

فائدہ: ۲ اِلٰى طَعَامِهٖٓ: پہلے انسان کے پیدا کرنے اور مارنے کا ذکر تھا، اب اسکی زندگی اور بقاء کے سامان یاد دلاتے ہیں۔

فائدہ: ۳ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا: یعنی ایک گھاس کے تنکے کی کیا طاقت تھی کہ زمین کو چیر پھاڑ کر باہر نکل آتا، یہ قدرت کا ہاتھ ہے جو زمین کو پھاڑ کر اس سے طرح طرح کے غلے، پھل اور سبزے، ترکاریاں وغیرہ باہر نکالتا ہے۔

فائدہ: ۴ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ: یعنی بعض چیزیں تمہارے کام آتی ہیں اور بعض تمہارے جانوروں کے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾

پھر جب آئے وہ کان پھوڑنے والی ۱ جس دن کہ بھاگے مرد اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں اور اپنے باپ،

وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾

اور اپنی ساتھ والی سے اور اپنے بیٹوں سے، ہر مرد کو ان میں سے اس دن ایک فکر لگا ہوا ہے جو اس کے لیے کافی ہے ۲

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک نصیحت قبول نہ کرنے پر مذمت تھی، اب آگے نصیحت قبول نہ کرنے پر سزا، اور نصیحت قبول کرنے کا ثواب مذکور ہے، یعنی اب تو یہ لوگ ناشکری اور کفر کرتے ہیں) پھر جس وقت کانوں کا بہرا کردینے والا شور برپا ہوگا (یعنی قیامت، اس وقت ساری ناشکری کا مزا معلوم ہوجائیگا، آگے اس دن کا بیان ہے کہ) جس روز (ایسا) آدمی (جس کا اوپر بیان ہوا) اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا (یعنی کوئی کسی کی ہمدردی نہ کریگا، ایک اور جگہ ارشاد ہے: **لا یسئل حمیم حمیما**، وجہ یہ کہ) ان میں ہر شخص کو (اپنا ہی) ایسا مشغلہ ہوگا جو اس کو اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ایسی سخت آواز جس سے کان بہرے ہوجائیں، اس سے مراد نفخہ صور کی آواز ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اس وقت ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہوگی احباب و اقارب ایک دوسرے کو نہ پوچھیں گے، بلکہ اس خیال سے کہ کوئی میری نیکیوں میں سے نہ مانگنے لگے، یا اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے لگے ایک دوسرے سے بھاگے گا۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾

کتنے منہ اس دن روشن ہیں، ہنستے خوشیاں کرتے ۱ اور کتنے منہ اس دن ان پر گرد پڑی ہے

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾ ع

چڑھی آتی ہے ان پر سیاہی ۲ یہ لوگ وہی ہیں جو منکر ہیں ڈھیٹھ ۳

خلاصہ تفسیر: (پیچھے کفار کا حال بیان ہوا، اب آگے مجموعہ مومنین اور کفار کی تفصیل ہے کہ) بہت سے چہرے اس روز (ایمان کی وجہ سے) روشن (اور مسرت سے) خنداں شاداں ہوں گے، اور بہت سے چہروں پر اس روز (کفر کی وجہ سے) ظلمت ہوگی (اور اس ظلمت کے ساتھ ان پر (غمی کی) کدورت چھائی ہوگی، یہی لوگ کافر فاجر ہیں (''کافر'' سے اشارہ ہے عقائد کے فساد کی طرف، اور ''فاجر'' سے اشارہ ہے اعمال کے فساد کی طرف)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی مومنین کے چہرے نور ایمان سے روشن اور غایت مسرت سے خنداں وفرحاں ہوں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی کافروں کے چہروں پر کفر کی کدورت چھائی ہوگی اور اوپر سے فسق وفجور کی ظلمت اور زیادہ تیرہ تاریک کردے گی۔

فائدہ: ۳ یعنی کافر بے حیا کو کتنا ہی سمجھاؤ ذرا نہ پسیجیں، نہ خدا سے ڈریں، نہ مخلوق سے شرمائیں۔

اٰیاتھا ۲۹ ۸۱ سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ مَکِّیَّۃٌ ۷ رکوعھا ۱

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں بھی گذشتہ اور آئندہ سورتوں کی طرح قیامت کے واقعات بیان کرنا مقصود ہے اور اس کی تقویت کے لیے سورت کے آخر میں قرآن کریم کی حقانیت مذکور ہے کہ قیامت کے لیے اس پر عمل کر کے تیار اور مستعد ہو جائیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝۱ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝۲ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝۳

جب سورج کی دھوپ تیز ہو جائے ۱ اور جب تارے میلے ہو جائیں ۲ اور جب پہاڑ چلائے جائیں ۳

خلاصہ تفسیر: جب آفتاب بے نور ہو جائے گا اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ گویا اس کی لمبی شعاعیں جن سے دھوپ پھیلتی ہے لپیٹ کر رکھ دی جائیں اور آفتاب بے نور ہو کر پنیر کی چکی کی مانند رہ جائے یا بالکل نہ رہے۔

فائدہ: ۲ یعنی ستارے ٹوٹ کر گر پڑیں اور ان کا نور زائل ہو جائے۔

فائدہ: ۳ یعنی ہوا میں اڑتے پھریں۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶

اور جب بیاتی اونٹنیاں چھٹی پھریں ۱ اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑ جائے ۲ اور جب دریا جھونکے جائیں ۳

خلاصہ تفسیر: اور جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی، اور جب وحشی جانور (گھبراہٹ کے مارے) سب جمع ہو جائیں گے اور جب دریا بھڑکائے جائیں گے۔

سورت کے شروع میں بیان کردہ یہ چھ واقعات تو نفخہ اولیٰ یعنی پہلی دفعہ صور پھونکنے کے وقت ہوں گے جبکہ دنیا آباد ہوگی اور اس نفخہ سے یہ تغیرات وتبدلات واقع ہوں گے اور اس وقت اونٹنیاں وغیرہ بھی اپنی اپنی حالت پر ہوں گی جن میں بعض وضع حمل کے قریب ہوں گی جو کہ عرب کے نزدیک بچے کی توقع اور دودھ کی وجہ سے سب سے زیادہ قیمتی مال ہے جس کی ہر وقت دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں، مگر اس وقت ہل چل میں کسی کو کسی کا ہوش نہ رہے گا اور وحشی جانور بھی مارے گھبراہٹ کے سب گڈمڈ ہو جائیں گے اور دریاؤں میں اول طغیانی پیدا ہوگی اور زمین میں دراڑیں اور شگاف واقع ہو جائیں گے جس سے سب میٹھے اور نمکین دریا ایک ہو جائیں گے جس کا ذکر آئندہ سورۃ میں **واذا البحار فجرت** میں فرمایا ہے، پھر شدت حرارت سے سب کا پانی آگ ہو جائے گا، شاید اول ہوا ہو جائے، پھر ہوا آگ بن جائے اس کے بعد عالم فنا ہو جائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ اونٹ عرب کا بہترین مال ہے اور دس مہینے کی گابھن اونٹنی جو بیانے کے قریب ہو دودھ اور بچہ کی توقع پر بہت زیادہ عزیز ہوتی

ہے، لیکن قیامت کے ہولناک زلازل کے وقت ایسے نفیس وعزیز مال کو کوئی نہ پوچھے گا نہ مالک کو اتنا ہوش ہوگا کہ ایسے بڑھیا مال کی خبر گیری کرے، باقی یہ کہنا کہ ریل نکل جانے کی وجہ سے اونٹنیاں بیکار ہو جائیں گی محض ظرافت ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی جنگل کے وحشی جانور جو آدمی کے سایہ سے بھاگتے ہیں مضطرب ہو کر شہر میں آگھسیں اور پالتو جانوروں میں مل جائیں جیسا کہ اکثر خوف کے وقت دیکھا گیا ہے، ابھی چند سال ہوئے گنگا جمنا میں سیلاب آیا تھا تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک چھپر بہتا جا رہا ہے اس پر آدمی بھی ہیں اور سانپ وغیرہ بھی لپٹ رہے ہیں ایک دوسرے سے کچھ تعرض نہیں کرتا، نفسی نفسی پڑی ہوئی ہے، بلکہ زیادہ سردی کے زمانہ میں بعض درندے جنگل سے شہر میں گھس آتے ہیں۔

تنبیہ: بعض مفسرین نے حُشِرَتْ کے معنی مارنے کے اور بعض نے مار کر اٹھانے کے لئے ہیں، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳ یعنی سمندروں کا پانی گرم ہو کر دھواں اور آگ بن جائے جو نہایت گرم ہو کر محشر میں کافروں کو دکھ پہنچائے اور تنور کی طرح جھونکنے سے ابلے۔

وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ﴿٧﴾ وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ﴿٨﴾ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾

اور جب جیون کے جوڑے باندھے جائیں ۱ اور جب بیٹی جیتی گاڑ دی گئی کو پوچھیں، کہ کس گناہ پر وہ ماری گئی ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اگلے چھ واقعات دوسری دفعہ صور پھونکنے کے بعد ہوں گے جن کا بیان یہ ہے کہ) جب ایک ایک قسم کے لوگ اکٹھے کئے جائیں گے (کافر الگ مسلمان الگ، پھر ان میں ایک ایک طریقہ کے الگ الگ ہو جائیں گے) اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر قتل کی گئی تھی (مقصود اس پوچھنے سے زندہ درگور کرنے والے ظالموں کے جرم کو ظاہر کرنا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی کافر کافر کے اور مسلم مسلم کے ساتھ پھر ہر قسم کا نیک یا بدعمل کرنے والا اپنے جیسے عمل کرنے والوں کے ساتھ جوڑ دیا جائے اور عقائد، اعمال، اخلاق وغیرہ کے اعتبار سے الگ جماعتیں بنادی جائیں یا یہ مطلب ہے کہ روحوں کو جسموں کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

فائدہ: ۲ عرب میں رسم تھی کہ باپ اپنی بیٹی کو نہایت سنگدلی اور بے رحمی سے زندہ زمین میں گاڑ دیتا تھا بعض تو تنگدستی اور شادی بیاہ کے اخراجات کے خوف سے یہ کام کرتے تھے اور بعض کو یہ عار تھی کہ ہم اپنی بیٹی کسی کو دیں گے وہ ہمارا داماد کہلائے گا۔ قرآن نے آگاہ کیا کہ ان مظلوم بچیوں کی نسبت بھی سوال ہوگا کہ کس گناہ پر اس کو قتل کیا تھا۔ یہ مت سمجھنا کہ ہماری اولاد ہے، اس میں ہم جو چاہیں تصرف کریں بلکہ اولاد ہونے کی وجہ سے جرم اور زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿١٠﴾ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ﴿١١﴾ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ﴿١٢﴾

اور جب اعمال نامے کھولے جائیں، اور جب آسمان کا پوست اتار لیں ۱ اور جب دوزخ دہکائی جائے

وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ﴿١٣﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ ﴿١٤﴾

اور جب بہشت پاس لائی جائے ۲ جان لے گا ہر ایک جی جو لے کر آیا ۳

خلاصہ تفسیر: اور جب نامہ اعمال کھول دیئے جائیں گے (تاکہ سب اپنے اپنے عمل دیکھ لیں ایک اور جگہ ارشاد ہے: یلقٰہ منشورا) اور جب آسمان کھل جائے گا (اور اس کے کھلنے سے آسمان کے اوپر کی چیزیں نظر آنے لگیں گی اور نیز اس کے کھلنے سے غمام کا نزول ہوگا جس

کا ذکر سورہ فرقان کی آیت: **ویوم تشقق السماء** میں آیا ہے) اور جب دوزخ (اور زیادہ) دہکائی جائے گی، اور جب جنت نزدیک کردی جائے گی (جیسا کہ سورہ ق میں ارشاد ہے: **وازلفت الجنته للمتقین**، جب پہلی اور دوسری دفعہ صور پھونکنے کے سبب یہ سب واقعات ہوجائیں گے تو اس وقت) ہر شخص ان اعمال کو جان لے گا جو لے کر آیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ے جیسے جانور کا بعد ذبح کے پوست اتار لیتے ہیں، اس سے تمام اعضاء اور رگ وریشہ ظاہر ہوجاتے ہیں، اسی طرح آسمان کے کھل جانے سے اس کے اوپر کی چیزیں نظر آئیں گی اور غمام کا نزول ہوگا، جس کا ذکر انیسویں پارہ میں آیت **ویوم تشقق السماء بالغمام** سے ہوا ہے۔

فائدہ: ۲ے یعنی دوزخ بڑے زور شور کے ساتھ دہکائی جائے اور بہشت متقیوں کے نزدیک کردی جائے جس کی رونق و بہار دیکھنے سے عجیب مسرت و فرحت حاصل ہو۔

فائدہ: ۳ے یعنی ہر ایک کو پتہ لگ جائے گا کہ نیکی یا بدی کا کیا سرمایہ لے کر حاضر ہوا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾

سو قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والوں، سیدھے چلنے والوں دبک جانے والوں کی ۱ے اور رات کی جب پھیل جائے ۲ے اور صبح کی جب دم بھرے ۳ے

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾

مقرر یہ کہا ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا، قوت والا عرش کے مالک کے پاس درجہ پانے والا، سب کا مانا ہوا وہاں کا معتبر ہے ۴ے

خلاصہ تفسیر: (اور جب ایسا دردناک واقعہ ہونے والا ہے) تو (میں منکرین کو اس کی حقیقت بتلاتا ہوں اور ماننے والوں کو اس کیلئے آمادہ کرتا ہوں، اور یہ دونوں باتیں قرآن کی تصدیق اور اس پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہیں کہ اس میں اس قیامت کا اثبات اور نجات کا طریقہ مذکور ہے اس لئے) میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو (سیدھے چلتے چلتے) پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں (اور پھر پیچھے ہی کو) چلتے رہتے (اور کبھی پیچھے چلتے چلتے اپنے مطالع میں) جا چھپتے ہیں اور قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے، اور قسم ہے صبح کی جب وہ آنے لگے (قسموں کے بعد اب جواب قسم ہے) کہ یہ قرآن (اللہ کا) کلام ہے ایک معزز فرشتہ (یعنی جبرئیل علیہ السلام) کا لایا ہوا جو قوت والا ہے (جیسا کہ سورہ نجم میں ارشاد ہے: **علّمه شدید القوٰی** اور) مالک عرش کے نزدیک ذی رتبہ ہے (اور) وہاں (یعنی آسمانوں میں) اس کا کہنا مانا جاتا ہے (یعنی فرشتے اس کا کہنا مانتے ہیں جیسا کہ حدیث معراج سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کہنے سے فرشتوں نے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے اور) امانت دار ہے (کہ وحی کو صحیح پہنچادیتا ہے)۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ: یہ قسمیں اس مقام کے مقصود اور مطلوب کے لیے نہایت مناسب ہیں، چنانچہ ستاروں کا سیدھا چلنا، لوٹنا اور چھپ جانا وحی لانے والے فرشتہ کے آنے، واپس جانے اور عالم ملکوت میں جا چھپنے کے مشابہ ہے، اور رات کا گزرنا اور صبح کا آنا قرآن کے سبب سے کفر کی ظلمت دور ہوجانے اور ہدایت کا نور ظاہر ہوجانے کے مشابہ ہے۔

بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ: ایسا معاملہ پانچ سیاروں کو پیش آتا ہے کہ کبھی سیدھے چلتے ہیں کبھی پیچھے کو چلتے ہیں اور ان کو علم ہیئت وفلکیات میں ''خمسہ متحیرہ'' کہتے ہیں: ① زحل ② مشتری، ③ عطارد ④ مریخ ⑤ زہرہ، متحیرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان پانچوں ستاروں کی حرکت دنیا میں اس طرح دیکھی جاتی ہے کہ کبھی مشرق سے مغرب کی طرف چل رہے ہیں، کبھی پھر پیچھے کو مغرب سے مشرق کی طرف چلنے لگتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ے **الْجَوَارِ الْكُنَّسِ:** کئی سیاروں (مثلاً زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد) کی چال اس ڈھب سے ہے کہ کبھی مغرب سے

مشرق کو چلیں یہ سیدھی راہ ہے، کبھی ٹھٹک کر الٹے پھریں اور کبھی سورج کے پاس آ کر کتنے دنوں تک غائب رہیں۔

فائدہ: ٢ وَالَّيۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ: یا جب جانے لگے، اس لفظ کے دونوں معنیٰ آتے ہیں۔

فائدہ: ٣ وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ: حضرت شاہ عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں گویا آفتاب کو دریا میں تیرنے والی مچھلی سے تشبیہ دی اور طلوع سے پہلے اسکے نور کے منتشر ہونے کو دم ماہی سے نسبت کی، جیسے مچھلی دریا میں آنکھوں سے پوشیدہ گزرتی ہے اور اسکے سانس لینے سے پانی اڑتا اور منتشر ہوتا ہے، اسی طرح آفتاب کی حالت قبل طلوع اور قبل روشنی پھیلنے کے ہے اور بعضوں نے کہا کہ دم صبح کنایہ ہے نسیم سے جو طلوع صبح کے قریب موسم بہار میں چلتی ہے۔

تنبیہ: ان قسموں کی مناسبت آیندہ مضمون سے یہ ہے کہ ان ستاروں کا چلنا، ٹھہرنا، لوٹنا، اور چھپ جانا ایک نمونہ ہے اگلے انبیاء پر بار بار وحی آنے اور ایک مدت دراز تک اس کے نشان باقی رہنے پھر منقطع ہو کر چھپ جانے اور غائب ہو جانے کا، اور رات کا آنا نمونہ ہے اس تاریک دور کا جو خاتم المرسلین ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے دنیا پر گزرا کہ کسی شخص کو حق و باطل کی تمیز نہ رہی تھی، اور وحی کے آثار بالکل مٹ چکے تھے، اس کے بعد صبح صادق کا دم بھرنا حضور ﷺ کا اس جہان میں تشریف لانا اور قرآن کا اترنا ہے کہ ہر چیز کو ہدایت کے نور سے دن کی مانند روشن کر دیا، گویا اگلے انبیاء کا نور ستاروں کی طرح تھا اور اس نور اعظم کو آفتاب درخشاں کہنا چاہئے، ولنعم ما قیل:

فانــه شمس فضل هـم كـواكبهـا يظـهرن انوارها للناس فى الظلم

حتیٰ اذاطلعت فى الكون عم هداها العـالمين واحيت سـائر الامـم

اور بعض علماء نے فرمایا کہ ستاروں کا سیدھا چلنا اور لوٹنا اور چھپ جانا، فرشتے کے آنے اور واپس جانے اور عالم ملکوت میں جا چھپنے کے مشابہ ہے اور رات کا گزرنا اور صبح کا آنا، قرآن کے سبب ظلمت کفر دور ہو جانے اور نور ہدایت کے پوری طرح ظاہر ہو جانے کے مشابہ ہے، اس تقریر کے موافق مقسم بہ کی مناسبت مقسم علیہ سے زیادہ واضح ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ٤ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيۡنٍ: یہ حضرت جبرائیل کی صفات بیان ہوئیں، مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم جو اللہ کے پاس سے ہم تک پہنچا اس میں دو واسطے ہیں، ایک وحی لانے والا فرشتہ (جبرائیل) اور دوسرا پیغمبر عربی ﷺ دونوں کی صفات وہ ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد کسی طرح کا شک وشبہ قرآن کے صادق اور منزل من اللہ ہونے میں نہیں رہتا، کسی روایت کی صحت تسلیم کرنے کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ راوی وہ ہوتا ہے جو اعلیٰ درجہ کا ثقہ، عادل، ضابط، حافظ اور امانتدار ہو، جس سے روایت کرے اس کے پاس عزوحرمت کے ساتھ رہتا ہو، بڑے بڑے معتبر ثقات اس کی امانت وغیرہ پر اعتماد کلی رکھتے ہوں، اور اسی لئے اس کی بات بے چون و چرا مانتے ہوں، یہ تمام صفات حضرت جبرائیل میں موجود ہیں وہ کریم (عزت والے) ہیں جن کے لئے اعلیٰ نہایت متقی اور پاکباز ہونا لازم ہے: اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ (الحجرات:13) وفى الحديث: "الكرم التقوىٰ" قوت والے ہیں جس میں اشارہ ہے کہ حفظ وضبط اور بیان کی قوت بھی کامل ہے، اللہ کے ہاں ان کا بڑا درجہ ہے، سب آسمانوں کے فرشتے ان کے امین اور معتبر ہونے میں کسی کو شبہ نہیں، یہ تو رسول ملکی کا حال تھا آگے رسول بشری کا حال سن لیجئے:

وَمَا صَاحِبُكُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲۲﴾ وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِيۡنِ ۚ﴿۲۳﴾

اور یہ تمہارا رفیق کچھ دیوانہ نہیں ١ اور اس نے دیکھا ہے اس فرشتہ کو آسمان کے کھلے کنارہ کے پاس ٢

وَمَا هُوَ عَلَى الۡغَيۡبِ بِضَنِيۡنٍ ۚ﴿۲۴﴾ وَمَا هُوَ بِقَوۡلِ شَيۡطٰنٍ رَّجِيۡمٍ ۙ﴿۲۵﴾

اور یہ غیب کی بات بتانے میں بخیل نہیں ٣ اور یہ کہا ہوا نہیں کسی شیطان مردود کا ٤

خلاصہ تفسیر: پیچھے وحی لانے والے فرشتے کا ذکر تھا، اب آگے جن پر وحی نازل ہوئی ان کی نسبت ارشاد ہے کہ:

اور یہ تمہارے ساتھ کے رہنے والے (محمد ﷺ جن کا حال بخوبی تم کو معلوم ہے) مجنون نہیں ہیں (جیسا کہ منکرین نبوت کہتے تھے) اور

انہوں نے اس فرشتہ کو (اصلی صورت میں آسمان کے) صاف کنارہ پر دیکھا بھی ہے (صاف کنارہ سے مراد بلند کنارہ ہے کہ صاف نظر آتا ہے جیسا کہ سورہ نجم میں ہے: وھو بالافق الاعلیٰ، اوراس کا مفصل بیان سورۃ نجم میں گزر چکا ہے) اور یہ پیغمبر مخفی (بتلائی ہوئی وحی کی) باتوں پر بخل کرنے والے بھی نہیں (جیسا کاہنوں کی عادت تھی کہ رقم لے کر کوئی بات بتلاتے تھے، اس سے کہانت کی بھی نفی ہوگئی اوراس کی بھی کہ آپ اپنے کام کا کسی سے معاوضہ نہیں لیتے) اور یہ قرآن کسی شیطان مردود کی کہی ہوئی بات نہیں ہے (اس سے کہانت کی نفی کی اور تاکید ہوگئی، حاصل یہ کہ نہ آپ مجنوں ہیں، نہ کاہن، نہ صاحب غرض، اور وحی لانے والے کو پہچانتے بھی ہیں اور وحی لانے والا ایسا ایسا ہے پس لامحالہ یہ اللہ کا کلام اور آپ اللہ کے رسول ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ: یعنی بعثت سے پہلے چالیس سال تک وہ تمہارے اور تم اس کے ساتھ رہے اتنی طویل مدت تک اس کے تمام کھلے چھپے احوال کا تجربہ کیا، کبھی ایک مرتبہ اس میں جھوٹ فریب یا دیوانہ پن کی بات نہ دیکھی، ہمیشہ اسکے صدق وامانت اور عقل و دانائی کے معترف رہے، اب بلا وجہ اسے جھوٹا یا دیوانہ کیونکر کہہ سکتے ہو، کیا یہ وہ ہی تمہارا رفیق نہیں ہے جس کے رتی رتی احوال کا تم پہلے سے تجربہ رکھتے ہو، اب اسکو دیوانہ کہنا بجز دیوانگی کے کچھ نہیں۔

فائدہ: ۲ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ: یعنی مشرقی کنارہ کے پاس اس کی اصلی صورت میں صاف صاف دیکھا، اس لئے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ شاید دیکھنے یا پہچاننے میں کچھ اشتباہ والتباس ہوگیا ہوگا جس کو فرشتہ سمجھ لیا وہ واقع میں فرشتہ نہ ہوگا، سورۃ نجم میں پہلے آچکا: **فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى** (النجم:6-7)

فائدہ: ۳ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ: یعنی یہ پیغمبر ہر قسم کے غیوب کی خبر دیتا ہے، ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے، یا اللہ کے اسماء وصفات سے یا احکام شرعیہ سے یا مذاہب کی حقیت و بطلان سے یا جنت ودوزخ کے احوال سے یا واقعات بعد الموت سے، اوران چیزوں کے بتلانے میں ذرا بخل نہیں کرتا نہ اجرت مانگتا ہے، نہ نذرانہ، نہ بخشش، پھر کاہن کا لقب اس پر کیسے چسپاں ہوسکتا ہے، کاہن محض ایک جزئی اور نامکمل بات غیب کی سو جھوٹ ملا کر بیان کرتا ہے اوراس کے بتلانے میں بھی اس قدر بخیل ہے کہ بدون مٹھائی یا نذرانہ وغیرہ وصول کئے ایک حرف زبان سے نہیں نکالتا، پیغمبروں کی سیرت سے کاہنوں کی پوزیشن کو کیا نسبت۔

فائدہ: ۴ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ: بھلا شیطان ایسی نیکی اور پرہیز گاری کی باتیں کیوں سکھلانے لگا جس میں سراسر بنی آدم کا فائدہ اور خود اس ملعون کی تقبیح و مذمت ہو۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾

پھر تم کدھر چلے جارہے ہو ۱ یہ تو ایک نصیحت ہے جہان بھر کے واسطے ۲ جو کوئی چاہے تم میں سے کہ سیدھا چلے ۳

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾ ع

اور تم جبھی چاہو کہ چاہے اللہ سارے جہان کا مالک ۴

خلاصہ تفسیر: (جب یہ بات ثابت ہے) تو تم لوگ (اس بارہ میں) کدھر کو چلے جارہے ہو (کہ نبوت کے منکر ہو رہے ہو) بس یہ تو (بالعموم) دنیا جہاں والوں کے لئے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے (اور خاص طور پر) ایسے شخص کے لئے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے (عام لوگوں کے لئے ہدایت اس معنی سے ہے کہ ان کو سیدھا راستہ بتلا دیا اور مؤمنین متقین کے لئے اس معنی سے کہ ان کو منزل مقصود پر پہنچا دیا) اور (بعض لوگوں کے نصیحت قبول نہ کرنے سے قرآن کے نصیحت نامہ ہونے میں شبہ نہ کیا جائے کیونکہ) تم بدون خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے ہو (یعنی قرآن فی نفسہ تو

نصیحت ہے، لیکن اس کی تاثیر مشیت پر موقوف ہے جو بعض لوگوں کے لئے متعلق ہوتی ہے اور بعض کے لئے کسی حکمت سے متعلق نہیں ہوتی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جب جھوٹ، دیوانگی، تخیل وتوہم اور کہانت وغیرہ کے سب احتمالات مرفوع ہوئے تو بجز صدق وحق کے اور کیا باقی رہا، پھر اس روشن اور صاف راستہ کو چھوڑ کر کدھر بہکے جا رہے ہو۔

فائدہ: ۲ قرآن کی نسبت جو احتمالات تم پیدا کرتے ہو، سب غلط ہیں، اگر اس کے مضامین وہدایات میں غور کرو تو اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ یہ سارے جہان کے لئے ایک سچا نصیحت نامہ اور مکمل دستور العمل ہے جس سے ان کی دارین کی فلاح وابستہ ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی بالخصوص ان کے لئے نصیحت ہے جو سیدھا چلنا چاہیں، عناد اور کج روی اختیار نہ کریں، کیونکہ ایسے ہی لوگ اس نصیحت سے منتفع ہوں گے۔

فائدہ: ۴ یعنی فی نفسہٖ قرآن نصیحت ہے لیکن اس کی تاثیر مشیت الٰہی پر موقوف ہے جو بعض لوگوں کے لئے متعلق ہوتی ہے اور بعض کے لئے کسی حکمت سے ان کے سوءِ استعداد کی بناء پر متعلق نہیں ہوتی۔

ایاتها ۱۹ ۸۲ سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّةٌ ۸۲ رکوعها ۱

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں بھی پچھلی سورتوں کی طرح قیامت اور جزا وسزا کا بیان ہے اور درمیان میں غفلت پر دھمکی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿۲﴾ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿۳﴾

جب آسمان چر جائے، اور جب تارے جھڑ پڑیں، اور جب دریا ابل نکلیں ۱

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ﴿۵﴾

اور جب قبریں زیر وزبر کر دی جائیں ۲ جان لے کر ہر ایک جی جو کچھ کہ آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا ۳

خلاصہ تفسیر: جب آسمان پھٹ جائے گا، اور جب ستارے (ٹوٹ کر) جھڑ پڑیں گے، اور جب سب دریا (میٹھے اور نمکین) بہہ پڑیں گے (اور بہہ کر ایک ہو جائیں گے جیسے گذشتہ سورت میں سُجِّرت کی تفسیر میں بیان ہوا ہے یہ تینوں واقعات تو پہلی دفعہ صور پھونکنے کے ہیں، آگے دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے بعد کا واقعہ ہے یعنی) اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی (یعنی ان میں سے مردے نکل کھڑے ہوں گے اس وقت) ہر شخص اپنے اگلے اور پچھلے اعمال کو جان لے گا (اور ان واقعات کا تقاضہ اور مطالبہ یہ تھا کہ انسان خواب غفلت سے بیدار ہوتا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سمندر کا پانی زمین پر زور کرے، آخر میٹھے اور کھاری سب پانی مل جائیں۔

فائدہ: ۲ یعنی جو چیز زمین کی تہ میں تھی اوپر آجائے، اور مردے قبروں سے نکالے جائیں۔

فائدہ: ۳ یعنی جو بھلے برے کام کئے یا نہیں کئے شروع عمر میں کئے یا اخیر میں، ان کا اثر اپنے پیچھے چھوڑا یا نہیں چھوڑا، سب اس وقت سامنے آجائیں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِيۡمِ ۙ۝۶ الَّذِيۡ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ۝۷

اے آدمی! کس چیز سے بہکا تو اپنے رب کریم پر۱ جس نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو ٹھیک کیا پھر تجھ کو برابر کیا۲

فِيۡۤ اَيِّ صُوۡرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ۝۸

جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۳

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ آگے غفلت پر زجر وتنبیہ ہے کہ) اے انسان! تجھ کو کس چیز نے تیرے ایسے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو (انسان) بنایا پھر تیرے اعضا کو درست کیا پھر تجھ کو (مناسب) اعتدال پر بنایا (یعنی اعضا میں تناسب رکھا اور) جس صورت میں چاہا تجھ کو ترکیب دے دیا (یعنی پیدا کرنا، انسان بنانا اور اعضاء میں اعتدال رکھنا تو سب انسانوں میں مشترک ہے، اس کے بعد پھر ہر ایک کی صورت الگ الگ ایسے امتیازات پیدا فرما دیے جو ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں ہوتے، صاف اور نمایاں امتیاز رہتا ہے)۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الۡكَرِيۡمِ: اس آیت سے پہلے گذشتہ آیات میں انسان کے انجام یعنی آخرت کا ذکر تھا اور اس کے بعد یہاں انسان کی ابتداء یعنی تخلیق کے ابتدائی مراحل کا ذکر ہے، اس مجموعہ میں اس طرف اشارہ ہے کہ غفلت سے روکنے والی دونوں حالتیں موجود ہیں، پھر بھی انسان غفلت سے باز نہیں آتا، اس جگہ ''رب'' کی صفت ''کریم'' ذکر کر کے اس کے جواب کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ انسان کے بھول اور دھوکہ میں پڑنے کا سبب حق تعالیٰ کا کریم ہونا ہے کہ وہ اپنے لطف وکرم سے انسان کے گناہ پر فوراً سزا نہیں دیتا، بلکہ اس کے رزق اور عافیت اور دنیوی آسائش میں بھی کوئی کمی نہیں کرتا، یہ لطف وکرم اس کے غرور اور دھوکے کا سبب بن گیا، حالانکہ ذرا عقل سے کام لیتا تو یہ لطف وکرم غرور وغفلت کا سبب بننے کے بجائے اور زیادہ اپنے رب کریم کے احسانات کا ممنون ہو کر اطاعت میں لگ جانے کا سبب ہونا چاہئے تھا، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ: ''کم من مغرور تحت الستر وھو لا یشعر'' یعنی کتنے ہی انسان ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے عیبوں اور گناہوں پر پردہ ڈال ہوا ہے ان کو رسوا نہیں کیا، وہ اس لطف وکرم سے اور زیادہ غرور اور دھوکے میں مبتلا ہو گئے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وہ رب کریم کیا اس کا حقدار تھا کہ تو اپنے جہل وحماقت سے اس کے حلم پر مغرور ہو کر نافرمانیاں کرتا رہے؟ اور اس کے لطف وکرم کا جواب کفران وطغیان سے دے؟ اس کا کرم دیکھ کر تو اور زیادہ شرمانا اور حلیم کے غصہ سے بہت زیادہ ڈرنا چاہیے تھا، بیشک وہ کریم ہے لیکن منتقم اور حکیم بھی ہے، پھر یہ غرور اور دھوکا نہیں تو اور کیا ہوگا کہ اس کی ایک صفت کو لے کر دوسری صفات سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔

فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''ٹھیک کیا بدن میں، برابر کیا خصلت میں'' یا یہ مطلب ہے کہ تیرے اعضاء کے جوڑ بند درست کئے اور حکمت کے موافق ان میں تناسب رکھا، پھر مزاج واخلاط میں اعتدال پیدا کیا۔

فائدہ: ۳ یعنی سب کی صورتوں میں تھوڑا بہت تفاوت رکھا، ہر ایک کو الگ صورت شکل اور رنگ روپ عنایت کیا اور بحیثیت مجموعی انسان کی صورت کو تمام جانداروں کی صورت سے بہتر بنایا، بعض سلف اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ وہ چاہتا تو تجھے گدھے، کتے، خنزیر کی شکل وصورت میں ڈال دیتا، باوجود اس قدرت کے محض اپنے فضل اور مشیت سے انسانی صورت میں رکھا، بہر حال جس خدا کی یہ قدرت ہو اور ایسے انعامات ہوں، کیا اس کے ساتھ آدمی کو یہ ہی معاملہ کرنا چاہئے۔

كَلَّا بَلۡ تُكَذِّبُوۡنَ بِالدِّيۡنِ ۙ۝۹ وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ ۙ۝۱۰ كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ ۙ۝۱۱

ہرگز نہیں پر تم جھوٹ جانتے ہو انصاف کا ہونا۱ اور تم پر نگہبان مقرر ہیں، عزت والے عمل لکھنے والے

يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ⑫

جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو ۲

خلاصہ تفسیر: (بہرحال مذکورہ سب باتوں کا تقاضہ یہ ہے کہ تم کو) ہرگز (مغرور) نہیں (ہونا چاہئے مگر تم فریب خوردگی سے باز نہیں آتے) بلکہ (دھوکہ وفریب میں اس درجہ بڑھ گئے ہو کہ) تم (خود) جزا وسزا (ہی) کو (جس سے یہ غرور اور فریب دور ہوسکتا تھا) جھٹلاتے ہو، اور (تمہارا یہ جھٹلانا خالی نہ جائے گا بلکہ ہماری طرف سے) تم پر (تمہارے سب اعمال کے) یاد رکھنے والے (جو ہمارے نزدیک) معزز (اور تمہارے اعمال کے) لکھنے والے (ہیں) مقرر ہیں جو تمہارے سب افعال کو جانتے ہیں (اور لکھتے ہیں پس قیامت میں یہ سب اعمال پیش ہوں گے جن میں تمہارا یہ جھٹلانا اور کفر بھی داخل ہے اور سب پر مناسب جزا ملے گی)۔

یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ: یعنی وہ فرشتے تمہارے سب افعال کو جانتے ہیں، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں کو بھی جانتے ہیں، کیونکہ آیت میں ما تفعلون اس کو بھی عام اور شامل ہے، مگر ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض نیک کام جو دل سے ہوتے ہیں کراما کاتبین سے بھی مخفی رہتے ہیں، حق تعالیٰ ہی کو اس کا علم ہے، چنانچہ حصن حصین کے حواشی میں مرقاۃ کے حوالے سے حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ ذکر خفی جس کو اعمال لکھنے والے فرشتے بھی نہیں جانتے ستر درجہ فضیلت میں زیادہ ہے، مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ فرشتوں کو دل کے افعال کی مطلقاً خبر نہیں ہوتی، کیونکہ احادیث میں تصریح ہے کہ نیک کام کے ارادہ پر ثواب لکھا جاتا ہے، اب یہ تفصیل باقی رہی کہ کس قسم کے کاموں کی فرشتوں کو اطلاع ہوتی ہے اور کس قسم کے کاموں کی نہیں ہوتی، سو یہ بات میری نظر سے نہیں گزری، اور یہ سب تقریر اس حدیث کے صحیح ہونے کی صورت پر ہے ورنہ استثناء کی ضرورت نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بہکنے اور دھوکا کھانے کی اور کوئی وجہ نہیں، بات یہ ہے کہ تم انصاف کے دن پر یقین نہیں رکھتے ہو کہ جو چاہیں کرتے رہیں، آگے کوئی حساب اور باز پرس نہیں، یہاں جو کچھ عمل ہم کرتے ہیں کون ان کو لکھتا اور محفوظ کرتا ہوگا، جس کی تفصیل آگے بیان کی۔

فائدہ: ۲ جو نہ خیانت کرتے ہیں نہ کوئی عمل لکھے بغیر چھوڑتے ہیں، نہ ان سے تمہارے اعمال پوشیدہ ہیں جب سب عمل ایک ایک کرکے اس اہتمام سے لکھے جارہے ہیں تو کیا یہ سب دفتر یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں، یقیناً ہر شخص کے اعمال اس کے آگے آئیں گے اور اس کا اچھا برا پھل چکھنا پڑے گا جس کی تفصیل آگے بیان کی:

اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِىۡ نَعِيۡمٍ ⑬ وَاِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِىۡ جَحِيۡمٍ ⑭ يَّصۡلَوۡنَهَا يَوۡمَ الدِّيۡنِ ⑮

بیشک نیک لوگ بہشت میں ہیں ۱ اور بیشک گناہ گار دوزخ میں ہیں، ڈالے جائیں گے اس میں انصاف کے دن

وَمَا هُمۡ عَنۡهَا بِغَآئِبِيۡنَ ⑯

اور نہ ہوں گے اس سے جدا ہونے والے ۲

خلاصہ تفسیر: (پیچھے بدلہ ملنے کا ذکر تھا اب آگے اس کی تفصیل ہے کہ) نیک لوگ بیشک آسائش میں ہوں گے، اور بدکار (یعنی کافر) لوگ بیشک دوزخ میں ہوں گے، روز جزا کو اس میں داخل ہوں گے اور (پھر داخل ہوکر) اس سے باہر نہ ہوں گے (بلکہ اس میں ہمیشہ رہنا ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱ جہاں ہمیشہ کے لئے ہر قسم کی نعمتوں اور راحتوں میں رہنا ہوگا، اگر نکلنے کا کھٹکا رہتا تو راحت ہی کیا ہوتی۔

فائدہ: ٢ یعنی نہ بھاگ کر اس سے الگ رہ سکتے ہیں، نہ داخل ہونے کے بعد کبھی نکل کر جا سکتے ہیں، ہمیشہ وہیں رہنا ہے۔

وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ ﴿۱۸﴾

اور تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے دن انصاف کا، پھر بھی تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے دن انصاف کا

يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ؕ وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ ع

جس دن کہ بھلا نہ کر سکے کوئی جی کسی جی کا کچھ بھی ١ اور حکم اس دن اللہ ہی کا ہے ٢

خلاصہ تفسیر: اور آپ کو کچھ خبر ہے کہ روز جزا کیسا ہے؟ (اور ہم) پھر (دوبارہ کہتے ہیں کہ) آپ کو کچھ خبر ہے کہ وہ روز جزا کیسا ہے؟ (بار بار سوال کرنے سے مقصود اس دن کی ہیبت اور ہولنا کی ظاہر کرنا ہے، آگے جواب ہے کہ:) وہ ایسا دن ہے جس میں کسی شخص کا کسی شخص کے نفع کے لئے کچھ بس نہ چلے گا اور تمام تر حکومت اس روز اللہ ہی کی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی کتنا ہی سوچو اور غور کرو، پھر بھی اس ہولناک دن کی پوری کیفیت سمجھ میں نہیں آسکتی، بس مختصراً اتنا سمجھ لو کہ اس دن جتنے رشتے ناطے خویشی اور آشنائی کے ہیں سب نیست و نابود ہو جائیں گے، سب نفسی نفسی پکارتے ہوں گے، کوئی شخص بدون حکم مالک الملک کے کسی کی سفارش نہ کر سکے گا، عاجزی، چاپلوسی اور صبر و استقلال کچھ کام نہ دیگا: الا من رحم اللہ۔

فائدہ: ٢ یعنی دنیا میں جس طرح بادشاہ کا حکم رعیت پر، ماں باپ کا اولاد پر، اور آقا کا نوکر پر جاری ہوتا ہے اس دن یہ سب حکم ختم ہو جائیں گے اور اس شہنشاہ مطلق کے سوا کسی کو دم مارنے کی قدرت نہ ہوگی، تنہا بلا شرکت غیرے ظاہراً و باطناً اسی کا حکم چلے گا، اور سارے کام حساً و معناً اکیلے اسی کے قبضہ میں ہوں گے۔

ایاتها ٣٦ ۔ ٨٣ سُوۡرَةُ الۡمُطَفِّفِيۡنَ مَكِّيَّةٌ ٨٦ ۔ رکوعها ١

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورتوں کی طرح اس سورت میں بھی اعمال کی جزا و سزا کا بیان ہے، اور چونکہ یہ مقام عدل کا بیان ہے اس مناسبت سے بعض ان اعمال پر جو کہ حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں اور عدل کے خلاف ہیں جیسے ناپ تول میں کمی کرنا، اس پر خصوصیت کے ساتھ وعید مذکور ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِيۡنَ ﴿۱﴾ الَّذِيۡنَ اِذَا اكۡتَالُوۡا عَلَى النَّاسِ يَسۡتَوۡفُوۡنَ ﴿۲﴾

خرابی ہے گھٹانے والوں کی، وہ لوگ کہ جب ناپ کر لیں لوگوں سے تو پورا بھر لیں

وَاِذَا كَالُوۡهُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡهُمۡ يُخۡسِرُوۡنَ ﴿۳﴾

اور جب ناپ کر دیں ان کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں ١

خلاصہ تفسیر: بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے (اپنا حق) ناپ کر لیں تو پورا لے لیں، اور

جب ان کوناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ: لوگوں سے اپنا حق پورا لینا اگرچہ برا نہیں ہے مگر یہاں اس کے بیان کرنے سے خود اس کی مذمت کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ کم دینے کی مذمت تاکید کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہے، مطلب یہ ہے کہ کم دینا اگرچہ فی نفسہ برا ہے، لیکن اس کے ساتھ اگر دوسروں کو ذرا بھی رعایت نہ کی جائے تو یہ بہت زیادہ برا ہے، بخلاف اس شخص کے جو دوسروں کے ساتھ رعایت بھی کرتا ہے کہ اس میں اگر ایک عیب ہے تو ایک ہنر بھی ہے، اس لیے پہلے شخص کا عیب بہت سخت ہے۔

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ: چونکہ اصل مقصود کم دینے کی مذمت ہے اس لئے اس میں ناپ اور تول دونوں کا ذکر کیا تاکہ خوب تصریح ہو جائے کہ ناپنے میں بھی کم دیتے اور تولنے میں بھی کم دیتے ہیں، اور چونکہ پورا لینا فی نفسہ مذمت کا مدار نہیں اس لئے وہاں ناپ اور تول دونوں کا ذکر نہیں، بلکہ ایک ہی کا ذکر کیا، پھر دونوں جگہ کیل یعنی ناپ کا ذکر بطور خاص شاید اس لئے ہو کہ عرب میں کیل کا زیادہ دستور تھا خصوصاً اگر آیت مدنی ہو جیسا کہ روح المعانی میں اس کا نزول اہل مدینہ کے بارے میں لکھا ہے تو اس وقت کیل کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ زیادہ ظاہر ہے، کیونکہ مدینہ میں کیل کا دستور مکہ سے بھی زیادہ تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ گو لوگوں سے اپنا حق پورا لینا مذموم نہیں مگر یہاں اس کے لانے سے مقصود خود اس بات پر مذمت کرنا نہیں، بلکہ کم دینے کی مذمت کو مؤکد کرنا ہے، یعنی کم دینا اگرچہ فی نفسہ مذموم ہے، لیکن اس کے ساتھ اگر لیتے وقت دوسروں کی بالکل رعایت نہ کی جائے تو اور زیادہ مذموم ہے، بخلاف رعایت کرنے والے کے کہ اگر اس میں ایک عیب ہے تو ایک ہنر بھی ہے فتلك بتلك، لہذا پہلے شخص کا عیب زیادہ شدید ہوا، اور چونکہ اصل مقصود مذمت ہے کم دینے کی، اس لئے اس میں ناپ اور تول دونوں کا ذکر کیا جائے تاکہ خوب تصریح ہو جائے کہ ناپنے میں بھی کم ناپتے ہیں اور تولنے میں بھی کم تولتے ہیں اور چونکہ پورا لینا فی مذموم نہیں اس لئے وہاں صرف ایک کے ذکر پر اکتفاء کیا پھر تخصیص ناپ کی شاید اس لئے ہو کہ عرب میں اور خصوصاً مدینہ میں زیادہ رواج کیل کا تھا، اس کے سوا اور بھی وجوہ تخصیص کی ہو سکتی ہے۔

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ﴿۴﴾ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵﴾ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ﴿۶﴾

کیا خیال نہیں رکھتے وہ لوگ کہ ان کو اٹھنا ہے، اس بڑے دن کے واسطے ۱؎ جس دن کھڑے رہیں لوگ راہ دیکھتے جہان کے مالک کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو ڈرایا گیا ہے کہ) کیا ان لوگوں کو اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جس دن تمام آدمی رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے (یعنی اس روز سے ڈرنا چاہئے اور تطفیف یعنی لوگوں کی حق تلفی سے توبہ کرنی چاہئے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگر انہیں خیال ہوتا کہ مرنے کے بعد ایک دن پھر اٹھنا اور اللہ کے سامنے تمام حقوق و فرائض کا حساب دینا ہے، تو ہرگز ایسی حرکت نہ کرتے۔

فائدہ: ۲؎ کہ کب تجلی فرماتا اور کب حساب کتاب کر کے ہمارے حق میں کوئی فیصلہ سناتا ہے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ؕ﴿۷﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴿۸﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ؕ﴿۹﴾

ہرگز نہیں ۱؎ بیشک اعمال نامہ گناہ گاروں کا سجین میں ہے، اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجین، ایک دفتر ہے لکھا ہوا ۲؎

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیات میں بعث و جزا کو سن کر جو مومن تھے وہ ڈر گئے اور جو کافر تھے وہ انکار کرنے لگے، اس لئے آگے

انکار پر تنبیہ فرما کر فریقین کی جزاء کی تفصیل فرماتے ہیں کہ جیسا کفار لوگ جزا و سزا کے منکر ہیں) ہرگز (ایسا) نہیں (بلکہ جزا و سزا ضرور واقع ہوگی، اور جن اعمال پر جزا و سزا ہوگی وہ سب بھی محفوظ اور منضبط ہیں اور اس مجموعہ کا بیان یہ ہے کہ) بدکار (یعنی کافر) لوگوں کا نامہ عمل سجین میں رہے گا (وہ ایک مقام ہے ساتویں زمین میں جہاں کفار کی روحیں رہتی ہیں، اور کفار کے نامہ اعمال کا اس مقام پر رہنا مجاہد و عبداللہ بن عمرو سے بھی منقول ہے، آگے ڈرانے کے لئے سوال ہے کہ) اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ سجین میں رکھا ہوا نامہ عمل کیا چیز ہے؟ وہ ایک نشان کیا ہوا دفتر ہے (نشان سے مراد مہر ہے جیسا کہ درمنثور میں کعب احبار سے مروی ہے: "فیختم و یوضع أی بعد الموت" پس مقصود یہ ہوگا کہ اس میں تغیر و تبدل کا کچھ احتمال نہیں، حاصل یہ کہ سب اعمال محفوظ اور منضبط ہیں جس سے جزا و سزا کا انصاف کے ساتھ ہونا ثابت ہوا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہرگز گمان نہ کیا جائے کہ ایسا دن نہیں آئے گا، وہ ضرور آنا ہے اور اس کے لئے سب نیکوں اور بدوں کے اعمالنامے اپنے اپنے دفتر میں مرتب کئے رکھے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی سجین ایک دفتر ہے جس میں نام ہر ایک دوزخی کا درج ہے، اور بندوں کے عمل لکھنے والے فرشتے، جن کا ذکر اس سے پہلی سورت میں آچکا، ان بدکاروں کے مرنے اور عمل منقطع ہونے کے بعد ہر شخص کے عمل علیحدہ علیحدہ فردوں میں لکھ کر اس دفتر میں داخل کرتے ہیں اور اس فرد پر یا ہر ایک دوزخی کے نام پر ایک علامت بنا دیتے ہیں جس کے دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ شخص دوزخی ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی ارواح بھی اسی مقام میں رکھی جاتی ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "یعنی ان کے نام وہاں داخل ہوتے ہیں، مر کر وہیں پہنچیں گے"، بعض سلف نے کہا ہے کہ یہ مقام ساتویں زمین کے نیچے ہے، واللہ اعلم۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٠﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿١١﴾ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ

خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی، جو جھوٹ جانتے ہیں انصاف کے دن کو، اور اس کو جھٹلاتا ہے وہی جو بڑھ نکلنے والا

اَثِيْمٍ ﴿١٢﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾

گناہ گار ہے ۱ جب سنائے اس کو ہماری آیتیں کہے نقلیں ہیں پہلوں کی ۲

خلاصہ تفسیر: (اب آگے ان اعمال کی جزاء کا بیان ہے کہ) اس روز (یعنی قیامت کے روز) جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہوگی، جو کہ روز جزاء کو جھٹلاتے ہیں، اور اس (یوم جزا) کو تو وہی شخص جھٹلاتا ہے جو حد (بندگی) سے گزرنے والا ہو مجرم ہو (اور) جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جائیں تو یوں کہہ دیتا ہو کہ یہ بے سند باتیں اگلوں سے منقول چلی آتی ہیں (مطلب یہ بتلانا ہے کہ جو شخص روز قیامت کو جھٹلاتا ہے وہ بندگی کی حد سے گزرنے والا، مجرم اور قرآن کو جھٹلانے والا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ جو شخص روز جزا کا منکر ہے فی الحقیقت اللہ کی ربوبیت، اس کی قدرت اور اس کے عدل و حکمت سب کا منکر ہے اور جو ان چیزوں کا منکر ہو وہ جس قدر گناہوں پر دلیر ہو تھوڑا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی قرآن اور نصیحت کی باتیں سن کر کہتا ہے ایسی باتیں، لوگ پہلے بھی کرتے آئے ہیں، وہی پرانی کہانیاں اور فرسودہ افسانے انہوں نے نقل کر دیے، بھلا ہم ان نقلوں اور کہانیوں سے ڈرنے والے کہاں ہیں۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ؕ

کوئی نہیں پر زنگ پکڑ گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے ۱؎ کوئی نہیں وہ اپنے رب سے اس دن روک دیے جائیں گے ۲؎

ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۱۶﴾ؕ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾ؕ

پھر مقرر وہ گرنے والے ہیں دوزخ میں، پھر کہا جائے گا یہ وہی ہے جس کو تم جھوٹ جانتے تھے

خلاصہ تفسیر: (آگے روز قیامت کے جھٹلانے پر تنبیہ کی گئی ہے کہ جیسا یہ لوگ اس کو غلط سمجھ رہے ہیں) ہرگز ایسا نہیں (بلکہ وہ ضرور واقع ہوگی، اور کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ لوگ جو قیامت کے منکر ہیں تو شاید ان کے پاس کوئی دلیل ہوگی جس سے یہ استدلال کرتے ہوں گے، ہرگز نہیں) بلکہ (جھٹلانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان کے اعمال بد کا زنگ بیٹھ گیا ہے (جس سے حق بات قبول کرنے کی استعداد خراب ہوگئی اس لئے محض عناد کی وجہ سے انکار کرنے لگے، آگے پھر اس انکار پر دھمکی ہے کہ جیسا یہ لوگ سمجھ رہے ہیں) ہرگز ایسا نہیں (آگے ویل یعنی خرابی کی کچھ تفصیل ہے کہ وہ خرابی یہ ہے کہ) یہ لوگ اس روز (ایک تو) اپنے رب (کا دیدار دیکھنے) سے روک دیئے جائیں گے، پھر (صرف اسی پر اکتفا نہ ہوگا بلکہ) یہ دوزخ میں داخل ہوں گے، پھر (ان سے) کہا جائے گا کہ یہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہماری آیتوں میں کچھ شک وشبہ کا موقع نہیں، اصل یہ ہے کہ گناہوں کی کثرت ومزاولت سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گئے ہیں، اس لئے حقائق صحیحہ کا انعکاس ان میں نہیں ہوتا، حدیث میں فرمایا کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے ایک سیاہ نقطہ اس کے دل پر لگ جاتا ہے، اگر توبہ کرلی تو مٹ گیا، ورنہ جوں جوں گناہ کرتا جائے گا وہ نقطہ بڑھتا اور پھیلتا رہے گا، تا آنکہ قلب بالکل کالا سیاہ ہوجائے کہ حق وباطل کی تمیز باقی نہ رہے، یہی حال ان مکذبین کا سمجھو کہ شرارتیں کرتے کرتے ان کے دل بالکل مسخ ہوچکے ہیں، اسی لئے آیات اللہ کا مذاق اڑاتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس انکار وتکذیب کے انجام سے بےفکر نہ ہوں، وہ وقت ضرور آنے والا ہے جب مومنین حق سبحانہ وتعالیٰ کے دیدار کی دولت سے مشرف ہوں گے اور یہ بدبخت محروم رکھے جائیں گے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ؕ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ؕ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ۙ

ہرگز نہیں ۱؎ بیشک اعمال نامہ نیکوں کا علیین میں ہے، اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے علیین، ایک دفتر ہے لکھا ہوا ۲؎

يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ؕ

اس کو دیکھتے ہیں نزدیک والے یعنی فرشتے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (چونکہ یہ لوگ یوم دین کو جھٹلانے میں جس طرح اپنی سزا کو جھٹلاتے تھے اسی طرح مومنین کی جزا کو بھی جھٹلاتے تھے، چنانچہ آگے اس پر تنبیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو مومنین کے اجر وثواب کے منکر ہیں) ہرگز ایسا نہیں (بلکہ ان کا اجر وثواب ضرور ہونے والا ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) نیک لوگوں کا نامہ عمل علیین میں رہے گا (یہ ایک مقام ساتویں آسمان میں ہے جو مؤمنین کی ارواح کا مستقر ہے) اور (آگے عظمت اور اہمیت کے لئے سوال ہے کہ) آپ کو کچھ معلوم ہے کہ علیین میں رکھا ہوا نامہ عمل کیا چیز ہے؟ وہ ایک نشان کیا ہوا دفتر ہے جس کو مقرب فرشتے (شوق سے) دیکھتے ہیں (اور یہ مؤمن کے لیے بڑی عزت کی بات ہے)۔

روح المعانی میں حضرت کعب سے روایت ہے کہ جب ملائکہ مومن کی روح کو قبض کر کے لے جاتے ہیں تو ہر آسمان کے مقرب فرشتے اس کے ساتھ ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں آسمان تک پہنچ کر اس روح کو رکھ دیتے ہیں، پھر فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ہم اس کا نامہ اعمال دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ نامہ عمل کھول کر ان کو دکھلایا جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان بدمعاشوں کا اور نیکوں کا ایک انجام ہرگز نہیں ہوسکتا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جنتیوں کے نام درج ہیں اور ان کے اعمال کی مسلیں مرتب کر کے رکھی جاتی ہیں اور ان کی ارواح کو اول وہاں لے جا کر پھر اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچایا جاتا ہے اور قبر سے بھی ان ارواح کا ایک گونہ تعلق قائم رکھا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ یہ مقام ساتویں آسمان کے اوپر ہے اور مقربین کی ارواح اسی جگہ مقیم رہتی ہیں، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ مقرب فرشتے یا اللہ کے مقرب بندے خوش ہو کر مومنین کے اعمال نامے دیکھتے ہیں اور اس مقام پر حاضر رہتے ہیں۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ﴿٢٤﴾

بیشک نیک لوگ ہیں آرام میں، تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے ۱؎ پہچان لے تو ان کے منہ پر تازگی آرام کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے مؤمنین کی جزاء آخرت کا بیان ہے کہ) نیک لوگ بڑی آسائش میں ہوں گے، مسہریوں پر (بیٹھے بہشت کے عجائب) دیکھتے ہوں گے، اے مخاطب! تو ان کے چہروں میں آسائش کی بشاشت پہچانے گا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مسہریوں میں بیٹھے جنت کی سیر کرتے ہوں گے اور دیدار الٰہی سے آنکھیں شاد کریں گے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جنت کے عیش و آرام سے ان کے چہرے ایسے پر رونق اور تروتازہ ہوں گے کہ ہر ایک دیکھنے والا دیکھتے ہی پہچان جائے کہ یہ لوگ نہایت عیش و تنعم میں ہیں۔

يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴿٢٦﴾

ان کو پلائی جاتی ہے شراب خالص مہر لگی ہوئی ۱؎ جس کی مہر جمتی ہے مشک پر ۲؎ اور اس پر چاہیے کہ ڈھکیں ڈھکنے والے ۳؎

وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾

اور اس کی ملونی ہے تسنیم سے، وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں نزدیک والے ۴؎

خلاصہ تفسیر: (اور) ان (جنتیوں) کو پینے کے لیے شراب خالص سر بمہر جس پر مشک کی مہر ہوگی ملے گی اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہئے (کہ حرص کے لائق یہی ہے خواہ صرف شراب مراد لی جائے خواہ جنت کی سب نعمتیں، یعنی شوق و رغبت کی چیز یہ نعمتیں ہیں، نہ کہ دنیا کی ناقص اور فانی لذتیں اور ان کے حاصل کرنے کا طریق نیک اعمال ہیں، پس اس میں کوشش کرنی چاہئے) اور اس (شراب) کی آمیزش تسنیم (کے پانی سے) ہوگی (عرب عموماً شراب میں پانی ملا کر پیتے تھے تو اس شراب کی آمیزش کے لئے تسنیم کا پانی ہوگا، آگے تسنیم کی شرح ہے) یعنی ایک ایسا چشمہ جس سے مقرب لوگ پانی پئیں گے۔

خِتَامُهُ مِسْكٌ: یہ مہر لگنا اکرام و تعظیم کی علامت ہے، ورنہ وہاں ایسی حفاظت کی ضرورت نہیں، اور مشک کی مہر کا مطلب یہ ہے کہ جیسے قاعدہ ہے کہ لاکھ وغیرہ لگا کر اس پر مہر کرتے ہیں اور ایسی چیز کو "طین ختام" کہتے ہیں، وہاں شراب کے برتن کے منہ پر مشک لگا کر اس پر مہر کر دی جائے گی۔

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ: مطلب یہ کہ سابقین یعنی مقربین کو تو خالص پینے کے لیے تسنیم کا پانی ملے گا اور اصحاب الیمین یعنی ابرار کو اس کا پانی دوسری شراب میں ملا کر ملے گا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ: حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ: ''شراب کی نہریں ہیں ہر کسی کے گھر میں، لیکن یہ شراب نادر ہے جو سر بمہر رہتی ہے''۔

فائدہ: ۲؎ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ: جیسے دنیا میں مہر لاکھ یا مٹی پر جمائی جاتی، وہاں کی مٹی مشک ہے اسی پر جمائی جائے گی، شیشہ ہاتھ میں لیتے ہی دماغ معطر ہو جائے گا اور اخیر تک خوشبو مہکتی رہے گی۔

فائدہ: ۳؎ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ: یعنی دنیا کی ناپاک شراب اس لائق نہیں کہ بھلے آدمی اس کی طرف رغبت کریں، ہاں! یہ شراب طہور ہے جس کے لئے لوگوں کو ٹوٹ پڑنا چاہیے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش ہونی چاہئے۔

فائدہ: ۴؎ يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ: یعنی مقرب لوگ اس چشمہ کی شراب خالص پیتے ہیں اور ابرار کو اس شراب کی ملونی دی جاتی ہے جو بطور گلاب وغیرہ کے ان کی شراب میں ملاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾

وہ لوگ جو گناہ گار تھے ایمان والوں سے ہنسا کرتے ۱؎ اور جب ہو کر نکلتے ان کے پاس کو تو آپس میں آنکھ مارتے ۲؎

وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾

اور جب پھر کر جاتے اپنے گھر پھر جاتے باتیں بناتے ۳؎ اور جب ان کو دیکھتے کہتے بیشک یہ لوگ بہک رہے ہیں ۴؎

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾

اور ان کو بھیجا نہیں ان پر نگہبان بنا کر ۵؎

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک فریقین مؤمن و کافر کی جزاء آخرت کا الگ الگ بیان تھا، اب آگے دونوں فریقوں کا دنیا و آخرت کا مجموعی حال مذکور ہے یعنی) جو لوگ مجرم (یعنی کافر) تھے وہ ایمان والوں سے (دنیا میں حقارت کے ساتھ) ہنسا کرتے تھے، اور یہ (ایمان والے) جب ان کافروں کے سامنے سے ہو کر گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے (مطلب یہ کہ ان کے ساتھ استہزا و تحقیر سے پیش آتے تھے) اور جب اپنے گھروں کو جاتے تو (وہاں بھی ایمان والوں کا تذکرہ کر کے) دل لگیاں (اور تمسخر) کرتے (مطلب یہ کہ سامنے پیچھے ہر حالت میں ان کی تحقیر و استہزاء کا مشغلہ رہتا، البتہ سامنے اشارے چلا کرتے اور غیبت میں صراحۃً تذکرہ کرتے) اور جب ان کو دیکھتے تو یوں کہا کرتے کہ یہ لوگ یقیناً غلطی پر ہیں (کیونکہ کفار اسلام کو غلطی پر سمجھتے تھے) حالانکہ یہ (کافر) ان (مسلمانوں) پر نگرانی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے (یعنی ان کو اپنی فکر کرنی چاہئے تھی، مسلمانوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے پس ان سے دو غلطیاں ہوئیں: ① اہل حق کے ساتھ استہزاء ② پھر اپنی اصلاح سے بے فکری)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ: کہ ان بیوقوفوں کو کیا خیال فاسد دامن گیر ہوا ہے کہ محسوس و موجود لذتوں کو جنت کی خیالی لذتوں کی توقع پر چھوڑتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ: کہ دیکھو یہ ہی بے عقل اور احمق لوگ ہیں جنہوں نے اپنے کو جنت کے ادھار پر دنیا کے نقد سے محروم کر رکھا ہے۔

فائدہ: ۳ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ: یعنی خوش طبعی کرتے اور مسلمانوں پر پھبتیاں کستے تھے اور اپنے عیش وآرام پر مفتون ومغرور ہو کر سمجھتے کہ ہمارے ہی عقیدے اور خیالات درست ہیں ورنہ یہ نعمتیں ہم کو کیوں ملتیں۔

فائدہ: ۴ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ: کہ خواہ مخواہ زہد وریاضت کر کے اپنی جانیں کھپاتے اور موہوم لذتوں کو موجودہ لذتوں پر ترجیح دیتے ہیں اور لا حاصل مشقتوں کا کمالات حقیقی نام رکھا ہے، کیا کھلی ہوئی گمراہی نہیں کہ سب گھر بار اور عیش وآرام چھوڑ کر ایک شخص کے پیچھے ہو لئے اور اپنے آبائی دین کو بھی ترک کر بیٹھے۔

فائدہ: ۵ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ: یہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کافروں کو ان مسلمانوں پر کچھ نگہبان نہیں بنایا گیا کہ احمق اپنی تباہ کاریوں سے آنکھیں بند کر کے ان کی حرکات کی نگرانی کیا کریں، اپنی اصلاح کی فکر نہ ہو اور سیدھی راہ چلنے والوں کو گمراہ اور احمق بنائیں۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ﴿٣٥﴾

سو آج ایمان والے منکروں سے ہنستے ہیں ۱ تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہیں ۲

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾ ع

اب بدلہ پایا ہے منکروں نے جیسا کچھ یہ کرتے تھے ۳

خلاصہ تفسیر: سو آج (قیامت کے دن) ایمان والے کافروں پر ہنستے ہوں گے، مسہریوں پر (بیٹھے ان کا حال) دیکھ رہے ہوں گے (آگے تقریر ہے اس سزا کی یعنی) واقعی کافروں کو ان کے کئے کا خوب بدلہ ملا۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ: درمنثور میں قتادہؒ سے منقول ہے کہ کچھ دریچے جھروکے ایسے ہوں گے جن سے اہل جنت دوزخیوں کو دیکھ سکیں گے، پس ان کا برا حال دیکھ کر انتقام کے طور پر ان پر ہنسیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی قیامت کے دن مسلمان ان کافروں پر ہنستے ہیں کہ یہ لوگ کیسے کوتاہ اندیش اور احمق تھے جو خسیس اور فانی چیز کو نفیس اور باقی نعمتوں پر ترجیح دی، آخر آج دوزخ میں کس طرح عذاب دائم کا مزہ چکھ رہے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی اپنی خوش حالی اور کافروں کی بدحالی کا نظارہ کر رہے ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی جو دنیا میں مسلمانوں کی ہنسی اڑاتے تھے، آج ان کا حال قابل مضحکہ ہو رہا ہے اور مسلمان ان کی گزشتہ حماقتوں کا خیال کر کے ہنستے ہیں۔

ایاتها ٢٥ | ٨٤ سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ ٨٣ | رکوعها ١

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت کی طرح اس سورت میں بھی جزا وسزا کی تفصیل ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿١﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿٢﴾ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿٣﴾

جب آسمان پھٹ جائے، اور سن لے حکم اپنے رب کا، اور وہ آسمان اسی لائق ہے ۱ اور جب زمین پھیلا دی جائے ۲

وَاَلۡقَتۡ مَا فِيۡهَا وَ تَخَلَّتۡ ۙ﴿۴﴾ وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ ؕ﴿۵﴾

اور نکال ڈالے جو کچھ اس میں ہے اور خالی ہو جائے [3] اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ زمین اسی لائق ہے [4]

خلاصہ تفسیر: جب (دوسری بار صور پھونکنے کے وقت) آسمان پھٹ جائے گا (تا کہ اس میں سے بادل کی شکل کی ایک چیز کا نزول ہو جس میں فرشتے ہوں گے جس کا ذکر و یوم تشقق السماء بالغمام الخ میں گزر چکا ہے) اور اپنے رب کا حکم سن لے گا (یہاں حکم سے تکوینی حکم مراد ہے یعنی آسمان کو جو پھٹنے کا حکم ہوگا تو وہ اس کو مان لے گا، سننے سے مراد حکم ماننا ہے)) اور وہ (آسمان قدرت کا محکوم ہونے کی وجہ سے) اسی لائق ہے (کہ جس امر کی مشیت اس کے متعلق ہو اس کا وقوع ضرور ہو جائے) اور جب زمین کھینچ کر بڑھا دی جائے گی (جس طرح چمڑا یا ربڑ کھینچا جاتا ہے، پس اس وقت کی مقدار سے اُس وقت مقدار زیادہ ہو جائے گی تا کہ سب اولین و آخرین اس میں سما جائیں، پس آسمان کا یہ پھٹنا اور زمین کا بڑھنا دونوں حساب محشر کے مقدمات میں سے ہیں) اور (وہ زمین) اپنے اندر کی چیزوں کو (یعنی مُردوں کو) باہر اگل دے گی اور (سب مردوں سے) خالی ہو جائے گی اور (وہ زمین) اپنے رب کا حکم سن لے گی اور وہ اسی لائق ہے (اس کی تفسیر بھی گذشتہ کی طرح ہے، بس اُس وقت انسان اپنے اعمال کو دیکھے گا)۔

وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ: یہاں آسمان وزمین کی اطاعت اور تعمیل حکم کے دو معنی ہو سکتے ہیں، کیونکہ احکام الٰہیہ دو طرح کے ہوتے ہیں: ① ایک تشریعی احکام جن میں ایک قانون بتلایا جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی کی سزا بتلا دی جاتی ہے مگر کرنے والے کو اس کی کسی جانب پر مجبور محض نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کو ایک درجہ کا اختیار دیا جاتا ہے، وہ اپنے اختیار سے اس قانون کی پابندی کرے یا خلاف ورزی اور ایسے احکام عموماً ان مخلوقات پر عائد ہوتے ہیں جو ذوی العقول کہلاتے ہیں جیسے انسان اور جن، یہیں سے ان میں مؤمن و کافر اور مطیع و نافرمان کی دو قسمیں پیدا ہو جاتی ہیں ② دوسری قسم احکام کی تکوینی اور تقدیری احکام ہیں، ان کی تنفید جبری ہوتی ہے، کسی کی مجال نہیں کہ سرمو ان کے خلاف کر سکے، ان احکام کی تعمیل کل مخلوقات جبراً کرتی ہے، ان میں انسان اور جن بھی داخل ہیں، تکوینی احکام میں ان کے لئے جو کچھ مقدر کر دیا گیا ہے مومن ہو یا کافر، متقی ہو یا فاسق، سب کے سب اسی تقدیر قانون کے تابع چلنے پر مجبور ہیں، اس جگہ یہ ہو سکتا ہے کہ آسمان وزمین کو حق تعالیٰ خاص شعور و ادراک عطا فرما دیں جو مکلفین میں ہوتا ہے اور جب ان کو کوئی حکم حق تعالیٰ کی طرف سے ملا انہوں نے با اختیار خود اس کی تعمیل اور اطاعت کی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس حکم سے مراد حکم تکوینی لیا جائے جس میں کسی کے ارادہ و اختیار کو دخل ہی نہیں ہوتا۔

* * *

فائدہ: [1] وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ: یعنی اللہ کی طرف سے جب پھٹنے کا حکم تکوینی ہوگا، آسمان اسکی تعمیل کرے گا اور وہ مقدور و مقہور ہونے کے لحاظ سے اسی لائق ہے کہ باایں عظمت و رفعت اپنے مالک و خالق کے سامنے گردن ڈال دے اور اسکی فرمانبرداری میں ذرا چون و چرا نہ کرے۔

فائدہ: [2] وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ: محشر کے دن یہ زمین ربڑ کی طرح کھینچ کر پھیلا دی جائے گی اور عمارتیں پہاڑ وغیرہ سب برابر کر دیے جائیں گے تا کہ ایک سطح مستوی پر سب اولین و آخرین بیک وقت کھڑے ہو سکیں اور کوئی حجاب و حائل باقی نہ رہے۔

فائدہ: [3] وَاَلۡقَتۡ مَا فِيۡهَا وَ تَخَلَّتۡ: زمین اس دن اپنے خزانے اور مردوں کے اجزاء اُگال ڈالے گی اور ان تمام چیزوں سے خالی ہو جائے گی جن کا تعلق اعمال عباد کے مجازات سے ہے۔

فائدہ: [4] وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ: زمین و آسمان جس کے حکم تکوینی کے تابع و منقاد ہوں، آدمی کو کیا حق ہے کہ اس کے حکم تشریعی سے سرتابی کرے۔

يٰۤاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدۡحًا فَمُلٰقِيۡهِ ۚ﴿۶﴾ فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيۡنِهٖ ۙ﴿۷﴾

اے آدمی! تجھ کو تکلیف اٹھانی ہے اپنے رب تک پہنچنے میں سہہ سہہ کر، پھر اس سے ملنا ہے [1] سو جس کو ملا اعمال نامہ اس کا داہنے ہاتھ میں

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝٨ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝٩

تو اس سے حساب لیں گے آسان حساب ۲ اور پھر کر آئے گا اپنے لوگوں کے پاس خوش ہو کر ۳

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ ارشاد ہے کہ) اے انسان! تو اپنے رب کے پاس پہنچنے تک (یعنی مرنے کے وقت تک) کام میں کوشش کر رہا ہے (یعنی کوئی نیک کام میں لگا ہوا ہے، کوئی برے کام میں) پھر (قیامت میں) اس (کام کی جزاء) سے جا ملے گا تو (اس روز) جس شخص کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں ملے گا سو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ (اس سے فارغ ہو کر) اپنے متعلقین کے پاس خوش خوش آئے گا۔

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا: آسان کے حساب کے مختلف مراتب ہیں: ایک یہ کہ اصلا اس پر عذاب ہی مرتب نہ ہو، بعض کے لیے تو یہ ہوگا، اور حدیث میں اسی کی تفسیر یہ آئی ہے کہ جس حساب میں مناقشہ نہ ہو صرف پیشی ہو جائے اور یہ ان کے لیے ہوگا جو بلا کسی عذاب کے نجات پائیں گے، دوسرا یہ کہ اس پر عذاب ہمیشہ کا نہ ہو اور یہ عام مؤمنین کے لیے ہوگا، اور مطلق عذاب اس کے منافی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی رب تک پہنچنے سے پہلے ہر آدمی اپنی استعداد کے موافق مختلف قسم کی جدوجہد کرتا ہے کوئی اس کی طاعت میں محنت و مشقت اٹھاتا ہے، کوئی بدی اور نافرمانی میں جان کھپاتا ہے۔ پھر خیر کی جانب میں ہو یا شر کی، طرح طرح کی تکلیفیں سہہ سہہ کر آخر پروردگار سے ملتا اور اپنے اعمال کے نتائج سے دوچار ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲ آسان حساب یہ ہی کہ بات بات پر گرفت نہ ہوگی، محض کاغذات پیش ہو جائیں گے اور بدون بحث و مناقشہ کے ستے چھوڑ دیے جائیں گے۔

فائدہ: ۳ نہ سزا کا خوف رہے گا نہ غصہ کا ڈر، نہایت امن و اطمینان سے اپنے احباب و اقارب اور مسلمان بھائیوں کے پاس خوشیاں مناتا ہوا آئے گا۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝١٠ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝١١ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝١٢

اور جس کو ملا اس کا اعمال نامہ پیٹھ کے پیچھے سے ۱ سو وہ پکارے گا موت موت ۲ اور پڑے گا آگ میں

اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝١٣ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝١٤ بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝١٥

وہ رہا تھا اپنے گھر میں بے غم ۳ اس نے خیال کیا تھا کہ پھر کر نہ جائے گا ۴ کیوں نہیں اس کا رب اس کو دیکھتا تھا ۵

خلاصہ تفسیر: اور جس شخص کا نامہ اعمال (اس کے بائیں ہاتھ میں) اس کی پیٹھ کے پیچھے سے ملے گا (مراد اس سے کفار ہیں) سو وہ موت کو پکارے گا (جیسا کہ مصیبت کے وقت موت کو پکارنے کی عادت ہے) اور جہنم میں داخل ہوگا، یہ شخص (دنیا میں) اپنے متعلقین (اہل و عیال، خدام و حشم) میں خوش خوش رہا کرتا تھا (یہاں تک کہ فرط خوشی میں آخرت کو جھٹلانے لگا تھا جیسا کہ آگے ارشاد ہے کہ) اس نے خیال کر رکھا تھا کہ اس کو (خدا کی طرف) لوٹنا نہیں ہے (آگے اس گمان کا رد ہے کہ لوٹنا) کیوں نہ ہوتا (اب لوٹنے کے بعد جزا کا اثبات ہے کہ) اس کا رب اس کو خوب دیکھتا تھا (اور اس کے اعمال پر جزا دینے کا ارادہ کر چکا تھا، پس جزا و سزا کا ہونا ضروری تھا)۔

مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ: پشت کی طرف سے ملنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ اس کی مشکیں کسی ہوئی ہوں گی تو بایاں ہاتھ بھی

پشت کی طرف ہوگا، دوسری صورت مجاہدؒ کا قول ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ پشت کی طرف نکال دیا جائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ: یعنی پیٹھ کے پیچھے سے بائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا، فرشتے سامنے سے اس کے صورت دیکھنا پسند نہیں کریں گے، گویا غایت کراہیت کا اظہار کیا جائے گا، اور ممکن ہے پیچھے کو مشکیں بندھی ہوں اس لئے اعمال نامہ پشت کی طرف سے دینے کی نوبت آئے۔

فائدہ: ۲؎ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا: یعنی عذاب کے ڈر سے موت مانگے گا۔

فائدہ: ۳؎ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا: یعنی دنیا میں آخرت سے بے فکر تھا، اس کا بدلہ یہ ہے کہ آج سخت غم میں مبتلا ہونا پڑا، اس کے برعکس جو لوگ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی فکر میں گھلے جاتے تھے، ان کو آج بالکل بے فکری اور امن چین ہے، کافر یہاں مسرور تھا، مومن وہاں مسرور ہے۔

فائدہ: ۴؎ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ: اسے کہاں خیال تھا کہ ایک روز خدا کی طرف واپس ہونا اور رتی رتی کا حساب دینا ہے، اسی لئے گناہوں اور شرارتوں پر خوب دلیر رہا۔

فائدہ: ۵؎ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا: یعنی پیدائش سے موت تک برابر دیکھتا تھا کہ اس کی روح کہاں سے آئی، بدن کس کس چیز سے بنا، پھر کیا اعتقاد رکھا، کیا عمل کیا، دل میں کیا بات تھی، زبان سے کیا نکلا، ہاتھ پاؤں سے کیا کمایا، اور موت کے بعد اس کی روح کہاں گئی اور بدن کے اجزاء بکھر کر کہاں کہاں پہنچے، وغیر ذٰلک، جو خدا آدمی کے احوال سے اس قدر واقف ہو اور ہر جزئی وکلی حالت کو نگاہ میں رکھتا ہو، کیا گمان کرسکتے ہو کہ وہ اس کو یوں ہی مہمل اور معطل چھوڑ دے گا؟ ضرورت ہے کہ اس کے اعمال پر ثمرات ونتائج مرتب کرے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝١٦ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝١٧ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝١٨ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝١٩

سو قسم کھاتا ہوں شام کی سرخی کی، اور رات کی اور جو چیزیں اسمیں سمٹ آتی ہیں ۱؎ اور چاند کی جب پورا بھر جائے ۲؎ کہ تم کو چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی ۳؎

خلاصہ تفسیر: آگے تفصیل ہے اس مضمون کی جسے پیچھے اس عنوان سے بیان فرمایا تھا کہ: يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ الخ، اے انسان! تو اپنے رب کے پاس پہنچنے تک کام میں لگا ہوا ہے، پھر قیامت میں اس کی جزا سے جاملے گا، پیچھے جنس انسان کو خطاب تھا، یہاں تمام افراد کو خطاب ہے، پیچھے عمل سے جزاء ملنے کو اجمالاً بیان فرمایا تھا یہاں اس کی تفصیل ہے:

سو (اس بناپر) میں قسم کھا کر کہتا ہوں شفق کی، اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو رات سمیٹ (کر جمع کر) لیتی ہے (مراد وہ سب جاندار ہیں جو رات کو آرام کرنے کے لئے اپنے اپنے ٹھکانے میں آجاتے ہیں) اور چاند کی جب وہ پورا ہوجائے (یعنی بدر بن جائے، ان سب چیزوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں) کہ تم لوگوں کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ: ان قسموں کو اس مقام سے یہ مناسبت ہے کہ رات کو مختلف حالتیں ہوتی ہیں، پہلے شفق نمودار ہوتی ہے، پھر زیادہ رات آجاتی ہے، پھر لوگ سوجاتے ہیں، یہ سب موت کے بعد کے مختلف احوال سے مشابہ ہے، کیونکہ موت سے عالم آخرت شروع ہوتا ہے، جیسے شفق سے رات شروع ہوتی، پھر برزخ یعنی قبر میں رہنا مشابہ ہے لوگوں کے سوتے رہنے سے، اور چاند کا کمی کے بعد پورا ہونا مشابہ ہے عالم کے فنا ہونے کے بعد قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے سے۔

طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ: وہ حالتیں چند ہیں: ایک تو موت ہے، اس کے بعد برزخ کے احوال، پھر قیامت کے احوال، پھر ان میں بھی ہر حالت کے ساتھ متعدد حالتیں ہوں گی، صحیح بخاری کی ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے تو اس سے مراتب قرب میں ترقی مراد ہوگی، اور یہی شان وارثین رسول کے مراتب واحوال میں ہوا کرتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی آدمی اور جانور جو دن میں تلاش معاش کے لئے مکانوں سے نکل کر ادھر ادھر منتشر ہوتے ہیں، رات کے وقت سب طرف

سمٹ کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر جمع ہوجاتے ہیں۔

فائدہ: ۲ اور چاند کی جب پورا بھر جائے

فائدہ: ۳ یعنی دنیا کی زندگی میں مختلف دور سے بتدریج گزر کر اخیر میں موت کی سیڑھی ہے، پھر عالم برزخ کی، پھر قیامت کی، پھر قیامت میں خدا جانے کتنے احوال و مراتب درجہ بدرجہ طے کرنے ہیں، جیسے رات کے شروع میں شفق کے باقی رہنے تک ایک قسم کی روشنی رہتی ہے، جو فی الحقیقت بقیہ ہے آفتاب کے اثرات کا، پھر شفق غائب ہونے پر دوسرا دور تاریکی کا شروع ہوتا ہے جو سب چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے، اس میں چاند بھی نکلتا ہے اور درجہ بدرجہ اس کی روشنی بڑھتی ہے، آخر چودھویں شب کو ماہ کامل کا نور اس تاریک فضاء میں ساری رات اجالا رکھتا ہے، گویا انسانی احوال کے طبقات رات کی مختلف کیفیات سے مشابہ ہوئے، واللہ اعلم۔

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿٢١﴾ السجدة ۱۳

پھر کیا ہوا ہے ان کو جو یقین نہیں لاتے ۱ اور جب پڑھیے ان کے پاس قرآن وہ سجدہ نہیں کرتے ۲

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿٢٣﴾

اوپر سے اور یہ کہ منکر جھٹلاتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو اندر بھر رکھتے ہیں ۳

خلاصہ تفسیر: سو (ان سب باتوں کے باوجود) ان لوگوں کو کیا ہوا کہ ایمان نہیں لاتے اور (خود تو ایمان اور حق کی کیا طلب کرتے ان کے عناد کی تو یہ حالت ہے کہ) جب ان کے روبرو قرآن پڑھا جاتا ہے تو (اس وقت بھی خدا کی طرف) نہیں جھکتے، بلکہ (بجائے جھکنے کے) یہ کافر (اور الٹی) تکذیب کرتے ہیں اور اللہ کو سب خبر ہے جو کچھ یہ لوگ (برے اعمال کا ذخیرہ) جمع کر رہے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ کہ ہم کو موت کے بعد بھی کسی طرف رجوع ہونا ہے اور ایک بڑا بھاری سفر درپیش ہے جس کے لئے کافی توشہ ساتھ ہونا چاہیے۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر ان کی عقل خود بخود ان حالات کو دریافت نہیں کرسکتی تھی تو لازم تھا کہ قرآن کے بیان سے فائدہ اٹھاتے، لیکن اس کے برخلاف ان کا حال یہ ہے کہ قرآن معجز بیان کو سن کر بھی ذرا عاجزی اور تذلل کا اظہار نہیں کرتے، حتی کے جب مسلمان خدا کی آیات سن کر سجدہ کرتے ہیں، ان کو سجدہ کی توفیق نہیں ہوتی۔

فائدہ: ۳ یعنی فقط اتنا ہی نہیں کہ اللہ کی آیات سن کر انقیاد و تذلل کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ان کو زبان سے جھٹلاتے ہیں اور دلوں میں جو تکذیب و انکار، بغض وعناد اور حق کی دشمنی بھری ہوئی ہے اس کو تو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٤﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿٢٥﴾

سو خوشی سنادے ان کو عذاب دردناک کی ۱ مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کام کئے بھلے ان کے لیے ثواب ہے بے انتہا ۲

خلاصہ تفسیر: سو (ان کفریہ اعمال کے سبب) آپ ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجیے لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے ان کے لئے (آخرت میں) ایسا اجر ہے جو کبھی موقوف ہونے والا نہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یہاں "عمل صالح" کی قید شرط کے طور پر نہیں ہے، کیونکہ مؤمن اگر گناہ گار بھی ہو اس کو بھی ایسا ہی اجر ملے گا جو کبھی منقطع نہ ہوگا یعنی جنت، بلکہ یہ شرط سبب کے طور پر ہے کہ نیک کاموں کی بدولت یہ ثواب جلدی مل جائے گا، ورنہ تھوڑا سا عذاب بھگتنا

پڑے گا، ہاں! خدا تعالیٰ معاف کردیں تو اور بات ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی خوش خبری سنا دیجئے کہ جو کچھ وہ کما رہے ہیں اس کا پھل ضرور ملے گا، ان کی یہ کوشش ہرگز خالی نہیں جائیں گی۔
فائدہ: ۲؎ جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

ایاتھا ۲۲ — ۸۵ سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ ۲۷ — رکوعھا ۱

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں ایک قصہ کا اجمالاً ذکر ہے جو صحیح مسلم میں مذکور ہے، خلاصہ اس کا یہ ہے کوئی کافر بادشاہ تھا اس کے پاس ایک کاہن تھا، کاہن اس کو کہا جاتا ہے جو شیاطین کے ذریعہ یا نجوم کے آثار کے ذریعہ کچھ مستقبل کی غیبی خبریں معلوم کرکے لوگوں کو بتائے، اس کاہن نے بادشاہ سے کہا کہ مجھ کو ایک ہوشیار لڑکا دیا جائے تو اس کو اپنا علم سکھادوں، چنانچہ ایک لڑکا تجویز کیا گیا، اس کے راستے میں ایک راہب یعنی عیسائی پادری رہتا تھا اور اس زمانے میں دین عیسیٰ ہی دین حق تھا، اور یہ راہب اسی پر قائم عبادت گزار تھا، وہ لڑکا اس کے پاس آنے جانے لگا اور خفیہ مسلمان ہوگیا، ایک بار اس لڑکے نے دیکھا کہ کسی شیر نے راستہ روک رکھا ہے اور خلق خدا پریشان ہے تو اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لے کر دعا کی کہ: "اے اللہ! اگر راہب کا دین سچا ہے تو یہ جانور میرے پتھر سے مارا جائے اور اگر کاہن سچا ہے تو نہ مارا جائے اور یہ کہہ کر وہ پتھر مارا تو شیر کو لگا اور وہ ہلاک ہوگیا، لوگوں میں شور ہوگیا کہ اس لڑکے کو کوئی عجیب علم آتا ہے، کسی اندھے نے سنا آکر درخواست کی میری آنکھیں اچھی ہوجائیں، لڑکے نے کہا بشرطیکہ تو مسلمان ہوجائے، چنانچہ اندھے نے قبول کیا، لڑکے نے دعا کی وہ اچھا ہوگیا اور مسلمان ہوگیا، بادشاہ کو یہ خبریں پہنچیں تو اس راہب کو اور لڑکے کو اور اس نابینا کو گرفتار کرکے بلایا، اس نے راہب اور اندھے کو توقتل کردیا اور لڑکے کے لئے حکم دیا کہ پہاڑ کے اوپر لے جاکر گرادیا جائے، مگر جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ خود گر کر ہلاک ہوگئے اور لڑکا صحیح سالم چلا آیا، پھر بادشاہ نے سمندر میں غرق کرنے کا حکم دیا وہ اس سے بھی بچ گیا اور جو لوگ اس کو لے گئے تھے وہ سب ڈوب گئے، پھر خود لڑکے نے بادشاہ سے کہا "مجھ کو بسم اللہ کہہ کر تیر مارو تو میں مرجاؤں گا"، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور لڑکا مر گیا، پس اس عجیب واقعہ کو دیکھ کر یک لخت عام لوگوں کی زبان سے نعرہ بلند ہوا کہ ہم سب اللہ پر ایمان لاتے ہیں، بادشاہ بڑا پریشان ہوا اور ارکان سلطنت کے مشورے سے بڑی بڑی خندقیں آگ سے بھروا کر اشتہار دیا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھرے گا تو اس کو آگ میں جلادیں گے، چنانچہ بہت آدمی جلائے گئے، اس سورت میں ان پر غضب الٰہی نازل ہونے کو قسم کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

اس قصہ میں اس لڑکے نے اپنے مرنے کی تدبیر خود کیسے بتلائی ہے حالانکہ یہ تو اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یا تو اس شریعت میں جائز ہوگا یا لڑکے کی اجتہادی غلطی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ① وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ② وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ③

قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں ۱؎ اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے ۲؎ اور اس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اسکی کہ جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں ۳؎

خلاصہ تفسیر: قسم ہے برجوں والے آسمان کی (مراد برجوں سے بڑے بڑے ستارے ہیں) اور قسم ہے وعدہ کئے ہوئے دن کی (یعنی قیامت کے دن کی) اور قسم ہے حاضر ہونے والے (دن) کی، اور قسم ہے اس (دن) کی جس میں لوگوں کی حاضری ہوتی ہے۔

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ: "شاہد" جمعہ کا دن ہے اور "مشہود" عرفہ کا دن ہے، ایک دن کو شاہد اور دوسرے کو مشہود شاید اس لئے فرمایا کہ جمعہ کے دن تو سب اپنی اپنی جگہ رہتے ہیں تو گویا وہ دن خود آتا ہے اور عرفہ کے دن حجاج اپنے اپنے مقامات سے سفر کرکے عرفات میں اس یوم کے قصد سے جمع

ہو جاتے ہیں تو گویا وہ دن مقصود ومشہود اور دوسرے لوگ حاضری کا قصد کرنے والے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ ''برجوں'' سے مراد ① تو وہ بارہ برج ہیں جن کو آفتاب ایک سال کی مدت میں تمام کرتا ہے ② یا آسمانی قلعہ کے وہ حصے جن میں فرشتے پہرہ دیتے ہیں ③ یا بڑے بڑے ستارے جو دیکھنے میں آسمان پر معلوم ہوتے ہیں، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ یعنی قیامت کا دن۔

فائدہ: ۳ سب شہروں میں حاضر ہوتا ہے جمعہ کا دن، اور سب ایک جگہ حاضر ہوتے ہیں عرفہ کے دن حج کے لیے، اسی لئے روایات میں آیا کہ ''شاہد'' جمعہ کا دن ہے اور ''مشہود'' عرفہ کا دن، اسکے علاوہ ''شاہد ومشہود'' کی تفسیر میں اقوال بہت ہیں لیکن اوفق بالروایات یہی قول ہے، واللہ اعلم۔

تنبیہ: قرآنی قسموں کے متعلق ہم سورۃ قیامہ کے شروع میں جو لکھ چکے ہیں اسکو ہر جگہ یاد رکھنا چاہئے، اور ان قسموں کو جواب قسم سے مناسبت یہ ہے کہ ان سب سے اللہ تعالیٰ کا مالک امکنہ وازمنہ ہونا ظاہر ہوتا ہے اور ایسے مالک الکل کی مخالفت کرنے والے کا مستحق لعن وعقوبت ہونا ظاہر ہے۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۝۴ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۝۵ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۝۶

مارے گئے کھائیاں کھودنے والے، آگ ہے بہت ایندھن والی ۱ جب وہ اس پر بیٹھے

وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ۝۷

اور جو کچھ وہ کرتے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ۲

خلاصہ تفسیر: (قسموں کے بعد اب جواب قسم ہے) کہ خندق والے یعنی بہت سے ایندھن کی آگ والے ملعون ہوئے جس وقت وہ لوگ اس (آگ) کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ (ظلم وستم) کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے۔

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ: ان کے ملعون ہونے کی خبر دینے سے مؤمنین کی تسلی ظاہر ہے کہ اسی طرح جو کافر اس وقت مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں وہ بھی گرفتار لعنت ہوں گے، جس کا اثر خواہ دنیا میں بھی مرتب ہو جیسے غزوہ بدر وغیرہ میں رسوا ومقتول ہوئے، یا صرف آخرت میں جیسا عام کفار کے لئے یقینی ہے اور دشمن کے عذاب کی خبر سے تسلی ہونا طبعی بات ہے۔

سورت کے شروع میں جو قسمیں کھائی گئیں ہیں ان کی اس جواب قسم کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کا تمام مکان وزمان کا مالک ہونا ظاہر ہے اور ایسے مالک الملک کی مخالفت کرنے والا یقیناً لعنت کا مستحق ہے۔

اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ: ان لوگوں کا بیٹھنا اس ظلم وستم کے انتظام اور نگرانی کے لئے تھا اور لفظ ''شہود'' میں نگرانی کے علاوہ ان لوگوں کی سنگ دلی کی طرف بھی اشارہ ہے کہ دیکھ کر بھی رحم نہ آتا تھا اور اس کو خدا تعالیٰ کی لعنت میں خاص دخل ہے کہ یہ سنگ دلی لعنت کا سبب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ملعون ومغضوب ہوئے وہ لوگ جنہوں نے بڑی بڑی خندقیں کھود کر آگ سے بھریں اور بہت سا ایندھن ڈال کر ان کو دھونکایا، ان ''اصحاب الاخدود'' سے کون مراد ہیں؟ مفسرین نے کئی واقعات نقل کئے ہیں، لیکن صحیح مسلم، جامع ترمذی اور مسند احمد وغیرہ میں جو قصہ مذکور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں کوئی کافر بادشاہ تھا، اس کے ہاں ایک ساحر (جادوگر) رہتا تھا، جب ساحر کی موت کا وقت قریب ہوا، اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ایک ہوشیار اور ہونہار لڑکا مجھے دیا جائے تو میں اس کو اپنا علم سکھادوں تاکہ میرے بعد یہ علم مٹ نہ جائے، چنانچہ ایک لڑکا تجویز کیا گیا جو روزانہ ساحر کے پاس جا کر اس کا علم سیکھتا تھا، راستہ میں ایک عیسائی راہب رہتا تھا جو اس وقت کے اعتبار سے دین حق پر تھا، لڑکا اس کے پاس بھی آنے جانے لگا، اور خفیہ طور سے راہب کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا، اور اس کے فیض صحبت سے ولایت وکرامت کے درجہ کو پہنچا، ایک روز لڑکے نے

دیکھا کہ کسی بڑے جانور (شیر وغیرہ) نے راستہ روک رکھا ہے جس کی وجہ سے مخلوق پریشان ہے، اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لے کر دعا کی کہ اے اللہ! اگر راہب کا دین سچا ہے تو یہ جانور میرے پتھر سے مارا جائے، یہ کہہ کر پتھر پھینکا جس سے اس جانور کا کام تمام ہوگیا، لوگوں میں شور ہوا کہ اس لڑکے کو عجیب علم آتا ہے اندھے نے سن کر درخواست کی کہ میری آنکھیں اچھی کردو، لڑکے نے کہا کہ اچھی کرنے والا میں نہیں، وہ اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے، اگر تو اس پر ایمان لائے تو میں دعا کروں، امید ہے وہ تجھ کو بینا کردے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، شدہ شدہ یہ خبریں بادشاہ کو پہنچیں، اس نے برہم ہو لڑکے کو مع راہب اور اندھے کے طلب کرلیا اور کچھ بحث وگفتگو کے بعد راہب اور اندھے کو قتل کردیا اور لڑکے کی نسبت حکم دیا کہ اونچے پہاڑ پر سے گرا کر ہلاک کردیا جائے، مگر خدا کی قدرت جو لوگ اس کو لے گئے تھے، سب پہاڑ سے گر کر ہلاک ہوگئے اور لڑکا صحیح وسالم چلا آیا، پھر بادشاہ نے دریا میں غرق کرنے کا حکم دیا، وہاں بھی یہ ہی صورت پیش آئی کہ لڑکا صاف بچ کر نکل آیا اور جو لے گئے تھے وہ سب دریا میں ڈوب گئے، آخر لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ میں خود اپنے مرنے کی ترکیب بتلاتا ہوں، آپ سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کریں، ان کے سامنے مجھ کو سولی پر لٹکائیں اور یہ لفظ کہہ کر مجھے تیر ماریں: "بسم الله رب الغلام" (اس اللہ کے نام پر جو رب ہے اس لڑکے کا) چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا، اور لڑکا اپنے رب کے نام پر قربان ہوگیا، یہ عجیب واقعہ دیکھ کر یکلخت لوگوں کی زبان سے ایک نعرہ بلند ہوا کہ: "آمنا برب الغلام" (ہم سب لڑکے کے رب پر ایمان لائے) لوگوں نے بادشاہ سے کہا کہ لیجئے، جس چیز کی روک تھام کر رہے تھے، وہ ہی پیش آئی پہلے تو کوئی اکا دکا مسلمان ہوتا تھا اب خلق کثیر نے اسلام قبول کرلیا، بادشاہ نے غصہ میں آکر بڑی بڑی خندقیں کھدوائیں اور ان کو خوب آگ سے بھروا کر اعلان کیا کہ جو شخص اسلام سے نہ پھریگا اس کو ان خندقوں میں جھونک دیا جائے گا، آخر لوگ آگ میں ڈالے جارہے تھے، لیکن اسلام سے نہیں ہٹتے تھے، ایک مسلمان عورت لائی گئی جس کے پاس دودھ پیتا بچہ تھا، شاید بچہ کی وجہ سے آگ میں گرنے سے گھبرائی، مگر بچہ نے خدا کے حکم سے آواز دی، "اماه اصبری فانك على الحق" (اماں جان صبر کر کہ تو حق پر ہے)۔

فائدہ: ۲ یعنی بادشاہ اور اس کے وزیر ومشیر خندقوں کے آس پاس بیٹھے ہوئے نہایت سنگدلی سے مسلمانوں کے جلنے کا تماشہ دیکھ رہے تھے، بدبختوں کو ذرا رحم نہ آتا تھا۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اور ان سے بدلہ نہ لیتے تھے مگر اسی بات کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں والا، جس کا راج ہے آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ

اور زمین میں، اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز ۱ تحقیق جو دین سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر

لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝۱۰

توبہ نہ کی تو ان کے لیے عذاب ہے دوزخ کا اور ان کے لیے عذاب ہے آگ لگنے کا ۲

خلاصہ تفسیر: اور ان کافروں نے ان مسلمانوں میں اور کوئی عیب نہیں پایا تھا بجز اس کے کہ وہ خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست (اور) سزاوار حمد ہے ایسا کہ اسی کی ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی (یعنی ایمان لانے پر یہ معاملہ کیا، اور ایمان لانا کوئی خطا نہیں، پس بے خطا ان پر ظلم کیا اس لئے وہ لوگ ملعون ہوئے، آگے ظالموں کے لئے عام وعید اور مظلوموں کے لئے عام وعدہ ہے) کہ اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے (مظلوم کی مظلومیت سے بھی، پس اس کی مدد کرے گا، اور ظالم کے ظلم سے بھی تو اس کو سزا دے گا، خواہ دنیا میں، خواہ آخرت میں، چنانچہ آگے یہی مضمون ہے کہ) جنہوں نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو تکلیف پہنچائی اور پھر توبہ نہیں کی تو ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے، اور (جہنم میں خاص

طور پر) ان کے لئے جلنے کا عذاب ہے (عذاب میں ہر طرح کی تکلیف داخل ہے، سانپ، بچھو، طوق، زنجیریں، گرم پانی، لہو پیپ وغیرہ اور ان سب میں جلنے کا عذاب سخت ہے اس لیے اس کو خصوصیت سے بیان فرمایا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان مسلمانوں کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ کفر کی ظلمت سے نکل کر ایک زبردست اور ہر طرح کی تعریف کے لائق خدا پر ایمان لائے، جس کی بادشاہت سے زمین و آسمان کا کوئی گوشہ باہر نہیں، اور جو ہر چیز کے ذرہ ذرہ احوال سے باخبر ہے، جب ایسے خدا کے پرستاروں کو محض اس جرم پر کہ وہ کیوں اسی اکیلے کو پوجتے ہیں، آگ میں جلا دیا جائے تو کیا گمان ہوسکتا ہے کہ ایسا ظلم وستم یوں ہی خالی چلا جائے گا اور وہ خداوند قہار ظالموں کو سخت ترین سزا نہ دے گا، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''جب اللہ کا غضب آیا وہی آگ پھیل پڑی، بادشاہ اور امیروں کے گھر سارے پھونک دیئے''، مگر روایات صحیحہ میں اس کا ذکر نہیں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کچھ اصحاب الاخدود پر منحصر نہیں، جو لوگ ایمانداروں کو دین حق سے برگشتہ کرنے کی کوشش کریں گے (جیسے کفار مکہ کر رہے تھے) پھر اپنی ان نالائق حرکات سے تائب نہ ہوں گے ان سب کے لئے دوزخ کا عذاب تیار ہے جس میں بیشمار قسم کی تکلیفیں ہوں گی اور بڑی تکلیف آگ لگنے کی ہوگی جس میں دوزخی کا تن من سب گرفتار ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ۥ

بیشک جو لوگ یقین لائے اور کیں انہوں نے بھلائیاں ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ﴿۱۱﴾

یہ ہے بڑی مراد ملنی

خلاصہ تفسیر: (پیچھے ظالم کے حق میں وعید تھی، آگے مؤمنین کے حق میں جن میں مظلوم بھی آگئے وعدہ ارشاد ہے) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے (بہشت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) یہ بڑی کامیابی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہاں کی تکلیفوں اور ایذاؤں سے نہ گھبرائیں، بڑی اور آخری کامیابی ان ہی کے لئے ہے، جس کے مقابلہ میں یہاں کا عیش یا تکلیف سب ہیچ ہے۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿۱۳﴾

بیشک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے ۱؎ بیشک وہی کرتا ہے پہلی مرتبہ اور دوسری ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے دو مضمون تھے کفار کے لئے جہنم ہونا اور مؤمنین کے لئے جنت ہونا، آگے ان کے مناسب اپنے بعض احوال وصفات ان مضمونوں کی تاکید کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ) آپ کے رب کی داروگیر بڑی سخت ہے (پس کفار پر شدید سزا کا واقع ہونا بعید نہیں اور نیز) وہی پہلی بار بھی پیدا کرتا ہے اور دوبارہ (قیامت میں بھی) پیدا کردے گا (پس یہ شبہ بھی نہ رہا کہ اگرچہ پکڑ شدید ہے مگر قیامت ہی واقع نہ ہوگی جو کہ پکڑ اور گرفتاری کا وقت ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اسی لئے ظالموں اور مجرموں کو پکڑ کر سخت ترین سزا دیتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی پہلی مرتبہ دنیا کا عذاب اور دوسری مرتبہ آخرت کا (کذا فی الموضح) یا یہ مطلب ہے کہ اول مرتبہ آدمی کو وہ ہی پیدا کرتا ہے اور دوسری مرتبہ موت کے بعد بھی وہ ہی پیدا کرے گا، پس مجرم اس دھوکے میں نہ رہے کہ موت جب ہمارا نام ونشان مٹا دے گی، پھر ہم کس طرح ہاتھ آئیں گے۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۶﴾

اور وہی ہے بخشنے والا محبت کرنے والا ۱؎ مالک عرش کا بڑی شان والا، کر ڈالنے والا جو چاہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے کفار کے لیے وعید تھی، آگے مؤمنین کے لیے وعدہ ہے کہ) وہی بڑا بخشنے والا (اور) بڑی محبت کرنے والا اور عرش کا مالک (اور) عظمت والا ہے (پس ایمان والوں کے گناہ معاف کر دے گا اور ان کو اپنا محبوب بنا لے گا، گزشتہ دونوں صفت کو ثابت کرنے کے لیے آگے ایک اور صفت ارشاد ہے کہ) وہ جو چاہے سب کچھ کر گزرتا ہے۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ: ''ذوالعرش'' اور ''مجید'' اگرچہ عذاب دینے یا ثواب دینے دونوں کے ساتھ متعلق ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں ہی صاحب سلطنت وکمال کی صفات ہیں، لیکن یہاں مقابلہ کے قرینہ کی وجہ سے ان کے ذریعے ثواب کو متفرع کرنا مقصود ہے، کیونکہ کفار کے لیے وعید اس سے پہلے: ان بطش ربك لشديد میں بیان ہو چکی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی باوجود اس صفت قہاری وسخت گیری کے اس کی بخشش اور محبت کی بھی کوئی حد نہیں، وہ اپنے فرماں بردار بندوں کی خطائیں معاف کرتا، ان کے عیب چھپاتا اور طرح طرح کے لطف وکرم اور عنایت وشفقت سے نوازتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اپنے علم وحکمت کے موافق جو کرنا چاہے کچھ دیر نہیں لگتی، نہ کوئی روکنے ٹوکنے کا حق رکھتا ہے، بہرحال نہ اس کے انعام پر بندہ کو مغرور ہونا چاہیے، نہ انتقام سے بے خوف، بلکہ ہمیشہ اس کی صفات جلال وجمال دونوں پر نظر رکھے، اور خوف کے ساتھ رجاء اور رجاء کے ساتھ خوف کو دل سے زائل نہ ہونے دے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۱۹﴾

کیا پہنچی تجھ کو بات ان لشکروں کی، فرعون اور ثمود کے ۱؎ کوئی نہیں بلکہ منکر جھٹلاتے ہیں ۲؎

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ ع

اور اللہ نے ان کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے ۳؎ کوئی نہیں یہ قرآن ہے بڑی شان کا ۴؎ لکھا ہوا لوح محفوظ میں ۵؎

خلاصہ تفسیر: آگے مؤمنین کی مزید تسلی اور کفار کی مزید تنبیہ کے لئے بعض خاص مغضوبین کا حال بیان فرماتے ہیں:

کیا آپ کو ان لشکروں کا قصہ پہنچا ہے یعنی فرعون (اور آل فرعون) اور ثمود کا (کہ کس طرح کفر کیا اور کیونکر عذاب میں گرفتار ہوئے، اس سے مؤمنین کو تسلی حاصل کرنی چاہئے اور کفار کو ڈرنا چاہئے، مگر کفار بالکل عذاب سے نہیں ڈرتے) بلکہ یہ کافر (خود قرآن کی) تکذیب میں (لگے) ہیں (پس عذاب کے مضمون کو بھی اور دیگر مضامین کو بھی جھٹلاتے ہیں) اور (انجام کار اس کی سزا بھگتیں گے کیونکہ) اللہ ان کو ادھر ادھر سے گھیرے ہوئے ہے (اس کے قبضہ قدرت اور عذاب سے بچ نہیں سکتے اور ان کا قرآن کو جھٹلانا محض حماقت ہے، کیونکہ قرآن ایسی چیز نہیں جو جھٹلانے کے قابل ہو) بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوح محفوظ میں (لکھا ہوا) ہے (جس میں کوئی تغیر وتبدل کا احتمال نہیں، وہاں سے نہایت حفاظت کے ساتھ صاحب وحی کے پاس پہنچایا جاتا ہے جیسا کہ سورہ جن میں ارشاد ہے: فانه يسلك من بين يديه ومن خلفه رصدا پس ایسی صورت میں قرآن کو جھٹلانا بلاشبہ جہالت

ہےاورعذاب کا سبب ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ: کہ ایک مدت تک انعام کا دروازہ ان پر کھلا رکھا تھا، اور ہر طرف سے طرح طرح کی نعمتیں ان کو پہنچتی تھیں پھر ان کے کفر وطغیان کی بدولت کیسا سخت انتقام لیا گیا۔

فائدہ: ۲؎ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ: یعنی کفار ان قصوں سے عبرت نہیں پکڑتے اور عذاب الٰہی سے ذرا نہیں ڈرتے، بلکہ ان قصوں کے اور قرآن کے جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

فائدہ: ۳؎ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ: یعنی جھٹلانے سے کوئی فائدہ نہیں، ہاں اس تکذیب کی سزا بھگتنا ضروری ہے اللہ کے قبضہ قدرت سے وہ نکل نہیں سکتے نہ سزا سے بچ سکتے ہیں۔

فائدہ: ۴؎ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ: یعنی ان کا قرآن کو جھٹلانا محض حماقت ہے، قرآن ایسی چیز نہیں جو جھٹلانے کے قابل ہو، یا چند احمقوں کے جھٹلانے سے اس کی شان اور بزرگی کم ہو جائے۔

فائدہ: ۵؎ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ: جہاں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا، پھر وہاں سے نہایت حفاظت واہتمام کے ساتھ صاحب وحی کے پاس پہنچایا جاتا ہے: فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا (الجن:۲۷) اور یہاں بھی قدرت کی طرف سے اس کی حفاظت کا ایسا سامان ہے جس میں کوئی طاقت رخنہ نہیں ڈال سکتی۔

ایاتھا ۱۷ ۸٦ سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ ٣٦ رکوعھا ۱

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت میں مؤمنین کی تسلی کے ساتھ ساتھ کفار کو وعید بھی تھی، اس سورت میں وعید کو ثابت کرنے کے لیے بندوں کے اعمال کا محفوظ رہنا، بعث یعنی دوبارہ زندہ ہونے کا ممکن اور واقع ہونا، اور قیامت کی دلیل یعنی قرآن کا حق ہونا ارشاد فرماتے ہیں، اور گزشتہ سورت کے اخیر میں بھی قرآن کی حقانیت کا مضمون تھا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝۲ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝۳

قسم ہے آسمان کی اور اندھیرے میں آنے والے کی، اور تونے کیا سمجھا کیا ہے اندھیرے میں آنے والا، وہ تارا چمکتا ہوا

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝۴ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝۵

کوئی جی نہیں جس پر نہیں ایک نگہبان، اب دیکھ لے آدمی کہ کاہے سے بنا ہے ۱؎

خلاصہ تفسیر: قسم ہے آسمان کی اور اس چیز کی جو رات کو نمودار ہونے والی ہے، اور آپ کو کچھ معلوم ہے وہ رات کو نمودار ہونے والی چیز کیا ہے؟ وہ روشن ستارہ ہے (کوئی بھی ستارہ ہوسکتا ہے، ایک اور جگہ ارشاد ہے: **والنجم اذا ھوی**، اب آگے جواب قسم ہے کہ) کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس پر کوئی اعمال کا یاد رکھنے والا (فرشتہ) مقرر نہ ہو (جیسا کہ ارشاد ہے: **و ان علیکم لحفظین کراماً کٰتبین یعلمون ما تفعلون**، مطلب یہ کہ ان اعمال پر محاسبہ ہونے والا ہے اور فرشتے ان کو لکھتے رہتے ہیں، اور اس قسم کو مقصود سے مناسبت یہ ہے کہ جیسے آسمان پر ستارے ہر وقت محفوظ ہیں مگر ان کا ظہور خاص رات کے وقت ہوا کرتا ہے، اسی طرح سب کام نامہ اعمال میں اس وقت بھی محفوظ ہیں مگر ظہور ان کا خاص

قیامت میں ہوگا، جب یہ بات ہے) توانسان کو (قیامت کی فکر چاہئے اور اگر اس کے محال یا بعید ہونے کا شبہ ہوتو اس کو) دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی فرشتے رہتے ہیں آدمی کے ساتھ، بلاؤں سے بچاتے ہیں یا اسکے عمل لکھتے ہیں (موضح القرآن) اور قسم میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ جس نے آسمان پر ستاروں کی حفاظت کے ایسے سامان کئے ہیں اس کو زمین پر تمہاری یا تمہارے اعمال کی حفاظت کرنا کیا دشوار ہے، نیز جس طرح آسمان پر ستارے ہر وقت محفوظ ہیں مگر ان کا ظہور خاص شب میں ہوتا ہے، ایسے ہی سب اعمال نامہ اعمال میں اس وقت بھی محفوظ ہیں، مگر ظہور ان کا خاص قیامت میں ہوگا، جب یہ بات ہے تو انسان کو قیامت کی فکر چاہیے، اور اگر اس کو مستبعد سمجھتا ہے تو اس کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾

بنا ہے ایک اچھلتے ہوئے پانی سے ۱؎ جو نکلتا ہے پیٹھ کے بیچ سے اور چھاتی کے بیچ سے ۲؎ بیشک وہ اس کو پھیر لا سکتا ہے ۳؎

خلاصہ تفسیر: وہ (انسان) ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پشت اور سینہ (یعنی تمام بدن) کے درمیان سے نکلتا ہے (مراد اس پانی سے منی ہے، خواہ صرف مرد کی یا مرد وعورت دونوں کی، حاصل یہ ہے کہ نطفہ سے انسان بنا دینا زیادہ عجیب ہے بہ نسبت دوبارہ بنانے کے اور جب یہ عجیب تر امر اس کی قدرت سے ظاہر ہو رہا ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ) وہ اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قادر ہے (پس قیامت کو محال یا بعید سمجھنے کا شبہ دور ہو گیا)۔

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ: عورت کی منی میں اگرچہ اچھلنے کی صفت مرد کی منی کے برابر نہیں ہوتی، لیکن کچھ اندفاق (اچھلنا) ضرور ہوتا ہے، اور اس صورت میں جبکہ ''ماء'' سے مراد وعورت دونوں کا نطفہ ہو تو یہاں لفظ ''ماء'' کا مفرد لانا اس بناء پر ہے کہ دونوں مادے مخلوط ہو کر مل جل کر ایک چیز کی طرح ہو جاتے ہیں۔

مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ: سینہ و پشت چونکہ بدن کی دو طرفین ہیں اس لیے یہ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کو بیان کر کے تمام بدن مراد لیا گیا ہو، اور یہ اس لیے کہا گیا کہ منی تمام بدن میں پیدا ہو کر پھر جدا ہوتی ہے، اور اس میں پشت اور سینہ کا خاص طور پر ذکر اس لیے ہوسکتا ہے کہ مادہ منویہ کے پیدا ہونے میں اعضاء رئیسہ کو خاص دخل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی منی سے جو اچھل کر نکلتی ہے۔

فائدہ: ۲؎ کہتے ہیں کہ مرد کی منی کا انصباب پیٹھ سے ہوتا ہے اور عورت کا سینہ سے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ پیٹھ اور سینہ تمام بدن سے کنایہ ہے، یعنی مرد کی ہو یا عورت کی تمام بدن میں پیدا ہو کر پھر جدا ہوتی ہے اور اس کنایہ میں تخصیص صلب و ترائب کی شاید اس لئے ہو کہ حصول مادہ منویہ میں اعضاء رئیسہ (قلب، دماغ، کبد) کو خاص دخل ہے جن میں سے قلب و کبد کا تعلق و تلبس ترائب سے اور دماغ کا تعلق بواسطہ نخاع (حرام مغز) کے صلب سے ظاہر ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اللہ پھیر لائے گا مرنے کے بعد (موضح القرآن) حاصل یہ کہ نطفہ سے انسان بنا دینا بہ نسبت دوبارہ بنانے کے زیادہ عجیب ہے، جب یہ امر عجیب اس کی قدرت سے واقع ہو رہا ہے تو جائز نہیں کہ اس سے کم عجیب چیز کے وقوع کا خواہ مخواہ انکار کیا جائے۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ؕ﴿۱۰﴾

جس دن جانچے جائیں بھید ۱؎ تو کچھ نہ ہوگا اس کو زور اور نہ کوئی مدد کرنے والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس روز ہوگا) جس روز سب کی قلعی کھل جائے گی (یعنی سب مخفی باتیں چاہے وہ باطل عقائد کی قبیل سے ہوں یا فاسد نیتیں سب ظاہر ہو جائیں گی، اور دنیا میں جس طرح موقع پر جرم سے مکر جاتے ہیں اس کو چھپا لیتے ہیں یہ بات وہاں ممکن نہ ہوگی) پھر اس کو نہ تو خود (اپنا دفاع کرنے) کی قوت ہوگی اور نہ اس کا کوئی حمایتی ہوگا (کہ عذاب کو اس سے دور کردے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سب کی قلعی کھل جائے گی، اور کل باتیں جو دلوں میں پوشیدہ رکھی ہوں یا چھپ کر کی ہوں ظاہر ہو جائیں گی اور کسی جرم کا اخفاء ممکن نہ ہوگا۔

فائدہ: ۲ اس وقت مجرم نہ اپنے زور و قوت سے مدافعت کر سکے گا نہ کوئی حمایتی ملے گا جو مدد کر کے سزا سے بچالے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿١١﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿١٢﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿١٣﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿١٤﴾

قسم ہے آسمان چکر مارنے والے کی ۱ اور زمین پھوٹ نکلنے والی کی ۲ بیشک یہ بات ہے دوٹوک، اور نہیں یہ بات ہنسی کی ۳

خلاصہ تفسیر: (اگر کہا جائے کہ قیامت کا ممکن ہونا اگرچہ عقلی ہے مگر اس کا واقع ہونا تو نقلی ہے اور دلیل نقلی قرآن ہے اور قرآن ابھی تک ثابت نہیں ہوا تو اس کے متعلق سنو کہ) قسم ہے آسمان کی جس سے پے در پے بارش ہوتی ہے اور زمین کی جو (بیج نکلنے کے وقت) پھٹ جاتی ہے (اب آگے جواب قسم ہے) کہ یہ قرآن (حق و باطل میں) ایک فیصلہ کر دینے والا کلام ہے اور وہ کوئی لغو چیز نہیں ہے (اس سے قرآن کا اللہ کی طرف سے کلام ٹھہونا ثابت ہوگیا)۔

حاصل یہ کہ جس طرح قرآن کریم اپنی دلالت سے واقعی اور غیر واقعی باتوں میں فیصلہ کرنے والا ہے، اسی طرح اپنی صفت اعجاز سے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے، جب قرآن کریم کی حقانیت ثابت ہوگئی اور اس میں قیامت کے واقع ہونے کا بھی ذکر ہے تو اس سے قیامت کا واقع ہونا بھی ثابت ہوگیا، یہاں قسم کی جواب قسم کے مضمون سے یہ مناسبت ہے کہ قرآن آسمان سے آتا ہے اور جس میں استعداد و قابلیت ہوتی ہے اس کو مالا مال کرتا ہے، جیسے بارش آسمان سے آتی ہے اور عمدہ زمین کو فیضیاب کرتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یا بارش لانے والے کی۔

فائدہ: ۲ یعنی اس میں سے پھوٹ نکلتے ہیں کھیتی اور درخت۔

فائدہ: ۳ یعنی قرآن اور جو کچھ وہ معاد کے متعلق بیان کرتا ہے، کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں، بلکہ حق و باطل اور صدق و کذب کا دوٹوک فیصلہ ہے اور لاریب وہ سچا کلام اور ایک طے شدہ معاملہ کی خبر دینے والا ہے جو یقینا پیش آ کر رہے گا۔

تنبیہ: قسم کو اس مضمون سے یہ مناسبت ہوئی کہ قرآن آسمان سے آتا ہے اور جس میں قابلیت ہو مالا مال کر دیتا ہے، جیسے بارش آسمان کی طرف سے آتی ہے اور عمدہ زمین کو فیضیاب کرتی ہے، نیز قیامت میں ایک غیبی بارش ہوگی جس سے مردے زندہ ہو جائیں گے جس طرح یہاں بارش کا پانی گرنے سے مردہ اور بے جان زمین سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی ہے۔

ع اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾

البتہ وہ لگے ہوئے ہیں ایک داؤ کرنے میں، اور میں لگا ہوا ہوں ایک داؤ کرنے میں، سو ڈھیل دے منکروں کو ڈھیل دے انکو تھوڑے دنوں ۱

خلاصہ تفسیر: (مگر حق ثابت ہو جانے کے باوجود ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ) یہ لوگ (حق کے انکار کیلئے) طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں بھی (ان کی ناکامی اور سزا کیلئے) طرح طرح کی تدبیریں کر رہا ہوں (اور ظاہر ہے کہ میری تدبیر غالب آئے گی اور جب

میرا تدبیر کرنا سن لیا) تو آپ ان کافروں (کی مخالفت سے گھبرایئے نہیں اور ان پر جلدی عذاب آنے کی خواہش نہ کیجئے، بلکہ ان) کو یوں ہی رہنے دیجئے (اور زیادہ دن نہیں بلکہ) ان کو تھوڑے ہی دنوں رہنے دیجئے (پھر میں ان پر عذاب نازل کردوں گا، خواہ موت سے پہلے یا موت کے بعد)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی منکرین داؤ پیچ کرتے رہتے ہیں کہ شکوک وشبہات ڈال کر یا اور کسی تدبیر سے حق کو ابھرنے اور پھیلنے نہ دیں، اور میری تدبیر لطیف بھی (جس کا انہیں احساس نہیں) اندر اندر کام کر رہی ہے کہ ان کے تمامی مکر وکید کا جال توڑ پھوڑ کر رکھ دیا جائے اور ان کے سب داؤ پیچ ان ہی کی طرف واپس کئے جائیں، اب خود سوچ لو کہ اللہ کی تدبیر کے مقابلہ میں کسی کی چالاکی اور مکاری کیا کام دے سکتی ہے، لامحالہ یہ لوگ ناکام اور خائب وخاسر ہو کر رہیں گے، اس لئے مناسب ہے کہ آپ ان کی سزا دہی میں جلدی نہ کریں اور ان کی حرکات شنیعہ سے گھبرا کر بددعا نہ فرمائیں، بلکہ تھوڑے دن ڈھیل دیں، پھر دیکھیں نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

آیاتہا ۱۹ — ۸۷ سُوْرَةُ الْاَعْلٰی مَکِّیَّةٌ ۸ — رکوعہا ۱

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت میں آخرت اور جزا کا ذکر تھا، اس سورت میں بھی اصل فلاح آخرت کا مقصود ہونا اور اس کا طریقہ بتلانا ہے جو کہ تسبیح، نماز، تزکیہ اور ذات وصفات الٰہی کی معرفت ہے، اور اس مقصود کو ثابت کرنے کے لیے دنیا کا فانی اور مضمحل ہونا اور کامیابی کا طریقہ بتلانے کے لیے حضور ﷺ کو قرآن کے ذریعہ لوگوں کی نصیحت کا حکم ہونا مذکور ہے، اور قریب قریب اسی غرض سے پہلی سورت میں بھی قرآن کی حقانیت بیان کی گئی تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝١ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝٢ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝٣

پاکی بیان کر اپنے رب کے نام کی جو سب سے اوپر ۱؎ جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا ۲؎ اور جس نے ٹھہرادیا، پھر راہ بتلائی ۳؎

وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝٤ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝٥

اور جس نے نکالا چارا، پھر کر ڈالا اس کو کوڑا سیاہ ۴؎

خلاصہ تفسیر: (اے پیغمبر ﷺ!) آپ (اور جو مومن آپ کے ساتھ ہیں) اپنے پروردگار عالیشان کے نام کی تسبیح (و تقدیس) کیجئے جس نے (ہر چیز کو) بنایا پھر (اس کو) ٹھیک بنایا (یعنی ہر چیز کو مناسب طور پر بنایا) اور جس نے (جانداروں کے لئے ان کے مناسب چیزوں کو) تجویز کیا پھر (ان جانداروں کو ان چیزوں کی طرف) راہ بتلائی (یعنی ان کی طبیعتوں میں ان چیزوں کا تقاضا پیدا کردیا) اور جس نے (سبز خوش نما) چارہ (زمین سے) نکالا پھر اس کو سیاہ کوڑا کردیا (اول عام تصرفات مذکور ہیں، پھر حیوانات کے متعلق، پھر نباتات کے متعلق، مطلب یہ ہے کہ طاعات کے ذریعہ آخرت کی تیاری کرنی چاہئے جہاں اعمال پر جزا وسزا ہونے والی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى: حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی آپ ﷺ نے فرمایا: "اجعلوها فی سجودکم" (اس کو اپنے سجود میں رکھو) اسی لئے سجدہ کی حالت میں "سبحان ربی الاعلیٰ" کہا جاتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى: یعنی جو چیز بنائی عین حکمت کے موافق بہت ٹھیک بنائی اور باعتبار خواص وصفات اور ان کے فائدوں کے جو اس چیز سے مقصود ہیں اس کی پیدائش کو درجہ کمال تک پہنچایا اور ایسا معتدل مزاج عطا کیا جس سے وہ منافع وفوائد اس پر مرتب ہوسکیں۔

فائدہ: ۳ وَالَّذِیۡ قَدَّرَ فَهَدٰی: حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں: ''یعنی اول تقدیر لکھی پھر اسی کے موافق دنیا میں لایا''، گویا دنیا میں آنے کی راہ بتادی، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''ہر شخص کے لئے ایک کمال کا اندازہ ٹھہرایا، پھر اس کو وہ کمال حاصل کرنے کی راہ بتلا دی''، و فیہ اقوال اخر لا نطول بذکرھا۔

فائدہ: ۴ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی: یعنی اول نہایت سبز وخوش نما گھاس چارہ زمین سے پیدا کیا، پھر آہستہ آہستہ اس کو خشک وسیاہ کرڈالا تاکہ خشک ہوکر ایک مدت تک جانوروں کے لئے ذخیرہ کیا جاسکے اور خشک کھیتی کٹ کر کام میں آئے۔

سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰۤی ۝۶ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ یَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ وَمَا یَخۡفٰی ۝۷

البتہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو پھر تو نہ بھولے گا، مگر جو چاہے اللہ ۱ وہ جانتا ہے پکارنے کو اور جو چھپا ہوا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: (اور اسی اطاعت کا طریقہ بتلانے کے لئے ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور آپ کو اس کی تبلیغ کا حکم کیا گیا ہے، سو اس قرآن کی نسبت ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) ہم (جتنا) قرآن (نازل کرتے جائیں گے) آپ کو پڑھا دیا کریں گے (یعنی یاد کرادیا کریں گے) پھر آپ (اس میں سے کوئی جز) نہیں بھولیں گے مگر جس قدر (بھلانا) اللہ کو منظور ہو (کہ نسخ کا ایک طریقہ یہ بھی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: **ما ننسخ من ایة او ننسها** سو وہ البتہ آپ کے اور سب کے ذہنوں سے بھلا دیا جائے گا، اور یہ یاد رکھانا اور بھلا دینا سب قرین حکمت ہوگا کیونکہ) وہ ہر ظاہر اور مخفی کو جانتا ہے (اس لئے اس سے کسی چیز کی مصلحت پوشیدہ نہیں، تو جب کسی چیز کا محفوظ رکھنا مصلحت ہوتا ہے محفوظ رکھتے ہیں، اور جب بھلا دینا مصلحت ہوتا ہے تو بھلا دیتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جس طرح ہم نے اپنی تربیت سے ہر چیز کو بتدریج اس کے کمال مطلب تک پہنچایا ہے تم کو بھی آہستہ آہستہ کامل قرآن پڑھا دیں گے اور ایسا یاد کرادیں گے کہ اس کا کوئی حصہ بھولنے نہ پاؤ گے بجز ان آیتوں کے جن کا بالکل بھلا دینا ہی مقصود ہوگا کہ وہ بھی ایک قسم نسخ کی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی وہ تمہاری مخفی استعداد اور ظاہری اعمال واحوال کو جانتا ہے اسی کے موافق تم سے معاملہ کرے گا۔

نیز یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جو آیات ایک مرتبہ نازل کردی گئیں پھر ان کو منسوخ کرنے اور بھلا دینے کے کیا معنی؟ اس کی حکمتوں کا احاطہ کرنا اسی کی شان ہے جو تمام کھلی چھپی چیزوں کا جاننے والا ہے، اسی کو معلوم ہے کہ کونسی چیز ہمیشہ باقی رہنی چاہئے اور کس کو ایک مخصوص مدت کے بعد اٹھا لینا چاہیے کیونکہ اب اس کا باقی رکھنا ضروری نہیں ہے۔

وَنُیَسِّرُكَ لِلۡیُسۡرٰی ۝۸ فَذَكِّرۡ اِنۡ نَّفَعَتِ الذِّكۡرٰی ۝۹

اور سہج سہج پہنچائیں گے ہم تجھ کو آسانی تک ۱ سو تو سمجھائے اگر فائدہ کرے سمجھانا ۲

خلاصہ تفسیر: اور (جیسے ہم آپ کے لئے قرآن کا یاد ہونا آسان کردیں گے اسی طرح) ہم اس آسان (شریعت کے ہر حکم پر چلنے) کے لئے آپ کو سہولت دے دیں گے (یعنی سمجھنا بھی آسان ہوگا اور عمل بھی آسان ہوگا اور تبلیغ بھی آسان ہوجائے گی اور مزاحمتوں کو ختم کردیں گے، اور شریعت کی صفت ''یسری'' لانا مدح کے طور پر ہے، یا اس لئے کہ شریعت سبب ہے سہولت کا، اور جب ہم آپ کے لئے وحی کے متعلق ہر کام آسان کردینے کا وعدہ کرتے ہیں) تو آپ (جس طرح خود تسبیح وتقدیس کرتے ہیں اس طرح دوسروں کو بھی) نصیحت کیا کیجئے اگر نصیحت کرنا مفید ہوتا ہو (مگر جیسا کہ ظاہر اور معلوم ہے کہ نصیحت اپنی ذات میں ہمیشہ مفید ہی ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: **فان الذکری تنفع المومنین** حاصل یہ ہوا کہ چونکہ نصیحت نفع کی چیز ہے اس لیے آپ نصیحت کرنے کا اہتمام کریں)۔

فَذَكِّرۡ اِنۡ نَّفَعَتِ الذِّكۡرٰی: یعنی آپ لوگوں کو تبلیغ ونصیحت کیجئے اگر نصیحت نفع دیتی ہو، یہ الفاظ اگر چہ شرط کے آئے ہیں مگر درحقیقت مقصود کوئی شرط نہیں، بلکہ اس کا تاکیدی حکم دینا ہے جس کی مثال ہمارے عرف میں یہ ہے کہ کسی شخص کو بطور تنبیہ کے کہا جائے کہ اگر تو آدمی ہے تو فلاں کام کرنا ہوگا ، یا اگر تو فلاں کا بیٹا ہے تو تجھے ایسا کرنا چاہئے، یہاں مقصود شرط نہیں ہوتی، بلکہ اس کا اظہار ہوتا ہے کہ جب تو آدمی زاد ہے یا جبکہ تو فلاں بزرگ یا شریف آدمی کا بیٹا ہے تو تجھ پر یہ کلام لازم ہے، مطلب یہ ہے کہ نصیحت وتبلیغ کا نافع ومفید ہونا تو متعین اور متیقن ہے اس لئے اس نافع چیز کو آپ کسی وقت نہ چھوڑیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وحی کو یادرکھنا آسان ہوجائے گا اور اللہ کی معرفت وعبادت اور ملک وملت کی سیاست کے طریقے سب سہل کردیے جائیں گے اور کامیابی کے راستہ سے تمام مشکلات ہٹادی جائیں گی۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ نے جب آپ پر ایسے انعام فرمائے، آپ دوسروں کو فیض پہنچایئے اور اپنے کمال سے دوسروں کی تکمیل کیجئے۔

تنبیہ: ان نفعت الذکری کی شرط اس لئے لگائی کہ تذکیر ووعظ اس وقت لازم ہے جب مخاطب کی طرف سے اس کا قبول کرنا مظنون ہو، اور منصب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا، وعظ وتذکیر ہر شخص کے لئے نہیں، ہاں! تبلیغ وانذار (یعنی حکم الٰہی کا پہنچانا اور اللہ کے عذاب سے ڈرانا) تاکہ بندوں پر حجت قائم ہو اور عذر جہل ونادانی کا نہ رہے اتنا باعتبار ہر شخص کے ضرور ہے، اس کو عرف میں تذکیر ووعظ نہیں کہتے، شاید اسی لئے بعض مفسرین نے زیادہ واضح الفاظ میں آیت کے معنی یوں کئے ہیں کہ بار بار نصیحت کر (اگر ایک بار کی نصیحت نے نفع نہ کیا ہو) اور ہوسکتا ہے کہ **ان نفعت الذکری** کی شرط محض تذکیر کی تاکید کے لئے ہو، یعنی اگر کسی کو تذکیر نفع دے تو تجھ کو تذکیر کرنا چاہیے اور یقین بات ہے کہ تذکیر عالم میں کسی نہ کسی کو ضرور نفع دے گی گو ہر کسی کو نہ دے، کما قال تعالیٰ: (وَذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰی تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (الذاریات:۵۵) پس ایک امر کا ایسی چیز پر معلق کرنا جس کا وقوع ضروری ہے اس امر کی تاکید کا موجب ہوا۔

سَيَذَّكَّرُ مَنۡ يَّخۡشٰی ﴿۱۰﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا الۡاَشۡقَی ﴿۱۱﴾ الَّذِیۡ يَصۡلَی النَّارَ الۡكُبۡرٰی ﴿۱۲﴾

سمجھ جائے گا جس کو ڈر ہوگا ۱ اور یکسو رہے گا اس سے بڑا بدقسمت، وہ جو داخل ہوگا بڑی آگ میں ۲

ثُمَّ لَا يَمُوۡتُ فِيۡهَا وَلَا يَحۡيٰی ﴿۱۳﴾

پھر نہ مرے گا اس میں اور نہ جیے گا ۳

خلاصہ تفسیر: (مگر اس کے باوجود کہ نصیحت اپنی ذات میں نافع ومفید ہے اس سے یہ نہ سمجھے کہ وہ سب ہی کے لئے مفید ہوگی اور سب ہی اس کو مان لیں گے بلکہ) وہی شخص نصیحت مانتا ہے جو (خدا سے) ڈرتا ہے اور جو سخت بدنصیب ہے وہ اس سے گریز کرتا ہے جو (آخرکار) بڑی آگ میں (یعنی دوزخ کی آگ میں جو دنیا کی سب آگوں سے بڑی ہے) داخل ہوگا پھر (اس سے بڑھ کر یہ کہ) نہ اس میں مرہی جائے گا اور نہ (آرام کی زندگی) جیے گا (یعنی جس جگہ نصیحت قبول کرنے کی شرط موجود نہیں ہوتی وہاں اگر چہ اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا، مگر نصیحت اپنی ذات کے اعتبار سے نافع ومفید ہی ہے، اور آپ کے ذمہ اس کے واجب ہونے کے لئے یہی کافی ہے)۔

سورت کے شروع سے یہاں تک کا خلاصہ یہ ہوا کہ آپ اپنی بھی تکمیل کیجیے اور دوسروں کو بھی اس کی تبلیغ کیجیے کہ ہم آپ کے معاون ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ سمجھانے سے وہ ہی سمجھتا ہے اور نصیحت سے وہ ہی فائدہ اٹھاتا ہے، جسکے دل میں تھوڑا بہت خدا کا ڈر اور اپنے انجام کی فکر ہو۔

فائدہ: ۲ یعنی جس بدقسمت کے نصیب میں دوزخ کی آگ لکھی ہے وہ کہاں سمجھتا ہے، اسے خدا کا اور اپنے انجام کا ڈر ہی نہیں جو نصیحت کی طرف متوجہ ہو اور ٹھیک بات سمجھنے کی کوشش کرے۔

فائدہ: ۳ یعنی نہ موت ہی آئے گی کہ تکلیفوں کا خاتمہ کردے اور نہ آرام کی زندگی ہی نصیب ہوگی، ہاں ایسی زندگی ہوگی جس کے مقابلہ میں موت کی تمنا کرے گا، العیاذ باللہ۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾

بیشک بھلا ہوا اُس کا جو سنورا ۱ اور لیا اس نے نام اپنے رب کا پھر نماز پڑھی ۲ کوئی نہیں تم بڑھاتے ہو دنیا کے جینے کو

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ ع

اور پچھلا گھر بہتر ہے اور باقی رہنے والا ۳ یہ لکھا ہوا ہے پہلے ورقوں میں، صحیفوں میں ابراہیم کے اور موسیٰ (علیہما السلام) کے ۴

خلاصہ تفسیر: (اب آگے نصیحت ماننے والوں کی حالت قدرے تفصیل سے مذکور ہے) بامراد ہوا جو شخص (قرآن سن کر باطل عقائد اور گندے اخلاق سے) پاک ہوگیا اور اپنے رب کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا (مگر اے منکرو! تم قرآن سن کر اس کو نہیں مانتے اور آخرت کا سامان نہیں کرتے) بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہا بہتر اور پائیدار ہے (اور یہ مضمون صرف قرآن ہی کا دعویٰ نہیں بلکہ) یہ مضمون اگلے صحیفوں میں بھی ہے، یعنی ابراہیم وموسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں۔

صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى: روح المعانی میں حدیث مرفوع مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے نزول سے پہلے دس صحیفے نازل ہوئے۔

* * *

فائدہ: ۱ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى: یعنی ظاہری و باطنی، حسی و معنوی نجاستوں سے پاک ہوا اور اپنے قلب و قالب کو عقائد صحیحہ، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ سے آراستہ کیا۔

فائدہ: ۲ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى: یعنی پاک وصاف ہو کر تکبیر تحریمہ میں اپنے رب کا نام لیا، پھر نماز پڑھی، اور بعض سلف نے کہا کہ **تزکی** "زکوٰۃ" سے ہے جس سے مراد یہاں "صدقۃ الفطر" ہے، اور **وذکر اسم ربہ** سے تکبیرات عید مراد ہیں، اور **فصلی** پھر تکبیریں، پھر نماز، **والظاهر هو الاول**، حنفیہ نے پہلی تفسیر کے موافق اس آیت سے دو مسئلے نکالے ہیں: ① اول یہ کہ تحریمہ میں خاص لفظ "اللہ اکبر" کہنا فرض نہیں، مطلق ذکر اسم رب کافی ہے جو مشعر تعظیم ہو اور اپنی غرض وحاجت پر مشتمل نہ ہو، ہاں "اللہ اکبر" کہنا احادیث صحیحہ کی بناء پر سنت یا واجب قرار پائے گا ② دوسرے تکبیر تحریمہ نماز کے لئے شرط ہے رکن نہیں، کیونکہ **فصلی** کا **ذکر اسم ربہ** پر عطف کرنا معطوف ومعطوف علیہ کی مغائرت پر دال ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى: یعنی یہ بھلائی تم کو کیسے حاصل ہو جب کہ آخرت کی فکر ہی نہیں بلکہ دنیا کی زندگی اور یہاں کے عیش وآرام کو اعتقاداً یا عملاً آخرت پر ترجیح دیتے ہو، حالانکہ دنیا حقیر وفانی اور آخرت اس سے کہیں بہتر اور پائیدار ہے، پھر تعجب ہے کہ جو چیز کماً وکیفاً ہر طرح افضل ہو اسے چھوڑ کر مفضول کو اختیار کیا جائے۔

فائدہ: ۴ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى: یعنی یہ مضمون (قد افلح من تزکی سے یہاں تک) اگلی کتابوں میں بھی مذکور ہے جو کسی وقت منسوخ نہیں ہوا، نہ بدلہ گیا، اس اعتبار سے اور زیادہ مؤکدہ ہوگیا، بعض روایات ضعیفہ میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے اور موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے علاوہ دس صحیفے نازل ہوئے تھے خدا جانے کہاں تک صحیح ہے۔

• اٰیاتھا ٢٦ • • ٨٨ سُوۡرَۃُ الۡغَاشِیَۃِ مَکِّیَّۃٌ ٦٨ • • رکوعھا ١ •

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت میں آخرت کی تیاری کرنے کا حکم تھا، اس سورت میں آخرت کی تیاری کرنے اور نہ کرنے والے کی جزاوسزا کا ذکر مقصود ہے، اور قیامت کو ثابت کرنے کے لیے قدرت کا بیان ہے، اور کفار اس کا انکار کرتے تھے جس سے حضور ﷺ کو رنج ہوتا تھا اس پر آپ ﷺ کو تسلی دی گئی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ الۡغَاشِيَةِ ؕ‏ ﴿١﴾ وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۙ‏ ﴿٢﴾ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ‏ ﴿٣﴾ تَصۡلٰى نَارًا حَامِيَةً ۙ‏ ﴿٤﴾

کچھ پہنچی تجھ کو بات اس چھپا لینے والی کی ١۔ کتنے منہ اس دن ذلیل ہونے والے ہیں، محنت کرنے والے تھکے ہوئے ٢۔ گریں گے دہکتی ہوئی آگ میں

تُسۡقٰى مِنۡ عَيۡنٍ اٰنِيَةٍ ؕ‏ ﴿٥﴾ لَيۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ ضَرِيۡعٍ ۙ‏ ﴿٦﴾ لَّا يُسۡمِنُ وَلَا يُغۡنِىۡ مِنۡ جُوۡعٍ ؕ‏ ﴿٧﴾

پانی ملے گا ایک چشمے کھولتے ہوئے کا ٣۔ نہیں ان کے پاس کھانا مگر جھاڑ کانٹوں والا ٤۔ نہ موٹا کرے اور نہ کام آئے بھوک میں ٥۔

خلاصہ تفسیر: آپ کو اس محیط عام واقعہ کی کچھ خبر پہنچی ہے (مراد اس سے قیامت کا واقعہ ہے کہ اس کا اثر تمام عالم کو محیط ہوگا اور سوال سے مقصود شوق دلانا ہے جس سے کلام کے سننے کا اہتمام پیدا ہو، آگے جواب کی صورت میں اس خبر کی تفصیل ہے یعنی) بہت سے چہرے اس روز ذلیل (اور) مصیبت جھیلتے (مصیبت جھیلنے سے) خستہ (اور درماندہ) ہوں گے (اور) آتش سوزاں میں داخل ہوں گے (اور) کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلائے جائیں گے (اور) ان کو بجز ایک خاردار جھاڑ کے اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا، جو نہ (تو کھانے والوں کو) فربہ کرے گا اور نہ (ان کی) بھوک کو دفع کر دے گا (یعنی نہ اس میں غذا بننے کی صلاحیت ہے نہ بھوک ختم کرنے کی)۔

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ: مصیبت جھیلنے سے مراد حشر کے دن پریشان پھرنا اور دوزخ میں سلاسل اور اغلال کو اپنے اوپر لادنا، دوزخ کے پہاڑوں پر چڑھنا اور ان کاموں کے اثرات سے تھکنا اور درماندہ ہونا ظاہر ہے، بعض روایات سے اس آیت کا اہل باطل کے عبادت گذاروں کے بارے میں ہونا معلوم ہوتا ہے کہ محنت ہی محت پڑتی ہے اور انجام صرف جہنم، تو جو شخص بدعت وگمراہی کی حالت میں عبادت کرتا ہو لیکن صراط مستقیم پر نہ ہو تو وہ بھی اسی میں داخل ہے۔

عَيۡنٍ اٰنِيَةٍ: کھولتا ہوا چشمہ وہی جس کو دوسری آیتوں میں حمیم فرمایا ہے، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اسکا بھی چشمہ ہوگا۔

لَيۡسَ لَهُمۡ طَعَامٌ اِلَّا مِنۡ ضَرِيۡعٍ: یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے گا کہ گھاس درخت تو آگ سے جل جانے الی چیزیں ہیں، جہنم میں یہ کیسے رہیں گی؟ جواب یہ ہے کہ جس خالق ومالک نے ان کو دنیا میں پانی اور ہوا سے پالا ہے اس کو یہ بھی قدرت ہے کہ جہنم میں ان درختوں کی غذا آگ ہی بنا دے وہ اسی سے پھلیں پھولیں۔

دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن میں اہل جہنم کی غذا کے بارے میں مختلف چیزوں کا ذکر آیا ہے، یہاں ان کی غذا ''ضریع'' یعنی خاردار جھاڑی بتلائی ہے، دوسری جگہ زقوم اور تیسری جگہ غسلین، تو اس آیت میں جو حصر کیساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اہل جہنم کو کوئی غذا بجز ضریع کے نہ دی جائے گی، یہ حصر بمقابلہ اس غذا کے ہے جو کھانے کے لائق خوشگوار جزء بدن بننے والی ہو اور ''ضریع'' بطور مثال کے لایا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اہل جہنم کو کوئی کھانے کے لائق غذا یا لذیذ کھانا نہیں ملے گا، بلکہ ضریع جیسی تکلیف دہ مضر چیزیں ہی دی جائیں گی اس لئے ضریع میں حصر مقصود نہیں بلکہ زقوم اور غسلین بھی ضریع

میں شامل ہیں اور قرطبی نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ جہنم کے مختلف درکات طبقات میں ان کی مختلف غذائیں ہوں کہیں ضریع کہیں زقوم کہیں غسلین ۔

* * *

فائدہ: ۱؎ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ: یعنی وہ بات سننے کے لائق ہے، غاشیۃ (چھپالینے والی) سے مراد قیامت ہے جو تمام مخلوق پر چھا جائے گی اور جس کا اثر سارے عالم پر محیط ہوگا۔

فائدہ: ۲؎ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ: یعنی آخرت میں مصیبتیں جھیلنے والے اور مصیبت جھیلنے کی وجہ سے خستہ ودرماندہ، اور بعض نے کہا کہ عاملة ناصبة سے دنیا کا حال مراد ہے، یعنی کتنے لوگ ہیں جو دنیا میں محنتیں کرتے کرتے تھک جاتے ہیں مگر ان کی سب محنتیں طریق حق پر نہ ہونے کی وجہ سے سب اکارت ہیں، یہاں بھی تکلیفیں اٹھائیں اور وہاں بھی مصیبت میں رہے خسر الدنیا والاخرة اسی کو کہتے ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ’’(کافرلوگ) جو دنیا میں (بڑی بڑی) ریاضت کرتے ہیں (اللہ کے ہاں) کچھ قبول نہیں ہوتی‘‘۔

فائدہ: ۳؎ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ: یعنی جب دوزخ کی گرمی ان کے باطن میں سخت تشنگی پیدا کرے گی، بے اختیار پیاس پکاریں گے کہ شاید پانی پینے سے یہ تشنگی دور ہو، اس وقت ایک گرم کھولتے ہوگے چشمہ کا پانی دیا جائے گا جس کے پیتے ہی ہونٹ کباب ہوجائیں گے، اور آنتیں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر پڑیں گی، پھر فوراً درست کی جائیں گی اور اسی طرح ہمیشہ عذاب میں گرفتار رہیں گے، العیاذ باللہ۔

فائدہ: ۴؎ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ: ضریع ایک خاردار درخت ہے دوزخ میں جو تلخی میں ایلوے سے زیادہ اور بدبو میں مردار سے بدتر اور گرمی میں آگ سے بڑھ کر ہے، جب دوزخی بھوک کے عذاب سے چلائیں گے تو یہ چیز کھانے کو دی جائے گی۔

فائدہ: ۵؎ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ: کھانے سے مقصود یا محض لذت حاصل کرنا ہوتا ہے، یا بدن کو فربہ کرنا، یا بھوک کو دفع کرنا، ضریع کے کھانے سے کوئی بات حاصل نہ ہوگی، لذت ومزہ کی نفی تو اس کے نام سے ظاہر ہے، رہے باقی دو فائدے ان کی نفی اس آیت میں تصریحاً کردی، غرض کوئی لذیذ ومرغوب کھانا ان کو میسر نہ ہوگا، یہاں تک دوزخیوں کا حال تھا، آگے ان کے بالمقابل جنتیوں کا ذکر ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿۸﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿۹﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۱۰﴾

کتنے منہ اس دن تروتازہ ہیں، اپنی کمائی سے راضی ۱؎ اونچے باغ میں

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿۱۱﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿۱۳﴾ وقف لازم

نہیں سنتے اس میں بکواس ۲؎ اس میں ایک چشمہ ہے بہتا ۳؎ اس میں تخت ہیں اونچے بچھے ہوئے

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿۱۵﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿۱۶﴾

اور آبخورے سامنے چنے ہوئے ۴؎ اور غالیچے برابر بچھے ہوئے ۵؎ اور مخمل کے نہالچے جگہ جگہ پھیلے ہوئے ۶؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے دوزخیوں کا حال ہوا، اب آگے اہل جنت کا حال ہے یعنی) بہت سے چہرے اس روز بارونق (اور) اپنے نیک کاموں کی بدولت خوش ہوں گے (اور) بہشت بریں میں ہوں گے، جن میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے (اور) اس (بہشت) میں بہتے ہوئے چشمے ہوں گے (اور) اس (بہشت) میں اونچے اونچے تخت (بچھے) ہیں، اور رکھے ہوئے آبخورے (موجود) ہیں (یعنی یہ سامان اس کے سامنے ہی موجود ہوگا تاکہ جب پانی کو جی چاہے دیر نہ لگے) اور برابر لگے ہوئے گدے (تکیے) ہیں اور سب طرف قالین (ہی قالین) پھیلے پڑے ہیں (کہ جہاں چاہیں آرام کرلیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بھی نہ پڑے یہ تفصیل ہوئی جزا کی)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ لِّسَعۡيِهَا رَاضِيَةٌ: یعنی خوش ہوں گے کہ اپنی کوشش ٹھکانے لگی اور محنت کا پھل بہت خوب ملا۔

فائدہ: ۲۔ لَّا تَسۡمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً: یعنی کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے چہ جائیکہ گالی گفتار اور ذلت کی بات ہو۔

فائدہ: ۳۔ فِيهَا عَيۡنٌ جَارِيَةٌ: یعنی ایک عجیب طرح کا چشمہ، اور بعض نے اس کو جنس پر حمل کیا ہے، یعنی بہت سے چشمے بہ رہے ہیں۔

فائدہ: ۴۔ وَّأَكۡوَابٌ مَّوۡضُوعَةٌ: کہ جب پینے کو جی چاہے دیر نہ لگے۔

فائدہ: ۵۔ وَّنَمَارِقُ مَصۡفُوفَةٌ: یعنی نہایت قرینے اور ترتیب سے بچھے ہوئے، اور گاؤ تکیے لگے ہوئے۔

فائدہ: ۶۔ وَّزَرَابِيُّ مَبۡثُوثَةٌ: تاکہ جس وقت جہاں چاہیں آرام کریں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی کلفت نہ اٹھائیں۔

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الۡإِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ ﴿١٧﴾ وَإِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ ﴿١٨﴾

بھلا کیا نظر نہیں کرتے اونٹوں پر کہ کیسے بنائے ہیں ۱۔ اور آسمان پر کہ کیسا اس کو بلند کیا ہے ۲۔

وَإِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ ﴿١٩﴾ وَإِلَى الۡأَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ ﴿٢٠﴾

اور پہاڑوں پر کہ کیسے کھڑے کر دیے ہیں ۳۔ اور زمین پر کہ کیسی صاف بچھائی ہے ۴۔

خلاصہ تفسیر: (ان مذکورہ مضامین کو سن کر جو بعض لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں جس میں یہ سب واقعات ہوں گے تو ان کی غلطی ہے کیونکہ) کیا وہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح (عجیب طور پر) پیدا کیا گیا (کہ ہیئت اور خاصیت دونوں دیگر جانوروں کی بہ نسبت اس میں عجیب ہیں) اور آسمان کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے، اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح کھڑے کئے گئے، اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کس طرح بچھائی گئی ہے (یعنی ان چیزوں کو دیکھ کر قدرت الہیہ پر استدلال نہیں کرتے تاکہ اس کا بعث یعنی قیامت پر قادر ہونا سمجھ لیتے)۔

ان چار چیزوں کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ عرب کے لوگ اکثر جنگلوں میں چلتے پھرتے رہتے تھے، اس وقت ان کے سامنے اونٹ ہوتے تھے، اوپر آسمان اور نیچے زمین اور اطراف میں پہاڑ، اس لئے ان علامات میں غور کرنے کیلئے ارشاد فرمایا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الۡإِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ: کہ ہیئت اور خاصیت دونوں اور جانوروں کی نسبت اس میں عجیب ہیں جن کی تفصیل تفسیر عزیزی میں دیکھنے کے قابل ہے۔

فائدہ: ۲۔ وَإِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ: بدون ظاہری ستون اور کھمبے کے۔

فائدہ: ۳۔ وَإِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ: کہ ذرا اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتے۔

فائدہ: ۴۔ وَإِلَى الۡأَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ: کہ اپنی کلانی کے سبب باوجود کروی الشکل ہونے کے مسطح معلوم ہوتی ہے، اسی لئے اس پر رہنا سہنا آسان ہو گیا، یہ سب دلائل قدرت بیان ہوئے، یعنی تعجب ہے ان چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکیمانہ انتظامات کو نہیں سمجھتے جس سے بعثت بعد الموت پر اس کا قادر ہونا اور عالم آخرت کے عجیب وغریب انتظامات کا ممکن ہونا سمجھ میں آجاتا، اور تخصیص ان چیزوں کی بقول ابن کثیر اس لئے ہے کہ عرب کے لوگ اکثر جنگلوں میں چلتے پھرتے تھے، اس وقت ان کے سامنے بیشتر یہی چار چیزیں ہوتی تھیں، سواری میں اونٹ، اوپر آسمان نیچے زمین، اردگرد پہاڑ، اس لئے انہی علامات میں غور کرنے کے لئے ارشاد ہوا۔

فَذَكِّرۡ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسۡتَ عَلَيۡهِم بِمُصَيۡطِرٍ ﴿٢٢﴾ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾

سو تو سمجھائے جا تیرا کام تو یہی سمجھانا ہے، تو نہیں ان پر داروغہ ۱۔ مگر جس نے منہ موڑا اور منکر ہو گیا

فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾ ع

تو عذاب کرے گا اس پر اللہ وہ بڑا عذاب، بیشک ہمارے پاس ہے ان کو پھر آنا، پھر بیشک ہمارا ذمہ ہے ان سے حساب لینا ۲

خلاصہ تفسیر: (اور جب یہ لوگ واضح دلائل قائم ہونے کے باوجود غور نہیں کرتے) تو آپ (بھی ان کی فکر میں زیادہ نہ پڑیئے، بلکہ صرف) نصیحت کر دیا کیجئے (کیونکہ) آپ تو بس صرف نصیحت کرنے والے ہیں (اور) آپ ان پر مسلط نہیں ہیں (جو زیادہ فکر میں پڑیں) ہاں! مگر جو روگردانی اور کفر کرے گا تو خدا اُس کو (آخرت میں) بڑی سزا دے گا (کیونکہ) ہمارے ہی پاس ان کا آنا ہوگا، پھر ہمارا ہی کام ان سے حساب لینا ہے (آپ زیادہ غم میں نہ پڑیئے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جب یہ لوگ باوجود قیام دلائل واضحہ غور نہیں کرتے تو آپ ﷺ بھی ان کی فکر میں زیادہ نہ پڑیے، بلکہ صرف نصیحت کر دیا کیجئے، کیونکہ آپ ﷺ نصیحت کرنے اور سمجھانے کے لئے بھیجے گئے ہیں، اگر یہ نہیں سمجھتے تو کوئی آپ ﷺ ان پر داروغہ بنا کر مسلط نہیں کئے گئے کہ زبردستی منوا کر چھوڑیں، اور ان کے دلوں کو بدل ڈالیں، یہ کام مقلب القلوب ہی کا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی جس نے اللہ کی طاعت سے روگردانی کی اور اس کی آیتوں کا انکار کیا وہ آخرت کے بڑے عذاب اور اللہ کی سخت ترین سزا سے بچ نہیں سکتا، یقیناً ان کو ایک روز ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہم کو ان سے رتی رتی کا حساب لینا ہے، غرض آپ ﷺ اپنا فرض ادا کئے جایئے اور ان کا مستقبل ہمارے سپرد کیجئے۔

ایاتها ۳۰ | ۸۹ سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ ۱۰ | رکوعها ۱

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں جزا و سزا کا بیان تھا، اس سورت میں بڑا مقصود مؤمنین کے ان اعمال کو بیان کرنا ہے جو ثواب کا باعث ہوتے ہیں، اور شروع میں بعض ہلاک شدہ امتوں کا ذکر ہے جن کے برے اعمال سزا کا سبب بن گئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ﴿۴﴾

قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی، اور جفت اور طاق کی، اور اس رات کی جب رات کو چلے ۱

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾

ہے ان چیزوں کی قسم پوری عقل مندوں کے واسطے ۲

خلاصہ تفسیر: قسم ہے (فجر کے وقت) کی اور (ذی الحجہ کی) دس راتوں (یعنی دس تاریخوں) کی (کہ وہ نہایت فضیلت والی ہیں) اور جفت کی اور طاق کی (جفت سے مراد ذی الحجہ کی دسویں تاریخ اور طاق سے نویں تاریخ مراد ہے حدیث میں یہی تفسیر کی گی ہے) اور (قسم ہے) رات کی جب وہ چلنے لگے (یعنی گزرنے لگے جیسا کہ ارشاد ہے: **والیل اذا ادبر**، آگے جملہ معترضہ کے طور پر تاکید کے لئے اس قسم کا عظیم ہونا بیان فرماتے ہیں کہ) کیوں اس (مذکورہ قسم) میں عقل مند کے واسطے کافی قسم بھی ہے (یہ استفہام مذکورہ قسموں کی تاکید کے لیے ہے، جواب قسم مقدر ہے کہ "منکروں کو ضرور سزا ہوگی" کمافی الجلالین جواب قسم پر اگلا کلام قرینہ ہے جس میں گزشتہ زمانہ کے کافروں کی سزا کا ذکر ہے)۔

وَّالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ :اور ایک حدیث میں ہے کہ اس سے نماز مراد ہے کہ کسی کی طاق رکعتیں ہیں کسی کی جفت، اور پہلی حدیث کو روایۃً بھی اصح کہا گیا ہے اور درایۃً بھی وہ ارجح ہے، کیونکہ اس سورت میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی وہ سب زمانے اور اوقات کی قسم سے ہیں، درمیان میں جفت اور طاق بھی اوقات ہی کی قسم سے ہو تو تناسب واضح رہتا ہے اور یہ تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ شفع اور وتر سے مراد ہر وہ جفت اور طاق ہوں جو لائق تعظیم ہیں، اوقات و ایام بھی اس میں داخل ہیں اور نماز کی رکعتوں کا عدد بھی۔

هَلۡ فِيۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ : یہ استفہام بیان کی گئی قسموں کی تقریر و تاکید کے لئے ہے، یعنی ان مذکورہ قسموں میں سے ہر قسم تاکید کلام کے لئے کافی ہے اور اگرچہ سب قسمیں جو قرآن میں مذکور ہیں ایسی ہی ہیں، مگر اہتمام کے لئے یہاں ان کے کافی ہونے کی تصریح بھی فرما دی جیسا کہ سورہ واقعہ میں گزر چکا ہے: **وانه لقسم لو تعلمون عظيم**، یہاں قسم اور جواب قسم میں یہ مناسبت ہو سکتی ہے کہ ان قسموں میں مذکور سب باتیں تصرفات الٰہی کے دلائل ہیں جن کا تقاضہ اور مطالبہ ایمان و اطاعت کا وجوب ہے اور واجب کے چھوڑنے پر عذاب کا مرتب ہونا ظاہر ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''عید قربان کی فجر بڑا حج ادا ہوتا ہے اور دس رات اس سے پہلے، اور جفت اور طاق رمضان کی آخری (عشرہ) دہائی میں ہے، اور جب رات کو چلے یعنی پیغمبر معراج کو''، یہ سب اوقات متبرک تھے اس لئے ان کی قسم کھائی۔

تنبیہ: والیل اذا یسر کے معنی عموماً مفسرین نے رات کے گزرنے یا اس کی تاریکی پھیلنے کے لئے ہیں، گویا صبح کی قسم کے مقابلہ میں رات کے جانے یا آنے کی قسم کھائی جیسا کہ جفت کے مقابل طاق کی قسم کھائی گئی، اور **ولیال عشر** سے بھی ممکن ہے مطلق دس راتیں مراد ہوں، کیونکہ اس کے افراد و مصادیق میں بھی تقابل پایا جاتا ہے، مہینہ کے شروع کی دس راتیں اول روشن ہوتی ہیں پھر تاریک، اور اخیر کی دس راتیں ابتداء میں تاریک رہتی ہیں پھر روشن ہوتی ہیں، اور درمیانی دس راتوں کا حال ان دونوں سے جداگانہ ہے، گویا اس اختلاف و تقابل سے اشارہ فرمادیا کہ آدمی کو عیش و آرام یا مصیبت اور تنگی یا فراخی کی جو حالت پیش آئے مطمئن نہ ہو جائے اور یوں نہ سمجھے کہ اب اس کے خلاف دوسری حالت پیش نہ آئے گی، اسے یاد رکھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ خالق اضداد ہے جس طرح وہ آفاق میں ایک ضد کے مقابل دوسری ضد کو لاتا ہے ایسے ہی تمہارے حالات و کوائف کو بھی اپنی حکمت و مصلحت کے موافق ادل بدل کرتا رہتا ہے، چنانچہ آگے جو واقعات و مضامین مذکور ہیں ان میں اسی اصول پر متنبہ فرمایا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں دو حدیثیں مرفوع آئی ہیں جابر کی اور عمران بن حصین کی، حافظ ابن کثیر پہلی کی نسبت لکھتے ہیں: "وهذا اسناد رجاله لا باس بهم وعندى ان المتن فى رفعه نكارة"، اور دوسری کی نسبت فرماتے ہیں: "وعندى ان وقفه على عمران بن حصين اشبه"، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یہ قسمیں معمولی نہیں نہایت معتبر اور مہتم بالشان ہیں اور عقلمند لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ تاکید کلام کے لئے ان میں ایک خاص عظمت و وقعت پائی جاتی ہے۔

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۙ⑥ اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ ۙ⑦ الَّتِيۡ لَمۡ يُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِي الۡبِلَادِ ۙ⑧

تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے عاد کے ساتھ، وہ جو ارم میں تھے ۱؎ بڑے ستونوں والے ۲؎ کہ بنی نہیں ویسی سارے شہروں میں ۳؎

خلاصہ تفسیر: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قوم عاد یعنی قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قد و قامت ستون (وعمود) جیسے (دراز) تھے (اور) جن کی برابر (زور و قوت میں دنیا بھر کے) شہروں میں کوئی شخص نہیں پیدا کیا گیا۔

اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ: اس قوم کے دو لقب ہیں: ① عاد ② ارم، کیونکہ عاد بیٹا ہے عاص کا، اور عاص بیٹا ہے ارم کا، اور ارم بیٹا ہے سام بن نوح کا، کبھی ان کو باپ کے نام پر عاد کہتے ہیں اور کبھی دادا کے نام پر ارم کہتے ہیں، اور اس ارم کا ایک بیٹا عابر ہے اور عابر کا بیٹا ثمود جس کے نام سے ایک قوم مشہور ہے، پس عاد اور ثمود دونوں ارم میں جا ملتے ہیں، عاد بواسطہ عاص کے اور ثمود بواسطہ عابر کے، یہاں لفظ ''ارم'' اس لئے بڑھا دیا کہ اس قوم عاد میں

دو طبقے ہیں: ① ایک متقدمین جن کو ''عاد اولیٰ'' کہتے ہیں ② دوسرے متاخرین جن کو ''عاد اخری'' کہتے ہیں، پس ارم بڑھا دینے سے اشارہ ہو گیا کہ عاد اولیٰ مراد ہے، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ عاد ایک شخص کا نام ہے جس کی طرف یہ قوم منسوب ہوئی، اس کے اجداد میں سے ایک شخص ارم نامی تھا، اس کی طرف نسبت کرنے سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ یہاں عاد سے ''عاد اولیٰ'' مراد ہے، عاد ثانیہ نہیں، اور بعض نے کہا قوم عاد میں جو شاہی خاندان تھا اسے ''ارم'' کہتے تھے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ستون کھڑے کر کے بڑی بڑی اونچی عمارتیں بناتے، یا مطلب ہے کہ اکثر سیر و سیاحت میں رہتے اور اونچے ستونوں پر خیمے تانتے تھے، اور بعض کے نزدیک ذات العماد کہہ کر ان کے اونچے قد و قامت اور ڈیل ڈول کو ستونوں سے تشبیہ دی ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اس وقت دنیا میں اس قوم جیسی کوئی قوم مضبوط و طاقتور نہ تھی، یا ان کی عمارتیں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔

وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝٩ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝١٠ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝١١

اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے تراشا پتھروں کو وادی میں ۱؎ اور فرعون کے ساتھ وہ میخوں والا ۲؎ یہ سب تھے جنہوں نے سر اٹھایا ملکوں میں

فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝١٢ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝١٣

پھر بہت ڈالی ان میں خرابی، پھر پھینکا ان پر تیرے رب نے کوڑا عذاب کا ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (آگے عاد کے بعد دوسری ہلاک ہونے والی امتوں کا بیان فرماتے ہیں کہ آپ کو معلوم ہے کہ) قوم ثمود کے ساتھ (کیا معاملہ کیا) جو وادی القریٰ میں (پہاڑ کے) پتھروں کو تراشا کرتے تھے (اور مکانات بنایا کرتے تھے) اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (آگے سب کافروں کی مشترکہ صفت بیان فرماتے ہیں کہ) جنہوں نے شہروں میں سر اٹھا رکھا تھا، اور ان میں بہت فساد مچا رکھا تھا، سو آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا (یعنی عذاب نازل کیا، پس عذاب کو کوڑے سے اور اس کے نازل کرنے کو برسانے سے تعبیر فرمایا)۔

وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ: وادی القریٰ ان کے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے جیسا کہ ایک کا نام حجر ہے، اور یہ سب حجاز اور شام کے درمیان میں ہیں اور سب میں ثمود رہتے تھے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ: درمنثور میں ابن مسعود وسعید بن جبیر ومجاہد وحسن وسدی سے اس کی تفسیر میں یہ منقول ہے کہ فرعون جس کو سزا دیتا اس کے چاروں ہاتھ پاؤں کو چار میخوں سے باندھ کر سزا دیا کرتا تھا، اس کی ایک تفسیر سورۃ ص آیت ۱۲: **وَفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ** کے تحت گزر چکی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ''وادی القریٰ'' ان کے مقام کا نام ہے جہاں پہاڑ کے پتھروں کو تراش کر نہایت محفوظ و مضبوط مکان بناتے تھے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بڑے لاؤ لشکر والا جس کو فوجی ضروریات کے لئے بہت کثیر مقدار میں میخیں رکھنا پڑتی تھیں یا یہ مطلب ہے کہ لوگوں کو چو میخا کر کے سزا دیتا تھا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ان قوموں نے عیش و دولت اور زور و قوت کے نشہ میں مست ہو کر ملکوں میں خوب اودھم مچایا، بڑی بڑی شرارتیں کیں اور ایسا سر اٹھایا گویا ان کے سروں پر کوئی حاکم ہی نہیں؟ ہمیشہ اسی حال میں رہنا ہے! کبھی اس ظلم و شرارت کا خمیازہ بھگتنا نہیں پڑے گا؟ آخر جب ان کے کفر و تکبر اور جور و ستم کا پیمانہ لبریز ہو گیا، اور مہلت و درگزر کا کوئی موقع باقی نہ رہا دفعتاً خداوند قہار نے ان پر اپنے عذاب کا کوڑا برسا دیا، ان کی سب قوت اور بڑائی خاک میں مل گئی اور وہ ساز و سامان کچھ کام نہ آیا۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿١٤﴾ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ

بیشک تیرا رب لگا ہے گھات میں ۱؎ سو آدمی جو ہے جب جانچے اس کو رب اس کا پھر اس کو عزت دے اور اس کو نعمت دے تو کہے

رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿١٦﴾

میرے رب نے مجھ کو عزت دی ۲؎ اور وہ جس وقت اسکو جانچے پھر کھینچ کرے اس پر روزی کی تو کہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا ۳؎

خلاصہ تفسیر: (آگے اس عذاب کی علت اور موجودہ کفار کی عبرت کے لئے ارشاد ہے کہ) بیشک آپ کا رب نافرمانوں کی گھات میں ہے (جن میں سے مذکورہ بالا قوموں کو تو ہلاک کر دیا اور موجودہ کفار کو عذاب کرنے والا ہے) سو (اس کا تقاضہ اور مطالبہ یہ تھا کہ موجودہ کفار عبرت پکڑتے اور ان اعمال سے بچتے جو عذاب کا سبب ہیں، لیکن کافر) آدمی (کا یہ حال ہے کہ ان اعمال کو اختیار کرتا ہے جو عذاب کا سبب ہیں، جن سب کی اصل حب دنیا ہے چنانچہ اس) کو جب اس کا پروردگار آزماتا ہے یعنی اس کو (ظاہری اعتبار سے) انعام اکرام دیتا ہے (مثل مال و جاہ وغیرہ جس سے مقصود اس کی شکر گزاری کا دیکھنا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو آزمانے سے تعبیر فرمایا) تو وہ (اس کو اپنا حق لازم سمجھ کر فخر و غرور سے) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر بڑھا دی (یعنی میں اس کا مقبول ہوں کہ مجھ کو ایسی ایسی نعمتیں دیں) اور جب اس کو (دوسری طرح) آزماتا ہے یعنی اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے (جس سے مقصود اس کے صبر و رضا کا دیکھنا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو آزمانے سے تعبیر فرمایا) تو وہ (شکایت کرتا ہے) کہتا ہے کہ میرے رب نے میری قدر گھٹا دی (یعنی مجھے اکرام کا مستحق ہونے کے باوجود اپنی نظر سے آج کل گرا رکھا ہے کہ دنیوی نعمتیں کم ہوگئیں)۔

مطلب یہ کہ کافر دنیا ہی کو مقصود بالذات سمجھتا ہے کہ اس کی فراخی کو اپنی مقبولیت کی دلیل اور اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھتا ہے، اور دنیا کی تنگی کو اپنے مردود ہونے کی دلیل اور اپنے آپ کو اس کا غیر مستحق سمجھتا ہے پس اس میں دو غلطیاں ہیں: ① ایک دنیا کو مقصود بالذات سمجھنا جس سے آخرت کا انکار اور اس سے اعراض پیدا ہوتا ہے ② دوسرے اپنا مستحق ہونے کا دعویٰ جس سے نعمت پر فخر و غرور، اور ناشکری اور مصیبت پر شکوہ اور بے صبری پیدا ہوتی ہوتی ہے اور یہ سب اعمال عذاب کا سبب ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا میں رزق کی کشادگی اور تنگی اللہ کے نزدیک مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں، یہاں ''انسان'' سے مراد اصل میں تو کافر انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق جو چاہے خیال باندھ لے، مگر مفہوم عام کے اعتبار سے وہ مسلمان بھی اس خطاب میں شریک ہے جو اس جیسے خیال میں مبتلا ہو، اور وہ خیال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے رزق میں وسعت اور مال و دولت صحت و تندرستی سے نوازے تو شیطان اس کو دو باطل خیالات میں مبتلا کرتا ہے: ① اول یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ میری ذاتی صلاحیت اور عقل و فہم اور سعی و عمل کا لازمی نتیجہ ہے جو مجھے ملنا ہی چاہئے، میں اس کا مستحق ہوں ② دوسرے یہ کہ ان چیزوں کے حاصل ہونے سے یہ قرار دے کہ میں اللہ کے نزدیک بھی مقبول ہوں، اگر مردود ہوتا تو وہ مجھے یہ نعمتیں کیوں دیتا، اسی طرح جب کسی انسان پر رزق میں تنگی اور فقر و فاقہ آ جائے تو اس کو اللہ کے نزدیک مردود ہونے کی دلیل سمجھے اور اس پر اس لئے خفا ہو کہ میں تو مستحق انعام و اکرام کا تھا مجھے بے وجہ ذلیل و حقیر کر دیا، ایسے خیالات کفار و مشرکین میں تو ہوتے ہی تھے اور قرآن کریم میں کئی جگہ کفار کے ان خیالات کا اظہار مذکور بھی ہے، افسوس ہے کہ آج کل بہت سے مسلمان بھی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حق تعالیٰ نے ان آیات میں ایسے انسانوں کا حال ذکر کرنے کے بعد فرمایا: کَلَّا یعنی تمہارا یہ خیال بالکل باطل بے بنیاد ہے، نہ دنیا میں وسعت رزق نیک اور مقبول عند اللہ ہونے کی علامت ہے اور نہ تنگی رزق اور فقر و فاقہ اللہ کے نزدیک مردود یا ذلیل ہونے کی علامت ہے، بلکہ اکثر معاملہ برعکس ہوتا ہے فرعون کو دعوائے خدائی کے ساتھ کبھی دردِ سر بھی نہ ہوا اور بعض پیغمبروں کو دشمنوں نے آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرات مہاجرین میں سے جو فقیر و مفلس تھے وہ اغنیا مہاجرین سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ سے محبت فرماتے

ہیں اس کو دنیا سے ایسا پرہیز کراتے ہیں جیسے تم لوگ اپنے بیمار کو پانی سے پرہیز کراتے ہو۔

* * *

فائدہ: لے یعنی جیسے کوئی شخص گھات میں پوشیدہ رہ کر آنے جانے والوں کی خبر رکھتا ہے کہ فلاں کیونکر گزرا اور کیا کرتا ہوا گیا، اور فلاں کیا لایا اور کیا لے گیا، پھر وقت آنے پر اپنی ان معلومات کے موافق معاملہ کرتا ہے، اسی طرح سمجھ لو کہ حق تعالیٰ انسانوں کی آنکھوں سے پوشیدہ رہ کر سب بندوں کے ذرہ ذرہ احوال واعمال دیکھتا ہے، کوئی حرکت وسکون اس سے مخفی نہیں، ہاں سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، غافل بندے سمجھتے ہیں کہ بس کوئی دیکھنے اور پوچھنے والا نہیں جو چاہو بے دھڑک کئے جاؤ، حالانکہ وقت آنے پر ان کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتا ہے اور ہر ایک سے انہی اعمال کے موافق معاملہ کرتا ہے جو شروع سے اس کے زیر نظر تھے، اس وقت پتہ لگتا ہے کہ وہ سب ڈھیل تھی اور بندوں کا امتحان تھا کہ دیکھیں کن حالات میں کیا کچھ کرتے ہیں اور ایک عارضی حالت پر نظر کر کے آخری انجام کو تو نہیں بھولتے۔

فائدہ: ۲ یعنی میں اسی لائق تھا، اس لیے عزت دی۔

فائدہ: ۳ یعنی میری قدر نہ کی، خلاصہ یہ ہے کہ اس کی نظر صرف دنیا کی زندگی اور حالت حاضرہ پر ہے پس دنیا کی موجودہ راحت وتکلیف ہی کو عزت وذلت کا معیار سمجھتا ہے، نہیں جانتا کہ دونوں حالتوں میں اس کی آزمائش ہے، نعمت دے کر اس کی شکر گزاری اور سختی بھیج کر اس کے صبر ورضا کو جانچا جارہا ہے، نہ یہاں کا عارضی عیش وآرام اللہ کے ہاں مقبول ومعزز ہونے کی دلیل ہے، نہ محض تنگی اور سختی مردود ہونے کی علامت ہے، مگر انسان اپنے افعال واعمال پر نظر نہیں کرتا، اپنی بے عقلی یا بے حیائی سے رب پر الزام رکھتا ہے۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿١٧﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿١٨﴾

کوئی نہیں پر تم عزت سے نہیں رکھتے یتیم کو لے اور تاکید نہیں کرتے آپس میں محتاج کے کھلانے کی ۲

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾

اور کھا جاتے ہو مردے کا مال سمیٹ کر سارا ۳ اور پیار کرتے ہو مال کو جی بھر کر ۴

خلاصہ تفسیر: (آگے دنیا کی محبت پر زجر وتنبیہ ہے کہ) ہرگز ایسا نہیں (یعنی نہ تو دنیا مقصود بالذات ہے، اور نہ ہی دنیا کا ہونا یا نہ ہونا مقبول یا مردود ہونے کی دلیل ہے، اور نہ کوئی کسی اکرام کا مستحق ہے، اور نہ کوئی صبر وشکر کے وجوب سے مستثنیٰ ہے، آگے خطاب کے صیغہ کے ساتھ التفات کے طور پر فرماتے ہیں کہ تم لوگوں پر عذاب کا سبب صرف یہی اعمال نہیں) بلکہ (تم میں اور بھی ایسے برے اعمال پائے جاتے ہیں جو اللہ کی ناراضی اور عذاب کا سبب ہیں، چنانچہ) تم لوگ یتیم کی (کچھ) قدر (اور خاطر) نہیں کرتے ہو (مطلب یہ کہ یتیم کی اہانت اور اس پر ظلم کرتے ہو کہ اس کا مال کھا جاتے ہو) اور دوسروں کو بھی مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتے (یعنی دوسروں کے واجب حقوق نہ خود ادا کرتے ہو اور نہ دوسروں کو واجب حقوق ادا کرنے کو کہتے ہو اور عملاً اس کے تارک اور اعتقاداً اس کے منکر ہو) اور (تم) میراث کا مال سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو (یعنی دوسروں کا حق بھی کھا جاتے ہو) اور (تم لوگ) مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو (اور مذکورہ تمام برے کام حب دنیا کا نتیجہ ہیں، کیونکہ دنیا کی محبت ہی سب گناہوں کی اصل اور بنیاد ہے، غرض یہ سب باتیں، احوال اور افعال عذاب کا سبب ہیں، پس انسان کا یہ حال ہے کہ مضامین عبرت سن کر بجائے اس کے عبرت پکڑتا ایسے اعمال اختیار کرتا ہے جو اور زیادہ موجب عذاب ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دینے والا ہے: ان ربك لبالمر صاد)۔

کافر کے لئے واجب کو چھوڑنا عذاب کی زیادتی کا سبب ہوتا ہے اور اعتقاد کا فساد یعنی کفر وشرک اصل نفس عذاب کی بنیاد ہے۔

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا: میراث کا حکم اگرچہ مکہ مکرمہ میں مشروع نہ تھا مگر نفس میراث حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی شریعت سے متوارث چلی آتی تھی، چنانچہ جاہلیت میں بچوں اور لڑکیوں کو میراث کا مستحق نہ سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ میراث کا حکم پہلے سے بھی تھا جس کا بیان

سورۃ نساء کے پہلے رکوع میں آیت :للرجال نصیب الخ کے تحت گزر چکا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی خدا کے ہاں تمہاری عزت کیوں ہو، جب تم بے کس یتیموں کی عزت اور خاطر مدارت نہیں کرتے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی خود اپنے مال سے مسکینوں کی خبر گیری کرنا تو کجا دوسروں کو بھی اس طرف نہیں ابھارتے کہ بھوکے محتاجوں کی خبر لے لیا کریں۔

فائدہ: ۳؎ یعنی مردے کی میراث لینے میں حلال حرام اور حق ناحق کی کچھ تمیز نہیں، جو قابو چڑھا ہضم کیا، یتیموں اور مسکینوں کے حقوق تلف ہوں، ہونے دو۔

فائدہ: ۴؎ یعنی جڑ کی بات یہ ہے کہ تمہارا دل مال کی حرص اور محبت سے بھرا ہوا ہے، بس کسی طرح مال ہاتھ آئے اور ایک پیسہ کسی نیک کام میں ہاتھ سے نہ نکلے خواہ آگے چل کر نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، مال کی اس قدر محبت اور پرستش کہ آدمی اسی کو کعبہ مقصود ٹھہرالے، صرف کافر کا شیوہ ہوسکتا ہے۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍ

کوئی نہیں جب پست کردی جائے زمین کوٹ کوٹ کر ۱؎ اور آئے تیرا رب ۲؎ اور فرشتے آئیں قطار قطار ۳؎ اور لائی جائے اس دن

بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿٢٣﴾

دوزخ ۴؎ اس دن سوچے گا آدمی اور کہاں ملے اس کو سوچنا ۵؎

خلاصہ تفسیر: (آگے ان لوگوں پر زجر و تنبیہ ہے جو ان برے افعال کو عذاب کا سبب نہیں سمجھتے) ہرگز ایسا نہیں (جیسا تم سمجھتے ہو کہ ان اعمال پر عذاب نہ ہوگا، ضرور ہوگا، آگے جزاء وسزا کا وقت بتلاتے ہیں جس میں ان کو عذاب اور اہل اطاعت کو اجر وثواب ملے گا، ارشاد ہے کہ) جس وقت زمین (کے بلند اجزاء پہاڑ وغیرہ) کوتوڑ توڑ کر (اور) ریزہ کرکے زمین کو برابر کردیا جائے گا (ایک اور جگہ ارشاد ہے: لا ترى فيها عوجا ولا امتا) اور آپ کا پروردگار اور جوق جوق فرشتے (میدان محشر میں) آئیں گے (یہ حساب کے وقت ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کا آنا متشابہات میں سے ہے جس کی حقیقت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) اور اس روز جہنم کو لایا جائے گا (جیسا کہ سورۃ مدثر میں وما يعلم جنود ربك کے متعلق بیان ہوچکا) اس روز انسان کو سمجھ آئے گی اور اب سمجھ آنے کا موقع کہاں رہا (یعنی اب سمجھ آنے سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ دار الجزاء ہے، دار العمل نہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سب ٹیلے اور پہاڑ کوٹ کر ریزہ ریزہ کردیے جائیں اور زمین صاف چٹیل میدان ہوجائے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اپنی قہری تجلی کے ساتھ جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی میدان محشر میں آئیں گے وہاں انتظامات کے لئے۔

فائدہ: ۴؎ یعنی لاکھوں فرشتے اس کی جگہ سے کھینچ کر محشر والوں کے سامنے لائیں گے۔

فائدہ: ۵؎ یعنی اس وقت سمجھے گا کہ میں سخت غلطی اور غفلت میں تھا، مگر اس وقت کا سمجھنا کس کام کا، سوچنے سمجھنے کا موقع ہاتھ سے نکل چکا، دار العمل میں جو کام کرنا چاہیے تھا وہ دار الجزاء میں نہیں ہوسکتا۔

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿٢٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٦﴾

کہے کیا اچھا ہوتا جو میں کچھ آگے بھیج دیتا اپنی زندگی میں ۱؎ پھر اس دن عذاب نہ دے اسکا سا کوئی اور، نہ باندھ کر رکھے اسکا سا باندھنا کوئی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے قیامت کے دن سمجھ آنے کے بعد جو اس کا قول ہوگا اس کا بیان ہے کہ وہ) کہے گا کاش! میں اس (اخروی)

زندگی کے لئے کوئی (نیک) عمل آگے بھیج لیتا، پس اس روز نہ تو خدا کے عذاب کے برابر کوئی عذاب دینے والا نکلے گا، اور نہ اس کے جکڑنے کے برابر کوئی جکڑنے والا نکلے گا (یعنی ایسی سخت سزا اور قید کرے گا کہ دنیا میں کبھی کسی نے کسی کو نہ اتنی سخت سزا دی ہوگی، نہ ایسی سخت قید کی ہوگی)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی افسوس دنیا کی زندگی میں کچھ نیکی کر کے آگے نہ بھیجی، جو آج اس زندگی میں کام آتی، یونہی خالی ہاتھ چلا آیا، کاش حسنات کا کوئی ذخیرہ آگے روانہ کر دیتا جو یہاں کے لئے توشہ بنتا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ اس دن مجرموں کو ایسی سخت سزا دے گا اور ایسی سخت قید میں رکھے گا کہ کسی دوسرے کی طرف سے اس طرح کی سختی کسی مجرم کے حق میں متصور نہیں، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں کہ اس روز نہ مارے گا اسکا سا مارنا کوئی، نہ آگ نہ دوزخ کے موکل نہ سانپ بچھو، جو دوزخ میں ہوں گے، کیونکہ ان کا مارنا اور دکھ دینا عذاب جسمانی ہے، اور حق تعالیٰ کا عذاب اس طور سے ہوگا کہ مجرم کی روح کو حسرت اور ندامت میں گرفتار کر دے گا جو عذاب روحانی ہے اور ظاہر ہے عذاب روحانی کو عذاب جسمانی سے کیا نسبت، نیز نہ باندھے گا اسکا سا کوئی باندھنا کوئی، کیونکہ دوزخ کے پیادے ہر چند کہ دوزخیوں کے گلے میں طوق ڈالیں گے اور زنجیروں سے جکڑیں گے اور دوزخ کے دروازے بند کر کے اوپر سے سرپوش رکھ دیں گے، لیکن ان کی عقل اور خیال کو بند نہ کر سکیں گے اور عقل و خیال کی عادت ہے کہ بہت سی باتوں کی طرف التفات کرتا ہے اور ان میں سے بعض باتیں دوسری باتوں کے لئے حجاب ہو جاتی ہیں، اسی لئے عین قید کی تنگی میں انسان کو عقلی اور خیالی وسعت حاصل ہوتی ہے، برخلاف اسی شخص کے کہ اللہ تعالیٰ عقل و خیال کو ادھر ادھر جانے سے روک دے اور بالکل ہمہ تن دکھ درد ہی کی طرف متوجہ رکھے، تو ایسی قید بدنی قید سے ہزاروں درجے سخت ہے، اسی لئے مجنوں سودائیوں کو عین باغوں اور جنگلوں کی سیر کے وقت تنگی اور گھبراہٹ وہم و خیال کے سبب سے پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ باغ اور وسیع جنگل اس کی نظر میں تنگ معلوم ہوتے ہیں۔

يَٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفۡسُ ٱلۡمُطۡمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ٱرۡجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً ﴿٢٨﴾

اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا، پھر چل اپنے رب کی طرف تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی

فَٱدۡخُلِي فِي عِبَٰدِي ﴿٢٩﴾ وَٱدۡخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾　ع

پھر شامل ہو میرے بندوں میں، اور داخل ہو میری بہشت میں ۱؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے ان لوگوں کی سزا بیان ہوئی جو بداعمالی اور نافرمانی کرنے والے تھے، اور جو اللہ کے فرماں بردار تھے ان کو ارشاد ہوگا کہ) اے اطمینان والی روح! (یعنی جس کو امر حق میں کامل یقین تھا اور کسی طرح کا شک و انکار نہ تھا) تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر (ادھر چل کر) تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا (یہ بھی روحانی نعمت ہے کہ انس کے لئے احباب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں) اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

يَٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفۡسُ ٱلۡمُطۡمَئِنَّةُ: مقام کے قرینہ سے مؤمن کو یہ خطاب قیامت کے روز معلوم ہوتا ہے، بعض روایات میں جو آیا ہے کہ مرنے کے وقت مؤمن سے یہ خطاب کیا جاتا ہے تو وہاں اس آیت کی تفسیر مقصود نہیں اور نہ ہی اس روایت میں موت کے وقت کی تخصیص ہے، یہاں لفظ **مطمئنۃ** میں ان لوگوں کے اعمال حسنہ کی طرف اشارہ ہو گیا، اعمال حسنہ کی طرف اشارہ اور اعمال عذاب کی تفصیل بیان فرمانا شاید اس لئے ہے کہ یہاں زیادہ مقصود اہل مکہ کو سنانا ہے، کیونکہ اس وقت مکہ میں ایسے اعمال کے مرتکب زیادہ تھے۔

فَٱدۡخُلِي فِي عِبَٰدِي وَٱدۡخُلِي جَنَّتِي: نفس مطمئنہ کو مخاطب کر کے یہ حکم ہوگا کہ میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا، اس میں پہلے اللہ کے صالح اور مخلص بندوں میں شامل ہونے کا حکم ہے پھر جنت میں داخل ہونے کا، اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اس پر موقوف ہے کہ پہلے اللہ کے صالح مخلص بندوں کے زمرہ میں شامل ہو ان سب کے ساتھ ہی جنت میں داخل ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ جو

دنیا میں صالحین کی صحبت ومعیت اختیار کرتا ہے یہ علامت اس کی ہے کہ یہ بھی ان کے ساتھ جنت میں جائے گا، اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی دعا میں فرمایا: وادخلنی برحمتك فی عبادك الصّٰلحین اور حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا میں فرمایا: والحقنی بالصّٰلحین، معلوم ہوا کہ صحبت صالحین وہ نعمت کبریٰ ہے کہ انبیا علیہ السلام بھی اس کی دعا سے مستغنی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ پہلے مجرموں اور ظالموں کا حال بیان ہوا تھا، اب اس کے مقابل ان لوگوں کا انجام بتلاتے ہیں جن کے دلوں کو اللہ کے ذکر اور اس کی اطاعت سے چین اور آرام ملتا ہے ان سے محشر میں کہا جائے گا کہ اے نفس آرمیدہ بحق! جس محبوبِ حقیقی سے تو لو لگائے ہوئے تھا، اب ہر قسم کے جھگڑوں اور خرخشوں سے یکسو ہو کر راضی خوشی اس کے مقامِ قرب کی طرف چل، اور اس کے مخصوص بندوں کے زمرہ میں شامل ہو اس کی عالیشان جنت میں قیام کر، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو موت کے وقت بھی یہ بشارت سنائی جاتی ہے، بلکہ عارفین کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں بھی ایسے نفوس مطمئنہ اس طرح کی بشارات کافی الجملہ حظ اٹھاتے ہیں، اللّٰھم انی اسالك نفسا بك مطمئنة تو من بلقائك وترضی بقضائك وتقنع بعطائك۔

تنبیہ: نفس مطمئنہ، نفس امارہ اور نفس لوامہ کی تحقیق سورۃ قیامہ کے شروع میں دیکھ لی جائے۔

ركوعها ١	٩٠ سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ ٣٥	اٰياتها ٢٠

خلاصہ تفسیر: گزشتہ سورت میں جزا وسزا والے کاموں کا بیان تھا، اس سورت میں بھی ایسے ہی اعمال کا بیان ہے، مگر وہاں برے اعمال کا زیادہ ذکر تھا، یہاں اعمال خیر کا زیادہ ذکر ہے۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿١﴾ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿٢﴾

قسم کھاتا ہوں میں اس شہر کی ۱؎ اور تجھ پر قید نہیں رہے گا اس شہر میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی اور (جواب قسم سے پہلے آنحضرت ﷺ کے حق میں ایک بشارت دی گئی کہ) آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے (چنانچہ فتح مکہ کے روز آپ کے لئے قتال جائز کر دیا گیا تھا اور احکام حرم باقی نہیں رہے تھے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مکہ معظمہ کی۔

فائدہ: ۲؎ مکہ میں ہر شخص کو لڑائی کی ممانعت ہے مگر آنحضرت ﷺ کے لئے صرف فتح مکہ کے دن یہ ممانعت نہیں رہی تھی جو کوئی آپ ﷺ سے لڑا اس کو مارا، اور بعض سنگین مجرموں کو خاص کعبہ کی دیوار کے پاس قتل کیا گیا، پھر اس دن کے بعد سے وہی ممانعت قیامت تک کے لئے قائم ہوگئی، چونکہ اس آیت میں مکہ کی قسم کھا کر ان شدائد اور سختیوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے اور اس وقت دنیا کا بزرگ ترین انسان اسی شہر مکہ میں دشمنوں کی طرف سے زہرہ گداز سختیاں جھیل رہا تھا، اس لئے درمیان میں بطور جملہ معترضہ وانت حل بھذا البلد فرما کر تسلی کر دی کہ اگرچہ آج آپ ﷺ کا احترام اس شہر کے جاہلوں میں نہیں ہے، لیکن ایک وقت آیا چاہتا ہے جب آپ ﷺ کا اسی شہر میں فاتحانہ داخلہ ہوگا، اور اس مقدس مقام کی ابدی تطہیر وتقدیس کے لئے مجرموں کو سزا دینے کی بھی آپ ﷺ کو اجازت ہوگی، یہ پیشین گوئی ۸ ھ میں خدا کے فضل سے پوری ہوئی۔

تنبیه: بعض نے وانت حل بھذا البلد کے معنی "وانت نازل" کے لئے ہیں، یعنی میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں بحالیکہ آپ ﷺ اس شہر میں پیدا کئے گئے اور قیام پذیر ہوئے۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ﴿٣﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴿٤﴾

اور قسم ہے جنتے کی اور جو اس نے جنا ۱ تحقیق ہم نے بنایا آدمی کو محنت میں ۲

خلاصہ تفسیر: اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی (ساری اولاد کے باپ آدم علیہ السلام ہیں، پس آدم اور بنی آدم سب کی قسم ہوئی، آگے جواب قسم ہے) کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے (چنانچہ عمر بھر کہیں مرض میں، کہیں رنج میں، کہیں فکر میں اکثر اوقات مبتلا رہتا ہے، اس کا تقاضا اور مطالبہ تو یہ تھا کہ اس میں عاجزی اور درماندگی پیدا ہوتی، اور اپنے آپ کو اس کے حکم تقدیری کا پابند سمجھ کر اس کے حکم کی تعمیل کرتا اور اس پر راضی رہتا)۔

قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ مکہ میں اس وقت بہترین مخلوق سیدنا رسول اللہ ﷺ مشقت میں تھے، جس کے زائل ہونے کی بشارت پیچھے اس جملہ میں دی گئی ہے کہ آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہوگی، پس دوسروں کی مشقت بدرجہ اولی ثابت ہوگئی، باپ اور اولاد تو خود ہی مشقت کا محل ہیں، ان کا حال مشاہدہ کر لینا مقصود کی کافی دلیل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی آدم اور بنی آدم وقیل غیرذٰلک۔

فائدہ: ۲ یعنی آدمی ابتداء سے انتہا تک مشقت اور رنج میں گرفتار ہے اور طرح طرح کی سختیاں جھیلتا رہتا ہے، کبھی مرض میں مبتلا ہے کبھی رنج میں، کبھی فکر میں شاید عمر بھر میں کوئی لمحہ ایسا آتا ہو جب کوئی انسان تمام قسم کے خرخشوں اور محنت وتکلیف سے آزاد ہو کر بالکل بے فکری کی زندگی بسر کرے، حقیقت میں انسان کی پیدائشی ساخت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ان سختیوں اور بکھیڑوں سے نجات نہیں پاسکتا، آدم اور اولاد آدم کے احوال کا مشاہدہ خود اس کی واضح دلیل ہے، اور مکہ جیسے سنگلاخ ملک کی زندگی خصوصاً اس وقت جبکہ وہاں افضل الخلائق محمد رسول اللہ ﷺ سخت ترین جور و جفا اور ظلم وستم کے ہدف بنے ہوئے تھے، لقد خلقنا الانسان فی کبد کی نمایاں شہادت ہے۔

أَيَحْسَبُ أَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ﴿٥﴾ يَقُوْلُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ﴿٦﴾ أَيَحْسَبُ أَنْ لَّمْ يَرَهٗ أَحَدٌ ﴿٧﴾

کیا خیال رکھتا ہے وہ کہ اس پر بس نہ چلے گا کسی کا ۱ کہتا ہے میں نے خرچ کر ڈالا مال ڈھیروں ۲ کیا خیال رکھتا ہے کہ دیکھا نہیں اسکو کسی نے ۳

خلاصہ تفسیر: (انسان جن سختیوں سے گذرا ہے اس کا تقاضہ یہ تھا کہ اس میں عاجزی پیدا ہوتی، لیکن انسان کافر کی یہ حالت ہے کہ بالکل بھول میں پڑا ہے تو) کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا (یعنی کیا اپنے آپ کو اللہ کی قدرت سے خارج سمجھتا ہے جو اس قدر بھول میں پڑا ہے اور) کہتا ہے کہ میں نے اتنا وافر مال خرچ کر ڈالا (یعنی ایک تو شیخی بھگارتا ہے، پھر رسول سے دشمنی، اسلام کی مخالفت اور گناہوں میں خرچ کرنے کو ہنر سمجھتا ہے، پھر جھوٹ بھی بولتا ہے کہ اس کو مثال کثیر بتلاتا ہے) کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں (یعنی اللہ تعالیٰ نے تو دیکھا ہے اور وہ جانتا ہے کہ گناہ میں خرچ کیا ہے، پس اس پر سزا دے گا، نیز اس نے مقدار بھی دیکھی ہے جو اس قدر نہیں ہے جس قدر وہ لوگوں کو یقین دلانا چاہتا ہے یہ حال مطلق کافر کا ہے کہ اُس وقت آپ ﷺ کے مخالفین کے یہی اقوال واحوال تھے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی انسان جن سختیوں اور محنت و مشقت کی راہوں سے گزرتا ہے اس کا مقتضاء تو یہ تھا کہ اس میں عجز و درماندگی پیدا ہوتی اور

اپنے کو بستہ حکم وقضا سمجھ کر مطیع امر و تابع رضا ہوتا اور ہر وقت اپنی احتیاج وافتقار کو پیش نظر رکھتا، لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ بالکل بھول میں پڑا ہے، تو کیا وہ سمجھتا ہے کہ کوئی ہستی ایسی نہیں جو اس پر قابو پا سکے اور اس کی سرکشی کی سزا دے سکے۔

فائدہ: ۲ یعنی رسول کی عداوت، اسلام کی مخالفت اور معصیت کے مواقع میں یونہی بے تکے پن سے مال خرچ کرنے کو ہنر سمجھتا ہے، پھر اسے بڑھا چڑھا کر فخر سے کہتا ہے کہ میں اتنا کثیر مال خرچ کر چکا ہوں، کیا اس کے بعد بھی کوئی میرے مقابلہ میں کامیاب ہوسکتا ہے، لیکن آگے چل کر پتہ لگے گا کہ یہ سب خرچ کیا ہوا مال یونہی برباد گیا، بلکہ الٹا وبال جان ہوا۔

فائدہ: ۳ یعنی اللہ سب دیکھ رہا ہے، جتنا مال جس جگہ جس نیت سے خرچ کیا ہے، جھوٹی شیخی بگھارنے سے کچھ فائدہ نہیں۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝۸ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝۹ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝۱۰

بھلا ہم نے نہیں دیں اس کو دو آنکھیں ۱ اور زبان اور دو ہونٹ ۲ اور دکھلا دیں اس کو دو گھاٹیاں ۳

خلاصہ تفسیر: (غرض ایسا مذکورہ شخص نہ تو مصائب سے متاثر ہوتا ہے اور نہ نعمتوں سے جس کا آگے بیان ہے کہ) کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور (پھر) ہم نے اس کو دونوں رستے (خیر وشر) کے بتلا دیئے (تا کہ نقصان دہ رستہ سے بچے، نافع اور مفید رستہ پر چلے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جس نے دیکھنے کو آنکھیں دیں، کیا وہ خود دیکھتا نہ ہوگا؟ یقیناً جو سب کو بینائی دے وہ سب سے بڑھ کر بینا ہونا چاہئے۔

فائدہ: ۲ جن سے بات کرنے اور کھانے پینے میں مدد لیتا ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی خیر اور شر دونوں کی راہیں بتلا دیں، تا کہ برے راستہ سے بچے اور اچھے راستہ پر چلے، اور یہ بتلانا اجمالی طور پر عقل وفطرت سے ہوا، اور تفصیلی طور پر انبیاء ورسل کی زبان سے۔

تنبیہ: بعض نے نجدین سے مراد عورت کی پستان لئے ہیں، یعنی بچے کو دودھ پینے اور غذا حاصل کرنے کا راستہ بتلا دیا۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝۱۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝۱۲ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝۱۳ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ

سو نہ دھمک سکا گھاٹی پر ۱ اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی، چھڑانا گردن کا ۲ یا کھلانا

ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝۱۴ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝۱۵ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝۱۶

بھوک کے دن میں ۳ یتیم کو جو قرابت والا ہے ۴ یا محتاج کو جو خاک میں رل رہا ہے ۵

خلاصہ تفسیر: سو (اس قدر انعامات اور اسباب ہدایت کا تقاضہ بھی یہ تھا کہ وہ احکام الٰہی کا تابع ہوتا، مگر) وہ شخص (دین کی) گھاٹی میں سے ہو کر نہ نکلا (دین کے کاموں کو گھاٹی اس لئے کہا کہ نفس پر شاق ہیں) اور آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی (سے) کیا (مراد) ہے؟ وہ کسی (کی) گردن کا (غلامی سے) چھڑا دینا ہے، یا کھانا کھلانا فاقہ کے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو، یا کسی خاک نشین محتاج کو (یعنی ان احکام الٰہیہ کو بجالانا چاہئے تھا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس قدر انعامات کی بارش اور اسباب ہدایت کی موجودگی میں بھی اسے توفیق نہ ہوئی کہ دین کی گھاٹی پر آ دھمکتا، اور مکارم اخلاق کے راستوں کو طے کرتا ہوا فوز وفلاح کے بلند مقامات پر پہنچ جاتا۔

تنبیہ: دین کے کاموں کو گھاٹی اس لئے کہا کہ مخالفت ہوا کی وجہ سے ان کا انجام دینا نفس پر شاق اور گراں ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی غلام آزاد کرنا یا قرضدار کی گردن قرض سے چھڑوانا۔

فائدہ: ۳ یعنی قحط کے دنوں میں بھوکوں کی خبر لینا۔

فائدہ: ۴ یتیم کی خدمت کرنا ثواب اور قرابتداروں کے ساتھ سلوک کرنا بھی ثواب، جہاں دونوں جمع ہو جائیں تو دوہرا ثواب ہوگا۔

فائدہ: ۵ یعنی فقر و فاقہ اور تنگدستی سے خاک میں مل رہا ہو، یہ مواقع ہیں مال خرچ کرنے کے نہ یہ کہ شادی غمی کی فضول رسموں اور خدا کی نافرمانیوں میں روپیہ برباد کر کے دنیا کی رسوائی اور آخرت کا وبال سر لیا جائے۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

پھر ہووے ایمان والوں میں ۱ جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی اور تاکید کرتے ہیں رحم کھانے کی ۲ وہ لوگ ہیں بڑے

ع الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۱۹﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾ ع ۱۵

نصیب والے ۳ اور جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے وہ ہیں کم بختی والے ۴ انہی کو آگ میں موند دیا ہے ۵

خلاصہ تفسیر: پھر (سب سے بڑھ کر یہ کہ) ان لوگوں میں سے نہ ہوا جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو (ایمان کی) پابندی کی فہمائش کی اور ایک دوسرے کو ترحم (علی الخلق) کی (یعنی ترک ظلم کی) فہمائش کی (آگے اہل ایمان کی جزا کا بیان ہے یعنی) یہی لوگ داہنے والے ہیں (جن کی تفصیل سورۃ واقعہ میں ہے، یہاں اس میں مطلق اہل ایمان خواص وعوام سب داخل ہیں) اور (آگے ان کے مقابلین کا بیان ہے کہ) جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہیں (خود اصول ہی میں مخالف ہیں فروع کا تو کہنا کیا) وہ لوگ بائیں والے ہیں، ان پر آگ محیط ہوگی جس کو بند کر دیا جائے گا (یعنی دوزخیوں کو دوزخ میں بھر کر آگے سے دروازہ بند کر دیں گے، کیونکہ اس وجہ سے نکلنا تو ملے گا ہی نہیں)۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یعنی ایمان تو سب سے مقدم ہے، پھر ایمان پر جمنے کا حکم کرنا دیگر کاموں سے افضل ہے، پھر ظلم اور ضرر رسانی کا چھوڑنا باقی کاموں سے اہم ہے، پھر ان عمال کا رتبہ ہے جو ان سے پہلے فك رقبة سے ذا متربة تک بیان ہوئے ہیں، پس یہاں آیت کے شروع میں لفظ ثُمَّ تفخیم رتبہ کے لیے ہے، مطلب یہ کہ تمام اصول اور فروع میں اطاعت کرنا چاہیے تھی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی پھر ان سب اعمال کے مقبول ہونے کی سب سے بڑی شرط ایمان ہے، اگر یہ چیز نہیں تو سب کیا کرایا اکارت ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی ایک دوسرے کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ حقوق وفرائض کے ادا کرنے میں ہر قسم کی سختیوں کا تحمل کرو اور خدا کی مخلوق پر رحم کھاؤ تا کہ آسمان والا تم پر رحم کھائے۔

فائدہ: ۳ یعنی یہ لوگ بڑے خوش نصیب اور میمون و مبارک ہیں جن کو عرش عظیم کے دائیں جانب جگہ ملے گی اور ان کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

فائدہ: ۴ یعنی بدنصیب منحوس، شامت زدہ جن کا اعمالنامہ بائیں ہاتھ میں دیا جائیگا اور عرش کے بائیں طرف کھڑے کئے جائیں گے۔

فائدہ: ۵ یعنی دوزخ میں ڈال کر سب دروازے نکلنے کے بند کر دیے جائیں گے۔ اعاذنا الله منها۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں ایمانی وکفریہ اعمال کی اخروی جزا کا ذکر تھا، اس سورت میں اصل مقصود یہ بتلانا ہے کہ کفریہ اعمال پر دنیا میں بھی سزا کا احتمال ہے جیسا کہ قوم ثمود پر عذاب نازل ہوا، اور اس کے ضمن میں اعمال کی تقسیم کفر وایمان کی طرف کی گئی، اور پھر اجمالی طور پر دونوں کی سزا و جزا کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝١ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝٢ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝٣ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝٤

قسم سورج کی اور اسکے دھوپ چڑھنے کی، اور چاند کی جب آئے سورج کے پیچھے ۱ اور دن کی جب اسکو روشن کر لے ۲ اور رات کی جب اسکو ڈھانک لیوے ۳

خلاصہ تفسیر: قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی، اور چاند کی جب سورج (کے غروب) سے پیچھے آئے (یعنی طلوع ہو مراد اس سے مہینہ کے وسط کی بعض راتوں کا چاند ہے کہ وہ سورج کے چھپنے کے بعد طلوع ہوتا ہے) اور (قسم ہے) دن کی جب وہ اس (سورج) کو خوب روشن کردے اور (قسم ہے) رات کی جب وہ اس (سورج) کو (اور اس کے آثار وانوار کو بالکل) چھپالے (یعنی خوب رات ہو جائے کہ دن کی روشنی کا کچھ اثر نہ رہے، یہاں چاروں قسموں میں جو قیدیں بڑھائی گئی ہیں وہ ان کے کمال کے اعتبار سے ہیں، یعنی ہر ایک کی قسم ان کی حالت کمال کے اعتبار سے ہے)۔

اِذَا تَلٰىهَا: یہ قید شاید اس لئے بڑھائی ہو کہ وہ وقت کمال نور کا ہوتا ہے جیسا کہ ضحٰها کا اشارہ ہے کہ کمال نور آفتاب کی طرف، یا اس وقت قدرت کی دو نشانیاں آگے پیچھے متصل طور پر ظاہر ہوتی ہیں ایک سورج کا غروب، دوسرے چاند کا طلوع۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سورج غروب ہونے کے بعد جب اس کی چاندنی پھیلے۔

فائدہ: ۲ یعنی جب دن میں سورج پوری روشنی اور صفائی کے ساتھ جلوہ گر ہو۔

فائدہ: ۳ یعنی جب رات کی تاریکی خوب چھا جائے اور سورج کی روشنی کا کچھ نشان دکھائی نہ دے۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝٥ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝٦

اور آسمان کی اور جیسا کہ اس کو بنایا ۱ اور زمین کی اور جیسا کہ اس کو پھیلایا ۲

خلاصہ تفسیر: اور (قسم ہے) آسمان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بنایا (مراد اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح آگے ما طحٰها اور ما سوّٰها میں بھی خدا کی ذات مراد ہے) اور (قسم ہے) زمین کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو بچھایا۔

سورت کے شروع کی چار آیتوں میں پہلے مخلوقات کی قسم کھائی گئی، اس کے بعد اب خالق کی قسم، تو مخلوقات کی قسم کو خالق کی قسم پر مقدم فرمانا اس لیے ہوسکتا ہے کہ اس میں مخلوق سے خالق کی طرف ذہن منتقل کرنا مقصود ہے، کیونکہ مصنوعات صانع پر دلیل ہوتی ہیں، اور دلیل سے مدلول کی طرف انتقال ہوا کرتا ہے، پس اس میں توحید پر استدلال کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جس شان وعظمت کا اس کو بنایا، اور بعض کے نزدیک **ما بنٰها** سے مراد اس کا بنانے والا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی جس حکمت سے اسکو پھیلا کر مخلوق کی بود و باش کے قابل کیا، یہاں بھی بعض نے **وما طحٰها** سے اسکا پھیلانے والا مراد لیا ہے۔

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝٧ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝٨

اور جی کی اور جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا ۱؎ پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور بچ کر چلنے کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (قسم ہے انسان کی) جان کی اور اس (ذات) کی جس نے اس کو (ہر طرح صورت، شکل اعضا سے) درست بنایا پھر اس کی بدکرداری اور پرہیزگاری (دونوں باتوں) کا اس کو القا کیا۔

فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا: یہ اسناد تخلیق کے اعتبار سے ہے، یعنی دل میں جو نیکی کا رجحان ہوتا ہے یا جو بدی کی طرف میلان ہوتا ہے دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اگرچہ پہلے کا القاء فرشتہ کے واسطہ سے ہوتا ہے اور دوسرا شیطان کے واسطہ سے، پھر وہ رجحان اور میلان کبھی عزم کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے جو کہ قصد اور اختیار سے صادر ہوتا ہے، اسی قصد و اختیار پر عذاب و ثواب مرتب ہوتا ہے، اور کبھی عزم تک نہیں پہنچتا وہ معاف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو بنایا، پھر اس کے دل میں فجور اور تقویٰ دونوں کا الہام کر دیا، مراد یہ ہے کہ نفس انسانی کی تخلیق میں حق تعالیٰ نے گناہ اور اطاعت دونوں کے مادے اور استعداد رکھ دی ہے، پھر انسان کو ایک خاص قسم کا اختیار اور قدرت دے دی کہ وہ اپنے قصد و اختیار سے گناہ کی راہ اختیار کر لے یا اطاعت کی، جب وہ اپنے قصد و اختیار سے ان میں سے کوئی راہ اختیار کرتا ہے تو اسی قصد و اختیار پر اس کو ثواب یا عذاب ملتا ہے، اس تفسیر سے وہ شبہ رفع ہو گیا کہ گناہ اور اطاعت جب خود انسان کی تخلیق میں رکھ دی گئی تو وہ اس کے کرنے پر مجبور ہوا، ایسی صورت میں وہ نہ کسی ثواب کا مستحق ہے نہ عذاب کا، اور یہ تفسیر ایک حدیث مرفوع سے مستفاد ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حصین کی روایت سے آئی ہے کہ بعض لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے مسئلہ تقدیر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے جواب میں یہ آیت تلاوت فرمائی، اس آیت سے مسئلہ تقدیر کے شبہ کا جواب اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ الہام فجور و تقویٰ سے مراد یہ لیا جائے کہ دونوں کے مادے اور استعداد یں حق تعالیٰ نے نفس انسانی کے اندر رکھ دیئے ہیں، مگر اس کو ان میں سے کسی ایک پر مجبور محض نہیں کیا، بلکہ اس کو قدرت و اختیار دیا کہ ان میں سے جس کو جی چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ کہ اعتدال مزاج کا اور حواس ظاہری و باطنی اور قوائے طبیعیہ حیوانیہ و نفسانیہ سب اس کو دیے اور نیکی بدی کے راستوں پر چلنے کی استعداد رکھی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اول تو اجمالی طور پر عقل سلیم اور فطرت صحیحہ کے ذریعہ سے بھلائی میں فرق کرنے کی سمجھ دی، پھر تفصیلی طور پر انبیاء و رسل کی زبانی کھول کھول کر بتلا دیا کہ یہ راستہ بدی کا اور یہ پرہیزگاری کا ہے، اس کے بعد قلب میں جو نیکی کا رجحان یا بدی کی طرف میلان ہو، ان دونوں کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے، گو القاء اول میں فرشتہ واسطہ ہوتا ہے، اور ثانی میں شیطان، پھر وہ رجحان و میلان کبھی مندہ کے قصد و اختیار سے مرتبہ عزم تک پہنچ کر صدور فعل کا ذریعہ بن جاتا ہے جس کا خالق اللہ اور کاسب بندہ ہے، اسی کسب خیر و شر پر مجازات کا سلسلہ بطریق تسبیب قائم ہے، وھذہ المسئلة من معضلات المسائل و تفصیلها یطلب من مظانها، ونریدان نفرد لها جزءا ان ساعدنا التوفیق والله الموفق والمعین۔

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ۝٩ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ۝١٠

تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوار لیا ۱؎ اور نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملا چھوڑا ۲؎

كَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ بِطَغۡوٰىهَاۤ ۝١١ اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰىهَا ۝١٢

جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے ۳؎ جب اٹھ کھڑا ہوا ان میں کا بڑا بدبخت ۴؎

خلاصہ تفسیر: (اب گزشتہ مضمون کی تکمیل کے لئے آگے بدکردار اور اہل تقویٰ کا انجام بتلاتے ہیں کہ) یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس

نے اس (جان) کو پاک کرلیا (یعنی نفس کو بدکرداری سے روکا اور تقویٰ اختیار کرلیا) اور نامراد ہوا جس نے اس کو (فجور میں) دبا دیا (اور فجور یعنی بدکرداری سے مغلوب کردیا، اس کے بعد جواب قسم مقدر ہے، یعنی اے کفار مکہ! جب تم بدکردار ہو تو ضرور غضب وہلاک میں مبتلا ہو گے آخرت میں تو یقینا اور دنیا میں بعض اوقات جیسا کہ قوم ثمود اس بدکرداری کی وجہ سے غضب الٰہی اور عذاب کا مورد بنے جن کا قصہ یہ ہے کہ) قوم ثمود نے اپنی شرارت کے سبب (صالح علیہ السلام کی) تکذیب کی (اور یہ اس زمانہ کا قصہ ہے) جبکہ اس قوم میں جو سب سے زیادہ بدبخت تھا وہ (اونٹنی کے قتل کرنے کے لئے) اٹھ کھڑا ہوا (یعنی آمادہ ہو گیا اور اس کے ساتھ اور لوگ بھی شریک تھے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ نفس کا سنوارنا اور پاک کرنا یہ ہے کہ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ کو عقل کے تابع کرے اور عقل کو شریعت الٰہیہ کا تابعدار بنائے، تاکہ روح اور قلب دونوں تجلی الٰہی کی روشنی سے منور ہو جائیں۔

فائدہ: ۲؎ خاک میں ملا چھوڑنے سے یہ مراد ہے کہ نفس کی باگ یکسر شہوت وغضب کے ہاتھ میں دے دے، عقل وشرع سے کچھ سروکار نہ رکھے۔ گویا خواہش اور ہویٰ کا بندہ بن جائے، ایسا آدمی جانوروں سے بدتر اور ذلیل ہے۔

تنبیہ: قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا جواب قسم ہے اور اس کو مناسبت قسموں سے یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے سورج کی دھوپ اور چاند کی چاندنی دن کا اجالا، اور رات کا اندھیرا، آسمان کی بلندی اور زمین کی پستی کو ایک دوسرے کے مقابل پیدا کیا اور نفس انسانی میں خیر وشر کی متقابل قوتیں رکھیں اور دونوں کو سمجھنے اور ان پر چلنے کی قدرت دی، اسی طرح متضاد ومختلف اعمال پر مختلف ثمرات ونتائج مرتب کرنا بھی اسی حکیم مطلق کا کام ہے خیر وشر اور ان دونوں کے مختلف آثار ونتائج کا عالم میں پایا جانا بھی حکمت تخلیق کے اعتبار سے ایسا ہی موزوں و مناسب ہے، جیسے اندھیرے اور اجالے کا وجود۔

فائدہ: ۳؎ یعنی حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا، یہ وقد خاب من دسّھا کی ایک مثال عبرت کے لئے بیان فرما دی، سورۃ اعراف وغیرہ میں یہ قصہ مفصل گزر چکا ہے۔

فائدہ: ۴؎ یہ بدبخت قذار بن سالف تھا۔

فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾

پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے اور اس کی پانی پینے کی باری سے

خلاصہ تفسیر: (جب صالح علیہ السلام کو ان کے اس اونٹنی کے قتل کے ارادہ کی اطلاع ہوئی) تو ان لوگوں سے اللہ کے پیغمبر (صالح علیہ السلام) نے فرمایا کہ اللہ کی (اس) اونٹنی سے اور اس کے پانی پینے سے خبردار رہنا (یعنی اس کو قتل مت کرنا اور نہ اس کا پانی بند کرنا)۔

چونکہ قتل کے ارادہ کا اصل سبب بھی پانی کی باری تھی اس لئے اس کی تصریح فرمائی، اور ''اللہ کی اونٹنی'' اس لئے کہا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو معجزہ کے طور پر عجیب طرح سے پیدا کر کے نبوت کی دلیل بنا دیا اور اس کے احترام کو واجب فرمایا۔

* * *

فائدہ: یعنی خبردار اس کو قتل نہ کرنا اور نہ اس کا پانی بند کرنا، پانی کا ذکر اس لئے فرمایا کہ بظاہر اسی سبب سے وہ اس کے قتل پر آمادہ ہوئے تھے، اور ''اللہ کی اونٹنی'' اس اعتبار سے کہا کہ اللہ نے اس کو حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت کا ایک نشان بنایا تھا اور اس کا احترام واجب کیا تھا، یہ قصہ پہلے ''اعراف'' وغیرہ میں گزر چکا۔

فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ۙ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿١٤﴾

پھرانہوں نے جھٹلایا اسکو پھر پاؤں کاٹ ڈالے اسکے پھر الٹ مارا ان پر ان کے رب نے بسبب ان کے گناہوں کے پھر برابر کر دیا سب کو ۔ا

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿١٥﴾ ع ۱۵

اور وہ نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے ۔۲

خلاصہ تفسیر: سوانہوں نے پیغمبر کو (یعنی دلیل نبوت کو جو ناقۃ اللہ کے ذریعہ ظاہر ہوئی) جھٹلایا (کیونکہ وہ ان کو نبی نہ سمجھتے تھے) پھر اس اونٹنی کو مار ڈالا تو ان کے پروردگار نے ان کے گناہ کے سبب ان پر ہلاکت نازل فرمائی پھر اس (ہلاکت) کو (تمام قوم کے لئے) عام فرمایا اور اللہ تعالیٰ کو اس ہلاکت کے اخیر میں کسی خرابی (نکلنے) کا (کسی سے) اندیشہ نہیں ہوا (جیسے دنیا کے بادشاہوں کو بعض اوقات کسی قوم کی سزا دینے کے بعد احتمال ہوتا ہے کہ اس پر کوئی ملکی و داخلی شورش و ہنگامہ مرتب نہ ہو)۔

* * *

فائدہ: ۔ا حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا تھا: ولا تمسوھا بسوء فیاخذ کم عذاب الیم (اس اونٹنی کو برائی سے ہاتھ نہ لگانا، ورنہ سخت دردناک عذاب میں پھنس جاؤ گے) ان لوگوں نے اس بات کو جھوٹ سمجھا، پیغمبر کی تکذیب کی اور اونٹنی کو ہلاک کر ڈالا، آخر وہی ہوا جو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا تھا، اللہ تعالیٰ نے سب کو مٹا کر برابر کر دیا۔

فائدہ: ۔۲ یعنی جیسے بادشاہان دنیا کو کسی بڑی قوم یا جماعت کی سزا دہی کے بعد احتمال ہوتا ہے کہ کہیں ملک میں شورش برپا نہ ہو جائے، یا انتظام ملکی میں خلل نہ پڑے اللہ تعالیٰ کو ان چیزوں کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ ایسی کون سی طاقت ہے جو سزا یافتہ مجرموں کا انتقام لینے کے لئے اس کا پیچھا کرے گی؟ العیاذ باللہ۔

ایاتھا ۲۱ ۹۲ سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ ۹ رکوعھا ۱

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں اعمال اور جزا کا مختلف ہونا مذکور تھا، اب اس سورت میں بھی یہی مضمون ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ﴿١﴾ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ﴿٢﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ﴿٣﴾ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ﴿٤﴾

قسم رات کی جب چھا جائے، اور دن کی جب روشن ہو، اور اس کی جو اس نے پیدا کئے نر اور مادہ، تمہاری کمائی طرح طرح پر ہے ۔ا

خلاصہ تفسیر: قسم ہے رات کی جبکہ وہ (سورج کو اور دن کو) چھپا لے، اور (قسم ہے) دن کی جبکہ وہ روشن ہو جائے (اور قسم ہے) اس (ذات) کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا (مراد اللہ تعالیٰ ہے، آگے جواب قسم ہے) کہ بیشک تمہاری کوششیں (یعنی اعمال) مختلف ہیں (اور اسی طرح ان کے ثمرات اور نتائج بھی مختلف ہیں)۔

قسم اور جواب میں قسم میں مناسبت ظاہر ہے کہ رات اور دن بھی تمہاری مختلف اعمال اور ان کے نتائج و ثمرات کی طرح مختلف ہیں، اور اسی وجہ سے خالق کی صفت بھی ایسی لائی گئی جس میں دو مختلف چیزیں مذکور ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس طرح دنیا میں رات اور دن، نر اور مادہ، مختلف ومتضاد چیزیں پیدا کی گئی ہیں، تمہارے اعمال اور کوششیں بھی مختلف و متضاد ہیں، پھر ان مختلف اعمال ومساعی پر ظاہر ہے ثمرات ونتائج بھی مختلف ہی مرتب ہوں گے جن کا ذکر آگے آتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝۷

سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا، اور سچ جانا بھلی بات کو، تو اس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے آسانی میں ۱؎

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝۸ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰

اور جس نے نہ دیا اور بے پروا رہا، اور جھوٹ جانا بھلی بات کو، سو اس کو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے سعی وعمل کا ذکر تھا، آگے اسی سعی وعمل کے اعتبار سے انسانوں کے دو گروہ بیان فرماتے ہیں، اور یہاں دونوں گروہوں کے تین تین اوصاف ذکر کیے گئے۔

سو جس نے (اللہ کی راہ میں مال) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات (یعنی ملت اسلام) کو سچا سمجھا (یعنی اسلام کو اختیار کیا) تو ہم اس کو راحت کی چیز کے لئے سامان دے دیں گے (راحت کی چیز سے نیک عمل اور نیک عمل کے واسطہ سے جنت مراد ہے جو کہ یسر کا سبب اور محل ہے، اسی لئے ''یسریٰ'' کہہ دیا گیا ورنہ یسریٰ کے معنی ہیں آسان چیز) اور جس نے (حقوق واجبہ سے) بخل کیا اور (بجائے خدا سے ڈرنے کے خدا سے) بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات (یعنی ملت اسلام) کو جھٹلایا (یعنی اسلام قبول نہ کیا) تو ہم اس کو تکلیف کی چیز کے لئے سامان دے دیں گے (تکلیف کی چیز سے بدعمل اور بدعمل کے واسطہ سے دوزخ مراد ہے جو کہ عسر کا سبب اور محل ہے اس لئے اس کو ''عسریٰ'' کہہ دیا گیا)۔

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى -- فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى: دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کے بارے میں فرمایا: فسنیُسّرہ للیُسریٰ ''یسریٰ'' کے لفظی معنی ہیں آسان اور آرام دہ چیز جس میں مشقت نہ ہو، مراد اس سے جنت ہے، اسی طرح اس کے بالمقابل دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا: فسنُیسّرہ للعُسریٰ ''عسریٰ'' کے لفظی معنی مشکل اور تکلف دہ چیز کے ہیں، مراد اس سے جہنم ہے، اور دونوں جملوں کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اپنی سعی ومحنت پہلے تین کاموں میں لگاتے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں خرچ اور اللہ سے ڈرنا اور ایمان کی تصدیق، ان لوگوں کو ہم یسریٰ یعنی جنت کے لئے اعمال آسان کر دیتے ہیں، اور جو لوگ یہ سعی وعمل دوسرے تین کاموں میں لگاتے ہیں ان کو ہم عسریٰ یعنی جہنم کے لئے اعمال آسان کر دیتے ہیں، یہاں بظاہر مقام کا تقاضہ یہ کہنے کا تھا کہ ان کے لئے اعمال جنت یا اعمال دوزخ آسان کر دیئے جائیں گے، کیونکہ آسان یا مشکل ہونا اعمال ہی کی صفت ہو سکتی ہے تو خود ذوات واشخاص نہ آسان ہوتے ہیں نہ مشکل، مگر قرآن کریم نے اس کی تعبیر اس طرح فرمائی کہ خود ان لوگوں کی ذات اور وجود ان اعمال کے لئے آسان کر دیئے جائیں گے، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ان کی طبیعتوں اور مزاجوں کو ایسا بنا دیا جائے گا کہ پہلے گروہ کے لئے اعمال جنت ان کی طبیعت بن جائیں گے، ان کے خلاف کرنے میں وہ تکلف محسوس کرنے لگیں گے، اسی طرح دوسرے گروہ کا مزاج ایسا بنا دیا جائے گا کہ اس کو اعمال جہنم ہی پسند آئیں گے، انہیں میں راحت ملے گی اعمال جنت سے نفرت ہوگی، ان دونوں گروہوں کے مزاجوں میں یہ کیفیت پیدا کر دینے کو اس سے تعبیر فرمایا کہ یہ خود ان کاموں کے لئے آسان ہو گئے، ایک مرفوع حدیث میں اس کی تائید اس طرح آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اعملوا فکل میسر لما خلق له، اما من کان من اهل السعادة فسیسر لعمل السعادة، واما من کان من اهل الشقاوة'' یعنی تم جو عمل کرتے ہو وہ کرتے رہو، کیونکہ ہر ایک آدمی کے لئے وہ ہی کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا، اس لئے جو اہل سعادت نیک بخت خوش نصیب ہیں تو اہل سعادت ہی کے اعمال ان کی طبعی رغبت بن جاتے ہیں اور جو اہل شقاوت بدنصیب یعنی اہل جہنم ہیں ان کے لئے اہل شقاوت ہی کے اعمال کرنا مزاج اور طبیعت بن جاتی ہے، مگر یہ دونوں چیزیں اپنے خداداد اختیار کو استعمال کرنے کے نتیجہ میں ملتی ہیں، اس لئے ان پر عذاب وثواب کا

ترتب مستبعد نہیں کہا جاسکتا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو شخص نیک راستہ میں مال خرچ کرتا اور دل میں خدا سے ڈرتا ہے اور اسلام کی بھلی باتوں کو سچ جانتا اور بشارات ربانی کو صحیح سمجھتا ہے اس کیلئے ہم اپنی عادت کے موافق نیکی کا راستہ آسان کر دینگے اور انجام کار انتہائی آسانی اور راحت کے مقام پر پہنچا دیں گے جسکا نام جنت ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس نے خدا کی راہ میں خرچ نہ کیا، اس کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کی پروانہ کی اور اسلام کی باتوں اور اللہ کے وعدوں کو جھوٹ جانا، اس کا دل روز بروز تنگ اور سخت ہوتا چلا جائے گا، نیکی کی توفیق سلب ہوتی جائے گی اور آخر کار آہستہ آہستہ عذاب الٰہی کی انتہائی سختی میں پہنچ جائے گا، یہی اللہ کی عادت ہے کہ سعداء جب نیک عمل اختیار کرتے ہیں اور اشقیاء جب بدعمل کی طرف چلتے ہیں تو دونوں کے لئے وہی راستہ آسان کر دیا جاتا ہے جوانہوں نے تقدیر الٰہی کے موافق اپنے ارادہ اور اختیار سے پسند کرلیا ہے: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (الاسراء:۲۰)

وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ⑪ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ⑫ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ⑬

اور کام نہ آئے گا اسکے مال اسکا جب گڑھے میں گرے گا ۱؎ ہمارا ذمہ ہے راہ سجھا دینا، اور ہمارے ہاتھ میں ہے آخرت اور دنیا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (آگے صاحب عسریٰ یعنی بدنصیب اہل جہنم کا حال مذکور ہے کہ) اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا جب وہ برباد ہونے لگے گا (بربادی سے مراد جہنم میں جانا ہے) واقعی ہمارے ذمہ (اپنے وعدہ کے مطابق بطور فضل واحسان) راہ کا بتلا دینا ہے (سو وہ ہم نے پورے طور سے بتلا دیا ہے، پھر کسی نے ایمان واطاعت کی راہ اختیار کر لی جس کا ذکر پیچھے فاما من اعطیٰ الخ میں ہوا ہے، اور کسی نے کفر ومعصیت کی راہ کو اختیار کرلیا جس کا ذکر پیچھے واما من بخل میں ہوا ہے) اور (جیسی راہ کوئی شخص اختیار کرے گا ویسا ہی ثمرہ اس کو دیں گے کیونکہ) ہمارے ہی قبضہ میں ہے آخرت اور دنیا (یعنی دونوں میں ہماری ہی حکومت ہے، اس لئے دنیا میں ہم نے احکام مقرر کئے اور آخرت میں ان کی مخالفت اور موافقت پر سزا وجزا دیں گے جس کا بیان دو جگہ فسنیسرہ میں ہوا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس مال ودولت پر گھمنڈ کر کے یہ آخرت کی طرف سے بے پرواہ ہورہا تھا وہ ذرا بھی عذاب الٰہی سے نہ بچا سکے گا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہماری حکمت اس کو مقتضی نہیں کہ کسی آدمی کو زبردستی نیک یا بد بننے پر مجبور کریں، ہاں یہ ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے کہ سب کو نیکی بدی کی راہ سجھا دیں اور بھلائی برائی کو خوب کھول کر بیان کر دیں، پھر جو شخص جو راہ اختیار کرلے دنیا اور آخرت میں اسی کے موافق اس سے برتاؤ کریں گے۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ⑭ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ⑮ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ⑯

سو میں نے سنا دی تم کو خبر ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی ۱؎ اس میں وہی گرے گا جو بڑا بدبخت ہے، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا ۲؎

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ⑰ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ⑱

اور بچادیں گے اس سے بڑے ڈرنے والے کو ۳؎ جو دیتا ہے اپنا مال دل پاک کرنے کو ۴؎

خلاصہ تفسیر: (اب آگے وضاحت اور تنقیح کے طور پر ارشاد ہے کہ میں نے جو تم کو مختلف اعمال کی مختلف جزائیں بتلا دی ہیں) تو میں تم کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا چکا ہوں (جس پر پیچھے آیت: فسنیسرہ للعسریٰ دلالت کرتی ہے تاکہ ایمان واطاعت جن کا ذکر فاما من اعطیٰ میں آچکا ہے۔ اختیار کر کے اس آگ سے بچو، اور کفر ومعصیت۔ جن کا ذکر واما من بخل میں گذر چکا ہے۔ اختیار کر کے دوزخ میں نہ جاؤ،

کیونکہ اس میں جانے اور نہ جانے کے یہی اسباب ہیں چناچہ آگے اس کی تصریح ہے کہ) اس میں (ہمیشہ کے لئے) وہی بدبخت داخل ہوگا جس نے (دین حق کو) جھٹلایا اور (اس سے) روگردانی کی (بدبختوں کے مقابلہ میں اب اہل سعادت اور تقویٰ شعار حضرات کی جزا کا بیان ہے) اور اس سے ایسا شخص دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہے جو اپنا مال (محض) اس غرض سے دیتا ہے کہ (گناہوں سے) پاک ہوجائے (یعنی محض رضائے حق اس کا مقصود ہے)۔

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى: اس سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مومن گناہگار جو تکذیب کا مجرم نہیں جہنم میں نہیں جائے گا، حالانکہ قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص اس سے بھری ہوئی ہیں کہ مومن بھی جو گناہ کرتا ہے اگر اس نے توبہ نہ کرلی یا کسی کی شفاعت سے یا خالص رحمت سے اس کو معاف نہ کردیا گیا تو وہ بھی جہنم میں جائے گا اور اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے تک جہنم میں رہے گا، البتہ سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا اور پھر ایمان کی برکت سے جنت میں داخل ہوجائے گا، بظاہر اس آیت کے الفاظ اس کے خلاف ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ مراد اس آیت کی وہ ہو جو دوسری آیات قرآن اور احادیث صحیحہ کے خلاف نہ ہو، اس کی بہت آسان توجیہ تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں لی گئی ہے کہ یہاں دخول جہنم سے مراد وہ دخول ہے جو ہمیشہ کے لئے ہو اور ایسا دخول صرف کافر کے ساتھ مخصوص ہے، مومن کسی نہ کسی وقت بالاخر اپنے گناہ کی سزا پوری کرنے کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا، علماء مفسرین نے اس کے سوا دوسری کچھ توجیہات بھی بیان فرمائی ہیں وہ بھی اپنی جگہ درست ہوسکتی ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اس ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے شاید دوزخ کا وہ طبقہ مراد ہوگا جو بڑے بھاری مجرموں اور بدبختوں کے لئے مخصوص ہے۔
فائدہ: ۲؎ یعنی ہمیشہ کے لئے وہی گرے گا کہ پھر کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا کما تدل علیه النصوص۔
فائدہ: ۳؎ یعنی ایسے لوگوں کو اس کی ہوا تک بھی نہیں لگے گی، صاف بچا دیے جائیں گے۔
فائدہ: ۴؎ یعنی نفس کو رذیلہ بخل وطمع وغیرہ سے پاک کرنا مقصود ہے، کسی طرح کا ریاء اور نمود ونمائش یا دنیاوی اغراض پیش نظر نہیں۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾ ع

اور نہیں کسی کا اس پر احسان جس کا بدلہ دے، مگر واسطے چاہنے مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے، اور آگے وہ راضی ہوگا ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور بجز اپنے عالی شان پروردگار کی رضا جوئی کے (کہ یہی اس کا مقصود ہے) اس کے ذمہ کسی کا احسان نہ تھا کہ (اس دینے سے) اس کا بدلہ اتارنا (مقصود) ہو (اس میں نہایت ہی مبالغہ کے ساتھ اخلاص کا بیان ہے) اور (ایسے شخص کے لئے پیچھے صرف جہنم سے بچنا مذکور تھا آگے آخرت کی نعمتوں کا حاصل ہونا بھی بیان فرماتے ہیں کہ) یہ شخص عنقریب خوش ہوجائے گا (یعنی آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ملیں گی جن سے اس کو دائمی خوش نصیب ہوگی)۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ: اس میں اخلاص کا بیان ہے، کیونکہ کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا بھی فی نفسہ مستحب، افضل اور موجب ثواب ہے مگر فضیلت میں اس احسان کے برابر نہیں جو کہ ابتداءاً ہو، پس جب اس شخص کا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اس سے بھی پاک ہے تو ریا وغیرہ گناہوں کی آمیزش سے تو بدرجہ اولیٰ پاک ہوگا اور یہ کمال اخلاص ہے، اگرچہ آیت کے الفاظ عام ہیں، مگر اس کے نزول کا سبب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قصہ ہے کہ انہوں نے حضرت بلالؓ وغیرہ کو کافروں سے خرید کر اللہ کی رضا وخوشنودی کے لیے آزاد کردیا تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی خرچ کرنے سے کسی مخلوق کے احسان کا بدلہ اتارنا مقصود نہیں، بلکہ خالص رضاء مولیٰ کی طلب اور دیدار الٰہی کی تمنا میں گھر بار لٹا رہا ہے، تو وہ اطمینان رکھے کہ اسے ضرور خوش کردیا جائے گا، اور اس کی یہ تمنا ضرور پوری ہوکر رہے گی: ان الله لا يضيع اجر المحسنين۔

تنبیہ: اگرچہ مضمون آیات کا عام لیکن روایات کثیر شاہد ہیں کہ ان آخری آیات کا نزول سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان میں ہوا، اور یہ بہت بڑی دلیل ان کی فضیلت و برتری کی ہے، زہے نصیب اس بندے کے جس کے اتقاء ہونے کی تصدیق آسمان سے ہو: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اور خود حضرت حق سے اس کو ولسوف یرضٰی کی بشارت سنائی جائے، فی الحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں ولسوف یرضیٰ کی بشارت کا ایک انعکاس ہے اس بشارت عظمیٰ کا جو آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں آرہی ہے: وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔

ایاتھا ۱۱ | ۹۳ سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ ۱۱ | رکوعھا ۱

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں آیت فامامن اعطی سے فسنیسرہ للعسری تک تمام ضروری اصول و فروع کا اجمالی بیان، ان کی تصدیق و بجا آوری یا تکذیب و خلل اندازی پر وعدہ اور وعید مذکور ہے جو کہ ماقبل کی سورتوں بلکہ تمام قرآن مجید کے لیے بمنزلہ خلاصہ کے ہے ، اب سورہ ضحیٰ سے سورہ ناس تک ان ضروری اصول کی بعض جزئیات اور ان کے مناسب مضامین مذکور ہیں، تو گویا آنے والی تمام سورتیں سورہ واللیل کی کسی قدر تفصیل ہیں، چنانچہ ان اہم مضامین میں سے ایک مسئلہ رسالت کا بھی ہے جس کا بیان دوسرے مضامین کے ساتھ اس سورت میں ہوا ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض انعامات کا فیض فرمانا اور ان کے شکریہ میں آپ کو احکام کا مخاطب فرمانا وغیرہ وغیرہ، اس تقریر سے آئندہ تمام سورتوں کا باہمی ربط اور ماقبل کے ساتھ تعلق واضح ہوگیا، اب جدا جدا ہر سورت کے لیے ربط بیان کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اسی تقریر کی طرف اشارہ کردینا کافی ہوگا، اگرچہ باہم سب سورتوں میں مستقل ربط ادنی تامل سے بھی معلوم ہوسکتا ہے، چونکہ آگے چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں اس لیے سب کو ایک تقریر میں منسلک کردینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ امام رازیؒ نے بھی سورہ کوثر کی تفسیر میں والضحیٰ سے آخر تک کا ربط ایک ہی تقریر میں لکھا ہے لیکن وہ تقریر بلند و دقیق مضامین اور طوالت پر مشتمل ہے اور ہماری یہ تقریر مختصر بھی ہے اور آسان بھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾

قسم دھوپ چڑھتے وقت کی، اور رات کی جب چھا جائے، نہ رخصت کر دیا تجھ کو تیرے رب نے اور نہ بیزار ہوا ۱

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ؕ﴿۴﴾ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ؕ﴿۵﴾

اور البتہ پچھلی بہتر ہے تجھ کو پہلی سے ۲ اور آگے دے گا تجھ کو تیرا رب پھر تو راضی ہوگا ۳

خلاصہ تفسیر: اس سورت کا شان نزول یہ ہے کہ آپ ایک بار کسی بیماری کی وجہ سے دو تین رات تہجد میں نہ اٹھے، ایک کافر عورت نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے شیطان نے تم کو چھوڑ دیا اور اتفاق سے وحی آنے میں بھی دیر ہوگئی تھی جس پر دوسرے مشرکین نے بھی کہا کہ ان کے خدا نے ان کو چھوڑ دیا، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جب کہ وہ قرار پکڑے (آگے جواب قسم ہے) کہ آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ آپ سے بیزار ہوا (کیونکہ اول تو آپ سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی، دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس سے محفوظ و معصوم بنایا ہے، پس آپ کفار کی خرافات ولغویات سے غمگین نہ ہوں جو چند روز وحی کی تاخیر کے سبب یہ کہنے لگے کہ آپ کو آپ کے خدا نے چھوڑ دیا ہے، آپ برابر وحی کی نعمت سے مشرف رہیں گے اور یہ شرف و کرامت تو آپ کے لئے دنیا میں ہے) اور آخرت آپ کے لئے دنیا سے بدرجہا بہتر ہے (پس وہاں آپ کو اس سے زیادہ نعمتیں ملیں گی) اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (آخرت میں بکثرت نعمتیں) دے گا سو آپ (ان کے عطا ہونے سے) خوش ہو جائیں گے۔

وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی: یعنی رات کی قسم جبکہ وہ قرار پکڑے، قرار پکڑنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ① ایک حقیقی یعنی اس کی تاریکی اور ظلمت کا کامل ہو جانا، کیونکہ رات میں اندھیری رفتہ رفتہ بڑھتی ہے، کچھ رات گزرنے پر مکمل ہو جاتی ہے ② دوسرے مجازی یعنی جانداروں کا اس میں سو جانا اور چلنے پھرنے اور بولنے چالنے کی آوازوں کا ساکن ہو جانا۔

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی: ان قسموں کو جواب قسم سے مناسبت یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ظاہر میں اپنی قدرت وحکمت کے مختلف نشان ظاہر کرتا ہے دن کے پیچھے رات کو اور رات کے پیچھے دن کو لاتا ہے یہی کیفیت باطنی حالات کی سمجھو، اگر سورج کی دھوپ کے بعد رات کی تاریکی کا آنا اللہ تعالیٰ کی خفگی اور ناراضی کی دلیل نہیں اور نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ اس کے بعد دن کا اجالا کبھی نہ ہوگا تو چند روز وحی کے رکے رہنے سے یہ کیونکر سمجھ لیا جائے کہ آج کل خدا اپنے منتخب کئے ہوئے پیغمبر سے خفا اور ناراض ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے وحی کا دروازہ بند کر دیا، ایسا کہنا تو خدا تعالیٰ کے علم محیط اور حکمت بالغہ پر اعتراض کرنا ہے گویا اس کو خبر نہ تھی کہ جس کو میں نبی بنا رہا ہوں وہ آئندہ چل کر اس کا اہل ثابت نہ ہوگا، نعوذ باللہ منہ۔

وَلَلۡاٰخِرَةُ خَیۡرٌ لَّكَ مِنَ الۡاُوۡلٰی: یہاں ''آخرت'' کو اپنے معروف معنی میں اور اس کے بالمقابل ''اولیٰ'' کو دنیا کے معنی میں لیا جائے تو تفسیر وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں اوپر آ چکی ہے کہ یہ کفار ومشرکین جو طعنے آپ کو دے رہے ہیں یہ دنیا میں تو دیکھ ہی لیں گے کہ وہ سراسر لغو اور غلط تھے، ہم اس سے آگے آخرت کے انعامات کا بھی آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو دنیا سے بہت زیادہ انعامات سے نوازا جائے گا، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ ''آخرت'' کو اس کے لفظی معنی میں لیا جائے یعنی پچھلی حالت، جیسا کہ لفظ ''اولیٰ'' کے لفظی معنی پہلی حالت کے ہیں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ آپ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات برابر زیادہ ہی ہوتے چلے جائیں گے، گویا آپ ﷺ کی ہر لاحق (اگلی) حالت، سابق (پچھلی) حالت سے افضل واکمل ہے، مطلب یہ کہ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر اگلا دور اپنے پچھلے دور سے افضل واکمل ہے، پس وحی جس وقت بند ہو گئی تھی (جس کو اصطلاح میں ''قبض'' کہتے ہیں) یہ حالت اکمل تھی اس حالت سے جس میں وحی جاری تھی (جس کو اصطلاح میں ''بسط'' کہتے ہیں) پھر وحی بند ہونے کے بعد جب دوبارہ جاری ہو گئی تو یہ پچھلی حالت سے افضل حالت ہے، عارف کو بھی اسی کا معتقد رہنا چاہیے تو پھر وہ ان احوال کی تبدیلی سے غمگین نہ ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱ے روایات صحیحہ میں ہے کہ جبرائیل علیہ السلام دیر تک رسول اللہ ﷺ کے پاس نہ آئے (یعنی وحی قرآنی بند رہی) مشرکین کہنے لگے کہ (لیجئے) محمد ﷺ کو اس کے رب نے رخصت کر دیا، اس کے جواب میں یہ آیات نازل ہوئیں، میرا گمان یہ ہے (واللہ اعلم) کہ یہ زمانہ فترت الوحی کا ہے جب سورۃ اقراء کی ابتدائی آیات نازل ہونے کے بعد ایک طویل مدت تک وحی رکی رہی تھی اور حضور ﷺ خود اس فترت کے زمانہ میں سخت مغموم و مضطرب رہتے تھے، تا آنکہ فرشتہ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا ایھا المدثر کا خطاب سنایا، اغلب ہے کہ اس وقت مخالفوں نے اس طرح کی چہ میگوئیاں کی ہوں، چنانچہ ابن کثیرؒ نے محمد بن اسحاق وغیرہ سے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ اسی احتمال کی تائید کرتے ہیں، ممکن ہے اسی دوران میں وہ قصہ بھی پیش آیا ہو جو بعض احادیث صحیحہ میں بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ بیماری کی وجہ سے دو تین رات نہ اٹھ سکے، تو ایک (خبیث) عورت کہنے لگی: اے محمد! معلوم ہوتا ہے تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا ہے (العیاذ باللہ) غرض ان سب خرافات کا جواب سورۃ والضحیٰ میں دیا گیا ہے، پہلے قسم کھائی دھوپ چڑھتے وقت کی اور اندھیری رات کی، پھر فرمایا کہ (دشمنوں کے سب خیالات غلط ہیں) نہ تیرا رب تجھ سے ناراض اور بیزار ہوا نہ تجھ کو رخصت کیا، بلکہ جس طرح ظاہر میں وہ اپنی قدرت وحکمت کے مختلف نشان ظاہر کرتا، اور دن کے پیچھے رات اور رات کے پیچھے دن کو لاتا ہے، یہی کیفیت باطنی حالات کی سمجھو، اگر سورج کی دھوپ کے بعد رات کی تاریکی کا آنا اللہ کی خفگی اور ناراضگی کی دلیل نہیں، اور نہ اس کا ثبوت ہے کہ اس کے بعد دن کا اجالا کبھی نہ ہوگا تو چند روز نور وحی کے رکے رہنے سے یہ کیونکر سمجھ لیا جائے کہ آج کل خدا اپنے منتخب کیے ہوئے پیغمبر سے خفا اور ناراض ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے وحی کا دروازہ بند کر دیا ہے، ایسا کہنا تو خدا کے علم محیط اور حکمت بالغہ پر اعتراض کرنا ہے، گویا اسے خبر نہ تھی کہ جس کو میں نبی بنا رہا ہوں وہ آئندہ چل کر اس کا اہل ثابت نہ ہوگا؟ العیاذ باللہ۔

فائدہ: ۲ے یعنی آپ ﷺ کی پچھلی حالت پہلی حالت سے کہیں ارفع واعلیٰ ہے، وحی کی یہ چند روزہ رکاوٹ آپ ﷺ کے نزول و

انحطاط کا سبب نہیں بلکہ بیش از بیش عروج وارتقاء کا ذریعہ ہے اور اگر پچھلی سے بھی پچھلی حالت کا تصور کیا جائے، یعنی آخرت کی شان وشکوہ کا، جبکہ آدم اور آدم کی ساری اولاد آپ ﷺ کے جھنڈے تلے جمع ہوگی تو وہاں کی بزرگی اور فضیلت تو یہاں کے اعزاز واکرام سے بے شمار درجہ بڑھ کر ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ناراض اور بیزار ہو کر چھوڑ دینا کیسا، ابھی تو تیرا رب تجھ کو (دنیا وآخرت میں) اس قدر دولتیں اور نعمتیں عطا فرمائے گا کہ تو پوری طرح مطمئن اور راضی ہو جائے، حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ محمد راضی نہیں ہوگا جب تک اس کی امت کا ایک آدمی بھی دوزخ میں رہے۔

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۞۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۞۷ وَوَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰی ۞۸

بھلا نہیں پایا تجھ کو یتیم پھر جگہ دی ۱؎ اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سجھائی ۲؎ اور پایا تجھ کو مفلس پھر بے پروا کر دیا ۳؎

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ مضمون کی تائید کے لیے اب آگے بعض نعمتوں کا بیان ہے) کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم نہیں پایا پھر (آپ کو) ٹھکانا دیا (چنانچہ آپ شکم مادر میں تھے کہ آپ کے والد کی وفات ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے دادا سے پرورش کرایا، پھر جب آپ آٹھ برس کے ہوئے تو ان کی بھی وفات ہوگئی تو آپ کے چچا سے پرورش کرایا، ٹھکانہ دینے کا مطلب یہی ہے) اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو (شریعت سے) بے خبر پایا سو (آپ کو شریعت کا) راستہ بتلایا (جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد ہے: ما كنت تدري ما الكتب ولا الايمان الخ اور وحی سے پہلے نبی کو شریعت کی تفصیل معلوم نہ ہونا کوئی عیب نہیں) اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادر پایا سو مالدار بنا دیا (اس طرح کہ حضرت خدیجہؓ کے مال میں آپ نے بطور مضاربت کے تجارت کی، اس میں نفع ملا، پھر حضرت خدیجہؓ نے آپ سے نکاح کر لیا اور اپنا تمام مال حاضر کر دیا، مطلب یہ کہ آپ ابتدا سے مورد انعامات رہے ہیں آئندہ بھی رہیں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضرت محمد ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی آپ ﷺ کی والد وفات پا چکے تھے، چھ سال کی عمر تھی کہ والدہ نے رحلت کی، پھر آٹھ سال کی عمر میں تک اپنے دادا (عبد المطلب) کی کفالت میں رہے، آخر اس دُرِ یتیم اور نادرہ روزگار کی ظاہری تربیت و پرورش کی سعادت آپ ﷺ کے بے حد شفیق چچا ابوطالب کے حصہ میں آئی، انہوں نے زندگی بھر آپ ﷺ کی نصرت وحمایت اور تکریم وتبجیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، ہجرت سے کچھ پہلے وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے، چند روز بعد یہ امانت الٰہی اللہ کے حکم سے انصار مدینہ کے گھر پہنچ گئی، اوس اور خزرج کی قسمت کا ستارہ چمک اٹھا، اور انہوں نے اس کی حفاظت اس طرح کی جس کی نظیر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی، یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ایواء کے تحت میں داخل ہیں، کما اشار الیہ ابن کثیر رحمہ اللہ۔

فائدہ: ۲؎ جب حضور ﷺ جوان ہوئے، قوم کے مشرکانہ اطوار اور بیہودہ رسم وراہ سے سخت بیزار تھے اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ پورے زور کے ساتھ موجزن تھا، عشق الٰہی کی آگ سینہ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی، وصول الی اللہ اور ہدایت خلق کی اس اکمل ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفس قدسی میں ودیعت کیا گیا تھا، اندر ہی اندر جوش مارتا تھا، لیکن کوئی صاف کھلا ہوا راستہ اور مفصل راستہ اور مفصل دستور العمل بظاہر دکھائی نہ دیتا تھا جس سے اس عرش وکرسی سے زیادہ وسیع قلب کو تسکین ہوتی، اسی جوش طلب اور فرط محبت میں آپ ﷺ بے قرار اور سرگرداں پھرتے اور غاروں اور پہاڑوں میں جا کر مالک کو یاد کرتے اور محبوب حقیقی کو پکارتے، آخر اللہ تعالیٰ نے غارِ حرا میں فرشتہ کو وحی دے کر بھیجا اور وصول الی اللہ اور اصلاح خلق کی تفصیلی راہیں آپ ﷺ پر کھول دیں، یعنی دین حق نازل فرمایا: مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (الشوریٰ: ۵۲)۔

تنبیہ: یہاں ضَآلًّا کے معنی کرتے وقت سورۃ یوسف کی آیت: قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ (یوسف: ۹۵) کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

فائدہ: ۳؎ اس طرح کہ حضرت خدیجہؓ کی تجارت میں آپ ﷺ مضارب ہو گئے، اس میں نفع ملا، پھر حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ سے نکاح کر لیا اور اپنا تمام مال حاضر کر دیا، یہ تو ظاہری غناء تھا، باقی آپ ﷺ کے قلبی اور باطنی غناء کا درجہ تو وہ غنی عن العالمین ہی جانتا ہے، کوئی بشر اس کا کیا اندازہ کر سکے، مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ابتداء سے موردِ انعامات رہے ہیں، آئندہ بھی رہیں گے، جس پروردگار نے اس شان سے آپ ﷺ کی تربیت فرمائی، کیا وہ خفا ہو کر آپ ﷺ کو یونہی درمیان میں چھوڑ دیگا، استغفر اللہ!۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ۭ وَاَمَّا السَّاۗىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰ۭ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱ۧ ع ۱۸

سو جو یتیم ہو اس کو مت دبا ۱؎ اور جو مانگتا ہو اس کو مت جھڑک ۲؎ اور جو احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر ۳؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے تین نعمتوں کا بیان ہوا، جن پر ادائے شکر کے لیے آگے آپ ﷺ کو تین باتوں کا حکم دیا جاتا ہے کہ جب ہم نے آپ کو یہ نعمتیں دی ہیں) تو آپ (اس کے شکر یہ میں) یتیم پر سختی نہ کیجئے اور سائل کو مت جھڑکئے (یہ تو شکر فعلی ہے) اور اپنے رب کے (مذکورہ) انعامات کا تذکرہ کرتے رہا کیجئے (یعنی زبان سے قولی شکر بھی ادا کیجیے کہ اللہ تعالی نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے)۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ: عرب جاہلیت میں یتیم بے چارے کی کوئی قدر نہ تھی، اور وہ کسی عزت یا جائداد کا حقدار نہ تھا، چنانچہ یتیم کے ساتھ ہر طرح کا حسن سلوک و مدارات برتا کیجئے، یہ آیت ماقبل کی آیت: **الم یجدك یتیما فاوی** کے مقابلہ پر ہے۔

وَاَمَّا السَّاۗىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ: محتاج سائل کا کوئی حق کسی قسم کا تسلیم ہی نہیں کیا جاتا، آپ ﷺ کو تعلیم مل رہی ہے کہ خود اپنی حاجت مندی کے زمانہ کو یاد کر لیا کیجئے اور محتاج سائل کے ساتھ حسن مدارات سے پیش آیے، یہ آیت ماقبل کی آیت: **ووجدك عآئلا فاغنی** کے مقابل ہے۔

آیت سے یہ فقہی استنباط کہ سائل کو کسی حال میں بھی جھڑکنا نہیں چاہیے، شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ اسے محض سوال کرنے پر بیشک جھڑکنا نہیں چاہئے، بلکہ انکار کی صورت میں صرف نرم الفاظ میں معذرت کر دینی چاہیے، لیکن سائل اگر پیچھا نہ چھوڑے، اور اپنی بات پر اڑا رہے، اور کسی طرح نہ مانے جس سے انقباض و تکدر پیدا ہو جانا طبعی بات ہے، تو اسے جھڑک دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ: یعنی اپنے رب کے انعامات کا تذکرہ کرتے رہا کیجیے، چنانچہ اولیاء اللہ جب کبھی اپنے کمالات کا اظہار کرتے ہیں تو اس سے ادائے شکر مقصود ہوتا ہے، نہ کہ عجب و ریاء۔

مسئلہ: سورہ ضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر سورت کے ختم پر تکبیر یعنی ''اللہ اکبر'' کہنا سنت ہے، بعض حضرات نے اس میں یہ حکمت ظاہر کی ہے کہ وحی بند ہونے کے بعد جب یہ سورت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے خوش ہو کر ''اللہ اکبر'' فرمایا تھا، اور پھر شاید مضمون کی مناسبت کی وجہ سے بقیہ سورتوں میں بھی تکبیر فرمائی ہو، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ بلکہ اس کی خبر گیری اور دلجوئی کر، جس طرح تم کو یتیمی کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے ٹھکانا دیا، تم دوسرے یتیموں کو ٹھکانا دو، اسی طرح کے مکارم اخلاق اختیار کرنے سے بندہ اللہ کے رنگ میں رنگا جاتا ہے: صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: "انا و کافل الیتیم کھاتین، واشار الی السبابة والوسطی"۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تم نادار تھے، اللہ تعالیٰ نے غناء عطا فرمایا، اب شکر گزار بندے کا حوصلہ یہی ہونا چاہیے کہ مانگنے والوں سے تنگ دل نہ ہو اور حاجتمندوں کے سوال سے گھبرا کر جھڑکنے ڈانٹنے کا شیوہ اختیار نہ کرے، بلکہ فراخدلی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے، احادیث میں سائلین کے مقابلہ پر آپ ﷺ کی وسعت اخلاق کے جو قصے منقول ہیں وہ بڑے سے بڑے مخالف کو آپ ﷺ کے اخلاق کا گرویدہ بنا دیتے ہیں۔

تنبیہ: صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ سائل کے زجر کی ممانعت اس صورت میں ہے جب وہ نرمی سے مان جائے، ورنہ اگر اڑی لگا کر

کھڑا ہو جائے اور کسی طرح نہ مانے اس وقت زجر جائز ہے۔

فائدہ: ۳ محسن کے احسانات کا بہ نیت شکر گذاری (نہ بقصد فخر ومباہات) چرچا کرنا شرعاً محمود ہے، لہٰذا جو انعامات اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر فرمائے ان کو بیان کیجئے، خصوصاً وہ نعمت ہدایت جس کا ذکر: ووجدك ضالا فهدى میں ہوا، اس کا لوگوں میں پھیلانا اور کھول کھول کر بیان کرنا تو آپ ﷺ کا فرض منصبی ہے، شاید آپ ﷺ کے ارشادات وغیرہ کو جو حدیث کہا جاتا ہے، وہ اسی لفظ فَحَدِّثْ سے لیا گیا ہو، واللہ اعلم۔

ایاتها ۸ — ۹۴ سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ مَكِّيَّةٌ ۱۲ — رکوعها ۱

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں نعمتوں پر جو ادائے شکر کا مضمون تھا اس سورت میں اسی کی تکمیل اور تتمہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿١﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿٢﴾

کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ ۱ اور اتار رکھا ہم نے تجھ پر سے بوجھ تیرا

الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿٣﴾ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿٤﴾

جس نے جھکا دی تھی پیٹھ تیری ۲ اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا ۳

خلاصہ تفسیر: کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ (علم اور حلم سے) کشادہ نہیں کر دیا (یعنی علم بھی وسیع عطا فرمایا اور تبلیغ میں جو مخالفین کی مزاحمت سے تکلیف پیش آتی ہے اس میں تحمل اور حلم بھی دیا) اور ہم نے آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا (یعنی اکثر جگہ شریعت میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نام مبارک ملایا گیا)۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ: ''وزر'' سے مراد وہ مباح اور جائز امور ہیں جو کبھی کبھی کسی حکمت و مصلحت کے پیش نظر آپ سے صادر ہو جاتے تھے اور بعد میں ان کا خلاف حکمت وخلاف اولیٰ ہونا ثابت ہوتا تھا تو آپ علوشان وغایت قرب کی وجہ سے اس سے ایسے غمگین ہوتے تھے جس طرح گناہ سے کوئی غمگین ہوتا ہے، چنانچہ یہاں ایسے امور پر مواخذہ نہ ہونے کی بشارت ہے، پس اس بناء پر یہ بشارت آپ کو دوبار ہوئی، ایک بار مکہ میں اس سورت کے ذریعہ، دوسری بار مدینہ میں سورۂ فتح میں اس کی تاکید و تکمیل اور تجدید و تفصیل کے لئے۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ: چنانچہ درمنثور میں ہے: "قال الله تعالىٰ: اذا ذكرت ذكرت معى"، یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جہاں میرا ذکر ہوگا آپ کا ذکر بھی میرے ساتھ ہوگا، جیسے خطبہ میں، تشہد میں، نماز میں، اذان میں، اقامت میں، اور اللہ کے نام کی رفعت اور شہرت ظاہر ہے پس جو اس کے ساتھ ملا ہوگا رفعت وشہرت میں وہ بھی تابع رہے گا

* * *

فائدہ: ۱ کہ اس میں علوم ومعارف کے سمندر اتار دیے اور لوازم نبوت اور فرائض رسالت برداشت کرنے کو بڑا وسیع حوصلہ دیا کہ بیشمار دشمنوں کی عداوت اور مخالفوں کی مزاحمت سے گھبرانے نہ پائیں۔

تنبیہ: احادیث وسیر سے ثابت ہے کہ ظاہری طور پر بھی فرشتوں نے متعدد مرتبہ آپ ﷺ کا سینہ چاک کیا، لیکن مدلول آیت کا بظاہر وہ معلوم نہیں ہوتا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ وحی کا اترنا اول سخت مشکل تھا، پھر آسان ہو گیا، یا منصب رسالت کی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے خاطر شریف پر گرانی گزرتی

ہوگی، وہ رفع کردی گئی، یا وزر سے وہ امور مباحہ مراد ہوں جو گاہ بگاہ آپ ﷺ قرین حکمت وصواب سمجھ کر لیتے تھے، اور بعد میں ان کا خلاف حکمت یا خلاف اولیٰ ہونا ظاہر ہوتا تھا اور آپ ﷺ بوجہ علوشان اور غایت قرب کے اس سے ایسے ہی مغموم ہوتے تھے جس طرح کوئی گناہ سے مغموم ہوتا ہے تو اس آیت میں ان پر مواخذہ نہ ہونے کی بشارت ہوئی، کذا روی عن بعض السلف، اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کی ہمت عالی اور پیدائشی استعداد جن کمالات ومقامات پر پہنچنے کا تقاضا کرتی تھی، قلب مبارک کو جسمانی ترکیب یا نفسانی تشویشات کی وجہ سے ان پر فائز ہونا دشوار معلوم ہوتا ہوگا، اللہ نے جب سینہ کھول دیا اور حوصلہ کشادہ کردیا، وہ دشواریاں جاتی رہیں اور سب بوجھ ہلکا ہوگیا۔

فائدہ: ۳ یعنی پیغمبروں اور فرشتوں میں آپ ﷺ کا نام بلند ہے، دنیا میں تمام سمجھدار انسان نہایت عزت ووقعت سے آپ ﷺ کا ذکر کرتے ہیں، اذان، اقامت، خطبہ، کلمہ طیبہ اور التحیات وغیرہ میں اللہ کے نام کے بعد آپ ﷺ کا نام لیا جاتا ہے اور خدا نے جہاں بندوں کو اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے وہیں ساتھ کے ساتھ آپ ﷺ کی فرمانبرداری کی تاکید کی ہے۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦

سو البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے، البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے ۱۔

خلاصہ تفسیر: (چونکہ مکہ میں آپ ﷺ اور مؤمنین طرح طرح کی تکالیف شدائد میں گرفتار تھے اس لئے آگے ان کے ازالہ کے لیے گذشتہ مضمون کے نتیجہ کے طور پر وعدہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نے آپ کو روحانی راحت دی اور روحانی کلفت دور کردی جیسا کہ الم نشرح سے معلوم ہوا) سو (اس سے دنیوی راحت ومحنت میں بھی ہمارے فضل وکرم کا امیدوار رہنا چاہئے، چنانچہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ) بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ (یعنی عنقریب ہی جو حکماً ساتھ ہونے کے معنی میں ہے) آسانی (ہونے والی) ہے (اور چونکہ ان مشکلات کی اقسام اور شمار بہت تھیں اس لئے اس وعدہ کو مکرر تاکید کے لئے فرماتے ہیں کہ) بیشک موجودہ مشکلات کے ساتھ آسانی (ہونے والی) ہے (چنانچہ وہ مشکلات ایک ایک کر کے سب دور ہوگئیں جیسا روایات احادیث وسیر وتوارِخ اس پر متفق ہیں)۔

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا: اس کی تفسیر پر یہ شبہ اس آیت پر نہیں ہوسکتا کہ بعض مشکلات کے بعد تو آسانی نہیں ہوتی؟ جواب یہ ہے کہ آیت میں وہ خاص مشکلات مراد ہیں جو حضور ﷺ کو درپیش تھیں، چنانچہ دنیا میں اگر کسی شخص کو عسر کے بعد یسر نصیب نہ ہو تو وہ اس آیت کے خلاف نہیں، البتہ عادۃ اللہ اب بھی یہی ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے اور سچے دل سے اللہ پر اعتماد رکھے اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی سے لو لگائے اور اسی کے فضل کا امیدوار رہے اور کامیابی میں دیر ہونے سے آس نہ توڑ بیٹھے تو ضرور اللہ تعالیٰ اس کے حق میں آسانی کردے گا، بعض روایات حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اللہ کی رضاجوئی میں جو سختیاں آپ ﷺ نے برداشت کیں اور رنج وتعب کھینچے، ان میں سے ہر ایک سختی کے ساتھ کئی کئی آسانیاں ہیں، مثلاً حوصلہ فراخ کردینا جس سے ان مشکلات کا اٹھانا سہل ہوگیا، اور ذکر کا بلند کرنا، جس کا تصور بڑی بڑی مصیبتوں کے تحمل کو آسان کردیتا ہے، یا یہ مطلب ہے کہ جب ہم نے آپ ﷺ کو روحانی راحت دی اور روحانی کلفت رفع کردی جیسا کہ الم نشرح سے معلوم ہوا تو اس سے دنیاوی راحت ومحنت میں بھی ہمارے فضل وکرم کا امیدوار رہنا چاہیے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ بیشک موجودہ مشکلات کے بعد آسانی ہونے والی ہے اور تاکید مزید کے لئے پھر کہتے ہیں کہ ضرور موجودہ سختی کے بعد آسانی ہوکر رہے گی، چنانچہ احادیث وسیر سے معلوم ہوچکا کہ وہ سب مشکلات ایک ایک کر کے دور کردی گئیں، اور ہر ایک سختی اپنے بعد کئی کئی آسانیاں لے کر آئی، اب بھی عادۃ اللہ یہی ہے کہ جو شخص سختی پر صبر کرے اور سچے دل سے اللہ پر اعتماد رکھے اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی سے لو لگائے، اسی کے فضل ورحمت کا امیدوار رہے، امتداد زمانہ سے گھبرا کر آس نہ توڑ بیٹھے ضرور اللہ اس کے حق میں آسانی کرے گا، ایک طرح کی نہیں، کئی طرح کی، وفی الحدیث: "لن يغلب عسر يسرين"، وفيه ايضا: "لو جاء العسر فدخل هٰذا الحجر لجاء اليسر حتى يدخل عليه فيخرجه"۔

ع ۱۹

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝٧ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝٨

پھر جب تو فارغ ہوتو محنت کر، اور اپنے رب کی طرف دل لگا ۱

خلاصہ تفسیر: (آگے ان نعمتوں پر شکر کا حکم ہے کہ جب ہم نے آپ کو ایسی ایسی نعمتیں دی ہیں) تو آپ جب (تبلیغی احکام سے جو کہ دوسروں کی نفع رسانی کی وجہ سے عبادت ہے) فارغ ہو جایا کریں تو (دوسری عبادات متعلقہ بذات خاص میں) محنت کیا کیجئے (مراد کثرت عبادت وریاضت ہے کہ آپ کی شان کے یہی مناسب ہے) اور (جو کچھ مانگنا ہو اس میں) اپنے رب ہی کی طرف توجہ رکھئے (یعنی اسی سے مانگئے اور اس میں بھی ایک حیثیت سے دشواری دور ہونے کی بشارت ہے کہ خود درخواست کرنے کا حکم گویا درخواست پورا کرنے کا وعدہ ہے)۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ: اس سے معلوم ہوا کہ علماء جو تعلیم وتبلیغ اور اصلاح خلق کا کام کرنے والے ہیں ان کو اس سے غفلت نہ ہونا چاہئے کہ ان کا کچھ وقت خلوت میں توجہ الی اللہ اور ذکر اللہ کے لئے بھی مخصوص رہنا چاہئے جیسا کہ علماء سلف کی سیرتیں اس پر شاہد ہیں اس کے بغیر تعلیم وتبلیغ بھی موثر نہیں ہوتی ان میں نور وبرکت نہیں ہوتی، اور لفظ فانصب ''نصب'' سے مشتق ہے، جس کے اصلی معنی تعب اور تکان کے ہیں، اس میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ عبادت اور ذکر اللہ اس حد تک جاری رکھا جائے کہ کچھ مشقت اور تکان محسوس ہونے لگے، صرف نفس کی راحت وخوشی ہی پر اس کا مدار نہ رہے، اور کسی وظیفہ اور معمول کی پابندی خود ایک مشقت اور تعجب ہے، خواہ کام مختصر ہی ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جب خلق کے سمجھانے سے فراغت پائے تو خلوت میں بیٹھ کر محنت کر، تا کہ مزید یسر کا سبب بنے اور اپنے رب کی طرف (بلا واسطہ) متوجہ ہو۔

تنبیہ: خلق کو سمجھانا اور نصیحت کرنا آپ ﷺ کی اعلیٰ ترین عبادت تھی، لیکن اس میں فی الجملہ مخلوق کا توسط ہوتا تھا، مطلوب یہ ہے کہ ادھر سے ہٹ کر بلا واسطہ بھی متوجہ ہونا چاہئے، اس کی تفسیر اور کئی طرح کی گئی ہے، مگر اقرب یہی معلوم ہوتی ہے۔

ایاتها ٨ | ٩٥ سُوْرَةُ التِّيْنِ مَكِّيَّةٌ ٢٨ | رکوعها ١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝١ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝٢ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝٣

قسم انجیر کی اور زیتون کی ۱ اور طور سینین کی ۲ اور اس شہر امن والے کی ۳

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝٤ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝٥

ہم نے بنایا آدمی خوب سے انداز ے پر ۴ پھر پھینک دیا اس کو نیچوں سے نیچے ۵

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝٦

مگر جو یقین لائے اور عمل کیے اچھے سو ان کے لیے ثواب ہے بے انتہا ۶

خلاصہ تفسیر: قسم ہے انجیر (کے درخت) کی اور زیتون (کے درخت) کی، اور طور سینین کی، اور اس امن والے شہر (مکہ معظمہ) کی، کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچہ میں ڈھالا ہے، پھر (ان میں جو بوڑھا ہو جاتا ہے) ہم اسکو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر

کر دیتے ہیں (یعنی وہ خوبصورتی بدصورتی سے اور قوت کمزوری سے بدل جاتی ہے اور برے سے برا ہو جاتا ہے، اس آیت کے عموم سے چونکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھے سب کے سب قبیح اور برے ہو جاتے ہیں جس سے آخرت میں بھی برے اور خراب ہونے کا وہم ہوسکتا ہے چنانچہ اس ابہام کو دور کرنے کے لیے آگے ایک استثناء بیان کیا جاتا ہے) لیکن جولوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کیلئے اس قدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگا (جس میں بتلا دیا کہ مؤمن صالح بوڑھے اور ضعیف ہو جانے کے باوجود انجام کار کے اعتبار سے اچھے ہی رہتے ہیں، بلکہ پہلے سے زیادہ ان کی عزت بڑھ جاتی ہے)۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ: قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ شروع میں چار چیزوں کی قسمیں کھائی گئیں ہیں، دو درخت جو کہ بہت نفع دینے والے ہیں، اور دو زمینیں جو کہ بہت برکت والی ہیں، ایک زمین موسی علیہ السلام سے خدا کے ہم کلام ہونے کا مقام ہے، اور دوسری زمین آپ ﷺ کا مسکن، جائے پیدائش اور وحی نازل ہونے کی جگہ ہے، سو درختوں کی قسم کو مقصود سے مناسبت ظاہر ہے کہ درخت کی بھی انسان کی طرح نشو ونما ہوتی ہے، پھر سوکھ کر کٹنے کے قابل ہو جاتا ہے، چونکہ یہاں اشرف المخلوقات انسان کا ذکر تھا اس لیے قسم بھی اشرف الاشجار کی مناسب ہوئی، اور کوہ طور اور مکہ معظمہ دونوں وحی کی جگہ ہیں تو آخرت کی جزا سے ان کو زیادہ مناسبت ہوئی، کیونکہ وحی سے آخرت کی جزا کا علم ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ: اس سے مقصود کمال قبح کا بیان کرنا ہے، پچھلی آیت میں ساری مخلوقات اور کائنات سے احسن بنانے کا بیان تھا، اس آیت میں اس کے بالمقابل یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح وہ اپنی ابتدا اور شباب میں ساری مخلوقات سے زیادہ حسین اور سب سے بہتر تھا آخر میں اس پر یہ حالت بھی آتی ہے کہ وہ بد سے بدتر اور برے سے برا ہو جاتا ہے، جس سے ان کے دوبارہ پیدا کرنے پر حق تعالیٰ کی قدرت ہونا واضح ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: اللہ الذی خلقکم من ضعف الخ اور اس سورت کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ پیدا کرنے اور زندہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ثابت کرنا ہے جیسا کہ آگے: فما یکذبك بعد بالدین کے جملے سے اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اس آیت میں جو مؤمنین صالحین کا استثناء ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر بڑھاپے کے حالات اور عجز و درماندگی نہیں آتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس جسمانی بیکاری اور مادی خرابی کا نقصان ان کو نہیں پہنچتا، بلکہ نقصان صرف ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اپنی ساری فکر اور توانائی اسی مادی درستی پر خرچ کی تھی وہ اب ختم ہوگئی اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں بخلاف مؤمنین صالحین کے کہ ان کا اجر وثواب کبھی قطع ہونے والا نہیں، اگر دنیا میں بڑھاپے کی بیماری کمزوری اور عجز سے سابقہ بھی پڑا تو آخرت میں ان کے لئے درجات عالیہ اور راحت ہی راحت موجود ہے اور بڑھاپے کی بیکاری اور عجز سے سابقہ بھی پڑا تو آخرت میں ان کے لئے درجات عالیہ اور راحت ہی راحت موجود ہے اور بڑھاپے کی بیکاری میں بھی عمل کم ہو جانے کے باوجود ان کے نامہ اعمال میں وہ سب اعمال لکھے جاتے ہیں جو وہ قوت کے زمانے میں کیا کرتا تھا۔

* * *

فائدہ: ۱ انجیر اور زیتون دونوں چیزیں نہایت کثیر المنافع اور جامع الفوائد ہونے کی وجہ سے انسان کی حقیقت جامعہ کے ساتھ خصوصی مشابہت رکھتے ہیں، اسی لئے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کے مضمون کو ان دونوں کی قسم سے شروع کیا، اور بعض محققین کہتے ہیں کہ یہاں التین اور الزیتون سے دو پہاڑوں کی طرف اشارہ ہے جن کے قریب بیت المقدس واقع ہے، گویا ان درختوں کی قسم مقصود نہیں بلکہ اس مقام مقدس کی قسم کھائی ہے جہاں یہ درخت بکثرت پائے جاتے ہیں اور وہی مولد و مبعث حضرت مسیح علیہ السلام کا ہے۔

فائدہ: ۲ ''طور سینین'' یا ''طور سینا'' وہ پہاڑ ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شرف ہم کلامی بخشا۔

فائدہ: ۳ ''امن والا شہر'' مکہ معظمہ ہے جہاں سارے عرب عالم کے سردار حضرت محمد ﷺ مبعوث ہوئے اور اللہ کی سب سے بڑی اور آخری امانت (قرآن کریم) اول اسی شہر میں اتاری گئی، تورات کے آخر میں ہے: ''اللہ طور سینا سے آیا اور ساعیر سے چمکا (جو بیت المقدس کا پہاڑ ہے) اور فاران سے بلند ہو کر پھیلا'' (فاران مکہ کے پہاڑ ہیں)۔

فائدہ: ۴ یعنی یہ سب مقامات متبرکہ جہاں سے ایسے ایسے اولوالعزم پیغمبر اٹھے گواہ ہیں کہ ہم نے انسان کو کیسے اچھے سانچے میں ڈھالا،

اور کیسی کیسی قوتیں اور ظاہری و باطنی خوبیاں اس کے وجود میں جمع کی ہیں، اگر یہ اپنی صحیح فطرت پر ترقی کرے تو فرشتوں سے گوئے سبقت لے جائے، بلکہ مسجود ملائکہ بنے۔

فائدہ:۵ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''اس کو لائق بنایا فرشتوں کے مقام کا، پھر جب منکر ہوا تو جانوروں سے بدتر ہے''۔

فائدہ:٦ جو کبھی کم یا ختم نہ ہوگا۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ ۝٧ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ۝٨ ع

پھر تو اس کے پیچھے کیوں جھٹلائے بدلہ ملنے کو ۱ کیا نہیں ہے اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم ۲

خلاصہ تفسیر: (پیچھے انسان کی پیدائش اور اس کے پستی کی طرف لوٹا دینے کا ذکر تھا، اب آگے اسی مضمون کے نتیجہ کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ پیدا کرنے اور احوال کے بدلنے پر قادر ہیں) تو (اے انسان!) پھر کون چیز تجھ کو قیامت کے بارے میں منکر بنا رہی ہے (یعنی وہ کونسی دلیل ہے جس کی بنا پر تو ان دلائل کے ہوتے ہوئے قیامت کا منکر ہو رہا ہے) کیا اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے (دنیوی تصرفات میں بھی جن میں سے انسان کا پیدا کرنا اور پھر پستی کی طرف لوٹا دینا بھی ہے، اور اخروی تصرفات میں بھی جن میں سے قیامت میں دوبارہ زندہ کرنا اور جزا و سزا دینا بھی ہے)۔

* * *

فائدہ:۱ یعنی او آدمی! ان دلائل کے بعد کیا سبب ہے جس کی بناء پر سلسلہ جزاء و سزا کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ یا یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا، یعنی ایسے صاف بیانات کے بعد کیا چیز ہے جو منکرین کو جزاء کے معاملہ میں تمہاری تکذیب پر آمادہ کرتی ہے خیال کرو! انسان کو اللہ نے پیدا کیا اور بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا، اس کا قوام ایسی ترکیب سے بنایا کہ اگر چاہے تو نیکی اور بھلائی میں ترقی کر کے فرشتوں سے آگے نکل جائے، کوئی مخلوق اس کی ہمسری نہ کر سکے، چنانچہ اس کے کامل نمونے دنیا نے شام، بیت المقدس، کوہ طور اور مکہ معظمہ میں اپنے اپنے وقت پر دیکھ لئے جن کے نقش قدم پر اگر آدمی چلیں تو انسانی کمالات اور دارین کی کامیابی کے اعلیٰ ترین مقامات پر پہنچ جائیں، لیکن انسان خود اپنی بدتمیزی اور بدعملی سے ذلت و ہلاکت کے گڑھے میں گرتا اور اپنی پیدائشی بزرگی کو گنوا دیتا ہے، کسی ایماندار اور نیکوکار انسان کو اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ نیچے نہیں گراتا بلکہ اس کے تھوڑے عمل کا بے اندازہ صلہ مرحمت فرماتا ہے، کیا ان حالات کے سننے کے بعد بھی کسی کا منہ ہے جو دین فطرت کے اصول اور جزاء و سزا کے ایسے معقول قاعدوں کو جھٹلا سکے؟ ہاں ایک ہی صورت تکذیب و انکار کی ہو سکتی ہے کہ دنیا کو یونہی ایک بے سرا کارخانہ فرض کر لیا جائے، جس پر نہ کسی کی حکومت ہو نہ یہاں کوئی آئین و قانون جاری ہو، نہ کسی بھلے برے پر کوئی گرفت کر سکے، اس کا جواب آگے دیتے ہیں: الیس اللہ باحکم الحکمین۔

فائدہ:۲ یعنی اس کی شہنشاہی کے سامنے دنیا کی سب حکومتیں ہیچ ہیں، جب یہاں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں اپنے وفاداروں کو انعام اور مجرموں کو سزا دیتی ہیں تو اس احکم الحاکمین کی سرکار سے یہ توقع کیوں نہ رکھی جائے۔

آیاتها ۱۹ ۔ ۹٦ سُورَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ ۱ ۔ رکوعها ۱

خلاصہ تفسیر: سورہ ضحیٰ کی تمہید میں شریعت کی جن اہم چیزوں کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ایک نبوت کا عطا کیا جانا اور وحی کی تعلیم ہے جو توحید کے بعد تمام اہم اور ضروری چیزوں میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی کی مناسب یہ مضمون بھی ہے کہ صاحب وحی یعنی پیغمبر کے مخالف کی مذمت کی جائے اور اس کو دھمکایا جائے، چنانچہ اس سورت میں اسی مضمون کا بیان ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ‌ۚ ﴿۱﴾ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ‌ۚ ﴿۲﴾

پڑھ اپنے رب کے نام سے ۱۔ جو سب کا بنانے والا ۲۔ بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے ۳۔

خلاصہ تفسیر: اقراء سے آیت مالم یعلم تک سب سے پہلی وحی ہے جس کے نزول سے نبوت کی ابتدا ہوئی، جس کا قصہ حدیث شیخین میں ہے کہ عطاء نبوت کے قریب زمانے میں آپ کو از خود خلوت پسند ہوگئی، آپ غار حرا میں تشریف لے جا کر کئی کئی رات رہتے تھے، ایک روز اچانک جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ سے کہا کہ: اقراء یعنی پڑھئے، آپ نے فرمایا: "ماانا بقارئ"، یعنی میں کچھ پڑھا ہوا نہیں ہوں، انہوں نے آپ کو خوب زور سے دبایا پھر چھوڑ دیا اور پھر کہا: اقراء، آپ نے پھر وہی جواب دیا، اسی طرح تین بار کیا پھر آخر میں دبانے کے بعد چھوڑ کر کہا: اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ (الی قولہ) عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ، جبرئیل علیہ السلام کے کئی بار اقراء کہنے سے یہ مقصود نہ تھا کہ جو پہلے سے یاد ہو وہ پڑھیے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ جو آئندہ بتلایا جائے گا اس کو پڑھیے، جیسا کہ استاذ طالب علم سے الف با شروع کرانے کے وقت کہتا ہے کہ "ہاں پڑھو!" پس اس سے تکلیف مالایطاق لازم نہیں آتی، اور آپ ﷺ کا عذر فرمانا یا تو اس وجہ سے تھا کہ آپ کو اس جملے کے معنی متعین نہ ہوئے ہوں کہ مجھ سے کیا پڑھوانا چاہتے ہیں اور یہ امر کوئی خلاف شان نہیں ہے، یا معنی کی تعیین کے باوجود عذر فرمانا اس سبب سے ہے کہ قراءت کا استعمال اکثر لکھی ہوئی چیز کو پڑھنے کے معنی میں آتا ہے تو آپ ﷺ نے حروف نہ پہچاننے کی وجہ سے یہ عذر فرمایا ہو، اور جبرئیل علیہ السلام کا آپ ﷺ کو دبانا ظن غالب یہ ہے کہ وحی کا بوجھ اٹھانے کی استعداد پہنچانے کے لیے تھا، واللہ اعلم۔

اے پیغمبر (ﷺ!) آپ (پر جو) قرآن (نازل ہوا کرے گا جس میں اس وقت کی نازل ہونے والی آیتیں بھی داخل ہیں) اپنے رب کا نام لے کر پڑھا کیجیے (یعنی جب پڑھیے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کہہ کر پڑھا کیجیے جیسا کہ ایک آیت: **فاذا قرات القرآن فاستعذ باللہ** میں قرآن کے ساتھ اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم ہوا ہے، اور لفظ "رب" سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہم آپ کی مکمل تربیت کریں گے اور نبوت کے اعلیٰ درجات پر پہنچا دیں گے، آگے رب کی صفت ہے یعنی وہ ایسا رب ہے) جس نے (تمام مخلوقات کو) پیدا کیا (عمومی تخلیق کے بیان کے بعد اب آگے خاص طور پر ارشاد ہے کہ) جس نے (سب مخلوقات میں سے خاص طور پر) انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا (ساری مخلوق کی خلقت کے بعد انسان کا نام صراحت کے ساتھ لینا عام نعمت کے بعد خاص نعمت پر توجہ دلانا ہے)۔

احادیث میں جو آپ ﷺ کا ڈر جانا اور ورقہ ابن نوفل سے بیان کرنا آیا ہے وہ کسی شبہ کی وجہ سے نہ تھا بلکہ خوف تو وحی کی عظمت و ہیبت کی وجہ سے اضطراری طور پر تھا، اور ورقہ سے بیان کرنا عدم یقین کی وجہ سے نہیں، بلکہ مزید اطمینان اور یقین کے لیے تھا۔

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ: ان دونوں حکم سے جو اصل مقصود ہے یعنی توکل و استعانت وہ تو واجب ہے اور زبان سے کہہ لینا مسنون و مستحب ہے، اگرچہ اصل مقصود کے اعتبار سے اس آیت کے نزول کے وقت بسم اللہ کا آپ کو معلوم ہونا ضروری نہیں، لیکن بعض روایات میں اس سورت کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا نازل ہونا بھی آیا ہے: " اخرجه الواحدی عن عکرمة والحسن انهما قالا: اول مانزل بسم الله الرحمن الرحيم، و اول سورة اقراء، واخرجه ابن جرير وغيره عن ابن عباس انه قال: اول مانزل جبرئيل عليه السلام على النبی ﷺ قال: يا محمد! استعذ، ثم قل: بسم الله الرحمن الرحيم "، ان آیتوں میں جو قراءۃ کو اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرنے کا حکم ہوا ہے اس حکم میں خود ان آیتوں کا داخل ہونا ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ: "اسمع ما اقول لك" یعنی میں جو کچھ تجھ سے کہوں تو اس کو سن، تو خود اس جملہ کے سننے کا حکم کرنا بھی اس کو مقصود ہے پس حاصل یہ ہوگا کہ خواہ ان آیتوں کو پڑھو یا جو آیات بعد میں نازل ہوں گی ان کو پڑھو سب کی قرات

اللہ کے نام سے ہونی چاہئے اور آپ کو بعلم ضروری معلوم ہوگیا کہ یہ قرآن اور وحی ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ: یہاں بطور خاص اس وصف تخلیق کو ذکر کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ حق تعالی کی نعمتوں میں سے پہلے اسی نعمت کا ظہور ہوتا ہے اس لیے ذکر کرنے میں بھی اس کا مقدم اور سب سے پہلے ہونا ہی مناسب ہے، نیز خلق یعنی پیدا کرنا دلالت کرتا ہے خالق پر، چنانچہ خالق کی معرفت ہی سب سے اہم اور مقدم ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ: ساری مخلوق کی خلقت کے بعد انسان کا نام صراحت کے ساتھ لینے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس نعمت میں بھی عام مخلوقات سے زیادہ انسان پر انعام ہے کہ اس کو جماد محض سے کس درجہ تک ترقی دی کہ صورت کیسی بنائی، عقل وعلم سے مشرف بنایا، پس انسان کو زیادہ شکر اور ذکر کرنا چاہئے، انسانی تخلیق کے مختلف مراحل میں سے یہاں بطور خاص علق کا ذکر کیا، علق کے معنی منجمد خون کے ہیں انسان کی تخلیق پر مختلف دور گزرے اور گزرتے ہیں، اس کی ابتداء مٹی اور عناصر سے ہے، پھر نطفہ سے، اس کے بعد علق یعنی منجمد خون بنتا ہے، پھر مضغہ گوشت، پھر ہڈیاں وغیرہ پیدا کی جاتی ہیں، علق ان تمام ادوار تخلیق میں ایک درمیانی حالت ہے اس کو اختیار کرکے اس کے اول وآخر کی طرف اشارہ ہوگیا۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ پانچ آیتیں (اقرا سے مالم یعلم تک) قرآن کی سب آیتوں اور سورتوں سے پہلے اتریں، آپ ﷺ غار حرا میں خدائے واحد کی عبادت کر رہے تھے کہ اچانک حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر آئے اور آپ ﷺ کو کہا: اقرا (پڑھیے) آپ ﷺ نے فرمایا: "ماانا بقارئ" (میں پڑھا ہوا نہیں) جبرائیل علیہ السلام نے کئی بار آپ ﷺ کو زور زور سے دبایا، اور بار بار وہی لفظ اقرا کہا، آپ ﷺ وہی "ماانا بقارئ" جواب دیتے رہے، تیسری مرتبہ جبرائیل علیہ السلا منے زور سے دبا کر کہا: اقرا باسم ربك یعنی اپنے رب کے نام کی برکت اور مدد سے پڑھیے، مطلب یہ ہے کہ جس رب نے ولادت سے اس وقت تک آپ ﷺ کی ایک عجیب اور نرالی شان سے تربیت فرمائی جو پتہ دیتی ہے کہ آپ ﷺ سے کوئی بہت بڑا کام لیا جانے والا ہے کیا وہ آپ ﷺ کو ادھر میں چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں، اسی کے نام پر آپ ﷺ کی تعلیم ہوگی جس کی مہربانی سے تربیت ہوئی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی جس نے سب چیزوں کو پیدا کیا، کیا وہ تم میں صفت قرات پیدا نہیں کرسکتا۔

فائدہ: ۳ جمے ہوئے خون میں نہ حس ہے نہ شعور، نہ علم، نہ ادراک محض جماد لایعقل ہے، پھر جو خدا جماد لایعقل کو انسان عاقل بناتا ہے، وہ ایک عاقل کو کامل اور ایک امی کو قاری و عالم نہیں بنا سکتا، یہاں تک قرات کا امکان ثابت کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کچھ مشکل نہیں کہ تم کو باوجود امی ہونے کے قاری بنادے، آگے اس کی فعلیت اور وقوع پر متنبہ فرماتے ہیں:

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ﴿۵﴾

پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے ۱ جس نے علم سکھایا قلم سے ۲ سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا ۳

خلاصہ تفسیر: (آگے قرآن کی قراءت کو اہم مقصود قرار دینے کے لئے ارشاد ہے کہ) آپ قرآن پڑھا کیجئے اور (آگے اس عذر کو ختم کردینے کی طرف اشارہ ہے جو آپ نے جبرئیل علیہ السلام سے پیش کیا تھا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، اس کے لئے ارشاد فرمایا کہ) آپ کا رب بڑا کریم ہے (جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور وہ ایسا ہے) جس نے (لکھے پڑھوں کو نوشتہ) قلم سے تعلیم دی (اور عموماً) انسان کو (دوسرے ذرائع سے) ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا (جواب کا حاصل یہ ہے کہ اول تو تعلیم کچھ لکھنے پڑھنے ہی میں منحصر نہیں، دوسرے اسباب سے بھی تعلیم ہوسکتی ہے، پھر اسباب خود موثر حقیقی نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت علوم عطا کرنے والے ہم ہیں، پس اگر چہ آپ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے، مگر جب ہم نے آپ کو پڑھنے کا حکم کیا ہے تو ہم دوسرے ذریعہ سے آپ کو پڑھنے پر اور علوم وحی کے محفوظ رکھنے پر قدرت دے دیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہو، پس ان آیات میں آپ کی نبوت اور اس کے مقدمات و متمات کا پورا بیان ہوگیا)۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ: یہاں اقرا کا حکم دوبارہ اس لیے فرمایا کہ پہلے حکم یعنی اقرا باسم ربك سے یہ شبہ نہ ہوجائے کہ قرآن کی قراءت خود مقصود نہیں، بلکہ وہاں مقصود یہ ہے کہ جب قرآن پڑھو تو خدا کے نام سے شروع کرو، اور یہاں یہ بتایا کہ قرآن کی قراءت خود بھی فی نفسہٖ مقصود ہے، کیونکہ تبلیغ کا ذریعہ یہی قراءت ہے اور تبلیغ ہی صاحب وحی کا اصل کام ہے، پس اس تکرار میں آپ کی نبوت اور آپ کو تبلیغ کا حکم دیا جانے کا اظہار بھی ہو گیا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی آپ ﷺ کی تربیت جس شان سے کی گئی، اس سے آپ ﷺ کی کامل استعداد اور لیاقت نمایاں ہے جب اِدھر سے استعداد میں قصور نہیں اور اُدھر سے مبداءِ فیاض میں بخل نہیں، بلکہ وہ تمام کریموں سے بڑھ کر کریم ہے، پھر وصول فیض میں کیا چیز مانع ہو سکتی ہے ضرور ہے کہ یونہی ہو کر رہے۔

فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''حضرت نے کبھی لکھا پڑھا نہ تھا، فرمایا کہ قلم سے بھی علم وہی دیتا ہے یوں بھی وہی دے گا''، اور ممکن ہے ادھر بھی اشارہ ہو کہ جس طرح مفیض و مستفیض کے درمیان جبرائیل علیہ السلام محض ایک واسطہ ہیں، جس طرح قلم کا توسط اس کو مستلزم نہیں کہ وہ مستفیض سے افضل ہوجائے، ایسے ہی یہاں حقیقت جبرائیلیہ کا حقیقت محمدیہ سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔

فائدہ: ۳ یعنی انسان کا بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو کچھ نہیں جانتا، آخر اسے رفتہ رفتہ کون سکھاتا ہے، بس وہی رب قدیر جو انسان کو جاہل سے عالم بناتا ہے، اپنے ایک امی کو عارف کامل بلکہ تمام عارفوں کا سردار بنادے گا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ﴿٦﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ﴿٧﴾ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۭ﴿٨﴾

کوئی نہیں آدمی سر چڑھتا ہے اس سے کہ دیکھے اپنے آپ کو بے پروا۔۱ بیشک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: چونکہ صاحب نبوت یعنی پیغمبر کی مخالفت انتہائی درجہ کا گناہ اور بہت قبیح ہے اس لیے آئندہ آیتوں میں۔ جن کا نزول گذشتہ آیات سے ایک مدت کے بعد ہوا۔ آپ ﷺ کے ایک خاص مخالف ابوجہل کی مذمت عام الفاظ کے ساتھ مذکور ہے تاکہ یہ وعید ہر مخالف کو شامل ہوجائے، جس کا سبب نزول یہ ہے کہ ایک بار ابوجہل نے آپ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا تو کہنے لگا کہ میں آپ کو اس سے بارہا منع کر چکا ہوں، آپ ﷺ نے اس کو جھڑک دیا تو کہنے لگا کہ مکہ میں سب سے بڑا مجمع میرے ساتھ ہے اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر اب کی بار نماز پڑھتے دیکھوں گا تو نعوذ باللہ آپ کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا، چنانچہ ایک بار اسی ارادہ سے چلا مگر قریب جا کر رک گیا اور پیچھے ہٹنے لگا، لوگوں نے وجہ پوچھی کہنے لگا مجھ کو آگ کی ایک خندق حائل معلوم ہوئی اور اس میں پروالی چیزیں نظر آئیں آپ ﷺ نے فرمایا وہ فرشتے تھے اگر اور آگے آتا تو فرشتے اس کو بوٹی بوٹی کر کے نوچ ڈالتے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، چنانچہ ارشاد ہے کہ:

سچ مچ بیشک (کافر) آدمی حد (آدمیت) سے نکل جاتا ہے اس وجہ سے کہ اپنے آپ کو (ابنائے جنس سے) مستغنی دیکھتا ہے (جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہے: ولو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض الخ حالانکہ اس استغناء پر سرکشی حماقت ہے، کیونکہ کسی کو اگرچہ مخلوق سے من وجہ استغنا ہو بھی جائے لیکن حق تعالیٰ سے استغنا تو کسی حال میں نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ آخر میں) اے مخاطب! (عام) تیرے رب ہی کی طرف سب کا لوٹنا ہو گا (اور اس وقت بھی زندگی کی حالت کی طرح اللہ کی قدرت کے احاطہ میں گھرا ہو گا، اور اس حالت میں جو اس کو سرکشی کی سزا ہو گی اس سے بھی کہیں نہ بھاگ سکے گا، پس ایسا عاجز انسان ایسے قادر سے کب مستغنی ہو سکتا ہے سو اپنے کو مستغنی سمجھنا اور اس کی بنا پر سرکشی کرنا بڑی بے وقوفی ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی آدمی کی اصل تو اتنی ہے کہ جمے ہوئے خون سے بنا اور جاہل محض تھا۔ خدا نے علم دیا، مگر وہ اپنی اصل حقیقت کو ذرا یاد نہیں رکھتا دنیا کے مال و دولت پر مغرور ہو کر سرکشی اختیار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کی پروا ہی نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی اول بھی اس نے پیدا کیا اور آخر بھی اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ اسی وقت اس تکبر اور خود فراموشی کی حقیقت کھلے گی۔

أَرَءَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ⑨ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ⑩ أَرَءَيْتَ إِن كَانَ عَلَى الْهُدَىٰ ⑪

تونے دیکھا اس کو جو منع کرتا ہے، ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھے ۱؎ بھلا دیکھ تو اگر ہوتا نیک راہ پر

أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ ⑫ أَرَءَيْتَ إِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ⑬ أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ⑭

یا سکھلاتا ڈر کے کام، بھلا دیکھ تو اگر جھٹلایا اور منہ موڑا ۲؎ یہ نہ جانا کہ اللہ دیکھتا ہے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (آگے استفہام کی صورت میں اس کی سرکشی پر تعجب ہے، یعنی) اے مخاطب! (عام) بھلا اس شخص کا حال تو بتلا جو (ہمارے) ایک (خاص) بندے کو منع کرتا ہے جب وہ (بندہ) نماز پڑھتا ہے (مطلب یہ کہ اس شخص کا حال دیکھ کر تو بتلا کہ اس سے زیادہ عجیب بات بھی کوئی ہے، حاصل یہ کہ نمازی کو نماز سے روکنا نہایت ہی بری اور عجیب بات ہے، آگے اسی تعجب کی تاکید وتقویت کے لئے دوبارہ فرماتے ہیں کہ) اے مخاطب! (عام) بھلا یہ تو بتلا کہ اگر وہ بندہ (جس کو نماز سے روکا گیا ہے) ہدایت پر ہو (کہ جو ذاتی کمال ہے یعنی جس کا فائدہ عام طور پر اپنی ذات تک محدود ہے) یا وہ (دوسروں کو بھی) تقویٰ کی تعلیم دیتا ہو (جو کمال متعدی یعنی دوسروں کو بھی نفع پہنچانا ہے اور) اے مخاطب! (عام) بھلا یہ تو بتلا کہ اگر وہ شخص (منع کرنے والا دین حق کو) جھٹلاتا ہو اور (دین حق سے) روگردانی کرتا ہو (یعنی نہ عقیدہ رکھتا ہو اور نہ عمل، یعنی اول تو یہ دیکھو کہ نماز سے منع کرنا کتنا برا ہے، پھر بالخصوص یہ دیکھو کہ جب منع کرنے والا ایک گمراہ ہے اور جس کو منع کر رہا ہے وہ ہدایت کا اعلیٰ نمونہ ہے تو یہ کتنی عجیب بات ہے، آگے اس منع کرنے پر اس کو وعید ہے یعنی) کیا اس شخص کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ (اس کی سرکشی اور اس سے پیدا ہونے والے اعمال کو) دیکھ رہا ہے (اور اس پر سزا دے گا)۔

أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ: شاید کلمہ تردید ''اوْ'' لانے سے اس طرف اشارہ ہو کہ اگر ان دونوں میں سے ایک صفت بھی ہوتی تب بھی منع کرنے والے (ابوجہل) کی مذمت کے لئے کافی تھی چہ جائیکہ دونوں جمع ہوں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس کی سرکشی اور تمرد کو دیکھو کہ خود کو تو اپنے رب کے سامنے جھکنے کی توفیق نہیں، دوسرا بندہ اگر خدا کے سامنے سربسجود ہوتا ہے اسے بھی نہیں دیکھ سکتا، ان آیات میں اشارہ ابوجہل ملعون کی طرف ہے، جب وہ حضرت کو نماز پڑھتے دیکھتا تو چڑاتا اور دھمکاتا تھا، اور طرح طرح سے ایذائیں پہنچانے کی سعی کرتا تھا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی نیک راہ پر ہوتا بھلے کام سکھاتا تو کیا اچھا آدمی ہوتا، اب جو منہ موڑا تو ہمارا کیا بگاڑا، كذا فى موضح القرآن وللمفسرين اقوال فى تفسير ها من شاء الاطلاع عليها فليراجع روح المعانى۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اس ملعون کی شرارتوں کو اور اس نیک بندے کے خشوع وخضوع کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ⑮ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ⑯

کوئی نہیں اگر باز نہ آئے گا ہم گھسیٹیں گے چوٹی پکڑ کر ۱؎ کیسی چوٹی جھوٹی گناہ گار ۲؎

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ⑰ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ⑱ كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب ۩ ⑲ ع

اب بلا لیوے اپنی مجلس والوں کو، ہم بھی بلاتے ہیں پیادے سیاست کرنے کو ۳؎ کوئی نہیں مت مان اسکا کہا اور سجدہ کر اور نزدیک ہو ۴؎

خلاصہ تفسیر: (آگے اس روکنے پر دھمکی ہے یعنی اس کو) ہرگز (ایسا) نہیں (کرنا چاہئے اور) اگر یہ شخص (اپنی اس حرکت

سے) باز نہ آئے گا تو ہم (اس کو) پٹھے پکڑ کر جو کہ دروغ اور خطا میں آلودہ پٹھے ہیں (جہنم کی طرف) گھسیٹیں گے (اور اس کو جو اپنے مجمع پر گھمنڈ ہے اور ہمارے پیغمبر کو دھمکاتا ہے) سو یہ اپنی مجلس والوں کو بلا لے (اگر اس نے ایسا کیا تو) ہم بھی دوزخ کے پیادوں کو بلا لیں گے (چونکہ اس نے نہیں بلایا اس لئے اللہ نے ان فرشتوں کو بھی نہیں بلایا، آگے مزید دھمکی کے لئے پھر اس کو تنبیہ ہے کہ اس کو) ہرگز (ایسا) نہیں (کرنا چاہئے مگر) آپ (اس نالائق کی ان حرکتوں کی کچھ پرواہ کیجئے اور) اس کا کہنا نہ مانیے (جیسا کہ اب تک بھی نہیں مانا) اور (بدستور) نماز پڑھتے رہئے اور (خدا کا) قرب حاصل کرتے رہئے (اس میں ایک لطیف وعدہ ہے کہ حق تعالیٰ آپ کو ان لوگوں کے نقصان وضرر سے محفوظ رکھے گا، کیونکہ نماز سے قرب ہوتا ہے اور قرب خداوندی عصمت اور بچاؤ کا سبب بن جاتی ہے الا یہ کہ کبھی کسی خاص حکمت سے نہ ہو، پس ایسے امور کی طرف ذرا التفات نہ کیجئے اپنے کام میں لگے رہئے)۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ: ''ناصیہ'' سر کے اگلے بالوں کو کہا جاتا ہے جن کو اردو میں پٹھے بولتے ہیں، اس کی صفت میں **کاذبۃ خاطئۃ** مجاز کے طور پر فرمایا۔

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ: فرشتوں کو بلانا ابوجہل کے بلانے پر مشروط تھا، جیسا کہ طبری میں قتادہؒ سے روایت ہے کہ: ''قال النبی ﷺ لو فعل ابو جهل لاخذته الملئكته الز بانيه عيانا''۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی رہنے دو! یہ سب کچھ جانتا ہے، پر اپنی شرارت سے باز نہیں آتا، اچھا اب کان کھول کر سن لے کہ اگر اپنی شرارت سے باز نہ آیا تو ہم اس کو جانوروں اور ذلیل قیدیوں کی طرح سر کے بل پکڑ کر گھسیٹیں گے

فائدہ: ۲ یعنی جس سر پر یہ چوٹی ہے وہ جھوٹ اور گناہوں سے بھرا ہوا ہے گویا اس کا دروغ اور گناہ بال بال میں سرایت کر گیا ہے۔

فائدہ: ۳ ابوجہل نے ایک مرتبہ حضرت محمد ﷺ کو نماز سے روکنا چاہا، آپ ﷺ نے سختی سے جواب دیا، کہنے لگا کہ کیا آپ ﷺ جانتے نہیں کہ مکہ میں سب سے بڑی مجلس میری ہے، اس پر فرماتے ہیں کہ اب وہ مجلس والے ساتھیوں کو بلا لے، ہم بھی اس کی گوشمالی کے لئے اپنے سپاہی بلاتے ہیں، دیکھیں کون غالب رہتا ہے، چند روز بعد بدر کے میدان میں دیکھ لیا کہ اسلام کے سپاہیوں نے اسے گھسیٹا اور آخرت میں جب دوزخ کے فرشتے اس کو نہایت ذلت کے ساتھ جہنم رسید کریں گے، روایات میں ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل حضرت کو نماز میں دیکھ کر چلا کہ بے ادبی کرے، وہاں پہنچا نہ تھا کہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور لوگوں کے دریافت کرنے پر کہا کہ مجھے اپنے اور محمد ﷺ کے درمیان ایک آگ کی خندق نظر آئی جس میں کچھ پر رکھنے والی مخلوق تھی، میں گھبرا کر واپس آ گیا، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ (ملعون) ذرا آگے بڑھتا فرشتے اس کی بوٹی بوٹی جدا کر دیتے، گویا آخرت سے پہلے ہی دنیا میں اس کو **سندع الزبانیۃ** کا ایک چھوٹا سا نمونہ دکھلا دیا۔

تنبیہ: اکثر مفسرین نے **زبانیۃ** سے دوزخ کے فرشتے مراد لئے ہیں۔

فائدہ: ۴ یعنی آپ ﷺ اس کی ہرگز پروا نہ کیجئے اور اس کی کسی بات پر کان نہ دھریے، جہاں چاہو شوق سے اللہ کی عبادت کرو اور اس کی بارگاہ میں سجدے کرو اور اس کی بارگاہ میں سجدے کر کے بیش از بیش قرب حاصل کرتے رہو، حدیث میں آیا ہے کہ: ''بندہ سب حالتوں سے زیادہ سجدہ میں اللہ تعالیٰ سے نزدیک ہوتا ہے''۔

رکوعها ١	٩٧ سُورَةُ الْقَدْرِ مَكِّيَّةٌ ٢٥	اٰياتها ٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِنَّآ أَنزَلْنٰهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ① وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ② لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ③

ہم نے اس کو اتارا شب قدر میں ۱ اور تو نے کیا سمجھا کہ کیا ہے شب قدر، شب قدر بہتر ہے ہزار مہینے سے ۲

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۛ۝۴ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵

اترتے ہیں فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے حکم سے ۳؎ ہر کام پر ۴؎ امان ہے ۵؎ وہ رات صبح کے نکلنے تک ۶؎

خلاصہ تفسیر: بیشک ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا ہے (پس وہ حق بھی ہے کہ ہمارا اُتارا ہوا ہے اور خارجی اسباب سے بھی اس میں عظمت ہے کہ محترم زمانہ میں اُتارا ہے) اور (مزید شوق دلانے کے لئے فرماتے ہیں کہ) آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شب قدر کیسی چیز ہے؟ (آگے جواب ہے کہ) شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے (یعنی ہزار مہینہ تک عبادت کرنے کے ثواب سے شب قدر کی عبادت کا ثواب بڑھا ہوا ہے، اور وہ رات ایسی ہے کہ) اس رات میں فرشتے اور روح القدس (یعنی جبرائیل علیہ السلام) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر امر خیر کو لے کر (زمین کی طرف) اترتے ہیں (اور وہ شب) سراپا سلام ہے (اور) وہ شب قدر (اسی صفت و برکت کے ساتھ) طلوع فجر تک رہتی ہے (یہ نہیں کہ اس شب کے کسی حصہ خاص میں یہ برکت ہو اور کسی میں نہ ہو)۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ: ''قدر'' کے معنی تعظیم کے ہیں، چونکہ اس رات میں عظمت اور شرف ہے اس لیے اس کو ''شب قدر'' کہتے ہیں، شب قدر میں قرآن نازل ہونے کی تحقیق سورۃ دخان کے شروع میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ: بطور خاص ہزار مہینوں کو ذکر کرنے کی یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی اسرائیل کے بعض عابدوں کا ذکر کیا تھا جنہوں نے ہزار مہینے یا ایک روایت میں اسی برس عبادت کی تھی، صحابہ کو تعجب ہوا، اس پر یہ سورت نازل ہوئی، کسر کو حذف کر کے اسی برس تقریباً ہزار مہینے ہی ہوتے ہیں۔

یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ اختلاف مطالع کی وجہ سے مختلف ملکوں اور شہروں میں شب قدر کا ہر جگہ مختلف دنوں میں ہونا لازم آتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی اشکال نہیں، کیونکہ ہر جگہ کے اعتبار سے جو رات شب قدر پائے گی اس جگہ اسی رات میں شب قدر کے برکات حاصل ہوں گے، یہ برکتیں کسی کو کسی وقت میں ملیں اور کسی کو دوسرے وقت میں، اسی طرح فرشتوں کا نزول ہر جگہ مختلف وقت میں ہو، کیونکہ خدا کے خزانہ میں رحمت اور برکت کی کیا کمی ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا: حدیث بیہقی میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ شب قدر میں جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کے ایک گروہ میں آتے ہیں اور جس شخص کو قیام وقعود اور ذکر میں مشغول دیکھتے ہیں تو اس کے لئے دعائے رحمت کرتے ہیں اور خازن نے ابن الجوزی سے اسی روایت میں "یسلمون" بھی بڑھایا ہے یعنی سلامتی کی دعا کرتے ہی، اسی کو قرآن میں ''سلام'' فرمایا ہے اور ''امر خیر'' سے مراد یہی ہے اور نیز بعض روایات میں شب قدر میں توبہ کا قبول ہونا، آسمانوں کے دروازے کھلنا اور ہر مومن پر فرشتوں کا سلام کرنا آیا ہے، اور ان کاموں کا فرشتوں کے ذریعہ سے ہونا اور سلامتی کا سبب ہونا ظاہر ہے، یا ''امر'' سے مراد وہ امور ہوں جن کا عنوان سورۃ دخان میں ''امر حکیم'' اور اس شب میں ان کا طے ہونا ذکر فرمایا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ **اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ:** یعنی قرآن مجید لوح محفوظ سے سماء دنیا پر شب قدر میں اتارا گیا اور شاید اسی شب سماء دنیا سے پیغمبر ﷺ پر اترنا شروع ہوا، اس کے متعلق کچھ مضمون سورۃ دخان میں گزر چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

فائدہ: ۲؎ **خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ:** یعنی اس رات میں نیکی کرنا ایسا ہے گویا ہزار مہینے تک نیکی کرتا رہا، بلکہ اس سے بھی زائد۔

فائدہ: ۳؎ **فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ:** یعنی اللہ کے حکم سے روح القدس (حضرت جبرائیل علیہ السلام) بیشمار فرشتوں کے ہجوم میں نیچے اترتے ہیں تاکہ عظیم الشان خیر و برکت سے زمین والوں کو مستفیض کریں، اور ممکن ہے ''روح'' سے مراد فرشتوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق ہو، بہرحال اس مبارک شب میں باطنی حیات اور روحانی خیر و برکت کا ایک خاص نزول ہوتا ہے۔

فائده: ۴ مِنۡ كُلِّ اَمۡرٍ : یعنی انتظام عالم کے متعلق جو کام اس سال میں مقدر ہیں ان کے نفاذ کی تعیین کے لئے فرشتے آتے ہیں، کما مز فی سورة الدخان، یا **من کل امر** سے امر خیر مراد ہو، یعنی ہر قسم کے امور خیر لے کر آسمان سے اترتے ہیں، واللہ اعلم۔

فائده: ۵ سَلٰمٌ : یعنی وہ رات امن وچین اور دلجمعی کی رات ہے، اس میں اللہ والے لوگ عجیب وغریب طمانیت اور لذت وحلاوت اپنی عبادت کے اندر محسوس کرتے ہیں، اور یہ اثر ہوتا ہے، نزول رحمت وبرکت کا جو روح وملائکہ کے توسط سے ظہور میں آتا ہے، بعض روایات میں ہے کہ اس رات جبرائیل علیہ السلام اور فرشتے عابدین وذاکرین پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں۔ یعنی ان کے حق میں رحمت اور سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

فائده: ۶ هِيَ حَتّٰى مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ : یعنی شام سے صبح تک ساری رات یہی سلسلہ رہتا ہے اس طرح وہ پہلی رات مبارک ہے۔

تنبیه: قرآن سے معلوم ہوا کہ وہ رات رمضان شریف میں ہے: شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِيۡٓ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ اور حدیث صحیح میں بتلایا کہ رمضان کے اخیر عشرہ میں خصوصاً عشرہ کی طاق راتوں میں اسکو تلاش کرنا چاہئے، پھر طاق راتوں میں بھی ستائیسویں شب پر گمان غالب ہوا ہے، واللہ اعلم، بہت سے علماء نے تصریح کی ہے کہ شب قدر ہمیشہ کیلئے کسی ایک رات میں متعین نہیں، ممکن ہے ایک رمضان میں کوئی رات ہو، دوسرے میں دوسری۔

آیاتها ۸ ◆ ۹۸ سُوۡرَةُ الۡبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۰۰ ◆ رکوعها ۱

خلاصه تفسیر: شریعت کے اہم امور میں سے رسالت کا مسئلہ اور اس کے ماننے والوں اور جھٹلانے والوں کی جزا وسزا کا بتلانا ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَمۡ يَكُنِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ مُنۡفَكِّيۡنَ حَتّٰى تَاۡتِيَهُمُ الۡبَيِّنَةُ ۱
نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہیں اہل کتاب اور مشرک ۱ باز آنے والے یہاں تک کہ پہنچے ان کے پاس کھلی بات

رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۲ فِيۡهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۳ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ
ایک رسول اللہ کا پڑھتا ہوا ورق پاک ۲ اس میں لکھی ہیں کتابیں مضبوط ۳ اور وہ جو پھوٹ پڑی اہل کتاب میں

اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنَةُ ۴ وَمَآ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ
سو جب کہ آچکی ان کے پاس کھلی بات ۴ اور ان کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کر کے اس کے واسطے بندگی

حُنَفَآءَ وَيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيۡنُ الۡقَيِّمَةِ ۵
ابراہیم (علیہ السلام) کی راہ پر ۵ اور قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور یہ ہے راہ مضبوط لوگوں کی ۶

خلاصه تفسیر: جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے (بعثت نبویہ سے قبل) کافر تھے وہ (اپنے کفر سے ہرگز) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس واضح دلیل نہ آتی (یعنی) ایک اللہ کا رسول جو (ان کو) پاک صحیفے پڑھ کر سنادے جن میں درست مضامین لکھے ہوں (مراد قرآن ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کفار کا کفر ایسا شدید تھا اور ایسے جہل میں مبتلا تھے کہ کسی عظیم رسول کے آئے بغیر ان کی راہ پر آنے کی کوئی توقع نہ تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی حجت تمام کرنے کے لئے آپ کو قرآن دے کر مبعوث فرمایا) اور (ان کو چاہئے تھا کہ اس کو غنیمت سمجھتے اور اس پر ایمان

لے آتے مگر) جولوگ اہل کتاب تھے (اور غیر اہل کتاب یعنی مشرکین تو بدرجہ اولیٰ) وہ اس واضح دلیل کے آنے ہی کے بعد (دین میں) مختلف ہو گئے (یعنی دین حق سے بھی اختلاف کیا اور جو باہمی اختلافات پہلے سے تھے ان کو بھی دین حق کا اتباع کر کے دور نہ کیا، اور مشرکین کو بدرجہ اولیٰ اس لئے کہا کہ ان کے پاس تو پہلے سے بھی کوئی دین سماوی نہ تھا) حالانکہ ان لوگوں کو (کتب میں) یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت کو اسی کے لئے خالص رکھیں یکسو ہو کر (باطل ادیان کی طرح کسی کو اللہ کا شریک نہ بنادیں) اور نماز کی پابندی رکھیں اور زکوۃ دیا کریں اور یہی طریقہ ہے ان درست مضامین کا (بتلایا ہوا)۔

حاصل تقریر کا یہ ہوا کہ ان اہل کتاب کو پہلی کتابوں میں یہ حکم ہوا تھا کہ عبادت خالص ایک خدا کے لیے کریں، شرک وکفر سے علیحدہ رہیں، جس میں قرآن پر اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا بھی داخل ہے، چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح ہے: **ولقد اخذ الله میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منهم اثنی عشر نقیبا وقال الله انی معکم لئن اقمتم الصلوة واتیتم الزکوة وامنتم برسلی** الخ، اور یہی تعلیم قرآن کی ہے جس کو یہاں کتب قیّمۃ (درست مضامین) سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لیے قرآن کے نہ ماننے سے خود اپنی کتابوں کی بھی مخالفت لازم آتی ہے، یہ الزام تو اہل کتاب کو ہوا، اور مشرکین اگرچہ پہلی کتب کو نہیں مانتے تھے مگر ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کا حق ہونا ان کے نزدیک بھی مسلم تھا، اور یہ بات بھی یقینی طور پر ثابت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام شرک سے بالکل برے تھے اور کتب قیّمۃ یعنی قرآن کا اس طریقے کے ساتھ موافق ہونا بھی ظاہر ہے اس لئے ان پر بھی حجت تمام ہوگئی، اور ان تفرق اور اختلاف کرنے والوں سے مراد بعض وہ کفار ہیں جو ایمان نہ لائے تھے اور اس سے بطور مقابلہ کے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جن لوگوں نے تفرق اور اختلاف نہیں کیا وہ اہل ایمان ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ **مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ**: اہل کتاب یہود ونصاریٰ ہوئے، اور مشرکین وہ قومیں جو بت پرستی یا آتش پرستی وغیرہ میں مبتلا تھیں اور کوئی کتاب سماوی ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔

فائدہ: ۲؎ **يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً**: آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے سب دین والے بگڑ چکے تھے، اور ہر ایک اپنی غلطی پر مغرور تھا، اب چاہیے کسی حکیم یا ولی یا بادشاہ عادل کے سمجھانے سے راہ پر آجائیں تو یہ ممکن نہ تھا جب تک ایک ایسا عظیم القدر رسول نہ آئے جس کے ساتھ اللہ کی پاک کتاب اس کی قوی مدد ہو کہ چند سال میں ایک ایک ملک کو ایمان کی روشنی سے بھر دے اور اپنی زبردست تعلیم اور ہمت وعزیمت سے دنیا کی کایا پلٹ کر دے، چنانچہ وہ رسول ﷺ، اللہ کی کتاب پڑھتا ہوا آیا جو پاک ورقوں میں لکھی ہوئی ہے۔

فائدہ: ۳؎ **فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ**: یعنی قرآن کی ہر سورت گویا ایک مستقل کتاب ہے، یا یہ مطلب ہو کہ جو عمدہ کتابیں پہلے آچکی ہیں ان سب کے ضروری خلاصے اس کتاب میں درج کر دیے گئے ہیں، یا کتب قیّمۃ سے علوم ومضامین مراد ہیں، یعنی اسکے علوم صحیح وراست اور مضامین نہایت مضبوط ومتعدل ہیں۔

فائدہ: ۴؎ **اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ**: یعنی اس رسول ﷺ اور اس کتاب کے آئے پیچھے شبہ نہیں رہا، پھر اب اہل کتاب ضد سے مخالف ہیں، شبہ سے نہیں، اسی لئے ان میں دو فریق ہو گئے، جس نے ضد کی منکر رہا، جس نے انصاف کیا ایمان لے آیا، چاہیے تو یہ تھا کہ جس پیغمبر آخر الزمان کا انتظار کر رہے تھے، اسکے آنے پر اپنے تمام اختلافات کو ختم کر کے سب وحدت واجتماع کو خلاف وشقاق کا ذریعہ بنالیا، جب اہل کتاب کا یہ حال ہے تو جاہل مشرکوں کا تو پوچھنا کیا۔

تنبیہ: حضرت شاہ عبدالعزیز نے یہاں البیّنة کا مصداق حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ٹھہرایا ہے، یعنی جب حضرت مسیح کھلے کھلے نشان لے کر آئے یہود دشمن ہو گئے، اور نصاریٰ نے بھی دنیاوی اغراض میں پھنس کر اپنی جماعتیں اور پارٹیاں بنالیں، مدعا یہ ہے کہ پیغمبر کا آنا اور کتاب کا نازل ہونا بھی بغیر حضرت حق کی توفیق کے کفایت نہیں کرتا، کتنے ہی سامان ہدایت جمع ہو جائیں جن کو توفیق نہیں ملتی وہ اسی طرح خسارے

میں پڑے رہتے ہیں۔

فائدہ: ۵ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ: یعنی ہرقسم کے باطل اور جھوٹ سے علیحدہ ہوکر خالص خدائے واحد کی بندگی کریں اور ابراہیم علیہ السلام حنیف کی طرح سب طرف سے ٹوٹ کر اسی ایک مالک کے غلام بن جائیں، تشریع وتکوین کے کسی شعبہ میں کسی دوسرے کو خودمختار نہ سمجھیں۔

فائدہ: ۶ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ: یعنی یہ چیزیں ہردین میں پسندیدہ رہی ہیں، انہی کی تفصیل یہ پیغمبر کرتا ہے، پھر خدا جانے ایسی پاکیزہ تعلیم سے کیوں وحشت کھاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ

اور جو منکر ہوئے اہل کتاب اور مشرک ہوں گے دوزخ کی آگ میں سدا رہیں اس میں ۱ وہ لوگ ہیں سب

شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۞ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞ جَزَآؤُهُمْ

خلق سے بدتر ۲ وہ لوگ جو یقین لائے اور کیے بھلے کام وہ لوگ ہیں سب خلق سے بہتر ۳ بدلہ ان کا

عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

ان کے رب کے یہاں باغ ہیں ہمیشہ رہنے کو نیچے بہتی ہیں ان کے نہریں سدا رہیں ان میں ہمیشہ اللہ ان سے راضی

وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۞ ع

اور وہ اس سے راضی ۴ یہ ملتا ہے اس کو جو ڈرا اپنے رب سے ۵

خلاصہ تفسیر: (اب آگے صراحت کے ساتھ کفار کی دونوں قسموں یعنی اہل کتاب ومشرکین کی، اور مؤمنین کی سزا وجزاء کا مضمون ارشاد فرماتے ہیں) بیشک جو لوگ اہل کتاب اور مشرکین میں سے کافر ہوئے وہ آتش دوزخ میں جائیں گے جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ لوگ بدترین خلائق ہیں (اور) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے وہ لوگ بہترین خلائق ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار کے نزدیک ہمیشہ رہنے کی بہشتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) اور اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے (یعنی نہ ان سے کوئی گناہ ہوگا اور نہ ان کو کوئی مکروہ معاملہ پیش آئے گا کہ جانبین سے راضی نہ ہونے کا احتمال ہو، اور) یہ (جنت اور رضا) اس شخص کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے (اور اللہ سے ڈرنے ہی پر ایمان وعمل صالح مرتب ہوتا ہے جو کہ مدار ہے جنت میں داخل ہونے کا اور رضائے الٰہی حاصل ہونے کا)۔

اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ --- اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ: بہترین خلائق اور بدترین خلائق کی تفسیر میں آسان بات یہ ہے کہ اکثر مخلوق سے بہتر اور بدتر ہونا مراد ہے، اصل مقصود یہ ہے کہ مؤمنین بہترین میں کامل ہیں، اور کفار بدتر ہونے میں کامل ہیں، پس اس تقریر کے بعد ان کفار کا ابلیس سے بدتر ہونا یا تمام مسلمانوں کا فرشتوں سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی علم کا دعویٰ رکھنے والے اہل کتاب ہوں، یا جاہل مشرک، حق کا انکار کرنے پر سب کا انجام ایک ہے وہی دوزخ جس سے کبھی چھٹکارا نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی بہائم سے بھی زیادہ ذلیل اور بدتر، کما قال فی سورۃ الفرقان: اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا۔

فائدہ: ۳ یعنی جو لوگ سب رسولوں اور کتابوں پر یقین لائے اور بھلے کاموں میں لگے رہے وہی بہترین، خلائق ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بعض افراد بعض فرشتوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔

فائدہ: ۴ یعنی جنت کے باغوں اور نہروں سے بڑھ کر رضاء مولیٰ کی دولت ہے، بلکہ جنت کی تمام نعمتوں کی اصلی روح یہی ہے۔

فائدہ: ۵ یعنی یہ مقام بلند ہر ایک کو نہیں ملتا، صرف ان بندوں کا حصہ ہے جو اپنے رب کی ناراضی سے ڈرتے ہیں اور اس کی نافرمانی کے پاس نہیں جاتے۔

ایاتھا ۸ | ۹۹ سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ مَدَنِيَّةٌ ۹۳ | رکوعھا ۱

خلاصہ تفسیر: شریعت کے اہم امور میں سے قیامت اور سزا و جزا واقع ہونے کا اعتقاد بھی ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝١ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝٢ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۝٣

جب ہلا ڈالے زمین کو اس کے بھونچال سے ۱ اور نکال باہر کرے زمین اپنے اندر سے بوجھ ۲ اور کہے آدمی اس کو کیا ہو گیا ۳

خلاصہ تفسیر: جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جائے گی اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی (بوجھ سے مراد دفینے اور مردے ہیں) اور (اس حالت کو دیکھ کر کافر) آدمی کہے گا کہ اس کو کیا ہوا (کہ زمین اس طرح ہل رہی ہے اور خلاف عادت اور خلاف گمان زمین کے دفینے کیسے نکلنے لگے، وجہ اس کہنے کی یہ ہے کہ قیامت اور اس کے واقعات کا پہلے سے منکر تھا، اب ان واقعات کو دیکھ کر حیرت کرنے لگا)۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا: یہاں زلزلہ سے دوسری بار صور پھونکنے کے وقت کا زلزلہ مراد ہے، اس زلزلہ سے پہاڑ وغیرہ سب گر کر زمین کے برابر ہو جائیں گے تاکہ میدان محشر بالکل ہموار اور صاف ہو جائے۔

وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا: اگرچہ بعض روایات میں قیامت سے پہلے بھی دفینوں کا زمین سے باہر آ جانا معلوم ہوتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ قیامت سے پہلے جو دفینے باہر آ گئے تھے وقت گذرنے کے ساتھ پھر ان پر مٹی آ گئی ہو اور وہ چھپ گئے ہوں اور وہ قیامت کے روز پھر نکلیں، اور دفینوں کے ظاہر ہو جانے کی شاید یہ حکمت ہو کہ ان کی بہت محبت رکھنے والے اپنی آنکھوں ان کا بیکار ہونا دیکھ لیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حق تعالیٰ ساری زمین کو ایک نہایت سخت اور ہولناک زلزلہ سے ہلا ڈالے گا، جس کے صدمہ سے کوئی عمارت اور کوئی پہاڑ یا درخت زمین پر قائم نہ رہے گا، سب نشیب و فراز برابر ہو جائیں گے، تاکہ میدان حشر بالکل ہموار اور صاف ہو جائے اور یہ معاملات قیامت میں نفخ ثانی کے وقت ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی اس وقت زمین جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے، مثلاً مردے یا سونا چاندی وغیرہ سب باہر اگل ڈالے گی، لیکن مال کا کوئی لینے والا نہ ہوگا، سب دیکھ لیں گے کہ آج یہ چیز جس پر ہمیشہ لڑا کرتے تھے کس قدر بیکار ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی آدمی زندہ ہونے اور اس زلزلہ کے آثار دیکھنے کے بعد یا ان کی روحیں عین زلزلہ کے وقت حیرت زدہ ہو کر کہیں گی کہ اس زمین کو کیا ہو گیا جو اس قدر زور سے ہلنے لگی اور اپنے اندر کی تمام چیزیں ایک دم باہر نکال پھینکیں۔

یَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴿۵﴾

اس دن کہہ ڈالے گی وہ اپنی باتیں، اس واسطے کہ تیرے رب نے حکم بھیجا اس کو [1]

خلاصہ تفسیر: اس روز زمین اپنی سب (اچھی بری) خبریں بیان کرنے لگے گی اس سبب سے کہ آپ کے رب کا اس کو یہی حکم ہوگا (ترمذی وغیرہ میں اس کی تفسیر میں حدیث مرفوع آئی ہے کہ جس شخص نے روئے زمین پر جیسا عمل کیا ہوگا اچھا یا برا زمین سب کہہ دے گی، یہ زمین کی شہادت ہوگی)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی بنی آدم نے جو برے بھلے کام اس کے اوپر کیے تھے سب ظاہر کر دے گی، مثلاً کہے گی فلاں شخص نے مجھ پر نماز پڑھی تھی، فلاں نے چوری کی تھی، فلاں نے خون ناحق کیا تھا، وغیرذٰلک، گویا آجکل کی زبان میں یوں سمجھو کہ جس قدر اعمال زمین پر کئے جاتے ہیں زمین میں ان سب کے ریکارڈ موجود رہتے ہیں، قیامت میں وہ پروردگار کے حکم سے کھول دیے جائیں گے۔

یَوْمَىِٕذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ﴿۶﴾ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ﴿۷﴾

اس دن ہو پڑیں گے لوگ طرح طرح پر [1] کہ ان کو دکھا دیے جائیں ان کے عمل [2] سو جس نے کی ذرہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اسے

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ﴿۸﴾ ع

اور جس نے کی ذرہ بھر برائی وہ دیکھ لے گا اسے [3]

خلاصہ تفسیر: اس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر (موقف حساب سے) واپس ہوں گے (یعنی جو لوگ حساب محشر سے فارغ ہو کر لوٹیں گے تو کچھ جماعتیں جنتی اور کچھ دوزخی قرار پا کر جنت و دوزخ کی طرف چلی جائیں گی) تاکہ اپنے اعمال (کے ثمرات) کو دیکھ لیں، سو جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا (بشرطیکہ اس وقت تک وہ خیر و شر باقی رہی ہو، ورنہ اگر کفر کے سبب وہ چیز فنا ہو چکی ہو یا ایمان و توبہ کے ذریعہ وہ شر اور بدی معاف ہو چکی ہو تو وہ اس میں داخل ہی نہیں، کیونکہ اب نہ وہ باطل شدہ خیر خیر ہے، یعنی کافر نے اگر دنیا میں کچھ نیک عمل بھی کیے تو شرط عمل یعنی ایمان نہ ہونے کی وجہ سے وہ کالعدم ہیں، اس لیے آخرت میں اس کی کوئی خیر خیر ہی نہیں، اور نہ وہ معاف کیا ہوا گناہ اور شر شر ہے اس لئے محشر میں وہ سامنے نہ آئیں گی، جب مدار حکم نہ رہا تو حکم بھی ثابت نہ ہوگا)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی اس روز آدمی اپنی قبروں سے میدان حشر میں طرح طرح کی جماعتیں بن کر حاضر ہوں گے، ایک گروہ شرابیوں کا ہوگا، ایک زانیوں کا، ایک ظالموں کا، ایک چوروں کا، وعلی ہذا القیاس، یا یہ مطلب ہے کہ لوگ حساب سے فارغ ہو کر جو لوٹیں گے تو کچھ جماعتیں جنتی اور کچھ دوزخی ہو کر جنت اور دوزخ کی طرف چلی جائیں گی۔

فائدہ: [2] یعنی میدان حشر میں ان کے عمل دکھلا دیے جائیں گے، بدکاروں کو ایک طرح کی رسوائی اور نیکوکاروں کو ایک قسم کی سرخروئی حاصل ہو یا ممکن ہے اعمال کے دکھلانے سے ان کے ثمرات و نتائج کا دکھلانا مراد ہو۔

فائدہ: [3] یعنی ہر ایک کا ذرہ ذرہ عمل بھلا ہو یا برا اس کے سامنے ہوگا اور حق تعالیٰ جو کچھ معاملہ ہر ایک عمل کے متعلق فرمائیں گے وہ بھی آنکھوں سے نظر آ جائے گا۔

رکوعها ١ ۱۰۰ سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰتِ مَکِّیَّۃٌ ١٤ ایاتها ١١

خلاصہ تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے برے اعمال سے بچنا بھی ہے، اس سورت میں ان کی مذمت اور ان پر سزا ہونے کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ﴿۲﴾ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ﴿۴﴾

قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر، پھر آگ سلگانے والے جھاڑ کر ۱ پھر غارت ڈالنے والے صبح کو ۲ پھر اٹھانے والے اس میں گرد ۳

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِیْدٌ ﴿۷﴾

پھر گھس جانے والے اس وقت فوج میں ۴ بیشک آدمی اپنے رب کا ناشکرا ہے ۵ اور وہ آدمی اس کام کو سامنے دیکھتا ہے ۶

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ﴿۸﴾

اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے ۷

خلاصہ تفسیر: قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں، پھر (پتھر پر) ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں، پھر صبح کے وقت تاخت تاراج کرتے ہیں، پھر اس وقت غبار اڑاتے ہیں، پھر اس وقت (دشمنوں کی) جماعت میں جا گھستے ہیں (مراد اس سے لڑائی کے گھوڑے ہیں جہاد ہو یا غیر جہاد، عرب چونکہ حرب وضرب اور جنگ کے عادی تھے جس کے لئے گھوڑے پالتے تھے ان کی مناسبت سے ان جنگی گھوڑوں کی قسم کھائی گئی، آگے جواب قسم ہے کہ) بیشک (کافر) آدمی اپنے پروردگار کا بڑا ناشکر ہے اور اس کو خود بھی اس کی خبر ہے (کبھی ابتداء سے اور کبھی کچھ غور کے بعد اپنی ناشکری کا احساس کر لیتا ہے) اور وہ مال کی محبت میں بڑا مضبوط ہے (مال کی محبت اس کی ناشکری کا سبب ہے)۔

دوڑنے کے وقت ہانپنا ظاہر ہے، اور آہنی نعل کے پتھریلی زمین پر لگنے سے آگ کا جھڑنا بھی ظاہر ہے، اور غبار کا اڑنا اگرچہ ہر وقت ہوتا ہے، مگر اس کو صبح کے ساتھ مقید کرنے میں دوڑ کی شدت کی طرف اشارہ ہے کہ ٹھنڈے وقت گرد وغبار دبا ہوا ہوتا ہے، ان کے دوڑنے سے اس وقت بھی غبار اڑتا ہے، اور ان قسموں کو مقصود سے یہ مناسبت ہے کہ جنگ وجدال کا سبب ایک فریق کی ناشکری ہوتی ہے خواہ جان بوجھ کر ہو یا غلطی سے۔

* * *

فائدہ: ۱ فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا: یعنی جو پتھر یا پتھریلی زمین پر ٹاپ مار کر آگ جھاڑتے ہیں۔

فائدہ: ۲ فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا: عرب میں اکثر عادت صبح کے وقت تاخت کرنے کی تھی تاکہ رات کے وقت جانے میں دشمن کو خبر نہ ہو صبح کو دفعتاً جا پڑیں اور رات کو حملہ نہ کرنے میں اظہار شجاعت سمجھتے تھے۔

فائدہ: ۳ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا: یعنی ایسی تیزی اور قوت سے دوڑنے والے کہ صبح کے وقت جبکہ رات کی سردی اور شبنم کی رطوبت سے عموماً غبار دبا رہتا ہے، ان کے ٹاپوں سے اس وقت بھی بہت گرد وغبار اٹھتا ہے۔

فائدہ: ۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا: یعنی اس وقت بے خوف وخطر دشمن کی فوج میں جا گھستے ہیں۔

تنبیہ: ممکن ہے کہ قسم کھانا گھوڑوں کی مقصود ہو جیسا کہ ظاہر ہے، اور ممکن ہے مجاہدین کے رسالہ کی قسم ہو، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''یہ جہاد والے سواروں کی قسم ہے، اس سے بڑا کون عمل ہوگا کہ اللہ کے کام پر اپنی جان دینے کو حاضر ہے''۔

فائدہ: ۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ: یعنی جہاد کرنے والے سواروں کی اللہ کی راہ میں سرفروشی و جانبازی بتلاتی ہے کہ وفادار وشکر گذار بندے ایسے ہوتے ہیں، جو آدمی اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو اس کے راستہ میں خرچ نہیں کرتا وہ پرلے درجہ کا ناشکرا اور نالائق ہے بلکہ غور کرو تو خود گھوڑا زبان حال سے شہادت دے رہا ہے کہ جو لوگ مالک حقیقی کی دی ہوئی روزی کھاتے اور اس کی بیشمار نعمتوں سے شب و روز تمتع کرتے ہیں، پھر اس کے باوجود اس کی فرمانبرداری نہیں کرتے، وہ جانوروں سے زیادہ ذلیل وحقیر ہیں، ایک شائستہ گھوڑے کو مالک گھاس کے تنکے اور تھوڑا سا دانہ کھلاتا ہے وہ اتنی سی تربیت پر اپنے مالک کی وفاداری میں جان لڑا دیتا ہے، جدھر سوار اشارہ کرتا ہے ادھر چلتا ہے، دوڑتا اور ہانپتا ہوا ٹاپیں مارتا اور غبار اٹھاتا ہوا گھمسان کے معرکوں میں بے تکلف گھس جاتا ہے، گولیوں کی بارش میں، تلواروں اور سنگینوں کے سامنے پڑ کر سینہ نہیں پھیرتا، بلکہ بسا اوقات وفادار گھوڑا سوار کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرہ میں ڈال دیتا ہے، کیا انسان نے ایسے گھوڑوں سے کچھ سبق سیکھا کہ اس کا بھی کوئی پالنے والا مالک ہے جس کی وفاداری میں اسے جان و مال خرچ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے، بیشک انسان بڑا ناشکرا اور نالائق ہے کہ ایک گھوڑے بلکہ کتے کے برابر بھی وفاداری نہیں دکھلا سکتا۔

فائدہ: ۶ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ: یعنی سرفروش مجاہدین کی اور ان کے گھوڑوں کی وفاشعاری اور شکر گذاری اس کی آنکھوں کے سامنے ہے، پھر بھی بے حیا ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

تنبیہ: ترجمہ کی رعایت سے ہم نے یہ مطلب لکھا ہے، ورنہ اکثر مفسرین اس جملہ کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ انسان خود اپنی ناشکری پر زبان حال سے گواہ ہے، ذرا اپنے ضمیر کی آواز کی طرف متوجہ ہو تو سن لے کہ اندر سے خود اس کا دل کہہ رہا ہے کہ تو بڑا ناشکرا ہے بعض سلف نے انه کی ضمیر رب کی طرف لوٹائی ہے، یعنی اس کا رب اس کی ناسپاسی اور کفران نعمت کو دیکھ رہا ہے۔

فائدہ: ۷ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ: یعنی حرص وطمع اور بخل و امساک نے اس کو اندھا بنا رکھا ہے۔ دنیا کے زر و مال کی محبت میں اس قدر غرق ہے کہ منعم حقیقی کو بھی فراموش کر بیٹھا، نہیں سمجھتا کہ آگے چل کر اس کا کیا انجام ہونے والا ہے۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝۹ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝۱۰

کیا نہیں جانتا وہ وقت کہ کریدا جائے جو کچھ قبروں میں ہے، اور تحقیق ہووے جو کچھ کہ جیوں میں ہے ۱

ع ۱۱/۲۵ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝۱۱

بیشک ان کے رب کو ان کی اس دن سب خبر ہے ۲

خلاصہ تفسیر: (آگے مال کی محبت اور ناشکری پر وعید ہے یعنی) کیا اس کو وہ وقت معلوم نہیں جب زندہ کئے جائیں گے جتنے مردے قبروں میں ہیں، اور ظاہر ہو جائے گا جو کچھ دلوں میں ہے، بیشک ان کا پروردگار ان کے حال سے اس روز پورا آگاہ ہے (اور مناسب جزا دے گا، حاصل یہ ہے کہ انسان کو اگر اس وقت کی پوری خبر ہوتی اور آخرت کا حال مستحضر ہوتا تو اپنی ناشکری اور مال کی محبت سے باز آ جاتا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وہ وقت بھی آنے والا ہے جب مردہ جسم قبروں سے نکال کر زندہ کئے جائیں گے اور دلوں میں جو چیزیں چھپی ہوئی ہیں سب کھول کر رکھ دی جائیں گی، اس وقت دیکھیں یہ مال کہاں تک کام دے گا اور نالائق ناشکرے لوگ کہاں چھوٹ کر دکھائیں گے، اگر یہ بے حیا اس بات کو بھی سمجھ لیتے تو ہرگز مال کی محبت میں غرق ہو کر ایسی حرکتیں نہ کرتے۔

فائدہ: ۲ یعنی ہر چند کہ اللہ کا علم ہر وقت بندے کے ظاہر و باطن پر محیط ہے، لیکن اس روز اس کا علم ہر شخص پر ظاہر ہو جائے گا۔ اور کسی کو گنجائش انکار کی نہ رہے گی۔

أياتها ١١ ۞ ١٠١ سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ ٣٠ ۞ رکوعها ١

خلاصہ تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے جزاوسزا کا عقیدہ بھی، اس سورت میں اسی کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ

وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی، کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی، اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ کھڑکھڑ ڈالنے والی ۱؎ جس دن ہویں لوگ جیسے پتنگے

الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ؕ﴿۵﴾

بکھرے ہوئے ۲؎ اور ہوویں پہاڑ جیسے رنگی ہوئی اون دھنی ہوئی ۳؎

خلاصہ تفسیر: وہ کھڑکھڑانے والی چیز، کیسی ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز، اور آپ کو کچھ معلوم ہے کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز (مراد قیامت ہے جو دلوں کو گھبراہٹ سے اور کانوں کو سخت آوازوں سے کھڑکھڑائے گی، اور یہ اس روز ہوگا) جس روز آدمی پریشان پروانوں کی طرح ہوجائیں گے، اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہوجائیں گے (عهن رنگین اون کو کہا جاتا ہے، پہاڑوں کے رنگ چونکہ مختلف ہیں وہ سب اڑتے پھریں گے جن کی مثال اس اون کی ہوگی جس میں مختلف رنگ کے بال ملے ہوئے ہوں)۔

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ: پروانوں سے تشبیہ چند چیزوں کی وجہ سے دی گئی: ① ایک کثرت سے ہونا کہ سارے اولین وآخرین انسان ایک میدان میں جمع ہوجائیں گے ② دوسرے کمزور ہونا کہ سب انسان اس وقت کمزوری میں پروانے جیسے ضعیف وعاجز ہوں گے یہ دونوں وصف تو تمام اہل محشر انسانوں میں عام ہوں گے ③ تیسرے بیتاب اور بےچین ادھر ادھر پھرنا جو پروانوں میں مشاہدہ کیا جاتا ہے یہ صورت خاص مومنین میں نہیں ہوگی وہ اپنی قبروں سے مطمئن اٹھیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ مراد قیامت ہے جو قلوب کو سخت فزع اور گھبراہٹ سے اور کانوں کو صوت شدید سے کھڑکھڑا ڈالے گی، مطلب یہ ہے کہ حادثہ قیامت کے اس ہولناک منظر کا کیا بیان ہو، بس اسکے بعض آثار آگے بیان کردیے جاتے ہیں جن سے اس کی سختی اور شدت کا قدرے اندازہ ہوسکتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ کہ ہر ایک ایک طرف کو بےتابانہ چلا جاتا ہے گویا پروانوں کے ساتھ تشبیہ ضعف، کثرت بیتابی اور حرکت کی بےانتظامی میں ہوئی۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جیسے دھنیا اون یا روئی کو دھنک کر ایک ایک پھاہا کر کے اڑا دیتا ہے، اسی طرح پہاڑ متفرق ہوکر اڑ جائیں گے، اور رنگین اون سے شاید اس لئے تشبیہ دی کہ بہت کمزور اور ہلکی ہوتی ہے، نیز قرآن میں دوسری جگہ پہاڑوں کے رنگ بھی کئی قسم کے بیان فرمائے ہیں: وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾

سو جس کی بھاری ہوئیں تولیں، تو وہ رہے گا من مانتے گزران میں ۱؎ اور جس کی ہلکی ہوئیں تولیں

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ؕ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾ ع ۲۶

تو اس کا ٹھکانا گڑھا ہے، اور تو کیا سمجھا وہ کیا ہے، آگ ہے دہکتی ہوئی ۲؎

خلاصه تفسیر: (اس روز اعمال انسانی تولے جائیں گے) پھر جس شخص کا پلہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی جو مومن ہوگا) وہ تو خاطر خواہ آرام میں ہوگا (یعنی نجات پا کر جنت میں جائے گا) اور جس شخص کا پلہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی کافر) تو اس کا ٹھکانا ہاویہ ہوگا اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ (ہاویہ) کیا چیز ہے؟ (وہ) ایک دہکتی ہوئی آگ ہے۔

پلہ بھاری ہونا اور پلہ ہلکا ہونا اس کی تحقیق سورہ اعراف کے شروع میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جس کے اعمال وزنی ہوں گے وہ اس روز خاطر خواہ عیش و آرام میں رہے گا اور اعمال کا وزن اخلاص و ایمان کی نسبت سے ہوگا، دیکھنے میں کتنا ہی بڑا عمل ہو مگر اخلاص کی روح نہ ہو، وہ اللہ کے ہاں کچھ وزن نہیں رکھتا: **فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔**

فائدہ: ۲ یعنی جو عذاب اس طبقہ میں ہے کچھ آدمی کی سمجھ میں نہیں آسکتا، بس اتنا سمجھ لو کہ ایک آگ ہے نہایت گرم دہکتی ہوئی جس کے مقابلہ میں گویا دوسری آگ کو گرم کہنا نہ چاہئے اعاذنا اللہ منہا و من سائر وجوہ العذاب بفضلہ و منہ۔

آیاتھا ۸　۱۰۲ سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ ١٦　رکوعھا ۱

خلاصه تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے آخرت سے غافل نہ ہونا بھی ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ① حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ② كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ③

غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے، یہاں تک کہ جا دیکھیں قبریں ۱ کوئی نہیں آگے جان لو گے

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ④ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ⑤ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ⑥

پھر بھی کوئی نہیں آگے جان لو گے ۲ کوئی نہیں اگر جانو تم یقین کر کے ۳ بیشک تم کو دیکھنا ہے دوزخ

ع ۲۷　**ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ⑦ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ⑧**

پھر دیکھنا ہے اس کو یقین کی آنکھ سے ۴ پھر پوچھیں گے تم سے اس دن آرام کی حقیقت ۵

خلاصه تفسیر: (دنیوی سامان پر) فخر کرنا (جو کہ محبت و طلب کی علامت ہے) تم کو (آخرت سے) غافل کئے رکھتا ہے (کیونکہ تم کو اس سے انکار ہے) یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو (یعنی مر جاتے ہو، آگے اس پر رد ہے کہ) ہرگز نہیں (یعنی دنیوی سامان فخر کے قابل نہیں اور نہ آخرت غفلت کے قابل ہے) تم کو بہت جلد (قبر میں جاتے ہی یعنی مرتے ہی) معلوم ہو جائے گا، پھر (دوبارہ تم کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ) ہرگز (یہ چیزیں فخر اور توجہ کے قابل نہیں، اور آخرت غفلت و انکار کے قابل) نہیں تم کو بہت جلد (قبر سے نکلتے ہی یعنی حشر میں) معلوم ہو جائے گا (اور تیسری بار پھر تم کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ) ہرگز (یہ چیزیں فخر اور توجہ کے قابل نہیں، اور آخرت غفلت و انکار کے قابل) نہیں (اور) اگر تم یقینی طور پر (واجب الاتباع صحیح دلائل سے اس بات کو) جان لیتے (جیسا کہ یہی یقین تم کو مرنے کے بعد اور حشر کے بعد حاصل ہوگا تو کبھی اس سامان پر فخر اور آخرت سے غفلت میں نہ پڑتے، آگے اس وعید کی تاکید ہے) واللہ! تم لوگ ضرور دوزخ کو دیکھو گے پھر (تاکید کے لئے دوبارہ کہا جاتا ہے کہ) واللہ تم لوگ ضرور اس کو ایسا دیکھنا دیکھو گے جو کہ خود یقین ہے (یعنی وہ دیکھنا مشاہدہ سے ہوگا جس پر فوری یقین حاصل ہو جاتا ہے، استدلال اور دلائل کی راہ سے

نہیں ہوگا جس سے یقین حاصل ہونے میں کبھی دیر بھی لگتی ہے، نیز مشاہدہ میں بہ نسبت استدلال کے انکشاف بھی زیادہ ہوتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کو عین الیقین سے تعبیر فرمایا ہے) پھر (اور بات سنو کہ) اس روز تم سب سے نعمتوں کی پوچھ ہوگی (کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا حق ایمان واطاعت کے ساتھ بجالائے یا نہیں، گذشتہ خطابات خاص کفار کے ساتھ ہیں، اور لتسئلنّ میں خطاب عام ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی مال واولاد کی کثرت اور دنیا کے ساز وسامان کی حرص آدمی کو غفلت میں پھنسائے رکھتی ہے، نہ مالک کا دھیان آنے دیتی ہے نہ آخرت کی فکر، بس شب وروز یہی دھن لگی رہتی ہے کہ جس طرح بن پڑے مال ودولت کی بہتات ہو، اور میرا کنبہ اور جتھا سب کنبوں اور جتھوں سے غالب رہے، یہ پردہ غفلت کا نہیں اٹھتا یہاں تک کہ موت آجاتی ہے، تب قبر میں پہنچ کر پتہ لگتا ہے کہ سخت غفلت اور بھول میں پڑے ہوئے تھے محض چند روز کی چہل پہل تھی، موت کے بعد وہ سب سامان ہیچ بلکہ وبال جان ہیں۔

تنبیہ: بعض روایات میں آیا ہے (الله اعلم بصحتها) کہ ایک مرتبہ دو قبیلے اپنے اپنے جتھے کی کثرت پر فخر کر رہے تھے، جب مقابلہ کے وقت ایک کے آدمی دوسرے سے کم رہے تو اس نے کہا کہ ہمارے اتنے آدمی لڑائی میں مارے جاچکے ہیں چل کر قبریں شمار کرلو، وہاں پتہ لگے گا کہ ہمارا جتھا تم سے کتنا زیادہ ہے، اور ہم میں کیسے کیسے نامور گزر چکے ہیں، یہ کہہ کر قبریں شمار کرنے لگے، اس جہالت وغفلت پر متنبہ کرنے کے لئے یہ سورت نازل ہوئی، ترجمہ میں دونوں مطلبوں کی گنجائش ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی دیکھو بار بار تاکید کہا جاتا ہے کہ تمہارا خیال صحیح نہیں کہ مال واولاد وغیرہ کی بہتات ہی کام آنے والی چیز ہے، عنقریب تم معلوم کرلوگے کہ یہ زائل وفانی چیز ہرگز فخر ومباہات کے لائق نہ تھی پھر سمجھ لو کہ آخرت ایسی چیز نہیں جس سے انکار کیا جائے یا غفلت برتی جائے، آگے چل کر تم پر بہت جلد کھل جائے گا کہ خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی، یہ حقیقت بعض لوگوں کو دنیا میں تھوڑی بہت کھل جاتی ہے لیکن قبر میں پہنچ کر اور اس کے بعد محشر میں سب کو پوری طرح کھل جائے گی۔

فائدہ: ۳ یعنی تمہارا خیال ہرگز صحیح نہیں اگر تم یقینی طور پر دلائل صحیحہ سے اس بات کو جان لیتے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے سب سامان ہیچ ہیں تو ہرگز اس غفلت میں پڑے نہ رہتے۔

فائدہ: ۴ یعنی اس غفلت وانکار کا نتیجہ دوزخ ہے، وہ تم کو دیکھنا پڑے گا، اول تو اس کا کچھ اثر برزخ میں نظر آجائے گا، پھر آخرت میں پوری طرح دیکھ کر عین الیقین حاصل ہوجائے گا۔

فائدہ: ۵ یعنی اس وقت کہیں گے اب بتلاؤ! دنیا کے عیش وآرام کی کیا حقیقت تھی، یا اس وقت سوال کیا جائے گا کہ جو نعمتیں (ظاہری وباطنی، آفاقی وانفسی، جسمانی وروحانی) دنیا میں عطا کی گئی تھیں ان کا حق تم نے ادا کیا اور منعم حقیقی کو کہاں تک خوش رکھنے کی سعی کی۔

ایاتها ۳ | ۱۰۳ سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ ۱۳ | رکوعها ۱

خلاصہ تفسیر: سورہ ضحیٰ کی تمہید میں جن اہم باتوں کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ایک اپنی عمر کو ضائع ہونے سے بچانا اور اس کو اعمال وطاعات میں صرف کرنا ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ

قسم ہے عصر کی ۱ مقرر انسان ٹوٹے میں ہے ۲ مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کیے بھلے کام اور آپس میں تاکید کرتے رہے سچے دین کی

عٌ ۲۸

وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾

اور آپس میں تاکید کرتے رہے تحمل کی ۳

خلاصہ تفسیر: قسم ہے زمانہ کی (جس میں رنج اور خسارہ واقع ہوتا ہے) کہ انسان (اپنی عمر ضائع کرنے کی وجہ سے) بڑے خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے (جو اپنے نفس کا کمال ہے) اور ایک دوسرے کو حق (پر قائم رہنے) کی فرمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو (عمال کی) پابندی کی فرمائش کرتے رہے (جو دوسروں کی تکمیل ہے تو جو لوگ یہ کمال حاصل کریں اور دوسروں کی بھی تکمیل کریں یہ لوگ البتہ خسارے میں نہیں بلکہ نفع میں ہیں)۔

قسم اور جواب قسم میں مناسبت خود صفت عصر سے ظاہر ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ ''عصر'' زمانہ کو کہتے ہیں، یعنی قسم ہے زمانہ کی جس میں انسان کی عمر بھی داخل ہے جسے تحصیل کمالات وسعادات کے لئے ایک متاع گرانمایہ سمجھنا چاہیے یا قسم ہے نماز عصر کے وقت کی جو کاروباری دنیا میں مشغولیت اور شرعی نقطہ نظر سے نہایت فضیلت کا وقت ہے (حتیٰ کہ حضور ﷺ نے حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جس کی نماز عصر فوت ہوگئی گویا اس کا سب گھر بار لٹ گیا) یا قسم ہے ہمارے پیغمبر کے زمانہ مبارک کی، جس میں رسالت عظمیٰ اور خلافت کبریٰ کا نور اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمکا۔

فائدہ: ۲ اس سے بڑھ کر ٹوٹا کیا ہوگا کہ برف بیچنے والے دکاندار کی طرح اس کی تجارت کا راس المال جسے عمر عزیز کہتے ہیں، دم بدم کم ہوتا جا رہا ہے، اگر اس رواداری میں کوئی ایسا کام نہ کر لیا جس سے یہ عمر رفتہ ٹھکانے لگ جائے، بلکہ ایک ابدی اور غیر فانی متاع بن کر ہمیشہ کے لئے کارآمد بن جائے، تو پھر خسارہ کی کوئی انتہاء نہیں، زمانہ کی تاریخ پڑھ جاؤ اور خود اپنی زندگی کے واقعات پر غور کرو تو ادنیٰ غور وفکر سے ثابت ہوجائے گا کہ جن لوگوں نے انجام بینی سے کام نہ لیا اور مستقبل سے بے پرواہ ہو کر محض خالی لذتوں میں وقت گزار دیا وہ آخر کار کس طرح ناکام ونامراد بلکہ تباہ وبرباد ہو کر رہے، آدمی کو چاہیے کہ وقت کی قدر پہچانے اور عمر عزیز کے لمحات کو یونہی غفلت وشرارت یا لہو ولعب میں نہ گنوائے، جو اوقات تحصیل شرف ومجد اور اکتساب فضل وکمال کی گرم بازاری کے ہیں، خصوصاً وہ گراں مایہ اوقات جن میں آفتاب رسالت اپنی انتہائی نور افشانی سے دنیا کو روشن کر رہا ہے، اگر غفلت ونسیان میں گزار دیے گئے، تو سمجھو کہ اس سے بڑھ کر آدمی کے لئے کوئی خسارہ نہیں ہوسکتا، بس خوش نصیب اور اقبال مند انسان وہی ہیں جو اس عمر فانی کو باقی اور ناکارہ زندگی کو کارآمد بنانے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور بہترین اوقات اور عمدہ مواقع کو غنیمت سمجھ کر کسب سعادت اور تحصیل کمال کی کوشش میں سرگرم رہتے ہیں، اور یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر آگے: الا الذین امنو وعملوا الصلحت میں کیا گیا ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی انسان کو خسارہ سے بچنے کے لئے چار باتوں کی ضرورت ہے، اول خدا اور رسول پر ایمان لائے اور ان کی ہدایات اور وعدوں پر خواہ دنیا سے متعلق ہوں یا آخرت سے، پورا یقین رکھے، دوسرے اس یقین کا اثر محض اپنی انفرادی صلاح وفلاح پر قناعت نہ کرے بلکہ قوم وملت کے اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھے، جب دو مسلمان ملیں ایک دوسرے کو اپنے قول وفعل سے سچے دین اور ہر معاملہ میں سچائی اختیار کرنے کی تاکید کرتے رہیں، چوتھے ہر ایک کو دوسرے کی یہ نصیحت ووصفت رہے کہ حق کے معاملہ میں اور شخصی وقومی اصلاح کے راستہ میں جس قدر سختیاں اور دشواریاں پیش آئیں یا خلاف طبع امور کا تحمل کرنا پڑے، پورے صبر واستقامت سے تحمل کریں، ہرگز قدم نیکی کے راستہ میں ڈگمگانے نہ پائے، جو خوش قسمت حضرات ان چار اوصاف کے جامع ہوں گے اور خود کامل ہو کر دوسروں کی تکمیل کریں گے ان کا نام صفحات دہر پر زندہ جاوید رہے گا، اور جو آثار چھوڑ کر دنیا سے جائیں گے وہ بطور باقیات صالحات ہمیشہ ان کے اجر کو بڑھاتے رہیں گے، فی الحقیقت یہ چھوٹی سی سورت سارے دین وحکمت کا خلاصہ ہے، امام شافعیؒ نے سچ فرمایا کہ اگر قرآن میں سے صرف یہی ایک سورت نازل کر دی جاتی تو (سمجھدار بندوں کی) ہدایت کے لئے کافی تھی، بزرگان سلف میں جب دو مسلمان آپس میں ملتے تھے، جدا ہونے سے پہلے ایک دوسرے کو یہ سورت سنایا کرتے تھے۔

ایاتھا ۹ — ١٠٤ سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ ٣٢ — رکوعھا ۱

خلاصہ تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے ایک اپنے آپ کو عذاب کی خصلتوں سے بچانا بھی ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ﴿۱﴾ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿۲﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ﴿۳﴾

خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی ۱ جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا ۲ خیال کرتا ہے کہ اسکا مال سدا کو رہے گا اسکے ساتھ ۳

كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴿۴﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿۶﴾

کوئی نہیں وہ پھینکا جائے اس روندنے والی میں ۴ اور تو کیا سمجھا کون ہے وہ روندنے والی ایک آگ ہے، اللہ کی سلگائی ہوئی

الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۸﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾ ع ۱ ۹ ۲۹

وہ جھانک لیتی ہے دل کو ۵ ان کو اس میں موند دیا ۶ لمبے لمبے ستونوں میں ۷

خلاصہ تفسیر: بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لئے جو پس پشت عیب نکالنے والا ہو (اور) رو در رو طعنہ دینے والا ہو جو (بہت حرص کی وجہ سے) مال جمع کرتا ہو اور (اس کی محبت اور اس پر فخر کے سبب) اس کو بار بار گنتا ہو (اس کے برتاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا) وہ خیال کر رہا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا (یعنی مال کی محبت میں ایسا انہماک رکھتا ہو جیسے وہ اس کا معتقد ہے کہ وہ خود بھی ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کا مال بھی ہمیشہ یوں ہی رہے گا، حالانکہ یہ مال اس کے پاس) ہرگز نہیں (رہے گا، آگے اس ویل یعنی خرابی کی تفصیل ہے کہ) واللہ وہ شخص ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جس میں جو کچھ پڑے وہ اس کو توڑ پھوڑ دے، اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ توڑنے پھوڑنے والی آگ کیسی ہے وہ اللہ کی آگ ہے جو (اللہ کے حکم سے) سلگائی گئی ہے (آگ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں اس آگ کے سخت اور ہولناک ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور وہ ایسی ہے) جو (بدن کو لگتے ہی) دلوں تک جا پہنچے گی وہ (آگ) ان پر بند کردی جائے گی (اس طرح سے کہ وہ لوگ آگ کے) بڑے لمبے لمبے ستونوں میں (گھرے ہوئے ہوں گے، یعنی آگ کے اتنے بڑے بڑے شعلے ہوں گے اور وہ لوگ اس میں مقید ہوں گے، جیسے کسی کو آگ کے صندوقوں میں بند کردیا جائے)۔

سورت کے شروع میں بیان کی گئی صفات وافعال پر یہ خاص وعید اس صورت میں ہے کہ ان کا منشا کفر ہو اگرچہ مذکورہ صفات پر کسی قدر عذاب ہونا مسلمانوں کے لیے بھی احادیث وغیرہ میں وارد ہے۔

الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ: یعنی وہ آگ دلوں تک جا پہنچے گی، چونکہ وہ آگ بدن میں جلد سرایت اور نفوذ کرنے والی ہے اور کافر کو جہنم میں موت آئے گی نہیں، اس لیے یہ حالت ہوگی کہ بدن کے ساتھ ہی دل کو جلائے گی، اور اگر دیر میں بھی سرایت کرے تب بھی یہ بات ہے کہ دل تک اس کو پہنچنے کی تکلیف جہنمی کو محسوس ہوگی، کیونکہ وہاں موت نہیں ہے، بخلاف دنیا کی آگ کے کہ بدن سے دل تک پہنچتے پہنچتے بہت دیر لگتی ہے، حتی کہ اس سے پہلے ہی روح نکل جاتی ہے، اور دل تک پہنچنے کی تکلیف محسوس ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

* * *

فائدہ: ۱ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ: یعنی اپنی خبر نہیں لیتا دوسروں کو حقیر سمجھ کر طعنے دیتا ہے اور انکے واقعی یا غیر واقعی عیب چنتا رہتا ہے۔

فائدہ: ۲ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ: یعنی طعنہ زنی اور عیب جوئی کا منشاء تکبر اور تکبر کا سبب مال ہے جس کو مارے حرص کے ہر طرف

سے سمیٹتا اور مارے بخل کے گن گن کر رکھتا ہے کہ کوئی پیسہ کہیں خرچ نہ ہوجائے یا نکل کر بھاگ نہ جائے، اکثر بخیل مالداروں کو دیکھا ہوگا کہ وہ بار بار روپیہ شمار کرتے اور حساب لگاتے رہتے ہیں، اسی میں ان کو مزہ آتا ہے۔

فائدہ: ۳۔ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ: یعنی اس کے برتاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ مال کبھی اس سے جدا نہ ہوگا، بلکہ ہمیشہ اس کو آفات ارضی وسماوی سے بچاتا رہے گا۔

فائدہ: ۴۔ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ: یعنی یہ خیال محض غلط ہے، مال تو قبر تک بھی ساتھ نہ جائے گا، آگے تو کیا کام آتا، سب دولت یونہی پڑی رہ جائے گی، اور اس بد بخت کو اٹھا کر دوزخ میں پھینک دیں گے۔

فائدہ: ۵۔ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ: یعنی یاد رہے یہ آگ بندوں کی نہیں، اللہ کی سلگائی ہوئی ہے، اس کی کیفیت کچھ نہ پوچھو، بڑی سمجھدار ہے، دلوں کو جھانک لیتی ہے، جس دل میں ایمان ہو نہ جلائے، جس میں کفر ہو جلا ڈالے، اس کی سوزش بدن کو لگتے ہی فوراً دلوں تک نفوذ کر جائیگی، بلکہ ایک طرح دل سے شروع ہو کر جسموں میں سرایت کرے گی، اور باوجودیکہ قلوب وارواح جسموں کی طرح جلیں گے، اس پر بھی مجرم مرنے نہ پائیں گے دوزخی تمنا کرے گا کہ کاش موت آ کر اس عذاب کا خاتمہ کر دے، لیکن یہ آرزو پوری نہ ہوگی۔ اعاذنا اللہ منها ومن سائر وجوہ العذاب۔

فائدہ: ۶۔ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ: یعنی کفار کو دوزخ میں ڈال کر دروازے بند کر دیے جائینگے، کوئی راستہ نکلنے کا نہ رہے گا، ہمیشہ اس میں پڑے جلتے رہیں گے۔

فائدہ: ۷۔ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ: یعنی آگ کے شعلے لمبے لمبے ستونوں کی مانند بلند ہوں گے، یا یہ کہ دوزخیوں کو لمبے ستونوں سے باندھ کر خوب جکڑ دیا جائے گا کہ جلتے وقت ذرا حرکت نہ کر سکیں، کیونکہ ادھر ادھر حرکت کرنے سے بھی عذاب میں کچھ برائے نام تخفیف ہو سکتی تھی، اور بعض نے کہا کہ دوزخ کے منہ کو لمبے لمبے ستون ڈال کر اوپر سے پاٹ دیا جائے گا، واللہ اعلم۔

ایاتها ۵ ۱۰۵ سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ ۱۹ رکوعها ۱

خلاصہ تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے یہ بھی ہے کہ شعائر واحکام الہی کی بے حرمتی کرنے پر عذاب الہی سے ڈرنا چاہیے، چنانچہ اس سورت میں بیت اللہ کی بے حرمتی کے وبال اور عذاب سے اسی پر استدلال کیا گیا ہے۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ بادشاہ حبشہ کی طرف سے یمن میں ایک حاکم تھا ابرہہ، اس نے ایک کنیسہ بنا رکھا تھا، کیونکہ یہ لوگ نصرانی تھے، اور اس نے یہ چاہا کہ کعبہ کا حج کرنے والے یہاں آیا کریں اور اس کا اعلان کر دیا، عرب کو خصوصاً قریش کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی، اور کسی شخص نے رات کو اس میں جا کر غلاضت کر دی، بعض کے نزدیک عرب کے کچھ لوگوں نے وہاں آگ جلائی تھی، ہوا سے اس میں آگ جا لگی اور وہ سب جل گیا، ابرہہ کو غصہ آیا اور ایک بڑا لشکر لے کر جس میں ہاتھی بھی تھے خانہ کعبہ کو منہدم کرنے نکلا، جب مُحَمّس میں پہنچا جو کہ طائف کے راستہ میں ہے تو عبدالمطلب رئیس مکہ کے پاس آدمی بھیجا کہ میں لڑنے نہیں آیا ہوں، صرف کعبہ منہدم کرنے آیا ہوں، اگر کوئی اس کی حمایت کرے گا اس سے البتہ لڑوں گا، عبدالمطلب نے جواب دیا کہ یہ گھر میرا نہیں ہے، جس کا یہ گھر ہے وہ آپ حفاظت کر لے گا، پھر عبدالمطلب خود بھی اس کے پاس گئے اور یہی گفتگو زبانی ہوئی، وہاں سے واپس آ کر وہ سب قریش کو لے کر پہاڑوں میں جا چھپے، تاکہ لشکر کے شر سے محفوظ رہیں اور دعا میں مشغول ہو گئے، ابرہہ وہاں سے مکہ کی طرف چلا، جب مزدلفہ کے قریب وادی محسر میں پہنچا تو سمندر کی طرف سے کچھ سبز اور زرد رنگ کے پرندے کبوتر سے کچھ چھوٹے آئے اور ان کے پنجوں اور چونچوں میں مسور اور چنے کے برابر کنکریاں تھیں جو لشکر پر چھوڑنا شروع کیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ گولی کی طرح لگتی اور ہلاک کر دیتی تھی، بعض تو اس عذاب سے ہلاک ہوئے اور بعض بھاگ گئے اور دوسری بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر مر گئے اور ابرہہ کے بدن کا گوشت اور دل پھٹ گیا، وہ راستہ ہی میں مر گیا، یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ سے پچاس روز قبل ہوا، آپ ربیع الاول میں پیدا ہوئے اور یہ واقعہ محرم کے آخر میں ہوا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ﴿۱﴾ اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَہُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ۙ﴿۲﴾

کیا تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ ۱ کیا نہیں کر دیا ان کا داؤ غلط ۲

خلاصہ تفسیر: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں سے کیا معاملہ کیا (اس استفہام وسوال سے مقصود اس واقعہ کی عظمت اور ہولناک ہونے پر تنبیہ کرنا ہے، کیونکہ یہ قدرت الہیہ پر دلالت کرتا ہے، آگے اس معاملہ کا بیان ہے:) کیا ان کی تدبیر کو (جو کعبہ ویران کرنے کے لئے تھی) سرتا پا غلط نہیں کر دیا (یہ استفہام وسوال تقریری ہے، یعنی واقعہ کی صحت کو ثابت کرنے کے لئے)۔

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ: یہاں الم تر فرمایا جس کے معنی ہیں: ''کیا آپ نے نہیں دیکھا'' حالانکہ یہ واقعہ آپ کی ولادت باسعادت سے کچھ دن پہلے کا ہے، آپ کے دیکھنے کا یہاں بظاہر کوئی موقع نہیں تھا، مگر جو واقعہ یقینی ایسا ہو کہ عام طور پر مشاہدہ کیا گیا ہو اس کے علم کو بھی لفظ ''رویت'' سے تعبیر کر دیا جاتا ہے کہ گویا یہ آنکھوں دیکھا واقعہ ہے اور ایک حد تک دیکھنا بھی ثابت ہے جیسا کہ مروی ہے کہ حضرت صدیقہ عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ نے ان ہاتھی بانوں کو اندھا اور اپاہج بھیک مانگتے دیکھا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہاتھی والوں کے ساتھ تیرے رب نے جو معاملہ کیا وہ تم کو ضرور معلوم ہوگا، کیونکہ یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت سے چند روز پیشتر ہوا تھا اور غایت شہرت سے بچہ بچہ کی زبان پر تھا، اسی قرب عہد اور تواتر کی بناء پر اس کے علم کو ''رؤیت'' سے تعبیر فرما دیا۔

فائدہ: ۲ یعنی وہ لوگ چاہتے تھے کہ اللہ کا کعبہ اجاڑ کر اپنا مصنوعی کعبہ آباد کریں، یہ نہ ہو سکا، اللہ نے ان کے سب پیچ غلط اور کل تدبیریں بے اثر کر دیں، کعبہ کی تباہی کی فکر میں وہ خود ہی تباہ و برباد ہو گئے۔

ع وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡہِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ۙ﴿۳﴾ تَرۡمِیۡہِمۡ بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَہُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ﴿۵﴾

اور بھیجے ان پر اڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں، پھینکتے تھے ان پر پتھریاں کنکر (کھنگر) کی ۱ پھر کر ڈالا ان کو جیسے بھس کھایا ہوا ۲

خلاصہ تفسیر: اور ان پر غول کے غول پرندے بھیجے جو ان لوگوں پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے سو اللہ تعالیٰ نے ان کو کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح (پامال) کر دیا۔

اگر بعض بھاگ جانے والوں پر کنکریوں کا نہ پڑنا ثابت ہو تو یہ مضمون اکثر کے اعتبار سے ہوگا، یعنی ان میں سے اکثر کے ساتھ ایسا ہوا۔

سورت کا حاصل یہ ہے کہ احکام الہیہ کی بے حرمتی کرنے والوں کو ایسے عذاب وعقاب سے بے فکر نہیں رہنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ دنیا ہی میں عذاب آ جائے جیسے اصحاب فیل پر آیا، ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ ''اصحاب فیل'' کا قصہ مختصر یہ ہے کہ بادشاہ حبشہ کی طرف سے یمن میں ایک حاکم ابرہہ نامی تھا، اس نے دیکھا کہ سارے عرب کعبہ کا حج کرنے جاتے ہیں، چاہا کہ ہمارے پاس جمع ہوا کریں، اس کی تدبیر یہ سوچی کہ اپنے مذہب عیسائی کے نام پر ایک عالیشان گرجا بنایا جائے، جس میں ہر طرح کے تکلفات اور راحت و دلکشی کے سامان ہوں، اس طرح لوگ اصلی اور سادہ کعبہ کو چھوڑ کر اس مکلف و مرصع کعبہ کی طرف آنے لگیں گے اور مکہ کا حج چھوٹ جائے گا، چنانچہ صنعاء میں (جو یمن کا بڑا شہر ہے) اپنے مصنوعی کعبہ کی بنیاد رکھی اور خوب دل کھول کر روپیہ خرچ کیا، اس پر بھی لوگ ادھر

متوجہ نہ ہوئے، عرب کو خصوصاً قریش کو جب اس کی اطلاع ہوئی، سخت خشمگین ہوئے، کسی نے غصہ میں آکر وہاں پاخانہ کر دیا، اور بعض کہتے ہیں کہ بعض عرب نے آگ جلائی تھی ہوا سے اڑ کر اس عمارت میں لگ گئی، ابرہہ نے جھنجھلا کر کعبہ شریف پر فوج کشی کر دی، بہت سا لشکر اور ہاتھی لے کر اس ارادہ سے چلا کہ کعبہ کو منہدم کر دے، درمیان میں عرب کے جس قبیلہ نے مزاحمت کی اسے مارا اور مغلوب کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب اس وقت قریش کے سردار اور کعبہ کے متولی اعظم تھے، ان کو خبر ہوئی تو فرمایا لوگو! اپنا بچاؤ کر لو، کعبہ جس کا گھر ہے وہ خود اس کو بچا لے گا، ابرہہ نے راستہ صاف دیکھ کر یقین کر لیا کہ اب کعبہ کا منہدم کر دینا کوئی مشکل کام نہیں، کیونکہ ادھر سے کوئی مقابلہ کرنے والا نہ تھا، جب وادی محسر (جو مکہ کے قریب جگہ ہے) پہنچا تو سمندر کی طرف سے سبز اور زرد رنگ کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی ٹکڑیاں نظر آئیں، ہر ایک کی چونچ اور پنجوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں تھیں، ان عجیب وغریب پرندوں کے غول کے غول کنکریاں لشکر پر برسانے لگے، خدا کی قدرت سے وہ کنکر کی پتھریاں بندوق کی گولی سے زیادہ کام کرتی تھیں، جس کے لگتی، ایک طرف سے گھس کر دوسری طرف سے نکل جاتی اور ایک عجیب طرح کا سمی مادہ چھوڑ جاتی تھی، بہت سے وہیں ہلاک ہو گئے، جو بھاگے وہ دوسری بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر مرے، یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریف سے پچاس روز پہلے ہوا، بلکہ بعض کہتے ہیں کہ خاص اسی روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد آمد کا تھا، اور ایک غیبی اشارہ تھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی فوق العادت حفاظت فرمائی ہے، اس گھر کے سب سے مقدس متولی اور سب سے بزرگ پیغمبر کی حفاظت بھی اسی طرح کرے گا، اور عیسائی یا کسی دوسرے مذہب کو یہ موقع نہ دے گا کہ وہ کعبہ اور کعبہ کے سچے خادموں کا استیصال کر سکیں۔

فائدہ: ۲؎ جو بیل، گائے وغیرہ کھا کر آخور چھوڑ دیتے ہیں، یعنی ایسا پراگندہ منتشر، مبتذل، بدصورت، نکما اور چورا چورا۔

ایاتها ٤ | ١٠٦ سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَّكِّيَّةٌ ٢٩ | رکوعها ١

خلاصہ تفسیر: اصحاب فیل کے واقعہ کی عظمت کا یہ اثر تھا کہ قریش مکہ مختلف ملکوں کا سفر بغرض تجارت کرتے تھے اور راستہ میں کوئی ان کو نقصان نہ پہنچاتا، حالانکہ اس وقت دوسروں کے لئے کوئی سفر ایسے خطرات سے خالی نہیں تھا، قریش کے انہی سفروں کا ذکر اس سورۃ میں کر کے ان کو شکر نعمت کی طرف دعوت دی گئی ہے، یعنی اہم شرعی مضامین میں سے ایک نعمت الہیہ کے شکر یہ میں عبادت بجالانا ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ﴿۲﴾

اس واسطے کہ مانوس رکھا قریش کو، مانوس رکھنا ان کو سفر سے جاڑے کے اور گرمی کے

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾ ع ۳۱

تو چاہیے کہ بندگی کریں اس گھر کے رب کی، جس نے ان کو کھانا دیا بھوک میں اور امن دیا ڈر میں ۱؎

خلاصہ تفسیر: چونکہ قریش خوگر ہو گئے ہیں، یعنی جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہو گئے ہیں، تو (اس نعمت کے شکر میں) ان کو چاہئے کہ اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں، جس نے ان کو بھوک میں کھانے کو دیا اور خوف سے ان کو امن دیا۔

رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ: انعامات کا ذکر کرنے کے بعد ان کا شکر ادا کرنے کے لئے قریش کو خصوصی خطاب کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ اس کے گھر کے مالک کی عبادت کیا کرو، اس جگہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ''رب البیت'' ہونے کی صفت کو خصوصیت سے اس لئے ذکر فرمایا کہ یہی بیت کعبہ ان کے تمام فضائل اور برکات کا سرچشمہ تھا اور اسی کے سبب قریش کا احترام ہوتا تھا، حاصل یہ کہ مکہ میں غلہ وغیرہ پیدا نہیں ہوتا تھا، اس لیے قریش کی عادت تھی کہ سال بھر میں تجارت کے لیے دو سفر کرتے، سردیوں میں یمن کی طرف کیونکہ وہ گرم ملک ہے، اور گرمیوں میں شام کی طرف کیونکہ وہ ٹھنڈا

علاقہ ہے، لوگ قریش کو اہل حرم اور بیت اللہ کا خادم سمجھ کر ان کا احترام کرتے اور ان کے مال وجان سے کوئی تعرض نہ کرتا اور قریش کو خاطر خواہ نفع ہوتا کہ گھر بیٹھ کر کھاتے اور کھلاتے، اسلیے ربّ کی نسبت ھذا البیت کی طرف فرمائی۔

الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ: اس میں قریش مکہ کے لئے دنیا کی ان تمام عظیم نعمتوں کو جمع فرمادیا ہے جو انسان کے خوش عیش رہنے کے لئے ضروری ہیں، **اطعمھم من جوع** میں کھانے پینے کی ضروریات اور ہر قسم کا نفع داخل ہے، اور **اٰمنھم من خوف** میں دشمنوں ڈاکوؤں کے خوف سے مامون ہونا بھی شامل ہے سفر میں بھی اور حضر میں بھی۔

اس سورت سے معلوم ہوا کہ جس طرح قریش کو بیت اللہ کے سبب نعمتیں اور برکتیں حاصل تھیں، اگر کسی کو دین کے سبب مال وجاہ نصیب ہو تو اس کا حق یہ ہے کہ فخر، غرور کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر اور اطاعت کا خاص اہتمام کرے۔

* * *

فائدہ: لہ مکہ میں غلہ وغیرہ پیدا نہیں ہوتا اس لئے قریش کی عادت تھی کہ سال بھر میں تجارت کی غرض سے دو سفر کرتے تھے: ① جاڑوں میں یمن کی طرف کہ وہ ملک گرم ہے ② اور گرمیوں میں شام کی طرف جو سرد اور شاداب ملک ہے، لوگ ان کو اہل حرم اور خادم بیت اللہ سمجھ کر نہایت عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے، ان کی خدمت کرتے اور ان کے جان ومال سے کچھ تعرض نہ کرتے، اس طرح ان کو خاطر خواہ نفع ہوتا، پھر امن وچین سے گھر بیٹھ کر کھاتے اور کھلاتے تھے، حرم کے چاروں طرف لوٹ کھسوٹ اور چوری ڈکیتی کا بازار گرم رہتا تھا، لیکن کعبہ کے ادب سے کوئی چور، ڈاکو قریش پر ہاتھ صاف نہ کرتا تھا، اسی انعام کو یہاں یاد دلایا ہے کہ اس گھر کے طفیل تم کو روزی دی، اور امن چین دیا، ''اصحاب فیل'' کی زد سے محفوظ رکھا، پھر اس گھر والے کی بندگی کیوں نہیں کرتے اور اس کے رسول کو کیوں ستاتے ہو، کیا یہ انتہائی ناشکری اور احسان فراموشی نہیں، اگر دوسری باتیں نہیں سمجھ سکتے تو ایسی کھلی ہوئی حقیقت کا سمجھنا کیا مشکل ہے۔

ایاتها ٧ ● ١٠٧ سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ ١٧ ● ركوعها ١

خلاصہ تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے ایک کفر ونفاق سے بچنا ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ① فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ② وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ③

تو نے دیکھا اس کو جو جھٹلاتا ہے انصاف ہونے کو لہ سو یہ وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو ۲ اور نہیں تاکید کرتا محتاج کے کھانے پر ۳

خلاصہ تفسیر: کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جو روز جزاء کو جھٹلاتا ہے، سو (آپ اس کا حال سننا چاہیں تو سنئے کہ) وہ شخص وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور محتاج کو کھانا دینے کی (دوسروں کو بھی) ترغیب نہیں دیتا (یعنی وہ ایسا سنگدل ہے کہ خود وہ کسی غریب کو کیا دیتا، دوسروں کو بھی اس پر آمادہ نہیں کرتا، نہ خود احسان کرے اور نہ دوسرے کو احسان پر آمادہ کرے)۔

اس سورۃ میں کفار ومنافقین کے بعض افعال قبیحہ مذمومہ کا ذکر اور ان پر جہنم کی وعید ہے، یہ افعال اگر کسی مومن سے سرزد ہوں جو تکذیب نہیں کرتا وہ بھی اگر چہ شرعاً مذموم اور سخت گناہ ہیں مگر مذکورہ وعید ان پر نہیں ہے، اسی لئے ان افعال واعمال سے پہلے ذکر اس شخص کا فرمایا ہے جو دین اور قیامت کا منکر ہے اس کی تکذیب کرتا ہے اس میں اشارہ اس طرف ضرور ہے کہ یہ اعمال جن کا ذکر آگے رہا ہے مومن کی شان سے بعید ہیں، وہ کوئی منکر کافر ہی کرسکتا ہے، وہ قبیح اعمال جن کا اس سورۃ میں ذکر فرمایا ہے یہ سب افعال اپنی ذات میں بھی بہت مذموم اور سخت گناہ ہیں اور جب کفر وتکذیب کے نتیجہ میں یہ افعال سرزد ہوں تو ان کا وبال دائمی جہنم ہے جیسا کہ اس سورۃ میں اس کو ''ویل'' کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سمجھتا ہے کہ انصاف نہ ہوگا اور اللہ کی طرف سے نیک و بد کا کبھی بدلہ نہ ملے گا، اور بعض نے ''دین'' کے معنی ''ملت'' کے لئے ہیں، یعنی ملت اسلام اور مذہب حق کو جھٹلاتا ہے، گویا مذہب وملت اس کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یتیم کی ہمدردی اور غمخواری تو درکنار اس کے ساتھ نہایت سنگدلی اور بداخلاقی سے پیش آتا ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی غریب کی نہ خود خبر لے نہ دوسروں کو ترغیب دے، ظاہر ہے کہ یتیموں اور محتاجوں کی خبر لینا اور ان کے حال پر رحم کھانا دنیا کے ہر مذہب وملت کی تعلیم میں شامل ہے اور ان کا مکارم اخلاق میں سے ہے جن کی خوبی پر تمام عقلاء اتفاق رکھتے ہیں، پھر جو شخص ان ابتدائی اخلاق سے بھی عاری ہو، سمجھو کہ آدمی نہیں، جانور ہے، بھلا ایسے کو دین سے کیا واسطہ، اور اللہ سے کیا لگاؤ ہوگا۔

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۝۴ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۝۵

پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی، جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں ۱؎

الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ ۝۶ وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۝۷ ع ۳۲

وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں ۲؎ اور مانگی نہ دیویں برتنے کی چیز ۳؎

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات سے معلوم ہوا کہ جب بندوں کا حق ضائع کرنا ایسا برا ہے تو خالق کا حق ضائع کرنا تو اور زیادہ برا ہے: سو (اس سے ثابت ہوا کہ) ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں (یعنی ترک کر دیتے ہیں) جو ایسے ہیں کہ (جب نماز پڑھتے ہیں تو) ریا کاری کرتے ہیں اور زکوٰۃ بالکل نہیں دیتے (کیونکہ زکوٰۃ کے لئے شرعاً یہ ضروری نہیں کہ سب کے سامنے ظاہر کر کے دے، اس لیے اس کو تو بالکل ہی ترک کر دیتے ہیں، بخلاف نماز کے وہ جماعت کے ساتھ اعلانیہ ادا کی جاتی ہے اس کو بالکل چھوڑ دیں تو سب پر نفاق ظاہر ہو جائے گا، اس لئے نماز کو محض دکھلاوے کے لئے کبھی کبھی پڑھ لیتے ہیں)۔

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ: یہاں حقوق اللہ سے حقوق العباد کو اس لیے مقدم کیا کہ بندوں کے حق زیادہ لازم ہیں، کیونکہ بندہ محتاج ہے، وہ اپنے حق کو نہ چھوڑے گا، ورنہ ظاہر ہے کہ حقوق اللہ کا مرتبہ بڑا ہے، اور ویسے حقوق العباد بھی اللہ ہی کے حقوق ہیں، کیونکہ اسی کے حکم سے مقرر ہوئے ہیں۔

وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ: ''ماعون'' کے اصل لفظی معنی شئ قلیل وحقیر کے ہیں، اس لئے ''ماعون'' ایسی استعمالی اشیاء کو کہا جاتا ہے جو عادۃً ایک دوسرے کو عاریتاً دی جاتی ہیں اور جن کا باہم لین دین عام انسانیت کا تقاضا سمجھا جاتا ہے جیسے کلہاڑی پھاوڑہ، یا کھانے پکانے کے برتن جن کا ضرورت کے وقت پڑوسیوں سے مانگ لینا کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا اور جو اس میں دینے سے بخل کرے وہ بڑا کنجوس کمینہ سمجھا جاتا ہے، مگر آیت مذکورہ میں لفظ ''ماعون'' سے مراد زکوۃ ہے، اور زکوۃ کو ماعون اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ مقدار کے اعتبار سے نسبۃً بہت قلیل ہے، یعنی صرف چالیسواں حصہ (ڈھائی فیصد)، اور اس کے نہ دینے پر جو عذاب ویل جہنم کا مذکور ہے وہ بھی ترک فرض ہی پر ہوسکتا ہے، اشیاء استعمال کا دوسروں کو دینا بہت بڑا ثواب اور انسانیت ومروت کے لحاظ سے ضروری سہی مگر فرض وواجب نہیں جس کے روکنے پر جہنم کی وعید ہو، اور بعض روایات حدیث میں جو اس جگہ ماعون کی تفسیر استعمالی اشیاء اور برتنوں سے کی گئی ہے، اس کا مطلب ان لوگوں کی انتہائی خست کا اظہار ہے کہ یہ زکوۃ تو کیا دیتے استعمالی اشیاء جن کے دینے میں اپنا کچھ خرچ نہیں ہوتا اس میں بھی کنجوسی کرتے ہیں تو وعید صرف ان اشیاء کے نہ دینے پر نہیں، بلکہ زکوۃ فرض کی عدم ادائیگی اور اس کے ساتھ مزید بخل شدید پر ہے واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ **الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ**: یعنی نہیں جانتے کہ نماز کس کی مناجات ہے اور مقصود اس سے کیا ہے اور کس قدر اہتمام کے لائق ہے یہ کیا نماز ہوئی کہ کبھی پڑھی کبھی نہ پڑھی، وقت بے وقت کھڑے ہو گئے، باتوں میں دنیا کے دھندوں میں جان بوجھ کر وقت تنگ کر دیا، پھر پڑھی بھی تو چار ٹکریں لگا لیں، کچھ خبر نہیں کس کے روبرو کھڑے ہیں، اور احکم الحاکمین کے دربار میں کس شان سے حاضری دے رہے ہیں، کیا

خدا صرف ہمارے اٹھنے بیٹھنے، جھک جانے اور سیدھے ہونے کو دیکھتا ہے؟ ہمارے دلوں پر نظر نہیں رکھتا؟ کہ ان میں کہاں تک اخلاص اور خشوع کا رنگ موجود ہے، یادرکھو یہ سب صورتیں عن صلاتهم ساهون میں درجہ بدرجہ داخل ہیں، کما صرح به بعض السلف۔

فائدہ: ۲ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ: یعنی ایک نماز کیا، ان کے دوسرے اعمال بھی ریاکاری اور نمود و نمائش سے خالی نہیں گویا ان کا مقصد خالق سے قطع نظر کر کے صرف مخلوق کو خوش کرنا ہے۔

فائدہ: ۳ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ: یعنی زکوٰۃ و صدقات وغیرہ تو کیا ادا کرتے معمولی برتنے کی چیزیں بھی مثلاً (ڈول، رسی، ہنڈیا، دیگچی، کلہاڑی، سوئی دھاگا وغیرہ) کسی کو مانگے نہیں دیتے جن کے دے دینے کا دنیا میں عام رواج ہے، بخل اور فسق کا جب یہ حال ہو تو ریاکاری کی نماز سے ہی کیا فائدہ ہوگا، اگر ایک آدمی اپنے کو مسلمان نمازی کہتا اور کہلاتا ہے مگر اللہ کے ساتھ اخلاص اور مخلوق کے ساتھ ہمدردی نہیں رکھتا، اس کا اسلام لفظ بے معنی، اور اس کی نماز حقیقت سے بہت دور ہے، یہ ریاکاری اور بداخلاقی تو ان بدبختوں کا شیوہ ہونا چاہیے جو اللہ کے دین اور روز جزا پر کوئی اعتقاد نہیں رکھتے۔

آیاتها ۳ ۱۰۸ سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ ۱۵ رکوعها ۱

خلاصہ تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے حضور ﷺ کے ساتھ عقیدت و محبت اور آپ کے مخالف کے ساتھ بغض و عداوت رکھنا بھی ہے، اس سورت کی پہلی اور آخری آیتوں میں اسی کے اسباب کا بیان ہے اور درمیان کی آیت میں حضور ﷺ کو نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم ہوا ہے۔

اس سورت کا سبب نزول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سب سے بڑے بیٹے حضرت قاسم تھے، ان کا مکہ میں انتقال ہو گیا تو عاص بن وائل سہمی نے اور اس کے ساتھ دوسرے مشرکوں نے کہا کہ محمد (ﷺ) کی نسل منقطع ہوگئی، پس آپ نعوذ باللہ 'ابتر' یعنی بے نام و نشان ہیں، مطلب یہ تھا کہ ان کے دین کا چرچا چندروزہ ہے پھر یہ سب بکھیڑے پاک ہو جائیں گے، اس پر آپ ﷺ کی تسلی کے لئے یہ سورت نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿١﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿٢﴾

بیشک ہم نے دی تجھ کو کوثر ۱ سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر ۲

خلاصہ تفسیر: بیشک ہم نے آپ کو کوثر (جنت کی ایک حوض کا نام بھی ہے اور ہر خیر کثیر بھی اس میں شامل ہے) عطا فرمائی ہے (جس میں دنیا و آخرت کی ہر خیر و بھلائی شامل ہے، دنیا میں دین اسلام کی بقاء و ترقی، اور آخرت میں جنت کے درجات عالیہ سب داخل ہیں، پھر اگر ایک بیٹا فوت ہو گیا اور اس پر مخالفین خوشیاں مناتے ہیں اس پر غم نہ کیجیے، کیونکہ اس سے بڑھ کر آپ کو یہ دولتیں عطا فرمائی ہیں) سو (ان نعمتوں کے شکر میں) آپ اپنے پروردگار کی نماز پڑھئے (کیونکہ سب سے بڑی نعمت کے شکر میں سب سے بڑی عبادت چاہئے اور وہ نماز ہے) اور (تکمیل شکر کے لئے جسمانی عبادت کے ساتھ مالی عبادت یعنی اسی کے نام کی) قربانی کیجئے (جیسا دوسری آیتوں میں عموماً نماز کے ساتھ زکوۃ کا حکم ہے اس میں زکوۃ کے بجائے قربانی کا ذکر شاید اس لئے اختیار کیا گیا کہ قربانی میں مالی عبادت ہونے کے علاوہ مشرکین اور مشرکانہ رسوم کی عملی مخالفت بھی ہے، کیونکہ مشرکین بتوں کے نام کی قربانی کیا کرتے تھے)۔

إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ: ''کوثر'' یہ ایک حوض کا نام بھی ہے اور ہر خیر کثیر بھی اس میں داخل ہے، صحاح میں یہ دونوں تفسیریں اور ایک تفسیر کا دوسری تفسیر میں داخل ہونا آیا ہے، اور بعض حدیثوں سے اس نہر کا جنت میں ہونا، اور بعض سے میدان حشر میں ہونا معلوم ہوتا ہے، دونوں میں یہ تطبیق ہوسکتی ہے کہ اصل نہر جنت میں ہے اور اس کی ایک شاخ میدان حشر میں باذن الٰہی آجائے گی، اور دونوں کو ''کوثر'' کہہ دیا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اِنَّآ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ: ''کوثر'' کے معنی ''خیر کثیر'' کے ہیں، یعنی بہت زیادہ بھلائی اور بہتری، یہاں اس سے کیا چیز مراد ہے، ''البحر المحیط'' میں اس کے متعلق چھبیس اقوال ذکر کئے گئے ہیں اور اخیر میں اس کو ترجیح دی ہے کہ اس لفظ کے تحت میں ہر قسم کی دینی و دنیاوی دولتیں اور حسی و معنوی نعمتیں داخل ہیں، جو آپ ﷺ کو یا آپ کے طفیل میں امت مرحومہ کو ملنے والی تھیں، ان نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت وہ ''حوض کوثر'' بھی ہے جو اسی نام سے مسلمانوں میں مشہور ہے اور جس کے پانی سے آپ ﷺ اپنی امت کو محشر میں سیراب فرمائیں گے (اے ارحم الراحمین! تو اس خطا کار و سیاہ کاروں کو بھی اس سے سیراب کیجئے)۔

تنبیہ: ''حوض کوثر'' کا ثبوت بعض محدثین کے نزدیک حد تواتر تک پہنچ چکا ہے، ہر مسلمان کو اس پر اعتقاد رکھنا لازم ہے، احادیث میں اس کی عجیب و غریب خوبیاں بیان ہوئی ہیں، بعض روایات سے اس کا محشر میں ہونا اور اکثر سے جنت میں ہونا ثابت ہوتا ہے، اکثر علماء نے تطبیق یوں دی ہے کہ اصل نہر جنت میں ہوگی اور اسی کا پانی میدان حشر میں لا کر کسی حوض میں جمع کر دیا جائے گا، دونوں کو ''کوثر'' ہی کہتے ہوں گے، واللہ اعلم بالصواب۔

فائدہ: ۲؎ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ: یعنی اتنے بڑے انعام و احسان کا شکر بھی بہت بڑا ہونا چاہئے، تو چاہیے کہ آپ اپنی روح، بدن اور مال سے برابر اپنے رب کی عبادت میں لگے رہیں، بدنی و روحی عبادات میں سب سے بڑی چیز نماز ہے، اور مالی عبادات میں قربانی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے کیونکہ قربانی کی اصل حقیقت جان کا قربان کرنا تھا، جانور کی قربانی کو بعض حکمتوں اور مصلحتوں کی بناء پر اس کے قائم مقام کر دیا گیا، جیسا کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) کے قصہ سے ظاہر ہے اسی لئے قرآن میں دوسری جگہ بھی نماز اور قربانی کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے: قُلۡ اِنَّ صَلَاتِىۡ وَنُسُكِىۡ وَمَحۡيَاىَ وَمَمَاتِىۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ (الانعام: ۱۶۲-۱۶۳)۔

تنبیہ: بعض روایات میں وانحر کے معنی سینہ پر ہاتھ باندھنے کے آئے ہیں، مگر ابن کثیرؒ نے ان روایات میں کلام کیا ہے، اور ترجیح اس قول کو دی ہے کہ نحر کے معنی قربان کرنے کے ہیں، گویا اس میں مشرکین پر تعریض ہوئی کہ وہ نماز اور قربانی بتوں کے لئے کرتے تھے، مسلمانوں کو یہ کام خالص خدائے واحد کے لئے کرنے چاہئیں۔

ع ۲۲ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ۝۳

بیشک جو دشمن ہے تیرا وہی رہ گیا پیچھا کٹا

خلاصہ تفسیر: اب آگے آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے حضرت قاسم کی بچپن میں وفات پر بعض مشرکین نے جو یہ طعنہ دیا تھا کہ ان کی نسل نہ چلے گی اور ان کے دین کا سلسلہ جلد ختم ہو جائے گا، اس کا جواب ہے کہ آپ بفضلہ تعالیٰ بے نام و نشان نہیں ہیں بلکہ:

بالیقین آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے (خواہ ظاہری نسل اس دشمن کی چلے یا نہ چلے لیکن دنیا میں اس کا ذکر خیر باقی نہیں رہے گا، بخلاف آپ ﷺ کے کہ قیامت تک آپ کی امت، آپ کا دین، اور آپ کی یاد نیک نامی، محبت و اعتقاد کے ساتھ باقی رہے گی، اور یہ سب نعمتیں لفظ ''کوثر'' کے مفہوم میں داخل ہیں، اگر پسری اولاد کی نسل نہ ہو نہ سہی، جو نسل سے مقصود ہے وہ آپ کو حاصل ہے، یہاں تک کہ دنیا سے گزر کر آخرت میں بھی نیک نامی ہوگی، اور دشمن اس سے محروم ہے)۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ: یہ مطلق ہونے کی وجہ سے اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ کا ہر مخالف خیر سے محروم ہے، نہ اس کی زندگی میں برکت ہے کہ زاد آخرت اس سے جمع کرے، نہ اس کے دل میں خیر ہے کہ حق بات کو سمجھے، یا اس میں حق تعالیٰ کی محبت و معرفت پیدا ہو، نہ اس کے اعمال میں برکت ہے کہ توفیق یا اخلاص نصیب ہو، اور یہی حالت ان کی بھی ہو جاتی ہے جو آپ ﷺ کے ورثاء کی مخالفت کرتا ہے، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ: ''جو شخص میرے ولی سے دشمنی کرے تو میں اس کو اعلان جنگ دیتا ہوں''۔

* * *

فائدہ: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ: بعض کفار حضور ﷺ کی شان میں کہتے تھے، کہ اس شخص کے کوئی بیٹا نہیں، بس زندگی تک اس کا نام

ہے پیچھے کون نام لے گا، ایسے شخص کو ان کے محاورات میں ابتر کہتے تھے، ''ابتر'' اصل میں دم کٹے جانور کو کہتے ہیں، جس کے پیچھے کوئی نام لینے والا نہ رہے، گویا اس کی دم کٹ گئی، قرآن نے بتلایا کہ جس شخص کو اللہ خیر کثیر عنایت فرمائے اور ابدالآباد تک نام روشن کرے اسے ابتر کہنا پرلے درجہ کی حماقت ہے، حقیقت میں ''ابتر'' وہ ہے جو ایسی مقدس و مقبول ہستی سے بغض وعناد اور عداوت رکھے اور اپنے پیچھے کوئی ذکر خیر اور اثر نیک نہ چھوڑے، آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد ماشاء اللہ حضور ﷺ کی روحانی اولاد سے دنیا پٹی پڑی ہے اور جسمانی دختری اولاد بھی بکثرت ملکوں میں پھیلی ہوئی ہے، آپ ﷺ کے آثار صالحہ عالم میں چمک رہے ہیں، آپ ﷺ کی یاد نیک نامی اور محبت وعقیدت کے ساتھ کروڑوں انسانوں کے دلوں کو گرما رہی ہے، دوست دشمن سب آپ کے اصلاحی کارناموں کا صدق دل سے اعتراف کر رہے ہیں، پھر دنیا سے گزر کر آخرت میں جس مقام محمود پر آپ ﷺ کھڑے ہوں گے اور جو مقبولیت ومتبوعیت عامہ آپ ﷺ کو علیٰ روس الاشہاد حاصل ہوگی وہ الگ رہی، کیا ایسی دائم البرکتہ ہستی کو (العیاذ باللہ) ''ابتر'' کہا جا سکتا ہے؟ اس کے مقابل اس گستاخ کو خیال کرو جس نے یہ کلمہ زبان سے نکالا تھا، اس کا نام ونشان کہیں باقی نہیں، نہ آج بھلائی کے ساتھ اسے کوئی یاد کرنے والا ہے، یہی حال ان تمام گستاخوں کا ہوا جنہوں نے کسی زمانہ میں آپ ﷺ کے بغض وعداوت پر کمر باندھی اور آپ ﷺ کی شان مبارک میں گستاخی کی اور اسی طرح آئندہ ہوتا رہے گا۔

ایاتها ٦ | ١٠٩ سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ ١٨ | رکوعها ١

خلاصہ تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے ایک توحید اور شرک سے بیزاری ظاہر کرنا بھی ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے، سبب نزول یہ ہے کہ ایک بار چند رؤسا کفار نے آپ ﷺ سے عرض کیا کہ آئیے! ہمارے معبودوں کی آپ عبادت کریں اور آپ کے معبود کی ہم عبادت کیا کریں، جس میں ہم اور آپ طریق دین میں شریک رہیں جو طریقہ ٹھیک ہوگا اس سے سب کو کچھ کچھ حصہ مل جائے گا، اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝١ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝٢ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝٣

تو کہہ اے منکرو ۱ میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو، اور نہ تم پوجو جسکو میں پوجوں ۲

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝٤ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝٥ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝٦ ع

اور نہ مجھ کو پوجنا ہے اس کا جس کو تم نے پوجا، اور نہ تم کو پوجنا ہے اس کا جس کو میں پوجوں ۳ تم کو تمہاری راہ اور مجھ کو میری راہ ۴

خلاصہ تفسیر: آپ (ان کافروں سے) کہہ دیجئے کہ اے کافرو! (میرا تمہارا طریقہ ایک نہیں ہوسکتا اور) نہ (توفی الحال) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرتے ہو، اور نہ (آئندہ استقبال میں) میں تمہارے معبودوں کی پرستش کروں گا اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرو گے (مطلب احقر کے نزدیک یہ ہے کہ میں موحد ہو کر شرک نہیں کرسکتا نہ اب نہ آئندہ، اور تم مشرک ہو کر موحد نہیں قرار دیے جا سکتے نہ اب نہ آئندہ، یعنی توحید وشرک جمع نہیں ہو سکتے، آگے توحید وشرک کا انجام ارشاد ہے کہ:) تم کو تمہارا بدلہ ملے گا اور مجھ کو میرا بدلہ ملے گا (اس میں ان کے شرک پر وعید بھی سنا دی گئی، پس یہ سورت مشتمل ہے مخالفت اور اس کی وعید کے اظہار پر)۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ: اس سورۃ میں یہ چند کلمات مکرر آئے ہیں، اس تکرار کو رفع کرنے کے لئے ایک تفسیر تو وہ ہے جس کو بخاری نے بہت سے مفسرین سے نقل کیا ہے کہ دو کلمے ایک مرتبہ زمانہ حال کے لئے، اور دوسری مرتبہ زمانہ مستقبل کے متعلق آئے ہیں اس لئے کوئی تکرار نہیں، مطلب

یہ ہے کہ نہ تو بالفعل ایسا ہو رہا ہے کہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں اور تم میرے معبود کی عبادت کرو، اور نہ آئندہ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اپنی توحید پر تم اپنے شرک پر قائم رہتے ہوئے ایک دوسرے کے معبود کی عبادت کریں، یہی بات اوپر خلاصہ تفسیر میں آ چکی ہے، مگر بخاری کی تفسیر میں **لکم دینکم ولی دین** کی تفسیر دین بمعنی مذہب اسلام و کفر سے کی ہے، اور مطلب یہ قرار دیا ہے کہ مصالحت کی مجوزہ صورت قابل قبول نہیں، میں تو اپنے دین پر قائم ہوں ہی تم بھی اپنے دین پر مصر ہو تو تم جانو، اس کا انجام تمہیں بھگتنا ہے اور خلاصہ تفسیر میں ''دین'' کو بمعنی جزاء و بدلہ قرار دیا ہے۔

دوسری تفسیر وہ ہے جس کو ابن کثیر نے اختیار فرمایا ہے کہ حرف **ما** لغت عرب میں جیسا اسم موصول **الذی** کے معنی میں آتا ہے ایسا ہی کبھی مصدری معنی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کہ وہ جس فعل پر داخل ہو اس کو بمعنی مصدر کر دیتا ہے، اس سورت میں پہلی جگہ تو صرف **ما** اسم موصول **الذی** کے معنی میں ہے، اور دوسری جگہ **ما** مصدریہ ہے، تشریح اس کی یہ ہے کہ پہلے جملہ: **لا اعبد ما تعبدون، ولا انتم عبدون ما اعبد** کے معنی یہ ہوئے کہ جن معبودوں کی تم عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا اور جس معبود کی میں عبادت کرتا ہوں اس کی تم نہیں کرتے اور دوسرے جملے: **ولا انا عابد ما عبدتم ولا انتم عبدون ما اعبد** میں حرف **ما** مصدریہ ہے اور معنی یہ ہیں: "انا عابد عبادتکم ولا انتم عابدون عبادتی''، یعنی ہماری اور تمہاری عبادت کے طریقے ہی الگ الگ ہیں، میں تمہارے طرز کی عبادت نہیں کر سکتا اور تم جب تک ایمان نہ لاؤ تو میرے طرز کی عبادت نہیں کر سکتے، اس طرح پہلے جملے میں معبودوں کا اختلاف بتلایا اور دوسرے جملے میں عبادت کے طرز و طریقہ کے اختلاف کو ظاہر کیا، حاصل یہ ہوا کہ نہ تمہارے اور ہمارے معبود میں اشتراک ہے نہ طرزِ عبادت میں، اس طرح تکرار رفع ہوا اور طریق عبادت رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کا وہ ہے جو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی بتلایا گیا اور مشرکین کے طریقے خود ساختہ ہیں۔

ابن کثیر نے اس تفسیر کو راجح قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ کلمہ اسلام لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے یہی مفہوم نکلتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور طریق عبادت وہ معتبر ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے اور **لکم دینکم ولی دین** کی تفسیر میں ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: **فان کذبوك فقل لی عملی ولکم عملکم** اور دوسری جگہ ہے: **لنا اعمالنا ولکم اعمالکم** اس کا حاصل یہ ہے کہ لفظ ''دین'' کو ابن کثیر نے بھی اعمال دین کے معنی میں لیا ہے اور پھر مقصود اس سے وہی ہوگا جو اوپر خلاصہ تفسیر میں بیان کیا گیا کہ ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کی جزا سزا خود بھگتنی پڑے گی۔

بعض مفسرین نے ایک تیسری تفسیر یہ اختیار کی کہ صرف **ما** دونوں جگہ موصولہ ہی ہے اور حال و استقبال کا بھی فرق نہیں، بلکہ یہ دو جملے فی المواقع مکرر لائے گئے ہیں، مگر ہر تکرار برا نہیں ہوتا، بہت جگہ تکرار بلاغت کا تقاضہ ہوتا ہے جیسا کہ: **فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا** میں ہے، یہاں اس تکرار کا مقصد تاکید مضمون بھی ہے اور یہ بھی کہ کفار کی طرف سے چونکہ ایسی مصالحت کی پیشکش متعدد مرتبہ کی گئی تو متعدد جملوں سے اسکو رد کیا گیا۔

لَآ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ: اس سورت میں اہل کفر و شرک اور گمراہوں سے براءت اور متارکت (بے زاری اور دوری) کی صراحت ہے، اور بغض فی اللہ بھی یہی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ قُلۡ یٰۤاَیُّهَا الۡکٰفِرُوۡنَ: چند رؤسائے قریش نے کہا کہ اے محمد (ﷺ)! آؤ! ہم تم صلح کر لیں کہ ایک سال تک آپ ہمارے معبودوں کی پرستش کیا کریں، پھر دوسرے سال ہم آپ کے معبود کو پوجیں۔ اس طرح دونوں فریق کو ہر ایک کے دین سے کچھ نہ کچھ حصہ مل جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا خدا کی پناہ کہ میں اس کے ساتھ (ایک لمحہ کے لئے بھی) کسی کو شریک ٹھہراؤں، کہنے لگے اچھا تم ہمارے بعض معبودوں کو مان لو (ان کی مذمت نہ کرو) ہم تمہاری تصدیق کریں گے اور تمہارے معبود کو پوجیں گے، اس پر یہ سورت نازل ہوئی، اور آپ ﷺ نے ان کو مجمع میں پڑھ کر سنائی، جس کا خلاصہ مشرکین کے طور و طریق سے بکلی بیزاری کا اظہار اور انقطاع تعلقات کا اعلان کرتا ہے، بھلا انبیاء علیہم السلام جن کا پہلا کام شرک کی جڑیں کاٹنا ہے، ایسی ناپاک اور گندی صلح پر کب راضی ہو سکتے ہیں، فی الحقیقت اللہ کے معبود ہونے میں تو کسی مذہب والے کو اختلاف ہی نہیں، خود مشرکین اس کا اقرار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم بتوں کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ سے نزدیک کر دیں گے: مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی

اللہِ زُلْفٰی)(الزمر: ۳)اختلاف جو کچھ ہے غیر اللہ دونوں کی پرستش میں ہے، لہٰذا صلح کی جو صورت قریش نے پیش کی تھی اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ وہ تو برابر اپنی روش پر قائم رہیں، یعنی اللہ اور غیر اللہ دونوں کی پرستش کیا کریں اور آپ اپنے مسلک توحید سے دستبردار ہو جائیں، اسے گفتگوئے مصالحت کو ختم کرنے کے لئے یہ سورت اتاری گئی ہے۔

فائدہ: ۲ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ: یعنی خدا کے سوا جو معبود تم نے بنا رکھے ہیں میں فی الحال ان کو نہیں پوج رہا اور نہ تم اس احد و صمد خدا کو بلا شرکت غیرے پوجتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

فائدہ: ۳ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ: یعنی آئندہ بھی میں تمہارے معبودوں کو کبھی پوجنے والا نہیں اور نہ تم میرے معبود واحد کی بلا شرکت غیرے پرستش کرنے والے ہو، مطلب یہ ہے کہ میں موحد ہو کر شرک نہیں کرسکتا نہ اب نہ آئندہ اور تم مشرک رہ کر موحد نہیں قرار دیئے جاسکتے نہ اب نہ آئندہ، اس تقریر کے موافق آیتوں میں تکرار نہیں رہی۔

تنبیہ: ① بعض علماء نے یہاں تکرار کو تاکید پر حمل کیا ہے ② اور بعض نے پہلے دو جملوں میں حال و استقبال کی نفی، اور اخیر کے دو جملوں میں ماضی کی نفی مراد لی ہے کما صرح بہ الزمخشری ③ اور بعض نے پہلے جملوں میں حال کا اور اخیر کے جملوں میں استقبال کا ارادہ کیا ہے کما یظھر من الترجمۃ، ④ لیکن بعض محققین نے پہلے دو جملوں میں ما موصولہ اور دوسرے دونوں جملوں میں ما کو مصدریہ لے کر یوں تقریر کی ہے کہ: ''میرے اور تمہارے درمیان معبود میں اشتراک ہے نہ طریق عبادت میں، تم بتوں کو پوجتے ہو، وہ میرے معبود نہیں، میں اس خدا کو پوجتا ہوں جس کی شان وصفت میں کوئی شریک نہ ہوسکے، ایسا خدا تمہارا معبود نہیں، علیٰ ہذا القیاس تم جس طرح عبادت کرتے ہو، مثلاً ننگے ہو کر کعبہ کے گرد ناچنے لگے یا ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانے لگے، میں اس طرح کی عبادت کرنے والا نہیں، اور میں جس شان سے اللہ کی عبادت بجالاتا ہوں تم کو اس کی توفیق نہیں، لہٰذا میرا اور تمہارا راستہ بالکل الگ الگ ہے''۔

اور احقر کے خیال میں یوں آتا ہے کہ پہلے جملے کو حال و استقبال کی نفی کے لئے رکھا جائے، یعنی میں اب یا آیندہ تمہارے معبودوں کی پرستش نہیں کرسکتا جیسا کہ تم مجھ سے چاہتے ہو، اور: وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ کا مطلب (بقول حافظ ابن تیمیہؒ) یہ لیا جائے کہ (جب میں خدا کا رسول ہوں تو) میری شان یہ نہیں اور نہ کسی وقت مجھ سے ممکن ہے (بامکان شرعی) کہ شرک کا ارتکاب کروں، حتیٰ کہ گزشتہ زمانہ میں نزول وحی سے پہلے بھی جب تم سب پتھروں اور درختوں کو پوج رہے تھے، میں نے کسی غیر اللہ کی پرستش نہیں کی، پھر اب اللہ کی طرف سے نور وحی و بینات وہدیٰ وغیرہ آنے کے بعد کہاں ممکن ہے کہ شرکیات میں تمہارا ہم نوا ہو جاؤں، شاید اسی لئے یہاں: ولا انا عابد میں جملہ اسمیہ، اور: ما عبدتم میں صیغہ ماضی کا عنوان اختیار فرمایا، رہا کفار کا حال، اس کا بیان دونوں مرتبہ ایک ہی عنوان سے فرمایا: ولا انتم عابدون ما اعبد، یعنی تم لوگ تو اپنی سوء استعداد اور انتہائی بدبختی سے اس لائق نہیں کہ کسی وقت اور کسی حال میں خدائے واحد کی بلا شرکت غیرے پرستش کرنے والے بنو، حتیٰ کہ عین گفتگوئے صلح کے وقت بھی شرک کا دم چھلا ساتھ لگائے رکھتے ہو۔

اور ایک جگہ: ما تعبدون بصیغہ مضارع اور دوسری جگہ: ما عبدتم بصیغہ ماضی لانے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ان کے معبود ہر روز بدلتے رہتے ہیں جو چیز عجیب سی نظر آئی یا کوئی خوبصورت سا پتھر نظر پڑا اس کو اٹھا کر معبود بنالیا، اور پہلے کو رخصت کیا، پھر ہر موسم کا اور ہر کام کا جدا معبود ہے، ایک سفر کا، ایک حضر کا، کوئی روٹی دینے والا، کوئی اولاد دینے والا، وقس علیٰ ھذا، حافظ شمس الدین ابن قیمؒ نے ''بدائع الفوائد'' میں اس سورت کے لطائف ومزایا پر بہت نفیس کلام کیا ہے جس کو معارف قرآنی کا شوق ہو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

فائدہ: ۴ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یعنی تم نے ضد باندھی اب سمجھانا کیا فائدہ کرے گا جب تک اللہ فیصلہ کریں''، اب ہم تم سے بالکل بیزار ہو کر اسی فیصلہ کے منتظر ہیں، اور جو دین قویم اللہ نے ہم کو مرحمت فرمایا ہے اس پر نہایت خوش ہیں، تم نے اپنے لئے بدبختی سے جو روش پسند کی وہ تمہیں مبارک رہے، ہر ایک فریق کو اس کی راہ وروش کا نتیجہ مل رہے گا۔

آیاتها ۳ — ١١٠ سُورَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ ١١٤ — رکوعها ۱

خلاصه تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نعمتوں کا شکر کیا جائے خاص طور پر فیض کامل ہو جانے کی نعمت کا، اس سورت میں اسی کا بیان ہے جس کا خطاب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا ہے اور اس کے ضمن میں آپ کی نبوت کو بھی ثابت کیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ① وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ②

جب پہنچ چکے مدد اللہ کی اور فیصلہ ۱، اور تو دیکھے لوگوں کو داخل ہوتے دین میں غول کے غول (فوج فوج)

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ③

تو پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں ۲، اور گناہ بخشوا اُس سے، بیشک وہ معاف کرنے والا ہے ۳۔

خلاصه تفسیر: (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (اپنے آثار کے ساتھ) آپہنچے (یعنی واقع ہو جائے) اور (اس فتح پر مرتب ہونے والے آثار یہ ہیں کہ) آپ لوگوں کو اللہ کے دین (اسلام) میں جوق جوق داخل ہوتا دیکھ لیں، تو (اس وقت سمجھئے کہ مقصود دنیا میں رہنے کا اور آپ کی بعثت کا جو تکمیل دین تھا وہ پورا ہو چکا، اب سفر آخرت قریب ہے، اس کے لئے تیاری کیجئے اور) اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے مغفرت کی درخواست کیجئے (یعنی ایسے امور جو خلاف اولیٰ واقع ہو گئے ان سے مغفرت مانگئے، اس لیے کہ) وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ: بہت سی احادیث میں اس سورت کی تفسیر آئی ہے کہ اس میں قرب وفات کی خبر ہے، یہ سورۃ باجماع مدنی ہے اور اس کا نام سورۃ التودیع بھی ہے، ''تودیع'' کے معنی کسی کو رخصت کرنے کے ہیں اس سورۃ میں چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات قریب ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لئے اس کو سورۃ التودیع بھی کہا گیا ہے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آیت: اذا جاء نصر الله والفتح میں ''فتح'' سے فتح مکہ مراد ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ سورۃ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے یا بعد میں، لفظ اذا جاء سے بظاہر قبل فتح نازل ہونا معلوم ہوتا ہے، روح المعانی میں بحر محیط سے ایک روایت بھی اس کے موافق نقل کی ہے جس میں اس سورۃ کا نزول غزوہ خیبر سے لوٹنے کے وقت بیان کیا گیا اور خیبر کی فتح فتح مکہ سے مقدم ہونا معلوم و معروف ہے، اور روح المعانی میں بسند عبد ابن حمید حضرت قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سورۃ کے نزول کے بعد دو سال زندہ رہے، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ اس کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا، کیونکہ فتح مکہ سے وفات تک دو سال سے کم مدت ہے، فتح مکہ رمضان ۸ ہجری میں ہوئی اور وفات ربیع الاول ۱۱ ہجری میں، اور جن روایات میں اس کا نزول فتح مکہ یا حجۃ الوداع میں نازل ہونا بیان کیا گیا ہے ان کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورۃ پڑھی ہوگی جس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ یہ ابھی نازل ہوئی ہے۔

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا: لوگوں کے جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے کو فتح مکہ کے آثار میں سے اس لیے کہا گیا کہ عام اہل عرب فتح مکہ کے منتظر تھے اور اب تک ایک ایک دو دو مسلمان ہوتے تھے، فتح مکہ کے بعد قبائل کے قبائل اسلام میں داخل ہونے لگے اور روح المعانی میں سند کے ساتھ قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس سورت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف دو سال بعد واقع ہوئی اور صحاح میں مذکور ہے کہ آپ آخر عمر میں تسبیح، تحمید اور استغفار کے کلمات کی کثرت فرماتے تھے۔

احادیث و روایات کے مطابق اس سورت کا حاصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے کہ تبلیغ دین سے فارغ ہونے کے بعد رب سے ملاقات کا خاص

طور سے اہتمام کرنا چاہیے، اسی طرح اہل طریق کو بھی چاہیے کہ جب تعلیم وتبلیغ، وعظ وارشاد سے فارغ ہوجائیں تو کثرت ذکر وفکر اور تقرب الی اللہ کے لیے فارغ ہوجائیں۔

* * *

فائدہ: ۱ إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ: بڑی فیصلہ کن چیز یہ تھی کہ مکہ معظّمہ (جو زمین پر اللہ کا دار السلطنت ہے) فتح ہوجائے، اسی پر اکثر قبائل عرب کی نظریں لگی ہوئی تھی، اس سے پہلے ایک ایک دو دو آدمی اسلام میں داخل ہوتے تھے، فتح مکہ کے بعد جوق در جوق داخل ہونے لگے، حتیٰ کہ سارا جزیرہ عرب اسلام کا کلمہ پڑھنے لگا اور جو مقصد نبی کریم ﷺ کی بعثت سے تھا پورا ہوا۔

فائدہ: ۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ: یعنی سمجھ لیجئے کہ مقصود بعثت کا اور دنیا میں رہنے کا (جو تکمیل دین وتمہید خلافت کبریٰ ہے) پورا ہوا، اب سفر آخرت قریب ہے، لہٰذا ادھر سے فارغ ہوکر ہمہ تن ادھر ہی لگ جایئے اور پہلے سے بھی زیادہ کثرت سے اللہ کی تسبیح وتحمید اور ان فتوحات اور کامیابیوں پر اس کا شکر ادا کیجئے۔

فائدہ: ۳ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا: یعنی اپنے لئے اور امت کے لئے استغفار کیجئے۔

تنبیہ: نبی کریم ﷺ کا اپنے لئے استغفار کرنا پہلے کئی جگہ بیان ہوچکا ہے، وہیں دیکھ لیا جائے۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی قرآن میں ہر جگہ وعدہ ہے فیصلہ کا، اور کافر شتابی کرتے تھے، حضور ﷺ کی آخری عمر میں مکہ فتح ہوچکا، قبائل عرب دَل کے دَل مسلمان ہونے لگے، وعدہ سچا ہوا، اب امت کے گناہ بخشوایا کر کہ درجہ شفاعت کا بھی ملے، یہ سورت اتری آخر عمر میں، حضرت نے جانا کہ میرا کام تھا دنیا میں کر چکا اب سفر ہے آخرت کا''۔

آیاتھا ۵ ۔ ۱۱۱ سُوْرَةُ اللَّهَبِ مَكِّيَّةٌ ٦ ۔ رکوعھا ۱

خلاصہ تفسیر: اہم شرعی مضامین میں سے ایک رسول کی مخالفت سے بچنا ہے، اس سورت میں اسی مخالفت کا وبال مذکور ہے، صحیحین میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پر آیت: وانذر عشیرتك الاقربین نازل ہوئی تو آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر پکار کر سب کو جمع کر کے اسلام کی دعوت دی تو ابولہب نے گستاخانہ انداز میں کہا: "تبا لك سائر الیوم أ لهذا جمعتنا" جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تو برباد ہوجائے، کیا ہم کو اسی بات کے لیے جمع کیا تھا اور آپ کو مارنے کے لیے پتھر اٹھا لیا، اس پر یہ سورت نازل ہوئی، ابولہب کی ایک بیوی تھی جو کانٹوں والی لکڑیاں جمع کر کے لاتی اور حضور ﷺ کی راہ میں بچھاتی، اس سورت میں اس کی بھی مذمت ہے اور ان دونوں میاں بیوی کی مذمت کی وجہ مشترک رسول ﷺ کے ساتھ عداوت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ①

ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ آپ ۱

خلاصہ تفسیر: ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہوجائے (چنانچہ واقعہ بدر کے سات روز بعد اس کو طاعون کا دانہ نکلا، مرض لگ جانے کے خوف سے گھر والوں نے اس کو الگ ڈال دیا یہاں تک کہ اسی حالت میں مرگیا، تین روز تک لاش پڑی رہی، جب سڑنے لگی تو مزدوروں سے اٹھوا کر ایک گڑھے میں دھکیل دیا گیا اور اوپر سے پتھر بھر دیے گئے، اس تکلیف اور ذلت سے زیادہ دنیا کی کیا بربادی ہوگی)۔

تبّت، تباب سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ہلاک وبرباد ہو، اور ''ید'' کے اصلی معنی ہاتھ کے ہیں، عربی زبان میں دونوں ہاتھوں سے کنایۃً ذات اور نفس مراد لیا جاتا ہے، اس صورت میں یہ کلام تاکید پر مبنی ہوگا، یا یوں کہا جائے کہ انسان کے اکثر کاموں میں بڑا دخل ہاتھوں کو ہے، اس صورت

میں پہلے جملہ یعنی تبّت یدا ابی لهب سے اعمال کی ہلاکت وضائع ہونا مراد ہوگا یعنی ابولہب کے تمام اعمال ضائع اور ہلاک ہو گئے، اور دوسرے وتبّ سے اس کی ذات کی ہلاکت مراد ہوگی، دونوں صورتوں میں حاصل یہ ہوگا کہ وہ اس طرح ہلاک ہوگا کہ اس کی تدبیریں سب بے کار ہو جائیں گی۔

اس آیت میں پہلا جملہ تبت یدا ابی لهب بطور بددعا کے ہے، یعنی ابولہب ہلاک ہو جائے اور دوسرا جملہ یعنی وتبّ جملہ خبریہ ہے، گویا بددعا کے ساتھ اس کا اثر بھی بتلا دیا کہ وہ ہلاک ہو گیا اور بددعا کا جملہ مسلمانوں کے شفاء غیظ کے لئے ارشاد فرمایا گیا، کیونکہ جس وقت ابولہب نے آپ کی شان میں ''تبا لك'' کہا تو مسلمانوں کے دل کی خواہش تھی کہ وہ اس کے لیے بددعا کریں، حق تعالیٰ نے گویا ان کے دل کی بات خود فرما دی اور ساتھ ہی یہ خبر بھی دے دی کہ یہ بددعا اس کو لگ بھی گئی اور وہ ہلاک ہو گیا۔

اس آیت میں ہلاکت کے لیے خاص لفظ تبّ اس لیے اختیار کیا کیونکہ ابولہب نے بھی اپنے کلام میں اسی مادہ کا استعمال کیا تھا اور یہاں تعبیر میں خاص ہاتھوں کو ذکر کرنے کا نکتہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابولہب ہاتھوں سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچاتا تھا، چنانچہ روح المعانی میں بحوالہ مجمع طارق سے روایت ہے کہ میں نے ایک بار دیکھا کہ ذی المجاز کے بازار میں آپ ﷺ آگے آگے دعوت اسلام کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور پیچھے پیچھے ابولہب پتھر مارتا ہوا آ رہا ہے، جس سے آپ ﷺ کی پنڈلی اور قدم لہولہان ہو گئے، اور بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابولہب نے ایک روز لوگوں سے کہا کہ محمد ﷺ کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد فلاں فلاں کام ہوں گے، پھر اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ ان ہاتھوں میں ان چیزوں میں سے کچھ بھی آیا نہیں، پھر اپنے ہاتھوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا: ''تبا لكما ما ارى فيكما شيئا مما قال محمد''، یعنی تم برباد ہو جاؤ میں تمہارے اندر ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں دیکھتا جن کے ہونے کی خبر محمد دیتے ہیں اس کی مناسبت سے قرآن کریم نے ہلاکت کو ہاتھوں کی طرف منسوب کیا۔

* * *

فائدہ: لے ''ابولہب'' (جس کا نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب ہے) آنحضرت ﷺ کا حقیقی چچا تھا، لیکن اپنے کفر وشقاوت کی وجہ سے حضور ﷺ کا شدید ترین دشمن تھا، جب آپ ﷺ کسی مجمع میں پیغام حق سناتے یہ بدبخت پتھر پھینکتا حتیٰ کہ آپ کے پائے مبارک لہولہان ہو جاتے اور زبان سے کہتا کہ لوگو! اس کی بات مت سنو، یہ شخص (معاذ اللہ) جھوٹا بے دین ہے، کبھی کہتا کہ محمد (ﷺ) ہم سے ان چیزوں کا وعدہ کرتے ہیں جو مرنے کے بعد ملیں گی، ہم کو تو وہ چیزیں ہوتی نظر نہیں آتیں، پھر دونوں ہاتھوں سے خطاب کر کے کہتا: ''تبا لكما ما ارىٰ فيكما شيأ ا مما يقول محمد'' (تم دونوں ٹوٹ جاؤ کہ میں تمہارے اندر اس میں سے کوئی چیز نہیں دیکھتا جو محمد بیان کرتا ہے) ایک مرتبہ حضور ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر سب کو پکارا، آپ کی آواز پر تمام لوگ جمع ہو گئے، آپ ﷺ نے نہایت موثر پیرایہ میں اسلام کی دعوت دی، ابولہب بھی موجود تھا (بعض روایات میں ہے کہ ہاتھ جھٹک کر) کہنے لگا: ''تبا لك سائر اليوم أ لهذا جمعتنا'' (یعنی تو برباد ہو جائے کیا ہم کو اسی بات کے لئے جمع کیا تھا)۔

اور روح المعانی میں بعض سے نقل کیا ہے کہ اس نے ہاتھوں میں پتھر اٹھایا کہ آپ ﷺ کی طرف پھینکے، غرض اس کی شقاوت اور حق سے عداوت انتہاء کو پہنچ چکی تھی، اس پر جب اللہ کے عذاب سے ڈرایا جاتا تو کہتا کہ سچ مچ یہ بات ہونے والی ہے تو میرے پاس مال واولاد بہت ہے، ان سب کو فدیہ میں دے کر عذاب سے چھوٹ جاؤں گا، اس کی بیوی ام جمیل کو بھی پیغمبر (علیہ السلام) سے بہت ضد تھی، جو دشمنی کی آگ ابولہب بھڑکاتا تھا، یہ عورت گویا لکڑیاں ڈال کر اس کو اور زیادہ تیز کرتی تھی، سورۃ ہذا میں دونوں کا انجام بتلا کر متنبہ کیا ہے کہ مرد ہو یا عورت، اپنا ہو یا بیگانہ بڑا ہو یا چھوٹا، جو حق کی عداوت پر کمر باندھے گا وہ آخر کار ذلیل اور تباہ و برباد ہو کر رہے گا، پیغمبر کی قرابت قریبہ بھی اس کو تباہی سے نہ بچا سکے گی، یہ ابولہب کیا ہاتھ جھٹک باتیں بناتا اور اپنی قوت بازو پر مغرور ہو کر خدا کے مقدس ومعصوم رسول کی طرف دست درازی کرتا ہے، سمجھ لے کہ اب اس کے ہاتھ ٹوٹ چکے، اس کی سب کوششیں حق کے دبانے کی برباد ہو چکیں اس کی سرداری ہمیشہ کے لئے مٹ گئی، اس کے اعمال اکارت ہوئے اس کا زور ٹوٹ گیا، اور وہ خود تباہی کے گڑھے میں پہنچ چکا۔

یہ سورت مکی ہے، کہتے ہیں کہ غزوہ بدر سے سات روز بعد اس کے زہریلی قسم کا ایک دانہ نکلا اور مرض لگ جانے کے خوف سے سب گھر والوں نے الگ ڈال دیا، وہیں مر گیا اور تین روز تک لاش یوں ہی پڑی رہی کسی نے نہ اٹھائی، جب سڑنے لگی، اس وقت حبشی مزدوروں سے اٹھوا کر دبوائی،

انہوں نے ایک گڑھا کھود کر اس کو ایک لکڑی سے اندر ڈھلکا دیا اوپر سے پتھر بھر دیے، یہ تو دنیا کی رسوائی اور بربادی تھی: وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (القمر: ۳۳)۔

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ؕ﴿۲﴾

کام نہ آیا اس کو مال اس کا اور نہ جو اس نے کمایا [1]

خلاصہ تفسیر: چونکہ اس بددعا سے مقصود اس کے واقع ہونے کی خبر دینا ہے اس لیے گذشتہ آیت اس معنی میں ہوئی کہ وہ ہلاک ہوگا جس پر ابولہب یہ شبہ کرسکتا ہے کہ میں اپنے مال وتدبیر کی بدولت بچ جاؤں گا، اس لیے اب آگے ارشاد ہے کہ:

نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی (مال سے مراد اصل سرمایہ اور کمائی سے مراد اس کا نفع ہے، مطلب یہ ہے کہ کوئی سامان اس کو ہلاکت سے نہ بچائے گا، یہ حالت تو اس کی دنیا میں ہوئی)۔

یہاں صیغے ماضی کے ہیں لیکن اس سے مراد مستقبل ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی مال، اور اولاد، عزت، وجاہت کوئی چیز اس کو ہلاکت سے نہ بچاسکی۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۚ﴿۳﴾ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ﴿۴﴾ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿۵﴾

اب پڑے گا ڈیگ (لپٹیں) مارتی آگ میں [1] اور اس کی جورو جو سر پر لیے پھرتی ہے ایندھن [2] اس کی گردن میں رسی ہے مونجھ کی [3]

خلاصہ تفسیر: (اور آخرت میں اس کی حالت یہ ہوگی کہ) وہ عنقریب (یعنی مرتے ہی) ایک شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا، وہ بھی اور اس کی بیوی بھی جو لکڑیاں لاد کر لاتی ہے (مراد خاردار لکڑیاں ہیں جن کو وہ رسول اللہ ﷺ کے راستہ میں بچھا دیتی تھی تا کہ آپ کو تکلیف پہنچے اور دوزخ میں پہنچ کر) اس کے گلے میں (دوزخ کی زنجیر اور طوق ہوگا کہ گویا وہ) ایک رسی ہوگی خوب بٹی ہوئی (تشبیہ شدت اور استحکام میں ہے)۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ: یعنی قیامت کے بعد یا مرنے کے فوراً بعد قبر ہی میں یہ ایک شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا، اس کے نام یعنی ابولہب کی مناسبت سے یہاں آگ کے ساتھ ذات لہب کی صفت میں خاص بلاغت ہے۔

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ: اس کے لفظی معنی ہیں سوختہ یعنی آگ لگانے والی لکڑیاں لادنے والی، عرب کے محاورات میں چغل خوری کرنے والے کو "حمال الحطب" کہا جاتا تھا کہ جیسے کوئی سوختہ کی لکڑیاں جمع کر کے آگ لگانے کا سامان کرتا ہے، چغل خوری کا عمل بھی ایسا ہی ہے کہ وہ اپنی چغل خوری کے ذریعہ افراد اور خاندانوں میں آگ بھڑکا دیتا ہے، یہ عورت رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی ایذا رسائی کے لئے چغل خوری کا کام بھی کرتی تھی، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا یہ حال جہنم میں ہوگا کہ اپنے شوہر پر جہنم کے درختوں زقوم وغیرہ کی لکڑیاں لا کر ڈالے گی تا کہ اس کی آگ بھڑک جائے جس طرح دنیا میں وہ اس کے کفر وظلم کو بڑھاتی تھی آخرت میں اس کے عذاب کو بڑھائے گی۔

اس سورت میں دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ جیسے اپنے مقبول بندوں میں سے نبیوں کا انتقام لیتا ہے، ایسے ہی اپنے مقبول بندوں میں سے اولیاء کا بھی انتقام لیا کرتا ہے۔

* * *

فائدہ: [1] سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ: یعنی مرنے کے بعد سخت شعلہ زن آگ میں پہنچنے والا ہے، شاید اسی مناسبت سے قرآن نے اس کی کنیت "ابولہب" قائم رکھی، دنیا تو اس کو "ابولہب" اس لئے کہتی تھی کہ اس کے رخسار آگ کے شعلے کی طرح چمکتے تھے، مگر قرآن نے بتلا دیا کہ وہ اپنے آخری انجام کے اعتبار سے بھی "ابولہب" کہلانے کا مستحق ہے۔

فائده: ۲ وَّامۡرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الۡحَطَبِ: ابولہب کی عورت ام جمیل باوجود مالدار ہونے کے سخت بخل اور خست کی بناء پر خود جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتی، اور کانٹے حضرت کی راہ میں ڈال دیتی تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آنے والوں کو تکلیف پہنچے، فرماتے ہیں کہ وہ جس طرح یہاں حق کی دشمنی اور پیغمبر خدا کی ایذا رسانی میں اپنے شوہر کی مددگار ہے دوزخ میں بھی اسی ہیئت سے اس کے ہمراہ رہے گی، شاید وہاں زقوم اور ضریع کی (جو جہنم کے خاردار درخت ہیں) لکڑیاں اٹھائے پھرے اور ان کے ذریعہ سے اپنے شوہر پر عذاب الٰہی کی آگ کو تیز کرتی رہے کما قال ابن اثیر۔

تنبیہ: بعض نے حمالة الحطب کے معنی چغل خور کے لئے ہیں، اور محاورات عرب میں یہ لفظ اس معنی میں مستعمل ہوتا ہے جیسے فارسی میں بھی ایسے شخص کو "ہیزم کش" کہتے ہیں۔

فائدہ: ۳ فِیۡ جِیۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ: یعنی بہت مضبوط بٹی ہوئی چبھنے والی، اس سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک دوزخ کے طوق سلاسل ہیں اور تشبیہ حمالة الحطب کی مناسبت سے دی گئی ہے، کیونکہ لکڑیوں کا بوجھ اٹھانے میں رسی کی ضرورت پڑتی ہے، لکھتے ہیں کہ اس عورت کے گلے میں ایک ہار بہت قیمتی تھا، کہا کرتی تھی کہ لات وعزیٰ کی قسم! اس کو محمد کی عداوت پر خرچ کر ڈالوں گی، ضرور تھا کہ دوزخ میں بھی اس کی گردن ہار سے خالی نہ رہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس بدبخت کی موت بھی اسی طرح واقع ہوئی، لکڑیوں کے گٹھے کی رسی گلے میں آپڑی جس سے گلا گھٹ کر دم نکل گیا۔

ایاتها ٤ ﴿١١٢ سُوۡرَةُ الۡاِخۡلَاصِ مَکِّیَّةٌ ٢٢﴾ رکوعها ١

خلاصہ تفسیر: اہم ترین مضامین میں سے ایک توحید ہے، اس سورت میں اسی کا بیان ہے، اس سورت کا سبب نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کی صفات اور نسب بیان کیجئے اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے ۱ اللہ بے نیاز ہے ۲

خلاصہ تفسیر: (آپ ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ وہ یعنی اللہ (اپنے کمال ذات وصفات میں) ایک ہے (کمال ذات یہ ہے کہ واجب الوجود ہے، یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور کمال صفات یہ کہ علم قدرت وغیرہ اس کے قدیم اور محیط ہیں، اور) اللہ بے نیاز ہے (یعنی وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں)۔

قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک سمجھنے والے منکرین توحید کی دنیا میں مختلف اقسام ہوئی ہیں، سورۃ اخلاص نے ہر طرح کے مشرکانہ خیالات کی نفی کر کے مکمل توحید کا سبق دیا ہے، کیونکہ منکرین توحید میں ایک گروہ تو خود اللہ کے وجود ہی کا منکر ہے، بعض وجود کے تو قائل ہیں مگر وجوب وجود کے منکر ہیں، بعض دونوں کے قائل ہیں مگر کمال صفات کے منکر ہیں، بعض یہ سب کچھ مانتے ہیں، مگر پھر عبادت میں غیر اللہ کو شریک ٹھہراتے ہیں، ان سب کے خیالات باطلہ کا رد هو الله احد میں ہو گیا، بعض لوگ عبادت میں بھی کسی کو شریک نہیں کرتے مگر حاجت روا اور کارساز اللہ کے سوا دوسروں کو بھی سمجھتے ہیں ان کے خیال کا ابطال لفظ الله الصمد میں ہو گیا۔

قرآن کریم نے اللہ کے تعارف کے لیے نہایت سیدھا سادہ عنوان اختیار کیا ہے جو ایک عام انسان سے لے کر ایک بڑے فلسفی دانا فرزانہ کو بھی مطمئن کر دیتا ہے، اصولی طور پر کسی بھی شخصیت کے تعارف سے پہلے دو باتوں کا سمجھنا ضروری ہے: ① ایک اس کا ذاتی تعارف ② دوسرا صفاتی تعارف، اللہ کا ذاتی تعارف اس لیے ممکن نہیں کہ انسان کی ذہنی وعقلی پرواز خود اس قدر ضعیف ومحدود قسم کی ہے کہ وہ خود اپنا ذاتی تعارف حاصل نہ کر سکا،

کیونکہ انسان جسم وروح کا مجموعہ ہے، لیکن روح کی حقیقت سے آج تک کوئی واقف نہ ہوسکا تو پھر اپنے خالق کا ذاتی تعارف کیونکر پاسکتا ہے؟ البتہ اس سورت میں اللہ کا صفاتی تعارف ملتا ہے جس سے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے کہ وہ یکتا ہے، بے نیاز (غیر محتاج) ہے، اس کی کوئی اولاد نہیں، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کا کوئی ثانی وہمسر نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ **قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ**: یعنی جو لوگ اللہ کی نسبت پوچھتے ہیں کہ وہ کیسا ہے؟ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ ایک ہے جس کی ذات میں کسی قسم کے تعدد وتکثر اور دوئی کی گنجائش نہیں، نہ اس کا کوئی مقابل، نہ مشابہ، اس میں مجوس کے عقیدہ کا رد ہوگیا جو کہتے ہیں کہ خالق دو ہیں: خیر کا خالق ''یزداں'' اور شر کا ''اہرمن''، نیز ہنود کی تردید ہوئی جو تینتیس کروڑ دیوتاؤں کو خدائی میں حصہ دار ٹھہراتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ **اَللّٰهُ الصَّمَدُ**: صمد کی تفسیر کئی طرح کی گئی ہے، طبرانی ان سب کو نقل کرکے فرماتے ہیں: "و کل هذا صحيحة وهي صفات ربنا عزوجل هو الذى يصمد اليه فى الحوائج وهو الذى قد انتهى سؤدده، وهو الصمد الذى لا جوف له، ولا يا كل ولا يشرب وهو الباق بعد خلقه" (ابن کثیر) (یہ سب معانی صحیح ہیں اور یہ سب ہمارے رب کی صفات ہیں، وہ ہی ہے جس کی طرف تمام حاجات میں رجوع کیا جاتا ہے، یعنی سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں، اور وہ ہی ہے جس کی بزرگی اور فوقیت تمام کمالات اور خوبیوں میں انتہاء کو پہنچ چکی ہے، اور وہ ہی ہے جو کھانے پینے کی خواہشات سے پاک ہے، اور وہ ہی ہے جو خلقت کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہنے والا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی صفت صمدیت سے ان جاہلوں پر رد ہوا جو کسی غیر اللہ کو کسی درجہ میں مستقل اختیار رکھنے والا سمجھتے ہوں، نیز آریوں کے عقیدہ مادہ و روح کی تردید بھی ہوئی، کیونکہ ان کے اصول کے موافق اللہ تو عالم کے بنانے میں ان دونوں کا محتاج ہے اور یہ دونوں اپنے وجود میں اللہ کے محتاج نہیں (العیاذ باللہ)۔

لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾ ع ۲۷

نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا ۱؎ اور نہیں اس کے جوڑ کا کوئی ۲؎

خلاصہ تفسیر: اس کے اولاد نہیں، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔

لَمْ يَلِدْ: اس میں خدا کی اولاد ہونے کو باطل ثابت کیا۔

وَلَمْ يُوْلَدْ: بعض انسان اور جنات کی نسبت خدائی کے دعوی کو اس سے باطل کردیا، یعنی یہ لوگ مولود ہیں، حق تعالیٰ مولود نہیں۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ: مجوس جو کہ یزداں اور اہرمن کو خدا کا ہمسر مانتے ہیں اس سے ان کا باطل ہونا ثابت کیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نہ کوئی اس کی اولاد، نہ وہ کسی کی اولاد، اس میں ان لوگوں کا رد ہوا جو حضرت مسیح علیہ السلام کو یا حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں، نیز جو لوگ مسیح علیہ السلام کو یا کسی بشر کو خدا مانتے ہیں ان کی تردید **ولم یولد** میں کردی گئی، یعنی خدا کی شان یہ ہے کہ اس کو کسی نے جنا نہ ہو، اور ظاہر ہے حضرت مسیح علیہ السلام ایک پاکباز عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے، پھر وہ خدا کس طرح ہوسکتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ جب اس کے جوڑ کا کوئی نہیں تو جورو یا بیٹا کہاں سے ہو، اس جملہ میں ان اقوام کا رد ہوگیا جو اللہ کی کسی صفت میں کسی مخلوق کو اس کا ہمسر ٹھہراتے ہیں، حتیٰ کہ بعض گستاخ تو اس سے بڑھ کر صفات دوسروں میں ثابت کردیتے ہیں، یہود کی کتابیں اٹھا کر دیکھو ایک دنگل میں خدا کی کشتی یعقوب علیہ السلام سے ہورہی ہے، اور یعقوب علیہ السلام خدا کو پچھاڑ دیتے ہیں۔ (العیاذ باللہ) **كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا** (الکہف:۱۰۵)۔

انی اسالك یا الله الواحد الاحدا لصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوا احد ان تغفرلی ذنوبی انك انت الغفور الرحیم

ايـاتها ٥ | ١١٣ سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَكِّيَّةٌ ٢٠ | رکوعها ١

خلاصہ تفسیر: سورہ فلق اور سورہ ناس ایک ساتھ نازل ہوئیں، ان کا سبب نزول یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ پر لبید یہودی اور اس کی بیٹیوں نے سحر کر دیا تھا جس سے آپ کو مرض کی سی حالت عارض ہوگئی، آپ نے حق تعالیٰ سے دعا کی اس پر یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں، اس سورت میں دنیاوی آفات ومصائب سے پناہ مانگنے کی تعلیم ہے اور دونوں سورتوں کے مجموعہ میں مختلف شرور سے استعاذہ کا اور سب کاموں میں حق تعالیٰ پر توکل کرنے کا حکم ہوا ہے اور یہ بھی اہم ترین شرعی مضامین میں سے ہے۔

مستند احادیث میں ان دونوں سورتوں کے بڑے فضائل اور برکات منقول ہیں، صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں کچھ خبر ہے کہ آج کی رات اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایسی آیات نازل فرمائی ہیں کہ ان کی مثل نہیں دیکھی یعنی: **قل اعوذ برب الفلق** اور **قل اعوذ برب الناس**، اور ایک روایت میں ہے کہ تورات، انجیل اور زبور اور قرآن میں بھی ان کی مثل کوئی دوسری سورت نہیں ہے، ایک دوسرے روایت انہی حضرت عقبہ سے ہے کہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ نے ان کو معوذتین پڑھائی اور پھر مغرب کی نماز میں انہی دونوں سورتوں کی تلاوت فرمائی، اور پھر فرمایا کہ ان سورتوں کو سونے کے وقت بھی پڑھا کرو اور پھر اٹھنے کے وقت بھی، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ان دونوں سورتوں کو ہر نماز کے بعد پڑھنے کی تلقین فرمائی۔

اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی بیماری پیش آتی تو یہ دونوں سورتیں پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم کر کے سارے بدن پر پھیر لیتے تھے پھر جب مرض وفات میں آپ کی تکلیف بڑھی تو میں یہ سورتیں پڑھ کر آپ کے ہاتھوں پر دم کر دیتی تھی، آپ اپنے تمام بدن پر پھیر لیتے تھے، میں یہ کام اس لئے کرتی تھی کہ حضرت کے مبارک ہاتھوں کا بدل میرے ہاتھ نہ ہو سکتے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ تمام آفات سے محفوظ رہنے کے لئے یہ دو سورتیں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا معمول تھیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ① مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ② وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ③

تو کہہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی ۱ ہر چیز کی بدی سے جو اس نے بنائی ۲ اور بدی سے اندھیرے کی جب سمٹ آئے ۳

خلاصہ تفسیر: آپ (اپنے استعاذہ یعنی اللہ سے پناہ مانگنے کے لئے اور دوسروں کو بھی یہ استعاذہ سکھلانے کے لئے جس کا حاصل اللہ پر توکل اور مکمل بھروسہ کی تعلیم ہے یوں) کہئے کہ میں صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں تمام مخلوقات کے شر سے اور (بالخصوص) اندھیری رات کے شر سے جب وہ رات آجائے۔

سورہ فلق کی پانچ آیتیں اور سورہ ناس کی چھ آیتیں مجموعہ گیارہ آیتیں ہیں، اور آپ ﷺ کو وحی سے اس جادو کا موقع بھی معلوم کرا دیا گیا، چنانچہ وہاں سے مختلف چیزیں نکلیں جن میں سحر کیا گیا تھا اور اس میں تانت کا ایک ٹکڑا بھی تھا جس میں گیارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں، حضرت جبریل علیہ السلام یہ سورتیں پڑھنے لگی، ایک ایک آیت پر ایک ایک گرہ کھل گئی، چنانچہ آپ کو بالکل شفا ہوئی، جو لوگ سحر کی حقیقت سے ناواقف ہیں ان کو تعجب ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کا اثر کیسے ہو سکتا ہے؟ خلاصہ اس کا جس کا جاننا یہاں ضروری ہے اتنا ہے کہ سحر کا اثر بھی اسباب طبعیہ کا اثر ہوتا ہے جیسے آگ سے جلنا یا گرم ہونا، پانی سے سرد ہونا، بعض اسباب طبعیہ سے بخار آجانا، یا مختلف قسم کے درد وامراض کا پیدا ہو جانا ایک امر طبعی ہے جس سے پیغمبر وانبیاء مستثنیٰ نہیں ہوتے اسی طرح سحر وجادو کا اثر بھی اسی قسم سے ہے اس لئے کوئی بعید نہیں۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ: اس آیت میں جو اللہ کی صفت رب الفلق یعنی صبح کا مالک ذکر کی گئی، حالانکہ اللہ تو صبح اور شام سبھی چیزوں کا رب اور مالک ہے، اس تخصیص میں شاید اشارہ اس طرف ہو کہ جیسے اللہ تعالیٰ رات کے اندھیرے کا ازالہ کر کے صبح کی روشنی نکال دیتا ہے اسی طرح وہی اللہ رات کے اثر یعنی جادو سحر کو بھی زائل کر سکتا ہے۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ: تمام شرور و آفات کو شامل کرنے کے لئے من شر ما خلق فرما دیا، اس استعاذہ میں ساری مخلوقات کا شر داخل ہے۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ: رات میں شرور و آفات کا احتمال ظاہر ہے، کیونکہ عام طور پر یہی وقت جنات وشیاطین اور موذی جانوروں اور حشرات الارض اور چوروں ڈاکوؤں کے پھیلنے اور دشمنوں کے حملہ کرنے کا وقت ہوتا ہے، اور شاید رات کی تخصیص کی یہ بھی وجہ ہو کہ جادو کی ترکیب وترتیب اکثر رات کو کی جاتی ہے، تا کہ کسی کو اطلاع نہ ہو اطمینان سے اس کی تکمیل کر سکیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جو رات کی ظلمت پھاڑ کر صبح کی روشنی نمودار کرتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ہر ایسی مخلوق جس میں کوئی بدی ہو اس کی بدی سے پناہ مانگتا ہوں، آگے بمناسبت مقام چند مخصوص چیزوں کا نام لیا ہے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی رات کا اندھیرا کہ اس میں اکثر شرور خصوصاً سحر وغیرہ بکثرت واقع ہوتے ہیں، یا چاند کا گہن یا آفتاب کا غروب مراد ہے، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ: ''اس میں سب تاریکیاں آگئیں ظاہر اور باطن کی اور تنگدستی اور پریشانی اور گمراہی''۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝۴ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝۵ ع ۳۸

اور بدی سے عورتوں کی جو گرہوں میں پھونک ماریں ۱؎ اور بدی سے برا چاہنے والے کی جب لگے ٹوک لگانے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (بالخصوص گنڈے کی) گروہوں پر پڑھ پڑھ کر پھنکنے والیوں کے شر سے، اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرنے لگے۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ: نفاثات، نفث سے مشتق ہے جس کے معنی پھونک مارنے کے ہیں، اور عُقد عقدۃ کی جمع ہے جس کے معنی گرہ کے ہیں، جادو کرنے والے ڈورے وغیرہ میں گرہ لگا کر اس پر جادو کے کلمات پڑھ کر پھونکتے ہیں، نفاثات فی العقد کے معنی ہوئے گروہوں پر پھونکنے والیاں، مراد جادو کرنے والیاں ہیں اور لفظ نفاثات کا موصوف نفوس بھی ہو سکتا ہے جس میں مرد عورت دونوں داخل ہیں، اس صورت میں جادو کرنے والیوں سے مراد جادو کرنے والی جانیں ہوں گی اور ظاہر یہ ہے کہ اس کا موصوف عورتیں ہیں، عورتوں کی تخصیص شاید اس لئے کی گئی کہ جادو کا کام عموماً عورتیں کرتی ہیں اور کچھ خلقۃً عورتوں کو اس سے مناسبت بھی زیادہ ہے اور یا اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے کا جو واقعہ ان سورتوں کا سبب نزول ہوا اس میں جادو کرنے والیاں ولید بن اعصم کی لڑکیاں تھیں جنہوں نے باپ کے کہنے سے یہ کام کیا تھا، اس لئے اس جادو کی نسبت ان کی طرف کر دی گئی اور جادو کرنے والو سے پناہ مانگنے کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ سبب نزول یہی جادو کا واقعہ ہے اور یہ بھی کہ اس کا شر اور ضرر اس لئے زیادہ ہے کہ انسان کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی بے خبری کی وجہ سے اس کے ازالہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، وہ بیماری سمجھ کر دوا دارو میں لگا رہتا ہے اور تکلیف بڑھ جاتی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ: حسد کو بطور خاص ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کرنے کا اقدام اسی حسد کے سبب سے ہوا، یہود و منافقین آپ کی اور مسلمانوں کی ترقی کو دیکھ کر جلتے تھے اور ظاہری جنگ وقتال میں آپ پر غالب نہیں آسکے تو جادو کے ذریعہ اپنی حسد کی آگ کو بجھانا چاہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاسد دنیا میں بیشمار تھے اس لئے بھی خصوصیت سے پناہ مانگی گئی، نیز حاسد کا حسد اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا، وہ ہر وقت اس کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے اس لئے یہ ضرر شدید بھی ہے، غرض سحر اور جادو کے متعلقہ جتنی چیزیں تھیں سب سے اس سورت میں استعاذہ ہو گیا۔

حضور ﷺ پر جوسحر کا کچھ اثر ہوگیا تھا اس کے ازالہ کے لیے سورہ فلق اور اس کے بعد سورہ ناس کا نزول ہوا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسباب طبعی سے اہل باطل کا اثر اہل حق پر بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ یہودیوں کے جادو کا کچھ اثر نبی کریم ﷺ پر ہوا تھا، اور اس قسم کی تاثیرات حق و باطل کا ہرگز معیار نہیں بن سکتیں جیسا کہ بعض لوگ اس کو کمال سمجھ کر دعوی کرتے ہیں اور گمراہی میں مبتلا ہوجاتے ہیں ۔

* * *

فائدہ: ۱؎ نفاثات فی العقد سے وہ عورتیں یا وہ جماعتیں یا وہ نفس مراد ہیں جو ساحرانہ عمل کرنے کے وقت کسی تانت یا رسی یا بال وغیرہ میں کچھ پڑھ کر اور پھونک مار کر گرہ لگایا کرتے ہیں، حضور ﷺ پر جو سحر لبید بن اعصم نے کیا تھا لکھا ہے کہ بعض لڑکیاں بھی اس میں شریک تھیں، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''اس وقت اس کی ٹوک لگ جاتی ہے''، بیشک ٹوک یا نظر لگ جانا ایک امر واقع ہے، لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک: **ومن شر حاسد اذا حسد** کا مطلب یہ ہے کہ حاسد جب اپنی قلبی کیفیت کو ضبط نہ کر سکے اور عملی طور پر حسد کا اظہار کرنے لگے، اس کی بدی سے پناہ مانگنا چاہئے، اگر ایک شخص کے دل میں بے اختیار حسد پیدا ہو مگر وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر محسود کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہ کرے وہ اس سے خارج ہے۔

نیز یاد رکھنا چاہیے کہ حسد کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے سے اللہ کی دی ہوئی نعمت کے زوال کا متمنی ہو، باقی یہ آرزو کرنا کہ مجھے بھی ایسی نعمت یا اس سے زائد عطا ہو جو فلاں کو عطا ہوئی ہے حسد میں داخل نہیں، اس کو ''غبطہ'' کہتے ہیں، بخاری کی حدیث: ''لا حسد الا فی اثنتین'' الخ میں لفظ ''حسد'' سے یہی ''غبطہ'' مراد ہے۔

ایاتها ٦ ۞ ١١٤ سُورَةُ النَّاسِ مَكِّيَّةٌ ٢١ ۞ رکوعها ١

خلاصہ تفسیر: اس سورت میں دینی واخروی آفات سے پناہ مانگنے کی تاکید ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝١ مَلِكِ النَّاسِ ۝٢ اِلٰهِ النَّاسِ ۝٣

تو کہہ میں پناہ میں آیا لوگوں کے رب کی، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی ۱؎

خلاصہ تفسیر: آپ کہئے کہ میں آدمیوں کے مالک، آدمیوں کے بادشاہ، آدمیوں کے معبود کی پناہ لیتا ہوں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت اور بادشاہت وغیرہ تمام مخلوقات کو شامل ہے، لیکن ان صفات کا جیسا کامل ظہور انسانوں میں ہوا، کسی دوسری مخلوق میں نہیں ہوا، اس لئے ''رب'' اور ''ملک'' وغیرہ کی اضافت ان ہی کی طرف کی گئی، نیز وسواس میں مبتلا ہونا بجز انسان کے دوسری مخلوق کی شان بھی نہیں۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝٤ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝٥ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝٦ ع

بدی سے اس کی جو پھسلائے (بہکائے) اور چھپ جائے ۱؎ وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے دل میں، جنوں میں اور آدمیوں میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: وسوسہ ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے (شیطان) کے شر سے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے خواہ وہ (وسوسہ ڈالنے والا) جن ہو یا آدمی (یعنی جس طرح میں شیاطین الجن سے پناہ مانگتا ہوں، اسی طرح شیاطین الانس سے بھی پناہ مانگتا ہے جیسا کہ قرآن

کریم میں دوسری جگہ جنات اور انسان دونوں میں شیاطین ہونے کا ذکر ہے: **و كذلك جعلنا لكل نبي عدواً شيطين الانس والجن)**

مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ: وسوسہ کے معنی شیطان کا اپنی اطاعت کی طرف ایک مخفی کلام کے ذریعہ بلانا ہے جس کا مفہوم انسان کے دل میں آجائے اور کوئی آواز سنائی نہ دے، خناس، ''خنس'' سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے لوٹنے کے ہیں، شیطان کو ''خناس'' اس لئے کہا گیا کہ اس کی عادت یہ ہے کہ انسان جب اللہ کا نام لیتا ہے تو پیچھے بھاگتا ہے، پھر جب ذرا غفلت ہوئی پھر آجاتا ہے، پھر بندہ اللہ کا نام نام لیتا ہے تو پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، یہی عمل مسلسل جاری رکھتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے قلب میں دو گھر ہیں: ایک میں فرشتہ رہتا ہے، دوسرے میں شیطان (فرشتہ اس کو نیک کاموں کی رغبت دلاتا رہتا ہے اور شیطان برے کاموں کی) پھر جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب تک وہ ذکر اللہ میں مشغول نہیں ہوتا تو اپنی چونچ انسان کے دل پر رکھ کر اس میں برائیوں کے وسوسے ڈالتا ہے۔

الَّذِيۡ يُوَسۡوِسُ فِيۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ: یہاں جس وسوسہ سے ڈرایا گیا ہے اس سے مراد وہ خیال ہے جس میں انسان باختیار خود مشغول ہو، اور غیر اختیاری وسوسہ وخیال جو دل میں آیا اور گزر گیا وہ کچھ مضر نہیں، نہ اس پر کوئی گناہ ہے۔

مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ: یہ بیان ہے وسواس کا یعنی وسوسہ ڈالنے والے جنات میں سے بھی ہوتے ہیں، اور انسانوں میں سے بھی، تو حاصل اس کا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس کی تلقین فرمائی کہ اللہ سے پناہ مانگیں جنات شیطاطین کے شر سے بھی اور انسانی شیاطین کے شر سے بھی، اگر یہ شبہ ہو کہ وسوسہ جناتی شیاطین کی طرف سے ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ مخفی طور پر انسان کے قلب میں کوئی مخفی کام ڈال دلیں، مگر انسانی شیاطین تو کھلم کھلا سامنے آ کر بات کرتے ہیں ان کا وسوسہ سے کیا تعلق ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ انسانی شیاطین بھی اکثر ایسی باتیں کسی کے سامنے کرتے ہیں جن سے اس کے دل میں کسی معاملے کے متعلق ایسے شکوک وشبہات پیدا ہوجاتے ہیں جن کو وہ صراحۃً نہیں کہتے، نیز انسانی شیطان میں اس طرح سے ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا اپنے آپ کو ناصح مشفق کی صورت میں ظاہر کرتا ہے، لیکن اگر اسے ڈانٹ دیا جائے تو پھر وسوسہ سے باز آجاتا ہے، اور اگر قبول کرلیا جائے تو اور مبالغہ کرتا ہے، اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اپنی کتاب ''الفوائد فی مشکلات القرآن'' میں فرمایا کہ انسانی شیطان کے شر سے مراد خود اپنے نفس کا وسوسہ ہے، کیونکہ جس طرح شیطان جن انسان کے دل میں برے کاموں کی طرف رغبت ڈالتا ہے، اسی طرح خود انسان کا اپنا نفس بھی برے ہی کاموں کی طرف مائل ہوتا ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے نفس کے شر سے بھی پناہ مانگنا سکھلایا ہے حدیث میں ہے: ''اللهم اعوذ بك من شر نفسي و شر الشيطان و شركه''، یعنی یا اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں اپنے نفس کے شر سے بھی اور شیطان کے شر اور شرک سے بھی۔

قرآن کریم کے فاتحہ اور خاتمہ میں مناسبت: ایک عجیب لطیف نکتہ اس سورت میں جس سے قرآن کریم کا حسن آغاز واختتام بھی ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ اس سورت کے مضامین اور سورہ فاتحہ کے مضامین بہت ہی قریب قریب ہیں، گویا دونوں ایک ہی ہیں، چنانچہ یہاں **رب الناس** کے مناسب وہاں **رب العلمين** ہے، اور **ملك الناس** کے مناسب وہاں **ملك يوم الدين** ہے اور **اله الناس** کے مناسب وہاں **اياك نعبد** ہے، اور پناہ مانگنے کے مناسب وہاں **اياك نستعين** ہے اور **الوسواس الخناس** کے مناسب وہاں **اهدنا الصراط المستقيم** ہے، قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ سے شروع فرمایا ہے جس کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کے بعد اس کی مدد حاصل کرنا اور اس سے صراط مستقیم کی توفیق مانگنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور صراط مستقیم یہی دو چیزیں ہیں جن میں انسان کی دنیا ودین کے سب مقاصد کی کامیابی مضمر ہے، لیکن ان دونوں چیزوں کے حصول میں اور حصول کے بعد اس کے استعمال میں ہر قدم پر شیطان لعین کے مکر وفریب اور وسوسوں کا جال بچھا رہتا ہے اس لئے اس جال کو پاش پاش کرنے کی مؤثر تدبیر استعاذہ پر قرآن کو ختم کیا گیا۔

* * *

فائدہ: [1] شیطان نظروں سے غائب رہ کر آدمی کو بہکاتا پھسلاتا ہے، جب تک آدمی غفلت میں رہا اس کا تسلط بڑھتا رہا، جہاں بیدار ہو کر اللہ کو یاد کیا، یہ فوراً پیچھے کو کھسکا۔

فائدہ:۲ شیطان جنوں میں بھی ہیں اور آدمیوں میں بھی: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (الانعام: ۱۱۲) اللہ تعالیٰ دونوں سے پناہ میں رکھے۔

تکملہ: ان دونوں سورتوں کی تفسیر میں علماء حکماء نے بہت کچھ نکتہ آفرینیاں کی ہیں، حافظ ابن قیمؒ، امام رازیؒ، ابن سیناؔ، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بیانات درج کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، صرف استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ روحہ، کی تقریر کا خلاصہ درج کرتا ہوں تاکہ فوائد قرآن کے حسن خاتمہ کے لئے ایک فال نیک ثابت ہو: ''یہ ایک فطری اور عام دستور ہے کہ باغ میں جب کوئی نیا پودا زمین کو شق کرتا ہوا تخم سے باہر نکل آتا ہے تو باغبان (یا مالی) اس کے تحفظ میں پوری کوشش اور ہمت صرف کر دیتا ہے اور جب تک وہ جملہ آفات ارضی وسماوی سے محفوظ ہو کر اپنے حد کمال کو نہیں پہنچ جاتا اس وقت تک بہت زیادہ تردد اور عرق ریزی کرنا پڑتی ہے، اب غور کرنا چاہیے کہ پودے کی زندگی کو فنا کر دینے والی یا اس کے ثمرات کے تمتع سے مالک کو محروم بنا دینے والی وہ کون کون سی آفات ہیں جن کے شر اور مضرت سے بچا لینے میں باغبان کو اپنی مساعی کے کامیاب بنانے کی ہر وقت دھن لگی رہتی ہے، ادنیٰ تامل سے معلوم ہو جائے گا کہ ایسی آفات اکثر چار طرح سے ظہور پذیر ہوتی ہیں جن کے انسداد کے لئے باغبان کو چار امور کی اشد ضرورت ہے:

① اول: ایسے سبزہ خور جانوروں کے دندان ودہن کو اس پودے تک پہنچنے سے روکا جائے جن کی جبلت اور خلقت میں سبزہ وگیاہ کا کھانا داخل ہے۔

② دوسرے: کنویں یا نہر یا بارش کا پانی اور ہوا اور حرارت آفتاب (غرضیکہ تمام اسباب زندگی وترقی) کے پہنچنے کا پورا انتظام ہو۔

③ تیسرے: اوپر سے برف اولہ وغیرہ جو اس کی یہ حرارت غریزہ کے احتقان کا باعث ہو اس پر گرنے نہ پائے، کیونکہ یہ چیز اس کی ترقی اور نشوونما کو روکنے والی ہے۔

④ چوتھے: مالک باغ کا دشمن یا اور کوئی حاسد اس پودے کی شاخ وبرگ وغیرہ کو نہ کاٹ ڈالے یا اس کو جڑ سے اکھاڑ کر نہ پھینک دے۔

اگر ان چار باتوں کا خاطر خواہ بندوبست باغبان نے کر لیا تو خدا سے امید رکھنا چاہیے کہ وہ پودا بڑا ہوگا، پھولے پھلے گا، اور مخلوق اس کی پرمیوہ شاخوں سے استفادہ کرے گی، ٹھیک اسی طرح ہم کو خالق ارض وسما سے جو رب الفلق اور فالق الحب والنویٰ اور چمنستان عالم کا حقیقی مالک ومربی ہے اپنے شجرِ وجود اور شجرِ ایمان کے متعلق ان ہی چار قسم کی آفات سے پناہ مانگنا چاہیے جو اوپر مذکور ہوئیں۔

پس معلوم کرنا چاہیے کہ جس طرح اول قسم میں سبزہ خور جانوروں کی ضرررسانی محض ان کی طبیعت کے مقتضیات میں سے تھی، اسی طرح شر کی اضافت **ماخلق** کی طرف سے بھی اسی جانب مشیر ہے کہ یہ شر اس مخلوق میں من حیث ہو مخلوق کے واسطے ثابت ہے اور اس کے صدور میں بجز ان کی طبعیت اور پیدائشی دواعی کے اور کسی سبب کو دخل نہیں، جیسا کہ سانپ بچھو اور تمام سباع وبہائم وغیرہ میں مشاہدہ کیا جاتا ہے:

نیش عقرب نہ از پیے کین است　　　مقتضائے طبیعتش این است

اس کے بعد دوسرے درجہ میں: **غاسق اذا وقب** سے تعوذ کی تعلیم دی گئی ہے، جس سے مفسرین کے نزدیک مراد یا تو رات ہے جب خوب اندھیری ہو، یا آفتاب ہے جب غروب ہو جائے، یا چاند ہے جب اس کو گہن لگ جائے، ان میں سے کوئی معنی لو، اتنی بات یقینی ہے کہ **غاسق** میں سے شر کا پیدا ہونا اس کے وقوب (چھپ جانے) میں اس کے سوا کوئی بات نہیں کہ ایک چیز کا علاقہ ہم سے منقطع ہو جائے اور جو فوائد اس کے ظہور کے وقت ہم کو حاصل ہوتے تھے وہ اب ہاتھ نہ آئیں، لیکن جب یہ ہے تو یہ تمثیل اسباب ومسببات سے زیادہ اور کسی چیز پر چسپاں نہیں ہوتی، کیونکہ مسبب کا وجود اسباب ومعدات کے وجود پر موقوف ہوتا ہے، اور جب تک اسباب کا علاقہ مسببات کے ساتھ قائم نہ ہو ہرگز کوئی مسبب اپنی ہستی میں کامیاب نہیں ہوسکتا، اور یہی وہ بات ہے جس کو ہم نے آفت کی دوسری قسم میں یہ کہہ کر بیان کیا تھا کہ پانی، ہوا اور حرارت آفتاب (غرض کل اسباب زندگی وترقی) کا اگر خاطر خواہ انتظام نہ ہو تو وہ پودا کملا کر خشک ہو جائے گا۔

اب اس کے بعد تیسر اتعوذ: **نفاثاتِ فی العقد** سے کیا گیا، جس سے میں کہہ چکا ہوں ساحرانہ اعمال مراد ہیں، جولوگ سحر کا وجود تسلیم کرتے ہیں وہ یہ مانتے ہیں کہ سحر کے اثر سے مسحور کو ایسے امور عارض ہوجاتے ہیں جن سے طبیعت کے اصلی آثار مغلوب ہو کر دب جائیں تو سحر کی یہ آفت اس آفت سے بہت ہی مشابہ ہوئی جو پودے پر برف وغیرہ گرنے اور حرارت غریزیہ کے محتقن (بند) ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی جس سے اس کا نشوونما رک جاتا تھا، لبید بن اعصم کے قصہ میں جو الفاظ آئے ہیں: " فقام (علیه السلام) کانما انشط من عقال " ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز نے مستولی ہو کر آپ کے مقتضیات طبیعت کو چھپالیا تھا جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے تعوذ سے باذن اللہ دفع ہوگئی، اب ان آفات میں سے جن سے تحرز کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا صرف ایک آخری درجہ باقی ہے، یعنی کوئی مالک باغ کا دشمن بربناء عداوت وحسد پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے یا اس کی شاخ وبرگ کاٹ ڈالے، شر کے اس مرتبہ کو: **ومن شر حاسد اذا حسد** نے بہت ہی وضاحت کے ساتھ ادا کر دیا۔

ہاں! اس تقریر میں اگر کچھ کمی ہے تو صرف اتنی کہ کبھی کبھی تخم کو ان چاروں آفات میں سے کسی کا سامنا کرنا نہیں پڑتا، بلکہ روئیدگی سے پہلے ہی یا تو بعض چیونٹیاں اس تخم کے باطن میں سے وہ خاص جوہر چوس لیتی ہیں جس سے تخم کی روئیدگی ہوتی ہے اور جس کو ہم "قلب الحبوب" یا "سویدائے تخم" سے تعبیر کر سکتے ہیں، یا اندر ہی اندر گھن لگ کر کھوکھلا ہوجاتا ہے اور قابل نشوونما نہیں رہتا، شاید اسی سرسری کمی کی تلافی کے لئے دوسری سورت میں: **الوسواس الخناس** کے شر سے استعاذہ کی تعلیم فرمائی گئی، کیونکہ **وسواس** ان ہی فاسد خطرات کا نام ہے جو ظاہر ہو کر نہیں، بلکہ اندرونی طور پر ایمان کی قوت میں رخنہ ڈالتے ہیں اور جن کا علاج عالم الخفیات والسرائر کے سوا کسی کے قبضہ میں نہیں، لیکن جب وساوس کا مقابلہ ایمان سے ٹھہرا تو دفع وسواس کے واسطے انہی صفات سے تمسک کرنے کی ضرورت ہوئی جو ایمان کے اصل مبادی ومناشی گنے جاتے ہیں اور جن سے ایمان کو مدد پہنچتی ہے۔

اب تجربہ سے معلوم ہوا کہ سب سے اول ایمان (انقیاد وتسلیم) کا نشوونما حق تعالیٰ کی تربیت ہائے بے پایاں اور انعامات بے غایت ہی کو دیکھ کر حاصل ہوتا ہے، پھر جب ہم ان کس ربوبیت مطلقہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ وہ رب العزت مالک الملک اور شہنشاہ مطلق بھی ہے، کیونکہ تربیت مطلقہ کے معنی ہر قسم کی جسمانی وروحانی ضروریات بہم پہنچانے کے ہیں اور یہ کام بجز ایسی ذات منبع الکمالات کے اور کسی سے بن نہیں پڑسکتا، جو ہر قسم کی ضروریات کی مالک ہو اور دنیا کی کوئی ایک چیز بھی اس کے قبضۂ اقتدار سے خارج نہ ہو سکے، ایسی ہی ذات کو ہم "مالک الملک" اور "شہنشاہ مطلق" کہہ سکتے ہیں، اور لاریب اسی کی یہ شان ہونی چاہئے: **لمن الملك اليوم لله الواحد القهار** گویا "مالکیت" یا "ملکیت" ایک ایسی قوت کا نام ہے جس کی فعلیت کا مرتبہ "ربوبیت" سے موسوم ہوتا ہے، کیونکہ ربوبیت کا کل خلاصہ اعطاء منفعت اور دفع مضرت ہے اور ان دونوں چیزوں پر قادر ہونا ہی ملک علی الاطلاق کا منصب ہے۔

پھر ذرا اور آگے بڑھتے ہیں تو ملک علی الاطلاق ہونے ہی سے ہم کو اس کی معبودیت (الٰہیت) کا سراغ ملتا ہے، کیونکہ معبود اسی کو کہتے ہیں جس کے حکم کے سامنے گردن ڈال دی جائے اور اس کے حکم کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے حکم کی اصلا پروانہ کی جائے، تو ظاہر ہے کہ یہ انقیاد وبندگی بجز محبت کاملہ اور حکومت مطلقہ کے اور کسی کے سامنے سزاوار نہیں اور ان دونوں چیزوں کا اصلی مستحق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا، اس لئے معبودیت والہیت کی صفت بھی تنہا اسی وحدہ لاشریک لہ، کے لئے ثابت ہوگئی، پڑھو: **اتعبدون من دون الله مالا يملك لكم ضرا ولا نفعا** غرض سب سے اول جو صفت ایمان کا مبداء بنتی ہے وہ ربوبیت ہے، اس کے بعد صفت ملکیت، اور سب کے بعد الوہیت کا مرتبہ ہے، پس جو شخص اپنے ایمان کو وسواس شیطانی کی مضرت سے بچانے کے لئے حق تعالیٰ کی بارگاہ میں چارہ جوئی کرے گا اس کو اسی طرح درجہ بدرجہ نیچے کی عدالت سے اوپر کی عدالت میں جانا مناسب ہوگا، جس طرح خود اس نے بالترتیب اپنی صفات (**رب الناس، ملك الناس، اله الناس**) کو سورۃ الناس میں بیان فرمادیا ہے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح مستعاذ بہ کی جانب میں یہاں تین صفتیں بغیر واؤ عطف اور بغیر اعادہ باء جارہ کے مذکور ہیں اسی طرح مستعاذ منہ کی جانب بھی تین چیزیں نظر آتی ہیں جو صفت در صفت کر کے بیان کی گئی ہیں، اس کو یوں سمجھ سکتے ہو کہ لفظ وسواس کو صفت الوہیت کے مقابلہ میں رکھو، کیونکہ جس طرح مستعاذ بہ حقیقی: **اله الناس** ہے اور "ملک" و "رب" اسی تک رسائی حاصل کرانے کے عنوان قرار دیے گئے ہیں، اسی طرح

مستعاذ منہ کی حقیقت یہ ہی وسواس ہے جس کی صفت آگے: **خناس** بیان فرمائی ہے۔

خناس سے مراد یہ ہے کہ شیطان بحالت غفلت آدمی کے دل میں وسواس ڈالتا رہتا ہے، اور جب کوئی بیدار ہوجائے تو چوروں کی طرح پیچھے کو کھسک آتا ہے ایسے چوروں اور بدمعاشوں کا بندوبست اور ان کے دست تعدی سے رعایا کو مصؤن و مامون بنانا بادشاہان وقت کا خاص فریضہ ہوتا ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ اس صفت کے مقابل: **ملك الناس** کو رکھا جائے، اور: **الذی یوسوس فی صدور الناس** جو **خناس** کی فعلیت کا درجہ ہے اور جس کو ہم چور کے نقب لگانے سے تشبیہ دے سکتے ہیں اس کو **رب الناس** کے مقابلہ میں (جو حسب تحریر سابق **ملك الناس** کی فعلیت کا مرتبہ ہے) شمار کیا جائے، پھر دیکھئے کہ مستعاذ منہ اور مستعاذ بہ میں کس قدر تام اور کامل تقابل ظاہر ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم باسرار کلامہ۔

تنبیه اول: کئی صحابہ (مثلاً عائشہ صدیقہ، ابن عباس زید بن ارقم) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ پر بعض یہود نے سحر کیا، جس کے اثر سے ایک طرح کا مرض سا بدن مبارک کو لاحق ہوگیا، اس دوران میں کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ ایک دنیاوی کام کر چکے ہیں، مگر خیال گزرتا تھا کہ نہیں کیا، یا ایک کام نہیں کیا اور خیال ہوتا تھا کہ کر چکے ہیں، اس کے علاج کے واسطے اللہ تعالیٰ نے یہ دو سورتیں نازل فرمائیں اور ان کی تاثیر سے وہ اثر باذن اللہ زائل ہوگیا۔

واضح رہے کہ یہ واقعہ صحیحین میں موجود ہے جس پر آج تک کسی محدث نے جرح نہیں کی اور اس طرح کی کیفیت منصب رسالت کے قطعاً منافی نہیں، جیسے آپ ﷺ کبھی کبھی بیمار ہوئے، بعض اوقات غشی طاری ہوگئی یا کئی مرتبہ نماز میں سہو ہوگیا، اور آپ ﷺ نے فرمایا: "انما انا بشر انسی کما تنسون فاذا نسیت فذکرونی" (میں بھی ایک بشر ہی ہوں جیسے تم بھولتے ہو، میں بھی بھولتا ہوں، میں بھول جاؤں تو یاد دلا دیا کرو) کیا اس غشی کی کیفیت اور سہو و نسیان کو پڑھ کر کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اب وحی پر اور آپ ﷺ کی دوسری باتوں پر کیسے یقین کریں، ممکن ہے ان میں بھی سہو و نسیان اور بھول چوک ہوگئی ہو، اگر وہاں سہو و نسیان کے ثبوت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وحی الٰہی اور فرائض تبلیغ میں شکوک و شبہات پیدا کرنے لگیں، تو اتنی بات سے کہ احیاناً آپ ایک کام کر چکے ہوں اور خیال گزرے کہ نہیں کیا، کس طرح لازم آیا کہ آپ ﷺ کی تمام تعلیمات اور فرائض بعثت سے اعتبار اٹھ جائے، یاد رکھیے! سہو و نسیان، مرض اور غشی وغیرہ عوارض خواص بشریت سے ہیں، اگر انبیاء بشر ہیں، تو ان خواص کا پایا جانا اس کے رتبہ کو کم نہیں کرتا، ہاں! یہ ضروری ہے کہ جب ایک شخص کی نسبت دلائل قطعیہ اور براہین نیرہ سے ثابت ہوجائے کہ وہ یقیناً اللہ کا سچا رسول ہے، تو ماننا پڑے گا کہ اللہ نے اس کی عصمت کا تکفل کیا ہے اور وہ ہی اس کو اپنی وحی کے یاد کرانے سمجھانے اور پہنچانے کا ذمہ دار ہے، ناممکن ہے کہ اس کے فرائض دعوت و تبلیغ کی انجام دہی میں کوئی طاقت خلل ڈال سکے، نفس ہو، یا شیطان، مرض ہو، یا جادو، کوئی چیز ان امور میں رخنہ اندازی نہیں کرسکتی، جو مقصد بعثت کے متعلق ہیں۔

کفار جو انبیاء کو "مسحور" کہتے تھے، چونکہ ان کا مطلب نبوت کا ابطال اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ جادو کے اثر سے ان کی عقل ٹھکانے نہیں رہی، گویا "مسحور" کے معنی "مجنون" کے لیتے تھے اور وحی الٰہی کو جوش جنون قرار دیتے تھے (العیاذ باللہ) اس لئے قرآن میں ان کی تکذیب و تردید ضروری ہوئی، یہ دعویٰ کہیں نہیں کیا گیا کہ انبیاء علیہم السلام لوازم بشریت سے مستثنیٰ ہیں، اور کسی وقت ایک آن کے لئے کسی نبی پر سحر کا معمولی اثر جو فرائضِ بعثت میں اصلا خلل انداز ہو نہیں ہوسکتا۔

تنبیه دوم: معوذتین کے قرآن ہونے پر تمام صحابہ کا اجماع ہے اور ان کے عہد سے آج تک بتواتر ثابت ہے، صرف ابن مسعودؓ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ان دو سورتوں کو اپنے مصحف میں نہیں لکھتے تھے، لیکن واضح رہے کہ ان کو بھی ان سورتوں کے کلام اللہ ہونے میں شبہ نہ تھا، وہ مانتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور لاریب آسمان سے اترا ہے، مگر ان کے نازل کرنے کا مقصد رقیہ اور علاج تھا، معلوم نہیں کہ تلاوت کی غرض سے اتاری گئی یا نہیں اس لئے ان کو مصحف میں درج کرنا اور اس قرآن میں شامل کرنا جس کی تلاوت نماز وغیرہ میں مطلوب ہے، خلاف احتیاط ہے۔

روح البیان میں ہیں: "انه كان لا يعد المعوذتين من القرآن وكان لا يكتبهما فى مصحفه يقول انهما منزلتان من السماء و هما من كلام رب انهما من القرآن اوليستا منه فلم يكتبهما فى المصحف" (صفحہ ۲۳۷ جلد ۴) قاضی ابوبکر باقلانی لکھتے

ہیں:"لم ینکر ابن مسعود کو نہما من القرآن وانما انکر اثباتہما فی المصحف فانه کان یری ان لا یکتب فی المصحف شیأا الا ان کان النبی ﷺ اذن فی کتابته فیه و کانه لم یبلغه الاذن"(فتح الباری صفحہ ۵۷۱ جلد ۸) حافظ نے ایک اور عالم کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:"لم یکن اختلاف ابن مسعود مع غیرہ فی قرآنیتہما وانما کان فی صفته من صفاتہما"(فتح الباری صفحہ ۵۷۱ جلد ۵) بہر حال ان کی یہ رائے بھی شخصی اور انفرادی تھی اور جیسا کہ بزار نے تصریح کی ہے کسی ایک صحابی نے ان سے اتفاق نہیں کیا، اور بہت ممکن ہے کہ جب تواتر سے ان کو ثابت ہوگیا ہو کہ یہ بھی قرآن متلو ہے تو اپنی رائے پر قائم نہ رہے ہوں، اس کے علاوہ ان کی یہ انفرادی رائے بھی محض خبر واحد سے معلوم ہوئی ہے جو تواتر قرآن کے مقابلہ میں قابل سماعت نہیں ہوسکتی، شرح مواقف میں ہے:ان اختلاف الصحابة فی بعض سور القرآن مروی بالاحاد المفیدة للظن و مجموع القرآن منقول بالتواتر المفید الیقین الذی یضمحل الظن فی مقابلته فتلك الاحاد مما لا یلتفت الیه ثم ان سلمنا اختلافهم فیما ذکر قلنا انهم لم یختلفوا فی نزوله علی النبی ﷺ ولا فی بلوغه فی البلاغة حد الاعجاز بل فی مجرد کونه من القرآن و ذٰلك لا یضر فیما نحن بصدده .

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:"واجیب باحتمال انه کان متواترا فی عصر ابن مسعود لکن لم یتواتر عند ابن مسعود فانحلت العقدة بعون الله تعالیٰ"، الخ

اور صاحب المعانی کہتے ہیں:"ولعل ابن مسعود رجع عن ذٰلك".

* * *

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْالُک اَنْ تَجعَلَ الْقُرآنَ الْعَظِیْمَ رَبِیعَ قُلُوبِنَا، وَ جَلَاءَ اَحْزَانِنا، وَ ذَهَابَ هُمُومِنَا، وَ اَنْ تُخَلِّطَه بِلُحُومِنَا وَ دِمَائِنَا وَ اَسْمَاعِنَا وَ اَبْصَارِنَا، وَ تَسْتَعْمِلَ بِهٖ اَجْسَادَنَا، وَ اَنْ تُذَکِّرَنَا مِنْهُ مَا نَسِیْنَا، وَ تُعَلِّمَنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا، وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ اللَّیْلِ وَ آنَاءَ النَّهَارِ، وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ، وَ صَلِّ اللّٰهُمَّ وَ بَارِکْ وَ سَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْکَرِیْمِ الامِیْنِ، اَلْمَبْعُوْثِ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ، وَ عَلٰی آلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ، وَعَلٰی کُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ، آمین یا ربّ العالمین -

یادداشت

Banuri
بنوری